مجموعہ
مُنشی پریم چند
افسانے
مُنشی پریم چند

مجموعہ

مُنشی پریم چند

افسانے

مُنشی پریم چند

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Prem Chand, Munshi
Majmoa Munshi Prem Chand :
Afsanay / Munshi Prem Chand. -
Lahore : Sang - e - Meel Publications,
2002.
928p.
1. Urdu Adab - Afsanay. I. Title.

2002.
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan. Phone 7667970

کمبائن پرنٹرز، لاہور

فہرست

تعارف

کسی دریا کے کنارے، سرد لہر سے چُلّو میں پانی لے کر تشنگی بجھاتے ہوئے ہم شعوری طور پر کبھی بھی اس امر کا احساس نہیں کرتے کہ ہماری پیاس بجھانے والا' یہ آبِ خنک کتنا طویل سفر طے کرتا ہوا آیا۔ کیا اس نے کسی گلیشیئر کی کوکھ سے جنم لیا یا کوئی گہری جھیل اس کی ماں ہے؟

کچھ ایسا ہی عالم تخلیقی اصناف کا بھی ہوتا ہے' آج کا قاری کسی اچھے افسانے کے مطالعے سے لطف اندوز ہوتے وقت کبھی بھی اس امر کا ادراک نہ کرے گا کہ یہ اچھا افسانہ—— افسانے کے جس دریا سے ملا' وہ دریا بذاتِ خود کتنی طویل مسافت کے بعد لمحۂ موجود تک آیا ہے؟

اردو افسانہ سو برس کا ہو گیا مگر تخلیقی لحاظ سے بوڑھا نہیں ہوا تو اس کا بڑا سبب منشی پریم چند ہیں جو اردو کے پہلے افسانہ نگار کے طور پر معروف رہے۔ اگرچہ اب ان کی اولیّت کے بارے میں سوالات کیے جا چکے ہیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پریم چند' سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری سے بہت بہتر اور ان کے مقابلہ میں قد آور افسانہ نگار ہیں۔

پریم چند کا اصل نام دھنپت رائے تھا مگر سرکاری ملازمت کی پابندیوں اور ان سے بھی بڑھ کر اپنے افسانوں کے سیاسی موضوعات کی بنا پر پہلے نواب رائے اور پھر پریم چند کے قلمی نام اختیار کیے۔ **31** جولائی **1880**ء کو ضلع بنارس کے موضع ملہی میں ڈاکخانہ کے ملازم عجائب لال کے ہاں ولادت ہوئی۔ غربت اور نامساعد حالات کے باوجود بڑی محنت اور لگن سے تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا مگر وقفوں وقفوں سے امتحانات پاس کیے۔ **1899**ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا مگر بی۔اے (الہ آباد یونیورسٹی) کرنے کی نوبت **1919**ء میں آئی۔

پریم چند سرکاری ملازمت میں ترقی کرتے گئے اور ڈپٹی انسپکٹر آف سکولز کے عہدہ تک پہنچ گئے مگر اپنے سیاسی تصورات کی بنا پر **1921**ء میں سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو کر خود کو کلیتاً تحریر کے لیے وقف کر دیا اور آخری وقت تک قلمی لحاظ سے فعال رہے۔ **8** اکتوبر **1936**ء کو بنارس میں انتقال ہوا۔

افسانہ کے محققین کے بموجب پریم چند کا پہلا افسانہ بعنوان ''عشق دنیا اور حبِ وطن'' اس دور کے معروف ادبی جریدہ ''زمانہ'' (مدیر: دیا نرائن نگم) کے شمارہ اپریل **1908**ء میں طبع ہوا' نواب رائے کے قلمی نام سے۔ تاہم

"دنیا کا سب سے انمول رتن" (1907ء) ان کے اولین افسانہ کے لحاظ سے معروف ہے اور بالعموم اسی لیے پریم چند کی تخلیقی زندگی کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ 1908ء میں "سوزِ وطن" کے نام سے ان پانچ افسانوں "دنیا کا سب سے انمول رتن" ___ "شیخ مخمور" ___ "یہی میرا وطن ہے" ___ "صلۂ ماتم" ___ "عشق دنیا اور حبِ وطن" ___ پر مشتمل پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا تو انگریز سرکار کو اس میں "بغاوت" نظر آئی' ملازمت بچانے کی خاطر آئندہ نہ لکھنے کا وعدہ کیا' کتاب نذرِ آتش ہوئی۔ مگر تخلیقی فنکار کو یوں پابند نہیں کیا جاسکتا۔ باطن میں تخلیق کا جو شعلہ فروزاں تھا وہ اپنے اظہار کو بے قرار رہا چنانچہ نواب رائے کے بجائے پریم چند کا قلمی نام اختیار کیا' اس نام سے "زمانہ" (دسمبر: 1910ء) میں "بڑے گھر کی بیٹی" پہلا افسانہ طبع ہوا' عمر بھر اسی نام سے لکھا اور اسی نام سے امر ہوئے۔

معروف افسانوی مجموعوں کے نام یہ ہیں:

"سوزِ وطن" (1908ء)، "پریم پچیسی" (1915ء)، "پریم بتیسی" (1920ء)، "پریم چالیسی" (1930ء)، "آخری تحفہ" (1934ء)، "زادِ راہ" (1936ء)۔

پریم چند نے افسانوں کے علاوہ متعدد عمدہ ناول بھی لکھے جیسے "بازارِ حسن" (1918ء)، "گوشۂ عافیت" (1928ء)، "چوگانِ ہستی" (1927ء)، "نرملا" (1929ء)، "میدانِ عمل" (1932ء)، "گئودان" (1936ء)۔

پریم چند نے فکشن کے علاوہ علمی' ادبی اور سیاسی موضوعات پر مضامین اور شخصی خاکے بھی قلم بند کیے۔ ملازمت سے مستعفی ہونے کے بعد ہندی میں بھی لکھنا شروع کر دیا۔ ہندی میں اپنا رسالہ "ہنس" بھی جاری کیا۔

پریم چند نے غلام ہندوستان میں جنم لیا۔ ان کے والد معمولی حیثیت کے انسان تھے' پریم چند منہ میں سونے کا چمچا لے کر پیدا نہ ہوئے تھے۔ تعلیم کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کی تو وہ بھی سول سروس کی اعلیٰ ملازمت نہ تھی بلکہ محکمۂ تعلیم میں سکول مدرس تھے۔ پریم چند ان تمام ناآسودگیوں کا عملی تجربہ رکھتے تھے جو نچلے متوسط طبقہ کے افراد کا مقدر ہوتی ہیں اس لیے اگر پریم چند نے معاصر زندگی کے تضادات' اقتصادی عدم مساوات اور عام افراد کی جذباتی ناآسودگیوں کو موضوع بنایا تو یہ بطور رواج یا ادبی کلیشے کے طور پر نہ تھا بلکہ وہ خود ان سب سے واقف تھے بالخصوص سماجی ناہمواری سے۔

بطور افسانہ نگار پریم چند کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو افسانہ کی عمارت کی اولین خشت سیدھی رکھی' یوں افسانہ کی جو عمارت "تا ثریا" پہنچی وہ بھی سیدھی ہی رہی' ٹیڑھی نہ ہوئی!

اس بات کو ناول کی مثال سے سمجھیے۔ نذیر احمد نے اصلاحی مقاصد کے لیے ناول کو استعمال کیا مگر اس کے فنی تقاضے ملحوظ نہ رکھے۔ اس کے بعد عبدالحلیم شرر نے شاعرانہ اسلوب میں ناول کو دلچسپ تاریخی رومانس کے لیے وقف کر دیا۔ چنانچہ "امراؤ جان ادا" کی صورت میں ناول کو زمین پر آنے کے لیے نصف صدی تک انتظار کرنا پڑا مگر پریم چند نے افسانہ کا آغاز ہی زمین سے کیا اور وہ حقیقت نگاری کا انداز اپنا کر!

جب 1936ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس تحریک کی اساس اور منشور سے کہیں پہلے پریم چند اپنے فکشن میں ان ہی تصوراتِ ادب کا ابلاغ کر رہے تھے اس لیے اگر انہوں نے انتقال سے چند ماہ پیشتر انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس (لکھنؤ: 15 اپریل 1936ء) کے خطبۂ صدارت میں یہ تصورِ ادب دیا تو یہ انجمن کے ادبی مقاصد سے قطع نظر عمر بھر کی تخلیقی لگن پر مشتمل ذاتی سوچ بھی تھی:

"ہماری کسوٹی پر وہ ادب پر پورا اترے گی جس میں تفکر ہو' آزادی کا جذبہ ہو' حسن کا جوہر ہو' تعمیر کی روح

ہو' زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہو' جو ہم میں حرکت' ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرے' سلائے نہیں کیونکہ اب اور زیادہ سونا موت کی علامت ہوگی۔"

پریم چند انجمن ترقی پسند مصنّفین کی تاسیس سے کہیں پہلے ترقی پسند اور ادبی مقاصد اپنا چکے تھے لہٰذا انہیں ترقی پسندوں کا ہراول قرار دیا جاسکتا ہے۔ پریم چند نے اردگرد پھیلی زندگی کے تضادات' افراد کے رویوں میں تنوع' انسانی شخصیت کے نفسیاتی مطالعے' اقتصادی ناہمواری' سماجی عدم مساوات اور غلام ہند کی سیاسی صورتِ حال کے تجزیہ اور مطالعہ کے لیے اپنے افسانوں اور ناولوں کو بھی محدّب شیشہ میں تبدیل کرلیا۔ انہوں نے اس خوبی سے کردار واعمال کی توضیح کی کہ آج بھی ان کے افسانوں کا مطالعہ بصیرت افروز ثابت ہوسکتا ہے۔ سب کچھ بھول جائے صرف "کفن" ہی پریم چند کو زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

جدید ادبی مباحث میں "کمٹمنٹ" کا بہت چرچا ہے اور اس کے ڈانڈے جنگ عظیم دوم میں یورپ کی زیر زمین تحریکوں سے ملائے جاتے ہیں جبکہ اردو ادب میں کمٹمنٹ کی اولین مثال پریم چند کی صورت میں ملتی ہے۔ ایک کمٹڈ ادیب اپنے عصر' معاشرہ اور سیاسی صورتِ حال میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے اور ان ہی مقاصد کے حصول کے لیے وہ قلم کو بطور ہتھیار استعمال کرتا ہے ـــــ اور یہی کام پریم چند نے اس زمانہ میں کیا جب نہ سوشلزم کا تصور تھا' نہ ترقی پسندی تھی اور نہ ہی کمٹمنٹ کی اصطلاح۔

گزشتہ نصف صدی میں ادبی تصورات تغیر آشنا ہوئے۔ کئی چڑھی پتنگیں کٹیں' کئی غباروں سے ہوا نکلی' متعدد مقبول افسانہ نگاروں کے مجموعے اب الماریوں کی زینت بنے ہیں' اس عہدِ آشوب میں ایک منٹو ہے جو آج بھی "کارآمد" محسوس ہوتا ہے۔

پریم چند کے سو سے زائد افسانوں کی اس "کلیات" کی اشاعت اس لحاظ سے اہم ہے کہ آج کا قاری کل کے بڑے افسانہ نگار کو از سرِنو دریافت کرسکتا ہے۔ نصاب میں شامل افسانوں اور ناول سے قطع نظر پریم چند کے افسانوی مجموعے دستیاب نہ تھے' اب افسانہ کا ناقد' ان افسانوں کی روشنی میں عصرِ حاضر کے تقاضوں کے تناظر میں پریم چند کی ضرورت اور اہمیت طے کرکے' اس کی بازیافت کرتے ہوئے اس کا مقام متعین کرسکتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کتاب کی اشاعت ایک اہم ادبی خبر ہے۔

سنگِ میل پبلی کیشنز کے ناشر نیاز احمد اور ان کے صاحبزادہ افضال احمد (اور مرحوم اعجاز احمد بھی) اس انداز کی اہم کتابوں کی اشاعت سے ادب و نقد کی جو خدمت کررہے ہیں' اس کی داد انہیں ملنی چاہیے۔

ڈاکٹر سلیم اختر

دنیا کا سب سے انمول رتن

دلفگار ایک پُر خار درخت کے نیچے دامن چاک بیٹھا ہوا خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ وہ حسن کی دیوی یعنی ملکہ دلفریب کا سچا اور جانباز عاشق تھا۔ ان عشاق میں نہیں جو عطر پھلیل میں بس کر اور لباس فاخرہ سے سج کر عاشق کے بھیس میں معشوقیت کا دم بھرتے ہیں بلکہ ان سیدھے سادے' بھولے بھالے فدائیوں میں جو کوہ و بیابان میں سر ٹکراتے اور نالہ و فریاد مچاتے پھرتے ہیں۔ دلفریب نے اس سے کہا تھا کہ اگر تو میرا سچا عاشق ہے تو جا اور دنیا کی سب سے بیش بہا شے لے کر میرے دربار میں آ۔ تب میں تجھے اپنی غلامی میں قبول کروں گی۔ اگر تجھے وہ چیز نہ ملے تو خبردار! ادھر کا رُخ نہ کرنا ورنہ دار پر کھینچوا دوں گی۔ دلفگار کو اپنے جذبے کے اظہار کا شکوہ و شکایات کا اور جمالِ یار کے دیدار کا مطلق موقع نہ دیا گیا۔ دلفریب نے جونہی یہ فیصلہ سنایا' اس کے چوبداروں نے غریب دلفگار کو دھکے دے کر باہر نکال دیا اور آج تین دن سے یہ ستم رسیدہ شخص اسی پُر خار درخت کے نیچے اسی وحشت ناک میدان میں بیٹھا ہوا سوچ رہا ہے کہ کیا کروں؟ دنیا کی سب سے بیش بہا شے! مجھ کو ملے گی! ناممکن! اور وہ ہے کیا؟ قارون کا خزانہ؟ آب حیات؟ تاج خسرو؟ جام جم؟ تخت طاؤس؟ زر پرویز؟ نہیں یہ چیزیں ہرگز نہیں۔ دنیا میں ضرور ان سے بھی گراں تر' ان سے بھی بیش بہا چیزیں موجود ہیں مگر وہ کیا ہیں؟ کہاں ہیں؟ کیسے ملیں گی؟ یا خدا میری مشکل کیونکر آسان ہو گی!

دلفگار انہی خیالات میں چکر کھا رہا تھا اور عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ منیر شامی کو حاتم سا مددگار مل گیا۔ اے کاش کوئی میرا بھی مددگار ہو جاتا۔ اے کاش مجھے بھی اس چیز کا جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے ہے' نام بتلا دیا جاتا۔ بلا سے وہ شے دستیاب نہ ہوتی مگر مجھے اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ وہ کس قسم کی چیز ہے۔ میں گھڑے برابر موتی کی کھوج میں جا سکتا ہوں۔ میں سمندر کا نغمہ' پتھر کا دل' قضا کی آواز اور ان سے بھی زیادہ بے نشان چیزوں کی تلاش میں کمر ہمت باندھ سکتا ہوں مگر دنیا کی سب سے بیش بہا شے! یہ میرے پرِ پرواز سے بہت بالاتر ہے۔

آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔ دلفگار یکا یک خدا کا نام لے کر اٹھا اور ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔ بھوکا پیاسا' برہنہ تن' خستہ و زار وہ برسوں ویرانوں اور آبادیوں کی خاک چھانتا پھرا۔ تلوے کانٹوں سے چھلنی ہو گئے۔ جسم میں تارِ مسطر کی طرح ہڈیاں ہی ہڈیاں نظر آنے لگیں مگر وہ چیز جو دنیا کی سب سے بیش بہا شے تھی' نہ میسر ہوئی اور نہ اس کا کچھ نشان ملا۔

ایک روز وہ بھولتا بھٹکتا ایک میدان میں جا نکلا جہاں ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ بیچ میں کئی عمامے اور عبا والے ریشائیل قاضی شان تحکم سے بیٹھے ہوئے باہم کچھ غرفش کر رہے تھے اور اس جماعت سے ذرا دور پر ایک سولی کھڑی تھی۔ دلفگار کچھ تو ناتوانی کے غلبے سے اور کچھ یہاں کی کیفیت دیکھنے کے ارادے سے ٹھٹک

گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ کئی برقنداز ایک دست و پا بزنجیر قیدی کو لیے چلے آرہے ہیں۔ سولی کے قریب پہنچ کر سب سپاہی رک گئے اور قیدی کی ہتھکڑیاں، بیڑیاں سب اتار لی گئیں۔ اس بد قسمت شخص کا دامن صدہا بے گناہوں کے خون کے چھینٹوں سے رنگین ہو رہا تھا اور اس کا دل نیکی کے خیال اور رحم کی آواز سے مطلق مانوس نہ تھا۔ اسے کالا چور کہتے تھے۔ سپاہیوں نے اسے سولی کے تختے پر کھڑا کر دیا۔ موت کی پھانسی اس کی گردن میں ڈال دی اور جلادوں نے تختہ کھینچنے کا ارادہ کیا کہ بد قسمت مجرم چیخ کر بولا۔ للہ مجھے ایک دم کے لیے پھانسی سے اتار دو تاکہ اپنے دل کی آخری آرزو نکال لوں۔ یہ سنتے ہی چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ حیرت میں آ آکر تاکنے لگے۔ قاضیوں نے ایک مرنے والے شخص کی آخری استدعا کو رد کرنا مناسب نہ سمجھا اور بد نصیب سیہ کار کالا چور کو ذرا دیر کے لیے پھانسی سے اتار لیا گیا۔

اسی مجمع میں ایک خوبصورت بھولا بھالا لڑکا ایک چھڑی پر سوار ہو کر اپنے پیروں پر اچھل اچھل فرضی گھوڑا دوڑا رہا تھا اور اپنے عالم سادگی میں ایسا مگن تھا گویا وہ اس وقت واقعی کسی عربی رہوار کا شہسوار ہے۔ اس کا چہرہ اس سچی مسرت سے کنول کی طرح کھلا ہوا تھا جو چند دنوں کے لیے بچپن ہی میں حاصل ہوتی ہے اور جس کی یاد ہم کو مرتے دم تک نہیں بھولتی۔ اس کا سینہ ابھی تک معصیت کے گرد و غبار سے بے لوث تھا اور معصومیت اسے اپنی گود میں کھلا رہی تھی۔

بد قسمت کالا چور پھانسی سے اترا۔ ہزاروں آنکھیں اس پر گڑی ہوئی تھیں۔ وہ اس لڑکے کے پاس آیا اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگا۔ اسے اس وقت وہ زمانہ یاد آیا، جب وہ خود ایسا ہی بھولا بھالا، ایسا ہی خوش و خرم اور آلائشات دنیاوی سے ایسا ہی پاک و صاف تھا۔ ماں گودیوں میں کھلاتی تھی۔ باپ بلائیں لیتا تھا اور سارا کنبہ جانیں وارا کرتا تھا۔ آہ! کالے چور کے دل پر اس وقت ایام گزشتہ کی یاد کا اتنا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے جنھوں نے نیم بسمل لاشوں کو تڑپتے دیکھا اور نہ جھپکی تھیں، آنسو کا ایک قطرہ ٹپک پڑا۔ دلفگار نے لپک کر اس دُرِ یکتا کو ہاتھ میں لے لیا اور اس کے دل نے کہا، بے شک یہ شے دنیا کی سب سے انمول چیز ہے جس پر تخت طاؤس اور جام جم اور آب حیات اور زر پرویز سب تصدق ہیں۔

اس خیال سے خوش ہوتا کامیابی کی امید میں سرمست دلفگار اپنی معشوقۂ دلفریب کے شہر مینو سواد کو چلا مگر جوں جوں منزلیں طے ہوتی جاتی تھیں، اس کا دل بیٹھا جاتا تھا کہ کہیں اس چیز کی جسے میں دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھتا ہوں، دلفریب کی نگاہوں میں قدر نہ ہوئی تو میں دار پر کھینچ دیا جاؤں گا اور اس دنیا سے نامراد جاؤں گا۔ پر ہر چہ بادا باد۔ اب تو قسمت آزمائی ہے۔ آخر کوہ و دریا طے کرتے شہر مینو سواد میں آ پہنچا اور دلفریب کے درِ دولت پر جاکر التماس کی کہ خستہ و زار دلفگار بفضل خدا تعمیل ارشاد کر کے آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔ دلفریب نے فی الفور حضور میں بلا بھیجا اور ایک زرنگار پردہ کی اوٹ سے فرمائش کی کہ وہ ہدیہ بیش بہا پیش کرو۔ دلفگار نے ایک عجیب امید و بیم کے عالم میں وہ قطرہ پیش کیا اور اس کی ساری کیفیت نہایت موثر لہجے میں بیان کی۔ دلفریب نے کل روئداد بغور سنی اور تحفہ ہاتھ میں لے کر ذرا دیر تک غور کر کے بولی۔ ”دلفگار! بے شک تو نے دنیا کی ایک بیش قیمت چیز ڈھونڈ نکالی۔ تیری ہمت کو آفریں اور تیری فراست کو مرحبا! مگر یہ دنیا کی سب سے بیش قیمت چیز نہیں، اس لیے تو یہاں سے جا اور پھر کوشش کر۔ شاید اب کی تیرے ہاتھ دُرِ مقصد لگے اور تیری قسمت میں میری غلامی لکھی ہو۔ اپنے عہد کے مطابق میں تجھے دار پر کھینچوا سکتی ہوں مگر میں تیری جان بخشی کرتی ہوں۔ اس لیے کہ تجھ میں وہ اوصاف موجود

ہیں جو میں اپنے عاشق میں دیکھنا چاہتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تو ضرور کبھی سرخرو ہو گا۔" ناکام و نامراد دلفگار اس عنایتِ معشوقانہ سے ذرا دلیر ہو کر بولا۔ "اے محبوب دلنشین! بعد مدت ہائے دراز کے تیرے آستان کی جبہ سائی نصیب ہوتی ہے۔ پھر خدا جانے ایسے دن کب آئیں گے۔ کیا تو اپنے عاشق جانباز کے حال زار پر ترس نہ کھائے گی اور کیا اپنے جمال جہان آرا کا ایک نظارہ دکھا کر اس سوختہ تن دلفگار کو آنے والی سختیوں کے جھیلنے کے لیے مستعد نہ بنائے گی۔ تیری ایک نگاہِ مست کے نشہ سے بے خود ہو کر میں وہ کر سکتا ہوں جو آج تک کسی سے نہ ہوا۔" دلفریب عاشق کے یہ اشتیاق آمیز کلمات سن کر برافروختہ ہو گئی اور حکم دیا کہ اس دیوانے کو کھڑے کھڑے دربار سے نکال دو۔ چوبدار نے فوراً غریب دلفگار کو دھکے دے کر کوچہ یار سے باہر نکال دیا۔

کچھ دیر تک تو دلفگار معشوقہ ستم کیش کی اس تند خوئی پر آنسو بہاتا رہا۔ بعد ازاں سوچنے لگا کہ اب کہاں جاؤں۔ مدتوں کی رہ نوردی و بادیہ پیمائی کے بعد یہ قطرۂ اشک ملا تھا۔ اب ایسی کون سی چیز ہے جس کی قیمت اس دُرِ آبدار سے زائد ہو۔ حضرت خضر! تم نے سکندر کو چاہِ ظلمات کا راستہ دکھایا تھا۔ کیا میری دستگیری نہ کرو گے؟ سکندر شاہ ہفت کشور تھا۔ میں تو ایک خانماں برباد مسافر ہوں۔ تم نے کتنی ہی ڈوبتی کشتیاں کنارے لگائی ہیں۔ مجھ غریب کا بیڑا بھی پار کرو۔ اے جبرئیل عالی مقام! کچھ تمہی اس عاشقِ نیم جان واسیر رنج و محن پر ترس کھاؤ۔ تم مقربان بارگاہ سے ہو۔ کیا میری مشکل آسان نہ کرو گے؟ الغرض دلفگار بیزار نے بہت فریاد مچائی مگر کوئی اس کی دستگیری کے لیے نمودار نہ ہوا۔ آخر مایوس ہو کر وہ مجنون صفت دوبارہ ایک طرف کو چل کھڑا ہوا۔

دلفگار نے پورب سے پچھم تک اور اُتّر سے دکھن تک کتنے ہی دیاروں کی خاک چھانی۔ کبھی برفستانی چوٹیوں پر سویا، کبھی ہولناک وادیوں میں بھٹکتا پھرا مگر جس چیز کی دھن تھی، وہ نہ ملی۔ یہاں تک کہ اس کا جسم ایک تودۂ استخواں ہو گیا۔

ایک روز وہ شام کے وقت کسی دریا کے کنارے خستہ حال پڑا ہوا تھا۔ نشۂ بے خودی سے چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ صندل کی ایک چتا بنی ہوئی ہے اور اس پر ایک نازنین شہانے جوڑے پہنے، سولہ سنگار کیے بیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے زانو پر اس کے پیارے شوہر کی لاش ہے۔ ہزاروں آدمی حلقہ باندھے کھڑے ہیں اور پھولوں کی برکھا کر رہے ہیں۔ یکایک چتا میں سے خود بخود ایک شعلہ اٹھا۔ ستی کا چہرہ اس وقت ایک پاک جذبہ سے منور ہو رہا تھا۔ مبارک شعلے اس کے گلے لپٹ گئے اور دم زدن میں وہ پھول سا جسم تودۂ خاکستر ہو گیا۔ معشوق نے اپنے تئیں عاشق پر نثار کر دیا اور دو فدائیوں کی سچی، لافانی اور پاک محبت کا آخری جلوہ نگاہ ظاہر سے پنہاں ہو گیا۔ جب سب لوگ اپنے گھروں کو لوٹے تو دلفگار چپکے سے اٹھا اور اپنے گریبان چاک دامن میں یہ تودۂ خاک سمیٹ لیا اور اس مشت خاک کو دنیا کی سب سے گراں بہا چیز سمجھتا ہوا کامرانی کے نشہ میں مخمور کوچہ یار کی طرف چلا۔ اب کے جوں جوں وہ منزل مقصود کے قریب آتا تھا اس کی ہمتیں بڑھتی جاتی تھیں۔ کوئی اس کے دل میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا، اب کے تیری فتح ہے اور اس خیال نے اس کے دل کو جو جو خواب دکھائے، ان کا ذکر فضول ہے۔ آخر وہ شہر مینو سواد میں داخل ہوا اور دلفریب کے آستانِ رفعت نشان پر جا کر خبر دی کہ دلفگار سرخرو اور باوقار لوٹا ہے اور حضوری میں باریاب ہوا چاہتا ہے۔ دلفریب نے عاشق جانباز کو فوراً دربار میں بلایا اور اس چیز کے لیے جو دنیا کی سب سے بیش بہا جنس تھی، ہاتھ پھیلا دیا۔ دلفگار نے جرأت کر کے اس ساعد سیمیں کا بوسہ لے لیا اور وہ مشتِ خاک اس میں رکھ کر اس کی ساری کیفیت نہایت دلسوز الفاظ میں کہہ سنائی اور معشوقۂ دلپذیر کے نازک لبوں سے اپنی قسمت کا مبارک اور جانفزا فیصلہ سننے کے لیے

منتظر ہو بیٹھا۔ دلفریب نے اس مشتِ خاک کو آنکھوں سے لگالیا اور کچھ دیر تک دریائے تفکر میں غرق رہنے کے بعد بولی۔ ''اے عاشق جان نثار دلفگار! بے شک یہ خاک کیمیا صفت جو تو لایا ہے' دنیا کی نہایت بیش قیمت چیز ہے اور میں تیری صدق دل سے ممنون ہوں کہ تو نے ایسا بیش بہا تحفہ مجھے پیشکش کیا مگر دنیا میں اس سے بھی زیادہ گرانقدر کوئی چیز ہے۔ جا' اسے تلاش کر اور تب میرے پاس آ۔ میں تہ دل سے دعا کرتی ہوں کہ خدا تجھے کامیاب کرے۔'' یہ کہہ کر وہ پردۂ زرنگار سے باہر آئی اور معشوقانہ ادا سے اپنے جمال جانسوز کا نظارہ دکھا کر پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ ایک برق تھی کہ کوندی اور پھر پردۂ ابر میں چھپ گئی۔ ابھی دلفگار کے حواس بجا نہ ہونے پائے تھے کہ چوبدار نے ملائمت سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کوچۂ یار سے نکال دیا۔ اور پھر تیسری بار وہ بندۂ محبت' وہ زاویہ نشینِ کنجِ ناکامی یاس کے اتھاہ سمندر میں غوطہ کھانے لگا۔

دلفگار کا ہیاؤ (حوصلہ) چھوٹ گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ میں دنیا میں ناشاد و نامراد مر جانے کے لیے پیدا کیا گیا تھا اور اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ کسی پہاڑ پر چڑھ کر اپنے تئیں گرا دوں تاکہ معشوق کی جفاکاریوں کی فریاد کرنے کے لیے ایک ریزۂ استخواں بھی باقی نہ رہے۔ وہ دیوانہ وار اٹھا اور افتاں و خیزاں ایک سر بفلک کوہ کی چوٹی پر جا پہنچا۔ کسی اور وقت وہ ایسے اونچے پہاڑ پر چڑھنے کی جرات نہ کر سکتا تھا مگر اس وقت جان دینے کے جوش میں اسے وہ پہاڑ ایک معمولی ٹیکرے سے زیادہ اونچا نہ نظر آیا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے کود پڑے کہ ایک سبز پوش پیر مرد' سبز عمامہ باندھے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا لیے برآمد ہوئے اور ہمت افزا لہجہ میں بولے۔ ''دلفگار! نادان دلفگار! یہ کیا بزدلانہ حرکت ہے۔ استقلال راہِ عاشق کی پہلی منزل ہے۔ با اینہمہ ادعائے عاشقی تجھے اتنی بھی خبر نہیں۔ مرد بن اور یوں ہمت نہ ہار۔ مشرق کی طرف ایک ملک ہے جس کا نام ہندوستان ہے۔ وہاں جا اور تیری آرزو پوری ہو گی۔'' یہ کہہ کر حضرت خضر غائب ہو گئے۔ دلفگار نے شکریے کی نماز ادا کی اور تازہ حوصلے' تازہ جوش اور غیبی امداد کا سہارا پا کر خوش خوش پہاڑ سے اترا اور جانبِ ہند مراجعت کی۔

مدتوں تک پُرخار جنگلوں' شرربار ریگستانوں' دشوار گزار وادیوں اور ناقابل عبور پہاڑوں کو طے کرنے کے بعد دلفگار ہند کی پاک سرزمین میں داخل ہوا اور ایک خوشگوار چشمہ میں سفر کی کلفتیں دھو کر غلبۂ ماندگی سے لب جوئبار لیٹ گیا۔ شام ہوتے ہوتے وہ ایک کف دست میدان میں پہنچا جہاں بے شمار نیم کشتہ و بے جان لاشیں بے گور و کفن پڑی ہوئی تھیں۔ زاغ و زغن اور وحشی درندوں کی گرم بازاری تھی اور سارا میدان خون سے شنگرف ہو رہا تھا۔ یہ ہیبت ناک نظارہ دیکھتے ہی دلفگار کا جی دہل گیا۔ خدایا! کس عذاب میں جان پھنسی۔ مرنے والوں کا کراہنا' سسکنا اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر جان دینا۔ درندوں کا ہڈیوں کو نوچنا اور گوشت کے لوتھڑوں کو لے کر بھاگنا۔ ایسا ہولناک نظارہ دلفگار نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ یکایک اسے خیال آیا۔ میدان کارزار ہے اور یہ لاشیں سورما سپاہیوں کی ہیں۔ اتنے میں قریب سے کراہنے کی آواز آئی۔ دلفگار اس طرف پھرا تو دیکھا کہ ایک قوی ہیکل شخص جس کا مردانہ چہرہ ضعف جانکندنی سے زرد ہو گیا ہے' زمین پر سرنگوں پڑا ہوا ہے۔ سینے سے خون کا فوارہ جاری ہے مگر شمشیر آبدار کا قبضہ پنجے سے الگ نہیں ہوا۔ دلفگار نے ایک چیتھڑا لے کر دہانِ زخم پر رکھ دیا تاکہ خون رک جائے اور بولا۔ ''اے جوان مرد تُو کون ہے؟'' جوان مرد نے یہ سن کر آنکھیں کھولیں اور دلیرانہ لہجے میں بولا۔ ''کیا تو نہیں جانتا' میں کون ہوں؟ کیا تُو نے آج اس تلوار کی کاٹ نہیں دیکھی؟ میں اپنی ماں کا بیٹا اور بھارت کا لختِ جگر ہوں۔'' یہ کہتے کہتے اس کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ زرد چہرہ خشمگیں ہو گیا اور شمشیر آبدار پھر اپنا جوہر دکھانے کے لیے چمک اٹھی۔ دلفگار

سمجھ گیا کہ یہ اس وقت مجھے دشمن خیال کر رہا ہے۔ ملائمت سے بولا۔ ”اے جوان مرد! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ ایک آوارۂ وطن، غربت زدہ مسافر ہوں۔ ادھر بھولتا بھٹکتا آ نکلا۔ براہ کرم مجھ سے یہاں کی مفصل کیفیت بیان کر۔“
یہ سنتے ہی زخمی سپاہی نہایت شیریں لہجہ میں بولا۔ ”اگر تو مسافر ہے تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی نہیں چھین سکتا۔ افسوس ہے کہ تو یہاں ایسے وقت میں آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہو گئے مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں تُو دیکھ رہا ہے' یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں۔ (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں۔ (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تُو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں؟ نہیں' ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں۔“

جوان مرد کی آواز مدھم ہو گئی۔ اعضا ڈھیلے ہو گئے۔ خون اس کثرت سے بہا کہ اب خود بخود بند ہو گیا۔ رہ رہ کر ایک آدھ قطرہ ٹپک پڑتا تھا۔ آخر کار سارا جسم بے دم ہو گیا۔ قلب کی حرکت بند ہو گئی اور آنکھیں مُند گئیں۔ دلفگار نے سمجھا اب کام تمام ہو گیا کہ مرنے والے نے آہستہ سے کہا۔ ”بھارت ماتا کی جے۔“ اور اس کے سینے سے آخری قطرہ خون نکل پڑا۔ ایک سچے محبِّ وطن اور دیس بھگت نے حب الوطنی کا حق ادا کر دیا۔ دلفگار اس نظارہ سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے دل نے کہا' بے شک دنیا میں اس قطرۂ خون سے بیش قیمت شے نہیں ہو سکتی۔ اس نے فوراً اس رشکِ لعل رمّانی کو ہاتھ میں لیا اور اس دلیر راجپوت کی بسالت پر عش عش کرتا ہوا عازم وطن ہوا اور وہی سختیاں جھیلتا ہوا بالآخر ایک مدتِ دراز میں ملکۂ اقلیم خوبی اور دُرِ صدف محبوبی کے درِ دولت پر جا پہنچا اور پیغام دیا کہ دلفگار سرخرو و کامگار لوٹا ہے اور دربار گہربار میں حاضر ہونا چاہتا ہے۔ دلفریب نے اسے فوراً حاضر ہونے کا حکم دیا۔ خود حسب معمول پردۂ زرنگار کے پس پشت بیٹھی اور بولی۔ ”دلفگار! اب کی تو بہت دنوں کے بعد واپس آیا ہے۔ لا' دنیا کی سب سے بیش بہا چیز کہاں ہے؟“ دلفگار نے پنجۂ حنائی کا بوسہ لے کر وہ قطرۂ خون اس پر رکھ دیا اور اس کی مشرح کیفیت پُر جوش لہجے میں کہہ سنائی۔ وہ خاموش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ یکایک وہ پردۂ زرنگار ہٹ گیا اور دلفگار کے روبرو ایک دربار حسن آراستہ نظر آیا جس کی ایک ایک نازنین رشک زلیخا تھی۔ دلفریب بصد شان رعنائی مسند زریں کار پر جلوہ افروز تھی۔ دلفگار یہ طلسم حسن دیکھ کر متحیر ہو گیا اور نقش دیوار کی طرح سکتے میں آ گیا کہ دلفریب مسند سے اٹھی اور کئی قدم آگے بڑھ کر اس کے ہم آغوش ہو گئی۔ رقاصانِ دلنواز نے شادیانے گانے شروع کیے۔ حاشیہ نشینانِ دربار نے دلفگار کو نذریں گزاریں اور ماہ و خورشید کو بہ عزت تمام مسند پر بٹھا دیا۔ جب نغمۂ دل پسند بند ہوا تو دلفریب کھڑی ہو گئی اور دست بستہ ہو کر دلفگار سے بولی۔ ”اے عاشق جانثار دلفگار! میری دعائیں تیر بہدف ہوئیں اور خدا نے میری سن لی اور تجھے کامیاب و سرخرو کیا۔ آج سے تو میرا آقا اور میں تیری کنیز ناچیز۔“

یہ کہہ کر اس نے ایک مرصّع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالا جس پر آبِ زر سے لکھا ہوا تھا۔

”وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے۔“

شیخ مخمور

(1)

ملک جنت نشان کی تاریخ میں وہ بہت تاریک زمانہ تھا جب شاہِ کشور کی فتوحات کا سیلاب بڑے زور و شور کے ساتھ اس پر آیا۔ سارا ملک پامال ہو گیا۔ آزادی کی عمارتیں ڈھے گئیں اور جان و مال کے لالے پڑ گئے۔ شاہ بامراد خوب جی توڑ کر لڑا۔ خوب داد شجاعت دی اور اپنے خاندان کے تین لاکھ سورماؤں کو اپنے ملک پر قربان کر دیا۔ مگر فاتح کی شمشیر خارا شگاف کے مقابلے میں اس کی یہ مردانہ جانبازیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ملک پر شاہِ کشور کشا کی حکومت کا سکہ جم گیا اور شاہ بامراد یکہ و تنہا و بے یارومددگار' اپنا سب کچھ آزادی کے نام پر قربان کر کے ایک جھونپڑے میں زندگی بسر کرنے لگا۔

یہ جھونپڑا کوہستانی مقام میں واقع تھا۔ آس پاس جنگلی قومیں آباد تھیں اور دور دور تک پہاڑوں کے سلسلے نظر آتے تھے۔ اس سنسان جگہ میں شاہ بامراد ایام مصیبت کاٹنے لگا۔ دنیا میں اب اس کا کوئی رفیق نہ تھا۔ وہ دن بھر آبادی سے دور ایک چٹان پر اپنے خیال میں مست بیٹھا رہتا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کوئی شراب عرفان کا مخمور ہے۔ شاہ بامراد کو یوں گزارہ کرتے ایک زمانہ گزر گیا اور شباب کی الوداع و پیری کے خیر مقدم کے سامان ہونے لگے۔

تب ایک روز شاہ بامراد بستی کے سردار کے پاس گیا اور اس سے کہا' میں اپنی شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اس کی جانب سے یہ پیغام سن کر وہ متعجب ہو گیا مگر چونکہ دل میں شاہ صاحب کے کمال و فقر کا معتقد تھا۔ ردِ سوال نہ کر سکا اور اپنی دوشیزہ' نوجوان بیٹی ان کے نذر کی۔ تیسرے سال اس نازنین کے گلشن مراد میں ایک نورس پودا اگا۔ شاہ صاحب فرط مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سمائے۔ بچہ کو گود میں اٹھا لیا اور حیرت میں ڈوبی ہوئی ماں کے روبرو پُر جوش لہجے میں بولے۔ "خدا کا شکر ہے کہ ملکِ جنت نشان کا وارث پیدا ہوا۔"

بچہ بڑھنے لگا۔ فہم و ذکاوت میں' ہمت و طاقت میں وہ اپنی دوگنی عمر کے بچوں سے بڑھ کر تھا۔ صبح ہوتے ہی غریب رندہ بچے کا بناؤ سنگار کر کے اور اسے ناشتہ کھلا کر اپنے کام دھندے میں مصروف ہو جاتی تھی اور شاہ صاحب بچے کی انگلی پکڑ کر اسی آبادی سے دور چٹان پر لے جاتے۔ وہاں کبھی اسے پڑھاتے' کبھی فنون حرب کی مشق کراتے اور کبھی اسے قوانین شاہی سمجھاتے۔ بچہ تھا تو کمسن مگر ان باتوں میں ایسا جی لگاتا اور ایسے شوق سے مصروف رہتا گویا اسے اپنے حسب و نسب کا حال معلوم ہے۔ مزاج بھی اس کا شاہانہ واقع ہوا تھا۔ گاؤں کا ایک ایک لڑکا اس کے حکم کا فرمانبردار تھا۔ ماں اس پر فخر کرتی' باپ پھولا نہ سماتا اور سارے گاؤں کے لوگ سمجھتے کہ یہ شاہ صاحب کے کشف و کرامات کا اثر ہے۔

بچہ مسعود دیکھتے دیکھتے ایک ہفت سالہ نوجوان شہزادہ ہو گیا۔ اسے دیکھ کر دیکھنے والے کے دل کو سُرور ہوتا تھا۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ شاہ صاحب تنہا سیر کرنے گئے اور جب لوٹے تو ان کے سر پر ایک تاج مرصع زیب دے رہا تھا۔ رندہ ان کی یہ ہیئت دیکھ کر سہم گئی اور منہ سے کچھ نہ بول سکی۔ تب انہوں نے نوجوان مسعود کو گلے سے لگایا۔ اسے اسی وقت نہلایا' دھلایا اور ایک چٹان کے تخت پر بیٹھا کر رقت آمیز لہجے میں بولے۔ "مسعود! میں آج تم

سے رخصت ہوتا ہوں اور تمہاری امانت تمہیں سونپتا ہوں۔ یہ اسی ملک جنت نشان کا تاج ہے۔ کوئی وہ زمانہ تھا کہ یہ تاج تمہارے بدنصیب باپ کے سر پر زیب دیتا تھا۔ اب وہ تمہیں مبارک ہو۔ رندہ! پیاری بیوی! تیرا بدقسمت شوہر کسی زمانے میں اس ملک کا فرمانروا تھااور اب تواس کی ملکہ ہے۔ میں نے یہ راز تم سے اب تک چھپایا تھا مگر ہماری فرقت کا زمانہ بہت قریب ہے۔ اب چھپا کر کیا کروں۔ مسعود! تم ابھی بچے ہو مگر دلیر اور ذی فہم ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اپنے بوڑھے باپ کی آخری وصیت پر دھیان دو گے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرو گے۔ یہ ملک تمہارا ہے۔ یہ تاج تمہارا ہے اور یہ رعایا تمہاری ہے۔ تم انہیں اپنے قبضے میں لانے کی مرتے دم تک کوشش کرتے رہنا اور اگر تمہاری تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور تمہیں بھی یہی بے سروسامانی کی موت نصیب ہو تو یہی وصیت تم اپنے فرزند دلبند سے کر دینا اور یہ تاج جو اس کی امانت ہو گی' اس کے سپرد کرنا۔ مجھے تم سے اور کچھ نہیں کہنا۔ خدا تم دونوں کو خوش و خرم رکھے اور تمہیں مراد کو پہنچائے۔"

یہ کہتے کہتے شاہ صاحب کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ رندہ دوڑ کر ان کے پیروں سے لپٹ گئی اور مسعود گریہ و زاری کرنے لگا۔ دوسرے دن صبح کو گاؤں کے لوگ جمع ہوئے اور ایک کوہستانی غار کے آغوش میں لاش رکھ دی۔

(2)

شاہ کشور کشا نے نصف صدی تک خوب عدل وانصاف سے سلطنت کی مگر کشور کشا ثانی نے تخت پر آتے ہی اپنے عقلمند باپ کے مشیروں کو یک قلم برخاست کر دیا اور اپنی مرضی کے موافق نئے نئے وزیر و مشیر مامور کیے۔ کار سلطنت روز بروز بگڑنے لگا۔ سرداروں نے بے انصافی پر کمر باندھی اور عمال رعایا پر جور و جبر کرنے لگے۔ یہاں تک کہ خاندان مرادیہ کے ایک نمک خوار قدیم نے موقع اچھا دیکھ کر علم بغاوت بلند کر دیا۔ اطراف سے لوگ اس کے زیر علم جمع ہونے لگے اور چند ہفتوں میں ایک فوج کثیر قائم ہو گئی اور مسعود بھی سردار نمک خوار کی فوج میں آکر معمولی سپاہیوں کا کام انجام دینے لگا۔

مسعود کا اس وقت عنفوانِ شباب تھا۔ دل میں مردانہ جوش اور بازوؤں میں شیروں کی قوت موجود تھی۔ ایسا وجیہ اور کشیدہ قامت جوان رعنا بہت کم کسی نے دیکھا ہو گا۔ شیروں کے شکار کا اسے عشق تھا۔ دور دور تک کے جنگل درندوں سے خالی ہو گئے۔ سویرے سے شام تک اسے بجز سیر و شکار کے اور کوئی دھندا نہ تھا۔ لب و لہجہ ایسا دلکش پایا تھا کہ جس وقت سُرور میں آکر کوئی قومی نغمہ چھیڑ دیتا تو راہ چلتے مسافروں اور پہاڑی عورتوں کا ایک اژدحام لگ جاتا تھا۔ کتنے ہی بھولے بھالے دلوں پر اس کی موہنی صورت نقش تھی۔ کتنی ہی آنکھیں اس کے دیدار کو ترستی تھیں۔

اور کتنی ہی جانیں اس کے سوز محبت میں گھلتی تھیں مگر مسعود پر ابھی تک کسی کا جادو نہ چلا تھا۔ ہاں اگر اسے محبت تھی تو اپنی شمشیر آب دار سے جو اس نے باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اس تیغ کو وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا۔ بیچارہ خود برہنہ تن رہتا مگر اس کے لیے انواع واقسام کے میان بنوائے تھے۔ اسے ایک دم کے لیے اپنے پہلو سے جدا نہ کرتا۔ سچ ہے دلیر سپاہی کی تلوار اس کی نگاہوں میں دنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ خصوصاً وہ خنجر آبدار جس کا جوہر متعدد موقعوں پر پرکھا جا چکا ہو۔ اسی تیغ سے مسعود نے کتنے ہی وحشی درندوں کو ہلاک کیا تھا۔

کتنے ہی لٹیروں اور رہزنوں کو شربتِ مرگ چکھایا تھا اور اسے یقین کامل تھا کہ یہی تلوار کسی دن کشور کشا ثانی کے سر پر چمکے گی اور اس کی شہ رگ کے خون سے اپنی زبان تر کرے گی۔

ایک روز وہ ایک شیر کے تعاقب میں بہت دور نکل گیا۔ دھوپ سخت تھی۔ بھوک اور پیاس سے جی بے تاب ہوا مگر وہاں نہ تو کوئی میوے کا درخت' نہ کوئی رواں چشمہ نظر آیا جس سے بھوک اور پیاس کی آگ بجھاتا۔ حیران و پریشان کھڑا تھا کہ سامنے سے ایک مہوش نازنین ہاتھ میں نیزہ لیے اور اسپ برق رفتار پر سوار آتی ہوئی دکھائی دی۔ پسینے کے موتی کے سے قطرے اس کی پیشانی پر نمودار تھے اور گیسوئے عنبریں دونوں شانوں پر ایک دل پذیر بے تکلفی سے بکھرے ہوئے تھے۔ دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں اور مسعود کا دل ہاتھ سے جاتا رہا۔ اس غریب نے آج تک ایسا جمال جہاں سوز نہ دیکھا تھا۔ اس پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ نازنین اس دیار میں ملکہ شیر افگن کے نام سے مشہور تھی۔

ملکہ نے مسعود کو دیکھ کر گھوڑے کی باگ کھینچ لی اور تند لہجہ میں بولی۔ "کیا تو وہی نوجوان ہے جو میرے علاقے کے شیروں کا شکار کیا کرتا ہے؟ بتلا تیری اس گستاخی کی کیا سزا دوں؟" یہ سنتے ہی مسعود کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور بے اختیار ہاتھ دستۂ تیغ پر جا پہنچا مگر ضبط کر کے بولا۔ "اس سوال کا جواب میں خوب دیتا' اگر بجائے آپ کے وہ کسی دلیر مرد کی زبان سے نکلتا۔" ان الفاظ نے ملکہ کو اور بھی برانگیختہ کر دیا۔ اس نے گھوڑے کو چمکایا اور نیزہ اچھالتی سر پر آ پہنچی اور وار پر وار کرنے شروع کیے۔ مسعود کے ہاتھ پاؤں شدتِ تکان سے شل ہو رہے تھے۔ ملکہ شیر افگن فن نیزہ بازی میں فرد تھی۔ اس نے پیہم چر کے پر چر کے لگائے۔ یہاں تک کہ مسعود زخمی ہو کر گھوڑے سے گر پڑا۔ اس نے اب تک بجز ملکہ کے واروں کو کاٹنے کے خود ایک ہاتھ بھی نہ چلایا تھا۔

تب ملکہ گھوڑے سے کودی اور اپنا رومال پھاڑ پھاڑ کر مسعود کے زخم باندھنے لگی۔ ایسا دلیر اور غیور جوان مرد اس کی نظر سے آج تک نہ گزرا تھا۔ وہ اسے بہ آرام تمام اٹھوا کر اپنے خیمے میں لائی اور کامل دو ہفتے تک اس کی عیادت میں مصروف رہی۔ یہاں تک کہ زخم انگور ہو گئے اور مسعود کا چہرہ پھر بدرِ کامل کی طرح چمکنے لگا مگر حسرت یہ تھی کہ اب ملکہ نے اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیا۔

ایک روز ملکہ شیر افگن نے مسعود کو دربار میں بلایا اور یوں ہمکلام ہوئی۔ "اے مغرور نوجوان! خدا کا شکر ہے کہ تُو میرے نوکِ سناں کے زخموں سے صحت پا گیا۔ اب میرے علاقے سے جا۔ تیری گستاخی معاف کرتی ہوں مگر آئندہ میرے علاقے میں شکار کے لیے آنے کی جرات نہ کرنا۔ فی الحال تاکیداً تیری تلوار چھین لی جائے گی تاکہ تو نشۂ نخوت سے مخمور ہو کر پھر ادھر قدم بڑھانے کی ہمت نہ کرے۔

مسعود نے شمشیر برہنہ نیام سے کھینچ لی اور کڑک کر بولا۔ "جب تک میرے دم میں دم ہے' کوئی یہ تلوار مجھ سے نہیں لے سکتا۔" یہ سنتے ہی ایک قوی ہیکل دیو قامت پہلوان للکار کر بڑھا اور مسعود کی کلائی پر تیغہ کا تُلا ہوا ہاتھ چلایا۔ مسعود نے وار خالی دیا اور سنبھل کر تیغ کا وار کیا تو پہلوان کی گردن کا تسمہ تک نہ باقی رہا۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ملکہ کی آنکھوں سے چنگاریاں اڑنے لگیں۔ غضبناک لہجے میں بولی۔ "خبر دار یہ شخص یہاں سے زندہ نہ جانے پاوے۔" چوطرفہ سے نبرد آزمایانِ پختہ کار پل پڑے اور مسعود پر تلواروں اور نیزوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔

مسعود کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا۔ خون کے فوارے جاری تھے اور خون کی پیاسی تلواریں زبان کھولے بار بار اس کی طرف لپکتی تھیں اور اس کا خون چاٹ کر شادکام ہو جاتی تھیں۔ کتنی ہی تلواریں اس کی سپر سے ٹکرا کر

ٹوٹ گئیں۔ کتنے ہی دلاورانِ سر فروش زخمی ہو کر تڑپنے لگے اور کتنے ہی راہیِ عدم ہو گئے مگر مسعود کے ہاتھ میں شمشیر آبدار جوں کی توں برق کی طرح کوندتی اور ستھراؤ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ پُر فن ملکہ نے خود نعرۂ تحسین بلند کیا اور اس کے تیغہ کا بوسہ لے کر بولی۔ "مسعود! تو بحر بسالت کا نہنگ ہے۔ شیروں کے شکار میں تضیع اوقات مت کر۔ دنیا میں شکار کے علاوہ اور بھی ایسے موقع ہیں جہاں تو اپنے تیغ آبدار کا جوہر دکھا سکتا ہے۔ جا اور ملک و قوم کی خدمت کر۔ سیر و شکار ہم جیسی عورتوں کے لیے چھوڑ دے۔" مسعود کے دل نے گدگدایا۔ کلامِ شوق زبان تک آیا مگر باہر نکل نہ سکا اور اسی وقت وہ اپنے جگر میں ناوکِ مژگان کی خلش لیے ہوئے تین ہفتوں کے بعد اپنی بے قرار ماں کے قدموں پر جا گرا۔

(3)

سردار نمک خوار کی فوج روز بروز بڑھنے لگی۔ پہلے تو وہ تاریکی کے پردے میں خزائن شاہی پر ہاتھ بڑھاتا رہا۔ رفتہ رفتہ ایک باقاعدہ فوج تیار ہو گئی۔ یہاں تک کہ سردار کو افواج شاہی کے مقابلے میں شمشیر آزمائی کا حوصلہ ہوا اور پہلی ہی لڑائی میں چوبیس قلعے اس نئی فوج کے ہاتھ آ گئے۔ فوج شاہی نے لڑنے میں مطلق دریغ نہ کیا مگر وہ طاقت، وہ جذبہ جو سردار نمک خوار اور اس کے رفقاء کے دلوں کو میدانِ ہمت میں آگے بڑھاتا رہتا تھا، کشور کشا ثانی کے سپاہیوں میں معدوم تھا۔ فنونِ جنگ آوری، خوبیِ اسلحہ اور ظاہری تزک و احتشام کے لحاظ سے دونوں فوجوں میں کوئی مقابلہ نہ تھا۔ بادشاہ کے سپاہی لحیم و شحیم، توانا و تنومند اور کار آزمودہ تھے۔ ان کے ساز و سامان اور طور و طریق سے دیکھنے والوں کے دلوں پر ایک ہیبت طاری ہوتی تھی اور وہم بھی یہ گمان نہ کر سکتا تھا کہ اس زبردست جماعت کے مقابلے میں نیم مسلح، نیم برہنہ اور بے قاعدہ سرداری فوج ایک لمحہ تک بھی قدم جما سکے گی مگر جس وقت "بزن" کی دل بڑھانے والی صدا ہوا میں گونجی۔ ایک عجیب و غریب نظارہ پیش نظر ہو گیا۔ سردار کے سپاہی تو نعرے مار کر آگے دھاوا کرتے تھے اور سپاہ قیصری راہ گریز پر دبی ہوئی نگاہیں ڈالتی تھیں۔ دم زدن میں مورچے غبار کی طرح پھٹ گئے اور جب مسقاط کے مضبوط قلعے میں سردار نمک خوار شاہی قلعہ دار کی مسند پر امیرانہ کر و فر سے بیٹھا اور اپنی سپاہ کی کار گزاریوں اور جانبازیوں کی داد دینے کے لیے ایک طشت میں طلائی تمغے منگوا رکھے تو سب سے پہلے جس سپاہی کا نام پکارا گیا، وہ نوجوان مسعود تھا۔

مسعود اس وقت اپنی فوج کا مایۂ ناز تھا۔ میدان جنگ میں سب سے پہلے اس کی تلوار چمکتی تھی اور دھاوے کے وقت سب سے پہلے اسی کے قدم اٹھتے تھے۔ غنیم کے مورچوں میں ایسی بے باکی سے گھستا تھا جیسے آسمان میں شہاب ثاقب۔ اس کی تلوار کے وار قیامت تھے اور اس کا نشانہ تیرِ پیامِ مرگ۔

مگر چرخ کج رفتار سے اس کا یہ اعزاز و قار نہ دیکھا گیا۔ چند افسرانِ آزمودہ کار جن کے تیغوں کی چمک مسعود کے تیغہ کے سامنے ماند پڑ گئی تھی، اس سے خار کھانے لگے اور اسے مٹا دینے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ سوءِ اتفاق سے انہیں موقع بھی جلد ہاتھ آ گیا۔

کشور کشا ثانی نے باغیوں کی سرزنش کے لیے اب کی ایک جرار فوج روانہ کی اور میر شجاع کو اس کا سپہ سالار بنایا جو میدانِ کارزار میں اپنے وقت کا اسفندیار تھا۔ سردار نمک خوار نے یہ خبر پائی تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میر شجاع

کے مقابلے میں آنا شکست کی دعوت کرنا تھا۔ بالآخر یہ رائے قرار پائی کہ اس خطے سے آبادی کا نشان مٹا کر ہم لوگ قلعہ بند ہو جائیں۔ اس وقت نوجوان مسعود نے اٹھ کر بڑے پُرجوش لہجے میں کہا۔
"نہیں ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم میدان میں رہیں گے اور دست بدست دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ ہمارے سینوں کی ہڈیاں ایسی کمزور نہیں ہیں کہ تیر و تفنگ کے نشانے نہ برداشت کر سکیں۔ قلعہ بند ہونا اس بات کا اعلان ہے کہ ہم دوبدو نہیں لڑ سکتے۔ کیا آپ لوگ جو شاہ بامراد کے نام لیوا ہیں' بھول گئے کہ اسی ملک پر اس نے اپنے خاندان کے تین لاکھ سپوتوں کو پھول کی طرح نثار کر دیا؟ نہیں! ہم ہرگز قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اگر خدا منصف ہے تو ضرور ہماری تلواریں دشمنوں سے گلے ملیں گی اور ہمارے نیزے ان سے ہم آغوش ہوں گے۔"

صدہا نگاہیں مسعود کے پرجوش چہرے کی طرف اٹھ گئیں۔ سرداروں کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور سپاہیوں کے سینے جوش سے دھڑکنے لگے۔ سردار نمک خوار نے اسے گلے سے لگایا اور بولے۔ "مسعود! تیری ہمت اور حوصلہ کو آفریں۔ تو ہماری فوج کے لیے باعث فخر ہے۔ تیری صلاح مردانہ صلاح ہے۔ بے شک ہم قلعہ بند نہ ہوں گے۔ ہم دشمن کے مقابلے میں خم ٹھونک کر آئیں گے اور اپنے پیارے جنت نشان کے لیے اپنا خون پانی کی طرح بہائیں گے۔ تُو ہمارے لیے مشعل رہبر ہے اور ہم سب آج اسی روشنی میں قدم آگے بڑھائیں گے۔"
مسعود نے چنے ہوئے سپاہیوں کا ایک دستہ تیار کیا اور کچھ اس دم خم اور کچھ اس جوش و خروش سے میر شجاع پر ٹوٹا کہ اس کی ساری فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ سردار نمک خوار نے جب دیکھا کہ سپاہ قیصری کے قدم ڈگمگا رہے ہیں تو اپنی پوری جماعت سے برق و باد کی طرح لپکا اور تیغوں سے تیغے اور نیزوں سے نیزے کھڑکنے لگے۔ تین گھنٹے تک ایک شور محشر بپا تھا۔ یہاں تک کہ سپاہ قیصری کے قدم اکھڑ گئے اور وہ سپاہی جس کی تلوار میر شجاع کی گلوگیر ہوئی' مسعود تھا۔

تب سرداری فوج اور افسر سب کے سب مال غنیمت پر ٹوٹے اور مسعود زخموں سے چُور اور خون میں رنگا ہوا اپنے چند جانباز رفیقوں کے ساتھ قلعۂ مسقاط کی طرف لوٹا۔ مگر جب ہوش نے آنکھیں کھولیں اور حواس بجا ہوئے تو کیا دیکھتا ہے کہ میں ایک آراستہ کمرے میں مخملی گدے پر لیٹا ہوا ہوں۔ پھولوں کی دلآویز مہک اور ماہرویانِ سروقد کے جمگھٹ سے کمرہ تختۂ چمن بنا ہوا ہے۔ قطر استعجاب سے ادھر ادھر تاکنے لگا کہ اتنے میں ایک پری وش' گل اندام نازنین طشت میں پھولوں کا ہار لیے خراماں خراماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ گویا بہار پھولوں کی ڈالی پیش کرنے آرہی ہے۔ اسے دیکھتے ہی ماہرویانِ سروقد نے آنکھیں فرشِ راہ کیں اور اس کے دستِ حنائی کے بوسے لیے۔ مسعود دیکھتے ہی پہچان گیا کہ یہ ملکہ شیر افگن تھی۔

ملکہ نے پھولوں کا ہار مسعود کے گلے میں ڈالا۔ زرو جواہر اس پر نثار کیے اور مسندِ زرنگار پر جلوہ افروز ہو گئی۔ سازندوں نے بین لے کر فاتح مہمان کے خیر مقدم میں دلکش نغمے الاپنے شروع کیے۔
یہاں تو عیش و طرب کے جلسے تھے۔ ادھر رشک خانہ برانداز نے نئے شگوفے کھلائے۔ سردار سے شکایت کی کہ مسعود ضرور حریف سے جاملا ہے اور آج مصلحتاً ایک دستہ فوج لے کر لڑنے کو گیا تھا تاکہ اسے خاک و خون میں سلا کر سرداری فوج کو بے چراغ کر دے۔ اس کی شہادت میں چند نقلی خطوط بھی دکھائے اور اس کمینہ کوشش میں ایسی چرب زبانی سے کام لیا کہ آخر سردار کو ان باتوں پر یقین آگیا۔ جب علی الصبح مسعود ملکہ شیر افگن کے دربار سے فتح کا

ہار گلے میں ڈالے سردار کو مبارکباد دینے گیا تو بجائے اس کہ قدردانی کا خلعت اور جانبازی کا تمغہ پائے وہاں تیر ملامت کا نشانہ بنایا گیا اور اسے حکم ملا کہ تلوار کمر سے کھول کر رکھ دے۔

مسعود دم بخود رہ گیا۔ یہ تیغہ میں نے پدر بزرگوار سے ورثہ میں پایا ہے اور یہ میری گزشتہ عظمت کی آخری یادگار ہے۔ یہ میرا قوتِ بازو اور میرا معین و مددگار ہے۔ اس کے ساتھ کیسی کیسی یادگاریں وابستہ ہیں۔ کیا میں جیتے جی اسے اپنے پہلو سے جدا کر دوں۔ اگر مجھ پر کوئی فرد بشر میدان کارزار سے قدم ہٹانے کا الزام لگا سکتا؟ اگر کوئی فرد بشر اس تیغہ کا استعمال میرے مقابلے میں زیادہ کارگزاری کے ساتھ کر سکتا۔ اگر میرے بازوؤں میں تیغہ پکڑنے کی قوت نہ ہوتی تو بخدا میں خود ہی تیغہ کمر سے کھول کر رکھ دیتا مگر خدا کا شکر ہے کہ میں ان الزامات سے بَری ہوں۔ پھر کیوں میں اسے ہاتھ سے دوں؟ کیا اس کے لیے چند بدخواہ حاسدوں نے سردار نمک خوار کو میری جانب سے بدظن کر دیا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔

مگر پھر اسے خیال آیا' میری سرکشی پر سردار اور بھی برگشتہ ہو جائیں گے اور یقیناً مجھ سے تلوار بزور شمشیر چھین لی جائے گی۔ ایسی حالت میں میرے اوپر نثار ہونے والے سپاہی کب اپنے تئیں قابو میں رکھ سکیں گے۔ ضرور آپس میں خون کی ندیاں بہیں گی اور بھائی بھائی کا سر کاٹے گا۔ نہ! خدا نہ کرے کہ میرے سبب سے ایسے روح فرسا سانحے درپیش ہوں۔ یہ سوچ کر اس نے چپکے سے شمشیر سردار نمک خوار کے پہلو میں رکھ دی اور خود سر نیچا کیے' ضبط کی انتہائی قوت سے غصہ کو دباتا ہوا خیمہ سے باہر نکل آیا۔

مسعود پر ساری فوج فخر کرتی تھی اور اس پر جانیں وارنے کے لیے سربکف رہتی تھی۔ جس وقت اس نے شمشیر آبدار کھولی ہے' دو ہزار سورما سپاہی نیام پر ہاتھ رکھے اور شعلہ بار آنکھوں سے تاکتے کنوتیاں بدل رہے تھے۔ مسعود کے ایک ذرا سے اشارے کی دیر تھی اور دم کے دم میں لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے۔ مگر مسعود شجاعت ہی میں یگانہ روزگار نہ تھا ضبط اور استقلال میں بھی اس کا ثانی نہ تھا۔ اس نے یہ ذلت اور رسوائی سب گوارا کی۔ تلوار دینا گوارا کیا۔ بغاوت کا الزام لینا گوارا نہ کیا اور ہم چشموں کے روبرو سر جھکانا گوارا کیا مگر یہ نہ گوارا کیا کہ اس کی ذات سے فوج میں سرکشی اور نافرمانبرداری کا خیال پیدا ہو۔ اور ایسے نازک وقت میں جبکہ کتنے ہی دلیرانِ جنگ آزما ضبط ہاتھ سے کھو بیٹھتے اور عالم غیظ و غضب میں ایک دوسرے کے گلے کاٹتے' مسعود خاموش اور ثابت قدم رہا۔ اس کی پیشانی پر ذرا بھی بل نہ آیا۔ اس کے تیور ذرا بھی نہ بدلے۔ اس نے خونبار آنکھوں سے رفیقوں کو خیر باد کہا اور بادلِ حسرت ناک اٹھا اور ایک غارِ کوہ میں چھپ بیٹھا۔ اور جب آفتاب کے غروب ہو جانے پر وہاں سے اٹھا تو اس کے دل نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ داغ بدنامی ماتھے سے مٹاؤں گا اور حاسدوں کو ندامت کے غار میں گراؤں گا۔

مسعود نے لباس فقیرانہ اختیار کیا۔ سر پر خود کے بجائے لمبی جٹائیں بنائیں۔ جسم پر بجائے زرہ و بکتر کے گیروے رنگ کا بانا سجا ہاتھ میں تلوار کے بجائے قدح فقیری لیا۔ نعرۂ جنگ کے بجائے یا حق کی صدا بلند کی اور اپنا نام شیخ مخمور رکھ دیا۔ مگر یہ جوگی دوسرے جوگیوں کی طرح دھونی رما کر نہ بیٹھا اور نہ فقر و ریاضت کی تلقین شروع کی۔ وہ غنیم کی فوج میں جاتا اور سپاہیوں کی باتیں سنتا۔ کبھی ان کی مورچہ بندیوں پر نگاہ دوڑاتا۔ کبھی ان کے دمدموں اور فصیلوں کا معائنہ کرتا۔ تین بار سردار نمک خوار غنیم کے پنجے سے ایسے وقت نکلے جبکہ انہیں جان براری کی کوئی آس نہ رہی تھی اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھی۔ منقاد کا قلعہ جیتنا کوئی آسان بات نہ تھی۔ پانچ ہزار جنگ آور سپاہی اس کی محافظت میں قربان ہونے کو تیار بیٹھے تھے۔ تیس اژدر دہان توپیں آگ کے گولے اگلنے کے لیے منہ کھولے

ہوئے تھیں اور دو ہزار تیر اندازِ پُر فن ہاتھوں میں موت کا پیغام لیے حکم کے منتظر تھے۔ مگر جس وقت سردار نمک خوار اپنے دو ہزار جانبازوں کے ساتھ اس قلعے پر چڑھا تو پانچ ہزار مخالف سپاہی کاٹھ کے پتلے بن گئے۔ توپوں کے منہ بند ہو گئے اور تیر اندازوں کے تیر ہوا میں بلند پروازیاں کرنے لگے۔ اور یہ سب شیخ مخمور کی کرامات تھیں۔ شاہ صاحب وہیں موجود تھے۔ سردار دوڑ کر ان کے قدموں پر گرا اور ان کے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔

(4)

کشور کشا ثانی کا دربار آراستہ ہے۔ مئے ناب کا دور چل رہا ہے اور امراؤ رؤسا درجہ بدرجہ زانوادب تہ کیے ہوئے بیٹھے ہیں۔ یکایک مخبروں نے خبر دی کہ میر شجاع کو شکست نصیب ہوئی اور جان سے مارے گئے۔ یہ سن کر کشور کشا کے چہرے پر تفکر کے آثار نمودار ہوئے۔ سرداروں سے مخاطب ہو کر بولے۔ "آپ لوگوں میں ایسا دلیر کون ہے جو اس بداندیش سرکار کا سر قلم کر کے مابدولت کے سامنے پیش کرے۔ اس کی گستاخیاں اب درجۂ اعتدال سے گزرتی جاتی ہیں۔ آپ ہی لوگوں کے بزرگوں نے یہ ملک خاندان مرادیہ سے بزور شمشیر چھینا تھا۔ کیا آپ انہیں بزرگوں کی اولاد نہیں ہیں۔" یہ سنتے ہی سرداروں میں ایک سناٹا چھا گیا۔ سب کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور کسی کی ہمت نہ پڑی کہ دعوت شاہ قبول کرے۔ آخر شاہ کشور کشا کے عم بزرگوار خود اٹھے اور بولے اے شاہِ جوان بخت! میں تیری دعوت قبول کرتا ہوں۔ اگرچہ میرے قویٰ ضعیف ہو گئے ہیں اور بازوؤں میں تلوار پکڑنے کی طاقت باقی نہیں رہی مگر میرے خون میں وہی گرمی اور دل میں وہی جوش ہے جن کی بدولت ہم نے یہ ملک شاہ بامراد سے لیا تھا۔ یا تو میں اس سگِ ناپاک کی ہستی خاک میں ملا دوں گا یا اس کوشش میں اپنی جان نثار کر دوں گا تاکہ اپنی نظروں سے طوائف الملوکی کے مناظر نہ دیکھوں۔ یہ کہہ کر امیر پُر تدبیر وہاں سے اٹھا اور مستعدی سے جنگی تیاریوں میں مصروف ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ آخری مقابلہ ہے اور اگر اس میں ناکام رہے تو بجز مر جانے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ ادھر سردار نمک خوار آہستہ آہستہ پایہ تخت کی طرف بڑھتا آتا تھا۔ یکایک اسے خبر ملی کہ امیر پُر تدبیر بیس ہزار پیدل اور سواروں کے ساتھ مقابلے کے لیے آرہا ہے۔

یہ سنتے ہی سردار نمک خوار کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ امیر پُر تدبیر باوجود پیرانہ سالی کے اپنے وقت کا ایک ہی سپہ سالار تھا۔ ان کا نام سن کر دلیران جنگ آزما کانوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ سردار نمک خوار کا خیال تھا کہ اب امیر گوشۂ عبادت میں بیٹھے ہوں گے مگر ان کو اپنے مقابلے میں دیکھ کر اس کے ہوش اڑ گئے کہ مبادا اس شکست سے ہم اپنے سارے فتوحات کھو بیٹھیں اور برسوں کی محنت پر پانی پھر جائے۔ سب کی یہی صلاح ہوئی کہ واپس چلنا ہی مصلحت ہے۔ اس وقت شیخ مخمور نے فرمایا۔

"اے سردار نمک خوار! تو نے ملک جنت نشان کی نجات کا بیڑا اٹھایا ہے۔ کیا انہیں ہمتوں سے تیری آرزوئیں بر آئیں گی۔ تیرے سردار اور سپاہیوں نے کبھی میدان سے قدم پیچھے نہیں ہٹایا۔ کبھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ تیروں کی بوچھاڑ کو تم نے پانی کی پھوار سمجھا اور بندوقوں کی باڑھ کو پھولوں کی بہار۔ کیا ان مدارات سے تم اس قدر جلد سیر ہو گئے؟

تم نے یہ جنگ توسیعِ سلطنت کے کمینہ ارادے سے نہیں چھیڑی ہے۔ تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے

ہو۔ کیا تمہارا جوش اتنے جلد ٹھنڈا ہو گیا۔ کیا تمہاری تیغ انصاف کی پیاس اتنے جلدی بجھ گئی۔ تم خوب جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہو گی اور تمہاری ان جانفشانیوں کا صلہ دربارِ عالی سے ضرور عطا ہو گا۔ پھر ابھی سے کیوں حوصلے چھوڑے جاتے ہو؟ کیا مضائقہ ہے اگر امیر پُر تدبیر بڑا دلیر اور الوالعزم سپاہی ہے۔ اگر وہ شیر ہے تو تم شیر مرد ہو۔ اگر اس کی تلوار لوہے کی ہے تو تمہارا تیغہ فولاد کا ہے۔ اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمہارے سپاہی بھی سر فروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغہ مضبوط پکڑو اور نامِ خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ تمہارے تیور کہے دیتے ہیں کہ میدان تمہارا ہے۔"

اس پُر جوش تقریر نے سرداروں کے حوصلے ابھار دیئے۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ تلواریں پہلو بدلنے لگیں اور قدم بے اختیار عرصہ کارزار کی طرف بڑھے۔ شیخ مخمور نے تب دلق فقیری اتار پھینکا۔ قدح فقیری کو سلام کیا اور ہاتھوں میں وہی تیغہ اور سپر لے کر جو کسی وقت مسعود سے چھینے گئے تھے' سردار نمک خوار کے پہلو بہ پہلو' سپاہیوں اور افسروں کا دل بڑھاتے' شیرانہ وار بپھرتا ہوا چلا۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ امیر کے سپاہی ابھی منزلیں مارے چلے آتے تھے۔ بیچارے دم بھی نہ لینے پائے تھے کہ یکایک سردار نمک خوار کے آ پہنچنے کی خبر پائی۔ ہوش اڑ گئے اور ہمتیں ٹوٹ گئیں۔ مگر امیر شیر کی طرح گرج کر خیمے سے باہر آیا اور دم زدن میں اپنی ساری فوج دشمن کے مقابلے میں صف بستہ کھڑی کر دی۔ گویا ایک باغبان تھا کہ آیا اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے پھولوں کو ایک گلدستے میں سجا گیا۔

دونوں فوجیں کالے کالے پہاڑوں کی طرح آمنے سامنے کھڑی تھیں اور توپوں کی آتش باری کوہِ آتش فشاں کا منظر پیش کر رہی تھی۔ ان کی گھن گرج صدا سے ایک شور محشر بپا تھا۔ یہ پہاڑ بتدریج آگے بڑھتے گئے۔ یکایک وہ ٹکرائے اور کچھ ایسے زور سے ٹکرائے کہ زمین کانپ اٹھی اور گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی۔ مسعود کا تیغہ اس وقت بلائے بے درمان تھا۔ جدھر پہنچتا لاشوں کے ڈھیر لگ جاتے اور سینکڑوں سر اس پر سے نثار ہو جاتے۔

پو پھٹے تک تیغے یونہی کھڑ کا کیے اور یونہی خون کا دریا بہتا رہا۔ جب روز روشن ہوا تو میدان جنگ بازارِ مرگ سے مشابہ ہو رہا تھا۔ جدھر نگاہ اٹھتی تھی مقتولین کے سر اور اعضاء لہو میں تیرتے دکھائی دیتے تھے۔ یکایک شیخ مخمور کی کمان سے ایک تیر برق بن کر نکلا اور امیر پُر تدبیر کے خرمن جان پر گرا اور اس کے گرتے ہی فوج قیصری نے راہ گریز اختیار کی اور سرداری فوج فتح و نصرت کا علم بلند کیے پایۂ تخت کی طرف بڑھی۔

(5)

جب یہ فوج ظفر موج شہر پناہ کے اندر داخل ہوئی تو شہر کے زن و مرد جو مدت دراز سے غلامی کے جور و ستم جھیل رہے تھے' اس کے خیر مقدم کے لیے نکل پڑے۔ سارا شہر امڈ آیا۔ لوگ سپاہیوں کو گلے لگاتے تھے اور ان پر پھولوں کی برکھا کرتے تھے۔ گویا بلبلیں تھیں جو پنجۂ صیاد سے رہائی پانے پر گلستان چمن میں گلوں کو چوم رہی تھیں۔ لوگ شیخ مخمور کے قدموں کی خاک پیشانی سے لگاتے تھے اور سردار نمک خوار کے پیروں پر مسرت اور انبساط کے آنسو بہاتے تھے۔

اب موقع تھا کہ مسعود اپنا جوگیا بھیس اتار پھینکے اور دعویٰ تاج و تخت پیش کرے مگر جب اس نے دیکھا

کہ ملکہ شیر افگن کا نام ہر شخص کی زبان پر ہے تو خاموش ہو رہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اگر میں اپنا دعویٰ پایہ ثبوت کو پہنچاؤں تو ملکہ کا دعویٰ باطل ہو جائے گا۔ مگر تاہم یہ ناممکن تھا کہ بلا سخت کشت و خون کے یہ فیصلہ ہو سکے۔ ایک پرجوش اور آرزومند دل کے لیے اس حد تک ضبط کرنا معمولی بات نہ تھی۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا یہ خیال کہ میں اس ملک کا بادشاہ ہوں' اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا تھا۔ شاہ بامراد کی وصیت اسے ایک دم کو بھی نہ بھولتی تھی۔ دن کو وہ بادشاہت کے منصوبے باندھتا اور رات کو بادشاہت کے خواب دیکھتا۔ یہ یقین کہ میں بادشاہ ہوں' اسے بادشاہ بنائے ہوئے تھا۔ افسوس! آج وہ منصوبے ٹوٹ گئے اور وہ خواب پریشان ہو گیا۔ مگر مسعود کے اوصاف میں مردانہ ضبط کی انتہائی حد کھنچ گئی تھی۔ اس نے اُف تک نہ کی۔ ایک ٹھنڈی آہ بھی نہ بھری بلکہ پہلا شخص جس نے ملکہ کے دست مبارک کو بوسہ دیا اور اس کے روبرو سرِ اطاعت خم کیا' وہ فقیر مخمور تھا۔ ہاں عین اس وقت جبکہ وہ بوسہ لے رہا تھا' اس کی زندگی بھر کی آرزوئیں آنسو کا ایک قطرہ بن کر ملکہ کے کفِ حنائی پر گر پڑیں۔ گویا مسعود نے اپنا دُرِ آرزو ملکہ کو سونپ دیا۔ ملکہ نے ہاتھ کھینچ لیا اور فقیر مخمور کے چہرے پر شفقت آمیز نگاہ ڈالی۔ جب سب اراکین سلطنت نذریں گزران چکے' توپوں کی سلامیاں دغنے لگیں۔ شہر میں عیش و نشاط کا بازار گرم ہو گیا اور مسرت و شادمانی کے جلوے ہر چہار طرف نظر آنے لگے۔

تخت نشینی کے تیسرے دن مسعود گوشۂ عبادت میں بیٹھا ہوا تھا کہ ملکہ شیر افگن تنہا اس کے پاس آئی اور بولی۔ ”مسعود! میں ایک ناچیز تحفہ تمہارے لیے لائی ہوں اور وہ میرا دل ہے۔ کیا تم اسے میرے ہاتھ سے قبول کرو گے؟“ مسعود ششدر رہ گیا مگر جب ملکہ کی آنکھیں نشۂ الفت سے مخمور پائیں تو فرطِ شوق سے اٹھا اور اسے سینے سے لگا کر بولا۔ ”میں تو مدت سے تمہاری نوک سنان کا گھائل ہوں۔ زہے نصیب کہ آج تم مرہم رکھنے آئی ہو۔“

(6)

ملک جنت نشان اب آزادی کا مسکن اور خوشحالی کا مرزبوم ہے۔ ملکہ شیر افگن کو ابھی تخت پر بیٹھے سال بھر سے زیادہ نہیں گزرا مگر کاروبار سلطنت بڑی خوبی اور حسن انتظام سے چل رہا ہے اور اس کارِ اہم میں اس کا پیارا شوہر مسعود جو ابھی تک فقیر مخمور ہی کے نام سے مشہور ہے' اس کا مشیر و معاون ہے۔

رات کا وقت تھا۔ دربار شاہی آراستہ تھا۔ وزراء عالی مقام حسب رتبہ بیٹھے ہوئے تھے اور خدام زرق و برق مغرق وردیاں پہنے دست بستہ کھڑے تھے کہ ایک پیش خدمت نے آکر عرض کی۔ ”ملکۂ دوجہاں! ایک خستہ حال عورت باہر کھڑی ہے اور شرف قدم بوسی چاہتی ہے۔“ اراکین سلطنت چونکے اور ملکہ نے استعجاب آمیز لہجے میں کہا۔ ”اندر حاضر کرو۔“ پیش خدمت باہر چلا گیا اور ذرا دیر میں ایک بڑھیا لاٹھی ٹیکتی ہوئی آئی اور اپنی پٹاری سے ایک مرصع تاج نکال کر بولی۔ ”تم لوگ اسے لے لو۔ اب یہ میرے کسی کام کا نہیں رہا۔ میاں نے مرتے وقت اسے مسعود کو دے کر کہا تھا کہ تم اس کے مالک ہو مگر اپنے جگر کے ٹکڑے مسعود کو کہاں ڈھونڈھوں؟ روتے روتے اندھی ہو گئی۔ ساری دنیا کی خاک چھانی مگر اس کا کہیں پتہ نہ لگا۔ اب زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ جی کر کیا کروں گی۔ یہ امانت میرے پاس ہے جس کا جی چاہے لے لے۔“

دربار میں سناٹا چھا گیا۔ لوگ فرط حیرت سے نقش دیوار بنے ہوئے تھے۔ گویا ایک ساحر تھا کہ انگلی کے

اشارے سے سب کا دم بند کیے ہوئے تھا۔ یکا یک مسعود اپنی جگہ سے اٹھا اور روتا ہوا جا کر رندہ کے قدموں پر گر پڑا۔ رندہ اپنے لختِ جگر کو دیکھتے ہی پہچان گئی۔ اسے چھاتی سے لگا لیا اور وہ تاج مرصع اس کے زیب سر کر کے بولی۔

"صاحبو! یہی میرا پیارا مسعود اور شاہِ بامراد کا لختِ جگر ہے۔ تم لوگ اس کی رعایا ہو۔ یہ تاج اس کا ہے۔ یہ ملک اس کا ہے اور ساری خلقت اس کی ہے۔ آج سے وہ اپنے ملک کا بادشاہ ہے اور اپنی قوم کا خادم۔"

دربار میں ایک شورِ قیامت برپا ہو گیا۔ اراکین اٹھے اور مسعود کو ہاتھوں ہاتھ لے جا کر تخت پر ملکہ شیر افگن کے پہلو میں بٹھا دیا۔ نذریں گزرنے لگیں، سلامیاں دغنے لگیں۔ نفیریوں نے شادمانی کا نغمہ گایا اور باجوں نے کامرانی کا شور مچایا۔ مگر جب یہ جوشِ مسرت ذرا کم ہوا اور لوگوں نے رندہ کو دیکھا تو وہ مر گئی تھی۔ آرزوؤں کے پورے ہوتے ہی جان نکل گئی۔ گویا آرزوئیں روح بن کر اس کے تنِ خاکی کو زندہ رکھے ہوئے تھیں۔

یہی میرا وطن ہے

آج پورے ساٹھ برس کے بعد مجھے اپنے وطن، پیارے وطن کا دیدار پھر نصیب ہوا۔ جس وقت میں اپنے پیارے دیس سے رخصت ہوا اور قسمت مجھے مغرب کی طرف لے چلی، مجھ پر شباب کا عالم تھا۔ میری رگوں میں تازہ خون دوڑتا تھا اور سینہ امنگوں اور بڑے بڑے ارادوں سے بھرا ہوا تھا۔ مجھے پیارے ہندوستان سے کسی ظالم کے جورو جبر یا انصاف کے زبردست ہاتھوں نے نہیں جدا کیا تھا۔ نہیں، ظالم کا ظلم اور قانون کی سختیاں مجھ سے جو چاہیں کرا سکتی ہیں مگر میرا وطن مجھ سے نہیں چھڑا سکتیں۔ یہ میرے بلند ارادے اور بڑے بڑے منصوبے تھے جنھوں نے مجھے دیس سے جلاوطن کیا۔ میں نے امریکہ میں خوب تجارت کی، خوب دولت کمائی اور خوب عیش کیے۔ خوبیِ قسمت سے بیوی بھی ایسی پائی جو حسن میں اپنی آپ ہی نظیر تھی۔ جس کی خوبروئی کا شہرہ سارے امریکہ میں پھیلا ہوا تھا اور جس کے سینے میں کسی ایسے خیال کی گنجائش بھی نہ تھی جس کا مجھ سے تعلق نہ ہو۔ میں اس پر دل و جان سے فدا تھا اور وہ میرے لیے سب کچھ تھی۔ میرے پانچ بیٹے ہوئے۔ خوش رو، قوی ہیکل اور سعادت مند جنھوں نے تجارت کو اور بھی چمکایا اور جن کے بھولے ننھے بچے اس وقت میری گود میں بیٹھے ہوئے تھے جب میں نے پیارے وطن کا آخری دیدار دیکھنے کے لیے قدم اٹھایا۔ میں نے بے شمار دولت، وفادار بیوی، سپوت بیٹے اور پیارے پیارے جگر کے ٹکڑے۔ ایسی ایسی بے بہا نعمتیں ترک کر دیں۔ اس لیے کہ پیاری بھارت ماتا کا آخری دیدار کر لوں۔ میں بہت ضعیف ہو گیا ہوں۔ دس اور ہوں تو پورے سو برس کا ہو جاؤں۔ اور اگر اب میرے دل میں کوئی آرزو باقی ہے تو وہ یہی ہے کہ اپنے وطن کی خاک کا پیوند بنوں۔ یہ آرزو کچھ آج ہی میرے دل میں موجزن نہیں ہوئی ہے۔ نہیں اس وقت بھی جبکہ میری بیوی اپنی شیریں کلامیوں اور نازک اداؤں سے میرا دل خوش کیا کرتی تھی جبکہ میرے نوجوان بیٹے سویرے آکر اپنے بوڑھے باپ کو ادب سے سلام کرتے تھے۔ اس وقت بھی میرے جگر میں ایک کانٹا سا کھٹکتا تھا اور وہ کانٹا یہ تھا کہ میں یہاں جلاوطن ہوں۔ یہ دیس میرا نہیں ہے۔ میں اس دیس کا نہیں ہوں۔ دھن میرا تھا، بیوی میری

تھی' لڑکے میرے تھے اور جائیدادیں میری تھیں مگر جانے کیوں مجھے رہ رہ کر ساتھیوں کی یاد ستا جایا کرتی تھی اور اکثر مسرتوں کی گہما گہمی اور شادمانیوں کے ہجوم میں بھی یہ خیال دل میں چٹکی لیا کرتا کہ کاش اپنے دیس میں ہوتا!

مگر جس وقت بمبئی میں جہاز سے اترا اور کالے کالے کوٹ پتلون پہنے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے ملاح دیکھے۔ پھر انگریزی دکانیں۔ ٹراموے اور موٹر کار گاڑیاں نظر آئیں۔ پھر ربڑ والے پہیوں اور چرٹ والے آدمیوں سے مڈ بھیڑ ہوئی۔ پھر ریل کا اسٹیشن دیکھا اور ریل پر سوار ہو کر اپنے گاؤں کو چلا۔ پیارے گاؤں کو جو ہری بھری پہاڑیوں کے بیچ میں واقع تھا تو میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میں خوب رویا کیونکہ یہ میرا پیارا دیس نہ تھا۔ یہ وہ دیس نہ تھا جس کے دیدار کی آرزو ہمیشہ میرے دل میں موجیں مارا کرتی تھیں۔ یہ کوئی اور دیس تھا۔ یہ امریکہ تھا۔ انگلستان تھا مگر پیارا بھارت نہیں!

ریل گاڑی جنگلوں' پہاڑوں' ندیوں اور میدانوں کو طے کر کے میرے پیارے گاؤں کے قریب پہنچی جو کسی زمانے میں پھول پتوں کی افراط اور ندی نالوں کی کثرت سے رشک فردوس بنا ہوا تھا۔ میں گاڑی سے اترا تو میرا دل بانسوں اچھل رہا تھا۔ اب اپنا پیارا گھر دیکھوں گا۔ اپنے بچپن کے پیارے ساتھیوں سے ملوں گا۔ مجھے اس وقت یہ بالکل یاد نہ رہا کہ میں اسی (80) برس کا بوڑھا آدمی ہوں۔ جوں جوں میں گاؤں کے قریب آتا تھا۔ میرے قدم جلد جلد اٹھتے تھے اور دل پر ایک ناقابل بیان مسرت کا اثر ہو رہا تھا۔ ہر چیز پر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نگاہ ڈالتا۔ اہا! یہ وہ نالا ہے جس میں ہم روز گھوڑے نہلاتے اور خود غوطے لگاتے تھے۔ مگر اب اس کے دونوں طرف کانٹے دار تاروں کی چار دیواری کھنچی ہوئی تھی اور سامنے ایک بنگلہ تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لیے ادھر ادھر تاک رہے تھے۔ نالے میں نہانے یا نہلانے کی قطعی ممانعت تھی۔ گاؤں میں گیا اور نگاہیں بچپن کے ساتھیوں کو ڈھونڈنے لگیں۔ مگر افسوس! وہ سب کے سب لقمۂ اجل ہو گئے تھے۔ اور میرا گھر' میرا شکستہ جھونپڑا جس کی گود میں برسوں تک کھیلا تھا' جہاں بچپن اور بے فکریوں کے مزے لوٹے تھے' جس کا نقشہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہا ہے' وہ اب ایک تودۂ خاکستر ہو گیا تھا۔ مقام غیر آباد نہ تھا۔ صدہا آدمی چلتے پھرتے نظر آئے جو عدالت اور کلکٹری اور تھانہ پولیس کی باتیں کر رہے تھے۔ ان کے چہروں سے تفکر اور پژمردگی نمایاں تھی اور وہ سب افکارِ دنیا سے خستہ حال معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھیوں کے سے قوی ہیکل' خوش رو' سرخ و سفید نوجوان کہیں نہ دکھائی دیئے۔ وہ اکھاڑہ جس کی میرے ہاتھوں نے بنیاد ڈالی تھی' وہاں اب در و دیوار شکستہ اسکول تھا اور اس میں چند مریض صورت' گرسنہ رو اور دلق پوش لڑکے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ نہ! یہ میرا دیس نہیں ہے۔ یہ دیس دیکھنے کے لیے میں اتنی دور سے نہیں آیا۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ میرا پیارا دیس نہیں!

اس برگد کے پیڑ کی طرف دوڑا جس کے خوشگوار سائے میں ہم نے بچپن کی بہاریں اڑائی تھیں۔ جو ہمارے چھٹپنے کا گہوارہ اور عالم جوانی کا آرام گاہ تھا۔ آہ! اس پیارے برگد کو دیکھتے ہی دل پر ایک رقت طاری ہو گئی اور ایسی ایسی حسرت ناک' دلسوز اور دردناک یادگاریں تازہ ہو گئیں کہ گھنٹوں زمین پر بیٹھ کر روتا رہا۔ یہی پیارا برگد ہے جس کی پھنگیوں پر ہم چڑھ جاتے تھے جس کی جٹائیں ہمارا جھولا تھیں اور جس کے پھل ہمیں ساری دنیا کی مٹھائیوں سے زیادہ لذیذ اور شیریں معلوم ہوتے تھے۔ وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کھیلنے والے ہمجولی جو کبھی روٹھتے تھے' کبھی مناتے تھے۔ وہ کہاں گئے؟ آہ! میں غربت زدہ مسافر کیا اب اکیلا ہوں؟ کیا میرا کوئی ساتھی نہیں۔ اس برگد کے درخت کے قریب اب تھانہ تھا اور درخت کے نیچے ایک کرسی پر کوئی لال پگڑی باندھے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے آس

پاس دس بیس اور لال پگڑی والے دست بستہ کھڑے تھے اور ایک نیم برہنہ قحط زدہ شخص جس پر ابھی ابھی چابکوں کی بوچھاڑ ہوئی تھی، پڑا سسک رہا تھا۔ مجھے خیال آیا' یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ یورپ ہے' امریکہ ہے مگر میرا پیارا وطن نہیں ہے۔ ہرگز نہیں۔

ادھر سے مایوس ہو کر میں اس چوپال کی طرف چلا۔ جہاں شام کے وقت پتاجی گاؤں کے اور بزرگوں کے ساتھ حقہ پیتے اور ہنسی قہقہے اڑاتے تھے۔ ہم بھی اس ٹاٹ کے فرش پر قلابازیاں کھایا کرتے۔ کبھی کبھی وہاں پنچایت بھی بیٹھتی تھی جس کے سرپنچ ہمیشہ پتاجی ہی ہوتے تھے۔ اسی چوپال سے ملحق ایک گئوشالہ تھا جہاں گاؤں بھر کی گائیں رکھی جاتی تھیں اور ہم یہیں بچھڑوں کے ساتھ کللیلیں کیا کرتے تھے۔ افسوس اب اس چوپال کا پتہ نہ تھا۔ وہاں اب گاؤں کے ٹیکہ لگانے کا اسٹیشن اور ایک ڈاک خانہ تھا۔ ان دنوں اسی چوپال سے لگا ہوا ایک کولہواڑہ تھا جہاں جاڑے کے دنوں میں اوکھ پیری جاتی تھی اور گڑ کی خوشبو سے دماغ معطر ہو جاتا تھا۔ ہم اور ہمارے ہمجولی گھنٹوں گنڈیریوں کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے اور گنڈیریاں کاٹنے والے مزدور کی سبکدستی پر حیرت کرتے تھے۔ جہاں صدہا بار میں نے کچا رس اور پکا دودھ ملا کر پیا تھا۔ یہاں آس پاس کے گھروں سے عورتیں اور بچے اپنے اپنے گھڑے لے کر آتے اور انہیں رس سے بھرا کر لے جاتے۔ افسوس! وہ کولہو ابھی جیوں کے تیوں گڑے ہوئے ہیں مگر دیکھو! کولہواڑے کی جگہ پر اب ایک سن لپیٹنے والی کل ہے اور اس کے مقابل ایک تمبولی اور ایک سگریٹ کی دکان ہے۔ ان جگر خراش نظاروں سے میں دل شکستہ ہو کر ایک آدمی سے جو صورت سے شریف نظر آتا تھا' کہا' بابا میں پردیسی مسافر ہوں۔ رات بھر پڑ رہنے کے لیے مجھے جگہ دے دو۔ اس آدمی نے مجھے سر سے پیر تک غور کی نگاہ سے دیکھا اور تب بولا' آگے جاؤ' یہاں جگہ نہیں ہے۔ میں آگے گیا اور یہاں سے پھر حکم ملا آگے جاؤ۔ پانچویں بار دست سوال پھیلانے پر ایک صاحب نے ایک مٹھی بھر چنے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ چنے میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑے اور پھر آنکھوں سے اشک کی دھار بہنے لگی۔ ہائے! یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ ہمارا مہمان نواز' مسافر نواز پیارا وطن نہیں۔ ہرگز نہیں۔

میں نے ایک سگریٹ کی ڈبیا لی اور ایک سنسان جگہ پر بیٹھ کر اگلے وقتوں کو یاد کرنے لگا کہ یکا یک مجھے اس دھرم شالہ کا خیال آیا جو میرے پردیس جاتے وقت بن رہا تھا۔ میں ادھر کی طرف لپکا کہ رات کسی طرح وہیں کاٹوں مگر افسوس! ہائے افسوس! دھرم شالہ کی عمارت جوں کی توں تھی لیکن اس میں غریب مسافروں کے رہنے کے لیے جگہ نہ تھی۔ شراب اور شراب خوری' بدکاری اور قمار بازی نے اسے اپنا مسکن بنا رکھا تھا۔ یہ کیفیت دیکھ کر بے اختیار دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکلی۔ میں زور سے چیخ اٹھا۔ "نہیں۔ نہیں اور ہزار بار نہیں۔ یہ میرا وطن' یہ میرا پیارا دیس' میرا پیارا بھارت نہیں ہے۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ یہ یورپ ہے۔ امریکہ ہے مگر بھارت ہرگز نہیں۔

اندھیری رات تھی۔ گیدڑ اور کتے اپنے نغمے الاپ رہے تھے۔ میں بادلِ پردرد اسی نالے کے کنارے جا کر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ کیا اپنے پیارے بچوں کے پاس لوٹ جاؤں اور اپنی نامراد مٹی امریکہ کے خاک میں ملاؤں۔ اب تک میرا کوئی وطن تھا۔ میں غریب الوطن ضرور تھا مگر پیارے وطن کی یاد دل میں بنی ہوئی تھی۔ اب میں بے وطن ہوں۔ میرا کوئی وطن نہیں۔ اسی غور و خوض میں میں بہت دیر تک خاموش سر بہ زانو بیٹھا رہا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ گھڑیال نے تین بجایا اور کسی کے گانے کی آواز کان میں آئی۔ دل نے گدگدایا۔ یہ تو وطن کا نغمہ ہے۔ یہ دیس کا راگ ہے۔ میں چٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پندرہ بیس عورتیں' بوڑھی ضعیف' سفید دھوتیاں

پہنے' ہاتھوں میں لوٹے لیے اشنان کو جارہی ہیں اور گاتی جاتی ہیں۔

"پر بھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

اس پُر سرور' دلخراش راگ سے میرے دل پر جو کیفیت طاری ہوگئی' اس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ میں نے امریکہ کی شوخ سے شوخ اور خوش مزاج سے خوش مزاج حسینوں کی الاپ سنی تھی اور بارہا ان کی زبانوں سے محبت اور پیار کے الفاظ سنے تھے جو دلکش نغموں سے بھی زیادہ شیریں تھے۔ میں نے پیارے بچوں کے ادھورے بولوں اور تتلاتی ہوئی زبانوں کا لطف اٹھایا تھا۔ میں نے خوش نوا چڑیوں کا چہچہانا سنا تھا مگر جو لطف' جو مزا' جو آنند مجھے اس نغمے میں آیا' وہ مجھے زندگی میں کبھی اور نہ حاصل ہوا تھا۔ میں نے خود غنغنا کر گایا۔

"پر بھو میرے اوگن۔ پر بھو میرے اوگن چت نہ دھرو"

میں وجد کے عالم میں تھا کہ پھر مجھے بہت سے آدمیوں کی بول چال سنائی پڑی اور کچھ لوگ ہاتھوں میں پیتل کے کمنڈل لیے شیو۔ شیو۔ ہر۔ ہر۔ گنگے۔ گنگے۔ نارائن۔ نارائن کہتے ہوئے دکھائی دیے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا۔ یہ تو دیس پیارے دیس کی باتیں ہیں۔ فرطِ مسرت سے دل باغ باغ ہو گیا۔ میں ان آدمیوں کے ساتھ ساتھ ہو لیا اور ایک دو تین چار پانچ چھ میل پہاڑی راستہ طے کرنے کے بعد ہم اس ندی کے کنارے پہنچے جس کا نام مقدس ہے۔ جس کی لہروں میں غوطہ لگانا اور جس کی گود میں مرنا ہر ہندو برکت عظمیٰ سمجھتا ہے۔ گنگا میرے پیارے گاؤں سے چھ سات میل پر بہتی تھیں اور کسی زمانے میں میں صبح کے وقت گھوڑے پر چڑھ کر گنگا ماتا کے درشن کو آیا کرتا تھا۔ ان کے درشن کی تمنا میرے دل میں ہمیشہ تھی۔ یہاں میں نے ہزاروں آدمیوں کو اس سرد' ٹھٹھرتے ہوئے پانی میں غوطہ لگاتے دیکھا۔ کچھ لوگ بالو پر بیٹھے گائتری منتر جپ رہے تھے۔ کچھ لوگ ہون کرنے میں مصروف تھے۔ کچھ لوگ ماتھے پر ٹیکے لگا رہے تھے۔ کچھ اور لوگ وید منتر بڑی خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ میرے دل نے پھر گدگدایا اور میں زور سے کہہ اٹھا۔ ہاں ہاں یہی میرا دیس ہے۔ یہی میرا پیارا وطن ہے۔ یہی میرا بھارت ہے اور اسی کے دیدار کی' اسی کے خاک میں پیوند ہونے کی حسرت میرے دل میں تھی۔

میں انتہائی سُرور کے عالم میں تھا۔ میں نے اپنا پرانا کوٹ اور پتلون اتار پھینکا اور جا کر گنگا ماتا کے گود میں گر پڑا۔ جیسے کوئی بے سمجھ بھولا بھالا بچہ دن بھر ناہمدرد لوگوں میں رہنے کے بعد شام کو اپنی پیاری ماں کے گود میں دوڑ کر چلا آئے اور اس کی چھاتی سے چمٹ جائے۔ ہاں اب اپنے دیس میں ہوں۔ یہ میرا پیارا وطن ہے۔ یہ لوگ میرے بھائی ہیں۔ گنگا میری ماتا ہیں!!!

میں نے عین گنگا جی کے کنارے ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنوالی ہے اور اب مجھے سوائے رام نام جپنے کے اور کوئی کام نہیں۔ میں روز شام سویرے گنگا اشنان کرتا ہوں اور یہ میری خواہش اور آرزو ہے کہ اس جگہ میرا دم نکلے اور میری ہڈیاں گنگا ماتا کے پاس لہروں کے نذر ہوں۔

میرے لڑکے اور میری بیوی مجھے بار بار بلاتے ہیں مگر اب میں یہ گنگا کا کنارہ! اور یہ پیارا دیس چھوڑ کر وہاں نہیں جاسکتا۔ میں اپنی مٹی گنگا جی کو سونپوں گا۔ اب دنیا کی کوئی خواہش' کوئی آرزو مجھے یہاں سے نہیں ہٹا سکتی کیونکہ یہ میرا پیارا دیس' میرا پیارا وطن ہے اور میری لالسا ہے کہ میں وطن میں مروں۔

صلۂ ماتم

آج تین سال گزر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ میں یونیورسٹی ہال سے خوش خوش چلا آرہا تھا۔ میرے صدہا دوست مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔ فرطِ مسرت سے میری باچھیں کھلی جاتی تھیں۔ میری زندگی کی سب سے پیاری آرزو کہ میں ایم۔اے پاس ہو جاؤں، پوری ہو گئی تھی اور ایسی خوبی سے جس کی مجھے مطلق امید نہ تھی۔ میرا نمبر اول تھا۔ وائس چانسلر صاحب نے خود مجھ سے ہاتھ ملایا تھا اور مسکرا کر فرمایا تھا کہ ''خدا تمہیں اعلیٰ تر کاموں کی توفیق دے۔'' میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ میں نوجوان تھا، شکیل تھا، تندرست تھا۔ مال و زر کی نہ مجھے خواہش تھی اور نہ کچھ کمی تھی۔ والدین بہت کچھ چھوڑ گئے تھے۔ دنیا میں سچی خوشی میسر ہونے کے لیے جن اسباب کی ضرورت ہے، وہ سب مجھے حاصل تھے اور سب سے بڑھ کر پہلو میں ایک حوصلہ مند دل تھا جو نام و نمود حاصل کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔

گھر پر آیا۔ احباب نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ دعوت کی ٹھہری۔ دوستوں کی خاطر و مدارات میں بارہ بج گئے۔ لیٹا تو بے اختیار خیال مس لیلاوتی کی طرف جا پہنچا جو میرے پڑوس میں رہتی تھی اور جس نے میرے ساتھ بی۔اے کا ڈپلوما حاصل کیا تھا۔ خوش قسمت ہو گا وہ شخص جو مس لیلا کو بیاہے گا۔ کیسی حسین ہے! کیسی خوش گلو! کیسی خوش مزاج۔ میں کبھی کبھی اس کے یہاں پروفیسر صاحب سے فلسفہ میں مدد لینے کے جایا کرتا تھا۔ وہ دن مبارک ہوتا تھا جب پروفیسر صاحب گھر پر نہ ملتے تھے۔ مس لیلا میرے ساتھ بڑے تپاک سے پیش آتی اور مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں حضرت مسیح کی پناہ میں آجاؤں تو اسے مجھے اپنی شوہری میں قبول کرنے سے انکار نہ ہو گا۔ وہ شیلی، بائرن اور کیٹ کی عاشق تھی اور میرا مذاق بھی بالکل اس کے ہمرنگ تھا۔ ہم جب تنہا ہوتے تو اکثر محبت اور فلسفہ پر بحث کرنے لگتے اور اس کے منہ سے جذبہ آمیز باتیں سن سن کر میرے دل میں گدگدی پیدا ہونے لگتی تھی۔ مگر افسوس! میں اپنا مالک نہ تھا۔ میری شادی ایک معزز گھرانے میں کر دی گئی تھی اور اگرچہ میں ابھی تک اپنی بیوی کی صورت سے بھی آشنا نہ تھا مگر مجھے بجائے شک کے یقین کامل تھا کہ مجھے اس کی صحبت میں وہ لطف نہیں آسکتا جو مس لیلا کی صحبت میں ممکن ہے۔ شادی ہوئے دو سال ہو چکے تھے مگر اس نے میرے پاس ایک خط بھی نہ لکھا تھا۔ میں نے دو تین خط لکھے بھی مگر کسی کا جواب نہ ملا۔ اس سے مجھے یہ شک ہو گیا تھا کہ اس کی تعلیم بھی واجبی ہی واجبی ہے۔

آہ! کیا میں اسی لڑکی کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں گا؟ اس سوال نے میرے ان تمام ہوائی قلعوں کو ڈھا دیا جو میں نے ابھی ابھی بنائے تھے۔ کیا میں مس لیلا سے ہمیشہ کے لیے ہاتھ دھولوں؟ ناممکن ہے، میں کمدنی کو چھوڑ دوں گا۔ میں اپنے یگانوں سے ناطہ توڑ لوں گا۔ میں رسوا ہوں گا، خوار ہوں گا مگر مس لیلا کو ضرور اپنا شریک حال بناؤں گا۔

انہیں خیالات سے موثر ہو کر میں نے اپنی ڈائری لکھی اور اسے میز پر کھلا چھوڑ کر بستر پر لیٹ گیا اور سوچتے سوچتے سو گیا۔

سویرے اٹھ کر دیکھتا ہوں تو بابو نرنجن داس میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ڈائری تھی جسے وہ بغور پڑھ رہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی میں فرطِ شوق سے لپٹ گیا۔ افسوس! اب اس فرشتہ صفت نوجوان کی صورت دیکھنی نہ نصیب ہوگی۔ بے ہنگام موت نے اسے ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ وہ کمدنی کے حقیقی بھائی تھے۔ نہایت وجیہ و شکیل اور ہنس مکھ۔ سن مجھ سے دو ہی چار سال زیادہ تھا۔ اچھے عہدہ پر ممتاز تھے۔ کچھ دنوں سے اسی شہر میں تبدیل ہو کر آگئے تھے۔ میری اور ان کی گاڑھی دوستی ہوگئی تھی۔ میں نے پوچھا "کیا تم نے میری ڈائری پڑھ لی؟"

نرنجن۔ "ہاں۔"

میں۔ "مگر کمدنی سے کچھ نہ کہنا۔"

نرنجن۔ "بہت اچھا، نہ کہوں گا۔"

میں۔ "اس وقت کسی سوچ میں ہو۔ میرا ڈپلوما دیکھا؟"

نرنجن۔ "گھر سے خط آیا ہے۔ والد بیمار ہیں۔ دو تین دن میں جانے والا ہوں۔"

میں۔ "شوق سے جائیے۔ ایشورا نہیں جلد صحت بخشے۔"

نرنجن۔ "تم بھی چلو گے؟ نہ معلوم کیسا پڑے۔ کیسا نہ پڑے۔"

میں۔ "مجھے تو اس وقت معاف ہی رکھو۔"

نرنجن داس یہ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے حجامت درست کی، کپڑے بدلے اور مس لیلاوتی سے ملنے کے اشتیاق میں چلا۔ وہاں جا کر دیکھا تو قفل پڑا ہوا ہے۔ معلوم ہوا کہ مس صاحبہ کی طبیعت دو تین دن سے خراب تھی۔ تبدیل آب و ہوا کے لیے نینی تال چلی گئی ہیں۔ افسوس! میں ہاتھ مل کر رہ گیا۔ کیا لیلا مجھ سے ناراض تھی؟ اس نے مجھے اطلاع نہیں دی۔ لیلا! کیا تو بے وفا ہے۔ تجھ سے بے وفائی کی امید نہ تھی۔ فوراً مصمم ارادہ کر لیا کہ آج کی ڈاک سے نینی تال چل دوں۔ مگر گھر آیا تو لیلا کا خط ملا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کھولا۔ لکھا تھا "میں بیمار ہوں۔ میرے جینے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پلیگ ہے۔ جب تک تم آؤ گے، غالباً میرا قصہ تمام ہو جائے گا۔ آخری وقت تم سے نہ ملنے کا سخت صدمہ ہے۔ میری یاد دل میں قائم رکھنا۔ مجھے سخت افسوس ہے کہ تم سے مل کر نہیں آئی۔ میرا قصور معاف کرنا اور اپنی بد قسمت لیلا کو بھلا مت دینا۔ خط میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا۔ دنیا آنکھوں میں تاریک ہوگئی۔ منہ سے ایک سرد آہ نکلی۔ بلا ایک لمحہ ضائع کیے ہوئے میں نے بستر باندھا اور نینی تال چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر سے نکلا ہی تھا کہ پروفیسر بوس سے ملاقات ہوگئی۔ کالج سے چلے آرہے تھے۔ چہرہ مغموم تھا۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے جیب سے ایک تار نکال کر میرے سامنے پھینک دیا۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ تار کون اٹھاتا ہے اور ہائے مار کر بیٹھ گیا۔ لیلا تو اتنی جلد مجھ سے جدا ہوگئی!

(2)

میں روتا ہوا گھر آیا اور چارپائی پر منہ ڈھانپ کر خوب رویا۔ نینی تال جانے کا ارادہ فسخ ہو گیا۔ دس بارہ دن

تک میں وحشت کے عالم میں ادھر ادھر گھومتا رہا۔ دوستوں کی صلاح ہوئی کہ چند روز کے لیے کہیں گھومنے چلے جاؤ۔ میرے دل میں بھی یہ بات جم گئی۔ نکل کھڑا ہوا اور دو مہینے تک وندھیا چل' پارسناتھ وغیرہ پہاڑیوں میں سرگرداں پھرتا رہا۔ بارے نئے نئے مقامات' اور مناظر کی سیر سے طبیعت کو ذرا تسکین ہوئی۔ میں آبو میں تھا جب میرے نام تار پہنچا کہ میں کالج کی اسسٹنٹ پروفیسری پر نامزد کیا گیا ہوں۔ جی تو نہ چاہتا تھا کہ پھر اس شہر میں آؤں مگر پرنسپل کے خط نے مجبور کر دیا۔ ناچار لوٹا اور اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ زندہ دلی نام کو نہ باقی رہی تھی۔ دوستوں کی صحبت سے بھاگتا اور ہنسی مذاق سے طبیعت نفور ہوتی۔

ایک روز شام کے وقت میں اپنے اندھیرے کمرے میں لیٹا ہوا عالم خیال کی سیر کر رہا تھا کہ سامنے والے مکان سے گانے کی آواز آئی۔ آہ! کیا آواز تھی۔ تیر کی طرح دل میں چبھی جاتی تھی۔ لہجہ کیسا رقت آمیز تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ نغموں میں کیا اثر ہے۔ تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کلیجہ مسوسنے لگا اور دل پر ایک عجیب حسرت ناک کیفیت طاری ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہائے! یہ لیلا کی پیاری گیت تھی۔

پیا ملن ہے کٹھن باوری

مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں ایک وحشت کے عالم میں اٹھا اور جا کر سامنے والے مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے اس وقت یہ تمیز نہ تھی کہ ایک اجنبی آدمی کے مکان پر آ کھڑے ہو جانا اور اس کے خلوت میں مخل ہونا انتہا درجے کی بدتہذیبی ہے۔

(3)

ایک بڑھیا نے دروازہ کھول دیا اور مجھے کھڑے دیکھ کر لپکی ہوئی اندر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ چلا گیا۔ دہلیز طے کرتے ہی ایک وسیع کمرے میں پہنچا۔ اس پر ایک سفید فرش بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکیے بھی رکھے تھے۔ دیواروں پر خوبصورت تصاویر آویزاں تھیں اور ایک سولہ سترہ سال کا سبزہ آغاز نوجوان مسند کے قریب بیٹھا ہوا ہارمونیم پر گا رہا تھا۔ میں قسم کھا سکتا ہوں کہ ایسا وجیہ نوجوان میری نظر سے کبھی نہیں گزرا۔ وضع و قطع سے سکھ معلوم ہوتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی چونک پڑا اور ہارمونیم چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ شرم سے سر جھکا لیا اور کچھ گھبرایا ہوا سا نظر آنے لگا۔ میں نے کہا' معاف کیجئے گا میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی۔ آپ اس فن کے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً جو چیز ابھی آپ گا رہے تھے' وہ مجھے پسند ہے۔ نوجوان نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پھر سر نیچا کر لیا اور ہونٹوں ہی میں کچھ اپنی بدمشقی کا اظہار کیا۔ میں نے پھر پوچھا۔ "آپ یہاں کب سے مقیم ہیں؟"

نوجوان۔ "تین مہینے کے قریب ہوتا ہے۔"

میں۔ "اسم شریف؟"

نوجوان۔ "مجھے مہر سنگھ کہتے ہیں۔"

میں بیٹھ گیا اور نہایت گستاخانہ بے تکلفی سے مہر سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا اور پھر معذرت کی۔ اس وقت کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ پنجاب کا باشندہ ہے اور یہاں پڑھنے کے لیے آیا ہوا ہے۔ شاید ڈاکٹروں نے صلاح دی تھی کہ پنجاب کی آب و ہوا اس کے موافق نہیں ہے۔ میں دل میں تو جھینپا کہ ایک اسکول کے لڑکے کے ساتھ بیٹھ

کہ ایسی بے تکلفی سے باتیں کر رہا ہوں مگر نغمے کے اشتیاق نے اس خیال کو رہنے نہ دیا۔ رسمی تعارف کے بعد میں نے پھر التجا کی کہ وہی چیز چھیڑیئے۔ مہر سنگھ نے آنکھیں نیچی کر کے جواب دیا کہ میں ابھی بالکل نو مشق ہوں۔

میں۔ "یہ تو آپ ہی اپنی زبان سے کہیے۔"

مہر سنگھ (جھینپ کر)۔ "آپ کچھ فرمائیں۔ ہارمونیم حاضر ہے۔"

میں۔ "میں اس فن سے مطلق بے بہرہ ہوں ورنہ آپ کی فرمائش کی ضرور تعمیل کرتا۔"

اس کے بعد میں نے ہر چند اصرار کیا مگر مہر سنگھ جھینپتا ہی رہا۔ مجھے خلقتاً تکلف سے نفرت ہے۔ حالانکہ اس وقت مجھے ترش ہونے کا کوئی حق نہ تھا مگر جب میں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہ مانے گا تو ذرا رکھائی سے بولا۔ "خیر جانے دیجئے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کا بہت وقت ضائع کیا۔ معاف کیجئے۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میری رونی صورت دیکھ کر شاید مہر سنگھ کو اس وقت رحم آ گیا۔ اس نے جھینپتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "آپ تو ناراض ہوئے جاتے ہیں۔"

میں۔ "مجھے آپ سے ناراض ہونے کا کوئی حق حاصل نہیں۔"

مہر سنگھ۔ "اچھا بیٹھ جایئے۔ میں آپ کی فرمائش کی تعمیل کروں گا مگر میں ابھی بالکل نو مشق ہوں۔"

میں بیٹھ گیا اور مہر سنگھ نے ہارمونیم پر وہی گیت الاپنا شروع کیا۔

"پیا ملن ہے کٹھن باوری"

کیسی سریلی تان تھی! کیسی دلکش آواز۔ کیسا بے چین کرنے والا جذبہ۔ اس کے گلے میں وہ رس تھا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ میں نے دیکھا کہ گاتے گاتے خود اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ مجھ پر اس وقت ایک دلپسند خواب کی سی کیفیت طاری تھی۔ ایک نہایت شیریں، نازک، دردناک مگر ناقابل بیان اثر دل پر ہو رہا تھا۔ ایک پر فضا سبزہ زار کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا اور لیلا، پیاری لیلا سبزہ زار پر بیٹھی ہوئی میری طرف حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ میں نے ایک لمبی آہ بھری اور بلا کچھ کہے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میری طرف تاکا۔ اس کی آنکھوں میں موتی کے قطرے ڈبڈبائے ہوئے تھے اور بولا۔ "کبھی کبھی تشریف لایا کیجئے گا۔"

میں نے صرف اتنا جواب دیا۔ "میں آپ کا بہت مشکور ہوا۔"

(4)

رفتہ رفتہ میری یہ حالت ہو گئی کہ جب تک مہر سنگھ کے یہاں جا کر دو چار نغمے نہ سن لوں، جی کو چین نہ آتا۔ شام ہوئی اور میں جا پہنچا۔ کچھ دیر تک نغمہ سرائیوں کی بہار لوٹتا اور تب اسے پڑھاتا۔ ایسے ذہین اور سمجھدار لڑکے کو پڑھانے میں مجھے خاص مزا آتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ میری ایک ایک بات اس کے دل پر نقش ہو رہی ہے۔ جب تک میں پڑھاتا، وہ ہمہ تن گوش بنا بیٹھا رہتا۔ جب اسے دیکھتا پڑھنے لکھنے میں محو پاتا۔ سال بھر میں اپنے ذہن خداداد کے بدولت اس نے انگریزی میں اچھی استعداد حاصل کر لی۔ معمولی چٹھیاں لکھنے لگا اور دوسرا سال گزرتے گزرتے وہ اپنے اسکول کے کل طلبہ سے بازی لے گیا۔ جتنے مدرس تھے، سب اس کی ذکاوت پر عش عش کرتے۔ اور سیدھا، نیک چلن ایسا کہ کبھی جھوٹ موٹ بھی کسی نے اس کی شکایت نہیں کی۔ وہ اپنے سارے اسکول کی امید اور

رونق تھا لیکن باوجود سکھ ہونے اسے کھیل کود سے رغبت نہ تھی۔ میں نے اسے کبھی کرکٹ میں نہیں دیکھا۔ شام ہوتے ہی سیدھے گھر چلا آتا اور نوشت وخواند میں مصروف ہو جاتا۔

میں رفتہ رفتہ اس سے ایسا مانوس ہو گیا کہ بجائے شاگرد کے دوست سمجھنے لگا۔ سن کے لحاظ سے اس کی سمجھ حیرت انگیز تھی۔ دیکھنے میں سولہ سترہ سال سے زائد نہ معلوم ہوتا مگر جب کبھی میں روانی میں آکر دقیق شاعرانہ خیالات ونازک جذبات کی اس کے سامنے تشریح کرتا تو مجھے اس کے بشرے سے ایسا معلوم ہوتا کہ وہ ایک ایک نکتے کو سمجھ رہا ہے۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔

میں۔ ”مہر سنگھ! تمہاری شادی ہو گئی ہے؟“

مہر سنگھ نے شرما کر جواب دیا۔ ”ابھی نہیں۔“

میں۔ ”تمہیں کیسی عورت پسند ہے؟“

مہر سنگھ۔ ”میں شادی کروں گا ہی نہیں۔“

میں۔ ”کیوں؟“

مہر سنگھ۔ ”مجھ جیسے جاہل مطلق کے ساتھ شادی کرنا کوئی عورت پسند نہ کرے گی۔“

میں۔ ”بہت کم ایسے نوجوان ہوں گے جو تم سے زیادہ لائق ہوں یا تم سے زیادہ سمجھ رکھتے ہوں۔“

مہر سنگھ نے میری طرف حیرت سے دیکھ کر کہا۔ ”آپ دل لگی کرتے ہیں۔“

میں۔ ”دل لگی نہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ مجھے خود حیرت ہوتی ہے کہ اتنے کم دنوں میں تم نے اتنی استعداد کیونکر پیدا کرلی۔ ابھی تمہیں انگریزی شروع کیے تین برس سے زیادہ نہیں ہوئے۔“

مہر سنگھ۔ ”کیا میں کسی تعلیم یافتہ لیڈی کو خوش رکھ سکوں گا؟“

میں (جوش سے)۔ ”بے شک!“

(5)

گرمی کا موسم تھا۔ میں ہوا کھانے شملہ گیا ہوا تھا۔ مہر سنگھ بھی میرے ساتھ تھا۔ وہاں میں بیمار پڑا۔ چیچک نکل آئی۔ تمام جسم میں آبلے پڑ گئے۔ پشت کے بل چارپائی پر پڑا رہتا۔ اس وقت مہر سنگھ نے میرے ساتھ جو احسانات کیے' وہ مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ڈاکٹروں کی سخت ممانعت تھی کہ وہ میرے کمرے میں نہ آوے مگر مہر سنگھ آٹھوں پہر میرے ہی پاس بیٹھا رہتا۔ مجھے کھلاتا' پلاتا' اٹھاتا' بٹھاتا۔ رات رات بھر چارپائی کے قریب بیٹھ کر جاگتے رہنا مہر سنگھ ہی کا کام تھا۔ حقیقی بھائی بھی اس سے زیادہ خدمت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک مہینہ گزر گیا۔ میری حالت روز بروز ردی ہوتی جاتی تھی۔ ایک روز میں نے ڈاکٹر کو مہر سنگھ سے کہتے ہوئے سنا۔ ”ان کی حالت نازک ہے۔“ مجھے یقین ہو گیا کہ اب نہ بچوں گا مگر مہر سنگھ کچھ ایسی مستقل مزاجی سے میری تیمارداری میں مصروف تھا گویا وہ مجھے زبردستی موت کے منہ سے بچالے گا۔ ایک روز شام کے وقت میں کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ کسی کے سسکی لینے کی آواز آئی۔ وہاں بجز مہر سنگھ کے اور کوئی نہ تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”مہر سنگھ! مہر سنگھ! تم روتے ہو؟“

مہر سنگھ نے ضبط کر کے کہا۔ ”نہیں۔ رووَں کیوں؟“ اور میری طرف بڑی دردمندانہ نگاہ سے دیکھا۔

میں۔ ''تمہارے سسکنے کی آواز آئی۔''
مہر سنگھ۔ ''وہ کچھ بات نہ تھی۔ گھر کی یاد آگئی تھی۔''
میں۔ ''سچ بولو۔''
مہر سنگھ کی آنکھیں پھر پر نم ہو گئیں۔ اس نے میز پر سے آئینہ اٹھا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یا نارائن! میں خود اپنے تئیں پہچان نہ سکا۔ چہرہ اس قدر تبدیل ہو گیا تھا۔ رنگت بجائے سرخ کے سیاہ ہو رہی تھی اور چیچک کے بد نما داغوں نے صورت مسخ کر دی تھی۔ اپنی یہ حالت زار دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وجاہت' جس پر مجھے اس قدر ناز تھا' بالکل رخصت ہو گئی تھی۔

(6)

میں شملہ سے واپس آنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مہر سنگھ اسی روز مجھ سے رخصت ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ میری طبیعت بہت اُچاٹ ہو رہی تھی۔ اسباب سب بندھ چکا تھا کہ ایک گاڑی میرے دروازے پر آ کر رکی اور اس میں سے کون اُترا؟ مس لیلا! میری آنکھوں کو اعتبار نہ ہوا۔ متحیر ہو کر تاکنے لگا۔ مس لیلاوتی نے آگے بڑھ کر مجھے سلام کیا اور ہاتھ ملانے کو بڑھایا۔ میں نے اضطراری طور پر ہاتھ تو بڑھا دیا مگر ابھی تک یہ یقین نہیں ہوا تھا کہ آیا خواب دیکھ رہا ہوں یا حقیقت ہے۔ لیلا کے رخساروں پر وہ سرخی نہ تھی' نہ وہ چلبلا پن بلکہ وہ بہت متین اور زرد ہو رہی تھی۔ آخر میری حیرت کم نہ ہوتے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔ ''تم کیسے جنٹلمین ہو کہ ایک شریف لیڈی کو بیٹھنے کے لیے کرسی بھی نہیں دیتے۔''

میں نے اندر سے کرسی لا کر اس کے لیے رکھ دی مگر ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔
لیلاوتی نے کہا۔ ''شاید تم مجھے بھول گئے۔''
میں۔ ''بھول تو عمر بھر نہیں سکتا مگر آنکھوں کا اعتبار نہیں آتا۔''
لیلا۔ ''تم تو بالکل پہچانے نہیں جاتے۔''
میں۔ ''تم بھی تو وہ نہیں رہیں مگر آخر یہ راز کیا ہے؟ کیا تم جنت سے لوٹ آئیں؟''
لیلا۔ ''میں تو نینی تال میں اپنے ماموں کے ہاں تھی۔''
میں۔ ''اور وہ مجھے چٹھی کس نے لکھی تھی اور تار کس نے دیا تھا؟''
لیلا۔ ''میں نے ہی۔''
میں۔ ''کیوں؟ تم نے مجھے یہ دھوکا کیوں دیا۔ شاید تم اندازہ نہیں کر سکتیں کہ میں نے تمہارے ماتم میں کتنی تکلیف اٹھائی ہے۔''
مجھے اس وقت ایک انوکھا غصہ آیا۔ یہ پھر میرے سامنے کیوں آگئی۔ مر گئی تھی تو مری ہی رہتی۔
لیلا۔ ''اس میں ایک مصلحت تھی مگر یہ باتیں تو پھر ہوتی رہیں گی۔ آؤ اس وقت تمہیں اپنے ایک لیڈی فرینڈ سے انٹروڈیوس کراؤں۔ وہ تمہاری ملاقات کی بہت مشتاق ہے۔''
میں نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''میری ملاقات کی!'' مگر لیلاوتی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر

گاڑی کے سامنے لے گئی۔ اس میں ایک نازنین ہندوستانی کپڑے پہنے بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور ہاتھ بڑھادیا۔ میں نے لیلا کی طرف مستفسر نگاہوں سے دیکھا۔

لیلا۔ ''کیا تم نے نہیں پہچانا؟''

میں۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا اور اگر دیکھا بھی ہو تو گھونگھٹ کی آڑ سے کیونکر پہچان سکتا ہوں۔''

لیلا۔ ''یہ تمہاری بیوی کمدنی ہیں۔''

میں نے استعجاب کے لہجے میں کہا۔ ''کمدنی! یہاں؟''

لیلا۔ ''کمدنی! منہ کھول دو اور اپنے پیارے شوہر کا خیر مقدم کرو۔''

کمدنی نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ذرا سا گھونگھٹ اٹھایا۔ لیلا نے سارا منہ کھول دیا اور ایسا معلوم ہوا گویا بادل سے چاند نکل آیا۔ مجھے خیال آیا' میں نے یہ چہرہ کہیں دیکھا ہے۔ کہاں؟ اہا! اس کی ناک پر بھی تو وہی تل ہے۔ انگلی میں وہی انگوٹھی بھی ہے۔

لیلا۔ ''کیا سوچتے ہو۔ اب پہچانا!''

میں۔ ''میری کچھ عقل کام نہیں کرتی۔ یہی حلیہ بجنسہ میرے ایک پیارے دوست مہر سنگھ کا ہے۔''

لیلا (مسکرا کر)۔ ''تم تو ہمیشہ نگاہ کے تیز بنتے تھے۔ اتنا بھی نہیں پہچان سکتے۔''

میں خوشی سے پھول اٹھا۔ کمدنی مہر سنگھ کے بھیس میں! میں نے اسی وقت گلے سے لگا لیا اور خوب دل کھول کر پیار کیا۔ ان چند لمحوں میں مجھے جو مسرت حاصل ہوئی اس کے مقابلے میں زندگی بھر کی خوشیاں ہیچ ہیں۔ ہم دونوں ہم آغوش تھے۔ کمدنی' پیاری کمدنی کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ ہاں آنکھوں سے اشک جاری تھے۔

مس لیلا باہر کھڑی ہمدردانہ نگاہوں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ ''پیاری لیلا۔ تم سچی دیوی ہو۔ ہم جب تک جئیں گے' تمہارے ممنون احسان رہیں گے۔'' لیلا کے چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم دکھائی دیا۔ بولی۔ ''اب تو شاید تمہیں میرے ماتم کا کافی صلہ مل گیا۔''

عشق دنیا اور حُبِّ وطن

شہر لندن کے ایک پرانے خستہ حال ہوٹل میں جہاں سر شام سے اندھیرا ہو جاتا ہے جس خطہ میں فیشن ایبل لوگ آنا ہی گناہ سمجھتے ہیں اور جہاں قمار بازی' شراب خوری اور بدکاری کے نہایت عبرتناک نظارے ہر دم پیش نظر رہتے ہیں۔ اس ہوٹل میں' اس بدکاریوں کے اکھاڑے میں اطالیہ کا نامور مُحبِّ وطن میزینی خاموش بیٹھا ہوا ہے۔ اس کا وجیہ چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں سے فکر برس رہی ہے۔ ہونٹ خشک ہیں اور شاید مہینوں سے حجامت درست نہیں ہوئی۔ کپڑے میلے کچیلے ہیں۔ کوئی شخص جو میزینی سے پہلے واقف نہ ہو اسے دیکھ کر یہ خیال کرنے سے نہیں

رک سکتا کہ یہ بھی انہیں محروم القسمت شخصوں میں ہے جو اپنے نفس کے غلام ہو کر ذلیل ترین حرکات کے مرتکب ہوتے ہیں۔

میزینی اپنے خیالات میں غرق ہے۔ آہ! بد نصیب قوم! اے مظلوم اٹلی! کیا تیری قسمتیں کبھی نہ سدھریں گی؟ کیا تیرے سینکڑوں سپوتوں کا خون ذرا بھی رنگ نہ لائے گا؟ کیا تیرے ہزار ہا جلاوطن، دیس سے نکالے ہوئے جانثاروں کی آہوں میں ذرا بھی تاثیر نہیں! کیا تو ظلم و جفا، غلامی اور اطاعت گزاری کے دام میں ہمیشہ گرفتار رہے گی۔ غالباً تجھ میں ابھی سدھرنے کی، خود مختار بننے کی صلاحیت نہیں آئی۔ شاید تیری قسمت میں کچھ دنوں اور ذلت و خواری جھیلنی لکھی ہے۔ آزادی! ہائے آزادی! تیرے لیے میں نے کیسے کیسے دوست، جان سے پیارے دوست قربان کیے۔ کیسے کیسے نوجوان، ہونہار نوجوان جن کی مائیں اور بیویاں آج ان کی قبر پر آنسو بہا رہی ہیں اور اپنے آلام و مصیبت سے بیزار ہو کر ان کی جدائیوں کی تکلیف میں بد قسمت، حرماں نصیب، آفت رسیدہ میزینی کو بددعائیں دے رہی ہیں۔ کیسے کیسے شیر جو دشمنوں کے مقابل پیٹھ پھیرنا نہ جانتے تھے، کیا یہ سب قربانیاں، کیا یہ سب نذریں کافی نہیں ہیں؟ آزادی تو ایسی قیمتی شے ہے!! ہاں تو پھر میں کیوں زندہ ہوں۔ کیا یہ دیکھنے کے لیے کہ میرا پیارا وطن، میرا پیارا دیس، دغا پرست، جفا شعار دشمنوں کے پیروں تلے روندا جائے۔ میرے پیارے بھائی، میرے پیارے ہم وطن جور و تعدی کا شکار بنیں۔ نہیں میں یہ دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا!!

میزنی انہیں خیالات میں غرق تھا کہ اس کا دوست رفیتی جو اس کے ساتھ جلاوطن کیا گیا تھا، اس کوٹھری میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بسکٹ کا ٹکڑا تھا۔ رفیتی عمر میں اپنے دوست سے دو چار برس چھوٹا تھا۔ بشرے سے شرافت جھلک رہی تھی۔ اس نے میزینی کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا۔ ”جوزف! یہ لو۔ کچھ کھالو۔“ میزینی نے چونک کر سر اٹھایا اور بسکٹ دیکھ کر بولا۔ ”یہ کہاں سے لائے؟ تمہارے پاس پیسے کہاں تھے؟“

رفیتی۔ ”پہلے کھالو، پھر یہ باتیں پوچھنا۔ تم نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

میزینی۔ ”پہلے یہ بتادو، کہاں سے لائے؟ جیب میں تمباکو کا ڈبہ بھی نظر آتا ہے۔ اتنی دولت کہاں ہاتھ لگی!“

رفیتی۔ ”پوچھ کر کیا کرو گے؟ وہی اپنا نیا کوٹ جو والدہ نے بھیجا تھا، گروی رکھ آیا ہوں۔“

میزینی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ زمین پر گر پڑے۔ روتے ہوئے بولا۔ ”یہ تم نے کیا حرکت کی۔ کرسمس کے دن آتے ہیں۔ اس وقت کیا پہنو گے؟ کیا اطالیہ کے ایک لکھ پتی تاجر کا اکلوتا بیٹا کرسمس کے دن بھی ایسے ہی پھٹے پرانے کوٹ میں بسر کرے گا۔ ایں!“

رفیتی۔ ”کیوں کیا اس وقت تک کچھ آمدنی نہ ہو گی؟ ہم تم دونوں نئے جوڑے بنوائیں گے اور اپنے پیارے وطن کی آنے والی آزادی کے نام پر خوشیاں منائیں گے۔“

میزینی۔ ”آمدنی کی تو کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ جو مضمون ماہواری رسالوں کے لیے لکھے گئے، وہ واپس ہی آ گئے۔ گھر سے جو کچھ ملتا ہے، وہ کب کا ختم ہو چکا۔ اب اور کونسا ذریعہ ہے؟“

رفیتی۔ ”ابھی کرسمس کو ہفتہ بھر پڑا ہے۔ ابھی سے اس کی کیا فکر کریں اور اگر بالفرض یہی کوٹ پہنا تو کیا؟ تم نے نہیں میری بیماری میں ڈاکٹر کی فیس کے لیے میگڈالن کی انگوٹھی بیچ ڈالی تھی۔ میں عنقریب یہ واقعہ اسے لکھنے والا ہوں۔ دیکھنا تمہیں کیسا بناتی ہے۔“

(2)

کرسمس کا دن ہے۔ لندن میں ہر چہار طرف مسرت کی گرم بازاری ہے۔ صغیر و کبیر' امیر و غریب سب اپنے اپنے گھر خوشیاں منا رہے ہیں اور اپنے نفیس سے نفیس کپڑے پہن کر کلیساؤں میں جا رہے ہیں۔ کوئی مغموم صورت نظر نہیں آتی۔ ایسے وقت میں میزینی اور رفیتی دونوں اسی تنگ و تار حجرے میں سر جھکائے خاموش بیٹھے ہیں۔ میزینی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے اور رفیتی رہ رہ کر دروازے پر آتا ہے اور بدمست شرابیوں کو معمول سے زیادہ بہکتے اور دیوانہ پن کی حرکتیں کرتے دیکھ کر اپنے بے نوائی اور ناداری کی فکر دور کرنا چاہتا ہے۔ افسوس! اطالیہ کا سر تاج جس کی ایک للکار پر ہزاروں آدمی اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو جاتے تھے' آج ایسا محتاج ہو رہا ہے کہ اسے کھانے کا ٹھکانہ نہیں حتیٰ کہ آج صبح سے اس نے ایک سگار بھی نہیں پیا۔ تمبا کو ہی دنیا کی وہ نعمت تھی جس سے وہ دستبردار نہیں ہو سکتا تھا اور وہ بھی آج اسے نصیب نہ ہوا۔ مگر اس وقت اسے اپنی فکر نہیں۔ رفیتی' نوجوان خوشحال و خوش رو ہونہار رفیتی کی فکر اسے سوہانِ روح ہو رہی ہے۔ وہ پوچھتا ہے' مجھے کیا حق ہے کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنے ساتھ عسرت کی تکلیفیں جھیلنے پر مجبور کروں جس کے خیر مقدم کے لیے دنیا کی سب نعمتیں آغوش کھولے ہوئے کھڑی ہیں۔

اتنے میں ایک چٹھی رسان نے پوچھا' جوزف میزینی یہاں کہیں رہتا ہے۔ اپنی چٹھی لے جا۔ رفیتی نے خط لے لیا اور جوش مسرت سے اچھل کر بولا۔ "جوزف! یہ لو میگڈالن کا خط ہے!"

میزینی نے چونک کر خط لے لیا اور بڑی بے صبری سے کھولا۔ لفافہ کھولتے ہی چند بالوں کا ایک گچھا گر پڑا جو میگڈالن نے کرسمس کے تحفہ کے طور پر بھیجا تھا۔ میزینی نے اس گچھے کو بوسہ دیا اور اسے اٹھا کر اپنے سینے کی جیب میں ٹھونس لیا۔ خط میں یہ لکھا ہوا تھا:

"مائی ڈیئر جوزف! یہ ناچیز تحفہ قبول کرو۔ خدا کرے تمہیں ایک سو کرسمس دیکھنے نصیب ہوں۔ اس یادگار کو ہمیشہ اپنے پاس رکھنا اور غریب میگڈالن کو بھولنا مت۔ میں اور کیا لکھوں کلیجہ منہ کو آیا جاتا ہے۔ ہائے جوزف! میرا پیارا میرا آقا۔ میرا مالک جوزف! تو مجھے کب تک تڑپائے گا۔ اب ضبط نہیں ہوتا۔ آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ہیں۔ میں تیرے ساتھ مصیبتیں جھیلوں گی۔ فاقوں مروں گی۔ یہ سب مجھے گوارا ہے مگر تجھ سے جدا رہنا گوارا نہیں۔ تجھے قسم ہے' تجھے اپنے ایمان کی قسم۔ تجھے اپنے وطن کی قسم! یہاں آجا۔ تجھے میری قسم۔ یہ آنکھیں ترس رہی ہیں۔ کب تجھے دیکھوں گی۔ کرسمس قریب ہے! مجھے کیا۔ جب تک زندہ ہوں تیری ہوں۔

تمہاری میگڈالن

(3)

میگڈالن کا گھر سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ وہ ایک مرفہ حال تاجر کی بیٹی تھی اور انتہا درجہ کی حسینہ و جمیلہ۔ حسن باطن میں بھی اس کا نظیر نہ تھا۔ کتنے ہی امراء و رؤسا اس کا سودا سر میں رکھتے تھے مگر وہ کسی کو کچھ خیال میں نہ لاتی

تھی۔ میزینی جب اطالیہ سے بھاگا تو سوئٹزر لینڈ میں آ کر پناہ گزیں ہوا۔ میگڈالن اس وقت بھولے بھالے شباب کی گود میں کھیل رہی تھی۔ میزینی کی سرفروشیوں کی تعریفیں پہلے ہی سن چکی تھی۔ کبھی کبھی اپنی ماں کے ساتھ اس کے یہاں آنے لگی اور باہمی ارتباط جو بڑھا اور میزینی کے محاسن باطنی کا جوں جوں اس کے دل پر نقش ہوتا گیا' اس کی محبت اس کے دل میں پختہ ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ اس نے ایک دن خود شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کر میزینی کے پیروں پر سر رکھ کر کہا۔ ''مجھے اپنی خدمت میں قبول کیجئے۔''

میزینی پر بھی اس وقت شباب کا عالم تھا۔ قومی تفکرات نے ابھی دل کو پژمردہ نہیں ہونے دیا تھا۔ جوانی کی پر جوش امیدیں دل میں موجزن ہو رہی تھیں مگر اس نے عہد کر لیا تھا کہ میں ملک و قوم پر اپنے تئیں نثار کروں گا اور اس عہد پر قائم رہا۔ ایک ایسی نازنین کے نازک لبوں سے ایسی درخواست سن کر رد کر دینا میزینی ہی جیسے اعتقاد کے پکے' ہباؤ کے پورے آدمی کا کام تھا۔

میگڈالن باچشم تر اٹھی مگر مایوس نہ ہوئی تھی۔ اس ناکامی نے اس کے دل میں آتشِ محبت اور بھی تیز کر دی اور گو آج میزینی کو سوئٹزر لینڈ چھوڑے کئی سال گزرے مگر وفادار میگڈالن ابھی تک میزینی کو نہیں بھولی۔ دنوں کے ساتھ اس کی محبت اور بھی گاڑھی اور سچی ہوتی جاتی ہے۔

میزینی جب خط پڑھ چکا تو ایک لمبی آہ بھر کر رفیتی سے بولا۔ ''دیکھا میگڈالن کیا کہتی ہے؟''

رفیتی۔ ''اس غریب کی جان لے کر دم لوگے۔''

میزینی پھر خیال میں ڈوبا۔ ''میگڈالن'' تو نوجوان ہے' حسین ہے۔ خدا نے تجھے دولت بے انتہا عطا کی ہے تو کیوں ایک غریب دکھیارے' مفلس' قلانچ اور غربت زدہ شخص کے پیچھے اپنی زندگی مٹی میں ملا رہی ہے۔ مجھ جیسا مایوس' آفت زدہ' مصیبتوں کا مارا شخص تجھے کیونکر خوش رکھ سکے گا۔ نہیں نہیں میں ایسا خود غرض نہیں ہوں۔ دنیا میں بہت سے ایسے شگفتہ مزاج' خوشحال نوجوان ہیں جو تجھے خوش رکھ سکتے ہیں۔ جو تیری پرستش کر سکتے ہیں۔ کیوں تو ان میں سے کسی کو اپنی غلامی میں نہیں لے لیتی۔ میں تیری محبت' سچی' نیک اور بے غرض محبت کی قدر کرتا ہوں مگر میرے لیے جس کا دل قوم اور وطن پر نثار ہو چکا ہے' تو بجز ایک پیاری اور ہمدرد بہن کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مجھ میں ایسی کیا خوبی ہے' ایسے کون سے اوصاف ہیں کہ تجھ جیسی دیوی میرے لیے ایسی مصیبتیں جھیل رہی ہے۔ آہ! میزینی۔ کمبخت میزینی۔ تو کہیں کا نہ ہوا۔ جن کے لیے تو نے اپنے تئیں نثار کر دیا' وہ تیری صورت سے بیزار ہیں جو تیرے ہمدرد ہیں' وہ سمجھتے ہیں تو خواب دیکھ رہا ہے!'' ان خیالات سے بے بس ہو کر میزینی نے قلم دوات نکالی اور میگڈالن کو خط لکھنا شروع کیا۔

(4)

''پیاری میگڈالن! تمہارا خط مع بیش بہا تحفہ کے آیا۔ میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں کہ تم نے مجھ جیسے بے کس و بے بس شخص کو اس تحفہ کے قابل سمجھا۔ میں اس کی ہمیشہ قدر کروں گا۔ یہ میرے پاس ہمیشہ ایک سچی' بے غرض اور غیر فانی محبت کی یادگار رہے گا اور جس وقت یہ جسم خاکی آغوش لحد میں جائے گا' میری آخری وصیت یہ

ہو گی کہ یہ یادگار میرے جنازے کے ساتھ دفن کر دی جائے۔ میں شاید خود اس تقویت کا اندازہ نہیں لگا سکتا جو مجھے اس خیال سے ہے کہ دنیا میں جہاں ہر چہار طرف میری نسبت بدگمانیاں پھیل رہی ہیں' کم از کم ایک ایسی فرشتہ خصال عورت ہے جو میری نیتوں کی صفائی اور میری آلائشوں سے پاک کوششوں پر پکا اعتقاد رکھتی ہے اور شاید تمہاری ہی ہمدردی کا یقین ہے کہ میں زندگی کے ایسے سخت امتحانات میں کامیاب ہوتا جاتا ہوں۔

مگر پیاری بہن! مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم میری تکلیفوں کے خیال سے اپنا دل مت دُکھانا۔ میں بہت آرام سے ہوں۔ تمہاری محبت جیسی لازوال دولت پا کر بھی اگر میں چند جسمانی تکالیف کا رونا روؤں تو مجھ جیسا بدقسمت شخص دنیا میں کون ہو گا۔

میں نے سنا ہے تمہاری صحت روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے۔ میرا جی بے اختیار چاہتا ہے کہ تجھے دیکھوں۔ کاش میں آزاد ہوتا۔ کاش میرا دل اس قابل ہوتا کہ تیرے نذر کیا جاتا مگر ایک پژمردہ افسردہ دل تیرے قابل نہیں میگڈالن۔ خدا کے واسطے اپنی صحت کا خیال رکھو۔ مجھے شاید اس سے زیادہ اور کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی کہ پیاری میگڈالن تکلیف میں ہے اور میرے لیے! تیری پاکیزہ صورت اس وقت نگاہوں کے سامنے ہے! میگا! دیکھو مجھ سے ناراض نہ ہو! بخدا میں تمہارے قابل نہیں۔ آج کرسمس کا دن ہے۔ تمہیں کیا تحفہ بھیجوں۔ خدا تم پر ہمیشہ اپنی بے انتہا برکات نازل کرتا ہے۔ اپنی ماں کو میری طرف سے سلام کہنا۔ تم لوگوں کے دیدار کی بہت آرزو ہے۔ دیکھیں کب تک یہ آرزو پوری ہوتی ہے۔

تیرا جوزف

(5)

اس واقعہ کے بعد بہت دن گزر گئے۔ جوزف میزینی پھر اطالیہ پہنچا اور روم میں پہلی بار جمہوری سلطنت کا اعلان کیا گیا۔ تین شخص کاروبار سلطنت کے انصرام کے لیے منتخب کیے گئے۔ میزینی بھی ان میں ایک تھا مگر تھوڑے ہی دنوں میں فرانس کی زیادتیوں اور شاہ پیڈمانٹ کی دغابازیوں کی بدولت اس جمہوری سلطنت کا انتزاع ہو گیا اور اس کے ارکان و مشیر اپنی جانیں لے کر بھاگ نکلے۔ میزینی اپنے معتمد دوستوں کی دغابازی و دنیاسازی پر پیچ و تاب کھاتا ہوا خستہ حال و پریشان روم کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ اس کا یہ خواب کہ روم کو میں ضرور ایک دن جمہوری سلطنت کا مرکز بنا کر چھوڑوں گا' پورا ہو کر پھر پریشان ہو گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ سے آشفتہ حال ہو کر وہ ایک درخت کے سائے میں ذرا دم لینے کے لیے ٹھہر گیا کہ سامنے سے ایک لیڈی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ کپڑے بالکل سفید اور سادہ۔ سن تیس سال سے متجاوز۔ میزینی خود فراموشی کے عالم میں تھا کہ یہ نازنین جوشِ محبت سے بے تاب ہو کر اس کے گلے لپٹ گئی۔

میزینی نے چونک کر دیکھا! بولا۔ ”پیاری میگڈالن! تم ہو۔“ یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ میگڈالن نے رو کر کہا۔ ”جوزف!“ اور منہ سے کچھ نہ نکلا۔

دونوں خاموش کئی منٹ تک روتے رہے۔ آخر میزینی بولا۔ ”تم یہاں کب آئیں میگا!“

میگڈالن۔ ”میں یہاں کئی ماہ سے ہوں مگر تم سے ملاقات کی کوئی صورت نہیں نکلتی تھی۔ تمہیں کاروبار میں محو دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ اب تمہیں مجھ جیسی عورت کی ہمدردی کی ضرورت باقی نہیں رہی، تم سے ملنے کی کوئی ضرورت نہ دیکھتی تھی۔ (رک کر) کیوں جوزف! یہ کیا سبب ہے کہ اکثر لوگ تمہاری برائی کیا کرتے ہیں۔ کیا وہ اندھے ہیں؟ کیا خدا نے انہیں آنکھیں نہیں دیں؟“

جوزف۔ ”میگا! غالباً وہ لوگ سچ کہتے ہوں گے۔ فی الواقع مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو میں نخوت کے باعث اکثر کہا کرتا ہوں کہ مجھ میں ہیں یا جنہیں تم اپنی سادگی اور پاک نفسی سے مجھ میں موجود سمجھتی ہو۔ میری کمزوریاں روز بروز مجھے معلوم ہوتی جاتی ہیں۔“

میگڈالن۔ ”جبھی تو تم اس قابل ہو کہ میں تمہاری پرستش کروں۔ مبارک ہے وہ انسان جو خودی کو مٹا کر اپنے تئیں ہیچ سمجھنے لگے۔ جوزف! خدا کے لیے مجھے یوں مت جدا کرو۔ میں تمہاری ہو گئی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ تم ویسے ہی پاک وصاف ہو جیسا ہمارا یسوع تھا۔ یہ خیال میرے دل میں نقش ہو گیا ہے اور اگر اس میں ذرا کمزوری آ گئی تھی تو تمہاری اس وقت کی گفتگو نے اسے اور بھی مضبوط کر دیا۔ بے شک تم فرشتے ہو مگر مجھے افسوس ہے کہ دنیا میں کیوں لوگ اس قدر کوتاہ نظر اور کم بین ہوتے ہیں اور خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں تنگ خیالوں سے بالاتر سمجھتی تھی۔ رفیتی، رماری نو، پلائی نو، برناباس۔ یہ سب کے سب تمہارے دوست ہیں۔ تم انہیں اپنا دوست سمجھتے ہو مگر وہ سب تمہارے دشمن ہیں اور انہوں نے مجھ سے میرے روبرو سینکڑوں ایسی باتیں تمہاری نسبت کہی ہیں جس کا میں مر کر بھی یقین نہیں کر سکتی۔ وہ سب غلط، لغو، بکتے ہیں۔ ہمارا پیارا جوزف ویسا ہی ہے جیسا میں سمجھتی تھی بلکہ اس سے بھی افضل۔ کیا یہ بھی تمہاری ایک ذاتی خوبی نہیں کہ تم اپنے دشمنوں کو بھی اپنا دوست سمجھتے ہو۔“

جوزف سے اب صبر نہ ہو سکا۔ اس نے میگڈالن کے زرد ہاتھوں کو بوسہ دے کر کہا۔ ”پیاری میگا! میرے دوست بے قصور ہیں اور میں خود خطاوار ہوں۔ (رو کر) جو کچھ انہوں نے کہا، وہ سب میرے ہی اشارے اور مرضی کے موافق تھا۔ میں نے تم سے نرو دغا ہی کی۔ مگر میری پیاری بہن! یہ محض اس لیے تھا کہ تم میری طرف سے بے پروا ہو جاؤ اور اپنے شباب کے باقی دن مسرت سے بسر کرو۔ میں بہت نادم ہوں۔ میں نے تمہیں مطلق نہ سمجھا تھا۔ میں تمہاری محبت کی گہرائی سے ناواقف تھا کیونکہ جو میں چاہتا تھا، اس کا الٹا اثر ہوا مگر میگا میں معافی کا خواستگار ہوں۔“

میگڈالن۔ ”ہائے جوزف! تم مجھ سے معافی مانگتے ہو۔ ایں! تم جو دنیا کے سب انسانوں سے زیادہ نیک، زیادہ سچے اور زیادہ لائق ہو مگر ہاں بے شک، تم نے مجھے بالکل نہ سمجھا تھا۔ جوزف! یہ تمہاری غلطی تھی۔ مجھے تعجب تو یہ ہے کہ تم اتنے سنگدل کیونکر ہو گئے؟“

جوزف۔ ”میگا! خدا جانتا ہے۔ جب میں نے رفیتی کو یہ سب سکھا پڑھا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی۔ میں جو دنیا میں نیک نامی کی سب سے زیادہ وقعت سمجھتا ہوں اور جس نے حریفوں کے ذاتی حملوں کو کبھی بلا کامل تردید کیے ہوئے نہ چھوڑا، اپنے منہ سے سکھاؤں کہ جا کر مجھے برا کہو مگر یہ محض اس لیے تھا

کہ تم اپنی صحت کا خیال رکھو اور مجھے بھول جاؤ۔"
حقیقت یہ تھی کہ میزینی نے میگڈالن کے عشق کو روز افزوں ہوتے دیکھ کر ایک خاص حکمت کی تھی۔ اسے خوب معلوم تھا کہ میگڈالن کے شیدائیوں میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جو اس سے زیادہ شکیل' زیادہ جری' زیادہ دولت منداور زیادہ ذہین ہیں مگر وہ کسی کو خیال میں نہیں لاتی۔ مجھ میں اس کے لیے جو خاص کشش ہے' وہ میرے چند اوصاف ہیں اور اگر میرے ایسے احباب جن کی وقعت میگڈالن کی نگاہوں میں بھی ہے' اس سے میری شکایت کر کے ان اوصاف کی وقعت اس کے دل سے مٹا دیں تو وہ خود بخود مجھے بھول جائے گی۔ پہلے تو اس کے احباب اس فعل کے کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے مگر اس خوف سے کہیں میگڈالن نے گھل گھل کر جان دے دی تو میزینی اپنی زندگی بھر ہمیں بھی نہ معاف کرے گا۔ انہوں نے یہ ناگوار کام قبول کر لیا تھا۔ وہ سوئٹزر لینڈ گئے اور جہاں تک ان کی زبان میں گویائی تھی' اپنے دوست کی غیبت اور بد گوئی میں صرف کی۔ مگر میگڈالن پر محبت کا رنگ ایسا گہرا چڑھا ہوا تھا کہ ان کوششوں کا بجز اس کے اور کوئی نتیجہ نہ ہو سکتا تھا جو ہوا۔ وہ ایک روز بے قرار ہو کر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور روم میں آ کر ایک سرائے میں مقیم ہو گئی۔ یہاں اس کا روز کا وطیرہ تھا کہ میزینی کے پیچھے پیچھے اس کی نگاہ سے دور گھوما کرتی مگر اسے مطمئن اور اپنی کامیابی سے خوش دیکھ کر اسے چھیڑنے کی جرات نہ کرتی تھی۔ بالآخر جب پھر اس پر ناکامیابیوں کا وار ہوا اور وہ پھر دنیا میں بے کس و بے بس ہو گیا تو میگڈالن نے سمجھا' اب اس کو کسی ہمدرد کی ضرورت ہے۔ اور ناظرین دیکھ چکے ہیں جس طرح وہ میزینی سے ملی۔

(6)

میزینی روم سے پھر انگلستان پہنچا اور یہاں وہ عرصے تک مقیم رہا۔ 1870ء میں اسے خبر ملی کہ سسلی کی رعایا بغاوت پر آمادہ ہے اور انہیں میدان جنگ میں لانے کے لیے ایک محرک کی ضرورت ہے۔ بس وہ فوراً سسلی پہنچا مگر اس کے جانے کے قبل شاہی فوج نے باغیوں کو زیر کر دیا تھا۔ میزینی جہاز سے اترتے ہی گرفتار کر لیا گیا اور ایک زنداں خانہ میں ڈال دیا گیا مگر چونکہ اب وہ بہت ضعیف ہو گیا' حکام شاہی نے اس خوف سے کہ کہیں وہ تکالیف قید سے مر جائے تو رعایا کو شبہ ہو گا کہ بادشاہ کی تحریک سے وہ قتل کر ڈالا گیا' اسے رہا کر دیا۔ مایوس اور شکستہ دل میزینی پھر سوئٹزر لینڈ کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی زندگی کی تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اس میں شک نہیں کہ اٹلی کے متفق اور متحد ہو جانے کے دن بہت قریب آ گئے تھے مگر اس کی حکومت کی حالت اس سے ہرگز بہتر نہ تھی جیسی آسٹریا یا نیپلز کے عہد حکومت میں۔ فرق یہ تھا کہ پہلے وہ ایک غیر قوم کی زیادتیوں سے نالاں تھے۔ اب اپنے قوم کے ہاتھوں خستہ و خوار۔ ان متواتر ناکامیوں نے مستقل مزاج میزینی کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ غالباً عوام کی ملکی تعلیم اس حد تک نہیں ہوئی ہے کہ وہ اپنے لیے ایک جمہوری طرز حکومت کی بنیاد ڈالیں اور اس نیت سے وہ سوئٹزر لینڈ جا رہا تھا کہ وہاں سے ایک زبردست قومی اخبار نکالے کیونکہ اطالیہ میں اسے اپنے خیالات کی اشاعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ رات بھر نام تبدیل کر کے روم میں مقیم رہا۔ پھر وہاں سے اپنے نژاد بوم جنیوا میں آیا اور اپنی پاک خصال ماں کی قبر پر پھول چڑھائے۔ بعد ازاں سوئٹزر لینڈ کی طرف چلا اور سال بھر تک چند معتمد احباب کی اعانت سے اخبار نکالتا رہا مگر متواتر تفکرات اور مصائب نے اسے بالکل لاغر اور نحیف بنا دیا تھا۔ 1870ء میں وہ صحت کے

خیال سے انگلستان آرہا تھا کہ کوہ آلپس کے دامن میں نمونیا کی بیماری نے سلسلہ حیات منقطع کر دیا اور وہ ایک پر ارمان دل لیے ہوئے جنت کو سدھارا۔ اٹلی کا نام مرتے دم تک اس کی زبان پر تھا۔ یہاں بھی اس کے متعدد حامی، ہمدرد شریک تھے۔ اس کا جنازہ بڑی دھوم سے نکلا۔ ہزارہا آدمی ساتھ تھے اور ایک بڑے پر فضا، فرحت بخش مقام پر ایک شفاف چشمے کے کنارے پر اس فنافی القوم کو سلا دیا گیا۔

(7)

میزینی کو کنج لحد میں سوئے ہوئے آج تین دن گزر گئے۔ شام کا وقت تھا۔ سورج کی زرد شعاعیں اس تازہ قبر پر حسرت ناک نگاہوں سے تاک رہی ہیں کہ ایک ادھیڑ عمر عورت، خوبصورت، شہانے جوڑے پہنے لڑکھڑاتی ہوئی آئی۔ یہ میگڈالن تھی۔ اس کا چہرہ نہایت مغموم و پژمردہ تھا۔ گویا اب اس جسم میں جان نہیں باقی رہی۔ وہ اس قبر کے سرہانے بیٹھ گئی اور اپنے سینے پر کھسے ہوئے پھول اس پر چڑھائے۔ پھر دوزانو ہو کر صدق دل سے دعا کرتی رہی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا۔ برف پڑنے لگی تو وہ چپکے سے اٹھی اور خاموش سر جھکائے قریب کے ایک گاؤں میں جا کر رات بسر کی اور علی الصبح اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئی۔

میگڈالن اب اپنے گھر کی مالک تھی۔ اس کی ماں بہت عرصہ ہوا انتقال کر گئی تھی۔ اس نے میزینی کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی اور خود خانقاہ نشین عیسائی لیڈیوں کے لباس میں وہاں شب و روز رہنے لگی۔ میزینی کا نام اس کے لیے نہایت پر درد اور دلکش نغمے سے کم نہ تھا۔ ہمدردوں اور قدردانوں کے لیے اس کا گھر خانۂ بے تکلف تھا۔ میزینی کے خطوط اس کی انجیل اور میزینی کا نام اس کا معبود تھا۔ آس پاس کے غریب لڑکے اور مفلس بیویوں کے لیے یہی بابرکت نام حصولِ معاش کا وسیلہ تھا۔ میگڈالن تین برس تک زندہ رہی اور جب مری تو اپنی آخری وصیت کے مطابق اسی خانقاہ میں دفن کی گئی۔ اس کا عشق معمولی محبت نہ تھا بلکہ وہ ایک پاک اور بے لوث جذبہ تھا اور وہ ہم کو ان پریم رس میں ڈوبی ہوئی گوپیوں کی یاد دلاتا ہے جو سری کرشن کے پریم میں بندرابن کی کنجوں اور گلیوں میں منڈلایا کرتی تھیں۔ جو اس سے ملے ہونے پر بھی اس سے الگ تھیں اور جن کے دلوں میں پریم کے سوا اور کسی چیز کی جگہ نہ تھی۔ میزینی کی خانقاہ آج تک قائم ہے اور غرباء اور فقراء ابھی تک میزینی کا پاک نام لے کر وہاں ہر طرح کی آسائش اور راحت پاتے ہیں۔

سیرِ درویش

(1)

میں برلن کا باشندہ ہوں۔ میرے والد بزرگوار علوم طبیعات کے مشہور محقق تھے۔ جغرافی تحقیقات کا

شوق مجھے بھی ان سے وراثت میں ملا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے یہ دھن سوار ہوئی کہ پیادہ پا صفحہ گیتی کے ہر ایک خطہ کی سیر کروں۔ میرے پاس دولت وافر تھی۔ میں نے سب روپیہ ایک بینک میں جمع کر دیا اور اس سے معاہدہ کر لیا کہ مجھے عندالطلب روپیہ بھیجتا رہے۔ اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سامان سفر درست کیا۔ ضروری آلات ساتھ لیے اور نام خدا لے کر چل پڑا۔ اس وقت یہ خیال میرے دل میں گدگدی پیدا کر رہا تھا کہ میں وہ پہلا شخص ہوں جسے یہ بات سوجھی ہے۔ دوسرے سیاحوں نے ریل، جہاز اور موٹر کار کی پناہ لی ہے۔ میں وہ پہلا مرد دلیر ہوں جو اپنے پیروں کے بوتے پر باغِ دنیا کی سیر کے لیے روانہ ہوا ہے۔ اگر میری ہمتِ بلند نے یہ کارِ عظیم پورا کر دکھایا تو عملی دنیا مجھے فخر واعزاز کے مسند پر بٹھائے گی اور ابد تک میرے نام پر فضیلت کے پھول چڑھتے رہیں گے۔ اس وقت میرا دل انہیں خیالات سے لبریز تھا اور شکر ہے کہ ہزاروں مشکلات کا سامنا کرنے پر بھی استقلال نے میرا ساتھ نہ چھوڑا اور ہمت دم بھر کے لیے بھی پست نہ ہوئی۔ میں برسوں ایسے مقامات میں رہا ہوں جہاں خموشی کے سوا کوئی دوسرا رفیق نہ تھا۔ مدتوں اس دنیا میں رہا ہوں جہاں کا آسمان اور زمین برف تھی۔ میں درندوں کے پہلو میں سویا ہوں۔ میں نے پرندوں کے آشیانوں میں راتیں کاٹی ہیں مگر میری ہمتِ بلند نے یہ سب سختیاں جھیل ڈالیں اور وہ زمانہ بہت قریب ہے کہ علم وادب کی دنیا میرے قدموں پر سجدہ کرے گی۔

میں نے اس دوران سیاحت میں بڑے بڑے عجائب روزگار دیکھے۔ بے شمار دلکش مناظر کی سیر کی اور کتنے ہی قوموں کے اخلاق و آداب کا مشاہدہ کیا۔ میرا سفر نامہ خیالات و تجربات کا ایک بے بہا گنجینہ ہوگا۔ میں نے ایسے ایسے واقعے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جن کا تذکرہ الف لیلہ کی داستان سے کم حیرت انگیز اور پر لطف نہ ہوگا۔ مگر وہ واقعہ جو میں نے گیان سرور کے کنارے دیکھا، غرابت میں بے مثل ہے۔ میں اسے تا زیست نہ بھولوں گا۔ اگر میری ان تمام دقتوں کا صلہ یہی ایک مشاہدہ ہوتا تو بھی میں اسے کافی سمجھتا۔ میں یہ جتا دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں باطل پرست نہیں ہوں اور نہ خرقِ عادات پر میرا عقیدہ ہے۔ میں اس سائنس کا قائل ہوں جس کی بنیاد علت واسباب پر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ واقعہ مجھ سے بیان کرتا تو مجھے اس پر اعتبار کرنے میں تامل ہوتا مگر میں جو کچھ بیان کر رہا ہوں، وہ ایک سچا واقعہ ہے۔ اگر میرے یوں یقین دلانے پر بھی کوئی اس کو شبہ کی نگاہ سے دیکھے تو یہ اس کے عقیدہ کی کمزوری اور خیالات کی تنگی ہے۔

ایامِ سفر کا ساتواں سال تھا اور مئی کا مہینہ۔ میں کوہ ہمالیہ کے دامن میں گیان سرور کے کنارے ہری ہری گھاس پر لیٹا ہوا تھا۔ موسم بہت سہانا تھا۔ روح پرور ہوائیں چل رہی تھیں۔ گیان سرور کے شفاف پانی میں نیلے آسمان کا عکس، کنارے پر سبزہ سے ڈھکی ہوئی ناہموار چوٹیاں، مرغابیوں کا تختۂ آب پر تیرنا۔ یہ نظارے ایسے دلفریب تھے کہ مجھ پر ایک مستانہ کیفیت سی طاری ہوگئی۔ میں نے سوئٹزر لینڈ اور امریکہ کے مناظر دیکھے ہیں مگر ان میں یہ سکون بخش جادو کہاں۔ میں خاموش بیٹھا ہوا محوِ نظارہ تھا کہ یکایک میری نگاہ ایک شیر پر جا پڑی جو آہستہ آہستہ شاہانہ قدم بڑھاتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میرے اوسان خطا ہوگئے۔ ایسا دراز قد، جسیم شیر میری نظر سے نہ گزرا تھا۔ وہاں بجز گیان سرور کے اور کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں بھاگ کر اپنی جان بچاتا مگر دہشت کا مجھ پر ایسا غلبہ ہوا کہ میں اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ اعضاء بالکل میرے قابو سے باہر تھے۔ مجھے یقین کامل ہوگیا کہ یہ شیرِ اجل مجھے لقمۂ دہن بنائے گا۔ زندگی کا یہیں تک ساتھ تھا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میری جیب میں ایک پستول گولیوں سے بھری ہوئی رکھی ہے۔ میں نے تیزی سے پستول نکال لی اور قریب تھا کہ اس شیر پر وار کروں کہ میرے کانوں میں یہ

آواز آئی۔ ''اے مسافر! ایشور کے لیے وار نہ کرنا ورنہ تجھے افسوس ہو گا۔ شیر تجھے نقصان نہ پہنچائے گا۔''

میں نے متحیر ہو کر پیچھے کی طرف دیکھا تو ایک عورت آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سنہرا آفتابہ تھا اور دوسرے میں ایک طشتری۔ ایسا حسن فنون ساز آج تک میری نگاہوں سے نہیں گزرا۔ میں نے ارمنی کی حوریں اور کوہ قاف کی پریاں دیکھی ہیں مگر ہماچل پربت کی یہ اپسرا میں نے ایک ہی بار دیکھی اور اس کی تصویر آج تک پردۂ دماغ پر کھچی ہوئی ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ رفیلی یا کریجیو نے اپنے سحر طراز پنسل سے ایسی تصویر کھینچی ہو۔ وینڈائک اور رمبرانٹ کے شبیہوں میں بھی میں نے ایسی صبیح دلکش جادو بھری تصویر نہیں دیکھی۔ میں ایسا محوِ نظارہ ہوا کہ شیر کا خوف اور پستول داغنے کا خیال جاتا رہا۔ جادوئے حسن کی سواد نیا میں کوئی دوسری ایسی طاقت نہ تھی جو اس وقت مجھے اپنے خطرہ کے خیال سے بے خبر کر سکتی تھی۔ مجھے پہلی بار حسن کی بے انتہا قوت کا تجربہ ہوا۔ کوئی تعجب نہیں کہ حسن نے ملک تباہ کر دیئے ہیں۔ سلطنتوں کے نشان مٹا دیئے ہیں۔

میں اس حسینہ کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ خراماں خراماں اس شیر کے پاس آئی۔ شیر اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور میری طرف حاسدانہ نگاہوں سے دیکھ کر رعد کی طرح گرجا۔ نازنین نے ایک رومال نکال کر اس کا منہ پونچھا اور پھر آفتابہ سے دودھ انڈیل کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ شیر دودھ پینے لگا۔ میری حیرت کی اب کوئی انتہائی نہ تھی۔ حیران تھا کہ یہ کوئی طلسم ہے یا جادو۔ دنیاءِ حقیقت میں ہوں یا عالم خیال میں۔ میں نے اکثر سرکسوں میں پالتو شیر دیکھے ہیں مگر انہیں قابو میں رکھنے کے لیے کیسی کیسی پیش بندیاں کی جاتی ہیں۔ ان کے برعکس خونخوار دہشت ناک جانور نازنین کے سامنے اس طرح لیٹا ہوا ہے گویا وہ شیر کے قالب میں کوئی بچہ آہو ہے۔ نازنین میں وہ کونسی طاقت ہے جس نے شیر کو اس طرح رام کر لیا ہے؟ کیا جانور بھی حسن کی گرمی سے متاثر ہوتے ہیں؟ کہتے ہیں کہ مہور کی الاپ کالے ناگ کو مست کر دیتی ہے۔ جب آواز میں یہ اثر ہے تو حسن کی طاقت کا اندازہ کون لگائے گا۔ حسن دنیا کی سب سے انمول جنس ہے۔ حسن صانعِ قدرت کے کمال کا معراج ہے۔

جب شیر دودھ پی چکا تو اس حسینہ نے رومال سے پھر اس کا منہ پونچھا اور اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اسے تھپکیاں دینے لگی۔ شیر دم ہلاتا تھا اور اپنی زبان سے نازنین کے پنجۂ مرجان کو چاٹتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد دونوں ایک غار کے اندر چلے گئے۔ مجھے بھی دھن سوار ہوئی کہ کسی طرح اس طلسم کی حقیقت تک پہنچوں۔ جب وہ دونوں نظر سے پنہاں ہو گئے تو میں بھی اٹھا اور دبے پاؤں اس غار کے دروازہ تک جا پہنچا۔ اس وقت خوف سے میرے جسم کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی مگر پردۂ طلسم کھولنے کی خواہش اس خوف پر غالب تھی۔ میں نے غار کے اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ زمین پر زری کا فرش بچھا ہوا ہے اور کارچوبی گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔ شیر مسند پر شاہانہ احتشام سے بیٹھا ہوا ہے۔ سونے' چاندی کے ظروف' خوشنما فانوسین' خوبصورت تصویریں۔ سبھی اپنے اپنے موقع پر زیب دے رہی ہیں اور وہ شگاف کوہ امیرانہ محل بنا ہوا ہے۔

دروازہ پر میری پرچھائیں دیکھ کر وہ نازنین باہر نکل آئی اور مجھ سے بولی۔ ''اے مسافر! تو کون ہے؟ اور ادھر کیونکر آنکلا؟''

آہ! کیا دلکش آواز تھی۔ نغمہ کا لطف دینے والی۔ میں نے اب کی نزدیک سے دیکھا تو اس حسینہ کا چہرہ غمناک تھا اور صورت سے حسرت برس رہی تھی۔ اس کی آواز اور لہجہ میں بھی دردِ دل کی چاشنی تھی۔ وہ آواز جو شیاما کے زمزموں سے بھی زیادہ شیریں تھی' آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ میں نے جواب دیا۔ ''اے

ملکۂ حسن! میرا مکان یورپ میں ہے۔ میں سیاحی کی غرض سے یہاں آیا ہوں۔ میری عین خوش نصیبی ہے کہ آپ سے ہمکلام ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔"

حسینہ کے گلاب سے ہونٹوں پر دلآویز تبسم کا جلوہ نظر آیا۔ شاید میرے اس باتکلف اندازِ گفتگو کا اثر تھا۔ بولی۔ "تو پردیسی آدمی ہے اور ہمارے یہاں اِتتھ سنسکار کا فرض بتایا گیا ہے۔ آج تو میری دعوت قبول کر۔"

میں نے موقع دیکھ کر جواب دیا۔ "میں آپ کی مہمان نوازی سے بہرہ ور ہونا اپنے لیے مایۂ ناز سمجھتا ہوں مگر اس طلسم نے میری بھوک پیاس سب بند کر دی ہے۔ کیا میں امید کروں کہ آپ اس کی حقیقت مجھ سے بیان فرمائیں گی؟"

حسینہ (آہ سرد بھر کر) میری رام کہانی ایک داستان غم ہے۔ تجھے سن کر افسوس ہوگا۔ مگر میں نے اصرار کیا۔ آخر اس حسینہ نے مجھے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اپنی سرگزشت سنانی شروع کی۔ "میں کشمیر دیس کی رہنے والی راجپوتنی ہوں۔ میری شادی ایک شیر دل راجپوت سے ہوئی تھی۔ ان کا نام نرسنگھ دیو تھا۔ ہم دونوں باغ زندگی کی بہار لوٹتے تھے۔ دنیا میں سب سے بڑی نعمت حسن ہے۔ دوسری صحت اور تیسری دولت۔ پرماتما نے ہم کو یہ تینوں نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ افسوس میں ان سے تیری ملاقات نہیں کرا سکتی۔ ایسا حسین' ایسا شہ زور' ایسا دلیر جوان سارے کشمیر میں نہ تھا۔ میں ان کی پرستش کرتی تھی اور وہ مجھے پیار کرتے تھے۔ کئی سالوں تک ہماری زندگی وہ بہار تھی جس میں خزاں کے جھونکے نہیں لگتے تھے۔ ایک آنند کی دھارا تھی جو سایہ دار درختوں اور سبزہ زار میدانوں میں خوش خرامی کرتی ہوئی چلی جاتی تھی۔

میرے پڑوس میں ایک مندر تھا۔ اس کے پوجاری ایک پنڈت شری دھر تھے۔ ہم دونوں شام سویرے اس مندر میں اُپاسنا کے لیے جاتے۔ مندر ایک پر فضا تالاب کے لب کنار تھا۔ وہاں کی تازہ ہوا روح کو پھڑکا دیا کرتی تھی۔ شری دھر پنڈت بڑے صاحب علم و کمال تھے۔ ان کی سنسکرت ودیا کا دور دور تک چرچا تھا۔ سارے کشمیر کے لوگ ان کے معتقد تھے۔ وہ اپنے اصولوں کے بڑے پابند تھے۔ ان کی آنکھیں روحانیت کا پاک سرچشمہ تھیں اور دل نیکیوں کا گنجینہ۔ ان کی زبان نے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا اور ان کا دل سدا دوسروں کے درد سے کھٹکتا رہا۔

شری دھر سن میں میرے شوہر سے کوئی دس سال بڑے ہوں گے مگر ان کی بیوی ودیا دھری میری ہم سن تھی۔ ہم دونوں سہیلیاں تھیں۔ ودیا دھری بہت متین اور بہت قانع عورت تھی۔ اس کی شکل و صورت رانیوں کی سی تھی اور لب و لہجہ دلوں کو لبھانے والا۔ ایسی عورتیں رنواس کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں نہ کہ مندر کے لیے۔ مگر یہ شکایت نہ کبھی ودیا دھری کے دل میں آئی اور نہ زبان پر۔ وہ اپنے شوہر کو دیوتا سمجھتی تھی۔

ساون کا مہینہ تھا۔ آسمان پر کالے کالے بادل منڈلاتے تھے۔ گویا کاجل کے پہاڑ اڑے جا رہے ہیں۔ آبشاروں سے دودھ کی دھاریں نکل رہی تھیں اور پہاڑوں پر دلفریب ہریائی چھائی ہوئی تھی۔ ننھی ننھی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ جیسے سرچشمہ جنت سے امرت کی بوندیں ٹپک رہی ہوں۔ پانی کے قطرے پھولوں اور پتیوں کے گلے کا ہار ہو رہے تھے۔ روح کو امنگوں سے ابھارنے والا اور دل کو نشہ مسرت سے مدہوش کرنے والا سماں چھایا ہوا تھا۔ وہ سماں جب پردیسی پیا کی یاد عورتوں کو رلانے لگتی ہے۔ جب سینہ کسی سے ہم آغوش ہونے کے لیے تڑپتا ہے۔ جب سونی سیج دیکھ کر کلیجہ میں ہوک سی اٹھتی ہے۔ اسی موسم میں برہ کی ماری عورت اپنی بیماری کا بہانہ کرتی ہے تاکہ اس کا شوہر اسے دیکھنے آئے۔ اسی موسم میں مالی کی لڑکی دھانی رنگ کی ساڑھی پہن کر کیاریوں میں اٹھلاتی ہوئی چمپا اور بیلے

کے پھولوں سے آنچل بھرتی ہے کیونکہ ہار اور گجروں کی مانگ بہت بڑھ جاتی ہے۔ میں اور ودیادھری بالا خانے پر بیٹھی ہوئی برکھا کی بہار دیکھ رہی تھیں اور کالی داس کا رُت سنگھار پڑھتی تھیں کہ اتنے میں میرے شوہر نے آکر کہا کہ آج موسم بڑا سہانا ہے۔ جھولا جھولنے میں بڑا لطف آئے گا۔ ایسے پر بہار موسم میں جھولا جھولنے کی تجویز کیونکر رد کی جا سکتی تھی۔ ودیادھری بھی راضی ہوگئی۔ ریشم کی ڈوریاں کدم کی شاخ میں پڑگئیں۔ صندل کا پیڑا رکھ دیا گیا اور میں ودیا دھری کے ساتھ جھولا جھولنے لگی۔ ہمارے دل اس وقت امنگ کی موجود سے اڈرہے تھے۔ جس طرح گیان سرور شفاف پانی سے لبریز ہورہا ہے' اسی طرح سے ہمارے سینے پاک خوشی سے لبریز تھے۔ مگر افسوس! اس دن کی خوشی اس برکتِ عظمیٰ کا آخری جلوہ تھی۔ چاند پورن ماشی کے دن چمک کا انتہائی زور دکھا کر گھٹ جاتا ہے۔ وہ دن ہماری زندگی کی پورن ماشی تھی۔ میں جھولے کے پاس پہنچ کر پیڑے پر جا بیٹھی مگر ودیادھری نزاکت کے باعث اوپر نہ آسکی۔ وہ دو تین بار اچکی مگر پیڑے پر نہ پہنچی۔ تب میرے جان و جگر کے مالک' میرے پیارے شوہر نے سہارا دینے کے لیے اس کی بانہہ پکڑلی۔ ان کی آنکھیں مخمور تھیں اور وہ آہستہ آہستہ ملار گارہے تھے مگر ودیادھری پیڑے پر آئی تو اس کا چہرہ ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح سرخ تھا' آنکھیں خون ناب ہورہی تھیں۔ اس نے میرے شوہر کی طرف پر غضب نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"تو نے کام کے بس میں ہو کر میرے بدن میں ہاتھ لگایا ہے۔ میں اپنے پتی برت کے بل سے تجھے سراپ دیتی ہوں کہ تو اسی وقت پشو ہو جا۔"

یہ کہتے ہی ودیادھری نے اپنے گلے سے رودراکش کی مالا نکال کر میرے شوہر پر پھینک دی اور دم زدن میں پیڑے کے پاس میرے شوہر کے بجائے ایک قوی ہیکل شیر کھڑا دکھائی دیا۔

(2)

اے مسافر! اپنے پیارے شوہر کی یہ گت دیکھ کر میرا خون خشک ہوگیا اور کلیجہ پر ایک بجلی سی آگری۔ میں ودّیادھری کے پیروں سے لپٹ گئی اور زار قطار رونے لگی۔ اس وقت مجھے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تجربہ ہوا کہ پتی برت میں کتنی طاقت ہے۔ ایسے واقعے میں نے اپنے پُرانوں میں پڑھے تھے مگر مجھے یقین نہ تھا کہ اس زمانہ میں جبکہ روز بروز استری پُرش کا تعلق خود غرضانہ ہوتا جاتا ہے' پتی برت میں ایسی طاقت ہوگی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ ودیا دھری کا خیال کہاں تک صحیح تھا۔ میرے پتی ودیادھری کو ہمیشہ بہن کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بہت حسین تھے اور حسین مرد کی بیوی کی زندگی ہرگز قابل رشک نہیں ہوتی مگر مجھے ان پر بدگمانی کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ استری برت دھرم کے ویسے ہی پابند تھے جیسے پتی برتا عورت اپنے دھرم کی پابند ہوتی ہے۔ ان کی نگاہ پاک تھی اور خیالات نہایت پاکیزہ۔ یہاں تک کہ کالی داس کی شاعری انہیں پسند نہ تھی مگر "کام" کے جانسوز تیر سے کون بچا ہے۔ جس کام نے شیو اور برہما جیسے تپسیوں کی تپسیا بھنگ کردی۔ جس نے نارد اور وشوامتر کو نشانۂ ملامت بنایا۔ وہ کام سب کچھ کرسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ انگور گلغدار اور موسم پُر بہار نے کچھ اثر کیا ہو۔ میرا تو گمان ہے کہ ودیادھری کی بدگمانی بالکل قیاسی تھی۔ بہرحال اس نے سراپ دے دیا۔ اس وقت میرے دل میں بھی جوش پیدا ہوا کہ جس طاقت کا ودیا دھری کو گھمنڈ ہے' کیا وہ طاقت مجھ میں نہیں ہے؟ کیا میں پتی برتا نہیں ہوں۔ مگر آہ! میں نے ہر چند چاہا کہ بد دعا کا

کلمہ زبان سے نکالوں مگر کسی نے میری زبان بند کر دی۔ وہ اعتماد جو ودیا دھری کو اپنے برت پر تھا' مجھے نہ حاصل تھا۔ بے بسی نے میرے انتقام کے جوش کو فرو کر دیا۔ میں نے بڑی فروتنی کے ساتھ کہا۔ ''بہن یہ تم نے کیا کیا؟''

ودیا دھری۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ اس کے کرموں کا پھل ہے۔''

میں۔ ''تمہارے سوا میں کس سے اس درد کی دوا مانگوں؟ کیا مجھ پر اتنی دیانہ کرو گی؟''

ودیا دھری۔ ''میرے کیے اب کچھ نہیں ہو سکتا۔''

میں۔ ''دیوی! تم پتی برت دھارنی ہو۔ تمہاری زبان میں بہت کچھ اثر ہے۔ تمہارا کرودھ اگر آدمی سے حیوان بنا سکتا ہے تو کیا تمہاری دیا حیوان سے آدمی نہ بنا سکے گی؟''

ودیا دھری۔ ''پرائشچت کرو۔ پرائشچت کے سوا اب کوئی علاج نہیں۔''

اے مسافر! میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میں نے ودیا دھری سے زیادہ منت سماجت نہیں کی۔ اس کا سینہ رحم کا سمندر تھا۔ اگر میں اس کے پیروں پر سر رکھ دیتی تو یقیناً اسے میری حالت پر رحم آ جاتا مگر راجپوتنی ذلت سہہ سکتی ہے' نفرت سہہ سکتی ہے' غصہ برداشت کر سکتی ہے' حرفِ رحم نہیں کہہ سکتی۔ دوسروں کے رحم کا بوجھ اس سے نہیں اٹھایا جاتا۔ میں نے جتنی آرزو منت کی اس پر اب تک نادم ہوں۔ میں نے پیڑے سے اتر کر اپنے شوہر کے قدم چومے اور انہیں ساتھ لیے ہوئے اپنے مکان پر آئی۔ پرائشچت (کفارۂ گناہ) کرنے کا ارادہ میرے دل میں مضبوط ہو گیا۔

(3)

کئی مہینے گزر گئے۔ میں اپنے شوہر کی خدمت میں دل و جان سے مصروف رہتی۔ اگرچہ ان کی زبان میں قوت گویائی نہ تھی مگر ان کے بشرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی حرکت پر نادم ہیں۔ باوجود اس قلب ماہیت کے انہیں گوشت سے قطعی نفرت تھی۔ میرے پاس سینکڑوں گائیں اور بھینسیں تھیں مگر شیر سنگھ نے کبھی کسی کو ایذا نہیں پہنچائی۔ میں انہیں دونوں وقت دودھ پلاتی اور شام کے وقت انہیں ساتھ لے کر میدانوں کی سیر کراتی۔

اسی اثناء میں ہردوار میں گنگا اشنان کا میلہ لگا۔ میرے گاؤں سے جاتریوں کا ایک قافلہ ہردوار کو چلا۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لی اور غرباء و فقراء کو تقسیم کرنے کے لیے کئی کیسے سیم و زر سے بھرے ہوئے ساتھ لیے۔ میں نے پیادہ پا یہ سفر طے کیا اور ایک مہینے میں ہردوار جا پہنچی۔ یہاں ہندوستان کے ہر حصہ سے بے شمار جاتری آئے ہوئے تھے۔ دور سے وہ مثل سنگریزوں کے نظر آتے تھے۔ میلوں تک آدمیوں کا فرش سا بچھا ہوا تھا۔ مجھے یہاں آئے تین دن گزرے تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ میں گنگا ماتا کی گود میں کھڑی اشنان کر رہی تھی۔ یکایک میری نگاہ اوپر کو اٹھی تو میں نے کسی آدمی کو پل کی سلاخوں پر جھک کر نیچے کی طرف جھانکتے دیکھا۔ دفعتاً اس آدمی کا پیر اوپر کو اٹھ گیا اور وہ سینکڑوں گز کی بلندی سے گنگا جی میں گر پڑا۔ ہزاروں آنکھیں یہ نظارہ دیکھ رہی تھیں مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس بدقسمت شخص کی جان بچائے۔ ہندوستان کے سوا ایسا بے حمیت ملک کون ہو گا۔ لوگ بیٹھے ہوئے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ دھار بڑی تیزی سے بہہ رہی تھی اور پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا تھا۔ سرد ہوا بدن کی ہڈیوں میں چبھی جاتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ غریب دھار کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے۔ یہ دلدوز نظارہ مجھ سے نہ دیکھا گیا۔ میں نے ایشور کا نام لیا اور دل مضبوط کر کے دھار کے ساتھ تیرنے لگی۔ جوں جوں میں آگے بڑھتی تھی۔ وہ شخص مجھ سے دور ہوتا

جاتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے اعضاء سردی کے مارے شل ہو گئے۔

میں نے کئی بار چٹانوں کو پکڑ کر دم لیا۔ کئی بار پتھروں سے ٹکرائی۔ میرے ہاتھ مشکل سے چلتے تھے۔ سارا جسم برف کا ڈھانچا سا بنا ہوا تھا۔ میرے اعضاء ایسے قابو سے باہر ہو گئے کہ میں بھی دھارے کے ساتھ بہنے لگی اور مجھے یقین ہو گیا کہ گنگا کے آغوش میں میری جان نکلے گی۔

دفعتاً میں نے اس شخص کی لاش کو ایک چٹان پر جا کر رکتے دیکھا۔ میرا حوصلہ بندھ گیا۔ بدن میں سکت معلوم ہوئی۔ میں زور لگا کر کسی نہ کسی طرح اس چٹان تک پہنچ گئی اور اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر چٹان پر کھینچا۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ وہ سری دھر پنڈت تھے۔

اے مسافر! میں نے یہ کام اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر پورا کیا۔ جس وقت میں پنڈت شری دھر کی لاش بے جان لیے ہوئے کنارے پر آئی ہزاروں زبانوں سے نعرۂ تحسین بلند ہوا اور کتنے ہی آدمیوں نے میرے قدموں کی خاک پیشانی پر لگائی۔ ابھی لوگ سری دھر کو ہوش میں لانے کی تدبیریں کر ہی رہے تھے کہ ودیا دھری میرے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ ہونٹ سوکھے ہوئے اور آنکھوں سے آنسو کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ وہ زور زور سے ہانپ رہی تھی۔ دوڑ کر میرے پیروں سے چمٹ گئی۔ تب ہم دونوں کی نگاہیں ملیں مگر دل کھول کر نہیں' آزادی سے نہیں۔ ایک کی فخر سے بھری ہوئی' دوسرے کی ندامت سے جھکی ہوئی۔ ودیا دھری کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ صرف اتنا بولی' بہن! ایشور تم کو اس کارِ خیر کا صلہ دے۔

(4)

اے مسافر! یہ دعا ودیا دھری کے تہ دل سے نکلی تھی۔ میں اس کی زبان سے یہ دعا سن کر پھولی نہ سمائی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب کی جب میں اپنے مکان پر پہنچوں گی تو میرا پیارا' دلیر شوہر مسکراتا ہوا مجھ سے ہم آغوش ہونے کے لیے دروازہ پر آئے گا۔ اس خیال سے میرے دل میں ایک مسرت خیز گدگدی ہونے لگی۔ میں نے فوراً اسباب سفر درست کیا اور وطن کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ شوقِ دیدار میرے قدم بڑھائے جاتا تھا۔ میں دن کو بھی چلتی اور رات کو بھی چلتی مگر تھکن ذرا بھی محسوس نہ ہوتی۔ یہ امید کہ وہ موہنی مورت دروازہ پر میرا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑی ہوگی' میرے پیروں میں پر سا لگائے ہوئے تھی۔ ایک مہینہ کی منزل میں نے ایک ہفتہ میں طے کی۔ مگر افسوس! جس وقت مکان کے سامنے پہنچی تو اس حسرت کدہ کو دیکھ دل بیٹھ گیا اور ہمت نہ پڑی کہ اندر قدم رکھوں۔ میں چوکھٹ پر بیٹھ کر بہت روئی۔ نہ کسی نوکر کا پتہ تھا' نہ کہیں مویشی نظر آتے تھے۔ دروازہ پر خاک اڑ رہی تھی۔ بارے کلیجہ پر پتھر کی سِل رکھ کر میں اندر گئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میرا پیارا شیر صحن میں موٹی موٹی زنجیروں سے بندھا ہوا ہے اور لاغری سے اس کے کولہوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ در و دیوار پر ویرانی کی دلخراش تصویر کھینچی ہوئی نظر آتی تھی۔ میں دوڑ کر شیر سنگھ کے گلے سے لپٹ گئی۔ مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے نوکروں نے نرد دغا کھیلی۔ اثاث البیت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بیش قیمت ظروف' فرش فروش' آلات نادرہ سب غائب تھے۔ اس خانہ بربادی نے مصیبت کا پیالہ لبریز کر دیا۔ ہائے! ظالم میرے زیوروں کا صندوقچہ بھی اٹھا لے گئے۔ غالباً پہلے انہوں نے شیر سنگھ کو جکڑ کر باندھ دیا ہوگا۔ بعد ازاں خوب دل کھول کر لوٹ کھسوٹ شروع کی ہوگی۔ کیا تقدیر کی خوبی تھی کہ دھرم

لوٹنے گئی تھی اور گھر لٹا بیٹھی۔ افلاس نے زندگی میں پہلی بار اپنی مکروہ صورت دکھائی۔

اے مسافر! اس خانہ ویرانی کے بعد وہ جگہ آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہم نے عیش و تنعم کی بہاریں لوٹی تھیں۔ انہیں کیاریوں میں ہم نے غزالوں کی طرح کلیلیں کی تھیں۔ انہیں کنجوں میں ہماری شراب محبت کے دور چلے تھے۔ یہ نظارے دل میں حسرتوں کا ایک ہجوم سا برپا کر دیتے تھے۔ وہ یادگاریں آنکھوں میں خون کے آنسو بھر دیتی تھیں۔ یہ شب و روز کی جلن مجھ سے نہ برداشت ہو سکی۔ بہار کا موسم تھا۔ بُور کی مہک سے ہوا معطر ہو رہی تھی۔ مہوے کے نیچے موتیوں کا فرش بچھا ہوا تھا اور ڈھاک کسی شاہدِ رعنا کی طرح گلنار کا جوڑا زیبِ بَر کیے اپنے شاندار حسن کی بہار دکھا رہا تھا۔ میں نے اپنے وطن کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا۔ میری آنکھوں میں اس وقت اشک کا ایک قطرہ بھی نہ آیا۔ جس وطن کی بہار زندگی لمحہ بھر پہلو میں خار کی طرح کھٹکا کرتی ہے' اس وطن سے میں نے یوں منہ موڑ لیا جیسے رہا شدہ قیدی جیل خانہ سے۔ اور ہفتہ بھر کی بادیہ پیمائی کے بعد میں شیر سنگھ کے ساتھ سرینگر کے شمال میں آ پہنچی۔ اور دریائے اندس کے کنارے ایک سنسان جگہ میں زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ اس مقام پر ایک پرانا مندر تھا۔ بہت وسیع اور پائیدار شاید کسی زمانہ میں وہاں دیوتاؤں کا باس رہا ہو۔ اس وقت بالکل ویران تھا۔ دیوتاؤں کی موت سے نجات ہے مگر زمانہ کی خانہ براندازیوں سے نہیں۔ اس کنج عزلت میں آرام سے رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ اس جگہ سے محبت ہو گئی اور وہ پرانا مندر مسافرانِ رہ نورد کے واسطے دھرم شالہ کا کام دینے لگا۔

مجھے یہاں رہتے تین سال گزرے تھے۔ برسات کا دن تھا۔ شام ہو گئی تھی۔ کالی کالی ڈراؤنی گھٹائیں کالے دیووں کی طرح بامِ فلک پر مستِ خرام تھیں۔ مندر سے قریباً دو سو گز کے فاصلہ پر ایک خوبصورت تالاب تھا۔ اس کے کنارے سایہ دار درختوں کے جھرمٹ کھڑے تھے۔ مجھے اس جھرمٹ سے ایک شخص گھوڑے پر سوار نکلتا دکھائی دیا۔ اس کے پیچھے تین چار آدمی اور تھے۔ یہ لوگ قدم بڑھاتے۔ آپس میں شانے ملائے اور چوکنی نگاہوں سے ادھر ادھر تاکتے چلے آتے تھے۔ تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ دفعتاً اسی جھرمٹ سے دس بارہ آدمی بندوقیں لیے ہوئے نکل پڑے اور اس سوار کو گھیر لیا۔ ہمراہی بھاگ نکلے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کو میں نے تلوار سونت کر ڈاکوؤں پر وار کرتے دیکھا مگر وہ تنہا کیا کر سکتا تھا۔ ڈاکوؤں نے اسے مار گرایا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھندلی تصویریں نظروں سے غائب ہو گئیں۔

اے مسافر! یہ نظارہ میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکی۔ اسے دیکھ کر موثر نہ ہو جانا میرے خیال میں دائرۂ بشریت سے خارج ہو جاتا ہے۔ میں فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک نیچہ ہاتھ میں لیا اور ایشور کا نام لے کر تالاب کی طرف چلی۔ اب خوب موسلا دھار مینہ برسنے لگا تھا۔ گویا آج برس کر پھر کبھی برسے گا ہی نہیں۔ رہ رہ کر رعد کی ایسی دہشت ناک صدا بلند ہوتی تھی گویا سارے پہاڑ آپس میں ٹکرا گئے ہیں۔ بجلی کی چمک ایسی تیز تھی جیسے دنیا کی ساری روشنی سمٹ کر یکجا ہو گئی ہو۔ تاریکی کا یہ حال گویا ہزاروں اماوس کی راتیں آملی ہوں۔ میں کمر تک پانی میں ہلتی' کلیجہ مضبوط کیے آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اس تالاب کے کنارے آ پہنچی۔ وہاں ایک غار میں سے کچھ روشنی آتی ہوئی دکھائی دی۔ میں نے نزدیک جا کر اندر جھانکا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک بڑا الاؤ جل رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف کئی آدمی کھڑے ہیں اور الاؤ سے کئی قدم کے فاصلہ پر ایک عورت غضبناک نگاہوں سے گھور گھور کر بلند آواز میں کہہ رہی ہے۔ "میں اپنے پتی کے ساتھ اسے بھی جلا کر راکھ کر دوں گی۔" یہ نظارہ دیکھ کر میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میں نے سانس بند کر لی اور غور سے یہ کیفیت دیکھنے لگی۔ اس عورت کے سامنے ایک خاک و خون میں لپٹی ہوئی

لاش پڑی تھی اور لاش کے پاس ہی ایک شخص رسیوں سے بندھا ہوا سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں قیافہ سے تاڑ گئی کہ یہ وہی شخص ہے جس پر ان ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا۔ یہ لاش ڈاکو سردار کی ہے اور یہ عورت اس کی بیوی ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں سے انگارے نکل رہے تھے۔ ہمارے مصوروں نے غصہ کی خیالی تصویر مرد بنائی ہے۔ میرے خیال میں عورت کا غصہ اس سے زیادہ مہلک' اس سے زیادہ شرربار ہوتا ہے۔ عالم غضب میں عورت بپھری ہوئی شیرنی ہو جاتی ہے۔ عورتوں کا جذبہ انتقام ایک جہان سوز شعلہ ہوتا ہے۔ وہ نزاکت کی پتلی' وہ حسن کی دیوی' وہ حلم کی تصویر' غصہ کے عالم میں ایک تند خو دیونی ہو جاتی ہے۔ یہ عورت ہی ہے جو انتقام کو ایک پاک فرض خیال کرتی ہے۔ انتقام کا برت دھارن کرنا عورت ہی کا کام ہے۔

اس عورت نے پھر دانت پیس کر کہا۔ "میں اپنے پتی کے ساتھ اسے بھی جلا کر راکھ کر دوں گی۔ اس کی ساری دولت میرے کلیجہ کی آگ کو نہیں بجھا سکتی۔" یہ کہہ کر اس نے اس دست و پابستہ شخص کو پکڑ کر گھسیٹا اور دہکتی ہوئی چتا میں ڈال دیا۔ آہ! کیسا ہولناک نظارہ تھا۔ عورت انتقام کی آگ بجھانے میں اس حد تک بے رحم ہو سکتی ہے۔ میرے خون میں جوش آ گیا۔ میں نے نیچہ کھینچ لیا۔ ایشور کا نام لے کر الاؤ کی طرف جھپٹی۔ ڈاکو چونک کر تتر بتر ہو گئے۔ میں بے محابہ چتا میں گھس گئی اور دم زدن میں اس بدقسمت شخص کو دہن آتش سے نکال لائی۔ آگ صرف اس کے کپڑوں کو جلا سکی تھی۔ جس طرح سانپ اپنے شکار کے چھن جانے سے جھنجلا کر لپکتا ہے' اسی طرح آگ کے شعلے گرجتے ہوئے میرے پیچھے دوڑے مگر میں اس کی زد سے دور نکل آئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ آگ بھی اس کے خون کی پیاسی ہو رہی ہے۔

اسی اثناء میں ڈاکو سنبھل گئے اور مقتول سردار کی بیوی دیونی کی طرح منہ کھولے ہوئے میری طرف بڑھی۔ قریب تھا کہ یہ لوگ میرے تکے بوٹی کر دیں گے کہ اتنے میں غار کے دروازہ پر رعد کی سی گرج سنائی دی اور شیر سنگھ غضبناک آنکھوں سے تاکتے ہوئے داخل ہوئے۔ جس طرح مرلی دھر نے بھری سبھا میں دروپدی کی لاج رکھ لی تھی' اسی طرح اس وقت شیر سنگھ نے میری جان بچائی۔ ان کی صورت دیکھتے ہی ڈاکو اپنی اپنی جانیں لے کر بھاگے۔ صرف ڈاکو سردار کی بیوی قالب بے جان کی طرح اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ یکایک اس نے اپنے شوہر کی لاش اٹھائی اور اسے لے کر آگ کی گود میں بیٹھ گئی۔ میں نے چاہا کہ اسے بچا لوں مگر ست کی آگ کو کون روک سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ قہر و غضب کی تصویر آگ کے منہ میں سما گئی۔ اب میں نے اس بندھے ہوئے آدمی کی طرف غور سے دیکھا تو میرا دل بلیوں اچھل پڑا۔ یہ شری دھر پنڈت تھے۔ وہی شکل' وہی لباس' وہی پُر استقلال بشرہ۔ مجھے دیکھتے ہی سر جھکا لیا اور رونے لگے۔ میں ان کے حالات پوچھ رہی تھی کہ اسی غار کے ایک گوشہ سے ایک جوان سپاہیانہ لباس پہنے ہوئے نکل آیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ یہ ودیادھری تھی۔ مردانہ لباس اس پر خوب سجتا تھا۔ ہماری نگاہیں ملیں۔ ودیادھری کے زرد مرجھائے ہوئے چہرہ پر ندامت کی سرخی دکھائی دی۔ وہ زبان سے کچھ نہ بول سکی مگر اس کے آنکھوں نے جذبات کا ایک دفتر بیان کر دیا۔

(5)

اے مسافر! اس دیار میں اب میرا رہنا دشوار ہو گیا۔ ڈاکو بندوقیں لیے شیر سنگھ کی تلاش میں گھومنے

لگے۔ ایک روز میں وہاں سے چل کھڑی ہوئی اور کوہ بیاباں کی سیر کرتے اس جگہ آ نکلی۔ یہ مقام مجھے ایسا پسند آیا کہ میں نے اس غار میں بود و باش اختیار کر لی۔ آج پورے تین سال گزرے۔ جب میں نے اس ساحل پر قدم رکھا۔ اس وقت بھی یہی موسم تھا۔ ایسا ہی طرب خیز۔ میں گیان ساگر میں پانی بھرنے گئی ہوئی تھی۔ یکایک کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نوجوان مشکی گھوڑے پر سوار ہاتھ میں چمکتا ہوا نیزہ لیے چلا آتا ہے۔ شیر سنگھ کو دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور نیزہ سنبھال کر ان پر وار کر بیٹھا۔ تب شیر سنگھ کو بھی غصہ آیا اور اس زور شور سے گرجے کہ گیان ساگر کی مچھلیاں گھبرا کر اوپر نکل آئیں اور اس نوجوان کو گھوڑے سے کھینچ کر اس کے سینہ پر قدم رکھ دیا۔ یہ سب باتیں چشم زدن ہو گئیں۔ میں گھڑا چھوڑ کر دوڑی اور قبل اس کے کہ شیر سنگھ اس کا کام تمام کر دیں۔ میں ان کے روبرو دست بستہ کھڑی ہو گئی۔ نوجوان کے سینہ میں زخم کاری لگا تھا۔ اسے میں نے اس غار میں لا کر رکھا اور اس کے معالجے میں مصروف ہوئی۔ اس کا زخم دھوتی اور باندھتی۔ ایک روز میں چند ضروری چیزیں خریدنے کے لیے اس قصبہ میں گئی جہاں کا سواد یہاں سے دکھائی دے رہا ہے مگر سب دکانیں بند تھیں اور بازاروں میں خاک اڑ رہی تھی۔ در و دیوار پر ماتم چھایا ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک ادھر ادھر حیرت میں ڈوبی ہوئی گھومتی رہی۔ کسی انسان کی صورت بھی نہ دکھائی دیتی تھی کہ اس سے وہاں کی کچھ کیفیت پوچھوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا شہر خموشاں میں آ گئی ہوں۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب واپس چلوں کہ گھوڑوں کے ٹاپ کی آواز کان میں آئی اور ذرا دیر میں ایک عورت سر سے پیر تک سیاہ لباس پہنے ایک سیاہ فام گھوڑے پر سوار ہاتھ میں نیزہ لیے آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کے پیچھے کئی سوار اور پیادے سیاہ وردیاں پہنے آ رہے تھے۔ چو طرفہ موت کی سی خموشی طاری تھی اور اس سناٹے میں یہ ماتمی جلوس خوفناک معلوم ہوتا تھا۔ دفعتاً اس سوار عورت کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور میرے قریب آ کر تند لہجہ میں بولی۔ "تو کون ہے؟" میں نے بے خوفی سے جواب دیا۔ "میں مسافر ہوں۔ یہاں بازار میں چیزیں خریدنے آیا تھا مگر شہر میں کسی انسان کا پتہ نہیں۔"

سوار عورت نے پیچھے کی طرف دیکھ کر کچھ اشارہ کیا اور دو سواروں نے آگے بڑھ کر مجھے گرفتار کر لیا اور کشاں کشاں لے چلے۔ وہاں ہر شخص کے لبوں پر مہر سی لگی ہوئی تھی۔ اس لیے مجھے منہ کھولنے کی جرات نہ ہوئی۔ ہاں قیافہ سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ عورت یہاں کی رانی ہے۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی کہ میں کس جرم میں گرفتار کی گئی ہوں اور مجھے کیا سزا دی جائے گی۔ نہیں معلوم یہاں کب تک رکنا پڑے گا۔ شیر سنگھ گھبرا رہے ہوں گے۔ ان کے کھانے کا وقت آ پہنچا ہے۔ کون کھانا کھلائے گا۔ کیا عذاب میں جان مبتلائی ہوئی۔ نہیں معلوم قسمت میں کیا لکھا ہے۔ مجھ ابھاگن کو اس حالت میں بھی چین نہیں۔ انہی پریشان خیالات میں محو میں سواروں کے ساتھ آدھ گھنٹہ تک چلتی رہی کہ ایک بندوق کی گھن گرج صدا نے مجھے چونکا دیا۔ آنکھ اٹھا کر دیکھتی ہوں تو سامنے ایک رفیع پہاڑی پر شاہی محلات بنے ہوئے ہیں اور اوپر چڑھنے کے لیے پتھر تراش کر چوڑے زینے بنائے گئے ہیں۔ یہ ماتمی جلوس اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں مجھے صدہا درویش دکھائی دیئے مگر سب کے سب سیاہ پوش تھے۔ میں جس کمرہ میں لا کر رکھی گئی، وہ شاہی محل سے بالکل ملحق تھا۔ فرش سفید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا اور بجز ایک کش آسن کے وہاں اور کوئی سامان آرائش نظر نہ آتا تھا۔ میں زمین پر بیٹھ کر اپنی بد قسمتی کو کوسنے لگی۔ تھوڑی دیر میں رانی صاحبہ جلوہ افروز ہوئیں۔ ان کے جسم پر ایک سیاہ ریشمی ساڑی زیب دے رہی تھی اور اگرچہ سن پچاس سال سے زاید تھا مگر چہرہ پر ایک نور برس رہا تھا۔ وہ کُش آسن پر بیٹھ گئی۔ میں نے تعظیماً اٹھ کر ان کے قدم چومے اور دست بستہ کھڑی ہو گئی۔

(6)

اے مسافر! رانی صاحبہ کا طرز کلام نہایت دلفریب تھا۔ پہلے ان کے تیور دیکھ کر میں خائف تھی مگر جس طرح صندل سی سخت چیز میں دلآویز مہک چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی تندی اور سخت کلامی کے پردہ میں موم کا دل پوشیدہ تھا۔ ان کا نوجوان راجکمار جو ساری قوم کی امید اور سارے دیش کا مایہ ناز تھا' عین عالم شباب میں داغ دے گیا تھا۔ اسی کے ماتم میں سب آدمی سیہ پوش اور سارا شہر ویران تھا۔ شاہی حکم ہو گیا تھا کہ جس گھر سے نغمہ کی آواز آئے' اس گھر کو مسمار کر دو اور جس گلشن میں پھول نظر آئے' اسے جلا کر خاک سیاہ کر دو۔ میری گرفتاری کا باعث یہ تھا کہ میں نے ماتمی لباس کیوں نہ پہنا تھا۔ رانی صاحبہ باتیں کرتے کرتے پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔ ان کے آنسو دیکھ کر میری آنکھیں بھی امڈ آئیں۔ درد کی داستان چوٹ کھائے ہوئے دلوں پر سرود مستان کا کام کرتی ہے۔ ہم دونوں بیٹھی رو رہی تھیں کہ یکایک رانی صاحبہ اٹھ کر کھڑی ہو گئیں' اور حیرت سے بولیں۔ "کیا تو عورت ہے۔"

میں۔ "ہاں۔"

رانی۔ "گیان ساگر پر رہتی ہے؟"

میں۔ "ہاں۔"

رانی۔ "کتنے دن سے؟"

میں۔ "دو ہفتہ سے۔"

رانی۔ "تو نے میرے راجکمار کو دیکھا ہے؟"

میں۔ "ہاں دیکھا ہے۔"

رانی۔ "کب؟"

میں۔ "جس دن وہ شیر کا شکار کھیلنے گئے تھے اور شیر نے ان پر چوٹ کی تھی۔"

رانی (آبدیدہ ہو کر)۔ تو ان کی لاش کا پتہ لگا سکتی ہے۔ میں نے اعلان کر دیا ہے کہ جو ان کی لاش کا پتہ لگائے گا' میں اسے اپنا آدھا راج پاٹ دے دوں گی۔"

میں۔ "میں لگا دوں گی۔"

رانی۔ "لاش کا؟"

میں۔ "نہیں راجکمار کا۔"

رانی۔ "میرا رندھیر زندہ ہے؟"

میں۔ "ہاں۔"

رانی میرے پیروں پر گر پڑی۔ تیسرے دن ارجن نگر کا اور ہی عالم تھا۔ ہوا نغمہ کی صداؤں سے گونجتی تھی اور مسرت در و دیوار کی بلائیں لیتی تھی۔ دکانوں نے پھولوں کا ہار پہنا تھا۔ بازاروں میں جشن کی محفلیں آراستہ تھیں۔ ماتمی نیلگوں لباس کی بجائے زعفران کی سہانی شوخی مبارکبادی سناتی پھرتی تھی۔ ادھر آفتاب پردۂ مشرق سے نمودار ہوا اور شہر پناہ کی فصیلوں سے سلامیاں دغنی شروع ہوئیں۔ آگے آگے میں ایک سبزہ گھوڑے پر سوار آ رہی اور پیچھے راجکمار کا ہاتھی زر و جواہر سے سجا ہوا جھومتا چلا آتا تھا۔ عورتیں بالاخانوں سے مبارکباد گاتی تھیں اور

پھول نثار کرتی تھیں۔ شاہی محل کے دروازہ پر رانی آنچل ہیرے جواہرات سے بھری کھڑی تھیں۔ راجکمار کو دیکھتے ہی وہ اسے گود میں لینے کے لیے دوڑیں اور سینہ سے چمٹالیا۔ مگر افسوس! یہ مادرانہ محبت کا آخری نظارہ تھا۔ اپنے لخت جگر کو پاکر وہ مسرت کے اس انتہائی درجہ پر پہنچ گئی جسے شادی مرگ کہتے ہیں۔ ماتا محبت کا سب سے پاک سب سے بے غرض اور سب سے رفیع درجہ ہے۔ عاشقانہ الفت بشریت سے آلودہ ہوتی ہے اور مادرانہ محبت روحانیت سے لبریز۔ عاشقہ الفت ایک دنیاوی جنس ہے مگر مادرانہ محبت بہشتی نعمت ہے۔

(7)

اے مسافر! رانی صاحبہ نے مجھے آدھاراج پاٹ سونپ دیا تھا۔ راج کمار نے طیب خاطر سے ایفائے وعدہ کیا۔ اگرچہ ظاہری جاہ و جلال کی مجھے خواہش نہ تھی اور دل میں سیم وزر کی ہوس نہ باقی رہی تھی۔ مدت ہوئی کہ یہ آرزوئیں گورِ حسرت میں دفن ہو چکی تھیں مگر صرف اس خیال سے کہ شاید دولت مجھے اپنے ابنائے جنس کی خدمت کرنے کی توفیق دے' میں نے ایک فرمانروا کی ذمہ داریاں اپنے سر لیں۔ تب سے دو سال گزر گئے ہیں مگر عیش و آرام کا خیال بھی میرے دل میں نہیں آیا۔ میں کبھی پلنگ پر نہیں سوئی۔ میرے کانوں نے کبھی نغمہ کا لطف نہیں اٹھایا۔ میں نے نان خشک کے سوا کوئی چیز نہیں کھائی۔ پتی بیوگ کی حالت میں عورت تپسونی ہو جاتی ہے۔ عیش و آرام کا خیال بھی اس کے دل میں نہیں آتا۔ ہم بھارت کی عورتیں گاندھاری کی بیٹیاں ہیں جس کا پتی برت دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ بھارت کی خاک سے سیتا اور ساوتری پیدا ہوئیں۔ ستی اور دمینتی جیسی دیویاں اس گود میں کھیلیں مگر گاندھاری ان سب سے بالاتر ہے۔ اس کی پتی برتا لاثانی اور لافانی ہے۔ اس دیوی نے دنیا کی دلفریبیوں پر کبھی نگاہ نہیں ڈالی۔ صرف اس لیے کہ اس کے پتی کو قدرت نے نگاہ ظاہر نہ عطا کی تھی۔ اس کی پتی برتا اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ سیتا اور ساوتری اس خاک سے ہمیشہ اٹھتی رہیں گی مگر گاندھاری صرف ایک ہے اور ایک رہے گی۔ میرے قبضے میں عالیشان عمارتیں اور پرفضا باغیچے' مرصع غالیچے اور آلات نادرہ سب ہیں مگر عمارتیں سونی پڑی ہوئی ہیں اور باغیچوں میں خزاں کا دور ہے۔ میں نے ان کی طرف کبھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اپنے پران ادھار کے قدموں سے لپٹے ہوئے مجھے دنیا کی کسی اور چیز کی خواہش نہیں ہے۔ میں روز صبح کے وقت ارجن نگر جاتی ہوں اور ریاست کے ضروری فرائض انجام دے کر واپس آجاتی ہوں۔ عمال اور ملازمین کو میری تنہائی میں مخل ہونے کی سخت ممانعت ہے۔ ریاست کی کل آمدنی کارخیر میں صرف ہوتی ہے۔ میں اس کی ایک کوڑی بھی اپنے تصرف میں نہیں لاتی۔ آپ کو فرصت ہو تو آپ میری ریاست کا انتظام دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ میں نے اس دو سال میں بیس بڑے بڑے تالاب بندھوا دیئے ہیں اور چالیس گئو شالے کھلوا دیئے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ اپنی ریاست کو نہروں سے سجادوں جیسے جسم رگوں سے۔ میں نے ڈیڑھ سو وید مقرر کر دیئے ہیں جن کا فرض ہے کہ وہ گاؤں میں گھوم کر بیماروں کا علاج کریں۔ میرا کوئی ایسا موضع نہیں ہے جہاں میری طرف سے صفائی کا انتظام نہ ہو۔ چھوٹے چھوٹے مواضعات میں بھی آپ روشنی کا انتظام پائیں گے۔ دن کی روشنی ایشور مہیا کرتا ہے۔ رات کی روشنی کرنا ہر فرمانروائے قوم کا فرض ہے۔ میں نے ریاست کا کل انتظام پنڈت شری دھر پر چھوڑ دیا ہے۔ میں نے سب سے پہلا کام جو کیا ہے' وہ یہ تھا کہ انہیں ڈھونڈ نکالوں اور یہ خدمت ان کے سپرد کر دوں۔ اس خیال سے نہیں کہ مجھے ان کی

خاطر داری منظور تھی بلکہ میری نگاہ میں کوئی دوسرا شخص ایسا معتمد' ایسا فرائض کا پابند' ایسا نیتوں کا صاف' ایسا حمیدہ اخلاق نہیں تھا۔ مجھے اطمینان کامل ہے کہ وہ ان فرائض کو تادم مرگ حسن و خوبی سے انجام دیتے رہیں گے۔ ودیادھری بھی ان کے ساتھ ہے۔ وہ وہی حلم اور قناعت کی تصویر' وہی نیکی اور پاکیزگی کی دیوی ہے۔ اس کا پتی برت اب بھی اس گیان ساگر کی طرح اتھاہ اور اپار ہے۔ اس کے حسن میں اب وہ جادو نہیں رہا۔ نہ اداؤں میں دلفریبی اور نزاکت باقی ہے۔ ایک کملائے ہوئے پھول کی طرح اس کا چہرہ مرجھا گیا ہے اور فکر نے چہرہ پر شکن ڈال دیئے ہیں مگر اب بھی وہ رنواس کی رانی معلوم ہوتی ہے اور اس کے خدوخال میں وہی دلفریبی ہے۔ اس کی سادگی اب بھی ہزار سجاوٹوں کو مات کرتی ہے۔ ہم دونوں کبھی کبھی مل جاتی ہیں مگر بات چیت کی نوبت نہیں آتی۔ اس کی آنکھیں میرے سامنے نہیں اٹھتیں۔ اس پر مجھے دیکھتے ہی گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے اور اس کی پیشانی پر عرقِ خجالت کے قطرے نظر آنے لگتے ہیں۔ میں آپ سے بصدق دل کہتی ہوں کہ مجھے ودیادھری سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ اس کی عظمت اور محبت میرے دل میں روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ میں اسے دیکھتی ہوں تو میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے قدم چوم لوں۔ پتی برتا عورت کا درشن ایک برکت ہے مگر صرف اس خیال سے کہ شاید وہ اسے خوشامد سمجھے' رک جاتی ہوں۔ اب میری ایشور سے یہی دعا ہے کہ اپنے پتی کے چرنوں سے لگی رہوں اور ان کی خدمت کرنے کی شردھا دن بہ دن زیادہ ہوتی جائے اور جب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئے تو میری پیشانی ان کے قدموں پر ہو اور آخری لفظ جو میرے منہ سے نکلے' وہ یہ ہو کہ ایشور تو دوسرے جنم میں بھی مجھے ان کی کنیز بنانا۔

(8)

ناظرین! حسینہ کی سرگزشت نے میرے دل پر جو اثر کیا' وہ میرے حیطۂ بیان سے باہر ہے۔ افسوس ہے جس آب و گل سے ایسی عورتیں پیدا ہوں' اسے میرے اہل قوم انگشت نما کریں۔ میں یورپ کی ہزار عورتوں کو اس ایک دیوی پر قربان کر سکتا ہوں۔ ہم نے میاں بیوی کے رشتہ کو ایک مادی تعلق سمجھ رکھا ہے۔ اس کے روحانی پہلو سے ہمارے خیال کوسوں دور ہیں۔ یہی باعث ہے کہ ہمارے ملک میں باوجود صدیوں کی تہذیب کے عصمت اور نسوانی پاکیزگی کی ایسی رفیع اور بے لوث مثالیں نہیں نظر آتیں۔ اور بدقسمتی سے ہماری معاشرت نے کچھ ایسی روش اختیار کی ہے کہ شاید دور از خیال مستقبل میں بھی عفت کے یہ انسانی معجزے نظر نہ آئیں۔ بے شک عصمت ایک زبردست روحانی طاقت ہے اور جس شخص کو عصمت کے حیرت انگیز جلوے دیکھنا ہوں' وہ ہندوستان کی مقدس سرزمین میں آکر دیکھ سکتا ہے۔ جرمنی کو اگر اپنی فوج پر' فرانس کو اگر اپنی تہذیب پر' انگلستان کو اگر اپنی تجارت پر ناز ہے تو ہندوستان کو اپنی عصمت پر غرور ہے۔ کیا یہ اہل یورپ کے لیے شرم کی بات نہیں ہے کہ ہومر اور ورجل' ڈینٹی اور گیٹی' شیکسپیئر اور ہیوگو جیسے جیسے جادو نگار ایک بھی سیتا اور ساوتری نہ پیدا کر سکیں۔ حق یہ ہے کہ عصمت کا یہ معیار یورپین سوسائٹی میں مفقود ہے۔

میں نے دوسرے دن گیان ساگر کو بادل ناخواستہ خیر باد کہا اور یورپ کو روانہ ہوا۔ میری واپسی کی خبریں پہلے ہی مشہور ہو چکی تھیں۔ ہیمبرگ کے بندرگاہ میں جس وقت میرا جہاز پہنچا' ہزاروں آدمی' صدہا علما و فضلاء میرے استقبال کو کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خیر مقدم و مبارکباد کے پرجوش نعرے بلند ہوئے اور وہاں سے میرے

مکان تک جس تزک و احتشام سے میرا جلوس نکلا' اس پر ایک تاجدار قوم ناز کر سکتا ہے۔ شام کو مجھے شہنشاہ قیصر نے دعوت کا اعزاز بخشا اور وہاں ملک کے علماء نے میری دھواں دار تعریفیں کیں اور کئی مہینوں تک مجھے اخباروں' کلب گھروں اور یونیورسٹی کے فرمائشات سے دم لینے کی فرصت نہ ملی۔ میرا سفر نامہ صدہا اخبارات میں شائع ہوا۔ دیگر ممالک سے بھی مبارکباد کے پیغام آئے اور فرانس' انگلینڈ' روس وغیرہ کے ملکوں کے کتنے ہی انجمنوں نے مجھے اپنے تجربات پر تقریر کرنے کی دعوتیں دیں۔ مجھے ایک ایک تقریر کے لیے کئی کئی ہزار پونڈ کے وعدے کیے جاتے تھے۔ علماء کی انجمن' یونیورسٹی کے سنڈیکیٹ نے مجھے اعزازی خطابات دیئے۔ روس کے شہنشاہ نے اپنا آٹوگراف بھیج کر ذرہ نوازی کی۔ شاہ اسپین نے ایک ہوائی جہاز عنایت فرمایا۔ مگر ان مصروفیتوں میں بھی مجھے ہمالیہ کی یاد آتی تھی اور گیان ساگر کا خوشنما ساحل اور وہ غار اور وہ شیریں کلام نازنین ہمیشہ پیش نظر رہتے تھے۔ اس کی دلسوز آواز کانوں میں گونجا کرتی تھی۔ میں تھیٹروں میں جاتا اور اسپین اور جیار جیا کے باغ حسن کی سیر کرتا۔ میں کلب اور رقص و سرود کی مجلسوں میں شریک ہوتا اور یورپی حسن و نزاکت اور یورپی ناز و انداز کے کرشمے دیکھتا مگر ہمالیہ کی اپسرا میرے دھیان سے نہ اترتی۔ اس کی ملیح اور دلکش تصویر میرے دل و دماغ پر کھنچی ہوئی تھی۔ اکثر تخیل میں مجھے وہ عفت کی تصویر آسمان سے اترتی ہوئی نظر آتی۔ طبیعت اچاٹ ہو جاتی اور جی چاہتا کہ کسی طرح گیان ساگر کے لب کنار پہنچوں اور اس نازنین کی دلکش باتیں سنوں۔ دنوں کے ساتھ یہ خواہش بڑھتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے اضطراب کا درجہ اختیار کر لیا۔ آخر ایک روز میں نے اسباب سفر درست کیا اور جہاز پر بیٹھ کر بمبئی کو روانہ ہوا اور اس تاریخ کے عین ایک ہزار دنوں کے بعد جبکہ میں نے پہلی بار گیان ساگر کے ساحل پر قدم رکھا تھا' میں پھر وہاں جا پہنچا۔

صبح کا وقت تھا۔ ہمانچل سر پر سنہرا تاج پہنے کھڑا تھا۔ باد نسیم کے طرب خیز جھونکے آ رہے تھے اور گیان ساگر کے شفاف پانی میں ہلکا ہلکا تلاطم ہو رہا تھا۔ کنول کے پھول آفتاب کی شعاعوں سے منعکس ہو کر اس طرح جھکولے لیتے تھے جیسے کسی رشی کا دل معرفت کے رموز سے سرشار ہو کر جھوم رہا ہو۔ پھولوں کے بیچ میں خوش رنگ مرغابیاں تیر رہی ہوں۔ جیسے کسی عفت مآب نازنین کا دل کام کے نظر فریب جال کو حقارت سے چیرتا ہوا چلا جائے۔ میں نے مشتاق آنکھوں سے اس غار کی طرف دیکھا تو وہاں شاہی محلات آسمان سے شانہ ملائے کھڑے تھے۔ ایک طرف پُر فضا باغیچہ تھا۔ دوسرے طرف ایک رفیع الشان مندر جس کے سنہرے کلس آسمان میں چھپے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ مجھے یہ کایا پلٹ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ صدر دروازہ پر جا کر دیکھا تو دو چوبدار اودے مخمل کی وردیاں پہنے زری کے صافے باندھے' ہاتھوں میں طلائی عصا لیے ہوئے کھڑے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا۔

"کیوں بھئی یہ کس کا محل ہے؟"

چوبدار۔ "ارجن نگر کی مہارانی کا۔"

میں۔ "ابھی حال ہی میں بنا ہے؟"

چوبدار۔ "ہاں...... تم کون ہو؟"

میں۔ "میں ایک پردیسی مسافر ہوں۔ کیا تم مہارانی صاحبہ سے میری اطلاع کر دو گے؟"

چوبدار۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

میں۔ "ان سے صرف یہ کہہ دینا کہ یورپ سے ایک مسافر آیا ہے اور شرف قدم بوسی چاہتا ہے۔"

چوبدار اندر چلا گیا اور ایک لمحہ کے بعد باہر آ کر بولا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" میں اس کے ساتھ ہو لیا اور

دہلیز طے کرنے کے بعد ایک وسیع بارہ دری میں داخل ہوا جو خالص سنگ مرمر کی بنی ہوئی تھی۔ میں نے ایسی پُر فن گلکاری بجز تاج محل کے اور کہیں نہیں دیکھی۔ فرش کی پچی کاری واقعی حیرت انگیز تھی۔ دیواروں پر استادانِ کامل فن کی تصویریں زیب دے رہی تھیں اور سجاوٹ میں معشوقانہ نفاست سے کام لیا گیا تھا۔ صندل اور گلاب کی خوشبو سے دماغ معطر ہوا جاتا تھا۔ میں فرش پر بیٹھ گیا کہ اتنے میں ایک کشیدہ قامت وجیہ شخص کمرہ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرہ پر شاہانہ جلال تھا اور آنکھوں سے مردانگی برس رہی تھی۔ اس کی سیاہ اور بھالے کی نوک کی طرح تنی ہوئی مونچھیں دیکھنے والے پر رعب طاری کر دیتی تھیں۔ اس کے بھونرے کی سیاہ گھونگر والے بال شانوں تک بکھرے ہوئے تھے۔ اور شاید سینہ جسم کی مناسبت سے زیادہ فراخ تھا۔ مردانہ شجاعت کی اس سے بہتر خیالی تصویر نہیں کھنچ سکتی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھے پہچانتے ہیں؟" میں مودٔبانہ طرز سے کھڑا ہو گیا۔ "مجھے جناب سے کبھی نیاز نہیں حاصل ہوا۔"

صدر کی طرف ہاتھی دانت کا ایک مرصّع تخت تھا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "میں شیر سنگھ ہوں۔" میں فرط حیرت سے مبہوت ہو گیا!

شیر سنگھ نے کہا۔ "کیا آپ خوش نہیں ہیں کہ آپ نے مجھے پستول کا نشانہ نہیں بنایا۔ میں تب حیوان تھا' اب انسان ہوں۔"

میں نے شیر سنگھ سے کہا۔ "میں آپ کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔"

شیر سنگھ۔ "میں اس مبارکباد کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

میں۔ "اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ایک سوال کروں؟"

شیر سنگھ (مسکرا کر)۔ "میں سمجھ گیا۔ پوچھئے۔"

میں۔ "ودیادھری کے اس شبہ کی کوئی بنیاد تھی؟"

شیر سنگھ نے ندامت سے سر جھکا کر ذرا دیر کے بعد جواب دیا۔ "جی ہاں تھی۔" "جس وقت میں نے اس کی کلائی پکڑی تھی' میرے بدن میں رعشہ سا آ گیا تھا۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے' اسی طرح جوش سے میرا ایک ایک عضو کانپ رہا تھا۔ میں ودیادھری کے اس احسان کو تازیست نہ بھولوں گا۔ اس کا تازیانہ بہت کارگر ہوا۔ باوجود اس کفارہ کے ندامت نے ابھی تک میرا دامن نہیں چھوڑا۔ دنیا کی کسی چیز کو قرار نہیں مگر گناہ کا داغ لافانی ہے۔ نام نیک مٹ جاتا ہے مگر داغ گناہ نہیں مٹتا۔ میرے خیال میں ایشور بھی اس داغ کو نہیں مٹا سکتا۔ کوئی تلافی' کوئی کفارہ' کوئی تعزیر اس گناہ کے داغ کو نہیں دھو سکتی۔ شفاعت اور توبہ اور کنفشن یہ سب دنیا پرست زاہدوں کی ایجادیں ہیں۔ گناہ کی آگ روح کی عظمت اور آزادی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔"

ہم لوگ انہیں باتوں میں مصروف تھے کہ اندر کا پردہ اٹھا اور رانی پریم بدا آ کر کھڑی ہو گئیں۔ گویا ماہِ چاردہ اتر آیا۔ میں نے جب اسے پہلے دیکھا تھا تو سوز جگر نے اس کے حسن کو ماند کر رکھا تھا مگر اس وقت جبکہ میں نے اسے دوبارہ دیکھا' میرے خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ قدرت کا دستِ اصلاح یہاں کچھ کمال دکھا سکتا ہے۔ میں نے تعظیم کی اور مبارکباد دی۔ حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ "مسافر! اپنے دور دراز وطن میں تو نے کبھی ہم لوگوں کی یاد بھی کی تھی؟" اگر میں مصور ہوتا تو اس کے تبسم کا کرشمہ دکھا کر اساتذہ سلف کی روحوں کو حیرت میں ڈال دیتا۔ اس کا مسکرانا ایک پاک نظارہ تھا۔ اس کے منہ سے یہ سوال سننے کے لیے میں تیار نہ تھا۔ جس بے تکلفی سے اس نے یہ سوال کیا اگر اسی

بے تکلفی سے میں اس کا جواب دیتا تو شاید شیر سنگھ کے تیور بدل جاتے۔ میں یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میری زندگی کے سب سے مبارک لمحے وہی ہیں جو گیان سرور کے لب ساحل گزرے۔ اتنا کہنے میں کوئی نقصان نہ تھا مگر شاید مجھے ان الفاظ کی سادگی اور پاکیزگی پر وہ اعتبار نہ تھا جو رانی پریم بدا کو اپنے الفاظ پر تھا۔ میں نے دبی زبان سے کہا۔ "کیا میں انسان نہیں ہوں؟" اور شیر سنگھ کے ایک مردانہ قہقہہ نے ثابت کر دیا کہ میرا جواب ایسا بہت برا نہ تھا۔

(9)

تین دن گزر گئے۔ ان تین دنوں میں مجھے خوب معلوم ہو گیا کہ مشرق کو مہمان نواز کا لقب کیوں دیتے ہیں۔ یورپ کے کسی دوسرے شخص کو شاید یہ مہماں نوازیاں وبال جان ہو جاتیں مگر مجھے ہندوستانی معاشرت کا کافی تجربہ ہے اور میں نے اس کی قدر کرنا سیکھ لیا ہے۔ ان پرجوش عظیم الشان بلکہ کسی حد تک ظالمانہ دلجوئیوں کے مقابلہ میں یورپ کی سرد اور بے جان مہماں نوازی شرمناک معلوم ہوتی ہے۔

چوتھے دن میری درخواست پر رانی پریم بدا نے اپنی بقیہ سرگزشت سنانی شروع کی۔

"اے مسافر! میں نے تجھ سے کہا تھا کہ اپنی ریاست کا نظم و نسق میں نے پنڈت شری دھر کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور جس جزرسی اور قابلیت سے انہوں نے ریاست کا کام انجام دیا ہے' وہ میری تعریف سے مستغنی ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ ایک مندر کا عالم پنڈت جس کی ساری زندگی کتابوں کی ورق گردانی میں گزری ہو' ایک ریاست کا بوجھ سنبھالے مگر راجہ بیربر کی طرح پنڈت شری دھر نے بھی ہمہ گیر طبیعت پائی تھی اور میں نے یہ بوجھ ان پر صرف امتحاناً رکھا تھا مگر تجربہ نے ثابت کر دیا کہ فطرت نے انہیں اسی کام کے لیے بنایا ہے۔ جس وقت وہ آئے' ریاست ایک خزاں رسیدہ جنگل تھی۔ اب وہ روشوں اور کیاریوں سے سجا ہوا باغ ہے۔ کوئی صیغہ ایسا نہیں جس پر پنڈت جی کے تدبر اور دقیق رسی کی مہر نہ لگی ہو۔ چند ہی مہینوں میں ہر خاص و عام ان کے اخلاق کا گرویدہ ہو گیا اور راجہ رندھیر سنگھ بھی ان پر نظر عنایت فرمانے لگے۔ پنڈت جی پہلے شہر سے باہر ایک ٹھاکر دوارہ میں رہتے تھے مگر جب راجہ صاحب سے ربط ضبط بڑھا تو طرفین کی گرم جوشیاں انہیں راج محل میں کھینچ لائیں۔ یہاں آپس میں دوستانہ مراسم اس حد تک بڑھے کہ حفظِ مراتب کی تمیز بھی باقی نہ رہی۔ راجہ صاحب پنڈت جی سے کچھ سنسکرت بھی پڑھتے تھے اور ان کے وقت کا بڑا حصہ پنڈت جی ہی کے مکان پر کٹتا تھا۔ مگر افسوس! یہ شوقِ علم یا مراسم اخلاق کی کشش نہ تھی۔ یہ وہ کشش تھی جو شاید قوتِ کشش سے بھی زیادہ پرزور ہوتی ہے۔ یہ حسن کی کشش تھی۔ اگر اس وقت مجھے ذرا بھی علم ہوتا کہ راجہ صاحب کی یہ گرم جوشیاں کچھ اور ہی پہلو لیے ہوئے ہیں تو اس دوستی کا انجام ایسا حسرت انگیز نہ ہوتا جیسا کہ بعد کو ہوا۔ راجہ صاحب کی نگاہ وِدیادھری پر اس وقت پڑی جب وہ ٹھاکر دوارے میں تھی اور یہ ساری فتنہ انگیزیاں اسی ایک نگاہ کی کرامات تھیں۔ راجہ صاحب طبعاً بہت پاک نفس اور نیک شعار آدمی ہیں مگر جس حسن نے میرے پتی جیسے فرشتہ خصال شخص کا ایمان ڈگمگا دیا وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

بھولی بھالی وِدیادھری نفس کی ان معرکہ آرائیوں سے بالکل بے خبر تھی۔ جس طرح چھلانگیں مارتا ہوا ہرن صیاد کی پھیلائی ہوئی ہری ہری گھاس کو دیکھتے ہی خوش ہو کر اس کی طرف بڑھتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ ہر ایک قدم مجھے دامِ بلا کے قریب لیے جاتا ہے' اسی طرح وِدیادھری نفس کی مکاریوں سے بے خبر غارِ معصیت کے قریب

پہنچتی جاتی تھی۔ وہ راجہ صاحب کے لیے اپنے ہاتھ سے بیڑے لگا کر بھیجتی۔ وہ ان کی پوجا کے لیے چندن رگڑتی۔ رانی صاحبہ سے بھی اس کا بہناپا ہو گیا۔ بھوجی کو ایک دم کے لیے بھی اس سے جدا ہونا شاق گزرتا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ باغیچہ کی سیر کرتیں۔ ساتھ ساتھ جھولا جھولتیں۔ ساتھ ساتھ چوپڑ کھیلتیں۔ یہ ان کا سنگار کرتی اور وہ اس کی مانگ چوٹی سنوارتی۔ گویا بھوجی نے ودیادھری کے دل میں وہ جگہ حاصل کر لی جو کسی زمانہ میں مجھے حاصل تھی۔ مگر وہ غریب کیا جانتی تھی کہ جس وقت میں باغ کی روشوں میں محو خرام ہوتی ہوں، نفس میرے تلووں کے نیچے آنکھیں بچھاتا ہے۔ جب میں جھولا جھولتی ہوں تو وہ آڑ میں بیٹھا ہوا مسرت سے جھومتا ہے۔ اس ایک غریب بھولی عورت پر نفس چاروں طرف سے گھات لگا رہا تھا۔

اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ راجہ صاحب کی شکر ریزیاں روز بروز بڑھتی جاتی تھیں۔ پنڈت جی کو ان سے وہ عقیدت ہو گئی جو کسی استاد کو اپنے ہونہار شاگرد سے ہوتی ہے۔ میں نے جب دیکھا کہ یہ صحبتیں پنڈت جی کے کام میں ہارج ہوتی ہیں تو ایک روز میں نے ان سے کہا، اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو آپ دور افتادہ مواضعات کا دورہ شروع کریں اور اس امر کی تحقیقات کریں کہ زراعتی ذخیروں کے کھولنے میں ہمیں رعایا سے کس قسم کی ہمدردی اور امداد کی امید کرنی چاہیے۔ پنڈت جی بہت خوش ہوئے اور دوسرے دن سویرے روانہ ہو گئے مگر ودیادھری ان کے ساتھ نہ گئی۔ اب تک جہاں پنڈت جاتے تھے، ودیادھری سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہتی تھی۔ آرام یا تکلیف کا خیال اس کے دل میں مطلق نہ پیدا ہوتا تھا۔ پنڈت جی کتنا ہی سمجھائیں۔ کتنا ہی خوف دلائیں، وہ ان کا ساتھ نہ چھوڑتی مگر اب کی تکلیف کے خیال نے اسے فرض کے راستہ سے ہٹا دیا۔ پہلے اس کا پتی برت وہ درخت تھا جو اس کے خیابان محبت کا رس اکیلا چکھتا تھا مگر اب اسی کیاری میں دوستانہ مراسم کی کونپلیں نکل آئی تھیں جن کی سرسبزی اور شادابی بھی اسی خوراک پر منحصر تھی۔

(10)

اے مسافر! چھ مہینے گزر گئے اور پنڈت شری دھر واپس نہ ہوئے۔ برف پہاڑوں کی چوٹیوں سے گھل گھل کر ندیوں میں بہنے لگی۔ پہاڑوں کی گود میں پھر رنگ برنگ کے پھول لہریں مارنے لگے۔ چاند کی کرنیں پھر پھولوں کی مہک سونگھنے لگیں۔ مرغابیاں اپنے سالانہ دورے ختم کر کے اپنے آشیانوں کو لوٹ آئیں مگر پنڈت جی ریاست کے کاموں میں ایسے الجھے کہ باوجود میرے متواتر تقاضوں کے ارجن نگر نہ آئے۔ یہ تعجب کی بات تھی کہ پنڈت جی ودیادھری کی طرف سے ایسے بے سدھ کیونکر ہو گئے۔ انہیں تو اس کی جدائی ایک دم کے لیے شاق گزرتی تھی مگر اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ تھی کہ بجز تحریری تقاضوں کے ودیادھری نے بھی ان کے پاس جانے کی تکلیف گوارا نہیں کی۔ وہ اکثر خطوط لکھتی۔ "سوامی جی میں بہت بے چین ہوں۔ یہاں میری طبیعت نہیں لگتی۔ کیا آپ مجھے بھول گئے۔ مجھ سے کونسی خطا ہوئی۔ کیا آپ کو مجھ پر ترس نہیں آتا۔ میں رو رو کر مری جاتی ہوں۔" اس کے خطوط ایسے ہی پرسوز الفاظ سے بھرے ہوئے تھے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو کچھ وہ لکھتی تھی، اس میں سر مو فرق نہ تھا مگر باوجود ان شکوہ آمیز خطوط اور بے چینیوں کے اسے ایک دم کے لیے بھی خیال نہ آیا کہ کیوں نہ میں ہی ان کے پاس چلی چلوں۔

بڑا سہانا موسم تھا۔ گیان ساگر میں شباب کی امنگوں کی طرح کنول کے پھول جھکولے لے رہے تھے۔ راجہ رندھیر سنگھ کی پچیسویں سالگرہ کا مبارک دن آیا۔ سارے شہر میں جشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ عورتیں کورے

کورے چراغ پانی میں بھگونے لگیں تاکہ وہ زیادہ تیل نہ جذب کر لیں۔ بوڑھی عورتیں اپنے اپنے گھر لیپنے لگیں۔ چیت کی پورن ماشی تھی مگر روشنی کی جگمگاہٹ چاند کی کرنوں کو ماند کر رہی تھی۔ میں نے راجہ صاحب کے لیے ایک مرصع تلوار منگوا رکھی تھی۔ دربار کے دوسرے امراء نے بھی انواع واقسام کے تحفے مہیا کیے تھے۔ میں نے ودیادھری کے گھر جا کر دیکھا تو وہ پھولوں کا ہار گوندرہی تھی۔ میں آدھ گھنٹہ تک اس کے سامنے کھڑی رہی مگر وہ اپنے کام میں ایسی ڈوبی ہوئی تھی کہ اسے میری آہٹ معلوم نہ ہوئی۔ تب میں نے کہا۔ ''بہن!'' ودیادھری نے چونک کر سر اٹھایا اور بڑی تیزی سے وہ ہار پھولوں کے نیچے چھپا دیا اور شرمندہ ہو کر بولی۔ ''کیا تم دیر سے کھڑی ہو؟'' میں نے جواب دیا۔ ''آدھ گھنٹہ سے زیادہ ہوا۔''

ودیادھری کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ آنکھیں جھک گئیں۔ کچھ ہچکچائی، کچھ گھبرائی اور پھر معذرت آمیز لہجہ میں بولی۔ ''یہ ہار میں نے ٹھاکر جی کے لیے گوندھا ہے۔''

اس وقت ودیادھری کی گھبراہٹ کا راز میری سمجھ میں بالکل نہ آیا۔ ٹھاکر جی کے لیے ہار گوندھنا کیا شرم کی بات ہے! ہم دونوں نے بار بار ساتھ بیٹھ کر ہار گوندھے تھے۔ پُر فن مالن بھی ہم سے اچھے ہار نہ گوندھ سکتی تھی مگر اس میں شرم کیا؟ دوسرے دن یہ راز میرے سمجھ میں آ گیا۔ وہ ہار راجہ صاحب کے لیے تحفتاً بنایا گیا تھا۔

یہ بہت خوبصورت چیز تھی۔ ودیادھری نے کمال صَرف کر دیا تھا۔ یہ شاید سب سے نادر تحفہ تھا جو وہ راجہ صاحب کو دے سکتی تھی۔ وہ برہمنی تھی۔ وہ راجہ صاحب کی گرو ماتا تھی۔ اس کی طرف سے یہ تحفہ بہت ہی موزوں تھا مگر اس نے مجھ سے یہ بات چھپائی کیوں؟

مجھے اس دن رات بھر نیند نہیں آئی۔ اس کی اس ایک حرکت نے اسے میری نظروں سے گرا دیا۔ ایک بار آنکھ جھپکی تو میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ وہ ایک خوش رنگ پھول تھی مگر باس اڑ گئی تھی۔ وہ مجھ سے گلے ملنے کو بڑھی مگر میں اس سے دور ہٹ گئی اور چیخ کر بولی۔ ''تو نے مجھ سے وہ بات چھپائی کیوں؟''

(11)

اے مسافر! راجہ رندھیر سنگھ کی فیاضیوں نے رعایا کو مالا مال کر دیا۔ روساء اور امراء نے خلعتیں پائیں۔ کسی کو گھوڑا ملا، کسی کو جاگیر عطا ہوئی۔ مجھے انہوں نے شری بھگوت گیتا کی ایک جلد، ایک مرصع غلاف میں رکھ کر دی۔ ودیادھری کو ایک بیش قیمت جڑاؤ کنگن عطا ہوا۔ اس کنگن میں انمول ہیرے جڑے ہوئے تھے۔ دہلی کے پُر فن کاریگروں نے اس پر اپنے کمال کے معجزے دکھائے تھے۔ ودیادھری کو اب تک زیوروں سے ایسی بہت الفت نہ تھی۔ اب تک سادگی اس کا زیور اور پاکیزگی اس کا سنگار تھی مگر اس کنگن پر وہ لوٹ پوٹ ہو گئی۔

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ گھٹائیں آسمان میں منڈلانے لگیں۔ پنڈت شری دھر کو گھر کی یاد آئی۔ مور کی جھنکار اور پپیہے کی ہوک نے دل کی سوتی ہوئی آگ جگائی۔ ودیادھری نے مکان خوب صاف کرا رکھا تھا۔ سارا مکان فرش فروش سے دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ اس نے بھی آج خوب بناؤ سنگار کیا تھا۔ کپڑوں سے صندل کی مہک اڑ رہی تھی۔ اس نے کنگن کو صندوقچہ سے نکالا اور سوچنے لگی کہ اسے پہنوں یا نہ پہنوں۔ اس کے دل نے فیصلہ کیا کہ اسے نہ پہنوں گی۔ اس نے صندوقچہ میں بند کر کے رکھ دیا۔ یکایک لونڈی نے آ کر خبر دی کہ پنڈت جی دروازہ پر آ گئے۔ یہ

سنتے ہی ودیادھری جھپک کر اٹھی مگر اشتیاق دیدار اسے دروازہ کی طرف نہیں لے گیا۔ اس نے بڑی پھرتی سے صندوقچہ کھولا۔ کنگن نکال کر پہنا اور اپنی صورت آئینہ میں دیکھنے لگی۔

ادھر پنڈت جی فرط شوق سے قدم بڑھاتے دہلیز سے صحن اور صحن سے زنانہ نشست گاہ میں آپہنچے اور ایک کرسی پر بیٹھ کر کپڑے اتارنے لگے کہ اتنے میں ودیادھری نے آکر ان کے قدموں پر سر جھکا دیا۔ پنڈت جی اس کا بناؤ سنگار دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ دفعتاً ان کی نگاہ اس کنگن پر پڑی۔ راجہ رندھیر سنگھ کی صحبتوں نے انہیں جواہر کا نقاد بنا دیا تھا۔ غور سے دیکھا تو ایک ایک نگینہ ایک ایک ہزار کو سستا تھا۔ متحیر ہو کر بولے۔ "کیوں پیاری یہ کنگن کہاں ملا؟"

ودیادھری نے جواب پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ بولی "سکھی پریم بدا کا تحفہ ہے۔" یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ ودیادھری نے اپنے پتی سے دغا کی۔ جب دل صاف نہیں ہوتا تو زبان سے صفائی کی بات کیونکر نکلے۔ یہ کنگن نہیں تھا' یہ ایک زہریلا ناگ تھا۔

(12)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ ودیادھری کی خوشی اور زندہ دلی رخصت ہو گئی تھی۔ یہ الفاظ کہ "یہ سکھی پریم بدا کا تحفہ ہے۔" اس کے کانوں میں ہر دم گونجا کرتے۔ وہ اپنے تئیں کوستی کہ میں نے اپنے پران ادھار سے کیوں کپٹ کی۔ وہ اکثر روتی' کاش یہ الفاظ کسی طرح واپس مل جاتے۔ ایک دن اس نے سوچا کہ کیوں نہ چل کر اپنے پتی سے ساری کیفیت بے کم و کاست بیان کر دوں۔ کیا وہ مجھے معاف نہ کریں گے! یہ سوچ کر اٹھی مگر پنڈت کے سامنے جاتے ہی اس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ اپنے کمرہ میں آکر لیٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کنگن پہن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ اسی کنگن نے اسے ہنسایا تھا اور اب وہی کنگن رُلا رہا تھا۔

ودیادھری نے بھوجی کے ساتھ باغوں میں سیر کرنا چھوڑ دیا۔ چوپڑ اور شطرنج اس کے نام کو روتے۔ وہ سارے دن اپنے کمرہ میں پڑی رہتی اور سوچتی کہ میں کیا کروں۔ سیاہ چادر پر سیاہ داغ چھپ جاتا ہے مگر سفید چادر پر سیاہی کی ایک بوند بھی جھلکنے لگتی ہے۔

وہ سوچتی اسی کنگن نے میری خوشی ہَر لی ہے۔ یہی کنگن مجھے خون کے آنسو رلا رہا ہے۔ سانپ جتنا خوبصورت ہوتا ہے' اتنا ہی زہریلا ہوتا ہے۔ یہ خوبصورت کنگن زہریلا سانپ ہے۔ میں اس کا سر کچل ڈالوں گی۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے ایک دن اپنے کمرہ میں کوئلہ کا الاؤ جلایا۔ چاروں طرف سے کواڑ بند کر دیئے اور اس کنگن کو جس نے اس کی زندگی وبال کر رکھی تھی' ہاتھ سے اتار کر آگ میں ڈال دیا۔ ایک دن وہ تھا کہ یہ کنگن اسے جان سے بھی پیارا تھا' اسے مخملی صندوقچے میں رکھتی تھی۔ آج اسے اتنی بیدردی سے آگ میں جلا رہی ہے۔ بھولی ودیادھری کنگن نے تیرا کیا بگاڑا ہے؟ تو نے اپنے دل کو بھی ٹٹولا ہے۔ اس میں ایک تیز کانٹا کھٹک رہا ہے۔ یہ کنگن جل کر راکھ ہو جائے گا مگر کانٹے کی خلش ہوتی رہے گی۔ اس کانٹے کو نکال۔

ودیادھری الاؤ کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی کہ اتنے میں پنڈت شری دھر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ودیادھری کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا۔ کاش زمین پھٹ جاتی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ پنڈت جی نے بڑے استعجاب سے کمرہ میں نگاہ دوڑائی مگر صورتحال سمجھ میں نہ آئی۔ بولے "کواڑ بند کر کے کیا ہو رہا ہے؟"

ودیادھری نے جواب نہ دیا۔ تب پنڈت جی نے ایک چھڑی اٹھالی اور اس سے الاؤ کو کریدا تو کنگن نکل آیا۔ اس کی صورت بالکل مسخ ہو گئی تھی۔ چیخ کر بولے "ودیا! تمہاری عقل کہاں ہے؟"

ودیا۔ "میرے پاس نہیں ہے۔"

پنڈت۔ "اس کنگن نے تمہارا کیا بگاڑا تھا؟"

ودیا۔ "اس نے میری زندگی تلخ کر رکھی ہے۔"

پنڈت۔ "ایسی انمول چیز مٹی میں مل گئی۔"

ودیا۔ "اس نے اس سے بھی زیادہ انمول چیز خراب کر دی ہے۔"

پنڈت۔ "تمہارا سر تو نہیں پھر گیا ہے؟"

ودیا۔ "شاید آپ کا فرمانا درست ہے۔"

پنڈت جی نے ودیادھری کی طرف چبھنے والی، دقیق نگاہوں سے دیکھا۔ ودیادھری کی آنکھیں نیچے کو جھک گئیں۔ وہ ان سے نگاہ نہ ملا سکی۔ یہ تیز نگاہیں میرے کلیجے میں چبھ جائیں گی۔ اس خوف سے اس نے پتی کی طرف نہیں دیکھا۔ پنڈت جی تیز لہجہ میں بولے۔ ودیادھری تمہیں صاف صاف کہنا ہوگا۔ ودیادھری سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور پنڈت جی کے روبرو زمین پر گر پڑی۔

(13)

ودیادھری کو جب ہوش آیا تو پنڈت جی کا وہاں پتہ نہ تھا۔ گھبرائی ہوئی مردانہ کمرہ میں آئی مگر یہاں بھی انہیں نہ پایا۔ نوکروں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گھوڑے پر سوار ہو کر گیان ساگر کی طرف گئے ہیں۔ یہ سن کر ودیادھری کو کچھ تسکین ہوئی۔ وہ دروازے پر کھڑے ہو کر ان کی راہ دیکھنے لگی۔ دوپہر ہوئی، آفتاب سر پر آیا۔ پھر شام ہوئی، چڑیاں بسیرا لینے لگیں۔ پھر رات آئی، تارے آسمان پر جگمگانے لگے مگر ودیادھری خاموش کٹھ پتلی کی طرح دروازہ پر کھڑی پنڈت جی کا انتظار کرتی رہی۔ رات بھیگ گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ چوکیدار کے خوفناک نعرے سنائی دینے لگے۔ یکایک اسے گھوڑے کی ٹاپ سنائی دی۔ اس کا سینہ دھڑکنے لگا۔ فرط مسرت سے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کبھی کبھی خوشی میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ دیوانہ وار لپک کر دروازہ کے باہر آئی مگر افسوس گھوڑے پر سوار کا پتہ نہ تھا۔ ودیادھری کو اب یقین ہو گیا کہ اپنے پران ادھار کے درشن نصیب نہ ہوں گے۔ اس کے جگر سے ایک آہ سرد نکلی اور وہ وہاں زمین پر بیٹھ گئی اور ساری رات آنکھوں سے خون کے آنسو بہاتی رہی۔ جب سفیدہ صبح نمودار ہوا۔ چڑیاں مسرت کے راگ الاپنے لگیں تو وہ دکھیاری ہائے مار کر اٹھی اور اپنے کمرہ میں جا کر لیٹ رہی۔

جس طرح آفتاب کی گرمی تالاب کو خشک کر دیتی ہے، اسی طرح ہجوم غم نے ودیادھری کو بے جان کر دیا۔ لبوں سے ٹھنڈی آہیں نکلتی تھیں اور آنکھوں سے گرم آنسو بہتے تھے۔ دانہ پانی چھوٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے رخصت ہو گئی۔ اس عالم میں ایک روز راجہ رندھیر سنگھ اظہار ہمدردی کے لیے اس کے پاس آئے۔ انہیں دیکھتے ہی ودیادھری کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ فرطِ غضب سے ہونٹ کانپنے لگے۔ جھلائی ہوئی کالی ناگن کی طرح پھنکار مار کر اٹھی اور راجہ کے روبرو آکر تند شرار آمیز لہجہ میں بولی۔ "ظالم یہ آگ تیری لگائی ہوئی ہے۔ اگر میری آہوں میں

کچھ اثر ہے تو تجھے اس شرارت کے کڑوے پھل کھانے پڑیں گے۔" جس طرح پیکانِ تیر ہرن کے جگر میں چبھ جاتا ہے' اسی طرح یہ الفاظ راجہ کے کلیجہ میں چبھ گئے۔ ان کی زبان سے ایک حرف نہ نکلا۔ شیر افگن راجپوت ایک عورت کی نگاہِ شعلہ بار سے کانپ اٹھا۔

پورا سال گزر گیا۔ ہمانچل پر دلفریب ہریالی کی بہار آئی۔ خوش رنگ پھول دامن کوہسار میں متوالوں کی طرح جھومنے لگے۔ پھر کوہ و دیار نے برف کی سفید چادر اوڑھی۔ سارس پُر درد نعرے مارتے ہوئے زیادہ خوشگوار میدانوں کو چلے۔ یہ موسم بھی گزرا۔ ندی نالوں میں دودھ کی دھاریں بہنے لگیں۔ چاند کی صاف' جان بخش' خوشگوار شعاعیں گیان ساگر کے شفاف پانی میں تھرکنے لگیں مگر پنڈت شری دھر کا کچھ ٹوہ نہ ملا۔ ودیادھری نے رنواس کو خیر باد کہا اور ایک پرانے ویران مندر میں جوگیوں کی طرح زندگی کے دن کاٹنے لگیں۔ اس دکھیا کی حالت بھی کیسی عبرتناک تھی۔ اسے دیکھ کر میری آنکھیں بھر آتی تھیں۔ وہ میری پیاری سکھی تھی۔ اس کی محبت میں میں نے بہار زندگی کی سیر کی تھی۔ اس کا اتھاہ دکھ دیکھ کر میں اپنا دکھ بھول گئی۔ ہائے ایک دن وہ تھا کہ اس نے اپنی برت کے بل پر انسان کو حیوان کا جامہ پہنا دیا اور آج اس کا پتی اس کے پرتی برتا پر شک کرتا ہے! کسی عورت کے دل پر اس سے زیادہ جانگزا' اس سے زیادہ مہلک' اس سے زیادہ شرمناک زخم نہیں لگ سکتا۔ اس کی تکلیفوں نے میرے دل میں اسے پھر وہی احترام کی جگہ دے دی۔ اس کی پتی برت پر پھر میرا اعتقاد مضبوط ہو گیا مگر اس کے روبرو جا کر اس سے ہمکلام ہونے کی میری ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں بے رحمی کا' بے دردی کا الزام سر پر لینے کے لیے تیار تھی مگر سفلہ پن کا الزام میرے مان کا نہ تھا۔ اس کی درد کشیوں نے میرے دل میں یہ خیال جما دیا کہ وہ اب بھی وہی پتی کے نام پر جان دینے والی ودیادھری ہے۔ کئی مہینے کے بعد جب ودیادھری نے مجھ سے یہ رام کہانی بیان کی تو صاف ظاہر ہو گیا کہ یہ سب کانٹے راجہ رندھیر سنگھ کے بوئے ہوئے تھے۔ انہیں کی ایما پر بھوجی نے اسے پنڈت جی کے ساتھ جانے سے روکا۔ اس کے مزاج نے جو کچھ رنگ بدلا' وہ سب بھوجی کی صحبت کا اثر تھا۔ بھوجی ہی کی دیکھا دیکھی اسے بناؤ سنوار کا چسکا پڑا۔ بھوجی ہی کے منع کرنے سے اس نے کنگن کا راز پنڈت جی سے چھپایا۔ ایسے واقعے عام عورتوں کی زندگی میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں اور انہیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ ہمارے پتی برت میں فرق آیا۔ ودیادھری کی پتی برتا چونکہ نہایت رفیع تھی' اس لیے یہ فروگزاشتیں اس کے جگر میں نشتر غم بن گئیں۔ میں یہ نہیں کہتی کہ ودیادھری فرض کے راستہ سے نہیں ہٹی۔ خواہ کسی کے بہکانے سے خواہ اپنے بھولے پن سے۔ اس نے فرض کا سیدھا راستہ چھوڑ دیا مگر گناہ کا خیال اس کے دل سے کوسوں دور تھا۔ جن لوگوں کا اخلاقی معیار نیچا ہے' ان کے دل میں ایسی لغزشوں سے مطلق خلش نہیں ہوتی مگر جن کا اخلاقی احساس بلند اور پاکیزہ ہوتا ہے' ان کی نگاہوں میں ایسی فروگزاشتیں گناہ کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ کوا جس بلندی کو اپنی پرواز کی معراج سمجھتا ہے' وہ ہنس کی بلند پروازیوں کی ابتدائی منزل ہوتی ہے۔

(14)

اے مسافر! میں نے پنڈت شری دھر کا سراغ لگانا شروع کیا۔ میں ان کے طبعی میلان سے واقف تھی۔ وہ شری رام چندر کے بھگت تھے۔ کوشل پوری کی پاک سر زمین اور سرجوندی کے پر فضا کنارے ان کی زندگی کے خوابِ آرزو تھے۔ مجھے خیال گزرا کہ کیا عجب ہے انہوں نے اجودھیا کی راہ لی ہو۔ کاش ان کا سراغ مل جاتا اور میں

انہیں لا کر وِدیا دھری کے آغوش وفا میں سونپ دیتی۔ وہ میری زندگی کا مبارک دن ہوگا۔ اس برہمن نے بہت دکھ جھیلا ہے۔ کیا اب بھی دیوتاؤں کو اس پر ترس نہ آئے گا۔ ایک روز میں نے شیر سنگھ کو ساتھ لیا اور پانچ معتمد آدمیوں کے ساتھ اجودھیا کو چلی۔ پہاڑوں سے نیچے اترتے ہی ریل مل گئی۔ اس نے ہماری منزل آسان کر دی۔ بیسویں دن مجھے اودھ پوری کا سواد دکھائی دیا۔ میں نے ایک دھرم شالہ میں قیام کیا۔ پھر سرجو میں اشنان کر کے شری رام چندر کے درشن کو چلی۔ مندر کے صحن میں قدم رکھا ہی تھا کہ پنڈت شری دھر کی محترم صورت دکھائی دی۔ وہ ایک کش آسن پر بیٹھے ہوئے رامائن کا پاٹ کر رہے تھے اور ہزاروں آدمی بیٹھے ہوئے ان کی جادو بیانیوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔

پنڈت جی کی نگاہ مجھ پر جونہی پڑی وہ آسن سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور بڑی گرم جوشی سے میرا خیر مقدم کیا۔ دو ڈھائی گھنٹہ تک انہوں نے مجھے اس مندر کی سیر کرائی۔ تہہ خانے دیکھے جن کی زمین کاملین کے سجدوں سے پاک تھی۔ بعد ازاں مندر کی چھت پر گئی۔ سارا شہر بساطِ شطرنج کی طرح میرے پیروں کے نیچے پھیلا ہوا تھا۔ ہوا دریائے سرجُو کی موجوں کو آہستہ آہستہ تھپکیاں دے رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ایک مادر مہربان کی طرح اس نے سارے شہر کو اپنے آغوش میں لے لیا ہے۔ یہاں سے اتر کر میں اپنے قیام گاہ کو چلی۔ پنڈت جی بھی میرے ساتھ ساتھ آئے۔ جب اطمینان سے بیٹھے تو میں نے کہا کہ "آپ نے تو ہم لوگوں سے بالکل ہی ناطہ توڑ لیا۔"

پنڈت۔ (افسوسناک لہجہ میں) "بدھاتا کو یہی منظور تھا۔ میرا کیا بس تھا۔ اب تو شری رام چندر کے سرن میں آ گیا ہوں اور زندگی کے باقی دن انہیں کی سیوا کے نذر ہوں گے۔"

میں۔ "آپ تو شری رام چندر کے سرن میں آ گئے ہیں۔ غریب وِدیا دھری کو کس کے سرن میں چھوڑ دیا ہے؟"

پنڈت جی چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ "آپ کی زبان سے اس کی سفارش زیبا نہیں۔"

میں نے جوش سے جواب دیا۔ "وِدیا دھری میری سفارش کی محتاج نہیں ہے۔ وہ دیوی ہے۔ اگر آپ نے اس کی پتی برت پر شک کیا ہے تو آپ سے ایسا بھاری گناہ سرزد ہوا ہے جس کا پرائشچت آپ بار بار جنم لیں تو بھی نہیں کر سکتے۔ آپ کی یہ بھگتی اس گناہ کو نہیں مٹا سکتی۔ آپ کیا جانتے ہیں کہ آپ کے فراق میں اس دُکھیا کی زندگی کس طرح کٹ رہی ہے۔ افسوس ہے آپ نے ایسی عورت کی قدر نہیں کی۔"

مگر پنڈت جی نے ایسا منہ بنا لیا گویا اس مسئلہ پر وہ آخری لفظ کہہ چکے اور اب انہیں اس کے متعلق ایک لفظ بھی کہنا یا سننا ناگوار ہوگا لیکن میں اتنی آسانی سے ان کا پیچھا کیوں چھوڑنے لگی تھی۔ میں نے اول سے آخر تک ساری کیفیت بیان کی اور راجہ صاحب کی ریشہ دوانیوں کی خوب قلعی کھولی۔ تب پنڈت جی کی آنکھیں کھلیں۔ میں خوش تقریر نہیں ہوں مگر اس وقت حق اور انصاف کی حمایت نے میرے الفاظ کو بہت موثر اور پرزور بنا دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا میری زبان پر سرسوتی بیٹھ گئی ہوں۔ وہ باتیں اب یاد آتی ہیں تو مجھے خود تعجب ہوتا ہے۔ آخر پنڈت جی میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ مجھے اس دن سچی خوشی حاصل ہوئی۔

(15)

بڑی سہانی صبح تھی۔ آفتاب کی شعاعیں گیان ساگر کی لہروں سے اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ شیر سنگھ کو میں نے

یہیں چھوڑا اور پنڈت جی کے ساتھ ارجن نگر کو چلی۔ ہم دونوں خاموش تھے۔ خیالات نے ہماری زبانیں بند کر رکھی تھیں۔ پنڈت جی کی گردن ندامت سے جھکی ہوئی تھی کیونکہ وہ اب روٹھے ہوئے کی حیثیت سے نہیں بلکہ منانے والے کی حیثیت سے جاتے تھے۔ آج وفا کے خزاں رسیدہ باغ میں پھر بہار آئے گی۔ پریم کی سوکھی ہوئی ندی پھر امڈے گی۔ آکاش کے دیوتا بھی یہ نظارہ دیکھنے کے لیے بے چین ہیں۔ وفا میں کیسی کشش ہے کہ جو روٹھا تھا' وہی منانے جاتا ہے۔

دن چڑھ آیا تھا جب ہم ودیادھری کے درِ حسرت پر پہنچے۔ پنڈت جی باہر ٹھہر گئے۔ میں نے اندر جا کر دیکھا تو ودیادھری پوجا کر رہی تھی مگر یہ کسی دیوتا کی پوجا نہ تھی۔ دیوتا کی جگہ پنڈت جی کے کھڑاون رکھے ہوئے تھے۔ پتی برت کا یہ پاک نظارہ دیکھ کر مجھ پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہو گیا اور آنند کی ایک لہر دل میں امڈ آئی۔ میں نے دوڑ کر ودیادھری کے قدم چوم لیے۔ اس کا بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے اور غم نے کمر خم کر دی تھی۔ اس نے اپنے تئیں پتی برت پر قربان کر دیا تھا۔

ودیادھری نے مجھے اٹھا کر سینہ سے لگا لیا اور بولی۔ ''بہن مجھے شرمندہ نہ کرو۔ میرا فرض ہے کہ تمہارے قدموں کی خاک ماتھے پر لگاؤں۔ خوب آئیں۔ بہت دنوں سے جی تمہاری ملاقات کو ترس رہا تھا۔''

میں نے جواب دیا۔ ''ذرا اجودھیا چلی گئی تھی۔''

جب ہم دونوں اپنے وطن میں تھیں تو میں جب کہیں جاتی تو ودیادھری کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی سوغات لے آتی۔ اسے وہ بات یاد آ گئی۔ آبدیدہ ہو کر بولی۔ ''میرے لیے بھی کچھ لائیں؟''

میں۔ ''ہاں۔ ایک بہت اچھی چیز لائی ہوں۔''

ودیادھری۔ ''کیا ہے۔ دیکھوں؟''

میں۔ ''پہلے بوجھ جاؤ۔''

ودیادھری۔ ''سہاگ کی پٹاری ہو گی؟''

میں۔ ''نہیں۔ اس سے اچھی۔''

ودیا۔ ''ٹھاکر جی کی مورتی۔''

میں۔ ''نہیں۔ اس سے بھی اچھی۔''

ودیا۔ ''میرے پران ادھار کی کچھ خبر۔''

میں۔ ''نہیں۔ اس سے بھی اچھی۔''

ودیا۔ ''تو کیا وہ باہر کھڑے ہیں؟''

یہ کہہ کر وہ بے تابانہ جوش سے اٹھی کہ دروازہ پر جا کر پنڈت جی کا خیر مقدم کرے مگر ضعف نے دل کی آرزو نہ نکلنے دی۔ تین بار سنبھلی اور تین بار گری۔ تب میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور آنچل سے ہوا کرنے لگی۔ اضطراب سے اس کا دل دھڑک رہا تھا اور آرزوئے قدم بوسی آنکھوں سے آنسو بن کر نکلتی تھی۔ جب ذرا طبیعت سنبھلی تو اس نے کہا۔ ''انہیں بلا لو۔ ان کا درشن میرے لیے رام بانڑ ہو جائے گا۔''

ایسا ہی ہوا۔ جونہی پنڈت جی اندر آئے ودیادھری اٹھ کر ان کے پیروں سے چمٹ گئی۔ دیوی نے بہت دنوں کے بعد پتی کے درشن پائے ہیں۔ آنسوؤں سے ان کے پیر پکھار رہی ہے۔

جس طرح مینہ برسنے کے بعد گلاب کے پودے سے پانی کی بوندیں ٹپکتی ہیں' اسی طرح پنڈت جی کی

آنکھوں سے آنسو کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ دونوں کے دل مسرت سے امڈے ہوئے ہیں۔ انسان خوشی میں بھی روتا ہے۔ جس طرح کبھی کبھی دھوپ میں ترشح ہو جاتا ہے۔ میں نے وہاں زیادہ ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان کے دل میں کتنی باتیں سمارہی ہوں گی۔ یہ خیال کر کے میں اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔ "بہن اب میں جاتی ہوں۔ شام کو آؤں گی۔" ودیا دھری نے میری طرف آنکھیں اٹھائیں۔ پتلیوں کی جگہ دل رکھا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولی۔

"ایشور تمہیں اس نیکی کا بدلہ دے۔"

(16)

اے مسافر! ودیادھری کی استدعا نے میری مصیبتوں کا خاتمہ کر دیا۔ میں جب گیان ساگر کو چلی تو میرے دل پر روحانی مسرت کا ایک نشہ سا چھایا ہوا تھا۔ میں نے دو دفعہ پنڈت شری دھر کو موت کے منہ سے بچایا تھا مگر آج کی سی خوشی مجھے کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

دو پہر کا وقت تھا۔ جب میں گیان ساگر پہنچی۔ ودیادھری کی دعا مجھ سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص حجرۂ غار سے نکل کر گیان ساگر کی طرف چلا آتا ہے۔ مجھے تعجب ہوا کہ اس وقت یہاں کون آیا مگر جب وہ شخص میرے قریب آیا تو فرطِ مسرت سے میرا کلیجہ ایسا اُمڈا گویا سینہ سے بالکل نکل پڑا۔ یہ میرے جان و دل کے مالک، میرے پیارے پتی نرسنگھ دیو تھے۔ جب تک میں ان کے قدموں کا بوسہ لوں، انہوں نے مجھے سینہ سے چمٹا لیا۔ پورے دس سالوں کے بعد آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ مجھے اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گیان ساگر کے کنول میرے ہی لیے کھلے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں نے میرے ہی لیے پھولوں کے تختے بچھا رکھے ہیں۔ ہوا میرے لیے ہی جھومتی ہوئی آرہی ہے۔ سورج نے میرے ہی لیے روشنی کی چادر بچھا رکھی ہے۔ دس سالوں کے بعد آج ان دلفریب نظاروں سے مجھے عاشقانہ حظ حاصل ہوا۔

دس سالوں کے بعد میرا اجڑا ہوا گھر بسا۔ گئے دن لوٹے میری خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس دن کی خوشی نے ایک مدت دراز کے غم بھلا دیئے۔ وہ دن اور راتیں جو میں نے رو رو کر کاٹی تھیں، وہ آگ جو مدتوں تک میرے سینہ میں سلگتی رہی تھی، وہ سب اس سیلاب مسرت میں بہہ گئی۔

میرے پتی نے پرنم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "پریم بدا۔"

اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ کہہ سکتے۔

ماما

(1)

بابو رام رکھا مل دہلی کے ایک مرفہ حال کھتری تھے۔ بہت ہی خوش وضع اور انتہا درجے کے اپ ٹوڈیٹ۔ ان

کی مہمان نوازی کی سارے محلے میں دھوم تھی۔ آئے دن احباب کسی نہ کسی تقریب سے جمع ہو جاتے۔ ٹینس کھیلتے۔ تاش سے دل بہلاتے۔ ہارمونیم سے شوق کرتے۔ چائے پانی کا لطف اٹھاتے اور اپنے دریادل میزبان کی فراخ دلی اور مہماں نوازی کی داد دیتے۔ بابو صاحب ممدوح دن بھر میں جتنے رنگ بدلتے اس پر پیرس کی ''سوسائٹی آف ویمن'' کو رشک ہو سکتا تھا۔ ان کا کئی بینکوں میں حصہ تھا۔ کئی دکانیں تھیں۔ اور آمدنی کے ذرائع وافر تھے مگر بابو صاحب کو اتنی فرصت نہ تھی کہ ان کی کچھ دیکھ بھال کرتے۔ مہمان نوازی ایک پاک فرض ہے۔ وہ ایک سچے محبّ وطن کے جوش سے فرمایا کرتے تھے۔ ''مہماں نوازی ابتداءِ آفرینش سے ہندوؤں کی امتیازی صفت رہی ہے۔ ہماری مہماں نوازی یگانہ روزگار ہے۔ ہم اس لحاظ سے دنیا میں فرد ہیں۔ ہم سب کچھ کھو بیٹھے ہیں مگر جس دن ہم میں یہ صفت باقی نہ رہے گی' وہ دن ہندو قوم کے لیے شرم' ذلت اور موت کا دن ہو گا۔''

مگر باوجود ان مہماں نوازیوں کے مسٹر رام رکھا قومی ضروریات سے بے خبر نہ تھے وہ ملکی اور تمدنی تحریکوں میں پُر جوش حصہ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ سال میں دو۔ بلکہ کبھی تین تقریریں ضرور تیار کر لیتے۔ تقریریں بہت شستہ' بہت چست اور انشاپردازی کی خوبیوں سے مرصّع ہوتی تھیں۔ احباب تقریر کے ایک ایک لفظ پر نعرہ مرحبا بلند کرتے۔ تالیاں بجاتے۔ حتی کہ مسٹر رام رکھا کو تقریر کا سلسلہ قائم رکھنا دشوار ہو جاتا۔ خاتمہ تقریر پر اکثر احباب انہیں گود میں اٹھا لیتے اور پیٹھ ٹھوک کر کہتے۔ تیری زبان میں جادو ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟ قوم کی اتنی بیش بہا خدمت کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ نیچ ذاتوں کے سدھار کے لیے دہلی میں ایک سوسائٹی تھی۔ بابو صاحب اس کے سیکرٹری تھے اور اس کام کو غیر معمولی دلچسپی سے انجام دیتے تھے۔ جب ان کا بوڑھا کہار بیمار ہوا اور کرسچین مشن کے ڈاکٹروں نے اس کا علاج کیا۔ جب اس کی بیوہ عورت گزران کی کوئی صورت نہ دیکھ کر درگا مشن کی سجادہ نشین ہو گئی تب ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب نے افسوس کے رزولیوشن پاس کیے۔ زمانہ جانتا ہے کہ سیکرٹری کا کام جلسے کرنا اور رزولیوشن بنانا ہے۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

مسٹر رام رکھا کی قومی مصروفیتیں یہیں تک محدود نہ تھیں۔ وہ بے جا رسوم اور جاہلانہ عقائد کے زبردست مخالف تھے۔ ہولی کے دنوں میں جب محلے کے چمار اور کہار شراب سے متوالے ہو کر پھاگ گاتے اور دف بجاتے ہوئے نکلتے تو انہیں بڑا صدمہ ہوتا۔ قوم کی اس جہالت پر ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ اکثر اس بری رسم کا علاج اپنے ہنٹر سے کیا کرتے تھے۔ ان کے ہنٹر میں قومی فلاح کا جوش ان کی زبان سے بھی زیادہ تھا۔ یہ انہیں کی مبارک اور قابل یادگار کوششیں تھیں جنہوں نے عین ہولی کے دن دہلی شہر میں کہرام مچادیا۔ پھاگ گانے کے جرم میں ہزاروں پولیس کی زد میں آگئے۔ سینکڑوں گھروں میں عین ہولی کے دن محرم کا سا ماتم برپا ہو گیا۔ ادھر ان کے دروازے پر ہزاروں مرد اور عورتیں نالہ و فریاد کر رہی تھیں اور ادھر بابو صاحب کے خیر سگال اور قدر دان احباب ان کی اس اعلیٰ اور بے لوث قومی خدمت پر صدق دل سے مبارکباد دیتے تھے۔ غرض بابو صاحب کی یہ قومی ہمدردیاں اور کوششیں نمائشی' خیالی' ذہنی اور فیشن ایبل تھیں۔ ہاں اگر انہوں نے کسی اچھی تحریک میں حصہ لیا تھا تو وہ خاندان مشترکہ کی مخالفت تھی۔ اپنے والد مرحوم کے انتقال کے بعد بیوہ ماں سے الگ ہو گئے تھے۔ اس قومی خدمت میں ان کی بیوی خاص مددگار تھیں۔ بیوہ ماں اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اس سے بہو کی آزادی میں فرق آتا ہے اور آزادی میں فرق آنے سے دل و دماغ کی بالیدگی اور تقویت نہیں حاصل ہوتی۔ بہو کو جلانا اور کڑھانا ساس کی طبیعت ہے۔ اس لیے بابو رام رکھا اپنی ماں سے علیحدہ ہو گئے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے سعادت مندی کو راہ دے کر

دس ہزار روپے اپنی ماں کے نام جمع کر دیئے تاکہ اس کے سود سے اس کی گزران ہوتی رہے۔ لیکن بیٹے کی اس سعادت مندی پر ماں کا دل ایسا ٹوٹا کہ وہ دہلی چھوڑ کر اجودھیا جارہیں اور تب سے برابر وہیں رہتی تھیں۔ بابو صاحب مسز رام رکھا کی پُرزور مخالفت کے باوجود کبھی کبھی اجودھیا چلے جایا کرتے تھے۔ مگر وہ دہلی آنے کا کبھی نام نہ لیتی تھیں۔ ہاں اگر خیر وعافیت کا خط پہنچنے میں دیر ہو جاتی۔ تو دل سے مجبور ہو کر دریافت حال کر لیتی تھیں۔

(2)

اسی محلے میں ایک سیٹھ گردھاری لال رہتے تھے۔ لاکھوں کا لین دین تھا۔ ہیرے جواہرات کا روزگار کرتے تھے۔ بابو رام رکھا کے دور کے رشتے میں ساڑھو ہوتے تھے۔ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ صبح کو جمنا نہانے والے۔ گائے کو اپنے ہاتھوں سے جھاڑنے پونچھنے والے۔ ان سے مسٹر رام رکھا کی طبیعت نہ ملتی تھی۔ مگر جب کبھی روپیوں کی ضرورت ہوتی تو سیٹھ گردھاری لال کے یہاں سے بے تکلف منگا لیا کرتے۔ آپس کا معاملہ تھا۔ صرف رقعے پر روپیہ مل جاتا۔ نہ کوئی رہن۔ نہ ضمانت۔ نہ اسٹامپ۔ نہ شہادت۔ موٹر کار کے لیے دس ہزار کی ضرورت ہوئی۔ وہ وہیں سے آیا۔ گھوڑ دوڑ کے لیے ایک آسٹر یلین گھوڑا ڈیڑھ ہزار میں لیا۔ وہ بھی سیٹھ جی کے یہاں سے آیا۔ رفتہ رفتہ کوئی بیس ہزار کا معاملہ ہو گیا۔ سیٹھ جی نیک طبیعت آدمی تھے۔ سمجھتے تھے کہ اس کے پاس دکانیں ہیں۔ بینکوں میں حصہ ہے۔ جب جی چاہے گا روپیہ وصولی کر لیں گے۔ مگر جب دو تین سال گزر گئے اور بابو رام رکھا کے تقاضے سیٹھ جی کے تقاضوں سے زیادہ سرگرم ہوتے گئے تو گردھاری لال کو اندیشہ ہوا۔ ایک روز وہ رام رکھا کے مکان پر آئے اور ملائمت سے کہا۔ "بھائی صاحب! مجھے ایک ہنڈی کا روپیہ دینا ہے۔ اگر آپ میرا حساب کر دیں تو بہت اچھا ہو۔" یہ کہہ کر فرد حساب اور رقعے دکھائے۔ مسٹر رام رکھا کسی گارڈن پارٹی میں شریک ہونے کے لیے تیار تھے۔ بولے۔ "اس وقت معاف رکھئے۔ پھر دیکھ لوں گا۔ جلدی کیا ہے۔"

گردھاری لال کو بابو صاحب کی رُکھائی پر غصہ آ گیا۔ تُرش ہو کر بولے۔ "آپ کو جلدی نہیں ہے۔ مجھے تو ہے۔ میرا دو سو روپیہ ماہوار کا نقصان ہو رہا ہے۔" مسٹر رام رکھا نے بے صبری سے گھڑی دیکھی۔ پارٹی کا وقت بہت قریب تھا۔ بہت منت آمیز لہجے میں بولے۔ "بھائی صاحب! اس وقت میں بڑی عجلت میں ہوں۔ اس وقت مجھ پر عنایت کیجئے۔ میں کل خود حاضر ہوں گا۔"

سیٹھ جی خوددار آدمی تھے۔ رام رکھا کی اس کج خلقی پر جل گئے۔ میں ان کا مہاجن۔ ان سے دولت میں۔ عزت میں۔ حیثیت میں بڑھا ہوا۔ چاہوں تو ایسوں کو نوکر رکھ لوں۔ ان کے دروازے پر آؤں اور میری یہ خاطر! یہ ہاتھ باندھے میرے سامنے کھڑے نہ رہیں مگر کیا میں حقہ 'پان الائچی' عطر کا بھی مستحق نہیں؟ تنک کر بولے۔ "اچھا۔ تو کل حساب صاف ہو جائے۔"

رام رکھا نے اکڑ کر جواب دیا۔ "ہو جائے گا۔"

رام رکھا کی خود پسند طبیعت پر سیٹھ جی کے اس برتاؤ کا اثر کچھ کم حوصلہ شکن نہ ہوا۔ اس کندۂ ناتراش نے آج میری آبرو مٹی میں ملا دی۔ مجھے ذلیل کر گیا۔ خیر تم بھی اسی دلّی میں ہو اور ہم بھی یہیں ہیں۔ غرض دونوں دلوں میں گانٹھ پڑ گئی۔ بابو صاحب کی طبیعت ایسی گری اور دل میں ایسی تشویش پیدا ہوئی کہ پارٹی میں شریک ہونے کا خیال چھوڑ

دیا۔ دیر تک اسی الجھن میں پڑے رہے۔ پھر سوٹ اتار دیا اور خدمتگار سے بولے۔ "جا کر منیب جی کو بلا لا۔" منیب جی آئے۔ ان کا حساب دیکھا گیا۔ پھر بینکوں کا حساب دیکھا مگر جوں جوں اس وادی میں اترے۔ اندھیرا بڑھتا گیا۔ بہت کچھ ٹٹولا۔ کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر مایوس ہو کر وہ آرام کرسی پر گر پڑے اور ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دکانوں کا مال بکا۔ مگر رقم بقایا میں پڑی ہوئی تھی۔ کئی گاہکوں کی دکانیں ٹوٹ گئیں۔ اور ان پر جو رقم آتی تھی۔ وہ دب گئی۔ کلکتہ کے آڑھتیوں سے جو مال منگایا' اس کی ادائیگی کی تاریخ سر پر آ پہنچی اور یہاں روپیہ بھی وصول نہ ہوا۔ دکانوں کا یہ حال بینک کا اس سے بھی بدتر۔ رات بھر وہ انہیں تفکرات میں کروٹیں بدلتے رہے۔ اب کیا کرنا چاہیے۔ گردھاری لال شریف آدمی ہے۔ اگر سارا کچا حال اسے سنا دوں تو ضرور مان جائے گا۔ مگر یہ ذلت کیونکر اٹھائی جائے گی۔ کمزور طالب علم کی جو کیفیت امتحان کے دنوں ہوتی ہے' وہی حال اس وقت رام رکھا کا تھا۔ بستر سے نہ اٹھے۔ منہ ہاتھ بھی نہ دھویا۔ کھانا کھانے نہ گئے۔ اتنا جانتے تھے کہ مصیبت میں کوئی کسی کا ساتھی نہیں ہوتا۔ اس لیے ایک ذلت سے بچنے کی کوشش میں کئی ذلتوں کا بوجھ نہ اٹھانا پڑے۔ دوستوں کو ان معاملات کی خبر تک نہ دی۔ جب دوپہر ہو گئی اور ان کی طبیعت یکسو نہ ہوئی تو ان کا چھوٹا لڑکا بلانے آیا۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"لالہ جی۔ آج کانے کیوں نہیں تلتے؟"

لالہ رکھا بولے۔ "بھوک نہیں ہے۔"

"کیا کایا ہے؟"

"من کی مٹھائی"

"اور کیا کایا ہے؟"

"مار۔"

"کچنے مارا؟"

"گردھاری لال نے۔"

لڑکا روتا ہوا گھر میں چلا گیا۔ اور اس مار کے صدمے سے دیر تک روتا رہا۔ آخر طشتری کی بالائی نے اس کے اس زخم پر مرہم کا کام دیا۔

(3)

مریض کو جب جینے کی آس نہیں رہتی تو علاج کرانا چھوڑ دیتا ہے۔ بابو رام رکھا جب اس گتھی کو نہ سلجھا سکے تو چادر تان لی اور منہ لپیٹ کر سو گئے۔ شام کو یکا یک اٹھ کر سیٹھ جی کے یہاں جا پہنچے اور کسی قدر بے پروائی سے بولے۔

"حضرت! میں اب آپ کا حساب نہیں کر سکتا۔"

سیٹھ جی گھبرا کر بولے۔ "کیوں؟"

رام رکھا۔ "اس لیے کہ میں بالکل مفلس قلانچ ہوں۔ میرے پاس ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ آپ اپنا روپیہ جیسے چاہیں وصول کر لیں۔"

سیٹھ۔ "یہ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟"

رام رکھا۔ ''بالکل سچ!''

سیٹھ۔ ''دکانیں نہیں ہیں؟''

رام رکھا۔ ''دکانیں آپ مفت۔لے جائیے۔''

سیٹھ۔ ''بینک کے حصے؟''

رام رکھا۔ ''وہ کب کے اڑ گئے۔''

سیٹھ۔ ''جب یہ حال تھا تو آپ کو مناسب نہیں تھا کہ میرے گلے پر چھری پھیرتے۔''

رام رکھا نے مغرورانہ انداز سے کہا۔ ''میں آپ کے یہاں اپدیش سننے کے لیے نہیں آیا ہوں۔'' اور وہاں سے اٹھ کر چل دیئے۔

سیٹھ جی نے فوراً نالش دائر کی۔ بیس ہزار اصل' پانچ ہزار سود' ڈگری ہو گئی۔ مکان نیلام پر چڑھا۔ پندرہ ہزار کی جائیداد پانچ ہزار میں نکل گئی۔ دس ہزار کی موٹر چار ہزار میں اڑ گئی۔ غرضیکہ ساری جائیداد منقولہ و غیر منقولہ کا صفایا ہو گیا اور کل ملا کر سولہ ہزار سے زائد رقم نہ کھڑی ہو سکی۔ اب رام رکھا کی ذات کے سوا کوئی ایسی جائیداد باقی نہ تھی جو اس بوجھ کی کفیل ہوتی۔ ساری گرہستی تباہ ہو گئی۔ پھر بھی دس ہزار کے مقروض رہ گئے۔ عزت آبرو' مال اسباب سب مٹی میں مل گئے۔ بہت تیز دوڑنے والا شخص اکثر منہ کے بل گر پڑتا ہے۔

(4)

اس واقعہ کے کچھ دنوں بعد دہلی میونسپلٹی کے ممبروں کا انتخاب شروع ہوا۔ ممبری کے امیدوار ووٹروں کی ناز برداریاں کرنے لگے۔ دلالوں کی گرم بازاری ہوئی۔ رائیں موتیوں کے تول بکنے لگیں۔ امیدوار ممبروں کے پیروکار اپنے مؤکل کے محاسن ذاتی اور جوہر صفاتی کے راگ الاپنے لگے۔ چوطرفہ چہل پہل ہو گئی۔ ایک وکیل صاحب نے عام جلسے میں میں اپنے مؤکل صاحب کی نسبت فرمایا۔

''میں جس باکمال بزرگ کا پیروکار ہوں' وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے اپنے فرزند اکبر کی شادی میں 25 ہزار روپیہ صرف رقص و سرود میں صرف کر دیا تھا۔'' حاضرین نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

ایک دوسرے کنویسر نے اپنے حلقے کے ووٹروں کے روبرو اپنے مؤکل کا یوں ذکر کیا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ آپ سیٹھ گردھاری لال کو اپنا ممبر بنائیے۔ آپ خود اپنا نیک و بد سمجھتے ہیں اور نہ سیٹھ جی میری سفارش کے محتاج ہیں۔ میری صرف یہ التماس ہے کہ آپ جسے ممبر بنائیں پہلے اس کے گزشتہ کارناموں کو غور سے دیکھیں۔ دہلی میں صرف ایک شخص ہے جو گزشتہ دس سال سے آپ کی خدمت کر رہا ہے۔ صرف ایک شخص ہے جس نے آب رسانی اور صفائی کے انتظامات میں دل و جان سے مدد دی ہے۔ صرف ایک شخص ہے جس کو حضور وائسرائے کے دربار میں کرسی پر بیٹھنے کا حق حاصل ہے اور آپ سب اصحاب اسے جانتے ہیں۔'' حاضرین نے تالیاں بجائیں۔

سیٹھ گردھاری لال کے حلقے میں ان کے ایک رقیب بھی تھے۔ منشی فیض الرحمٰن خاں۔ بڑے زمیندار اور مشہور وکیل تھے۔ بابو رام رکھا نے اپنے رسوخ' اپنی سرگرمی اور اپنی جادو بیانی سے منشی جی صاحب کی خدمت کرنی شروع کی۔ انہیں سیٹھ جی کو زک دینے کا نادر موقع ہاتھ آیا۔ روز ایک نہ ایک جلسہ کرتے۔ رات اور دن اسی دھن

میں رہتے۔ ان کی شعلہ بیانیوں کا حاضرین پر بہت اچھا اثر پڑتا۔ ایک بار آپ نے غیر معمولی جوش عقیدت سے فرمایا۔ ”میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ منشی فیض الرحمٰن سے زیادہ لائق آدمی آپ کو دہلی میں نہ مل سکے گا۔ یہ وہ شخص ہے۔ جس کی غزلوں سے مشاعرے گرم ہو جاتے ہیں۔ ایسے بزرگ کی اعانت کرنا میں اپنا قومی اور انسانی فرض خیال کرتا ہوں۔ میں ان شعبدہ بازوں پر لعنت بھیجتا ہوں جو ایسے پاک اور قومی کام کو ذاتی مفاد کا ذریعہ بناتے ہیں۔ دولت اَور شے ہے۔ حضور وائسرائے کے دربار میں باریابی اَور شے ہے۔ مگر قومی خدمت اور قومی چاکری کچھ اور ہی چیز ہے۔ اور وہ شخص جس کی ساری زندگی سود خوری‘ حرام کاری‘ غصب اور عیش و عشرت میں گزری ہو وہ اس خدمت کو ہرگز انجام نہیں دے سکتا۔

(5)

سیٹھ گردھاری لال نے اس معرکتہ الآرا تقریر کا حال سنا تو غصے سے آگ ہو گئے۔ میں حرام کار ہوں۔ سود خوار ہوں۔ عیاش ہوں۔ خیریت ہوئی کہ تم نے میرا نام نہیں لیا۔ مگر اب بھی تم میرے قابو میں ہو۔ ہوا خواہوں نے آگ پر تیل ڈالا۔ ادھر مسٹر رام رکھا اپنے کام مصروف رہے۔ یہاں تک کہ ووٹنگ ڈے آ پہنچا۔ مسٹر رام رکھا کو اپنی کوششوں میں بہت کچھ کامیابی ہوئی تھی۔ آج وہ بہت خوش تھے۔ آج گردھاری لال کو نیچا دکھا دوں گا۔ آج اسے معلوم ہو جائے گا کہ دولت دنیا کی کل نعمتوں کو مہیا نہیں کر سکتی۔ جس وقت فیض الرحمٰن کے ووٹ زیادہ نکلیں گے اور میں تالیاں بجاؤں گا‘ اس وقت گردھاری لال کا چہرہ قابل دید ہو گا۔ رنگ فق ہو جائے گا۔ منہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں گی۔ آنکھیں نہ ملا سکے گا۔ شاید مجھے پھر منہ نہ دکھائے۔

انہیں خیالات میں مگن مسٹر رام رکھا شام کو ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے۔ شاندار مجمع تھا۔ حاضرین نے بڑے جوش سے ان کا خیر مقدم کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ”ووٹنگ“ شروع ہوا۔ امیدوار ممبر صاحبان اپنی قسمتوں کا فیصلہ سننے کے لیے مضطرب ہو رہے تھے۔ چھ بجے چیئرمین نے فیصلہ سنایا۔ سیٹھ جی کو شکست ہو گئی۔ فیض الرحمٰن نے میدان مار لیا۔ مسٹر رام رکھا نے فرط مسرت سے ٹوپی ہوا میں اچھال دی اور خود کئی بار اچھل پڑے۔ جس نے سنا حیران رہ گیا۔ چاندنی چوک سے سیٹھ جی کو ہٹانا قطب صاحب کی لاٹ کو جگہ سے اکھاڑنا تھا۔ واللہ کرامات ہے! معجزہ ہے۔ سیٹھ جی کے چہرے سے رام رکھا کو جتنی آرزوئیں تھیں‘ وہ سب پوری ہو گئیں۔ رنگ فق تھا۔ خفت اور ندامت کی تصویر۔ ایک وکیل صاحب نے ان سے ازراہ ہمدردی کہا۔ ”سیٹھ جی! مجھے آپ کی شکست کا بہت افسوس ہے۔ اگر میں جانتا کہ یہاں مبارک باد کے بجائے ماتم پرسی کا فرض ادا کرنا پڑے گا تو ہرگز یہاں نہ آتا۔ میں تو صرف آپ کے خیال سے یہاں چلا آیا تھا۔“ سیٹھ جی نے بہت ضبط کیا مگر آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا ہی آئے۔ بے تعلق بننے کی بے سود کوشش کر کے بولے۔ ”وکیل صاحب! مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں۔ کونسی ریاست نکل گئی؟ خواہ مخواہ کی الجھن‘ فکر‘ پریشانی رہتی۔ چلو اچھا ہوا‘ گلو خلاصی ہو گئی۔ اپنے کام میں ہرج ہوتا تھا۔ مجھے سچ مچ دل سے خوشی ہوئی۔ یہ کام تو بے کاروں کا ہے۔ گھر نہ بیٹھے رہے یہی بیگار کی۔ میری حماقت تھی کہ اتنے دنوں آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔“ مگر سیٹھ جی کے چہرے نے ان خیالات کی تصدیق نہ کی۔ چہرہ دل کا آئینہ ہے۔ اس کی تصدیق البتہ ہو گئی۔

مگر بابو رام رکھا بہت دیر تک خوشی کے مزے نہ لوٹنے پائے اور نہ سیٹھ جی کو انتقام کے لیے بہت دیر تک

منتظر ہونا پڑا۔ مجلس برخاست ہونے پر جب بابو رام رکھا کامیابی کے زعم میں اینڈتے، مونچھوں پر تاؤ دیتے اور چاروں طرف مغرورانہ نگاہیں ڈالتے ہوئے باہر آئے تو دیوانی کے تین سپاہیوں نے آگے بڑھ کر انہیں گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ اب کے بابو صاحب کے چہرے کا رنگ فق اور سیٹھ جی کے اس مبارک نظارے سے محظوظ ہونے کی باری تھی۔ گردھاری لال نے نشاط انگیز تالیاں تو نہ بجائیں مگر مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گئی۔ آج اس فتح کی خوشی میں منشی فیض الرحمٰن نے پہلے ہی سے ایک شاندار دعوت کی تیاریاں کی تھیں۔ مسٹر رام رکھا اس کے منتظم تھے۔ آج کی تقریر انہوں نے بڑی عرق ریزی سے تیار کی تھی۔ مگر اس وارنٹ نے ساری آرزوؤں کا خون کر دیا۔ بابو صاحب کے دوستوں میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو دس ہزار روپے کی ضمانت کر لیتا۔ ادا کر دینے کا ذکر ہی کیا۔ لیکن اگر ایسا ہوتا بھی تو سیٹھ جی اپنے کو بد نصیب نہ سمجھتے کیونکہ دس ہزار روپیہ اور میونسپلٹی کی ممتاز ممبری ہاتھ سے کھو کر انہیں اس وقت یہ شادمانی حاصل ہوئی تھی۔

(6)

مسٹر رام رکھا کے گھر میں جوں ہی یہ خبر پہنچی کہرام مچ گیا۔ ان کی بیوی پچھاڑ کھا کر زمین پر گر پڑی۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو رونے لگی اور رونے سے فرصت ہوئی تو اس نے گردھاری لال کو کوسنا شروع کیا۔ دیوتاؤں سے منت کر رہی تھی۔ انہیں رشوتیں دینے پر آمادہ تھی کہ وہ کسی طرح گردھاری لال کو نگل جائیں۔ اس کارِ عظیم میں گنگا اور جمنا سے مدد مانگ رہی تھی۔ پلیگ اور ہیضہ کی خوشامدیں کر رہی تھی کہ وہ دونوں مل کر اس گردھاری لال کو ہضم کر جائیں۔ مگر گردھاری لال کا کوئی قصور نہیں۔ قصور تمہارا ہے۔ بہت اچھا ہوا۔ تم اسی پوجا کے دیوتا تھے۔ کیا اب دعوتیں نہ کھلاؤ گے۔ میں نے تمہیں کتنا سمجھایا۔ روئی، روٹھی، بگڑی، مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ گردھاری لال نے بہت اچھا کیا۔ تمہیں سبق تو مل گیا۔ مگر اس کا بھی کوئی قصور نہیں۔ یہ سب آگ میں نے لگائی ہے۔ مخملی سلیپروں کے بغیر میرے پاؤں نہ اٹھتے تھے۔ جڑاؤ کڑوں کے بغیر مجھے نیند نہ آتی تھی۔ سیج گاڑی میرے ہی لیے بنوائی گئی تھی۔ انگریزی پڑھانے کے لیے میم صاحبہ کو میں نے ہی رکھا۔ غرض یہ سب کانٹے میں نے بوئے ہیں۔

مسز رام رکھا بہت دیر تک انہیں خیالات میں ڈوبی رہی۔ جب وہ رات بھر کروٹیں بدلنے کے بعد صبح کو اٹھی تو اس کے خیالات چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کے صرف ایک ہی مرکز پر جم گئے تھے۔ "گردھاری لال بڑا موذی ہے۔ اسے میرا سب کچھ لے کر بھی تسکین نہ ہوئی۔ اتنا بھی ظالم قصائی سے نہ دیکھا گیا۔" ان خیالات نے انتشار سے اجتماع کی صورت اختیار کر کے اس کے دل میں غصے کی آگ دہکا دی۔ سورج کی کرنیں جب ایک مرکز پر جمع ہو جاتی ہیں تو شعلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عورت کے دل میں رہ رہ کر غصے کا ایک بے قابو کر دینے والا جوش پیدا ہوتا تھا۔ بچے نے مٹھائی کے لیے ضد کی۔ اس پر برس پڑی۔ مہری نے چوکا برتن کر کے چولہے میں آگ جلا دی۔ اس کے پیچھے پڑ گئی۔ میں تو اپنے نصیبوں کو رو رہی ہوں۔ اس چڑیل کو روٹیوں کی دھن لگی ہے۔ آخر نو بجے اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے یہ خط لکھ کر اپنے دل کی بڑھاس نکالی۔

"سیٹھ جی! تمہیں اب اپنی دولت کے گھمنڈ نے اندھا کر دیا ہے۔ مگر کسی کا گھمنڈ یوں نہیں قائم رہتا۔ کبھی نہ کبھی سر ضرور نیچا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ کل شام جب تم نے میرے

پیارے پتی کو گرفتار کرایا ہے' میں وہاں موجود نہ تھی۔ ورنہ اپنا اور تمہارا خون ایک کر دیتی۔ تم دولت کے نشے میں بھولے ہوئے ہو۔ میں اسی دم تمہارا نشہ اتار دیتی۔ ایک عورت کے ہاتھوں ذلیل ہو کر تم پھر کبھی کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ خیر اس ظلم کا بدلہ تمہیں کسی نہ کسی طرح ضرور مل جائے گا۔ مجھے اس دن چین آئے گا جب تمہارے خاندان کا نام و نشان مٹ جائے گا اور تمہارا خاتمہ ہو جائے گا۔"

سیٹھ جی نے یہ پھٹکار پڑھی تو غصے سے آگ ہو گئے۔ اور گو کم ظرف و کمینہ آدمی نہ تھے مگر غصے کے عالم میں طبعی شرافت کا نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ خیال نہ رہا کہ گو بیہودہ گستاخانہ تحریر ہے مگر ایک مظلوم عورت کے دلی جذبات ہیں۔ اس کی بے کسی اور مجبوری پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ مرے ہوئے کو مارنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

(7)

اس کے تیسرے دن سیٹھ گردھاری لال پوجا کے آسن پر بیٹھے ہوئے تھے کہ مہرا نے آکر کہا۔ "سرکار! کوئی عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔" سیٹھ جی نے اندر سے پوچھا۔ "کون عورت ہے؟" مہرا نے جواب دیا۔ "سرکار! مجھے کیا معلوم۔ مگر ہے کوئی امیر زادی۔ ریشمی ساڑھی پہنے ہوئے ہے۔ ہاتھوں میں سونے کے کڑے ہیں۔ پیر میں ٹاٹ کا سلیپر ہے۔ بڑے گھر کی عورت معلوم ہوتی ہے۔"

یوں بالعموم سیٹھ جی پوجا کے وقت کسی سے نہیں ملتے تھے۔ خواہ کیسا ہی ضروری کام کیوں نہ ہو۔ عبادت الٰہی میں مکروہات روزگار کو راہ نہیں دیتے تھے مگر ایسی حالت میں کہ بڑے گھر کی عورت ملنے کے لیے آئے تو تھوڑی سی دیر کے لیے پوجا میں ہرج چنداں قابل شکایت نہیں سمجھتے تھے۔ نوکر سے کہا۔ "بلا لاؤ۔"

جب وہ عورت آئی تو سیٹھ جی فرط تعظیم سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ بعد ازاں نہایت ملائم' خلیق اور ہمدردانہ لہجہ سے بولے۔ "ماتا کہاں سے آنا ہوا؟" اور جب یہ جواب ملا کہ وہ اجودھیا سے آئی ہے تو آپ نے اسے دوبارہ ڈنڈوت کیا۔ اور قند و شکر سے زیادہ شیریں اور مکھن بالائی سے زیادہ چکنے الفاظ میں بولے۔ "اچھا۔ آپ سری اجودھیا جی سے آرہی ہیں! اس نگری کا کیا کہنا۔ دیوتاؤں کی بستی ہے۔ بڑے بھاگ تھے کہ آپ کے درشن ہوئے۔ یہاں آپ کا آنا کیسے ہوا؟"

عورت نے جواب دیا۔ "مکان تو میرا یہیں ہے۔"

سیٹھ جی کا منہ پھر کانِ حلاوت بنا۔ "اچھا تو آپ کا مکان اسی شہر میں ہے؟ تو آپ نے مایا جنجال کو تیاگ دیا؟ وہ تو میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا۔ ایسی پاک آتمائیں دنیا میں بہت تھوڑی ہیں۔ ایسی دیویوں کے درشن مبارک ہوتے ہیں۔ آپ نے مجھے درشن دیئے بڑا احسان کیا۔ میں اس لائق نہیں کہ آپ جیسی دیویوں کی کچھ خدمت کر سکوں۔ مگر جو کام میرے لائق ہو' جو کچھ میرے کئے ہو سکتا ہو' اس میں مجھے مطلق دریغ نہیں ہے۔ یہاں سیٹھ ساہو کاروں نے مجھے بہت بدنام کر رکھا ہے۔ میں سب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہوں۔ اگر کوئی بزرگ سن رسیدہ آدمی مجھ سے معاملہ کرنے آتا ہے تو یقین مانو مجھے اس کی زبان پھیرتے نہیں بنتی۔ کچھ تو بڑھاپے کا ادب' کچھ ان کی دل شکنی کا خوف' کچھ یہ خیال کہ کہیں یہ دغا بازوں کے پنجے میں نہ پھنس جائیں' مجھے ان کی فرمائشوں کی تعمیل پر مجبور کر دیتا ہے۔ میرا اصول ہے کہ اچھی جائیداد اور کم سود۔ مگر آپ سے اس قسم کی باتیں فضول ہیں۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔

میرے لائق جو کچھ کام ہو۔ اسکے لیے بسرو چشم حاضر ہوں۔"

بوڑھی عورت نے کہا۔ "میرا کام آپ ہی سے ہو سکتا ہے۔"

سیٹھ جی۔ (خوش ہو کر) "شوق سے کہئے۔"

عورت۔ "میں آپ کے سامنے بھکارنی بن کر آئی ہوں۔ آپ کے سوا کوئی میرا سوال نہیں پورا کر سکتا۔"

سیٹھ جی۔ "شوق سے کہئے۔"

بوڑھی عورت۔ "میرا سوال رد نہ کرنا۔ میں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔"

سیٹھ جی۔ "کہئے کہئے۔"

بوڑھی عورت۔ "آپ رام رکھا کو رہا کر دیجئے۔"

سیٹھ جی کا چہرہ مدھم پڑ گیا۔ سارے ہوائی قلعے جو ابھی تیار ہوئے تھے' منہدم ہو گئے۔ بولے۔ "اس نے مجھے نقصان پہنچایا ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑ کر چھوڑوں گا۔"

ماں۔ "کچھ میرا' میرے بڑھاپے کا' میرے ہاتھ پھیلانے کا' کچھ اپنی بڑائی کا خیال نہ کرو گے؟ بیٹا۔ ماتا بری چیز ہے۔ دنیا سے ناتا ٹوٹ جائے۔ دھن جائے۔ دھرم جائے۔ مگر لڑکے کی محبت دل سے نہیں جاتی۔ انقلاب زمانہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مگر لڑکے کی محبت ماں کے دل سے نہیں نکال سکتا۔ اس پر حاکم کا' بادشاہ کا' یہاں تک کہ ایشور کا بھی بس نہیں ہے۔ تم مجھ پر ترس کھاؤ۔ میرے لڑکے کی جان بخش دو۔ تمہیں بڑا ثواب ہو گا۔ میں جب تک جیوں گی۔ تمہیں دعا دیتی رہوں گی۔"

سیٹھ جی کا دل کچھ پسیجا۔ پتھر کی تہ میں پانی رہتا ہے۔ مگر مسز رام رکھا کے اس خط کا خیال آ گیا۔ بولے۔ "مجھے رام رکھا سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اگر انہوں نے مجھے نہ چھیڑا ہوتا۔ تو میں نہ بولتا آپ کے کہنے سے میں اب بھی ان کا قصور معاف کر سکتا ہوں۔ مگر ان کی بیوی نے جو خط میرے پاس بھیجا ہے' اسے دیکھ کر بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ دکھاؤں آپ کو؟"

رام رکھا کی ماں نے خط لے کر پڑھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی۔ "بیٹا! اس عورت نے مجھے بہت دکھ دیا ہے۔ اس نے مجھے دیس سے نکال دیا۔ اس کا مزاج اور زبان اس کے قابو میں نہیں۔ مگر اس وقت اس نے تم سے گستاخی کی ہے۔ اس کا تمہیں خیال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہوش کی چٹھی نہیں ہے۔ بیہوشی کا رونا ہے۔ تم اس سے درگزر کرو۔ تمہارا دیس دیس میں نام ہے۔ یہ نیکی تمہارے نام کو اور بھی روشن کر دے گی۔ مین تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ سارا حال رام رکھا سے لکھوا کر کسی مشہور اخبار میں چھپوا دوں گی۔ رام رکھا میرا کہنا نہیں ٹالے گا۔ تمہارے اس احسان کو وہ کبھی نہ بھولے گا۔ جس وقت یہ حالات اخباروں میں چھپیں گے تو ہزاروں آدمیوں کو تمہارے درشن کا شوق ہو گا۔ سرکار میں تمہاری بڑائی ہو گی۔ اور میں سچے دل سے کہتی ہوں کہ تمہیں جلد کوئی نہ کوئی جاگیر مل جائے گی۔ رام رکھا کی انگریزوں سے بہت دوستی ہے۔ وہ اس بات کو کبھی نہ ٹالیں گے۔

سیٹھ جی کے دل میں گدگدی پیدا ہو گئی۔ اگر اس سلوک سے پاک اور مبارک منزل قریب ہو جائے جس کے لیے ہزاروں خرچ کیے۔ ہزاروں ڈالیاں دیں۔ ہزاروں سلام بجا لائے۔ ہزاروں خوشامدیں کیں۔ خانساموں کی جھڑکیاں سہیں۔ بنگلوں کے چکر لگائے۔ آہ! اس کامیابی کے لیے ایسے ایسے کئی ہزار میں خرچ کر سکتا ہوں اور مجھے اس کام میں رام رکھا سے بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔ مگر ان خیالات کو ظاہر کرنے سے کیا فائدہ۔ بولے۔ "ماتا مجھے نام

نمود کی بہت پروا نہیں ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ مجھے تو آپ کی بات کا خیال ہے۔ جاگیر ملے تو لینے سے انکار نہیں۔ اور نہ ملے تو اس کی ہوس بھی نہیں ہے۔ مگر یہ تو بتایئے کہ میرے روپوں کا کیا بندوبست ہوگا؟ آپ کو معلوم ہوگا کہ میرے دس ہزار روپے آتے ہیں۔ رام رکھا کی ماں نے جواب دیا۔ "تمہارے روپوں کی ضمانت میں کرتی ہوں۔ یہ دیکھو بینک بنگال کی پاس بک ہے۔ اس میں پچیس ہزار روپیہ جمع ہے۔ اس روپے سے تم رام رکھا کو کوئی روزگار کرادو۔ تم اس دکان کے مالک رہو گے۔ رام رکھا کو اس کا منیجر بنا دینا۔ جب تک وہ تمہارے کہنے پر چلے تب تک نباہنا ورنہ دکان تمہاری ہے۔ مجھے اس میں سے کچھ نہیں چاہیے۔ میرا ایشور مالک ہے۔ رام رکھا اچھی طرح رہے اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔" یہ کہہ کر پاس بک سیٹھ جی کو دے دی۔ ماں کی اس اتھاہ محبت نے سیٹھ جی کو پھسلا دیا۔ پانی ابل پڑا۔ اور پتھر اس کے نیچے ڈھک گیا۔ ایسے پاک نظارے دیکھنے کے زندگی میں کب موقعے ملتے ہیں۔ سیٹھ جی کے دل میں فیاضی کی ایک لہر سی اٹھی۔ آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ جس طرح پانی کے بہاؤ سے کبھی کبھی باندھ ٹوٹ جاتا ہے' اسی طرح فیاضی کے اس جوش نے خود غرضی اور دنیاداری کے باندھ کو توڑ دیا۔ پاس بک بوڑھی عورت کو واپس دے کر بولے۔ "ماتا! یہ اپنی کتاب لو۔ مجھے اب زیادہ شرمندہ نہ کرو۔ یہ دیکھو میں رام رکھا کا نام بہی سے اڑا دیتا ہوں۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں نے اپنا سب کچھ پالیا۔ آج تمہارا رام رکھا تم کو مل جائے گا۔"

اس واقعہ کے دو سال بعد ٹاؤن ہال میں پھر ایک شاندار جلسہ ہوا۔ بینڈ بج رہا تھا۔ بیرقیں اور جھنڈیاں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ شہر کے تمام رؤسا جمع تھے۔ ٹینڈم فٹن اور موٹروں سے احاطہ بھرا ہوا تھا۔ یکایک ایک مشکی گھوڑوں کی فٹن احاطے میں داخل ہوئی۔ سیٹھ گردھاری لال عمامہ اور چغہ زیب بر کیے اس میں سے اترے۔ ان کے ساتھ ایک فیشن ایبل نوجوان' انگریزی سوٹ پہنے ہوئے مسکراتا ہوا اترا۔ یہ مسٹر رام رکھا تھے۔ وہ اب سیٹھ جی کی ایک خاص دکان کے منیجر تھے۔ محض منیجر نہیں۔ بلکہ مینجنگ پروپرائٹر سمجھنا چاہیے۔ دہلی کے دربار تاج پوشی میں سیٹھ جی کو بھی رائے بہادری کا خطاب عطا ہوا تھا۔ آج مجسٹریٹ ضلع اس کا باقاعدہ اعلان کریں گے اور رؤسا شہر کی جانب سے سیٹھ جی کو مبارک دینے کے لیے یہ جلسہ منعقد کیا گیا ہے۔ سیٹھ جی کی طرف سے شکریہ کا اظہار مسٹر رام رکھا کریں گے اور جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں۔ وہ بہت بے صبری سے اس موقع کا انتظار کر رہے ہیں۔

جلسہ ختم ہونے کے بعد سیٹھ جی رام رکھا کے ساتھ اپنے مکان پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج وہی بوڑھی عورت پھر ان سے ملنے آئی ہے۔ سیٹھ جی دوڑ کر رام رکھا کی ماں کے قدموں سے لپٹ گئے۔ ان کا دل اس وقت دریا کی طرح امڈا ہوا تھا۔

رام رکھا اینڈ فرینڈس کا کارخانہ شکر سازی بہت ترقی پر ہے۔ رام رکھا اب بھی اسی شان سے بسر کر رہے ہیں۔ مگر پارٹیاں کم دیتے ہیں اور دن بھر میں تین سے زیادہ سوٹ نہیں بدلتے۔ وہ اب اس خط کو جو ان کی بیوی نے سیٹھ جی کو لکھا تھا' دنیا کی ایک بہت بیش بہا چیز سمجھتے ہیں۔ اور مسز رام رکھا کو بھی اب غالباً سیٹھ جی کے نام و نشان مٹنے کی زیادہ آرزو نہیں ہے کیونکہ ابھی سال میں جب ان کے لڑکا پیدا ہوا تھا تو مسز رام رکھا نے اپنا طلائی کڑا دائی جنائی کی نذر کر دیا تھا اور منوں مٹھائی تقسیم کی تھی۔

یہ سب ہو گیا مگر وہ بات جو اَن ہونی تھی' نہ ہوئی۔ رام رکھا کی ماں اب بھی اجودھیا میں رہتی ہیں اور اپنی بہو کی صورت نہیں دیکھنا چاہتیں۔

وکرمادت کا تیغہ

(1)

بہت زمانہ گزرا۔ ایک روز پشاور کے موضع ماہ نگر میں قدرت کا ایک حیرت انگیز کرشمہ نظر آیا۔ اندھیری رات تھی۔ بستی سے کچھ دور برگد کے ایک سایہ دار درخت کے نیچے ایک شعلۂ آتشیں نمودار ہوا اور ایک جھلملاتی ہوئی شمع کی طرح نظر آنے لگا۔ گاؤں میں بہت جلد یہ خبر پھیل گئی۔ باشندے یہ عجیب و غریب نظارہ دیکھنے کے لیے جابجا اکٹھے ہوگئے۔ عورتیں جو کھانا پکا رہی تھیں ہاتھوں میں گوندھا ہوا آٹا لپیٹے باہر نکل آئیں۔ بوڑھوں نے بچوں کو کندھے پر بٹھا لیا۔ اور کھانستے ہوئے آ کھڑے ہوئے۔ نویلی بہوئیں حیا سے باہر نہ آسکیں مگر دروازوں کی دراڑوں سے جھانک جھانک کر اپنے بے قرار دلوں کو تسکین دینے لگیں۔ اس گنبد نما درخت کے نیچے تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں روشنی کا یہ دھندلا شعلہ ابرِ معصیت میں گھری ہوئی روح کی متشکل مثال پیش کر رہا تھا۔

ٹیک سنگھ نے عارفانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ بھوتوں کی سبھا ہو رہی ہے۔"

پنڈت چیت رام نے عالمانہ یقین کے ساتھ فرمایا۔ "تم کیا جانو؟ میں تہ پر پہنچ گیا۔ سانپ من چھوڑ کر چرنے گیا ہے۔ اس میں جسے شک ہو جا کر دیکھ آئے۔"

منشی گلاب چند بولے۔ "اس وقت جو وہاں جا کر من کو اٹھا لائے۔ اس کے راجہ ہونے میں شک نہیں۔ مگر جان جوکھوں ہے۔"

پریم سنگھ ایک بوڑھا جاٹ تھا۔ وہ ان مہاتماؤں کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

(2)

پریم سنگھ دنیا میں بالکل اکیلا تھا۔ اس کی ساری عمر معرکہ آرائیوں میں صرف ہوئی تھی۔ مگر جب زندگی کی شام آئی اور وہ صبح کی زندگی کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑے میں پھر آیا تو اس کے دل میں ایک عجیب خواہش پیدا ہوئی۔ افسوس! دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ کاش میرے بھی کوئی بچہ ہوتا۔ جو خواہش شام کے وقت طائروں کو گھونسلوں میں کھینچ لاتی ہے اور جس خواہش سے بے قرار ہو کر جانور شام کو اپنے تھانوں کی طرف چلتے ہیں' وہی خواہش پریم سنگھ کے دل میں موجیں مارنے لگی۔ ایسا کوئی نہیں جو صبح کے وقت دادا کہہ کر اس کے گلے میں لپٹ جائے۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ کھانے کے وقت لقمے بنا بنا کر کھلائے۔ ایسا کوئی نہیں جسے وہ رات کے وقت لوریاں سنا کر سلائے۔ یہ آرزوئیں پریم سنگھ کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھیں۔ مگر سارے دن کی تنہائی ایسی غمناک نہیں ہوتی جیسی شام کی۔

ایک روز پریم سنگھ بازار گیا ہوا تھا۔ راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک گھر میں آگ لگی ہوئی ہے۔ آگ کے بلند اور خوفناک شعلے ہوا میں اپنے پھریرے لہرا رہے ہیں۔ اور ایک عورت دروازے پر کھڑی سر پیٹ پیٹ کر رو

رہی ہے۔ یہ غریب بیوہ عورت تھی۔ اس کا بچہ اندر سو رہا تھا کہ گھر میں آگ لگ گئی۔ وہ دوڑی تھی کہ گاؤں کے آدمیوں کو آگ بجھانے کے لیے بلائے۔ کہ اتنے میں آگ نے زور پکڑ لیا۔ اور اب شعلہ ہائے سوزاں کا امڈا ہوا دریا اسے اس کے پیارے بچے سے الگ کئے ہوئے تھا۔ پریم سنگھ کے دل میں اس عورت کی دردناک آہیں چبھ گئیں۔ وہ بے خوف آگ میں گھس گیا اور سوتے ہوئے بچے کو گود میں لے کر باہر نکل آیا۔ بیوہ عورت نے بچے کو گود میں لے لیا اور اس کے نازک رخساروں کو بار بار چوم کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔ اور بولی۔ "مہاراج! تم جو کوئی ہو۔ میں آج اپنا پیارا بچہ تمہیں بھینٹ کرتی ہوں۔ تمہیں ایشور نے اور بھی لڑکے دیئے ہوں گے۔ انہیں کے ساتھ اس یتیم کی بھی خبر لیتے رہنا۔ تمہارے دل میں رحم اور ترس ہے۔ میرا سب کچھ اگن دیوی نے لے لیا۔ اب اس تن پر کے کپڑے کے سوا میرے پاس اور کوئی چیز نہیں۔ میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لوں گی۔ یہ بچہ اب تمہارا ہے۔"

پریم سنگھ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ بولا۔ "بیٹی ایسا نہ کہو۔ تم میرے گھر چلو۔ اور ایشور نے جو کچھ روکھا سوکھا دیا ہے وہ کھاؤ۔ میں بھی دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ کوئی پانی دینے والا نہیں۔ کیا جانے پرماتما نے اسی بہانے سے ہم لوگوں کو ملایا ہو۔"

شام کے وقت پریم سنگھ گھر لوٹا تو اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا گلعذار بچہ تھا۔ اور پیچھے پیچھے ایک زرد اور مرجھائی ہوئی عورت۔ آج پریم سنگھ کا گھر آباد ہوا۔ آج سے اسے کسی نے شام کے وقت ندی کے کنارے خاموش بیٹھے نہیں دیکھا۔

اسی بچے کے لیے سانپ کا من لانے کا قصد کر کے پریم سنگھ آدھی رات کے وقت کمر سے تلوار لگائے۔ چونک چونک کر قدم رکھتا برگد کے درخت کی طرف روانہ ہوا۔

جب درخت کے نیچے پہنچا۔ تو من کی دمک زیادہ صاف نظر آنے لگی۔ مگر سانپ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ پریم سنگھ بہت خوش ہوا۔ سمجھا۔ شاید سانپ کہیں چرنے گیا ہے مگر جب من کو لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں صاف زمین کے سوا اور کوئی چیز نہ دکھائی دی۔ بوڑھے جاٹ کا کلیجہ سَن سے ہو گیا۔ اور بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یکایک اسے اپنے سامنے کوئی چیز لٹکتی ہوئی نظر آئی۔ پریم سنگھ نے تیغہ کھینچ لیا اور اس کی طرف لپکا۔ مگر دیکھا تو وہ برگد کی جٹا تھی۔ اب پریم سنگھ کا خوف بالکل دور ہو گیا۔ اس نے اس جگہ کو جہاں سے روشنی کی لو نکل رہی تھی' اپنی تلوار سے کھودنا شروع کیا۔ جب ایک بالشت زمین کھد گئی تو تلوار کسی چیز سے ٹکرائی اور لو بھبک اٹھی۔ یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا۔ مگر پریم سنگھ کے ہاتھ میں آتے ہی اس کی شمع گوں چمک غائب ہو گئی۔

(3)

یہ ایک چھوٹا سا تیغہ تھا۔ مگر نہایت آب دار۔ اس کے دستے میں بیش قیمت جواہرات جڑے ہوئے تھے اور دستے کے اوپر "وکرمادت" منقوش تھا۔ یہ وکرمادت کا تیغہ تھا۔ اس وکرمادت کا جو بھارت کا آفتاب بن کر چمکا۔ جس کے گن اب تک گھر گھر گائے جاتے ہیں۔ اس تیغے نے بھارت کے زندہ جاوید کالی داس کی صحبتیں دیکھی ہیں۔ جس وقت وکرمادت راتوں کو بھیس بدل کر درد دکھ کی کہانی اپنے کانوں سے سننے اور جور و جبر کے کرشمے اپنی درد رس آنکھوں سے دیکھنے کے لئے نکلتے تھے تو یہی تیغۂ آب دار ان کے پہلو کی زینت ہوا کرتا تھا۔ جس رحم و انصاف نے

وکرمادت کانام اب تک زندہ رکھا ہے' اس میں یہ تیغہ بھی ان کا ہمدرد اور شریک تھا۔ یہ ان کے ساتھ اس تخت پر جلوہ افروز ہوتا تھا جس پر راجہ بھوج کو بھی بیٹھنا نہ نصیب ہوا۔

اس تیغے میں غضب کی چمک تھی۔ مدت دراز تک زمین کے نیچے دفن رہنے پر بھی اس پر زنگ کا نام نہ تھا۔ اندھیرے گھروں میں اس سے اجالا ہو جاتا تھا۔ رات بھر درخشاں تارے کی طرح جگمگاتا رہتا۔ جس طرح چاند پردۂ ابر میں چھپ جاتا ہے مگر اس کی مدھم روشنی چھن چھن کر آتی ہے' اسی طرح غلاف کے اندر سے اس تیغے کی شعاعیں شوخ نگاہیاں کیا کرتی تھیں۔

جب کوئی شخص اسے ہاتھ میں لے لیتا۔ تو اس کی چمک غائب ہو جاتی تھی۔ اس کا یہ وصف دیکھ کر لوگ دنگ رہ جاتے تھے۔

ہندوستان میں ان دنوں شیر پنجاب کی للکار گونج رہی تھی۔ رنجیت سنگھ سخاوت و شجاعت اور رحم و انصاف میں اپنے وقت کے وکرمادت تھے۔ اس مغرور کابل کا غرور جس نے صدیوں تک ہندوستان کو سر نہیں اٹھانے دیا تھا' خاک میں ملا کر لاہور جاتے تھے۔ ماہ نگر کا پُرفضا میدان اور درختوں کا دلآویز جمگھٹ دیکھا تو وہیں پڑاؤ ڈال دیا۔ بازار آراستہ ہوگئے۔ خیمے اور شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ جب رات ہوئی تو پچیس ہزار چولھوں کا سیاہ دھواں سارے میدان اور باغیچے پر چھا گیا اور اس دھوئیں کے آسمان میں چولھوں کی آگ قندیلیں اور مشعلیں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ گویا اندھیری رات میں آسمان پر تارے نکل آئے ہیں۔

(4)

شاہی فرودگاہ سے گانے بجانے کی پُرشور اور پُرجوش آوازیں آ رہی تھیں۔ سکھ سرداروں نے سرحدی مقامات پر صدہا افغانی عورتیں گرفتار کرلی تھیں۔ جیسا ان دنوں لڑائیوں میں عام طور پر ہوا کرتا تھا۔ وہی عورتیں اس وقت سایہ دار درختوں کے نیچے قدرتی فرش سے سجی ہوئی محفل میں اپنی بے سری تانیں الاپ رہی تھیں۔ اور اہل محفل جنہیں نغمہ کا لطف اٹھانے کی اتنی خواہش نہ تھی۔ جتنی ہنسنے اور خوش ہونے کی۔ خوب زور زور سے قہقہے لگا لگا کر ہنس رہے تھے۔ کہیں کہیں منچلے سپاہیوں نے سوانگ بھرے تھے۔ وہ چند مشعلیں اور سینکڑوں تماشائیوں کا ہجوم ساتھ لئے ادھر ادھر خوش فعلیاں کرتے پھرتے تھے۔ ساری فوج کے دلوں میں بیٹھ کر فتح کی دیوی اپنے جلوس دکھا رہی تھی۔

رات کے نو بجے ہوں گے کہ ایک آدمی کالا کمبل اوڑھے ایک بانس کا سونٹا لئے شاہی خیمے سے باہر نکلا اور بستی کی طرف آہستہ آہستہ چلا۔ آج ماہ نگر بھی مسرت سے اینڈ رہا ہے۔ دروازوں پر کئی کئی بتیوں والے فتیل سوز روشن ہیں۔ دروازوں کے صحن جھاڑ کر صاف کر دئے گئے ہیں۔ دو ایک جگہ شہنائیاں بج رہی ہیں۔ اور کہیں کہیں لوگ بھجن گا رہے ہیں۔ کالی کملی والا مسافر ادھر ادھر دیکھتا بھالتا گاؤں کی چوپال میں جا پہنچا۔ چوپال خوب سجی ہوتی تھی۔ اور گاؤں کے معززین بیٹھے ہوئے اس اہم مسئلے پر بحث کر رہے تھے کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں کونسا تحفہ پیش کیا جائے۔ آج مہاراجہ نے اس گاؤں کو اپنے قدموں سے روشن کیا ہے۔ تو کیا اس گاؤں کے بسنے والے مہاراج کے قدموں کو بوسہ نہ دیں گے! ایسے مبارک موقعے کہاں آتے ہیں! سب لوگ سر جھکائے متفکر

بیٹھے تھے۔ کسی کی عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ وہاں انمول جواہرات کی کشتیاں کہاں؟ کامل گھنٹہ بھر تک کسی نے سر نہ اٹھایا۔ یکایک بوڑھا پریم سنگھ کھڑا ہو گیا۔ اور بولا۔ "اگر آپ لوگ پسند کریں۔ تو میں بکرما جیت کی تلوار نذرانہ کے لئے دے سکتا ہوں۔"

اتنا سنتے ہی سب کے سب آدمی فرط مسرت سے اچھل پڑے۔ اور ایک ہلڑ سا مچ گیا۔ اتنے میں ایک مسافر کالی کملی اوڑھے چوپال کے اندر آیا۔ اور ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"بھائیو! واہ گورہ کی جے"! چیت رام بولے۔ "تم کون ہو؟"

مسافر۔ "راہی آدمی ہوں۔ پشاور جانا ہے۔ رات زیادہ آگئی ہے اس لئے یہیں لیٹ رہوں گا۔"

ٹیک سنگھ۔ "ہاں ہاں۔ آرام سے سوؤ۔ چارپائی کی ضرورت ہو تو منگادوں؟"

مسافر۔ "نہیں۔ آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ میں اسی ٹاٹ پر لیٹ رہوں گا۔ ابھی آپ لوگ بکرما جیت کی تلوار کی کچھ بات چیت کر رہے تھے۔ یہی سن کر چلا آیا۔ ورنہ باہر ہی پڑا رہتا۔ کیا یہاں کسی کے پاس بکرما جیت کی تلوار ہے؟"

مسافر کے لب و لہجہ سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی ہے۔ اس کی آواز میں وہ کشش تھی جو کانوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی ہے۔ سب کی آنکھیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ پنڈت چیت رام بولے۔ "جی ہاں کچھ عرصہ ہوا۔ مہاراج وکرمادت کا تیغہ زمین سے نکلا ہے۔"

مسافر۔ "یہ کیونکر معلوم ہوا۔ کہ یہ تیغہ انہیں کا ہے؟"

چیت رام۔ "اس کے دستے پران کا نام کھدا ہوا ہے۔"

مسافر۔ "ان کی تلوار تو بہت بڑی ہو گی؟"

چیت رام۔ "نہیں۔ وہ تو ایک چھوٹا سا نیچہ ہے۔"

مسافر۔ "تو پھر اس میں کوئی خاص وصف ہو گا۔"

چیت رام۔ "جی ہاں۔ اس کے گن انمول ہیں۔ دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ جہاں رکھ دو' اس میں جلتے چراغ کی سی روشنی پیدا ہو جاتی ہے۔"

مسافر۔ "افوہ!"

چیت رام۔ "مگر جونہی کوئی آدمی اسے ہاتھ میں لے لیتا ہے اس کی ساری چمک دمک غائب ہو جاتی ہے۔"

یہ عجیب بات سن کر اس مسافر کی وہی کیفیت ہو گئی۔ جو ایک حیرت انگیز کہانی سننے سے بچوں کی ہو جایا کرتی ہے۔ اس کی آنکھ اور انداز سے بے صبری ظاہر ہونے لگی۔ جوش سے بولا۔ "وکرمادت تمہارے پرتاپ پر دھنیہ ہے۔"

ذرا دیر کے بعد پھر بولا۔ "وہ کون بزرگ ہیں۔ جن کے پاس یہ انمول چیز ہے؟"

پریم سنگھ نے فخریہ انداز سے کہا۔ "میرے پاس ہے۔"

مسافر۔ "کیا میں اسے دیکھ سکتا ہوں؟"

پریم سنگھ۔ "ہاں۔ میں آپ کو سویرے دکھادوں گا۔ مگر نہیں ٹھہریئے' سویرے تو ہم اسے مہاراج رنجیت سنگھ کی بھینٹ کریں گے۔ آپ کا جی چاہے۔ تو اسی وقت دیکھ لیجئے۔"

دونوں آدمی چوپال سے چل کھڑے ہوئے۔ پریم سنگھ نے مسافر کو اپنے گھر میں لے جا کر تیغے کے پاس کھڑا کر دیا۔ اس کمرے میں چراغ نہ تھا۔ مگر سارا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ مسافر نے پُرجوش آواز سے کہا۔ "وکرمادت! تمہارے پرتاب کو دھنیہ ہے۔ اتنا زمانہ گزرنے پر بھی تمہاری تلوار کا تیج کم نہیں ہوا۔"

یہ کہہ کر اس نے فرط شوق سے ہاتھ بڑھا کر تیغے کو پکڑ لیا۔ مگر اس کا ہاتھ لگتے ہی تیغے کی چمک جاتی رہی۔ اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔

مسافر نے فوراً تیغے کو تخت پر رکھ دیا۔ اس کا چہرہ اب بہت اداس ہو گیا تھا۔ اس نے پریم سنگھ سے کہا۔ "کیا تم یہ تیغہ رنجیت سنگھ کی بھینٹ دو گے؟ وہ اسے ہاتھ میں لینے کے قابل نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر مسافر تیزی سے باہر نکل آیا۔ برندا دروازے پر کھڑی تھی۔ مسافر نے اس کے چہرے کی طرف ایک بار غور سے دیکھا۔ مگر کچھ بولا نہیں۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ مگر فوج میں شور و غل بدستور جاری تھا۔ ہنگامۂ مسرت نے نیند کو سپاہیوں کی آنکھوں سے دور بھگا دیا۔ اگر کوئی انگڑائی لیتا یا اونگھتا نظر آ جاتا ہے تو اہل مجلس اسے ایک ٹانگ سے کھڑا کر دیتے ہیں۔ یکایک یہ خبر مشہور ہوئی کہ مہاراج اسی وقت کوچ کریں گے۔ لوگ تعجب میں آ گئے کہ مہاراج نے کیوں اس اندھیر رات میں سفر کرنے کی ٹھانی ہے۔ اس خوف سے کہ فوج کو اسی وقت کوچ کرنا پڑے گا' چاروں طرف کھلبلی سی مچ گئی۔ وہ خود چند آزمودہ کار سرداروں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ اس کا سبب کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

جس طرح بند ٹوٹ جانے سے تالاب کا پانی قابو سے باہر ہو کر زور شور کے ساتھ بہ نکلتا ہے' اسی طرح مہاراج کے جاتے ہی فوج کے افسر اور سپاہی خرمستیاں کرنے لگے۔

(5)

برندا کو بیوہ ہوئے تین سال گذرے ہیں۔ اس کا شوہر ایک بے فکر اور رنگین مزاج آدمی تھا۔ گانے بجانے کا اسے عشق تھا۔ گھر کی جو کچھ جمع جتھا تھی' وہ سرسوتی اور اس کے پجاریوں کی بھینٹ کر دی۔ تین لاکھ کی جائیداد تین سال کے لئے بھی کافی نہ ہو سکی۔ مگر اس کا مدعا پورا ہو گیا۔ سرسوتی دیوی نے اسے دعا دی۔ فن نغمہ میں اس نے ایسا کمال کیا کہ اچھے اچھے گنی استاد اس کے سامنے زبان کھولتے ڈرتے تھے۔ گانے کا جس قدر شوق تھا' اتنی ہی محبت اسے برندا سے تھی۔ اس کی جان اگر گانے میں بستی تھی تو دل برندا کی محبت سے لبریز تھا۔ پہلے مذاقاً اور پھر تفریحاً اس نے برندا کو کچھ گانا سکھایا۔ یہاں تک کہ اس کو بھی اس آب حیات کی لذت مل گئی۔ اور اگرچہ اس کے شوہر کو مرے تین سال گزر گئے ہیں اور اس نے لطائف دنیا کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ یہاں تک کہ کسی نے اس کے گلاب کے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جھلک نہیں دیکھی۔ مگر گانے کی طرف ابھی تک اس کی طبیعت مائل تھی۔ اس کی طبیعت جب کبھی ایام رفتہ کی یاد سے اداس ہوتی ہے تو وہ کچھ گا کر جی بہلا لیتی ہے۔ لیکن گانے سے اس کا مقصد حظ نفس نہیں ہوتا۔ بلکہ جب کوئی دلکش راگ الاپنے لگتی ہے تو خیال میں اپنے شوہر کو خوشی سے مسکراتے ہوئے دیکھتی ہے۔ وہ خیالی تصویر اسے داد دیتی ہوئی نظر آتی ہے۔ گانے سے اس کا مدعا اپنے جنت نصیب شوہر کی یاد کو تازہ کرنا ہے۔ گانا اس کے

نزدیک پتی برت دھرم کا نباہ ہے۔

تین پہر رات جا چکی ہے۔ آسمان پر چاند کی روشنی ماند ہو چکی ہے۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھایا ہوا ہے۔ اور اس خیال افزا سناٹے میں برندا زمین پر بیٹھی ہوئی مدھم سروں میں گا رہی ہے:

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

برندا کی آواز میں لوچ بھی ہے اور درد بھی۔ اس میں بے چین دل کو تسکین دینے والی قوت بھی ہے اور سوئے ہوئے جذبات کو جگانے کی طاقت بھی۔ صبح کے وقت شفق میں سر اٹھائے ہوئے نخل گل پر بیٹھ کر گانے والی بلبل کی چہک میں بھی یہ ملاحت نہیں ہوتی۔ یہ وہ نغمہ ہے جسے سن کر اہلِ صفا وجد کرنے لگتے ہیں۔ اس کی تان کانوں کو چھیدتی ہوئی جگر میں جا پہنچتی ہے۔

بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر
میں بوری پگ پر بھٹکوں کاہو کی کچھ ناہیں کھبر
بتا دے کوئی پریم نگر کی ڈگر

یکا یک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور کئی آدمی پکارنے لگے۔ ''کس کا مکان ہے؟ دروازہ کھولو۔'' برندا چپ ہو گئی۔ پریم سنگھ نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ دروازے کے صحن میں سپاہیوں کا ایک ہجوم تھا۔ دروازہ کھلتے ہی کئی سپاہی دہلیز میں گھس آئے اور بولے۔ ''تمہارے گھر میں کوئی گائن رہتی ہے۔ ہم اس کا گانا سنیں گے۔''

پریم سنگھ نے کڑی آواز میں کہا۔ ''ہمارے یہاں کوئی گائن نہیں ہے۔''

اس پر کئی سپاہیوں نے پریم سنگھ کو پکڑ لیا۔ اور بولے۔ ''تیرے گھر سے گانے کی آواز آتی تھی۔''

ایک سپاہی۔ ''بتلاتا کیوں نہیں رے۔ کون گا رہا تھا؟''

پریم سنگھ۔ ''میری لڑکی گا رہی تھی۔ مگر وہ گائن نہیں ہے۔''

سپاہی۔ ''کوئی ہو۔ ہم تو آج گانا سنیں گے۔''

غصہ سے پریم سنگھ کانپنے لگا۔ ہونٹ چبا کر بولا۔ ''یارو ہم نے بھی اپنی زندگی فوج میں کاٹی ہے مگر کبھی ——''

اس ہنگامے میں پریم سنگھ کی بات کسی نے نہ سنی۔ ایک نوجوان جاٹ نے جس کی آنکھیں نشے سے سرخ ہو رہی تھیں، للکار کر کہا۔ ''اس بڈھے کی مونچھیں اکھاڑ لو۔''

برندا آنگن میں پتھر کی مورت کی طرح کھڑی یہ کیفیت دیکھ رہی تھی۔ جب اس نے دو سپاہیوں کو پریم سنگھ کی مونچھ پکڑ کر کھینچتے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ بے خوف سپاہیوں کے بیچ میں گھس آئی اور بلند آواز میں بولی۔ ''کون میرا گانا سننا چاہتا ہے؟''

سپاہیوں نے اسے دیکھتے ہی پریم سنگھ کو چھوڑ دیا اور بولے۔ ''ہم سب تیرا گانا سنیں گے۔''

برندا۔ ''اچھا بیٹھ جاؤ۔ میں گاتی ہوں۔''

اس پر کئی سپاہیوں نے ضد کی کہ اسے پڑاؤ لے چلو۔ وہاں خوب رنگ جمے گا۔

جب برندا سپاہیوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف چلی تو پریم سنگھ نے کہا۔ ''برندا ان کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا۔''

برندا جب پڑاؤ پر پہنچی تو وہاں خرمستیوں کا ایک طوفان برپا تھا۔ فتح کی دیوی غنیم کو پامال کر کے اب فاتحوں کی

انسانیت اور شرافت کو پاؤں سے کچل رہی تھی۔ حیوانیت کا خونخوار شیر غنیم کے خون سے آسودہ نہ ہو کر اب انسانی جذبات کا خون چوس رہا تھا۔ برندا کو لوگ ایک سجے ہوئے خیمے میں لے گئے۔ یہاں فرشی گلاس روشن تھے اور بادۂ آتشین کے دور چل رہے تھے۔ برندا اس بچہ گوسفند کی طرح جو خونخوار درندوں کے پنجے میں پھنس جاتا ہے' فرش کے ایک گوشے پر سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ نفسانیت کا بھوت جو اس وقت دلوں میں اپنی شیطانی فوج آراستہ کئے بیٹھا تھا' کبھی آنکھوں کی کمان سے تیز آبرو ریز تیر چلاتا اور کبھی منہ کی کمان سے جگر دوز تیروں کی بوچھاڑ کرتا۔ زہریلی شراب میں بجھے ہوئے یہ تیر برندا کے نازک اور پاکیزہ دل کو چھیدتے ہوئے پار ہو جاتے تھے۔ وہ سوچ رہی تھی۔ ''اے دروپدی کی لاج رکھنے والے کرشن بھگوان! تم نے دھرم کے بندھن سے بندھے ہوئے پانڈوؤں کے ہوتے ہوئے دروپدی کی لاج رکھی تھی۔ میں تو دنیا میں بالکل بے کس ہوں۔ کیا میری لاج نہ رکھو گے؟'' یہ سوچتے ہوئے اس نے میرا کا یہ مشہور بھجن گایا۔

سیار گھو بیر بھروسو ایسو

برندا نے یہ گیت بڑے دلکش انداز سے گایا۔ اس کے میٹھے سروں میں میرا کا انداز پیدا ہو گیا تھا۔ ظاہری حیثیت سے وہ بادہ نوش سپاہیوں کے روبرو گا رہی تھی۔ مگر عالم خیال میں وہ مرلی والے شیام کے روبرو ہاتھ باندھے کھڑی اس سے التجا کر رہی تھی۔

ذرا دیر کے لئے اس پُر شور محل میں عالم سکوت طاری ہو گیا۔ انسان کے دل میں بیٹھے ہوئے حیوان پر بھی پریم کی یہ دل سوز صدا اپنا جادو چلا گئی۔ نغمۂ لطیف فیل مست کو بھی رام کر لیتا ہے۔ پورے گھنٹہ بھر تک برندا نے سپاہیوں کو بے حس و حرکت رکھا۔ یکایک گھڑیال نے پانچ بجائے۔ سپاہی اور سردار سب چونک پڑے۔ سب کا نشہ ہرن ہو گیا۔ چالیس فرسنگ کی منزل طے کرنی ہے۔ پھرتی کے ساتھ روانگی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ خیمے اکھڑنے لگے۔ سواروں نے گھوڑوں کو دانہ کھلانا شروع کیا۔ ایک بھاگڑ سی مچ گئی۔ ادھر آفتاب نکلا۔ ادھر فوج نے نقارۂ کوچ بجا دیا۔ شام کو اس میدان کا ایک ایک گوشہ آباد تھا۔ صبح کو وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف ٹوٹے پھوٹے گھڑے' چولھوں کی راکھ اور خیموں کی میخوں کے نشان اس خدم و حشم کی یادگار باقی ہے۔

برندا نے جب اہلِ محفل کو روانگی کی تیاریوں میں مصروف دیکھا تو وہ خیمے سے باہر نکل آئی۔ کوئی مزاحم نہ ہوا۔ مگر اس کا دل دھڑک رہا تھا کہ کہیں کوئی آکر پھر نہ پکڑ لے۔ جب وہ درختوں کے جھرمٹ سے باہر پہنچی تو اس کی جان میں جان آئی۔ بڑا سہانا موسم تھا۔ ہوائے دلنواز مستانہ وار درختوں کے پتوں پر محوِ خرام تھی اور افقِ مشرق میں شہ خورشید کے استقبال کے لئے سرخ مخمل کا فرش بچھایا جا رہا تھا۔ برندا نے آگے قدم بڑھانا چاہا۔ مگر اس کے پاؤں نہ اٹھے۔ پریم سنگھ کی یہ بات کہ سپاہیوں کے ساتھ جاتی ہو تو پھر اس گھر میں قدم نہ رکھنا' اسے یاد آگئی۔ اس نے ایک لمبی سانس لی اور زمین پر بیٹھ گئی۔ دنیا میں اب اس کے لئے کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

اس بے کس چڑیا کی حالت کیسی دردناک ہے جو دل میں شوقِ پرواز لئے ہوئے بندِ صیاد سے نکل آتی ہے۔ مگر آزاد ہو کر اسے معلوم ہوتا ہے کہ بے رحم صیاد نے اس کے پروں کو کاٹ دیا ہے۔ وہ درختوں کی سایہ فگن ڈالیوں کی طرف بار بار حسرت ناک نگاہوں سے دیکھتی ہے۔ مگر پر پرواز نہیں کھول سکتی اور ایک بے بسی کے عالم میں سوچنے لگتی ہے۔ کہ کاش صیاد مجھے پھر اپنے قفس میں قید کر لیتا۔ برندا کی حالت بھی اس وقت ایسی ہی دردناک تھی۔ برندا کچھ دیر تک خیال میں ڈوبی بیٹھی رہی۔ پھر وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ پریم سنگھ کے دروازے پر آئی۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مگر وہ اندر قدم نہ رکھ سکی۔ اس نے درودیوار کو آرزومند نگاہوں سے دیکھا اور پھر جنگل کی طرف چلی گئی۔

(6)

شہر لاہور کے ایک ممتاز حصے میں عین سر راہ ایک خوش قطع صاف ستھرا سہ منزلہ مکان ہے۔ سرسبز اور خوش نما پھولوں والی مادھوی نے اس کی دیواروں اور محرابوں کو خوب سجادیا ہے۔ اسی مکان میں ایک امیرانہ انداز سے سجے ہوئے کمرے کے اندر برندا ایک مخملی قالین پر بیٹھی ہوئی اپنی خوش رنگ اور خوشنوا مینا کو پڑھا رہی ہے۔ کمرے کی دیواروں پر ہلکے سبز رنگ کی قلعی ہے۔ خوش نما دیوار گیریاں۔ خوبصورت تصویریں مناسب موقعوں پر زیب دے رہی ہے۔ صندل اور خس کی جانفزا خوشبو کمرے میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی پنکھا جھل رہی ہے۔ مگر اس تکلف اور سامان عیش کے باوجود برندا کا چہرہ اداس ہے۔ اس کا چہرہ اب اور بھی زرد نظر آتا ہے۔ مولسری کا پھول مرجھا گیا ہے۔

برندا اب لاہور کی مشہور گانے والیوں میں ہے۔ اسے اس شہر میں آئے تین مہینے سے زیادہ نہیں ہوئے۔ مگر اتنے ہی دنوں میں اس نے عام شہرت حاصل کرلی ہے۔ یہاں اس کا نام شاما مشہور ہے۔ اتنے بڑے شہر میں جس سے شامابائی کا پتہ پوچھو' وہ یقیناً بتادے گا۔ شاما کی آواز اور انداز میں کوئی موہنی ہے۔ جس نے شہر میں ہر خاص وعام کو اپنا شیدائی بنا رکھا ہے۔ لاہور میں باکمال گانے والیوں کی کمی نہیں ہے۔ لاہور اس زمانے میں ہر فن اور کمال کا مرکز تھا۔ مگر کوئلیں اور بلبلیں بہت تھیں۔ شاما صرف ایک تھی۔ وہ دھرپد زیادہ گاتی تھی۔ اس لئے لوگ اسے دھرپدی شاما کہتے تھے۔

لاہور میں میاں تان سین کے خاندان کے کئی اہل کمال ہیں۔ جو راگ اور راگنیوں میں باتیں کرتے ہیں۔ وہ شاما کا گانا پسند نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاما کا گانا اکثر غلط ہوتا ہے۔ اسے راگ اور راگنیوں کی تمیز نہیں۔ مگر ان کی حرف گیریوں کا کسی پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ شاما غلط گائے یا صحیح گائے۔ وہ جو کچھ گاتی ہے لوگ اسے سن کر مست ہو جاتے ہیں۔ اس کا راز یہ ہے کہ شاما ہمیشہ دل سے گاتی ہے اور جن جذبات کا وہ اظہار کرتی ہے' انہیں خود بھی محسوس کرتی ہے۔ وہ کٹھ پتلیوں کی طرح تلی ہوئی اداؤں کی نقل نہیں کرتی۔ اب اس کے بغیر محفلیں سونی رہتی ہیں۔ ہر محفل میں اس کا وجود ہونا لازمی ہو گیا ہے۔ وہ چاہے اشلوک ہی گائے۔ مگر اس کے بغیر ضیافت طبع کا سامان پورا نہیں ہوتا۔ تلوار کی باڑھ کی طرح وہ محفلوں کی جان ہے۔ اس نے عوام کے دلوں میں یہاں تک گھر کرلیا ہے کہ جب وہ اپنی پالکی پر ہوا کھانے نکلتی ہے تو اس پر چاروں طرف سے پھولوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔ مہاراج رنجیت سنگھ کو کابل سے لوٹے ہوئے تین مہینے گذر گئے۔ مگر ابھی تک فتح کی خوشی میں کوئی جلسہ نہیں ہوا۔ واپسی کے بعد کئی دن تک تو مہاراج کسی وجہ سے اداس تھے۔ بعد ازاں ان کے مزاج میں یکا یک ایک تغیر واقع ہوا۔ انہیں کابل کے ذکر سے نفرت سی ہو گئی۔ جو کوئی انہیں اس فتح پر مبارک باد دینے جاتا' اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ وہ روحانی مسرت جو موضع ماہ نگر تک ان کے چہرے سے جھلکتی تھی' اب وہاں نہ تھی۔ تسخیر کابل ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو تھی۔ وہ مہم جو ایک ہزار سال تک ہندو راجاؤں کے امکان خیال سے بھی بعید تھی' ان کے ہاتھوں سر

ہوئی۔ جس ملک نے ہندوستان کو ایک ہزار برس تک زیر نگین رکھا' وہاں ہندو قوم کا پھریرا رنجیت سنگھ نے اڑایا۔ غزنی اور کابل کی پہاڑیاں انسانی خون سے لال ہوگئیں۔ مگر رنجیت سنگھ خوش نہیں ہے۔ ان کے مزاج کی کایاپلٹ کا راز کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اگر کچھ سمجھتی ہے تو برندا سمجھتی ہے۔

تین مہینے تک مہاراج کی یہی کیفیت رہی۔ بعد ازاں ان کا مزاج اپنے اصلی رنگ پر آنے لگا۔ ہوا خواہانِ دربار اس موقع کے منتظر تھے۔ ایک روز انہوں نے مہاراج سے ایک شاندار جلسہ کرنے کی استدعا کی۔ پہلے تو وہ بہت برہم ہوئے۔ مگر بالآخر مزاج شناسوں کی گھاتیں اپنا کام کر گئیں۔

جلسے کی تیاریاں وسیع پیمانے پر کی جانے لگیں۔ شاہی رقص گاہ کی سجاوٹ ہونے لگی۔ پٹنہ' بنارس' لکھنؤ' گوالیار' دہلی اور پونا کی نامور طوائفوں کو پیغام دیئے گئے۔ برندا کو بھی دعوت ملی۔ آج ایک مدت کے بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ کی جھلک دکھائی دی۔

جلسے کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ لاہور کی گزرگاہوں پر خوش رنگ جھنڈیاں لہرانے لگیں۔ چاروں طرف سے نواب اور راجے شاہانہ احتشام کے ساتھ سج سج کر آنے لگے۔ ذی شعور فراشوں نے رقص گاہ کو ایسے حسنِ لیاقت سے آراستہ کیا تھا کہ اسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ عشرت کی آرام گاہ ہے۔

شام کے وقت دربار شاہی آراستہ ہوا۔ مہاراجہ صاحب تختِ زرنگار پر جلوہ افروز ہوئے۔ نواب اور راجے' امراء وُساہا تھی گھوڑوں پر سوار' اپنی سج دھج دکھاتے ہوئے ایک جلوس بنا کر مہاراج کی قدم بوسی کو چلے۔ سڑک پر دو رویہ تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ خوشی کو رنگوں سے بھی کوئی گہرا تعلق ہے۔ جدھر نظر اٹھتی تھی رنگوں کی کیفیت دکھائی دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اُمڈی ہوئی ندی خوش رنگ پھولوں کی کیاریوں سے بہتی چلی آتی ہے۔

مسرت کے جوش میں کبھی کبھی لوگ تہذیب سے گری ہوئی حرکتیں بھی کر بیٹھتے تھے۔ ایک پنڈت جی مرزائی پہنے' سر پر گول ٹوپی رکھے' تماشا دیکھنے میں مصروف تھے۔ کسی شریر آدمی نے ان کی توند پر ایک چمگادڑ چمٹا دی۔ پنڈت جی بے تحاشا توند مٹکاتے ہوئے بھاگے۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ ایک اور مولوی صاحب نیچی اچکن پہنے ایک دکان پر کھڑے تھے۔ دکان دار نے کہا مولوی صاحب! آپ کو کھڑے کھڑے تکلیف ہوتی ہے۔ یہ کرسی رکھی ہوئی ہے۔ بیٹھ جائیے۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے۔ سوچنے لگے کہ شاید میرے بشرے سے رعب جھلک رہا ہے۔ ورنہ دکان دار کرسی کیوں دیتا۔ دکان دار غضب کے مردم شناس ہوتے ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے ہیں مگر اس نے کسی سے بیٹھنے کی استدعا نہ کی۔ مسکراتے ہوئے کرسی پر بیٹھے۔ مگر بیٹھتے ہی پیچھے کی طرف لڑھکے۔ اور نیچے بہتی ہوئی نالی میں گر پڑے۔ سارے کپڑے لت پت ہو گئے۔ دکان دار کو ہزاروں بے نقط سنائیں۔ بڑا قہقہہ پڑا۔ کرسی تین ہی ٹانگ کی تھی۔

ایک جگہ کوئی افیونی صاحب تماشا دیکھنے آئے ہوئے تھے۔ جھکی ہوئی کمر' پوپلا منہ' سر کی چھدری زلفیں اور داڑھی کے بال مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔ آپ بڑے غور سے مصروف سیر تھے۔ اتنے میں ایک حلوائی سر پر خوانچہ رکھے ہوئے آیا۔ اور بولا۔ "خاں صاحب! جمعرات کی گلاب والی ریوڑیاں ہیں۔ آج پیسے کی آدھ پاؤ لگا دیں۔ کھا لیجئے۔ ورنہ پچھتایئے گا۔" افیونی صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ مگر پیسے نہ تھے۔ کفِ افسوس مل کر رہ گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ گلاب والی ریوڑیاں اور پیسے میں آدھ پاؤ! نہ ہوئے پیسے نہیں تو سیروں تلا لیتے۔ حلوائی تاڑ گیا۔ بولا "آپ پیسوں کی کچھ فکر نہ کریں۔ پیسے پھر مل جائیں گے۔ آپ کوئی

غیر معتبر آدمی تھوڑا ہی ہیں۔" افیونی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ روح پھڑک اٹھی۔ آپ نے پاؤ بھر ریوڑیاں لیں اور جی میں کہا۔ اب پیسہ دینے والے پر لعنت ہے۔ گھر سے نکلوں گا ہی نہیں تو پیسے کیا لو گے۔ اپنے رومال میں ریوڑیاں لیں۔ دلِ عاشق میں صبر کہاں۔ مگر جوں ہی پہلی ریوڑی زبان پر رکھی' تلملا گئے۔ پاگل کتے کی طرح پانی کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ آنکھ اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ آدھا منہ کھول کر ٹھنڈی ہوا سے زبان کی جلن بجھانے لگے۔ جب ہوش بجا ہوئے تو حلوائی کو ہزاروں صلواتیں سنائیں۔ اس پر بھی لوگ خوب ہنسے۔ خوشی کے موقعوں پر ایسی بے ضرر شرارتیں اکثر ہوا کرتی ہیں اور انہیں لوگ معافی کے قابل سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ کھولتی ہوئی ہانڈی کے ابال ہیں۔

رات کے نو بجے سرود گاہ میں جمگھٹ ہوا۔ سارا قصر نیچے سے اوپر تک خوش رنگ ہانڈیوں اور فانوسوں سے جگمگا رہا تھا اور جھاڑوں کی بہار تھی۔ ایک باکمال کاریگر نے رنگ شالا کے بیچوں بیچ فضا میں معلق تھما ہوا ایک فوارہ لگایا تھا۔ جس کے سوراخوں سے خس' کیوڑہ' گلاب اور صندل کا عرق ہلکی پھواروں میں برس رہا تھا۔ محفل میں عنبر بیز طراوت پھیلی ہوئی تھی۔ خوشی اپنی سکھیوں سہیلیوں کے ساتھ خوشیاں منا رہی تھی۔

دس بجے مہاراجہ رنجیت سنگھ تشریف لائے۔ ان کے بدن پر تن زیب کی ایک سفید اچکن تھی اور سر پر ترچھی پگڑی بندھی ہوئی۔ جس طرح آفتاب شفق کی خوش رنگ آرائشوں سے پاک رہ کر اپنی پوری روشنی دکھا سکتا ہے' اسی طرح ہیرے اور جواہرات' دیبا و حریر کی پر تکلف سجاوٹ سے مبرا ہو کر مہاراجہ رنجیت سنگھ کا جلال پوری تیزی کے ساتھ چمک رہا تھا۔

چند نامور شعرا نے مہاراج کی شان میں اسی موقع کے لئے قصیدے کہے تھے مگر حاضرین کے چہروں سے ان کے دلوں میں جوش کھاتا ہوا شوق نغمہ دیکھ کر مہاراج نے گانا شروع کرنے کا حکم دیا۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ سازندوں نے سُر ملایا۔ نیند سے جھپکتی ہوئی آنکھیں کھل گئیں۔ اور گانا شروع ہو گیا۔

(7)

اس شاہی محفل میں رات بھر نغمہ لطیف کی بارش ہوتی رہی۔ پیلو اور پرج' دیس اور بہاگ کے طرب ناک جھونکے چلتے رہے۔ رقاصان دل نواز نے باری باری اپنا جوہر کمال دکھایا۔ کسی کی پُرناز ادائیں دلوں میں کُھب گئیں۔ کسی کا تھرکنا قتل عام کر گیا۔ کسی کی رسیلی تانوں پر واہ واہ مچ گئی۔ ایسی طبیعتیں بہت کم تھیں جنہوں نے خلوص کے ساتھ گانے کا پاکیزہ لطف اٹھایا ہو۔

چار بجے ہوں گے۔ جب شاما کی باری آئی۔ تو حاضرین سنبھل بیٹھے۔ فرط شوق سے لوگ آگے کھسکنے لگے۔ خمار سے بھری ہوئی آنکھیں چونک پڑیں۔ برندا محفل میں آئی اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر لوگ حیرت میں آ گئے۔ اس کے جسم پر نہ آب دار گہنے تھے نہ خوش رنگ بھڑکیلی پشواز۔ وہ صرف ایک گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھی۔ جس طرح ورق گلاب پر ڈوبتے ہوئے آفتاب کی سنہری کرن چمکتی ہے' اسی طرح اس کے گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکتی تھی۔ اس کا تکلف سے پاک حسن اپنی قدرتی آرائش کی شان دکھا رہا تھا۔ اصلی حسن مشاطہ کی فسوں سازیوں کا محتاج نہیں ہوتا۔ نظارۂ فطرت سے روح کو جو حظ اور سرور حاصل ہوتا ہے' وہ پُر تکلف

باغیچوں کی سیر سے ممکن نہیں۔ برندا نے گایا:۔

سب دن ناہیں برابر جات

یہ گیت اس سے پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا' مگر اس وقت کا سا اثر کبھی دلوں پر نہیں ہوا تھا۔ کسی کے سب دن برابر نہیں جاتے۔ یہ کہاوت روز سنتے تھے۔ آج اس کے معنی سمجھ میں آئے۔ کسی رئیس کو وہ دن یاد آیا' جب وہ خود ایک تاج دار تھا۔ آج وہ ایک اطاعت گزار ہے۔ کسی کو اپنے بچپن کا آغوش ناز یاد آیا۔ کسی کو وہ زمانہ یاد آیا' جب وہ زندگی کے دل فریب خواب دیکھ رہا تھا۔ مگر افسوس اب وہ خواب پریشان ہو گیا۔ برندا بھی گزرے ہوئے دنوں کو یاد کرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا کہ اس کے دروازے پر عطائیوں اور گانے والوں کا ہجوم رہتا تھا اور دل میں خوشیوں کا!اور آج! آہ آج!اس کے آگے برندا کچھ نہ سوچ سکی۔ دونوں حالتوں کا مقابلہ نہایت دل شکن' نہایت یاس انگیز تھا۔ اس کی آواز بھاری ہو گئی اور رقت سے گلا بیٹھ گیا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ شاما کے طرز و انداز کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی تیز نگاہیں اس کے دل میں پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ لوگ متحیر تھے کہ کیوں ان کی زبان سے تعریف اور قدر دانی کا ایک کلمہ بھی نہ نکلا۔ وہ خوش نہ تھے۔ غمگین بھی نہ تھے۔ وہ خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ قیافہ انہیں بتا رہا تھا کہ یہ عورت ہرگز ادا فروش نہیں ہے۔ یکایک وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور بولے۔ ''شاما! جمعرات کو میں پھر تمہارا گانا سنوں گا۔''

(8)

برندا کے چلے جانے کے بعد اس کا گلعذار بچہ راجہ اٹھا۔ اور آنکھیں ملتا ہوا بولا۔ ''اماں کہاں ہے؟'' پریم سنگھ نے اسے گود میں لے کر کہا۔ ''اماں مٹھائی لینے گئی ہے۔''

راجہ خوش ہو گیا۔ باہر جا کر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگا مگر کچھ دیر کے پھر بولا۔ ''اماں! مٹھائی۔'' پریم سنگھ نے مٹھائی لا کر دی۔ مگر راجہ رو رو کر کہتا رہا۔ ''اماں مٹھائی۔'' وہ شاید سمجھا تھا کہ اماں کی مٹھائی اس مٹھائی سے زیادہ میٹھی ہو گی۔

آخر پریم سنگھ نے اسے کندھے پر چڑھا لیا اور دوپہر تک کھیتوں میں گھومتا رہا۔ راجہ کچھ دیر تک چپکا رہتا۔ اور پھر چونک کر پوچھنے لگتا۔ ''اماں کہاں؟''

بوڑھے سپاہی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ بچے کے پاس سے ایک دم کو بھی کہیں نہ جاتا۔ اور اسے باتوں میں لگائے رہتا۔ کہ کہیں وہ پھر نہ پوچھ بیٹھے۔ اماں کہاں ہے؟ بچوں کا حافظہ کمزور ہوتا ہے۔ راجا کئی دن تک بے قرار رہا۔ آخر رفتہ رفتہ ماں کی یاد اس کے دل سے مٹ گئی۔

اس طرح تین مہینے گزر گئے۔ ایک روز شام کے وقت راجہ اپنے دروازے پر کھیل رہا تھا کہ برندا آتی ہوئی دکھائی دی۔ راجہ نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ ذرا جھجکا۔ پھر دوڑ کر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا اور بولا۔ ''اماں آئی۔ اماں آئی۔''

برندا کی آنکھوں سے آنسوں جاری ہو گئے۔ اس نے راجہ کو گود میں اٹھا لیا اور کلیجے سے لگا کر

بولی۔ "بیٹا! ابھی میں نہیں آئی پھر کبھی آؤں گی۔"

راجہ اس کا مطلب نہ سمجھا۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا گھر کی طرف چلا۔ ماما کی کشش برندا کو دروازے تک لے گئی مگر چوکھٹ سے آگے نہ لے جا سکی۔ راجہ نے بہت کھینچا۔ مگر وہ آگے نہ بڑھی۔ تب راجہ کی بڑی بڑی آنکھیں آب گوں ہو گئیں۔ اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ اور وہ رونے لگا۔

پریم سنگھ اس کا رونا سن کر باہر نکل آیا۔ دیکھا کہ برندا کھڑی ہے۔ چونک کر بولا۔ "برندا۔" مگر برندا کچھ جواب نہ دے سکی۔

پریم سنگھ نے پھر کہا۔ "باہر کیوں کھڑی ہو۔ اندر آؤ۔ اب تک کہاں تھیں؟"

برندا نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اندر نہ آؤں گی۔"

پریم سنگھ۔ "آؤ۔ آؤ اپنے بوڑھے باپ کی باتوں کا برا نہ مانو۔"

برندا۔ "نہیں دادا۔ میں اندر قدم نہیں رکھ سکتی۔"

پریم سنگھ۔ "کیوں؟"

برندا۔ "پھر کبھی بتا دوں گی۔ میں تمہارے پاس وہ تیغہ لینے آئی ہوں۔"

پریم سنگھ نے حیرت میں آکر پوچھا۔ "اسے لے کر کیا کرو گی؟"

برندا۔ "اپنی بے عزتی کا بدلہ لوں گی۔"

پریم سنگھ۔ "کس سے؟"

برندا۔ "رنجیت سنگھ سے۔"

پریم سنگھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اور برندا کی باتوں پر غور کرنے لگا۔ پھر بولا۔ "برندا! تمہیں موقع کیونکر ملے گا؟"

برندا۔ "کبھی کبھی خاک کے ساتھ اڑ کر چیونٹی بھی آسمان تک جا پہنچتی ہے۔"

پریم سنگھ۔ "مگر بکری شیر سے کیونکر لڑے گی؟"

برندا۔ "اس تیغے کی مدد سے۔"

پریم سنگھ۔ "اس تیغے نے کبھی چھپ کر خون نہیں کیا۔"

برندا۔ "دادا یہ کرامات کا تیغہ ہے۔ اس نے ہمیشہ دکھیاروں کی مدد کی ہے۔"

پریم سنگھ نے تیغہ لا کر برندا کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ برندا اسے پہلو میں چھپا کر جس طرف سے آئی تھی، اسی طرف چلی گئی۔ سورج ڈوب گیا تھا۔ مغرب کے افق میں روشنی کا کچھ کچھ نشان باقی تھا۔ اور بھینسیں اپنے بچھڑوں کو دیکھنے کے لئے مرغزار سے دوڑتی، پُر شوق آواز سے ممیاتی چلی آتی تھیں اور برندا اپنے بچے کو روتا چھوڑ کر شام کے تاریک خوفناک جنگل کی طرف جا رہی تھی۔

(9)

جمعرات کا دن ہے۔ رات کے دس بج چکے ہیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی عشرت گاہ میں رونق افروز ہیں۔ ایک سات بتیوں والا جھاڑ روشن ہے۔ گویا عروس شمع اپنی سہیلیوں کے ساتھ شبنم کا نقاب منہ پر ڈالے ہوئے محوِ ناز

ہے۔ مہاراجہ کے سامنے برندا گیروے رنگ کی ساری پہنے ہوئے بیٹھی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک بین ہے۔ اسی پر وہ ایک دلآویز نغمہ الاپ رہی ہے۔

مہاراج بولے۔ ”شاما! میں تمہارا گانا سن کر بہت خوش ہوا۔ تمہیں کیا انعام دوں؟“

شاما نے ایک انداز سے سر جھکا کر کہا۔ ”حضور کے اختیار میں سب کچھ ہے۔“

رنجیت سنگھ۔ ”جاگیر لوگی؟“

شاما۔ ”ایسی چیز دیجئے۔ جس سے آپ کا نام ہو جائے۔“

مہاراج نے برندا کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کی سادگی کہہ رہی تھی کہ وہ مال وزر کو کچھ نہیں سمجھتی۔ اس کی نگاہ کی پاکیزگی اور انداز کی متانت صاف بتا رہی تھی کہ وہ ناز فروش نہیں ہے۔ پھر پوچھا۔ ”کوہ نور لوگی؟“

شاما۔ ”وہ حضور کے تاج میں زیادہ زیب دیتا ہے۔“

مہاراج متحیر ہو کر بولے۔ ”تم خود مانگو۔“

شاما۔ ”ملے گا؟“

رنجیت سنگھ۔ ”ہاں۔“

شاما۔ ”مجھے خونِ انصاف عطا ہو۔“

مہاراج رنجیت سنگھ چونک پڑے۔ برندا کی طرف پھر غور سے دیکھا اور سوچنے لگے۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ انصاف تو خون کا پیاسا نہیں ہوتا۔ یہ عورت ضرور کسی ظالم رئیس راجہ کے دست بیداد سے نالاں ہے۔ کیا عجب ہے کہ اس کا شوہر کہیں راجہ ہو۔ ضرور ایسا ہی ہے۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔ انصاف کو خون کی پیاس اسی حالت میں ہوتی ہے۔ اسی وقت انصاف خونخوار جانور ہو جاتا ہے۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جو کچھ مانگے گی' وہ دوں گا۔ اس نے ایک بیش قیمت چیز مانگی ہے۔ خونِ انصاف۔ وہ اسے ملنا چاہیے۔ مگر کس کا خون؟

راجہ نے پھر پہلو بدل کر سوچا۔ کس کا خون؟ یہ سوال میرے دل میں نہ پیدا ہونا چاہیے۔ انصاف جس کا خون مانگے' اس کا خون مجھے دینا چاہیے۔ انصاف کے نزدیک سب کا خون برابر ہے۔ مگر انصاف خون کا مستحق ہے؟ اس کا فیصلہ کون کرے گا۔ کینے کے بخار سے بھرے ہوئے انسان کے ہاتھ میں اس کا فیصلہ نہیں رہنا چاہیے۔ اکثر ایک کڑی بات' ایک دل جلا دینے والا طعنہ انسان کے دل میں خون کی پیاس پیدا کر دیتا ہے۔ اس طعنہ دل سوز کی آگ اس وقت تک نہیں بجھتی جب تک اس پر خون کے چھینٹے نہ دیئے جائیں۔ میں نے زبان دے دی ہے۔ غلطی ہوئی۔ پوری روداد سنے بغیر میں ہرگز اس امر کا مجاز نہیں کہ خونِ انصاف کا وعدہ کروں۔ ان خیالات نے راجہ کو کئی منٹ تک محو رکھا۔ آخر وہ بولے۔

”شاما! تم کون ہو؟“

برندا۔ ”ایک بے کس عورت۔“

راجہ۔ ”تمہارا گھر کہاں ہے؟“

برندا۔ ”ماہ نگر میں۔“

رنجیت سنگھ نے برندا کو پھر غور سے دیکھا۔ کئی مہینے پہلے رات کے وقت ماہ نگر میں ایک بھولی بھالی عورت کی جو تصویر دل میں کھینچی تھی' وہ اس عورت سے بہت کچھ ملتی تھی۔ اس وقت نگاہیں اتنی بیباک نہ تھیں۔ اس وقت

آنکھوں میں شرم کی آب تھی۔اب شوخی کی جھلک ہے۔ تب سچا موتی تھا۔اب جھوٹا ہو گیا ہے۔

مہاراج بولے۔ ”شاما! انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟“

برندا۔ ” جسے آپ قصور وار ٹھہرائیں۔ جس دن حضور نے رات کو ماہ نگر میں پڑاؤ کیا تھا‘ اسی رات کو آپ کے سپاہی مجھے بزور کھینچ کر پڑاؤ پر لائے۔ مجھے اس قابل نہیں رکھا کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ مجھے ان کی ناپاک نگاہوں کا نشانہ بننا پڑا۔ ان کی بیباک زبانوں نے‘ ان کے شرمناک اشاروں نے میری عزت خاک میں ملا دی۔ آپ وہاں موجود تھے اور آپ کی بے کس رعیت پر یہ ظلم کیا جا رہا تھا۔ کون مجرم ہے؟ انصاف کس کا خون چاہتا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کریں۔“

رنجیت سنگھ زمین پر آنکھیں گاڑے سنتے رہے۔ برندا نے ذرا دم لے کر پھر کہنا شروع کیا۔ ”میں بیوہ عورت ہوں۔ میری عزت کے پاسبان‘ میری آبرو کے محافظ آپ ہیں۔ پتی بیوگ کے ساڑھے تین سال میں نے تپسوی بن کر کاٹے تھے۔ مگر آپ کے آدمیوں نے میری تپسیا خاک میں ملا دی۔ میں اس قابل نہیں کہ لوٹ کر اپنے گھر جا سکوں۔ اپنے بچے کے لئے میری گود اب نہیں کھلتی۔ اپنے بوڑھے باپ کے سامنے میری گردن نہیں اٹھتی۔ میں اب اپنے گاؤں کی عورتوں سے آنکھیں چراتی ہوں۔ میری عزت لٹ گئی۔ عورت کی عزت کتنی قیمتی چیز ہے‘ اسے کون نہیں جانتا۔ ایک عورت کی عزت کے پیچھے لنکا کا شاندار راج مٹ گیا۔ ایک ہی عورت کی عزت کے لئے کورو بنس کا ناس ہو گیا۔ عورتوں کی عزت کے لئے ہمیشہ خون کی ندیاں بہی ہیں اور راج الٹ گئے ہیں۔ میری عزت آپ کے آدمیوں نے لی ہے۔ اس کا جواب دہ کون ہے۔ انصاف کس کا خون چاہتا ہے۔ اس کا فیصلہ آپ کریں۔“

برندا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ ایک دہقان عورت کا یہ حوصلہ‘ یہ خیال اور یہ جوشِ تقریر دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ کانچ کا ٹکڑا ٹوٹ کر تیز دھار والا چھرا ہو جاتا ہے۔ وہی کیفیت انسان کے ٹوٹے ہوئے دل کی ہے۔

آخر مہاراج نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور حسرت ناک لہجے میں بولے۔ ”شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے۔ وہ میں ہوں۔“

اتنا کہنے کے ساتھ مہاراج رنجیت سنگھ کا چہرہ بھبک اٹھا۔ اور ان پر ایک جذبہ کا عالم طاری ہو گیا۔ فوری جذبات سے مخمور ہو کر انسان کا دل عرش کی بلندیوں تک جا پہنچتا ہے۔ کانٹے کے چبھنے سے کراہنے والا انسان اسی نشے سے مست ہو کر خنجر کی نوک کلیجے میں چبھو لیتا ہے۔ پانی کی بوچھاڑ سے ڈرنے والا انسان گلے گلے پانی میں اکڑتا ہوا چلا جاتا ہے۔ اس عالم میں انسان کا دل ایک غیر معمولی قوت اور بے انتہا جوش محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسی عالم میں انسان سے ادنیٰ ترین حرکتیں سرزد ہوتی ہیں اور اسی عالم میں انسان اپنے قول و فعل کی بلندی سے دیوتاؤں کو بھی شرمندہ کر دیتا ہے۔ مہاراج رنجیت سنگھ بیتاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بلند آواز سے بولے۔ ”شاما! انصاف جس کا خون چاہتا ہے‘ وہ میں ہوں! تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا ہے اس کا جواب دہ میں ہوں۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ ایشور کے نزدیک راجہ اپنے ملازموں کی سختی و زبردستی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔“

یہ کہہ کر راجہ نے تیزی کے ساتھ اچکن کے بند کھول دیئے اور برندا کے سامنے گھٹنوں کے بل سینہ پھیلا کر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”شاما! تمہارے پہلو میں تلوار چھپی ہوئی ہے۔ وہ کرامات کی تلوار ہے۔ اس نے کتنی ہی بار انصاف کی حمایت کی ہے۔ آج ایک بد قسمت راجہ کے خون سے اس کی پیاس بجھا دو۔ بے شک وہ راجہ بد نصیب ہے

جس کے راج میں بیکسوں پر ظلم ہوتا ہے۔"
برندا کے دل میں ایک زبردست تبدیلی پیدا ہوئی۔ جوشِ انتقام نے محبت اور احترام کو جگہ دی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ذمہ داری تسلیم کر لی۔ وہ اس کے سامنے ایک مجرم کی حیثیت میں تیغ انصاف کا نشانہ بننے کے لئے کھڑے ہیں۔ ان کی جان اب اس کی مٹھی میں ہے۔ انہیں مارنا یا جلانا اب اس کا اختیار ہے۔
یہ خیالات اس کا جوش انتقام ٹھنڈا کر دینے کے لئے کافی تھے۔ ثروت اور حشمت جب اپنے تخت زرنگار سے اتر کر دستِ ترحم کی خواستگار ہوتی ہے تو کون سا ایسا دل ہے جو پسیج نہ جائے گا؟ برندا نے دل پر جبر کر کے پہلو سے خنجر نکالا۔ مگر وار نہ کر سکی۔ تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔
مہاراج رنجیت سنگھ سمجھ گئے کہ عورت کی ہمت دغا دے گئی۔ وہ بڑی تیزی سے لپکے اور تیغے کو ہاتھ میں اٹھا لیا۔ یکایک داہنا ہاتھ مجذوبانہ جوش کے ساتھ اوپر کو اٹھا۔ وہ ایک بار زور سے بولے۔ "واہ گرو کی جے" اور قریب تھا کہ سینہ تلوار کے ہم آغوش ہو۔ بجلی کوند کر سینہ ابر میں گھسنے ہی والی تھی کہ برندا ایک چیخ مار کر اٹھی اور راجہ کے اوپر اٹھے ہوئے ہاتھ کو اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوط پکڑ لیا۔ رنجیت سنگھ نے جھٹکا دے کر ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر کمزور عورت نے ان کے ہاتھ کو اس طرح جکڑا تھا جیسے محبت دل کو جکڑ لیتی ہے۔ بے بس ہو کر بولے۔
"شاما! انصاف کو اپنی پیاس بجھانے دو۔"
شاما نے کہا۔ "مہاراج! اس کی پیاس بجھ گئی۔ یہ تلوار اس کی گواہ ہے۔" مہاراج نے تیغہ کو دیکھا۔ اس وقت اس میں دوج کے چاند کی چمک تھی۔ حق اور انصاف کے چمکتے ہوئے سورج نے اس چاند کو منور کر دیا تھا۔

بڑے گھر کی بیٹی

(1)

بنی مادھو سنگھ موضع گوری پور کے زمیندار اور نمبردار تھے۔ ان کے بزرگ کسی زمانے میں بڑے صاحب ثروت تھے۔ پختہ تالاب اور مندر انہی کی یادگار تھی۔ کہتے ہیں' اس دروازے پر پہلے ہاتھی جھومتا تھا۔ اس ہاتھی کا موجودہ نعم البدل ایک بوڑھی بھینس تھی۔ جس کے بدن پر گوشت تو نہ تھا۔ مگر شاید دودھ بہت دیتی تھی۔ کیونکہ ہر وقت ایک نہ ایک آدمی ہانڈی لئے اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ بنی مادھو سنگھ نے نصف سے زائد جائیداد وکیلوں کی نذر کی اور اب ان کی سالانہ آمدنی ایک ہزار سے زائد نہ تھی۔ ٹھاکر صاحب کے دو بیٹے تھے۔ بڑے کا نام سری کنٹھ سنگھ تھا۔ اس نے ایک مدت دراز کی جانکاہی کے بعد بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی تھی اور اب ایک دفتر میں نوکر تھا۔ چھوٹا لڑکا لال بہاری سنگھ دہرے بدن کا سجیلا جوان تھا۔ بھرا ہوا چہرہ' چوڑا سینہ۔ بھینس کا دو سیر تازہ دودھ ناشتا کر جاتا تھا۔ سری کنٹھ اس سے بالکل متضاد تھے۔ ان ظاہری خوبیوں کو انہوں نے دو انگریزی حروف بی۔ اے پر قربان کر دیا تھا۔ انہیں دو حرفوں نے ان کے سینے کی کشادگی' قد کی بلندی' چہرے

کی چمک' سب ہضم کر لی تھی۔ یہ حضرت اب اپنا وقت فرصت طب کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ آیورویدک دواؤں پر زیادہ عقیدہ تھا۔ شام سویرے ان کے کمرے میں اکثر کھرل کی خوشگوار پیہم صدائیں سنائی دیا کرتیں تھیں۔ لاہور اور کلکتہ کے ویدوں سے بہت خط و کتابت رہتی تھی۔

سری کنٹھ اس انگریزی ڈگری کے باوجود انگریزی معاشرت کے بہت مداح نہ تھے بلکہ اس کے برعکس وہ اکثر بڑی شدومد سے اس کی مذمت کیا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے گاؤں میں ان کی بڑی عزت تھی۔ دسہرے کے دنوں میں وہ بڑے جوش سے رام لیلا میں شریک ہوتے اور خود ہر روز کوئی نہ کوئی روپ بھرتے۔ انہی کی ذات سے گوری پور میں رام لیلا کا وجود ہوا۔ پرانے رسم و رواج کا ان سے زیادہ پُرجوش وکیل مشکل سے کوئی ہوگا۔ خصوصاً مشترکہ خاندان کے وہ زبردست حامی تھے۔ آج کل بہوؤں کو اپنے کنبے کے ساتھ مل جل کر رہنے میں جو وحشت ہوتی ہے' اسے وہ ملک اور قوم کے لئے فال بد خیال کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گاؤں کی بہوئیں انہی مقبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھتی تھیں۔ بعض بعض شریف زادیاں تو انہیں اپنا دشمن سمجھتیں۔ خود انہیں کی بیوی ان سے اس مسئلہ پر اکثر زور شور سے بحث کرتی تھی۔ مگر اس وجہ سے نہیں کہ اسے اپنے ساس سسر' دیور جیٹھ سے نفرت تھی۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ اگر غم کھانے اور طرح دینے پر بھی کنبے کے ساتھ نباہ نہ ہو سکے تو آئے دن کی تکرار سے زندگی تلخ کرنے کے بجائے یہی بہتر ہے کہ اپنی کھچڑی الگ پکائی جائے۔

آنندی ایک بڑے اونچے خاندان کی لڑکی تھی۔ اس کے باپ ایک چھوٹی سی ریاست کے تعلقہ دار تھے۔ عالی شان محل' ایک ہاتھی' تین گھوڑے' پانچ وردی پوش سپاہی' فٹن' بہلیاں' شکاری کتے' باز بحری' شکرے جرے' فرش فروش' شیشہ آلات' آنریری مجسٹریٹی اور قرض جو ایک معزز تعلقہ دار کے لوازم ہیں' وہ ان سب سے بہرہ ور تھے۔ بھوپ سنگھ نام تھا۔ فراخ دل' حوصلہ مند آدمی تھے مگر قسمت کی خوبی' لڑکا ایک بھی نہ تھا۔ سات لڑکیاں ہی لڑکیاں ہوئیں اور زندہ رہیں۔ اپنے برابر یا زیادہ اونچے خاندان میں ان کی شادی کرنا اپنی ریاست کو مٹی میں ملانا تھا۔ پہلے جوش میں تو انہوں نے تین شادیاں دل کھول کر کیں۔ مگر جب پندرہ بیس ہزار کے مقروض ہوگئے تو آنکھیں کھلیں۔ ہاتھ سمیٹ لیا۔ آنندی چوتھی لڑکی تھی۔ مگر اپنی سب بہنوں سے زیادہ حسین اور نیک۔ اسی وجہ سے ٹھاکر بھوپ سنگھ اسے بہت پیار کرتے تھے۔ حسین بچے کو شاید اس کے ماں باپ بھی زیادہ پیار کرتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب بڑے پس و پیش میں تھے کہ اس کی شادی کہاں کریں۔ نہ تو یہی چاہتے تھے کہ قرض کا بوجھ بڑھے اور نہ یہی منظور تھا کہ اسے اپنے آپ کو بدقسمت سمجھنے کا موقع ملے۔ ایک روز سری کنٹھ ان کے پاس کسی چندے کے لئے روپیہ مانگنے آئے۔ شاید ناگری پرچار کا چندہ تھا۔ بھوپ سنگھ ان کے طور طریق پر ریجھ گئے۔ کھینچ تان کر زائچے ملائے گئے اور شادی دھوم دھام سے ہوگئی۔

آنندی دیوی اپنے نئے گھر میں آئیں تو یہاں کا رنگ ڈھنگ کچھ اَور ہی دیکھا۔ جن دلچسپیوں اور تفریحوں کی وہ بچپن سے عادی ہو رہی تھی ان کا یہاں وجود بھی نہ تھا۔ ہاتھی گھوڑوں کا تو کیا ذکر کوئی سجی ہوئی خوبصورت بلی بھی نہ تھی۔ ریشمی سلیپر ساتھ لائی تھی۔ مگر یہاں باغ کہاں! مکان میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ نہ زمین پر فرش' نہ دیواروں پر تصویریں۔ یہ ایک سیدھا سادا دہقانی مکان تھا۔

آنندی نے تھوڑے ہی دنوں میں ان تبدیلیوں سے اپنے تئیں اس قدر مانوس بنا لیا' گویا اس نے تکلفات کبھی دیکھے ہی نہیں۔

(2)

ایک روز دوپہر کے وقت لال بہاری سنگھ دو مرغابیاں لئے ہوئے آئے اور بھاوج سے کہا۔ ”جلدی سے گوشت پکادو۔ مجھے بھوک لگی ہے۔“ آنندی کھانا پکا کر ان کی منتظر بیٹھی تھی۔ گوشت پکانے بیٹھی مگر ہانڈی میں دیکھا تو گھی پاؤ بھر سے زیادہ نہ تھا۔ بڑے گھر کی بیٹی ’کفایت شعاری کا سبق ابھی اچھی طرح نہ پڑھی تھی۔ اس نے سب گھی گوشت میں ڈال دیا۔ لال بہاری کھانے بیٹھے تو دال میں گھی نہ تھا بولے۔ ”دال میں گھی کیوں نہیں چھوڑا؟“

آنندی نے کہا۔ ”گھی سب گوشت میں پڑ گیا۔“

لال بہاری۔ ”ابھی پرسوں گھی آیا ہے۔ اس قدر جلد اٹھ گیا۔“

آنندی۔ ”آج تو کُل پاؤ بھر تھا۔ وہ میں نے گوشت میں ڈال دیا۔“

جس طرح سوکھی لکڑی جلدی سے جل اٹھتی ہے‘ اسی طرح بھوک سے باؤلا انسان ذرا ذرا سی بات پر تنک جاتا ہے۔ لال بہاری سنگھ کو بھاوج کی یہ زبان درازی بہت بری معلوم ہوئی۔ تیکھا ہو کر بولا۔ ”میکے میں تو چاہے گھی کی ندی بہتی ہو۔“

عورت گالیاں سہتی ہے۔ مار سہتی ہے مگر میکے کی نندا اس سے نہیں سہی جاتی۔ آنندی منہ پھیر کر بولی۔ ”ہاتھی مرا بھی تو نو لاکھ کا۔ وہاں اتنا گھی روز نائی کہار کھا جاتے ہیں۔“

لال بہاری جل گیا۔ تھالی اٹھا کر پٹک دی اور بولا۔ ”جی چاہتا ہے کہ تالو سے زبان کھینچ لے۔“

آنندی کو بھی غصہ آیا۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ ”وہ ہوتے تو آج اس کا مزہ چکھا دیتے۔“

اب نوجوان اجڈ ٹھاکر سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی ایک معمولی زمیندار کی بیٹی تھی۔ جب جی چاہتا تھا اس پر ہاتھ صاف کر لیا کرتا تھا۔ کھڑاؤں اٹھا کر آنندی کی طرف زور سے پھینکی اور بولا۔ ”جس کے گمان پر بھولی ہوئی ہو‘ اسے بھی دیکھوں گا اور تمہیں بھی۔“

آنندی نے ہاتھ سے کھڑاؤں روکی۔ سر بچ گیا مگر انگلی میں سخت چوٹ آئی۔ غصے کے مارے ہوا سے ہلتے ہوئے پتے کی طرح کانپتی ہوئی اپنے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ عورت کا زور اور حوصلہ۔ غرور اور عزت شوہر کی ذات سے ہے۔ اسے شوہر ہی کی طاقت اور ہمت کا گھمنڈ ہوتا ہے۔ آنندی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئی۔

(3)

سری کنٹھ سنگھ ہر شنبہ کو اپنے مکان آیا کرتے تھے۔ جمعرات کا یہ واقعہ تھا۔ دو دن تک آنندی نے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ ان کی راہ دیکھتی رہی۔ آخر شنبہ کو حسب معمول شام کے وقت وہ آئے اور باہر بیٹھ کر کچھ ملکی و مالی خبریں‘ کچھ نئے مقدمات کی تجویزیں اور فیصلے بیان کرنے لگے۔ اور سلسلہ تقریر دس بجے رات تک جاری رہا۔ دو تین گھنٹے آنندی نے بے انتہا اضطراب کے عالم میں کاٹے۔ بارے کھانے کا وقت آیا۔ پنچایت اٹھی۔ جب تخلیہ ہوا تو لال بہاری نے کہا۔ ”بھیا آپ ذرا گھر میں سمجھا دیجئے گا کہ زبان سنبھال کر بات چیت کیا کریں۔ ورنہ ناحق ایک دن خون ہو جائے گا۔“

بینی مادھو سنگھ نے شہادت دی۔ "بہو بیٹیوں کی یہ عادت اچھی نہیں کہ مردوں کے منہ لگیں۔"
لال بہاری۔ "وہ بڑے گھر کی بیٹی ہیں۔ تو ہم لوگ بھی کوئی کُرمی کہار نہیں ہیں۔"
سری کنٹھ۔ "آخر بات کیا ہوئی؟"
لال بہاری۔ "کچھ بھی نہیں۔ یوں ہی آپ ہی آپ الجھ پڑیں۔ میکے کے سامنے ہم لوگوں کو تو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

سری کنٹھ کھاپی کر آنندی کے پاس گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھی اور یہ حضرت بھی کچھ تیکھے تھے۔
آنندی نے پوچھا۔ "مزاج تو اچھا ہے؟"
سری کنٹھ بولے۔ "بہت اچھا ہے۔ یہ آج کل تم نے گھر میں کیا طوفان مچا رکھا ہے؟"
آنندی کے تیوروں پر بل پڑ گئے۔ اور جھنجھلاہٹ کے مارے بدن میں پسینہ آگیا۔ بولی۔ "جس نے تم سے یہ آگ لگائی ہے اسے پاؤں تو منہ جھلس دوں۔"
سری کنٹھ۔ "اس قدر تیز کیوں ہوتی ہو۔ کچھ بات تو کہو۔"
آنندی۔ "کیا کہوں قسمت کی خوبی ہے ورنہ ایک گنوار لونڈا جسے چپراس گری کرنے کی بھی تمیز نہیں مجھے کھڑاؤں سے مار کر یوں نہ اکڑتا پھرتا۔ بوٹیاں نچوا لیتی۔ اس پر تم پوچھتے ہو کہ گھر میں طوفان کیوں مچا رکھا ہے۔"
سری کنٹھ۔ "آخر کچھ کیفیت تو بیان کرو مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں۔"
آنندی۔ "پرسوں تمہارے لاڈلے بھائی نے مجھ سے گوشت پکانے کو کہا۔ گھی پاؤ بھر سے کچھ زیادہ تھا۔ میں نے سب گوشت میں ڈال دیا۔ جب کھانے بیٹھا تو کہنے لگا۔ دال میں گھی کیوں نہیں۔ بس اسی پر میرے میکے کو برا کہنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکی۔ بولی۔ کہ وہاں اتنا گھی نائی کہار کھا جاتے ہیں اور کسی کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ بس اتنی سی بات پر اس ظالم نے مجھ پر کھڑاؤں پھینک ماری۔ اگر میں ہاتھ سے نہ روک لیتی تو سر پھٹ جاتا۔ اس سے پوچھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے سچ ہے یا جھوٹ؟"
سری کنٹھ کی آنکھیں لال ہو گئیں بولے۔ "یہاں تک نوبت پہنچ گئی یہ لونڈا تو بڑا اشریر نکلا۔"
آنندی رونے لگی۔ جیسے عورتوں کا قاعدہ ہے کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر رہتا ہے۔ عورت کے آنسو مرد کے غصے پر روغن کا کام کرتے ہیں۔ سری کنٹھ کے مزاج میں تحمل بہت تھا۔ انہیں شاید کبھی غصہ آیا ہی نہیں تھا۔ مگر آنندی کے آنسوؤں نے آج زہریلی شراب کا کام کیا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے۔ سویرا ہوتے ہی اپنے باپ کے پاس جا کر بولے۔ "دادا اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہو گا۔"

یہ اور اسی معنی کے دوسرے جملے زبان سے نکالنے کے لئے سری کنٹھ سنگھ نے اپنے کئی ہمجولیوں کو بارہا آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ جب ان کا کوئی دوست ان سے ایسی باتیں کہتا تو وہ اس کا مضحکہ اڑاتے۔ اور کہتے 'تم لوگ بیویوں کے غلام ہو۔ انہیں قابو میں رکھنے کے بجائے خود ان کے قابو میں ہو جاتے ہو۔ مگر ہندو مشترکہ خاندان کا یہ پُرجوش وکیل آج اپنے باپ سے کہہ رہا تھا۔ "دادا! اب میرا نباہ اس گھر میں نہ ہو گا۔" ناصح کی زبان اسی وقت تک چلتی ہے جب تک وہ عشق کے کرشموں سے بے خبر رہتا ہے۔ آزمائش کے پیچ میں آکر ضبط اور حلم رخصت ہو جاتے ہیں۔
بینی مادھو سنگھ گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ اور بولے۔ "کیوں؟"

سری کنٹھ۔ "اس لئے کہ مجھے بھی اپنی عزت کا کچھ تھوڑا بہت خیال ہے۔ آپ کے گھر میں اب ہٹ دھرمی کا برتاؤ ہوتا ہے۔ جن کو بڑوں کا ادب ہونا چاہیے۔ وہ ان کے سر چڑھتے ہیں۔ میں تو دوسرے کا غلام ٹھہرا۔ گھر پر رہتا نہیں۔ اور یہاں میرے پیچھے عورتوں پر کھڑاؤں اور جوتوں کی بوچھاڑ ہوتی ہے۔ کڑی بات تک مضائقہ نہیں۔ کوئی ایک کی دو کہہ لے۔ یہاں تک میں ضبط کر سکتا ہوں۔ مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ میرے اوپر لات اور گھونسے پڑیں اور میں دم نہ ماروں۔"

بنی مادھو سنگھ کچھ جواب نہ دے سکے۔ سری کنٹھ ہمیشہ ان کا ادب کرتے تھے۔ ان کے ایسے تیور دیکھ کر بوڑھا ٹھاکر لاجواب ہو گیا۔ صرف اتنا بولا۔ "بیٹا تم عقل مند ہو کر ایسی باتیں کرتے ہو۔ عورتیں اسی طرح گھر تباہ کر دیتی ہیں۔ ان کا مزاج بہت بڑھانا اچھی بات نہیں۔"

سری کنٹھ۔ اتنا میں جانتا ہوں آپ کی دعا سے ایسا احمق نہیں ہوں۔ آپ خود جانتے ہیں کہ اس گاؤں کے کئی خاندانوں کو میں نے علیحدگی کی آفتوں سے بچا دیا ہے مگر جس عورت کی عزت و آبرو کا میں ایشور کے دربار میں ذمہ دار ہوں' اس عورت کے ساتھ ایسا ظالمانہ برتاؤ نہیں سہ سکتا۔ آپ یقین مانئے میں اپنے اوپر بہت جبر کر رہا ہوں کہ لال بہاری کی گوشمالی نہیں کرتا۔"

اب بنی مادھو سنگھ بھی گرمائے۔ یہ کفر زیادہ نہ سن سکے بولے۔ "لال بہاری تمہارا بھائی ہے۔ اس سے جب کبھی بھول چوک ہو۔ تم اس کے کان پکڑو۔ مگر......"

سری کنٹھ۔ "لال بہاری کو میں اب اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔"

بنی مادھو۔ "عورت کے پیچھے۔"

سری کنٹھ۔ "جی نہیں اس کی گستاخی اور بے رحمی کے باعث۔"

دونوں آدمی کچھ دیر تک خاموش رہے۔ ٹھاکر صاحب لڑکے کا غصہ دھیما کرنا چاہتے تھے مگر یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے کہ لال بہاری سے کوئی گستاخی یا بے رحمی وقوع میں آئی۔ اسی اثنا میں کئی اور آدمی حقہ تمباکو اڑانے کے لئے آ بیٹھے۔ کئی عورتوں نے جب سنا کہ سری کنٹھ بیوی کے پیچھے باپ سے آمادۂ جنگ ہیں تو ان کا دل بہت خوش ہوا۔ اور طرفین کی شکوہ آمیز باتیں سننے کے لئے ان کی روحیں تڑپنے لگیں۔ کچھ ایسے حاسد بھی گاؤں میں تھے جو اس خاندان کی سلامت روی پر دل ہی دل میں جلتے تھے۔ سری کنٹھ اپنے باپ سے دبتا تھا۔ اس لئے وہ خطاوار ہے۔ اس نے اتنا علم حاصل کیا۔ یہ بھی اس کی خطا ہے۔ بنی مادھو سنگھ بڑے بیٹے کو بہت پیار کرتے ہیں۔ یہ بری بات ہے۔ وہ بلا اس کی صلاح کے کوئی کام نہیں کرتے۔ یہ ان کی حماقت ہے۔ ان خیالات کے آدمیوں کی آج امیدیں بر آئیں۔ حقہ پینے کے بہانے سے' کوئی لگان کی رسید دکھانے کے حیلے سے آ آ کر بیٹھ گئے۔ بنی مادھو سنگھ پرانا آدمی تھا۔ سمجھ گیا کہ آج یہ حضرات پھولے نہیں سماتے۔ اس کے دل نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں خوش نہ ہونے دوں گا۔ خواہ اپنے اوپر کتنا ہی جبر ہو۔ یکایک لہجہ تقریر نرم کر کے بولے۔ "بیٹا! میں تم سے بالکل باہر نہیں ہوں تمہارا جو جی چاہے کرو۔ اب تو لڑکے سے خطا ہو گئی۔"

الہ آباد کا نوجوان جھلایا ہوا گریجویٹ اس گھات کو نہ سمجھا۔ اپنے ڈیبیٹنگ کلب میں اس نے اپنی بات پر اڑنے کی عادت سیکھی تھی۔ مگر عملی مباحثوں کے داؤ پیچ سے واقف نہ تھا۔ اس میدان میں وہ بالکل اناڑی نکلا۔ باپ نے جس مطلب سے پہلو بدلا تھا' وہاں تک اس کی نگاہ نہ پہنچی۔ بولا۔ "میں لال بہاری سنگھ کے ساتھ اب اس گھر میں نہیں رہ سکتا۔"

باپ۔ "بیٹا! تم عقل مند ہو اور عقل مند آدمی گنواروں کی بات پر دھیان نہیں دیتا۔ وہ بے سمجھ لڑکا ہے۔ اس سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اسے تم بڑے ہو کر معاف کر دو۔"

بیٹا۔ "اس کی یہ حرکت میں ہرگز معاف نہیں کر سکتا۔ یا تو وہی گھر میں رہے گا یا میں ہی رہوں گا۔ آپ کو اگر اس سے زیادہ محبت ہے تو مجھے رخصت کیجئے۔ میں اپنا بوجھ آپ اٹھالوں گا۔ اگر مجھے رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے کہئے جہاں چاہے چلا جائے۔ بس یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

لال بہاری سنگھ دروازے کی چوکھٹ پر چپ چاپ کھڑا بڑے بھائی کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ ان کا بہت ادب کرتا تھا۔ اسے کبھی اتنی جرات نہ ہوئی تھی کہ سری کنٹھ کے سامنے چارپائی پر بیٹھ جائے۔ یا حقہ پی لے۔ یا پان کھا لے۔ اپنے باپ کا بھی اتنا پاس و لحاظ نہ کرتا تھا۔ سری کنٹھ کو بھی اس سے دلی محبت تھی۔ اپنے ہوش میں انہوں نے کبھی اسے گھرکا تک نہ تھا۔ جب الٰہ آباد سے آتے تو ضرور اس کے لئے کوئی نہ کوئی تحفہ لاتے۔ مگدر کی جوڑی انہیں نے بنوادی تھی۔ پچھلے سال جب اس نے اپنے سے ڈیوڑھے جوان کو ناگ پنچمی کے دنگل میں پچھاڑ دیا تو انہوں نے خوش ہو کر اکھاڑے ہی میں جا کر اسے گلے سے لگالیا تھا اور پانچ روپے کے پیسے لٹائے تھے۔ ایسے بھائی کے منہ سے آج ایسی جگر دوز باتیں سن کر لال بہاری سنگھ کو بڑا ملال ہوا۔ اسے ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اپنے فعل پر آپ نادم تھا۔ بھائی کے آنے سے ایک دن پہلے ہی سے اس کا دل ہر دم دھڑکتا تھا کہ دیکھوں بھیا کیا کہتے ہیں۔ میں ان کے سامنے کیسے جاؤں گا۔ میں ان سے کیسے بولوں گا۔ میری آنکھیں ان کے سامنے کیسے اٹھیں گی۔ اس نے سمجھا تھا کہ بھیا مجھے بلا کر سمجھادیں گے۔ اس امید کے خلاف آج وہ انہیں اپنی صورت سے بیزار پاتا تھا۔ وہ جاہل تھا مگر اس کا دل کہتا تھا کہ بھیا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ اگر سری کنٹھ اسے اکیلا بلا کر دو چار سخت باتیں کہتے، بلکہ دو چار طمانچے بھی لگا دیتے تو شاید اسے اتنا ملال نہ ہوتا۔ مگر بھائی کا یہ کہنا کہ اب میں اس کی صورت سے نفرت رکھتا ہوں، لال بہاری سے نہ سہا گیا۔ وہ روتا ہوا گھر میں آیا اور کوٹھری میں جا کر کپڑے پہنے۔ آنکھیں پونچھیں جس میں کوئی یہ نہ سمجھے کہ روتا تھا۔ تب آنندی دیوی کے دروازے پر آ کر بولا۔ "بھابی! بھیا نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ میرے ساتھ اس گھر میں نہ رہیں گے۔ وہ اب میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے اس لئے اب میں جاتا ہوں۔ انہیں پھر منہ نہ دکھاؤں گا۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے اسے معاف کرنا۔"

یہ کہتے کہتے لال بہاری کی آواز بھاری ہو گئی۔

(4)

جس وقت لال بہاری سنگھ سر جھکائے آنندی کے دروازے پر کھڑا تھا، اسی وقت سری کنٹھ سنگھ بھی آنکھیں لال کئے باہر سے آئے۔ بھائی کو کھڑا دیکھا تو نفرت سے آنکھیں پھیر لیں اور کترا کر نکل گئے۔ گویا اس کے سائے سے بھی پرہیز ہے۔

آنندی نے لال بہاری سنگھ کی شکایت تو شوہر سے کی، مگر اب دل میں پچھتا رہی تھی۔ وہ طبعاً نیک عورت تھی اور اس کے خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ معاملہ اس قدر طول کھینچے گا۔ وہ دل ہی دل میں اپنے شوہر کے اوپر جھنجھلا رہی تھی کہ یہ اس قدر گرم کیوں ہو رہے ہیں۔ یہ خوف کہ کہیں یہ مجھے الٰہ آباد چلنے کو نہ کہنے لگیں۔ تو پھر میں کیا کروں

گی، اس کے چہرے کو زرد کیئے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں جب اُس نے لال بہاری کو دروازے پر کھڑے یہ کہتے ہوتے سنا کہ "اب میں جاتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ خطا ہوئی ہے معاف کرنا۔" تو اس کا رہا سہا غصہ بھی پانی ہو گیا۔ وہ رونے لگی۔ دلوں کا میل دھونے کے لئے آنسو سے زیادہ کارگر کوئی چیز نہیں ہے۔

سری کنٹھ کو دیکھ کر آنندی نے کہا۔ "لالہ باہر کھڑے ہیں۔ بہت رو رہے ہیں۔"

سری کنٹھ۔ "تو میں کیا کروں؟"

آنندی۔ "اندر بلالو۔ میری زبان میں آگ لگے۔ میں نے کہاں سے یہ جھگڑا اٹھایا۔"

سری کنٹھ۔ "میں نہیں بلانے کا۔"

آنندی۔ "پچھتاؤ گے۔ انہیں بہت گلان آگئی ہے۔ ایسا نہ ہو کہیں چل دیں۔"

سری کنٹھ نہ اٹھے۔ اتنے میں لال بہاری نے پھر کہا۔ "بھابی! بھیا سے میرا اسلام کہہ دو۔ وہ میرا منہ نہیں دیکھنا چاہتے۔ اس لئے میں بھی اپنا منہ انہیں نہ دکھاؤں گا۔"

لال بہاری سنگھ اتنا کہہ کر لوٹ پڑا اور تیزی سے باہر کے دروازہ کی طرف جانے لگا۔ یکایک آنندی اپنے گھر سے نکلی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال بہاری نے پیچھے کی طرف تاکا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولا۔ "مجھے جانے دو۔"

آنندی۔ "کہاں جاتے ہو؟"

لال بہاری۔ "جہاں کوئی میرا منہ نہ دیکھے۔"

آنندی۔ "میں نہ جانے دوں گی۔"

لال بہاری۔ "میں تم لوگوں کے ساتھ رہنے کے قابل نہیں ہوں۔"

آنندی۔ "تمہیں میری قسم' اب ایک قدم بھی آگے نہ بڑھانا۔"

لال بہاری۔ "جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے گا کہ بھیا کا دل میری طرف سے صاف ہو گیا یا نہیں تب تک میں اس گھر میں ہرگز نہ رہوں گا۔"

آنندی۔ "میں ایشور کی سوگند کھا کر کہتی ہوں کہ تمہاری طرف سے میرے دل میں ذرا بھی میل نہیں ہے۔"

اب سری کنٹھ کا دل پگھلا۔ انہوں نے باہر آکر لال بہاری کو گلے لگالیا۔ اور دونوں بھائی خوب پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ لال بہاری نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بھیا! اب کبھی نہ کہنا کہ تمہارا منہ نہ دیکھوں گا۔ اس کے سوا جو سزا آپ دیں گے وہ میں خوشی سے قبول کروں گا۔"

سری کنٹھ نے کانپتی ہوئی آواز سے کہا۔ "للّو ان باتوں کو بالکل بھول جاؤ۔ ایشور چاہے گا تو اب ایسی باتوں کا موقع نہ آئے گا۔"

بنی مادھو سنگھ باہر سے آرہے تھے۔ دونوں بھائیوں کو گلے ملتے دیکھ کر خوش ہو گئے۔ اور بول اٹھے۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ بگڑتا ہوا کام بنا لیتی ہیں۔"

گاؤں میں جس نے یہ واقعہ سنا' ان الفاظ میں آنندی کی فیاضی کی داد دی۔ "بڑے گھر کی بیٹیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

رانی سارندھا

(1)

اندھیری رات کے سناٹے میں دھسان ندی چٹانوں اور سنگ ریزوں سے ٹکراتی ہوئی سہانی آواز پیدا کرتی تھی۔ گویا چکیاں گھمر گھمر کرتی ہوں۔ ندی کے داہنے کنارے پر ایک ٹیکرا ہے۔ اس پر ایک پرانا قلعہ بنا ہوا ہے۔ جس کی فصیلوں کا گھاس اور کائی نے محاصرہ کر رکھا ہے۔ ٹیکرے سے پورب کی طرف ہٹ کر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ یہ قلعہ اور گاؤں دونوں ایک بندیل سردار کی یادگار ہیں۔ صدیاں گزر گئیں۔ بندیل کھنڈ میں سلطنتیں بنیں اور بگڑیں۔ مسلمان آئے اور گئے۔ بندیل راجے اٹھے اور گرے۔ کوئی دیہہ علاقہ ایسا نہ تھا جس پر ان ملوک گردیوں کے داغ نہ لگے ہوں۔ مگر قلعے پر کسی غنیم کا پھریرا نہ لہرایا اور اس گاؤں میں کسی غنیم کے قدم نہ آئے۔ یہ اس کی خوش نصیبی تھی۔

انردھ سنگھ دلیر راجپوت تھا۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب ہر شخص کو ضرور تاً دلیر اور جانباز بننا پڑتا تھا۔ ایک طرف مسلمان فوجیں پرا جمائے کھڑی رہتی تھیں۔ دوسری طرف زبردست بندیل راجے چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو ہوسناک نگاہوں سے دیکھتے رہتے تھے۔ انردھ سنگھ کے پاس سواروں اور پیادوں کی مختصر مگر آزمودہ کار جماعت تھی۔ اس سے وہ اپنے خاندان کا وقار' اپنے بزرگوں کی عزت قائم رکھتا تھا۔ اسے کبھی چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا۔ تین سال ہوئے۔ اس کی شادی سیتلا دیوی سے ہوئی تھی۔ مگر انردھ سنگھ آرزوؤں کے دن اور امیدوں کی راتیں کوہ وبیاباں میں کاٹتا تھا اور غریب سیتلا دیوی اس کی جان کی خیر منانے میں۔ وہ کتنی دفعہ شوہر سے کہہ چکی تھی۔ وہ کتنی بار اس کے قدموں پر گر کر روئی تھی کہ تم میرے آنکھوں کے سامنے سے کہیں نہ جاؤ۔ مجھے ہر دوار لے چلو۔ بندرابن لے چلو۔ مجھے تمہارے ساتھ جنگل میں رہنا منظور ہے۔ مگر یہ بیوگ اب نہیں سہا جاتا۔ اس نے پیار سے کہا۔ ضد سے کہا۔ منت سے کہا۔ مگر انردھ سنگھ بندیل تھا۔ سیتلا اپنے کسی ہتھیار سے اس پر فتح نہ پاسکی۔

اندھیری رات تھی۔ ساری دنیا سوتی تھی۔ مگر تارے آسمان پر گھورتے تھے۔ سیتلا دیوی پلنگ پر پڑی ہوئی کروٹیں بدل رہی تھی۔ اور ان کی نند سارندھا فرش پر بیٹھی ہوئی دلکش لہجے میں گاتی تھی:

"بن رگھوبیر کٹت نہیں رین"

سیتلا نے کہا۔ "جی نہ جلاؤ۔ کیا تمہیں بھی نیند نہیں آتی؟"

سارندھا۔ "تمہیں لوری سنا رہی ہوں۔"

سیتلا۔ "میری آنکھوں سے تو نیند غائب ہو گئی۔"

سارندھا۔ "کسی کو ڈھونڈنے گئی ہو گی۔"

اتنے میں دروازہ کھلا اور ایک لمبے قد کا سجیلا جوان اندر داخل ہوا۔ یہ انردھ تھا۔ اس کے کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور بدن پر کوئی ہتھیار نہ تھا۔ سیتلا چارپائی سے اتر کر زمین پر بیٹھ گئی۔ سارندھا نے پوچھا۔

"بھیا یہ کپڑے بھیگے کیوں ہیں؟"

انردھ۔ "ندی تیر کر آیا ہوں۔"

سارندھا۔ "ہتھیار کیا ہوئے؟"

انردھ۔ "چھن گئے۔"

سارندھا۔ "اور ساتھ کے آدمی؟"

انردھ۔ "سب کے سب میدان میں کام آئے۔"

سیتلا نے دبی زبان سے کہا۔ "ایشور نے بڑی خیر کی۔"

مگر سارندھا کے تیوروں پر بل پڑ گئے اور غرور کی سرخی سے چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "بھیا! تم نے خاندان کی رسم کھو دی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔"

سارندھا بھائی پر جان دیتی تھی۔ اس کے منہ سے یہ جلا ہوا فقرہ سن کر انردھ سنگھ شرم سے عرق عرق ہو گیا۔ اور وہ مردانہ جوش جسے محبت نے ذرا دیر کے لئے دبا رکھا تھا' آگ کی طرح بھڑک اٹھا۔ وہ الٹے قدم لوٹا۔ اور یہ کہہ کر کہ "سارندھا! تم نے مجھے عمر بھر کے لئے خبردار کر دیا۔ یہ باتیں مجھے کبھی نہ بھولیں گی۔" باہر چلا گیا۔

اندھیری رات تھی۔ آسمان پر تارے گھور رہے تھے۔ انردھ سنگھ قلعے سے باہر نکلا۔ اور ذرا دیر میں ندی کے اس پار جا پہنچا۔ اور پھر تاریکی کے اتھاہ سمندر میں غرق ہو گیا۔ سیتلا اس کے پیچھے پیچھے فصیل تک آئی مگر جب انردھ جست مار کر باہر کود پڑا تو وہ برہن ایک چٹان پر بیٹھ کر رونے لگی۔

اتنے میں سارندھا بھی وہیں آ پہنچی۔ سیتلا نے ناگن کی طرح بل کھا کر کہا۔ "رسم اتنی پیاری ہے!"

سارندھا۔ "ہاں۔"

سیتلا۔ "اپنا پتی ہوتا تو کلیجے میں چھپا رکھتی۔"

سارندھا۔ "نہ کلیجے میں خنجر چبھو دیتی۔"

سیتلا نے طیش کھا کر کہا۔ "ڈولی میں چھپاتی پھرو گی۔ میرے بات گرہ میں باندھ لو۔"

سارندھا۔ "جس روز یہ نوبت آئے گی میں اپنا قول پورا کر دکھاؤں گی۔"

اس واقعہ کے تین ماہ بعد انردھ سنگھ مہرونی کا قلعہ فتح کر کے لوٹا اور سال بھر کے بعد سارندھا کی شادی اورچھا کے راجہ چمپت رائے سے ہو گئی۔ مگر اس دن کی باتیں دونوں عورتوں کے دل میں کھٹکتی رہیں۔

(2)

راجہ چمپت رائے بڑا ذی حوصلہ اولوالعزم راجپوت تھا۔ ساری بندیلہ قوم اسے اپنا مایہ ناز سمجھتی تھی۔ اس کے ابرو کے اشارے پر فوجیں آراستہ اور ریاستیں تباہ ہو جاتی تھیں۔ مسند حکومت پر آتے ہی اس نے مغل بادشاہوں کو خراج دینا بند کر دیا اور زور شمشیر سے اپنا دائرہ سلطنت وسیع کرنے لگا۔ اسلامی فوجیں بار بار حملہ آور ہوتیں اور پسپا ہو جاتیں۔ اس کے نام پر سارا بندیل کھنڈ فدا ہونے کو تیار تھا۔ یہی زمانہ تھا جب انردھ سنگھ نے اپنی بہن اس کے آغوش محبت میں دی۔ سارندھا نے منہ مانگی مراد پائی۔ اس کی یہ آرزو کہ میرا شوہر سب بندیلوں کا سرتاج ہو' پوری ہو گئی۔ اگرچہ چمپت رائے کے رنواس میں پانچ رانیاں تھیں۔ ایک سے ایک حسین و مہ جبین

مگر چمپت رائے کو بہت جلد معلوم ہو گیا کہ وہ عورت جو دل میں میری پرستش کرتی ہے' سارندھا ہے۔

مگر اتفاقات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ چمپت رائے کو دربار دہلی کا حلقہ بگوش ہونا پڑا۔ اس نے اپنا ملک و مال اپنے بھائی پہاڑ سنگھ کو سونپا اور خود دہلی کی طرف روانہ ہوا۔ یہ عہد شاہجہانی کا آخری دور تھا۔ ولی عہد کی آنکھوں میں مروت اور دل میں شرافت تھی۔ انہوں نے چمپت رائے کی معرکہ آرائیوں کی داستانیں سنی تھیں۔ اس کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ اور کالپی کی بیش بہا جاگیر اسے عنایت کی جس کے محاصل نو لاکھ سالانہ تھے۔

یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ چمپت رائے کو آئے دن کی صف آرائیوں سے نجات ملی۔ رعب و شان کے ساتھ حکومت کرنے لگا۔ فراغت کے ساتھ امارت کے چونچلے آ پہنچے۔ عشرت محفلیں سجاتی اور مسرت کے نغمے الاپتی۔ راجہ نشۂ عیش میں متوالے ہوئے۔ رانیاں زیورات مرصع کی چمک دمک پر ریجھیں۔ کامرانی کے نشے نے سب کو مدہوش کر دیا مگر سارندھا ان دنوں بہت مغموم و پژمردہ خاطر رہتی۔ وہ خوشی کی مجلسوں میں بہت کم بیٹھتی اور مسرت کی زمزمہ سنجیاں اسے بہت کم پسند آتیں۔

ایک روز چمپت رائے نے سارندھا سے کہا۔ "سارن! تم اداس کیوں رہتی ہو۔ میں تمہیں کبھی ہنستے نہیں دیکھتا۔ کیا مجھ سے ناراض ہو؟"

سارندھا آبدیدہ ہو کر بولی۔ "سوامی! آپ کیوں ایسا خیال کرتے ہیں۔ آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔ جب آپ خوش ہیں۔ تو میں بھی خوش ہوں۔"

چمپت رائے۔ "میں جب سے یہاں آیا ہوں۔ میں نے تمہارے چہرے پر وہ دلآویز مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھی جو میرا من ہر لیا کرتی تھی۔ تم نے کبھی اپنے ہاتھوں سے مجھے بیڑا نہیں کھلایا۔ کبھی میری پاگ نہیں سنواری۔ کبھی میرے بدن پر ہتھیار نہیں سجائے۔ سچ بتاؤ۔ کیا بات ہے؟ کیا میں یہ خیال کروں کہ مجھ میں اب وہ تازگی نہیں رہی۔"

سارندھا۔ "پران ناتھ۔ آپ مجھ سے ایسی بات پوچھتے ہیں جس کا جواب میں نہیں دے سکتی۔ بے شک ان دنوں میری طبیعت شگفتہ نہیں رہتی۔ میں بہت چاہتی ہوں کہ خوش رہوں مگر ایک بوجھ سا دل کو دبائے رہتا ہے۔"

چمپت رائے۔ (تیوری چڑھا کر) "مجھے اس دل کی گرفتگی کا کوئی خاص سبب نظر نہیں آتا۔ ایشور نے تمہیں کیا نہیں دیا۔ آخر اورچھا میں کیا سکھ تھا؟"

سارندھا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ "میں کچھ کہوں۔ آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟"

چمپت رائے۔ "نہیں شوق سے کہو۔"

سارندھا۔ "اورچھا میں میں ایک راجہ کی رانی تھی۔ یہاں میں ایک جاگیردار کی لونڈی ہوں۔ اورچھا میں میں وہ تھی جو اودھ میں کوشلیا تھیں۔ مگر یہاں ایک شاہی نمک خوار کی کنیز ہوں۔ جس بادشاہ کے روبرو آپ آج سر نیاز خم کرتے ہیں' وہ کل آپ کا نام سن کر تھراتا تھا۔ رانی سے باندی ہو کر خوش رہنا میرے بس میں نہیں۔ آپ نے فراغت اور یہ محفلیں بڑی گراں قیمت دے کر خریدی ہیں۔"

چمپت رائے کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ سا ہٹ گیا۔ وہ اب تک سارندھا کی روحانی عظمت سے بے خبر تھے۔ جیسے یتیم بچہ ماں کا تذکرہ سن کر رونے لگتا ہے' اسی طرح اورچھا کی یاد میں چمپت رائے کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ اس عقیدت سے جو ایک سچے پاسک کو دیوی سے ہوتی ہے۔ انہوں نے سارندھا کے قدم

چوم لئے۔ آج سے انہیں پھر اسی اجڑے دیار میں بسنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ جہاں سے ہوس پرستیوں کی تمنا کھینچ لائی تھی۔

(3)

جس طرح ماں اپنے کھوئے ہوئے نادان بچے کو پا کر نہال ہو جاتی ہے' اسی طرح چمپت رائے کے آنے سے بندیل کھنڈ نہال ہو گیا۔ وہ بندیل قوم کا طرہ دستار تھا۔ قلعہ جیرچھ کے سوئے ہوئے نصیب جاگے۔ نوبتیں چھڑنے لگیں اور ایک بار سارندھا کی نرگسی آنکھوں میں تبسم کی جھلک نظر آنے لگی۔

یہاں رہتے کئی ماہ گذر گئے۔ اسی اثناء میں شاہ جہان بیمار پڑا۔ شہزادوں میں پہلے ہی سے چشمک تھی۔ اس خبر کے پھیلتے ہی عناد و فساد کا شعلہ بھڑک اٹھا۔ صف آرائیوں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ مراد اور محی الدین اپنے دَل سجا کر دکن سے چلے۔

برسات کے دن تھے۔ ندی نالے امنڈے ہوئے تھے۔ کوہ و بیابان ہری ہری گھاسوں سے لہرا رہے تھے۔ نامیہ رنگ برنگ روپ بھر کر اپنی اداؤں کے کرشمے دکھا رہی تھی۔ مراد اور محی الدین عاشقانہ بے صبری سے قدم بڑھاتے چلے آتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ دھول پور کے قریب دریائے چمبل کے کنارے آ پہنچے۔ مگر یہاں عین معبر پر فوج شاہی اپنے خیر مقدم کے لئے آراستہ پائی۔

شہزادے اب بڑی تشویش میں مبتلا ہوئے۔ سامنے دریائے ذخار بہتا تھا۔ راز عرفاں کی طرح وسیع۔ معبر پر ایک آہنی دیوار کھڑی تھی۔ کسی درویش کے استغنا کی طرح مستحکم۔ بے بسی کے عالم میں چمپت رائے کے پاس پیغام بھیجا کہ خدا کے لئے آکر ان کشتی شکست گان کا بیڑا پار لگایئے۔

راجہ نے رنواس میں جاکر سارندھا سے پوچھا۔ "اس پیغام کا کیا جواب دوں؟"

سارندھا۔ "آپ کو مدد کرنی ہو گی۔"

چمپت رائے۔ "ان کی مدد کرنا دارا شکوہ سے بیر مول لینا ہے۔"

سارندھا۔ "بے شک مگر ہاتھ پھیلانے والے کی لاج رکھنا بھی ضروری ہے۔"

چمپت رائے۔ (سوچ کر) "سارن! تم نے غور کر کے جواب نہیں دیا۔"

سارندھا۔ "پران ناتھ۔ میں خوب جانتی ہوں کہ منزل دشوار ہے اور ہمیں اپنے سپاہیوں کا خون پانی کی طرح بہانا پڑے گا۔ مگر ہم اپنا خون بہائیں گے۔ اپنے جاں بازوں کے سر کٹوائیں گے۔ اور چمبل پر لاشوں کا گھاٹ تیار کر دیں گے۔ یقین مانئے جب تک چمبل کی دھارا بہتی رہے گی' ہمارے سرفروشوں کے خون لعل بن بن کر درخشاں رہیں گے۔ اور جب تک بندیلوں کا ایک نام لیوا بھی زندہ رہے گا' یہ خون اس کے ماتھے پر کیسر کا تلک بن کر چمکے گا۔

آسمان پر بادلوں کے سمندر موجیں مار رہے تھے۔ جیرچھ کے قلعے سے سرفروش بندیلوں کی ایک کالی گھٹا اٹھی اور دریائے چمبل کی طرف چلی۔ ہر سپاہی بیر رس سے جھوم رہا تھا۔ رانی سارندھا نے دونوں راجکماروں کو گلے سے لگا لیا اور چمپت رائے کو پان کا بیڑا دے کر بولی۔ "بندیلوں کی لاج تمہارے ہاتھ ہے۔ ایشور تمہاری تلواروں کو اندر کا بجر بنا دے۔"

آج خوشی سے اس کا ایک ایک عضو مسکرا رہا ہے اور دل سینے کے جامے میں پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح ریگستان کا جاں بہ لب مسافر نخلستان کا سوار دور سے دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جاتا ہے' اسی طرح بندیلوں کی یہ پُر خروش گھٹا دیکھ کر شہزادوں کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ راجہ وہاں کی چپہ چپہ زمین سے واقف تھا۔ اس نے بندیلوں کو تو کمین گاہ میں چھپنے کا اشارہ کیا اور شہزادوں کی منتشر فوج کو آراستہ کر کے دریا کے کنارے مغرب کی طرف چلا۔ دارا شکوہ کو گمان ہوا کہ حریف کسی دوسرے گھاٹ اتر جانا چاہتا ہے۔ فوراً معبر سے مورچے ہٹا لئے۔ کمین گاہ میں بیٹھے ہوئے بندیلے اسی موقع کے منتظر تھے۔ باہر نکل پڑے اور دریا میں گھوڑے ڈال دیئے۔ چمپت رائے نے شہزادہ دارا شکوہ کو بھلاوا دے کر اپنی فوج گھما دی اور بندیلوں کے نقش قدم پر چلتا ہوا اسے اتار لایا۔ اس نقل و حرکت میں اسے صرف سات گھنٹوں کا توقف ہوا۔ مگر جا کر دیکھا تو سات سو بندیل جانبازوں کی لاشیں پھڑک رہی تھیں۔

راجہ کو دیکھتے ہی بندیلوں کی ہمتیں بندھ گئیں۔ محی الدین کی فوج نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ بلند کیا اور جس طرح طوفان پُر شور سمندر کو زیر و زبر کر دیتا ہے' اسی طرح ان کے پر زور حملے سے شاہی فوج میں ہل چل پڑ گئی۔ بندیلوں نے پہلے ہی ان کا قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ اس دھاوے نے ان کی صفیں توڑ دیں۔ دست بدست جنگ کی نوبت پہنچی۔ خنجر میانوں سے نکل پڑے اور خون کے فوارے چلنے لگے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ آسمان شفق سے سرخ ہوا اور زمین خون سے۔

اندھیرا ہو گیا۔ تلواریں دم لینے کے لئے بے قرار ہو رہی تھیں۔ دفعتاً افق مغرب سے سپاہیوں کا ایک دَل اٹھا۔ اور دیکھتے دیکھتے فوج شاہی کی پشت پر آ پہنچا اور کچھ اس جوش خروش اور اس سر گرمی سے حملہ آور ہوا کہ فوج شاہی کے قدم اکھڑ گئے۔ سارا شیرازہ بکھیر گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ یہ امداد غیب کہاں سے آئی۔ اکثر عقیدت مندوں کو خیال گزرا کہ شاید فتح کے فرشتے ہیں۔ شہزادوں کی حمایت کو آئے ہیں۔ جب راجہ دریافت حال کے لئے نزدیک گیا تو ان کے سردار نے گھوڑے سے اتر کر اس کے روبرو سرِ تعظیم خم کر دیا۔ راجہ غرور کے نشے سے متوالا ہو گیا۔ یہ سارندھا تھی۔

میدانِ جنگ اس وقت مرقع عبرت بنا ہوا تھا۔ جہاں چند گھنٹے پہلے سپاہیوں کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ وہاں بے جان لاشیں پھڑک رہی تھیں۔ حضرت انسان نے ابتدائے آفرینش سے کتنی جانیں قربان کر دی ہیں اور کس بے دردی سے!

اب فتح نصیب فوج کے سپاہی مال غنیمت پر ٹوٹے۔ پہلے زندوں کی زندوں سے جنگ تھی۔ اب زندوں کی مردوں سے جنگ شروع ہوئی۔ وہ شجاعت اور مردانگی کا نظارہ تھا۔ یہ حرص اور سفلہ پن کی خراش تصویر۔ اس وقت انسان حیوان بنا ہوا تھا۔ اب وہ حیوان سے شیطان بنا ہوا نظر آتا تھا۔

اس نوچ کھسوٹ میں لوگوں کو فوج شاہی کے سپہ سالار ولی بہادر خاں کی لاش نیم جان خاک و خون میں آلودہ نظر آئی۔ اس کے قریب اس کا گھوڑا دم سے اس کی مکھیاں اڑا رہا تھا۔

راجہ کو گھوڑوں کا شوق تھا۔ اسے دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ یہ ایک عراقی نژاد اصیل جانور تھا۔ ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا۔ شیر کا سا سینہ۔ چیتے کی سی کمر۔ دو آنکھیں جانداری کی دو تصویریں۔ اس کی محبت اور وفاداری دیکھ کر لوگ عش عش کرنے لگے۔ راجہ نے حکم دیا کہ اس بندۂ وفا پر کوئی ہتھیار نہ چلائے۔ اسے

زندہ گرفتار کر لو۔ یہ میرے اصطبل کی زینت ہو گا۔ جو شخص اسے میرے روبرو لائے گا' اس کا دامنِ مراد زر و جواہر سے بھر دوں گا۔

سوارانِ آزمودہ کار چاروں طرف سے گھوڑے پر پل پڑے۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس کے قریب جا سکے۔ کوئی پچکارتا۔ کوئی کمند ڈالنے کی فکر کرتا مگر کوئی تدبیر راس نہ آئی۔ ذرا دیر میں وہاں سپاہیوں کا ایک انبوہ کثیر جمع ہو گیا۔ تب سارندھا اپنے خیمے سے نکلی۔ وہ بے خوف گھوڑے کے قریب چلی گئی۔ اس کی آنکھوں میں جادو تھا۔ گھوڑے نے سر جھکا دیا۔ سارندھا نے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ دیا اور اس کی پیٹھ سہلانے لگی۔ اسپِ وفاشعار ایک بے کسانہ انداز سے اس کے آنچل میں منہ چھپا کر یوں کھڑا ہو گیا گویا بچہ گوسفند ہے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کی دھار بہنے لگی۔ رانی نے مادرانہ شفقت سے اس کے آنسو پونچھے اور اس کی راس پکڑ کر اپنے خیمے کی طرف چلی۔ گھوڑا خاموش اس کے پیچھے پیچھے چلا۔ گویا مدتوں کا نمک خوار ہے۔ لوگ تاثیرِ شفقت کا معجزہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔

مگر بہت بہتر ہوتا کہ گھوڑے نے اس سے بھی بے التفاتی کی ہوتی۔ یہ خوبصورت گھوڑا آگے چل کر اس خاندان کے حق میں آہوئے زرنگار ثابت ہوا۔

(4)

دنیا ایک عرصۂ کارزار ہے۔ اس میدان میں اسی سپہدار کو فتح نصیب ہوتی ہے جس کی آنکھیں موقع شناس ہوتی ہیں۔ وہ موقع دیکھ کر جتنی سرگرمی اور جوش سے آگے بڑھتا ہے' اتنے ہی جوش اور سرگرمی سے خطرے کے مقام پر پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ یہ مردِ میدان سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے اور تاریخ اس کے نام پر عظمت کے پھول نثار کرتی ہے۔

مگر اس میدان میں کبھی کبھی ایسے سپاہی بھی آ جاتے ہیں جو موقع پر قدم بڑھانا جانتے ہیں۔ مگر خطرے پر پیچھے ہٹنا نہیں جانتے۔ یہ سپاہی فتح کو اصولوں پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ اپنی فوج کا نام و نشان مٹا دے گا مگر جہاں ایک بار پہنچ گیا ہے وہاں سے قدم پیچھے نہ ہٹائے گا۔ اس ناموقع شناس شخص کو دنیاوی فتح شاذ ہی حاصل ہوتی ہے مگر بسا اوقات اس کی شکست فتوحات سے زیادہ اہم اور زیادہ شاندار ہوتی ہے۔ اگر موقع شناس سپہ سالار سلطنتیں قائم کرتا اور قومیں بناتا ہے تو یہ آن پر جان دینے والا۔ یہ قدم پیچھے نہ ہٹانے والا سپاہی قوموں کے اخلاق کو سدھارتا اور ان کے دلوں پر اخلاقی عظمت کا نقش جماتا ہے۔ اسے دنیا میں کبھی فروغ نہیں مگر جب کسی مجلس یا تقریر میں اس کا نام زبان پر آ جاتا ہے تو حاضرین ہم آہنگ ہو کر اس پر اعزاز کے نعرے بلند کرتے ہیں اور اس کے نام کے گرد ہمیشہ کے لئے روحانی جلال کا ایک پُرنور ہالہ قائم ہو جاتا ہے۔ سارندھا انہی آن پر جان دینے والے سپاہیوں میں تھی۔

شہزادہ محی الدین چمبل کے کنارے سے آگرہ کی طرف چلا تو اقبال اس کے سر پر مورچھل ہلاتا تھا اور نصرت کامرانی کا نقارہ بجاتی تھی۔ جب وہ آگرہ پہنچا تو شوکت نے اس کے لئے تختِ شاہی سجا دیا۔

اورنگ زیب میں قدر شناسی کا احساس کم نہ تھا۔ اس نے سرداران شاہی کی خطائیں معاف کر دیں اور ان کے مناصب بحال کئے۔ راجہ چمپت رائے کو اس کی جاں بازانہ خدمات کے صلے میں منصب دوازدہ ہزاری پر سرفراز کیا اور اورچھا سے بنارس اور بنارس سے جمنا تک جاگیر عطا کی۔ بندیل راجہ نے پھر شاہی اطاعت کا طوق پہنا۔ عشرت کی

محفلیں آراستہ ہو گئیں اور ساغر عیش کے دور چلنے لگے۔ ایک بار پھر نغمہ دلپذیر کی صدا بلند ہوئی اور رانی سارندھا پھر فکر و ملال سے گھلنے لگی۔

ولی بہادر خاں بڑا چرب زبان شخص تھا۔ اس کی لطافت زبان نے بہت جلد شاہ عالمگیر کے دل میں جگہ پیدا کر لی۔ بارگاہ سلطانی میں اس پر اعزاز کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ خان صاحب کے دل میں اپنے گھوڑے کے ہاتھ سے نکل جانے کا غم کانٹے کی طرح کھٹکا کرتا تھا۔ ایک روز کنور چھترسال اسی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کو گیا تھا۔ خان صاحب کے محل کی طرف جا نکلا۔ ولی بہادر خاں ایسے ہی موقع کا منتظر تھا۔ فوراً اپنے آدمیوں کو اشارہ کر دیا۔ راج کمار تنہا کیا کر سکتا تھا۔ پیادہ پا اپنے مکان پر آیا اور سارندھا سے ساری کیفیت بیان کی۔ راجکماری کا چہرہ تمتما گیا۔ بولی۔ "مجھے اس بات کا غم نہیں کہ گھوڑا ہاتھ سے گیا بلکہ غم اس بات کا ہے کہ تو اسے کھو کر زندہ کیوں لوٹا۔ کیا تیری رگوں میں بندیلوں کا خون نہیں ہے؟ کوئی پروانہ تھی اگر تجھے گھوڑا نہ ملتا مگر تجھے ثابت کر دینا چاہیے تھا کہ ایک بندیل لڑکے سے اس کا گھوڑا چھین لینا ہنسی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے پچیس جانبازوں کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ خود سپاہیانہ بانا سجایا اور سپاہیوں کو لے کر ولی بہادر خاں کے مکان پر جا پہنچی۔ خاں صاحب اسی گھوڑے پر سوار ہو کے دربار چلے گئے تھے۔ سارندھا نے فوراً دربار کی طرف رخ کیا اور ہوا کی طرح سنسناتی ہوئی دربار شاہی کے مقابل جا پہنچی۔ یہ کیفیت دیکھتے ہی ارکان دربار میں ہل چل مچ گئی۔ ملازمین شاہی ادھر ادھر سے آکر جمع ہو گئے۔ شاہ عالمگیر صحن دربار میں نکل آئے۔ امرا اپنے اپنے تیغے اور تلواریں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور چاروں طرف شور مچ گیا۔ کتنی ہی آنکھوں نے اس دربار میں امر سنگھ کے آبدار تیغے کی جھلک دیکھی تھی۔ ان کی آنکھوں میں وہی سانحہ کھنچ گیا۔

سارندھا نے بلند آواز میں کہا۔ "خان صاحب! بڑے شرم کی بات ہے کہ آپ نے وہ مردانگی جو دریائے چمبل کے کنارے دکھانی چاہیے تھی، آج ایک طفل شیر خوار کے مقابلے میں دکھائی ہے۔ کیوں کیا یہ مناسب تھا کہ آپ لڑکے سے گھوڑا چھین لیتے؟"

ولی بہادر خاں کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ تند لہجے میں بولے۔ "کسی غیر کو کیا اختیار ہے کہ میری چیز اپنے تصرف میں لائے۔"

رانی۔ "وہ آپ کی چیز نہیں، وہ میری چیز ہے۔ اسے میں نے رن بھوم میں پایا ہے اور اتنی آسانی سے آپ اسے میرے ہاتھ سے نہیں چھین سکتے۔ میں اس کے پیچھے ایک ہزار سواروں کا خون بہادوں گی۔"

خاں صاحب۔ "وہ گھوڑا میں نہیں دے سکتا۔ اس کے عوض میں اپنا اصطبل خالی کر سکتا ہوں۔"

رانی۔ "میں اپنا گھوڑا لوں گی۔"

خاں صاحب۔ "میں اس کے ہم وزن زر و جواہر دے سکتا ہوں مگر گھوڑا نہیں دے سکتا۔"

رانی۔ "اس کا فیصلہ تلواریں کریں گی۔"

بندیل نوجوانوں نے میان سے تلواریں کھینچیں اور قریب تھا کہ کشت و خون کا بازار گرم ہو۔ عالمگیر نے بیچ میں آکر فرمایا۔ "رانی صاحبہ! آپ اپنے سپاہیوں کو روکیں۔ گھوڑا آپ کو مل جائے گا۔ مگر اس کی قیمت بہت گراں ہو گی۔"

رانی۔ "میں اس کے لئے اپنا سب کچھ قربانی کرنے کو تیار ہوں۔"

عالمگیر۔ "جاگیر اور منصب بھی؟"

رانی۔ "جاگیر اور منصب کوئی چیز نہیں۔"

عالمگیر۔ "اپنا راج بھی؟"

رانی۔ "اس کی بھی میرے نزدیک کچھ ہستی نہیں ہے۔"

عالمگیر۔ "ایک گھوڑے کے مقابلے میں؟"

رانی۔ "جی نہیں اس چیز کے مقابلے میں جو دنیا میں سب سے زیادہ پیاری ہے۔"

عالمگیر۔ "وہ کیا ہے؟"

رانی۔ "اپنی آن!"

اس طرح رانی سارندھا نے ایک گھوڑے کے لئے اپنی وسیع جاگیر' اونچا منصب اور شاہی اعزاز سب ہاتھ سے کھو دیا اور صرف اتنا ہی نہیں' آئندہ کے لئے شاہی عتاب کو بیعانہ دیا۔ اس گھڑی سے دم آخر تک چمپت رائے کو اطمینان نصیب نہ ہوا۔

(5)

راجہ چمپت رائے نے پھر قلعہ جیرچھ میں بود و باش اختیار کی۔ ان کو منصب و جاگیر کے ہاتھ سے نکل جانے کا ملال ضرور ہوا مگر حرف شکایت لبوں پر نہیں لائے۔ وہ سارندھا کے مزاج سے خوب واقف تھے۔ کچھ دنوں تک عافیت سے گزری۔ مگر عالمگیر سارندھا کے سخت الفاظ بھولا نہ تھا۔ جوں ہی بھائیوں کے طرف سے اطمینان ہوا' اس نے ایک فوج جرار چمپت رائے کی سرزنش کے لئے روانہ کی۔ اور بائیس سپہداران آزمودہ کار اس مہم پر مامور ہوئے۔ سبھ کرن بندیلہ شاہی صوبہ دار تھا۔ چمپت رائے کے بچپنے کا کھلاڑی اور ہم نوالہ دوست۔ اس نے چمپت رائے کو خاک میں ملانے کا بیڑا اٹھایا۔ اور بھی کتنے ہی بندیل سردار راجہ سے منحرف ہو کر شاہی صوبہ دار سے آملے اور ایک خونریز معرکہ ہوا۔ الطاف شاہی نے بھائیوں کی تلواریں بھائیوں کے خون سے رنگین کرا دیں۔ گو اس مہم میں راجہ کو فتح نصیب ہوئی مگر اس کی طاقت ہمیشہ کے لئے زائل ہو گئی۔ گرد و پیش کے بندیل رؤسا جو اس کی پشت پناہ تھے' عنایات خسروی کے دام میں پھنس گئے۔ رفقاء جاں نثار کچھ تو کام آئے۔ کچھ دغا کر گئے۔ اعزہ آنکھیں چرانے لگے۔ مگر ان مشکلات کے باوجود چمپت رائے کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔ اس نے جیرچھ کو خیر باد کہی اور تین سال تک بندیل کھنڈ کے کوہ و بیابان میں گھومتا رہا۔ شاہی فوجیں شکاری جانوروں کی طرح سارے ملک میں منڈلا رہی تھیں۔ راجہ کو آئے دن کسی نہ کسی سے سابقہ پڑ جاتا تھا۔ ان موقعوں پر اس کی دلیری معجزے دکھاتی تھی۔ سارندھا ہمیشہ اس کے پہلو میں رہتی۔ اور اس کا حوصلہ بڑھایا کرتی۔ بڑے بڑے سخت معرکوں میں بھی صبر رخصت ہو جاتا اور امید ساتھ چھوڑ دیتی۔ خودداری کا فرض اس کے پیش نظر رہتا۔ تین سال تک یہ کیفیت رہی۔ آخر صوبہ داران شاہی نے تنگ آکر شاہ عالمگیر کو عرضداشت بھیجی کہ اس شیر کا شکار حضور کے سوا اور کسی سے نہ ہو گا۔ جواب آیا کہ فوجیں ہٹالو اور محاصرے اٹھالو۔ راجہ نے سمجھا کہ ان بلاؤں سے نجات ہوئی۔ اور چھا کے قلعے میں آبسا مگر جس طرح برسات کے دنوں میں آفتاب ذرا دیر کے لئے ابر سیہ فام کے پردے سے نکل کر پھر غائب ہو جاتا ہے' اسی طرح چند مہینوں

کے امن کے بعد راجہ کو پھر آوارۂ دشتِ غربت ہونا پڑا۔

(6)

تین ہفتوں سے شاہی فوج نے اورچھا کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ جس طرح کلمۂ سخت جگر کو چھلنی کر دیتا ہے' اسی طرح توپ کے گولوں نے فصیلوں کی حالت کر رکھی ہے۔ قلعے میں بیس ہزار آدمی محصور ہیں مگر ان میں نصف سے زائد عورتیں اور ان سے کچھ ہی کم بچے ہیں۔ مردوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ آمدورفت کے راستے چاروں طرف سے بند ہیں۔ ہوا کا بھی گزر نہیں۔ رسد کا ذخیرہ بہت کم رہ گیا ہے۔ عورتیں اپنے مردوں اور بچوں کو زندہ رکھنے کے لئے خود فاقے کرتی ہیں۔ اس خوف نے کہ چند دنوں میں ہم آب و دانہ کے بغیر تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے' لوگوں کو نیم جان کر رکھا ہے۔ عورتیں سورج دیوتا کی طرف ہاتھ اٹھا کر غریب کو کوستی ہیں۔ بچے جھنجھلا جھنجھلا کر فصیلوں کی آڑ سے ان پر پتھر پھینکتے ہیں جو مشکل سے دیوار کے اس پار جاتے ہیں۔ سوءِ اتفاق سے راجہ چمپت رائے بھی مرض بخار میں مبتلا ہیں۔ کئی دن ہوئے ضعف نے انہیں پلنگ سے اٹھنے نہیں دیا۔ انہیں دیکھ کر یاس زدہ دلوں کو تسکین ہوتی تھی۔ مگر ان کی بیماری نے سارے قلعے میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔

راجہ نے سارندھا سے کہا۔ "سارن! آج دشمن ضرور قلعے کے اندر گھس آئیں گے۔"

سارن۔ "ایشور نہ کرے کہ ان آنکھوں سے وہ دن دیکھنا پڑے۔"

راجہ۔ "مجھے بڑی فکر ان غریب عورتوں اور بچوں کی ہے۔ گیہوں کے ساتھ یہ بے گناہ گھن کی طرح پسے جاتے ہیں۔"

سارن۔ "ہم لوگ یہاں سے نکل جائیں تو کیسا؟"

راجہ۔ "ان بیکسوں کو چھوڑ کر؟"

سارن۔ "ان پر یہ آفت ہماری لائی ہوئی ہے۔ ہم نہ ہوں گے تو شاید دشمن ان کے ساتھ رحم سے پیش آئیں۔"

راجہ۔ "نہیں۔ یہ لوگ مجھ سے نہ چھوڑے جائیں گے۔ جن مردوں نے ہمارے اوپر اپنی جان نثار کر دی ہے' ان کی عورتوں اور بچوں کو میں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔"

سارندھا۔ "مگر یہاں رہ کر ہم ان کی کچھ مدد بھی تو نہیں کر سکتے۔"

راجہ۔ "ان کے ساتھ مر تو سکتے ہیں۔ میں ان کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دوں گا۔ میں ان کے لیے شاہی فوج سے منتیں کروں گا۔ قید کی مصیبتیں جھیلوں گا۔ مگر اس آفت میں چھوڑ نہیں سکتا۔"

سارندھا نے ندامت سے گردن جھکا لی۔ اور سوچنے لگی۔ بے شک! اپنے رفیقوں کو آگ کی آنچ میں چھوڑ کر اپنی جان بچانا دلیری نہیں۔ میں ایسی خود غرض کیوں ہو گئی ہوں۔ مگر اپنے شوہر کو اطاعت کی ذلت سے بچانے کی فکر جذبہ انسانیت پر غالب آ گئی تھی۔ پھر بولی۔ "اگر آپ کو یقین ہو جائے کہ ان آدمیوں کے ساتھ ظلم نہ کیا جائے گا۔ تب تو آپ کو چلنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔"

راجہ۔ (سوچ کر) "کون یقین دلائے گا؟"

سارندھا۔ ”شاہی سپہ سالار کی تحریر۔“

راجہ۔ ”ہاں تب میں چلوں گا۔ مگر ایک شرط پر۔ جب یہ لوگ بھی مجھے بخوشی رخصت کر دیں۔“

سارندھا خیال میں ڈوب گئی۔ شاہی سپہ سالار سے یہ معاہدہ کس طرح لوں۔ کون پیغام لے کر جائے گا۔ اور یہ ظالم ایسا معاہدہ کرنے ہی کیوں لگے۔ انہیں تو یقین کامل ہے کہ دو چار روز میں ہمیں فتح ہو جائے گی اور ہماری طرف سے اطاعت کا پیغام کیوں قبول کریں گے اور جب انہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمارے ساتھ دغا کی گئی ہے تب تو ان غریبوں کے سر پر آفت آجائے گی۔ میرے یہاں ایسا چرب زبان' معاملہ فہم کون ہے جو یہ مشکل آسان کردے۔ چھترسال شاید یہ کام پورا کر دکھائے۔

یہ خیال کر کے رانی نے چھترسال کو بلایا۔ یہ اس کے چاروں بیٹوں میں سب سے زیادہ دلیر' فہیم اور شیریں زبان تھا۔ رانی اسے سب لڑکوں سے زیادہ پیار کرتی تھی۔ جس وقت چھترسال نے آکر اسے پرنام کیا تو رانی کی آنکھیں پُرآب ہو گئیں اور کلیجے سے ایک آہ سرد نکل گئی۔

چھترسال۔ ”ماتاجی۔ میرے لیے کیا حکم ہوتا ہے؟“

رانی۔ ”آج لڑائی کی کیا کیفیت ہے؟“

چھترسال۔ ”ہمارے پچاس آدمی اب تک مر چکے ہیں۔“

رانی۔ ”بندیلوں کی لاج اب ایشور کے ہاتھ میں ہے۔“

چھترسال۔ ”آج ہم لوگ رات کو شب خون مارنے کی فکر میں ہیں۔“

رانی نے چند لفظوں میں اپنی تجویز اس سے بیان کی۔ اور پھر پوچھنے لگی۔ ”یہ کام کس کے سپرد کیا جائے؟“

چھترسال۔ ”میرے۔“

رانی۔ ”تم! اسے پورا کر آؤ گے؟“

چھترسال۔ ”ہاں مجھے یقین ہے۔“

چھترسال جب یہاں سے چلا تو رانی نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اور دعا دے کر بولی۔ ایشور تمہاری صورت جلد دکھائے اور پھر دیر تک روتی رہی۔ اس کے بعد آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ”ایشور! میں نے اپنا جوان 'دلیر' ہونہار بیٹا بندیلوں کی آن کے بھینٹ کر دیا۔ اب اس آن کو نباہنا تیرا کام ہے۔ میں نے بڑی پیاری چیز بھینٹ کی ہے۔ اسے قبول کر۔“

(7)

دوسرے روز صبح کے وقت سارندھا اشنان کر کے تھال میں پوجا کا سامان لئے مندر کو چلی۔ اس وقت اس کا چہرہ زرد تھا۔ اور آنکھوں میں اندھیرا چھایا جاتا تھا۔ نیند کا سکون بخش جادو فکر مند دلوں پر نہیں چلتا۔ وہ مندر کے دروازے پر پہنچی تھی کہ اس کے تھال میں ایک تیر آکر گرا۔ اس کی نوک پر ایک کاغذ کا پرزہ لپٹا ہوا تھا۔ سارندھا نے تھال مندر کے چبوترے پر رکھ دیا۔ اور کاغذ کے پرزے کو دیکھا۔ تو چہرہ شگفتہ ہو گیا۔ مگر یہ شگفتگی ذرا دیر کی مہمان تھی۔ ”آہ! اس کاغذ کے پرزے کے لیے میں نے ایک جوان بیٹا ہاتھ سے کھویا ہے۔ کاغذ کے ٹکڑے کو اتنی گراں

قیمت پر کس نے خریدا ہو گا!"

سارندھا مندر سے لوٹ کر راجہ چمپت رائے کے پاس گئی اور بولی۔ "جیون ناتھ! آپ نے رات کو جو وعدہ کیا تھا۔ وہ اب پورا کرنا ہو گا۔"

راجہ نے چونک کر پوچھا۔ "تم نے اپنا وعد پورا کر لیا؟"

رانی نے وہ تحریری معاہدہ راجہ کو دے دیا۔ چمپت رائے نے اسے بغور دیکھا۔ بعد ازاں بولے۔ "ہاں مجھے اطمینان ہو گیا' اب میں چلوں گا۔ اور ایشور نے چاہا تو ایک دفعہ پھر ان دشمنوں کے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھاؤں گا۔ مگر سارن! سچ بتانا۔ اس کاغذ کا کیا مول ہے؟"

رانی نے آب دیدہ ہو کر کہا۔ "بہت گراں۔"

راجہ۔ "آخر؟"

رانی۔ "ایک جوان بیٹا۔"

راجہ کو سکتہ سا ہو گیا۔ چیخ کر بولے۔ "کون۔ انگد رائے؟"

رانی۔ "نہیں۔"

راجہ۔ "رتن ساہ؟"

رانی۔ "نہیں۔"

راجہ۔ "چھتر سال؟"

رانی۔ "ہاں۔"

جس طرح طائرِ بسمل اوپر اچھلتا ہے اور بے جان ہو کر گر پڑتا ہے۔ اسی طرح چمپت رائے پلنگ سے اچھلے اور پھر بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ چھتر سال انہیں بہت پیارا تھا اور ان کی زندگی کے سارے حوصلے اسی سے وابستہ تھے۔ جب آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو بولے۔ "سارن! مجھے پہلے معلوم ہوتا تو چھتر سال ہاتھ سے نہ جانے پاتا۔ چھتر سال مارا گیا تو بندیل بنس کا چراغ گل ہو جائے گا۔"

وہ رات قلعہ والوں کے لیے غم و ماتم کی رات تھی۔ عورتیں سارندھا کے پاؤں پر گر کر کہتیں کہ ہمیں بھول نہ جانا۔ مرد راجہ سے منتیں کرتے کہ ہم نے سائے کی طرح آپ کا ساتھ دیا ہے۔ ہم کو بھی لیتے چلئے۔ ایک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ سارندھا نے عورتوں کو گلے لگایا۔ چمپت رائے مردوں سے رخصت ہوئے اور ہزاروں مردوں عورتوں کو روتے چھوڑ کر پالکی میں بیٹھ گئے۔ سب آدمیوں کے دل کہہ رہے تھے کہ اب تمہاری آنکھیں چمپت رائے کو پھر نہ دیکھیں گی۔ یہ آخری ملاقات ہے اس لیے خوب جی بھر کر رو لو۔ کسے گمان تھا کہ یہ سکھپال نہیں۔ جنازہ ہے۔

اندھیری رات تھی۔ آسمان نے تاروں کے بے شمار چراغ جلا رکھے تھے۔ مگر شمع مزار کی طرح ان کی روشنی بہت دھندلی تھی۔ قلعے کے درودیوار پر حسرت برس رہی تھی۔ آہ وزاری کی دلخراش صدائیں آ رہی تھیں۔ اور رانی سارندھا سپاہیانہ لباس پہنے گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو پالکی میں بٹھائے قلعے کے زمین دوز راستے سے نکلی جاتی تھی۔

آج سے بہت دن پہلے ایک دن ایسی ہی اندھیری اور غمناک رات تھی۔ تب سارندھا کا دل مزۂ الفت سے غیر مانوس تھا۔ سیتلا دیوی کی زبان سے اس وقت جو بچن نکلے' وہ آج پورے ہوئے۔ کیا سارندھا کا وہ جواب بھی پورا ہو گا؟

(8)

دوپہر کا وقت تھا۔ آفتاب نصف النہار پر آکر آگ کے شرارے برسا رہا تھا۔ بدن کو جھلسنے والی تند پُرشور ہوا شعلہ سوزاں کی طرح وادی وصحرا میں آگ لگاتی پھرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا اگن دیوی کی ساری فوج گرجتی ہوئی چلی آتی ہے۔ زمین سے لے کر آسمان تک غبار آتشیں کا ابر چھایا ہوا تھا۔ رانی سارندھا گھوڑے پر سوار چمپت رائے کو لیے مغرب کی طرف چلی جارہی تھی۔ اورچھا دس کوس پیچھے چھوٹ چکا تھا اور یہ خیال کہ اب ہم خطرے کے دائرے سے باہر نکل آئے' غالب آتا جاتا تھا۔ راجہ پالکی میں بے سدھ پڑے ہوئے تھے اور کہار پسینے میں شرابور تھے۔ پالکی کے پیچھے پانچ سوار گھوڑے بڑھائے چلے آتے تھے۔ پیاس کے مارے سارے قافلے کا برا حال تھا۔ کلیجے لبوں پر آرہے تھے۔ سایہ دار درخت اور کنوئیں کی تلاش میں نگاہیں دوڑ رہی تھیں۔

دفعتاً سارندھا نے پیچھے کی طرف پھر کر دیکھا۔ تو اسے سواروں کی ایک جماعت نظر آئی۔ اس کا ماتھا ٹھنکا کہ اب خیر نہیں۔ یہ لوگ ضرور ہمارے تعاقب میں آرہے ہیں۔ پھر خیال گزرا کہ شاید میرے راجکمار آدمیوں کو لے کر میری مدد کو آرہے ہیں۔ عالم یاس میں بھی امید کا رشتہ نہیں ٹوٹتا۔ ذرا دیر تک وہ اسی امید و بیم کی حالت میں رہی۔ یہاں تک کہ وہ جماعت قریب آگئی اور سپاہیوں کا لباس صاف نظر آنے لگا۔ رانی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور سر پیٹ لیا۔ یہ لوگ شاہی فوج کے سپاہی تھے۔

سارندھا نے کہاروں سے کہا۔ ڈولی روک لو۔ بندیل سپاہیوں نے بھی تلواریں کھینچ لیں۔ راجہ ضعف و نقاہت کے مارے نیم جان ہورہے تھے۔ مگر جس طرح دبی ہوئی آگ ہوا لگتے ہی مشتعل ہوجاتی ہے' اسی طرح یہ کیفیت دیکھتے ہی ان کے تن بے جان میں جان آگئی۔ پالکی کا پردہ اٹھا کر باہر نکل آئے۔ تیروکمان ہاتھ میں لے لی۔ مگر وہ کمان جو ان کے ہاتھ میں پیام مرگ بن جاتی تھی اس وقت شاخِ بید کی طرح خم کھا گئی۔ سر میں چکر آیا۔ پاؤں تھرائے اور وہ زمین پر گر پڑے۔ یقین ہوگیا کہ ہمائے اقبال کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس طائرِ بے پر کی طرح جو سانپ کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اوپر کو اچکتا اور پھر زمین پر گر پڑتا ہے۔ راجہ چمپت رائے پھر اٹھے اور پھر گر پڑے۔ سارندھا نے انہیں سنبھال کر بٹھایا۔ اور آبدیدہ ہوکر بولی۔ "پران ناتھ!" اس کے آگے اس کی زبان سے کچھ نہ نکلا۔ ایسے موقع پر خموشی فصاحت سے بھی زیادہ فصیح ہوجاتی ہے۔ غریب سارندھا اس وقت عام عورتوں کی طرح کمزور نظر آرہی ہے لیکن ایک خاص حد تک کمزوری عورتوں کی خصلت کا سنگار ہے۔

چمپت رائے نے کہا۔ "سارن! دیکھو ہمارا ایک سپاہی اور موت کا شکار ہوا۔ افسوس! جس ذلت سے زندگی بھر بچتا رہا' وہ آج مرتے دم نصیب ہوئی۔ میری آنکھوں کے سامنے دشمن تمہارے پاک جسم کو ہاتھ لگائیں گے اور میں جگہ سے نہ ہل سکوں گا۔ ہائے موت کب آئے گی؟"

یہ کہتے کہتے انہیں ایک خیال آگیا۔ تیغے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر ہاتھ بے جان ہورہے تھے۔ تب سارندھا سے۔ "سارن! تم نے بہت موقعوں پر میری آن نباہی ہے۔"

اتنا سنتے ہی سارندھا کی کمزوری رخصت ہوگئی۔ آنسو خشک ہوگئے۔ اور مرجھائے ہوئے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ یہ امید کہ ابھی میں اپنے پران ناتھ کے کچھ کام آسکتی ہوں' اسے ہوش میں لے آئی۔ راجہ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "ایشور نے چاہا۔ تو مرتے دم تک نباہوں گی۔"

رانی نے سمجھا۔ شاید راجہ مجھ سے میری جان مانگ رہے ہیں۔

چمپت رائے۔ ”میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اسے تم نے ہمیشہ مانا ہے۔“

سارندھا۔ ”مرتے دم تک مانوں گی۔“

چمپت رائے۔ ”شاید یہ میری آخری درخواست ہو۔ اسے رد نہ کرنا۔“

سارندھا نے تیغہ نکال کر اپنے سینے پر رکھ لیا۔ اور بولی۔ ”یہ آپ کی درخواست نہیں۔ یہ میری آرزو ہے کہ مروں تو سر آپ کے قدموں پر ہو۔“

چمپت۔ ”تم نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔ کیا تم مجھے اس لیے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ جاؤ گی کہ بیڑیاں پہنے ہوئے دلی کی گلیوں میں نشانہ تضحیک بنوں؟“

رانی نے متحیر ہو کر راجہ کی طرف دیکھا۔ ان کا مطلب نہ سمجھی۔

چمپت۔ ”میں تم سے ایک بردان مانگتا ہوں۔“

رانی۔ ”شوق سے مانگئے۔“

چمپت۔ ”یہ میری آخری التجا ہے۔ جو کچھ کہوں گا۔ کرو گی؟“

رانی۔ ”سر کے بل کروں گی۔ شوق سے فرمائیے۔“

راجہ۔ ”دیکھو تم نے زبان دی ہے انکار نہ کرنا۔“

رانی۔ (کانپ کر) ”فرمائیے۔“

راجہ۔ ”اپنا تیغہ میرے سینے میں چبھو دو۔“

رانی کے دل پر بجلی سی گر پڑی۔ بولی۔ ”جیون ناتھ ایسا کبھی ہوا ہے؟“

راجہ۔ ”میں بیڑیاں پہننے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتا۔“

رانی۔ ”مجھ سے کیسے ہوگا؟“

پانچواں اور آخری سپاہی زخم کھا کر گرا۔ راجہ نے جھنجھلا کر کہا۔ ”اسی جگر پر آن نباہنے کا دعویٰ تھا؟“

شاہی سپاہی راجہ کی طرف لپکے کہ اتنے میں رانی نے اپنا تیغہ آب دار نکال کر راجہ کے سینے میں چبھو دیا۔ پریم کی ناؤ پریم کے ساگر میں غوطہ لگا گئی۔ راجہ کے کلیجے سے خون نکل رہا تھا۔ اور چہرے پر تبسم تھا۔

کیسا عبرت ناک نظارہ ہے! وہ عورت جو اپنے شوہر پر قربان ہوتی تھی' آج اس کی قاتلہ ہے۔ جس سینے سے لپٹ کر اس نے شباب کی بہاریں لوٹیں۔ جو سینہ اس کی امیدوں کا کاشانہ اور اس کی آرزوؤں کا آشیانہ تھا۔ جو سینہ اس کی عزت کا پاسبان اور اس کی محبت کا گنجینہ تھا۔ اس سینے کو آج سارندھا کی تلوار چوم رہی ہے۔ اس بحرِ الفت میں آج پریم کی ناؤ تیر رہی ہے۔ ہاں یہ تلوار فرض کی کٹار ہے۔ یہ تلوار پریم کی برچھی ہے۔ کس عورت کی تلوار سے ایسا کام ہوا ہے؟

آہ خودداری کا کیسا حسرت ناک انجام ہے۔ اودے پور اور مارواڑ کے کارناموں میں بھی خودداری اور علو ہمت کی ایسی مثال نہیں ملتی۔ عورت کے لیے اپنی جان دے دینا بہت آسان ہے۔ مگر یہ وہ کام ہے جو سارندھا کے سوا کبھی کسی عورت سے نہیں ہوا۔ نفس کے بہکانے سے' دل کی جلن سے عورتوں نے اپنے مردوں کی جانیں لی ہیں۔ مگر ادائے فرض۔ پتی برت اور آن پروری نے ایسی شان دار قربانی کبھی نہیں پائی۔

شاہی سپاہی سارندھا کی یہ جرأت اور اوسان دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ عداوت نے احترام کو جگہ دی۔ سردار نے

آگے بڑھ کر کہا۔ "رانی صاحبہ خدا گواہ ہے۔ ہم سب آپ کے بندۂ بے درم ہیں۔ آپ کا جو حکم ہو بہ سرو چشم بجا لائیں گے۔ سارندھا نے ہنس کر کہا۔ "اگر ہمارے بیٹوں میں سے کوئی زندہ ہو تو دونوں لاشیں اسے سونپ دینا۔"

یہ کہہ کر وہی خون آلود تیغہ اپنے سینے میں گھونپ لیا۔ جب وہ زمین پر گری تو اس کا سر راجہ چمپت رائے کے سینے پر تھا۔

راج ہٹ

(1)

دسہرے کے دن تھے۔ اچل گڑھ میں جشن کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ دربارِ عام میں مشیرانِ سلطنت کے بجائے اپسرائیں جلوہ افروز تھیں۔ دھرم شالوں اور سراؤں میں گھوڑے ہنہنا رہے تھے۔ ریاست کے ملازم کیا چھوٹے کیا بڑے رسد پہنچانے کے حیلے سے دربارِ عام میں جمے رہتے۔ کسی طرح ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ دربارِ خاص میں پنڈت اور پجاری اور مہنت لوگ آسن جمائے پاٹھ کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ وہاں کسی ملازم سرکار کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ گھی اور پوجا کی سامگری نہ ہونے کے باعث صبح کی پوجا شام کو ہوتی تھی۔ رسد نہ ملنے کی وجہ سے پنڈت لوگ ہون کے گھی اور میوہ جات کو بھوگ کے اگن کنڈ میں ڈالتے۔ دربارِ عام میں انگریزی انتظام تھا اور دربارِ خاص میں ریاست کا۔

راجہ دیو مل بڑے صاحبِ حوصلہ رئیس تھے۔ اس سالانہ جشن میں وہ بے دریغ روپیہ خرچ کرتے۔ جن دنوں قحط پڑا ریاست کے آدھے آدمی بھوکوں تڑپ کر مر گئے۔ بخار، ہیضہ اور پلیگ میں ہزاروں آدمی ہر سال لقمۂ مرگ بن جاتے تھے۔ ریاست مفلس تھی۔ اس لئے نہ وہاں مدرسے تھے، نہ شفاخانے، نہ سڑکیں۔ برسات میں رنواس دلدل ہو جاتا۔ اور اندھیری راتوں میں سر شام سے گھروں کے دروازے بند ہو جاتے۔ اندھیری سڑکوں پر چلنا جان جوکھم تھا۔ یہ سب اور ان سے بھی زیادہ تکلیف دہ باتیں گوارا تھیں۔ مگر یہ غیر ممکن، دشوار محال تھا کہ درگا دیوی کا سالانہ جشن نہ ہو۔ اس سے شانِ ریاست میں بٹہ لگنے کا خوف تھا۔ ریاست مٹ جائے، محلوں کی اینٹیں بک جائیں مگر یہ جشن ضرور ہو۔ قرب و جوار کے راجہ رئیس مدعو کئے جاتے۔ ان کے شامیانوں سے میلوں تک سنگِ مرمر کا ایک شہر بس جاتا۔ ہفتوں تک خوب چہل پہل دھوم دھام رہتی۔ اسی کی بدولت اچل گڑھ کا نام اٹل ہو گیا تھا۔

(2)

مگر کنور اندر مل کو راجہ صاحب کی ان رندانہ سرگرمیوں سے بالکل عقیدت نہ تھی۔ وہ خلقتاً ایک بہت متین اور سادہ منش نوجوان تھا۔ یوں غضب کا دلیر۔ موت کے سامنے بھی خم ٹھونک کر اتر پڑے مگر اس کی شجاعت خون کی پیاس سے پاک تھی۔ اس کے وار بے پر طائروں یا بے زبان جانوروں پر نہیں ہوتے تھے۔ اس کی تلوار کمزوروں پر

نہیں اٹھتی تھی۔ درماندوں کی حمایت‘ بے کسوں کی سفارشیں‘ غربا کی دست گیری اور فلک زدوں کی زخم شوئی‘ ان کاموں سے اسے روحانی مناسبت تھی۔ دو سال ہوئے وہ اندور کالج سے اعلیٰ درجے کی تعلیم پا کر لوٹا تھا اور تب سے اس کا یہ جوش راہ اعتدال اور مصلحت کی حدود سے متجاوز ہو گیا تھا۔ چوبیس سال کا قوی ہیکل جوان ناز و نعمت میں پلا ہوا۔ جسے فکر کی کبھی ہوا تک نہ لگی۔ اگر کبھی رُلایا تو ہنسی نے۔ وہ ایسا نیک شعار ہو۔ اس کے مردانہ چہرے پر غور و خوض کی زردی اور تصور کی جھریاں نظر آئیں۔ یہ غیر معمولی بات تھی۔ جشن مبارک کا دن قریب آ پہنچا تھا۔ صرف چار دن باقی تھے۔ جشن کا انتظام مکمل ہو چکا تھا۔ صرف اگر کسر تھی تو کہیں کہیں نظر ثانی کی۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ راجہ صاحب رنواس میں بیٹھے ہوئے چند منتخب اپسراؤں کا گانا سن رہے تھے۔ اس کی سریلی تانوں سے جو خوشی ہو رہی تھی‘ اس سے بدر جہا حظ اس خیال سے ہوتا تھا کہ یہ ترانہ ریزیاں پولیٹکل ایجنٹ کو پھڑ کا دیں گی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سنے گا اور فرط مسرت سے اچھل اچھل پڑے گا۔

اس خیال سے جو لطف اور نشہ تھا‘ وہ تان سین کی تانوں میں بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ آہ! اس کی زبان سے بے ساختہ داد نکل پڑے گی۔ عجب نہیں اٹھ کر مجھ سے ہاتھ ملائے اور میرے انتخاب کی داد دے۔ اتنے میں کنور اندر مل بہت سادہ کپڑے پہنے خدمت میں باریاب ہوئے اور سر نیاز خم کیا۔ راجہ صاحب کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ مگر کنور صاحب کی یہ بے موقع مداخلت ناگوار خاطر ہوئی۔ ارباب نشاط کو وہاں سے اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

کنور اندر مل بولے۔ ”مہاراج! کیا میری منت سماجت پر بالکل دھیان نہ دیا جائے گا؟“ راجہ صاحب ولی عہد کی عزت کرتے تھے اور محبت تو قدرتی بات تھی۔ تاہم انہیں یہ بے موقع ہٹ ناگوار تھی۔ وہ اتنے کم نظر نہ تھے کہ کنور صاحب کے نیک مشوروں کی قدر نہ کریں۔ ضرور ریاست زیر بار ہوتی جاتی تھی اور رعایا پر بہت ظلم کرنا پڑتا تھا۔ میں اندھا نہیں ہوں کہ ایسی موٹی موٹی باتیں نہ سمجھ سکوں۔ مگر اچھی باتیں بھی موقع اور محل دیکھ کر کی جاتی ہیں۔ آخر نام و نمود‘ عزت و آبرو بھی تو کوئی چیز ہے۔ ریاست میں سنگِ مرمر کی سڑکیں بنوا دوں۔ گلی گلی مدرسے کھول دوں۔ گھر گھر کنوئیں کھدا دوں۔ دواؤں کی نہریں جاری کر دوں۔ مگر دسہرے کی دھوم دھام سے ریاست کی جو عزت اور شہرت ہے‘ وہ ان باتوں سے کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ بتدریج یہ خرچ گھٹا دوں مگر یکبارگی ایسا کرنا نامناسب ہے اور ناممکن۔ جواب دیا۔ ”آخر تم کیا چاہتے ہو کہ کیا دسہرہ بالکل بند کر دوں؟“

اندر مل نے راجہ صاحب کے تیور بدلے ہوئے دیکھے۔ مؤدبانہ انداز سے بولے۔ ”میں نے کبھی دسہرے کے جشن کے خلاف زبان سے ایک لفظ نہیں نکالا۔ یہ ہمارا قومی نشان ہے۔ یہ فتح و نصرت کا مبارک دن ہے۔ آج کے دن خوشیاں منانا ہمارا قومی فرض ہے۔ مجھے صرف ان اپسراؤں سے اعتراض ہے۔ رقص و سرود سے اس دن کی متانت اور عظمت ڈوب جاتی ہے۔“

راجہ صاحب نے طنزیہ لہجے میں فرمایا۔ ”تمہارا مطلب ہے کہ رو رو کر جشن منائیں۔ ماتم کریں۔“

اندر مل نے تیکھے ہو کر کہا۔ ”یہ آئین انصاف کے خلاف ہے کہ ہم تو جشن منائیں اور ہزاروں آدمی اس کی بدولت ماتم کریں۔ بیس ہزار مزدور ایک مہینے سے مفت میں کام کر رہے ہیں۔ کیا ان کے گھروں میں جشن ہو رہا ہے۔ جو پسینہ بہائیں۔ وہ روٹیوں کو ترسیں اور جنہوں نے حرام کاری کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے‘ وہ ہماری محفلوں کی زینت بنیں۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ جور و ستم نہیں دیکھ سکتا۔ میں اس عذاب میں شریک نہیں ہو سکتا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ منہ چھپا کر کہیں نکل جاؤں۔ اس راج میں رہنا میں اپنے اصول کے خلاف اور شرمناک سمجھتا ہوں۔“

اندرمل نے طیش میں یہ گستاخانہ باتیں کیں۔ مگر الفت پدری کو جگانے کی کوشش نے راج ہٹ کے سوئے ہوئے دیو سیاہ کو جگادیا۔ راجہ صاحب پُر غضب نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ”ہاں میں بھی یہی بہتر سمجھتا ہوں۔ تم اپنے اصول کے پکے ہو۔ تو میں بھی اپنی دھن کا پورا ہوں۔“

اندرمل نے مسکرا کر راجہ صاحب کو سلام کیا۔ اس کا مسکرانا زخم پر نمک ہو گیا۔ راج کمار کی آنکھوں میں چند بوندیں شاید مرہم کا کام دیتیں۔

(3)

راج کمار نے ادھر پیٹھ پھیری۔ ادھر راجہ صاحب نے پھر اپسراؤں کو بلایا اور پھر نغمۂ جاں نواز کی صدائیں بلند ہو گئیں۔ ان کا دریائے نغمہ سنجی کبھی اتنے زور شور سے نہیں امڈا تھا۔ واہ واکی رَو آئی تھی۔ تالیوں کا تلاطم برپا تھا اور سُر کی کشتی اس دریائے پُر شور میں ہنڈولے کی طرح جھول رہی تھی۔

یہاں تو عیش و طرب کا ہنگامہ گرم تھا اور رنواس میں نالۂ دلگیر کا۔ رانی بھان کنور درگا کی پوجا کر کے لوٹ رہی تھیں کہ ایک لونڈی نے آکر اس سانحۂ دل خراش کی اطلاع دی۔ رانی نے آرتی کا تھال زمین پر پٹک دیا۔ وہ ایک ہفتہ سے درگاہ کا برت رکھتی تھیں۔ مرگ چھالے پر سوتی اور دودھ کا اہار کرتی تھیں۔ پاؤں تھر تھرائے۔ زمین پر گر پڑیں۔ مرجھایا ہوا پھول ہوا کے جھونکے کو نہ سہ سکا۔ چیریاں سنبھل گئیں اور رانی کے چاروں طرف حلقہ باندھ کر چھاتی اور سر پیٹنے لگیں۔ بین اور بکا کی پر جوش صدائیں بلند ہوئیں۔ آنکھوں میں آنسو نہ سہی۔ آنچلوں سے ان کا پردہ چھپا ہوا تھا مگر گلے میں آواز تو تھی۔ اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ اسی کی بلندی اور گرج میں اس وقت بخت رسا کی جھلک نمودار تھی۔

لونڈیاں تو یوں محوِ وفا تھیں اور بھان کنور اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کنور سے ایسی بے ادبی کیونکر ہوئی؟ یہ خیال میں نہیں آتا۔ اس نے کبھی میری باتوں کا جواب نہیں دیا۔ ضرور راجہ کی زیادتی ہے۔

اس نے ناچ رنگ کی مخالفت کی ہو گی۔ کیا ہی چاہیے۔ انہیں کیا جو کچھ بنے بگڑے گی اس کے ذمے لگے گی۔ یہ غصہ ور ہیں ہی۔ جھلا گئے ہوں گے۔ اسے سخت سُست کہا ہو گا۔ بات کی اسے کہاں برداشت۔ یہی تو اس میں بڑا عیب ہے۔ روٹھ کر کہیں چلا گیا ہو گا۔ مگر گیا کہاں؟ درگا! تم میرے لال کی رکشا کرنا۔ میں اسے تمہارے سپرد کرتی ہوں۔ افسوس یہ غضب ہو گیا۔ میرا راج سونا ہو گیا اور انہیں اپنے راگ رنگ کی سوجھی ہوئی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے رانی کے بدن میں رعشہ آگیا۔ اٹھ کر غصے سے کانپتی ہوئی وہ بے محابا عیش محفل کی طرف چلی۔ قریب پہنچی تو سریلی تانیں سنائی دیں۔ ایک برچھی سی جگر میں چبھ گئی۔ آگ پر تیل پڑ گیا۔

رانی کو دیکھتے ہی مطربوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ کوئی کسی گوشے میں جا چھپی۔ کوئی گرتی پڑتی دروازے کی طرف بھاگی۔ راجہ صاحب نے رانی کی طرف گھور کر دیکھا۔ غیظ و غضب کا شعلہ سامنے دہک رہا تھا۔ ان کے تیوروں پر بھی بل پڑ گئے۔ خونبار نگاہیں باہم ملیں۔ موم نے لوہے کا سامنا کیا۔

رانی تھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میرا اندرمل کہاں گیا؟“

یہ کہتے کہتے اس کی آواز رک گئی اور ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

راجہ نے بے رخی سے جواب دیا۔ "میں نہیں جانتا۔"

رانی سکیاں بھر کر بولی۔ "آپ نہیں جانتے کہ وہ کل سہ پہر سے غائب ہے اور اس کا کہیں پتہ نہیں۔ آپ کی ان زہریلی ناگنوں نے یہ بس بویا ہے۔ اگر اس کا بال بھی بیکا ہوا تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔"

راجہ نے ترشی سے کہا۔ "وہ سرکش' خود سر اور مغرور ہو گیا ہے۔ میں اس کا منہ نہیں دیکھنا چاہتا۔"

رانی کچلے ہوئے سانپ کی طرح اینٹھ کر بولی۔ "راجہ! تمہاری زبان سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔ ہائے میرا لال۔ میری آنکھوں کی پتلی۔ میرے جگر کا ٹکڑا۔ میرا سب کچھ یوں الوپ ہو جائے اور اس بے رحم کا دل ذرا بھی نہ پسیجے۔ میرے گھر میں آگ لگ جائے اور یہاں اندر کا اکھاڑا سجا رہے۔ میں خون کے آنسو روؤں اور یہاں خوشی کے راگ الاپے جائیں۔" راجہ کے نتھنے پھڑکنے لگے۔ کڑک کر بولے۔ "رانی بھان کنور! اب زبان بند کرو میں اس سے زیادہ نہیں سن سکتا۔ بہتر ہو گا کہ تم محل میں چلی جاؤ۔"

رانی نے بھری شیرنی کی طرح گردن اٹھا کر کہا۔ "ہاں میں خود جاتی ہوں۔ میں حضور کے عیش میں مخل نہیں ہونا چاہتی۔ مگر آپ کو اس کا خمیازہ اٹھانا پڑے گا۔ اچل گڑھ میں یا تو بھان کنور رہے گی یا آپ کی زہریلی بسیلی پریاں۔"

راجہ پر اس دھمکی کا مطلق اثر نہ ہوا۔ گینڈے کی ڈھال پر کچے لوہے کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ جی میں تو آیا کہ صاف صاف کہہ دیں۔ بھان کنور چاہے رہے یا نہ رہے۔ یہ پریاں ضرور رہیں گی۔ لیکن ضبط کر کے بولے۔ "تم کو اختیار ہے جو مناسب سمجھو۔ وہ کرو۔"

رانی چند قدم چل کر پھر لوٹی اور بولی۔ "تریاہٹ رہے گی یا راج ہٹ؟"

راجہ نے مستقل لہجے میں جواب دیا۔ "اس وقت تو راج ہٹ ہی رہے گی۔"

(4)

رانی بھان کنور کے چلے جانے کے بعد راجہ دیومل پھر اپنے کمرے میں آبیٹھے مگر پژمردہ اور دل گرفتہ۔ رانی کی سخت باتوں سے دل کے نازک ترین حصوں میں خلش ہو رہی تھی۔ پہلے تو وہ اپنے اوپر جھنجھلائے کہ میں نے اس کی باتوں کو کیوں اس قدر تحمل سے سنا مگر جب ذرا غصے کی آگ دھیمی ہوئی اور دماغی توازن پھر اصلی حالت پر آیا تو ان واقعات پر اپنے دل میں غور کرنے لگے۔ انصاف پسند طبیعتوں کے لئے غصہ ایک چتاونی ہوتی ہے جس سے انہیں اپنے قول و فعل کے حسن و قبح کو جانچنے اور آئندہ کے لئے مزید احتیاط کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اس دارو ئے تلخ سے اکثر تجربے کو تقویت' نگاہ کو وسعت اور فکر کو بیداری حاصل ہوتی ہے۔ راجہ سوچنے لگے بے شک ریاست کے اندرونی حالات کے لحاظ سے یہ بزم آرائیاں بے موقع ہیں۔ بے شک وہ رعایا کے ساتھ اپنا فرض نہیں ادا کر رہے تھے۔ وہ ان مصارف اور اس اخلاقی دھبے کو مٹانے پر آمادہ تھے۔ مگر اس طرح کہ نکتہ چین نگاہیں اس میں کچھ اور معنی نہ نکال سکیں۔ شانِ ریاست قائم رہے۔ اتنا اندر مل سے انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ اگر اتنے پر بھی وہ اپنی سخت گیریوں سے باز نہیں آتا تو یہ اس کی خود سری ہے۔ ہر ایک ممکن پہلو سے غور کرنے پر راجہ صاحب کے اس فیصلے میں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ کنور کا یوں غائب ہو جانا ضرور تشویش ناک ہے اور ریاست کے لئے خطرناک نتائج سے مملو۔ مگر وہ اپنے آپ کو ان نتائج کی ذمہ داریوں سے بالکل بری سمجھتے تھے۔ وہ یہ تسلیم کرتے تھے کہ اندر مل کے چلے جانے

کے بعد ان کا بزم نشاط آراستہ کرنا بے موقع اور شعلہ انگیز تھا مگر اس کا کنور کے آخری فیصلے پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ کنور ایسا نادان' خام کار اور بزدل تو نہیں ہے کہ خود کشی پر آمادہ ہو جائے۔ ہاں دو چار دن ادھر ادھر آوارہ گھومے گا اور اگر ایشور نے کچھ بھی انصاف عطا کیا ہے تو وہ پشیمان اور متاسف ہو کر ضرور چلا آئے گا۔ میں خود اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔ وہ ایسا ناسعادت مند نہیں ہے کہ اپنے بوڑھے باپ کی معذرت پر دھیان نہ دے۔

اندر مل سے فارغ ہو کر راجہ صاحب کا دھیان رانی کی طرف پہنچا اور جب اس کے کلماتِ آتشین یاد آئے تو غصے سے بدن میں پسینہ آ گیا اور وہ ایک عالم بے تابی میں اٹھ کر ٹہلنے لگے۔ بے شک میں اس کے ساتھ بے رحمی سے پیش آیا۔ ماں کو اپنی اولاد ایمان سے بھی زیادہ پیاری ہوتی ہے اور اس کی خفگی بجا تھی مگر ان دھمکیوں کے کیا معنی! اس کے سوا کہ وہ روٹھ کر میکے چلی جائے اور مجھے بدنام کرے۔ وہ میرا اور کیا کر سکتی ہے؟ عقل مندوں نے کہا ہے کہ عورت کی ذات بے وفا ہوتی ہے۔ وہ میٹھے پانی کی چنچل' چلبلی' چمکیلی دھارا ہے۔ جس کے آغوش ناز میں چہکتی اور چمٹتی ہے' اسے تودہ ریگ بنا کر چھوڑتی ہے۔ یہی بھان کنور ہے۔ جس کی ناز برداریاں عشق کا درجہ رکھتی ہیں۔ آہ! کیا وہ پچھلی باتیں فراموش کر جاؤں! کیا انہیں قصہ سمجھ کر دل کو تسکین دوں! اس اثناء میں ایک لونڈی نے آ کر کہا کہ مہارانی نے ہاتھی منگوایا ہے۔ اور نہ جانے کہاں جا رہی ہیں۔ کچھ بتاتی نہیں۔ راجہ نے سنا اور منہ پھیر لیا۔

(5)

شہر اندور سے تین میل شمال کی طرف گھنے درختوں کے بیچ میں ایک تالاب ہے۔ جس کے رُخِ سیمیں سے کائی کا سبز مخملی گھونگٹ کبھی نہیں اٹھتا۔ کہتے ہیں کسی زمانے میں اس کے چاروں طرف پختہ گھاٹ بنے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت تو صرف روایت باقی تھی۔ اور عالم اسباب میں یہ اکثر سنگ و خشت کی یادگاروں سے زیادہ دیرپا ہوا کرتی ہے۔

تالاب کی پوربی جانب ایک پرانا مندر تھا۔ اس میں شیو جی راکھ کی دھونی رمائے خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ ابابیلیں اور جنگلی کبوتر انہیں اپنی میٹھی بولیاں سنایا کرتے۔ مگر اس ویرانے میں بھی ان کے بھگتوں کی کمی نہ تھی۔ مندر کے اندر بھرا ہوا پانی اور باہر عفونت انگیز کیچڑ' اس عقیدت مندی کے شاہد تھے۔ وہ مسافر جو اس تالاب میں نہاتا۔ اس کے ایک لوٹے پانی سے اپنے معبود کی پیاس بجھاتا تھا۔ شیو جی کھاتے کچھ نہ تھے مگر پانی بہت پیتے تھے۔ ان کی نہ بجھنے والی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ کوار کی دھوپ تیز تھی۔ کنور اندر مل اپنے باد رفتار گھوڑے پر سوار اندور کی طرف سے آئے اور ایک درخت کے سائے میں ٹھہر گئے۔ وہ بہت اداس تھے۔ انہوں نے گھوڑے کو درخت سے باندھ دیا اور خود زین پوش بچھا کر لیٹ رہے۔ انہیں اچل گڑھ سے نکلے آج تیسرا دن ہے مگر تفکرات نے پلک تک نہیں جھپکنے دی۔ رانی بھان کنور اس کے دل سے ایک لمحہ کے لئے بھی دور نہ ہوتی تھی۔ اس وقت ٹھنڈی ہوا لگی تو نیند آ گئی۔ خواب میں دیکھنے لگا گویا رانی آئی ہیں اور اسے گلے لگا کر رو رہی ہیں۔ چونک کر آنکھیں کھولیں تو سچ مچ رانی سامنے کھڑی اس کی طرف آبگوں آنکھوں سے تاک رہی تھیں۔ وہ اٹھ بیٹھا اور ماں کے قدموں کو بوسہ دیا۔ مگر رانی نے فرطِ شفقت سے اسے اٹھا کر گلے لگا لینے کے بجائے اپنے پاؤں ہٹا لئے اور منہ سے کچھ نہ بولی۔

اندر مل نے کہا۔ "ماں جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟"

رانی نے رکھائی سے جواب دیا۔ ”میں تمہاری کون ہوتی ہوں؟“

کنور۔ ”آپ کو یقین آئے یا نہ آئے میں جب سے اچل گڑھ سے چلا ہوں ایک لمحہ بھی آپ کا خیال دل سے دور نہیں ہوا۔ ابھی آپ ہی کو خواب میں دیکھ رہا تھا۔“

ان الفاظ نے رانی کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ کنور کی طرف سے بے فکر ہو کر اب وہ راجہ کا دھیان کر رہی تھی۔ اس نے کنور سے پوچھا۔ ”تم تین دن کہاں رہے؟“

کنور نے جواب دیا۔ ”کیا بتاؤں کہاں رہا۔ اندور چلا گیا تھا۔ وہاں پولیٹکل ایجنٹ سے ساری داستان بیان کی۔“

رانی نے یہ کیفیت سنی تو ماتھا پیٹ کر بولی۔ ”تم نے غضب کر دیا۔ آگ لگا دی۔“

اندر مل۔ ”کیا کروں۔ خود پچھتاتا ہوں۔ اس وقت یہی دھن سوار تھی۔“

رانی۔ ”مجھے جن باتوں کا ڈر تھا وہ سب ہو گئیں۔ اب کون منہ لے کر اچل گڑھ جائیں گے؟“

اندر مل۔ ”میرا جی چاہتا ہے کہ اپنا گلا گھونٹ لوں۔“

رانی۔ ”غصہ بری بلا ہے۔ تمہارے آنے کے بعد میں نے رار مچائی۔ اور کچھ یہی ارادہ کر کے اندور جا رہی تھی۔ راستے میں تم مل گئے۔“

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے بہلیوں اور سانڈنیوں کی ایک لمبی قطار آتی ہوئی دکھائی دی۔ سانڈنیوں پر مرد سوار تھے۔ سرگیں آنکھوں والے۔ پیچ دار زلفوں والے۔ بہلیوں میں حسن کے جلوے تھے۔ شوخ نگاہیں' بیباک چتونیں۔ یہ ارباب نشاط کا قافلہ تھا جو اچل گڑھ سے ناشاد و نامراد چلا آتا تھا۔ انہوں نے رانی کی سواری دیکھی اور کنور کا گھوڑا پہچان لیا۔ متکبرانہ انداز سے سلام کئے۔ مگر بولے نہیں۔ جب وہ دور نکل گئے تو کنور نے زور سے قہقہہ مارا۔ یہ فتح کا نعرہ تھا۔

رانی نے استصواب کیا۔ ”یہ کیا کایا پلٹ ہو گئی۔ یہ سب اچل گڑھ سے لوٹے آتے ہیں اور عین دسہرے کے دن؟“

اندر مل پُر غرور انداز سے بولے۔ ”یہ پولٹیکل ایجنٹ کے انکاری تار کے کرشمے ہیں۔ میری چال بالکل ٹھیک پڑی۔“

رانی کا شبہ دور ہو گیا۔ ضرور یہی بات ہے۔ یہ انکاری تار کی کرامات ہے۔ وہ بہت دیر تک ایک محویت کے عالم میں زمین کی طرف تاکتی رہی اور اس کے دل میں بار بار یہ سوال پیدا ہوتا تھا۔ ”کیا اسی کا نام راج ہٹ ہے؟“

آخر اندر مل نے مہر سکوت توڑی۔ ”کیا آج چلنے کا ارادہ ہے کہ کل؟“

رانی۔ ”کل شام تک ہم کو اچل گڑھ پہنچنا ہے۔ مہاراج گھبراتے ہوں گے۔“

راجہ ہردول

(1)

بندیل کھنڈ کے کارناموں میں چمپت رائے کی زندہ جاوید رانی سارندھا جس قدر ممتاز ہے شاید اس سے زیادہ

عقیدت لوگوں کو ہردول سے ہے۔ آج بندیل کھنڈ کا کوئی موضع ایسا نہیں جہاں ہردول کا چبوترہ نہ ہو۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبوں کے موقع پر عورتیں بناؤ سنگار کر کے اس چبوترے پر آتی ہیں اور ہردول کے نام پر عقیدت کے پھولوں کے ساتھ پرستش کے جیونار چڑھاتی ہیں۔ جب تک سہاگ کے چاول اور سہاگ کی ہلدی میں ہردول کو حصہ نہ مل جائے' شادی کی رسم پوری نہیں ہو سکتی۔ دیوتا ہر ایک خاندان اور فرقہ کے جدا ہیں۔ کوئی مہادیو جی کو بھنگ چڑھاتا ہے۔ کوئی مہابیر جی کی ملیدے سے مدارات کرتا ہے۔ کوئی قربانی کا بکرا چڑھا کر دیوی کی پیاس بجھاتا ہے۔ مگر ہردول ہے کہ ہر کس و ناکس سے اس کی بساط کے موافق عقیدت کا خراج لیتا ہے۔ کسی موضع میں جاؤ اور ایک بچے سے بھی پوچھو تو وہ فوراً ہردول کے چبوترے کا نشان بتادے گا۔ مگر اس فرد بشر نے وہ کون سا کام کیا جس سے آج اس کے نام پر عقیدت نثار ہوتی ہے اور عظمت موتی لٹاتی ہے۔ اس نے کوئی ملک نہیں فتح کیا۔ کوئی سلطنت نہیں قائم کی۔ کوئی ایجاد نہیں کی۔ کوئی تصنیف نہیں لکھی۔ وہ دیوتا نہ تھا۔ پرتاپی راجہ نہ تھا۔ وہ ایک وہمی مزاج بھائی کے شکوک کا نشانہ بنا۔ ایک عورت کے نام پر سے بے وفائی کا جھوٹا داغ مٹانے کے لئے اس نے زہر کا پیالہ پینا گوارا کیا۔ اپنے خون سے ایک عفیفہ کے داغ بدگمانی کو دھویا۔ اور یہی وہ فعل مردانہ ہے جس نے تین صدیاں گزر جانے پر بھی اس کے نام کے چاروں طرف تقدس اور احترام کا ایک منوّر ہالہ قائم کر دیا ہے۔ سنگ و خشت کی یادگاریں اور تاریخی فتوحات انسان سے ثنا و صفت کی داد لیتی ہیں مگر مردانہ جانبازی دلوں میں مذہبی ارادت پیدا کر دیتی ہے۔ حق یہ ہے کہ جب تک کوئی فرد بشر ایسا عظیم الشان کام نہ کرے جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہو' اس وقت تک عوام الناس کا دربار اسے دیوتاؤں کی پدوی نہیں دیتا۔ فاتح اور شاعر' سخی اور عادل دماغ کے مندر میں جگہ پاتے ہیں مگر حمیت کے نام پر قربان ہونے والا انسان دل کے مندر میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ آج جو ایک دیوتا کی عزت ہے وہی عزت ہردول کی ہے۔ اس نام پر کبیشروں نے کبتا کے موتی نثار کئے ہیں۔ اس کی داستان آج بھی غیرت مند دلوں میں دلاوری اور جانبازی کا جوش پیدا کرتی ہے۔ اور نیک بیویاں آج بھی اس سے عبرت کے سبق لیتی ہیں۔

(2)

ہردول جوجھار سنگھ کا چھوٹا بھائی تھا' یہ اورچھا کے راجہ تھے۔ اورچھا بندیلوں کا گہوارہ ہے۔ انہی پہاڑوں کی گود میں بندیل قوم نے پرورش پائی ہے۔ اورچھا کا راجہ آج بھی بندیلی مجلس کا صدر نشین ہے۔ جوجھار سنگھ بڑا دلیر اور دانا شخص تھا۔ شاہجہان اس زمانے میں دہلی کا بادشاہ تھا۔ جب خان جہاں لودھی نے علم بغاوت بلند کیا اور علاقہ شاہی کو خاک سیاہ کرتا ہوا اورچھا کی طرف آ نکلا تو راجہ جوجھار سنگھ نے اس سے مردانہ وار مقابلہ کیا۔ شاہجہان راجہ کی اس جانبازانہ سرفروشی سے بہت خوش ہوا۔ انسانی جوہر کا کمال جوہری تھا۔ راجہ کو فوراً صوبہ دکن میں ایک اہم خدمت پر مامور کر دیا۔ اس دن اورچھا میں خوب جشن منایا گیا۔ شاہی سفیر خلعت و سند افتخار لے کر راجہ کے پاس آیا۔ جوجھار سنگھ کو بڑے بڑے کام کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راجہ نے ہردول کو بلا کر کہا۔ ''بھیا میں جاتا ہوں۔ اب یہ راج پاٹ تمہارے سپرد ہے۔ میری رعایا مجھے بہت پیاری ہے۔ تم بھی ان کو دل سے پیار کرنا۔ انصاف راجہ کا سب سے زبردست مددگار ہے۔ انصاف کی شہر پناہ میں کوئی دشمن شگاف نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ راون کی فوج اور راندر کا زور لے کر آئے۔ مگر انصاف وہی سچا ہے جسے رعایا بھی انصاف سمجھے۔ تمہارا کام صرف انصاف

کرنا نہ ہوگا بلکہ رعایا کو اپنے انصاف کا یقین بھی دلانا ہوگا۔ اور میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ تم خود دانش مند ہو۔" یہ کہہ کر اپنی پگڑی اتاری اور ہردول کے سر پر رکھ دی۔ ہردول روتا ہوا ان کے قدموں پر گر پڑا۔

تب راجہ اپنی رانی کلینتا سے رخصت ہونے کے لئے رنواس میں آئے۔ رانی دروازے پر کھڑی رو رہی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی پاؤں پر گر پڑی۔ جوجھار سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ اور بولے۔ "پیاری! یہ رونے کا وقت نہیں ہے۔ بندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں۔ ایشور نے چاہا تو ہم تم جلد ملیں گے۔ مجھ پر ایسی ہی محبت کی نگاہ رکھنا۔ میں نے راج پاٹ ہردول کو سونپا ہے۔ وہ ابھی لڑکا ہے۔ اس نے ابھی زمانے کا نیک و بد نہیں دیکھا۔ اپنی صلاحوں سے اس کی مدد کرتی رہنا۔" وفور گریہ سے رانی کی زبان بند ہو گئی۔ ہائے! یہ کہتے ہیں کہ بندیلوں کی عورتیں ایسے موقعوں پر رویا نہیں کرتیں۔ شاید ان کے سینے میں دل نہیں ہوتا یا اگر ہوتا ہے تو درد محبت سے نا آشنا! رانی دل پر جبر کر کے آنسو پی گئی اور ہاتھ باندھ کر راجہ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا۔ مگر کیا وہ مسکراہٹ تھی؟ جس طرح اندھیرے گھپ میدان میں مشعل کی روشنی تاریکی کو اور بھی اتھاہ کر دیتی ہے' اسی طرح یہ مسکراہٹ کی روشنی رانی کے دل کے اتھاہ غم کو اور بھی روشن کر رہی تھی۔

(3)

جوجھار سنگھ کے چلے جانے کے بعد ہردول راج کرنے لگا۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس کے انصاف و دلجوئی نے رعایا کو اس کا گرویدہ بنالیا۔ لوگ جوجھار سنگھ کو بھول گئے۔ جوجھار سنگھ کے دوست بھی تھے۔ دشمن بھی تھے۔ مگر ہردول کے اخلاق نے سب کو اپنا دوست بنالیا۔ وہ ایسا ہنس مکھ' وجیہ ایسا شیریں زبان تھا کہ جو اس سے دو دو باتیں کر لیتا وہ زندگی بھر کے لئے اس کا معتقد ہو جاتا۔ ریاست میں ایسا کوئی فرد بشر نہ تھا جسے اس کے حضور میں رسائی حاصل کرنی مشکل ہو۔ رات اور دن اس کے دربار کا دروازہ کھلا رہتا تھا۔ اور چھا کو کبھی ایسا ہر دلعزیز راجہ نہ نصیب ہوا تھا۔ وہ فیاض تھا۔ منصف تھا۔ علم و ہنر کا قدردان تھا مگر سب سے بڑی صفت جو اس میں تھی' وہ اس کی مردانگی تھی۔ اس کی ذات میں یہ جوہر کمال کو پہنچ گیا تھا۔ وہ قوم جس کی زندگی کا دارومدار تلوار پر تھا' اپنے بادشاہ کے کسی وصف پر اتنا ناز نہیں کرتی جتنا اس کی دلاوری پر۔ ہردول سچی شجاعت کا پتلا تھا اور بندیلے تلوار کے دھنی۔ ہردول ان کے دلوں پر راج کرنے لگا۔ جو ملک و مال پر راج کرنے سے بہت مشکل تھا۔ اس طرح سال بھر گزر گیا۔ جوجھار سنگھ نے ادھر دکن میں اپنے حسنِ انتظام سے چاروں طرف شاہی تسلط جمادیا۔ ادھر اریچھ میں ہردول نے رعایا پر موہنی منتر پھونک دیا۔

پھاگن کا مہینہ تھا۔ عبیر اور گلاب سے زمین سرخ ہو رہی تھی اور پھاگ کے پُر جوش نغمے بے نیاز معشوقوں کے دلوں میں تمنا اور اشتیاق کی آگ بھڑکا رہے تھے۔ ربیع نے کھیتوں میں سنہرا فرش بچھا دیا تھا اور کھلیانوں میں خوشۂ زریں کے محل کھڑے کر دیئے تھے۔ آسودگی اس سنہرے فرش پر اٹھلاتی پھرتی تھی اور فراغت اس سنہرے محل میں اپنی تانیں الاپ رہی تھی۔ انہی دنوں میں دہلی کا نامور پھکیت قادر خان اریچھ میں آیا۔ بڑے بڑے آزمودہ کار پہلوان اس کی تلوار کا لوہا مان گئے تھے۔ دہلی سے اریچھ تک صدہا نشۂ مردانگی کے متوالے اس کے سامنے آئے مگر کوئی اس سے بازی نہ لے گیا۔ اس سے لڑنا قسمت سے نہیں بلکہ موت سے لڑنا تھا۔ اور وہ کسی انعام و اکرام کا بھوکا نہ تھا۔ وہ جیسا دل کا دلیر تھا' ویسا ہی طبیعت کا غنی تھا۔ عین ہولی کے

دن اس نے صدائے کوس کے ساتھ ایرچھ میں اعلان کر دیا کہ "خدا کا شیر۔ دلی کا قادر خان ایرچھ آ پہنچا ہے جسے اپنی بھاری ہو آ کر قسمت کا فیصلہ کر لے۔"

ایرچھ کے منچلے بندیل سورما آوازۂ پُرغرور سنتے ہی گرم ہو کر اٹھے۔ دف اور پھاگ کی صدائے دل نواز کے بدلے ڈھول کی مردانہ گرج سنائی دینے لگی۔ ہر دول کا اکھاڑہ ایرچھ کے قادر اندازوں اور پھکیتوں کا مرکز تھا۔ شام کو یہاں سارے شہر کے سورما جمع ہوئے۔ کالدیو اور بھالدیو بندیلوں کی ناک تھے۔ سینکڑوں میدان مارے ہوئے۔ یہی دونوں پہلوان قادر خاں کا غرور ڈھانے کے لئے چنے گئے۔

دوسرے دن قلعے کے سامنے تالاب کے کنارے وسیع میدان میں ایرچھ کے برناو پیر جمع ہوئے۔ کیسے کیسے سجیلے البیلے جوان تھے۔ سروں پر خوش رنگ بانکی پگڑیاں۔ ہاتھوں پر صندل کے ٹیکے۔ آنکھوں میں مردانگی کا سرور۔ کمروں میں خنجرِ آب دار۔ اور کیسے کیسے بوڑھے تھے۔ تنی ہوئی مونچھیں۔ سادہ مگر ترچھی پاگ۔ کانوں سے بندھی ہوئی داڑھیاں۔ شکل کے بوڑھے، مگر دل کے جوان۔ عمر کے بارِ گراں کو ہیچ سمجھنے والے۔ ان کی مردانہ آن بان نوجوانوں کو شرماتی تھی۔ ہر شخص کی زبان پر سپہ گری کے چرچے تھے۔ نوجوان کہتے تھے دیکھا چاہیے آج ایرچھ کی لاج رہتی ہے یا نہیں۔ مگر بوڑھے کہتے تھے کہ ایرچھ کی ہار کبھی نہیں ہوئی اور نہ ہو گی۔ دلاوروں کا یہ جوش دیکھ کر ہر دول نے بہ آواز بلند کہہ دیا تھا کہ خبردار! بندیلوں کی لاج رہے نہ رہے مگر ان کی آن پر ہرگز فرق نہ آنے پائے۔ اگر کسی نے غیروں کو یہ کہنے کا موقع دیا کہ ایرچھ والوں کی تلوار سے پیش نہ چلی تو دھاندلی کر بیٹھے، وہ اپنے آپ کو قوم کا دشمن سمجھے۔

آفتاب نکل آیا تھا۔ یکایک نقارے پر چوٹ پڑی اور امید و بیم نے لوگوں کے دلوں کو اچھال کر لبوں تک پہنچا دیا۔ کالدیو اور قادر خاں دونوں لنگوٹ کسے دو شیروں کی طرح اکھاڑے میں اترے اور باہم گلے مل گئے۔ تب دونوں طرف سے تلواریں نکلیں اور باہم بغل گیر ہو گئیں اور پھر بادل کے دو ٹکڑوں سے بجلیاں کوندنے لگیں۔ کامل تین گھنٹے تک یہی معلوم ہوتا تھا کہ دو شعلہ دہن اژدہے سرگرم پیکار ہیں۔ ہزاروں آدمی کھڑے محوِ تماشا تھے اور میدان میں آدھی رات کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہاں جب کبھی کالدیو کوئی گرہ دار ہاتھ چلاتا یا کوئی پیچ دار وار بچا جاتا تو لوگوں کی گردنیں خود بخود اٹھ جاتیں۔ مگر کیا مجال کہ زبان سے ایک لفظ بھی نکلے۔ اکھاڑے کے اندر تلواروں کی کھینچ تان تھی مگر صاحبِ نظر کے لئے اکھاڑے کے باہر میدان میں زیادہ قابل دید کشمکش تھی۔ بار بار قومی آن کے خیال سے انسانی دل کے جذبات کو روکنا اور خوشی یا رنج کی آوازوں کو زبان سے باہر نہ نکلنے دینا، تلواروں کے وار بچانے سے زیادہ مشکل کام تھا۔ یکایک قادر خان نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ گویا بادل گرج اٹھا اور اس کے گرجتے ہی کالدیو کے سر پر بجلی گر پڑی۔

(4)

کالدیو کے گرتے ہی بندیلوں کا ضبط ہاتھ سے جاتا رہا۔ ہر ایک چہرہ غرور پامال، غصہ اور خفّت کی تصویر بن گیا۔ ہزاروں آدمی مجنونانہ جوش کے ساتھ اکھاڑے کی طرف دوڑے مگر ہر دول نے بہ آواز بلند کہا۔ "خبردار! اب کوئی آگے نہ بڑھے!" اس آواز نے پاؤں کے ساتھ زنجیر کا کام کیا۔ تماشائیوں کو روک کر جب وہ اکھاڑے میں گئے

اور کالدیو کو دیکھا تو آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ زخمی شیر زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اس کے رشتۂ حیات کی طرح اس کی تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ آج کا دن گزرا' رات آئی مگر بندیلوں کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ لوگوں نے پہلو بدل بدل کر رات کاٹی۔ شاید درد جانگزا سے کراہتا ہوا مریض بھی سپیدۂ صبح کا اتنی بے صبری سے انتظار نہیں کرتا۔ لوگ رہ رہ کر آسمان کی طرف دیکھتے اور اس کی رفتار سُست پر جھنجھلاتے۔ ان کے قومی غرور کو کاری زخم لگا تھا۔ دوسرے دن جب آفتاب نکلا تو تین لاکھ بندیلوں نے تالاب کے کنارے اس کا خیر مقدم کیا اور جس وقت بھالدیو درّانہ اکھاڑے کی طرف چلا تو دلوں میں دھڑکن سی ہونے لگی۔ کل جب کالدیو اکھاڑے میں اترا تھا تو بندیلوں کے حوصلے بڑھے ہوئے تھے مگر آج یہ کیفیت نہ تھی۔ دلوں پر امید کے بجائے خوف غالب آ گیا تھا۔ جب قادر خاں کوئی مہلک وار کرتا تو لوگوں کے دل اچھل کر لبوں تک آ جاتے تھے۔ سورج سر پر چڑھتا چلا آتا تھا اور لوگوں کے دل بیٹھے جاتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بھالدیو اپنے بھائی کی بہ نسبت زیادہ چابک دست تھا اور اس نے کئی بار قادر خاں کو زچ کر دیا مگر دہلی کا آزمودہ کار پہلوان ہر بار سنبھل جاتا۔ کامل تین گھنٹے تک دونوں دلاوروں میں تیغے چلتے رہے۔ یکایک کھٹاکے کی آواز آئی اور بھالدیو کی تلوار کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ راجہ ہردول اکھاڑے کے سامنے کھڑے تھے۔ بھالدیو کی طرف تیزی سے تلوار پھینکی۔

بھالدیو تلوار اٹھانے کے لئے جھکا کہ قادر خان کی تلوار اس کی گردن پر آ پڑی۔ زخم مہلک نہ تھا۔ محض ایک چرکا تھا مگر اس نے لڑائی کا فیصلہ کر دیا۔

اب دل شکستہ بندیلے اپنے گھروں کو لوٹے۔ اگرچہ بھالدیو اب بھی مقابلے کے لئے آمادہ تھا اور بندیلے کسی طرح ہار ماننے پر تیار نہ تھے مگر ہردول نے انہیں سمجھا کر کہا۔ "بھائیو! ہماری ہار اسی وقت ہو گئی جب ہماری تلوار نے جواب دے دیا۔ اگر ہم قادر خاں کی جگہ ہوتے تو نہتے آدمی پر وار نہ کرتے اور اس وقت تک ہاتھ نہ اٹھاتے جب تک ہمارے رقیب کے ہاتھ میں تلوار آ جاتی۔ مگر قادر خاں فیاضی کا سبق نہیں پڑھا۔ اکثر زبردست دشمن کے مقابلے میں فیاضی کو بالائے طاق رکھنا پڑتا ہے۔ تاہم ہم نے ثابت کر دیا ہے کہ فنِ تیغ میں ہم اس کے مدِ مقابل ہیں اور اب ہم کو یہ ثابت کرنا باقی ہے کہ ہماری تلوار میں بھی ویسا ہی جوہر ہے۔

اس طرح لوگوں کو تشفی دے کر راجہ ہردول رنواس کو گئے۔ رانی کلینتا نے پوچھا۔ "بھیا! آج دنگل کا کیا رہا؟"

ہردول نے سر جھکا کر جواب دیا۔ "آج بھی وہی کل کی کیفیت ہوئی۔"

کلینتا۔ "کیا بھالدیو مارا گیا؟"

ہردول۔ "نہیں جان سے تو نہیں گیا مگر ہار ہو گئی۔"

کلینتا۔ "تو اب کیا کرنا ہوگا؟"

ہردول۔ "میں خود اسی سوچ میں ہوں۔ آج تک ایرچھ کو کبھی نیچا نہیں دیکھنا پڑا۔ ہمارے پاس دولت نہ تھی۔ بڑا راج نہ تھا۔ مگر اپنی سپہ گری کے سامنے ہم راج اور دولت کوئی چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ہم اب کس منہ سے اپنی سپہ گری پر ناز کریں گے۔ ایرچھ کی اور بندیل قوم کی لاج اب جاتی ہے۔"

کلینتا۔ کیا اب کوئی آس نہیں؟"

ہردول۔ "ہمارے پہلوانوں میں ایسا کوئی نہیں ہے جو اس سے پیش لے جائے۔ بھالدیو کی ہار نے بندیلوں کے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ آج سارے شہر میں ماتم ہو رہا ہے۔ سیکڑوں گھروں میں آگ نہیں جلی۔ چراغ نہیں

روشن ہوا۔ ہمارے ملک اور قوم کی وہ چیز اب دم توڑ رہی ہے جس سے ہماری عزت تھی۔ بھالدیو میرا استاد تھا۔ اس کے ہار چکنے کے بعد میرا میدان میں آنا ایک بے ادبی کی بات ہے۔ مگر بندیلوں کی ساکھ جاتی ہے تو میرا سر بھی اس کے ساتھ جائے گا۔ قادر خان بے شک اپنے ہنر میں یکتا ہے مگر ہمارا بھالدیو ہرگز اس سے کم نہیں۔ قادر خاں کی جیت صرف اس وجہ سے ہوئی کہ اس کی تلوار پختہ اور آب دار تھی۔ قادر خاں کی تلوار اگر بھالدیو کے ہاتھ میں ہوتی تو ضرور میدان اس کے ہاتھ میں رہتا۔ ایرچھ میں صرف ایک تلوار ہے جو قادر خان کی تلوار کا منہ موڑ سکتی ہے۔ وہ بھیا کی دامن تلوار ہے۔ اگر تم ایرچھ کی ناک رکھنا چاہتی ہو تو وہ تلوار مجھے دے دو۔ یہ ہماری آخری کوشش ہوگی۔ اگر اب کے بھی ناکام رہے تو ایرچھ کا نام ہمیشہ کے لئے ڈوب جائے گا۔"

کلینتا سوچنے لگی کہ تلوار ان کو دوں یا نہ دوں۔ راجہ منع کر گئے ہیں۔ ان کا حکم تھا کہ کسی غیر کا اس پر سایہ بھی نہ پڑنے پائے۔ کیا ایسی حالت میں میں ان کے حکم کے خلاف کروں تو وہ ناراض ہوں گے؟ ہرگز نہیں جب وہ سنیں گے کہ میں نے کیسے نازک موقع پر تلوار نکالی ہے تو انہیں سچی خوشی حاصل ہوگی۔ بندیلوں کی آن کس کو اتنی پیاری ہے۔ ان سے زیادہ ایرچھ کا اور کون شیدائی ہوگا؟ اس وقت ان کے حکم کو توڑنا ہی حکم کی تعمیل ہے۔ یہ سوچ کر کلینتا نے تلوار ہردول کو دے دی۔

(5)

صبح ہوتے ہی یہ خبر پھیل گئی کہ راجہ ہردول قادر خان سے مقابلہ کرنے کے لئے جا رہے ہیں۔ اتنا سنتے ہی گویا ہر شخص کو نوید جنگ مل گئی۔ چونک کر لوگ اٹھ بیٹھے اور دیوانوں کی طرح اکھاڑے کی طرف دوڑے۔ ہر شخص کہتا تھا کہ جب تک ہم جیتے ہیں مہاراج کو مقابلے میں نہ آنے دیں گے مگر جب لوگ اکھاڑے کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ اکھاڑے میں بجلیاں کوند رہی ہیں۔ بندیلدوں کے دل پر اس وقت جو گزری اس کا قیاس کرنا مشکل ہے۔

اس وقت اس وسیع میدان میں جہاں تک نگاہ جاتی تھی' آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے مگر چاروں طرف سکوت کا عالم طاری تھا۔ ہر آنکھ اکھاڑے کی طرف لگی ہوئی تھی اور ہر دل ہردول کے لئے دعا خیر کر رہا تھا۔ قادر خاں کا ایک ایک وار ہزاروں دلوں کے ٹکڑے کر دیتا تھا اور ہردول کے ایک ایک کاٹ سے دلوں میں مسرت کی لہریں اٹھنے لگتی تھیں۔ اکھاڑے میں دونوں پہلوانوں کا مقابلہ تھا اور اکھاڑے کے باہر امید و بیم کا۔ آخر گھڑیال نے پہلا پہر بجایا اور دامن برق بن کر قادر خاں کے سر پر گر پڑی۔ یہ دیکھتے ہی بندیلے جوشِ کامرانی سے باؤلے ہو گئے۔ کسی کو کسی کی سدھ نہ رہی۔ کوئی کسی سے گلے ملتا تھا' کوئی اچھلتا تھا' کوئی چھلانگیں مارتا تھا۔ ہزاروں آدمیوں پر مردانگی کا نشہ چھا گیا۔ خود بخود تلواریں نکل پڑیں اور نیزے چمکنے لگے۔ فتح کی خوشی میں صدہا جانیں قربان ہو گئیں۔ مگر جب ہردول اکھاڑے سے باہر آئے اور بندیلوں کی طرف تیز نگاہوں سے دیکھا تو آن کی آن میں لوگ سنبھل گئے۔ تلواریں میانوں میں جا چھپیں۔ خیال آ گیا۔ یہ خوشی کیوں؟ یہ مسرت کا سیلاب کیوں؟ یہ دیوانگی کس لئے؟ بندیلوں کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں ہوئی۔ اس خیال نے لوگوں کا دل ٹھنڈا کر دیا۔ ہردول کی اس جانبازی نے ہر بندیل کے دل میں اسے عقیدت اور محبت کی اس اونچی جگہ پر جا بٹھایا' جہاں انصاف اور فیاضی کی متفقہ کوششیں بھی اسے نہ پہنچا سکتی تھیں۔ وہ پہلے ہی سے ہردلعزیز تھا اور اب وہ اپنی قوم کا ہیرو اور بندیل دلاوری کا مایہ ناز بن گیا۔

(6)

راجہ جوجھار سنگھ نے دکن میں دادِ سپہ گری دی۔ اور وہ محض میدانِ کارزار ہی کے مرد نہ تھے بلکہ انصرامِ سلطنت میں یکتا تھے۔ صوبہ دکن کو اپنے حسن انتظام سے خطۂ گلزار بنا دیا اور پورے سال بھر کے بعد وہ بادشاہ سے اجازت لے کر اریچھ کی طرف چلے۔ اریچھ کی یاد انہیں ہمیشہ بے چین کرتی ہے۔ آہ! اریچھ! وہ مبارک دن کب آئے گا کہ تیرے درشن ہوں گے! راجہ منزلیں مارتے چلے آتے تھے۔ نہ بھوک تھی' نہ پیاس۔ اریچھ اور اریچھ والوں کی محبت کھینچے لئے آتی تھی۔ یہاں تک کہ اریچھ کے جنگلوں میں آپہنچے۔ ساتھ کے آدمی پیچھے چھوٹ گئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ تیز تھی۔ گھوڑے سے اترے اور ایک درخت کے سائے میں جا بیٹھے۔ سوءِ اتفاق سے آج ہردول بھی فتح کی خوشی میں شکار کھیلنے نکلا تھا۔ صدہا بندیل سردار اس کے ساتھ تھے۔ نشہ غرور سے جھومتے چلے آتے تھے۔ انہوں نے راجہ جوجھار سنگھ کو تنہا بیٹھے دیکھا مگر اپنے زعم میں اس قدر مست تھے کہ نزدیک تک نہ آئے۔ سمجھے کوئی مسافر ہوگا۔ ہردول کی آنکھوں نے بھی دھوکا کھایا۔ وہ گھوڑے پر سوار اکڑتا ہوا جوجھار سنگھ کے سامنے آیا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو کہ بھائی سے آنکھ مل گئی۔ پہچانتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور ان کے قدم چومے۔ راجہ نے بھی اٹھ کر ہردول کو سینے سے لگا لیا مگر اس سینے میں اب بھائی کی محبت نہ تھی۔ محبت کی جگہ حسد نے لے لی تھی اور صرف اس لئے کہ ہردول دور ہی سے پیادہ پا اس کی طرف نہ دوڑا۔ اس کے سواروں نے دور ہی سے سر تعظیم خم نہ کیا۔

شام ہوتے ہوتے دونوں بھائی اریچھ پہنچے۔ راجہ کے واپس آنے کا حال جوں ہی معلوم ہوا' مسرت کے شادیانے بجنے لگے۔ جا بجا نشاط کی محفلیں آراستہ ہوگئیں اور دم کے دم میں سارا شہر جگمگا اٹھا۔ آج رانی کلینتا نے اپنے ہاتھوں سے جیونار بنایا۔ نو بجے ہوں گے۔ لونڈی نے آکر کہا۔ "مہاراج جیونار تیار ہے۔"

دونوں بھائی کھانا کھانے گئے۔ سونے کے تھال میں راجہ کے لئے کھانا پروسا گیا تھا۔ چاندی کے تھال میں ہردول کے لیے۔ کلینتا نے خود جیونار بنایا تھا۔ خود تھال پروسے تھے اور خود ہی سامنے لائی۔ مگر فرط نشاط کہو۔ خواہ نوشتہ تقدیر کہ اس نے غلطی سے سونے کا تھال ہردول کے سامنے رکھ دیا اور چاندی کا راجہ کے سامنے۔ ہردول نے اس کا خیال نہ کیا۔ وہ سال بھر سے سونے کے تھال میں کھاتے کھاتے اس کا عادی ہو گیا تھا مگر جوجھار سنگھ تلملا گئے۔ زبان سے کچھ نہ بولے لیکن تیور بدل گئے اور چہرہ سرخ ہو گیا۔ رانی کی طرف گھور کر دیکھا اور کھانا کھانے لگے۔ مگر اس وقت ایک ایک لقمہ زہر معلوم ہوتا تھا۔ دو چار لقمے کھا کر اٹھ آئے۔ رانی ان کے تیور دیکھ کر دم بخود ہو گئی تھی۔ آج کیسے پریم سے اس نے جیونار بنایا تھا۔ کتنے انتظار کے بعد یہ مبارک دن آیا تھا۔ اس کی خوشی کی آج کوئی حد نہ تھی۔ راجہ کے تیور دیکھ کر جان سوکھ گئی۔ جب راجہ اٹھ گئے اور اس نے تھال کو دیکھا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا اور پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے سر پیٹ لیا۔ ایشور! آج رات خیریت سے کٹے۔ مجھے آثار اچھے نظر نہیں آتے۔

(7)

راجہ جوجھار سنگھ سیج محل میں لیٹے۔ جادو کار نائین نے رانی کا سنگار کیا اور مسکرا کر بولی۔ "کل مہاراج سے اس کا انعام لوں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ مگر کلینتا وہاں سے نہ اٹھی۔ وہ گہری سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔ ان کے سامنے

کون سامنہ لے کر جاؤں! نائن نے ناحق میرا سنگار کر دیا۔ میرا سنگار دیکھ کر وہ خوش بھی ہوں گے؟ مجھ سے اس وقت خطا ہوئی ہے۔ میں خطاوار ہوں۔ مجھے ان کے پاس اس وقت بناؤ سنگار کر کے جانا زیبا نہیں۔ نہیں نہیں۔ آج مجھے ان کے پاس بھکارنی کے بھیس میں جانا چاہیے۔ میں ان سے چھما کا دان مانگوں گی۔ میرے لئے اس وقت یہی مناسب ہے۔ یہ سوچ کر رانی قد آدم شیشے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ اپسرا معلوم ہوتی تھی۔ حسن کی کتنی تصویریں اس نے دیکھی تھیں مگر اسے اس وقت آئینے کی تصویر سب سے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی۔ حسن اور خود پسندی کا ساتھ ہے۔ ہلدی رنگ دیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ذرا دیر کے لئے کلپتا نشہ حسن سے پھول اٹھی۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں حسن میں جادو ہے اور وہ جادو جس کا کوئی اتار نہیں۔ دین اور ایمان' جان اور جہان سب حسن پر فدا ہیں۔ میں حسین نہ سہی۔ ایسی بری بھی نہیں ہوں۔ کیا میرے حسن میں اتنی بھی طاقت نہیں کہ مہاراج سے میری خطا معاف کرا دے۔ یہ بانہیں جس وقت ان کے گلے کا ہار ہوں گی' یہ آنکھیں جس وقت پریم کے نشے سے سرخ ہو کر ان کی طرف دیکھیں گی۔ کیا میرے حسن کی روح افزا طراوت ان کے غصے کی آنچ کو ٹھنڈا نہ کر دے گی!

مگر ذرا دیر میں رانی کو ہوش آ گیا۔ آہ! یہ میں کیا خواب دیکھ رہی ہوں۔ مگر دل میں ایسی باتیں کیوں آتی ہیں۔ میں اچھی ہوں یا بری ہوں۔ ان کی چیری ہوں۔ مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ ان سے چھما مانگنی چاہیے۔ یہ سنگار اور بناؤ اس وقت بے موقع ہے۔ یہ سوچ کر رانی نے سب گہنے اتار دیئے۔ شبنمی ریشم کی معطر ساڑی الگ کر دی۔ موتیوں بھری مانگ کھول دی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ہائے یہ ملاپ کی رات ہے۔ بچھڑوں کی رات سے بھی زیادہ درد انگیز!

بھکارنی کا بھیس بنا کر رانی سیج محل کی طرف چلی۔ قدم آگے بڑھتے تھے مگر دل پیچھے رہا جاتا تھا۔ دروازے تک آئی مگر اندر قدم نہ رکھ سکی۔ دل دھڑکنے لگا۔ ایسا معلوم ہوا گویا اس کے پاؤں تھرا رہے ہیں۔ راجہ جوجھار سنگھ بولے۔ "کون ہے کلپتا؟ اندر کیوں نہیں آتیں؟"

کلپتا نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "مہاراج کیسے آؤں۔ میں اپنی جگہ کرودھ کو بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔"

راجہ۔ "یہ کیوں نہیں کہتیں کہ دل گنہگار ہے۔ اس لئے آنکھیں نہیں ملانے دیتا۔"

کلپتا۔ "بے شک مجھ سے خطا ہوئی ہے مگر ایک ابلا آپ سے چھما کا دان مانگتی ہے۔"

راجہ۔ "اس کا پراسچت کرنا ہو گا۔"

کلپتا۔ "کیسے؟"

راجہ۔ "ہردول کے خون سے۔"

کلپتا سر سے پاؤں تک کانپ گئی بولی۔ "کیا اسی لئے کہ آج میری بھول سے جیونار کے تھالوں میں الٹ پھیر ہو گیا۔"

راجہ۔ "نہیں اس لئے کہ ہردول نے تمہاری محبت میں الٹ پھیر کر دیا۔"

جیسے آگ سے لوہا سرخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ایک منٹ تک اسے معلوم ہوا گویا دل اور دماغ دونوں کھول رہے ہیں۔ مگر اس نے ضبط کی انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ صرف اتنا بولی۔ "ہردول کو میں اپنا لڑکا اور بھائی سمجھتی ہوں۔"

راجہ اٹھ بیٹھے اور تیز لہجے میں بولے۔ "نہیں ہردول لڑکا نہیں ہے۔ لڑکا میں ہوں جس نے تمہارے اوپر

اعتبار کیا۔ کلیتا مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی! مجھے تمہارے اوپر گھمنڈ تھا۔ میں سمجھتا تھا ہما چل ٹل سکتا ہے مگر تمہارا دل نہیں ٹل سکتا۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ یہ میری نادانی تھی۔ بزرگوں نے سچ کہا ہے کہ عورت پانی کی دھارا ہے۔ جس طرف ڈھال پاتی ہے ادھر بہ جاتی ہے۔"

سونا گرم ہو کر پگھل جاتا ہے۔ کلیتا رونے لگی۔ جب آواز قابو میں ہوئی تو بولی۔ "میں آپ کے اس شبہ کو کیسے دور کروں؟"

راجہ۔ "ہردول کے خون سے۔"

رانی۔ "میرے خون سے یہ داغ نہ مٹے گا؟"

راجہ۔ "تمہارے خون سے اور پختہ ہو جائے گا۔"

رانی۔ "اور کوئی تدبیر نہیں ہے؟"

راجہ۔ "نہ"

رانی۔ "یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟"

راجہ۔ "ہاں یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ دیکھو اس خاصدان میں پان کا بیڑا رکھا ہوا ہے۔ تمہاری عصمت کا ثبوت یہی ہے کہ تم ہردول کو اسے اپنے ہاتھ سے کھلا دو۔ میرے دل سے شبہ اسی وقت نکلے گا جب اس گھر سے ہردول کی لاش نکلے گی۔"

رانی نے نفرت آمیز نگاہوں سے پان کے بیڑے کو دیکھا اور الٹے قدم لوٹ آئی۔

(8)

رانی سوچنے لگی۔ اب میں کیا کروں۔ کیا ہردول کی جان لوں۔ بے خطا' نیک شریف ہردول کے خون سے اپنی عصمت کا ثبوت دوں۔ اس ہردول کے خون سے اپنے ہاتھ رنگوں جو مجھے بہن سمجھتا ہے! یہ پاپ کس کے سر پڑے گا؟ کیا ایک بے گناہ کا خون رنگ نہ لائے گا۔ آہ! بدنصیب کلیتا! تجھے آج اپنی عصمت کا ثبوت دینے کی ضرورت پڑی ہے! اور وہ بھی ایسا مشکل۔ نہیں۔ یہ پاپ مجھ سے نہ ہو گا۔ وہ اگر مجھے بے وفا سمجھتے ہیں تو سمجھیں۔ انہیں اگر مجھ پر شبہ ہے تو ہو مجھ سے یہ پاپ نہ ہو گا۔

آخر راجہ کو یہ شبہ کیوں ہوا۔ کیا محض تھالوں کے بدل جانے سے؟ نہیں ضرور اور کوئی بات ہے۔ آج ہردول انہیں شکار گاہ میں مل گیا تھا۔ راجہ نے اس کی کمر میں دامن تلوار دیکھی ہو گی۔ کیا عجب ہے ہردول سے کوئی بے ادبی ہو گئی ہو۔ مگر میری خطا کیا ہے؟ مجھ پر کیوں اتنا بڑا الزام لگایا جاتا ہے۔ محض تھالوں کے بدل جانے سے! اے ایشور میں کس سے اپنا دکھ کہوں۔ تو ہی میرا گواہ ہے۔ چاہے کچھ ہی ہو مجھ سے یہ پاپ نہ ہو گا۔

رانی نے پھر سوچا۔ راجہ! کیا تمہارا دل ایسا چھوٹا۔ ایسا تنگ ہے۔ تم مجھ سے ہردول کی جان لینے کو کہتے ہو۔ اگر تم سے اس کا اختیار اور دباؤ نہیں دیکھا جاتا تو کیوں صاف صاف ایسا نہیں کہتے۔ کیوں مردوں کی لڑائی نہیں لڑتے۔ کیوں خود اسے نہیں قتل کرتے۔ مجھ سے کیوں وہ کام کرنے کو کہتے ہو جو تم خوب جانتے ہو میں نہیں کر سکتی۔ اگر تمہارا جی مجھ سے اکتا گیا ہے۔ اگر میں وبال جان ہو گئی ہوں تو مجھے کاشی یا متھرا بھیج دو۔ میں شوق سے چلی

جاؤں گی۔ مگر ایشور کے لئے مجھ پر اتنا بڑا الزام نہ رکھو۔ تم میرے مالک ہو۔ شوق سے بے وفا سمجھو۔ لیکن میں زندہ ہی کیوں رہوں؟ میرے لئے اب زندگی میں کوئی سکھ نہیں ہے۔ میرا مرنا ہی اچھا ہے۔ میں خود جان دے دوں گی مگر یہ پاپ مجھ سے نہ ہو گا۔

خیالات نے پھر پلٹا کھایا۔ کلینتا! تم کو یہ پاپ کرنا ہو گا۔ اس سے بڑا پاپ شاید آج تک دنیا میں نہ ہوا ہو۔ مگر یہ پاپ تم کو کرنا پڑے گا۔ تمہارے پتی برت پر شبہ کیا جا رہا ہے اور تمہیں اس شبہ کو دور کرنا ہو گا۔ اگر تمہاری جان خطرے میں ہوتی تو مضائقہ نہ تھا۔ تو اپنی جان دے کر ہردول کو بچا لیتی۔ مگر اس وقت تمہارے پتی برت پر آنچ آ رہی ہے۔ اس لئے تمہیں یہ پاپ کرنا ہو گا اور پاپ کرنے کے بعد ہنسنا اور خوش رہنا ہو گا۔ اگر تمہاری طبیعت ذرا بھی گری، اگر تمہارا چہرہ ذرا بھی مدھم ہوا تو اتنا بڑا پاپ کرنے پر بھی تم شبہ کے دور کرنے میں کامیاب نہ ہو گی۔ تمہارے دل پر چاہے جو گزرے تمہیں یہ پاپ کرنا ہو گا۔

مگر کیسے ہو گا؟ کیا میں ہردول کو قتل کروں گی؟ یہ سوچ کر رانی کے بدن میں لرزہ آ گیا۔ نہ! میرا ہاتھ اس پر نہیں اٹھ سکتا۔ پیارے ہردول! میں تمہیں زہر نہیں کھلا سکتی۔ میں جانتی ہوں تم میرے لئے شوق سے زہر کا بیڑا کھا لو گے۔ ہاں میں جانتی ہوں۔ تم انکار نہ کرو گے۔ مگر مجھ سے یہ پاپ نہیں ہو سکتا۔ ایک بار نہیں ہزار بار نہیں ہو سکتا!

(9)

ہردول کو ان باتوں کی مطلق خبر نہ تھی۔ آدھی رات کے وقت پُنجا لونڈی روتی ہوئی اس کے پاس گئی اور اس سے سب حال حرف بحرف کہہ سنایا۔ وہ خاصہ لے کر رانی کے پیچھے پیچھے سیج محل کے دروازے تک گئی تھی اور ساری باتیں سن آئی تھی۔ ہردول راجہ کے تیور دیکھ کر پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ کوئی نہ کوئی کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے۔ پُنجا کی باتوں نے اس کے شک کی تصدیق کر دی۔ اس نے لونڈی سے سخت تاکید کر دی کہ خبردار کسی دوسرے آدمی کے کان میں ان باتوں کی بھنک نہ پڑے اور خود مرنے کے لئے تیار ہو گیا۔

ہردول بندیل دلاوری کا آفتاب اور بندیلوں کا مایہ افتخار تھا۔ اس کے ابرو کے ذرا سے اشارے پر تین لاکھ بندیل سورما مرنے مارنے کے لئے جمع ہو سکتے تھے۔ ایرچھ اس پر نثار تھا۔ اگر جوجھار سنگھ کھلے میدان میں اس کا مقابلہ کرتا تو یقیناً منہ کی کھاتا کیونکہ ہردول بھی بندیل تھا اور بندیل اپنے دشمن کے ساتھ کسی طرح کی رورعایت روا نہیں رکھتے۔ مرنا مارنا ان کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ مگر اس وقت ایک عورت کو اس کے خون کی ضرورت تھی۔ اور مردانہ حمیت اس کی متقاضی تھی کہ خون اسے دیا جائے! اگر بھیا کو یہ شبہ ہوتا کہ میں ان کے خون کا پیاسا ہوں اور انہیں مار کر راج پر قبضہ کرنا چاہتا ہوں تو کوئی مضائقہ نہ تھا۔ راج کے لئے قتل اور خون، دغا اور فریب جائز سمجھا گیا ہے۔ مگر ان کے اس شبہ کا جواب میری موت کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت میرا فرض ہے کہ اپنی جان دے کر ان کے شبہ کو دور کروں۔ ان کے دل میں ایسا مہلک، ایسا قاتل شبہ پیدا کر کے اگر میں زندہ رہوں اور پاکیزگی سے بھی زیادہ پاک کلینتا کو حقارت اور ذلت کا نشانہ بناؤں تو یہ میری بے حیائی ہے۔ نہیں اس کار خیر میں زیادہ ششں و پنج کی ضرورت نہیں۔ میں خوشی سے زہر کا بیڑا کھاؤں گا۔ اس سے زیادہ مردانہ موت اور کیا ہو سکتی ہے۔ غصہ اور رقابت کے جوش میں، دلاوری اور ناموری کے زعم میں، نقارے کی حوصلہ خیز صداؤں اور نقیب کے آتشین نعروں

سے مشتعل ہو کر موت کا سامنا کرنا ایسا مشکل کام نہیں۔ حمیت کی تلوار کو سینے پر روکنا ہی سچی دلاوری ہے۔

دوسرے روز ہردول نے علی الصباح اشنان کیا۔ بدن پر ہتھیار سجائے اور مسکراتے ہوئے راجہ کے پاس گئے۔ راجہ ابھی سو کر یا کروٹیں بدل کر اٹھے تھے۔ ان کی خمار آلودہ آنکھیں ہردول کی تصویر کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ سامنے سنگ مرمر کی چوکی پر زہریلا پان طشت زرنگار میں رکھا ہوا تھا۔ راجہ کبھی تصویر کی طرف دیکھتے کبھی پان کی طرف۔ شاید خیال نے اس بس کی گانٹھ اور اس تصویر میں ایک رشتہ پیدا کر دیا تھا۔ اس وقت جو ہردول یکایک کمرے میں داخل ہوا تو راجہ چونک پڑا اور سنبھل کر پوچھا۔ "اس وقت کہاں چلے؟"

ہردول کا چہرہ بشاش تھا کیونکہ انسان بہروپیا ہے۔ ہنس کر بولا۔ "کل آپ تشریف لائے ہیں۔ اس کی مبارک باد میں آج شکار کھیلنے جاتے ہیں۔ آپ کو ایشور نے اجیت بنایا ہے۔ ہمیں اپنے ہاتھوں سے وجے کا بیڑا دیجئے۔"

یہ کہہ کر ہردول نے چوکی پر سے خاصدان اٹھا لیا اور اسے راجہ کے سامنے رکھ کر بیڑا لینے کے لئے ہاتھ پھیلا دیا۔ ہردول کا شگفتہ چہرہ دیکھ کر راجہ کے حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ ظالم! میرے زخم پر نمک چھڑکنے آیا ہے۔ میری عزت اور اطمینان کو تباہ کر کے بھی تجھے آسودگی نہیں ہوئی۔ مجھ سے وجے کا بیڑا مانگتا ہے۔ ہاں یہ وجے کا بیڑا ہے مگر تیرے وجے کا نہیں میرے وجے کا!

یہ سوچ کر جوجھار سنگھ نے بیڑے کو ہاتھ میں اٹھایا۔ ایک لمحے تک کچھ سوچتا رہا۔ پھر مسکرا کر ہردول کو بیڑا دے دیا۔ ہردول نے سر جھکا کر بیڑا لیا۔ اسے ماتھے پر چڑھایا۔ ایک بار حسرت ناک نگاہوں سے در و دیوار کو دیکھا اور بیڑے کو منہ میں رکھ لیا۔ ایک سچے راجپوت نے مردانہ حمیت کا حق ادا کر دیا۔ مردانہ جانبازی نے اس سے بہتر داد کبھی نہیں پائی۔

زہر قاتل تھا۔ حلق کے نیچے اترتے ہی ہردول کے چہرے پر مردنی چھا گئی اور آنکھوں کی چمک جاتی رہی۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے ٹھنڈے قطرے نمودار ہو گئے اور سانس تیزی سے چلنے لگی۔ مگر چہرے پر سکون اور اطمینان کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔

جوجھار سنگھ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ اس کے چہرے پر ایک بے رحمانہ مسکراہٹ نمودار تھی مگر آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ روشنی اور تاریکی کا ملاپ ہو گیا تھا۔

نمک کا داروغہ

(1)

جب نمک کا محکمہ قائم ہوا اور ایک خداداد نعمت سے فائدہ اٹھانے کی عام ممانعت کر دی گئی تو لوگ دروازہ صدر بند پا کر روزن و شگاف کی فکریں کرنے لگے۔ چاروں طرف خیانت اور غبن اور تحریص کا بازار گرم تھا۔ پٹوار گری کا معزز اور پُرمنفعت عہدہ چھوڑ چھوڑ کر لوگ صیغۂ نمک کی برقندازی کرتے تھے۔ اور اس محکمے کا داروغہ تو وکیلوں کے لئے بھی رشک کا باعث تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی تعلیم اور عیسائیت مترادف الفاظ تھے۔ فارسی کی

تعلیم سند افتخار تھی۔ لوگ حسن اور عشق کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر اعلیٰ ترین مدارج زندگی کے قابل ہو جاتے تھے۔ منشی بنسی دھر نے بھی زلیخا کی داستان ختم کی اور مجنوں و فرہاد کے قصۂ غم کو دریافتِ امریکہ یا جنگِ نیل سے عظیم تر واقعہ خیال کرتے ہوئے روزگار کی تلاش میں نکلے۔ ان کے باپ ایک جہان دیدہ بزرگ تھے۔ سمجھانے لگے۔ ''بیٹا! گھر کی حالت زار دیکھ رہے ہو۔ قرضے سے گردنیں دبی ہوئی ہیں۔ لڑکیاں ہیں۔ وہ گنگا جمنا کی طرح بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ میں کگارے کا درخت ہوں۔ نہ معلوم کب گر پڑوں۔ تمہی گھر کے مالک و خود مختار ہو۔ مشاہرے اور عہدے کا مطلق خیال نہ کرنا۔ یہ تو پیر کا مزار ہے۔ نگاہ چڑھاوے اور چادر پر رکھنی چاہیے۔ ایسا کام ڈھونڈنا جہاں کچھ بالائی رقم کی آمد ہو۔ ماہوار مشاہرہ پورنماشی کا چاند ہے جو ایک دن دکھائی دیتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے غائب ہو جاتا ہے۔ بالائی رقم پانی کا بہتا ہوا سوتا ہے جس سے پیاس ہمیشہ بجھتی رہتی ہے۔ مشاہرہ انسان دیتا ہے اسی لئے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ بالائی رقم غیب سے ملتی ہے اسی لئے اس میں برکت ہوتی ہے۔ اور تم خود عالم و فاضل ہو۔ تمہیں کیا سمجھاؤں۔ یہ معاملہ بہت کچھ ضمیر اور قیافے کی پہچان پر منحصر ہے۔ انسان کو دیکھو۔ اس کی ضرورت کو دیکھو۔ موقع دیکھو۔ اور خوب غور سے کام لو۔ غرض مند کے ساتھ ہمیشہ بے رحمی اور بے رخی کر سکتے ہو۔ لیکن بے غرض سے معاملہ کرنا مشکل کام ہے۔ ان باتوں کو گرہ میں باندھ لو۔ میری ساری زندگی کی کمائی ہیں۔

بزرگانہ نصیحتوں کے بعد کچھ دعائیہ کلمات کی باری آئی۔ بنسی دھر نے سعادت مند لڑکے کی طرح یہ باتیں بہت توجہ سے سنیں اور تب گھر سے چل کھڑے ہوئے۔ اس وسیع دنیا میں جہاں اپنا استقلال اپنا رفیق، اپنی ہمت اپنا مددگار اور اپنی کوشش اپنا مربی ہے۔ لیکن اچھے شگون سے چلے تھے۔ خوبی قسمت ساتھ تھی۔ صیغہ نمک کے داروغہ مقرر ہو گئے۔ مشاہرہ معقول۔ بالائی رقم کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔ بوڑھے منشی جی نے خط پایا تو باغ باغ ہو گئے۔ کلوار کی تسکین و تشفی کی سند ملی۔ پڑوسیوں کو حسد ہوا اور مہاجنوں کی سخت گیریاں مائل بہ نرمی ہو گئیں۔

(2)

جاڑے کے دن تھے اور رات کا وقت۔ نمک کے برقنداز اور چوکی دار شراب خانے کے دربان بنے ہوئے تھے۔ منشی بنسی دھر کو ابھی یہاں آئے ہوئے چھ ماہ سے زیادہ نہیں ہوئے تھے لیکن اسی عرصے میں ان کی فرض شناسی اور دیانت نے افسروں کا اعتبار اور پبلک کی بے اعتباری حاصل کر لی تھی۔ نمک کے دفتر سے ایک میل پورب کی جانب جمنا ندی بہتی تھی اور اس پر کشتیوں کی ایک گزرگاہ بنی ہوئی تھی۔ داروغہ صاحب کمرہ بند کئے میٹھی نیند سوتے تھے۔ یکایک آنکھ کھلی تو ندی کے میٹھے سہانے راگ کے بجائے گاڑیوں کا شور و غل اور ملاحوں کی بلند آوازیں کان میں آئیں۔ اٹھ بیٹھے۔ اتنی رات گئے گاڑیاں کیوں دریا کے پار جاتی ہیں اگر کچھ دغا نہیں تو اس پردۂ تاریک کی ضرورت کیوں۔ شبہ کو استدلال نے ترقی دی۔ وردی پہنی۔ طپنچہ جیب میں رکھا اور آن کی آن میں گھوڑا بڑھائے ہوئے دریا کے کنارے آ پہنچے۔ دیکھا تو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار زلف محبوب سے بھی زیادہ طولانی پل سے اتر رہی ہے۔ حاکمانہ انداز سے بولے:

''کس کی گاڑیاں ہیں؟''

تھوڑی دیر تک سناٹا رہا۔ آدمیوں میں کچھ سرگوشیاں ہوئیں۔ تب اگلے گاڑی بان نے جواب دیا۔ ''پنڈت الوپی دین کی۔''

”کون پنڈت الوپی دین؟“

”داتا گنج کے۔“

منشی بنسی دھر چونکے۔ الوپی دین اس علاقے کا سب سے بڑا اور ممتاز زمیندار تھا۔ لاکھوں کی ہنڈیاں چلتی تھیں۔ غلے کا کاروبار الگ۔ بڑا صاحب اثر' بڑا حکام رس' بڑے بڑے انگریز افسر اس کے علاقے میں شکار کھیلنے آتے اور اس کے مہمان ہوتے۔ بارہ مہینے سدابرت چلتا تھا۔ پوچھا۔ ”کہاں جائیں گی؟“ جواب ملا کہ کان پور کو۔ لیکن اس سوال پر کہ ”ان میں کیا ہے؟“ ایک خاموشی کا عالم طاری ہو گیا اور داروغہ صاحب کا شبہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ جواب کے ناکام انتظار کے بعد ذرا زور سے بولے ”کیا تم سب گونگے ہو گئے۔ ہم پوچھتے ہیں ان میں کیا لدا ہے؟“

(3)

جب اب کے بھی کوئی جواب نہ ملا تو انہوں نے گھوڑے کو ایک گاڑی سے ملا دیا اور ایک بورے کو ٹٹولا۔ شبہ یقین سے ہم آغوش تھا۔ یہ نمک کے ڈھیلے تھے۔

پنڈت الوپی دین اپنے سجیلے رتھ پر سوار کچھ سوتے کچھ جاگتے چلے آتے تھے کہ دفعتاً کئی گھبرائے ہوئے گاڑی بانوں نے آ کر جگایا اور بولے۔ ”مہاراج! داروگا نے گاڑیاں روک دیں اور گھاٹ پر کھڑے آپ کو بلاتے ہیں۔“

پنڈت الوپی دین کو مبلغ علیہ السلام کی طاقت کا پورا پورا اور عملی تجربہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دنیا کا ذکر ہی کیا دولت کا سکہ بہشت میں بھی رائج ہے۔ اور ان کا یہ قول بہت صحیح تھا۔ قانون اور حق وانصاف یہ سب دولت کے کھلونے ہیں جن سے وہ حسب ضرورت اپنا جی بہلایا کرتی ہے۔ لیٹے لیٹے امیرانہ بے پروائی سے بولے۔ ”اچھا چلو' ہم آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر پنڈت جی بہت اطمینان سے پان کے بیڑے لگائے اور تب لحاف اوڑھے ہوئے داروغہ جی کے پاس آ کر بے تکلفانہ انداز سے بولے۔ ”بابو جی اشیر باد۔ ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ گاڑیاں روک دی گئیں۔ ہم برہمنوں پر آپ کی نظر عنایت ہی رہنی چاہیے۔“

بنسی دھر نے الوپی دین کو پہچانا۔ بے اعتنائی سے بولے۔ ”سرکاری حکم!“

الوپی دین نے ہنس کر کہا۔ ”ہم سرکاری حکم کو نہیں جانتے اور نہ سرکار کو۔ ہمارے سرکار تو آپ ہی ہیں۔ ہمارا اور آپ کا تو گھر کا معاملہ ہے۔ کبھی آپ سے باہر ہو سکتے ہیں۔ آپ نے ناحق تکلیف کی۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ ادھر سے جائیں اور اس گھاٹ کے دیوتا کو بھینٹ نہ چڑھائیں۔ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا۔“

بنسی دھر پر دولت کی اس شیریں زبانیوں کا کچھ اثر نہ ہوا۔ دیانت داری کا تازہ جوش تھا۔ کڑک کر بولے۔ ”ہم ان نمک حراموں میں نہیں ہیں جو کوڑیوں پر اپنا ایمان بیچتے پھرتے ہیں۔ آپ اس وقت حراست میں ہیں۔ صبح کو آپ کا باقاعدہ چالان ہو گا۔ بس مجھے زیادہ باتوں کی فرصت نہیں ہے۔ جمعدار بدلو سنگھ! تم انہیں حراست میں لے لو میں حکم دیتا ہوں۔“

پنڈت الوپی دین اور اس کے ہواخواہوں اور گاڑی بانوں میں ایک ہل چل سی مچ گئی۔ یہ شاید زندگی میں پہلا موقع تھا کہ پنڈت جی کو ایسی ناگوار باتوں کے سننے کا اتفاق ہوا۔ بدلو سنگھ آگے بڑھا لیکن فرط رعب سے ہمت نہ پڑی کہ ان کا ہاتھ پکڑ سکے۔ الوپی دین نے بھی فرض کو دولت سے ایسا بے نیاز اور ایسا بے غرض کبھی نہیں پایا تھا۔ سکتے میں آ

گئے۔ خیال کیا کہ یہ ابھی طفلِ مکتب ہے۔ دولت کے ناز و انداز سے مانوس نہیں ہوا۔ الھڑ ہے، جھجکتا ہے، زیادہ ناز برداری کی ضرورت ہے۔ بہت منکسرانہ انداز سے بولے۔ "بابو صاحب! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ ہم مٹ جائیں گے۔ عزت خاک میں مل جائے گی۔ آخر آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟ بہت ہوا تو تھوڑا سا انعام اکرام مل جائے گا۔ ہم کسی طرح آپ سے باہر تھوڑا ہی ہیں۔"

بنسی دھر نے سخت لہجے میں کہا۔ "ہم ایسی باتیں سننا نہیں چاہتے۔"

الوپی دین نے جس سہارے کو چٹان سمجھ رکھا تھا وہ پاؤں کے نیچے سے کھسکتا ہوا معلوم ہوا۔ اعتمادِ نفس اور غرورِ دولت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن ابھی تک دولت کی تعدادی قوت کا پورا بھروسہ تھا۔ اپنے مختار سے بولے۔ "لالہ جی! ایک ہزار روپیہ کا نوٹ بابو صاحب کی نذر کرو۔ آپ اس وقت بھوکے شیر ہو رہے ہیں۔"

بنسی دھر نے گرم ہو کر کہا۔ "ایک ہزار نہیں، مجھے ایک لاکھ بھی فرض کے راستے سے نہیں ہٹا سکتا۔" دولت فرض کی اس خام کارانہ جسارت اور اس زاہدانہ نفس کشی پر جھنجھلائی۔ اور اب ان دونوں طاقتوں کے درمیان بڑے معرکے کی کشمکش شروع ہوئی۔ دولت نے پیچ و تاب کھا کھا کر مایوسانہ جوش کے ساتھ کئی حملے کئے۔ ایک ہزار سے پانچ ہزار تک۔ پانچ سے دس۔ دس سے پندرہ اور پندرہ سے بیس ہزار تک نوبت پہنچی۔ لیکن فرض مردانہ ہمت کے ساتھ اس سپاہ عظیم کے مقابلہ میں یکہ و تنہا پہاڑ کی طرح اٹل کھڑا تھا۔

الوپی دین مایوسانہ انداز سے بولے۔ "اس سے زیادہ میری ہمت نہیں۔ آئندہ آپ کو اختیار ہے۔" بنسی دھر نے اپنے جمعدار کو للکارا۔ بدلو سنگھ دل میں داروغہ جی کو گالیاں دیتا ہوا الوپی دین کی طرف بڑھا۔ پنڈت جی گھبرا کر دو تین قدم پیچھے ہٹ گئے اور نہایت منت آمیز بے کسی کے ساتھ بولے۔ "بابو صاحب! ایشور کے لئے مجھ پر رحم کیجئے۔ میں پچیس ہزار پر معاملہ کرنے کو تیار ہوں۔"

"غیر ممکن"

"تیس ہزار پر"

"غیر ممکن"

"کیا چالیس ہزار بھی ممکن نہیں"

"چالیس ہزار نہیں چالیس لاکھ پر بھی غیر ممکن۔ بدلو سنگھ! اس شخص کو فوراً حراست میں لے لو۔ اب میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا۔"

فرض نے دولت کو پاؤں تلے کچل ڈالا۔ الوپی دین نے ایک قوی ہیکل جوان کو ہتھکڑیاں لئے ہوئے اپنی طرف آتے دیکھا۔ چاروں طرف مایوسانہ نگاہیں ڈالیں اور تب غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔

(4)

دنیا سوتی تھی مگر دنیا کی زبان جاگتی تھی۔ صبح ہوئی تو یہ واقعہ بچے بچے کی زبان پر تھا اور ہر گلی کوچے سے ملامت اور تحقیر کی صدائیں آتی تھیں۔ گویا دنیا میں اب گناہ کا وجود نہیں رہا۔ پانی کو دودھ کے نام سے بیچنے والا گوالا، فرضی روزنامچے بھرنے والے حکام سرکار، ٹکٹ کے بغیر ریل پر سفر کرنے والے بابو صاحبان اور جعلی دستاویزیں

بنانے والے سیٹھ اور ساہو کار' یہ سب اس وقت پارساؤں کی طرح گردنیں ہلاتے تھے۔ اور جب دوسرے دن پنڈت الوپی دین کا مواخذہ ہوا اور وہ کانسٹیبلوں کے ساتھ شرم سے گردن جھکائے ہوئے عدالت کی طرف چلے۔ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں' دل میں غصہ و غم تو سارے شہر میں ہلچل سی مچ گئی۔ میلوں میں بھی شاید شوقِ نظارہ ایسی امنگ پر نہ آتا ہو۔ کثرتِ ہجوم سے سقف و دیوار میں تمیز کرنا مشکل تھا۔

مگر عدالت میں پہنچنے کی دیر تھی۔ پنڈت الوپی دین اس قلزم ناپیدا کنار کے نہنگ تھے۔ حکام ان کے قدر شناس' عملے ان کے نیاز مند' وکیل اور مختار ان کے ناز بردار اور اردلی کے چپراسی اور چوکیدار تو ان کے درم خریدہ غلام تھے۔ انہیں دیکھتے ہی چاروں طرف سے لوگ دوڑے۔ ہر شخص حیرت سے انگشت بدنداں تھا۔ اس لئے نہیں کہ الوپی دین نے کیوں ایسا فعل کیا۔ بلکہ وہ کیوں قانون کے پنجے میں آئے۔ ایسا شخص جس کے پاس محال کو ممکن کرنے والی دولت اور دیوتاؤں پر جادو ڈالنے والی چرب زبانی ہو کیوں قانون کے شکار بنے۔ حیرت کے بعد ہمدردی کے اظہار ہونے لگے۔ فوراً اس حملے کو روکنے کے لئے وکیلوں کا ایک دستہ تیار کیا گیا اور انصاف کے میدان میں فرض اور دولت کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی۔ بنسی دھر خاموش کھڑے تھے۔ یکہ و تنہا۔ سچائی کے سوا اور کچھ پاس نہیں۔ صاف بیانی کے سوا اور کوئی ہتھیار نہیں۔ استغاثہ کی شہادتیں ضرور تھیں لیکن ترغیبات سے ڈانواڈول۔ حتیٰ کہ انصاف بھی کچھ ان کی طرف سے کھچا ہوا نظر آتا تھا۔ یہ ضرور سچ ہے کہ انصاف سیم و زر سے بے نیاز ہے لیکن پردے میں وہ اشتیاق ہے جو ظہور میں ممکن نہیں۔ دعوت اور تحفے کے پردے میں بیٹھ کر دولت زاہد فریب بن جاتی ہے۔ وہ عدالت کا دربار تھا لیکن اس کے ارکان پر دولت کا نشہ چھایا ہوا تھا۔ مقدمہ بہت جلد فیصل ہو گیا۔ ڈپٹی مجسٹریٹ نے تجویز لکھی۔ پنڈت الوپی دین کے خلاف شہادت نہایت کمزور اور مہمل ہے۔ وہ ایک صاحب ثروت رئیس ہے۔ یہ غیر ممکن ہے کہ وہ محض چند ہزار کے فائدے کے لئے ایسی کمینہ حرکت کے مرتکب ہو سکتے۔ داروغہ صاحب نمک منشی بنسی دھر پر اگر زیادہ سنگین نہیں تو ایک افسوس ناک غلطی اور خام کارانہ سرگرمی کا الزام ضرور عائد ہوتا ہے۔

ہم خوش ہیں کہ وہ ایک فرض شناس نوجوان ہے لیکن صیغۂ نمک کی اعتدال سے بڑھی ہوئی نمک حلالی نے اس کے امتیاز و ادراک کو مغلوب کر دیا۔ اسے آئندہ ہوشیار رہنا چاہیے۔ وکیلوں نے یہ تجویز سنی اور اچھل پڑے۔ پنڈت الوپی دین مسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ حوالیوں نے روپے برسائے۔ سخاوت اور فراخ حوصلگی کا سیلاب آ گیا اور اس کی لہروں نے عدالت کی بنیادیں تک ہلا دیں۔ جب بنسی دھر عدالت سے باہر نکلے' نگاہیں غرور سے لبریز تو طعن و تمسخر کے آوازے چاروں طرف سے آنے لگے۔ چپراسیوں اور برقندازوں نے جھک کر سلام کئے لیکن ایک ایک اشارہ اس وقت اس نشۂ غرور پر ہوائے سرد کا کام کر رہا تھا۔ شاید مقدمے میں کامیاب ہو کر وہ شخص اس طرح اکڑتا ہوا نہ چلتا۔ دنیا نے اسے پہلا سبق دے دیا تھا۔ انصاف' علم اور پنج حرفی خطابات اور لمبی داڑھیاں اور ڈھیلے ڈھالے چغے ایک بھی حقیقی عزت کے مستحق نہیں!

(5)

لیکن بنسی دھر نے ثروت اور رسوخ سے بیر مول لیا تھا۔ اس کی قیمت دینی واجب تھی۔ مشکل سے ایک

ہفتہ گزرا ہوگا کہ معطلی کا پروانہ آ پہنچا۔ فرض شناسی کی سزا ملی۔ بے چارے شکستہ اور پریشان حال اپنے وطن کو روانہ ہوئے۔ بوڑھے منشی جی پہلے ہی سے بدظن ہو رہے تھے کہ چلتے چلتے سمجھایا تھا مگر اس لڑکے نے ایک نہ سنی۔ ہم تو کلوار اور بوچڑ کے تقاضے سنہیں۔ بڑھاپے میں بھگت بن کر بیٹھیں اور وہاں بس وہی سوکھی تنخواہ۔ آخر ہم نے بھی نوکری کی ہے اور کوئی عہدہ دار نہیں تھے لیکن جو کام کیا دل کھول کر کیا اور آپ دیانت دار بننے چلے ہیں۔ گھر میں چاہے اندھیرا رہے' مسجد میں ضرور چراغ جلائیں گے۔ جب ایسی سمجھ پر پڑھانا لکھانا سب اکارت گیا۔ اسی اثنا میں بنسی دھر خستہ حال مکان پر پہنچے اور بوڑھے منشی جی نے روداد سنی تو سر پیٹ لیا اور بولے۔ جی چاہتا ہے کہ اپنا اور تمہارا سر پھوڑ لوں۔ بہت دیر تک پچھتاتے اور کفِ افسوس ملتے رہے۔ غصے میں کچھ سخت سُست بھی کہا اور بنسی دھر اگر وہاں سے ٹل نہ جائیں تو عجب نہیں تھا کہ یہ غصہ عملی صورت اختیار کر لیتا۔ بوڑھی اماں کو بھی صدمہ ہوا۔ جگن ناتھ اور رامیشور کی آرزوئیں خاک میں مل گئیں اور بیوی نے تو کئی دن تک سیدھے منہ سے بات نہیں کی۔

اس طرح اپنے یگانوں کی ترش روئی اور بیگانوں کی دلدوز ہمدردیاں سہتے سہتے ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ بوڑھے منشی رام نام کی مالا پھیر رہے تھے کہ ان کے دروازے پر ایک سجا ہوا رتھ آ کر رکا۔ سبز اور گلابی پردے' پچھائیں نسل کے بیل' ان کی گردنوں میں نیلے دھاگے' سینگ پیتل سے منڈھے ہوئے۔ منشی جی پیشوائی کو دوڑے۔ دیکھا تو پنڈت الوپی دین ہیں۔ جھک کر ڈنڈوت کی اور مدبرانہ دُر افشانیاں شروع کیں۔ "آپ کو کونسا منہ دکھائیں۔ منہ میں کالک لگی ہوئی ہے مگر کیا کریں لڑکا نالائق ہے۔ ناخلف ہے ورنہ آپ سے کیوں منہ چھپاتے۔ ایشور بے چراغ رکھے مگر ایسی اولاد نہ دے۔" بنسی دھر نے الوپی دین کو دیکھا۔ مصافحہ کیا لیکن شان خودداری لئے ہوئے۔ فوراً گمان ہوا کہ یہ حضرت مجھے جلانے آئے ہیں۔ زبان شرمندۂ معذرت نہیں ہوئی۔ اپنے والد بزرگوار کا خلوص رواں سخت ناگوار گزرا۔ یکایک پنڈت جی نے قطع کلام کیا۔ "نہیں بھائی صاحب! ایسا نہ فرمایئے۔"

بوڑھے منشی جی کی قیافہ شناسی نے جواب دے دیا۔ اندازِ حیرت سے بولے۔ "ایسی اولاد کو اور کیا کہوں۔" الوپی دین نے کسی قدر جوش سے کہا۔ "فخر خاندان اور بزرگوں کا نام روشن کرنے والا ایسا سپوت لڑکا پا کر آپ کو پرماتما کا شکر گزار ہونا چاہیے۔ دنیا میں ایسے کتنے انسان ہیں جو دیانت پر اپنا سب کچھ نثار کرنے پر تیار ہوں۔ داروغہ جی! اسے زمانہ سازی نہ سمجھئے۔ زمانہ سازی کے لئے مجھے یہاں تک تکلیف کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس رات کو آپ نے مجھے حکومت کے زور سے حراست میں لیا تھا۔ آج میں خود بخود آپ کی حراست میں آیا ہوں۔ میں نے ہزاروں رئیس اور امیر دیکھے۔ ہزاروں عالی مرتبہ حکام سے سابقہ پڑا لیکن مجھے زیر کیا تو آپ نے۔ میں نے سب کو اپنا اور اپنی دولت کا غلام بنا کر چھوڑ دیا۔ مجھے اجازت ہے کہ آپ سے کوئی سوال کروں؟"

بنسی دھر کو ان باتوں میں کچھ خلوص کی بو آئی۔ پنڈت جی کے چہرے کی طرف اڑتی ہوئی مگر تلاش کی نگاہ سے دیکھا۔ صداقت کی گاڑھی گاڑھی جھلک نظر آئی۔ غرور نے ندامت کو راہ دی۔ شرماتے ہوئے بولے۔ "یہ آپ کی ذرہ نوازی ہے۔ فرض نے مجھے آپ کی شان میں بے ادبی کرنے پر مجبور کیا ورنہ میں تو آپ کی خاکِ پا ہوں جو آپ کا ارشاد ہوگا بحدِ امکان اس کی تعمیل سے انکار نہ کروں گا۔"

الوپی دین نے التجا آمیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "دریا کے کنارے آپ نے میرا سوال رد کر دیا تھا لیکن یہ سوال آپ کو قبول کرنا پڑے گا۔"

بنسی دھر نے جواب دیا۔ "میں کس قابل ہوں لیکن مجھ سے جو کچھ ناچیز خدمت ہو سکے گی اس میں دریغ نہ ہو گا۔"
الوپی دین نے ایک قانونی تحریر نکالی اور اسے بنسی دھر کے سامنے رکھ کر بولے۔ "اس مختار نامے کو ملاحظہ فرمایئے اور اس پر دستخط کیجئے۔ میں برہمن ہوں۔ جب تک یہ سوال پورا نہ کیجئے گا دروازے سے نہ ٹلوں گا۔"
منشی بنسی دھر نے مختار نامے کو پڑھا تو شکریہ کے آنسو آنکھوں میں بھر آئے۔ پنڈت الوپی دین نے انہیں اپنی ساری ملکیت کا مختار عام قرار دیا تھا۔ چھ ہزار سالانہ تنخواہ جیب خاص کے لئے۔ روزانہ خرچ الگ۔ سواری کے لئے گھوڑے۔ اختیارات غیر محدود۔ کانپتی ہوئی آواز سے بولے۔ "پنڈت جی۔ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں کہ آپ نے مجھے ان عنایات بیکراں کے قابل سمجھا لیکن میں آپ سے سچ عرض کرتا ہوں کہ میں اتنے اعلیٰ رتبے کے قابل نہیں ہوں۔"
الوپی دین ہنس کر بولے۔ "اپنے منہ سے اپنی تعریف نہ کیجئے۔"
بنسی دھر نے متین انداز سے کہا۔ "یوں میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ جیسے نورانی اوصاف بزرگ کی خدمت کرنا میرے لئے فخر کی بات ہے۔ لیکن مجھ میں نہ علم ہے' نہ فراست' نہ تجربہ ہے جو ان خامیوں پر پردہ ڈال سکے۔ ایسی معزز خدمات کے لئے ایک بڑے معاملہ فہم اور کارکردہ منشی کی ضرورت ہے۔"
الوپی دین نے قلمدان سے قلم نکالا اور بنسی دھر کے ہاتھ میں دے کر بولے۔ "مجھے نہ علم کی ضرورت ہے' نہ فراست کی' نہ کارکردگی کی اور نہ معاملہ فہمی کی۔ ان سنگ ریزوں کے جوہر میں بارہا پرکھ چکا ہوں۔ اب حسن تقدیر اور حسنِ اتفاق نے مجھے وہ بے بہا موتی دے دیا ہے جس کی آب کے سامنے علم اور فراست کی چمک کوئی چیز نہیں۔ یہ قلم حاضر ہے زیادہ تامل نہ کیجئے۔ اس پر آہستہ سے دستخط کیجئے۔ میری پرماتما سے یہی التجا ہے کہ آپ کو سدا وہی ندی کے کنارے والا بے مروت' سخت زبان' تند مزاج لیکن فرض شناس داروغہ بنائے رکھے۔
بنسی دھر کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ دل کے تنگ ظرف میں اتنا احسان نہ سما سکا۔ پنڈت الوپی دین کی طرف ایک بار پھر عقیدت اور پرستش کی نگاہ سے دیکھا اور مختار نامے پر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دستخط کر دیئے۔ الوپی دین فرط مسرت سے اچھل پڑے اور انہیں گلے لگا لیا۔

عالم بے عمل

(1)

بابو اکھے کمار پٹنہ کے ایک وکیل تھے اور بڑے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے یعنی رائے بہادری کے قریب پہنچ چکے تھے۔ جیسا کہ اکثر بڑے آدمیوں کی نسبت مشہور ہے ان بابو صاحب کا لڑکپن بھی بہت افلاس میں بسر ہوا تھا۔ والدین جب اپنے ناہموار لڑکوں کو تنبیہ کرتے تو بابو اکھے کمار کا نام تمثیلاً پیش کیا جاتا تھا۔ "اکھے بابو کو دیکھو۔ آج دروازے پر ہاتھی جھومتا ہے۔ کل پڑھنے کو تیل نہیں میسر ہوتا تھا۔ پیال جلا کر اس کی آنچ میں پڑھتے۔ سڑک کی

لالٹینوں کی روشنی میں سبق یاد کرتے۔ علم اس طرح آتا ہے۔'' بعض بلند پرواز حضرات اس امر کے بھی شاہد تھے کہ انہوں نے اکھے بابو کو جگنو کی روشنی میں پڑھتے دیکھا ہے۔ آیا جگنو کی دمک یا پیال کی آنچ میں مستقل روشنی ہو سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ سننے والوں کے فہم اور فراست پر تھا۔ حاصل کلام یہ کہ اکھے کمار کی طفولیت کا زمانہ رشک کے قابل نہ تھا اور نہ وکالت کا۔ گاؤں خوش نصیبوں کا وہ سیلاب اپنے ساتھ لایا جس کی امید تھی۔ سیلاب کا ذکر ہی کیا۔ برسوں تک قحط کی صورت تھی۔ یہ امید کہ سیاہ گاؤں کام دھینو ثابت ہوگا اور دنیا کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی رہیں گی، باطل نکلی۔ سیاہ گاؤں بخت سیاہ کو روشن نہ کر سکا۔ اچھے دنوں کے انتظار میں بہت دن گزر گئے اور بالآخر جب اچھے دن آئے، جب گارڈن پارٹیوں میں شریک ہونے کی دعوتیں آنے لگیں۔ جب وہ عام جلسوں میں کرسیِ صدارت پر جلوہ افروز ہونے لگے تو شباب رخصت ہو چکا تھا اور بالوں کو خضاب کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ حسین اور ہنس مکھ ہیموتی کی خاطر داری لازمی تھی۔ جس کی مبارک آمد نے بابو اکھے کمار کی زندگی کی آخری آرزو پوری کر دی تھی۔

(2)

جس طرح سخاوت انسان کے عیبوں کو چھپا لیتی ہے۔ اسی طرح بخل اس کی خوبیوں پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ بخیل کے دشمن سب ہوتے ہیں۔ دوست کوئی نہیں ہوتا۔ ہر کس و ناکس کو اس سے بغض للہ ہوتا ہے۔ وہ غریب کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا۔ وہ بالعموم بہت ہی صلح پسند، سلامت رو، متین اور خوددار شریف آدمی ہوتا ہے۔ مگر بخل کا کالا رنگ ہے جس پر کوئی رنگ خواہ کیسا ہی شوخ ہو نہیں چڑھ سکتا۔ بابو اکھے کمار بھی بخیل مشہور تھے حالانکہ جیسا قاعدہ ہے یہ لقب انہیں حسد کے دربار سے عطا ہوا تھا۔ جو شخص بخیل کہا جاتا ہو سمجھ لو کہ وہ بہت خوش نصیب ہے اور اس کے حاسد بہت ہیں۔ اگر بابو اکھے کمار کوڑیوں کو دانت سے پکڑتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا۔ اگر ان کا مکان بہت اعلیٰ پیمانہ پر نہیں سجا ہوا تھا، اگر ان کے یہاں مفت خور، او نگھنے والے نوکروں کی فوج نہیں تھی، اگر وہ دو گھوڑوں کی فٹن پر کچہری نہیں جاتے تھے تو کسی کا کیا نقصان تھا۔ ان کی زندگی کا اصول تھا کہ کوڑیوں کی تم فکر رکھو، روپے اپنی فکر آپ کر لیں گے اور اس زریں اصول پر سختی سے کاربند ہونے میں وہ بالکل حق بجانب تھے۔ انہیں کوڑیوں پر شباب کی بہاریں اور دل کی امنگیں نثار کی تھیں۔ آنکھوں کی بینائی اور صحت جیسی نعمت عظمیٰ انہیں کوڑیوں پر صدقے کی تھی۔ انہیں دانتوں سے پکڑتے تھے تو بہت اچھا کرتے تھے۔ پلکوں سے اٹھانا چاہیے تھا۔

مگر حسین ہنس مکھ ہیمونی کا مزاج بالکل اس کے متضاد تھا۔ اپنی دوسری بہنوں کی طرح وہ بھی تکلف اور آرائش پر جان دیتی تھی اور گو بابو اکھے کمار ایسے نادان اور ایسے خشک نہیں تھے کہ اس کی قابل قدر کمزوریوں کی قدر نہ کرتے۔ نہیں وہ سنگار اور سجاوٹ کی چیزوں کو دیکھ کر کبھی کبھی خوش ہونے کی کوشش بھی کرتے تھے مگر بعض اوقات جب ہیمونی ان کے نیک مشوروں کی پروا نہ کر کے دائرۂ اعتدال سے بڑھ جاتی تھی تو اس دن بابو صاحب کو اس کی خاطر اپنی قوت استدلال و تنظیر کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور صرف کرنا پڑتا تھا۔

ایک روز جب اکھے کمار کچہری سے آئے تو حسین اور ہنس مکھ ہیموتی نے ایک رنگین لفافہ ان کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ انہوں نے دیکھا تو اندر ایک بہت نفیس گلابی رنگ کی نوید تھی۔ ہیموتی سے بولے۔ ''ان لوگوں کو ایک نہ ایک

خبط سوجھتا ہی رہتا ہے۔ میرے خیال میں اس ڈرامیٹک پرفارمنس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔"

ہیموتی ان باتوں کے سننے کی عادی تھی۔ مسکرا کر بولی۔ "کیوں اس سے بہتر اور کون خوشی کی تقریب ہو سکتی ہے؟"

اکھے کمار سمجھ گئے کہ اب بحث مباحثہ کی ضرورت آ گئی۔ سنبھل کر بیٹھے اور بولے۔ "جان من! بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہونا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ ہزاروں نوجوان ہر سال پاس ہوتے رہتے ہیں اگر میرا بھائی ہوتا تو میں صرف اس کی پیٹھ ٹھونک کر کہتا کہ شاباش! خوب محنت کی۔ مجھے ڈراما کھیلنے کا خیال بھی نہ پیدا ہوتا۔ ڈاکٹر صاحب تو سمجھ دار آدمی ہیں۔ انہیں کیا سوجھی!"

ہیموتی۔ "مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔"

اکھے کمار۔ "کیوں کیا وعدہ کر لیا ہے؟"

ہیموتی۔ "ڈاکٹر صاحب کی بیوی خود آئی تھیں۔"

اکھے کمار۔ "تو جان من! تم بھی کبھی ان کے گھر چلی جانا۔ پرسوں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

ہیموتی۔ "اب بتا ہی دوں۔ مجھے نائکہ کا پارٹ دیا گیا ہے اور میں نے اسے منظور کر لیا ہے۔"

یہ کہہ کر ہیموتی نے ناز سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا مگر اکھے کمار کو اس کی خبر سے بہت خوشی نہ ہوئی۔ اس سے قبل دو بار ہیموتی شکنتلا بن چکی تھی۔ ان دونوں موقعوں پر بابو صاحب کو مصارفِ کثیر برداشت کرنے پڑے تھے۔ انہیں خوف ہوا کہ اب کے ہفتے میں پھر گھوش کمپنی دو سو کا بل پیش کرے گی۔ اور اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ ابھی سے روک تھام کی جائے۔ انہوں نے بہت ملائمت سے ہیموتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت شیریں اور محبت آمیز لہجے میں بولے۔ "پیاری! یہ بلا پھر تم نے اپنے سر لے لی۔ اپنی تکلیف اور پریشانی کا بالکل خیال نہیں کیا۔ یہ بھی نہیں سوچا کہ تمہاری پریشانی تمہارے اس عاشق زار کو کتنا پریشان کرتی ہے۔ جانِ من! یہ جلسے اخلاقی وجوہ کے اعتبار سے سخت قابل اعتراض ہیں۔ انہیں موقعوں پر دلوں میں رشک کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ یہیں غیبت کی عادت پڑتی ہے اور یہیں طعنہ بازی اور نوک جھونک کی مشق ہوتی ہے۔ فلاں لیڈی حسین ہے۔ اس لئے اس کی دوسری بہنوں کا فرض ہے کہ اس سے جلیں۔ جان من! ایشور نہ کرے کہ کوئی حاسد بنے۔ مگر محسود بننا تو اپنے اختیار کی بات نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارا حسن جان سوز کتنے ہی دلوں کو جلا کر راکھ کر دے گا۔ الغرض پیاری ہیمو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی دعوت منظور کر لی۔ مجھے یقین ہے اگر تمہیں معلوم ہوتا کہ میں اسے پسند نہ کروں گا تو تم ہرگز منظور نہ کرتیں۔"

حسین اور ہنس مکھ ہیموتی اس محبت آمیز تقریر کو بظاہر بہت غور سے سنتی رہی۔ بعد ازاں تجاہل سے بولی۔ "میں نے تو یہ سوچ کر منظور کر لیا تھا کہ کپڑے سب پہلے ہی رکھے ہوئے ہیں۔ زیادہ سامان کی ضرورت نہ ہو گی۔ صرف چند گھنٹوں کی تکلیف ہے اور احسان مفت۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی تو اچھی بات نہیں ہے مگر اب نہ جاؤں گی۔ میں ابھی معذرت لکھے دیتی ہوں۔ سچ مچ کیا فائدہ خواہ مخواہ کی الجھن۔"

یہ سن کر کہ کپڑے سب پہلے کے رکھے ہوئے ہیں' کچھ زیادہ خرچ نہ ہو گا' اکھے کمار کے دل پر سے ایک بڑا بوجھ اٹھ گیا۔ ڈاکٹروں کو ناراض کرنا بھی اچھی بات نہیں۔ یہ جملہ بھی معنوں سے خالی نہ تھا۔ بابو صاحب پچھتائے کہ اگر پہلے سے یہ حال معلوم ہوتا تو کاہے کو واعظ خشک بننا پڑتا۔ گردن ہلا کر بولے۔ "نہیں نہیں جانِ من! میرا منشاء یہ

ہرگز نہیں کہ تم جاؤ ہی مت۔ جب تم دعوت منظور کر چکی ہو تو اب معذرت کرنا انسانیت سے بعید معلوم ہوتا ہے۔ میرا صرف یہ منشاء تھا کہ جہاں تک ممکن ہو' ایسے جلسوں سے دور رہنا چاہیے۔''

مگر ہیموتی نے اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ ''اب میں نہ جاؤں گی۔ تمہاری باتیں گرہ میں باندھ لیں۔''

(3)

دوسرے دن شام کو اکھے کمار ہوا خوری کو نکلے۔ آنند باغ اس وقت جوبن پر تھا۔ خوش قامت سرو اور اشوک کی دو رویہ قطاروں کے بیچ میں سرخ سنگ ریزوں سے سجی ہوئی سڑک ایسی خوبصورت معلوم ہوتی تھی گویا کنول کے پتوں میں پھول کھلا ہوا ہے۔ یا نوک دار پلکوں کے بیچ میں لال متوالی آنکھیں زیب دے رہی ہیں۔ بابو اکھے کمار اس روش پر ہوا کے ہلکے ہلکے فرح بخش جھونکوں کا لطف اٹھاتے ہوئے ایک سایہ دار کنج میں جا بیٹھے۔ یہ ان کی مخصوص جگہ تھی۔ اس عنایتوں کی بستی میں آکر تھوڑی دیر کے لئے ان کے دل پر پھولوں کی شگفتگی اور پتوں کی شادابی کا بہت ہی پُرسرور اثر ہوتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے ان کا دل بھی پھول کی طرح شگفتہ ہو جاتا تھا۔ یہاں بیٹھے انہیں تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ انہیں ایک بوڑھا آدمی اپنی طرف آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے سامنے آکر سلام کیا اور ایک سربمہر لفافہ دے کر غائب ہو گیا۔ اکھے بابو نے لفافہ کھولا اور اس کی عنبر ریز مہک سے روح پھڑک اٹھی۔ خط کا مضمون یہ تھا:-

''میرے پیارے اکھے بابو! آپ اس ناچیز کے خط کو پڑھ کر بہت حیرت میں آئیں گے مگر مجھے امید ہے کہ آپ میری اس دلیری کو معاف کریں گے۔ آپ کے حسنِ اخلاق حسنِ مذاق اور حسنِ معاشرت کی تعریفیں سن سن کر میرے دل میں آپ کے لئے ایک محبت آمیز عقیدت پیدا ہو گئی ہے۔ آپ کی سادہ روش نے مجھے فریفتہ کر لیا ہے۔ اگر شرم و حیا دامن گیر نہ ہوتی تو میں اپنے جذبات کا زیادہ پرجوش الفاظ میں اظہار کرتی۔ سال بھر ہوا کہ میں نے عام مردوں کی کمزوریوں سے مایوس ہو کر یہ ارادہ قائم کر لیا تھا کہ بقیہ زندگی مسرتوں کا خواب دیکھنے میں کاٹوں گی۔ میں نے ڈھونڈا مگر جس دل کی تلاش تھی نہ ملا۔ لیکن جب سے میں نے آپ کو دیکھا ہے' مدتوں کی سوئی ہوئی آرزوئیں بیدار ہو گئی ہیں۔ آپ کے چہرے پر حسن اور شباب کی نہ سہی مگر تصور کی جھلک موجود ہے جس کی میری نگاہ میں زیادہ عزت ہے۔ حالانکہ میرا خیال ہے کہ اگر آپ کو اپنے اوصافِ ظاہری کی فکر ہوتی تو غالباً میرے وجود کا کمزور حصہ زیادہ خوش ہوتا۔ مگر میں حسن صورت کی بھوکی نہیں ہوں۔ مجھے ایک سچے' نمائش سے پاک سینے میں دل رکھنے والے انسان کی چاہ ہے اور میں نے اسے پا لیا ہے۔ میں نے ایک ہوشیار غواص کی طرح سمندر کی تہ میں بیٹھ کر اس رتن کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ میری آپ سے صرف یہ التجا ہے کہ آپ کل رات کو ڈاکٹر کچلو کے مکان پر تشریف لائیں۔ میں آپ کا بہت احسان مانوں گی۔ وہاں ایک سبز پوش عورت اشوکوں کے کنج میں آپ کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے بیٹھی نظر آئے گی۔''

اس خط کو اکھے کمار نے دوبارہ پڑھا۔ اس کا ان کے دل پر کیا اثر ہوا اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ رشی نہیں تھے حالانکہ ایسے نازک موقع پر رشیوں کا پھسل جانا بھی بعید از قیاس نہیں۔ انہیں ایک نشہ محسوس ہونے لگا۔ ضرور اس غیرت حور نے مجھے یہاں بیٹھے دیکھا ہو گا۔ میں نے آج کئی دن سے آئینہ بھی نہیں دیکھا۔ جانے چہرے کی کیا کیفیت ہو رہی ہے۔ اس خیال سے بے قرار ہو کر وہ دوڑے ہوئے ایک حوض پر گئے اور شفاف پانی میں

اپنی صورت دیکھی مگر تسکین نہ ہوئی۔ بہت تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے مکان کی طرف چلے اور جاتے ہی آئینے پر نگاہ دوڑائی۔ خط صاف نہیں ہے! اور صافا کم بخت خوبصورتی سے نہیں بندھا۔ تاہم مجھے کوئی بدصورت نہیں کہہ سکتا۔ یہ ضرور کوئی اعلیٰ درجے کی تعلیم یافتہ بلند خیال عورت ہے۔ ورنہ معمولی عورتوں کی نگاہ میں تو دولت اور حسن کے سوا اور کوئی چیز جچتی ہی نہیں۔ تاہم میرا یہ پھوہڑپن کسی خوش مذاق عورت کو اچھا نہیں معلوم ہو سکتا۔ مجھے اب اس کا زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔ آج میرے نصیب جاگے ہیں۔ بہت مدت کے بعد میرا ایک قدردان سچا جوہری نظر آیا ہے۔ ہندوستانی عورتیں شرم وحیا کی پتلی ہوتی ہیں۔ تاوقتیکہ اپنے دل کے اضطراب سے مجبور نہ ہو جائیں' وہ ایسا خط لکھنے کی جرات نہیں کر سکتیں۔

انہیں خیالوں میں بابو اکھے کمار نے رات کاٹی۔ پلک تک نہیں جھپکی۔

(4)

دوسرے دن صبح سے دس بجے تک بابو اکھے کمار نے شہر کی ساری فیشن ایبل دکانوں کی سیر کی۔ دکاندار حیرت میں تھے کہ آج بابو صاحب یہاں کیسے بھول پڑے۔ کبھی بھول کر بھی نہ جھانکتے تھے۔ یہ کایا پلٹ کیونکر ہوئی؟ غرض آج انہوں نے بڑی بے دردی سے روپیہ صرف کیا اور جب گھر چلے تو فٹن پر بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔

ہیموتی نے ان کے ماتھے پر سے پسینہ صاف کر کے پوچھا۔ "آج سویرے سے کہاں غائب ہو گئے؟" اکھے کمار نے چہرے کو ذرا متین بنا کر جواب دیا۔ "آج جگر میں کچھ درد تھا۔ ڈاکٹر چڈھا کے پاس چلا گیا تھا۔"

ہیموتی کے حسین ہنستے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سی آ گئی۔ بولی۔ "تم نے مجھ سے بالکل ذکر نہیں کیا۔ درد جگر خوفناک مرض ہے۔"

اکھے کمار۔ "ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کوئی اندیشے کی بات نہیں ہے۔"

ہیموتی۔ "اس کی دوا ڈاکٹر کچلو کے یہاں بہت مجرب ہے۔ معلوم نہیں ڈاکٹر چڈھا مرض کی تہ تک پہنچے یا نہیں۔"

اکھے کمار نے ہیموتی کی طرف ایک بار چبھتی ہوئی نگاہوں سے دیکھا اور کھانا کھانے لگے۔ بعد ازاں اپنے کمرے میں جا کر لیٹے۔ شام کو جب وہ پارک' گھنٹہ گھر' آنند باغ کی سیر کرتے ہوئے فٹن پر جا رہے تھے تو ان کے ہونٹوں پر سرخی اور گالوں پر شباب کی گلابی جھلک موجود تھی۔ تاہم قدرت کی بے انصافی پر جس نے انہیں دولت حسن سے محروم رکھا تھا' انہیں آج جتنا غصہ آیا شاید اور کبھی نہ آیا ہو۔ آج وہ پتلی سی ناک کے بدلے اپنا خوبصورت گاؤن اور ڈپلوما سب کچھ دینے پر آمادہ تھے۔

(5)

ڈاکٹر کچلو کا خوش وضع لتاؤں سے سجا ہوا بنگلہ رات کے وقت دن کا سماں دکھا رہا تھا۔ پھاٹک کے ستون' برآمدے کی محرابیں' سروؤں کی قطاریں سب برقی شمعوں سے جگمگا رہی تھیں۔ انسان کی برقی صنعت اپنا

بوقلموں کرشمہ دکھا رہی تھی۔ دروازے پر خیر مقدم کا مژدہ' درختوں پر طائر خوش رنگ' لتاؤں میں شگفتہ پھول' یہ سب اسی برقی روشنی کے جلوے ہیں۔ اس سہانی روشنی میں روٴساء شہر محو خرام ہیں۔ ابھی ناٹک شروع ہونے میں کچھ دیر ہے۔ مگر اشتیاق نے بے قرار طبیعتوں کو کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ ڈاکٹر چلو دروازے پر کھڑے مہمانوں کا استقبال کر رہے ہیں۔ آٹھ بجے ہوں گے کہ بابو اکھے کمار ایک شان رعنائی کے ساتھ اپنی فٹن سے اترے۔ ڈاکٹر صاحب چونک پڑے۔ یہ آج گولر میں کیسے پھول لگ گئے۔ انہوں نے بڑی گرم جوشی سے بابو صاحب سے مصافحہ کیا اور سر سے پاؤں تک انہیں غور سے دیکھا۔ انہیں کبھی خیال بھی نہ ہوا تھا کہ بابو اکھے کمار ایسے خوش وضع' جامہ زیب گبرو نوجوان بن سکتے ہیں۔ مسئلہ تناسخ کی بدیہی مثال آنکھوں کے سامنے کھڑی تھی۔

اکھے بابو کو دیکھتے ہی ادھر ادھر سے لوگ آکر ان کے گرد جمع ہو گئے۔ ہر شخص حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکتا تھا۔ ہونٹ رومال کی آڑ ڈھونڈنے لگے۔ آنکھیں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ ہر شخص نے غیر معمولی تپاک سے ان کی مزاج پرسی کی۔ میکشوں کی مجلس اور حضرت واعظ کی تشریف آوری کا نظارہ پیش ہو گیا۔

اکھے بابو بہت جھینپ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اوپر کو نہ اٹھتی تھیں۔ اس لئے جب مزاج پرسیوں کا طوفان دور ہوا تو انہوں نے اپنی سبز پوش نازنین کی تلاش میں چاروں طرف ایک وسیع نگاہ دوڑائی اور دل میں کہا۔ یہ شہدے ہیں' مسخرے' مگر ابھی ان کی آنکھیں کھلی جاتی ہیں۔ میں دکھادوں گا کہ مجھ پر بھی حسینوں کی نگاہیں پڑتی ہیں۔ ایسے حسین بھی ہیں جو صدق دل سے میرے مزاج کی کیفیت پوچھتے ہیں اور جن سے اپنا درد دل کہنے میں میں بھی رنگین بیان ہو سکتا ہوں مگر معشوق سبز پوش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ نگاہیں چاروں طرف سے گھوم گھام کر ناکام واپس آئیں۔

آدھ گھنٹہ کے بعد ناٹک شروع ہوا۔ بابو صاحب مایوسانہ انداز سے قدم اٹھاتے ہوئے تھیٹر ہال میں گئے اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ بیٹھ کیا گئے گر پڑے۔ پردہ اٹھا۔ شکنتلا اپنی دونوں سکھیوں کے ساتھ سر پر گھڑا رکھے پودوں کو سینچتی ہوئی دکھائی دی۔ ناظرین باغ باغ ہو گئے۔ نعرہٴ مرحبا بلند ہوا۔ شکنتلا کی جو خیالی تصویر کھنچ سکتی ہے وہ نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی معشوقانہ شگفتگی' وہی دلفریب متانت' وہی متوالی چال' وہی شرمیلی آنکھیں' اکھے بابو پہچان گئے۔ یہ حسین ہنس مکھ ہیموتی تھی۔

بابو اکھے کمار کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں ناٹک میں نہ جاؤں گی۔ میں نے گھنٹوں اسے سمجھایا۔ معذرت لکھنے پر تیار تھی۔ مگر محض دوسروں کو رجھانے اور لبھانے کے لئے۔ محض دوسروں کے دلوں میں اپنے حسن اور ادا کا جادو پھونکنے کے لئے۔ محض دوسری عورتوں کو جلانے کے لئے اس نے میری نصیحتوں کا اور اپنے وعدے کا حتی کہ میری ناراضی کا ذرا بھی خیال نہ کیا! ہیموتی نے بھی اڑتی ہوئی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے بانکپن پر اسے ذرا بھی تعجب نہ ہوا۔ کم از کم وہ مسکرائی نہیں۔

ساری محفل پر محویت کا عالم طاری تھا مگر اکھے کمار بابو کی طبیعت وہاں نہ جمتی تھی۔ وہ بار بار اٹھ کر باہر جاتے۔ ادھر ادھر اشتیاق سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ دیکھتے اور ہر بار جھنجھلا کر واپس آتے۔ یہاں تک کہ بارہ بج گئے۔ اور اب مایوس ہو کر انہوں نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کیا۔ میں بھی کیسا احمق ہوں۔ ایک شوخ عورت کے چکمے میں آ گیا۔ ضرور انہیں بدمعاشوں میں سے کسی کی شرارت ہو گی۔ یہ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کر کیسا ہنستے تھے۔ انہیں میں سے کسی مسخرے نے یہ شگوفہ چھوڑا ہے۔ افسوس! سیکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ خفیف ہوا وہ الگ۔ کئی مقدمے ہاتھ سے

گئے۔ ہیموتی کی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا۔ اور یہ سب محض حاسدوں کی خاطر! مجھ سے بڑا احمق اور کون ہو گا؟

اس طرح اپنے اوپر لعنت بھیجتے، غصے میں بھرے ہوئے وہ پھر محفل کی طرف چلے کہ یکایک ایک سرو کے درخت کے نیچے وہ سبز پوش حسینہ انہیں اشارے سے اپنی طرف بلاتی ہوئی نظر آئی۔ فرطِ مسرت سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھا گیا۔ مستانہ وار قدم اٹھاتے، جھومتے اور اینڈتے اس نازنین کے قریب آئے اور عاشقانہ جوش کے ساتھ بولے۔ "اے ملکہ حسن میں اس ذرہ نوازی کے لئے تمہارا تہ دل سے ممنون ہوں۔ اشتیاق دیدار میں اس عاشقِ نیم جاں کی آنکھیں پتھرا گئیں اور اگر تمہیں کچھ دیر تک اور یہ آنکھیں دیکھ نہ پاتیں تو تمہیں اپنے کشتۂ ناز کی لاش پر حسرت کے آنسو بہانے پڑتے۔ کل شام ہی سے میرے دل کی جو کیفیت ہو رہی ہے اس کا ذکر قوت بیان سے باہر ہے۔ جانِ من! میں کل کچہری نہ گیا۔ اور کئی مقدمے ہاتھ سے کھوئے۔ مگر تمہارے دیدار سے جو روحانی سرور حاصل ہو رہا ہے، اس پر میں اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ مجھے اب تاب صبر نہیں ہے۔ آتش اشتیاق نے ضبط اور صبر کو جلا کر خاک کر دیا ہے۔ تمہیں اپنے دیوانۂ حسن سے یہ پردہ داری زیبا نہیں۔ پروانہ اور شمع میں پردہ کیسا! اے کان زیبائی اور اے روح رعنائی! تیرے مہر انگیز کلمات نے میرے دل میں آرزوؤں کا طوفان برپا کر دیا ہے۔ اب یہ دل تمہارے اوپر صدقے اور یہ جان تمہارے قدموں پر نثار ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بابو اکھے کمار نے عاشقانہ جسارت سے آگے بڑھ کر اس سبز پوش نازنین کا گھونگٹ اٹھا دیا۔ اور ہیموتی کو مسکراتے دیکھ کر بے اختیار منہ سے نکلا۔ "ارے!" اور بس سکتہ ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوا۔ گویا آنکھوں کے سامنے سے پردہ ساہٹ گیا۔ بولے۔ "یہ سب تمہاری شرارت تھی؟"

حسین ہنس مکھ ہیموتی مسکرائی اور کچھ جواب دینا چاہتی تھی۔ مگر بابو اکھے کمار نے اس وقت زیادہ سوال و جواب کا موقع نہ دیکھا۔ بہت ندامت کے ساتھ بولے۔ "ہیموتی۔ اب منہ سے کچھ نہ کہو۔ تم جیتیں اور میں ہار گیا۔ یہ ہار کبھی نہ بھولے گی۔"

گناہ کا اگن کنڈ

(1)

کنور پرتھی سنگھ مہاراجہ جسونت سنگھ کے بیٹے تھے۔ زیور حسن و شجاعت سے آراستہ۔ ایران، مصر، شام، وغیرہ ملکوں میں سیر و سیاحت کی تھی۔ اور کئی زبانوں میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان کی ایک بہن تھی راج نندنی۔ حسن و ملاحت کی تصویر، شیریں زبان، خوش ادا اور بلند خیال، گناہ سے اسے خلقی نفرت تھی۔ یہاں تک کہ وہ بارہا مہاراجہ صاحب سے اخلاقی مسائل پر دلیلیں کر چکی تھی اور جب کبھی انہیں نظم و سیاست کے پردے میں کوئی غیر واجب کام کرتے دیکھتی تو اسے حتی الوسع روکنے کی کوشش کرتی۔ اس کی شادی کنور دھرم سنگھ سے ہوئی تھی جو ایک چھوٹی سی ریاست کے ولی عہد تھے اور جسونت سنگھ کی فوج میں ایک اعلیٰ عہدے پر مامور تھے۔ دھرم سنگھ بڑا شجاع

اور کار پرداز آدمی تھا۔ اسے ہونہار دیکھ کر مہاراجہ صاحب نے راج نندنی کو اس کے آغوش محبت میں سونپ دیا تھا اور یہ بڑے اخلاص سے رہتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے شیدا تھے۔ دھرم سنگھ زیادہ تر جودھ پور ہی میں رہتے۔ پرتھی سنگھ ان کے دلی دوست تھے۔ ایک جان دو قالب۔ ان میں وہ دوستی تھی جو برادرانہ تعلقات سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے رازدار اور ہمدرد۔ جس طرح ان دونوں راجکماروں میں یگانگی تھی' اس طرح دونوں راجکماریاں بھی ایک دوسرے پر جان دیتیں۔ پرتھی سنگھ کی بیوی درگا کنور بہت ہی نیک مزاج' متین اور درگزر کرنے والی عورت تھی۔ عام طور پر نند بھاوج میں چشمکیں رہا کرتی ہیں۔ مگر دونوں عورتیں ایک دوسرے کی عاشقِ زار تھیں اور دونوں سنسکرت علم ادب کی شیدا۔

ایک روز دونوں راجکماریاں باغیچے میں محو خرام تھیں کہ ایک کنیز نے راج نندنی کے ہاتھ میں ایک پرچہ لا کر رکھ دیا۔ راج نندنی نے کھولا تو وہ سنسکرت میں لکھا ہوا ایک رقعہ تھا۔ اسے پڑھ کر اس کنیز سے کہا کہ جا انہیں یہاں بھیج دے۔ ذرا دیر میں ایک عورت بوسیدہ کپڑے پہنے ہوئے آتے دکھائی دی۔ اس کا سن پچیس سال سے زائد نہ تھا۔ مگر رنگت زرد تھی۔ آنکھیں بڑی بڑی اور ہونٹ خشک۔ چال ڈھال میں نزاکت تھی اور خط و خال نہایت دلفریب۔ قیاس یہ کہتا تھا کہ گو اس وقت زمانے نے اس کی یہ حالت بنا رکھی ہے مگر کسی وقت وہ نہایت حسین عورت ہو گی۔ اس عورت نے آکر چوکھٹ چومی اور دعائیں دے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ راج نندنی نے اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ کر پوچھا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ اس نے جواب دیا۔ مجھے برج بلاسی کہتے ہیں۔

راج نندنی۔ "کہاں رہتی ہو؟"

برج بلاسی۔ "یہاں سے تین دن کے راستے پر ایک گاؤں وکرم نگر ہے۔ وہیں میرا مکان ہے۔"

راج نندنی۔ "سنسکرت کہاں پڑھی؟"

برج بلاسی۔ "میرے باپ سنسکرت کے بڑے پنڈت تھے۔ انہیں نے تھوڑا بہت پڑھا دیا۔"

راج نندنی۔ تمہارا بیاہ تو ہو گیا ہے نا؟"

بیاہ کا نام سنتے ہی برج بلاسی کی آنکھوں میں موتی جھڑنے لگے۔ آواز سنبھال کر بولی۔ "اس کا جواب میں پھر کبھی دوں گی۔ میری رام کہانی بڑی دردناک ہے۔ آپ لوگوں کو سن کر رنج ہو گا۔ اس وقت معاف رکھئے۔"

آج سے برج بلاسی یہاں رہنے لگی۔ سنسکرت ادب میں اسے بڑی رسائی تھی اور شعرا کے کلام کی دلدادہ۔ وہ ہر روز دونوں راجکماریوں کو نظم و نثر کے کلام پڑھ کر سناتی۔ اس کے حسن مذاق اور وسیع علمیت نے رفتہ رفتہ راجکماریوں کے دل میں اس کی محبت اور عزت پیدا کر دی۔ یہاں تک کہ پاس اور رتبے کی تمیز اٹھ گئی اور برج بلاسی سہیلیوں کی طرح بے تکلف رہنے لگی۔

(2)

کئی مہینے گزر گئے۔ کنور پرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ دونوں مہاراجہ صاحب کے ساتھ افغانستان کی مہم پر گئے ہوئے تھے۔ جدائی کی یہ گھڑیاں یہاں میگھ دوت اور رگھوبنس کے مطالعہ میں کٹتیں۔ برج بلاسی کو کالیداس کے کلام سے بہت رغبت تھی اور وہ اس کی توضیح ایسی خوبی سے کرتی اور اس میں ایسے ایسے نکتے نکالتی کہ دونوں راجکماریاں

کرنے لگتیں۔ ایک روز شام کا وقت تھا۔ دونوں راجکماریاں پائیں باغ کی سیر کرنے لگیں تو دیکھا برج بلاسی ہری ہری گھاس پر لیٹی ہوئی ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ راج کماریوں کے حسن سلوک خاطر و مدارات اور بے تکلفانہ برتاؤ نے اس کا حسن بہت کچھ چمکا دیا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ خود بھی راج کماری معلوم ہوتی۔ مگر ان دلجوئیوں کے باوجود یہ غریب عورت اکثر تنہائی میں بیٹھ کر رویا کرتی۔ اس کے دل پر ایک ایسا صدمہ تھا جو اسے دم بھر بھی چین سے نہ بیٹھنے دیتا۔ راج کماریوں نے اس وقت اسے روتے دیکھا تو کمال ہمدردی سے اس کے پاس بیٹھ گئیں۔ راج نندنی نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے گلاب سے رخساروں کو تھپک کر بولی۔ سکھی! تم اپنے دل کا حال ہم کو نہ بتاؤ گی۔ کیا اب بھی ہم غیر ہیں۔ تمہارا یوں اکیلے اکیلے غم کی آگ میں جلنا ہم سے نہیں دیکھا جاتا۔"

برج بلاسی۔ (کچھ آواز سنبھال کر بولی) "بہن میں ابھاگن ہوں۔ میرا حال مت سنو۔"

راج نندنی۔ "اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟"

برج بلاسی۔ "کیا؟ کہو۔"

راج نندنی۔ "وہی جو میں نے پہلے دن پوچھا تھا۔ تمہارا بیاہ ہوا ہے کہ نہیں؟"

برج بلاسی۔ "اس کا جواب میں کیا دوں۔ ابھی نہیں ہوا۔"

راج نندنی۔ کیا کسی کے پریم کی برچھی جگر میں چبھی ہوئی ہے؟"

برج بلاسی۔ "نہیں بہن ایشور جانتا ہے۔"

راج نندنی۔ "تو اتنی اداس کیوں رہتی ہو۔ کیا محبت کا مزہ اٹھانے کو جی چاہتا ہے؟"

برج بلاسی۔ "نہیں۔ غم کے سوا دل میں محبت کی جگہ نہیں ہے۔"

راج نندنی۔ "ہم محبت کی جگہ پیدا کر دیں گے۔"

برج بلاسی کنایہ سمجھ گئی۔ بولی۔ "بہن ان باتوں کا چرچا مت کرو۔"

راج نندنی۔ "میں اب تمہارا بیاہ رچاؤں گی۔ دیوان جے چند کو تم نے دیکھا ہے؟"

برج بلاسی آب دیدہ ہو کر بولی:

"راج کماری! میں برت دھارنی ہوں اور اپنے برت کا پورا کرنا ہی میری زندگی کا خاص مقصد ہے۔ اسی عہد کو پورا کرنے کے لیے جیتی ہوں۔ ورنہ میں نے ایسی ایسی آفتیں جھیلی ہیں کہ جینے کی آرزو دل میں باقی نہیں رہی۔ میرے باپ وکرم نگر کے جاگیردار تھے۔ میرے سوا ان کے کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ مجھے جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ میری ہی خاطر انہوں نے برسوں تک سنسکرت ودیا سیکھی تھی۔ فنون سپہ گری میں بڑے ماہر۔ کئی بار لڑائیوں میں شریک ہوئے تھے۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ گائیں مرغزار سے لوٹ رہی تھیں۔ میں اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ اتنے میں ایک شخص بانکی پگیا باندھے 'بدن پر ہتھیار لگائے 'نشہ جوانمردی سے جھومتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ میری پیاری گائے موہنی اسی وقت چراگاہ سے لوٹی تھی اور اس کا بچہ ادھر ادھر کلیلیں کر رہا تھا۔ اتفاق سے بچہ اس نوجوان کے پاؤں تلے دب گیا۔ گائے اس آدمی پر جھپٹی۔ راجپوت بڑا دلیر تھا۔ اس نے شاید خیال کیا کہ بھاگتا ہوں تو کلنک کا ٹیکا لگتا ہے۔ فوراً تلوار میان سے کھینچ لی۔ اور گائے پر حملہ کر بیٹھا۔ گائے جھلائی ہوئی تھی۔ مطلق نہ ڈری۔ میری آنکھوں کے سامنے راجپوت نے اس پیاری گائے کو جان سے مار ڈالا۔ دیکھتے دیکھتے صدہا آدمی جمع ہو گئے اور اس شخص کو سخت سست کہنے لگے۔ اتنے میں پتا جی بھی آ گئے۔ وہ سندھیا کرنے گئے ہوئے تھے۔ دروازے پر آ کر دیکھا تو صدہا آدمیوں کا مجمع ہے۔

گائے تڑپ رہی ہے اور اس کا بچہ کھڑا رو رہا ہے۔ پتاجی کی آواز سنتے ہی گائے نے بڑی پر درد آواز سے کراہا اور ان کی طرف کچھ ایسی دردناک نگاہوں سے دیکھا کہ پتاجی کو طیش آ گیا۔ میرے بعد انہیں یہ گائے ہی پیاری تھی۔ للکار کر بولے۔ "میری گائے کس نے ماری ہے؟" نوجوان شرم سے سر جھکائے سامنے آیا اور بولا۔ "میں نے۔"

پتاجی۔ "تم چھتری ہو۔"

راجپوت۔ "ہاں۔"

پتاجی۔ "تو کسی چھتری سے ہاتھ ملاتے۔"

راجپوت کا چہرہ تمتما گیا۔ بولا! "کوئی چھتری سامنے آ جائے۔"

ہزاروں آدمی کھڑے تھے۔ مگر کسی کی ہمت نہ پڑی کہ اس راجپوت کا سامنا کرے۔ یہ دیکھ کر پتاجی نے تلوار کھینچ لی۔ اور اس پر ٹوٹ پڑے۔ اس نے بھی تیغہ نکال لیا۔ اور دونوں آدمیوں میں تیغے چلنے لگے۔ پتاجی بوڑھے تھے۔ سینے پر زخم کاری لگا۔ گر پڑے۔ انہیں اٹھا کر لوگ گھر میں لائے۔ ان کا چہرہ زرد تھا۔ مگر آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ میں روتی ہوئی ان کے سامنے آئی۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے سب آدمیوں کو وہاں سے ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ جب میں اور وہ تنہا رہ گئے۔ تو پتاجی بولے۔ "بیٹی! تم راجپوتنی ہو؟"

میں۔ "جی ہاں۔"

پتاجی۔ "راجپوت بات کے دھنی ہوتے ہیں۔"

میں۔ "جی ہاں۔"

پتاجی۔ "اس راجپوت نے میری گائے کی جان لی ہے۔ اس کا بدلہ تمہیں لینا ہو گا۔"

میں۔ "میں آپ کا حکم بجا لاؤں گی۔"

پتاجی۔ "اگر آج میرا کوئی بیٹا ہوتا تو میں یہ بوجھ تمہاری گردن پر نہ رکھتا۔"

میں۔ "آپ کا جو کچھ ارشاد ہو گا' میں بسروچشم بجا لاؤں گی۔"

پتاجی۔ "تم عہد کرتی ہو؟"

میں۔ "جی ہاں۔"

پتاجی۔ "اس عہد کو پورا کر دکھاؤ گی؟"

میں۔ "جہاں تک میرا بس چلے گا۔ میں ضرور یہ عہد پورا کروں گی۔"

پتاجی۔ "یہ میرا تیغہ لو۔ جب تک تم یہ تیغہ اس راجپوت کے کلیجے میں نہ پیوست کر لینا' اپنے اوپر عیش و آرام حرام سمجھنا۔"

یہ کہتے کہتے پتاجی کی جان نکل گئی۔ میں نے اسی دن سے جوگن کا بھیس بدل لیا۔ اور اس تیغہ کو پہلو میں چھپائے اس راجپوت نوجوان کی تلاش میں گھومنے لگی۔ برسوں گزر گئے میں کبھی بستیوں میں جاتی۔ کبھی کوہ و بیابان کی خاک چھانتی۔ مگر اس نوجوان کا سراغ نہ ملتا۔ ایک روز میں ایک سنسان جگہ میں بیٹھی ہوئی اپنی حسرت نصیبوں پر رو رہی تھی کہ وہی نوجوان شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

میں۔ "میں ایک دکھیاری برہمنی ہوں۔ آپ مجھ پر دیا کیجئے اور مجھے کچھ کھانے کو دیجئے۔"

راجپوت۔ "اچھا میرے ساتھ آ۔"

میں اٹھ کھڑی ہوئی وہ شخص بے خبر تھا۔ میں نے بجلی کی طرح چمک کر پہلو سے تیغہ نکالا اور اس کے سینے میں بھونک دیا۔ اتنے میں کئی آدمی آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ میں اتنی خوف زدہ ہوئی کہ تیغہ چھوڑ کر بھاگی۔ تین سال تک پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپی رہی۔ بار بار جی میں آیا کہ کہیں ڈوب مروں مگر جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔ نہ جانے کیا کیا ذلت وخواری جھیلنی بدی ہوئی ہے کہ اب تک زندہ ہوں۔ آخر جب بہائم کی طرح جنگل میں رہتے رہتے جی اکتا گیا تو جودھ پور چلی آئی۔ یہاں آپ لوگوں کی غربا پروری کا شہرہ سنا۔ آپ کی سیوا میں آ پہنچی اور تب سے آپ کی شفقتوں کی بدولت آرام سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ یہ میری مختصر رام کہانی ہے۔

راج نندنی نے لمبی سانس لے کر کہا۔ ''افوہ! دنیا میں کیسے کیسے لوگ پڑے ہوئے ہیں۔ خیر تمہارے تیغے نے اس کا کام تمام کر دیا۔''

برج بلاسی۔ ''کہاں بہن! وہ بچ گیا۔ زخم اوچھا پڑا تھا۔ اسی شکل کا ایک نوجوان راجپوت میں نے جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ نہیں معلوم وہی تھا یا اور کوئی؟ شکل بالکل ملتی تھی۔''

(3)

کئی مہینے گزر گئے۔ راج کماریوں نے جب سے برج بلاسی کی سرگزشت سنی تھی اس کے ساتھ اور بھی محبت اور ہمدردی کا برتاؤ کرنے لگی تھیں۔ پہلے بے تکلفی میں کبھی کبھی چھیڑ چھاڑ ہو جاتی مگر اب دونوں ہر دم اس کی دلجوئی کیا کرتیں۔ ایک روز بادل گھرا ہوا تھا۔ راج نندنی نے کہا۔ آج بہاری لال کی ست سئی سننے کو جی چاہتا ہے۔ برکھارت پر اس میں بہت عمدہ دوہے ہیں۔

درگا کنور۔ ''بڑی انمول کتاب ہے سہیلی! تمہاری بغل میں جو الماری رکھی ہوئی ہے۔ اس میں وہ کتاب ہے ذرا نکالنا۔''

برج بلاسی نے کتاب نکالی اور اس کا پہلا ہی ورق کھولا تو اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے سر ورق پر ایک تصویر زیب دے رہی تھی۔ یہ اسی ظالم کی تصویر تھی جو اس کے باپ کا قاتل تھا۔ برج بلاسی کی آنکھیں شعلہ بار ہو گئیں۔ تیوری پر بل پڑ گئے۔ اپنا عہد یاد آ گیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ اس شخص کی تصویر یہاں کیسے آئی اور اسے ان راجکماریوں سے کیا تعلق ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے زیر بارِ احسان ہو کر اپنا عہد توڑنا پڑے۔ راج نندنی نے اس کی صورت دیکھ کر کہا۔ ''سکھی کیا بات ہے۔ یہ غصہ کیوں؟'' برج بلاسی نے آہستہ سے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ نہ جانے چکر کیوں آ گیا تھا۔''

آج سے برج بلاسی کے دل میں ایک اَور فکر جاگزیں ہوئی۔
کیا مجھے زیر بارِ احسان ہو کر اپنا عہد توڑنا پڑے گا۔

(4)

پورے سولہ مہینے کے بعد افغانستان سے پرتھی سنگھ اور دھرم سنگھ لوٹے۔ شاہی مہم کو بڑی بڑی دقتوں کا

سامنا کرنا پڑا۔ برف کثرت سے پڑنے لگی۔ پہاڑوں کے درے برف سے ڈھک گئے۔ آمد ورفت کے راستے بند ہو گئے۔ رسد کے سامان کمیاب ہونے لگے۔ سپاہی بھوکوں مرنے لگے۔ تب افغانوں نے موقع پا کر شب خون مارنے شروع کئے۔ آخر شہزادہ محی الدین کو ناکام اور پسپا ہو کر واپس آنا پڑا۔

دونوں راج کمار جوں جوں جودھ پور کے نزدیک پہنچتے تھے ان کے دل شوق سے امڈے آتے تھے۔ اتنے دنوں کی جدائی کے بعد پھر وصال نصیب ہو گا۔ شوق دیدار قدم بڑھائے جاتا ہے۔ رات دن منزلیں طے کرتے چلے آتے ہیں۔ نہ تھکن معلوم ہوتی ہے نہ ماندگی۔ دونوں نے زخم کھائے ہیں مگر پھر ملنے کی خوشی میں زخم کی تکلیف بالکل محسوس نہیں ہوتی۔ پرتھی سنگھ درگا کنور کے لئے ایک اصفہانی تیغہ لائے ہیں۔ دھرم سنگھ نے راج نندنی کے لئے کشمیر کی ایک بیش بہا شال مول لی ہے۔ دونوں کے دل امنگ سے بھرے ہوئے ہیں۔

راجکماریوں نے جب سنا کہ دونوں ہیر واپس آتے ہیں تو نشہ مسرت سے متوالی ہو گئیں۔ سنگار کیا جانے لگا۔ مانگ موتیوں سے بھری جانے لگی۔ ان کے چہرے فرط مسرت سے گلنار ہوئے جاتے تھے۔ اتنے دنوں کی جدائی کے بعد پھر ملاپ ہو گا۔ خوشی آنکھوں سے ابلی پڑتی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چھیڑتی ہیں اور خوش ہو ہو کر گلے ملتی ہیں۔

اگھن کا مہینہ تھا۔ برگد کی ڈالیوں میں مونگے کے خوشے لگے ہوئے تھے۔ جودھ کے قلعے سے سلامیوں کی گھن گرج صدائیں آنے لگیں۔ سارے شہر میں شور مچ گیا کہ کنور پرتھی سنگھ بخیر و عافیت افغانستان سے واپس آئے۔ دونوں راجکماریاں تھالوں میں آرتی کے سامان لئے دروازے پر کھڑی تھیں۔ پرتھی سنگھ درباریوں کے سلام لیتے ہوئے محل میں آئے۔ درگاہ کنور نے آرتی اتاری اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ کنور دھرم سنگھ بھی جوش شجاعت سے اینڈتے ہوئے اپنے محل میں داخل ہوئے مگر اندر قدم بھی نہ رکھنے پائے تھے کہ چھینک کی آواز سنائی دی اور داہنی آنکھ پھڑکنے لگی۔ راج نندنی آرتی کا تھال لے کر لپکی مگر پاؤں پھسل گیا اور تھال ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ دھرم سنگھ کا ماتھا ٹھنکا اور راج نندنی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ یہ بدشگونی کیوں؟

(5)

برج بلاسی نے دونوں راج کماروں کے آنے کی خبر پا کر ان دونوں کی شان میں دو پُر درد قصیدے کہہ رکھے تھے۔ صبح کو جب کنور پرتھی سنگھ سندھیا سے فارغ ہو کر بیٹھے تو وہ ان کے سامنے آئی اور ایک خوبصورت کُش کی طشتری میں قصیدہ رکھ کر پیش کیا۔ پرتھی سنگھ نے دست شوق بڑھا کر قصیدہ لے لیا۔ شاعری گو اعلیٰ پائے کی نہ تھی مگر کلام میں تازگی اور جدت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ پرتھی سنگھ نے نفیس شاعرانہ مذاق پایا تھا۔ اس قصیدے کو پڑھ کر بہت محظوظ ہوئے اور ایک موتیوں کا ہار انعام دیا۔

برج بلاسی یہاں سے فرصت پا کر کنور دھرم سنگھ کے پاس پہنچی۔ وہ بیٹھے ہوئے راج نندنی سے میدان جنگ کے واقعات بیان کر رہے تھے۔ مگر جوں ہی برج بلاسی کی نگاہ ان پر پڑی' وہ بے اختیار جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔ کنور دھرم سنگھ نے بھی اسے دیکھا اور چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ ہونٹ خشک ہو گئے اور ہاتھ پاؤں میں رعشہ سا آ گیا۔ برج بلاسی تو الٹے قدم واپس ہوئی اور دھرم سنگھ نے چارپائی پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔ راج

نندنی نے یہ کیفیت دیکھی اور اس کا پھول سا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔
دھرم سنگھ سارے دن، پلنگ پر خاموش پڑے کروٹیں بدلتے رہے۔ چہرہ ایسا کملا گیا جیسے برسوں کا مریض۔ راج نندنی ان کی دلجوئی میں مصروف تھی۔ دن تو یوں کٹا۔ رات کو کنور صاحب سر شام ہی سے تھکن کا بہانہ کر کے لیٹ گئے۔ راج نندنی حیران تھی کہ ماجرا کیا ہے۔ کیا برج بلاسی انہیں کے خون کی پیاسی ہے۔ کیا ممکن ہے کہ میرا پیارا' میرا عالی دماغ دھرم سنگھ ایسا سنگ دل ہو۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر چند چاہتی ہے کہ اپنی خوش ادائیوں سے ان کے دل کا بوجھ ہلکا کرے مگر ناکام رہتی ہے۔ آخر اسے بھی نیند نے اپنے آغوش میں لے لیا۔
رات زیادہ آگئی تھی۔ آسمان نے تاریکی کی چادر منہ پر لپیٹ لی تھی۔ سارس کی دردناک آواز کبھی کبھی سنائی دے جاتی تھی۔ اور رہ رہ کر قلعے کے سنتریوں کی آواز کان میں آپڑتی تھی۔ راج نندنی کی آنکھ یکایک کھلی تو دھرم سنگھ کو پلنگ پر نہ پایا۔ اندیشہ ہوا۔ تیزی سے اٹھ کر برج بلاسی کے کمرے کی طرف چلی اور دروازے پر کھڑی ہو کر اندر جھانکا۔ شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ کیا دیکھتی ہے کہ برج بلاسی ہاتھ میں تیغہ لئے کھڑی ہے اور دھرم سنگھ دونوں ہاتھ جوڑے اس کے سامنے بیکسوں کی طرح گھٹنے ٹیکے بیٹھے ہیں۔
یہ نظارہ دیکھتے ہی راج نندنی کا خون خشک ہو گیا اور سر میں چکر سا آنے لگا۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ معلوم ہوا کہ گری جاتی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں آئی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا قطرہ بھی نہ نکلا۔

(6)

دوسرے دن پرتھی سنگھ علی الصبح کنور دھرم سنگھ کے پاس گئے اور مسکرا کر کہا۔ "بھیا! موسم بڑا سہانا ہے۔ شکار کھیلنے چلتے ہو۔"
دھرم سنگھ کسی گہرے خیال میں غرق تھے۔ سر اوپر اٹھایا۔ تو چہرہ اداس تھا۔ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ بولے۔
"کیا کہا؟"
پرتھی سنگھ۔ "شکار کھیلنے چلتے ہو؟"
دھرم سنگھ۔ "ہاں چلو۔"
دونوں طرف راجکماروں نے گھوڑے کسوائے اور شکار گاہ کی طرف چل دیئے۔
پرتھی سنگھ کا چہرہ شگفتہ تھا۔ جیسے کنول کا پھول کھلا ہو۔ ایک ایک حرکت سے تیزی اور چستی ٹپکی پڑتی تھی۔ مگر کنور دھرم سنگھ کے چہرے پر زردی چھائی ہوئی تھی۔ گویا بدن میں جان نہیں ہے۔ پرتھی سنگھ نے انہیں کئی مرتبہ چھیڑا۔ مگر دیکھا کہ یہ بہت زیادہ دل گرفتہ ہیں۔ تو خاموش ہو گئے۔ چلتے چلتے دونوں ایک جھیل کے کنارے پہنچ گئے۔ یکایک دھرم سنگھ ٹھٹک گئے۔ اور بولے۔ "میں نے آج رات کو ایک سخت عہد کیا ہے۔" یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ پرتھی سنگھ نے پھر کر پوچھا۔
"کیسا عہد؟"
دھرم سنگھ۔ "تم نے برج بلاسی کی سرگزشت سنی ہے؟"

پرتھی سنگھ۔ ''ہاں۔''
دھرم سنگھ۔ ''میں نے عہد کیا ہے کہ جس شخص نے اس کے باپ کا خون کیا ہے۔ اسے بھی جہنم میں پہنچادوں۔''
پرتھی سنگھ۔ ''تم نے واقعی بڑا دلیرانہ عہد کیا ہے۔''
دھرم سنگھ۔ ''ہاں بشرطیکہ پورا کر سکوں۔ کیوں تمہارے خیال میں ایسا شخص گردن زدنی ہے یا نہیں؟''
پرتھی سنگھ۔ ''ایسے موذی کی گردن کند چھری سے کاٹنی چاہیے۔''
دھرم سنگھ۔ ''بے شک یہی میرا بھی خیال ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے یہ کام نہ انجام دے سکوں تو تم میرا عہد پورا کر دو گے؟''
پرتھی سنگھ۔ ''بڑے شوق سے۔ تم اسے پہچانتے ہو نا؟''
دھرم سنگھ۔ ''ہاں اچھی طرح۔''
پرتھی سنگھ۔ ''تو بہتر ہوگا کہ یہ کار خیر مجھی کو کرنے دو۔ تمہیں شاید اس پر رحم آجائے۔''
دھرم سنگھ۔ ''بہت خوب۔ مگر یاد رکھو۔ وہ شخص بڑا خوش نصیب ہے۔ کئی بار موت کے منہ سے بچ نکلا ہے۔ کیا عجب ہے کہ تم بھی نرم ہو جاؤ۔ اس لیے تم بھی عہد کرو کہ اسے ضرور واصل جہنم کرو گے۔''
پرتھی سنگھ۔ ''میں درگا کی قسم کھاتا ہوں کہ اس شخص کے خون سے اپنے تیغے کے پیاس بجھاؤں گا۔''
دھرم سنگھ۔ ''بس ہم دونوں مل کر یہ مہم سر کر لیں گے۔ تم اپنے عہد پر قائم رہو گے نا؟''
پرتھی سنگھ۔ ''کیوں؟ میں سپاہی نہیں ہوں۔ ایک دفعہ جو عہد کیا۔ بس سمجھ لو کہ وہ پورا ہو کر رہے گا۔ چاہے اس میں اپنی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔''
دھرم سنگھ۔ ''ہر حالت میں؟''
پرتھی سنگھ۔ ''ہاں ہر حالت میں۔''
دھرم سنگھ۔ ''اگر وہ تمہارا کوئی عزیز ہو تو؟''
پرتھی سنگھ۔ (دھرم سنگھ کو ٹٹولتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر) ''کوئی عزیز ہو تو!''
دھرم سنگھ۔ ''ہاں ممکن ہے کہ وہ تمہارا کوئی رشتہ دار ہو۔''
پرتھی سنگھ۔ (جوش سے) ''کوئی ہو۔ اگر میرا بھائی بھی ہو۔ تو زندہ چنوا دوں۔''
دھرم سنگھ گھوڑے سے اتر پڑے۔ ان کا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ اور ہونٹ کانپ رہے تھے۔ انہوں نے کمر سے تیغہ کھول کر زمین پر رکھ دیا۔ اور پرتھی سنگھ کو للکار کر بولے۔ ''پرتھی سنگھ تیار ہو جاؤ۔ وہ موذی مل گیا۔'' پرتھی سنگھ نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ مگر دھرم سنگھ کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیا۔
دھرم سنگھ۔ ''تیغہ کھینچو۔''
پرتھی سنگھ۔ ''میں نے اسے نہیں دیکھا۔''
دھرم سنگھ۔ ''وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ وہ سیہ کار موذی دھرم سنگھ ہی ہے۔''
پرتھی سنگھ۔ ''(گھبرا کر) ''ایں! یہ سنگ دلی!''
دھرم سنگھ۔ ''راجپوت! اپنا عہد پورا کر۔''
اتنا سنتے ہی پرتھی سنگھ نے بجلی کی طرح کمر سے تیغہ کھینچ لیا اور اسے دھرم سنگھ کے سینے میں چبھو دیا۔ تیغہ

دستے تک چبھ گیا۔ خون کا فوارہ بہہ نکلا۔ دھرم سنگھ زمین پر گر پڑے اور آہستہ سے بولے۔ ''پرتھی سنگھ! میں تمہارا بہت ممنون ہوں۔ تم سچے بیر ہو۔ تم نے مرد کا فرض مرد کی طرح پورا کیا۔''
پرتھی سنگھ نے یہ سنا اور زمین پر بیٹھ کر رونے لگے۔

(7)

آج راج نندنی ستی ہونے جا رہی ہے۔ اس نے سولہ سنگار کیے ہیں اور مانگ موتیوں سے بھروائی ہے۔ کلائی میں بیاہ کا کنگن باندھا ہے۔ پاؤں میں سرخ مہندی رچائی ہے۔ اور گلناری جوڑا زیب تن کیا ہے۔ اس کے بدن سے خوشبو آ رہی ہے کیونکہ آج وہ ستی ہونے جاتی ہے۔

راج نندنی کا چہرہ ماہِ کامل کی طرح روشن ہے۔ اس کی طرف دیکھتے ہی آنکھیں جھپک جاتی ہیں۔ نشہ محبت سے اس کا رویاں رویاں مست ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں سے روحانی نور برس رہا ہے۔ وہ آج آسمان کی دیوی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی چال کیسی مستانہ ہے۔ نشہ محبت میں جھوم رہی ہے۔ وہ اپنے پیارے پتی کا سر گود میں لئے ہوئے آتی ہے اور اس چتا میں بیٹھ جاتی ہے جو صندل، خس اور عود سے بنائی گئی تھی۔

سارے شہر کے لوگ یہ نظارہ دیکھنے کے لیے امڈے چلے آتے ہیں۔ باجے بج رہے ہیں۔ پھولوں کی برکھا ہو رہی ہے۔ ستی چتا میں بیٹھ چکی تھی کہ اتنے میں کنور پرتھی سنگھ آئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''مہارانی میرا قصور معاف کرو۔''

ستی نے جواب دیا۔ ''معاف نہیں ہو سکتا۔ تم نے ایک نوجوان راجپوت کی جان لی ہے۔ تم بھی جوانی میں قتل کیے جاؤ گے۔'' ستی کے بچن کبھی جھوٹے ہوئے ہیں۔ یکا یک چتا میں آگ کا شعلہ نمودار ہوا۔ جے جے کار کے نعرے بلند ہوئے۔ آگ میں اس کا چہرہ یوں چمکتا تھا جیسے افق کی سرخی میں آفتاب چمکتا ہے۔ ذرا دیر میں وہاں ایک تودۂ خاک کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

اس ستی کے مزاج میں کیسا ست تھا۔ پرسوں جب اس نے برج بلاسی کو جھجک کر دھرم سنگھ کے سامنے جاتے دیکھا تھا۔ اسی وقت اس کے دل میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جب رات کو اس نے دیکھا کہ میرا شوہر اس عورت کے سامنے بے کسوں کی طرح بیٹھا ہوا ہے تو شک یقین کے درجے تک پہنچ گیا۔ اور یہ یقین ست کا جذبہ اپنے ساتھ لیتا آیا۔ سویرے جب دھرم سنگھ اٹھے تو راج نندنی نے کہا کہ میں برج بلاسی کے دشمن کا سر چاہتی ہوں۔ تمہیں لانا ہوگا۔

دھرم سنگھ نے کہا کہ شام تک تمہارے سامنے وہ سر آ جائے گا۔ اور ایسا ہی ہوا۔ اپنے ستی ہونے کے سب اسباب راج نندنی نے خود بخود جان بوجھ کر پیدا کیے۔ کیونکہ اس کے مزاج میں ست تھا۔

کیسا اعلیٰ اخلاقی معیار ہے اور کتنی عبرتناک داستان! گناہ کی آگ کیسی تیز اور اس کی لپٹ کیسی جان سوز ہوتی ہے۔ ایک گناہ نے کتنی جانیں جلا ڈالیں۔ شاہی خاندان کے دو راج کنور اور شاہی خاندان کی دو کنواریاں دیکھتے دیکھتے اس اگن کنڈ کی نذر ہو گئیں۔ کیونکہ ستی کا بچن ست ہوا۔ اور ساتھ ہی ہفتے کے اندر پرتھی سنگھ بھی دہلی میں قتل کیے گئے اور دُرگا کنور نے اپنے تئیں ان پر قربان کر دیا۔

بے غرض محسن

(1)

ساون کا مہینہ تھا۔ ریوتی رانی نے پاؤں میں مہندی رچائی۔ مانگ چوٹی سنواری۔ اور تب اپنی بوڑھی ساس سے جا کر بولی۔ ''اماں جی! آج میں میلہ دیکھنے جاؤں گی۔''

ریوتی پنڈت چنتا من کی بیوی تھی۔ پنڈت جی نے سرسوتی کی پوجا میں زیادہ نفع نہ دیکھ کر لکشمی دیوی کی مجاوری کرنی شروع کی تھی۔ لین دین کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر اور مہاجنوں کے خلاف خاص خاص حالتوں کے سوا 25 فیصدی سے زیادہ سود لینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔

ریوتی کی ساس ایک بچے کو گود میں لئے کھٹولے پر بیٹھی تھیں۔ بہو کی بات سن کر بولیں۔ ''بھیگ جاؤ گی تو بچے کو زکام ہو جائے گا۔''

ریوتی۔ ''نہیں اماں مجھے دیر نہ لگے گی۔ ابھی چلی آؤں گی۔''

ریوتی کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکا دوسری لڑکی۔ لڑکی ابھی گود میں تھی۔ اور لڑکا ہیرامن ساتویں سال میں تھا۔ ریوتی نے اسے اچھے اچھے کپڑے پہنائے۔ نظر بد سے بچانے کے لیے ماتھے اور گالوں پر کاجل کے ٹیکے لگا دیئے۔ گڑیاں پیٹنے کے لیے ایک خوش رنگ چھڑی دے دی اور اپنی ہمجولیوں کے ساتھ میلہ دیکھنے چلی۔

کیرت ساگر کے کنارے عورتوں کا بڑا جمگھٹ تھا۔ نیلگوں گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ عورتیں سولہ سنگار کیے ساگر کے پُر فضا میدان میں ساون کی رم جھم برکھا کی بہار لوٹ رہی تھیں۔ شاخوں میں جھولے پڑے تھے۔ کوئی جھولا جھولتی۔ کوئی ملہار گاتی۔ کوئی ساگر کے کنارے بیٹھی لہروں سے کھیلتی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی خوش گوار ہوا' پانی کی ہلکی ہلکی پھوار' پہاڑیوں کی نکھری ہوئی ہریاول' لہروں کے دل فریب جھکولے موسم کو توبہ شکن بنائے ہوئے تھے۔

آج گڑیوں کی بدائی ہے۔ گڑیاں اپنے سسرال جائیں گی۔ کنواری لڑکیاں ہاتھ پاؤں میں مہندی رچائے' گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجائے انہیں بدا کرنے آئی ہیں۔ انہیں پانی میں بہاتی ہیں اور چہک چہک کر ساون کے گیت گاتی ہیں۔ مگر دامن عافیت سے نکلتے ہی ان ناز و نعمت میں پلی ہوئی گڑیوں پر چاروں طرف سے چھڑیوں اور لکڑیوں کی بوچھاڑ ہونے لگتی ہے۔

ریوتی یہ سیر دیکھ رہی تھی۔ اور ہیرامن ساگر کے زینوں پر اور لڑکیوں کے ساتھ گڑیاں پیٹنے میں مصروف تھا۔ زینوں پر کائی لگی ہوئی تھی۔ دفعتاً اس کا پاؤں پھسلا تو پانی میں جا پڑا۔ ریوتی چیخ مار کر دوڑی اور سر پیٹنے لگی۔ دم کے دم میں وہاں مردوں اور عورتوں کا ایک ہجوم ہو گیا۔ مگر یہ کسی کی انسانیت تقاضا نہ کرتی تھی کہ پانی میں جا کر ممکن ہو تو بچے کی جان بچائے۔ سنوارے ہوئے گیسو نہ بکھر جائیں گے! دھلی ہوئی دھوتی نہ بھیگ جائے گی! کتنے ہی مردوں کے دلوں میں یہ مردانہ خیالات آ رہے تھے۔ دس منٹ گزر گئے۔ مگر کوئی شخص کمرہمت باندھتا نظر نہ آیا۔ غریب ریوتی پچھاڑیں کھا رہی تھی۔ ناگاہ ایک آدمی اپنے گھوڑے پر سوار چلا جاتا تھا۔ یہ ازدحام دیکھ کر اتر پڑا۔ اور ایک تماشائی سے پوچھا۔ ''یہ کیسی بھیڑ ہے؟'' تماشائی نے جواب دیا۔ ''ایک لڑکا ڈوب گیا ہے۔''

مسافر "کہاں؟"

تماشائی۔ "جہاں وہ عورت کھڑی رو رہی ہے۔"

مسافر نے فوراً اپنی گاڑھے کی مرزئی اتاری اور دھوتی کس کر پانی میں کود پڑا۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ لوگ متحیر تھے کہ کون شخص ہے۔ اس نے پہلا غوطہ لگایا۔ لڑکے کی ٹوپی ملی۔ دوسرا غوطہ لگایا تو اس کی چھڑی ہاتھ لگی اور تیسرے غوطے کے بعد جب اوپر آیا تو لڑکا اس کی گود میں تھا۔ تماشائیوں نے واہ واہ کا نعرۂ پُر شور بلند کیا۔ ماں نے دوڑ کر بچے کو لپٹا لیا۔ اس اثنا میں پنڈت چنتا من کے اور کئی عزیز آ پہنچے اور لڑکے کو ہوش میں لانے کی فکر کرنے لگے۔ آدھ گھنٹے میں لڑکے نے آنکھیں کھول دیں۔ لوگوں کی جان میں جان آئی۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ اگر لڑکا دو منٹ بھی پانی میں اور رہتا تو بچنا غیر ممکن تھا۔ مگر جب لوگ اپنے گم نام محسن کو ڈھونڈنے لگے تو اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف آدمی دوڑائے۔ سارا میلہ چھان مارا۔ مگر وہ نظر نہ آیا۔

(2)

بیس سال گزر گئے۔ پنڈت چنتا من کا کاروبار روز بروز بڑھتا گیا۔ اس دوران میں اس کی ماں نے ساتوں جاترائیں کیں اور مریں تو ان کے نام پر ٹھاکر دوارا تیار ہوا۔ ریوتی بہو سے ساس بنی۔ لین دین بہی کھاتہ ہیرا من کے ہاتھ میں آیا۔ ہیرا من اب ایک وجیہ لحیم شحیم نوجوان تھا۔ نہایت خلیق' نیک مزاج' کبھی کبھی باپ سے چھپا کر غریب آسامیوں کو قرض حسنہ دیا کرتا تھا۔ چنتا من نے کئی بار اس گناہ کے لئے بیٹے کو آنکھیں دکھائیں تھیں اور الگ کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ ہیرا من نے ایک بار ایک سنسکرت پاٹھ شالا کے لئے پچاس روپیہ چندہ دیا۔ پنڈت جی اس پر ایسے برہم ہوئے کہ دو دن تک کھانا نہیں کھایا۔ ایسے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ انہیں وجوہ سے ہیرا من کی طبیعت باپ سے کچھ کچھی رہتی تھی۔ مگر اس کی یہ ساری شرارتیں ہمیشہ ریوتی کی سازش سے ہوا کرتی تھیں۔ جب قصبے کی غریب بدھوائیں یا زمینداروں کے ستائے ہوئے آسامیوں کی عورتیں ریوتی کے پاس آکر ہیرا من کو آنچل پھیلا پھیلا کر دعائیں دینے لگتیں تو اسے ایسا معلوم ہوتا کہ مجھ سے زیادہ بھاگوان اور میرے بیٹے سے زیادہ فرشتہ صفت آدمی دنیا میں کوئی نہ ہو گا۔ تب اسے بے اختیار وہ دن یاد آ جاتا جب ہیرا من کرت ساگر میں ڈوب گیا تھا اور اس آدمی کی تصویر اس کی نگاہوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی جس نے اس کے لال کو ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس کے عمق سے دعا نکلتی اور ایسا جی چاہتا کہ اسے دیکھ پاتی تو اس کے پاؤں پر گر پڑتی۔ اسے اب یقین کامل ہو گیا تھا کہ وہ انسان نہ تھا۔ بلکہ کوئی دیوتا تھا وہ اب اس کھٹولے پر بیٹھی ہوئی جس پر اس کی ساس بیٹھی تھی' اپنے دونوں پوتوں کو کھلایا کرتی تھی۔

آج ہیرا من کی ستائیسویں سالگرہ تھی۔ ریوتی کے لئے یہ دن سال بھر کے دنوں میں سب سے زیادہ مبارک تھا۔ آج اس کا دست کرم خوب فیاضی دکھاتا تھا اور یہی ایک بے جا صرف تھا جس میں پنڈت چنتا من بھی اس کے شریک ہو جاتے تھے۔ آج کے دن وہ بہت خوش ہوتی اور بہت روتی اور آج اپنے گمنام محسن کے لئے اس کے دل سے جو دعائیں نکلتیں وہ دل و دماغ کے اعلیٰ ترین جذبات میں رنگی ہوتی تھیں۔ اسی کی بدولت تو آج مجھے یہ دن اور سکھ دیکھنا میسر ہوا ہے!

(3)

ایک دن ہیرا من نے آکر ریوتی سے کہا۔ ’’اماں سری پور نیلام پر چڑھا ہوا ہے۔ کہو تو میں دام لگاؤں۔‘‘
ریوتی۔ ’’سولھوں آنہ ہے؟‘‘
ہیرا من۔ ’’سولھوں آنہ اچھا گاؤں ہے۔ نہ بڑا' نہ چھوٹا۔ یہاں سے دس کوس ہے۔ بیس ہزار تک بولی چڑھ چکی ہے۔ سو دو سو میں ختم ہو جائے گا۔‘‘
ریوتی۔ ’’اپنے دادا سے تو پوچھو۔‘‘
ہیرا من۔ ’’ان کے ساتھ دو گھنٹے تک سر مغزن کرنے کی کسے فرصت ہے۔‘‘
ہیرا من اب گھر کا مختار کل ہو گیا تھا اور چنتا من کی ایک نہ چلنے پاتی۔ وہ غریب اب عینک لگائے ایک گدّے پر بیٹھے اپنا وقت کھانسنے میں صرف کرتے تھے۔
دوسرے دن ہیرا من کے نام پر سری پور ختم ہو گیا۔ مہاجن سے زمیندار ہوئے۔ اپنے منیب اور دو چپراسیوں کو لے کر گاؤں کی سیر کرنے چلے۔ سری پور والوں کو خبر ہوئی۔ نئے زمیندار کی پہلی آمد تھی۔ گھر گھر نذرانہ دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ پانچویں دن شام کے وقت ہیرا من گاؤں میں داخل ہوئے۔ دہی اور چاول کا تلک لگایا گیا اور تین سو اسامی پہر رات تک ہاتھ باندھے ہوئے ان کی خدمت میں کھڑے رہے۔ سویرے مختارِ عام نے اسامیوں کا تعارف کرانا شروع کیا۔ جو اسامی زمیندار کے سامنے آتا' وہ اپنی بساط کے موافق ایک یا دو روپے ان کے پاؤں پر رکھ دیتا۔ دوپہر ہوتے ہوتے وہاں پان سو روپوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔
ہیرا من کو پہلی بار زمینداری کا مزہ ملا۔ پہلی بار ثروت اور طاقت کا نشہ محسوس ہوا۔ سب نشوں سے زیادہ تیز' زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ جب اسامیوں کی فہرست ختم ہو گئی تو مختار بولے۔ ’’اور کوئی اسامی تو باقی نہیں ہے؟‘‘
مختار۔ ’’ہاں مہراج۔ ابھی ایک اسامی اور ہے تخت سنگھ۔‘‘
ہیرا من۔ ’’وہ کیوں نہیں آیا؟‘‘
مختار۔ ’’ذرا مست ہے۔‘‘
ہیرا من۔ ’’میں اس کی مستی اتار دوں گا۔ ذرا کوئی اسے بلا لائے۔‘‘
تھوڑی دیر میں ایک بوڑھا آدمی لاٹھی ٹیکتا آیا اور ڈنڈوت کر کے زمین پر بیٹھ گیا۔ نہ نذر نہ نیاز۔ اس کی یہ گستاخی دیکھ کر ہیرا من کو بخار چڑھ آیا۔ کڑک کر بولے۔ ’’ابھی کسی زمیندار سے پالا نہیں پڑا۔ ایک ایک ہیکڑی بھلا دوں گا۔‘‘
تخت سنگھ نے ہیرا من کی طرف غور سے دیکھ کر جواب دیا۔ ’’میرے سامنے بیس زمیندار آئے اور چلے گئے مگر کبھی کسی نے اس طرح گھڑکی نہیں دی۔‘‘
یہ کہہ کر اس نے لاٹھی اٹھائی اور اپنے گھر چلا آیا۔ بوڑھی ٹھکرائن نے پوچھا۔ ’’دیکھا زمیندار کو' کیسے آدمی ہیں؟‘‘
تخت سنگھ۔ ’’اچھے آدمی ہیں۔ میں انہیں پہچان گیا۔‘‘
ٹھکرائن۔ ’’کیا تم سے پہلے کی ملاقات ہے؟‘‘
تخت سنگھ۔ ’’میری ان کی بیس برس کی جان پہچان ہے۔ گڑیوں کے میلے والی بات یاد ہے نا؟‘‘

اس دن سے تخت سنگھ پھر ہیرامن کے پاس نہ آیا۔

(4)

چھ مہینے کے بعد ریوتی کو بھی سری پور دیکھنے کا شوق ہوا۔ وہ اور اس کی بہو اور بچے سب سری پور آئے۔ گاؤں کی سب عورتیں ان سے ملنے آئیں۔ ان میں بوڑھی ٹھکرائن بھی تھی۔ اس کی بات چیت' سلیقہ اور تمیز دیکھ کر ریوتی دنگ رہ گئی۔ جب وہ چلنے لگی تو ریوتی نے کہا۔ "ٹھکرائن! کبھی کبھی آیا کرنا۔ تم سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔" اس طرح دونوں عورتوں میں رفتہ رفتہ میل ہو گیا۔ یہاں تو یہ کیفیت تھی اور ہیرامن اپنے مختار عام کے مغالطے میں آکر تخت سنگھ کو بے دخل کرنے کی بندشیں سوچ رہا تھا۔

جیٹھ کی پورن ماشی آئی۔ ہیرامن کی سالگرہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ریوتی چھلنی میں میدہ چھان رہی تھی کہ بوڑھی ٹھکرائن آئی۔ ریوتی نے مسکرا کر کہا۔ "ٹھکرائن! ہمارے یہاں کل تمہارا نیوتا ہے۔"

ٹھکرائن۔ "تمہارا نیوتا سر آنکھوں پر۔ کون سی برس گانٹھ ہے؟"

ریوتی۔ "انتیسویں۔"

ٹھکرائن۔ "نارائن کرے ابھی ایسے ایسے سوؤں تمہیں اور دیکھنے نصیب ہوں۔"

ریوتی۔ "ٹھکرائن! تمہاری زبان مبارک ہو۔ بڑے بڑے جنتر منتر کئے ہیں تب تم لوگوں کی دعا سے یہ دن دیکھنا نصیب ہوا ہے۔ یہ ساتویں ہی سال میں تھے کہ ان کی جان کے لالے پڑ گئے۔ گڑیوں کا میلہ دیکھنے گئی تھی۔ یہ پانی میں گر پڑے۔ بارے ایک مہاتما نے ان کی جان بچائی۔ ان کی جان انہیں کی دی ہوئی ہے۔ بہت تلاش کرایا۔ ان کا پتہ نہ چلا۔ ہر برس گانٹھ پر ان کے نام سے سو روپیہ نکال رکھتی ہوں۔ دو ہزار سے اوپر ہو گیا ہے۔ بچے کی نیت ہے کہ ان کے نام سے سری پور میں ایک مندر بنوادیں۔ سچ مانو۔ ٹھکرائن! ایک بار ان کے درشن ہو جاتے تو زندگی سپھل ہو جاتی۔ جی کی ہوس نکال لیتے۔"

ریوتی جب خاموش ہوئی تو ٹھکرائن کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

دوسرے دن ایک طرف ہیرامن کی سالگرہ کا جشن تھا اور دوسری طرف تخت سنگھ کے کھیت نیلام ہو رہے تھے۔

ٹھکرائن بولی۔ "میں ریوتی رانی کے پاس جا کر دہائی مچاتی ہوں۔"

تخت سنگھ نے جواب دیا۔ "میرے جیتے جی نہیں۔"

(5)

اساڑھ کا مہینہ آیا۔ میگھ راج نے اپنی جاں بخش فیاضی دکھائی۔ سری پور کے کسان اپنے اپنے کھیت جوتنے چلے۔ تخت سنگھ کی حسرت ناک اور آرزو مند نگاہیں ان کے ساتھ ساتھ جاتیں۔ یہاں تک کہ زمین انہیں اپنے دامن میں چھپا لیتی۔

تخت سنگھ کے پاس ایک گائے تھی۔ وہ اب دن کے دن اسے چرایا کرتا۔ اس کی زندگی کا اب بھی ایک سہارا

تھا۔ اس کے اپلے اور دودھ بیچ کر گزران کرتا۔ کبھی کبھی فاقے کرنے پڑ جاتے۔ یہ سب مصیبتیں اس نے جھیلیں مگر اپنی بے نوائی کارونارونے کے لئے ایک دن بھی ہیرامن کے پاس نہ گیا۔ ہیرامن نے اسے زیر کرنا چاہا تھا مگر خود زیر ہو گیا۔ جیتنے پر بھی اسے ہار ہوئی۔ پرانے لوہے کو اپنی کمینہ ضد کی آنچ سے نہ جھکا سکا۔

ایک دن ریوتی نے کہا۔ ''بیٹا! تم نے غریب کو ستایا۔ اچھا نہ کیا۔''

ہیرامن نے تیز جواب دیا۔ ''وہ غریب نہیں ہے۔ اس کا گھمنڈ توڑ دوں گا۔''

ثروت کے نشے میں متوالا زمیندار وہ چیز توڑنے کی فکر میں تھا جس کا وجود ہی نہ تھا' جیسے بے سمجھ بچہ اپنی پرچھائیں سے لڑنے لگتا ہے۔

(6)

سال بھر تخت سنگھ نے جوں توں کر کے کاٹا۔ پھر برسات آئی۔ اس کا گھر چھایا نہ گیا تھا۔ کئی دن تک موسلادھار مینہ برسا تو مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی۔ دب کر مر گئی۔ تخت سنگھ کے بھی چوٹ آئی۔ اسی دن اسے بخار آنا شروع ہوا۔ دوا دارو کون کرتا۔ روزی کا سہارا تھا وہ بھی ٹوٹا۔ ظالم' بے درد مصیبت نے کچل ڈالا۔ سارا مکان پانی سے بھرا ہوا۔ گھر میں اناج کا ایک دانہ نہیں۔ اندھیرے میں پڑا ہوا کراہ رہا تھا کہ ریوتی اس کے گھر گئی۔ تخت سنگھ نے آنکھیں کھول دی اور پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ٹھکرائن۔ ''ریوتی رانی ہیں۔''

تخت سنگھ۔ ''میرے دھن بھاگ۔ مجھ پر بڑی دیا کی۔''

ریوتی نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ٹھکرائن! ایشور جانتا ہے میں اپنے بیٹے سے حیران ہوں۔ تمہیں جو تکلیف ہو مجھ سے کہو۔ تمہارے اوپر ایسی آفت پڑ گئی اور ہم سے خبر تک نہ کی۔''

یہ کہہ کر ریوتی نے روپوں کی ایک چھوٹی سی پوٹلی ٹھکرائن کے سامنے رکھ دی۔

روپوں کی جھنکار سن تخت سنگھ اٹھ بیٹھا اور بولا۔ ''رانی! ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں۔ مرتے دم گنہگار نہ کرو۔''

دوسرے دن ہیرامن بھی اپنے ہواخواہوں کو لئے ادھر سے جا نکلا۔ گرا ہوا مکان دیکھ کر مسکرایا۔ اس کے دل نے کہا آخر میں نے اس کا گھمنڈ توڑ دیا۔ مکان کے اندر جا کر بولا۔ ''ٹھاکر! اب کیا حال ہے؟''

ٹھاکر نے آہستہ سے کہا۔ ''سب ایشور کی دیا ہے۔ آپ کیسے بھول پڑے؟''

ہیرامن کو دوسری بار زک ملی۔ اس کی یہ آرزو کہ تخت سنگھ میرے پاؤں کو آنکھوں سے چومے' اب بھی پوری نہ ہوئی۔ اسی رات کو غریب' آزاد منش' ایمان دار' بے غرض ٹھاکر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

(7)

بوڑھی ٹھکرائن اب دنیا میں اکیلی تھی۔ کوئی اس کے غم کا شریک اور اس کے مرنے پر آنسو بہانے والا نہ

تھا۔ بے نوائی اور بے مائگی نے غم کی آنچ اور بھی تیز کر دی تھی۔ سامان فراغت موت کے زخم کو گو بھر نہ سکیں مگر مرہم کا کام ضرور کرتے ہیں۔

فکر معاش بری بلا ہے۔ ٹھکرائن اب کھیت اور چراگاہ سے گوبر چن لاتی اور اپلے بنا کر بیچتی۔ اسے لاٹھی ٹیکتے ہوئے کھیتوں کو جاتے اور گوبر کا ٹوکرا سر پر رکھ کر بوجھ سے ہانپتے ہوئے آتے دیکھنا سخت دردناک تھا۔ یہاں تک کہ ہیرامن کو بھی اس پر ترس آ گیا۔ ایک دن انہوں نے آٹا دال چاول تھالیوں میں رکھ کر اس کے پاس بھیجا۔ ریوتی خود لے کر گئی مگر بوڑھی ٹھکرائن آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ”ریوتی! جب تک آنکھوں سے سوجھتا ہے اور ہاتھ پاؤں چلتے ہیں، مجھے اور مرنے والے کو گنہگار نہ کرو۔“

اس دن سے ہیرامن کو پھر اس کے ساتھ عملی ہمدردی کرنے کی جرات نہ ہوئی۔

ایک دن ریوتی نے ٹھکرائن سے اپلے مول لئے۔ گاؤں میں پیسے کے تیس اپلے بکتے تھے۔ اس نے چاہا کہ اس سے بیس ہی اپلے لوں۔ اس دن سے ٹھکرائن نے اس کے ہاں اپلے لانا بند کر دیا۔

ایسی دیویاں دنیا میں کتنی ہیں۔ کیا وہ اتنا نہ جانتی تھی کہ ایک راز سربستہ زبان پر لا کر میں اپنی جان کاہیوں کا خاتمہ کر سکتی ہوں۔ مگر پھر وہ احسان کا بدلہ نہ ہو جائے گا۔ مثل مشہور ہے نیکی کر اور دریا میں ڈال۔ شاید اس کے دل میں کبھی یہ خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے ریوتی پر کوئی احسان کیا ہے۔

یہ وضع دار آن پر مرنے والی عورت شوہر کے مرنے کے بعد تین سال زندہ رہی۔ یہ زمانہ اس نے جس تکلیف سے کاٹا اسے یاد کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کئی کئی دن فاقے سے گزر جاتے۔ کبھی گوبر نہ ملتا۔ کبھی کوئی اپلے چرا لے جاتا۔ ایشور کی مرضی! کسی کا گھر بھرا ہوا ہے کھانے والے نہیں۔ کوئی یوں رو رو کر زندگی کاٹتا ہے۔

بڑھیا نے یہ سب دکھ جھیلا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔

(8)

ہیرامن کی تیسویں سالگرہ آئی۔ ڈھول کی سہانی آواز سنائی دینے لگی۔ ایک طرف گھی کی پوریاں پک رہی تھیں، دوسری طرف تیل کی۔ گھی کی موٹے معزز برہمنوں کے لئے، تیل کی غریب فاقہ کش نیچوں کے لئے۔

یکایک ایک عورت نے ریوتی سے آ کر کہا۔ ”ٹھکرائن جانے کیسی ہوئی جاتی ہیں۔ تمہیں بلا رہی ہیں۔“

ریوتی نے دل میں کہا۔ ”ایشور! آج تو خیریت سے کاٹنا۔ کہیں بڑھیا نہ مر رہی ہو۔“

یہ سوچ کر وہ بڑھیا کے پاس نہ گئی۔ ہیرامن نے جب دیکھا اماں نہیں جانا چاہتیں تو خود چلا۔ ٹھکرائن پر اسے کچھ دنوں سے رحم آنے لگا تھا۔ مگر ریوتی مکان کے دروازے تک اسے منع کرنے آئی۔ یہ رحم دل، نیک مزاج شریف ریوتی تھی۔

ہیرامن ٹھکرائن کے مکان پر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بوڑھی عورت کا چہرہ زرد تھا اور جان کنی کی حالت طاری تھی۔ ہیرامن نے زور سے کہا۔ ”ٹھکرائن! میں ہوں ہیرامن۔“

ٹھکرائن نے آنکھیں کھولیں اور اشارے سے اسے اپنا سر نزدیک لانے کو کہا پھر رک رک کر بولی۔ ”میرے سرہانے پٹاری میں ٹھاکر کی ہڈیاں رکھی ہوئی ہیں۔ میرے سہاگ کا سیندور بھی وہیں ہے۔ یہ دونوں پراگ راج بھیج دینا۔“

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ ہیرا من نے پٹاری کھولی تو دونوں چیزیں بہ حفاظت رکھی ہوئی تھیں۔ ایک پوٹلی میں دس روپے بھی رکھے ہوئے ملے۔ یہ شاید جانے والے کا زادِ راہ تھا۔

رات کو ٹھکرائن کی تکلیفوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا۔

اسی رات کو ریوتی نے خواب دیکھا۔ ساون کا میلہ ہے۔ گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ میں کیرت ساگر کے کنارے کھڑی ہوں۔ اتنے میں ہیرا من پانی میں پھسل پڑا۔ میں چھاتی پیٹ پیٹ کر رونے لگی۔ دفعتہً ایک بوڑھا آدمی پانی میں کودا اور ہیرا من کو نکال لایا۔ ریوتی اس کے پاؤں پر گر پڑی اور بولی۔ ''آپ کون ہیں؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں سری پور میں رہتا ہوں میرا نام تخت سنگھ ہے۔''

سری پور اب بھی ہیرا من کے قبضے میں ہے۔ مگر اب اس کی رونق دو چند ہو گئی ہے۔ وہاں جاؤ تو دور سے شوالے کا سنہری کلس دکھائی دینے لگتا ہے۔ جس جگہ تخت سنگھ کا مکان تھا' وہاں شوالہ بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے ایک پختہ کنواں اور پختہ دھرم سالہ ہے۔ مسافر یہاں ٹھہرتے ہیں اور تخت سنگھ کا گن گاتے ہیں۔ یہ شوالہ اور دھرم سالہ دونوں اس کے نام سے مشہور ہیں۔

آہِ بے کس

(1)

منشی رام سیوک بھویں چڑھائے ہوئے گھر سے نکلے اور بولے۔ ''ایسی زندگی سے تو موت بہتر۔''

موت کی دست درازیوں کا سارا زمانہ شاکی ہے۔ اگر انسان کا بس چلتا تو موت کا وجود ہی نہ رہتا۔ مگر فی الواقع موت کو جتنی دعوتیں دی جاتی ہیں' انہیں قبول کرنے کی فرصت ہی نہیں۔ اگر اسے اتنی فرصت ہوتی تو آج زمانہ ویران نظر آتا۔

منشی رام سیوک موضع چاندپور کے ایک ممتاز رئیس تھے اور رؤسا کے اوصاف حمیدہ سے بہرہ ور۔ وسیلہ معاش اتنا ہی وسیع تھا' جتنی انسان کی حماقتیں اور کمزوریاں۔ یہی ان کی املاک اور موروثی جائداد تھی۔ وہ روز عدالت منصفی کے احاطے میں ایک نیم کے درخت کے نیچے کاغذات کا بستہ کھولے' ایک شکستہ حال چوکی پر بیٹھے نظر آتے تھے' اور گو انہیں کسی نے کسی اجلاس پر قانونی بحث یا مقدمے کی پیروی کرتے نہیں دیکھا مگر عرف عام میں وہ مختار صاحب مشہور تھے۔ طوفان آئے' پانی برسے' اولے گریں مگر مختار صاحب کسی نامراد دل کی طرح وہیں جمے رہتے تھے۔ وہ کچہری چلتے تو دہقانیوں کا ایک جلوس سا نظر آتا۔ چاروں طرف سے ان پر عقیدت واحترام کی نگاہیں پڑتیں اور اطراف میں مشہور تھا کہ ان کی زبان پر سرسوتی ہیں۔

اسے وکالت کہو یا مختار کاری مگر یہ صرف خاندانی اور اعزازی پیشہ تھا۔ آمدنی کی صورتیں یہاں مفقود تھیں۔ نقرئی سکوں کا تو ذکر ہی کیا' کبھی کبھی مسی سکے بھی آزادی سے آنے میں تامل کرتے تھے۔

منشی جی کی قانون دانی میں کوئی شک نہیں مگر "پاس" کی منحوس قید نے انہیں مجبور و معذور کر دیا تھا۔ بہر حال جو کچھ ہو یہ پیشہ محض اعزاز کے لئے تھا۔ ورنہ ان کی گزران کی خاص صورت قرب و جوار کی بے کس مگر فارغ البال بیواؤں اور سادہ لوح مگر خوش حال بڈھوں کی خوش معاملگی تھی۔ بیوائیں اپنا روپیہ ان کی امانت میں رکھتیں۔ بوڑھے اپنی پونجی ناخلف لڑکوں کی دست برد سے محفوظ رکھنے کے لئے انہیں سونپتے اور روپیہ ایک دفعہ ان کی مٹھی میں جاکر پھر نکلنا نہیں جانتا تھا۔ وہ حسب ضرورت کبھی کبھی قرض بھی لیتے تھے۔ بلا قرض لئے کس کا کام چل سکتا ہے؟ صبح کو شام کے وعدے پر روپیہ لیتے مگر وہ شام کبھی نہیں آتی تھی۔ خلاصہ کہ منشی جی قرض لے کر دینا نہیں جانتے تھے اور یہ ان کا خاندانی وصف تھا۔ اس خاندان کی یہ رسم قدیم تھی۔

یہ معاملات اکثر منشی جی کے آرام میں مخل ہوا کرتے تھے۔ قانون اور عدالت کا تو انہیں کوئی خوف نہ تھا۔ اس میدان میں ان کا سامنا کرنا پانی میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کرنا تھا لیکن جب بعض شریر النفس لوگ خواہ مخواہ ان سے بدظن ہو جاتے' ان کی خوش نیتی پر شک کرتے اور ان کے روبرو علانیہ بدزبانیوں پر اتر آتے تو منشی جی کو بڑا صدمہ ہوتا۔ اس قسم کے ناگوار واقعات آئے دن ہوتے رہتے تھے۔ ہر جگہ ایسے تنگ ظرف حضرات موجود ہوتے ہیں جنہیں دوسروں کی تحقیر میں مزہ آتا ہے۔ انہیں بدخواہوں کی شہ پاکر بعض اوقات چھوٹے چھوٹے آدمی منشی جی کے منہ آجاتے تھے۔ ورنہ ایک کنجڑن کا اتنا حوصلہ نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے گھر میں جاکر انہیں کی شان میں نازیبا کلمات منہ سے نکالے۔ منشی جی اس کے پرانے گاہک تھے۔ برسوں تک اس سے سبزی لی تھی اگر دام نہ دیئے تو کنجڑن کو صبر کرنا چاہیے تھا۔ جلد یا دیر میں مل ہی جاتے مگر وہ بدزبان عورت دو سال میں ہی گھبرا گئی اور چند آنے پیسوں کے لئے ایک معزز آدمی کی آبروریزی کی۔ ایسی حالت میں اگر انہوں نے جھنجھلا کر موت کو دعوت دی تو ان کی کوئی خطا نہیں۔

(2)

اسی موضع میں مونگا نام ایک بیوہ برہمنی تھی۔ اس کا شوہر برما کی کالی پلٹن میں حوالدار تھا اور وہیں مارا گیا تھا۔ اس کے حسنِ خدمات کے صلے میں مونگا کو پانچ سو روپے ملے تھے۔ بیوہ عورت تھی۔ زمانہ نازک۔ اس نے یہ روپے منشی رام سیوک کو سونپ دیئے اور ہر ماہ اس میں سے تھوڑا تھوڑا لے کر گذر کرتی رہی۔ منشی جی نے یہ قرض کئی سال تک نیک نیتی کے ساتھ پورا کیا مگر جب پیرانہ سالی کے باوجود مونگا نے مرنے میں تامل کیا اور منشی جی کو اندیشہ ہوا کہ شاید وہ توشۂ آخرت کے لئے نصف رقم بھی چھوڑنا نہیں چاہتی تو ایک روز انہوں نے کہا۔ "مونگا! تمہیں مرنا ہے یا نہیں۔ صاف صاف کہہ دو تاکہ میں اپنے مرنے کی فکر کروں۔"

اس دن مونگا کی آنکھیں کھلیں۔ خواب سے بیدار ہوئی۔ بولی۔ "میرا حساب کر دو۔" فردِ حساب تیار تھی۔ امانت میں اب ایک کوڑی بھی باقی نہ تھی۔ اس سخت گیری سے جو بڑھاپے کے ساتھ مخصوص ہے' اس نے منشی جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا۔ "میرے پورے سو روپے تم نے دبائے ہیں۔ میں ایک ایک کوڑی لے لوں گی۔"

مگر بے کسوں کا غصہ پٹاخے کی آواز ہے۔ جس سے بچے ڈر جاتے ہیں اور اثر کچھ نہیں ہوتا۔ عدالت میں اس کا کچھ زور نہ تھا۔ نہ کوئی لکھا پڑھی۔ نہ حساب کتاب۔ البتہ پنچایت سے کچھ امید تھی اور پنچایت بیٹھی۔ گاؤں کے

آدمی جمع ہوئے۔ منشی جی نیت اور معاملے کے صاف تھے۔ انہیں پنچوں کا کیا خوف! سبھا میں کھڑے ہو کر پنچوں سے کہا۔ "بھائیو! آپ سب لوگ ایمان دار اور شریف ہیں۔ میں آپ سب صاحبوں کا خاک پا پروردہ ہوں۔ آپ صاحبوں کی عنایات والطاف سے' فیض و کرم سے' محبت و شفقت سے' میرا ایک ایک رونگٹا گراں بار ہے۔ کیا آپ سب نیک اور شریف حضرات خیال کرتے ہیں کہ میں نے ایک بے کس اور بیوہ عورت کے روپے ہضم کر لئے؟"

پنچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"اگر آپ سب نیک اور شریف صاحبوں کا خیال ہے کہ میں نے روپے دبا لئے تو میرے لئے ڈوب مرنے کے سوا اور کوئی تدبیر نہیں۔ میں امیر نہیں ہوں' نہ مجھے فیاضی کا دعویٰ ہے مگر اپنے قلم کی بدولت' آپ صاحبوں کی عنایت کی بدولت کسی کا محتاج نہیں۔ کیا میں ایسا کمینہ ہو جاؤں گا کہ ایک بے کس عورت کے روپے ہضم کر لوں!"

پنچوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ "نہیں' نہیں آپ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔"

پگڑی کی نگری ہے۔ پنچوں نے منشی جی کو رہا کر دیا۔ پنچایت ختم ہو گئی اور مونگا کو اب کسی خیال سے تسکین ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھا کہ یہاں نہ دیا' نہ سہی' وہاں کہاں جائے گا!

(3)

مونگا کا اب کوئی غم خوار و مددگار نہ تھا۔ ناداری سے جو کچھ تکلیفیں ہو سکتی ہیں' وہ سب اسے جھیلنی پڑیں۔ اس کے قویٰ درست تھے۔ وہ چاہتی تو محنت کر سکتی تھی۔ مگر جس دن پنچایت ختم ہوئی اسی دن سے اس نے کام کرنے کی قسم کھالی۔ اب اسے رات دن روپوں کی رٹ لگی ہوئی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اسے صرف ایک کام تھا اور وہ منشی رام سیوک کا ذکر خیر تھا۔ اپنے جھونپڑے کے دروازے پر بیٹھی وہ رات دن انہیں صدق دل سے دعائیں دیا کرتیں اور اکثر دعاؤں میں ایسے شاعرانہ تلازمے' ایسے رنگین استعارے استعمال کرتی کہ سن کر حیرت ہوتی تھی۔

رفتہ رفتہ مونگا کے حواس پر وحشت کا غلبہ ہوا۔ ننگے سر' ننگے بدن' ہاتھ میں ایک کلھاڑا لئے وہ سنسان جگہوں میں جا بیٹھتی۔ جھونپڑے کے بجائے اب وہ مرگھٹ پر ندی کے کنارے کھنڈروں میں گھومتی دکھائی دیتی۔ بکھری ہوئی پریشان لٹیں' سرخ آنکھیں' وحشت ناک چہرہ' سوکھے ہوئے ہاتھ پاؤں۔ اس کی یہ ہیئت کذائی دیکھ کر لوگ ڈر جاتے تھے۔ اب اسے کوئی مزاح کے طور پر نہ چھیڑتا۔ اگر وہ گاؤں میں نکل آتی تو عورتیں گھروں کے کواڑ بند کر لیتیں۔ مرد کترا کر نکل جاتے اور بچے چیخ چیخ کر بھاگ جاتے۔ اگر کوئی لڑکا نہ بھاگتا تو یہ منشی رام سیوک کا صاحبزادہ رام غلام تھا۔ باپ میں جو کچھ کور کسر رہ گئی تھی' وہ ان کی ذات سے پوری ہو گئی تھی۔ لڑکوں کا اس کے مارے ناک میں دم تھا۔ گاؤں کے کانے اور لنگڑے آدمی اس کی صورت سے بیزار تھے اور گالیاں کھانے میں تو شاید سسرال میں آنے والے داماد کو بھی اتنا مزہ نہ آتا ہو۔ وہ مونگا کے پیچھے تالیاں بجاتا کتوں کو ساتھ لئے اس وقت تک رہتا جب تک وہ غریب تنگ آ کر نکل نہ جاتی۔ روپیہ پیسہ ہوش و حواس کھو کر اسے پگلی کا لقب ملا اور وہ سچ مچ پگلی تھی۔ اکیلے بیٹھے ہوئے آپ ہی آپ گھنٹوں باتیں کیا کرتی۔ جس میں رام سیوک کے گوشت' ہڈی' پوست' آنکھیں' کلیجہ وغیرہ کو کھانے مسلنے' نوچنے' کھسوٹنے کی پرجوش خواہش کا اظہار ہوتا تھا اور جب یہ خواہش بے تابی کی حد تک پہنچ جاتی تو

وہ رام سیوک کے مکان کی طرف منہ کر کے بلند اور ڈراؤنی آواز سے ہانک لگاتی۔ ”تیرا لہو پیوں گی۔“

اکثر راتوں کے سناٹے میں یہ گرجتی ہوئی آواز سن کر عورتیں چونک پڑتی تھیں مگر اس آواز سے زیادہ ہیبت ناک اس کا قہقہہ تھا۔ منشی جی کے خیالی لہو پینے کی خوشی مین وہ زور سے ہنسا کرتی تھی۔ اس قہقہے سے ایسی شیطانی مسرت، ایسی سفاکی، ایسی خونخواری ٹپکتی تھی کہ رات کو سن کر لوگوں کے خون سرد ہو جاتے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا سیکڑوں الو ایک ساتھ ہنس رہے ہیں۔

منشی رام سیوک بڑے حوصلہ و جگر کے آدمی تھے۔ نہ انہیں دیوانی کا خوف تھا، نہ فوجداری کا مگر مونگا کے ان خوفناک نعروں کو سن کر وہ بھی سہم جاتے تھے۔ ہمیں انسانی انصاف کا چاہے خوف نہ ہو اور بسا اوقات نہیں ہوتا مگر خدائی انصاف کا خوف ہر انسان کے دل میں خلقی طور پر موجود ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایسے مبارک اتفاقات پیش آ جاتے ہیں، جب نفس کے نیچے دبا ہوا یہ خیال اوپر آ جاتا ہے۔ مونگا کی وحشت ناک شب گردی رام سیوک کے لئے یہی مبارک اتفاق تھی اور ان سے زیادہ ان کی بیوی کے لئے جو ایک وفادار عورت کی طرح ہر معاملے میں نہ صرف اپنے شوہر کا ساتھ دیتی تھیں بلکہ آئے دن کے مباحثوں اور مناظروں میں زیادہ نمایاں حصہ لیا کرتی تھیں۔ فرقہ اناث میں ان کے زور بیان کا عام شہرہ تھا۔ زبانی معاملات ہمیشہ وہی طے کیا کرتی تھیں۔ ان لوگوں کو بھول تھی جو کہتے تھے کہ منشی جی کی دکان پر سرستی ہے۔ یہ فیض ان کی بیوی کو حاصل تھا۔ زور بیان میں انہیں وہی ملکہ تھا جو منشی جی کو زور تحریر میں اور یہ دونوں پاک روحیں اکثر عالم مجبوری میں مشورہ کرتیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔

(4)

آدھی رات کا وقت تھا۔ منشی جی حسب معمول غم غلط کرنے کے لئے آب آتشیں کے دو چار گھونٹ پی کر سو گئے تھے۔ یکایک مونگا نے ان کے دروازے پر آ کر زور سے ہانک لگائی۔ ”تیرا لہو پیوں گی۔“ اور خوب کھلکھلا کر ہنسی۔

منشی جی یہ خوفناک قہقہہ سن کر چونک پڑے۔ خوف سے پاؤں تھر تھرا رہے تھے اور کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ دل پر بہت جبر کر کے انہوں نے دروازہ کھولا اور جا کر ناگن کو جگایا۔

ناگن نے جھلا کر کہا۔ ”کیا ہے؟ کیا کہتے ہو؟“

منشی جی نے آواز دبا کر کہا۔ ”وہ دروازے پر آ کر کھڑی ہے۔“

ناگن اٹھ بیٹھی۔ ”کیا کہتی ہے؟“

”تمہارا سر۔“

”کیا دروازے پر آ گئی؟“

”ہاں آواز نہیں سنتی ہو؟“

ناگن مونگا سے نہیں مگر اس کی وحشت سے ڈرتی تھی۔ تاہم اسے یقین تھا کہ میں تقریر میں اسے ضرور نیچا دکھا سکتی ہوں۔ سنبھل کر بولی تو میں اس سے دو باتیں کر لوں۔ مگر منشی جی نے منع کیا۔

دونوں آدمی دہلیز پر گئے اور دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ مونگا کی دھندلی مورت زمین پر پڑی تھی اور

اس کی سانس تیزی سے چلتی سنائی دیتی تھی۔ رام سیوک کے خون اور گوشت کی آرزو میں وہ اپنا گوشت اور خون خشک کر چکی تھی۔ ایک بچہ بھی اسے گرا سکتا تھا مگر اس سے سارا گاؤں ڈرتا تھا۔ ہم زندہ انسانوں سے نہیں ڈرتے ہیں۔ مُردوں سے ڈرتے ہیں۔

اگرچہ اندر سے دروازہ بند تھا مگر منشی جی اور ناگن نے بیٹھ کر رات کاٹی۔ مونگا اندر نہیں آسکتی تھی مگر اس کی آواز کو کون روک سکتا تھا۔ مونگا سے زیادہ ڈراؤنی اس کی آواز تھی۔

صبح کے وقت منشی جی باہر نکلے اور مونگا سے بولے۔ ''یہاں کیوں پڑی ہے؟''

مونگا بولی۔ ''تیرا خون پیوں گی۔''

ناگن نے بل کھا کر کہا۔ ''تیرا منہ جھلس دوں گی۔''

مگر ناگن کے زہر نے مونگا پر کچھ اثر نہ کیا۔ اس نے زور سے قہقہہ لگایا۔ ناگن کھسیانی سی ہو گئی۔ قہقہے کے مقابلے میں زبان بند ہو جاتی ہے۔ منشی جی پھر بولے۔ ''یہاں سے اٹھ جا۔''

''نہ اٹھوں گی۔''

''کب تک پڑی رہے گی؟''

''تیرا لہو پی کے جاؤں گی۔''

منشی جی کی پُر زور تحریر کا یہاں کچھ زور نہ چلا اور ناگن کی آتشین تقریر یہاں سرد ہو گئی۔ دونوں گھر میں جا کر مشورہ کرنے لگے۔ یہ بلا کیوں ٹلے گی۔ اس آفت سے کیوں کر نجات ہو گی۔

دیوی آتی ہیں تو بکرے کا خون پی کر چلی جاتی ہیں مگر یہ ڈائن انسان کا خون پینے آئی ہے۔ وہ خون جس کے اگر قلم بنانے میں چند قطرے نکل پڑتے تھے تو ہفتوں اور مہینوں سارے کنبے کو افسوس رہتا تھا۔ اور یہ واقعہ گاؤں میں مرکز گفتگو بن جاتا تھا۔ کیا یہ خون پی کر مونگا کا سوکھا ہوا جسم ہرا ہو جائے گا!

گاؤں میں خبر پھیل گئی۔ مونگا منشی کے دروازے پر دھرنا دیئے بیٹھی ہے۔ منشی جی کی رسوائی میں گاؤں والوں کو خواہ مخواہ لطف آتا تھا۔ سیکڑوں آدمی جمع ہو گئے۔ اس دروازے پر وقتاً فوقتاً میلے لگتے رہتے تھے مگر وہ پُر شور اور پُر خروش میلے ہوتے تھے۔ آج کا مجمع خاموش اور متین تھا۔ یہ رکاؤ اور حبس رام غلام کو مرغوب نہ تھا۔ مونگا پر اسے ایسا غصہ آرہا تھا کہ اس کا بس چلتا تو ضرور کنوئیں میں دھکیل دیتا۔ کہتا۔ ''چل کنوئیں پر تجھے پانی پلاؤں۔'' جب وہ کنوئیں پر پہنچتی تو پیچھے سے ایسا دھکا دیتا کہ وہ ارارادھم کنوئیں میں جا گرتی اور وہاں پیٹے ہوئے کتے کی طرح چیخنے لگتی۔ دھماکے کی آواز آتی! اس خیال سے رام غلام کے سینے میں گدگدی سی ہونے لگی اور وہ مشکل سے اپنی ہنسی کو روک سکا۔ کیسے مزے کی بات ہوتی مگر یہ چڑیل یہاں سے اٹھتی ہی نہیں کیا کروں۔ منشی جی کے گھر میں استخوانی نسل کی ایک گائے تھی۔ کھلی، دانہ اور بھوسا تو اسے بڑی کثرت سے کھلایا جاتا تھا مگر وہ سب اس کی ہڈیوں میں پیوست ہو جاتا تھا اور اس کا ڈھانچہ روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ رام غلام نے ایک ہانڈی میں اس کا گوبر گھولا اور وہ ساری غلاظت مونگا پر لا کر انڈیل دی اور پھر اس کے چھینٹے تماشائیوں پر ڈال دیئے۔ غریب مونگا لت پت ہو گئی اور اٹھ کر رام غلام کی طرف دوڑی۔ صدہا تماشائیوں کے کپڑے خراب ہو گئے۔ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ منشی رام سیوک کا دروازہ ہے۔ یہاں اسی طرح کی مدارات کی جاتی ہے۔ جلد بھاگ چلو ورنہ اب کے کوئی اس سے اچھی خاطر کی جائے گی۔ ادھر مطلع صاف ہوا۔ ادھر رام غلام گھر میں جا کر خوب ہنسا اور خوب تالیاں بجائیں۔ منشی جی نے

اس مجمع ناجائز کو ایسی آسانی اور خوب صورتی سے ہٹا دینے کی تدبیر پر اپنے سعادت مند لڑکے کی پیٹھ ٹھونکی مگر سب بھاگ گئے! مونگا جو کی توں بیٹھی رہی۔

دوپہر ہوئی۔ مونگا نے کھانا نہیں کھایا۔ شام ہوئی۔ ہزاروں اصرار کے باوجود اس نے کھانا نہیں کھایا۔ گاؤں کے چودھری نے خوشامدیں کیں۔ حتیٰ کہ منشی جی نے ہاتھ تک جوڑے مگر دیوی راضی نہ ہوئیں۔ آخر منشی جی اٹھ کر اندر چلے گئے۔ ان کا قول تھا روٹھنے والوں کو بھوک آپ منالیا کرتی ہے۔ مونگا نے یہ رات بھی بے آب ودانہ کاٹ دی اور لالہ صاحب اور ان کی زوجہ غمگسار نے آج پھر جاگ جاگ کر صبح کی۔ آج مونگا کے نعرے اور قہقہے بہت کم سنائی دیئے۔ گھر والوں نے سمجھا بلا ٹل گئی۔ سویرا ہوتے ہی جو دروازے پر آکر دیکھا تو وہ بے حس وحرکت پڑی ہوئی تھی۔ منہ پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی جان نکل چکی تھی۔ وہ اس دروازے پر جان ہی دینے آئی تھی۔ جس نے اس کی جمع جتھالی تھی‘ اسی کو جان بھی سونپ دی۔ اپنی مٹی تک اس کی نذر کر دی۔

یہ ذکر کہ گاؤں میں کیسی ہلچل مچی اور منشی رام سیوک کیسے ذلیل ہوئے‘ فضول ہے۔ ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک ایسے غیر معمولی واقعہ پر جتنی ہلچل مچ سکتی ہے‘ اس سے کچھ زیادہ ہی مچی اور منشی جی کی جتنی ذلت ہونی چاہیے تھی‘ اس سے ذرا بھی کم نہ ہوئی۔ گاؤں کا چمار بھی ان کے ہاتھ کا پانی پینے کا یا انہیں چھونے کا روادار نہ تھا۔ اگر کسی کے گھر میں کوئی گائے بندھی بندھی مر جاتی ہے تو وہ شخص مہینوں دربدر بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ نہ حجام اس کی حجامت بنائے۔ نہ کہار اس کا پانی بھرے۔ نہ کوئی اسے چھوئے۔ یہ گئوہتیا کا پرائیشچت ہے۔ برہم ہتیا کی سزائیں اس سے بدرجہا سخت اور ذلتیں بدرجہا زیادہ ہیں۔ مونگا یہ جانتی تھی اور اسی لئے اس دروازے پر آکر مری تھی کہ میں جو زندہ رہ کر کچھ نہیں کر سکتی‘ مر کر بہت کچھ کر سکتی ہوں۔ گوبر کا اپلا جب جل کر راکھ ہو جاتا ہے تو سادھو سنت اسے ماتھے پر چڑھاتے ہیں۔ پتھر کا ڈھیلا آگ میں جل کر آگ سے بھی زیادہ اور قاتل ہو جاتا ہے۔

(5)

منشی رام سیوک قانون دان آدمی تھے۔ قانون نے ان پر کوئی جرم نہیں لگایا تھا۔ مونگا کسی قانونی دفعہ کے منشا کے مطابق نہیں مری تھی۔ تعزیرات ہند میں اس کی کوئی نظیر نہ ملتی تھی۔ اس لئے جو لوگ ان سے پرائیشچت کرانا چاہتے تھے ان کی سخت غلطی تھی۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ کہار پانی نہ بھرے گا۔ وہ خود اپنا پانی آپ بھر سکتے ہیں۔ اپنا کام کرنے میں کوئی شرم نہیں۔ بلا سے حجام بال نہ بنائے گا۔ حجامت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ داڑھی بہت خوبصورت چیز ہے۔ داڑھی مرد کا زیور اور سنگار ہے اور پھر جو بالوں سے ایسی ہی نفرت ہو گی تو ایک ایک آنے میں تو استرے آتے ہیں۔ دھوبی کپڑے نہ دھوئے گا اس کی بھی کچھ پروا نہیں۔ صابون کوڑیوں کے مول آتا ہے۔ ایک بٹی میں درجنوں کپڑے صاف ہو جائیں گے‘ جیسے بگلے کا پر۔ دھوبی کیا کھا کے ایسے صاف کپڑے دھوئے گا۔ کمبخت پتھر پر پٹک پٹک کر کپڑوں کا لتا نکال لیتا ہے۔ خود پہنے۔ دوسروں کو پہنائے۔ بھٹی میں چڑھائے ریہہ میں بھگوئے۔ کپڑوں کی درگت کر ڈالتا ہے۔ جبھی تو کرتے دو تین سال سے زیادہ نہ چلتے۔ ورنہ دادا ہر پانچویں سال دو اچکن اور دو کرتے بنوایا کرتے تھے۔ منشی رام سیوک اور ان کی زوجہ غمگسار نے دن بھر یوں ہی اپنے دلوں کو سمجھا کر ٹالا۔

مگر شام ہوتے ہی ان کی قوت استدلال نے جواب دے دیا۔ ان کے دلوں پر ایک بے معنی‘ بے بنیاد مہمل

خوف کا غلبہ ہوا اور رات کے ساتھ ساتھ خوف کا احساس مشکل ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ ناگن کھانا پکانے کے لئے رسوئی کے کمرے میں تنہا نہ جا سکی۔ باہر کا دروازہ غلطی سے کھلا رہ گیا تھا مگر کسی ایک کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ جا کر دروازہ بند کر آئے۔ آخر ناگن نے ہاتھ میں چراغ لیا۔ منشی جی نے کلہاڑا اور رام غلام نے گنڈاسا۔ اس قطع سے تینوں آدمی چونکتے، ہچکچاتے دروازے تک آئے۔ یہاں منشی جی نے بڑی جرات سے کام لیا۔ انہوں نے بے دھڑک دروازے سے باہر نکلنے کی کوشش کی اور کانپتی ہوئی مگر بلند آواز میں ناگن سے بولے۔ "تم ناحق ڈرتی ہو۔ کیا یہاں وہ بیٹھی ہے۔" مگر وفادار ناگن نے انہیں کھینچ لیا اور خفا ہو کر بولیں۔ "تمہارا یہی لڑکپن تو اچھا نہیں۔" یہ مہم فتح کر کے تینوں آدمی رسوئی کے کمرے میں آئے اور کھانا پکنا شروع ہوا۔

مگر مونگا ان کی آنکھوں میں گھسی ہوئی تھی۔ اپنی پرچھائیں کو دیکھ کر مونگا کا گمان ہوتا تھا۔ اندھیرے کونوں میں مونگا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہی ہڈیوں کا ڈھانچہ، وہی جھنڈولے بال، وہی وحشت، وہی ڈراؤنی آنکھیں۔ مونگا کا نکھ سکھ دکھائی دیتا تھا۔ اسی کمرے میں آٹا دال کے کئی مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ وہیں کچھ پرانے چیتھڑے بھی پڑے تھے۔ ایک چوہے کو بھوک نے بے چین کیا۔ مٹکوں نے کبھی اناج کی صورت نہیں دیکھی مگر سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ اس گھر کے چوہے غضب کے ڈاکو ہیں۔ وہ ان دانوں کی تلاش میں جو مٹکوں سے کبھی نہیں گرے تھے، رینگتا اس چیتھڑے کے نیچے آنکلا۔ کپڑے میں حرکت ہوئی۔ پھیلے ہو چیتھڑے مونگا کی پتلی ٹانگیں بن گئے۔ ناگن دیکھتے ہی جھجکی اور چیخ اٹھی۔ منشی جی بدحواس ہو کر دروازے کی طرف لپکے۔ رام غلام دوڑ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ بارے چوہا باہر نکل آیا۔ اسے دیکھ کر ان لوگوں کے ہوش بجا ہوئے۔ اب منشی جی مردانہ وار قدم اٹھائے مٹکے کی طرف چلے۔ ناگن نے طنز سے کہا۔ "رہنے بھی دو۔ دیکھ لی تمہاری مردمی!"

منشی جی وفادار ناگن کی اس ناقدری پر بہت بگڑے۔ "کیا تم سمجھتی ہو میں ڈر گیا بھلا۔ ڈر کی کیا بات تھی۔ مونگا مر گئی۔ اب کیا وہ بیٹھی ہے۔ کل میں دروازے کے باہر نکل گیا تھا۔ تم روکتی ہی رہیں اور میں نہ مانا۔"

منشی جی کی اس زبردست دلیل نے ناگن کو لاجواب کر دیا۔ کل دروازے کے باہر نکل جانا یا نکلنے کی کوشش کرنا معمولی کام نہ تھا۔ جس کی جرات کا ایسا ثبوت مل چکا ہو اسے بزدل کون کہہ سکتا ہے۔ یہ ناگن کی ہٹ دھرمی تھی۔

کھانا کھا کر تینوں آدمی سونے کے مکان میں آئے لیکن مونگا نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ باتیں کرتے تھے۔ دل بہلاتے تھے۔ ناگن نے راجہ ہردول اور رانی سارندھا کی کہانیاں کہیں۔ منشی جی نے چند مقامات کی تفصیل بیان کی مگر تدبیروں کے باوجود مونگا کی تصویر آنکھوں کے سامنے سے دور نہ ہوتی تھی۔ ذرا کواڑ کھڑکا اور دونوں چونک پڑے۔ پتوں میں سنسناہٹ ہوئی اور دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور رہ رہ کر ایک مدھم آواز نہ جانے کہاں سے۔ شاید آسمان کے اوپر، یا زمین کے نیچے سے ان کے کانوں میں آتی تھی۔ "میں تیرا خون پیوں گی۔"

(6)

آدھی رات کو ناگن عالم غنودگی سے چونکی۔ وہ غریب ان دنوں حاملہ تھی۔ سرخ آتشیں آنکھوں والی، تیز نکیلے دانتوں والی مونگا اس کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ناگن چیخ مار کر اٹھی۔ ایک عالم وحشت میں بھاگ کر آنگن میں آئی ور فرط ہراس سے زمین پر گر پڑی۔ سارا بدن پسینے میں ڈوبا ہوا تھا۔ منشی جی نے بھی اس کی چیخ سنی مگر خوف سے آنکھیں نہ

کھولیں۔ اندھوں کی طرح دروازہ ٹٹولتے رہے۔ بہت دیر کے بعد انہیں دروازہ ملا۔ آنگن میں آئے۔ ناگن زمین پر پڑی ہاتھ پاؤں پٹک رہی تھی۔ اسے اٹھا کر اندر لائے مگر رات بھر اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ صبح کو ہڈیاں پکنے لگیں۔ تھوڑی دیر میں بخار ہو آیا۔ جسم سرخ توا ہو گیا۔ شام ہوتے ہوتے سرسام ہوا اور آدھی رات کے وقت جب ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا' ناگن اس دنیا سے چل بسی۔ مونگا کے خوف نے اس کی جان لی۔ جب تک مونگا زندہ رہی وہ ناگن کے پھنکار سے ہمیشہ ڈرتی رہی۔ عالم جنون میں بھی اس نے ناگن کا سامنا کبھی نہیں کیا مگر اپنی جان دے کر آج اس نے ناگن کی جان لی۔ خوف میں بڑی طاقت ہے۔ انسان ہوا میں ایک گرہ نہیں لگا سکتا۔ خوف نے ہوا میں ایک دنیا بنا ڈالی ہے۔

رات گزر گئی۔ دن چڑھتا آتا تھا مگر گاؤں کا کوئی آدمی لاش اٹھانے کے لئے دروازے پر نہ آتا تھا۔ منشی جی گھر گھر گھومے۔ مگر کوئی نہ نکلا۔ ہتیارے کے دروازے پر کون جائے! ہتیارے کی لاش کون اٹھائے! منشی جی کا رعب' ان کے خونخوار قلم کا خوف اور قانونی مصلحت آمیزیاں۔ کچھ بھی کارگر نہ ہوا۔ چاروں طرف سے ہار کر منشی جی پھر اپنے خانہ تحریک میں آئے مگر اندر قدم نہیں رکھا جاتا تھا' نہ باہر کھڑے رہ سکتے تھے۔ باہر مونگا اندر ناگن۔ دل پر بہت جبر کر کے ہنومان چالیسا کا ورد کرتے ہوئے وہ مکان میں گئے۔ اس وقت ان کے دل پر جو گزر رہی تھی' اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ گھر میں لاش پڑی ہوئی۔ نہ کوئی آگے نہ پیچھے۔ دوسری شادی تو ہو سکتی تھی۔ ابھی اسی پھاگن میں تو پچاسواں سال ہے۔ مگر ایسی زبان دراز' خوش بیان عورت کہاں ملے گی۔ افسوس کہ اب تقاضا کرنے والوں سے بحث کون کرے گا! کون انہیں لاجواب کرے گا۔ لین دین کا حساب کون اتنی خوبی سے کرے گا۔ کس کی آواز بلند تیر کی طرح اہل تقاضا کے سینوں میں چبھے گی' اس نقصان کی تلافی اب ممکن نہیں!

دوسرے دن منشی جی لاش کو ایک ٹھیلے پر لاد کر گنگا جی کی طرف چلے۔ عزاداروں کی تعداد بہت مختصر تھی۔ ایک منشی جی' دوسرا رام غلام۔ اس ہیئت کذائی سے مونگا کی لاش بھی نہیں اٹھی تھی۔

مگر مونگا نے ناگن کی جان لے کر بھی منشی جی کا پنڈ نہ چھوڑا۔ لیلیٰ کی تصویر مجنوں کے پردۂ دماغ پر ایسے شوخ رنگوں سے شاید ہی کھنچی ہو۔ آٹھوں پہر ان کا خیال اسی طرف لگا رہتا ہے۔ اگر دل بہلاؤ کا کوئی ذریعہ ہوتا تو شاید انہیں اتنی پریشانی نہ ہوتی۔ مگر گاؤں کا کوئی ذی روح ان کے دروازے کی طرف جھانکتا بھی نہ تھا۔ غریب اپنے ہاتھوں پانی بھرتے۔ خود برتن دھوتے۔ غم اور غصہ' فکر اور خوف۔ اتنے دشمنوں کے مقابلے میں ایک دماغ کب تک ٹھہر سکتا تھا۔ خصوصاً وہ دماغ جو روزانہ قانونی مباحثوں میں صرف تبخیر ہو جاتا ہو۔

کنج تنہائی کے دس بارہ دن جوں توں کر کے کٹے۔ چودھویں دن منشی جی نے کپڑے بدلے اور بستہ لئے ہوئے کچہری چلے۔ آج ان کا چہرہ کچھ روشن تھا۔ جاتے ہی میرے موکل دوڑ کر مجھے گھیر لیں گے۔ ماتم پرسی کریں گے۔ میں آنسوؤں کے دو چار قطرے گرا دوں گا۔ پھر بیع ناموں' رہن ناموں' صلح ناموں وغیرہم کا ایک طوفان بلکہ سیلاب سامنے آ جائے گا۔ یہ خیال انہیں خوش کئے ہوئے تھا۔ مٹھیاں گرم ہوں گی۔ روپے کی صورت نظر آئے گی۔ شام کو ذرا شغل ہو جائے گا۔ اس کے چھوٹنے سے تو جی اور اچاٹ تھا۔ انہیں خیالوں میں سرخوش منشی جی کچہری پہنچے۔

مگر وہاں رہن ناموں کے طوفان' بیع ناموں کے سیلاب اور موکلوں کی چہل پہل کے بدلے مایوسی کا ایک کف دست حوصلہ شکن ریگستان نظر آیا۔ بستہ کھولے گھنٹوں بیٹھے رہے مگر کوئی مخاطب نہ ہوا۔ کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ مزاج کیسا ہے۔ نئے موکل تو خیر' بڑے بڑے پرانے موکل جن کا منشی جی کے ساتھ پشتوں سے تعلق چلا

آتا تھا' آج ان سے گریز کرنے لگے۔ وہ نالائق اور بد تمیز رمضان خاں کیسا بے شعور آدمی تھا۔ املا تک غلط لکھتا۔ منشی جی اس کا خوب مضحکہ اڑاتے تھے مگر آج سیکڑوں آدمی اسے گھیرے ہوئے تھے۔ بے تمیز گوپیوں میں کنھیا بنا ہوا تھا۔ واہ ری قسمت! مؤکل کمبخت یوں منہ پھیرے چلے جاتے ہیں گویا کبھی کی جان پہچان ہی نہیں۔ دن بھر مؤکلوں کا انتظار کرنے کے بعد شام کو اپنے گھر کی طرف چلے۔ پژمردہ' مایوس' متفکر اور جوں جوں گھر نزدیک آتا تھا' مونگا کی تصویر سامنے آتی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ جب شام کو گھر کا دروازہ کھولا اور دو کتے جنہیں رام غلام نے شرارتاً بند کر رکھا تھا جھپٹ کر باہر نکلے تو منشی جی کے اوسان ختم ہوگئے۔ ایک چیخ مار کر زمین پر گر پڑے۔

انسان کا دل اور دماغ خوف سے جس قدر متاثر ہوتا ہے' اتنا کسی اور طاقت سے نہیں۔ محبت' افسوس' مایوسی' جدائی' نقصان۔ یہ سب دل پر کچھ نہ کچھ اثر کرتے ہیں مگر یہ اثرات ہلکے ہلکے جھونکے ہیں اور خوف کا اثر طوفان ہے۔ منشی رام سیوک پر بعد کو کیا گزری' یہ معلوم نہیں۔ کئی دن تک لوگوں نے انہیں روزانہ کچہری جاتے اور وہاں سے افسردہ و پژمردہ لوٹتے دیکھا۔ کچہری جانا ان کا فرض تھا اور گو وہاں مؤکلوں کا قحط تھا مگر تقاضے والوں سے گلا چھڑانے اور انہیں اطمینان دلانے کے لئے اب یہی ایک لٹکارہ گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کئی ماہ تک نظر نہ آئے۔ بدری ناتھ چلے گئے۔

ایک دن گاؤں میں ایک سادھو آیا۔ بھبوت رمائے' لمبی لمبی جٹائیں' ہاتھ میں کمنڈل۔ اس کی صورت منشی رام سیوک سے بہت ملتی تھی۔ آواز اور رفتار میں بھی زیادہ فرق نہ تھا۔ وہ ایک پیڑ کے نیچے دھونی رمائے بیٹھا رہا۔ اسی رات کو منشی رام سیوک کے گھر سے دھواں اٹھا۔ پھر شعلے نظر آئے اور آگ بھڑک اٹھی۔ ناگن کی آتش تقریر بھی کبھی اس قدر نہ بھڑکی تھی۔ گاؤں کے سینکڑوں آدمی دوڑے۔ مگر آگ بجھانے کے لئے نہیں۔ تماشا دیکھنے کے لئے۔ ایک بے کس کی آہ میں کتنا اثر ہے!

صاحب زادہ رام غلام منشی کے غائب ہو جانے پر اپنے ماموں کے یہاں چلے گئے اور وہاں کچھ دنوں رہے۔ مگر وہاں ان کی خوش فعلیاں نہ پسند کی گئیں۔ ایک روز آپ نے کسی کے کھیت میں ہولے نوچے۔ اس نے دو چار دھول لگائے۔ اس پر آپ اس قدر برہم ہوئے کہ جب اس کے چنے کھلیان میں آئے تو جا کر آگ لگادی۔ ایک کے پیچھے سارا کھلیان جل کر راکھ ہو گیا۔ ہزاروں روپے کا نقصان ہوا۔ پولیس نے تحقیقات کی۔ حضرت گرفتار ہوئے۔ اپنے قصور کا اقبال کیا اور اب چنار کے رفار میٹری اسکول میں موجود ہیں۔

رہائی

(1)

"بیٹی سوشیلا۔ اب رہنے دے۔ بارہ تو بج گئے۔ سویرے دیکھا جائے گا۔ آج سارا دن اور اتنی رات کام کرتے ہی گزری ہے۔"

رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ دنیا کا بیشتر حصہ نیند کی گود میں خراٹے لے رہا ہے۔ جاگ صرف وہ لوگ رہے ہیں جنہیں جاگنے میں سونے کی بہ نسبت زیادہ مزا اور آرام ملتا ہے یا وہ لوگ جو دن کو رات اور رات کو دن سمجھتے ہیں اور یا پھر وہ لوگ جو رات کی تاریکی اور لوگوں کے عالم خواب سے ناجائز فائدہ اٹھانے کو بے چین رہتے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ کچھ اور قسم کے لوگ بھی جاگ رہے ہیں۔ یہ لوگ وہ ہیں۔ جن کے پیٹ پالنے کے لیے دن کے بارہ گھنٹے کافی نہیں۔ جن کے لئے سونے اور آرام کرنے کا مطلب دوسرے دن فاقہ کرنا ہے۔ جو نیند کی دیوی کے محبت بھرے وصال کی طرف سے بے رخی کا اظہار اس لئے کر رہے ہیں کہ اس کے بدلے میں انہیں دوسرے دن بھوک کی ڈائن کی سختیاں سہنی پڑیں گی۔

ان کی آنکھیں جھکی پڑتی ہیں۔ سر چکرا رہا ہے۔ مگر پیٹ کو بھوک کی تکلیف سے بچانے کے لئے وہ اپنی بچی کھچی طاقت وہمت سے کام لے رہے ہیں۔

ایک چھوٹے سے مکان میں ارنڈی کے تیل کا دیا ٹمٹمار ہا ہے۔ اسی چراغ کے پاس ایک پھٹی پرانی چٹائی پر دو عورتیں جھکی ہوئی بیٹھی ہیں۔ ان کے سامنے ایک نیلی مخمل کا لہنگا ہے اور وہ دونوں اس پر سلمے ستارے کا کام بنا رہی ہیں۔ ایک کی عمر 50 سال کے لگ بھگ ہے اور دوسری کی 25 سال کے لگ بھگ۔ ان کی رک رک کر چلنے والی انگلیاں کام کرنے سے منہ موڑ رہی ہیں اور خاموش زبان میں یہ بتا رہی ہیں کہ وہ اس قدر تھکی ہوئی ہیں کہ ان سے زیادہ کام لینا گویا ان پر ظلم کرنا ہے۔

کام کرتے کرتے یکایک بڑھیا نے سوئی چھوڑ دی۔ چند ساعت آنکھوں پر ہاتھ رکھے رہنے کے بعد وہ بولی:۔

''بٹی سوشیلا! اب رہنے دے بارہ تو بج گئے ہیں سویرے دیکھا جائے گا۔ آج سارا دن اور اتنی رات کام کرتے ہی گزری ہے۔''

سوشیلا اسی طرح کام کرتی ہوئی بولی۔ ''نہیں سویرے نہیں۔ ابھی ختم کئے دیتی ہوں۔ اگر یہ لہنگا ادھورا رہ گیا تو کل پیسے کہاں سے آئیں گے۔''

بڑھیا۔ ''چولھے میں جائیں پیسے۔ اگر آنکھیں نہیں تو پیسوں کو کیا کریں گے؟''

سوشیلا۔ ''آنکھیں رہیں یا جائیں۔ پیٹ تو کھانے کو مانگے گا ہی۔ کیا اندھے کھانا نہیں کھاتے؟''

بڑھیا۔ ''اچھا بٹی! میری آنکھیں تو اس وقت کام نہیں کرتیں۔ میں تو اٹھتی ہوں۔''

سوشیلا۔ ''ہاں ہاں! تم جا کر سو رہو۔''

بڑھیا۔ ''لڑکا کہتا تھا۔ کل فیس دینی ہے۔ اور یہاں بھونی بھانگ بھی گھر میں نہیں ہے۔''

سوشیلا۔ ''لہنگا تو ابھی ختم کئے دیتی ہوں۔ اسے دوکان دار کے ہاں لے جانا اور روپیہ لانا آپ کا کام ہے۔''

بڑھیا۔ ''اگر اس نے روپے نہ دیئے تو؟''

سوشیلا۔ ''ماں۔ ایشور پر بھروسہ رکھو۔ اگر وہ نہ دے گا تو کوئی دوسرا وسیلہ نکل آئے گا۔''

بڑھیا لہنگے کو ایک طرف سرکا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پاس ہی کونے میں ایک میلا بچھونا بچھا ہوا تھا۔ اور اس پر ایک طرف آٹھ دس سال کا لڑکا سو رہا تھا۔ بڑھیا بھی اسی چارپائی پر لیٹ گئی اور جلد ہی سو گئی۔

جب ماں سو گئی تو سوشیلا اٹھی اور اس نے ایک انگڑائی لی تھوڑا سا پانی پیا۔ آنکھوں پر پانی کے دو چار چھینٹے

مارے اور پھر اپنی جگہ پر بیٹھ کر کام کرنے لگی۔

سوشیلا یہ خیال کر کے کہ تھوڑا سا کام اور ہے زبردستی کام کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ بیچ میں اس نے ایک بار اور پانی پیا اور آنکھیں دھوئیں۔ آخرکار تقریباً ڈیڑھ بجے سوشیلا نے آخری ٹانکہ لگایا۔

اب اس میں اتنا دم نہیں تھا کہ اٹھ کر چارپائی پر جاتی۔ کام ختم ہوتے ہی اس نے سوئی ہاتھ سے رکھ دی۔ چراغ کو منہ سے پھونک مار کر بجھادیا۔ اور اس کے بعد اسی چٹائی پر لیٹ کر سو گئی۔

حالانکہ اتنی رات گئے سوئی تھیں۔ مگر دونوں عورتوں کے فکر مند دلوں نے انہیں پوری نیند نہ لینے دی۔ صبح چھ ہی بجے دونوں بیدار ہو گئیں۔ اگرچہ تھکے ہوئے جسم ابھی اور آرام کرنا چاہتے تھے۔ آنکھوں میں پھر بھی ابھی نیند کا پورا پورا غلبہ تھا۔ مگر پھر بھی حوائج سے فارغ ہو کر آٹھ بجنے سے ذرا پہلے سوشیلا نے اپنی ماں سے کہا۔

"اماں! اب تم بھیا کو ساتھ لے جا کر لہنگا دے آؤ۔ پھر یہ اسکول چلا جائے گا۔"

یہ کہہ کر سوشیلا نے لہنگے کو ایک کپڑے میں لپیٹ دیا۔

بڑھیا لہنگا لے کر رادھے کے ساتھ بازار میں ایک دکان پر پہنچی۔ یہ ایک بہت بڑی دکان تھی اور اس میں سلمے ستارے اور چکن کے کپڑے اور ٹوپیاں وغیرہ بکتی تھیں۔

دکان پر پہنچ کر بڑھیا نے دکاندار کو لہنگا دیا۔

دکاندار نے لہنگا کھولا اسے پلٹ کر دیکھنے کے بعد بولا۔ "کچھ بہت اچھا تو بنا نہیں۔ کچھ سلمہ بچا ہے؟"

بڑھیا۔ "ہاں تھوڑا سا بچا ہے۔"

دکاندار۔ "اچھا! اسے ابھی اپنے پاس رہنے دو۔ ایک ٹوپی بنوانی ہے اسی میں لگا دینا۔ ہاں! تو یہ کام تم نے کچھ جی کر کے نہیں کیا۔"

بڑھیا۔ "پندرہ دن سے ہم دونوں اسی کام میں لگے رہے تب جا کر کہیں یہ آج بن سکا۔ اچھا نہیں بنا تو برا بھی نہیں بنا۔ کوئی بیل بوٹا ٹیڑھا ترچھا نہیں ہوا۔ جیسا تم نے کہا تھا۔ ویسا ہی بنایا ہے۔"

دکاندار۔ "ٹیڑھا ترچھا نہ سہی۔ پھر بھی بہت اچھا نہیں بنا۔ خیر! اس کی بنوائی دو تین دن میں لے جانا۔ ایک ٹوپی بھی لے جاؤ۔ اسے جلد ہی بنا کر دے جانا۔"

بڑھیا۔ "لاؤ۔ ٹوپی دے دو۔ اور اس کی بنوائی بھی ابھی دے دو تو بڑا کام کرو۔ گھر میں کھانے پینے کو نہیں رہا۔ رادھے کی فیس بھی دینی ہے۔"

دکاندار چند لمحے سوچتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ "اچھا! تو اس کی بنوائی سات روپے ہوئے کیوں نہیں؟"

بڑھیا عاجزی سے بولی۔ "اب تم ہی سمجھ لو بیٹا! میں کیا کہوں۔ پندرہ دن کام کیا ہے۔"

دکاندار۔ "سات روپے بھی تو تھوڑے نہیں ہیں۔ تمہیں تو ہم ایک آدھ روپیہ زیادہ ہی دے دیا کرتے ہیں۔"

بڑھیا۔ "بیٹا! سات روپے میں تو پیٹ نہیں بھرتا کچھ اور دو۔ ہم بڑے غریب ہیں۔ گھر میں کوئی مردمانس نہیں جو آج اس لڑکے کا باپ یا جیجا (بہنوئی) ہوتا تو ہمیں یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔" یہ کہہ کر بڑھیا آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

دکاندار بولا۔ "اچھا آٹھ روپے دیں گے۔ بس اب تو خوش ہو؟"

بڑھیا۔ ’’بیٹا! بھگوان تمہیں دودھ پوت سے سکھی رکھے۔ تمہاری بدولت ہمارا بھی پیٹ بھرتا ہے۔‘‘
دکاندار نے بڑھیا کو آٹھ روپے دیئے۔ ٹوپی کا پلّہ بھی دے دیا اور اس کے متعلق ضروری باتیں سمجھا دیں۔
بڑھیا کے چلے جانے پر دکاندار نے اپنے منیب کو مخاطب کر کے کہا۔ ’’یہ لہنگا تیار ہو گیا ہے۔ اسے آج ہی رائے صاحب کے ہاں بھجوا دینا۔ ساتھ ہی اس کی اجرت کا پرچہ بھی بھیج دینا۔‘‘
منیب نے پوچھا۔ ’’کتنے کا پرچہ بناؤں؟‘‘
دکاندار کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ’’ایک سو چالیس روپے کا پرچہ بنا دینا۔ سو روپے مال کے اور چالیس بنوائی۔‘‘

رائے صاحب بابو جوتی سروپ کے بڑے بیٹے بابو کرشن سروپ ایک انگریزی اخبار پڑھ رہے تھے۔ پاس ہی ان کے دو تین دوست بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ یکایک کرشن سروپ نے اخبار میز پر رکھ دیا اور بولے۔ ’’آج کل بڑی ہڑتالیں ہو رہی ہیں۔ یہ بات کیا ہے؟ آخر یہ مزدور چاہتے کیا ہیں؟ کیا ان لوگوں کی خواہش ہے کہ سرمایہ لگانے والوں کے برابر منافع میں انہیں بھی حصہ ملا کرے؟‘‘
ایک دوست نے کہا۔ ’’برابر نہ سہی۔ کم سے کم اتنا تو ضرور ملے۔ جس میں وہ آرام سے گزارہ کر سکیں۔‘‘
کرشن سروپ منہ بنا کر بولے۔ ’’یہ کیونکر ہو سکتا ہے؟ جو روپے لگائے گا۔ دماغ خرچ کرے گا۔ وہ اپنی کمائی میں سے دے کر نقصان کیوں اٹھانے لگا۔‘‘
دوسرا۔ ’’صرف روپیہ دینے ہی سے اسے اس قدر اختیار حاصل نہیں ہو سکتا کہ وہ مزدوروں سے سخت شدید کام لے اور مزدوری اتنی دے۔ جیسے کتے کو روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے۔ ایک مزدور سے کسی سرمایہ دار کو پانچ روپے کا فائدہ ہوتا ہے اور وہ ان پانچ روپوں میں سے مزدور کو صرف دو آنے یا چار آنے دیتا ہے۔ باقی خود ڈکار جاتا ہے۔ تو یہ بے انصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ بالخصوص اس حالت میں جب ان دو چار آنوں سے مزدور کا پیٹ نہیں بھرتا۔‘‘
کرشن۔ اگر دو چار آنوں میں اس کا پیٹ نہیں بھرتا تو وہ ایسی جگہ مزدوری ہی کیوں کرے؟ اس جگہ کیوں نہ کرے جہاں زیادہ ملے؟‘‘
تیسرا۔ آپ بھی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔ زیادہ دیتا ہی کون ہے؟ سب کا یہی حال ہے۔ اگر ایک آدھ ایسا ہو بھی تو اس سے کتنے مزدوروں کا کام چل سکتا ہے؟ ایک دو سرمایہ دار تو دنیا بھر کے مزدوروں کو رکھ نہیں سکتے۔‘‘
کرشن۔ ’’ہاں! ممکن ہے۔ مگر میری سمجھ میں تو مزدور مزدور ہی ہے۔ اسے مزدوری ہی دی جاوے گی۔ علاوہ اس کے اتنا اندھیر تو شاید ہی کہیں ہوتا ہو کہ جس مزدور سے پانچ روپے کا فائدہ ہو۔ اسے صرف دو چار ہی آنے دیئے جائیں۔‘‘
تیسرا۔ ’’شاید ہی کہیں نہیں۔ سب جگہ ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو یہ کب ممکن ہو سکتا ہے کہ بڑی بڑی کمپنیوں‘ کارخانوں کا سرمایہ بڑھتا ہی جائے اور بیچارے مزدور وہی موچی کے موچی بنے رہیں۔‘‘
کرشن۔ ’’روپیہ لگانے والے سرمایہ بڑھانے کے لئے ہی لاگت لگاتے ہیں۔ اور مزدور صرف اپنا پیٹ

بھرنے کے لئے مزدوری کرتے ہیں۔"

چوتھا۔ "اگر پیٹ بھی بھر جایا کرے تو بھی ٹھیک ہے مگر مشکل تو یہی ہے کہ ان کا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔"

دوسرا۔ "پیٹ بھرنے کا کہیں یہ مطلب نہ نکال لیجئے گا کہ چنے چبا کر بھی پیٹ بھر سکتا ہے۔ اپنے لئے آپ پیٹ بھرنے کے یہ معنی لیتے ہیں کہ انواع واقسام کے گھی سے چپھاتے ہوئے پکوان ہوں۔ کھٹی میٹھی چیزیں ہوں۔ ربڑی ہو۔ بالائی ہو۔ دودھ ہو اور ان کے لئے پیٹ بھرنے کا مطلب "کہ چنے چبا کر بھی پیٹ بھر سکتے ہیں۔"

کرشن۔ "(کچھ سوچ کر) نہیں۔ اس قدر بے انصافی تو میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مگر ساتھ ہی میں یہ بھی ٹھیک نہیں سمجھتا کہ مزدوروں کی ہمت اتنی بڑھائی جائے کہ وہ سرمایہ داروں کے منافع پر دانت رکھیں۔"

پہلا۔ "تو صاحب! معاف کیجئے گا۔ میں کہوں گا۔ کہ یہ خود غرضی ہے۔"

کرشن۔ "خود غرضی ہے۔ کس طرح؟"

پہلا۔ "لیجئے! عرض کرتا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ یہ سرمایہ دار کس کے بل بوتے پر اتنے اکڑتے اور تنتے ہیں۔"

کرشن۔ "روپے کے سر پر۔ بھائی! تمہیں شاید معلوم نہیں کہ روپیہ روپے کو کھینچتا ہے۔ اگر کسی کے پاس روپیہ ہو تو وہ اپنی عقل کی بدولت اسی سے ہزاروں اور پیدا کر سکتا ہے۔"

پہلا۔ "لیکن پیدا کس کے ذریعے کرے گا؟ آدمی ہی تو تلاش کرے گا۔ پھر بھلا یہ کون سا انصاف ہے کہ محنت کریں مزدور۔ اور پھل کھائے سرمایہ دار۔ آخر مزدوروں کا بھی تو کچھ حصہ ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر سرمایہ دار ذرا بھی انصاف سے کام لیں تو آئے دن کے تمام جھگڑے بکھیڑے مٹ جائیں اور ہمارا ملک دنوں میں خوشحال ہو جائے۔"

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گلاب چند اینڈ سنز کا آدمی کپڑے میں کوئی چیز لپیٹی ہوئی لے کر داخل ہوا اور سلام کر کے کپڑا بابو کرشن سروپ کے ہاتھ میں دے کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ کرشن سروپ نے کپڑا کھول کر دیکھا تو جھم جھم کرتا ہوا لہنگا نظر آیا۔ باچھیں کھل گئیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہوئے کہنے لگے۔ "دیکھو کتنا اچھا کام ہے۔" دوستوں نے بھی دیکھ کر کام کی تعریف کی۔ اس کے بعد کرشن سروپ نے لفافہ پھاڑ کر اندر سے بل نکالا۔ بل پڑھ کر چپراسی سے بولے۔ "اچھا روپے شام کو یا کل بھجوا دیئے جائیں گے۔"

"بہت اچھا۔" کہہ کر اور سلام کر کے چپراسی کمرے سے نکل گیا۔

جب چپراسی چلا گیا تو کرشن سروپ کے دوستوں نے ان سے پوچھا۔ "یہ کتنی قیمت کا ہے؟"

کرشن۔ "اب یہ سمجھ لیجئے کہ سو روپے کی تو مخمل ہے۔ دس گز سو روپے کی زری لگی ہے اور چالیس روپے بنوائی۔"

دوسرا۔ "چالیس روپے بنوائی! چالیس روپے تو کچھ زیادہ نہیں ہیں۔"

کرشن۔ "چالیس روپے میں صرف زری کا کام بنا ہے۔ لہنگے کی سلائی الگ ہے۔"

تیسرا۔ "پھر بھی کچھ زیادہ نہیں۔ کام کو دیکھتے ہوئے مناسب ہی ہے۔"

کرشن۔ "ہم سے زیادہ لے بھی نہیں سکتے۔ آرڈر دے کر بنوایا ہے۔ مخمل ہماری' زری ہماری' لہنگے کی سلائی ہماری۔ صرف انہوں نے بنوا دیا ہے۔"

چوتھا۔ ''بنابنایا لیتے تو کچھ اور زیادہ دام لگ جاتے۔''

کرشن۔ ''بلاشبہ زیادہ لگتا۔ کیونکہ وہ اپنا منافع بھی تو لیتے۔ صرف زری کے کام کی بنوائی میں زیادہ منافع کی گنجائش نہیں ہے۔ دو چار روپے بچ بھی گئے تو کیا۔''

پہلا۔ ''ان کے ہاں کاریگر نوکر ہوں گے؟''

کرشن۔ ''اور نہیں تو کیا؟ نوکر نہ ہوں تو کام کیسے چلے؟ اچھا بڑا کارخانہ ہے۔ معمولی فرم نہیں ہے۔''

مذکورہ بالا واقعہ کے چار پانچ روز بعد کرشن سروپ کے ایک دوست جنہیں ہم نے تیسرا نمبر دیا ہے' ''گلاب چند اینڈ کمپنی'' کے ہاں پہنچے۔ ان کا نام برج بہاری تھا۔ انہیں بھی کچھ زری کا کام بنوانا تھا۔ اسی لئے کرشن سروپ سے گلاب چند کمپنی کے بارے میں یہ معلوم کر کے کہ وہ کرشن سروپ کا کام مناسب اجرت پر کر دیتی ہے انہوں نے بھی اس کمپنی سے کچھ کام کرانے کا فیصلہ کیا۔

دکان پر پہنچ کر برج بہاری نے پہلے ان کے ہاں کا جدا جدا قسم کا کام دیکھا۔ اس کے بعد انہیں جو کچھ بنوانا تھا' اس کے متعلق گفتگو کی۔ ابھی وہ بات چیت کر ہی رہے تھے کہ سوشیلا کی ماں رادھے کو ساتھ لئے آ پہنچی۔ اور سیدھے گلاب چند کے پاس آ کر اس نے ان کے ہاتھ میں ایک ٹوپی دے دی۔ گلاب چند نے جلدی سے ٹوپی کو دیکھ کر بڑھیا سے کہا۔ ''اچھا! اب اس وقت تم جاؤ۔ کل کسی وقت ملنا۔''

بڑھیا نے عاجزانہ انداز سے کہا۔ ''اس کی بنوائی دے دو تو اچھا ہو۔''

گلاب چند ذرا ناخوش ہو کر بولے۔ ''بنوائی مل جائے گی ابھی مجھے فرصت نہیں ہے۔ ابھی تین چار ہی دن تو ہوئے۔ روپے لے گئی تھی۔''

بڑھیا۔ ''ہاں بیٹا! لہنگے کی بنوائی کے آٹھ روپے جو تم نے دیئے تھے۔ وہ سب خرچ ہو گئے۔ کچھ کا کھانے پینے کو آ گیا۔ کچھ ادھر ادھر خرچ ہو گئے۔''

گلاب چند نے غصہ ہو کر کہا۔ ''تم سے حساب کون پوچھتا ہے؟ فضول بک بک لگا رکھی ہے۔ جاؤ۔ اپنا کام دیکھو۔ جب فرصت ہو گی اس وقت تمہارا حساب دے دیں گے۔ چلو ہٹو۔''

بڑھیا اپنا سا منہ لے کر وہاں سے آہستہ آہستہ چل دی۔

گلاب چند نے برج بہاری کو مخاطب کر کے کہا:۔

''ہاں! تو آپ آرڈر دے جایئے۔ آپ کا کام تیار ہو جائے گا۔ یہ یقین رکھئے کہ قیمت مناسب لی جائے گی اور کام وقت پر دیا جائے گا۔''

مگر برج بہاری صاحب کسی اور ہی دھن میں تھے انہوں نے پوچھا۔ ''یہ بڑھیا کون ہے؟''

گلاب چند۔ ''ہمارے ہاں کا کچھ کام بناتی ہے۔ صاحب! کاریگروں نے ناک میں دم کر رکھا ہے ایک ایک کے دو دو لیتے ہیں۔ پھر بھی ہر گھڑی چھاتی پر سوار ہو کر لاؤ روپیہ لاؤ روپیہ کی رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ ان کے پاس ہمارا کچھ نہ کچھ پیشگی ہی رہتا ہے۔ پیشگی نہ دیں تو کام نہ کریں۔ کیا کریں ناچار دینا ہی پڑتا ہے۔''

برج بہاری کچھ سوچ کر بولے۔ ''اچھا! میں پھر کسی وقت آؤں گا۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی سے دکان کے باہر آئے اور ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ تھوڑی ہی دور پرے سوشیلا کی ماں رادھے کو ساتھ لئے ہوئے آہستہ آہستہ چلی جا رہی تھی۔ برج بہاری لپک کر اس کے پاس پہنچے۔ پاس جا کر انہوں

نے بڑھیا سے کہا۔ ”کیوں! مائی جی! تم کہاں رہتی ہو؟“

بڑھیا نے پہلے تھوڑی دیر تک بہاری کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ پھر بولی۔ ”یہی چاول والی گلی میں رہتی ہوں۔“

برج بہاری۔ ”تم زری کا کام کرتی ہو؟“

بڑھیا۔ ”ہاں بیٹا! بناتی تو ہوں کیا کروں۔ یہ پیٹ سب کچھ کراتا ہے۔ گھر میں کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ اسی سے پیٹ پالتی ہوں۔“

برج۔ ”تمہارے اور کوئی نہیں ہے؟“

بڑھیا۔ ”ایک بیوہ لڑکی ہے اور یہ لڑکا ہے۔ اور کوئی نہیں ہے۔“

برج۔ ”مجھے بھی کچھ کام بنوانا ہے بنا دوگی؟“

بڑھیا۔ ”ہاں! بنا کیوں نہ دیں گے۔ ہمارا گزارہ تو اسی سے چلتا ہے۔“

برج۔ ”مگر مجھے اپنا کام بنوانا ہے۔ ایسا ویسا نہیں۔“

بڑھیا۔ ”اچھا ہی بنا دیں گے۔ ابھی تین چار دن ہوئے گلاب چند کو ایک نیلی مخمل کے لہنگے پر زری کا کام بنا کر دیا ہے۔ اسے تم دیکھتے تو معلوم ہو جاتا کہ ہم کیسا کام بناتے ہیں۔“

برج بہاری چونک کر بولے۔ ”نیلی مخمل کا لہنگا؟“

بڑھیا۔ ”ہاں نیلی مخمل کا۔“ اس پر بڑے بڑے بوٹے اور بیل بنائی گئی ہے۔“

برج۔ ”کتنے دن ہوئے؟“

بڑھیا۔ ”بنا کر دیئے ہوئے ابھی تین یا چار دن ہوئے ہیں۔“

برج۔ ”رائے صاحب؟“

بڑھیا۔ ”اب یہ تو میں جانتی نہیں۔ گلاب چند نے مجھ سے بنوایا تھا۔ چاہے کسی کا ہو۔“

برج۔ ”اس کی بنوائی تمہیں کیا ملی تھی؟“

بڑھیا۔ ”آٹھ روپے۔“

برج بہاری ذرا متحیر ہو کر بولے۔ ”آٹھ روپے! تو وہ نہ ہوگا۔ کوئی اور ہوگا۔ اس کی اجرت تو چالیس روپے تھی۔“

برج بہاری نے اپنے کام کے متعلق سمجھا کر کہا۔ ”اس کی بنوائی کیا لوگی؟“

بڑھیا۔ ”جو گلاب چند دیتے ہیں۔ وہی تم بھی دیدینا۔“

برج۔ ”وہ کیا دیتے ہیں؟“

بڑھیا۔ ”اتنے کام کے پانچ روپے دیتے ہیں۔“

برج بہاری بے حد متعجب ہو کر بولے۔ ”پانچ روپے!“

بڑھیا۔ ”ہاں! پانچ روپے! میں تم سے جھوٹ نہ کہوں گی۔ پانچ روپے دیتے ہیں۔ کم نہیں دیتے۔“

برج۔ ”مگر وہ تو اس کی بنوائی..........“

اتنا کہہ کر برج بہاری ذرا جھجکے۔ مگر ویسے ہی بات کا رخ بدل کر بولے۔ ”اچھا! تم مکان دکھا دو۔ میں

تمہیں سب سامان بھجوادوں گا۔"

سوشیلا کی ماں نے برج بہاری کی تجویز منظور کرلی اوران کو ساتھ لے کر اپنے گھر پہنچی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر بولی۔ "یہیں بھیجوا دینا۔"

برج بہاری نے جیب سے چارروپے نکال کر کہا:۔

"گلاب چند سے جو کچھ تم نے کہا تھا' اس سے مجھے پتہ لگا کہ اس وقت تمہیں روپوں کی ضرورت ہے۔ اس لئے اپنے کام کی بنوائی میں سے چارروپے پیشگی دیتا ہوں۔"

بڑھیا روپے لیتے ہوئے کچھ جھجکی۔ مگر برج بہاری زبردستی اس کے ہاتھ میں روپے رکھ کر چل کھڑے ہوئے۔

سوشیلا کی والدہ کے مکان سے لوٹ کر برج بہاری سیدھے کرشن سروپ کے پاس پہنچے۔ اور بولے۔ 'تھوڑی دیر کے لئے آپ مجھے وہ لہنگا دے دیجئے۔ جو پرسوں بن کر آیا ہے۔"

کرشن سروپ نے مسکرا کر کہا۔ "کیوں ویسا بنوانے کی مرضی ہے کیا؟"

برج۔ "ہاں کچھ ایسی ہی مرضی ہے۔"

کرشن سروپ نے لہنگا منگوادیا۔

برج بہاری وہ لہنگا اور اپنے کام کے لئے ضروری سامان لے کر پھر سوشیلا کے مکان پر پہنچے۔ جاتے ہی پہلے انہوں نے وہ لہنگا بڑھیا کو دکھا کر پوچھا۔ "یہی لہنگا تمہارا بنایا ہوا ہے ؟"

بڑھیا اور سوشیلا ایک آواز سے بولیں۔ "جی ہاں! یہی لہنگا ہے۔"

یہ سن کر برج بہاری کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ سوچنے لگے۔ صرف اس کے بنوانے کی دلالی میں گلاب چند بتیس روپے کھا گیا اور جنہوں نے لہو پسینہ ایک کر کے بنایا' انہیں گنتی کے آٹھ ہی روپے دیئے۔

برج بہاری نے پوچھا۔ "تم نے یہ لہنگا کتنے دن میں تیار کیا تھا؟"

بڑھیا نے جواب دیا۔ "پندرہ دن تک ہم دونو ماں بیٹی لگے رہے تھے۔ تب جا کر یہ کہیں تیار ہوا تھا۔ رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک کام کیا تھا۔"

برج بہاری کے تہِ دل سے ایک آہ نکلی۔ انہوں نے سوچا۔ اگر ان کو ان کی محنت کا نصف منافع بھی مل جایا کرے تو ان کے افلاس و تنگدستی میں بہت کچھ کمی ہو سکتی ہے۔

برج بہاری نے پوچھا۔ "معلوم ہے۔ اس کی بنوائی گلاب چند نے کیا لی ہے ؟"

بڑھیا نے کہا۔ "ہم کیا جانیں بیٹا؟"

برج۔ "یہ میرے ایک واقف کے گھر کا لہنگا ہے۔ گلاب چند نے ان سے اس کی بنوائی چالیس روپے لی ہے ؟"

سوشیلا اور اس کی ماں دونو صمٌ بکمٌ برج بہاری کے منہ کی طرف دیکھنے لگیں۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہیں۔ اس کے بعد سوشیلا ایک لمبی سانس لے کر بولی۔ "چاہے کچھ ہی لے۔ ہمیں کیا؟ ہمیں جو دیتا ہے۔ ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں۔ اتنا بھی دیتا ہے غنیمت ہے۔"

برج۔ ”تو تم اس کے لئے کام کیوں کرتی ہو؟ خود ادھر ادھر سے کام کیوں نہیں لے آتیں؟“

بڑھیا۔ ”ہم نے پہلے یہی کام کر کے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے ہمیں کام نہیں دیا۔ لوگ کہنے لگے۔ تمہیں ہم کیا جانیں؟ ہمارا مال ہی لے کر چل دو۔ تو ہم کیا کریں؟ ہم نے یہ بھی کہا کہ تمہارے مکان پر بیٹھ کر بنا دیا کریں۔ مگر اس پر کوئی راضی نہ ہوا۔“

برج۔ ”گلاب چند تمہیں پیشگی بھی دیتا رہتا ہے؟“

بڑھیا۔ ”جب کبھی بہت ہاتھ پاؤں جوڑتی ہوں تو دو چار روپے دے دیتا ہے اور کبھی نہیں بھی دیتا۔“

برج۔ ”اچھا۔ میں اپنے کام کی بنوائی تمہیں پندرہ روپے دوں گا۔ چار روپے دے چکا ہوں۔ پانچ روپے یہ اور لو۔ باقی چھ روپے اس وقت دوں گا جب کام بن جائے گا۔ اب ایک کام یہ کرنا کہ گلاب چند کا کام اس قدر کم اجرت پر کبھی نہ کرنا۔ کم از کم اس کا اڑھائی گنا دے تو کرنا۔“

پانچ روپے کے کام کے پندرہ روپے اور اس میں سے نو روپے پیشگی ملتے دیکھ کر ماں بیٹی کی آنکھوں میں شکر گزاری کے آنسو بھر آئے۔

بڑھیا بولی۔ ”یہ تو بیٹا تم نے جو کہا سو ٹھیک ہے۔ مگر گلاب چند ایسا کیوں کرے گا؟“

برج۔ ”نہ کرے تو تم بھی اس کا کام نہ کرنا۔“

بڑھیا۔ ”کام نہ کریں گے تو کھائیں گے کیا؟“

برج بہاری یہ سن کر فکر میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ دیر تک سوچ کر بولے۔ ”اس کے لئے تم مت گھبرانا۔ میں تمہیں کام دیا کروں گا۔“

یہ کہہ کر برج بہاری ان سے رخصت ہوئے اور سیدھے کرشن سروپ کے پاس پہنچے۔ ان کے روبرو سارا کچا چٹھا بیان کر کے بولے۔ ”دیکھ لی آپ نے گلاب چند کی شرافت؟ آپ اسے بڑا شریف آدمی سمجھتے تھے!“

کرشن سروپ بھی سن کر متحیر رہ گئے۔ کہنے لگے۔ ”مجھے خواب میں بھی یہ امید نہ تھی کہ وہ اس طرح غریبوں کے گلے کاٹتا ہے۔“

برج۔ ”اور نہیں تو کیا؟ یہ تو صرف انہی عورتوں کی ایک مثال ہے۔ اس کے پاس تو بیس پچیس کاریگر ہوں گے۔ اس روز آپ ان سرمایہ داروں کی طرفداری کر رہے تھے۔ دیکھے ان کے کرتوت؟ یہ تو ایک چھوٹی سی مثال آپ کو ملی ہے۔ اسی سے آپ بڑی بڑی ملوں اور کارخانوں کے حال کا بھی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ خیر یہ تو جو ہے وہ ہے۔ اب میں نے گلاب چند کے ہوش و حواس درست کرنے کا تہیہ کیا ہے۔ آپ کو اس کام میں میری مدد کرنی پڑے گی۔“

کرشن۔ ”کہو۔“

برج۔ ”میرا ارادہ ایک دکان کھولنے کا ہے۔ اس میں یہ قاعدہ رکھا جائے کہ جو کاریگر جتنے کا کام کرے‘ اس کا نصف حصہ کاریگر کو دیا جائے اور نصف فرم لے۔ اس کے علاوہ سال بھر میں جو منافع ہو‘ اس سے بھی انہیں کچھ دیا جائے۔“

کرشن۔ ”سکیم تو اچھی ہے۔“

برج۔ ”اچھی ہو یا بری۔ میں اسے ضرور عملی جامہ پہناؤں گا اور اس میں آپ کو میری مدد کرنی پڑے گی۔“

کرشن۔ ''میں حاضر ہوں۔ جیسا کہو گے ویسا کرونگا۔ اس واقعہ کو سن کر مجھے بھی ان سرمایہ داروں سے نفرت ہوگئی ہے۔''

مذکورہ بالا واقعہ کے ایک ماہ بعد ''کرشن اینڈ کمپنی ایمبرائڈرز'' نام کی ایک بڑی فرم قائم ہوگئی۔ اس فرم نے ایک اشتہار شائع کیا۔ جس میں کاریگروں کے لئے کام کرنے کی شرائط چھپی ہوئی تھیں۔ وہ شرائط اس قدر سہولت بخش تھیں کہ کرشن اینڈ کمپنی کو دھڑادھڑ کاریگر ملنے لگے۔ رفتہ رفتہ اس کا پتہ گلاب چند اینڈ کمپنی کے کاریگروں کو لگا۔ گلاب چند سے انہیں جو اجرت ملتی تھی' اس سے کرشن اینڈ کمپنی کی اجرت کا موازنہ کیا تو کتنے کا فرق پایا۔ اس حساب سے گلاب چند کے ہاں جو ایک روپیہ ملتا تھا تو کرشن اینڈ کمپنی کے ہاں تین روپے ملنے کی امید تھی۔ بعض لوگ ایسے تھے جو گلاب چند کا پیشگی روپیہ کھائے بیٹھے تھے۔ چنانچہ جب تک وہ لوگ وہ روپیہ ادا نہ کر دیتے' اس وقت تک گلاب چند کے ہاں سے کام چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسوں میں بھی بہتوں نے قرض لے کر گلاب چند کا روپیہ ادا کر دیا۔ جنہیں قرض نہ ملا۔ انہوں نے اپنی مشکلات کرشن اینڈ کمپنی کے روبرو بیان کیں۔ کرشن اینڈ کمپنی نے فوراً ان کا قرض چکا کر انہیں گلاب کے پنجے سے چھڑا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گلاب چند کے سب کاریگر کرشن اینڈ کمپنی کے ہاں آگئے۔ گلاب چند نے بہت لالچ دیئے۔ مگر کاریگروں کو اس سے اس قدر نفرت ہوگئی تھی کہ انہوں نے ہرگز اس کا کام کرنا منظور نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گلاب چند کا دیوالیہ نکل گیا۔ ادھر کرشن اینڈ کمپنی کا کام دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ اس کے کاریگر چاروں طرف اس کے گن گاتے پھرتے تھے۔ اس کا اثر عوام پر اچھا پڑا۔ لوگوں کو کرشن اینڈ کمپنی پر اٹل اعتقاد ہوگیا۔

ایک سال کے بعد کا ذکر ہے

''بٹی سوشیلا! اب تو رادھے کے بیاہ کی تیاری کرنی چاہیے۔''

ایک چھوٹے سے مگر صاف ستھرے مکان کے ایک دالان میں ایک موٹے گدیلے پر بیٹھی ہوئی سوشیلا کار چوبی کا کام کر رہی ہے۔ پاس ہی ایک چارپائی پر سوشیلا کی ماں مالا لئے بیٹھی ہے۔ مالا پھیرتے پھیرتے یکایک بڑھیا نے سوشیلا سے کہا۔ ''بٹی سوشیلا! اب تو رادھے کے بیاہ کی تیاری کرنی چاہیے۔''

سوشیلا نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ابھی سے۔ ابھی تو یہ بارہ ہی برس کا ہے۔''

بڑھیا۔ ''اور کیا بڑھاپے میں بیاہ ہوگا؟ میری یہ ابھلاکھ (آرزو) ہے کہ میں رادھے کی بہو کا منہ دیکھ کر مروں۔ میرے اتنے بھاگ کہاں جو ناتی پوتوں کا منہ دیکھوں؟''

سوشیلا ہنس کر بولی۔ ''کیوں بھاگ ہونے کو کیا ہوا؟''

بڑھیا۔ ''نا بٹی! میرے ایسے بھاگ نہیں۔''

عین اسی وقت رادھے کتابیں بغل میں دبائے اسکول سے آگیا۔ اور کتابیں ایک طرف رکھ کر بولا۔ ''جی جی!'' بڑی بھوک لگی ہے۔ کھانے کو دو۔''

سوشیلا نے کام چھوڑ دیا اور رادھے کو کھانا دیا۔

رادھے کھانا کھانے میں مشغول ہو کر بولا۔ "جی جی! راج برجو بابو (برج بہاری) کہتے تھے کہ تو جب بڑا ہو جائے گا تو تجھے ہم اپنی دکان پر رکھ لیں گے۔"

سوشیلا۔ "پھر کیا۔ جلدی جلدی پڑھ لے۔"

رادھے۔ "جی جی۔ میں یہ جماعت پاس کر لونگا۔ تو پھر نئی کتابیں لینی پڑیں گی۔"

سوشیلا۔ "تو پھر کیا ہوا لے دیں گے۔ اب ہمیں کیا کمی ہے؟ برجو بابو کی دکان بنی رہے اور ہمارے ہاتھ پاؤں چلتے رہیں۔ اب ہمیں کسی بات کی کمی نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر سوشیلا پھر اپنی جگہ پر آکر کام کرنے لگی۔

تائی

(1)

"تاؤ جی! ہمیں لیل گاڑی (ریل گاڑی) لادو گے؟"

یہ کہتا ہوا ایک پانچ سالہ لڑکا بابو رام جی داس کی طرف دوڑا۔

بابو صاحب نے دونوں بازو پھیلا کر کہا۔ "ہاں بیٹا! لادیں گے۔"

ان کے یہ کہتے کہتے لڑکا ان کے پاس آگیا۔ انہوں نے اس کو گود میں اٹھالیا۔ اور اس کا منہ چوم کر بولے۔ "کیا کرے گا ریل گاڑی کا؟"

لڑکے نے جواب دیا۔ "اس میں بیٹھ کے بلی دول جائیں گے۔ چنی کو بھی لے جائیں گے۔ بابو جی کو نہیں لے جائیں گے۔ ہمیں لیل گاڑی نہیں لا کر دیتے۔ تاؤ جی تم لاؤ گے تو تمہیں لے جائیں گے۔"

بابو۔ "اور کسے لے جائے گا؟"

لڑکا۔ پل بھر سوچ کر بولا۔ "بچھ اول کسی کو نہیں لے جائیں گے۔"

پاس ہی بابو رام جی داس کی بیوی بیٹھی تھی۔ بابو صاحب نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا:- اور اپنی تائی کو نہیں لے جائے گا؟"

لڑکا کچھ دیر اپنی تائی کی طرف دیکھتا رہا۔ تائی جی اس وقت ذرا چڑھی ہوئی سی بیٹھی تھیں۔ لڑکے کو ان کے چہرے کا وہ انداز اچھا نہ لگا۔ چنانچہ وہ بولا۔ "تائی کو نہیں لے جائیں گے۔"

تائی جی سپاری کترتی ہوئی بولیں۔ "اپنے تاؤ جی ہی کو لے جا۔ مجھ پر تو مہربانی رکھ۔"

تائی جی نے یہ بات بڑے روکھے پن کے ساتھ کہی۔ لڑکا تائی کے اس خشک سلوک کو فوراً تاڑ گیا۔ بابو صاحب نے پھر پوچھا۔ "تائی کو کیوں نہیں لے جائے گا؟"

لڑکا۔ ''تائی ہمیں پیال نہیں کلتیں۔''

بابو۔ ''اگر پیار کریں تو لے جائے گا؟''

لڑکے کو اس میں کچھ شک تھا۔ تائی کا یہ انداز دیکھ کر اسے یہ امید نہیں تھی کہ وہ پیار کریں گی۔ اس لئے لڑکا خاموش رہا۔

بابو صاحب اسے اپنی بیوی صاحبہ کے پاس لے جا کر ان سے بولے۔ ''لو اسے پیار کر لو۔ یہ تمہیں بھی لے جائے گا۔''

مگر بچے کی تائی شریمتی رامیشوری دیوی کو شوہر کی یہ چہل بازی اچھی نہ لگی وہ تنک کر بولی۔ ''تم ہی ریل پر بیٹھ کر جاؤ۔ مجھے نہیں جانا ہے۔''

بابو صاحب نے رامیشوری کی بات پر دھیان نہ دیا۔ بچے کو ان کی گود میں بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ ''پیار نہیں کرو گی تو پھر ریل میں نہیں بٹھائے گا۔ کیوں بھئی منوہر؟''

منوہر نے تاؤ کی بات کا جواب نہیں دیا۔ ادھر تائی نے منوہر کو اپنی گود سے دھکیل دیا۔ منوہر نیچے گر پڑا۔ جسم کو تو چوٹ نہیں لگی۔ مگر دل پر چوٹ لگی۔ لڑکا رو پڑا۔

بابو صاحب نے لڑکے کو گود میں اٹھالیا۔ چمکار پچکار کر چپ کرایا اور اس کے بعد اسے کچھ پیسے اور ریل گاڑی لا دینے کا وعدہ کر کے چھوڑ دیا۔ لڑکا منوہر ڈری ہوئی نگاہوں سے اپنی تائی کی طرف تاکتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ منوہر کے جانے کے بعد بابو رام جی داس رامیشوری سے بولے۔ ''تمہارا یہ کیسا سلوک ہے؟ بچے کو دھکیل دیا جو اس کے چوٹ لگ جاتی تو؟''

رامیشوری جی منہ بنا کر بولیں۔ ''لگ جاتی تو اچھا ہوتا کیوں میری کھوپڑی پر لادے دیتے تھے۔ اور آپ ہی اب ایسی باتیں کرتے ہیں!''

بابو صاحب کڑھ کر بولے۔ ''اسی کو کھوپڑی پر لادنا کہتے ہیں۔''

رامیشوری۔ ''اور نہیں تو کسے کہتے ہیں؟ تمہیں تو اپنے آگے اور کسی کا سکھ دکھ سوجھتا ہی نہیں۔ نہ جانے کب کس کا جی کیسا ہوتا ہے۔ تمہیں ان باتوں کی کوئی پرواہ نہیں اپنی چہل سے کام ہے؟''

بابو۔ ''بچوں کی پیاری پیاری باتیں سن کر تو جی چاہے کیسا ہی ہو خوش ہو جاتا ہے۔ مگر تمہارا دل معلوم نہیں کس دھات کا بنا ہوا ہے؟''

رامیشوری۔ ''تمہارا ہو جاتا ہو گا اور ہونے کو ہوتا بھی ہے۔ مگر ویسا بچہ بھی تو ہو! پرائے دھن سے بھی کہیں گھر بھرتا ہے؟''

بابو صاحب تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولے۔ ''اگر سگا بھتیجا بھی پرایا دھن کہا جا سکتا ہے۔ تو پھر میں سمجھتا کہ اپنا دھن کسے کہیں گے۔''

رامیشوری ذرا جوش میں آکر بولیں۔ ''باتیں بنانا بہت آتا ہے۔ تمہارا بھتیجا ہے تم چاہو جو سمجھو۔ مگر مجھے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ ہمارے بھاگ ہی پھوٹے ہیں۔ نہیں تو یہ دن کاہے کو دیکھنے پڑتے۔ تمہارا چلن تو دنیا سے نرالا ہے۔ آدمی اولاد کے لئے معلوم نہیں کیا کیا کرتے ہیں۔ پوجا پاٹ کراتے ہیں۔ برت رکھتے ہیں۔ مگر تمہیں ان باتوں سے کیا کام؟ رات دن بھائی بھتیجوں میں مگن رہتے ہو۔''

بابو صاحب کے چہرے پر نفرت کے جذبات جھلکنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ ''پوجا پاٹ۔ برت سب

ڈھکوسلا ہے جو چیز تقدیر میں نہیں وہ پوجا پاٹ سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی میرا تو یہ اٹل عقیدہ ہے۔"
شریمتی جی کچھ کچھ رونے کے لہجہ میں بولیں۔ "اسی عقیدے نے تو چوپٹ کر رکھا ہے! ایسے ہی عقیدے پر سب بیٹھ جائیں تو کام کیسے چلے۔ سب وشواش پر ہی بیٹھے رہیں تو آدمی کا ہے کو کسی بات کے لئے کوشش کرے۔"
بابو صاحب نے سوچا کہ بیوقوف عورت کے منہ لگنا ٹھیک نہیں۔ اس لئے انہوں نے بیوی کی بات کا جواب نہ دیا اور وہاں سے ٹل گئے۔

(2)

بابو رام جی داس دولت مند آدمی ہیں۔ کپڑے کی آڑھت کا کاروبار کرتے ہیں۔ لین دین بھی ہے۔ ان کا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ اس کا نام ہے کرشن داس۔ دونوں بھائیوں کا کنبہ اکٹھا ہی ہے۔ بابو رام جی داس کی عمر 35 سال کے لگ بھگ ہے۔ اور چھوٹے بھائی کرشن داس کی تقریباً 31 سال کی۔ رام جی داس کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ کرشن داس کے دو بچے ہیں۔ ایک لڑکا وہی جس سے ناظرین واقف ہو چکے ہیں اور ایک لڑکی ہے۔ لڑکی کی عمر تقریباً دو سال کی ہے۔
رام جی داس اپنے چھوٹے بھائی اور ان کے بچوں کو بہت پیار کرتے ہیں۔ ایسا پیار کہ اس کے اثر سے انہیں اپنا بے اولاد ہونا کھٹکتا ہی نہیں۔ چھوٹے بھائی کی اولاد کو وہ اپنی ہی اولاد سمجھتے ہیں۔ دونوں بچے بھی بابو رام داس سے اس قدر ہلے ہوئے ہیں کہ انہیں اپنے باپ سے بھی زیادہ سمجھتے ہیں۔ مگر رام جی داس کی بیوی رامیشوری کو اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ ان کے کوئی اولاد نہیں ہے۔ وہ دن رات اولاد ہی کی فکر میں گھلا کرتی ہے۔ چھوٹے بھائی کے بچوں سے شوہر کی محبت اس کی آنکھوں میں خار کے مانند کھٹکتی ہے۔
رات کو کھانے پینے سے فارغ ہو کر رام جی داس پلنگ پر لیٹے ہوئے ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کا لطف اٹھا رہے تھے۔ پاس ہی دوسری چارپائی پر رامیشوری ہتھیلی پر سر رکھے کسی فکر میں مستغرق تھی۔ دونوں بچے ابھی بابو صاحب کے پاس سے اٹھ کر اپنی ماں کے پاس گئے تھے۔
بابو صاحب نے اپنی بیوی کی طرف کروٹ لے کر کہا:۔
"آج تم نے منّو کو ایسی بری طرح سے دھکیلا تھا کہ مجھے اب تک اس کا افسوس ہے۔ کبھی کبھی تمہارا سلوک بالکل حیوانوں کا سا ہو جاتا ہے۔"
رامیشوری بولی۔ "تمہی نے تو مجھے ایسا بنا رکھا ہے۔ اس روز اس پنڈت نے کہا تھا کہ ہم، دونوں کے جنم پتر میں اولاد کا جوگ ہے اور اپائے کرنے سے اولاد ہو بھی سکتی ہے۔ اس نے اپائے بھی بتائے تھے۔ مگر تم نے ان میں سے ایک بھی اپائے کر کے نہ دیکھا۔ بس تم تو انہی دونوں میں مگن ہو۔ تمہاری اس بات سے رات دن میرا کلیجہ سلگتا رہتا ہے۔ آدمی اپائے تو کر کے دیکھتا ہے۔ پھر ہونا نہ ہونا تو بھگوان کے ادھین ہے۔"
بابو جی ہنس کر بولے۔ "تمہاری جیسی سیدھی عورت بھی...... کیا کہوں تم ان جوتشیوں کی باتوں پر اعتبار کرتی ہو جو دنیا بھر کے جھوٹے اور ٹھگ ہیں۔ یہ جھوٹ بولنے ہی کی روٹیاں کھاتے ہیں۔"

رامیشوری تنک کر بولی۔ ''تمہیں تو سارا جہان جھوٹا ہی نظر آتا ہے۔ یہ پوتھی پران بھی سب جھوٹے ہیں۔ پنڈت جوتشی کچھ اپنی طرف سے بنا کر تو کہتے ہی نہیں۔ شاستر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہی وہ بھی کہتے ہیں۔ شاستر جھوٹا ہے تو وہ بھی جھوٹے ہیں۔ انگریزی کیا پڑھی۔ اپنے آگے کسی کو گنتے ہی نہیں۔ جو باتیں باپ دادا کے زمانے سے چلی آتی ہیں انہیں بھی جھوٹا بتاتے ہیں۔''

بابو صاحب۔ ''تم بات تو سمجھتی نہیں اپنی ہی رٹی جاتی ہو۔ میں یہ نہیں کہتا۔ کہ جوتش شاستر جھوٹا ہے۔ ممکن ہے وہ سچا ہو۔ مگر جوتشیوں میں زیادہ تر جھوٹے ہوتے ہیں انہیں جوتش سے پوری واقفیت تو ہوتی نہیں۔ دو ایک چھوٹی موٹی کتابیں پڑھ کر جوتشی بن بیٹھتے اور لوگوں کو ٹھگتے پھرتے ہیں۔ ایسی حالت میں ان کی باتوں پر کیونکر یقین کیا جاسکتا ہے؟''

رامیشوری۔ ''ہوں۔ سب جھوٹے ہی ہیں۔ تمہی ایک بڑے سچے ہو۔ اچھا! ایک بات پوچھتی ہوں بھلا تمہارے دل میں اولاد کی خواہش کیا کبھی نہیں ہوتی؟''

اب کے رامیشوری نے بابو صاحب کے دل کا نازک حصہ پکڑا۔ وہ تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ اس کے بعد ایک لمبی سانس لے کر بولے۔ ''بھلا ایسا کون شخص ہوگا جس کے دل میں اولاد کا منہ دیکھنے کی خواہش نہ ہو؟ مگر کیا کیا جائے۔ جب تک نہیں ہے اور نہ ہونے کی امید ہے۔ تو پھر فضول فکر کرنے سے کیا حاصل؟ علاوہ اس کے جو بات اپنی اولاد سے ہوتی وہ ہی بھائی کی اولاد سے بھی ہو رہی ہے۔ جس قدر محبت اپنے بچوں سے ہوتی' اتنی ہی ان سے بھی ہے۔ جو خوشی ان کی کلولوں سے حاصل ہوتی ہے وہی ان کی کھیلوں سے بھی ہو رہی ہے۔ پھر میں نہیں سمجھتا کہ فکر کیوں کی جائے۔''

رامیشوری کُڑھ کر بولی۔ ''تمہاری سمجھ کو میں کیا کہوں اسی سے تو رات دن جلا کرتی ہوں۔ بھلا یہ تو بتاؤ کہ تمہارے پیچھے کیا انہی سے تمہارا نام چلے گا؟''

بابو صاحب نے ہنس کر جواب دیا۔ ''اجی تم بھی کہاں کی پوچ باتیں لائیں۔ نام اولاد سے نہیں چلتا۔ نام چلتا ہے اپنے نیک عملوں سے۔ تلسی داس کو ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ سور داس کو مرے کتنی مدت ہو چکی؟ اسی طرح جتنے مہاتما ہو گزرے ہیں۔ ان سب کا نام کیا ان کی اولاد ہی کی بدولت چل رہا ہے؟ سچ پوچھو تو اولاد سے جتنی نام چلنے کی امید رہتی ہے اتنا ہی نام ڈوب جانے کا بھی امکان ہوتا ہے۔ مگر نیک عمل ایک ایسی چیز ہے جس سے نام روشن ہونے کے سوائے ڈوبنے کا کبھی کھٹکا ہی نہیں رہتا۔ ہمارے شہر میں رائے گردھاری لال کتنے مشہور آدمی تھے؟ ان کی اولاد کہاں ہے؟ مگر ان کی دھرم شالا اور یتیم خانے سے ان کا نام اب تک چلا جا رہا ہے اور ابھی معلوم نہیں کتنی مدت چلے گا۔''

رامیشوری۔ ''شاستر میں لکھا ہے۔ جس کے بیٹا نہیں ہوتا اس کی مکتی نہیں ہوتی۔''

بابو۔ ''مکتی پر مجھے اعتقاد ہی نہیں۔ مکتی ہے کس چڑیا کا نام۔ اگر مکتی کا ہونا مان بھی لیا جائے تو یہ کیسے مانا جاسکتا ہے کہ بیٹے والے کی مکتی ضرور ہو جاتی ہے؟ مکتی کا بھی کیسا آسان طریقہ ہے یہ جتنے بیٹے والے ہیں۔ سبھی کی تو مکتی ہو گی؟''

رامیشوری کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ بولی۔ ''اب تم سے کون بکواد (بکواس) کرے؟ تم تو اپنے سامنے کسی کو مانتے ہی نہیں۔''

(3)

انسان کا دل ماتا کی آماجگاہ ہے۔ کیسی ہی مفید اور کیسی ہی خوبصورت چیز کیوں نہ ہو۔ جب تک انسان اس کو پرائی سمجھتا ہے' اس وقت تک اس سے پیار نہیں کرتا۔ لیکن بھدی سے بھدی اور بالکل ناکارہ چیز کو بھی اگر آدمی اپنی سمجھتا ہے تو اس سے پیار کرتا ہے۔ پرائی چیز کیسی ہی قیمتی کیوں نہ ہو اس کے ضائع ہو جانے پر آدمی ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں کرتا۔ اپنی چیز خواہ کیسی ہی بھدی ہو۔ کسی مصرف کی نہ ہو۔ اگر وہ جاتی رہے تو آدمی کو بڑی تکلیف ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنی چیز ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی پرائی چیز سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں جب تک آدمی اس چیز کو اپنی نہیں بنالیتا یا کم از کم اس خیال کو اپنے دل میں مضبوط و مستحکم نہیں کر لیتا کہ یہ چیز میری ہے' اس وقت تک اسے صبر نہیں آتا۔ اپنائیت سے محبت پیدا ہوتی ہے اور محبت سے اپنائیت۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔

اگرچہ رامیشوری کو ماں بننے کی خوش قسمتی نصیب نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس کا دل ماں بننے کا کامل طور پر اہل تھا۔ اس کے دل میں وہ اوصاف اندر چھپے ہوئے تھے جو ایک ماں کے دل میں ہوتے ہیں۔ مگر انہوں نے ابھی نشو و نما نہیں پائی تھی۔ اس کا دل اس زمین کے مانند تھا جس میں بیج تو پڑا ہوا ہے مگر اس کو سینچ کر اور اس طرح بیج کو پھوڑ کر اس کو نکال کر زمین کے اوپر لانے والا کوئی نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ اس کا دل ان بچوں کی طرف مائل تو تھا مگر جب اسے دھیان آتا تھا کہ یہ بچے میرے نہیں دوسرے کے ہیں۔ اس وقت اس کے دل میں ان کی طرف سے عناد پیدا ہوتا تھا۔ نفرت پیدا ہوتی تھی بالخصوص اس وقت اس کا عناد اور بھی بڑھ جاتا تھا جب وہ یہ دیکھتی تھی کہ اس کا شوہر ان بچوں پر جان چھڑکتا ہے۔ جو اس کے (رامیشوری) کے نہیں ہیں۔

شام کا وقت تھا۔ رامیشوری کھلی چھت پر بیٹھی ہوا کھا رہی تھی۔ پاس ہی اس کی دیورانی بھی بیٹھی تھی۔ دونوں بچے دوڑ دوڑ کر کھیل رہے تھے۔ رامیشوری ان کے کھیل کو دیکھ رہی تھی۔ ہوا میں اڑتے ہوئے ان کے بال کنول کے مانند شگفتہ۔ ان کے ننھے ننھے چہرے' ان کی پیاری پیاری توتلی باتیں' ان کا چلّانا' لوٹ جانا' بھاگنا وغیرہ وغیرہ حرکتیں اس کے دل کو ٹھنڈا کر رہی تھیں کہ یکایک منوہر اپنی بہن کو مارنے دوڑا۔ وہ کھکھلاتی ہوئی رامیشوری کی گود میں جاگری۔ اس کے پیچھے پیچھے منوہر بھی دوڑتا ہوا آیا۔ اور وہ بھی اس کی گود میں جاگرا۔ رامیشوری اس وقت سارا بغض عناد بھول گئی۔ اس نے دونوں بچوں کو اسی طرح دل سے لگالیا جس طرح وہ آدمی لگاتا ہے جو بچوں کے لئے ترس رہا ہو۔ اس نے بڑی تشنہ کامی سے دونوں کو پیار کیا۔ اس وقت اگر کوئی ناواقف شخص اسے دیکھتا تو اسے یہی یقین ہوتا کہ رامیشوری ہی ان بچوں کی ماں ہے۔

دونوں بچے بہت دیر تک اس کی گود میں کھیلتے رہے۔ یکایک اسی وقت کسی کے آنے کی آہٹ پاکر بچوں کی ماں وہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔

منوہر سے "ریل گاڑی" کہتے ہوئے بابو رام جی داس چھت پر آئے۔ ان کی آواز سنتے ہی دونوں بچے رامیشوری کی گود سے تڑپ کر نکل بھاگے۔ رام جی داس نے پہلے دونوں کو خوب پیار کیا پھر بیٹھ کر ریل گاڑی دکھانے لگے۔

ادھر رامیشوری کی نیند سی ٹوٹی۔ شوہر کو بچوں میں مگن دیکھ کر ابرو تن گئے۔ بچوں کی طرف سے دل میں

پھر وہی بغض و عناد اور نفرت کے جذبات بیدار ہو اٹھے۔

بچوں کو ریل گاڑی دے کر بابو صاحب رامیشوری کے پاس آئے اور مسکرا کر بولے۔ "آج تو تم بچوں کو بڑا پیار کر رہی تھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے دل میں بھی ان کے لئے محبت ضرور ہے۔"

رامیشوری کو شوہر کی یہ بات بہت بری لگی۔ اسے اپنی کمزوری پر بہت افسوس ہوا۔ صرف افسوس ہی نہیں اپنے اوپر غصہ بھی آیا۔ وہ افسوس اور غصہ شوہر کی مندرجہ باتوں سے اور بھی دوبالا ہو گیا۔ اس کی کمزوری شوہر پر ظاہر ہو گئی۔ یہ بات اس کے لئے ناقابل برداشت ہو گئی۔

رام جی داس بولے۔ "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کے لئے سوچ کرنا فضول ہے۔ اگر تم ان سے محبت کرنے لگو تو تمہیں یہ ہی اپنی اولاد معلوم ہونے لگیں گے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم ان سے محبت کرنا سیکھ رہی ہو۔"

یہ بات بابو صاحب نے بہت صاف دل سے کہی تھی مگر رامیشوری کو اس میں طنز کی تیز بو معلوم ہوئی۔ اس نے کُڑھ کر اپنے دل میں کہا۔ "انہیں موت بھی نہیں آتی۔ مر جائیں پاپ کٹے۔ آٹھوں پہر آنکھوں کے سامنے رہنے سے پیار کرنے کو جی للچا ہی اٹھتا ہے۔ ان کے مارے کلیجہ اور بھی جلا کرتا ہے۔"

بابو صاحب نے بیوی کو خاموش دیکھ کر کہا۔ "اب جھینپنے سے کیا فائدہ؟ اپنی محبت کو چھپانے کی کوشش کرنا لاحاصل ہے۔ چھپانے کی ضرورت بھی نہیں۔"

رامیشوری جل بُھن کر بولی۔ "مجھے کیا پڑی ہے جو میں محبت کروں گی۔ تم ہی کو ان کی محبت مبارک رہے۔ نگوڑے آپ ہی آ آ کے گھستے ہیں۔ ایک گھر میں رہنے سے کبھی ہنسنا بولنا ہی پڑتا ہے۔ ابھی پرسوں ذرا یونہی دھکیل دیا۔ اس پر تم نے سینکڑوں باتیں سنائیں۔ سنکٹ میں جان ہے نہ یوں چین نہ ووں چین!"

بابو صاحب کو بیوی کی بات سن کر بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے کرخت لہجے میں کہا۔ "معلوم نہیں کیسے دل کی عورت ہے۔ ابھی اچھی خاصی بیٹھی بچوں کو پیار کر رہی تھی۔ میرے آتے ہی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے لگی۔ اپنی مرضی سے تو خواہ کچھ ہی کرے۔ مگر میرے کہنے سے بلیوں اچھلتی ہے۔ معلوم نہیں میری باتوں میں کونسا زہر گھلا رہتا ہے۔ اگر میرا کہنا ہی برا معلوم ہوتا ہے تو نہ کہوں گا۔ مگر اتنا یاد رکھو کہ اب جو کبھی ان کے بارے میں نگوڑے سگوڑے وغیرہ برے الفاظ استعمال کئے تو اچھا نہ ہو گا۔ تم سے یہ بچے مجھے کہیں زیادہ پیارے ہیں۔"

رامیشوری نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور اپنے دل کی جلن اور غصہ کو وہ آنکھوں کے ذریعے نکالنے لگی۔

جوں جوں بابو رام جی داس کی محبت بچوں سے بڑھتی جاتی تھی۔ رامیشوری کا بغض و عناد اور نفرت زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ اکثر بچوں کے لئے میاں بیوی میں کہا سنی ہو جاتی تھی۔ اور رامیشوری کو شوہر کی سخت سُست سننی پڑتی تھی۔ جب رامیشوری نے یہ دیکھا کہ بچوں کی وجہ سے ہی وہ اپنے شوہر کی نظروں سے گرتی جا رہی ہے' اس وقت اس کے دل میں ایک سخت طوفان برپا ہوا۔ اس نے سوچا پرائے بچوں کے پیچھے یہ مجھ سے محبت کم کرتے جاتے ہیں۔ مجھے ہر وقت برا بھلا کہا کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ بچے ہی سب کچھ ہیں۔ میں کچھ بھی نہیں۔ دنیا مرتی جاتی ہے۔ مگر ان دونوں کو موت نہیں۔ یہ پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئے۔ نہ یہ ہوتے نہ مجھے یہ دن دیکھنے پڑتے۔ جس دن یہ مریں گے' گھی کے چراغ جلاؤں گی۔ انہوں نے ہی میرے گھر کا ستیاناس کر رکھا ہے۔"

یونہی کچھ دن گزرے۔ ایک دن حسب معمول رامیشوری چھت پر اکیلی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے دل

میں طرح طرح کے خیالات آجا رہے تھے۔ خیالات اور کچھ نہیں۔ وہی اپنی اولاد کا نہ ہونا۔ شوہر کا بھائی کی اولاد سے محبت کرنا وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دیر بعد جب اس کے خیالات اسے تکلیف دہ معلوم ہونے لگے تو وہ اپنی توجہ دوسری طرف مبذول کرنے کے لئے اٹھ کر ٹہلنے لگی۔

وہ ٹہل رہی تھی کہ منوہر دوڑتا ہوا آیا۔ منوہر کو دیکھ کر اس کی بھویں چڑھ گئیں۔ اور وہ چھت کی چہار دیواری پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوگئی۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر رنگ برنگ کے پتنگ اڑ رہے تھے۔ منوہر کچھ دیر پتنگوں کو دیکھتا اور سوچتا رہا کہ کوئی پتنگ کٹ کر اس کی چھت پر گرے تو کیسا مزہ آئے۔ دیر تک پتنگ...... گرنے کی امید کرنے کے بعد وہ دوڑ کر رامیشوری کے پاس آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر بولا۔ "تائی! ہمیں پتنگ منگوادو۔"

رامیشوری نے جھٹک کر کہا۔ "چل ہٹ۔ اپنے تاؤ سے مانگ جاکر۔"

منوہر ذرا کھسیانا سا ہو کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس سے نہ رہا گیا۔ اب کے اس نے بڑے لاڈ میں آکر بے حد لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔ "تائی! پتنگ منگا دو۔ ہم بھی اڑائیں گے۔"

اس دفعہ اس کی بھولی بھالی درخواست سے رامیشوری کا کلیجہ کچھ پسیجا۔ وہ کچھ دیر تک اس کی طرف ٹکی ہوئی نگاہوں سے دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ایک لمبی سانس لے کر دل میں کہا۔ "اگر یہ میرا بیٹا ہوتا تو آج مجھ سے بڑھ کر خوش نصیب عورت دنیا میں نہ ہوتی۔ نگوڑ مارا کتنا خوبصورت ہے اور کیسی پیاری پیاری باتیں کرتا ہے۔ یہی جی چاہتا ہے کہ اٹھا کر چھاتی سے لگا لیں۔"

یہ سوچ کر وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے والی تھی کہ اتنے میں منوہر اسے خاموش دیکھ کر بولا۔ "تم ہمیں پتنگ نہیں منگوادو گی تو تاؤ جی سے کہہ کر تمہیں پٹوادیں گے۔"

اگرچہ بچے کی اس بھولی بات میں بھی بڑی حلاوت تھی مگر رامیشوری کا چہرہ مارے غصہ کے تمتما اٹھا۔ وہ اسے جھڑک کر بولی۔ "جا کہہ دے اپنے تاؤ جی سے۔ دیکھوں وہ میرا کیا کر لیں گے؟"

منوہر ڈر کر اس کے پاس سے اٹھ گیا۔ اور پھر تشنہ کام نگاہوں سے آسمان میں اڑتے ہوئے پتنگوں کو دیکھنے لگا۔ ادھر رامیشوری نے سوچا۔ "یہ سب تاؤ جی کے لاڈ دلار کا نتیجہ ہے کہ بالشت بھر کا لڑکا مجھے دھمکاتا ہے۔ ایشور کرے۔ اس دلار پر بجلی ٹوٹے۔"

اسی لمحے ایک پتنگ آسمان سے ٹوٹ کر اسی چھت کی طرف آیا اور رامیشوری کے اوپر سے ہوتا ہوا منڈیر کی طرف گیا۔ چھت کے چاروں طرف دیوار بنی ہوئی تھی۔ جہاں رامیشوری کھڑی تھی' صرف ایک دروازہ تھا۔ جس کی راہ منڈیر پر آجا سکتے تھے۔ رامیشوری اس دروازے سے لگی ہوئی کھڑی تھی۔ منوہر نے پتنگ کو منڈیر پر جاتے دیکھا۔ پتنگ پکڑنے کے لئے وہ دوڑ کر منڈیر کی طرف چلا۔ رامیشوری کھڑی دیکھتی رہی۔ منوہر اس کے پاس سے ہو کر منڈیر پر چلا گیا۔ اور اس سے دو فٹ کے فاصلے پر کھڑا ہو کر پتنگ کو دیکھنے لگا جو چھجے پر سے ہوتا ہوا نیچے مکان کے صحن میں جا گرا۔ ایک پاؤں چھجے کے منڈیر پر رکھ کر منوہر نے نیچے صحن میں جھانکا اور پتنگ کو صحن میں گرتے دیکھ کر مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ وہ نیچے جانے کے لئے جلدی سے مڑا۔ مگر پلٹتے وقت منڈیر پر سے اس کا پاؤں پھسل گیا۔ وہ نیچے کی طرف چلا۔ نیچے جاتے جاتے اس کے دونوں ہاتھوں میں منڈیر آگئی۔ وہ اسے پکڑ کر لٹک گیا۔ اور رامیشوری کی طرف دیکھ کر چلایا۔ "تائی!"

رامیشوری نے دھڑکتے ہوئے دل سے اس سانحہ کو دیکھا۔ اس کے دل میں آیا "اچھا ہے مرنے دو۔ سدا کے لئے پاپ کٹ جائے گا۔" یہی سوچ کر وہ ایک منٹ کے لئے رکی۔ ادھر منوہر کے ہاتھ منڈیر پر سے پھسلنے لگے۔ وہ بیحد خوفزدہ اور التجا آمیز نگاہوں سے رامیشوری کی طرف دیکھ کر چلایا "ارے تائی"۔

رامیشوری کی آنکھیں منوہر کی آنکھوں سے جا ملیں۔ منوہر کی وہ دردناک نگاہ دیکھ کر رامیشوری کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ اس نے بیتاب ہو کر منوہر کو پکڑنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ہاتھ منوہر کے ہاتھ تک پہنچے ہی تھے کہ منوہر کے ہاتھ سے منڈیر چھٹ گئی۔ وہ نیچے آگرا۔ رامیشوری چیخ کر چھجے پر گر پڑی۔

رامیشوری ایک ہفتہ تک بخار میں بیہوش پڑی رہی۔ کبھی کبھی وہ زور سے چلا اٹھتی اور کہنے لگتی۔ "دیکھو دیکھو۔ گرا جارہا ہے۔ اسے بچاؤ۔ دوڑو۔ میرے منوہر کو بچالو۔" کبھی وہ کہتی۔ "بیٹا منوہر! میں نے تجھے نہیں بچایا۔ ہاں ہاں! میں چاہتی تو بچاسکتی تھی۔ میں نے دیر کردی تھی۔"

منوہر کی ٹانگ اکھڑ گئی تھی۔ ٹانگ بٹھادی گئی۔ وہ رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی حالت پر آنے لگا۔

ایک ہفتہ بعد رامیشوری کا بخار ہلکا ہوا۔ جب اچھی طرح سے ہوش آیا۔ تو اس نے پوچھا "منوہر کیسا ہے؟"

رام جی داس نے جواب دیا۔ "اچھا ہے۔"

رامیشوری۔ "اسے میرے پاس لاؤ۔"

منوہر رامیشوری کے پاس لایا گیا۔ رامیشوری نے اسے بڑے پیار سے سینے سے لگایا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ ہچکیوں سے گلا رندھ گیا۔

رامیشوری کچھ دنوں بعد بالکل تندرست ہوگئی۔ اب منوہر کی بہن چنی کی طرف سے بھی اس کے دل میں بغض یا نفرت نہیں ہے۔ اور منوہر تو اس کی جان ہو گیا ہے۔ اب اس کے بغیر اسے ایک لمحہ چین نہیں پڑتا۔

ماں کا دل

(1)

"کیا کہوں بہو! جب سے برج موہن کا بیاہ ہوا' اس وقت سے اس کی تو جیسے کایا ہی پلٹ گئی ہے۔ بیاہ سے پہلے میرے پاس گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ اپنا دکھ سکھ کہتا تھا۔ ہر بات میں میری صلاح لیتا تھا مگر جب سے بیاہ ہوا۔ تب سے یہ ساری باتیں خواب سی ہو گئی ہیں۔ میں نے کس چاہ سے بیاہ کیا تھا۔ میں سوچتی تھی کہ دونوں کی جوڑی دیکھ کر میں آنکھیں ٹھنڈی کروں گی۔ میں یہ نہیں جانتی تھی کہ اپنے پاؤں پر آپ کلہاڑی مار رہی ہوں۔"

"بہو! آج کل کچھ ہوا ہی ایسی چل گئی ہے کہ مرد جورو کے غلام ہو جاتے ہیں۔ ماں باپ کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ جب دیکھو لاڈلی کا دامن پکڑے بیٹھے ہیں۔ یہ کل جگ ہے۔ اس میں جو نہ ہو سو تھوڑا

ہے۔ آج کل کی لڑکیاں ایسی چہیتی ہوتی ہیں کہ اپنے مرد پر جادو ڈال دیتی ہیں۔ بس وہ انہی کے کہنے پر چلتا ہے۔"

شام کا وقت ہے۔ ایک کمرے میں دو ادھیڑ عمر عورتیں بیٹھی مندرجہ ذیل باتیں کر رہی ہیں۔ ٹھیک اس وقت ایک نوجوان عورت ذرا گھونگھٹ نکالے اس جگہ آئی۔ اسے دیکھ کر دونوں ادھیڑ عمر عورتوں میں سے ایک نے منہ پر انگلی رکھ کر دوسری کی طرف اشارہ کیا۔ دوسری عورت کچھ کہنا ہی چاہتی تھی۔ مگر اس کے اشارہ کرنے سے چپ ہو گئی۔ نوجوان عورت نے اشارہ کرنے والی سے پوچھا: "ماں جی! آج کھانے کو کیا بنے گا؟"

ماں منہ پھلا کر بولیں۔ "میں کیا جانوں؟ جو تیرا جی چاہے بنا۔ اپنے آدمی سے پوچھ لے۔"

اپنے آدمی سے پوچھنے کا مطلب تھا۔ "اپنے شوہر سے پوچھ لے۔"

نوجوان عورت نے کچھ دیر چپ رہ کر کہا۔ "تمہارا دل جو کھانے کو چاہے وہ میں بناؤں۔"

ادھیڑ عمر کی عورت ذرا روکھے تبسم کے ساتھ بولی۔ "میرا دل اب کس چیز میں رہا؟ میں تو بہت کھا پی چکی۔ مجھے تو اب پیٹ بھرنا ہے۔ اب تمہارا راج ہے۔ جو جی چاہے وہ بناؤ کھاؤ۔"

یہ کہہ کر اس ادھیڑ عمر عورت نے دوسری ادھیڑ عمر عورت کی طرف ایک معنی خیز نگاہ ڈالی۔ دوسری نے لمبی سانس لے کر گردن جھکالی۔ نوجوان عورت کچھ دیر تک خاموش کھڑی رہی پھر آہستہ آہستہ وہاں سے چلی گئی۔

اس کے چلے جانے پر پہلی عورت یعنی برج موہن کی ماں بولی۔ "دیکھا۔ مجھ سے پوچھتی ہے کیا کھاؤ گی؟"

دوسری عورت نے کہا۔ "تو اس میں کوئی ویسی بات نہیں۔ گھر کے بڑے بوڑھوں سے تو پوچھا ہی جاتا ہے۔"

برج موہن کی ماں پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ہے بھگوان! بہو تو اب سٹھیا گئی؟ اجی اس میں بھی چال ہے۔ میں کچھ کہہ دیتی بس جھٹ خصم سے جا کر کہتی کہ وہ یہ کھائیں گی۔ وہ وہ کھائیں گی۔ ان کی زبان پسر پسر کرتی رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ معلوم نہیں اور کیا کیا جڑتی! اسی سے تو میں نے کہہ دیا کہ جو تمہارا جی چاہے بناؤ کھاؤ۔ اور بہو سچی بات تو یہ ہے کہ ہم تم نے بہت کھا پی لیا ہے۔ وہ آج کل کے آدمیوں کو دیکھنے کو بھی نصیب نہیں ہو سکتا۔"

دوسری نے کہا۔ "رام رام وہ باتیں کہاں؟"

(2)

برج موہن لعل اپنے کمرے میں کپڑے اتار رہا تھا۔ اسی وقت اس کی بیوی کمرے میں داخل ہوئی۔ بیوی کو دیکھ برج موہن ذرا مسکرا کر بولا۔ "کھانا تیار ہے؟"

منورما نے دھیمے لہجہ میں جواب دیا۔ "تیار ہے۔"

برج موہن۔ نے پوچھا۔ "آج کیا بنا ہے؟"

منورما منہ بھاری کر کے بولیں۔ جو بننا تھا۔ وہی بنا ہے۔"

برج موہن لال تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر ذرا سنجیدگی کے انداز سے بولا۔ "آج تم کچھ اداس معلوم ہوتی ہو۔ کیا بات ہے؟"

منورما۔ چپ رہی۔

برج موہن نے پوچھا۔ "کیوں کیا ہوا؟"

منورما چلانے کے لہجہ میں بولی۔ "اماں جی کا سلوک دن بدن روکھا ہوتا جارہا ہے۔ آج پڑوس کے بسنت کمار کی ماں آئی تھیں۔ ان سے تنہائی میں بیٹھ کر معلوم نہیں کیا کیا کھسر پھسر کررہی تھیں۔ میں نے جاکر پوچھا۔ "آج کھانے کو کیا بنے گا؟" بولیں۔ "خصم سے پوچھ لو میرا راج تو گیا۔ اب تمہارا راج ہے۔ جو چاہو بناؤ۔ کھاؤ وغیرہ وغیرہ اور معلوم نہیں کیا کیا کہا۔ مجھے یوں تو کچھ برا نہ لگتا۔ وہ روز ہی دو چار باتیں کہتی ہی رہتی ہیں مگر آج ایک باہر کی عورت کے سامنے انہوں نے یہ باتیں کہیں۔ وہ اپنے دل میں نہ معلوم کیا کہے گی! ماں جی تو اب کچھ دشمنی سی کرنے پر آمادہ رہتی ہیں۔"

منورما کی باتیں سن کر برج موہن کے چہرہ کی سنجیدگی بڑھ گئی۔ وہ بڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ "ہاں! مجھے بھی ان کے روکھے برتاؤ کا احساس ہورہا ہے۔ پہلے وہ مجھے اس قدر پیار کرتی تھیں، جتنا کہ ایک ماں کو کرنا چاہیے مگر اب ان کے اس سلوک میں بہت فرق پڑگیا ہے۔"

منورما۔ "یہ تمام باتیں میری وجہ سے ہیں۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کیوں جلتی ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تو ہر وقت ان کی ٹہل خدمت میں لگی رہتی ہوں۔ ہر ایک کام میں ان کی اجازت لے لیتی ہوں۔ پھر بھی وہ ناخوش ہی رہتی ہیں۔"

برج موہن۔ "ساس اور بہو کے درمیان کبھی محبت کا سلوک نہیں رہ سکتا۔ ساس اور بہو میں دشمنی رہنا بالکل قدرتی امر ہے۔"

منورما۔ "مگر جب مین اپنی طرف سے کوئی ایسا کام نہیں کرتی جس سے انہیں تکلیف ہو تو پھر اس میں میرا کیا قصور؟"

برج موہن۔ "جب انسان کے دل میں بغض و عناد کا بیج بویا جاتا ہے' اس وقت اسے ذرا ذرا سی باتوں میں نقص اور قصور نظر آنے لگتے ہیں۔ اب سوال صرف یہ ہے کہ ان کے دل میں تمہاری طرف سے بغض کیوں پیدا ہوا؟"

منورما۔ "یہی تو میں بھی سوچتی ہوں کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟"

برج موہن۔ "(ذرا روکھے لہجے میں) اس کا سبب ان کی بیوقوفی کے سوائے اور کیا کہا جاسکتا ہے؟ اچھا۔ اب تم کھانا یہیں لے آؤ۔"

برج موہن لال نے اپنے کمرے ہی میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ اس روز وہ اپنی ماں کے پاس تک نہیں گئے۔

(3)

برج موہن لال بیاہ سے پیشتر اپنا خالی وقت یعنی جب تک وہ گھر میں رہتا تھا' ماں کے پاس بیٹھنے اٹھنے میں گزارتا تھا۔ دونوں وقت ماں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ رات کو ماں کے پلنگ کے پاس پلنگ بچھا کر سوتا تھا۔ رات کو جب تک جاگتا رہتا تھا ماں سے طرح طرح کی گفتگو کرتا رہتا تھا۔ اپنا دکھ سکھ کہتا اور ان کا سنتا تھا۔ ہر ایک کام شروع کرنے سے پیشتر ان کا مشورہ لیتا تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے ماں پریشان خاطر یا اداس ہوتی تھی۔ یا اسے کوئی جسمانی تکلیف ہوتی تھی تو برج موہن ان کو خوش کرنے کی' ان کی جسمانی تکلیف کو رفع کرنے کی پوری پوری کوشش کرتا

تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے ماں کا جی کھانا کھانے کو نہیں چاہتا تھا تو برج موہن ان کو مخاطب کر کے کہتا تھا۔ "دیکھو ماں۔ جو تم نہ کھاؤ گی تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔ یہ سن کر ماں بے چین ہو جاتی اور جس طرح بنتا تھوڑا بہت کھانے کی کوشش کرتی تھی۔ پہلے برج موہن جو کچھ کماتا تھا لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ اور جب کبھی خرچ کی ضرورت ہوتی۔ اس سے مانگ لیا کرتا تھا۔

مگر شادی کے بعد اس کی فرصت کے وقت کا بیشتر حصہ منورما کے ساتھ گزرنے لگا۔ جب برج موہن کھانا کھانے بیٹھتا تو منورما مارے محبت کے خود اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور اسے کھانا کھلاتی۔ ایسی حالت میں ماں وہاں کس طرح موجود رہ سکتی تھی؟ اب وہ جو کچھ کما کے لاتا۔ اس میں سے نصف ماں کو دینے لگا اور نصف منورما کو۔ پہلے برج موہن کی صلاح کار اور مشیر ماں تھی۔ مگر اب اس کی جگہ منورما نے لے لی۔ ہاں کبھی کبھی کسی بات میں ماں کی صلاح بھی لے لی جاتی تھی۔ مگر اب ماں کو جسمانی تکلیف ہوتی تو معمولی طور سے خدمت گزاری ہوتی تھی۔ اس میں وہ پہلے کی سی محبت کی گرمی نہیں پائی جاتی تھی۔ اب اگر ماں کسی وجہ سے کھانا نہیں کھاتی تو برج موہن لال دو ایک بار پوچھ کر خود کھالیتا ہے۔ وہ محبت کے رس میں شرابور والی بات نہ رہی کہ "دیکھو ماں جو تم نہ کھاؤ گی تو میں بھی نہ کھاؤں گا۔"

مندرجہ بالا واقعہ کے اگلے دن برج موہن کی ماں بسنت کمار کے گھر گئی۔ بسنت کمار کی ماں نے اسے بٹھلا کر پوچھا۔ "کہو بہو! آج اداس کیوں ہو؟"

انسان کی یہ خصلت ہے کہ وہ اپنا دکھ درد اپنے دوستوں سے بیان کر کے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ لوگوں بالخصوص عورتوں میں یہ خصلت بہت بڑھی چڑھی ہوتی ہے۔ وہ اپنا دکھ سکھ جب تک کسی سے کہہ کر اس کی ہمدردی حاصل نہیں کر لیتیں' اس وقت تک ان کے سینے پر بڑا بھاری بوجھ لدا رہتا ہے۔ برج موہن کی ماں بسنت کمار کی ماں کے پاس اسی غرض سے آئی تھی کہ اپنے دل کا درد اس سے کہے۔ وہ ایک لمبی آہ بھر کر بولی:۔ "کیا کہوں بہو! میرے بھاگ پھوٹ گئے۔ اب میرا برج موہن میرا نہیں رہا۔ ہائے! اب مجھے یہ دھیان آتا ہے کہ برج موہن کو میں نے اتنے دکھ اٹھا کر پالا۔ اس کی خاطر دن کو دن اور رات کو رات نہیں سمجھا۔ اسی کا منہ دیکھ دیکھ کر جیتی رہی۔ جب اس کا باپ پرلوک سدھارا تھا' اس وقت میں نے اس کو دیکھ کر اپنے دل کو دھیرج دیا تھا۔ میں نے ان کے مرنے کا دکھ اس قدر نہیں مانا جتنا کہ میری جیسی بیواؤں کو ہونا چاہیے۔ جب میں یہ سوچتی ہوں کہ جو برج موہن میرے بغیر ایک گھڑی بھی نہیں رہ سکتا تھا' ایک پل کی جدائی سے بیقرار ہو جاتا تھا۔ جو برج موہن مجھے کھلائے بغیر نہیں کھاتا تھا۔ جو برج موہن مجھے تکلیف میں دیکھ کر بے چین ہو جاتا تھا۔ جو برج موہن رات دن میرے منہ کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ میری اجازت کے بغیر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی نہیں کرتا تھا۔ کہاں تک گناؤں بہو۔ جو برج موہن ہر طرح سے میرا برج موہن تھا۔ وہ اب پرایا ہو گیا۔ جب مجھے خیال آتا ہے۔ اس وقت کلیجہ میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ مجھ نگوڑی نے اپنا آپ جلا جلا کر اسے پالا پوسا۔ آج مجھے ایک پرائے گھر کی چھوکری نے دودھ کی مکھی کی طرح الگ کر دیا۔ میرے برج موہن کو اپنا بنا لیا۔ مجھے غیر کر دیا۔ ہائے!"

بسنت کمار کی ماں نے کہا۔ "بہو! یہ تو ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ ماں باپ کتنے دکھ سکھ اٹھا کر بچوں کو پالتے پوستے ہیں مگر وہ تو غیر ہو جاتے ہیں اور دو دن کی آئی ہوئی پرائے گھر کی لڑکیاں لاڈلی ہو جاتی ہیں۔"

برج موہن کی ماں نے اپنا سلسلہ کلام پھر جاری کیا۔ "یوں تو بہو۔ میری بہو میں کوئی عیب نہیں۔ بیچاری

ہر طرح سے میری خدمت کرتی رہتی ہے۔ مگر جب مجھے یہ خیال آتا ہے کہ اس نے میرے برج موہن کو مجھ سے چھڑا کر اپنا بنالیا۔ جو یہ نہ آتی تو برج موہن کا اور میرا اسی طرح پیار قائم رہتا۔ اس وقت میرے دل میں آگ سی لگ جاتی ہے۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اتر آتا ہے۔ کیا بتاؤں۔ میں اپنے دل کو بہت سمجھاتی ہوں کہ دنیا میں گھر گھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بھی ساس سسر تھے۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ ایسا ہی کیا۔ جو اب ہمارے بہو بیٹے ہمارے ساتھ کر رہے ہیں۔ مگر پھر بھی یہ دل نہیں مانتا۔"

بسنت کمار کی ماں بولی۔ "بہو۔ چاہے کچھ ہو۔ اب وہ بات تو ہونے کی نہیں۔ اب تو وہ اسی کا ہو چکا۔ خواہ تم کچھ ہی کرو۔ وہ اب تمہارا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اب دل کو دھیرج دینا ہی ٹھیک ہے۔"

برج موہن کی ماں رونے لگی اور روتے روتے کہنے لگی۔ "بہو! میں اور کچھ نہیں چاہتی۔ جس میں وہ سکھی رہے وہی کرے۔ اسے سکھی دیکھ کر میرا کلیجہ ٹھنڈا رہے گا۔ مگر میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ وہ جتنا پیار مجھ سے پہلے کرتا تھا اس سے آدھا ہی کرے۔ کیا کہوں بہو۔ اب تو کئی کئی دن تک وہ میرے پاس تک نہیں آتا۔"

بسنت کمار کی ماں نے کہا۔ "اچھا! آج میں بسنت سے کہوں گی وہ برج موہن کو سمجھادے گا۔ دیکھو اس کے سمجھانے سے وہ سمجھ جائے تو اچھا ہی ہے۔"

(4)

محبت اور مامتا کا ایسا جوڑا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں کئے جا سکتے۔ جہاں محبت ہے وہاں مامتا ہے۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے اگر اس کو اپنا بنا کر نہیں رکھ سکتا تو اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور ایسا ہی بعینہٖ یہی حال برج موہن کی ماں کا بھی تھا۔ ماں کی محبت کا کیا کہنا۔ ایسی حالت میں برج موہن کی ماں کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی کہ برج موہن اس کی طرف سے بے نیاز ہو جائے۔ اس کا باعث وہ اپنی بہو کو ہی سمجھتی تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ بیٹے کی وجہ سے بہو کی طرف سے اس کے دل میں سخت بغض و عناد پیدا ہو گیا تھا۔ اسی بغض کے سبب وہ اس سے اتنا روکھا اور ناخوشگوار برتاؤ کرتی تھی۔

دوسرے دن بسنت کمار نے برج موہن سے مل کر کہا:۔

"بھائی برج موہن! مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔"

برج موہن نے جواب دیا۔ "فرمایئے کیا کہتے ہیں؟"

بسنت کمار۔ "میں نے سنا ہے کہ تم اپنی ماں کے ساتھ بہت برا سلوک کرنے لگے ہو۔"

برج موہن چونک کر بولا۔ "برا سلوک؟"

بسنت کمار۔ "ہاں! برا سلوک۔"

برج موہن۔ "یہ تم سے کس نے کہا؟"

بسنت کمار۔ "کسی نے کہا ہو۔ مگر ہے بات بالکل ٹھیک۔"

برج موہن۔ "مگر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے کیا برا سلوک کیا۔ بلکہ سچ پوچھو تو وہی برا سلوک کرنے لگی ہیں۔"

بسنت کمار۔ ”تم جیسا محبت کا سلوک اپنی ماں کے ساتھ شادی سے پیشتر کرتے تھے ویسا اب نہیں کرتے۔“

یہ کہہ کر بسنت کمار نے اس کا اپنی ماں کے ساتھ شادی سے پیشتر اور بعد کا سلوک جیسا اس نے اپنی ماں کی زبانی سن رکھا تھا برج موہن سے بیان کیا۔

برج موہن سب سن کر مسکرایا۔

بسنت کمار بولا۔ ”کیوں یہ بات ٹھیک ہے؟“

برج موہن۔ ”ٹھیک تو ہے۔ مگر میں اسے ناروا سلوک نہیں سمجھتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پہلے میں ان کی طرف اپنی محبت کا اظہار قول و فعل کے ذریعہ کرتا رہتا تھا۔ مگر اب ایسا نہیں کرتا۔ اس کا سبب آپ دریافت کریں تو میں یہ بتاؤں گا کہ پہلے میری طبیعت میں لڑکپن تھا اب وہ لڑکپن نہیں رہا۔ مجھے اب اس قسم کا سلوک کرتے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ اس شرم کا سبب میرا شادی شدہ ہونا ہے۔ جب سے میری بیوی آئی ہے' اس وقت سے ماں کے سامنے جانے میں بھی مجھے شرم سی محسوس ہوتی ہے۔ آپ کی شادی نہیں ہوئی اس لئے آپ کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ جب شادی ہو جائے گی تب سمجھو گے کہ میری بات میں کس قدر صداقت ہے۔ باقی رہی دل کی بات' سو میرے دل میں ان کے لئے محبت اور تعظیم میں ذرا بھی کمی نہیں آئی۔“

بسنت کمار۔ ”بھائی! میں شادی شدہ زندگی کے متعلق کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ اس سے ناواقف ہوں۔ البتہ اس قدر ضرور کہوں گا کہ انسانی خصلت صرف جذبات کے دل میں رہنے سے ہی مطمئن نہیں ہوتی۔ جس سے تم محبت کرتے ہو' اس کے لئے اگر اپنی محبت کو اپنے سینے میں ہی چھپائے رکھو۔ اس پر اپنے برتاؤ سے اس محبت کا اظہار نہ کرو تو وہ کبھی تمہاری محبت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو تمہاری محبت کی مقدار سے اسی وقت باخبر ہوگا جب تم اپنے برتاؤ کے ذریعے اسے اس پر ظاہر کرو گے۔ فرض کرلو۔ تم کسی شخص سے محبت کرتے ہو۔ اگر اسے تمہاری دلی محبت کا حال معلوم بھی ہو جائے تب بھی وہ مطمئن نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دل میں محدود محبت ایک کٹورے میں بھرے ہوئے پانی کی مانند ہے۔ کٹورے میں بھرا ہوا پانی نظر تو آتا ہے مگر اسے صرف دیکھنے ہی سے پیاس نہیں بجھ سکتی۔ پیاس تب ہی بجھے گی جب وہ پینے کے لئے دیا جائے۔“

برج موہن۔ یہ بات ٹھیک ہے۔ مگر اس بارے میں صاد نہیں کرتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ماتا جی کی جہالت اور ان کی خصلتِ نسوانی ہے کہ وہ ایک ذرا سی بات کو اس قدر اہمیت دے رہی ہیں۔“

بسنت کمار۔ ”خیر تمہاری مرضی۔ جو مناسب سمجھو کرو۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ چکا۔“

(5)

برج موہن نے بسنت کمار کی باتوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔ اس نے ان باتوں کو بالکل لایعنی سمجھا۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اس کی ماں نے ہی ان پڑھ ہونے اور بہو منورما سے بغض رکھنے کے سبب یہ فساد برپا کر رکھا ہے۔ اسے ماں کے گھر بار کی باتوں کو دوسرے سے کہہ کر ان سے امداد کے طالب ہونے کے کام پر بہت غصہ آیا۔ اس نے یہ سب باتیں منورما سے کہیں۔ منورما نے بھی ساس کے اس فعل کو بہت برا سمجھا۔ اور شوہر کو اس کے خلاف خوب

بھڑکایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گانٹھ سلجھنے کی بجائے اور بھی زیادہ الجھ گئی۔ انسان خود غرضی کا پتلا ہے وہ دوسروں کے دل کی، دوسروں کے جذبات کی اس وقت تک کچھ بھی پرواہ نہیں کرتا جب تک اپنے دل پر چوٹ نہ لگے۔ اس نے اپنی ماں کی محبت کی گہرائی کو نہ دیکھا۔ اس کی صاف دلی کو نہ سمجھا۔ اس نے اسے صرف ایک ان پڑھ اور جاہل عورت سمجھا۔ اور اسی روز سے اور بھی روکھا برتاؤ کرنے لگا۔

ادھر برج موہن کی ماں بھی ان پڑھ تھی۔ اس نے بھی تھپڑ کا جواب گھونسے سے دینا شروع کیا۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ برج موہن کے روکھے برتاؤ سے دکھی ہو کر تنہائی میں گھنٹوں رویا کرتی تھی۔ مگر اسے اپنے دل پر اس قدر اختیار نہ تھا کہ اپنے برتاؤ کو ٹھیک رکھتی۔ جب بات نکلتی تھی تو ایک کی چار سناتی تھی۔ عموماً جھگڑا شروع اسی کی طرف سے ہوتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ منورما نے نہا کر غلطی سے ساس کی دھوتی پہن لی۔ ساس نے بھی کچھ دیر کے بعد غسل کیا۔ غسل کرنے کے بعد جب دھوتی کی ضرورت پڑی۔ تب معلوم ہوا کہ اس کی دھوتی بہو رانی نے پہن لی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ اس کا غصہ ابل پڑا۔ چیخ کر بولی۔ "دیکھو تو رانڈ کی باتیں۔ میرے کپڑے چھیننے کی گھات میں ہے۔"

ساس کی طرف سے شوہر کی بے پرواہی دیکھ کر منورما کی ہمت دوبالا ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے بھی جواب دیا۔ "ذرا سوچ سمجھ کر بات کہا کرو۔ کیوں بڑھاپے میں اپنی مٹی خراب کرانے کے درپے ہوئی ہو۔ ہمارا ہی دیا کھاتی پہنتی ہو۔ اور ہم ہی تمہارے کپڑے چھیننے کی گھات میں ہیں! کہتے شرم بھی تو نہیں آتی۔ دیکھو نہ باپ کے گھر سے کپڑوں کے تھان آتے ہیں۔ ہمیں جو رانڈ کہے۔ وہ اس جنم میں تو رانڈ ہے ہی۔ رام کرے۔ سات جنموں تک رانڈ رہے!"

منورما کی یہ بات سنی تو ساس کے سر پر غصہ کا بھوت سوار ہو گیا۔ اس نے جو منہ میں آیا، بکنا شروع کر دیا۔ منورما جب اس کی باتوں کا جواب نہ دے سکی تو بیٹھ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد برج موہن آ گیا۔ منورما نے رو رو کر اس سے سب حال بیان کیا۔ برج موہن اسی وقت غصے میں بھرا ہوا ماں کے پاس پہنچا اور بولا۔ "کیوں ماں! تم نے اسے رانڈ کیوں کہا۔"

ماں نے جواب دیا۔ "میں نے کہا اور سو بار کہوں گی۔ جو تیرا جی چاہے تو کر۔ اور جو اس رانڈ کا جی چاہے وہ کر کے دیکھ لے۔"

برج موہن۔ "تم اتنی بیوقوف ہو۔ تمہیں یہ پتہ نہیں کہ اسے رانڈ کہہ کر مجھے ہی کوس رہی ہو۔"

ماں۔ "کوستی تو ہوں۔ پھر؟ میں تو کہتی ہوں کہ جب تیری ارتھی نکلے گی۔ جس روز اس کل موہنی کی چوڑیاں پھوٹیں گی اس روز میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔"

ماں کی یہ باتیں سن کر برج موہن سناٹے میں آ گیا۔ اس نے سوچا۔ "یہی میری ماں ہے؟ اسی کی محبت کے راگ الاپے جاتے ہیں؟ یہ ماں نہیں ہے۔ ڈائن ہے۔ کالی ناگن ہے!"

برج موہن کے دل میں ماں کی طرف سے سخت نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے کچھ دیر تک سوچ کر کہا۔ "بس حد ہو گئی۔ اب ہمارا تمہارا گزارہ ایک مکان میں نہیں ہو سکتا۔"

ماں نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں ہو سکتا تو اپنا کالا منہ لے کر نکل جا۔ یہ گھر میرے آدمی کا ہے۔ میں تو اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے جو اس گھر سے نکلنے کو کہے گا، اس کی اپنی جان ایک کر دوں گی۔"

برج موہن نے کرخت لہجے میں کہا۔ ”تمہارے آدمی کا ہے تو تم اسے لے کر بیٹھو۔ جو میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں تو اس گھر میں آکر کبھی تھوکوں گا بھی نہیں۔“

ماں بولی۔ ”اور جو میں بھی اپنے باپ کی بیٹی ہوں تو تیرے دروازے پر کوڑا پھینکنے بھی نہ جاؤں گی۔“

برج موہن کو اپنی ماں سے الگ ہوئے تین مہینے ہو چکے۔ اتنے دنوں تک دونوں نے اپنے اپنے عہد کو نبھایا۔ برج موہن تو ماں کو ایک طرح سے بالکل ہی بھول گیا۔ مگر برج موہن کی ماں اب بھی ہر روز پاس پڑوس والوں سے برج موہن کے بارے میں پوچھ لیتی اور یہ معلوم کر کے کہ وہ مزے سے ہے 'اطمینان کی سانس لیتی ہے۔ اس دوران میں برج موہن کی سالگرہ کا دن پڑا۔ اس روز ماں نے بڑی خوشیاں منائیں۔ برہمنوں کو دان دچھنا دی۔ اڑوس پڑوس کی دو چار عورتوں کو اکٹھا کر کے کچھ گایا بجایا۔ بعض لوگ اس کی کارروائی پر ہنستے تھے۔ کہ یہ بڑھیا پاگل ہو گئی ہے۔ خود ہی تو پہلے لڑ بھڑ کر بیٹے سے الگ ہوئی۔ اور اب اس کی سالگرہ کے موقع پر ڈھولک ٹھنکاتی ہے۔

بعض اوقات بڑھیا خلوت میں بیٹھ کر سوچا کرتی کہ میں نے ناحق جھگڑا بڑھایا۔ میں خاموش رہتی تو بہتر تھا۔ میرا برج موہن میری آنکھوں کی اوٹ نہ ہوتا۔ ہائے! میں نے اسے کیسی کیسی کڑی باتیں کہیں۔ میں نے اسے کوسا ہے۔ بھگوان! اس وقت میری جیب کیوں نہ جل گئی۔ رام کرے۔ اسے کوسا ہوا مجھے لگ جائے۔ ایسی ایسی باتیں سوچ کر بڑھیا گھنٹوں بیٹھی رویا کرتی۔ اور بالآخر یہ کہہ کر دل کو تسلی دیتی کہ چاہے وہ کہیں رہے ایشور اسے دودھ پوت سے سکھی رکھیں۔

ایک روز ایک ہمسائے نے آکر کہا۔ ”تین دن سے برج موہن کو تیز بخار ہے۔ بیہوش پڑا ہے۔“ اتنا سنتے ہی بڑھیا کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس نے گھبرا کر کہا۔ ”دیکھو! اس کل موہنی نے مجھے خبر تک نہ کی۔ اس نے تو میرے برج موہن کا دل خراب کر دیا۔ نہیں تو اس کا ایسا اچھا سبھاؤ ہے کہ ویسے سبھاؤ کا آدمی دیا لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ ملے گا۔“

برج موہن کی ماں اسی وقت برج موہن کے گھر پہنچی۔ برج موہن نے ماں کو دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ برج موہن کا بخار بڑھتا گیا۔ وہ ایک ماہ کے قریب بیمار رہا۔ بڑھیا نے ٹہل خدمت میں جان لڑا دی۔ حتی الوسع منورما کو الگ رکھنے کی کوشش کرتی رہی۔ ماں رات رات بھر بیٹھی پنکھا جھلتی رہتی تھی۔ وقت پر دودھ دیتی۔ وقت پر پرہیزی غذا کھلاتی۔ بخار کم ہونے پر ایک روز رات کے دو بجے برج موہن کو اچھی طرح ہوش آیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اس کے سرہانے اس کی ماں بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ پاس ہی ایک پلنگ پر منورما پڑی سو رہی تھی۔ نیند کے مارے بڑھیا کی آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں۔ مگر وہ بدستور اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔ برج موہن کو ادھر ادھر تکتے دیکھا تو ماں کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کیوں بیٹا! کیسی طبیعت ہے 'کیوں بیٹا! کیسی طبیعت ہے؟“

یہ الفاظ تھے تو معمولی مگر ماں کے منہ سے نکلے ہوئے ان الفاظ میں خدا معلوم کتنی محبت کی سرگزشت پنہاں تھی۔ برج موہن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ اس نے ماں کہہ کر ماں کے گلے کے گرد اپنی باہیں ڈال دی۔

دہریہ پروفیسر

(1)

پروفیسر کنج بہاری ایم-اے بگڑ کر بولے۔ "یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ ایشور ویشور کچھ نہیں ہے۔ سب ڈھکوسلا ہے۔ ہم لوگ بہت عرصے سے ایشور پر اعتقاد رکھنے کے عادی ہو رہے ہیں۔ اس لئے ہمارا دل ایشور کی طرف جھکتا ہے۔ ورنہ ہمارے پاس اس کی ہستی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔"

پروفیسر صاحب کے دوست پنڈت اجودھیا پرشاد بی۔اے نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے باپ دادا تو گوبر کا ڈھیر پوجتے پوجتے مر گئے۔ اور اب تم ایشور پر بھی اعتقاد نہیں رکھتے۔"

پروفیسر صاحب ذرا جھینپ کر بولے۔ "کیوں صاحب! اس گوبر کے ڈھیر سے آپ کا کیا مطلب ہے۔"

اجودھیا پرشاد نے ہنس کر جواب دیا۔ "یہاں آپ شہر میں ہیٹ (ولایتی ٹوپی) لگا کر نئی تہذیب کی خراد پر چڑھ گئے ہیں۔ مگر آپ کے بدن میں خون دیہاتی ہی ہے۔ یہ کم سے کم آپ کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔"

پروفیسر صاحب ذرا جوش میں آ کر بولے۔ "تو پھر اس سے کیا؟ آخر آپ دیہاتیوں سے اس قدر نفرت کیوں کرتے ہیں؟ دیہاتی کیا آدمی............"

"آپ اتنے ناراض نہ ہوں۔ میں دیہاتیوں سے نفرت نہیں کرتا۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ مگر ان دیہاتیوں سے جو اپنا دیہاتی پن چھپانے کی کوشش نہیں کرتے۔ جنہیں اپنے دیہاتی پن پر ناز ہے۔ مگر جو لوگ کوٹ پتلون اور ہیٹ کی آڑ میں اپنا دیہاتی پن چھپا کر ٹھیٹھ پیرس کے باشندے بننا چاہتے ہیں۔ جو اپنا دیہاتی پن ظاہر کرتے ہوئے جھینپتے ہیں۔ ان سے میں ضرور نفرت کرتا ہوں۔"

"خیر! یہ اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات ہیں۔ کوئی اسے ٹھیک سمجھتا ہے۔ کوئی نہیں۔ انسان ترقی کرنے والا جاندار ہے۔ انسان کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جب وہ نیچی حالت سے اونچی حالت میں پہنچ جائے تو بھی اپنی نیچی ہی حالت کو ظاہر کرنے میں فخر سمجھے۔ یہ تو محض دیوانہ پن ہے۔"

"بلاشک۔ مگر یہ دیوانہ پن اس حالت میں ہو سکتا ہے۔ جب جسے وہ نیچی حالت سمجھتا ہے' وہ دراصل نیچی حالت ہو۔"

اجودھیا پرشاد زور سے ہنس کر بولے۔ "واہ یہ خوب رہی اتنی باتیں ہو گئیں۔ اور آپ کو ابھی تک اپنی بات کا جواب نہیں ملا۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہے کہ دیہات میں مٹی اور گوبر کے بت پوجنے کا بہت چلن ہے۔"

پروفیسر صاحب نے اجودھیا پرشاد کی بات کا مطلب سمجھ کر کہا۔ "آپ تو ہیں بوڑم! بی۔اے تک تعلیم حاصل کر کے بھی آپ کو ذرا تمیز نہ آئی۔ آپ ہی ایسے لوگ پڑھے لکھے بیوقوف کہلاتے ہیں۔ جو چیز ہمارا کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتی' اس کی ہستی کے اگر ہم قائل نہ بھی ہوں تو اس میں کوئی نقصان نہیں۔ ایشور ہمارا کچھ بنا بگاڑ نہیں سکتا۔ اس لئے وہ نہ ہونے کے برابر ہی ہے۔"

"دلیل سے تو ایشور کی ہستی کبھی ثابت ہو ہی نہیں سکتی۔"

"تو پھر کا ہے سے ثابت ہو سکتی ہے؟"
"صرف تجربے سے"
"یہ آپ کی لچر دلیل ہے۔"
"آپ ایسا ہی سمجھیں۔"

اجودھیا پرشاد کی اس بات سے پروفیسر صاحب نے ان کو اپنی بات کا جواب دینے کے ناقابل سمجھا۔ چنانچہ خوش ہو کر بولے۔ "اسی سے تو کہتا ہوں کہ تم لوگوں کو کوری باتیں بنانا آتی ہیں۔ ثبوت وبوت تم لوگوں کے پاس خاک بھی نہیں ہے۔ آج کل وہ زمانہ نہیں رہا۔ جب "باباوا کیم پرمانم" پر لوگوں کو اعتقاد تھا۔ اب تو جس بات کا بین ثبوت موجود ہو' وہی ٹھیک سمجھی جاتی ہے۔ (مسکرا کر) جونی بات کا ہمرے پاس پرمان ہوئی۔ تونی تو ہم مانب دادا۔ اور جونی کا نہ ہوئی تون نہ مانب۔ چاہے برہے کا ہے نہ کہیں۔"

اجودھیا پرشاد نے مسکرا کر کہا۔ "دیکھئے دیکھئے۔ آپ کا دیہاتی پن پھر زور پکڑ رہا ہے۔ اسے ذرا سنبھالئے۔ اس ہیٹ اور کوٹ کی ساری شان خاک میں ملی جا رہی ہے۔"

پروفیسر صاحب ذرا شرمندہ ہو کر بولے۔ "دیہاتی تو بھائی ہم ہیں ہی۔ اس میں شک ہی کیا ہے؟ اور ہماری مادری زبان بھی دیہاتی ہی ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم ہیٹ کوٹ پہنیں ہی نہ۔"

(2)

پروفیسر کنج بہاری کی بیوی سکھ دیوی بڑی دھارمک ہے۔ پوجا پاٹ وغیرہ میں اس کی بڑی لگن ہے۔ ہر روز صبح کے وقت دو تین گھنٹے پوجا پاٹ کرتی ہے۔ پروفیسر کو ان کا یہ دھرم کرم ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ وہ اسے صرف ایک ڈھونگ سمجھتے ہیں۔ کئی بار پروفیسر صاحب نے بیوی کے اس کام کی سخت مخالفت کی۔ مگر بیوی نے ان کی ایک نہ مانی۔ اور برابر اپنا کام کرتی رہی۔ مندرجہ بالا واقعہ کے کچھ عرصے بعد اچانک پروفیسر صاحب کا لختِ جگر جس کی عمر تین سال کے لگ بھگ تھی؟ بیمار ہو گیا۔ پروفیسر صاحب ڈاکٹری معالجہ کرانے لگے۔

دوسرے دن صبح کے وقت سکھ دیوی نے شوہر سے کہا۔ "تم ذرا رادھے (لڑکے کا نام) کو تھوڑی دیر اپنے پاس رکھ لو۔ میں اپنی پوجا کر لوں۔"

پروفیسر صاحب بگڑ کر بولے۔ "چولھے میں گئی تمہاری پوجا کیا ہو گیا ایسی پوجا کرنے سے۔"

سکھ دیوی کے کلیجے میں شوہر کے یہ الفاظ تیر کی مانند لگے مگر وہ حسب سابق پُرمتانت انداز سے بولی۔ "میرا یہ ہمیشہ کا نیم ہے۔ میں اسے توڑنا اچھا نہیں سمجھتی۔ تھوڑی دیر کی تو بات ہے۔ اسے لئے رہو۔"

سکھ دیوی نے یہ کہا اور شوہر کے جواب کا انتظار نہ کر کے رادھے کو پروفیسر صاحب کی گود میں دے کر چلی گئی۔

پروفیسر صاحب کُڑھ کر دل میں کہنے لگے۔ "جاہل عورتوں سے اس کے سوا اور توقع ہی کیا کی جا سکتی ہے؟ جب دیکھو۔ تب پوجا پاٹ۔ معلوم نہیں اس سے لوگوں کو کیا ملتا ہے؟ ایک فرضی نام کے پیچھے ساری دنیا مٹی جا رہی ہے۔ آج تک کسی نے ایشور کی جھلک تک نہیں دیکھی۔ مگر پھر بھی اس اندھا دھند تقلید کا پیچھا نہیں

چھوڑتے۔ میں جلدی ہی اس مضمون پر ایک کتاب لکھوں گا اور اس میں ایشور وادیوں کو اتنا پھٹکاروں گا کہ وہ بھی یاد کریں گے۔"

اس کے بعد جب پروفیسر صاحب کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو ان کا دھیان رادھے کے سر کی طرف گیا۔ سر کی طرف تھوڑی دیر دیکھتے رہنے کے بعد وہ سوچنے لگے۔ "نیچر بھی کیسی عقلمند ہے۔ اس نے انسان کا سر گول بنایا ہے چوکور نہیں بنایا۔ کیونکہ اسے یہ معلوم تھا کہ اگر سر چوکھونٹا ہوا تو اول تو دیکھنے میں برا لگے گا۔ دوئم لیٹنے اور کروٹ بدلنے میں آدمیوں کو تکلیف ہو گی۔"

پروفیسر صاحب اسی قسم کی باتیں سوچتے رہے۔ کبھی بالوں کے بارے میں سوچتے تھے کہ نیچر نے آدمی کے سر پر اتنے بال کیوں پیدا کئے۔ اسی ادھیڑ بُن میں ایک گھنٹہ گزر گیا۔ ایک گھنٹہ کے بعد سکھ دیوی نے پوجاپاٹ سے فراغت پائی اور پروفیسر صاحب کو نیچر کی عجیب وغریب کارروائیوں پر غور کرنے سے آزاد کیا۔

پروفیسر صاحب رادھے کو سکھ دیوی کی گود میں لٹا کر بولے۔ "تمہیں تو اپنے پوجاپاٹ کی پڑی رہتی ہے۔ لڑکے کی کوئی فکر نہیں۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے لئے پوجاپاٹ سے زیادہ قیمتی رادھے ہے۔ اس لئے اب اسی کی پوجاپاٹ کیا کرو۔"

سکھ دیوی سنجیدگی اختیار کر کے بولی۔ "میں اسی کا پوجاپاٹ کرتی ہوں۔"

پروفیسر نے طنزاً کہا۔ "تو اس وقت بھی شاید تم نے اسی کی پوجا کی ہے؟"

سکھ دیوی۔ "اس کی نہیں کی۔ مگر اس کے لئے کی ہے۔"

پروفیسر۔ "اس پوجا سے کیا ہو گا؟"

سکھ دیوی۔ "ایشور اسے اچھا کر دیگا۔"

پروفیسر (نفرت آمیز ہنسی ہنس کر) "تو ایشور تمہارے کہنے میں ہے؟"

سکھ دیوی۔ "کہنے میں وہ کسی کے نہیں۔ مگر جو لوگ اس کا دھیان دل سے کرتے ہیں' ان پر وہ ضرور رحم کرتا ہے۔"

پروفیسر۔ "ایشور ہے کیا چیز۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے یا خالی ایشور کا نام سن رکھا ہے۔"

سکھ دیوی۔ "خالی نام ہی نہیں سنا۔ مجھے اس پر اعتقاد ہے۔"

پروفیسر۔ "جھوٹی باتوں پر بھی لوگوں کا اعتقاد جم سکتا ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب سکھ دیوی کے پاس سے چلے گئے۔

(3)

رادھے کی حالت روز بروز بگڑنے لگی۔ پروفیسر نے حتی الوسع علاج معالجہ کرایا۔ مگر کوئی اچھے آثار نظر نہ آئے۔ جوں جوں رادھے کا حال ابتر ہونے لگا توں توں پروفیسر صاحب سکھ دیوی کی بھجن بندگی سے زیادہ ناراض ہونے لگے۔ ایک روز انہوں نے سکھ دیوی کے منہ پر صاف صاف کہہ دیا۔ "تمہاری لاپرواہی سے لڑکے کی حالت خراب ہوتی جاتی ہے۔ اور تم اندھ وشواش کے پھیر میں پڑی ہوئی ہو۔ تم دوا دارو کی کچھ پرواہ نہیں کرتی۔ باقاعدگی

کے ساتھ دوا نہیں کھلاتی۔ یاد رکھو جو رادھے کو کچھ ہو گیا تو تم کو اس کا جواب دہ بننا پڑے گا۔"

سکھ دیوی۔ "مجھے دواؤں پر اس قدر اعتقاد اور بھروسہ نہیں جتنا ایشور کے رحم اور طاقت پر ہے۔"

بیوی کا یہ جواب سنا تو پروفیسر صاحب آگ ہو گئے۔ مارے غصے کے ان کا منہ لال سرخ ہو گیا۔ وہ کرخت لہجے میں بولے۔ "بھاڑ میں گیا تمہارا ایشور اور اس کی طاقت۔ دوائیں جو ہیں پھل دکھلاتی ہیں۔ ان پر تمہیں اعتبار نہیں۔ اور ساڑھے تین حرف کے لفظوں پر اس قدر بھروسہ ہے؟ میں آج تمہارے اس اندھا دھند اعتقاد کو ضرور دور کروں گا۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب لپکتے ہوئے سکھ دیوی کے پوجا گھر میں گئے۔ اس کی پوجا کا سامان اور مورتیاں اٹھا کر ادھر ادھر پھینک دیں۔ اور اسی طرح پیچ و تاب کھاتے ہوئے لوٹ کر سکھ دیوی سے بولے۔ "دیکھوں۔ اب یہ تمہاری مورتیاں اور تمہارا ایشور میرا کیا کر لیتا ہے؟"

شوہر کی اس کارروائی کو دیکھ کر سکھ دیوی کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ نکلا۔ وہ شوہر کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر روتی ہوئی بولی۔ "ہائے! تم نے یہ کیا کیا۔ تم نے میری محنت خاک میں ملا دی۔ ابھی تک مجھے امید تھی۔ مگر اب میری ساری امید ٹوٹ گئی۔ تھوڑی دیر پہلے جس بات کا جواب دہ مجھے بنا رہے تھے۔ اس کام کے کرنے سے تم خود ہی اس کے لئے جواب دہ بن گئے۔ ہائے ایشور! اب کیا ہوگا۔"

(4)

رات کے آٹھ بجے ہیں۔ رادھے عالم بیہوشی میں پلنگ پر پڑا ہوا ہے۔ پلنگ کے ایک طرف سکھ دیوی اور دوسری طرف پروفیسر صاحب بیٹھے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے چہرے پر فکر و غم کے آثار صاف طور سے جھلک رہے ہیں۔ سکھ دیوی کے چہرے سے سنجیدگی برستی ہے۔ مگر اس سنجیدگی کے نیچے دلی تکلیف' خوف اور فکر کی جھلک پھوٹ نکلنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ڈاکٹروں نے آج کی رات رادھے کے لئے نازک بتلائی ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ آج رات کو رادھے کا بچنا بے حد مشکل ہے۔ مگر جو آج کی رات بخیریت گزر گئی تو پھر یہ امر ہے۔ پروفیسر صاحب لحہ لحہ کے بعد رادھے کی نبض دیکھتے ہیں۔ نبض دیکھنے پر کبھی ان کا چہرہ کھل اٹھتا ہے' کبھی مرجھا جاتا ہے۔ اور سکھ دیوی چپ چاپ بیٹھی ہے۔ اس کی نگاہ صرف رادھے کے چہرے کی طرف ہے۔ پروفیسر صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔ انہیں آج گھڑی کی سوئیوں کی رفتار بہت دھیمی معلوم ہوتی ہے۔ جتنی دیر میں وہ ایک گھنٹہ گزرنے کی توقع کرتے ہیں' اتنی دیر میں صرف بیس پچیس منٹ گزرتے ہیں۔ اسی طرح تین گھنٹے گزرے۔ گیارہ بجے کے قریب پروفیسر صاحب نے پھر نبض دیکھی۔ نبض دیکھتے ہی ان کا چہرہ شگفتہ ہو اٹھا۔ وہ سکھ دیوی سے بولے۔ "اگر نبض ایسی ہی رہی تو کوئی خطرے کی بات نہیں۔ دوا کا ایک معتاد اور پلانا چاہیے۔ وقت ہو گیا۔"

سکھ دیوی نے قدرے لاپرواہی سے جواب دیا۔ "پلا دو۔"

پروفیسر صاحب سکھ دیوی کی لاپرواہی کو سمجھ کر بولے۔ "تمہیں تو دوا پر اعتقاد آ ہی نہیں سکتا۔ یہ تمہاری خطا نہیں تمہاری لاعلمی اور جہالت کا قصور ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر صاحب نے دوا کی شیشی اٹھائی اور سکھ دیوی کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ "دیکھو۔ اس وقت ہمارا ایشور یہ دوا ہے۔ باقاعدہ طور پر پلاؤ۔ یہ اپنا گن دکھاوے گی اگر اس کی طرف سے بے پرواہی برتو گی' باقاعدہ طور پر نہ دو گی تو یہ کوئی پھل نہیں دکھلاوے گی۔"

سکھ دیوی نے شوہر کے اوپر ایک تیز نگاہ ڈالی۔ اس نگاہ میں وہ انداز تھا جو ایک عقلمند آدمی کی نگاہ میں اس وقت ہوتا ہے جب وہ ایک بیوقوف آدمی کو بڑھ بڑھ کر باتیں مارتے ہوئے دیکھتا ہے۔ "پروفیسر صاحب پر اس نگاہ کا اثر بھی ویسا ہی پڑا۔ اس نگاہ کی تیزی کو وہ برداشت نہ کر سکے۔ وہ آگے اور بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر کہہ نہ سکے۔ اپنی مرضی کے خلاف انہیں اپنی بات پر کچھ ندامت سی محسوس ہوئی۔ سکھ دیوی نے چپ چاپ اپنی نگاہ نیچی کر لی۔ اور پھر اسی طرح رادھے کے منہ کی طرف دیکھنے لگی۔

پروفیسر صاحب نے دوا پلا دی اور پھر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ایک گھنٹہ تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ بیچ بیچ میں پروفیسر صاحب نبض دیکھ لیتے تھے۔

بارہ بجنے میں چند منٹ کی کسر تھی۔ پروفیسر صاحب نے پھر نبض ٹٹولی۔ نبض دیکھتے ہی ان کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ گھبرا کر سکھ دیوی سے بولے۔ "اس وقت نبض بہت گری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھے۔ اور انہوں نے پھر دوا کا معتاد پلایا۔ مگر دوا حلق سے نیچے نہ اتری۔ پروفیسر صاحب گھبرا گئے۔ دل اور آنکھوں نے اپنا کام ایک ساتھ کیا۔ دل سے ایک آہ نکلی اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ انہوں نے شیشی پٹک دی اور رادھے کے منہ پر منہ رکھ کر بچوں کی طرح رونے لگے۔ سکھ دیوی کی آنکھوں سے بھی آنسو رواں ہو گئے۔

پروفیسر صاحب روتے روتے سکھ دیوی سے بولے۔ "ہائے اب کیا کریں۔ کوئی تدبیر نہیں سوجھتی!"

سکھ دیوی آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔ "تم نے اپنی تمام تدبیریں کر لیں۔ مگر میری تدبیر کی جڑ تم نے پہلے ہی کاٹ دی۔ اب میں کیا کہوں؟"

پروفیسر صاحب کچھ دیر تک روتے رہے۔ پھر آنسو پونچھ کر بولے۔ "اب وہ تمہارا ایشور کہاں ہے؟ اسے کیوں نہیں بلاتیں؟ آخر وہ کام کب آوے گا؟"

سکھ دیوی۔ "میں اسے کس منہ سے پکاروں؟ تم نے میرے پوجا کے دیوتا (معبود) کی جو بے عزتی کی ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھ میں طاقت نہیں کہ اس سے مدد مانگ سکوں۔"

پروفیسر۔ "ہوں۔ بے عزتی۔ گویا وہ مورتیاں بھی کوئی آدمی تھیں۔"

سکھ دیوی۔ "دیکھو۔ میں تم سے پرارتھنا کرتی ہوں کہ اب ان کے بارے میں کوئی بری بات زبان سے نہ نکالنا۔"

پروفیسر صاحب چپ ہو گئے۔ انہوں نے پھر رادھے کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ نبض پر ہاتھ رکھتے ہی وہ چلّا اٹھے۔ "لو رادھے کی ماں! اب یہ کچھ ہی دیر کا مہمان ہے۔ (پھر رو کر) بولو۔ اب کیا تدبیر کی جائے۔"

سکھ دیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر ایک بہشتی نور نمودار ہو گیا۔ بولی "ایک بار کوشش کرتی ہوں۔ تم بھی کوشش کرو۔ جھکو۔ گھٹنے ٹیک دو۔"

پروفیسر صاحب سکھ دیوی کے چہرے کا نور دیکھ کر سناٹے میں آ گئے۔ اس وقت انہوں نے اپنے کو سکھ

دیوی کے سامنے ویسا ہی سمجھا جیسے ایک لڑکا اپنے تئیں استاد کے سامنے سمجھتا ہے۔ یا نوکر اپنے آقا کے روبرو۔ انہیں سکھ دیوی کا حکم ٹالنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فوراً گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئے۔

سکھ دیوی بولی۔ "دھیان کرو۔ ایشور کو سروشکتی مان سمجھتے ہوئے سچے دل سے اس کا دھیان کرو۔ اپنے گزشتہ اعمال کے لئے صدق دلی سے اظہار تاسف کرو۔ بس اب صرف یہی تدبیر باقی ہے۔"

پروفیسر صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا۔ "ایشور!..........." اور وہ اسی حالت میں محویت کے عالم میں چلے گئے۔

(5)

اجودھیا پرشاد شام کو سیر کر کے اپنے فرودگاہ پر واپس آئے۔ کمرے میں پہنچتے ہوئے انہوں نے میز پر ایک خط پڑا ہوا پایا۔ خط کھولا۔ اس میں درج تھا۔

پیارے اجودھیا پرشاد! تم تو بنارس میں ایسے رم گئے کہ اب تک لوٹنے کا نام ہی نہ لیا۔ کب تک لوٹنے کا ارادہ ہے؟ اب تمہاری صحت کیسی ہے؟ پرماتما کرے۔ پہلے سے بہتر ہی ہو۔ چونکہ میں بھی اب ایشور وادی ہو گیا ہوں۔ تمہارے قول کے مطابق کسی دلیل سے نہیں بلکہ تجربہ کی بنا پر۔ بوقت ملاقات سارا حال سناؤں گا۔ رادھے کو آج پرہیزی غذا دی گئی ہے۔ اگر تمہاری صحت پہلے سے بہتر ہو تو چلے آؤ۔"

تمہارا پیارا "کنج بہاری"

اجودھیا پرشاد نے مسکرا کر چٹھی میز پر رکھ دی اور خود بخود کہنے لگے۔ اس کٹر منکر کو ایسا کون سا تجربہ ہوا۔ جس نے اسے ایشور کا معتقد بنا دیا۔

انسان نما حیوان

(1)

پنڈت امبکا پرشاد متوسط الحال آدمی ہیں۔ پڑھے لکھے خاصے اچھے ہیں۔ انگریزی میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ سنسکرت بھی جانتے ہیں۔ ہندی تو مادری زبان ہے ہی۔ اردو میں بھی آپ کو کافی استعداد حاصل ہے۔

آپ ایک کالج میں پروفیسر ہیں۔ ڈھائی سو روپیہ تنخواہ ملتی ہے۔ آپ کے کنبے میں پانچ آدمی ہیں۔ خود آپ۔ آپ کی بیوی۔ آپ کی والدہ۔ ایک بیوہ چچی۔ اور ایک آپ کا چھوٹا بھائی جو جماعت نہم میں پڑھتا ہے۔

شام کے چار بج چکے تھے۔ یکایک پنڈت امبکا پرشاد کی بیوی گائتری دیوی نے چونک کر اپنی سہیلی سے کہا۔

"کیوں بہن پریما! اس وقت کیا بجا ہو گا؟ تمہارے یہاں تو کوئی گھڑی بھی نہیں۔"

پریمانے ذرا جھینپ کر جواب دیا۔ "بہن! ہم لوگوں کے یہاں گھڑی کا کیا کام! گھڑی تو دفتر کے بابو لوگوں کو چاہیے۔"

گائتری قدرے بے چین ہو کر بولی۔ "معلوم نہیں کیا بجا ہو گا؟ اچھا بہن! اب جاتی ہوں۔ پھر کسی دن آؤں گی۔"

پریمانے منہ بھاری کر کے کہا۔ "اجی بیٹھو بھی۔ معلوم نہیں کتنے دن بعد تو آئی ہو۔ جلدی کیا پڑی ہے۔ چلی جانا۔"

گائتری۔ "بہن! تم ایسی باتیں کرتی ہو جیسے برسوں بعد ملی۔ گھر سے گھر ملا ہوا ہے۔ چھت سے چھت بھڑی ہوئی ہے۔ روز بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ پھر بھی تمہارا پیٹ نہیں بھرتا۔"

پریما۔ "یہ بات الگ ہے۔ ہمارے گھر تو تم بہت دنوں بعد آئی ہو۔"

گائتری۔ "(مسکرا کر کھڑی ہو گئی) اور ایک انگڑائی لے کر بولی "بہن! بیٹھتی تو ابھی کچھ دیر اور۔ مگر دن ڈھل چکا ہے۔ ان کے آنے کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ تم تو ان کا سبھاؤ جانتی ہی ہو ذرا ذرا سی بات میں ہاتھ چلا بیٹھتے ہیں۔"

پریما۔ "ہاں سبھاؤ تو بہت برا ہے۔ میں سچ کہتی ہوں بہن! تم ہی ایسی ہو جو سہہ لیتی ہو میں تو کبھی نہ سہوں۔"

گائتری ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ "سہوں نہ تو کیا کروں؟ ایک آدمی کا سبھاؤ ہی پڑ گیا۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ سہنا ہی پڑتا ہے۔ اچھے کے ساتھ تو سبھی نبھاہ لیتے ہیں۔ بات تو تب ہے۔ جب برے کے ساتھ نبھاوے۔"

پریما۔ "ہاں بہن! تمہارے منہ سے یہی زیب دیتا ہے۔"

گائتری پریما سے رخصت ہو کر گھر آئی۔ گھر آ کر وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف گئی۔ کمرے کے دروازے پر اس نے قدم رکھا ہی تھا کہ دیکھا شوہر صاحب قمیض اور دھوتی پہنے کرسی پر بیٹھے ہیں۔ ان کی پیشانی پر بل پڑے ہیں۔ گائتری کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اس نے سوچا۔ غضب ہو گیا۔ انہیں آئے معلوم نہیں کتنی دیر ہوئی۔ میں یہاں موجود نہ تھی۔

وہ دبے پاؤں ڈرتی ڈرتی کمرے کے اندر پہنچی۔ امبکا پرشاد نے آہٹ پا کر اس کی طرف دیکھا۔ ان کی پیشانی کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔ انہوں نے گائتری کی طرف گھور کر دیکھا۔ گائتری کا اختلاج قلب اور بھی بڑھ گیا۔

امبکا پرشاد نے کرخت لہجہ میں کہا۔ "مجھے آئے تین گھنٹے ہو چکے اور تمہارا پتہ نہیں۔"

گائتری چونک پڑی۔ ایں! تین گھنٹے؟ اس کی نگاہ دیوار پر لگے ہوئے گھنٹے کی طرف گئی۔ گھنٹے میں پونے چار بجے تھے۔ سوچنے لگی۔ روز ساڑھے تین بجے آتے ہیں۔ کبھی کبھی سوا تین بجے بھی آ جاتے ہیں۔ اس حساب سے تو زیادہ سے زیادہ انہیں آدھ گھنٹہ ہوا ہو گا۔ آدھ گھنٹہ کو تین گھنٹے بتا رہے ہیں۔

گائتری کو خاموش دیکھ کر امبکا کا غصہ اور بھی بڑھا۔ وہ کچھ اور بگڑ کر بولے۔ "روز بروز تم بگڑتی ہی چلی جاتی ہو۔ ایک آدمی سمجھانے بجھانے سے مان جاتا ہے۔ مگر تمہاری سمجھ دیمک چاٹے جاتی ہے۔ وہی مثل ہے کہ

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔" "میں دن بھر مر کھپ کر تھکا ماندہ گھر آتا ہوں اور تمہارا پتہ نہیں رہتا۔ سہیلیوں کے ساتھ گل چھرے اڑایا کرتی ہو۔"

گائتری کا جسم کانپنے لگا۔ اسے پریما پر بہت غصہ آیا۔ اسی رانڈ نے مجھے روک لیا۔ نہیں۔ میں کبھی کی آگئی ہوتی۔ میں نے نگوڑی سے کہا بھی کہ مجھے جانے دے۔ مگر نہ مانی۔

گائتری کو بت کی طرح کھڑا دیکھ کر امبکا پرشاد بولے۔ "آخر تم گئی کہاں تھیں؟ کچھ معلوم بھی تو ہو۔"

گائتری نے دھیمے لہجہ میں کہا۔ "پریما کے ہاں گئی تھی۔"

امبکا پرشاد۔ "کیوں گئی تھیں؟ کچھ کام کاج تھا؟ اس کے ہاں کوئی تقریب تھی؟ کوئی ناچ گانا تھا؟ آخر کیا تھا۔ جو تم گئی تھیں؟"

گائتری چپ رہی۔

امبکا پرشاد چلا کر بولے۔ "بولتی نہیں حرامزادی!"

گائتری آب دیدہ ہو کر بولی۔ "اس نے کئی بار کہا تھا کہ ایک دن ہمارے گھر آؤ۔ اسی لئے چلی گئی تھی۔ جاتے وقت ماں جی سے پوچھ لیا تھا۔ انہوں نے کہہ دیا تھا۔ چلی جا۔ تب گئی تھی۔"

گائتری نے ماں جی یعنی اپنی ساس کا نام اس لئے لیا کہ شاید یہ جان کر کہ ماں جی نے اجازت دے دی تھی۔ شوہر صاحب کا غصہ فرو ہو جائے۔ مگر امبکا پرشاد بولے۔ "کیوں انہوں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ دن بھر وہیں بیٹھی رہنا؟ اور اگر انہوں نے کہا بھی ہو تو تجھے خود دھیان رکھنا چاہیے تھا۔ اتنی بڑی لفینڈ ہو گئی۔ مگر تجھے اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔ کیوں؟"

گائتری ذرا جوش میں آکر بولی۔ "تو اگر تھوڑی دیر ہو ہی گئی تو کیا ہوا؟ کہیں اور تو گئی ہی نہیں تھی۔ اور ماں جی سے پوچھ کر گئی تھی۔"

اتنا سن کر امبکا پرشاد بڑے جوش کے ساتھ اٹھے اور گائتری کے پاس پہنچ کر انہوں نے اسے دو تین طمانچے جڑ ہی تو دیئے۔ اس کے بعد اسے دھکا دے کر بولے۔ "جا حرامزادی! وہیں جا کر بیٹھ۔ ماں جی پر پھولی بیٹھی ہے۔ ہم کچھ نہ ہوئے۔ ماں جی سب کچھ ہو گئیں۔ ماں جی کا کہنا برہم وا کیہ ہے۔ چل دور ہو میرے سامنے سے۔"

دھکا لگتے ہی گائتری دیوار سے ٹکرا کر گر پڑی۔ سر میں چوٹ لگی۔ مگر غریب کرتی کیا۔ چپ چاپ آنچل سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

(2)

پنڈت امبکا پرشاد میز پر ہاتھ ٹیک کر بولے۔ "ہمیں سوراجیہ ضرور ملنا چاہیے۔ سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے۔ نیچر کو دیکھئے وہ کسی کو بھی غلام پیدا نہیں کرتی۔ چرند پرند سب آزاد۔ خود مختار ہوتے ہیں۔ اپنی آزادی بچانے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ان میں بھی طبعی رجحان ہوتا ہے۔ وہ بھی اپنے تئیں غلامی سے بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دیتے ہیں۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی آدمی کو غلام بنا کر رکھے۔ پرادھین بنا کر رکھے۔ اس پر حکم چلاوے سب انسانوں کے حقوق مساوی ہیں۔ جتنا حق آپ کو مجھ پر حکم چلانے کا ہے'

اسی قدر حق مجھے آپ پر بھی ہے۔ میں تو دنیا میں سب سے بڑا گناہ کسی کی آزادی و حریت کو غضب کر لینے کو ہی سمجھتا ہوں۔ یہ ایسا پاپ ہے جس کا کوئی نشچت ہی نہیں۔"

پنڈت امبکا پرشاد کی یہ زوردار بات سن کر ان کے دوستوں کے زمرے میں سناٹا چھا گیا۔

چند لمحہ بعد ان کا ایک دوست مراری لال بولا "آپ کے خیالات میرے خیالات سے کامل طور پر ملتے ہیں۔"

دوسرا۔ "آپ لوگوں کے خیالات بہت اعلیٰ ہیں۔ اگر ایسے ہی خیالات کے لوگ پیدا ہونے لگیں تو ہندوستان کی کایا پلٹ ہو جائے۔"

پنڈت امبکا پرشاد جوش میں بھرے بیٹھے تھے۔ بولے۔ "بڑا بھاری غضب تو یہ ہے کہ لوگ اپنے ہی اصولوں (قواعد) کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ منہ سے بکنے کو تو بڑے بڑے احوال اور اعلیٰ اعلیٰ خیالات بک جائیں گے مگر ڈھول کے اندر پول ہی رہے گی۔ جو کچھ زبان سے کہیں گے۔ خود اس کا آٹھواں حصہ بھی عمل نہ کریں گے۔ مجھے اس بات سے بڑی نفرت ہے۔ میرا پہلا اصول یہ ہے کہ اسی اصول کا پرچار کرو جسے تم عملی جامہ پہنا چکے ہو۔"

امبکا پرشاد کے ایک دوست نے دوسرے دوست کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دیکھا آپ نے پنڈت جی کے کیسے اعلیٰ خیالات ہیں۔"

امبکا پرشاد بولے۔ "میرے ہاں جتنے نوکر ہیں۔ سب کو اتنی آزادی حاصل ہے کہ شاید ہی کسی کے ہاں ویسی آزادی ملے۔ یہی سبب ہے کہ وہ میرے یہاں کی ملازمت نہیں چھوڑتے۔ خواہ دوسری جگہ انہیں دگنی تنخواہ ملے۔"

پنڈت امبکا پرشاد کے دو ایک دوست سر ہلا کر بولے "یہی بات ہے"

ایک صاحب بولے۔ "ہمارے بنک کے خزانچی پنڈت جی کے کہار کو سولہ روپے دیتے رہے۔ مگر اس نے ان کے ہاں نوکری کرنا منظور نہ کیا۔"

امبکا پرشاد بول اٹھے۔ "اور میرے ہاں صرف آٹھ روپے پاتا ہے۔ اس بات پر غور کیجئے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ وہی جو میں ابھی بیان کر چکا ہوں۔ میرے ہاں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ انسان بہت ہی آزادی پسند واقع ہوا ہے۔ انسان ہی کیوں۔ سارا جہاں ہی آزادی پسند ہے۔ چرند پرند وغیرہ کھلے اور آزاد رہنے میں کتنے ہٹے کٹے تر و تازہ رہتے ہیں۔ بندھے اور پنجرے میں بند چرند پرند کبھی موٹے تازے نہیں دیکھے جاتے۔ خواہ انھیں کیسی ہی اچھی خوراک دی جائے۔ میں نے آزادی پر مضمون لکھ کر ایک انگریزی رسالے بنام "ماڈرن ریویو" میں بھیجا تھا۔ لوگوں نے اس مضمون کی اس قدر تعریف کی کہ میں کچھ بیان نہیں کر سکتا۔"

مراری لال بول اٹھے۔ "بلاشک وہ مضمون ایسا ہی تھا۔ آپ جس موضوع پر لکھتے ہیں خوب لکھتے ہیں۔"

ٹھیک اسی وقت ایک اور صاحب تشریف لائے۔ انہیں دیکھتے ہی امبکا پرشاد بڑی خوشی سے بولے۔ "آیئے ترویدی جی کہیئے۔ سب خیریت ہے؟"

ترویدی جی بیٹھتے ہوئے بولے۔ "سب آپ کی عنایت ہے۔ کیا بات چیت ہو رہی ہے؟"

امبکا پرشاد نے مسکرا کر کہا۔ "آزادی کے مضمون پر گفتگو ہو رہی ہے۔"

ترویدی جی ذرا سنجیدہ ہو کر بولے۔ "ہاں۔ آزادی کا مضمون تو بہت وقیع ہے۔ اس پر تو میں نے ایک آپ کا آرٹیکل بھی دیکھا تھا۔"

مراری لال نے کہا۔ "ماڈرن ریویو میں شائع ہوا تھا۔"

ترویدی۔ "ٹھیک۔ ماڈرن ریویو میں ہی دیکھا تھا۔ اچھا مضمون ہے۔ آپ کبھی ہمارے پرچے پر مہربانی نہیں کرتے۔"

امبکا پرشاد منہ بنا کر بولے۔ "اردو! اردو میں تو مضمون گھٹتا نہیں۔"

ترویدی جی۔ "اردو سے آپ کو اس قدر کیا کہوں؟ نفرت کہوں۔ دشمنی کہوں۔ لاپرواہی کہوں؟"

امبکا پرشاد ہنس کر بولے۔ "نہیں۔ یہ کوئی بات نہیں۔ اردو ہماری زبان ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ مگر وہ ابھی اس قدر غیر شستہ ہے کہ اس کے ذریعے دل کے خیالات کامل طور سے ظاہر نہیں کئے جا سکتے۔

ترویدی۔ "آپ کی یہ بات کسی حد تک درست ہے۔ مگر سوچئے تو سہی۔ اگر آپ جیسے لوگ اس کی طرف سے لاپرواہی کریں گے تو وہ شستہ کیسے ہو گی؟"

امبکا پرشاد۔ "ہاں یہ بات تو درست ہے۔"

ترویدی۔ "پھر کچھ لکھا کیجئے۔"

امبکا پرشاد۔ "اچھا لکھوں گا اور آزادی پر ہی لکھوں گا۔"

(3)

انسان کا دل کمزوریوں کا مسکن ہے۔ جو شخص اپنے دل سے ان کمزوریوں کو نکال دیتا ہے۔ وہی دیوتا کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ۔ گیانی اور اگیانی۔ شریف اور بدمعاش۔ برتر اور بدتر میں کیا فرق ہے؟ فرق انہیں کمزوریوں کا ہوتا ہے۔

جو شخص اپنی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں' وہ تعلیم یافتہ ہیں۔ جو نہیں سمجھتے وہ غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ جنہیں اپنی کمزوریوں کے رفع کرنے کی ترکیب معلوم ہے' وہ گیانی ہیں۔ جنہیں نہیں معلوم وہ اگیانی ہیں۔ جو اپنی کمزوریوں کو کمزوریاں جان کر انہیں رفع کرنے کی فکر میں رہتے ہیں' وہ نیک ہیں اور جو اپنی کمزوریوں کو کمزوریاں نہیں مانتے۔ اور اپنی ایک کمزوری کو پیدا نہ ہونے دینے کی خاطر دس کمزوریاں اور پیدا کر لیتے ہیں وہ بد ہیں۔ جو اپنی کمزوریوں کو دور کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں' وہ برتر ہیں اور جو ان کی پرواہ نہیں کرتے وہ بدتر ہیں۔

اعلیٰ تعلیم یافتہ کہلانے والے اور رات دن آزادی اور حریت کا راگ گانے والے پنڈت امبکا پرشاد میں ایک بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ ایک طرف تو آزادی اور حریت کے بڑے بھاری موید بنتے تھے۔ مگر دوسری طرف کمال بیدردی کے ساتھ اسی آزادی اور حریت کا گلا گھونٹتے تھے۔ لوگ اسے ڈھونگ بھی کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ ایک طرف کچھ کرنا اور دوسری طرف کچھ کرنا ہی ڈھونگ کہلاتا ہے۔ ڈھونگ بھی ایک قسم کی کمزوری ہے۔ نام' عزت' آدر یا اور کسی قسم کی خود غرضی کی طمع سے آدمی کوئی بات کہنے لگتا ہے۔ مگر اس کے دل کی کمزوری اسے اس بات کو عملی جامہ نہیں پہنانے دیتی۔ اور اس سے اس کے اصول کے خلاف عمل کراتی ہے۔ ایسا ہی آدمی ڈھونگی یا ریاکار کہلاتا ہے۔

پنڈت امبکا پرشاد اپنے گھر کی مستورات پر بڑا ظلم روا رکھتے تھے۔ ذرا ذرا سی بات میں انہیں ڈانٹنا' پھٹکارنا'

سخت سُست کہنا اور ہاتھ تک چلا بیٹھنا ان کا روز مرہ کا معمول سا تھا۔ ان کا یہ احوال تھا کہ فہمائش کے بغیر عورتیں ٹھیک نہیں رہتیں۔ ان کی اس فہمائش کا بیشتر حصہ غریب گائتری کے حصہ میں آتا تھا۔ وہ بے چاری چپ چاپ سب سہہ لیا کرتی تھی۔ اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی۔ اور نہ وہ اس قدر تعلیم یافتہ تھی کہ شوہر کے سلوک کی مخالفت کرتی۔ وہ سمجھتی تھی دنیا کا دستور ہی ایسا ہے۔ مرد ایسا ہی کرتے ہیں۔ عورتیں برداشت کرنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔ شوہر کے ایسا ناروا سلوک کرنے پر بھی اس کے دل میں اس کے لئے سوائے محبت کے اور کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا۔

(4)

رات کے دس بج چکے ہیں۔ گائتری اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی۔ ایک ہندی کی کتاب پڑھ رہی ہے۔ کتاب پڑھتے پڑھتے اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے دس بجے تھے۔ گائتری نے ایک انگڑائی لے کر کتاب ایک طرف رکھ دی۔ اور سوچنے لگی۔ دس بج چکے ہیں ابھی تک ان کا پتہ نہیں۔ میں جب کبھی کسی کے ہاں جاتی ہوں اور ذرا بھی دیر ہو جاتی ہے تو سینکڑوں باتیں کہتے ہیں۔ مارتک بیٹھتے ہیں۔ مگر آپ رات کے گیارہ گیارہ بارہ بارہ بجے تک باہر رہتے ہیں۔ میں یہاں بیٹھی سوکھا کرتی ہوں۔ جب تک وہ نہ آجاویں' اس وقت تک نہ کھانا کھا سکتی ہوں نہ سو سکتی ہوں۔ کیا ان کا یہ کام ٹھیک ہے؟ ٹھیک نہ ہوتا تو وہ پڑھے لکھے ہو کر ایسا کیوں کرتے؟ تو کیا ایشور نے عورتوں کو غلامی کرنے کے لئے پیدا کیا ہے؟ کیا دنیا میں ہر قسم کی سہولتیں' سب آرام مرد ہی کے لئے ہیں؟ شاستر اور پران سب یہی کہتے ہیں کہ استری کو پتی کا حکم ماننا چاہیے۔ اسے پتی کے سکھ کا دھیان رکھنا چاہیے۔ پتی جس بات پر خوش رہے' مطمئن رہے' وہی اسے کرنا چاہیے۔ شاستر اور پران میں کہی ہوئی بات ٹھیک ہی ہوتی ہے۔ سب لوگ اسے ٹھیک مانتے ہیں تو مجھے بھی اسے ٹھیک ہی ماننا چاہیے۔ لوگ کہتے ہیں۔ شاستر اور پران کی بات نہ ماننے سے آدمی نرک میں جاتا ہے۔ نرک! نرک کیا چیز ہے؟ کیا نرک میں اس سے بھی زیادہ دکھ ملتا ہے جو ان مردوں کے برتاؤ سے عورتوں کو مل رہا ہے؟ ضرور ملتا ہوگا ورنہ لوگ اتنا نرک سے ڈرتے کیوں؟

اس قسم کی باتیں سوچتے سوچتے گائتری کو نیند نے آگھیرا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ رہی اور لیٹتے ہی تھوڑی دیر میں سو گئی۔ وہ خواب میں دیکھنے لگی۔

"اب پنڈت امبکا پرشاد کی طبیعت میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ وہ اب گائتری کو بات بات پر ڈانٹتے پھٹکارتے نہیں۔ مارنا پیٹنا تو اب خواب کی سی بات ہو گئی ہے۔ گائتری جب کہیں جانا چاہتی ہے تو امبکا پرشاد اسے فوراً جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ اور کسی سبب سے دیر ہو جائے تو بھی کچھ نہیں کہتے۔ اب وہ گائتری سے ہر ایک بات میں صلاح لیتے ہیں۔ اور جس کام کے کرنے کی گائتری صلاح نہیں دیتی' وہ کام نہیں کرتے۔ اگر وہ گائتری کی صلاح غلط سمجھتے ہیں تو اسے سمجھا دیتے ہیں۔ تب گائتری اپنی غلطی سمجھ لیتی ہے۔ گائتری کو اب پہلے کی طرح پیسے پیسے کے لئے شوہر کا منہ نہیں تکنا پڑتا۔ اب روپیہ پیسہ گائتری کے ہی ہاتھ میں رہتا ہے۔ گائتری بھی اب کفایت شعاری کے ساتھ کام کرتی ہے۔ اب اس کے پتی دیو رات کے بارہ بارہ بجے تک باہر نہیں رہتے۔ اور اگر کبھی کس وجہ سے رہنے کی ضرورت پڑتی ہے تو گائتری سے کہہ جاتے ہیں کہ ہمارا انتظار نہ کیا جائے۔ اب جس وقت گائتری اپنی موجودہ حالت کو گزشتہ حالت سے مقابلہ کرتی ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ اور گزشتہ حالت

میں سورگ اور نرک کا فرق ہے۔ گزشتہ حالت نرک تھی اور موجودہ حالت سورگ ہے۔ گائتری اب اپنی نسوانی زندگی پر دکھی نہیں ہے۔ کیونکہ اب اسے معلوم ہو گیا ہے کہ عورتیں بھی دنیاوی خوشیوں سے بہرہ اندوز ہو سکتی ہیں۔ آج پنڈت امبکا پرشاد بنارس جا رہے ہیں۔ گائتری کی بڑی خواہش ہے کہ وہ کاشی دھام میں جا کر شری وشیوناتھ جی کے درشن کرے۔ اس نے ہچکچاہٹ کے ساتھ کہا۔ "کاشی دیکھنے کی میری بڑی خواہش ہے۔" پنڈت جی مسکرا کر بولے۔ "کیا چلو گی؟"

گائتری نے کہا۔ "چلتی تو مگر نہیں معلوم۔ تم کس کام سے جاتے ہو۔ میرے چلنے سے اس میں کچھ خلل نہ پڑے۔"

پنڈت جی بولے۔ "میں کسی کام وام سے نہیں جاتا۔ صرف سیر کرنے جا رہا ہوں۔ اگر تمہارا جی چاہے تو تم بھی چلو۔ میں لے چلنے کو تیار ہوں۔"

گائتری نے بے حد خوش ہو کر کہا۔ "سچ! مجھے بھی لے چلو گے؟"

پنڈت جی نے جواب دیا۔ "ہاں! کہتا تو ہوں۔ چلو"

گائتری نے کہا۔ "اچھا میں تیاری کئے لیتی ہوں۔"

یہ کہہ کر گائتری بڑے شوق سے جھپٹ کر اٹھی۔ اٹھتے ہی آنکھ کھل گئی۔ سامنے پتی دیو کھڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی گائتری اٹھ کھڑی ہوئی۔ اور آنکھیں ملنے لگی۔ پنڈت امبکا پرشاد کچھ دیر گائتری کی طرف گھورتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔ "کیا ٹھکانہ ہے اس آرام طلبی کا۔ اب تو دن چھپتے ہی نیند آ جاتی ہے۔"

گائتری نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پونے بارہ بجے تھے۔ اس نے سوچا۔ کیا مردوں کا دن رات کے پونے بارہ بجے چھپتا ہے؟ اتنا سوچنے پر اسے دھیان آیا۔ میں تو نیند میں سورگ کا مزہ لوٹ رہی تھی۔ جاگتے ہی پھر نرک میں آ گری۔ اس جاگنے سے تو وہ سونا ہی بھلا تھا۔ ایسی نیند عمر بھر رہے تو بہتر ہے۔"

پنڈت امبکا پرشاد بولے۔ "آج شام سے ہی موت آ گئی تھی۔ آرام سے پاؤں پھیلا کر سو رہی۔ یہ خیال نہیں تھا کہ میں نے اب تک کھانا تک نہیں کھایا۔ کیوں؟"

گائتری نے سوچا۔ "موت ہی آ جاتی تو بھی اچھا تھا۔ ایسی زندگی سے تو موت ہی اچھی۔"

پنڈت امبکا پرشاد تھوڑی دیر تک بک جھک کر خاموش ہو گئے۔ آج پتی دیو نے اپنے کنول ایسے ہاتھوں کو گائتری کے پتھر ایسے جسم سے دور ہی رکھا۔ اس کے لئے گائتری نے پتی جی کا شکریہ ادا کیا یا ایشور کا۔ کچھ کہہ نہیں سکتے۔

(5)

جب سے گائتری نے خواب راحت دیکھا ہے، اس وقت سے اس کو دن رات یہی فکر رہتی ہے کہ کیا اس کے مزے کبھی اسے عالم بیداری میں بھی نصیب ہو سکتے ہیں؟ اس نے اس پر جس قدر غور کیا، اتنا ہی اسے مایوس ہونا پڑا۔ اس نے سمجھ لیا کہ اس طرح شوہر اپنے آپ سدھر نہیں سکتا۔ مجھ میں ان کے سدھارنے کی طاقت نہیں اور نہ کوئی اور ذریعہ ہی ہے۔ اسی طرح کچھ دن گزرے۔

ایک روز تین بجے سہ پہر کے وقت گائتری اپنے کمرے کی کھڑکی سے سڑک کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت پروفیسر صاحب اپنی بائیسکل پر گھر آرہے تھے۔ پروفیسر صاحب نے گائتری کو جھانکتے ہوئے دیکھا۔ گائتری کی اوران کی آنکھیں چار ہوئیں۔ گائتری نے گھبرا کر کھڑکی بند کرلی۔ اس کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ سوچنے لگی۔ ایشور ہی خیر کرے۔ آج معلوم نہیں کیسی گزرے۔

پروفیسر صاحب پیچ وتاب کھاتے ہوئے آئے۔ اور کپڑے اتارنے سے پہلے ہی گائتری کو مخاطب کر کے بولے۔

"کیوں حرامزادی! سڑک پر کیا جھانک رہی تھی؟"

گائتری نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے جواب دیا۔ "کچھ نہیں۔ یونہی دیکھ رہی تھی۔"

اس پر پروفیسر صاحب نے کچھ مذموم الفاظ استعمال کئے۔ گائتری ان الفاظ کی تلخی کو برداشت نہ کرسکی۔ اس نے جوش میں آکر کہا۔ "تم خواہ مخواہ مجھ پر بہتان لگاتے ہو۔ معلوم نہیں تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ میرے بھاگ پھوٹے تھے جو تمہارے پلے بندھی۔ ایشور مجھے موت دے تو اچھا ہے۔ میں کچھ بولتی نہیں۔ اسی سے دن بدن دباتے چلے جاتے ہو۔ جو تمہیں میری عادتیں اچھی نہیں لگتیں تو میکے بھیج دو۔ میں وہاں پڑی رہوں گی۔ جیسے ممکن ہوگا۔ اپنے دن کاٹوں گی۔ تمہاری جان چھوٹ جائے گی۔ میری قسمت میں جو لکھا ہوگا سو ہوگا۔"

اب کے گائتری کے جسم پر تو چوٹ لگی ہی۔ مگر جسم کی نسبت دل پر زیادہ کڑی چوٹ لگی۔ وہ بہت سخت بیمار ہوگئی۔ پروفیسر "آگ لگا کر پانی کو دوڑے" کی ضرب المثل کے مطابق خوب دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ جسمانی چوٹ تو اچھی ہوگی۔ مگر دل کا زخم اچھا نہ ہوا۔ بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غریب گائتری اس دکھ بھری دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی۔

بیوی کی موت واقع ہونے پر پروفیسر صاحب نے بڑا رنج وغم کیا۔ ایک مقامی اخبار نے پروفیسر کی بیوی کی وفات پر اس طرح کالم سیاہ کیا۔

"ہمارے شہر کے معزز لیڈر اور محبّ وطن پروفیسر امبکا پرشاد جی کی دھرم پتنی شری متی گائتری دیوی کا گزشتہ سوموار کے روز بعارضہ بخار انتقال ہوگیا۔ ہمیں نہیں سوجھتا کہ اس وقت ہم پروفیسر صاحب موصوف کو کن الفاظ میں تسلی دیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ پروفیسر صاحب اپنی بیوی سے بہت محبت کرتے تھے۔ پروفیسر صاحب اس مفارقت کو اپنی زندگی میں بھول سکیں گے' اس میں شک ہے۔"

"ہم اس انتہائی مصیبت کے موقع پر صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ پرماتما شری متی جی کی آتما کو شانتی اور پروفیسر صاحب کے دل کو اس قدر طاقت عطا فرمائے کہ وہ اس جگر پاش جدائی کو صبر واستقلال سے برداشت کرسکیں۔"

اخبار کے ایڈیٹر کو چاہے شک ہو یا نہ ہو مگر ہمیں اس بات میں ذرا بھی شک نہیں کہ پروفیسر صاحب بیوی کی موت کو ساری عمر نہ بھولیں گے۔ کیونکہ ان کی روح انہیں یہ بات ہر وقت یاد دلاتی رہے گی کہ گائتری کی موت کا سبب وہ خود ہی تھے۔ ساتھ ہی ایشور کو بیوی کی جدائی برداشت کرنے کے لئے پروفیسر صاحب کو طاقت عطا فرمانے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایشور پروفیسر صاحب اور ان کے سے حیوان نما انسانوں کو اتنی عقل وتمیز بخشے کہ وہ عورت کو انسان سمجھیں اور ساتھ ہی ان کے دل کو اتنی طاقت عطا کرے کہ وہ اپنی عقل سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ان پڑھ کا دل

(1)

بوڑھا منوہر سنگھ منکسرانہ انداز سے بولا۔ ''سرکار! ابھی تو میرے پاس روپے ہی نہیں۔ ہوتے تو دے دیتا۔ قرض کا پاپ تو دینے ہی سے کٹے گا۔ پھر آپ کے روپے کو کوئی جوکھوں نہیں۔ میرا نیم کا پیڑ گروی رکھا ہوا ہے۔ وہ پیڑ کچھ نہ ہوگا تو پچیس تیس روپے کا ہوگا۔ اتنا پرانا پیڑ سارے گاؤں میں دوسرا نہیں۔

ٹھاکر شوپال سنگھ بولے۔ ''ڈیڑھ سال کا سود شامل کر کے کل پچیس روپے ہوتے ہیں۔ یہ روپیہ ادا کر دو۔ ورنہ ہم تمہارا پیڑ کٹوا دیں گے۔

منوہر سنگھ ذرا گھبرا کر بولا۔ ''ارے سرکار ایسا اندھیر نہ کیجئے گا۔ پیڑ نہ کٹوایئے گا۔ روپیہ میں دے ہی دوں گا۔ اگر نہ بھی دے سکوں تو پیڑ آپ کا ہو جائے گا۔ مگر مجھ پر اتنی مہربانی کیجئے گا کہ اسے کٹوایئے گا نہیں۔''

ٹھاکر شوپال سنگھ مسکرا کر بولے۔ ''منوہر تم سٹھیا گئے ہو۔ تب ہی تو ایسی اُول ژلول باتیں کرتے ہو۔ بھلا جو پیڑ کٹوایا نہ جائے گا تو ہمارے روپے کیسے نکلیں گے؟''

منوہر سنگھ نے کہا۔ ''ان داتا! آپ کے روپے تو جہاں تک ہوگا۔ میں دے ہی دوں گا۔''

ٹھاکر۔ ''اچھا اب ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ روپے کب دوگے؟''

منوہر کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ''ایک ہفتہ میں ضرور دے دوں گا۔''

ٹھاکر۔ ''اچھا منظور ہے۔ ایک ہفتہ میں دے دینا۔ ورنہ پھر پیڑ ہمارا ہو جائے گا۔ ہماری جو مرضی ہوگی کریں گے۔ چاہے کٹوائیں گے چاہے رکھیں گے۔''

منوہر۔ ''اور چاہے جو کیجئے گا۔ اسے کٹوایئے گا نہیں۔ اتنی آپ سے درخواست ہے۔''

ٹھاکر۔ ''خیر ہمارا جو جی چاہے گا کریں گے۔ تمہیں پھر کچھ کہنے کا حق نہیں رہے گا۔''

(2)

منوہر سنگھ کی عمر 55 سال کے لگ بھگ ہے۔ اپنی جوانی کے دن اس نے فوج میں گزارے تھے۔ اس وقت وہ دنیا میں اکیلا ہے۔ اس کے کنبے میں کوئی نہیں۔ گاؤں میں دو ایک دور کے رشتہ دار رہتے ہیں۔ انہی کے ہاتھوں اپنا کھانا پکوا لیتا ہے۔ نہ کہیں آتا نہ کہیں جاتا ہے۔ دن رات اپنے ٹوٹے پھوٹے مکان میں پڑا ایشور کا بھجن کیا کرتا ہے۔

ایک سال پیشتر اسے کچھ کھیتی باڑی کرانے کی سنک سوار ہوئی تھی۔ اس نے ٹھاکر شوپال سنگھ کی کچھ زمین لگان پر لے کر کاشت کرائی بھی تھی۔ مگر اس کی بدقسمتی سے اس سال قحط سالی کے سبب کچھ پیداوار نہ ہوئی۔ ٹھاکر شوپال سنگھ کا لگان نہ پہنچا۔ منوہر سنگھ کو جو پنشن ملتی تھی' وہ مشکل سے اس کی روٹی کپڑے کو کافی ہوتی تھی۔ آخر کار

جب ٹھاکر صاحب کا لگان وصول نہ ہوا تو انہوں نے اس کا نیم کا ایک درخت جو اس کی جھونپڑی کے دروازے پر لگا تھا گرو رکھ لیا۔ یہ نیم کا درخت بہت پرانا اور اس کے باپ کے ہاتھ کا لگایا ہوا تھا۔

منوہر سنگھ کو ایک ہفتہ کی مہلت دی گئی۔ اس نے بہت کچھ دوڑ دھوپ کی۔ دو چار آدمیوں سے قرض مانگا۔ مگر کسی نے اسے روپے نہ دیئے۔ لوگوں نے سوچا۔ بوڑھا آدمی ہے۔ خدا معلوم کب لڑھک جائے۔ ایسی حالت میں روپیہ کس سے وصول ہو گا؟ منوہر چاروں طرف سے مایوس ہو کر بیٹھ رہا اور دھڑکتے ہوئے کلیجے کے ساتھ ہفتہ گزرنے کا انتظار کرنے لگا۔

دوپہر کا وقت ہے۔ منوہر سنگھ ایک چارپائی پر نیم کے نیچے لیٹا ہوا ہے۔ نیم کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اس کو بہت راحت افزا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ پڑا پڑا سوچ رہا ہے کہ پرسوں تک اگر روپے نہیں پہنچیں گے تو ٹھاکر صاحب اس پیڑ کو کٹوا ڈالیں گے۔ یہ پیڑ میرے باپ کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ میرے کنبے قبیلے کو داتن اور سایہ دیتا رہا ہے۔ اس کو ٹھاکر صاحب کٹوا ڈالیں گے۔

یہ خیال منوہر سنگھ کو ایسا تکلیف دہ معلوم ہوا کہ وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور درخت کی طرف منہ کر کے بولا۔ "اگر دنیا میں کسی نے میرا ساتھ دیا ہے تو تو نے 'اگر دنیا میں کسی نے میری بے غرضانہ خدمت کی ہے تو تو نے۔ اب میری آنکھوں کے سامنے وہ نظارہ پھر جاتا ہے جب میرا باپ تجھے سینچا کرتا تھا۔ میرا باپ کہا کرتا تھا۔ "بیٹا منوہر! یہ میرے ہاتھ کی نشانی ہے۔ اس سے تجھے اور تیرے بال بچوں کو جب سکھ ملے گا میری یاد آئے گی۔ تو اس وقت بالکل بچہ تھا۔ تیرے لئے تالاب سے پانی بھر کر لایا کرتا تھا۔ میرے باپ کو مرے ہوئے چالیس سال ہو گئے۔ ان کے کہنے کے مطابق تو ہمیشہ ان کا نام یاد کراتا رہا۔ اور جب تک رہے گا۔ ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے' جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ تیری ڈالیوں پر چڑھ کر کھیلا کرتا تھا۔ اس وقت دنیا میں تو ہی ایک میرا پرانا دوست ہے۔ تجھے وہ بدمعاش کاٹنا چاہتا ہے۔ ہاں کاٹے گا کیوں نہیں۔ دیکھوں کیسے کاٹتا ہے!"

اسی وقت ادھر سے ایک پندرہ سولہ سال کا لڑکا نکلا۔ بوڑھے منوہر کو بڑبڑاتے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ "چچا جی! کس سے باتیں کر رہے ہو۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔"

بڈھے نے چونک کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اور کہا۔ "کیا کہوں۔ بیٹا تیجا! اپنے کرم (تقدیر) سے باتیں کر رہا ہوں۔ ٹھاکر شوپال سنگھ کے مجھ پر کچھ روپے چاہئیں۔ تجھے تو معلوم ہی ہے کہ پچھلے سال کھیتوں میں ایک دانہ بھی نہیں ہوا۔ ہوتا تو کیا میں ان کا لگان رکھ لیتا؟ اب وہ کہتے ہیں کہ لگان کے روپے دو نہیں تو پیڑ کٹوا لیں گے جو میرے باپ کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ یہ بات تو دیکھو۔ زمانے کی گردش ہے۔ جو آج ایسی ایسی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ بیٹا میں نے ساری عمر فوج میں گزاری ہے۔ بڑی بڑی لڑائیاں اور میدان دیکھے ہیں۔ یہ بچارے ہیں کس کھیت کی مولی؟ آج بدن میں زور ہوتا تو ان کی مجال تھی کہ میرے پیڑ کے لئے ایسا کہتے۔ منہ نوچ لیتا۔ میں نے ناک پر کبھی مکھی نہیں بیٹھنے دی۔ بڑے بڑے صاحب بہادروں سے لڑ پڑتا تھا۔ یہ بچارے ہیں کیا؟ بڑے ٹھاکر کی دُم بنے پھرتے ہیں۔ میں سچ کہتا ہوں۔ ابھی اس گاؤں کے ڈانڈے پر بھی گولی چلنے لگے تو ٹھاکر صاحب ٹھکرائن کے لہنگے میں نظر آئیں گے۔ میں نے تو توپ کے منہ پر ڈٹ کر بندوق چلائی ہے۔ مگر بیٹا! وقت سب کچھ کرا لیتا ہے۔ جنہوں نے کبھی توپ کی صورت بھی نہیں دیکھی وہ بہادر اور ٹھاکر بنے پھرتے ہیں۔ ہمیں آنکھ دکھاتے ہیں کہ روپے دو نہیں تو درخت کٹوا لیں گے۔ دیکھیں کیسے پیڑ کٹواتے ہیں۔ لاکھ بڈھا ہو گیا ہوں لیکن اب بھی چار چھ کے لئے بہت ہوں۔ جب

تلوار لے کر ڈٹ جاؤں گا تو بھاگتے ہی نظر آئیں گے۔ اور بیٹا سو بات کی ایک بات تو یہ ہے کہ اب تو مجھے مرنا ہی ہے۔ چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ میں بڑی بڑی لڑائیوں سے جیتا لوٹ آیا۔ سمجھوں گا یہ بھی ایک لڑائی ہے۔ اب اسی لڑائی میں میرا خاتمہ ہے۔ مگر اتنا کہ میرے جیتے جی اس پیڑ کی ایک ڈال بھی کوئی نہیں کاٹنے پائے گا۔ ان کے روپے گلے برابر ہیں۔ بھگوان جانے۔ میرے پاس ہوتے تو دے دیتا نہیں تو کیا کیا جائے؟ مگر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ٹھاکر صاحب میرا پیڑ کٹوالیں اور میں بیٹھا ٹکر ٹکر دیکھا کروں۔"

تیجا بولا۔ "چاچا! جانے بھی دو۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے؟ پیڑ کٹوانے کو کہتے ہیں۔ کٹوا لینے دینا۔ اس پیڑ میں تمہارا رکھا ہی کیا ہے؟ پیڑ تو روز ہی کٹا کرتے ہیں۔"

منوہر سنگھ بگڑ کر بولا۔ "آخر لڑکے ہی ہو نا۔ ارے بیٹا! یہ پیڑ ایسا ویسا نہیں ہے۔ یہ پیڑ میرے بھائی کے برابر ہے۔ میں اسے اپنا سگا بھائی سمجھتا ہوں۔ یہ میرے باپ کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے۔ کسی اور کے ہاتھ کا نہیں۔ جب میں تم سے بھی چھوٹا تھا' اس وقت سے میرا اور اس کا ساتھ ہے۔ میں برسوں اس پر کھیلا ہوں۔ برسوں اس کی میٹھی میٹھی نبولیاں کھائی ہیں۔ اس کی داتن آج تک کرتا ہوں۔ گاؤں میں سینکڑوں پیڑ ہیں۔ مگر مجھ سے قسم لے لو جو میں نے کبھی ان کی ایک پتی تک چھوئی ہو۔ جب میرے گھر میں آپ ہی اتنا بڑا پیڑ کھڑا ہے تب مجھے دوسرے پیڑ کو ہاتھ لگانے کی کیا پڑی ہے؟ دوسرے مجھے اور کسی پیڑ کی داتن ہی اچھی نہیں لگتی۔"

تیجا بولا۔ "چاچا! بغیر روپے دیئے تو پیڑ بچ نہیں سکتا۔"

منوہر۔ "بیٹا! ایشور جانتا ہے۔ میرے پاس روپے ہوتے تو میں آج ہی دے دیتا۔ مگر کیا کروں لاچار ہوں۔ میرے گھر میں ایسی کوئی چیز بھی نہیں جو بیچ کر دے دوں۔ مجھے خود اس بات کا بڑا دکھ ہے۔ سارا گاؤں پھر آیا۔ کسی نے ادھار نہ دیا۔ کیا کروں؟ بیٹا تیجا! سچ جاننا۔ جو یہ پیڑ کٹ گیا تو مجھے بڑا دکھ ہوگا۔ میرا بڑھاپا بگڑ جائے گا۔ اب تک مجھے کوئی دکھ نہیں تھا۔ کھاتا تھا۔ ایشور کا بھجن کرتا تھا۔ مگر اب بے حد دکھ ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر بوڑھا منوہر سنگھ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔

تیجا بوڑھے منوہر سنگھ کی تکلیف دیکھ سن کر بہت دکھی ہوا۔ تیجا سنگھ گاؤں کے ایک معزز کسان کا بیٹا تھا۔ اس کا باپ ڈیڑھ دو سو بیگہ زمین کی کاشت کرتا تھا۔ منوہر سنگھ کو تیجا سنگھ چاچا کہہ کر مخاطب کیا کرتا تھا۔

تیجا نے پوچھا۔ "چاچا! باپو سے یہ حال کہا ہے؟"

منوہر سنگھ۔ "سب سے کہہ چکا بیٹا! تیرا باپو تو اب بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ وہ میرے جیسے غریبوں کی بات کیوں سننے لگا؟ ایک زمانہ تھا۔ جب وہ سارا سارا دن میرے در پر پڑا رہتا تھا۔ گھر میں لڑائی ہوتی تھی تو میرے ہی ہاں بھاگ آتا تھا۔ اور دو دو تین دن تک ٹھہرا رہتا تھا۔ وہی اب تمہارا باپو اب سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ اسی سے کہتا ہوں۔ وقت کی بات ہے۔"

تیجا نے پوچھا۔ "کتنے روپے دینے سے پیڑ بچ سکتا ہے؟"

منوہر۔ "پچیس روپے دینے پڑیں گے۔"

تیجا۔ "پچیس روپے بہت ہیں چاچا؟"

منوہر۔ "پاس نہیں ہیں تو بہت ہی ہیں۔ ہوتے تو تھوڑے تھے۔"

تیجا۔ "دس پانچ روپے کی بات ہوتی تو میں ہی کہیں سے لا دیتا۔"

منوہر۔ ''بیٹا۔ ایشور تیری عمر بڑی کرے۔ تو نے مجھ سے ایک بات تو کہی۔ گاؤں والوں نے تو اتنا بھی نہ کہا۔ خیر۔ دیکھا جائے گا۔ مگر اتنا تو یاد رکھنا کہ میرے جیتے جی اس پیڑ کو کوئی ہاتھ نہیں لگانے پائے گا۔''

(3)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔ منوہر سنگھ روپیوں کا بندوبست نہیں کر سکا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب پیڑ کا بچنا مشکل ہے۔ مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کے جیتے جی کوئی اس کو نہیں کاٹ سکتا۔ اس نے اپنی تلوار بھی نکال لی تھی اور صاف کر کے رکھ لی تھی۔ اب وہ ہر وقت پیڑ کے نیچے ہی پڑا رہتا تھا۔ تلوار سرہانے رکھی رہتی تھی۔

آٹھویں دن دوپہر کے وقت شوپال سنگھ نے منوہر کو بلوایا۔ منوہر سنگھ تلوار بغل میں دبائے اکڑتا ہوا ٹھاکر صاحب کے روبرو پہنچا۔

شوپال سنگھ اور ان کے پاس جو بیٹھے تھے' وہ بڈھے کی اس سج دھج کو دیکھ کر مسکرائے۔ شوپال سنگھ نے کہا۔ ''سنتے ہو منوہر سنگھ! ایک ہفتہ گزر گیا۔ اب پیڑ ہمارا ہو گیا۔ اب ہم اس کی کٹائی شروع کرتے ہیں۔''

منوہر۔ ''آپ کو اختیار ہے۔ مجھے روپیہ ملتا تو دے ہی دیتا۔ اور اب بھی اگر مل جائے۔ تو دے دوں گا۔ میری نیت میں بے ایمانی نہیں ہے۔ میں فوج میں رہا ہوں۔ بے ایمانی کا نام نہیں جانتا''

شوپال۔ ''تو اب ہم اسے کٹوا لیں نا؟''

منوہر۔ ''یہ میں کیسے کہوں۔ آپ کا جو جی چاہے کیجئے۔''

یہ کہہ کر منوہر سنگھ اسی طرح اکڑتا ہوا شوپال سنگھ کے سامنے سے چلا آیا۔ اور اپنے پیڑ کے نیچے چارپائی پر آکر بیٹھ گیا۔

جس وقت دوپہر ڈھلی۔ چار پانچ آدمی ہاتھوں میں کلہاڑیاں لئے آتے نظر آئے۔ منوہر سنگھ جھٹ میان سے تلوار نکال ڈٹ کر کھڑا ہو گیا اور للکار کر بولا۔ ''سنبھل کر آگے بڑھنا۔ جو کسی نے بھی پیڑ میں کلہاڑی لگائی تو اس کی اور اپنی جان ایک کر دوں گا۔''

مزدور بڈھے کی للکار سن کر اور تلوار دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب شوپال سنگھ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ تب پہلے تو وہ ہنسے مگر بعد ازاں کچھ سوچ کر مارے غصہ کے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولے۔ ''اس بڈھے کی شامت آئی ہے۔ ہمارا مال ہے۔ ہم چاہے کاٹیں چاہے رکھیں۔ وہ کون ہوتا ہے؟ چلو تو میرے ساتھ دیکھوں وہ کیا کرتا ہے؟''

شوپال سنگھ مزدوروں اور دو لٹھ بند آدمیوں کو لے کر پہنچے۔ انہیں آتے دیکھا تو بڈھا پھر تلوار نکال کر کھڑا ہو گیا۔

شوپال سنگھ اس کے سامنے پہنچ کر بولے۔ ''کیوں۔ منوہر یہ کیا بات ہے؟''

منوہر سنگھ نے جواب دیا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ میرے جیتے جی اسے کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ میں مانتا ہوں کہ اب پیٹر آپ کا ہے مگر اس کے باوجود بھی میں اسے کٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔''

شوپال۔ "مگر ہم تو اسے کٹوائے بغیر نہیں مانیں گے۔"

منوہر سنگھ کو بھی غصہ آ گیا۔ بولا۔ "ٹھاکر صاحب! جو آپ سچے ٹھاکر ہیں۔ تو اس پیڑ کو کٹوالیں۔ جو میں اصلی ٹھاکر ہوں گا۔ تو اسے کٹنے نہ دوں گا۔"

ٹھاکر شوپال سنگھ نے اپنے آدمیوں کو مخاطب کر کے کہا۔ "دیکھتے کیا ہو؟ اس بڈھے کو پکڑ لو اور پیڑ کو کاٹنا شروع کرو۔"

عین اسی وقت تیجا سنگھ دوڑتا ہوا آیا۔ اور منوہر سنگھ کو کچھ روپے دے کر بولا۔ "لو چاچا! یہ روپے۔ اب تمہارا یہ پیڑ بچ گیا۔"

منوہر سنگھ نے روپے گن کر ٹھاکر شوپال سنگھ سے پوچھا۔ "کہئے ٹھاکر صاحب! روپے لینے ہوں تو یہ حاضر ہیں۔ یہ جو پیڑ کٹوانا ہو تو آگے بڑھئے۔"

شوپال۔ "روپے اب ہم نہیں لے سکتے۔ روپے دینے کی میعاد گزر گئی۔ اب تو پیڑ کٹے گا۔"

منوہر سنگھ اکڑ کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اب معلوم ہوا کہ آپ صرف مجھے دکھ پہنچانے کے لئے پیڑ کٹوا رہے ہیں۔ اچھا کٹوایئے۔ مجھے بھی دیکھنا ہے۔ آپ کس طرح پیڑ کٹواتے ہیں؟"

اسی اثنا میں سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ شوپال سنگھ منوہر کا نیم کا پیڑ کٹواتے ہیں۔ مگر منوہر سنگھ تلوار کھینچے کھڑا ہے۔ کسی کو درخت کے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ یہ خبر پھیلتے ہی سارا گاؤں وہاں آ کر جمع ہو گیا۔

گاؤں کے دو معزز آدمیوں نے منوہر سنگھ سے پوچھا۔ "کیا بات ہے منوہر سنگھ؟"

منوہر سنگھ سارا حال بیان کر کے بولا۔ "میں روپے دیتا ہوں۔ ٹھاکر صاحب نہیں لیتے۔ کہتے ہیں۔ کل تک میعاد تھی۔ اب تو پیڑ کٹے گا۔"

شوپال سنگھ نے کہا۔ "کل تک یہ روپے دے دیتا تو پیڑ پر ہمیں کوئی حق نہیں تھا۔ اب ہمیں اس پر پورا پورا حق حاصل ہے۔ ہم پیڑ ضرور کٹوائیں گے۔"

ایک شخص بولا۔ "جب کل تک اس کے پاس روپے نہیں تھے تو آج کہاں سے آ گئے؟"

شوپال سنگھ کا ایک آدمی بولا۔ "تیجا سنگھ نے ابھی لا کر دیئے ہیں۔"

گاؤں والوں کے ساتھ تیجا کا باپ بھی آیا تھا۔ اس نے یہ سن کر تیجا کو پکڑا اور کہا۔ "کیوں بے تو نے ہی روپے چرائے تھے؟" "میں نے دوپہر کو پوچھا تو تین تیرہ بکنے لگا تھا۔"

اس کے بعد منوہر سنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ "منوہر! یہ روپے تیجا میرے صندوق سے چرا لایا۔ یہ روپے میرے ہیں۔"

منوہر روپے پھینک کر بولا۔ "تیرے ہیں تو تو لے جا۔ میں نے تیرے لڑکے سے روپے نہیں مانگے تھے۔"

پھر منوہر سنگھ نے تیجا سے کہا۔ "بیٹا تو نے یہ برا کام کیا! چوری کی۔ رام رام! بڑھاپے میں میری ناک کٹوانے کا کام کیا تھا۔ یہ لوگ سمجھیں گے، میں نے ہی چرانے کے لئے تجھ سے کہا ہو گا۔"

تیجا بولا۔ "چاچا! میں گنگا جل اٹھا کر کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مجھ سے روپے مانگے تک نہیں۔ چرانے کے لئے کہنا تو بڑی دور کی بات ہے۔"

شوپال نے ہنس کر کہا۔ ”کیوں منوہر! اب روپے کہاں ہیں؟ لاؤ۔ روپے ہی دو۔ میں روپے لینے کو تیار ہوں۔ اب یا تو ابھی روپیہ دے دو۔ یا سامنے سے ہٹ جاؤ۔ جھگڑا کرنے سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔“

منوہر۔ ”ٹھاکر صاحب! ان طعنوں سے کیا فائدہ؟ روپے میرے پاس نہیں ہیں۔ لیکن پیڑ میں کٹنے نہیں دوں گا۔“

شوپال حاضرین کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔ ”آپ لوگ اس بات کو دیکھئے اور انصاف کیجئے۔ میعاد کل تک کی تھی۔ میں آج بھی روپے لینے کو تیار ہوں۔ اب میرا قصور نہیں۔ یہ بڈھا خواہ مخواہ جھگڑا کر رہا ہے۔“

تیجا سنگھ یہ سنتے ہی آگے بڑھا اور انگلی سے سونے کی انگوٹھی اتار کر شوپال سنگھ سے بولا۔ ”ٹھاکر صاحب! یہ انگوٹھی ایک تولے کی ہے۔ آپ کے روپے اس سے نکل آئیں گے۔ آپ یہ انگوٹھی لے جایئے۔ اس انگوٹھی پر باپو کا کوئی اختیار نہیں۔ یہ انگوٹھی مجھے میری نانی نے دی تھی۔“

سب لوگ لڑکے کی بات سن کر دنگ رہ گئے۔

یہ دیکھ کر تیجا سنگھ کا باپ آگے بڑھا اور بولا۔ ”ٹھاکر صاحب! لیجئے یہ پچیس روپے اور اب اس پیڑ کو چھوڑ دیجئے۔ آپ ابھی کہہ چکے ہیں کہ روپے مل جائیں تو پیڑ چھوڑ دیں گے۔ اس لئے اپنی بات کو پورا کیجئے۔“

ٹھاکر صاحب کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ اب منوہر سنگھ کو روپے ملنا ناممکن ہیں۔ اسی سے انہوں نے اپنی فراخدلی دکھانے کے لئے روپے لینا منظور کر لئے تھے۔ اب وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ کیونکہ پچیس تیس آدمیوں کے سامنے روپیہ لینا منظور کر لیا تھا۔ وہ روپیہ لے کر چپ چاپ چلے گئے۔

ٹھاکر صاحب کے جانے کے بعد منوہر سنگھ نے تیجا کو بلا کر سینہ سے لگایا اور کہا۔ ”بیٹا! اس پیڑ کو تو نے ہی بچایا۔ اس لئے میں تجھی کو یہ پیڑ دیتا ہوں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میرے بعد تو اس پیڑ کی پوری پوری حفاظت کر سکے گا۔“ تیجا سے یہ کہہ کر اس نے حاضرین کو یوں مخاطب کیا۔

”بھائیو! میں تم سب کے سامنے یہ پیڑ تیجا سنگھ کو دیتا ہوں۔ تیجا کے سوائے اس پر اور کسی کو حق حاصل نہ ہو گا۔“

اس کے بعد تلوار میان میں کرتے ہوئے آپ ہی آپ کہا ”مگر میرے جیتے جی کوئی پیڑ میں ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔ اپنی اور اس کی جان ایک کر دیتا۔ میں نے فوج میں نوکری کی ہے۔ بڑی بڑی لڑائیاں جیتی ہیں۔ یہ بیچارے ہیں کیا چیز؟“

وہ محبت کی پتلی

(1)

یاد! وہ جگر کو ٹکڑے کر دینے والی یاد! جو صفحہ دل پر دردانگیز جذبات کی اس پکی اور گہری سیاہی سے منقش کی گئی ہے جس کا مٹنا اس جنم میں مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ آہ! وہ یاد تکلیف دہ ہونے کے باوجود بھی کس قدر

خوشگوار اور پیاری ہے۔ اس یاد سے کلیجہ پھنکتا ہے۔ تن من راکھ ہوا جاتا ہے۔ پھر بھی اسے مٹانے کی کوشش کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ وہ یاد وہ میٹھی چھری ہے جس کی تیز دھار سے دل لہولہان ہو رہا ہے۔ مگر اس میں وہ شیرینی ہے' وہ حلاوت ہے کہ اسے کلیجہ سے دور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس پریم کی پتلی' اس پیکرِ وفا کی یاد ہے جس کی محبت کی قیمت کو' جس کی فرض شناسی کی گہرائی کو میں اس وقت سمجھا جب وہ مجھ سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ کر محبت کے پردے میں غائب ہو رہی تھی۔ اس محبت کی پتلی کی اصل شکل میں نے اس وقت دیکھی جب موت کے پردے کی رسیاں کھل چکی تھیں۔ اور وہ آہستہ آہستہ ہم دونوں کے درمیان گر رہا تھا۔ اس کی اصل روشن شکل دیکھ کر میری آنکھیں جھپک گئیں اور اس کے بعد اس وقت کھلیں جب ظالم پردہ اسے اوٹ میں چھپا چکا تھا۔

میری شادی اس وقت ہوئی تھی جب میری عمر سولہ سال کی تھی۔ شادی کے دو ہی سال بعد میرا گونا بھی ہو گیا تھا۔ میری بیوی چنبیلی معمولی طور پر خوبصورت اور لکھی پڑھی بھی تھی۔ بہت حسین نہ ہونے کے باوجود بھی اس میں چند خوبیاں ایسی تھیں جو دل کو اپنی طرف اسی طرح کھینچتی تھیں جس طرح حسن و جمال کھینچتا ہے۔ وہ خوبیاں وہ باتیں کیا تھیں؟ آہ! ان کی یاد آنے پر آج بھی کلیجہ میں ہوک اٹھتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ صرف اس ناز و ادا پر بعض دلدار بے نظیر حسن تک کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ باتیں تھیں اس کی شرمیلی آنکھیں' اس کا ہلکا تبسم' اس کا شرما کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ آنکھیں نیچی کر لینا بڑے سے بڑے حسن کا رنگ پھیکا کر سکتا تھا۔

گونا ہونے کے بعد تین چار سال تک دونوں کے دن بڑی راحت سے گزرے۔ اس دوران میں دو بچے بھی ہوئے ان میں بیٹا ابھی تک زندہ ہے۔ ایک لڑکی ہوئی تھی۔ وہ صرف تین ماہ زندہ رہ کر مر گئی۔ لڑکی پیدا ہونے کے بعد ہمارے عیش و آرام کی زندگی پر پالا پڑ گیا۔ چرخِ ناہنجار سے ہماری وہ زندگی جس میں کسی قسم کی ذرّہ بھر بھی تکلیف نہ تھی' سیدھی آنکھوں نہ دیکھی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چنبیلی بیمار ہو گئی۔ خدا معلوم۔ کس منحوس گھڑی مرض نے حملہ کیا تھا۔ اس نے جان لے کر ہی چھوڑا۔ مرض تھا تپ دق۔ یہ وہ نامراد مرض ہے جو آدمی کو گھلا گھلا کر مار تا ہے۔ اس مرض میں مبتلا ہو کر آدمی برسوں زندہ رہتا ہے۔ لیکن تندرست وہ ایک لمحہ کیلئے بھی نہیں ہو تا۔ یہی حال چنبیلی کا بھی ہوا۔ اگرچہ تپ دق میں گرفتار ہونے کے بعد وہ پانچ چھ سال تک زندہ رہی۔ مگر تندرست وہ پورے ایک ماہ بھی نہ رہی۔ بعض اوقات ایسی حالت ہو جاتی تھی کہ سرسری نگاہ سے دیکھنے پر کوئی مرض نہ معلوم ہو تا تھا۔ مگر پھر بھی اس کی طبیعت اداس رہتی تھی۔ کسی کام میں دل نہ لگتا تھا۔ صرف انہی باتوں سے پتہ چلتا تھا کہ مرض اس پر عمل دخل جما چکا ہے۔

ایک سال تک تو میں اس کی اس حالت پر بہت فکر مند رہا۔ دوا درمن بھی خوب کی۔ مگر اس کے بعد میرا جی کچھ ایسا اکتا گیا کہ میں نے اسے ایشور کے بھروسہ پر چھوڑ دیا۔ معمولی طور سے علاج معالجہ کرنے کے علاوہ کوئی خاص کوشش نہ کی۔ معالجوں سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ تپ دق بہت جلد لگ جانے والی بیماری ہے۔ چنانچہ اس خوف سے کہ کہیں میں خود بھی اس میں مبتلا نہ ہو جاؤں' میں نے اس کے پاس بیٹھنا اٹھنا بھی بند کر دیا تھا۔ علاوہ ازیں ایک یہ سبب بھی تھا کہ اس کا بے نور چہرہ اور دبلا پتلا جسم دیکھ کر میرے دل کو تکلیف ہوتی تھی۔ میرے کنبہ میں میری والدہ اور دو چھوٹی بڑی بھاوجیں تھیں۔ اس لئے خانہ داری کے متعلق سب کام وہ ہی انجام دیتی تھیں۔ یہ بھی سبب تھا کہ مجھے اس سے زیادہ تعلق رکھنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ بعض اوقات تو ایسا ہو تا تھا کہ دس دس پندرہ پندرہ دن تک

اس سے میری بات چیت تک نہ ہوتی تھی۔ میری اس بے پروائی کو چنبیلی بھی جانتی تھی۔ مگر اس کے بارے میں اس نے مجھ سے کبھی شکایت نہیں کی۔

(2)

اس طرح ایک سال گزر گیا۔ ان دنوں میری طبیعت بالکل بدل گئی تھی۔ اب مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی گھر میں رہنا گوار گزرتا تھا۔ جب تک باہر رہتا' دل خوش رہتا تھا۔ مگر گھر میں قدم رکھتے ہی طبیعت پژمردہ اور مضمحل ہو جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دن میں صرف دو تین گھنٹے مکان پر رہتا تھا۔ اور ادھر رات کو دس گیارہ بجے سے پہلے گھر نہ لوٹتا تھا۔ مجھے شراب خوری وغیرہ بری عادات اور عیبوں کی بھی لت پڑ گئی تھی۔ کیونکہ میرا دل ہمیشہ خوشی اور مسرت کے لئے خواہشمند رہتا تھا۔ ان عیوب میں مجھے بڑی راحت حاصل ہوتی تھی۔

ایک روز میں دوپہر کے وقت بیٹھا ہوا ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ یکایک کسی کے آنے کی آہٹ پا کر میں نے سر اٹھایا۔ سامنے چنبیلی کو کھڑا دیکھ کر کچھ سٹ پٹا گیا۔ کیونکہ میں اس سے ہر وقت الگ تھلگ رہنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ میں نے اخلاق کے لحاظ سے چنبیلی سے کہا۔ ''آؤ۔ بیٹھو۔ کہو طبیعت کیسی رہتی ہے؟''

چنبیلی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اور اداس لہجے میں بولی۔ ''جیسی ہے ویسی ہی رہتی ہے۔''

میں۔ ''آخر کچھ معلوم تو ہو۔ پہلے سے اچھی ہے یا کچھ......؟''

چنبیلی۔ ''اچھی تو کیا۔ کسی نہ کسی طرح جی رہی ہوں۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں وہ کسی نہ کسی طرح پورے کرنے ہی پڑیں گے؟''

میں کچھ کہنے کی غرض سے بولا۔ ''ہاں! یہ تو ٹھیک ہی ہے۔ کیا کہیں اتنا معالجہ ہوا اور ہو رہا ہے مگر ابھی تک کچھ بھی افاقہ نہ ہوا۔''

چنبیلی میری اس بات پر کچھ دھیان نہ دے کر بولی۔ ''آج بیس دن بعد تم سے بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔''

میں۔ ''بیس دن! ابھی آٹھ دس دن تو ہوئے۔ جب میں تم سے ملا تھا۔''

چنبیلی۔ ''تمہیں بیس دن آٹھ دس دن ہی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر میرے لئے تو بیس دن بیس ہی دن ہیں۔''

میں نے ذرا شرمندہ ہو کر کہا۔ ''ممکن ہے بیس دن ہو گئے ہوں جب سے تم بیمار رہنے لگی ہو اس وقت سے ملنے جلنے کا موقع ہی نہیں لگتا۔''

چنبیلی۔ ''موقع تو تب لگے۔ جب موقع کے لئے کچھ کوشش کی جائے۔''

میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ دل پر کچھ چوٹ سی لگی۔ کیونکہ چنبیلی کی اس بات میں صداقت کا بہت کچھ جزو تھا۔

میں نے ناول کے صفحے الٹتے ہوئے کہا۔ ''ماں وغیرہ کی موجودگی میں اس قسم کی کوشش کرنا کچھ بھدا سا معلوم ہوتا ہے۔''

کہنے کو تو یہ بات کہہ گیا۔ مگر مجھے خود یہ بات بے تکی سی معلوم ہوئی۔ کیونکہ ایک وہ زمانہ بھی تھا۔ جب

ماں وغیرہ کے موجود ہوتے ہوئے بھی میں دن میں جتنی مرتبہ چاہتا تھا، چنبیلی سے ملنے کے موقعے پیدا کر ہی لیتا تھا۔

چنبیلی نے بھی یہ بات کہی۔ بولی: "میرے بیمار ہونے سے پہلے بھی توماں اور بھاوجیں تھیں۔"

اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ مجھے چنبیلی کا اپنے پاس بیٹھنا ناگوار گزرا۔ میں اپنے دل میں ایشور سے پرارتھنا کرنے لگا کہ کوئی سبب ایسا پیدا ہو جائے جس سے چنبیلی میرے پاس سے اٹھ کر چلی جائے۔ آہ! یہ کیسا خوفناک انقلاب تھا۔ جس چنبیلی کے دیدار کے لئے میں مکان کے گوشوں اور کوٹھریوں میں چھپا کھڑا رہا کرتا تھا، اسی چنبیلی کے پاس بیٹھنا آج مجھے برا معلوم ہو رہا تھا۔

چنبیلی کچھ دیر تک خاموش رہی۔ پھر بولی۔ "شرمندہ کیوں ہوتے ہو؟ شرمندہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ میں اس بات سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ اب مجھ میں کوئی ایسی کشش نہیں رہی جو تمہیں میرے پاس آنے کے لئے مجبور کرے۔"

میں نے بیقرار ہو کر کہا۔ "آج تمہیں یہ کیا سوجھا ہے جو ایسی واہیات باتیں منہ سے نکال رہی ہو۔"

چنبیلی ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ "واہیات باتیں نہیں ہیں سچی باتیں ہیں۔ مجھے کوئی شکایت نہیں۔ البتہ دکھ ضرور ہے۔ تمہیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ سب کا دل تمہارا جیسا نہیں ہے۔"

میں نے کچھ خفا ہو کر کہا۔ "دیکھو چنبیلی اگر تم ایسی فضول باتیں کرو گی تو میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔"

چنبیلی کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہی آنکھیں جنہیں دیکھ کر کبھی میں بیخود ہو جاتا تھا۔ مگر آج انہیں آنکھوں کو پرنم دیکھ کر میرا دل پسیجا تک نہیں۔

چنبیلی نے کہا۔ "اگر تمہیں یہ باتیں بری معلوم ہوتی ہیں تو نہ کہوں گی۔ ہاں اگر تم ایک بات ماننے کا قول دو تو کہیں۔"

میں۔ "کون بات؟"

چنبیلی۔ "مانو گے؟"

میں۔ "اگر ماننے کے لائق ہو گی۔"

چنبیلی۔ "تم دوسری شادی کر لو۔"

میں چونک پڑا۔ ایں دوسری شادی! اور چنبیلی خود اس کی تجویز پیش کرے۔ میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا۔ پھر بولا "تم ایسا کیوں کہتی ہو؟"

چنبیلی۔ "اس لئے کہ تمہیں اس کی ضرورت ہے۔ میں تو اس لائق ہی نہیں رہی کہ تمہاری کچھ خدمت کر سکوں۔ اس لئے دوسرا بیاہ کر لینا مناسب ہے۔ میری خاطر تم اپنی زندگی کو پُر تکلیف کیوں بنا رہے ہو؟ اس سے مجھے بھی بڑی تکلیف ہے۔ میں تمہیں اداس اور فکر مند دیکھتی ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ تم کسی دن بھی رات کو بارہ بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتے۔ میں یہ جانتی ہوں کہ گھر میں تمہارا دل نہیں لگتا۔ ان تمام باتوں کا سبب بھی میں جانتی ہوں۔ میں رات دن ایشور سے یہی پرارتھنا کرتی ہوں کہ وہ مجھے بہت جلد اٹھا لیں اور تم بیاہ کرنے کے لئے آزاد ہو جاؤ۔ مگر میری پرارتھنا جلدی منظور ہوتی نظر نہیں آتی۔ اس لئے میں بھی چاہتی ہوں کہ تم بیاہ کر ڈالو۔"

چنبیلی کی اس بات نے مجھے بحرِ فکر میں غوطہ زن کر دیا۔ کئی بار میرے دل میں بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا کہ اگر چنبیلی شفایاب نہیں ہوتی تو مر ہی جائے اور میں دوسرا بیاہ کرنے کے لئے آزاد ہو جاؤں۔ اف! میں نہیں سمجھتا کہ

میرے دل میں یہ خیال کیسے پیدا ہوتا تھا؟ جس چنبیلی کے ذرا سا سر میں درد ہونے سے ہی مجھے سخت صدمہ پہنچتا تھا' اسی چنبیلی کا مرنا میں مناتا تھا۔ حق تو یہ ہے کہ انہی باتوں کے پرائشچت کے طور پر میں آج سخت روحانی عذاب میں مبتلا ہوں۔

میں نے کہا۔ "نہیں۔ میں شادی نہیں کروں گا۔ تمہارے ہوتے میں بیاہ کروں۔ یہ کبھی ممکن نہیں ہو سکتا۔"

چنبیلی۔ "نقصان ہی کیا ہے۔ جب میں راضی ہوں۔ تو تم کیوں ہچکچاتے ہو؟"

خلاف مرضی بھی میری زبان سے سچی بات نکل گئی۔ میں نے کہا۔ "میں اگر بیاہ کرنے کے لئے تیار بھی ہو جاؤں تو ماں اور بھائی صاحب اسے کب منظور کریں گے؟"

چنبیلی۔ "میں جب کہوں گی تو منظور کر لیں گے۔"

میں۔ "ایشور کے واسطے کہیں ایسا کر بھی نہ بیٹھنا۔ ورنہ ماں تو مجھے کھا جائے گی۔ تم اس چکر میں نہ پڑو۔ میں شادی وادی کچھ نہ کروں گا۔"

چنبیلی۔ "میرے لئے تم تکلیف کیوں اٹھاتے ہو؟"

میں۔ "مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ صرف تمہاری بیماری اور تکلیف سے ضرور دکھ ہوتا ہے۔ مگر اس کے لئے کیا کیا جائے؟ ایشور ہی کو یہ منظور ہے کہ ہمیں یہ دکھ ہو۔"

چنبیلی نے اس پر کچھ نہیں کہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد وہ میرے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔"

(3)

ایک سال اور گزرا۔ چنبیلی کی وہی حالت تھی۔ نہ تو مرض کے پنجہ سے آزاد ہوتی نظر آتی تھی اور نہ بارِ زندگی سے۔ کبھی کبھی مجھے اس پر بڑا رحم آتا تھا۔ کیونکہ سوائے موت کا انتظار کرنے کے اس کے لئے دنیا میں اور کوئی کام نہ تھا۔ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اس کا دل بہلا سکے۔ مگر بایں ہمہ اس کی نگاہ میرے دکھ سکھ کی طرف بہت رہتی تھی۔ وہ ہر وقت میرے ہی رنج و راحت کا خیال رکھتی تھی۔ وہ میرے الگ الگ رہنے پر بھی مجھے خوش اور سکھی رکھنے کی فکر میں رہتی تھی۔ اگرچہ اس کا جسمانی حسن تباہ ہو چکا تھا مگر روحانی جمال بدستور قائم تھا۔ بلکہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ سوکھ گیا تھا۔ مگر وہ گلاب کا پھول تھا۔ جو خشک ہونے پر بھی اپنی خوشبو نہیں چھوڑتا۔ بخلاف اس کے میرے دل میں کس قدر گہرا انقلاب بپا ہو گیا تھا۔ میرے دل کا بھنورا اس پھول کی خوشبو کی ذرا بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ بھنورے کو خوشبو سے کیا سروکار؟ وہ تو صرف رس چاہتا ہے۔ وہ ایسے پھول کے پاس تک نہیں پھٹکتا۔ جس میں خوشبو تو ہو۔ لیکن رس نہ ہو۔

ایک روز میں نے اپنے بیٹے گیانو کو جس کی عمر اس وقت سات برس کی تھی' کسی معمولی سے قصور پر پیٹ دیا۔ وہ روتا ہوا اپنی ماں کے پاس گیا۔ صرف اتنی سی بات پر چنبیلی نے دوسرے دن مجھ سے مل کر کہا۔ "کل تم نے گیانو کو بڑی بری طرح سے مارا۔"

میں نے کہا۔ "اس نے کام ہی مار کھانے کا کیا تھا۔"

چنبیلی آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "اسے مارا نہ کرو۔"
میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"
چنبیلی۔ "مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"
مجھے اس کی اس بات پر ہنسی آئی۔ "میں نے چنبیلی سے کہا۔ سبھی بچے تھوڑے بہت مارے پیٹے جاتے ہیں۔ اس میں اتنا دکھ ماننے کی ضرورت کیا؟ اگر کوئی قصور کرے تو اسے مارا پیٹا ہی جاتا ہے۔ اس میں تمہارا اس قدر دکھ ماننا بالکل فضول ہے۔"
چنبیلی۔ "میرا اتنا دکھ ماننے کا سبب ہے۔"
میں۔ "کیا سبب؟"
چنبیلی۔ "وہ بے ماں کا ہے۔"
میری عقل نے کچھ کام نہ کیا۔ بولا "بے ماں کا ہے؟"
چنبیلی۔ "ہاں۔ میں ایسا ہی سمجھتی ہوں۔ میری زیست کا کیا بھروسہ؟ میں اپنے کو مرا ہوا ہی مانتی ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسے بے ماں کا سمجھتی ہوں۔ یہی سبب ہے کہ کوئی اسے کچھ کہتا سنتا ہے تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ابھی تو جب اسے کوئی کچھ کہتا سنتا ہے۔ جب کبھی تم مارتے پیٹتے ہو۔ تو وہ آکر میرے سینے سے لگ جاتا ہے۔ میں کلیجے سے لگا کر اسے چمکار پچکار کر اس کا دل ٹکا دیتی ہوں۔ مگر میرے بعد وہ کس کے پاس جائے گا؟ کس کے آنچل میں منہ چھپا کر بیٹھے گا؟ کون اسے پیار کر کے خوش کرے گا؟ اسی لئے کہتی ہوں۔ کہ تم اسے کچھ نہ کہا کرو۔"
چنبیلی کی اس دردناک درخواست سے چند لمحوں کے لئے میرا دل تھرا اٹھا۔ اس کے ان الفاظ میں معلوم نہیں کیسی زبردست طاقت تھی کہ اس نے میرے پتھر جیسے دل کو بھی ٹھیس پہنچائی۔ میں نے کہا۔ "اچھا! اب جہاں تک ممکن ہو سکے گا' اسے کچھ نہ کہوں گا۔"

(4)

چنبیلی کا آخری وقت قریب تھا۔ ایک ماہ ہوا۔ اس نے چارپائی کی پناہ لی تھی۔ اس وقت سے اس کی حالت دن بدن بگڑتی ہی گئی۔ وہ جس روز رات کو اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے والی تھی' اس دن اس نے دوپہر کے وقت مجھے اپنے پاس بلوایا۔ میں اس کے پاس پہنچا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ چنبیلی چند روز کی مہمان ہے۔ مگر خواب میں بھی یہ خیال نہ آیا تھا۔ کہ یہی دن اس کا آخری دن ہے۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور پوچھا۔ "اس وقت طبیعت کیسی ہے؟"
چنبیلی قدرے مسکرائی اور بولی۔ "اب طبیعت بہت اچھی ہے۔"
میں نے کہا۔ "بہت اچھی تو کیا ہو گی؟"
چنبیلی۔ "میری طبیعت اس وقت جس قدر خوش ہے اتنی پہلے کبھی نہیں رہی۔"
میں۔ "یہ تو تمہاری باتیں ہیں۔"
چنبیلی۔ "نہیں۔ میں سچ کہتی ہوں۔"

میں نے چنبیلی کے چہرے کو بغور دیکھا۔ آج چھ سال بعد مجھے اس کی آنکھوں میں' اس کے چہرے پر وہی نور' وہی حسن نظر آیا۔ جو چھ سال پیشتر تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ چنبیلی کو کوئی مرض ہی نہیں۔ وہ بالکل تندرست ہے۔ نہ معلوم اس روز میرے دل میں اس کے لئے پہلے کی سی محبت کیوں پیدا ہو گئی۔ چھ برس بعد میں نے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اگر تمہاری طبیعت ایسی رہی تو دو ہی چار روز میں تم بالکل اچھی ہو جاؤ گی۔"

میرا محبت بھرا سلوک دیکھ کر چنبیلی نے ہلکے تبسم کے ساتھ شرما کر اپنی نگاہ دوسری طرف پھیر لی۔

میں بیقرار ہو گیا۔ وہی شرمیلی نگاہ! وہی ہلکا تبسم! میں نے اپنے دل میں کہا۔ چنبیلی کے حسن و جمال میں تو ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ کیا میں اتنی مدت اندھا رہا۔ جو یہ بات نہ دیکھ سکا؟ اف! میں نے کیسا غضب کیا۔ جو اس کی طرف سے اس قدر بے پروا ہو گیا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میں اسے اتنے دن کیسے اور کیوں ٹھکرائے رہا؟ اس میں کونسی ایسی بڑی تبدیلی ہو گئی تھی جس کے سبب سے میں اس سے اتنے دنوں نفرت کرتا رہا؟ میں اس ہیرے کو چھوڑ کر ادھر ادھر کانچ کے ٹکڑوں سے کس طرح خوشی محسوس کرتا رہا؟ اس لئے کہ یہ پنجۂ مرض میں گرفتار تھی؟ چھی! چھی! کیسی حیوانیت ہوئی۔ میں اگر اس طرح کوشش کرتا رہتا تو بہت ممکن ہے یہ اب تک کبھی کی شفایاب ہو گئی ہوتی۔ اسے مرض میں مبتلا اور اتنی تکلیف میں چھوڑ کر میں اکیلا صرف اپنی ہی خاطر خوشی اور راحت کی تلاش میں کس طرح پھرتا رہا؟ اگر یہ دکھی تھی تو مجھے اس کے دکھ درد میں شریک ہونا چاہیے تھا۔ نہ کہ اس کو اس حالت میں چھوڑ کر اکیلے عیش اڑانا۔ اف! کیسا ستم ہوا۔ اس نے ان تمام باتوں کے جاننے کے باوجود کبھی کوئی شکایت نہیں کی۔ برخلاف اس کے یہ ہمیشہ مجھے خوش اور سکھی رکھنے کے لئے فکر کرتی رہی۔ یہاں تک کہ صرف مجھے سکھی کرنے کے لئے اس نے میری دوسری شادی کرانے کی بھی کوشش کی۔ آہ! میرے اور اس کے برتاؤ میں زمین و آسمان کا فرق رہا۔ اف! میں نے بڑا پاپ کیا۔ معلوم نہیں۔ اس پاپ سے کیسے چھوٹ سکوں گا!"

چنبیلی نے مجھے بحرِ فکر میں غوطہ زن دیکھ کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

میں۔ "کچھ نہیں۔"

چنبیلی۔ "میں نے کچھ کہنے کے لئے بلایا تھا۔"

میں۔ "کہو کیا کہتی ہو؟"

چنبیلی۔ "میری وجہ سے تمہیں بڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔ میں تمہارے سکھ کے راستے میں کانٹا رہی۔ میری تقدیر میں تو ایشور نے سکھ لکھا ہی نہ تھا۔ جتنا لکھا تھا وہ بھوگا۔ اور وہ خواب میں سورگ ملنے کی طرح تھا۔ مگر میں تمہارے عیش و آرام کی تباہی کا موجب ہوئی۔ اب مجھے یہ معلوم ہو کر بیحد خوشی ہے کہ میں تمہارے سکھ کے راستے سے الگ ہوئی جاتی ہوں۔ اب تم دنیا میں سکھ بھوگنے کے لئے آزاد......"

میں آگے کچھ نہ سن سکا۔ میں نے بے چین ہو کر کہا۔ "چنبیلی! یہ تم کیا بک رہی ہو؟ تمہارے بغیر مجھے سورگ میں بھی کوئی سکھ نہیں مل سکتا۔ ایشور نہ کرے۔"

چنبیلی ذرا متحیر ہو کر بولی۔ "ناتھ! اب تو دنیاداری دکھانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ ریاکاری چھوڑو۔ اور جو میں کہتی ہوں اسے سنو۔"

میں نے بیحد دکھی ہو کر کہا۔ "چنبیلی! میں بڑا کمینہ ہوں۔ بڑا نیچ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ ایک گھنٹہ

پہلے میں مکر کا بھیس بنائے ہوئے تھا مگر ایشور شاہد ہے' اس وقت میں اپنے پچھلے خشک برتاؤ کے لئے بیحد نادم ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا۔ اس کا پرائشچت اگر جان دے کر بھی ہو سکے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔ میں اندھا ہو گیا تھا۔ میں نہیں جانتا تھا۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے اس بات کا تعجب ہے کہ میں نے کیسے تم سے یہ برا سلوک روا رکھا۔"

اتنا کہتے کہتے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ میری ہچکی بندھ گئی۔ چنبیلی کی آنکھوں سے بھی آنسوؤں کا تار بندھ گیا کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ "اگر یہ بات تم نے آج سے کچھ دن پہلے کہی ہوتی تو شاید میں زندہ رہنے کی کوشش کرتی۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں چونک پڑا۔ آنکھوں کے آگے تاریکی آنے لگی۔ میں نے چنبیلی کا سر اپنی گود میں رکھ کر کہا۔ "نہیں نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسے وقت میں جب میں اپنی غلطی پر پشچاتاپ (اظہار تاسف) کر رہا ہوں۔ اس کا پرائشچت (کفارہ) کرنے کے لئے تیار ہوں۔ جب تم اب میرے نزدیک دنیا کی تمام بیش قیمت اشیاء سے عزیز تر ہو گئی ہو۔ اب تم مجھ کو چھوڑ کر جانا چاہتی ہو؟ نہیں پیاری ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

چنبیلی ایک آہ بھر کر بولی۔ "تمہاری ان باتوں سے مجھے موت سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ دل میں جینے کی زبردست خواہش پیدا ہوتی ہے۔ ابھی تک میں خوشی خوشی مرنے کو تیار تھی۔ مگر اب تمہاری باتوں سے مجھے مرنا تکلیف دہ معلوم ہو رہا ہے۔ ناتھ! میرا آخری وقت دکھ وائی نہ بناؤ۔ مجھے اس طرح مرنے میں تکلیف ہو گی۔ تم یہی کہو کہ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔ میری طرف سے اسی طرح بے پروا بنے رہو۔ مجھے یقین دلا دو کہ تمہیں میرے مرنے سے خوشی ہو گی۔ راحت ہو گی۔ تاکہ مجھے موت سے ڈر نہ لگے۔ میں خوشی خوشی مروں۔"

مارے دکھ اور تاسف کے میرا گلا رندھ گیا۔ اس کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔

چنبیلی نے کہا۔ "اس وقت میں تم سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔"

میں نے بڑی مشکل سے پوچھا۔ "کیا؟"

چنبیلی نے جواب دیا۔ "میرے گیانو کو کبھی کچھ نہ کہنا۔"

اتنا کہہ کر وہ محبت کی پتلی بے ہوش ہو گئی۔ پھر اسے آخری سانس تک ہوش نہ آیا۔

بیوہ کا ایثار

(1)

بابو اندر جیت سنگھ کی اور میری آپس میں بڑی گہری دوستی تھی۔ ہم دونوں ایک ہی ذات ایک ہی عمر اور ایک ہی خیال کے آدمی تھے۔ بابو اندر جیت سنگھ میرے مکان سے تھوڑی ہی دور رہتے تھے۔ چنانچہ فرصت ملنے پر کبھی میں ان کے گھر چلا جاتا۔ اور کبھی وہ میرے مکان پر آ جاتے تھے۔ بابو اندر جیت سنگھ ایک ہندوستانی فرم میں ہیڈ کلرک یا بڑے بابو تھے۔ مشاہرہ ایک سو پچاس روپے ملتا تھا۔ ان کے کنبے میں ان کے اور ان کی بیوی کے سوائے

اور کوئی نہ تھا۔ ان کی ایک بہن بھی تھی۔ مگر وہ زیادہ تر اپنی سسرال میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایک دو ماہ کے لئے چلی آیا کرتی تھی۔

ان دنوں میں میں نے ڈاکٹری میں ایل ایم ایس کی ڈگری حاصل کر کے اپنا کاروبار شروع ہی کیا تھا۔ اس وقت میرے کنبہ میں میری بوڑھی ماں اور ایک بیوہ بہن کے سوائے کوئی نہ تھا۔ میری شادی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ شہر میں کافی جائداد ہونے کے سبب سے میں مالی تفکرات سے آزاد تھا۔ مگر پھر بھی میں نے شادی نہیں کی۔ میرے خیالات میں کچھ عجیب و غریب پن تھا۔ مگر مجھے ان میں کوئی عجیب و غریب پن نہیں نظر آتا تھا۔ میرے خیالات کا ایک عجیب و غریب پن۔ اگر اسے اس نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے' یہ تھا کہ میں نے تعلیم یافتہ اور حسین بیوہ سے شادی کرنے کا عہد کر لیا تھا۔ میرے اس عہد کو میری والدہ اور بڑی بہن بھی جن کو ہر طرح سے خوش رکھنا اور جن کے تمام احکام کو بجالانا میں اپنا فرض سمجھتا تھا' نہیں توڑ سکتی تھیں۔ مجھے یہ معلوم تھا کہ میرے بیاہ نہ کرنے سے میری ماں اور بہن کو روحانی تکلیف ہو رہی ہے۔ ان کے بہت سے ارمانوں کا خون ہو رہا ہے۔ مگر میں نے اپنی بھیشم پر تگیا کو توڑنا پاپ سمجھا۔

ایک روز شام کو میں بابو اندر جیت کے مکان پر گیا۔ وہ دفتر سے لوٹ کر کچھ ناشتہ کرنے بیٹھے ہی تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''آؤ اچھے موقع پر آئے (اپنی بیوی سے) ''جاؤ۔ ان کے لئے بھی کچھ لاؤ''

اندر جیت سنگھ کی بیوی مجھ سے پردہ نہ کرتی تھی۔ بلکہ خود اندر جیت ہی نہیں کرنے دیتے تھے۔ اندر جیت کی بیوی چندر کلا میرے لئے بھی تھوڑا سا کھانا لے آئی۔ میں بھی کھانے لگا۔

اندر جیت نے پوچھا۔ ''آج ہال نہیں گئے کیا؟''

ہال سے ان کا مطلب میڈیکل ہال یا دواخانہ سے تھا۔

میں نے جواب دیا۔ ''گیا تو تھا۔ دن بھر خالی بیٹھا کرسی توڑتا رہا۔ بیٹھے بیٹھے طبیعت اکتا گئی۔ اس وقت یہ خیال کر کے کہ تم دفتر سے آگئے ہوگے ادھر چلا آیا۔''

اندر جیت۔ ''ابھی کوئی مریض وریض نہیں ملا؟''

میں۔ ''ابھی تو کوئی نہیں ملا اور ملے بھی کہاں سے؟ ڈھیروں تو ڈاکٹر ہیں۔ گلی گلی میڈیکل ہال اور دواخانے ہیں۔ علاوہ اس کے ابھی مجھے کام شروع کئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟''

اندر جیت۔ ''ہاں۔ جب آہستہ آہستہ لوگوں کو معلوم ہوگا تو مریض بھی ملیں گے۔''

چندر کلا مسکرا کر بولی۔ ''ڈاکٹر تو صبح اٹھ کر یہی مناتے ہوں گے کہ کوئی بڑا آدمی بیمار ہو تو ہماری بن آوے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں! بہت سے مناتے بھی ہیں۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی مناتے ہیں کہ ہمارے علاج معالجہ سے اچھا ہو جائے۔''

چندر کلا۔ ''اچھا کرنا ان کے ہاتھ میں تھوڑے ہی ہے۔ جو ایسا ہو تو پھر کاہے کو کوئی مرے۔''

اندر جیت بول اٹھے۔ ''اگر اچھا کرنا ان کے ہاتھ میں نہیں ہے تو بیمار کرنا بھی ان کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ لاکھ منایا کریں ان کے منانے سے ہوتا ہی کیا ہے؟''

ہم دونوں ناشتہ سے فارغ ہو کر ہاتھ منہ دھو کر بیٹھ گئے۔ چندر کلا پان بنانے لگی۔

اندر جیت نے پوچھا۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟ سیر کرنے چلو گے یا گھر جاؤ گے؟"

میں نے جواب دیا۔ "گھر میں کیا رکھا ہے۔ گھر میں تو میرا دل ہی نہیں لگتا۔"

چندر کلا بول اٹھی۔ "دل کیا لگے پتھر! دل لگنے کا سامان بھی تو ہو۔ کل میں ماتا جی (میری والدہ) کے پاس گئی تھی۔ سچ کہتی ہوں کہ وہ اس قدر دکھی ہیں کہ کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کہتی تھیں کہ مجھے اور کوئی دکھ نہیں۔ صرف یہی دکھ ہے کہ رگھبیر کی بیوی کا منہ نہیں دیکھ سکی۔ ان کی تو یہ آرزو تھی کہ تمہارے لڑکے بچے دیکھ کر مرتیں۔ مگر جب بہو کا منہ دیکھنے ہی کے لالے پڑے ہیں۔ تب لڑکے بچوں کا ذکر ہی کیا ہے؟

اندر جیت بولے۔ "ہاں بھائی! یہ بات تو تمہاری واقعی ٹھیک نہیں۔ آخر تم نے سوچا کیا ہے؟"

میں۔ "بھائی! میں تمہیں اپنے خیالات بتا چکا ہوں۔"

اندر جیت۔ "یار! تمہاری سب باتیں مجھے پسند ہیں۔ تمہارے سب ہی خیالات میرے خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ مگر اس بارے میں میرا تمہارے ساتھ اتفاق رائے نہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ کوئی خوبصورت پڑھی لکھی بیوہ نہ ملے گی تو تم شادی ہی نہ کرو گے؟ خاصے رہے۔ میری سمجھ میں تو یہ جنون ہے۔"

چندر۔ "آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اوروں کی نبض ٹٹولتے ہیں۔ دوسروں کا جنون رفع کرتے ہیں۔ مگر اپنا جنون دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "انسان اپنے مرض کی خود دوا نہیں کر سکتا۔ ڈاکٹروں کو بھی اپنی بیماری کے علاج کے لئے دوسرے ڈاکٹروں کی مدد لینی پڑتی ہے۔ اس لئے میں اپنا یہ پاگل پن یا جنون خود نہیں رفع کر سکتا۔ اس کے لئے کسی دوسرے ڈاکٹر کی ضرورت ہے۔"

چندر کلا پان لپیٹتی ہوئی بولی۔ "اے ہٹو بھی! خواہ مخواہ باتیں بناتے ہو۔"

اندر جیت۔ "بھائی رگھبیر! سچ مچ! یہ بڑی بری عادت ہے۔ اس ضد سے باز آؤ۔ کوئی سمجھ دار آدمی تمہاری اس ضد کو ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔"

میں ذرا سنجیدگی کے انداز سے بولا۔ "یار اندر جیت! اس بارے میں بحث مباحثہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مانا کہ یہ میرا پاگل پن ہے۔ مگر یہ ایسا پاگل پن ہے جو دلیل اور بحث و مباحثہ سے رفع نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔ ایشور ہی اس پاگل پن کو دور کرے تو کرے۔ یہ انسان کی طاقت سے باہر کا کام ہے۔"

اندر جیت۔ "اگر یہ بات ہے تو اب کچھ نہ کہوں گا۔ پرماتما تمہارے سر سے یہ سودا اتارے!"

چندر کلا میرے ہاتھ میں پان دیتے ہوئے بولی۔ "میرا دل تو یہ کہتا ہے کہ تمہارا یہ جنون رفع ہو جائے گا۔ اور کسی انسان کے ذریعے ہی رفع ہو گا۔ لوہا لوہے ہی سے کٹتا ہے۔ تمہیں بھی کوئی تمہارے ہی ایسا پاگل مل جائے گا۔ تب یہ سارا پاگل پن دور ہو جائے گا۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تمہارے منہ میں گھی شکر!"

(2)

مندرجہ بالا واقعہ کے بعد دو سال گزر گئے۔ اس عرصہ میں میرا کام چل نکلا۔ اندر جیت سنگھ کے ہاں میرا آنا

جانا کم ہو گیا۔ کیونکہ مریضوں سے فرصت کم ملنے لگی۔

شہر میں انفلوائنزا کا خوب زور شور تھا۔ موت کا بازار گرم ہو رہا تھا۔ مجھے کھانے پینے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔ میں ایک مریض کو دیکھ کر آیا تھا۔ ایک اور بھلا مانس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ جونہی میں نے گاڑی سے پاؤں نیچے رکھا وہ مجھ سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو لے جانے کے لئے بہت دیر سے بیٹھا ہوں۔ مہربانی کر کے فوراً میرے ساتھ چلئے۔ ذرا چل کر میری ماں کو دیکھ لیجئے۔"

میں الٹے پاؤں واپس چلا۔ گاڑی کے پائدان پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ اندر جیت کا نوکر گھبرایا ہوا آیا اور بولا۔ "بابو جی! ہمارے بابو کی طبیعت خراب ہے۔ بخار چڑھ آیا ہے۔ بدن میں درد سے معلوم ہو گیا کہ انفلوانزا کا حملہ ہے۔"

پہلے تو میرے دل میں آیا کہ اس بھلے مانس سے کہہ دوں کہ کسی دوسرے ڈاکٹر کو لے جائے۔ میں نہیں جا سکتا۔ مگر پھر یہ سوچ کر کہ یہ غریب بھی مصیبت کا مارا ہے۔ معلوم نہیں کتنی دیر سے میرا انتظار کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں اسے مایوس پھیر نا مناسب نہیں۔ چنانچہ میں نے اندر جیت سنگھ کے ملازم سے کہا۔ "اچھا! ابھی چلتا ہوں۔ ایک جگہ ہو لوں۔ تم بھی گاڑی کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔"

میں اس شریف آدمی کے گھر گیا۔ اس کی ماں کو دیکھ کر نسخہ لکھا اور وہاں سے سیدھا اندر جیت کے ہاں پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی چندر کلا رونے لگی۔ میں نے کہا۔ "رونے کی کون بات ہے۔ آجکل موسم خراب ہے۔ مگر کوئی فکر نہیں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر میں اس کمرے میں گیا۔ جہاں اندر جیت پڑے تھے۔ اندر جیت پلنگ پر پڑے تڑپ رہے تھے۔ مارے درد کے ان کا برا حال تھا۔ میں نے انہیں پکارا۔ "اندر جیت، اندر جیت۔" انہوں نے ذرا چونکتے ہوئے انداز سے آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھا۔ میں نے پوچھا "کیا حال ہے؟"

اندر جیت کراہتے ہوئے بول۔ "بڑا درد ہے۔ آہ!"

میں نے کہا۔ "گھبراؤ نہیں۔ درد جاتا رہے گا۔"

میں نے تھرمامیٹر لگایا۔ بخار 103 درجے تھا۔ چھاتی کی بھی جانچ کی۔ اس وقت تک پھیپھڑے درست حالت میں تھے۔

میں نے چندر کلا سے پوچھا۔ "کھانسی تو نہیں ہے؟"

چندر کلا۔ "کھانسی ہے۔ مگر بہت نہیں۔ پیاس بہت ہے۔"

میں۔ "پانی انہیں مت دینا۔ صرف برف کا ٹکڑا دینا۔"

میں نے اسی لمحہ نسخہ لکھا اور نوکر کو اپنے دواخانہ بھیج دیا۔ نسخہ پر "اشد ضروری" لکھ دیا تھا۔ چنانچہ دس ہی منٹ میں نوکر دوا لے کر آ گیا۔ میں نے اپنے ہاتھ سے ایک معتاد دوا پلا دی۔ ایک دوا مالش کے لئے بھی منگوائی تھی۔ اس کی مالش کی ترکیب بتا دی اور دیگر ضروری باتیں بھی سمجھا دیں۔ اس کے بعد چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ چلتے وقت میں نے چندر کلا سے کہا۔ "جو باتیں میں نے سمجھائی ہیں۔ ان کا دھیان رکھنا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اچھے ہو جائیں گے۔ کھانا کھا کر میں پھر آؤں گا۔"

میں وہاں سے سیدھا گھر آیا۔ کچھ کھا پی چکا تو اندر جیت سنگھ کے بیمار ہونے کا حال ماں اور بہن کو سنایا۔ ان دونوں کو بھی فکر ہوئی۔ میں نے اپنی بہن سے کہا۔ "اچھا ہو۔ اگر تم وہاں چلی جاؤ۔ چندر کلا اکیلی ہے۔ اور گھبرا رہی

ہے۔ ایسے وقت میں تسلی تشفی دینے والا کوئی شخص ضرور ہونا چاہیے۔“
بہن اسی لمحہ جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اس کے وہاں چلے جانے پر میں دواخانہ چلا آیا۔

(3)

میں نے اندر جیت کو موت کے پنجہ سے بچانے کے لئے حتی الوسع کوشش کی۔ دو دن تک چوبیس گھنٹے ان کے پاس موجود رہا۔ دوسرے مریضوں کا دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ صرف چند پرانے مریضوں کو دیکھ آتا تھا۔ مگر میری محنت رائگاں ثابت ہوئی۔ تیسرے دن اندر جیت کو نمونیا ہو گیا۔ ان کے پھیپھڑوں میں خرابی آ گئی۔ سانس لینا دشوار ہو گیا۔ میں گھبرایا۔ سمجھ گیا کہ اب میرے علاج معالجہ سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ یہ سوچ کر میں نے شہر کے دیگر بڑے بڑے ڈاکٹروں کو جمع کیا۔ ان سب کے مشورہ سے دوا دی گئی۔ میں دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ نتیجہ کی راہ دیکھنے لگا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اندر جیت کے سرہانے کرسی پر بیٹھا ہوا ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ میرے بہت سمجھانے پر چندر کلا تھوڑی دیر کے لئے کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی تھی۔ یک بیک اندر جیت نے کروٹ بدل کر پکارا۔ ”چندر کلا۔“ میں نے کہا۔ ”کیوں بھئی! کیا چاہیے؟ چندر کلا کو میں نے سلا دیا ہے۔ کئی دن کی جاگی ہوئی تھی۔“

اندر جیت نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ تھوڑی دیر ٹکی ہوئی نگاہ سے دیکھتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔ ”رگھبیر!“

میں۔ ”ہاں بھائی! کیا چاہیے؟“

اندر جیت۔ ”میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔“

میں سمجھا۔ اندر جیت عالم بیہوشی میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”دیکھا ہو گا۔ جانے دو خواب کو۔ چپ چاپ لیٹے رہو۔ بات کرنے سے سانس پھولے گا۔“

اندر۔ ”نہیں۔ سانس نہیں۔ میں...... نے...... ایک خواب...... خواب دیکھا ہے۔“

میں نے پوچھا ”کیا خواب؟“

اندر۔ ”تم نے چندر کلا...... چندر کلا...... سے بیاہ کر لیا۔“

اگر اس وقت اندر جیت یک لخت تندرست ہو کر اٹھ بیٹھتے۔ اور مجھ سے پوچھتے۔ ”سیر کرنے چلو گے؟“ تب بھی میں اتنا نہ چونکتا۔ جس قدر ان کی اس بات سے چونکا۔ میری قوت گویائی سلب ہو گئی۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کی اس بات کا کیا جواب دوں۔

اندر جیت بولے۔ ”کیوں...... چپ...... کیوں ہو گئے۔“

اور کچھ نہ سوچ سکنے کے سبب میں نے کہا۔ ”ایسی واہیات بات منہ سے نہ نکالو۔ چپ چاپ پڑے رہو۔ ایشور تمہیں اچھا کر دیں گے۔ گھبراتے کیوں ہو؟“

اندر۔ ”رگھبیر!“

میں نے کہا۔ "کیا کہتے ہو۔ تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اندر جیت۔ "تم جیسی...... بیوہ چاہتے ہو...... چندر کلا ویسی ہی ہے۔"

اف! میرے صبر و شکیب کی طاقت کی انتہا ہو گئی۔ اگر اندر جیت بیمار نہ ہوتے تو میں ان کے پاس سے بھاگ جاتا اور ساری عمر ان سے بات نہ کرتا۔ خیر یہی ہوئی کہ چندر کلا سو رہی تھی۔ اگر وہ پاس ہوتی تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی۔

میں نے کہا۔ "بھائی اندر جیت! ایشور کے لئے تم ایسی باتیں نہ کہو۔"

اندر جیت۔ "رگھبیر!"

میں۔ "بھائی۔ چپ ہو کر پڑے رہو۔ کہنا مانو۔ باتیں کرنے سے تکلیف بڑھے گی۔"

اندر جیت۔ "میں...... اس...... بات...... سے...... خو...... خوش ہوں...... میرے۔ بعد...... اس پر۔ تمہارا۔ قب......"

اتنا کہہ کر اندر جیت خاموش ہو گئے۔ ان کی سانس پھول گئی۔ وہ زور زور سے ہانپنے سے لگے۔

میں نے دوا کی ایک معتاد پلانی چاہی۔ مگر انہوں نے ہاتھ سے دوا ہٹا دی۔

اس کے بعد پھر وہ نہ بول سکے۔ حالت بگڑتی ہی گئی۔ تڑکے چار بجے کے قریب چندر کلا کی آنکھ کھلی۔ اس نے مجھ سے پوچھا "کیا حال ہے؟"

میں نے گرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "ویسا ہی ہے۔"

صبح سات بجے اندر جیت کو پھر ذرا ہوش آیا۔ سانس بڑھی ہوئی تھی۔ بول نہیں سکتے تھے۔ پلنگ کے ایک طرف میں بیٹھا تھا۔ اور دوسری طرف چندر کلا۔ اندر جیت سنگھ نے پہلے میری طرف دیکھا۔ پھر چندر کلا کی طرف۔ اس کے بعد ان کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ کی طرف بڑھا۔ اور دوسرا چندر کلا کی طرف۔ ہم دونوں ان کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ ہم دونوں نے اس خیال سے کہ وہ اٹھنا چاہتے ہیں' ان کو سنبھالنے کے لئے اپنے اپنے ہاتھ بڑھائے۔ انہوں نے ہم دونوں کے ہاتھ پکڑ لئے اور چندر کلا کا ہاتھ کھینچ کر میرے ہاتھ میں دے دیا۔ یہ کام کر کے ہمارے ہاتھ چھوڑ کر پھر اسی طرح چپ چاپ لیٹ رہے۔

دن کے بارہ بجے کے قریب ان کی روح اس جہانِ فانی سے ہمیشہ کے لئے پرواز کر گئی۔

(4)

اندر جیت سنگھ کی وفات کے چھ ماہ بعد ایک روز اندر جیت سنگھ کے ملازم نے آکر مجھے ایک چٹھی دی۔ میں نے چٹھی کھول کر پڑھی۔ چٹھی چندر کلا کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی۔ اس میں صرف اس قدر درج تھا۔

"آج کسی وقت مجھ سے آکر ملئے۔ ایک ضروری کام ہے۔"

چندر کلا

میں نے چٹھی کی پشت پر لکھ دیا کہ میں شام کو آؤں گا۔

شام کو میں چندر کلا کے پاس گیا۔ جا کر بیٹھنے کے کچھ دیر بعد میں نے پوچھا۔ "مجھے کس لئے بلایا تھا؟"

چندر کلا بولی۔ "ان کے (اندر جیت سنگھ کے مابعد) میرے روٹی کپڑے کے کفیل تم ہی ہو رہے ہو۔ اگر اس موقع پر تم میری مدد نہ کرتے تو خدا معلوم میری کیا حالت ہوتی۔ میرے میکے میں کوئی نہیں۔ میرے نند اور نندوئی نے بھی خشک سلوک روا رکھا۔ اس لئے اس وقت تمہارے سوائے میرا کوئی نہیں ہے۔ تم نے جو کچھ کیا۔ اس کے لئے تا عمر میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔"

میں نے کہا۔ "اس کے کہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کچھ کیا اپنا فرض سمجھ کر کیا۔"

چندر کلا۔ "میں تمہارے قرضہ سے کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مگر میں چاہتی ہوں کہ مجھ سے بھی تمہاری تھوڑی بہت خدمت ہو سکے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ تمہارا مطلب کیا ہے؟"

چندر کلا کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ "مجھے بے شرم سمجھو بے حیا سمجھو۔ خواہ کچھ ہی سمجھو۔ مگر اب مجھ سے کہے بغیر نہیں رہا جاتا۔ اب تک میں پس و پیش کرتی رہی۔ مگر اب میں نے تہیہ کر لیا ہے۔"

میں۔ "کیا تہیہ کر لیا ہے؟"

چندر کلا۔ "کہ تمہارے ساتھ شادی کروں گی۔"

میں چونک پڑا۔ مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ میں نے پھر پوچھا۔ "کیا کہا۔"

چندر کلا۔ "یہی کہ تم میرے ساتھ بیاہ کر کے میرا بیڑا پار کرو۔ میں اس طرح اپنی زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس طرح کی زندگی بسر کرنے سے میرے دل کو چین اور اطمینان نصیب نہ ہوگا۔"

مجھے چندر کلا کی بات پر تعجب ہوا۔ میں نے سوچا۔ "کیا یہ پاگل ہو گئی ہے۔ اگر پاگل نہ ہوتی تو اس قدر بے غیرت کیسے ہو جاتی؟ بیوہ عورت اپنی زبان سے اپنی شادی کی تجویز پیش کرے۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔"

بظاہر کہا۔ "یہ کیا کہتی ہو؟ تم اپنے ہوش میں نہیں ہو۔ اندر جیت کا سورگ باس ہوئے ابھی چھ ہی مہینے ہوئے ہیں۔ اتنی جلدی؟"

چندر کلا مجھے روک کر بولی۔ "نہیں۔ ان کو میں اس زندگی میں نہیں بھول سکتی۔ مگر مجھے یہ بھی یاد ہے کہ انہوں نے آخری وقت میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیا تھا۔ میں ان کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ میں انہی کی خواہش کی تکمیل کر رہی ہوں۔ اس میں میرے دو مقصد ہیں۔ اول میں تمہارا عہد پورا کر کے تمہاری کچھ خدمت بجا لا سکوں گی۔ دوئم۔ میری زندگی بھی پر اطمینان بسر ہوگی۔ میں اس زندگی میں نہیں رہ سکتی۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکی۔ اب میرا بیڑا پار کرنا' میری زندگی کو پُر اطمینان بنانا تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

میں فکر میں پڑ گیا۔ اس میں کلام نہیں۔ چندر کلا حسین تھی۔ تعلیم یافتہ تھی۔ مجھے اس قسم کی عورت کے ساتھ شادی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔ میرا دل ترغیب اور فرض کے جھولے میں جھولنے لگا۔ خود غرضی کہتی تھی۔ نقصان ہی کیا ہے؟ تمہارے حسب پسند کام ہو رہا ہے۔ فرض کہتا تھا۔ خبردار یہ اس شخص کی بیوی ہے جسے تم اپنے برادر حقیقی کے برابر سمجھتے تھے۔ بڑی دیر تک میرے دل کے اندر خود غرضی اور فرض کے مابین کش مکش ہوتی رہی۔

بالآخر میں نے چندر کلا سے کہا۔ "میں یہ کام ترکال میں بھی کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے اپنا عہد توڑ دیا ہے۔ میں بیوہ سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔"

چندر کلا۔ ”کیا تم یہ سچ کہہ رہے ہو؟“
میں۔ ”ہاں۔ سچ کہہ رہا ہوں۔“
چندر کلا۔ ”مجھے یقین نہیں آتا۔“
میں۔ ”کیسے یقین دلاؤں؟“
چندر کلا۔ ”تم اب اپنا بیاہ کسی بھی لڑکی سے کرنے کو تیار ہو؟“
میں۔ ”ہاں! تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ پڑھی لکھی اور خوبصورت ہو۔“
چندر کلا۔ ”یہ ضروری نہیں کہ وہ بیوہ ہو؟“
میں۔ ”نہیں۔“

چندر کلا کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ اس نے کہا۔ ”میری آرزو بر آئی۔ میں تمہاری ہی خاطر اس قدر قربانی کر رہی تھی۔ مجھے بیاہ کی کوئی خواہش نہیں۔ میں اسے پاپ سمجھتی ہوں۔ مگر تمہارے لئے میں یہ پاپ کرنے کو بھی تیار تھی۔ تم نے مجھے اس پاپ سے بچا کر مجھ پر وہ احسان کیا۔ جس کا عوض میں جنم جنمانتر میں بھی نہیں دے سکتی۔ اب میں شانتی سے اپنی زندگی گزاروں گی۔“

میں۔ ”اب تم نے اپنے لئے کیا سوچا ہے؟“
چندر کلا۔ ”بس ایشور کے بھجن بندگی میں اپنے دن گزاروں گی“
میں۔ ”بہن چندر کلا! میں تمہیں ایک اور راہ بتا سکتا ہوں جس سے تمہاری زندگی زیادہ شانتی اور چین سے گزر سکتی ہے۔“
چندر کلا۔ ”میں اس راہ پر چلنے کو تیار ہوں۔“
میں۔ ”دنیا میں دوسروں کا بھلا کرنے سے بڑھ کر اور کوئی اچھا راستہ نہیں۔ اسی سے دل کو سچی تسکین اور حقیقی خوشی حاصل ہو سکتی ہے۔ میرا ارادہ ایک یتیم خانہ قائم کرنے کا ہے۔“
چندر کلا۔ ”بڑی اچھی بات ہے۔ بلا شک اس طریقہ سے میں اپنی زندگی اور بھی زیادہ اطمینان اور شانتی سے گزار سکوں گی۔ میں تمہارے یتیم خانہ میں تاعمر یتیموں کی خدمت کروں گی۔“

غریبی کا انعام

(1)

شوہر کی آواز سنتے ہی سومترا نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ تھکا ماندہ موہن گھر کے اندر آتے ہی ایک شکستہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شوہر کی حالت دیکھ کر سومترا سمجھ گئی کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ موہن کے پاس جا کر بولی۔ ”کیوں! آج بھی کوئی کام نہیں ملا؟“

موہن سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے سومترا کی بات سن کر سر اٹھایا۔ کچھ دیر تک وہ سومترا کی طرف ٹکی ہوئی نظر سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے پھر سر نیچا کر لیا اور ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔ "نہیں"

شوہر کا جواب سن کر سومترا کے چہرہ پر بھی اداسی چھا گئی۔ کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے۔ اس کے بعد سومترا ایک آہ سرد بھر کر بولی۔ "تو اب کیا تدبیر ہوگی؟ کھانے کو بھی آج ہی کے لئے ہے۔ میری دھوتی تو بالکل پھٹ گئی ہے۔ کوئی اور کپڑا بھی ایسا نہیں ہے جسے پہن کر باہر نکل سکوں۔"

پاس ہی ایک چھوٹے سے کھٹولے پر کچھ پھٹے پرانے گودڑ بچھے تھے۔ انہی پر ایک تین سالہ لڑکا پڑا سو رہا تھا۔ اس کے بدن پر ایک پھٹا ہوا اور میلا کرتہ تھا۔ سومترا بچہ کی طرف دیکھ کر بولی۔

"ہم تو کسی نہ کسی طرح دکھ سکھ سہہ کر وقت گزار بھی سکتے ہیں مگر اس بچے کا کیا حال ہوگا؟ سردی کے دن آرہے ہیں اور اس کے پاس یہی ایک کرتہ ہے۔"

کہتے کہتے سومترا کا گلا بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے۔ موہن نے پھر سر اٹھایا۔ اور اس کے چہرے پر اندرونی تکلیف اور دلی اضطراب کے آثار پھوٹ کر نمایاں ہو رہے تھے۔ اس نے نہایت دردانگیز لہجے میں کہا۔ "میں کیا کروں۔ میں نے سب کچھ کر کے دیکھ لیا۔ دوڑتے دوڑتے آج پندرہ بیس دن ہوگئے۔ کوئی کام نہ ملا۔ نہ کسی نے نوکر رکھا۔ دو چار ملے بھی تو ایسے جو کام تو پورا لینا چاہتے ہیں۔ مگر دینا چاہتے ہیں بہت تھوڑا۔ بتاؤ کیا کروں۔"

سومترا۔ "نہ سہی۔ جب تک کوئی کام لگے۔ اس وقت تک کے لئے چار چھ روپے اور قرض لے آؤ۔"

موہن۔ "کہاں تک قرض لوں۔ کوئی دوست نہیں بچا۔ کوئی جان پہچان کا آدمی نہیں بچا۔ سب سے کچھ نہ کچھ قرض لے چکا ہوں۔ اب وہ لوگ نہیں دیتے۔ کہتے ہیں۔ "پہلے جتنا لیا ہے وہ تو ادا کردو۔ تم کہیں نوکر نہ چاکر۔ اتنا پیسہ کہاں سے ادا کرو گے؟"

سومترا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ "اچھا! جو بھگوان کی اِچھا! چلو۔ کچھ کھالو۔ صبح سے اب تک پانی بھی نہیں پیا۔"

موہن۔ "مارے فکر کے میری تو سب بھوک پیاس اڑی ہوئی ہے۔ جب مجھے دھیان آتا ہے کہ کل یہ بچہ کیا کھائے گا......"

موہن کا گلا رندھ گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

سومترا بولی۔ "بھگوان کو کھلانا ہوگا تو وہ ہی کوئی تدبیر نکالیں گے خیر جو کچھ ہوگا' دیکھا جاوے گا۔ تم چل کر کچھ کھاؤ پیو۔"

موہن کی مرضی کھانا کھانے کی بالکل نہ تھی۔ مگر سومترا کے کہنے سے اس نے پانی کے سہارے دو چار نوالے حلق کے نیچے اتار لئے۔ کھانا کھا کر فارغ ہوا تو وہ اسی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر آکر لیٹ گیا۔ اور کوٹھری کی چھت پر نگاہ جما کر خیالات میں محو ہو گیا۔ آدھ گھنٹہ کے بعد اس نے کروٹ بدلی۔ اس کی چارپائی سے ذرا فاصلہ پر بیٹھی سومترا اپنی پھٹی ہوئی دھوتی میں پیوند لگا رہی تھی۔ موہن نے اس منظر کو دیکھا۔ کچھ دیر تک وہ سومترا کے اس کام کو ٹکی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ رفتہ رفتہ اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہونے لگیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے اٹھنے کی آہٹ پا کر سومترا نے اپنی نگاہ کام پر سے ہٹا کر اس کی طرف ڈالی۔ شوہر کے چہرہ کو دیکھ کر اس کا

کلیجہ دھڑکنے لگا۔ تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ خوف زدہ نگاہوں سے موہن کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد ہلکے سے بولی۔ "کیوں اٹھ کر کیوں بیٹھ گئے؟"

موہن نے کچھ جواب نہ دیا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے کپڑے پہننے لگا۔

سومترا نے پھر پوچھا۔ "ابھی اس دوپہر میں کہاں جاؤ گے؟"

موہن نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "ابھی کچھ مت پوچھو۔ شام تک سب معلوم ہو جائے گا۔"

یہ کہہ کر موہن مکان کے باہر ہو گیا۔

(2)

موہن سڑک پر سر جھکائے چلا جا رہا تھا۔ اسے اتنا ہوش نہیں تھا کہ میں اس وقت کہاں جا رہا ہوں۔ یکایک کسی آدمی کا دھکا لگنے پر اسے ہوش آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس شریف آدمی جو پوشش سے کچھ امیر معلوم ہوتا ہے' آنکھیں سرخ انگارہ کئے اس کی طرف گھور رہے تھے۔ موہن نے جونہی ان کی طرف دیکھا۔ وہ ابل پڑے۔ بولے۔ "دیکھ کر نہیں چلتے۔ اندھا ہے' کیا؟"

موہن نے منکسرانہ انداز سے کہا۔ "معاف کیجئے۔ میرا دھیان اس وقت کہیں اور تھا۔"

یہ سن کر وہ اور بھی لال پیلے ہوئے۔ کہنے لگے۔ "کچھ نشہ کا عادی ہے کیا؟ دھیان کا بچہ۔ گنوار کہیں کا۔"

موہن نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ ان کی پوشاک کی قیمت کا تخمینہ لگایا۔ ساتھ ہی اپنے میلے کچیلے کپڑوں پر نگاہ ڈالی۔ زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری۔ اور چپ چاپ چل دیا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ اس کے کان میں یہ الفاظ پڑے۔ "اوہو! معاف فرمایئے۔ اجی واہ! آپ بھی کیا کہتے ہیں۔ راہ چلتے ایسا ہو ہی جایا کرتا ہے۔"

موہن نے پلٹ کر دیکھا۔ وہی صاحب پھر ایک اور آدمی سے ٹکرا گئے تھے۔ مگر اب کے وہ جن سے ٹکرائے' وہ ٹھاٹ باٹ شان و شوکت میں ان سے بھی بڑھ چڑھ کر تھے۔ چنانچہ پہلے صاحب فوراً ان سے معافی کے خواستگار ہوئے۔ موہن نے یہ دیکھ کر پھر اپنے کپڑوں کی طرف دیکھا اور ایک لمبی آہ بھر کر چل دیا۔

تھوڑی دیر میں وہ بزازہ بازار میں پہنچا اور ایک دکان کے سامنے کھڑے ہو کر خریداروں کے کپڑے خریدنے کا تماشا دیکھنے لگا۔ اس وقت بزاز ایک خریدار کو بہت بڑھیا قسم کی دھوتی کے جوڑے دکھلا رہا تھا۔ دھوتی کے جوڑوں کو دیکھ کر موہن آگے بڑھ کر خریدار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ ان دھوتی کے جوڑوں کو دیکھ کر موہن دل میں سوچنے لگا۔ "کیسی نفیس دھوتیاں ہیں۔ اگر ان میں سے ایک جوڑا سومترا کے لئے لے جاؤں تو وہ کس قدر خوش ہو۔ ان کے پہننے سے اس کا خوبصورت جسم کھل اٹھے۔" اس بات کے سوچنے اور دھوتی پہنے ہوئے سومترا کے خیالی تصویر کے حسن و جمال کا مزا لوٹنے میں وہ اس قدر محو ہو گیا کہ چند لمحوں کے لئے اسے اپنے تن بدن کی بھی سدھ نہ رہی۔

اسے اس طرح کھڑے دیکھ کر بزاز کے دل میں شک گزرا۔ وہ سمجھا کہ یہ کوئی اٹھائی گیرہ ہے۔ اور تھان

وان اٹھا لینے کی فکر میں ہے۔ یہ سوچ کر بزاز موہن سے بولا۔ ’’کیوں بے کیا دیکھ رہا ہے؟ کچھ لینا دینا ہو تو ویسی کہہ نہیں تو اپنا رستہ ناپ۔‘‘

موہن کے خواب راحت میں خلل پڑ گیا۔ وہ چونک پڑا۔ اسے اس طرح چونکتے دیکھ کر بزاز کا شک اور بھی بڑھا۔ وہ بولا ’’ابے جاتا ہے یا سپاہی کو بلاؤں۔‘‘

موہن ایک لمبی آہ بھر کر دھوتیوں کی طرف تشنہ کام نگاہوں سے دیکھتا ہوا وہاں سے آہستہ آہستہ چل دیا۔ چلتے چلتے اس نے سنا۔ بزاز گاہک سے کہہ رہا تھا۔ ’’آپ سے مول تول کی بات نہیں۔ یہ دھوتی جوڑے آٹھ آٹھ روپے سے کم میں نہیں ملیں گے۔‘‘

موہن سوچنے لگا۔ آٹھ روپے ہوتے تو ایک جوڑا لے لیتا۔ یہی سوچتا ہوا وہ ایک طرف چلا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ جوں جوں شام پڑنے لگی‘ موہن کی بے تابی بڑھنے لگی۔ آج ہی سومترا کے لئے ایک دھوتی کے جوڑے کا انتظام کرنا ہے۔ وہ اسی طرح سوچ بچار کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ نصف گھنٹہ چلنے کے بعد وہ ایک سوداگر کی دکان پر پہنچا۔ سوداگر میز کے اوپر بیٹھا کچھ لکھ پڑھ رہا تھا۔ موہن بے دھڑک اسی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

سوداگر اسے دیکھ کر ذرا بگڑ کر بولا۔ ’’کیوں کیا چاہیے؟‘‘

موہن۔ ’’آپ کو کسی نوکر کی ضرورت تو نہیں؟‘‘

سوداگر۔ ’’کیا تم نوکری کی تلاش میں ہو؟‘‘

موہن۔ ’’جی ہاں۔‘‘

سوداگر نے اپنا چشمہ اتار لیا۔ اور اسے سر تا پا بہ غور دیکھ کر بولا۔ ’’کیا کام کر سکتے ہو؟‘‘

موہن۔ ’’لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ کر اور چاہے جو کام ہو۔‘‘

سوداگر۔ ’’لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے؟‘‘

موہن۔ ’’جانتا ہوں مگر اتنا نہیں کہ اچھی طرح لکھ پڑھ سکوں۔‘‘

سوداگر۔ ’’کیا ذات ہے؟‘‘

موہن۔ ’’ٹھاکر۔‘‘

سوداگر۔ ’’ٹھاکر کھتری کو کہتے ہیں نا؟‘‘

موہن۔ ’’ہاں صاحب! کھتری کو کہتے ہیں۔‘‘

سوداگر۔ ’’اچھا! ذرا یہ بکس اٹھا کر سامنے کی الماری میں چُن دو۔ ذرا دور دور رکھنا۔ بالکل ملا کر نہ رکھنا۔‘‘

یہ کہہ کر سوداگر نے پھر چشمہ چڑھا لیا۔ اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

موہن نے آدھ گھنٹہ کے عرصہ میں سب بکس چن دیے۔ اس کے بعد سوداگر کے پاس آ کر بولا۔ ’’بکس چن دیے۔ دیکھ لیجئے ٹھیک چنے ہیں؟‘‘

سوداگر نے پھر عینک اتار دی اور الماری کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’ٹھیک چنے ہیں۔ تم ہوشیار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مگر مجھے افسوس ہے کہ میرے ہاں کوئی جگہ خالی نہیں ورنہ میں تمہیں ضرور رکھ لیتا۔‘‘

موہن کو امید ہوئی تھی کہ سوداگر ضرور کچھ نہ کچھ دنوں کے لئے رکھ لے گا۔ لیکن سوداگر نے اسے کورا جواب دیا تو وہ بہت مایوس ہوا۔ ساتھ ہی اسے غصہ بھی آیا کہ اگر اسے مجھے نوکر نہیں رکھنا تھا تو اس طرح چالاکی سے

اپنا کام کرا کر اس نے میرا اتنا وقت کیوں ضائع کیا۔

موہن۔ ”جو آپ کو مجھے نہیں رکھنا تھا تو پہلے ہی کہہ دیتے۔ اتنی دیر میں اور کہیں دیکھتا۔“

سوداگر منہ بنا کر بولا۔ ”مجھے پہلے دھیان نہ رہا کہ مجھے آدمی کی ضرورت نہیں ہے۔ اچھا۔ اب تم اپنا قیمتی وقت برباد نہ کرو۔ سلام“

یہ کہہ کو سوداگر پھر عینک چڑھا کر حسب سابق کام میں مصروف ہو گیا۔

موہن کچھ دیر تک کھڑا سوداگر کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر دانت پیستا ہوا دکان کے باہر چلا آیا۔ چلتے چلتے اس نے سوچا۔ چلو ایک بار اپنے سابق آقا سے مدد مانگوں۔ ان کے ہاں دو تین سال کام کر چکا ہوں۔ وہ اس وقت ضرور کچھ نہ کچھ مدد کریں گے۔“

یہ سوچ کر وہ ان کے پاس پہنچا۔ انہوں نے موہن کو دیکھتے ہی مسکرا کر پوچھا۔

”اوہو موہن! تو تو بہت دن بعد نظر آیا۔ اتنی مدت کہاں رہا؟“

موہن۔ ”ادھر ادھر ہی پھرتا رہا سرکار۔“

”تیری تو صحت بھی بہت خراب ہو گئی۔ کچھ طبیعت خراب رہتی ہے کیا۔“

”آج کل نوکری چاکری ہے نہیں۔ اس لئے مارے فکر کے یہ حال ہو گیا ہے۔“

”فکر تو بہت بری چیز ہے۔ اس کا اثر دل و دماغ دونوں پر بہت برا پڑتا ہے۔ ابھی حال میں مجھے ایک مریض ایسا ملا تھا جو اور کسی مرض میں مبتلا نہ تھا۔ وہ صرف فکر ہی میں گھل گھل کر مر گیا۔“

”سرکار! میں آج کل بہت تنگ ہوں۔ اتنا بھی ٹھکانا نہیں کہ چار چھ روز گھر بیٹھ کر کھا سکوں۔ بیوی کے بدن پر صرف ایک دھوتی ہے۔ وہ بھی............“

موہن کی یہ بات ابھی ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس کے سابق آقا خود بخود گھڑی کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”اف! پانچ بجنے والے ہیں۔ مجھے تو ایک مریض کو دیکھنے جانا ہے۔ (موہن سے) اچھا اب پھر کسی وقت ملنا۔“

موہن۔ ”معلوم نہیں۔ کتنے دنوں سے نوکری کی تلاش میں پھر رہا ہوں۔ پر کوئی نہیں ملی۔“

”اوہو۔ بڑی بری بات ہے مجھے بھی آجکل ضرورت نہیں ضرورت ہوتی تو رکھ لیتا۔ اچھا پھر ملنا۔“

اتنا کہہ کر ڈاکٹر صاحب اٹھے اور دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

(3)

موہن مکان کے باہر آیا۔ سڑک پر تھوڑی دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ مایوسی نے اپنا پورا اثر اس پر ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ کچھ دیر تک کھڑے غور کرتے رہنے کے بعد وہ چلا اور ایک طرف تنہائی کے عالم میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس کو اس وقت سخت تکلیف تھی۔ وہ رونا چاہتا تھا۔ مگر دل کے شعلوں سے آنسو جل کر خاک سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ ”کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ نہ کسی نے نوکر رکھا۔ نہ کہیں مزدوری ملی۔ نہ کسی نے کچھ مدد ہی دی۔ یہاں تک کہ وہ آقا بھی جس کی خدمت میں دو تین سال بجا لایا تھا' اس وقت سرد مہری سے پیش آیا۔“

اس کے سامنے چند پارسی لیڈیاں اور دیگر لوگ ٹہل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر اس کے دل میں خیال

گزرا۔ "یہ لوگ کس قدر خوش وخرم معلوم ہوتے ہیں! ان کے لئے کمی سے پیدا ہونے والی تکالیف ہستی ہی نہیں رکھتیں۔ انہیں کیا خبر ہے کہ جس دنیا میں یہ لوگ جنت کے مزے لوٹ رہے ہیں' اس دنیا میں بعض لوگ افلاس و تنگدستی کے باعث دوزخ کی سی تکلیف اور مصائب سے دوچار ہو رہے ہیں۔ اف! کتنا فرق ہے۔ ایک آدمی تو انواع و اقسام کے مزیدار کھانے کھائے' ریشم اور مخمل سے تن ڈھانپے۔ اور ایک آدمی کو وقت پر پیٹ بھر کر روکھی سوکھی روٹی بھی نہ ملے۔ اس کے لئے پہننے کو ایک کپڑا بھی ثابت نہ ہو۔ ان کے بچے گاڑیوں میں ہواخوری کرنے نکلیں۔ طرح طرح کے کپڑے پہنیں اور میرے بچے کے لئے گزی کا ایک کرتہ تک نہیں۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اپنا دکھ کس کے آگے روؤں؟ اور تو سب کر کے دیکھ لیا۔ صرف بھیک مانگنا باقی رہ گیا ہے۔ لاؤ۔ آج بھیک مانگ کر بھی دیکھ لوں۔ یہ لوگ بڑے امیر معلوم ہوتے ہیں۔ ترس کھا کر دو چار روپے دے دیں۔ تو ان کے لئے کون سی بڑی بات ہے! مگر بھیک تو میں نے آج تک مانگی نہیں۔ مجھے اس میں کامیابی نہ ہو گی۔ خیر! کوشش کر کے تو دیکھوں۔"

یہ سوچ کر موہن اپنی جگہ سے اٹھا اور اسی طرف چلا۔ جدھر وہ لوگ ٹہل رہے تھے۔ اس کی آتما بھیک مانگنے سے پیچھے ہٹتی تھی مگر تنگدستی و افلاس کی تکلیف نے اس کے دل کی طاقت کو بہت زائل کر دیا تھا۔ اس کے دل میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنی آتما کی آواز پر دھیان دیتا۔

موہن آہستہ آہستہ ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ پہلے تو تھوڑی دیر تک وہ ان کے کپڑوں اور ان کی سج دھج کو تشنہ کام نگاہوں سے کھڑا غور سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ذرا سنبھل کر بولا۔ "صاحب میں بڑا غریب............"

ایک نوجوان ہندوستانی کے ہاتھ میں لپلپاتا ہوا بید تھا۔ وہ موہن کی بات سن کر بولا۔ "غریب ہے تو یہ لے۔" اتنا کہہ کر اس نے تڑ سے ایک بید موہن کے پیٹ پر جمایا۔ بے چارہ موہن تلملا اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کا تلملانا دیکھ کر جتنے آدمی وہاں موجود تھے' سب زور سے ہنسنے لگے۔ ان کی ہنسی پر موہن کو بڑا غصہ آیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس نوجوان کو بید مارنے کا مزہ چکھا دے۔ مگر سومترا کے لئے دھوتی کا بندوبست کرنے کا دھیان آ گیا۔ اس لئے وہ چپ چاپ اپنی پیٹھ سہلاتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ ان واقعات سے اس کے دل میں لوگوں کی طرف سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اس نے سوچا۔ "سب نے میرے ساتھ سنگدلی اور خود غرضی کا سلوک کیا۔ مدد دینا تو در کنار۔ کسی نے میری داستان سنی تک نہیں۔ جب سب کی یہ حالت ہے۔ تو میں ہی کیوں خاک چاٹتا پھروں۔ یہ لوگ میرے ساتھ جیسا سلوک کرتے ہیں' ویسا ہی ان کے ساتھ بھی کرنا چاہیے۔ تب ہی یہ لوگ ٹھیک ہوں گے۔" یہ تہیہ کرتے ہی اس کے دل میں طاقت آ گئی۔ ابھی تک وہ اپنے تئیں بہت عاجز اور گیا گزرا سمجھ رہا تھا۔ مگر اب یہ بات بہت کم ہو گئی۔ اس نے قسم کھائی کہ آئندہ جو شخص میرے ساتھ جس قسم کا سلوک روا کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کروں گا۔

(4)

شام ہو چکی تھی۔ چاروں طرف تاریکی نے اپنے تسلط جما لیا تھا۔ موہن کچھ سوچ سمجھ کر بزاز کی طرف چلا۔ راستے میں چلتے ہوئے کبھی کبھی وہ خود بخود مسکرانے لگتا۔ بزازے میں پہنچ کر وہ اسی بزاز کی دکان پر پہنچا جس نے دوپہر کو اسے دھتکارا تھا۔ دوکان پر جا کر اس نے بزاز سے کہا۔ "ایک موٹے میل کا دھوتی کا جوڑا نکالو۔"

دھوتی دیکھ کر موہن نے پوچھا۔ "کتنے دام کا ہے؟"

بزاز۔ "پونے تین کا۔"

موہن۔ "ٹھیک دام۔"

بزاز۔ "بالکل ٹھیک۔"

جوڑا اٹھا کر موہن نے بغل میں دبایا اور کہا۔ "میں جوڑا لئے جاتا ہوں۔ ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔ جس وقت ہوں گے میں فوراً دے جاؤں گا۔ اس طرح میں کبھی نہ لے جاتا۔ مگر کیا کروں بہت لاچار ہو کر ایسا کرنا پڑا۔ میں تمہارے روپے نہیں رکھوں گا ایک ایک کوڑی چکا دوں گا۔"

موہن نے یہ بات ایسی سنجیدگی بے پروائی سے کہی۔ گویا وہ کوئی بزاز کا پرانا خریدار تھا اور بزاز کا اس پر اعتبار نہ کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں تھی۔ بزاز بڑے تعجب کے ساتھ موہن کی باتیں سن رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ کوئی جواب دے کہ اتنے میں موہن دھوتی لے کر چل دیا۔ یہ دیکھ کر بزاز گز اٹھا کر اس کے پیچھے دوڑا اور موہن کے پاس پہنچ کر اس نے زور سے ایک گز اس کی پیٹھ پر دے مارا۔ موہن رک گیا۔ اور اس نے لپک کر بزاز کے منہ پر اس زور سے گھونسہ مارا کہ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھا گیا۔

موہن بولا۔ "مصیبت میں پھنسے ہوئے ایک شریف آدمی کا اعتبار نہ کرنے اور اس کے ساتھ برا سلوک کرنے کا یہی انعام ہے۔"

یہ کہہ کر موہن لپک کر ایک کوچے میں جا گھسا کیونکہ یہ نظارہ دیکھ کر دوسرے دوکاندار بھی اس جگہ آ گئے تھے۔

موہن مسکراتا ہوا جلدی جلدی گھر پہنچا اور سومترا کے آگے دھوتی پھینک کر بولا۔ "لو تمہارے لئے تو دھوتی لے آیا ہوں۔ اب سوہن کے بچے کے لئے کل لاؤں گا۔"

سومترا دھوتی دیکھ کر اس قدر خوش ہوئی کہ اس نے موہن سے یہ بھی نہ پوچھا کہ دھوتی کیسے اور کہاں سے لایا۔ اس نے فوراً جوڑے سے ایک دھوتی پھاڑ لی۔ اور مٹی کے چراغ کی دھندلی روشنی میں کھڑی ہو کر دھوتی کے کپڑے اور کناری کی دیکھ بھال کرنے لگی۔

سومترا کی خوشی دیکھ کر موہن کا دل جس میں آگ جل رہی تھی۔ ذرا ٹھنڈا ہوا۔

سومترا ابھی دھوتی کو دیکھ بھال ہی رہی تھی کہ دروازہ پر زور سے دھکا لگا۔ اور کسی نے کہا۔ "کواڑ کھولو۔"

سومترا چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ موہن بھی قدرے چونکا۔ سومترا موہن سے بولی۔ "کون ہے؟"

موہن نے کہا۔ "دیکھتا ہوں۔"

یہ کہہ کر موہن اٹھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی دو کانسٹیبل اور دو تین آدمی جن میں وہ بزار بھی تھا اندر آئے۔

بزاز ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔ "دیکھئے صاحب! یہی وہ دھوتی جوڑا ہے۔ ایک دھوتی تو اس عورت نے پہن رکھی ہے۔ اور ایک وہ سامنے رکھی ہے۔"

بزاز کی بات سن کر کانسٹیبلوں نے موہن کو پکڑ لیا۔ موہن نے جھٹکا دے کر کہا۔ "کیوں پکڑتے ہو۔ پہلے کچھ بتاؤ گے بھی؟"

بزاز بولا۔ ’’دھوتی کا جوڑا چرا کر بھاگا ہے اس لئے۔ وہ تو ہم لوگ اس وقت تیرے پیچھے دوڑ پڑے۔ نہیں بھلا تو ملتا۔‘‘

موہن نے کہا۔ ’’تم بالکل جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے دھوتی کا جوڑا کبھی نہیں چرایا۔ میں تو تم سے کہہ کر لایا ہوں۔ میں نے کہہ دیا تھا کہ قیمت جب میرے پاس ہوگی۔ دے جاؤں گا۔‘‘

بزاز دیدے بدل کر بولا۔ ’’اتنے گواہ کھڑے ہیں تو جوڑا لے کر بھاگا۔ جب تجھے پکڑا۔ تب تو نے گھونسہ مارا۔ اور بھاگ نکلا۔

بزاز کی بات سن کر سومترا کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ وہ شوہر کے پاس آ کر بولی ’’ایں! کیا تم یہ جوڑا چرا کر لائے ہو؟‘‘

موہن نے پر استقلال لہجہ میں جواب دیا۔ ’’ہرگز نہیں۔‘‘

سومترا۔ ’’تو پھر یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟‘‘

موہن۔ ’’جو ان کی سمجھ میں آ رہا ہے کہہ رہے ہیں۔ یہ لوگ اسے چوری کہتے ہیں اور میں اسے چوری کبھی نہیں سمجھتا۔‘‘

سومترا سر پر دو ہتڑ جما کر بولی۔ ’’ہائے میں سب دکھ سہہ سکتی تھی۔ مگر یہ نہیں سہہ سکتی کہ میرا پتی چوری کرے۔ ہائے تم نے یہ کیا کیا۔ مجھے ننگے رہنا منظور تھا۔ مگر چوری کی دھوتی پہننا ہرگز منظور نہیں۔‘‘

اب تک موہن بڑی سنجیدگی کے ساتھ چپ چاپ بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ مگر سومترا کی باتیں سن کر اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ گھبرا کر سومترا سے بولا۔ ’’سومترا! تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔ میں نے چوری کبھی نہیں کی۔

سومترا۔ ’’یہ چوری نہیں تو اور کیا ہے؟‘‘

سومترا کی یہ بات موہن کے دل میں مانند تیر کے لگی۔ اس نے سر جھکا کر کہا ’’اف! میں نے بڑا دھوکہ کھایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دوسروں کی طرح تم بھی میرے ساتھ سنگدلی سے پیش آؤ گی۔ دنیا نے مجھے دھتکارا سب نے مجھے ٹھکرایا۔ مگر سومترا تم سے یہ امید نہ تھی۔ اگر میں نے چوری بھی کی تو تمہاری ہی خاطر مگر تم نے عوض اس کا یہ دیا! میں جیل جانے سے نہیں ڈرتا۔ میں یہ بات جج کے ذہن نشین کر دیتا کہ میں نے چوری نہیں کی۔ ایک بھوکا آدمی جسے مانگنے اور محنت کرنے پر بھی روٹی میسر نہ ہو۔ جس کے لئے اور سب دروازے بند ہو جائیں۔ اگر کسی کی روٹی اٹھا کر کھا لے تو کیا وہ چور سمجھا جائے گا؟ اسی طرح ایک پیاسا آدمی پانی اٹھا کر پی لے۔ ایک ننگا آدمی کپڑا اٹھا کر پہن لے تو کیا وہ چور سمجھا جائے گا؟‘‘ (حاضرین سے مخاطب ہو کر) ’’آپ ہی لوگ انصاف سے کہیے۔ آپ اسے چور کہیں گے۔ اگر میں بھی ان حالات میں پڑ کر دھوتیاں لے آیا تو میں چور ہرگز نہیں۔ اس کے علاوہ میں نے اس (بزاز سے) کہہ دیا تھا کہ میرے پاس جب روپیہ ہو گا اس وقت میں فوراً دے جاؤں گا۔ میں یہ تمام باتیں جج کے روبرو کہتا۔ اور اگر اس پر بھی وہ بے انصافی سے کام لے کر مجھے جیل بھیج دیتا تو میں بڑی خوشی سے چلا جاتا کیونکہ میں اکیلا ہوں۔ اور وہ لوگ بے شمار ہیں۔ زبردست کی بے انصافی بھی چل سکتی ہے۔ میں یہ سب سہنے کو تیار تھا۔ مگر صرف اس وقت جب کم سے کم سومترا مجھے بے گناہ سمجھتی۔‘‘

سومترا۔ ’’تمہاری یہ باتیں میری سمجھ میں بالکل نہیں آتیں۔ تم نے بہت برا کیا جو چوری کی۔ مجھے تم سے یہ امید نہ تھی۔ پہننا تو در کنار۔ میں اس جوڑے کو چھو بھی نہیں سکتی۔‘‘

سومترا نے آڑ میں جا کر دھوتی اتار دی۔ اور اپنی وہی پھٹی پرانی دھوتی پہن لی۔ اس نے دونوں دھوتیاں لا کر بزاز کے حوالہ کر دیں۔

موہن کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے۔

کانسٹیبلوں نے دھکا مار کر کہا۔ "چلو بچہ حوالات۔ اب روتے ہو۔ دھوتی چراتے تو بہت اچھا لگا ہوگا"

یہ کہہ کر کانسٹیبلوں نے اسے باہر کی طرف دھکیلا۔

موہن بولا۔ "بھائی میں چلتا ہوں۔ ایک منٹ اور ٹھہر جاؤ۔"

یہ کہہ کر موہن اپنے بیٹے کے پاس گیا جو رو رہا تھا۔ اور اس کا منہ چوم کر تھوڑی دیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ایک دم منہ پھیر کر وہاں سے ہٹ آیا۔ اور بولا۔ "چلو۔"

چلتے چلتے موہن سومترا کی طرف منہ کر کے بولا۔ "سومترا۔ بس یہی آخری ملاقات ہے۔ اب یہ چور تمہیں منہ نہ دکھلائے گا۔"

سومترا منہ پر آنچل رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس نے شوہر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

کانسٹیبل موہن کو کوتوالی لے جاتے ہوئے نہر کے پل پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر موہن نے کہا۔ "بھائی! مجھے ذرا پیشاب کر لینے دو۔"

موہن کی کمر میں رسی بندھی تھی۔ کانسٹیبلوں کی گرفت ذرا ڈھیلی ہوئی۔ اس وقت موہن نے کمر کی رسی پکڑ کر ایک زور کا جھٹکا مارا۔ رسی کانسٹیبلوں کے ہاتھ سے چھٹ گئی۔ موہن فوراً پل پر سے نہر میں پھاند پڑا۔ اور ورون دیوتا کی گود میں فوراً اسے جگہ مل گئی۔

ووٹر

(1)

بابو راج نرائن ذرا جوش میں آ کر بولے۔ "سنئے صاحب! یہ نہ سمجھئے گا کہ ووٹ آپ ہی کو ملیں گے۔ میرا بھی کچھ رسوخ ہے۔"

بابو راج نرائن کے دوست پنڈت جوالا پرشاد نے کہا۔ "مجھے آپ کے اثر و رسوخ کے متعلق خوب معلوم ہے۔ مگر اس قدر یاد رکھئے کہ اس طرح آپس ہی میں لڑائی جھگڑا ٹھیک نہیں۔ طویلے میں لاتیں چلانے سے سراسر نقصان ہی ہے۔ فائدہ کچھ بھی نہیں۔"

راج نرائن۔ "کیا کہوں۔ مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ میں آپ کے خلاف کھڑا ہو گیا ہوں۔ حالات کچھ ایسے ہی پیش آ گئے ہیں کہ مجھے مجبور ہو کر ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔"

جوالا پرشاد ذرا متانت کے ساتھ بولے۔ "اگر حالات ایسے ہی ہیں تو آپ خوشی سے کھڑے ہو سکتے

ہیں۔ میں آپ کو منع تھوڑے ہی کرتا ہوں۔"

راج نرائن۔ "اگر آپ اس مخالفت کو ناپسند کرتے ہیں تو پھر آپ ہی صبر کیجئے۔"

جوالا پرشاد۔ "ہیں ہیں۔ صبر تو بہت کچھ کر لیتا۔ مگر لوگ اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ میں ضرور کھڑا ہوؤں۔ میں بتاؤں آپ ضلع کی طرف سے کھڑے ہو جایئے۔"

راج نرائن۔ "ضلع کی طرف سے کھڑا ہونا بڑی ہمت کا کام ہے۔ اس طرف بڑے بڑے آدمیوں کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔"

جوالا پرشاد سوکھی ہنسی ہنس کر بولے۔ "یہ فرمایئے کہ مجھے ہی آپ نے کمزور پالیا ہے۔ خیر صاحب! ایسا ہی سہی۔ مگر میں یہ بات ایک بار پھر کہوں گا کہ میرا اور آپ کا مقابلہ ٹھیک نہیں۔"

راج نرائن۔ "میرا خود یہی خیال ہے۔ مگر کیا کیا جائے۔ امر مجبوری ہے۔"

پنڈت جوالا پرشاد اور بابو راج نرائن دونوں شہر کے رئیس ہیں۔ پنڈت جوالا پرشاد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ اور شہر کے تمام پولیٹیکل اور سوشل کاموں میں ایک عرصہ سے حصہ لے رہے ہیں۔ ان کی شہر میں عزت بھی بہت ہے۔

بابو راج نرائن پنڈت جوالا پرشاد کی نسبت زیادہ دولتمند ہیں۔ مگر پڑھے لکھے بس خدا کا نام ہی ہیں۔ آپ کی ملکی خدمات کی جمع میزان بس اتنی ہی ہے کہ شہر کے رئیس اور دولت مند ہونے کے سبب آپ گاہے ماہے کسی چھوٹے موٹے جلسے کے صدر بنا دیئے جاتے ہیں۔ کرسیِ صدارت پر گو آپ مٹی کے مادھو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے مگر اس کے باوجود بھی چندہ دینے میں ان کا ہاتھ کھلا ہے۔ ایک مرتبہ آپ نے بڑی ہمت سے کام لے کر ایک پولیٹیکل میٹنگ کے صدر بننے کی خواہش کی تھی۔ لوگوں نے آپ کی حوصلہ افزائی کے خیال سے منظور بھی کر لیا۔ اور جلسہ کے اشتہار میں آپ کے صاحب صدر ہونے کی خبر بھی شائع کر دی گئی تھی۔ مگر جس روز جلسہ منعقد ہونے والا تھا' اس سے ایک روز پیشتر مجسٹریٹ نے آپ کو بلا کر ڈانٹا۔ اور میٹنگ میں حصہ لینے سے منع کیا۔ آپ نے دوسرے دن صبح ہی ارنڈی کا تیل پی لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جلسہ میں یہ کہنا پڑا کہ "ہمیں نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ہمارے صاحب صدر کی طبیعت آج یک بیک ناساز ہو گئی ہے۔ چنانچہ یہ تجویز پیش کی جاتی ہے۔ کہ ان کے بجائے فلاں صاحب کرسیِ صدارت کو رونق بخشیں۔"

اب جب آپ نے یہ سنا کہ کونسل کی ممبری کا دارومدار صرف ووٹوں پر رہ گیا ہے تب آپ نے سوچا' چلو یہ اچھا موقع ہاتھ لگا۔ بلی بھاگوں چھینکا ٹوٹا! لاؤ۔ ہم بھی بہتی گنگا میں غوطہ لگا ہی لیں۔ ادھر خوشامدیوں نے بھی آپ کو خراد پر چڑھا دیا۔ کہنے لگے۔ "سرکار! اب تو ضرور آپ کو کونسل کے لئے کھڑا ہونا چاہیے۔ آپ جیسے لوگ کونسل میں نہ جائیں گے تو پھر کون جائے گا۔ سچ پوچھئے تو کونسل میں بڑے آدمیوں ہی کا کام ہے۔ چھوٹے آدمی کا دل ہی کتنا؟ وہ وہاں بول ہی نہیں سکے گا۔ لاٹ صاحب کے سامنے بولنا کچھ ہنسی مذاق تھوڑا ہی ہے۔ یہ کام بڑے آدمی ہی کر سکتے ہیں۔ جب آپ ممبر ہو جائیں گے تو پھر کوئی شہر میں آپ سے آنکھ تو ملا ہی نہیں سکے گا۔ اس وقت آپ کی ٹکر کا کوئی دوسرا اس شہر میں نہیں ہے۔ پھر جب آپ ممبر بن جائیں گے' اس وقت تو کوئی آپ کے سامنے بول بھی نہ سکے گا۔"

یہ سن کر بابو راج نرائن نے سوچا۔ "بیوقوف ہیں تو کیا ہوا کہتے پتے کی ہیں۔ بلاشک ممبری کی شان کچھ اور ہی رہے گی۔ پھر ممبری بھی کون سی۔ لاٹ صاحب کی کونسل کی۔ یہ خوش قسمتی پچھلے جنم کے پنیہ سے ہی حاصل ہوتی ہے۔"

یہی سب باتیں سوچ سمجھ کر آپ نے ممبری کے لئے کمر کس ہی تو دی۔ اپنے پیروؤں سے کہا۔ "سنتے ہو بھائی! روپیہ خواہ کتنا ہی خرچ ہو۔ مگر ووٹ حاصل کرنے میں کسر کوتاہی نہ ہو۔"

لوگوں نے کہا۔ "اجی اتنے ووٹ لیجئے کہ دھرتے اٹھاتے نہ بنے۔ جو خوشی سے دے گا' اس سے خوشی سے لیں گے۔ خوشی سے نہ دے گا تو زبردستی لیں گے۔ ذرا بھی چوں چرا کرے گا تو گھر پھونک دیں گے۔"

بابو صاحب پھول کر کپا ہو گئے کہ جب ایسے ایسے خیر خواہ موجود ہیں تو پھر ممبری ملی رکھی ہے۔ ایسا مائی کا لال کون ہے جو اپنا گھر جلایا جانا منظور کرے گا۔

(2)

بابو راج نرائن اور پنڈت جوالا پرشاد کی طرف سے ووٹ حاصل کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ بابو راج نرائن اور پنڈت جوالا پرشاد میں پہلے بڑی دوستی تھی۔ مگر جب سے دونوں ممبری کے لئے کھڑے ہوئے' اس وقت سے ان میں عداوت ہو گئی۔ بابو راج نرائن جوالا پرشاد کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ جوالا پرشاد اگرچہ بڑے سمجھ دار اور اچھے دل کے آدمی تھے مگر جب سے راج نرائن ان کے خلاف کھڑے ہوئے' ان کے دل میں بھی راج نرائن کی طرف سے بغض و عداوت کے جذبات پیدا ہو گئے۔

ادھر راج نرائن کے کارندوں' دوستوں اور مصاحبوں نے ووٹ لینے کے لئے ہر طرح کے ہتھیاروں سے کام لینا شروع کیا۔ جوالا پرشاد کی طرف سے جو لوگ کام کر رہے تھے' ان کا بھی یہی حال تھا۔ بازاروں میں' کتب خانوں میں' قصبات و دیہات میں تھیٹر اور بائیسکوپ میں' غرض کہ ہر جگہ دونوں کے مددگار و پیروکار موجود رہتے۔ اور بغاوت کی آگ پھیلانے کی طرح لوگوں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا کرتے تھے۔

شام کا وقت تھا۔ ایک کتب خانہ میں پندرہ بیس آدمی بیٹھے اخبار بینی میں محو تھے۔ یکایک ایک شخص اخبار پر سے نگاہ ہٹا کر بولا۔ "لاکھ کچھ ہو۔ ممبر پنڈت جوالا پرشاد ہوں گے۔"

سب نے اخبار میز پر رکھ دئے۔

ایک نے کہا۔ "آپ یہ کس طرح کہتے ہیں کہ ممبر جوالا پرشاد ہی ہوں گے؟ کیا بابو راج نرائن کچھ کمزور ہیں؟"

ایک تیسرا شخص بول اٹھا۔ "کمزور کاہے کو ہیں؟ کس بات میں کمزور ہیں؟ میرے خیال میں مال و دولت میں تو بابو راج نرائن کے مقابلہ کا کوئی دوسرا اس شہر میں ہے ہی نہیں۔"

چوتھے نے کہا۔ "صاحب! روپے سے کیا ہوتا ہے؟ قابلیت بھی تو ہونی چاہیے۔ پنڈت جوالا پرشاد کی قابلیت بابو راج نرائن نہیں پا سکتے۔"

تیسرا۔ "اجی! آجکل دولت کے سامنے قابلیت ماری ماری پھرتی ہے۔"

پانچواں۔ "آپ بھی جناب! کیا باتیں کرتے ہیں۔ کونسل میں جانے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو قابلیت کی' دوسرے جذبہ حب الوطنی کی۔ جس کے دل میں حب الوطنی نہ ہو گی وہ کونسل میں پہنچ کر بھی ملک کو فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔"

بعض لوگ۔ ’’آپ بالکل بجا فرماتے ہیں۔ حب الوطنی مقدم چیز ہے۔‘‘
چھٹا۔ ’’صاحب! جس کا سینہ حب الوطنی کے جذبات سے معمور نہ ہو گا۔ وہ کونسل میں جانے کی خواہش ہی کیوں کرے گا؟‘‘
پانچواں۔ ’’یہ نہ کہئے جناب! بہت سے لوگ تو صرف شان کی خاطر کونسل میں جانا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہی ہوتا ہے کہ ہم بھی پانچوں سواروں میں ہیں۔‘‘
تیسرا۔ ’’بے شک! یہ درست ہے۔ خیر کچھ ہی ہو۔ بابو راج نرائن کونسل کے لئے ہر طرح سے موزوں ہیں۔ جوالا پرشاد کی دال ان کے آگے نہ گلے گی۔ لوگ بابو راج نرائن ہی کو ووٹ دیں گے۔ اور دیں کیوں نہ؟ بابو راج نرائن خاندانی رئیس ٹھہرے۔ شہر کے پبلک کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ چندہ بھی خوب دیتے ہیں۔ دوئم ایک بہت ہی پرائیوٹ بات یہ ہے کہ مجسٹریٹ صاحب کی بھی یہ زبردست خواہش ہے کہ بابو راج نرائن ہی کونسل میں جائیں۔ ان حالات میں جو شخص بابو راج نرائن کو ووٹ نہ دے گا‘ مجسٹریٹ اس کا دشمن ہو جائے گا۔‘‘
ایک صاحب بول اٹھے۔ ’’کیوں صاحب! یہ کس چنڈو خانے کا تار ہے؟‘‘
تیسرا۔ ’’چنڈو خانے کے تار آپ ہی لاتے ہوں گے۔ ہم تو سچی بات کہتے ہیں۔‘‘
ایک بوڑھا بھلا آدمی جو ابھی تک چپ چاپ بیٹھا تھا۔ بولا۔ ’’کچھ ہی ہو۔ خواہ مجسٹریٹ دشمن ہو جائے یا دوست ہم تو بابو راج نرائن ہی کو ووٹ دیں گے۔ ہمارے خاندان پر ان کے خاندان کے اتنے احسانات ہیں کہ ہم تو کسی طرح سر ہی نہیں اٹھا سکتے۔‘‘
تیسرا۔ ’’شریف آدمیوں کا کام ہی یہ ہے اور ایک آپ ہی پر کیا موقوف ہے‘ شہر کے سینکڑوں ہزاروں آدمیوں پر ان کے احسانات ہیں۔‘‘
چوتھا۔ ’’اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بابو راج نرائن ہی کو زیادہ ووٹ ملیں گے۔‘‘

(3)

اگر کسی نے بابو راج نرائن کو کونسل کے لئے کھڑے ہونے سے منع کیا تھا تو وہ ان کے کارندے لالہ ہردت رائے تھے۔ ہردت کی عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ لالہ صاحب بڑے شریف آدمی اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی تھے۔ انگریزی اچھی جانتے تھے۔ اردو اور فارسی کے عالم تھے۔ ہندی بھی تھوڑا بہت لکھ پڑھ لیتے تھے۔
جس وقت بابو صاحب نے کونسل کے انتخاب کے لئے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا۔ اسی وقت لالہ ہردت رائے نے کہا۔ ’’ابھی آپ کو کونسل میں جانے کی خواہش نہ کرنی چاہیے۔ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ آپ کا کونسل کے لئے کھڑا ہونا کسی طرح مناسب نہیں کیونکہ کونسل میں جانے کے لئے کئی باتوں کی ضرورت ہے۔ اول تو یہ کہ امیدوار انگریزی زبان سے بہت اچھی طرح سے واقف ہو۔ پھر ملک کی موجودہ حالت اور اس کی ضرورت کا اسے پورا پورا علم ہو۔ ملک کی خدمت بجالانے کی لگن ہو۔ یہ نہیں کہ نام کے لئے فوری جوش میں آکر کونسل کے لئے کھڑا ہو جائے۔ باحوصلہ اور نڈر ہو۔ ڈرپوک آدمی اس کام کے لائق نہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس نے ملک کی کچھ خدمت کر کے ہردلعزیزی حاصل کر لی ہو۔ جس آدمی میں اتنی باتیں ہوں۔ اس کا کونسل کے لئے کھڑا ہونا مناسب ہے۔‘‘

بابو راج نرائن نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ مگر ان کے ایک مصاحب نے ذرا جوش میں آکر کہا۔ ''لالہ صاحب! آپ کورے لالہ ہی رہے۔ آپ کسی مدرسے میں لڑکے پڑھاتے تو زیادہ موزوں ہوتا۔ لگے سبق دینے۔ ہمارے بابو صاحب کسی بات میں کسی سے کم نہیں ہیں۔ جو کچھ کمی کوتاہی ہوگی' وہ کام کرنے سے رفع ہو جائے گی۔ کو توالی کرنے کا ڈھنگ کو توال بننے پر خود ہی آجاتا ہے۔ سمجھے یا نہیں؟ اب بھی نہ سمجھتے ہو تو آج شام کو پریڈ بازار سے تھوڑی سی سمجھ خرید لانا۔''

مصاحب کی اس بات پر سب ہنس پڑے۔ چلئے وہ بات مذاق میں اڑ گئی۔ لالہ جی بے چارے اپنا سامنہ لے کر رہ گئے۔ بابو راج نرائن کے لئے ووٹ اکھٹے کرنے کی پوری پوری کوشش ہونے لگی۔ دس پندرہ آدمیوں کا غول ووٹروں کا نام لکھنے کے لئے نکلتا تھا۔ غول میں دو چار بد معاش اور شہدے بھی ہوتے تھے۔ جس نے ووٹ دینا منظور کر لیا' اس کے ساتھ تو بڑی عزت و محبت کا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مگر جس نے ووٹ دینے سے انکار کر دیا' اس کو پہلے تو سمجھا بجھا کر بابو صاحب کے اوصاف کی تعریف کر کے' ان کی تعریف کے گیت گا کر' مستقبل میں وطن کی جو شاندار خدمات انجام دینے والے تھے' ان کی فہرست سنا کر۔ اگر انکار کرنے والا کوئی برادری کا آدمی ہوا تو بھائی برادری کا رشتہ دکھا کر۔ مطلب بر آری کی کوشش کی جاتی تھی۔

کہیں کسی ووٹر سے ملتے ہی ایک کہنے لگتا تھا۔ ''بھائی! پنڈت جی بڑے شریف آدمی ہیں۔ ایسا گئو آدمی شاید ہی کوئی ہو۔ ہمیں پنڈت جی پہچانتے نہیں ہیں مگر ہمارے والد کی ان کے والد سے بڑی دوستی تھی۔ (اپنے آدمیوں سے) بھائی! ان سے کیا پوچھنا۔ یہ تو اپنے ہی آدمی ہیں۔ یہ بھلا انکار کر سکتے ہیں؟ (ووٹر سے) بھائی! ذرا کبھی کبھی بابو صاحب کی کوٹھی پر بھی آیا کرو۔ ہم آپ کی ملاقات کرا دیں گے۔ بابو صاحب بڑے رئیس آدمی ہیں اور برہمنوں کو اتنا مانتے ہیں کہ کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

ان محبت بھری باتوں میں آکر اور بابو جی سے ملاقات ہو جانے کی ترغیب میں پھنس کر پنڈت جی (ووٹر) سے ''نہیں'' کرتے نہیں بن پڑتا تھا۔ وہ فوراً کہہ دیتے تھے۔ ''اجی! یہ کون بڑی بات ہے۔ بابو صاحب سے ہم کسی بات میں باہر تھوڑے ہی ہیں۔''

اگر کوئی پنڈت جوالا پرشاد کا طرفدار ہوا اور اس لئے اس نے ووٹ دینے سے انکار کیا۔ اور بابو صاحب کے کارندوں اور گرگوں کی باتوں میں نہ آیا تو اسے ایک طرف بلا کر کوئی بد معاش کہتا تھا۔ ''سنتے ہو بھائی! تم شریف آدمی ہو۔ اس لئے کہتے ہیں۔ بابو صاحب کو رائے کیوں نہیں دیتے؟ کیوں اپنی آبرو کے پیچھے پڑے ہو۔ یاد رکھو۔ دو ہی چار دن میں تمہارے ہاں سے کوکین بر آمد کرا دی جائے گی۔ اور اندھیرے اجالے کہیں مل گئے تو اتنی بے بھاؤ کی پڑے گی کہ چاند گنجی ہو جائے گی۔ اس لئے کہنا مان جاؤ۔ آبرو ہے تو سب کچھ ہے۔ تمہاری بلا سے۔ چاہے کوئی ممبر ہو''

بہت سے اس دھمکی سے گھبرا کر ووٹ دینا منظور کر لیتے تھے۔ جو نڈر ہوتے وہ اس دھمکی میں نہ آتے اور برابر انکار کرتے رہتے۔ ان سے چلتے وقت کہہ دیا جاتا۔ ''اچھا! سمجھ لیں گے۔''

جو بابو جی کے لئے ووٹ اکھٹے کرنے میں مدد دیتے تھے' ان کی کچھ نہ پوچھئے۔ پو بارہ تھے۔ ٹانگوں اور موٹروں میں چڑھے چڑھے پھرتے تھے۔ دن میں تین بار خوب تن کر کھاتے تھے۔ پان تمباکو چباتے اور سگرٹ پھونکتے تھے۔ اس طرح بہت سے آوارہ آدمی جنہیں کہیں ٹھکانا نہ تھا' بابو جی کے کونسل کے انتخاب کے لئے کھڑے ہونے کے سبب موجیں اڑانے لگے۔

(4)

شام کے آٹھ بجے کا وقت ہے۔ لالہ ہردت رائے اپنے کمرے میں بیٹھے حقہ پی رہے ہیں۔ حقہ تو ضرور پی رہے ہیں مگر ساتھ ہی گہرے فکر میں مستغرق ہیں۔ اس وقت ایک دس سالہ لڑکی نے آکر کہا۔

"چاچا جی! چلو۔ کھانا کھالو۔"

ہردت رائے نے روکھے پن سے جواب دیا۔ "میں آج کھانا نہیں کھاؤں گا۔ بھوک نہیں ہے۔"

لڑکی چلی گئی۔ اس کے چلے جانے کے تھوڑی دیر بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے آکر کہا۔ "کیوں! آج کھانا کیوں نہیں کھاؤ گے؟ کیا کچھ طبیعت خراب ہے؟"

ہردت رائے۔ "نہیں! طبیعت تو کچھ ایسی زیادہ خراب نہیں ہے۔ مگر کھانا کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

بیوی۔ "آخر جی کیوں نہیں چاہتا۔ سبب کیا ہے؟"

ہردت رائے تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے حقہ پیتے رہے۔ اس کے بعد ایک لمبی آہ بھر کر بولے۔ "مجھے بابو راج نرائن کے ہاں دس بارہ برس ہو چکے ہیں۔ اور تنخواہ بھی اب میری سوا سو روپیہ ہو گئی ہے۔ ویسے تو بابو جی جیسے ہی اچھے ہیں۔ اپنے کو کیا؟ ہمیں تو اپنے کام سے کام ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اب............"

ہردت کی بیوی کھڑی تھی۔ شوہر کی بات جو سنی تو بیٹھ گئی۔ اور بولی۔ "اب کیا؟"

ہردت رائے۔ "معلوم ہوتا ہے کہ اب مجھے ان کی نوکری چھوڑنی پڑے گی"

لالہ ہردت رائے کی بیوی چونک کر بولی۔ "کیوں؟"

ہردت۔ "بعض ایسے ہی اسباب پیدا ہو گئے ہیں۔"

بیوی۔ "کون سے اسباب؟"

ہردت۔ "بات یہ ہے کہ وہ لاٹ صاحب کی کونسل کے ممبر ہونا چاہتے ہیں۔ اور اس کے لئے ووٹ اکٹھے کر رہے ہیں۔ ووٹ حاصل کرنے میں ہر طرح کی انیتی' ادھرم اور ظلم سے کام لیا جارہا ہے۔ جو لوگ شروع ہی میں اس طرح کام کر رہے ہیں' ان سے آئندہ کیا امید کی جا سکتی ہے؟"

بیوی۔ "تم معلوم نہیں کیا کہہ گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ کاہے میں ادھرم کر رہے ہیں؟"

ہردت۔ "بات یہ ہے۔ کہ ہمارے صوبہ کے لاٹ صاحب کی ایک کونسل یعنی۔ دیکھو۔ اسے کیا کہتے ہیں۔ اونہ اچھا! تم سبھا سمجھو۔ ایک سبھا ہے۔ جس میں ہمارے صوبہ کی ترقی کے متعلق غور ہوتا ہے۔ اس سبھا کے بابو راج نرائن ممبر ہونا چاہتے ہیں مگر اس کے ممبر اس وقت ہو سکتے ہیں جب لوگوں کی رائے ہو۔ یعنی جب بہت سے آدمی یہ لکھ دیں کہ یہ ممبر بنائے جائیں۔ تب ممبر ہو سکتے ہیں۔"

بیوی۔ "اب میں کچھ کچھ سمجھ گئی۔ ہاں تو پھر؟"

ہردت۔ "بابو راج نرائن لوگوں کو پھسلا ورغلا کر۔ لالچ دے کر اور کوئی بس نہیں چلتا تو مارنے پیٹنے کی دھمکی دے کر' پولیس کے پنجے میں پھنسا دینے کا خوف دلا کر ان سے زبردستی اپنے حق میں رائے لکھوا رہے ہیں۔ یہ ادھرم اور انیتی نہیں تو کیا ہے؟"

بیوی۔ "ہاں! یہ تو بڑا ادھرم ہے۔ اس سے زیادہ اور ادھرم کیا ہوگا؟ اپنے فائدے کی خاطر دوسروں کو اس

طرح دھمکانا ڈرانا تو بڑی بُری بات ہے۔"

ہردت رائے۔"اسی ممبری کے لئے پنڈت جوالا پرشاد بھی کھڑے ہوئے ہیں۔"

بیوی۔"وہ بھی ایسا ہی کرتے ہوں گے۔"

ہردت رائے۔"نہیں۔ وہ لالچ دلاتے ہیں۔ پھسلاتے ہیں۔ ورغلاتے ہیں۔ سفارشیں پہنچاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرتے ہیں مگر دھمکاتے کسی کو نہیں۔ پنڈت جی ہمارے بابو صاحب کے مقابلہ میں کہیں زیادہ لائق ہیں۔ ان کا کونسل میں جانا مناسب ہے اور اکثر آدمی انہیں کے حق میں ہیں۔ ہمارے بابو جی تو لنگاڑوں کے کہنے میں آگئے ہیں۔ روپیہ پاس ہے۔ اس لئے انہوں نے کہا لاؤ۔ یہ کھیل بھی کھیل دیکھیں۔ اس کے علاوہ ان کا مقصد اور کچھ نہیں۔"

بیوی۔"تو ہوگا۔ کرنے دو۔ جیسا کریں گے ویسا بھریں گے۔ تم کیوں سوچ میں مرے جاتے ہو۔ تمہیں کیا پڑی ہے؟"

ہردت رائے۔"بات یہ ہے کہ مجھ سے بھی تو ووٹ یعنی رائے مانگی جائے گی۔ تب میں کس کو دوں گا؟ بابو راج نرائن کو رائے دینا نامناسب ہے۔ میری آتما! اس کو منظور نہیں کرتی۔ وہ اس کے اہل نہیں ہیں اور کوئی بات ہوتی تو میں ضرور ان کا ساتھ دیتا۔ لیکن ان حالات میں میں اگر پنڈت جوالا پرشاد کو ووٹ دوں گا تو بابو راج نرائن مجھے نکال دیں گے۔ رکھیں گے نہیں۔ ایسی حالت میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی فکر میں پڑا ہوں۔"

شوہر کی یہ بات سنتے ہی بیوی کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ فوراً بولی۔"تو تم بابو جی ہی کو ووٹ دینا۔ لاکھ کچھ ہو۔ پھر بھی وہ اپنے مالک ہیں۔ ہم ان کا دیا کھاتے ہیں۔ ذرا سی بات کے لئے منہ موڑنا ٹھیک نہیں۔ پھر تمہارے ایک ووٹ سے کسی کا کچھ بنے بگڑے گا نہیں۔ تب تم کیوں اپنی نوکری پر آفت لاؤ گے؟ تمہیں کیا۔ کوئی ممبر ہو۔ جان ہے تو جہان ہے۔ آپ سکھی تو جگ سکھی۔"

بیوی کی بات سنتے ہی ہردت رائے کے چہرہ پر ناراضگی کے جذبات جھلک اٹھے۔ مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ دل میں کہنے لگے۔"دیکھو۔ یہ ابھی تک میری ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ بابو راج نرائن کے ادھرم پر دلی نفرت کا اظہار کر رہی تھی۔ مگر اپنے اغراض کو نقصان پہنچتے' اپنی روٹیوں کو دھکا لگتے دیکھ کر اس نے ان تمام باتوں کی طرف سے نگاہ پھیر لی۔ یہ تو بیوقوف عورت ہے۔ اس کے ایسے خیالات' ایسا چھوٹا اور کمزور دل ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جب تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے کہ صرف ذرا سی خود غرضی کی خاطر تھوڑی سی دوستی اور مروت میں آکر مناسب نامناسب کا خیال بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ سب دیدہ دانستہ اپنی ضمیر کشی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تو اگر یہ عورت اپنی روٹیوں کے لئے ایسا کرتی ہے تو کیا برا کرتی ہے؟ کیا میں بھی یہی کروں؟ ایک طرف سوا سو روپے ماہوار اور دوسری طرف اپنی اور بیوی بچوں کی روٹیوں پر آفت! مجھے اس عالم ضعیفی میں کون سوا سو روپے ماہوار دے گا؟ یہ عورت کہتی تو ٹھیک ہے۔ آپ سکھی تو جگ سکھی! مگر یہ خیال عمدہ نہیں۔ یہ خیال مطلب پرستوں کے ہوتے ہیں۔ دوئم یہ کام ملک کا ہے۔ نااہل کو رائے دینا گویا وطن کے ساتھ دغابازی' غداری' ضمیر کشی کرنا ہے۔ اف! یہ بڑا پاپ ہے۔ فاقوں مر جانا بہتر ہے۔ مگر یہ پاپ کرنا ٹھیک نہیں۔"

بڑی دیر تک لالہ ہردت رائے ایسی ہی باتیں سوچتے رہے۔ آخر کار بیوی کے بہت کچھ اصرار کرنے پر اٹھ کر کھانا کھانے چلے گئے۔

(5)

بابو راج نرائن نے لالہ ہردت رائے کے سامنے کچھ کاغذ پتر رکھ کر کہا۔ ”دیکھئے! اتنے ووٹ تو مل گئے۔“

لالہ ہردت رائے نے کاغذات کو دیکھنا شروع کیا۔ یکا یک جونہی ان کی نگاہ اپنے نام کے اوپر پڑی۔ وہ چونک پڑے۔ انہوں نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد ایک پُرخوف نگاہ۔ بابو راج نرائن اور ان کے دوستوں پر ڈالی۔ قلم اٹھایا۔ کاغذ تک لے گئے۔ مگر ہاتھ کانپنے لگا۔ اس لئے ہٹا لیا۔ اور کچھ سوچنے لگے۔ اس کے بعد قلم اٹھایا مگر کچھ سوچ کر رکھ دیا۔ پھر کچھ سوچتے رہے۔ آخر کار پھر ایک دفعہ ہونٹ دانتوں میں دبا کر قلم اٹھایا اور اپنے نام کے اوپر ایک لکیر کھینچ دی۔ لکیر کھینچنے کے فوراً بعد ہی ان کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ چہرے کی سرخی زردی میں بدل گئی۔

انہیں قلم پھیرتے دیکھ کر ایک صاحب بول اٹھے۔ ”کیوں لالہ جی! کچھ غلطی ہے کیا؟ یہ گھنیشام کا لکھا ہوا ہے۔ انہیں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ جیسے ہیں۔ پھر بھلا کیونکر ٹھیک ہو سکتا ہے؟ لاؤ دیکھوں تو کیا گڑبڑ کر دی ہے؟“

لالہ جی نے چپکے سے کاغذ ان کے سامنے رکھ دیا۔ انہوں نے کاغذ اٹھا کر دیکھا۔ اور دیکھتے ہی منہ پھلا کر بولے۔ ”ایں! آپ نے اپنا نام کیوں کاٹ دیا؟“

ان کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ بابو راج نرائن و دیگر حاضرین جھٹ بول اٹھے۔ ”ایں! اپنا نام کاٹ دیا!“ یہ کہتے ہی سب لوگ اس کاغذ پر ٹوٹ پڑے۔ سب نے دیکھا نام پر ایک موٹی اور صاف لکیر کھنچی ہوئی ہے۔

بابو راج نرائن بھویں چڑھا کر بولے۔ ”آپ نے اپنا نام کیوں کاٹ دیا؟“

لالہ ہردت رائے کا بدن کانپ رہا تھا۔ ذرا مشکل سے بول سکے۔ انہوں نے کہا۔ ”اس لئے کہ مجھ سے دریافت کئے بغیر لکھ لیا گیا تھا۔“

ایک آدمی۔ ”آپ سے دریافت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ تو گھر کے آدمی ہیں۔“

لالہ ہردت رائے۔ ”اس بارے میں میں بالکل پرایا اور آزاد ہوں۔“

بابو راج نرائن بگڑ کر بولے۔ ”تو کیا آپ مجھے ووٹ نہیں دینا چاہتے۔“

لالہ ہردت رائے پسینے میں شرابور ہو گئے۔ انہوں نے استقلال کے ساتھ کہا۔ ”ہرگز نہیں۔“

بابو راج نرائن ہونٹ چباتے ہوئے بولے۔ ”کیوں؟“

لالہ ہردت رائے۔ ”اس لئے کہ آپ اس کے اہل نہیں ہیں۔ آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں۔ اور اب بھی کہتا ہوں کہ آپ کا یہ کام دخل در معقولات ہے۔ آپ صرف ایک کھیل سا کھیل رہے ہیں۔ مگر یاد رکھئے۔ یہ کھیل نہیں ہے۔ آپ روپیہ کے زور سے صرف اپنا دل بہلانے کی خاطر ایک قابل آدمی کے منہ کا نوالہ چھین رہے ہیں۔ اور انیتی اور ادھرم سے چھین رہے ہیں۔ (پسینے میں تر بتر چہرہ پونچھتے ہوئے) یاد رکھئے۔ آپ یہ صرف ایک اس شخص ہی کے ساتھ غیر معمولی بے انصافی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ اس ملک کے ساتھ بھی دغا بازی کر رہے ہیں۔ جس کی خدمات بجا لانے کی ڈھونگ کی آڑ لے کر آپ اس انرتھ پر آمادہ ہیں۔ آپ طرح طرح کی ترغیبیں دے کر اور خوف دلا کر لوگوں کو اپنے ضمیر کا خون کرنے کے لیے مجبور کر رہے ہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی یہ کتنا بڑا پاپ ہے۔ کونسل کی ممبری کے اہل پنڈت جوالا پرشاد ہیں۔ اور آخر کار انہیں کی فتح ہو گی اور میں بھی انہیں کو ووٹ دوں گا۔

آپ چند خوشامدیوں کے کہنے میں آکر فضول روپیہ اڑا رہے ہیں۔ خیر! اڑایئے۔ آپ کا مال ہے۔ مگر میں اتنا ضرور عرض کروں گا کہ اس طرح فضول روپیہ پھونک کر بالآخر شرمندہ ہونے کی نسبت اگر آپ اپنا یہ روپیہ کسی اور کام میں لگائیں جس سے حقیقی بھلائی ہو تو آپ کا نام اس سے بھی زیادہ ہو۔ جتنے کی آپ کونسل میں جانے کی توقع رکھتے ہیں۔ اخیر میں مجھے صرف یہی کہنا ہے کہ میں پہلے ہی سے یہ سمجھے ہوئے تھا کہ میرے اس طرزِ عمل سے آپ مجھے اپنے ہاں نہیں رکھیں گے۔ اس لئے میں نے پہلے ہی استعفیٰ لکھ کر رکھ چھوڑا ہے۔"

یہ کہہ کر لالہ ہردت رائے نے بابو راج نرائن کے روبرو اپنا استعفیٰ رکھ دیا اور اٹھ کر انہیں بندگی کی۔ پھر اپنی ٹوپی اور چھڑی اٹھا کر چل دیئے۔

چار دن کے بعد لالہ ہردت رائے کو بابو راج نرائن کی مندرجہ ذیل مضمون کی ایک چٹھی ملی۔

لالہ ہردت رائے صاحب!

آپ کی باتوں نے میرے دل پر اثر ڈالا۔ میں نے دو دن تک برابر ان پر غور کیا۔ ہر ایک پہلو کو سوچا۔ مگر ہر طرح پر آپ ہی کی بات ٹھیک معلوم ہوئی۔ بلاشک میں کھیل کھیل رہا تھا۔ اور یہ میری سخت غلطی تھی۔ میں نے اب کونسل میں جانے کا ارادہ بالکل ترک کر دیا ہے۔ میں اخبارات میں بھی اس امر کی اطلاع شائع کرا رہا ہوں۔ آپ کا استعفیٰ میں نے منظور نہیں کیا۔ چنانچہ آپ کو آکر اپنا کام سنبھالنا چاہیے۔"

آپ کا

راج نرائن سنگھ

لالہ ہردت رائے نے چٹھی ایک طرف رکھ دی۔ اور حقہ کا کش لے کر خود بخود کہنے لگے۔ "چلو! اچھا ہوا۔ پنڈت جوالا پرشاد کے لئے راستہ صاف ہو گیا۔"

پرائشچت

(1)

بابو برجیندر سروپ کی یہ آرزو تھی کہ اپنے اکلوتے بیٹے بابو نریندر سروپ کو کوئی سرکاری عہدہ دلائیں۔ وہ شہر کے رئیس تھے اس لئے کلکٹر اور دیگر حکام سے ان کا میل جول رہتا تھا۔ وہ اکثر مجسٹریٹ سے ملنے جایا کرتے تھے۔ رخصت ہوتے وقت جب مجسٹریٹ ان سے مسکرا کر حلیمی سے کہتا۔ "ویل بابو برجیندر سروپ! میرے لائق کوئی خدمت؟" اس وقت برجیندر سروپ کے دل کی تہ سے ایک لمبی آہ نکلتی تھی۔ وہ سوچتے تھے۔ اگر آج نریندر پڑھ لکھ کر تیار ہو گیا ہوتا تو کیسا اچھا موقع تھا۔

اسی طرح کئی سال گزرنے کے بعد برجیندر سروپ کے شجر امید کے پھلنے پھولنے کا وقت آیا۔ نریندر سروپ بی اے کے امتحان میں کامیاب ہوا۔ آج برجیندر سروپ کی شادمانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ آج وہ اپنے تئیں انتہائی

خوش قسمت اور سکھی سمجھنے لگے۔ نریندر کی کامیابی کی خبر پاتے ہی وہ فوراً کلکٹر سے ملے۔ اور اپنی یہ خواہش ظاہر کر دی کہ نریندر سروپ کو ڈپٹی کلکٹری کے لئے نامزد کرا دیا جائے۔ کلکٹر نے اس بات کو منظور کر لیا اور اس کے لئے کوشش کرنے کا بھی وعدہ کر لیا۔

ادھر نریندر سروپ اور ہی دھن میں تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ولایت جا کر صنعت و حرفت کی اعلیٰ تعلیم حاصل کروں اور وہاں سے لوٹ کر مادر وطن کے صنعت و حرفت کو فروغ دوں۔ وہ اپنے خیالات والد کے روبرو ظاہر کرنے کا موقع تلاش کر ہی رہا تھا کہ بابو برجیندر سروپ نے اسے علیحدگی میں بلا کر کہا۔ ''میرے خیال میں اب تمہاری تعلیم ختم ہو چکی۔ اب تمہیں کچھ کام کرنا چاہیے۔''

نریندر سروپ پس و پیش کے ساتھ بولا۔ ''تعلیم تو ابھی ختم نہیں ہوئی اور نہ کبھی ختم ہوتی ہے۔ خواہ آدمی ساری عمر پڑھتا رہے۔''

برجیندر سروپ۔ ''وہ علیحدہ بات ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تم اس لائق ہو گئے ہو کہ جس لائن میں جانا چاہو۔ جا سکتے ہو۔''

اتنا کہہ کر برجیندر سروپ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر خوش ہو کر بولے۔ ''تمہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہو گی کہ میں نے تمہارے لئے ایک ایسی لائن سوچی ہے جس کے لئے بڑے بڑے آدمی خواہشمند رہتے ہیں۔''

نریندر سروپ چونک پڑا۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کون سی لائن؟''

برجیندر سروپ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ڈپٹی کلکٹری۔''

انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ نریندر ایسے اعلیٰ عہدے کی بات سن کر بے حد خوش ہو گا۔ مگر جب انہوں نے دیکھا کہ ڈپٹی کلکٹری کا نام سنتے ہی نریندر کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ تب انہیں بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے ذرا گھبرا کر نریندر سروپ سے پوچھا۔ ''کیوں کیا یہ عہدہ تمہیں پسند نہیں ہے؟''

نریندر سروپ نے استقلال کے ساتھ جواب دیا۔ ''ذرا بھی نہیں صرف ناپسند ہی نہیں۔ بلکہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔''

''نفرت!'' یہ کہہ کر برجیندر سروپ اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ بیٹے کے پاس آ کر بولے۔ ''نریندر! مجھے تمہاری عقل پر تعجب ہو رہا ہے۔ جس عہدے کے لئے لوگ ترستے رہتے ہیں۔ جس کے حصول کیلئے لوگ ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر دیتے ہیں۔ اس عہدے سے تم نفرت کرتے ہو۔ اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہتا تو مجھے اس کا دماغ صحیح ہونے میں شک گزرتا۔''

نریندر۔ ''خواہ کچھ ہی ہو۔ مگر میں آپ سے صاف صاف کہتا ہوں کہ اس عہدہ سے مجھے سراسر نفرت ہے۔''

برجیندر سروپ کے شجر امید کی جڑ میں کلہاڑا لگا۔ ان کے ہوائی قلعہ ڈگمگانے لگے۔ انہوں نے ناراض ہو کر پوچھا۔

''آخر اس نفرت کا سبب؟''

نریندر۔ ''اول تو میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ خواہ وہ ڈپٹی کلکٹری ہو یا مجسٹریٹی۔ میں آزاد رہنا چاہتا

ہوں۔ دوئم میری خواہش یہ ہے کہ میں ابھی تعلیم نہ بند کروں۔"

برجیندر۔ "مجھے یہ امید نہ تھی کہ اتنی اعلیٰ تعلیم پا کر بھی تمہارے خیالات اتنے لچر ہوں گے۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ڈپٹی کلکٹری ملازمت ہے مگر ایسی ملازمت ہے جس پر لوگوں کو ناز ہوتا ہے۔"

نریندر۔ "بلا شک لوگوں کو ناز ہوتا ہے۔ مگر مجھے ناز نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ سب سے مقدم بات یہ ہے کہ میں ابھی اپنی تعلیم بند نہیں کرنا چاہتا۔"

برجیندر۔ "آخر اب کب تک پڑھو گے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب تمہیں اور پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دیکھو بیٹا نریندر! میں نے تمہیں اس لئے نہیں پڑھایا کہ تم کہیں نوکری کر کے چار پیسے کماؤ۔ کیونکہ ایشور کے فضل سے تمہیں روپے پیسے کی کمی ذرا بھی نہیں ہے۔ تم ساری عمر چار آدمیوں کو کھلا کر کھا سکتے ہو۔ میں نے تمہیں صرف تعلیم کے لئے پڑھایا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس لئے کہ تمہیں......... ایسا عہدہ مل جائے۔ جس سے آئندہ اس خاندان کا نام عزت کے ساتھ لیا جا سکے۔"

نریندر۔ "اگر آپ نے مجھے صرف تعلیم کے لئے پڑھایا ہے تو اب آئندہ بھی اسی نقطۂ نگاہ سے میری تعلیم جاری رکھئے۔ اور نام چلنے کی جو آپ کہتے ہیں۔ سو اس کے لئے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ جس سے آئندہ آپ کا نام عزت و احترام کے ساتھ لیا جا سکے۔"

برجیندر سروپ کے چہرے پر ناخوشی اور تکلیف کے جذبات نمودار ہو گئے۔ انہوں نے سمجھا۔ نریندر کے ذریعہ ان کی خواہش کا پورا ہونا دور کی بات ہے۔ مگر برجیندر سروپ اس طبیعت کے آدمی نہ تھے۔ جن کی امید کی ڈور ذرا ہی سے جھٹکے میں ٹوٹ جاتی ہے۔ وہ نہایت مستقل مزاج آدمی تھے۔ اور اسی لئے ابھی مایوس نہیں ہوئے۔ انہوں نے نریندر سے کہا۔ "دیکھو! اس بارے میں تم خوب غور کر لو۔ جلدی میں بغیر سوچے سمجھے کوئی بات ٹھان لینا مناسب نہیں۔ میں تمہیں اس کے لئے دو دن کی مہلت دیتا ہوں۔"

نریندر۔ "اگر گستاخی میں شمار نہ ہو تو یہی بات میں آپ سے بھی کہہ سکتا ہوں۔ آپ بھی پھر اس پر غور کر لیجئے۔"

(2)

ان دو دنوں میں نریندر سروپ نے اپنے خیالات بدلنے کی بڑی کوشش کی۔ مگر ان کا ضمیر یہی کہتا رہا کہ انہیں ڈپٹی کلکٹری سے صرف بے اطمینانی ہی نہیں۔ بلکہ دکھ بھی ہو گا۔ ادھر برجیندر سروپ کا خیال یہی رہا کہ انہیں سکھ صرف اسی حالت میں ہو گا جب وہ نریندر کو ڈپٹی کلکٹری کی کرسی پر متمکن دیکھیں گے۔ ادھر نریندر کے سینے میں اعلیٰ تعلیم کی تشنگی تھی۔ ادھر برجیندر سروپ اسے بالکل فضول سمجھ رہے تھے۔

دو دن گزر گئے تو برجیندر سروپ نے بیٹے سے اس بارے میں پھر گفتگو کی۔ مگر نریندر سروپ نے صاف صاف کہہ دیا۔ "میں ڈپٹی کلکٹری ہرگز نہیں کروں گا۔ میری خواہش ولایت جا کر تعلیم حاصل کرنے کی ہے۔ اور اس خواہش کو میں ضرور پورا کروں گا۔"

بیٹے کی یہ استقلال بھری بات سن کر برجیندر سروپ سناٹے میں آ گئے۔ وہ نہیں سوچ سکے کہ بیٹے کی اس بات کے آگے کیا کہیں؟ انہوں نے گرے ہوئے لہجے میں صرف اتنا کہا۔ "اچھا! تمہاری مرضی۔"

نریندر کی ماں شوہر کو اداس دیکھ کر بولی۔ ''آج تم بڑے اداس ہو۔ نریندر نے کیا جواب دیا۔''

برجیندر۔ ''اس سے جس جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس نے وہی جواب دیا۔ میری تمام امیدیں خاک میں مل گئیں۔ اب تک میں اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت اور سکھی سمجھتا تھا۔ مگر آج میں اپنے تئیں بڑا بد قسمت اور دکھی سمجھتا ہوں۔ ہائے افسوس! جس نریندر پر میں بڑی بڑی امیدیں باندھ رہا تھا' اس نریندر نے یہ جواب دیا۔ ایسے بیٹے سے تو میں...........''

نریندر کی والدہ شوہر کو روک کر بولی۔ ''یہ کیا بات منہ سے نکالتے ہو۔ اس کا جی نہیں چاہتا تو جانے دو۔ ہمیں نوکری نہیں کرانی۔ کمی کس بات کی ہے؟''

برجیندر۔ ''کمی تو کسی بات کی نہیں۔ بات تو ساری عہدے کی ہے۔ ایسی ملازمت بھلا کہیں ملتی ہے؟ یہ تو میرا ہی دم ہے کہ بغیر کسی تردّد کے ایسی نوکری مل رہی ہے۔ نہیں تو بچہ مارے مارے پھرتے۔ کوئی ٹکے کو نہ پوچھتا۔ خیر! (آہ سرد بھر کر) اگر آج کوئی دوسرا لڑکا ہوتا تو میں اپنا حوصلہ اسی کے ذریعہ پورا کر لیتا۔ اس کا جو جی چاہتا کرتا۔ بڑی بھاری بات تو یہ ہے کہ میں کلکٹر صاحب کے پاس خود دوڑا گیا۔ اور ان سے بھی بہت کچھ کہا سنا۔ تب وہ راضی ہوئے۔ اب جس وقت ان سے یہ کہوں گا کہ لڑکا اسے منظور نہیں کرتا۔ جانے دیجئے تو وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے کہ اچھا لڑکا ہے جو ایسی ملازمت منظور نہیں کرتا اور پھر باپ کی خواہش کے باوجود بھی۔''

نریندر کی ماں ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ ''تو پھر کیا کریں کوئی بچہ ہو تو ڈانٹ کر' دھمکا کر سمجھا دیں۔ وہ اب بچہ تو ہے نہیں۔ نیک و بد سب سمجھتا ہے۔ اسے کیسے سمجھائیں؟ اپنا تو منہ سے کہنے کا ہی بس ہے۔''

برجیندر۔ ''اس لڑکے نے میرا بڑھاپا بگاڑ دیا۔ امید تھی کہ نریندر پڑھ لکھ گیا ہے۔ بڑھاپے میں آرام ملے گا۔ مگر سکھ آرام ملنا تو درکنار الٹا دکھ ہو گیا۔ (آہ سرد بھر کر) خیر! جو ایشور کی اِچھا! میں نے صبر کر لیا۔ اب اس کا جو جی چاہے کرے۔''

مندرجہ بالا واقعہ کے بعد برجیندر سروپ بے حد اداس اور دکھی رہنے لگا۔ نریندر کی والدہ اگرچہ بیٹے کے حق میں تھی۔ مگر شوہر کو مضطرب دیکھ کر نریندر کی اس کارروائی سے اسے بھی تکلیف ہوئی۔ اس نے ایک روز موقع پا کر نریندر سے کہا۔ ''بیٹا! تمہارے پتا جی تمہاری اس ضد سے بڑے دکھی ہیں۔ کیوں انہیں بڑھاپے میں دکھی کرتے ہو؟ جیسا کہیں ویسا ہی کرو۔''

نریندر سروپ بولا۔ ''ماں! یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ مگر میں کیا کروں۔ میری آتما اس بات کو منظور نہیں کرتی۔ میری خواہش ہے کہ میں ولایت جا کر ابھی اور پڑھوں لکھوں۔''

یہ پہلا موقعہ تھا۔ جب نریندر سروپ نے ولایت جانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ماں دیدے پھاڑ کر بولی۔ ''کیا کہا؟ ولایت جا کر؟ ہے بھگوان! تو کیا ہمیں اس بڑھاپے میں اکیلے چھوڑ کر پردیس جانا چاہتا ہے؟ کیوں نریندر! تیرا دل اتنا سخت کیسے ہو گیا؟ کیا تجھے ہماری محبت نہیں رہی؟

نریندر ماں کی بات پر دل میں ہنسا۔ مگر بعد ازاں یہ سوچ کر کہ ایک ان پڑھ ہندوستانی عورت کے ایسے خیالات ہونا بالکل قدرتی امر ہے۔ بولا ''ماں! پردیس جانے میں برائی ہی کیا ہے؟ سینکڑوں جاتے ہیں۔ وہاں صرف تین چار برس رہنا پڑے گا۔ میری تعلیم کے لئے تین چار سال برداشت کر لو۔ کون بڑی بات ہے۔ لوگ تو مدتوں پردیس میں رہتے ہیں۔''

نریندر کی والدہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''نا بیٹا! مجھ سے یہ کبھی نہ سہا جائے گا۔ ہاں جو تیرے پتا جی اس بات پر راضی ہو جاتے تو چھاتی پر پتھر رکھ کر سہہ بھی لیتی۔ مگر اب تو یہ دکھ نہیں سہا جائے گا۔ کیا تیرا دل یہ مانتا ہے کہ ہم دونوں کو کُڑھا کر تو پردیس جائے؟''

یہ بات نریندر کے دل سے ٹکرا گئی۔ وہ مضطرب ہو کر بولا۔ ''میرا دل تو...... یہ...... بات...... مگر اس میں نقصان ہی کیا ہے؟''

والدہ۔ ''بیٹا! ابھی تو ہمارے جی کا دکھ نہیں سمجھ سکتا۔ جب تیرے بال بچے ہوں گے۔ اس وقت تجھے پتہ لگے گا کہ بیٹے سے جدا ہونے پر ماں باپ کا جی کتنا دکھی ہوتا ہے۔ دیکھ! وہ سات آٹھ دنوں میں ہی آدھے رہ گئے۔ جو یہی حال رہا تو وہ کتنے دن جئیں گے؟ کیا تیرے پیچھے مجھے اس بڑھاپے میں وہ دن..........'' نریندر کی والدہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

نریندر سمجھ گیا۔ ماں کا مطلب یہ ہے کہ اگر باپ کا یہی حال رہا تو بہت دنوں وہ زندہ نہ رہیں گے۔ اور اس طرح ماں کو بیوگی کی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے نریندر کو مضطرب کر دیا۔ اس کو اب یہ فیصلہ کرتے دیر نہیں لگی اور ایک آہ سرد بھر کر ماں سے کہا۔ ''ماں! میں تمہارے حکم سے باہر نہیں ہوں۔ جیسا پتا جی کہتے ہیں ویسا ہی کروں گا۔''

(3)

نریندر سروپ کو ڈپٹی کلکٹری کرتے ہوئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا۔ اب بابو برجیندر سروپ بہت سکھی ہیں۔ مگر نریندر سروپ کے لئے اس جہاں میں سکھ یا راحت نہیں۔ جس کام کے لئے اس کے دل میں امنگ تھی۔ اور جس مقصد کی خاطر وہ اپنی زندگی کو ضروری سمجھ رہا تھا' اس سے یک لخت اور زبردستی ہٹا دیئے جانے کے سبب اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا۔

نریندر سروپ کی صحت دن بدن بگڑنے لگی۔ وہ اس بات کو بخوبی سمجھ رہا تھا۔ مگر اسے اپنی زندگی سے محبت بہت کم ہو گئی تھی۔ اس لئے اس نے اس بات کی چنداں پرواہ نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کمزوری کے باعث اسے بخار رہنے لگا۔ بخار کے باوجود بھی اس نے دو ماہ تک سخت محنت کی۔ آخر کار جب وہ بالکل کمزور ہو گیا تو چھٹی لے کر گھر آیا۔ وہاں اس کا علاج معالجہ ہونے لگا۔ مگر بخار پہلے ہی اپنا کام پورا کر چکا تھا۔ چنانچہ رخصت لینے کے دو ماہ بعد ہی نریندر سروپ اس جہان فانی سے چل بسا۔

اس کی وفات حسرت آیات سے جو غم اس کی والدہ اور بابو برجیندر سروپ کو ہوا' وہ ناقابل بیان ہے۔ بابو برجیندر سروپ بیٹے کی موت کے غم سے پاگل سے ہو گئے۔ ان کے دل میں بہت زبردست تاسف اس امر کا تھا کہ انہوں نے بیٹے کی خواہش پورا کرنے کے بجائے اس سے اپنی خواہش پوری کرائی۔ اگر وہ اس کی خواہش پوری کر دیتے تو شاید انہیں اس کی موت سے اس قدر صدمہ نہ ہوتا۔ اس سخت تکلیف سے ان کا تن من جل کر خاک سیاہ ہوا جاتا تھا۔ بعض اوقات اپنے آپ کو ہی وہ نریندر کی موت کا باعث سمجھنے لگتے تھے۔ وہ شب و روز بیٹھ یہی سوچا کرتے کہ اس دل کی آگ کو کیسے بجھائیں۔ چنانچہ اپنا دل بہلانے کے لئے انہوں نے سیر و سیاحت کا ارادہ کیا۔ پھرتے

رتے ایک روز وہ پریاگ پہنچے۔ وہاں ایک روز وہ اپنے ایک پرانے دوست بابو امرناتھ سے ملنے کے لئے گئے۔

ان سے گفتگو کرنے اور اپنی داستان غم سنانے کے بعد وہ چلنے ہی کو تھے کہ بابو امرناتھ کا بیٹا شیام ناتھ ہاں آ پہنچا۔ اس کی عمر کوئی 25 برس کے قریب تھی۔ اسے دیکھ کر برجیندر سروپ کو بیٹا یاد آ گیا۔ ان کے دل سے یک آہِ جگر پاش نکلی۔ شیام ناتھ برجیندر سروپ کو پرنام کر کے ان کے پاس آ بیٹھا۔ برجیندر سروپ نے اس کی تعلیم غیرہ کے بارے میں گفتگو شروع کی۔ انہیں معلوم ہوا کہ شیام ناتھ نے اسی سال بی اے پاس کیا ہے۔

برجیندر سروپ نے پوچھا۔ ''اب آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

پیشتر اس کے کہ شیام ناتھ کوئی جواب دے کہ بابو امرناتھ بول اٹھے۔ ''اس کا ارادہ تو ابھی پڑھنے ہی کا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ اب پڑھنا فضول ہے۔''

برجیندر سروپ کو اپنے اوپر بیتے ہوئے گزشتہ واقعات یاد آ گئے۔ وہ آہِ سرد بھر کر بولا۔ ''آخر آپ کا ایسا یال کیوں ہے؟''

امرناتھ۔ ''محض اس لئے کہ میرے حالات ایسے نہیں کہ میں اسے آگے تعلیم دلا سکوں۔ میں نے اتنا ی جو کچھ کیا' وہ اپنی طاقت سے باہر ہے۔ اب مناسب ہے کہ یہ کہیں ملازمت کرے جس سے چار پیسے کی آمدن اور جھے اس بڑھاپے میں سہارا ملے۔''

برجیندر سروپ نے شیام ناتھ سے پوچھا۔ ''کیوں بھئی! تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

شیام ناتھ۔ ''میرا ارادہ تو یہی تھا کہ میں ابھی کچھ دن اور پڑھتا مگر مجبوری ہے۔''

شیام ناتھ کے آخری الفاظ سے صاف ظاہر تھا کہ اسے اس امر کا بڑا دکھ ہے۔

اس کے بعد شیام ناتھ اٹھ کر چلا گیا۔ بابو برجیندر سروپ بھی تھوڑی دیر ادھر ادھر باتیں کرنے کے بعد پنی فرودگاہ کو چلے آئے۔

رات کو جب بابو برجیندر سروپ پلنگ پر لیٹے تو ان کے سینے میں چھپا ہوا دکھ پھر امڈ آیا۔ وہ روز کی طرح پھر نریندر کی یاد میں تڑپنے لگے۔

دن نکلتے ہی انہوں نے امرناتھ کو لکھا۔

''مجھے یہ معلوم ہو کر تکلیف ہوئی۔ کہ آپ شیام ناتھ کو روپے کی کمی کے سبب تعلیم نہیں دلا سکتے۔ شیام اتھ جیسے آپ کا بیٹا ہے ویسے ہی میرا بیٹا ہے۔ میں اس کی تعلیم کے اخراجات اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ امید ہے آپ اسے منظور کریں گے۔ آپ کو اس لئے یہ تجویز ضرور منظور کر لینی چاہیے کہ ایسا کرنے سے آپ ایک بیٹے کی موت کے غم سے مضطرب باپ کے دل کی آگ کو کم کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوں گے۔''

آپ کا دوست

برجیندر

اس کے جواب میں امرناتھ نے لکھا۔

پیارے دوست!

میں کن الفاظ میں تمہارا شکریہ ادا کروں ایشور تمہیں اس کے عوض میں شانتی دے۔

امرناتھ

بابو برجیندر سروپ چٹھی لے کر ایک میز کے پاس گئے۔ جس پر نریندر سروپ کا فوٹو رکھا ہوا تھا۔ چٹھی فوٹو کے سامنے رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

"بیٹا نریندر! تیری آتما کو شانتی پہنچانے کے لئے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔"

برجیندر سروپ کی آنکھوں سے سیلاب اشک بہہ نکلا۔ مگر اس سیلاب اشک میں دل کی آگ بجھانے کی طاقت موجود تھی۔

بابو برجیندر سروپ نے اپنے پاپ کا پرائشچت کر دیا۔

انسان کی قیمت

(1)

رام داس ایک غریب آدمی ہے۔ ایک مل میں آٹھ آنہ روز پر کام کرتا ہے۔ بونس وغیرہ ملا کر اسے بیس روپیہ ماہوار کے قریب پڑ جاتے ہیں۔ رام داس کے کنبہ میں اس کے سمیت پانچ آدمی ہیں۔ ایک اس کی بڑھیا ماں۔ ایک اس کی بیوی۔ ایک لڑکا۔ جس کی عمر آٹھ برس کے قریب ہے اور ایک لڑکی جس کی عمر تیرہ برس کی ہے۔ بیس روپے میں پانچ آدمی کس طرح گزارہ کرتے ہیں۔ یہ بات ان لوگوں کے خیال میں مشکل سے آسکتی ہے جن کو گزارہ کے لئے کافی آمدن ہے۔ اور ان لوگوں کی سمجھ میں آنا ناممکن ہے جن کی آمدنی ان کے خرچ سے زیادہ ہے۔ رام داس جاڑے کے دنوں میں سردی سے کانپتا ہوا' برسات میں مینہ بوندی سے بھیگتا ہوا اور گرمی کے موسم میں صبح کی ٹھنڈی بادِ نسیم کے دئے ہوئے خواب راحت کو ٹھکرا کر منہ اندھیرے اپنے کام پر جاتا ہے۔ دوپہر کو وہ دو چار مٹھی چنے چبا کر پیٹ کی لگی بجھاتا ہے۔ شام کو گھر لوٹ کر موٹے اناج کی روکھی سوکھی' تازہ باسی جیسی موجود ہوئیں روٹیاں کھاتا ہے۔ اس وقت جب بے شمار تو ندیل امیر الوان نعمت میں بھی نقص نکالے بغیر نوالہ نہیں توڑتے' رام داس اپنے روکھے سوکھے کھانے کو بڑے مزے سے کھاتا اور پرماتما کا شکر ادا کرتا ہے۔

(2)

رات کے گیارہ بج چکے ہیں۔ گھر کے سب لوگ سو گئے ہیں۔ صرف رام داس اور اس کی بیوی جاگ رہے ہیں۔ دونوں میں کچھ باتیں ہو رہی ہیں۔ رام داس کی بیوی بولی۔ "کچھ ہی ہو۔ چمپا کا بیاہ تو اس سال کرنا ہی ہوگا۔"

رام داس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ "بیاہ تو ہونا چاہیے۔ مگر بیاہ کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا؟"

چمپا کی ماں۔ "خواہ کہیں سے آئے بیاہ کرنا ہی پڑے گا۔"

رام داس۔ "قرض کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

چمپا کی ماں۔ ''قرض ہی لے لینا۔ آہستہ آہستہ چکا دیں گے۔''
رام داس۔ ''بھلا رائے صاحب کے یہاں سے کچھ مدد مل سکتی ہے؟''
چمپا کی ماں۔ ''کیا خبر دیں یا نہ دیں۔''
رام داس۔ ''تم نے تو ان سے بیاہ کا ذکر کیا ہی ہو گا؟''
چمپا کی ماں۔ ''ہاں کیا تو تھا۔ ایک روز بڑی بہو نے بھی پوچھا تھا کہ چمپا کا بیاہ کب ہو گا۔ میں نے جواب دیا۔ ''جب بھگوان چاہے گا۔''
رام داس۔ ''اچھا! تم کل پھر ذکر چھیڑنا۔ اور دیکھنا کیا کہتی ہیں۔ رائے صاحب کے ہاں سے کچھ مدد مل جائے تو اچھا ہے۔ قرض لے لینا تو سہل ہے۔ مگر چکانے میں ناکوں چنے چبانے پڑیں گے۔ ابھی کھانے پہننے کو نصیب نہیں ہوتا' اس وقت تو اور بھی تنگی ہو جائے گی۔''

(3)

رام داس جس مکان میں رہتا ہے' اس سے ملحقہ ایک اونچی اور عالیشان حویلی ہے۔ اس کے مالک رائے نرنجن لال ہیں۔ رائے صاحب کئی لاکھ کے آدمی ہیں۔ جس مل میں رام داس کام کرتا ہے رائے صاحب اس مل کے ایک بڑے حصہ دار ہیں۔ رام داس کی بیوی اور بیٹی رائے صاحب کے ہاں آجاتی ہیں۔ رائے صاحب کی بوڑھی والدہ بڑی دھرماتما ہے۔ ان سے رام داس کے کنبے کو وقتاً فوقتاً کھانے کپڑے کی مدد ملتی رہتی ہے۔
دوسرے دن رام داس کی بیوی رائے صاحب کے ہاں گئی۔ کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد چمپا کی ماں نے کہا۔ ''بہو جی! چمپا کے بیاہ کی بات چیت ہو رہی ہے۔''
رائے صاحب کی ماں بولی۔ ''اچھا ہی ہے۔ جھٹ پٹ کر ڈالو۔ لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔''
چمپا کی ماں نے ذرا پس و پیش کے ساتھ کہا۔ ''کر تو ڈالیں بہو جی! مگر روپیہ بھی تو چاہیے جو کچھ آتا ہے وہ کھانے پہننے ہی کو کافی نہیں ہوتا۔ بیاہ کاہے سے ہو۔''
رائے صاحب کی والدہ۔ ''تو جیسی تمہاری حیثیت ہو۔ ویسا کر دو۔ بہت ٹیم ٹام نہ کرو۔''
چمپا کی ماں سے اس بات کا جواب نہیں بن پڑا۔ وہ نہیں سمجھ سکی کہ حیثیت اور ٹیم ٹام سے رائے صاحب کی والدہ کی مراد کیا ہے۔ چند لمحے خاموش رہی۔ اس کے بعد بولی۔ ''بہو جی! ہماری حیثیت تو کچھ بھی نہیں ہے۔''
رائے صاحب کی بیوی بھی اسی جگہ موجود تھی۔ وہ منہ چڑھا کر بولی۔ ''ایسا بھی کوئی آدمی ہے جس کی کچھ حیثیت نہ ہو۔ کسی کی حیثیت لاکھ کی ہے۔ کسی کی ہزار کی۔ کسی کی سو کی۔ ایسا آدمی بھی کوئی آدمی ہے جس کی کوئی حیثیت ہی نہ ہو۔''
چمپا کی ماں کو کوئی جواب نہ سوجھا۔ رائے صاحب کی بیوی کا منہ تکنے لگی۔
رائے صاحب کی ماں بول اٹھی۔ ''بیاہ ٹھیک کر لو۔ ہم بھی سہارا دیں گے۔''
رائے صاحب کی بیوی کو اپنی ساس کے یہ الفاظ برے لگے مگر اس نے اس کی تردید میں اس وقت کچھ نہیں کہا۔

چمپا کی ماں کو رائے صاحب کی والدہ کے لفظ "سہارے" سے یہ امید بندھی کہ وہ چمپا کا بیاہ کرادے گی۔ اس نے اس بارے میں پھر کچھ نہ کہا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر اپنے گھر چلی گئی۔

اس کے چلے جانے پر رائے صاحب کی بیوی نے اپنی ساس سے کہا "ماں جی! تم نہ کچھ سمجھتی ہو نہ بوجھتی ہو۔ یوں ہی منہ سے بات نکال دیتی ہو۔ ہم اسے کیا سہارا دیں گے؟ کیا اس کے کمانے دھمانے والا نہیں ہے؟ ا کریں دھریں۔ ہم سے کیا مطلب؟ ہاں کوئی رانڈ بیوہ ہو۔ یتیم ہو تو ایک بات بھی ہے۔ گھر میں پانچ ہاتھ کا مرد تو بیٹھا ہے۔ وہ پھر کس دن کام آئے گا؟ لڑکے بچے کیا دوسروں کے بھروسے پر پیدا کیے ہیں؟ اونہہ۔ منہ لگائی ڈومنی گاوے۔ تال بے تال! چلی وہاں سے میاؤں میاؤں کرنے! میں تو اسی وجہ سے ان لوگوں کو منہ نہیں لگاتی۔ انگلی دیتے ہاتھ پکڑتی ہیں۔ ہم نے کسی کی بیاہ شادی کا ٹھیکہ تھوڑا ہی لیا ہے"

رائے صاحب کی والدہ بہو کی میٹھی پھٹکار سے ذرا شرمندہ ہو کر بولی۔ "بیٹی! میں نے اس سے یہ تھوڑے ہی کہا ہے کہ بیاہ کر دوں گی۔ میرا تو کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم بھی دس پانچ روپے کا سہارا لگا دیں گے"

رائے صاحب کی بیوی۔ "اور نہیں تو کیا؟ یہ بھی کہاں کا تھوڑا ہے اور کہیں سے دو روپے ہی لے آوے۔ آج کل ایسا وقت گزر رہا ہے کہ کوئی کسی کو ایک پیسہ دِوال نہیں ہے۔ اور دے بھی کہاں سے۔ اپنا ہی پورا کرنا مشکل ہو رہا ہے۔"

(4)

رام داس کو جب چمپا کی ماں کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ رائے صاحب کے ہاں سے چمپا کی شادی میں اچھی مدد ملے گی۔ تب اسے ڈھارس بندھی۔ اس کے تفکرات میں بہت کچھ کمی ہو گئی۔ مصیبت میں مبتلا اور غرض کے بندے کا بھروسہ بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ وہ امید کا غلام بن جاتا ہے۔ نہایت ہی معمولی امید پر بھی یقین کرنے لگتا ہے۔ اگر اس کا ضمیر اسے یہ دکھانے کی کوشش بھی کرتا ہے کہ یہ امید باطل اور موہوم ہے تو وہ اس منظر کی طرف سے اپنی آنکھیں پھیر لیتا ہے۔ رام داس کی روح نے چمپا کے الفاظ پر یقین کرنے سے انکار کیا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک بار پھر چمپا کی ماں سے پوچھا۔ "تمہیں ٹھیک معلوم ہے کہ وہ مدد دیں گے"؟

چمپا کی ماں نے جواب دیا۔ "اب ٹھیک بے ٹھیک تم سمجھ دیکھو۔ انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ہم بھی سہارا دیں گے۔"

رام داس نے اس بات پر تھوڑی دیر غور کر کے کہا۔ "اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورا پورا سہارا دیں گے۔ ہو سکنے کو تو ان سے بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ وہ چاہیں تو ایک بیاہ کیا چار بیاہ کرا سکتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنی بات سے پھر جائیں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمیوں کو اپنی بات کا بڑا خیال رہتا ہے۔"

اسی امید پر بھروسہ کر کے رام داس نے چمپا کے بیاہ کی تیاری شروع کر دی۔ اس نے کچھ روپے پیٹ کاٹ کاٹ کر جوڑ لیے تھے۔ چنانچہ اس نے اس سے بیاہ کے ابتدائی کام انجام دے کر بیاہ کی تاریخ مقرر کر لی۔

شادی کی تاریخ سے بیس روز پہلے رام داس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "چمپا کی ماں! اب بیاہ کے صرف بیس دن رہ گئے ہیں۔ رائے صاحب کے ہاں سے روپے لاؤ تو تیاری کریں۔ وقت بہت تھوڑا ہی رہ گیا ہے۔"

چمپا کی ماں اسی دن رائے صاحب کے ہاں پہنچی۔ ان کے گھر کا تھوڑا سا کام کرنے کے بعد اس نے رائے

صاحب کی والدہ سے کہا۔ "بہو جی! اب چمپا کے بیاہ کے بیس دن رہ گئے ہیں۔"

رائے صاحب کی والدہ خوش ہو کر بولی۔ "بڑی خوشی کی بات ہے۔ بھگوان راضی خوشی سے اس شبھ کام کو پورا کر دے۔"

چمپا کی ماں کو یقین تھا کہ بیاہ کا نام سنتے ہی بہو جی روپے نکال کر دیدیں گی مگر جب وہ صرف خوشی کا اظہار کر کے ہی رہ گئیں اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں تب تو اس کی حرکت قلب بند سی ہونے لگی۔ مگر اس نے یہ کہہ کر دل کو دھیرج دیا کہ آج نہیں تو کل دیدیں گے۔ بڑے آدمی ہیں۔ ان کی عادت ہی کچھ بے پرواہی کی ہوتی ہے۔

چمپا کی ماں بہت دیر تک بیٹھی ساس اور بہو کا منہ تکتی رہی۔ ہر لحہ یہ امید کرتی رہی کہ اب یہ پوچھنے والی ہی ہیں کہ بیاہ میں کتنا خرچ ہوگا۔

آخر کار جب ان کی طرف سے اس قسم کا کوئی سوال نہ ہوا تو چمپا کی ماں نے اس امید سے رخصت ہونے کا انداز ظاہر کیا کہ شاید چلتے وقت پوچھیں۔ اس نے کہا۔ "اچھا بہو جی! اب جاتی ہوں۔ بیاہ کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں اور کام بہت ہے"۔

رائے صاحب کی بیوی ذرا مسکرا کر بولی۔ "جاؤ گی؟ اچھا ہاں بیاہ شادی میں تو کام رہتا ہے"۔

چمپا کی ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اگرچہ اسے یہ امید تھی کہ انہیں جو کچھ دینا ہوگا دو ایک دن میں دیدیں گی مگر پھر بھی اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے پس و پیش کے ساتھ کہا۔ "بہو جی! چمپا کا بیاہ تو تم ہی کرو گی۔ ہماری ایسی حیثیت کہاں جو بیاہ کریں۔ کھانے ہی کے ٹوٹے ہیں۔"

رائے صاحب کی بیوی بولی۔ "کرنے دھرنے والا تو بھگوان ہے چمپا کی ماں! اور حیثیت کی جو کہو تو اپنی اپنی حیثیت موافق سبھی کرتے ہیں۔ جس کا بیٹی بیٹے ہوتے ہیں' وہ ان کے بیاہ شادی کی بھی فکر رکھتا ہی ہے۔ اچھا ذرا ٹھہرو"۔

یہ کہہ کر رائے صاحب کی بیوی اپنی ساس سمیت اندر چلی گئی۔ ان کے اندر جانے کے دس منٹ بعد ایک نوکرانی نے آکر چمپا کی ماں سے کہا۔ "چھوٹی بہو نے پندرہ روپے دیئے ہیں اور کہا ہے کہ انہیں ہماری طرف سے چمپا کے بیاہ میں خرچ کرنا"۔

بہو جی کا پیغام سن کر اور پندرہ روپے دیکھ کر چمپا کی ماں کا دم نیچے کا نیچے اور اوپر کا دم اوپر رہ گیا۔ اس کی عقل ماری گئی اور وہ نوکرانی کا منہ تکنے لگی۔

چمپا کی ماں بڑی دیر تک سناٹے میں آئی کھڑی رہی۔ اس کی وہ کشتیِ امید جس کی مدد سے وہ بحرِ مصیبت کو عبور کرنا چاہتی تھی' گرداب میں چکر کھانے لگی۔

چمپا کی ماں نے گھر آکر شوہر کے سامنے وہ پندرہ روپے رکھ دیئے اور کہہ دیا کہ اب اس سے زیادہ رائے صاحب کے ہاں سے ایک پیسے کی بھی توقع نہیں۔

رام داس کو جس وقت یہ معلوم ہوا وہ بڑا متردّد ہوا۔ اسے اس میں چمپا کی ماں کا ہی قصور نظر آیا۔ اس نے کہا۔ "تمہی نے کہا تھا کہ وہ پوری مدد دیں گے۔ مجھے تو یقین نہیں آیا تھا مگر تمہارے کہنے سے میں نے یقین کر لیا تھا۔ یہ سب کانٹے تمہارے ہی بوئے ہوئے ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟ بیاہ کی تاریخ مقرر نہ ہو گئی ہوتی تو سال چھ ماہ اور ٹھہر جاتے۔ اب تو آبرو پر پانی پھرا جاتا ہے"۔

چمپا کی ماں آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ ''انہوں نے جو کچھ کہا تھا۔ وہی میں نے تم سے کہہ دیا۔ تمہیں یقین نہیں تھا تو پھر کیوں یہ سب کچھ کیا؟''

رام داس اور چمپا کی ماں کے درمیان بہت دیر اسی بارے میں بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ رام داس نے اس خرابی کا الزام بیوی کے ہی ماتھے مڑھا۔

(5)

پنڈت شاردا پرشاد نے رام داس کی مصیبت کا حال سن کر پوچھا۔ ''تمہیں یہ یقین ہے کہ رائے صاحب کے ہاں سے بیاہ کے اخراجات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا؟

رام داس۔'' یہ تو میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ جو بات انہوں نے کہی تھی وہ میں نے آپ کو سنا دی۔ اب دیکھ لیں اس سے جو مطلب نکلتا ہو اور یہ بھی میں نہیں کہہ سکتا کہ اتنا بھی کہا تھا یا نہیں۔ مجھ سے جو کچھ چمپا کی ماں نے کہا وہی میں جانتا ہوں''۔

شاردا۔ ''اس سے تو دو مطلب نکل سکتے ہیں۔ اس میں اَور کسی کا نہیں صرف تمہاری مفلسی کا قصور ہے۔ مفلسی کے سبب دل اس قدر کمزور اور اندھ وشواسی ہو جاتا ہے کہ اپنے فائدے کی کمزور سے کمزور بات پر بھی آدمی یقین کر لیتا ہے۔ خیر! یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ان کی طرف سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا تاہم رائے صاحب کا فرض ہے کہ اس موقع پر تمہیں اس مصیبت کے پنجہ سے چھڑائیں۔ اس سال تمہاری مل کو تین چار لاکھ روپے کا منافع ہوا ہے' اس حساب سے رائے صاحب کو پچاس ساٹھ ہزار روپے کا فائدہ ہوا ہو گا۔ کیونکہ اس میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ یہ سب تم ہی لوگوں کی محنت کا ثمر ہے۔ ان حالات میں چالیس پچاس ہزار میں سے دو چار سو روپے تمہارے کام میں لگا دینا ان کا کام ہے۔ بالخصوص اس حالت میں تمہارے ان کے خانگی تعلقات بھی ہیں۔ اچھا! میرے ساتھ رائے صاحب کے ہاں چلو۔ میں بھی ایک دفعہ زور لگاؤں''۔

پنڈت شاردا پرشاد رام داس کو اپنے ساتھ لے کر رائے صاحب کے پاس گئے۔ رائے صاحب نے شاردا پرشاد کو عزت کے ساتھ بٹھایا۔ شاردا پرشاد مالی اعتبار سے تو معمولی آدمی تھے مگر پبلک کاموں میں حصہ لینے کے سبب سوسائٹی میں ان کی پوزیشن اچھی تھی۔ سب لوگ انہیں جانتے اور اکثر آدمی انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ شاردا پرشاد نے رام داس کے متعلق سب باتیں رائے صاحب کو سنائیں۔

رائے صاحب سن کر بولے۔ ''یہ سب مجھے معلوم ہے۔ میرے گھر سے تعلق رکھنے والی کوئی بات ایسی نہیں جو مجھے معلوم نہ ہو۔ اب آپ یہ بتائیے کہ ان باتوں سے آپ کا مطلب کیا ہے''۔

شاردا پرشاد نے کہا۔ ''میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اس مصیبت سے اس غریب کو بچائیں۔ آپ کے ہاں سے بعض باتیں ایسی کہی گئی تھیں جن پر بھروسہ کر کے اس نے بیاہ مقرر کر لیا۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اسے ان باتوں پر اس قدر اعتماد نہ رکھنا چاہیے تھا جس قدر اس نے رکھا۔ مگر پھر بھی آپ کو اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ایشور نے آپ کو مانا ہے۔ آپ کیلئے دو چار سو روپے دے دینا بہت معمولی بات ہے۔ مگر اتنے ہی سے اس کا کام بنا جاتا ہے۔ آپ لوگ یوں بھی تو لڑکیوں کا بیاہ کرایا کرتے ہیں۔ یہ بھی لڑکی ہی کا کام ہے۔ علاوہ ازیں یہ آپ ہی کے کارخانے

میں کام بھی کرتا ہے۔ انہی لوگوں کی محنت سے آپ کو فائدہ ہوا ہے۔ یہ کہنا بھی چنداں بے جانہ ہوگا کہ ان کے پسینے کی کمائی کا بہت بڑا حصہ آپ ہی لوگوں کو ملتا ہے"۔

اس موقع پر رائے صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ ان کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

شاردا پرشاد نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "ایسی حالت میں دو چار سو روپے سے اس کی مدد کر دینا آپ کا فرض ہے"۔

رائے صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا۔ وہ بولے۔ "فرض! تو یہ کہئے کہ آپ اس کی سفارش کرنے نہیں آئے بلکہ اس کا حق اور میرا فرض ثابت کرنے کیلئے تشریف لائے ہیں"۔

شاردا پرشاد بے خوفی کے ساتھ بولے۔ "بلاشک! اگر آپ اسے سمجھیں"۔

رائے صاحب۔ "مگر مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ ایک ادنیٰ سے مزدور کو مجھ پر کوئی حق حاصل نہیں اور نہ اس کی طرف میرا کوئی فرض ہے۔ مل میں سینکڑوں مزدور کام کرتے ہیں اگر سب کے بارے میں یہی بات کہی جائے تو ہم لوگ تو کوئی چیز ہی نہ رہیں۔ مجھے ہنسی آتی ہے کہ آپ ایک ایسے آدمی کا جس کی کوئی قیمت نہیں' میرے اوپر حق اور اس کی طرف میرا فرض ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

شاردا پرشاد۔ "مجھے دکھ ہے کہ آپ ایسے آدمی کی زبان سے ایسی باتیں نکل رہی ہیں۔ انسان کی قیمت روپیہ پیسہ نہیں ہوتا۔ انسان کی قیمت صرف اس کی انسانیت ہی ہوتی ہے۔ اس کی قیمت صرف یہی ہے کہ وہ بھی آپ ہی کی طرح ایک آدمی ہے۔ آپ کو جتنی سہولتیں حاصل ہیں' اتنی ہی' ویسی ہی سہولتیں اگر اس کو بھی ملیں تو وہ آپ سے کسی بات میں کم نہیں رہ سکتا۔ آپ کی مل میں جتنے مزدور ہیں' ان سب کا حق مالکانِ کارخانہ...... آپ...... پر ہے اور مل والوں کا...... آپ کا...... ان سب کی طرف فرض ہے۔ تھوڑی تھوڑی مزدوری لے کر' بھوکے ننگے رہ کر' صبح سے شام تک محنت شاقہ کر کے وہ آپ کو کس قدر فائدہ پہنچاتے ہیں۔ مگر اس کے عوض میں آپ انہیں کیا دیتے ہیں؟"

رائے صاحب۔ "اس کے عوض میں ہم انہیں مزدوری دیتے ہیں۔ اگر اتنی مزدوری سے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تو وہ کام چھوڑ دیں۔ انہیں کام کرنے کیلئے کوئی مجبور تو کرتا ہی نہیں"۔

شاردا پرشاد۔ "اس کا مطلب ہے ایک بھوکے آدمی کو روٹیوں کا لالچ دے کر پھانس لینا۔ اس کا خون چوستے رہنا اور جب وہ بے مصرف ہو جائے' کسی کام کا نہ رہے تو ٹھوکر مار کر نکال دینا۔ آپ لوگ تو جانتے ہی ہیں کہ کپاس جہاں جائے گی اوٹی ہی جائے گی۔ مزدور بھی یہ بات سمجھتے ہیں۔ اس لیے آپ لوگ ان کے کام چھوڑ دینے کی پرواہ نہیں کرتے اور مزدور کام نہیں چھوڑتے۔ وہ کام تو اس وقت چھوڑیں جب انہیں کہیں زیادہ سہولت حاصل ہو۔ چنانچہ بے چارے چار و ناچار برداشت کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ انہیں گئی گزری حالت میں رہنے کیلئے مجبور کرتے ہیں اور ان کے افلاس اور مجبوری کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں"۔

رائے صاحب۔ "خیر جناب! ہم سراسر غیر انصافی کرتے ہیں۔ ظلم کرتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں بحث کرنے کی نہ تو فرصت ہے اور نہ ضرورت ہی ہے۔ اگر آپ کو ضرورت سے زیادہ مزدوروں سے ہمدردی ہے تو آپ ان کی مخلصی کا طریقہ ڈھونڈ نکالیں"۔

شاردا پرشاد۔ "وہ وقت بھی قریب ہے جب آدمی اپنی قیمت سمجھ کر اپنا چھٹکارا خود کرے گا۔ خیر رام داس کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟"

رائے صاحب پُرغرور لہجے میں بولے۔ "یوں تو خواہ میں اس کی مدد کر بھی دیتا مگر جب آپ اس کی انسانیت اور اس کے حقوق کے بل پر مجھ سے یہ کام کرانا چاہتے ہیں تو مجھے کہنا ہی پڑتا ہے کہ اس بارے میں میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔"

پنڈت شاردا پرشاد مسکرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا۔ "رائے صاحب! مجھے یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ آپ لوگ اپنی دھن کے پکے ہیں۔ آپ لوگوں کا یہ برتاؤ مزدوروں کی جلد مخلصی کرنے میں اچھی مدد دے گا۔ آپ لوگ جتنے سخت ہوتے جائیں' اتنا ہی مزدوروں کے حق میں بہتر ہے۔ آپ کی یہ سختی مزدوروں کو اپنی قدر و قیمت سمجھنے پر مجبور کرے گی۔"

یہ کہہ کر شاردا پرشاد رائے صاحب سے رخصت ہوئے۔ باہر رام داس ان کا انتظار کر رہا تھا۔ شاردا پرشاد نے اس سے کہہ دیا کہ رائے صاحب مدد نہیں دیں گے۔

(6)

پنڈت شاردا پرشاد کی کوشش سے رام داس کے سر پر آئی ہوئی مصیبت ٹل گئی۔ چمپا کا بیاہ ہو گیا۔ شاردا پرشاد جیسے صاحب رسوخ آدمی کیلئے دو چار سو روپے کا بندوبست کر دینا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ انہوں نے ایک ساہوکار سے کہہ دیا۔ اس نے فوراً پانسو روپے رام داس کو بطور دان دے دیئے۔

چمپا کے بیاہ کے تین ماہ بعد ہڑتالوں کی لہر اٹھی۔ ملوں میں ہڑتالیں ہونے لگیں۔ مزدوروں نے کارخانہ داروں کی غیر انصافی کو سمجھا۔ اپنی آدمیت' انسانیت کو سمجھا۔ رائے صاحب کی مل کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی۔ مل والوں نے مزدوروں کے مطالبات پورے کرنے سے انکار کر دیا۔ مزدوروں کے مطالبات کی سب سے زیادہ مخالفت رائے صاحب نے کی۔ رائے صاحب کہتے تھے کہ یہ لوگ جائیں گے کہاں؟ جب بھوکوں مرنے لگیں گے تو خود آکر قدموں میں گریں گے۔ ایک ہفتہ تک مل بند رہی۔ مگر مزدور اپنی بات پر اڑے رہے۔ مل کا بڑا نقصان ہوا۔ ایک ہفتہ بعد مالکانِ مل کے آسن ہلے۔ انہوں نے سمجھا۔ یہ گانٹھ کھینچا تانی سے کستی ہی جائے گی۔ ادھر مل والوں کی دھمکیوں اور مزدوروں کو بھوکوں مار کر انہیں راہِ راست پر لانے کی پالیسی نے مزدوروں کے دلوں میں کارخانہ داروں کی طرف سے نفرت و غصہ کے جذبات پیدا کر دیئے۔ اس غصہ و نفرت کا نتیجہ مندرجہ ذیل ہوا۔

ایک روز رائے صاحب اپنی موٹر پر مل کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں وہ ایک ایسے مقام سے ہو کر نکلے' جہاں ان کی مل کے مزدوروں کی ایک بڑی ٹولی اپنی میٹنگ کر رہی تھی۔ مزدوروں نے رائے صاحب کی موٹر کو آتے دیکھا۔ ان کی آتشِ غضب بھبھک کر پھوٹ نکلی۔ جونہی موٹر قریب آئی۔ سب نے اسے روک لیا۔ مزدوروں کے موٹر روکنے سے وہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔ ان کا کلیجہ تھرا اٹھا۔ بدن پسینہ پسینہ ہو گیا۔ مزدوروں نے با آواز بلند کہا۔ "مارو! اسے مارو! بس کی گانٹھ یہی ہے۔ اسی کی بدولت ہم لوگوں کے مطالبات پورے نہیں ہو پاتے۔"

مزدوروں نے رائے صاحب کا ہاتھ پکڑ لیا اور چاہا کہ نیچے گھسیٹ لیں۔ اسی وقت ایک آدمی بھیڑ چیر کر موٹر کے پاس آیا۔ اس نے زور سے چلا کر کہا۔ ”ٹھہرو! یہ کیا کرتے ہو؟ خبر دار!“ اس کے اتنا کہتے ہی مزدوروں نے رائے صاحب کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس آدمی نے کہا۔ ”سرکار! آپ نکل جایئے۔ میری موجودگی میں آپ پر آنچ نہیں آ سکتی۔ جب تک یہ جھگڑا طے نہ ہو جائے اس وقت تک آپ گھر سے نہ نکلیں تو اچھا ہے۔“

موٹر ڈرائیور نے جلدی سے موٹر بھیڑ سے نکالی اور مل کی طرف تیزی سے دوڑا دی۔ تھوڑی دور چل کر موٹر ڈرائیور نے کہا۔ ”سرکار! اس وقت خیر گزری۔ اگر رام داس نہ آ جاتا تو خدا معلوم کیا ہو جاتا۔“

رائے صاحب پیشانی کا پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ ”اس میں کیا شک ہے۔ اس وقت رام داس نے ہی جان بچائی۔“

(7)

رائے صاحب پنڈت شاردا پرشاد سے بولے۔ ”جس طرح آپ فیصلہ کر دیں ہمیں منظور ہے۔“

شاردا پرشاد۔ ”میں کیا فیصلہ کر دوں؟ آپ لوگ سمجھ کر طے کر دیجئے۔“

رائے صاحب۔ ”آپ جانتے ہیں مزدوروں کے مطالبات کامل طور سے پورے کرنا ہمارے لیے نقصان دہ ہوگا۔ چنانچہ ایسی تدبیر کیجئے کہ مزدور بھی مطمئن ہو جائیں اور ہمارا بھی کچھ زیادہ نقصان نہ ہو۔“

شاردا پرشاد۔ ”اچھا اس بارے میں کل جواب دوں گا۔ ہاں! میں نے سنا ہے کہ آپ پر کل مزدوروں نے حملہ بھی کیا تھا۔“

رائے صاحب۔ ”واقعی حملہ کیا تھا۔ اگر رام داس انہیں نہ روکتا تو اس حملے کا جو کچھ بھی نتیجہ ہوتا تھوڑا تھا۔“

شاردا پرشاد۔ (مسکرا کر) ”رائے صاحب اگر آپ طعنہ زنی نہ سمجھیں تو کچھ عرض کروں“

رائے صاحب۔ ”آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ میں سمجھ گیا۔ بلاشک اس وقت میں غلطی پر تھا۔“

یہ کہہ کر رائے صاحب نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

تصویرِ خودداری

(1)

تِلوتما ایک ایسے نادار باپ کی بیٹی ہے جس کو اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دس گھر جھانکنے پڑتے ہیں۔ تلوتما کے والد جگد مبا پرشاد کا پیشہ پنڈتائی ہے۔ پوجا پاٹ۔ جنم پتر اور برش پھل بنا کر۔ یگیو پویت اور شادی بیاہ کے مہورت وغیرہ بتلا کر اپنا گھر چلاتے ہیں۔

تلوتما کا بیاہ ایک دولت مند گھرانے میں ہوا۔ صرف اس وجہ سے کہ تلوتما ایک غریب برہمن کی بیٹی ہے۔

تلوتما کے سسرال والے اس کو حقیر سمجھتے اور اس کی عزت نہیں کرتے مگر چونکہ وہ بردبار' سمجھدار' اپنے حالات کو سمجھنے والی ہے۔ اس لیے اس کے خلاف کبھی زبان تک نہیں ہلائی۔

شام کا وقت تھا۔ تلوتما دن بھر اور سخت محنت کرنے کے بعد ایک پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی ہوئی تھی۔ اس کی ساس نے تھوڑی دیر ہوئی' اسے بلایا تھا۔ مگر چونکہ اس کے سر میں درد تھا اس لیے ساس کے حکم کی تعمیل نہ کر سکی۔ ساس کو یہ بات ناگوار گزری کہ اس کے بلانے پر تلوتما یہ کہلادے کہ "میرے سر میں درد ہے۔ مجھ سے اٹھا نہیں جاتا۔" پس وہ خود پیچ و تاب کھا کر اٹھی اور تلوتما کے پاس پہنچ کر بولی۔ "ایسی کہاں کی نیند پھٹ پڑی کہ دن ڈوبتے ہی پلنگ پر چڑھ بیٹھی۔"

تلوتما ساس کو پرنام کرنے کیلئے اٹھ بیٹھی۔ اور کراہتی ہوئی بولی۔ "اماں جی! آج معلوم نہیں۔ کیوں سر میں درد ہوتا ہے مجھے تو آپ برا لگتا ہے۔ مگر کیا کروں اٹھا ہی نہیں جاتا۔"

ساس ناک چڑھا کر بولی۔ "ایسا کون سا درد ہے۔ میرے سر میں آئے دن درد ہوا کرتا ہے۔ مگر میں تو ذرا پروا نہیں کرتی۔ ایسے ایسے دردوں میں منہ لپیٹ کر پڑیں تو کام کیسے چلے۔ چل اٹھ آج مصرانی نہیں آئی۔ چل کر شام کا کھانا بنا۔"

صبح کی کچی رسوئی تلوتما ہی کو بنانی پڑتی تھی۔ شام کو پکا کھانا مصرانی بنایا کرتی تھی۔

تلوتما نے کہا۔ "میں کیا کہوں۔ ماں جی! مجھ سے تو اٹھا ہی نہیں جاتا۔ چکر سا آتا ہے۔ آج تم ہی بنالو تو اچھا ہے۔"

ساس۔ "میں بنالوں۔ واہ بہو رانی! ماں باپ نے اچھی تعلیم دی ہے...... جیسے ہیں ویسے...... اب کیا کہوں؟"

تلوتما چپ چاپ لیٹی رہی۔

ساس غصہ میں بھری ہوئی تھی۔ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس نے کہا۔ "واہ بہو واہ! تم خوب ملیں۔ تمہارے باپ رام دوسروں کو تو گیان سکھاتے پھریں۔ مگر اپنی لاڈلی کو ایک بھی گیان نہ بتایا۔"

ساس نے اس مقصد سے ان لفظوں کا تیر پھینکا تھا کہ اس کی چوٹ سے مضطرب ہو کر تلوتما بھی اس کا جواب دے گی اور یوں اسے آگے وار کرنے کا بہانہ مل جائے گا مگر تلوتما کی خاموشی نے ساس کے سب ہتھیار بیکار و بے مصرف کر دیئے۔ اسے دل کے ارمان دل ہی میں رکھ کر واپس لوٹ جانا پڑا۔

رات کو کھانا کھانے کو بیٹھتے ہوئے تلوتما کے شوہر چھمن پرشاد نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ "ماں کیا آج کھانا تم نے بنایا ہے؟" ماں منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔ "ہاں! آج میں نے ہی بنایا ہے۔

چھمن۔ "کیوں مصرانی نہیں آئی کیا؟"

ماں۔ "مصرانی آج نہیں آئی اور تمہاری بنّو آج دن چھپے ہی سے پلنگ پر لیٹ رہی۔ ان کا سر پھٹا جا رہا ہے۔ ان کے لیے گلاب جل منگواؤ۔ ڈاکٹر وید بلاؤ۔ تب ان کا درد جائے گا۔"

چھمن۔ "اس میں تعجب کی بات ہی کیا ہے۔ درد ہو گیا ہوگا۔"

ماں۔ "ہاں! بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ بڑے آدمیوں کے تو درد ہوتا ہی ہے۔ ہمارے تو آج تک کبھی ایسا درد نہیں ہوا جو ہمیں منہ لپیٹ کر پڑنا پڑتا۔"

لچھمن۔ ”خیر ہو گا۔ اس میں بات ہی کیا ہے؟“

ماں۔ ”اس کے آئے دن یہی نخرے رہتے ہیں۔ جو کسی کھاتے پیتے گھر کی ہوتی تو زمین پر پاؤں ہی نہ رکھتی۔ میں نے تو تمہارے باپ سے نہ معلوم کتنی دفعہ کہا کہ اس گھر میں بیاہ نہ کرو...... نہ کرو مگر کیا کریں۔ لہنا ہی ایسا تھا۔ جو کچھ دیتے لیتے جب بھی صبر آتا کہ لڑکی خواہ کیسی ہے روپیہ تو ملا۔ مگر وہاں تو برات کے لیے پانی تک نہ میسر آیا۔ میرا تو یہی کہنا ہے کہ غریب سے کبھی ناطہ نہ جوڑے۔ اس کا دل بڑا او چھا ہوتا ہے۔“

لچھمن پرشاد چپ چاپ کھانا کھا رہا تھا اور ماں کی باتیں سن کر دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ کسی حد تک یہ باتیں ٹھیک بھی ہیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر لکشمن پرشاد اپنی خواب گاہ میں آیا۔ اس وقت تلوتما کا درد بہت کم ہو گیا تھا۔ شوہر کی آہٹ پاتے ہی تلوتما پلنگ سے اتر پڑی اور پان دان کے پاس جا کر پان بنانے لگی۔

لچھمن نے ذرا طنزاً کہا۔ ”بڑی جلدی درد اچھا ہو گیا۔“

تلوتما۔ ”دو گھنٹے تک تو تڑپتی رہی۔ صندل کا لیپ کرایا تب درد کم ہوا۔“

لچھمن۔ ”آج مصرانی نہیں آئی تھی۔ تم درد لے کر پڑ رہیں۔ کھانا ماں کو بنانا پڑا۔“

تلوتما۔ ”مجھے تو خود شرم آئی تھی۔ مگر کیا کروں اٹھا ہی نہیں گیا“

لچھمن۔ ”اٹھنے کی کوشش کرتیں تو اٹھ ہی بیٹھتیں۔ کام خواہ نہ کرتیں بیٹھی ہی رہتیں۔ تمہارا لیٹ رہنا اماں کو ناگوار ہوا۔“

تلوتما۔ ”خیر جو ہوا سو ہوا۔ میں ہاتھ جوڑ کر انہیں خوش کر لوں گی۔“

لچھمن۔ ”بات یہ ہے کہ تم غریب گھر کی لڑکی ہو۔ تمہیں اسی طرح رہنا چاہیے۔ ہم لوگوں کی نقل کرنا تمہارے لیے مناسب نہیں۔ ہم تو بچپن سے ہی اسی طرح رہتے آئے ہیں۔ ہمیں زیب دیتا ہے۔ مگر تمہیں یہ بات زیب نہیں دیتی۔“

لچھمن پرشاد پہلے بھی چند مرتبہ ایسے ہی کلمات کہہ چکا تھا اور وہ باتیں تلوتما کے دل پر اب تک کانٹے کی طرف کھٹک رہی تھیں۔ تلوتما نے شوہر کی بات سنی۔ شوہر کے لیے دل میں جو محبت تھی۔ اس کو صدمہ پہنچا۔ تلوتما تڑپ اٹھی۔ اس نے شوہر کی طرف حسرت آمیز نظر سے دیکھا۔ وہ زبان خاموش سے کہہ رہی تھی کہ مجھے غریب کی بیٹی سمجھ کر تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ یہ تمہارا ظلم ہے۔ بے انصافی ہے۔ میں سب کچھ برداشت کر سکتی ہوں مگر یہ برداشت نہیں کر سکتی۔

تلوتما یہ سمجھتی ہے کہ لچھمن پرشاد کو مجھ سے کچھ محبت ضرور ہے اور وہ محبت بڑھ بھی سکتی ہے لیکن لچھمن کے دل میں جو امیری غریبی کا امتیاز جاگزین ہے' وہ سچی محبت کو بڑھنے نہیں دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ تلوتما گھر کے کام کاج کے متعلق جملہ فرائض تو حتی الوسع انجام دیتی ہے۔ مگر بات چیت کرنے اور ہنسنے بولنے میں اس کا دل افسردہ رہتا ہے۔ اس کی ویسی ہی حالت ہے جیسی ایک آقا پرست خادم کی ہوتی ہے۔ آقا پرست خادم اپنے آقا کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کی ایک لحظہ کی خوشی کے لیے وہ اپنی جملہ طاقتیں صرف کر دیتا ہے۔ آقا کی خوشی پر وہ دل میں خوش ہوتا ہے۔ مگر اپنی مسرت و شادمانی کو کامل طور سے ظاہر کرنے کی جرات نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں آقا اس کی اس حرکت کو دخل در معقولات نہ سمجھ بیٹھے۔ تلوتما کی بھی یہی حالت ہے۔

لچھمن پرشاد ایک روز تلوتما کا ہاتھ پکڑ کر محبت کے ساتھ بولا۔ ”میرے ایک دوست کلکتہ جا رہے ہیں۔ ان سے لوگوں نے چیزیں منگوائی ہیں۔ تم کچھ بتاؤ تو تمہیں بھی منگوا دوں۔“

تلوتما شوہر کے اس پریم بھرے سلوک سے پھولی نہ سمائی۔ مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کا جی چاہا کہ شوہر کے سینے پر سر رکھ کر دو چار اچھی اچھی چیزوں کی فرمائش کرے۔ مگر پھر خیال آگیا کہ شوہر صاحب دل میں محبت رکھتے ہوئے بھی اسے حقیر سمجھتے ہیں۔ تلوتما رک گئی۔ اس نے سوچا کہیں یہ اپنے دل میں یہ نہ کہیں کہ آخر غریب ہی کی بیٹی تھی نا۔ ذرا سی بات میں اترا گئی۔ اس کے علاوہ جب وہ مجھے اپنے برابر نہیں سمجھتے تو میں کیوں ان سے ہمسری کا سلوک روا رکھوں؟

یہ خیال پیدا ہوتے ہی اس نے عاجزی کے ساتھ ہاتھ چھڑا کر کہا۔ ”نہیں مجھے کچھ نہیں منگانا ہے۔“

لچھمن پرشاد اس کے اس سلوک سے دل میں ناراض ہو گیا۔ وہ سمجھا کہ تلوتما کو کسی اور کا گھمنڈ ہے اس لیے ایسا خشک برتاؤ کرتی ہے۔ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ غریب آدمی بھی کسی بات پر گھمنڈ کر سکتا ہے۔

لچھمن پرشاد تلوتما کے پاس سے چپ چاپ چلا گیا۔

(2)

لچھمن پرشاد اپنی والدہ سے بولا۔ ”ماں تم اسے میکے بھیج دو۔ کچھ عرصہ وہاں رہ کر اس کے حواس ٹھکانے آجائیں گے۔“

لچھمن پرشاد کی ماں بولی۔ ”میری بھی یہی خواہش ہے۔ چٹھی لکھ دو۔ بھائی آکر لے جائے گا۔“

لچھمن پرشاد نے چٹھی لکھ دی۔

ایک ہفتہ کے اندر تلوتما کا بڑا بھائی آگیا۔ تلوتما کی خواہش نہ تھی کہ وہ لچھمن پرشاد کی خدمت گزاری سے محروم رہ کر میکے میں رہے۔ علاوہ ازیں اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو کر اسے میکے بھیج رہا ہے۔ ان حالات میں اس کا جانے کو ہرگز جی نہ چاہتا تھا۔ وہ دل سے چاہتی تھی کہ کوئی سبب ایسا پیدا ہو جائے جس سے اس کا جانا رک جائے۔

جس روز میکے جانا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے رات کو لچھمن پرشاد نے تلوتما سے کہا۔ ”کل کی تیاری ہے اپنا سامان ٹھیک کر رکھو۔“

تلوتما کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن اس نے اس خوف سے کہ کہیں شوہر اس کے آنسو نہ دیکھ لے۔ جلدی سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

لچھمن پرشاد بولا۔ ”اچھا ہے چار چھ ماہ وہیں رہ آؤ۔“

”تمہارے بغیر میں وہاں ایک لمحہ بھی نہیں رہنا چاہتی۔“

یہ الفاظ تلوتما کی زبان پر آکر رہ گئے۔ اس نے اپنے آپ کو فوراً سنبھال لیا اور سوچا کہ ایسا کہنے سے کہیں یہ اپنے دل میں یہ نہ سمجھ لیں کہ یہاں مجھے کھانے پینے اوڑھنے کا سکھ زیادہ ہے۔ اس لیے میں اس سکھ آرام کو چھوڑ کر وہاں نہیں جانا چاہتی۔ تلوتما نے دبی زبان سے جواب دیا۔ ”مجھے تیاری ہی کیا کرنی ہے جو کچھ تھوڑا بہت لے جاؤں

گی۔اسی وقت باندھ لوں گی۔''

چھمن پرشاد نے روکھے پن سے جواب دیا۔''خیر! یہ تم جانو میں نے تمہیں اطلاع دے دی۔''

تلوتما کے دل میں اس وقت ایک طوفان برپا تھا۔ تلوتما کا دل اس بات کے لیے ضد کر رہا تھا کہ وہ ایک بار شوہر کے پاؤں پکڑ کر کہے کہ مجھے کیوں ٹھکرا رہے ہو؟ میں نے تمہاری کیا خطا کی ہے؟ یہ ضرور ہے کہ میں ایک غریب کی بیٹی ہوں۔ میرے ساتھ بیاہ کرنے سے تمہیں اپنوں اور غیروں میں سر اونچا کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ لوگ عموماً تمہیں اس کے لیے طعنے دیا کرتے ہیں۔ مگر ان تمام باتوں کے باوجود بھی تمہیں مجھ کو ذلیل کرنا ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں اپنے دل کا دیوتا سمجھتی ہوں۔ تمہیں خوش کرنے کے لیے تم پر اپنی جان تک نثار کر سکتی ہوں۔ میری اس محبت کی طرف دیکھ کر مجھ سے محبت کرو۔ محبت نہ بھی کرو مگر اپنے چرنوں سے تو الگ نہ کرو۔ میں اپنی محبت کا عوض نہ پا کر بھی صرف تمہاری خدمت بجالانے میں اپنی خوش قسمتی سمجھوں گی۔ تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے نیچے سے اوپر اٹھایا۔ اپنے برابر بٹھایا۔ تو اب کیوں مجھے ٹھکراتے ہو؟ کیوں میری بے عزتی کرتے ہو؟

تلوتما کے دل میں یہ خیالات زور پکڑ رہے تھے۔ اس نے ایک طرح سے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اب کے سامنے ہوتے ہی وہ ضرور ایسا کرے گی۔ مگر چھمن پرشاد کے سامنے آتے ہی اس کے خیالات کا رنگ ایک دم پلٹ گیا۔ اس نے سوچا۔''میں کیوں گڑگڑاؤں؟ میں ان سے کس بات میں کم ہوں۔ غریب ہونا کوئی عیب نہیں۔ میری ان باتوں کے وہ الٹے معنی لیں گے۔ میں ان سے بھیک نہیں مانگ سکتی۔ جو چیز مجھے بطور حق کے حاصل ہونی چاہیے۔ اسے میں بطور خیرات کیوں لوں؟''

تلوتما نے رات تڑپ تڑپ کر کاٹی۔ اس کے دل میں رات بھر آگ سلگتی رہی۔

بوقت رخصت ایک لمحہ کے لیے چھمن پرشاد سے تنہائی میں سامنا ہوا۔ تلوتما کے دل نے کہا۔ اب بھی موقع ہے۔ دردِ دل کے اظہار کے لیے اب بھی وقت ہے۔ مگر تلوتما نے استقلال کے ساتھ کہا۔''نہیں۔''اس نے شوہر کی طرف ایک نظر ڈالی۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ خدا معلوم وہ آنسو تھے۔ یا ایک لمحہ کے لیے دل کی ساری محبت کا عرق کھنچ کر آنکھوں میں آ گیا تھا۔ چھمن پرشاد بھی اس نگاہ کو برداشت کرنے کی تاب نہ لا سکا۔ اس نے ایک آہِ سرد بھر کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیں۔

(3)

تلوتما کو میکے گئے ایک سال کا عرصہ ہو گیا۔ اس اثنا میں تلوتما کے والد نے چھمن پرشاد کو چند خطوط بھی اس مضمون کے لکھے کہ وہ تلوتما کو آ کر لے جائیں مگر اس طرف سے طرح طرح کے بہانے کر کے یہ کہہ دیا جاتا تھا کہ ابھی کچھ دن اور رہنے دو۔

چھمن پرشاد نے تلوتما سے دریافت کیا۔''تو کیا اب تم میرے ساتھ نہ چلو گی؟''

تلوتما نے اشک پونچھتے ہوئے جواب دیا۔''نہیں۔''

چھمن۔''کیوں؟''

تلوتما۔''میں تمہارے لائق نہیں۔ میرے کارن تمہیں طرح طرح کی تکلیفیں ہوتی ہیں۔ اندر باہر کے

طعنے برداشت کرنے پڑتے ہیں۔"

لچھمن۔ (آہ سرد بھر کر) "اس میں شک نہیں کہ اس رشتہ سے ہمارے یہاں کوئی خوش نہیں ہوا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ یہ محض جہالت اور ہماری سوسائٹی کے برے سنسکاروں کا پھل ہے مگر کیا کروں؟ خیر! ان باتوں کی بھی مجھے زیادہ پرواہ نہیں۔ میں اور تم شادی کے رشتہ میں منسلک ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں تمہیں اپنے سے الگ نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ میرے دل میں تمہارے لئے محبت بھی ہے۔"

تلوتما۔ "نہیں نہیں۔ اس پر میں کبھی یقین نہیں کروں گی۔"

لچھمن۔ (تلوتما کا ہاتھ پکڑ کر بولے) "کیوں؟ یقین نہ کرنے کا سبب؟"

تلوتما۔ "اگر تمہارے دل میں میرے لئے محبت ہوتی تو لوگوں کے لاکھ کہنے پر بھی تمہاری نگاہ میری بے مائگی پر کبھی نہ جاتی۔ تم یوں مجھ سے لاپرواہی سے سلوک کبھی نہ کرتے۔"

لچھمن "ہاں! میں نے لاپرواہی کا سلوک ضرور کیا۔ مگر اس سے یہ نہ سمجھو کہ میں تم سے محبت نہیں......"

تلوتما۔ "نہیں نہیں! تم لاکھ کہو۔ میں ہرگز یقین نہ کروں گی۔ تمہارے لئے میرے دل میں جتنی محبت ہے' میرے لئے تمہارے دل میں اگر اس کا آٹھواں حصہ بھی ہوتا تو تم مجھ سے ایسا سلوک کبھی نہ کرتے۔ اچھا! اب ہاتھ چھوڑ دو۔ کوئی آنہ جائے۔"

لچھمن۔ "سنو تو............"

تلوتما۔ "نہیں۔ اب وقت نہیں رہا۔"

یہ کہہ کر تلوتما ہاتھ چھڑا کر چلی۔ لچھمن پرشاد اسے پکڑنے کے لئے لپکے۔ یکایک کسی چیز کی ٹھوکر جو لگی تو وہ منہ کے بل گر پڑے۔ اتنے میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ پھر اسے نیند نہ آئی۔ صبح ہوتے ہی لچھمن پرشاد نے ماں سے کہا۔ "ماں! آج میں وہاں جاتا ہوں۔"

ماں۔ "کیوں؟ کہاں! کیا بہو کو لینے؟"

لچھمن۔ "ہاں!"

ماں۔ "ارے پڑی رہنے دے وہیں۔ اس کے بغیر یہاں کچھ گیہوں نہیں سڑے جاتے۔ جو ایسا ہی ہے تو دوسرا بیاہ کرلیں گے۔"

لچھمن۔ "میں دوسرا بیاہ نہیں کروں گا۔ میں آج اسے لینے جاتا ہوں۔"

یہ کہہ کر لچھمن پرشاد ماں کے پاس سے چلا آیا۔ اور سسرال جانے کی تیاری کرنے لگا۔

لچھمن پرشاد نے گھڑی دیکھ کر نوکر کو بلایا۔ اور اس سے ٹانگہ تیار کرنے کے لئے کہا۔ اور خود کپڑے پہن کر وہ چلنے کے لئے تیار ہوا ہی تھا کہ نوکر نے ایک تار لا کر دیا۔ لچھمن پرشاد نے ناک بھوں چڑھا کر تار کے رسید فارم پر دستخط کئے۔ اور لفافہ پھاڑ کر تار نکالا۔ تار میں لکھا تھا۔

"کل شام تلوتما چل بسی۔"

جگدمبا پرشاد

لچھمن پرشاد تار کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہ گیا۔ تار کے فارم پر سے حروف غائب ہوگئے اور ان کے بجائے تلوتما کی تصویر نمودار ہوگئی۔ تصویر کی وہی نظر تھی جو اس نے بوقت رخصت اس پر ڈالی تھی۔ اس وقت لچھمن

پرشاد کو اس نگاہ میں محبت اور خودداری کے کچھ ایسے ملے جلے جذبات نظر آئے جن کی نہ کوئی مصور تصویر کھینچ سکتا ہے۔ اور نہ کوئی مصنف قلم بند کر سکتا ہے۔

خوبصورت' شوہر پرست اور نیک عورت واقعی حور جنت ہے۔ یہ اس قابل ہے کہ نکہت بن کر پھولوں میں بسے۔ چاندنی کی طرح ماہتاب سے ضیاپاش ہو۔ روشن ہو کر آفتاب سے جلوہ ریز ہو۔ اور آب بن کر جواہرات کی آبرو بڑھائے۔

ادب کی خدمت

(1)

پنڈت شاردا پرشاد ترپاٹھی جب باپ کی آخری رسوم کی ادائیگی سے فارغ ہو چکے تو انہیں معاش کی فکر ہوئی۔ باپ نے ان کے لئے صرف دو سو روپیہ اور ایک چھوٹا سا مکان چھوڑا تھا۔ یہ دو سو روپیہ خرچ ہو جانے کے بعد گزارہ کس طرح ہو گا؟ پیٹ کس طرح پالیں گے؟ اسی فکر میں ترپاٹھی جی گھلے جاتے تھے۔ ترپاٹھی جی ہندی' اردو کے عالم تھے۔ سنسکرت اچھی جانتے تھے اور بنگلہ زبان میں بھی کافی استعداد بہم پہنچائی تھی۔ یہ سب کچھ تھا لیکن صرف انگریزی نہ جاننے کے سبب ان کی قدر نہ ہوتی تھی۔ انگریزی زبان کے عالموں کا تو ذکر ہی کیا' معمولی انگریزی جاننے والوں کے لئے بھی ترپاٹھی جی جاہلوں سے کچھ ہی کم تھے۔ بے کس و حقیر مادری زبان ہندوستانی میں اتنی طاقت کہاں جو اپنے سپوت کا بیڑا پار کر سکے؟ اس وقت ترپاٹھی جی کو ہر طرف سنسان نظر آتا تھا۔ اگر کچھ تسکین ملتی تھی تو اپنی بیوی سے۔ ان کی دھرم پتنی لچھمی دراصل لچھمی تھی۔ پڑھی لکھی اور عقلمند ہونے کے سوا وہ خانہ داری کے دھندوں میں بڑی ہوشیار تھی۔ ترپاٹھی جی کے لئے لچھمی صحرائے دنیا میں گھن دار درخت کے سایہ کے مانند تھی۔ جس وقت ترپاٹھی جی حصول معاش کی کوشش میں ناکام ہو کر اپنے مستقبل کی خوفناک خیالی تصویر کے وہم و گمان سے مضطرب ہو اٹھتے تھے' اس وقت لچھمی ان کی ڈھارس بندھاتی تھی۔

ترپاٹھی جی کو روزِ اول سے ادب سے عشق تھا اور انہوں نے دو ایک اردو ڈرامے بھی لکھے تھے جو اب تک غیر مطبوعہ تھے۔ اگرچہ بہت اچھے نہ تھے مگر اس قابل بھی نہ تھے کہ شائع نہ کئے جائیں۔ تاہم اردو کے اِنے گنے' خودسر اور صرف نام سے کام کی پرکھ کرنے والے پبلشروں کی نگاہ میں وہ صرف ردی کی ٹوکری کے قابل ٹھہرے۔ ترپاٹھی صاحب نے بھی ان ڈراموں کو اپنی پہلی کوشش سمجھ کر پبلشروں کے فیصلہ کو ٹھیک سمجھا۔

بے حد کوشش کرنے کے باوجود بھی جب ترپاٹھی جی کو کوئی ذریعہ معاش نہ ملا تب انہوں نے سوچا کہ لاؤ ایک اور ڈرامہ لکھیں اور اچھا لکھنے کی کوشش کرنے پر اچھا ہی لکھا جائے گا اور کوئی نہ کوئی پبلشر اسے ضرور لے گا۔ اسی امید کو دل میں جگہ دے کر ترپاٹھی جی نے لگاتار دو ماہ تک محنت کر کے ایک ڈرامہ لکھا۔ یہ ڈرامہ اپنی رائے میں انہوں نے بہت اچھا لکھا تھا۔ جب مکمل ہو گیا تو اسے انہوں نے دو تین پبلشروں کے پاس بھیجا۔

ایک روز بچھی نے شوہر سے پس و پیش کرتے ہوئے کہا۔
"اب صرف چالیس روپے رہ گئے ہیں۔"
ترپاٹھی جی چونک کر بولے۔ "صرف چالیس! یہ چالیس کب تک چلیں گے؟ بہت چلے تو دو مہینے۔"
بچھی ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ "بہت کفایت کی جائے تو ڈھائی مہینے چل جائیں گے۔"
ترپاٹھی جی۔ "جیسے دو ویسے ڈھائی' کوئی بڑا فرق نہیں۔ اف! اس کے بعد پھر کیا ہوگا؟ نوکری کہیں ملتی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں وہیں پوچھتے ہیں' انگریزی جانتے ہو؟ ہندی اردو کو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ دیسی زبانوں کی ترقی کی آواز تو چاروں طرف سے آتی ہے مگر دیسی زبان جاننے والوں کو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ کیسا زمانہ آیا ہے۔ خیر! دیکھا جائے گا۔ ڈرامہ بھیجا ہے' اگر کسی پبلشر نے لے لیا تو کچھ نہ کچھ مل ہی رہے گا۔"

(2)

دو تین دن کے بعد پبلشروں کی طرف سے جواب موصول ہوا۔ ایک صاحب نے تحریر فرمایا۔ "ڈرامہ کچھ اچھا نہیں' تاہم شائع کر دیا جائے گا۔ چھپ جانے پر دوست احباب میں تقسیم کرنے کے لئے آپ کو کچھ جلدیں بھیج دی جائیں گی۔ اگر یہ منظور ہو تو لکھ بھیجیں۔"
ایک صاحب نے لکھا۔ "ڈرامہ شائع کرنے کے لئے ہم تیار ہیں مگر نقد کچھ نہیں دے سکتے۔ چھپ جانے پر دو سو جلدیں نذر کر سکتے ہیں۔"
غرض اسی ڈھنگ پر جواب دیا گیا۔ گویا وہ ترپاٹھی جی کا ڈرامہ شائع کر کے ان پر احسان کریں گے۔
ترپاٹھی جی ان خطوط کو پڑھ کر آگ بگولہ ہو گئے۔ خطوط چاک کر کے پھینکتے ہوئے بولے۔ "سب لٹیرے ہیں۔ مہذب ڈاکو ہیں۔ دن دہاڑے لوٹنا چاہتے ہیں۔ بس آج سے ادب کی خدمت کا نام نہ لوں گا۔ مزدوری کروں گا' بھیک مانگوں گا مگر علم ادب کی خدمات انجام دے کر ان لٹیروں کی جیبیں ہرگز نہ بھروں گا۔ ادب کی خدمت کروں ہی کیوں؟ جس ادب میں اتنی طاقت نہیں کہ اپنے ایک ادنیٰ خادم کا پیٹ پال سکے' اس ادب کی خدمت کرنا بالکل فضول ہے۔"
شام کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر بچھی نے شوہر سے کہا۔ "دوپہر کو تم اس قدر غصے میں تھے کہ اس وقت مجھے تم سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی مگر اب پوچھتی ہوں۔ "کیا سچ مچ ہی تم نے علم و ادب کی خدمت نہ کرنے کا عہد کر لیا ہے؟"
ترپاٹھی جی کو پھر جوش آ گیا۔ بولے "عہد نہ کر لوں تو کیا کروں؟ جس خدمت سے پیٹ بھر کھانے کو بھی نہ ملے' اس خدمت سے حاصل؟"
بچھی نے عاجزی سے کہا۔ "اگر میری بات مانو تو کچھ کہوں؟"
ترپاٹھی جی بولے۔ "کیا کہتی ہو' کہو؟"
بچھی۔ "پہلے یہ قول دو کہ جو کچھ میں کہوں گی' اسے مانو گے۔"
ترپاٹھی جی ایک لمبی آہ بھر کر بولے۔ "مجھے اس بات کا بڑا دکھ ہے کہ میں اس زندگی میں تمہیں کوئی سکھ نہ

دے سکا۔ جب روٹی تک کے لالے پڑے ہیں' اس وقت اور کسی راحت و آرام کا ذکر ہی کیا ہے۔ اگر ان پرانوں کی آہوتی دے کر بھی میں تمہیں سکھی کر سکتا ہوتا تو بخوشی کرتا۔"

یہ کہتے کہتے ترپاٹھی جی کا گلا بھر آیا۔

لچھمی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے شوہر کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ "مجھے تمہارے چرنوں کی سیوا میں جو سکھ ملتا ہے' وہ راج سنگھاسن مل جانے پر بھی نہیں مل سکتا۔ اب میں جو کہتی ہوں' وہ کرو۔"

ترپاٹھی جی بولے۔ "کہو کیا کہتی ہو؟ میں تمہاری بات کبھی نہ ٹالوں گا۔"

لچھمی۔ "میں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ تم ایک ڈرامہ اور لکھو۔"

ترپاٹھی جی نے متحیر ہو کر کہا۔ "یہ تم کیا کہتی ہو لچھمی؟ اتنے ڈرامے لکھے' ان سے کیا حاصل ہوا؟ ان کو جلا کر ایک روز کی روٹیاں بھی تو نہیں پک سکتیں۔ ڈرامے کا نام نہ لو۔ اس کے لکھنے میں لہو پانی ہو جاتا ہے مگر ہاتھ کچھ نہیں آتا۔"

لچھمی نے کہا۔ "کچھ بھی ہو، ایک ڈرامہ اور لکھو۔"

ترپاٹھی جی ذرا بگڑ کر بولے۔ "لکھوں تو سب کچھ مگر کس کے لیے؟"

لچھمی۔ "میرے لئے۔"

ترپاٹھی جی نے حیران ہو کر کہا۔ "تمہارے لئے؟ اس کا کیا مطلب؟"

لچھمی بولی۔ "اس کا مطلب یہی کہ مجھے خوش کرنے کے لئے' مجھے سکھی کرنے کے لئے۔"

ترپاٹھی جی اور بھی زیادہ متعجب ہو کر بولے۔ "کیا تم کو اس سے خوشی حاصل ہو گی؟ سکھ ملے گا؟"

لچھمی۔ "ہاں! خوشی حاصل ہو گی۔ سکھ ملے گا۔"

ترپاٹھی جی۔ "تمہاری بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آتی لیکن تم کو اس سے سکھ ملے گا تو میں ضرور لکھوں گا۔ صرف تمہیں خوش کرنے کے لئے لکھوں گا۔"

لچھمی۔ "اچھا! یہ بھی بتا دو۔ ڈرامے کا مضمون کیا ہو گا؟"

ترپاٹھی جی۔ "یہ ابھی کیسے کہوں؟ سوچ لوں پھر بتاؤں گا۔"

لچھمی۔ "میری خواہش ہے کہ تم آپ بیتی لکھو۔"

ترپاٹھی: "آپ بیتی کا کیا مطلب ہے؟"

لچھمی۔ "مطلب وطلب تو میں کچھ نہیں جانتی۔ آپ بیتی کے جو معنی ہوتے ہیں وہی معنی ہیں۔"

ترپاٹھی جی کچھ دیر تک سوچ کر بولے۔ "میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ اچھا! لکھوں گا۔"

(3)

ترپاٹھی جی نے ایک ماہ کی سخت مسلسل محنت کے بعد ڈرامہ تیار کیا۔ لچھمی کو ڈرامہ دے کر بولے "لچھمی! یہ ڈرامہ میں نے صرف تم کو خوش کرنے کے لئے لکھا ہے، اس لئے اسے تم ہی رکھو۔ اگر اس سے تمہیں ذرا بھی خوشی حاصل ہو گی تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت سپھل ہوئی۔"

لچھمی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور ڈرامہ لے کر اپنے پاس رکھ لیا۔

دو تین دن کے بعد لچھمی نے شوہر سے کہا۔ "تم نے پانچ چھ دن ہوئے کہا تھا کہ یہاں ایک تھیٹر کی کمپنی آئی ہوئی ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ تم اس کے مالک کو دکھاؤ، ممکن ہے وہ اسے لے لیں۔"

ترپاٹھی جی۔ "میں اب کہیں نہ لے جاؤں گا۔ میں نے اسے صرف تمہارے لئے لکھا ہے۔"

لچھمی۔ "اچھا! میری ہی چیز سمجھ کر لے جاؤ۔"

ترپاٹھی جی۔ "اس سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

لچھمی۔ "نہ ہو۔ تم اسے لے تو جاؤ۔"

دوسرے دن ترپاٹھی جی وہ مسودہ لے کر کمپنی کے منیجر کے پاس پہنچے۔ منیجر کو ڈرامہ دکھایا۔ منیجر نے کہا۔ "ڈرامہ اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ہم اسے ایک شرط پر لیتے ہیں۔ ہم اسے تیار کرتے ہیں۔ غالباً ایک ماہ میں تیار ہو جائے گا۔ تیار ہو جانے پر ہم اسے یہیں کھیلیں گے۔ کھیلے جانے پر اگر لوگوں نے پسند کیا تو ہم آپ کو پانچ سو روپیہ نذر کریں گے لیکن اگر لوگوں نے پسند نہ کیا تو ہم کچھ نہ دے سکیں گے۔"

ترپاٹھی جی نے یہ شرط فوراً منظور کر لی۔

آج ترپاٹھی جی کا ڈرامہ پہلی دفعہ کھیلا جائے گا۔ شام کو لچھمی نے شوہر سے کہا۔ "آج ڈرامہ کھیلا جائے گا۔ تم تو ضرور جاؤ گے۔"

ترپاٹھی جی نے جواب دیا۔ "کیا کروں گا جا کر؟ جو کچھ ہو گا کل معلوم ہو جائے گا۔"

لچھمی۔ "معلوم کیا ہو جائے گا۔ تمہیں ضرور جانا چاہیے۔"

ترپاٹھی جی بولے۔ "چلا تو جاتا مگر ان برے حالوں جانا مناسب نہیں۔ ٹوپی بھی پھٹی ہے۔ جوتا بھی ٹوٹا ہوا ہے۔ اس طرح کیسے جاؤں؟"

لچھمی نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ چپ چاپ کوٹھری کے اندر چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد کوٹھری سے نکل کر اس نے شوہر کے ہاتھ میں دس روپے دیئے اور کہا۔ "اپنے لئے ضروری چیزیں لے آؤ۔ یہ روپے میں نے کسی نہ کسی طرح ایسے ہی موقع کے لئے بچا لئے تھے۔"

رات کو ترپاٹھی ڈرامہ دیکھنے کے لئے پہنچے۔ نیا تماشہ ہونے کے سبب بھیڑ کافی تھی۔ ترپاٹھی دھڑکتے ہوئے دل سے تماشہ شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

وقت مقررہ پر پردہ اٹھا۔ تماشہ شروع ہوا۔ ترپاٹھی جی تماشہ دیکھ رہے تھے مگر کان تماشائیوں کی گفتگو پر لگے ہوئے تھے۔ پہلا ایکٹ ختم ہوا۔ پردہ گرتے ہی تماشائیوں میں رائے زنی ہونے لگی۔

ایک صاحب نے فرمایا۔ "تماشہ تو کچھ ڈھنگ کا نہیں معلوم ہوتا۔"

دوسرے صاحب بولے۔ "اجی بالکل ردی ہے۔ نام بڑے اور درشن چھوٹے۔"

اسی طرح اوروں نے بھی ایسا ہی کہا۔ ترپاٹھی جی کا حوصلہ پست ہو گیا اور دکھی ہو کر ہال کے باہر آئے۔ باہر آ کر منیجر کے پاس پہنچے۔ منیجر انہیں دیکھتے ہی بول اٹھا۔ "پنڈت جی! تماشہ تو پاس ہوتا معلوم نہیں ہوتا۔"

ترپاٹھی جی نے کہا۔ "میری تقدیر! اور کیا کہوں؟"

اس کے بعد ان کا دل اس قدر خراب ہوا کہ انہوں نے باقی ماندہ دو ایکٹ نہ دیکھنا ہی مناسب سمجھا۔ چنانچہ وہ چپ چاپ گھر کو چل دیئے۔

(4)

شوہر کو جلدی لوٹتے دیکھ کر لچھمی ذرا متحیر ہو کر بولی۔ ”جلدی کیسے چلے آئے؟“
ترپاٹھی جی۔ ”چلا آیا۔ دل نہیں لگا۔“
لچھمی۔ ”کیوں؟“
ترپاٹھی جی۔ ”لوگوں نے کچھ پسند نہیں کیا۔“
لچھمی متعجب ہو کر ”ایں! پسند نہیں کیا۔ یہ کبھی ممکن نہیں۔“
ترپاٹھی جی۔ ”مجھے اس کی کچھ فکر نہیں۔ میں نے تو وہ تمہارے لئے لکھا ہے۔ تم نے اسے پسند کیا، میری محنت سپھل ہو گئی۔ اب چاہے اسے کوئی پسند کرے یا نہ کرے۔“
لچھمی۔ ”مگر مجھے یقین ہے کہ لوگ اسے ضرور پسند کریں گے۔ اس ڈرامے میں دل کے سچے جذبات ظاہر کئے گئے ہیں۔ وہ لکھا گیا ہے ایک انسانی دل کو متاثر کرنے کے لئے۔ خواہ میرا دل ہو یا کسی اور کا۔ ایسی حالت میں اگر وہ تماشائیوں کے دل پر اثر نہ ڈالے تو بڑے تعجب کی بات ہو گی...... مجھے یقین نہیں آتا کہ تماشائیوں کے پہلو میں دل ہی نہیں ہے۔“
ترپاٹھی جی۔ ”تم ناحق فکر کرتی ہو، مجھے اس وقت تو ضرور تکلیف ہوئی تھی مگر تمہارے پاس آتے ہی میرا سب دکھ دور ہو گیا کیونکہ مجھے یہ بات یاد آ گئی کہ وہ تمہارے لئے لکھا گیا تھا اور تم نے اسے پسند کیا۔ اب مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔“
لچھمی نے مسکرا کر گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ اس رات کو میاں بیوی بے فکر ہو کر راحت کی نیند سوئے۔ دونوں کے دل باہمی پیار و محبت سے لبریز تھے۔ کل کیا ہو گا؟ اس کی فکر دونوں میں سے کسی کو نہ تھی۔
دوسرے دن صبح کے نو بجے کمپنی کے چپڑاسی نے ترپاٹھی جی کے مکان پر آ کر انہیں ایک چٹھی دی۔ چٹھی منیجر کی لکھی ہوئی تھی۔ منیجر صاحب نے لکھا تھا۔

”ڈیر پنڈت جی!

کل تو آپ ایسے غائب ہوئے کہ پتہ بھی نہ لگا۔ اتنی جلدی گھر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے افسوس ہے کہ کل آپ نے اپنے ڈرامے کے باقی دو ایکٹ نہ دیکھے۔ ان دونوں ایکٹوں کو پبلک نے بے حد پسند کیا۔ آج بھی آپ کا ڈرامہ کھیلا جائے گا۔ آپ کے ڈرامہ کو پوری پوری کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ آپ کے پانچ سو روپے بطور امانت رکھے ہیں' آ کر لے لیجئے۔ ساتھ ہی ایک درخواست اور ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے مستقل ڈرامائسٹ ہو

جائیں۔اس کے لئے ہم آپ کو ایک سو پچاس روپیہ ماہوار پیش کریں گے۔امید ہے
کہ آپ ہماری اس درخواست پر غور فرماویں گے۔"

آپ کا صادق منیجر

ترپاٹھی جی نے چٹھی لے کر چھمی کو دکھائی اور بولے۔"یہ سب تمہاری عنایت کا پھل ہے۔"
چھمی نے کہا۔"نہیں، یہ تمہاری نشپھل ادبی خدمات کا پھل ہے۔ خدمت کبھی نشپھل نہیں جاتی۔اگر خدمت کا عوض جلدی نہ ملے تو اس خدمت کو نشپھل (رائیگاں) نہ سمجھنا چاہیے۔"
ترپاٹھی جی چھمی کی ٹھوڑی پکڑ کر بولے۔"جب چھمی خوش ہوئی تو سب دکھ دور ہو گئے۔"
چھمی نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

بگلا بھگت

(1)

پنڈت روپ کشور بی۔اے،ایل۔ایل۔بی وکیل ہائی کورٹ بگڑ کر بولے۔"صاحب پہلے محنتانہ نکالئے' پیچھے کوئی بات کیجئے۔ میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں جو آپ کے ساتھ فضول مغز پچی کروں۔"
موکل۔"سرکار پہلے یہ تو معلوم ہو کہ یہ معاملہ چلے گا بھی یا نہیں؟"
وکیل صاحب ناک بھوں سکوڑ کر بولے۔"جب ہم چلاویں گے تو چلے گا کیوں نہیں؟ چلانا یا نہ چلانا ہمارے ہاتھ میں ہے۔"
وکیل صاحب کے پاس ہی رام نرائن بیٹھا تھا۔ یہ شخص وکیل صاحب کے لیے موکلوں کو پھانس کر لایا کرتا تھا۔رام نرائن بولا۔"اجی چلانے کی بات کیا کہتے ہو؟ ہمارے وکیل صاحب سچے کو جھوٹا کر دکھانے والے آدمی ہیں۔ابھی دس پندرہ دن کی بات ہے' ایک مقدمہ جیتا ہے۔ یقین مانناوہ سولہوں آنے جھوٹا تھا مگر ہمارے وکیل صاحب نے وہ بحث کی۔ایسی ایسی نظیریں پیش کیں کہ جج صاحب کو سوائے جتانے کے اور کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑااور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ عدالت کے جتنے حاکم ہیں' وہ سب وکیل صاحب کے دوست ہیں۔ کبھی کبھی تو ایسا ہو جاتا ہے کہ حاکم فیصلہ لکھنے کے لیے انہیں کو بنگلے پر بلا لیتے ہیں۔(وکیل صاحب سے مخاطب ہو کر) کیوں سرکار!وہ کون سا کیس تھا جس میں جج صاحب نے آپ سے فیصلہ لکھوایا تھا؟"
وکیل صاحب منہ بنا کر بولے۔"اجی ہو گا بھی۔ان جھگڑوں سے کیا مطلب؟(موکل سے) ہم نے تمہارا کیس بخوبی سمجھ لیا ہے۔ایسے ایسے کیس خدا معلوم کتنے ہم جیت چکے ہیں۔"
یکا یک اسی وقت وکیل صاحب کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ٹیلی فون وکیل صاحب کا پرائیویٹ ٹیلی فون تھا۔اس کا تعلق صرف وکیل صاحب کے زنان خانے سے تھا۔وکیل صاحب نے جھٹ ٹیلی فون

کا چونگا کان سے لگایا اور کہنے لگے۔ ”ہیلو! آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ اوہو...... سب جج صاحب ہیں۔ معاف کیجئے گا...... اچھا...... اب آپ ہی سوچ سمجھ کر فیصلہ لکھ لیجئے۔ آپ سے زیادہ میں کیا سمجھ سکتا ہوں...... یہ آپ کی عنایت ہے جو ایسا سمجھتے ہیں...... ہاں۔ ہاں...... یہی میری بھی رائے ہے...... مدعا علیہ کی طرف سے اچھا ثبوت ہے...... اچھا...... خیر میں...... شام کو کھانا کھانے کے بعد حاضر ہوں گا۔“

وکیل صاحب چونگا ٹیلی فون پر لٹکا کر خود بخود بولے۔ ”ناک میں دم ہے۔ نہ معلوم انہیں کس احمق نے سب جج بنا دیا؟ تنخواہ آپ لیں' سب ججی کی شان آپ جھاڑیں اور فیصلہ لکھنے کے لیے صلاح ہم سے پوچھیں۔ خوب!“

ادھر موکل یہ کارروائی دیکھ سن کر متحیر رہ گیا۔ اس نے سوچا' جب فیصلہ ان کے مشورے سے لکھا جاتا ہے۔ تب یہ کاہے کو کوئی مقدمہ ہارتے ہوں گے۔ اس غریب کو کیا خبر کہ وکیل صاحب کے زنان خانے سے ان کا نوکر صرف گھنٹی بجا کر جج صاحب کا پارٹ ادا کر رہا ہے اور اصلی ٹیلی فون وکیل صاحب کے لکھنے پڑھنے کے کمرے میں لگا ہوا ہے۔

موکل ڈرتا ہوا بولا۔ ”تو سرکار! کیا محنتانہ ہو گا؟“

رام نرائن نے جواب دیا۔ ”ٹھاکر صاحب! ہمارے وکیل صاحب کو لالچ چھو نہیں گیا۔ میں سچ کہتا ہوں۔ اگر دوسرا وکیل حاکموں کا اس قدر منہ لگا ہو تو لوگوں کو لوٹ لے مگر ہمارے وکیل صاحب میں یہ بات نہیں۔ انہیں غریبوں کا بڑا خیال رہتا ہے۔ اب تم سے کون بکواس کرے' تم پچیس روپے دے دو مگر ہاں جیت جانے پر شکرانہ بھی دینا پڑے گا۔“

موکل نے کہا۔ ”شکرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔“

یہ کہہ کر اس نے کمر سے بیس روپے نکال کر وکیل صاحب کے سامنے رکھ دیئے اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اب سرکار ہمارے اوپر رحم کریں۔ ہم بڑے غریب آدمی ہیں۔ آپ سمجھ لینا کہ ایک مقدمہ پُن کھاتے لڑ دیا۔ بس اتنی کرپا کرو۔ ہاں شکرانہ ہم پورا کر دیں گے۔ چاہے چوری کریں' چاہے بھیک مانگیں۔ اس میں کوئی کور کسر نہ رکھیں گے۔“

وکیل صاحب اپنے دلال رام نرائن کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”کیوں بھئی رام نرائن! یہ کیا کہتے ہیں؟“

رام نرائن۔ ”خیر سرکار! جو کچھ یہ دیں' لے لیجئے۔ ان کی ہماری پرانی جان پہچان ہے۔ بیچارے بڑے شریف آدمی ہیں مگر کیا کریں' غریب ہیں۔“

وکیل۔ ”خیر تمہارے کہنے سے لیے لیتے ہیں۔“

یہ کہہ کر وکیل صاحب نے روپے اٹھا کر جیب میں ڈال لیے۔

موکل اٹھ کر بولا۔ ”تو سرکار! ہم اب کب آویں؟“

وکیل۔ ”کل صبح چلے آنا۔ لکھا پڑھا کر ٹھیک کرا دیں گے اور کل ہی داخل بھی کرا دیں گے۔“

موکل سلام کر کے چل دیا۔ رام نرائن بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔ باہر آ کر اس سے بولا۔ ”یار! ہم نے تمہارا دس روپے کا فائدہ کرایا ہے۔ اور کوئی ہوتا تو وکیل صاحب تیس سے ہرگز کم نہ لیتے۔ اب کچھ ہمیں بھی دلواؤ۔“

موکل۔ "ہاں بھائی! اس وقت تم نے بڑی کرپا کی جو کہہ دیا' ہماری ان کی پرانی جان پہچان ہے۔ اسی لیے انہوں نے بیس روپے لے لیے۔ (تین روپے نکال کر) اچھا! یہ تم رکھو۔"

رام نرائن۔ "دس روپے کا فائدہ کرایا اور تین روپے! ارے بھائی! کم سے کم پانچ تو دیتے۔ خیر! جو تمہاری مرضی!"

موکل سے تین روپے اینٹھ کر رام نرائن وکیل صاحب کے پاس لوٹ آیا اور ان سے بولا۔ "کہیے سرکار! آج کیسا شکار پھانسا نہ کہیئے گا۔"

وکیل صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "ایسا ہی روز پھانس کر لایا کرو' تب مزا ہے۔"

رام نرائن۔ "سرکار! ایسے بدھو روز ملتے کہاں ہیں؟ اسے تو آج اسٹیشن ہی سے پھانس لایا۔ جونہی جھولا لادے اور ہاتھ میں کاغذ کا پلند لیے گاڑی سے اترتے دیکھا تو ں ہی سمجھ گیا کہ یہ کچہری جائے گا۔ بس میں نے باتوں میں لگا کر پھانس لیا۔ سرکار نے بھی اس وقت خوب رنگ جمایا۔"

وکیل۔ "ارے۔ یہ تو دیہاتی ہے۔ کوئی شہر کا ہو۔ تب بھی میں ایسا رنگ جماؤں کہ اُلو بن جائے۔"

رام نرائن۔ "اچھا سرکار! اب ہمیں بھی ہمارا حق دلوایئے۔"

وکیل صاحب نے پانچ روپے نکال کر دیئے۔

رام نرائن۔ "صرف پانچ ہی روپے؟ پندرہ کے بیس دلوائے' یہ خیال رکھئے۔"

وکیل۔ "خیر! کسی دوسرے مقدمہ میں سمجھ لیں گے۔ اس وقت ہمیں روپیوں کی بہت ضرورت ہے۔"

رام نرائن۔ "یہ دوسری بات ہے۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتا ہوں کہ ابھی دے دیجئے۔"

(2)

وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔ "اب کی کانگریس میں نہ چلو گے؟"

وکیل صاحب کے دوست نرنجن لال نے کہا۔ "دیکھئے۔ شاید ہی چل سکوں۔"

وکیل۔ "یار! تم معلوم نہیں کیسے آدمی ہو؟ تم کو حب الوطنی چھو کر بھی نہیں گئی۔"

نرنجن۔ "کیا کروں۔ اس بار ایک ایسا کام آپڑا ہے کہ شاید نہ جاسکوں۔"

وکیل۔ "میں تو وطن کے لیے ضروری سے ضروری کام پر بھی لات مارنے کو تیار رہتا ہوں۔"

نرنجن۔ "آپ کی بات الگ ہے۔ آپ کی سی حب الوطنی کے جذبات میرے سینے میں ہوتے تو پھر کہنا ہی کیا تھا! پرسوں آپ نے جو "ہندوستان کے افلاس" پر تقریر کی تھی' اس کی لوگ بڑی تعریف کر رہے ہیں۔"

وکیل۔ "میں نے تو سب باتیں صاف صاف کہی تھیں۔ ہمارا ملک بہت غریب ہے اور اس غریبی یا افلاس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ کسانوں کو سہولتیں حاصل نہیں۔ ٹیکس رات دن بڑھتے جاتے ہیں۔ ہم لوگ آپس ہی میں ایک دوسرے کا خون پینے کے لیے کمر کسے رہتے ہیں۔"

نرنجن۔ "آپ کا دیش پریم دیکھ کر بعض اوقات میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کہیں آپ سب چھوڑ چھاڑ کر دیش کے اُدھار ہی میں نہ لگ جائیں۔"

وکیل (سرد آہ بھر کر) ”کیا کروں۔ ایسے قید و بند میں پڑا ہوں کہ کچھ کرتے نہیں بنتا ورنہ میری تو یہ زبردست آرزو ہے کہ وطن کی خدمت کے سوائے میں اور کچھ بھی نہ کروں۔ دیکھئے! اور وکیل کتنا روپیہ پیدا کر رہے ہیں۔ مجھے ان کی نسبت نصف آمدنی بھی نہیں۔ سبب کیا ہے؟ یہی کہ میرے وقت کا بیشتر حصہ تو ملک کے کام میں صرف ہو جاتا ہے۔ بھائی! یقین ماننا۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب میں ملک کی حالت پر غور کرنے میں محو ہوتا ہوں اور کوئی موکل آجاتا ہے تو بڑا برا لگتا ہے اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے فرصت نہیں۔“

نرنجن۔ ”سچ تو یہ ہے کہ وطن کی خدمت کرنے کے لیے بڑی قربانی کی ضرورت ہے۔“

وکیل۔ ”بڑا ایثار چاہیے صاحب! بڑا ایثار! یہ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے مگر بھائی صاحب! قربانی کرنے والے کرتے ہی ہیں۔ مہاتما گاندھی کو دیکھئے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر آدمی ان مہاپرشوں کے اصولوں پر عمل کرے تو آدمی ہو جائے۔ میں تو یہی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک روز مجھے یہ سنک سوار ہوئی کہ یہ کوٹ پتلون سب اتار ڈالوں اور سیدھے سادے کپڑے پہنا کروں مگر پھر میں نے سوچا کہ کپڑے کا کیا ہے؟ کپڑے چاہے جیسے پہنو دل صاف رہنا چاہیے۔“

نرنجن۔ ”ہاں۔ اصل تو دل ہی ہے۔“

وکیل۔ ”بس کھدر کے سادہ کپڑے پہن لیے اور دل میں کچھ نہ ہوا تو کس کام کا؟“

نرنجن۔ ”اچھا! تو اب اجازت دیجئے۔ جاؤں گا۔“

یہ کہا اور نرنجن لال اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے پر تھوڑی دیر بعد وکیل صاحب کا ایک دوسرا دلال آیا اور وکیل صاحب کو مخاطب کر کے بولا۔ ”آج ایک بڑی موٹی آسامی پھانس کر لایا ہوں۔“

وکیل۔ ”سچ؟“

دلال۔ ”دیکھ لیجئے گا۔“

وکیل: ”کہاں ہے؟“

دلال۔ ”باہر بٹھلا آیا ہوں۔ اس سے کہا کہ دیکھ لوں وکیل صاحب آرام تو نہیں کر رہے ہیں۔ اچھا! ایک بات میں نے اور سوچی ہے۔“

وکیل۔ ”وہ کیا؟“

دلال۔ ”وہ شخص پڑھا لکھا تو کچھ نہیں ہے۔ اس سے کسی طرح...... بس سمجھ جائیے۔“

وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔ ”بات تو دور کی سوچی مگر نصفا نصف رہا۔ مقدمہ ہم مفت لڑ دیں گے۔“

دلال۔ ”یہ مانا مگر بہت ہوشیاری سے۔ کہیں سنک نہ جائے۔“

وکیل: ”اجی! دیکھ لینا کیا مجال جو پتہ بھی چل جائے۔ اچھا تو جھٹ پٹ بلا لاؤ۔“

دلال باہر چلا گیا۔ ادھر وکیل صاحب نے مسکرا کر سگریٹ سلگایا۔ دلال کچھ ہی دیر میں ایک دیہاتی کو ساتھ لیے ہوئے آیا اور اسے ایک کرسی پر بٹھلا کر بولا۔ ”دیکھو۔ یہی وہ وکیل صاحب ہیں جن کی ہم نے تم سے تعریف کی تھی۔“

دیہاتی نے وکیل صاحب کو سلام کیا۔ وکیل صاحب نے بڑی لاپروائی کے ساتھ صرف سر ہلا دیا۔

دلال۔ ”سرکار! انہیں ایک نالش دائر کرنی ہے۔“

وکیل۔ ”کیسی نالش؟“

دلال۔ ”ایک آدمی سے انہیں پانچ سو روپے لینے ہیں۔ اسی کی نالش کرنی ہے۔“

وکیل۔ ”ہنڈی پر دیئے تھے یا رقعہ پر؟“

دیہاتی۔ ”صاحب! ہنڈی' رقعہ کچھ نہیں ہے۔ ایسے ہی ہاتھ ادھار دیئے تھے۔“

وکیل۔ ”پانچ سو روپے اور ہاتھ ادھار!“

دیہاتی۔ ”صاحب! اعتبار پر دیئے تھے۔ اب وہ ادھرم پر اتر آیا ہے۔“

وکیل۔ ”گواہ ہے؟“

دیہاتی۔ ”گواہ تو تم جان لیو' ایک نہیں بیس ہیں۔“

وکیل۔ ”تو بس پھر کیا ہے' تمہارے روپے مل جائیں گے۔“

دیہاتی۔ ”ہاں! بس ایسی کرپا کرو۔ روپے کا ہمیں کچھ نہیں۔ پر دشمن کے آگے مونچھ نیچی نہ ہو۔ بس ہم یہی چاہتے ہیں۔ روپیہ چاہے جتنا خرچ پڑے۔“

وکیل۔ ”پڑھے لکھے ہو؟“

دیہاتی۔ ”پڑھا تو رہا۔ مُدا اب سب بھول بھال گئے۔“

وکیل۔ ”دستخط بھی نہیں کر سکتے؟“

دیہاتی۔ ”اب تو کالا اچھر بھینس برابر ہے۔“

وکیل۔ ”یہ تو دقت ہے۔“

دلال۔ ”انگوٹھے کا نشان تو بنا ہی سکتے ہیں' پھر دستخط کی کیا ضرورت ہے؟“

وکیل۔ ”یہ لوگ دیہات کے آدمی ہیں...... کھیتی کسانی کا کام کرتے ہوں گے۔ اس کام میں انگوٹھے کی لکیریں ٹھیک نہیں رہتیں۔“

دلال۔ ”اجی! ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ بنا کر دیکھ ہی نہ لیجئے۔“

وکیل صاحب نے ایک کاغذ کا ٹکڑا اور سیاہی کی ڈبیہ دلال کو دے کر کہا۔ ”اچھا بنوا کر دیکھو!“

دلال۔ ”ہاں! ذرا دیکھیں تمہارا انگوٹھا ٹھیک ہے یا نہیں؟“

یہ کہہ کر دلال رام نے انگوٹھے کا نشان لیا اور اسے وکیل صاحب کے سامنے رکھ کر کہا۔ ”دیکھئے ایسا آیا ہے۔“

وکیل صاحب دیکھ کر بولے۔ ”ٹھیک تو ہے مگر جب اشٹامپ پر بھی ایسا ہی آوے تب ہے۔“

دلال۔ ”تو اشٹامپ پر بھی دیکھ ہی لیجئے۔ ایک ٹکٹ ہی تو خراب ہوگا اور کیا؟“

وکیل صاحب نے لاپروائی سے کہا۔ ”دیکھ لو۔“

دلال۔ ”تو ایک کاغذ کا ٹکڑا اور ایک اشٹامپ دے دیجئے۔“

وکیل صاحب نے ایک لمبا کاغذ اور چار پیسے والا ٹکٹ نکال کر دیا اور خود ایک کتاب کھول کر مطالعہ میں مصروف ہو گئے۔ میاں دلال نے جھٹ کاغذ پر ٹکٹ چسپاں کر کے اس پر دیہاتی کے انگوٹھے کا نشان لیا اور اسے بغور دیکھ کر کہا۔ ”سرکار! ایک ٹکٹ بھی خراب ہوا اور کام بھی نہ بنا۔“

وکیل۔ ”کیا ہوا؟ دیکھیں۔“

میاں دلال نے کاغذ وکیل صاحب کو دیا۔ وکیل صاحب اسے دیکھ کر بولے۔ ”ہاں اس پر تو نشان ٹھیک

نہیں آیا مگر ہاں! ٹھیک طرح سے لیا جائے گا تو آ جائے گا۔"

دلال نے وکیل کی طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ وکیل صاحب نے بھی اشارہ کیا۔ میاں دلال دیہاتی سے بولے۔ "بھائی۔ دیکھو! تمہاری چادر گری جا رہی ہے۔"

دیہاتی کاغذ سنبھالنے لگا۔ ادھر وکیل صاحب نے جھٹ پٹ وہ کاغذ تو کتاب میں چھپا دیا اور اتنا ہی بڑا ایک دوسرا کاغذ جو پہلے ہی سے میز پر رکھا تھا' الٹا کر دیکھنے لگے۔ لمحہ بھر بعد بولے۔ "خیر! اس سے کام چل جائے گا۔ اچھا! یہ کاغذ پھاڑ ڈالیں۔ اب یہ تو کسی کام میں آ ہی نہیں سکتا۔"

یہ کہہ کر وکیل صاحب نے جھٹ پٹ اس کاغذ کو پھاڑ ڈالا۔

کاغذ پھاڑنے کے بعد وہ اس دیہاتی سے بولے۔ "اچھا! تو اب تم صبح آ کر اپنی نالش لکھوا دینا۔ اس وقت تو کوئی محرر ہے نہیں۔"

دیہاتی بہت اچھا کہہ کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد وکیل صاحب مسکرا کر بولے۔ "آج تو بڑا گہرا داؤ مارا۔"

دلال۔ "اور کیا سرکار! ہم تو ایسے ہی داؤ مارتے ہیں۔ اب اس پر پانچ سو کا رقعہ لکھوائیے۔"

وکیل۔ "کس کے نام لکھا جانا چاہیے؟ تمہارے نام؟"

دلال۔ "اور کیا...... میرے ہی نام لکھا جانا چاہیے۔ کل صبح چچا نالش لکھوانے آئیں گے اور یہ خبر نہیں کہ انہیں کے اوپر نالش ہو گی۔"

وکیل۔ "کل اس سے کہہ دیا جائے گا کہ ہمیں فرصت نہیں' کوئی دوسرا وکیل کر لو۔ ہے نہ ٹھیک؟"

دلال۔ "ٹھیک ہے۔ اس کی طرف سے نالش دائر کرنا ٹھیک نہیں۔"

(3)

مندرجہ بالا واقعہ کے بعد تین ماہ گزر گئے۔ دلالوں کی مہربانی اور اپنی عیاری کی بدولت روپ کشور کی وکالت چل نکلی مگر ان کی آمدنی کا نصف سے زیادہ حصہ دلال لوگ کھا جاتے تھے۔ اگر دلالوں کو نہ دیں تو جو کچھ ملتا ہے' وہ بھی نہ ملے۔ چنانچہ انہیں مجبوراً دلالوں کا پیٹ بھرنا ہی پڑتا تھا۔ ادھر شہر کے محبانِ وطن میں بھی ان کی خاصی دھاک بندھ رہی تھی۔ وہ قریب قریب ہر ایک پبلک کام میں حصہ لے کر بڑی بڑی تقریریں جھاڑتے اور ملک کی بری حالت پر زبانی رونا رویا کرتے۔ لوگ کہتے تھے۔ پنڈت روپ کشور بڑے دیش بھگت ہیں۔ ایسے آدمی ہونے لگیں تو ملک کا بیڑا ہی پار نہ ہو جائے؟ یہ حال تو عوام کا تھا مگر تعلیم یافتہ طبقے میں...... ان آدمیوں میں جو تعلیم یافتہ اور عالم کہلاتے تھے اور جنہیں اپنے علم و فضل پر ناز تھا' ان لوگوں میں بھی وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ سب لوگ ان کے بیرونی ڈھونگ دیکھ کر ان پر فریفتہ تھے۔ اندرونی حالات کا نہ تو کسی کو علم تھا اور نہ وہ اس کا علم حاصل کرنے کی کوشش ہی کرتے تھے۔ اگر کوئی بات ان کے خلاف سنی بھی جاتی تھی تو اعتقاد کورانہ کے سبب لوگ اس پر یقین ہی نہ کرتے تھے۔

ادھر تین ماہ کے بعد وکیل صاحب نے اس دیہاتی پر جس سے رقعہ پر انگوٹھے کا نشان بنوایا تھا' دلال رام سے نالش دائر کرا دی اور خود پیروی کے لیے کھڑے ہو گئے۔

دیہاتی تھا تو بے وقوف مگر رقعہ دیکھ کر اسے شک ہو گیا۔ جب اس نے رقعہ لکھنے اور قرض لینے سے انکار کیا تو اسے رقعہ دکھایا گیا۔

عدالت نے پوچھا۔ "یہ تمہارے انگوٹھے کا نشان ہے یا نہیں؟"

دیہاتی رقعہ اور اپنے انگوٹھے کا نشان دیکھ کر بولا۔ "ہاں حضور! ہے تو ہمرے ہی انگوٹھے کا نشان۔"

عدالت۔ "پھر تمہیں قرض لینے سے انکار کیوں ہے؟"

دیہاتی نے تھوڑی دیر تک پنڈت روپ کشور اور دلال صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ "صاحب! اور تو میں کچھ نہیں جانتا مگر تین مہینے کی بات ہے۔ میں ان وکیل صاحب کے پاس ایک مقدمہ کے لیے گیا تھا۔ اس وقت وکیل صاحب مجھ سے بولے کہ تمہارا انگوٹھا ٹھیک نہیں۔ پھر تین چار کاغذوں پر مجھ سے انگوٹھے کا نشان لیا۔ ایک نشان ٹکٹ چپکا کر بھی لیا۔ ہماری جان میں تو یہ وہی کاغذ ہے۔ مُدا ہاں۔ اُس بکھت اس نے تو ہمارے سامنے وہ کاغذ پھاڑ دیا تھا۔ پھر معلوم نہیں' یہ کیسا رقعہ ہے۔"

دیہاتی کی اس بے تکی پر عدالت نے کوئی دھیان نہ دیا اور دلال کے حق میں ڈگری دے دی۔

دیہاتی نے روپیہ فوراً جمع کر دیا۔

باہر آ کر دیہاتی دلال اور وکیل صاحب سے بولا۔ "دادا! تم نے چالاکی تو خوب کھیلی۔ مُدا یہ چالاکی ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ روپیہ تو جیسے اب تمہیں مل ہی گیا۔ اب بتا دیو' کیسے کیا کیا تھا؟ ارے اور کیا۔ آگے کھاتر ہوسیار رہی۔"

میاں دلال بگڑ کر بولے۔ "ابے جائے گا یا کچھ لے گا؟ بچہ زیادہ باتیں بناؤ گے تو فوجداری دکھلاؤں گا۔"

دیہاتی: "ارے تم کیا فوجداری دکھاؤ گے۔ دیس کے چوٹے فوجداری دکھلاویں گے۔ لیے تو جاتے ہو گھڑی بھر۔ مُدا ان میں سے کچھ پُن بھی کر دینا۔ نہیں تو ہضم نہیں ہوں گے۔ پھوٹ پھوٹ کر نکلیں گے۔

یہ کہہ کر دیہاتی دوسری طرف چلا گیا۔

پنڈت روپ کشور نے جلسہ میں پنجاب ریلیف کے لیے فنڈ کے لیے اپیل کرتے ہوئے فرمایا:

"صاحبان! آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت پنجاب میں ہمارے بھائیوں پر کیسی مصیبت ہے۔ آہ! سینکڑوں خاندان تباہ ہو گئے۔ صدہا عورتیں بیوہ ہو گئیں۔ خدا معلوم کتنے بچے یتیم ہو گئے۔ ان کے لیے کھانے کو اناج نہیں۔ پہننے کو کپڑا نہیں۔ رہنے کو مکان نہیں۔ اس وقت آپ کا کیا فرض ہے؟ یہ مت خیال کیجئے گا کہ اہلِ پنجاب سے آپ کا کوئی تعلق نہیں۔ ہم سب آریوں کی اولاد ہیں۔ ہماری سب کی رگوں میں ایک ہی خون بہہ رہا ہے۔ ہم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ پنجابی آپ کے بھائی ہیں۔ آپ پنجابیوں کے بھائی ہیں۔ چنانچہ ہر ایک ہندوستانی کا فرض ہے کہ وہ دوسرے ہندوستانی کی...... اپنے بھائی کی مدد کرے۔ اس کے دکھ' اس کی تکلیف میں حصہ لینے کی کوشش کرے۔ آپ کے پسینے کی کمائی کے بہترین استعمال کا سب سے عمدہ موقع ہے۔ دھرم کی کمائی کا دھرم ہی میں خرچ ہونا ٹھیک ہے۔ کیا آپ اپنے دھن کو اس دھرم کارج

میں......اپنے بھائیوں کی مدد میں لگادیں گے؟ اپنے فرض کی طرف دیکھئے اور بے شمار طرح کی مصیبتوں میں مبتلا پنجابی بھائیوں کی طرف دیکھئے۔ میرے خیال میں ایسا سنگدل شخص شاید ہی کوئی جو اس موقع پر حتی الوسع اپنے بھائیوں کی امداد نہ کرے۔"

یہ کہہ کر وکیل صاحب نے اپنی جیب سے سو روپے نکالے اور کہا۔"میں پنجابی بھائیوں کی امداد کے لیے سو روپے دیتا ہوں۔"

وکیل صاحب کی اس فراخدلی اور حب الوطنی پر فریفتہ ہو کر لوگ تالیاں بجانے لگیں۔ منڈوہ گونج اٹھا۔ لوگ آپس میں کہنے لگے۔"وکیل صاحب بڑے دیش بھگت ہیں۔ بڑے فراخدل ہیں۔ بڑے دھرماتما ہیں۔ اپنی کمائی کو ہمیشہ اچھے ہی کاموں خرچ کرتے ہیں۔"

ایک صاحب بولے۔"ہم نے تو سنا ہے کہ وکیل صاحب صرف سچے مقدمے لیتے ہیں۔ جھوٹوں کے پاس تک نہیں پھٹکتے۔"

دوسرے نے جواب دیا۔"یہی بات ہے۔ اسی لیے ان کا پیسہ ایسے کاموں میں خرچ ہوتا ہے۔ اچھا پیسہ اچھے ہی کاموں میں جاتا ہے۔"

مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وکیل صاحب نے سو روپے انہی روپیوں میں سے دیئے تھے جو انہوں نے اس دیہاتی پر جھوٹی نالش کر کے وصول کیے تھے۔

تصویرِ حسرت

(1)

سُمترا بیوہ ہے۔ ایسی بیوہ جسے ابھی اپنی بیوگی کا پورا علم بھی نہیں۔ اس کی عمر ابھی صرف سولہ سترہ سال کی ہوگی۔ شوہر کی وفات سے اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ اس کی کوئی ایسی چیز گم ہو گئی ہے جسے وہ دیگر اشیاء کے مقابلہ میں زیادہ پیار کرنے لگی تھی۔ کیوں پیار کرنے لگی تھی؟ اس لیے کہ وہ بھی سُمترا کو دل و جان سے عزیز رکھتے تھے۔ جس محبت سے وہ سُمترا کے ساتھ بات چیت کرتے تھے' اس محبت سے اب اور کوئی بات چیت نہیں کرتا۔ جو حلاوت' جو مزہ ان کی باتوں میں تھا' وہ حلاوت اور وہ مزہ اور کسی کی باتوں میں نہیں ہے۔ اس کے سکھ کا جس قدر خیال انہیں رہتا تھا' اتنا اب اور کسی کو نہیں رہتا۔ اس کی تکلیف پر جتنا دکھ انہیں ہوتا تھا' اتنا اور کسی کو نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ جو خوشی جو راحت اسے ان کے پاس بیٹھنے اور ہنسنے بولنے سے حاصل ہوتی تھی' وہ اب کسی سے نہیں ہوتی۔ بس اپنی بیوگی کا سُمترا کو اتنا ہی علم تھا کہ کسی بڑی پیاری چیز کے گم ہو جانے سے جس طرح آدمی اداس رہتا ہے' اس کی یاد آنے پر سرد آہیں بھر کر رہ جاتا ہے اور کبھی اپنی اس پژمردگی سے خود اکتا کر اس گمشدہ چیز کو بھولنے کی کوشش کرتا

ہے اور اس بھولنے کی کوشش میں کسی قدر کامیابی ہو جانے پر بھی جب اس چیز کو یاد دلانے والی کسی اور چیز کو دیکھتا ہے' اس وقت اس کے دل کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ بعینہ یہی حال سُمترا کا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ سمترا کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر دھوپ میں بیٹھی اپنی قمیض سی رہی تھی۔ اس وقت کسی کے آنے کی آہٹ پا کر اس نے سر اٹھایا۔ سامنے اپنی سہیلی جاوتری کو دیکھ کر وہ مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''آؤ بہن! آج تو کئی دن بعد دکھائی دی۔''

جاوتری سُمترا کے سامنے بیٹھ کر بولی۔ ''ہاں ان دنوں اپنی نانی کے ہاں چلی گئی تھی۔ اس لیے ادھر نہ آ سکی۔''

سمترا۔ ''نانی کے ہاں کچھ کام کاج تھا کیا؟''

جاوتری۔ ''ہاں۔ میرے چھوٹے ماموں کا ٹیکو چڑھا تھا۔''

سمترا۔ ''وہی چھوٹے ماموں جن کی بیوی پچھلے سال......''

سمترا کی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جاوتری بول اٹھی۔ ''ہاں! وہی۔''

سمترا۔ ''ان کی عمر تو تیس برس کے قریب ہو گی۔''

جاوتری۔ ''27-28 سال کی ہے۔ تیس ہی سمجھو۔ تیس پورے ہونے میں ابھی باقی ہی کیا ہے؟ دیکھو' مجھے نانی کے ہاں سے یہ چوڑیاں ملی ہیں۔ کتنی خوبصورت چوڑیاں ہیں۔''

سُمترا چوڑیوں کو بغور دیکھ کر بولی۔ ''ہاں بڑی اچھی چوڑیاں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ابھی نئی نئی چلی ہیں۔''

جاوتری۔ ''ہاں! نئی ہی ہیں۔ ایسی چوڑیاں میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھیں۔ میں تو اب یہ ہی چوڑیاں پہنا کروں گی۔''

سُمترا کے چہرے پر پژمردگی چھا گئی۔ اس نے ایک آہِ سرد بھر کر کہا۔ ''چاہے جیسی پہنو بہن! تمہیں سب زیب دیتا ہے۔ ہمیں تو بھگوان نے اس لائق ہی نہیں رکھا۔''

جاوتری۔ ''ہاں بہن! تم پر تو بھگوان کا ایسا قہر نازل ہوا کہ کچھ بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بھگوان کسی دشمن کو بھی یہ دن نہ دکھلائے۔''

سُمترا کے دل کو اس وقت سکون حاصل تھا۔ وہ اپنے دل کی حالت کو' اپنے دکھ کو بھولی ہوئی تھی مگر جاوتری کے آنے سے ایک معمولی سے واقعہ سے اس کے دل پر دکھ کی گھٹا پھر گھر کر آئی۔ کوئی بھولی ہوئی بات پھر یاد آ گئی۔ سُمترا نے سوچا۔ لوگوں کو ہمجولیوں اور سہیلیوں کے آنے سے خوشی ہوتی ہے' مجھے الٹا دکھ ہوتا ہے' جی کڑھتا ہے۔ ہائے! میں تو اس لائق بھی نہیں رہی کہ کسی سے ہنسی خوشی مل جل سکوں۔

جاوتری۔ ''جب میرے ماموں کا بیاہ ہو گا تو تمہیں بھی لے چلوں گی۔ چلو گی نا؟''

سمترا۔ ''ماں جی (ساس) اجازت دیں گی تو چلی چلوں گی۔''

جاوتری۔ ''اجازت کیوں نہ دیں گی۔ میں زور ڈالوں گی تو اجازت دے دیں گی۔''

سمترا نے جاوتری کی بات نہیں سنی کیونکہ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

جاوتری ذرا ناراض ہو کر بولی۔ ''بہن! تم گم سم ہو گئیں۔ اتنے دن بعد میں آئی اور تم سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔''

سمترا جیسے چونک پڑی اور مسکرائی۔ مگر کیا وہ دل سے مسکرائی تھی۔ ہرگز نہیں۔ چوڑیوں کا ذکر چھڑتے ہی تبسم چند گھنٹے کے لیے اس سے رخصت ہو گیا تھا مگر اس خیال سے کہ کہیں اس کی بے پروائی سے جاوتری برا نہ مان جائے اور اپنے دل میں نہ سوچے کہ اچھی رونی صورت کے پاس آئی۔ سُمترا کو زبردستی اپنے چہرے پر مسکراہٹ لا کر کہنا پڑا۔ ”نہیں بہن! بھلا ایسا کبھی ہو سکتا ہے کہ میں تم سے سیدھی طرح نہ بولوں؟ میرا دھیان سلائی کی طرف چلا گیا تھا۔ اس لئے میں نے تمہاری بات نہیں سنی۔“

جاوتری۔ ”تو تھوڑی دیر کے لیے قمیض کو اٹھا کر رکھ دو۔ جب میں چلی جاؤں' اس وقت سی لینا۔“

سمترا نے قمیض رکھ دی اور کہا۔ ”ہاں۔ اب کہو۔ کیا کہتی ہو؟“

جاوتری۔ ”خیر وہ بات تو ایسی ضروری نہ تھی۔ میں ایک اور بات پوچھنا چاہتی ہوں۔“

سمترا۔ ”کون سی بات؟“

جاوتری۔ ”دیکھو میرا مذاق نہ اڑانا ورنہ پھر میں تم سے کبھی نہ بولوں گی۔“

سُمترا کے دل میں اشتیاق پیدا ہوا۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”نہیں مذاق نہیں اڑاؤں گی۔ بتاؤ' کیا بات ہے۔“

جاوتری۔ ”اور کسی سے نہ کہنا۔“

سمترا۔ ”کسی سے نہیں کہوں گی۔“

جاوتری نے ایک چٹھی جیب سے نکال کر دی اور کہا۔ ”اسے پڑھو مگر تمہیں میری قسم ہے ہنسنا مت۔“

سُمترا نے چٹھی لے کر پڑھی۔ چٹھی میں درج تھا۔

”میرے دل کی دیوی!

عرصہ سے تمہارا کوئی پریم پتر نہیں ملا۔ میرا دل لگا ہوا ہے۔ کیا تم ناراض ہو گئی ہو؟ ناراضگی کا تو بظاہر کوئی سبب نہیں ہے۔ اگر نادانستہ مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہو تو معاف کرو۔ ماتا جی کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمہیں بلانے کا ارادہ کر رہی ہیں۔ ایشور کرے' وہ دن بہت جلد آئے۔ میں نے تمہارے لیے کچھ چیزیں خریدی ہیں۔ بوقت ملاقات نذر کروں گا۔ خط کا جواب جلدی دینا۔“

تمہارا ”وہی“

سُمترا نے چٹھی پڑھ کر جاوتری کو واپس دے دی۔ جاوتری نے پوچھا۔ ”اب تم ہی بتاؤ' میں اس کا کیا جواب دوں؟ بہن! مجھے تو...... کیا کہوں...... لکھتے شرم آتی ہے۔ کہیں کسی دوسرے کے ہاتھ پڑ جائے تو وہ اپنے دل میں کیا کہے گا؟ بڑی مشکل سے جب ان کی کئی چٹھیاں آئیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ایک کا جواب دیا تھا۔ اب تو مجھے جرأت نہیں ہوتی۔ تم بتاؤ' اس کا جواب دوں یا نہ دوں؟“

سُمترا نے روکھے پن سے کہا۔ ”دے دو۔ کیا حرج ہے؟ انہوں نے ایسا انتظام کر لیا ہوگا کہ چٹھی کسی دوسرے کے ہاتھ میں نہ پڑے۔ پھر ڈر کیا ہے؟“

اتنا کہنے کے بعد سُمترا نے ایک جمائی لے کر کہا۔ ”بہن! اب تو نیند آ رہی ہے۔ سونے کو جی چاہتا ہے۔“

جاوتری۔ ”نیند آتی ہے تو سو رہو۔ میں بھی جاتی ہوں۔ اچھا تو تمہاری صلاح ہے کہ جواب دے دوں۔“

سمترا۔ ”ہاں دے دو۔“

ناظرین حیران ہوں گے کہ سُمترا کو نیند نے ایک دم کیوں آگھیرا لیکن یہ بات نہیں تھی۔ سُمترا کو نیند وینڈ کچھ نہیں آئی تھی۔ اصل بات یہ تھی کہ جاوتری کے خاوند کا محبت نامہ پڑھ کر اس کے دل کے نیم مندمل زخم پر کڑی چوٹ لگی۔ وہ اس چوٹ کو برداشت کرنے کی تاب نہ لا سکی۔ اسے آپ بیتی یاد آگئی۔ کبھی اس کے پاس بھی ایسے محبت نامے آتے تھے۔ اس کا شوہر بھی ایسی چٹھیاں لکھتا تھا۔ وہ بھی ان کی چٹھی پا کر اتنی ہی خوش ہوتی تھی جتنی آج جاوتری ہے۔ اف! وہ محبت نامے لکھنے والا کہاں غائب ہو گیا۔ اب اس زندگی میں اس کے درشن ہونا ناممکن ہے۔ سُمترا کو جاوتری کی خوشی و شادمانی پر رشک اور اپنی حالت پر افسوس ہوا۔ کسی کی یاد نے کلیجہ میں چٹکیاں لیں۔ دل میں ہوک اٹھی۔ دردِ دل اس قدر بڑھا کہ ضبط کی طاقت نہ رہی اور اس نے جاوتری کو اس بہانہ سے ٹال دیا۔

سُمترا اپنے کمرے کے اندر جا کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ اس کے پلنگ پر لیٹنے کی دیر تھی کہ آنکھوں نے آنسوؤں کو نکلنے کے لیے راستہ دے دیا۔

(2)

جب سمترا بیوہ ہوئی' اس وقت سے اس کی ساس نے کھانا بنانے والی برہمنی کو جواب دے دیا اور اس کا کام سُمترا کو سونپا۔ سُمترا کو اب دونوں وقت کھانا بنانا پڑتا ہے۔ سُمترا کو ساس کی اس کارروائی سے حیرت ہوئی۔ جس سُمترا کو پہلے ساس پلنگ سے پاؤں نیچے نہیں رکھنے دیتی تھی' اب وہی ساس اس سے اس قدر سخت محنت و مشقت لیتی ہے۔ سُمترا کو ساس کے اس کام پر تعجب ضرور تھا مگر دکھ ذرا بھی نہ تھا کیونکہ کام کرتے رہنے سے اس کی طبیعت بہلی رہتی تھی۔ خالی بیٹھنا اسے خودنا گوار گزرتا تھا۔ خالی بیٹھنے سے اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات اٹھتے رہتے تھے۔ دکھ اسے صرف ایک بات کا تھا اور وہ یہ کہ اس کے بیوہ ہونے کے بعد اس کی ساس اس کے ساتھ ذرا روکھا برتاؤ کرنے لگی تھی۔ بعض اوقات اس کا سلوک روکھے پن کی حدود کو عبور کر کے تلخی تک بھی پہنچ جاتا تھا۔ سُمترا کو اس کا بڑا رنج تھا مگر وہ اپنے اس رنج اور دکھ کو دل ہی میں دبائے ہوئے تھی۔

بسنت پنچمی کا دن تھا۔ جاوتری نے سُمترا کو بہت اصرار کے بعد اپنے ہاں بلایا۔ سُمترا کی ساس نے بھی خوشی اجازت دے دی۔

سادہ لوح سُمترا نے اس خیال سے کہ پرائے گھر اچھے کپڑوں سے جانا چاہیے' ایک زرد ریشمی قمیض اور اس کے اوپر ایک گلابی پھولدار جاکٹ پہن لی۔ سر بھی گوندھ لیا۔ گلے میں دو ایک زیور بھی پہن لیے اور بوقت روانگی دو بیڑے پان بھی کھا لیے۔ جاوتری کا مکان سُمترا کے مکان سے ملحق تھا اور چھت پر سے آنے جانے کا راستہ تھا۔

جس وقت سُمترا اپنے کمرے سے نکل کر چھت پر جانے کے لیے زینے کی طرف جا رہی تھی' اسی وقت اس کی ساس اتفاقاً اوپر سے نیچے آ رہی تھی۔ بیچ میں مڈ بھیڑ ہو گئی۔ ساس نے سُمترا کی پوشش کو دیکھا۔ دیکھتے ہی اس کی بھویں چڑھ گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ سمترا نے زینے کی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ ساس نے پکارا۔ ''بہو۔''

سُمترا نے ایک پاؤں سیڑھی پر رکھے پلٹ کر بولی۔ ''کیا ہے ماں جی!''

سُمترا کے چہرے پر مسرت تھی۔ دل میں امنگ تھی۔ ویسی ہی امنگ جیسی کسی تہوار یا تقریب کے موقع پر دوستوں کے ہاں جاتے وقت ہر ایک آدمی کے دل میں ہوا کرتی ہے۔

ساس کرخت لہجہ میں بولی۔ ''یہ سنگار تم نے کیوں کیا؟''

سُمترا کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کے سینے میں مسرت اور امنگ کا چراغ روشن تھا۔ اس چراغ کی شعاعوں سے اس کا چہرہ منور ہو رہا تھا۔ ساس کی کرخت آواز نے اس چراغ کے ساتھ آندھی کے جھونکے کا کام کیا۔ چراغ فوراً بجھ گیا۔ چہرے پر جو نور تھا' وہ بھی جاتا رہا۔ سُمترا نے سیڑھی پر سے پاؤں کھینچ لیا اور چپ چاپ سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے سوچا...... بناؤ سنگار کیوں کیا' اس کا کیا جواب دوں؟ ساس بوڑھی ہونے آئی۔ انہیں کیا یہ نہیں معلوم کہ پرائے گھر اچھے کپڑے پہن کر جانا ہوتا ہے۔

سمترا کو چپ چاپ دیکھ کر ساس بولی ''گھر کا ناس تو کر دیا' اب کیا آبرو پر بھی پانی پھیرنے کی دل میں ہے؟ ہے بھگوان! لوگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ بھلا بیوہ کو ایسا سنگار کرنا چاہیے؟ تیرے نصیب میں تو اوڑھنا پہننا لکھا ہی نہ تھا۔ لکھا ہوتا تو میرا ہاتھی سا جوان بیٹا کیوں اٹھ جاتا؟ تیرے لیے تو ایک سفید دھوتی ہی بہت تھی۔ جوان بیوہ کے پاؤں تلے کی زمین تو یوں ہی کانپا کرتی ہے۔ ہے بھگوان! اس بڑھاپے میں مجھے معلوم نہیں کیا کیا دیکھنا پڑے گا!''

ساس کی تیر سی باتیں سن کر سُمترا کا لہو پانی ہو گیا۔ مارے شرم اور دکھ کے اس کا برا حال ہو گیا۔ آنکھوں سے سیلابِ اشک بہہ نکلا۔ وہ ساس کی زیادہ باتیں سننے کے لیے کھڑی نہ رہ سکی۔ ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس کے لیے جتنا کہا گیا تھا' وہ کافی سے زیادہ تھا۔ وہ چپ چاپ الٹے پاؤں اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور کمرے کا دروازہ بند کر کے اپنے پلنگ پر گر پڑی۔ سُمترا کو آج یقین ہو گیا کہ شوہر کے ساتھ ہی ساتھ اس کا سب کچھ چلا گیا۔ اب وہ کسی لائق نہیں رہی۔ دنیا میں اب کوئی ایسا شخص نہیں جو لمحہ بھر کے لیے بھی اسے خوشی دے سکے۔ وہ شوہر کی موت کو' ان کی جدائی کے غم کو بھول جانا چاہتی تھی۔ اسے فراموش کر کے اپنے دل کو دنیا کی دیگر باتوں سے بھلانا چاہتی تھی مگر لوگ اسے نہیں بھولنے دیتے تھے۔ لوگوں کو اس کی لمحہ بھر کی بھی خوشی بری لگی تھی۔ وہ اسے ٹھکرا کر اس کے دل میں یہ خیال پیدا کر رہے تھے کہ جا تو اپنے دل کی آگ میں پڑی جلا کر۔ تیرے لیے جہان میں نہ کسی طرح کا سکھ ہے' نہ کسی طرح کی شانتی۔

سمترا کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ دل میں اپنے مرنے والے کو یاد کر کے کہہ رہی تھی کہ ''پران دھن! تم کہاں ہو؟ آؤ دیکھو تمہارے حین حیات تمہاری تصویرِ محبت کو جو سر آنکھوں پر بٹھا لیتے تھے' اب اسے پیروں سے ٹھکراتے ہیں۔''

(3)

سمترا اپنے چھوٹے بھائی کے بیاہ میں اپنے میکے آئی ہوئی ہے۔ بیاہ کی تیاریاں خوب دھوم دھام سے ہو رہی ہیں۔ سمترا بھی پچھلی باتوں کو بھول کر بڑے حوصلے' بڑی امنگ کے ساتھ بیاہ میں حصہ لے رہی ہے۔ جس روز ساس نے اس کے بناؤ سنگار پر اعتراض کیا' اسی روز سے سمترا نے سفید کپڑوں کے سوا سب قسم کے کپڑے پہننا چھوڑ دیئے' پان کھانا بھی چھوڑ دیا' سر میں تیل لگانے کو بھی خیر باد کہہ دیا۔

بیاہ کی رسوم ادا کی جا رہی تھیں۔ ہندوؤں کے ہاں بیاہ شادی میں بعض رسوم ایسی ہوتی ہیں جن میں بیوہ

کی موجودگی منحوس سمجھی جاتی ہے۔ سہاگ کی چیزوں کو اس کا چھونا بدشگنی خیال کیا جاتا ہے۔ سمترا کو یہ باتیں معلوم تھیں۔ رسوم ادا کرنے کے لیے سہاگ کی چیزیں دیوستھان پر لائی جارہی تھیں۔ سمترا بھی خوش خوش ادھر ادھر پھر رہی تھی۔ اس وقت وہ سب باتیں بھولی ہوئی تھیں۔ بھائی کی شادی' چھوٹے بھائی کے بیاہ میں کس بہن کو امنگ نہ ہوگی۔ مسرت وشادمانی نہ ہوگی۔ چاؤ نہ ہوگا؟ تھالی میں سہاگ کی چیز ایک سہاگن عورت لیے جارہی تھی۔ اتفاق سے ایک چیز تھالی سے کھسک کر نیچے گر پڑی۔ سمترا پاس ہی کھڑی تھی۔ اس نے جلدی سے وہ چیز اٹھا کر پھر تھالی میں رکھ دی۔ جلدی میں اسے یہ دھیان نہ رہا کہ اس چیز کے چھونے کا اسے حق حاصل نہیں۔ اس کے اس چیز کو ہاتھ لگانے کی دیر تھی کہ جتنی عورتیں وہاں موجود تھیں' سب کے چہروں پر ناخوشی جھلکنے لگی۔ جو زیادہ ضعیف عقیدے کی تھیں' ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوہ نے سہاگ کی چیزیں چھولیں! پرماتما خیر کرے۔ معلوم نہیں' اس کا کیا برا نتیجہ ہوگا۔ جو عورت تھالی لیے تھی' اس نے وہیں زمین پر تھالی رکھ دی اور کہا۔ ''اب یہ چیزیں تو بے مصرف ہو گئیں۔''

عورتوں نے چیں چیں کرنا شروع کیا۔ ماں نے بھی سمترا کی اس خلل اندازی کا حال سنا۔ وہ گرجتی ہوئی آئی۔ ادھر سمترا کو فوراً اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ مارے خوف کے بیچاری اس طرح کھڑی رہ گئی جیسے بُت ہو۔ ماں نے آتے ہی سمترا کے نازک گال پر ایک زور کا طمانچہ رسید کیا اور چیخ کر بولی۔ ''بدنصیب! رانڈ! دنیا مرتی جاتی ہے مگر تجھے موت نہ آئی۔ اپنا سہاگ تو گنوا بیٹھی۔ اب دوسروں کے سُبھ کام میں بگھن ڈالتی پھرتی ہے۔ جس روز تیری ارتھی نکلے گی' اس روز میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔ تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گئی۔ ہائے! اب کیا کروں۔ رام کرے تیرے ہاتھوں میں کوڑھ ٹپکے۔ کیڑے پڑیں۔''

ماں خدا معلوم کب تک بکتی جھکتی رہتی اور کیا کیا کہتی مگر جو عورتیں وہاں موجود تھیں' انہوں نے سمجھا بجھا کر چپ کرایا۔ انہوں نے کہا' جو کچھ ہونا تھا' ہو گیا۔ اب اس شُبھ کام کے موقع پر ایسی باتیں منہ سے نہ نکالو۔

سمترا غریب روتی ہوئی وہاں سے ہٹ کر ایک کوٹھری میں چلی آئی۔ اُف! گھاؤ پر گھاؤ! چرکے پر چرکہ۔ ہتک پر ہتک! جب غریب خوش ہونے کی کوشش کرتی ہے' اپنے دکھ' اپنی حالت کو بھول جانے کی کوشش کرتی ہے۔ جب ہی اس کی ساری خوشی ایک لمحہ میں پیروں تلے مسل دی جاتی ہے اور اس کے دل کی بھٹی میں جو آگ سلگ رہی ہے' اس کی بھٹی میں دھکیل دی جاتی ہے۔ اس کے لیے کہیں جگہ نہیں۔ کوئی اس کو تسلی دینے والا نہیں۔ دل کی آگ پر کوئی پانی کے دو چھینٹے مارنے والا نہیں۔ گھاؤ پر مرہم کا پھاہا رکھنے والا نہیں۔ جو ہے' وہ نمک چھڑکتا ہے۔ یہاں تک کہ ماں...... وہ ماں جس پر ہر ایک بچے کو ناز ہوتا ہے۔ فخر ہوتا ہے۔ وہ ماں جس کی محبت دنیا میں آئیڈیل محبت مانی جاتی ہے۔ اس ماں نے بھی بدنصیب بیٹی کی' اس مصیبت زدہ بیٹی کی جس کا دنیا جہان میں کوئی بھی نہیں' اس بیٹی کی جس کی حالتِ زار پر اس کی چشم اب بھی اشکباری کیا کرتی ہیں' ساری خوشی' سارا امنگ' سارا چاؤ ایک لمحہ میں پیروں تلے بڑی بے دردی کے ساتھ روند دیا۔

مگر نہیں' ماں غریب کا کوئی قصور نہیں۔ اس کے سینے میں اب بھی اپنی بیٹی کے لیے اتنی ہی محبت ہے۔ اتنا ہی پیار ہے۔ وہ اب بھی اس کو سکھی کرنے کے لیے اپنی جان تک قربان کر سکتی ہے۔ یہ سارا قصور ہے سوسائٹی کے بڑے سنسکاروں کا جو ماں کو بھی بیٹی کا دشمن بنا سکتے ہیں جو انسان کو حیوان...... بلکہ صرف حیوان ہی نہیں' پتھر تک بنا سکتے ہیں۔

(4)

سمترا سسرال لوٹ آئی۔

چاروں طرف سے ٹھکرائے جانے پر' سب کے ہاتھوں سے بے عزت ہونے پر اس کی صرف ایک آرزو باقی رہ گئی ہے جس کے سامنے وہ ہنسی۔ اسی نے اس کے گال پر طمانچہ مار کر اس کی ہنسی کو رونے میں تبدیل کر دیا۔ سب نے اسے نفرت کی نگاہ سے دیکھا۔ سب نے اسے دھتکار دیا۔ دنیا اس سے نفرت کرتی ہے۔ اس لیے اسے بھی دنیا سے نفرت ہو گئی۔ اب وہ چاہتی ہے صرف موت! کس کے لیے جئے؟ کوئی سکھ نہیں۔ بیوہ کو اچھا کھانا دینا ٹھیک نہیں۔ اس کو اچھا کپڑا دینا مناسب نہیں۔ اس کا ہنسنا کھیلنا برا ہے۔ تب جئے تو کیسے اور کس کے لیے؟ موت! بس صرف موت! دنیا میں صرف موت ہی ایسی چیز ہے جو سب کو ایک نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے غریب' امیر' حقیر' معزز' گنہگار اور نیک سب یکساں ہیں۔ وہ سب کو سینے سے لگانے کے لیے تیار رہتی ہے۔ دنیا نے جس کو ٹھکرا دیا ہو' اس کو پناہ دینے والا موت کے سوا اور کوئی نہیں۔

(5)

سمترا بیمار ہے۔ صرف بیمار ہی نہیں بلکہ سخت بیمار ہے۔ سسرال والے علاج معالجہ کرتے ہیں لیکن صرف برائے نام کیونکہ وہ چاہتے ہیں کہ سمترا اس جہان سے اٹھ جائے۔

سمترا کے چاروں طرف تین چار عورتیں بیٹھی ہیں۔ ساس بھی بیٹھی ہے۔

ایک عورت بولی۔ ''بہن! بیماری تو سخت ہے۔ بھگوان آرام کر دیں تو اچھا ہی ہے۔''

سمترا کی ساس بولی۔ ''بہن! بیوہ کا تو مرنا ہی بہتر! مگر دکھ اتنا ہی ہے کہ میرے شیاما کی ایک نشانی تھی' سو وہ بھی چلی۔ اگر آج کوئی لڑکا بچہ ہوتا۔ تب بھی صبر تھا۔''

سمترا نے ساس کی بات سنی۔ اف! اس آخری وقت میں بھی کوئی اس کے لیے آنسو بہانے والا نہیں۔ آنکھوں سے اگر آنسو نکلتے بھی ہیں تو دل یہی کہتا ہے۔ چلو' اچھا ہوا۔ پاپ کٹا! اس کا مرنا ہی بھلا! اف! کیسی حیوانی خود غرضی ہے۔ اس کے جینے کی خواہش کرتے بھی ہیں تو اس لیے کہ وہ ان کے بیٹے کی نشانی تھی۔ صرف اس کے لیے اس کی زندگی کی خواہش کوئی نہیں کرتا۔ سمترا کو خیال آیا۔ جب سیٹھ جی کی بیوی مر رہی تھی' اس وقت کتنی گریہ وزاری ہو رہی تھی۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ سہاگن تھی مگر میرے لیے کوئی ڈاکٹر نہیں۔ میرے مرنے پر لوگوں کو ضرور اطمینان ہے۔ اف! اتنا فرق! جیسی وہ آدمی تھی' ویسی ہی میں بھی ہوں۔ پھر اتنا فرق کیوں؟ اتنی تمیز کس لیے؟ محض اس لیے کہ میں بیوہ ہوں؟ اگر آج وہ ہوتے تو میرے لیے زمین آسمان ایک کر دیتے۔ مجھے بچانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے تیار ہو جاتے مگر آج کوئی میرے منہ میں پانی ٹپکانے والا بھی نہیں۔

سمترا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ہائے! بد نصیب عورت کے آخری آنسو پونچھنے کے لیے بھی کوئی ہاتھ آگے نہ بڑھا۔

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سمترا کے پاس صرف ایک خادمہ بیٹھی ہوئی تھی۔ باقی سب لوگ خواب راحت میں تھے۔ خادمہ نے سمترا کے آخری الفاظ سنے۔

''ناتھ! تمہارے بغیر دنیا میں میرا کوئی آدر نہیں کرتا۔ اس لیے تمہارے ہی شرن میں آتی ہوں۔''

پگلی

(1)

''اری سُدھیا! کہاں مر گئی...... بھاگ گئی رانڈ۔ آنے تو دو۔ آج رانڈ کی جو ٹانگ نہ توڑی ہو۔''

شام کے چار بج چکے ہیں۔ جیٹھ کی لُو کے تھپیڑوں کے مارے نازک بدن آدمیوں کو اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ سرد خانوں کو چھوڑ کر باہر نکلیں۔ ایسے ہی وقت کمرے کے دروازے پر پڑے ہوئے ٹاٹ کے پردے سے باہر منہ نکال کر ایک اٹھارہ سالہ نازنین نے مندرجہ بالا الفاظ کہے۔ ٹھیک اسی وقت ایک خوبصورت نوجوان جس کی عمر لگ بھگ بیس برس کی ہوگی' آنکھوں پر ایک ہلکے نیلے رنگ کا ایمولیٹ (دھوپ کا چشمہ) لگائے ہاتھ میں چھتری لیے اسی کمرے کے دروازے پر پہنچا اور نازنین سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہے بھابھی! کس کی ٹانگ توڑنے کی فکر میں ہو؟''

بھابھی پیشانی کی شکنیں زیادہ گہری کر کے بولی۔ ''تمہاری اس لاڈلی کی جسے تم نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ میرا بس چلے تو میں اس کل موہی کی صورت نہ دیکھوں۔ لاکھ کچھ ہو' نیچ پھر نیچ ہی ہے۔ سانپ کو چاہے امرت پلاؤ مگر وہ بس ہی اُگلے گا۔ جو نیچ اپنا نیچ پن چھوڑ دے تو پھر اس میں اور نیچ میں فرق ہی کیا رہے؟ کھانے کے لیے نگوڑی سب سے پہلے آ بیٹھے گی مگر کام کے وقت پتہ نہیں لگتا۔''

نوجوان اسی طرح مسکراتا ہوا بولا۔ ''تو آخر ہوا کیا؟''

بھابھی نے کہا۔ ''ہوا یہ کہ اس رانڈ کے مارے آج سونا نہیں ملا۔ دو دفعہ رانڈ کو پکڑ پکڑ کر بٹھایا۔ جہاں ذرا آنکھ لگی' رانڈ نے پنکھا چھوڑ دیا۔ مارے پسینے کے ساری دھوتی تربتر ہو گئی۔ کبھی موئی کو پیاس لگی۔ کبھی متاس لگی۔ ایک گھنٹہ بھی جم کر پنکھا نہیں کھینچا۔ ابھی پھر ذرا آنکھ لگی تھی' بس چھوڑ کر بھاگ گئی۔''

نوجوان ہنس کر بولا۔ ''بلا شک کام تو شریر لڑکی نے برا کیا مگر جانے دو' بچہ ہے۔''

بھابھی نے جھنجھلا کر کہا۔ ''ہوں! بچہ ہے۔ کھانے کو تو نگوڑی سب سے زیادہ کھاتی ہے۔ باتیں ایسی کرتی ہے گویا سب کی نانی' دادی ہے۔ تم نے کہہ دیا' بچہ ہے۔ آنے تو دو آج رانڈ کو۔''

یہ کہہ کر اس نوجوان کی بھابھی نے پردے کے اندر سر کھینچ لیا۔ نوجوان اسی طرح مسکراتا ہوا اسی کمرے سے ملحق ایک دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔

یہ کمرہ معمولی طور سے آراستہ تھا۔ دیواروں پر مہاتما گاندھی' لوکمانیہ تلک وغیرہ لیڈروں کی تین چار

تصویریں آویزاں تھیں۔ ایک طرف الماری میں کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ ایک طرف ایک میز اور دو کرسیاں رکھی تھیں اور دوسری طرف ایک پلنگ پڑا تھا۔ آدھے فرش پر ایک سفید چادر بچھی تھی اور دو تین بڑے بڑے گاؤ تکیے رکھے تھے۔

نوجوان نے چھتری ایک کونے میں رکھ دی۔ ایمولیٹ اتار کر میز پر رکھا۔ اس کے بعد کوٹ اور پتلون اتار کر دھوتی پہنی۔ دھوتی پہن چکا تو وہ ایک پلنگ پر بیٹھ گیا اور ایک پنکھے کو جو پلنگ پر پڑا تھا' اٹھا کر جھلنے لگا۔

چند لمحہ بعد ایک تیرہ سالہ لڑکی کمرے کے اندر آئی۔ رنگ سانولا تھا مگر لڑکی پھر بھی دیکھنے میں خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ اس کی آنکھیں نہایت سرمگین اور بڑی بڑی تھیں۔ بھویں بھی بہت سیاہ اور گھنی تھیں۔ چہرہ گول' منہ چھوٹا' ناک سیدھی اور پتلی اور ہونٹ پتلے پتلے تھے۔ لڑکی کا جسم سڈول اور گٹھا ہوا تھا۔ وہ اس وقت ایک صاف دھوتی اور شلوکا پہنے ہوئی تھی۔ دروازے پر جو پائیدان پڑا تھا' وہ لڑکی اس پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ نوجوان کو دیکھ کر اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کواڑ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اور اس پر اپنا سر رکھ کر کہا۔ "بابو جی آ گئے؟"

نوجوان سر جھکائے بیٹھا تھا۔ لڑکی کی بات سن کر اس نے سر اٹھایا اور چند لمحے اس کی طرف ٹکی ہوئی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ "سدھیا! آج تو نے ٹھیک طرح سے پنکھا نہیں کیا۔ بھابھی کو مارے گرمی کے نیند نہیں آئی۔ وہ آج تجھ پر بہت ناراض ہیں۔"

سدھیا نے ذرا خائف ہو کر اپنی نگاہ تختے پر جما لی اور اپنی انگلی کے ناخن کھرچتی ہوئی بولی۔ "بابو جی! پنکھا تو کھینچا تھا۔"

جوان نے کہا۔ "بھابھی تو کہتی تھیں کہ کئی بار تو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔"

سدھیا چپ رہی۔

نوجوان نے نرم لہجے میں کہا۔ "کیوں ری بولتی نہیں؟"

سدھیا دھیمے لہجے میں بولی۔ "ایک بار پانی پینے گھر گئی تھی۔"

نوجوان نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔ "اور دوسری بار؟"

نوجوان کو مسکراتے دیکھ کر سدھیا کے لبوں پر بھی تبسم کی ایک ہلکی سی جھلک دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "بہت زور کی نیند آ رہی تھی۔"

نوجوان۔ "نیند آ گئی تھی تو کیا سونے چلی گئی تھی؟"

سدھیا۔ "سونے نہیں' منہ دھونے۔ پنکھا کھینچتے کھینچتے سو جاتی تو بہو جی مارتیں۔ اسی لیے منہ دھونے گئی تھی کہ نیند نہ آوے۔"

نوجوان کے دل پر ایک ہلکی سی چوٹ لگی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ سدھیا اسی طرح تختے کو ناخن سے کھڑی کھرچتی رہی۔

چند لمحوں کے بعد نوجوان نے سر اٹھا کر کہا۔ "بھابھی بڑی ناراض ہیں۔"

سدھیا بولی۔ "میں ہاتھ پاؤں جوڑ کر منا لوں گی۔"

نوجوان۔ "وہ تجھے مارنے کو کہتی ہیں۔ اگر ماریں تو؟"

سدھیا۔ "ماریں گی تو مار لیں گی۔"

نوجوان۔ ''تیرے چوٹ نہیں لگے گی؟''
سدھیا نے کوئی جواب نہ دیا۔
لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان کے پاس پہنچی۔ نوجوان نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''بول تیرے چوٹ نہیں لگے گی؟''
اس پر لڑکی اچھی طرح مسکرا کر بولی۔ ''لگے گی کیوں نہیں۔''
نوجوان۔ ''تو پھر؟''
سدھیا۔ ''پھر کیا؟ چوٹ لگے گی تو تھوڑی دیر رولوں گی۔''
نوجوان ہنس پڑا اور ہنستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''چل! بھابھی سے تیرا میل کرادوں۔''

(2)

سدھیا ذات کی چمارن ہے۔ اس کا باپ بابو چندر کانت کے گھوڑے کی سائیسی کرتا ہے۔ سدھیا کی ماں نہیں ہے۔ اس کی ماں اس کے پیدا ہونے کے دو ہی سال بعد چل بسی تھی۔ اس وقت سے لے کر اس کے باپ نے ہی اس کی پرورش کی ہے۔

یوں تو سدھیا بابو چندر کانت کے گھر میں اسی وقت سے آتی تھی جب سے وہ اپنے پیروں سے چلنے کے قابل ہوئی تھی اور اسے برابر روٹی کپڑا ملا کرتا تھا مگر جب سدھیا چھ برس کی ہوئی تو بابو چندر کانت کے چھوٹے بھائی رادھا کانت کی توجہ سدھیا کی طرف خاص طور سے مبذول ہوئی۔ وہ سدھیا سے بڑی محبت کرنے لگے۔ ایک روز بیٹھے بیٹھے آپ کو یہ دھن سوار ہوئی کہ سدھیا کو لکھانا پڑھانا چاہیے۔ بس اسی دن سے انہوں نے اسے خود پڑھانا شروع کر دیا۔ ان کی اس سنک پر ان کے بڑے بھائی بابو چندر کانت پہلے تو بہت بگڑے۔ ان کی بھابھی بھی بہت ناخوش ہوئیں۔ بولیں ''چمارن کو پڑھا کر کیا سیتا ساوتری بناؤ گے؟ نیچ ذات بھی کہیں پڑھا لکھا کرتی ہے؟ انہیں باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گھور کلجگ آگیا۔ واہ! اچھی الٹی گنگا بہاتے ہو۔ چمارنیں تو اب پڑھیں لکھیں گی اور گھوڑوں کا دانہ بھلے گھروں کی بہو بیٹیاں دلیں گی۔''

مگر رادھا کانت نے سب کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اڑا دیں۔ آخر کار سب ہار مان کر چپ ہو گئے۔ سدھیا کے پڑھائے لکھائے جانے پر اس کے والد مہنگو نے بھی اعتراض کیا تھا۔ اس نے رادھا کانت سے کہا۔ ''حضور! کاہے کو میرا بڑھاپا بگاڑتے ہو؟ یہ پڑھ لکھ جائے گی تو پھر کاہے کو میرے پاس رہے گی؟ کہیں کرٹان ورٹان ہو جائے گی۔ پھر بھلا مجھ غریب کا گھر اسے کاہے کو سہائے گا؟''

اس کے جواب میں رادھا کانت نے کہا تھا۔ ''مہنگو! تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہماری تعلیم ایسی نہیں ہے جس سے یہ عیسائی مذہب میں چلی جائے گی اور نہ ایسی ہی ہے کہ تم سے نفرت کرنے لگے۔ تم کسی بات سے مت ڈرو۔''

مہنگو بھی یہ کہہ کر چپ ہو گیا کہ ''اچھا بابو۔ جیسی آپ کی مرضی! جو تقدیر میں لکھا ہے' وہ ہوگا۔ میری تو آپ کے ٹکڑوں میں ٹیر ہو آئی ہے۔ میں تو آپ کے گھر سے مر کر ہی نکلوں گا۔ اس کی تقدیر میں جو لکھا ہے' وہ ہو رہے گا۔ ماں باپ جنم کے ساتھی ہیں' کرم کے نہیں۔''

رادھاکانت کی مہربانی سے سدھیا اب اچھی طرح سے ہندی اردو پڑھ لیتی ہے۔ لکھنے کی مشق کم ہے۔ سدھیا کو پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ اتنی ہی عمر میں اس نے بہت سی اچھی اچھی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ رادھاکانت جو نئی کتاب لاتے ہیں' سدھیا اسے ضرور پڑھتی ہے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ بابو رادھاکانت اپنی بھابھی کے کمرے میں پلنگ پر لیٹے ہوئے ایک کتاب پڑھ رہے تھے۔ پاس ہی دوسرے پلنگ پر ان کی بھابھی پڑی خراٹے لے رہی تھی۔ سدھیا دروازے کے پاس بیٹھی پنکھا کھینچ رہی تھی اور ایک کتاب اپنی گود میں رکھے اسے پڑھ بھی رہی تھی۔ رادھاکانت مطالعہ میں ایسے محو تھے کہ انہیں وقت گزرتا معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ یکایک ان کو ایسی سخت گرمی محسوس ہوئی کہ کتاب سے ان کا دھیان ہٹ گیا۔ اس وقت انہیں معلوم ہوا کہ وہ پسینے میں تربتر ہیں۔ "اف" کہہ کر انہوں نے سدھیا کی طرف دیکھا۔ سدھیا تختے پر اپنا سر رکھے سو رہی تھی۔ گود میں کتاب کھلی کی کھلی رکھی تھی۔ داہنا ہاتھ تن کر رہ گیا تھا اور اس میں سے پنکھے کی رسی آہستہ آہستہ سرک کر چھوٹ رہی تھی۔ رادھاکانت نے پسینہ پونچھتے ہوئے اس منظر کو دیکھا۔ انہیں سدھیا پر غصہ آیا۔ انہوں نے سوچا "بھابی تبھی تو اس سے خفا رہتی ہے۔ ٹھیک بھی ہے، کام کے وقت سو جاتی ہے۔ اس وقت اگر بھابی جی جاگ پڑیں تو بغیر پیٹے کبھی نہ چھوڑیں۔ شریر لڑکی اسی لئے کتاب دے دی تھی کہ پڑھتی اور پنکھا کھینچتی رہے۔"

یہ سوچ کر انہوں نے سدھیا کو جگانے کی خاطر پنکھے کی رسی کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر ان کا ہاتھ رسی کی طرف بڑھ کر اسے بغیر کھینچے ہی اپنی جگہ واپس آگیا۔ انہیں خیال آیا' کیا کرے' بیچاری کو نیند آگئی۔ معلوم نہیں کیوں؟ پنکھا کھینچتے کھینچتے نیند آہی جاتی ہے۔ اچھا ہے غریب کو تھوڑی دیر سو لینے دو۔

یہ سوچ کر رادھاکانت نے ایک ہاتھ کا پنکھا اٹھالیا اور جھلنے لگے۔ ان کا دھیان پھر کتاب میں لگ گیا۔

چند لمحوں کے بعد سدھیا کے ہاتھ سے پنکھے کی ڈوری چُھٹ گئی اور اس کا ہاتھ ایک جھٹکے کے ساتھ زمین پر گر پڑا۔ سدھیا کی آنکھ کھل گئی۔ اسی وقت رادھاکانت کی بھابی کی نیند بھی اُچٹ گئی۔ جاگنے پر انہوں نے اپنے کو پسینے سے ترپایا۔ کروٹ بدل کر دیکھا کہ رادھاکانت ہاتھ کا پنکھا جھل رہے ہیں۔ مارے غصہ کے آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ سدھیا کی طرف دیکھا تو اسے آنکھیں ملتے ہوئے پایا۔ جھٹ پلنگ سے اتریں۔ آہٹ پاکر رادھاکانت نے ان کی طرف نگاہ پھیری اور پوچھا۔ "کیوں بھابھی؟" بھابھی نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سدھیا کے پاس جاکر اس کے تین چار لاتیں ماریں اور بولیں۔ "حرام زادی کہیں کی۔ جب ہمیں اپنے ہی ہاتھوں پنکھا جھلنا ہے تو تجھے کیا صورت دیکھنے کے لیے رکھا ہے؟ چل نکل یہاں سے۔ اب جو یہاں آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گی۔"

سدھیا بیچاری روتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔ رادھاکانت نے اس واقعہ کو دیکھا۔ وہ کتاب کے مطالعہ میں اس قدر محو تھے کہ جب تک اپنی بھابھی کے پلنگ سے اترنے کا مطلب ٹھیک ٹھیک سمجھیں تب تک یہ سب کچھ ہو گیا۔ بھابھی پھر پلنگ پر آکر بیٹھ گئی اور بڑبڑانے لگی۔

رادھاکانت بابو کچھ دیر تک خاموش رہے۔ اس کے بعد بولے۔ "بھابھی! تم نے بیچاری کو اس وقت بڑی بے دردی سے مارا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

بھابھی صاحب کڑک کر بولیں "ماروں نہ تو کیا کروں؟ رانڈ نہ کام کی نہ کاج کی۔ ماس کا لوندا! تم نے اسے پڑھا لکھا کر اور بھی بگاڑ دیا۔ موئی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ ماں باپ کی تو عمر گھاس چھیلتے چھیلتے گزر گئی۔ یہ رامائن

پڑھتی ہے۔ ''اوچھے کے گھر تیتر' باہر دھروں کہ بھیتر۔ '' ذرا سی ہندی اردو کیا پڑھ لی' اب اپنے سامنے کسی کو سمجھتی ہی نہیں۔ رہیں جھونپڑوں میں' سپنا دیکھیں محلوں کا۔ دن بدن امیری امیری چڑھتی جاتی ہے۔ واہ! ''منہ لگائی ڈومنی گاوے تال بے تال۔ '' ہم نے تو سمجھا' چلو ہمیں کیا۔ پڑھنے لکھنے دو مگر یہ تو سر ہی چڑھنے لگی۔ ''

بھابھی کے غصے کے سامنے رادھا کانت کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ کچھ زیادہ کہہ سکیں۔ انہوں نے دبی ہوئی ایک لمبی آہ بھری اور سوچنے لگے۔ ''سدھیا ذات کی چمارن ہے اور غریب۔ صرف ان ہی دو باتوں سے ہم لوگ اس کی تحقیر اور اس پر ظلم تک روا رکھنا اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں۔ جن کے بدن میں کافی طاقت ہے جو بہت محنت کر سکتے ہیں' جو بہت تکلیف برداشت کر سکتے ہیں' وہ پاؤں پھیلا کر آرام سے سوتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ امیر ہیں اور ذات کے اعلیٰ۔ اور ایک لڑکی جس کے جسم سے زیادہ محنت نہیں ہو سکتی۔ جس کا زیادہ کھیلنا اور سونا قدرتی امر ہے' وہ پنکھا کھینچتی ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے کہ وہ غریب ہے اور ذات کی چمارن ہے۔ کیا صرف ناداری اور ذات کا چھوٹا پن آدمی کے جملہ اوصاف پر پانی پھیر سکتا ہے؟ ''

بابو رادھا کانت بہت دیر تک اسی قسم کی باتیں سوچتے رہے۔ بالآخر جب ان کے خیالات انہی کو تکلیف دہ معلوم ہونے لگے تو انہوں نے پھر اپنی توجہ کتاب کی طرف مبذول کی۔

(3)

رادھا کانت نے سدھیا سے مسکرا کر کہا۔ ''سدھیا! آج ایک نئی کتاب آئی ہے۔ ''

اَور دن سدھیا نئی کتاب کا نام سنتے ہی خوش ہو جاتی تھی اور اس کے دیکھنے کے لیے بے حد بے تاب ہو اٹھتی تھی مگر آج اس کے چہرے پر مسرت کی جھلک تک نظر نہیں آئی اور نہ اس نے کتاب کے دیکھنے کے لیے بے تابی کا اظہار کیا۔ وہ چپ چاپ کھڑی رہی۔

رادھا کانت نے کہا۔ ''سدھیا! آج تو تُو نئی کتاب کے نام سے سنکی تک نہیں۔ کیا بات ہے؟ ''

سدھیا بولی۔ ''بابو جی! میں اب کتابیں نہیں پڑھوں گی۔ ''

رادھا کانت نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''کیوں؟ ''

سدھیا۔ ''کتابیں پڑھنا برا ہے۔ ''

رادھا کانت اور بھی زیادہ حیران ہو کر بولا۔ ''برا ہے؟ ''

سدھیا۔ ''ہاں۔ ''

رادھا۔ ''کیوں؟ ''

سدھیا۔ ''جب سے میں کتابیں پڑھنے لگی۔ اس وقت سے بہو جی اور ہر کوئی یہی طعنہ دیتے ہیں کہ ذات کی چمارن۔ کتابیں پڑھ کر مزاج بگڑ گئے۔ ''

رادھا۔ ''انہیں کہنے دو۔ ان کے کہنے سے ہوتا ہی کیا ہے؟ ''

سدھیا۔ ''مجھے بھی بری لگتی ہیں۔ ''

رادھا۔ ''تجھے کیا بری لگتی ہیں؟ ''

سدھیا۔ ''ان کی باتیں۔''
رادھا۔ ''کیوں؟''
سدھیا۔ ''معلوم نہیں کیوں۔ پہلے جب کوئی کچھ کہتا یا مارتا تھا تو ذرا بھی برا نہ لگتا تھا مگر اب بڑا برا لگتا ہے۔''
رادھا۔ ''کیوں برا لگتا ہے؟''
سدھیا۔ ''میں نے کتابوں میں ایسی باتیں پڑھی ہیں کہ اب ان کے آگے لوگوں کا ایسا برتاؤ اچھا نہیں لگتا۔''
رادھا۔ ''کیا برتاؤ اچھا نہیں لگتا؟''
سدھیا۔ ''لوگ جب چمارن کہہ کر مجھے دُردُر کرتے ہیں تو بڑا برا لگتا ہے۔''
رادھا کانت نے ''ہوں'' کہہ کر سر جھکا لیا اور سوچنے لگے۔ یہ سب تعلیم کا اثر ہے ورنہ اس کو کبھی ان باتوں کا خیال خواب میں بھی نہ آتا۔
چند لمحوں کے بعد رادھا کانت نے کہا۔ ''تو یہ لوگوں کی غلطی ہے۔ ان کی غلطی کے پیچھے تو اپنا پڑھنا لکھنا کیوں چھوڑتی ہے؟''
سدھیا سر جھکائے چپ کھڑی رہی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔
رادھا کانت نے کہا۔ ''سدھیا! چپ کیوں ہو گئی؟''
سدھیا نے سر اوپر اٹھایا اور بولی ''کیا کہوں؟''
رادھا کانت۔ ''میں نے جو پوچھا ہے' اس کا جواب دو۔''
سدھیا۔ ''میں اب پڑھوں لکھوں گی نہیں۔ آپ نے جو مجھے پڑھایا لکھایا' یہ اچھا نہیں کیا۔''
رادھا کانت متحیر ہو کر بولے۔ ''اچھا نہیں کیا! یہ کیسے؟''
سدھیا۔ ''پڑھنے لکھنے سے میرا جی بڑا برا ہو گیا ہے۔''
رادھا۔ ''کیسے؟''
سدھیا۔ ''اب جب کوئی مجھے چمارن کہہ کر دُردُراتا ہے تو میرے جی میں یہی آتا ہے کہ میں بھی اسے دُردُراؤں۔ میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کروں جیسا وہ میرے ساتھ کرتا ہے۔ یہ جی کا بگڑ جانا نہیں تو اور کیا ہے؟ اور جتنے لڑکی لڑکے ہیں' میرے پتا ہیں۔ ان کا جی نہیں بگڑا ہے۔ وہ کسی کے کہنے کا ذرا بھی برا نہیں مانتے۔''
رادھا۔ ''تو کیا تو یہ سمجھتی ہے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں' اس لیے انہیں برا نہیں لگتا؟''
سدھیا۔ ''ہاں! میں تو یہی سمجھتی ہوں مگر میرا سمجھنا ٹھیک ہے یا نہیں' یہ میں نہیں کہہ سکتی۔''
رادھا۔ ''ہاں! یہ ٹھیک ہو سکتا ہے مگر لوگوں کو بکنے دے۔ میں تو تیرے ساتھ کبھی اس قسم کا سلوک نہیں کرتا۔''
سدھیا خاموش رہی۔
رادھا۔ ''بتا! میں نے کیا کبھی ایسا کیا ہے؟''
سدھیا نے کچھ جواب نہ دیا۔
رادھا کانت اس کے پاس جا کر اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ ''بولتی کیوں نہیں؟''
سدھیا نے ہلکے سے کہا۔ ''کیا بولوں؟''

رادھا۔ ''کیا میں نے تیرے ساتھ کبھی ایسا سلوک کیا ہے؟''

سدھیا۔ ''ایک روز میں نے غلطی سے آپ کا پن ڈبہ چھو لیا تھا۔ تب آپ نے مجھے مارا تھا۔''

رادھا کانت سدھیا کا ہاتھ چھوڑ کر بولے ''اوہ! وہ تو بات ہی دوسری تھی۔ تو نے میرا پن ڈبہ چھوت (ناپاک) کر دیا تھا۔''

سدھیا نے ایک بار رادھا کانت کو سر سے پاؤں تک اور ایک بار اپنے جسم کی طرف دیکھا۔ پھر لمبی آہ بھر کر رہ گئی۔

رادھا۔ ''کیا سوچتی ہے سدھیا؟''

سدھیا۔ ''بابو جی! میں نے ایک دن ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ جو نیچ ذاتوں کے لوگ عیسائی ہو جاتے ہیں' ان سے عیسائی اور انگریز نفرت نہیں کرتے۔ وہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے پیتے ہیں۔''

رادھا۔ ''ارے انگریزوں اور عیسائیوں کی کیا وہ مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر بھی کھا لیتے ہیں مگر ہم لوگوں کے دھرم میں یہ بات نہیں ہے۔ ہمارے ہاں نیچ ذات کے لوگ اچھوت سمجھے جاتے ہیں۔''

سدھیا۔ ''بابو جی! میری سمجھ میں ایک بات نہیں آتی۔ میں نے کئی بار پوچھنا چاہا مگر پوچھ نہ سکی۔''

رادھا۔ ''کون سی بات؟''

سدھیا۔ ''میں ہر روز نہاتی ہوں۔ روز اپنے کپڑے دھو ڈالتی ہوں۔ تیسرے چوتھے دن صابن سے کپڑے دھو ڈالتی ہوں۔ پھر بھی جب میں کوئی آپ کے ہاں کا برتن چھو لیتی ہوں تو وہ چھوت ہو جاتا ہے۔ میرے جسم میں ایسی کونسی بات ہے جو اچھوت سمجھی جاتی ہے؟ کمہاروں کو میں نے دیکھا ہے کہ کپڑے میلے پہنے رہتے ہیں۔ دو دو تین تین دن تک نہاتے بھی نہیں۔ پھر بھی ان کی چھوئی ہوئی چیزیں کھا پی لی جاتی ہیں۔ اس سے میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ میرے جسم ہی میں کوئی ایسی بات ہے۔''

رادھا کانت سدھیا کی باتیں سن کر سناٹے میں آ گئے۔

انہوں نے سوچا۔ اس کا کیا جواب دوں؟ سوال بڑا بے ڈھب ہے۔ کچھ تو کہنا چاہیے ورنہ یہ سمجھے گی کہ میرے پاس اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ سوچ کر رادھا کانت نے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ ہمارے دھرم شاستر میں جن ذاتوں کو اچھوت بتایا گیا ہے' انہیں ہم لوگ اب تک اچھوت مانتے چلے آ رہے ہیں۔ مگر ان ذاتوں کو اچھوت کیوں بتلایا گیا ہے' اس کا ٹھیک ٹھیک سبب میں نہیں بتلا سکتا۔ ممکن ہے ان کے پیشے کے مطابق ایسا ہوا ہو۔ ان کے غلیظ اور ناپاک رہنے سے ایسا قاعدہ بنا لیا گیا ہو۔''

سدھیا۔ ''اور جو گندا یا غلیظ نہ رہے تو؟''

بابو رادھا کانت سر کھجلاتے ہوئے بولے۔ ''ہاں! اگر گندا نہ رہے تو اچھا ہی ہے مگر جن کو اتنی مدت سے اچھوت مانتے آئے ہیں' انہیں اب کس طرح پاک مان سکتے ہیں؟ میں دل سے تو یہ مانتا ہوں کہ اگر نیچ ذات کے لوگ صفائی سے رہیں تو انہیں اچھوت نہ سمجھا جائے لیکن میں اس کو عملی جامہ نہیں پہنا سکتا۔ لوگ نکو بنا دیں گے۔ پھر میرے ہاتھ کا چھوا کوئی پانی نہ پئے۔''

سدھیا سر جھکائے چپ چاپ سنتی رہی۔ چند لمحوں کے بعد اس نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔ اس نے کہا۔ ''جب یہ بات تھی تو بابو جی! آپ نے مجھے کیوں پڑھایا لکھایا؟ ہماری ذات کے لوگوں کا

اَن پڑھ رہنا ہی اچھا ہے۔"

رادھا۔ "تو تو بالکل پگلی ہے۔ آج خدا معلوم تجھے کیا ہو گیا ہے؟"

سدھیا۔ "بابو جی! مجھے ہوا ہوایا کچھ بھی نہیں‘ میں اب پڑھوں لکھوں گی نہیں۔ جو پڑھا لکھا ہے‘ اسے بھی بھولنے کی کوشش کروں گی۔"

یہ کہہ کر سدھیا چلی گئی۔

پانچ برس بعد ایک گاؤں میں ایک جھونپڑے کے آگے الاؤ لگ رہا ہے۔ اس کے چاروں طرف چار پانچ آدمی بیٹھے تاپ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک آدمی نے کہا۔ "اتنا دن چڑھ گیا۔ آج ابھی پگلی نہیں نکلی؟"

ایک بوڑھے نے لمبی آہ بھر کر کہا۔ "بھیا! ابھی اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہوا۔ کیا کہیں‘ تقدیر میں جو لکھا تھا وہی ہوا۔ جن کے ہاں ہم نوکر تھے‘ انہوں نے بھی بڑی دوا دارو کی۔ میں نے انہیں منع کیا تھا کہ اسے نہ پڑھاؤ مگر اپنی اَکل کے سامنے ہم گنواروں کی کون سنتا ہے؟ بھائی! معلوم نہیں اسے کیا ہو گیا کہ کتاب دیکھے اسے ڈر لگتا ہے۔ جتنی کتابیں پاس تھیں‘ سب جلا دیں۔"

ٹھیک اسی وقت ایک نوجوان عورت جس کی عمر 18-19 سال کے قریب تھی‘ جھونپڑے سے نکلی۔ سب لوگ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کے کپڑے میلے کچیلے تھے۔ سر کے بال سب الجھے ہوئے تھے۔ چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے دروازے پر بندھی ہوئی دو بھینسوں اور ایک گائے کو کھولا اور ایک لکڑی ہاتھ میں لے کر انہیں ہانکتی ہوئی جنگل کی طرف لے گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے گائے بھینسوں کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا اور آپ دھوپ میں ایک پتھر کے اوپر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک بیٹھی رہی۔ پھر لیٹ گئی۔ لیٹنے کے تھوڑی دیر بعد اس نے انگلی سے زمین پر صاف حروف میں "رادھا کانت" لکھا۔ لکھ کر اسے بڑی دیر تک غور سے دیکھتی رہی۔ اس کے بعد ذرا مسکرائی۔ پھر ایک دم اداس ہو گئی۔ ایک لمبی آہ بھری اور آنکھوں میں آنسو بھر لائی۔

اسی وقت ایک چھوٹے لڑکے نے اس کے پاس آ کر کہا۔ "پگلی! آ گئی۔"

یہ سنتے ہی پگلی نے جھٹ پٹ لفظ رادھا کانت ہاتھ سے بگاڑ ڈالا اور منہ بنا کر وہاں سے پلٹی۔ پھر اس جگہ سے دور جا کر بیٹھی اور زمین پر کچھ لکھنے لگی۔

نمک حلال نوکر

(1)

شام کے پانچ بج چکے ہیں۔ ملکہ کے باغ میں خاصی چہل پہل ہے۔ لوگ گھاس اور بنچوں پر بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں کا مزہ لوٹ رہے ہیں۔ اسی وقت ایک وکٹوریہ گاڑی جس میں ایک خوبصورت اور

مضبوط گھوڑا جتا ہوا تھا' باغ کے بڑے لان کے قریب آکر ٹھہری۔ اس میں سے دو نوجوان اترے اور جو بنچ پڑی تھی' اس پر بیٹھ گئے۔

بنچ پر بیٹھ کر وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک فقیر جس کی عمر کوئی 50 سال کی ہو گی' ان کے پاس آیا۔ اس آدمی کی مونچھیں اور سر کے بال سفید ہو چلے تھے۔ اگر چہ اس کا جسم دبلا تھا مگر بغور دیکھنے سے یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ عالمِ شباب میں یہ شخص بڑا طاقتور اور توانا ہو گا کیونکہ اس کے زمانہ شباب کے زور و طاقت کا بچا کھچا حصہ اب بھی اس کے بدن میں موجود تھا۔ اس آدمی نے پاس آکر صرف اتنا ہی کہا۔ ''پرماتما بھلا کرے۔'' اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

دونوں نوجوانوں نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پھر آپس میں باتیں کرنے میں محو ہو گئے۔

وہ بوڑھا اسی طرح خاموش کھڑا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ان نوجوانوں کی توجہ اس کی طرف پھر مبذول ہوئی۔ ان میں سے ایک نے اس سے پوچھا ''کیا چاہتے ہو؟''

بوڑھا بولا۔ ''ایشور کے نام پر جو کچھ بابو صاحبان کی مرضی ہو۔''

نوجوان چند لمحے اس کی طرف ٹکی ہوئی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد بولا۔ ''آگے دیکھو۔''

بوڑھا۔ ''بھگوان بھلا کرے۔'' کہہ کر آگے چل دیا۔ جب وہ کچھ دور چلا گیا تو دوسرا نوجوان بولا۔ ''یہ شخص ایک دفعہ انکار کرنے پر چل دیا۔ پیشہ ور فقیروں کا تو یہ قاعدہ نہیں ہے۔ وہ تو کچھ لیے بغیر یا دو چار کھوٹی کھری سنائے بغیر پنڈ ہی نہیں چھوڑتے۔''

پہلا نوجوان بولا۔ ''یہ بات تو تم نے پتے کی کہی۔ اسے بلا کر پوچھنا تو چاہیے کہ یہ ہے کون؟''

دوسرا۔ ''میری بھی یہی رائے ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے پکارا۔ ''او بڈھے۔''

بوڑھے نے پلٹ کر دیکھا۔ نوجوان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

بوڑھا ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا اور نوجوانوں کی طرف دیکھنے لگا۔ نوجوان نے پھر ہاتھ کے اشارہ سے اسے بلایا۔

بڈھا دم بھر کچھ سوچتا رہا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کے پاس آیا۔ جب وہ پاس آگیا تو دوسرے نوجوان نے پوچھا۔ ''تمہاری کیا ذات ہے؟''

بڈھے نے سر جھکا لیا۔ لمبا مگر دبا ہوا سانس لے کر بولا۔ ''ٹھاکر۔''

نوجوان۔ ''کون ٹھاکر؟''

بوڑھا۔ ''بیئس۔''

پہلا نوجوان۔ ''ٹھاکر تو کلین ہو پھر بھی بھیک مانگتے ہو۔''

بوڑھا۔ ''پیٹ کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔''

دوسرا نوجوان۔ ''پیٹ کی خاطر مزدوری کر سکتے ہو۔ نوکری کر سکتے ہو۔''

بوڑھا۔ ''نوکری ملتی نہیں' مزدوری ہوتی نہیں۔''

پہلا نوجوان۔ ''کیوں مزدوری کیوں نہیں ہوتی؟''

بوڑھا۔ ''مزدوری میں محنت بہت پڑتی ہے۔ اتنی محنت کی عادت نہیں۔''

دوسرا نوجوان۔ ”بھیک مانگنے میں محنت بالکل نہیں کرنی پڑتی۔ ٹھیک ہے نا؟“
بوڑھے کا چہرہ تمتما اٹھا۔ خدا معلوم غصہ کے مارے یا شرم سے۔
پہلے نوجوان نے کہا۔ ”بھیک مانگنا تو بہت ہی ذلیل کام ہے۔“
بوڑھا۔ ”ذلیل تو ہے۔“
دوسرا۔ ”اس کے علاوہ بھیک مانگنے میں بیشتر بے عزتی ہوتی ہے۔“
بوڑھا۔ ”میں بے عزتی کا کام نہیں کرتا۔ ایک بار سوال کرتا ہوں جس نے دے دیا' لے لیا۔ نہیں تو اپنی راہ دیکھتا ہوں۔“
پہلا۔ ”کچھ ہی ہو۔ بھیک مانگنا برا ہے۔“
بوڑھے نے سر جھکالیا ہے۔ کچھ جواب نہ دیا۔
دوسرا۔ ”خیر! جو کچھ ہو تم آدمی شریف معلوم ہوتے ہو۔ اس لیے یہ لو۔“
یہ کہہ کر نوجوان نے بوڑھے کے ہاتھ پر ایک روپیہ رکھ دیا۔ بوڑھے نے روپیہ لے کر کہا۔ ”آپ نے جب اتنی دیا دکھلائی تو اس سے بہتر تو یہ تھا کہ کہیں نوکری دلا دیتے۔ مجھے بھیک مانگنے میں جتنا دکھ ہوتا ہے' وہ بھگوان ہی جانتا ہے۔“
پہلا۔ ”تم تنہا ہو؟“
بوڑھا۔ ”جی نہیں۔ بیوی ہے اور ایک لڑکی۔“
پہلا: ”اس وقت ہمیں کسی آدمی کی ضرورت تو ہے نہیں۔ تم کوشش کر کے دیکھو۔ اگر تمہیں کہیں نوکری نہ ملے تو پھر ہمارے پاس آنا۔“
بوڑھا۔ ”بہت اچھا مگر آپ لوگ ملیں گے کہاں؟“
پہلا۔ ”ہم لوگ تو عموماً روز ہی یہاں آتے ہیں یا ہمارے مکان پر آ جانا۔“
یہ کہہ کر اس نوجوان نے اپنے مکان کا پتہ بتا دیا۔ بوڑھا فقیر ”بھگوان آپ کا بھلا کرے۔“ کہہ کر چل دیا۔
اس کے چلے جانے کے بعد دوسرے نوجوان نے کہا۔ ”تمہیں تو ایک آدمی کی ضرورت تھی۔“
پہلا۔ ”تھی کیا۔ اب بھی ہے؟“
دوسرا۔ ”تو اسے رکھ کیوں نہیں لیا؟“
پہلا۔ ”بات یہ ہے کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اسے درحقیقت ملازمت کرنی بھی ہے یا نہیں۔ اگر کرنی ہوگی تو ضرور آئے گا۔ اگر نہیں کرنی ہوگی تو نہیں آئے گا۔“

(2)

بابو شنکر سہائے ذات کے کائستھ اور شہر کے مشہور وکیلوں میں ہیں۔ ان کے دو فرزند ہیں۔ ایک کی عمر کوئی تیرہ چودہ سال کی ہے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ نام دیوی سہائے ہے۔ دوسرے یعنی فرزند اکبر کی عمر بیس بائیس برس کے قریب ہے۔ فورتھ ایئر (بی۔اے) کلاس میں پڑھتے ہیں۔ نام رگھبیر سہائے ہے۔ انہیں

رگھبیر سہائے نے ملکہ کے باغ میں اس بڈھے فقیر سے کہا تھا کہ اگر تمہیں کہیں نوکری نہ ملے تو پھر ہمارے پاس آنا۔

اتوار کا دن تھا۔ اس بڈھے فقیر سے رگھبیر سہائے کی ملاقات ہوئے نو دن گزر چکے تھے۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ بابو رگھبیر سہائے سو کر اٹھے تھے اور بیٹھے ایک کتاب کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اسی وقت ان کے کہار نے آکر اطلاع دی۔ ''بابو جی! ایک بڈھا آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

بابو رگھبیر سہائے ملکہ کے باغ کی بات بالکل فراموش کر بیٹھے تھے۔ انہوں نے پوچھا۔ ''کون بڈھا؟''

کہار۔ ''یہ تو معلوم نہیں۔''

رگھبیر۔ ''کیا کوئی نیا آدمی ہے؟''

کہار۔ ''ہاں! نیا آدمی ہے۔''

رگھبیر سنگھ کچھ دیر تک سوچ کر بولے۔ ''اچھا بلاؤ۔''

بڈھے نے سامنے آکر سلام کیا۔ اسے دیکھتے ہی رگھبیر سہائے نے کہا۔ ''اوہو! تم ہو۔ میں سوچتا تھا' کون آدمی ہے۔ ہاں! تو کیا تمہیں ابھی تک نوکری نہیں ملی؟''

بوڑھا۔ ''نہیں سرکار۔''

رگھبیر۔ ''تو تم ہمارے ہاں نوکری کرو گے؟''

بوڑھا۔ ''کیوں نہیں کروں گا سرکار؟''

رگھبیر۔ ''کیا تنخواہ لو گے؟''

بوڑھا۔ ''تنخواہ ونخواہ کچھ نہیں...... میرا اور میرے بال بچوں کا پیٹ بھرنا چاہیے۔''

رگھبیر۔ ''تو بھی آخر کچھ معلوم تو ہو۔''

بوڑھا۔ ''میں کیا بتاؤں؟''

رگھبیر۔ ''اچھا! ہم تمہیں پندرہ روپے ماہوار دیں گے۔''

بوڑھا۔ ''بہت ہیں۔ کام سرکار کیا کرنا ہو گا؟''

رگھبیر۔ ''تمہارے لائق جو کام ہو گا۔''

بوڑھا۔ ''ہاں سرکار! اس بات کا دھیان رکھئے گا کہ میں ٹھاکر ہوں۔''

رگھبیر۔ ''ہاں ہاں' اس بات کا پورا دھیان رکھا جائے گا۔''

بوڑھا۔ ''بس سرکار! میں اتنا ہی چاہتا ہوں۔''

رگھبیر۔ ''تم بھی نمک حلالی کے ساتھ کام کرنا۔ یہ یاد رکھو۔ لوگ بہت دیکھ بھال کر نوکر رکھتے ہیں۔ جب تک کوئی شریف آدمی سفارش نہیں کرتا' اس وقت تک نوکر نہیں رکھا جاتا۔ ہم تمہیں صرف تمہاری ہی بات پر رکھ لیتے ہیں۔''

بوڑھا۔ ''آپ کی تمام باتوں کے جواب میں میں صرف اتنا کہتا ہوں کہ میں اصیل چھتری ہوں۔''

رگھبیر۔ ''اچھی بات ہے۔ ہم بھی کوئی ایسا ہی آدمی چاہتے تھے۔ تم رہتے کہاں ہو؟''

بوڑھا۔ ''سرکار! مجھے اس شہر میں آئے دس بارہ دن ہوئے ہیں۔ ایک دھرم شالہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

رگھبیر۔ ''اوہو! تم پہلے یہاں کبھی نہیں آئے؟''

بوڑھا۔ ''کبھی نہیں۔''

رگھبیر سہائے تھوڑی دیر تک کچھ سوچتے رہے۔ اس کے بعد بولے ''اچھا! تم اپنے بیوی بچوں کو یہیں لے آؤ۔ تمہیں رہنے کے لیے جگہ دے دی جائے گی۔''

بوڑھا۔ ''بہت اچھا سرکار۔''

رگھبیر۔ ''ہاں! آج ہی آجاؤ۔''

رگھبیر سنگھ نے کہار کو بلا کر کہا۔ ''دیکھو۔ انہیں وہ کوٹھڑی اور دالان جو خالی پڑا ہے' دکھادو۔ (بوڑھے سے) جاؤ اپنی جگہ دیکھ لو۔''

بوڑھا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آکر بولا۔ ''ٹھیک ہے' میرے لیے جگہ کافی ہے۔ اچھا! تو جاتا ہوں۔ شام تک آجاؤں گا۔''

رگھبیر۔ ''جاؤ...... ہاں...... تمہارا نام کیا ہے؟ نام پوچھنا تو میں بھول ہی گیا تھا۔''

بوڑھا۔ ''میرا نام سرکار شیر سنگھ ہے۔''

یہ کہہ کر بوڑھا شیر سنگھ چلا گیا۔

(3)

شیر سنگھ کو بابو رگھبیر سہائے کے ہاں نوکر ہوئے تین ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے۔ اب اس کی حالت اچھی ہے۔ پہلے کی نسبت اب جسم بہت تروتازہ ہے۔ ایک روز رگھبیر سہائے کے دوست شوموہن لال نے ان سے پوچھا ''کہیے! شیر سنگھ کیسا آدمی ہے؟ کام ٹھیک کرتا ہے؟''

رگھبیر سنگھ منہ بولا کر بولے۔ ''کیا بتاؤں۔ بڑا کاہل آدمی ہے۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اس کا کریکٹر سمجھنے میں غلطی کی۔ اس آدمی سے محنت نہیں ہو سکتی اور ہو کیسے؟ جس آدمی کو بھیک مانگنے کا چسکا پڑ جائے۔ اس سے محنت کا کام ہو ہی نہیں سکتا۔''

شوموہن۔ ''یہ بات تو بجا ہے مگر اس وقت ہم نے یہ قیاس کیا تھا کہ یہ بھیک مانگنے کا عادی نہیں......''

رگھبیر۔ ''ہاں وہ قیاس غلط ثابت ہوا۔''

شوموہن۔ ''آخر اس میں نقص کیا ہے؟''

رگھبیر۔ ''نقص یہی ہے کہ جتنا کام کہا جائے گا' آپ اتنا ہی کریں گے۔ اپنی طرف سے کوئی کام نہیں کریں گے۔ یہ بھی نہیں کہ ہر وقت حاضر رہیں۔ گھر میں آرام سے پڑے رہتے ہیں۔ کبھی جی چاہا تو گھنٹے دو گھنٹے کے لیے دروازہ پر آبیٹھے ورنہ جب ضرورت پڑتی ہے' گھر سے بلانا پڑتا ہے۔''

شوموہن۔ ''یہ تو بری بات ہے۔''

رگھبیر۔ ''اکڑ بھی آپ میں کافی ہے۔ ذرا سی بات پر لوگوں سے لڑ مرتے ہیں۔ باتونی اتنے ہیں کہ اپنے سامنے کسی کو بولنے نہیں دیتے۔ والد صاحب تو بہت ہی ناخوش ہیں۔ انہوں نے تو کئی بار کہا کہ نکال باہر کرو مگر میں ہی نبھا رہا ہوں۔ ایک آدھ مہینے اور دیکھتا ہوں۔ اگر راہ پر آگئے تو خیر ورنہ جواب دے دوں گا۔''

شو موہن۔ ”ہاں پھر اور کیا کروگے؟ اچھا! ذرا ان حضرت کو بلاؤ۔ میں بھی تو ان کی باتیں سن لوں۔“

رگھبیر۔ ”ارے ہٹاؤ بھی۔ کیا سنو گے۔“

شو موہن۔ ”تمہیں ہماری قسم، ذرا بلواؤ۔“

رگھبیر سہائے نے کہار کو آواز دی۔ کہار کے آنے پر اس سے پوچھا ”شیر سنگھ کہاں ہے؟“

کہار۔ ”کیا معلوم؟ درونجے (دروازے) پر تو ہیں نہیں۔ گھر میں پڑے ہون گے۔“

رگھبیر سہائے شو موہن سے بولا۔ ”دیکھا آپ نے؟“ اس کے بعد کہار سے کہا۔ ”انہیں بلواؤ۔“

تھوڑی دیر بعد شیر سنگھ اکڑتے ہوئے آئے۔ سر پر ایک گلابی صافہ بندھا تھا۔ ایک ململ کا سفید کرتہ زیبِ تن کر رکھا تھا۔ دھوتی بھی صاف تھی۔ شو موہن نے شیر سنگھ کی شان دیکھ کر دل میں کہا۔ ”واقعی یہ آدمی کام دھندا کیا کرتا ہوگا۔“

شو موہن نے پوچھا۔ ”کیوں شیر سنگھ! کہاں تھے؟“

شیر سنگھ بڑی لاپروائی سے بولے۔ ”کہیں نہیں۔ گھر میں پڑا تھا۔ تھوڑی دیر ہوئی کھانا کھایا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کرنا اچھا ہوتا ہے۔ کچھ عادت بھی پڑ گئی ہے۔ کھانا کھانے کے بعد اگر گھنٹہ دو گھنٹے آرام نہ کرلوں تو طبیعت اچھی نہیں رہتی۔“

شو موہن۔ ”اس سے پہلے کہیں اور بھی نوکری کر چکے ہو؟“

شیر سنگھ۔ ”سرکار! نوکری تو کئی جگہ کر چکا ہوں مگر کسی سے بنی نہیں۔ تیس برس کی عمر تک تو اپنے گاؤں میں کھیتی ویتی کرتا رہا۔ زمیندار سے ایک چھوٹی سی بات پر جھگڑا ہوگیا۔ ٹھاکر بچے لڑے اور دبیں بھی تو کیوں؟ لگان سب سے پہلے مجھ پر بسا دیتے تھے۔ نذر بیگار کچھ دیتے نہیں تھے۔ جب تک ان کے والد زندہ رہے' وہ کچھ نہیں بولے۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے صاحبزادے گاؤں تحصیلنے لگے۔ وہ تھے چھوکرے۔ لوگوں کے کہنے سننے میں آگئے اور لگے ہم پر رعب جمانے۔ ہم نے سرکار! آج تک کسی کا رعب سہا نہیں اور اب تو سرکار! زمانہ کی گردش نے ہمارا مزاج بہت ملائم کر دیا ہے۔ اس وقت تو ہم ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے۔ بس ایک روز ان سے ہماری کہا سنی ہوگئی۔ ہم نے انہیں دھر کے ڈانٹ دیا۔ بس اسی دن سے وہ ہمارے دشمن ہوگئے۔ ہم نے بھی سوچا دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر ٹھیک نہیں۔ نہ جانیئے کب وار کر بیٹھیں' وہ زمیندار' ہم کسان' سب انہی کی سی کہنے والے۔ ہماری سی کہنے والا کوئی نہیں۔ یہی سب سوچ کر ہم نے زمین چھوڑ دی اور گاؤں سے چلے آئے۔“

شو موہن۔ ”پھر کیا کرتے رہے؟“

شیر سنگھ۔ ”اس کے بعد ایک جگہ نوکری کی۔ وہ بھی ٹھاکر ہی تھے۔ ان کے ہاں سرکار! ہم پندرہ برس رہے۔ وہ آدمی کو پہچانتے تھے۔ اسی لیے ہمارے اتنے دن ان کے ہاں نبھ گئے۔ ان کے مرنے پر ہم نے ایک دوسری جگہ نوکری کی مگر ان سے ہماری پٹی نہیں۔ وہ بھی چھوڑ دی۔ اس وقت سے پھر ایسے ہی رہا کہ کہیں چھ مہینے رہے' کہیں چار مہینے۔ کوئی آدمی ایسا نہیں ملا جو ہماری قدر کرتا۔ پچھلے سال ایک کے ہاں لکھنؤ میں نوکری کی۔ اس سے جھگڑا ہوگیا۔ اس وقت سے ہم نے یہ عہد کرلیا تھا کہ بھیک مانگ کھانا منظور مگر نوکری نہ کریں گے۔ کریں گے تو ایسے آدمی کے ہاں جو ہماری قدر کرے گا۔ اب سرکار! آپ لوگوں کی ڈھیری میں آئے ہیں۔ آپ لوگوں نے دیا کر کے شرن میں رکھا ہے۔ نبھ جائے تو اچھا ہی ہے۔“

شو موہن۔ ’’تم نبھانا چاہو گے تو نبھے گی۔‘‘

شیر سنگھ۔ ’’ہم تو چاہتے ہی ہیں مگر اصل نبھانا آپ لوگوں کے ہاتھ ہے۔ جن لوگوں کے ہاں ہم پندرہ برس رہے ہیں۔ ان سے ہم نے نوکری کرتے وقت کہا تھا کہ سرکار! ہم ٹٹو نہیں ہیں جو ہم سے دن بھر بوجھ ڈھوایا جائے۔ ہم ہیں گھوڑے اور وہ بھی عربی نسل کے۔ عربی نسل کے گھوڑے مہینوں بندھے کھاتے ہیں مگر لڑائی کے میدان میں سارا کھلایا پلایا ایک ہی دن میں وصول کر دیتے ہیں۔ سرکار! ایسی ہی بات ہے۔ سمجھنے والے سمجھتے ہیں۔ ان کے ہاں ہم پندرہ برس رہے۔ کام پڑنے پر وہ بھی مان گئے۔ ان باتوں کے بیان کرنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ وہ زمانہ ہی اور تھا۔‘‘

شو موہن شیر سنگھ کی باتیں سن کر چپ رہ گئے۔ آخر کار بولے۔ ’’ٹھیک کہتے ہو۔‘‘

شیر سنگھ نے رگھبیر سہائے سے پوچھا۔ ’’کچھ کام تو نہیں سرکار؟‘‘

رگھبیر سہائے شیر سنگھ کی باتیں سن کر دل میں کڑھ رہے تھے۔ بڑے روکھے پن سے کہا۔ ’’کچھ کام نہیں۔‘‘

شیر سنگھ۔ ’’تو جاتا ہوں سرکار! گھنٹہ آدھ گھنٹہ آرام کروں گا۔‘‘ یہ کہہ کر شیر سنگھ چلا گیا۔

رگھبیر۔ ’’سنا آپ نے؟‘‘

شو موہن۔ ’’ہاں سنا۔ عجیب و غریب آدمی ہے۔ باتونی بڑا ہے۔‘‘

رگھبیر۔ ’’جتنی باتیں اس نے کہیں‘ آپ ان پر یقین کرتے ہیں؟‘‘

شو موہن۔ ’’کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے درست ہوں۔‘‘

رگھبیر۔ ’’مجھے تو ذرا بھی یقین نہیں آتا۔ مجھے تو یہ آدمی بالکل جھوٹا اور مکار معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے یہ کہیں چار چھ برس رہا ہو مگر کسی آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے کے پاس رہا ہوگا۔ اس کی باتوں میں آکر اس نے رکھ لیا ہوگا۔ کام کچھ خاص ہوگا نہیں اس لیے نبھ گئی ہوگی۔‘‘

شو موہن۔ ’’یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔ خیر! میرے دل میں ایک بات آئی ہے۔‘‘

رگھبیر۔ ’’وہ کیا؟‘‘

شو موہن۔ ’’یہ آدمی بہت بڑھ بڑھ کر باتیں مارتا ہے۔ عربی گھوڑا بنتا ہے۔ ایک روز اس کا امتحان لیا جائے۔ کوئی مشکل کام بتا دیا جائے۔ دیکھیں یہ کرتا ہے یا نہیں؟‘‘

رگھبیر۔ ’’اجی یہ کیا کرے گا‘ باتوں میں ٹال دے گا۔‘‘

شو موہن۔ ’’خیر۔ دیکھنا تو چاہیے۔‘‘

رگھبیر۔ ’’تو تم ہی کوئی کام سوچو۔‘‘

شو موہن۔ ’’اچھا! سوچ کر بتاؤں گا۔‘‘

(4)

ایک ہفتہ بعد شو موہن لالہ رگھبیر سہائے سے ملے تو رگھبیر سہائے نے پوچھا۔ ’’کہیے۔ کوئی تدبیر سوچی؟‘‘

شو موہن۔ ”کیا کہوں۔ ابھی تک تو کوئی تدبیر نہیں سوچ سکا۔ آپ نے کوئی بات سوچی؟“
رگھبیر۔ ”میرے بھی خیال میں ابھی تک کوئی بات نہیں آئی۔“
شو موہن۔ ”تو پھر؟“
رگھبیر۔ ”میں کیا بتاؤں! میں تو اس جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ تمہاری ہی رائے تھی۔ اس لیے تم ہی کوئی تدبیر سوچ نکالو۔“
شو موہن۔ ”اس وقت تو کوئی تدبیر نہیں سوجھتی۔ جب سوجھے گی تب بتا دوں گا۔“
رگھبیر۔ ”تدبیر ودبیر کچھ نہیں‘ یہ سب واہیات ہے۔ ایک آدھ مہینے اور دیکھتا ہوں۔ اس کے بعد جواب دے دوں گا۔“
شو موہن سے رگھبیر کی مندرجہ بالا گفتگو ہوئے پندرہ دن گزر گئے۔
ایک روز رگھبیر سہائے کے ماموں کے ہاں سے رقعۂ نوید آیا۔ رگھبیر سہائے کے عموزاد بھائی کی شادی تھی۔ اس شادی میں شامل ہونے کے لیے وہ چٹھی آئی تھی۔ رگھبیر سہائے کے والد نے ان سے کہا۔ ”میں تو اتنے دن پہلے نہیں جا سکتا۔ دو چار ضروری مقدمے ہیں۔ تم اپنی والدہ‘ بیوی اور دیو سہائے کو لے کر کل چلے جاؤ۔ میں دو ایک روز کے لیے سیدھے وہیں آکر برات میں شامل ہو جاؤں گا۔“
رگھبیر۔ ”ساتھ کون سا نوکر لے جاؤں؟“
شنکر سہائے۔ ”کہار کے لڑکے کو لے جاؤ۔ اس سے تمہارا کام چل جائے گا۔“
رگھبیر۔ ”ہاں چل تو جائے گا۔“
شنکر۔ ”تو بس ٹھیک ہے۔“
رگھبیر۔ ”کہیے تو شیر سنگھ کو بھی لے جاؤں؟“
شنکر۔ ”اسے لے جا کر کیا کرو گے؟ وہاں اس کے لیے ایک الگ نوکر کی ضرورت نہ ہو گی۔ دوسرے برات کا معاملہ ٹھہرا۔ سبھی طرح کے آدمی ہوں گے۔ اگر وہاں کسی سے لڑ پڑا تو اور بدنامی ملے گی۔ ویسے تمہاری مرضی۔ میرے تو وہ کسی کام کا نہیں ہے۔ مجھے تو اس کی صورت سے نفرت ہے۔ تم نے اسے رکھا ہے۔ تمہاری مرضی ہو تو لے جاؤ۔“
رگھبیر سہائے۔ ”اچھا! جیسا مناسب ہو گا‘ کروں گا۔“
دوسرے دن چار بجے شام کی گاڑی سے سب روانہ ہو گئے۔ شو موہن کے کہنے سے رگھبیر سہائے نے شیر سنگھ کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ شو موہن نے کہا۔ ”اچھا ہے لیتے جاؤ۔ کچھ نہ کچھ کام تو کرے ہی گا۔ اس کے علاوہ دو آدمی ساتھ رہیں گے تو شان رہے گی۔“
روانہ ہوتے وقت رگھبیر سہائے نے شیر سنگھ کے ہاتھ میں موٹا لٹھ دیکھ کر کہا۔ ”یہ لٹھ کیا کرو گے لے چل کر؟ کسی سے فوجداری کرو گے کیا؟“
شیر سنگھ۔ ”صاحب! سرکار انگریز بہادر نے ہتھیار تو سب چھین ہی لیے‘ اب لٹھ باندھنے سے بھی گئے کیا؟ ہم لوگوں کا تو یہی ایک سہارا ہے۔“
رگھبیر۔ ”مگر لٹھ سے تو کچھ بہت کام نکلتا نہیں۔ تلوار‘ بندوق کے سامنے لٹھ کیا کام دے سکتا ہے؟“

شیر سنگھ۔ ''بندوق کے سامنے تو کوئی کام نہیں دے سکتا مگر تلوار اس کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ پڑا لٹھ سے کام بھول گئی ایپٹے بازی سرکار! لٹھ کی مار بہت بری ہوتی ہے۔ لٹھ کے سامنے تلوار یا بھالا کسی کام کا نہیں ہے۔''

رگھبیر سہائے شیر سنگھ کو بے وقوف سمجھ کر خاموش ہو گئے۔ آٹھ بجے رات کو گاڑی معینہ اسٹیشن پر پہنچی۔ اسٹیشن سے گاؤں چار کوس کے فاصلہ پر تھا۔ اسٹیشن پر دو بہلیاں اور دو لٹھ بند آدمی موجود تھے۔

اسٹیشن پر اترتے ہی پہلا سوال رگھبیر سہائے نے یہ اٹھایا کہ اس وقت چلنا مناسب ہے یا نہیں؟ بہلیوں کے ساتھ جو آدمی آئے تھے' انہوں نے کہا۔ ''کوئی فکر نہیں۔ آپ بے دھڑک چلیں۔''

رگھبیر۔ ''ادھر ڈاکے والے تو نہیں پڑتے؟''

وہ بولے ''نہیں سرکار! اس وقت اس کی فکر نہیں۔ ڈاکے پڑتے ہیں رات کے بارہ بجے کے بعد۔ پھر ہم لوگوں کا ڈاکو کیا کر سکتے ہیں؟ ابھی تو شام ہی ہوئی ہے۔ دس بجے تک گھر پہنچ جائیں گے۔ آپ بے خوف و خطر چلیں۔''

رگھبیر سنگھ نے شیر سنگھ سے پوچھا ''کیوں بھئی شیر سنگھ! میری تو رائے یہ ہے کہ رات یہیں اسٹیشن پر گزار دیں اور سویرے یہاں سے چلیں...... تمہاری کیا رائے ہے؟''

شیر سنگھ نے جواب دیا ''آپ کی رائے ٹھیک ہے۔ میری بھی یہی رائے ہے۔''

وہ آدمی جو بہلیوں کے ساتھ آئے تھے' شیر سنگھ کی بات سن کر ہنس پڑے۔ انہوں نے شیر سنگھ سے پوچھا ''تمہاری کیا ذات ہے بھائی؟''

شیر سنگھ۔ ''ہم تو ٹھاکر ہیں۔''

ایک آدمی۔ ''ارے رام رام۔ ٹھاکر ہو کر اتنا ڈرتے ہوئے؟''

شیر سنگھ کے لبوں پر نفرت آمیز تبسم کی جھلک نظر آئی۔ اس نے کہا۔ ''بھائی ڈریں کیوں نہیں۔ جان سب کو عزیز ہوتی ہے۔ دوسرے عورتوں کا ساتھ ہے۔''

وہی آدمی۔ ''تو کوئی بات ہو تو ہمارا ذمہ۔ تم چلے چلو چپ چاپ۔ رات بھر یہیں پڑے رہ کر کیا کرو گے؟ تکلیف ہو گی۔''

رگھبیر سہائے۔ ''بھائی! جیسا تم مناسب سمجھو کرو۔ میں تو اس بارے میں کچھ زیادہ جانتا نہیں۔''

وہی آدمی۔ ''آپ چلیے' دیر مت کیجئے۔ دیر کرنے سے رات زیادہ ہو جائے گی۔''

شیر سنگھ۔ ''چلیے سرکار! یہ لوگ کہتے ہیں تو چلیے۔ ڈر کیا ہے؟ ابھی شام ہی ہوئی ہے' چاندنی رات ہے۔''

شیر سنگھ کی یہ بات سن کر وہ دونوں آدمی ہنس کر بولے۔ ''ہاں۔ اب تم نے ٹھاکر پن کی بات کہی۔ پہلے تو بڑی بودی بات کہی تھی۔''

شیر سنگھ ذرا بگڑ کر بولا۔ ''دیکھو بھائی! میرے ٹھاکر پن کی ہنسی مت اڑاؤ ورنہ اچھا نہ ہو گا۔ میں ٹھاکر ہوں تو اپنے لیے' نہیں ہوں تو اپنے لیے۔ مجھے یہاں کسی سسرے سے ناطہ داری نہیں کرنی ہے۔''

رگھبیر سہائے ذرا ناراض ہو کر بولے۔ ''تو یہاں لڑنے آئے ہو۔ اپنا کام دیکھو۔''

وہ آدمی بولے۔ ''نہیں مالک! لڑائی وڑائی کی کوئی بات نہیں۔ آپس کی باتیں ہیں۔ اچھا! تو اب سوار ہو جائیے۔''

سب لوگ سوار ہوئے۔ ایک بہلی پر رگھبیر سہائے کی والدہ' بیوی اور ان کا چھوٹا بھائی دیوی سہائے سوار

ہوئے۔ دوسری پر رگھبیر سہائے اور کہار کا لڑکا جس کی عمر چودہ پندرہ سال کی تھی' بیٹھ گئے۔ جو آدمی بہلیوں کے ساتھ آئے تھے' وہ پیدل چلے۔

تھوڑی دور چل کر شیر سنگھ بھی اچک کر رگھبیر سنگھ کی بہلی پر چڑھ بیٹھا۔ ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے شیر سنگھ سے کہا۔ ''کیوں بھائی! ڈٹ گئے؟''

شیر سنگھ۔ ''اور کیا۔ جب جگہ ہے تو کیوں پیر توڑیں؟''

دوسرے آدمی نے کہا۔ ''اور جو ڈاکو ملے؟''

شیر سنگھ۔ ''ملے تو تم کاہے کے لیے ہو؟ تمہارے ہی کہنے سے تو ہم لوگ اس وقت چلے ہیں۔ میں تو بڈھا آدمی ٹھہرا۔ مجھ سے کیا ہو سکے گا؟''

پہلا۔ ''کچھ فکر نہیں۔ آپ بے کھٹکے چلے چلیے۔ ہمارے ہوتے آپ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔''

دو کوس چلنے کے بعد ایک ندی ملی۔ یہ ندی اس وقت سوکھی پڑی تھی۔ ندی کے پاس پہنچ کر گاڑی بانوں نے کہا۔ ''سنبھلے رہیو۔ اس جگہ اتار ہے۔''

بہلیاں چھم چھم کرتی ہوئی ندی میں اتریں اور پار جا نکلیں۔ دوسری طرف چڑھاؤ تھا۔ اس لیے بیلوں کو بڑی محنت پڑی۔ جب اس پار پہنچے تو گاڑی بانوں نے بہلیاں روک دیں۔

رگھبیر سہائے نے کہا۔ ''چلے چلو۔ رک کیوں گئے؟''

گاڑی بانوں نے جواب دیا۔ ''سرکار! ذرا بیلوں کو دم لینے دیجیے۔''

بہلیوں کو رکے چند ہی سیکنڈ ہوئے تھے کہ ندی کے کگاروں سے آٹھ دس آدمی ڈھاٹے باندھے ہاتھوں میں لٹھ لیے تیزی کے ساتھ نکلے اور ڈانٹ کر بولے۔ ''بس خبردار! جو کچھ پاس ہو' رکھتے جاؤ۔''

ان کی للکار سن کر گاڑی بان تو کود کر بھاگے۔ وہ آدمی جو بہلیوں کے ساتھ تھے' ڈاکوؤں کی للکار سن کر گم سے ہو گئے۔

ادھر شیر سنگھ اسی لمحہ بہلی پر سے کود پڑا۔ اور رگھبیر سہائے کو مخاطب کر کے بولا۔ ''سرکار! آپ چپ چاپ بیٹھے رہیے۔ میرے جیتے جی آپ لوگوں پر آنچ نہیں آسکتی۔ میرا کہنا سنا معاف کیجیے گا۔ بچ گیا تو خیر! ورنہ آپ کے نمک پانی سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔''

رگھبیر سہائے مارے خوف وہراس کے بدحواس ہو گئے تھے۔ ان کی زبان سے کوئی بات نہ نکلی۔

ادھر ڈاکوؤں نے ان دونوں آدمیوں کو ایک ایک کر کے لٹھ رسید کیا۔ پہلے تو انہوں نے بھی ایک آدھ ہاتھ دکھایا مگر پھر لٹھ پھینک کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

ادھر شیر سنگھ آگے بڑھ کر بولا۔ ''جس نے اپنی ماں کا دودھ پیا ہو' وہ میرے سامنے آئے۔''

اتنا سنتے ہی سب ڈاکو شیر سنگھ پر ٹوٹ پڑے۔ چند لمحوں تک لاٹھیوں کی کھٹا کھٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دیا اور نہ پے در پے واروں کے سوا اور کچھ نظر آیا۔ اس کے بعد ہائے مار ڈالا۔ ہائے رام وغیرہ جملے سنائی دیئے۔ ساتھ ہی چار پانچ آدمی بھدا بھد گرے۔ پانچ منٹ تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد ڈاکو بھاگ کھڑے ہوئے۔

لہو سے تربتر شیر سنگھ رگھبیر سہائے کے پاس آکر بولا۔ ''سب بھاگ گئے۔ نامرد تھے مگر میرا بھی کام تمام ہو گیا۔ اُف!''

یہ کہہ کر شیر سنگھ گر پڑا اور بے ہوش ہو گیا۔ ڈاکوؤں کے بھاگ جانے پر گاڑی بان اور وہ دونوں آدمی بھی آ گئے۔ جانچ کرنے پر پانچ ڈاکو بے ہوش پڑے پائے گئے۔

شیر سنگھ بہت بری طرح گھائل ہوا تھا۔ جانبری کی امید نہیں رہی تھی۔ دو ماہ تک ہسپتال میں پڑا رہا مگر آخرکار اچھا ہو گیا۔ جب شیر سنگھ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تو ایک دن شنکر سہائے نے اس سے کہا۔ ''شیر سنگھ! تم نے ہمارے بال بچوں کی جان بچائی۔ اس کا عوض تمہیں ہم اس زندگی میں نہیں دے سکتے۔ آج سے تم ہمارے بھائی ہو۔ تمہیں عمر بھر کھانا' کپڑا اور دس روپے ماہوار جیب خرچ کے لیے ملیں گے۔ تمہارے بعد تمہاری بیوی کو بھی یہی کچھ ملتا رہے گا۔''

شیر سنگھ بڑی لاپروائی سے بولا۔ ''اجی سرکار! کھانے کپڑے کی تو میں نے آج تک کبھی فکر نہیں کی۔ قدر دان آدمی ملنا چاہیے۔ کھانے کے لیے خشک چنے بھی ملیں تو مست رہوں۔''

رگھبیر سہائے بولے۔ ''ہمیں پہلے تمہاری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ ہم تو تمہارا امتحان لینے والے تھے مگر تمہارا امتحان تو ایشور نے ہی کرا دیا۔''

شیر سنگھ۔ ''سرکار! اگر آپ امتحان لیتے۔ آزمائش کرتے تو کیا فکر تھی اور ابھی کیا ہوا ہے۔ جی چاہے تو اب امتحان لے لیجیے۔ جو نکل جاؤں تو ٹھاکر نہیں چمار کہیے گا۔ ہم تو جس کا نمک پانی کھاتے ہیں' اسی کو جان سونپ دیتے ہیں۔ جب اس کا جی چاہے لے لے۔''

یہ کہہ کر شیر سنگھ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوا چلا گیا۔

اس کے چلے جانے پر رگھبیر سہائے نے کہا۔ ''انسان کا کریکٹر ایک ایسا معمہ ہے جسے کوئی حل نہیں کر سکتا۔''

شنکر سہائے۔ ''اس میں کیا شک ہے۔ جس طرح ہر ایک آدمی کا رنگ روپ' شکل و صورت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے' اسی طرح کریکٹر بھی۔ کوئی کہاں تک جانے اور کہاں تک سمجھے۔''

بیوی

(1)

باپ کی وفات کے بعد ایک سال تک بختاور سنگھ کا چال چلن ٹھیک رہا مگر اس کے بعد ان کا چال چلن بگڑنے لگا۔ روپے کی کمی نہیں تھی۔ پچیس ہزار سالانہ آمدنی کی زمینداری تھی۔ صحبتِ بد میں پڑ کر بختاور سنگھ کھل کھیلے۔ شراب نوشی' رنڈی بازی و دیگر افعال قبیحہ میں روپے پانی کی طرح بہائے جانے لگے۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ روپیہ آدمی کو دنیا میں معزز و محترم بناتا ہے۔ جن گناہوں کو غریب آدمی

صرف روپے کی خاطر اپنے سر پر لادتا ہے۔ دولت مند ان سے بچا رہتا ہے۔ روپیہ کا ہونا دنیادار کے لیے بہت فائدہ مند اور اس کا نہ ہونا بے حد نقصان دہ اور غیر سہولت بخش ہوتا ہے مگر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ بہت سی حالتوں میں روپے کا ہونا نہایت نقصان دہ اور نہ ہونا بے حد فائدہ بخش ہوتا ہے۔ بہت سے آدمی تنگدستی کے سبب ان برے افعال سے بچے رہتے ہیں جن سے وہ اس حالت میں ہرگز بچے نہ رہ سکتے' اگر وہ صاحبِ ثروت ہوتے۔ اسی طرح بہت سے لوگ محض اس لیے برے کاموں میں پھنسے رہتے ہیں کہ ان کے پاس افعالِ بد کے سب سے بڑے مددگار روپے کی کمی نہیں ہے۔ اس قسم کے آدمیوں کے پاس اگر روپیہ نہ ہو تو وہ بے شمار گناہوں سے بچے رہ سکتے ہیں۔ اصل بدچلن وہی ہے جو نادار ہو کر بھی برے کام کرتا ہے۔ ایسا آدمی ایک برا کام کرنے کے لیے بہت سے برے کام کرتا ہے۔ رنڈی بازی اور شراب نوشی کرنے کے لیے چوری کرتا ہے۔ جوا کھیلتا ہے۔ اصلی نیک چلن وہی ہے جو دولت مند اور فراخ دل ہو کر بھی گناہ نہیں کرتا۔

بختاور سنگھ ان لوگوں میں سے تھے جو صرف دولت مند ہونے کی وجہ سے بدچلن ہو جاتے ہیں۔ بختاور سنگھ کے لیے روپے کا استعمال یہی تھا کہ وہ رنڈی بازی اور شراب نوشی وغیرہ میں خرچ کیا جائے۔

بختاور سنگھ کی شادی والد کے حینِ حیات ہی ہو چکی تھی۔ اس وقت ان کا ایک پانچ سالہ لڑکا اور ایک دو برس کی لڑکی تھی۔ بختاور سنگھ کی بیوی روپ کنوری ایک شریف اور دولت مند خاندان کی لڑکی تھی۔

پہلے تو بختاور سنگھ پوشیدہ طور سے اپنی بری خواہشات پوری کرتے تھے۔ عرصہ تک روپ کنوری پر ان کی بدچلنیوں کا کچھ بھی حال نہ کھلا۔ بالآخر ایک روز رات کے وقت بختاور سنگھ شراب کے نشہ میں جھومتے ہوئے اپنی خوابگاہ میں پہنچے۔ دونوں بچے سو گئے تھے۔ روپ کنوری شوہر کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ بختاور سنگھ نے پلنگ پر بیٹھتے ہی روپ کنوری کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ روپ کنوری چونک پڑی۔ اس نے ذرا پرے ہٹ کر شوہر کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ ''آج تمہارے منہ سے شراب کی بو آتی ہے۔ کیا آج تم نے شراب پی ہے؟''

نشہ کے باوجود بھی بختاور سنگھ نے ذرا جھینپ کر کہا ''نہیں۔ یونہی ذرا چکھ لی تھی۔ کلیان پور کے ٹھاکر صاحب آئے تھے۔ ان کے لیے منگوائی تھی۔ انہوں نے نہ مانا۔ مجھے بھی تھوڑی سی پلا ہی دی۔''

روپ کنوری۔ ''تم نے پی ہو گی تو انہوں نے پلائی ہو گی۔ کوئی کسی کو زبردستی تو پلا ہی نہیں سکتا۔''

بختاور۔ ''تم ان باتوں کو کیا سمجھو؟ دوست احباب کے ساتھ بیٹھ کر پھر انکار نہیں بنتا۔''

روپ کنوری۔ ''واہ! اچھے دوست احباب ہیں۔ کل کو وہ اور کچھ کہیں گے' اس سے بھی انکار نہ کرو گے۔''

بختاور۔ ''اس کی بات اور ہے۔ کبھی کبھی پی لینے میں کچھ نقصان نہیں۔''

روپ کنوری۔ ''نقصان کیوں نہیں۔ بڑا بھاری نقصان ہے۔ عادت پڑ جاتی ہے۔''

بختاور۔ ''میری عادت نہیں پڑ سکتی۔''

روپ کنوری نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ اس رات کو روپ کنوری کا برتاؤ شوہر کے ساتھ قدرے خشک سا رہا۔ بختاور سنگھ کو بیوی کے خشک برتاؤ پر غصہ آیا۔ انہوں نے سوچا ''ذرا سی بات میں ایسا روکھا پن۔ جس بات میں میری خوشی ہو' اس میں خوش ہونا اور جس میں مجھے سکھ ملے' اس میں سکھ ماننا اس کا فرض ہے۔ ہندو استری کا یہی فرض ہے۔''

اپنے دل میں اس طرح کا بحث مباحثہ کرنے کے بعد بختاور سنگھ نے روپ کنوری کو ہی سزاوار گردانا۔
اسی طرح کچھ دن اور گزرے۔ بختاور سنگھ پہلے تو بیوی کا کچھ لحاظ کرتے تھے مگر جب دو چار بار ایسے ہی واقعات رونما ہوئے تو ان کی آنکھوں کا رہا سہا پانی بھی ڈھل گیا۔ روپ کنوری نے شوہر کی حالت کو دیکھا۔ اس پر غور کیا اور اس کا نتیجہ سمجھا۔ اس نے متعدد بار پیار سے' روکھے پن سے' حلیمی سے' سختی سے' ہنس کر' رو کر' منت سماجت کر کے اور میکے چلے جانے کی دھمکیاں دے کر شوہر کو سمجھایا مگر بختاور سنگھ کچھ نہ سمجھے۔ اس وقت تو ہاں ہاں کر دیتے تھے مگر اپنی بد چلنیوں کو کم کرنا تو درکنار دن بدن بڑھاتے ہی جاتے تھے۔ اکثر ایسا ہوا کہ روپ کنوری نے کئی کئی دن تک ان سے بات نہیں کی مگر اس کا نتیجہ اور بھی برا ہوا۔ بختاور سنگھ نے سمجھا' ان کی بیوی دخل در معقولات کر رہی ہے۔ انہوں نے سوچا' وہ صرف اپنی ضد رکھنے کے لیے ان سے ایسا سلوک روا رکھ رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے یہی فیصلہ کیا' دیکھیں کہاں تک ضد کرتی ہے۔

(2)

پنڈت بال گوبند بختاور سنگھ کے ہاں سب سے پرانے ملازم تھے۔ ایک طرح سے ان کی عمر ہی بختاور سنگھ کے ہاں گزری تھی۔ وقتِ رحلت بختاور سنگھ کے والد کہہ گئے تھے کہ پنڈت بال گوبند ہمیشہ کام کرتے رہیں اور جب وہ کام نہ کرنا چاہیں' اس وقت ان کی پنشن مقرر کر دی جائے۔
پنڈت بال گوبند کی عمر اس وقت پچاس سے اوپر تھی۔ بڑے شریف اور نیک چلن تھے۔ ان کا کام خزانہ کی نگرانی رکھنا اور حساب کتاب کرنا تھا۔
بختاور سنگھ شکار کھیلنے گئے تھے۔ بال گوبند روپ کنوری کے پاس پہنچے۔ ان سے روپ کنوری پردہ نہیں کرتی تھی اور ہمیشہ چچا کہہ کر مخاطب کرتی تھی۔
پنڈت جی کو دیکھتے ہی روپ کنوری نے کہا۔ "کہو چچا جی! آج کیسے بھول پڑے؟"
پنڈت جی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ "کیا کہوں بیٹی! بعض ضروری باتیں کہنی ہیں۔ اس لیے چلا آیا۔ بیٹی! تمہارا چہرہ آج اترا ہوا سا کیوں ہے؟ کچھ تکلیف ہے کیا؟"
روپ کنوری ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ "نہیں۔ تکلیف تو کوئی نہیں۔ یونہی طبیعت ذرا خراب رہتی ہے۔"
پنڈت جی۔ "بیٹی! مجھے یہ کہنا تھا کہ اب میری سفیدی میں سیاہی لگا چاہتی ہے۔ بڑے ٹھاکر صاحب کے سامنے تو میری جیسی کٹی' اسے سب جانتے ہیں اور انہوں نے جیسا مجھے مانا' وہ بھی سب پر روشن ہے مگر اب ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بڑھاپے میں کلنک کا ٹیکہ لگنا لکھا ہے۔"
روپ کنوری اگرچہ دل میں تو سمجھ گئی کہ پنڈت جی کی تمہید کس مضمون سے تعلق رکھتی ہے مگر پھر بھی انجان بن کر بولی۔ "بات کیا ہے۔ کاہے کو کلنک کا ٹیکہ لگے گا؟"
پنڈت جی۔ "بیٹی! مجھے بڑا دکھ ہے کہ مجھے تم سے یہ باتیں کہنی پڑ رہی ہیں۔ شاید تم خیال کرو کہ چغلی کھاتا ہوں۔ نارائن جانے میں نے ہر چند چاہا کہ نہ کہوں مگر جب دیکھا کہ بغیر کہے نہیں بنتا تو چلا آیا۔"
روپ کنوری۔ "چچا! تم ناحق ایسی باتیں کہتے ہو جو تمہارے مزاج سے واقف نہ ہو' اس سے کہو۔"

پنڈت جی آبدیدہ ہو کر بولے۔ ”بھگوان تمہاری مانگ کوکھ بھری پُری رکھے! بیٹی! مجھے بختاور کے بارے میں کچھ کہنا ہے۔“

روپ کنوری کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اس نے جی کڑا کر کے کہا۔ ”کیا؟“

پنڈت جی۔ ”بختاور کے طور بگڑتے جا رہے ہیں۔ ان کا خرچ بے طرح بڑھتا جا رہا ہے۔ اگر یہی حال رہا تو نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔“

روپ کنوری۔ ”خرچ بہت بڑھ رہا ہے؟“

پنڈت جی۔ ”بہت زیادہ۔ پچھلے مہینے میں انہوں نے پندرہ ہزار روپے خرچ کر ڈالے۔ اس سے پہلے کسی مہینے چھ ہزار' کسی مہینے پانچ ہزار۔ ایسا ہی حساب رہا۔ میں نے کئی بار انہیں محتاط بھی کیا مگر بے سود! بیٹی! اگر یہی حال رہا تو بہت جلدی خزانہ خالی ہو جائے گا اور قرض اٹھانے کی نوبت آئے گی۔“

روپ کنوری کے دل پر یہ دوسری چوٹ لگی۔ اب تک وہ یہی سمجھے ہوئے تھی کہ صحبتِ بد میں پڑ جانے کے سبب اس وقت بختاور سنگھ کا چال چلن خراب ہو رہا ہے مگر اسے اس بات کا ذرا بھی حال معلوم نہ تھا کہ اس کے ساتھ ہی مالی حالت بھی روز بروز خراب ہوتی جا رہی ہے۔

روپ کنوری بڑی دیر بیٹھی سر جھکائے سوچتی رہی۔ اس کے بعد سر اٹھا کر بولی۔ ”تو چچا! اس کی تدبیر؟“

پنڈت جی۔ ”تدبیر بس یہی کہ تم انہیں سمجھاؤ۔ میں تو سمجھا سمجھا کر ہار گیا۔ میرا کہنا نہیں سنتے تو نہ سنیں مگر مجھے یقین ہے کہ وہ تمہاری بات ضرور سنیں گے۔“

روپ کنوری نے دل میں سوچا۔ ”یہ خوب رہی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کسی روز چچا کو بلا کر ان سے اپنا دکھ کہوں گی اور ان سے درخواست کروں گی کہ وہ انہیں (میرے شوہر کو) سمجھائیں مگر یہ تو خود مجھ ہی سے سمجھانے کی درخواست کر رہے ہیں!“

اس سے روپ کنوری نے یہ نتیجہ نکالا کہ حالات زیادہ خراب ہو گئے ہیں۔ اس نے پنڈت جی سے کہا۔ ”مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ خزانہ اتنی تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ ہاں ان کی بدچلنیوں کی خبر مجھے بہت پہلے ہی سے ہے۔ میں نے بھی انہیں بہت سمجھایا مگر انہوں نے میری بھی نہیں سنی اور نہ سنیں گے۔“

پنڈت بال گوبند متحیر ہو کر بولے۔ ”ایں! بات یہاں تک پہنچ گئی؟ تو بس ہو چکا۔ اب کسی قسم کی امید رکھنا لاحاصل ہے۔ میں تو کل ہی سب کچھ ان کو سونپ کر گھر بیٹھتا ہوں۔ وہ جانیں' ان کا کام! مجھے بڑھاپے میں اپنی مٹی خراب نہیں کرنی ہے۔ میرے رہتے ہوئے کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو میری سفیدی میں سیاہی لگ جائے گی۔ دنیا مجھے ہی قصوروار ٹھہرائے گی۔ انہیں تو لوگ ناسمجھ اور ناتجربہ کار سمجھ کہہ کر چھوڑ دیں گے' سر پر میرے پڑے گی۔ سب مجھ ہی کو لعنت ملامت کریں گے کہ ان کی موجودگی میں ایسا ہو گیا۔ یہ کوئی بھڑوانہ دیکھے گا کہ پنڈت جی نے کتنا سمجھایا بجھایا' کتنی کوششیں کیں مگر ان کی ایک پیش نہ گئی۔ بھلا غور کرنے کی بات ہے کہ جب گھر کی مچھی کی نہیں مانی تو میں بیچارہ کس شمار میں ہوں۔ لاکھ کچھ ہو نوکر پھر نوکر ہی ہے۔ اس سے بابا! ابھی خیر ہے۔“

یہ باتیں پنڈت جی نے اس طرح کہیں جیسے وہ خود اپنے سے باتیں کر رہے ہیں۔

روپ کنوری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ”تو چچا جی! مجھے اور میرے بچوں کو منجدھار میں چھوڑ کر تم

گھر بیٹھو گے ؟ ابھی تو کچھ تمہارا لحاظ کرتے ہیں۔ پھر تو جہاں سال بھر میں سب ختم ہوتا ہوگا' وہاں ایک ہی مہینے میں ہو جائے گا۔"

پنڈت بال گوبند کا دل روپ کنوری کی آب گوں آنکھوں اور اداس چہرے کو دیکھ کر اور اس کی منکسرانہ باتیں سن کر پگھل گیا۔ وہ جلدی سے بولے۔ "نہیں نہیں بیٹی! تم ایسا خیال مت کرو۔ میں تمہارا ساتھ ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ اگر میرا یہ جسم بھی تمہارے اور تمہاری اولاد کے کام آ جائے تو مجھے انکار نہیں مگر میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنے موجودہ عہدے سے سبکدوش ہو جاؤں۔ اس عہدے کی ذمہ داری میرے سر پر نہ رہے۔"

روپ کنوری۔ "اگر آپ کی ایسی ہی خواہش ہے تو آپ ایسا ہی کریں مگر یاد رکھئے' مجھے صرف آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

پنڈت جی۔ "بھلا بیٹی! ایسا کہیں ہو سکتا ہے کہ میں تمہیں چھوڑ دوں؟ پھر میں اس طرح بختاور کو بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔ لاکھ کچھ ہو' وہ ان ہی کا بیٹا ہے جن کے اناج سے میری پرورش ہوئی ہے۔ میں یہ تھوڑے ہی دیکھ سکتا ہوں کہ وہ آگے چل کر تکلیف اٹھائے۔"

روپ کنوری۔ "تو چچا جی! پھر کوئی تدبیر سوچو۔"

پنڈت جی۔ "سوچوں گا۔ بغیر سوچے کام ہی نہ چلے گا۔"

(3)

بختاور سنگھ کی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ یہاں تک کہ دو دو تین تین دن تک گھر کے اندر قدم نہیں رکھتے تھے۔ مردان خانے ہی میں پڑے رہتے تھے۔ روپ کنوری کی آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو رہی تھی۔ اسے اس وقت دو مشکلوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اول تو شوہر کی اپنی طرف بے پروائی کا۔ دوم مالی مسائل کا۔ شوہر کی بے پروائی کی طرف سے تو اسے کچھ زیادہ خوف نہ تھا' دکھ ضرور تھا۔ خوف نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ اس کو یقین تھا کہ میرا شوہر فوری جوش میں آ کر تھوڑے سے عرصہ کے لیے دوسرے کا چاہے ہو جائے مگر ہمیشہ کے لیے ہرگز نہیں ہو سکتا۔ زیادہ فکر اسے مالی حالت کی تھی۔ وہ سوچتی تھی کہ سال چھ ماہ اور میرا شوہر اپنے نفسانی خواہشات کو پورا کرنے میں اسی طرح محو رہے تو قرض کے بھوت کے چنگل میں پھنس جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہے گا۔

آدمی خواہ کتنا ہی عقلمند ہو' مصیبت آنے پر ایک ایسے شخص کی' خواہ وہ دوست ہو یا واقف کار' ضرورت محسوس کرتا ہے جس سے وہ اپنا دکھ درد کہہ کر اس کی ہمدردی اور نیک صلاح حاصل کر سکے۔

روپ کنوری بھی اسی بات کے لیے بے تاب ہو اٹھی۔ اس نے سوچا بغیر کسی سے مشورہ لیے کام نہیں چلے گا۔ یہی سوچ کر وہ ایک روز پاس ہی کے زمیندار ٹھاکر بسنت کے ہاں گئی۔ بسنت سنگھ کی بیوی نے حسبِ قاعدہ روپ کنوری کی بڑی خاطر کی۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد بسنت سنگھ کی بیوی نے پوچھا "اور کہو بیٹی! کام کاج سب ٹھیک طرح سے چل رہا ہے؟"

روپ کنوری تو اس ذکر کے چھیڑنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ "کیا کہوں بوا جی! آج کل جیسی مصیبت میرے سر پر ہے' ویسی بھگوان کسی بیری پر بھی نہ ڈالے۔"

بسنت سنگھ کی بیوی نے حیران ہو کر پوچھا۔ ''ہیں بیٹی! یہ تم کیا کہتی ہو؟ تم پر مصیبت کیسی؟ بھگوان نے ساتوں سکھ دے رکھے ہیں۔ دودھ پوت سے بھری پڑی ہو۔ تمہارے ہاں دکھ مصیبت کا کیا کام؟''

روپ کنوری۔ ''بوا! تم نے ابھی تک پوری بات نہیں سنی۔ پہلے پوری بات سن لو۔ تب کچھ کہنا۔''

روپ کنوری نے ساری داستان بیان کر دی۔ سب کچھ سن کر بسنت سنگھ کی بیوی نے اس طرح سر ہلا دیا گویا وہ حقیقتِ حال سے آگاہ ہو گئی ہے۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد اس نے کہا ''کچھ بھی ہو بیٹی! تمہیں تو وہی کام کرنا چاہیے جس میں بختاور خوش رہے۔ مرد تو سبھی ایسے ہوتے ہیں۔ رنڈی منڈی کی بات جو کہو تو آج کل یہ نگوڑا چلن سا چل گیا ہے کہ لوگ رنڈی ضرور رکھتے ہیں۔ سہاگ پور کے ٹھاکر نے دو رنڈیاں رکھ لی ہیں۔ کون نہیں ایسا کرتا؟ میں تو جانتی ہوں کہ سبھی کرتے ہیں۔ شاید ہی ایسا کوئی سو دو سو میں ایک آدھ ست جگی نکلے جو بالکل دودھ کا دھویا ہو ورنہ سبھی کرتے ہیں۔''

بسنت کی بیوی نے جو کچھ کہا۔ اس کی تائید اور تائید مزید انہی کے گھر کی دو بوڑھی عورتوں نے کر دی۔ ایک بولی۔ ''ہماری تو عمر یہی دیکھتے دیکھتے گزر گئی۔ سب جگہ مردوں کا یہی حال ہے۔ یہ کسی کے بس کے نہیں ہیں۔ اپنی مرضی کے ہیں اور رہی روپے پیسے کی بات! سو بیٹی! روپے کی کیا فکر ہے؟ مرد کماتے بھی ہیں' خرچ بھی کرتے ہیں۔ آج خرچ کرتے ہیں تو کل کما بھی لیں گے۔ اس حالت میں ان سے لڑائی جھگڑا کرنا ٹھیک نہیں۔ ایسی باتوں میں مرد کے دل میں عورت کی طرف سے برائی بیٹھ جاتی ہے۔ تم چپ چاپ بیٹھ کر اپنے بچوں کو پالو۔ وہ سال چھ ماہ کے بعد خود ہی سب کچھ چھوڑ دیں گے۔ اور ایک آدھ رنڈی پڑی بھی رہے تو کیا ہے؟ روشن پور کے ٹھاکر نے ساری عمر رنڈی رکھی۔ ان کے گھر والی سمجھدار تھی' اس نے کچھ نہیں کہا۔ رنڈی بھی رہتی رہی۔ رنڈی منڈی رکھنے سے ہوتا کیا ہے؟ یہ بھی ایک مردوں کی سنک ہے جو تم ہو' وہ دوسری تھوڑے ہی ہو سکتی ہے۔''

روپ کنوری بڑی مایوس ہوئی۔ اگر کوئی اس کے شوہر کے اس کام پر دکھ اور رنج کا اظہار کر دیتا تو اس کو کچھ دھیرج ہو جاتا مگر دکھ یا رنج کا اظہار تو درکنار' انہوں نے الٹے اسی کی حمایت کی۔ ایسی حالت میں نیک صلاح کی توقع کرنا لاحاصل تھا۔ یہی سب سوچ سمجھ کر نہایت اداس ہو کر روپ کنوری گھر لوٹی۔

روپ کنوری کو اب ایک لحہ چین سے بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ اس کی حالت قفس میں ایک بند شیرنی کی سی ہو رہی تھی۔ اس نے پنڈت بال گوبند کو بلوایا۔ جب وہ آ گئے تو ان سے پوچھا۔ ''چچا! آپ نے کوئی تدبیر سوچی؟''

پنڈت جی منہ بنا کر بولے۔ ''کیا کہوں بیٹی! کوئی تدبیر نہیں سوجھتی۔''

روپ کنوری۔ ''تو کیا میں اور میرے بچے ایک شرابی اور رنڈی باز مرد کی بھینٹ چڑھ جائیں گے؟''

پنڈت جی دانتوں تلے جیبھ دبا کر بولے۔ ''ہیں بیٹی! ایسا نہ کہو۔ کہیں وہ سن لیں گے تو غضب ہی ہو جائے گا۔ دوسرے تمہیں شوہر کے بارے میں ایسے سخت الفاظ ہرگز استعمال نہ کرنے چاہئیں۔ ہندوستانی عورت کا فرض......''

روپ کنوری۔ ''بھاڑ میں گیا ہندوستانی عورت کا فرض! میں ان ہندوستانی عورتوں کی مانند نہیں ہوں جو حیوانوں کی طرح پڑی رہتی ہیں اور کبھی شوہر کے خلاف زبان تک نہیں ہلا سکتیں۔ ہندوستانی عورت کا صرف ایک ہی فرض ہے اور وہ یہی کہ سامنے یا پیٹھ پیچھے کوئی ایسا کام نہ کرے جس سے شوہر کی عزت کو بٹہ لگنے اور اس کے راحت و آرام میں خلل آنے کا ذرا سا بھی امکان ہو۔ میں ان کی اور ان کی اولاد کی عزت آبرو اور سکھ کے لیے خود ان کے

ساتھ کڑے سے کڑا برتاؤ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

پنڈت جی۔ "نہیں۔ ایسا نہ ہونا چاہیے۔ جو کام نرمی سے نکلتا ہے' وہ سختی سے نہیں نکلتا۔"

روپ کنوری۔ "نرمی کا سلوک بھی میں نے پوری طرح کر کے دیکھ لیا۔ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسی طرح مکان کے اندر بیٹھی رویا کروں اور وہ باہر موجیں ماریں؟ اگر مجھے کوئی یقین دلا دے کہ ان کا حقیقی سکھ اسی میں ہے اور یہ سکھ ہمیشہ قائم رہے گا تو میں ایسا بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

پنڈت جی۔ "اگر باہمی محبت کی بجائے بغض و عداوت پیدا ہو کر کوئی بات ہوئی بھی تو کس کام کی؟"

روپ کنوری۔ "محبت کی دہائی دینا فضول ہے۔ آپس کی محبت اس قسم کی باتوں سے کم نہیں ہو سکتی۔ جب ان کے ایسے غیر منصفانہ برتاؤ سے ان کے دل میں میرے لیے محبت اگر ہے تو کبھی کم نہ ہو گی۔"

پنڈت جی۔ "تو تم کیا کرنا چاہتی ہو؟"

روپ کنوری۔ "یہ مجھے آپ بتا دیں کہ میں کیا کر سکتی ہوں؟"

پنڈت جی۔ "جو میں بتاؤں گا' اس کے مطابق کام کرو گی؟"

روپ کنوری۔ "یقیناً کروں گی۔"

پنڈت جی۔ "مجھے یقین نہیں۔ اچھا! میں بتلاتا ہوں۔ تمہیں یہ معلوم ہے کہ کل جائیداد جدّی ہے؟"

روپ کنوری۔ "ہاں! مگر اس سے کیا؟"

پنڈت جی۔ "اسی سے تو سب کچھ ہے۔ بختاور کا حق نصف جائیداد پر ہے۔ نصف کا حقدار تمہارا بیٹا ہے۔"

روپ کنوری کو یہ قانونی نکتہ نہیں معلوم تھا۔ اس نے تھوڑی دیر تک غور کیا۔ غور کرنے کے بعد بولی۔ "تو کیا عدالت سے نصف جائیداد میرے بیٹے کے نام ہو سکتی ہے؟"

پنڈت جی۔ "یقیناً! مگر مجھے یقین ہے کہ تم اس راہ کو پسند نہ کرو گی۔"

روپ کنوری۔ "میں ضرور ایسا ہی کروں گی۔"

پنڈت جی۔ "بڑی بدنامی ہو گی۔"

روپ کنوری۔ "اس میں تو بدنامی ہو رہی ہے اور ابھی جو کچھ وہ کر رہے ہیں' اس میں کیا نیک نامی ہو رہی ہے اور کل کو جب دانہ دانہ کے محتاج ہو جائیں گے۔ تبھی نیک نامی ہو گی...... کیوں؟"

پنڈت جی۔ "اچھی طرح سوچ لو۔"

روپ کنوری۔ "میں نے خوب سوچ لیا ہے۔ اچھا! اب آپ جائیے۔ آپ نے مجھے راستہ بتا دیا۔ اس کے لیے میں آپ کی احسان مند رہوں گی۔"

پنڈت جی۔ "میں آخری مرتبہ کہتا ہوں کہ جو کچھ کرنا ہے' وہ خوب سوچ سمجھ کر۔"

یہ کہہ کر پنڈت جی چلے گئے

(4)

بختاور سنگھ کی بدچلنیوں نے اور بھی زور پکڑا۔ روپ کنوری نے یہ حال دیکھ کر سوچا کہ اب اگر دیر کی تو

سب چوپٹ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے بڑی کوشش کر کے ایک روز شوہر کو بلوایا۔

بختاور سنگھ شراب کے نشے میں جھومتے ہوئے آئے مگر خمار زیادہ نہیں تھا۔

روپ کنوری نے شوہر کی حالت دیکھی۔ چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی۔ جس چہرے پر پہلے ستوگن کا تیج تھا' اس پر تموگن کی سیاہی چھا گئی تھی۔ جس چہرے پر پہلے محبت کا بہشتی تبسم جھلکتا تھا' اس پر اب بے حیائی کی شرمائی ہوئی سوکھی ہنسی تھی۔

روپ کنوری کو یہ حالت دیکھ کر شوہر پر غصہ نہیں آیا۔ اس نے شوہر کو اسی نگاہ سے دیکھا جس طرح ایک بزرگ آدمی کسی نٹ کھٹ بچے کو دیکھتا ہے یا کوئی خدا رسیدہ کسی گنہگار کو۔ اس کی آنکھوں میں نفرت یا حسد نہیں تھا۔ محبت اور ہمدردی تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''کہو کیا حال ہے؟''

بختاور سنگھ کو اس طرح بیوی کا مسکرانا ناگوار گزرا۔ انہوں نے کہا۔ ''حال اچھا ہے۔ تم نے جس مطلب سے بلایا ہے' وہ بیان کرو۔''

روپ کنوری۔ ''میں نے یہ پوچھنے کو بلایا ہے کہ ابھی تمہاری طبیعت سیر ہوئی یا نہیں؟''

بختاور سنگھ نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ ''کاہے سے؟''

روپ کنوری۔ ''جو کچھ تم کر رہے ہو' اس سے۔ جس کے لیے تم اپنے کو اور اپنے بال بچوں کو در در کا گدا بنانے کی کوشش کر رہے ہو۔''

بختاور۔ ''میرے باپ کی کمائی ہے۔ جو جی چاہے گا' کروں گا۔ تمہارے باپ کا اس میں کیا؟''

روپ کنوری۔ ''میرے باپ کا چاہے کچھ نہ ہو مگر میرا اور میرے بچوں کا ضرور ہے۔''

بختاور۔ ''تمہارا اتنا ہی ہے کہ روٹی کپڑا لو اور پڑی رہو۔ بچے تمہارے نہیں' میرے ہیں۔ میں ان کے لیے جو ٹھیک سمجھوں گا' کروں گا۔ تمہارا جی چاہے یہاں پڑی رہو' خواہ اپنے باپ کے ہاں چلی جاؤ۔''

روپ کنوری۔ ''وہاں جا کر کیا کروں؟''

بختاور۔ ''کرو گی کیا' اپنے نصیبوں کو بیٹھی بیٹھی رویا کرنا۔''

روپ کنوری نے مسکرا کر کہا۔ ''اتنی آسانی سے میں تمہارا پنڈ نہ چھوڑوں گی۔ اگر میں روؤں گی تو تمہیں بھی اپنے ساتھ رلاؤں گی اور ہنسوں گی تو تمہیں بھی اپنے ساتھ ہنساؤں گی۔ میں ان عورتوں میں سے نہیں ہوں جو یا تو تمام عمر روتی رہتی ہیں یا زہر کھا کر سو رہتی ہیں۔''

بختاور۔ ''اری چل! اپنا کام دیکھ۔ میں جب چاہوں' تجھے کان سے پکڑ کر نکال باہر کر سکتا ہوں اور تو میرا کیا کر سکتی ہے؟''

روپ کنوری۔ ''میں صرف وہی کروں گی جو تمہارے اور میرے دونوں کے حق میں مفید ہو گا۔''

بختاور سنگھ قہقہہ لگا کر بولے۔ ''کیا کہنے ہیں۔ تجھ ایسا خیر خواہ مجھے کاہے کو کوئی ملے گا۔ اچھا! جو تیرا جی چاہے کر۔ اگر ایسی ہوتی تو میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں کرتی جس سے میرا دل تیری طرف سے پھٹتا۔''

روپ کنوری نے ذرا ہنس کر کہا۔ ''سچ! کیا تمہارا دل مجھ سے پھٹ گیا؟''

بختاور۔ ''بالکل! مجھے تیری صورت سے نفرت ہو گئی۔''

روپ کنوری۔ ”کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر اس صورت سے محبت ہو جائے۔“

بختاور۔ ”محبت! ناممکن! میں اس بات کا عہد کرتا ہوں......“

روپ کنوری نے دوڑ کر شوہر کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولی۔ ”بس! عہد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری بات پر یقین آ گیا ہے۔ لاکلام تمہارے دل میں میرے لیے کبھی محبت نہ پیدا ہو گی۔“

بختاور سنگھ نے روپ کنوری کو جھٹکا دیا اور بولے۔ ”دور سے بات کر۔“

روپ کنوری۔ ”تو میں کہاں رہوں۔ یہاں یا اپنے میکے میں؟“

بختاور۔ ”چاہے یہاں رہ۔ چاہے اپنے میکے میں رہ اور چاہے جہنم میں۔ مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں۔“

روپ کنوری۔ ”اچھا‘ میں اپنے میکے چلی جاؤں گی۔“

بختاور۔ ”بڑی اچھی بات ہے۔“

روپ کنوری۔ ”اور بچے؟“

بختاور۔ ”بچوں کو بھی لے جا۔ جب میرا جی چاہے گا‘ میں انہیں بلا لوں گا۔“

یہ کہہ کر ٹھاکر بختاور سنگھ چلے گئے۔

روپ کنوری کھڑی سوچتی رہی۔ اس کے بعد ایک لمبی آہ بھر کر خود بخود بولی۔ ”ایشور انہیں اور مجھے دونوں کو زندہ رکھے۔ اگر ان کے لیے میرا پریم سچا ہے تو وہ ضرور میرے ہی ہو کر رہیں گے۔ اگر مجھے اس امر کا یقین ہو جائے کہ وہ اب مجھ سے کبھی محبت نہیں کریں گے تو میں آج ہی زہر کھا کر جان دے دوں گی مگر مجھے یہ یقین ہی نہیں آتا۔“

(5)

روپ کنوری اپنے میکے چلی گی۔ وہاں پہنچنے کے دو ماہ بعد اپنے بڑے بھائی کو مختارِ عام بنا کر بختاور سنگھ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اس کے میکے والوں نے بھی مقدمہ دائر ہونے سے پیشتر اسے بہت کچھ سمجھایا بجھایا کہ ایسا کرنے سے بڑی بدنامی ہو گی۔ وہ جو کرتے ہیں‘ کرنے دو۔ تم یہاں آرام سے رہو۔ تمہارے لیے کھانے پہننے کی کمی نہیں ہے مگر روپ کنوری نے سب کو یہی جواب دیا کہ ”میں ان کی بیوی ہوں۔ وہ میرے شوہر ہیں۔ میں ان سے محبت بھی کروں گی اور لڑوں گی بھی۔ اپنے اور ان کے فائدہ کے لیے جو مناسب سمجھوں گی‘ کروں گی۔ دوسروں کو اس میں دخل اندازی کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ لوگوں کا جو جی چاہے کہیں۔ مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔“

بختاور سنگھ کو اس مقدمہ کا حال معلوم ہوا تو وہ بہت بگڑے۔ بڑے ناراض ہوئے اور بولے۔ ”خواہ میرے پاس ایک کوڑی نہ رہے۔ سب عدالت کھا جائے مگر اس کی آرزو بر نہ آنے دوں گا۔“

مقدمہ چلا اور خوب چلا۔ ایک سال تک چلتا رہا۔ بختاور سنگھ کی برابر ہار ہوتی رہی۔ معاملہ ہائی کورٹ تک پہنچا۔ یہاں بھی بختاور سنگھ کی ہار ہوئی۔

ٹھاکر بختاور سنگھ بدچلن اور فضول خرچ ثابت کر دیئے گئے اور نصف جائیداد ان کے بیٹے کے نام ہو گئی۔ روپ کنوری بیٹے کی ولی مقرر ہوئی۔

بختاور سنگھ کے روپے کا بیشتر حصہ بدچلنیوں کی نذر ہو چکا تھا‘ باقی جو بچا تھا‘ اسے عدالت چٹ کر گئی۔

بختاور سنگھ کی بد چلنی کی رفتار سُست پڑ گئی۔ مقدمہ کے خاتمہ کے بعد اور ایک سال تک رنڈیوں کے ساتھ شراب کا بھی کچھ زور رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنے حصے کی جائیداد رہن رکھنی پڑی اور بالآخر اس کے بیچنے کی نوبت آئی۔ اب ان کے پاس صرف اتنی جائیداد رہ گئی جس سے دو تین سو روپے ماہوار کی آمدنی ہو سکے۔

روپے کی کمی ہوئی تو بختاور سنگھ کی آنکھیں کھلیں۔ جیسے کوئی خواب دیکھ کر بیدار ہوا ہو۔ روپیہ نہ رہا تو بد چلنیاں بند ہو گئیں۔ بد چلنی بند ہوئی تو انہیں اپنی حالت کا علم ہوا۔

ادھر روپ کنوری سویرے اٹھ کر ایشور سے یہی پرارتھنا کرتی تھی کہ میرے شوہر کے پاس جو کچھ دولت و حشمت ہے' وہ جس قدر جلد ٹھکانے لگ جائے' اتنا ہی اچھا ہے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ جب تک ان کے پاس روپیہ رہے گا۔ وہ اس وقت تک افعالِ بد سے باز نہ آئیں گے۔

جس روز اس نے سنا کہ جائیداد فروخت ہونے کی نوبت آ گئی ہے' اس روز اس نے اطمینان کی سانس لی۔

(6)

ایک روز ٹھاکر بختاور سنگھ اپنے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے اور اپنی گزشتہ حالت پر غور کر کے دل ہی میں اپنے تئیں لعنت ملامت کر رہے تھے۔ اسی وقت خدمتگار نے آ کر کہا۔ "سرکار! بہو جی آ گئیں۔"

بختاور سنگھ نے چونک کر پوچھا۔ "بہو جی! کون بہو جی؟"

نوکر۔ "سرکار! ہماری مالکن!"

بختاور۔ "کچھ گھاس تو نہیں کھا گیا؟...... وہ یہاں کیا کریں گی آ کر؟ بغیر میرے حکم کے اور میرے بلائے بغیر وہ کبھی نہ آئیں گی۔ ممکن ہے اب بلانے پر بھی نہ آئیں۔"

نوکر۔ "سرکار! وہ آ گئی ہیں اور زنان خانے میں پہنچ گئی ہیں۔"

یہ سن کر بختاور سنگھ اس ارادہ سے اٹھے کہ روپ کنوری کو جا کر کھڑے کھڑے نکلوا دیں مگر تھوڑی دور جا کر رک گئے۔ انہیں جرأت نہ ہوئی کہ بیوی کے سامنے جائیں۔ وہ چپ چاپ لوٹ کر اپنی جگہ آ بیٹھے۔ انہوں نے سوچا۔ "اچھا آئی ہے تو آوے' دو چار دن میں خود چلی جاوے گی۔"

رات کے نو بج چکے تھے۔ بختاور سنگھ اپنی حالت پر غور کرتے کرتے نیند سے مغلوب ہو چکے تھے کہ اتنے میں دروازہ کھلنے کی آہٹ پا کر چونک پڑے۔ کروٹ بدل کر دیکھا تو سامنے روپ کنوری اور دونوں بچوں کو کھڑے پایا۔ انہوں نے کہنا چاہا کہ نکل جا مگر الفاظ ان کی زبان کی نوک پر آ کر رہ گئے۔ چنانچہ وہ پیٹھ پھیر کر لیٹ رہے کہ دیکھیں بیوی کیا کرتی ہے۔ تھوڑی دیر تک وہ اسی انتظار میں پڑے رہے۔ اس کے بعد دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر انہوں نے رضائی کا کونہ آہستہ سے ہٹا کر دیکھا تو کسی کو نہ پایا۔ انہیں بہت ناگوار گزرا۔ سوچنے لگے کہ یہاں آئی ہی کیوں تھی؟ اور جو آئی تھی تو اس طرح چلی کیوں گئی؟ انہیں مایوسی کا سامنا ہوا۔ مایوسی ہونے پر انہوں نے پھر بیوی کے سلوکوں کو ناروا سلوکوں کی شکل دے کر ان پر غور کرنا شروع کیا اور یوں بیوی کے لیے جو تھوڑا سا انس پیدا ہوا تھا' اسے غصے کی لاٹھی سے مار کر باہر ٹھیلنا چاہا۔ انہوں نے سونا چاہا مگر نیند نہ آئی۔ برابر یہی دھیان آتا رہا کہ شاید پھر آئے۔ آخر کار جب انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو سو رہے۔ دوسرے دن وہ یہی کوشش کرتے رہے کہ کسی طرح

ان کا غصہ بیوی پر سے کم نہ ہوا۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ اگر وہ اب آئی تو اسی وقت دھکا دے کر نکال دوں گا۔

اگلے دن رات کو لیٹے تو پھر وہی انتظار! وہ ہر چند کوشش کرتے تھے کہ بیوی کے آنے کا خیال دل سے رفع کر کے سو رہیں مگر نیند ہی نہ آئی۔ وہ پڑے انتظار کر ہی رہے تھے کہ دروازہ کھلا اور روپ کنوری اندر آئی۔ انہوں نے اسے دیکھتے ہی بہت کوشش کی کہ غصہ آئے مگر غصہ کا دیوتا اس وقت عدم تعاون کیے بیٹھا تھا۔

روپ کنوری آج تنہا تھی۔ بچے نہیں تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ بختاور سنگھ نے ترچھی نگاہوں سے روپ کنوری کا چہرہ دیکھ لیا۔ ڈیڑھ دو برس کے بعد آج یہ پہلا موقع تھا کہ بختاور سنگھ نے بیوی کو اچھی طرح سے دیکھا۔ آج روپ کنوری انہیں غضب کی حسین نظر آئی۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

روپ کنوری نے آہستہ سے ان کے منہ پر سے رضائی ہٹائی۔ بختاور سنگھ رضائی کو اچھی طرح سے لپیٹنے کی کوشش کرنے لگے مگر کامیاب نہ ہوئے۔ روپ کنوری نے رضائی ہٹا کر ایک طرف کر دی۔ بختاور سنگھ نے کروٹ بدل کر منہ چھپانا چاہا مگر روپ کنوری نے ان کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور انہیں کروٹ نہیں لینے دی اور ان کی آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکرائی۔ اس وقت بختاور سنگھ کی بری حالت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہنسی نہ آئے اور ہنسی کی ملکہ رسیاں تڑا رہی تھی۔ روپ کنوری نے جو جو سلوک کیے تھے، بختاور سنگھ نے جلدی جلدی ان پر نگاہ ڈالی۔ سوچا یہ بڑی بدمعاش ہے۔ اس نے مجھ سے مقدمہ لڑا۔ مجھے بدنام کیا وغیرہ وغیرہ۔ مگر ایک اس خیال نے بھی بختاور سنگھ کا ساتھ نہ دیا۔ انہیں ہنسی آ ہی گئی۔ روپ کنوری نے اپنا سر ان کے سینے پر رکھ دیا۔ بختاور سنگھ کا ہاتھ خود ہی روپ کنوری کے گلے میں جا پڑا۔ شوہر کا بازو گلے کے گرد حمائل ہوتے ہی گویا روپ کنوری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ بہہ نکلا۔ وہ شوہر کے سینے میں منہ چھپا کر اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی جس طرح وہ اس وقت بھی نہیں روئی تھی جب بختاور سنگھ اس کی چھاتی پر مونگ دل رہے تھے۔ اس وقت روپ کنوری کے دل میں صرف یہی خیال تھا کہ بختاور سنگھ اس کا شوہر ہے اور وہ اس کی بیوی۔

روپ کنوری، مضبوط دل روپ کنوری، ہمت ور روپ کنوری، روحانی طاقت سے بہرہ ور روپ کنوری اور عقلمند روپ کنوری کہ اس وقت صرف ایک کمزور عورت تھی۔ ایسی عورت جس کا شوہر کے سوا اور کوئی محفوظ مامن نہیں تھا۔

ادھر بختاور سنگھ بائیں ہاتھ سے یہ سوچ کر مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے، چلو آخر کار فتح ہماری ہی ہوئی۔

آخری الفاظ

(1)

لالہ بدری داس ایک لمبی سانس لے کر اپنے چھوٹے بیٹے جانکی داس سے بولے ”بیٹا! کچھ بھی ہو مگر بلاقی داس تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس کا دھیان ہمیشہ رکھنا۔“

جانکی داس نے سر جھکا کر کہا ”اگر آپ یہ باتیں نہ بھی کہیں تو بھی مجھے اس کا دھیان ہمیشہ رہے گا مگر بھائی

صاحب کی جیسی طبیعت ہے' اس سے یہ امید نہیں کہ وہ صلح صفائی سے کام کریں۔"

بدری داس تکیے کے سہارے بیٹھ کر بولے۔ "بیٹا! میری عمر اس وقت ستر برس کے قریب ہے۔ میں نے بیس برس کی عمر سے پیسہ کمانا شروع کر دیا تھا۔ میں نے جن تکلیفوں اور دکھوں سے روپیہ جمع کیا ہے' وہ مجھے ہی معلوم ہے۔ میں تمہیں اپنی تمام زندگی کے تجربے کا نچوڑ بتائے دیتا ہوں کہ چاہے سارا زمانہ تمہارا دشمن کیوں نہ ہو جائے' تم کبھی سیدھا اور سچا راستہ نہ چھوڑنا اور ہمیشہ منکسر المزاج رہنا۔ ایسا کرنے سے پہلے چاہے تمہیں تکلیف اٹھانی پڑے مگر آخر کار ضرور سکھ ملے گا۔"

جانکی داس۔ "میں دل و جان سے آپ کی نصیحت پر کاربند رہنے کی کوشش کروں گا؟"

بدری داس۔ "بڑی خوشی کی بات ہے' اگر تم ایسا کرو گے تو تمہارا خوفناک سے خوفناک دشمن بھی بالآخر تمہارے آگے سر جھکا دے گا۔ میرا تو اب چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ میں اب صرف دو چار روز کا مہمان ہوں۔ اس مرض کے پنجے سے چھٹکارا پانے کی کوئی امید نہیں۔ یہ مرض جم کا دوت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں سب قسم کے دکھ سکھ دیکھ لیے۔ میرے دل میں کسی قسم کی آرزو' خواہش نہیں ہے۔ اگر کوئی ہے تو صرف یہ کہ میرے پیچھے تم دونوں بھائی سکھ شانتی سے رہو۔"

جانکی۔ "اگر پرماتما کی اِچھا اور آپ کی آشیرباد ہے تو ایسا ہی ہو گا۔"

بدری۔ "ہو گا' ضرور ہو گا اور وہ صرف تمہاری طرف سے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس امر کی کوشش کرو گے۔ اسی لیے میں تم سے اتنی باتیں کہہ رہا ہوں۔ بلاقی داس سے مجھے کوئی امید نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا مگر ایک بار کہنے کی خواہش ضرور ہے۔ ماننا نہ ماننا اس کا کام ہے۔"

جانکی۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ ایک بار آپ ان سے بھی یہ سب باتیں کہہ دیں۔"

بدری۔ "کہوں گا' ضرور کہوں گا۔ بغیر کہے میں آرام سے نہ مر سکوں گا۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مانے گا نہیں۔ اس نے کبھی کسی کی نہیں مانی مگر شاید...... شاید مرتے ہوئے بوڑھے باپ کی آخری نصیحت اسے یاد رہے۔ اسی امید سے کہوں گا۔"

جانکی داس آنکھوں میں آنسو بھر کر بولے۔ "پتا جی! آپ بار بار موت کا نام نہ لیں۔ جو کچھ ایشور کی اِچھا ہے' وہ تو ہو گا ہی۔ پھر اسے رٹنے سے کیا حاصل؟ آپ کی طبیعت بھی گھبراتی ہے' دوسروں کو بھی دکھ ہوتا ہے۔"

بدری داس کے لبوں پر غم آمیز ہلکی سی مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگے۔ "میرا دل موت سے نہیں گھبراتا۔ میں تو اس کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار بیٹھا ہوں۔ اس طرح مرنے میں بھی سکھ ہے۔ راحت ہے۔ بشرطیکہ کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ میرے بعد گھر میں سکھ شانتی کا راج رہے گا۔"

جانکی۔ "جو ہو گا' ہوتا رہے گا۔ آپ اس کے لیے اس قدر متفکر کیوں ہوتے ہیں؟"

بدری۔ "نہیں' فکر کوئی نہیں۔ صرف یہ خواہش ہے کہ میرا لگایا ہوا پودا ہرا بھرا رہے' سوکھنے نہ پائے۔ بس صرف یہی تمنا ہے۔ یہی آخری خواہش ہے۔"

جانکی۔ "اب تمناؤں اور خواہشات کو چھوڑیئے اور اپنا دل ایشور کی طرف لگایئے۔"

بدری۔ "ایشور کا دھیان تو رہتا ہے۔ وہ تو روم روم میں بسا ہوا ہے۔ وہ تو سب کا مالک ہی ہے۔ اس بلاقی داس نے...... ہاں ایشور تو مالک ہی ہے۔ ہے رام! ہے کرشن!"

جانکی۔ ''آپ بھائی صاحب کی طرف سے فکر مت کیجئے۔ آپ کے سامنے وہ خواہ کچھ ہی کریں مگر مجھے یقین ہے کہ آپ کے بعد وہ مجھے بیٹے کے مانند سمجھیں گے۔''

بدری۔ ''سمجھے تو اچھا ہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا بات ہو سکتی ہے مگر بیٹا! بلاقی سے مجھے اس بات کی بہت کم توقع ہے۔ میں اس کی طبیعت سے بخوبی واقف ہوں۔''

جانکی۔ ''جب میں ان کا فرمانبردار رہوں گا تو وہ پھر کچھ نہ کہیں گے۔''

بدری۔ ''ایشور ایسا ہی کرے مگر مجھے صبر نہیں آتا۔ دیکھو' کسی وقت اس سے کہوں گا۔ یوں تو سینکڑوں بار کہا ہے۔ سمجھایا ہے مگر آخری بار کہہ کے دیکھنا ہے۔''

(2)

لالہ بدری داس بڑے رئیس آدمی ہیں۔ چھ سات لاکھ کا ٹھکانہ ہے۔ آپ کے دو بڑی بڑی ملیں ہیں۔ ایک آٹا پیسنے کی۔ ایک کپاس بیلنے کی۔ لالہ بدری داس اپنی جوانی کے دنوں میں ایک معمولی پوزیشن کے آدمی تھے۔ اپنی قوتِ بازو اور محنت ہی سے انہوں نے اتنی دولت پیدا کی ہے۔

آج کل لالہ بدری داس بیمار ہیں۔ صرف بیمار ہی نہیں' لوگ کہتے ہیں سخت بیمار ہیں۔ معالجوں اور ان کے احباوا قرباء کا خیال ہے کہ ان کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ اس مرض کے پنجے سے چھٹکارا پانا ممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے۔ لالہ بدری داس کو خود بھی یہی یقین ہے کہ اب ان کا آخری وقت آگیا ہے۔ جب سے ان کو یہ یقین ہوا ہے' وہ بہت مضمحل رہتے ہیں۔ ان کے اضطراب کا سبب یہ نہیں ہے کہ وہ موت سے ڈرتے ہیں' وہ اس لیے بے چین نہیں ہیں کہ ان کے دل میں دنیا کے مزے لوٹنے کی خواہش باقی ہے۔ وہ اس لیے بھی دکھی نہیں ہیں کہ ان کے بعد ان کے کنبے' قبیلے کی کیا حالت ہو گی کیونکہ اپنے بال بچوں کے لیے وہ اتنی دولت چھوڑے جاتے ہیں جو انہیں ان کے بعد آرام اور سکھ سے رکھ سکتی ہے۔ ان کے دل میں اگر کوئی فکر ہے تو صرف اس بات کہ ان کے بعد کوئی بندھن نہ رہنے سے کہیں ان کا کنبہ تتر بتر نہ ہو جائے۔ صرف اسی ایک فکر نے ان کے بسترِ مرگ کو ان کے لیے تکلیف دہ بنا رکھا ہے۔ اس خوف کو دل میں رکھ کر وہ مرنا نہیں چاہتے۔ اگر ان کے دل سے یہ کانٹا نکال دیا جائے تو وہ آرام سے مر سکتے ہیں۔

جانکی داس سے مندرجہ بالا گفتگو ہونے کے دو دن بعد بلاقی داس کو تنہائی میں بلا کر بدری داس نے کہا۔ ''بیٹا بلاقی! میرا تو آخری وقت قریب ہے۔ رات کو ہوں تو دن کی امید نہیں۔ دن میں ہوں تو رات کا بھروسہ نہیں۔ پتہ نہیں کس وقت دم نکل جائے۔''

بلاقی۔ ''پتا جی! [illegible] خواہ مخواہ ایسی باتیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹروں کی رائے ہے کہ آپ کی حالت کچھ زیادہ خراب نہیں ہے۔ آپ کا اٹھ [illegible] نا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔''

یہ بات بلاقی داس نے باپ کو صرف ڈھارس بندھانے کے لیے کہی ورنہ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ ان کا آخری وقت بالکل ہی قریب ہے۔

بدری۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں اور دنیاداری ہے۔ میں اپنی حالت اچھی طرح جانتا ہوں۔ خیر! میں نے تمہیں اس لیے بلوایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کہوں۔''

بلاقی داس نے ذرا بے تابی کے ساتھ کہا۔ ''کہیے۔''

بدری۔ ''اگر آج تمہاری ماں زندہ ہوتی تو میں بے فکر ہو کر اطمینان سے مر سکتا مگر تقدیر میں تو اس آخری وقت میں شانتی ملنا لکھا ہی نہ تھا۔''

لالہ بدری داس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ انہوں نے ایک لمبی آہ بھری۔ اس کے بعد بولے۔ ''تمہاری ماں زندہ رہتی تو تم دونوں بھائیوں کو ایک دھاگے میں باندھے رکھتی مگر اب کوئی ایسا سہارا نہیں ہے۔ اس لیے اب مجھے صرف تم دونوں بھائیوں کی شرافت پر ہی بھروسہ کرنا پڑتا ہے۔''

بلاقی داس اپنے باپ کا مطلب سمجھ گئے مگر بات کو جلدی سے ختم کرنے کے لیے بولے۔ ''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟''

بدری۔ ''صرف اتنا کہ میرے بعد تم دونوں بھائی مل جل کر رہو۔ سب کام اسی طرح رہے جیسے اب ہیں۔ گھر میں پھوٹ نہ ہو' ہمیشہ سکھ شانتی کا راج رہے۔ جانکی اگرچہ تم سے صرف تین سال چھوٹا ہے مگر وہ تم کو میرے بعد میری ہی جگہ سمجھے گا۔ اگرچہ اس نے مجھے یقین دلا دیا ہے مگر تمہاری طرف سے ابھی میں مطمئن نہیں ہوا۔ اگر تم بھی میرے دل میں یہ بات جما دو تو مجھے پورا پورا اطمینان اور سکون ہو جائے۔''

بلاقی داس کے چہرہ پر ایک طعنہ آمیز مسکراہٹ دوڑ گئی۔ بولے۔ ''آپ اس فکر میں کیوں پڑے ہیں؟ جو ہونا ہو گا' ہو گا۔ آپ اپنے دل کو قرار دیجئے۔''

بدری۔ ''کوشش کرتا ہوں مگر دل کو قرار نہیں آتا۔ رات دن بس یہی دھیان رہتا ہے۔ تم بچے نہیں ہو۔ تمہاری عمر 35 سال کی ہے۔ تمہارے بیٹے بیٹیاں بھی ہیں۔ تم ایک باپ کے دل کو سمجھ سکتے ہو۔ اسی لیے تم سے کہتا ہوں۔ میرے یہ آخری الفاظ...... آخری نصیحت۔ آخری درخواست' جو کچھ سمجھو...... یہی ہے۔ اس کے سوا میں اور کچھ نہیں کہنا چاہتا۔''

بلاقی سوچنے لگے۔ یہ بڈھا کس قدر موہ جال میں پھنسا ہوا ہے۔ آپ تو مر رہا ہے مگر مستقبل پر بھی اپنا سکہ جمائے رکھنا چاہتا ہے۔ مرتے ہوئے آدمی کو مستقبل کی کیا فکر؟

بظاہر اپنے والد سے کہا۔ ''پتا جی! صاف بات تو یہ ہے کہ میری اور جانکی کی نبھنا مشکل ہے مگر میں آپ کو اتنا یقین دلاتا ہوں کہ میں نبھانے کی پوری کوشش کروں گا اور اپنی طرف سے کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس سے آپس میں نفاق کی چنگاری بھڑکے۔''

بدری داس بیٹے کی اس بات کو سمجھ گیا۔ انہیں معلوم ہو گیا کہ بلاقی داس اپنے کو کسی طرح پابند نہیں کرنا چاہتا۔ وہ مایوسی کی ایک لمبی آہ بھر کر بولے۔ ''ایشور کو جو منظور ہو گا' وہی ہو گا۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا۔ اب تم جانو' تمہارا کام۔ اس آخری وقت میں شانتی سے مرنا میری تقدیر میں لکھا نہیں ہے۔ خیر! کبھی کبھی اپنے قریب المرگ باپ کے آخری الفاظ یاد کر لینا۔''

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی مل جائے تو بھی وہ اپنے بچنے کی امید کو سینے سے چمٹائے رکھتا ہے۔ انسان کی امیدیں خواہ وہ سچی ہوں یا جھوٹی' اسے دکھ جھیلنے پر آمادہ کرتی ہیں۔ امید ہی کو سینے سے لگا کر انسان سخت سے سخت تکالیف کو جھیل جاتا ہے۔

بدری داس کو جب چاروں طرف عالمِ یاس نظر آنے لگا۔ اس وقت انہوں نے صرف اس بات پر اپنی امید

کو زندہ رکھا کہ میرے بعد میرے آخری الفاظ یاد کر کے ہی ممکن ہے اس کے دل پر کچھ اثر پڑے۔ انسان کی موت کے بعد اس کی اور اس کی باتوں کی یاد کا زیادہ اثر پڑتا ہے۔ امید کی اسی عکسی تصویر کو بدری داس نے اپنے سامنے رکھ کر اس سے اپنے دل کو' اپنی مضطرب اور بے چین آتما کو شانتی دینے کی کوشش کی۔ بدری داس نے بیٹے کے جواب میں ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ ''بیٹا! مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا۔ اب تمہارا جو جی چاہے اور جو تم مناسب سمجھو' وہ کرنا۔''

(3)

لالہ بدری داس کا سورگ باس ہو گیا۔ ادھر ان کا دم نکل رہا تھا اور ادھر بلاقی داس کوٹھڑی میں قفل ڈلوا رہے تھے۔ ان کی اس کارروائی پر لوگوں کو تعجب ہوا' دکھ ہوا مگر کسی نے بھی ان سے کچھ کہنے کی جرأت نہ کی۔ ان کے پیسے سے پرورش پانے والوں کی تو اتنی ہمت ہو ہی نہیں سکتی تھی مگر ان کے احباء و اقرباء نے بھی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا۔ جانکی داس بھی ان کے اس کام کو چپ چاپ دیکھتے اور دل میں ہنستے رہے۔

باپ کی وفات کے پندرہ دن بعد بلاقی داس نے جانکی داس کو بلا کر کہا۔ ''کریا کرم سے فراغت پالی۔ اب ہمارا تمہارا بٹوارا ہونا چاہیے۔''

جانکی داس تو یہ سمجھے ہی بیٹھے تھے کہ مال و جائیداد جلد ہی تقسیم ہو گی۔ جس کوٹھڑی میں روپیہ پیسہ تھا' اس میں قفل ڈلوانے کا مطلب اور ہو ہی کیا سکتا تھا؟ چنانچہ انہوں نے نہایت عاجزی کے ساتھ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بٹوارا! میری سمجھ میں تو بٹوارے کی کوئی ضرورت ہے نہیں۔''

بلاقی داس روکھے پن سے بولے۔ ''تمہاری سمجھ میں نہ ہو' میری سمجھ میں تو ہے۔''

جانکی۔ ''کیوں ایسی ضرورت کیا ہے؟''

بلاقی۔ ''اس لیے کہ میں ایسا ہی چاہتا ہوں۔''

جانکی۔ ''والد صاحب کی تو مرتے دم تک یہی تمنا رہی کہ ان کے بعد ہم لوگ مل جل کر رہیں۔''

بلاقی۔ ''ہاں۔ ان کی ایسی ہی تمنا تھی مگر میں اس کے خلاف ہوں۔ تم بھی ہوشیار ہو۔ اپنا کام دیکھ بھال سکتے ہو۔ چنانچہ یہی ٹھیک ہے کہ تم اور میں الگ الگ اپنا اپنا راستہ دیکھیں۔''

جانکی۔ ''مگر میں تو بٹوارا نہیں چاہتا۔''

بلاقی۔ ''لیکن میں تو چاہتا ہوں۔''

جانکی۔ ''پتاجی کے آخری الفاظ یاد کیجئے۔''

بلاقی۔ ''یہ سب بے وقوفی اور Sentimentality ہے۔ ان کی زندگی میں میں نے کوئی کام ان کے خلاف مرضی نہیں کیا۔ ہمیشہ ان کو خوش رکھا مگر اب میں ان کے بعد اپنے حسبِ مرضی کام کرنے کو آزاد ہوں۔''

جانکی۔ ''مگر اس سے پتاجی کی روح کو صدمہ ہو گا۔''

بلاقی۔ ''میں پھر کہتا ہوں کہ یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ بٹوارا ضرور ہو گا۔''

جانکی۔ ''میں پتاجی کے بعد اب آپ ہی کو باپ کی جگہ سمجھتا ہوں۔''

بلاقی۔ ''نہایت خوشی کی بات ہے۔ میں بھی تم کو اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھوں گا۔''

جانکی۔ ”تو بٹوارے کی کیا ضرورت ہے؟“
بلاقی۔ ”بٹوارا ضرور ہوگا۔“
جانکی داس نے دیکھا۔ بلاقی داس ان کی درخواستوں سے رسی کی طرح اور بھی زیادہ اینٹھے جارہے ہیں۔ انہوں نے مجبور ہو کر کہا۔ ”جیسی آپ کی مرضی! مگر اس کام سے مجھے ضرور تکلیف ہوگی۔“
بلاقی داس نے جانکی داس کی اس بات کو جیسے سنا ہی نہیں۔

(4)

جب سے بلاقی داس نے ہوش سنبھالا' انہوں نے جانکی داس کو کبھی برادرانہ محبت بھری نگاہ سے نہیں دیکھا۔ بلاقی داس کی Ambitions اس قدر بڑھی چڑھی ہوئی تھیں کہ انہوں نے باقی تمام جذبات کو دبا دیا تھا۔ جب ان کو یہ دھیان آتا تھا کہ اگر جانکی داس نہ ہوتا تو وہ خود ہی اس تمام مال و جائیداد کے مالک ہوتے' اس وقت جانکی داس کی طرف ان کے دل میں ایک خوفناک ہنسا بھاو پیدا ہو جاتا۔ اس ہنسا بھاو کا ان کے اوپر اس قدر اثر تھا کہ جس بات سے جانکی داس کو دکھ اور تکلیف پہنچتی' اسی سے انہیں سکھ حاصل ہوتا۔ باپ کے مرنے کے وقت روپے پیسے والی کوٹھڑی میں قفل ڈلوانے کے اسباب میں سے جانکی داس کے دل کو صدمہ پہنچانا بھی ایک سبب تھا۔ بلاقی داس نے سوچا تھا کہ اگر کریا کرم سے فراغت پاتے ہی بٹوارا نہ کرایا تو بلاقی داس میرا نام نہیں۔ اس بدمعاش کو بھی تو معلوم ہو کہ کوئی بھائی ملا تھا۔ کیسا مکار ہے۔ کتنا شریف بنتا ہے۔ کیسا بھولا پن دکھاتا ہے۔ جیسے کچھ جانتا ہی نہیں اور پیٹ میں کترنی چلتی ہے۔ میں تو صاف آدمی ہوں جو اندر ہے' وہی باہر ہے۔ مجھے فریب نہیں آتا۔ جسے دل سے دشمن سمجھوں گا' اس کے ساتھ بظاہر دشمن کا سا سلوک روا رکھوں گا۔

بلاقی داس اس بات کا بڑا ناز کرتے تھے کہ میں جانکی داس کے ساتھ سخت سلوک کرتا ہوں۔ وہ سمجھتے تھے کہ صاف دلی اور مکرو ریا سے پاک و صاف نہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ انسان جس سے نفرت کرے' اسے قدم قدم پر تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتا رہے۔ اپنی اس خصلت کو وہ ایک بڑا بھاری وصف سمجھتے تھے۔

بٹوارے کی بات پکی ہوگئی۔ سرکار کی طرف سے ایک افسر بٹوارا کرنے کے لیے مقرر ہوا۔ بٹوارا ہونے میں ایک ہفتہ لگا۔ اس موقع پر جس قدر بدمزگی پیدا کی جاسکتی تھی' اس میں بلاقی داس نے ذرا کسر نہیں رکھی مگر جانکی داس کا برتاؤ نہایت منکسرانہ و شریفانہ تھا۔ بلاقی داس کی خصلت کے لیے انکسار آگ پر گھی کا کام کرتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے' جانکی داس اپنی شرافت دکھا کر انہیں دوسروں کی نظروں میں برا بنانا چاہتے ہیں اور آپ اچھا بننا چاہتے ہیں۔

بٹوارے میں یہ حالت ہوئی کہ جو اشیا تعداد میں صرف ایک تھیں' ان کے دو دو ٹکڑے کیے گئے۔ اس موقع پر اگر جانکی داس کہتے کہ ”بھائی صاحب! یہ چیز دو ٹکڑے کرنے سے نہ آپ کے کام کی رہے گی اور نہ میرے' اس لیے اسے آپ ہی رکھئے۔“ تو بلاقی داس جل بھن کر راکھ ہو جاتے تھے۔ ایک بار تو انہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ ”مجھے تمہارا حصہ کئو مانس کے برابر ہے۔ میں صرف اپنا حصہ لوں گا۔“ یہ کہہ کر وہ بڑے غرور سے حاضرین کی طرف دیکھنے لگتے۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ لوگ ان کے اس برتاؤ پر انہیں انصاف پسند' حرص و طمع سے خالی اور صاف گو سمجھ کر دل میں ان کی تعریف کرتے ہوں گے۔ اس طرح بٹوارا ہونے پر وہ اپنی فتح اور جانکی داس کی شکست

سمجھ کر دل ہی دل میں خوش تھے۔
ادھر جانکی داس کے دل میں بڑے بھائی کے اس سلوک سے بیراگ پیدا ہو چلا تھا۔ وہ سوچتے تھے...... جب سگے بھائی کا یہ سلوک ہے تو دنیا میں اور کس سے بہتر سلوک کی توقع کی جاسکتی ہے؟ بلاقی داس کے اس کام پر ان کے دوست احباب منہ پر تو ان کی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے۔"یہ آپ نے اچھا کیا جو بٹوارا کر لیا۔ کچھ اونچ نیچ ہو جاتی تو اسے کوئی کچھ نہ کہتا۔ سب آپ ہی کو مستوجب الزام ٹھہراتے۔ وہ تو چھوٹا بھائی بن کر چھوٹ جاتا۔ آج کل کا زمانہ دیکھتے ہوئے یہی ٹھیک تھا۔ اب اس کا حصہ الگ ہو گیا۔ چاہے رکھے' چاہے کھوئے آپ کو کیا؟"
دوست احباب کی یہ باتیں سنیں تو بلاقی داس نے اپنے اس کام کو بہت ہی ٹھیک سمجھا مگر جب کسی غیر جانبدار انصاف پسند آدمی سے گفتگو ہوتی۔ تب وہی دوست کہتے تھے۔"اجی! لالہ بلاقی داس معلوم نہیں کیسے آدمی ہیں۔ خوامخواہ چھوٹے بھائی سے الگ ہو گئے۔ وہ غریب تو علیحدہ ہونے کو راضی نہ تھا۔ بلاقی داس نے زبردستی الگ ہو کر ناحق اس سے دشمنی مول لے لی۔ وہ اب بھی جب بات چھڑتی ہے' یہی کہتا ہے کہ میں انہیں اپنے باپ کے بجائے سمجھتا ہوں۔"

(5)

مذکورہ بالا واقعہ کے بعد چھ ماہ گزر گئے۔ اس اثناء میں بلاقی داس اور جانکی داس میں اتنا ہی تعلق رہا جتنا دو معمولی رشتہ داروں میں ہوتا ہے۔ اگرچہ جانکی داس کی خواہش تھی کہ تعلقات گہرے ہوں مگر بلاقی داس ایسا برتاؤ کرتے تھے کہ گہرائیت پیدا ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ان حالات میں جانکی داس کو بھی مجبور ہو کر اپنے سلوک کو ایک محدود دائرے کے اندر رکھنا پڑتا تھا۔
جانکی داس نے کپاس بیلنے کا ایک نیا کارخانہ کھولا تھا۔ کچھ دن تو وہ کارخانہ چلا مگر بعد میں ایسے حالات رونما ہو گئے کہ سرمایہ کی کمی کے سبب سے اس کا چلنا مشکل ہو گیا۔ اس مل کا چلانا بہت ہی ضروری تھا کیونکہ جانکی داس نے اپنے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ اس میں لگا دیا تھا۔ اگر وہ کارخانہ بند کر دیا جاتا تو کل سرمایہ بٹے کھاتے میں پڑ جاتا تھا۔ اس کو چلانے کے لیے روپیوں کی ضرورت پڑی۔ جانکی داس کے پاس روپے نہیں تھے۔ وہ بڑی مشکل میں پھنسے۔ کئی دن تک بہت متفکر رہے۔ بالآخر ایک روز اپنی بیوی سے بولے۔"نہ سہی' ایک بار بھائی سے ہی کہوں۔"
بیوی منہ بنا کر بولی۔"ہاں بھائی تمہیں روپے گن دیں گے!"
جانکی۔"گن کیوں نہ دیں گے؟ بہت کریں گے۔ سود لے لیں گے۔ اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"
بیوی۔"وہ کبھی نہ دیں گے۔ تم اپنے دوستوں سے کیوں نہیں لیتے؟"
جانکی۔"میرے دوستوں میں اس وقت دو ایک کے سوا کسی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اتنے روپے دے سکے۔ جو دو ایک ایسے ہیں بھی کہ شاید دے سکیں' ان سے مانگنے کی میری ہمت نہیں پڑتی۔ آج تک کسی سے مانگا نہیں۔ سوچتا ہوں' اگر مانگا اور کسی نے انکار کر دیا تو مجھے بڑی شرم آئے گی۔ میری تو یہی خواہش ہے کہ ایک بار بھیا سے کہوں۔ وہ انکار بھی کر دیں تو کوئی فکر نہیں۔ وہ میرے بڑے ہیں۔ ان سے کیا شرم؟"
بیوی۔"جب وہ تمہیں اپنا چھوٹا بھائی نہیں مانتے تو تمہیں کیا غرض پڑی ہے کہ تم انہیں بڑا مانو۔ وہ تو وہی

مثل ہوئی کہ "مان نہ مان میں تیرا مہمان۔" کچھ خودداری بھی ہونی چاہیے۔ جب وہ تمہیں خاطر میں نہیں لاتے تو تم کیوں چمٹتے ہو؟"

جانکی داس ذرا جھینپ کر بولے۔ "اس میں خودداری کو گھسیٹنا فضول ہے۔ خودداری غیروں کے سامنے کام میں لائی جاتی ہے۔ اپنوں کے...... بالخصوص بڑوں کے...... سامنے خودداری نہیں چلتی۔"

بیوی۔ "جو چلانا چاہتے ہیں' وہ سبھی جگہ چلاتے ہیں۔ میرے چچا نے ایک بار اپنے باپ سے دس روپے مانگے تھے۔ باپ نے جواب دیا۔ "کیا میرے گھر میں ٹکسال ہے؟ جوان ہو گئے۔ پڑھ لکھ گئے۔ اب کماؤ دھماؤ۔ مجھ بڈھے کا منہ کیوں تکتے ہو؟ یہ بات میرے داداجی نے ویسے ہی ہنس کر کہہ دی تھی۔ اس کے بعد وہ روپے دینے لگے مگر چچا نے نہیں لیے۔ انہوں نے بہتیرا کہا سنا۔ چچاجی روپے لینے کو کسی طرح راضی نہیں ہوئے۔ اس کے بعد چچا نے پھر کبھی بھول کر بھی داداجی سے ایک پیسہ نہیں مانگا۔ مرتے مرتے مر گئے' دکھ اٹھائے' تنگی سہی مگر داداجی کے آگے ہاتھ نہیں پسارا۔ جن میں خودداری ہوتی ہے' وہ اسے سب جگہ برتتے ہیں۔ چاہے اپنا ہو یا پرایا۔"

مگر جانکی داس کو یہ آئیڈیا پسند نہ آیا۔ انہوں نے اس وقت صرف اتنا کہہ کر جان چھڑائی کہ "اچھا دیکھا جائے گا۔"

دوسرے دن جانکی داس بلاقی داس کے پاس گئے۔ بلاقی داس نے ان کو دیکھ کر روکھے پن سے کہا۔ "کہو' سب خیریت تو ہے؟"

جانکی۔ "جی ہاں' سب آپ کی مہربانی ہے۔"

بلاقی داس اپنا کام کرنے لگے۔ جانکی داس کچھ دیر تک چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ "آپ کے پاس ایک کام سے آیا تھا۔"

بلاقی۔ "کس کام سے؟"

جانکی۔ "میں نے ایک کارخانہ کھولا ہے کپاس بیلنے کا...... آپ نے شاید سنا بھی ہو۔"

بلاقی۔ "ہاں سنا تو ہے۔"

جانکی۔ "اس کے چلانے کے لیے اس وقت کچھ روپوں کی ضرورت ہے۔ میرے پاس اس وقت اتنے روپے نہیں ہیں۔"

بلاقی۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

ایک طرح سے بلاقی داس نے جانکی داس کا مطلب سمجھ لیا اور اس کا جواب "تو پھر میں کیا کروں؟" ان الفاظ میں دے دیا مگر جانکی داس نے ان الفاظ پر دھیان نہ دے کر کہا۔ "آپ روپوں کا انتظام کر دیتے تو اچھا تھا۔"

بلاقی داس سوکھی ہنسی ہنس کر بولے۔ "میرے پاس اتنے روپے کہاں سے آئے؟"

جانکی۔ "آپ بندوبست کر سکتے ہیں۔"

بلاقی۔ "میں تمہارے لیے بھیک مانگوں یا قرض لوں؟ مجھے ان جھگڑوں سے کیا سروکار؟"

جانکی۔ "میں سود دے دوں گا۔"

بلاقی۔ "مگر مجھے سود لینا ہو تب نا؟ جب سود ہی دینا ہے تو دنیا پڑی ہے جہاں سے جی چاہے لے آؤ۔"

جانکی۔ "ساری دنیا کی اور بات ہے۔ آپ کی اور...... دنیا سے مانگنے کی میری ہمت نہیں پڑتی۔"

بلاقی۔ ”جب ایسے بے لاگ ہو تو ایسا کام ہی کیوں کرتے ہو جو تمہارے بل بوتے سے باہر ہے؟“
جانکی۔ ”آپ سے تو مجھے بڑی امید تھی۔“
بلاقی۔ ”یہ سب تمہاری ناسمجھی ہے۔ مجھ سے تمہیں کوئی امید نہیں رکھنی چاہیے۔“
جانکی داس کو یہ بات بڑی بری لگی۔ انہوں نے ذرا جوش میں آکر کہا۔ ”اچھی بات ہے‘ دیکھا جائے گا۔“
اگرچہ ”دیکھا جائے گا“ ان الفاظ سے جانکی داس کا یہ مطلب تھا کہ روپوں کا اور بندوبست کر لیا جائے گا مگر بلاقی داس نے اس کا کچھ اور ہی مطلب لیا۔ انہوں نے منہ بنا کر کہا۔ ”دیکھا کیا جائے گا۔ میں تمہارے دروازے پر کبھی مانگنے نہ آؤں گا اور جو آؤں تو تم مجھے دھتکار دینا۔“
لالہ جانکی داس اپنا سا منہ لے کر لوٹ آئے۔ انہیں بیوی کی بات یاد آئی۔ سوچا‘ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس کی بات نہ مان کر آیا اور خوامخواہ اپنی بات گنوائی۔

(6)

جانکی داس کی حالت بڑی نازک ہو گئی۔ ان کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کا سبھی کچھ تباہ ہوا چاہتا ہے۔ مل چلانے کے لیے روپیہ نہیں ہے۔ اگر مل نہیں چلائی جاتی تو جو کچھ رہا سہا ہے بھی وہ سب مٹی میں ملا جاتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے شرم کو بالائے طاق رکھ کر اپنے ایک دوست سے اپنے دکھ درد کی کہانی سنائی...... اس دوست نے انہیں کچھ امداد دی۔ کچھ روپیہ انہوں نے بیوی کے قیمتی زیور گروی رکھ کر حاصل کیا۔ اگرچہ ان دونوں کاموں سے اس کو سخت روحانی صدمہ ہوا مگر کرتے کیا؟ ضرورت اور حالات سبھی کچھ کرا لیتے ہیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں جانکی داس کا کام خوب چل نکلا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے دوست کا قرضہ بھی بے باق کر دیا اور بیوی کے گہنے بھی چھڑا لیے۔ اسی طرح ان کی روزافزوں ترقی ہونے لگی۔

ادھر زمانہ کی گردش نے بلاقی داس پر اپنا وار کیا۔ انہوں نے اپنا کام تو خوب بڑھا لیا مگر اس کام میں اتنی آمدنی نہیں ہوئی جس قدر کہ امید تھی۔ ادھر خرچ کافی تھا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ لالہ بلاقی داس کسی کا اعتبار نہیں کرتے تھے۔ ساری دنیا انہیں بے ایمان اور ٹھگ نظر آتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ ان کی ایمانداری کی قدروقیمت سمجھنے والا ہی کوئی نہیں۔ برعکس اس کے وہ مشتبہ نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں تو بعض نے جو اپنے اصول پر زیادہ مضبوطی سے قائم تھے‘ بے ایمانی تو نہیں کی مگر کام کی طرف زیادہ دھیان دینا اور محنت کرنا کم کر دیا اور بعض نے جو اپنے اصول کے پکے نہ تھے‘ چڑ کر بے ایمانی کرنا شروع کر دی۔ انہوں نے سوچا‘ یہ بڑا سیانا بنتا ہے اور دنیا بھر کو بے ایمان سمجھتا ہے تو ہم بھی اس پر کیوں نہ ہاتھ صاف کریں۔ دیکھیں! یہ کتنا چالاک ہے۔ انہی تمام وجوہات سے حالت ایسی ہو گئی کہ بلاقی داس کے دیوالیہ نکالنے کی نوبت آ گئی۔ اب بلاقی داس بہت گھبرائے۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جو جس قدر زیادہ گھمنڈی اور مغرور ہوتا ہے‘ وہ اتنا ہی ناکامیابی سے ڈرتا ہے اور ناکامیاب ہونے پر اتنا ہی ڈرپوک اور بزدل ہو جاتا ہے۔ یہی حال بلاقی داس کا بھی ہوا۔ انہوں نے حالت کو سنبھالنے کی بڑی کوشش کی۔ بہت دوڑ دھوپ کی۔ جن سے کبھی سیدھے منہ بات نہیں کرتے تھے‘ ان سے بھی انہوں نے مدد مانگی مگر کوئی امید افزا نتیجہ نہ نکلا۔

بلاقی داس کی بیوی نے ان سے کہا۔ "نہ سہی۔ جانکی سے مدد لو۔ وہ تو بیچارہ ہمیشہ تم سے ہیل میل رکھنے کی کوشش میں رہتا ہے۔ تم ہی اس سے پھٹے رہتے ہو۔ مجھے پورا بھروسہ ہے کہ وہ تمہاری مدد کرے گا۔ آج کل اس کی چڑھتی کلا بھی ہے۔"

بلاقی داس بیوی کی بات سن کر ذرا غصہ میں آ کر بولے۔ "اس گئے گزرے سے میں مدد مانگوں گا؟ چاہے میرا سبھی کچھ چلا جائے مگر میں اس سے ایک پیسہ تک نہ لوں گا۔ جس کو میں نے دھتکار دیا تھا' اسی سے مدد مانگوں؟ راہ چلتوں سے میں مانگنے کے لیے تیار ہوں مگر اس سے کچھ نہ کہوں گا۔"

مگر بلاقی داس حالت سنبھالنے کا کچھ بندوبست نہ کر سکے۔ چاروں طرف سے مایوس ہو کر ایک بار ان کا دھیان پھر جانکی داس کی طرف گیا۔ سوچا' اگر اس وقت اس کی مدد کر دی ہوتی تو آج مجھے اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی۔ اگر میں جاؤں تو مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گا۔ وہ تو بہت کچھ لپٹنا چاہتا ہے مگر میں ہی اسے منہ نہیں لگاتا۔

بہت کچھ غور و خوض کرنے کے بعد بلاقی داس نے یہی طے کیا کہ خواہ میں دیوالیہ ہی کیوں نہ ہو جاؤں مگر جانکی داس سے مدد کے لیے درخواست نہ کروں گا۔ اس وقت جانکی داس پر انہیں نفرت اور غصہ اور بھی زیادہ ہو گیا کیونکہ جانکی کی حالت اچھی تھی اور وہ اس وقت تکلیف میں تھے۔

ادھر جانکی داس بلاقی داس کا حال سن کر بہت متفکر ہوئے۔ انہوں نے سارا حال اپنی بیوی سے بیان کیا۔ بیوی نے ذرا ہنس کر کہا۔ "تم سے انہوں نے جو سلوک کیا تھا' ایشور نے اس کا یہ بدلہ دیا ہے۔"

جانکی۔ "تو اس وقت مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

بیوی۔ "کرو گے کیا؟ اپنے گھر میں آرام سے بیٹھے رہو۔ جب وہ تمہارے پاس آئیں' کچھ کہیں سنیں۔ تب دیکھا جائے گا۔"

جانکی داس نے کہا۔ "یہی ٹھیک ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ ان کا نشہ غرور اتاروں۔ اگر انہوں نے مجھ سے مدد مانگی تو مدد تو میں ضرور کروں گا مگر ان کا غرور بھی چور ہو جائے گا۔"

دوسرے دن انہیں پتہ لگا کہ بلاقی داس چاہے خودکشی کر لیں مگر ان سے مدد کے طلبگار نہ ہوں گے۔ یہ سن کر انہیں بڑی فکر ہوئی۔ رات بھر اسی ادھیڑ بن میں رہے کہ کیا کریں۔ وہ چاہتے تھے کہ بھائی کی مدد کی جائے مگر سوال یہ تھا کہ وہ اس امداد کو قبول کیسے کریں گے؟ انہوں نے سوچا "اگر میں خود جا کر ان سے کہوں کہ میرے لائق جو خدمت ہو' بتلایئے تو ٹھیک ہو گا۔ مگر بعد ازاں انہیں دھیان آیا کہ ایسا کرنے سے وہ اور بھی زیادہ چڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے کہ یہ مجھے شرمندہ کرنے اور اس طرح اپنا بدلہ چکانے کے لیے آیا ہے۔ پھر سوچا' کسی اور آدمی کے ذریعے پیغام بھجواؤں مگر یہ بھی ٹھیک نہیں۔ بھیا بڑے ضدی واقع ہوئے ہیں۔ وہ اسے بھی پسند نہ کریں گے۔ اسی طرح بہت کچھ سوچا مگر کوئی بات نہ سوجھی۔ آخر کار اکتا کر انہوں نے کہا "ہٹا بھی جھگڑا۔ اگر انہیں سو دفعہ غرض ہو گی تو مجھ سے مدد مانگیں گے۔ نہیں تو مجھے کیا؟ جیسا کیا ویسا بھوگیں۔ میرے ہی ساتھ انہوں نے کون سی بڑی نیکی کی ہے؟ قدم قدم پر انہوں نے مجھے بے عزت' ذلیل اور شرمندہ کرنے کی کوشش کی تھی حتیٰ کہ ایسے موقع پر جب میرا سب کچھ تباہ و برباد ہوا چاہتا تھا' انہوں نے ہمدردی کا ایک لفظ کہنا تو درکنار' الٹا مجھ ہی کو نا سمجھ بنایا۔"

مگر اس خیال کے بعد انہیں باپ کے آخری الفاظ یاد آئے کہ "بیٹا! کچھ بھی ہو۔ بلاقی داس تمہارا بڑا بھائی ہے۔ اس کا دھیان ہمیشہ رکھنا۔" ان الفاظ کو یاد آنے کی دیر تھی۔ اسی لمحہ ان کا دل بھر آیا اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ

آنسو گرنے لگے۔ انہوں نے سوچا' خواہ کسی طرح ہو۔ بھیا کو اس تکلیف سے بچانا ہو گا مگر ایسی ترکیب سے کہ ان کی مدد بھی ہو جائے اور انہیں یہ بھی پتہ نہ لگے کہ کس نے مدد دی ہے۔

(7)

بلاقی داس اپنی کوٹھی کے کمرے میں بیٹھے بحرِ فکر میں مستغرق تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ کل تک اگر روپیوں کا بندوبست نہ ہوا تو دیوالیہ نکل جائے گا۔ ساری عزت و آبرو' سب شان و شوکت خاک میں مل جائے گی۔ باپ کا نام ڈوب جائے گا۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ اسی وقت ایشور بھی مجھے بھول گیا۔ ہائے! میں کس طرح لوگوں کو منہ دکھاؤں گا۔

یہ سوچتے سوچتے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ہچکی بندھ گئی۔ خیال آیا' اب خودکشی کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ وہ بیٹھے ایسے ہی باتیں کر رہے تھے کہ کمرے کے دروازے پر سے نوکر نے کہا "سرکار!"

بلاقی داس نے جھٹ آنسو پونچھ ڈالے اور اپنے کو سنبھال کر کہا۔ "کیا ہے؟"

نوکر۔ "سرکار! ایک چٹھی ہے۔"

بلاقی۔ "لے آؤ۔"

نوکر نے آکر ایک لمبا اور موٹا لفافہ دیا۔ بلاقی داس نے لفافہ کھولا۔ لفافہ کے اندر سے اسی ہزار روپے کے نوٹ اور ایک چھوٹا سا رقعہ نکلا۔ رقعہ کا مضمون یہ تھا۔

"شریمان جی! مجھے کامل امید ہے کہ آپ اس حقیر پیشکش کو قبول فرمائیں گے۔

آپ کا ایک دلی خیر خواہ

بلاقی داس کے جسم میں گویا بجلی دوڑ گئی۔ وہ فوراً کھڑے ہو گئے اور نوٹوں کو لرزاں ہاتھوں سے لفافے میں رکھتے ہوئے بولے۔ "یہ چٹھی کون لایا ہے؟"

نوکر۔ "ایک آدمی۔"

بلاقی۔ "اسے فوراً میرے سامنے لاؤ۔"

نوکر باہر چلا گیا اور واپس آکر بولا۔ "سرکار! وہ تو چلا گیا۔"

بلاقی۔ "ایں! چلا گیا۔"

نوکر۔ "ہاں سرکار۔"

بلاقی۔ "تم اسے پہچانتے ہو؟"

نوکر۔ "نہیں سرکار! میں تو نہیں پہچانتا۔ آج ہی اسے دیکھا ہے۔ بالکل نیا آدمی تھا۔"

بلاقی کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ بڑی دیر تک سوچتے رہے۔ قیاس کرتے رہے کہ یہ کام کس کا ہو سکتا ہے مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ بالآخر ہنس کر بولے۔ "یہ ایشور کی بھیجی ہوئی مدد ہے۔ اب کیا' اب تو پوبارہ ہیں۔"

(8)

اگلے دن جانکی داس بلاقی داس کے پاس آئے۔ بلاقی داس نے انہیں دیکھتے ہی بھنویں چڑھالیں۔ جانکی داس نے کہا۔ "بھیامیں نے سنا............"

جانکی داس اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ بلاقی داس کڑک کر بولے۔ "جو کچھ سنا' ٹھیک سنا۔ یہ سب دشمنوں کی چال تھی مگر میں ایساویسا آدمی نہیں ہوں۔ اڑتی چڑیا پہچانتا ہوں۔ میں نے پہلے ہی سے بندوبست کر لیا تھا۔ اب آج سب کے منہ دھواں ہو جائیں گے۔ تم شاید اس لیے آئے ہو گے کہ میں تم سے کچھ مدد مانگوں مگر یاد رکھو کہ بلاقی داس اپنی بات کا پکا ہے۔ میں پھر تم سے کہتا ہوں کہ ایسا موقع کبھی نہ آئے گا کہ تمہیں میری مدد کرنی پڑے۔"

جانکی۔ "بھیا! میں اس قابل ہی نہیں ہوں کہ آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔"

بلاقی۔ "دنیاداری کی باتیں نہ بگھارو۔ میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ تم اوپر سے میاؤں میاؤں کرتے ہو مگر تمہارے پیٹ میں چھری چلتی ہے۔ میری تباہی کا نظارہ دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرنے آئے ہو گے۔ کیوں؟"

جانکی۔ "بھیا! ایسامت کہیے۔ ایشور ایسانہ کرے۔ آپ تو خوامخواہ میرے بارے میں ایسے خیالات کو دل میں جگہ دے دیا کرتے ہیں۔ میں تو ہمیشہ آپ کو باپ کے برابر سمجھتا ہوں اور سمجھتا رہوں گا۔"

بلاقی۔ "بڑے ہی شریف ہو' کیا کہنے ہیں؟ اچھا! تو اب دیکھ سن لیا۔ یہ یقین رکھو کہ بلاقی داس کا کبھی بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔"

جانکی۔ "ایشور نہ کرے۔"

تھوڑی دیر میں جانکی داس اٹھ کر چل دیے۔ اگرچہ بڑے بھائی کا برتاؤ پہلے کی نسبت بھی زیادہ ناخوشگوار تھا مگر پھر بھی ان کے چہرے پر مسرت اور مسکراہٹ تھی اور دل میں اطمینان۔

تیر بہدف دوا

(1)

بابو رام بھجن معمولی طور سے سب طرح سے سکھی تھے۔ انہیں کسی بات کی تکلیف نہ تھی۔ کچہری میں ملازم تھے۔ دو سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ آرام سے رہتے تھے۔ نہ کسی کے لینے میں تھے اور نہ دینے میں۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ بابو رام بھجن سکھی ہیں۔ رام بھجن بھی اپنے تئیں سکھی سمجھنے کی کوشش کیا کرتے تھے مگر صرف روٹی کپڑے کا سکھ سکھ نہیں ہے اور نہ 'کمی' کے نہ ہونے کا ہی نام سکھ ہے۔ سکھ تو کوئی چیز ہی دوسری ہے۔ سکھ کا

تعلق دل اور من سے ہے۔ دنیا کے تمام عیش و عشرت کے سامان مہیا ہونے پر بھی اگر دل کو سکھ نہیں ہے، چین اور شانتی نہیں ہے تو وہ آدمی سکھی نہیں کہلا سکتا۔ دنیا میں لوگوں کے سکھ جاتے رہنے کے بہت سے سبب ہوتے ہیں۔ بابو رام بھجن کا سکھ کھونے والی خود ان کی بیوی ہی تھی۔ اپنی بیوی کے مارے رام بھجن کا ناکوں دم تھا۔ شاید وہ اپنے افسروں سے اتنا نہیں ڈرتے تھے جس قدر اپنی بیوی سے۔ بیوی سے بھی نہیں بیوی کی زبان سے۔ تلوار کا سامنا وہ خوشی خوشی کر سکتے تھے۔ اس کے وار سہنے کی ہمت ان میں تھی مگر بیوی کی زبان کے واروں کا مقابلہ کرنے کی تاب ان میں نہ تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر ان کی بیوی باتوں کے تیروں کی وہ بوچھاڑ کرتی تھی کہ بیچارے کو سوائے بھاگ کھڑے ہونے کے اور کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ کیا مجال کہ وہ بیوی کی مرضی کے خلاف کوئی کام یا اس کی حکم عدولی کریں۔ بیوی جتنا پانی پلاتی تھی، اتنا ہی انہیں پینا پڑتا تھا۔

یہاں پر یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اس سلوک کی بنیاد کیسے پڑی؟ اس برتاؤ کی جڑ جمانے والے بڑی حد تک خود رام بھجن صاحب ہی تھے۔ بیوی کی جیبھ میں زہر تو شروع ہی سے تھا مگر شروع شروع میں وہ زہر رام بھجن کے لئے مانند آبِ حیات کے تھا۔ جس وقت ان کی شادی ہوئی تھی، اس وقت الفاظ کے تیروں کی بوچھاڑ کے ساتھ ہلکا ہلکا تبسم اور تیکھی چتون رہتی تھی۔ ان دو باتوں کے سبب رام بھجن ان تیروں کو پھولوں کی مار سے بھی زیادہ نرم اور خوشگوار سمجھتے تھے۔ درشت کلامی کا زہر ترچھے چتون اور ہلکے تبسم کی چینی میں لپیٹ کر دیا جاتا تھا۔ رام بھجن اس چینی کی شیرینی کا مزا لینے میں اس قدر محو ہو جاتے تھے کہ انہیں زہر کی تلخی کا احساس بھی نہ ہوتا تھا۔ ناز و نخرے کے ساتھ ذرا مسکرا کر کہی ہوئی کڑی سے کڑی بات بھی ان کے کانوں کو بھلی معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ وہ ہر وقت ایسی باتوں کے سننے کے مشتاق رہتے تھے مگر جوں جوں وقت گزرتا گیا، نئے نئے پیار اور محبت کے پینگ بھی گھٹتے گئے۔ جب محبت میں کوئی نیا پن نہ رہا۔ جب اپنے تئیں عاشق اور معشوقہ سمجھنے والے دو آدمی اپنے کو صرف ٹھیٹھ شوہر اور بیوی سمجھنے لگے۔ تب باہمی برتاؤ میں بھی تبدیلی واقع ہو گئی۔ اب وہ کڑی بات کہنے میں نہ وہ ہلکا تبسم رہا، نہ وہ ترچھی چتون۔ تبسم کی جگہ تو طعن تشنیع کے ساتھ اینٹھتے ہوئے ہونٹوں نے لے لی اور ترچھی چتون کی جگہ لال لال آنکھوں نے۔ جو زہر پہلے چینی میں لپیٹ کر دیا جاتا تھا، وہی اب سرخ مرچوں میں لپیٹ کر دیا جانے لگا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ رام بھجن کچہری گئے ہوئے تھے۔ ان کے بوڑھے والد کھانا کھا کر کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ بابو رام بھجن کا لڑکا جس کی عمر چھ برس کی تھی، اسی کمرے میں کھیل رہا تھا۔ بوڑھے نے پوتے سے کہا "بیٹا شیامو! ذرا گھسیٹے (خدمت گار) سے کہہ دے، ایک گلاس پانی دے جائے۔"

شیامو بولا۔ "میں نہیں کہتا۔ جاؤ۔"

بوڑھا۔ "نہیں نہیں بیٹا! کہہ آ۔ بڑا راجہ ہے۔"

شیامو۔ "میں نہیں کہوں گا۔"

بوڑھا۔ "اپنے دادا کا کام نہیں کرے گا؟"

شیامو۔ "نہیں کروں گا۔"

بوڑھے نے چمکار کر کہا۔ "بیٹا کہہ آ، دادا کو پیاس لگی ہے۔"

شیامو۔ "میں نہیں جاؤں گا۔ نہیں جاؤں گا۔"

بوڑھے نے جب دیکھا کہ شیامو ہلنے والا آدمی نہیں، چنانچہ وہ خود کہنے کے لئے اٹھتے ہوئے بولے۔

"بڑا بد معاش ہے۔ سارے گن اپنی ماں کے سیکھ رہا ہے۔"

شیامو نے کہا۔ "میں بد معاش نہیں' بد معاش تم!"

بوڑھے نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "ایں! کیا کہا؟"

شیامو۔ "بد معاش' بد معاش! دادا بڑا بد معاش ہے۔"

بوڑھے کو ذرا غصہ آگیا۔ انہوں نے اٹھ کر شیامو کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے کان پکڑ کر بولے۔ "کیوں! پھر بد معاش کہے گا؟"

شیامو اسی طرح ڈھیٹ پن کے ساتھ بولا۔ "ہاں کہوں گا۔"

بوڑھے نے کان مروڑ کر کہا۔ "اچھا کہہ تو سہی۔"

کان مروڑنے سے شیامو کو تکلیف ہوئی۔ اسے بھی غصہ آگیا۔ وہ کان چھڑانے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ "دادا بد معاش۔"

شیامو کے اتنا کہتے ہی بوڑھے نے اس کے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ شیام زور سے چلا کر رو اٹھا۔ بوڑھے نے اسے چھوڑ کر کہا۔ "خبردار! اب جو کبھی بد معاش کہا تو۔ کان اکھیڑ ڈالوں گا۔"

شیام روتا ہوا اماں کے پاس گیا۔ ماں نے بیٹے کو روتے دیکھ کر پوچھا۔ "کیا ہوا شیامو؟"

شیامو نے روتے روتے کہا۔ "دادا نے مارا۔"

ماں نے دیکھا۔ بیٹے کا ایک کان سرخ ہو رہا ہے۔ بس پھر کیا تھا' ابل پڑی۔ بولی۔ "اس بڈھے کی باتیں تو دیکھو۔ جب دیکھو ہاتھ چلا بیٹھتا ہے۔ بیٹھے بیٹھے ہمارا کھائے گا اور ہمارے ہی لڑکے پر ہاتھ چلائے گا۔ بھگوان کرے ہاتھ میں کوڑھ ٹپکے' بجلی گرے۔ دنیا مرتی جاتی ہے' اس بڈھے کو موت بھی تو نہیں آتی۔ واہ کیا کوئی بے ماں باپ کا لڑکا سمجھ رکھا ہے۔ اس کی سمجھ تو دیکھو۔ سانڈ کو ذرا سے بچے پر ہاتھ چلاتے شرم بھی تو نہیں آتی۔ جس دن اس کی ارتھی مچچاتی نکلے گی اس روز میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی۔ اس کی تیرھویں کھا کر مجھے صبر آئے گا (بیٹے کو چمکار کر) "نا بیٹا! رومت' اب کی جو تجھے مارے تو تُو اینٹ اٹھا کر مارنا۔ اسے بھی مارنے کا مزا مل جائے۔"

اسی طرح وہ جو منہ میں آیا بکتی رہی۔ خسر صاحب کچھ دیر تو چپ کان دبائے سنتے رہے۔ سوچا! اس بلا کے منہ کون لگے مگر جب بہو کا منہ چلتا ہی رہا تو انہیں بھی غصہ آگیا۔ وہ اپنے عالم شباب کو یاد کر کے اٹھے اور زنانہ خانے کے دروازے پر جا کر بولے۔ "مار ہی دیا تو کون سی تلوار لگ گئی۔ اپنے لڑکے کا گن تو دیکھیں گی نہیں' دوسروں کو الزام دیں گی۔ ذرا سے کام کو کہا' وہ نہیں کیا اور اوپر سے "بد معاش" کہنے لگا۔ ایسی حالت میں جو میں نے دھمکانے کے لئے ذرا کان مروڑ دیا تو کون سا بڑا پاپ کر ڈالا؟"

بہو بولی۔ "کیوں کان مروڑ دیا؟ تم ہو کون کان مروڑنے والے؟ بد معاش کہا تو کیا برا کیا؟ بد معاش تو تم ہو ہی۔ بچوں کو مارنا بد معاشوں کا کام نہیں تو کیا شریف آدمیوں کا کام ہے؟"

اپنے بد معاش ہونے کا یہ ٹکسالی ثبوت سن کر بڈھے خسر کو بڑا غصہ آیا۔ مارے غصے کے وہ کانپنے لگے۔ انہوں نے کہا۔ "دیکھو بہو! میرے منہ پر تو کہو نہیں۔ تمہاری یہ باتیں میں سہنے والا نہیں' تمہارا خصم ہی برداشت کرے گا۔ میرے سامنے زبان سنبھال کر بات چیت کرو ورنہ جیبھ پکڑ کر کھینچ لوں گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ بڈھا ہو گیا ہوں۔"

خسر کا اتنا کہنا تھا کہ وہ اچھل کر دروازے پر پہنچ گئی اور کواڑوں کی آڑ میں کھڑے ہو کر بولی۔ "لے کھینچ

زبان' کھینچ۔ تجھے بھی قسم ہے جو نہ کھینچے۔ دیکھوں تو کیسے زبان کھینچتا ہے۔ اب کھینچتا کیوں نہیں، کھینچ۔"

مالکہ کو چلاتے سنا تو گھر کے نوکر چاکر دوڑ پڑے۔ نوکرانی نے مالکہ کو پکڑ کر ہٹایا۔ نوکر نے بوڑھے کو گھسیٹا۔ بوڑھے نے بھی سوچا' اس ننگی کے منہ کون لگے۔ بکتے جھکتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ کمرے میں آکر بولے۔ "اس حرام زادے رام بھجن نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ دوسرا ہو تو اس بدمعاش کو ایک دن میں ٹھیک کر دے۔"

غرض اسی طرح بکتے جھکتے رہے۔ ادھر بہو نے بھی خسر کی سات پیڑھیوں کا شرادھ کر ڈالا۔

(2)

شام کو جب رام بھجن دفتر سے لوٹے تو پہلے ان کی مڈبھیڑ باپ سے ہوئی۔ بیٹے کو دیکھتے ہی باپ نے کہا۔

"رام بھجن! اب میرا رہنا اس گھر میں نہیں ہو سکتا۔ تم اپنا گھربار سنبھالو' میں سب تکلیفیں برداشت کر سکتا ہوں مگر بہو کی بے ہودہ باتیں نہیں سہہ سکتا۔ اب تک جس طرح ہو سکا' نباہ کیا۔ اب نہیں سہا جاتا۔"

رام بھجن کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ بیوی کی شکایت سن کر ان کا اختلاج قلب بڑھ جاتا تھا۔ انہوں نے پوچھا "بات کیا ہے؟ کیا ہوا؟"

باپ نے جواب دیا۔ "تمہیں بتلانے سے کچھ حاصل نہیں۔ تم سے بنے تو ہیں دو روٹی دے دینا' نہیں تو ہری اچھا! جو تقدیر میں لکھا ہے' ہو گا۔"

رام بھجن۔ "آپ خواہ مخواہ کی باتیں کرتے ہیں۔ آپ بھلا گاؤں میں رہ سکتے ہیں؟"

باپ۔ "نہ رہوں گا تو کیا کروں گا؟ یہاں رہ کر بہو کی جوتیاں کھاؤں گا۔"

"بات بتائیں گے نہیں اپنی ہی رٹیں گے۔" کہتے ہوئے رام بھجن مکان کے اندر چلے گئے۔

اندر پہنچ کر دیکھا تو بہو رانی ساون بھادوں کی گھٹا کی طرح بھری ہوئی بیٹھی تھی۔ منہ پھولا ہوا ہے۔ ابرو تنے ہوئے ہیں۔ آنکھوں میں غصہ کی سرخی اب تک موجود ہے۔ وہ خوفناک شکل دیکھ کر رام بھجن کے فرشتے کوچ کر گئے۔ جی چاہا کہ کچھ پوچھیں مگر ہمت نہیں ہوئی۔ اسی وجہ سے چپ چاپ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں سے کپڑے بدل کر نکلے اور ادھر ادھر کتراتے ہوئے خادمہ کے پاس پہنچے۔ اس سے پوچھا۔ "کیوں ری! کیا ہوا؟ تجھے کچھ معلوم ہے؟"

خادمہ بولی۔ "بڑے بابو نے شیام کو مارا۔ اس پر دونوں جنوں میں خواب لڑائی ہوئی۔"

"کیوں؟" کہہ کر رام بھجن پھر بیوی کے پاس پہنچے اور ہمت کر کے بولے۔ "آج اداس کیوں بیٹھی ہو؟"

بہو رانی نے چھوٹتے ہی کہا۔ "آج وہ بڈھا مر گیا ہے نا! اسی کے سوگ میں بیٹھی ہوں۔"

رام بھجن چپ! کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔' کچھ دیر بعد ہمت کر کے نہایت عاجزی کے ساتھ پوچھا۔ "بات کیا ہے؟"

بہو۔ "بات اسی نگوڑے سے پوچھو جسے کھلا کھلا کر سانڈ بنا رکھا ہے۔ نگوڑے کو بڑھاپے میں مستی سوار ہوئی ہے۔"

رام بھجن ہلکے سے ہنس کر بولے۔ "تم تو فضول باتیں کرتی ہو' اصل بات نہیں بتلاتی۔"

بہو۔ "ایک تو بچے کو بے قصور مارا اور اوپر سے میری جیبھ کھینچنے آیا تھا۔ گھڑی ساعت اچھی تھی بچ گیا۔ نہیں تو آج مونچھیں اکھاڑ ڈالتی۔"

والد کے حق میں ایسے نامناسب الفاظ سن کر رام بھجن کو غصہ آ گیا۔ چنانچہ وہ ذرا کرخت لہجہ میں بولے۔ "یہ کیا واہیات باتیں بکتی ہو؟ ان کے لئے ایسے الفاظ کہتے تمہیں شرم نہیں آتی!"

مندرجہ بالا الفاظ رام بھجن نے بڑی ہمت سے کہے تھے۔ اس ہمت سے جو غصہ سے پیدا ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے لئے بزدل کو بھی دلیر بنا دیتی ہے۔

شوہر کی بات سن کر بیوی نے لال لال آنکھوں سے اس طرف گھور کر کہا۔ "آپ ہی تو کھود کھود کر پوچھتے ہیں اور جب میں نے سچی بات کہی تو الٹے بڈھے کی حمایت کرتے ہوئے مجھے ڈانٹنے لگے۔ اچھی بات ہے' خوب حمایت کرو۔ دیکھتی ہوں حمایتی بن کر میرا کیا کر لیتے ہو؟ میں بھی اس بڈھے کو گھر سے نکال کر پانی پیوں گی۔"

بیوی کی یہ بھیشم پر تگیا سن کر رام بھجن کا سارا غصہ کافور ہو گیا۔ غصہ کی جگہ خوف نے لے لی۔ انہوں نے سوچا' اس بارے میں زیادہ کہنے سننے میں خیر نہیں۔ خیر ہے اس معاملہ کو کسی نہ کسی طرح دفع کر دینے میں۔ چنانچہ وہ پھر منکسرانہ انداز سے بولے۔ "خیر جو ہوا سو ہوا' اب غصہ تھوک دو۔ میں انہیں بھی سمجھا دوں گا۔"

بہورانی سن کر بولی۔ "تم کیا سمجھا دو گے؟ اور وہ کیا سمجھے گا؟ اور وہ سمجھ بھی جائے تو میں کب سمجھنے والی ہوں؟ اب تو اس گھر میں وہی رہے گا یا میں رہوں گی۔"

رام بھجن چڑ کر اس جگہ سے یہ کہتے ہوئے چل دیئے کہ "جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

اس روز شام کو چولھا نہیں جلا۔ سب لوگ بھوکے ہی سو رہے۔ صرف شیامو کے لئے بازار سے کھانا منگوایا گیا۔

رام بھجن کو رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ اس میں زیادہ قصور بیوی ہی کا ہے۔ اسی نے تل کا تاڑ بنایا ہے مگر کرتے کیا' مجبور تھے۔ رات بھر وہ بھی سوچتے رہے کہ بیوی کی یہ بری خصلت کیونکر دور ہو۔ کبھی طیش میں آکر سوچتے تھے کہ ڈنڈا لے کر پل پڑیں اور مارتے مارتے بے دم کر دیں۔ بس ٹھیک ہو جائے گی۔ مگر جب نتیجے پر غور کرتے تھے تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ اگر مارا یا گہری چوٹ لگی یا عورت غصہ میں آکر کنوئیں میں پھاند پڑی یا اس نے افیم کھالی تو کیا ہو گا؟ آبرو پر پانی پھر جائے گا۔ سارا گھر بار خاک میں مل جائے گا۔ پھر بچے کی غور و پرداخت کون کرے گا؟

انجام بین آدمی دیگر باتوں میں خواہ کتنا ہی عقلمند' ہوشیار اور ماہر ہو وہ عموماً دل کا ڈرپوک ہوتا ہے۔ انجام بین آدمی بہادر بہت کم ہوتے ہیں مگر جو ہوتے ہیں وہ آدرش بیر ہوتے ہیں۔

آخر کار بہت کچھ سوچ بچار کر یہی طے کیا کہ والد صاحب گاؤں میں رہیں۔ ان کی مرضی بھی یہاں رہنے کی نہیں ہے۔ ادھر بیوی بھی انہیں نکال باہر کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ اگر ایک جگہ دونوں رہیں گے تو پھر جھگڑا ہونے کا امکان ہے۔ اس سے یہی بہتر ہے کہ والد صاحب الگ رہیں۔

صبح اٹھ کر انہوں نے والد سے پوچھا۔ "کہیے' آپ نے کیا طے کیا؟"

بوڑھے نے دنیا دیکھی تھی۔ انہوں نے اس فقرے سے بیٹے کا دلی مطلب تاڑ کر کہا۔ "طے کیا کرنا گاؤں

میں جاکر رہنے کے سوااور کوئی چارہ نہیں ہے۔ یہ تو تقدیر ہی میں لکھا ہے۔"

رام بھجن۔ "نقصان تو کچھ نہیں ہے مگر آپ کو تکلیف نہ ہو گی۔ تکلیف صرف کھانے کی ہے سو اس کے لئے چچی وہاں ہے ہی' وہی بنادیا کرے گی۔"

باپ بیٹے کی ان باتوں پر خوب ہنسا مگر بظاہر سنجیدگی کے ساتھ کہا۔ "تکلیف کچھ نہ ہو گی تکلیف کا کیا کام۔ یہاں کی نسبت وہاں آرام ہی رہے گا۔ روز کی دانتا کل کل سے تو جان بچے گی۔"

رام بھجن۔ "ہاں! میں بھی یہی سوچتا ہوں۔ میں تو دن بھر دفتر میں رہتا ہوں' پیچھے کسی دن زیادہ بات بڑھ گئی تو ٹھیک نہ ہو گا' اس لئے یہی ٹھیک ہے۔"

باپ بیٹے کی زن مریدی کو دل میں لعنت ملامت کرتا ہوا گاؤں کو جانے کی تیاری کرنے لگا۔

(3)

اتوار کا دن تھا۔ رام بھجن مردان خانے میں بیٹھے ہوئے اپنے جگری دوست کیلاش ناتھ سے باتیں کر رہے تھے۔ رام بھجن کہہ رہے تھے۔ "بس اتنی ہی بات تھی۔"

کیلاش ناتھ مسکرا کر بولے۔ "اتنی ہی سی بات کا یہ نتیجہ نکلا کہ والد صاحب کو گاؤں میں جاکر رہنا پڑا۔"

رام بھجن۔ "ہاں۔"

کیلاش ناتھ حیرت زدہ لہجہ میں بولے۔ "خوب! اور آپ نے انہیں چلا جانے دیا۔"

رام بھجن۔ "چلا جانے نہ دیتا تو اور کیا کرتا؟"

کیلاش۔ "یار برا مانو یا بھلا' میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم پورے جورو کے غلام ہو۔"

رام بھجن ایک لمبی آہ بھر کر بولے۔ "ہاں بھائی' جو کہو ٹھیک ہے۔ ایسی عورت سے نہیں پالا پڑا۔ اس وجہ سے خواہ کچھ کہو۔"

کیلاش۔ "اجی! ہم کا نام لو۔ یہاں تو ایشور کی کرپا سے ایسی سوشیلا بیوی ملی ہے کہ میں چاہے جو بک جھک لوں مگر وہ کبھی کڑی آواز سے بولتی تک نہیں۔"

رام بھجن کو کیلاش ناتھ کی استری پر بڑا رشک آیا۔ ایک شخص جس بات کو اپنے لئے نہایت اہم سمجھتا ہے وہی دوسرے کے لئے اتنی معمولی ہوتی ہے کہ کبھی اس کا دھیان بھی اس طرف نہیں جاتا کہ دنیا میں کسی کے لئے یہ بات اس قدر اہمیت سے پُر ہو سکتی ہے۔ ادھر رام بھجن کو اس بات میں شک تھا کہ کوئی عورت اس قدر سوشیل ہو سکتی ہے اور ادھر کیلاش ناتھ کو اس میں شک تھا کہ کوئی عورت ایسے برے مزاج کی ہو سکتی ہے۔ دونوں کو باہم ایک دوسرے کی باتوں سے مبالغہ کی بو آرہی تھی۔ ہر ایک آدمی اپنے تجربے کے ترازو میں دوسروں کو تولتا ہے۔

کیلاش ناتھ نے کہا۔ "بھائی! میری بیوی اگر ایسا برتاؤ کرنے لگے تو میں اس کو ایک ہی دن میں درست کر دوں۔"

رام بھجن پُرشک و شبہ لہجہ میں بولے "ممکن ہے کر دو۔"

کیلاش۔ ''تم بھی چاہو تو کر سکتے ہو۔''

رام بھجن ذرا بگڑ کر بولے۔ ''تم ہی بتلاؤ، کیسے کروں؟ مار پیٹ کروں۔''

کیلاش۔ ''اجی! رام کا نام لو۔ مارنے پیٹنے کا تو الٹا نتیجہ ہوگا۔''

رام بھجن۔ ''پھر؟''

کیلاش۔ ''بولنا چالنا بند کر دو۔''

رام بھجن۔ ''پاگل ہوئے ہو' ایک گھر میں ہر وقت رہنے پر یہ کب تک نبھے گا؟''

کیلاش۔ ''اسے اپنے باپ کے گھر بھیج دو اور جب تک وہ اپنے کیئے پر اظہار تاسف نہ کرے' نادم نہ ہو' مت بلاؤ۔''

رام بھجن۔ ''تمہارا تو سر پھر گیا ہے۔ میں نہ بلاؤں تو کیا وہ خود بخود نہیں آ سکتی؟ اس پر شاید تم یہ کہو کہ خود آئے تو گھر میں گھسنے نہ دو۔ کیوں؟''

کیلاش۔ ''وہ خود ہی کیوں آنے لگی؟''

رام بھجن۔ ''یار! تم پورے شیخ چلی ہی رہے! کیا کوئی نئی دلہن ہے جو خود ہی نہ چلی آئے گی؟ یوں چاہے آنے میں سو نخرے بگھارے مگر جب معلوم ہوگا کہ میں ناراضگی کے سبب نہیں بلاتا ہوں تو دوسرے ہی دن بھائی کو لے کر آدھمکے گی۔''

کیلاش۔ ''اسے چھوڑ دو۔ دوسرا بیاہ کر لو۔''

رام بھجن۔ ''کیوں! سنکھیا نہ کھلا دوں؟''

کیلاش۔ ''اتنی تدبیریں بتائیں مگر تمہیں ایک بھی ٹھیک معلوم نہ ہوئی۔''

رام بھجن ذرا ناراض ہو کر بولے۔ ''تدبیریں کیا بتاتے ہو' ہنستے ہو' مذاق اڑاتے ہو! اچھا بھائی! ہنس لو۔''

کیلاش۔ ''دیوانے ہو' میں بھلا تم پر ہنس سکتا ہوں؟ اچھا ایک اور تدبیر ہے۔ شیکسپیئر کا Taming of the shrew پڑھا ہے؟''

رام بھجن۔ ''سب کچھ پڑھا ہے مگر ہوتا کیا ہے؟ یہ باتیں کتابوں ہی میں اچھی لگتی ہیں۔ جب سر پر پڑتی ہے تو ایک نہیں چلتی۔ شیکسپیئر کا پالا کسی shrew سے پڑتا تو سب بھول جاتے۔ یوں لکھنے کو کہو میں بھی بیس باتیں لکھ دوں۔''

کیلاش۔ ''ہنسی نہیں' ذرا کر کے تو دیکھو۔ کبھی سیدھے بات نہ کرو' ہر گھڑی ابرو تنے رہیں۔ بولو تو ڈانٹ کر' ذرا کہا سنی ہو تو گھر کے برتن الٹا الٹا کر کے پھینکنا شروع کر دو۔ کھانا ذرا خراب ہو تو الٹا کر کے پھینک دو۔''

رام بھجن۔ ''بوڑم پن کی باتیں تو کرو نہیں۔ الو بناتے ہو۔ دن بھر دفتر میں مروں اور شام کو آ کر یہ ناٹک کروں تو تم ہی بتاؤ کتنے دن جیوں گا؟ جب شام کو تھکا ماندہ لوٹتا ہوں تو اس وقت بولنے کو تو جی چاہتا نہیں۔ یہ ناٹک کس بھکوے سے ہوگا؟ چیزوں کا نقصان الگ۔ برتن ٹوٹیں گے تو میرے۔ کھانا خراب ہوگا تو میرا۔ اس مہنگے زمانے میں یونہی گزر کرنا مشکل ہو رہا ہے' اس پر تم وہ بات بتاتے ہو کہ چار ہی دنوں میں گھر کا صفایا ہو جائے۔ خوب ملے۔ دوستی کا حق ادا کرنا اسی کو کہتے ہیں۔''

کیلاش۔ ''تمہارے کیئے کچھ نہ ہو گا۔ یونہی جورو کی جوتیاں اٹھاتے رہو گے۔''

رام بھجن۔ ''میں اسی طرح اچھا ہوں۔ ایک چپ سو بلائیں ٹالتی ہے۔ آرام سے دونوں وقت کھانے کو مل جاتا ہے۔ اک دن کی لڑائی جھگڑے میں دو دن چولہا نہیں جلتا۔ یا تو اپنے ہاتھ سے بناؤ یا بازار گھاٹ اترو' اس سے تو بچا ہوا ہوں۔''

کیلاش۔ ''تو تمہاری سمجھ میں مرض لاعلاج ہے؟''

رام بھجن۔ ''ممکن ہے لاعلاج ہو مگر ابھی تک مجھے تو کوئی ایسی دوا ملی نہیں جو خطا نہ کرے۔ اندھا تب بتاوے جب دو آنکھیں پاوے۔''

کیلاش۔ ''اچھا! اگلے اتوار کو میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس لے چلوں گا' وہ بڑے تجربہ کار ہیں۔ 45 برس گرہست آشرم کا سکھ بھوگنے کے بعد انہوں نے سنیاس لیا ہے۔ عالم بھی بڑے ہیں۔ خصلت انسانی کی جس قدر واقفیت انہیں ہے' اتنی بہت تھوڑے لوگوں کو ہو گی۔ یہ میری ہی رائے نہیں ہے بلکہ ان سب کی ہے جو ان سے ملے ہیں۔''

رام بھجن۔ ''تمہارے کہنے سے چلا چلوں گا لیکن مجھے تو زیادہ امید نہیں۔''

کیلاش۔ ''خیر! میرے ہی کہنے سے چلے چلنا۔''

(4)

اگلے روز کیلاش ناتھ رام بھجن کو لے کر انہی سنیاسی کی خدمت میں پہنچے جن کے متعلق انہوں نے رام بھجن سے ذکر کیا تھا۔ وہ سنیاسی شہر کے باہر ندی کے کنارے ایک کٹیا میں رہتے تھے۔ ان کی عمر کوئی ساٹھ برس کے قریب ہو گی۔ چہرہ پر علم و فضل' تجربہ اور ریاضت کے نور کی جھلک تھی۔ کیلاش ناتھ کو دیکھتے ہی وہ مسکرا کر بولے۔ ''کہو بیٹا! اچھے تو ہو؟ بہت مدت بعد نظر آئے۔''

کیلاش ناتھ ہاتھ جوڑ کر بولے۔ ''جی ہاں، خانہ داری کے دھندوں سے فرصت نہیں ملی۔''

یہ کہہ کر کیلاش ناتھ نے ان کے سامنے تھوڑے سے پھل رکھ دیئے۔

رام بھجن کی طرف اشارہ کر کے بولے۔ ''یہ صاحب کون ہیں؟''

کیلاش۔ ''آپ میرے ایک دوست ہیں۔ رام بھجن نام ہے۔ میرے ساتھ ہی کچہری میں کام کرتے ہیں۔''

بوڑھے سنیاسی نے خوش ہو کر کہا۔ ''بڑی خوشی کی بات ہے' آپ خوش تو ہیں؟''

رام بھجن نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''سب آپ کی دیا ہے۔''

کیلاش۔ ''مہارج! یہ آپ کے پاس اپنے ایک مرض کی دوا پوچھنے آئے ہیں؟''

سنیاسی۔ ''مرض کی دوا...... دوا میں کیا جانوں؟ یہ کام تو ویدوں' حکیموں کا ہے۔''

کیلاش۔ ''جسمانی عارضہ نہیں ہے' روحانی عارضہ ہے۔''

سنیاسی۔ ''اچھا! میں سمجھ گیا۔ وہ کون سا روحانی عارضہ ہے؟''

کیلاش نے رام بھجن سے کہا۔ ”بتلاؤ جی۔“

رام بھجن نے ذرا جھینپ کر کہا ”تم ہی بتلادو۔“

کیلاش۔ ”اچھا! میں بتائے دیتا ہوں۔ مہاراج! یہ اپنی بیوی کے مارے بڑے دکھی ہیں۔“

سنیاسی۔ ”کیسے؟“

کیلاش۔ ”ان کی بیوی بڑی لڑاکا' بڑی سخت مزاج ہے۔ انہیں تو وہ کچھ سمجھتی ہی نہیں کہ کس کھیت کی مولی ہیں۔ ذرا سی بات پر سینکڑوں سناتی ہیں۔“

سنیاسی نے سنجیدگی کا انداز اختیار کر کے کہا۔ ”یہ عارضہ تو نیا نہیں ہے۔ لاتعداد آدمی اس مرض کے شکار ہو رہے ہیں۔“

کیلاش۔ ”جی ہاں، اس کی کوئی تیر بہدف دوا آپ سے پوچھنی ہے۔“

سنیاسی۔ ”دوا تیر بہدف تو نہ ہوگی مگر فائدہ مند ضرور ہوگی۔ بالکل آرام نہ ہوگا تو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ دوا کا گن دکھانا مرض اور مریض پر انحصار رکھتا ہے۔ دوا بتانے سے پیشتر میں بعض باتیں صاف صاف جاننا چاہتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ان کی بیوی میں صرف یہی نقص ہے یا کوئی اور بھی؟“

رام بھجن ابھی تک اس طرف زیادہ دھیان نہیں دے رہے تھے مگر سنیاسی کی گفتگو سے انہوں نے سمجھا کہ تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوگا۔ چنانچہ انہوں نے کہا۔ ”صرف یہی عیب ہے۔ گھر کے کام میں بڑی ہوشیار ہے۔ پوری خانہ دار ہے۔“

سنیاسی۔ ”کچھ پڑھی لکھی ہے؟“

رام بھجن۔ ”یوں ہی معمولی۔“

سنیاسی۔ ”کوئی بال بچہ ہے؟“

رام بھجن۔ ”ایک لڑکا۔“

سنیاسی۔ ”عمر کیا ہوگی؟“

رام بھجن۔ ”یہی پچیس چھبیس برس کی ہوگی۔“

سنیاسی۔ ”یہی نقص شروع ہی سے ہے یا درمیان میں پیدا ہو گیا ہے؟“

رام بھجن کچھ سوچ کر بولے۔ ”تلخ باتیں کہنے کی عادت تو شروع ہی سے تھی مگر میں نے اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا' اسی لئے یہاں تک نوبت پہنچ گئی۔“

سنیاسی کے لبوں پر تبسم کی ایک ہلکی لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے پھر سنجیدگی کے انداز سے کہا۔ ”اب اس کا برتاؤ کیسا ہے؟“

رام بھجن جھینپتے ہوئے بولے۔ ”بس یہی چاہتی ہے کہ ہر ایک بات اسی کی مرضی کے موافق ہو۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف چلنے کوشش کی جاتی ہے تو جو منہ میں آتا ہے' بکتی ہے۔ روتی ہے' چلاتی ہے۔ کھانا نہیں کھاتی۔ بعض اوقات تو خودکشی کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ جب اس کی زبان کھلتی ہے تو چھوٹے بڑے کا کچھ خیال نہیں کرتی۔“

سنیاسی۔ ”مرض تو بلاشک مشکل سے رفع ہونے والا ہے اور اسے ایسا بنانے کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

مرض کو بڑھانا جس قدر آسان ہوتا ہے اتنا ہی مشکل اسے دور کرنا ہو جاتا ہے۔"

کیلاش۔ "یہی تو میں بھی کہتا تھا۔ اس میں سارا قصور انہی کا ہے۔ میں نے کئی طریقے انہیں بتائے مگر کوئی پسند نہ آیا۔ پسند تو تب آئے جب انہیں ہمت ہو۔"

سنیاسی نے مسکرا کر کہا۔ "اچھا! تم نے کیا طریقے بتائے، ہم بھی ذرا سنیں۔"

رام بھجن۔ "اجی! یہ تو یونہی انٹ سنٹ بکتے رہے۔ کبھی کہتے تھے چھوڑ دو، دوسرا بیاہ کرلو۔ کبھی Taming of the shrew کی بات کہتے تھے۔ یوں ہی بکتے رہے۔"

سنیاسی سن کر ہنسے اور ہنستے ہوئے بولے۔ "Taming of the shrew کی خوب کہی۔" پھر کچھ دیر بعد پُر متانت لہجہ میں کہا۔ "یہ ترکیب بھی بری نہیں ہے مگر اس جگہ ٹھیک نہیں اترے گی۔ یہاں تو سب جانی بوجھی بات ہو گئی ہے۔ یہ بیوی کے مزاج سے واقف ہو گئے ہیں اور بیوی ان کا مزاج پہچان گئی ہے۔ ایسی حالت میں مزاج میں غیر متوقع تبدیلی کے ہونے سے وہ فوراً سمجھ جائے گی تو پھر اس کی اصلاح ہونا مشکل ہو جائے گا کیونکہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔"

اس کے بعد سنیاسی نے رام بھجن سے کہا۔ "اس کی ایک ترکیب ہے لیکن پہلے میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تم کامل طور پر اس کو عمل میں لانے کے لئے تیار ہو یا نہیں؟"

رام بھجن۔ "مہاراج! اگر میرے بس کی بات ہو گی تو میں ضرور کروں گا۔"

سنیاسی۔ "بس کی بات تو ہے ہی، یہ سمجھ لو کہ تم نے اپنی بیوی کے مزاج کو بگاڑنے کا جو پاپ کیا ہے' اس کا تمہیں پرائشچت کرنا ہو گا۔ آج کل نوجوان مرد اور عورتیں شادی ہو جانے کے بعد شباب کے مزے لوٹنے میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ انہیں برسوں ایک دوسرے کے حسن وقبح کا پتہ تک نہیں لگتا۔ جب ذرا ڈھیلے پڑ جاتے ہیں تو ان کی آنکھیں کھلتی ہیں۔ شادی کے بعد پہلے تین چار سال میں میاں بیوی کے باہمی سلوک کی تقدیر کا فیصلہ ہمیشہ کے لئے ہو جاتا ہے۔ ان تین چار سالوں میں جو جس پر حاوی ہو گیا' وہ بعد ازاں روز بروز حاوی ہی ہوتا جائے گا۔ یہی وہ وقت ہے جب شوہر اپنی بیوی کے مزاج میں حسب دلخواہ تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ اس کے بعد یہ کام بے حد مشکل بلکہ ناممکن العمل ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرف زیادہ دھیان نہیں دیا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں میاں بیوی کو اپنے پاؤں کی جوتی سمجھنے لگتا ہے اور کہیں بیوی میاں کو صرف روپیہ کمانے کی کل...... ایسے خوش قسمت گھرانے بہت کم ہیں جہاں میاں بیوی میں سچی محبت اور ایک دوسرے کے لئے عزت واحترام کے جذبات موجود ہوں۔"

کیلاش۔ "تو شادی کے بعد کے پہلے تین چار سال تک میاں بیوی میں کس قسم کا سلوک ہونا چاہیے؟"

سنیاسی۔ "جیسے دو گہرے دوستوں میں ہوتا ہے۔ اگر بیوی پڑھی لکھی نہیں ہے تو شوہر کا فرض ہے کہ پہلے اسے تعلیم دے کہ وہ کتابیں پڑھنے کے قابل ہو جائے۔ اگر وہ تعلیم یافتہ نہ ہو تو اسے اچھی اچھی کتابیں خوب پڑھائے۔ اس کے خصائل اور مزاج کا بغور مطالعہ کرے اور جو نقائص اس میں ہوں' انہیں رفع کرنے کی کوشش کرے۔ اس وقت تھوڑی سی کوشش سے مزاج میں بہت کچھ تبدیلی ہو سکتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس وقت باہمی محبت اور الفت کا جوش اس قدر تیز ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے کی بات ماننی ہی پڑتی ہے۔ اگر بیوی عاقلہ ہو تو وہ بھی شوہر کے نقائص رفع کر سکتی ہے۔ والدین کا بھی فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں دولہا دلہن کی حتی الوسع امداد کریں۔"

کیلاش۔ ”خیر! یہ سب تو پہلے کی باتیں ہیں۔اب بتلایئے کیا ہونا چاہیے ؟“

سنیاسی۔ ”ہاں! بتلاتا ہوں۔ میں کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک طرح سے پاپ کا پرائشچت کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس میں صبر واستقلال کی بہت ضرورت پڑے گی۔ بغیر ان دو باتوں کے کامیابی ہرگز نہیں ہو سکتی۔“

کیلاش ناتھ (رام بھجن کو مخاطب کر کے بولے) ”کیوں بھائی! سنتے ہو۔اگر تم یہ چاہو کہ دو ہی چار دن میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے تو یہ ناممکن ہے۔“

رام بھجن (کچھ دیر سوچ کر بولے) ”آپ بتلایئے‘ میں تیار ہوں۔ میں نے جو پاپ کیا ہے‘ اس کا پرائشچت جس طرح ممکن ہوگا‘ کروں گا۔“

سنیاسی۔ ”پہلی بات تو یہ ہے کہ آج سے تم برت دھارن کرلو کہ اپنی بیوی سے کبھی خوش ہو کر بات چیت نہ کرو گے۔اس پر یہ بخوبی روشن کردو کہ تم اس سے دل سے ناراض ہو۔“

رام بھجن۔ ”ایسا سلوک کب تک روا رکھا جائے گا؟“

سنیاسی۔ ”جب تک مقصد براری نہ ہو۔ میں تو کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک قسم کی تپسیا یا ریاضت ہے۔“

رام بھجن۔ ”اچھی بات ہے۔اور......؟“

سنیاسی۔ ”دوسری بات یہ ہے کہ اس سے بالکل نہ ڈرو۔اس پر بہت اچھی طرح سے ظاہر کردو کہ تم اس سے بالکل نہیں ڈرتے۔یاد رکھو جتنا اس سے ڈرو گے اتنا ہی وہ تم کو دباتے جانے کی کوشش کرے گی۔“

رام بھجن۔ ”ہوں، ٹھیک ہے۔اور......؟“

سنیاسی۔ ”جب بھی وہ لڑائی جھگڑا کرے یا تلخ کلامی سے کام لے تو تم فوراً اس کے اس سلوک کی سخت مخالفت کرو۔ مخالفت کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی گالیاں بکنے لگو۔اس سے صاف کہہ دو کہ اس کا یہ برتاؤ نہایت مذموم ہے اور اگر وہ اس قسم کا برتاؤ کرنے سے باز نہ آئے گی تو نتیجہ اس کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ دو چار بار اس طرح تنبیہ کردینے پر بھی اگر وہ نہ مانے تو گھر بار کے متعلق اسے جتنے اختیارات حاصل ہوں یعنی گھر کا مال واسباب‘ اپنے قبضے میں لو اور اسے ضرورت کے موافق اپنے ہاتھ سے دے دیا کرو۔“

رام بھجن۔ ”ہوں۔اور کچھ ؟“

سنیاسی۔ ”اس کی اس بری طبیعت کا حال پوشیدہ مت رکھو۔ جو عورتیں یا مرد تمہاری بیوی سے ملتے جلتے ہوں‘ ان کو اپنی بیوی کے مزاج سے آگاہ کردو۔ان کو یہ بھی بتلادو کہ تم اپنی بیوی کے مزاج سے بے حد دکھی اور ناراض ہو۔“

رام بھجن۔ ”اس سے کیا ہوگا؟“

سنیاسی۔ ”اس سے یہ ہوگا کہ وہ لوگ بھی تمہاری بیوی کے منہ پر اس کے برے مزاج کی تنقید کریں گے۔ عورتوں میں یہ بات بہت ہوتی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی منہ پر ہی کرتی ہیں۔“

رام بھجن۔ ”ٹھیک ہے اور کچھ ؟“

سنیاسی۔ ”اگر تمہاری بیوی کے پاس کوئی ایسی عورت آتی جاتی ہو جو خود بری طبیعت کی ہو تو اس کی آمدورفت فوراً بند کردو۔ بری صحبت کے سبب بھی ایسی طبیعت ہو جاتی ہے۔“

رام بھجن۔ ”اگر ان تمام ترکیبوں سے بھی فائدہ نہ ہوا؟“

سنیاسی۔ ''ابھی سے کیوں مایوس ہوئے جاتے ہو؟ پہلے کر کے تو دیکھو۔ اگر فائدہ نہ ہو تو سمجھ لینا مرض لاعلاج ہے۔ یاد رکھو بیوی کے لئے شوہر کی بے پروائی بڑی سخت سزا ہے بشرطیکہ اگر اچھی طرح سے اور مناسب عرصہ تک دی جائے اور دو چار دن بول چال بند کر دینے سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔''

رام بھجن۔ ''ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔''

سنیاسی۔ ''بس جاؤ، میں آشیرباد دیتا ہوں کہ تمہیں کامیابی حاصل ہو۔''

رام بھجن کے دل میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ آج تک جس بات کو وہ ناممکن خیال کرتے تھے وہی انہیں کامل طور پر ممکن نظر آنے لگی۔ انہوں نے دل میں یہ مستحکم ارادہ کر لیا کہ خواہ کچھ ہی ہو اس کام میں کامیابی حاصل کر کے ہی چھوڑوں گا۔

مذکورہ بالا واقعہ کو چھ ماہ کا عرصہ گذر گیا۔

رام بھجن اور کیلاش ناتھ سنیاسی کی کٹیا میں بیٹھے ہیں۔

رام بھجن نے کہا۔ ''آپ کی عنایت سے میری آرزو بر آئی۔''

سنیاسی۔ ''خیر! تم تو مایوس ہو چکے تھے۔''

رام بھجن۔ ''ہاں بیشک! میں مایوس ہو چکا تھا۔ جیسا کہ میں ایک بار بیچ میں آکر آپ سے عرض کر گیا تھا۔ اس تدبیر سے بہت فائدہ ہوا۔''

سنیاسی۔ ''کس تدبیر سے؟''

رام بھجن۔ ''وہی اس کے برے مزاج کی بات میں نے اس کی تمام سکھی سہیلیوں میں پھیلائی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب نے اس کو اس قدر لعنت ملامت کی کہ اس کی آمد و رفت' ملنا جلنا بند سا ہو گیا۔''

سنیاسی۔ ''درست ہے۔''

رام بھجن۔ ''جب میں نے گھر پر اپنا قبضہ جمایا تو اس نے افیم کھا کر سو رہنے تک کی دھمکی دی مگر میں نے اس طرف ذرا بھی دھیان نہیں دیا۔''

سنیاسی۔ ''ٹھیک ہے۔ بہت خوب کیا۔''

رام بھجن۔ ''پانچ ہی مہینے میں اس کو اپنی زندگی بوجھ معلوم ہونے لگی۔''

سنیاسی۔ ''اب کیا حالت ہے؟''

رام بھجن۔ ''اب تو سب ٹھیک ہے۔ یہاں تک کہ خسر کو بھی خود ہی بلا کر اپنی خطاؤں کے لئے معافی مانگی۔''

سنیاسی۔ ''بہت ٹھیک۔''

رام بھجن۔ ''یہ سب آپ کی مہربانی کا نتیجہ ہے کہ میرا گھر جو دوزخ کا نمونہ تھا' اس وقت بہشت کے برابر ہو گیا ہے۔''

سنیاسی نے کہا۔ ''یہ سب تپسیا کا پھل ہے۔ تپسیا کرنے سے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ یہ تیر بہدف دوا ہے۔''

پاون پتت

(1)

رات کے بارہ بج چکے ہیں۔ ایک عالیشان اور عام طور سے خوبصورت حویلی کے ایک بڑے کمرے میں پلنگ پر ایک بڈھا لیٹا ہوا ہے۔ کمرے میں بجلی کی روشنی پھیلی ہوئی ہے جس سے کمرے کی سب چیزیں صاف صاف نظر آتی ہیں۔ پلنگ کے سرہانے کی طرف ایک چھوٹی سی گول میز رکھی ہے جس پر تین چار دواؤں کی شیشیاں اور دو شیشے کے گلاس رکھے ہیں۔ بڈھے کے پلنگ کے پاس ہی آرام کرسی پر ایک نوجوان جس کی عمر بیس بائیس برس کے لگ بھگ ہو گی' لیٹا ہوا ایک انگریزی کتاب پڑھ رہا ہے۔ کمرے کی کھڑکیوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں۔ کمرے کے دروازے کے پاس ایک ملازم بیٹھا اونگھ رہا ہے۔

دیوار پر لگی ہوئی گھڑی نے ساڑھے بارہ کا نصف گھنٹہ بجایا۔ گھنٹہ کی آواز سن کر نوجوان اٹھا اور آہستہ سے پلنگ کے پاس پہنچا۔ بوڑھا آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ سفید ہو رہا تھا جس سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھے کے جسم میں خون نہیں رہا تھا۔ جسم اس قدر دُبلا ہو گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہڈیوں کے ڈھانچے پر صرف چمڑا مڑھا ہوا ہے۔ نوجوان نے پلنگ کے پاس پہنچ کر چند لمحے تک بوڑھے کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے بعد میز کے پاس پہنچ کر ایک شیشی اٹھائی اور اس نے گلاس میں دوا ڈالی۔ پھر پلنگ کے پاس آکر اس نے ہلکے سے کہا۔ "پتا جی! دوا پی لیجئے۔" بوڑھے نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوجوان کے اٹھنے سے نوکر بھی ہوشیار ہو گیا تھا۔ اس نے پاس آکر آہستگی سے کہا۔ "بابو جی! بڑے بابو جی سوتے ہوں تو جگایئے نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہہ گئے تھے کہ جگا کر دوا نہ پلائی جائے۔"

نوجوان نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "نہیں سوتے نہیں ہیں' نقاہت سے آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔"

یہ کہہ کر نوجوان نے پھر ہلکے سے کہا۔ "پتا جی!"

اس دفعہ بوڑھے نے پھر آنکھیں کھولیں اور نوجوان کو دیکھ کر پھر بند کر لیں۔ نوجوان نے کہا۔ "دوا پی لیجئے۔" بوڑھے نے آنکھیں کھولیں اور کچھ دیر تک نوجوان کی طرف دیکھ کر ہلکے سے کہا۔ "اب دوا کا کام نہیں رہا۔"

نوجوان بولا۔ "اس دوا سے تو آپ کو فائدہ ہوا ہے' پی لیجئے۔"

بوڑھے نے سر ہلایا اور جواب دیا۔ "فائدہ اتنا ہی ہوا ہے کہ میں بول سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اب دنیا کی دوا مجھے مرنے سے نہیں بچا سکتی۔"

نوجوان کا گلا کچھ بھر آیا۔ اس نے کہا۔ "تو حرج ہی کیا ہے' پی لیجئے۔"

بوڑھے نے ہاتھ اٹھا کر دوا کا گلاس رکھ دینے کا اشارہ کیا۔

نوکر نے نوجوان سے بہت دھیمے لہجے میں کہا۔ "جانے دیجئے بڑے بابو جی کی مرضی نہیں ہے۔"

نوجوان کچھ دیر تک کھڑا سوچتا رہا۔ شاید وہ یہ سوچتا تھا کہ اس وقت کیا کرنا مناسب ہے' دوا پلانا یا نہ پلانا۔ آخر کار وہ گہرے یاس کے عالم میں گلاس لئے ہوئے میز کی طرف بڑھا۔ اسی وقت بوڑھے نے کہا۔ "اچھا لاؤ۔"

نوجوان کا جذبۂ یاس فوراً دور ہو گیا اور وہ بشاش ہو کر گلاس لئے بوڑھے کی طرف بڑھا۔ داہنے ہاتھ سے اس نے بوڑھے کا سر اٹھایا اور بائیں ہاتھ سے گلاس اس کے منہ کو لگا دیا۔ بوڑھے نے دوا پی لی' نوکر نے ایک صاف تولئے سے اس کا منہ پونچھ دیا۔

بوڑھا کچھ دیر تک چپ چاپ آنکھیں بند کئے پڑا رہا۔ اس کے بعد اس نے آنکھیں کھول کر پکارا۔ "چرنجو!"

نوکر فوراً پاس آکر بولا۔ "حضور!"

بوڑھا۔ "تم باہر جا کر بیٹھو۔ مجھے راجیو سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

چرنجو۔ "بہت اچھا حضور!"

چرنجو کمرے سے باہر چلا گیا۔

بوڑھے نے نوجوان سے کہا۔ "راجیو دروازہ بند کر لو۔"

نوجوان بوڑھے کی اس کارروائی پر دل میں حیران ہوا اور بیتابی کے ساتھ دروازہ بند کر کے پھر بوڑھے کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

بوڑھے نے کہا۔ "ایک کرسی لے لو۔"

نوجوان نے ایک کرسی اٹھا کر پلنگ کے پاس بچھالی اور اس پر بیٹھ گیا۔

بوڑھا۔ "ذرا اور آگے کو کھسک آؤ۔"

نوجوان نے کرسی پلنگ سے لگالی اور بولا۔ "کہیے۔"

بوڑھا۔ "کھڑکیاں سب بند ہیں نا؟"

نوجوان نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "بند ہیں۔"

اس وقت نوجوان کے چہرے پر بیتابی و اشتیاق کے آثار ہویدا تھے۔ اس بیتابی میں اندرونی خوشی بھی ملی ہوئی تھی مگر وہ اس قدر ہلکی تھی کہ سب کوئی اسے تاڑ نہ سکتے تھے بلکہ وہی عقلمند اور تجربہ کار لوگ جو آدمی کے چہرے کی حالت اور اتار چڑھاؤ دیکھ کر اس کے دلی جذبات سمجھنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بوڑھا اس علم کو سمجھتا تھا کیونکہ اس نے ایک ہلکے سے تبسم کے ساتھ کہا۔ "بیٹا راجیو! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں اپنے کسی دفینے کی بابت بتاؤں گا۔ میرے پاس جو کچھ ہے وہ تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے' اس سے زیادہ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔"

راجیو چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر ندامت کی جھلک دوڑ گئی۔ انسان کی کمزوری جب دوسرے پر ظاہر ہوتی ہے تب اس کا شرمندہ ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

راجیو نے جھینپی ہوئی سوکھی ہنسی ہنس کر کہا۔ "نہیں پتا جی! دفینے کی مجھے کوئی خواہش نہیں۔ آپ تندرست ہو جائیں یہی میرے لئے سب سے بڑی حشمت ہے۔"

بوڑھے کے چہرے پر غم آمیز سنجیدگی چھا گئی۔ اس نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ "میرے تندرست ہونے کی امید چھوڑ دو۔ جتنا اس امید کو زیادہ جگہ دو گے اتنی ہی زیادہ تکلیف ہو گی۔ میں تم سے ایک ایسی بات کہنے والا ہوں جسے سن کر تمہیں بڑا دکھ ہو گا۔"

راجیو پھر چونک پڑا۔ اس کے چہرے پر فکر کے آثار ہویدا ہو گئے۔ اس نے گھبرا کر پوچھا۔ "وہ کونسی بات؟"

بوڑھا۔ "وہ ایسی بات ہے جسے سن کر تمہاری محبت مجھ پر سے ہٹ اور گھٹ جائے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ

تم مجھ سے نفرت کرنے لگو مگر خواہ کچھ ہی ہو' مجھے کہنا پڑے گا۔ جب سے مجھے اپنے مرنے کا یقین ہوا ہے اس وقت سے لگا تار یہی سوچ رہا ہوں کہ وہ بات تم سے کہوں یا نہ کہوں؟ آخر کار بہت سوچ بچار کر میں نے کہنا ہی طے کیا ہے۔"

بوڑھا کمزوری کے سبب اتنی بات کہنے میں تھک گیا۔ اس کی سانس زور زور سے چلنے لگی۔

ادھر راجیو کے چہرے پر فکر اور بے چینی کے آثار آنے اور جانے لگے۔

بوڑھے نے دم لے کر پھر کہنا شروع کیا۔ "اگر مجھے اپنی زندگی کا بھروسہ ہوتا تو میں کبھی وہ بات تم سے نہ کہتا مگر اب مجھے بخوبی معلوم ہو گیا ہے کہ میں دو ہی چار دن کا مہمان ہوں۔ اس لئے کہتا ہوں مگر بات کہنے سے پیشتر اتنی درخواست تم سے کروں گا کہ وہ بات سن کر تم جلدی سے میرے متعلق کوئی ایسی رائے قائم کر کے مجھ سے نفرت مت کرنے لگ جانا۔ پہلے مجھ سے اپنے دل کے تمام شکوک رفع کرا لینا۔ اگرچہ مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہارے ساتھ بہت دیر تک بات چیت کر سکوں مگر پھر بھی حتی الوسع کوشش کروں گا۔"

بوڑھا پھر دم لینے کے لئے چپ ہو گیا۔

راجیو نے بے حد بے قرار ہو کر کہا۔ "پتاجی! وہ کونسی بات ہے؟ جلدی کہیے! اس دنیا میں ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی جسے سن کر میری محبت آپ پر سے کم ہو جائے۔ یہ ناممکن ہے' آپ اس کا ذرا بھی خوف نہ کیجئے۔"

بوڑھا مسکرایا' اس نے کہا۔ "یہ ایک ناتجربہ کار اور صاف دل سے نکلی بات ہے بیٹا! میں نے دنیا دیکھی ہوئی ہے اور خوب دیکھی ہے۔ دنیا کے اکثر لوگ وہم اور غلطی میں مبتلا ہونے کے سبب سکھ سے دنیا میں رہتے ہیں۔ اگر ان کا وہم اور غلطی رفع ہو جائے تو ان کے لئے ایک لمحہ بھی دنیا میں سکھی رہنا ناممکن ہو جائے۔"

راجیو نے بوڑھے کی اس بات پر کچھ دھیان نہ دیا۔ اس نے کہا "آپ اصل بات کہئے۔ تمہید چھوڑ دیجئے۔"

بوڑھا۔ "گھبراؤ نہیں' وہی کہہ رہا ہوں۔ تم مجھے باپ سمجھ کر مجھ سے محبت کرتے ہو اور آرام سے اپنا وقت گزار رہے ہو لیکن اگر تم سے کوئی کہہ دے کہ یہ تمہارا وہم ہے۔ میں تمہارا والد نہیں ہوں تو تمہارا سب سکھ ایک لمحہ میں دکھ میں بدل جائے۔"

راجیو۔ "آپ کو معلوم نہیں' آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

بوڑھا۔ "سب سمجھ میں آ جائے گا۔ لو سنو' آج تک تم مجھے اپنا باپ سمجھتے رہے ہو لیکن آج میں تمہیں بتلاتا ہوں کہ نہ میں تمہارا باپ ہوں' نہ تم میرے بیٹے ہو۔"

راجیو حیران اور گم سم ہو کر بوڑھے کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

بوڑھا۔ "کیا دیکھتے ہو راجیو؟ کیا تمہیں یقین نہیں آتا؟"

راجیو اپنے خشک ہونٹوں پر جیبھ پھیر کر بولا۔ "نہیں مجھے یقین نہیں آتا۔ کیا آپ سچ کہتے ہیں؟"

بوڑھا۔ "ایشور شاہد ہے بلکہ بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ بسترِ مرگ پر پڑا ہوا آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔"

راجیو کا چہرہ فق ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "تو آپ میرے دادا یا چچا ہوں گے؟"

بوڑھا۔ "کچھ بھی نہیں' مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ تمہارے ماں باپ کون ہیں۔"

راجیو "ایں!" کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر تک وہ بوڑھے کو بڑی تیز نگاہ سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد مسکرا کر بولا "میں سمجھ گیا آپ میری آزمائش کر رہے ہیں مگر مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ آزمائش کا یہ ڈھنگ بہت بے دردانہ ہے۔"

(2)

بوڑھا کچھ دیر تک راجیو کی طرف تکتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ "میرا چھوٹا کیش بکس لے آؤ۔" راجیو بوڑھے کی بات پر حیران ہوتا اور یقین کرنے اور نہ کرنے کے درمیان جھولتا ہوا جاکر کیش بکس لے آیا۔

بوڑھے نے اشارے سے کیش بکس کرسی پر رکھ دینے کے لئے کہا! راجیو نے رکھ دیا۔ اس کے بعد بوڑھے نے کہا۔ "میرے جنیئو میں ایک چھوٹی چابی بندھی ہے' اسے کھولو۔"

راجیو نے چابی کھول لی۔

بوڑھا۔ "کیش بکس کھولو۔"

راجیو نے کیش بکس کھولا۔

بوڑھا۔ "کیش بکس کے بائیں طرف کے خانے میں ٹٹول کر دیکھو کیل کی قسم کا ایک چھوٹا سا بٹن ملے گا۔ اسے دباؤ۔"

راجیو نے ویسے ہی کیا۔ بٹن دباتے ہی اس خانے کی پینڈی کا تختہ نیچے گر گیا اور اس کے نیچے ایک اور خانہ دکھائی دیا جس میں ایک کاغذ تہ کیا ہوا رکھا تھا۔

بوڑھا۔ "کاغذ کو نکالو۔ یہ کاغذ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے سچ کہا ہے۔"

راجیو نے کاغذ نکالا۔

بوڑھا۔ "اس کاغذ کو کھول کر پڑھ لو۔"

راجیو نے کاغذ کھولا۔ کاغذ چونکہ بہت پرانا تھا' اس لئے بدرنگ اور کمزور ہو گیا تھا۔ سیاہی کا رنگ بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ راجیو نے کاغذ پڑھا۔ کاغذ کی ہر ہر سطر کے خاتمہ کے ساتھ ہی راجیو کے چہرے کا رنگ رفتہ رفتہ اڑتا جا رہا تھا۔ یونہی پڑھ کر تمام کیا۔ اس نے دانت پیستے ہوئے کاغذ کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دیا اور بوڑھے کی طرف نہایت ہتک آمیز نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا آپ نے میری جان اسی لیے بچائی تھی کہ میرے بڑے ہونے پر مجھ کو میری اس ذلیل و خوار اصلیت سے آگاہ کر کے اس کا لطف اٹھائیں گے؟"

بوڑھا مسکرایا' نوجوان کے ہتک آمیز چہرے کے سامنے بوڑھے کا متبسم دُبلا پتلا چہرہ اور اس کی محبت بھری آنکھیں ایک بہت عمدہ فرق ظاہر کر رہی تھیں۔ بوڑھے نے کہا۔ "راجیو! بیٹھ جاؤ اور ٹھنڈے دماغ سے اس پر غور کرو۔ ابھی دس منٹ پہلے تم نے کہا تھا کہ دنیا کی کوئی بات مجھ پر سے تمہاری محبت کم نہیں کر سکتی۔ اب تمہاری کیا حالت ہے؟ اسی لیے میں کہتا تھا کہ بیشتر حالات میں وہم اور لاعلمی ہی آدمی کے لیے خوشی کا باعث ثابت ہوتی ہے۔"

راجیو کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا۔ "بلاشک اس علم سے وہ لاکھ درجہ بہتر تھی۔"

بوڑھا۔ "راجیو! میں جو کچھ کہتا ہوں' اسے غور سے سنو۔ پھر میرے بارے میں جیسی رائے مناسب سمجھنا' قائم کر لینا۔"

راجیو نے تھوڑی دیر سوچ کر کہا۔ "کہو' میں سنتا ہوں۔"

بوڑھا۔ "پہلے مجھے ایک معتاد دوا اور پلا دو کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں' کہہ سکوں۔"

راجیو نے اٹھ کر بوڑھے کو دوا پلائی۔

بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔ "یہ تو تم کو اس کاغذ سے معلوم ہی ہو گیا ہے کہ میں نے تمہیں رات کو دو بجے کے قریب کپڑے میں لپیٹا ہوا ایک گلی کے کونے میں پایا تھا۔"

راجیو کے چہرے پر غضب کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے ذرا بگڑ کر کہا۔ "ہاں معلوم ہو گیا۔"

بوڑھا۔ "اس وقت میں کیسی حالت میں تھا' یہ تمہیں بتلاتا ہوں۔ میری بیوی کو مرے صرف پانچ ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ دنیا میری نگاہوں میں تاریک ہو رہی تھی۔ دنیا جہان کی کسی چیز میں کسی بات میں میرے لیے خوشی نہیں تھی۔ میں اپنی بیوی سے محبت کرتا تھا' اس کی جدائی کے غم نے مجھے پاگل سا بنادیا تھا۔"

بوڑھے نے کچھ دیر تک ٹھہر کر دم لیا اور اپنا سلسلہ کلام پھر یوں شروع کیا۔ "میں اپنا دن اِدھر اُدھر پھرنے میں اور رات تھیٹر اور بائسکوپ دیکھنے میں گزارا کرتا تھا۔ جس روز میں نے تمہیں پڑے پایا' اس دن میں تھیٹر سے لوٹ رہا تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر میں چونک پڑا۔ میں نے دیا سلائی جلا کر دیکھا تو کپڑے میں لپٹا ہوا ایک نوزائیدہ بچہ پڑا رو رہا تھا۔ میں صمٌ بکمٌ رہ گیا' سوچا اگر اس وقت مجھے اس حالت میں کوئی دیکھ لے تو ضرور یہی خیال کرے کہ میں ہی بچہ یہاں رکھ کر بھاگنے کی فکر میں ہوں۔"

بوڑھے نے پھر دم لے کر کہنا شروع کیا۔ "میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ پہلے جی چاہا کہ بچہ کو اس کی تقدیر کے حوالے کر کے چل دوں مگر اس خیال نے کہ رات میں ایسا خوبصورت بچہ پڑا پڑا مر جائے گا' میرے جگر کو پانی پانی کر دیا۔ زیادہ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے سوچا جی بہلانے کے لیے اس بچے کی پرورش ایک اچھا مشغلہ ہو گا۔ اگر پولیس میں اطلاع دوں تو بچہ تو بچ جائے گا مگر ایک ہندو کی اولاد عیسائیوں کے اضافہ کا باعث ہو گی۔ یہی سب سوچ کر میں نے تمہیں اٹھالیا اور گھر لے آیا۔"

بوڑھا پھر چپ ہو گیا اور کچھ دیر بعد بولا۔ "میں نے رات ہی رات خود دوڑ دھوپ کر کے تمہارے دودھ پلانے کے لیے ایک عورت ٹھیک کی اور صبح ہوتے ہوتے وہ شہر چھوڑ دیا۔ تمہارے لیے میں نے اپنی جنم بھومی چھوڑ دی اور اس شہر میں اپنا گھر بنایا۔ جس مقصد سے میں نے تمہاری جان بچائی تھی' وہ پورا ہو گیا۔ تمہاری جان بچ گئی' تمہاری غور و پرداخت میں لگ جانے سے میرا دل جو دنیا سے پھر گیا تھا' پھر دنیا میں لگ گیا۔ میرے لیے پھر دنیا آرام دہ ہو گئی۔ اس راز سے سوائے میرے اور اس عورت کے جس نے تمہاری پرورش کی اور کوئی شخص آگاہ نہیں۔ وہ عورت اسی وقت مر گئی تھی جب تم سات برس کے تھے۔ اب اس وقت میرے سوائے اور کوئی اس بات کو نہیں جانتا۔"

راجیو۔ "معلوم ہوتا ہے آپ نے میری باقی ماندہ زندگی کو پُر تکلیف بنانے کے لیے ہی مجھ سے یہ بات کہی ہے۔"

بوڑھا۔ "ایشور نہ کرے! میں ایسی خواہش ہرگز نہیں کرتا۔ تمہاری ہی خاطر میں نے دوسری شادی نہیں کی۔ اگرچہ اس وقت میری عمر صرف 29-30 برس کی تھی۔ میں نے پوشیدہ طور سے تمہارے والدین کی ہر چند تلاش کی مگر کچھ پتہ نہیں لگا۔"

راجیو نے ذرا چڑ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بیماری نے آپ کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ جب آپ کو یہ نہیں معلوم کہ میں کس ذات کی اولاد ہوں تو آپ نے پتہ کیا دیواروں سے لگایا ہو گا۔"

بوڑھا۔ "دیکھو پھر تم پوری بات سنے بغیر رائے قائم کر رہے ہو۔ یہ تمہارا لڑکپن ہے۔ پہلے پوری بات

سن لو۔ جب میں تمہیں اٹھالایا تھا' اس وقت تمہارے گلے میں ایک تعویذ پڑا ہوا تھا۔ اس تعویذ کی بناوٹ ایک خاص طرز کی تھی۔ اسی تعویذ کے سہارے میں نے کوشش کی تھی۔"

راجیو نے جلدی سے اپنے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا یہی تعویذ جو میرے بازو پر بندھا ہے؟"

بوڑھا۔ "ہاں یہی تعویذ۔"

راجیو۔ "اوہ! تبھی آپ مجھ سے اکثر کہا کرتے تھے کہ اس تعویذ کو اپنے بازو پر سے کبھی نہ کھولنا۔"

بوڑھا۔ "اسی لیے کہ شاید اس کے ذریعے کبھی سراغ مل جائے۔"

راجیو نے دونوں ہاتھوں پر اپنا سر رکھ لیا اور چپ چاپ بیٹھا کچھ سوچتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے سر اٹھایا اور ایک لمبی آہ بھر کر بولا۔ "بہتر تو یہی تھا کہ میں اسی حالت میں مر گیا ہوتا مگر آپ نے میری جان بچائی' اس کے لیے مجھے ضرور آپ کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ایک ایسے بچے کی جس کے ماں باپ کا' جس کی ذات پات کا کچھ پتہ نہیں' آپ نے حفاظت کی۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ اس کی غور و پرداخت کی۔ اس کو اپنے بیٹے کی طرح رکھا' یہ تھوڑی بات نہیں ہے۔ اگرچہ اب میری باقی ماندہ زندگی خوشگوار نہیں رہی' تاہم اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ قصور میری تقدیر کا ہے۔"

بوڑھا۔ "شاید تم یہ سوچو کہ اگر میں یہ راز تم سے بیان نہ کرتا تو اچھا تھا مگر تمہارا یہ خیال درست نہیں ہو سکتا۔"

راجیو۔ "ہاں ٹھیک ہے۔ اگرچہ میں نے پہلے یہی سوچا تھا کہ مجھے یہ بات نہ معلوم ہوتی تو اچھا تھا مگر اب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس کا مجھ پر منکشف ہونا اچھا ہی ہوا۔ اگر کہیں آپ مجھ سے نہ کہتے تو آپ کے بعد کسی طرح سے مجھے یہ بات معلوم ہو جاتی اور مجھے بڑا صدمہ ہوتا اور میں ہمیشہ آپ کی آتما کو کوسا کرتا۔ اب مجھے یہ بات معلوم ہو گئی' میں اپنی باقی زندگی اس امر کی جستجو میں لگاؤں گا کہ میرے ساتھ ایسا ظلم کس نے کیا اور کیوں کیا؟"

بوڑھے نے مسکرا کر کہا۔ "ایشور کا لاکھ لاکھ دھنباد ہے کہ تم نے اس اسرار سے آگاہ ہو کر مجھ سے نفرت نہیں کی' اس کا مجھے بڑا ڈر تھا۔"

راجیو۔ "سچ کہہ دوں؟ اگرچہ میرے دل میں آپ کے لیے محبت کا اتنا زور نہیں رہا جتنا پہلے تھا مگر نفرت میں کبھی نہیں کر سکتا۔ میں نے شروع میں جو کچھ نامناسب الفاظ آپ کے لیے استعمال کئے تھے' ان کے لیے میں معافی کا خواستگار ہوں۔"

یہ کہتے کہتے راجیو کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ بوڑھے نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیے۔ راجیو نے جس کو یہ عادت پڑ گئی تھی کہ تکلیف اور دُکھ کے وقت بوڑھے کی گود میں پناہ لے کر تسلی تشفی حاصل کرے' یہ جانتے ہوئے بھی کہ بوڑھا اس کا باپ نہیں ہے' صرف اپنی عادت سے متحرک ہو کر اپنے دل کی جلن بجھانے کے لیے بوڑھے کی چھاتی پر اپنا سر رکھ دیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(3)

مندرجہ بالا واقعہ کو ایک ماہ کا عرصہ ہو گیا۔ بابو راجیو لوچن کمرے میں بیٹھے ہوئے اپنی حالت پر غور کر رہے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے۔ "ایک ماہ پیشتر مجھے اپنی حالت پر کس قدر ناز تھا۔ میں کس قدر خوش اور سکھی

تھا۔ لوگوں کے چھوٹے چھوٹے نقائص پر میں ہنسا کرتا تھا مگر آج میری کیا حالت ہے؟ اگر آج دنیا کو یہ معلوم ہو کہ میں ایک شخص ہوں جس کے ماں باپ کا پتہ نہیں' ذات پات کا ٹھکانا نہیں تو لوگ مجھ سے کیسا برتاؤ کریں۔ اُف! اس کا خیال آتے ہی کلیجہ تھرا اٹھتا ہے۔ اُف! کاش کہ میں مر گیا ہوتا' کیا کروں' کہاں جاؤں؟ کس طرح اس دل کی لگی کو بجھاؤں؟ کون سا ایسا پرائشچت کروں جس سے لوگوں سے بغیر کسی قسم کی جھینپ کے مل جل سکوں؟ اگرچہ اس راز سے میرے سوا کوئی آگاہ نہیں' پھر بھی لوگوں سے ملتے جلتے مجھے خوف اور شرم محسوس ہوتی ہے۔

بابو راجیولوچن اسی ادھیڑ بن میں محو تھے کہ ایک نوکر نے آکر کہا۔ "بابو جی، آپ سے پنڈت رادھاچرن ملنے آئے ہیں۔" راجیولوچن کا دل دھڑکنے لگا۔ انہوں نے کہا۔ "پنڈت رادھاچرن!"

نوکر نے کہا۔ "جی ہاں۔"

راجیولوچن فوراً اپنے کو سنبھال کر بولے۔ "اچھا بلا لاؤ۔"

راجیولوچن نے سوچا۔ "رادھاچرن کا نام سن کر میں گھبرا گیا۔ نوکر نے میری گھبراہٹ ضرور دیکھی ہو گی۔ اسے کہیں کچھ شک نہ گزرا ہو۔ اف! مجھے کیا ہو گیا! میں اپنے نوکروں تک سے ڈرنے لگا!"

معاً ایک صاحب جن کی عمر چالیس کے اوپر تھی اور جن کے لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بڑے آدمی ہیں' کمرے کے اندر آئے۔

راجیولوچن نے کھڑے ہو کر انہیں پرنام کیا اور کہا۔ "آیئے تشریف رکھئے۔"

رادھاچرن بولے۔ "بیٹھوں کیا' مجھے تو بڑا افسوس ہے۔ آخری وقت میں اپنے دوست سے مل تک نہ سکا۔"

یہ کہہ کر رادھاچرن رومال سے آنکھیں پونچھتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ راجیولوچن نے کہا۔ "ہاں مجھے خبر ملی تھی کہ آپ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔"

رادھاچرن۔ "میں دو مہینے کے بعد آیا ہوں۔ کل رات کو میں نے سنا' بیٹا! کیا کہوں مجھے بڑا غم ہوا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ تمہارے باپ کی اور میری کیسی دوستی تھی۔"

راجیو۔ "جی ہاں' آخری وقت پتا جی نے کئی بار یاد کیا تھا۔"

"پتا جی" کہتے وقت راجیو کے چہرے پر ندامت کی ایک ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔

پنڈت رادھاچرن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، بولے۔ "انہوں نے ضرور مجھے یاد کیا ہو گا مگر تقدیر میں نہیں لکھا تھا' کیا کہیں۔"

راجیو کی آنکھوں میں بھی آنسو اُمنڈ آئے مگر اس لیے نہیں کہ وہ مرحوم ان کا باپ تھا۔ انہوں نے سوچا۔ "کچھ بھی ہو مگر آدمی اچھا تھا اور مجھ سے بہت محبت کرتا تھا۔"

رادھاچرن نے پوچھا۔ "کیا بیماری ہوئی تھی؟"

راجیو۔ "پندرہ روز بخار آیا تھا۔"

رادھا۔ "صرف بخار؟"

راجیو۔ "جی ہاں' پندرہ ہی دن میں بڑے کمزور ہو گئے تھے۔"

رادھا۔ "یہ کہو کہ ان کا آخری وقت آ گیا تھا ورنہ بیٹا لوگ مہینوں بخار میں پڑے رہتے اور پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔"

راجیو۔ ”جی ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہی ہے۔“

رادھا۔ ”خیر! جو ایشور کی اِچھا تھی‘ وہی ہوا۔ اب ایشور تمہاری عمر دراز کرے اور تم ان کا نام چلاؤ! میری اور ان کی دوستی اس وقت سے تھی جب تم چار پانچ برس کے تھے۔ میں نے ان سے متعدد بار شادی کر لینے کے لیے کہا مگر انہوں نے یہی جواب دیا۔ “

”شادی کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لیے دنیا میں جو کچھ ہے راجیو ہے۔“سچ تو یہ ہے کہ تمہارے ہی لیے انہوں نے سب سکھ آرام قربان کر دیئے تھے۔ خیر! مرنا تو ایک روز سبھی کو ہے مگر اتنی بات کا افسوس ضرور ہے کہ وہ اپنے سامنے تمہاری شادی نہ کر پائے۔ کئی بار میں نے اور دوسرے لوگوں نے ان سے کہا کہ راجیو کا بیاہ کر ڈالو مگر وہ یہی جواب دیتے تھے کہ ”ابھی نہیں۔ جب راجیو بی‘ اے پاس کر لے گا تب۔“”تم نے تو شاید اس سال بی-اے کا امتحان دیا تھا؟“

راجیو۔ ”جی ہاں دیا تھا۔“

رادھا۔ ”پاس ہو گئے ؟“

راجیو۔ ”جی ہاں۔ آپ کی عنایت سے پاس تو ہو گیا۔“

رادھا۔ ”رام رام! دیکھو کیسے وقت میں ان کی موت ہوئی۔ جیتے رہتے تو اس سال بیاہ ضرور ہو جاتا۔“

راجیو نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا‘ بیاہ نہیں ہوا‘ یہ بہت اچھا ہوا۔

رادھا۔ ”خیر! اب تم اپنا بیاہ خود کرنا۔ مجھ سے جو ہو سکے گا‘ اس کے لیے میں تیار ہوں۔“

راجیو۔ ”آپ لوگوں کا تو بھروسہ ہے۔“

رادھا چرن بولے۔ ”اچھا بیٹا! اب میں چلوں گا۔ کسی بات کی تکلیف ہو تو مجھ سے کہنا‘ تم میرے دوست کے بیٹے ہو۔ اس لیے میں بھی تمہیں اپنے بیٹے ہی کی طرح مانتا ہوں۔ مجھ سے کسی قسم کا پس و پیش نہ کرنا۔“

راجیو کا چہرہ مارے ندامت کے سرخ ہو گیا۔ انہوں نے سر جھکا کر اپنے چہرے کے جذبات چھپانے کی کوشش کی۔ سر جھکائے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کی عنایت ہے۔ میں بھی آپ کو انہیں کے برابر سمجھتا ہوں۔“

یہ الفاظ راجیو نے اپنی دلی خواہش کے خلاف بڑی کوشش سے کہے تھے۔

رادھا چرن کے چلے جانے کے بعد راجیو کرسی پکڑے کچھ دیر کھڑے رہے۔ ان کے چہرے پر غم آمیز ہلکا تبسم تھا۔ وہ سوچ رہے تھے کہ اگر میں ان سے اپنا دکھ بیان کروں تو اسے دور کرنا تو درکنار جناب میری صورت تک سے نفرت کرنے لگیں۔ حق تو یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت مجھ سا بد نصیب دوسرا نہ ہو گا۔ کیا میں دنیا میں اسی لیے پیدا ہوا تھا کہ ایک شخص کی تفریح طبع کا کھلونا بنوں اور اس کے مر جانے پر اپنی تمام زندگی اپنی ذات سے نفرت کرنے اور روحانی تکلیف میں گزار دوں؟ اس میں شک نہیں کہ کھلونا بننے کی اجرت میں نے اچھی پائی۔ کافی مال و متاع کا مالک ہوا مگر کیا؟ کچھ نہیں سب فضول ہے۔ جب دل کو چین نہیں‘ خوشی نہیں تو سب لاحاصل ہے۔ اچھا ہوتا اگر مجھ پر یہ اسرار منکشف نہ ہوا ہوتا کہ اس نے میری جان بچا کر میرے ساتھ نیکی کی تو کم از کم مجھے اس راز سے آگاہ کر کے زیادہ نیکی نہیں کی۔ مگر نہیں‘ مجھے یہ بات معلوم ہو گئی‘ اچھا ہی ہوا۔

دوسرے دن راجیو لوچن نے اپنے پرانے اور معتبر نوکر چرنجو کو بلا کر کہا۔ ”چرنجو! میرا دل اُداس رہتا ہے۔ اس گھر میں جی نہیں لگتا۔ میری خواہش ہے کچھ دن باہر پھر آؤں۔“

چرنجو۔ ''کیا کہوں بابو جی! میرا بھی جی بہت گھبراتا ہے۔ اچھا ہے کچھ دن گھوم آیئے طبیعت بہل جائے گی۔''
راجیو۔ ''ہاں یہی میں سوچتا ہوں کہ ساتھ کسے لے جاؤں؟''
چرنجو۔ ''جسے آپ کی مرضی ہو' میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ مگر مجھے لے چلیئے تو اچھا ہے میرا بھی جی بہل جائے گا۔''
راجیو۔ ''اچھی بات ہے' تمہی چلو۔''

(4)

راجیو لوچن کو اپنا گھر چھوڑے ہوئے چھ سات ماہ ہو گئے۔ اس اثنا میں وہ خوب اِدھر اُدھر پھرتے رہے مگر کہیں ان کا دل نہ لگا۔ دل لگتا کیسے؟ اکثر لوگ سوچا کرتے ہیں کہ فلاں جگہ جانے سے طبیعت بہل جائے گی۔ فلاں چیز دیکھنے سے جی بہلے گا مگر یہ سب غلطی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نیاپن دکھی سے دکھی آدمی کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتا ہے لیکن چند لمحوں کے لیے۔ باہر کی چیزوں کا اثر دل پر پڑتا ضرور ہے لیکن اگر دل دکھی ہے تو اس پر اثر پڑے گا جیسا جلتے ہوئے توے پر ٹھنڈے پانی کا۔ اگر دل میں خوشی ہے' شانتی ہے تو باہر کی چیزوں کا اثر دلی خوشی اور بھی دوبالا کر دے گا۔

راجیو لوچن اس وقت اسی شہر میں ہیں جہاں وہ پیدا ہوئے تھے۔ اسے اگر ان کی جنم بھومی کہا جائے تو بھی کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ جس وقت راجیو اس شہر کے اسٹیشن پر اترے تھے' اس وقت ان کے دل کی عجیب حالت تھی۔ اس میں بے تابی' اشتیاق' رنج اور خوشی چاروں ساتھ چلے ہوئے تھے۔ جس وقت وہ گاڑی میں سوار ہو کر شہر کو چلے تھے' اس وقت ہر ایک سڑک' ہر ایک گلی کوچے اور ہر ایک مکان کو بغور دیکھتے جاتے تھے اور سوچتے تھے کہ انہیں مکانوں میں سے کسی ایک میں میرا جنم ہوا ہوگا مگر یہ کیونکر معلوم ہو کہ وہ مکان کونسا ہے۔ آہ! اگر یہ مکان بول سکتے تو۔ یہ خیال آتے ہی راجیو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ اس نے سوچا' یہ کیا شیخ چلی کی سی باتیں میرے دھیان میں آ رہی ہیں۔

آدمی خواہ کتنا ہی صاحب جاہ و حشمت ہو' جس چیز کی اسے تمنا ہے' وہ چیز اگر کسی بھی وجہ سے اسے نہیں ملتی تو وہ اپنے کو اتنا ہی دکھی' اتنا ہی کمزور' ناطاقت اور بے کس سمجھتا ہے جتنا کہ ایک غریب آدمی اپنی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے پر اپنے کو سمجھتا ہے۔ راجیو لوچن گاڑی پر جاتے ہوئے جب کسی تکلیف زدہ یا کسی محتاج فقیر کو دیکھتے تھے تو ان کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ یہ بھی میری ہی مانند دکھی ہوگا۔ اس وقت ان کو یہ دھیان نہیں رہتا تھا کہ اس کنگال کو صرف پیٹ بھرنے کی فکر ہے یا کپڑا نہ ہونے کا دکھ ہے مگر راجیو لوچن کو اس کی کوئی فکر نہیں۔ وہ بھول جاتے تھے کہ میں گاڑی پر سوار ہوں اور بھیک منگا پیدل' گھسل رہا ہے۔ وہ بھول جاتے تھے کہ ان کے پاس ایک بڑی حشمت ہے اور اس فقیر کے پاس اپنا پیٹ بھرنے تک کو پیسہ نہیں۔ انہیں اگر دھیان رہتا تھا تو صرف دل کی حالت کا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جتنی روحانی تکلیف اس فقیر کو ہے' اتنی ہی انہیں بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہی ہے کہ اس کی اندرونی تکلیف کا اندازہ اس کی ظاہراً حالت سے لگایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ لوگوں کو اس پر رحم آتا ہے مگر ان کی ظاہراً حالت سے لوگ ان کی تکالیف کا قیاس نہیں کر سکتے۔ اسے لیے لوگوں کو ان پر رحم کھانے کا کوئی موقع نہیں رہتا مگر اس کی ان کو ضرورت نہیں۔ انہیں کبھی کبھی خود اپنی حالت پر اس قدر رحم آتا ہے۔ جتنا دوسرے کو کبھی آ ہی نہیں سکتا۔

راجیولوچن کو اس شہر میں آئے ایک ہفتہ گزر گیا۔ وہ روز گنگا اشنان کرنے جاتے ہیں۔ آج بھی چر نجو کو ساتھ لیے گنگا جی کی طرف جا رہے ہیں۔ جس گھاٹ پر وہ جایا کرتے تھے' اسی گھاٹ پر دونوں نے ایک تخت پر کپڑے اتارے اور گنگا جی میں اتر کر اشنان کرنے لگے۔

ان کے پانی میں داخل ہونے کے پانچ منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی جو صورت و شکل اور لباس سے دولت مند معلوم ہوتا تھا' اسی گھاٹ پر آیا۔ اس کے ساتھ ایک رنڈی تھی۔ رنڈی کی عمر بھی تیس چالیس برس کی ہوگی۔ اس کے لباس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہندو ہے۔ رنڈی سرسری نگاہ سے دیکھنے سے خوبصورت معلوم ہوتی تھی مگر اس کا وہ حسن و جمال زیادہ تر بناوٹی تھا مگر ساتھ ہی غائر بین آدمی کے لیے یہ بھی صاف تھا کہ جس وقت اس کا عالم شباب نصف النہار پر ہوگا' اس وقت واقعی وہ بہت خوبصورت ہوگی۔

وہ شخص اسی تخت پر جس پر راجیولوچن اور چر نجو نے کپڑے اتارے تھے' آکر بیٹھ گیا۔ رنڈی اوپر ہی کھڑی رہی۔

چند لمحے بعد اس شخص نے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ رنڈی سیڑھیوں سے اترتی ہوئی بولی۔ "تمہیں نہانا ہو تو جلد نہالو' پھر چلیں۔"

شخص۔ "نہانے کے لیے تو آئے ہیں۔ آؤ بیٹھو۔"

رنڈی آکر اسی تخت پر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر تک وہ شخص اسی رنڈی کے ساتھ گنگا جی اور اس کے بے مثال پانی کے متعلق گفتگو کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے کپڑے اتارتے ہوئے کہا۔ "اچھا تم بیٹھو' میں غوطے لگا کر ابھی آتا ہوں۔"

رنڈی ناک چڑھا کر بولی۔ "جلدی آنا ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

اس شخص نے کہا۔ "چلی کیسے جاؤ گی؟ میں بھی تو چلوں گا۔"

رنڈی مسکرا کر بولی۔ "ایں! تو کیا گھر لوٹ جاؤ گے؟"

شخص۔ "گھر نہیں لوٹیں گے تو کیا یہیں رہیں گے؟"

رنڈی۔ "میں نے سوچا کہ شاید گھر سے لڑ کر آئے ہو۔"

وہ شخص اس مذاق کا مطلب سمجھ کر ذرا شرمائی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "بڑی دل لگی باز ہو۔ اچھا بیٹھی رہنا۔ میں ابھی آیا۔" یہ کہہ کر وہ شخص چلا گیا۔

اس شخص کے جانے کے چند ہی لمحے بعد راجیولوچن اور چر نجو نہا کر لوٹے۔ راجیولوچن رنڈی کو بیٹھے دیکھ کر ذرا ناخوش ہوئے مگر چپ چاپ ایک کنارے کھڑے ہو کر کپڑے پہننے لگے۔ وہ دوسری طرف رخ کیے چپ چاپ بنیان پہن رہے تھے کہ یکایک ان کے کان میں ایک چیخ کی آواز آئی۔ انہوں نے جلدی سے سر پھیرا۔ دیکھا کہ رنڈی تخت سے نیچے گر پڑی ہے۔ اگرچہ رنڈیوں کی طرف سے ان کے خیال اچھے نہیں تھے مگر صرف انسانیت کے پاس سے انہوں نے دوڑ کر اسے اٹھایا۔ چر نجو نے بھی مدد دی اور لوگ بھی دوڑ پڑے۔ جس شخص کے ساتھ وہ آئی تھی' وہ بھی گیلی دھوتی پہنے ہی گھبرایا ہوا آیا اور بولا "کیا ہوا؟ معاملہ کیا ہے؟"

راجیو نے رنڈی کو اٹھا کر تخت پر لٹایا اور کہا۔ "مجھے تو معلوم نہیں۔ میرا منہ تو دوسری طرف تھا۔ میں نے تو صرف چیخ اور اس کے گرنے کی آواز سنی۔"

ایک دبلا پتلا سا آدمی بولا۔ ”اجی مجھ سے پوچھیے۔ یہ مزے سے بیٹھی تھیں، پھر معلوم نہیں۔ کیا سوچ کر اترنے لگیں۔ بس پاؤں پھسلا، گر پڑیں۔“

ایک دوسرا آدمی بولا۔ ”واہ گرو! کیا بے پر کی اڑائی ہے۔ تخت نہ ہوا۔ ہاتھی ہو گیا! تخت سے اترنے میں پاؤں پھسل گیا۔“

گرو بگڑ کر بولے۔ ”الو ہو! آدمی کا راہ چلتے پاؤں نہیں پھسل جاتا؟ یہ کونسی بات ہے۔ میں نے تو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا، میں سنی سنائی تھوڑی ہی کہتا ہوں۔“

وہی آدمی۔ ”معلوم ہوتا ہے، تمہیں دیکھ کر بائی جی پھسل پڑیں۔“

گورو۔ ”تمہیں تو ہر وقت دل لگی سوجھتی ہے۔ کوئی اپنی جان سے جائے، ان کے لیے مذاق ہے۔ ہیں نہیں تو۔“

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ ادھر بائی صاحبہ پر پنکھا چل رہا تھا۔

ایک صاحب نے ان شخص سے جن کے ساتھ بائی صاحبہ تھیں، کہا۔ ”آپ دھوتی تو بدل لیجئے۔“

وہ بولے۔ ”ہاں میں دھوتی بدل آؤں۔ (راجیو سے) آپ ذرا دیکھتے رہیے گا۔“

راجیو۔ ”جلدی آئیے گا۔ میں جانے والا ہوں۔“

وہ شخص۔ ”ابھی آیا۔“ کہہ کر چلا گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ شخص دھوتی بدل کر آگیا۔ اس نے راجیو لوچن سے کہا۔ ”آپ نے بڑی عنایت کی۔ کیا آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟“

راجیو۔ ”نہیں میں تو پردیسی ہوں۔“

وہی شخص۔ ”یہاں کہاں ٹھہرے ہو؟“

راجیو۔ ”ہندو ہوٹل میں۔“

وہ شخص۔ ”آپ نے بڑی زحمت کی۔ معاف فرمائیے گا۔ آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ آپ کا نام؟“

راجیو۔ ”میرا نام راجیو لوچن ہے۔“

یہ کہہ کر راجیو لوچن چر نجو کو ساتھ لے کر چل دیئے۔

(5)

مذکورہ بالا واقعہ کے دوسرے دن رات کے آٹھ بجے راجیو، چر نجو کھانا کھا کر فارغ ہوئے ہی تھے کہ ہوٹل کے خدمت گار نے آکر پوچھا۔

”کیوں صاحب! بابو راجیو لوچن آپ ہی کا نام ہے؟“

راجیو۔ ”ہاں ہے تو کیوں؟“

خدمتگار۔ ”ایک آدمی کھڑا آپ کو پوچھ رہا ہے۔“

راجیو۔ ”مجھے؟“

خدمتگار۔ ”ہاں آپ کو۔“

راجیو۔ ''مجھے کون پوچھے گا؟ مجھے یہاں جانتا ہی کون ہے؟''

خدمتگار۔ ''جو کچھ ہو' اس نے مجھ سے پوچھا۔ یہاں بابو راجیو لوچن رہتے ہیں۔ میں نے کہا' پوچھ کر بتاتا ہوں۔ اب جیسا کہئے' کہہ دوں۔''

راجیو لوچن چرنجو سے بولے۔ ''ذرا دیکھنا تو کون ہیں؟ کوئی اپنی طرف کا آدمی تو نہیں ہے۔ شاید پتہ لگاتے لگاتے آ گیا ہو۔''

چرنجو خدمتگار کے ساتھ چلا گیا اور کچھ دیر کے بعد آ کر بولا۔ ''اپنی طرف کا تو کوئی نہیں ہے۔ یہیں کا ہے۔ کسی کا نوکر معلوم ہوتا ہے۔''

راجیو۔ ''آخر وہ چاہتا کیا ہے؟''

چرنجو۔ ''آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

راجیو کچھ دیر سوچ کر بولے۔ ''اچھا' یہیں بلا لاؤ۔''

وہ آدمی بوڑھا تھا اور معمولی اور ذرا میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس نے آتے ہی راجیو لوچن کو ایک لمبا سلام کیا۔

راجیو لوچن نے پوچھا۔ ''تمہارا کیا نام ہے؟''

وہ شخص۔ ''سرکار میرا نام تو گردھاری ہے۔''

راجیو۔ ''یہیں رہتے ہو؟''

گردھاری۔ ''جی ہاں۔''

راجیو۔ ''مجھ سے کیا کام ہے؟''

گردھاری۔ ''سرکار ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

راجیو۔ ''تو پھر وہ ہے کہاں؟''

گردھاری۔ ''اپنے مکان پر ہے۔ اس نے وہیں آپ کو بلایا ہے۔''

راجیو۔ ''وہیں بلایا ہے؟''

گردھاری۔ ''جی ہاں۔''

راجیو۔ ''آخر کام کیا ہے؟ مجھے تو یہاں کوئی جانتا وانتا نہیں۔''

گردھاری۔ ''انہوں نے آپ کا نام اور پتہ سب بتایا۔ جانتے نہیں تو انہیں یہ سب کیونکر معلوم ہوا؟''

راجیو۔ ''میں کیا کہوں۔ میں خود چکر میں ہوں۔ اچھا تو اسے یہاں لے آؤ۔''

گردھاری۔ ''انہوں نے کہا تھا جہاں تک ہو سکے' ساتھ لے آنا۔''

چرنجو بول اٹھا۔ ''ساتھ نہیں جائیں گے' یہیں بلا لاؤ۔''

گردھاری۔ ''جیسی آپ کی مرضی۔ میں تو کچھ کہہ نہیں سکتا۔ ایک بات اور بھی ہے۔''

راجیو۔ ''کیا؟''

گردھاری۔ ''ایک طرف ہو کر سنیئے تو کہوں۔''

راجیو۔ ''ایک طرف ہو کر؟''

گردھاری۔ ''ہاں۔''

راجیولوچن بحرِ حیرت میں غرق ہو کر بولے۔ ''اچھا!''

یہ کہہ کر وہ کمرے کے باہر آگئے اور بولے۔ ''کہو۔ کیا کہتے ہو؟''

گردھاری نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ معلوم نہیں۔ اس نے کونسا منتر پھونک دیا کہ راجیولوچن نے اس کو نہایت حیرت واستعجاب کے ساتھ سر تاپا دیکھا اور اس کے بعد کہا۔ ''اچھا چلتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ پھر کمرے کے اندر چلے گئے اور کپڑے پہننے لگے۔

چرنجو نے انہیں کپڑے بدلتے دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا آپ جارہے ہیں؟''

راجیو۔ ''ہاں۔''

چرنجو نے پاس آکر ہلکے سے کہا۔ ''پردیس کا معاملہ ہے۔ سمجھ بوجھ لیجئے۔ سو دوست' سو دشمن۔ میں تو زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔''

راجیو۔ ''میں نے سمجھ لیا۔ اگر دنیا میں میرا کوئی دوست نہیں تو کوئی دشمن بھی نہیں ہے۔ پھر میں کچھ بچہ تو ہوں نہیں۔''

چرنجو۔ ''جیسا آپ مناسب خیال کریں۔''

راجیولوچن گردھاری کے ساتھ چلے۔ پندرہ منٹ تک چلنے کے بعد گردھاری ایک گلی میں پہنچ کر ایک مکان کے سامنے رُک گیا۔

راجیولوچن نے پوچھا۔ ''یہی مکان ہے؟''

گردھاری۔ ''جی ہاں۔''

راجیولوچن نے دیکھا۔ مکان معمولی طور سے اچھا معلوم ہوتا تھا۔

گردھاری اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد آکر بولا۔ ''چلیے۔''

راجیولوچن اس کے ساتھ چلے۔ گردھاری نے انہیں ایک بڑے کمرے میں بٹھایا اور خود کمرے کا دروازہ بند کر کے چلا آیا۔ کمرہ آراستہ تھا۔ زمین پر سفید فرش اور اس پر دو سوتی لیکن نفیس قالین بچھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک لوہے کا پلنگ بچھا تھا۔ جس پر موٹا گدا اور گدے پر سفید چادر بچھی تھی۔ نیچے فرش پر بھی دو گاؤ تکیے رکھے تھے۔ کمرے میں بجلی کی صاف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

راجیولوچن گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئے مگر چوکنےّ تھے۔ کمرے کی ہر ایک چیز کو بغور دیکھ رہے تھے۔

کچھ دیر بعد کمرے کا ایک اور دروازہ کھلا۔ راجیولوچن نے اسی طرف پلٹ کر دیکھا۔ دروازے سے ایک عورت ایک سفید دھوتی پہنے اور ایک نیلا دوشالہ اوڑھے اندر آئی۔ اندر آکر اس نے دروازہ بند کر لیا۔

راجیولوچن نے دیکھا' عورت اور کوئی نہیں۔ وہی رنڈی تھی جو ایک روز پہلے انہیں گنگا کے کنارے پر ملی تھی۔

راجیولوچن چونک پڑے۔ ان کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ رنڈی آکر ذرا فاصلے پر راجیولوچن کے سامنے بیٹھ گئی۔ رنڈی کا چہرہ پژمردہ تھا۔ آنکھیں لال اور ذرا سوجھی ہوئی تھیں جس سے پتہ لگتا تھا کہ وہ بہت روئی ہے۔

راجیولوچن نے اپنے کو سنبھال کر کہا۔ ''تم نے مجھے بلوایا ہے؟''

رنڈی سر جھکا کر ہلکے سے بولی۔ ’’ہاں۔‘‘
راجیو۔ ’’کیوں؟‘‘
رنڈی۔ ’’آپ کو معلوم نہیں؟‘‘
راجیو۔ ’’مجھے کچھ معلوم نہیں۔ تمہارے نوکر نے مجھ سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ایک تعویذ کے متعلق تمہیں کچھ کہنا ہے۔‘‘
رنڈی۔ ’’ہاں۔‘‘
راجیو۔ ’’کیا کہنا ہے؟ جلدی کہیے‘ میں یہاں بہت دیر تک نہیں بیٹھ سکتا۔‘‘
رنڈی کچھ دیر تک اداسی کے انداز سے راجیو لوچن کو ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ معلوم ہوتا تھا۔ راجیو لوچن کے چہرے پر کوئی خاص بات دیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔
اس نے کچھ دیر کے بعد کہا۔ ’’جو تعویذ آپ کے بازو پر بندھا ہے‘ وہ آپ کو کہاں سے ملا؟‘‘
راجیو۔ ’’یہ میں اس وقت تک نہیں بتلا سکتا۔ جب تک مجھے یہ نہ معلوم ہو جائے کہ تم یہ بات کس لیے معلوم کرنا چاہتی ہو؟‘‘
رنڈی۔ ’’اس کا سبب ہے۔‘‘
راجیو۔ ’’صرف اتنے سے ہی مجھ کو اطمینان نہیں ہو سکتا۔‘‘
رنڈی۔ ’’مجھے اس تعویذ کے بارے میں سب باتیں معلوم ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کب اور کس کے لیے بنا تھا۔‘‘
راجیو چونک کر بے تابی کے ساتھ بولے۔ ’’کیا تم سچ کہتی ہو؟‘‘
رنڈی۔ ’’بالکل سچ۔‘‘
راجیو۔ ’’اگر یہ بات ہے تو میں بتاتا ہوں کہ یہ تعویذ میرا ہی ہے اور جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے‘ اس وقت سے اسے پہنے ہوئے ہوں۔ لوگوں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بالکل شیر خوارگی سے ہی یہ میرے گلے میں پڑا ہوا تھا۔‘‘
رنڈی نے کہا۔ ’’ایک بار آپ اسے مجھے اچھی طرح سے دکھا دیجئے۔ میں دیکھ لوں‘ کہیں مجھے وہم تو نہیں ہوا؟‘‘
راجیو لوچن تھوڑی دیر سوچ کر بولے۔ ’’اچھا! مگر تعویذ تمہارے ہاتھ میں نہیں دوں گا۔‘‘
رنڈی۔ ’’آپ کسی بات کا خوف نہ کیجئے۔ یہاں کسی طرح کی دغابازی نہیں ہو گی۔‘‘
راجیو لوچن کوٹ اتارتے ہوئے بولے۔ ’’یہ ٹھیک ہے مگر محتاط رہنا اچھا ہوتا ہے۔‘‘
کپڑے اتار کر راجیو نے تعویذ کھولا اور ہاتھ میں لے کر بولے ’’دیکھو۔‘‘
رنڈی جھک کر دیکھنے لگی۔ اس نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک لمبی آہ بھر کر بولی۔ ’’ٹھیک ہے۔‘‘
’’ٹھیک ہے۔‘‘ یہ الفاظ اس کے منہ سے سن کر راجیو لوچن سمجھ گئے کہ عورت رو رہی ہے۔
انہوں نے اس کا سر آہستہ سے اوپر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی تھی۔
راجیو۔ ’’ایں! تم روتی کیوں ہو؟ یہ معاملہ کیا ہے؟ تمہارا اس تعویذ سے کیا تعلق ہے؟
رنڈی کچھ دیر تک ٹکٹکی باندھے راجیو لوچن کی طرف اسی حالت میں دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے

ایک دم آگے بڑھ کر راجیو لوچن کو سینے سے لگالیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
راجیو لوچن اب کچھ سمجھے۔ انہوں نے سوچا۔ اس عورت کا اس تعویذ سے کوئی گہرا تعلق ہے۔
وہ بولے۔ ''معاملہ کیا ہے' کچھ بتاؤ گی بھی؟''
رنڈی نے کچھ جواب نہ دیا۔
راجیو لوچن نے کہا۔ ''یہ مکر مجھے پسند نہیں یا تو بتاؤ ورنہ میں جاتا ہوں۔''
رنڈی ہچکیاں لیتی ہوئی بولی۔ ''میں بدنصیب تمہاری...... اف!...... کس منہ سے کہوں...... میں مر گئی ہوتی تو اچھا ہوتا۔''
راجیو لوچن جلدی سے گھبرا گئے۔ ''کیا تم میری ماں ہو؟''
رنڈی کے منہ سے بات نہ نکلی۔ صرف اس نے سر کے اشارہ سے ''ہاں'' کہا۔
راجیو لوچن پر بجلی گر پڑی۔ انہیں خواب میں بھی یہ امید نہیں تھی کہ میری ماں ایک رنڈی نکلے گی۔ وا
بڑی دیر تک بے جان بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔
کچھ دیر بعد انہوں نے آنسو پونچھ کر کہا۔ ''اف! میری ذلت کی حد ہو گئی۔ امید کی ہلکی سی شعاع بھی آج
بجھ گئی۔ خیر! اب تم یہ بتاؤ کہ تم نے مجھے اس طرح کیوں پھینک دیا تھا؟''
راجیو لوچن کی ماں نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں سب بتاؤں گی۔''
راجیو۔ ''تو بتاؤ۔ اس رونے دھونے سے کیا حاصل؟ تم خود تو ذلیل ہوئی ہو مگر ساتھ ہی مجھ بے خطا کو بھی کسی کام کا نہیں رکھا۔''
بڑی دیر کے بعد راجیو لوچن کی ماں اس قابل ہوئی کہ بات کر سکے۔ اس نے اپنا سلسلۂ کلام یوں شروع کیا۔
''میں ایک خاندانی گھرانے کی لڑکی تھی اور خاندانی گھرانے کی بہو۔ جب صرف چودہ برس کی تھی۔ اس وقت میں بیوہ ہو گئی۔ سسرال ہی میں زیادہ رہتی تھی۔ جب سولہ سال کی ہوئی تو نشۂ شباب نہ سنبھال سکی۔ مجھے کھانے کپڑے کا دکھ نہیں تھا۔ اچھے سے اچھا کھاتی اور اچھے سے اچھا پہنتی تھی مگر مجھے صرف اتنے سے ہی اطمینان نہ ہوا۔ میں نے مطمئن رہنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ....''
اس مقام پر راجیو کی ماں پھر رونے لگی۔ روتی روتی بولی۔ ''میں پڑوس کے ایک آدمی کے ساتھ بھاگ نکلی۔ کچھ دن اس کے ساتھ رہی۔ یہاں اس شہر میں آنے پر جب اسے معلوم ہوا کہ میں حاملہ ہوں تو وہ ایک روز رات کو میرے زیور لے کر بھاگ گیا۔ میں بے یار و مددگار ہو گئی۔ جہان میری آنکھوں میں تاریک ہو گیا۔ میں سمجھ گئی کہ میرے پاپوں کا پرائشچت شروع ہو گیا۔ دو تین روز تک میں پاگل سی رہی۔ آخر کار ایک بڑھیا سے ملاقات ہو گئی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی اور اچھی طرح سے رکھا۔ تین مہینے کے بعد لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے بڑھیا سے بہت کچھ منت سماجت کی مگر اس نے یہی کہا کہ لڑکے کا زندہ رہنا ٹھیک نہیں۔ جب میں بہت روئی پیٹی تو اس نے اتنا منظور کیا کہ بچے کو کہیں رکھ آوٴں گی۔ میں نے لاچار ہو کر اس کی بات مان لی اور اس امید سے مان لی کہ شاید بچے کو سرکار یا کوئی پال لے گا۔ بڑھیا ہی چپکے سے بچے کو کہیں رکھ آئی۔ میرے گلے میں ایک تعویذ پڑا ہوا تھا۔ صرف یہی تعویذ بچ رہا تھا۔ اسے میں نے بڑھیا سے چھپا کر بچے کے گلے میں باندھ دیا۔ اس امید سے کہ اس تعویذ کے سہارے شاید کبھی اگر وہ زندہ رہا تو پتہ لگ جائے۔ اس کے بعد جب میں تندرست ہو گئی تو بڑھیا نے مجھے کسب کرنے کے لیے کہا۔ اس کے

لیے بھی میں نے ہر چند کہا سنا مگر اس نے مجھے مارنا پیٹنا شروع کر دیا اور مکان کا کرایہ اور جو کچھ میرے کھانے پینے میں خرچ ہوا تھا' طلب کرنے لگی۔ میرے پاس ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ آخر کار جب اور کوئی چارہ نظر نہ آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ پہلے تو کچھ دنوں تک پوشیدہ طور سے کسب کرتی رہی۔ بعد ازاں کھلم کھلا کرنے لگی۔ یہی میری تپت زندگی کی داستان ہے۔ کسب کرنے کے بعد میں ساری باتیں بھول گئی تھی۔ مجھے اپنی گزشتہ زندگی پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوتا تھا۔ میں سکھی تھی۔ خوش تھی مگر اس روز گنگا کے کنارے تمہارے بازو پر اپنا تعویز بندھا دیکھ کر میرے دل کو سخت صدمہ ہوا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اپنے آپ کو تم پر ظاہر نہ کروں مگر دل نہ مانا۔ جب سے میں نے رنڈی کا کسب اختیار کیا' اس وقت سے کبھی مجھے ذلیل سے ذلیل کام کرتے ہوئے شرم نہیں آئی مگر تمہارے سامنے آتے ہوئے مجھے شرم آتی تھی۔ دنیا کے نہایت دردناک منظر دیکھ کر مجھے ہنسی آیا کرتی تھی مگر جب سے تمہیں دیکھا' اس وقت سے میرے آنسو نہیں تھمے۔ میں نے روپے کو چھوڑ کر آج تک کبھی کسی انسان کی پروا نہیں کی۔ مگر ایک بار تمہیں چھاتی سے لگا لینے کے لیے میرا دل بے قرار ہو اٹھا۔ مجھے خواب میں بھی یہ امید نہیں تھی کہ مجھ میں اتنا عظیم انقلاب واقع ہو سکتا ہے۔ اب مجھے اپنی پچھلی زندگی پر پچھتاوا ہو رہا ہے۔ میرے دل کی حالت ویسی ہی ہو گئی ہے جیسی کہ رنڈی کا کسب اختیار کرنے سے پہلے تھی۔

راجیولوچن چپ چاپ بیٹھے سنتے رہے۔ ان کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کوئی عالم بیداری میں خواب دیکھ رہا ہو۔ آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' وہ ایک جگہ پر لگ کر رہ گئی تھیں اور ان سے اشکوں کا سیلاب برابر جاری تھا۔ بڑی دیر تک ان کی یہی حالت رہی۔ اس کے بعد ذرا سنبھل کر بولے۔ ''خیر! جو کچھ ہوا سو ہوا۔ ہم دونوں ہی صرف سوسائٹی کے مذموم رواجات کے شکار ہیں مگر جو کچھ ہو' اب میری تمہاری یہی پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ میں اس راز کے معلوم کرنے کی خاطر مارا مارا پھرتا تھا۔ آج سب معلوم ہو گیا مگر اس نے حالات کو اور بھی بدتر بنا دیا۔''

یہ کہہ کر راجیو نے اپنا کوٹ پہنا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ راجیو کی ماں بھی کھڑی ہو گئی اور زور سے راجیو کو کلیجے سے لگا کر آنسو بہانے لگی۔

راجیولوچن نے کہا۔ ''بس بہت ہو گیا۔ تم جس حالت میں ہو' وہ میرے بالکل متضاد ہے۔ تم جلد ہی یہ سب باتیں بھول جاؤ گی اور پھر دنیا تمہارے لیے بہشت ہو جائے گی۔ اس لیے زیادہ مایا موہ بڑھانا ٹھیک نہیں۔''

راجیولوچن کی ماں نے راجیولوچن سے آنکھیں ملا کر استقلال سے کہا۔ ''اگرچہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں ایسی عورت ہوں جس کے پہلو میں دل نہیں مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ میرے پاس بھی دل ہے۔ اگر کمی تھی تو صرف ایسے آدمی کی جو میرے جذبہ دلداری کو بیدار کر سکتا۔ آج تک مجھے کوئی ایسا مرد نہیں ملا۔ جتنے ملے خود غرض اور نفس پرست ملے۔ اگر ایک بھی دل والا آدمی مجھے ملتا تو میں اس قدر تپت نہ ہوتی۔ جو دنیا میں دل والے کہلاتے ہیں' جو دوسروں کے دلوں کو سانچے میں ڈھالنے کی ڈینگیں مارتے ہیں' وہ میرے سائے تک سے بھاگتے ہیں۔ میرے پاس آتے ہیں' صرف وہی جو دل نہیں رکھتے' جو نفس پرست ہیں۔ ان حالات میں میری جیسی بے کس عورت سے جس کے پاس پیٹ بھرنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں' دنیا سے کیا توقع کر سکتی ہے؟ میرے ایسے حالات میں اکثر عورتیں جو ایسی حالت میں سے گزری ہوں' جس میں کہ میں تھی' ایسا ہی کرتیں۔''

راجیولوچن نے پوچھا۔ ''اب تم کیا کرو گی؟''

راجیو کی ماں نے کہا۔ ''میں جو کچھ کروں گی' اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔''

راجیو۔ ''اچھا! تو میں اب چلتا ہوں۔ امید ہے' اب اس زندگی میں میری اور تمھاری ملاقات نہ ہوگی۔''
راجیولوچن کی ماں نے کہا۔ ''آخر کو تم بھی' میرے پیٹ کے بیٹے بھی' ویسے ہی بے دل اور دبو نکلے جیسے دوسرے مرد ہیں۔ تم نے بھی میرے اُدھار کے لیے ہاتھ نہیں بڑھایا۔''
راجیولوچن نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ ''جس حالت میں تم ہو' اسی میں مَیں ہوں۔ اس لیے ہم دونوں ایک دوسرے کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔''
یہ کہہ کر راجیولوچن کی ماں پُرنم اور تشنہ ناکام آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔

دوسرے دن شام کو چرنجو نے بازار سے لوٹ کر کہا۔ ''آج شہر میں بڑا شور مچا ہوا ہے۔''
راجیولوچن۔ ''کس بات کا؟''
چرنجو۔ ''کسی ایک رنڈی نے زہر کھا کر خودکشی کر لی ہے۔ کوئی ہندو عورت تھی۔''
راجیولوچن نے آنکھیں بند کر کے ایک لمبی آہ بھری۔ کچھ دیر بعد انھوں نے کہا۔ ''سامان باندھو۔ گیارہ بجے کی گاڑی سے چلنا ہوگا۔''
چرنجو۔ ''آج ہی؟''
راجیو۔ ''ہاں۔ آج ہی۔''
چرنجو۔ ''بہت اچھا۔''

رشی کیش میں گنگا کے کنارے ایک سنیاسی گیرے کپڑے پہنے کھڑا ہے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا گنگا کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اپنے بازو پر سے ایک سونے کا تعویذ کھولا۔ چند لمحے اسے الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے اسے گنگا کی گود میں پھینک دیا۔ پھر چند لمحے اسی مقام پر نگاہ جمائے کھڑا رہا جہاں تعویذ گرا تھا۔ اس کے بعد ایک لمبی آہ بھر کر خراماں خراماں پہاڑ کی طرف چل دیا۔

سبق

(1)

رات کے دس بج چکے تھے۔ چونکہ شام سے زور کی بارش ہوتی رہی ہے' اس لئے ہوا ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ دن بھر کی گرمی کے بعد رات کی یہ خنکی بڑی خوشگوار معلوم ہو رہی ہے۔ ایسے ہی وقت میں ایک خوشنما باغ کی کوٹھی میں چھ نوجوان بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں۔ کوٹھی میں بجلی کی سفید روشنی پھیلی ہوئی ہے۔ فرش پر سفید چادر اور چادر پر ایک طرف تین بڑے بڑے اونی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ قالینوں پر تین بڑے گاؤ تکیے رکھے ہیں۔ انھی گاؤ تکیوں

کے سہارے سب لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔

کچھ دیر تک کھیلتے رہنے کے بعد ایک نوجوان نے تاش پھینک کر کہا۔ ''یار! اب تاشوں میں جی نہیں لگتا۔ ہٹاؤ انہیں۔''

ایک دوسرے نوجوان نے ایک اور نوجوان سے کہا۔ ''کیوں یار موہن لال! کہیں چکمہ تو نہیں دیتے ہو؟ ابھی تک تو کوئی آیا وایا نہیں۔''

موہن لال بولا۔ ''چکمہ وکمہ نہیں' سچ بات ہے۔ دیکھو ابھی تمہارے سامنے پچھوائے دیتا ہوں۔ گھسیٹے!''

موہن کے پکارتے ہی ایک شخص جو شکل وصورت میں خدمت گار معلوم ہوتا تھا' سامنے آکر بولا۔ ''حضور!''

موہن۔ ''کیوں بھئی! وہ ابھی تک آئی نہیں' کیا بات ہے؟''

گھسیٹا۔ ''حضور! ابھی آتی ہی ہوں گی۔ میں تو انہیں ساڑھے نو بجے کا ٹیم دے آیا تھا۔''

موہن۔ ''اب تو سوا دس بج چکے ہیں۔''

گھسیٹا۔ ''ہاں تو اب آتی ہوں گی۔ کپڑے وپڑے پہننے اور سنگار کرنے میں دیر لگ ہی جاتی ہے۔''

ایک اور نوجوان مسکرا کر بولا۔ ''تو بھائیو! اپنے اپنے دل تھام کر بیٹھو' کیوں گھسیٹے! ہے نا ٹھیک؟''

گھسیٹا ہنستا ہوا بولا۔ ''اجی حضور! میں غریب آدمی یہ باتیں کیا جانوں؟ مگر ہاں چیز تو ایسی ہی ہے۔''

چوتھا نوجوان۔ ''اوہو! اگر یہ بات ہے تو ہم لوگ ساری رات انتظار کرنے کو تیار ہیں۔''

اسی لمحہ گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ ''لیجئے آگئیں!'' کہتا ہوا گھسیٹا جلدی سے وہاں سے چلا گیا۔

چند لمحوں میں گڑگڑاہٹ کی آواز بالکل قریب آکر بند ہوگئی۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی اور اس کے بعد ایک چھماکا۔

چھماکے کی آواز سنتے ہی ایک نوجوان نے یہ شعر پڑھا۔

خلخالِ پائے یار سے آتی ہے یہ صدا
مُردوں سے لیجئے وہ جو زندوں کا کام ہے

پانچواں نوجوان ہنس کر بولا۔ ''جھکنے لگے۔ ابھی تو مرے ہوئے پڑے تھے''

اس نوجوان نے جس نے شعر پڑھا تھا' فوراً جواب دیا۔ ''مسیحا آن پہنچے' اب بھی مردے زندہ نہ ہوں گے تو کب ہوں گے؟''

باقی سب نوجوان بول اٹھے۔ ''بھئی! خوب کہی' بہت خوبصورت۔ اس میں شک نہیں کہ گھنشام بڑا حاضر جواب ہے۔''

معاً ایک رنڈی جو نوجوان اور حسینہ تھی' کمرے کے اندر آئی۔ نازنین سفید کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ کپڑوں سے خس کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔

رنڈی نے پہلے سب کو جھک کر ''آداب عرض'' کیا۔ اس کے بعد جوتے اتار کر نوجوان کے سامنے ذرا فاصلے سے سمٹ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد پانچ آدمی کمرے کے اندر آئے جن میں سے دو کے پاس سارنگی' ایک کے پاس طبلہ' ایک کے پاس اگال دان اور ایک کے پاس کچھ اور چیز تھی۔

رنڈی نے ایک سے پوچھا۔ ''پاندان اٹھالیا تھا؟''

وہ آدمی۔ ''ایں! پاندان؟ پاندان تو اٹھانا بھول ہی گیا۔''

اتنا کہہ کر وہ آدمی جلدی سے باہر چلا گیا اور تھوڑی دیر میں پاندان لے کر پھر اندر آگیا۔

سب نوجوان دیدے پھاڑ پھاڑ کر رنڈی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کا دیکھنا اسی طرح کا تھا جیسے کوئی خوبصورت چیز جو عموماً دور سے دیکھنے کو ملتی ہو' اگر کبھی قریب دیکھنے کو مل جائے تو آدمی اس کے دیکھنے میں ساری طاقت خرچ کر دیتا ہے۔

ایک نوجوان نے کہا۔ ''آپ کا نام؟''

رنڈی بولی۔ ''مجھے چندر بھاگا کہتے ہیں۔''

دوسرے نوجوان نے پوچھا۔ ''آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

رنڈی۔ ''اسی ضلع کی۔''

تیسرا۔ ''اوہو' تو آپ بیڑن ہیں؟''

رنڈی۔ ''جی ہاں۔''

موہن۔ ''آپ لوگ فضول یہ باتیں پوچھ رہے ہیں۔ میں تو یہ سب پہلے آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔''

گھینشام۔ ''ان کے منہ سے یہ باتیں سننے میں جو مزہ ہے' وہ آپ کے منہ سے سننے میں کہاں؟''

چندر بھاگا نے ایک ترچھی چتون ڈال کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کیوں صاحب! میرے منہ میں ایسی کون سی بات ہے؟''

گھینشام۔ ''اس کا جواب آپ کو موہن لال دے سکتے ہیں۔''

موہن لال نے ذرا جھینپ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بڑے بدمعاش ہو تم۔''

ادھر رنڈی نے بھی ذرا شرما کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

تھوڑی دیر میں سازندوں نے اپنے ساز ملا کر ٹھیک کیے اور گانا شروع ہوا۔

(2)

تقریباً ایک بجے تک گانا ہوتا رہا۔ بیچ بیچ میں ہنسی مذاق بھی ہوتا جاتا تھا۔ ایک بجنے پر گانا بند کر دیا گیا۔ موہن لال کے سب دوست اپنی اپنی بائیسکل پر چڑھ کر گھر چلتے بنے۔ سب کے چلے جانے پر چندر بھاگا نے موہن لال سے کہا۔ ''مجھے بھی اجازت دیجئے''

موہن۔ ''تم اتنی رات کو کہاں جاؤ گی؟ یہیں ٹھہرو' صبح چلی جانا۔''

چندر بھاگا۔ ''گاڑی جو کھڑی ہے۔''

موہن۔ ''تو اس میں تمہارے سازندے چلے جائیں گے' تم سویرے چلی جانا۔''

چندر بھاگا۔ ''مجھے جانے ہی دیجئے۔ اماں راہ دیکھتی ہوں گی۔''

موہن۔ ''دیکھنے دو' میں نہیں جانے دوں گا۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

چندر۔ ”کیا باتیں کرنی ہیں؟“

موہن۔ ”اوہو! اس وقت تو بڑی بھولی بنی ہوئی ہیں جیسے کچھ جانتی ہی نہیں۔“

چندر بھاگا نے ہنس کر کہا۔ ”میں تو نہیں جانتی۔ خیر! جیسا آپ کہیں گے کرنا ہی پڑے گا۔“

یہ کہہ کر چندر بھاگا نے اپنے سازندوں سے کہا۔ ”تم لوگ سب جاؤ‘ صرف رامو کو چھوڑ جاؤ۔ اماں سے کہہ دینا کہ بابو جی نہیں مانے‘ روک لیا۔ سویرے آؤں گی۔“

سازندوں کے چلے جانے پر موہن لال نے کہا۔ ”چلو دوسرے کمرے میں چل کر بیٹھیں۔“

دونوں ایک دوسرے کمرے میں جو چھوٹا اور خوب آراستہ تھا‘ جا کر بیٹھے۔

موہن لال تھوڑی دیر تک چپ چاپ بیٹھے کچھ سوچتے رہے۔ اس کے بعد بولے۔ ”بھاگے! اس طرح کب تک چلے گا؟ میری بات پر تم نے کچھ غور کیا؟“

بھاگا سر جھکائے بیٹھی تھی‘ کچھ جواب نہ دیا۔

موہن لال نے بھاگا کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا منہ اوپر کو اٹھایا اور بولے۔ ”میں نے جو کہا‘ وہ سنا؟“

بھاگا نے کہا۔ ”ہاں سنا۔“

موہن۔ ”پھر اس کا جواب؟“

بھاگا۔ ”کیا جواب دوں؟“

موہن۔ ”جو مناسب سمجھو۔“

بھاگا۔ ”جو بات آپ چاہتے ہیں‘ وہ بڑی مشکل ہے۔“

موہن۔ ”کچھ مشکل نہیں‘ خاص کر ایسی حالت میں جب تم بھی مجھ سے محبت کرتی ہو۔ تم چاہے اپنے منہ سے نہ کہو مگر مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پیار کرتی ہو۔“

بھاگا کچھ دیر تکی ہوئی نگاہ سے موہن لال کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد ایک دبی ہوئی لمبی آہ بھر کر بولی۔ ”میری محبت پر یقین کر لینے سے پہلے آپ ایک بار یہ سوچ لیجئے کہ میں رنڈی ہوں۔“

موہن لال نے کہا۔ ”بھاگا! تم مجھے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ میری اتنی عمر رنڈیوں کے ساتھ گزری ہے۔ تمہاری یہ فہمائش ہی یہ بات بتا رہی ہے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“

بھاگا۔ ”مگر لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ رنڈیاں محبت کرنا نہیں جانتیں۔“

موہن۔ ”ہاں یہ بات بہت کچھ درست ہے مگر تم پر مجھے اعتبار ہے۔“

بھاگا۔ ”مگر رنڈیوں سے پیار کرنے والوں پر رنڈیوں کو کم اعتبار ہوتا ہے۔“

موہن۔ ”اوہو۔ یہ بات ہے تو یہ کہو‘ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔“

بھاگا۔ ”میں تو ایک عام بات کہتی ہوں۔ آپ کا نام تو لیتی نہیں۔“

موہن۔ ”نام نہ لو۔ پھر بھی اشارہ تو میری ہی طرف ہے۔ خیر اگر تمہارے دل میں یہ خیال ہے تو اسے دور کرنا ہی پڑے گا۔ اچھا بتاؤ! کس طرح مجھ پر تم کو اعتبار ہو سکتا ہے؟“

بھاگا۔ ”آپ ان باتوں کو جانے ہی دیجئے۔“

موہن۔ ”یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ چاہے میرا سبھی کچھ چلا جائے مگر میں تمہیں اپنا بنائے بغیر نہ چھوڑوں گا۔“

بھاگا نے پھر ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ ’’رنڈی کے لئے یہ بات بڑی مشکل ہے کہ وہ کسی ایک کی ہو کر رہے۔‘‘

موہن۔ ’’جہاں محبت ہوتی ہے‘ اس جگہ یہ ذرا بھی مشکل نہیں۔‘‘

بھاگا۔ ’’محبت! محبت کہاں ہے؟ کس میں ہے؟ مجھے تو آج تک ایک بھی آدمی ایسا نہیں ملا جو محبت کے جاننے کا دعویٰ کر سکتا ہو۔‘‘

موہن۔ ’’ایک میں ہی تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔‘‘

بھاگا مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں بے اعتباری اور موہن کے رموزِ محبت سے ناشنا ہونے کے لئے رحم تھا۔ بھاگا نے کہا۔ ’’موہن بابو! یہ بات یاد رکھیے مصنوعی محبت دکھانے میں آپ رنڈی سے زیادہ چالاک نہیں ہو سکتے۔‘‘

موہن لال انتہائی سنجیدگی کا انداز اختیار کر کے بولے۔ ’’بھاگے! تم میری محبت کا تمسخر اڑاتی ہو‘ یہ بات ٹھیک نہیں۔ میں تمہیں دکھادوں گا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔‘‘

بھاگا۔ ’’جتنے مرد ہم لوگوں کے پاس آتے ہیں سبھی ہم سے محبت کرتے ہیں۔ پریم نہ رکھیں تو آئیں کیوں؟‘‘

موہن۔ ’’یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ سبھی پریم رکھتے ہیں۔‘‘

بھاگا۔ ’’کم از کم وہ لوگ تو ایسا ہی کہتے ہیں۔‘‘

موہن۔ ’’کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ لوگ تو کہا ہی کرتے ہیں۔‘‘

بھاگا۔ ’’آپ بھی تو کہہ ہی رہے ہیں۔‘‘

موہن لال ذرا شرمندہ ہو کر بولے۔ ’’تم تو وکیلوں کی طرح بحث کرتی ہو اور لوگوں کے کہنے اور میرے کہنے میں فرق ہے اور اس فرق کو تم بھی سمجھتی ہو۔‘‘

بھاگا۔ ’’بابو جی! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ انگریزی‘ فارسی اور معلوم نہیں کیا کیا پڑھے ہوئے ہیں۔ میں تھوڑی اردو اور ہندی جانتی ہوں۔ میں آپ سے بحث میں جیت نہیں سکتی۔ سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ جو بات آپ چاہتے ہیں وہ میرے بس کی نہیں۔ میں مان بھی لوں تو اماں یہ بات کبھی نہیں مانے گی۔‘‘

موہن۔ ’’جب تم مان لوگی تو اماں کو جھک مار کر ماننا پڑے گا۔‘‘

بھاگا۔ ’’میں اماں کو ناراض کر کے کوئی کام نہیں کر سکتی۔‘‘

موہن۔ ’’مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ رنڈیوں میں بھی ماتری بھگتی ہے۔‘‘

بھاگا کے دل پر ان الفاظ سے چوٹ لگی۔ وہ کچھ دیر تک نیم وا آنکھوں سے موہن لال کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد بولی۔ ’’رنڈیوں میں تو کچھ بھی نہیں۔ نہ محبت ہے نہ رحم ہے‘ نہ عصمت عفت ہے‘ نہ ماتری بھگتی ہے۔ پھر بھی وہ لوگ رنڈیوں کے آگے ناک رگڑتے ہیں جو اپنے دل میں ان تمام اوصاف کے رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں۔‘‘

موہن۔ ’’ناک رگڑتے ہیں صرف اپنی خواہشاتِ نفسانی پورا کرنے کے لئے۔‘‘

بھاگا۔ ’’تو میں ایسے انسانوں میں اور حیوانوں میں کوئی تمیز روا نہیں رکھتی۔‘‘

موہن۔ ’’بلاشک ایسے آدمی حیوان ہی ہیں۔‘‘

بھاگا۔ ’’آپ بھی تو ابھی تک یہی کرتے رہے۔‘‘

موہن لال گھبرا کر بولے...... ’’کون؟ میں؟ نہیں میں تو...... ہاں جب کرتا تھا‘ تب کرتا تھا مگر اب میں

نے قسم کھالی ہے کہ صرف اپنی خواہشات نفسانی پورا کرنے کے لئے کسی رنڈی کے ہاں نہیں جاؤں گا۔"

بھاگا۔ "اوہو! تب تو آپ نے بہت بڑا کام کیا۔"

موہن لال چندر بھاگا کا ہاتھ پکڑ کر بولے۔ "اور یہ سب اس لئے ہوا کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔"

بھاگا۔ "اوہ! پھر وہی محبت کا نام' مجھے اس نام سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ آپ کو معلوم نہیں رنڈی کے لئے دنیا میں اگر کوئی بد قسمتی کی بات ہے تو وہ اس کے دل میں کسی کے لئے محبت پیدا ہونا ہے۔ کم از کم ہم لوگوں میں ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔"

موہن لال چپ ہو گئے۔

(3)

بابو موہن لال ایک رئیس کے صاحبزادے ہیں۔ ان کے پاس مال و جائیداد کافی ہے۔ موہن لال کی والدہ اسی وقت چل بسی تھی جب وہ بالکل ہی بچے تھے۔ بیس برس کی عمر ہوتے ہوتے ان کے والد بھی اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ موہن لال باپ کے حینِ حیات ہی سولہ برس کی عمر سے رنڈی نوازی کی طرف مائل رہنے لگے تھے۔ ان کی شادی پندرہ برس کی عمر میں ہوئی تھی مگر تین ہی سال بعد بیوی مر گئی۔ ان کے والد ان کا دوسرا بیاہ کرنے کی فکر ہی میں تھے کہ اچانک وہ بھی چل بسے۔ اب موہن لال تن تنہا رہ گئے۔ مال و دولت کی کچھ کمی نہ تھی۔ چنانچہ وہ خوب کھل کر رنڈی بازی کرنے لگے۔

تین چار سال تک موہن لال کا یہی حال رہا۔ آخر کار وہ چندر بھاگا کے گھر آنے جانے لگے۔ چندر بھاگا انہیں دنوں کہیں باہر سے آکر ان کے شہر میں بسی تھی۔ مگر چندر بھاگا سے ملاقات ہونے پر موہن لال کو معلوم ہوا کہ اس سے ان کے دلی جذبات ویسے نہیں ہیں جیسے ابھی تک دوسری رنڈیوں کے لئے رہے تھے۔ چندر بھاگا کی طرف ان کا دل بہت راغب ہوا۔ جوں جوں کشش بڑھتی گئی اور موہن لال زیادہ شیدا ہوتے گئے' ان کے دل میں چندر بھاگا کو اپنی بنانے کے لئے زبردست خواہش پیدا ہوتی گئی۔ انہوں نے چندر بھاگا کو پانچ چھ ماہ نوکر بھی رکھا مگر اس سے بھی ان کو صبر نہ آیا۔ وہ چاہتے تھے کہ چندر بھاگا بالکل ان کی بیوی کی طرح ہو کر رہے یعنی کسب چھوڑ دے' ان کے گھر میں رہے اور اسی طرح پردے میں رہے جس طرح خانہ داروں کی عورتیں رہتی ہیں۔ موہن لال کے دوست ان کے اس خیال کو ان کا دیوانہ پن سمجھ کر ہنستے تھے مگر انہیں اس کی ذرا پرواہ نہ تھی۔

ادھر موہن لال کے دل میں یہ خیال اب صرف خیال ہی نہیں رہا بلکہ یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ چندر بھاگا بھی اس سے پیار کرنے لگی ہے۔ اس یقین سے ان کی مذکورہ بالا خواہش تیز تر ہو گئی۔

شام کے پانچ بج چکے تھے۔ موہن لال اپنی کوٹھی کے برآمدہ میں بیٹھے تھے۔ اسی وقت ان کے دوست رادھاچرن تشریف لائے۔ رادھاچرن کو دیکھتے ہی موہن لال اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔ "اوہو! آج کہاں بھول پڑے؟"

رادھاچرن کرسی پر بیٹھ کر بولے۔ "بھول کیا پڑا' طبیعت نہ مانی اس لئے آج ہمت کر کے چلا آیا۔"

موہن۔ "کیوں؟ ہمت کرنے کی کونسی بات تھی؟"

رادھا۔ ”بھئی! تمہارا چال چلن آج کل بہت خراب ہو رہا ہے اس لئے تمہارے پاس آتے ڈر معلوم ہوتا ہے۔“

موہن لال ہنس کر بولے۔ ”اس لئے کہ کہیں تمہارا چال چلن بھی نہ بگڑ جائے؟“

رادھا۔ ”اجی! یہ خوف تو مجھے آج تک کبھی ہوا ہی نہیں۔ میں کسی میں اتنی طاقت ہی نہیں دیکھتا کہ میرے چال چلن کو بگاڑ سکے۔ ڈر صرف اس بات کا ہے کہ لوگ کہیں تمہارے پاس اٹھتے بیٹھتے دیکھ کر مجھے بھی تمہارے جیسا نہ سمجھ لیں۔“

موہن۔ ”اوہو! تو کیا میں ایسا ذلیل وخوار ہو گیا ہوں۔“

رادھا۔ ”وہ تو تمہارا جی ہی جانتا ہو گا۔“

موہن۔ ”خیر! اب آپ کو یہ خوشخبری سناتا ہوں کہ میں اب اپنے سبھی برے کام چھوڑ چکا ہوں۔“

رادھا۔ ”یہ کیسے؟ رنڈی بازی تو تمہاری ابھی بند نہیں ہوئی۔“

موہن۔ ”بند ہی سمجھئے۔“

رادھا۔ ”اجی! رام کا نام لو' یہ کہیں بند ہو سکتی ہے؟“

موہن۔ ”آپ مانئے تو۔“

رادھا۔ ”مانوں کیا پتھر! ابھی تک تم اس بیڑن...... کیا نام ہے اس کا؟...... دیکھو...... بھلا سا نام ہے۔“

موہن۔ ”چندر بھاگا۔“

رادھا۔ ”ہاں چندر بھاگا۔ ابھی تک تم اس کے پیچھے پڑے ہو۔“

موہن۔ ”بس چندر بھاگا پر ہی خاتمہ ہے۔“

رادھا۔ ”اس کے کیا معنی؟“

موہن۔ ”میں اسے گھر ڈالنا چاہتا ہوں۔“

رادھا۔ ”یہ اور بھی اچھی سنائی' موہن لال! مجھے تمہارے حال پر بہت افسوس آتا ہے۔ تم میرے دوست ہو اس لئے اور بھی۔ تم اپنا بیاہ کیوں نہیں کر لیتے۔“

موہن۔ ”بس! تو اب بھاگا کے ہی ساتھ بیاہ ہو گا۔“

رادھا۔ ”اگر یہاں تک بھی ہو جائے اور تمہاری رنڈی بازی کی لت چھوٹ جائے تو برا نہیں۔ مگر مجھے تو یقین نہیں کہ تمہاری عادت چھوٹ جائے گی۔“

موہن۔ ”آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں؟“

رادھا۔ ”ایشور کرے میرا خیال غلط ہو مگر دیکھنا ضرور ہے۔“

موہن۔ ”دیکھ لیجئے گا۔“

تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کر کے چلے گئے۔

ان کے جاتے ہی موہن لال اپنی ٹم ٹم پر سوار ہو کر چندر بھاگا کے مکان پر پہنچے۔ موہن لال کو دیکھتے ہی چندر بھاگا کی ماں کی پیشانی پر بل پڑ گئے مگر فوراً ہی وہ چہرے پر مسکراہٹ لا کر بولی۔ ”آیئے۔“

موہن لال قالین پر گاؤ تکیئے کے سہارے بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ ”بھاگا کہاں ہے؟“

بھاگا کی ماں بولی۔ "اوپر چھت پر ہے۔"
یہ کہہ کر موہن لال اٹھنے لگے مگر بھاگا کی ماں انہیں روک کر بولی۔ "ابھی تھوڑی دیر ٹھہر جائیے۔"
موہن۔ "کیوں؟"
بھاگا کی والدہ۔ "اوپر ایک صاحب تشریف رکھتے ہیں۔"
موہن لال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "ہوں" کر کے بیٹھ گئے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کچھ سوچنے لگے۔ ذرا دیر بعد بولے۔ "اچھا تو تب تک تمہیں سے باتیں کر لوں۔"
بھاگا کی ماں۔ "فرمائیے۔"
موہن لال۔ "میں بھاگا سے بھی کہہ چکا ہوں اور آج تم سے بھی کہتا ہوں' میں بھاگا کو گھر بٹھانا چاہتا ہوں۔"
بھاگا کی والدہ بے حد حیرت واستعجاب کا اظہار کر کے بولی۔ "یہ آپ کیا کہتے ہیں؟"
موہن۔ "مذاق نہیں' میں سچ کہتا ہوں۔"
بھاگا کی والدہ۔ "ایسا بھلا کہیں ہو سکتا ہے؟"
موہن۔ "ہونے کو کیا ہوا؟"
بھاگا کی والدہ۔ "آپ شریف آدمی ہیں' رنڈی گھر میں ڈال لیں گے تو لوگ آپ کو کیا کہیں گے؟ دوسرے ہمارے لئے بھی یہ بات ٹھیک نہیں' آپ جانتے ہیں۔ ہم لوگوں کا یہی ذریعہ آمدنی ہے۔ بھاگا چلی جائے گی تو اس بڑھاپے میں میں کس کے سہارے جیوں گی؟ میری روزی کا ٹھیکرا تو یہی ایک لڑکی ہے۔ آج اس کی کوئی چھوٹی بہن ہوتی تو میں کہتی' چلو ایسا ہی سہی۔"
موہن۔ "تمہارے گزارے کا بھی بندوبست ہو جائے گا۔"
بھاگا کی والدہ۔ "حضور! آپ سمجھ دار آدمی ہیں۔ پرائے بھروسے سے اپنا بھروسہ اچھا ہوتا ہے۔"
موہن۔ "تو یہ کہو۔ تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں۔"
بھاگا کی والدہ۔ "حضور! آپ بھی کیا باتیں کرتے ہیں۔ آپ کے غلاموں کا اعتبار کرتی ہوں مگر بات اتنی ہی ہے کہ اپنی اپنی سمائی کی بات ہے۔"
اس کے بعد بات ٹالنے کے لئے بھاگا کی والدہ بولی۔ "رامو! ذرا اوپر سے پاندان تو اٹھا لا' بابو صاحب کے لئے پان بناؤں۔ بھاگا سے کہہ دینا کہ بابو موہن لال صاحب آئے ہوئے ہیں۔"
تھوڑی دیر بعد رام لال پاندان لے آیا اور موہن لال سے بولا۔ "چلئے۔ آپ کو اوپر ہی بلایا ہے۔"
بھاگا کی والدہ۔ "اوپر جو صاحب تھے' چلے گئے؟"
رامو۔ "ہاں چلے گئے۔ دوسرے زینے سے ابھی گئے ہیں۔"
موہن۔ "اچھا! تو اوپر جاتا ہوں۔ پان وہیں بھیج دینا۔"
موہن لال اوپر پہنچے۔ کھلی چھت تھی۔ اس کے چاروں طرف اتنی اونچی دیوار تھی کہ بیٹھے ہوئے آدمی کو دوسری چھتوں کے آدمی نہیں دیکھ سکتے تھے۔
بھاگا پلنگ پر بیٹھی تھی۔ پلنگ کے پاس تین چار کرسیاں پڑی تھیں۔ موہن لال جاتے ہی ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ موہن لال کو دیکھتے ہی بھاگا کے چہرے پر اداسی چھا گئی۔ ہلکے سے بولی۔ "کہیے۔ آپ کے مزاج تو اچھے ہیں؟"

موہن۔ ''مزاج کا اچھا ہونا تمہارے ہی ہاتھوں میں ہے۔''

بھاگا کے چہرے پر غم کی جھلک نمودار ہو گئی۔ بولی۔ ''آپ بڑے آدمی 'میں غریب رنڈی۔ میرے ہاتھوں میں آپ کا مزاج کیسے ہو سکتا ہے؟''

موہن۔ ''بھاگے! جب تمہارے۔لئے میں رنڈی کا لفظ سنتا ہوں' اس وقت میرا خون ابلنے لگتا ہے۔ بھلا تم رنڈی ہونے کے لائق تھیں؟ تم تو اس لائق تھیں کہ کسی شریف اور خوبرو نوجوان کے دل کی دیوی اور عمر کی ساتھی بنتیں۔ اس کا گھر تمہارے دائمی قیام سے جگمگاتا رہتا۔ یہ قابل نفرت کام تمہارے ایسی حوروش نازنین کے شایان شان ہرگز نہیں۔''

بھاگا کچھ دیر تک سر جھکائے سوچتی رہی۔ اس کے بعد اس نے سر اٹھا کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ ''آپ بجا فرماتے ہیں مگر تدبیر کیا ہے؟ بھگوان نے جس حالت میں رکھا ہے' اس میں رہنا ہی پڑے گا۔''

موہن۔ ''تدبیر تو تمہارے ہاتھ میں ہے مگر تم اس سے کام ہی نہیں لیتیں۔''

بھاگا۔ ''کام لینے پاؤں تب تو۔ اماں کے سامنے میری ایک نہیں چلتی۔''

موہن۔ ''تمہاری اماں تو اپنا مطلب دیکھتی ہیں' انہیں تمہارے سکھ دکھ سے کیا مطلب؟''

اسی وقت راموا ایک طشتری میں پان لایا اور بھاگا کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔

بھاگا۔ ''لیجئے' پان کھایئے۔''

موہن لال نے دو بیڑے اٹھا کر کھائے اور ایک الائچی اٹھا کر اسے چھیلتے ہوئے بولے۔ ''بھاگا! یہ سمجھ لو کہ میں تمہیں اپنا اور صرف اپنا بنائے بغیر چین نہ لوں گا۔ خواہ اس کوشش میں میری ساری عمر ہی تمام ہو جائے۔''

بھاگا کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ آج تک اس نے اپنے لئے اتنی محبت' اتنی ہمدردی' ایسی لگن کسی آدمی میں نہ پائی تھی۔

موہن لال نے نیک فال دیکھ کر کہا۔ ''بھلا بھاگا! سچ سچ بتاؤ۔ اس کسب سے تمہیں کبھی نفرت پیدا نہیں ہوئی؟''

بھاگا آنسو پونچھ کر بولی۔ ''نفرت! صرف نفرت ہی نہیں بلکہ جی چاہتا ہے کہ ایسی زندگی سے خودکشی کر لینا ہی بہتر ہے۔ جن مردوں سے عام طور پر بات کرنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ جن آدمیوں کو دیکھ کر دل میں کراہیت پیدا ہوتی ہے' عموماً انہی لوگوں کو صرف روپے کی خاطر گلے لگانا پڑتا ہے۔ اس وقت یہی جی چاہتا ہے کہ خودکشی کر لوں۔ جس وقت چپ چاپ بیٹھنے کو جی چاہتا ہے' جس وقت جی چاہتا ہے کہ آرام سے پاؤں پسار کر سوؤں' اس وقت صرف روپے کے لئے رات بھر جاگنا گانا اور ناچنا پڑتا ہے۔ جب ہنسنے کو جی چاہتا ہے' اس وقت رونا پڑتا ہے۔ جب رونے کو جی چاہتا ہے تب ہنسنا پڑتا ہے۔ سب کام خلافِ مرضی کرنے پڑتے ہیں اور یہ سب صرف اچھا کھانے' اچھا پہننے کے لئے! اگر یہ سب نہ کریں تو کیا کریں؟''

موہن۔ ''اگر اچھے سے اچھا کھانا اور کپڑا ملے اور اپنی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرنا پڑے تو کیسا؟''

بھاگا۔ ''یہ تو ہمارے لیے بہشت ہے۔ اس کے خواب تو ہم لوگ رات دن دیکھا کرتے ہیں مگر نصیب کہاں ہے؟''

موہن۔ ''اور کو چاہے نہ نصیب ہو مگر تمہارے تو ہاتھ کے پاس ہے۔ صرف تمہارے ہاتھ بڑھا کر

اٹھانے ہی کی دیر ہے۔"

بھاگا۔"ان باتوں کو جانے ہی دیجئے' طبیعت خراب ہوتی ہے۔ ہمارے نصیب میں تو یہ نرک ہی لکھا ہے۔ میں اس نرک سے نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتی۔"

موہن۔"کیوں؟"

بھاگا۔"میں بڑھاپے میں ماں کو دکھی نہیں کرنا چاہتی۔"

موہن۔"اس بڑھیا کے دکھ سکھ کی فکر کرتی ہو جس نے تمہیں نرک میں ڈال رکھا ہے؟"

بھاگا۔"کچھ بھی ہو' پر میری ماں تو ہے۔ اس کی ساری زندگی بھی تو اسی نرک میں گزری ہے۔"

موہن۔"خیر! میں پھر تمہیں سوچنے کے لئے مہلت دیتا ہوں۔ خوب غور کرلو' آج میں نے تمہاری ماں کے کانوں میں بھی یہ بات ڈال دی ہے۔ تم ان سے بات چیت کرنا' اچھا! میں اب چلتا ہوں۔"

(4)

مذکورہ بالا واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے۔ موہن لال کی آرزو بر آئی۔ چندر بھاگا نے آخر کار موہن لال کی بات مان لی۔ اس کی ماں نے سمجھایا' دھمکایا' ڈرایا' اونچ نیچ دکھایا مگر سب لاحاصل! چندر بھاگا کی ماں کے گزارے کے لئے پچاس روپے ماہوار مقرر کر دیئے گئے۔

اب چندر بھاگا گرہستنوں کی طرح موہن لال کے گھر رہتی ہے۔ چندر بھاگا کے لئے یہ تبدیلی گویا بہشت کے برابر تھی۔ اب جب کبھی وہ اپنی گزشتہ زندگی پر نگاہ ڈالتی ہے تو اس وقت اس کا کلیجہ کانپ اٹھتا ہے۔

ادھر چار پانچ ماہ تک موہن لال ٹھیک رہے مگر اس کے بعد ان کی رنڈی نوازی کے جذبات نے پھر زور مارا۔ رفتہ رفتہ وہ پھر رنڈی بازی میں محو ہو گئے۔ کچھ دنوں تک یہ بات چندر بھاگا سے چھپی رہی مگر آخر کار معلوم ہو گئی۔

ایک روز موہن لال رات کو ایک بجے گھر لوٹے۔ چندر بھاگا ان کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ موہن لال چندر بھاگا کے سامنے پہنچے۔ چندر بھاگا نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا۔"آج اتنی دیر کہاں لگی؟"

موہن لال بولے۔"ذرا تھیٹر دیکھنے چلا گیا تھا۔"

چندر بھاگا۔"سچ کہتے ہو؟"

موہن۔"سچ نہیں تو کیا جھوٹ کہتا ہوں؟"

چندر بھاگا۔"ہاں جھوٹ ہی کہتے ہو۔"

موہن۔"اچھا جھوٹ ہی سہی۔"

چندر بھاگا نے موہن لال سے آنکھیں ملا کر کہا۔"جھوٹ ہی سہی" کہنے سے کام نہیں چلے گا۔ تم جہاں گئے تھے' مجھے معلوم ہے۔"

موہن۔"کہاں گیا تھا؟"

چندر۔"رنڈی کے مکان پر۔"

موہن لال قہقہہ مار کر بولے۔ ''بھئی! خوب کہی۔''

بھاگا۔ ''کیوں' کیا نہیں گئے تھے؟''

موہن۔ ''اچھا گیا تھا' پھر؟''

چندر۔ ''تمہیں اپنی پچھلی باتیں یاد ہیں؟''

موہن۔ ''کیوں! یاد کیوں نہیں؟''

چندر۔ ''تو پھر اب مجھ میں کون سی کمی ہو گئی جو تم نے پھر وہی پرانا ڈھنگ اختیار کیا؟''

موہن۔ ''اگر تم صاف صاف باتیں کرنا چاہتی ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم میں بہت کچھ کمی ہو گئی ہے۔ تم اب پہلی سی نہیں رہی۔''

چندر۔ ''کیسے؟''

موہن۔ ''نہ تم میں پہلی سی چنچلتا رہی' نہ پہلی جیسی ناز و ادا۔ نہ ویسا محبت دکھانا' نہ وہ صفائی' نہ ویسا سنگار۔ کوئی بات بھی پہلی جیسی نہیں رہی۔''

چندر بھاگا موہن لال کی بات سن کر سناٹے میں آ گئی۔ وہ چند لمحے چپ چاپ بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کے بعد بولی۔ ''تمہیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ پہلے میں رنڈی تھی مگر اب رنڈی نہیں ہوں۔ کم از کم رنڈیوں کی طرح نہیں رہتی۔''

موہن۔ ''سبب چاہے کچھ ہی ہو مگر تم میں جو کمی ہے' وہ میں نے بتا دی۔''

چندر بھاگا۔ ''تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم رنڈیوں کے بناوٹی ناز و ادا کو زیادہ پسند کرتے ہو۔ مگر میں اب بناوٹی باتوں سے تمہارا دل خوش نہیں کر سکتی۔ مجھے ان باتوں کو یاد تک کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے۔ اب تو میں صرف اپنے دل کے قدرتی جذبات کے مطابق چل سکتی ہوں۔''

موہن۔ ''اگر تمہارے دل کے قدرتی جذبات ایسے ہی ہیں تو میں ان کو دور سے ہی سلام کرتا ہوں۔''

چندر بھاگا۔ ''دیکھو موہن لال! تم نے مجھے نرک سے نکال کر سورگ میں بٹھایا ہے اس لئے تمہیں میں اپنا اشٹ دیو سمجھتی ہوں۔ تمہاری پوجا کرتی ہوں۔ ایشور کے لئے اب ایسا برتاؤ مت کرو جس سے میں تمہیں دیوتا کے علاوہ کچھ اور سمجھوں۔ تم نے مجھے پریم سے بس میں کیا ہے تو اب اس پریم کی جڑ میں کلہاڑی مت چلاؤ۔''

موہن۔ ''ایک رنڈی کو بس میں کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔''

چندر بھاگا پاؤں تلے دبی ہوئی ناگن کی طرح سر اونچا کر کے بولی۔ ''کیا کہا' رنڈی کو بس میں کرنا مشکل بات نہیں! ہاں! تم روپے سے رنڈی کا جسم اپنے بس میں کر سکتے ہو مگر اس کے دل پر ہرگز قبضہ نہیں کر سکتے۔ محبت روپے سے کبھی نہیں خریدی جا سکتی۔ وہ چاہے رنڈی کی ہو' چاہے دیوی کی۔ کیا تم سمجھے ہو کہ میں تمہارے مال و دولت کے سبب تمہاری ہو کر رہی ہوں؟ اگر تم یہ سمجھتے تو تمہارا ایسا عقلمند آدمی دنیا میں نہیں۔ روپے کی مجھے کیا کمی تھی۔ تمہارے جیسے ستر میرے تلوے چاٹنے کو تیار رہتے تھے۔ تمہارے جیسے دس کو میں مول لے سکتی تھی اور ابھی جس روز باہر جا بیٹھوں' اسی دن روپیوں کی بارش ہو جائے۔ کیا تم سمجھتے ہو اگر کل کو تم بھکاری ہو جاؤ تو میں تمہارا ساتھ چھوڑ دوں گی یا تمہارے لئے میری محبت کم ہو جائے گی؟ یہ تمہارے جیسے گئے گزرے رنڈیوں کے مریدوں کا ہی کام ہے کہ اگر آج مجھ میں رنڈی پن نہیں رہا تو مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دینا چاہتے

ہو۔ جو تم رنڈی پن کے ہی بھوکے ہو تو جاؤ' جہاں جی چاہے منہ کالا کرو مگر مجھ سے یہ توقع مت کرو کہ میں ویسے مذموم طرزِ عمل اختیار کر کے اس سورگ کو کلنک لگاؤں گی۔"

اتنا کہتے کہتے چندر بھاگا کا گلا بھر آیا اور وہ آنچل سے منہ ڈھانپ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

موہن لال نے چندر بھاگا کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

دوسرے دن سے موہن لال نے چندر بھاگا کے پاس آنا جانا بھی بند کر دیا۔ بد نصیب چندر بھاگا رات دن اکیلی پڑی رویا کرتی تھی۔

اسی طرح پندرہ دن گزرے۔ آخر کار مایوس ہو کر چندر بھاگا اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔

(5)

ماں نے بیٹی کو خوب آڑے ہاتھوں لیا۔ بولی۔ "بڑی محبت میں ڈوب گئی تھی' اب مزا چکھا۔ میں نے یہ جُوڑا دھوپ میں سفید نہیں کیا۔ دنیا دیکھی ہے۔ میں ان موئے رنڈی بازوں کو خوب سمجھتی ہوں۔ رنڈیاں بیچاری تو بدنام ہیں مگر یہ رنڈی باز اول درجہ کے دغا باز' بے ایمان ہوتے ہیں۔ ان کو تو ایسا بنا کر چھوڑے کہ ٹکا کفن کو نہ رہے۔ سرکاری ٹھیلے پر لد کر جائیں۔ جس نے رنڈی بازوں پر اعتبار کیا وہ رنڈی نہیں۔"

چندر بھاگا نے کہا۔ "اماں! ان باتوں سے اب کیا حاصل؟ جو میری تقدیر میں لکھا تھا' وہ ہوا۔"

چندر بھاگا کی ماں بولی۔ "چل نگوڑی! تقدیر لے کر چلی ہے۔ میں جو منع کرتی تھی تب تو اماں موئی خار سی کھٹکتی تھی۔ اب تقدیر بکھانتی ہے۔ میں تو سمجھتی تھی' کچھ سہور (شعور) آ گیا مگر تو لونڈیا ہی رہی۔ اب جو اس موئے نے میرے زینے پر پیر رکھا تو اتنی جھاڑو ماروں گی کہ وہ بھی یاد کرے گا۔ خیر! جو ہوا سو ہوا۔ اس سے تین سو ساٹھ تیری غلامی کریں گے۔ تو گھبراتی کیوں ہے؟"

چندر بھاگا۔ "اب میں بازار میں نہیں بیٹھوں گی۔"

چندر بھاگا کی والدہ بے حد متحیر ہو کر بولی۔ "کیوں؟"

چندر بھاگا۔ "مجھے اس کسب سے نفرت ہو گئی ہے۔"

چندر بھاگا کی والدہ۔ "اوہو! تو تو سیتا ساوتری بن کر آئی ہے۔ بازار میں نہیں بیٹھے گی تو کھائے گی کیا؟...... انگارے؟"

چندر۔ "میں سلائی کر کے اپنا پیٹ بھر لوں گی۔"

چندر بھاگا کی ماں ناک پر انگلی رکھ کر بولی۔ "اے واہ ری میری لاڈو! ایسی ہوتی تو آج یہ دن دیکھنا پڑتا؟"

چندر بھاگا کی ماں نے بہت کچھ کہا سنا' سمجھایا بجھایا مگر چندر بھاگا نے کسب کرنا منظور نہیں کیا۔

آخر میں بڑھیا بولی۔ "اگر بازار میں نہیں بیٹھنا ہے تو نکل میرے گھر سے۔ جس نے تجھے سیتا ساوتری کا سبق پڑھایا ہے' اسی موئے کے پاس جا۔ اب جو کبھی میرے گھر آئی تو ٹانگ توڑ دوں گی۔"

بڑھیا نے صرف دھمکانے کے لئے یہ الفاظ کہے تھے مگر چندر بھاگا سچ مچ ہی چادر اوڑھ کر روتی ہوئی چل کھڑی ہوئی۔ بڑھیا نے بھی مارے غصہ کے اسے نہ روکا۔

مندرجہ بالا واقعہ کو چھ ماہ کا عرصہ ہو گیا۔ ادھر موہن لال نے جب یہ سنا کہ چندر بھاگا نے رنڈی کا کسب اختیار کرنا منظور نہیں کیا اور اسی وجہ سے اس کی ماں نے اسے گھر سے نکال دیا تب ان کے دل پر بڑا اثر ہوا۔ انہوں نے چندر بھاگا کی ہر چند تلاش کی مگر پتہ نہ لگا۔

ایک روز موہن لال اپنے دوستوں کے ساتھ اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ایک عورت میلے کچیلے کپڑے پہنے ان کی طرف آئی۔ ایک خدمتگار نے ڈانٹ کر پوچھا۔ "کہاں جاؤ گی؟"

عورت نے کہا۔ "بابو موہن لال کے پاس۔"

خدمتگار۔ "کیا کام ہے؟"

عورت۔ "ایک چٹھی ہے۔"

خدمتگار۔ "لا مجھے دے۔ تو یہیں کھڑی رہ۔"

عورت۔ "نہیں۔ میں انہی کے ہاتھ میں دوں گی۔"

خدمتگار۔ "وہاں جانے کی اجازت نہیں۔"

موہن لال نے نوکر کے چلانے کی آواز سنی تو اسے بلا کر پوچھا۔ "کیا ہے؟"

خدمتگار۔ "حضور! ایک عورت ہے۔ چٹھی لائی ہے۔"

موہن۔ "بلاؤ۔"

خدمتگار اس عورت کو بلا لایا۔ موہن لال نے پوچھا...... "کہاں سے چٹھی لائی ہے؟"

عورت۔ "پڑھ لیجئے۔"

یہ کہہ کر اس نے موہن لال کے ہاتھ میں ایک میلا سا کاغذ دیا۔ موہن لال نے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔

"میں مر رہی ہوں۔ تمہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔ اگر تمہارے دل میں میری ذرا بھی محبت ہے تو فوراً آؤ۔"

چندر بھاگا

موہن لال چٹھی پڑھ کر گھبرا گئے۔ جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے نوکر کو کہا۔ "جلدی جاؤ اور موٹر نکلوا کر فوراً لاؤ۔"

نوکر گھبرا کر موٹر نکلوانے کے لئے بھاگا۔ ادھر ان کے دوستوں نے پوچھا۔ "کہو کیا بات ہے؟"

موہن لال بولے۔ "بعد میں بتلاؤں گا۔"

ایک دوست بولے۔ "یار! تمہاری بدکاری بڑھتی ہی جاتی ہے' اب تو اِدھر اُدھر سے بھی چٹھیاں آنے لگیں۔"

موہن لال نے بگڑ کر کہا۔ "چپ رہو۔ ہر وقت مذاق اچھا نہیں ہوتا۔"

اتنے میں موٹر آ گئی۔ موہن لال اس عورت کے ساتھ بیٹھ کر چل دیئے۔ عورت کی رہنمائی میں موٹر شہر کے ایک تاریک اور غلیظ کوچے کے پاس جا کر رکی۔ موہن لال عورت کے ساتھ اس کوچے میں داخل ہوئے۔ تھوڑی دور چل کر ایک ٹوٹے پھوٹے مکان میں گئے۔ اس مکان کے دالان میں ایک پرانی چارپائی پر میلی دری بچھی ہوئی تھی۔ اس دری پر ایک عورت میلے کپڑے پہنے آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ موہن لال نے اس کو بغور دیکھا۔ اس عورت کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھیں گڑھوں میں دھنس گئی تھیں' بدن سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا۔

عورت نے سرہانے جا کر پکارا۔ "چندر بھاگا! بابو جی آ گئے۔"
چندر بھاگا نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں اور موہن لال کی طرف دیکھ کر آہستہ سے بولی۔ "بیٹھو۔"
موہن لال نے اب اچھی طرح سے پہچانا۔ اپنے شکار کو دم توڑتے دیکھ کر شکاری کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ ابل پڑا۔ موہن لال چندر بھاگا کے پاس بیٹھ گئے اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ "بھاگے! میں آ گیا۔ میرا قصور معاف کر دو۔ میں نے ہی تمہیں اس حالت کو پہنچایا۔"
چندر بھاگا بولی۔ "تمہارا...... کوئی...... قصور...... نہیں...... میری تقدیر...... میں یہی...... لکھا تھا...... اب...... میں...... سکھ...... سے...... مروں گی...... اماں...... کی...... کچھ...... خبر...... ہے؟"
موہن۔ "معلوم نہیں' وہ کہاں سے ایک جوان لڑکی لے آئی ہے۔ اسی کو ہی بازار میں بٹھلایا ہے۔"
چندر بھاگا۔ "خیر!...... بھگوان...... انہیں...... سکھی رکھے!"
موہن۔ "بھاگے! میرے پاپ کا کوئی پرائشچت ہے؟ اگر ہو تو بتلاؤ۔"
چندر بھاگا کچھ دیر تک موہن لال کی طرف دیکھتی رہی' اس کے بعد بولی...... "ہے۔"
موہن لال نہایت بیتاب ہو کر بولے۔ "کیا؟"
چندر بھاگا۔ "عیاشی...... چھوڑ دو...... بیاہ...... کر لو...... میری یہی...... آخری...... بھیک...... ہے۔"
موہن لال نہایت بے چین ہو کر روتے ہوئے بولے۔ "بھاگے! میں آج سے عہد کرتا ہوں کہ تا حیات کبھی عیاشی نہ کروں گا مگر بیاہ نہیں کروں گا۔ تمہاری جیسی محبت کرنے والی کہاں ملے گی؟"
چندر بھاگا۔ "نہیں...... ایسا...... نہ...... کہو...... میں...... محبت کرنا...... کیا...... جانوں؟ رنڈی...... پھر...... رنڈی......"
موہن لال نے چندر بھاگا کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور بولے۔ "یہ بات مت کہو' میرا کلیجہ پاش پاش ہوا جاتا ہے۔"
چندر بھاگا۔ بیاہ...... ضرور...... کرنا...... تمہیں میری ہی...... قسم...... ہے۔"
اس کے بعد چندر بھاگا ٹکی ہوئی نگاہوں سے چپ چاپ موہن لال کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کے بعد اس نے بصد دقت اپنی بانہہ اٹھا کر موہن لال کے گلے کی طرف بڑھائی۔ موہن لال نے اس کا مطلب سمجھ کر اس کی بانہہ پکڑ کر اپنے گلے میں ڈال لی۔ بانہہ کے گلے پڑتے ہی چندر بھاگا کا جسم بے جان ہو گیا۔
مذکور بالا واقعہ کے ایک سال بعد موہن لال ایک سولہ سالہ حسینہ کے ساتھ اپنے باغ میں ٹہل رہے تھے۔ گھومتے گھومتے وہ دونوں سنگ مرمر کی ایک بارہ دری کے پاس پہنچے۔ وہاں پہنچ کر موہن لال حسینہ سے بولے۔ "چلو' تمہیں ایک چیز دکھاویں۔"
یہ کہہ کر موہن لال نازنین کا ہاتھ تھامے ہوئے بارہ دری کے اندر پہنچے۔ بارہ دری نہایت خوبصورت بنی ہوئی تھی۔ اس کے اندر دیوار پر ایک نہایت خوبصورت عورت کی **Oil Painting** لگی ہوئی تھی۔ تصویر کی طرف انگلی اٹھا کر موہن لال نے کہا۔ "دیکھو۔"
سولہ سالہ نازنین کچھ دیر تک تصویر کو بغور دیکھنے کے بعد بولی۔ "بڑی خوبصورت تصویر ہے' کس کی ہے؟ شاید بہن جی کی ہو گی؟"
بہن جی سے نازنین کی مراد موہن لال کی مرحوم بیوی سے تھی۔

موہن لال نے ایک لمبی آہ بھر کر کہا۔ ''نہیں'ان کی نہیں ہے۔''

سولہ سالہ نازنین نے پوچھا۔ ''پھر کس کی ہے؟''

موہن لال۔ ''یہ تصویر اس کی ہے جو مجھ سے اس قدر محبت کرتی تھی کہ اب اتنی محبت کوئی کر سکے گا'اس میں شک ہے۔ یہ تصویر اس کی ہے جس نے میری زیادتیوں کے ہاتھوں بے شمار تکالیف اٹھا کر آخر کار جان دے دی۔ یہ تصویر اس کی ہے جو مرتے مرتے بھی میرے ساتھ نیکی کر گئی کہ میری زندگی سدھر گئی۔ میں حیوان سے انسان ہو گیا۔ میں ایک بے حد ذلیل وخوار اور قابل نفرت' نفس پرست اور رنڈی باز انسان تھا مگر اس نے مرتے وقت مجھ سے نفس پرستی'عیاشی چھوڑ دینے کی بھیک مانگی۔ میں نے اس کی آخری التجا سے متاثر ہو کر عیاشی ہمیشہ کے لئے چھوڑ دی۔ اس کی موت اور اس کے آخری الفاظ نے میرے دل میں نفس پرستی کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔ اس نازنین کو اور اس کے آخری الفاظ کو میں تادم حیات نہیں بھول سکتا۔ کسی روز مفصل حال تمہیں سناؤں گا۔''

یہ کہتے کہتے موہن لال کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس سولہ سالہ نازنین نے نہایت متحیر نگاہوں سے تصویر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا''آخر یہ ہے کون؟''

موہن۔ ''یہ مت پوچھو۔ یہ وہ ہے جس کے کہنے سے'جس کے اصرار سے'جس کے قسم دلانے کے سبب آج تم میری زندگی کی ساتھی اور اردھانگنی (بیوی) بنی ہوئی ہو۔ اس دنیا کو جس سے مجھے نفرت ہو گئی تھی' سورگ کا سماں بنا رہی ہو۔''

نازنین بے چین ہو کر بولی۔ ''مگر یہ تھی کون؟''

موہن لال نے کہا۔ ''یہ؟ چندر بھاگا نام کی ایک رنڈی تھی۔''

موہن لال سمجھے ہوئے تھے کہ رنڈی کا نام سن کر ان کی بیوی چونکے گی مگر اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ناتھ جس نے تمہارے ساتھ اتنی نیکیاں کیں'جس کی بدولت آج مجھے تمہاری داسی بننے کی خوش قسمتی حاصل ہوئی ہے' وہ خواہ کوئی ہو۔ میں ہمیشہ اس کی احسان مند رہوں گی۔ چنانچہ جس طرح نادانستہ میں نے انہیں بہن جی سمجھا تھا ویسے ہی اب بھی میں انہیں اپنی ''بہن جی'' کے برابر ہی سمجھتی ہوں۔''

موہن لال کی آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ انہوں نے بیوی کو سینے سے لگا لیا۔ دونوں نے تصویر کی طرف دیکھا۔ دونوں کو ایسا محسوس ہوا۔ گویا تصویر کے چہرہ پر مسرت کی جھلک دوڑ گئی ہے۔

لیڈری کا پیشہ

پنڈت اُمادت شکل جب تین بار لگاتار ایف'اے میں فیل ہوئے تو انہیں تعلیم سے اس قدر نفرت ہو گئی ہ ان کے سامنے کالج کا نام لینے سے ان کا جی متلانے لگتا تھا۔ آخر کار آپ نے پڑھنا لکھنا سب اپنے سے کم عقل لوں کے لئے چھوڑ دیا اور بھنگ لاڈلے بن کر پھرنے لگے۔

شکل جی کچھ روز کالج کی تعلیم کے باعث تھکے ہوئے اپنے جسم اور دماغ کو آرام دیتے رہے مگر جب گھر والوں نے کھٹمل کی طرح ان کے آرام میں خلل ڈالنا اور ان کو نوکری چاکری کرنے کے لیے کونچنا شروع کیا تو وہ عرضیاں جیب میں ڈال کر دفتروں کے دروازے جھانکنے لگے۔ مگر جہاں جاتے وہاں ''جگہ خالی نہیں'' ٹکا سا جواب پا کر بے رنگ لوٹ آتے۔ ایک آدھ جگہ آسامی خالی بھی ملی اور بیس روپے ماہوار پر انہیں لوگ رکھنے کے لئے تیار بھی ہوئے مگر شکل جی کو پچاس سے نیچے کے ہندسوں سے کچھ ایسی چڑ تھی کہ انہوں نے لوگوں کی اس درخواست کو قطعی نامنظور کر دیا۔

گھر والے اور دیگر یار دوست ان سے کہتے تھے۔ ''ارے بھائی! شروع میں بیس ہی کیا برے ہیں؟ جو لوگ پہلے پہل بیس کے نوکر ہوئے تھے' وہ اب سو سوڈیڑھ ڈیڑھ سو پاتے ہیں۔ جوں جوں پرانے ہوتے جاؤ گے' ترقی ہوتی جائے گی۔ علاوہ اس کے تمہاری قابلیت ہی کیا ہے۔ انٹرنس والوں کو اس سے زیادہ کی نوکری مل ہی نہیں سکتی۔''

یہ سن کر اُمادت جی آگ ہو جاتے تھے۔ وہ کرخت لہجہ میں جواب دیتے۔ ''انٹرنس کا نام نہ لینا۔ میں انڈر گریجوایٹ ہوں۔ میں نے چار سال کالج اٹینڈ کیا ہے۔ ایم' اے' بی' اے پاس کرنے سے ہی کیا ہوتا ہے؟ لیاقت اور چیز ہے۔ ایشور کی کرپا سے ابھی اتنی لیاقت ہے کہ اچھے اچھے گریجوایٹوں کو پڑھا دوں۔ آجکل تو اندھیر ہے۔ سب دو انگل کے کاغذ (یعنی سرٹیفکیٹ یا سند) کو دیکھتے ہیں' لیاقت کو کوئی نہیں دیکھتا اور جو فیل ہونے کی کہو تو یہ چانس پر موقوف ہے۔ اچھے اچھے فیل ہو جاتے ہیں اور گدھے پاس۔ اپنی اپنی تقدیر ہے۔ نوکری نہیں ملتی نہ ملے' میں نوکری کروں گا بھی نہیں۔ مجھے نوکری سے خود نفرت ہے۔''

اس پر جب پوچھا جاتا کہ نوکری نہ کرو گے تو کرو گے کیا؟ تو شکل جی سر کھجلا کر کہتے ''یہ ابھی میں خود نہیں سوچ سکا کہ کیا کروں گا۔ یہ ذرا غور طلب بات ہے مگر یقین رکھئے کروں گا کوئی اعلیٰ ہی کام۔''

اس میں شک نہیں کہ شکل جی کا دماغ ایک اچھا خاصہ چلتا پرزہ تھا۔ شکل جی آسانی سے بڑی دور کی کوڑی لے آتے تھے۔

ایک روز پڑے پڑے شکل جی کے دھیان میں یہ بات آئی کہ آج کل سب سے اچھا پیشہ لیڈری کا ہے۔ یہ ایک ایسا روزگار ہے کہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اس روزگار کے لئے نہ سرمایہ کی ضرورت ہے' نہ کسی ڈگری کی' صرف کچھ تھوڑی سی باتوں کی۔ حلق میں ایسا زور ہو کہ گھنٹوں چیخنے چلانے پر بھی نہ تھکے۔ باتیں بنانا خوب جانتا ہو۔ ایسے ویسے کو اپنے سامنے بولنے نہ دے۔ گپ ہانکنے اور جھوٹ بولنے میں بھی ماہر ہو۔ اول درجہ کا بنا ہوا یعنی مکار ہو۔ ضرورت پڑنے پر فوراً رو سکے اور ہنس بھی سکے۔ اس کے علاوہ گھر کا فالتو ہو۔ ''اگر جورو نہ جاتا۔ اللہ میاں سے ناطہ'' ہو تو بہت ہی اچھا۔

شکل جی نے جب اچھی طرح اپنے اوپر تنقیدی نگاہ ڈالی تو مندرجہ بالا اوصاف میں سے بہتوں سے اپنے تئیں متصف پایا۔ جن اوصاف کی کمی دیکھی' انہیں پیدا کرنے کی اپنے میں قابلیت سمجھی۔ البتہ ایک جگہ شکل جی کی قابلیت کا چھکڑا اڑ گیا۔ شکل جی اگرچہ اپنے گھر میں ایک بالکل غیر مفید چیز تھے۔ تاہم سولھوں آنے گھر سے فالتو نہیں تھے کیونکہ شکل جی کا بہترین نصف ان کے فالتو پن کو غیر مکمل بنائے ہوئے تھا۔ تاہم بہت کچھ غور و خوض کے بعد شکل جی نے یہ فیصلہ کیا کہ بیوی کے ہونے سے ان کی لیڈری میں کچھ زیادہ رخنہ نہیں پڑے گا۔

شکل جی مہاراج پہلے ہی سے عموماً سوسائٹیوں میں آیا جایا کرتے تھے مگر اب انہوں نے ہر ایک مقامی سبھا

اور ہر پولیٹیکل اور قومی انجمن میں حصہ لینے کی قسم کھالی۔ لیڈری کی یہی پہلی سیڑھی ہے۔

اب شکل جی نے لیڈری کا کام بڑے زور شور سے شروع کیا۔ جب کوئی جلسہ ہوتا تو آپ پلیٹ فارم پر ہی بیٹھتے اور کسی کے کہے سنے بغیر ہی جلسہ کے متعلق چھوٹے موٹے کام دوڑ دوڑ کر کرتے تھے۔ لیکچرار کو پانی کی ضرورت ہوئی' پانی کے لئے کہا کسی سے گیا مگر دوڑ پڑے ہمارے شکل جی۔ لوگوں نے بھی دیکھا کوئی نئی چڑیا ہے۔ حاضرین نے کچھ گڑبڑ مچائی' فوراً ہی شکل جی کھڑے ہوگئے اور لوگوں کو چپ کرنے کے لئے آپ نے دو چار فقروں کا لیکچر دے ڈالا۔

اسی طرح کچھ دن تک شکل جی لیڈری کا کورس پورا کرتے رہے۔ تھوڑے دنوں بعد شکل جی سے لوگ واقف ہوگئے۔ آپ کی کچھ کچھ عزت بھی ہو چلی۔ بڑے بڑے آدمیوں سے بھی بندے ماترم ہونے لگی۔ جلسہ منعقد کرنے والوں کی فہرست میں بھی آپ کا نام چھپنے لگا۔ کبھی کبھی شکل جی خود کوشش کر کے اپنا نام شامل کرا دیتے تھے۔

ادھر گھر والے شکل جی کی اس نیک کوشش کی قیمت نہیں سمجھتے تھے۔ اس سے بے حد غیر مطمئن تھے۔ ان کو شکل جی کا شتر بے مہار کی طرح بھاگے بھاگے پھرنا ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا مگر بیچارے کرتے کیا؟

ایک روز شکل جی کے والد نے ان سے بگڑ کر کہا۔ "دیکھو امادت! تم اس طرح اپنی زندگی برباد کر رہے ہو' یہ اچھی بات نہیں۔ میں مانتا ہوں کہ تمہارا یہ کام برا نہیں مگر یہ صرف اسی حالت میں زیب دے سکتا ہے۔ جب تم ان لوگوں کو جو تم سے بڑی بڑی امیدیں رکھتے ہیں' محض یہی نہیں بلکہ جن کی زندگی کا انحصار تم پر ہے' مطمئن رکھو۔ ان کے گزارے کا انتظام کر دو مگر تم ان کی کچھ پروا نہ کر کے صرف اپنی خواہش کی تکمیل میں مصروف ہو' یہ بات سراسر غیر مناسب ہے۔"

شکل جی ناک بھوں سکوڑ کر بولے۔ "آپ سے یہ کس نے کہا کہ مجھے ان کا دھیان نہیں؟ میں انہی کے لئے تو یہ سب کچھ کر رہا ہوں۔ ذرا میری دھاک تو جم جانے دیجئے پھر دیکھئے گا کہ کس مزے سے زندگی بسر ہوتی ہے۔"

مگر باپ کو بیٹے کی یہ بات مجذوب کی بڑ سی معلوم ہوئی۔ غریب کرتے کیا' برابر کے بیٹے کو مار پیٹ بھی نہیں سکتے تھے۔ چپ چاپ اپنی تقدیر کو پیٹ کر رہ گئے۔ ادھر شکل جی "دھوبی کا کتا گھر کا نہ گھاٹ کا" کی مثل کے مطابق دونوں دین سے جا رہے تھے۔

اس طرح ایک سال کے قریب گزرا۔ اب ان کے کنبے میں ان کی جگہ صرف اتنی رہ گئی کہ جب بھوک لگتی تھی' آ کر کھانا کھا جاتے تھے اور اگر کہیں باہر ہی ڈول لگ گیا تو گھر آنے کی بھی ضرورت نہ تھی۔ رات کو سرائے میں آ کر ٹھہرنے والے مسافر کی طرح گھر میں آ کر پڑ رہتے اور وہ بھی اس لئے کہ باہر کہیں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی۔

دنیا میں ظاہر نمائش اور ڈھونگ پر فریفتہ ہونے والے آنکھ کے اندھے اور گانٹھ کے پورے لوگوں کی کمی نہیں۔ شکل جی نے شہر کے محبان وطن کے درمیان ایک اچھی جگہ حاصل کر لی۔ شہر کے بعض دولت مند اصحاب پر شکل جی کی اچھی دھاک جم گئی۔ شکل جی اب باہر کی سبھاؤں اور جلسوں میں بھی جانے لگے۔ کانگریس کو بھی اپنی خاکِ پا سے پوتر کرنے لگے۔ غرض جس طرح آپ تعلیم میں انڈر گریجوایٹ تھے' اسی طرح اپنی سمجھ میں لیڈری میں بھی انڈر گریجوایٹ ہو گئے۔

اب شکل جی اپنے کو ملک کے بڑے بڑے لیڈروں سے کچھ ہی کم سمجھنے لگے۔ کچھ کام نہ رہنے کے باوجود بھی عام آدمیوں سے ملنے کے لئے بھی فرصت کم رہنے لگی۔

جب دیکھئے کسی رائے صاحب یا سیٹھ صاحب کی نشست گاہ میں لیٹے ہوئے برقی پنکھے کی ہوا کھا رہے ہیں اور پولیٹیکل گپیں لڑ رہی ہیں۔ اگر رائے صاحب نے پوچھا۔ ''کیوں شکل جی! ستیاگرہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟'' تو شکل جی نے ذرا مسکرا کر جواب دیا۔ ''اجی ستیاگرہ میں کیا رکھا ہے مگر ہاں ایک بات ضرور ہے کہ اس وقت اس کی کچھ کچھ ضرورت ہے۔ ایسی کچھ زیادہ ضرورت بھی نہیں مگر گاندھی جی کے حکم کی تعمیل ضرور کرنی چاہیے۔''

اس طرح شکل جی کبھی صاف جواب نہ دیتے تھے۔ ہمیشہ ذومعنی بات کہتے تھے۔ شکل جی میں ایک یہ گن بھی تھا کہ جیسا پبلک کا میلان پاتے تھے ویسی ہی ہانکتے تھے۔ جب دیکھتے کہ پبلک کا رجحان اس وقت فلاں بڑے رہنما کو گالیاں دینے کی طرف زیادہ ہے تو آپ گالیوں کی ایسی پھلجھڑیاں چھوڑتے کہ سننے والے مارے خوشی کے پھول اٹھتے اور جب دیکھتے کہ پبلک اس وقت ان کی تعریف سننے سے خوش ہوتی ہے تو تعریفوں کے پل باندھ دیتے تھے۔ شکل جی کی سعی سے ایک لیگ بھی قائم ہو گئی تھی۔ شکل جی اس لیگ کے اصولوں کی توسیع اشاعت کی غرض سے مہینوں ادھر ادھر پھرتے اور لیگ کے روپے سے خوب گل چھرّے اڑایا کرتے تھے۔ گرمیوں میں بغیر برف کے پانی نہیں پیتے تھے۔ جاڑوں میں دن بھر چار دفعہ چاء نہ پئیں تو نمونیا ہو جائے۔ لوگ کہا کرتے تھے۔ ''شکل جی کی صحت محنت کرنے سے بہت نازک ہو گئی ہے۔ ذرا سی سردی گرمی کا اثر ہو جاتا ہے۔'' محنت شکل جی کی یہ تھی کہ دن بھر بیٹھے گپ شپ اڑانا' ادھر ادھر خط و کتابت کرنا' سیر کرنا اور مہینے میں دو چار لیکچر دے دینا۔ اتنی ہی سخت محنت سے شکل جی کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ لیگ کے قیام سے کچھ دنوں بعد شکل جی نے لیگ کو اپنی ''لائف'' دیدی اور اس طرح وہ لیگ کے فنڈ سے فائدہ اٹھانے کے مستقل طور پر حقدار ہو گئے۔

ایک روز شکل جی سے ایک بگڑے دل نے پوچھا۔ ''کیوں شکل جی! آپ نے اپنی زندگی لیگ کے لئے وقف کر دی؟''

شکل جی ہنس کر بولے۔ ''ہیں ہیں۔ مجھ میں کیا طاقت ہے جو کسی کے لئے کچھ وقف کر سکوں؟ ہاں حتی الوسع اس کی خدمت ضرور کرتا ہوں۔''

بگڑے دل۔ ''زندگی وقف کرنے سے آپ کو فائدہ ہی ہوا۔''

شکل جی چکرا کر بولے۔ ''فائدہ کیسا؟''

بگڑے دل۔ ''یہی کہ اب آرام سے زندگی بسر ہوتی ہے' اچھا کھانا ملتا ہے' اچھا کپڑا' گاڑیوں پر چڑھے چڑھے پھرتے ہیں۔ بہت سے بڑے بڑے لیڈر بالکل سیدھی سادی زندگی بسر کرتے ہیں مگر آپ تو ویسا نہیں کرتے۔''

شکل جی۔ ''جو ایسا نہیں کرتے وہ کام بھی زیادہ نہیں کر سکتے۔ ایک آدھ ایسے ہوں تو ان کی بات جانے دیجئے۔ دیکھئے اگر میں دودھ گھی نہ کھاؤں تو گھنٹوں تقریر کیسے کروں؟ آپ جانتے ہیں' تقریر کرنے میں کتنی طاقت خرچ ہوتی ہے؟ اگر اچھے اور صاف کپڑے نہ پہنوں تو صحت بگڑ جائے۔ گاڑی پر نہ چڑھوں تو جلدی کام نہ ہو۔ جہاں دس منٹ میں پہنچ سکتا ہوں' وہاں آدھ گھنٹہ میں پہنچوں۔ اب آپ ہی بتائیے کہ ایک لیڈر کے لئے یہ باتیں کس

قدر ضروری ہیں؟ان کے بغیر تولیڈر کاکام ایک گھڑی بھی نہیں چل سکتا۔"

بگڑے دل۔ "مگراوروں کو تو آپ سیدھی سادی زندگی بسر کرنے کی نصیحت کیا کرتے ہیں؟"

شکل جی۔ "جن کو ایک لیڈر کی سی محنت نہیں کرنی پڑتی' ان کو تو سیدھی سادی زندگی ہی بسر کرنی چاہیے کیونکہ انہیں زیادہ آرام کی ضرورت نہیں۔ لیڈر کو محنت زیادہ کرنی پڑتی ہے' اس لئے اسے آرام بھی زیادہ چاہیے۔ اگر آپ یہ فرمائیں کہ لیڈر کو اتنے آرام کی ضرورت نہیں تو یہ بتایئے کہ اگر لیڈر زیادہ محنت کرنے کے سبب اس جہان سے چل بسا تو پھر آپ کو ٹھیک راہ کون بتائے گا؟ آپ لوگ بھٹکتے پھریں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اسی لئے یہ ضروری ہے کہ لیڈر کو جس قدر آرام اور سکھ دیا جائے' اچھا ہے کیونکہ جتنے زیادہ دن وہ زندہ رہے گا' اتنا ہی اس سے ملک کو فائدہ پہنچے گا۔"

شکل جی کی اس دلیل کے آگے بگڑے دل بھی بغلیں جھانکنے لگے۔

لیگ کے کام کی انجام دہی کے لئے شکل جی تین ماہ سے باہر پھر رہے تھے۔ انہی دنوں میں تار ملا کہ ان کے والد صاحب سورگ سدھار گئے۔ شکل جی نے بڑے افسوس کا اظہار کیا اور تار کے ذریعہ یہ جواب بھیجا۔ "بڑا دکھ ہوا مگر آ نہیں سکتا۔ کام کے مارے ذرا بھی فرصت نہیں ہے۔"

اس روز شکل جی پر لوگوں کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔ لوگوں نے سوچا۔ شکل جی بڑے فرض شناس ہیں۔ فرض کے سامنے باپ کی موت کی بھی پروا نہیں کی۔ ان کے کریا کرم تک میں شامل ہونے نہیں گئے۔ لوگ ایسے فرض شناس ہونے لگیں تو ہندوستان کا بیڑا پار ہو جائے۔

باپ کی وفات کے ایک ماہ بعد شکل جی وطن لوٹے۔ وہ جس وقت ماں کے روبرو پہنچے تو ماں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ روتے روتے بولی۔ "بد نصیب! دور ہو میرے سامنے سے' میں تیری صورت نہیں دیکھنا چاہتی۔ ایسے لڑکے سے تو میں بانجھ ہی رہتی تو اچھا تھا۔ باپ کی کریا تک کرنے نہیں آیا۔ تو پیدا ہوتے ہی کیوں نہ مر گیا؟ تو نے جیسا ہمیں دکھ دیا' ایشور کرے وہ سب تیرے آگے آئے۔ تیرے بدن میں کوڑھ ٹپکے۔"

اس طرح بڑھیا نے سینکڑوں سنائیں۔ شکل جی بڑھیا کی گالیاں اتنی بری نہیں لگیں جس قدر کہ اس کا ان کو بلند لہجہ میں کہنا کیونکہ انہیں خوف تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ محلے والے سن لیں اور ان کی لیڈری کی ساری شان خاک میں مل جائے۔

بوڑھی ماں کو اپنے دیش بھگت اور لیڈر بیٹے کی صورت سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ وہ دوسرے شہر میں اپنے بھائی کے پاس چلی گئی اور اس نے عہد کر لیا کہ وہ اُس اولاد کی صورت مرتے دم تک نہ دیکھے گی مگر شکل جی نے اس بات کی ذرا بھی پروا نہیں کی۔ وہ بیوی سمیت وہیں رہ کر ملک کا بیڑا پار کرنے کے لئے نت نئی تجویزیں سوچنے لگے۔

یوں شکل جی اور کسی کام کے نہ ہوتے ہوئے بھی لیڈری کے پیشے کے لئے کامل طور پر قابل ثابت ہوئے۔

نوک جھونک

بیوی

میں در حقیقت بد نصیب ہوں ورنہ کیوں مجھے روز ایسے نفرت انگیز مناظر دیکھنے پڑتے۔ افسوس تو یہ ہے کہ یہ مجھے دیکھنے ہی نہیں پڑتے بلکہ بد نصیبی نے ان کو میری زندگی کا جزو خاص بنادیا ہے۔ میں اس عالی ظرف برہمن کی لڑکی ہوں جس کا احترام بڑی بڑی ہندو مذہبی سوسائٹیوں میں کیا جاتا ہے' جو آج مذہب کا ستون سمجھا جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں آتا کہ میں نے گھر پر کبھی بغیر نہائے اور پوجا کیے منہ میں پانی کی ایک بوند تک بھی ڈالی ہو۔ مجھے ایک بار بخار کی حالت میں بغیر نہائے ہوئے مجبوراً دوا پینا پڑی تھی اس کا مجھے مہینوں رنج رہا۔ ہمارے گھر میں دھوبی قدم نہیں رکھنے پاتا تھا۔ چماریاں تو دالان میں بھی نہ بیٹھ سکتی تھیں اور جولاہوں کے لڑکوں کے ساتھ تو کھیلتے ہوئے مجھے سخت نفرت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن یہاں آکر گویا میں ایک ظلمت کدہ میں پہنچ گئی۔ میرے شوہر بڑے رحیم' خوش اخلاق قابل شخص ہیں۔ ان کے یہ اوصاف دیکھ کر میرے باپ ان پر محو ہوئے لیکن افسوس! وہ کیا جانتے تھے کہ یہ لوگ ایسے لامذہب ہیں۔ سندھیا عبادت تو درکنار' کوئی یہاں روزانہ نہاتا بھی نہیں۔ ہمیشہ کمرے میں مسلمان' عیسائی آیا کرتے ہیں اور آپ وہیں بیٹھے بیٹھے پانی' چاء' دودھ پی لیتے ہیں اور صرف اس قدر نہیں بلکہ وہیں بیٹھے بیٹھے مٹھائیاں بھی کھالیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ میں نے انہیں لیمنڈ پیتے دیکھا تھا۔ سائیس جو چمار ہے بغیر روک ٹوک گھر میں آتا ہے اور بورے سے چنے نکال کرلے جاتا ہے۔ سنتی ہوں وہ اپنے مسلمان دوستوں کے یہاں دعوتیں کھانے بھی جایا کرتے ہیں۔ بے عنوانیاں مجھ سے دیکھی نہیں جاتیں۔ میری طبیعت متنفر ہوتی جاتی ہے۔ جب وہ مسکراتے ہوئے میرے قریب آجاتے ہیں اور میرا ہاتھ پکڑ کر قریب بیٹھا لیتے ہیں تو میرا جی چاہتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ اپنی اس ذلت پر اپنے نامعقول طرز زندگی پر میرے چشم دل سے لہو کے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ اف! ہندو قوم! تو نے ہم عورتوں کو ایسا کمزور بنادیا۔ کیا اپنے خاوند کی لونڈی بننا ہی ہماری زندگی کا فرض اولیٰ ہے۔ کیا ہمارے خیال' ہمارے ارادے اور ہمارے فرائض کی کچھ قیمت نہیں۔

اب مجھے صبر نہیں آتا۔ آج میں ان حالات کا فیصلہ کر دینا چاہتی ہوں۔ میں اس بلا سے نکلنا چاہتی ہوں۔ یہ شرمناک زندگی اب مجھ سے ایک ساعت بھی نہیں برداشت ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے دامن میں' پناہ لینے کا ارادہ کر لیا ہے۔ آج یہاں دعوت ہو رہی ہے۔ میرے شوہر صرف اس میں شامل ہی نہیں بلکہ اس کے خاص محرکوں میں ہیں۔ انہیں کی کوشش اور ایما سے اس نامہذبانہ بدعت کا ظہور ہوا ہے۔ مختلف مذاہب کے لوگ بیٹھ کر ایک ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ سنتی ہوں مسلمان بھی اس قطار میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔ کیا بھگوان مذہب کی حفاظت کے لیے اب اوتار نہ لیں گے۔ کیا اس سے بھی زیادہ کسی مذہبی کجروی کا قیاس کیا جا سکتا ہے۔ برہمن ذات اپنے خاص بھائیوں کے علاوہ دوسرے برہمن تک کا چھوا ہوا کھانا گوارا نہیں کرتی۔ وہی ذی وقعت قوم

آج اس پستی کو پہنچ گئی ہے کہ کائستھوں' بنیوں' مسلمانوں کے ساتھ تک بیٹھ کر کھانے میں دریغ نہیں کرتی بلکہ اسے قومی عروج اور قومی اتحاد کا باعث سمجھتی ہے۔

شوہر

وہ کون سا مبارک وقت ہو گا جب کہ اس ملک کی عورتیں تعلیم کے زیور سے آراستہ ہوں گی۔ قومی شیرازہ بندی میں مردوں کا ساتھ دیں گی؟ یہ مذہبی تنگ خیالیاں کب مٹیں گی؟ ہم کب تک برہمن غیر برہمن کی قید میں پھنسے رہیں گے۔ ہمارے شادی بیاہ کے طریقے کب تک خاندانی قید کی رسی سے بندھے رہیں گے۔ ہم کو کب معلوم ہو گا کہ عورت اور مرد کے خیالات کی مواقفت نسبتی پابندیوں سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو برندا میری زوجہ نہ ہوتی۔ اور نہ میں اس کا شوہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اگرچہ وہ ظاہراً نہیں کہتی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے آزاد خیالات کو نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مجھے چھونا بھی نہیں چاہتی۔ یہ اس کا قصور نہیں یہ ماں باپ کا قصور ہے جنہوں نے ہم دونوں پر ایسا ظلم کیا۔ تاہم مجھے خوشی ہے کہ برندا اتنی خوددار ہے۔ یہ اس امر کی دلیل ہے کہ وہ مشکلات میں بھی اپنے خیالات پر خواہ وہ صحیح ہوں یا غیر صحیح نہایت مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔

کل برندا کھل پڑی۔ میرے کئی دوستوں نے عام دعوت کی تجویز کی تھی۔ میں نے بخوشی اس کی تائید کی تھی۔ کئی دن کی بحث و تکرار کے بعد آخر کل میرے گنے گنائے دوستوں نے دعوت کا سامان کر ہی ڈالا۔ ماسوا میرے صرف چار برہمن تھے۔ باقی بقال' کائستھ اور چند اور مذاہب کے لوگ تھے۔ یہ آزاد روی برندا کے لیے ناقابل برداشت تھی۔ میں جب کھانا کھا کر واپس آیا تو وہ ایسی بے چین تھی گویا اس کے دل پر سخت صدمہ پہنچا ہے۔ میری طرف غضب ناک نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔

"اب تو بہشت کا دروازہ ضرور کھل گیا ہو گا؟"

یہ ناملائم الفاظ میرے دل پر تیر کی طرح لگے۔ کرخت آواز سے بولا۔ "بہشت اور دوزخ کے خیال میں وہ رہتے ہیں جو کاہل ہیں' مردہ ہیں۔ ہماری دوزخ اور بہشت سب اسی زمین پر ہے۔ ہم اس دارِ عمل میں کچھ کرنا چاہتے ہیں۔"

برندا۔ "آفرین ہے آپ کی ہمت اور مردانگی کو۔ اب دنیا میں آرام و چین کا راج ہو جائے گا۔ دنیا کو آپ نے بچا لیا۔ اس سے بڑھ کر اس کی اور کیا بھلائی ہو سکتی ہے؟"

میں نے جھلا کر کہا۔ "جب ایشور نے تمہیں ان باتوں کے سمجھنے کی قوت ہی نہیں دی تو میں تمہیں کیا سمجھاؤں۔ اس باہمی تفریق اور تمیز سے ہمارے ملک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اسے موٹی سے موٹی عقل کا انسان بھی سمجھ سکتا ہے۔ اس تفرقہ کے مٹنے سے قوم کو جو نفع ہو گا وہ اظہر من الشمس ہے۔ البتہ جو لوگ جان کر بھی انجان بنیں۔ ان کی دوسری بات ہے۔"

برندا۔ "کیا بغیر ایک ساتھ بیٹھ کے کھائے ہوئے آپس میں محبت پیدا نہیں ہو سکتی۔"

میں نے اس بحث میں پڑنا فضول تصور کر کے ایسے اصول کی آڑ لینا مناسب خیال کیا جس میں مباحثہ کی گنجائش ہی نہ ہو۔ برندا مذہبی عقائد پر جان دیتی ہے۔ میں نے اس منتر سے اسے تسخیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم لوگ

مذہبی عقائد کا بھی احترام نہیں کرتے۔ بڑی سنجیدگی سے بولا۔ ''اگر محال نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ذرا غور تو کرو۔ یہ کتنی بڑی ناانصافی ہے کہ ہم سب ایک خالق کی مخلوق ہوتے ہوئے ایک دوسرے کو نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کی تخصیص کریں۔ یہ ساری دنیا اسی معبود حقیقی کا جلوہ ہے۔ ہر ایک ذی روح اسی نور حقیقی سے منور ہے۔ صرف اسی نفسانیت کے پردہ نے ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ اسی خود پروری نے ہمیں اندھا بنا دیا ہے ورنہ دراصل ہم سب ایک ہیں۔ جس طرح سورج کی روشنی مختلف مکانوں میں جا کر اختلافی صورت نہیں اختیار کرتی اس طرح پروردگار عالم کی روشنی بھی مختلف اجسام میں جاں گزیں ہو کر علیحدہ نہیں ہو جاتی۔ کیا سورج کی روشنی جھونپڑوں پر نہیں پڑتی۔ میں تو کہوں گا کو جھونپڑیوں پر محلوں سے کہیں زیادہ پڑتی ہے۔ علیٰ ہذا میرے اس عارفانہ سیلاب نے برندا کے سوکھے ہوئے دل کو شاداب کر دیا۔ ہمہ تن گوش ہو کر میری باتیں سنتی رہی۔ جب میں خاموش ہو گیا تو اس نے میری طرف ارادت مندانہ نگاہوں سے دیکھا اور رونے لگی۔

انسان کا دل لاکھ کی مانند ہوتا ہے۔ اس کے نشانات مٹانا یوں تو ناممکن ہے مگر اسے گرم کر کے ہم اس کی جگہ نئے نشانات مرتسم کر سکتے ہیں۔ برندا کے من سے خاندانی عظمت اور قومی غرور کے حروف مٹ گئے۔ ان کی جگہ عالم گیر روحانی ارتباط کے حروف منقوش ہو گئے۔

بیوی

سوامی جی کے گیان اپدیش نے مجھے بیدار کر دیا۔ اف میں اندھے کنویں میں پڑی تھی۔ اس نے اٹھا کر مجھے ایک روشن قلعہ کوہ پر پہنچا دیا۔ میں نے اپنے اعلیٰ خاندان کے غرور میں اپنی اونچی ذات کے ناجائز فخر میں کتنے ہی نفوس کی بے عزتی کی۔ اے پرماتما تو مجھے معاف کر۔ میں نااہل تھی' ناسمجھ تھی۔ مجھ غریب کی اس دعا کو قبول کر۔ اس خیال کے باعث میرے دل میں اپنے قابلِ احترام شوہر سے جو کدورت پیدا ہو گئی تھی اور جو محبت کی کمی میری طرف سے ظاہر ہوئی اسے معاف فرما۔

جب سے میں نے وہ نورانی الفاظ سنے ہیں' میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔ طرح طرح کے نیک ارادے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

کل دھوبن کپڑے لے کر آئی تھی۔ اس کے سر میں بڑا درد تھا۔ کراہ رہی تھی۔ پہلے اسے اس حالت میں دیکھ کر شاید زبانی ہمدردی کرتی یا مہری سے تھوڑا سے تیل ڈلوا دیتی۔ پر کل میرا دل بے چین ہو گیا۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا وہ میری بہن ہے۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور کامل ایک گھنٹہ تک اس کے سر پر تیل ملتی رہی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت مجھے کتنا روحانی لطف آ رہا تھا۔ میرا دل خود بخود کسی زبردست کشش کے تابع ہو کر اس کی طرف کھنچا جاتا تھا۔ میری نند نے آ کر میرے اس فعل پر کس قدر ناک بھوں چڑھائی' تیور بدلے مگر میں نے ذرا بھی پرواہ نہ کی۔ آج علی الصبح سخت سردی تھی۔ ہاتھ پاؤں گلے جاتے تھے۔ مہری کام کرنے اٹھی تو کھڑی کانپ رہی تھی۔ میں لحاف اوڑھے انگیٹھی کے پاس بیٹھی تھی۔ اس پر بھی منہ کھولنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ مہری کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ مجھے اپنی خود غرضی پر شرم آئی۔ میں نے خیال کیا جو یہ ہے وہی میں ہوں۔ اس کی روح میں بھی وہی روشنی ہے لیکن میں آرام سے انگیٹھی کے پاس بیٹھی ہوں اور یہ میری خدمت میں مصروف ہے۔ یہ ناانصافی کیوں؟ کیا اس وجہ سے کہ میں ایک دولت مند شخص کی بیوی ہوں؟ کیا اس وجہ سے کہ خودی نے ہماری نگاہوں پر پردے ڈال دیئے ہیں۔

مجھے کچھ سوچنے کی ہمت نہ ہوئی۔ فوراً اٹھی اور نیا شال لا کر مہری کو اڑھا دیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر انگیٹھی کے پاس بٹھا دیا۔ اس نے متعجب ہو کر کہا۔ ”بہو جی چھوڑیئے میں کروں۔ سرکار کو کچہری جانے میں دیر ہو جائے گی۔“

میں نے لحاف اتار دیا اور اس ساتھ بیٹھ کر برتن دھونے لگی۔ غریب عورت مجھے بار بار ہٹانا چاہتی تھی۔ میری نند نے آ کر مجھے استعجاب کی نگاہ سے دیکھا اور اس طرح منہ بنا کر چلی گئی گویا میں کوئی سوانگ بھر رہی ہوں۔ تمام گھر میں ہلچل مچ گئی۔ گویا کوئی تعجب خیز واقعہ ہو گیا۔ ہم کتنے خود پرست ہیں۔ ہم پرماتما کی توہین کرتے ہیں۔ نفسانیت کے دام میں پھنس کر اپنے ہی اوپر انواع واقسام کے ظلم کرتے ہیں۔ افسوس!

شوہر

شاید میانہ روی عورتوں کی سرشت میں داخل ہی نہیں۔ وہ حدود پر ہی رہ سکتی ہیں۔ برندا کہاں تو اپنی عالی نسبی پر جان دیتی تھی، قومی وقار کا راگ الاپتی تھی۔ کہاں اب مساوات اور ہمہ اوست کی صورت بنی بیٹھی ہے۔ میری ذرا سی تعلیم کا یہ اثر ہے۔ اب میں بھی اپنی قوتِ تالیف پر ناز کروں گا۔ واقعی یہ جنس تمیز سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ اس میں مجھے اعتراض نہیں ہے کہ وہ نیچی ذاتوں کی عورتوں کے ساتھ بیٹھے، ہنسے بولے، انہیں پڑھ کر کچھ سنائے لیکن ان کے پیچھے اپنے آپ کو بالکل کھو دینا میں کبھی بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

تین دن ہوئے میرے پاس ایک چمار اپنے زمیندار کے مظالم کا رونا رونے آیا۔ بیشک زمیندار نے اس کے ساتھ سختی برتی تھی لیکن وکیل مفت میں تو مقدمہ نہیں کیا کرتا اور پھر ایک چمار کے پیچھے ایک بڑے زمیندار سے دشمنی کروں۔ ایسا کروں تو پھر وکالت کر چکا۔ اس کی فریاد کی آواز برندا کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ میرے درپے ہوئی کہ اس مقدمہ کی پیروی ضرور کیجیے اور لگی بحث مباحثہ کرنے۔ میں نے حیلہ حوالہ کر کے اسے کسی طرح ٹالنا چاہا لیکن اس نے مجھ سے وکالت نامہ پر دستخط بنوا ہی لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان تین دنوں میں میرے پاس کئی مقدمے ایسے ہی مفت خوروں کے آئے اور مجھے کئی بار برندا کو سخت الفاظ میں فہمائش کرنی پڑی۔ اسی وجہ سے بزرگوں نے عورتوں کو مذہبی مسائل کی تلقین کے قابل نہیں سمجھا۔ اتنا بھی نہیں جانتی کہ ہر ایک اصول کی عملی شان کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ خدا عادل ہے پر اس کی عدالت کے پیچھے اپنے ماحول کو کوئی نہیں بھولتا۔ اگر وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر عمل کیا جائے تو تمام دنیا میں آج امن وعافیت کی دہائی پھر جائے لیکن یہ مسئلہ فلسفہ کا ایک اصول ہی رہے گا اور انسانی قوت ہمارے نظام معاشری کی ایک محال تمنا۔ ہم ان دنوں مسائل کی زبان سے تعریف کرتے ہیں۔ ان پر مناظرے کرتے ہیں۔ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ عوام کی نظروں میں وقار حاصل کرنے کے لیے ان سے مدد لیتے ہیں لیکن ان پر عمل کرنا ناممکن ہے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ برندا اتنی ذرا سی معمولی اور موٹی بات نہیں سمجھتی۔

برندا کا انہماک روزانہ ناقابل برداشت ہوتا جاتا ہے۔ آج سب کے کھانے کے لیے ایک ہی قسم کا کھانا بنا ہے۔ اب تک گھر کے خاص آدمیوں کے لیے باریک چاول پکتے تھے۔ ترکاریاں گھی میں بنائی جاتی تھیں۔ دودھ مکھن اور میوہ جات وغیرہ منگوائے جاتے تھے۔ نوکروں کے لیے موٹا چاول، تیل کی ترکاری، سڑی کی دال رہتی تھی۔ دودھ وغیرہ انہیں نہیں دیے جاتے تھے۔ بڑے بڑے رئیسوں کے یہاں بھی یہی دستور زمانہ قدیم سے چلا آتا ہے۔ میں نے کوئی نئی بات نہیں کی ہے اور نہ نوکروں نے اس کے متعلق کبھی شکایت کی لیکن آج ملازموں نے بھی وہی

کھانے کھائے ہیں جو گھر کے لوگوں نے کھائے۔ میں کچھ نہ بول سکا۔ متحیر سا ہو گیا۔ برندا خیال کرتی ہے کہ کھانے میں فرق کرنا نوکروں پر ظلم ہے۔ کتنا بچوں کا سا خیال ہے۔ یہ اپنی مساوات کی دھن میں شریف رذیل' چھوٹے بڑے کا فرق مٹانا چاہتی ہے۔ اے بیوقوف یہ تفریق ہمیشہ قائم رہتی ہے اور رہے گی۔ میں بھی ملکی اتحاد کا حامی ہوں اور تمام تعلیم یافتہ ابنائے وطن اس اتحاد پر جان دیتے ہیں لیکن کوئی خواب میں بھی یہ خیال نہیں کرتا کہ ان مزدوروں' خدمت گاروں کو برابری کا حق دیا جائے۔ ہم ان میں تعلیم پھیلانا چاہتے ہیں۔ ان کو حالت افلاس سے نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ ہوا تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ پر اس کی اصلیت کیا ہے یہ ہمارے دل ہی جانتے ہیں خواہ اس کا اظہار نہ کیا جاوے۔ اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ ہمارا ملکی وقار قائم ہو' ہمارا دائرۂ اثر وسیع ہو' ہم اپنے حقوق کے لیے کامیابی کے ساتھ جدوجہد کر سکیں' ہمیں یہ کہنے کا موقع مل جائے کہ ہماری آواز صرف تعلیم یافتوں کی آواز نہیں ہے بلکہ تمام قوم کی متحدہ آواز ہے لیکن یہ برندا اتنا بھی نہیں سمجھتی۔

بیوی

کل میرے شوہر کا منشا ظاہر ہوا۔ اس وقت میری طبیعت سخت مغموم ہوئی۔ اے خدا دنیا میں اتنی نمائش ہے۔ لوگ اتنے خود غرض ہیں' اتنے ظالم ہیں۔ مجھے کل یہ دردناک تجربہ ہوا۔ میں اس نصیحت کو سن کر اپنے شوہر کو دیوتا سمجھنے لگی تھی۔ مجھے اس بات کا فخر تھا کہ ایسے نفس مطمئنہ کی خدمت گذاری کا موقع حاصل ہے۔ یہ میرے مقدر کی خوبی ہے لیکن مجھے آج معلوم ہوا کہ جو لوگ دوناؤں میں ایک ساتھ بیٹھنے کے مشتاق ہیں زیادہ تر وہی قومی خیر اندیش کہلاتے ہیں۔

کل میری نند کی رخصتی تھی۔ وہ سسرال جا رہی تھی۔ شہر کی بہتیری عورتیں آئی تھیں۔ وہ سب عمدہ لباس اور مرصع زیورات سے آراستہ ہو کر قالینوں پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں ان کی مہمان داری میں مصروف تھی کہ یکایک مجھے دروازے پر چند عورتیں اس جگہ زمین پر بیٹھی ہوئی نظر آئیں جہاں ان عورتوں کی سلیپریں اور جوتیاں رکھی ہوئی تھی۔ یہ بیچاریاں بھی رخصتی دیکھنے آئی تھیں۔ مجھے ان کا وہاں بیٹھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اس لیے میں نے ان کو بھی قالین پر بٹھا دیا۔ اس پر خاتونوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں اور تھوڑے عرصے میں سب کی سب کسی نہ کسی حیلہ سے ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ اتنے میں کسی نے میرے شوہر تک یہ خبر پہنچا دی۔ وہ باہر سے نہایت مغلوب القلب ہو کر آئے اور بھری سبھا میں مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔

آج علی الصبح اٹھی تو میں نے عجیب واقعہ دیکھا۔ شب میں مہمانوں کی دعوت و مدارات کے بعد جو جوٹھے پتل' کٹورے' دونے وغیرہ باہر میدان میں پھینک دیے گئے تھے اس وقت پچاسوں آدمی انہیں پتلوں پر گرے ہوئے ان کو چاٹ رہے تھے۔ ہاں انسان تھے اور انسان وہی انسان جن پر پرماتما کا جلوہ ہے۔ روشنی ہے۔ بہتیرے کتے بھی ان پتلوں پر جھپٹ رہے تھے۔ پر یہ کنگلے کتوں کو مار کر ہٹا دیتے تھے۔ ان کی حالت کتوں سے بھی گئی گذری تھی۔ یہ نظارہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایشور! یہ بھی ہمارے بھائی بہن ہیں۔ ہماری ہی روحیں ہیں۔ ان کی ایسی قابل رحم حالت! میں نے اسی وقت مہری کو بھیج کر ان آدمیوں کو بلایا اور میوے مٹھائیاں وغیرہ جو مہمانوں کے لیے رکھی ہوئی تھیں سب کی سب پتلوں میں رکھ کر انہیں دے دیں۔ مہری تھرّانے لگی کہ مالک سنیں گے تو میرے سر کا ایک بال نہ چھوڑیں گے لیکن میں نے اسے ڈھارس دی تب اس کی جان میں جان آئی۔

ابھی یہ بیچارے مٹھائیاں کھا ہی رہے تھے کہ میرے شوہر صاحب بھی غصہ میں بھرے ہوئے آئے اور نہایت سخت آواز میں بولے۔ "تمہاری عقل پر پتھر تو نہیں پڑ گیا ہے کہ جب دیکھو ایک نہ ایک آفت مچائے رہتی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ مٹھائیاں ڈومڑوں کے لیے نہیں بنوائی گئی تھیں، مہمانوں کے لیے بنوائی گئی تھیں۔ اب مہمانوں کو کیا دیا جائے گا؟ کیا تم نے میری غیرت کو خاک میں ملانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے؟"

میں نے مستقل مزاجی سے کہا۔ "آپ فضول غصہ کرتے ہیں۔ آپ کی جس قدر مٹھائیاں میں نے خرچ کی ہیں وہ سب منگا دوں گی۔ یہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا کہ کوئی شخص تو مٹھائیاں کھائے اور کوئی پتل اور دونے چاٹے۔ ڈومڑے بھی تو انسان ہیں۔ ان کی بھی تو روح وہی ہے۔ کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟"

شوہر صاحب بولے۔ "رہنے بھی دو۔ بے وقت کی شہنائی بجاتی ہو۔ جب دیکھو وہی مرغ کی ایک ٹانگ کہ سب روحیں ایک سی ہیں۔ اگر ایک سی ہیں تو ایشور کو کس نے منع کر دیا تھا کہ سب کو ایک حالت میں نہ رکھے۔ یہ اعلیٰ اور ادنیٰ کی تفریق اس نے کیوں کر رکھی ہے۔ بے سر پیر کی بحث کرتی ہو۔"

میں خاموش ہو گئی۔ بول نہ سکی میرے دل سے شوہر کی عزت اور محبت اور اٹھنے لگی۔ افسوس نفسانیت نے ہم کو کس قدر خود غرض بنا دیا ہے۔ ہم ایشور کا بھی سوانگ بھرتے ہیں کتنی شرمناک ریاکاری ہے۔ ہم حقیقت کو مکمل مفاد اور ذاتی اغراض پر قربان کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر ہماری کوششیں بار آور نہیں ہوتیں تو تعجب کیا ہے۔

سُجان بھگت

(1)

سیدھے سادے کسان روپیہ ہاتھ میں آتے ہی دھرم اور شہرت کی طرف جھکتے ہیں۔ امیر لوگوں کی طرح پہلے وہ اپنی خواہشات پوری کرنے کی طرف نہیں دوڑتے۔ سجان کی کھیتی میں کئی برس سے ہن برس رہا تھا۔ محنت تو گاؤں کے سبھی کسان کرتے ہیں لیکن اس کا ستارہ اوج پر تھا۔ بنجر زمین میں دانہ بوتا تو کچھ نہ کچھ پیدا ہو ہی جاتا۔ تین برس لگا تار اکھ لگتی گئی۔ ادھر گڑ کا بھاؤ تیز تھا۔ دو اڑھائی ہزار ہاتھ میں آ گئے بس ذہن کا جھکاؤ دھرم کی طرف ہو تا گیا۔ سادھو سنتوں کا خیر مقدم اور تعظیم ہونے لگی۔ دروازے پر دھونی جلنے لگی۔ قانون گو علاقہ میں آتے تو سوجان مہتو کے یہاں ٹھہرتے۔ حلقے کا کانسٹبل، تھانیدار، محکمہ تعلیم کے افسر ایک نہ ایک ان کے چوپال میں پڑا ہی رہتا۔ مہتو مارے خوشی کے پھولے نہ سماتے۔ خوش بختی! ان کے ہاں اتنے بڑے بڑے آدمی آکر ٹھہرتے تھے۔ جن حاکموں کے سامنے ان کی زبان نہ کھلتی تھی۔ انہیں کی زبان اب مہتو! مہتو! کہتے سوکھتی تھی۔ ایک مہاتما نے فضا اچھی دیکھی تو وہیں آسن جما دیا۔ گانجہ اور چرس کی بہار اڑنے لگی۔ ایک ڈھولک آئی، منجیرے منگوائے گئے اور ست سنگ ہونے لگا۔ یہ سب سوجان کے دم سے ہی تھا۔ گھر میں سیروں دودھ ہوتا لیکن سوجان کے منہ میں ایک بوند جانی بھی حرام تھی۔ کبھی حاکم لوگ چکھتے اور کبھی سادھو۔ کسان کو دودھ گھی سے مطلب؟ اسے تو ساگ روٹی چاہیے۔

سوجان کی عاجزی کی انتہا نہ رہی۔ سب کے سامنے سر جھکائے رہتا۔ ایسا نہ ہو لوگ کہنے لگیں کہ دولت پاکر مغرور ہو گیا ہے۔ گاؤں میں کل تین ہی کنوئیں تھے۔ سبھی کھیتوں میں پانی نہ پہنچتا تھا۔ کھیتی ماری جاتی تھی۔ سوجان نے ایک پختہ کنواں اور بنوا دیا۔ کنویں کے بیاہ‘ برہم بھوج اور یگیہ ہوا۔ جس دن کنواں چلا اس روز جیسے سوجان کو دنیا بھر کی نعمتیں مل گئیں۔ جو کام گاؤں بھر میں کسی سے نہ ہوا تھا وہ باپ دادا کی عنایت سے سوجان نے کر دکھایا۔

ایک روز گاؤں میں گیا کے یاتری آکر ٹھہرے۔ سوجان ہی کے ہاں ان کا بھوجن ہوا۔ سوجان کے دل میں بھی گیا جانے کی بہت روز سے خواہش تھی۔ یہ اچھا موقع پاکر وہ بھی چلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس کی بیوی بلاقی نے کہا۔ ”ابھی رہنے دو۔ اگلے سال چلیں گے۔“

سوجان نے متانت سے جواب دیا۔ ”اگلے برس کیا ہو گا۔ کون جانتا ہے؟ دھرم کے کام میں میخ نکالنا اچھا نہیں ہوتا۔ زندگی کا کیا بھروسہ؟“

”ہاتھ خالی ہو جائے گا۔“

”بھگوان کی اِچھا ہو گی تو روپیہ پھر آجائے گا۔ ان کے ہاں کس بات کی کمی ہے؟“

بلاقی اس کا کیا جواب دیتی۔ مذہبی فریضہ میں مداخلت کر کے اپنی عاقبت کیوں بگاڑتی؟ صبح ہی خاوند اور بیوی گیا کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں سے لوٹے تو یگیہ اور برہم بھوج کی ٹھہری۔ ساری برادری کو مدعو کیا گیا۔ گیارہ گاؤں میں سپاریاں بٹیں۔ اس کروفر سے کام ہوا کہ چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ سب یہی کہتے تھے کہ بھگوان دولت دے تو دل بھی ایسا ہی دے۔ گھمنڈ تو چھو بھی نہیں گیا۔ اپنے ہاتھ سے تیل اٹھاتا پھرتا ہے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا۔ بیٹا ہو تو ایسا ہو۔ باپ مرا تو گھر میں پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔ اب لکشمی گھٹنے ٹیک کر آ بیٹھی ہے۔

ایک حاسد نے کہا ”کہیں گڑی ہوئی دولت مل گئی ہو گی۔“ تو چاروں طرف سے اس پر لعنتیں برسنے لگیں۔ ”ہاں تمہارے باپ دادا جو خزانہ چھوڑ گئے ہیں وہی اس کے ہاتھ لگ گیا ہے۔“ ”ارے بھیا! یہ دھرم کی کمائی ہے۔ تم بھی تو سینہ پھاڑ کر محنت کرتے ہو‘ ایسی اکھ کیوں نہیں ہوتی؟ بھگوان آدمی کا دل دیکھتے ہیں جو خرچ کرنا جانتا ہے اس کو دیتے ہیں۔“

(2)

سوجان مہتو سوجان بھگت ہو گئے۔ بھگتوں کے طور اطوار کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ بھگت بِنا اشنان کئے کچھ نہیں کھاتے۔ گنگا اگر گھر سے دور ہو اور وہ دوپہر تک نہا کر لوٹ نہ سکتا ہو تو تہوار کے دن ضرور ہی وہاں جاتا ہے۔ بھجن اور پوجا تو اس کے گھر یقیناً ہونا چاہیے۔ پوجا پاٹھ اس کے لئے از بس ضروری ہے۔ کھانے پینے میں بھی اسے خاص توجہ دینی پڑتی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے جھوٹ ترک کرنا پڑتا ہے۔ بھگت غلط نہیں کہہ سکتا۔ عام آدمی کو اگر جھوٹ کی سزا ایک ملتی ہے تو بھگت کو ایک لاکھ سے کم نہیں۔ انجان کے لئے کتنے ہی قصور قابلِ معافی ہیں سیانے کے لئے نہ معافی ہے اور نہ کفارہ‘ اگر ہے بھی تو بہت مشکل۔ سوجان کو اب بھگت کا وقار قائم رکھنا پڑا۔ اب تک اس کی زندگی مزدور کی زندگی تھی۔ زندگی کا کوئی معیار کوئی اصول اس کے سامنے نہ تھا۔ اب اس کی زندگی میں خیالات آ گئے۔ راستہ کانٹوں سے بھرپور تھا۔ اپنی خدمت ہی پہلے اس کی زندگی کا مقصد تھا۔ اس ترازو سے وہ ہر چیز کو تولتا تھا۔ وہ

اب انہیں مناسب اور نامناسب کانٹوں پر تولنے لگا۔ یوں کہہ کہ جیل کی دنیا سے نکل کر اب وہ علم کی دنیا میں آ گیا۔ اس نے کچھ لین دین شروع کیا تھا۔ اب اسے بیاج لیتے ہوئے خجالت ہونے لگی۔ یہاں تک کہ گوؤں کو دوہتے ہوئے اسے بچھڑوں کا خیال لگا رہتا۔ کہیں بچھڑا بھوکا تو نہیں رہتا؟ ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ وہ گاؤں کا مکھیا تھا۔ کتنے ہی مقدموں میں اس نے جھوٹی شہادتیں دیں۔ کتنوں سے رشوت لے کر معاملہ رفع دفع کر دیا تھا۔ اب ان کاموں سے اسے نفرت ہوتی تھی۔ جھوٹ اور ڈھونگ سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔ پہلے اس کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ مزدوروں سے جس قدر کام لیا جاسکتا ہے لے اور مزدوری جس قدر کم دی جاسکتی ہے' دے لیکن اب اسے کام سے زیادہ انسان کی مزدوری کی فکر ہوتی تھی۔ کہیں بے چارے مزدوروں پر جبر نہ کریں بلکہ اس کی واحد فکر ہوتی تھی کہ کہیں کسی کا رویاں نہ دکھے۔ اس کے دونوں جوان بیٹے بات بات پر اس پر پھبتیاں کستے۔ یہاں تک کہ بلاقی بھی اب اسے کورا بھگت سمجھنے لگی۔ جسے گھر کے برے بھلے سے کوئی سروکار نہ ہو۔ گیان کی دنیا میں آ کر مہتو کورے بھگت ہو گئے۔

سوجان کے ہاتھوں سے آہستہ آہستہ تمام حقوق چھینے جانے لگے۔ کس کھیت میں کیا بونا ہے' کس کا کیا دینا ہے' کیا لینا ہے' کس بھاؤ کیا چیز بکی۔ ایسی اہم باتوں میں بھگت جی کی صلاح نہ لی جاتی۔ بھگت کے پاس کوئی جانے ہی نہ پاتا۔ دونوں لڑکے یا خود بلاقی دور سے ہی معاملہ طے کر لیا کرتے۔ گاؤں بھر میں سوجان کی قدر و منزلت بڑھتی جا رہی تھی اور خود اس کے گھر میں کم ہو رہی تھی۔ — لڑکے اس کی عزت اب بہت کرتے۔ اسے خود چارپائی اٹھاتے دیکھ کر دور سے ہی لپک کر تھام لیتے۔ اسے چلم نہ بھرنے دیتے۔ یہاں تک کہ خود دھوتی تک نہ جھٹکنے دیتے۔ لیکن اثر اس کے ہاتھوں میں نہ تھا۔ وہ اب گھر کا مالک نہیں' مندر کا دیوتا تھا۔

(3)

ایک دن بلاقی اوکھلی میں دھان چھانٹ رہی تھی کہ ایک بھک منگا دروازہ پر آ کر چلانے لگا۔ بلاقی نے سوچا دال بنالوں تو اسے دوں گی۔ اتنے میں بڑا لڑکا بھولا آ کر بولا۔ ''اماں مہاتما دروازے پر کھڑے گلا پھاڑ رہے ہیں' کچھ دے دو۔ ورنہ اس کا دل روئے گا۔''

بلاقی نے طنز سے کہا۔ ''بھگت کے پاؤں میں کیا مہندی لگی ہے؟ کیوں کچھ لے جا کر نہیں دے دیتے؟ کیا میرے چار ہاتھ ہیں؟ کس کس کا دل سکھی رکھوں؟ دن بھر تو تانتا بندھا رہتا ہے؟''

''چوپٹ کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور کیا؟ ابھی مہنگو بھینگی دینے آیا تھا۔ حساب سے سات من ہوتے تھے تولا تو پونے سات من ہی نکلے۔ میں نے کہا دس سیر اور لا۔ تو آپ بیٹھے بیٹھے کہہ اٹھے۔ اب اتنی دور کہاں لینے جائے گا۔ وصولی لکھ لو ورنہ اس کا دل دکھے گا۔ میں نے حساب بے باق نہیں لکھا۔ دس سیر باقی درج کر لئے۔''

''بہت اچھا کیا تم نے۔ بکنے دیا کرو نہیں۔ دس پانچ مرتبہ منہ کی کھائیں گے تو خود بخود بولنا چھوڑ دیں گے۔''

''دن بھر ایک نہ ایک شگوفہ چھوڑتے ہی رہتے ہیں۔ سو مرتبہ کہہ دیا کہ تم گھر گرہستی کے معاملہ میں مت بولا کرو لیکن اس سے بنا بولے رہا ہی نہیں جاتا۔''

''میں جانتی کہ ان کا یہ حال ہوگا تو گورو منتر نہ لینے دیتی۔''

''بھگت کیا ہوئے کہ دین دنیا سے گئے۔ تمام دن پوجا پاٹھ میں ہی اڑ جاتا ہے۔ ابھی ایسے بوڑھے نہیں ہو

گئے کہ کوئی کام ہی نہ کرسکیں۔"

بلاقی نے بات بدلی اور کہا۔"یہ تو تمہاری زیادتی ہے بھولا۔ اب بھلاان سے پھاوڑا کدال کہاں پکڑا جاتا ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہیں۔ بیلوں کو دانہ پانی دیتے ہیں۔ گائے دوہاتے ہیں اور بھی جو کچھ ہو سکتا ہے کرتے ہیں۔"

فقیرا بھی کھڑا چلا رہا تھا۔ سوجان نے جب گھر سے کسی کو کچھ بھی لاتے نہ دیکھا تو اٹھ کر اندر گیا اور کڑے لہجے میں بولا۔"تم لوگوں کو کچھ سنائی نہیں دیتا کہ دروازہ پر کون گھنٹہ بھر سے کھڑا بھیک کے لئے چلا رہا ہے۔ اپنا کام تو دن بھر کرنا ہی ہے۔ ایک ساعت بھگوان کا کام بھی تو کرلیا کرو۔"

بلاقی بولی۔"تم تو بھگوان کا کام کرنے کے لئے بیٹھے ہی ہو۔ کیا گھر بھر یہی کام کرے گا؟"

"کہیں آٹا رکھا ہے تو لاؤ۔ میں ہی نکال کر دے آؤں۔ تم رانی بنی بیٹھی رہو۔"

"آٹا میں نے مرمر کے پیسا ہے۔ اناج دے دو۔ ایسے مسٹنڈوں کے لئے پہر رات اٹھ کر چکی نہیں چلاتی ہوں۔"

سوجان گودام میں گئے اور ایک چھوٹی ٹوکری بھر جُو لئے باہر نکلے جو سیر بھر سے کیا کم ہوں گے۔ سوجان نے محض جان بوجھ کر بلاقی اور بھولا کو چڑانے کے لئے بھیک کی موزوں مقدار سے تجاوز کیا تھا۔ اس پر بھی یہ دکھانے کے لئے ٹوکری میں زیادہ جو نہیں ہیں وہ اسے چٹکی سے تھامے ہوئے تھے۔ چٹکی اس قدر بوجھ نہ سنبھال سکتی تھی۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ ایک لمحہ کی تاخیر ہونے سے ہی اس کے گر پڑنے کا خدشہ تھا۔ اس لئے وہ جلدی سے باہر نکل جانا چاہتے تھے۔ اچانک بھولا نے جھابڑی ان کے ہاتھ سے چھین لی اور تیورا کر کہا۔

"مالِ غنیمت نہیں ہے جو لٹانے چلے ہو۔ چھاتی پھاڑ پھاڑ کر کام کرتے ہیں تب گھر میں دانہ آتا ہے۔"

سوجان نے کھسیانہ ہو کر کہا۔"میں بھی تو بیٹھا نہیں رہتا۔"

"بھیک' بھیک سمجھ کر دی جاتی ہے لٹائی نہیں جاتی۔ ہم تو ایک وقت کھا کر گزر کرتے ہیں کہ عزت بنی رہے اور تمہیں لٹانے کی سوجھی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

سوجان نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ باہر آکر بھکاری سے کہہ دیا۔"بابا! اس وقت جاؤ۔ گھر میں کسی کا ہاتھ خالی نہیں۔"اور خود پیڑ تلے جا کر خیالات میں ڈوب گیا۔ اپنے ہی گھر میں اس کی یہ قدر؟ ابھی وہ اپاہج نہیں ہے۔ ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ گھر کا کچھ نہ کچھ کام کرتا ہی ہوں۔ اس پر یہ توہین؟ اس نے یہ گھر بنایا۔ ساری رونق اسی کے دم خم سے ہے۔ لیکن اب اس گھر پر اس کا کوئی حق نہیں۔ اب وہ دروازہ کا کتا ہے۔ گھر والے جو روکھا سوکھا دے دیں وہ وہی کھا کر پیٹ بھر لے۔ اپنی زندگی پر لعنت ہے۔ سوجان ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا۔

شام ہو گئی۔ بھولا کا چھوٹا بھائی شنکر چلم بھر کر لایا۔ سوجان نے دیوار سے لگا کر رکھ دیا۔ دھیرے دھیرے تمباکو جل گیا۔ ذرا دیر بعد بھولا نے دروازہ پر چارپائی ڈال دی۔ سوجان پیڑ تلے سے نہ اٹھا۔

کچھ دیر اور گذری۔ کھانا تیار ہوا۔ بھولا بلانے آیا۔ سوجان نے کہا۔"بھوک نہیں ہے۔"

بہت منانے پر بھی نہ اٹھا۔ تب بلاقی نے آکر کہا۔"کھانا کھانے کیوں نہیں چلتے۔ جی تو اچھا ہے۔"

سوجان کو سب سے زیادہ غصہ بلاقی پر ہی تھا۔ یہ بھی لڑکوں کے ساتھ ہے۔ یہ بیٹھی دیکھتی رہی اور بھولا نے اناج میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اس کے منہ سے اتنا بھی نہ نکلا کہ رہنے دے' لے جاتے ہیں تو لے جانے دے۔ لڑکوں کو نہ معلوم ہو کہ میں نے کتنی محنت سے یہ گرہستی بنائی ہے لیکن اسے تو معلوم تھا۔ دن کو دن اور رات کو

رات نہیں سمجھا۔ بھادوں کی اندھیری راتوں میں لاٹھی تھامے جوار کی حفاظت کی ہے۔ جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں بھی دم نہیں لیا۔ اور اب گھر پر میرا اتنا بھی حق نہیں کہ کسی کو بھیک بھی دے سکوں۔ مانا کہ بھیک اتنی نہیں دی جاتی لیکن انہیں تو چپ رہنا چاہیے تھا خواہ میں گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگادوں۔ قانون سے بھی تو میرا کچھ ہے۔ میں اپنا حصہ خود نہیں لیتا' دوسروں کو کھلا دیتا ہوں۔ اس میں کسی کے باپ کا کیا جاتا ہے۔ اب اس وقت منانے آئی ہے۔ اسے میں نے کبھی آج تک پھول کی چھڑی سے بھی نہیں چھوا۔ ورنہ ایسی کون عورت ہے گاؤں میں جس نے شوہر کی لاتیں نہ سہی ہوں۔ کبھی کڑی نگاہ سے دیکھا تک نہیں۔ روپے پیسے' لینا دینا سب اس کے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اب روپے جمع کر لئے ہیں تو مجھ سے ہی اکڑتی ہے۔ اب اسے لڑکے عزیز ہیں۔ میں تو گھر لٹاؤ' نکھٹو اور بھوندو ہوں۔ میری اسے کیا پروا۔ جب لڑکے نہ تھے تب میں گود میں اٹھا اٹھا کر وید کے پاس لئے پھرا تھا۔ آج اس کے بیٹے ہیں اور یہ ان کی ماں ہے میں تو باہر کا آدمی ہوں۔ مجھے گھر سے کیا مطلب؟ بولا۔

"میں اب کھا پی کر کیا کروں گا؟ ہل جوتنے سے رہا۔ پھاوڑا چلا نہیں سکتا۔ مجھے کھلا کر اناج کو کیوں ضائع کرو گی؟ رکھ دو' بیٹا دوسری بار کھائے گا۔"

"تم تو ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتے ہو۔ سچ کہا ہے۔ بڑھاپے میں آدمی کی عقل ماری جاتی ہے۔ بھولا نے اتنا ہی تو کہا تھا کہ اتنی بھیک مت لے جاؤ یا اور کچھ؟"

"ہاں! بیچارہ اتنا ہی کہہ کر رہ گیا۔ تمہیں تو تب مزا آتا اگر وہ اوپر سے دو چار ڈنڈے بھی جما دیتا۔ کیوں؟ اگر یہی خواہش ہے تو لو اب پوری کرو۔ بھولا کھا چکا ہوگا۔ اسے بلا لاؤ۔ نہیں۔ بھولا کو کیوں بلاتی ہو۔ تمہیں جمادو نہ چار ہاتھ۔ اتنی کسر ہے وہ بھی پوری ہو جائے۔"

"ہاں! اور کیا۔ یہی تو عورت کا فرض ہے۔ اپنے بھاگ سراہو کہ مجھ جیسی سیدھی عورت مل گئی۔ جس بل چاہتے ہو بٹھاتے ہو۔ ایسی منہ زور ہوتی تو گھر میں کیوں اب تک نباہ ہوتا۔"

"ہاں بھئی۔ وہ تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ تم دیوی تھیں اور ہو۔ میں تب بھی راکشش تھا اور اب تو شیطان ہوں۔ بیٹے کماؤ ہیں۔ ان کی سی نہ کہے گی تو اور کس کی کہے گی۔ مجھ سے اب کیا لینا دینا ہے؟"

تم جھگڑا کرنے پر تلے ہوئے ہو اور میں بچانا چاہتی ہوں کہ چار آدمی ہنسیں گے۔ چل کر کھانا کھالو سیدھے سے نہیں تو میں بھی جا کر سو رہوں گی۔"

"تم بھوکی کیوں سو رہو گی۔ تمہارے بیٹوں کی تو کمائی ہے۔ ہاں! میں تو بھلا اجنبی ہوں ہی۔"

"بیٹے تمہارے بھی تو ہیں۔"

"نہیں! میں ایسے بیٹوں سے باز آیا۔ کسی اور کے بیٹے ہوں گے۔ میرے بیٹے ہوتے تو کیا میری یہ درگت ہوتی؟"

"گالیاں دو گے تو میں کچھ اور کہہ بیٹھوں گی۔ سنتی تھی مرد بڑے سمجھ دار ہوتے ہیں۔ لیکن تم سب سے نیارے ہو۔ آدمی کو چاہیے کہ جیسا وقت دیکھے اس کے مطابق کام کرے۔ اب ہمارا اور تمہارا گذارہ اسی میں ہے کہ نام کے مالک بنے رہیں اور جو کچھ لڑکے چاہیں کریں۔ میں یہ بات سمجھ گئی تو تم کیوں نہیں سمجھتے۔ جو کماتا ہے اس کا گھر میں راج ہوتا ہے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ میں لڑکوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتی۔ تم کیوں اپنے من کی کرو۔ اتنے دن تو راج کر لیا۔ اب کیوں اس مایا میں پڑو؟ چلو کھانا کھالو۔"

"تو کیا میں دروازے کا کتا ہوں؟"

"بات جو تھی میں نے کہہ دی۔ اب خود کو جو چاہو سمجھو۔"

سوجان نہ اٹھے۔ بلاقی تھک ہار کر چلی گئی۔

(4)

سوجان کے سامنے اب ایک نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بہت دنوں سے گھر کا مالک تھا اور اب بھی یہی تصور کرتا تھا۔ حالات میں کتنا الٹ پھیر ہو گیا اس کی اسے خبر نہ تھی۔ لڑکے اس کی عزت اور خدمت کرتے ہیں' اسی سے وہ مغالطہ میں پڑ گیا تھا۔ لڑکے اس کے سامنے چلم نہیں پیتے' کھاٹ پر نہیں بیٹھتے۔ کیا یہ سب اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں لیکن آج اسے معلوم ہوا کہ وہ محض عقیدت تھی۔ اس کے آقا ہونے کا ثبوت نہیں۔ کیا عقیدت کے عوض وہ اپنا آقا پن کا حق چھوڑ سکتا تھا؟ ہرگز نہیں۔ اب تک جس گھر میں راجہ تھا اس میں غلام ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس گھر پر اب دوسروں کا غلبہ نہیں دیکھ سکتا۔ مندر کا پجاری ہو کر رہنا اسے قطعاً ناپسند تھا۔

نہ جانے کتنی رات باقی تھی کہ سوجان نے اٹھ کر گنڈاسے سے بیلوں کا چارہ کاٹنا شروع کر دیا۔ سارا گاؤں سوتا تھا لیکن سوجان چارہ کاٹ رہے تھے۔ اتنی محنت اپنی زندگی میں انہوں نے کبھی نہ کی تھی۔ جب سے انہوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے' تب سے ہی چارہ کے لئے ہائے ہائے مچی رہتی تھی۔ شنکر بھی کاٹتا اور بھولا بھی لیکن چارہ پورا ہی نہ پڑتا۔ آج وہ ان لونڈوں کو دکھادے گا کہ چارہ کیسے کاٹا جاتا ہے۔ جلدی ان کے سامنے کاٹے ہوئے چارہ کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ ٹکڑے کس قدر مہین اور صاف تھے جیسے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں۔

منہ اندھیرے بلاقی اٹھی تو کٹے ہوئے چارہ کا ڈھیر دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بولی۔ "یہ بھولا آج رات بھر چارہ ہی کاٹتا رہا۔ کتنا کہا کہ بیٹا جی سے جہان ہے لیکن مانتا ہی نہیں۔ رات کو سویا ہی نہیں۔"

سوجان بھگت نے طنز سے کہا۔ "وہ سوتا ہی کب ہے؟ جب دیکھتا ہوں کام ہی کرتا رہتا ہے۔ ایسا کماؤ دنیا میں اور کون ہو گا؟"

اتنے میں بھولا آنکھیں ملتا ہوا باہر آ نکلا۔ اسے بھی یہ ڈھیر دیکھ کر تعجب ہوا۔ ماں سے بولا۔ "کیا شنکر آج بڑی رات گئے اٹھا تھا اماں؟"

"وہ تو پڑا سو رہا ہے۔ میں نے سمجھا تم نے کاٹا ہے۔"

"میں تو صبح اٹھ ہی نہیں سکتا۔ دن بھر چاہے جتنا کام کر لوں لیکن رات کو مجھ سے نہیں اٹھا جاتا۔"

"تو کیا تمہارے دادا نے کاٹی ہے؟"

"ہاں! یہی معلوم ہوتا ہے۔ رات بھر سوئے نہیں۔ مجھ سے کل رات بڑی بھول ہوئی۔ ارے وہ تو ہل لے کر جا رہے ہیں۔ جان دینے پر تل گئے ہیں کیا؟"

"غصیلے تو کبھی کے ہیں۔ اب کسی کی سنیں گے تھوڑا ہی۔"

"شنکر کو جگا دو۔ میں بھی جلدی سے منہ ہاتھ دھو کر ہل لے کر جاؤں۔"

جب اور کسانوں کے ساتھ ہل لے کر بھولا کھیت میں پہنچا تو سوجان آدھا کھیت جوت چکے تھے۔ بھولا نے

چپکے سے کام کرنا شروع کیا۔ سوجان سے کچھ بولنے کی کسی کو بھی ہمت نہ پڑی۔

دوپہر ہوئی۔ سب کسانوں نے بیل چھوڑ دیئے لیکن سوجان اپنے کام میں مگن رہے۔ بھولا تھک گیا۔ اس کی بار بار یہی خواہش ہوتی کہ بیلوں کو کھول دے مگر مارے خوف کے کچھ کہہ نہیں سکا۔ اس کو حیرت ہوتی تھی کہ دادا کیسے اتنا کام کرتے ہیں۔ آخر ڈرتے ڈرتے بولا۔

"دادا! اب تو دوپہر ہو گئی۔ ہل کھول دیں ذرا۔"

"ہاں کھول دو۔ تم بیلوں کو لے کر چلو۔ میں ڈانڈ پھینک کر ابھی آیا۔"

"میں شام کو پھینک دوں گا۔"

"تم کیا پھینک دو گے۔ دیکھتے نہیں کہ کھیت کٹورے کے مانند گہرا ہو گیا ہے۔ تبھی تو بیچ میں پانی جم جاتا ہے۔ اس طرح کے کھیت میں بیس من کا بیگھہ ہوتا تھا۔ تم لوگوں نے اس کا ستیاناس کر دیا۔"

بیل کھول دیے گئے۔ بیلوں کو لے کر بھولا گھر چلا لیکن سوجان ڈانڈ پھینکتے رہے۔ آدھ گھنٹہ کے بعد وہ ڈانڈ پھینک کر گھر آئے لیکن تھکن کا نام بھی نہ تھا۔ نہا' کھا کر آرام کرنے کی بجائے انہوں نے بیلوں کو سہلانا شروع کر دیا۔ ان کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا' پاؤں ملے اور دم سہلائی۔ بیلوں کی دم کھڑی تھی۔ سوجان کی گود میں سر رکھے انہیں ناقابلِ بیان مسرت مل رہی تھی۔ بہت دنوں کے بعد آج انہیں یہ راحت میسر آئی تھی۔ ان کی آنکھوں میں تشکر کے جذبے ابل رہے تھے۔ جیسے کہہ رہے تھے کہ تمہارے ساتھ رات دن ایک کرنے کو تیار ہیں۔

دوسرے کسانوں کی طرح بھولا ابھی کمر ہی سیدھی کر رہا تھا کہ سوجان ہل اٹھا کر کھیت کی طرف چل دیا۔ دونوں بیل امنگ سے بھرے بھاگے چلے جا رہے تھے جیسے انہیں خود کھیت میں پہنچنے کی جلدی تھی۔

بھولا نے غنودگی میں ہی باپ کو ہل لے جاتے دیکھا لیکن اٹھ نہ سکا۔ اس کی ہمت چھوٹ گئی۔ اس نے کچھ اتنی محنت نہ کی تھی۔ اسے بنی بنائی گرہستی مل گئی تھی۔ اس کو ہی کسی نہ کسی طرح چلا رہا تھا۔ اس قیمت پر وہ گھر کا مالک ہے کے لیے تیار نہ تھا۔ جوان آدمی کو بیس دھندے ہوتے ہیں۔ ہنسنے بولنے اور گانے بجانے کے لیے اسے وقت چاہیے۔ پڑوس کے گاؤں میں دنگل ہو رہا ہے۔ جوان آدمی خود کو کیسے وہاں جانے سے روک سکے گا؟ کسی گاؤں میں برات آئی ہے۔ محفلِ رقص و سرود گرم ہے۔ گبرو کیسے اس لطف سے محروم ہو سکتا ہے؟ بوڑھوں کے لیے یہ رکاوٹیں نہیں۔ انہیں نہ ناچ گانے سے مطلب نہ کھیل تماشے سے غرض۔ محض اپنے کام سے سروکار ہے۔

بلاقی نے کہا۔ "بھولا تمہارے دادا ہل لے کر گئے۔"

"جانے دو اماں۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا۔"

(5)

سوجان کے اس نئے حوصلے پر گاؤں بھر میں تبصرے ہوئے۔ نکل گئی ساری بھگتی۔ بنا ہوا تھا۔ مایا میں پھنسا ہوا ہے۔ آدمی کاہے کو ہے بھوت ہے۔ مگر بھگت جی کے دروازے پر اب پھر سادھو سنت آسن جمائے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اب کے اس کی دھرتی نے سونا اگل دیا۔ کوٹھار میں اناج رکھنے کی جگہ نہیں ملتی۔ جس کھیت میں مشکل سے پانچ من ہوتا تھا اس میں دس من اناج پیدا ہوا۔

چیت کا مہینہ تھا۔ کھلیانوں میں ست یگ کی حکومت تھی۔ جگہ جگہ اناج کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ یہی وقت ہے جب کسانوں کو ایک لمحے کے لیے اپنی زندگی کامیاب معلوم دیتی ہے۔ جب فخر سے ان کا دل اچھلنے لگتا ہے۔ سوجان بھگت ٹوکرے میں اناج بھر بھر کر دیتے اور لڑکے انہیں تھام کر گھر پہنچانے جاتے۔ کتنے ہی بھاٹ اور فقیر بھگت جی کو گھیرے ہوئے تھے۔ ان میں وہ سادھو بھی تھا جو آج سے آٹھ مہینے قبل ان کے در سے مایوس لوٹا تھا۔

اچانک بھگت نے اس فقیر سے پوچھا۔ ''کیوں بابا! آج کہاں کہاں چکر لگا آئے؟''

''ابھی تو کہیں نہیں گیا بھگت! پہلے تمہارے ہی پاس آیا ہوں۔''

''اچھا تمہارے سامنے یہ انبار ہے۔ جتنا اناج اٹھا سکتے ہو اٹھالو۔''

فقیر نے حریص نگاہوں سے ڈھیر کو دیکھ کر کہا۔ ''جتنا اپنے ہاتھ سے اٹھا کر دے دو گے اتنا ہی لے لوں گا۔''

''نہیں تم سے جتنا اٹھایا جاسکے اٹھالو۔''

فقیر کے پاس ایک چادر تھی۔ اس نے کوئی دس سیر اناج اس میں بھرا اور اٹھانے لگا۔ جھجک کے مارے اور زیادہ بھرنے کی اسے جرأت نہ ہوئی۔

بھگت اس کے دل کا مطلب بھانپ کر حوصلہ دلاتے ہوئے بولا۔

''بس! اتنا تو ایک بچہ بھی اٹھالے جاسکتا ہے۔''

فقیر نے بھولا کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''میرے لیے اتنا ہی بہت ہے۔''

''نہیں، تم جھجکتے ہو۔ اتنا اور بھرو۔''

فقیر نے پانچ سیر اناج اور بھرا اور بھولا کی طرف متوحش نظروں سے دیکھنے لگا۔

''اس کی طرف کیا دیکھتے ہو بابا جی! میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔ تم سے جتنا اٹھایا جاسکے اٹھاؤ۔''

فقیر ڈر رہا تھا کہ اگر اس نے اناج بھر لیا اور بھولا نے گٹھری نہ اٹھانے دی تو کتنی خفت ہوگی۔ دوسرے فقیروں کو ہنسنے کا موقع مل جائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ فقیر کتنا لالچی ہے۔ اسے اور اناج بھرنے کی ہمت نہ ہوئی۔

تب سوجان بھگت نے چادر میں اور اناج بھرا۔ اس کی گٹھری باندھ کر بولا۔ ''اسے اٹھالے جاؤ۔''

''بابا! اتنا تو مجھ سے اٹھ نہ سکے گا۔''

''ارے اتنا بھی نہ اٹھ سکے گا؟ بہت ہوگا تو من بھر۔ بھلا زور تو لگاؤ۔ دیکھوں اٹھا سکتے ہو یا نہیں۔''

فقیر نے گٹھری کو پہلے آزمایا۔ بھاری تھی۔ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں بولا۔ ''بھگت جی! یہ مجھ سے نہ اٹھے گی۔''

''اچھا بتاؤ کس گاؤں میں رہتے ہو؟''

''بڑی دور ہے بھگت جی۔ امولا کا نام تو سنا ہوگا۔''

''اچھا آگے آگے چلو۔ میں پہنچا دوں گا۔''

یہ کہہ کر بھگت جی نے زور لگا کر گٹھری اٹھائی اور فقیر کے پیچھے ہو لیے۔ دیکھنے والے بھگت کا یہ جذبہ دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ بھگت جی پر اس وقت کون سا نشہ سوار ہے۔ آٹھ مہینوں کی مسلسل اور انتھک محنت کا انہیں آج پھل ملا ہے۔ آج انہوں نے اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر حاصل کیا تھا۔ وہی تلوار جو کیلے کو بھی نہیں کاٹ سکتی دھار پر چڑھ کر لوہے کو کاٹ دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں دھن بڑے کام کی چیز ہے۔ جس میں لاگ ہے وہ بوڑھا بھی جوان ہے۔ جس میں لاگ نہیں، عزت نہیں، وہ جوان بھی ہو تو مردہ ہے۔ سوجان میں حمیت تھی۔

اس نے اسے غیر معمولی قوت دی۔ چلتے وقت انہوں نے بھولا کو پر غرور نظروں سے دیکھا اور کہا۔ "یہ بھاٹ اور فقیر کھڑے ہیں۔ ان میں سے کوئی خالی ہاتھ نہ جانے پائے۔"

بھولا سر جھکائے کھڑا رہا۔ اسے کچھ بولنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ بوڑھے باپ نے اسے ہرا دیا۔

طلوعِ محبت

(1)

بھوندو پسینہ میں شرابور لکڑیوں کا ایک گٹھا سر پر لیے آیا اور اسے پٹک کر بنٹی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ گویا زبان حال سے پوچھ رہا تھا۔ "کیا ابھی تک تیرا مزاج درست نہیں ہوا؟"

شام ہو گئی تھی پھر بھی لو چلتی تھی اور آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ ساری قدرت دق کے مریض کی طرح نیم جان ہو رہی تھی۔ بھوندو صبح گھر سے نکلا تھا۔۔۔ دوپہر درخت کے سایہ تلے بسر کی تھی اور سمجھا تھا اس تپسیا سے دیوی جی کا منہ ٹھیک ہو گیا ہو گا۔ لیکن آکر دیکھا تو وہ ابھی تک تنی بیٹھی تھی۔

بھوندو نے سلسلہ کلام شروع کرنے کی غرض سے کہا۔ "لا ایک پانی کا لوٹا دے دے' بڑی پیاس لگی ہے۔ مر گیا سارے دن میں۔ بجار جاؤں گا تو تین آنے سے بیشی نہ ملیں گے۔"

بنٹی نے سر کی کے اندر بیٹھے بیٹھے کہا۔ "دھرم بھی لوٹو گے اور پیسے بھی۔ منہ دھو رکھو۔"

بھوندو نے آنکھیں سکوڑ کر جواب دیا۔ "کیا دھرم دھرم بکتی ہے۔ دھرم کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے۔ دھرم وہ کرتا ہے جس پر بھگوان کی مہربانی ہو۔ ہم دھرم کھاک کریں گے۔ پیٹ بھرنے کو چنا چبینا تو ملتا نہیں دھرم کیا کریں گے؟"

بنٹی نے اپنا وار اوچھا پڑتے دیکھ کر چوٹ کی۔ "دنیا میں کچھ ایسے دھرماتما بھی ہیں جو اپنا پیٹ چاہے نہ بھر سکیں مگر پڑوسیوں کی دعوت کرتے پھرتے ہیں۔ ورنہ سارے دن بن بن کر لکڑیاں نہ کاٹتے پھرتے۔ ایسے دھرماتما لوگوں کو جورو رکھنے کی کیوں سوجھتی ہے؟ یہی میری سمجھ میں نہیں آتا۔۔۔ دھرم چھکڑا کیا اکیلے نہیں چلتا؟"

بھوندو اس چوٹ سے تلملا اٹھا۔ اس کی رگیں تن گئیں۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بنٹی کا منہ وہ ایک ڈپٹ میں بند کر سکتا تھا مگر اس نے یہ نہ سیکھا تھا۔ جس کی طاقت کی سارے کنجڑوں میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی' جو تن تنہا سو پچاس نوجوانوں کا نشہ اتار سکتا تھا' وہ ایک کمزور عورت کے سامنے منہ نہ کھول سکا۔ دبی زبان سے بولا۔ "جورو دھرم گنوانے کے لیے نہیں لائی جاتی' دھرم کمانے کے لیے لائی جاتی ہے۔"

یہ دونوں کنجڑ خاوند بیوی تین دن سے اور کئی کنجڑوں کے ساتھ اس باغ میں اترے ہوئے تھے۔ سارے باغ میں سرکیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ان تین ہاتھ چوڑی اور چار ہاتھ لمبی سرکیوں کے ساتھ گزر اوقات کر رہا تھا۔ ایک طرف چکی تھی' ایک طرف باورچی خانہ کی اشیاء' ایک طرف اناج کے مٹکے' دروازہ پر ایک کھٹولی پڑی تھی۔ ہر

ایک گھر کے ساتھ دو دو بھینسے یا گدھے تھے۔ جب ڈیرا کوچ ہوتا تھا تو سارا ساز و سامان ان گدھوں یا بھینسوں پر لاد دیا جاتا تھا۔ یہی ان کنجڑوں کی زندگی تھی۔ ساری بستی ایک ساتھ چلتی تھی' ایک ساتھ ٹھہرتی تھی۔ ان کی دنیا اس بستی کے اندر تھی۔ آپس ہی میں شادی بیاہ' لین دین' جھگڑے قضیئے ہوتے رہتے تھے۔ اس دنیا کے باہر سارا جہان ان کے لیے شکار گاہ تھا۔ ان کے کسی علاقہ میں پہنچتے ہی وہاں کی پولیس آ کر انہیں نگرانی میں لے لیتی تھی۔ پڑاؤ کے ارد گرد چوکیداروں کا پہرا الگ جاتا تھا۔ عورت یا مرد کسی گاؤں میں جاتے تو پولیس کے آدمی ان کے ساتھ ہو لیتے۔ رات کو ان کی حاضری لی جاتی۔ پھر بھی گرد و نواح کے لوگ سہمے ہوئے تھے کیوں کہ کنجڑ لوگ اکثر گھروں میں گھس کر جو چیز چاہتے اٹھا لیتے اور ان کے ہاتھ میں جا کر کوئی شے لوٹ نہ سکتی تھی۔ رات میں یہ لوگ اکثر چوری کرنے نکل جاتے۔ چوکیدار ان سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ خونخوار تھے۔ ذرا سی بات پر لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتے۔ سختی کرنے میں جان کا خطرہ تھا کیونکہ کنجڑ لوگ بھی ایک حد تک ہی پولیس کا دباؤ مانتے ہیں۔ ساری بستی میں بھوندو ہی ایک ایسا شخص تھا جو اپنی محنت کی کمائی کھاتا تھا۔ مگر اس لیے نہیں کہ پولیس والوں سے خائف تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی بہادری یہ گوارا نہ کر سکتی تھی کہ وہ ناجائز طریقے سے اپنی کسی ضرورت کو پورا کرے۔

بنٹی کو شوہر کی یہ پاک دامنی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی بہنیں نئی نئی چوڑیاں اور نئے نئے زیور پہنتیں تو بنٹی اپنے شوہر کی بزدلی پر کڑھتی تھی۔ اس بات پر دونوں میں کئی مرتبہ جھگڑے ہو چکے تھے لیکن بھوندو اپنی عاقبت بگاڑنے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ آج بھی صبح یہی سوال درپیش تھا اور بھوندو لکڑی کاٹنے جنگل نکل گیا تھا۔ کچھ مل جاتا تو بنٹی کی اشک شوئی ہو جاتی مگر آج سوائے لکڑی کے اور کوئی شے نہ ملی۔ نہ کوئی جانور' نہ خس' نہ جڑی نہ بوٹی۔

بنٹی نے کہا۔ "جن سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہی دھرماتما بن جاتے ہیں۔ رانڈ اپنے مانڈ ہی میں خوش ہے۔"

بھوندو نے کہا۔ "تو میں نکھٹو ہوں۔"

بنٹی نے اس سوال کا سیدھا جواب نہ دیا۔ "میں کیا جانوں۔ تم کیا ہو۔ میں تو یہ جانتی ہوں کہ یہاں دھیلے دھیلے کی چیز کے لیے ترسنا پڑتا ہے۔ یہاں جتنی عورتیں ہیں سب کھاتی ہیں' پہنتی اوڑھتی ہیں۔ کیا میرے ہی دل نہیں ہے۔ تمہارے ساتھ بیاہ کر کے جندگی کھراب ہو گئی۔"

بھوندو نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ "جانتی ہے پکڑا گیا تو تین سال سے کم سجا نہ ہو گی۔"

بنٹی پر اثر نہ ہوا۔ بولی۔ "جب اور لوگ نہیں پکڑے جاتے تو تم ہی کیوں پکڑے جاؤ گے؟"

بھوندو۔ "اور لوگ پولیس کی کھسامدیں کرتے ہیں۔ چوکیداروں کے پاؤں سہلاتے ہیں۔ تو چاہتی ہے میں بھی یہ کام کروں۔"

بنٹی نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ بولی۔ "میں تمہارے ساتھ ستی ہونے نہیں آئی۔ پھر تمہارے چھرے گنڈاسے سے کوئی کہاں تک ڈرے۔ جانور کو بھی جب گھاس چارہ نہیں ملتا تو رسہ تڑا کر کسی کھیت میں جا گھستا ہے۔ میں تو آدمی ہوں۔"

بھوندو نے اس کا جواب نہ دیا۔ اس کی بیوی کوئی دوسرا گھر کرے گی۔ یہ خیال بھی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ آج بنٹی نے پہلی مرتبہ یہ دھمکی دی۔ اب تک بھوندو اس طرف سے بے فکر تھا۔ اب یہ نیا خطرہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی ساری زندگی میں ایسا روز سیاہ کبھی نہ آنے دے گا۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر گزرے گا۔ بھوندو کی نگاہوں میں بنٹی کی وہ عزت نہیں رہی' وہ اعتماد نہیں رہا۔ مضبوط دیوار کو ٹھکاؤنے کی ضرورت نہیں

ہوتی۔ جب دیوار ہلنے لگتی ہے تو ہمیں اس کے سنبھالنے کی فکر ہوتی ہے۔ آج بھوندو کو اپنے گھر کی دیوار ہلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ آج تک بنٹی اس کی اپنی تھی۔ وہ جس طرح اپنی طرف سے بے پرواتھااس کی طرف سے بھی بے فکر تھا۔ وہ جس طرح خود رہتا تھااسی طرح اس کو رکھتا تھا۔ جو خود کھاتا تھا وہی اسے کھلاتا تھا۔ اس کی کوئی خاص فکر نہ تھی۔ پر آج اسے معلوم ہوا کہ وہ اس کی اپنی نہیں ہے۔ اب اسے اس کی خاص طور پر دلجوئی کرنا ہوگی۔

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس کا گدھا چر کر چپ چاپ سر جھکائے چلا آرہا ہے۔ بھوندو نے کبھی اس کے کھانے پینے کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ آج بھوندو نے باہر آکر اسے پچکارا' اس کی پیٹھ سہلائی اور اسے پانی پلانے کے لیے ڈول اور رسی لے کر کنویں پر چلا گیا۔

(2)

اس کے دوسرے ہی دن گاؤں کے ایک امیر ٹھاکر کے گھر چوری ہوگئی۔ اس رات بھوندو اپنے ڈیرے پر نہ تھا۔ بنٹی نے چوکیدار سے کہا۔ ''کل جنگل سے نہیں لوٹا۔ صبح کے وقت بھوندو آپہنچا۔ اس کی کمر میں روپوں کی ایک تھیلی تھی۔ کچھ سونے کے گہنے تھے۔ بنٹی نے گہنے ایک درخت کے نیچے گاڑ دیے۔ روپوں کی کیا پہچان ہو سکتی تھی۔

بھوندو نے پوچھا۔ ''اگر کوئی پوچھے 'اتنے سارے روپے کہاں سے ملے تو کیا کہو گی؟''

بنٹی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ ''کہہ دوں گی کیوں بتاؤں۔ دنیا کماتی ہے تو کسی کو حساب دینے جاتی ہے۔ ہم اپنا حساب کیوں دیں؟''

بھوندو نے گردن ہلا کر کہا۔ ''یہ کہنے سے گلا نہ چھوٹے گا بنٹی۔ تو کہہ دینا میں کئی مہینے سے تین تین چار چار روپے مہینہ بچاتی آرہی ہوں۔ ہمارا خرچ ہی کون سا لمبا ہے۔''

دونوں نے مل کر کئی جواب سوچ لیے۔ جڑی بوٹیاں بیچتے ہیں' ایک ایک جڑی کے کئی کئی روپے مل جاتے ہیں۔ گھس' گھاس' جانوروں کی کھالیں سب بیچتے ہیں۔

اس طرف سے بے فکر ہو کر دونوں بازار چلے۔ بنٹی نے اپنے لیے کئی قسم کے کپڑے' چوڑیاں' بندے' سیندور' پان' تمباکو' تیل اور مٹھائی لی۔ پھر دونوں شراب کی دکان پر گئے۔ خوب شراب پی اور دو بوتلیں رات کے لیے لے کر گھومتے پھرتے' گاتے بجاتے' گھڑی رات گئے ڈیرہ پر آئے۔ بنٹی کے پاؤں آج زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنے کے ساتھ ہی بن ٹھن کر پڑوسنوں کو اپنی چھب دکھانے چلی گئی۔

جب وہ لوٹ کر اپنے گھر گئی اور کھانے پکانے لگی تو پڑوسنوں نے تنقید شروع کر دی۔ ''کہیں گہرا ہاتھ مارا ہے۔''

''بڑا دھرماتما بنا پھرتا ہے۔''

''بگلا بھگت ہے۔''

''بنٹی تو جیسے آج ہوا میں اڑ رہی ہے۔''

''آج بھوندو کی خاطر ہو رہی ہے ورنہ کبھی ایک لٹیا پانی بھی دینے نہ اٹھتی تھی۔''

اس رات بھوندو کو دیوی کی یاد آئی۔ آج تک اس نے کبھی دیوی کو بلیدان نہ دیا تھا۔ پولیس کو گانٹھنا کسی قدر مشکل تھا۔ کچھ خودداری بھی کھونی پڑتی تھی۔ دیوی صرف ایک بکرا لے کر خوش ہو جائے گی۔ ہاں اس سے ایک غلطی ضرور ہوئی تھی۔ اس کی برادری کے اور لوگ عام طور پر کوئی کام کرنے سے پہلے قربانی کرتے تھے۔ بھوندو نے یہ خطرہ نہ لیا۔ جب تک مال ہاتھ نہ لگ جائے اس میں سے دیوتاؤں کو کھلا دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ لوگوں سے اپنی چوری کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس نے کسی کو خبر نہ دی' یہاں تک کہ بنٹی سے بھی نہ کہا اور بکرے کی تلاش میں گھر سے نکلا۔

بنٹی نے پوچھا۔ ''اب کھانے کے بکھت کہاں چلے؟''

''ابھی آتا ہوں۔''

''مت جاؤ مجھے ڈر لگتا ہے۔''

بھوندو نے محبت کے اس نئے اظہار پر خوش ہو کر کہا۔ ''مجھے دیر نہ لگے گی۔ تو یہ گنڈاسا اپنے پاس رکھ لے۔''

اس نے گنڈاسا نکال کر بنٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور باہر نکلا۔ مگر بکرا کہاں ہے۔ آخر اس مشکل کو بھی اس نے ایک خاص طریقے سے حل کیا۔ قریب کی بستی میں ایک گڈریے کے پاس کئی بکرے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہاں سے ایک بکرا اٹھا لاؤں۔ دیوی کو اپنی قربانی سے غرض ہے یا اس سے کہ بکرا کہاں سے آیا اور کیوں آیا۔

لیکن بستی کے قریب پہنچا ہی تھا کہ پولیس کے چار آدمیوں نے اسے گرفتار کر لیا۔ اور مشکیں باندھ کر تھانے لے چلے۔

(3)

بنٹی کھانا پکا کر بناؤ سنگار کرنے لگی۔ آج اسے اپنی زندگی گلزار معلوم ہوتی تھی۔ مسرت سے کھلی جاتی تھی۔ آج اپنی عمر میں پہلی مرتبہ اس کے سر میں خوشبودار تیل پڑا۔ اس کا آئینہ خراب ہو گیا تھا۔ اس میں اب منہ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ آج وہ نیا آئینہ لائی تھی۔ اس کے سامنے بیٹھ کر اس نے بال سنوارے' منہ پر ابٹن ملا' صابن لانا وہ بھول گئی تھی۔ صاحب لوگ صابن لگانے ہی سے تو گورے ہو جاتے ہیں۔ صابن ہوتا تو اس کا رنگ بھی کچھ نکھر آتا۔ ایک ہی دن میں بالکل گوری تو نہ ہو جاتی لیکن رنگ ایسا سیاہ بھی نہ رہتا۔ کل وہ صابن کی ٹکیاں ضرور خرید لائے گی اور روز اس سے منہ دھوئے گی۔ بال سنوار کر اس نے ماتھے پر اسی کا لعاب لگایا کہ بال اِدھر اُدھر منتشر نہ ہو جائیں۔

پھر پان لگائے۔ چونا زیادہ ہو گیا تھا اس لیے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ لیکن اس نے سمجھا' شاید پان کھانے کا مزہ ہو۔ آخر کڑوی مرچ بھی تو لوگ مزے مزے سے کھاتے ہیں۔ لال رنگ کی ساڑی پہن کر اور پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کے آبنوسی رنگ پر سرخی دوڑ گئی۔ اپنے آپ کو دیکھ کر شرما گئی۔ افلاس کی آگ میں نسائیت بھی جل کر خاک سیاہ ہو جاتی ہے۔ نسائیت کی حیا کا ذکر ہی کیا ہے۔ میلے کچیلے کپڑے پہن کر شرمانا ایسا ہی ہے جیسے کوئی چنوں میں خوشبو لگا کر کھائے۔

اسی طرح بناؤ سنگار کر کے بنٹی بھوندو کی راہ دیکھنے لگی۔ جب دیر ہوگئی اور وہ نہ آیا تو اس پر جھنجھلا اٹھی۔ روج تو سانجھ سے دروا جے پر پڑے رہتے تھے۔ آج نہ جانے کہاں جا کر بیٹھ رہے۔ بنٹی کے سوکھے دل میں آج پانی پڑتے ہی اس کی نسائیت اگ آئی تھی۔ خفگی کے ساتھ اسے فکر بھی ہو رہی تھی۔ اس نے باہر نکل کر کئی مرتبہ پکارا۔ اس کی آواز میں ایسی شیرینی کبھی نہ تھی۔ اسے کئی مرتبہ شبہ ہوا کہ بھوندو آ رہا ہے۔ وہ دوسری مرتبہ سر کی کے اندر دوڑ آتی اور آئینہ میں اپنا منہ دیکھا کہ بگڑ نہ گیا ہو۔ ایسی دھڑکن ' ایسی الجھن اسے آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔

بنٹی شوہر کے انتظار میں ساری رات بے قرار رہی۔ جوں جوں رات گزرتی جاتی تھی' اس کے اندیشے بڑھتے جاتے تھے۔ آج ہی اس کی پر لطف زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ آج ہی یہ حال!

صبح جب وہ اٹھی تو ابھی کچھ اندھیرا ہی تھا۔ اس کا جسم شب بیداری سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ معاً کسی نے آکر اطلاع دی۔ بنٹی رات بھوندو پکڑا گیا۔

(4)

بنٹی تھانے پہنچی تو پسینہ میں بھیگی ہوئی تھی اور دم پھول رہا تھا۔ اسے بھوندو پر رحم نہ آتا تھا۔ غصہ آتا تھا۔ سارا زمانہ کام کرتا ہے اور چین کی بنسی بجاتا ہے۔ انہوں نے کہنے سننے پر ہاتھ بھی لگایا تو چوک گئے۔ شعور نہ تھا تو صاف کہہ دیتے کہ یہ کام مجھ سے نہ ہوگا۔ میں یہ تھوڑے ہی کہتی تھی کہ آگ میں کود پڑو۔

اسے دیکھتے ہی تھانیدار نے دھونس جمائی۔ "یہی تو ہے بھوندو کی عورت' اسے بھی پکڑ لو۔"

بنٹی نے اکڑ کر کہا۔ "ہاں ہاں پکڑ لو۔ یہاں کسی سے نہیں ڈرتے۔ جب ڈرنے کا کام نہیں کرتے تو ڈریں کیوں؟"

افسر اور ماتحت سب بنٹی کی طرف دیکھنے لگے۔ اس کا دل بھوندو کی طرف سے کچھ نرم ہو گیا۔ اب تک وہ دھوپ میں کھڑا تھا۔ اب اسے سائے میں لے آئے۔ اس نے ایک مرتبہ بنٹی کی طرف دیکھا۔ گویا کہہ رہا تھا۔ "دیکھنا کہیں ان لوگوں کے دھوکے میں نہ آجانا۔"

تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا۔ "ذرا اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو جیسے پاکیزگی کی دیوی ہی تو ہے مگر اس پھیر میں نہ رہنا۔ میں تم لوگوں کی نس نس سے واقف ہوں۔ تین سال کے لیے بھجوا دوں گا۔ تین سال کے لیے۔ صاف صاف کہہ دو اور سارا مال لوٹا دو' اسی میں خیریت ہے۔"

بھوندو نے بیٹھے بیٹھے کہا۔ "کیا کہہ دوں۔ جو لوگوں کو لوٹتے ہیں ان سے تو کوئی کچھ نہیں کہتا اور جو غریب محنت کی کمائی کھاتے ہیں ان کا گلا کاٹنے کو سبھی تیار ہو جاتے ہیں۔ ہمارا قصور صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس کسی کو دینے دلانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

تھانے دار نے سخت لہجہ میں کہا۔ "ہاں ہاں سکھا پڑھا دے بیوی کو کہ کہیں بھید نہ کھول دے۔ لیکن ان گیدڑ بھبکیوں سے بچ نہیں سکتا۔ تو نے اقبال نہ کر لیا تو تین سال کے لیے جائے گا۔ میرا کیا بگڑتا ہے۔ ارے چھوٹے سنگھ اسے پکڑ کر کوٹھری میں بند کر دے۔"

بھوندو نے بے پروائی سے کہا۔ "داروگا ساب! بوٹی بوٹی کاٹ ڈالو مگر کچھ ہاتھ نہ لگے گا۔ آپ کی دھمکیوں

کے آگے بڑے بڑے سیدھے ہو جاتے ہیں۔ میں دوسری قسم کا آدمی ہوں۔"

داروغہ صاحب کو یقین ہو گیا کہ اس فولاد کا جھکنا دشوار ہے۔ بھوندو کے بشرہ سے شیروں کا استقلال نظر آتا تھا۔ تھانے دار کا حکم پاتے ہی دو آدمیوں نے بھوندو کو پکڑ کر کمرے میں بند کر دیا۔ شوہر کی بے بسی دیکھ کر بنٹی کا سینہ پھٹا جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ کنجڑوں میں چوری کر کے اقبال کر لینا انتہادرجہ کی ذلت ہے۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا ہو؟ خدا جانے کتنی سزا ہو جائے۔ ممکن ہے تین ہی سال کے لیے چلا جائے۔ جان پر کھیل کر بولی۔

"داروگا جی! تم سمجھتے ہو گے۔ ان گریبوں کی پیٹھ پر کوئی نہیں ہے۔ لیکن بھگوان تو سب کچھ دیکھتے ہیں۔ بھلا چاہو تو ان کو چھوڑ دو۔ کید ہو گئے تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔"

تھانیدار نے مسکرا کر کہا۔ "تجھے کیا۔ یہ مر جائے گا کسی اور سے بیاہ کر لینا۔ جو کچھ چوری کر کے لایا ہو گا وہ تو تیرے ہی پاس ہو گا۔ کیوں نہیں اقبال کر کے چھڑا لیتی۔ میں وعدہ کرتا ہوں' مقدمہ نہ چلاؤں گا۔ سب مال لوٹا دے' تو نے ہی منتر دیا ہو گا۔ گلابی ساڑھی اور پان اور خوشبودار تیل کے لیے تو ہی بے قرار ہو رہی ہو گی۔ اس پر مقدمہ چل رہا ہے اور سامنے کھڑی دیکھ رہی ہے۔ عجیب عورت ہے۔"

بنٹی نے چند لمحے غور کیا اور پھر سر جھکا کر آہستہ سے بولی۔ "اچھا داروگا ساب! میں سب کچھ دے دوں گی ان پر حرف نہ آنے پائے۔"

(5)

بھوندو کو باہر نکالا گیا تو اس نے خائف ہو کر پوچھا۔ "کیوں کیا بات ہے؟"

ایک چوکیدار نے کہا۔ "تیری عورت نے اقبال کر لیا ہے۔"

بھوندو پہلی مرتبہ پھنسا تھا۔ اس کا سر چکر کھا رہا تھا اور آواز بند سی ہو گئی تھی لیکن یہ بات سنتے ہی جیسے بیدار ہو گیا۔ اس نے دونوں مٹھیاں کس لیں اور بولا۔ "کیا کہا؟"

"کیا کہا۔ چوری کھل گئی۔ داروغہ صاحب مال برآمد کرنے گئے ہیں۔ رات اقبال کر لیتے تو یہ نوبت کاہے کو آتی۔"

بھوندو نے گرج کر کہا۔ "وہ جھوٹ بولتی ہے۔"

"وہاں مال بھی برآمد ہو گیا تم ابھی تک اپنی گا رہے ہو۔"

اپنے آباؤ اجداد کی وضعداری اپنے ہاتھوں خاک میں ملتے دیکھ کر بھوندو کا سر جھک گیا۔ اس جگر سوز ذلت کے بعد اب اسے اپنی زندگی میں رسوائی اور نفرت اور بے عزتی کے سوائے اور کوئی چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ اب اس نے سوچا وہ اپنی برادری میں کسی کو منہ نہ دکھا سکے گا۔

یکایک بنٹی آ کر سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی کہ بھوندو کی خونخوار شکل دیکھ کر اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی بھوندو کا مجروح خاندانی وقار کچلے ہوئے سانپ کی طرح تڑپ اٹھا۔ اس نے بنٹی کو آتشیں آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی آگ جل رہی تھی۔ بنٹی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی اور الٹے پاؤں وہاں سے بھاگی۔

کسی دیوتا کے آہنی ہتھیاروں کے مانند وہ دونوں انگاروں کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھنے لگیں۔

تھانے سے نکل کر بنٹی نے سوچا اب کہاں جاؤں؟ بھوندو اس کے ساتھ ہوتا تو وہ پڑوسنوں کے طعنے برداشت کر سکتی تھی۔ لیکن انگارے کی سی آنکھیں اس کے دل میں چبھی جاتی تھیں۔ لیکن کل کی عیش و آرام کی چیزوں کا پیار اسے ڈیرے کی طرف کھینچنے لگا۔ شراب کی بوتل اب بھی بھری رکھی تھی۔ پھلوڑیاں چھینکے پر ہانڈی میں پڑی تھیں۔ وہ تشنہ آرزوئیں جو موت کو سامنے دیکھ کر بھی دنیا کی نعمتوں کی طرف دل کو مائل کرتی ہیں' اسے کھینچ کر ڈیرے کی طرف لے چلیں۔

دوپہر کا وقت تھا۔ وہ پڑاؤ پر پہنچی تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ابھی کچھ دیر قبل جو جگہ رنگینی حیات سے گلزار بنی ہوئی تھی' اب وہاں سوائے ویرانے کے اور کچھ بھی نہ تھا۔ یہ برادری کا انتقام تھا۔ سب نے سمجھ لیا کہ بھوندو اب ہمارا آدمی نہیں۔ صرف اس کی سرکی ویرانے میں گویا روتی ہوئی کھڑی تھی۔ بنٹی نے اس کے اندر پاؤں رکھا تو اس کی وہی حالت ہوئی جو خالی گھر کو دیکھ کر کسی چور کی ہوتی ہے۔ کون کون سی چیز اٹھائے۔ اس جھونپڑی میں اس نے رو رو کر پانچ برس کاٹے تھے لیکن آج اس سے وہ محبت پیدا ہو گئی تھی جو کسی ماں کے دل میں اپنے نالائق بیٹے کو دیکھ کر ہوتی ہے جو برسوں کے بعد پردیس سے لوٹا ہو۔ ہوا سے کچھ اشیاء ادھر ادھر ہو گئی تھیں۔ بنٹی کو شبہ ہوا کہ شاید اس پر کوئی بلی جھپٹی ہو۔ اس نے جلدی سے ہانڈی اتار کر دیکھا۔ پھلوڑیاں شاید کسی نے چھتیری تھیں۔ پانوں پر جو گیلا کپڑا لپٹا تھا وہ خشک ہو گیا تھا۔ اس نے اس پر پانی چھڑک دیا۔

کسی کے پاؤں کی آہٹ پا کر اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ بھوندو آ رہا تھا۔ اس کی وہ انگارے کی سی آنکھیں۔ بنٹی کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بھوندو کے غصہ کا اسے ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا تھا لیکن اس نے دل کو مضبوط کیا۔ کیوں مارے گا؟ کچھ سنے گا۔ سوال جواب کرے گا۔ یونہی گنڈاسا چلا دے گا۔ اس نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی۔ اسے آفت سے بچایا۔ مر جاد اجان سے پیاری نہیں ہوتی۔ بھوندو کو ہو گی۔ اسے نہیں ہے۔ کیا اتنی سی بات پر وہ اس کی جان لے گا۔

اس نے سرکی کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ بھوندو نہ تھا' اس کا گدھا آ رہا تھا۔ بنٹی اس بدبخت گدھے کو دیکھ کر ایسی خوش ہوئی جیسے اپنا بھائی میکے سے بتاشوں کی پوٹلی لیے تھکا ماندہ چلا آ رہا ہو۔ اس نے جا کر اس کی گردن سہلائی' اس کے تھوتھنے کو منہ سے لگا لیا۔ وہ اسے پھوٹی آنکھوں نہ بھاتا تھا پر آج اسے اپنا عزیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ وہ پھر کانپ اٹھی۔

اس نے سوچا کیا کسی طرح نہ چھوڑے گا۔ وہ روتی ہوئی اس کے پیروں پر گر پڑے گی۔ کیا تب بھی نہ چھوڑے گا۔ ان آنکھوں کی وہ کتنی تعریف کیا کرتا تھا۔ کیا آج ان میں آنسو دیکھ کر بھی اسے رحم نہ آئے گا۔ بنٹی نے مٹی کے پیالے میں شراب انڈیل کر پی اور پھلوڑیاں کھائیں۔ جی اسے مرنا ہی ہے تو دل میں حسرت کیوں رہ جائے۔ وہ دونوں انگارے سی آنکھیں اب بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے دوسرا پیالہ بھرا اور وہ بھی پی گئی۔ زہریلا ٹھرا جسے دوپہر کی گرمی نے اور بھی قاتل بنا دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے دماغ کو کھولانے لگا۔ بوتل آدھی رہ گئی۔

اس نے سوچا۔ بھوندو پوچھے گا تو نے اتنی دارو کیوں پی؟ تو وہ کیا کہے گی؟ کہہ دے گی۔ ہاں پی کیوں نہ پیتے۔ اسی کے لیے تو یہ سب کچھ ہوا۔ وہ ایک بوند نہ چھوڑے گی۔ جو ہونا ہے ہو جائے۔ بھوندو اسے مار نہ سکے گا۔ وہ

اتنا ظالم، اتنا کمینہ نہیں ہے۔ اس نے پھر پیالہ بھرا اور پی گئی۔ پانچ برس کی گزری ہوئی باتیں اسے یاد آنے لگیں۔ سیکڑوں مرتبہ دونوں میں لڑائیاں ہوتی تھیں ــــ آج بنٹی کو ہر مرتبہ اپنی ہی زیادتی معلوم ہو رہی تھی۔

بیچارہ جو کچھ کماتا ہے اسی کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ اپنے لیے ایک پیسہ کا تمباکو بھی لیتا ہے تو پیسہ اسی سے مانگتا ہے۔ صبح سے شام تک بن بن پھرتا ہے۔ جو کام اس سے نہیں ہوتا اسے کیوں ــــ

معاً ایک کانسٹبل نے آکر کہا۔ "ارے بنٹی کہاں ہے؟ چل کر دیکھ بھوندو کا کیا حال ہے۔ بے حال ہو رہا ہے۔ ابھی تک چپ چاپ بیٹھا تھا۔ پھر نہ جانے کیا جی میں آیا کہ ایک پتھر سر پر پٹک دیا۔ سر سے لہو بہہ رہا ہے۔ ہم لوگ دوڑ کر پکڑ نہ لیتے تو جان ہی دے دی تھی۔

(6)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ موسلا دھار برکھا ہو رہی تھی۔ بھوندو کی سر کی اب بھی اس ویرانی میں کھڑی تھی۔ بھوندو کھٹولی پر پڑا تھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑا تھا اور جسم مرجھا گیا تھا۔ وہ فکر مندانہ انداز سے بارش کی طرف دیکھتا ہے۔ چاہتا ہے اٹھ کر باہر دیکھوں مگر اٹھا نہیں جاتا۔

بنٹی سر پر گھاس کی گٹھری لیے پانی میں شرابور آتی دکھائی دی۔ وہی گلابی ساڑھی مگر تار تار۔ لیکن اس کا چہرہ کھلا ہوا ہے۔ رنج و افسوس کی جگہ اس کی آنکھوں سے محبت ٹپک رہی ہے۔ چال ایسی مستانہ ہے اور آنکھیں ایسی چمکتی ہیں کہ دیکھ کر جی خوش ہو جائے۔ بھوندو نے آہستہ آہستہ کہا۔ "تو اتنی بھیگ رہی ہے، کہیں بیمار پڑ گئی تو کوئی ایک گھونٹ پانی دینے والا بھی نہ رہے گا۔ میں کہتا ہوں تو اتنا کیوں مرتی ہے۔ دو گٹھے تو بیچ چکی تھی۔ اب یہ تیسرا گٹھا لانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ہانڈی میں کیا لائی ہے؟"

بنٹی نے ہانڈی کو چھپاتے ہوئے کہا۔ "کچھ بھی تو نہیں ہے، کیسی ہانڈی؟"

بھوندو زور لگا کر کھٹولی سے اٹھا۔ آنچل کے نیچے چھپی ہوئی ہانڈی کھولی اور اس کے اندر نظر ڈال کر بولا۔ "ابھی لوٹا نہیں تو ہانڈی پھوڑ دوں گا۔"

بنٹی نے دھوتی نچوڑتے ہوئے کہا۔ "ذرا آئینہ میں صورت دیکھو۔ گھی، دودھ کچھ نہ ملے گا تو کیسے اٹھو گے یا ہمیشہ چارپائی پر پڑے رہنے کا ارادہ ہے؟"

بھوندو نے کھٹولی پر لیٹے ہوئے کہا۔ "اپنے لیے ایک ساڑھی بھی نہیں لائی۔ میرے لیے گھی اور دودھ سب چاہیے۔ میں گھی نہ کھاؤں گا۔"

بنٹی نے مسکرا کر کہا۔ "اسی لیے تو گھی کھلاتی ہوں کہ تم جلدی سے کام دھندا کرنے لگو اور میرے لیے ساڑھی لاؤ۔"

بھوندو نے مسکرا کر کہا۔ "تو آج کہیں چوری کرنے جاؤں، کیوں؟"

بنٹی نے بھوندو کے گال پر آہستہ سے چپت لگا کر کہا۔ "پہلے میرا گلا کاٹ دینا پھر۔"

نجات

(1)

دکھّی چمار دروازے پر جھاڑو لگا رہا تھا اور اس کی بیوی جُھریا گھر کو لیپ رہی تھی۔ دونوں اپنے اپنے کام سے فراغت پا چکے تو چمارن نے کہا۔

''تو جا کر پنڈت بابا سے کہہ آؤ۔ ایسا نہ ہو کہیں چلے جائیں۔''

دکھی۔ ''ہاں جاتا ہوں لیکن یہ تو سوچ کہ بیٹھیں گے کس چیز پر؟''

جھریا۔ ''کہیں سے کوئی کھٹیا نہ مل جائے گی۔ ٹھکرانی سے مانگ لانا۔''

دکھی۔ ''تو تو کبھی کبھی ایسی بات کہہ دیتی ہے کہ بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ بھلا ٹھکرانے والے مجھے کھٹیا دیں گے؟ جا کر ایک لوٹا پانی مانگو تو نہ ملے۔ بھلا کھٹیا کون دے گا۔ ہمارے اوپلے' ایندھن' بھوسا' لکڑی تھوڑے ہی ہیں کہ جو چاہے اٹھالے جائے۔ اپنی کھٹولی دھو کر رکھ دے۔ گرمی کے تو دن ہیں۔ ان کے آتے آتے سوکھ جائے گی۔''

جُھریا۔ ''ہماری کھٹولی پر وہ نہ بیٹھیں گے۔ دیکھتے نہیں کتنے دھرم سے رہتے ہیں۔''

دکھی نے کسی قدر مغموم لہجہ میں کہا۔ ''ہاں یہ بات تو ہے۔ مہوے کے پتے توڑ کر ایک پتّل بنالوں' تو ٹھیک ہو جائے۔ پتّل میں بڑے آدمی کھاتے ہیں۔ وہ پاک ہے۔ لا تو لاٹھی' پتے توڑ لوں۔''

جھریا۔ ''پتّل میں بنالوں گی۔ تم جاؤ لیکن ہاں انہیں سیدھا بھی جائے اور تھالی بھی۔ چھوٹے بابا تھالی اٹھا کر پٹک دیں گے۔ وہ بہت جلد غصہ میں آجاتے ہیں۔ غصہ میں پنڈتانی تک کو نہیں چھوڑتے۔ لڑکے کو ایسا پیٹا کہ آج تک ٹوٹا ہاتھ لیے پھرتا ہے۔ پتّل میں سیدھا بھی دینا مگر چھونا مت۔ بھوری گونڈ کی لڑکی کو لے کر شاہ کی دکان سے چیزیں لے آنا۔ سیدھا بھرپور' سیر بھر آٹا' آدھ سیر چاول' پاؤ بھر دال' آدھ پاؤ گھی' نمک' ہلدی اور پتّل میں ایک کنارے چار آنہ کے پیسے رکھ دینا۔ گونڈ کی لڑکی نہ ملے تو پھر جن کے ہاتھ پیر جوڑ کے لے آنا۔ تم کچھ نہ چھونا ورنہ غجب ہو جائے گا۔''

ان باتوں کی تاکید کر کے دکھی نے لکڑی اٹھالی اور گھاس کا ایک بڑا سا گٹھا لے کر پنڈت جی سے عرض کرنے چلا۔ خالی ہاتھ بابا جی کی خدمت میں کس طرح جاتا۔ نذرانے کے لیے اس کے پاس گھاس کے سوا اور کیا تھا۔ اسے خالی دیکھ کر تو بابا جی دور ہی سے دھتکار دیتے۔

(2)

پنڈت گھاسی رام ایشور کے پرم بھگت تھے۔ نیند کھلتے ہی ایشور اپاسنا میں لگ جاتے' منہ ہاتھ دھوتے' آٹھ بجتے' تب اصلی پوجا شروع ہوتی۔ جس کا پہلا حصہ بھنگ کی تیاری تھی۔ اس کے بعد آدھ گھنٹہ تک چندن رگڑتے۔ پھر آئینے کے سامنے ایک تنکے سے پیشانی پر تلک لگاتے۔ چندن کے متوازی خطوط کے درمیان لال روئی کا ٹیکہ

ہوتا۔ پھر سینہ پر، دونوں بازوؤں پر چندن کے گول گول دائرے بناتے اور ٹھاکر جی کی مورتی نکال کر اسے نہلاتے۔ چندن لگاتے، پھول چڑھاتے، آرتی کرتے اور گھنٹی بجاتے۔ دس بجتے بجتے وہ پوجن سے اٹھتے اور بھنگ چھان کر باہر آتے۔ اس وقت دو چار دورازے پر آجاتے۔ ایشور اپاسنا کافی الفور پھل مل جاتا۔ یہی ان کی کھیتی تھی۔

آج وہ عبادت خانے سے نکلے تو دیکھا دکھی چمار گھاس کا ایک گٹھا لیے بیٹھا ہے۔ انہیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور نہایت ادب سے ڈنڈوت کر کے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایسا پُر جلال چہرہ دیکھ کر اس کا دل عقیدت سے پُر ہو گیا۔ کتنی تقدس مآب صورت تھی۔ چھوٹا سا گول مول آدمی، چکنا سر، پھولے ہوئے رخسار، روحانی جلال سے منور آنکھیں۔ اس پر روئی اور چندن نے دیوتاؤں کی تقدس عطا کر دی تھی۔ دکھی کو دیکھ کر شیریں لہجہ میں بولے۔

"آج کیسے چلا آیا رے دکھیا؟"

دکھی نے سر جھکا کر کہا۔ "بیٹا کی سگائی کر رہا ہوں مہاراج! ساعت شگن بچارنا ہے۔ کب مرجی ہو گی؟"

گھاسی۔ "آج تو مجھے چھٹی نہیں۔ شام تک آجاؤں گا۔"

دکھی۔ "نہیں مہاراج! جلدی مرجی ہو جائے۔ سب سامان ٹھیک کر آیا ہوں۔ یہ گھاس کہاں رکھ دوں؟"

گھاسی۔ "اس گائے کے سامنے ڈال دے۔ اور ذرا جھاڑو دے کر دروازہ تو صاف کر دے۔ یہ بیٹھک بھی کئی دن سے لیپی نہیں گئی۔ اسے بھی گوبر سے لیپ دے۔ تب تک میں بھوجن کر لوں۔ پھر ذرا آرام کر کے چلوں گا۔ ہاں یہ لکڑی بھی چیر دینا۔ کھلیان میں چار کھانچی بھوسہ پڑا ہے اسے بھی اٹھا لانا اور بھوسیلے میں رکھ دینا۔

دکھی فوراً حکم کی تعمیل کرنے لگا۔ دروازے پر جھاڑو لگائی۔ بیٹھک گوبر سے لیپا۔ اس وقت بارہ بج چکے تھے۔ پنڈت جی بھوجن کرنے چلے۔ دکھی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اسے بھی زور کی بھوک لگی۔ لیکن وہاں کھانے کو دھرا ہی کیا تھا۔ گھر یہاں سے میل بھر تھا۔ وہاں کھانے چلا جائے تو پنڈت جی بگڑ جائیں۔ بے چارے نے بھوک دبائی اور لکڑی پھاڑنے لگا۔ لکڑی کی موٹی سی گرہ تھی جس پر کتنے بھگتوں نے اپنا زور آزما لیا تھا۔ وہ اسی دم خم کے ساتھ لوہے سے لوہا لینے کے لیے تیار تھی۔ دکھی گھاس چھیل کر بازار لے جاتا۔ لکڑی چیرنے کا اسے محاورہ نہ تھا۔ گھاس اس کے کھرپے کے سامنے سر جھکا دیتی تھی۔ یہاں کس کس کر کلہاڑی کا بھرپور ہاتھ جماتا لیکن اس گرہ پر نشان تک نہ پڑتا۔ کلہاڑی اچٹ جاتی۔ پسینہ سے تر تھا۔ ہانپتا تھا، تھک کر بیٹھ جاتا تھا، پھر اٹھتا تھا۔ ہاتھ اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ پاؤں کانپ رہے تھے۔ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پھر بھی اپنا کام کیے جاتا تھا۔ اگر ایک چلم تمباکو پینے کو مل جاتا تو شاید کچھ طاقت آجاتی۔ اس نے سوچا۔ یہاں چلم اور تمباکو کہاں ملے گا۔ برہمنوں کا گاؤں ہے۔ برہمن ہم سے نیچ جاتوں کی طرح تمباکو تھوڑا ہی پیتے ہیں۔ یکایک اسے یاد آیا کہ گاؤں میں ایک گونڈ بھی رہتا ہے۔ اس کے یہاں ضرور چلم تمباکو ہو گی۔ فوراً اس کے گھر دوڑا۔ خیر محنت سپھل ہوئی۔ اس نے تمباکو اور چلم دی لیکن آگ وہاں نہ تھی۔

دکھی نے کہا۔ "آگ کی فکر نہ کرو بھائی، پنڈت جی کے گھر سے آگ مانگ لوں گا۔ وہاں تو ابھی رسوئی بن رہی تھی۔"

یہ کہتا ہوا وہ دونوں چیزیں لے کر چلا اور پنڈت جی کے گھر میں دالان کے دروازہ پر کھڑا ہو کر بولا۔ "مالک ذرا سی آگ مل جائے تو چلم پی لیں۔"

پنڈت جی بھوجن کر رہے تھے۔ پنڈتانی نے پوچھا۔ "یہ کون آدمی آگ مانگ رہا ہے؟"

"تو دے دو۔"

پنڈ تانی نے بھنویں چڑھا کر کہا۔ "تمہیں تو جیسے پوڑی پیڑے کے پھیر میں دھرم کرم کی سدھ بھی نہ رہی۔ چمار ہوا' دھوبی ہوا' پاسی ہو' منہ اٹھائے گھر میں چلے آئے۔ پنڈت کا گھر نہ ہوا' کوئی سرائے ہوئی۔ کہہ دو ڈیوڑھی سے چلا جائے ورنہ اسی آگ سے منہ جھلس دوں گی۔ بڑے آگ مانگنے چلے ہیں۔"

پنڈت جی نے انہیں سمجھا کر کہا۔ "اندر آ گیا تو کیا ہوا۔ تمہاری کوئی چیز تو نہیں چھوئی' زمین پاک ہے۔ ذرا سی آگ کیوں نہیں دے دیتیں۔ کام تو ہمارا ہی کر رہا ہے۔ کوئی لکڑ ہارا یہی لکڑی پھاڑتا تو کم از کم چار آنے لیتا۔"

پنڈ تانی نے گرج کر کہا۔ "وہ گھر میں آیا ہی کیوں؟"

پنڈت نے ہار کر کہا۔ "سسرے کی بدقسمتی تھی۔"

پنڈ تانی۔ "اچھا اس وقت تو آگ دے دیتی ہوں لیکن پھر جو اس گھر میں آئے گا تو منہ جھلس دوں گی۔"

دکھی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنک پڑ رہی تھی۔ بے چارا پچھتا رہا تھا۔ ناحق چلا آیا۔ سچ تو کہتی ہیں۔ پنڈت کے گھر چمار کیسے آئے۔ یہ لوگ پاک صاف ہوتے ہیں تب ہی تو اتنا مان ہے۔ چر چمار تھوڑے ہی ہیں۔ اسی گاؤں میں بوڑھا ہو گیا مگر مجھے اتنی اکل (عقل) بھی نہ آئی۔ اسی لیے جب پنڈ تانی جی آگ لے کر نکلیں تو جیسے اسے جنت مل گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر زمین پر سر جھکاتا ہوا بولا۔ "پنڈ تانی ماتا! مجھ سے بڑی بھول ہوئی کہ گھر میں چلا آیا۔ چمار کی اکل (عقل) ہی تو ٹھہری۔ اتنے مورکھ نہ ہوتے تو سب کی لات کیوں کھاتے؟"

پنڈ تانی چمٹے سے پکڑ کر آگ لائی تھی۔ انہوں نے پانچ ہاتھ کے فاصلہ پر گھونگھٹ کی آڑ سے دکھی کی طرف آگ پھینکی۔ ایک بڑی سی چنگاری اس کے سر پر پڑ گئی۔ جلدی سے پیچھے ہٹ کر جھاڑنے لگا۔ اس کے دل نے کہا۔ یہ ایک پاک برہمن کے گھر کو ناپاک کرنے کا نتیجہ ہے۔ بھگوان نے کتنی جلدی سزا دے دی۔ اسی لیے تو دنیا پنڈتوں سے ڈرتی ہے۔ اور سب کے روپے مارے جاتے ہیں۔ برہمن کے روپے بھلا کوئی مار تو لے۔ گھر بھر کا ستیاناس ہو جائے۔ ہاتھ پاؤں گل گل گرنے لگیں۔

باہر آ کر چلم پی اور کلہاڑی لے کر مستعد ہو گیا۔ کھٹ کھٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ سر پر آگ پڑ گئی تو پنڈ تانی کو کچھ رحم آ گیا۔ پنڈت جی کھانا کھا کر اٹھے تو بولیں۔ "اس چمرا کو بھی کچھ کھانے کو دے دو۔ بے چارہ کب سے کام کر رہا ہے۔ بھوکا ہو گا۔"

پنڈت جی نے اس کی تجویز کو فنا کر دینے کے ارادے سے پوچھا۔

"روٹیاں ہیں؟"

پنڈ تانی۔ "دو چار بچ جائیں گی۔"

پنڈت۔ "دو چار روٹیوں سے کیا ہو گا؟ یہ چمار ہے کم از کم سیر بھر چڑھا جائے گا۔"

پنڈ تانی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ "ارے باپ رے۔ سیر بھر' تو پھر رہنے دو۔"

پنڈت جی نے اب تیر بن کر کہا۔ "کچھ بھوسی چوکر ہو تو آٹے میں ملا کر موٹی موٹی روٹیاں توے پر ڈال دو۔ سالے کا پیٹ بھر جائے گا۔ پتلی روٹیوں سے ان کمینوں کا پیٹ نہیں بھرتا۔ انہیں تو جوار کا ٹکڑ چاہیے۔"

پنڈ تانی نے کہا۔ "اب جانے بھی دو' دھوپ میں مرے۔"

(3)

دکھی نے چلم پی کر کلہاڑی سنبھالی۔ دم لینے سے ذرا ہاتھوں میں طاقت آ گئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹہ تک پھر کلہاڑی چلاتا رہا۔ پھر بے دم ہو کر وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اتنے میں وہی گونڈ آ گیا۔ بولا "بوڑھے دادا جان کیوں دم دیتے ہو۔ تمہارے پھاڑے یہ گانٹھ نہ پھٹے گی۔ ناحق ہلکان ہوتے ہو۔"

دکھی نے پیشانی کا پسینہ صاف کر کے کہا۔ "بھائی ابھی گاڑی بھر بھوسہ ڈھونا ہے۔"

گونڈ۔ "کچھ کھانے کو بھی دیا یا کام ہی کروانا جانتے ہیں۔ جا کے مانگتے کیوں نہیں"

دکھی۔ "تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ بھلا برہمن کی روٹی ہم کو پچے گی؟"

گونڈ۔ "پچنے کو تو پچ جائے گی۔ مگر ملے تو۔ خود تو مونچھوں پر تاؤ دے کر کھانا کھایا اور آرام سے سو رہے ہیں۔ تمہارے لیے لکڑی پھاڑنے کا حکم لگا دیا۔ زمیندار بھی کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ یہ اس سے بھی بڑھ گئے۔ اس پر دھرماتما بنتے ہیں۔"

دکھی نے کہا۔ "بھائی آہستہ بولو کہیں سن لیں گے تو بس!"

یہ کہہ کر دکھی پھر سنبھل پڑا اور کلہاڑی چلانے لگا۔ گونڈ کو اس پر رحم آ گیا۔ کلہاڑی ہاتھ سے چھین کر تقریباً نصف گھنٹہ تک جی توڑ کر چلاتا رہا لیکن گانٹھ پر ذرا بھی نشان نہ ہوا۔ بالآخر اس نے کلہاڑی پھینک دی اور یہ کہہ کر چلا گیا۔ "یہ تمہارے پھاڑے نہ پھٹے گی۔ خواہ تمہاری جان ہی کیوں نہ نکل جائے۔"

دکھی سوچنے لگا۔ یہ گانٹھ انہوں نے کہاں سے رکھ چھوڑی تھی کہ پھاڑے نہیں پھٹتی۔ میں کب تک اپنا خون پسینہ ایک کروں گا۔ ابھی گھر پر سو کام پڑے ہیں۔ کام کاج والا گھر ہے ایک نہ ایک چیز گھٹتی رہتی ہے مگر انہیں اس کی کیا فکر؟ چلوں جب تک بھوسہ ہی اٹھا لاؤں۔ کہہ دوں گا آج تو لکڑی نہیں پھٹی کل آ کر پھاڑ دوں گا۔

اس نے ٹوکرا اٹھایا اور بھوسہ ڈھونے لگا۔ کھلیان یہاں سے دو فرلانگ سے کم نہ تھا۔ اگر ٹوکرا خوب بھر بھر کر لاتا تو کام جلدی ہو جاتا۔ مگر سر پر اٹھاتا کون؟ خود اس سے نہ اٹھ سکتا۔ اس لیے تھوڑا تھوڑا لاتا تھا۔ چار بجے بھوسہ ختم ہوا۔ پنڈت کی نیند بھی کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کر پان کھایا اور باہر نکلے۔ دیکھا تو دکھی ٹوکرے پر سر رکھے سو رہا ہے۔ زور سے بولے۔ "اے دکھیا! تو سو رہا ہے۔ لکڑی تو ابھی جوں کی توں پڑی ہے۔ اتنی دیر تو کیا کرتا رہا؟ مٹھی بھر بھوسہ اٹھانے میں شام کر دی۔ اس پر سو رہا ہے۔ کلہاڑی اٹھا لے اور لکڑی پھاڑ ڈال۔ تجھ سے ذرہ بھر لکڑی بھی نہیں پھٹتی۔ پھر ساعت بھی ویسی ہی نکلے گی۔ مجھے دوش مت دینا۔ اسی لیے تو کہتے ہیں جہاں نیچ کے گھر کھانے کو ہوا اس کی آنکھ بدل جاتی ہے۔"

دکھی نے پھر کلہاڑی اٹھائی۔ جو باتیں اس نے پہلے سوچ رکھی تھیں، وہ سب بھول گیا۔ پیٹ پیٹھ میں دھنسا جاتا تھا۔ دل ڈوبا جاتا تھا۔ پر دل کو سمجھا کر اٹھا۔ پنڈت ہیں۔ کہیں ساعت ٹھیک نہ بچاریں تو پھر سفینہ ناس ہو جائے۔ تب ہی تو ان کا دنیا میں اتنا مان ہے۔ ساعت ہی کا تو سب کھیل ہے۔ جسے چاہیں بنا دیں، جسے چاہیں بگاڑ دیں گے۔ پنڈت جی گانٹھ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے اور حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ "ہاں مار کس کے۔ اور کس کے مار۔ ایسے زور سے مار، تیرے ہاتھوں میں جیسے دم ہی نہیں۔ لگا کس کے۔ کھڑا کھڑا سوچنے کیا لگتا ہے۔ ہاں بس پھٹا ہی چاہتی ہے۔ اس سوراخ میں۔"

دکھی اپنے ہوش میں نہ تھا۔ نہ معلوم کوئی غیبی طاقت اس کے ہاتھوں کو چلا رہی تھی۔ تکان' بھوک' پیاس کمزوری سب کے سب جیسے ہوا ہو گئی تھیں۔ اسے اپنے قوتِ بازو پر خود تعجب ہو رہا تھا۔ ایک ایک چوٹ پہاڑ کی مانند پڑتی تھی۔ آدھ گھنٹے تک وہ اسی طرح بے خبری کی حالت میں ہاتھ چلاتا رہا۔ حتیٰ کہ لکڑی بیچ سے پھٹ گئی اور دکھی کے ہاتھ سے کلہاڑی چھوٹ کر گر پڑی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی چکر کھا کر گر پڑا۔ بھوکا پیاسا تکان خوردہ جسم جواب دے گیا۔ پنڈت جی نے پکارا۔ "اٹھ کر دو چار ہاتھ اور لگا دے۔ پتلی پتلی چیلیاں ہو جائیں۔"

پنڈت جی نے اب اسے دق کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اندر جا کر بُوٹی چھانی۔ حاجات ضروری سے فارغ ہوئے' نہایا اور پنڈتوں کا لباس پہن کر باہر نکلے۔ دکھی ابھی تک وہیں پڑا ہوا تھا۔ زور سے پکارا۔ "اے دکھی! کیا پڑے ہی رہو گے۔ چلو تمہارے ہی گھر چل رہا ہوں۔ سب سامان ٹھیک ہے نا؟"

دکھی پھر بھی نہ اٹھا۔

اب پنڈت جی کو کچھ فکر ہوئی۔ پاس جا کر دیکھا تو دکھی اکڑا ہوا پڑا تھا۔ بد حواس ہو کر بھاگے اور پنڈتانی سے بولے۔ "دکھیا تو جیسے مر گیا۔"

پنڈتانی جی تعجب انگیز لہجہ میں بولیں۔ "ابھی تو لکڑی چیر رہا تھا نا!؟"

"ہاں لکڑی چیرتے چیرتے مر گیا۔ اب کیا ہو گا؟"

پنڈتانی نے مطمئن ہو کر کہا۔ "ہو گا کیا' چمروٹے میں کہلا بھیجو مردہ اٹھا لے جائیں۔"

دم کے دم میں یہ خبر گاؤں میں پھیل گئی۔ گاؤں میں زیادہ تر برہمن ہی تھے۔ صرف ایک گھر گونڈ کا تھا۔ لوگوں نے ادھر کا راستہ چھوڑ دیا۔ کنویں کا راستہ ادھر ہی سے تھا۔ پانی کیوں کر بھرا جائے؟ چمار کی لاش کے پاس ہو کر پانی بھرنے کون جائے۔ ایک بڑھیا نے پنڈت جی سے کہا۔ "مردہ کیوں نہیں اٹھواتے' کوئی گاؤں میں پانی پیے گا یا نہیں؟"

ادھر گونڈ نے چمروٹے میں جا کر سب سے کہہ دیا۔ "خبردار مردہ اٹھانے مت جانا۔ ابھی پولیس کی تحقیقات ہو گی۔ دل لگی ہے کہ ایک غریب کی جان لے لی۔ پنڈت ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ لاش اٹھاؤ گے تو تم بھی پکڑے جاؤ گے۔"

اس کے بعد ہی پنڈت جی پہنچے۔ پر چمروٹے میں کوئی آدمی لاش اٹھا لانے کو تیار نہ ہوا۔ ہاں دکھی کی بیوی اور لڑکی دونوں ہائے ہائے کرتی وہاں سے چلیں اور پنڈت جی کے دروازے پر آ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگیں۔ ان کے ساتھ دس پانچ اور چمارنیں تھیں۔ کوئی روتی تھی' کوئی سمجھاتی تھی۔ پر چمار ایک بھی نہ تھا۔ پنڈت جی نے ان سب کو بہت دھمکایا' سمجھایا' منت کی۔ پر چماروں کے دل پر پولیس کا ایسا رعب چھایا کہ ایک بھی من نہ سکا آخر ناامید ہو کر لوٹ آئے۔

(4)

آدھی رات تک رونا پیٹنا جاری رہا۔ دیوتاؤں کا سونا مشکل ہو گیا۔ مگر لاش اٹھانے کوئی چمار نہیں آیا اور برہمن چمار کی لاش کیسے اٹھاتے؟ بھلا ایسا کسی شاستر پوران میں لکھا ہو' کہیں کوئی دکھا دے۔

پنڈتانی نے جھنجھلا کر کہا۔ "ان ڈائنوں نے تو کھوپڑی چاٹ ڈالی۔ ان سبھوں کا گلا بھی نہیں تھکتا۔"

پنڈت نے کہا۔ "چڑیلوں کو رونے دو۔ کب تک روئیں گی۔ جیتا تھا تو کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ مر گیا تو شور و غل مچانے کے لیے سب کی سب آ پہنچیں۔"

پنڈتانی۔ "چماروں کا رونا منحوس ہوتا ہے؟"

پنڈت۔ "ہاں بہت منحوس۔"

پنڈتانی۔ "ابھی سے بو آنے لگی۔"

پنڈت۔ "چمار تھا سسرا کہیں کا۔ ان سبھوں کو کھانے پینے میں کوئی بچار نہیں ہوتا۔"

پنڈتانی۔ "ان لوگوں کو نفرت بھی نہیں معلوم ہوتی۔"

پنڈت۔ "سب کے سب بھرشٹ ہیں۔"

رات تو کسی طرح کٹی مگر صبح بھی کوئی چمار نہ آیا۔ چمارنی بھی رو پیٹ کر چلی گی۔ بد بو پھیلنے لگی۔

پنڈت جی نے ایک رسی نکالی۔ اس کا پھندا بنا کر مردے کے پیر میں ڈالا اور پھندے کو کھینچ کر کس دیا۔ بھی کچھ اندھیرا تھا۔ پنڈت جی نے رسی پکڑ کر لاش کو گھسیٹنا شروع کیا اور گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے۔

وہاں سے آکر فوراً نہائے۔ درگا پاٹھ پڑھا اور سر میں گنگا جل چھڑکا۔

ادھر دکھی کی لاش کو کھیت میں گیڈر، گدھ اور کوے نوچ رہے تھے۔ یہی اس کی تمام زندگی کی بھگتی، خدمت اور اعتقاد کا انعام تھا۔

دو بہنیں

(1)

دو بہنیں دو سال کے بعد ایک تیسرے عزیز کے گھر ملیں اور خوب رو دھو کر خاموش ہوئیں تو بڑی بہن روپ کماری نے دیکھا کہ چھوٹی بہن رام دلاری سر سے پاؤں تک گہنوں سے لدی ہے۔ کچھ اس کا رنگ کھل گیا ہے۔ مزاج میں کچھ تمکنت آ گئی ہے اور بات چیت کرنے میں زیادہ مشاق ہو گئی ہے۔ بیش قیمت ساری اور بیل دار عنابی مخمل کے جمپر نے اس کے حسن کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ وہی رام دلاری جو لڑکپن میں سر کے بال کھولے پھوہڑ سی ادھر ادھر کھیلا کرتی تھی۔ آخری بار روپ کماری نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا، دو سال قبل تب بھی اس کی شکل و صورت میں کچھ زیادہ تغیر نہ ہوا تھا۔ لمبی تو ہو گئی مگر تھی اتنی ہی دبلی، اتنی ہی زرد رُو، اتنی ہی بد تمیز۔ ذرا ذرا سی بات پر روٹھنے والی۔ مگر آج تو حالت ہی کچھ اور تھی جیسے کلی کھل گئی ہو اور حسن اس نے کہا چھپا رکھا تھا۔ نہیں نظروں کو دھوکا ہو رہا ہے یہ حسن نہیں محض دیدہ زیبی ہے۔ ریشم اور مخمل اور سونے کی بدولت نقشہ تھوڑا ہی بدل جائے گا۔ پھر بھی وہ آنکھیں آنکھوں میں سمائی جاتی ہیں۔ پچاسوں عورتیں جمع ہیں مگر یہ سحر کشش اور کسی میں نہیں اور اس کے دل میں حسد کا ایک شعلہ سا دہک اٹھا۔

کہیں آئینہ ملتا تو اپنی صورت بھی دیکھتی۔ گھر سے چلتے وقت اس نے اپنی صورت دیکھی تھی۔ اسے چمکانے کے لئے جتنا صیقل کر سکتی تھی وہ کیا تھا لیکن اب وہ صورت، جیسے یادداشت مٹ گئی ہے۔ اس کی ایک دھندلی سی پرچھائیں ذہن میں ہے۔ اسے وہ پھر سے دیکھنے کے لیے بے قرار ہو رہی ہے۔ یوں تو اس کے پاس میک اپ کے لوازمات کے ساتھ آئینہ بھی ہے لیکن مجمع میں وہ آئینہ دیکھنے یا بناؤ سنگار کرنے کی عادی نہیں ہے۔ یہ عورتیں دل میں خدا جانے کیا سمجھیں۔ یہاں کوئی آئینہ ہو گا ہی۔

ڈرائنگ روم میں تو ضرور ہو گا۔ وہ اٹھ کر ڈرائنگ روم میں گئی اور قد آدم شیشہ میں اپنی صورت دیکھی اس کے خدوخال بے عیب ہیں مگر وہ تازگی، وہ شگفتگی، وہ نظر فریبی نہیں ہے۔ ہاں نہیں ہے۔ وہ رام دلاری آج کھلی ہے۔ اسے کھلے زمانہ ہو گیا لیکن اس خیال سے اسے تسکین نہیں ہوئی۔ وہ رام دلاری سے ہیٹی بن کر نہیں رہ سکتی۔ مرد بھی کتنے احمق ہوتے ہیں۔ کسی میں اصل حسن کی پرکھ نہیں۔ انہیں نوجوانی اور شوخی اور نفاست چاہیے۔ آنکھیں رکھ کر بھی اندھے بنتے ہیں۔ میرے کپڑوں میں رام دلاری کو کھڑا کر دو۔ پھر دیکھو یہ سارا جادو کہاں اڑ جاتا ہے۔ چڑیل سی نظر آئے۔ ان احمقوں کو کون سمجھائے۔

رام دلاری کے گھر والے تو اتنے خوش حال نہ تھے۔ شادی میں جو جوڑے اور زیور آئے تھے وہ بہت دل شکن تھے۔ امارت کا کوئی دوسرا سامان ہی نہ تھا۔ اس کے سسر ایک ریاست میں مختار تھے اور شوہر کالج میں پڑھتا تھا۔ اس دو سال میں کیسے ہن برس گیا۔ کون جانے زیور کسی سے مانگ لائی ہو۔ کپڑے بھی دو چار دن کے لئے مانگ لیے ہوں۔ اسے یہ سوانگ مبارک رہے۔ میں جیسی ہوں ویسی ہی اچھی ہوں۔ اپنی حیثیت کو بڑھا کر دکھانے کا مرض کتنا بڑھتا جاتا ہے۔ گھر میں روٹیوں کا ٹھکانا نہیں ہے لیکن اس طرح بن ٹھن کر نکلیں گی گویا کہیں کی راجکماری ہیں۔ بساطیوں کے، بزاز کے اور درزی کے تقاضے سہیں گی۔ شوہر کی گھڑکیاں کھائیں گی، روئیں گی، روٹھیں گی مگر نمائش کے جنون کو نہیں روک سکتیں۔ گھر والے بھی سوچتے ہوں گے کتنی چھچھوری طبیعت ہے اس کی۔ مگر یہاں تو بے وفائی پر کمر باندھ لی، کوئی کتنا ہی ہنسے بے حیا کی بلا دور۔ بس یہی دھن سوار ہے کہ جدھر سے نکل جائیں ادھر اس کی خوب تعریفیں کی جائیں۔ رام دلاری نے ضرور کسی سے زیور اور کپڑے مانگ لیے ہیں، بے شرم جو ہے۔

اس کے چہرے پر غرور کی سرخی جھلک پڑی۔

نہ سہی اس کے پاس زیور اور کپڑے۔ کسی کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہونا پڑتا۔ ایک ایک لاکھ کے تو اس کے دو لڑکے ہیں۔ بھگوان انہیں زندہ اور سلامت رکھے۔ وہ اسی میں خوش ہے۔ خود اچھا پہننے اور کھا لینے سے ہی زندگی کا مقصد پورا نہیں ہو جاتا۔ اس کے گھر والے غریب ہیں، پر عزت تو ہے۔ کسی کا گلا تو نہیں دباتے، کسی کی بد دعا تو نہیں لیتے۔

اس طرح اپنا دل مضبوط کر کے وہ پھر برآمدے میں آئی تو رام دلاری نے جیسے رحم کی آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ”جیجا جی کی کچھ ترقی ورقی ہوئی کہ نہیں بہن یا ابھی تک وہی پچھتر روپے پر قلم گھس رہے ہیں۔“ روپ کماری کے بدن میں آگ سی لگ گئی۔ افوہ رے دماغ، گویا اس کا شوہر لاٹ ہی تو ہے۔ اکڑ کر بولی۔ ”ترقی کیوں نہیں ہوئی۔ اب سو کے گریڈ میں ہیں۔ آج کل یہ غنیمت ہے۔ میں تو اچھے اچھے ایم۔ اے پاسوں کو دیکھتی ہوں کہ کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا۔ تیرا شوہر اب بی۔ اے میں ہو گا۔“

”انہوں نے تو پڑھنا چھوڑ دیا بہن۔ پڑھ کر اوقات خراب کرنا تھا اور کیا۔ ایک کمپنی کے ایجنٹ ہو گئے

ں۔اب ڈھائی سو روپے ماہوار پاتے ہیں، کمیشن اوپر سے۔پانچ روپے روز سفر خرچ کے بھی ملتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ نچ سو کا اوسط پڑ جاتا ہے۔ڈیڑھ سو روپے ماہوار تو ان کا ذاتی خرچ ہے بہن۔اونچے عہدے پر ہیں تو اچھی حیثیت بھی ائے رکھنی لازم ہے۔ساڑھے تین سو روپے بے داغ گھر دے دیتے ہیں۔اس میں سو روپے مجھے ملتے ہیں' ڈھائی سو وپے میں گھر کا خرچ خوش فعلی سے چل جاتا ہے۔ایم۔اے پاس کر کے کیا کرتے۔"

روپ کماری اسے شیخ چلی کی داستان سے زیادہ وقعت نہ دینا چاہتی تھی۔ مگر رام دلاری کے لہجے میں اتنی مداقت ہے کہ تحت الشعور میں وہ اس سے متاثر ہو رہی ہے اور اس کے چہرے پر خفت اور شکست کی بدمزگی صاف ملک رہی ہے۔ مگر اسے اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھنا ہے تو اس اثر کو دل سے مٹا دینا پڑے گا۔اسے جرحوں سے پنے دل کو یقین کرا دینا پڑے گا کہ اس میں ایک چوتھائی سے زیادہ حقیقت نہیں۔ وہاں تک وہ برداشت کرے گی۔ ں سے زیادہ کیسے برداشت کر سکتی ہے۔اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں دھڑکن بھی ہے کہ کہیں یہ روداد سچ نکلی وہ کیسے رام دلاری کو منہ دکھائے گی۔اسے اندیشہ ہے کہ کہیں اس کی آنکھوں سے آنسو نہ نکل پڑیں۔ کہاں پچھتّر ر کہاں پانچ سو۔اتنی بڑی رقم اگر ضمیر کا خون کر کے بھی کیوں نہ ملے پھر بھی روپ کماری اس کی متحمل نہیں ہو لتی۔ ضمیر کی قیمت زیادہ سے زیادہ سو روپیہ ہو سکتی ہے۔پانچ سو کسی حالت میں نہیں۔

اس نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔"جب ایجنسی میں اتنی تنخواہ اور بھتّے ملتے ہیں تو کالج بند کیوں نہیں و جاتے؟ ہزاروں لڑکے کیوں اپنی زندگی خراب کرتے ہیں۔"

رام دلاری بہن کی خفت کا مزہ اٹھاتی ہوئی بولی۔"بہن تم یہاں غلطی کر رہی ہو۔ایم۔اے تو سب ہی پاس و سکتے ہیں مگر ایجنسی کرنی کس کو آتی ہے۔یہ خداداد ملکہ ہے۔کوئی زندگی بھر پڑھتا رہے مگر ضروری نہیں کہ وہ پھا ایجنٹ ہو جائے۔روپیہ پیدا کرنا دوسری چیز ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا دوسری چیز ہے۔اپنے مال کی خوبی کا قین پیدا کرنا' یہ ذہن نشین کرا دینا کہ اس سے ارزاں اور دیرپا چیز بازار میں مل ہی نہیں سکتی آسان کام نہیں ہے۔ یک سے ایک گاہکوں سے ان کا سابقہ پڑتا ہے۔ بڑے بڑے راجاؤں اور رئیسوں کا تالیفِ قلب کرنی پڑتی ہے۔ روں کی تو ان راجاؤں اور نوابوں کے سامنے جانے کی ہمت بھی نہ پڑے اور کسی طرح پہنچ جائیں تو زبان نہ نکلے۔ روع شروع میں انہیں بھی جھجک ہوئی تھی۔ مگر اب تو اس دریا کے مگرمچھ ہیں۔اگلے سال ترقی ہونے والی ہے۔"

روپ کماری کی رگوں میں جیسے خون کی حرکت بند ہوتی جا رہی ہے۔ ظالم آسمان کیوں نہیں گر پڑتا۔بے رحم مین کیوں نہیں پھٹ جاتی۔یہ کہاں کا انصاف ہے کہ روپ کماری جو حسین ہے' تمیزدار ہے' کفایت شعار ہے۔اپنے وہر پر جان دیتی ہے۔ بچوں کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہے اس کی زندگی اس خستہ حالی میں بسر ہو اور یہ بدتمیز' ن پرور' چنچل چھوکری رانی بن جائے۔ مگر اب کچھ امید باقی تھی۔شاید اس کی تسکینِ قلب کا کوئی راستہ نکل آئے۔

اسی تمسخر کے انداز سے بولی۔"تب تو شاید ایک ہزار ملنے لگیں گے۔"

"ایک ہزار تو نہیں مگر چھ سو میں شبہ نہیں۔"

"کوئی آنکھ کا اندھا مالک بن گیا ہو گا۔"

"بیوپاری آنکھ کے اندھے نہیں ہوتے۔جب تم انہیں چھ ہزار کما کر دو تب کہیں چھ سو ملیں۔جو ساری نیا کو چرائے' اسے کوئی کیا بیوقوف بنائے گا۔"

تمسخر سے کام چلتے نہ دیکھ کر روپ کماری نے تحقیر شروع کی۔"میں تو اس کو بہت معزز پیشہ نہیں

سمجھتی۔ سارے دن جھوٹ کے طومار باندھو۔ یہ تو ٹھگ بدیا ہے۔"

رام دلاری زور سے ہنسی۔ روپ کماری پر اس نے کامل فتح پالی تھی۔ "اس طرح تو جتنے وکیل بیرسٹر ہیں سب ہی ٹھگ بدیا کرتے ہیں۔ اپنے موکل کے فائدے کے لیے انہیں اپنی سبھاؤں کا صدر بناتے ہیں۔ ان کی گاڑیاں کھینچتے ہیں۔ ان پر پھولوں کی اور زر و جواہر کی برکھا کرتے ہیں۔ آج کل دنیا پیسہ دیکھتی ہے۔ پیسے کیسے آئے یہ کوئی نہیں دیکھتا۔ جس کے پاس پیسہ ہو اس کی پوجا ہوتی ہے۔ جو بدنصیب ہیں' نا قابل ہیں' پست ہمت ہیں' ضمیر اور اخلاق کی دہائی دے کر اپنے آنسو پونچھ لیتے ہیں ورنہ ضمیر اور اخلاق کو کون پوچھتا ہے۔"

روپ کماری خاموش ہو گئی۔ اب اسے یہ حقیقت اس کی ساری تلخیوں کے ساتھ تسلیم کرنی پڑے گی کہ رام دلاری اس سے زیادہ خوش نصیب ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ تمسخر یا تحقیر سے وہ اپنی تنگ دلی کے اظہار کے سوا اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتی۔ اسے کسی بہانے سے رام دلاری کے گھر جا کر اصلیت کی چھان بین کرنی پڑے گی۔ اگر رام دلاری واقعی لکشمی کا بردان پا گئی ہے تو وہ اپنی قسمت ٹھونک کر بیٹھ رہے گی۔ سمجھ لے گی کہ دنیا میں کہیں انصاف نہیں ہے۔ کہیں ایمانداری کی قدر نہیں ہے۔

مگر کیا سچ مچ اس خیال سے اسے تسکین ہو گی۔ یہاں کون ایماندار ہے۔ وہی جسے بے ایمانی کا موقع نہیں ہے۔ اور اتنی ہمت ہے کہ وہ موقع پیدا کرے۔ اس کے شوہر پچھتّر روپے ماہوار پاتے ہیں۔ کیا دس بیس روپے اوپر سے مل جائیں تو وہ خوش ہو کر لے نہ لیں گے۔ ان کی ایمانداری اور اصول پروری اس وقت تک ہے جب تک موقع نہیں ملتا۔ جس دن موقع ملا ساری اصول پروری دھری رہ جائے گی اور تب کیا روپ کماری میں اتنی اخلاقی قوت ہے کہ وہ اپنے شوہر کو ناجائز آمدنی سے روک دے۔ روکنا تو درکنار وہ خوش ہو گی۔ شاید اپنے شوہر کی پیٹھ ٹھونکے۔ ابھی ان کے دفتر سے واپسی کے وقت من مارے بیٹھی رہتی ہے۔ تب دروازے پر کھڑی ہو کر ان کا انتظار کرے گی اور جونہی وہ گھر میں آئیں گے ان کی جیبوں کی تلاشی لے گی۔

آنگن میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ رام دلاری امنگ کے ساتھ گا رہی تھی اور روپ کماری وہیں برآمدے میں اداس بیٹھی ہوئی تھی۔ نہ جانے کیوں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ کوئی ناچے' اسے کوئی سروکار نہیں۔ وہ تو بدنصیب ہے' رونے کے لیے پیدا کی گئی ہے۔

نو بجے رات کو مہمان رخصت ہونے لگے۔ روپ کماری بھی اٹھی۔ یکہ منگوانے جا رہی تھی کہ رام دلاری نے کہا۔ "یکہ منگوا کر کیا کرو گی بہن۔ مجھے لینے کے لیے ابھی کار آتی ہو گی۔ دو چار دن میرے یہاں رہو' پھر چلی جانا۔ میں جیجا جی کو کہلا بھیجوں گی۔"

روپ کماری کا آخری حربہ بھی بے کار ہو گیا۔ رام دلاری کے گھر جا کر دریافت حال کی خواہش یکایک فنا ہو گئی۔ وہ اب اپنے گھر جائے گی اور منہ ڈھانپ کر پڑ رہے گی۔ ان پھٹے حالوں کیوں کسی کے گھر جائے۔ بولی۔ "بہن میرے سر میں زور سے درد ہو رہا ہے۔"

"اچھا بتاؤ کب آؤ گی؟ میں سواری بھیج دوں گی۔"

"میں خود کہلا بھیجوں گی۔"

"تمہیں یاد نہ رہے گا۔ سال بھر ہو گیا۔ بھول کر بھی یاد نہ کیا۔ میں اسی انتظار میں تھی کہ دیدی بلائیں تو چلوں۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہیں۔ پھر بھی اتنی دور کہ سال سال بھر گزر جائے اور ملاقات نہ ہو۔"

گھر کی فکروں سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ تجھے بلا بھیجوں مگر موقع ہی نہ ملا۔ اتنے میں رام
لاری کے شوہر مسٹر گروسیوک نے آکر بڑی سالی کو سلام کیا۔ بالکل انگریزی وضع تھی۔ کلائی پر سونے کی گھڑی'
نکھوں میں سنہری عینک۔ بالکل اپٹوڈیٹ جیسے کوئی تازہ وارد سویلین ہو۔ چہرے سے ذہانت' متانت اور شرافت
س رہی تھی۔ وہ اتنا خوبرو اور جامہ زیب ہے' روپ کماری کو کبھی گمان بھی نہ تھا۔ دعا دے کر بولی۔ "آج یہاں نہ
تی تو تم سے ملاقات کیوں ہوتی۔"

گروسیوک ہنس کر بولا۔ "بجا فرماتی ہیں۔ الٹی شکایت۔ کبھی آپ نے بلایا اور میں نہ گیا۔"

"میں نہیں جانتی تھی کہ تم اپنے کو مہمان سمجھتے ہو۔ وہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

"اب مان گیا بھابی صاحبہ! بے شک میری غلطی ہے۔ انشاء اللہ اس کی تلافی کروں گا۔ مگر آج ہمارے گھر
ہیے۔"

"نہیں آج بالکل فرصت نہیں ہے۔ پھر آؤں گی۔ لڑکے گھر پر گھبرا رہے ہوں گے۔"

رام دلاری بولی۔ "میں کتنا کہہ کے ہار گئی بولتی ہی نہیں۔"

دونوں بہنیں کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئیں۔ گروسیوک کار ڈرائیو کرتا ہوا چلا۔ ذرا دیر میں اس کا مکان
گیا۔ رام دلاری نے پھر روپ کماری سے چلنے کے لیے بہت اصرار کیا مگر وہ نہ مانی۔ "لڑکے گھبرا رہے ہوں گے۔"
خر رام دلاری اس سے مل کر اندر چلی گئی۔ گروسیوک نے کار بڑھائی۔ روپ کماری نے اڑتی ہوئی نگاہ سے رام
لاری کا مکان دیکھا اور ٹھوس حقیقت سلاخ کی طرح اس کے جگر میں چبھ گئی۔ کچھ دور چل کر گروسیوک بولا۔
بھابی میں نے اپنے لیے کیسا اچھا راستہ نکال لیا۔ اگر دو چار سال کام چل گیا تو آدمی بن جاؤں گا۔"

روپ کماری نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ "رام دلاری نے مجھ سے کہا۔ بھگوان کرے جہاں رہو خوش
رہو۔ ذرا ہاتھ پیر سنبھال کر رہنا۔"

"مالک کی آنکھ بچا کر ایک پیسہ لینا بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ دولت کا مزہ جب ہے کہ ایمان سلامت رہے۔
یمان کھو کے پیسے ملے تو کیا۔ میں ایسی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ اور آنکھ کس کی بچاؤں۔ سب سیاہ و سفید تو میرے
اتھ میں ہے۔ مالک تو کوئی ہے نہیں۔ اس کی بیوہ ہے۔ اس نے سب کچھ میرے ہاتھ میں چھوڑ رکھا ہے۔ میں نے
س کا کاروبار نہ سنبھال لیا ہوتا تو سب کچھ چوپٹ ہو جاتا۔ میرے سامنے تو مالک صرف تین مہینے زندہ رہے۔ مگر بڑا
مردم شناس آدمی تھا۔ مجھے سو روپے پر رکھا اور ایک ہی مہینے میں ڈھائی سو کر دیئے۔ آپ کی دعا سے پہلے ہی مہینے میں
میں نے بارہ ہزار کا کام کیا۔"

"کام کیا کرنا پڑتا ہے؟"

"وہی مشینوں کی ایجنسی۔ طرح طرح کی مشینیں منگانا اور بیچنا۔"

روپ کماری کا منحوس گھر آگیا۔ دروازے پر ایک لالٹین ٹمٹما رہی تھی۔ اس کے شوہر بابو رمانا تھ
دروازے پر ٹہل رہے تھے۔ روپ کماری اتری مگر اس نے گروسیوک سے آنے کے لیے اصرار نہ کیا۔ بے دلی سے
کہا ضرور' مگر زور نہ دیا۔ اور رمانا تھ تو مخاطب ہی نہ ہوئے۔

روپ کماری کو وہ گھر اب قبرستان سا لگ رہا تھا۔ جیسے پھوٹا ہوا نصیب ہو۔ نہ کہیں فرش' نہ فرنیچر' نہ
گملے۔ دو چار ٹوٹی ٹاٹی کرسیاں' ایک لنگڑا میز' چار پانچ پرانی دھرانی کھاٹیں۔ یہی اس گھر کی بساط تھی۔ آج صبح تک

روپ کماری اس گھر میں خوش تھی لیکن اب اس گھر سے اسے مطلق دلچسپی نہ رہی۔ لڑکے اماں اماں کر کے دوڑے مگر اس نے دونوں کو جھڑک دیا۔ سر میں درد ہے' وہ کسی سے نہ بولے گی۔ اب بھلا کھانا پکاتا کون؟ لڑکوں نے تو دودھ پی لیا ہے مگر رماناتھ نے کچھ نہیں کھایا۔ اسی انتظار میں تھے کہ روپ کماری آئے تو پکائے۔ مگر روپ کماری کے سر میں درد ہے۔ مجبوراً بازار سے پوریاں لانی پڑیں گی۔

روپ کماری نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔ ”تم اب تک میرا انتظار کیوں کرتے رہے؟ میں نے کھانا پکانے کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔ جو رات بھر میں وہیں رہ جاتی؟ آخر تم ایک مہراجن کیوں نہیں رکھ لیتے یا زندگی بھر مجھی کو پیٹتے رہو گے۔“

رماناتھ نے اس کی طرف مظلوم اور پُر سوال حیرت کی نگاہ ڈالی۔ اس کی برہمی کا کوئی سبب ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ روپ کماری سے انہوں نے ہمیشہ بے عذر اطاعت پائی ہے۔ بے عذر ہی نہیں خوش دلانہ بھی۔ انہوں نے کئی بار مہراجن رکھ لینے کی تجویز اور خواہش کی تھی۔ مگر اس نے ہمیشہ یہی کہا کہ آخر میں بیٹھے بیٹھے کیا کروں گی۔ چار پانچ روپیہ کا خرچ بڑھانے سے کیا فائدہ۔ یہ رقم بچ رہے گی تو بچوں کے لیے مکھن آ جائے گا اور آج وہ اتنی بے دردی سے شکایت کر رہی ہے جیسے غصہ میں بھری ہو۔

اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے بولے۔ ”مہراجن رکھنے کے لیے میں نے تم سے کئی بار کہا۔“

”تو لا کیوں نہ دیا۔ میں اسے نکال دیتی تو کہتے۔“

”ہاں یہ غلطی ہوئی۔“

”تم نے کبھی سچے دل سے کہا۔ محض مہراجن کے لیے کہا۔ تمہارے دل میں کبھی میرے آرام کا خیال آیا ہی نہیں۔ تم خوش تھے کہ اچھی لونڈی مل گئی۔ ایک روٹی کھاتی ہے اور چپ چاپ پڑی رہتی ہے۔ اتنی سستی لونڈی اور کہاں ملتی۔ محض کپڑے اور کھانے پر۔ وہ بھی جب گھر بھر کی ضرورتوں سے بچے تو۔ پچھتّر روپلیاں میرے ہاتھ پر رکھ دیتے ہو اور ساری دنیا کا خرچ۔ میرا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے کتنی کتر بیونت کرنی پڑتی ہے۔ کیا پہنوں اور کیا اوڑھوں۔ تمہارے ساتھ زندگی خراب ہوگئی۔ وہ مرد بھی ہوتے ہیں جو بیویوں کے لیے آسمان کے تارے توڑ لاتے ہیں۔ گروسیوک ہی کو دیکھو۔ تم سے کم پڑھا ہے۔ عمر میں تم سے کہیں کم ہے۔ مگر پانچ سو روپیہ مہینہ لاتا ہے۔ رام دلاری رانی بنی بیٹھی رہتی ہے۔ تمہارے لیے یہ ہی پچھتّر بہت ہیں۔ رانڈ مانڈ میں ہی خوش۔ تمہیں تو عورت ہونا چاہیے تھا۔ اوروں کے دل میں کیسے کیسے ارمان ہوتے ہیں۔ مگر میں تو تمہارے لیے گھر کی مرغی باسی ساگ ہوں۔ تمہیں تو کوئی تکلیف ہوتی نہیں۔ تمہیں تو کپڑے بھی اچھے چاہئیں' کھانا بھی اچھا چاہیے۔ کیونکہ تم مرد ہو' کما کر لاتے ہو۔ میں چاہے جیسے رہوں' تمہاری بلا سے——“

یہ سلسلہ کئی منٹ تک جاری رہا اور بچارے رماناتھ خاموش سنتے رہے۔ اپنی دانست میں انہوں نے روپ کماری کو شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا۔ ان کی تنخواہ کم ہے ضرور۔ یہ ان کے بس کی بات تو نہیں۔ وہ دل لگا کر اپنا کام کرتے ہیں۔ افسروں کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کرتے ہیں۔ اس سال بڑے بابو کے چھوٹے صاحبزادے کو چھ مہینے تک بلاناغہ پڑھایا۔ اسی لیے کہ وہ خوش رہیں۔ اب اور کیا کریں۔ روپ کماری کی برہمی کا راز تو انہیں معلوم ہو گیا۔ اگر گروسیوک واقعی پانچ سو روپیہ لاتا ہے تو بے شک خوش نصیب ہے لیکن دوسروں کی اونچی پیشانی دیکھ کر اپنا ماتھا تو نہیں پھوڑا جاتا۔ اسے ایسا موقع مل گیا۔ دوسروں کو ایسے مواقع کہاں ملتے ہیں۔ وہ تحقیق کریں گے کہ واقعی اسے پانچ

سو ملتے ہیں یا محض گپ ہے اور بالفرض ملتے ہوں تو اس سے کیا روپ کماری کو یہ حق ہے کہ وہ انہیں نشانہ ملامت بنائے اور اگر اسی طرح وہ روپ کماری سے زیادہ حسین' زیادہ خوش سلیقہ عورت دیکھ کر اسے کوسنا شروع کر دیں تو کیسا ہو۔ روپ کماری حسین ہے' شیریں زبان ہے' خوش مذاق ہے بے شک لیکن اس سے زیادہ حسین' زیادہ شیریں' زیادہ خوش مذاق عورت دنیا میں معدوم نہیں ہے۔ ایک زمانہ تھا جب ان کی نظروں میں روپ کماری سے زیادہ حسین عورت دنیا میں نہ تھی۔ لیکن وہ جنون اب باقی نہ رہا۔ جذبات کی دنیا سے حقیقت کی دنیا میں آئے انہیں ایک مدت گزر گئی۔ اب تو انہیں ازدواجی زندگی کا کافی تجربہ ہے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر معلوم ہو گئے ہیں۔ صابر و شاکر رہ کر ہی ان کی زندگی عافیت سے کٹ سکتی ہے۔ روپ کماری اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھتی۔

پھر بھی انہیں روپ کماری سے ہمدردی ہوئی۔ اس کی سخت کلامیوں کا انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ شربت کی طرح پی گئے۔ اپنی بہن کا ٹھاٹ دیکھ کر ایک لمحہ کے لیے روپ کماری کے دل میں ایسے دل شکن' مایوس کن' غیر منصفانہ خیالات کا پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ وہ کوئی فلاسفر نہیں' تارک الدنیا نہیں کہ ہر حال میں اپنے طبعی سکون کو قائم رکھے۔ اس طرح اپنے دل کو سمجھا کر رمانا تھ دریافت حال کی مہم کے لیے آمادہ ہو گئے۔

(2)

ایک ہفتہ تک روپ کماری ہیجان کی حالت میں رہی۔ بات بات پر جھنجھلاتی۔ لڑکوں کو ڈانٹتی' شوہر کو کوستی' اپنی تقدیر کو روتی۔ گھر کا کام تو کرنا ہی پڑتا تھا ورنہ نئی آفت آجاتی۔ لیکن اب کسی کام سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ گھر کی جن پرانی دھرانی چیزوں سے اسے دلی تعلق ہو گیا تھا۔ جن کی صفائی اور سجاوٹ میں وہ منہمک رہا کرتی تھی' ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔ گھر میں ایک ہی خدمت گار تھا۔ اس نے جب دیکھا بہو جی گھر کی طرف سے خود ہی لاپرواہیں تو اسے کیا غرض تھی کہ صفائی کرتا۔ دونوں بچے بھی ماں سے بولتے ڈرتے تھے اور رمانا تھ تو اس کے سائے سے بھاگتے تھے۔ جو کچھ سامنے آجاتا زہر مار کر لیتے اور دفتر چلے جاتے۔ دفتر سے لوٹ کر دونوں بچوں کو ساتھ لے لیتے اور کہیں گھومنے نکل جاتے۔ روپ کماری سے کچھ بولتے روح فنا ہوتی تھی۔ ہاں ان کی تفتیش جاری تھی۔

ایک دن رمانا تھ دفتر سے لوٹے۔ ان کے ساتھ گروسیوک بھی تھے۔ روپ کماری نے آج کئی دن کے بعد زمانے سے مصالحت کر لی تھی اور اس وقت جھاڑن لے کر کرسیاں اور تپائیاں صاف کر رہی تھی کہ گروسیوک نے اسے اندر پہنچ کر سلام کیا۔ روپ کماری دل میں کٹ گئی۔ رمانا تھ پر بے حد غصہ آیا۔ انہیں لا کر یہاں کیوں کھڑا کر دیا۔ نہ کہنا نہ سننا۔ بس بلا لائے۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر گروسیوک نے کیا سمجھا ہو گا۔ مگر انہیں عقل آئی کب تھی۔ وہ اپنا پردہ ڈھانکتی پھرتی ہے اور آپ اسے کھولتے پھرتے ہیں۔ ذرا بھی شرم نہیں۔ جیسے بے حیائی کا جامہ پہن لیا ہے۔ خواہ مخواہ اسے ذلیل کرتے ہیں۔

دعا دے کر عافیت پوچھی اور کرسی رکھ دی۔ گروسیوک نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”آج بھابی صاحبہ نے میری دعوت کی ہے۔ میں ان کی دعوت پر تو نہ آتا لیکن انہوں نے کہا کہ تمہاری بھابی کا سخت تقاضا ہے۔ تب مجھے وقت نکالنا پڑا۔“

روپ کماری نے بات بنائی۔ ”تم سے اس دن رواداری میں ملاقات ہوئی۔ دیکھنے کو جی لگا ہوا تھا۔“
گروسیوک نے درودیوار پر نظر ڈال کر کہا۔ ”اس پنجرے میں تو آپ لوگوں کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔“
روپ کماری کو اب معلوم ہوا کہ یہ کتنا بدمذاق ہے۔ دوسروں کے جذبات کی اسے بالکل پروا نہیں۔ یہ اتنی سی بات بھی نہیں سمجھتا کہ دنیا میں سبھی تقدیر والے نہیں ہوتے۔ لاکھوں میں کہیں ایک ایسا ہی بھگوان نکلتا ہے۔ کسی قدر ترش ہو کر بولی۔ ”پنجرے میں رہنا کنگھرے میں رہنے سے اچھا ہے۔ پنجرے میں معصوم چڑیاں رہتی ہیں۔ کنگھر درندوں کا مسکن ہے۔“ گروسیوک کنایہ نہ سمجھ سکا۔ بولا۔ ”مجھے تو اس گھر میں حبس ہو جائے‘ دم گھٹ جائے۔ میں آپ کے لیے اپنے گھر کے پاس ایک گھر لے کر دوں گا۔ خوب لمبا چوڑا۔ آپ سے کچھ کرایہ نہ لیا جائے گا۔ مکان ہماری مالکن کا ہے۔ میں تو اسی کے مکان میں رہتا ہوں۔ سینکڑوں مکان ہیں اس کے پاس۔ سینکڑوں۔ سب میرے اختیار میں ہیں۔ جس کو جو مکان چاہے دے دوں۔ میرے اختیار میں ہے‘ کرایہ لوں یا نہ لوں۔ میں آپ کے لیے اچھا سا مکان ٹھیک کر دوں گا جو سب سے اچھا ہے۔ میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔“
روپ کماری سمجھ گئی حضرت اس وقت نشے میں ہیں جب ہی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ رخسار کچھ پھول گئے ہیں۔ زبان میں ہلکی سی لغزش تھی جو ہر لحہ نمایاں ہو جاتی تھی۔ ایک جوان‘ خوبصورت‘ شریف چہرہ‘ رکیک اور بے غیرت بن گیا تھا جسے دیکھ کر نفرت ہوتی تھی۔
اس نے ایک لحہ بعد پھر بہکنا شروع کیا۔ ”میں آپ کا بہت ادب کرتا ہوں۔ آپ میری بڑی بھابی ہیں۔ آپ کے لیے میری جان حاضر ہے۔ آپ کے لیے مکان کا انتظام کرنا میرے لیے مشکل نہیں ہے۔ میں مسز لوہیا کا مختار ہوں۔ سب کچھ میرے اختیار میں ہے۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ آنکھیں بند کر کے منظور کر لیتی ہے۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھتی ہے۔ میں اس کی ساری جائیداد کا مالک ہوں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے بیس روپے کا نوکر رکھا تھا۔ بڑا مالدار آدمی تھا۔ مگر یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کی دولت کہاں سے آتی تھی‘ کسی کو معلوم نہیں۔ میرے سوا کوئی جانتا نہیں۔ وہ خفیہ فروش تھا۔ کوکین بیچتا تھا۔ لاکھوں کی آمدنی تھی۔ اس کی موت کے بعد میں اب بھی وہی کام کرتا ہوں۔ ہر شہر میں ہمارے ایجنٹ ہیں۔ مسٹر لوہیا نے مجھے اس فن میں یکتا کر دیا۔ جی ہاں مجال نہیں کہ کوئی مجھے گرفتار کرے۔ بڑے بڑے افسروں سے میرا یارانہ ہے۔ ان کے منہ میں نوٹوں کے پلندے ٹھونس کر ان کی آواز بند کر دیتا ہوں۔ کوئی چوں نہیں کر سکتا۔ حساب میں لکھتا ہوں۔ ایک ہزار دیتا ہوں۔ پانچ سو باقی یاروں کا ہے۔ بے دریغ روپے آتے ہیں اور بے دریغ خرچ کرتا ہوں۔ بڑھیا کو تو رام نام سے مطلب ہے۔ سادھو سنتوں کی سیوا میں لگی رہتی ہے۔ اور بندہ چین کرتا ہے۔ جتنا چاہوں خرچ کروں۔ کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں‘ کوئی بولنے والا نہیں۔“ جیب سے نوٹوں کا ایک بنڈل نکال کر ”یہ آپ کے قدموں کا صدقہ ہے۔ مجھے دعا دیجیے۔ جو ایمان اور اصول کے اپاسک ہیں انہیں دولت لات مارتی ہے۔ دولت تو انہیں پکڑتی ہے جو اس کے لیے اپنا دین وایمان سب کچھ نثار کرنے کو تیار ہیں۔ مجھے برا نہ کہیے۔ جتنے دولت مند ہیں سب لٹیرے ہیں۔ میں بھی انہیں میں سے ایک ہوں۔ کل میرے پاس روپے ہو جائیں اور میں ایک دھرم شالہ بنوادوں۔ پھر دیکھئے میری کتنی واہ واہ ہوتی ہے۔ کون پوچھتا ہے مجھے یہ دولت کہاں سے ملی۔ ایک وکیل ایک گھنٹہ بھر بحث کر کے ایک ہزار سیدھا کر لیتا ہے۔ ایک ڈاکٹر ذرا سا نشتر لگا کر پانچ سو روپے مار لیتا ہے۔ اگر ان کی آمدنی جائز ہے تو میری آمدنی بھی جائز ہے۔ ضرورت مندوں کو لوٹ مار کر مالدار ہو جانا ہماری سوسائٹی کا پرانا دستور ہے۔ میں بھی وہی کرتا ہوں جو دوسرے کرتے ہیں۔ زندگی کا مقصد ہے عیش کرنا۔ میں بھی لوٹوں گا اور

عیش کروں گا۔ عیش کروں گا اور خیرات کروں گا اور ایک دن لیڈر بن جاؤں گا۔ کتنے گنوادوں' یہاں کتنے لوگ جوا کھیل کر کروڑ پتی ہو گئے۔ کتنے عورتوں کا بازار لگا کر کروڑ پتی ہو گئے۔"

رماناتھ نے آکر کہا۔ "گروسیوک کیا کر رہے ہو۔ چلو چائے پی لو ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

گروسیوک اٹھا' پیر لڑکھڑائے اور زمین پر گر پڑا۔ پھر سنبھل کر اٹھا اور جھومتا جھامتا ٹھوکریں کھاتا باہر چلا گیا۔ روپ کماری نے آزادی کا سانس لیا۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ کمرے کی ہوا جیسے بھاری ہو گئی تھی۔ جو ترغیبیں کئی دن سے اچھے اچھے دل آویز روپ بھر کر اس کے سامنے آ رہی تھیں آج اسے ان کی اصلی مکروہ' گھناؤنی صورت نظر آئی۔ جس سادگی اور خلوص اور ایثار کی فضا میں اب تک زندگی گزاری تھی' اس پر حرام کاری اور آبلہ آفرینی کا گزر نہ تھا۔ ان داموں وہ دنیا کی ساری دولت اور سارا عیش بھی خریدنے کو آمادہ نہ ہو سکتی تھی۔ اب وہ رام دلاری کی تقدیر سے اپنی تقدیر کا بدلہ نہ کرے گی۔ وہ اپنے حال میں خوش ہے۔ رام دلاری پر اسے رحم آیا۔ جو نمود و نمائش کے لیے اپنے ضمیر کا خون کر رہی ہے۔ مگر ایک لمحہ میں گروسیوک کا دل نرم پڑ گیا۔ جس سوسائٹی میں دولت پُجتی ہے' جہاں انسان کی قیمت اس کے بینک اکاؤنٹ اور شان و شوکت سے آنکی جاتی ہے۔ جہاں قدم قدم پر ترغیبوں کا جال بچھا ہوا ہے اور سوسائٹی کا نظام اتنا بے ڈھنگا ہے کہ انسان میں حسد اور غضب اور فرومائیگی کے جذبات کو اکساتا رہتا ہے' وہاں گروسیوک اگر رو میں بہ جائے تو تعجب کا مقام نہیں۔

اس وقت رماناتھ نے آکر کہا۔ "یہاں بیٹھا بیٹھا کیا بک رہا تھا؟ میں نے تو اسے رخصت کر دیا۔ جی ڈرتا تھا کہیں اس کے پیچھے پولیس لگی ہو۔ کہیں میں ناکردہ گناہ پکڑا جاؤں۔"

روپ کماری نے اس کی طرف معذرت خواہانہ نظر سے دیکھ کر جواب دیا۔ "وہی اپنی خفیہ فروشی کا ذکر کر رہا تھا۔"

"مجھے بھی مسز لوہیا سے ملنے کی دعوت دے گیا۔ شاید کوئی اچھی جگہ مل جائے۔"

"جی نہیں! آپ اپنی کلرکی کیے جائیے۔ اسی میں آپ کی خیریت ہے۔"

"مگر کلرکی میں عیش کہاں؟ کیوں نہ سال بھر کی رخصت لے کر ذرا ادھر کا بھی لطف اٹھاؤں۔"

"مجھے اب وہ ہوس نہیں رہی۔"

"تم سے آکر یہ قصہ کہتا تو تمہیں یقین نہ آتا۔"

"ہاں یقین تو نہ آتا۔ میں تو قیاس ہی نہیں کر سکتی کہ اپنے فائدے کے لیے کوئی آدمی دنیا کو زہر کھلا سکتا ہے۔"

"مجھے سارا قصہ معلوم ہو گیا تھا۔ میں نے اسے خوب شراب پلا دی تھی کہ نشہ میں بہکے گا ضرور۔ سب کچھ خود قبول جائے گا۔"

"للچائی تو تمہاری طبیعت بھی تھی۔"

"ہاں للچائی تو ہے۔ مگر عیب کرنے کے لیے جس ہنر کی ضرورت ہے وہ کہاں سے لاؤں گا۔"

"ایشور نہ کرے وہ ہنر تم میں آئے۔ مجھے اس بچارے پر ترس آتا ہے۔ معلوم نہیں راستہ میں اس پر کیا گزری؟"

"نہیں وہ تو اپنی کار پر تھے۔"

روپ کماری ایک منٹ تک زمین کی طرف دیکھتی رہی پھر بولی۔ ”تم مجھے دلاری کے گھر پہنچادو۔ ابھی شاید میں اس کی مدد کرسکوں۔ جس باغ کی وہ سیر کررہی ہے اس کے چاروں طرف درندے گھات لگائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ شاید میں اسے بچاسکوں۔“

منتر

(1)

شام کا وقت تھا۔ ڈاکٹر چڈھا گولف کھیلنے جارہے تھے۔ موٹر دروازے کے سامنے کھڑی تھی کہ دو کہار ڈولی لیے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ڈولی کے پیچھے ایک بوڑھا نحیف آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آتا تھا۔ ڈولی مطب کے سامنے آکر رک گئی۔ بوڑھے نے دھیرے دھیرے دروازہ پر آکر اندر جھانکا۔ ایسی صاف ستھری زمین پر اسے پیر رکھتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چلّا نہ دوڑے۔

ڈاکٹر صاحب نے چق کے اندر سے گرج کر کہا۔ ”کون ہے، کیا چاہتا ہے؟“

بوڑھے نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ ”ہجور بڑا گریب آدمی ہوں، میرا لڑکا کئی دن سے......“

ڈاکٹر نے سگار جلاتے ہوئے کہا۔ ”کل سویرے آؤ، سویرے۔ ہم اس وقت مریضوں کو نہیں دیکھتے۔“

بوڑھے نے گھٹنے ٹیک کر زمین پر سر رکھ دیا اور بولا۔ ”دہائی ہے سرکار کی، ہجور لڑکا مر جائے گا، چار دن سے آنکھیں......“

ڈاکٹر نے کلائی پر نظر ڈالی، چھ بجنے میں صرف دس منٹ باقی تھے، گولف اسٹک ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ ”کل سویرے آؤ، ہم کھیلنے جاتا ہے۔“

بوڑھے نے پگڑی اتار کر چوکھٹ پر رکھ دی اور رو کر بولا۔ ”ہجور ایک نگاہ دیکھ لیں، لڑکا ہاتھ سے چلا جائے گا۔ سات لڑکوں میں یہی ایک بچ رہا ہے ہجور۔ ہم دونوں آدمی رو رو کر مر جائیں گے۔“

ڈاکٹر نے چلمن اٹھائی اور موٹر کی طرف چلے۔ بوڑھا پیچھے پیچھے یہ کہتا ہوا دوڑا۔ ”سرکار بڑا دھرم ہوگا، ہجور دیا کیجیے۔“ مگر ڈاکٹر صاحب مطلق مخاطب نہ ہوئے۔ موٹر پر بیٹھ کر بولے۔ ”کہہ دیا کل سویرے آؤ۔“

موٹر چلی گئی۔ بوڑھا کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑا رہا۔ دنیا میں ایسے انسان بھی ہوتے ہیں، شاید اسے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔ پھر اس نے کہاروں سے ڈولی اٹھانے کو کہا۔ یہ غریب چاروں طرف سے مایوس ہوکر چڈھا کے پاس آیا تھا۔ ان کی بڑی تعریف سنی تھی۔ یہاں سے جواب پاکر پھر وہ کسی اور ڈاکٹر کے پاس نہ گیا۔ قسمت ٹھونک لی۔

اسی رات کو اس کا سات سال کا ہنستا کھیلتا بچہ دنیا سے رخصت ہوگیا۔

بوڑھے ماں باپ ہاتھ مل کر رہ گئے۔ زندگی کا یہی ایک سہارا تھا، اسی بچہ کا منہ دیکھ کر دونوں جیتے تھے۔ اب دنیا ان کے لیے تاریک ہوگئی!

(2)

کئی سال گزر گئے، ڈاکٹر چڈھا کی ثروت اور شہرت ماہِ نو کی طرح بڑھتی گئی اور صحت تو ان کی بے مثال تھی۔ یہ ان کی پابندی اوقات کا نتیجہ تھا کہ پچاس سال کے سن میں بھی ان کی چستی و جفاکشی جوانوں کو شرمندہ کرتی تھی۔ اکثر لوگ صحت کے قواعد کی پابندی اس وقت کرتے ہیں جب صحت زائل ہو چکی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر چڈھا علاج اور انسداد کے راز کو خوب سمجھتے تھے ورنہ ڈاکٹر ہی کیوں ہوتے۔ تعین اولاد بھی انہیں قواعد میں تھا۔ ان کے صرف دو بچے ہوئے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ تیسری اولاد نہ ہوئی۔ چنانچہ شریمتی چڈھا کی صحت میں بھی کسی قسم کا ضعف نہ تھا۔ دونوں بچے صحت اور زندہ دلی کے پتلے تھے۔ لڑکی کی تو شادی ہو چکی تھی، لڑکا کالج میں پڑھ رہا تھا۔ سبزہ آغاز نوجوان تھا، مردانہ حسن کا اعجاز، ذہانت کا پتلا' تحریر و تقریر میں یونیورسٹی کا مایہ ناز، چہرہ سے نور برستا تھا۔ ہر ایک دائرہ کا مرکز نگاہ، خوش گلو، خلیق، منکسر۔ آج اس کی بیسویں سالگرہ تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ہری ہری گھاس پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ شہر کے رؤسا اور حکام ایک طرف، کالج کے طلبہ دوسری طرف بیٹھے ہوئے دعوت کھا رہے تھے۔ بجلی کی روشنی سے سارا میدان برق قائم بنا ہوا تھا۔ تفریح کے سامان بھی جمع تھے۔ ایک چھوٹے سے فارس کھیلنے کی تیاری کی گئی تھی۔ فارس خود نوجوان چڈھا کی تصنیف تھی۔ وہی خاص ایکٹر بھی تھا۔ وہ اس وقت ایک ریشمی کرتہ پہنے، ننگے پاؤں، دوستوں کی خاطر و مدارات میں مصروف تھا۔ کوئی پکارتا چڈھا صاحب ذرا ادھر آنا، کوئی ادھر سے پکارتا، چڈھا کیا ادھر ہی رہو گے؟

یکا یک ایک حسینہ نے آکر کہا۔ "کیوں کیلاش! تمہارے سانپ کہاں ہیں، ذرا مجھے بھی دکھا دو۔"

چڈھا نے ٹالتے ہوئے کہا۔ "اس وقت معاف کرو مرنالنی، کل دکھا دوں گا۔"

مرنالنی نے ایک انداز سے ماتھا سکوڑ کر کہا۔ "جی نہیں، تمہیں دکھانا پڑے گا۔ میں نہیں ماننے کی، تم یونہی روز کل کل کرتے رہتے ہو۔"

مرنالنی اور کیلاش دونوں ہم جماعت تھے اور ایک دوسرے پر فدا۔ کیلاش کو سانپوں کو نچانے اور کھلانے کا شوق تھا۔ طرح طرح کے سانپ پال رکھے تھے، ان کے عادات و خواص کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ سانپوں پر تھوڑے دن ہوئے انہوں نے یونیورسٹی کلب میں ایک نہایت دلچسپ تقریر کی تھی اور سانپوں کو نچا کر دکھایا تھا۔ ایک بوڑھے سپیرے سے اس نے یہ فن سیکھا تھا۔ سانپوں کی کتنی ہی جڑی بوٹیاں اس نے جمع کر رکھی تھیں۔ مرنالنی کا اصرار بے موقع تھا۔ سانپوں کے کمرہ میں بہت ہجوم ہو جائے گا۔ اس لیے وہ ٹال رہا تھا اور شاید مرنالنی مان بھی جاتی مگر دوستوں کو چین کہاں؟ ایک صاحب بولے۔ "دکھا کیوں نہیں دیتے بھئی؟ ایک ذرا سی بات کے لیے اتنا ٹال مٹول کر رہے ہو۔ مرنالنی ہرگز نہ ماننا، دیکھوں یہ حضرت کیسے نہیں دکھاتے۔" دوسرے صاحب بولے۔ "مس مرنالنی اس قدر سیدھی اور بھولی ہیں جبھی آپ اتنا مزاج کرتے ہیں، دوسری ہوتی تو اسی بات پر بگڑ کھڑی ہوتی۔" تیسرے صاحب نے فرمایا۔ "اجی بولنا چھوڑ دیتی، صورت نہ دیکھتی۔ اس پر آپ کو دعویٰ ہے کہ مس مرنالنی کیلئے جان حاضر ہے۔"

مرنالنی نے ان شہدوں کی طرف تمسخر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "آپ لوگ میری وکالت نہ کریں، میں اس وقت نہیں دیکھنا چاہتی، چلو چھٹی ہوئی۔"

اس پر دوستوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک صاحب بولے۔ ”دیکھنا تو آپ سب چاہیں لیکن کوئی دکھائے بھی۔“
کیلاش کو مرنالنی کے بشرے سے معلوم ہوا کہ اس وقت اس کا انکار ناگوار گزرا۔ جونہی دعوت ختم ہوئی اور گانا شروع ہوا، اس نے مرنالنی اور چند احباب کو سانپوں کے ڈربے کے سامنے لے جاکر مہور بجانا شروع کیا۔ پھر ہر ایک خانے کو کھول کھول کر ایک ایک سانپ نکالنے لگا۔ واہ کیا کمال تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کیڑے اس کی ایک ایک بات کو سمجھتے ہیں۔ کسی کو ہاتھوں میں اٹھالیا، کسی کو گردن میں ڈال لیا۔ کسی کو ماتھے کے گرد لپیٹ لیا۔ مرنالنی بار بار منع کرتی تھی، انہیں گردن میں نہ ڈالو۔ دور ہی سے دکھادو۔ بس ذرا نچادو۔ کیلاش کی گردن میں سانپوں کو لپٹتے دیکھ کر اس کی جان نکلی جاتی تھی۔ افسوس کر رہی تھی کہ میں نے ناحق انہیں چھیڑا مگر کیلاش ایک نہ سنتا تھا۔ معشوقہ کے روبرو اپنے کمال کے اظہار کا ایسا موقع پاکر کون چوکتا ہے۔
ایک صاحب بولے۔ ”دانت تو توڑ ہی ڈالے ہوں گے۔“
کیلاش نے ہنس کر کہا۔ ”جی نہیں بندہ نواز۔ دانت توڑنا مداریوں کا کام ہے، کسی کے دانت نہیں توڑے گئے، کہئے تو دکھادوں؟“
یہ کہہ کر اس نے ایک کالے سانپ کو پکڑ لیا اور بولا۔ ”میرے پاس اس سے بڑا اور زہریلا دوسرا جانور نہیں ہے۔ اگر کسی کو کاٹ لے تو آناً فاناً آدمی مرجائے۔ اس کا کوئی علاج نہیں، دکھادوں اس کے دانت!“
مرنالنی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”نہیں نہیں کیلاش، ایشور کیلئے اسے چھوڑ دو۔ تمہارے پیروں پڑتی ہوں۔“
اس پر ایک دوسرے مہربان بولے۔ ”مجھے یقین تو نہیں آتا مگر چونکہ تم کہتے ہو، اس لیے مان لیتا ہوں۔“
کیلاش نے سانپ کی گردن پکڑ کر کہا۔ ”نہیں صاحب! آپ آنکھوں سے دیکھ لیجئے تب مانئے۔ دانت توڑ کر قبضہ میں کیا تو مجھ میں اور مداریوں میں فرق ہی کیا رہا۔ سانپ بڑا سمجھدار ہوتا ہے۔ اگر اسے یقین ہوجائے کہ اس آدمی سے مجھے کوئی گزند نہ پہنچے گا تو وہ اسے ہرگز نہ کاٹے گا۔ دانت اس کا آلۂ محافظت ہے۔“
مرنالنی نے دیکھا کہ کیلاش پر اس وقت جنوں سوار ہے تو اس نے یہ تماشہ ختم کرنے کو کہا اور بولی۔ ”اب یہاں سے چلو، دیکھو باہر گانا شروع ہوگیا۔ آج میں بھی کوئی چیز سناؤں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے کیلاش کا کندھا پکڑ کر چلنے کا اشارہ کیا اور کمرہ سے چلی گئی مگر کیلاش معترضوں کو خاموش کر کے ہی دم لینا چاہتا تھا۔ اس نے سانپ کی گردن پکڑ کر اتنے زور سے دبائی کہ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ جسم کی ساری رگیں تن گئیں۔ سانپ نے اب تک اس کے ہاتھوں اس قسم کا بے رحمانہ برتاؤ نہ دیکھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔ اسے شاید خیال ہوا کہ یہ مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ اپنی محافظت کیلئے آمادہ ہوگیا۔ کیلاش نے اس کی گردن دبا کر اس کا منہ کھول دیا اور اس کے دانت دکھاتے ہوئے بولا۔ ”جن صاحبوں کو شبہ ہو، آکر دیکھ لیں، آیا یقین؟ یا اب بھی شک ہے؟“
دوستوں نے قریب آکر اس کے دانت دیکھے اور کیلاش کے کمال کا اعتراف کرنے لگے۔ عینی شہادت کے سامنے شبہ کی گنجائش کہاں۔ ان کا اطمینان کر کے کیلاش نے سانپ کی گردن ڈھیلی کردی اور اسے زمین پر رکھنا چاہا مگر وہ کالا گیہوؤں غضبناک ہو رہا تھا، گردن نرم پڑتے ہی اس نے سر اٹھا کر کیلاش کی انگلی میں زور سے کاٹا اور وہاں سے بھاگا۔ انگلی سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا۔ کیلاش نے فوراً زور سے انگلی دبالی اور اپنے کمرہ کی طرف دوڑا۔ اس کی میز کی دراز میں ایک جڑی رکھی تھی جس کے استعمال سے قابل زہر بھی رد ہوجاتا تھا۔ دوستوں میں ہلچل پڑ گئی۔ ڈاکٹر

صاحب بدحواس ہو کر دوڑے۔ وہ جڑی بوٹی کے قائل نہ تھے۔ انگلی کو جڑ سے کاٹ دینا چاہتے تھے۔ پر کیلاش کو جڑی بوٹی پر کامل اعتقاد تھا۔ فوراً جڑی پیسی گئی اور انگلی پر اس کا لیپ کیا گیا۔ کیلاش تو مطمئن ہو کر باقی سانپوں کو ڈربے میں بند کرنے لگا مگر ڈاکٹر صاحب اور دوسرے احباب پریشان تھے۔ مرنالنی پیانو چھوڑ کر دوڑی آئی تھی۔ وہ بار بار ڈاکٹر صاحب سے کہتی، آپ نشتر لگا دیجئے مگر ڈاکٹر صاحب تذبذب کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ مشکل سے پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ کیلاش کو سر میں چکر محسوس ہوا اور دیکھتے دیکھتے اس کے چہرہ کا رنگ زرد پڑنے لگا مگر ابھی تک وہ ضبط کیے کھڑا تھا اور سب سے کہتا تھا، آپ لوگ اندیشہ نہ کریں۔ میں بالکل اچھا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب گو خاموش کھڑے تھے۔ پر کیلاش کے چہرہ کا اڑتا ہوا رنگ دیکھ کر ان کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ آخر نہ رہا گیا، وہ جلدی سے مطب میں آگئے اور کئی چیزیں ایک گلاس میں ملا کر لائے۔ کیلاش نے ایک بے غرضانہ انداز سے گلاس لے لیا اور منہ میں لگانا چاہا تھا کہ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ گلاس ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ وہ وہیں زمین پر لیٹ گیا اور ہاتھ سے پنکھا جھلنے کا اشارہ کیا۔ میز کا پنکھا لگا دیا گیا اور تیز ہوا چلنے لگی۔ مرنالنی نے دوڑ کر اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”کیلاش کیسی طبیعت ہے؟“ کیلاش نے ہاتھ اوپر اٹھا دیا، پر منہ سے کچھ نہ بول سکا۔

مسز چڈھا نے بگڑ کر شوہر سے کہا۔ ”کھڑے منہ کیا تاک رہے ہو، کوئی چیز دیتے کیوں نہیں؟“

مرنالنی نے کہا۔ ”ماں دیکھئے، ان کا چہرہ کیسا ہوا جاتا ہے۔“

چڈھا نے پچھتا کر کہا۔ ”کیا بتلاؤں، میں اس کی باتوں میں آگیا۔ اب تو نشتر سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا، کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیا کروں؟“

یہ کہتے ہوئے انہیں کچھ خیال آگیا۔ پھر دوڑے ہوئے مطب گئے اور کوئی مرکب بنا کر لائے، بڑی مشکل سے کیلاش کا منہ کھولا گیا اور دوا ڈالی گئی مگر زہر اتنا قاتل تھا کہ دوبارہ لہر نہ آئی۔ دوا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ آدھ گھنٹہ بھی نہ گزرا تھا کہ کیلاش کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ چہرہ سفید ہو گیا۔ نبض کا کہیں پتہ نہیں، موت کی ساری علامتیں نمودار ہو گئیں۔ گھر میں کہرام مچ گیا۔ مرنالنی ایک طرف سر پیٹنے لگی۔ ماں الگ پچھاڑیں کھانے لگی اور ڈاکٹر چڈھا تو ایسے بدحواس ہو گئے کہ اگر دوستوں نے نہ پکڑ لیا ہوتا تو شاید اپنے گلے پر نشتر چلا لیتے۔

ایک صاحب بولے۔ ”کوئی منتر جھاڑنے والا مل جائے تو ممکن ہے، اب بھی جان بچ جائے۔“

دوسرے صاحب نے فرمایا۔ ”ارے صاحب قبر سے نکلی ہوئی لاشیں زندہ ہو گئی ہیں، ایسے ایسے باکمال پڑے ہوئے ہیں۔“

چڈھا نے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میری عقل پر پتھر پڑ گیا تھا کہ اس کی باتوں میں آگیا۔ نشتر لگا دیتا تو یہ نوبت کیوں آتی۔ بار بار سمجھاتا رہا کہ بیٹا سانپ نہ پالو، جان کا خطرہ ہے مگر میری کون سنتا تھا، بلایئے کسی جھاڑنے والے کو بلایئے، میرا سب کچھ لے لے۔ میں اپنی ساری جائیداد اس کے پیروں پر رکھ دوں گا۔ لنگوٹی باندھ کر گھر سے نکل جاؤں گا مگر میرا کیلاش ' میرا لختِ جگر اٹھ بیٹھے۔ ایشور کیلئے بلایئے، مجھ پر رحم کیجئے۔“

بنگلہ سے کچھ دور پر کئی گوالے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک سانپ کا منتر جانتا تھا۔ اس نے آکر کئی بار منتر پڑھا۔ کئی بار کیلاش کے کان میں چلایا۔ پھر پچاسوں گھڑے پانی اس کے اوپر ڈلوائے۔ پر بازیافت کی کوئی علامت نہ دیکھ کر مایوس چلا گیا۔ ایک دو منتر والے اور بھی آئے، ان سبھوں نے بھی منتر پڑھے۔ دوائیں پلائیں، سونگھائیں، نہلایا، شور مچایا مگر کوئی نتیجہ نہ دیکھ کر رخصت ہو گئے۔ چوتھے نے آکر کیلاش کی صورت دیکھتے ہی کہا۔ ”اب میں کیا

منتر پڑھوں سرکار، جو کچھ ہونا تھا ہو چکا۔"

ظالم! یہ کیوں نہیں کہتا کہ جو کچھ نہ ہونا تھا ہو چکا، جو کچھ ہونا تھا، وہ کہاں ہوا۔ ماں باپ نے بیٹے کا سہرا کہاں دیکھا۔ مرنالنی کو آغوشِ محبت میں بیٹھنا کہاں نصیب ہوا۔ زندگی کے وہ سنہرے خواب جن سے زندگی نوبہار ہو جاتی تھی، کیا وہ پریشان نہیں ہو گئے۔ تمناؤں کی زرنگار جھیلوں میں لطف سیر اٹھاتے ہوئے کیا ان کا بجرا غرقاب نہیں ہو گیا۔ جو ہونا تھا وہ کہاں ہوا۔ جو کچھ نہ ہونا تھا وہ البتہ ہو گیا۔

وہی نورانی سبزہ زار تھا۔ وہی سنہری چاندنی ایک نغمۂ خاموش کی طرح منظر پر چھائی ہوئی تھی۔ وہی مجمع احباب تھا، وہی تفریح کے سامان تھے مگر اب ان پر تارے ماتم کرتے تھے اور شبنم آنسو بہاتی تھی۔ بارات وہی تھی، پر دلہا رخصت ہو گیا تھا۔

(3)

ایک چھوٹے سے کچے مکان میں ایک بوڑھا اور ایک بڑھیا انگیٹھی کے سامنے بیٹھے جاڑے کی رات کاٹ رہے تھے۔ انگیٹھی میں آگ نہ تھی، صرف من کو بہلانے کا ایک سامان تھا۔ زمین پر پڑی ہوئی پوال اور دو تار تار کمبل خوش آیند نیند کے ضامن نہ ہو سکتے تھے۔ انگیٹھی میں کم سے کم گرم راکھ تو تھی، دونوں خاموش تھے۔ دونوں صبر کے پتلے اور صبر بھی کیسا؟ بے عذر، ان کی زبان پر نہ زمانہ کا شکوہ تھا، نہ مرنے والوں کا ذکر غم! ان کا سارا وقت مصافِ حیات میں صرف ہوتا تھا۔ موت دروازہ پر کھڑی دستک دے رہی تھی۔ باتوں کی کہاں فرصت، فردا ہی نہ ہو تو غم کس کا۔

بڑھیا نے بڑی دیر کے بعد پوچھا۔ "کل کے لیے سن تو ہے ہی نہیں، کیا ہوگا؟"

"جا کر جھگڑو ساہ سے ادھار لاؤں گا۔"

"اس کے پہلے کے پیسے تو ابھی دیئے ہی نہیں، ادھار نہ دے گا۔"

"نہ دے گا نہ سہی، گھاس تو کہیں نہیں گئی ہے۔ دوپہر تک کیا دو آنہ کی بھی نہ چھیل سکوں گا اور کیا کرنا ہے۔"

اتنے میں ایک آدمی نے دروازہ پر دستک دی۔ "بھگت، سو گئے کیا؟ ذرا کواڑ کھولو، میں ہوں منگلی۔"

بھگت نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔ منگلی نے کوٹھڑی میں آکر کہا۔ "کچھ سنا۔ چڈھا بابو کے لڑکے کو سانپ نے کاٹ لیا؟"

بھگت نے چونک کر سر اٹھایا۔ "چڈھا بابو کے لڑکے کو؟ وہی چڈھا بابو ہیں نا جو بنگلے میں رہتے ہیں، پورپ طرپھ۔"

منگلی نے کہا۔ "ہاں ہاں وہی، نامی آدمی ہیں، چاروں اَور ہلا مچا ہوا ہے۔ جاتے ہو وہاں؟ آدمی بن جاؤ گے!"

بوڑھے نے بے رحمانہ انداز سے کہا۔ "میں نہیں جاتا، میری بلا جائے۔ وہی چڈھا ہیں، کھوب (خوب) جانتا ہوں، آدمی نہیں کسائی (قصائی) ہے۔ آج آٹھ سال ہوئے......"

بڑھیا نے تصحیح کی۔ "نواں لگا ہے۔"

بوڑھا۔ ”ہاں نواں سال ہے۔ میں پنّا کو لے کر دکھانے گیا تھا۔ کھیلنے جا رہے تھے۔ پیروں پر گر پڑا کہ ایک نجر (نظر) دیکھ لیجئے مگر اس نے بات تک نہ سنی۔ بھگوان بیٹھے سن رہے تھے۔ اب معلوم ہو گا کہ بیٹے کا گم (غم) کیسا ہوتا ہے۔ کئی لڑکے ہیں؟“

منگلی۔ ”نہیں جی، یہی تو ایک لڑکا ہے۔ سنا ہے سب لوگوں نے جواب دے دیا۔ گنگو گوالا، مدّو بہنا، منے مصر سب ہار کر چلے آئے۔“

بوڑھا۔ ”بھگوان بڑا کارساج (کارساز) ہے۔ ارے تم سے کیا کہوں، اس کے پیروں پر گر کر رویا، اس کے پیروں پر پگڑی اتار کر رکھ دی مگر اسے ذرا بھی دَیا نہ آئی۔ میں تو اس کے دروجے (دروازے) پر ہوتا تب بھی بات نہ پوچھتا۔ ایسے لوگوں کی یہی سجا (سزا) ہے۔“

منگلی۔ ”تو نہ جاؤ گے؟ ہم نے تو سنا تھا، تم سے کہہ دیا۔“

بوڑھا۔ ”بہت اچھا کیا، سن کر کلیجہ ٹھنڈا ہو گیا۔ آنکھیں ٹھنڈی ہو گئیں۔ تم جاؤ، آج چین کی نیند سوؤں گا۔ (بڑھیا سے) جرا تماکو لے لے، ایک چلم اور پیوں گا۔ اب معلوم ہو گا لالہ کو، ساری صاحبی بھول جائے گی۔ ہمارا کیا بگڑا، کچھ لڑکے کے مر جانے سے راج تو نہیں چلا گیا۔ تمہارا تو راج سونا ہو جائے گا۔ اسی لڑکے کے واسطے سب کا گلا دبا کر دھن جوڑا تھا نا، اب کیا کرو گے؟“

منگلی چلا گیا۔ بھگت نے چلم اٹھالی اور پڑوس کے حلوائی کی بھٹی سے آگ رکھ لایا، پھر کواڑ بند کر کے اطمینان سے چلم پینے لگا۔

بڑھیا نے کہا۔ ”اتنی رات گئے جاڑے پالے میں بھیجنے آیا تھا۔ موئے کو شرم بھی نہ آئی۔“

بوڑھا۔ ”رات نہیں، دوپہر بھی ہوتی تو میں نہ جاتا۔ اس کی سواری دروازے پر آتی تو بھی نہ جاتا۔ بھول نہیں گیا ہوں۔ پنّا کی صورت آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ اس نرموہی نے ایک نجر بھی تو نہیں دیکھا۔ کیا میں نہ جانتا تھا کہ وہ نہ بچے گا؟ کھوب جانتا تھا، وہ بھگوان نہیں تھا کہ اس کے ایک نجر دیکھ لینے سے امرت برس جاتا۔ نہیں کھالی (خالی) من کی دوڑ تھی۔ جرا تسکین ہو جاتی، بس اسی لیے اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ اب کسی دن پھر جاؤں گا اور کہوں گا۔ کیوں صاحب! کہئے کیا رنگ ہے؟ دنیا مجھے برا کہے گی، کہے، کوئی پروا نہیں۔ چھوٹے آدمیوں میں تو سب عیب ہوتے ہی ہیں۔ بڑوں میں کوئی عیب نہیں ہوتا۔ وہ دیوتا ہوتے ہیں۔“

اسّی سال کی عمر میں بھگت کے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ایسے سانحے کی خبر سن کر بھی وہ گھر سے باہر نہیں نکلا۔ ماگھ پوس کی اندھیری رات، جیٹھ بیساکھ کی دھوپ اور لو، ساون بھادوں کے موسلادھار مینہ، کسی کی اس نے کبھی پروا نہ کی۔ وہ فوراً گھر سے نکل پڑتا تھا۔ بے منت، بے غرض، معاوضہ کا خیال کبھی دل میں آیا ہی نہیں، نہ کبھی کسی نے کچھ دیا ہی۔ یہ معاوضہ کا کام ہی نہ تھا۔ جان کا کیا معاوضہ۔ یہ ایک کارِ ثواب تھا، اسے جو دیا آتی تھی، اس کا لازمی استعمال۔ سینکڑوں مایوسوں کو اس کے منتروں نے زندگی عطا کر دی تھی، پر آج وہ گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکتا۔ اپنے کانوں سے یہ خبر سن کر بھی اطمینان سے سونے کی کوشش کر رہا تھا۔

بڑھیا نے کمبل اوڑھ کر لیٹتے ہوئے کہا۔ ”تماکو کے ڈھائی پیسے ہو گئے۔ آج دیتی ہی نہ تھی۔“

بھگت نے کپّی بجھائی اور کچھ دیر کھڑا رہا۔ پھر بیٹھ کر کچھ سوچتا رہا۔ بعد ازاں لیٹ گیا۔ یہ خبر اس کے جگر پر بوجھ کی طرح رکھی ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی کوئی چیز کھو گئی ہے۔ جیسے سارے کپڑے گیلے ہو گئے ہیں یا

پیروں میں کیچڑ لگا ہوا ہے۔ جیسے کوئی اس کے دل کے اندر بیٹھا ہوا اسے گھر سے نکلنے کیلئے تحریک کر رہا ہو۔ بڑھیا ذرا دیر میں خراٹے لینے لگی۔ بوڑھے بولتے بولتے سو جاتے ہیں اور چوہے کا رینگنا سن کر جاگ اٹھتے ہیں۔ بھگت کو جب اطمینان ہو گیا کہ بڑھیا سو ہو گئی ہے تو وہ اٹھا، اپنی لکڑی ٹٹول کر اٹھائی اور دھیرے سے کواڑ کھولے۔

بڑھیا چونک پڑی، بولی۔ "کہاں جاتے ہو؟"

"کہیں نہیں، دیکھتا تھا کتنی رات گئی ہے۔"

"ابھی بہت رات ہے، سو جاؤ۔"

"نیند نہیں آتی۔"

"نیند کاہے کو آئے گی۔ من تو چڈھا بابو کے گھر پر لگا ہوا ہے۔"

"چڈھا بابو نے میرے ساتھ ایسی کونسی نیکی کر دی ہے جو وہاں جاؤں۔ وہ آ کر پیروں پڑیں تب بھی نہ جاؤں۔"

"مانو چاہے نہ مانو، پر تم اٹھے اسی ارادہ سے تھے۔"

"نہیں ری، ایسا پاگل نہیں ہوں کہ جو مجھے کانٹے بوئے اس کے لیے پھول بوتا پھروں۔"

بڑھیا پھر سو گئی، بھگت نے کواڑ لگا دیئے اور پھر آ کر بیٹھا مگر اس کے دل کی حالت اس کتے کی سی ہو رہی تھی جو رات کو کسی اجنبی کی آہٹ پا کر مالک کے منع کرنے پر بھی بھونکنا نہیں چھوڑتا اور زور سے چاہے نہ بھونکے مگر آہستہ آہستہ غراتا رہتا ہے۔ بھگت کا نفس اسے اپنی پوری طاقت سے روک رہا تھا، پر اس کے وجود کا ایک ایک ذرہ ہوا کے جھونکے سے اڑے ہوئے پتے کی طرح اس بدنصیب نوجوان کی طرف اڑا جا رہا تھا جو اس وقت مر رہا تھا اور جس کے لیے ایک ایک لمحہ کی دیر بازیافت کے امکان کو اور دور ٹال رہی تھی۔

اس نے پھر کواڑ کھولے، اتنے آہستہ سے کہ بڑھیا کو خبر نہ ہوئی۔ باہر نکل آیا، اسی وقت محلّہ کا چوکیدار گشت کر رہا تھا۔ بولا "کیسے اٹھے بھگت۔ آج تو بڑی سردی ہے۔ کہیں جا رہے ہو کیا؟"

بھگت نے کہا۔ "نہیں جی، جاؤں گا کہاں۔ دیکھتا تھا کہ ابھی کتنی رات ہے۔ بھلا کے بجے ہوں گے؟"

"ایک بجا ہو گا اور کیا۔ ابھی تھانے سے آ رہا تھا تو چڈھا کے بنگلے پر بڑی بھیڑ لگی تھی۔ ان کے لڑکے کا حال تو تم نے سنا ہو گا۔ کالے نے چھو لیا ہے، چاہے مر بھی گیا ہو۔ تم چلے جاؤ تو سائت (شاید) بچ جائے۔ سنا ہے دس ہجار (ہزار) تک دینے کو تیار ہیں۔ نہ دس ہجار دیں گے، دس سو تو دیں گے۔"

"میں تو نہ جاؤں گا چاہے وہ دس لاکھ بھی دیں۔ مجھے دس ہجار لے کر کرنا ہی کیا ہے۔ کل کو مر جاؤں گا تو کون بھوگے گا۔ میں ان کے درواجے پر ہوتا تب بھی نہ جاتا۔ ایسے بے دردوں کی سجا یہی ہے۔"

چوکیدار چلا گیا۔ بھگت نے آگے پیر بڑھائے۔ جیسے کسی مخمور آدمی کا اپنے فعلوں پر قابو نہیں ہوتا۔ وہ کہتا کچھ ہے، زبان سے نکلتا کچھ ہے۔ وہ اپنی دانست میں پاؤں سنبھال کر رکھتا ہے، پر وہ لغزش کرتے ہیں۔ وہی حالت بھگت کی تھی۔ نفس انتقام پر تلا ہوا تھا، پر عمل پر اس کا قابو نہ تھا۔ جس نے کبھی تلوار نہیں چلائی، وہ ارادہ کرنے پر بھی تلوار نہیں چلا سکتا۔ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔

دو میل کا راستہ تھا۔ بھگت لاٹھی کھٹ کھٹ کرتا چلا جاتا تھا۔ ادراک ثانی اولیٰ پر حاوی تھا۔ اولیٰ روکتا تھا، ثانی ٹھیلتا تھا۔ آدھا راستہ طے ہو جانے پر یکایک بھگت رک گیا۔ نفس نے قوتِ عمل پر فتح پائی۔ ارے! میں اتنی دور

چلا آیا! اس جاڑے پالے میں مجھے مرنے کی کیا ضرورت تھی۔ آرام سے پڑا کیوں نہ رہا۔ نہ نیند آتی دو چار بھجن ہی گاتا، ناحق اتنی دور دوڑا۔ چڈھا کا لڑکا رہے یا جائے، میری بلا سے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ دنیا میں ہزاروں مرتے ہیں، ہزاروں جیتے ہیں۔ مجھے کسی کے مرنے جینے سے مطلب، جس نے میرے ساتھ ذرا بھی سلوک نہیں کیا، اس کے ساتھ میں کیوں سلوک کروں؟

مگر نفس کی یہ فتح عارضی تھی، وہ ادراک ثانی جو اسے اتنی دور لایا تھا، ایک دوسری ہی صورت میں نمودار ہوا جو نفس سے بہت متشابہہ تھا۔

میں وہاں کچھ سانپ کا منتر پڑھنے تھوڑا ہی جا رہا ہوں، ذرا دیکھوں گا، لوگ کیا کرتے ہیں۔ ذرا ڈاکٹر صاحب کا رونا پیٹنا دیکھوں گا۔ کس طرح سر پیٹتے ہیں، کس طرح پچھاڑیں کھاتے ہیں۔ ذرا دیکھوں گا بڑے لوگ بھی ہمیں لوگوں کی طرح روتے ہیں یا صبر کر جاتے ہیں۔ وہ لوگ تو وِدوان ہوتے ہیں، من میں سمجھ کر رہ جاتے ہوں گے۔

اس طرح نفس کو دھوکا دیتا ہوا شیطان کو بہکاتا ہوا وہ چلا جا رہا تھا کہ دو آدمی راستہ سے گزرے، دونوں میں ڈاکٹر چڈھا ہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ ایک نے کہا۔ ”چڈھا بابو کا گھر اجڑ گیا۔“ دوسرا بولا۔ ”کشٹ بھی ہے کہ ابھی بیاہ نہیں ہوا تھا۔“ بھگت کی چال اور بھی تیز ہو گئی۔ ضعف کے مارے قدم نہ اٹھتے تھے مگر ہمت ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ سر کا حصہ اتنا آگے بڑھا جاتا تھا گویا اب منہ کے بل گر پڑے گا۔ اس طرح کوئی بیس منٹ چلا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب کا بنگلہ نظر آیا۔ بجلی کی بتیاں روشن تھیں مگر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ نالہ و شیون کی صدائیں بھی نہ سنائی دیتی تھیں۔ اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ کہیں دیر تو نہیں ہو گئی۔ وہ دوڑنے لگا۔ اپنی عمر میں وہ اتنا تیز کبھی نہ دوڑا تھا۔ بس یہی معلوم ہوتا تھا، گویا اس کے پیچھے موت دوڑی آ رہی ہے۔

(4)

کیلاش بے جان پڑا ہوا تھا۔ جسم ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہونٹ سیاہ پڑ گئے تھے۔ زندگی کی کوئی علامت باقی نہ تھی مگر کوئی بلند آواز سے نہ روتا تھا۔ گریۂ خاموش ڈوبنے والی امید کی آخری شعاع تھی۔

یکایک بھگت نے برآمدہ میں پہنچ کر پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا، کوئی مریض آیا ہوگا۔ کسی اور وقت انہوں نے اس آدمی کو دھتکار دیا ہوتا۔ رات کے وقت وہ کسی مریض کو نہ دیکھتے تھے مگر آج وہ فوراً گھر میں سے نکل آئے اور رقت آمیز انداز سے بولے۔ ”کیا ہے بھئی، آج تو ہمارے اوپر ایسی مصیبت آ پڑی ہے کہ کچھ کہتے نہیں بنتا، پھر کبھی آنا۔“

بھگت نے کہا۔ ”سب حال سن چکا ہوں بابو صاحب! اسی لیے تو آیا ہوں۔ جرا میں بھی دیکھ لوں۔ چھوٹے بھیا کہاں ہیں۔ بھگوان بڑا کارساج ہے۔ کون جانے اب بھی اسے دیا آ جائے۔“

ڈاکٹر چڈھا نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ ”اچھی بات ہے چلو دیکھ لو، تین چار گھنٹے ہو گئے ہیں، ہم تو نراش ہو گئے۔“

بھگت نے اندر جا کر ایک منٹ تک لاش کو دیکھا۔ تب مسکرا کر بولا۔ ”ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے بابو جی۔

واہ! نارائن چاہیں گے تو آدھ گھنٹہ میں بابو جی اٹھ بیٹھیں گے۔ جرا کہاروں سے کہئے پانی تو بھریں۔"

بوڑھے کا لہجہ اتنا یقین انگیز تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو بھی کچھ امید پیدا ہو گئی۔ بولے۔ "بوڑھے بابا بس یہی سمجھ لیجئے کہ ہم سب عمر بھر آپ کے غلام بنے رہیں گے۔ اس لڑکے پر ہم اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کو تیار ہیں۔"

مسز چڈھا نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "دادا! یہی ہماری جنم بھر کی کمائی ہے۔ بس اور کیا کہوں۔"

بوڑھے بھگت کے پاس ایک ایسی جڑی تھی کہ سانپ کیسا ہی زہریلا ہو، اس کا زہر زائل ہو جاتا تھا۔ اس جڑی کے ساتھ ہی وہ ایک منتر بھی پڑھتا تھا۔ اس منتر میں کچھ ایسی تاثیر تھی کہ پہلے ہی دم میں مار گزیدہ کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ بھگت کو اپنے ردِّ زہر کی طاقت پر پورا اعتماد تھا۔ آج تک اسے کبھی ناکامی نہ ہوئی تھی۔ اس لیے وہ اس قسم کی خبر پاتے ہی اضطراری طور پر گھر سے نکل پڑا تھا۔ وہ آدھ گھنٹہ تک کھڑا منتر پڑھتا رہا۔ ایک بار منتر ختم ہو جانے پر وہ کیلاش کو جڑی سونگھا دیتا تھا۔ ادھر کہار لوگ کیلاش کے سر پر پانی انڈیلتے چلے جاتے تھے۔ دو بجتے بجتے کیلاش نے آنکھیں کھول دیں اور اٹھ بیٹھا۔

بھگت نے پوچھا۔ "بابو یہاں کسی کو پہچانتے ہو؟"

کیلاش نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا۔ "ہاں صاحب، سب کو پہچانتا ہوں۔ وہ پاپا ہیں، یہ ماما ہیں، وہ مرنالنی ہیں۔"

مسز چڈھا بھگت کے پیروں پر گر پڑیں۔ ڈاکٹر چڈھا دوڑ کر کیلاش کے گلے سے لپٹ گئے۔ چاروں طرف سے احباب نے مبارکباد دینا شروع کیا۔ باہر ہلچل مچ گئی۔ کمرہ میں دوستوں کا ایسا ہجوم ہوا کہ تل رکھنے کی جگہ بھی نہ رہی۔ ہر شخص بھگت کے درشنوں کا مشتاق تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے لپک کر اپنا سیف کھولا اور گنیوں سے بھری ہوئی ایک تھیلی نکال لائے۔ وہ اسے بھگت کے پیروں پر رکھ دینا چاہتے تھے مگر جب تھیلی لے کر کمرہ میں پہنچے تو بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چاروں طرف بھگت کی تلاش ہونے لگی۔ کہاں گئے، کہاں گئے، ابھی تو یہیں کھڑے تھے۔ بھیتر باہر سب جگہ چھان ڈالی گئی مگر بھگت کا کہیں پتہ نہ تھا۔

مسز چڈھا نے کہا۔ "کوئی دیوتا تھا۔"

احباب نے کہا۔ "ہاں معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

پھر جشن شروع ہوا۔ نغمہ کی صدائیں بلند ہوئیں اور باجے بجنے لگے۔

کشمکش

(1)

حسن و شباب کی عارضی بہار کے بعد کوکلا اس خزاں کے ایام میں اس کارنامہ سیاہ کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔ دور گزشتہ کی یاد آتے ہی اس کا دل بے چین ہو جاتا اور وہ غصہ و یاس کی حالت میں پکار اٹھتی۔ ہائے! میں دنیا میں

پیدا ہی کیوں ہوئی۔ اس نے داد و دہش سے ان سیاہ حروف کو مٹانے کی کوشش کی اور ایام بہار کی بیشتر کمائی اس سعی ناکام میں صرف کر دی۔ پر دل کو تسکین نہ ہوئی۔ یہ حقیقت کھلی کہ اشک ندامت ہی سے وہ داغ سیاہ مٹ سکتے ہیں اور آج پندرہ سال کے بعد جب اس کے کانوں میں ایک حیات معصوم کے گریہ اولیں کی صدا آئی۔ جب اس کے غارِ معصیت میں ایک سنہری روشنی کا جلوہ ہوا۔ اس کے خشک اور نیلے ہونٹوں پر ایک فطری، وجدانی، روحانی، دردناک تبسم کی جھلک دکھائی دی اور اس نے پارۂ جگر کو سینہ سے چمٹا لیا۔ اسی وقت سے اس کی آنکھوں سے سیلاب اشک جاری ہو گیا۔ اس پارۂ گوشت نے کوہ حائل بن کر اس کی زندگی کا رخ پھیر دیا۔ وہ ہستی بے کس اس کے لیے پیغام حیات اور تلقین خاموش تھی۔ اس کی ہنستی ہوئی، شفاف آنکھوں کی گہرائیوں میں معرفت کا دریا چھپا ہوا تھا۔ حسن فروش، فسوں ساز، عشوہ طراز کوکلا ایشور کی اُپاسنا میں محو ہو گئی۔ وہ اب مشہود نہیں شاہد تھی۔ معشوق رعنا عاشق جانباز کی صورت میں نمودار ہو گیا۔

کوکلا نے اس بچی کا نام شردھا رکھا۔ اسی کے جنم نے تو اسے شردھا کی دولت عطا کی تھی۔ وہ اسے اپنی لڑکی نہیں، کسی دیوی کا اوتار سمجھتی تھی۔ اس کی بازاری ہمجولیاں اسے مبارکباد دینے آتیں۔ پر کوکلا بچی کو ان کی نظروں سے بچاتی۔ اسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ ان کی حیاسوز نگاہیں بچی پر پڑیں۔ وہی اس کی زندگی کی کائنات، اس کی آرزوؤں کا مرکز اور اس کے راہ حیات کی شمع تھی۔ وہ کبھی کبھی اسے گود میں لیے نگاہ حسرت سے دیکھ کر سوچتی۔ کیا یہ پاکیزہ وجود بھی نفس کی ترغیبات کا شکار ہو گا! کیا میری ساری کوشش رائیگاں جائے گی۔ آہ کیا کوئی ایسی دوا نہیں ہے جو خون کے اثر کو زائل کر دے! اس کی ساری جبیں سائیوں کا یہی مدعا تھا کہ ایشور اسے ترغیبات سے محفوظ رکھے۔ وہ اپنے قول و فعل سے، خیال اور عمل سے، اس کے سامنے ایک بہترین مثال پیش کرے گی۔ شردھا اتنی معصوم، اتنی چونچال، اتنی ذہین، اتنی نکتہ رس تھی کہ کبھی کبھی کوکلا جذبہ مادری سے مسرور ہو کر اپنی پیشانی کو اس کے تلووں سے رگڑتی اور روتی۔

(2)

سولہ سال گزر گئے۔ بھولی بھالی شردھا اب ایک متین، خوددار، مادر پرست نازنین تھی جسے دیکھ کر آنکھیں روشن ہو جاتی تھیں۔ طلب اور جستجو کی دلدادہ، ساری دنیا سے متنفر ہمجولیوں کے احتراز اور کنارہ کشی نے اسے حد درجہ مغرور بنا دیا تھا۔ اس کی نظروں میں تاہل خدائی قہر سے کم نہ تھا۔ کوکلا اگر کبھی اس کا ذکر کرتی تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے۔ رخ روشن مکدر ہو جاتا، آنکھیں آبگوں ہو جاتیں۔ کوکلا خاموش ہو جاتی۔ دونوں کے معیار زندگی جدا تھے۔ کوکلا سماج کے دیوتا کی پجارن شردھا رایشور تک سے منکر۔ اسے کتابوں سے عشق تھا، وہاں احتراز نہ تھا، اجتناب نہ تھا، تحقیر نہ تھی۔ جن اہل کمال کے روبرو دنیا نے سر اطاعت خم کیا، وہ اپنے اوراق میں اس سے خلوص کے ساتھ ہمکلام ہوتے، وہاں اصل اور کم اصل کا امتیاز نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کے لیے دعوت عام تھی۔ رحیم کے لفظوں میں اگر کوئی اسے خاطر سے بلا کر زہر دے دیتا تو وہ اسے قبول کر لیتی، بجائے اس کے کہ امرت کیلئے دست سوال پھیلائے۔

ایک دن کوکلا نے چشم پُر آب ہو کر کہا۔ "کیوں منّی، سچ بتانا تجھے یہ شرم تو آتی ہو گی کہ میں کیوں اس کی

بیٹی ہوئی۔ اگر تو کسی شریف خاندان میں پیدا ہوئی ہوتی تو کیا اس وقت بھی تیرے دل میں یہ خیالات آتے۔ تُو دل میں مجھے ضرور کوستی ہو گی۔"

شردھا ماں کا منہ تکنے لگی۔ اتنی عقیدت اس کے دل میں کبھی نہ پیدا ہوئی تھی۔ بولی۔ "اماں آپ مجھ سے کیوں ایسا سوال کرتی ہیں؟ کیا میں نے آپ کی کبھی بے ادبی کی ہے؟"

کوکلا۔ "نہیں بیٹی! تم جیسی نیک بخت لڑکی ایشور سب کو دے مگر کبھی کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے کہ تو ضرور میری بیٹی ہونے پر پچھتاتی ہو گی۔"

شردھا۔ "آپ کا یہ خیال غلط ہے اماں جی۔ میں ایشور سے کہتی ہوں کہ آپ کی جتنی عزت میرے دل مین ہے، اتنی اور کسی کی نہیں۔ میں آپ کی بیٹی ہونا شرم کا نہیں، فخر کا باعث سمجھتی ہوں۔ انسان حالات کا غلام ہوتا ہے۔ آپ نے جن حالات میں پرورش پائی، ان کا آپ کے اوپر اثر پڑنا لازمی تھا۔ مگر آپ کے دل میں بدی کا شائبہ تک نہ تھا۔ بہاؤ کی طرف کشتی کو لے جانا آسان ہے۔ بہادر ملاح وہی ہے جو چڑھاؤ کی طرف کشتی کو لے جائے۔ میں جب آپ کے ایثار اور بے نفسی کا خیال کرتی ہوں تو مجھے حیرت ہوتی ہے۔"

کوکلا۔ "تو پھر شادی کے نام سے کیوں چڑتی ہے؟"

شردھا۔ "میں بلا شادی کیے زندگی کو پار لگا سکتی ہوں۔ ودّیالیہ سے نکل کر کالج میں داخل ہو جاؤں گی اور دو تین سال میں ضرور اس قابل ہو جاؤں گی کہ آپ کے اور اپنے گزران کیلئے کسی کی دست نگر نہ ہوں۔ ڈاکٹر بن سکتی ہوں، وکالت کر سکتی ہوں۔ عورتوں کیلئے ابھی کافی گنجائش ہے۔" کوکلا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "تیرے دل میں اور کوئی خواہش نہیں ہے! محبت کے لیے تیرا دل کبھی نہیں تڑپتا؟"

شردھا نے متین لہجہ میں کہا۔ "اماں جی، محبت انسان کے دل کا ایک لازمی جزو ہے۔ میں تو خیال کرتی ہوں کہ محبت ہی انسان میں ایشور کی کبرتی ہے۔ جب کوئی ایسا آدمی ملے گا جو مجھ سے شادی کرنا اپنی ذلت کا باعث نہ سمجھے گا تو میں جان و دل سے اس کی پرستش کروں گی لیکن میں یہ ہرگز گوارا نہیں کر سکتی کہ کسی سے رحم کی بھیک مانگوں۔ اگر کسی نے ترس کھا کر یا مصلحانہ جوش میں مجھ سے شادی کر بھی لی تو میں خوش نہ رہوں گی۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ شادی کا خیال ہی دل میں نہ لاؤں۔"

(3)

انہیں دنوں مہلا منڈل کا ایک عام جلسہ ہوا۔ کالجوں کے نظرباز طلبہ اتنی کثرت سے آئے کہ وسیع ہال میں تل دھرنے کی بھی جگہ نہ رہی۔ شردھا بھی آکر عورتوں کی سب سے پچھلی قطار میں کھڑی ہو گئی۔ اسے یہ سب مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ آج تک کسی جلسہ میں شریک نہ ہوئی تھی۔

جلسہ شروع ہوا۔ صدر کی تقریر کے بعد تجویزیں پیش اور منظور ہونے لگیں مگر یا تو مہلائیں اپنی لکھی ہوئی تقریریں بھول گئیں یا ان پر اس شاندار مجمع کا رعب طاری ہو گیا۔ کئی لیڈیاں آئیں اور دو چار جملے بول کر چلی گئیں۔ ناظرین کو مذاق اڑانے کا بہانہ ملا۔ قہقہے پڑنے لگے۔ تالیاں بجنے لگیں۔ ان کا یہ نامردانہ، بے رحمانہ رویہ دیکھ کر شردھا کملا اٹھی۔ پلیٹ فارم پر آکر اس نے ایسی روانی سے اور ایسی پرجوش تقریر کی کہ دم زدن میں سارا شوروغل

رو ہو گیا۔ مجمع پر کامل سکون طاری ہو گیا۔ لوگ ٹکٹکی باندھ کر شردھا کو دیکھنے لگے۔ اس کے انداز بیان پر لوگوں کو حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے حسن نے تقریر میں اور ہی تاثیر بھر دی تھی۔

جلسہ ختم ہوا تو چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ ایک نے پوچھا۔ "یہ کون عورت تھی بھئی؟"

"اسی کوکلا طوائف کی لڑکی ہے۔"

"جبھی یہ آواز اور صفائی ہے۔ کیوں نہ ہو، اس کی ماں بھی تو ستم ڈھاتی تھی۔ جب سے اس نے گانا چھوڑا، شہر کی روح ہی غائب ہو گئی۔ اب یہ اپنی ماں کی جگہ لے گی۔"

اس پر ایک سیاہ فام روح کھدر پوش نوجوان بولا۔ "کیا خوب قدردانی فرمائی ہے، جناب نے واہ!"

"آپ کو کیوں برا لگا۔ کچھ سانٹھ گانٹھ تو نہیں ہے!"

سیاہ فام نوجوان نے تیز ہو کر کہا۔ "آپ کو ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم نہیں آتی۔"

"شرم کی بات کیا ہے اس میں۔ طوائف کی لڑکی اگر طوائف ہو تو تعجب کا کونسا موقع ہے!"

سیاہ فام نوجوان نے حقارت آمیز لہجہ میں کہا۔ "آپ جیسے باریک فہم آدمیوں کے لیے تعجب کا موقع نہ ہوگا مگر ہم جیسوں کے لیے تو ہے۔ جس عورت کے دل سے ایسے پاکیزہ خیالات نکل سکتے ہیں، وہ دیوی ہے، حسن فروش نہیں۔"

شردھا اسی وقت جلسہ سے رخصت ہو رہی تھی۔ یہ الفاظ اس کے کانوں میں پڑ گئے۔ وہ اضطراری طور پر ذرا ٹھٹک گئی۔ سیاہ فام نوجوان کی طرف احسان مندانہ نظروں سے دیکھا اور تیزی سے آگے بڑھ گئی لیکن راستہ بھر اس کے دل میں یہی الفاظ گونجتے رہے۔ لہجہ کتنا مردانہ تھا۔ الفاظ کتنے پاکیزہ! اب تک شردھا کی داد دینے والا دنیا میں اگر کوئی تھا تو وہ کوکلا تھی اور چاروں طرف اس کے اوصاف پر پردہ ڈالا جاتا تھا۔ چاروں طرف وہی ہمت شکن تغافل، وہی جگر خراش تحقیر، آج یہ غائبانہ داد پا کر شردھا کا دل داد طلب متوالا ہو گیا۔ رقص کرنے لگا۔ اس نوجوان کی صورت برابر آنکھوں کے سامنے پھرا کرتی۔ دل میں سوال پیدا ہوتا، وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے؟ کیا پھر کبھی اس کے درشن ہوں گے؟

کالج جاتے وقت شردھا چاروں طرف پر تلاش نظریں ڈالتی۔ گھر پر چق کی آڑ میں کھڑی گھنٹوں سڑک پر آنے جانے والوں کو دیکھا کرتی، پر وہ نوجوان کبھی نظر نہ آتا۔

اسی اثناء میں مہلا منڈل کے ایک دوسرے جلسہ کا اعلان ہوا۔ ابھی چار دن باقی تھے۔ یہ چاروں دن شردھا نے اپنی تقریر کی تیاری میں صرف کیے۔ ایک ایک جملے کو بار بار پڑھتی۔ ایک ایک لفظ کی تلاش میں گھنٹوں محو خیال رہتی۔ اساتذہ کی تقریروں کا مطالعہ کرتی۔ جب پوری تقریر تیار ہو گئی تو اس نے کئی بار اپنے کمرہ کی تنہائی میں، کرسیوں اور تصویروں کو مخاطب کر کے اسے ادا کیا۔ فن تقریر کے سارے نکات مجتمع ہو گئے تھے۔ خاتمہ کو اپنی ہی زبان سے سن کر وہ بول اٹھی۔ اس میں کتنا نغمہ تھا۔ کتنی تاثیر، کتنی گہرائی، خیالات بتدریج ایک ایک مرصع جملے میں بلند تر ہوتے ہوئے ایک آخری یادگار جملے میں روحانیت کے معراج پر پہنچ گئے تھے۔ اسی دن جلسہ تھا۔ شردھا دل میں امید و بیم کا ایک طوفان محسوس کرتی ہوئی ہال میں داخل ہوئی۔ ہال بھرا ہوا تھا، پہلے دن سے بھی زیادہ۔ شردھا کو دیکھتے ہی تالیوں نے اس کا خیر مقدم کیا اور شور مچ گیا۔ آپ اپنی تقریر شروع کیجیے۔

شردھا نے پنچ پر آ کر ایک اڑتی ہوئی نگاہ سے مجمع کو دیکھا۔ وہ سیاہ فام نوجوان جگہ نہ ملنے کے باعث آخری

صف میں کھڑا تھا۔ شردھا کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اس نے کانپتے ہوئے لہجہ میں تقریر شروع کی۔ اس کی نظروں میں سارا ہال پتلیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اگر کوئی انسان تھا تو وہی سیاہ فام نوجوان جو آخری صف میں کھڑا تھا۔ اس کا روئے سخن اسی کی طرف تھا۔ وہ اسی سے اپنی تقریر کی داد طلب کر رہی تھی۔ مغنی بھری ہوئی محفل کی اتنی پروا نہیں کرتا جتنی ایک جوہر شناس کی۔

آدھ گھنٹہ تک شردھا کے منہ سے نغمہ اور گل کی بارش ہوتی رہی۔ حقوقِ نسواں کی ایسی پُرزور، پُرتاثیر وکالت بہت کم سننے میں آئی تھی۔

(4)

شردھا جب جلسہ ختم ہو جانے پر گھر چلی تو اس نے دیکھا کہ وہ سیاہ فام نوجوان اس کے پیچھے پیچھے تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ شردھا کو یہ تو معلوم تھا کہ اس کی تقریر ناظرین نے بہت پسند کی مگر اس نوجوان کا فیصلہ سننے کا آج اسے موقع نہ ملا تھا۔ اس نے اپنی رفتار سُست کر دی اور ایک لمحہ بھر میں وہ نوجوان اس کے قریب آ گیا۔ دونوں کئی قدم خاموش چلتے رہے۔ آخر نوجوان نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”آج تو آپ نے کمال کر دیا۔“ شردھا نے نظریں نیچی کر کے کہا۔ ”یہ آپ کی قدردانی ہے۔“

نوجوان۔ ”میں کس قابل ہوں، ساری مجلس سر دھن رہی تھی۔“

”دولت خانہ یہیں ہے؟“

”غریب الوطن ہوں۔ یہاں ایم اے میں پڑھ رہا ہوں۔ یہ اونچ نیچ کا بھوت نہ جانے کب تک ہمارے سر پر سوار رہے گا۔ بدقسمتی سے میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں جنہیں نیچ کہا جاتا ہے۔ چمار ہوں۔ میرے والد ایک انسپکٹر مدارس کے اردلی تھے۔ ان کی سعی و سفارش سے اسکول میں داخل ہو گیا۔ تب سے تقدیر سے لڑتا جھگڑتا چلا آ رہا ہوں۔ پہلے تو سکول کے ماسٹر مجھے چھوتے ہی نہ تھے۔ اب وہ کیفیت تو نہیں ہے لیکن لڑکے مجھ سے کھنچے ہوئے ضرور رہتے ہیں۔“

”میں تو انسان کی شرافت پیدائش سے نہیں، اس کے اطوار سے مانتی ہوں۔“

”یہ تو آپ کی تقریر ہی سے ثابت ہوا اور اسی وجہ سے مجھے آپ سے باتیں کرنے کی جرات ہوئی ورنہ کہاں میں اور کہاں آپ۔“

شردھا نے مشتبہ انداز سے کہا۔ ”شاید آپ کو میرا حال معلوم نہیں ہے؟“

”بخوبی معلوم ہے۔ اگر آپ اپنی ماتا جی کے درشن مجھے کرا دیں تو عین احسان ہو۔“

شردھا نے خوش ہو کر کہا۔ ”چلیے شوق سے۔ وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ شبھ نام کیا ہے؟“

”مجھے بھگت رام کہتے ہیں۔“

یہ تعارف بتدریج آمد و رفت، بے تکلفی، دوستی کے درمیانی منازل طے کر کے بالآخر محبت کی آخری منزل پر جا پہنچا۔ وہ چمار تھا۔ نہایت درجہ مکروہ۔ پر شردھا کی نظروں میں دیوتا۔ شردھا ایک طوائف کی بیٹی تھی، اس کی نظروں میں دیوی۔

(5)

ایک سال گزر گیا۔ بھگت رام قریب قریب روزانہ دیوی کے درشنوں کو آتا۔ دونوں گھنٹوں بیٹھے باتیں کیا کرتے۔ شردھا کوئی تقریر کرتی تو بھگت رام سارے کام چھوڑ کر سننے آتا۔ اُن کے منصوبے ایک تھے۔ زندگی کا نقشہ ایک، مذاق ایک، بھگت رام محبت اور اس کے رموز پر خوب گلفشانی کرتا۔ اس کی باتوں میں شعریت اور رنگینی کو کبھی اتنا دخل نہ تھا۔ اظہارِ جذبات میں اسے کمال حاصل ہو گیا تھا لیکن عین موقعوں پر جب شردھا کے دل میں گدگدی پیدا ہوتی۔ اس کے رخسار اشتیاق سے سرخ ہو جاتے۔ جسم کا ایک ایک عضو ترجمانِ دل بن جاتا، بھگت رام موضوعِ کلام کو بدل دیتا۔ اتنا بیگانہ بن جاتا، گویا وہ اس کوچہ سے نا آشنا ہے اور جلد ہی کوئی بہانہ بنا کے کھسک جاتا۔ شردھا اس کے چلے جانے پر حسرت کے آنسو بہاتی اور سوچتی، کیا انہیں دل سے میری محبت نہیں؟

ایک دن کوکلا نے بھگت رام کو تخلیہ میں بلا کر کہا۔ ”بیٹا اب تو مُنّی سے تمہاری شادی...... ہو جائے تو اچھا، زندگی کا کیا اعتبار، کہیں مر جاؤں تو یہ آرزو دل میں رہ جائے۔“

بھگت رام نے سر جھکا کر کہا۔ ”اماں ذرا اس امتحان میں کامیاب ہو جانے دو، روزی کا مسئلہ حل ہو جانے پر ہی شادی زیب دیتی ہے۔“

”یہ سب تمہارا ہی تو ہے۔ کیا میں ساتھ باندھ لے جاؤں گی!“

”یہ آپ کی شفقت ہے اماں جی مگر اتنا بے غیرت نہ بنائیے۔ میں شردھا کا ہو چکا، اب تو آپ دُتکاریں بھی تو اس دروازہ سے نہیں ٹل سکتا۔ مجھ جیسا خوش نصیب آدمی دنیا میں کون ہے! لیکن دیوی کے مندر میں جانے سے پہلے کچھ پان پھول تو پاس ہونا چاہیے۔“

سال بھر اور گزر گیا۔ بھگت رام نے ایم اے کی ڈگری حاصل کی اور اپنے ہی کالج میں مالیات کا پروفیسر ہوا۔ اس دن کوکلا نے خوب دان پن کیا۔ جب بھگت رام نے آکر اس کے پیروں پر سر جھکایا تو اس نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اسے یقین تھا کہ آج بھگت رام ضرور شادی کا مسئلہ چھیڑے گا۔ شردھا مجسم انتظار ہو رہی تھی۔ اس کا ایک ایک عضو گویا سو سو تار ہو کر نغمہ ریز ہو رہا تھا۔ دل پر ایک نشہ چھایا ہوا تھا۔ پاؤں زمین پر نہ پڑتے تھے۔ آنکھیں غرور سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بھگت رام کو دیکھتے ہی بولی۔ ”اماں! اب ہمیں ایک ہلکا سا موٹر لے دیجئے گا۔“

کوکلا نے مسکرا کر کہا۔ ”ہلکا سا کیوں، بھاری سا لے لینا، پہلے کوئی اچھا سا مکان تو تجویز کر لو۔“

شردھا بھگت رام کو اپنے کمرہ میں بلا لے گئی۔ دونوں بیٹھ کر نئے مکان کی سجاوٹ کا ذکر کرنے لگے۔ فرش، پردے، تصاویر کا ذکر ہوا۔ شردھا نے کہا۔ ”روپے ابھی اماں جی سے لے لیں گے۔“

بھگت رام بولا۔ ”ان سے روپے لیتے مجھے شرم آئے گی۔“

شردھا نے مسکرا کر کہا۔ ”آخر میرے جہیز کے روپے تو دیں گی۔ کیا پانچ ہزار میں بھی کلام ہے۔“

دونوں گھنٹے بھر باتیں کرتے رہے مگر وہ حرفِ التجا جسے سننے کیلئے شردھا کا دل بے قرار ہو رہا تھا، آج بھی اس کی زبان پر نہ آیا اور وہ رخصت ہو گیا۔ کوکلا نے ڈرتے ڈرتے شردھا سے پوچھا۔ ”کیا باتیں ہوئیں؟“

شردھا نے اس کا مطلب سمجھ کر کہا۔ ”اگر میں ایسی بھاری ہو رہی ہوں تو کنوئیں میں کیوں نہیں ڈال دیتیں؟“

یہ کہتے کہتے اس کے ضبط کی دیوار ٹوٹ گئی۔ وہ جذبات درد جواب تک اندر ہی اندر ٹیس رہے تھے، نکل پڑے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کوکلا نے غصہ سے کہا۔ ''جب کچھ بات ہی نہیں کرنی ہے تو روز آتے کیوں ہیں؟ کوئی ایسے عالی خاندان بھی تو نہیں ہیں اور نہ ایسے دھنا سیٹھ ہی۔'' شردھا نے آنکھیں پونچھ کر کہا۔ ''اماں جی! میرے سامنے انہیں کچھ نہ کہئے۔ وہ زبان سے چاہے کچھ نہ کہیں مگر دل سے کہہ چکے اور میں کانوں سے چاہے کچھ نہ سنوں، پر دل سے سب کچھ سن چکی۔''

کوکلا نے شردھا سے کچھ نہ کہا لیکن دوسرے دن بھگت رام سے بولی۔ ''اب کس سوچ بچار میں ہو بیٹا!''

بھگت رام نے سر کھجلاتے ہوئے کہا۔ ''اماں جی میں تو حاضر ہوں لیکن گھر والے کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔ ذرا فرصت ملے تو گھر جا کر انہیں راضی کر لوں۔ ماں باپ کو ناراض کرنا بھی تو اچھا نہیں۔''

کوکلا خاموش ہو گئی۔

(6)

بھگت رام کے ماں باپ شہر سے دور ایک موضع میں رہتے تھے۔ یہی ان کا ایک لڑکا تھا اور ان کے دل کے سارے حوصلے اسی کی شادی کے منتظر تھے۔ انہوں نے کئی بار اس کی شادی طے کی مگر بھگت رام ہر بار یہی کہہ کر نکل گیا کہ جب تک نوکر نہ ہو جاؤں، شادی نہ کروں گا۔ اب وہ نوکر ہو گیا تھا۔ اس لیے دونوں ماگھ کی ایک ٹھنڈی، ابر آلود صبح کو لدے پھندے بھگت رام کے پاس آ پہنچے۔ بھگت رام نے دوڑ کر ان کے قدموں پر سر جھکا دیا اور خیر و عافیت پوچھنے کے بعد بولا۔ ''آپ لوگوں نے اس جاڑے پالے میں کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔''

چوہدری نے بیوی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''سنتی ہو بچہ کی اماں اس کی باتیں۔ جب بلاتے ہیں تو کہتا ہے، امتحان ہے۔ یہ ہے، وہ ہے۔ اب جو آ گئے تو کہتا ہے مجھے کیوں نہ بلا بھیجا۔ تمہاری شادی ٹھیک ہو گئی ہے۔ اب ایک مہینہ کی چھٹی لے کر ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ اسی لیے ہم دونوں آئے ہیں۔''

چوہدرائن۔ ''ہمیں نے کہا' بے گئے کام نہ چلے گا۔ تو آج ہی درکھاس دے دو۔ لڑکی بڑی سندر، پڑھی لکھی۔ اچھے کُل کی ہے۔''

بھگت رام نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''میری شادی تو یہیں ایک جگہ لگی ہوئی ہے۔ اگر آپ لوگ راضی ہوں تو کر لوں۔''

چوہدری۔ ''اس شہر میں ہماری برادری کا کون ہے، کا ہے بچہ کی اماں۔''

چوہدرائن۔ ''یہاں ہماری برادری کا کوئی نہیں ہے۔''

بھگت رام۔ ''ماں بیٹیاں ہیں، گھر میں روپیہ ہے۔ لڑکی ایسی ہے کہ تم دیکھ کر خوش ہو جاؤ گے۔ مفت میں شادی ہو جائے گی۔''

چوہدری۔ ''لڑکی کا باپ مر گیا ہے؟ اس کا نام کیا تھا؟ کہاں کا رہنے والا ہے؟ کل مر جاؤ کا کیسا ہے؟ جب تک یہ ساری باتیں معلوم نہ ہو جائیں، بیاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیوں بچہ کی اماں؟''

چوہدرائن۔ ”اس کا پتہ لگائے بنا کیسے ہو سکتا ہے؟“

بھگت رام نے کچھ جواب نہ دیا۔

چوہدری۔ ”یہاں کس محلہ میں رہتی ہے ماں بیٹی؟ سارا شہر ہمارا چھانا پڑا ہے۔ یہاں ہم کوئی بیس سال رہے ہوں گے کیونکہ بچہ کی اماں۔“

چوہدرائن۔ ”بیس سال سے جیادہ رہے ہوں گے۔ یہاں رہے کوئی پچیس سال۔“

بھگت رام۔ ”ان کا گھر نخاس پر ہے۔“

چوہدری۔ ”نخاس کے کس طرف؟“

بھگت رام۔ ”نخاس کے سامنے والی گلی میں پہلا مکان انہی کا ہے۔ سڑک سے دکھائی دیتا ہے۔“

چوہدری۔ ”پہلا مکان تو کوکلا رنڈی کا ہے۔ وہ دومحلّا مکان ہے۔ ہم انسپٹر صاحب کی اردلی میں تھے تو بن رہا تھا۔ گلابی رنگ سے پوتا ہوا ہے؟“

بھگت رام نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”جی ہاں، وہی مکان ہے۔“

چوہدری۔ ”تو اب کوکلا رنڈی اس میں نہیں رہتی؟“

بھگت۔ ”رہتی کیوں نہیں، ماں بیٹی دونوں رہتی ہیں۔“

چوہدری۔ ”تو کیا کوکلا رنڈی کی لڑکی سے بیاہ کرنا چاہتے ہو؟“

بھگت رام۔ ”میں تو کوئی حرج نہیں سمجھتا۔“

چوہدری۔ ”ناک کٹوانے پر لگے ہو کیا۔ برادری میں کوئی پانی تک تو پئے گا نہیں۔“

چوہدرائن۔ ”لو کانہ لگادوں منہ میں رانڈ کے۔ روپ رنگ دیکھ کے لُبھا گئے کیا۔“

بھگت رام۔ ”میں تو اسے اپنے بڑے بھاگ سمجھتا ہوں کہ وہ مجھ سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے پر راضی ہے۔ آج وہ چاہے تو کسی بڑے سے بڑے رئیس سے اس کا بیاہ کر سکتی ہے۔“

چوہدری۔ ”رئیس اس سے بیاہ نہ کرے گا، رکھ لے گا۔ تمہیں بھگوان سمائی دیں۔ ایک نہیں دس رکھو۔ مردوں کیلئے کون روک ہے لیکن جو بیاہ کی بات کہتے ہو تو بیاہ وہی ہے جو برادری میں ہو۔“

چوہدرائن۔ ”بہت پڑھنے سے آدمی بُودا جاتا ہے۔“

چوہدری۔ ”ہم تو گنوار آدمی ہیں مگر سمجھ میں نہیں آتا۔ تمہاری یہ نیت کیسے ہوئی۔ رنڈی کی بیٹی اندر کی پری ہو۔ ہے تو رنڈی کی بیٹی۔ نہ ہم تمہارا بیاہ وہاں نہ ہونے دیں گے۔ اگر تم نے اس سے بیاہ کیا تو ہم دونوں تمہارا اوپر جان دے دیں گے۔ اتنا سمجھ لو، کیوں بچہ کی اماں۔“

چوہدرائن۔ ”بیاہ کیسے کر لیں گے۔ ٹھٹھا ہے۔ جھاڑو مار کے بھگادوں گی رانڈ کو۔ اپنی بیٹی اپنے گھر میں رکھے۔“

بھگت رام۔ ”خیر اگر آپ لوگوں کی مرضی نہیں ہے تو میں اس سے شادی نہ کروں گا۔ شادی کروں گا تو اسی سے ورنہ بن بیاہی رہوں گا۔“

چوہدرائن۔ ”ہاں تم کنوارے رہو، یہ ہمیں منجور ہے۔ پتریا کے گھر ہم بیاہ نہ کریں گے۔“

بھگت رام نے اب کے جھنجھلا کر کہا۔ ”آپ اسے بار بار پتریا کیوں کہتی ہیں؟ کسی زمانہ میں یہ اس کا پیشہ رہا

ہو گا۔ آج جتنے دھرم سے وہ رہتی ہے شاید ہی کوئی دوسری عورت رہتی ہو۔ ایسی پارسا، ایسی نیک عورت تو میں نے دیکھی ہی نہیں۔"

مگر بھگت رام کی سرگرمیاں بے اثر ثابت ہوئیں۔ چوہدری اور چوہدرائن نے ایسی ضد پکڑی کہ جَو بھر بھی نہ ہلے۔ جاہلانہ ضد جھکنا نہیں جانتی۔

رات کو بھگت رام کوئے یار میں پہنچا تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ ایک ایک عضو سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ شردھا چشم براہ بیٹھی گھبرا رہی تھی کہ آج اتنی رات تک آئے کیوں نہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ میرے دل کی کیا حالت ہو رہی ہے۔ جب یار دوستوں سے فرصت ملے گی تو بھول کر ادھر آ جائیں گے۔

کوکلا نے کہا۔ "میں تو تجھ سے کہہ چکی کہ اب ان کا وہ مزاج نہیں رہا۔ پھر بھی تو نہیں مانتی۔ آخر اس ٹال مٹول کی کوئی حد بھی ہے۔"

شردھا نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ "اماں جی میں آپ سے بار بار عرض کر چکی کہ میں رسماً کنواری ضرور ہوں لیکن معناً ان کی بیاہتا ہو چکی۔ اگر ایسا آدمی بھی اعتبار کے قابل نہیں ہے تو میں نہیں جانتی دنیا میں اور کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ (آنکھوں میں آنسو بھر کر) میں آپ کے پیروں پڑتی ہوں، مجھ سے ایسی باتیں نہ کیا کیجئے۔ مجھے بڑا صدمہ ہوتا ہے۔"

اسی وقت بھگت رام صورت درد بنے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ دونوں عورتوں نے ان کی طرف دیکھا۔ کوکلا نے نگاہ شکایت سے، شردھا نے نگاہ اضطراب سے۔ کوکلا کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ یہ تمہارے کیا رنگ ڈھنگ ہیں۔ شردھا کے چہرہ سے وحشت برس رہی تھی۔

بھگت رام نے معذرت کے لہجہ میں کہا۔ "آپ لوگوں کو آج میرا بہت انتظار کرنا پڑا مگر میں مجبور تھا۔ گھر سے اماں اور دادا آئے ہوئے ہیں، انہیں سے باتیں کرتا رہا۔"

کوکلا بولی۔ "گھر پر تو سب خیریت ہے نا؟"

بھگت رام نے حسرت سے کہا۔ "جی ہاں گھر پر تو سب خیریت ہے۔ میری شادی کا مسئلہ پیش تھا۔ پرانے خیال کے لوگ ہیں، کسی طرح راضی نہیں ہوتے۔"

خود دار کوکلا کا چہرہ تمتما اٹھا۔ بولی۔ "ہاں کیوں راضی ہونے لگے۔ ہم لوگ ان سے بھی نیچ ہیں نا۔ مگر جب تمہیں انہیں کی مرضی پر چلنا تھا تو پہلے ان سے پوچھ کر یہاں آتے۔ اس طرح ہمیں ذلیل کرنا تو شرافت نہ تھی۔ مجھے معلوم ہوتا کہ تم ماں، باپ کے اتنے غلام ہو تو یہ نوبت ہی نہ آتی۔"

شردھا نے دیکھا بھگت رام کی آنکھوں سے آنسو گر رہے ہیں۔ معاً اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ محبت ہم آہنگیٔ جذبات کے سوا اور کیا ہے۔ شکایت آمیز نظروں سے ماں کی طرف دیکھ کر بولی۔ "اماں، ماں باپ کی مرضی کا غلام ہونا کوئی گناہ نہیں ہے۔ اگر میں آپ کی پروا نہ کروں تو آپ کو کتنا صدمہ ہو گا۔ یہی کیفیت ان لوگوں کی بھی تو ہو گی۔ میں اسے اپنی بدنصیبی سمجھوں گی کہ میری وجہ سے ان لوگوں کا دل ان کی طرف سے پھر جائے۔" یہ کہتی ہوئی وہ اپنے کمرہ کی طرف چلی اور بھگت رام کو بھی اشارے سے بلایا۔ وہاں دونوں بیٹھ کر ایک منٹ تک زمین کی طرف تاکتے رہے۔ تب بھگت رام بولے۔ "شردھا! اس وقت میرے دل کی جو کیفیت ہے، بیان نہیں کر سکتا۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ زہر کھا کر جان دے دوں۔ تم سے الگ ہو کر میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ مر

بھی نہیں سکتا۔ صرف تڑپ سکتا ہوں۔ میں نے اماں اور دادا کی کتنی خوشامد کی۔ کتنی منت سماجت کی۔ رویا، پر انہیں ذرا بھی جنبش نہ ہوئی۔ شاید میری موت بھی انہیں منظور ہو گی لیکن تم میرے دل کی رانی بنو، یہ انہیں منظور نہیں۔''

شردھا نے تشفی آمیز انداز سے کہا۔ ''پیارے مجھ سے ان کی نفرت واجب ہے۔ پڑھے لکھے آدمیوں میں ہی ایسے کتنے ہیں جو تم جیسے آزاد ہوں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں۔ میں کل سویرے ان کے درشن کرنے جاؤں گی۔ شاید میری خدمت سے ان کا دل پگھل جائے۔ میں اس طرح انؑ کی خدمت کروں گی، ان کی دھوتیاں دھوؤں گی۔ ان کے پیر پکھاروں گی جیسے ان کی من چاہی بہو کرتی۔ اس میں شرم کیسی۔ میں ان کے بدن دباؤں گی۔ انہیں بھجن گا کر سناؤں گی۔ مجھے بہت سے دیہاتی گیت آتے ہیں۔ اماں جی کے سر کے سفید بال چنوں گی۔ دادا جی کو چلمیں بھر بھر دوں گی۔ میں فیشن کی لونڈی نہیں، محبت کی چیری ہوں۔ تمہارے لیے میں سب کچھ کروں گی، سب کچھ۔''

بھگت رام کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کی آنکھوں کی روشنی بڑھ گئی ہے۔ گویا ان کے جسم میں کوئی نئی روح آگئی ہے۔ ان کے دل کی ساری پاکیزگی، ساری عقیدت، ساری رقت آنکھوں سے اس طرح نکل کر شردھا کے پیروں کی طرف جاتی ہوئی معلوم ہوئی ——جیسے کسی گھر سے ننھے ننھے سرخ رخساروں والے، گھونگریلے بالوں والے، ریشمی کپڑوں والے، بچے ہنستے ہوئے نکل کر کھیلنے جا رہے ہوں۔

(7)

چوہدری اور چوہدرائن کو شہر آئے دو ہفتے گزر گئے۔ وہ روز جانے کا ارادہ کرتے ہیں اور رہ جاتے ہیں۔ شردھا انہیں جانے ہی نہیں دیتی۔ سویرے ان کی نیند کھلتی ہے تو شردھا ان کے اشنان کیلئے پانی گرم کرتی ہوتی ہے۔ چوہدری کو اپنا حقہ بھرا ہوا ملتا ہے۔ وہ لوگ جونہی نہا کر اٹھتے ہیں، شردھا ان کی دھوتی چھانٹنے لگتی ہے۔ دونوں اس کی خدمت اور عقیدت دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ ایسی حسین، ایسی نازک بدن، ایسی شیریں بیان، ایسی ہنس مکھ، ایسی سلیقہ شعار عورت چوہدری نے انسپکٹر صاحب کے گھر میں بھی نہ دیکھی تھی۔ چوہدری کو وہ دیوی معلوم ہوتی اور چوہدرائن کو لکشمی، دونوں شردھا کی شرم اور حیا اور پاکیزگی پر حیرت کرتے ہیں۔ حالانکہ برادری اور خاندان کی بندشیں ان کی زبان پر مہر بنی ہوئی ہیں مگر ذاتی منافرت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

پندرھویں دن جب دس بجے رات کو شردھا گھر چلی گئی تو چوہدری بولے۔ ''لڑکی تو لچھی ہے۔''

چوہدرائن۔ ''جب میری دھوتی چھانٹنے لگتی ہے تو میں مارے شرم کے مر جاتی ہوں۔ ہماری طرح تو اس کے گھر میں لونڈی ہو گی۔''

چوہدری۔ ''پھر کیا صلاح دیتی ہو۔ ایسی لچھمی سنسار میں نہ پاؤ گی۔ برادری میں ایسی لڑکیاں کہاں ہیں۔''

چوہدرائن۔ ''رام کا نام لے کے بیاہ کرو۔ بہت ہو گا بھات لگ جائے گا۔ سو روپیہ میں تو بھات ہوتا ہے۔ کون چھپن ٹکے لگے جاتے ہیں۔ پہلے ہمیں سنکا ہوتی تھی کہ تیریا کی لڑکی ہے، نہ جانے کیسی پڑے، کیسی نہ پڑے۔ پر اب ساری سنکا مٹ گئی۔''

چوہدری۔ ''بات کرنے لگتی ہے تو جیسے منہ سے پھول جھڑیں۔''

چوہدرائن۔ ''میں تو اس کی ماں کو بکھانتی ہوں جس کی کوکھ سے ایسی لچھمی جنمی۔''
چوہدری۔ ''کل چلو کو کلا سے مل آئیں۔ متی ساعت سب ٹھیک ہو جائے۔''
چوہدرائن۔ ''مجھے تو اس کے گھر جاتے لاج آتی ہے۔ وہ رانی بنی بیٹھی ہو گی۔ میں اس کی لونڈی جنچوں گی۔''
چوہدری۔ ''پوڈر منگا کر منہ میں پوت لو۔ گوری ہو جاؤ گی۔ انسپکٹر صاحب کی میم روج پوڈر لگاتی تھیں۔ رنگ تو سانولا تھا۔ جب پوڈر لگا لیتی تھیں تو منہ چمکنے لگتا تھا۔''
چوہدرائن۔ ''ہم سے ہنسی کرو گے تو گالی دوں گی۔ کالی کملی پر کون رنگ چڑھتا ہے کہ پوڈر چڑھ جائے گا۔ تم تو سچ مچ اس کے چوکیدار سے لگو گے۔''
چوہدری۔ ''تو کل اندھیرے یہاں سے چل دیں۔ بٹیا آ جائے گی تو گلا نہ چھوڑے گی۔ بچہ سے کہہ دیں گے، پنڈت سے ساعت متی ٹھیک کر لو، انہیں تو آپ جلدی پڑی ہے۔''

(8)

چوہدری اور چوہدرائن کی رضامندی پا کر کوکلا زیور اور کپڑے اور برتن جہیز کے سامان جمع کرنے لگی لیکن نجانے کیا بات تھی کہ بھگت رام کے چہرہ پر ولولہ مسرت کے آثار نہ تھے۔ نہیں وہ کچھ دل گرفتہ سا نظر آتا تھا۔ شردھا کے گھر بلاناغہ جاتا لیکن وہاں بھی کچھ اداس، متفکر، کھویا سا بیٹھا رہتا۔ گھنٹوں محویت کے عالم میں آسمان یا زمین کی طرف تاکتا رہتا۔ شردھا اسے اپنے بیش قیمت جوڑے اور جڑاؤ گہنے دکھاتی۔ اس کے ایک ایک عضو سے مسرت کا جوش چھلکا پڑتا تھا۔ بسنت میں آنے والی کوئل کی طرح اسے بھی اپنے چاروں طرف گل اور بو اور نغمہ کی بہار نظر آتی۔ وہی مستی اور نشہ تھا۔ بھگت رام بھی اس کی خوشی میں شریک ہوتا لیکن اس کی خوشی آورد معلوم ہوتی تھی۔ اس مسرت کی مدہوشی میں شردھا کو وہ آنسو بھی نظر نہ آتے جو کبھی کبھی بھگت رام کے گوشہ چشم میں بھر آتے تھے۔ ادھر چوہدری بھی انتظامات میں مصروف تھے۔ بارہا شہر آتے اور شادی کے سامان خرید لے جاتے۔ بھگت رام کے آزاد خیال احباب بھی خوش تھے۔ وہ اس کی تقدیر پر رشک کرتے۔ محبت کی ایسی لازوال دولت کسے نصیب ہوتی ہے! مگر وہ جو اس ہجوم شادمانی کا باعث تھا، چھپ چھپ کر روتا تھا اور اپنی زندگی سے بیزار تھا۔ چراغ تلے اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس طوفان عظیم کی کسی کو خبر نہ تھی جو اس غریب کے دل کو زیر و زبر کر رہا تھا۔

جوں جوں شادی کا دن قریب آتا تھا۔ بھگت رام کی مصنوعی زندہ دلی بھی غائب ہوئی جاتی تھی۔ جب چار دن رہ گئے تو یکایک اسے خفیف سا بخار آ گیا۔ وہ شردھا کے گھر بھی نہ جا سکا۔ چوہدری، چوہدرائن اور چند قریبی رشتہ دار آ پہنچے تھے مگر سب کے سب شادی کی دھن میں اتنے منہمک تھے کہ اس کی طرف کسی نے دھیان بھی نہ دیا۔ دوسرے دن بھی وہ گھر سے نہ نکل سکا۔ شردھا نے سمجھا، شادی کے رسوم سے فرصت نہ ملی ہو گی۔ تیسرے دن شام کو چوہدرائن بھگت رام کو بلانے گئیں تو دیکھا کہ وہ ایک پریشانی اور وحشت کے عالم میں دونوں ہاتھوں کو سپر بنائے کمرہ کے کونے کی طرف ایک ایک قدم پیچھے ہٹتا چلا جا رہا تھا۔ گویا کسی کے وار سے اپنے کو بچاتا ہو۔

چوہدرائن نے گھبرا کر پوچھا۔ ''بچہ کیسی طبیعت ہے؟ پیچھے کیوں چلے جا رہے ہو؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔''

بھگت رام کے چہرہ پر مجذوبانہ وحشت نمودار تھی۔ آنکھیں سہمی ہوئی تھیں۔ بولا ”نہیں اماں جی، دیکھئے وہ شردھا چلی آرہی ہے۔ دیکھو اس کے دونوں ہاتھوں میں دو کالی ناگنیں ہیں۔ وہ مجھے ان ناگنوں سے ڈسوانا چاہتی ہے۔ ارے اماں۔ دیکھو وہ قریب آگئی۔ شردھا! شردھا! تم میری جان کی کیوں دشمن ہو رہی ہو۔ کیا میری محبت کا یہی صلہ ہے۔ میں تو تمہارے قدموں پر نثار ہونے کے لیے ہمیشہ تیار تھا۔ اس زندگی کی حقیقت ہی کیا ہے۔ تم ان ناگنوں کو دور پھینک دو۔ میں یہیں تمہارے قدموں میں لیٹ کر اپنی جان تمہاری نذر کر دوں گا...... تم نہ مانو گی!“

یہ کہتے کہتے وہ چت گر پڑا۔ چوہدرائن نے لپک کر چوہدری کو بلایا۔ دونوں نے بھگت رام کو اٹھا کر چارپائی پر لٹایا۔ چوہدری کو معاً کسی آسیب کا شک ہوا۔ وہ فوراً لونگ اور راکھ لے کر آسیب کو اتارنے کی فکر کرنے لگے۔ جنتر منتر کے علم کے ماہر تھے۔ بھگت رام کا سارا جسم ٹھنڈا تھا مگر سر توے کی طرح تپ رہا تھا۔

رات کو بھگت رام کئی بار چونک چونک کر اٹھا۔ چوہدری نے ہر بار منتر پھونک کر اپنے خیال میں آسیب کو بھگا دیا۔

چوہدرائن نے کہا۔ ”کوئی ڈاکدر کیوں نہیں بلا لیتے۔ سائت دوا سے کچھ آرام ہو جائے۔ کل بیاہ ہے اور آج یہ حال۔“

چوہدری نے دلیرانہ انداز سے کہا۔ ”ڈاکدر آکر کیا کرے گا۔ وہی پیپل والے بابا تو ہیں۔ دوا دے کر ان سے اور راڑ مول لوں۔ رات جانے دو سویرے ایک بکرا اور ایک بوتل داروان کی بھینٹ کر دی جائے گی۔ بس اور کچھ کرنے کی جرورت نہیں۔ ڈاکدر بیماری کی دوا کرتا ہے کہ ہوا بیار کی۔ بیماری انہیں کوئی نہیں ہے۔ کُل کے باہر بیاہ کرنے سے ہی دیوتا لوک روٹھ گئے ہیں۔“

سویرے چوہدری نے ایک بکرا منگوایا۔ عورتیں گاتی بجاتی دیوی کے چبوترے کی طرف چلیں۔ جب لوگ لوٹ آئے تو دیکھا کہ بھگت رام کی حالت خراب ہے۔ اس کی نبض سُست ہو گئی تھی اور چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی دونوں آنکھوں کے گوشوں سے آنسو بہہ کر رخساروں پر آ گئے تھے۔ گویا حسرت نے آخری پیغام سنا دیا ہو۔ زندگی کا کتنا دردناک خلاصہ تھا! آنسو کی دو بوندیں!

اب چوہدری گھبرائے۔ فوراً کوکلا کو خبر دی۔ ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس بھیجا۔ ڈاکٹر کے آنے میں تو دیر تھی۔ وہ بھگت رام کے ملاقاتی تھے مگر کوکلا اور شردھا آدمی کے ساتھ ہی آ پہنچیں۔ شردھا بھگت رام کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

ذرا دیر میں بھگت رام نے آنکھیں کھولیں اور شردھا کو دیکھ کر بولے۔ ”تم آگئیں شردھا۔ میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ یہ آخری پیار لو۔ آج اس کشمکش کا خاتمہ ہو جائے گا جو آج سے تین سال قبل شروع ہوئی۔ ان تین سالوں میں مجھے جو روحانی کوفت ہوئی ہے، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ میں جانتا تھا، تم وفا کی دیوی ہو لیکن رہ رہ کر یہ وہم ہو جاتا تھا، کیا تم خون کے اثر کو زائل کر سکتی ہو۔ کیا تم پیدائش کے قدرتی قانون کو توڑ سکتی ہو۔ اس بدگمانی کے لیے مجھے معاف کرنا شردھا۔ میرا ماتم نہ کرنا۔ میں تمہارے قابل نہ تھا۔ کسی طرح نہیں۔ ہاں! اس وہم کی بدولت دنیا سے نامراد جا رہا ہوں۔ تمہاری پاکیزہ، لافانی محبت کی یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی مگر افسوس!“

یہ کہتے کہتے بھگت رام کی آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔ شردھا کے چہرہ پر گاڑھی سرخی دوڑ گئی۔ اس کے آنسو خشک ہو گئے۔ جھکی ہوئی گردن تن گئی۔ پیشانی پر بل پڑ گئے۔ آنکھوں میں عزم قوی کی جھلک نظر آئی۔ وہ ایک لمحہ

وہاں کھڑی رہی۔ پھر بلا کچھ کہے سنے آکر اپنی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ کوکلا اس کے پیچھے پیچھے دوڑی ہوئی آئی اور بولی۔ ''بیٹی! یہ غصہ کا موقع نہیں ہے۔ لوگ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ ان کی حالت ہر لحہ خراب ہوئی جاتی ہے۔ تمہارے رہنے سے بڈھوں کی تشفی ہوتی رہے گی۔'' لیکن شردھا نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ کوچبان سے کہا۔ ''گھر چلو۔'' مجبور ہو کر کوکلا بھی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

غضب کی سردی پڑ رہی تھی۔ آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور ٹھنڈے جھونکے آرہے تھے۔ ماگھ کا آخری دن تھا۔ درخت بھی سردی سے اکڑے ہوئے تھے۔ دن کے 9 بج گئے تھے۔ ابھی تک لوگ لحافوں میں منہ ڈھانپے پڑے تھے مگر شردھا کا جسم پسینہ سے تر تھا۔ معلوم ہوتا تھا، آفتاب کی ساری حرارت اس کی رگوں میں سما گئی ہے۔ اس کے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ پیاس سے نہیں، اندرونی شعلوں کی لپٹوں سے۔ اس کا ایک ایک عضو اس جلن سے پھنکا جا رہا تھا۔ اس کے منہ سے بار بار تپتی ہوئی سانس نکلتی تھی۔ گویا کسی تنور کی لپیٹ میں ہو۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کا پھول سا جسم مرجھا گیا، ہونٹ نیلے پڑ گئے۔ جیسے کسی کالے نے ڈس لیا ہو۔ کوکلا بار بار چشم پر نم سے اس کی طرف تاکتی تھی۔ پر کیا کہے! کیسے سمجھائے!

گھر پہنچ کر شردھا جب اپنے اوپر کے کمرے کی طرف چلی تو اسے اتنا ضعف ہو گیا تھا کہ وہ بمشکل تمام زینہ طے کر سکی۔ ہائے! ابھی آدھ گھنٹہ قبل اس کمرے کے در و دیوار تک مسرت سے مدہوش تھے۔ اب سب کے سب سر دھنتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صندوقوں میں جوڑے سجائے ہوئے رکھے تھے۔ انہیں دیکھ کر شردھا کے جگر میں ایک ایسی ہوک اٹھی۔ گویا تیر لگ گیا ہو۔ وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ فرش پر گر پڑی۔

یکا یک شردھا کی نگاہ اس تصویر پر پڑی جو آج تین سال سے اس کی زندگی کی سب سے پیاری چیز تھی۔ اس تصویر کو اس نے کتنی بار بوسہ دیا تھا۔ کتنی بار گلے لگایا تھا۔ کتنی بار دل سے چمٹایا تھا۔ وہ ساری باتیں جو مایوسی کے جنوں میں اس کے دل سے یکلخت مٹ سی گئی تھیں، اس کی آنکھوں کے سامنے مصور ہو گئیں۔ دل میں پھر ایک درد اٹھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ جانگزار، کہیں زیادہ طوفاں انگیز۔ ہاں مرنے والے کے دل کو اس نے کتنا صدمہ پہنچایا۔ بھگت رام کی بے وفائی کا یہ جواب کتنا بے رحمانہ، کتنا سفاکانہ تھا! وہ کیوں اتنی بے درد ہو گئی۔ اس کا پیارا اس کی نظروں کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔ اس کے لیے تشفی اور تسکین کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ یہ خون کے اثر کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ آج شردھا کو پہلی بار کوکلا کی بیٹی ہونے پر پچھتاوا ہوا۔ وہ اتنی خود غرض، وہ اتنی کور باطن ہے! اس لافانی محبت کا یہ صلہ ایک طوائف کی بیٹی کے سوا اور کون دے سکتا تھا!

شردھا اسی وقت بالا خانہ سے اتری اور بے تحاشہ بھگت رام کے مکان کی طرف دوڑی۔ وہ آخری بار اس سے گلے ملنا چاہتی تھی۔ آخری بار اس کے درشن کرنا چاہتی تھی کہ وہ مرتے دم تک آئین وفا کو نبھائے گی۔ مرتے دم تک اس کی پرستش کرے گی۔

راستہ میں کوئی سواری نہ ملی۔ نازک بدن شردھا کا دم پھول رہا تھا۔ سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کتنی بار وہ ٹھوکریں کھا کر گری۔ اس کے گھٹنوں سے خون نکل رہا تھا۔ ساڑھی کئی جگہ سے پھٹ گئی تھی مگر اس وقت اسے اپنے تن بدن کی سدھ نہ تھی۔ اس کا ایک ایک رویاں ایک ایک ہزار زبان ہو کر ایشور سے التجا کر رہا تھا کہ وہ چراغ سحری ایک لحہ اور روشن رہے۔ اس کے منہ سے ایک بار شردھا! کا لفظ سننے کے لیے اس کی روح کتنی بے قرار ہو رہی تھی۔ یہ لفظ سن کر پھر اسے کوئی آرزو نہ رہ جائے گی۔ پھر وہ ہمیشہ کے لیے فریب آرزو سے آزاد ہو جائے گی۔

شردھا کو دیکھتے ہی چودھرائن نے دوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور روتی ہوئی بولیں! ''بیٹی! تم کہاں چلی گئی تھیں۔ دوبار تمہارا نام لے کر پکار چکے ہیں۔''

شردھا کو ایسا معلوم ہوا گویا اس کا کلیجہ پھٹا جا رہا ہے۔ اس کی بینائی رخصت ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ وہ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں جا پڑی ہے۔ اس نے کمرہ میں جاتے ہی بھگت رام کے ٹھنڈے پاؤں پر سر رکھ دیا اور اسے آنسوؤں کے گرم قطروں سے دھونے لگی۔ یہی اس کی آرزوؤں کا معراج تھا۔ اس وقت اس کے روحانی سرور کا کون ندازہ کر سکتا ہے۔

بھگت رام نے آنکھیں کھول کر کہا۔ ''تم ہو شردھا! میں جانتا تھا تم آؤ گی۔ اسی لیے اب تک دم رکے ہوئے تھے۔ ذرا میرے سینے پر اپنا سر رکھ دو۔ ہاں اب مجھے یقین ہو گیا کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔ جی ڈوب رہا ہے، تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ کچھ مانگنا چاہتا ہوں مگر کس منہ سے مانگوں۔ جب جیتے جی نہ مانگ سکا تو اب کیا ہے۔''

ہمارے آخری لمحے یادہائے شیریں کے آموختے ہوتے ہیں۔ موت پہلے ہماری عداوتوں اور کدورتوں کو فنا کر دیتی ہے جن کی صورت سے ہم بیزار تھے۔ ان سے ایک بار ہم آغوش ہونے کے لیے ہم تڑپ جاتے ہیں۔ جو کچھ کر سکتے تھے اور نہ کر سکے۔ اس کی حسرت رہ جاتی ہے۔ بھگت رام نے اکھڑے ہوئے حسرتناک لہجہ میں ان دلفریبیوں کا ذکر کیا جن کا لطف اس نے شردھا کے ساتھ اٹھایا تھا۔ اس لافانی دولت سے وہ اپنی زندگی کو مالامال کر سکتا تھا۔ آج وہ خالی ہاتھ جا رہا تھا۔ حسرتوں کا ایک انبار لیے ہوئے۔

شردھا بھگت رام کے سینہ پر جھکی ہوئی رو رہی تھی۔ دفعتاً بھگت رام نے سر اٹھا کر اس کے مرجھائے ہوئے آنسوؤں سے تر رخسار کا بوسہ لے لیا اور فاتحانہ انداز سے بولا۔ ''یہ ہماری اور تمہاری شادی ہے شردھا۔ یہی میری آخری نذر ہے۔'' یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔

شردھا کی آنکھیں پردرد، حسرتناک، مسرت سے جگمگا اٹھیں۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا بھگت رام اس کے سامنے آغوشِ محبت کھولے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ وہ حالات کو بھول گئی۔ اپنے کو بھول گئی۔ مہلک زخموں سے چور، فاتح دم مرگ بھی فتح کا مژدہ پا کر اپنا درد بھول جاتا ہے۔ موت ایک لمحے کے لیے حقیر ہو جاتی ہے۔ شردھا کی بھی یہی کیفیت ہوئی۔ ایک باوفا پر محبت، دل میں جاگزیں ہونے کا یقین، زندگی کی ساری آزمائشوں اور ساری مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی تھا۔

اس نے بوسہ کا جواب دے کر کہا۔ ''پیارے میں تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔''

خانہ برباد

(1)

آج دس سال سے ضبط کر رہا ہوں۔ اپنے اس تنگ سینہ کے اندر ایک کرۂ نار چھپائے بیٹھا ہوں۔ دنیا میں کہیں خوشی ہو گی، کہیں سیر و تماشے ہوں گے، کہیں دلچسپیاں ہوں گی، میرے لیے تو اب آتش کدہ ہے اور کچھ

نہیں۔ اس میں زندگی کی ساری آرزوئیں جل کر خاک ہو گئیں۔ دل کی جگہ اب ایک شعلہ ہے۔ جگر کی جگہ ایک مشتِ خاک! کس سے اپنی داستان درد کہوں۔ کہنے سے حاصل ہی کیا۔ اس کی دوا اب موت کے سوائے اور کچھ نہیں۔ کسی شاعر نے یہ مصرعہ کہہ کر میرے ہی جذبات دل کی ترجمانی کی ہے۔ مجھے تو موت ہی آتی شباب کے بدلے، آہ! کاش! موت آجاتی جس کی قسمت میں رونا ہی لکھا ہو، اس کا مر جانا ہی اچھا ہے۔

میں نے پہلی بار تارا کو اس وقت دیکھا جب کہ میری عمر دس سال کی تھی۔ میرے والد آگرہ کے ایک کامیاب ڈاکٹر تھے۔ لکھنؤ میں میرے ایک چچا رہتے تھے جنہوں نے وکالت میں کافی دولت پیدا کی تھی۔ میں ان دنوں اپنے چچا ہی کے ساتھ رہتا تھا۔ چچا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس لیے میں ہی ان کا وارث تھا۔ چچا اور چچی دونوں مجھے اپنا لڑکا سمجھتے تھے۔ ہمارے چچا صاحب کے پڑوس میں ہماری برادری کے ایک بابو صاحب رہتے تھے جو ریلوے کے محکمہ میں کسی اچھے عہدہ پر مامور تھے۔ دوڈھائی سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے۔ نام تھا بابو کمبل چندر۔ تارا انہیں کی لڑکی تھی۔ تارا اس وقت پانچ سال کی ہوگی۔ ایام طفلی کا وہ دن آج بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جب تارا ایک فراک پہنے بالوں میں ایک گلاب کا پھول گوندھے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ کہہ نہیں سکتا، کیوں؟ میں اسے دیکھ کر کچھ جھینپ سا گیا۔ مجھے وہ دیو کنیا سی معلوم ہوئی۔ تارا اکثر میرے گھر آتی۔ اس کے گھر میں کھیلنے کی جگہ نہ تھی۔ چچا صاحب کے مکان کے سامنے وسیع میدان تھا۔ وہیں وہ کھیلا کرتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اس سے مانوس ہوگیا۔ میں جب سکول سے لوٹتا تو تارا دوڑ کر میرے ہاتھوں سے کتابوں کا بستہ لے لیتی۔ جب میں سکول جانے کے لیے لیے گاڑی میں بیٹھتا تو وہ بھی آکر میرے ساتھ بیٹھ جاتی۔ ایک دن اس کے سامنے چچی نے چچا صاحب سے کہا۔ ”تارا کو میں اپنی بہو بناؤں گی۔ کیوں کرشنا تو تارا سے بیاہ کرے گا؟“ میں مارے شرم کے باہر بھاگ گیا لیکن اس دن سے اکثر چچا اور چچی دونوں ہمارے بیاہ کا مذاق کیا کرتے۔ ان موقعوں پر میں تو شرما کر باہر بھاگ جاتا مگر تارا خوش ہو جاتی تھی۔ دونوں خاندانوں میں اتنا ربط وضبط تھا کہ اس کا ہو جانا کوئی غیر ممکن امر نہ تھا۔ تارا کے ماں باپ کو شاید یقین تھا کہ تارا سے میری شادی ہوگی۔ جب کبھی اس کے گھر جاتا تو میری آؤ بھگت ہوتی۔ تارا کی ماں اسے میرے ساتھ چھوڑ کر کسی بہانے سے ٹل جاتی تھیں۔ کسی کو اب اس میں شک نہ تھا کہ تارا ہی اس گھر کی رانی ہوگی۔

ایک دن اس معصوم لڑکی نے ایک مٹی کا گھروندہ بنایا۔ میرے مکان کے سامنے ایک نیم کا درخت تھا۔ اسی کے نیچے اس کا گھروندہ تیار ہوا۔ اس میں کئی ننھے ننھے کمرے تھے۔ کچھ مٹی کے برتن تھے۔ ایک ذرا سی چارپائی تھی۔ میں نے جا کر دیکھا تو وہ دل وجان سے گھروندا بنانے میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ ”کرشنا چلو ہم اپنا گھر دکھائیں۔ میں نے ابھی بنایا ہے۔“

میں نے گھر دیکھا تو ہنس کر بولا۔ ”اس میں کون رہے گا تارا؟“

تارا نے خجالت آمیز متانت سے کہا۔ ”کیوں ہم اور تم کہاں رہیں گے۔ جب ہمارا اور تمہارا بیاہ ہو جائے گا تو ہم لوگ اس گھر میں آکر رہیں گے۔ یہ دیکھو تمہاری بیٹھک ہے۔ تم یہیں بیٹھ کر پڑھو گے۔ دوسرا کمرہ میرا ہے۔ اس میں بیٹھ کر میں گڑیا کھیلوں گی۔“

میں نے مذاق کر کے کہا۔ ”کیا میں ساری عمر پڑھتا ہی رہوں گا اور تم ہمیشہ گڑیا کھیلتی رہو گی؟“

تارا نے میری طرف اس انداز سے دیکھا گویا وہ میری بات نہیں سمجھی۔ غریب جانتی تھی کہ زندگی کھیلنے اور ہنسنے کے لیے ہے۔ یہ نہ جانتی تھی کہ ایک دن ہوا کا ایک جھونکا آئے گا اور اس گھروندے کو اڑا کر لے جائے گا۔

اسی کے ساتھ ہم دونوں بھی کہیں سے کہیں جا اڑیں گے۔

(2)

اس کے بعد میں اپنے والد کے پاس چلا آیا اور کئی سال پڑھتا رہا۔ لکھنؤ کی آب و ہوا مجھے موافق نہ تھی یا میرے والد صاحب نے مجھے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے لیے یہ بہانہ کیا تھا۔ میں تحقیق نہیں کہہ سکتا۔ آگرہ میں میں نے انٹر میڈیٹ پاس کیا لیکن چچا کے یہاں آمد و رفت جاری رہی۔ ہر ایک تعطیل میں لکھنؤ ضرور جاتا اور گرمیوں کی تعطیل تو میری پوری لکھنؤ ہی میں کٹتی تھیں۔ میں بڑی بے صبری سے تعطیلوں کا انتظار کرتا تھا۔ اگر مجھے ایک دن بھی دیر ہو جاتی تو تارا کا خط آ پہنچتا۔ بچپن کی اس بے لوث الفت میں اب شباب کی سرگرمیاں اور بے تابیاں تھیں۔ وہ دن کیا کبھی بھول سکتے ہیں؟ وہی شیریں یادگاریں اب اس زندگی کا سرمایہ ہیں۔ ہم دونوں راتوں کو نظر بچا کر ملتے اور خالی قلعے بناتے۔ اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدانخواستہ ہماری نیتیں بد تھیں۔ ہرگز نہیں۔ ہمارے درمیان ایک بھی ایسا لفظ' ایسا اشارہ نہ آتا جس پر ہمیں شرمندہ ہونا پڑے۔ یہ سرف وہ لحاظ تھا جو اس عمر میں عموماً ہوا کرتا ہے۔ شادی ہو جانے پر تو دولہا اور دلہن کچھ دنوں تک بزرگوں کے سامنے ایک دوسرے سے باتیں کرتے شرماتے ہیں۔ وہاں جن کے مزاج میں انگریزی خوبو پوری سرایت کر گئی ہے، ان کی بات میں نہیں چلاتا۔ وہ تو بزرگوں کے سامنے بوسہ بازی تک کر سکتے ہیں۔ ہماری ملاقاتیں صرف لطفِ صحبت کے لیے ہوتی ہیں۔ ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں، ایک دوسرے کے قرب میں ہمیں جو لطف بے انداز حاصل ہوتا تھا، اس کا اظہار ممکن نہیں۔ پھر عشق بازی کی گھاتوں کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں اپنی وفاداری اور خلوصِ محبت کا یقین دلانا ہوتا ہے۔ ہمارے درمیان تو رشتہ قائم ہو چکا تھا، صرف رسم کی پابندی باقی تھی۔ وہ مجھے اپنا شوہر سمجھتی تھی۔ میں اسے اپنی بیوی سمجھتا تھا۔ ہم دونوں بھی روٹھ بھی جاتے تھے اور کئی کئی دنوں تک بات چیت کرنے کی نوبت نہ آتی۔ ایسے موقع پر مصالحت کی تحریک ہمیشہ اسی کی طرف سے ہوتی تھی۔ میں زود رنج تھا۔ ذرا سی بات بھی مزاج کے خلاف ہوتی تو چیں بجبیں ہو جاتا۔ وہ خنداں پیشانی تھی، نہایت درجہ متحمل لیکن اس کے ساتھ خوددار بھی انتہا درجہ کی۔

انٹر میڈیٹ پاس ہوتے ہی مجھے فوج میں ملازمت مل گئی۔ والد صاحب کا فوجی حلقوں میں بہت رسوخ تھا۔ میں سارجنٹ ہو گیا اور حسنِ اتفاق سے لکھنؤ میں میری تعیناتی ہو گئی۔ منہ مانگی مراد بر آئی۔

مگر پیر چرخ رفتار تباہی کے سامان کر رہا تھا۔ میں تو اس خیال میں خوش تھا کہ اب کچھ دنوں میں تارا میری ہو گی۔ ادھر ایک دوسرا ہی گل کھلا۔ شہر کے ایک معزز رئیس نے میری شادی کی تجویز کی اور آٹھ ہزار روپیہ نقد جہیز پیش کیا۔ چچا صاحب یہ غیر متوقع رقم سن کر باغ باغ ہو گئے۔ ان کے نزدیک آٹھ ہزار کی رقم کوئی چیز نہ تھی مگر اسی رقم کے لیے انہوں نے مدت دراز کے ارتباط اور یارانہ کو قربان کر دیا۔ انہیں سوچ کر جواب دینے کا وعدہ کر کے ٹالا اور تارا کے والد کو بلا کر ان سے کہا۔

"آپ میرے پرانے دوست ہیں۔ اس لیے میں آپ کو مایوس نہیں کرنا چاہتا۔ ایک صاحب کرشنا کی شادی کے لیے مجھے آٹھ ہزار روپے دے رہے ہیں۔ آپ کے ساتھ کچھ رعایت کر سکتا ہوں۔ اگر آپ کم سے کم پانچ ہزار روپے دے دیں تو میں اس کی شادی تارا ہی سے کروں گا ورنہ مجبوراً مجھے وہ تجویز قبول کرنا پڑے گی۔"

تارا کے والد سکتے میں آ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنے دوستانہ، خلوص اور یگانگت کے بعد جہیز کا سوال ہی پیدا نہ ہو گا۔ بولے۔ ''آپ مذاق کر رہے ہیں یا سچ مچ مجھ سے جہیز کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا۔''

چچا صاحب نے متانت سے کہا۔ ''اس میں مذاق کی کوئی بات نہیں، ابھی ابھی ایک صاحب آٹھ ہزار روپیہ پیش کر رہے تھے۔''

بمل بابو نے فرمایا۔ ''یہ تو بابو صاحب آپ نے میرے سامنے ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا ہے۔ مجھے خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہ سوال آئے گا۔ ایشور نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے۔ پانچ ہزار روپیہ میں آپ صاحب دولت نہ ہو جائیں گے۔ ہاں یہ رقم میرے امکان سے باہر ہے۔ سوچئے آپ ایک طے شدہ بات کو الٹ کر کتنی بڑی بے انصافی کر رہے ہیں۔ آج دس سال سے ہم کرشنا کو اپنا داماد سمجھتے آئے ہیں۔ آپ کی باتوں سے بھی بارہا اس کی تصدیق ہو چکی ہے۔ کرشنا اور تارا میں جو محبت ہے، وہ آپ سے پوشیدہ نہیں۔ ایشور کے لیے چند ہزار روپیوں کے لیے اتنی جانوں کا خون نہ کیجئے۔''

چچا صاحب نے معذری کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''بمل بابو! مجھے سخت افسوس ہے کہ میں اس معاملہ میں اور زیادہ نہیں دب سکتا۔''

بمل بابو نے ذرا تیز ہو کر کہا۔ ''آپ نے اب تک کبھی جہیز کا ذکر نہیں کیا؟''

چچا صاحب۔ ''مجھے یاد نہیں آتا، میں نے کبھی آپ سے اس معاملہ میں کسی قسم کا وعدہ کیا ہے۔''

بمل۔ ''باقاعدہ طور پر ضرور کوئی بات ہمارے درمیان نہیں ہوئی لیکن اشارتاً کتنی ہی بار یہ ذکر آ چکا ہے۔''

چچا صاحب۔ ''آپ میرا احسان نہیں مانتے کہ میں آپ کے ساتھ کتنی رعایت کر رہا ہوں۔''

بمل۔ ''آپ میرا گلا گھونٹیں اور میں آپ کا احسان مانوں، اتنی فیاضی مجھ میں نہیں ہے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ اتنے بڑے بندۂ زر ہیں تو میں آپ سے کنارہ کش رہتا۔ میں آپ کو ایک شریف اور بامروت آدمی سمجھا تھا لیکن معلوم ہو گیا کہ آپ بھی کوڑیوں کے غلام ہیں جس کی نگاہوں میں انسان کی کوئی وقعت نہیں۔ رونے اور ہمدردی کی کوئی وقعت نہیں، اسے میں شریف نہیں کہہ سکتا۔ آپ کو اختیار ہے، آپ کرشنا کی شادی جہاں چاہیں کریں لیکن آپ کو کف افسوس نہ ملنا پڑے تو کہیئے گا۔ تارا کی شادی تو کہیں نہ کہیں ہو ہی جائے گی۔ اور ایشور نے چاہا تو کسی اچھے گھر ہو گی، اس کے لیے وروں کی کمی نہیں۔ ہاں اسے قلق ضرور ہو گا لیکن خیر! آپ کو آٹھ ہزار مبارک ہوں۔''

چچا صاحب نے برانگیختہ ہو کر کہا۔ ''اگر آپ میرے گھر نہ ہوتے تو ان بدزبانیوں کا جواب آپ کو دیتا۔''

بمل نے چھڑی اٹھائی اور کمرہ سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ ''آپ مجھے کیا جواب دیں گے، آپ جواب دینے کے قابل ہی نہیں ہیں۔''

اسی دن جب میں شام کو پارک سے آیا اور جل پان کر کے بمل بابو کے گھر جانے لگا تو چچی نے کہا۔ ''کہاں جاتے ہو۔ بمل بابو سے اور تمہارے چچا جی سے آج ایک جھڑپ ہو گئی۔''

میں نے ٹھٹک کر حیرت کے ساتھ کہا۔ ''کس بات پر؟''

چچی۔ ''یہی شادی بیاہ کی بات تھی۔ ایک رئیس تمہاری شادی کی بات چیت کر رہے ہیں۔ آٹھ ہزار روپیہ جہیز دیتے ہیں۔ تمہارے چچا نے بمل بابو سے کہا۔ آپ ہمارے پرانے ملاقاتی ہیں۔ آپ پانچ ہزار بھی دے دیں گے تو میں آپ ہی کے ہاں شادی کروں گا۔ اسی بات پر بگڑ گئے۔ جو کچھ منہ میں آیا، بکتے رہے۔''

میں نے ایک منٹ تک سکوت کے عالم میں رہنے کے بعد کہا۔ ”اچھی بات ہے، وہاں نہ جاؤں گا۔ بارک جارہاہوں۔“

چچی نے ہر چند روکا، پر میں ایک لمحہ بھی نہ ٹھہرا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا، کوئی میرے دل میں بھالے چبھا رہا تھا۔ شاید گھر سے بارک تک جانے میں مجھے ایک منٹ سے زیادہ نہ لگا تھا۔ بار بار جی جھنجھلاتا تھا۔ چچا صاحب پر نہیں، بمل بابو پر بھی نہیں۔ والدہ پر بھی نہیں۔ صرف اپنے اوپر کیوں مجھ میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ جاکر چچا صاحب سے کہہ دوں۔ کوئی مجھے لاکھ روپیہ بھی دے تو میں شادی نہیں کروں گا۔ میں کیوں اتنا کوتاہ سخن، اتنا بزدل، اتنا دبّو ہوں؟

اسی غصہ کے عالم میں میں نے والد صاحب کو ایک خط لکھااور وہ ساری داستان مفصل بیان کردی۔ یہ بھی لکھ دیا کہ میں اور کہیں شادی نہ کروں گا۔ خواہ مجھے آپ کا عتاب کیوں نہ سہنا پڑے۔ اس روانی میں کیا جانے کیا لکھ گیا۔ اب یاد بھی نہیں۔ اتنا یاد ہے کہ دس بارہ ورق کاغذ دس منٹ میں لکھ ڈالے تھے۔ کاش ممکن ہوتا تو میں یہ ساری داستان تار سے بھیجتا۔

تین دن میں نے جتنی بے صبری سے کاٹے، اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جی ایسا اچاٹ ہو گیا تھا کہ کسی کام میں نہ لگتا تھا۔ کبھی سوچتا کہ تارا ہمیں اپنے دل میں کتنا کمینہ سمجھ رہی ہوگی۔ کئی بار جی میں آیا۔ چل کر اس کے پیروں پر گر پڑوں اور کہوں۔ ”دیوی! میرا قصور معاف کرو۔ مجھے اپنی غلامی میں قبول کرو۔ چچا صاحب کی سخت گیری پر متعجب نہ ہونا محض پانچ ہزار روپیہ کے لیے انہوں نے ہماری ساری زندگی کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ افسوس!“

تیسرے دن خط کا جواب آیا۔ رہی سہی ہمت بھی ٹوٹ گئی۔ وہی جواب آیا جس کا مجھے خدشہ تھا۔ لکھا تھا۔ ”بھائی صاحب میرے بزرگ ہیں۔ انہوں نے جو فیصلہ کیا ہے، اس کے خلاف ایک کلمہ بھی زبان سے نہیں نکال سکتااور تمہیں بھی ویسا ہی مناسب ہے کہ انہیں ناراض مت کرو۔“

میں نے خط کو چاک کر کے پیروں سے کچل دیااور اسی وقت بمل بابو کے گھر کی طرف چلا۔ کاش! اس وقت کوئی میرا راستہ روک لیتا تو میں ان کے دروازے تک پہنچ جاتا مگر وہاں مزاحمت کرنے والا کون بیٹھا تھا۔ کچھ دور چل کر ہمت نے پھر جواب دے دیا۔ لوٹ آیا۔ کہہ نہیں سکتا کیا سوچ کر لوٹا۔ چچا صاحب کی خفگی کا مجھے شمہ بھر خوف نہ تھا۔ میں ان کی ساری دولت کو ٹھکرا دینے کو تیار تھا۔ والد صاحب کی ناراضگی کا بھی خیال نہ تھا۔ خیال صرف یہ تھا کہ کون منہ لے کر جاؤں۔ آخر میں انہیں چچا کا بھتیجا ہی تو ہوں۔ بمل بابو مجھ سے مخاطب نہ ہوئے یا جاتے ہی جاتے مجھے دھتکار دیا تو میرے لیے ڈوب مرنے کے سوائے اور کیا رہ جائے گا۔ سب سے بڑا خوف یہ تھا کہ کہیں تارا مجھ سے ملنے سے انکار کردے تو میری کیا حالت ہوگی۔ ہائے تارا! تغافل شعار تارا، ناموقع شناس تارا، اگر تو نے اس وقت مجھے تسکین کے دو کلمے لکھ بھیجے ہوتے تو آج یہ زندگی میرے لیے باغ و بہار ہوتی۔ تیری خاموشی نے مجھے ہمیشہ کے لیے خانماں خراب کردیا۔

(3)

تین دن پھر میں نے انگاروں پر لوٹ لوٹ کر کاٹے۔ مصمم ارادہ کرلیا کہ اب کسی سے نہ ملوں گا۔ سمجھ لوں

گا میں دنیا میں یتیم پیدا ہوا' میرا کوئی نہیں۔ چچا صاحب کی تو صورت سے نفرت ہو گئی تھی مگر تیسرے دن شام کو چچا صاحب کا ایک رقعہ پہنچا۔ مجھے بلایا تھا۔ جی میں آیا کہ لکھ دوں کہ میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔ آپ سمجھ لیجئے کہ میں مر گیا مگر پھر ان کے احسانات اور ان کی محبت یاد آ گئی۔ شام کو دل میں اعلان جنگ کا جوش و خروش لیے میں چچا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔

چچا صاحب نے مجھے سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ ''کیا آج کل تمہاری طبیعت اچھی نہیں تھی کیا؟ آج بابو سیتارام تشریف لائے تھے۔ تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ کل صبح کو موقع ملے تو چلے آنا یا تمہیں لوٹنے کی جلدی نہ ہو تو اسی وقت بلا بھیجوں۔''

میں سمجھ تو گیا کہ یہ بابو سیتارام کون ہیں لیکن تجاہل جتا کر بولا۔ ''بابو سیتارام صاحب کون ہیں۔ مجھے تو ان سے کبھی نیاز حاصل نہیں ہوا۔'' چچا صاحب نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''اجی یہ وہی صاحب ہیں جو تمہاری شادی کیلئے گھیرے ہوئے ہیں۔ شہر کے رئیس اور خاندانی آدمی ہیں۔ ان کی لڑکی بہت اچھی ہے۔ میں نے ہاں کر لیا ہے۔''

میں نے غصہ کے ایک امنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر کہا۔ ''آپ نے ناحق ہاں کیا۔ میں اپنی شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

چچا صاحب نے میری طرف قہر کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں؟''

میں نے اسی بے خوف لہجہ میں جواب دیا۔ ''اس لیے کہ میں اس معاملہ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔''

چچا صاحب نے میری طرف سے آنکھیں ہٹا لیں اور بولے۔ ''آزادی کی قیمت دینی پڑے گی۔ یہ بھی جانتے ہو؟''

میں نے ذرا بھی جنبش نہ کی۔ بولا ''جی ہاں خوب جانتا ہوں۔''

''تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''جی ہاں آخری۔''

''بہتر ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھے اور گھر میں چلے گئے۔ میں کمرہ کے باہر نکل آیا اور بارک کی طرف چلا۔ ساری زمین گردش کر رہی تھی۔ آسمان چکر کھا رہا تھا اور میرا جسم ہوا میں اڑا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا پیروں کے نیچے زمین ہے ہی نہیں۔

بارک میں پہنچ کر میں پلنگ پر لیٹ گیا ار پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

(4)

سویرے ہماری رجمنٹ کو ڈیرہ دون جانے کا حکم ہوا۔ مجھے آنکھیں سی مل گئیں۔ اب لکھنؤ کاٹے کھاتا تھا۔ اس کی در و دیوار سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ایک بار جی میں آیا کہ چل کر تارا سے مل لوں مگر پھر وہی خیال مانع ہوا ''کہیں وہ مخاطب نہ ہوئی تو؟''

میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکتا تھا۔ مجھے والد یا چچا کی امداد کی مطلق ضرورت نہ تھی۔ ایک طرح سے انہوں نے مجھے خانہ بدر کر دیا تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود تارا کو اپنا کیوں نہ کر سکا؟ کہہ نہیں سکتا۔ شاید میری

اس بے سروسامانی میں بمل بابو ہی مجھ سے مخاطب نہ ہوں۔ ممکن تھا کچھ دنوں کے بعد میرے مفلوج حواس توازن پر آجاتے اور میں اپنے طریق کار کا تصفیہ کر لیتا لیکن ڈیرہ دون پہنچے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا کہ مجھے ایک خط ملا، پتہ دیکھا تو میرے ہاتھ کانپنے لگے اور سارے جسم پر رعشہ سا آگیا۔ شاید شیر کو سامنے کھڑا دیکھ کر بھی اتنا خائف نہ ہوتا۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ خط کھولوں۔ وہی تحریر تھی جسے دیکھ کر میری آنکھوں میں سرور سا چھا جاتا تھا جسے بوسے دیتا تھا اور سینہ سے لگاتا تھا مگر آج وہ کالے حروف کالی ناگنوں سے بھی زیادہ خوفناک تھے۔ قیاس دوڑا رہا تھا کہ اس نے کیا لکھا ہوگا مگر قیاس کی انتہائی پرواز بھی خط کے مضموں تک نہ پہنچ سکی۔ بڑی مشکلوں سے خط کھولا تو آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ معلوم ہوا کسی نے لوہے کی سلاخ جگر میں چبھو دی۔ تارا کی شادی طے ہو گئی تھی۔ شادی ہونے میں اب صرف چوبیس گھنٹے باقی تھے۔ اس نے مجھ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تھی اور التجا کی تھی کہ مجھے بھلا مت دینا۔ خط کا آخری جملہ پڑھ کر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ لکھا تھا، یہ آخری پیار لو۔ اب آج سے میرے ور تمہارے درمیان صرف انسانیت اور ہمدردی کا رشتہ ہے۔ اگر تمہیں کچھ اور سمجھوں تو اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی ہوگی۔ جسے شاید تم سب سے زیادہ ناپسند کرو گے۔ بس اس سے زیادہ اب نہ لکھوں گی۔ بہت اچھا ہوا کہ تم یہاں سے چلے گئے۔ تم رہتے تو تمہیں بھی صدمہ ہوتا اور مجھے بھی مگر پیارے اپنی اس ابھاگنی تارا کو بھول نہ جانا۔ تم سے یہی التجا ہے۔

میں خط ہاتھ میں لیے ہوئے لیٹ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سینہ پھٹ جائے گا۔ بھگوان! اب کیا کروں، جب تک میں لکھنؤ پہنچوں گا، اس وقت تک بارات دروازہ پر آچکی ہوگی لیکن تارا کو آخری بار دیکھنے کی خواہش کو میں کسی طرح نہ روک سکتا تھا۔ یہی اب زندگی کی آخری آرزو تھی۔ اس کے بعد پھر یہ دل انہی آرزوؤں کا مزار ہوگا اور اس مزار پر آنسوؤں کے پھول چڑھائے جائیں گے۔

میں نے جا کر کمانڈنگ افسر سے کہا۔ ”مجھے ایک ضرورت لکھنؤ جانے کے لیے مجبور کر رہی ہے۔ تین دن کی رخصت چاہتا ہوں۔“

افسر نے کہا۔ ”چھٹی نہیں مل سکتی۔“

”میرا جانا ضروری ہے۔“

”تم نہیں جا سکتے۔“

”میں کسی طرح نہیں رک سکتا۔“

”تم کسی طرح نہیں جا سکتے۔“

میں نے اور زیادہ اصرار فضول سمجھا۔ وہاں سے چلا آیا اور شام کو سب کی نگاہ بچا کر سٹیشن پر آپہنچا۔ کورٹ مارشل کا اب مجھے مطلق خوف نہ تھا۔

(5)

جب میں لکھنؤ پہنچا تو شام ہو گئی تھی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا تو میں اپنی قسمت کے ناٹک کا آخری منظر دیکھنے چلا۔ بارات دروازہ پر آگئی تھی۔ گیس کی روشنی ہو رہی تھی۔ براتی لوگ جمع تھے۔ ہمارے مکان کی چھت تارا کی

چھت سے ملی ہوئی تھی۔ راستہ مردانہ کمرہ کی بغل سے تھا۔ چچا صاحب شاید کہیں سیر کرنے کو گئے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر سب بارات کی بہار دیکھ رہے تھے۔ میں چپکے سے زینہ پر چڑھا اور چھت پر جا پہنچا۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا تھا۔ اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ ہائے! یہی وہ مقام ہے جہاں ایک دن مئے الفت کے دور چلتے تھے۔ یہیں میں تارا کے ساتھ بیٹھ کر زندگی کے منصوبے باندھتا تھا اور محبت کی داستان کہتا تھا۔ اس زمین کا ایک ایک ذرہ میرے لیئے متبرک تھا مگر افسوس! آج میرے دل کی طرح وہ بھی ویران تھا۔ تاریک تھا۔ میں اسی زمین سے لپٹ کر خوب رویا۔ یہاں تک کہ میری ہچکیاں بندھ گئیں۔ کاش! اس وقت تارا وہاں آجاتی تو میں اس کے قدموں پر سر رکھ کر ہمیشہ کے لیے سو جاتا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تارا کی پاکیزہ روح میری حالت پر افسوس کر رہی ہے۔ آج بھی وہ یہاں ضرور آئی ہوگی۔ اس کے عنبریں زلفوں کی خوشبو زمین سے آرہی تھی۔ میں نے جیب سے رومال نکالا اور اس زمین کی خاک جمع کرنے لگا۔ دم کے دم میں میں نے ساری چھت صاف کر ڈالی اور اس خاک کو رومال میں باندھ گھنٹوں رویا۔ یہی مشت خاک میری محبت کا انعام ہے۔ یہی میری محبت کا حاصل ہے۔ یہی میری کشت الفت کی پیداوار ہے۔ ہائے ری ناکامی!

نیچے شادی کے رسوم ہو رہے تھے۔ ٹھیک آدھی رات کے وقت دلہن منڈپ کے تلے آئی۔ اب بھانوریں ہوں گی۔ میں چھت کے کنارے چلا آیا اور وہ جگر خراش منظر دیکھنے لگا۔ بس یہی معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی جگر کے ٹکڑے کیے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے کہ میرا سینہ کیوں نہ پھٹ گیا۔ کسی عزیز کی لاش چتا پر جلتے دیکھ کر بھی شاید اس سے زیادہ صدمہ نہ ہوتا ہو۔

بھانوریں ختم ہو گئیں تو میں کوٹھے سے اترا۔ اب کیا باقی تھا۔ چتا کی راکھ بھی پانی میں بہہ چکی تھی۔ دل کو تھامے نیم جان، زینہ کے دروازے تک آیا مگر دروازہ باہر سے بند تھا۔ اب کیا ہو، الٹے قدم لوٹا۔ اب تارا کے آنگن سے ہو کر جانے کے سوا دوسرا راستہ نہ تھا۔ میں نے سوچا اس جمگھٹ میں مجھے کون پہچانتا ہے۔ نکل جاؤں گا لیکن جونہی آنگن میں پہنچا کہ تارا کی ماں نے دیکھ لیا۔ چونک کر بولیں۔ "کون! کرشن بابو، تم کب آئے؟ آؤ میرے کمرے میں آؤ۔ تمہارے چچا صاحب کے خوف سے ہم نے تمہیں نوید نہ بھیجا۔ تارا صبح کو بدا ہو جائے گی۔ آؤ اس سے مل لو۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے میرا بازو پکڑ لیا اور مجھے کشاں کشاں اپنے کمرہ میں لے گئیں۔ پھر پوچھا۔ "اپنے گھر سے ہوتے آئے ہو نا؟"

میں نے کہا۔ "میرا گھر یہاں کہاں ہے؟"

"کیوں تمہارے چچا کا گھر نہیں ہے؟"

"ہاں چچا جی کا گھر ہے، میرا گھر اب کہیں نہیں ہے۔"

"تو کیا تم سیدھے اسٹیشن سے چلے آرہے ہو۔ تب تو کچھ کھایا بھی نہ ہوگا؟"

"مجھے تھوڑا سا زہر دے دیجیے۔ یہی میرے لیے سب سے اچھی دوا ہے۔"

بوڑھی عورت حیرت سے میرا منہ تاکنے لگی۔ تارا اور میرے درمیان کتنی محبت تھی، یہ وہ بیچاری کیا جانتی تھی۔ میں نے پھر اسی مایوسانہ انداز سے کہا۔ "میں اب زندہ رہ کر کیا کروں گا؟ آپ لوگ میرے ساتھ یہ دغا کریں گی، اس کی مجھے خبر نہ تھی۔ خیر جو ہوا اچھا ہی ہوا۔ چچا اور والد کی نظروں سے گر کر میں تارا کو شاید خوش نہ رکھ سکتا۔"

بوڑھی عورت نے شکوہ کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تم ہم لوگوں کو اتنا خود غرض کہتے ہو بیٹا!"

میں نے ملامت سے کہا۔ "اب تک تو نہ سمجھتا تھا لیکن واقعات نے ایسا کہنے پر مجبور کیا۔ میرے خون کا پیاسا دشمن بھی میرے اوپر اس سے زیادہ قاتلانہ وار نہ کر سکتا تھا۔ میرا خون آپ ہی کی گردن پر ہو گا۔"

"تمہارے چچا صاحب ہی نے تو ہمیں انکار کر دیا۔"

"آپ لوگوں نے مجھ سے بھی کچھ پوچھا۔ مجھے کچھ کہنے کا موقع بھی دیا۔ آپ نے تو ایسا رویہ اختیار کیا، گویا آپ یہی چاہتی تھیں مگر آپ سے شکایت کرنا فضول ہے۔ تارا خوش رہے۔ میرے لیے غنیمت ہے۔"

"تو بیٹا! تم نے بھی تو کچھ نہیں لکھا۔ اگر تم ایک پرزہ بھی لکھ دیتے تو ہمیں تسکین ہو جاتی۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ تم تارا کو اتنا پیار کرتے ہو۔ ہم سے بھول ہوئی لیکن اس سے بڑی بھول تم سے ہوئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تارا کیوں روز ڈاکیہ کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ ابھی تین دن پہلے تک وہ برابر ڈاکیہ کو پوچھتی رہی۔ جب تمہارا کوئی خط نہ آیا تب وہ نراش ہو گئی۔ بلا دوں؟ اسے ملنا چاہتے ہو؟"

میں نے چارپائی سے اٹھ کر کہا۔ "نہیں نہیں، اسے مت بلائیے۔ میں اب اسے نہیں دیکھ سکتا۔ اسے دیکھ کر میں نجانے کیا کر بیٹھوں۔"

یہ کہہ کر میں چل پڑا۔ تارا کی ماں نے کئی بار پکارا مگر میں نے پیچھے پھر کر نہ دیکھا۔

یہ ہے میری محبت مایوس کی داستان۔ اسے آج دس سال گزر گئے۔ ان سالوں میں میرے اوپر جو کچھ گزری، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ کئی کئی دن مجھے بے آب و دانہ رہنا پڑا ہے۔ فوجی ملازمت سے تو کورٹ مارشل نے برخاست کر ہی دیا۔ اب آوارہ گردی کے سوا مجھے کوئی کام نہیں ہے۔ اول تو کوئی کام ملتا ہی نہیں اور اگر مل گیا تو میں ٹکتا نہیں۔ زندگی وبال ہو گئی ہے۔ کسی بات سے دلچسپی نہیں رہی۔ آدمی کی صورت سے دور بھاگتا ہوں۔

تارا خوش ہے۔ تین چار سال ہوئے۔ ایک بار میں اس کے گھر گیا تھا۔ اس کے شوہر نے بہت اصرار کر کے بلایا تھا۔ بہت قسمیں دلائی تھیں۔ مجبوراً گیا۔ وہ کلی اب کھل کر پھول ہو گئی ہے۔ تارا میرے سامنے آئی۔ اس کا شوہر بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف تاک نہ سکا۔ اس نے میرے پیر چھوئے۔ میں نے پیر کھینچ لیے۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اگر تارا غمگین ہوتی، دل شکستہ ہوتی، تکلیف میں ہوتی تو میں اس پر نثار ہو جاتا مگر خوشحال بے فکر۔ شگفتہ رو، بے نیاز، تارا میری ہمدردی کی مستحق نہ تھی۔ میں اس خیال کو روک نہ سکا۔ کتنی بے وفائی، کتنی سرد مہری۔

شام کو میں مغموم بیٹھا تھا۔ وہاں جانے پر افسوس کر رہا تھا کہ تارا کے شوہر میرے پاس آ کر بیٹھ گئے اور مسکرا کر بولے۔

"بابو جی! میں نے بہت افسوس کے ساتھ سنا ہے کہ تارا سے میری شادی ہو جانے کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ تارا جیسی عورت شاید دیوتاؤں کو بھی خود غرض بنا دیتی لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں۔ اگر میں جانتا کہ آپ کو اس سے اس درجہ عشق ہے تو میں ہرگز آپ کی راہ میں کانٹا نہ بنتا۔ افسوس یہی ہے کہ مجھے بہت پیچھے معلوم ہوا۔ آپ کی محبت کی داستان تارا مجھ سے کہہ چکی ہے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "تب تو آپ مجھ سے بدگمان ہوں گے۔"

اس نے جوش سے کہا۔ "اس کے برعکس میں آپ کا احسان مند ہوں۔ محبت کا اتنا پاکیزہ، بے لوث اور اعلیٰ معیار اس کے روبرو رکھا۔ وہ آپ کو اب بھی اسی محبت سے یاد رکھتی ہے۔ شاید کوئی دن نہیں جاتا کہ آپ کا کوئی ذکر نہ

کرتی ہو۔ یہ آپ ہی کی صحبت کا فیض ہے کہ وہ اس درجہ بے نفس، بے غرض اور شاکر ہے۔ اس کا دل محبت کا سر چشمہ ہے۔ آپ کی محبت کو وہ اپنی زندگی کی سب سے پیاری چیز سمجھتی ہے۔ آپ شاید سمجھتے ہوں کہ ان دنوں کو یاد کر کے اسے افسوس ہوتا ہوگا، مطلق نہیں۔ وہ دن اس کی زندگی کے سب سے شیریں یادگار ہیں۔ وہ کہتی ہے، میں نے کرشن کو تم میں پایا ہے اور میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔"

کفّارہ

(1)

ڈسٹرکٹ بورڈ...... کے ہیڈ کلرک بابو مداری لال کو کئی بار جگر دوز سانحات کے سننے کا اتفاق ہوا تھا لیکن ان کا چہرہ کبھی اتنا زرد اور دل کبھی اتنا پامال نہیں ہوا تھا' جتنا وہ سرکاری لفافہ کھول کر ہوا جو ایک دن دس بجے دفتر آتے ہی انہیں ملا۔ لفافہ ہاتھ میں لیے وہ کئی منٹ تک سکتے کے عالم میں کھڑے رہے گویا سارے حواس مفلوج ہوگئے ہوں۔ گویا دنیا ان کی نظروں میں تاریک ہوگئی ہو۔ بورڈ کے سیکرٹری صاحب نے پنشن لے لی تھی اور اس لفافہ میں نئے سیکرٹری کے تقرر کا حکم تھا۔ اسی نئے تقرر پر بابو صاحب کی صورت اتنی متغیر ہوگئی تھی۔ سرکار نے سبودھ چندر کو اس عہدہ پر مامور کیا تھا اور سبودھ چندر وہ شخص تھا جس کے نام سے ہی بابو مداری لال کو نفرت تھی۔ وہ سبودھ چندر جوان کا ہم جماعت تھا جسے زک دینے کے لیے انہوں نے بارہا کوشش کی اور ہمیشہ ناکام رہے۔ وہ آج ان کا افسر ہو کر آرہا تھا۔ سبودھ چندر کی بہت دنوں سے کوئی خبر نہ ملی تھی۔ وہ لڑائی میں شریک ہو کر بصرہ چلا گیا تھا۔ بابو صاحب نے سمجھا تھا وہیں مر گیا ہوگا مگر آج وہ سیکرٹری ہو گیا اور مداری لال کو اس کی ماتحتی میں کام کرنا پڑے گا۔ اس ذلت سے تو موت بدرجہا بہتر تھی۔ یقیناً سبودھ کو سکول اور کالج کے واقعات یاد ہوں گے۔ مداری لال نے اسے سکول سے نکلوا دینے کے لیے کئی بار سازشیں کیں۔ غلط اتہام لگائے، بدنام کیا۔ کیا سبودھ وہ ساری باتیں بھول گیا ہوگا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ وہ آتے ہی آتے انتقام لینے کی کوشش کرے گا اور مداری لال کو جاں براری کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

مداری لال کو سبودھ سے بغض للّہی تھا۔ دونوں ایک ہی دن ایک ہی مدرسہ میں داخل ہوئے تھے اور اسی دن مداری لال کے دل میں حسد کی آگ مشتعل ہوگئی تھی۔ سبودھ کا قصور صرف یہی تھا کہ وہ مداری لال سے زیادہ ذہین، زیادہ حاضر جواب اور زیادہ خندہ پیشانی تھا اور مداری لال نے اس کا قصور کبھی معاف نہیں کیا۔ جب سبودھ ڈگری لے کر اپنے گھر چلا گیا اور مداری لال فیل ہو کر ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں نوکر ہو گیا تب اسے قدرے اطمینان ہوا۔ جب معلوم ہوا کہ سبودھ بصرہ جارہا ہے تب مداری لال کے چہرہ پر ہلکا سا تبسم نظر آیا تھا۔ ان کے دل سے وہ دیرینہ خلش نکل گئی تھی مگر وائے ناکامی! آج وہ پرانا ناسور صد گونہ سوزش اور تپش کے ساتھ کھل گیا۔ آج ان کی قسمت سبودھ کے ہاتھ میں تھی اور مداری لال کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ دریا میں بہے جارہے ہیں۔

جب ذرا اوسان بجا ہوئے تو مداری لال نے دفتر کے کلرکوں کو سرکاری حکم سناتے ہوئے کہا۔ اب آپ

لوگ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیے گا۔ سبودھ چندر وہ آدمی نہیں ہیں جو غلطیوں کو نظرانداز کر جائیں۔

ایک کلرک نے پوچھا۔ ”کیا بہت سخت ہیں؟“

مداری لال نے مسکرا کر کہا۔ ”وہ تو آپ لوگوں کو دو ہی چار دن میں معلوم ہو جائے گا۔ میں کیوں اپنی زبان سے کسی کی شکایت کروں۔ بس آگاہ کر دیا کہ ذرا ہاتھ پاؤں سنبھال کر رہیئے گا۔ آدمی لائق ہے مگر انتہا درجہ غصہ ور، نہایت مغرور اور بد مزاج۔ خود ہزاروں ہضم کر جائے اور ڈکار تک نہ لے مگر کیا مجال کہ کوئی ماتحت ایک کوڑی بھی ہضم کرنے پائے۔ ایسے آدمی سے ایشور ہی بچائے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ رخصت لے کر گھر چلا جاؤں۔ دونوں وقت حاضری بجالانی ہو گی۔ آپ لوگ آج سے دفتر کے ملازم نہیں۔ سیکرٹری صاحب کے ملازم ہیں۔ کوئی ان کے لڑکے کو پڑھائے گا۔ کوئی بازار سے سودا سلف لائے گا۔ کوئی انہیں اخبار سنائے گا اور چپڑاسیوں کے تو شاید دفتر میں درشن ہی نہ ہوں گے۔“

اسی طرح سارے دفتر کو سبودھ کی طرف سے بدظن کر کے مداری لال نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔

(2)

سبودھ چندر اس کے ایک ہفتہ بعد گاڑی سے اترے تو اسٹیشن پر بورڈ کے سارے عملہ کو حاضر پایا۔ سب ان کا استقبال کرنے آئے تھے۔ مداری لال کو دیکھتے ہی سبودھ لپک کر ان کے گلے سے لپٹ گئے اور بولے۔ ”تم خوب ملے، بھئی یہاں کیسے آئے؟ اوہ! آج دس سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ کہاں ہو اب؟“

مداری لال بولے۔ ”یہاں ڈسٹرکٹ بورڈ کے دفتر میں ہیڈ کلرک ہوں۔ آپ خیریت سے تو ہیں!“

سبودھ۔ ”اجی میری نہ پوچھو بصرہ، فرانس اور نجانے کہاں کہاں مارا پھرا۔ تم دفتر میں ہو، یہ بہت اچھا ہوا۔ میری تو سمجھ ہی میں نہ آتا تھا کہ کیسے کام چلے گا۔ میرے لیے یہ کام بالکل نیا ہے، کچھ تجربہ ہی نہیں۔ جہاں جاتا ہوں میری خوش نصیبی میرے ساتھ جاتی ہے۔ بصرہ میں سارے افسر خوش تھے۔ دو سال میں کوئی پچیس ہزار روپے بنا لایا اور سب اڑا دیئے۔ وہاں سے آکر کچھ دنوں کو آپریشن کے دفتر میں مٹر گشت کرتا رہا۔ یہاں آیا تو تم ملے۔ (کلرکوں کو دیکھ کر) یہ لوگ کون ہیں؟“

مداری لال کے دل پر برچھیاں سی چل رہی تھیں۔ ظالم پچیس ہزار روپے بصرہ سے کما لایا۔ یہاں قلم گھستے گھستے مر گئے اور پانچ سو بھی نہ جمع کر سکے۔ بولے ”یہ لوگ بورڈ کے کلرک ہیں۔ سلام کو حاضر ہوئے ہیں۔“

سبودھ نے ان سب لوگوں سے باری باری ہاتھ ملایا اور بولے۔ ”آپ لوگوں نے ناحق تکلیف کی۔ بہت مشکور ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ صاحبان کو مجھ سے شکایت کا کوئی موقع نہ ملے گا۔ مجھے اپنا افسر نہیں، اپنا بھائی سمجھئے۔ آپ سب مل کر اس طرح کام کیجئے کہ بورڈ سے نیک نامی ہو اور میں بھی سرخرو رہوں۔ آپ کے ہیڈ کلرک صاحب تو میرے پرانے رفیق اور لنگوٹیا یار ہیں۔“

ایک چرب زبان کلرک نے کہا۔ ”ہم سب حضور کے تابعدار ہیں۔ حتی الامکان تو جناب کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیں گے مگر تقاضائے بشری سے اگر کبھی سہو جائے تو حضور بھی از راہ سرپرستی چشم پوشی فرمایئے گا۔“

سبودھ۔ ”یہی میرا اصول ہے۔ ہمیشہ یہی اصول رہا‘ جہاں رہا۔ ماتحتوں کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رہا۔ ہم

اور آپ دونوں ہی کسی تیسرے کے غلام ہیں۔ پھر رعب کیسا اور حکومت کیسی۔ ہاں ہمیں نیک نیتی اور تندہی سے اپنا فرض ادا کرنا چاہیے۔"

جب سبودھ سے رخصت ہو کر عملہ والے دفتر چلے آئے تو آپس میں باتیں ہونے لگیں۔

"آدمی تو اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"ہیڈ کلرک کے بیان سے تو معلوم ہوتا تھا سب کو کچا ہی کھا جائے گا۔"

"جناب یہ دکھانے کے دانت ہیں۔"

(3)

سبودھ کو آئے ایک مہینہ گزر گیا۔ بورڈ کے کلرک، اردلی، چپڑاسی سب اس کے برتاؤ سے خوش تھے۔ دلجوئی کرنے کا اس میں ایسا فطری مادہ ہے کہ جو اس سے ایک بار ملتا ہے، ہمیشہ کے لیے گرویدہ ہو جاتا ہے۔ سخت کلمہ تو اس کی زبان پر آتا ہی نہیں مگر ہنر بہ چشم عداوت بزرگ ترغیب است کے مصداق اس کی یہ ساری خوبیاں مداری لال کی آنکھوں میں کھٹکتی رہتی ہیں۔ وہ اس کانٹے کو اپنے پہلو سے نکال ڈالنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ عملہ کو برانگیختہ کرنا چاہا، ناکامی ہوئی۔ ممبروں کو بھڑکانا چاہا، منہ کی کھائی۔ ٹھیکیداروں کو ابھارنے کی کوشش کی، نادم ہونا پڑا۔ چاہتے تھے کہ بھُس میں آگ لگا کر آپ دور سے تماشا دیکھیں۔ سبودھ سے اس طرح ہنس کر ملتے' یوں چکنی چپڑی باتیں کرتے، گویا اس کے سچے دوست ہیں لیکن گھات میں لگے رہتے کہ کب موقع ملے اور اسے نیچا دکھاؤں۔ سبودھ ذہین تھا، لائق تھا مگر مردم شناس نہ تھا۔ وہ مداری لال کو اب بھی اپنا رفیق اور شفیق سمجھتا تھا۔

ایک دن مداری لال سیکرٹری صاحب کے کمرے میں گئے تو کرسی خالی دیکھی۔ وہ کسی ضرورت سے باہر چلے گئے تھے۔ ان کی میز پر پانچ ہزار کے نوٹ پلندوں میں بندھے ہوئے رکھے تھے۔ بورڈ کے مدرسوں کے لیے کچھ لکڑی کے سامان بنوائے گئے تھے۔ اس کی قیمت تھی۔ ٹھیکیدار آج وصولی کیلئے طلب کیا گیا تھا۔ آج ہی سیکرٹری صاحب نے چیک بھیج کر خزانے سے روپئے منگوائے تھے۔ مداری لال نے برآمدہ میں نکل کر دیکھا سبودھ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ مداری لال کی نیت برگشتہ ہو گئی۔ حسد میں بدنیتی بھی شامل ہوئی۔ انھوں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پلندے اٹھائے۔ پتلون کی دونوں جیبوں میں بھر کر فوراً کمرہ سے نکلے اور چپڑاسی سے پوچھا۔ "سیکرٹری صاحب کمرہ میں ہیں یا نہیں؟" چپڑاسی نے کہا۔ "جی نہیں، کچہری میں کسی سے باتیں کر رہے ہیں۔"

مداری لال نے دفتر میں آ کر ایک کلرک سے کہا۔ "یہ فائل لے جا کر سیکرٹری صاحب کو دکھاؤ۔"

کلرک فائل لے کر چلا گیا اور ذرا دیر میں لوٹ کر بولا۔ "سیکرٹری صاحب کمرہ میں نہ تھے، فائل میز پر رکھ آیا ہوں۔"

مداری لال۔ "کمرہ چھوڑ کر کہاں چلے جایا کرتے ہیں۔ کسی دن دھوکا اٹھائیں گے۔"

کلرک نے کہا۔ "ان کے کمرہ میں دفتر والوں کے سوا جاتا ہی کون ہے؟"

مداری۔ "تو کیا دفتر والے سب کے سب فرشتے ہیں۔ کب کسی کی نیت برگشتہ ہوتی ہے، کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں نے چھوٹی چھوٹی رقموں پر اچھے اچھوں کی نیتیں بدلتے دیکھی ہیں۔ ہم میں اس وقت سبھی شاہ نظر آتے ہیں

لیکن موقع پا کر شاید ہی کوئی شاہ رہے۔ یہی انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ آپ جا کر ان کے کمرہ کا دروازہ دونوں طرف سے بند کر دیجئے۔"

کلرک۔ "چپڑاسی تو دروازہ پر بیٹھا ہوا ہے۔"

مداری لال نے جھنجھلا کر کہا۔ "آپ سے میں جو کہتا ہوں وہ کیجئے۔ کہنے لگے، چپڑاسی بیٹھا ہوا ہے۔ چپڑاسی کوئی رشی ہے، منی ہے۔ چپڑاسی ہی کچھ اڑا دے تو آپ اس کا کیا کر لیں گے؟ ضمانت بھی ہے تو تین سو کی، یہاں ایک ایک کاغذ لاکھوں کا ہے۔"

یہ کہہ کر مداری لال اٹھے اور دفتر کے دروازے دونوں طرف سے بند کر دیئے۔ جب ذرا موقع ملا تو نوٹوں کے پلندے پتلون کی جیب سے نکال کر ایک الماری میں کاغذوں کے نیچے چھپا دیئے۔ پھر آ کر اپنے کام میں ہمہ تن محو ہو گئے۔

سبودھ چندر آدھ گھنٹہ میں لوٹے تو دروازہ بند تھا۔ دفتر میں آ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ دروازہ کس نے بند کر دیا ہے صاحب۔ کیا مجھے آنے کی اجازت نہیں ہے؟"

مداری لال نے کھڑے ہو کر واعظانہ لہجے میں کہا۔ "جناب گستاخی معاف کیجئے گا۔ آپ جب کبھی باہر جائیں، چاہے ایک منٹ ہی کے لیے کیوں نہ ہو دروازہ ضرور بند کر دیا کریں۔ آپ کی میز پر روپے پیسے اور سرکاری کاغذات بکھرے پڑے رہتے ہیں، نہ جانے کس وقت کس کی نیت بدل جائے۔ میں نے ابھی سنا کہ آپ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں تو دروازے بند کرا دیئے۔"

سبودھ دروازہ کھول کر کمرہ میں گئے اور ایک سگار پینے لگے۔ میز پر نوٹ رکھے ہوئے ہیں، اس کی خبر ہی نہ تھی۔

دفعتاً ٹھیکیدار نے آ کر سلام کیا۔ سبودھ کرسی سے اٹھ بیٹھے اور بولے۔ "تم نے بہت دیر کر دی۔ تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔ دس بجے ہی روپے منگوا لیے تھے۔ رسید کا ٹکٹ لائے ہو نا؟"

ٹھیکیدار۔ "حضور، رسید لکھتا لایا ہوں۔"

سبودھ۔ "تو یہ روپیہ لو۔ تمہارے کام سے میں بہت خوش نہیں ہوں۔ لکڑی خراب استعمال کی ہے اور کوئی چیز صاف نہیں۔ اگر ایسا کام پھر کرو گے تو ٹھیکیداروں کے رجسٹر سے تمہارا نام نکال دیا جائے گا۔"

یہ کہہ کر سبودھ نے میز پر نگاہ ڈالی تو نوٹوں کا پلندہ نہ تھا۔ شاید کسی فائل کے نیچے دب گیا ہو گا۔ کرسی کے قریب کے کاغذات الٹ پلٹ ڈالے مگر نوٹوں کا پتہ نہیں۔ ایں! نوٹ کہاں گئے۔ ابھی یہیں تو میں نے رکھ دیئے تھے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔ پھر فائلوں کو الٹنے پلٹنے لگے۔ دل میں ذرا ذرا سی دھڑکن ہونے لگی۔ ساری میز کے کاغذات چھان ڈالے۔ پلندہ کا پتہ نہیں۔ تب وہ کرسی پر بیٹھ کر اس آدھ گھنٹہ کے واقعات اور حرکات کا تبصرہ کرنے لگے۔ چپڑاسی نے نوٹوں کا پلندہ لا کر مجھے دیا۔ خوب یاد ہے۔ بھلا یہ بھی بھولنے کی بات ہے اور اتنی جلد۔ میں نے نوٹوں کو لے کر یہیں میز پر رکھ دیا، گنا تک نہیں۔ اتنے میں ایک وکیل صاحب آ گئے۔ پرانے ملاقاتی ہیں، ان سے باتیں کرتا ہوا ذرا اس درخت کے نیچے چلا گیا۔

یہاں تو پلندہ رکھا ہوا تھا۔ خوب اچھی طرح یاد ہے۔ پھر نوٹ کہاں غائب ہو گئے۔ میں نے کسی صندوق، دراز یا الماری میں نہیں رکھے۔ پھر گئے تو کہاں گئے۔ شاید دفتر میں کسی نے احتیاطاً اٹھا کر رکھ دیئے ہوں۔ یہی بات ہے۔ میں ناحق اتنا گھبرا گیا۔ فوراً دفتر میں آ کر مداری لال سے بولے۔ "آپ نے میری میز پر سے کچھ نوٹ تو

کہیں نہیں رکھوا دیئے۔"

مداری لال نے استعجاب سے پوچھا۔ "کیا آپ کی میز پر نوٹ تھے۔ مجھے تو خبر نہیں۔ ابھی منشی سوہن لال ایک فائل لے کر گئے تھے تو آپ کو کمرہ میں نہ دیکھا۔ میں نے سنا کہ آپ کسی سے باتیں کرتے چلے گئے ہیں تو دروازے بند کروا دیئے۔ کیا کچھ نوٹ نہیں مل رہے ہیں؟"

سبودھ۔ "ارے صاحب پورے پانچ ہزار کے ہیں۔ ابھی ابھی چک بھنایا ہے۔"

مداری لال نے سر پیٹ کر کہا۔ "پورے پانچ ہزار! یا بھگوان غضب ہو گیا۔ آپ نے میز پر دیکھ لیا؟"

سبودھ۔ "جناب پندرہ منٹ سے پریشان ہوں!"

مداری لال۔ "چپڑاسی سے پوچھ لیا کہ کون کون آیا تھا؟"

سبودھ۔ "آیئے ذرا آپ لوگ بھی تلاش کیجئے۔ میرے حواس درست نہیں ہیں۔"

سارا دفتر سیکرٹری صاحب کے کمرہ میں سرگرم تلاش ہوا۔ میز، الماریاں، صندوق سب دیکھے گئے مگر نوٹوں کا پتہ نہیں۔ نوٹ غائب ہو گئے۔ اب اس میں شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ سبودھ نے ایک لمبی سانس لی اور کرسی پر بیٹھ گئے۔ ان کی ہیئت ہی بدل گئی جیسے مسخ ہو گئے ہوں۔

مداری لال نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ "غضب ہو گیا۔ آج تک کبھی ایسا سانحہ نہ ہوا تھا۔ مجھے آج یہاں دس سال کام کرتے ہوئے، کبھی دھیلے کی چیز بھی غائب نہیں ہوئی۔ میں نے آپ کو پہلے ہی دن متنبہ کر دینا چاہا کہ یہاں ذرا ہوشیار رہیے گا مگر شدنی تھی، خیال ہی نہ رہا۔ ضرور باہر سے کوئی آدمی آیا اور پلندہ لے کر غائب ہو گیا۔ چپڑاسی کی خطا یہی ہے کہ اس نے اس آدمی کو کمرہ میں جانے کیوں دیا۔ وہ لاکھ قسمیں کھائے کہ باہر سے کوئی نہیں آیا لیکن میں اسے کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ صرف منشی سوہن لال ایک فائل لے کر آپ کے کمرہ میں گئے تھے مگر دروازہ سے ہی جھانک کر چلے آئے۔"

سوہن لال نے کہا۔ "جی ہاں، میں نے تو اندر قدم بھی نہیں رکھا۔ اپنے جوان بیٹے کی قسم کھاتا ہوں جو میں نے اندر قدم رکھا ہو۔"

مداری لال۔ "آپ ناحق قسمیں کھاتے ہیں۔ آپ سے کوئی کچھ کہتا ہے۔ (سبودھ کے کان میں) بینک میں آپ کا کچھ روپیہ ہو تو نکال کر ٹھیکیدار کو دے دیا جائے ورنہ سخت بدنامی ہوگی۔ نقصان تو ہو ہی گیا۔ اس کے ساتھ خفت کیوں اٹھانی پڑے۔"

سبودھ چندر نے دردناک لہجہ میں کہا۔ "بینک میں مشکل سے دو چار سو روپے ہوں گے۔ بھائی جان روپے ہوتے تو کیا غم تھا۔ سمجھ لیتا جیسے پچیس ہزار اڑ گئے، ویسے پانچ ہزار اڑ گئے مگر میں تو قلاش ہوں۔"

اسی رات کو سبودھ چندر نے خودکشی کر لی۔ اتنے روپوں کا انتظام کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ پردہ موت کے سوا انہیں اپنی خفت، ندامت، بدگمانی، ذلت کو چھپانے کی اور کوئی آڑ نہ تھی۔

(4)

دوسرے دن علی الصبح چپڑاسی نے مداری لال کے گھر پہنچ کر آواز دی۔ مداری لال کو رات بھر نیند نہ آئی

تھی۔ گھبرا کر باہر آئے۔

چپڑاسی۔ "ہجور۔ بڑا گجب ہو گیا۔ سیکرٹری صاحب نے رات کو اپنی گردن پر چھری پھیر لی۔"

مداری کو ایسا معلوم ہوا گویا ان کے سر پر کوئی بڑا سا پتھر ٹوٹ پڑا ہوا۔ "چھری پھیر لی!"

"جی ہاں، آج سویرے معلوم ہوا۔ پولیس کے آدمی جمع ہیں۔ آپ کو بلایا ہے۔"

"لاش ابھی پڑی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں، ابھی ڈاکٹری معائنہ ہونے والا ہے۔"

"بہت سے لوگ جمع ہیں؟"

"سب بڑے بڑے اپسر جمع ہیں۔ لاس کی طرپھ دیکھے نہیں بنتا بابو جی۔ کیسا بھلا مانس، ہیرا آدمی تھا۔ سب لوگ رو رہے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے ہیں، ایک بڑی لڑکی ہے، بیاہنے لائق۔ بہو جی کو لوگ کتنا روک رہے ہیں، پر بار بار دوڑ کر لاس کے پاس آ جاتی ہیں۔ کوئی ایسا نہیں ہے جو آنکھیں رومال سے نہ پونچھ رہا ہو۔ ابھی اتنے ہی دن آئے ہوئے پر سب سے کیسا میل جول ہو گیا تھا۔ روپے کی تو نہیں محبت ہی نہیں تھی۔ دریا دل تھا۔"

مداری لال کے سر میں چکر آنے لگا۔ دروازہ کی چوکھٹ پکڑ کر اپنے کو سنبھال نہ لیتے تو شاید گر پڑتے۔

"بہو جی بہت رو رہی تھیں۔ کے لڑکے بتلائے تم نے؟"

"ہجور دو لڑکے ہیں اور ایک لڑکی۔"

"لڑکی سیانی ہو گی؟"

"جی ہاں، بیاہنے لائک ہے۔ روتے روتے بچاری کی آنکھیں سوج اٹھی ہیں۔"

"نوٹوں کے بارے میں بھی بات چیت ہو رہی ہو گی؟"

"جی ہاں، سب لوگ یہی کہتے ہیں کہ دپھتر کے کسی آدمی کا کام ہے۔ درگا جی تو سوہن لال کو گرپتار کرنا چاہتے تھے مگر سائت آپ کی صلاح لیں۔ سیکرٹری صاحب لکھ گئے ہیں کہ میرا سک کسی پر نہیں ہے۔ نہیں، تو اب تک تہلکہ مچ گیا ہوتا۔ سارا دپھتر پھنس جاتا۔"

"کیا سیکرٹری صاحب کوئی خط لکھ کر چھوڑ گئے ہیں؟"

"ہاں صاحب، معلوم ہوتا ہے چھری مارتے بکھت انہیں یاد آیا کہ سب دپھتر گرپتار ہو جائے گا۔ بس کلکٹر صاحب کے نام چٹھی لکھی دی۔"

"اس چٹھی میں میرا بھی ذکر ہے؟ تمہیں یہ کیا معلوم ہو گا۔"

"ہجور، اب میں کیا بتاؤں مگر اتنا سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی بڑی تارپھ لکھی ہے۔"

مداری لال کی سانس اور تیز ہو گئی۔ آنکھوں سے آنسو کے دو بڑے قطرے ٹپک پڑے۔

"میں اور وہ ایک ساتھ کے پڑھے تھے۔ نندو' آٹھ دس سال تک ساتھ رہنا' ساتھ اٹھتے بیٹھتے، ساتھ کھاتے، بس اسی طرح تھے۔ جیسے دو سگے بھائی ہوں۔ خط میں میری کیا تعریف لکھی ہے؟ یہ تمہیں کیا معلوم ہو گا!"

"آپ تو چل ہی رہے ہیں دیکھ لیجئے گا۔"

"کفن کا انتظام ہو گیا ہے؟"

"نہیں صاحب، کہانہ کہ ابھی لاس کا ڈاکٹری معائنہ ہوگا مگراب جلدی چلئے ایسانہ ہو کوئی دوسرا آدمی آتا ہو۔"

"ہمارے دفتر کے بھی سب لوگ آگئے ہوں گے ؟"

"جی ہاں، کئی آدمی آگئے تھے۔ وہی جو اس محلّہ میں رہتے ہیں۔"

"ان سے پولیس والوں نے میری بابت تو سوال جواب نہیں کیا؟"

"جی نہیں، کسی سے بھی نہیں۔"

مداری لال جب سبودھ چندر کے گھر پہنچے تو کئی افسر اور محلّہ کے معززین جمع تھے۔ مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ سب کے سب ان کی طرف بدگمانی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ پولیس انسپکٹر نے انہیں فوراً بلا کر کہا۔ "آپ بھی اپنا بیان لکھادیں اور سب کے بیان لکھ چکا ہوں۔" مداری لال نے اتنی ہوشیاری سے اپنا بیان دیا کہ انسپکٹر پولیس بھی ان کی قانونی نکتہ دانی کا معترف ہو گیا۔ سارے بیان میں ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جو ان کے خلاف پڑ سکے۔

یکایک مرحوم کے دونوں بچے روتے ہوئے مداری لال کے پاس آئے اور بولے۔ "چلئے آپ کو اماں جی بلا رہی ہیں۔" دونوں مداری لال سے مانوس تھے۔

مداری کو سبودھ چندر کی بیوی سے کبھی بات چیت کرنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ یہ بلاوا سن کر ان کا دل دھڑک اٹھا۔ کہیں اس کا مجھ پر شبہ نہ ہو۔ کہیں سبودھ نے میری نسبت شک تو ظاہر نہیں کیا۔ کچھ جھجکتے، کچھ ڈرے۔ اندر داخل ہوئے تو بیوہ کا نالہ دلخراش سنائی دیا۔ انہیں دیکھتے ہی بے کس بیوہ کے نالہ درد کا کوئی دوسرا سوتا کھل گیا۔ لڑکی نے آکر انہیں پرنام کیا اور ان کے لیے ایک کرسی رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں لڑکوں نے بھی انہیں گھیر لیا۔ مداری لال کو ان تینوں کی نظروں میں ایسی بے کسانہ التجا بھری ہوئی معلوم ہوئی کہ وہ ان کے سامنے دیکھ نہ سکے۔ ان کا نفس انہیں نفریں کرنے لگا۔ جن غریبوں کو ان پر اتنا اعتماد، اتنا بھروسہ، اتنی عقیدت، اتنی یگانگت ہے، انہیں کی گردن پر انہوں نے چھری پھیری۔ انہیں کے ہاتھوں یہ بھرا پرا خاندان خاک میں مل گیا۔ ان غریبوں کا اب کیا حشر ہوگا۔ لڑکی کی شادی کرنی ہے، کون کرے گا؟ بچوں کی تعلیم و تربیت کا بار کون اُٹھائے گا؟ مداری لال خود اپنی نظروں میں اتنے ذلیل ہوئے۔ ان کے دل نے خود اتنا دھتکارا کہ ان کی زبان سے تشفی کا ایک لفظ نہ نکلا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا گویا ان کے چہرہ پر کوئی سیاہ اور بدنما داغ لگا ہوا ہے۔ گویا ان کا قد کچھ چھوٹا ہو گیا ہے۔ وہ سبودھ چندر کو صرف پریشان کرنا چاہتے تھے۔ اس کا یہ انجام ہوگا، شاید اس کا انہیں گمان بھی نہیں تھا۔

مجروح بیوہ نے سسکتے ہوئے کہا۔ "بھیا جی، ہم لوگوں کو وہ منجدھار میں چھوڑ گئے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ دل میں یہ بات ٹھان چکے ہیں تو اپنے پاس جو کچھ تھا، سب ان کے قدموں پر رکھ دیتی۔ مجھ سے تو وہ یہی کہتے رہے کہ کوئی نہ کوئی انتظام ہو جائے گا۔ آپ ہی کے ذریعے وہ کوئی مہاجن ٹھیک کرنا چاہتے تھے۔ آپ کے اوپر انہیں کتنا بھروسہ تھا کہ بیان نہیں کر سکتی۔"

مداری لال کو ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ان کے دل پر نشتر چلا رہا ہے۔ ان کے حلق میں کوئی وزنی چیز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

بیوہ نے پھر کہا۔ "رات سوئے تو خوب ہنس رہے تھے۔ سابق دستور دودھ پیا، بچوں کو پیار کیا، تھوڑی دیر تک ہارمونیم بجایا۔ کوئی ایسی بات نہ کی جس سے کسی قسم کا شبہ ہوتا۔ مجھے متفکر دیکھ کر بولے۔ تم ناحق گھبراتی ہو۔

مداری لال سے پرانی ملاقات ہے۔ آخر وہ کس دن کام آئے گی۔ میرے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں۔اس شہر میں ان کی خاصی عزت ہے۔ روپوں کا انتظام آسانی سے ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کب ان کا ارادہ پلٹا۔ میں نصیبوں جلی ایسی سوئی کہ رات کو سُنگی تک نہیں۔ کیا جانتی تھی کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔"

مداری لال کو سارا مکان تیرتا ہوا معلوم ہوا۔ انہوں نے بہت ضبط کیا۔ پر جوش اشک نہ روک سکے۔

بیوہ نے آنکھیں پونچھ کر پھر کہا۔ "بابو جی جو کچھ ہونا تھا، وہ تو ہو چکا لیکن آپ اس بدمعاش کا پتہ ضرور لگائیے جس نے ہمارا ستیاناس کیا۔ دفتر ہی کے کسی آدمی کی حرکت ہے۔ وہ بہت سیدھے سادے آدمی تھے۔ مجھ سے یہی کہتے رہے کہ میرا کسی پر شبہ نہیں ہے۔ آپ سے صرف یہی التجا کرتی ہوں کہ اس بدمعاش کو بچ کر جانے نہ دیجئے گا۔ پولیس والے شاید رشوت لے کر اسے چھوڑ دیں۔ آپ کو دیکھ کر ان کا یہ حوصلہ نہ ہوگا۔ اب ہمارے سر پر آپ کے سوا اور کون ہے۔ کس سے اپنا دکھ کہیں۔ لاش کی یہ درگت ہونی ہی لکھی تھی۔"

مداری لال کے سر میں ایسا چکر آیا کہ وہ زمین پر گر پڑے۔

(5)

تیسرے پہر لاش کا معائنہ ختم ہوا۔ جنازہ ندی کی طرف چلا۔ سارا دفتر سارے حکام اور ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ چتا کے مراسم لڑکوں کے ہاتھوں ادا ہونے چاہیے تھے مگر لڑکے نابالغ تھے۔ بیوہ چلنے کو تیار ہی ہو رہی تھی کہ مداری لال نے جا کر کہا۔ "بہو جی، یہ فرض مجھے ادا کرنے دو۔ تم کریا پر بیٹھ جاؤ گی تو بچوں کو کون سنبھالے گا؟ سبودھ میرے بھائی تھے۔ زندگی میں میں ان کے ساتھ کچھ سلوک نہ کر سکا۔ اب زندگی کے بعد مجھے اپنا دوستانہ اور برادرانہ فرض ادا کر لینے دو۔ آخر میرا بھی تو ان پر کچھ حق تھا۔"

بیوہ نے رو کر کہا۔ "آپ کو بھگوان نے بڑا وفا پرور دل دیا ہے۔ بابو جی' نہیں تو مرنے پر کون پوچھتا ہے۔ دفتر کے آدمی جو آدھی رات تک ہاتھ باندھے کھڑے رہتے تھے، جھوٹوں بھی نہ آئے کہ ذرا دل کو ڈھارس ہوتی۔"

مداری لال نے واہ کریا کی۔ تیرہ دن تک سنسکار کرتے رہے۔ تیرھویں دن پنڈوان ہوا۔ برہمنوں نے بھوجن کیا۔ فقیروں کو غلہ تقسیم کیا گیا۔ قریبی احباب کی دعوت ہوئی اور سبھی اخراجات مداری لال نے ادا کیے۔ بیوہ نے ہر چند اصرار کیا کہ آپ نے جتنا کیا، اتنا ہی بہت ہے۔ اب میں آپ کو اور زیادہ زیر بار نہیں کرنا چاہتی۔ دوستی کا حق اس سے زیادہ اور کوئی کیا ادا کرے گا مگر مداری لال نے ایک نہ سنی۔ سارے شہر میں لوگ ان کی تعریف کرنے لگے۔ دوست ہو تو ایسا ہو!

سولہویں دن بیوہ نے مداری لال سے کہا۔ "بھیا آپ نے ہمارے ساتھ جو سلوک اور احسان کیے، ان سے ہم مرتے دم تک سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ آپ نے ہمارے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو نہیں معلوم ہماری کیا گت ہوتی۔ سی طرح کبھی کبھی یاد کیجئے گا۔ اب ہمیں اجازت دیجئے کہ گھر جائیں۔ وہاں دیہات میں خرچ بھی کم ہوگا اور کچھ کھیتی باڑی کا سلسلہ بھی کر لوں گی۔ کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کٹ جائیں گے۔"

مداری لال۔ "گھر پر کتنی جائیداد ہے؟"

بیوہ۔ ”جائیداد کیا ہے۔ ایک کچا مکان ہے اور دس بارہ بیگھے کاشتکاری ہے۔ پکا مکان بنوانا شروع کیا تھا مگر روپے پورے نہ پڑے۔ ابھی ادھورا پڑا ہوا ہے۔ دس بارہ ہزار روپے خرچ ہو گئے اور ابھی چھت پڑنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔“

مداری۔ ”کچھ روپے بینک میں جمع ہیں یا بس کھیتی ہی کا سہارا ہے؟“

بیوہ۔ ”جمع تو ایک پائی بھی نہیں ہے بھیا جی۔ ان کے ہاتھ میں روپیہ رہنے ہی نہ پاتا تھا۔ بس وہی کھیتی باڑی ہے۔“

مداری۔ ”تو ان کھیتوں میں اتنی پیداوار ہو جائے گی کہ لگان بھی ادا ہو جائے اور تم لوگوں کی بسر اوقات بھی ہو؟“

بیوہ۔ ”اور کر ہی کیا سکتے ہیں بھیا جی۔ کسی نہ کسی طرح زندگی تو کاٹنا ہی ہے۔ بچے نہ ہوتے تو میں زہر کھا لیتی۔“

مداری۔ ”اور ابھی لڑکی کی شادی بھی کرنی ہے۔“

بیوہ۔ ”لڑکی کی شادی کی اب کوئی فکر نہیں ہے۔ کاشتکاروں میں بہت سے ایسے مل جائیں گے جو بلا کچھ لیے دیئے شادی کر لیں گے۔“

مداری نے ذرا دیر خاموش رہ کر کہا۔ ”اگر میں کچھ صلاح دوں تو اسے مانیں گی آپ؟“

بیوہ۔ ”بھیا جی، آپ کی صلاح نہ مانیں گے تو کس کی صلاح مانیں گے؟ دوسرا اور ہے ہی کون؟“

مداری۔ ”تو آپ اپنے گھر جانے کے بدلے میرے گھر چلئے۔ جیسے میرے بال بچے کھائیں، رہیں گے ویسے آپ کے بال بچے بھی رہیں گے۔ آپ کو کسی طرح کی تکلیف نہ ہو گی۔ میرا مکان کافی بڑا ہے۔ آپ چاہیں گی تو اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ آپ کو دے دوں گا ورنہ ایک ساتھ ہی رہیں گے۔ ایشور نے چاہا تو لڑکی کی شادی بھی کسی شریف خاندان میں ہو جائے گی۔“

بیوہ نے آنکھوں میں احسان اور تشکر کے آنسو بھرے ہوئے کہا۔ ”مگر بابو جی، سوچئے۔“

مداری نے بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نہ کچھ سوچوں گا اور نہ کوئی عذر مانوں گا۔ آپ کو میری یہ درخواست قبول کرنی پڑے گی۔ میں آج دس دن سے اسی مسئلہ پر غور کر رہا تھا اور اس تجویز کے سوا مجھے اور کوئی دوسری صورت نظر نہیں آئی۔ اف' دو بھائیوں کے خاندان کیا ایک ساتھ نہیں رہتے؟ سبودھ کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ سمجھوں گا۔“

بیوہ کا کوئی عذر نہ سنا گیا۔ اسی دن مداری لال سارے خاندان کو اپنے گھر لے گئے اور آج دس سال سے ان کی پرورش کر رہے ہیں۔ لڑکی کی شادی ایک بہت ممتاز خاندان میں ہو گئی۔ دونوں بچے کالج میں پڑھتے ہیں اور ان کی ماں مداری لال کے گھر کی مالکن ہے۔ مداری لال اور ان کی بیوی دل و جان سے اس کی خدمت کرتے ہیں اور اسی کی مرضی کو مقدم سمجھتے ہیں۔

مداری لال نے اپنے گناہ کو خدمت کے پردہ میں چھپا لیا ہے۔

ترسول

(1)

اندھیری رات ہے۔ موسلا دھار پانی برس رہا ہے۔ کھڑکیوں پر پانی کے تھپیڑے لگ رہے ہیں۔ کمرہ کی روشنی کھڑکی سے باہر جاتی ہے تو پانی کی بڑی بڑی بوندیں تیروں کی طرح نوکدار لمبی، موٹی گرتی ہوئی نظر آجاتی ہیں۔ اس وقت اگر گھر میں آگ بھی لگ جائے تو شاید میں باہر نکلنے کی جرأت نہ کروں لیکن ایک دن تھا جب ایسی ہی اندھیری بھیانک رات کے وقت میں میدان میں بندوق لیے پہرہ دے رہا تھا۔ اسے آج تیس سال گزر گئے۔

ان دنوں میں فوج میں ملازم تھا۔

آہ! وہ فوجی زندگی کتنے لطف سے گزرتی تھی۔ میری زندگی کی سب سے شیریں، سب سے دلآویز یادگاریں اسی زمانہ سے وابستہ ہیں۔ آج مجھے اس حجرۂ تاریک میں اخباروں کے لیے مضامین لکھتے دیکھ کر کون قیاس کرے گا کہ اس نیم جاں، خمیدہ کمر، خستہ حال انسان میں بھی کبھی حوصلہ اور ہمت اور جوش کا دریا موجزن تھا۔ کیا کیا دوست تھے۔ جن کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ رقص کرتی رہتی تھی۔ شیر دل، رام سنگھ اور خوش گلو دیوی داس کی یاد کیا کبھی دل سے مٹ سکتی ہے۔ وہ عدن، وہ بصرہ، وہ مصر سب آج میرے خواب ہیں۔ حقیقت ہے تو یہ تنگ کمرہ اور اخبار کا دفتر۔

ہاں ایسی ہی اندھیری، ڈراونی، سنسان رات تھی۔ میں بارک کے سامنے برساتی پہنے ہوئے کھڑا میگزین کا پہرہ دے رہا تھا۔ کندھے پر بھرا ہوا رائفل تھا۔ بارک میں سے دو چار سپاہیوں کے گانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ رہ رہ کر جب بجلی چمک جاتی تو سامنے کے اونچے پہاڑ اور درخت اور نیچے کا ہرا بھرا سبزہ زار اس طرح نظر آجاتے تھے جیسے کسی بچے کی بڑی بڑی سیاہ معصوم پتلیوں میں خوشی کی جھلک نظر آجاتی ہے۔

رفتہ رفتہ بارش نے طوفانی صورت اختیار کی۔ تاریکی اور بھی تاریک، بادل کی گرج اور بھی مہیب اور بجلی کی چمک اور بھی تیز ہوگئی۔ معلوم ہوتا تھا فطرت اپنی ساری طاقت سے زمین کو پامال کر دے گی۔

یکایک مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سامنے سے کسی چیز کی پرچھائیں سی نکل گئی۔ پہلے تو مجھے خیال ہوا کہ کوئی جنگلی جانور ہوگا لیکن بجلی کی ایک چمک نے یہ خیال دور کر دیا۔ وہ کوئی آدمی تھا جو بدن کو چرائے پانی میں بھیگتا ہوا ایک طرف جا رہا تھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس سیلاب میں کون آدمی بارک سے نکل سکتا ہے اور کیوں؟ مجھے اب اس کے آدمی ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ میں نے بندوق سنبھال لی اور فوجی قاعدے کے مطابق پکارا۔ ''ہالٹ' ہُو کمس دیر؟'' پھر بھی کوئی جواب نہیں۔ قاعدہ کے مطابق تیسری بار للکارنے پر اگر جواب نہ ملے تو مجھے بندوق داغ دینی چاہیے تھی۔ اس لیے میں نے بندوق ہاتھ میں لے کر خوب زور سے کڑک کر کہا۔ ''ہالٹ، ہُو کمس دیر؟'' جواب تو اب کے بھی نہ ملا مگر وہ پرچھائیں میرے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ مرد نہیں عورت ہے۔ قبل اس کے کہ میں کوئی سوال کروں، اس نے کہا۔ ''سنتری خدا کے لیے چپ رہو۔ میں ہوں لوئسا۔''

میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی۔ اب میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہمارے کمانڈنگ افسر کی دوشیزہ لوئسا ہی

تھی مگر اس وقت اس موسلا دھار مینہ اور اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں وہ کہاں جا رہی تھی؟ بارک میں ایک ہزار جوان موجود تھے جو اس کے حکم کی تعمیل کر سکتے تھے، پھر وہ نازک بدن عورت اس وقت کیوں نکلی اور کہاں کے لیے نکلی؟ میں نے تحکمانہ انداز سے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں جا رہی ہو؟"

لوئسا نے نہایت لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔ "معاف کرو سنتری۔ یہ میں نہیں بتا سکتی اور تم سے التجا کرتی ہوں کہ یہ بات کسی سے نہ کہنا۔ میں ہمیشہ تمہاری احسان مند رہوں گی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز اس طرح کانپنے لگی جیسے کسی پانی سے بھرے ہوئے برتن کی آواز۔

میں نے اسی سپاہیانہ انداز سے کہا۔ "یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ میں فوج کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں۔ مجھے اتنا مجاز نہیں۔ میں قاعدہ کے مطابق آپ کو اپنے سرجنٹ کے روبرو لے جانے کے لیے مجبور ہوں۔"

"لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ میں تمہارے کمانڈنگ افسر کی لڑکی ہوں؟"

میں نے ذرا ہنس کر جواب دیا۔ "اگر میں اس وقت کمانڈنگ افسر صاحب کو بھی ایسی حالت میں دیکھوں تو ان کے ساتھ بھی مجھے یہی سختی کرنی پڑے گی۔ قاعدہ سب کے لیے یکساں ہے اور ایک سپاہی کو کسی حالت میں اسے توڑنے کا اختیار نہیں ہے۔"

یہ بے رحمانہ جواب پا کر اس نے دردناک انداز سے پوچھا۔ "تو پھر کیا تدبیر ہے؟"

مجھے اس پر رحم تو آ رہا تھا لیکن قاعدوں کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے انجام کا مطلق خوف نہ تھا۔ کورٹ مارشل یا تنزل اور کوئی سزا میرے ذہن میں نہ تھی۔ میرا ضمیر بھی صاف تھا لیکن قاعدے کو کیسے توڑوں جو فرض کی دستاویز ہے۔ اسی حیص بیص میں کھڑا تھا کہ لوئسا نے ایک قدم بڑھا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور نہایت پر درد اضطراب کے لہجہ میں بولی۔ "تو پھر میں کیا کروں؟"

ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا اس کا دل پگھلا جا رہا ہو۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ ایک بار جی میں آیا، جانے دوں۔ پیامِ یار یا ایفائے وعدہ کے سوا اور کونسی طاقت اس عالم میں اسے گھر سے نکلنے پر مجبور کرتی؟ پھر میں کیوں کسی کی راہ محبت کا کانٹا بنوں لیکن قاعدہ نے پھر زبان پکڑ لی۔ میں نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کر کے منہ پھیر کر کہا۔ "اور کوئی تدبیر نہیں ہے۔"

میرا جواب سن کر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گویا جسم میں جان نہ ہو۔ پر اس نے اپنا ہاتھ ہٹایا نہیں۔ میرے ہاتھ کو پکڑے ہوئے گڑگڑا کر بولی۔ "سنتری مجھ پر رحم کرو۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔ میری عزت خاک میں مت ملاؤ۔ میں بڑی بدنصیب ہوں۔"

میرے ہاتھ پر آنسوؤں کے کئی گرم قطرے ٹپک پڑے۔ موسلا دھار بارش کا مجھ پر ذرہ بھر بھی اثر نہ ہوا تھا لیکن ان چند بوندوں نے مجھے سر سے پاؤں تک ہلا دیا۔

میں بڑے پس و پیش میں پڑ گیا۔ ایک طرف قاعدہ اور فرض کی آہنی دیوار تھی۔ دوسری طرف ایک نازک اندام دوشیزہ کا منت آمیز اصرار۔ میں جانتا تھا اگر اسے سارجنٹ کے سپرد کر دوں گا تو سویرا ہوتے ہی سارے بٹالین میں خبر پھیل جائے گی۔ کورٹ مارشل ہو گا۔ کمانڈنگ افسر کی لڑکی پر بھی فوج کا آہنی قانون کوئی رعایت نہ کر سکے گا۔ اس کے بے رحم ہاتھ اس پر بھی بیدردی سے اٹھیں گے۔ خاص کر لڑائی کے زمانہ میں۔

اور اگر اسے چھوڑ دوں تو اتنی ہی بے دردی سے قانون میرے ساتھ پیش آئے گا۔ زندگی خاک میں مل

جائے گی۔ کون جانے کل زندہ بھی رہوں یا نہیں، کم سے کم تحقیر تو ہو گی ہی۔ راز مخفی بھی رہے تو کیا میرا ضمیر ہمیشہ لعن طعن نہ کرے گا۔ کیا میں پھر کسی کے سامنے اسی دلیرانہ انداز سے تاک سکوں گا؟ کیا میرے دل میں ہمیشہ ایک چور سانہ سمایا رہے گا؟

لوئیسا بول اٹھی۔ "سنتری۔"

منت کا ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہ نکلا۔ وہ اب یاس کے اس درجہ پر پہنچ چکی تھی جب انسان کی قوتِ اظہار مفردات تک محدود ہو جاتی ہے۔

میں نے دردمند لہجہ میں کہا۔ "بڑا مشکل معاملہ ہے۔"

"سنتری میری عزت بچالو۔ میرے امکان میں جو کچھ ہے، وہ میں تمہارے لیے کرنے کو تیار ہوں۔"

میں نے خوددارانہ انداز میں کہا۔ "مس لوئیسا، مجھے ترغیب نہ دیجئے۔ میں لالچی نہیں ہوں۔ میں صرف اس لیے معذور ہوں کہ فوجی قانون کو توڑنا ایک سپاہی کے لیے دنیا میں سب سے بڑا جرم ہے۔"

"کیا ایک دوشیزہ کے ننگ و ناموس کی حفاظت کرنا اخلاقی قانون نہیں ہے؟ کیا فوجی قانون اخلاقی قانون پر بھی غالب آسکتا ہے؟" لوئیسا نے ذرا پرجوش انداز سے کہا۔

اس سوال کا میرے پاس کیا جواب تھا۔ میں لاجواب ہو گیا۔ فوجی قانون عارضی، تغیر پذیر، ماحولات کا مطیع ہے۔ اخلاقی قانون ازلی، اٹل، ماحولات سے بالا۔ میں نے قائل ہو کر کہا۔

"جاؤ مس لوئیسا، تم اب آزاد ہو۔ تم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ میں فوجی قانون توڑ کر اس اخلاقی فرض کو پورا کروں گا مگر تم سے صرف اتنی التجا ہے کہ آئندہ کسی سپاہی کو اخلاقی فرض کی تلقین نہ کرنا کیونکہ فوجی قانون میں وہ بھی جرم ہے۔ فوجی آدمی کے لیے دنیا میں سب سے بڑا قانون فوجی قانون ہے۔ فوج کسی اخلاقی، روحانی، خدائی قانون کی پروا نہیں کرتی۔"

لوئیسا نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور احسان میں ڈوبے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "سنتری، خدا تمہیں اس کا اجر دے۔"

مگر فوراً اسے شبہ ہوا کہ شاید یہ سپاہی آئندہ کسی موقع پر یہ راز فاش نہ کرے۔ اس لیے مزید اطمینان کے خیال سے اس نے کہا۔ "میری آبرو اب تمہارے ہاتھ ہے۔"

میں نے یقین انگیز انداز سے کہا۔ "میری طرف سے آپ بالکل مطمئن رہیے۔"

"کبھی کسی سے نہیں کہو گے نا؟"

"کبھی نہیں۔"

"کبھی نہیں؟"

"ہاں جیتے جی کبھی نہیں۔"

"اب مجھے اطمینان ہو گیا سنتری۔ لوئیسا تمہاری اس نیکی اور احسان کو موت کی گود میں جاتے وقت بھی نہ بھولے گی۔ تم جہاں رہو گے تمہاری یہ بہن تمہارے لیے خدا سے دعا کرتی رہے گی۔ جس وقت تمہیں کبھی ضرورت ہو، میری یاد کرنا۔ لوئیسا دنیا کے کسی پردے پر ہو گی تب بھی تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہو گی۔ وہ آج سے تمہیں اپنا بھائی سمجھتی ہے۔ سپاہی کی زندگی میں ایسے موقعے آتے ہیں جب اسے ایک خدمت گزار بہن کی

ضرورت ہوتی ہے۔ خدا نہ کرے تمہاری زندگی میں ایسے موقعے آئیں لیکن اگر آئیں تو لوئسا اپنا فرض ادا کرنے میں کبھی دریغ نہ کرے گی۔ کیا میں اپنے نیک مزاج بھائی کا نام پوچھ سکتی ہوں؟"

بجلی ایک بار چمک اٹھی۔ میں نے دیکھا لوئسا کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

بولا۔"لوئسا ان حوصلہ انگیز باتوں کے لیے میں تمہارا تہ دل سے مشکور ہوں لیکن میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اخلاق اور ہمدردی کے ناطے کر رہا ہوں۔ صلہ یا انعام کی مجھے خواہش نہیں ہے۔ میرا نام پوچھ کر کیا کرو گی؟"

لوئسا نے شکوہ آمیز لہجہ میں کہا۔"کیا بہن کے لیے بھائی کا نام پوچھنا بھی فوجی قانون کے خلاف ہے؟"

ان الفاظ میں کچھ ایسا خلوص، کچھ ایسی محبت، کچھ ایسا اپنا پن بھرا ہوا تھا کہ میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔

بولا۔"نہیں لوئسا، میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ اس برادرانہ سلوک میں خود غرضی کا شائبہ بھی نہ رہنے پائے۔ میرا نام ہے سری ناتھ سنگھ۔"

لوئسا نے اظہار تشکر کے طور پر میرا ہاتھ آہستہ سے دبایا اور "تھینکس" کہہ کر چلی گئی۔ تاریکی کے باعث بالکل نظر نہ آیا کہ وہ کہاں گئی اور نہ پوچھنا قرینِ مصلحت تھا۔ وہیں کھڑا کھڑا اس اتفاقی ملاقات کے پہلوؤں کو سوچتا رہا۔ کمانڈنگ افسر کی بیٹی کیا ایک معمولی سپاہی کو اور وہ بھی جو کالا آدمی ہو، کیا کتے سے بدتر نہیں سمجھتی مگر وہی عورت آج میرے ساتھ بھائی کا رشتہ قائم کر کے پھولی نہیں سماتی تھی!

(2)

اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ دنیا میں کتنے ہی انقلاب ہو گئے۔ روس کی مطلق العنان شہنشاہی مٹ گئی۔ جرمنی کا قیصر دنیا کے سٹیج سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گیا۔ جمہوریت کو ایک صدی میں جتنا فروغ نہ ہوا تھا، اتنا ان چند سالوں میں ہو گیا۔ میری زندگی میں بھی کتنے ہی تغیرات ہوئے۔ ایک ٹانگ جنگ کے دیوتا کی بھینٹ ہو گئی۔ معمولی سپاہی سے لیفٹیننٹ ہو گیا۔

ایک دن پھر ایسی ہی چمک اور گرج کی رات تھی۔ میں کوارٹر میں بیٹھا ہوا کپتان ناکس اور لیفٹیننٹ ڈاکٹر چندر سنگھ سے اسی واقعہ کا چرچا کر رہا تھا جو دس بارہ سال قبل ہوا تھا۔ صرف لوئسا کا نام چھپا رکھا تھا۔ کپتان ناکس کو اس تذکرہ سے غیر معمولی دلچسپی ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ایک ایک بات پوچھتا اور واقعہ کا سلسلہ ملانے کے لیے دوبارہ پوچھتا تھا۔ جب میں نے آخر میں کہا، اس دن بھی ایسی ہی اندھیری رات تھی۔ ایسی ہی موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور یہی وقت تھا تو ناکس اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بڑے اضطراب سے بولا۔"کیا اس عورت کا نام لوئسا تو نہیں تھا؟"

میں نے تعجب سے کہا۔"آپ کو اس کا نام کیسے معلوم ہوا؟ میں نے تو نہیں بتلایا۔"

ناکس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ سسکیاں لے کر بولے۔"یہ سب آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا۔ پہلے یہ بتلائیے کہ آپ کا نام سری ناتھ سنگھ ہے یا چوہدری؟"

میں نے کہا۔"میرا پورا نام سری ناتھ سنگھ چوہدری ہے۔ اب لوگ مجھے صرف چوہدری کہتے ہیں لیکن اس وقت چوہدری کے نام سے مجھے کوئی نہ جانتا تھا۔ لوگ سری ناتھ کہتے تھے۔"

کپتان ناکس اپنی کرسی کھینچ کر میرے قریب آ گئے اور بولے۔ ”تب تو آپ میرے پرانے دوست نکلے۔ مجھے اب تک نام کے تبدیل ہو جانے سے دھوکا ہو رہا تھا ورنہ آپ کا نام تو مجھے خوب یاد ہے۔ ہاں ایسا یاد ہے کہ شاید مرتے دم بھی نہ بھولوں کیونکہ یہ اس کی آخری وصیت ہے۔“

یہ کہتے کہتے ناکس خاموش ہو گئے اور آنکھیں بند کر کے سر میز پر رکھ لیا۔ میری حیرت ہر لمحہ بڑھتی جاتی تھی اور لیفٹیننٹ ڈاکٹر چندر سنگھ بھی پر سوال نظروں سے ایک بار میری طرف اور دوسری بار کپتان ناکس کے چہرہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دو منٹ تک خاموش رہنے کے بعد کپتان ناکس نے سر اٹھایا اور ایک لمبی سانس لے کر بولے۔ ”کیوں لیفٹیننٹ چوہدری؟ تمہیں یاد ہے ایک بار ایک انگریز سپاہی نے تمہیں بری گالی دی تھی؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں خوب یاد ہے۔ وہ کارپول تھا۔ میں نے اس کی شکایت کر دی تھی اور اس کا کورٹ مارشل ہوا تھا۔ وہ کارپول سے تنزل ہو کر معمولی سپاہی بنا دیا گیا تھا۔ ہاں اس کا نام بھی یاد آ گیا۔ کرپ یا کرپ......؟“

کپتان ناکس نے قطع کلام کر کے ”کرپن۔ اس کی اور میری صورت میں آپ کو کچھ مشابہت معلوم ہوتی ہے؟ میں ہی وہ کرپن ہوں۔ میرا نام سی ناکس ہے۔ کرپن ناکس۔ جس طرح ان دنوں آپ کو لوگ سری ناتھ کہتے تھے، اسی طرح مجھے بھی کرپن کہا کرتے تھے۔“

اب جو میں نے غور سے ناکس کی طرف دیکھا تو پہچان گیا۔ بے شک وہ کرپن ہی تھا۔ میں استعجاب سے اس کی طرف تاکنے لگا۔ لوئسا سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ میری سمجھ میں اس وقت بھی نہ آیا۔

کپتان ناکس بولے۔ ”آج مجھے ساری داستان کہنی پڑے گی۔ لیفٹیننٹ چوہدری تمہاری وجہ سے جب میرا تنزل ہوا اور ذلت بھی کچھ کم نہ ہوئی تو میرے دل میں حسد اور انتقام کا شعلہ سا اٹھنے لگا۔ میں ہمیشہ اسی فکر میں رہتا تھا کہ کس طرح تمہیں ذلیل کروں۔ کس طرح اپنی ذلت کا بدلہ لوں۔ میں تمہاری ایک ایک حرکت کو ایک ایک بات کو عیب جویانہ نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ ان دس بارہ سالوں میں تمہاری صورت بہت کچھ بدل گئی ہے اور میری نگاہوں میں بھی کچھ فرق آ گیا ہے جس کے باعث میں تمہیں پہچان نہ سکا لیکن اس وقت تمہاری صورت ہمیشہ میری آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ اس وقت میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ کسی طرح تمہیں بھی تنزل کراؤں۔ اگر مجھے موقع ملتا تو شاید میں تمہاری جان لینے میں بھی دریغ نہ کرتا......“

کپتان ناکس پھر خاموش ہو گئے۔ میں اور ڈاکٹر چندر ٹکٹکی لگائے کپتان ناکس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ناکس نے پھر اپنی داستان شروع کی۔ ”اس دن رات کو جب لوئسا تم سے باتیں کر رہی تھی۔ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا ہوا تمہیں دور سے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس وقت کیا معلوم تھا کہ وہ لوئسا ہے۔ میں صرف یہ دیکھ رہا تھا کہ تم پہرہ دیتے وقت کسی عورت کا ہاتھ پکڑے اس سے باتیں کر رہے ہو۔ اس وقت مجھے جتنی پاجیانہ خوشی ہوئی، وہ بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے سوچا اب اسے ذلیل کروں گا۔ بہت دنوں کے بعد بچہ پھنسے ہیں۔ اب کسی طرح نہ چھوڑوں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں کمرہ سے نکلا اور پانی میں بھیگتا ہوا تمہاری طرف چلا لیکن جب تک میں تمہارے پاس پہنچوں لوئسا چلی گئی تھی۔ مجبور ہو کر اپنے کمرہ میں لوٹ آیا لیکن پھر بھی میں مایوس نہ تھا۔ میں جانتا تھا کہ تم جھوٹ نہ بولو گے اور جب میں کمانڈنگ افسر سے تمہاری شکایت کروں گا تو تم اپنا قصور تسلیم کر لو گے۔ میرے دل کی آگ بجھانے کے لیے اتنا اطمینان کافی تھا۔ میری آرزو بر آنے میں اب کوئی شک و شبہ نہ تھا۔“

میں نے مسکرا کر کہا۔ "لیکن آپ نے میری شکایت تو نہیں کی؟ کیا بعد کو رحم آ گیا؟"

ناکس نے جواب دیا۔ "نہیں جی، رحم کس مردود کو آنا تھا۔ شکایت نہ کرنے کا دوسرا ہی سبب تھا۔ سویرا ہوتے ہی میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ سیدھا کمانڈنگ افسر کے پاس پہنچا۔ تمہیں یاد ہوگا، میں ان کے بڑے بیٹے راجرس کو گھوڑے کی سواری سکھایا کرتا تھا۔ اس لیے وہاں جانے میں کسی قسم کی جھجک یا رکاوٹ نہ ہوئی۔ جب میں پہنچا تو راجرس اور لوئسا دونوں چائے پی رہے تھے۔ آج اتنے سویرے مجھے دیکھ کر راجرس نے کہا۔ "آج اتنی جلدی کیوں کرپن؟ ابھی تو وقت نہیں ہوا۔ آج بہت خوش نظر آ رہے ہو؟"

میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "آج کا دن میری زندگی میں مبارک ہے۔ آج مجھے اپنے ایک پرانے دشمن کو سزا دینے کا موقع ہاتھ آیا ہے۔ آپ کو معلوم ہے نا ایک راجپوت سپاہی نے کمانڈنگ افسر سے شکایت کر کے مجھے تنزل کرا دیا تھا؟"

راجرس نے کہا۔ "ہاں ہاں معلوم کیوں نہیں، مگر تم نے اسے گالی دی تھی۔"

میں نے کسی قدر جھینپتے ہوئے کہا۔ "میں نے گالی نہیں دی تھی، صرف بلڈی کہا تھا۔ سپاہیوں میں اس طرح کی بدزبانی بالکل عام ہے مگر اس راجپوت نے میری شکایت کر دی۔ آج میں نے اسے ایک سنگین جرم میں پکڑ پایا ہے۔ خدا نے چاہا کل اس کا بھی کورٹ مارشل ہوگا۔ میں نے آج رات کو اسے ایک عورت سے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ بالکل اس وقت جب وہ ڈیوٹی پر تھا۔ وہ اس فعل سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس حد تک کمینہ نہیں ہے۔"

لوئسا کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ عجیب سراسیمگی سے میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم نے اور کیا دیکھا؟"

میں نے کہا۔ "جتنا میں نے دیکھا ہے۔ اتنا اس راجپوت کو ذلیل اور معتوب کرنے کے لیے کافی ہے۔ ضرور اس کی کسی سے آشنائی ہے اور وہ عورت ہندوستانی نہیں کوئی یورپین لیڈی ہے۔ میں قسم کھا سکتا ہوں۔ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے بالکل اسی طرح باتیں کر رہے تھے جیسے عاشق و معشوق کیا کرتے ہیں۔"

لوئسا کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ چوہدری میں کتنا کمینہ ہوں۔ اس کا اندازہ تم خود کر سکتے ہو۔ میں چاہتا ہوں، تم مجھے کمینہ کہو۔ مجھے مطعون کرو۔ میں درندہ وحشی سے بھی زیادہ بے رحم ہوں۔ کالے سانپ سے بھی زیادہ زہریلا ہوں۔ وہ کھڑی دیوار کی طرف تاک رہی تھی کہ اس اثناء میں راجرس کا کوئی دوست آ گیا۔ وہ اس کے ساتھ چلا گیا۔ لوئسا میرے ساتھ اکیلی رہ گئی۔ تب اس نے میری طرف نہایت پر التجا نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "کرپن، تم اس رات کے سپاہی کی شکایت مت کرنا۔"

میں نے تعجب سے پوچھا۔ "کیوں؟"

لوئسا نے سر جھکا کر کہا۔ "اس لیے کہ جس عورت کو تم نے اس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھا، وہ میں ہی تھی۔"

میں نے اور بھی متحیر ہو کر کہا۔ "تو کیا تم اسے......"

لوئسا نے بات کاٹ کر کہا۔ "چپ، وہ میرا بھائی ہے۔ بات یہ ہے۔ میں کل رات کو ایک جگہ جا رہی تھی۔ تم سے چھپاؤں گی نہیں کرپن۔ جس کو میں دل و جان سے زیادہ چاہتی ہوں۔ اس سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ میرے انتظار میں پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا۔ اگر میں نہ جاتی تو اس کی کتنی دل شکنی ہوتی۔ میں جونہی میگزین کے پاس پہنچی۔ اس راجپوت سپاہی نے مجھے ٹوک دیا۔ وہ مجھے فوجی قاعدے کے مطابق سرجنٹ کے پاس لے جانا چاہتا تھا لیکن میرے بہت منت سماجت کرنے پر وہ میری لاج رکھنے کے لیے فوجی قانون کو توڑنے پر آمادہ ہو گیا۔ سوچو اس

نے اپنے سر کتنی ذمہ داری لی۔ میں نے اسے اپنا بھائی کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے بھی مجھے بہن کہا ہے۔ سوچو اگر تم اس کی شکایت کرو گے تو اس کی کیا حالت ہو گی۔ وہ نام نہ بتلائے گا، اس کا مجھے کامل یقین ہے۔ اگر اس کے گلے پر تلوار بھی رکھ دی جائے گی تو بھی وہ میرا نام نہ بتائے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ ایک نیک کام کرنے کا اسے یہ انعام ملے۔ تم اس کی شکایت ہرگز مت کرنا۔ تم سے التجا کرتی ہوں۔"

میں نے بے رحمانہ دریدہ دہنی سے کہا۔ "اس نے میری شکایت کر کے مجھے ذلیل کیا ہے۔ ایسا اچھا موقع پا کر میں اسے چھوڑنا نہیں چاہتا۔ جب تم کو یقین ہے کہ وہ تمہارا نام نہ بتلائے گا تو پھر اسے جہنم میں جانے دو۔"

لوئسا نے میری طرف حقارت کی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "چپ رہو کرپن۔ ایسی باتیں مجھ سے نہ کرو۔ میں اسے کبھی گوارا نہ کروں گی کہ میری عزت و حرمت کے لیے اسے ذلت اور حقارت کا نشانہ بننا پڑے۔ اگر تم میری نہ مانو گے تو میں سچ کہتی ہوں، میں خودکشی کر لوں گی۔"

اس وقت تو میں صرف انتقام کا پیاسا تھا۔ اب میرے اوپر نفس پروری کا بھوت سوار ہوا۔ میں بہت دنوں سے دل میں لوئسا کی پرستش کرتا تھا، اب اس کو راس کرنے کا مجھے موقع ملا۔ میں نے سوچا، اگر یہ اس راجپوت سپاہی کیلئے جان دینے پر تیار ہے تو یقیناً میرے اظہار خیال پر بد دماغ نہیں ہو سکتی۔ میں نے اسی بے رحمانہ خود پروری کے ساتھ کہا۔ "مجھے سخت افسوس ہے مگر اپنے شکار کو چھوڑ نہیں سکتا۔"

لوئسا نے میری طرف بے کسانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

میں نے ظالمانہ بے حیائی کے ساتھ کہا۔ "نہیں لوئسا یہ آخری فیصلہ نہیں ہے۔ تم چاہو تو اسے توڑ سکتی ہو۔ یہ بالکل تمہارے امکان میں ہے۔ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ یہ آج تک شاید تمہیں معلوم نہ ہو مگر ان تین سالوں میں تم ایک لمحہ کے لیے بھی میرے دل سے دور نہیں ہوئیں۔ اگر تم میری طرف سے اپنے دل کو نرم کر لو، میری محبت کی قدر کرو تو میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔ میں آج ایک معمولی سپاہی ہوں اور میرے منہ سے محبت کی دعوت پا کر شاید تم دل میں ہنستی ہو گی لیکن ایک دن میں بھی کپتان ہو جاؤں گا اور تب شاید ہمارے درمیان اتنی بڑی خلیج نہ رہے گی۔"

لوئسا نے رو کر کہا۔ "کرپن تم بڑے بے رحم ہو۔ میں تم کو اتنا ظالم نہ سمجھتی تھی۔ خدا نے کیوں تمہیں اتنا سنگدل بنایا؟ کیا تمہیں ایک بے کس عورت پر مطلق رحم نہیں آتا؟"

میں اس کی بیچارگی پر دل میں خوش ہو کر بولا۔ "جو خود سنگدل ہو، اسے دوسروں کی سنگدلی کی شکایت کرنے کا حق ہے؟"

لوئسا نے متین لہجہ میں کہا۔ "میں بے رحم نہیں ہوں کرپن۔ خدا کے لیے انصاف کرو۔ میرا دل دوسرے کا ہو چکا ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی اور شاید وہ بھی میرے بغیر زندہ نہ رہے۔ میں اپنی بات رکھنے کے لیے اپنے ایک محسن کی آبرو بچانے کیلئے اپنے اوپر جبر کر کے اگر تم سے شادی کر بھی لوں تو نتیجہ کیا ہو گا۔ جبر سے محبت نہیں پیدا ہوتی۔ میں کبھی تم سے محبت نہ کروں گی......"

دوستو! اپنی بے شرمی اور بے حیائی کا پردہ فاش کرتے ہوئے روحانی صدمہ ہو رہا ہے۔ مجھے اس وقت نفس نے اتنا اندھا بنا دیا تھا کہ میرے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بولا۔ "ایسا مت خیال کرو لوئسا۔ محبت اپنا اثر ضرور پیدا کرتی ہے۔ تم اس وقت مجھے نہ چاہو لیکن بہت دن نہ گزرنے پائیں گے کہ میری محبت رنگ لائے گی۔ تم مجھے

خود غرض اور کمینہ سمجھ رہی ہو گی، سمجھو۔ عشق خود غرض ہوتا ہی ہے، شاید وہ کمینہ بھی ہوتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ نفرت اور بے رخی بہت دنوں تک نہ رہے گی۔ میں اپنے جانی دشمن کو چھوڑنے کے لیے زیادہ سے زیادہ قیمت لوں گا جو مل سکے۔"

لوئسا پندرہ منٹ تک روحانی کوفت کی حالت میں کھڑی رہی۔ جب اس کی یاد آتی ہے تو جی چاہتا ہے گلے میں چھری مارلوں۔ آخر اس نے پر اشک نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "اچھی بات ہے کرپن۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو یہی سہی۔ تم جو قیمت چاہتے ہو، وہ میں دینے کا وعدہ کرتی ہوں مگر خدا کے لیے اس وقت جاؤ۔ مجھے خوب جی بھر کر رو لینے دو۔"

یہ کہتے کہتے کپتان ناکس پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں نے کہا۔ "اگر آپ کو یہ غم ناک داستان کہنے میں صدمہ ہو رہا ہے تو جانے دیجیے۔"

کپتان ناکس نے گلا صاف کر کے کہا۔ "نہیں بھئی۔ وہ قصہ تو پورا کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک میں روزانہ لوئسا کے پاس جاتا اور اس کے دل سے اپنے رقیب کے خیال کو نکالنے کی کوشش کرتا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کمرہ سے باہر نکل آتی۔ خوش ہو ہو کر باتیں کرتی۔ یہاں تک کہ میں سمجھنے لگا کہ مجھ سے ملتفت ہو گئی ہے۔ اسی اثناء میں یوروپین جنگ چھڑ گئی۔ ہم اور تم دونوں لڑائی پر چلے گئے۔ تم فرانس گئے۔ میں کمانڈنگ افسر کے ساتھ مصر گیا۔ لوئسا اپنے چچا کے ساتھ یہیں رہ گئی۔ راجرس بھی اس کے ساتھ رہ گیا۔ تین سال تک میں لام پر رہا۔ لوئسا کے پاس برابر خطوط آتے رہے۔ میں ترقی پا کر لیفٹیننٹ ہو گیا اور کمانڈنگ افسر کچھ دن اور زندہ رہتے تو ضرور کپتان ہو جاتا مگر میری بد نصیبی سے وہ ایک لڑائی میں مارے گئے۔ آپ لوگوں کو اس لڑائی کا حال معلوم ہی ہے۔ ان کے مرنے کے ایک ماہ بعد میں چھٹی لے کر پھر لوٹا۔ لوئسا اب بھی اپنے چچا کے ساتھ ہی تھی مگر افسوس! نہ وہ حسن تھا، نہ وہ زندہ دلی۔ گھل کر کانٹا ہو گئی تھی۔ اس وقت مجھے اس کی حالت دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ مجھے اب معلوم ہو گیا کہ اس کی محبت کتنی صادق اور کتنی جانکاہ تھی۔ مجھ سے شادی کا وعدہ کر کے بھی وہ اپنے جذبات پر فتح نہ پا سکی تھی۔ شاید اسی غم میں کڑھ کڑھ کر اس کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ ایک دن میں نے اس سے کہا۔ "لوئسا، مجھے ایسا خیال ہوتا ہے کہ شاید تم اپنے پرانے محبوب کو بھول نہیں سکیں۔ اگر میرا یہ خیال صحیح ہو تو میں اس وعدہ سے تمہیں سبکدوش کرتا ہوں۔ تم شوق سے اس کے ساتھ شادی کر لو۔ میرے لیے یہی اطمینان کافی ہو گا کہ میں دن رہتے گھر آ گیا۔ میری طرف سے اگر کوئی ملال ہو تو اسے نکال ڈالو۔"

لوئسا کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو کے قطرے ٹپکنے لگے، بولی۔ "وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے کرپن، آج چھ مہینہ ہوئے وہ فرانس میں مارے گئے۔ میں ہی ان کی موت کا باعث ہوئی۔ یہی غم ہے۔ فوج سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر وہ میری جانب سے مایوس نہ ہو جاتے تو کبھی فوج میں نہ بھرتی ہوتے۔ مرنے ہی کے لیے وہ فوج میں گئے مگر تم اب آ گئے۔ میں بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔ اب مجھ میں تمہاری بیوی بننے کی قابلیت زیادہ ہو گی۔ تمہاری پہلو میں اب کوئی کانٹا نہیں رہا اور نہ میرے دل میں کوئی غم۔"

ان الفاظ میں طنز بھرا ہوا تھا جس کے معنی یہ تھے کہ میں نے لوئسا کے محبوب کی جان لی۔ اس کی صداقت سے کون انکار کر سکتا تھا۔ اس کی تلافی کی اگر کوئی صورت تھی تو یہی کہ لوئسا کی اتنی خاطر داری، اتنی دلجوئی کروں، اس پر اس طرح نثار ہو جاؤں کہ اس کے دل سے یہ ملال نکل جائے۔

اس کے ایک ماہ بعد شادی کا دن مقرر ہو گیا۔ ہماری شادی بھی ہو گئی۔ ہم دونوں گھر آئے۔ احباب کی دعوت ہوئی۔ شراب کے دور چلے۔ میں اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا اور میں ہی کیوں میرے عزیز احباب سب میری خوش قسمتی پر مجھے مبارکباد دے رہے تھے۔

مگر کیا معلوم تھا تقدیر مجھے یوں سبز باغ دکھا رہی ہے۔ کیا معلوم تھا کہ یہ وہ راستہ ہے جس کے پیچھے ظالم شکاری کا جال بچھا ہوا ہے۔ میں تو اور دوستوں کی خاطر تواضع میں مصروف تھا۔ ادھر لوئسا اندر کمرہ میں لیٹی ہوئی اس دنیا سے رخصت ہونے کا سامان کر رہی تھی۔ میں ایک دوست کی مبارکباد کا شکریہ ادا کر رہا تھا کہ راجرس نے آکر کہا۔ ”کرپن چلو، لوئسا تمہیں بلا رہی ہے، جلد۔ اس کی نہ جانے کیا حالت ہو رہی ہے۔“ میرے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ دوڑا ہوا لوئسا کے کمرہ میں آیا۔

کپتان ناکس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ آواز پھر بھاری ہو گئی۔ ذرا دم لے کر انہوں نے کہا۔

”اندر جا کر دیکھا تو لوئسا کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے اعضاء میں تشنج ہو رہا تھا۔ چہرہ سے کرب کی علامت نمودار تھی۔ مجھے دیکھ کر بولی۔ ”کرپن میرے قریب آجاؤ۔ میں نے شادی کر کے اپنا قول پورا کر دیا۔ اس سے زیادہ میں تمہیں کچھ اور نہ دے سکتی تھی کیونکہ میں اپنی محبت پہلے ہی دوسرے کی نذر کر چکی ہوں۔ مجھے معاف کرنا۔ میں نے زہر کھا لیا ہے اور چند لمحوں کی مہمان ہوں۔“

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دل پر ایک نشتر سا لگا۔ گھٹنے ٹیک کر اس کے پاس بیٹھ گیا۔ روتا ہوا بولا۔ ”لوئسا یہ تم نے کیا کیا۔ ہائے! کیا تم مجھے داغ دے کر اتنی جلدی چلی جاؤ گی۔ کیا اب کوئی تدبیر نہیں ہے؟“

فوراً دوڑ کر ایک ڈاکٹر کے مکان پر گیا مگر آہ! جب تک اسے ساتھ لے کر آؤں میری وفا شعار، سچی لوئسا ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گئی تھی۔ صرف اس کے سرہانے ایک چھوٹا سا پرزہ پڑا ہوا تھا جس پر اس نے لکھا تھا۔

”اگر تمہیں میرا بھائی سری ناتھ نظر آئے تو اس سے کہہ دینا لوئسا مرتے وقت بھی اس کا احسان نہیں بھولی۔“

یہ کہہ کر ناکس نے اپنے واسکٹ کے جیب سے ایک مخملی ڈبیا نکالی اور اس میں سے کاغذ کا ایک پرزہ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”چوہدری! یہی میری اس عارضی خوش نصیبی کی یادگار ہے جسے آج تک میں نے جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔ آج تم سے تعارف ہو گیا۔ میں نے سمجھا تھا اور احباب کی طرح تم بھی لڑائی میں ختم ہو گئے ہو گے مگر شکر ہے کہ تم جیتے جاگتے موجود ہو۔ یہ امانت تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ اب تمہارے جی میں آئے تو مجھے گولی مار دو کیونکہ اس بہشتی وجود کا قاتل میں ہوں۔“

یہ کہتے کہتے کپتان ناکس پھیل کر کرسی پر لیٹ گئے۔ ہم دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے مگر جلد ہی ہمیں اپنے وقتی فرض کی یاد آگئی۔ ناکس کو تشفی دینے کے لیے میں کرسی سے اٹھ کر اس کے پاس گیا مگر اس کا ہاتھ پکڑتے ہی میرے جسم میں رعشہ سا آگیا۔ ہاتھ ٹھنڈا تھا۔ ایسا ٹھنڈا جیسا دم آخری ہوتا ہے۔ میں نے گھبرا کر ان کے چہرہ کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر چندر کو پکارا۔ ڈاکٹر صاحب نے آکر فوراً ان کی چھاتی پر ہاتھ رکھا اور غمناک لہجہ میں بولے۔ ”دل کی حرکت بند ہو گئی۔“

اسی وقت بجلی کڑ کڑا اٹھی۔ کڑ! کڑ! کڑ!

بُہنی

(1)

اس دن جب میرے مکان کے سامنے سڑک کے دوسری طرف ایک پانوں کی دکان کھلی تو میں باغ باغ ہو اٹھا۔ ادھر ایک فرلانگ تک پان کی کوئی دکان نہ تھی اور مجھے سڑک کے موڑ تک کئی چکر کرنے پڑتے تھے۔ کبھی وہاں کئی کئی منٹ تک دکان کے سامنے کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ چوراہہ ہے، گاہکوں کا ہر دم ہجوم رہتا ہے۔ یہ انتظار کی زحمت بہت ناگوار گزرتی ہے۔ پان کی لت مجھے کب پڑی اور کیسے پڑی، یہ تو اب یاد نہیں آتا لیکن اگر کوئی بنابنا کر گلوریاں دیتا جاوے تو شاید میں کبھی انکار نہ کروں۔ آمدنی کا بڑا حصہ نہیں تو چھوٹا حصہ ضرور پانوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ کئی بار ارادہ کیا کہ ایک پاندان خرید لوں لیکن پاندان خریدنا کوئی خالہ جی کا گھر تو نہیں ہے اور پھر میرے لیے تو ہاتھی خریدنے سے کسی طرح کم نہیں اور بالفرض جان پر کھیل کر ایک بار خرید بھی لوں تو پاندان کوئی پری کی تھیلی تو نہیں کہ ادھر خواہش ہوئی اور گلوریاں نکل پڑیں۔ بازار سے پان لانا، دن میں پانچ بار پھیرنا، پانی سے تر کرنا' سڑے ہوئے ٹکڑوں کو تراش کر الگ کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ میں نے تو بڑے گھروں کی عورتوں کو ہمیشہ پاندان کی دیکھ بھال اور انصرام و اہتمام ہی میں مصروف پایا ہے۔ اتنا دردِ سر اٹھانے کی صلاحیت ہوتی تو آج میں بھی آدمی ہوتا اور اگر کسی طرح یہ مشکل بھی حل ہو جائے تو چھالیا کون کاٹے؟ یہاں تو سروتے کی صورت دیکھتے ہی لرزہ آتا ہے۔ جب کبھی ضرورت ناگہانی لاحق ہوئی ہے تو سِل بٹے پر توڑ لیا کرتا ہوں لیکن سروتے سے کام لوں یہ غیر ممکن ہے۔ مجھے تو کسی کو چھالیہ کاٹتے دیکھ کر اتنی ہی حیرت ہوتی ہے جتنی کسی کو تلوار کی دھار پر ناچتے دیکھ کر اور بالفرض محال یہ عقدہ بھی حل ہو جائے تو آخری منزل کون فتح کرے۔ کتھے اور چونے کا ہم وزن کرنا کیا کوئی آسان کام ہے۔ کم سے کم مجھے تو اس کا سلیقہ نہیں۔ جب اس معاملہ میں وہ لوگ روز غلطیاں کرتے ہیں جو اس فن میں مشاق اور ماہر ہیں تو بھلا میں کس شمار و قطار میں ہوں۔ تمولی نے اگر چونا زیادہ کر دیا تو کتھا اور لے لیا۔ اس پر اسے ایک ڈانٹ بھی بتائی۔ آنسو پنچھ گئے۔ مصیبت کا سامنا تو اس وقت ہوتا ہے جب کسی دوست کے گھر جائے۔ پان اندر سے آیا تو بجز اس کے کہ جان کر مکھی نگلیں، عمداً زہر کا گھونٹ حلق کے نیچے اتاریں' اور چارہ ہی کیا ہے۔ شکایت نہیں کر سکتے تہذیب مانع ہوتی ہے۔ کبھی کبھی پان منہ میں ڈالتے ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر کوئی چنگاری پڑ گئی۔ حلق سے سینہ تک کسی نے پارہ گرم دیا مگر گھٹ کر رہ جانا پڑتا ہے۔ اس حد تک اندازہ میں غلطی ہو جائے یہ تو قرین قیاس نہیں۔ میں لاکھ اناڑی ہوں لیکن کبھی اس کثرت سے چونا نہیں ڈالتا۔ ہاں دو چار چھالے پڑ جاتے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں یہی اندرونِ خانہ کے قہر کا اظہار ہے۔ آخر وہ آپ کی زیادتیوں اور بے عنوانیوں کا پروٹسٹ کیونکر کریں۔ مقاطعۂ خاموشی سے آپ راضی نہیں ہوتے اور اسلحہ ان کے ہاتھ میں ہے نہیں۔ کمان ابرو اور نیزۂ مژگاں اور تفنگ تبسم اس وقت قطعاً اثر نہیں کرتے جب آپ آنکھیں لال کیے آستینیں سمیٹے اس لیے آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ ناشتہ اَور پہلے کیوں نہیں تیار ہوا۔ سالن میں نمک اور پان میں چونا زیادہ کر دینے کے سوا انتقام کا ان کے ہاتھ میں اور کیا ذریعہ رہ جاتا ہے۔

خیر' تین چار دن کے بعد ایک دن میں صبح کے وقت تمبولن کی دکان پر گیا تو اس نے میری فرمائش کی

تعمیل میں زیادہ مستعدی نہ ظاہر کی۔ ایک منٹ تک تو پان پھیرتی رہی۔ پھر اندر چلی گئی اور کوئی مسالہ لیے ہوئے نکلی۔ میں دل میں خوش ہوا کہ آج بڑے اہتمام سے گلوریاں بنارہی ہے مگر اب بھی وہ سڑک کی طرف منتظر نگاہوں سے تاک رہی تھی۔ گویا دکان کے سامنے کوئی گاہک ہی نہیں اور گاہک بھی کیسا؟ جو اس کا ہمسایہ ہے اور دن میں بیسیوں ہی بار آتا ہے۔ تب تو میں نے ذرا جھنجھلا کر کہا۔ "میں کتنی دیر سے کھڑا ہوں، کچھ اس کی بھی خبر ہے؟"

تمبولن نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ "ہاں بابو جی آپ کو دیر تو بہت ہوئی لیکن ایک منٹ اور ٹھہر جائیے، برا نہ مانئے گا بابو جی۔ آپ کے ہاتھ کی بہنی اچھی نہیں ہے۔ کل آپ کی بہنی ہوئی تھی، دن بھر میں کل چھ آنہ کی بکری ہوئی۔ پرسوں بھی آپ ہی کی بہنی تھی۔ آٹھ آنے کے پیسے دکان میں آئے۔ اس کے پہلے دو دن پنڈت جی کی بہنی ہوئی تھی۔ دوپہر تک ڈھائی روپے آگئے تھے۔ کبھی کسی کا ہاتھ نہیں اچھا ہوتا بابو جی۔"

مجھے گولی سی لگی۔ مجھے اپنی خوش نصیبی کا دعویٰ نہیں ہے۔ مجھ سے بدنصیب دنیا میں کم ہوں گے۔ اس اقلیم کا اگر میں بادشاہ نہیں تو کوئی اعلیٰ منصبدار ضرور ہوں لیکن یہ میں کبھی گوارا نہیں کر سکتا کہ نحوست کا داغ برداشت کرلوں۔ کوئی مجھ سے بہنی نہ کرائے۔ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھنا شگون سمجھیں یہ تو طوقِ لعنت ہے۔

میں نے پان تو لے لیا لیکن دل میں پکا عہد کر لیا کہ اس نحوست کے داغ کو مٹا کر ہی چھوڑوں گا۔ ابھی اپنے کمرہ میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے ایک دوست آگئے۔ بازار سبزی ترکاری لینے جارہے تھے۔ میں نے ان سے اپنی تمبولن کی خوب تعریف کی۔ وہ حضرت ذرا حسن پرست تھے اور ظریف بھی۔ میری طرف شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر بولے۔ "اس وقت تو بھئی میرے پاس پیسے نہیں ہیں اور نہ ابھی پانوں ہی کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔ "پیسے مجھ سے لے لو۔"

"ہاں یہ منظور ہے مگر کبھی تقاضا مت کرنا۔"

"یہ تو ٹیڑھی کھیر ہے۔"

"تو کیا مفت میں کسی کے منظور نظر بنا چاہتے ہو؟"

مجبور ہو کر ان حضرت کو ایک ڈھولی پان کے دام دیئے۔ اسی طرح جو مجھ سے ملنے آیا، اس سے میں نے اپنی تمبولن کا بکھان کیا۔ احباب نے میری خوب ہنسی اڑائی۔ مجھ پر خوب پھبتیاں کسیں۔ مجھے چھپے رستم! بھگت جی اور جانے کیا کیا لقب عطا ہوئے لیکن میں نے ساری آفتیں ہنس کر ٹالیں۔ یہ داغ مٹانے کی مجھے دھن سوار ہو گئی تھی۔

دوسرے دن جب میں تمبولن کی دکان پر گیا تو اس نے فوراً پان بنائے اور مجھے دیتی ہوئی بولی۔ "بابو جی کل تو آپ کی بہنی بہت اچھی ہوئی۔ کوئی ساڑھے تین روپے آئے۔ اب روز بہنی کرادیا کرو۔"

(2)

تین چار دن متواتر میں نے دوستوں سے سفارشیں کیں۔ تمبولن کا قصیدہ پڑھا اور اپنی گرہ سے پیسے خرچ کر کے سرخروئی حاصل کی لیکن اتنے ہی دنوں میں میرے خزانہ میں قابلِ محسوس کمی واقع ہو گئی۔ یہ سوانگ اب زیادہ مدت تک نہ چل سکتا تھا۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ کچھ دنوں اس کی دکان سے پان لینا چھوڑ دوں۔ جب میری بہنی ہی نہ ہو گی تو مجھے اس کی بکری کی کیا فکر ہو گی۔ دوسرے دن ہاتھ منہ دھو کر میں نے ایک الائچی کھالی اور اپنے کام

میں مصروف ہو گیا لیکن آدھ گھنٹہ مشکل سے گزرا ہو گا کہ کسی کی آہٹ ملی۔ آنکھ اوپر اٹھاتا ہوں تو تمبولن گلوریاں لیے سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نہایت شاق گزرا لیکن اتنی بے مروتی بھی تو نہ ہو سکتی تھی کہ دھتکار دوں۔ بولا "تم نے ناحق تکلیف کی۔ میں تو آ ہی رہا تھا۔"

تمبولن نے میرے ہاتھ میں گلوریاں رکھ کر کہا۔ "آپ کو دیر ہوئی تو میں نے کہا۔ میں ہی چل کر بہنی کر آؤں۔ دکان پر گاہک کھڑے ہیں مگر کسی کی بہنی نہیں کی۔"

کیا کرتا۔ گلوریاں کھائیں اور بہنی کرائی۔ جس فکر سے نجات چاہتا تھا، وہ پیرِ تسمہ پا کی طرح گردن پر چمٹی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا تھا، میرے احباب دو چار دن تک اس کے ہاں پان کھائیں گے تو آپ ہی اس سے مانوس ہو جائیں گے اور میری سفارش کی ضرورت نہ رہے گی مگر تمبولن شاید پانوں کے ساتھ اپنے حسن کا بھی کچھ مول کرتی تھی۔ اس لیے ایک بار جو اس کی دکان پر گیا، دوبارہ نہ گیا۔ دو ایک رنگین مزاج نوجوان ابھی تک آتے تھے مگر وہ لوگ ایک ہی ہنسی میں پان اور دیدارِ حسن دونوں کا لطف اٹھا کر چلتے بنے تھے۔ آج مجھے اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے پھر پورے ڈیڑھ روپے خرچ کرنے پڑے۔ بدھیا بیٹھ گئی۔

دوسرے دن میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا مگر جب تمبولن نے نیچے چیخنا چلانا اور کھٹکھٹانا شروع کیا تو مجبوراً دروازہ کھولنا پڑا۔ آنکھیں ملتا ہوا نیچے گیا جس سے معلوم ہو کہ آج نیند آ گئی تھی۔ پھر بہنی کرانی پڑی اور پھر وہی بلا سر پر سوار ہوئی۔ شام تک دو روپے کا صفایا ہو گیا۔ آخر اس بلائے عظیم سے نجات پانے کی یہی ایک تدبیر رہ گئی کہ وہ گھر چھوڑ دوں۔

(3)

میں نے وہاں سے دو میل پر ایک غیر معروف محلّہ میں ایک مکان ٹھیک کیا اور راتوں رات اسباب اٹھوا کر وہاں جا پہنچا۔ وہ گھر چھوڑ کر میں جتنا خوش ہوا شاید قیدی جیل خانہ سے نکل کر بھی اتنا خوش نہ ہوتا ہو گا۔ رات کو خوب گہری نیند سویا۔ سویرا ہوا تو مجھے اس طائر کی آزادی کا احساس ہو رہا تھا جس کے پر کھل گئے ہوں۔ بہ اطمینان سگریٹ پیا، منہ ہاتھ دھویا۔ پھر اپنا سامان قرینہ سے رکھنے لگا۔ کھانے کے لیے کسی ہوٹل کی بھی فکر تھی مگر اس بلا دہمت وشکن پر فتح پا کر مجھے جو مسرت ہو رہی تھی، اس کے مقابلہ میں ان فکروں کا کوئی شمار نہ تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر نیچے اترا۔ آج کی ہوا میں بھی آزادی کا نشہ تھا۔ ہر ایک چیز مسکراتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ خوش خوش ایک دکان پر جا کر پان کھائے اور زینہ پر چڑھ ہی رہا تھا کہ دیکھا، وہ تمبولن چپکی چلی آ رہی ہے۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت دل پر کیا گزری۔ بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنا اور اس کا دونوں کا سر پھوڑ لوں۔ مجھے دیکھ کر وہ ایسی خوش ہوئی جیسے کوئی دھوبی اپنا کھویا گدھا پا گیا ہو اور میری سراسیمگی کا اندازہ بس اسی گدھے کی دماغی حالت سے کر لو۔ اس نے دور ہی سے کہا۔ "واہ بابو جی واہ! آپ ایسا بھاگے کہ کہیں کو پتہ بھی نہ لگا۔ اسی محلے میں ایک سے ایک اچھے گھر خالی ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کو اس گھر میں تکلیف تھی۔ نہیں تو میرے پچھواڑے ہی ایک بڑے آرام کا مکان تھا۔ میں آپ کو یہاں نہ رہنے دوں گی۔ جس طرح ہو سکے گا۔ آپ کو اٹھا لے جاؤں گی۔ آپ اس گھر کا کیا کرایہ دیتے ہیں؟"

میں نے رونی صورت بنا کر کہا۔ "دس روپے۔"

میں نے سوچا تھا کہ کرایہ اتنا کم بتاؤں جس میں یہ دلیل اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس گھر کا کرایہ بیس روپے ہے۔ دس روپے میں تو شاید مرنے کو بھی جگہ نہ ملے گی مگر تمبولن پر اس چکمہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔ "اس ذرا سے گھر کے دس روپے! آپ آٹھ ہی دیجئے گا اور گھر اس سے اچھا نہ ہو تو جب جی چاہے چھوڑ دیجئے گا۔ چلئے میں اس گھر کی کنجی لیتی آئی ہوں۔ اسی وقت آپ کو دکھادوں۔"

میں نے چیں بجبیں ہو کر کہا۔ "آج ہی تو اس گھر میں آیا ہوں۔ آج ہی چھوڑ کیسے سکتا ہوں۔ پیشگی کرایہ دے چکا ہوں۔"

تمبولن نے دلربایانہ تبسم کے ساتھ کہا۔ "دس ہی روپے تو دیئے ہیں۔ آپ کے لیے دس روپے کون سی بڑی بات ہے۔ یہی سمجھ لیجئے کہ آپ نہ چلے تو میں اجڑ جاؤں گی۔ ایسی اچھی بِہنی وہاں اور کسی کی نہیں ہے۔ آپ نہ چلیں گے تو میں ہی اپنی دکان یہاں اٹھالاؤں گی۔"

میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ اچھی مصیبت گلے پڑی۔ کہیں سچ مچ یہ چڑیل اپنی دکان نہ اٹھالائے۔ میرے جی میں تو آیا کہ ایک پھٹکار بتاؤں۔ پر زبان اتنی بے مروت نہ ہو سکی۔ بولا۔ "میرا کچھ ٹھیک نہیں، کب تک رہوں۔ کب تک نہ رہوں۔ آج ہی تبادلہ ہو جائے گا تو بھاگنا پڑے گا۔ تم نہ ادھر کی رہو، نہ ادھر کی۔" اس نے حسرتناک لہجہ میں کہا۔ "آپ چلے جائیں گے تو میں بھی چلی جاؤں گی۔ ابھی آج تو آپ جاتے نہیں۔"

"میرا کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"تو میں روز یہاں آکر بِہنی کرالیا کروں گی۔"

"اتنی دور روز آؤ گی؟"

"ہاں چلی آؤں گی۔ دو میل تو نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھ کی بِہنی تو ہو جائے گی۔ یہ لیجئے گلوریاں لائی ہوں، بِہنی تو کرادیجئے۔"

میں نے گلوریاں لیں، پیسے دیئے اور ایک نیم غشی کی حالت میں اوپر چارپائی پر لیٹ گیا۔ اب میری عقل کچھ کام نہیں کرتی کہ اس مصیبت سے کیونکر گلوخلاصی ہو۔ تب سے اسی فکر میں پڑا ہوا ہوں۔ کوئی مفر نظر نہیں آتی۔ سرخرو بھی رہنا چاہتا ہوں۔ بے مروتی بھی نہیں کرنی چاہتا اور اس مصیبت سے نجات بھی پانا چاہتا ہوں۔ اگر کوئی صاحب میری قابلِ رحم حالت پر مجھے کوئی ایسی تدبیر بتلادیں تو زندگی بھر ان کا ممنون رہوں گا۔

داروغہ کی سرگزشت

(1)

کل شام کو ایک ضرورت سے تانگے پر بیٹھا ہوا چوک جا رہا تھا کہ راستے میں ایک اور حضرت تانگے پر آبیٹھے۔ تانگے والا انہیں بٹھانا تو نہ چاہتا تھا، پر انکار بھی نہ کر سکتا تھا۔ پولیس کے آدمی سے جھگڑا کون مول لے۔ یہ

صاحب کسی تھانہ کے داروغہ تھے۔ ایک چالانی مقدمہ کی پیروی کرنے صدر آئے ہوئے تھے۔ میری عادت ہے کہ پولیس والوں سے بہت کم بولتا ہوں۔ سچ پوچھئے تو مجھے ان کی صورت سے نفرت ہے۔ ان کے ہاتھوں ہمہ شما کو کیسی کیسی ذلتیں اور پریشانیاں اٹھانی پڑتی ہیں، اس کا مجھے کئی بار تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ میں ذرا سا کھسک گیا اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ یکایک داروغہ جی نے گل فشانی کی۔ ''جناب یہ عام شکایت ہے کہ پولیس والے بہت رشوت لیتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ پولیس والوں کو رشوت لینے کے لیے کتنا مجبور کیا جاتا ہے۔ اگر پولیس والے رشوت لینا بند کر دیں تو میں حلفاً کہتا ہوں کہ یہ جو بڑی بڑی پگڑیوں والے موٹے رئیس نظر آتے ہیں، سب کے سب جیل خانے کے اندر بیٹھے دکھائی دیں۔ آپ کو یقین نہ آئے گا جناب۔ تھیلیاں گلے لگائی جاتی ہیں، حلفاً کہتا ہوں۔ اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں۔ ہم ہزار انکار کریں پر چاروں طرف سے ایسے دباؤ پڑتے ہیں کہ مجبور ہو کر لینا ہی پڑتی ہے۔''

میں نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ ''جو کام روپے لے کر کیا جاتا، وہی کام بغیر روپے لیے بھی تو کیا جا سکتا ہے۔''

داروغہ جی نے ہنس کر فرمایا۔ ''یہ تو گناہ بے لذت ہو گا۔ بندہ پرور حلفاً کہتا ہوں۔ پولیس کا آدمی فرشتہ نہیں ہوتا اور میرا خیال ہے کہ کوئی انسان بھی اتنا بے لوث نہیں ہو سکتا۔''

میں ابھی کچھ جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ ایک میاں صاحب لمبی اچکن پہنے ترکی ٹوپی سر پر رکھے تانگے کے سامنے سے نکلے۔ داروغہ جی نے انہیں دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا اور شاید مزاج پرسی کرنی چاہتے تھے کہ اس بھلے آدمی نے سلام کا جواب گالیوں سے دینا شروع کیا۔ جب تانگا کئی قدم آگے نکل گیا تو وہ ایک پتھر لے کر ہمارے پیچھے دوڑا۔ تانگے والے نے گھوڑے کو تیز کیا۔ ان میاں صاحب نے بھی قدم تیز کیے اور پتھر پھینک ہی دیا۔ میرا سر بال بال بچا۔ اس نے دوسرا پتھر اٹھایا مگر خیریت ہوئی۔ وہ ہمارے سامنے آگرا۔ تیسرا پتھر اتنے زور سے آیا کہ داروغہ جی کے گھٹنے میں بڑی چوٹ آئی۔ پر اتنی دیر میں تانگا اتنی دور نکل آیا تھا کہ ہم پتھروں کی زد سے باہر ہو گئے تھے۔ شاید میاں صاحب بھی تھک گئے ہوں، ان کے ہاتھ میں اب بھی پتھر اور زبان پر گالیاں تھیں۔ جب تک وہ آدمی نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا، ہم اسے پتھر اٹھائے دیکھتے رہے۔

جب خطرہ کا اندیشہ نہ رہا تو میں نے داروغہ جی سے پوچھا ''یہ کون آدمی ہے صاحب؟ کوئی پاگل تو نہیں ہے؟''

داروغہ جی نے گھٹنے کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ''پاگل نہیں ہے صاحب۔ حلفاً کہتا ہوں، میرا پرانا دشمن ہے۔ میں نے سمجھا تھا ظالم پرانا قصہ بھول گیا ہو گا ورنہ مجھے کیا پڑی تھی کہ سلام کرنے جاتا!''

میں نے کہا۔ ''آپ نے اسے کسی مقدمہ میں سزا دلوائی ہو گی!''

''بڑی لمبی داستان ہے جناب، بس اتنا ہی سمجھ لیجئے کہ اس کا بس چلے تو مجھے سموچا ہی نگل جائے، حلف سے کہتا ہوں۔''

''آپ تو آتش شوق کو اور بھی تیز کر رہے ہیں۔ اب تو وہ داستان سنے بغیر تسکین نہیں ہوتی۔''

داروغہ جی نے پہلو بدل کر کہا۔ ''اچھی بات سنئے۔ کئی سال گزرے میں صدر ہی میں تعینات تھا۔ بے فکری کے دن تھے۔ تازہ خون، ایک معشوق سے آنکھ لڑ گئی۔ آمد و رفت شروع ہوئی۔ اب بھی جب اس حسینہ کی یاد آتی ہے تو آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں۔ بازاری حسینوں میں اتنی حیا، اتنی وفا، اتنی مروت میں نے آج تک نہیں

دیکھی۔ دو سال اس کے ساتھ اتنے لطف سے گزرے کہ آج بھی ان دنوں کو یاد کر کے روتا ہوں مگر قصہ کو بڑھاؤں کیوں ورنہ ختم نہ ہو گا۔ مختصر یہ کہ دو سال کے بعد میرے تبادلہ کا حکم ہو گیا۔ اس وقت دل کو جتنا صدمہ ہوا، عرض نہیں کر سکتا۔ حلفاً کہتا ہوں یہی جی چاہتا تھا کہ خودکشی کر لوں یا نوکری سے مستعفی ہو جاؤں۔ اس حسینہ نے یہ خبر سنی تو اس کی جان سی نکل گئی۔ سفر کی تیاریوں کے لیے مجھے تین دن ملے تھے۔ یہ تین دن میں نے منصوبے باندھنے میں کاٹے۔ اس وقت مجھے تجربہ ہوا کہ عورتوں کو عقل سے خالی سمجھنے میں ہم نے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ میرے منصوبے شیخ چلی کے سے تھے۔ کلکتہ بھاگ چلیں، وہاں کوئی دکان کر لیں یا کسی دیہات میں کھیتی باڑی کر کے زندگی بسر کریں لیکن وہ یہی جواب دیتی کہ ابھی وہاں جا کر اپنا کام کرو، جب مکان کا بندوبست ہو جائے تو مجھے بلا لینا، دوڑی چلی آؤں گی۔

آخر جدائی کی منحوس گھڑی آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اب جان نہ بچے گی۔ کوئی پہلو سے دل کو نکالے لیتا تھا۔ گاڑی کا وقت نکلا جاتا تھا اور میں اس کے پاس سے اٹھنے کا نام نہ لیتا تھا مگر میں پھر قصے کو طول دینے لگا۔ مختصر یہ کہ میں اسے دو تین دن میں بلانے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ پر افسوس! وہ دو تین دن کبھی ختم نہ ہوئے۔ پہلے دس پانچ روز تو افسروں سے ملنے اور علاقہ کی دیکھ بھال میں گزرے۔ اسی اثناء میں گھر سے خط آ گیا کہ تمہاری شادی طے ہو گئی ہے۔ رخصت لے کر چلے آؤ۔ شادی کی خوشی میں اس وفا کی دیوی کی مجھے یاد بھی نہ رہی۔ شادی کر کے مہینہ بھر بعد لوٹا تو اہلیہ ساتھ تھی۔ رہی سہی یاد بھی جاتی رہی۔ ایک مہینہ بعد اس حسینہ نے ایک خط بھیجا۔ پر میں نے اس کا جواب نہ دیا۔ ڈر تا رہتا تھا کہ کہیں ایک دن وہ لدی پھندی آ کر سر پر سوار نہ ہو جائے۔ پھر تو بیوی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا۔

سال بھر کے بعد مجھے ایک ضرورت سے صدر آنا پڑا۔ اس وقت مجھے اس حسینہ کی یاد آئی۔ سوچا ذرا چل کر دیکھنا چاہیے کس حالت میں ہے۔ فوراً اپنی خاموشی اور اتنے دنوں تک نہ آنے کا جواب سوچا اور اس کے دروازہ پر جا پہنچا۔ دروازہ صاف ستھرا، مکان کی حالت بھی پہلے سے اچھی تھی۔ دل میں خوش ہوا کہ اس کی حالت اتنی خراب نہیں ہے جتنی میں نے سمجھی تھی اور خراب کیوں ہونے لگی۔ مجھ جیسے آدمی کیا دنیا میں اور نہیں ہیں؟ میں نے دروازہ پر آواز دی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بھیتر سے آواز آئی، کون ہے؟

کوئی جواب نہ ملا۔ آواز اسی حسینہ کی تھی۔ اس میں شک نہ تھا۔ پھر دروازہ کیوں نہیں کھولتی؟ شاید ابھی اس کی خفگی دور نہیں ہوئی۔ پھر کواڑ کھٹکھٹائے اور باہر ہی کھڑے کھڑے اپنی مصیبتوں کی داستان سنانے لگا۔ سخت بیمار تھا۔ جینے کی امید نہ تھی۔ دوسری زندگی پائی وغیرہ۔ بارے کوئی پندرہ منٹ میں دروازہ کھلا۔ حسینہ نے مجھے اشارے سے اندر بلایا اور چٹ کواڑ بند کر لیے۔

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ یہاں سے جا کر میں بڑی مصیبت میں گرفتار ہو گیا۔ بس یہی سمجھ لو کہ مر کر اٹھا ہوں۔“

حسینہ بے اعتباری کے انداز سے کہا۔ ”معافی کس بات کی؟ تم سے میرا نکاح تو ہوا نہ تھا۔ دل کہیں اور لگ گیا تو میری یاد کیوں آتی۔ مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ جیسا اور لوگ کرتے ہیں، ویسا تم نے بھی کیا۔ یہاں سب لوگ تفریح کے لیے آتے ہیں۔ شرطِ وفا نبھانے کوئی نہیں آتا۔ تمہارے لیے یہی کیا کم ہے کہ اتنے دنوں......“

”کچھ نہ پوچھو۔ ایک مرض ہو تو بتاؤں۔ کسی طرح زندہ ہو گیا۔“

حسینہ نے مسکرا کر کہا۔ ”دنیا میں کوئی ایسی بیماری بھی ہے جس میں آدمی موٹا تازہ ہو جاتا ہے۔ شاید گھلتے گھلتے یہ توند نکل آئی ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلائے پہلے سے دوگنے ہو گئے ہو۔“

میں نے نادم ہو کر کہا۔ ”یہ سب بلغم کا فساد ہے۔ بھلا موٹا کیا ہوتا۔ ادھر کا پانی نہایت بلغمی ہے۔ تم نے تو میری یاد بھلا ہی دی۔“

حسینہ نے اب کی میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ ”خط کا جواب تک نہ دیا۔ الٹے مجھی کو الزام دیتے ہو۔ کتنے ہی آدمیوں سے مجھے سابقہ پڑا لیکن مجھے چرکا دیا تو تم نے، تم سب سے بڑے مکار، حیلہ ساز نکلے۔ بیوی لائے، شادی رچائی اور مجھے خبر تک نہ دی۔ تمہاری تو صورت سے مجھے نفرت ہو گئی۔“

میں نے تعجب سے پوچھا۔ ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری شادی ہو گئی؟“

اس نے رکھائی سے کہا۔ ”یہ پوچھ کر کیا کرو گے۔ جھوٹ تو نہیں کہتی۔ بے وفا بہت دیکھے لیکن تم سب کے استاد نکلے۔ تمہاری آواز سن کر جی میں تو آیا کہ دھتکار دوں لیکن یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ اپنے دروازہ پر کسی کو کیا ذلیل کروں۔“

میں نے اپنا خاکی کوٹ اتار کر کھونٹی پر لٹکا دیا۔ جوتے اتار ڈالے اور چارپائی پر دراز ہو کر بولا۔ ”لیلیٰ، دیکھو اتنی بے رحمی سے نہ پیش آؤ۔ میں تو اپنی خطاؤں کو خود تسلیم کرتا ہوں اور اسی لیے تم سے معافی مانگنے آیا ہوں۔ ذرا اپنے نازک ہاتھوں سے ایک پان تو کھلا دو۔“

لیلیٰ پاندان کھول کر بنانے لگی کہ یکایک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔ ”یہ کون شیطان آ پہنچا؟“

لیلیٰ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔ ”یہ میرے شوہر ہیں۔ تمہاری طرف سے جب مایوس ہو گئی تو میں نے ان سے نکاح کر لیا۔“

میں نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ”تو تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہ بتا دیا۔ میں الٹے پاؤں لوٹ جاتا۔ یہ نوبت کیوں آتی۔ نہ جانے کب کی کسر نکالی۔“

لیلیٰ نے معذرت آمیز لہجہ میں کہا۔ ”میں کیا جانتی تھی کہ وہ آج اتنی جلد آ پہنچیں گے۔ روز تو پہر رات گئے آتے تھے۔ پھر تم اتنی دور سے آئے تھے، تمہاری کچھ خاطر بھی تو کرنی تھی۔“

”یہ اچھی خاطر کی۔ بتاؤ اب میں جاؤں کہاں؟“

”میری سمجھ میں خود کچھ نہیں آ رہا ہے۔“

میں نے کھڑے ہو کہا۔ ”یا اللہ کس عذاب میں جان پھنسی۔“

اتنے میں اس شیطان نے پھر کواڑ کھٹکھٹائے۔ اب معلوم ہوتا تھا کہ دروازہ توڑ ڈالے گا۔ لیلیٰ کے چہرہ پر ایک رنگ آتا تھا، ایک رنگ جاتا تھا۔ بیچاری کھڑی کانپ رہی تھی۔ بس زبان سے یہی الفاظ نکل رہے تھے۔ ”یا اللہ رحم کر۔“

باہر سے آواز آئی۔ ”ارے کیا تم سر شام ہی سے سو گئیں؟ ابھی تو سات بجے ہیں۔ کہیں سانپ تو نہیں سونگھ گیا۔ خدا جانتا ہے، اب اور دیر کی تو کواڑ توڑ ڈالوں گا۔“

میں نے گڑگڑا کر کہا۔ ”خدا کے لیے میرے چھپنے کی کوئی جگہ بتاؤ۔ پیچھے کی طرف کوئی دروازہ نہیں ہے؟“

"نہ!"

"سنڈاس تو ہو گی؟"

"سب سے پہلے وہ سنڈاس ہی میں جائیں گے۔"

"اچھا وہ سامنے کوٹھڑی کیسی ہے؟"

"ہاں ہے تو لیکن کوٹھڑی کھول کر دیکھی تو؟"

"کیا بہت ڈبل آدمی ہے؟"

"تم جیسے دو کو بغل میں دبالے۔"

"تو کھول دو کوٹھڑی۔ وہ جونہی اندر جائے گا، میں کترا کر نکل بھاگوں گا۔"

حسینہ نے کوٹھڑی کھول دی۔ میں اندر جا گھسا۔ دروازہ بند ہو گیا۔

مجھے اندر بند کر کے حسینہ نے صدر دروازہ کھولا اور بولی۔ "کیوں کواڑ توڑے ڈالتے ہو! آ تو رہی ہوں۔"

میں نے کوٹھڑی کے کواڑوں کی درز سے دیکھا۔ آدمی کیا، پورا دیو تھا۔ اندر آتے ہی بولا۔ "تم سرِ شام سے سو گئی تھیں؟"

"ہاں ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔"

"مجھے تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ تم کسی سے باتیں کر رہی ہو۔"

"وہم کی دوا تو لقمان کے پاس بھی نہیں۔"

"میں نے صاف سنا، کوئی نہ کوئی تھا ضرور۔ تم نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔"

"انہیں باتوں پر تم سے میرا جی جلتا ہے۔ سارا گھر تو پڑا ہے۔ دیکھ کیوں نہیں لیتے۔"

"دیکھوں گا تو میں ضرور ہی لیکن تم سے سیدھے سے پوچھتا ہوں بتلا دو کون تھا۔"

حسینہ نے کنجیوں کا گچھا پھینک کر کہا۔ "اگر کوئی تھا تو گھر ہی میں ہو گا۔ لو سب جگہ دیکھ آؤ۔ کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ میں نے کہیں چھپا دیا ہو۔"

وہ ملعون اس چکمے میں نہ آیا۔ شاید پہلے بھی ایسا چرکا کھا چکا تھا۔ کنجیوں کا گچھا اٹھا کر سب سے پہلے میری کوٹھڑی کے دروازہ پر آیا اور کواڑ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ پر اس گچھے میں اس قفل کی کنجی نہ تھی۔ بولا۔ "اس کوٹھڑی کی کنجی کہاں ہے؟"

حسینہ نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ارے تو کیا اس میں کوئی چھپا بیٹھا ہے۔ وہ کوٹھڑی تو لکڑیوں سے بھری ہوئی ہے۔"

"تم کنجی دے دو نا۔"

"تم بھی کبھی کبھی دیوانوں کی سی حرکتیں کرنے لگتے ہو۔ اندھیرے میں کوئی سانپ بچھو بیٹھا ہو تو۔ نا بھیا میں اس کی کنجی نہ دوں گی۔"

"بلا سے سانپ نکل آوے گا، اچھا ہی ہو، نکل آئے۔ اس بے حیا زندگی سے تو موت ہی اچھی۔"

حسینہ نے ادھر ادھر کنجی کو تلاش کر کے کہا۔ "نہ جانے اس کی کنجی کہاں رکھ دی، خیال نہیں آتا۔"

"اس کوٹھڑی میں تو میں نے اور کبھی قفل پڑا نہیں دیکھا۔"

"میں تو روز قفل ڈالتی ہو، تمہاری نگاہ نہ پڑی ہو گی۔"
"تو تم کنجی نہ دو گی؟"
"کہتی تو ہوں کہ اس وقت نہیں مل رہی ہے۔"
"کہے دیتا ہوں کچا ہی کھا جاؤں گا۔"

اب تک تو میں کسی طرح ضبط کیے کھڑا رہا۔ بار بار اپنے اوپر غصہ آرہا تھا۔ یہاں کیوں آیا۔ کہیں یہ ملعون، مردود طیش میں آکر مار ہی نہ ڈالے۔ میرے ہاتھ میں تو کوئی چھری بھی نہیں۔ یا خدا اب تو ہی مالک ہے۔ دم روکے کھڑا تھا۔ ایک پل کا بھی موقع ملے تو نو دو گیارہ ہو جاؤں مگر جب اس مردود نے کواڑوں کو دھم دھمانا شروع کیا تب تو روح ہی فنا ہو گئی۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی کہ کسی کونے میں چھپنے کی جگہ ہے یا نہیں۔ کواڑ کی درازوں سے کچھ روشنی اندر آرہی تھی۔ اوپر جو نگاہ اٹھائی تو ایک مچان سا دکھائی دیا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا۔ چاہتا تھا کہ اچک کر چڑھ جاؤں مگر غضب خدا کا! ادھر بھی ایک صاحب جلوہ افروز تھے۔ انہیں دیکھ کر اس ہیئت کذائی میں بھی میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ یہ حضرت اچکن پہنے 'گھڑی لگائے' ایک خوبصورت صافا باندھے اکڑوں بیٹھے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے لیے دروازہ کھولنے میں لیلیٰ نے اتنی دیر کیوں کی تھی۔ ابھی ان حضرت کو دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ پر موسل کی چوٹیں پڑنے لگیں۔ بوسیدہ کواڑ تو تھے ہی، اس وقت چار دھماکوں میں نیچے آرہے اور وہ شقی لالٹین لیے کمرہ میں گھسا۔ اس وقت میری کیا حالت تھی، اس کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور میری گردن پکڑ کر بولا۔ "اچھا یہاں تو ایک سانڈ گھسا بیٹھا ہے۔ جبھی کنجی گم ہو گئی تھی۔ آیئے آپ کی کچھ خاطر کروں۔ ایسے مہمان روز کہاں ملتے ہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے میرا ایک ہاتھ پکڑ کر اتنے زور سے باہر کی طرف پھینکا کہ میں آنگن میں اوندھے منہ جا گرا۔ اس شیطان کی آنکھوں سے شرارے نکل رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اس کے ہونٹ میرا خون چوسنے کے لیے پھڑک رہے ہیں۔ میں ابھی زمین سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ قصائی ایک بڑا تیز چھرا لیے میری گردن پر آپہنچا۔ مگر جناب ہوں پولیس کا آدمی، اس وقت مجھے ایک ایسی چال سوجھ گئی جس نے صاف جان بچا دی ورنہ آج آپ سے باتیں نہ کرتا ہوتا۔ میں نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "ہجور میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں تو میر صاحب کے ساتھ آیا تھا۔"

اس نے گرج کر پوچھا۔ "کون میر صاحب؟"

میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "وہی جو مچان کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں تو ہجور کا گلام ہوں، مالک کے ساتھ چلا آیا تھا۔"

"اچھا تو کوئی میر صاحب مچان کے اوپر بھی تشریف رکھتے ہیں؟" یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور کوٹھڑی میں جا کر مچان کو دیکھا۔ وہ حضرت سمٹے سمٹائے بھیگی بلی بنے بیٹھے تھے۔ چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا گویا کوئی لاش بے جان ہو۔ ان پر نظر پڑنا تھا کہ اس ظالم نے میر صاحب کا ایک ہاتھ پکڑ کر ایسا جھٹکا دیا کہ آپ دھم سے نیچے آرہے۔ ان کا ٹھاٹھ دیکھ کر اب اس امر کی تصدیق ہو گئی کہ میں ان کا خدمتگار تھا۔ میری برہنہ پائی اس وقت معجزہ کر گئی۔ میر صاحب کی صورت دیکھ کر رحم کے ساتھ ساتھ ہنسی بھی آتی تھی۔ بیچارے عطر میں بسے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی تھا۔ اس میدان کے شہسوار اور اس بحرِ ناہموار کے غواص معلوم ہوتے تھے۔ پر اس وقت ان کی وہی حالت تھی جو چوہے کی بلی کے پنجے میں ہوتی ہے۔

اس نے پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

میر صاحب نے ہچکتے ہوئے کہا۔ "جناب میں...... جی میرا مکان...... یہ آدمی جھوٹا ہے۔ یہ میرا نوکر نہیں ہے۔"

"تم اس آدمی کو جہنم میں ڈالو۔ تم یہاں کیا کرنے آئے تھے؟"

"جی۔ یہی آدمی مجھے دھوکھا دے کر یہاں لایا تھا۔"

"یہ کیوں نہیں کہتا کہ نفس کھینچ کر لایا تھا۔ دوسروں پر الزام کیوں رکھتا ہے سؤر۔ لے تو بھی کیا کہے گا کہ کس سے سابقہ پڑا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے اسی تیز چھری سے میر صاحب کی ناک کاٹ لی۔ میں موقع پا کر بے تحاشہ بھاگا لیکن ہائے! ہائے! کی آواز کئی قدم تک برابر میرے کان میں آتی رہی۔ اس کے بعد ان دونوں میں کیسی چھنی، ان کے اوپر کیا آفت آئی۔ اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں تب سے بیسیوں بار صدر آ چکا ہوں پر ادھر بھول کر بھی نہیں گیا۔ یہ پتھر پھینکنے والے حضرت وہی میر صاحب ہیں جن کی ناک کٹی تھی۔ آج نہ جانے کہاں سے نکل پڑے۔ میری شامت آئی تھی کہ انہیں سلام کر بیٹھا۔ آپ نے شاید ان کی ناک کی طرف دھیان نہیں دیا!

مجھے اب خیال آیا کہ اس آدمی کی ناک چپٹی ضرور تھی۔ داروغہ جی نے شاید سمجھا ہو کہ میں ان کی ذکاوت اور فراست کی داد دوں گا مگر جب میں نے کہا۔ "آپ نے اس غریب کو براچرکا دیا۔" تو وہ کچھ مایوس ہو کر بولے۔ "اور کرتا ہی کیا!"

"آپ دونوں مل کر کیا اس آدمی کو نہ دبا لیتے؟"

"ضرور دبا لیتے مگر چور کا دل آدھا۔ اس وقت اپنی اپنی پڑی تھی۔ مقابلہ کرنے کی کسے سوجھتی۔ کہیں اس دم چھلّے میں دھر لیا جاتا تو آبرو الگ جاتی، نوکری سے الگ ہاتھ دھوتا۔"

چوک آ گیا اور ہم دونوں اپنی اپنی راہ چل دیئے۔

استعفےٰ

(1)

دفتر کا بابو ایک بے زبان مخلوق ہے۔ مزدور کو آنکھیں دکھاؤ تو وہ تیوریاں بدل کر کھڑا ہو جائے گا۔ قلی کو ایک ڈانٹ بتاؤ تو سر سے بوجھ پھینک کر اپنی راہ لے گا۔ کسی بھکاری کو دھتکارو تو وہ تمہاری طرف پر قہر نظروں سے دیکھ کر چلا جائے گا۔ یہاں تک کہ گدھا بھی کبھی کبھی اذیت پا کر دولتیاں جھاڑنے لگتا ہے مگر بیچارے دفتر کے بابو کو آپ چاہے آنکھیں دکھائیں، ڈانٹ بتائیں، دھتکاریں یا ٹھوکر ماریں، اس کے ماتھے پر بل نہ آئے گا۔ اسے اپنے جذبات پر جو قدرت ہوتی ہے، وہ شاید کسی نفس کش سادھو میں بھی نہ ہو۔ قناعت کا پتلا، صبر کی مورت، توکل کی تصویر، اطاعت کا مجسمہ، عبودیت کا پیکر۔ غرض وہ جملہ ملکوتی صفات کا ایک متحرک تودہ ہوتا ہے مگر افسوس! خس و

خاشاک کے تودہ کے بھی نصیب ایک دن جاگتے ہیں۔ دیوالی کے دن اس پر بھی روشنی ہوتی ہے۔ برسات میں اس پر بھی ہریالی چھاتی ہے۔ قدرت کی دلچسپیوں میں اس کا بھی حصہ ہے مگر اس غریب بابو کے نصیب کبھی نہیں جاگتے۔ اس کی اندھیری تقدیر میں روشنی کا جلوہ کبھی نظر نہیں آتا۔ اس کے چہرہ زرد پر کبھی تبسم کی روشنی نہیں دکھائی دیتی۔ اس کے لیے ہمیشہ سوکھا ساون ہے۔ کبھی ہرا بھادوں نہیں۔ لالہ فتح چند ایسے ہی ایک بے زبان مخلوق تھے۔

کہتے ہیں آدمی پر اس کے نام کا بھی کچھ اثر پڑتا ہے۔ فتح چند مستثنیات میں تھے۔ انہیں شکست داس کہنا زیادہ موزوں ہوتا۔ دفتر میں شکست، زندگی میں شکست۔ دوستوں میں شکست۔ زندگی میں ان کے چاروں طرف شکستیں اور مایوسیاں تھیں۔ لڑکا ایک بھی نہیں، لڑکیاں تین۔ بھائی ایک بھی نہیں، بھاوجیں دو۔ گانٹھ میں کوڑی نہیں مگر دل میں رحم اور مروت۔ سچا دوست ایک بھی نہیں جس سے دوستی ہوئی، اس نے دغا دی۔ اس پر صحت کا نام نہیں۔ بتیس سال کی عمر میں بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ آنکھیں بے نور، ہاضمہ چوپٹ، چہرہ زرد، گال پچکے، شانے جھکے ہوئے۔ نہ دل میں ہمت، نہ جگر میں طاقت۔ نو بجے دفتر جاتے اور چھ بجے شام کو لوٹ کر گھر آتے۔ پھر گھر سے باہر نکلنے کی ہمت نہ پڑتی۔ دنیا میں کیا ہوتا ہے، اس کی انہیں مطلق خبر نہ تھی۔ ان کی دنیا، عقبیٰ لوک پرلوک جو کچھ تھا دفتر تھا، نوکری کی خیر مناتے اور زندگی کے دن پورے کرتے تھے۔ نہ مذہب سے غرض تھی نہ دین سے واسطہ۔ نہ کوئی تفریح نہ کھیل۔ تاش کھیلے ہوئے بھی شاید ایک مدت گزر گئی تھی۔

(2)

جاڑوں کے دن تھے۔ آسمان پر کچھ کچھ ابر تھا۔ فتح چند ساڑھے پانچ بجے دفتر سے لوٹے تو چراغ جل گئے تھے۔ دفتر سے آکر وہ کسی سے کچھ نہ بولتے تھے۔ چپکے سے چارپائی پر لیٹ جاتے تھے اور پندرہ بیس منٹ تک بے حس و حرکت پڑے رہتے تھے۔ تب کہیں جا کر ان کے منہ سے آواز نکلتی تھی۔ آج بھی حسب معمول وہ مراقبہ میں ڈوبے مگر ایک ہی منٹ گزرا تھا کہ باہر کسی نے آواز دی۔ چھوٹی لڑکی نے جاکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ دفتر کا چپڑاسی ہے۔ شاردا شوہر کے منہ ہاتھ دھونے کے لیے لوٹا گلاش مانجھ رہی تھی۔ بولی۔ "اس سے کہہ دے، کیا کام ہے؟ ابھی تو دفتر سے آئے ہیں، ابھی سے پھر بلاوا آگیا۔"

چپڑاسی نے کہا۔ "صاحب نے کہا، ابھی بلا لاؤ۔ کوئی بڑا جروری کام ہے۔" فتح چند کا مراقبہ ٹوٹ گیا۔ سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے۔ کون بلا رہا ہے؟"

شاردا۔ "کوئی نہیں۔ دفتر کا چپڑاسی ہے۔"

فتح چند نے سہم کر کہا۔ "دفتر کا چپڑاسی۔ کیا صاحب نے بلایا ہے؟"

شاردا۔ "ہاں، کہتا ہے صاحب بلا رہے ہیں۔ یہ کیسا صاحب ہے تمہارا کہ جب دیکھو بلایا کرتا ہے۔ صبح کے گئے گئے گھڑی مکان کو لوٹے، اس پر پھر بلاوا آگیا۔ کہہ دو نہیں آتے، اپنی نوکری ہی لے گا یا اور کچھ۔"

فتح چند نے صابرانہ لہجہ میں کہا۔ "ذرا سن لوں، کس لیے بلایا ہے۔ میں نے تو سب کام ختم کر دیا تھا۔ ابھی آتا ہوں۔"

شاردا۔ "ذرا جل پان تو کرتے جاؤ۔ چپڑاسی سے باتیں کرنے لگو گے تو تمہیں اندر آنے کی یاد بھی نہ رہے گی۔"

یہ کہہ کر وہ ایک پیالی میں تھوڑی سی دالموٹ اور سیو لائی۔ فتح چند اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ چیزیں یکھیں تو چارپائی پر بیٹھ گئے اور پیالی کی طرف حریصانہ مگر خوفزدہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''لڑکیوں کو دے دیا ہے؟''

شاردا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ''ہاں ہاں دے دیا ہے۔ تم تو کھاؤ۔''

اتنے میں چھوٹی لڑکی آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ شاردا نے اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''تُو یا آکر سر پر سوار ہو گئی۔ جا باہر کھیل۔''

فتح چند۔ ''رہنے دو۔ کیوں ڈانٹتی ہو۔ یہاں آؤ چُنی۔ یہ لو دالموٹ لے جاؤ۔'' چنی نے ماں کی طرف پرخوف نظروں سے دیکھا اور باہر بھاگ گئی۔

فتح چند نے کہا۔ ''کیوں بیچاری کو بھگا دیا۔ دو چار دانے دے دیتا تو خوش ہو جاتی۔''

شاردا۔ ''اس میں ہے ہی کتنا کہ سب کو بانٹتے پھرو گے، اسے دیتے، باقی دونوں نہ آجاتیں، کس کس کو یتے؟''

اتنے میں چپڑاسی نے پھر پکارا۔ ''بابو جی، ہمیں بڑی دیر ہو رہی ہے۔''

شاردا۔ ''کہہ کیوں نہیں دیتے، اس وقت نہ آئیں گے۔''

فتح چند۔ ''ایسا کیسے کہہ دوں بھائی، روزی کا واسطہ ہے۔''

شاردا۔ ''تو کیا پران دے کر کام کرو گے؟ صورت نہیں دیکھتے اپنی۔ معلوم ہوتا ہے چھ مہینے کا مریض و۔'' فتح چند نے جلدی جلدی دالموٹ کی دو تین پھنکیاں لگائیں۔ ایک گلاس پانی پیا اور باہر کی طرف دوڑے۔ شاردا ن بناتی ہی رہ گئی۔

چپڑاسی نے کہا۔ ''بابو جی۔ آپ نے بڑی دیر کر دی۔ اب ذرا لپکے چلئے۔ نہیں تو جاتے ہی ڈانٹ بتا دے گا۔''

فتح چند نے دو قدم دوڑ کر کہا۔ ''چلیں گے تو بھئی آدمی ہی کی طرح' چاہے ڈانٹ بتائے یا دانت دکھائے' م سے دوڑا تو نہیں جاتا۔ بنگلہ ہی پر ہے نا؟''

چپڑاسی۔ ''بھلا وہ دفتر کیوں آنے لگا۔ بادشاہ ہے کہ دل لگی۔''

چپڑاسی تیز چلنے کا عادی تھا۔ بابو فتح چند بیچارے آہستہ آہستہ جاتے تھے۔ تھوڑی ہی دور چل کر ہانپ اٹھے ر مرد تو تھے ہی۔ یہ کیسے کہیں کہ بھئی ذرا اور دھیرے چلو۔ ہمت کر کے قدم اٹھاتے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ بوں میں درد ہونے لگا اور آدھا راستہ ختم ہوتے ہوتے پیروں نے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ سارا جسم پسینہ میں شل ہو یا۔ سر میں چکر آ گیا۔ آنکھوں کے سامنے تتلیاں اڑنے لگیں۔

چپڑاسی نے للکارا۔ ''ذرا قدم بڑھائے چلو بابو۔''

فتح چند بڑی مشکل سے بولے۔ ''تم جاؤ، میں آتا ہوں۔''

وہ سڑک کے کنارے پٹڑی پر بیٹھ گئے اور سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر دم لینے لگے۔ چپڑاسی نے ان کی حالت دیکھی تو آگے چلا۔ فتح چند ڈرے کہ یہ شیطان جا کر نہ جانے صاحب سے کیا کہہ دے تو غضب ہی ہو وے۔ زمین پر ہاتھ ٹیک کر اٹھے اور پھر چلے مگر ضعف سے جسم ہانپ رہا تھا۔ اس وقت کوئی بچہ بھی انہیں زمین پر اسکتا تھا۔ بارے بہزار خرابی کسی طرح گرتے پڑتے صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ صاحب بنگلہ میں ٹہل رہے تھے۔ بار پھاٹک کی طرف دیکھتے تھے اور کسی کو آتے نہ دیکھ کر دل ہی دل میں جھلّاتے تھے۔

چپڑاسی کو دیکھتے ہی آنکھیں نکال کر بولے۔ "اتنی دیر کہاں تھا؟"
چپڑاسی نے برآمدے کے زینے پر کھڑے کھڑے کہا۔ "ہجور جب وہ آویں تب تو۔ میں تو دوڑا چلا آرہا ہوں۔"
صاحب نے پیر پٹک کر کہا۔ "بابو کیا بولا؟"
چپڑاسی۔ "آرہے ہیں ہجور۔ گھنٹہ بھر میں تو گھر میں سے نکلے۔"
اتنے میں فتح چند احاطہ کے تار کے اندر سے نکل آئے اور جھک کر سلام کیا۔
صاحب نے کڑک کر کہاں۔ "اب تک کہاں تھا؟"
فتح چند نے صاحب کا غضب آلود چہرہ دیکھا تو خون سرد ہو گیا۔ بولے۔ "حضور ابھی ابھی تو دفتر سے گیا ہوں۔ جونہی چپڑاسی نے آواز دی۔ حاضر ہوا۔"
صاحب۔ "جھوٹ بولتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔ ہم گھنٹے بھر سے کھڑا ہے۔"
فتح چند۔ "حضور میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آنے میں جتنی دیر گئی ہو مگر گھر سے چلنے میں مجھے بالکل دیر نہیں ہوئی۔"
صاحب نے ہاتھ کی چھڑی گھما کر کہا۔ "چپ رہو سؤر، ہم گھنٹہ بھر سے کھڑا ہے، اپنا کان پکڑو۔"
فتح چند نے خون کا گھونٹ پی کر کہا۔ "حضور مجھے دس سال کام کرتے ہو گئے کبھی......"
صاحب۔ "چپ رہو سؤر۔ ہم کہتا ہے اپنا کان پکڑو۔"
فتح چند۔ "جب میں نے کوئی قصور کیا ہو۔"
صاحب۔ "چپڑاسی اس سؤر کا کان پکڑو۔"
چپڑاسی نے دبی زبان سے کہا۔ "حضور یہ بھی میرے افسر ہیں۔ میں ان کا کان کیسے پکڑوں؟"
صاحب۔ "ہم کہتا ہے، اس کا کان پکڑو۔ نہیں ہم تم کو ہنٹروں سے مارے گا۔"
چپڑاسی۔ "حضور میں یہاں نوکری کرنے آیا ہوں، مار کھانے نہیں آیا ہوں۔ میں بھی عزت دار آدمی ہوں۔ حضور اپنی نوکری لے لیں۔ آپ جو حکم دیں، وہ بجالانے کو حاضر ہوں لیکن کسی کی عزت نہیں بگاڑ سکتا۔ نوکری تو چار دن کی ہے۔ چار دن کے لیے کیوں زمانہ بھر سے بگاڑ کریں۔"
صاحب اب غصہ نہ ضبط کر سکے۔ ہنٹر لے کر دوڑے۔ چپڑاسی نے دیکھا، یہاں کھڑا رہنے میں خیریت نہیں ہے تو بھاگ کھڑا ہوا۔ فتح چند ابھی تک بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ صاحب نے چپڑاسی کو نہ پایا تو ان کے پاس آیا۔ ان کے دونوں کان پکڑ کر زور سے ہلا دیئے۔ بولا۔ "تم سؤر گستاخی کرتا ہے۔ جاکر آفس سے فائل لاؤ۔"
فتح چند نے کان سہلاتے ہوئے کہا۔ "کونسا فائل لاؤں حضور؟"
صاحب۔ "فائل، فائل اور کونسا فائل۔ تم بہرا ہے۔ سنتا ہے۔ ہم فائل مانگتا ہے۔"
فتح چند نے کسی قدر دلیر ہو کر کہا۔ "آپ کونسا فائل مانگتے ہیں؟"
صاحب۔ "وہی فائل جو ہم مانگتا ہے۔ وہی فائل لاؤ۔ ابی لاؤ۔"
بیچارے فتح چند کو اب اور کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ صاحب بہادر ایک یونہی تیز مزاج تھے۔ اس پر حکومت کا غرور اور سب سے بڑھ کر شراب کا نشہ۔ ہنٹر لے کر پل پڑے تو بیچارے کیا کر لیتے۔ چپکے سے دفتر کی طرف چل پڑے۔

صاحب نے کہا۔ "دوڑ کر جاؤ، دوڑو۔"
فتح چند نے کہا۔ "حضور مجھ سے دوڑا نہیں جاتا۔"
صاحب۔ "او تم بہت سُست ہو گیا ہے، ہم تم کو دوڑنا سکھائے گا۔ دوڑو (پیچھے سے دھکا دے کر) دوڑو۔ تم اب بھی نہیں دوڑے گا۔"

یہ کہہ کر صاحب ہنٹر لینے چلے۔ فتح چند دفتر کے بابو ہونے پر بھی انسان ہی تھے۔ اگر وہ طاقتور ہوتے تو س بدمعاش کا خون پی جاتے۔ اگر ان کے پاس کوئی ہتھیار ہوتا تو اس پر ضرور چلاتے لیکن اس حالت میں تو مار کھانا ہی ان کی تقدیر میں لکھا تھا۔ بے تحاشہ بھاگے اور پھاٹک سے باہر نکل کر سڑک پر آ گئے۔

(3)

فتح چند دفتر نہ گئے۔ جا کر کرتے ہی کیا۔ صاحب نے فائل کا نام تک نہ بتایا تھا۔ شاید نشہ میں بھول گیا۔ آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلے مگر اس تحقیر، ذلت اور تنبیہ نے پیروں میں بیڑیاں سی ڈال دی تھیں۔ مانا کہ وہ جسمانی قوت میں صاحب سے کمزور تھے۔ ان کے ہاتھ میں کوئی چیز بھی نہ تھی لیکن کیا وہ اس کی باتوں کا جواب بھی نہ دے سکتے تھے۔ ان کے پیروں میں جوتے تو تھے۔ کیا وہ جوتے سے کام نہ لے سکتے تھے۔ پھر کیوں انہوں نے اتنی ذلت برداشت کی؟

مگر چارہ ہی کیا تھا۔ اگر وہ غصہ میں انہیں گولی مار دیتا تو؟ اس کا کیا بگڑتا۔ شاید ایک دو ماہ کی سادہ قید ہو جاتی۔ ممکن ہے دو چار سو روپے جرمانہ ہو جاتا مگر ان کا خاندان تو خاک میں مل جاتا۔ دنیا میں کون تھا جو ان کی بیوی بچوں کی خبر لیتا۔ وہ کس کے دروازے ہاتھ پھیلاتیں؟ کاش ان کے پاس اتنے روپے ہوتے جس سے ان کے کنبہ کی پرورش ہو جاتی تو وہ آج اتنی ذلت نہ برداشت کرتے یا تو مر ہی جاتے یا اس شیطان کو کچھ سبق ہی دے دیتے۔ اپنی جان کا انہیں خوف نہ تھا۔ زندگی میں ایسا کون سا سکھ تھا جس لیے وہ اس قدر خائف ہوتے۔ خیال تھا صرف خاندان کی بے سروسامانی کا۔

آج فتح چند کو اپنی جسمانی بے پائیگی پر جتنا افسوس ہوا، اتنا کبھی نہ ہوا تھا۔ اگر انہوں نے شروع ہی سے صحت کا خیال رکھا ہوتا، کچھ ورزش کرتے رہتے۔ لکڑی چلانا جانتے ہوتے تو کیا اس شیطان کی اتنی ہمت ہوتی کہ وہ ان کے کان پکڑواتا، اس کی آنکھیں نکال لیتے۔ کم سے کم انہیں گھر سے ایک چھری لے کر چلنا تھا اور نہ ہوتا تو دو چار ہاتھ جماتے ہی۔ پیچھے دیکھا جاتا۔ جیل خانہ ہی تو ہوتا یا اور کچھ۔

جوں جوں آگے بڑھتے تھے۔ ان کی طبیعت اپنی بزدلی اور بودے پن پر اور بھی جھنجھلاتی تھی۔ اگر وہ اچک کر اس کے دو چار تھپڑ ہی لگا دیتے تو کیا ہوتا۔ وہی نہ کہ صاحب کے خانسامے بہرے سب ان پر پل پڑتے اور مارتے مارتے بے دم کر دیتے۔ بال بچوں کے سر پر جو کچھ پڑتی، پڑتی۔ پر صاحب کو اتنا تو معلوم ہو جاتا کہ کسی غریب کو بے گناہ ذلیل کرنا آسان نہیں ہے۔ آخر آج میں مر جاؤں تو کیا ہو؟ تب کون میرے عیال کی پرورش کرے گا؟ تب ان کے سر پر جو کچھ پڑے گی، وہ آج ہی پڑ جاتی تو کیا حرج تھا۔

اس آخری خیال نے فتح چند کو اتنا مشتعل کیا کہ وہ لوٹ پڑے اور صاحب سے ذلت کا انتقام لینے کے لیے دو چار قدم چلے مگر پھر خیال آیا۔ آخر جو کچھ ذلت ہونی تھی، وہ تو ہو ہی گئی۔ کون جانے بنگلہ پر ہو یا کلب چلا گیا ہو۔

شاردا کی بے کسی اور بچوں کی بے پدری کا خیال بھی آ گیا۔ پھر لوٹے اور گھر چلے۔

(4)

گھر میں جاتے ہی شاردا نے پوچھا۔ ''کس لیے بلایا تھا؟ بڑی دیر ہو گئی۔''

فتح چند نے چارپائی پر لیٹتے ہوئے کہا۔ ''نشہ کی سنک تھی اور کیا۔ شیطان نے مجھے گالیاں دیں، ذلیل کیا۔ بس یہی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ دیر کیوں کی؟ ظالم نے چپڑاسی سے میرا کان پکڑنے کو کہا۔''

شاردا نے طیش میں آ کر کہا۔ ''تم نے ایک جوتا اتار کر دیا نہیں سوٗر کو۔''

فتح چند۔ ''چپڑاسی بہت شریف ہے، اس نے صاف کہہ دیا، حضور مجھ سے یہ کام نہ ہو گا۔ میں نے بھلے آدمیوں کی عزت اتارنے کے لیے نوکری نہیں کی تھی۔ اسی وقت سلام کر کے چلا گیا۔''

شاردا۔ ''یہ ہے دلیری۔ تم نے اس صاحب کو کیوں نہیں پھٹکارا؟''

فتح چند۔ ''پھٹکارا کیوں نہیں۔ میں نے بھی خوب سنائیں۔ وہ چھڑی لے کر دوڑا۔ میں نے بھی جوتا سنبھالا۔ اس نے مجھے دو تین چھڑیاں جمائیں، میں نے بھی جوتے لگائے۔''

شاردا نے خوش ہو کر کہا۔ ''اتنا سا منہ ہو گیا ہو گا اس کا۔''

فتح چند۔ ''چہرے پر جھاڑو سی پھری ہوئی تھی۔''

شاردا۔ ''بڑا اچھا کیا تم نے اور مارنا چاہیے تھا۔ میں ہوتی تو بغیر جان لیے نہ چھوڑتی۔''

فتح چند۔ ''مار تو آیا ہوں لیکن اب خیریت نہیں ہے۔ دیکھو کیا حشر ہوتا ہے۔ نوکری تو جائے گی، شاید سزا کاٹنی پڑے۔''

شاردا۔ ''سزا کیوں کاٹنی پڑے گی۔ کیا کوئی انصاف کرنے والا نہیں ہے۔ اس نے کیوں گالیاں دیں، کیوں چھڑی جمائی۔''

فتح چند۔ ''اس کے سامنے میری کون سنے گا۔ عدالت بھی اسی کی طرف ہو جائے گی۔''

شاردا۔ ''ہو جائے گی ہو جائے مگر دیکھ لینا اب کسی صاحب کی یہ جرات نہ ہو گی کہ کسی بابو کو گالیاں دے بیٹھے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ جونہی اس کے منہ سے گالی نکلی، لپک کر ایک جوتا رسید کرتے۔''

فتح چند۔ ''تو پھر اس وقت زندہ لوٹ بھی نہ سکتا، ضرور مجھے گولی مار دیتا۔''

شاردا۔ ''دیکھی جاتی۔''

فتح چند نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر تم لوگ کہاں جاتیں؟''

شاردا۔ ''جہاں ایشور کی مرضی ہوتی۔ آدمی کے لیے سب سے بڑی چیز عزت ہے۔ عزت گنوا کر بال بچوں کی پرورش نہیں کی جاتی۔ تم اس شیطان کو مار کر آئے ہو۔ میں غرور سے پھولی نہیں سماتی۔ مار کھا کر آتے تو شاید میں تمہاری صورت سے بھی نفرت کرتی۔ یوں زبان سے چاہے کچھ نہ کہتی مگر دل سے تمہاری عزت جاتی رہتی۔ اب جو کچھ سر پر آئے گی، خوشی سے سر پر جھیل لوں گی...... کہاں جاتے ہو۔ سنو سنو، کہاں جاتے ہو؟''

فتح چند ایک مجنونانہ جوش میں گھر سے نکل پڑے۔ شاردا پکارتی رہ گئی۔ وہ پھر صاحب کے بنگلہ کی طرف جا

رہے تھے۔ خوف سے سہمے ہوئے نہیں، غرور سے گردن اٹھائے ہوئے۔ آہنی عزم ان کے چہرہ سے جھلک رہا تھا۔ ان کے پیروں میں وہ ضعف، چہرہ پر وہ نقاہت، آنکھوں میں وہ بے کسی نہ تھی۔ ان کی کایا پلٹ سی ہو گئی تھی۔ اس خستہ تن، نیم جاں، زرد رو، لاغر اندام دفتری بابو کی جگہ اب ایک مردانہ صورت چاق و چست، ہمت سے بھرا ہوا مضبوط گھٹا ہوا جوان تھا۔ انہوں نے پہلے ایک دوست کے گھر جا کر اس کا ڈنڈا لیا اور اکڑے ہوئے صاحب کے بنگلہ پر جا پہنچے۔

(5)

اس وقت نو بجے تھے۔ صاحب کھانے کی میز پر تھے مگر فتح چند نے آج ان کے میز پر سے اٹھ جانے کا انتظار نہ کیا۔ خانساماں تو کمرہ سے باہر نکلا اور وہ چق اٹھا کر اندر داخل ہوئے۔ کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ زمین پر ایسی قالین بچھی ہوئی تھی جیسی فتح چند کی شادی میں بھی نہ بچھی ہو گی۔ صاحب بہادر نے اس کی طرف خونبار نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”تم کیوں آیا؟ باہر جاؤ کیوں اندر چلا آیا؟“

فتح چند نے کھڑے کھڑے ڈنڈا سنبھال کر کہا۔ ”تم نے مجھ سے ابھی فائل مانگا تھا۔ وہی فائل لے کر آیا ہوں۔ کھانا کھا لو تو دکھاؤں۔ جب تک میں بیٹھا ہوں۔ اطمینان سے کھاؤ۔ شاید یہ تمہارا آخری کھانا ہو گا۔ اس وجہ سے خوب سیر ہو کر کھا لو۔“

صاحب سناٹے میں آ گئے۔ فتح چند کی طرف خوف اور غصہ کی نظروں سے دیکھا اور کانپ اٹھے۔ فتح چند کے چہرہ پر سفاکانہ عزم جھلک رہا تھا۔ صاحب سمجھ گئے۔ یہ شخص اس وقت مرنے مارنے کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔ قوت میں فتح چند ان کے پاسنگ بھی نہیں تھا لیکن یہ یقینی تھا کہ وہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہیں بلکہ لوہے سے دینے کو آمادہ ہے۔ اگر وہ فتح چند کو سخت سُست کہتے ہیں تو کیا عجب ہے ڈنڈا لے کر پل پڑے۔ ہاتھا پائی کرنے میں باوجودیکہ انہیں غالب آنے کا یقین تھا لیکن بیٹھے بٹھائے ڈنڈے کھانا بھی تو کوئی دانشمندی نہیں۔ کتّے کو آپ ڈنڈے سے ماریئے، ٹھکرایئے جو چاہے کیجئے مگر اسی وقت تک جب تک وہ غراتا نہیں۔ ایک بار وہ غرا کر دوڑ پڑے تو پھر دیکھیں آپ کی ہمت کہاں جاتی ہے۔ یہی حال اس وقت صاحب بہادر کا تھا۔ جب تک یقین تھا کہ فتح چند گھر کی دھرکی، ہنٹر ٹھوکر سب کچھ خاموشی سے برداشت کرے گا، تب تک آپ شیر تھے۔ اب وہ تیوریاں بدلے ڈنڈا سنبھالے بلی کی طرح گھات لگائے کھڑا ہے۔ زبان سے کوئی کلمۂ ناملائم نکلا اور اس نے ڈنڈا چلایا۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے برخاست کر سکتے ہیں۔ اگر مارتے ہیں تو مار کھانے کا بھی خوف۔ اس پر فوجداری میں مقدمہ دائر ہو جانے کا اندیشہ۔ مانا کہ وہ اپنے اثر اور وقار سے بالآخر فتح چند کو جیل میں ڈلوا دیں گے لیکن پریشانی اور بدنامی سے کسی طرح نہ بچ سکتے تھے۔ ایک دانشمند دور اندیش آدمی کی طرح انہوں نے حاضرہ کا دل میں تبصرہ کیا اور بولے۔ ”اوہو! ہم سمجھ گیا۔ آپ ہم سے ناراض ہے۔ ہم نے کیا آپ کو کچھ کہا ہے۔ آپ کیوں ہم سے ناراض ہے؟“

فتح چند نے تن کر کہا۔ ”تم نے ابھی آدھ گھنٹہ قبل میرے کان پکڑے ہیں اور مجھے سینکڑوں اول فول کہا۔ کیا اتنی جلدی بھول گئے؟“

صاحب۔ ”میں نے آپ کا کان پکڑا۔ اہہ ہہ ہہ، میں نے آپ کا کان پکڑا۔ اہہ اہہ ہہ ہہ۔ کیا مذاق ہے! کیا میں پاگل ہوں یا دیوانہ!“

فتح چند۔ ''تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ چپڑاسی گواہ ہے۔ آپ کے نوکر چاکر بھی دیکھ رہے تھے۔''

صاحب۔ ''کب کا بات ہے؟''

فتح چند۔ ''ابھی ابھی، کوئی آدھ گھنٹہ ہوا۔ آپ نے مجھے بلایا تھا اور بے وجہ میرے کان پکڑے اور دھکے دیئے۔''

صاحب۔ ''اوہ! بابو جی۔ اس وقت ہم نشہ میں تھا۔ بہرا نے ہم کو بہت دے دیا تھا۔ ہم کو کچھ کھبر نہیں۔ کیا ہوا مائی گاڈ! ہم کو کچھ کھبر نہیں۔''

فتح چند۔ ''نشہ میں اگر تم نے مجھے گولی ماردی ہوتی تو کیا میں مر نہ جاتا۔ اگر تمہیں نشہ تھا اور نشہ میں سب کچھ معافی کے قابل ہے تو میں بھی نشہ میں ہوں۔ سنو میرا فیصلہ یا تو اپنے کان پکڑو کہ پھر کبھی بھلے آدمی کے ساتھ ایسا برتاؤ نہ کرو گے یا میں آکر تمہاری کان پکڑوں گا۔ سمجھ گئے، نہیں۔ ادھر ادھر ہلو نہیں، تم نے جگہ چھوڑی اور میں نے ڈنڈا چلایا۔ پھر کھوپڑی ٹوٹ جائے تو میری خطا نہیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں، وہ بے عذر کرتے چلو۔ پکڑو کان۔''

صاحب نے مصنوعی ہنسی ہنس کر کہا۔ ''ویل بابو جی، آپ بہت دل لگی کرتا ہے۔ اگر ہم نے آپ کو برا بات کہا ہے تو ہم آپ سے معافی مانگتا ہے۔''

فتح چند۔ (ڈنڈا تول کر) ''نہیں، کان پکڑو۔''

صاحب آسانی سے اتنی ذلت نہ برداشت کر سکے، وہ لپک کر اٹھے اور چاہا کہ فتح چند کے ہاتھ سے لکڑی چھین لیں لیکن فتح چند غافل نہ تھا۔ صاحب میز سے اٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے ڈنڈے کا بھرپور اور تلا ہوا ہاتھ چلایا۔ صاحب ننگے سر تو تھے ہی، چوٹ سر پڑ گئی۔ کھوپڑی بھنا گئی۔ ایک منٹ تک سر کو پکڑے رہنے کے بعد بولے۔ ''ہم تم کو برکاست کردے گا۔''

فتح چند۔ ''اس کی مجھے پروا نہیں ہے مگر آج میں تم سے بلا کان پکڑائے نہ جاؤں گا۔ کان پکڑ کر وعدہ کرو۔ پھر کسی بھلے آدمی کے ساتھ ایسی بے ادبی نہ کرو گے ورنہ میرا دوسرا ہاتھ پڑا ہی چاہتا ہے۔''

یہ کہہ کر فتح چند نے پھر ڈنڈا اٹھایا۔ صاحب کو ابھی تک پہلی چوٹ نہ بھولی تھی۔ اگر کہیں یہ دوسرا ہاتھ پڑ گیا تو شاید کھوپڑی کھل جائے۔ کان پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''اب آپ خوش ہوا؟''

''پھر تو کبھی کسی کو گالی نہ دو گے؟''

''کبھی نہیں۔''

''اگر کبھی پھر ایسی حرکت کی تو سمجھ لینا کہ میں کہیں بہت دور نہیں ہوں۔''

''اب کسی کو گالی نہ دے گا۔''

''اچھی بات ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔ آج سے میرا استعفیٰ ہے۔ میں کل استعفیٰ میں یہ لکھ بھیجوں گا کہ تم نے مجھے گالیاں دیں، اس لیے میں نوکری نہیں کرنی چاہتا، سمجھ گئے؟''

صاحب۔ ''آپ استیپا کیوں دیتا ہے۔ ہم تو برکھاست نہیں کرتا۔''

فتح چند۔ ''اب تم جیسے پاجی آدمی کی ماتحتی نہ کروں گا۔''

یہ کہتے ہوئے فتح چند کمرہ سے باہر نکلے اور بڑے اطمینان سے گھر چلے۔ آج انہیں سچی فتح کی خوشی کا تجربہ ہوا۔ زندگی میں یہ مسرت کبھی نہ حاصل ہوئی تھی۔

انتقام

(1)

مایا اپنے سہ منزلے مکان کی چھت پر کھڑی سڑک کی طرف مضطرب اور مشتاق نظروں سے تاک رہی تھی اور سوچ رہی تھی، وہ اب تک آئے کیوں نہیں؟ کیوں دیر لگائی؟ اسی گاڑی سے آنے کو لکھا تھا۔ گاڑی تو آ گئی ہوگی۔ اسٹیشن سے مسافر چلے آرہے ہیں۔ اس وقت تو کوئی دوسری گاڑی نہیں آتی۔ شاید اسباب وغیرہ رکھنے میں دیر ہوئی۔ یار دوست اسٹیشن پر ہی مبارکباد دینے کے لیے پہنچ گئے ہوں۔ ان سے فرصت ملے گی تب گھر کی سدھ آئے گی۔ ان کی جگہ میں ہوتی تو سیدھے گھر آتی۔ دوستوں سے کہہ دیتی، جناب اس وقت مجھے معاف رکھئے، گھر پر ملئے گا مگر دوستوں میں تو ان کی جان بستی ہے۔

مسٹر ویاس لکھنؤ کے جوان مگر نہایت ممتاز بیرسٹروں میں ہیں۔ تین مہینہ سے وہ ایک سیاسی مقدمہ کی پیروی کرنے کے لیے سرکار کی جانب سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مایا کو لکھا تھا، فتح ہو گئی۔ یکم تاریخ کو میں شام کی ریل سے ضرور بالضرور پہنچوں گا۔ آج وہی شام ہے۔ مایا نے آج سارا دن تیاریوں میں صرف کیا۔ سارا مکان دھلوایا، کمروں کے آرائشی سامان صاف کرائے۔ موٹر دھلوائی۔ یہ تین مہینے اس نے تپسیا کر کے کاٹے تھے مگر اب تک مسٹر ویاس نہیں آئے۔

اس کی چھوٹی بچی تلوتما آ کر اس کے پیروں سے چمٹ گئی اور بولی۔ ''اماں جی بابو کب آئیں گے؟'' مایا نے اسے گود میں اٹھا لیا اور بوسہ لے کر بولی۔ ''آتے ہی ہوں گے بیٹی۔ گاڑی تو کب کی آ گئی۔''

تلوتما۔ ''میرے لیے اچھی اچھی گڑیاں لائے ہوں گے۔'' مایا نے کچھ جواب نہ دیا۔ انتظار اب غصہ کی صورت اختیار کرتا جاتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی جس طرح مجھے حضرت دق کر رہے ہیں، اسی طرح میں بھی دق کروں گی۔ گھنٹہ بھر تک بولوں گی ہی نہیں۔ آ کے سٹیشن پر بیٹھے ہوئے ہیں، جلانے میں انہیں مزہ آتا ہے۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ دل کو کیا کروں، نہیں جی تو یہی چاہتا ہے کہ جیسے وہ مجھ سے بے اعتنائی کرتے ہیں اسی طرح میں بھی ان کی بات نہ پوچھوں۔

یکا یک ایک خدمتگار نے اوپر آ کر کہا۔ ''بہو جی۔ لاہور سے یہ تار آیا ہے۔''

مایا اندر ہی اندر جل اٹھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا شدت کی حرارت ہو گئی ہو۔ معاً خیال آیا سوائے اس کے اور کیا لکھا ہوگا کہ اس گاڑی سے نہ آسکوں گا۔ تار دے دینا کون سا مشکل ہے۔ میں بھی کیوں نہ تار دے دوں کہ میں ایک مہینہ کے لیے میکے جا رہی ہوں۔ خدمتگار سے کہا۔ ''تار لے جا کر کمرے میں میز پر رکھ دو۔'' مگر پھر کچھ سوچ کر اس نے لفافہ لے لیا اور کھولا ہی تھا کہ کاغذ ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ لکھا تھا۔ مسٹر ویاس کو آج دس بجے رات کسی بدمعاش نے قتل کر دیا۔

(2)

کئی مہینے گزر گئے مگر قاتل کا اب تک پتہ نہیں چلا۔ خفیہ پولیس کے آزمودہ کار آدمی اس کا سراغ لگانے کی

فکر میں پریشان ہیں۔ قاتل کو گرفتار کرا دینے والے کو بیس ہزار روپیہ انعام دیئے جانے کا اعلان کر دیا گیا ہے مگر لاحاصل۔ جس ہوٹل میں مسٹر ویاس مقیم تھے' اسی میں ایک مہینہ سے مایا ٹھہری ہوئی ہے۔ اس کمرہ سے اسے عشق سا ہو گیا ہے۔ اس کی صورت اتنی مسخ ہو گئی ہے کہ اب اسے پہچاننا مشکل ہے مگر اس کے چہرہ پر بے کسی یا درد کی زردی نہیں۔ وحشت کی حرارت نمایاں ہے۔ اس کی مخمور آنکھوں میں اب خون کی پیاس ہے اور انتقام کا شعلہ۔ اس کے جسم کا ایک ایک ذرہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے۔ اب یہی اس کی زندگی کا ماحصل' یہی اس کی سب سے بڑی تمنا ہے۔ اس کی محبت کی ساری کائنات اب یہی انتقام کا جوش ہے جس سیہ کار نے اس کی زندگی غارت کر دی، اسے اپنے سامنے تڑپتے دیکھ کر ہی اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی۔ خفیہ پولیس تخویف اور ترغیب۔ تحقیق اور تفتیش سے کام لے رہی ہے مگر مایا نے منزل مقصود کے لیے ایک دوسرا ہی راستہ اختیار کیا ہے۔ مسٹر ویاس کو علم الارواح کا شوق تھا۔ ان کی صحبت میں مایا نے بھی کچھ ابتدائی مشق بہم پہنچائی تھی۔ اس وقت اس کے لیے یہ مشغلہ تفریح تھا مگر اب یہی اس کا مدار حیات تھا۔ وہ روزانہ تلوتما پر عمل کرتی اور روز بروز مشق بڑھاتی جاتی تھی۔ وہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب وہ اپنے شوہر کی روح کو حاضر کر کے اس سے قاتل کا سراغ لگا سکے گی۔ وہ بڑے انہماک سے مرکزی توجہ کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی۔ رات کے دس بج گئے تھے۔ مایا نے کمرہ کو اندھیرا کر دیا تھا اور تلوتما پر عمل کر رہی تھی۔ یکا یک اسے ایسا معلوم ہوا کہ کمرہ میں کسی نورانی وجود کا ظہور ہوا۔ بجھتی ہوئی شمع کی آخری جھلک کی طرح ایک روشنی نظر آئی۔

مایا نے پوچھا۔ ''آپ کون ہیں؟''

تلوتما نے ہنس کر کہا۔ ''تم مجھے نہیں پہچانتیں؟ میں ہی تو تمہارا من موہن ہوں جو زمانہ میں مسٹر ویاس مشہور تھا۔''

''آپ خوب آئے۔ میں آپ سے قاتل کا نام پوچھنا چاہتی ہوں۔''

''اس کا نام ایشور داس ہے۔''

''کہاں رہتا ہے؟''

''شاہجہاں پور۔''

مایا نے محلّہ کا نام، مکان کا نمبر، شکل و شباہت سب کچھ خوب تفصیل کے ساتھ پوچھا اور ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا۔ تلوتما ذرا دیر میں اٹھ بیٹھی۔ جب کمرہ میں پھر روشنی ہوئی تو مایا کا زرد چہرہ فاتحانہ مسرت سے روشن ہو گیا تھا۔ اس کے جسم میں ایک تازہ جوش موجزن تھا۔ گویا پیاس سے جاں بہ لب مسافر کو پانی مل گیا ہو۔

اسی رات کو مایا نے لاہور سے شاہجہاں پور کا عزم سفر کیا۔

(3)

رات کا وقت، پنجاب میل بڑی تیزی سے فضائے تاریک کو چیرتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ مایا ایک سیکنڈ کلاس کے کمرہ میں بیٹھی سوچ رہی تھی کہ شاہجہاں پور میں وہ کہاں مقیم ہو گی؟ کیسے ایشور داس کا مکان تلاش کرے گی؟ اور کیسے اس سے خون کا انتقام لے گی؟ اس کی بغل میں تلوتما بے خبر سو رہی تھی۔ سامنے اوپر کے برتھ پر ایک آدمی نیند میں غافل پڑا ہوا تھا۔

یکایک گاڑی کا کمرہ کھلا اور دو آدمی کوٹ پتلون پہنے کمرہ میں داخل ہوئے۔ دونوں انگریز تھے۔ ایک مایا کی ایک طرف بیٹھا اور دوسرا دوسری طرف۔ مایا سمٹ کر بیٹھ گئی۔ ان آدمیوں کا یوں بیٹھنا اسے بہت برا معلوم ہوا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ آپ لوگ دوسری طرف بیٹھیں مگر وہ عورت جو خون کا انتقام لینے جا رہی تھی، سامنے یہ خطرہ دیکھ کر سہم اٹھی۔ وہ دونوں شیطان اسے سمٹتے دیکھ کر اور بھی قریب آ گئے۔ مایا اب وہاں نہ بیٹھی رہ سکی۔ وہ اٹھ کر دوسرے برتھ پر جانا چاہتی تھی کہ ان میں سے ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مایا نے زور سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر کے کہا۔ ''تمہاری شامتیں تو نہیں آئی ہیں...... چھوڑ دو میرا ہاتھ، سوّر۔''

اس پر دوسرے آدمی نے اٹھ کر مایا کو سینے سے لپٹا لیا اور لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔ ''ول ہم تم کو بہت سارو پیہ دے گا۔'' مایا نے اسے ساری طاقت سے دھکیلنے کی کوشش کر کے کہا۔ ''ہٹ جا حرامزادے ورنہ ابھی تیرا سر توڑ دوں گی۔''

دوسرا آدمی بھی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں مل کر مایا کو برتھ پر لٹانے کی کوشش کرنے لگے۔ دفعتاً یہ کھٹ پٹ سن کر اوپر کے برتھ پر سویا ہوا آدمی چونکا اور ان حرام کاروں کی حرکت دیکھ کر اوپر سے کود پڑا۔ دونوں گورے اسے دیکھ کر مایا کو چھوڑ کر اس کی طرف جھپٹے اور اسے گھونسے مارنے لگے۔ دونوں اس پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے اور وہ ہاتھوں سے اپنے کو بچا رہا تھا۔ اسے وار کرنے کا کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ دفعتاً اس نے اچک کر اپنے بستروں میں سے ایک چھرا نکال لیا اور آستینیں سمیٹ کر بولا۔ ''تم دونوں اگر ابھی باہر نہ چلے گئے تو ایک کو بھی جیتا نہ چھوڑوں گا۔''

دونوں گورے چھرا دیکھ کر ذرا ڈرے مگر وہ بھی نہتے نہ تھے۔ ایک نے جیب سے ریوالور نکال لیا اور اس کی نلی اس آدمی کی طرف کر کے بولا۔ ''نکل جا۔ ریسکل''

مایا تھر تھر کانپ رہی تھی کہ نہ جانے کیا آفت آنے والی ہے مگر خطرہ ہماری چھپی ہوئی ہمتوں کی کنجی ہے۔ خطرہ میں پڑ کر ہم بشریت کے حدود سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وہ کچھ کر گزرتے ہیں جس پر ہمیں خود حیرت ہوتی ہے۔ وہی مایا جو اب تک تھر تھر کانپ رہی تھی، بلی کی طرح جست کر کے اس گورے کی طرف لپکی اور اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین کر گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ گورے نے کھسیا کر مایا کو دانٹ کاٹنا چاہا مگر مایا نے جلدی سے ہاتھ کھینچ لیا اور خطرہ کی زنجیر کے پاس جا کر اسے زور سے کھینچا۔ دوسرا گورا اب تک کنارے کھڑا تھا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ اس لیے وہ چھری کے سامنے نہ آنا چاہتا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ مایا نے زنجیر کھینچ لی تو بھیتر کا دروازہ کھول کر بھاگا۔ اس کا رفیق بھی اس کے پیچھے پیچھے بھاگا۔ چلتے چلتے چھری والے آدمی نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔ پھر تو اس نے اتنی ٹھوکریں، اتنی لاتیں اور اتنے گھونسے جمائے کہ اس کے منہ سے خون نکل پڑا۔ اتنے میں گاڑی رک گئی اور گارڈ لالٹین لیے آتا دکھائی دیا۔

(4)

مگر وہ دونوں شیطان گاڑی کو رکتے دیکھ کر بے تحاشہ نیچے کود پڑے اور اس تاریکی میں نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ گارڈ نے بھی زیادہ جستجو نہ کی اور کرتا بھی تو اس اندھیرے میں پتہ لگنا مشکل تھا۔ دونوں طرف نشیب تھا۔ شاید گاڑی کسی ندی کے قریب تھی۔ وہاں دو کیا سو دو سو آدمی اس وقت بڑی آسانی سے چھپ سکتے تھے۔ دس منٹ

تک گاڑی کھڑی رہی، پھر چل پڑی۔

مایا نے فراغت کی سانس لے کر کہا۔ ”آپ آج نہ ہوتے تو ایشور ہی جانے میرا کیا حال ہوتا۔ آپ کے کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟“

اس آدمی نے چھرے کو جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ ”بالکل نہیں، میں ایسا غافل سویا ہوا تھا کہ ان بدمعاشوں کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی ورنہ میں نے انہیں اندر قدم ہی نہ رکھنے دیا ہوتا۔ اگلے سٹیشن پر رپورٹ کروں گا۔“

مایا۔ ”جی نہیں، خوامخواہ کی بدنامی اور پریشانی ہوگی۔ رپورٹ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایشور نے آج میری آبرو رکھ لی۔ میرا کلیجہ ابھی تک دھک دھک کر رہا ہے۔ آپ کہاں تک چلیں گے؟“

”مجھے شاہجہاں پور جانا ہے۔“

”وہیں تک تو مجھے بھی جانا ہے۔ شبھ نام کیا ہے۔ کم از کم اپنے محسن کے نام سے تو بے خبر نہ رہوں۔“

”مجھے تو ایشور داس کہتے ہیں۔“

مایا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ ضرور یہ وہی قاتل ہے۔ اس کی شکل و شباہت وہی تھی جو اسے بتلائی گئی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”آپ کا مکان کس محلّہ میں ہے؟“

”...... میں رہتا ہوں۔“

مایا کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر ایک لمبی سانس لی۔ ہائے! قاتل ملا بھی تو ایسی حالت میں جب وہ اس کے بار احسان سے دبی ہوئی ہے۔ کیا اس آدمی کو وہ خنجر کا نشانہ بنا سکتی ہے جس نے بغیر کسی شناسائی کے محض ہمدردانہ جوش سے ایسے گاڑھے وقت میں اس کی مدد کی، جان پر کھیل گیا۔ وہ ایک عجیب مخمصے میں پڑ گئی۔ اس نے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔ شرافت جھلک رہی تھی۔ ایسا آدمی قتل کا مرتکب ہو سکتا ہے! اس میں اسے شبہ تھا۔

ایشور داس نے اس سے پوچھا۔ ”آپ لاہور سے آ رہی ہیں نا؟ شاہجہاں پور میں کہاں جایئے گا؟“

”ابھی تو کہیں دھرم سالہ میں ٹھہروں گی، مکان کا انتظام کرنا ہے۔“

ایشور داس نے تعجب سے پوچھا۔ ”تو وہاں آپ کسی عزیز یا رشتہ دار کے گھر نہیں جا رہی ہیں؟“

”کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔“

”یوں آپ کا اصلی مکان کہاں ہے؟“

”اصلی مکان پہلے لکھنؤ تھا، اب کہیں نہیں ہے۔ میں بیوہ ہوں۔“

(5)

ایشور داس نے شاہجہاں پور میں مایا کیلئے ایک اچھا مکان طے کر دیا۔ ایک نوکر بھی رکھ دیا۔ دن میں کئی بار استفسار حال کے لیے آتا۔ مایا ہر چند چاہتی تھی کہ اس کے احسانات نہ لے۔ اس سے بے تکلفی نہ پیدا کرے مگر وہ اتنا خلیق، اتنا بامروت اور اتنا کسر نفس تھا کہ مایا مجبور ہو جاتی۔

ایک دن وہ کئی گملے اور فرنیچر لے کر آیا۔ کئی خوبصورت تصویریں بھی تھیں۔ مایا نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ”مجھے ساز و سامان کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ ناحق تکلیف کرتے ہیں۔“

ایشور داس نے خطاوارانہ ندامت سے کہا۔ "میرے گھر میں یہ چیزیں بیکار پڑی تھیں، لا کر رکھ دیں۔"

"میں ان تکلفات کا غلام نہیں بننا چاہتی۔"

ایشور داس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "اگر آپ کو ناگوار ہو تو اٹھوا لے جاؤں؟"

مایا نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں ہیں۔ مجبور ہو کر بولی۔ "اب آپ لے آئے ہیں تو رہنے دیجئے مگر آئندہ سے کوئی ایسی چیز نہ لائیے گا۔"

ایک دن مایا کا نوکر نہ آیا۔ مایا نے آٹھ نو بجے تک اس کا انتظار کیا۔ جب اب بھی وہ نہ آیا تو اس نے جھوٹے برتن مانجھنے شروع کیے۔ اسے کبھی اپنے ہاتھ سے چوکا برتن کرنے کا اتفاق نہ پڑا تھا۔ بار بار اپنی حالت پر رونا آتا تھا۔ ایک دن وہ تھا کہ اس کے گھر میں نوکروں کی ایک پلٹن تھی۔ آج اسے اپنے ہاتھوں برتن مانجھنے پڑ رہے ہیں۔ تلوتما دوڑ دوڑ کر بڑے جوش سے کام کر رہی تھی۔ اسے کوئی فکر نہ تھی۔ اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کا۔ اپنے کو مفید ثابت کرنے کا ایسا اچھا موقع پا کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اتنے میں ایشور داس آ کر کھڑا ہو گیا اور مایا کو برتن مانجھتے دیکھ کر بولا۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ رہنے دیجئے۔ میں ابھی ایک آدمی کو بلائے لاتا ہوں۔ آپ نے مجھے کیوں نہ خبر دی۔ رام رام، اٹھ آئیے وہاں سے۔"

مایا نے لاپروائی سے کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں، آپ تکلیف نہ کیجئے۔ میں ابھی مانجھے لیتی ہوں۔"

"اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں ایک منٹ میں آتا ہوں۔"

"نہیں، آپ کسی کو نہ لائیے، میں اتنے برتن آسانی سے دھولوں گی۔"

"اچھا تو لائیے میں بھی آپ کی کچھ مدد کروں۔"

یہ کہہ کر اس نے ڈول اٹھا لیا اور باہر سے پانی لینے دوڑا۔ پانی لا کر اس نے منجھے ہوئے برتنوں کو دھونا شروع کیا۔

مایا نے اس کے ہاتھ سے برتن چھیننے کی کوشش کر کے کہا۔ "آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتے ہیں، رہنے دیجئے۔ میں ابھی صاف کیے ڈالتی ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کرتی ہیں یا میں آپ کو شرمندہ کر رہا ہوں۔ آپ یہاں مسافر ہیں، میں یہاں کا رہنے والا ہوں۔ میرا فرض ہے کہ آپ کی خدمت کروں۔ آپ نے ایک زیادتی تو یہ کہ مجھے مطلق خبر نہ دی۔ اب دوسری زیادتی یہ کر رہی ہیں کہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔" ایشور داس نے ایک لمحہ میں سارے برتن صاف کر کے رکھ دیئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایسے کاموں کا عادی ہے۔ برتن دھو کر اس نے سارے برتن پانی سے بھر دیئے اور تب پیشانی سے پسینہ پونچھتا ہوا بولا۔ "بازار سے کوئی چیز لانی ہو تو بتلا دیجئے۔ ابھی لا دوں۔"

مایا۔ "جی نہیں، معاف کیجئے۔ آپ اپنے گھر کا راستہ لیجئے۔"

ایشور داس۔ "تلوتما۔ آؤ آج تمہیں سیر کرالاؤں۔"

مایا۔ "جی نہیں، رہنے دیجئے۔ وہ اس وقت سیر کرنے نہیں جاتی۔"

مایا نے یہ الفاظ اتنی رکھائی، اتنی بے رخی سے کہے کہ ایشور داس کا کہنا گر گیا۔ اس نے دوبارہ کچھ نہ کہا۔ چپکے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد مایا نے سوچا، میں نے اس کے ساتھ بے مروتی کی۔ ریل گاڑی کے اس افسوسناک واقعہ کے بعد سے اس کے دل میں متواتر انتقام اور انسانیت میں جنگ وجدل ہوتی رہتی تھی۔ اگر

ایشور داس اس موقع پر فرشتہ غیب کی طرح نہ آ جاتا تو آج اس کی کیا حالت ہوتی۔ یہ خیال کر کے اس کے روئیں کھڑے ہو جاتے اور ایشور داس کے لیے اس کے تہہِ دل سے کلماتِ خیر نکل جاتے۔ کیا ایسے محسن کے خون سے وہ اپنے ہاتھ رنگے گی؟ لیکن اسی کے ہاتھوں اسے یہ روزِ سیاہ بھی تو دیکھنا پڑا۔ اسی کے کارن تو اس نے ریل کا وہ سفر کیا تھا ورنہ وہ تنہا بے یار و مددگار سفر ہی کیوں کرتی؟ اسی کے کارن تو آج وہ بیوگی کی مصیبتیں جھیل رہی ہے اور ساری عمر جھیلے گی۔ ان باتوں کا خیال کر کے اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔ منہ سے ایک آہِ شرربار نکل جاتی اور جی چاہتا، اسی وقت خنجر لے کر چلے اور اس کا کام تمام کر دے۔

(6)

آج مایا نے آخری فیصلہ کرلیا۔ اس نے ایشور داس کی دعوت کی تھی۔ یہی اسکی آخری دعوت ہوگی۔ ایشور داس نے اس پر احسان ضرور کیے ہیں لیکن دنیا میں کوئی احسان، کوئی نیکی اس صدمۂ جانکاہ کے داغ کو مٹا سکتی ہے؟ رات کے نو بجے ایشور داس آیا تو مایا نے ایک محبت آمیز گرمجوشی سے کہا۔ ''بیٹھئے آپ کے لیے گرم گرم پوریاں نکالوں؟''

ایشور داس۔ ''کیا ابھی تک آپ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ناحق گرمی میں پریشان ہوئیں۔''

مایا نے تھالی پُرس کر اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں کھانا پکانا نہیں جانتی۔ اگر کوئی چیز اچھی نہ لگے تو معاف کیجئے گا۔'' ایشور داس نے خوب تعریف کر کے ایک ایک چیز کھائی۔ ایسی لذیذ چیز اس نے اپنی عمر میں کبھی نہیں کھائی تھیں۔

''آپ تو کہتی تھیں، میں کھانا پکانا نہیں جانتی۔''

''تو کیا میں غلط کہتی تھی؟''

''بالکل غلط۔ آپ نے خود اپنی غلطی ثابت کر دی۔ ایسے خستے میں نے زندگی میں کبھی نہ کھائے تھے۔''

''آپ مجھے بناتے ہیں۔ اچھا صاحب بنا لیجئے۔''

''نہیں، میں بناتا نہیں۔ بالکل سچ کہتا ہوں۔ کس کس چیز کی تعریف کروں۔ چاہتا ہوں کہ کوئی عیب نکالوں لیکن سوجھتا ہی نہیں۔ اب کے میں اپنے دوستوں کی دعوت کروں گا تو آپ کو ایک دن تکلیف دوں گا۔''

''ہاں شوق سے کیجئے، میں حاضر ہوں۔''

کھاتے کھاتے دس بجے گئے۔ تلو تما سو گئی۔ گلی میں بھی سناٹا ہو گیا۔ ایشور داس چلنے کو تیار ہوا تو مایا بولی۔ ''کیا آپ چلے جائیں گے۔ کیوں نہ آج یہیں سو رہئے۔ مجھے کچھ ڈر لگ رہا ہے۔ آپ باہر کے کمرے میں سو رہیے گا۔ میں اندر آنگن میں سو رہوں گی۔'' ایشور داس نے ایک لمحہ تک سوچ کر کہا۔ ''اچھی بات ہے۔ آپ نے پہلے کبھی نہ کہا کہ آپ کو اس مکان میں ڈر لگتا ہے ورنہ میں کوئی معتبر سن رسیدہ عورت کو رات کو سونے کے لیے ٹھیک کر دیتا۔''

ایشور داس نے تو کمرے میں آسن جمایا۔ مایا اندر کھانا کھانے لگی لیکن آج اس کے حلق کے نیچے ایک لقمہ بھی نہ اتر سکا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دل پر ایک موہوم دہشت کا غلبہ تھا۔ کہیں ایشور داس جاگ پڑے تو؟ اسے اس وقت کتنی شرمندگی ہوگی۔

مایا نے خنجر کو خوب تیز کر رکھا تھا۔ آج دن بھر اس نے اسے ہاتھ میں لے کر مشق کی تھی۔ وہ اس طرح وارے کرے گی کہ وہ خالی ہی نہ جائے۔ اگر ایشور داس جاگ ہی پڑا تو زخم مہلک ہو گا۔

جب آدھی رات ہو گئی اور ایشور داس کے خراٹوں کی آوازیں کانوں میں آنے لگیں تو مایا خنجر لے کر اٹھی۔ پر اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ خوف اور عزم کشش اور نفرت ایک ساتھ کبھی اسے ایک قدم آگے بڑھا دیتے، کبھی پیچھے ہٹا دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سارا امکان سارا آسمان چکر کھا رہا ہے۔ کمرہ کی ہر ایک چیز گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ مگر ایک لمحہ میں یہ شورش فرو ہو گئی اور دل پر ہراس کا غلبہ ہوا۔ وہ دبے پاؤں ایشور داس کے کمرہ تک آئی۔ پھر اس کے قدم وہیں جم گئے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آہ! میں کتنی کمزور ہوں، جس شخص نے میرا ستیاناس مار دیا' میری ہری بھری کھیتی اجاڑ دی، میرے لہلہاتے ہوئے گلزار کو ویران کر دیا، مجھے ہمیشہ کے لیے آگ کے جلتے ہوئے کنڈوں میں ڈال دیا، اس سے میں خون کا انتقام نہیں لے سکتی۔ وہ میری ہی بہنیں تھیں جو تلوار اور بندوق لے کر میدان میں لڑی تھیں۔ دہکتی ہوئی چتا میں ہنستے ہنستے بیٹھ جاتی تھیں۔ اسے اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ مسٹر ویاس سامنے کھڑے ہیں اور اسے آگے بڑھنے کی تحریک کر رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں، کیا تم میرے خون کا انتقام نہ لو گی۔ میری روح انتقام کے لیے تڑپ رہی ہے۔ کیا اسے ازل تک یونہی تڑپاتی رہو گی؟ کیا یہی شرطِ وفا تھی؟ ان خیالات نے مایا کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ اس کی آنکھیں خون کی طرح سرخ ہو گئیں۔ ہونٹ دانتوں کے نیچے دب گئے اور خنجر کے قبضہ پر مٹھی بندھ گئی۔ سفاکانہ جنون کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے کمرہ کے اندر قدم رکھا مگر ایشور داس کی آنکھیں کھل گئی تھیں۔ کمرہ میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ مایا کی آہٹ پا کر وہ چونکا اور سر اٹھا کر دیکھا تو خون سرد ہو گیا۔ مایا قہر کی مورت بنی ہاتھ میں برہنہ شمشیر لیے اس کی طرف چلی آ رہی تھی۔

وہ چارپائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور گھبرا کر بولا۔ "کیا ہے بہن؟ یہ تلوار کیوں لیے ہوئے ہو؟"

مایا نے کہا۔ "یہ تلوار تمہارے خون کی پیاسی ہے کیونکہ تم نے میرے شوہر کو قتل کیا ہے۔"

ایشور داس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ بولا۔ "میں نے!"

"ہاں تم نے۔ تمہیں نے لاہور میں میرے شوہر کو قتل کیا۔ جب وہ ایک مقدمہ کی پیروی کرنے گئے تھے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو۔ میرے شوہر کی روح نے خود تمہارا پتہ بتلایا ہے۔"

"تو تم مسٹر ویاس کی بیوی ہو؟"

"ہاں، میں ان کی بدنصیب بیوی ہوں اور تم میرا سہاگ لوٹنے والے ہو۔ گو تم نے میرے اوپر احسان کیے ہیں لیکن احسان سے میرے دل کی آگ نہیں بجھ سکتی۔ وہ تمہارے خون ہی سے بجھے گی۔"

ایشور داس نے مایا کی طرف التجا آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "اگر آپ کا یہی فیصلہ ہے تو لیجئے یہ حاضر ہے۔ اگر میرے خون سے آپ کے دل کی آگ بجھ جائے تو میں خود اسے آپ کے قدموں پر گرا دوں گا لیکن جس طرح آپ میرے خون سے اپنی تلوار کی پیاس بجھانا اپنا فرض سمجھتی ہیں، اسی طرح میں نے بھی مسٹر ویاس کو قتل کرنا اپنا فرض سمجھا۔ آپ کو معلوم ہے، وہ ایک سیاسی مقدمے کی پیروی کرنے لاہور گئے تھے لیکن مسٹر ویاس نے جس طرح اپنی اعلیٰ قانونی لیاقت کا استعمال کیا، پولیس کو فرضی شہادتوں کے تیار کرنے میں جس طرح مدد دی، جس بے رحمی اور بے دردی سے بے کس اور زیادہ تر بے گناہ نوجوانوں کو تباہ کیا، وہ میرے صبر کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ان دنوں عدالت میں تماشائیوں کا بے انتہا ہجوم رہتا تھا۔ سبھی عدالت سے مسٹر ویاس کو نفرین کرتے ہوئے

جاتے تھے۔ میں تو مقدمہ کی حقیقت سے واقف تھا، اس لیے میرا ضمیر محض نفرت کے اظہار سے تسکین نہ حاصل کر سکتا تھا۔ میں آپ سے کیا عرض کروں، مسٹر ویاس نے دیدہ دانستہ باطل کو حق ثابت کیا اور کتنے ہی گھرانوں کو بے چراغ کر دیا۔ آج کتنی ہی مائیں اپنے بیٹوں کے لیے خون کے آنسو رو رہی ہیں۔ کتنی ہی رنڈاپے کی آگ میں جل رہی ہیں۔ پولیس کتنی ہی زیادتیاں کرے، ہم پروا نہیں کرتے۔ اس کے سوا ہم پولیس سے اور کوئی امید ہی نہیں رکھتے۔ اس میں زیادہ تر جاہل، شہدے، لچے بھرے ہوئے ہیں۔ سرکار نے اس محکمہ کو قائم ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ رعایا کو تنگ کرے مگر وکیلوں سے ہم انصاف کی امید رکھتے ہیں۔ ہم ان کی عزت کرتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ بیدار مغز ہوتے ہیں۔ جب ایسے آدمیوں کو ہم پولیس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بنا ہوا دیکھتے ہیں تو ہمارے غصہ کی انتہا نہیں رہتی۔ میں مسٹر ویاس کا مداح تھا مگر جب میں نے انہیں بے گناہ ملزموں سے جبراً جرم کا اقبال کراتے دیکھا تو مجھے ان سے نفرت ہو گئی۔ غریب ملزم رات رات بھر الٹے لٹکائے جاتے تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ اپنا جرم جو انہوں نے نہیں کیا، اقبال کر لیں۔ ان کی ناک میں لال مرچ کا دھواں ڈالا جاتا تھا۔ مسٹر ویاس یہ ساری بدعتیں محض اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہی نہیں تھے بلکہ انہیں کے ایما سے یہ کی جاتی تھیں۔"

مایا کے چہرہ کی تندی غائب ہو گئی۔ اس کی جگہ جائز غصہ کی حرارت پیدا ہوئی۔ بولی "اس کا آپ کے پاس کوئی ثبوت ہے کہ انہوں نے ملزمین پر ایسی سختیاں کیں؟"

"یہ ساری باتیں عام طور پر مشہور تھیں۔ لاہور کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ میں نے خود آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے سوا میں اور کیا ثبوت دے سکتا ہوں۔ ان غریبوں کا محض اتنا قصور تھا کہ وہ ہندوستان کے سچے دوست تھے۔ اپنا سارا وقت رعایا کی تعلیم اور خدمت میں صرف کرتے تھے۔ خود فاقے کرتے تھے۔ رعایا پر پولیس اور حکام کو سختیاں نہ ہونے دیتے تھے۔ یہی ان کا گناہ تھا اور اسی گناہ کی سزا دلانے میں ویاس پولیس کے داہنے ہاتھ بنے ہوئے تھے۔"

مایا کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، بولی۔ "مجھے نہ معلوم تھا کہ وہ ایسی حرکتیں بھی کر سکتے ہیں۔"

ایشور داس نے کہا۔ "یہ نہ سمجھئے کہ میں آپ کی تلوار سے ڈر کر وکیل صاحب پر جھوٹے الزام لگا رہا ہوں۔ میں نے کبھی زندگی کی پروا نہیں کی۔ میرے کون رونے والا بیٹھا ہے جس کے لیے زندگی کی پروا کروں۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ میں نے خون ناحق کیا ہے تو آپ اس تلوار کو اٹھا کر اس زندگی کا خاتمہ کر دیجئے۔ میں ذرا بھی نہ جھجھکوں گا۔ اگر آپ تلوار نہ اٹھا سکیں تو پولیس کو اطلاع دے دیجئے۔ وہ بڑی آسانی سے مجھے دنیا سے رخصت کر سکتی ہے۔ ثبوت مل جانا مشکل نہ ہو گا۔ میں خود پولیس کے روبرو اپنے جرم کا اقبال کر لیتا مگر میں اسے جرم نہیں سمجھتا۔ اگر ایک جان کے جانے سے سینکڑوں جانیں بچ جائیں تو وہ خون نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے زندہ رہنا چاہتا ہوں کہ شاید کسی ایسے ہی موقع پر پھر میری ضرورت پڑے۔"

مایا نے رقت کے ساتھ کہا۔ "اگر تمہارا بیان صحیح ہے تو میں اپنا خون معاف کرتی ہوں۔ تم نے جا کیا یا بے جا کیا، اس کا فیصلہ ایشور کریں گے۔ تم سے میری درخواست ہے کہ میرے شوہر کے ہاتھوں جو گھر تباہ ہوئے ہیں، ان کا مجھے پتہ بتلا دو شاید میں ان کی خدمت کر سکوں۔"

انسان کا مقدم فرض

(1)

ہولی کا دن تھا۔ لڈو کے شیدائی اور رس گلے کے فدائی پنڈت موٹے رام شاستری اپنے صحن میں ایک ٹوٹی چارپائی پر سر جھکائے، فکر و غم کا مجسمہ بنے بیٹھے ہیں۔ ان کی اہلیہ ان کے قریب بیٹھی ہوئی ان کی جانب سچی ہمدردی کی گاہوں سے دیکھ رہی ہے اور اپنی شیریں کلامی سے شوہر کے آتش غم کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔

پنڈت جی نے بہت دیر تک فکر میں غرقاب رہنے کے بعد مایوسانہ لہجہ میں کہا۔ ”نصیبا سرا نہ جانے یوں جا کر سو گیا۔ ہولی کے دن بھی نہ جاگا۔“

پنڈتائی۔ ”دن ہی برے آ گئے ہیں۔ یہاں تو جون دن سے تمہارا حکم پاوا وہی گھری سے سانجھ سبیرے ونوں جون سورج نارائن سے یہی بردان مانگا کرت ہے کہ کہوں سے بلاوا آوے۔ سینکڑوں دیا تلسی مائی کو چڑھاوا مدا سب سوئے گئے۔ گاڑھ پرے پر وہ کام نہیں آوت ہے۔“

موٹے رام۔ ”کچھ نہیں، یہ دیوی دیوتا سب نام کے ہیں۔ ہمارے بکھت (وقت) پر کام آویں تب ہم انیں کہ ہیں کوئی دیوی دیوتا، مفت میں مال پوا اور حلوا کھانے والے تو بہت ہیں۔“

پنڈتائی۔ ”کا سہر بھر، اب کُوؤ بھلا مانس ناہیں رہا؟ سب مر گئے؟“

موٹے رام۔ ”سب مر گئے بلکہ سڑ گئے۔ دس پانچ ہیں تو سال بھر میں دو ایک بار جیتے ہیں۔ وہ بھی بہت ست کی تو روپے کی تین سیر مٹھائی کھلا دی۔ میرا بس چلتا تو سبھوں کو سیدھے کالے پانی بھجوا دیتا۔ یہ سب اسی آریہ اج کی کرنی ہے۔“

پنڈتائی۔ ”تم ہو تو گھر ماں بیٹھے رہت ہو۔ اب اِی (اس) جمانہ (زمانہ) میں ایسا کوئی دانی ناہیں ہے کہ گھر ٹھے نیوتا بھیج دے۔ کبھوں کبھوں (کبھی کبھی) جبان (زبان) لڑا دیا کرو۔“

موٹے رام۔ ”تم کیسے جانتی ہو کہ میں نے زبان نہیں لڑائی۔ ایسا کون رئیس اس شہر میں ہے جس کے اں جا کر میں نے آشیر باد نہ دیا ہو مگر کون سسرا سنتا ہے۔ سب اپنے اپنے رنگ میں مست ہیں۔“

اتنے میں پنڈت چنتامن نے قدم رنجہ فرمایا۔ یہ پنڈت موٹے رام جی کے خاص دوست تھے۔ ہاں عمر کچھ تھی اور اسی کے مطابق ان کی توند بھی اتنی بارونق اور خوشنما نہ تھی۔

موٹے رام۔ ”کہو دوست، کیا سماچار (خبر) لائے؟“

چنتامن۔ ”ڈول نہیں اپنا سر ہے۔ اب وہ نصیبا ہی نہیں رہا۔“

موٹے رام۔ ”گھر ہی سے آ رہے ہو؟“

چنتامن۔ ”بھائی، ہم تو سادھو ہو جائیں گے۔ جب اس جینے میں کوئی سکھ ہی نہیں رہا تو جی کر کیا کریں؟ اب بتاؤ کہ آج کے دن جب بڑھیا چیزیں نہ ملیں تو کوئی کیسے جئے؟“

موٹے رام۔ ”ہاں بھائی، بات تو واجبی کہتے ہو۔“

چنتا من۔ ''تو اب تمہارا کیا کچھ نہ ہو گا؟ صاف صاف کہو، ہم سنیاس لے لیں۔''
موٹے رام۔ ''نہیں یار، گھبراؤ مت۔ جانتے نہیں ہو کہ مرے بنا (بغیر) سورگ نہیں ملتا۔ تر مال کھانے کے لیے کٹھن تپسیا (ریاضت) کرنی پڑتی ہے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ چلو ابھی گنگا کنارے چلیں اور وہاں بیاکھیان (لکچر) دیں۔ کون جانے کسی بھلے مانس کے آتما جاگ پڑے۔''
چنتا من۔ ''ہاں، بات تو اچھی ہے۔ چلو چلیں۔''
دونوں اٹھ کر گنگا جی کی طرف چلے۔ صبح کا وقت تھا۔ ہزاروں آدمی نہا رہے تھے۔ کوئی پوجا پاٹ کرتا تھا۔ کتنے ہی لوگ پنڈوں کی چوکیوں پر بیٹھے تلک لگا رہے تھے۔ کوئی کوئی تو بھیگی دھوتی ہی پہنے گھر جا رہے تھے۔
دونوں مہاتماؤں کو دیکھتے ہی چاروں طرف سے نمسکار، پرنام اور پا لاگن کی آوازیں آنے لگیں۔ دونوں ساتھی ان آوازوں کا مناسب جواب دیتے ہوئے گنگا کے کنارے پر جا پہنچے اور اشنان وغیرہ میں مشغول ہو گئے۔ اس کے بعد ایک پنڈا جی کی چوکی پر بیٹھ کر بھجن گانے لگے۔ یہ ایک ایسی عجیب بات تھی کہ سینکڑوں آدمی وہاں آ کر جمع ہو گئے۔ جب سامعین کی تعداد کئی سو تک پہنچ گئی تو پنڈت موٹے رام جی فخریہ لہجے میں بولے۔ ''اے لوگو! آپ کو معلوم ہے کہ جب برہما جی نے اس مٹ جانے والے سنسار کو بنایا تو برہمنوں کو اپنے منہ سے پیدا کیا۔ کسی کو اس بات میں سُبھا (شبہ) تو نہیں ہے؟''
سامعین۔ ''نہیں مہاراج! آپ بالکل سچ کہتے ہیں۔ آپ کی بات کون کاٹ سکتا ہے۔''
موٹے رام۔ ''تو برہمن برہما جی کے منہ سے نکلے، یہ بالکل ٹھیک ہی ہے۔ اس لیے منہ آدمی کے بدن کا سب سے اچھا انگ (حصہ) اس لیے منہ کو سکھ پہنچانا ہر آدمی کا خاص کام ہے۔ ہے یا نہیں؟ کوئی کاٹتا ہے ہماری بات کو؟ سامنے آئے، ہم اسے شاستر میں دکھا سکتے ہیں۔''
سامعین۔ ''مہاراج! آپ گیانی پرش (آدمی) ہو۔ آپ کی بات کاٹنے کی ہمت کون کر سکتا ہے؟''
موٹے رام۔ ''اچھا تو جب یہ بات پکی ہو گئی کہ منہ کو سکھ پہنچانا ہر آدمی کا دھرم ہے تو کیا یہ دیکھنا کٹھن ہے کہ جو لوگ منہ سے منہ پھیرے ہوئے ہیں، انہیں دکھ ملے گا۔ کوئی کاٹتا ہے اس بات کو؟''
سامعین۔ ''مہاراج! آپ دھنیہ ہو! آپ نیائے شاستر کے پورے پنڈت ہو۔''
موٹے رام۔ ''اب سوال یہ ہوتا ہے کہ منہ کو سکھ کیسے دیا جائے؟ ہم کہتے ہیں، جیسی تم میں بھگتی ہو۔ جیسی تم میں سکت ہو، اس کے بہت ڈھنگ ہیں۔ دیوتاؤں کے گن گاؤ۔ ایشور کی پوجا کرو۔ اچھی سنگت کرو اور کٹھور بچن (سخت بات) نہ بولو۔ ان باتوں سے منہ کو سکھ ملے گا۔ کسی کو مصیبت میں دیکھو تو اسے ڈھارس دو۔ اس سے منہ کو سکھ ملے گا مگر ان سب سے بڑھیا، سب سے اچھا، ایک اور ہی ڈھنگ ہے۔ کوئی آپ میں ایسا ہے جو اسے بتلا دے؟ ہے کوئی؟ بولے۔''
سامعین۔ ''مہاراج، آپ کے سامنے کون منہ کھول سکتا ہے۔ آپ ہی اسے بھی بتائیے۔''
موٹے رام۔ ''اچھا تو ہم چلّا چلّا کر، گلا پھاڑ پھاڑ کر کہتے ہیں کہ وہ ان سب ڈھنگوں سے بڑھ کر ہے۔ اسی طرح جیسے چندرما ان سب تاروں سے بڑھ کر ہے۔''
سامعین۔ ''مہاراج، اب دیر نہ کیجئے۔ یہ کونسا ڈھنگ ہے؟''
موٹے رام۔ ''اچھا سنئے۔ اچھی طرح سنئے۔ وہ ڈھنگ ہے، منہ کو بڑھیا کھانے کھلانا، اسے اچھی اچھی

بیزیں دینا۔ کوئی کاٹتا ہے، ہماری بات کو؟ آیئے ہم اسے ویدوں سے ثابت کر دیں۔"
ایک شخص نے اعتراض کیا۔"یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سچ بولنے سے مٹھائیاں کھانا کیونکر منہ کے لیے یادہ سکھ پہنچانے والا ہو سکتا ہے۔؟"
کئی آدمیوں نے کہا...... "ہاں ہاں، ہمیں بھی یہی شک ہے مہاراج! اس شک کو مٹائیے۔"
موٹے رام۔"اور کسی کو کچھ کچھ پوچھنا ہے، ہم بہت خوشی سے بتلائیں گے۔ آپ پوچھتے ہیں کہ بڑھیا یزوں کو کھانا کس طرح سچ بولنے سے زیادہ سکھ دینے والا ہے؟ میرا جواب ہے کہ پہلا روپ پرگٹ (ظاہر) ہے اور وسرا چھپا ہوا ہے۔ مثلاً مان لو کہ میں نے کوئی جرم کیا نہیں تھا تو اس کا یہ ڈنڈ مجھے اچھی راہ پر نہ لا سکے گا۔ میں کوئی رشی ہیں ہوں، میں مایا میں پھنسا ہوا کم درجہ کا آدمی ہوں۔ مجھ پر اس سزا ان کا کوئی اثر نہ ہو گا۔ میں حاکم کے سامنے سے ہٹتے ہی پھر اسی بری راہ پر چلنے لگوں گا۔ میری بات میں سمجھ میں آتی ہے؟ کوئی اسے کاٹتا ہے؟"
سامعین۔"مہاراج! آپ ودیا کے ساگر ہیں۔ آپ پنڈتوں کے سرتاج ہو۔ آپ کو دھنیہ ہے۔"
موٹے رام۔"اچھا، اب اسی بات کو لے کر پھر دیکھو۔ حاکم نے مجھے بلا کر جلد ہی جیل میں ڈال دیا اور وہاں مجھے رح طرح کے کشت (تکلیف) دیئے گئے۔ اب جب میں چھوٹوں گا تو برسوں تک تکلیفوں کو یاد کرتا رہوں گا اور شاید ری راہ پر چلنا چھوڑ دوں گا۔ آپ پوچھیں گے کہ ایسا کیوں ہے؟ ڈنڈ (سزا) دونوں ہی ہیں تو کیوں ایک کا اثر پڑتا ہے اور وسری کا نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ایک کا روپ دکھلاتا ہے اور دوسرے کا چھپا ہوا ہے۔ سمجھے آپ لوگ۔"
سامعین۔"دھنیہ ہو مہاراج! آپ کو ایشور نے بڑی بُدھی دی ہے۔"
موٹے رام۔"اچھا تو اب آپ پوچھیں گے کہ بڑھیا چیز کہتے کس کو ہیں؟ میں اسے بتلاتا ہوں۔ جیسے ھگوان نے طرح طرح کے رنگ آنکھوں کے لیے بنائے، اسی طرح منہ کے لیے بھی بہت سے ذائقوں کو بنایا مگر ان ب میں بڑھیا کون ہے؟ یہ اپنی اپنی پسند ہے لیکن ویدوں اور شاستروں میں میٹھا ذائقہ سب سے اچھا مانا گیا ہے۔ دیوتا گ اسی پر مست ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ سب کے مالک نارائن بھی میٹھی چیزوں ہی کو زیادہ پسند کرتے۔ کوئی ایسے یوتا کا نام بتا سکتا ہے جو نمکین چیزیں کھاتا ہو؟ ہے کوئی جو ایسے ایک بھی دیوتا کا نام بتا سکے؟ کوئی نہیں ہے۔ اسی طرح ھٹے، کڑوے، کسیلے، ذائقے بھی دیوتاؤں کو پسند نہیں۔"
سامعین۔"مہاراج آپ کی بُدھی کا پارادار نہیں۔"
موٹے رام۔"تو یہ ثابت ہو گیا کہ میٹھی چیزیں سب میں بڑھیا ہیں۔ اب آپ پھر پوچھیں گے کہ کیا سبھی ھی چیزوں سے منہ کو ایک ہی طرح کا مزہ ملتا ہے۔ اگر میں "ہاں" کہوں تو آپ چلّا اٹھو گے کہ پنڈت جی، تم باؤلے ۔ اس لیے میں کہوں گا "نہیں" اور بار بار "نہیں" سب مٹھائیاں ایک سی اچھی نہیں ہوتیں۔ گڑ اور شکر میں بہت رق ہے۔ اس لیے منہ کو سکھ دینے کے لیے ہمارا دھرم ہے کہ ہم بڑھیا سے بڑھیا مٹھائیاں کھائیں اور کھلائیں۔ میرا اپنا یال ہے کہ آپ کے تھال میں جونپور کی امرتیاں، آگرہ کے موتی چور، متھرا کے پیڑے، بنارس کی قلاقند، لکھنؤ کے ن گلے، اجودھیا کے گلاب جامن اور دلی کا حلوا سوہن ہو۔ وہ ایشور کے بھوگ کے لائق ہے۔ دیوتا لوگ ان پر مست ہو ئیں گے اور جو دل اور ہمت والا آدمی ایسے بڑھیا تھال براہمنوں کو کھلائے گا، اسے ضرور سورگ ملے گا۔ اگر آپ کا ایسا شواس ہے تو ہم آپ سے ہٹ کے ساتھ کہیں گے کہ اپنا دھرم ضرور نبھایئے، نہیں تو آدمی بننے کا نام نہ لیجیے۔"
پنڈت موٹے رام کی تقریر ختم ہو گئی۔ تالیاں بجنے لگیں۔ کچھ لوگوں نے اس دھرم اور گیان بھرے

اپدیش سے خوش ہو کر ان پر پھول برسائے۔ اس وقت چنتا من نے بھی یوں گلفشانی کی:

"دھرماتمالوگو! آپ نے میرے دوست پنڈت موٹے رام جی کی بڑھیا باتیں سنیں اور اب میرے کھڑے ہونے کی ضرورت نہ تھی مگر جہاں میں ان کی اور سبھی باتوں کو مانتا ہوں، وہاں میں ان کی کچھ باتوں کو نہیں بھی مانتا۔ میری رائے میں اگر آپ کے تھال میں صرف جونپور کی امرتیاں ہوں تو وہ "پنچ میل" مٹھائیوں سے کہیں بڑھ کر سکھ اور سوداد ینے والی ہوں گی۔ اسے میں شاستر سے ثابت کر سکتا ہوں۔"

موٹے رام جی نے ناراض ہو کر کہا۔ "تمہاری یہ رائے ٹھیک نہیں ہے۔ آگرہ کے موتی چور اور دلی کے حلواسوہن کے سامنے جونپور کی امرتیوں کی کوئی گنتی ہی نہیں ہے۔"

چنتا۔ "ثابت کیجئے۔"

موٹے رام۔ "آنکھوں دیکھی بات کا ثابت کرنا کیا؟"

چنتا۔ "یہ تمہارا مورکھ پن ہے۔"

موٹے رام۔ "تم جنم بھر کھاتے ہی رہے مگر کھانا نہ آیا۔"

اس پر چنتا من نے موٹے رام پر اپنی آسنی کا وار کیا۔ شاستری جی نے وار خالی کیا اور چنتا من کی طرف مست ہاتھی کی طرح دوڑ پڑے مگر حاضرین نے دونوں مہاتماؤں میں بیچ بچاؤ کر دیا۔

مندر

(1)

مہر مادری تجھے آفرین ہے! دنیا میں اور جو کچھ ہے، باطل ہے، ہیچ ہے۔ مہر مادری ہی حق ہے۔ غیر فانی ہے۔ لازوال ہے۔ تین روز سے سکھیا کے منہ میں نہ اناج کا ایک دانہ گیا تھا اور نہ ہی پانی کا ایک قطرہ۔ سامنے پُوال پر ماں کا ننھا سا لال پڑا کراہ رہا تھا۔ آج تین روز سے اس نے آنکھیں نہ کھولی تھیں۔ ماں اسے کبھی گود میں اٹھا لیتی۔ کبھی پوال پر سلا دیتی۔ ہنستے کھیلتے بچے کو دفعتاً کیا ہو گیا، یہ کوئی نہ بتا تا تھا۔ ایسی حالت میں ماں کو بھوک اور پیاس کہاں؟ ایک دفعہ ایک گھونٹ پانی منہ میں لیا مگر اسے حلق سے نیچے نہ اتار سکی۔ اس دکھیا کی مصیبت کی کوئی حد نہ تھی۔ ایک دن کے اندر وہ اپنے دو بچے گنگا کے سپرد کر چکی تھی۔ شوہر کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا۔ اب اس بدنصیب کی زندگی کا سہارا جو کچھ تھا، یہی بچہ تھا، ہائے کیا ایشور اسے بھی اس کی گودی سے چھین لینا چاہتا ہے؟ یہ سوچتے ہی ماں کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ اس بچہ کو وہ لمحہ بھر کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑتی تھی۔ اسے ساتھ لے کر گھاس چھیلنے جاتی تھی۔ گھاس بیچنے بازار جاتی تو بچہ اس کی گودی میں ہوتا۔ سکھیا نے اس کے لیے ایک چھوٹی سی کھرپی سی کھانچی بنوا دی تھی۔ جیاون ماں کے ساتھ گھاس چھیلتا اور فخر سے کہتا۔ "اماں! ہمیں بڑی سی کھرپی بنوا دو، ہم بہت سی گھاس چھیلیں گے۔ تم دروازے ماچی پر بیٹھے رہنا، اماں! میں گھاس بیچ لاؤں گا۔" ماں پوچھتی۔ "ہمارے لیے کیا لاؤ گے

بیٹا؟" جیاون سرخ سرخ ساڑھیوں کا وعدہ کرتا، اپنے لیے بہت سا گڑ بھی لانا چاہتا۔ وہی بھولی بھالی باتیں، اس وقت یاد آ آ کر ماں کے دل میں نشتر سی چبھ رہی تھیں۔ جو بچہ کو دیکھتا، یہی کہتا کہ کسی کی ڈیٹھ ہے مگر کس کی ڈیٹھ ہے؟ اس بیوہ کا بھی دنیا میں کوئی بیری ہے؟ اگر اس کا نام معلوم ہو جاتا تو سکھیا جا کر اس کے پیروں پڑتی اور بچہ کو اس کی گود میں ڈال دیتی، کیا اس کا دل رحم سے نہ پگھل جاتا؟ مگر نام کوئی نہیں بتاتا۔ ہائے کس سے پوچھے؟ کیا کرے۔

(2)

تین پہر رات گزر چکی تھی۔ سکھیا کا متفکر اور بے قرار دل جگہ جگہ دوڑ رہا تھا۔ کس دیوی کی پناہ لے؟ کس دیوتا کی منت مانے؟ اسی سوچ میں پڑے پڑے اسے ایک جھپکی آ گئی۔ کیا دیکھتی ہے کہ اس کا شوہر آ کر بچہ کے سرہانے کھڑا ہو جاتا ہے اور بچہ کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہتا ہے۔

"رو مت سکھیا! تیرا بچہ اچھا ہو جائے گا۔ کل ٹھاکر جی کی پوجا کر دے۔ وہی تیرے سہائے ہوں گے۔"

سکھیا کی آنکھ کھل گئی۔ ضرور ہی اس کا شوہر آیا تھا۔ اس میں سکھیا کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا۔ ان کو اب میری سدھ ہے۔ یہ سوچ کر اس کا دل امید سے معمور ہو گیا۔ فرط عقیدت و محبت سے اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ اس نے بچہ کو گودی میں اٹھا لیا اور آسمان کی طرف تاکتی ہوئی بولی۔ "بھگوان! میرا بچہ اچھا ہو جائے، میں تمہاری پوجا کروں گی۔ اناتھ بیدھوا پر دیا کرو۔"

اسی وقت جیاون کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس نے پانی مانگا۔ ماں نے دوڑ کر کٹورے میں پانی لیا اور بچہ کو پلا دیا۔

جیاون نے پانی پی کر کہا۔ "اماں، رات ہے کہ دن؟"

سکھیا۔ "ابھی تو رات ہے بیٹا، تمہارا جی کیسا ہے؟"

جیاون۔ "اچھا ہے اماں، اب میں اچھا ہو گیا۔"

سکھیا۔ "تمہارے منہ میں گھی شکر ہو بیٹا۔ بھگوان کریں تم جلد اچھے ہو جاؤ۔ کچھ کھانے کو جی چاہتا ہے؟"

جیاون۔ "ہاں اماں، تھوڑا سا گڑ دے دو۔"

سکھیا۔ "گڑ مت کھاؤ بھیا۔ نکسان کرے گا۔ کہو تو کھچڑی بنا دوں؟"

جیاون۔ "نہیں میری اماں! جرا سا گڑ دے دو۔ تمہارے پیروں پڑوں۔"

ماں اس کی ضد کو نہ ٹال سکی۔ اس نے تھوڑا سا گڑ نکال کر جیاون کے ہاتھ میں رکھ دیا اور ہانڈی کو بند ہی کر رہی تھی کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ وہ ہانڈی کو وہیں چھوڑ کر کواڑ کھولنے چلی گئی۔ جیاون نے گڑ کی دو پنڈیاں نکال لیں اور جلد جلد کھا گیا۔

(3)

دن بھر جیاون کی طبیعت درست رہی۔ اس نے تھوڑی کھچڑی کھائی۔ دو ایک بار آہستہ آہستہ دروازہ پر بھی گیا اور ہمجولیوں کے ساتھ کھیل نہ سکنے پر بھی انہیں کھیلتے دیکھ دیکھ کر اس کا جی بہل گیا۔ سکھیا نے سمجھا کہ لڑکا

اچھا ہو گیا۔ دو ایک روز میں جب پیسے ہاتھ میں آ جائیں گے تو وہ ایک دن ٹھاکر جی کی پوجا کرنے جائے گی۔ جاڑے کا دن جھاڑو دینے، نہانے دھونے اور کھانے پینے میں گزر گیا مگر جب شام کے وقت جیاون کی طبیعت پھر بھاری ہو گئی تو سکھیا گھبرا اٹھی۔ معاً دل میں شک پیدا ہوا کہ پوجا میں دیر کرنے ہی سے بچہ پھر مرجھا گیا۔ ابھی تھوڑا دن باقی تھا۔ وہ بچہ کو لٹا کر پوجا کا سامان کرنے لگی۔ پھول تو زمیندار کے باغیچہ میں مل گئے۔ تلسی کا درخت دروازہ پر ہی تھا مگر ٹھاکر جی کے بھوک کے لیے کچھ شیرینی بھی تو چاہیے تھی ورنہ گاؤں والوں کو بانٹے گی کیا؟ ٹھاکر جی پر چڑھانے کے لیے بھی ایک آنہ تو ضرور ہی چاہیے۔ سارا گاؤں چھان ڈالا، کہیں پیسے ادھار نہ ملے۔ تب وہ مایوس ہو گئی۔ ہائے رے برے دن، کوئی چار آنے پیسے بھی نہیں دیتا۔ آخر اس نے اپنے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتارے اور دوڑی ہوئی بنیئے کی دکان پر گئی۔ کڑے گروی رکھے، بتاشے لیے اور دوڑی ہوئی گھر آئی۔ پوجا کا سامان فراہم ہو گیا تو اس نے بچہ کو گودی میں اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں پوجا کی تھالی لیے ہوئے مندر کی طرف چلی۔

مندر میں آرتی کا گھنٹہ بج رہا تھا۔ دس پانچ بھگت لوگ کھڑے ہوئے استت کر رہے تھے۔ اتنے میں سکھیا جا کر مندر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

پجاری نے پوچھا۔ ”کیا ہے رے؟ کیا کرنے آئی ہے؟“

سکھیا چبوترے پر آ کر بولی۔ ”ٹھاکر جی کی منوتی مانی تھی مہاراج، سو پوجا کرنے آئی ہوں۔“

پجاری جی تمام دن زمیندار یئے آسامیوں کی پوجا کرتے تھے اور شام صبح ٹھاکر جی کی۔ رات کو مندر ہی میں سوتے تھے۔ مندر ہی میں آپ کا کھانا بھی پکتا تھا۔ جس سے ٹھاکر دوارے کی ساری استر کاری سیاہ پڑ گئی تھی۔ وہ بڑے رحمدل تھے اور عقیدت مآب ایسے کہ خواہ کتنی ہی ٹھنڈ پڑے، کتنی ہی ٹھنڈی ہوا چلے مگر بلا اشنان کیے منہ میں پانی نہ ڈالتے تھے۔ اگر اتنے پر بھی ان کے ہاتھوں اور پیروں میں میل کا موٹا پرت جما ہوا تھا تو اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔ بولے۔ ”تو کیا اندر چلی آوے گی؟ ہو تو چکی پوجا۔ یہاں آ کر بھرشٹ کرے گی؟“

ایک بھگت جی نے فرمایا۔ ”ٹھاکر جی کو پوتر (پاک) کرنے آئی ہے۔“

سکھیا نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”ٹھاکر جی کے چرن چھونے آئی ہوں سرکار، پوجا کی سب سامگری لائی ہوں۔“

پجاری۔ ”کیسی نادانی کی بات کرتی ہے رے، کچھ پاگل تو نہیں ہو گئی ہے؟ بھلا تو ٹھاکر جی کو کیسے چھوئے گی؟“

سکھیا کو اب تک کبھی ٹھاکر دوارے میں جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ حیرت سے بولی۔ ”سرکار! وہ تو سنسار کے مالک ہیں۔ ان کے درسن سے تو پاپی بھی تر جاتا ہے، میرے چھونے سے انہیں کیسے چھوت جائے گی؟“

پجاری۔ ”ارے تو چمارن ہے کہ نہیں رے؟“

سکھیا۔ ”تو بھگوان نے چماروں کو نہیں پیدا کیا ہے؟ چماروں کا بھگوان کوئی اور ہے؟ اس بچہ کی منوتی ہے سرکار!“

اس پر وہی بھگت جی جو اب استت ختم کر چکے تھے، ڈپٹ کر بولے۔ ”مار کر بھگا دو چڑیل کو، بھرشٹ کرنے آئی ہے۔ پھینک دو تھالی والی۔ سنسار میں تو آپ ہی آگ لگی ہوئی ہے۔ چمار بھی ٹھاکر جی کی پوجا کرنے لگیں گے تو دھرتی رہے گی کہ پاتال کو چلی جائے گی۔“

دوسرے بھگت جی بولے۔ ”اب بیچارے ٹھاکر جی کو چماروں کے ہاتھ کا کھانا بھی کھانا پڑے گا۔ اب پرے (قیامت) ہونے میں کوئی کسر نہیں ہے۔“

ٹھنڈ پڑ رہی تھی۔ سکھیا کھڑی کانپ رہی تھی اور یہاں مذہب کے ٹھیکیدار لوگ زمانہ کی حالت پر رائے

زنی کررہے تھے۔ بچہ ٹھنڈ کے مارے ماں کی چھاتی میں گھسا جاتا تھا مگر سکھیا وہاں سے ٹلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دونوں پیر زمین میں گڑ گئے ہیں۔ اس کے دل میں رہ رہ کر ایسا جذبہ پیدا ہوتا تھا کہ وہ جاکر ٹھاکر جی کے قدموں پر گر پڑے۔ ٹھاکر جی کیا انہیں کے ہیں؟ ہم غریبوں کا ان سے کوئی ناتا نہیں ہے؟ یہ لوگ کون ہوتے ہیں روکنے والے؟ مگر یہ خوف تھا کہ کہیں ان لوگوں نے سچ مچ تھالی پھینک دی تو میں کیا کروں گی۔ دل ہی دل میں مسوس کر رہ جاتی تھی۔ یکایک اس کو ایک بات سوجھی۔ وہ وہاں سے کچھ دور جاکر ایک درخت کے نیچے تاریکی میں چھپ رہی اور ان بھگتوں کے چلے جانے کی راہ دیکھنے لگی۔

(4)

آرتی اور استت کے بعد بھگت لوگ بڑی دیر تک بھاگوت کا پاٹھ کرتے رہے۔ دوسری طرف پجاری جی نے چولہا جلایا اور کھانا کھانے لگے۔ چولہے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں ہوں کرتے جاتے تھے اور وقفہ سے اپنی رائے کا اظہار بھی۔ دس بجے رات تک کتھا ہوتی رہی اور دس بجے رات تک سکھیا درخت کے نیچے دھیان لگائے برابر کھڑی رہی۔

آخر بھگتوں نے ایک ایک کرکے گھر کی راہ لی۔ پجاری جی تنہا رہ گئے۔ اس وقت سکھیا جاکر مندر کے برآمدے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ جہاں پجاری جی آسن جمائے دیگچی کا اشتہاء خیز اور شیریں ترانہ سننے میں محو تھے۔ پجاری جی نے آہٹ پاکر گردن اٹھائی تو سکھیا کو کھڑے دیکھا۔ وہ چڑ کر بولے۔ "کیوں ری، تو ابھی یہیں کھڑی ہے؟"

سکھیا نے تھالی زمین پر رکھ دی اور ایک ہاتھ پھیلا کر گداگری کے لہجہ میں کہا...... "مہاراج جی! میں بڑی ابھاگن ہوں۔ یہی بچہ میرے جینے کا سہارا ہے۔ مجھ پر دیا کرو، تین دن سے اس نے سر نہیں اٹھایا۔ تمہیں بڑا جس ہوگا مہاراج۔"

یہ کہتے کہتے سکھیا رونے لگی۔ پجاری جی رحمدل تو تھے مگر چمارن کو ٹھاکر جی کے پاس جانے دینے کے ناشنیدہ گناہِ عظیم کے مرتکب وہ کیسے ہو سکتے تھے؟ نہ جانے ٹھاکر جی اس کی کیا سزا دیں۔ آخر ان کے بھی تو بال بچے تھے۔ کہیں ٹھاکر جی ناراض ہو کر سارا گانوں تباہ کر دیں تو۔ بولے۔ "گھر جاکر بھگوان کا نام لے، تیرا بچہ اچھا ہو جائے۔ میں یہ تلسی دل دیتا ہوں، بچے کو کھلا دے۔ چرنامرت اس کی آنکھوں میں لگا دے۔ بھگوان چاہیں گے تو سب اچھا ہی ہوگا۔"

سکھیا۔ "ٹھاکر جی کے چرنوں پر گرنے دو گے مہاراج جی؟ بڑی دکھیا ہوں، ادھار لے کر پوجا کی سامگری لائی ہوں۔ میں نے کل سپنا دیکھا تھا مہاراج! کہ ٹھاکر جی کی پوجا کر، تیرا بچہ اچھا ہو جائے گا۔ میرے پاس روپیہ ہے، وہ مجھ سے لے لو۔ پر مجھ کو ایک چھین بھر ٹھاکر جی کے چرنوں پر گر لینے دو۔"

اس ترغیب نے پنڈت جی کو ایک لمحہ کے لیے ڈانواڈول کر دیا مگر جہالت کے سبب ایشور کا خوف ان کے دل میں کچھ نہ کچھ باقی تھا۔ سنبھل کر بولے۔ "اری پگلی! ٹھاکر جی بھگتوں کے دل کا بھاؤ دیکھتے ہیں کہ چرن پر گرنا دیکھتے ہیں۔ سنا نہیں ہے کہ من چنگا تو کٹھوت میں گنگا۔ دل میں بھگتی (عقیدت) نہ ہو تو لاکھ کوئی بھگوان کے چرنوں پر گرے مگر کچھ نہ ہوگا۔ میرے پاس ایک جنتر (تعویذ) ہے۔ دام تو اس کا بہت ہے پر تجھے ایک ہی روپیہ میں دے دوں گا۔ اسے بچہ کے گلے میں باندھ دینا، بس کل ہی وہ کھیلنے لگے گا۔"

سکھیا۔ ”تو ٹھاکر جی کی پوجا نہ کرنے دوگے؟“

پجاری۔ ”تیرے لیے اتنی ہی پوجا بہت ہے۔ جو بات کبھی نہیں ہوئی، وہ آج میں کر دوں اور گاؤں پر کوئی آفت آپڑے تو کیا ہو؟ اسے بھی تو سوچ لے۔ تو یہ جنتر لے جا۔ بھگوان چاہیں گے تو رات ہی بھر میں بچہ کا کلیس کٹ جائے گا۔ کسی کی ڈیٹھ لگ گئی ہے۔ ہے بھی تو چلبلا، معلوم ہوتا ہے چھتری ہے۔“

سکھیا۔ ”جب سے یہ بیمار ہوا ہے، میرے پران ہنون میں سمائے ہوئے ہے۔“

پجاری۔ ”بڑا ہونہار لڑکا ہے۔ بھگوان جلادیں، تیرے سارے دکھ درد دور کر دے گا۔ یہاں تو بہت کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ادھر دو تین دن سے نہیں دیکھا تھا۔“

سکھیا۔ ”تو جنتر کو کیسے باندھوں گی مہاراج؟“

پجاری۔ ”میں کپڑے میں باندھ کر دیتا ہوں۔ بس گلے میں پہنا دینا۔ اب تو اس وقت نیا کپڑا کہاں کھوجنے جائے گی۔“

سکھیا نے دو روپے پر کڑے گروی رکھے تھے۔ ایک پہلے ہی بُھن چکا تھا، دوسرا پجاری جی کے نذر کیا اور تعویذ لے کر دل کو بہلاتی ہوئی گھر لوٹ گئی۔

(5)

سکھیا نے گھر پہنچ کر بچہ کے گلے میں تعویذ باندھ دیا مگر جیوں جیوں رات گزرتی تھی‘ اس کا بخار بھی بڑھتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ تین بجتے بجتے اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ تب وہ گھبرا اٹھی اور سوچنے لگی۔ ہائے میں ناحق سکوچ میں پڑی رہی اور بلا ٹھاکر جی کے درسن کیے چلی آئی۔ اگر میں اندر چلی جاتی اور بھگوان کے چرنوں پر گر پڑتی تو کوئی میرا کیا کر لیتا؟ یہی ہوتا کہ لوگ مجھے دھکے دے کر نکال دیتے۔ شاید مارتے بھی مگر میرا مطلب تو پورا ہو جاتا۔ اگر میں ٹھاکر جی کے چرنوں کو اپنے آنسوؤں سے بھگو دیتی اور بچے کو ان کے چرنوں پر ڈال دیتی تو کیا انہیں دیا نہ آتی؟ وہ تو دیالو بھگوان ہیں‘ اناتھوں کے اِچّھا کرتے ہیں۔ کیا مجھ پر دیا نہ کرتے؟ یہ سوچ کر سکھیا کا دل بے چین ہو گیا، نہیں اب دیر کرنے کا موقع نہ تھا۔ وہ ضرور جائے گی اور ٹھاکر جی کے چرنوں پر گر کر روئے گی۔ اس بے کس کے خوفزدہ دل کے لیے اب اس کے سوا کوئی ڈھارس کا ذریعہ نہ تھا۔ مندر کا دروازہ بند ہو گا تو وہ قفل کو توڑ ڈالے گی۔ ٹھاکر جی کیا کسی کے ہاتھوں بک گئے ہیں کہ کوئی انہیں بند کر رکھے؟

رات کے تین بج گئے تھے۔ سکھیا نے بچہ کو کمبل سے ڈھانک کر گود میں اٹھایا، ایک ہاتھ میں تھالی لی اور مندر کی طرف چلی۔ گھر سے باہر نکلتے ہی سرد ہوا کے جھونکوں سے اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ سردی سے پاؤں سن ہوئے جاتے تھے۔ اس پر چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ مسافت دو فرلانگ سے کم کی نہ تھی۔ پگڈنڈی درختوں کے نیچے نیچے گئی تھی۔ کچھ فاصلہ پر داہنے جانب ایک تالاب تھا۔ کچھ فاصلہ پر بانس کی کوٹھیاں۔ تالاب میں ایک دھوبی مر گیا تھا اور بانس کی کوٹھیوں میں چڑیلوں کا اڈا تھا۔ بائیں جانب ہرے بھرے کھیت تھے۔ چاروں طرف ”سن“ کی آواز گونج رہی تھی۔ تاریکی سائیں سائیں کر رہی تھی۔ دفعتاً گیدڑوں نے کرخت اور خوفناک آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ آہ، اگر کوئی اس کو لاکھ روپے بھی دیتا تو بھی وہ اس وقت یہاں نہ آتی مگر مہر مادری سارے خوف و خطر کو مغلوب

کیے ہوئے تھی۔ "ہے بھگوان، سب تمہارا ہی آسرا ہے۔" یہی جپتی ہوئی وہ مندر کی طرف چلی جارہی تھی۔
مندر کے دروازہ پر پہنچ کر سکھیا نے زنجیر ٹٹول کر دیکھی تو قفل لگا ہوا تھا۔ پجاری جی برآمدے سے ملی ہوئی کوٹھڑی میں کواڑ بند کیے سو رہے تھے۔ چاروں طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ سکھیا چبوترے کے نیچے سے ایک اینٹ اٹھالائی اور زور زور سے قفل پر مارنے لگی۔ اس کے ہاتھوں میں نہ جانے اتنی سکت کہاں سے آگئی تھی۔ دو تین ہی ضربوں میں قفل اور اینٹ دونوں ٹوٹ کر چوکھٹ پر گر پڑے۔ سکھیا نے دروازہ کھول دیا اور اندر جانا ہی چاہتی تھی کہ پجاری جی کواڑ کھول کر گھبرائے ہوئے باہر نکل آئے اور "چور چور" کا شور مچاتے گاؤں کی طرف دوڑے۔ جاڑوں میں عموماً پہر رات ہی رہے لوگوں کی نیند کھل جاتی ہے۔ شور سنتے ہی کئی آدمی ادھر ادھر سے لالٹین لیے ہوئے نکل پڑے اور پوچھتے تھے "کہاں ہے کہاں؟ کدھر گیا؟"
پجاری۔ "مندر کا دروازہ کھلا پڑا ہے۔ میں نے کھٹ کھٹ کی آواز سنی۔"
یکایک سکھیا برآمدے سے نکل کر چبوترے پر آئی اور بولی...... "چور نہیں ہے، میں ہوں۔ ٹھاکر جی کی پوجا کرنے آئی تھی۔ ابھی تو اندر گئی بھی نہیں، تمام ہلہ (شور) مچادیا۔"
پجاری نے کہا۔ "اب غضب ہو گیا، سکھیا مندر میں جا کر ٹھاکر جی کو بھرشٹ کر آئی۔"
پھر کیا تھا، کئی آدمی جھلّائے ہوئے لپکے اور سکھیا پر لات گھونسوں کی مار پڑنے لگی۔ سکھیا ایک ہاتھ سے بچے کو پکڑے ہوئی تھی اور دوسرے سے اس کی حفاظت کر رہی تھی۔ یکایک ایک مضبوط ٹھاکر نے اسے اتنی زور سے دھکا دیا کہ بچہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا مگر نہ وہ رویا نہ بولا۔ نہ اس نے سانس لی۔ سکھیا بھی گر پڑی تھی۔ سنبھل کر بچے کو اٹھانے لگی تو اس کے چہرے پر نظر پڑی۔ ایسا معلوم ہوا، گویا پانی میں پرچھائیں ہو۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ بچہ کا ماتھا چھو کر دیکھا، سارا بدن ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ وہ ایک لمبی سانس کھینچ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ اس کا چہرہ غصہ سے تمتما اٹھا۔ اس کی آنکھوں سے انگارے برسنے لگے۔ دونوں مٹھیاں بندھ گئیں۔ دانت پیس کر بولی۔ "پاپیو! میرے بچے کی جان لے کر اب دور کیوں کھڑے ہو؟ مجھے بھی کیوں نہیں اسی کے ساتھ مار ڈالتے؟ میرے چھونے سے ٹھاکر جی کو چھوت لگ گئی۔ پارس کو چھو کر لوہا سونا ہو جاتا ہے۔ پارس لوہا نہیں ہو جاتا۔ میرے چھونے سے ٹھاکر جی بھرشٹ ہو جائیں گے۔ مجھے بنایا تو بھرشت نہیں ہوئے؟ اب بھی ٹھاکر جی کو چھونے نہیں آؤں گی۔ تالے میں بند کر کے رکھو، پہرا بٹھادو۔ ہائے تمہیں دیا چھو بھی نہیں گئی۔ تم اتنے کٹھور (سنگدل) ہو! بال بچے والے ہو کر بھی تمہیں ایک ابھاگن ماں پر دیا نہ آئی! اس پر دھرم کے ٹھیکیدار بنتے ہو! تم سب کے سب ہتھیارے ہو، پورے ہتھیارے ہو! ڈرو مت میں تھانہ پولیس میں نہیں جاؤں گی۔ میرا نیائے بھگوان کریں گے۔ اب انہیں کے دربار میں پھریاد (فریاد) کروں گی۔"
کسی نے چوں نہ کی، کوئی ہلا تک نہیں۔ سب کے سب پتھر کی مورتوں کی طرح سر جھکائے خاموش کھڑے رہے!
اس اثناء میں سارا گاؤں جمع ہو گیا تھا۔ سکھیا نے ایک مرتبہ پھر بچے کی طرف دیکھا۔ منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "ہائے میرا لال!" پھر وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑی۔ روح پرواز کر گئی۔ ماں نے بچے پر جان وار دی!
ماں تُو دھنیہ ہے! تیری سی عقیدت، تیری سی وفا دیوتاؤں میں بھی ہونا امرِ محال ہے!

رام لیلا

(1)

اس طرف ایک مدت سے رام لیلا دیکھنے نہیں گیا۔ بندروں کے بھدے چہرے لگائے، نصف ٹانگوں کا پاجامہ اور سیاہ رنگ کا اونچا کرتہ پہنے آدمیوں کو دوڑتے اور ''ہو ہو'' کرتے دیکھ کر اب ہنسی آتی ہے، مزہ نہیں آتا۔ بنارس کی لیلا زمانہ میں مشہور ہے۔ سنا ہے کہ لوگ اسے دور دور سے دیکھنے آتے ہیں۔ میں بھی بڑے شوق سے دیکھنے گیا مگر مجھے تو وہاں کی لیلا اور کسی بالکل دیہاتی لیلا میں کوئی فرق نہ نظر آیا۔ ہاں، رام نگر کی لیلا میں کچھ ساز و سامان عمدہ ہے۔ راچھسوں اور بندروں کے چہرے پیتل کے ہیں۔ گدائیں بھی پیتل کی ہیں شاید بن باسی بھائیوں کے کمٹ سچے کام کے ہوں لیکن ساز و سامان کے سوا وہاں بھی بجز ''ہو ہو'' کے اور کچھ نہیں۔ پھر بھی لاکھوں آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔

لیکن ایک زمانہ وہ تھا جب مجھے بھی رام لیلا میں لطف آتا تھا۔ لطف تو بہت سبک لفظ ہے، وہ لطف دیوانگی سے کم نہ تھا۔ حسن اتفاق سے اس وقت رام لیلا کا میدان میرے مکان سے بہت کم فاصلہ پر تھا اور جس مکان میں لیلا کرنے والوں کا روپ بھرا جاتا تھا، وہ تو میرے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ دو بجے دن سے بناؤ سنگار ہونا شروع ہو جاتا تھا۔ میں دوپہر ہی سے وہاں جا بیٹھتا اور جس مرحلہ سے دوڑ دوڑ کر چھوٹے موٹے کام کرتا، اس حوصلہ سے تو آج اپنی پنشن لینے بھی نہیں جاتا۔ ایک کوٹھری میں راجکماروں کا سنگار ہوتا تھا۔ ان کے بدن پر ''رام راج'' (سفیدی) پیس کر لگائی جاتی، چہرے پر پاؤڈر ملا جاتا اور پاؤڈر پر سرخ، سبز اور نیلے رنگ کی بندیاں دی جاتی تھیں۔ سارا ماتھا، بھویں، گال اور ٹھوڈی ان بندیوں سے مزین ہو جاتی تھی۔ اس کام میں ایک ہی شخص ہوشیار تھا۔ وہی باری باری سے تینوں مورتوں کا سنگار کرتا تھا۔ رنگ کی پیالیوں میں پانی لانا ''رام راج'' پیسنا، پنکھا جھلنا میرا کام تھا۔ جب ان ساری تیاریوں کے بعد بوان نکلتا تو اس پر رام چندر جی کے پیچھے بیٹھ کر مجھے فخر و مسرت کا جو احساس ہوتا، وہ اب لاٹ صاحب کے دربار میں کرسی پر بیٹھ کر بھی نہیں ہوتا۔ ایک مرتبہ جب ہوم ممبر صاحب نے کونسل میں میری ایک تجویز کی تائید کی تھی، اس وقت مجھے فخر و مسرت کا کچھ ویسا ہی احساس ہوا تھا، ہاں ایک مرتبہ جب میرا بڑا لڑکا نائب تحصیلداری کے لیے نامزد ہوا، اس وقت بھی کچھ اسی طرح کے احساس سے دل پھڑک اٹھا تھا مگر ان میں اور اس طفلانہ احساس کے لطف میں بڑا فرق ہے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس میں جنت میں بیٹھا ہوں۔

نکھاد کی ناؤ لیلا کا دن تھا۔ میں دو چار لڑکوں کے بہکانے میں آکر گلی ڈنڈا کھیلنے لگا تھا۔ آج سنگار دیکھنے نہ گیا۔ بوان بھی نکلا مگر میں نے کھیلنا نہ چھوڑا۔ مجھے اپنا داؤں لینا تھا۔ اپنا داؤں چھوڑنے کے لیے اگر اس سے کہیں زیادہ ایثار کی ضرورت تھی جتنا میں کر سکتا تھا۔ اگر داؤں دینا ہوتا تو میں کب کا بھاگ کھڑا ہوتا لیکن داؤں لینے میں کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔ خیر، داؤں پورا ہوا۔ اگر میں چاہتا تو دھوکا دے کر دس پانچ منٹ اور زچ کر سکتا تھا۔ اس کی کافی گنجائش تھی مگر اب اس کا موقع نہ تھا۔ میں سیدھا نالے کی طرف دوڑا۔ بوان لبِ آب پہنچ چکا تھا۔ میں نے دور سے دیکھا کہ ملاح کشتی لیے آرہا ہے۔ میں دوڑا مگر آدمیوں کے بھیڑ میں دوڑنا مشکل تھا۔ آخر جب میں بھیڑ کو ہٹاتا ہوا اور سخت کوشش سے آگے بڑھتا ہوا گھاٹ پر پہنچا تو نکھاد اپنی کشتی کھول چکا تھا۔ رام چند سے میری کتنی عقیدت

تھی۔ میں اپنے سبق کی پروانہ کر کے انہیں پڑھادیا کرتا تھا کہ وہ فیل نہ ہو جائیں۔ مجھ سے زیادہ عمر والے ہو کر بھی وہ نیچے درجہ میں پڑھتے تھے مگراس وقت وہی رام چند کشتی میں بیٹھے اس طرح منہ پھیرے چلے جاتے تھے۔ گویا مجھ سے ذرا بھی تعارف نہیں۔ نقل میں اصل کی کچھ بو باس آہی جاتی ہے۔ جن کی چتون بھگتوں کے لیے بھی ہمیشہ تیکھی رہے' وہ مجھ پر کیوں التفاف کرتے؟ میں بے قرار ہو کر اس بچھڑے کی طرح کودنے لگا جس کی گردن پر پہلی مرتبہ جُوا رکھا گیا ہو۔ کبھی لپک کر نالے کی طرف جاتا' کبھی کسی مددگار کی تلاش میں پیچھے کی طرف دوڑتا مگر سب کے سب اپنی دھن میں مست تھے۔ میری چیخ وپکار کسی کے کانوں تک نہ پہنچی۔ اس وقت سے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں مگر اس وقت جتنا رنج ہوا اتنا پھر کبھی نہ ہوا۔

میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب رام چندر سے کبھی نہ بولوں گا۔ نہ کبھی کھانے کی کوئی چیز ہی انہیں دوں گا مگر جونہی وہ نالہ کو پار کر کے پل کی طرف سے لوٹے، میں دوڑ کر بوان پر چڑھ گیا اور ایسا خوش ہوا گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی تھی۔

(2)

رام لیلا ختم ہو گئی تھی۔ راج گدی ہونے والی تھی مگر نہ جانے کیوں دیر ہو رہی تھی۔ شاید چندہ کم وصول ہوا تھا۔ ان دنوں رام چندر کی کوئی بات نہ پوچھتا تھا۔ انہیں نہ تو گھر جانے کی اجازت ہی ملتی تھی اور نہ ہی ان کے کھانے پینے ہی کا انتظام ہوتا تھا۔ چوہدری صاحب کے یہاں صرف ایک وقت کے کھانے کا سامان کوئی تین بجے دن کو ملتا تھا۔ بقیہ تمام دن کوئی پانی کو بھی نہ پوچھتا لیکن میری عقیدت ابھی جیوں کی تیوں برقرار تھی۔ میری نگاہوں میں وہ اب بھی رام چندر ہی تھے۔ مکان پر مجھے کھانے کو جو چیز ملتی، اسے لے کر میں رام چندر ہی کو دے آتا۔ انہیں کھلانے میں مجھے جو مسرت ہوتی تھی، وہ خود کھا لینے میں کبھی نہ ہوتی۔ کوئی مٹھائی یا پھل پاتے ہی میں بے تحاشہ چوپال کی طرف دوڑتا۔ اگر رام چندر وہاں نہ ملتے تو انہیں چاروں طرف تلاش کرتا اور جب تک وہ چیز انہیں نہ کھلا دیتا، مجھے چین نہ آتا۔

خیر راج گدی کا دن آیا۔ رام لیلا کے میدان میں ایک بڑا شامیانہ نصب کیا گیا۔ اس کی خوب آرائش کی گئی۔ طوائفوں کا گروہ بھی آپہنچا۔ شام کو رام چندر کی سواری نکلی اور ہر دروازہ پر ان کی آرتی اتاری گئی۔ اپنی اپنی عقیدت کے مطابق کسی نے روپے دیئے، کس نے پیسے۔ میرے والد پولیس کے آدمی تھے۔ پس انہوں نے بلا کچھ پیشکش ہی آرتی اتاری۔ اس وقت مجھے جتنی ندامت محسوس ہوئی، وہ بیان نہیں ہو سکتی۔ اس وقت میرے پاس اتفاقاً ایک روپیہ تھا۔ میرے ماموں صاحب دسہرہ کے قبل آئے تھے اور مجھے ایک روپیہ دے گئے تھے۔ اس روپیہ کو میں نے رکھ چھوڑا تھا۔ دسہرہ کے دن بھی اسے خرچ نہ کر سکا۔ میں نے فوراً وہ روپیہ لا کر آرتی کی تھالی میں ڈال دیا۔ والد صاحب میری طرف غضب آمیز نگاہوں سے دیکھ کر رہ گئے۔ انہوں نے کچھ کہا تو نہیں لیکن منہ ایسا بنا لیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میری اس دیدہ دلیری سے ان کی شان میں فرق آگیا۔ رات کے دس بجتے بجتے اس طواف کا خاتمہ ہوا۔ آرتی کی تھالی روپیوں پیسوں سے بھری ہوئی تھی۔ ٹھیک تو نہیں کہہ سکتا مگر اب ایسا قیاس ہوتا ہے کہ کل 24-25 روپیوں سے کم نہ تھے۔ چوہدری صاحب اس رقم سے کچھ زیادہ ہی خرچ کر چکے تھے۔ انہیں اس کی بڑی فکر ہوئی کہ کسی طرح کم از کم دو سو روپے اور وصول ہو جاویں اور اس کی بہترین ترکیب انہیں یہ معلوم ہوئی کہ رنڈیوں کے ذریعہ محفل میں وصولی ہو۔ جب سب لوگ آکر بیٹھ جاویں اور محفل کا رنگ جم جاوے تو آبادی جان حسن

پرستوں کی کلائیاں پکڑ پکڑ کر ایسے ناز و انداز دکھلائے کہ لوگ شرماتے شرماتے بھی کچھ نہ کچھ دے ہی نکلیں۔ آبادی جان اور چوہدری صاحب میں مشورہ ہونے لگا۔ اتفاقاً میں ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ چوہدری صاحب نے سمجھا ہوگا، یہ لونڈا ابھی کیا سمجھے گا مگر یہاں بفضلہٖ عقل کے پتلے تھے۔ ساری داستان سمجھ میں آتی جا رہی تھی۔

چوہدری۔ "سنو آبادی جان، یہ تمہاری زیادتی ہے۔ ہمارا تمہارا کوئی پہلا سابقہ تو ہے نہیں۔ ایشور نے چاہا تو یہاں ہمیشہ تمہاری آمد و رفت ہی رہے گی۔ اب کے چندہ بہت کم آیا ورنہ میں تم سے اس قدر اصرار نہ کرتا۔"

آبادی۔ "آپ مجھ سے بھی زمیندارانہ چالیں چلتے ہیں، کیوں؟ مگر یہاں حضور کی دال نہ گلے گی۔ واہ روپے تو میں وصول کروں اور مونچھوں پر تاؤ آپ دیں۔ کمائی کا یہ اچھا ڈھنگ نکالا ہے! ایسی کمائی سے تو واقعی آپ تھوڑے دنوں میں بادشاہ ہو جائیں گے۔ اس کے مقابلہ میں زمینداری جھک مارے گی۔ بس کل ہی سے ایک چکلہ کھول دیجئے۔ قسم خدا کی مالامال ہو جایئے گا۔"

چوہدری۔ "تم تو مذاق کرتی ہو اور یہاں قافیہ تنگ ہو رہا ہے۔"

آبادی۔ "تو آپ بھی مجھ سے استادی کرتے ہیں۔ یہاں آپ جیسے کائیوں کو روز انگلی پر نچاتی ہوں۔"

چوہدری۔ "آخر تمہارا انشاء کیا ہے؟"

آبادی۔ "جو کچھ وصول کروں، اس میں نصف میرا اور نصف آپ کا۔ لائیے ہاتھ ماریئے۔"

چوہدری۔ "یہی سہی۔"

آبادی۔ "اچھا تو پہلے میرے سو روپے گنا دیجئے۔ بعد کو آپ حیلہ سازی کرنے لگیں گے۔"

چوہدری۔ "واہ، وہ بھی لو گی اور یہ بھی!"

آبادی۔ "اچھا تو کیا آپ سمجھتے تھے کہ اپنی اجرت چھوڑ دوں گی، بلہاری آپ کی سمجھ کی۔ خوب 'کیوں نہ ہو۔ دیوانہ بکار خویش ہشیار۔"

چوہدری۔ "تو کیا تم نے دگنی فیس لینے کی ٹھانی ہے۔"

آبادی۔ "اگر آپ کو سو دفعہ غرض ہو تو' ورنہ میرے ایک سو روپے تو کہیں گئے نہیں۔ مجھے کیا کتے نے کاٹا ہے جو لوگوں کی جیبوں میں ہاتھ ڈالتی پھروں۔"

چوہدری کی ایک نہ چلی۔ انہیں آبادی جان سے دبنا ہی پڑا۔ ناچ شروع ہوا۔ آبادی جان بلا کی شوخ عورت تھی۔ ایک تو کمسن، اس پر حسین اور اس کی ادائیں تو اس غضب کی تھیں کہ میری طبیعت بھی مست ہوئی جاتی تھی۔ لوگوں کے پہچاننے کا وصف بھی اس میں کچھ کم نہ تھا۔ جس کے سامنے بیٹھ گئی، اس سے کچھ نہ کچھ لے ہی لیا۔ پانچ روپے سے کم تو شاید ہی کسی نے دیئے ہوں۔ والد صاحب کے سامنے بھی وہ جا بیٹھی۔ میں شرم کے مارے گڑے گیا۔ جب اس نے ان کی کلائی پکڑی، اس وقت تو میں سہم اٹھا۔ مجھے یقین تھا کہ والد صاحب اس کا ہاتھ جھٹک دیں گے اور شاید اسے پھٹکار بھی دیں مگر یہ کیا ہو رہا ہے؟ ایشور! میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟ والد صاحب مونچھوں میں ہنس رہے تھے۔ ایسی میٹھی ہنسی ان کے چہرہ پر میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ان کی آنکھیں، نشۂ محبت سے سرشار تھیں۔ ان کا ایک ایک رونگٹا متحرک ہو رہا تھا۔ مگر ایشور نے میری شرم رکھ لی۔ وہ دیکھو، انہوں نے آہستہ سے آبادی جان کے نازک ہاتھوں سے اپنی کلائی چھڑا لی۔ ارے، یہ پھر کیا ہوا؟ آبادی تو ان کے گلے میں بانہیں ڈالے دیتی ہے۔ اب کے والد صاحب ضرور اسے پیٹیں گے۔ چڑیل کو ذرا بھی حیا نہیں۔

ایک صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "یہاں تمہاری دال نہ گلے گی آبادی جان! اور دروازہ دیکھو۔"
بات تو ان صاحب نے میرے دل کی کہی اور بہت مناسب کہی مگر نہ جانے کیوں والد صاحب نے ان کی طرف قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور مونچھوں پر تاؤ دیا۔ منہ سے تو وہ کچھ نہ بولے مگر ان کا بشرہ زبانِ حال سے غصہ بھرے لفظوں میں کہہ رہا تھا تو بنیا، مجھے سمجھتا کیا ہے؟ یہاں ایسے مواقع پر جان تک نثار کرنے کو تیار ہیں! روپے کی تو حقیقت ہی کیا ہے؟ تیرا جی چاہے، آزما لے! تجھ سے دگنی رقم نہ دے ڈالوں تو منہ نہ دکھلاؤں۔ آہ حیرت، اف غضب! ارے زمین تو شق کیوں نہیں ہو جاتی؟ آسمان! تو پھٹ کیوں نہیں پڑتا؟ آہ مجھے موت کیوں نہیں آ جاتی؟ والد صاحب جیب میں ہاتھ ڈال رہے تھے۔ وہ کوئی چیز نکالی اور سیٹھ جی کو دکھلا کر آبادی جان کو دے دی۔ آہ، یہ تو اشرفی ہے! چاروں طرف تالیاں بجنے لگیں۔ سیٹھ جی الّو بن گئے۔ والد صاحب نے کی کھائی، یہ میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ میں نے صرف اتنا دیکھا کہ والد نے ایک اشرفی نکال کر آبادی جان کو دے دی۔ ان کی آنکھوں میں اس وقت ایسی فخر آمیز خوشی تھی۔ گویا انہوں نے حاتم کی قبر پر لات ماری ہو۔ یہی والد صاحب تو ہیں جنہوں نے مجھے آرتی میں ایک روپیہ ڈالتے دیکھ کر میری طرف اس طرح دیکھا تھا گویا مجھے پھاڑ ہی کھائیں گے۔ میرے اس بجا و مناسب برتاؤ سے ان کی شان میں فرق آتا تھا اور اس وقت ایسے نفرت آمیز اور مذموم طرز عمل پر وہ فخر و مسرت سے جامہ میں پھولے نہ سماتے تھے!

بی آبادی جان نے ایک دلربایانہ تبسم کے ساتھ والد صاحب کو سلام کیا۔ پھر وہ آگے بڑھی مگر مجھ سے وہاں نہ بیٹھا گیا۔ بار ندامت سے میرا سر جھکا جاتا تھا۔ اگر میری آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے اس پر کبھی اعتبار نہ ہوتا۔ میں باہر جو کچھ دیکھتا سنتا تھا، اس کی خبر والدہ کے کانوں تک ضرور پہنچا دیتا تھا مگر اس معاملہ کو میں نے ان سے پوشیدہ رکھا۔ میں جانتا تھا کہ انہیں اس بات سے بڑا رنج ہو گا۔
ساری رات گانا ہوتا رہا۔ طبلے کی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ چل کر دیکھوں مگر ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں کسی کو منہ نہ دکھانے جاؤں گا؟ کہیں کسی نے والد صاحب کا تذکرہ کر دیا تو میں کیا کروں گا؟
علی الصبح رام چندر جی کی بدائی (رخصت) ہونے والی تھی۔ میں پلنگ سے اٹھتے ہی آنکھیں ملتا ہوا چوپال کی طرف بھاگا۔ خوف ہو رہا تھا کہ کہیں رام چندر چلے نہ گئے ہوں۔ پہنچا تو دیکھا کہ طائفوں کی سواریاں جانے کے لیے تیار ہیں۔ بیسیوں آدمی حسرت بھرے دلوں کے ساتھ ان کے چاروں طرف جمع ہیں۔ میں نے ان کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔ سیدھا رام چندر کے پاس پہنچا۔ لکشمن اور سیتا بیٹھے رو رہے تھے اور رام چندر کھڑے کندھے پر لوٹا ڈور، ڈالے انہیں سمجھا رہے تھے۔ میرے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ میں نے مغموم لہجہ میں رام چندر سے پوچھا۔ "کیا تمہاری بدائی ہو گئی؟"

رام چندر۔ "ہاں، ہو تو گئی۔ ہماری بدائی ہی کیا؟ چوہدری صاحب نے کہہ دیا جاؤ چلے جاتے ہیں۔"
میں۔ "کیا روپے اور کپڑے نہیں ملے؟"
رام چندر۔ "ابھی نہیں ملے۔ چوہدری صاحب کہتے ہیں کہ اس وقت بچت میں روپے نہیں ہیں، پھر آ کر لے جانا۔"
میں۔ "کچھ نہیں ملا۔"
رام چندر۔ "ایک پیسہ بھی نہیں! کہتے ہیں کچھ بچت نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا تھا، کچھ روپے مل جائیں

گے تو پڑھنے کی کتابیں لے لوں گا، سو کچھ نہ ملا۔ سفر خرچ بھی نہیں دیا۔ کہتے ہیں، کونسا دور ہے، پیدل چلے جاؤ۔''

مجھے ایسا غصہ آیا کہ چل کر چودھری کو آڑے ہاتھوں لوں۔ رنڈیوں کے لیے روپے سواریاں سب کچھ مگر بیچارے رام چندر اور اس کے ساتھیوں کے لیے کچھ بھی نہیں۔ جن لوگوں نے آبادی جان پر دس دس، بیس بیس روپے نچھاور کیے تھے، ان کے پاس کیا انہیں دینے کے لیے دو دو، چار چار آنے پیسے بھی نہیں ہیں؟ والد صاحب نے بھی تو آبادی جان کو ایک اشرفی دی تھی، دیکھوں ان کے نام پر کیا دیتے ہیں۔ میں دوڑا ہوا والد کے پاس گیا۔ وہ کہیں تفتیش پر جانے کو تیار کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر بولے۔ ''کہاں گھوم رہے ہو؟ پڑھنے کے وقت تمہیں سیر سپاٹے کی سوجھتی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''گیا تھا چوپال، رام چند رخصت ہو رہے تھے۔ انہیں چودھری صاحب نے کچھ نہیں دیا۔''

والد۔ ''تو تمہیں اس کی کیا فکر پڑی ہے؟''

میں۔ ''وہ جائیں گے کیسے؟ ان کے پاس سفر خرچ بھی تو نہیں ہے۔''

والد۔ ''کیا کچھ خرچ بھی نہیں دیا، یہ چودھری صاحب کی بے انصافی ہے۔''

میں۔ ''اگر آپ دو روپے دے دیں تو میں انہیں دے آؤں۔ اتنے خرچ سے وہ شاید گھر پہنچ جاویں۔''

والد صاحب نے تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ''جاؤ اپنی کتاب دیکھو، میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

یہ کہہ کر وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اسی روز سے والد صاحب پر سے میرا اعتبار اٹھ گیا۔ میں نے پھر کبھی ان کی ڈانٹ ڈپٹ کی پروا نہیں کی۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ کو مجھے نصیحت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ مجھے ان کی صورت سے نفرت ہو گئی۔ وہ جو کہتے ہیں، ٹھیک اس کے برعکس کرتا۔ اگرچہ اس سے میرا ہی نقصان ہوا مگر اس وقت میرا دل غدارانہ خیالات سے مملو تھا!

میرے پاس دو آنے پیسے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے پیسے اٹھا لیے اور جا کر شرماتے شرماتے رام چندر کو دے دیئے۔ ان پیسوں کو دیکھ کر رام چندر کو جتنی خوشی ہوئی، وہ میرے لیے امید سے زیادہ تھی۔ ایک دم ٹوٹ پڑے گویا پیاسے کو پانی مل گیا۔

وہی دو آنے پیسے لے کر تینوں مورتیں رخصت ہو گئیں۔ میں تنہا ان کو گاؤں کے باہر تک پہنچانے گیا۔

انہیں پہنچا کر لوٹا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے مگر دل میں مسرت کا دریا موجزن تھا۔

دینداری

(1)

دنیا میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی کے نوکر نہ ہوتے ہوئے سب کے نوکر ہوتے ہیں جنہیں کوئی اپنا خاص کام نہ ہونے پر بھی سر اٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی۔ جامد اسی قسم کے آدمیوں میں تھا۔ بالکل بے فکر

کسی سے دوستی، نہ کسی سے دشمنی۔ جو ذرا ہنس کر بولا، اس کا غلام بے دام ہو گیا۔ بے دام کا کام کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بیمار پڑے، وہ بیمار کی تیمار داری کرنے کے لیے حاضر ہے۔ کہیئے تو آدھی رات کو حکیم کے گھر چلا جاوے۔ کسی جڑی بوٹی کی تلاش میں منزلوں کی خاک چھان آوے۔ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی غریب پر ظلم ہوتے دیکھے اور خاموش رہ جاوے۔ پھر خواہ اسے کوئی مار ہی ڈالے۔ وہ حمایت سے باز نہ آتا تھا۔ ایسے صدہا معرکے اس کے سامنے آچکے تھے۔ کانسٹیبلوں سے آئے دن اس کی چھیڑ چھاڑ ہوتی رہتی تھی۔ اسی لیے لوگ اس کو احمق سمجھتے تھے اور بات بھی یہی تھی۔ جو آدمی کسی کا بوجھ بھاری دیکھ کر اس سے چھین کر اپنے سر پر لے لے، کسی کا چھپر اٹھانے یا آگ بجھانے کے لیے کوسوں دوڑا چلا جاوے۔ اسے سمجھدار کون کہے گا؟ خلاصہ یہ کہ اس کی ذات سے دوسروں کو خواہ کتنا ہی نفع پہنچے، اسے خود کوئی نفع نہ پہنچتا تھا حتیٰ کہ دو روٹیوں کے لیے بھی دوسروں کا محتاج تھا۔ دیوانہ تو وہ تھا اور اس کا کام دوسرے لوگ کھاتے تھے۔

(2)

آخر جب لوگوں نے بہت لعنت ملامت کی۔ "کیوں اپنی زندگی خراب کر رہے ہو؟ تم دوسروں کے لیے مرتے ہو، کوئی تمہارا پرسانِ حال بھی ہے؟ اگر ایک روز بیمار پڑ جاؤ تو کوئی چلو بھر پانی نہ دے۔ جب تک لوگوں کی خدمت کرتے ہو، لوگ خیرات سمجھ کر کھانے کو دے دیتے ہیں۔ جس دن آ پڑے گی، کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گا۔" تب جامد کی آنکھیں کھلیں۔ برتن وغیرہ کچھ تھے ہی نہیں۔ وہ ایک روز اٹھا اور کسی طرف چل نکلا۔ دو روز بعد ایک شہر میں جا پہنچا۔ شہر بہت بڑا تھا۔ محل آسمان سے باتیں کرنے والے، سڑکیں کشادہ اور صاف، بازار پر رونق، مسجدوں اور مندروں کی تعداد اگر مکانات سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہ تھی۔ دیہات میں نہ تو کوئی مسجد تھی، نہ کوئی مندر تھا۔ مسلمان ایک چبوترے پر نماز پڑھ لیتے تھے اور ہندو ایک درخت کی جڑ میں پانی ڈال دیتے تھے۔ شہر میں مذہب کا یہ زور دورہ دیکھ کر جامد کی حیرت و مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس کی نگاہوں میں مذہب کی جتنی عزت تھی، اتنی اور کسی دنیاوی شے کی نہ تھی۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ لوگ کتنے باایمان اور راستباز ہیں۔ ان میں کتنا رحم، کتنی دانائی اور کتنی ہمدردی ہوگی۔ جبھی تو خدا نے انہیں اتنی خوشحالی بخشی ہے۔ وہ ہر آنے جانے والے کو عقیدت مندانہ نگاہوں سے دیکھتا اور اس کے آگے ادب سے سر جھکاتا تھا۔ یہاں کے سبھی لوگ اسے فرشتہ صفت معلوم ہوتے تھے۔

گھومتے گھومتے شام ہو گئی۔ وہ تھک کر ایک مندر کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ مندر بہت بڑا تھا۔ اوپر ایک سنہرا کلس چمک رہا تھا۔ جگت پر سنگ مرمر کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے مگر صحن میں جابجا گوبر اور کوڑا پڑا تھا۔ جامد کو گندگی سے نفرت تھی۔ مندر کی یہ حالت دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ کہیں جھاڑو مل جائے تو صاف کر دوں مگر جھاڑو کہیں نظر نہ آیا۔ ناچار ہو کر اس نے اپنے دامن سے چبوترے کو صاف کرنا شروع کیا۔

ذرا دیر میں بھگتوں کا مجمع ہونے لگا۔ انہوں نے جامد کو چبوترہ صاف کرتے دیکھا تو آپس میں گفتگو کرنے لگے۔

"ہے تو مسلمان!"

"مہتر ہو گا۔"

"نہیں، مہتر اپنے دامن سے صفائی نہیں کرتا۔ کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔"

"ادھر کا جاسوس نہ ہو!"
"نہیں، چہرے سے تو بڑا غریب معلوم ہوتا ہے۔"
"حسن نظامی کا کوئی مرید ہوگا۔"
"اجی، گوبر کی لالچ سے صفائی کر رہا ہے۔ کوئی بھٹیارہ ہوگا۔ (جامد سے) گوبر مت لے جانا بے، سمجھا کہاں رہتا ہے؟"
"پردیسی مسافر ہوں صاحب! مجھے گوبر لے کر کیا کرنا ہے؟ ٹھاکر جی کا مندر دیکھا تو آ کر بیٹھ گیا۔ کوڑا پڑا ہوا تھا۔ میں نے سوچا دھرماتما لوگ آتے ہوں، صفائی کرنے لگا۔"
"تم تو مسلمان ہو نہ؟"
"ٹھاکر جی تو سب کے ٹھاکر ہیں، کیا ہندو کیا مسلمان۔"
"تم ٹھاکر جی کو مانتے ہو؟"
"ٹھاکر جی کو کون نہ مانے گا صاحب! جس پیدا کیا، اسے نہ مانوں تو کسے مانوں گا؟"
بھگتوں میں مشورہ ہونے لگا۔
"دیہاتی ہے۔"
"پھانس لینا چاہیے، جانے نہ پاوے۔"

(3)

جامد پھانس لیا گیا، اس کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ ایک ہوادار مکان رہنے کو ملا۔ دونوں وقت عمدہ کھانا ملنے لگا۔ دو چار آدمی ہر وقت اس کے پاس موجود رہتے۔ جامد کو بھجن خوب یاد تھے۔ آواز بھی دلکش تھی۔ روزانہ مندر میں جا کر بھجن گاتا۔ عقیدت کے ساتھ خوش الحانی بھی ہو تو پھر کیا پوچھنا؟ لوگوں پر اس کے گانے کا بڑا اثر پڑتا۔ کتنے ہی لوگ گانا سننے ہی کی لالچ سے مندر آنے لگے۔ سب کو یقین ہو گیا کہ بھگوان نے یہ شکار چن کر بھیجا ہے۔ ایک روز مندر میں بہت سے آدمی جمع ہوئے۔ صحن میں فرش بچھایا گیا۔ جامد کا سر منڈا دیا گیا۔ اسے نئے کپڑے پہنائے گئے۔ ہوم ہوا، جامد کے ہاتھوں سے شیرینی تقسیم کرائی گئی۔ وہ اپنے مددگاروں کی سخاوت و عقیدت کا اور بھی قائل ہو گیا۔ یہ لوگ کتنے شریف ہیں۔ مجھ جیسے پھٹے حال پردیسی کی اتنی خاطر و مدارات! اسی کو سچا مذہب کہتے ہیں۔ جامد کو زندگی میں کبھی اتنا اعزاز نہ ملا تھا۔ یہاں وہی ہرزہ گرد نوجوان جسے لوگ احمق کہتے تھے، بھگتوں کا سردار بنا ہوا تھا۔ صد آدمی صرف اس کے درشن کو آتے تھے۔ اس کی زبردست علمیت کی کتنی ہی داستانیں رائج ہو گئیں۔ اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ ایک بڑے عالم مولوی کی شدھی ہوئی ہے۔ سیدھا سادا جامد اس اعزاز کے راز کو بالکل نہ سمجھتا تھا۔ ایسے دیندار اور ہمدرد لوگوں کی خاطر وہ کیا کچھ نہ کرتا؟ وہ روزانہ پوجا کرتا، بھجن گاتا۔ اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اپنے گانوں میں بھی وہ برابر ست نارائن کی کتھا میں بیٹھا کرتا تھا۔ بھجن کیرتن کیا کرتا تھا۔ فرق یہی تھا کہ دیہات میں اس کی قدر نہ تھی۔ یہاں سب اس کے معتقد تھے۔
ایک روز جامد کئی بھگتوں کے ساتھ بیٹھا ہوا کوئی پُران پڑھ رہا تھا تو کیا دیکھتا ہے کہ سامنے سڑک پر ایک

طاقتور نوجوان پیشانی پر تلک لگائے اور گلے میں جنیو پہنے ایک بوڑھے کمزور آدمی کو مار رہا ہے۔ بوڑھا روتا ہے، گڑگڑاتا ہے اور پیروں پڑ پڑ کر کہتا ہے کہ "مہاراج، میرا قصور معاف کرو" مگر نوجوان کو اس پر ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ جامد کا خون ابل پڑا۔ ایسا منظر دیکھ کر وہ خاموش نہ بیٹھ سکتا تھا۔ وہ فوراً کود کر باہر نکلا اور اس نوجوان کے پاس جا کر بولا۔ "اس بوڑھے کو کیوں مارتے ہو بھائی۔ تمہیں اس پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟"

نوجوان۔ "میں مارتے مارتے اس کی ہڈیاں توڑ دوں گا۔"

جامد۔ "آخر اس نے کیا قصور کیا ہے؟ کچھ معلوم تو ہو۔"

نوجوان۔ "اس کی مرغی ہمارے مکان میں گھس گئی تھی جو سارا مکان گندا کر آئی۔"

جامد۔ "تو کیا اس نے مرغی کو سکھا دیا تھا کہ تمہارا گھر گندا کر آئے؟"

بوڑھا۔ "خداوند! میں تو اسے برابر کھانچے میں ڈھانکے رکھتا ہوں۔ آج غفلت ہو گئی۔ کہتا ہوں، مہاراج! قصور معاف کرو مگر نہیں سنتے حضور! مارتے مارتے ادھ موا کر دیا۔"

نوجوان۔ "ابھی نہیں مارا ہے، اب ماروں گا۔ کھود کر گاڑ دوں گا۔"

جامد۔ "کھود کر گاڑ دو گے بھائی صاحب، تو تم بھی یوں نہ کھڑے رہو گے، سمجھ گئے؟ اگر پھر ہاتھ اٹھایا تو خیریت نہیں۔"

جوان کو اپنی طاقت کا نشہ تھا۔ اس نے پھر بوڑھے کو طمانچہ لگایا مگر طمانچہ پڑنے سے پہلے ہی جامد نے اس کی گردن پکڑ لی۔ دونوں میں کشتی ہونے لگی۔ جامد مضبوط جوان تھا۔ اس نوجوان کو اٹھا کر پٹک دیا تو چاروں شانہ چت گر گیا۔ اس کا گرنا تھا کہ بھگتوں کا مجمع جو اب تک مندر میں بیٹھا تماشہ دیکھ رہا تھا، دوڑ پڑا اور جامد پر چاروں طرف سے چوٹیں پڑنے لگیں۔ جامد کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ لوگ مجھے کیوں مار رہے ہیں۔ کوئی کچھ نہیں پوچھتا۔ اس تلک لگائے ہوئے نوجوان کو کوئی کچھ نہیں کہتا، بس جو آتا ہے، مجھی پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ آخر وہ بے دم ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اس وقت لوگوں میں باتیں ہونے لگیں۔

"دغا دے گیا۔"

"دھت تیری ذات کی! ان ملیچھوں سے بھلائی کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ کوّا کوّوں ہی کے ساتھ ملے گا۔ کمینہ جب کرے گا کمینہ پن! اسے کوئی پوچھتا نہ تھا، مندر میں جھاڑو لگا رہا تھا۔ بدن پر کپڑے کا تار بھی نہ تھا، ہم نے اس کی اتنی عزت کی۔ جانور سے آدمی بنا دیا پھر بھی اپنا نہ ہوا۔"

"ان کے مذہب کی تو جڑ ہی یہی ہے۔"

جامد رات بھر سڑک کے کنارے پڑا ہوا شدت درد سے کراہتا رہا۔ اسے مار کھانے کا غم نہ تھا۔ ایسی تکلیفیں وہ کتنی ہی دفعہ اٹھا چکا تھا۔ اسے رنج و تعجب صرف اس امر کا تھا کہ ان لوگوں نے کیوں ایک دن میری اس قدر عزت کی اور کیوں آج بلاوجہ میری اتنی درگت بنائی؟ ان کی وہ شرافت آج کہاں گئی؟ میں تو وہی ہوں۔ میں نے کوئی قصور بھی نہیں کیا۔ میں نے تو وہی کیا جو ایسی حالت میں سبھی کو کرنا چاہیے۔ پھر ان لوگوں نے مجھ پر کیوں اتنا ظلم کیا؟ فرشتے کیوں شیطان بن گئے؟

وہ رات بھر اسی الجھن میں پڑا رہا۔ علی الصبح اٹھ کر ایک طرف کی راہ لی۔

(4)

حامد ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ وہی بڈھا اسے ملا۔ اس کو دیکھتے ہی وہ بولا۔ ”قسم خدا کی، تم نے میری جان بچالی۔ سنا، ظالموں نے تم کو بری طرح پیٹا۔ میں تو موقع پاتے ہی نکل بھاگا۔ تم اب تک کہاں تھے؟ یہاں لوگ رات ہی سے تم سے ملنے کے لیے بے قرار ہو رہے ہیں۔ قاضی صاحب رات ہی سے تمہیں کھوجنے نکلے تھے مگر تم نہ ملے کل ہم دونوں تنہا پڑ گئے، دشمنوں نے ہمیں پیٹ لیا۔ نماز کا وقت تھا، یہاں سب لوگ مسجد میں تھے۔ اگر ذرا بھی خبر ہو جاتی تو ایک ہزار لٹھ بند پہنچ جاتے۔ اس وقت آٹا دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔ قسم خدا کی، آج سے میں نے تین کوڑی مرغیاں پالی ہیں۔ دیکھوں، پنڈت جی مہاراج اب کیا کرتے ہیں۔ قسم خدا کی، قاضی صاحب نے کہا کہ اگر وہ لونڈا ذرا بھی آنکھیں دکھلاوے تو تم آ کر مجھ سے کہنا۔ یا تو بچہ گھر چھوڑ کر بھاگیں گے یا ہڈی پسلی توڑ کر رکھ دی جاوے گی۔“

حامد کو لیے ہوئے وہ بڈھا قاضی زور آور حسین کے دروازہ پر پہنچا۔ قاضی صاحب وضو کر رہے تھے۔ حامد کو دیکھتے ہی دوڑ کر گلے لگا لیا اور بولے۔ ”واللہ، تمہیں آنکھیں ڈھونڈ رہی تھیں۔ تم نے کل تنہا اتنے آدمیوں کے دانت کھٹے کر دیئے۔ کیوں نہ ہو، مومن کا خون ہے! کافروں کی حقیقت کیا؟ سنا کہ سب کے سب تمہاری شدھی کرنے جا رہے تھے مگر تم نے ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسلام کو ایسے ہی خادموں کی ضرورت ہے۔ تمہی جیسے دیندار سے اسلام کا نام روشن ہے۔ غلطی یہی ہوئی کہ تم نے ایک مہینہ بھر تک صبر نہیں کیا۔ شادی ہو جانے دیتے تب مزہ آتا۔ ایک نازنین ساتھ لاتے اور دولت مفت۔ واللہ تم نے عجلت کر دی۔“

دن بھر عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہا۔ حامد کو ایک نظر دیکھنے کا سب کو شوق تھا۔ سبھی اس کی ہمت، طاقت اور اس کے مذہبی جوش کی تعریف کرتے تھے۔

(5)

ایک پہر رات جا چکی تھی۔ مسافروں کی آمد و رفت کم ہو چلی تھی۔ حامد نے قاضی صاحب سے مذہبی کتاب پڑھنا شروع کیا۔ انہوں نے اس کے لیے اپنی بغل کا کمرہ خالی کر دیا تھا۔ وہ قاضی صاحب سے سبق لے کر آ اور سونے کے لیے جا رہا تھا کہ دفعتاً اسے دروازے پر تانگے کے رکنے کی آواز سنائی دی۔ قاضی صاحب کے مرید اکثر آیا کرتے تھے۔ حامد نے سوچا کوئی مرید آیا ہو گا۔ نیچے آیا تو دیکھا کہ ایک عورت تانگے سے اتر کر برآمدے میں کھڑی ہے اور تانگہ والا اس کا اسباب اتار رہا ہے۔

عورت نے مکان کو ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔ ”نہیں جی، مجھے خوب خیال ہے۔ ان کا مکان یہ نہیں ہے۔ شاید تم بھول گئے ہو۔“

تانگے والا۔ ”حضور تو مانتی ہی نہیں۔ کہہ دیا کہ بابو صاحب نے مکان بدل دیا ہے۔ اوپر چلئے۔“

عورت نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ”بلاتے کیوں نہیں؟ آواز دو۔“

تانگے والا۔ ”او صاحب، آواز کیا دوں؟ جب جانتا ہوں صاحب کا یہی مکان ہے تو فضول چلانے سے کیا فائدہ؟ بچارے آرام کر رہے ہوں گے۔ آرام میں خلل پڑے گا۔ آپ مطمئن رہئے، چلئے، اوپر چلئے۔“

عورت اوپر چلی، پیچھے پیچھے تانگہ والا اسباب لیے ہوئے چلا۔ حامد حیرت زدہ نیچے کھڑا رہا۔ یہ راز اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

تانگہ والے کی آواز سنتے ہی قاضی صاحب چھت پر نکل آئے اور ایک عورت کو آتے دیکھ کر کمرے کی کھڑکیاں چاروں طرف بند کر کے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی تلوار اتار لی اور دروازے پر آکر کھڑے ہو گئے۔

عورت نے زینہ طے کر کے جونہی چھت پر قدم رکھا کہ قاضی صاحب کو دیکھ کر جھجکی۔ وہ فوراً پیچھے کی طرف مڑنا چاہتی تھی کہ قاضی صاحب نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے کمرہ میں گھسیٹ لائے۔ اسی اثناء میں حامد اور تانگے والا یہ دونوں بھی اوپر آگئے تھے۔ حامد یہ نظارہ دیکھ کر متحیر ہو گیا تھا۔ راز اور بھی ناقابلِ فہم ہو گیا تھا۔ یہ علم کا سمندر، یہ انصاف کا مخزن، یہ شریعت، مذہب اور فلسفہ کا معدن اس وقت ایک ناآشنا عورت پر ظلم و تشدد کر رہا ہے۔ تانگہ والے کے ساتھ وہ بھی قاضی صاحب کے کمرہ میں چلا گیا۔ قاضی صاحب تو عورت کے دونوں ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ تانگہ والے نے دروازہ بند کر دیا۔

عورت نے تانگہ والے کی طرف خونیں نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”تو مجھے یہاں کیوں لایا؟“

قاضی نے تلوار چمکا کر کہا۔ ”پہلے آرام سے بیٹھ جاؤ، سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

عورت۔ ”تم تو مجھے کوئی مولوی معلوم ہوتے ہو۔ کیا تمہیں خدا نے یہی سکھلایا ہے کہ پرائی بہو بیٹیوں کو جبراً گھر میں بند کر کے ان کی آبروریزی کرو؟“

قاضی۔ ”ہاں، خدا کا یہی حکم ہے کہ کافروں کو جس طرح ممکن ہو اسلام کے راستہ پر لایا جاوے۔ اگر خوشی سے نہ آویں تو جبر سے۔“

عورت۔ ”اسی طرح اگر کوئی تمہاری بہو بیٹیوں کو پکڑ کر بے آبرو کرے تو؟“

قاضی۔ ”یہ تو ہو ہی رہا ہے۔ جیسا تم ہمارے ساتھ کرو گے۔ ویسا ہی ہم تمہارے ساتھ کریں گے۔ پھر ہم تو بے آبرو نہیں کرتے بلکہ صرف اپنے مذہب میں شامل کرتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے سے آبرو بڑھتی ہے، گھٹتی نہیں۔ ہندو قوم نے تو ہمیں مٹا دینے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ اس ملک سے ہمارا نشان مٹا دینا چاہتی ہے۔ دھوکے سے، لالچ سے، جبر سے۔ مسلمانوں کو بے دین بنایا جا رہا ہے تو کیا مسلمان لوگ بیٹھے منہ تاکا کریں؟“

عورت۔ ”ہندو کبھی ایسا نہیں کرتا۔ ممکن ہے کہ تم لوگوں کی شرارتوں سے تنگ آکر نیچے درجے کے لوگ اس طرح بدلا لینے لگے ہوں مگر کوئی سچا ہندو اسے اب بھی پسند نہیں کرتا۔“

قاضی نے کچھ سوچ کر کہا...... ”بے شک پہلے اس طرح کی شرارتیں مسلمان شہدے کیا کرتے تھے مگر شریف لوگ ان حرکتوں کو برا سمجھتے تھے اور اپنی سکت بھر روکنے کی کوشش کرتے تھے۔ تعلیم اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ کچھ دنوں میں یہ شہداپن ضرور غائب ہو جاتا مگر اب تو ساری ہندو قوم ہمیں نگلنے کے لیے تیار بیٹھی ہوئی ہے۔ پھر ہمارے لیے اور راستہ بھی کون ہے؟ ہم کمزور ہیں۔ اس لیے ہمیں مجبوراً اپنی ہستی قائم رکھنے کے لیے دغا و فریب سے کام لینا پڑتا ہے مگر تم اتنا گھبراتی کیوں ہو۔ تمہیں یہاں کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔ اسلام عورتوں کے حقوق کا جتنا لحاظ کرتا ہے، اتنا اور کوئی مذہب نہیں اور مسلمان مرد تو اپنی بیوی پر جان دیتا ہے۔ میرے نوجوان دوست (حامد) تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔ انہیں کے ساتھ تمہارا نکاح کر دیا جاوے گا۔ بس آرام سے زندگی بسر کرنا۔“

عورت۔ ”میں تمہیں اور تمہارے مذہب کو نفرت کے قابل سمجھتی ہوں۔ تم کتے ہو، اس کے سوا

تمہارے لیے کوئی دوسرا نام نہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ مجھے جانے دو ورنہ میں ابھی شور مچادوں گی اور تمہارا سارا مولوی پن نکل جاوے گا۔"

قاضی۔ "اگر تم نے زبان کھولی تو تمہیں جان سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ بس اتنا سمجھ لو۔"

عورت۔ "آبرو کے سامنے جان کی کوئی حقیقت نہیں۔ تم میری جان لے سکتے ہو مگر آبرو نہیں لے سکتے۔"

قاضی۔ "کیوں بے فائدہ ضد کرتی ہو؟"

عورت نے دروازہ کے پاس جاکر کہا۔ "میں کہتی ہوں دروازہ کھول دو۔"

حامد اب تک چپ چاپ کھڑا تھا۔ جونہی عورت دروازہ کی طرف چلی تو قاضی صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا کہ حامد نے فوراً دروازہ کھول دیا اور قاضی صاحب سے بولا...... "انہیں چھوڑ دیجئے۔"

لیکن جب قاضی صاحب نے اس عورت کا ہاتھ نہ چھوڑا اور تانگے والا بھی اسے پکڑنے کے لیے بڑھا تو حامد نے ایک دھکا دے کر قاضی کو دھکیل دیا اور اس عورت کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کمرہ سے باہر نکل گیا۔ تانگہ والا پیچھے لپکا مگر حامد نے اسے اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ اوندھے منہ جاگرا۔ ایک لمحہ حامد اور عورت دونوں سڑک پر تھے۔

حامد۔ "آپ کا مکان کس محلّہ میں ہے؟"

عورت۔ "یحییٰ گنج میں۔"

حامد۔ "چلیئے، میں آپ کو پہنچا آؤں۔"

عورت۔ "اس سے زیادہ اور کیا مہربانی ہو گی۔ میں آپ کی اس نیکی کو کبھی نہ بھولوں گی۔ آپ نے آج میری آبرو بچالی ورنہ میں کہیں کی نہ رہتی۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ بھلے اور برے سب جگہ ہوتے ہیں۔ میرے شوہر کا نام پنڈت راجکمار ہے۔"

اسی وقت ایک تانگہ سڑک پر جاتا ہوا دکھائی دیا۔ حامد نے عورت کو اس پر بٹھادیا اور خود بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ اوپر سے قاضی صاحب نے حامد پر لٹھ چلادیا جو تانگہ میں آلگا۔ تانگہ روانہ ہو گیا۔

یحییٰ گنج میں پنڈت راجکمار کا پتہ لگانے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ حامد نے جونہی آواز دی۔ وہ گھبرائے ہوئے باہر نکل آئے اور عورت کو دیکھ کر بولے۔ "تم کہاں رہ گئی تھیں اندرا؟ میں نے تو تمہیں سٹیشن پر کہیں نہ دیکھا۔ مجھے پہنچنے میں ذرا دیر ہو گئی تھی۔ تمہیں اتنی دیر کہاں لگی؟"

اندر نے مکان کے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔ "بڑی لمبی داستان ہے۔ ذرا دم لینے دو تو کہوں۔ بس اتنا ہی سمجھ لو کہ آج اگر اس مسلمان نے میری مدد نہ کی ہوتی تو آبرو چلی گئی تھی۔"

پنڈت جی پوری داستان سننے کے لیے اور بھی بے قرار ہو اٹھے۔ اندرا کے ساتھ ہی وہ بھی مکان میں چلے گئے مگر ایک ہی منٹ بعد باہر آکر حامد سے بولے۔ "بھائی صاحب! شاید آپ اسے مبالغہ سمجھیں مگر مجھے اس وقت آپ کی شکل میں اپنے اِشت دیوتا (معبود) کے درشن ہو رہے ہیں۔ میری زبان میں اتنی سکت نہیں کہ آپ کا شکریہ ادا کر سکوں۔ آیئے، بیٹھ جایئے۔"

حامد۔ "جی نہیں، اب مجھے اجازت دیجئے۔"

پنڈت۔ "میں آپ کی اس نیکی کا کیا اجر دے سکتا ہوں؟"

حامد۔ "اس کا اجر یہی ہے کہ اس شرارت کا بدلہ کسی غریب مسلمان سے نہ لیجئے گا۔ آپ سے میری یہی التجا ہے۔"

یہ کہہ کر جامد اٹھ کھڑا ہوا اور اسی اندھیری رات کے سناٹے میں شہر سے باہر نکل گیا۔ اس شہر کی زہریلی ہوا میں سانس لیتے ہوئے اس کا دم گھٹتا تھا۔ وہ جلد سے جلد شہر سے اپنے گاؤں میں پہنچنا چاہتا تھا جہاں مذہب کا نام ہمدردی، محبت اور رفاقت تھا۔ دین اور دینداروں سے اسے نفرت ہو گئی تھی۔

چوری

(1)

ہائے بچپن، تیری یاد نہیں بھولتی! وہ کچا لوٹا گھر، وہ پوال کا بستر۔ وہ برہنہ جسم، برہنہ پا کھیتوں میں گھومنا۔ آم کے درختوں پر چڑھنا۔ ساری باتیں نگاہوں میں پھر رہی ہیں۔ گھتیے جوتے پہن کر اس وقت جتنی خوشی ہوتی تھی، اب فلیکس کے جوتوں سے بھی نہیں ہوتی۔ گرم پتلے رس میں جو لذت تھی، وہ اب گلاب کے شربت میں بھی نہیں۔ چربن اور کچے بیروں میں جو ذائقہ تھا، وہ اب شیر برنج اور انگور میں بھی نہیں ملتا۔

میں اپنے چچازاد بھائی ہلدھر کے ساتھ دوسرے گاؤں میں ایک مولوی صاحب کے یہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔ میری عمر آٹھ سال کی تھی۔ ہلدھر (وہ اب بہشت میں ہے) مجھ سے دو سال بڑے تھے۔ ہم دونوں علی الصبح باسی روٹیاں کھا کر دوپہر کے لیے مٹر اور جو کا چربن لے کر کوئی حاضری کا رجسٹر تو تھا ہی نہیں اور نہ ہی غیر حاضری کا جرمانہ دینا پڑتا تھا۔ پھر خوف کس بات کا؟ کبھی تو تھانہ کے سامنے کھڑے سپاہیوں کی قواعد دیکھتے، کبھی کسی ریچھ یا بندر نچانے والے مداری کے پیچھے پیچھے گھومنے میں دن گزار دیتے۔ کبھی ریلوے سٹیشن کی طرف جاتے اور گاڑیوں کی بہار دیکھتے۔ گاڑیوں کے وقت کا جتنا علم ہم کو تھا، اتنا شاید ٹائم ٹیبل کو بھی نہ تھا۔ راستہ میں شہر کے ایک مہاجن نے ایک باغ لگوانا شروع کیا تھا۔ وہاں ایک کنواں کھد رہا تھا۔ وہ بھی ہمارے لیے ایک دلچسپ تماشہ تھا۔ بڈھا مالی ہمیں اپنی جھونپڑی میں بڑی محبت سے بٹھاتا تھا۔ ہم اس سے جھگڑ جھگڑ کر اس کا کام کرتے۔ کہیں بالٹی لیے پودوں کو سینچ رہے ہیں۔ کہیں کھرپی سے کیارہ گوڑ رہے ہیں۔ کہیں مقراض سے بیلوں کی پتیاں چھانٹ رہے ہیں۔ ان کاموں میں کتنا لطف تھا۔ مالی بچوں کی فطرت کا عالم تھا۔ ہم سے کام لیتا مگر اس طرح کہ گویا ہم پر کوئی احسان کر رہا ہے۔ جتنا کام وہ دن بھر میں کرتا، اسے ہم گھنٹہ بھر میں ختم کر دیتے۔ اب وہ مالی نہیں ہے لیکن باغ ہرا بھرا ہے۔ اس کے پاس سے ہو کر گزرتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ ان درختوں کے گلے مل کر روؤں اور کہوں "پیارے! تم مجھے بھول گئے ہو مگر میں تم کو نہیں بھولا۔ میرے دل میں تمہاری یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اتنی ہی تازہ جتنے تمہارے پتے! بے غرضانہ محبت کے تم جیتے جاگتے مجسمہ ہو!"

کبھی کبھی ہم ہفتوں غیر حاضر رہتے مگر مولوی صاحب سے ایسا بہانہ کر دیتے کہ ان کی چڑھی ہوئی تیوریاں اتر جاتیں۔ اتنی تخیلی قوت آج ہوتی تو ایسا ناول لکھ مارتے کہ لوگ دنگ رہ جاتے۔ اب تو یہ حال ہے کہ بہت سر کھپانے کے بعد کوئی کہانی سوجھتی ہے۔ خیر، ہمارے مولوی صاحب درزی تھے۔ مولوی گیری محض شوقیہ کرتے

تھے۔ ہم دونوں بھائی اپنے گاؤں کے کُرمی کہاروں سے ان کی خوب تعریف کرتے یا کہئے کہ ہم لوگ مولوی صاحب کے سفری ایجنٹ تھے۔ ہماری کوشش سے مولوی صاحب کو جب کچھ کام مل جاتا تو ہم خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ جس روز کوئی اچھا بہانہ نہ سوجھتا، اس روز مولوی صاحب کے لیے کوئی نہ کوئی سوغات لے جاتے۔ کبھی سیر آدھ سیر پھلیاں توڑ ڈالیں تو کبھی دس پانچ گنے، کبھی جَو یا گیہوں کی ہری ہری بالیں لے لیں۔ ان تحفہ جات کو دیکھتے ہی مولوی صاحب کا غصہ فرو ہو جاتا۔ جب ان چیزوں کی فصل نہ ہوتی تو ہم سزا سے بچنے کی کوئی اور ہی تدبیر سوچتے۔ مولوی صاحب کو چڑیوں کا شوق تھا۔ مکتب میں شیاما، بلبل، وہیل اور چنڈولوں کے پنجرے لٹکتے رہتے تھے۔ ہمیں سبق یاد ہو یا نہ ہو مگر چڑیوں کو یاد ہو جاتے تھے۔ ہمارے ساتھ ہی وہ بھی پڑھا کرتی تھیں۔ ان چڑیوں کے لیے بیشن تیار کرنے میں ہم لوگ کافی حوصلہ کا اظہار کرتے تھے۔ مولوی صاحب سب لڑکوں کو پتنگے پکڑ کر لانے کی تاکید کرتے رہتے تھے۔ ان چڑیوں کو پتنگوں سے دلی رغبت تھی۔ کبھی کبھی ہماری بلا پتنگوں ہی کے سر چلی جاتی تھی۔ ان کی قربانی کر کے ہم مولوی صاحب کی قہر آلود شخصیت کو خوش و خرم بنا دیا کرتے تھے۔

ایک روز صبح ہم دونوں بھائی تالاب میں منہ دھونے گئے تو ہلدھر نے کوئی سفید سی چیز مٹھی میں لے کر دکھائی۔ میں نے لپک کر مٹھی کھولی تو اس میں ایک روپیہ تھا۔ میں نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''یہ روپیہ تمہیں کہاں ملا؟''

ہلدھر۔ ''اماں نے طاق پر رکھا تھا۔ چارپائی کھڑی کر کے نکال لایا۔''

مکان میں کوئی صندوق یا الماری تو تھی نہیں۔ روپے پیسے ایک بلند طاق پر رکھ دیئے جاتے تھے۔ ایک روز قبل چچا صاحب نے سن فروخت کیا تھا۔ اسی کے روپے زمیندار کو دینے کے لیے رکھے ہوئے تھے۔ ہلدھر کو نہ جانے کیسے سراغ مل گیا، جب گھر کے سب لوگ اپنے دھندوں میں مصروف ہو گئے تو اس نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ کر ایک روپیہ نکال لایا۔

اس وقت تک ہم نے کبھی روپیہ چھوا تک نہ تھا۔ وہ روپیہ دیکھ کر خوشی و خوف کے جو جذبات دل میں پیدا ہوئے، وہ ابھی تک یاد ہیں۔ ہمارے لیے روپیہ ایک نایاب چیز تھی۔ مولوی صاحب کو ہمارے یہاں سے صرف بارہ آنے ملا کرتے تھے۔ مہینہ کے آخر میں چچا صاحب خود جا کر پیسے دے آتے تھے۔ ہمارا اتنا بھی اعتبار نہ تھا۔ وہی ہم آج ایک روپیہ کے کامل بادشاہ تھے۔ بھلا کون ہمارے گھمنڈ کا اندازہ کر سکتا ہے لیکن مار کھانے کا خوف ہماری خوشی میں مخل ہو رہا تھا۔ روپے بے شمار تو تھے نہیں، چوری کا کھل جانا ایک مسلمہ امر تھا۔ چچا صاحب کے غصہ کا بھی مجھے تو نہیں مگر ہلدھر کو مجسم احساس ہو چکا تھا۔ یوں تو ان سے زیادہ سیدھا سادہ آدمی دنیا میں نہ تھا۔ چچی صاحبہ نے ان کی حفاظت کا ذمہ نہ لے رکھا ہوتا تو کوئی بنیا انہیں بازار میں فروخت کر سکتا تھا مگر جب غصہ آجاتا تو پھر انہیں کچھ نہ سوجھتا۔ اور تو اور چچی صاحبہ بھی ان کے غصہ کا مقابلہ کرتی ہوئی ڈرتی تھیں۔ ہم دونوں نے کئی منٹ تک انہیں امور پر غور کیا اور آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ آئی ہوئی لکشمی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔ ایک تو ہم پر شبہ ہوگا ہی نہیں اور اگر ہوا بھی تو ہم صاف انکار کر جائیں گے۔ کہیں گے۔ ''ہم روپیہ لے کر کیا کرتے؟ ہماری ''ننگا جھولی'' لے لیجئے۔'' شاید زیادہ ٹھنڈے دل سے غور کرتے تو ہمارا یہ ارادہ فسخ ہو جاتا اور وہ خوفناک نظارہ سامنے نہ آتا جسے بعد میں دیکھنا نصیب ہوا مگر اس وقت ہم میں اس طرح غور کرنے کی سکت ہی نہ تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر ہم دونوں گھر گئے اور ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا۔ اگر کہیں اس وقت تلاشی کی نوبت آئی تو پھر ایشور ہی مالک ہے لیکن سب لوگ اپنا اپنا کام کر رہے تھے۔ کوئی ہم سے نہ بولا۔ ہم نے ناشتہ بھی نہ کیا۔ چربن

بھی نہ لیا۔ کتاب بغل میں دبائی اور مکتب کو روانہ ہو گئے۔

برسات کے دن تھے۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ ہم دونوں خوش خوش مکتب جا رہے تھے۔ آج کونسل کی منسٹری پا کر بھی شاید اتنی خوشی نہ ہو، ہزاروں منصوبے باندھتے تھے۔ ہزاروں ہوائی قلعے تعمیر کرتے تھے۔ ایسا موقع بڑی قسمت سے نصیب ہوا تھا۔ زندگی میں پھر شاید ہی ایسا موقع نصیب ہو۔ پس روپیہ کو اس طرح صرف کرنا چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دنوں تک چل سکے۔ اگرچہ ان دنوں پانچ آنہ سیر بہت عمدہ مٹھائی ملتی تھی اور شاید آدھ سیر مٹھائی میں ہم دونوں آسودہ ہو جاتے مگر یہ خیال ہوا کہ مٹھائی کھائیں گے تو روپیہ آج ہی غائب ہو جاوے گا۔ کوئی سستی چیز کھانی چاہیے کہ مزہ بھی آئے، پیٹ بھی بھرے اور پیسے بھی کم خرچ ہوں۔ آخر امرودوں پر ہماری نظر پڑی۔ ہم دونوں راضی ہو گئے۔ دو پیسے کے امرود لیے۔ سستا وقت تھا، بڑے بڑے بارہ امرود ملے۔ ہم دونوں کے کرتوں کے دامن بھر گئے۔ جب ہلدھر نے کنجڑن کے ہاتھ میں روپیہ رکھا تو اس نے شبہ سے دیکھ کر پوچھا۔

"روپیہ کہاں پایا لالا؟ چرایا تو نہیں؟"

جواب ہمارے پاس تیار تھا۔ زیادہ نہیں تو دو تین کتابیں تو پڑھ ہی چکے تھے۔ علم کا کچھ کچھ اثر ہو چلا تھا۔ میں نے فوراً کہا...... "مولوی صاحب کی تنخواہ دینی ہے۔ گھر میں پیسے نہ تھا تو چچا صاحب نے روپیہ دے دیا۔"

اس جواب نے کنجڑن کا شبہ دور کر دیا۔ ہم دونوں نے ایک پلیا پر بیٹھ کر خوب امرود کھائے مگر اب ساڑھے پندرہ آنے پیسے کہاں لے جائیں؟ ایک روپیہ چھپا لینا تو اتنا مشکل نہ تھا۔ یہ پیسوں کا ڈھیر کہاں چھپتا؟ نہ کمر میں اتنی جگہ تھی اور نہ جیب میں اتنی گنجائش۔ انہیں اپنے پاس رکھنا اپنی چوری کا ڈھنڈورا پیٹنا تھا۔ بہت سوچنے کے بعد یہ طے کیا کہ بارہ آنے تو مولوی صاحب کو دے دیئے جائیں بقیہ ساڑھے تین آنے کی مٹھائی اڑائیے۔ یہ فیصلہ کر کے ہم لوگ مکتب پہنچے۔ آج کئی روز بعد گئے تھے۔ مولوی صاحب نے بگڑ کر پوچھا...... "اتنے دن کہاں رہے؟"

میں نے کہا۔ "مولوی صاحب، گھر میں غمی ہو گئی تھی۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے بارہ آنے ان کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر کیا پوچھنا تھا۔ پیسے دیکھتے ہی مولوی صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ مہینہ ختم ہونے میں ابھی کئی دن باقی تھے۔ عموماً مہینہ گزر جانے اور بار بار تقاضے کرنے پر کہیں پیسے ملتے تھے۔ اب کے اتنا جلد پیسے پا کر ان کا خوش ہونا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ ہم نے اور لڑکوں کی طرف فخریہ نگاہوں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے ہوں۔ "ایک تم ہو کہ مانگنے پر بھی پیسے نہیں دیتے، ایک ہم ہیں کہ پیشگی دیتے ہیں۔"

ہم ابھی سبق پڑھ ہی رہے تھے کہ معلوم ہوا، آج تالاب کا میلہ ہے۔ دوپہر سے چھٹی ہو جائے گی۔ مولوی صاحب میلے میں بلبل لڑانے جاویں گے۔ یہ خبر سنتے ہی ہماری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ بارہ آنے تو بینک میں جمع کر ہی چکے تھے۔ ساڑھے تین آنوں میں میلہ دیکھنے کی ٹھہری۔ خوب بہار رہے گی، مزہ سے ریوڑیاں کھائیں گے۔ گول گپے اڑائیں گے، جھولے پر چڑھیں گے اور شام کو گھر پہنچیں گے لیکن مولوی صاحب نے ایک سخت شرط یہ لگا دی تھی کہ سب لڑکے چھٹی سے پہلے اپنا اپنا سبق سنا دیں جو سبق نہ سنا سکے گا، اسے چھٹی نہ ملے گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے تو چھٹی مل گئی مگر ہلدھر قید کر لیے گئے اور کئی لڑکوں نے سبق سنا دیا۔ وہ سبھی میلہ دیکھنے چل پڑے۔ میں بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ پیسے میرے ہی پاس تھے۔ اس لیے میں نے ہلدھر کو ساتھ لینے کا انتظار نہ کیا۔ یہ طے ہو گیا تھا کہ وہ چھٹی پاتے ہی میلے میں آجاویں گے اور دونوں ساتھ ساتھ میلہ دیکھیں گے۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ جب تک وہ نہ آئیں گے، ایک پیسہ بھی نہ خرچ کروں گا لیکن کیا معلوم تھا کہ بدقسمتی کچھ اور ہی دکھلانے کو ہے۔ مجھے میلہ پہنچے

ہوئے ایک گھنٹہ سے زیادہ گزر گیا مگر ہلدھر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کیا ابھی تک مولوی صاحب نے چھٹی نہیں دی یا راستہ بھول گئے؟ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سڑک کی طرف دیکھتا تھا۔ تنہا میلہ دیکھنے میں جی بھی نہ لگتا تھا۔ یہ اندیشہ بھی ہو رہا تھا کہ کہیں چوری کھل تو نہیں گئی اور چچا صاحب ہلدھر کو پکڑ کر گھر تو نہیں لے گئے؟ آخر جب شام ہو گئی تو میں نے کچھ ریوڑیاں کھائیں اور ہلدھر کے حصے کے پیسے جیب میں رکھ کر آہستہ آہستہ گھر چلا۔ راستہ میں خیال آیا کہ مکتب ہوتا چلوں۔ شاید ہلدھر ابھی وہیں ہوں مگر وہاں سناٹا تھا۔ ہاں ایک لڑکا کھیلتا ہوا ملا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”بچہ گھر جاؤ تو کیسی مار پڑتی ہے۔ تمہارے چچا آئے تھے۔ ہلدھر کو مارتے مارتے لے گئے ہیں۔ اجی ایسا تان کر گھونسہ مارا کہ ہلدھر منہ کے بل گر پڑے۔ یہاں سے گھسیٹتے ہوئے لے گئے ہیں۔ تم نے مولوی صاحب کی تنخواہ دے دی تھی، وہ بھی لے لی۔ ابھی سے کوئی حیلہ سوچ لو ورنہ بے بھاؤ کی پڑیں گی۔“

میرے حواس جاتے رہے۔ بدن کا خون خشک ہو گیا۔ وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ ہو رہا تھا۔ پیر من من بھر کے ہو گئے۔ گھر کی طرف ایک ایک قدم چلنا مشکل ہو گیا۔ دیوی دیوتاؤں کے جتنے نام یاد تھے، سبھی کی منت مانی۔ کسی کو لڈو، کسی کو پیڑے، کسی کو بتاشے۔ گاؤں کے پاس پہنچا تو گاؤں کے ڈیہہ کا سمرن کیا کیونکہ اپنے حلقہ میں ڈیہہ کی مرضی ہی سب پر سبقت رکھتی ہے۔

یہ سب کچھ کیا مگر جیوں جیوں گھر نزدیک آتا، دل کی دھڑکن بڑھتی جاتی تھی۔ گھٹائیں امنڈتی آتی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پھٹ کر گرا ہی چاہتا ہے۔ دیکھتا تھا کہ لوگ اپنا اپنا کام چھوڑ کر بھاگے جا رہے ہیں۔ مویشی بھی دم اٹھائے گھر کی طرف اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ چڑیاں اپنے گھونسلوں کی طرف اڑی چلی جاتی تھیں لیکن میں اسی سست رفتاری سے چلا جاتا تھا۔ گویا پیروں میں طاقت ہی نہیں تھی۔ جی چاہتا تھا کہ زور کا بخار ہو جاوے یا کہیں چوٹ لگ جاوے لیکن کہنے سے دھوبی گدھے پر نہیں چڑھتا۔ بلانے سے موت بھی نہیں آتی۔ بیماری کا تو کہنا ہی کیا۔ کچھ نہ ہوا اور باوجود سست رفتاری کے گھر سامنے آ ہی گیا۔ اب کیا ہو؟ ہمارے دروازے پر املی کا ایک گھنا درخت تھا۔ میں اسی کی آڑ میں چھپ گیا کہ ذرا اور اندھیرا ہو جاوے تو چپکے سے اندر گھس جاؤں اور ماں کے کمرہ میں پلنگ کے نیچے جا بیٹھوں۔ جب سب لوگ سو جائیں گے تو ماں سے ساری داستان کہہ سناؤں۔ ماں کبھی نہیں مارتیں۔ ذرا ان کے سامنے جھوٹ موٹ روؤں گا تو وہ اور بھی پگھل جاویں گی۔ رات گزر جانے پر پھر کون پوچھتا ہے؟ صبح تک سب کا غصہ ٹھنڈا ہو جاوے گا۔ اگر یہ منصوبے پورے ہو جاتے تو اس میں شک نہیں کہ میں بے داغ بچ جاتا مگر وہاں تو خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ مجھے ایک لڑکے نے دیکھ لیا اور میرے نام کی رٹ لگائے ہوئے سیدھا میرے گھر کے اندر کو بھاگا۔ اب میرے لیے کوئی امید نہ رہی۔ ناچار گھر میں داخل ہوا تو دفعتاً میرے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ جیسے مار کھایا ہوا کتا کسی کو اپنی طرف آتا دیکھ کر خوف سے چلانے لگتا ہے۔ بروٹھے میں والد صاحب بیٹھے تھے۔ والد کی صحت ان دنوں کچھ خراب ہو گئی تھی۔ چھٹی لے کر گھر آئے ہوئے تھے۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہیں شکایت کیا تھی مگر وہ مونگ کی دال کھاتے تھے اور شام کے وقت شیشہ کے گلاس میں ایک بوتل میں سے کچھ انڈیل انڈیل کر پیتے تھے۔ شاید یہ کسی تجربہ کار حکیم کی بتائی ہوئی دوا تھی۔ دوائیں سب بدبودار اور تلخ ہوتی ہیں، یہ دوا بھی بری ہی تھی مگر والد صاحب نہ جانے کیوں اس دوا کو مزہ لے لے کر پیتے تھے۔ ہم جو دوا پیتے ہیں تو آنکھیں بند کر کے ایک ہی گھونٹ میں پی جاتے ہیں مگر شاید اس دوا کا اثر آہستہ آہستہ پینے ہی سے ہوتا ہے۔ والد صاحب کے پاس گاؤں کے دو تین اور کبھی کبھی چار پانچ اور مریض بھی ہو جاتے تھے اور گھنٹوں دوا پیتے رہتے تھے۔ کھانا کھانے مشکل سے

اٹھتے تھے۔ اس وقت بھی وہ دوا پی رہے تھے۔ مریضوں کا مجمع لگا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی والد صاحب نے سرخ آنکھیں کر کے پوچھا۔ "کہاں تھے اب تک؟"

میں نے دبی زبان سے کہا۔ "کہیں تو نہیں۔"

"اب چوری کی عادت سیکھ رہا ہے، بول تو نے روپیہ چرایا یا نہیں؟"

میری زبان بند ہو گئی۔ سامنے شمشیر برہنہ ناچ رہی تھی۔ لفظ بھی منہ سے نکلتے ڈرتا تھا۔ والد صاحب نے زور سے ڈانٹ کر پوچھا۔

"بولتا کیوں نہیں، تو نے روپیہ چرایا یا نہیں۔"

میں نے جان پر کھیل کر کہا۔ "میں نے کہاں............"

منہ سے پوری بات بھی نہ نکل پائی تھی کہ والد صاحب خوفناک شکل بنائے، دانت پیستے جھپٹ کر اٹھے اور ہاتھ اٹھائے میری طرف بڑھے۔ میں زور سے چلّا کر رونے لگا۔ ایسا چلّایا کہ والد صاحب بھی سہم گئے۔ ان کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ شاید سمجھے کہ جب ابھی سے اس کا یہ حال ہے تو طمانچہ پڑ جانے پر کہیں اس کی جان ہی نہ نکل جاوے۔ میں نے جو دیکھا کہ میری حکمت کام کر گئی تو اور بھی گلا پھاڑ پھاڑ کر رونے لگا۔ اتنے میں اس مجمع کے دو تین آدمیوں نے والد صاحب کو پکڑ لیا اور میری طرف اشارہ کیا کہ بھاگ جا۔ بچے اکثر ایسے مواقع پر اور بھی مچل جاتے ہیں اور مفت مار کھاتے ہیں۔ میں نے عقلمندی سے کام لیا۔

لیکن اندر کا منظر اس سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ میرا تو خون سرد ہو گیا۔ ہلدھر کے دونوں ہاتھ ایک کھمبے سے بندھے تھے۔ سارے بدن میں مٹی لگی ہوئی تھی اور وہ ابھی تک سسک رہے تھے۔ شاید وہ صحن بھر میں لوٹے تھے۔ ایسا معلوم ہوا کہ سارا صحن ان کے آنسوؤں سے تر ہو گیا ہے۔ چچی ہلدھر کو ڈانٹ رہی تھیں اور والدہ بیٹھی مسالہ پیس رہی تھیں۔ سب سے پہلے مجھ پر چچی کی نگاہ پڑی، بولیں۔ "لو وہ بھی آ گیا۔ کیوں رے، روپیہ تو نے چرایا تھا کہ اس نے؟"

میں نے بے دھڑک ہو کر کہا۔ "ہلدھر نے۔"

والدہ بولیں۔ "اگر اسی نے چرایا تھا تو تو نے گھر آ کر کسی سے کہا کیوں نہیں؟"

اب جھوٹ بولے بغیر بچنا مشکل تھا۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ جب آدمی کو جان کا خطرہ ہو تو جھوٹ بولنا قابلِ معافی ہے۔ ہلدھر مار کھانے کے عادی تھے۔ دو چار گھونسے اور پڑ جانے سے ان کا کچھ نہ بگڑ سکتا تھا۔

میں نے مار کبھی نہ کھائی تھی۔ میرا تو دو چار ہی گھونسوں میں کام تمام ہو جاتا۔ پھر ہلدھر نے بھی تو اپنے کو بچانے کے لیے مجھی کو پھنسانے کی کوشش کی تھی ورنہ چچی مجھ سے یہ کیوں پوچھتیں کہ "روپیہ تو نے چرایا یا ہلدھر نے؟" کسی بھی اصول کے مطابق اس وقت میرا جھوٹ بولنا قابل تصریف نہیں تو قابل تعریف ضرور تھا۔ میں نے فی الفور کہا۔ "ہلدھر کہتے تھے کہ کسی سے بتایا تو مار ہی ڈالوں گا۔"

ماں۔ "دیکھا۔ وہی بات نکلی نہ۔ میں تو کہتی تھی کہ بچہ کی ایسی عادت نہیں۔ پیسہ تو ہاتھ سے چھوتا ہی نہیں مگر سب لوگ مجھی کو الّو بنانے لگے۔"

ہلدھر۔ "میں نے تم سے کب کہا تھا کہ بتاؤ گے تو ماروں گا؟"

میں۔ "وہیں تالاب کے کنارے تو۔"

ہلدھر۔ ''اماں، بالکل جھوٹ ہے۔''
چچی۔ ''جھوٹ نہیں، سچ ہے۔ جھوٹا تو تُو ہے اور تو سارا سنسار سچا ہے۔ تیرا نام نکل گیا ہے نہ، تیرا باپ بھی نوکری کرتا۔ باہر سے روپے کما لاتا۔ چار آدمی اسے بھلا مانس کہتے تو تُو بھی سچا ہوتا۔ اب تو تُو ہی جھوٹا ہے۔ جس کے بھاگ میں مٹھائی لکھی تھی، اس نے مٹھائی کھائی۔ تیرے بھاگ میں تو لات کھانا ہی لکھا تھا۔''

یہ کہتے ہوئے چچی نے ہلدھر کو کھول دیا اور اندر لے گئی۔ میرے بارے میں محبت آمیز رائے زنی کر کے ماں نے پانسہ پلٹ دیا تھا ورنہ ابھی بیچارے پر نہ جانے کتنی مار پڑتی۔ میں نے ماں کے پاس بیٹھ کر اپنی بے گناہی کا راگ خوب الاپا۔ میری سیدھی سادی ماں مجھے سچائی کا اوتار سمجھتی تھی۔ انہیں یقین کامل ہو گیا کہ سارا قصور ہلدھر کا ہے۔ ایک لمحہ بعد میں گڑ چربن لیے ہوئے کوٹھڑی سے باہر نکلا۔ ہلدھر بھی اسی وقت چیوڑ تا چباتے ہوئے باہر نکلے۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے اور اپنی اپنی سرگزشت سنانے لگے۔ میری سرگزشت سکھ بھری تھی اور ہلدھر کی دکھ بھری مگر انجام دونوں کا ایک تھا...... گڑ اور چربن۔

الزام

(1)

منشی شیام کشور کے دروازہ پر منو مہتر نے جھاڑو لگائی، غسل خانہ دھو کر صاف کیا اور زاں بعد دروازہ پر جا کر مالکہ سے بولا...... ''ماں جی دیکھ لیجئے، سب صاف کر دیا۔ آج کچھ کھانے کو مل جائے سرکار!'' مالکہ نے دروازہ پر آ کر کہا...... ''ابھی تو تمہیں تنخواہ دیئے ہوئے دس روز بھی نہیں گزرے۔ اتنی جلد پھر مانگنے لگے۔''

منو۔ ''کیا کروں ماں جی، خرچ نہیں چلتا۔ اکیلا آدمی، گھر دیکھوں کہ کام کروں؟''

مالکہ۔ ''تو بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟''

منو۔ ''روپے مانگتے ہیں سرکار! یہاں کھانے سے نہیں بچتا۔ تھیلی کہاں سے لاؤں؟''

مالکہ۔ ''ابھی تو تم جوان ہو، کب تک اکیلے بیٹھے رہو گے؟''

منو۔ ''ہجور کی اتنی نگاہ ہے تو کہیں نہ کہیں ٹھیک ہو ہی جائے گا۔ سرکار کچھ مدد کریں گی نا؟''

مالکہ۔ ''ہاں ہاں، تم ٹھیک ٹھاک کرو۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا، میں بھی دے دوں گی۔''

منو۔ ''سرکار کا مجاج بڑا اچھا ہے۔ ہجور اتنا کھیال کرتی ہیں، دوسرے گھروں میں تو مالکن لوگ بات بھی نہیں پوچھتیں۔ سرکار کو اللہ نے جیسی شکل و صورت دی ہے، ایسا ہی دل بھی دیا ہے۔ اللہ جانتا ہے ہجور کو دیکھ کر بھوک پیاس جاتی رہتی ہے۔ بڑے بڑے گھر کی عورتیں دیکھی ہیں مگر ہجور کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتیں۔''

مالکہ۔ ''چل جھوٹے، میں ایسی کون بڑی خوبصورت ہوں۔''

مُنو۔ ”اب سرکار سے کیا کہوں؟ بڑی بڑی کھترانیوں کو دیکھتا ہوں مگر گورے پن کے سوائے اور کوئی بات نہیں۔ ان میں یہ نمک کہاں سرکار؟“

مالکہ۔ ”ایک روپے میں تمہارا کام چل جاوے گا؟“

مُنو۔ ”بھلا سرکار دو روپے تو دے دیں۔“

مالکہ۔ ”اچھا یہ لو اور جاؤ۔“

مُنو۔ ”جاتا ہوں سرکار، آپ ناراج نہ ہوں تو ایک بات پوچھوں؟“

مالکہ۔ ”کیا پوچھتے ہو، پوچھو! مگر جلدی، مجھے چولہا جلانا ہے۔“

مُنو۔ ”تو سرکار جائیں، پھر کبھی کہوں گا۔“

مالکہ۔ ”نہیں نہیں، کیا بات ہے؟ ابھی کچھ ایسی جلدی نہیں ہے۔“

مُنو۔ ”دال منڈی میں سرکار کے کوئی رہتے ہیں کیا؟“

مالکہ۔ ”نہیں، یہاں تو کوئی رشتہ دار نہیں۔“

مُنو۔ ”تو کوئی دوست ہو گا۔ سرکار کو اکثر ایک کوٹھے پر سے اترتے دیکھتا ہوں۔“

مالکہ۔ ”دال منڈی تو رنڈیوں کا محلّہ ہے۔“

مُنو۔ ”ہاں سرکار، رنڈیاں بہت ہیں وہاں لیکن سرکار تو سیدھے سادے آدمی جان پڑتے ہیں۔ یہاں رات میں دیر سے تو نہیں آتے؟“

مالکہ۔ ”نہیں' شام ہونے سے پہلے آجاتے ہیں اور پھر کہیں نہیں جاتے۔ ہاں کبھی کبھی لائبریری البتہ جاتے ہیں۔“

مُنو۔ ”بس بس یہی بات ہے ہجور، موکا (موقع) ملے تو اسارہ سے سمجھا دیجئے گا سرکار کہ رات کو ادھر نہ جایا کریں۔ آدمی کا دل کتنا ہی صاف ہو مگر دیکھنے والے سک کرنے لگتے ہیں۔“

اتنے ہی میں بابو شیام کشور آگئے۔ مُنو نے انہیں سلام کیا۔ بالٹی اٹھالی اور چلتا ہوا۔

شیام کشور نے پوچھا۔ ”مُنو کیا کہہ رہا تھا؟“

دیوی۔ ”کچھ نہیں، اپنے دکھڑے رو رہا تھا۔ کھانے کو مانگتا ہے۔ دو روپے دے دیئے ہیں۔ بات چیت بڑے ڈھنگ سے کرتا ہے۔“

شیام۔ ”تمہیں تو باتیں کرنے کا روگ ہے اور کوئی نہیں۔ مہتر ہی سہی، اس بھتنے سے نہ جانے تم کیسے باتیں کرتی ہو؟“

دیوی۔ ”مجھے اس کی صورت لے کر کیا کرنا ہے۔ غریب آدمی ہے، اپنا دکھڑا سنانے لگتا ہے تو کیسے نہ سنوں؟“

بابو صاحب نے بیلے کا گجرہ رومال سے نکال کر دیوی کے گلے میں ڈال دیا مگر دیوی کے چہرے پر خوشی کے کوئی آثار نہ دکھلائی پڑے۔ ترچھی نگاہوں سے دیکھ کر بولی۔ ”آپ آج کل دال منڈی کی سیر بہت کیا کرتے ہیں؟“

شیام۔ ”کون، میں؟“

دیوی۔ ”جی ہاں، تم مجھ سے لائبریری کا بہانہ کر کے جاتے ہو اور وہاں جلسے ہوتے ہیں۔“

شیام۔ ’’بالکل جھوٹ، سولہوں آنے جھوٹ! تم سے کون کہتا تھا، وہی مُنو؟‘‘

دیوی۔ ’’مُنو نے مجھ سے کچھ نہیں کہا مگر مجھے تمہاری ٹوہ ملتی رہتی ہے۔‘‘

شیام۔ ’’تم میری ٹوہ مت لیا کرو۔ شک کرنے سے آدمی شکی ہو جاتا ہے اور تب بڑی بڑی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ بھلا میں دال منڈی کیوں جانے لگا؟ تم سے بڑھ کر دال منڈی میں اور کون ہے؟ میں تو تمہاری ان مد بھری آنکھوں کا عاشق ہوں۔ اگر اپسرا (حور) بھی سامنے آجاوے تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ آج شار دا کہاں ہے؟‘‘

دیوی۔ ’’نیچے کھیلنے چلی گئی ہے۔‘‘

شیام۔ ’’نیچے نہ جانے دیا کرو۔ یکے، موٹریں، بگھیاں دوڑتی رہتی ہیں۔ نہ جانے کب کیا ہو جاوے۔ آج ہی اردلی بازار میں ایک واردات ہو گئی۔ تین لڑکے ایک ساتھ دب گئے۔‘‘

دیوی۔ ’’تین لڑکے! بڑا غضب ہو گیا، کس کی موٹر تھی؟‘‘

شیام۔ ’’اس کا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ ایشور جانتا ہے، تم پر یہ گجرا بہت کھل رہا ہے۔‘‘

دیوی۔ (مسکرا کر) ’’چلو باتیں نہ بناؤ۔‘‘

(2)

تیسرے روز مُنو نے دیوی سے کہا۔ ’’سرکار! ایک جگہ سگائی ٹھیک ہو رہی ہے۔ دیکھئے کول سے پھر نہ جائیے گا۔ مجھے آپ کا بڑا بھروسہ ہے۔‘‘

دیوی۔ ’’دیکھ لی، عورت کیسی ہے؟‘‘

مُنو۔ ’’سرکار جیسی تکدیر میں ہے، ویسی ہے۔ گھر کی روٹیاں تو ملیں گی۔ نہیں تو اپنے ہاتھوں ٹھونکنا پڑتا تھا۔ پر ہے کیا کہ مجاج کی سیدھی ہے۔ ہمارے جات کی عورتیں بری چنچل ہوتی ہیں ہجور، سیکڑے پیچھے ایک بھی پاک نہ ملے گی۔‘‘

دیوی۔ ’’مہتر لوگ اپنی عورتوں کو کچھ کہتے نہیں؟‘‘

مُنو۔ ’’کیا کہیں ہجور، ڈرتے ہیں کہ کہیں اپنے آسنا سے چغلی کھا کر ہماری نوکری چاکری نہ چھڑا دے۔ مہترانیوں پر بابو صاحبوں کی بہت نگاہ رہتی ہے سرکار!‘‘

دیوی۔ (ہنس کر) ’’چل جھوٹے، بابو صاحبوں کی عورتیں کیا مہترانیوں سے بھی گئی گزری ہوتی ہیں؟‘‘

مُنو۔ ’’اب سرکار کچھ نہ کہلاویں۔ ہجور کو چھوڑ کر اور تو کوئی ایسی ببوائن نہیں دیکھا جس کا کوئی بکھان کرے۔ بہت ہی چھوٹا آدمی ہوں سرکار، پر ان ببوانیوں کی طرح میری عورت ہوتی تو اس سے بولنے کو جی نہ چاہتا۔ ہجور کے چہرے مہرے کی کوئی عورت میں نے تو نہیں دیکھی۔‘‘

دیوی۔ ’’چل جھوٹھے، اتنی خوشامد کرنا کس سے سیکھا؟‘‘

مُنو۔ ’’خوشامد نہیں کرتا سرکار، سچی بات کہتا ہوں۔ ہجور ایک دن کھڑکی کے سامنے کھڑی تھیں۔ رجا میاں کی نگاہ آپ پر پڑ گئی۔ جوتے کی بڑی دکان ہے ان کی۔ اللہ نے جیسا دھن دیا ہے، ویسا ہی دل بھی۔ آپ کو دیکھتے ہی آنکھیں نیچی کر لیں۔ آج باتوں باتوں میں ہجور کی سکل و صورت سراہنے لگے۔ میں نے کہا، جیسی صورت ہے ویسا

ہی اللہ نے آپ کو دل بھی دیا ہے۔"

دیوی۔ "اچھا، وہ لانبا سا سانولے رنگ کا جوان؟"

مُنو۔ "ہاں ہجور، وہی۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کسی طرح ایک بار پھر انہیں دیکھ پاتا مگر میں نے ڈانٹ کر کہا۔ کھبر دار میاں، جو مجھ سے پھر ایسی باتیں کیں! وہاں تمہاری دال نہ گلے گی۔"

دیوی۔ "تم نے بہت اچھا کیا۔ نگوڑے کی آنکھیں پھوٹ جائیں، جب ادھر سے جاتا ہے، کھڑکی کی طرف اس کی نگاہ رہتی ہے۔ کہہ دینا ادھر بھول کر بھی نہ تاکے۔"

مُنو۔ "کہہ دیا ہے ہجور...... حکم ہو تو چلوں اور تو کچھ صاف نہیں کرنا ہے؟ سرکار کے آنے کی بیلا (وقت) ہو گئی ہے۔ مجھے دیکھیں گے تو کہیں گے کہ یہ کیا باتیں کر رہا ہے۔"

دیوی۔ "یہ روٹیاں لیتے جاؤ، آج چولہے سے بچ جاؤ گے۔"

مُنو۔ "اللہ ہجور کو سلامت رکھے۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اسی درواجے پر پڑا رہوں اور ایک ٹکڑا کھا لیا کروں۔ سچ کہتا ہوں ہجور کو دیکھ کر بھوک پیاس ہَر جاتی ہے۔"

مُنو جا ہی رہا تھا کہ بابو شیام کشور اوپر آ پہنچے۔ مُنو کی آخری بات ان کے کانوں میں پڑ گئی تھی۔ مُنو جیو نہی نیچے گیا، بابو صاحب دیوی سے بولے۔ "میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ مُنو کو منہ نہ لگاؤ مگر تم نے میری بات نہ مانی۔ چھوٹے لوگ ایک گھر کی بات دوسرے گھر میں پہنچا دیتے ہیں۔ انہیں کبھی منہ نہ لگانا چاہیے۔ بھوک پیاس ہَر جانے کی کیا بات تھی؟"

دیوی۔ "کیا جانے، بھوک پیاس کیسی؟ ایسی تو کوئی بات نہ تھی۔"

شیام۔ "تھی کیوں نہیں، میں نے صاف سنی۔"

دیوی۔ "مجھے تو یاد نہیں پڑتی، ہو گی کوئی بات۔ میں کون اس کی سب باتیں بیٹھی سنا کرتی ہوں۔"

شیام۔ "تو کیا وہ دیوار سے باتیں کرتا ہے؟ دیکھو نیچے کوئی آدمی اس کھڑکی کی طرف تاکتا چلا جاتا ہے۔ اسی محلّہ کا ایک مسلمان لونڈا ہے۔ جوتیوں کی دکان کرتا ہے۔ تم کیا اس کھڑکی پر کھڑی رہا کرتی ہو؟"

دیوی۔ "چق تو پڑی ہوئی ہے۔"

شیام۔ "چق کے پاس کھڑے ہونے سے باہر کا آدمی تمہیں صاف دیکھ سکتا ہے۔"

دیوی۔ "یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ اب کبھی کھڑکی کھولوں گی ہی نہیں۔"

شیام۔ "ہاں کیا فائدہ؟ مُنو کو اندر نہ آنے دیا کرو۔"

دیوی۔ "غسل خانہ کون کرے گا؟"

شیام۔ "خیر آوے مگر اس سے تمہیں باتیں نہ کرنی چاہئیں۔ آج ایک نیا تھیٹر آیا ہے۔ سنا ہے، اب کے ایکٹر بہت اچھے ہیں۔"

اتنے میں شاردا نیچے سے مٹھائی کا ایک دونا لیے دوڑتی ہوئی آئی۔ دیوی نے پوچھا...... "ارے یہ مٹھائی کس نے دی؟"

شاردا۔ "راجا بھیا نے تو دی ہے۔ کہتے تھے تم کو اچھے اچھے کھلونے لا دوں گا۔"

شیام۔ "راجا بھیا کون ہیں؟"

شاردا۔ ''وہی تو ہیں جو ابھی ادھر سے گئے ہیں۔''
شیام۔ ''وہی تو نہیں جو لمبا سا سانولے رنگ کا آدمی ہے؟''
شاردا۔ ''ہاں ہاں، وہی وہی۔ میں اب ان کے گھر روز جاؤں گی۔''
دیوی۔ ''کیا تو اس کے گھر گئی تھی؟''
شاردا۔ ''وہی تو گودی میں اٹھا کر لے گئے۔''
شیام۔ ''تو نیچے کھیلنے مت جایا کر۔ کسی دن موٹر کے نیچے دب جاوے گی۔ دیکھتی نہیں کتنی موٹریں آتی رہتی ہیں؟''
شاردا۔ ''راجا بھیا کہتے تھے کہ تمہیں موٹر پر ہوا کھلانے لے چلیں گے۔''
شیام۔ ''تم بیٹھی بیٹھی کیا کیا کرتی ہو؟ جو تم سے ایک لڑکی دیکھ بھال بھی نہیں ہو سکتی؟''
دیوی۔ ''اتنی بڑی لڑکی کو صندوق میں بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا۔''
شیام۔ ''تم جواب دینے میں تو تیز ہو، یہ میں جانتا ہوں۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ باتیں کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔''
دیوی۔ ''باتیں میں کس سے کرتی رہتی ہوں۔ یہاں تو کوئی پڑوسن بھی نہیں۔''
شیام۔ ''مُنّو مہتر تو ہے۔''
دیوی۔ (ہونٹ چبا کر) ''مُنّو کیا میرا سگا ہے جس سے بیٹھی باتیں کیا کرتی ہوں؟ غریب آدمی ہے، اپنا دکھڑا روتا ہے تو کیا کہہ دوں؟ مجھ سے تو دھتکارے نہیں بنتا۔''
شیام۔ ''خیر کھانا بنا لو، نو بجے تماشہ شروع ہو جاوے گا، سات بج گئے ہیں۔''
دیوی۔ ''تم جاؤ، دیکھ آؤ۔ میں نہ جاؤں گی۔''
شیام۔ ''تمہیں تو مہینوں سے تماشے کی رٹ لگائے ہوئے تھیں۔ اب کیا ہو گیا؟ کیا تم نے قسم کھالی ہے کہ یہ جو بات کہیں، اسے کبھی نہ مانوں گی؟''
دیوی۔ ''نہ جانے کیوں تمہارا ایسا خیال ہے۔ میں تو تمہاری مرضی سے ہی کوئی کام کرتی ہوں۔ میرے جانے سے کچھ اور پیسے خرچ ہو جاویں گے تو تم میری جان کھانے لگو گے، یہی سوچ کر میں نے کہا تھا۔ اب تم کہتے ہو تو چلی چلوں گی۔ تماشہ دیکھنا کسے برا لگتا ہے؟''

(3)

نو بجے شیام کشور ایک تانگہ پر بیٹھ کر دیوی اور شاردا کے ساتھ تھیٹر دیکھنے چلے۔ سڑک پر کچھ ہی دور گئے تھے کہ پیچھے سے ایک اور تانگہ آ پہنچا۔ اس پر رضا بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا وہی مُنّو مہتر جو بابو صاحب کے گھر کی صفائی کرتا تھا! دیوی نے ان دونوں کو دیکھتے ہی سر جھکا لیا۔ اسے تعجب ہوا کہ رضا اور مُنّو میں اتنی گہری دوستی ہے کہ رضا اسے اپنے ساتھ تانگے پر بٹھا کر سیر کرانے لے جاتا ہے۔ شاردا رضا کو دیکھتے ہی بول اٹھی......
''بابو جی دیکھو، وہ راجا بھیا آرہے ہیں۔ (تالی بجا کر) راجا بھیا، ادھر دیکھو، ہم لوگ تماشہ دیکھنے جا رہے ہیں۔''

رضا مسکرا دیا مگر بابو صاحب غصہ سے تلملا اٹھے۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ بدمعاش صرف میرے تعاقب میں آ رہے ہیں۔ ان دونوں میں ضرور سانٹھ گانٹھ ہے ورنہ رضا مُنو کو ساتھ کیوں لیتا؟ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے انہوں نے تانگہ والے سے کہا۔ "اور تیز چلو، دیر ہو رہی ہے۔" تانگہ تیز ہو گیا۔ رضا نے بھی اپنا تانگہ تیز کیا۔ بابو صاحب نے جب تانگہ کو آہستہ کرنے کو کہا تو رضا کا تانگہ بھی آہستہ ہو گیا۔ آخر بابو صاحب نے جھنجھلا کر کہا۔ "تم تانگے کو چھاؤنی کی طرف لے چلو، ہم تھیٹر دیکھنے نہ جاویں گے۔" تانگے والے نے ان کی طرف حیرت سے دیکھا اور تانگہ پھیر دیا۔ رضا کا تانگہ بھی پھر گیا۔ بابو صاحب کو اتنا غصہ آ رہا تھا کہ رضا کو للکاروں مگر ڈرتے تھے کہ کہیں جھگڑا ہو گیا تو بہت لوگ جمع ہو جاویں گے اور بے فائدہ خفت اٹھانی پڑے گی۔ لہو کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اپنے ہی اوپر جھنجھلانے لگے کہ ناحق آیا۔ کیا جانتا تھا کہ یہ دونوں شیطان سر پر سوار ہو جائیں گے۔ مُنو کو تو کل ہی نکال دوں گا۔ آخر رضا کا تانگہ کچھ دور چل کر دوسری طرف مڑ گیا اور بابو صاحب کا غصہ کسی قدر فرو ہوا مگر اب تھیٹر جانے کا وقت نہ تھا۔ چھاؤنی سے گھر واپس آئے۔

دیوی نے کوٹھے پر آ کر کہا۔ "مفت میں تانگہ والے کو دو روپے دینے پڑے۔"

شیام کشور نے اس کی طرف خون خشک کر دینے والی نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اور مُنو سے باتیں کرو اور کھڑکی پر کھڑے ہو ہو کر رضا کو اپنا جمال دکھاؤ۔ تم نہ جانے کیا کرنے پر تلی ہوئی ہو۔"

دیوی۔ "ایسی باتیں منہ سے نکالتے تمہیں شرم نہیں آتی! تم مجھے ناحق ہی ذلیل کرتے ہو۔ اس کا نتیجہ اچھا نہ ہوگا۔ میں کسی مرد کو تمہارے پیروں کی خاک برابر بھی نہیں سمجھتی۔ اس کمبخت مہتر کی کیا حقیقت ہے۔ تم مجھے اتنا ذلیل سمجھتے ہو؟"

شیام۔ "نہیں، میں تمہیں اتنا ذلیل نہیں سمجھتا مگر نادان ضرور سمجھتا ہوں۔ تمہیں اس بدمعاش کو کبھی منہ نہ لگانا چاہیے تھا۔ اب تو تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ ایک ہی شہدا ہے یا اب بھی کچھ شک ہے؟"

دیوی۔ "میں اس کو کل ہی نکال دوں گی۔"

منشی جی لیٹے مگر دل بے چین تھا۔ وہ تمام دن دفتر میں بیٹھے رہتے تھے۔ کیا جان سکتے تھے کہ ان کی عدم موجودگی میں دیوی کیا کرتی ہے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ دیوی عصمت شعار ہے مگر یہ بھی جانتے تھے کہ اپنا حسن و جمال دکھانے کا حسن و جمال والوں کو مرض ہوتا ہے۔ دیوی ضرور بن ٹھن کر دریچہ پر کھڑی ہوتی ہے اور محلّہ کے شہدے اس کو دیکھ دیکھ کر نہ جانے کیا کیا منصوبے کرتے ہوں گے۔ اس کاروبار کو بند کرنا انہیں اپنے قابو سے باہر معلوم ہوتا تھا۔ شہدے فن تسخیر کے ماہر ہوتے ہیں۔ ایشور نہ کرے ان بدمعاشوں کی نگاہ کسی بھلے گھر کی بہو بیٹی پر پڑے۔ ان سے کیسے پیچھا چھڑاؤں؟

بہت سوچنے پر آخر انہوں نے وہ مکان چھوڑ دینے کا قصد کر لیا۔ اس کے سوا انہیں اور کوئی تدبیر نہ سوجھی۔ دیوی سے بولے۔ "کہو تو یہ مکان چھوڑ دوں۔ ان شہدوں کے درمیان میں رہنے سے آبرو بگڑنے کا اندیشہ ہے؟"

دیوی نے معترضانہ لہجہ میں کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی۔"

شیام۔ "آخر تمہی کوئی تدبیر بتلاؤ۔"

دیوی۔ "میں کونسی تدبیر بتلاؤں اور کس بات کی تدبیر؟ مجھے تو مکان چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ ایک دو نہیں، لاکھ دو لاکھ شہدے ہوں تو کیا؟ کتوں کے بھونکنے کے خوف سے کوئی اپنا مکان چھوڑ دیتا ہے؟"

شیام۔ ’’کبھی کبھی کتے کاٹ بھی تو لیتے ہیں۔‘‘
دیوی نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ زیادہ قیل و قال سے شوہر کے خیالات میں زیادہ بگاڑ پیدا ہو جانے کا خوف تھا۔ وہ شکی تو ہیں ہی، نہ جانے اس کا کیا مطلب سمجھ بیٹھیں۔
تیسرے ہی روز شیام بابو نے وہ مکان ترک کر دیا۔

(4)

اس نئے مکان میں آنے کے ایک ہفتہ بعد مُنّو سر میں پٹی باندھے، لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور آواز دی۔ دیوی اس کی آواز پہچان گئی مگر اسے دھتکارا نہیں، جا کر دروازہ کھول دیا۔ پرانے گھر کے حالات جاننے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔
مُنّو نے اندر آ کر کہا۔ ’’سرکار! جب سے آپ نے وہ مکان چھوڑ دیا، قسم لے لیجئے جو ادھر ایک بار بھی گیا ہوں۔ اس گھر کو دیکھ کر رونا آنے لگتا ہے۔ میرا بھی جی چاہتا ہے کہ اسی محلہ میں آ جاؤں۔ پاگلوں کی طرح ادھر ادھر مارا مارا پھرا کرتا ہوں سرکار۔ کسی کام میں من نہیں لگتا۔ ہر گھڑی آپ ہی کی یاد آتی رہتی ہے۔ ہجور جتنی پرورس کرتی تھیں، اتنی اب کون کرے گا؟ یہ گھر تو بہت چھوٹا ہے۔‘‘
دیوی۔ ’’تمہارے ہی کارن تو وہ مکان چھوڑنا پڑا۔‘‘
مُنّو۔ ’’میرے کارن؟ مجھ سے کونسی تکسیر ہوئی سرکار؟‘‘
دیوی۔ ’’تمہیں تو تانگہ پر رضا کے ساتھ بیٹھے میرے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ ایسے آدمی پر آدمی کو شک ہوتا ہی ہے۔‘‘
مُنّو۔ ’’ارے سرکار، اس دن کی بات کچھ نہ پوچھئے۔ رضا میاں کو ایک وکیل صاحب سے ملنے جانا تھا۔ وہ چھاؤنی میں رہتے ہیں۔ مجھے بھی ساتھ بٹھا لیا۔ ان کا سائیس کہیں گیا ہوا تھا۔ مارے لحاج (لحاظ) کے آپ کے تانگے کے آگے نہ نکالتے تھے۔ سرکار اسے شہدا کہتی ہیں۔ اس کا سا بھلا آدمی محلّہ بھر میں نہیں ہے۔ پانچوں بکھت کی نماج پڑھتا ہے ہجور۔ تیسوں روجے رکھتا ہے۔ گھر میں بی بی بچے سبھی موجود ہیں۔ کیا مجال ہے کہ کسی پر بد نگاہ ہو۔‘‘
دیوی۔ ’’خیر، ہوگا، تمہارے سر میں پٹی کیوں بندھی ہے؟‘‘
مُنّو۔ ’’اس کا حال نہ پوچھئے۔ آپ کی برائی کرتے کسی کو دیکھتا ہوں تو بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ درواجے پر جو حلوائی رہتا تھا نا، کہنے لگا، میرے کچھ پیسے بابو جی پر آتے ہیں۔ بس سرکار، اسی بات پر تکرار ہو گئی۔ میں تو دکان کے نیچے نالی دھو رہا تھا۔ وہ اوپر سے کود کر آیا اور مجھے دھکیل دیا۔ میں بے کھبر کھڑا تھا، چاروں شانے چت سڑک پر گر پڑا۔ چوٹ تو آئی مگر میں نے بھی دکان کے سامنے بچہ کو اتنی گالیاں سنائیں کہ یاد ہی کرتے ہوں گے۔ اب گھاؤ اچھا ہو رہا ہے ہجور۔‘‘
دیوی۔ ’’رام رام، ناحق لڑائی لینے لگے۔ سیدھی سی بات تو تھی۔ کہہ دیتے، تمہارے پیسے آتے ہیں تو جا کر مانگ لاؤ۔ ہیں تو شہر ہی میں، کسی دوسرے دیس تو نہیں بھاگ گئے۔‘‘
مُنّو۔ ’’ہجور آپ کی برائی سن کر نہیں رہا جاتا۔ پھر چاہے وہ اپنے گھر کا لاٹ ہی کیوں نہ ہو، بھڑ پڑوں گا۔ وہ

مہاجن ہو گا تو اپنے گھر کا ہو گا۔ یہاں کون اس کا دیا کھاتے ہیں۔"

دیوی۔ "اس گھر میں ابھی کوئی آیا کہ نہیں؟"

منو۔ "کئی آدمی دیکھنے آئے ہجور مگر جہاں آپ رہ چکی ہیں وہاں اب دوسرا کون رہ سکتا ہے؟ ہم لوگوں نے انہیں بھڑکا دیا۔ رضا میاں تو ہجور اسی دن سے کھانا پینا چھوڑ بیٹھے ہیں۔ بٹیا کی یاد کر کر کے رویا کرتے ہیں۔ ہجور کو ہم گریبوں کی یاد کاہے کو آتی ہو گی۔"

دیوی۔ "یاد کیوں نہیں آتی۔ کیا میں آدمی نہیں ہوں؟ جانور تک تھان چھوٹنے پر دو چار دن تک چارہ نہیں کھاتے۔ یہ پیسے لو، کچھ بازار سے لا کر کھا لو، بھوکے ہو گے۔"

منو۔ "ہجور کی دعا سے کھانے کی تنگی نہیں ہے۔ آدمی کا دل دیکھا جاتا ہے ہجور۔ پیسوں کی کون بات ہے، آپ کا دیا تو کھاتے ہی ہیں۔ ہجور کا مجاج ایسا ہے کہ آدمی بے کوڑی کا گلام ہو جاتا ہے۔ تو اب چلوں گا ہجور، بابو جی آتے ہوں گے۔ کہیں گے، یہ سیطان یہاں پھر آ پہنچا۔"

دیوی۔ "ابھی ان کے آنے میں بڑی دیر ہے۔"

منو۔ "اوہو، ایک بات تو بھولا ہی جاتا تھا۔ رضا میاں نے بِٹیا کے لیے یہ کھلونے دیئے ہیں۔ باتوں میں ایسا بھول گیا کہ ان کی سدھ ہی نہ رہی۔ کہاں ہے بِٹیا؟"

دیوی۔ "ابھی تو مدرسے سے نہیں آئی مگر اتنے کھلونے لانے کی کیا ضرورت تھی؟ ارے، رضا نے تو غضب ہی کر دیا۔ بھیجنا ہی تھا تو دو چار آنے کے کھلونے بھیج دیتے۔ اکیلی میم تین چار روپے سے کم کی نہ ہو گی۔ کل ملا کر تیس پینتیس روپے سے کم کے کھلونے نہیں ہیں۔"

منو۔ "کیا جانیں سرکار، میں نے تو کبھی کھلونے خریدے نہیں۔ تیس پینتیس روپے ہی کے ہوں گے تو ان کے لیے کون بڑی بات ہے؟ اکیلی دکان سے پچاس روپے کی آمدنی ہے ہجور!"

دیوی۔ "نہیں، ان کو لوٹا لے جاؤ۔ اتنے کھلونے لے کر کیا کرے گی؟ میں ایک میم رکھے لیتی ہوں۔"

منو۔ "ہجور، رجا میاں کو بڑا رنج ہو گا۔ مجھے تو جیتا ہی نہ چھوڑیں گے۔ بڑے ہی مروتی آدمی ہیں ہجور، بی بی دو چار دن کے لیے میکے چلی جاتی ہے تو بے چین ہو جاتے ہیں۔"

اسی وقت شاردا پاٹھ شالا سے آ گئی اور کھلونے دیکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑی۔ دیوی نے ڈانٹ کر کہا۔ "کیا کرتی ہے، کیا کرتی ہے؟ میم لے لے اور سب لے کر کیا کرے گی؟"

شاردا۔ "میں تو سب لوں گی۔ میم کو موٹر پر بٹھا کر دوڑاؤں گی۔ کتا پیچھے پیچھے دوڑے گا۔ ان برتنوں میں گڑیا کے کھانے بناؤں گی۔ کہاں سے آئے ہیں اماں؟ بتا دو۔"

دیوی۔ "کہیں سے نہیں آئے۔ میں نے دیکھنے کو منگائے تھے تو ان میں سے کوئی ایک لے لے۔"

شاردا۔ "میں سب لوں گی۔ میری اماں نا' سب لے لیجئے۔ کون لایا ہے اماں؟"

دیوی۔ "منو، تم کھلونے لے جاؤ، ایک میم رہنے دو۔"

شاردا۔ "کہاں سے لائے ہو منو، بتا دو؟"

منو۔ "تمہارے راجا بھیا نے تمہارے لیے بھیجے ہیں۔"

شاردا۔ "راجا بھیا نے بھیجے ہیں، اوہو (ناچ کر) راجا بھیا بڑے اچھے ہیں۔ کل اپنی سہیلیوں کو دکھاؤں گی۔

کسی کے پاس ایسے کھلونے نہ نکلیں گے۔"

دیوی۔"اچھامنو، تم اب جاؤ۔ رضا میاں سے کہہ دینا، پھر یہاں کھلونے نہ بھیجیں۔"

منو چلا گیا تو دیوی نے شاردا سے کہا...... "لا بیٹی، تیرے کھلونے رکھ دوں۔ بابو جی دیکھیں گے تو بگڑیں گے۔ کہیں گے رضا میاں کے کھلونے کیوں لیے۔ توڑ تاڑ کر پھینک دیں گے۔ بھول کر بھی ان سے کھلونوں کا چرچا نہ کرنا۔"

شاردا۔"ہاں اماں رکھ دو، بابو جی توڑ ڈالیں گے۔"

دیوی۔"ان سے کبھی مت کہنا کہ راجا بھیا نے کھلونے بھیجے ہیں۔ نہیں تو بابو جی راجا بھیا کو ماریں گے اور تمہارے کان بھی کاٹ لیں گے۔ کہیں گے لڑکی بھک منگی ہے، سب سے کھلونے مانگتی پھرتی ہے۔"

شاردا۔"میں ان سے کچھ نہ کہوں گی اماں، رکھ دو سب کھلونے۔"

اتنے میں بابو شیام کشور بھی دفتر سے آ گئے۔ تیور چڑھے ہوئے تھے۔ آتے ہی بولے۔"وہ شیطان منو اس محلّہ میں بھی آنے لگا۔ میں نے آج اسے دیکھا۔ کیا یہاں بھی آیا تھا؟"

دیوی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔"ہاں، آیا تو تھا۔"

شیام۔"اور تم نے آنے دیا؟ میں نے منع کیا تھا نہ کہ اسے کبھی اندر قدم نہ رکھنے دینا؟"

دیوی۔"آ کر دروازہ کھڑکانے لگا تو کیا کرتی؟"

شیام۔"اس کے ساتھ وہ شہدا بھی رہا ہو گا؟"

دیوی۔"اس کے ساتھ اور کوئی نہ تھا۔"

شیام۔"تم نے آج بھی نہ کہا ہو گا کہ یہاں مت آیا کرو؟"

دیوی۔"مجھے تو اس کا خیال نہ رہا اور اب وہ یہاں کیا کرنے آوے گا؟"

شیام۔"جو کرنے آج آیا تھا وہی کرنے پھر آوے گا۔ تم میرے منہ میں کالکھ لگانے پر تلی ہوئی ہو۔"

دیوی نے غصہ سے پیچ و تاب کھا کر کہا...... "مجھ سے تم اوٹ پٹانگ باتیں مت کیا کرو، سمجھ گئے؟ تمہیں ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم بھی نہیں آتی! ایک بار پہلے بھی تم نے کچھ ایسی ہی باتیں کہی تھیں۔ آج پھر تم وہی بات کر رہے ہو۔ اگر تیسری بار یہ لفظ میں نے سنے تو نتیجہ برا ہو گا۔ اتنا کہے دیتی ہوں، تم نے مجھے کوئی رنڈی سمجھ لیا ہے۔"

شیام۔"میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے گھر آوے۔"

دیوی۔"تو منع کیوں نہیں کر دیتے؟ میں تمہیں روکتی ہوں؟"

شیام۔"تم کیوں نہیں منع کر دیتیں؟"

دیوی۔"تمہیں کہتے کیا شرم آتی ہے؟"

شیام۔"میرا منع کرنا فضول ہے۔ میرے منع کرنے پر بھی تمہاری مرضی پا کر اس کی آمد و رفت جاری ہی رہے گی۔"

دیوی نے ہونٹ چبا کر کہا۔"اچھا اگر وہ آتا ہی رہے تو اس میں کیا حرج ہے؟ مہتر سبھی گھروں میں آیا جایا کرتے ہیں۔"

شیام۔"اگر میں نے منو کو کبھی اپنے دروازہ پر پھر دیکھا تو تمہاری خیریت نہیں، اتنا سمجھائے دیتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے شیام کشور نیچے چلے گئے اور دیوی مبہوت سی کھڑی رہ گئی۔ تب اس کا دل اس توہین الزام اور

بے اعتباری کے صدمہ سے تڑپ اٹھا۔ وہ زار و قطار رونے لگی۔ اس کو سب سے زیادہ صدمہ جس بات سے پہنچا، وہ یہ تھی کہ میرا شوہر مجھے اس قدر کمینہ اور بے حیا سمجھتا ہے۔ جو کام رنڈی بھی نہ کرے گی، اس کا شبہ مجھ پر کر رہے ہیں۔

(5)

شیام کشور کے آتے ہی شاردا اپنے کھلونے اٹھا کر بھاگ گئی تھی کہ کہیں بابو جی توڑ نہ ڈالیں۔ نیچے جا کر وہ سوچنے لگی کہ انہیں کہاں چھپا کر رکھوں۔ وہ اسی سوچ میں کھڑی تھی کہ اس کی ایک سہیلی صحن میں آ گئی۔ شاردا اسے اپنے کھلونے دکھانے کے لیے بے قرار ہو گئی۔ اس ترغیب کو وہ کسی طرح ضبط نہ کر سکی۔ ابھی تو بابو جی اوپر ہی ہیں، کون اتنی جلدی نیچے آئے جاتے ہیں۔ تب تک کیوں نہ سہیلی کو اپنے کھلونے دکھا دوں؟ اس نے سہیلی کو بلا لیا اور دونوں نئے کھلونے دیکھنے میں اتنی محو ہو گئیں کہ بابو شیام کشور کے نیچے آنے کی بھی انہیں خبر نہ ہوئی۔ شیام کشور کھلونے دیکھتے ہی جھپٹ کر شاردا کے پاس جا پہنچے اور پوچھا...... "تم نے یہ کھولنے کہاں پائے؟"

شاردا کے ہوش و حواس گم ہو گئے۔ خوف سے تھر تھر کانپنے لگی۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

شیام کشور نے پھر گرج کر پوچھا...... "بولتی کیوں نہیں، تجھے کس نے یہ کھلونے دیئے؟"

شاردا رونے لگی۔ تب شیام کشور نے اسے بلا کر کہا۔ "روؤ مت ہم تجھے ماریں گے نہیں، تجھ سے اتنا ہی پوچھتے ہیں کہ تو نے ایسے اچھے کھلونے کہاں پائے؟"

اس طرح دو چار مرتبہ دلاسا دینے سے شاردا کو کچھ تسکین ہوئی۔ اس نے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ ہائے غضب، اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ شاردا چپ ہی رہتی۔ اس کا گونگا ہو جانا بھی اس سے کہیں بہتر تھا۔ دیوی کوئی بہانہ کر کے آئی ہوئی بلا کو سر سے ٹال دیتی مگر شدنی کون ٹال سکتا ہے؟ شیام کشور کے روئیں روئیں سے شعلے نکلنے لگے۔ کھلونے وہیں چھوڑ کر وہ دھم دھم کرتے اوپر گئے اور دیوی کے کندھے دونوں ہاتھوں سے جھنجھوڑ کر بولے۔ "تمہیں اس گھر میں رہنا ہے کہ نہیں؟ صاف صاف کہہ دو۔" دیوی ابھی تک کھڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نفرت بھرے سوال کو سن کر اس کے آنسو غائب ہو گئے۔ کسی بڑی مصیبت کے اندیشہ نے ہلکے صدمے کو بھلا دیا۔ جیسے قاتل کی تلوار دیکھ کر کوئی مریض بستر سے اٹھ کر بھاگے۔ شیام کشور کی طرف خوف بھری نگاہوں سے دیکھا مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ اس کا ایک ایک رونگٹا خاموش لہجہ میں دریافت کر رہا تھا۔ "اس سوال کا مطلب کیا ہے؟"

شیام کشور نے پھر کہا۔ "تمہاری جو مرضی ہو، صاف صاف کہہ ڈالو۔ اگر میرے ساتھ رہتے رہتے تمہارا جی اکتا گیا ہو تو تم کو اختیار ہے۔ میں تمہیں قید کر کے نہیں رکھنا چاہتا۔ میرے ساتھ تمہیں مکر و فریب کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں بخوشی رخصت کرنے کو تیار ہوں۔ جب تم نے دل میں ایک بات ٹھان لی تو میں نے تہیہ کر لیا۔ تم اس مکان میں اب نہیں رہ سکتیں، رہنے کے قابل نہیں ہو۔"

دیوی نے آواز کو سنبھال کر کہا...... "تمہیں آج کل ہو کیا گیا ہے جو ہر وقت زہر اگلتے رہتے ہو؟ اگر مجھ سے جی اکتا گیا ہے تو زہر دے دو۔ جلا جلا کر کیوں مارتے ہو؟ منہ سے باتیں کرنا تو ایسا قصور نہ تھا۔" جب اس نے آ کر پکارا تو میں نے دروازہ کھول دیا۔ اگر میں جانتی کہ ذرا سی بات کا بتنگڑ ہو جاوے گا تو اسے دور ہی سے دھتکار دیتی۔"

شیام۔ ''جی چاہتا ہے، تالو سے زبان کھینچ لوں۔ باتیں ہونے لگیں، اشارے ہونے لگے۔ تحفے آنے لگے۔ اب باقی کیا رہا؟''

دیوی۔ ''کیوں ناحق جلے پر نمک چھڑکتے ہو؟ ایک کمزور عورت کی جان لے کر کچھ پانہ جاؤ گے۔''

شیام۔ ''میں جھوٹ کہتا ہوں؟''

دیوی۔ ''ہاں جھوٹ کہتے ہو۔''

شیام۔ ''یہ کھلونے کہاں سے آئے؟''

دیوی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ کاٹو تو لہو نہ تھا بدن میں۔ سمجھ گئی اس وقت تقدیر بگڑی ہوئی ہے۔ تباہی کے سبھی آثار نمایاں ہیں۔ یہ نگوڑے کھلونے نہ جانے کس بری ساعت میں آئے۔ میں نے لیے ہی کیوں؟ اسی وقت لوٹا کیوں نہ دیئے؟ بات بنا کر بولی...... ''آگ لگے، وہ تحفے کھلونے ہو گئے! بچے کو کوئی کیسے روکے؟ کس کی مانتے ہیں۔ کہتی رہی کہ مت لے مگر نہ مانی تو میں کیا کرتی؟ ہاں یہ جانتی ہوتی کہ ان کھلونوں پر میری گردن ماری جائے گی تو جبراً چھین کر پھینک دیتی۔''

شیام۔ ''ان کے ساتھ اور کون کون سی چیزیں آئی ہیں؟ بھلا چاہتی ہو تو ابھی لاؤ۔''

دیوی۔ ''جو کچھ آیا ہوگا، اسی گھر میں تو ہوگا، دیکھ کیوں نہیں لیتے؟ اتنا بڑا گھر بھی تو نہیں ہے کہ دو چار دن دیکھنے میں لگ جائیں۔''

شیام۔ ''مجھے اتنی فرصت نہیں۔ خیریت اسی میں ہے کہ جو چیزیں آئی ہوں، انہیں میرے سامنے لا کر رکھ دو۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ لڑکی کے لیے کھلونے آویں اور تمہارے لیے کوئی سوغات نہ آوے۔ تم بھری گنگا میں قسم کھاؤ تو بھی مجھے یقین نہ آوے گا۔''

دیوی۔ ''تو گھر میں دیکھ کیوں نہیں لیتے۔''

شیام کشور نے گھونسہ تان کر کہا...... ''کہہ دیا، مجھے فرصت نہیں ہے۔ سیدھے سے ساری چیزیں لا کر رکھ دو ورنہ اسی دم گلا دبا کر مار ڈالوں گا۔''

دیوی۔ ''مار ڈالنا ہو تو مار ڈالو۔ جو چیزیں آئی ہی نہیں، انہیں میں دکھا کیسے دوں۔''

شیام کشور نے غصہ سے پاگل ہو کر دیوی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ چاروں شانے چت زمین پر گر پڑی۔ تب اس کے گلے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔ ''دبا دوں گلا، نہ دکھلاوے گی تو ان چیزوں کو؟''

دیوی۔ ''جو ارمان ہوں، پورے کر لو۔''

شیام۔ ''خون پی لوں گا، تو نے سمجھا کیا ہے؟''

دیوی۔ ''اگر دل کی پیاس بجھتی ہے تو پی لو۔''

شیام۔ ''پھر تو اس مہتر سے باتیں نہ کرے گی؟ اگر اب کبھی مُنّو یا اس شہدے رضا کو اس دروازہ پر دیکھا تو سر کاٹ لوں گا۔''

یہ کہہ کر بابو جی نے دیوی کو چھوڑ دیا اور باہر چلے گئے مگر دیوی اسی حالت میں بڑی دیر تک پڑی رہی۔ اس کے دل میں اس وقت شوہر کی محبت اور پاسداری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کا دل انتقام کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ اس وقت اگر وہ سنتی کہ شیام کشور کو کسی نے بازار میں جوتوں سے پیٹا ہوتا تو وہ شاید وہ خوش ہوتی۔ کئی دنوں تک پانی سے

بھیگنے کے بعد آج یہ جھونکا پا کر محبت کی دیوار زمین پر گر پڑی اور حفظ ناموس کا کوئی ذریعہ نہ رہا۔ اب صرف دنیاوی لحاظ اور قدرتی حیا کی ہلکی سی ڈور رہ گئی تھی جو ایک جھٹکے میں ٹوٹ سکتی ہے۔

(6)

شیام کشور باہر چلے گئے تو شاردا بھی اپنے کھلونے لے کے گھر سے نکلی۔ بابو جی کھلونوں کو دیکھ کر کچھ نہیں بولے تو اب اسے کس کی فکر اور کس کا خوف؟ اب وہ کیوں نہ اپنی سہیلیوں کو اپنے کھلونے دکھاوے؟ سڑک کے اسی پار ایک حلوائی کا مکان تھا۔ حلوائی کی لڑکی اپنے دروازہ پر کھڑی تھی۔ شاردا اسے کھلونے دکھانے چلی۔ درمیان میں سڑک تھی۔ سواری گاڑیوں اور موٹروں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ شاردا کو اپنی دھن میں کسی بات کا خیال نہ رہا۔ طفلانہ جذبات سے بھری ہوئی وہ کھلونے لیے دوڑی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ موت بھی اسی طرح اس کی جان کا کھلونا کھیلنے کے لیے دوڑی آرہی ہے۔ سامنے سے ایک موٹر آتا ہوا نظر پڑا۔ دوسری طرف سے ایک بگھی آرہی تھی۔ شاردا نے چاہا کہ دوڑ کر اس پار نکل جاؤں۔ موٹر نے بگل بجایا۔ شاردا اس کے سامنے آچکی تھی۔ ڈرائیور نے موٹر کو روکنا چاہا، شاردا نے بھی بہت زور مارا کہ سامنے سے نکل جاوے مگر شدنی کو کون ٹالتا ہے؟ موٹر بچی کو روندتی ہوئی چلی گئی۔ سڑک پر صرف ایک گوشت کا لوتھڑا پڑا رہ گیا۔ کھلونے جیوں کے تیوں تھے۔ ان میں سے ایک بھی نہ ٹوٹا تھا۔ کھلونے رہ گئے، کھیلنے والا چلا گیا۔ دونوں میں کون باقی اور کون فانی ہے، اس کا فیصلہ کون کرے؟

چاروں طرف سے لوگ دوڑ پڑے۔ ارے یہ تو بابو جی کی لڑکی ہے جو اوپر والے مکان میں رہتے ہیں۔ لاش کون اٹھاوے؟ ایک آدمی نے لپک کر دروازہ پر آواز دی۔ ''بابو جی، آپ کی لڑکی تو سڑک پر نہیں کھیل رہی تھی؟ ذرا نیچے آجائیے۔''

دیوی نے چھجے پر کھڑے ہو کر سڑک کی طرف دیکھا۔ شاردا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ چیخ مار کر بے تحاشہ نیچے دوڑی اور سڑک پر آکر بچی کو گودی میں اٹھالیا۔ اس کے پیر تھرتھر کانپنے لگے۔ اس جانکاہ صدمہ نے اس کو مبہوت بنادیا۔ رونا بھی نہ آیا۔

محلہ کے کئی لوگ پوچھنے لگے۔ بابو جی کہاں گئے ہیں، ان کو کیسے بلایا جاوے؟

دیوی کیا جواب دیتی۔ وہ تو بے ہوش سی ہو گئی تھی۔ لڑکی کی لاش کو گودی میں لیے اس کے خون سے اپنے کپڑوں کو تر کرتی آسمان کی طرف تاک رہی تھی۔ گویا دیوتاؤں سے پوچھ رہی ہو...... کیا ساری مصیبتیں مجھی پر؟

اندھیرا ہوتا جاتا تھا مگر بابو جی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ کچھ معلوم بھی نہیں، وہ کہاں گئے ہیں۔ رفتہ رفتہ نو بجے مگر اب تک بابو جی نہ لوٹے۔ اتنی دیر تک وہ کبھی باہر نہ رہتے تھے۔ کیا آج ہی انہیں بھی غائب ہونا تھا۔ دس بھی بج گئے۔ اب دیوی رونے لگی۔ اسے لڑکی کی موت کا اتنا رنج نہ تھا جتنا اپنی بے بسی کا۔ وہ کیسے لاش کو جلائے گی؟ کون اس کے ساتھ جائے گا؟ کیا اتنی رات گئے کوئی اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگا؟ اگر کوئی نہ گیا تو کیا اسے تنہا جانا پڑے گا؟ کیا رات بھر لاش پڑی رہے گی؟

جیوں جیوں سناٹا ہوتا جاتا تھا، دیوی کا خوف بڑھتا جاتا تھا۔ وہ پچھتا رہی تھی کہ میں شام ہی کو کیوں نہ اسے لے کر چلی گئی؟

گیارہ بجے تھے۔ دفعتاً کسی نے دروازہ کھولا۔ دیوی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سمجھی، بابو جی آگئے۔ اس کا دل امنڈ آیا اور وہ روتی ہوئی باہر آئی مگر آہ یہ بابو جی نہ تھے، یہ پولیس کے آدمی تھے جو اس معاملہ کی تحقیقات کرنے آئے تھے۔ پانچ بجے کا واقعہ، تحقیقات ہونے لگی۔ گیارہ بجے، آخر تھانیدار بھی تو آدمی ہے، وہ بھی تو شام کے وقت سیر و تفریح کیلئے جاتا ہے۔

گھنٹہ بھر تک تحقیقات ہوتی رہی۔ دیوی نے دیکھا، اب شرم سے کام نہ چلے گا۔ تھانیدار نے اس سے جو کچھ پوچھا، اس کا جواب اس نے بلا تامل دیا۔ ذرا بھی نہ شرمائی، ذرا بھی نہ جھجھکی۔ تھانیدار بھی دنگ رہ گیا۔

جب سب کے بیانات قلمبند کر کے داروغہ جانے لگے تو دیوی نے کہا...... "آپ اس موٹر کا پتہ لگا دیں گے؟"

داروغہ۔ "اب تو شاید ہی اس کا پتہ لگے۔"

دیوی۔ "تو اس کو کچھ سزا نہ ہو گی؟"

داروغہ۔ "مجبوری ہے، کسی کو نمبر بھی تو نہیں معلوم۔"

دیوی۔ "سرکار اس کا کچھ انتظام نہیں کرتی۔ غریبوں کے بچے اسی طرح کچلے جاتے رہیں گے؟"

داروغہ۔ "اس کا کیا انتظام ہو سکتا ہے؟ موٹریں تو بند نہیں ہو سکتیں۔"

دیوی۔ "کم از کم پولیس کو یہ تو دیکھنا چاہیے کہ شہر میں کوئی بہت تیز نہ چلاوے مگر آپ لوگ ایسا کیوں کرنے لگے؟ آپ کے افسر بھی تو موٹروں پر بیٹھتے ہیں۔ آپ ان کی موٹریں روکیں گے تو نوکری کیسے رہے گی؟"

تھانیدار نادم ہو کر چلا گیا۔ جب لوگ سڑک پر پہنچے تو ایک سپاہی نے کہا۔ "مہریا بڑی ٹُن مَن دکھات ہے۔"

تھانیدار۔ "اجی، اس نے تو میرا ناطقہ بند کر دیا۔ کس غضب کا حسن پایا ہے مگر قسم لے لو جو میں نے ایک بار بھی اس پر نگاہ ڈالی ہو۔ تاکنے کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔"

بابو شیام کشور بارہ بجے کے بعد نشہ میں چور گھر میں پہنچے۔ انہیں یہ خبر راستہ ہی میں مل گئی تھی۔ روتے ہوئے مکان میں داخل ہوئے۔ دیوی بھری بیٹھی تھی۔ سوچ رکھا تھا کہ آج چاہے جو ہو جائے مگر پھٹکاروں گی ضرور لیکن انہیں روتے دیکھا تو سارا غصہ غائب ہو گیا۔ خود بھی رونے لگی۔ دونوں بڑی دیر تک روتے رہے۔ اس ناگہانی مصیبت نے دونوں کے دلوں کو ایک دوسرے کی طرف بڑے زور سے کھینچا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا کہ ان میں پھر اگلی محبت عود کر آئی ہے۔

علی الصبح جب لوگ لاش کو جلا کر لوٹے تو شیام کشور نے دیوی کی طرف محبت سے دیکھ کر دکھ بھری آواز میں کہا۔ "تمہارا جی اکیلے کیسے لگے گا؟"

دیوی۔ "تم دس پانچ روز کی چھٹی نہ لے سکو گے؟"

شیام۔ "یہی میں سوچتا ہوں، پندرہ روز کی چھٹی لے لوں۔"

شیام بابو چھٹی لینے دفتر چلے گئے۔ اس مصیبت میں آج دیوی کا دل جتنا خوش تھا، اتنا ادھر مہینوں سے نہ ہوا تھا۔ بچی کو کھو کر وہ اعتبار اور محبت پا گئی تھی اور یہ بات اس کی اشک شوئی کے لیے کچھ کم نہ تھی۔

آہ بد نصیب خوش مت ہو، تیری زندگی کا وہ آخری واقعہ ابھی ہونے کو باقی ہے جس کو تو خیال میں بھی نہیں لا سکتی۔

(7)

دوسرے روز بابو شیام کشور مکان ہی پر تھے کہ منّو نے آکر سلام کیا۔ شیام کشور نے ذرا سخت لہجہ میں پوچھا۔ ”کیا ہے جی، یہ تم کیوں بار بار یہاں آیا کرتے ہو؟“

مُنو بڑے عاجزانہ لہجہ میں بولا۔ ”مالک، کل کی بات جو سنتا ہے، اسی کو رنج ہوتا ہے۔ میں تو ہجور کا گلام ٹھہرا۔ اب نوکر نہیں ہوں تو کیا، سرکار کا نمک تو کھا چکا ہوں۔ بھلاوہ کبھی ہڈیوں سے نکل سکتا ہے۔ کبھی کبھی حال احوال پوچھنے آجاتا ہوں۔ جب سے کل والی بات سنی ہے ہجور، ایسا رنج ہو رہا ہے کہ کیا کہوں، کیسی پیاری بچی تھی کہ دیکھ کر دکھ دور ہو جاتا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی مُنو مُنو کہہ کر دوڑتی تھی۔ جب بیگانوں کا یہ حال ہے تو سرکار کے دل پر جو کچھ بیت رہی ہوگی، سرکار ہی جانتے ہوں گے۔“

شیام بابو نرم ہو کر بولے۔ ”ایشور کی مرضی میں انسان کا کیا بس؟ میرا تو گھر ہی اندھیرا ہو گیا۔ اب یہاں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔“

مُنو۔ ”مالکن تو اور بھی بے حال ہوں گی؟“

شیام۔ ”ہوا ہی چاہیں، میں تو اسے شام سویرے کھلا لیا کرتا تھا۔ ماں تو دن بھر ساتھ ہی رہتی تھی۔ میں تو کام دھندوں میں بھول جاؤں گا، وہ کہاں بھول سکتی ہے؟ ان کو تو ساری زندگی کا رونا ہے۔“

شوہر کو مُنو سے باتیں کرتے سن کر دیوی نے کوٹھے پر صحن کی طرف دیکھا۔ مُنو کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو بھر آئے۔ بولی۔ ”مُنو میں تو لٹ گئی۔“

مُنو۔ ”ہجور، اب صبر کیجئے۔ رونے دھونے سے کیا پھائدہ؟ یہی سب اندھیر دیکھ کر تو کبھی کبھی بھگوان کو جالم (ظالم) کہنا پڑتا ہے۔ جو بے ایمان ہیں، دوسروں کا گلا کاٹتے پھرتے ہیں، ان سے بھگوان بھی ڈرتے ہیں جو سیدھے اور سچے ہیں، انہیں پر آپھت آتی ہے۔“

مُنو دیر تک دیوی کو دلاسا دیتا رہا۔ شیام بابو بھی اسؑ کی باتوں کی تائید کرتے جاتے تھے۔ جب وہ چلا گیا تو بابو صاحب نے کہا۔ ”آدمی تو کچھ برا نہیں معلوم ہوتا۔“

دیوی نے کہا۔ ”محبتی آدمی ہے، رنج نہ ہوتا تو یہاں کیوں آتا؟“

دیوی نے سمجھا ان کا دل مُنو کی طرف سے صاف ہو گیا۔

(8)

پندرہ دن گزر گئے۔ بابو صاحب پھر دفتر جانے لگے۔ مُنو اس درمیان میں پھر کبھی نہ آیا۔ اب تک تو دیوی کا دن شوہر سے باتیں کرنے میں کٹ جاتا تھا مگر اب ان کے چلے جانے پر اسے بار بار شاردا کی یاد آتی۔ عموماً سارا دن روتے ہی گزرتا تھا۔ محلّہ کی دو چار نیچ ذات کی عورتیں آتی تھی مگر دیوی کا دل ان سے نہ ملتا تھا۔ وہ جھوٹی ہمدردی دکھا کر دیوی سے کچھ اینٹھنا چاہتی تھیں۔

ایک روز کوئی چار بجے مُنو پھر آیا اور صحن میں کھڑا ہو کر بولا۔ ”مالکن! میں ہوں مُنو، جرا نیچے آجائیے گا۔“

دیوی نے اوپر ہی سے پوچھا۔ "کیا کام ہے؟ کہو تو۔"

مُنو۔ "جرا آیئے تو۔"

دیوی نیچے آئی تو مُنو نے کہا۔ "رجامیاں باہر کھڑے ہیں اور ہجور سے ماتم پرسی کرتے ہیں۔"

دیوی نے کہا۔ "جاکر کہہ دو، ایشور کی جو مرضی تھی، وہ ہوا۔"

رضا دروازہ پر ہی کھڑا تھا۔ یہ باتیں اس نے صاف سنیں۔ باہر ہی سے بولا۔ "خدا جانتا ہے، جب سے یہ خبر سنی ہے۔ دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے ہیں۔ میں ذرا دلّی چلا گیا تھا، آج ہی واپس آیا ہوں۔ اگر میری موجودگی میں یہ واردات ہوتی تو اور کیا کر سکتا تھا مگر موٹر والے کو بلا سزا کرائے نہ چھوڑتا۔ خواہ کسی راجہ ہی کا موٹر ہوتا۔ سارا شہر چھان مارتا۔ بابو صاحب چپکے ہو کر بیٹھ رہے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ موٹر چلا کر کیا کوئی کسی کی جان لے لے گا؟ پھول سی معصوم بچی کو ظالموں نے مار ڈالا۔ ہائے، اب کون مجھے راجا بھیا کہہ کر پکارے گا؟ خدا کی قسم اس کے لیے دلّی سے ٹوکری بھر کھلونے لایا ہوں۔ کیا جانتا تھا کہ یہاں یہ ستم ہو گیا۔ مُنو دیکھ یہ تعویذ لے جاکر .ہو.جی کو دے دے۔ اسے اپنے جوڑے میں باندھ لیں گی۔ خدا نے چاہا تو انہیں کسی قسم کا خوف و خدشہ نہ رہے گا۔ انہیں برے برے خواب دکھائی دیتے ہوں گے۔ رات کو نیند اچٹ جاتی ہوگی۔ بدن میں کمزوری معلوم ہوتی ہوگی۔ دل گھبرایا کرتا ہوگا۔ یہ ساری شکایتیں اس تعویذ سے دور ہو جاویں گی۔ میں نے ایک خدا رسیدہ فقیر سے یہ تعویذ لکھایا ہے۔"

اسی طرح سے رضا اور مُنو اس وقت تک ایک نہ ایک حیلہ سے دروازہ پر سے نہ ٹلے جب تک بابو صاحب آتے نہ دکھائی دیئے۔ شیام کشور نے ان دونوں کو جاتے دیکھ لیا۔ اوپر جاکر بڑی متانت سے بولے۔ "رضا کیا کرنے آیا تھا؟"

دیوی۔ "یونہی ماتم پرسی کرنے آیا تھا۔ آج دلی سے آیا ہے، یہ خبر سن کر دوڑا آیا تھا۔"

شیام۔ "مرد مردوں سے ماتم پرسی کرتے ہیں یا عورتوں سے؟"

دیوی۔ "تم نہ ملے تو مجھی سے رنج کا اظہار کر کے چلا گیا۔"

شیام۔ "اس کے معنی یہ ہیں کہ جو آدمی مجھ سے ملنے آوے، وہ میرے نہ ہونے پر تم سے مل سکتا ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں، کیوں؟"

دیوی۔ "سب سے ملنے میں تھوڑا ہی جا رہی ہوں۔"

شیام۔ "تو رضا کیا میرا سالا ہے یا سسرا؟"

دیوی۔ "تم تو ذرا ذرا سی بات پر جھلانے لگتے ہو۔"

شیام۔ "یہ ذرا سی بات ہے؟ ایک شریف گھر کی عورت ایک شہدے سے باتیں کرے، یہ ذرا سی بات ہے! تو بڑی سی بات کسے کہتے ہیں؟ یہ ذرا سی بات نہیں ہے۔ یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اگر میں تمہارا گلا گھونٹ دوں تو بھی مجھے پاپ نہ لگے۔ دیکھتا ہوں کہ پھر تم نے وہی رنگ پکڑا۔ اتنی بڑی سزا پاکر بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں۔ اب کے کیا مجھے لے بیٹھنا چاہتی ہو؟"

دیوی سناٹے میں آگئی۔ ایک تو لڑکی کا غم، اس پر یہ بدکلامیوں کی بوچھاڑ اور سنگین الزام۔ اس کے سر میں چکر سا آگیا۔ بیٹھ کر رونے لگی۔ "اس زندگی سے تو موت کہیں اچھی!" صرف یہی الفاظ اس کی زبان سے نکلے۔

بابو صاحب گرج کر بولے۔ "یہی ہوگا۔ مت گھبراؤ، یہی ہوگا۔ تم مرنا چاہتی ہو تو مجھے بھی تمہارے امر ہونے کی خواہش نہیں ہے۔ جتنی جلد تمہاری زندگی کا خاتمہ ہو جاوے، اتنا ہی اچھا۔ خاندان میں کلنک تو نہ لگے گا۔"

دیوی نے سسکیاں بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیوں ایک کمزور عورت پر اتنا ظلم کرتے ہو؟ تمہیں ذرا بھی رحم نہیں آتا؟''

شیام۔ ''میں کہتا ہوں چپ رہ!''

دیوی۔ ''کیوں چپ رہوں؟ کیا کسی کی زبان بند کر دو گے؟''

شیام۔ ''پھر بولے جاتی ہے، میں اٹھ کر سر توڑ دوں گا۔''

دیوی۔ ''کیوں سر توڑ دوگے، کوئی زبردستی ہے؟''

شیام۔ ''اچھا تو بلا، دیکھوں تیرا کون حمایتی ہے؟''

یہ کہتے ہوئے بابو صاحب جھلا کر اٹھے اور دیوی کو کئی تھپڑ اور گھونسے لگا دیئے مگر وہ نہ روئی، نہ چلائی۔ نہ زبان سے ایک لفظ نکالا۔ صرف بے معنی نگاہوں سے شوہر کی طرف تاکتی رہی۔ گویا یہ جاننا چاہتی تھی کہ یہ آدمی ہے یا کچھ اور۔

جب شیام کشور مار پیٹ کر کے علیحدہ کھڑے ہو گئے تو دیوی نے کہا۔ ''دل کے ارمان ابھی نہ نکلے ہوں تو اور نکال لو، پھر شاید موقع نہ ملے۔''

شیام کشور نے جواب دیا۔ ''سر کاٹ لوں گا سر، تو ہے کس پھیر میں۔'' یہ کہتے ہوئے نیچے چلے گئے۔ جھٹکے کے ساتھ کواڑ کھولے۔ دھماکے کے ساتھ بند کیے اور کہیں چلے گئے۔

اب دیوی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ندی بہنے لگی۔

(9)

رات کے دس بج گئے مگر شیام کشور گھر نہ لوٹے۔ روتے روتے دیوی کی آنکھیں پھول گئیں۔ غصہ میں یادہائے شیریں کا فقدان ہو جاتا ہے۔ دیوی کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شیام کشور کو اس کے ساتھ کبھی محبت ہی نہ تھی۔ ہاں کچھ دنوں تک وہ اس کا منہ ضرور جوہتے رہتے تھے لیکن وہ مصنوعی محبت تھی۔ اس کے شباب کی بہار لوٹنے ہی کے لیے اس سے میٹھی میٹھی محبت کی باتیں کی جاتی تھیں۔ اسے سینہ سے لگایا جاتا تھا۔ اسے کلیجے پر سلایا جاتا تھا۔ وہ سب دکھاوا تھا۔ سوانگ تھا۔ اسے یاد ہی نہ آتا تھا کہ کبھی اس سے سچی محبت کی گئی ہو۔ اب وہ شکل نہیں رہی، وہ شباب نہیں رہا۔ وہ جدت نہیں رہی۔ پھر اس پر کیوں نہ ظلم کیا جاوے؟ اس نے سوچا۔ کچھ نہیں، اب ان کا دل مجھ سے پھر گیا ہے ورنہ کیا اس ذرا سی بات پر مجھ پر یوں ٹوٹ پڑتے۔ کوئی نہ کوئی الزام لگا کر مجھ سے گلا چھڑانا چاہتے ہیں۔ یہی بات ہے تو کیا میں ان کی روٹیاں اور ان کی مار کھانے کے لیے اس گھر میں پڑی رہوں؟ جب محبت ہی نہیں رہی تو میرے یہاں رہنے پر لعنت ہے۔ مائیکہ میں کچھ نہ سہی، یہ درگت تو نہ ہوتی۔ ان کی یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں بھی سمجھ لوں گی کہ بیوہ ہو گئی۔

جیوں جیوں رات گزرتی تھی، دیوی کی جان سوکھتی جاتی تھی۔ اسے یہ کھٹکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ آکر پھر نہ مار پیٹ شروع کر دیں۔ کتنے غصہ میں بھرے ہوئے یہاں سے گئے۔ واہ ری قسمت، اب میں اتنی رذیل ہو گئی کہ مہتروں سے، جوتے والوں سے آشنائی کرنے لگی؟ اس بھلے آدمی کو ایسی باتیں منہ سے نکالتے شرم بھی نہیں آتی۔ نہ جانے ان

کے دل میں ایسی باتیں کیونکر آتی ہیں۔ کچھ نہیں، یہ مزاج کے کمینہ، دل کے ناپاک اور خود غرض آدمی ہیں۔ رذیلوں کے ساتھ رذیل ہی بننا چاہیے۔ میری غلطی تھی کہ اتنے دنوں سے ان کی جھڑکیاں سہتی رہی۔ جہاں عزت نہیں، قدر نہیں، محبت نہیں، اعتبار نہیں وہاں رہنا بے حیائی ہے۔ کچھ میں ان کے ہاتھوں بک تو گئی ہی نہیں کہ یہ جو چاہیں کریں، ماریں یا کاٹیں، میں پڑی سہا کروں۔ سیتا جیسی عورتیں ہوتی تھیں تو رام جیسے مرد بھی ہوتے تھے۔

دیوی کو اب یہ خوف ہونے لگا تھا کہ کہیں شیام کشور آتے ہی سچ مچ اس کا گلا نہ گھونٹ دیں یا اس کے چھری نہ بھونک دیں۔ وہ اخبارات میں ایسی کئی ہرجائیوں کی خبریں پڑھ چکی تھی۔ شہر ہی میں ایسی کئی وارداتیں ہو چکی تھیں۔ وہ خوف سے کانپ گئی۔ یہاں رہنے میں جان کی خیریت نہیں۔

دیوی نے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا بقچہ باندھا اور سوچنے لگی کہ یہاں سے کیسے نکلوں اور پھر یہاں سے نکل کر جاؤں کہاں؟ کہیں اس وقت مُنو کا پتہ لگ جاتا تو بڑا کام نکلتا۔ وہ مجھے کیا مائکے نہ پہنچا دیتا؟ ایک بار مائکہ پہنچ جاتی تو پھر لالہ سر ٹپک کر رہ جائیں، پر بھول کر بھی نہ آنے کا نام نہ لوں۔ یہ بھی کیا یاد کریں۔ روپے کیوں چھوڑ دوں۔ جس میں یہ مزہ سے گل چھرّے اڑاویں۔ میں نے ہی تو کاٹ کاٹ کر جمع کیے ہیں۔ ان کی کون سی ایسی بڑی کمائی تھی؟ خرچ کرنا چاہتی تو کوڑی نہ بچتی۔ پیسہ پیسہ بچاتی رہتی تھی۔

دیوی نے جا کر نیچے سے کواڑ بند کر دیئے۔ پھر صندوق کھول کر اپنے سارے زیور اور روپے نکال کر بقچے میں باندھ لیے۔ نقد میں سب نوٹ تھے، کوئی خاص بوجھ بھی نہ ہوا۔

یکا یک کسی نے صدر دروازے پر زور سے دھکا دیا۔ دیوی سہم گئی۔ اوپر سے جھانک کر دیکھا، شیام بابو تھے۔ اس کی ہمت نہ پڑی کہ جا کر دروازہ کھول دے۔ پھر تو بابو صاحب نے اتنی زور سے دھکّے مارنے شروع کیے گویا کہ کواڑ ہی توڑ ڈالیں گے۔ اس طرح دروازہ کا کھل جانا ہی ان کے دل کی حالت کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔ دیوی شیر کے منہ میں جانے کی جرأت نہ کر سکی۔

آخر شیام کشور نے چلا کر کہا۔ ''او ڈیم، کواڑ کھول! او بلاڈی کھول!!! ابھی کھول!''

دیوی کی رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی۔ شیام کشور نشہ میں چور تھے۔ ہوش میں شاید رحم آ جاتا، اسی لیے شراب پی کر آئے ہیں۔ کواڑ تو نہ کھولوں گی۔ چاہے توڑ ہی ڈالو۔ اب تم مجھے اس گھر میں پاؤ گے ہی نہیں، مارو گے کہاں سے؟ تمہیں خوب پہچان گئی۔

شیام کشور پندرہ بیس منٹ تک شور مچانے اور کواڑ کھٹکانے کے بعد اناپ شناپ بکتے ہوئے چلے گئے۔ دو چار پڑوسیوں نے لعنت ملامت بھی کی۔ آپ بھی تو پڑھے لکھے آدمی ہو کر آدھی رات کو گھر چلتے ہیں۔ نیند ہی تو ہے، نہیں کھلتی تو کیا کیجیے گا؟ جائیے کسی یار دوست کے گھر میں پڑ رہیے۔ صبح آئیے گا۔

شیام کشور کے جاتے ہی دیوی نے بقچہ اٹھایا اور آہستہ آہستہ نیچے اتری۔ ذرا دیر میں اس نے کان لگا کر آہٹ لی کہ کہیں شیام کشور کھڑے تو نہیں ہیں۔ جب یقین ہو گیا کہ وہ چلے گئے ہیں تو اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اسے ذرا بھی دکھ یا پچھتاوا نہ تھا۔ بس صرف ایک خواہش تھی کہ یہاں سے بچ کر بھاگ جاؤں۔ کوئی ایسا شخص نہ تھا جس پر وہ بھروسہ کر سکے۔ جو اس مصیبت میں کام آ سکے۔ تھا تو بس وہی مُنو مہر۔ اب اسی کے ملنے پر اس کی ساری امیدوں کا دار و مدار تھا۔ اسی سے مل کر وہ تصفیہ کرلے گی کہ کہاں جائے اور کیسے رہے۔ مائکہ جانے کا اب اس کا ارادہ نہ تھا۔ اسے خوف ہوتا تھا کہ مائکہ میں شیام کشور سے وہ اپنی جان نہ بچا سکے گی۔ اسے یہاں نہ پا کر وہ

ضرور اس کے مائکے جاویں گے اور اسے جبراً کھینچ لاویں گے۔ وہ ساری تکلیفیں، ساری ذلتیں برداشت کرنے کو تیار تھی۔ صرف شیام کشور کی صورت نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ محبت اہانت سے نفرت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

تھوڑی ہی دور چوراہا تھا۔ کئی یکہ والے کھڑے تھے۔ دیوی نے ایک یکہ کیا اور اسے سٹیشن چلنے کو کہا۔

(10)

دیوی نے رات سٹیشن پر گزاری۔ علی الصبح اس نے ایک تانگہ کرائے پر کیا اور پردہ میں بیٹھ کر چوک جا پہنچی۔ ابھی دکانیں نہ کھلی تھیں مگر پوچھنے پر رضا میاں کا پتہ چل گیا۔ اس کی دکان پر ایک لڑکا جھاڑو دے رہا تھا۔ دیوی نے اسے بلا کر کہا۔ ''جا کر رضا میاں سے کہہ دے کہ شاردا کی ماں تم سے ملنے آئی ہے، ابھی چلیئے۔''

دس منٹ میں رضا اور مُنو دونوں آ پہنچے۔

دیوی نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ ''تم لوگوں کے پیچھے مجھے گھر چھوڑنا پڑا۔ کل رات کو تمہارا میرے گھر جانا غضب ہو گیا۔ جو کچھ ہوا، وہ پھر کہوں گی۔ مجھے کہیں ایک گھر دلا دو۔ گھر ایسا ہو کہ بابو صاحب کو میرا پتہ نہ چلے ورنہ وہ مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔'' رضا نے مُنو کی طرف دیکھا، گویا کہہ رہا تھا۔ ''دیکھا، چال کیسی ٹھیک چلی۔'' (دیوی سے) ''آپ مطمئن رہیں۔ ایسا گھر دلا دوں گا کہ بابو صاحب کے بابا کو بھی پتہ نہ چلے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔ ہم آپ کے پسینہ کی جگہ خون بہادیں گے۔ سچ پوچھو تو بہو جی، بابو صاحب آپ کے قابل تھے ہی نہیں۔''

مُنو۔ ''کہاں کی بات بھیا۔ آپ رانی ہونے لائک ہیں۔ میں مالکن سے کہتا تھا کہ بابو جی کو دالمنڈی کی ہوا لگ گئی ہے مگر آپ مانتی ہی نہ تھیں۔ آج ہی رات کو میں نے انہیں گلاب جان کے کوٹھے پر سے اترتے دیکھا۔ نشہ میں چور تھے۔''

دیوی۔ ''جھوٹی بات۔ ان کی یہ عادت نہیں۔ غصہ انہیں ضرور بہت ہے اور غصہ میں آ کر انہیں نیک و بد کچھ نہیں سوجھتا مگر نگاہ کے برے نہیں۔''

مُنو۔ ''ہجور، مانتی ہی نہیں تو کیا کروں۔ اچھا کبھی دکھادوں گا۔ تب تو مانیئے گا۔''

رضا۔ ''ابے دکھانا پیچھے، اس وقت آپ کو میرے گھر پہنچادے۔ اوپر لے جانا۔ جب تک میں ایک مکان دیکھنے جاتا ہوں۔ آپ کے لائق بہت ہی اچھا ہے۔''

دیوی۔ ''تمہارے گھر میں بہت سی عورتیں ہوں گی؟''

رضا۔ ''کوئی نہیں ہے بہو جی۔ صرف ایک بڑھیا ماما ہے۔ وہ آپ کے لیے ایک کہارن بلادے گی۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔ میں مکان دیکھنے جا رہا ہوں۔''

دیوی۔ ''ذرا بابو صاحب کی طرف بھی ہوتے آنا۔ دیکھنا گھر آئے کہ نہیں۔''

رضا۔ ''بابو صاحب سے تو مجھے چڑ ہو گئی۔ شاید نظر آ جائیں تو ان سے میری لڑائی ہو جاوے۔ جو مرد آپ جیسی حسن کی دیوی کی قدر نہیں کر سکتا، وہ آدمی نہیں۔''

مُنو۔ ''بہت ٹھیک کہتے ہو بھیا۔ ایسی سریپ جادی (شریف زادی) کو نہ جانے کس منہ سے ڈانٹتے ہیں۔ مجھے اتنے دن ہجور کی گلامی کرتے ہو گئی، کبھی آدھی بات نہ کہی۔''

رضا مکان دیکھنے گیا اور تانگہ رضا کے مکان کی طرف چلا۔
دیوی کے دل میں اس وقت ایک خیال پیدا ہوا۔ کہیں یہ دونوں سچ مچ شہدے تو نہیں ہیں؟ مگر کیسے معلوم ہو؟ یہ سچ ہے کہ دیوی نے زندگی بھر کے لیے شوہر کو ترک کر دیا تھا مگر اتنی ہی دیر میں اسے پچھتاوا ہونے لگا تھا۔ وہ تنہا ایک مکان میں کیسے رہے گی؟ بیٹھی بیٹھی کیا کرے گی؟ یہ کچھ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ کیوں نہ گھر لوٹ چلوں؟ ایشور کرے، وہ ابھی گھر نہ آئے ہوں۔ مُنو سے بولی۔ ''تم ذرا دوڑ کر دیکھو تو، بابو جی گھر آئے کہ نہیں۔''
مُنو۔ ''آپ چل کر آرام سے بیٹھیں۔ میں دیکھے آتا ہوں۔''
دیوی۔ ''میں اندر نہ جاؤں گی۔''
مُنو۔ ''خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ گھر بالکل خالی ہے۔ آپ ہم لوگوں پر شک کرتی ہیں۔ ہم وہ لوگ ہیں کہ آپ کا حکم پاویں تو آگ میں کود پڑیں۔''
دیوی تانگہ سے اتر کر اندر چلی گئی۔
چڑیا ایک بار پکڑ جانے پر بھی پھڑ پھڑائی مگر بازوؤں میں لاسا لگا ہونے کے سبب اڑ نہ سکی اور شکاری نے اسے اپنی جھولی میں رکھ لیا۔ وہ بدبخت کیا پھر کبھی آسمان میں اڑے گی، کیا پھر اسے ڈالیوں پر چہکنا نصیب ہوگا؟

(11)

شیام کشور صبح گھر لوٹے تو ان کا دل سکون پذیر ہو گیا تھا۔ انہیں اندیشہ ہو رہا تھا کہ شاید دیوی گھر میں نہ ہوگی۔ دروازہ کے دونوں پاٹ کھلے دیکھے تو کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ اتنے سویرے کواڑوں کا کھلا ہونا فالِ بد تھی۔ ایک لمحہ دروازہ پر کھڑے ہو کر اندر کی آہٹ لی۔ کوئی آواز نہ سنائی دی۔ صحن میں گئے، وہاں بھی سناٹا! اوپر گئے، چاروں طرف سونا گھر کاٹنے کو دوڑ رہا تھا۔ شیام کشور نے اب ذرا توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ صندوق میں روپے ندارد، زیورات کا صندوقچہ بھی خالی! اب کیا ہو سکتا تھا؟ کوئی گنگا نہانے جاتا ہے تو گھر کے روپے نہیں اٹھا لے جاتا، وہ چلی گئی۔ اب اس میں ذرا بھی شبہ نہ تھا۔ یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کہاں گئی ہے، شاید اسی وقت لپک کر جانے سے وہ واپس لائی جا سکتی ہے لیکن دنیا کیا کہے گی؟
شیام کشور نے اب پلنگ پر بیٹھ کر ٹھنڈے دل سے ان سارے واقعات کی جانچ پڑتال شروع کی۔ اس میں تو انہیں کوئی شبہ نہ تھا کہ رضا شہدا ہے اور مُنو اس کا پٹھو۔ تو آخر بابو صاحب کا فرض کیا تھا؟ انہوں نے وہ پہلا مکان چھوڑ دیا۔ دیوی کو بار بار سمجھایا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتے تھے؟ کیا مارنا بے جا تھا؟ اگر ایک لمحہ کے لیے بے جا بھی مان لیا جاوے تو کیا دیوی کو اس طرح مکان سے نکل جانا چاہیے تھا؟ کوئی دوسری عورت جس کے دل میں پہلے ہی سے زہر نہ بھر دیا گیا ہو، صرف مار کھا کر مکان سے نہ نکل جاتی، ضرور ہی دیوی کا دل کثیف ہو گیا ہے۔
بابو صاحب نے پھر سوچا، ابھی ذرا دیر میں مہری آوے گی۔ وہ دیوی کو گھر میں نہ دیکھ کر پوچھے گی تو کیا جواب دوں گا؟ دم کے دم سارے محلّہ میں یہ خبر پھیل جاوے گی۔ ہائے ایشور کیا کروں؟ شیام کشور کے دل میں اس وقت ذرا بھی پچھتاوا، ذرا بھی رحم نہ تھا۔ اگر دیوی کسی طرح انہیں مل سکتی تو وہ اس کو ہلاک کر ڈالنے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرتے۔ اس کا گھر سے نکل جانا فوری جوش کے سوا اس کا اور کوئی سبب نہ ہو۔ ان کی نگاہ میں ناقابلِ عفو تھا۔ یہ

بے عزتی کسی طرح نہ گوارا کر سکتے تھے۔ مر جانا اس سے کہیں بہتر تھا۔ غصہ اکثر بے لوثی کی صورت اختیار کر لیا کرتا ہے۔ شیام کشور کو دنیا سے نفرت ہو گئی۔ جب اپنی بیوی ہی دغا دے جاوے تو اور سے کیا امید کی جاوے؟ جس عورت کیلئے ہم جیتے بھی ہیں اور مرتے بھی، جسے آرام سے رکھنے کے لیے ہم اپنی جان قربان کر دیتے ہیں جب وہ اپنی نہ ہوئی تو دوسرا کون اپنا ہو سکتا ہے؟ اس عورت کو خوش رکھنے کیلئے انہوں نے کیا کیا نہیں کیا؟ گھر والوں سے لڑائی کی۔ بھائیوں سے ناتا توڑا۔ یہاں تک کہ اب وہ ان کی صورت سے بھی بیزار ہیں۔ اس کی کوئی ایسی خواہش نہ تھی جسے انہوں نے پورا نہ کیا۔ اس کا ذرا سا سر بھی دکھتا تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے تھے۔ وہی عورت آج ان سے دغا کر گئی۔ صرف ایک شہدے کے بہکانے میں آ کر ان کے منہ میں کالکھ لگا گئی۔ شہدوں پر الزام لگانا تو ایک طرح دل کو سمجھانا ہے۔ جس کے دل میں خامی نہ ہو، اسے کوئی بہکا سکتا ہے؟ جب اس عورت نے دھوکا دیا تو پھر یہ سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں محبت و وفا کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ صرف اہلِ تخیل کی ایجاد ہے۔ ایسی دنیا میں رہ کر تکلیف اور ناامیدی کے سوا اور کیا ملتا ہے؟ پاجن! لے آج سے تو آزاد ہے۔ جو چاہے کر، اب کوئی تیرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں۔ جسے تو "پیارا" کہتے ہوئے نہ تھکتی تھی، اس کے ساتھ تو نے ایسا مجرمانہ سلوک کیا! چاہوں تو تجھے عدالت میں گھسیٹ کر اس جرم کی سزا دلا سکتا ہوں مگر کیا فائدہ؟ اس کا ثمرہ تجھے ایشور دے گا۔

شیام کشور چپ چاپ نیچے اترے۔ کسی سے کچھ کہا نہ سنا۔ دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور ساحل گنگا کی جانب روانہ ہو گئے۔

قزّاقی

(1)

میری بچپن کی یادداشتوں میں قزاقی ایک نہ فراموش ہونیوالا شخص ہے۔ آج چالیس برس گزر گئے مگر قزاقی کا تصور ابھی تک آنکھوں میں ہے۔ میں ان دنوں اپنے والد کے ساتھ ضلع اعظم گڑھ کی ایک تحصیل میں تھا۔ قزاقی ذات کا پاسی تھا، بڑا ہی ہنس مکھ، بڑا ہی ہمت ور، بڑا ہی زندہ دل۔ وہ روزانہ ڈاک کا تھیلا لے کر آتا۔ رات بھر رہتا اور سویرے ڈاک لے کر جاتا۔ شام کو پھر ادھر سے ڈاک لے کر آ جاتا۔ میں تمام دن بے صبری سے اس کا منتظر رہتا۔ جونہی چار بجتے، بے چین ہو کر سڑک پر جا کھڑا ہو جاتا اور تھوڑی دیر میں قزاقی کندھے پر بلم رکھے، اس کے گھونگھرو بجاتا دور سے دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ وہ سانولے رنگ کا مضبوط اور لمبے قد کا جوان تھا۔ اس کا جسم سانچے میں ایسا ڈھلا ہوا کہ چابکدست مصور بھی اس میں کوئی عیب نہ نکال سکتا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں اس کے سڈول چہرے پر بہت ہی بھلی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ اور تیز دوڑنے لگتا۔ اس کے بلم کے گھونگھرو اور زور سے بجنے لگتے اور میرا دل فرطِ مسرت سے زیادہ اچھلنے لگتا۔ خوشی کی امنگ میں میں بھی دوڑ جاتا اور ایک لمحہ میں قزاقی کا کندھا میرا سنگھاسن بن جاتا۔ وہ مقام میری تمناؤں کا بہشت تھا۔ بہشت والوں کو بھی شاید وہ متحرک سرور نہ ملتا ہوگا

جو مجھے قزاقی کے چوڑے کندھوں پر ملتا تھا۔ دنیا میری نگاہوں میں ہیچ ہو جاتی اور جب قزاقی مجھے اپنے کندھے پر لیے ہوئے دوڑنے لگتا، تب تو ایسا معلوم ہوتا کہ گویا میں ہوا کے گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہوں۔

قزاقی ڈاکخانہ میں پہنچتا تو پسینہ سے تر ہو جاتا لیکن آرام کرنے کی اس کی عادت نہ تھی۔ تھیلا رکھتے ہی وہ ہم لوگوں کو لے کر کسی میدان میں نکل جاتا۔ کبھی ہمارے ساتھ کھیلتا، کبھی برہے گا کر سناتا اور کبھی کہانیاں کہتا۔ اسے چوری، ڈاکہ، مار پیٹ، بھوت پریت کے صدہا قصے یاد تھے۔ میں یہ قصے سن کر حیرت آمیز سرور میں محو ہو جاتا۔ اس کے قصوں کے چور ڈاکو سچے بہادر ہوتے تھے۔ جو امراء کو لوٹ کر غرباء و مساکین کی پرورش کرتے تھے۔ مجھے ان سے نفرت کے بجائے عقیدت ہوتی تھی!

(2)

ایک روز قزاقی کو ڈاک کا تھیلا لے کر آنے میں دیر ہو گئی۔ آفتاب غروب ہو گیا اور وہ نظر نہ آیا۔ میں کھویا ہوا سا سڑک پر دور دور تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا مگر وہ مانوس صورت نہ نظر آتی تھی۔ کان لگا کر سنتا تھا مگر ''چھن چھن'' کی وہ مسرت افزا آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ روشنی کے ساتھ میری امید بھی غائب ہوتی جاتی تھی۔ ادھر سے کسی کو آتے دیکھتا تو پوچھتا۔ ''قزاقی آتا ہے؟'' مگر یا تو کوئی سنتا ہی نہ تھا یا صرف سر ہلا دیتا تھا۔

دفعتاً ''جھن جھن'' کی آواز کانوں میں آئی۔ مجھے اندھیرے میں چاروں طرف بھوت ہی بھوت نظر آتے تھے حتیٰ کہ والدہ کے کمرے میں طاق پر رکھی ہوئی مٹھائی بھی اندھیرا ہونے پر میرے لیے قابلِ ترک ہو جاتی تھی مگر وہ آواز سنتے ہی میں اس طرف زور سے دوڑا۔ ہاں وہ قزاقی ہی تھا! اسے دیکھتے ہی میری بے قراری غصہ میں تبدیل ہو گئی۔ میں اسے مارنے لگا، پھر روٹھ کر الگ کھڑا ہو گیا۔

قزاقی نے ہنس کر کہا۔ ''مارو گے تو میں ایک چیز لایا ہوں، وہ نہ دوں گا۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''جاؤ نہ دینا، میں لوں گا ہی نہیں۔''

قزاقی۔ ''ابھی دکھا دوں تو دوڑ کر گودی میں اٹھا لو گے۔''

میں نے پگھل کر کہا۔ ''اچھا دکھا دو۔''

قزاقی۔ ''تو آکر میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ، بھاگ چلوں۔ آج بہت دیر ہو گئی۔ بابو جی بگڑ رہے ہوں گے۔'' میں نے اکڑ کر کہا۔ ''پہلے دکھا دو۔''

میری فتح ہوئی۔ اگر قزاقی کو دیر کا خوف نہ ہوتا اور ایک منٹ بھی زیادہ ٹھہر سکتا تو شاید پانسہ پلٹ جاتا۔ اس نے کوئی چیز دکھلائی جسے وہ ایک ہاتھ سے سینہ سے چمٹائے ہوئے تھا۔ لانبا منہ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

میں نے دوڑ کر اسے قزاقی کی گود سے لے لیا۔ وہ ہرن کا بچہ تھا۔ آہ، میری اس خوشی کا کون اندازہ کرے گا؟ اس وقت سے مشکل امتحانات پاس کیے، بڑا عہدہ بھی پایا، رائے بہادر بھی ہوا مگر ویسی خوشی پھر نہ نصیب ہوئی۔ میں اسے گود میں لیے، اس کے نرم و نازک لمس سے لطف اندوز ہوتا ہوا مکان کی طرف دوڑا۔ قزاقی کو آنے میں کیوں اتنی دیر ہوئی، اس کا خیال ہی نہ رہا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کہاں ملا قزاقی؟''

قزاقی۔ ”بھیا، یہاں سے تھوڑی دور پر ایک چھوٹا سا جنگل ہے۔ اس میں بہت سے ہرن ہیں۔ میرا بہت جی چاہتا تھا کہ کوئی بچہ مل جائے تو تمہیں دوں۔ آج یہ بچہ ہرنوں کے جھنڈ کے ساتھ دکھائی دیا۔ میں جھنڈ کی طرف دوڑا تو سب کے سب بھاگے۔ یہ بچہ بھی بھاگا، پر میں نے پیچھا نہ چھوڑا اور ہرن تو بہت دور نکل گئے، پر یہی بچہ پیچھے رہ گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔ اسی سے تو اتنی دیر ہوئی۔“

اس طرح باتیں کرتے ہم دونوں ڈاکخانے پہنچے۔ بابو جی نے مجھے نہ دیکھا، ہرن کے بچے کو بھی نہ دیکھا۔ قزاقی ہی پر ان کی نگاہ پڑی۔ بگڑ کر بولے۔ ”آج اتنی دیر کہاں لگائی؟ اب تھیلا لے کر آیا ہے۔ اسے لے کر کیا کروں؟ ڈاک تو چلی گئی۔ بتا تو نے اتنی دیر کہاں لگائی؟“

قزاقی کے منہ سے آواز نہ نکلی۔

بابو جی نے کہا۔ ”تجھے شاید اب نوکری نہیں کرنی ہے۔ رذیل ہے نا۔ پیٹ بھرا تو موٹا ہو گیا۔ جب بھوکوں مرنے لگے گا تب آنکھیں کھلیں گی۔“ قزاقی خاموش کھڑا رہا۔

بابو جی کا غصہ اور بڑھا، بولے۔ ”اچھا، تھیلا رکھ دے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ سوٗر ’اب ڈاک لے کے آیا ہے۔ تیرا کیا بگڑے گا؟ جہاں چاہے گا مزدوری کر لے گا۔ ماتھے تو میرے جائے گی۔ جواب تو مجھ سے طلب ہو گا۔“

قزاقی نے رونی صورت بنا کر کہا۔ ”سرکار، اب کبھی دیر نہ ہو گی۔“

بابو۔ ”آج کیوں دیر کی۔ اس کا جواب دے؟“

قزاقی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ تعجب تو یہ تھا کہ میری زبان بھی بند ہو گئی۔ بابو جی بڑے غصہ ور تھے۔ انہیں کام بہت کرنا پڑتا تھا۔ اسی وجہ سے بات بات پر جھنجھلا پڑتے تھے۔ میں تو ان کے سامنے کبھی جاتا ہی نہ تھا۔ وہ بھی مجھے کبھی پیار نہ کرتے تھے۔ دن میں وہ صرف دو بار ایک ایک گھنٹہ کے لیے کھانا کھانے جاتے تھے۔ باقی تمام دن دفتر میں لکھا کرتے تھے۔ انہوں نے بار بار ایک اسسٹنٹ کے لیے افسروں سے درخواست کی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ ہوا تھا۔ حتیٰ کہ تعطیل کے دن بھی بابو جی دفتر ہی میں رہتے تھے۔ صرف والدہ ان کے غصہ کو فرو کرنا جانتی تھیں مگر وہ دفتر میں کیسے آتیں؟ بیچارہ قزاقی اسی وقت میرے دیکھتے دیکھتے نکال دیا گیا۔ اس کا بلم، چپڑاس اور صافہ چھین لیا گیا اور اسے ڈاکخانہ سے نکل جانے کا نادر شاہی حکم سنا دیا گیا۔ آہ اس وقت میرا ایسا جی چاہتا تھا کہ میرے پاس سونے کی لنکا ہوتی تو قزاقی کو دے دیتا اور بابو جی کو دکھلا دیتا کہ آپ کے نکال دینے سے قزاقی کا بال بھی بیکا نہیں ہوا۔ کسی سپاہی کو اپنی تلوار پر جتنا غرور ہوتا ہے، اتنا ہی غرور قزاقی کو اپنی چپڑاس پر تھا۔ جب وہ چپڑاس کھولنے لگا تو اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس سارے فساد کی جڑ وہ نازک شے تھی جو میری گود میں منہ چھپائے ایسے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی گویا ماں کی گود میں ہو۔ جب قزاقی چلا تو میں بھی آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلا۔ میرے گھر کے دروازہ پر آ کر قزاقی نے کہا۔ ”بھیا! اب گھر جاؤ، سانجھ ہو گئی۔“

میں چپ چاپ کھڑا اپنے آنسوؤں کے جوش کو پوری طاقت سے ضبط کر رہا تھا۔

قزاقی پھر بولا۔ ”بھیا، میں کہیں باہر تھوڑا ہی چلا جاؤں گا۔ پھر آؤں گا اور تمہیں کندھے پر بٹھا کر دوڑاؤں گا۔ بابو جی نے نوکری لے لی ہے تو کیا اتنا بھی نہ کرنے دیں گے؟ تم کو چھوڑ کر میں کہیں نہ جاؤں گا۔ بھیا جا کر اماں سے کہہ دو، کجا کی جاتا ہے۔ اس کا کہا سنا معاف کریں۔“

میں دوڑا ہوا گھر گیا مگر ماں سے کچھ کہنے کے بجائے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ماں رسوئی سے باہر آ کر

پوچھنے لگیں۔ ”کیا ہوا بیٹا؟ کس نے مارا؟ بابو جی نے کچھ کہا ہے؟ اچھا، رہ تو جاؤ۔ آج گھر آتے ہیں تو پوچھتی ہوں۔ جب دیکھو میرے لڑکے کو مارا کرتے ہیں۔ چپ رہو بیٹا۔ اب تم اس کے پاس کبھی مت جانا۔“

میں نے بڑی مشکل سے آواز سنبھال کر کہا۔ ”قزاقی......“

ماں نے سمجھا کہ قزاقی نے مارا ہے۔ ”اچھا آنے دو قزاقی کو۔ دیکھو کھڑے کھڑے نکلوائے دیتی ہوں۔ ہرکارہ ہو کر میرے راجہ بیٹے کو مارے۔ آج ہی تو صافہ، بلم، سب چھنوائے لیتی ہوں۔ واہ!“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں، قزاقی نے نہیں مارا۔ بابو جی نے اسے نکال دیا۔ اس کا صافہ بلم چھین لیا۔ چپڑاس بھی لے لی۔“

ماں۔ ”یہ تمہارے بابو جی نے بہت برا کیا ہے۔ وہ بیچارہ اپنے کام میں مستعد رہتا ہے۔ پھر اسے کیوں نکالا؟“

میں نے کہا۔ ”آج اسے دیر ہو گئی تھی۔“

یہ کہہ کر میں نے ہرن کے بچے کو گودی سے اتار دیا۔ گھر میں اس کے بھاگ جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ اب تک ماں کی نگاہ بھی اس پر نہ پڑی تھی۔ اسے پھدکتے دیکھ کر وہ یکایک چونک پڑیں اور لپک کر میرا ہاتھ پکڑ لیا، کہیں وہ خوفناک جانور مجھے کاٹ نہ لے۔ میں کہاں تو پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا، کہاں ماں کی اس گھبراہٹ پر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

ماں۔ ”ارے یہ تو ہرن کا بچہ ہے۔ کہاں ملا؟“

میں نے ہرن کے بچے کا سارا ماجرا اور اس کے خوفناک نتیجہ کا حال ابتدا سے انتہاء تک کہہ سنایا۔ ”اماں! یہ اتنا تیز بھاگتا تھا کہ کوئی دوسرا ہوتا تو پکڑ ہی نہ سکتا۔ سن سن ہوا کی طرح اڑتا چلا جاتا تھا۔ قزاقی پانچ چھ گھنٹے تک اس کے پیچھے دوڑتا رہا، تب کہیں بچہ جا کر ملا اماں۔ قزاقی کی طرح کوئی دنیا بھر میں بھی نہیں دوڑ سکتا۔ اسی سے تو دیر ہو گئی۔ تو بابو جی نے بیچارے کو نکال دیا۔ چپڑاس، صافہ، بلم، سب چھین لیے۔ اب بیچارہ کیا کرے گا؟ بھوکوں مر جائے گا۔“

ماں نے پوچھا۔ ”کہاں ہے قزاقی، ذرا اسے بلا تو لاؤ۔“

میں نے کہا۔ ”باہر تو کھڑا ہے۔ کہتا ہے، اماں جی سے میرا کہا سنا معاف کرا دینا۔“

اب تک ماں میری باتوں کو مذاق سمجھ رہی تھیں۔ شاید وہ سمجھتی تھیں کہ بابو جی نے قزاقی کو ڈانٹا ہو گا مگر میرا آخری جملہ سن کر انہیں خیال ہوا کہ کہیں واقعی تو قزاقی برخاست نہیں کر دیا گیا۔ وہ باہر جا کر قزاقی قزاقی پکارنے لگیں مگر قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ میں نے بار بار پکارا۔ رو رو کر پکارا مگر قزاقی وہاں نہ تھا۔

کھانا تو میں نے کھا لیا، بچے غم میں بھی کھانا نہیں ترک کرتے۔ خصوصاً جب ربڑی بھی سامنے ہو مگر بڑی رات تک پڑے پڑے سوچتا رہا۔ میرے پاس روپے ہوتے تو ایک لاکھ روپے قزاقی کو دے دیتا اور کہتا کہ بابو جی سے کبھی مت بولنا۔ بیچارہ بھوکوں مر جائے گا۔ دیکھیں کل آتا ہے یا نہیں۔ اب کیا کرے گا آ کر؟ مگر آنے کو تو کہہ گیا ہے۔ میں کل اسے اپنے ساتھ کھانا کھلاؤں گا۔

یہی ہوائی قلعے بناتے بناتے مجھے نیند آ گئی۔

(3)

دوسرے روز میں تمام دن اپنے ہرن کے بچے کی آؤ بھگت میں مشغول رہا۔ پہلے اس کے نام رکھنے کی رسم

ادا ہوئی۔ مُنّو نام رکھا گیا۔ پھر میں نے اس کا اپنے جملہ دوستوں اور ہم سبق لڑکوں سے تعارف کرایا۔ ایک ہی روز میں وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گیا کہ میرے پیچھے پیچھے دوڑنے لگا۔ اتنی ہی دیر میں مَیں نے اسے اپنی زندگی میں ایک اہم جگہ دے دی۔ اپنے مستقبل میں بننے والے شاندار محل میں اس کے لیے ایک علیحدہ کمرہ بنانے کا بھی تہیہ کر لیا۔ پلنگ، فٹن وغیرہ کی بھی تجاویز کر لیں۔

لیکن شام ہوتے ہی میں سب چھوڑ چھاڑ کر سڑک پر جا کھڑا ہوا اور قزاقی کی راہ دیکھنے لگا۔ یہ جانتا تھا کہ قزاقی نکال دیا گیا ہے۔ اب اسے یہاں آنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے یہ امید ہو رہی تھی کہ وہ آ رہا ہے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ قزاقی بھوکوں مر رہا ہوگا۔ میں فوراً گھر گیا۔ والدہ چراغ جلا رہی تھیں۔ میں نے چپکے سے ایک ٹوکری میں آٹا نکالا اور آٹا ہاتھوں میں لپیٹے، ٹوکری سے گرتے ہوئے آٹے کی ایک لکیر بناتا ہوا بھاگا۔ آ کر سڑک پر کھڑا ہوا ہی تھا کہ قزاقی سامنے سے آتا نظر پڑا۔ اس کے پاس بلم بھی تھا۔ کمر میں چپڑاس بھی تھی اور سر پر صافہ بھی بندھا ہوا تھا۔ اس کے بلم میں ڈاک تھیلا بھی بندھا ہوا تھا۔ میں دوڑ کر اس کی کمر سے لپٹ گیا اور متحیر ہو کر بولا۔ ”تمہیں چپڑاس اور بلم کہاں سے مل گیا قزاقی؟“ قزاقی نے مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ چپڑاس کس کام کی تھی بھیا۔ وہ تو گلامی کی چپڑاس تھی۔ یہ اپنی خوشی کی چپڑاس ہے۔ پہلے سرکار کا نوکر تھا۔ اب تمہارا نوکر ہوں۔“

یہ کہتے کہتے اس کی نگاہ ٹوکری پر پڑی جو وہیں رکھی تھی۔ بولا۔ ”یہ آٹا کیسا ہے بھیا؟“ میں نے شرماتے ہوئے کہا۔ ”تمہارے ہی لیے تو لایا ہوں۔ تم بھوکے ہو گے، آج کیا کھایا ہو گا؟“

قزاقی کی آنکھیں تو میں نہ دیکھ سکا، اس کے کندھے پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاں اس کی آواز سے معلوم ہوا کہ اس کا گلا بھر آیا ہے۔ بولا۔ ”بھیا! کیا روکھی روٹیاں کھاؤں گا۔ دال، نمک، گھی اور تو کچھ نہیں ہے۔“

میں اپنے سہو پر بہت نادم ہوا۔ سچ تو ہے کہ بیچارہ روکھی روٹیاں کیسے کھائے گا؟ لیکن نمک، دال اور گھی کیسے لاؤں؟ اب تو ماں چوکے میں ہوں گی۔ آٹا لے کر تو کسی طرح بھاگ آیا تھا (ابھی تک مجھے نہ معلوم تھا کہ میری چوری پکڑ لی گئی۔ آٹے کی لکیر نے سراغ دے دیا ہے) اب یہ تین تین کیسے لاؤں؟ ماں سے مانگوں گا تو کبھی نہ دیں گی۔ ایک ایک پیسے کے لیے تو گھنٹوں رلاتی ہیں، اتنی سبھی چیزیں کیوں دینے لگیں۔ یکایک مجھے ایک بات یاد آئی۔ میں نے اپنی کتابوں کے بستہ میں کئی آنے پیسے رکھ چھوڑے تھے۔ مجھے پیسے جمع کر کے رکھنے میں بڑی خوشی ہوتی تھی۔ معلوم نہیں، اب وہ عادت کیوں تبدیل ہو گئی۔ اب بھی وہی حالت ہوتی تو شاید اس قدر فاقہ مست نہ رہتا۔ بابو جی مجھے پیار تو کبھی نہ کرتے تھے مگر پیسے خوب دیتے تھے۔ شاید اپنے کام میں مصروف رہنے کے سبب مجھ سے گلا چھڑانے کے لیے اسی کام کو سب سے آسان سمجھتے تھے۔ انکار کرنے میں میرے رونے اور مچلنے کا اندیشہ تھا۔ اس بلا کو وہ دور ہی سے ٹال دیتے تھے۔ ماں کا مزاج اس کے ٹھیک برعکس تھا۔ انہیں میرے رونے اور مچلنے سے کسی کام میں خلل پڑنے کا خوف نہ تھا۔ آدمی لیٹے لیٹے دن بھر رونا سن سکتا ہے۔ حساب لگاتے ہوئے زور کی آواز سے بھی دھیان بٹ جاتا ہے۔ اماں مجھے پیار تو بہت کرتی تھیں مگر پیسہ کا نام سنتے ہی ان کی تیوریاں بدل جاتی تھیں۔ میرے پاس کتابیں نہ تھیں، ہاں ایک بستہ تھا جس میں ڈاکخانہ کے دو چار فارم تہہ کر کے کتابی صورت میں رکھے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا۔ دال، نمک اور گھی کے لیے کیا اتنے پیسے کافی نہ ہوں گے؟ میری تو مٹھی میں نہیں سماتے! خیر یہ فیصلہ کر کے میں نے کہا۔ ”اچھا، مجھے اتار دو تو میں دال اور نمک لا دوں مگر روز آیا کرو گے نا؟“

قزاقی۔ ”بھیا، کھانے کو دو گے تو کیوں نہ آؤں گا۔“

میں نے کہا۔ ''میں روز کھانے کو دوں گا۔''

قزاقی بولا۔ ''تو میں بھی روج آؤں گا۔''

میں نیچے اترا اور دوڑ کر اپنی ساری پونجی اٹھا لایا۔ قزاقی کو روزانہ بلانے کے لیے اس وقت میرے پاس کوہ نور ہیرا ہوتا تو اسے بھی نذر کرنے میں مجھے تامل نہ ہوتا۔

قزاقی نے متحیر ہو کر پوچھا۔ ''یہ پیسے کہاں پائے بھیا؟''

میں نے فخر سے کہا۔ ''میرے ہی تو ہیں!''

قزاقی۔ ''تمہاری اماں جی تم کو ماریں گی۔ کہیں گی کہ کجاکی نے پھسلا کر منگوا لیے ہوں گے۔ بھیا ان پیسوں کی مٹھائی لے لینا اور آٹا مٹکے میں رکھ دینا۔ میں بھوکوں نہیں مرتا۔ میرے دو ہاتھ ہیں، بھلا میں بھوکوں مر سکتا ہوں؟''

میں نے ہر چند کہا کہ پیسے میرے ہیں لیکن قزاقی نے نہ لیے۔ اس نے بڑی دیر تک ادھر ادھر کی سیر کرائی، گیت سنائے اور مجھے گھر پہنچا کر چلا گیا۔ میرے دروازہ پر آٹے کی ٹوکری بھی رکھ دی۔

میں نے مکان میں قدم رکھا ہی تھا کہ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔ ''کیوں رے چور تو آٹا کہاں لے گیا تھا؟ اب چوری کرنا سیکھتا ہے؟ بتا کس کو آٹا دے آیا ورنہ تیری کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گی۔''

میری نانی مر گئی! ماں غصہ میں شیرنی ہو جاتی تھیں۔ میں سٹپٹا کر بولا۔ ''کسی کو تو نہیں دے آیا۔''

ماں۔ ''تو نے آٹا نہیں نکالا؟ دیکھ کتنا آٹا سارے صحن میں بکھرا پڑا ہے۔''

میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ کتنا ہی دھمکاتی تھیں، چمکارتی تھیں مگر میری زبان نہ کھلتی تھی۔ آنے والی مصیبت کے خوف سے جان سوکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ بھی کہنے کی ہمت نہ پڑتی تھی بگڑتی کیوں ہو؟ آٹا تو دروازے پر رکھا ہوا ہے۔ نہ اٹھا کر لاتے بنتا تھا۔ گویا کام کرنے کی قوت ہی جاتی رہی تھی۔ گویا پیروں میں ہلنے کی طاقت ہی نہ تھی۔ دفعتاً قزاقی نے پکارا۔ ''بہو جی، آٹا یہ درواجے پر رکھا ہوا ہے۔ بھیا مجھے دینے کو لے گئے تھے۔''

یہ سنتے ہی ماں دروازہ کی طرف چلی گئیں۔ قزاقی سے وہ پردہ نہ کرتی تھیں۔ انہوں نے قزاقی سے کوئی بات کی یا نہیں، یہ تو میں نہیں جانتا لیکن اماں جی خالی ٹوکری لیے ہوئے گھر میں آئیں۔ پھر کوٹھڑی میں جا کر صندوق سے کچھ نکالا اور دروازہ کی طرف گئیں۔ میں نے دیکھا، ان کی مٹھی بند تھی۔ اب مجھ سے وہاں کھڑا نہ رہا گیا۔ ماں کے پیچھے پیچھے میں بھی گیا۔ ماں نے دروازے پر کئی بار پکارا مگر قزاقی چلا گیا تھا!

میں نے بڑی بہادری سے کہا۔ ''میں جا کر کھوج لاؤں اماں جی؟''

ماں نے کواڑ بند کرتے ہوئے۔ ''تم اندھیرے میں کہاں جاؤ گے؟ ابھی تو کھڑا تھا۔ میں نے کہا کہ یہاں رہنا، میں آتی ہوں، تب تک نہ جانے کہاں کھسک گیا۔ بڑا سکوچی آدمی ہے۔ آٹا تو لیتا ہی نہ تھا۔ میں نے زبردستی اس کے انگوچھے میں باندھ دیا۔ مجھے تو بیچارے پر بڑا ترس آتا ہے۔ نہ جانے غریب کے گھر میں کچھ کھانے کو ہے یا نہیں۔ روپے لائی تھی کہ دے دوں گی مگر نہ جانے کہاں چلا گیا۔''

اب تو مجھے بھی ہمت ہوئی۔ میں نے اپنی چوری کی پوری داستان کہہ ڈالی۔ بچوں کے ساتھ سمجھدار بچے بن کر والدین ان پر جتنا اثر ڈال سکتے ہیں، جتنی نصیحت دے سکتے ہیں، اتنا بڈھے بن کر نہیں۔

ماں نے کہا۔ ''تم نے مجھ سے پوچھ کیوں نہ لیا؟ کیا میں قزاقی کو تھوڑا سا آٹا نہ دے دیتی؟''

میں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ دل میں کہا، اس وقت تمہیں قزاقی پر رحم آ گیا ہے جو چاہو دے ڈالو لیکن

میں مانگتا تو مارنے دوڑتیں۔ ہاں یہ سوچ کر دل خوش ہوا کہ اب قزاقی بھوکوں نہ مرے گا۔ اماں جی اسے روز کھانے کو دیں گی اور وہ روز مجھے کندھے پر بٹھا کر سیر کرا دے گا۔

دوسرے روز میں دن بھر منو کے ساتھ کھیلتا رہا۔ شام کو سڑک پر جا کر کھڑا ہو گیا مگر اندھیرا ہو گیا اور قزاقی کا کہیں پتہ نہ تھا۔ چراغ جل گیا۔ راستہ میں سناٹا چھا گیا مگر قزاقی نہ آیا۔

میں روتا ہوا گھر آیا۔ ماں نے پوچھا۔ ''کیوں روتے ہو بیٹا؟ کیا قزاقی نہیں آیا؟''

میں اور زور سے رونے لگا۔ ماں نے مجھے چھاتی سے لگا لیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ان کا گلا بھی بھر آیا ہے۔ انہوں نے کہا۔ ''بیٹا چپ ہو جاؤ، میں کل کسی ہرکارے کو بھیج کر قزاقی کو بلاؤں گی۔''

میں روتے ہی روتے سو گیا۔ صبح جونہی آنکھیں کھلیں، میں نے ماں سے کہا۔ ''قزاقی کو بلوا دو۔''

ماں نے کہا۔ ''آدمی گیا ہے بیٹا، قزاقی آتا ہو گا۔'' میں خوش ہو کر کھیلنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں جی جو بات کہتی ہیں، اسے پورا ضرور کرتی ہیں۔ انہوں نے سویرے ہی ایک اہلکار کو بھیج دیا تھا۔ دس بجے جب میں منو کو لیے ہوئے گھر آیا تو معلوم ہوا کہ قزاقی اپنے گھر پر نہیں ملا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی کہ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ کہیں بھاگ گیا ہے۔

بچوں کا دل کتنا نازک ہوتا ہے، اس کا اندازہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ ان میں اپنے جذبات کو ظاہر کرنے کے لیے الفاظ نہیں ہوتے۔ انہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ کونسی بات انہیں بے چین کر رہی ہے۔ کونسا کانٹا ان کے دل میں کھٹک رہا ہے۔ کیوں بار بار انہیں رونا آتا ہے۔ کیوں وہ من مارے بیٹھے ہیں، کھیلنے میں جی نہیں لگتا۔ میری بھی یہی حالت تھی۔ کبھی گھر میں آتا، کبھی باہر جاتا، کبھی سڑک پر جا پہنچتا۔ آنکھیں قزاقی کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ وہ کہاں چلا گیا؟ کہیں بھاگ تو نہیں گیا؟

تیسرے پہر کو میں گمشدہ سا سڑک پر کھڑا تھا۔ یکایک میں نے قزاقی کو ایک گلی میں دیکھا۔ ہاں، وہ قزاقی ہی تھا! میں اس کی طرف پکارتا ہوا دوڑا مگر گلی میں اس کا پتہ نہ تھا۔ نہ جانے کدھر غائب ہو گیا۔ میں نے گلی کو اس سرے سے اس سرے تک دیکھا مگر کہیں قزاقی کی بو تک نہ ملی۔

گھر جا کر میں نے ماں سے یہ بات کہی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ یہ بات سن کر بہت متفکر ہو گئیں۔ اس کے بعد دو تین روز تک قزاقی نہ دکھائی دیا۔ میں بھی اب اس کو کچھ کچھ بھولنے لگا۔ بچے پہلے جتنی محبت کرتے ہیں، بعد کو اتنے ہی بے اعتنا بھی ہو جاتے ہیں۔ جس کھلونے پر جان دیتے ہیں، اسی کو دو چار روز بعد پٹک کر توڑ بھی ڈالتے ہیں۔

دس بارہ روز اور گزر گئے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ بابو جی کھانا کھا رہے تھے۔ میں منو کے پیروں میں پیتل کی پینجیاں باندھ رہا تھا۔ ایک عورت گھونگھٹ نکالے ہوئی آئی اور صحن میں کھڑی ہو گئی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے تھے مگر گوری، خوبصورت عورت تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''بھیا، بہو جی کہاں ہیں؟'' میں نے اس کے پاس جا کر اس کا منہ دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کون ہو؟ کیا بیچتی ہو؟''

عورت۔ ''کچھ بیچتی نہیں ہوں، تمہارے لیے یہ کمل گٹے لائی ہوں بھیا۔ تمہیں تو کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں نا؟'' میں نے اس کے ہاتھوں سے لٹکتی ہوئی پوٹلی کو شوق بھری نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ ''کہاں سے لائی ہو، دیکھیں۔''

عورت۔ ''تمہارے ہرکارے نے بھیجا ہے بھیا۔''

میں نے اچھل کر پوچھا۔ ”قزاقی نے؟“

عورت نے سر ہلا کر ہاں کہا اور پوٹلی کھولنے لگی۔ اتنے میں ماں بھی رسوئی سے نکل آئیں۔ اس نے ماں کے پیر چھوئے۔ ماں نے پوچھا۔ ”تو قزاقی کی گھروالی ہے؟“

عورت نے سر جھکا لیا۔

ماں۔ ”آج کل قزاقی کیا کرتا ہے؟“

عورت نے رو کر کہا۔ ”بہو جی، جس دن سے آپ کے پاس سے آٹا لے کر گئے ہیں، اسی دن سے بیمار پڑے ہیں۔ بس بھیا بھیا کرتے ہیں۔ بھیا ہی میں ان کا من بسا رہتا ہے۔ چونک چونک کر بھیا بھیا کہتے ہوئے درواجے کی طرف دوڑتے ہیں۔ نہ جانے انہیں کیا ہو گیا ہے بہو جی۔ ایک دن مجھ سے کچھ کہا نہ سنا، گھر سے چل دیئے اور ایک گلی میں چھپ کر بھیا کو دیکھتے رہے۔ جب بھیا نے انہیں دیکھ لیا تو بھاگے۔ تمہارے پاس آتے ہوئے لجاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں ہاں، میں نے اس دن تم سے جو کہا اماں جی۔“

ماں۔ ”گھر میں کچھ کھانے پینے کو ہے؟“

عورت۔ ”ہاں بہو جی، تمہارے آسرباد سے کھانے پینے کا دکھ نہیں ہے۔ سبیرے اٹھے اور تالاب کی طرف چلے گئے۔ بہت کہتی رہی کہ باہر مت جاؤ۔ ہوا لگ جائے گی مگر نہ مانا۔ مارے مجوری کے پیر کانپنے لگتے ہیں مگر تالاب میں گھس کر یہ کمل گٹے توڑ لائے اور مجھ سے کہا کہ لے جاؤ، بھیا کو دے آ۔ انہیں کمل گٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ کسل چھیم (خیریت وعافیت) پوچھتی آنا۔“

میں نے پوٹلی سے کمل گٹے نکال لیے اور مزے سے کھا رہا تھا۔ ماں نے بہت آنکھیں دکھائیں مگر یہاں اتنا صبر کہاں؟

میں نے کہا۔ ”کہہ دینا، سب کسل ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بھی کہہ دینا کہ بھیا نے بلایا ہے۔ نہ جاؤ گے تو پھر تم سے کبھی نہ بولیں گے۔ ہاں۔“

بابو جی کھانا کھا کر نکل آئے تھے۔ تولئے سے ہاتھ منہ صاف کرتے ہوئے بولے۔ ”اور یہ بھی کہہ دینا کہ صاحب نے تم کو بحال کر دیا ہے۔ جلد جاؤ ورنہ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیا جاوے گا۔“

عورت نے اپنا کپڑا اٹھایا، چلی گئی۔ ماں نے بہت پکارا مگر وہ نہ رکی۔ شاید اماں جی اسے آٹا، دال وغیرہ دینا چاہتی تھیں۔

ماں نے پوچھا۔ ”سچ مچ بحال ہو گیا؟“

بابو جی۔ ”اور کیا جھوٹ ہی بلا رہا ہوں۔ میں نے تو پانچویں ہی روز اس کی بحال رپورٹ کی تھی۔“

ماں۔ ”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“

بابو جی۔ ”اس کی بیماری کی یہی دوا ہے۔“

(4)

علی الصبح میں اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ قزاقی لاٹھی ٹیکتا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ بہت دبلا ہو گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا،

بوڑھا ہو گیا ہے۔ ہرا بھرا درخت سوکھ کر ٹھونٹھ ہو گیا تھا۔ میں اس کی طرف دوڑا اور اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ قزاقی نے میرے گالوں کو چوما اور مجھے اٹھا کر کندھے پر بٹھانے کی کوشش کی مگر نہ اٹھ سکا۔ تب وہ چوپایوں کی طرح زمین پر ہاتھوں اور گھٹنوں پر کھڑا ہو گیا اور میں اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر ڈاکخانہ کی طرف چلا۔ میں اس وقت خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا اور شاید قزاقی مجھ سے بھی زیادہ خوش تھا!

بابو جی نے کہا۔ "قزاقی تم بحال ہو گئے، اب کبھی دیر نہ کرنا۔"

قزاقی روتا ہوا والد صاحب کے قدموں میں گر پڑا مگر شاید میرے نصیب میں دو سکھ بھوگنا بدا نہ تھا۔ مُنو ملا تو قزاقی چھوٹا، قزاقی آیا تو منو ہاتھ سے گیا اور ایسا گیا کہ اس کے جانے کا رنج آج تک ہے۔ مُنو میری ہی تھالی میں کھاتا تھا۔ جب تک میں کھانے نہ بیٹھوں، وہ بھی کچھ نہ کھاتا تھا۔ اسے بھات سے بہت ہی رغبت تھی۔ مگر جب تک خوب گھی نہ پڑا ہو، اس کا جی نہ بھرتا تھا۔ وہ میرے ہی ساتھ سوتا بھی تھا اور میرے ہی ساتھ اٹھتا بھی۔ صفائی تو اسے اس قدر پسند تھی کہ رفع حاجت کے لیے گھر سے باہر میدان میں نکل جاتا تھا۔ کتوں سے اس کو چڑ تھی۔ کتوں کو گھر میں نہ گھسنے دیتا تھا۔ کتے کو دیکھتے ہی تھالی سے اٹھ جاتا اور اسے دوڑا کر گھر سے باہر نکال دیتا تھا۔

قزاقی کو ڈاکخانہ میں چھوڑ کر جب میں کھانا کھانے گیا تو مُنو بھی آ بیٹھا۔ ابھی دو چار ہی لقمے کھائے تھے کہ ایک بڑا سا جُھبرا کتا صحن میں نظر آیا۔ منو اسے دیکھتے ہی دوڑا۔ دوسرے مکان میں جا کر کتا چوہا ہو جاتا ہے۔ جُھبرا کتا اسے آتے دیکھ کر بھاگا۔ منو کو اب لوٹ آنا چاہیے تھا مگر وہ کتا اس کے لیے ملک الموت تھا۔ منو کو اسے گھر نکال کر بھی صبر نہ ہوا۔ وہ اسے گھر سے باہر میدان میں بھی دوڑانے لگا۔ مُنو کو شاید خیال نہ رہا کہ یہاں میری عملداری نہیں ہے۔ وہ اس احاطہ میں پہنچ گیا تھا جہاں جُھبرے کا بھی اتنا ہی اقتدار تھا جتنا مُنو کا اپنے گھر میں۔ مُنو کتوں کو بھگاتے بھگاتے شاید اپنے قوت بازو پر گھمنڈ کرنے لگا تھا۔ وہ یہ نہ سمجھتا تھا کہ مکان میں اس کی حمایت میں مالک مکان کا خوف کام کیا کرتا ہے۔ جُھبرے نے اس میدان میں آتے ہی پلٹ کر مُنو کی گردن دبا دی۔ بیچارے مُنو کے منہ سے آواز تک نہ نکلی۔ جب پڑوسیوں نے شور مچایا تو میں دوڑا۔ دیکھا تو مُنو مرا پڑا ہے اور جُھبرے کا کہیں پتہ نہیں۔

آنسوؤں کی ہولی

(1)

ناموں کے بگاڑنے کا رواج نہ جانے کب چلا اور کہاں شروع ہوا۔ کوئی اس عالمگیر مرض کا پتہ لگائے تو تاریخی دنیا میں ضرور ہی اپنا نام چھوڑ جاوے۔ پنڈت جی کا نام تو شری بلاس تھا مگر احباب انہیں سِلبِل کہا کرتے تھے۔ ناموں کا اثر عادات و اطوار پر بھی کچھ نہ کچھ پڑتا جاتا ہے۔ بیچارے سِلبِل واقعی سلبل تھے۔ دفتر جا رہے تھے مگر پاجامہ کا ازار بند نیچے لٹک رہا ہے۔ سر پر فلٹ ٹوپی ہے مگر لمبی سی چوٹی پیچھے جھانک رہی ہے۔ اچکن یوں بہت عمدہ ہے۔ کپڑا فیشن کے مطابق، سلائی بڑھیا مگر ذرا نیچی ہو گئی ہے۔ نہ جانے انہیں تیوہاروں سے کیا چڑ تھی۔ دیوالی گزر جاتی مگر وہ

بھلامانس کوڑی ہاتھ میں نہ لیتااور ہولی کا دن توان کے سخت امتحان کا دن تھا۔ تین روز تک وہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ گھر میں بھی سیاہ کپڑے پہنے بیٹھے رہتے تھے۔ یار لوگ ٹوہ میں رہتے تھے کہ بچہ کہیں پھنس جاویں مگر گھر میں گھس کر تو فوجداری نہیں کی جاتی۔ ایک آدھ مرتبہ پھنسے بھی مگر منت سماجت کر کے بے داغ نکل گئے۔

مگراب کے مسئلہ مشکل ہو گیا تھا۔ شاستروں کے مطابق پچیس برس تک برہمچاری رہنے کے بعد انہوں نے اپنا بیاہ کیا تھا۔ برہمچریہ کی پختگی میں جو تھوڑی بہت کسر تھی، وہ تین برس کے گونہ والی مدت نے پوری کر دی۔ اگرچہ بیوی کی جانب سے انہیں کوئی اندیشہ نہ تھا۔ وہ عورتوں کے سر چڑھانے کے حامی نہ تھے۔ اس معاملہ میں انہیں وہی اپنا پرانا طریقہ پسند تھا۔ بیوی کو جب سختی سے ڈانٹ دیا تواس کی مجال ہے کہ رنگ کو ہاتھ لگائے؟ مصیبت یہ تھی کہ خسرال کے لوگ بھی ہولی منانے کے لیے آنے والے تھے۔ پرانی کہاوت ہے کہ ''بہن اندر تو بھائی سکندر'' ان سکندروں کے حملہ سے بچنے کی انہیں کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ احباب تو مکان میں نہ جا سکتے تھے مگر سکندروں کو کون روک سکتا ہے؟ بیوی نے آنکھ پھاڑ کر کہا۔ ''ارے بھیا، کیا سچ مچ گھر میں رنگ نہ لاؤ گے؟''

سلبل نے تیوریاں بدل کر کہا۔ ''بس میں نے اک مرتبہ کہہ دیا اور بات دہرانا مجھے پسند نہیں۔ گھر میں رنگ نہیں آئے گا اور نہ کوئی رنگ چھوٹے گا۔ مجھے کپڑوں پر لال چھینٹے دیکھ کر متلی ہونے لگتی ہے۔ ہمارے گھر میں ایسی ہی ہولی ہوتی ہے۔''

بیوی نے سر جھکا کر کہا۔ ''تو نہ لانا رنگ ونگ، مجھے رنگ لے کر کیا کرنا ہے؟ جب تمہیں رنگ نہ چھوؤ گے تو میں کیسے چھو سکتی ہوں؟''

سلبل نے خوش ہو کر کہا۔ ''بے شک یہی وفادار بیوی کا دھرم ہے۔''

''لیکن بھیا تو آنے والے ہیں، وہ کیوں مانیں گے؟''

''ان کے لیے بھی میں نے ایک تدبیر سوچ لی ہے۔ اسے کامیاب بنانا تمہارا کام ہے، میں بیمار بن جاؤں گا۔ ایک چادر اوڑھ کر لیٹ رہوں گا۔ تم کہنا کہ انہیں بخار آ گیا۔ بس چلو چھٹی ہوئی۔''

بیوی نے آنکھیں نچا کر کہا۔ ''اے نوج، کیسی باتیں منہ سے نکالتے ہو؟ بخار جائے مدعی کے گھر، یہاں آئے تو منہ جھلس دوں نگوڑے کا۔''

''تو پھر دوسری تدبیر ہی کیا ہے؟''

''تم اوپر والی چھوٹی کوٹھڑی میں چھپ رہنا، میں کہہ دوں گی کہ انہوں نے جلاب لیا ہے۔ باہر نکلیں گے تو ہوا لگ جائے گی۔''

پنڈت جی کھل اٹھے۔ ''بس بس، یہ سب سے اچھا ہے۔''

(2)

ہولی کا دن ہے۔ باہر واویلا مچا ہوا ہے۔ زمانہ قدیم سے عبیر اور گلابی کے سوا اور کوئی رنگ نہ چلتا تھا۔ اب نیلا، ہرا، سیاہ سبھی رنگوں کا میل ہو گیا ہے اور اس اتحاد سے بچنا آدمیوں کے لیے تو ممکن نہیں۔ ہاں دیوتا بچیں تو بچیں۔ سلبل کے دونوں سالے محلہ بھر کی عورتوں، مردوں، بوڑھوں، بچوں کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی ایک

مہنڈارنگ گھول رکھا تھا۔ سکندری حملے کر رہے تھے۔ باہر کے دیوان خانہ میں فرش دیواریں، حتیٰ کہ تصویریں بھی رنگ ئی تھیں۔ گھر میں بھی یہی حال تھا۔ محلّہ کی نندیں بھلا کب ماننے والی تھیں؟ پرنالہ تک رنگین ہو گیا تھا۔

بڑے سالے نے پوچھا۔ "کیوں ری چمپا، کیا واقعی ان کی طبیعت درست نہیں؟ کھانا کھانے بھی نہ آئے؟"

چمپا نے سر جھکا کر کہا۔ "ہاں بھیا، رات ہی سے کچھ پیٹ میں درد ہونے لگا۔ ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔" ذرا دیر بعد چھوٹے سالے نے کہا۔ "کیوں جی جی، کیا بھائی صاحب نیچے نہ آویں گے؟ ایسی بھی کیا بیماری ہے، کہو تو اوپر جا کر دیکھ آؤں؟"

چمپا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں نہیں، اوپر مت جائیو، وہ رنگ ونگ نہ کھیلیں گے۔ ڈاکٹر نے ہوا میں نکلنے کو منع کر دیا ہے۔"

دونوں بھائی ہاتھ مل کر رہ گئے!

دفعتاً چھوٹے بھائی کو ایک بات سوجھی۔ جیجا کے کپڑوں کے ساتھ کیوں نہ ہولی کھیلیں؟ وہ تو بیمار نہیں ہیں! بڑے بھائی کے دل میں بھی یہ بات سما گئی۔ بہن بیچاری اب کیا کرتی؟ سکندروں نے کنجیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور سلبل کے سارے کپڑے نکال کر رنگ ڈالے۔ رومال تک کو رانہ چھوڑا۔ جب چمپا نے ان کپڑوں کو صحن میں الگنی پر خشک ہونے کے لیے ڈال دیا تو ایسا معلوم ہوا، گویا کسی رنگریز نے شادی کے جوڑے رنگے ہوں۔ سلبل اوپر بیٹھے بیٹھے یہ تماشے دیکھ رہے تھے مگر زبان نہ کھولتے تھے۔ سینہ پر سانپ سا لوٹ رہا تھا۔ سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ دفتر جانے کو بھی کچھ نہ بچا۔ ان پاجیوں کو میرے کپڑوں سے نہ جانے کیا عداوت تھی۔

گھر میں انواع واقسام کے لذیذ کھانے بن رہے تھے۔ محلّہ کی ایک برہمی کے ساتھ چمپا بھی لگی ہوئی تھی۔ دونوں بھائی اور کئی دیگر اصحاب صحن میں کھانا کھانے بیٹھے تو بڑے سالے نے چمپا سے پوچھا۔ "کچھ ان کے لیے بھی کھچڑی وچڑی بنائی ہے۔ پوریاں تو بیچارے آج کھا نہ سکیں گے۔"

چمپا نے کہا۔ "ابھی تو نہیں بنائی، اب بنالوں گی۔"

"واہ ری تیری عقل! ابھی تک تجھے یہ فکر نہیں کہ وہ بیچارے کھائیں گے کیا۔ تو تو اتنی لاپروا کبھی نہ تھی۔ جا نکال لا جلدی چاول اور مونگ کی دال!"

لیجئے کھچڑی پکنے لگی۔ ادھر دوستوں نے کھانا کھانا شروع کیا۔ سلبل اوپر بیٹھے اپنے نصیبوں کو رو رہے تھے۔ انہیں اس ساری مصیبت کا ایک ہی سبب معلوم ہوتا تھا، شادی؟ چمپا نہ آتی تو یہ سالے کیوں آتے۔ کپڑے کیوں خراب ہوتے۔ ہولی کے دن مونگ کی کھچڑی کیوں کھانے کو ملتی؟

مگر اب پچھتانے سے کیا ہوتا ہے؟ جتنی دیر میں لوگوں نے کھانا کھایا' اتنی دیر میں کھچڑی تیار ہو گئی۔ بڑے سالے نے خود چمپا کو اوپر بھیجا کہ کھچڑی کی تھالی اوپر دے آوے۔

سلبل نے تھالی کی طرف غصہ بھری نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "اسے میرے سامنے سے ہٹالے جا!"

"کیا آج فاقہ ہی کرو گے؟"

"تمہاری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔"

"میں نے کیا کیا؟ سویرے سے کام میں لگی ہوئی ہوں۔ بھیا نے خود کھچڑی پکوائی اور مجھے یہاں بھیجا۔"

"ہاں، وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ میں گھر کا مالک نہیں، سکندروں نے اس پر قبضہ جمالیا مگر میں یہ نہیں مان

سکتا کہ تم چاہتیں تو اور لوگوں کے پہلے ہی میرے پاس تھالی نہ پہنچ جاتی۔ میں اسے پتی برت دھرم کے خلاف سمجھتا ہوں اور کیا کہوں؟"

"تم تو دیکھ رہے تھے کہ دونوں میرے سر پر سوار تھے۔"

"اچھا مذاق ہے کہ اور لوگ سموسے اور خستے اڑاویں اور مجھے مونگ کی کھچڑی دی جاوے، واہ ری تقدیر!"

"تم اس میں سے دو چار لقمے کھالو۔ مجھے جونہی موقع ملے گا، دوسری تھالی لاؤں گی۔"

"سارے کپڑے رنگوا ڈالے۔ اب دفتر کیسے جاؤں گا؟ یہ دل لگی مجھے ذرا بھی نہیں بھاتی۔ میں اسے بدمعاشی کہتا ہوں۔ تم نے صندوق کی کنجی کیوں دے دی؟ کیا میں اتنا پوچھ سکتا ہوں؟"

"زبردستی چھین لی، تم نے سنا نہیں، کرتی کیا؟"

"اچھا جو ہوا، سو ہوا۔ یہ تھالی لے جاؤ۔ دھرم سمجھنا تو دوسری تھالی لانا، نہیں آج فاقہ ہی سہی۔"

یکایک پیروں کی آہٹ پا کر سلبل نے سامنے دیکھا تو دونوں سالے چلے آرہے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بیچارے نے منہ بنالیا۔ چادر سے بدن ڈھک لیا اور کراہنے لگے۔

بڑے سالے نے کہا۔ "کہئے، کیسی طبیعت ہے؟ تھوڑی سی کھچڑی کھالیجئے۔"

سلبل نے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تو کچھ کھانے کو جی نہیں چاہتا۔"

"نہیں، فاقہ کرنا تو مضر ہوگا۔ کھچڑی کھالیجئے۔"

بیچارے سلبل نے دل میں ان دونوں شیطانوں کو خوب کوسا اور زہر کی طرح کھچڑی حلق سے نیچے اتاری۔ آج ہولی کے دن کھچڑی ہی قسمت میں لکھی تھی! جب تک ساری کھچڑی ختم نہ ہو گئی، دونوں وہاں اڑے رہے۔ گویا جیل کے حکام کسی فاقہ کرنے والے قیدی کو جبراً کھانا کھلا رہے ہوں۔ بیچارے کو ٹھونس کر کھچڑی کو زہر مار کرنا پڑا۔ پکوانوں کے لیے گنجائش ہی نہ رہی۔

(3)

دس بجے رات کو چمپا بڑھیا کھانوں کا تھال لیے شوہر کے پاس پہنچی۔ حضرت دل ہی دل میں جھنجلا رہے تھے۔ بھائیوں کے سامنے میری پرواکون کرتا ہے؟ نہ جانے کہاں سے یہ شیطان پھٹ پڑے۔ تمام دن فاقہ کرایا اور ابھی تک کھانے کا کہیں پتہ نہیں! آخر چمپا کو تھال لاتے دیکھ کر کچھ غصہ ٹھنڈا ہوا۔ بولے۔ "ابھی تو بہت سویرا ہے، دو ایک گھنٹے بعد کیوں نہ آئیں؟"

چمپا نے سامنے تھال رکھ کر کہا۔ "تم تو نہ ہاری مانتے ہو، نہ جیتی۔ اب آخر یہ دو مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی آؤ بھگت نہ کروں تو بھی کام نہیں چلتا۔ تمہیں کو برا معلوم ہوگا۔ کون روز آویں گے۔"

"ایشور نہ کرے کہ روز آویں۔ یہاں تو ایک ہی دن میں کام تمام ہو گیا۔"

تھال کے خوشبودار اور لذیذ کھانوں کو دیکھ کر دفعتاً پنڈت جی کے چہرہ پر دلآویز تبسم کی لہر دوڑ گئی۔ ایک ایک چیز کھاتے تھے اور چمپا کو سراہتے تھے۔ "سچ کہتا ہوں چمپا، میں نے ایسی چیزیں کبھی نہیں کھائی تھیں۔ حلوائی کمبخت کیا بنائے گا۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ انعام دوں۔"

"تم مجھے بنا رہے ہو، کیا کروں؟ جیسا بنانے آتا ہے، بنا لائی ہوں۔"

"نہیں جی، سچ کہہ رہا ہوں۔ میری تو روح تک آسودہ ہو گئی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ غذا کا تعلق پیٹ سے اس قدر نہیں جتنا روح سے ہے۔ بتلاؤ، کیا انعام دوں؟"

"جو مانگوں، وہ دو گے؟"

"دوں گا، جنیو کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔"

"نہ دو تو میری بات جائے۔"

"کہتا تو ہوں بھئی، اب کیسے کہوں؟ کیا لکھا پڑھی کر دوں؟"

"اچھا تو مانگتی ہوں، مجھے اپنے ساتھ ہولی کھیلنے دو۔"

پنڈت جی کا رنگ فق ہو گیا۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ "ہولی کھیلنے دوں! میں تو ہولی کھیلتا ہی نہیں، کبھی نہیں کھیلا۔ ہولی کھیلنا ہوتا تو گھر میں چھپ کر کیوں بیٹھتا؟"

"اوروں کے ساتھ نہ کھیلو مگر میرے ساتھ تو کھیلنا ہی پڑے گا۔"

"یہ میرے اصول کے خلاف ہے۔ جس چیز کو اپنے گھر میں جائز سمجھوں، اسے کن الفاظ کے رو سے باہر ناجائز سمجھوں؟ سوچو!"

چمپا نے سر نیچا کر کے کہا۔ "گھر میں ایسی کتنی باتیں جائز سمجھتے ہو، جنہیں گھر کے باہر کرنا جائز ہی نہیں بلکہ گناہ ہے۔"

پنڈت جی جھینپ کر بولے۔ "اچھا بھئی، تم جیتیں، میں ہارا۔ اب میں تم سے یہی دان مانگتا ہوں۔"

"پہلے میرا انعام دے دو، پھر سے دان مانگنا۔" یہ کہتے ہوئے چمپا نے رنگ کا لوٹا اٹھا لیا اور پنڈت جی کو سر تا پا تر کر دیا۔ جب تک وہ اٹھ کر بھاگیں، اس نے مٹھی بھر گلال لے کر ان کے سارے منہ پر لپیٹ دیا۔

پنڈت جی رونی صورت بنا کر بولے۔ "ابھی اور کچھ کسر باقی ہو تو وہ بھی پوری کر لو۔ میں نہ جانتا تھا کہ تم میری آستین کا سانپ بنو گی۔ اب اور کچھ رنگ باقی نہیں رہا؟"

چمپا نے شوہر کے چہرہ پر نظر ڈالی تو اس پر دلی رنج کا گہرا اثر نمایاں تھا۔ پچھتا کر بولی۔ "کیا تم سچ مچ برا مان گئے؟ میں تو سمجھتی تھی کہ تم صرف مجھے چڑھا رہے ہو۔"

سری بلاس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "نہیں چمپا، مجھے برا نہیں لگا۔ ہاں تم نے مجھے اس فرض کی یاد دلا دی جسے میں اپنی بزدلی کے سبب بھولا بیٹھا ہوا تھا۔ وہ سامنے جو تصویر دیکھتی ہو، میرے دلی دوست منہر ناتھ کی ہے جواب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تم سے کیا کہوں کہ کتنا بامذاق، کتنا طبیعت دار اور کتنا جری شخص تھا۔ ملک کی حالت دیکھ دیکھ کر اس کا خون خشک ہوتا تھا۔ انیس، بیس برس کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے مگر وہ اسی کی عمر میں اپنی زندگی کا مقصد تجویز کر چکا تھا۔ خدمت کرنے کا موقع پا کر وہ اس کو اس طرح پکڑتا تھا، گویا دولت ہو۔ استغناء پیدائشی تھا۔ ہوس تو اسے چھو تک نہ گئی تھی۔ ہمارے اور دوست سیر و تفریح کرتے تھے مگر اس کا راستہ سب سے جدا تھا۔ راستی پر جان دینے کو تیار، کہیں بے انصافی دیکھی اور تیور بدل گئے۔ کہیں اخباروں میں ظلم و تشدد کی خبریں پڑھیں اور چہرہ تمتما اٹھا۔ ایسا تو میں نے آدمی ہی نہیں دیکھا۔ ایشور نے بے وقت ہی بلا لیا ورنہ وہ انسانوں میں ایک برگزیدہ شخص ہوتا۔ کسی مصیبت زدہ کی مدد کرنے کو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا تھا۔ عورتوں کی اتنی عزت و توقیر کوئی کیا کرے گا؟

عورت اس کے لیے پرستش و عقیدت کی چیز تھی۔ پانچ سال ہوئے، یہی ہولی کا دن تھا۔ میں بھنگ کے نشہ میں چور، سر سے پیر تک رنگ میں نہایا ہوا، اس کو گانا سننے کے لیے بلانے گیا۔ دیکھا کہ وہ کپڑے پہنے ہوئے کہیں جانے کو تیار تھے۔ پوچھا، کہاں جا رہے ہو؟"

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "تم اچھے وقت پر آ گئے ورنہ مجھے جانا پڑتا۔ ایک اناتھ بڑھیا مر گئی ہے۔ کوئی اسے کندھا دینے والا نہیں ملتا۔ کوئی کسی دوست سے ملنے گیا ہوا ہے۔ کوئی نشہ میں چور پڑا ہوا ہے۔ کوئی احباب کی دعوت کر رہا ہے اور کوئی رقص و سرود کی محفل سجائے بیٹھا ہے۔ کوئی لاش اٹھانے والا نہیں! برہمن، چھتری اس چمارن کی لاش کو کیسے چھوویں گے۔ ان کا تو دھرم بھرشٹ ہوتا ہے۔ کوئی تیار نہیں ہوتا۔ بڑی مشکل سے دو کہار ملے ہیں، ایک میں ہوں۔ اب چوتھے آدمی کی کمی ہے۔ سو ایشور نے تمھیں بھیج دیا، چلو چلیں۔"

ہائے اگر میں جانتا کہ یہ پیارے منہر کا آخری حکم ہے تو آج میرے دل کو اتنا رنج نہ ہوتا۔ میرے گھر پر کئی دوست آئے ہوئے تھے۔ گانا ہو رہا تھا۔ اس وقت لاش اٹھا کر دریا تک لے جانا مجھے ناگوار تھا۔ بولا۔ "اس وقت تو بھئی میں نہ جا سکوں گا۔ گھر پر مہمان جمع ہیں۔ میں تو تمھیں بلانے آیا تھا۔"

منہر نے میری طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "اچھی بات ہے، تم جاؤ۔ میں اور کسی کو ڈھونڈ لوں گا مگر مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی! تم نے بھی وہی کہا جو تم سے پیشتر اور لوگوں نے کہا تھا۔ کوئی نئی بات نہیں۔ اگر ہم لوگ اپنے فرض کو بھول نہ گئے ہوتے تو آج یہ حالت ہی کیوں ہوتی؟ ایسی ہولی پر لعنت ہے! تیوہار، تماشہ دیکھنے، عمدہ عمدہ چیزیں کھانے اور بڑھیا بڑھیا پوشاکیں پہننے کا نام نہیں۔ یہ برکت ہے، تپسیا ہے! اپنے بھائیوں سے محبت و ہمدردی جتانا ہی تیوہاروں کا خاص مقصد ہے۔ کپڑے سرخ کرنے سے پہلے خون کو سرخ بنا لو، سفید خون پر یہ سرخی زیب نہیں دیتی۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ مجھے اس وقت یہ فضیحت بہت بری معلوم ہوئی۔ اگر میرے دل میں وہ خدمتی جذبہ نہ تھا تو اس کو مجھے اس طرح لعنت ملامت کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ خیر، گھر چلا آیا مگر وہ باتیں میرے کانوں میں برابر گونجتی رہیں۔ ہولی کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا!

ایک مہینہ تک ہم دونوں میں ملاقات نہ ہوئی۔ کالج امتحان کی تیاری کے لیے بند ہو گیا تھا۔ اس لیے کالج میں بھی ملاقات نہ ہوتی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ وہ کب اور کیسے بیمار پڑا اور کب اپنے گھر گیا۔ دفعتاً ایک روز مجھے اس کا ایک خط ملا۔ ہائے، اس خط کو پڑھ کر آج بھی چھاتی پھٹنے لگتی ہے!

سری بلاس ایک لمحہ تک گلا بھر آنے کے سبب نہ بول سکے۔ پھر بولے۔ "کسی روز تمھیں دکھاؤں گا۔ لکھا تھا کہ مجھ سے آخری مرتبہ مل جاؤ۔ اب شاید اس زندگی میں ملاقات نہ ہو۔ خط میرے ہاتھ سے گر پڑا۔ اس کا مکان میرٹھ کے ضلع میں تھا۔ دوسری گاڑی جانے میں نصف گھنٹہ باقی تھا۔ میں فوراً روانہ ہو گیا مگر اسے دیکھنا نہ ہوا تھا۔ میرے پہنچنے کے قبل ہی وہ وفات پا چکا تھا۔ چمپا! اس کے بعد میں نے ہولی نہیں کھیلی۔ ہولی ہی نہیں اور سبھی تیوہار چھوڑ دیئے۔ ایشور نے شاید مجھے کام کی طاقت نہیں دی۔ اب بہت چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی طرح کا خدمتی کام لے، خود آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن پیچھے چلنے کیلئے تیار ہوں مگر کوئی مجھ سے کام لینے والا بھی نہیں۔ لیکن آج یہ رنگ ڈال کر تم نے مجھے اس لعنت کی یاد دلا دی۔ ایشور مجھے ایسی توفیق دے کہ میں دل ہی میں نہیں بلکہ عمل میں منہر بنوں!"

یہ کہتے ہوئے سری بلاس نے طشتری سے گلال اٹھایا اور اس تصویر پر چھڑک کر اسے پرنام کیا۔

سہاگ کا جنازہ

(1)

ممالک متوسط کے ایک پہاڑی گاؤں میں ایک چھوٹے سے مکان کی چھت پر ایک نوجوان گویا شام کے سکوت میں محو ہوا سا بیٹھا تھا۔ سامنے چاند کی مدھم روشنی میں اودی رنگ والی پہاڑیوں کا سلسلہ لا محدودیت کے خواب کی طرح متین، پراسرار، نغمہ خیز اور دلکش معلوم ہوتا تھا۔ ان پہاڑیوں کے نیچے آب رواں کی ایک روپہلی لکیر ایسی معلوم ہوتی تھی گویا ان پہاڑیوں کا کل نغمہ، کل متانت اور کل اسرار اسی سفید روانی میں خوش رو کیا ہو۔ نوجوان کی وضع سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی حالت بہت امیرانہ نہیں ہے۔ ہاں اس کے چہرہ پر جلال و ذہانت کے آثار نمایاں تھے۔ اس کی آنکھوں پر عینک نہ تھی۔ نہ مونچھیں منڈی ہوئی تھیں۔ نہ بال سنوارے ہوئے تھے۔ نہ کلائی پر گھڑی تھی حتیٰ کہ جیب میں فاؤنٹین قلم بھی نہ تھا یا تو وہ اصولوں کا دلدادہ تھا یا تصنع کا دشمن۔

نوجوان خیالات میں غرق اسی پہاڑیوں کے سلسلہ کی طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا کہ دفعتاً بادل کی گرج سے بھی زیادہ مہیب آواز سنائی دی۔ چشمہ کا نغمۂ شیریں اس خوفناک شور میں ڈوب گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ گویا اس آواز نے پہاڑوں کو بھی ہلا دیا ہے۔ گویا پہاڑوں میں کوئی زبردست لڑائی چھڑ گئی ہے۔ یہ ریل گاڑی تھی جو ندی پر کے پل سے چلی آرہی تھی۔

ایک نوجوان عورت کمرہ سے نکل کر چھت پر آئی اور بولی۔ ”آج ابھی سے گاڑی آگئی۔ اسے بھی آج ہی بَیر نکالنا تھا۔“

نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”پیاری میرا جی چاہتا ہے کہ کہیں نہ جاؤں۔ میں نے طے کر لیا۔ میں نے تمہاری خاطر سے ہاں کہہ دیا تھا مگر اب جانے کو دل نہیں چاہتا۔ تین سال کیسے گزریں گے؟“

عورت نے پُردرد لہجہ میں کہا۔ ”تین سال کی جدائی کے بعد پھر تو تمام عمر کوئی خلل واقع نہ ہوگا! ایک مرتبہ جو ارادہ کر لیا ہے، اسے پورا ہی کر ڈالو۔ بے انتہا خوشی کی امید میں ساری مصیبتیں جھیل لوں گی۔“

یہ کہتی ہوئی حسینہ ناشتہ لانے کے حیلہ سے پھر اندر چلی گئی۔ آنسوؤں کا ابال اس کے قابو سے باہر ہو گیا۔

ان دونوں کی ازدواجی زندگی کی یہ پہلی سالگرہ تھی۔ نوجوان بمبئی کالج سے ایم اے کی ڈگری لے کر ناگپور کے ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ عصرِ جدید کے نئے نئے ازدواجی اور معاشرتی انقلابات نے ذرا بھی ڈانواڈول نہ کیا تھا۔ قدیم رواجوں سے ایسی زبردست محبت شاید بڈھوں کو بھی کم ہوگی۔ پروفیسر ہو جانے پر اس کے والدین نے اس حسینہ سے اس کی شادی کر دی تھی۔ رواج کے مطابق ہی اس آنکھ مچولی کے کھیل میں انہیں محبت کا انمول رتن مل گیا! کیشو چھٹیوں میں یہاں پہلی گاڑی سے آتا اور آخری گاڑی سے جاتا۔ یہ دو چار روز خواب شیریں کی طرح نبٹ جاتے تھے۔ دونوں بچوں کی طرح رو رو کر جدا ہوتے۔ اسی بالا خانہ پر کھڑی ہو کر وہ اس کو دیکھا کرتی۔ جب تک بے درد پہاڑیاں اسے آڑ میں نہ کر لیتیں۔ مگر ابھی سال بھی نہ پورا ہونے پایا تھا کہ مفارقت نے اپنی سازشیں شروع کر دیں۔ کیشو کو پردیس میں جا کر اپنی تعلیم پوری کرنے کے لیے ایک وظیفہ مل گیا۔ دوستوں نے مبارکباد دی۔ کس کے ایسے

نصیب ہیں جسے بلا طلب اپنی ترقیوں کا ایسا نادر موقع ہاتھ لگے۔ کیشو بہت خوش نہ تھا۔ وہ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا اپنے مکان میں آیا۔ والدین اور دیگر رشتہ داروں نے اس سیاحت کی زبردست مخالفت کی۔ شہر میں جتنی مبارکبادیاں ملی تھیں، یہاں اس سے کہیں زیادہ رکاوٹیں پیش آئیں لیکن سبھدرا کے بڑے بڑے منصوبوں کی حد نہ تھی۔ وہ شاید کیشو کو اندر آسن پر بیٹھا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کے سامنے اس وقت بھی وہی شوہر کی اطاعت کا معیار ہوتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اس کے سر میں تیل ڈالے گی۔ اس کی دھوتی دھوئے گی۔ اس کے پیر دبائے گی اور اس کے پنکھا جھلے گی۔ عقیدت مند کی بلند ترین تمناؤں کا تعلق اس کی عقیدت کی چیز ہی سے ہوتا ہے۔ وہ اس کے لیے سونے کا مندر بنائے گا۔ اس کے سنگھاسن کو جواہرات سے سجائے گا۔ بہشت سے پھول لاکر اس کی نذر کرے گا مگر وہ خود ویسا ہی عقیدت شعار رہے گا۔ جٹاؤں کے بجائے مکٹ کی یا لنگوٹی کے بجائے پیتامبر کی ہوس اسے کبھی نہیں ستاتی۔ سبھدرا نے اس وقت تک دم نہ لیا جب تک کیشو سے ولایت جانے کا وعدہ نہ کرا لیا۔ والدین نے اسے کلنکنی اور نہ جانے کیا کیا کہا مگر بالآخر وہ بھی راضی ہو گئے۔ سب تیاریاں ہو گئیں۔ اسٹیشن قریب ہی تھا۔ وہاں گاڑی دیر تک کھڑی رہتی تھی۔ سٹیشن کے قریبی گاؤں کے باشندوں کے لیے گاڑی کی آمد' دشمن چڑھائی نہیں بلکہ دوست کی آمد ہے۔ گاڑی آ گئی۔ سبھدرا ناشتہ تیار کر کے شوہر کو ہاتھ دھلانے آئی تھی۔ اس وقت کیشو کے محبت بھرے اعتراض نے اسے ایک لمحہ کے لیے متزلزل کر دیا۔ ہائے کون جانتا ہے کہ تین سال میں کیا ہو جاوے! دل میں ایک جوش پیدا ہوا۔ کہہ دوں "پیارے نہ جاؤ۔ تھوڑا ہی کھائیں گے۔ موٹا ہی پہنیں گے۔ رو رو کر دن تو نہ کٹیں گے۔" کبھی کیشو کے آنے میں ایک آدھ مہینہ لگ جاتا تو وہ بے چین ہو جایا کرتی تھی۔ یہی جی چاہتا تھا کہ اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔ پھر یہ کمبخت تین سال کیسے گزریں گے۔ لیکن اس نے نہایت سختی سے ان مایوسی بھرے خیالات کو ٹھکرا دیا اور کانپتے ہوئے لہجہ میں بولی۔ "جی تو میرا بھی یہی چاہتا ہے۔ جب تین سال کی مدت کا اندازہ کرتی ہوں تو ایک کلپ سا معلوم ہوتا ہے مگر جب ولایت میں تمہاری عزت و شہرت کا خیال کرتی ہوں تو یہ تین سال تین دن کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ تم تو جہاز پر پہنچتے ہی مجھے بھول جاؤ گے۔ نئے نئے منظر تمہاری دلکشی کے لیے آ موجود ہوں گے۔ یورپ جا کر عالموں کی صحبت میں تمہیں گھر کی یاد بھی نہ آئے گی۔ مجھے تو رونے کے سوا اور کوئی دھندا نہیں ہے۔ یہی محبت کی یادداشتیں میری زندگی کا سہارا ہوں گی لیکن کیا کروں، زندگی کو آرام سے بسر کرنے کی خواہشیں تو ضبط نہیں ہوتیں۔ پھر جس جدائی کا انجام زندگی کے سارے لوازمات کو اپنے ساتھ لائے گا، وہ دراصل تپسیا (ریاضت) ہے۔ تپسیا کے بغیر تو "بردان" نہیں ملتا۔"

کیشو کو بھی اب معلوم ہوا کہ عارضی محبت کے جوش میں اپنی قسمت بنانے کا ایسا نادر موقع ہاتھ سے جانے دینا محض نادانی ہے۔ کھڑے ہو کر بولے۔ "تم بہت رونا دھونا نہیں ورنہ میرا جی نہ لگے گا۔" سبھدرا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر سینہ سے لگاتے ہوئے ان کے چہرہ کی طرف اشک آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ "خط برابر بھیجتے رہنا۔" "ضرور بھیجوں گا، ہفتہ وار لکھوں گا۔"

سبھدرا نے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "دیکھنا، ولایتی مسوں کے جال میں نہ پھنس جانا۔"

کیشو پھر پلنگ پر بیٹھ گیا اور بولا۔ "یہ شک ہے تو لو میں جاؤں گا ہی نہیں۔"

سبھدرا نے اس کے گلے میں ہاتھوں کو حمائل کر کے پُراعتماد نگاہوں سے دیکھا اور بولی۔ "میں دل لگی کر رہی تھی۔" "اگر اندر لوک کی اپسرا بھی آ جاوے تو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ برہما جی نے ایسی دوسری ہستی پیدا ہی نہیں کی۔"

"درمیان میں کوئی چھٹی مل سکے تو ایک بار چلے آنا۔"

"نہیں پیاری، درمیان میں شاید چھٹی نہ ملے گی مگر جو میں نے سنا کہ تم رو رو کر گھلی جاتی ہو، کھانا پینا ترک دیا ہے تو میں ضرور چلا آؤں گا۔ یہ پھول ذرا بھی نہ کملانے پاویں۔"

دونوں گلے مل کر جدا ہو گئے۔ باہر رشتہ داروں اور دوستوں کا ایک مجمع موجود تھا۔ کیشو نے بڑوں کے پیر چھوئے۔ چھوٹوں کو گلے لگایا اور سٹیشن کی طرف چلا۔ سب لوگ سٹیشن پر بھیجنے گئے۔ ایک لمحہ میں گاڑی مسافر کو لے کر چلدی۔

ادھر کیشو گاڑی میں بیٹھا ہوا پہاڑیوں کی بہار دیکھ رہا تھا۔ ادھر سبھدرا زمین پر پڑی سسکیاں بھر رہی تھی!

(2)

دن گزرنے لگے۔ اسی طرح جیسے بیماری کے دن گزرتے ہیں۔ دن پہاڑ رات کالی بلا۔ رات بھر مناتے گزرتی تھی کہ کسی طرح سویرا ہو، سویرا ہوتا تو منانے لگتی کہ جلد شام ہو۔ مائکے گئی کہ وہاں جی بہلے گا۔ دس پانچ روز تک مقام کی تبدیلی کا کچھ اثر ہوا۔ پھر اس سے بدتر حالت ہوئی، بھاگ کر سسرال چلی آئی۔ مریض کروٹ بدل کر آرام محسوس کرتا ہے۔

پہلے پانچ چھ ماہ تک تو کیشو کے خطوط پندرہویں روز برابر ملتے رہے۔ ان میں رنج فراق کا ذکر کم اور نئے نئے مناظر کا تذکرہ زیادہ ہوتا۔ مگر سبھدرا مطمئن تھی۔ خطوط آتے ہیں۔ وہ خوش ہیں۔ خیریت سے ہیں، اس کے لیے یہی کافی تھا۔ اس کے خلاف وہ خط لکھتی تو درد فراق کے ذکر کے سوا اسے کچھ سوجھتا ہی نہ تھا۔ کبھی کبھی جب دل بے چین ہو جاتا تو پچھتاتی کہ ناحق جانے دیا۔ کہیں ایک روز مر جاؤں تو ان کے درشن بھی نہ ہوں۔

لیکن چھٹے ماہ سے خطوط میں بھی دیر ہونے لگے۔ کئی مہینوں تک تو مہینہ میں ایک خط آتا رہا۔ پھر وہ بھی بند ہو گیا۔ سبھدرا کے 4-6 خط جاتے تو ایک خط آتا اور وہ بھی بے دلی سے لکھا ہوا۔ کثرت کار اور عدیم الفرصتی کے شکووں سے بھرا ہوا۔ ایک جملہ بھی ایسا نہیں جس سے دل کی تسکین ہو۔ جو دل کے ناسور پر پھاہے کا کام دے۔ ہائے ابتداء سے انتہا تک پیاری لفظ کا نام نہیں۔ سبھدرا بے قرار ہو گئی۔ اس نے یورپ جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہ ساری تکالیف برداشت کر لے گی۔ سر پر جو پڑے گی، اسے جھیل لے گی۔ کیشو کو آنکھوں سے دیکھتی تو رہے گی۔ وہ اس بات کو ان سے پوشیدہ رکھے گی، ان کی مشکلات میں اضافہ نہ کرے گی۔ ان سے بولے گی بھی نہیں، صرف انہیں کبھی کبھی آنکھ بھر کر دیکھ لے گی۔ یہی اس کے سکون دل کے لیے کافی ہوگا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اب اس کا وہ کیشو اس کا نہیں رہا، وہ ایک دوسری ہی حسینہ کی محبت کا بھکاری ہے۔

سبھدرا کئی دنوں تک اس تجویز پر غور کرتی رہی۔ اسے کسی طرح کا خوف نہ تھا۔ اخبارات کے پڑھتے رہنے سے اسے بحری مسافت کا حال معلوم ہوتا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے سسر اور خوشدامن کے سامنے اپنے ارادہ کا اظہار کیا۔ ان لوگوں نے بہت سمجھایا، روکنے کی بہت کوشش کی مگر اس نے اپنی ضد نہ چھوڑی۔ آخر جب لوگوں نے دیکھا کہ یہ کسی طرح نہیں مانتی تو اجازت دے دی۔ مائکے والے بھی سمجھا بجھا کر تھک گئے۔ کچھ روپے اس نے خود جمع کر رکھے تھے، کچھ خسرال میں ملے۔ ماں باپ نے بھی مدد کی۔ راستہ کے خرچ کی فکر نہ رہی۔ انگلستان پہنچ کر وہ کیا کرے گی۔ اس کے متعلق

اس نے ابھی کچھ طے نہ کیا تھا۔ اتنا جانتی تھی کہ محنت کرنے والوں کو کہیں بھی روٹیوں کی کمی نہیں رہتی۔
رخصت ہوتے وقت ساس اور سسر دونوں سٹیشن تک آئے۔ جب گاڑی نے سیٹی بجادی تو سبھدرا۔ ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''میری روانگی کا حال وہاں نہ لکھئے گا ورنہ انہیں تردد ہوگا اور پڑھنے میں ان کا جی نہ لگے گا۔''
سسر نے تشفی دی۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔

(3)

لندن کے اس حصہ میں جہاں اس دولت مندی کے وقت میں بھی افلاس کا دور دورہ ہے، اوپر کے ایک چھوٹے کمرہ میں سبھدرا کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس کو یہاں آئے آج ایک مہینہ ہوگیا ہے۔ سفر کے قبل اس کے دل میں جتنے وسوسے تھے، وہ سبھی دور ہوتے جارہے تھے۔ بمبئی کے بندرگاہ میں جہاز پر جگہ پانے کا مسئلہ بڑی آسانی سے حل ہوگیا۔ وہی ایک عورت نہ تھی جو یورپ جارہی تھی بلکہ پانچ چھ عورتیں اور بھی اسی جہاز سے جارہی تھی۔ سبھدرا کو نہ جگہ ملنے میں کوئی دقت ہوئی اور نہ راستہ میں۔ یہاں پہنچ کر ان عورتوں سے اس کا ساتھ چھوٹ گیا۔ کوئی کسی کالج میں چلی گئی، دو تین اپنے شوہروں کے پاس چلی گئیں جو یہاں پیشتر سے مقیم تھے۔ سبھدرا نے اسی محلّہ میں یہ کمرہ لے لیا۔ رزق کا مسئلہ بھی اس کے لیے بہت مشکل نہ رہا۔ جن عورتوں کے ساتھ وہ آئی تھی، ان میں سے کئی ذی عہدہ اصحاب کی بیویاں تھیں۔ کئی اچھے اچھے انگریز خاندانوں سے ان کا ربط ضبط تھا۔ سبھدرا کو دو عورتوں کو ہندوستانی گانا اور ہندی زبان سکھلانے کا کام مل گیا۔ بقیہ وقت میں وہ کئی ہندوستانی خاتونوں کے کپڑے سینے کا کام کرلیتی ہے۔ کیشو کی قیام گاہ یہاں سے نزدیک ہے۔ اسی لیے سبھدرا نے اس محلّہ کو پسند کیا ہے۔ کل کیشو اسے دکھائی دیا تھا۔ آہ اس کو ''بس'' سے اترتے دیکھ کر اس کا دل کتنا بے قرار ہوگیا تھا۔ بس دل میں یہی آتا تھا کہ دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ جائے اور کہے۔ ''کیوں جی، تم یہاں آتے ہی بدل گئے۔ یاد ہے کہ تم نے روانگی کے وقت کیا کیا وعدے کیے تھے؟'' اس نے بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ اس وقت سے اب تک اس پر ایک قسم کا نشہ سا طاری ہے۔ وہ ان کے اتنا قریب ہے' چاہے تو روزانہ انہیں دیکھ سکتی ہے، ان کی باتیں سن سکتی ہے۔ ہاں انہیں چھو تک سکتی ہے۔ اب وہ اس سے بھاگ کر کہاں جائیں گے؟ ان کے خطوط کی اب اس کو کیا پرواہ ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ممکن ہے کہ وہ ان کے ہوٹل کے ملازمین سے جو چاہے گی، دریافت کرسکے گی۔

شام ہوگئی تھی۔ دھوئیں میں برقی لالٹینیں روندھی آنکھوں کی طرح بے نور سی ہو رہی تھیں۔ گلی میں عورت مرد سیر کرنے چلے جارہے تھے۔ سبھدرا سوچنے لگی، ان لوگوں کو تفریحی مشاغل سے کتنی دلچسپی ہے۔ گویا کسی کو کچھ فکر ہی نہیں۔ سبھی خوشحال ہیں۔ جبھی یہ لوگ یکسوئی سے سارا کام کرسکتے ہیں۔ جس وقت جو کام کرتے ہیں، دل لگا کر کرتے ہیں۔ کھیلنے کا شوق ہے تو کام کرنے کا بھی شوق ہے۔ ایک ہم ہیں کہ نہ ہنستے ہیں، نہ روتے ہیں۔ بت بنے بیٹھے رہتے ہیں۔ زندہ دلی کا کہیں نام نہیں۔ کام تو تمام دن کرتے ہیں۔ مرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی مگر دراصل وقت کا چوتھائی حصہ بھی کام میں نہیں صرف کرتے۔ صرف کام کرنے کا بہانہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم بے جان ہوگئی ہے۔

دفعتاً اس نے کیشو کو جاتے دیکھا۔ ہاں، کیشو ہی تھا! وہ کرسی سے اٹھ کر برآمدے میں آگئی۔ بڑی خواہش

ہوئی کہ جا کر ان کے گلے سے لپٹ جائے۔ اس نے اگر قصور بھی کیا ہے تو انہی کی وجہ سے تو! اگر وہ برابر خطوط روانہ کرتے جاتے تو وہ یہاں کیوں آتی۔

لیکن کیشو کے ساتھ یہ کمسن عورت کون ہے؟ ارے کیشو اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے ہے۔ دونوں مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہ عورت کون ہے؟

سبھدرا نے غور سے دیکھا۔ عورت سانولے رنگ کی تھی، وہ ہندوستانی تھی۔ اس کی پوشش بھی ہندوستانی تھی۔ اس سے زیادہ سبھدرا کو اور کچھ نہ دکھائی دیا۔ اس نے فوراً جوتے پہنے، دروازہ بند کیا اور ایک لمحہ میں گلی میں پہنچ گئی۔ کیشو اب نظر نہ آتا تھا مگر وہ جس طرف گیا تھا، اسی طرف وہ نہایت تیزی سے قدم اٹھائے چلی جاتی تھی۔ یہ عورت کون ہے؟ وہ ان دونوں کی باتیں سننا چاہتی تھی۔ عورت کو دیکھنا بھی چاہتی تھی۔ اس کے قدم اتنی تیزی سے اٹھ رہے تھے گویا دوڑ رہی ہو مگر اتنا جلد وہ دونوں غائب ہوگئے۔ شاید دونوں کسی ''بس'' میں جا بیٹھے۔

اب وہ گلی کو طے کر کے ایک چوڑی سڑک پر آ پہنچی تھی۔ دونوں طرف بڑی بڑی جگمگاتی ہوئی دکانیں تھیں جن میں دنیا بھر کی مجسم آسائشیں گھمنڈ سے پھولی بیٹھی تھیں۔ قدم قدم پر ہوٹل تھے۔ سبھدرا دونوں طرف غور سے دیکھتی اور قدم قدم پر اشتباہ کے سبب مچلتی ہوئی کتنی دور نکل گئی۔ اس کی اسے کچھ خبر نہ تھی۔

پھر اس نے سوچا، یوں کہاں تک چلی جاؤں گی۔ کون جانے، کدھر گئے؟ جا کر پھر اپنے برآمدے سے دیکھوں۔ آخر ادھر سے گئے ہیں تو ادھر ہی سے لوٹیں گے بھی۔ یہ خیال آتے ہی وہ پلٹ پڑی اور اسی طرح دوڑتی ہوئی اپنی قیام گاہ کی طرف چلی۔ جب وہاں پہنچی تو بارہ بج گئے تھے اور اتنی دیر اسے چلتے ہی گزری۔ ایک لمحہ بھی اس نے کہیں آرام نہیں کیا۔

وہ اوپر پہنچی تو مکان کی مالکہ نے کہا۔ ''تمہارے لیے بڑی دیر سے کھانا تیار رکھا ہوا ہے۔''

سبھدرا نے کھانا اپنے کمرے میں منگا لیا مگر کھانے کا ہوش کسے تھا؟ وہ اسی برآمدے میں اسی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی جدھر کو کیشو گیا تھا۔

ایک بج گیا، دو بج گئے، پھر بھی کیشو نہیں لوٹا۔ اس نے دل میں کہا، وہ کسی دوسرے راستے سے چلے گئے۔ میرا یہاں کھڑا رہنا بیکار ہے۔ چلو اب سو رہوں مگر پھر خیال آگیا کہ کہیں چلے نہ آ رہے ہوں۔

معلوم نہیں، اسے کب نیند آ گئی۔

(4)

دوسرے روز علی الصبح سبھدرا اپنے کام پر جانے کو تیار ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان عورت ریشمی ساڑھی پہنے آ کر کھڑی ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔ ''معاف کیجئے گا۔ میں نے بڑے سویرے آپ کو تکلیف دی۔ آپ تو کہیں جانے کو تیار معلوم ہوتی ہیں۔''

سبھدرا نے ایک کرسی بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ایک کام سے باہر جا رہی تھی۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟''

یہ کہہ کر سبھدرا نے اس نوخیز کو سر سے پیر تک اس نقادانہ نظر سے دیکھا جس سے صرف عورتیں دیکھ

سکتی ہیں۔ حسن کے کسی اصول سے بھی اسے خوبصورت نہ کہا جاسکتا تھا۔ اس کا رنگ سانولا، منہ کسی قدر چوڑا، ناک کچھ چپٹی، قد بھی چھوٹا اور بدن بھی کسی قدر موٹا تھا۔ آنکھوں پر عینک لگی ہوئی تھی مگر ان کل وجوہ کے ہوتے ہوئے بھی اس میں کچھ ایسی بات تھی جو آنکھوں کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھی۔ اس کی آواز اتنی شیریں، اتنی با قاعدہ اور اتنی عاجزانہ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کسی دیوی کی دعا ہو۔ اس کے ہر عضو سے جلال نمایاں تھا۔ سبھدرا اس کے مقابلہ میں سبک اور ہیچ معلوم ہوتی تھی۔

عورت نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں بھولتی ہوں تو مجھے معاف فرمایئے گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ کچھ کپڑے بھی سیتی ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ یہاں سینے کی مشین موجود ہے؟''

سبھدرا۔ ''میں دو خاتونوں کو زبان کی تعلیم دینے جایا کرتی ہوں۔ بقیہ وقت میں کچھ سلائی بھی کر لیتی ہوں۔ آپ کپڑے لائی ہیں؟''

عورت۔ ''نہیں، ابھی کپڑے نہیں لائی۔'' یہ کہہ کر اس نے حیا سے سر جھکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بات یہ ہے کہ میری شادی ہونے جا رہی ہے۔ میں اپنی پوشاک بالکل ہندوستانی رکھنا چاہتی ہوں۔ شادی بھی ویدوں کے مطابق ہوگی۔ ایسے کپڑے یہاں آپ ہی تیار کر سکتی ہیں۔''

سبھدرا نے ہنس کر کہا۔ ''میں ایسے موقع پر آپ کے کپڑے تیار کر کے اپنے کو دھنیہ سمجھوں گی۔ وہ مبارک ساعت کب ہے؟''

عورت نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو کہتے ہیں کہ اسی ہفتہ میں ہو جاوے مگر میں انہیں ٹالتی جاتی ہوں۔ میں نے تو چاہا تھا کہ ہندوستان واپس جانے پر شادی ہوتی مگر وہ اس قدر بے صبرے ہو رہے ہیں کہ کچھ کہتے نہیں بنتا۔ ابھی تو میں نے یہی کہہ کر ٹالا کہ میرے کپڑے سل رہے ہیں۔''

سبھدرا۔ ''تو میں آپ کے جوڑے بہت جلد دے دوں گی۔''

عورت نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو چاہتی تھی کہ آپ مہینوں لگا دیتیں۔''

سبھدرا۔ ''واہ، میں اس نیک کام میں کیوں خلل ڈالنے لگی۔ میں اسی ہفتہ میں آپ کے کپڑے دے دوں گی اور ان سے اس کا انعام لوں گی۔''

عورت کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ کمرہ میں نور کی لہریں دوڑ گئیں۔ بولی ''اس کے لیے تو انعام وہ دیں گے، بڑی خوشی سے دیں گے اور تمہارے ممنون ہوں گے۔ میں نے تو عہد کیا تھا کہ بیاہ کی بندشوں میں پڑوں گی ہی نہیں مگر انہوں نے میری عہد شکنی کرا دی۔ اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ محبت کی بیڑیاں کتنی مسرت افزا ہوتی ہیں۔ تم تو ابھی حال ہی میں یہاں آئی ہو۔ تمہارے شوہر بھی ساتھ ہوں گے؟''

سبھدرا نے حیلہ کیا، بولی۔ ''وہ اس وقت جرمنی میں ہیں۔ موسیقی سے انہیں بہت رغبت ہے۔ اسی فن کے ماہر بننے کی غرض سے وہ وہاں گئے ہیں۔ تم بھی کچھ گانا جانتی ہو؟''

''بہت تھوڑا۔ کیشو کو گانے سے بڑی رغبت ہے۔''

کیشو کا نام سن کر سبھدرا کو ایسا معلوم ہوا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ وہ چونک پڑی۔

عورت نے پوچھا۔ ''آپ چونک کیوں پڑی؟ کیا کیشو کو جانتی ہو؟''

سبھدرا نے بات بنا کر کہا۔ ''نہیں، میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ وہ یہاں کیا کرتے ہیں؟''

سبھدرا کو خیال آیا کہ کیا کیشو کسی دوسرے شخص کا نام نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اس نے یہ سوال کیا۔ جواب
پر اس کی زندگی کا فیصلہ تھا۔

عورت نے جواب دیا۔ "وہ یہاں کالج میں پڑھتے ہیں۔ ہند کی سرکار نے انہیں بھیجا ہے۔ ابھی سال بھی تو
آئے نہیں ہوئے۔ تم دیکھ کر خوش ہو گی، شوکت و ذہانت کا مجسمہ سمجھ لو۔ یہاں کے بڑے بڑے پروفیسر ان کی
عزت کرتے ہیں۔ ایسی عمدہ تقریر تو میں نے کسی اور کی زبان سے سنی ہی نہیں۔ ان کی زندگی معیارانہ ہے۔ مجھ سے
نہیں کیوں محبت ہو گئی، مجھے خود اس پر حیرت ہے۔ مجھ میں نہ حسن ہے نہ ملاحت۔ یہ محض میری خوش قسمتی ہے۔
تو میں شام کو کپڑے لے کر آؤں گی۔"

سبھدرا نے دل میں اٹھتے ہوئے جوش کو روک کر کہا۔ "اچھی بات ہے۔"

جب وہ چلی گئی تو سبھدرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا بدن میں خون نہیں ہے۔ گویا
جان نکل گئی ہے۔ وہ کتنی بے کس، کتنی کمزور ہے۔ اس کا احساس اس کو آج ہوا۔ ایسا معلوم ہوا گویا دنیا میں اس کا کوئی
نہیں ہے۔ اب اس کا جینا بے فائدہ ہے۔ اس کے لیے اب زندگی میں رونے کے سوا اور کیا ہے۔ اس کے سارے
حواس باطل سے ہو گئے تھے۔ گویا وہ کسی بلند درخت سے گر پڑی ہو۔ ہائے یہ اس کی محبت و عقیدت کا صلہ ہے۔ اس
نے کتنا اصرار کر کے کیشو کو یہاں بھیجا تھا۔ اسی لیے کہ یہاں آتے ہی وہ اس کا ستیاناس کر دیں۔

پرانی باتیں یاد آنے لگیں۔ کیشو کی وہ محبت بھری آنکھیں سامنے آ گئیں۔ وہ معصوم اور متبسم صورت
آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اس کا ذرا سر بھی درد کرنے لگتا تو کتنا بے قرار ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ جب اسے فصلی بخار
آ گیا تو کیشو کتنا گھبرا کر پندرہ روز کی چھٹی لے کر گھر پہنچ گیا تھا اور اس کے سرہانے بیٹھا ہوا رات بھر پنکھا جھلتا
رہتا تھا۔ وہی کیشو اب اتنی جلدی اس سے اکتا گیا۔ اس کے لیے سبھدرا نے کون سی بات اٹھا رکھی؟ وہ تو اسی کو اپنی زندگی
کا سہارا، اپنی روح کا سرمایہ، اپنا سب کچھ سمجھتی تھی۔ نہیں نہیں! کیشو کا قصور نہیں۔ سارا قصور اسی کا ہے۔ اسی نے اپنی
میٹھی باتوں سے اس کے دل کو مسخر کر لیا ہے۔ اس کی علمیت، ذہانت اور قادر الکلامی ہی نے ان کے دل پر فتح حاصل
کی ہے۔ ہائے اس نے کتنی بار کیشو سے کہا تھا کہ مجھے بھی پڑھایا کرو مگر انہوں نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ تم جیسی
ہو، مجھے ویسی ہی پسند ہو۔ میں تم کو پڑھا کر تمہاری قدرتی سادگی کو مٹانا نہیں چاہتا۔ کیشو نے اس کے ساتھ کتنی بڑی
بے انصافی کی ہے مگر یہ ان کی خطا نہیں۔ اسی مست شباب چھوکری کی کرتوت ہے۔

سبھدرا کو اس رنج و حسد کے غلبہ میں اپنے کام پر جانے کا خیال نہ رہا۔ وہ کمرے میں اسی طرح ٹہلنے لگی۔
گویا کسی نے اس کو وہاں جبراً بند کر دیا ہو۔ کبھی مٹھیاں بندھ جاتیں، کبھی دانت پیسنے لگتی اور کبھی ہونٹ کاٹتی۔ جنون کی
سی حالت ہو گئی۔ آنکھوں میں بھی ایک تیز چمک پیدا ہو گئی۔ جیوں جیوں کیشو کے اس بے دردانہ سلوک کا خیال
کرتی، ان تکالیف کو یاد کرتی جو اس نے اس کے لیے جھیلی تھیں، اس کا دل انتقام کے لیے بے چین ہوتا جاتا تھا۔ اگر
کوئی بات ہوئی ہوتی، کسی باہمی کدورت کا شائبہ بھی ہوتا تو اسے اتنا رنج نہ ہوتا۔ یہ تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا
کوئی ہنستے ہنستے یکایک گلے پر چڑھ بیٹھے۔ اگر وہ ان کے قابل نہ تھی تو انہوں نے اس سے شادی ہی کیوں کی تھی؟
شادی کے بعد بھی اس کو کیوں نہ ٹھکرا دیا تھا؟ کیوں محبت کا بیج بویا تھا؟ اور آج جب وہ بیج پودے کی شکل میں لہرانے
لگا، اس کی جڑیں اس کے دل کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گئیں۔ اس کا کل خون، اس کا تمامی ایثار اسے سینچنے اور اس
کی حفاظت کرنے میں لگا دیا گیا تو وہ آج اس کو اکھاڑ پھینک دینا چاہتے ہیں! کیا بلا اس کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے

ہوئے، وہ پودا اکھڑ جاوے گا؟

دفعتاً اسے ایک بات یاد آ گئی۔ تشدد آمیز ضبط سے اس کا چہرہ اور بھی روکھا ہو گیا۔ کیشو نے اپنی شادی کی بات اس عورت سے پوشیدہ رکھی ہو گی! سبھدرا اس واقعہ کو طشت از بام کر کے کیشو کے سارے منصوبے خاک میں ملا دے گی۔ اسے اپنے اوپر غصہ آیا کہ عورت کا پتہ کیوں نہ دریافت کر لیا۔ اسے ایک خط لکھ کر کیشو کی کم ظرفی خود غرضی اور بزدلی کا پردہ فاش کر دیتی۔ اس کی علمیت، ذہانت اور شہرت کو خاک میں ملا دیتی۔ خیر' شام کے وقت تو وہ کپڑے لے کر آوے گی ہی، اس وقت اس سے سارا کچا چٹھا بیان کر دوں گی۔

(5)

سبھدرا تمام دن اس عورت کا انتظار کرتی رہی۔ کبھی برآمدے میں جا کر ادھر ادھر نگاہ دوڑاتی، کبھی سڑک پر دیکھتی مگر اس کا کہیں پتہ نہ تھا! دل میں جھنجھلاتی تھی کہ اس نے کیوں نہ اسی وقت سارا ماجرا کہہ سنایا۔

کیشو کا پتہ اسے معلوم تھا۔ اس مکان اور گلی کا نمبر تک یاد تھا جہاں سے وہ اس کو خط لکھا کرتا تھا۔ جیوں جیوں دن ڈھلنے لگا اور اس عورت کے آنے میں دیر ہونے لگی، اس کے دل میں ایک لہر سی اٹھنے لگی کہ جا کر کیشو کو لعنت ملامت کرے۔ اس کا سارا نشہ اتار دے، کہے۔ ''تم اتنے خوفناک ظالم ہو، اتنے بڑے مکار ہو۔ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ تم یہاں پڑھنے کے لیے آئے تھے، تمہاری ساری علمیت کا یہی نتیجہ ہے! تم ایک عورت کو جس نے تم پر اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اس طرح دھوکا دے سکتے ہو۔ تم میں کیا انسانیت نام کو بھی نہیں رہ گئی؟ آخر تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟ میں عمر بھر تمہارے نام کو روتی رہوں گی۔'' لیکن خودداری کا خیال ہر مرتبہ اسے روک لیتا۔ نہیں جس نے اس کے ساتھ ایسا فریب کیا ہے، اس کی اتنی بے عزتی کی ہے، اس کے پاس وہ نہ جاوے گی۔ وہ اسے دیکھ کر اپنے آنسوؤں کو روک سکے گی یا نہیں۔ اس میں اسے شبہ تھا اور کیشو کے سامنے وہ رونا نہ چاہتی تھی۔ اگر وہ اس سے نفرت کرتا ہے تو وہ بھی اس سے نفرت کرے گی۔ شام بھی ہو گئی مگر وہ عورت نہ آئی۔ بتیاں بھی جل گئیں مگر اس کا پتہ نہ تھا۔

یکا یک اسے اپنے کمرہ کے دروازہ پر کسی کے آنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ وہ کود کر باہر نکل آئی۔ نوجوان عورت کپڑوں کا ایک بنڈل لئے سامنے کھڑی تھی۔ سبھدرا کو دیکھتے ہی بولی۔ ''معاف کیجئے گا، مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ کیشو کو کسی بڑے ضروری کام سے جرمنی جانا ہے۔ وہاں انہیں ایک ماہ سے زیادہ لگ جاوے گا۔ وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔ مجھ سے انہیں اپنا مضمون لکھنے میں بڑی مدد ملے گی۔ برلن کے کتب خانہ چھاننے پڑیں گے۔ میں نے بھی اسے منظور کر لیا ہے۔ کیشو کی خواہش ہے کہ جرمنی جانے سے قبل ہمارا بیاہ ہو جاوے۔ کل شام کے وقت سنسکار ہو جاوے گا۔ اب یہ کپڑے مجھے آپ جرمنی سے لوٹ آنے پر دیجئے گا۔ شادی کے موقع پر ہم معمولی کپڑے پہن لیں گے اور کرتی کیا؟ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ کیشو کا جرمنی جانا لازمی امر ہے۔''

سبھدرا نے کپڑوں کو میز پر رکھ کر کہا۔ ''آپ کو دھوکا دیا گیا ہے۔''

عورت نے گھبرا کر پوچھا۔ ''دھوکا! کیسا دھوکا؟ میں بالکل نہیں سمجھی تمہارا مطلب کیا ہے؟''

سبھدرا نے لحاظ کے پردے کو ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''کیشو تمہیں دھوکا دے کر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

"کیشو ایسا آدمی نہیں ہے جو کسی کو دھوکا دے۔ کیا تم کیشو کو جانتی ہو؟"

"کیشو نے تم سے اپنے بارہ میں سب کچھ کہہ دیا ہے؟"

"سب کچھ۔"

"کوئی بات نہیں چھپائی؟"

"میرا تو یہی خیال ہے کہ انہوں نے ایک بات بھی نہیں چھپائی۔"

"تمہیں معلوم ہے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے؟"

عورت کے چہرہ کا رنگ کچھ فق سا ہو گیا۔ اس کی گردن شرم سے جھک گئی۔ رکتی ہوئی بولی...... "ہاں...... انہوں نے مجھ سے۔ یہ بات کہی تھی۔"

سبھدرا شکست کھا گئی۔ نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "یہ جانتے ہوئے بھی تم کیشو سے شادی کرنے پر تیار ہو؟"

عورت نے غرور سے دیکھ کر کہا۔ "تم نے کیشو کو دیکھا ہے؟"

"نہیں، میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

"پھر تم انہیں کیسے جانتی ہو؟"

"میرے ایک دوست نے مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ وہ کیشو کو جانتا ہے۔"

"اگر تم ایک بار کیشو کو دیکھ لیتیں، ایک بار ان سے باتیں کر لیتیں تو مجھ سے یہ سوال نہ کرتیں۔ ایک نہیں، اگر انہوں نے ایک سو شادیاں کر لی ہوتیں تو بھی میں انکار نہ کرتی۔ انہیں دیکھ کر پھر میری آنکھ کسی اور کی جانب اٹھتی ہی نہیں۔ اگر ان سے شادی نہ کروں تو پھر مجھے تمام عمر دوشیزہ ہی رہنا پڑے گا۔ جس وقت وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے ہیں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری روح پھول کی طرح شگفتہ ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے اس میں روشنی اور شگفتگی کا مجسم احساس ہوتا ہے۔ دنیا چاہے جتنا ہنسے، چاہے جتنی ندامت کرے۔ میں کیشو کو اب نہیں چھوڑ سکتی۔ ان کی شادی ہو چکی ہے۔ یہ سچ ہے مگر اس عورت سے ان کا دل کبھی نہیں ملا۔ دراصل ان کی شادی ابھی نہیں ہوئی۔ وہ کوئی معمولی، کم پڑھی لڑکی ہے۔ تمہیں سوچو کہ کیشو جیسا عالم، فراخدل اور طبیعت دار شخص ایسی لڑکی کے ساتھ کیونکر خوش رہ سکتا ہے۔ تمہیں کل میری شادی میں شرکت کرنی ہو گی۔" سبھدرا کا چہرہ تمتما تا جا رہا تھا۔ کیشو نے اس کو اتنے سیاہ رنگ میں رنگا ہے۔ یہ سوچ کر اس کا خون ابل رہا تھا۔ جی میں آتا تھا کہ اسی وقت اس کو دھتکار دوں مگر اس کے دل میں کچھ اور ہی خیالات آنے لگے تھے۔ اس نے متانت مگر بے پروائی کے لہجہ میں کہا۔ "کیشو نے کچھ اس عورت کے بارہ میں نہیں کہا؟ وہ اب کیا کرے گی؟ کیسے رہے گی؟"

عورت نے فوراً جواب دیا۔ "گھر پہنچنے پر وہ اس سے صرف یہی کہہ دیں گے کہ ہم اور تم اب زن و مرد نہیں رہ سکتے۔ اس کی پرورش کا بندوبست اس کی مرضی کے مطابق کر دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ وہ اور کیا کر سکتے ہیں؟ ہندو شاستروں کے مطابق ازدواجی رشتہ ٹوٹ نہیں سکتا مگر صرف بیوی کو کلیتًا آزاد کر دینے کے خیال سے وہ عیسائی یا مسلمان ہونے کے لیے بھی تیار ہیں۔ وہ تو ابھی اس کو اسی مضمون کا ایک خط لکھنے جا رہے تھے مگر میں نے روک دیا کہ اگر اس کی مرضی ہو تو وہ بھی ہمارے ساتھ رہے۔ میں اسے اپنی بڑی بہن سمجھوں گی مگر کیشو اس سے متفق نہیں ہوتے۔"

سبھدرا نے طنز سے کہا۔ ''روٹی، کپڑا دینے کو تیار ہی ہیں۔ عورت کو اس کے سوا اور کیا چاہیے؟''
اس عورت نے طنز کی کچھ پروانہ کر کے کہا۔ ''تو مجھے واپسی پر کپڑے تیار ملیں گے نا؟''
سبھدرا۔ ''ہاں، مل جائیں گے۔''
عورت۔ ''کل تم شام کے وقت آؤ گی؟''
سبھدرا۔ ''نہیں، افسوس کہ مجھے فرصت نہیں۔''
عورت نے کچھ نہ کہا۔ وہ چلی گئی۔

(6)

سبھدرا کتنا ہی چاہتی تھی کہ اس مسئلہ پر ٹھنڈے دل سے غور کرے مگر دل میں گویا آگ سی جل رہی تھی۔ کیشو کے لیے وہ اپنی جان کی کوئی قیمت نہ سمجھتی، وہی کیشو اسے پیروں سے ٹھکرا رہا ہے۔ یہ صدمہ اتنا گھانی، اتنا سخت تھا کہ اس کی ساری حسی نزاکت مفلوج ہو گئی۔ اس کا ایک ایک عضو انتقام کے لیے تڑپنے لگا۔ اگر یہی مسئلہ اس کے برعکس ہوتا تو کیا سبھدرا کے گلے پر چھری نہ پھر گئی ہوتی۔ کیشو اس کے خون کا پیاسا نہ ہو جاتا؟ کیا مرد ہو جانے ہی سے سبھی باتیں قابل عفو اور عورت ہو جانے ہی سے سبھی باتیں نا قابل عفو ہو جاتی ہیں؟ نہیں۔ اس فیصلہ کو سبھدرا کا باغی دل اس وقت قبول نہیں کر سکتا تھا۔ اور عورتوں کے بلند معیار کی پروا نہیں ہے۔ ان عورتوں میں خودداری کا مادہ نہ ہوگا۔ وہ مردوں کے پیروں کی جوتیاں بن کر رہنے ہی میں اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں گی۔ سبھدرا خودداری کے جذبہ سے اس قدر بے بہرہ نہیں، وہ اپنے جیتے جی یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کا شوہر اس کی زندگی کو تباہ و برباد کر کے چین کی بانسری بجائے۔ دنیا اسے ہتھیارن اور ڈائن کہے گی تو کہے، اسے پروا نہیں۔ رہ رہ کر اس کے دل میں خوفناک تحریک ہوتی تھی کہ اسی وقت اس کے پاس چلی جاوے اور اس سے قبل کہ وہ اس نوجوان عورت کی محبت سے لطف اندوز ہو، اس کی زندگی کا خاتمہ کر دے۔ وہ کیشو کی بیدردی کو یاد کر کے اپنے دل کو متحرک کرتی تھی۔ کیا وہ اتنی کمزور ہے، کیا اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے۔ اگر اسی وقت کوئی بدمعاش اس کے کمرہ میں گھس آوے تو کیا یہ اس کا مقابلہ نہ کرے گی؟ آخر اپنی حفاظت ہی کیلئے تو اس نے یہ پستول لے رکھی ہے۔ کیشو نے اس کی آبروریزی ہی کی ہے۔ اس کا اظہارِ محبت صرف فریب تھا۔ وہ صرف اپنی خواہشات نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اس کے ساتھ محبت کا سوانگ بھرتا تھا۔ پھر اسے ہلاک کر ڈالنا کیا اس کا فرض نہیں؟

اس آخری خیال سے سبھدرا کو وہ تحریک ملی جو اس کے خوفناک ارادہ کو پورا کرنے کے لیے ضروری تھی۔ یہی وہ حالت ہے جب عورت مرد کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہے۔

اس نے کھونٹی سے لٹکتی ہوئی پستول کو اتار لیا اور غور سے دیکھنے لگی۔ گویا اسے کبھی دیکھا نہ ہو۔ کل شام کے وقت جب آریہ سماج کے مندر میں کیشو اور اس کی معشوقہ ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے ہوں گے، اسی وقت وہ اس کی گولی سے کیشو کے عشقیہ تماشوں کا خاتمہ کر دے گی۔ پھر دوسری گولی اپنی چھاتی میں مار لے گی۔ کیا وہ اپنی نفرت خیز زندگی کو رو رو کر گزارے گی۔

(7)

شام کا وقت تھا۔ آریہ سماج کے مندر کے صحن میں دلہا، دلہن اپنے احباب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ بیاہ کی رسم ادا ہو رہی تھی۔ اسی وقت سھدرا پہنچی اور برآمدے میں جا کر ایک ستون کی آڑ میں اس طرح کھڑی ہو گئی کہ کیشو کا منہ اس کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہ منظر کھنچ گیا جب آج سے تین سال قبل اس نے اسی طرح کیشو کو منڈپ میں بیٹھے ہوئے پردہ سے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کا دل کتنا پُر شوق ہو رہا تھا۔ دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔ کتنی زبردست محبت تھی۔ کتنی بیحد تمنائیں تھیں' گویا زندگی کی صبح کا جلوہ ہو رہا ہو۔ زندگی نغمۂ شیریں کی طرح مسرت خیز تھی۔ مستقبل خوابِ افق کی طرح دلکش۔ کیا یہ وہی کیشو ہے؟ سھدرا کو ایسا وہم ہوا گویا یہ کیشو نہیں ہے۔ ہاں' یہ وہ کیشو نہیں تھا۔ یہ اسی شکل اور اسی نام کا کوئی دوسرا شخص تھا۔ اب اس کی مسکراہٹ میں' اس کی آنکھوں میں' اس کے کلام میں' اس کے دل کو کھینچنے والی کوئی چیز نہ تھی۔ اسے دیکھ کر وہ اسی طرح ساکت کھڑی ہے گویا کوئی ناآشنا شخص ہو۔ اب تک کیشو کا سا خوبصورت' بارونق' خوش خلق اور بامروت شخص دنیا میں نہ تھا۔ مگر اب سھدرا کو ایسا معلوم ہوا کہ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں اور کیشو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ نارِ حسد جس میں وہ جلی جا رہی تھی' وہ خیال انتقام جو اسے یہاں تک لایا تھا۔ گویا ایک دم نابود ہو گیا۔ ترکِ تشدد سے بھی زیادہ ضرر رساں ہوتا ہے۔ سھدرا کے انتقامی ارادہ میں ایک طرح کا انس تھا۔ اس کا کیشو' اس کے دل و جان کا مالک اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ مگر اب وہ انس نہیں ہے۔ کیشو اس کا نہیں ہے۔ اسے اب پرواہ نہیں کہ اس پر کس کا قبضہ ہوتا ہے۔

شادی کی رسم ادا ہو گئی۔ دوستوں نے مبارکباد دی۔ سہیلیوں نے تہنیت کے گانے گائے۔ پھر لوگ میزوں پر جا بیٹھے۔ دعوت ہوئی۔ رات کے بارہ بج گئے۔ مگر سھدرا وہیں بت بنی کھڑی رہی' گویا کوئی عجیب خواب دیکھ رہی ہو۔ ہاں' اب اسے اپنے دل میں ایک قسم کے خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ گویا کوئی بستی اجڑ گئی ہو' گویا کوئی نغمہ بند ہو گیا ہو۔ گویا کوئی چراغ بجھ گیا ہو۔

جب لوگ مندر سے نکلے تو وہ بھی نکل آئی مگر اس کو کوئی راستہ نہ سوجھتا تھا۔ جاتی ہوئی سڑکیں اسے بھولی ہوئی سی معلوم ہوتی تھیں۔ کل دنیا ہی تبدیل ہو گئی تھی۔ وہ ساری رات سڑکوں پر بھٹکتی پھری۔ گھر کا کہیں پتہ نہیں۔ کل دکانیں بند ہو گئیں' سڑکوں پر سناٹا چھا گیا پھر بھی وہ اپنا گھر ڈھونڈھتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ ہائے' کیا اسی طرح اس کو زندگی کے راستہ میں بھی بھٹکنا پڑے گا؟

دفعتاً ایک پولیس مین نے پکارا۔ "میڈم' تم کہاں جا رہی ہو؟"

سھدرا نے ٹھٹھک کر کہا۔ "کہیں نہیں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"میرا مکان؟"

"ہاں' تمہارا مکان کہاں ہے؟ میں تمہیں بڑی دیر سے ادھر ادھر بھٹکتے دیکھ رہا ہوں۔ کس ◌ک میں رہتی ہو؟"

سھدرا کو اس سڑک کا نام تک نہ یاد تھا!

"تمہیں اپنی سڑک کا نام تک یاد نہیں؟"

"بھول گئی' یاد نہیں آتا۔"

دفعتاً اس کی نگاہ سامنے کے ایک سائن بورڈ کی طرف اٹھی۔ آہ ' یہی تو اس کی سڑک ہے۔ اس نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا سامنے ہی اس کی قیام گاہ تھی اور اسی گلی میں ' اپنے ہی مکان کے سامنے نہ جانے کتنی دیر سے وہ چکر لگا رہی تھی۔

(8)

ابھی بڑا سویرا ہی تھا کہ وہ نوجوان عورت سبھدرا کے کمرہ میں داخل ہوئی۔ وہ اس کے کپڑے سی رہی تھی اس کا سارا دھیان کپڑوں میں لگا ہوا تھا۔ کوئی حسینہ اس قدر یکسو ہو کر اپنا سنگار بھی نہ کرتی ہو گی۔ نہ جانے وہ کونسا انعام لینا چاہتی تھی۔ اس کو نو وارد کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔

اس عورت نے پوچھا۔ "تم کل مندر میں بھی نہیں آئیں؟"

سبھدرا نے سر اٹھا کر دیکھا تو ایسا معلوم ہوا کہ گویا کسی شاعر کا تخیل مجسم ہو کر کھڑا ہے۔ اس کا حسن بے داغ تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے عشق و محبت کا اظہار ہو رہا تھا۔ سبھدرا دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی ' گویا اس کی چھوٹی بہن آ گئی ہو اور بولی ـــ "ہاں گئی تو تھی۔"

"میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"ہاں ' میں علیحدہ تھی۔"

"کیشو کو دیکھا؟"

"ہاں ' دیکھا!"

"آہستہ کیوں بولیں ' میں نے کچھ جھوٹ کہا تھا؟"

سبھدرا نے ہمدردی سے مسکرا کر کہا ـــ "میں نے تمہاری آنکھوں سے نہیں ' اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مجھے تو وہ تمہارے قابل نہیں معلوم ہوئے۔ تمہیں ٹھگ لیا۔"

حسینہ کھلکھلا کر ہنسی اور بولی۔ "واہ میں سمجھتی ہوں کہ میں نے انہیں ٹھگ لیا ہے۔"

سبھدرا نے متانت سے کہا۔ "ایک مرتبہ کپڑوں اور زیوروں سے مزیّن ہو کر اپنا جمال آئینے میں دیکھو تو معلوم ہو۔"

"تب کیا میں کچھ اور ہو جاؤں گی؟"

"اپنے کمرہ سے فرش ' پردے ' تصویریں ' ہانڈیاں ' گملے وغیرہ نکال کر دیکھ لو کہ کمرہ کی رونق وہی رہتی ہے؟"

حسینہ نے سر ہلا کر کہا۔ "ٹھیک کہتی ہو۔ مگر گہنے کہاں سے لاؤں؟ نہ جانے ابھی کتنے دنوں میں بننے کی نوبت آوے۔"

"میں تمہیں اپنے گہنے پہنا دوں گی۔"

"تمہارے پاس گہنے ہیں؟"

"بہت ' دیکھو میں ابھی لا کر تمہیں پہناتی ہوں۔"

حسینہ نے زبان سے تو بہت "نہیں نہیں" کہا مگر دل میں خوش ہو رہی تھی۔ سبھدرا نے اپنے سارے گہنے اسے پہنا دیئے ' اپنے پاس ایک چھلّا بھی نہ رکھا۔ اس عورت کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ اسے اس ہیئت ہی میں

نکلتے شرم تو آتی تھی مگر اس کی صورت چمک اٹھی تھی۔ اس میں شبہ نہ تھا۔ اس نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں' گویا کسی فرقت زدہ کو اپنے معشوق کا پیغام ملا۔ دل میں گدگدی ہونے لگی' وہ اس قدر حسین ہے' اسے اس کا خیال بھی نہ تھا!

کہیں کیشو اس شکل میں اسے دیکھ لیتے۔ یہ خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی مگر کہے کیسے؟ تھوڑی دیر بعد شرم سے سر جھکا کر بولی۔ "کیشو مجھ کو اس شکل میں دیکھ کر بہت ہنسیں گے!"

سبھدرا۔ "ہنسیں گے نہیں' بلائیں لیں گے۔ آنکھیں کھل جائیں گی۔ تم آج اسی روپ میں ان کے پاس جانا۔"

عورت نے متحیر ہو کر کہا۔ "سچ! آپ اس کی اجازت دیتی ہیں؟"

سبھدرا نے کہا— "بڑی خوشی سے۔"

"تمہیں شبہ نہ ہوگا؟"

"بالکل نہیں۔"

"اور جو میں دو چار روز پہنے رہوں؟"

"تم دو چار مہینے پہنے رہو۔ آخر یہاں پڑے ہی تو ہیں۔"

"تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

"نہیں' مجھے فرصت نہیں ہے۔"

"اچھا' تو میرے گھر کا پتہ نوٹ کر لو۔"

"ہاں' لکھ دو' شاید کبھی آؤں۔"

ایک لمحہ میں وہ عورت وہاں سے چلی گئی۔ سبھدرا اپنی کھڑکی پر کھڑی اس کو اس طرح خوش ہو کر دیکھ رہی تھی گویا اس کی چھوٹی بہن ہو۔ اس کے دل میں بغض و حسد کا نام بھی نہ تھا۔

مشکل سے ایک گھنٹہ گزرا ہوگا کہ حسینہ واپس آکر بولی۔ "سبھدرا معاف کرنا۔ میں تمہارا وقت بہت خراب کر رہی ہوں۔ کیشو باہر کھڑے ہیں' بلالوں؟"

ایک لمحہ کے لیے' صرف ایک لمحہ کے لیے سبھدرا کچھ گھبرا گئی۔ اس نے جلدی سے اٹھ کر میز پر پڑی ہوئی چیزوں کو ادھر ادھر ہٹا دیا۔ کپڑے قرینے سے رکھ دیئے۔ اپنے الجھے ہوئے بال ٹھیک کر لیے۔ پھر بے پروائی سے مسکرا کر بولی۔ "انہیں تم نے کیوں تکلیف دی۔ جاؤ' بلالو۔"

ایک منٹ میں کیشو نے کمرے میں قدم رکھا اور چونک کر پیچھے ہٹ گیا' گویا پیر جل گیا ہو۔ منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ سبھدرا سنجیدہ اور ساکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔ پھر ہاتھ بڑھا کر بولی' گویا کسی اجنبی سے بول رہی ہو۔

"آیئے مسٹر کیشو' میں آپ کو ایسی خلیق' ایسی حسین اور ایسی قابل بیوی پانے پر مبارکباد دیتی ہوں۔"

کیشو کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ مجرم سا بنا کھڑا تھا۔ ندامت اور پشیمانی سے اس کے چہرے پر [illegible] یہ بات [illegible] دفعتاً سبھدرا سے ا[illegible]

ملاقات ہوگی اس کا خیال اسے خواب میں بھی نہ تھا۔ سبھدرا سے وہ یہ بات کیسے کہے گا' اس کو اس نے خوب سوچ لیا تھا۔ اس کے اعتراضوں کے جوابات بھی سوچ لیے تھے۔ خط کے الفاظ تک دلنشین کر لیے تھے۔ یہ ساری تیاریاں رکھی رہ گئیں اور سبھدرا سے دو چار ہونے کی نوبت آگئی۔ سبھدرا اسے دیکھ کر ذرا بھی نہیں چونکی' اس کے چہرے پر

تعجب یا پریشانی یا رنج کی کوئی علامت نہ دکھائی دی۔ اس نے کیشو سے اسی طرح گفتگو کی گویا وہ کوئی شخص اجنب ہو۔ یہ یہاں کب آئی' کیسے آئی' کیوں آئی' کس طرح گزر بسر کرتی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد سوالات پوچھنے کے لیے کیشو کا دل بیقرار ہو اٹھا۔ اس نے سوچا تھا کہ سہدرا اسے لعنت ملامت کرے گی' زہر کھا لینے کی دھمکی دے گی۔ بیدرد' بے مروت' بیوفا اور نہ جانے کیا کیا کہے گی۔ ان ساری مصیبتوں کے لیے وہ تیار تھا۔ مگر اس اتفاقی ملاقات' اس متکبرانہ بے رخی کے لیے وہ تیار نہ تھا۔ وہ محبت کی دیوی سہدرا اس قدر سنگ دل' اس قدر بے رحم ہو گئی ہے۔ ضرور اسے ساری باتیں پیشتر ہی معلوم ہو چکی ہیں۔ زبردست ترین حملہ یہ تھا کہ اس نے اپنے سارے گہنے اتنی فیاضی سے دے ڈالے۔ اور کون جانے کہ واپس بھی نہ لینا چاہتی ہو۔ وہ مغلوب وافسردہ ہو کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ جواب میں ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا!

حسینہ نے ممنونیت کا اظہار کرنے کے لہجہ میں کہا۔ "ان کے پتی دیو (شوہر) اس وقت جرمنی میں ہیں۔"

کیشو نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا مگر کچھ بول نہ سکا۔

حسینہ نے پھر کہا۔ "بیچاری موسیقی کے سبق پڑھا کر اور کچھ کپڑے سی کر اپنا گزر بسر کرتی ہے۔ وہ حضرت یہاں آ جاتے تو میں ان کی خوش نصیبی پر مبارکباد دیتی۔"

کیشو اس پر بھی کچھ نہ بول سکا مگر سہدرا نے مسکرا کر کہا۔ "وہ مجھ سے روٹھے ہوئے ہیں' مبارکباد سے اور بھلا ناخوش ہوتے۔"

حسینہ نے حیرت سے کہا۔ "تم انہیں کی محبت کے سبب یہاں آئیں۔ اپنا گھر بار چھوڑا' یہاں محنت مزدوری کر کے گزر بسر کر رہی ہو۔ پھر بھی وہ تم سے روٹھے ہوئے ہیں! تعجب ہے۔"

سہدرا نے اسی طرح خندہ روئی سے کہا۔ "مرد کی فطرت ہی تعجب کی چیز ہے۔ خواہ مسٹر کیشو اسے نہ مانیں۔"

حسینہ نے پھر کیشو کی طرف تحریک آمیز نگاہوں سے دیکھا مگر کیشو اسی طرح اداس بیٹھا رہا۔ اس کے دل پر یہ نیا صدمہ تھا۔ حسینہ نے اسے خاموش دیکھ کر اس کی جانب سے صفائی دی۔ "کیشو' عورت اور مرد دونوں ہی کو مساوی حقوق دینا چاہتے ہیں۔"

کیشو ڈوب رہا تھا۔ تنکے کا سہارا پا کر اس کی ہمت بندھ گئی۔ بولا۔ "بیاہ صرف ایک طرح کا سمجھوتہ ہے۔ طرفین کو اختیار ہے کہ جب چاہیں اسے قائم نہ رکھیں۔"

حسینہ نے تائید کی۔ مہذب دنیا میں یہ تحریک زوروں سے جاری ہے۔

سہدرا نے کہا۔ "کسی سمجھوتہ کو توڑنے کے لیے کوئی سبب بھی تو ہونا چاہیے۔"

کیشو نے جذبات کی لاٹھی کا سہارا لے کر کہا۔ "جب اس کا احساس ہو جائے کہ ہم اس بندش سے آزاد ہو کر زیادہ خوش و خرم رہ سکتے ہیں تو یہی ایک سبب کافی ہے۔ عورت کو اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دوسرے مرد کے ساتھ ۔۔۔"

سہدرا نے بات کاٹ کر کہا۔ "معاف کیجئے! مسٹر کیشو' مجھ میں اتنی عقل نہیں ہے کہ اس مسئلہ پر آپ سے بحث کروں۔ اعلیٰ سمجھوتہ وہی ہے جو تمام عمر قائم رہے۔ میں ہندوستان کی بات نہیں کہتی' وہاں تو عورت مرد کی لونڈی ہے۔ میں انگلستان کی کہتی ہوں' یہاں بھی کتنی ہی عورتوں سے میری بات چیت ہوئی ہے۔ وہ طلاق کی بڑھتی

ہوئی تعداد کو دیکھ کر خوش نہیں ہوتیں۔ بیاہ کا بلند ترین معیار اس کی پاکیزگی اور پائیداری ہے۔ مردوں نے ہمیشہ اس اصول کو توڑا ہے اور عورتوں نے اسے نبھایا ہے۔ اب مردوں کا ظلم عورتوں کو کدھر لے جائے گا نہیں کہہ سکتی۔"

اس سنجیدہ اور برجستہ گفتگو نے بحث کا خاتمہ کر دیا۔ سہدرا نے چائے منگوائی۔ تینوں نے پی۔ کیشو پوچھنا چاہتا تھا کہ ابھی آپ یہاں کتنے دنوں تک رہیں گی لیکن نہ پوچھ سکا۔ وہ یہاں پندرہ منٹ اور رہا لیکن خیالات میں بالکل ڈوبا ہوا۔ مگر جاتے وقت اس سے نہ رہا گیا۔ پوچھ ہی بیٹھا۔ "ابھی آپ یہاں اور کتنے روز رہیں گی؟"

سہدرا نے زمین کی طرف تاکتے ہوئے کہا۔ "کہہ نہیں سکتی۔"

"کوئی ضرورت ہو تو مجھے یاد کیجئے گا۔"

"اس تشفی کے لیے آپ کا شکریہ۔"

کیشو تمام دن بے چین رہا۔ سہدرا اس کی آنکھوں میں پھرتی رہی۔ سہدرا کی باتیں اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اب اسے اس میں کوئی شبہ نہ تھا کہ اس کی محبت میں سہدرا یہاں آئی تھی۔ سارا ماجرا اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس زبردست ایثار کا اندازہ کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہاں سہدرا نے کیا کیا تکالیف برداشت کی ہوں گی۔ کیسی کیسی مصیبتیں جھیلی ہوں گی۔ یہ سب اسی کے لیے! وہ اس پر بار نہ ڈالنا چاہتی تھی۔ اسی لیے تو اس نے اپنی آمد کی اطلاع تک اسے نہ دی۔ اگر اس کو پیشتر سے معلوم ہوتا کہ سہدرا یہاں آگئی ہے تو شاید اس عورت کی طرف اتنی کشش ہی نہ ہوتی۔ چوکیدار کے سامنے چور کو گھر میں گھسنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ سہدرا کو دیکھ کر اس کی فرض شناسی کی قوت بیدار ہو گئی۔ اس کے قدموں پر گر کر اس سے معافی مانگنے کے لیے اس کا دل بیقرار ہو اٹھا۔ وہ اس کی زبان سے سارا ماجرا سنے گا۔ یہ خاموش بے رخی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ دن تو کیشو نے کسی طرح گزارا مگر جونہی رات کو دس بجے، وہ سہدرا سے ملنے چلا۔ نئی بیوی نے پوچھا۔ "کہاں جاتے ہو؟"

کیشو نے جوتے کا فیتہ باندھتے ہوئے کہا۔ "ذرا ایک پروفیسر سے ملنا ہے، اس وقت ملنے کا وعدہ کر چکا ہوں۔"

"تو جلد آنا۔"

"بہت جلد آؤں گا۔"

کیشو گھر سے نکلا تو اس کے دل میں کتنے ہی خیالات موجزن ہونے لگے۔ کہیں سہدرا ملنے سے انکار کر دے تو! نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی تنگ دل نہیں ہے۔ ہاں، یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بارے میں کچھ نہ کہے۔ اسے تسکین دینے کے لیے اس نے ایک مرض کی بات سوچ لی۔ ایسا بیمار تھا کہ زندگی کی امید نہ تھی۔ ارملا نے ایسی تندہی سے اس کی تیمارداری کی کہ اس کو اس سے محبت ہو گئی۔ مرض کا سہدرا پر جو اثر پڑے گا، اس بارے میں کیشو کو کوئی شبہ نہ تھا۔ سارے حالات سے واقف ہونے پر وہ اس کو معاف کر دے گی۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟ کیا وہ دونوں کے ساتھ یکساں محبت کر سکتا ہے؟ سہدرا کو دیکھ لینے کے بعد ارملا کو شاید اس کا ساتھ دینے میں اعتراض نہ ہو۔ اعتراض ہو ہی کیسے سکتا ہے؟ اس سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے۔ ہاں یہ دیکھنا ہے کہ سہدرا بھی اسے منظور کرتی ہے یا [illegible] معلوم پڑتا ہے۔ مگر وہ اسے منا لے گا۔ اس سے منت سماجت کرے گا۔ اس کے پیروں پڑے گا اور بالآخر اسے منا کر ہی چھوڑے گا۔ سہدرا کے عشق و محبت کا نیا ثبوت پا کر وہ گویا ایک گہری نیند سے بیدار ہو چکا تھا۔ اسے اب احساس ہو رہا تھا کہ سہدرا کے لیے اس کے دل میں جو جگہ تھی وہ خالی پڑی ہوئی ہے۔ ارملا اس مقام پر اپنا اقتدار نہیں قائم کر سکی۔ اب اسے معلوم

ہوا کہ ارملا سے اس کی محبت محض ایسی ہوس تھی جو لذیذ اشیاء کو دیکھ کر ہی پیدا ہوتی ہے' وہ سچی اشتہاء نہ تھی۔ اب پھر اس کو اسی سادہ معمولی غذا کی خواہش ہو رہی تھی۔ عیش پسند ارملا کبھی اتنا ایثار کر سکتی تھی' اس میں اسے شبہ تھا۔

سبھدرا کے مکان کے قریب پہنچ کر کیشو کا دل کچھ ہچکنے لگا۔ مگر اس نے دل مضبوط کر کے زینہ پر قدم رکھا اور ایک لمحہ میں کمرہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ مگر دروازہ بند تھا' اندر بھی تاریکی تھی۔ ضرور ہی وہ کہیں گئی ہے' آتی ہی ہوگی۔ جب تک اس نے برآمدے میں ٹہلنے کا ارادہ کر لیا۔

یکایک مکان کی مالکہ آتی ہوئی نظر پڑی۔ کیشو نے بڑھ کر پوچھا۔ "آپ بتا سکتی ہیں کہ یہ لیڈی کہاں گئی ہے؟"

مالکہ نے اس کو سر سے پیر تک دیکھ کر کہا۔ "وہ تو آج یہاں سے چلی گئی۔"

کیشو نے گھبرا کر پوچھا۔ "چلی گئیں! کہاں چلی گئیں؟"

"یہ تو مجھے کچھ نہیں بتایا۔"

"کب گئی؟"

"وہ تو دوپہر ہی کو چلی گئیں۔"

"اپنا اسباب لے کر گئیں۔"

"اسباب کس کے لیے چھوڑ جاتیں؟ ہاں ایک چھوٹا سا پیکٹ اپنی ایک سہیلی کے لیے چھوڑ گئی ہیں جس پر "مسز کیشو" لکھا ہوا ہے۔ مجھ سے کہا تھا کہ اگر وہ آ جائیں تو انہیں دے دینا ورنہ ڈاک سے بھیج دینا۔"

کیشو کو اپنا دل اس طرح بیٹھتا ہوا معلوم ہوا جیسے آفتاب غروب ہوتا ہے۔ ایک گہری سانس لے کر بولا۔۔۔ "آپ مجھے وہ پیکٹ دکھا سکتی ہیں؟ کیشو میرا ہی نام ہے۔"

مالکہ نے مسکرا کر کہا۔ "مسز کیشو کو کوئی اعتراض تو نہ ہوگا؟"

"تو پھر میں انہیں بلا لاؤں۔"

"ہاں' مناسب تو یہی ہے۔"

"بہت دور جانا پڑے گا۔"

کیشو کچھ ٹھٹھکتا ہوا زینہ کی طرف چلا تو مالکہ نے پھر کہا۔ "میں سمجھتی ہوں کہ آپ اسے لے ہی جائیں' ناحق آپ کو کیوں دوڑاؤں۔ مگر کل میرے پاس ایک رسید بھیج دیجئے گا' شاید اس کی ضرورت پڑے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے ایک چھوٹا سا پیکٹ لا کر کیشو کو دے دیا۔ کیشو پیکٹ کو لے کر اس طرح بھاگا جیسے کوئی چور بھاگا جا رہا ہو۔ اس پیکٹ میں کیا ہے' یہ جاننے کے لیے اس کا دل بیقرار ہو رہا تھا۔ اسے اتنی تاخیر بھی ناگوار تھی کہ اپنے مکان میں جا کر اسے کھولے۔ قریب ہی ایک پارک تھا۔ وہاں جا کر اس نے برقی لیمپ کی روشنی میں اس پیکٹ کو کھول ڈالا۔ اس وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا گویا کسی عزیز کی علالت کی خبر کے بعد تار ملا ہو۔

پیکٹ کا کھلنا تھا کہ کیشو کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس میں ایک زرد رنگ کی ساڑھی تھی' ایک چھوٹی سی سیندور کی ڈبی اور ایک کیشو کی عکسی تصویر۔ ساتھ ہی ایک لفافہ بھی تھا۔ کیشو نے اسے کھول کر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا:

"بہن' میں جاتی ہوں۔ یہ میرے سہاگ کا جنازہ ہے۔ اسے دریائے ٹیمس میں بہا دینا۔ تمہیں لوگوں کے

ہاتھوں یہ آخری سنسکار بھی ہو جائے تو اچھا۔"

"تمہاری سبھدرا"

کیشو خستہ دل سا اس خط کو ہاتھ میں لیے ہوئے وہیں گھاس پر لیٹ گیا اور زار و قطار رونے لگا۔

دیوی

رات بھیگ چکی تھی۔ میں برآمدہ میں کھڑا تھا۔ سامنے امین الدولہ پارک نیند میں ڈوبا کھڑا تھا۔ صرف ایک عورت ایک تکیہ دار بنچ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ پارک کے باہر 'لبِ سڑک' ایک فقیر کھڑا راہگیروں کو دعائیں دے رہا تھا۔ "خدا اور رسول کا واسطہ! رام اور بھگوان کا واسطہ! اس اندھے پر رحم کرو!"

سڑک پر موٹروں اور سواریوں کا تانتا بندھ چکا تھا۔ اکے دکے آدمی نظر آجاتے تھے۔ فقیر کی صدا جو پہلے نقار خانے میں طوطی کی صدا تھی' اب نالۂ صحرا ہو رہی تھی!

دفعتہً وہ عورت اٹھی اور ادھر ادھر محتاط نظروں سے دیکھ کر فقیر کے ہاتھ میں کچھ رکھ دیا۔ پھر بہت آہستہ سے کچھ کہہ کر ایک طرف چلی گئی۔ فقیر کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا نظر آیا جسے وہ بار بار مل رہا تھا۔ کیا اس عورت نے یہ کاغذ دیا ہے۔

یہ کیا اسرار ہے؟ میں فرطِ اشتیاق سے بے تاب ہو کر نیچے آیا اور فقیر کے پاس کھڑا ہو گیا۔

میری آہٹ پاتے ہی فقیر نے اس کاغذ کے پرزے کو دو انگلیوں سے دبا کر مجھے دکھایا اور پوچھا۔ "بابا دیکھو یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے دیکھا دس روپیہ کا نوٹ تھا! پوچھا۔ "دس روپیہ کا نوٹ ہے۔ کہاں پایا!"

فقیر نے نوٹ کو اپنی جھولی میں رکھتے ہوئے کہا "کوئی خدا کی بندی دے گئی ہے!"

میں نے اور کچھ نہ کہا۔ اس عورت کی طرف دوڑا جواب تاریکی میں محض خواب حسرت بن کر رہ گئی۔

وہ کئی گلیوں میں ہوتی ہوئی ایک بوسیدہ خستہ حال مکان کے دروازے پر رکی، قفل کھولا اور اندر چلی گئی۔

رات کو کچھ پوچھنا مصلحت کے خلاف سمجھ کر میں لوٹ آیا۔

رات بھر میرا جی اسی طرف لگا تھا۔ علی الصبح میں پھر اس کوچہ میں جا پہنچا۔ معلوم ہوا وہ ایک غریب بیکس بیوہ ہے!

میں نے دروازہ پر جا کر پکارا دیوی۔ "میں تمہارے درشن کرنے آیا ہوں۔"

عورت باہر نکل آئی۔ افلاس اور بیکسی کی مجسم تصویر تھی۔

ی ہوے ، ۔ رات آپ نے فقیر کو......

دیوی نے قطع کلام کر کے کہا۔ "اجی وہ کیا بات تھی۔ مجھے وہ نوٹ پڑا مل گیا تھا۔ میرے کس کام کا تھا۔"

میں نے اس دیوی کے قدموں پر سر جھکا دیا۔

حرزِ جان

(1)

بہت دنوں کی بات ہے، میں ایک بہت بڑی ریاست کا معتمد ملازم تھا۔ حسب عادت مرنجان مرنج، صلح کل، ریاست کی فرقہ بندیوں سے محترز، نہ ادھر نہ ادھر، اپنے کام سے کام۔ محل میں آئے دن نئے نئے شگوفے کھلتے رہتے تھے۔ نئے نئے تماشے ہوتے رہتے تھے۔ نئی نئی سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ مجھے کسی فریق سے سروکار نہ تھا۔ شاید اسی لیے راجہ صاحب کی مجھ پر عنایت رہتی تھی۔ راجہ صاحب غیور، باحمیت، آزاد رو اور کسی قدر خود پرور فرمانروا تھے۔ رزیڈنٹ کی خوشامدیں کرنا انہیں گوارانہ تھا۔ جن اخباروں سے دوسری ریاستیں بدظن تھیں اور اپنے حدود میں ان کے داخلہ کی ممانعت کر دی تھی۔ وہ سب ہماری ریاست میں بے تکلف آتے تھے۔ کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ ایک دو بار رزیڈنٹ کی جانب سے اس کی تحریک ضرور ہوئی تھی۔ پر راجہ صاحب نے مطلق پروانہ کی۔ اپنے اندرونی انتظامات میں وہ کسی غیر کی مداخلت پسند نہ کرتے تھے۔ اس لیے رزیڈنٹ بھی ان سے بدظن تھا۔

مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ راجہ صاحب دور اندیش، کفایت شعار، خوش انتظام، بیدار مغز آدمی تھے۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ نہایت عیش پسند، رنگین مزاج بلکہ شہوت پرور تھے۔ رنواس میں درجنوں ہی رانیاں تھیں۔ پھر بھی آئے دن نئی چڑیاں آتی رہتی تھیں۔ اس مد میں مطلق کفایت یا کنجوسی نہ کی جاتی تھی۔ حسن پروری ان کی طبیعت ثانی ہو گئی تھی۔ اس کے لیے وہ دین، ایمان تک قربان کرنے کو تیار رہتے تھے۔ وہ مطلق العنان رہنا چاہتے تھے اور چونکہ یورپین حکام انہیں قیود کا پابند رکھنا چاہتے تھے، وہ انہیں چڑانے کے لیے ایسے معاملوں میں غیر معمولی جرات کر بیٹھتے تھے جن میں انہیں رعایا کی رعایت و حمایت کا پورا اعتماد ہوتا تھا۔

ادھر کچھ دنوں سے ایک پنجابی عورت رنواس مین داخل ہوئی تھی۔ اس کے متعلق طرح طرح کی افواہیں مشہور تھیں۔ کوئی کہتا تھا، بازاری طوائف ہے، کوئی ایکٹریس بتلاتا تھا۔ کوئی بھلے گھر کی لڑکی۔ حسن کے اعتبار سے اسے لاثانی نہ کہا جا سکتا تھا مگر راجہ صاحب اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ انتظامی معاملات میں یوں بھی انہیں دلچسپی نہ تھی مگر اب تو وہ فنافی العشق ہو گئے تھے۔ اس کے لیے علیحدہ محل تعمیر ہو رہا تھا۔ روزانہ نئے تحائف آتے رہتے تھے۔ اس کی آرائش کیلئے یورپ سے تصویریں اور ظروف منگوائے گئے تھے۔ اسے گانا اور ناچنا سکھانے کے لیے اٹلی اور فرانس اور جرمنی کے استاد بلائے گئے تھے۔ ساری ریاست میں اسی کا دور دورہ تھا۔ لوگوں کو حیرت ہوتی تھی کہ آخر اس حسینہ میں ایسی کیا صفت ہے جس نے راجہ صاحب کو اس قدر از خود رفتہ بنا رکھا ہے۔

ایک دن رات کو میں کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ راجہ صاحب نے یاد فرمایا۔ تعجب ہوا کہ اس وقت خلاف معمول کیوں طلبی ہوئی؟ میں راجہ صاحب کے خاص معتمدوں میں نہ تھا۔ اس وقت سے دہشت بھی ہوئی کہ کہیں کوئی آفت تو نہیں آنے والی ہے۔ ریاستوں میں ایسے اتفاقات کم نہیں ہوتے۔ ممکن ہے کسی بد اندیش نے میری شکایت کر دی ہو۔ فوراً تیار ہوا اور بادل ناخواستہ اور لرزاں راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن پہلی نگاہ ہی میں میرے اندیشے مٹ گئے۔ راجہ صاحب کے چہرہ پر غصہ کی جگہ حسرت اور غم چھایا ہوا تھا۔ آنکھوں میں ایک التجا

تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولے۔ ”کیوں جی سردار صاحب! تم نے کبھی محبت کی ہے؟ کس کی محبت میں اپنے آپ کو فراموش کیا ہے؟“

میں نے یہ بے تکلفانہ گفتگو سنی تو سمجھ گیا کہ اس وقت ادب و لحاظ کی ضرورت نہیں۔ راجہ صاحب کسی ذاتی معاملہ میں مجھ سے بے تکلف مشورہ کرنا چاہتے ہیں۔ بولا۔ ”حضور ایسا تو کبھی اتفاق نہیں ہوا۔“

راجہ صاحب نے میری طرف خاصدان بڑھا کر کہا۔ ”سچ! تم بڑے خوش نصیب ہو۔ اچھا ہوا کہ تم اس جال میں نہیں پھنسے۔ یہ خوش رنگ سنہرا جال ہے۔ یہ میٹھا مگر قاتل زہر ہے۔ یہ دلفریب مگر نگاہ سوز نظارہ ہے۔ یہ وہ نغمۂ شیریں ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لیے جہنم کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔“

انہوں نے گلاس شراب سے بھرا اور ایک چسکی لے کر بولے۔

”جانتے ہو۔ میں نے اس سرفراز کیلئے کتنی ذلتیں اٹھائیں۔ میں اس کے ابرو کے اشارہ پر اپنا یہ سر قلم کر کے اس کے پیروں پر رکھ سکتا تھا۔ یہ ساری ریاست اس کے قدموں پر نثار کر سکتا تھا۔ انہیں ہاتھوں سے میں نے اس کا پلنگ بچھایا ہے۔ اسے حقہ بھر بھر کر پلایا ہے۔ اس کے کمرہ کی خاکروبی کی ہے۔ وہ پلنگ سے اترتی تھی تو میں اس کی زیرپائی سیدھی کرتا تھا۔ ان خدمتوں میں مجھے کتنا لطف حاصل ہوتا تھا۔ کتنی خوشی ہوتی تھی۔ تم سے بیان نہیں کر سکتا۔ اس کے سامنے جا کر میں اس کی رضا کا غلام ہو جاتا تھا۔ امارت اور ریاست کا غرور میرے دل سے کافور ہو جاتا تھا۔ اس انکسار میں مجھے کائنات کی دولت مل جاتی تھی مگر اس ظالم نے مجھ سے ہمیشہ اجتناب کیا۔ شاید وہ مجھے اپنے قابل نہیں سمجھتی تھی۔ مجھے یہ تمنا ہی رہ گئی کہ وہ ایک بار اپنی ان مستانہ، رسیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی۔ ایک بار ان شنگرفی ہونٹوں سے میری طرف مسکراتی۔ میں نے سمجھا تھا، شائد وہ پرستش ہی کی چیز ہے۔ شائد اس کی فطرت ہی اس طرح بے نیاز واقع ہوئی ہے۔ شائد اس میں درد و محبت کا احساس ہی نہیں ہے۔ شائد وہ ان رموز سے نا آشنا ہے۔ ہاں میں نے سمجھا تھا، شائد ابھی الہڑپن اسے اظہار میں مانع ہے۔ میں اس امید سے اپنے دلِ محزوں کو تسکین دیتا تھا کہ کبھی تو میری جانثاریاں سپھل ہوں گی۔ کبھی تو اس کے جذبات خفتہ بیدار ہوں گے۔“

راجہ صاحب یکایک خاموش ہو گئے۔ پھر قد آدم شیشے کی طرف دیکھ کر مطمئن انداز سے بولے ”میں اتنا بدصورت تو نہیں ہوں کہ کوئی حسینہ مجھ سے اس قدر احتراز کرے۔“

راجہ صاحب نہایت وجیہ آدمی تھے۔ اونچا قد، فراخ سینہ، سیب کا سا رنگ، مردانہ حسن کی تصویر۔

میں نے دلیرانہ لہجہ میں کہا۔ ”اس معاملہ میں تو فطرت نے حضور کیلئے غیر معمولی فیاضی سے کام لیا ہے۔“

راجہ صاحب کے چہرہ پر ایک ہلکا سا مایوسانہ تبسم نظر آیا مگر پھر وہی حسرت طاری ہو گئی۔ بولے۔ ”سردار صاحب! میں نے اس بازار حسن کی خوب سیر کی ہے۔ تسخیر اور وشی کرن کے جتنے نسخے ہیں، ایک ایک سے واقف ہوں مگر جن نسخوں سے میں نے اب تک ہمیشہ فتح پائی ہے‘ وہ سب اس موقع پر بے اثر ثابت ہوئے۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اس پیکر حسن میں حِس ہی نہیں مگر افسوس! کل مجھ پر اس بے نیازی اور بے التفاتی کا راز کھل گیا۔ آہ! کاش رازا۔ کھ دنو اوراور مجھ سے بوشدہ ر ت۔ کھ دنو اور ت ا عا بے خود ت ا بے۔ ت بڑار ت۔“

راجہ صاحب کے چہرہ پر حسرت کی جگہ کرختگی و تندی کا شعلہ نمودار ہوا۔

”دیکھئے یہ وہ خطوط ہیں۔ جو کل مجھے خفیہ طور پر ہاتھ لگے ہیں۔ میں اس وقت اس امر کی تفتیش کرنا بیکار سمجھتا ہوں کہ یہ خطوط میرے پاس کس نے بھیجے۔ اسے یہ کہاں ملے۔ یہ سرفراز کے کسی بداندیش کی کارروائی ہو گی۔

مجھے تو صرف یہ تحقیق کرنا ہے کہ یہ خطوط اصلی ہیں یا مصنوعی۔ مجھے ان کے اصلی ہونے میں ذرہ برابر بھی شک نہیں ہے۔ میں نے سرفراز کی تحریر دیکھی ہے۔ اس کی گفتگو کا اندازہ کیا ہے۔ اس کی زبان پر جو الفاظ چڑھے ہوئے ہیں۔ میں ان سے خوب مانوس ہوں۔ ان خطوط میں وہی تحریر ہے، سر مو فرق نہیں۔ وہی انداز، وہی بیان ہے۔ وہی الفاظ ہیں۔ ادھر میں تو ایک نگاہِ تبسم کے لیے ترستا ہوں۔ ادھر یاروں کے نام عاشقانہ خطوط لکھے جاتے ہیں۔ شکوے و شکایات کے رنگین دفتر کھولے جاتے ہیں۔ ان خطوط کو میں نے پڑھا ہے۔ پتھر کا دل کر کے پڑھا ہے۔"

راجہ صاحب کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔

"خون کے گھونٹ پی پی کر پڑھا ہے اور اپنی بوٹیاں نوچ نوچ کر پڑھا ہے۔ آنکھوں سے خون کے قطرے نکل نکل آئے ہیں۔ اف! یہ دغا! یہ تریا چلتر! میرے محل میں رہ کر میری ناز برداریوں کے سایہ میں زندگی کی بہترین نعمتوں کا لطف اٹھا کر میری خاکروبیوں اور جانثاریوں کو پیروں سے کچل کر یہ راز و نیاز کے خط لکھے جاتے ہیں۔ مجھے کھارے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں۔ دوسرے پر آبِ مقطر کی بارش کی جارہی ہے۔ میرے لیے ایک چٹکی بھر آٹا نہیں۔ دوسرے کے لیے خوان نعمت حاضر کیا جارہا ہے۔ اف! تم قیاس نہیں کر سکتے ان خطوط کو پڑھ کر میری کیا حالت ہوئی۔

پہلا ولولہ جو میرے دل میں آیا، وہ یہ تھا کہ اسی وقت تلوار لے کر جاؤں اور اس بیدرد کے سامنے اسی کے پیروں پر یہ تیغہ اپنے سینے میں چبھا لوں۔ اسی کی آنکھوں کے سامنے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ شائد میرے بعد وہ میری محبت کی قدر کرے۔ میرے خون کے گرم فوارے اس کے پتھر جیسے دل کو پگھلاویں۔ اس بے رحم کو معلوم ہو کہ محبت کیا شے ہے لیکن دل کے نہ معلوم کس گوشہ سے آواز آئی۔ یہ سراسر حماقت ہے! تم مر جاؤ گے اور یہ ساحرہ تمہارے زر و جواہر سے دامن بھرے، تمہارے عطیات سے گرانبار، دل میں تمہاری حماقت پر ہنستی ہوئی دوسرے دن اپنے گلشن میں چلی جائے گی اور دونوں تمہاری دولت کے مزے اڑائیں گے اور تمہاری روح مضطر کو تڑپائیں گے۔

سردار صاحب! یقین مانئے۔ یہ آواز مجھے اپنے دل کے کسی گوشہ سے آئی۔ میں نے اسی وقت تلوار کمر سے الگ کر رکھ دی۔ یہ خیال ترک کر دیا۔ ایک ہی لمحہ میں انتقام کا ولولہ پیدا ہوا۔ دل میں ایک شعلہ سا اٹھا۔ اف! کتنی جانسوز تھی، وہ لپٹ۔ کتنا بے تاب کن تھا' وہ اشتعال۔ ایک ایک روئیں سے آگ نکل رہی تھی۔ اٹھا کہ اسی وقت جا کر اس کے ظلم و ستم کا خاتمہ کر دوں۔ جن آنکھوں کی ایک نگاہ کے لیے اپنی جان نثار کرتا تھا، انہیں ہمیشہ کے لیے بند کر دوں۔ ان قاتل زہریلے لبوں کو ہمیشہ کے لیے سیاہ کر دوں۔ جس سینہ میں اتنا تغافل، اتنی بے مہری، اتنی بے وفائی بھری ہو، اسے چیر کر پیروں سے کچل ڈالوں۔ خون سا سر پر سوار ہو گیا۔ سرفراز کی ساری دلربائیاں، ساری رعنائیاں، ساری خوش اندازیاں مکروہ معلوم ہونے لگیں۔ اس وقت اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ سرفراز نے کسی کو قتل کر ڈالا ہے تو شائد میں قاتل کے پیروں کو بوسہ دیتا۔ اگر سنتا کہ وہ نزع کی حالت میں ہے تو اس کے دم توڑنے کا تماشہ دیکھتا۔ میں خون کا مصمم ارادہ کر کے دوہری تلواریں کمر سے لگائے اس حریم ناز میں داخل ہوا۔ جس دروازہ پر جاتے ہی دل میں امید و بیم کی کشمکش ہونے لگتی تھی، وہاں پہنچ کر اس وقت مجھے سفاکانہ مسرت ہوئی۔

سردار صاحب! ان کیفیات اور جذبات کا ذکر نہ کروں گا جو اس وقت میرے دل پر طاری ہوئیں۔ زبان میں اتنی طاقت ہو بھی تو دل کو اس سے ہیجان میں لانا مناسب نہیں۔ میں نے کمرہ میں قدم رکھا۔ سرفراز خوابِ ناز میں مست

تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل پر ایک عجیب رقت طاری ہوئی۔ جی ہاں وہ غیض و غضب نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔ اس کی بجائے رقت کا غلبہ ہوا۔ اس کی کیا خطا ہے؟ یہ سوال ایک ناگہانی طور پر میرے دل میں پیدا ہوا۔ اس کی کیا خطا ہے؟ اگر اس کی یہی خطا ہے جو میری ہے تو مجھے اس سے انتقام لینے کا کیا حق ہے؟ اگر وہ اپنے محبوب کیلئے اتنی ہی مضطرب، اتنی ہی بے تاب، اتنی ہی از خود رفتہ ہے جتنا میں ہوں تو اس کی کیا خطا ہے۔ جس طرح میں اپنے دل سے مجبور ہوں، کیا وہ بھی اپنے دل سے مجبور نہیں ہو سکتی؟ اگر مجھے کوئی عورت گرفتار کرلے اور زر و جواہر سے میری محبت خریدنا چاہے تو کیا میں اس کا دم بھرنے لگوں گا؟ شائد نہیں۔ میں موقع پاتے ہی راہ فرار اختیار کروں گا۔ یہ میری بے انصافی ہے۔ ستم ناروا۔ اگر مجھ میں وہ اوصاف ہوتے جو اس کے نامعلوم آشنا میں ہیں تو کیوں اس کی طبیعت میری جانب مائل نہ ہوتی۔ مجھ میں وہ اوصاف نہیں ہیں جو وہ اپنے محبوب میں دیکھنا چاہتی ہے۔ اگر مجھے کڑوی چیز اچھی نہیں لگتی تو میں قدرتاً حلوائی کی دکان کی طرف جاؤں گا جو مٹھائیاں بیچتا ہے۔ ممکن ہے رفتہ رفتہ میرا مذاق بدل جائے اور میں کڑوی چیز پسند کرنے لگوں لیکن جبراً تلوار کی نوک پر کوئی مجھے کڑوی چیز کی طرف رغبت نہیں دلا سکتا۔

ان خیالات نے مجھے نرم کر دیا۔ وہ صورت جو مجھے ایک لمحہ پہلے مکروہ معلوم ہوتی تھی، پھر صد گنا دلربا نظر آئی۔ اب تک میں نے اس کو محوِ خواب نہ دیکھا تھا۔ عالمِ خواب میں اس کا حسن زیادہ پاکیزہ اور لطیف نظر آیا۔ جیسے بارش کے بعد پھول۔ بیداری میں وہ اجتماعی کشش نہ تھی۔ نگاہ کبھی آنکھوں کے بوسے لیتی، کبھی لبوں کے، کبھی رخساروں کے۔ اس عالم خواب میں اس کا جلوہ حسن مسلم تھا۔ حسن کی ایک شمع روشن تھی جس کا مرکز نگاہ کے لیے کوئی خاص نقطہ نہ تھا۔"

راجہ صاحب نے ایک معذرت آمیز تبسم کے ساتھ پھر ساغر منہ سے لگایا اور بولے۔

"سردار صاحب! میرا جوش انتقام فرو ہو گیا۔ جس سے محبت ہو گئی، اس سے نفرت نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ ہمارے ساتھ کتنی ہی بے وفائیاں کرے۔ جہاں معشوق عاشق کے ہاتھوں قتل ہو، وہاں سمجھ لیجئے کہ محبت نہ تھی، صرف نفس پروری تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا لیکن دل کو کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ تب سے اس وقت تک میں نے غصہ کو ضبط کرنے کی بے حد امکان کوشش کی مگر ناکام رہا۔ جب تک وہ شیطان زندہ ہے، میرے پہلو میں ایک کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔ میری چھاتی پر سانپ لوٹتا رہے گا۔ میرے لیے خواب و خور حرام ہے۔ وہی مارِ سیاہ میرے خزانہ تک پہنچنے میں مانع ہو رہا ہے۔ وہی میرے اور سرفراز کے بیچ میں دیوار حائل ہے۔ وہی اس دودھ کی مکھی ہے۔ اس سانپ کا سر کچلنا ہو گا۔ اس دیوار کو منہدم کرنا ہو گا۔ اس مکھی کو نکال کر پھینکنا ہو گا۔ جب تک میں اپنی آنکھوں سے اس کی دھجیاں بکھرتے نہ دیکھوں گا، میری روح کو تسکین نہ ہو گی۔ مال کی مطلق پروا نہیں ہے۔ کچھ بھی ہو مگر اس کو واصلِ جہنم کر کے دم لوں گا۔"

یہ کہہ کر راجہ صاحب نے میری طرف سائلانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "بتلائیے۔ آپ میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

راجہ صاحب نے میرا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہاں! آپ! آپ جانتے ہیں میں نے اتنے آدمیوں کو چھوڑ کر آپ کو کیوں محرم راز بنایا اور کیوں آپ سے استدعا کی؟ یہاں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں ہے جو میرا اشارہ پاتے ہی اس مردود کے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ سرِ بازار اسے خاک و خون میں ملا دیں گے۔ جی ہاں! ایک اشارے سے

اس کی ہڈیوں کا برادہ بنوا سکتا ہوں۔ اس کے ناخنوں میں کیلیں ٹھکوا سکتا ہوں مگر میں نے سب کو چھوڑ کر آپ کا انتخاب کیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ مجھے تمہارے اوپر اعتبار ہے۔ وہ اعتبار جو مجھے اپنے قریب تر آدمیوں پر بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے سینہ میں یہ راز اتنا ہی محفوظ رہے گا جتنا میرے۔ مجھے اعتبار ہے کہ تحریص اپنا انتہائی زور صرف کر کے بھی تمہیں نہیں ہلا سکتی۔ حیوانی تشدد اور ظالمانہ ایذا تمہارے لبوں کو نہیں کھول سکتے۔ تم بے وفائی نہ کرو گے، دغا نہ کرو گے۔ اس موقع سے ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤ گے۔ جانتے ہو، اس کا صلہ کیا ہو گا؟ اس کے متعلق تم کوئی اندیشہ نہ کرو۔ مجھ میں اور کتنے ہی عیوب ہوں، احسان فراموشی کا عیب نہیں ہے۔ بڑے سے بڑا صلہ جو میرے امکان میں ہے، وہ تمہارے قدموں پر رکھ دیا جائے گا۔ منصب، جاگیر، دولت، اعزاز تمہارے حسب خواہش عطا ہوں گے۔ تم خود اس کے مختار کامل ہو گے۔ کوئی مداخلت نہ کرے گا۔ حرص اور ارمان کو انتہائی پرواز کی آزادی ہو گی۔ قدردانی کے قدیم افسانے پھر زندہ ہو جائیں گے۔ تم خود فرمان لکھو گے اور میں اس پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دوں گا۔ بولو کب جانا چاہتے ہو؟ اس کا نام اور پتہ اس کاغذ پر لکھا ہوا ہے۔ اسے ذہن میں نقش کر لو اور کاغذ پھاڑ ڈالو۔ میں نے کتنی بڑی ذمہ داری تمہارے اوپر رکھی ہے۔ میری جان تمہاری مٹھی میں ہے۔ تم اسے بنا اور بگاڑ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس کام کو بوجوہ احسن انجام دو گے۔ جنہیں اپنا شریک کار بناؤ گے، وہ بھروسے کے آدمی ہوں گے۔ انتہائی فراست، انتہائی دور اندیشی اور انتہائی احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ ایک غیر محتاط لفظ، ذرہ برابر لاپروائی، ایک لمحہ کی تاخیر میرے اور تمہارے دونوں کے حق میں سم قاتل ہو گی۔ دشمن گھات میں بیٹھا ہوا ہے۔ ناکردہ گناہ گدّی سے معزول کرنے کی تجویزیں سوچی جا رہی ہیں۔ گناہ کرنے پر کیا سزا ہو گی، اس کا تم اندازہ کر سکتے ہو۔ میں کسی دور دراز کوہستانی علاقہ میں بند کر دیا جاؤں گا۔ ریاست غیروں کے تصرف میں چلی جائے گی اور میری زندگی غارت ہو جائے گی۔ تو کب جاؤ گے؟ یہ امپریل بینک کا چیک بک ہے۔ میں نے چکوں پر دستخط کر دیئے ہیں۔ جب اور جتنے روپوں کی ضرورت ہو، لے لینا۔"

میرا دماغ عرشِ معلیٰ پر جا پہنچا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ ثروت میں تالیف کی کتنی قوت ہوتی ہے۔ کیوں لوگ اس کے آستانہ پر سجدے کرتے ہیں۔ مجھ پر جیسے کوئی نشہ ہو گیا۔ میں نے ایک کتاب میں پڑھا تھا کہ اپنی تقدیر کی تعمیر کا موقع زندگی میں ہر ایک انسان کو ملتا ہے اور ایک ہی بار۔ جو اس موقع کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیتا ہے، وہ کامیاب ہے۔ جو شش و پنج میں پڑ کر اسے چھوڑ دیتا ہے، وہ ناکام ہے۔ ایک کو دولت، عزت اور شہرت نصیب ہوئی ہے۔ دوسرا عسرت اور افلاس اور نکبت میں زندگی کے دن کاٹتا ہے۔ فیصلہ کرنے کے لیے صرف ایک منٹ بلکہ صرف ایک لمحہ کا وقت ملتا ہے۔ کتنا بیش قیمت ہے وہ لمحہ، میری زندگی میں یہ وہی لمحہ تھا۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ تقدیر اپنی بہترین نعمتوں کا طشت لیے میرے سامنے حاضر ہے۔ وہ ساری برکتیں جن کے لیے انسان مرتا اور جیتا ہے، میرا خیر مقدم کرنے کے لیے کھڑی ہیں۔ مانا خطرناک کام ہے لیکن صلہ تو دیکھو۔ دریا میں غوطہ لگانے سے ہی دُرِ یتیم ملتا ہے۔ کنارے پر بیٹھنے والے سبکسارانِ ساحل کیلئے خرمہروں کے سوائے اور کیا ہے۔ ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑے گا۔ کیا مضائقہ! خون ہی عروج کا زینہ ہے۔ یہ دنیا کارزارِ حیات ہے۔ یہاں لاشوں کے زینے بنا کر بامِ رفعت پر چڑھنا پڑتا ہے۔ خون کے نالوں میں تیر کر ہی فتح کا ساحل ملتا ہے۔ گرد و پیش کے واقعات کو دیکھو، تاریخ دیکھو۔ کامیاب زندگی کی داستان خونی حرفوں میں لکھی ہوئی ہے۔ دلیروں نے ہمیشہ خون کے دریا کی شناوری کی ہے۔ خون کی ہولیاں کھیلی ہیں۔ خون کا خوف پست ہمتی اور ضعف کی

دلیل ہے۔ سورما کی نگاہ منزل پر رہتی ہے، راستہ پر نہیں۔ چوٹی پر رہتی ہے، دامن کوہ پر نہیں۔ اب پس و پیش کا موقع نہیں، نیک و بد کی فکر اہل عمل کو نہیں ہوتی۔

میں نے کھڑے ہو کر عرض کی۔ "غلام اس خدمت کے لیے حاضر ہے۔"

راجہ صاحب نے نگاہ تحسین سے دیکھ کر کہا۔ "مجھے تم سے یہی امید تھی۔ تمہارا دل کہتا ہے کہ یہ کام پورا کر آؤ گے؟"

"مجھے یقین ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔ دیکھو مجھے پل پل کی خبریں بھیجتے رہنا۔ اخفائے کامل شرط ہے۔"

"ایشور نے چاہا تو حضور کو شکایت کا کوئی موقع نہ ہو گا۔"

"ایشور کا نام نہ لو۔ ایشور ایسے موقعوں کے لیے نہیں ہے۔ ایشور کی مدد اس وقت مانگو جب اپنا دل کمزور ہو۔ جس کے بازوؤں میں قوت، دل میں ارادہ اور عزم، دماغ میں دانائی اور ہمت ہے، وہ ایشور کا دست نگر کیوں بنے۔ اچھا جاؤ اور جلد سرخرو ہو کر آؤ۔ آنکھیں تمہارے انتظار میں دروازہ پر کھڑی رہیں گی۔"

(2)

میں نے ضمیر کی تحریکات کو سر تک نہ اٹھانے دیا۔ میرا نفس اس بدنصیب کو گردن زدنی ثابت کرنے کے لیے دلیلیں پیش کرنے لگا۔ اسے کیا حق تھا کہ وہ سرفراز سے ایسے تعلقات رکھے۔ جب اسے معلوم تھا کہ راجہ صاحب نے اسے اپنے حرم میں داخل کر لیا ہے تو یہ قریب قریب اتنا ہی سنگین جرم ہے جتنا کسی بیاہتا کا اغوا کرنا۔ سرفراز ہر ایک اعتبار سے منکوحہ ہے بلکہ منکوحہ سے بھی بڑھ کر۔ ایسی حسینہ سے نامہ و پیام جاری رکھنا اور اس پر ڈورے ڈالنا ہرگز قابل معافی نہیں۔ ایسے سنگین جرم کی سزا بھی اتنی ہی سنگین ہو تو کوئی افسوس کی بات نہیں۔ اگر میرے دل میں اس وقت تک کچھ ضعف، کچھ دُبدھا تھا تو اس دلیل نے اسے دور کر دیا۔ حق کا انصاف جرات کا منتر ہے۔ اب وہ خون میری نظروں میں خونِ ناحق نہیں، خونِ ناروا نہیں بلکہ خونِ جائز تھا اور اس سے منہ موڑنا شرمناک بزدلی۔

ٹرین جانے میں ابھی دو گھنٹہ کی دیر تھی۔ رات بھر کا سفر تھا لیکن مجھے کھانے کی اشتہا مطلق نہ تھی۔ میں نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ بازار سے ایک نقلی داڑھی لایا۔ شاید اس کی ضرورت پڑے۔ ٹرنک میں دو ریوالور رکھ لیے۔ پھر سوچنے لگا کہ کسے اپنے ساتھ لے چلوں۔ آغاز کیسے ہو؟ یہاں سے کسی کو لے جانا تو مصلحت کے خلاف ہے۔ پھر کیا اپنے بھائی صاحب کو تار دوں؟ ہاں یہی مناسب ہے۔ انہیں لکھ دوں مجھ سے بمبئی میں ملیں۔ وہ چلتے ہوئے آدمی ہیں لیکن نہیں، مفت میں بھائی صاحب کو کیوں پھنساؤں۔ کون جانے کیا ہو۔ بمبئی میں ایسے آدمیوں کی کیا کمی۔ ایک لاکھ روپیہ کا لالچ دوں گا۔ چٹکیوں میں کام ہو جائے گا۔ وہاں ایک سے ایک شاطر پڑے ہیں---- بس ان حضرت کو کسی حکمت سے کسی طوائف کے کمرہ میں بند کر کے وہیں بزن کر دیا جائے یا سمندر کے کنارے جس وقت وہ ہوا خوری کے لیے نکلیں۔

ابھی چونکہ دیر تھی، اس لیے سوچا، لاؤ سندھیا کر لوں۔ جونہی سندھیا کے کمرہ میں قدم رکھا۔ وہاں حسب دستور جس چیز پر نگاہ پڑی، وہ ماتا جی کی قدِ آدم تصویر تھی۔ میں یکایک چونک پڑا۔ جیسے کوئی آدمی اس وقت چور کے

کندھے پر ہاتھ رکھ دے' جب وہ سینڈھ مار رہا ہو۔ میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ روز یہی تصویر دیکھا کرتا تھا۔ دن میں صدہا بار اس پر نگاہ پڑتی تھی۔ آج میرے دل کی جو کیفیت ہوئی، وہ کبھی نہ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا وہ آنکھیں نگاہ سرزنش سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ ان میں کتنی تنبیہ تھی۔ کتنی شرم، کتنا افسوس، کتنی مایوسی۔ اف! میں اس طرف تاک نہ سکا، فوراً آنکھیں جھکا لیں۔ ان آنکھوں کے سامنے کھڑے ہونے کی مجھے جرات نہ ہوئی۔ وہ تصویر کی آنکھیں نہ تھیں۔ زندہ روشن، متحرک آنکھیں تھیں۔ دل میں نفوذ کرنے والی۔ نوکدار سلاخ کی طرح سینہ میں چبھنے والی۔ مجھے ایسا خوف ہوا کہ گر پڑوں گا۔ میں وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔ میرا سر آپ ہی آپ جھک گیا۔ بالکل نادانستہ، بالکل غیر محسوس طریقہ پر۔ میرے ارادوں میں' خیالات میں، خواہشات میں ایک انقلاب ہو گیا۔ اس صداقت کے پتلے۔ اس نور کے مجسمے نے میرے ضمیر کو منور کر دیا۔ دل میں کیا کیا جذبات پیدا ہوئے، اس کی مجھے خبر نہیں۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ میں ایک غیبی طاقت کے زیر اثر گھر سے نکلا۔ موٹر تیار کروائی اور 10 بجے راجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میرے لیے انہوں نے خاص طور پر ہدایت کر دی تھی۔ جس وقت چاہوں، ان سے ملوں۔ میں جا کر دست بستہ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''حضور کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔''

راجہ صاحب اس عقدہ کو اپنی دانست میں حل کر چکنے کے بعد اس وقت اطمینان کے سانس لے رہے تھے۔ بوجھ سر سے اتار کر وہ دم لے رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہیں فراست سے کسی نئی الجھن کا گمان ہوا۔ چیں بجبیں ہو گئے مگر ایک ہی لمحہ میں مصلحت غالب آ گئی۔ شگفتہ رو ہو کر بولے۔ ''ہاں ہاں کہیے، کوئی خاص بات؟''

میں نے بے خوف جھجک کر کہا ''مجھے اس کام سے معذور رکھئے۔''

راجہ صاحب کا چہرہ سفید ہو گیا۔ میری طرف وحشت سے دیکھ کر پوچھا۔ ''اس کا مطلب؟''

''مجھ سے وہ کام نہ ہو سکے گا۔''

''کیوں؟''

''مجھ میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔''

مہاراجہ صاحب نے طعن آمیز نظروں سے دیکھ کر فرمایا۔

''شائد ضمیر بیدار ہو گیا۔ کیوں؟ وہی بیماری جو پست ہمتوں اور نامردوں کو ہوا کرتی ہے۔ اچھی بات ہے جاؤ۔''

''حضور! میں اپنے میں وہ قابلیت نہیں پاتا۔''

راجہ صاحب نے شیر کی طرح آتشیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے گرج کر کہا۔ ''مت بکو۔ نمک......''

پھر کچھ نرم ہو کر بولے۔ ''تمہاری تقدیر میں عروج اور ثروت نہیں۔ میں نے تمہیں وہ موقع دیا تھا جسے کوئی دوسرا آدمی امدادِ غیب سمجھتا مگر تم نے اس کی قدر نہ کی۔ تمہاری تقدیر تم سے پھری ہوئی ہے۔ ہمیشہ غلامی کرو گے اور ٹھوکریں کھاؤ گے۔ تم جیسے آدمیوں کیلئے گیروے بانے ہیں اور کاسۂ گدائی اور ایک گوشۂ غار۔ نیک و بد کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اسی کی ضرورت ہے۔ دنیا مردوں کے لیے ہے۔''

میں خاموش تھا، پچھتا رہا تھا۔ پہلے ہی کیوں نہ یہ عذر کیا تھا۔

راجہ صاحب نے ایک لمحہ کے بعد پھر کہا۔ ''اب بھی موقع ہے، پھر سوچو۔''

میں نے اسی بے باکانہ انداز سے کہا۔ ''میں نے خوب سوچ لیا، مجھ سے......''

راجہ صاحب ہونٹ دانتوں سے کاٹ کر بولے۔ ”بہتر ہے جاؤ اور آج ہی شب کو میری حدود کے باہر نکل جاؤ۔ ممکن ہے، کل تمھیں پھر یہ موقع نہ ملے۔“

اسی رو میں انھوں نے مجھے نمک حرام، کج فہم، کمینہ اور نہ جانے کیا کیا کہا۔ میں نے سلام کیا اور چلا آیا اور اسی رات کو یکہ و تنہا چند کپڑے اور نقد روپیہ کا صندوق لیے ہوئے گھر سے نکل پڑا۔ ہاں وہ تصویر میرے سینہ سے لگی ہوئی تھی۔

ادھر آفتاب حدودِ مشرق میں آیا اور میں ریاست کے حدود سے نکل کر انگریزی علاقہ میں آپہنچا۔

ماں

(1)

آج قیدی چھوٹ کر گھر آ رہا ہے۔ کرونا نے ایک دن پہلے ہی گھر لیپ پوت رکھا تھا۔ اس تین سال میں اس نے اپنا پیٹ اور تن کاٹ کر جو دس پانچ روپے جمع کر رکھے تھے، وہ اس نے اپنے پیارے شوہر کی خاطر و خیر مقدم کی تیاریوں میں صرف کیے۔ اس کے لیے دھوتیوں کا نیا جوڑا لائی تھی۔ نئے کرتے بنوائے تھے۔ بچہ کے لیے نیا فراک اور کن ٹوپ بنایا۔ بار بار بچہ کو چھاتی سے لگاتی اور خوش ہوتی۔ وہ اس پیارے بچہ کو شوہر کی گود میں دے دی گی تو وہ کتنے خوش ہوں گے۔ اس خیال کا دل میں مزہ لے کر وہ پھولے نہ سماتی تھی۔ آتے ہی آتے وہ اسے گود میں اٹھالیں گے۔ پیار کریں گے اور کہیں گے، کرونا تم نے یہ رتن دے کر مجھے نہال کر دیا۔ قید کی ساری مصیبتیں اور سختیاں بچہ کی توتلی باتوں میں بھول جائیں گی۔ اس کی ایک طفلانہ معصوم نگاہ میں سارے غم دھل جائیں گے۔ وہ سوچتی تھی، ان کے ساتھ بہت سے آدمی ہوں گے۔ جس وقت وہ دروازہ پر پہنچیں گے۔ جے جے کے نعرے بلند ہوں گے اور لوگ ان پر پھولوں کی برکھا کریں گے۔ کتنا پاک نظارہ ہوگا۔ ان آدمیوں کو بٹھانے کے لیے کرونا نے ایک چھوٹا سا ٹاٹ بچھا رکھا تھا۔ کچھ پان بھی بنا لیے تھے اور بار بار منتظر نگاہوں سے دروازہ کی طرف دیکھتی تھی۔ شوہر کی وجیہ مردانہ صورت بار بار آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ ان کی وہ باتیں بار بار یاد آتی تھیں جو چلتے وقت ان کی زبان سے نکلی تھیں۔ ان کا وہ استقلال، وہ ضبط، جو پولیس کی دست درازیوں میں بھی اٹل رہا تھا۔ وہ تبسم جو اس وقت بھی ان کے لبوں کو شگفتہ کر رہا تھا، وہ خودداری جو اس وقت بھی ان کے چہرہ سے ٹپک رہی تھی۔ کیا کرونا کے دل سے محو ہو سکتی تھی۔ اس کی یاد آتے ہی کرونا کے چہرہ پر غرور کی سرخی نمایاں ہو گئی تھی۔ یہی وہ سہارا تھا جس نے ان تین برسوں کی بڑی بڑی سخت آزمائشوں میں اس کے دل کو تقویت دی تھی۔ راتیں فاقوں سے گزریں۔ اکثر گھر میں چراغ جلنے کی نوبت بھی نہ آتی تھی مگر حرفِ التجا کبھی اس کی زبان پر نہ آیا۔ آج ان ساری مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان کے آغوش محبت میں وہ سب کچھ ہنس کر جھیل لے گی۔ اس لازوال دولت کو پا کر اسے پھر کسی چیز کی آرزو نہ رہے گی۔

شام ہو رہی تھی۔ قضا کارہ نورد ازل اپنی منزل کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ جہاں افق نے اس کے لیے سنہرا

فرق بچھا رکھا تھا اور آرامگاہ میں پھولوں کی سیج بچھادی تھی۔ اسی وقت مکان کے سامنے میدان میں ایک آدمی لاٹھی ٹیکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ گویا کسی جاں بہ لب مسافر کا نالۂ ضعیف ہو۔ قدم قدم پر رک جاتا تھا اور کھانسنے لگتا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ کرونا اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتی تھی۔ رفتار سے معلوم ہوتا تھا، کوئی بوڑھا آدمی ہے مگر ایک منٹ میں جب وہ قریب آگیا تو کرونا پہچان گئی۔ اس کا پیارا شوہر ہی تھا لیکن آہ! اس کی صورت کتنی مسخ ہوگئی تھی۔ وہ جوانی، وہ مردانہ حسن، وہ چستی اور پھرتی رخصت ہو گئی تھی۔ صرف ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ نہ کوئی یار، نہ مددگار! ایک آدمی بھی ساتھ نہیں! کرونا اسے پہچانتے ہی دروازہ کے باہر آگئی مگر شوہر سے بغلگیر ہونے کا اشتیاق دل میں دب کر رہ گیا۔ سارے ولولے خاک میں مل گئے۔ آنسوؤں کے سیلاب میں ساری خوشیاں بہہ گئیں، فنا ہو گئیں!

آدتیہ نے گھر میں قدم رکھتے ہی مسکرا کر کرونا کو دیکھا مگر مسکراہٹ میں درد کا ایک دریا بھرا ہوا تھا۔ کرونا ایسی بے حس ہوگئی تھی، گویا بدن میں جان ہی نہ ہو۔ گویا دل کی حرکت بند ہوگئی۔ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے شوہر کی طرف ٹکٹکی لگائے کھڑی تھی۔ پر منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا تھا۔ نہ مزاج پرسی کا، نہ خیر مقدم کا، نہ رنج کا۔ بچہ اس کی گود میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے اس تودۂ استخواں کو دیکھ رہا تھا اور ماں کی گود سے چمٹا جاتا تھا۔ وہ بھول گئی کہ میری گود میں بچہ ہے۔

آخر اس نے دردناک لہجہ میں کہا۔ ''یہ تمہاری کیا حالت ہے۔ بالکل پہچانے نہیں جاتے۔''

آدتیہ نے اس کی تشویش کو رفع کرنے کے خیال سے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔ ''کچھ نہیں، ذرا دبلا ہو گیا ہوں۔ اب تمہارے ہاتھوں کی روٹیاں کھا کر پھر توانا ہو جاؤں گا۔''

کرونا۔ ''رام رام، بالکل سوکھ کر کانٹا ہو گئے۔ کیا وہاں کھانا بھی نہیں ملتا۔ تم تو کہتے تھے پولیٹیکل قیدیوں کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ تمہارے ساتھی کیا ہوئے جو تمہیں رات دن گھیرے رہتے تھے اور تمہارے پسینہ کی جگہ خون بہانے کو تیار رہتے تھے؟''

آدتیہ کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ بولے ''یہ بہت تلخ تجربہ ہے کرونا۔ مجھے نہ معلوم تھا کہ میرے قید ہوتے ہی لوگ میری طرف سے آنکھیں پھیر لیں گے۔ کوئی پرسانِ حال نہ ہوگا۔ قوم پر مٹنے والوں کا یہی انعام ہے۔ یہ مجھے نہ معلوم تھا۔ عوام کا حافظہ کمزور ہوتا ہے' یہ تو مجھے معلوم تھا لیکن اپنے رفیق اور غمگسار بھی اتنے بے وفا ہوتے ہیں' اس کا مجھے نیا تجربہ ہوا۔ مگر مجھے کسی سے شکایت نہیں۔ قوم کی خدمت خود اپنا انعام ہے۔ میری حماقت تھی کہ اس کے لیے صلہ یا تحسین چاہتا تھا۔

کھانے پینے کا قصہ نہ پوچھو کرونا۔ بڑی دردناک کہانی ہے۔ بیس فاقے کر چکا ہوں۔ بس یہی غنیمت سمجھو کہ زندہ آگیا۔ تمہارے درشن بدے تھے ورنہ تکلیفیں تو ایسی ایسی اٹھائیں کہ اب تک مجھے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ جیل کے قیدی کتے سے بھی بدتر سمجھے جاتے ہیں اور کھانا تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید کتا بھی نہ سونگھے۔''

کرونا: ''تو چل کر کچھ کھالو۔ نہیں، یہیں لاتی ہوں۔ کچھ کھا کر آرام سے لیٹو (بچے سے) بابو جی ہیں بیٹا۔ تمہارے بابو جی۔''

آدتیہ نے پشیمان نظروں سے بچے کو دیکھا اور ان کا ایک ایک رواں انہیں نفریں کرنے لگا۔ اپنی خستہ حالی پر انہیں کبھی اتنا صدمہ نہ ہوا تھا۔ کاش ان کی حالت اب کے سنبھل جاتی تو وہ پھر قومی تحریکوں کے قریب نہ جاتے۔ اس پھول سے بچے کو یوں دنیا میں لا کر اس بے کسی اور افلاس کا شکار بنانے کا انہیں کیا حق تھا۔ وہ ایک بار پھر دنیا کی

پرستش کریں گے اور اس بچے کی پرورش و پرداخت کیلئے اپنے کو نثار کر دیں گے۔ انہیں اس وقت ایسا معلوم ہوا کہ بچہ انہیں شکوہ آمیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے، تم نے میرے ساتھ اپنا کونسا فرض ادا کیا۔ ان کا سارا اشتیاق سارا پیار بچہ کو سینہ سے لگا لینے کے لیے تڑپ اٹھا مگر ہاتھ نہ پھیل سکے، ہاتھوں میں طاقت نہ تھی۔

کرونا بچہ کو لیے ہوئے اٹھی اور ایک تھالی میں کچھ کھانا نکال کر لائی۔ آدتیہ نے حریص نظروں سے تھالی کی طرف دیکھا۔ گویا مدت کے بعد کوئی کھانے کی چیز سامنے آئی ہے۔ وہ جانتا تھا، ہفتوں کی فاقہ کشی کے بعد اور صحت کی اس گئی گزری حالت میں یہ پر تکلف چیزیں ہضم نہ ہوں گی لیکن وہ صبر نہ کر سکا۔ تھالی پر ٹوٹ پڑا اور دم زدن میں تھالی صاف کر دی۔ کرونا ان کی یہ پرخوری دیکھ کر ڈر گئی۔ اس نے دوبارہ کسی چیز کے لیے نہ پوچھا۔ تھالی اٹھا کر چلی گئی اور لالٹین جلانے بیٹھی ہی تھی کہ کانوں میں آواز آئی۔ "کرونا"

کرونا نے جلدی سے لالٹین جلائی اور دوڑی ہوئی آدتیہ کے پاس آکر بولی۔ "تم نے مجھے پکارا ہے؟"

آدتیہ نے جواب نہ دیا۔ ان کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور سانس زور سے چل رہی تھی۔ ہاتھوں کے سہارے ٹاٹ پر لیٹ گئے تھے۔ کرونا گھبرا گئی۔ بولی۔ "تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ جا کر کسی وید کو بلا لاؤں؟"

آدتیہ نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر کے کہا۔ "فضول ہے کرونا! اب تم سے چھپانا فضول ہے۔ مجھے تپ دق ہو گیا ہے۔ اس تین سال کی متواتر تکلیف، فکر اور فاقہ کشی نے آخر مجھے اس مرض کا شکار بنا ڈالا۔ کئی بار مرتے مرتے بچ گیا ہوں۔ تمہیں دیکھنے کی آرزو باقی تھی، شائد اسی لیے جان نہ نکلتی تھی۔ اب کوئی بہانہ نہیں رہا۔ دیکھو روؤ مت۔"

کرونا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی ویدجی کو لیے آتی ہوں۔"

آدتیہ۔ "بے سود ہے۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ ایک قدم بھی چلنا محال تھا۔ مجھے تو یہی تعجب ہے کہ یہاں پہنچ کیسے گیا۔ نہ جانے کونسی غیبی طاقت مجھے یہاں لائی۔ شائد وہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی آخری جھلک تھی۔ آہ! میں نے تمہارے لیے کچھ نہ کیا۔ کوئی آرام نہ دے سکا۔ تمہارے ساتھ بڑی بے انصافی کی۔ محض سہاگ کا داغ لگا کر اور ایک بچہ کی پرورش کا بار چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں۔ افسوس!"

کرونا نے دل مضبوط کر کے کہا۔ "تمہیں کہیں درد ہو رہا ہے؟ آگ بنا لاؤں، کچھ بتلاتے کیوں نہیں۔"

آدتیہ نے کروٹ بدل کر کہا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔ کہیں درد نہیں، بس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل بیٹھا جاتا ہے۔ گویا پانی میں ڈوبا جاتا ہوں۔ زندگی کا کھیل ختم ہو رہا ہے۔ چراغ کو بجھتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ کچھ نہیں کہہ سکتا، کب آواز بند ہو جائے۔ اب جو کچھ کہنا ہے، کہہ ڈالوں گا۔ کیوں یہ حسرت لے جاؤں۔ میرے ایک سوال کا جواب دو گی؟ پوچھوں؟"

کرونا کے دل کا سارا ضعف، ساری مایوسی، سارا غم، سارا درد غائب ہو گیا۔ اس کی جگہ وہ روحانی طاقت رونما ہوئی جو موت پر ہنستی ہے اور مصائب سے کھیلتی ہے۔ جواہر نگار خول کے اندر جیسے تیز تلوار چھپی رہتی ہے۔ پانی کے نغمۂ شیریں میں جیسے بعید القیاس قوت چھپی ہوتی ہے۔ اسی طرح عورت کا نازک دل صبر اور استقلال کو اپنی گود میں چھپائے رہتا ہے۔ غصہ جیسے تلوار کو باہر کھینچ لیتا ہے۔ علم جیسے پانی کی مخفی طاقت کو بے نقاب کر دیتا ہے۔ اسی طرح الفت حسینہ کے صبر اور استقلال کو بیدار کر دیتی ہے۔

کرونا نے آہستہ سے شوہر کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا اور بولی۔ "پوچھو پیارے، کیا پوچھتے ہو؟"

آدتیہ نے کرونا کی طرف بے کسانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "تمہارے خیال میں میری زندگی کیسی تھی؟ رنج کرنے کے قابل یا خوش ہونے کے قابل؟ دیکھو تم نے مجھ سے کبھی پردہ نہیں کیا۔ اس وقت بھی پردہ نہ رکھنا۔ تمہارے خیال میں مجھے اپنی زندگی پر رونا چاہیے یا ہنسنا چاہیے؟"

کرونا نے جوش کے ساتھ کہا۔ "تمہاری زندگی دیوتاؤں کی زندگی تھی۔ بالکل بے غرض، بے لوث، ضرورتوں سے تنگ آکر میں نے بارہا تمہیں دنیا کی طرف کھینچنے کی کوشش کی ہے لیکن میں اس وقت بھی دل میں سمجھ رہی تھی کہ میں تمہیں اونچے درجہ سے گرا رہی ہوں۔ شائد تم مال و متاع کی طرف زیادہ مائل ہوتے تو میرے نفس کو زیادہ اطمینان ہوتا لیکن میری آتما کو وہ غرور اور سرور کبھی نہ ہوتا جو اس وقت مجھے ہو رہا ہے۔ میں اگر کسی کو اچھی سے اچھی دعا دے سکتی ہوں تو وہ یہی ہوگی کہ اس کی زندگی تمہاری جیسی ہو۔"

یہ کہتے کہتے کرونا کے چہرہ پر ایک نورانی جھلک نمودار ہوئی۔ گویا اس کی ہستی کا ایک ایک ذرہ پاکیزہ ہو گیا ہو۔

آدتیہ کا درد اور مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا۔ آنکھوں میں ایک نورانی مستی پیدا ہو گئی۔ اس دم واپسیں کے ایک لمحے میں اسے وہ سرور حاصل ہوا جو کبھی ساری زندگی میں نہ ہوا تھا۔ اس نے پر غرور نظروں سے کرونا کو دیکھ کر کہا۔ "بس اب مجھے اطمینان ہو گیا کرونا! مجھے اب اپنے بچے کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میں اسے اِس سے بہتر ہاتھوں میں نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ زندگی کا یہی اونچا معیار تمہارے سامنے ہمیشہ رہے گا۔ اب میں خوشی سے مرنے کے لیے تیار ہوں۔"

(2)

سات سال گزر گئے۔ بچہ پرکاش اب دس سال کا خوبصورت، مضبوط، دلفریب لڑکا تھا۔ بلا کا ذہین، مغرور اور دلیر۔ زمانہ کرونا کو بد نصیب سمجھے، وہ خود کبھی اپنی قسمت کا گلہ نہیں کرتی۔ اس کے پاس کچھ زیور تھے۔ ان سے اس نے تین چار بھینسیں اور گائیں لے لیں اور خالص دودھ کے خواستگار ٹوٹ پڑے۔ اس کا سارا دودھ گھر بیٹھے ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ یہی اس کی گزران کی صورت تھی۔ اسے پہر رات سے پہر رات تک مویشیوں کی داشت و پرداخت میں مصروف رہنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اپنے حال پر خوش ہے۔ اس کے چہرہ پر مایوسی اور بے کسی کی زردی نہیں۔ عزم اور ہمت کا جلال ہے۔ ایک ایک عضو سے خودداری کی شان ٹپک رہی ہے۔ اس کی آنکھوں میں ایک روحانی غرور ہے۔ خاموش، متین اور عمیق۔ حسرتیں اور کلفتیں، وہ بیوگی کا صدمہ، وہ بے کسی کا غم سب اس گہرائی میں فنا ہو گئے ہیں۔ پرکاش پر وہ جان دیتی ہے۔ اس کی خوشیاں، اس کی تمنائیں، اس کی دنیا، اس کی جنت، سب کچھ پرکاش پر نثار ہے مگر یہ مجال نہیں کہ پرکاش کوئی شرارت کرے اور کرونا اغماض کر جائے۔ وہ اس کے اطوار کی بڑی بے دردی سے نگرانی کرتی ہے۔ وہ پرکاش کی صرف ماں نہیں، ماں اور باپ دونوں ہے۔ اس کے برتاؤ میں ماں کے پیار کے ساتھ باپ کی تندی بھی شامل ہے۔ شوہر کے آخری الفاظ ابھی تک اس کے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ وہ روحانی مستی جوان کی آنکھوں میں چھا گئی تھی، وہ غرور جوان کے چہرہ پر دوڑ گیا تھا، ابھی تک اس کی آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ شب و روز کی یاد نے آدتیہ کو اس کے لیے زندہ کر دیا ہے۔ وہ دنیا کے لیے مر گئے ہیں۔ اس کے لیے زندہ ہیں۔ اسے ہمیشہ ان کی ہستی کا احساس ہوتا رہتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ آدتیہ کی روح اس کے ہر حال میں

شریک ہے۔اس کی سب سے بڑی تمنا یہی ہے کہ پرکاش جوان ہو کر اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے۔ یہی اس کی زندگی کا مقصود ہے۔اس زندگی کا جو درد اور غم کی ایک داستان ہے۔

شام ہو گئی ہے۔ایک بھکارن دروازہ پر آکر بھیک مانگنے لگی۔ پرکاش دروازہ پر کھیل رہا تھا۔شرارت سوجھی، گھر گیا اور ایک کٹورے میں تھوڑا سا بھوسہ لایا۔ بھکارنی نے اپنی جھولی پھیلادی۔ پرکاش نے وہ بھوسہ جھولی میں ڈال دیا اور زور سے تالیاں بجاتا بھاگا۔ بھکارن نے قہر کی نگاہ سے دیکھا اور بولی ''واہ رے لاڈلے۔ مجھ سے ہنسی کرنے چلا ہے۔ کیا یہی ماں باپ نے سکھایا ہے تب تو خوب کُل کا نام جگاؤ گے!''

کرونا باہر نکل آئی اور بولی ''کیا ہے ماتا، کسے کہہ رہی ہو؟''

بھکارن نے پرکاش کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ''وہ تمہارا لڑکا ہے نا؟ دیکھ کٹورے میں بھوسہ بھر کر میری جھولی میں ڈال گیا ہے۔ تھوڑا سا آٹا تھا، وہ بھی مٹی میں مل گیا۔ کوئی اس طرح دکھیاروں کو ستاتا ہے۔ سب کے دن ایک سے نہیں رہتے، آدمی کو گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔''

کرونا نے کرخت لہجہ میں پکارا۔ ''پرکاش!''

پرکاش نادم نہ ہوا۔ تمکنت کے انداز سے سر اٹھائے ہوئے آیا اور بولا۔ ''یہ کیوں ہمارے یہاں بھیک مانگنے آتی ہے! کچھ کام نہیں کرتی۔''

کرونا خفیف ہو کر بولی۔ ''شرم تو نہیں آتی۔ الٹے زبان درازی کرتے ہو۔''

کرونا نے بڑھیا کو آٹا دال دے کر رخصت کیا مگر پرکاش کی یہ حرکت اس کے دل میں پھوڑے کی طرح ٹیستی رہی۔ یہ شرارت اس نے کہاں سیکھی؟ رات کو بھی اسے بار بار یہی خیال ستاتا رہا۔

آدھی رات کے قریب یکایک پرکاش چونکا تو دیکھا لالٹین جل رہی ہے اور کرونا بیٹھی رو رہی ہے۔ بولا ''اماں! ابھی تم سوئیں نہیں؟'' کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ ''نیند نہیں آئی۔ تم کیسے جاگ گئے؟ پیاس تو نہیں لگی ہے؟''

پرکاش۔ ''میرا قصور معاف کرو۔ اب میں پھر ایسی شرارت نہ کروں گا۔''

یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ کرونا نے اسے گلے لگالیا اور بولی۔ ''بیٹا! مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو یا تمہارے دل میں سچ مچ پچھتاوا ہو رہا ہے؟''

پرکاش نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں اماں! مجھے دل سے افسوس ہو رہا ہے۔ اب کے وہ بڑھیا آئے گی تو میں اسے پیسے دوں گا۔''

کرونا کا چہرہ غرور سے سرخ ہو اٹھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ آدتیہ سامنے کھڑے بچے کو دعائیں دے رہے ہیں اور کچھ کہہ رہے ہیں۔ ''کرونا! رنجیدہ مت ہو۔ تیری ساری آرزوئیں پوری ہو جائیں گی۔''

(3)

نوجوان پرکاش کے قول اور فعل میں مناسبت نہ تھی اور دنوں کے ساتھ اس کے کریکٹر کا یہ پہلو نمایاں ہوتا جاتا تھا۔ زبان سے وہ قوم کا سچا ہمدرد اور جانثار تھا مگر قوم کے لیے کسی قسم کے ایثار کی ضرورت نہ سمجھتا تھا۔ ذہین تھا ہی، یونیورسٹی سے اسے وظیفے ملتے تھے۔ کرونا بھی اس کی مدد کرتی تھی لیکن پھر بھی اس کا خرچ پورا نہ پڑتا تھا۔ وہ

کفایت شعاری اور سادہ معاشرت پر عالمانہ تقریریں کر سکتا تھا مگر وضع اور قطع یونیورسٹی کے فیشن ایبل طلبہ سے جو بھر بھی گھٹ کر نہ ہوتی تھی۔ نمود و نمائش کی دھن اسے ہمیشہ سوار رہتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کے دل و دماغ میں ہمیشہ جنگ ہوتی رہتی تھی۔ دل قوم کی طرف تھا، دماغ اپنی طرف مگر دماغ کے مقابلہ میں دل کی ایک نہ چلتی تھی۔ قوم کی خدمت اوسر کی کھیتی تھی۔ وہاں غربت اور تنگدستی کے سوا اور کیا تھا۔ بڑے سے بڑا صلہ جو مل سکتا تھا، وہ تھی قوم کی عقیدت، ہر دلعزیزی، نیک نامی مگر وہ بھی پائیدار نہیں۔ اتنی عارضی کہ ایک غلطی میں عمر بھر کی کمائی پر پانی پھر سکتا تھا۔ اس کا دل ایک بے اختیاری جوش کے ساتھ امیرانہ زندگی کی طرف مائل ہوتا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اسے افلاس اور غربت سے نفرت ہونے لگی۔ وہ پست حالی کو ہمدردی کے قابل نہیں نفرت کے قابل سمجھتا تھا اور اس کی ذمہ داری قوم کے سر منڈھتا تھا۔ دماغ میں درد کہاں، احساس کہاں۔ اس کا جوہر تو دلیل ہے۔ ذہانت ہے، صلہ ہے۔

سندھ میں سیلاب آیا۔ ہزاروں آدمی تباہ ہو گئے۔ یونیورسٹی نے سیلاب زدوں کی امداد کے لیے ایک سیوا سمتی بھیجی۔ پرکاش نے پہلے بڑی سرگرمی اور خلوص کا اظہار کیا لیکن اس کے اندر یہ جنگ برابر جاری رہی کہ کیوں نہ اس اثناء میں بیٹھ کر کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کروں تاکہ اول درجہ میں پاس ہو جاؤں۔ آخر روانگی کے وقت وہ بیماری کا بہانہ کر کے بیٹھ رہا۔ کرونا نے سنا تو اسے بہت رنج ہوا۔

چند ہی مہینوں کے بعد اڑیسہ میں قحط نے آفت برپا کر دی۔ کانگریس نے قحط زدوں کی امداد کیلئے ایک مشن تیار کیا۔ اسی زمانہ میں یونیورسٹی نے طلبہ کو تاریخی یادگاروں کا مطالعہ کرنے کے لیے لنکا بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کرونا نے لکھا، تم اڑیسہ جاؤ مگر پرکاش کا دل لنکا کی جانب مائل تھا۔ وہ کئی دن تک اسی کشمکش میں مبتلا رہا۔ آخر لنکا کی کشش غالب آئی۔ کرونا کو معلوم ہوا تو اسے بے انتہا صدمہ ہوا مگر جب پرکاش نے لکھا ”اماں! میں یہ سب تیاریاں قومی خدمت کے لیے ہی کر رہا ہوں کیونکہ خدمت کے لیے یونیورسٹی کی ڈگریوں ہی کی قدر ہوتی ہے۔ دلسوزی اور لگن کوئی نہیں دیکھتا“ تو کرونا کو تشفی ہو گئی۔

اسی سال پرکاش اول درجہ میں ایم اے ہوا اور یونیورسٹی میں اول آیا۔

(4)

یونیورسٹی کھلتے ہی پرکاش کے نام یونیورسٹی کے رجسٹرار کا خط پہنچا۔ انہوں نے پرکاش کو انگلینڈ جا کر تعلیم کی تکمیل کے لیے سرکاری وظیفہ منظور ہونے کی خبر دی تھی۔ پرکاش خط لیے ہوئے مجنونانہ مسرت سے ماں کے پاس دوڑا اور بولا۔ ”اماں! مجھے انگلینڈ جا کر پڑھنے کے لیے سرکاری وظیفہ ملا ہے۔“

کرونا نے بے اعتنائی سے کہا۔ ”تو تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

پرکاش نے تعجب سے کہا۔ ”ایسا موقع پا کر بھلا کون چھوڑتا ہے اماں؟“

کرونا۔ ”تم تو قومی والنٹیروں میں بھرتی ہونے جا رہے تھے؟“

پرکاش۔ ”تو کیا آپ سمجھتی ہیں، وہی ایک قومی خدمت ہے۔ میں انگلینڈ سے آ کر بھی تو قومی کام کر سکتا ہوں اور اماں سچ پوچھو تو ایک مجسٹریٹ قوم کی جتنی خدمت کر سکتا ہے، اتنی ایک ہزار والنٹیر بھی نہیں کر سکتے۔ میں سول سروس کے امتحان میں بیٹھوں گا اور مجھے یقین ہے کہ کامیاب ہو جاؤں گا۔“

کرونا نے تمسخر کے انداز سے کہا۔ ''تو تم بھی مجسٹریٹ ہو جاؤ گے۔''

پرکاش نے مباحثہ کے انداز سے کہا۔ ''قومی درد رکھنے والا مجسٹریٹ کانگریس کی ایک ہزار پریسیڈنٹوں سے زیادہ قومی خدمت کر سکتا ہے۔ اس کے کام کی اخباروں میں تعریفیں نہ ہوں گے۔ اس کی تقریروں پر تالیاں نہ بجیں گی۔ اس کی گاڑیاں جہلانہ کھنچیں گے۔ نہ یونیورسٹی کے طلبہ اسے سپاسنامے پیش کریں گے لیکن حقیقی معنوں میں جو خدمت وہ کر سکتا ہے، وہ دوسرا نہیں کر سکتا۔ وہ قوم کا خاموش بے غرض خادم ہے۔''

کرونا۔ ''لیکن یہی مجسٹریٹ تو قومی خدمت کرنے والوں کو سزائیں دیتے ہیں۔ ان پر گولیاں چلاتے ہیں۔''

پرکاش نے کچھ خفیف ہو کر کہا۔ ''یہ تو مجسٹریٹ کی طبیعت ہے۔ اگر اس کے دل میں قومی درد ہے تو وہ ملائمت سے وہی کام کر سکتا ہے جو دوسرے گولیاں چلا کر بھی نہیں کر سکتے۔''

کرونا۔ ''میں یہ نہ مانوں گی۔ سرکار اسے کوئی ایسا کام نہ کرنے دے گی جس سے سرکار کی شان میں کوئی فرق آئے۔ اگر مجسٹریٹ اس کی مرضی کے مطابق کام نہ کرے گا تو وہ مجسٹریٹ نہ رہے گا۔ وہ ہندوستانی مجسٹریٹ ہی تو تھا جس نے تمہارے بابوجی کو ذرا سی بات پر تین سال کی قید ٹھونک دی تھی اور اس نے آخر ان کی جان ہی لے کر چھوڑی۔ بیٹا تم میری اتنی بات مان لو۔ سرکاری عہدوں پر نہ گرو۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم موٹا کھا کر اور موٹا پہن کر اپنے بھائیوں کی کچھ خدمت کرو، بجائے اس کے کہ تم حاکم بن جاؤ اور شان سے زندگی بسر کرو۔ یہ سمجھ لو کہ جس دن تم حاکم کی کرسی پر بیٹھو گے، اسی دن تمہارا دماغ حاکموں کا ہو جائے گا۔ تم کوئی ایسی کارگزاری دکھانی چاہو گے کہ افسروں کی نگاہ میں تمہاری نیک نامی ہو، ترقی ہو۔ جس کا کھاؤ گے اسی کا گاؤ گے۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔''

پرکاش۔ ''تو آپ یہ چاہتی ہیں کہ میں زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا پھروں؟''

کرونا۔ ''اگر ٹھوکر کھانے سے آتما آزاد رہ سکتی ہے تو میں کہوں گی، ٹھوکریں کھانا اچھا ہے۔''

پرکاش نے جواب نہ دیا۔ اٹھ کر باہر چلا گیا اور اسی غصہ میں رجسٹرار کو لکھ دیا۔ مجھے انگلینڈ جانا منظور نہیں ہے مگر اس دن سے اس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ مغموم، متفکر اپنے کمرہ میں پڑا رہتا۔ نہ کہیں گھومنے جاتا، نہ کسی سے ملتا۔ منہ لٹکا کر گھر میں آتا۔ دو چار لقمے کھاتا اور باہر چلا جاتا۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ گزر گیا۔ نہ چہرہ پر وہ سرخی رہی، نہ تازگی۔ معلوم ہوتا تھا برسوں کا مریض ہے۔ ہنسنا بولنا سب چھوٹ گیا۔ گویا اس انکاری خط کے ساتھ اس کی ساری حرارت، ساری زندگی رخصت ہو گئی۔ کرونا اس کا دل بہلانا چاہتی، اس کا غم بھلا دینا چاہتی مگر سب بے سود۔

آخر ایک دن اس نے پرکاش سے کہا۔ ''بیٹا! اگر تم نے ولایت جانے کی ٹھان ہی لی ہے تو جاؤ، میں منع نہ کروں گی۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں ناحق روکا۔ میں نے تو اس خیال سے منع کیا تھا کہ تمہیں قومی خدمت کرتے دیکھ کر تمہارے بابوجی کی آتما خوش ہو گی۔ یہی ان کی آخری وصیت تھی مگر جب تمہیں اتنا صدمہ ہے تو نہ روکوں گی۔''

پرکاش نے ترشی سے جواب دیا۔ ''اب تو انکاری خط لکھ چکا۔ کوئی دوسرا آدمی چن لیا گیا ہو گا۔ اب کس منہ سے پھر درخواست کروں اور پھر کرنا ہی کیا ہے۔ آپ کی مرضی ہے کہ گاؤں گاؤں کی خاک چھانوں تو وہی سہی۔''

کرونا کا غرور پامال ہو گیا۔ ''بولی! مجھے یقین ہے، ابھی جگہ خالی ہو گی۔ کل لکھ دو، اب جانے کو تیار ہوں۔''

پرکاش نے چڑ کر کہا۔ ''اب کچھ نہیں ہو سکتا اماں! لوگ ہنسی اڑائیں گے۔ میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ جس طرح آپ کی منشا ہو گی، اسی طرح زندگی بسر کروں گا۔''

کرونا نے منہ پھیر کر کہا۔ "یہ میری یا کسی غیر کی منشا کی بات نہیں ہے۔ یہ خیال تو تمہارے دل میں خود بخود پیدا ہونا چاہیے تھا۔ جب تم نے میری منشا سے مجھ پر احسان جتا کر اپنے دل پر جبر کر کے مجھے اپنے راستہ کا کانٹا سمجھ کر والنٹیروں میں نام لکھا بھی لیا تو کیا فائدہ۔ تم آج ہی اپنے رجسٹرار کو لکھ دو۔"

پرکاش۔ "اب نہیں لکھ سکتا۔"

کرونا۔ "اس سے کیا فائدہ کہ نہ ادھر کے رہو، نہ ادھر کے۔ بے دل قومی کارکن سے سرگرم سرکاری افسر کہیں اچھا۔"

پرکاش۔ "مجبوری ہے۔"

کرونا نے زیادہ اصرار نہ کیا۔ ذرا دیر میں کپڑے بدل کر باہر چلی گئی۔ پرکاش نے دیکھا، وہ کہیں جا رہی ہے مگر کچھ بولا نہیں۔ کرونا کے لیے باہر آنا جانا غیر معمولی بات نہ تھی مگر جب شام ہو گئی اور وہ نہ لوٹی تو پرکاش کو اندیشہ ہوا۔ وہ افسوس کرنے لگا کہ میں نے اماں سے پوچھا کیوں نہیں، کہاں جا رہی ہو؟ جوں جوں رات گزرنے لگی، اس کا اندیشہ خوف کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اب اسے یاد آیا۔ ماں کے ہاتھ میں چھوٹا بیگ بھی تھا۔ اگر کہیں قریب ہی گئی تو بیگ کیوں لے گئی؟ تو کیا کہیں دور چلی گئی؟ آخر گئی تو کہاں؟ جب وہ 10 بجے تک نہ لوٹی تو پرکاش کو ایک دوسرا ہی خوف پیدا ہوا۔ وہ گھر سے نکلا اور سیدھے دریا کی طرف جا پہنچا مگر وہاں گہرا سناٹا تھا۔ اس نے دریا کے کنارے کھڑے ہو کر کئی بار کانپتی ہوئی آواز سے پکارا "اماں! اماں!" مگر لہروں کے ماتمی راگ کے سوا اور کوئی آواز نہ آئی۔ وہیں بیٹھ کر وہ رونے لگا مگر اسے پھر خیال ہوا، کہیں اماں آ نہ گئی ہوں۔ اسے گھر پر نہ دیکھ کر گھبرا نہ رہی ہوں۔ وہ فوراً اٹھا اور تیزی سے قدم اٹھاتا گھر چلا۔ امید و بیم سے اس کا دل دھڑک رہا تھا مگر کرونا ابھی تک نہ لوٹی تھی۔

پرکاش نے ساری رات بیٹھے بیٹھے کاٹی۔ طرح طرح کے وسوسے پیدا ہوتے۔ اپنی ضد اور ماں کی دل شکنی پر صدمہ ہوتا۔ اپنی بے حسی پر غصہ آتا۔ میں نے کیوں اماں کی بات نہ مانی؟ کیوں دولت و ثروت کے لیے ان کی تمناؤں کا خون کیا؟ اس نے ارادہ کیا کہ اب بھول کر بھی انگلینڈ کا نام نہ لوں گا۔ اسی طرح ہنس کھیل کر زندگی بسر کروں گا۔ گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی ہے۔ علی الصبح پرکاش ماں کی تلاش میں نکل ہی رہا تھا کہ اسے سامنے سے آتے دیکھا۔ چہرہ زرد، دل بیٹھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ آج ہی اس کا سہاگ اٹھ گیا ہے۔ گویا دنیا میں اب اس کے لیے کچھ نہیں رہا۔ گویا وہ دریا کے کنارے کھڑی اپنی لدی ہوئی ناؤ کو ڈوبتے دیکھ رہی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔

پرکاش نے دوڑ کر پوچھا۔ "اماں کہاں چلی گئی تھیں؟ بڑی دیر لگائی۔ میں ساری رات تمہارا انتظار کرتا رہا۔ دریا کے کنارے دوڑا گیا۔ ادھر ادھر چاروں طرف تلاش کیا، کہاں گئی تھیں تم؟"

کرونا نے جیب سے ایک بند لفافہ نکال کر اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ یونیورسٹی کی مہر لگی ہوئی تھی۔ پرکاش نے تعجب سے اسے کھول کر پڑھا۔ مسرت کی سرخی چہرہ پر دوڑ گئی۔

بولا۔ "یہ تمہیں کہاں مل گیا اماں؟"

کرونا۔ "اسی کے لیے تو گئی تھی۔"

پرکاش۔ "تو کیا تم نے رجسٹرار سے ملاقات کی؟"

کرونا۔ "اور کیا کرتی؟"

پرکاش۔ "گئی کس ٹرین سے؟ اس وقت گاڑی کہاں ملی؟"

کرونا۔ ”موٹر پر گئی۔“

پرکاش۔ ”پچاس میل کا سفر کر ڈالا۔ رجسٹرار نے کیا کہا؟“

کرونا۔ ”کچھ نہیں۔ ابھی تک کسی دوسرے آدمی کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ یہ خط لکھ دیا۔“

پرکاش نے افسردہ خاطر ہو کر پوچھا۔ ”جب تم نہیں چاہتیں کہ میں جاؤں تو پھر کیوں بھیج رہی ہو؟“

کرونا۔ ”اس لیے کہ تم جانا چاہتے ہو۔ میں تمہارا یہ رنجیدہ چہرہ نہیں دیکھ سکتی۔ اپنی زندگی کے بیس سال تمہارے اوپر نثار کر دیئے۔ تمہارے لیے خوشیوں کے ہار گوندھتی تھی۔ تمہارے لیے دعاؤں کے تھال سجاتی تھی۔ اب ان آنکھوں سے تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارا سفر مبارک ہو۔ جب تک زندہ رہوں گی، تمہیں دعائیں دوں گی۔ جب تم نہ تھے، تب بھی روتی تھی۔ تم ہوئے تب بھی روتی تھی۔ تم نہ رہو گے، تب بھی روؤں گی۔ میرا تو جنم ہی رونے کے لیے ہوا ہے۔“ کرونا اور کچھ نہ کہہ سکی۔ رقت نے اس کی زبان بند کر دی۔

اسی دن سے پرکاش سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ نئے نئے سوٹ بنوائے ضروری اور غیر ضروری صدہا چیزیں خریدیں۔ کرونا کے پاس جو کچھ تھا، وہ سب کا سب خرچ ہو گیا۔ قرض کی نوبت آئی مگر پرکاش اپنی دھن میں مست تھا۔ کرونا کی سرخ آبگوں آنکھیں اور تمتماتا ہوا چہرہ اسے نظر نہ آیا۔ اس ایک ہفتہ میں وہ کتنی نحیف و ضعیف ہو گئی ہے۔ اس کے بالوں پر کتنی سفیدی آگئی ہے۔ اس کے چہرہ پر کتنی جھریاں پڑ گئی ہیں، یہ اسے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

آخر روانگی کا دن آیا۔ پرکاش کو احباب نے رخصتی دعوت دی۔ وہ تو دعوتیں کھانے اور دوستوں سے ملنے ملانے میں منہمک تھا اور کرونا اپنے شوہر کی یادگاروں پر اپنا غم و غصہ اتار رہی تھی۔ ان کی گاڑھے کی چادریں، کھدر کے کرتے اور پائجامہ اور لحاف ابھی تک صندوقوں میں حفاظت سے رکھے ہوئے تھے۔ وہ ہر سال دھوپ میں سکھائے جاتے اور جھاڑ کر رکھ دیئے جاتے تھے۔ کرونا نے آج پھر ان کپڑوں کو نکالا مگر سکھا کر رکھنے کے لیے نہیں بلکہ غریبوں کو تقسیم کرنے کے لیے۔ وہ آج شوہر سے ناراض ہے۔ وہ لٹیا، ڈور اور چھڑی جو پرتاب کی مونس اور تنہائی کی رفیق تھی اور جن کی آج بیس سال سے کرونا پرستش کرتی چلی آتی تھی، بڑی بے دردی سے آنگن میں پھینک دی گئیں۔ وہ جھولی جو ہمیشہ پرکاش کے کندھوں پر رہتی تھی، آج کوڑے میں ڈال دی گئی۔ وہ تصویر جس کے سامنے کرونا بیس سال سے بلاناغہ سر جھکاتی اور پھول چڑھاتی تھی، آج زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ شوہر کی کوئی یادگار اب وہ گھر میں نہیں رکھنا چاہتی۔ اس کا دل غم و غصہ سے پارہ پارہ ہو رہا ہے اور شوہر کے سوا وہ کس پر اپنا غصہ اتارے، کون اس کا اپنا ہے؟ وہ کس سے اپنا درد کہے، کسے اپنی چھاتی چیر کر دکھائے۔ وہ ہوتے تو کیا آج پرکاش غلامی کی زنجیر گلے میں ڈال کر یوں خوش ہوتا، وہ کیوں نہیں ہیں؟ کیوں اپنی روحانی اور جسمانی طاقت سے پرکاش کا دل نہیں پھیر دیتے؟ دکھیا کو کون سمجھائے؟

(5)

کرونا زندہ تھی مگر اسے اب کوئی علاقہ دنیا سے نہ تھا۔ اس کا چھوٹا سا سنسار خواب کی طرح پریشان ہو گیا تھا۔ وہ سنہری تمنائیں اب حسرت کی تاریکی میں فنا ہو چکی تھیں۔ جس روشنی کو وہ سامنے دیکھ کر زندگی کی اندھیری رات میں بھی دل میں امیدوں کا خزانہ لیے' آگے بڑھی چلی جاتی تھی، وہ بجھ گئی اور وہ خزانہ لٹ گیا۔ اب نہ اس کی کوئی منزل تھی اور نہ منزل پر پہنچنے کی ضرورت۔ جن گایوں کو وہ دونوں وقت اپنے ہاتھوں سے روٹیاں کھلاتی اور

سہلاتی تھی، وہ اب کھونٹوں پر کھڑی مشتاق نگاہوں سے دروازہ کی طرف تکتی رہتی تھیں۔ بچھڑوں کو گلے سے لگا کر چمکارنے والا اب کوئی نہ تھا۔ کس کے لیے مسکا نکالے۔ کس کے لیے مکھن بنائے؟ کھانے والا کون تھا؟ اپنے اس چھوٹے سے سنسار کو کرونا نے اپنے ہی اندر سمیٹ لیا تھا۔

مگر ایک ہفتہ میں کرونا کے مزاج نے پھر رنگ بدلا۔ اس کا وہ چھوٹا سا سنسار پھیلتے پھیلتے عالمگیر ہو گیا۔ جس لنگر نے کشتی کو ساحل سے مرکز پر باندھ رکھا تھا، وہ اکھڑ گیا۔ اب کشتی سمندر کی وسیع فضا میں تیرے گی، چاہے وہ غضبناک موجوں کا لقمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔

کرونا ایک دن دروازہ پر آ بیٹھی اور محلے بھر کے لڑکوں کو جمع کر کے انہیں دودھ پلایا۔ دوپہر تک مکھن نکالنے میں لگی رہی اور یہ مکھن محلے کے لڑکوں نے کھایا۔ پھر کھانا پکانے بیٹھی اور کئی طرح کے کھانے پکائے۔ یہ سب کا سب کتوں نے کھایا۔ اب یہ ہی اس کا روز کا وطیرہ ہو گیا۔

چڑیاں اور کتے بلیاں اور چیونٹے چونٹیاں اور محلے کے لڑکے بالے سب اس کے اپنے ہو گئے۔ محبت کا وہ دروازہ اب کسی کے لیے بند نہ تھا۔

ایک دن پرکاش کا خط آیا۔ کرونا نے اسے اٹھا کر پھینک دیا۔ پھر چند منٹوں کے بعد اسے اٹھا کر پھاڑ ڈالا۔
مگر جب آسمان کا جوگی اپنی کٹی میں دھونی رما کر بیٹھا اور آسمانی ہستیاں اپنا قصہ غم سنانے کے لیے جمع ہوئیں تو کرونا اس خط کو پڑھنے کے لیے بے قرار ہو اٹھی۔

اس نے اپنے دل کو سمجھایا۔ پرکاش تیرا کون ہے؟ مجھے اس سے کیا سروکار! وہ کہیں رہے، اس سے کیا مطلب؟ ہاں پرکاش میرا کون ہے؟ دل نے جواب دیا، پرکاش تیرا سب کچھ ہے۔ وہ اس لافانی محبت کی یادگار ہے جس سے تو ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئی۔ وہ تیری جان کی جان ہے۔ تیری روح کی روح ہے! کرونا اس خط کے پرزوں کو جمع کرنے لگی۔ گویا اس کی جان بکھر گئی ہو۔ ایک ایک ٹکڑا اسے اپنی کھوئی ہوئی الفت کا نقش قدم سا معلوم ہوتا تھا۔ جب سارے منتشر پرزے جمع ہو گئے تو وہ چراغ کے سامنے بیٹھ کر انہیں جوڑنے لگی۔ جیسے کوئی حسرت زدہ دل یاد ہائے شیریں کے شکستہ تاروں کو جوڑ رہا ہو۔ ہائے ری مامتا! وہ برہن ساری رات اس خط کو جوڑنے میں لگی رہی۔ خط دونوں طرف سے لکھا ہوا تھا۔ اس لیے عبارت کا مربوط ہونا اور بھی مشکل! کوئی لفظ کوئی جملہ بیچ میں غائب ہو جاتا اور راستہ میں ایک خلیج سی حائل ہو جاتی۔ اس ٹکڑے کو وہ پھر تلاش کرنے لگتی۔ ساری رات گزر گئی مگر خط ناتمام تھا۔ دن چڑھا، محلے کے لڑکے مکھن دودھ کے اشتیاق میں آ کر جمع ہو گئے۔ کتوں اور بلیوں نے آسن جمائے۔ چڑیاں آنگن میں پھدکنے لگیں۔ کوئی اولتی پر بیٹھی کوئی چبوترے پر مگر کرونا کو سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ جیسے بچہ اپنی ماں کو پا کر ساری دنیا کے کھلونے اور مٹھائیاں اور میوے اس گود پر نثار کر دے۔ دوپہر ہوا کرونا نے سر نہ اٹھایا، نہ بھوک تھی، نہ پیاس۔ شام ہو گئی مگر وہ خط ابھی تک نامکمل تھا۔ خط کا منشا کچھ کچھ سمجھ میں آ گیا تھا۔

پرکاش کا جہاز...... سے...... جا رہا ہے۔ اس کے دل میں...... اٹھا ہوا ہے لیکن پیاس سے تڑپتے ہوئے آدمی کی پیاس کیا اوس سے بجھ سکتی ہے!

کرونا اپنے لخت جگر کے قلم سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ کو پڑھنا اور اسے دل پر نقش کر لینا چاہتی تھی۔ اس طرح تین دن گزر گئے!

شام ہو گئی تھی۔ تین دن کی جاگی آنکھیں ذرا جھپک گئیں۔ کرونا نے دیکھا ایک وسیع کمرہ ہے۔ اس میں

کرسیاں اور میزیں لگی ہیں۔ بیچ میں ایک اونچے چبوترہ پر کوئی آدمی بیٹھا ہوا ہے۔ کرونا نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ پرکاش تھا۔ ایک لمحہ میں ایک دست وپابہ زنجیر قیدی چبوترے کے سامنے لایا گیا۔ بالکل خستہ حال، جاں بہ لب۔ یہ پرتاب تھا۔ کرونا کی آنکھیں کھل گئیں۔ آنسو جاری ہو گئے۔ اس نے خط کے ٹکڑوں کو پھر سمیٹ دیا اور اس تودے کو چراغ کی نذر کر دیا۔ ایک شعلہ اٹھا اور ایک لمحہ میں اس کی راکھ کی ایک چٹکی کے سوا کچھ نہ رہا۔ یہ اس کی مامتا کی چتا تھی جو ایک اضطراب وانتشار بن کر اس کے دل میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ اسی ایک چٹکی راکھ میں اس کا گڑیوں والا بچپن۔ اس کی غم نصیب جوانی۔ اس کی پر تمنا بیوگی! مدفون ہو گئی!!

صبح کو لوگوں نے دیکھا تو چڑیا پنجرے سے اڑ چکی تھی۔ پنجرا خالی پڑا ہوا تھا۔ پرکاش کی تصویر ابھی تک اس سینہ سے چمٹی ہوئی تھی جس کی حرکت بند ہو گئی تھی۔

اور پرکاش کا جہاز یورپ چلا جا رہا تھا۔

لیلیٰ

(1)

یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ لیلیٰ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے اور کیا کرتی ہے؟ ایک دن لوگوں نے ایک بے مثال حسینہ کو طہران کے ایک گوشہ میں اپنے دف پر حافظ کی یہ غزل جھوم جھوم کر گاتے سنا ۔

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نہ ماند چنیں نیز ہم نہ خواہد ماند

اور سارا طہران اس پر فدا ہو گیا۔ یہی لیلیٰ تھی۔

لیلیٰ کے حسن دلکش کا تصور کرنا ہو تو افق کی شگفتہ سرخی کو خیال میں لائیے۔ جب نیلگوں آسمان زریں شعاعوں سے منور ہوتا ہے۔ موسمِ بہار کو خیال میں لائیے جب باغ میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں اور ان پر بلبلیں چہچہاتی ہیں۔

لیلیٰ کی دلکش آواز کا تصور کرنا ہو تو اس گھنٹی کی آوازِ پیہم کو خیال میں لائیے جو رات کی سحر کار خموشی میں اونٹوں کی گردنوں میں بجتی ہوئی سنائی دیتی ہے یا اس بانسری کی آواز کو جو دوپہر کے تکان افزا سکوت میں کسی درخت کے سایہ سے مچلتی ہوئی نکلتی ہے!

جس وقت لیلیٰ مست ہو کر گاتی تھی تو اس کے چہرہ پر ایک غیر معمولی رونق آ جاتی تھی۔ وہ اس آنے والے دن کا پیغام سناتی تھی جب ملک میں امن کی سلطنت ہو گی، جب خونریزیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ بادشاہوں کو بیدار کرتی۔ یہ عیش وتنعم کب تک؟ یہ ثروت اور اقتدار کب تک؟ وہ رعایا کی خوابیدہ تمناؤں کو بیدار کرتی۔ ان کی رگ ہائے جاں کو اپنے نغموں سے مترنم کر دیتی۔

سارا طہران لیلیٰ پر فدا تھا۔ مایوسوں کے لیے وہ امید کا چراغ تھی۔ رنگین مزاجوں کے لیے جنت کی حور، دولت مندوں کے لیے ضمیر بیدار اور ذی اقتداروں کے لیے رحم وانصاف کا پیغام۔ جیسے روح مادہ کھینچ لیتی ہے' اسی طرح لیلیٰ نے انسانوں کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا اور یہ حسن بے مثال امرت کی طرح پاک، برف کی طرح سفید اور گل نورس کی طرح تازہ تھا۔ اس کی ایک پر مہر نگاہ، ایک شگفتہ تبسم، ایک رسیلی ادا پر سونے کے پہاڑ کھڑے ہو جاتے۔ اقتدار اس کی پرستش کرتا۔ ثروت اس کے پیروں کی خاک چومتی لیکن لیلیٰ میں فقر کی استغنا تھی اور صبر کی بے نیازی۔ وہ شاعر کے تخیل کی طرح صرف مسرت اور آرزو کی چیز تھی۔

(2)

ایک دن شام کو طہران کا شہزادہ گھوڑے پر سوار ادھر سے نکلا۔ لیلیٰ گا رہی تھی۔ نادر نے گھوڑے کو روک لیا اور معلوم نہیں کتنی دیر تک ایک عالم بے خودی میں کھڑا سنتا رہا۔

مرادر دیست اندر دل اگر گویم زباں سوزد

مرادر دیست ....

لحہ بہ لحہ شائقین کا مجمع زیادہ ہوتا جاتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا، سارا طہران چلا آرہا ہے۔ دفعتاً نادر گھوڑے سے اتر کر زمین پر بیٹھ گیا۔ پھر یکایک لیلیٰ کے پاس جا کر اس کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔ لوگ ادب سے ادھر ادھر ہٹ گئے۔

لیلیٰ نے اس کی طرف غلط انداز نگاہ سے دیکھا۔ پر پوچھا کچھ نہیں، کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ بدستور گانے میں محو رہی لیکن اس کا گلا تھرانے لگا جیسے باجے کا کوئی تار ٹوٹ گیا ہو۔

ایک شریف آدمی نے کہا۔ "لیلیٰ! یہ ہمارے حضور شہزادہ نادر ہیں۔"

لیلیٰ بے پروائی سے بولی۔ "بڑی خوشی کی بات ہے لیکن یہاں شہزادوں کا کیا کام۔ ان کے لیے محلات ہیں، محفلیں ہیں، شراب کا دور ہے۔ میں ان کے لیے گاتی ہوں جن کے دل میں درد ہے۔ ان کے لیے نہیں جن کے دل میں شوق ہے۔"

شہزادہ نے مجنونانہ لہجے میں کہا۔ "لیلیٰ بے شک میں شوق کا غلام تھا مگر تم نے درد کا مزہ چکھا دیا۔"

لیلیٰ پھر گانے لگی لیکن آواز قابو میں نہ تھی۔ گویا اس کا گلا ہی نہ تھا۔ لیلیٰ نے مجبور ہو کر دف بغل میں دبایا اور اپنے مسکن کی طرف چلی۔ سامعین اس کے پیچھے پیچھے اس مقام تک آئے جہاں اس کا جھونپڑا تھا۔ جب وہ اپنی جھونپڑی کے دروازہ پر پہنچی تو سبھی رخصت ہو چکے تھے۔ صرف ایک شخص جھونپڑے کے سامنے خاموش مؤدب کھڑا تھا۔

لیلیٰ نے پوچھا۔ "تم کون ہو؟"

نادر نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "تمہارا غلام نادر۔"

لیلیٰ: "میرے جھونپڑے میں تمہارے لیے بھی جگہ نکل آئے گی۔"

نادر: "نہیں لیلیٰ! میرے لیے یہ درخت کا سایہ کافی ہے۔"

آج نادر کو باجرے کی خشک روٹیوں میں وہ لذت ملی جو نعمتوں کے خوان میں بھی کبھی نہ ملی تھی۔ کھا کر

اس نے گھاس کا بستر بنایا اور اسی درخت کے سایہ میں پڑ رہا۔

نادر سارے دن لیلیٰ کے نغمے سنتا، گلیوں میں، سڑکوں پر جہاں وہ جاتی، اس کے پیچھے پیچھے گھومتا اور رات کو خشک روٹیاں کھا کر اسی درخت کے نیچے سو رہتا۔ بادشاہ نے سمجھایا، ملکہ نے سمجھایا، امراء نے منتیں کیں لیکن نادر کے سر سے لیلیٰ کا سودا نہ گیا۔ ملکہ اس کے لیے اچھے سے اچھے کھانے بنوا کر بھیجتی۔ پر نادر اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔

مگر لیلیٰ کے نغموں میں اب وہ شیرینی نہ تھی۔ نہ وہ لوچ تھا، نہ وہ اثر۔ وہ اب بھی گاتی تھی۔ سننے والے اب بھی آتے تھے مگر اب وہ اپنا دل خوش کرنے کو نہیں، ان کا دل خوش کرنے کو گایا کرتی تھی اور سننے والے بھی بے قرار ہو کر نہیں بلکہ اس کو خوش کرنے کے لیے آتے تھے۔

ایک روز لیلیٰ گانے نہ گئی تو نادر نے کہا۔ "کیوں لیلیٰ آج کیا ہے؟"

لیلیٰ نے کہا "اب کبھی نہ جاؤں گی۔ سچ کہنا، تمہیں میرے گانے میں پہلے کا سا لطف آتا ہے؟"

نادر: "پہلے سے کہیں زیادہ۔"

لیلیٰ: "لیکن اور لوگ تو اب پسند نہیں کرتے؟"

نادر: "مجھے اس کا تعجب ہے۔"

لیلیٰ: "تعجب کی بات نہیں، اس دل میں پہلے سب کے لیے جگہ تھی۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ وہ سب کو خوش کر سکتا تھا۔ اس میں سے جو آواز نکلتی تھی، وہ سب کے دلوں میں پہنچتی تھی۔ اب تم نے اس کا دروازہ بند کر دیا۔ اب وہاں صرف تم ہو۔ اس کی آواز تمہیں کو پسند آتی ہے۔ یہ دل اب تمہارے سوا اور کسی کے کام کا نہیں رہا۔ چلو آج تک تم میرے غلام تھے، آج سے میں تمہاری کنیز ہوں۔ تھوڑی سی آگ لے کر اس جھونپڑے میں لگا دو، اس دف کو اسی میں جلا دوں گی۔"

(3)

کئی سال گزر گئے۔ نادر اب بادشاہ تھا اور لیلیٰ اس کی ملکہ۔ ایران کی حکومت ایسی خوش اسلوبی سے کبھی نہ ہوئی تھی۔ دونوں ہی رعایا کے خدمت گزار تھے۔ محبت نے وہ مشکلیں رفع کر دیں جو لیلیٰ کو پریشان کیے رہتی تھیں۔ نادر شاہانہ اقتدار کا ضامن تھا، لیلیٰ حقوق عامہ کی لیکن عملاً ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ کبھی یہ دب جاتا، کبھی وہ دب جاتی۔ نادر لیلیٰ کا رخ دیکھتا تھا۔ لیلیٰ نادر کا پاس کرتی تھی۔ کام سے فرصت ملتی تو دونوں کبھی گاتے بجاتے، کبھی دریا کی سیر کرتے۔ کبھی کسی درخت کے سایہ میں بیٹھے ہوئے حافظ کی غزلیں پڑھتے اور جھومتے۔ نہ لیلیٰ میں اب وہ سادگی تھی، نہ نادر میں اب وہ تکلّف تھا۔ نادر کا لیلیٰ پر قابو تھا جو معمولی بات تھی مگر لیلیٰ کا بھی نادر پر پورا قابو تھا جو غیر معمولی بات تھی۔ جہاں بادشاہوں کی محل سرا میں بیگمات کے محلے بستے تھے، درجنوں اور کوڑیوں سے ان کا شمار ہوتا تھا وہاں لیلیٰ اکیلی تھی۔ جہاں محل سرا کا سالانہ خرچ کروڑوں تک پہنچتا تھا، وہاں اب ہزاروں سے زائد نہ تھا۔ یہ ساری قطع و برید لیلیٰ نے کی تھی۔ بادشاہ نادر تھا، حکومت لیلیٰ کے ہاتھوں میں تھی۔

مگر سیاسیات کے رموز حاملِ تنقید نہیں ہوتے۔ اقتدار پرستوں کے دلوں میں اندیشے پیدا ہونے لگے۔ اگر ملک کا یہی حال رہا تو ملوکیت کے فنا ہو جانے میں شبہ نہیں۔ جمشید کا لگایا ہوا تناور درخت جس نے صدیوں تک

آندھی اور طوفان کا مقابلہ کیا، اب ایک حسینہ کے نازک مگر قاتل ہاتھوں سے اکھڑا جارہا تھا۔ اس تحریک نے احرار کو بھی مشتعل کیا۔ اگر ایران اس رفتار سے شاہراہ ترقی پر گامزن ہوگا تو وہ قیامت سے پہلے منزلِ مقصود پر نہ پہنچے گا۔ دونوں جماعتوں میں خانہ جنگیاں شروع ہوئیں اور یہ کشمکش روز بروز زیادہ ہونے لگی۔

(4)

رات کا وقت تھا۔ لیلیٰ و نادر اپنی خوابگاہ میں بیٹھے ہوئے شطرنج کھیل رہے تھے۔ کمرہ میں کوئی آرائش نہ تھی۔ صرف ایک جاجم بچھا ہوا تھا۔

نادر نے لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "بس اب یہ زیادتی نہیں، تمہاری چال ہو چکی۔ تمہارا پیدل پٹ گیا۔"

لیلیٰ۔ "اچھا یہ شہ!"

نادر۔ "تمہارے ساتھ ہارنے میں جو مزہ ہے، وہ جیتنے میں کہاں۔"

لیلیٰ۔ "اچھا! تو گویا آپ میرا دل خوش کر رہے ہیں۔ شہ بچائیے، نہیں دوسری چال میں مات ہوتی ہے۔"

نادر۔ (ارو دے کر) "اچھا اب سنبھل جانا۔ ایک بار میرا فرزیں اٹھا تو تمہاری صفوں کا صفایا کر دے گا۔"

لیلیٰ۔ "کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ یہ شہ! لائیے فرزیں۔ یہ نہ ہوگا۔"

نادر۔ "جب تک میرا دلارام موجود ہے، بادشاہ کو کوئی غم نہیں۔"

لیلیٰ۔ "اچھا یہ شہ! لائیے دل آرام کو ادھر۔ کہیئے اب تو مات ہوئی۔"

نادر۔ "ہاں جانِ من۔ اب تو مات ہو گئی۔ جب میں ہی نثار ہو گیا تو میرا بادشاہ کب بچ سکتا تھا۔"

لیلیٰ۔ "تینوں ماتیں ہو گئیں۔ اب چپکے سے اپنا وعدہ وفا کیجئے۔ اس فرمان پر دستخط کر دیجئے۔"

یہ کہہ کر لیلیٰ نے ایک فرمان نکالا جسے اس نے خود اپنے موتی کے سے حروف میں لکھا تھا۔ اس میں غلہ کی درآمد کا محصول گھٹا کر نصف کر دیا گیا تھا۔ لیلیٰ رعایا کے فلاح کے لیے دل و جاں سے کوشاں رہتی تھی۔ نادر نے اس شرط پر یہ رعایت منظور کی تھی کہ لیلیٰ اسے تین ماتیں دے دے۔ وہ مشاق کھلاڑی تھا۔ یہ لیلیٰ جانتی تھی کہ مگر یہ شطرنج کی بازی نہ تھی، صرف محبت کا کھیل تھا۔ نادر نے مسکرا کر فرمان پر دستخط کر دیئے۔

لیلیٰ کا چہرہ غرور سے سرخ ہو گیا۔ جو کام برسوں کی تحریک سے نہ ہو سکتا تھا، وہ محبت کی ایک نگاہ نے پورا کر دیا۔ وہ یہ سوچ کر پھولی نہ سماتی تھی کہ جس وقت یہ فرمان سرکاری اخبار میں شائع ہوگا، اس وقت احرار کتنے خوش اور اہلِ استبداد کتنے غضبناک ہوں گے۔

محبت سے سرشار نادر اس کے چاند سے مکھڑے کو دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کا قابو ہوتا تو حسن کی اس مورت کو اپنے دل میں بٹھا لیتا۔

(5)

دفعتاً صدر دروازہ پر ایک دل ہلا دینے والا شور سنائی دیا۔

ایک لمحہ میں خلقت کا ایک سیلاب ہتھیاروں سے مسلح آ پہنچا اور اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ محافظوں کی جماعت دیوار حائل ہو گئی۔ وہ خشمگیں جماعت دیواروں پر چڑھنے لگی۔ بابِ عالی پر دست بدست جنگ شروع ہو گئی۔

لیلیٰ رنج و ندامت سے سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلتا تھا۔ کیا یہی وہ مجمع ہے جس کی تکالیف کی داستان اس کی زبان پر سحر بن جاتی تھی؟ یہی وہ کمزور، فاقہ کش، خستہ حال خلقت ہے جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی؟

نادر بھی خاموش تھا لیکن شرم سے نہیں، اس کا چہرہ غضبناک ہو رہا تھا۔ بار بار ہونٹ چباتا اور تلوار کے قبضہ پر ہاتھ رکھ کر رہ جاتا تھا۔ بار بار لیلیٰ کی طرف پرسش کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ تمہاری منشا ہو تو دم زدن میں باغیوں کے پرزے اڑا دوں مگر اس سے آنکھیں چار نہ ہوتی تھیں۔

آخر وہ بے قرار ہو کر بولا۔ ”لیلیٰ میں اب برداشت نہیں کر سکتا۔ کیا کہتی ہو؟“

لیلیٰ نے عاجزانہ نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ ”ذرا صبر کیجئے۔ پہلے ان لوگوں سے پوچھئے، کیا چاہتے ہیں؟“

نادر محل کی چھت پر چڑھ گیا۔ لیلیٰ بھی اس کے پیچھے پیچھے اوپر آ پہنچی۔ دونوں باغیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہزاروں گلوں سے آواز نکلی، وہ کھڑی ہے! وہ کھڑی ہے! لیلیٰ وہ کھڑی ہے! یہ وہ مجمع تھا جو لیلیٰ کے نغموں پر مست ہو جایا کرتا تھا۔

نادر نے بلند آواز میں باغیوں سے خطاب کیا۔ ”اے ایران کی بدنصیب رعایا، تم نے بغاوت کا جھنڈا کیوں کھڑا کیا ہے؟ کیا تم کو میرا اور اپنے خدا کا بالکل خوف نہیں ہے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ میں اپنی آنکھوں کے ایک اشارے سے تمہاری ہستی خاک میں ملا سکتا ہوں۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ ایک لمحہ کے اندر یہاں سے چلے جاؤ ورنہ کلامِ پاک کی قسم، میں تمہارے خون کی ندی بہا دوں گا۔“

سردار نے کہا۔ ”جو بندۂ عیش ہو اور آوازِ خلق کی طرف سے کان بند کر لے، وہ ہمیں اپنے حکم کی تعمیل کے لیے مجبور نہیں کر سکتا۔ ہم اس وقت نہ جائیں گے، جب تک شاہی محل لیلیٰ سے خالی نہ ہو جائے گا۔“

نادر نے طیش میں آ کر کہا۔ ”احسان فراموشو! تمہیں اپنی ملکہ کی شان میں ایسی بے ادبی کرتے ہوئے شرم نہیں آتی! جب سے لیلیٰ نے اس سلطنت کو زینت دی ہے، اس نے تمہارے ساتھ کتنی رعایتیں کی ہیں، کیا تم بھول گئے؟ ظالمو! یہ ملکہ ہے! مگر وہی کھانا کھاتی ہے جو تم کتوں کو کھلا دیتے ہو۔ وہی کپڑے پہنتی ہے جو تم فقیروں کو دے دیتے ہو۔ آ کر محل سرا کو دیکھو۔ تم اسے اپنی جھونپڑیوں کی طرح آرائش و تکلف سے خالی پاؤ گے۔ لیلیٰ تمہاری ملکہ ہو کر بھی فقیروں کی زندگی بسر کرتی ہے۔ تمہیں اس کے قدموں کی خاک کو آنکھوں کا سرمہ بنانا چاہیے۔ اس کی شان میں تم ایسی گستاخیوں کرتے ہو! افسوس! مجھے معلوم ہو گیا کہ تم جاہل ہو۔ انسانیت سے بے بہرہ۔ تم اسی قابل ہو کہ تمہاری گردنیں چھری سے کاٹی جائیں اور تمہیں پیروں تلے روندا جائے۔“

ہزاروں گلوں سے گھنگھور گرج کی صدا نکلی۔ ”لیلیٰ ہماری دشمن ہے۔ وہ ہماری ملکہ نہیں ہے!“

نادر نے غضبناک ہو کر کہا۔ ”تمہارے اوپر خدا کا قہر نازل ہو۔ جس خاتون نے تمہارے لیے خواب و خور حرام کر دیا ہے، اسے تم یوں مطعون کرتے ہو!

یہ دیکھو وہ فرمان ہے جس پر ابھی ابھی لیلیٰ نے مجھ سے جبراً دستخط کرائے ہیں۔ غلہ کا محصول درآمد نصف

کر دیا گیا ہے۔ کیا اب بھی تمہیں اطمینان نہیں ہوتا۔ جسے تم معتبر سمجھتے ہو، اسے یہ فرمان دیکھنے کے لیے بھیج دو۔"
پھر وہی گرجتی ہوئی صدا نکلی۔ "ہم اپنی تقدیر کو کسی فرد کے ہاتھ میں نہیں دے سکتے، خواہ وہ لیلیٰ ہی کیوں نہ ہو۔"

نادر غصہ سے کانپنے لگا۔ لیلیٰ نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "اگر رعایا کی یہی مرضی ہے کہ میں پھر دف بجا کر گاتی پھروں تو مجھے کوئی عذر نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں اپنے نغموں سے ایک بار پھر ان کے دلوں پر حکومت کر سکتی ہوں۔"
نادر نے جوش میں آ کر کہا۔ "لیلیٰ! میں رعایا کی تنگ مزاجیوں کا غلام نہیں۔ اس سے پیشتر کہ میں تمہیں اپنے پہلو سے جدا کروں، طہران کی گلیاں شنگرف ہو جائیں گی۔"
نادر نے مینار پر چڑھ کر خطرہ کا گھنٹہ بجایا۔ سارے طہران میں اس کی آواز گونج اٹھی۔ محافظ فوج قلعہ میں موجود تھی مگر ایک سپاہی بھی نظر نہ آیا۔
نادر نے دوبارہ گھنٹہ بجایا۔ اس کی جھنکار سے آسمان تھرا اٹھا، ستارے کانپ اٹھے مگر ایک بھی سپاہی نہ نکلا۔
آخر نادر نے تیسری بار گھنٹہ بجایا مگر اس کا جواب بھی صرف ایک کمزور صدائے واپسیں تھی۔
نادر نے سر پیٹ لیا۔ سمجھ گئے کہ برے دن آ گئے۔ اب بھی لیلیٰ کو رعایا کی ضد پر قربان کر کے وہ اپنی سلطنت کی حفاظت کر سکتا تھا مگر لیلیٰ اسے سلطنت سے کہیں عزیز تھی۔ اس نے چھت پر آ کر لیلیٰ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے لیے ہوئے صدر دروازہ سے نکلا۔ احرار نے نعرۂ فتح کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا مگر کسی نے مزاحمت نہ کی۔ راستہ چھوڑ کر ہٹ گئے۔

دونوں چپ چاپ طہران کی گلیوں میں چلے جاتے تھے۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ دکانیں بند تھیں، بازاروں میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کتے مرعوب ہو گئے تھے۔ فقیروں نے بھی مسجدوں میں پناہ لی تھی مگر یہ دونوں بے خوف چلے جا رہے تھے۔ نادر کی کمر میں تلوار تھی۔ لیلیٰ کے ہاتھ میں دف تھا۔ یہ ان کی شوکت کی مٹی ہوئی نشانی تھی۔

(6)

پورا سال گزر گیا۔ لیلیٰ اور نادر دیس بدیس کی خاک چھانتے پھرتے تھے۔ سمرقند اور بخارا، نجد اور حلب، قاہرہ اور عدن سارے ملک انہوں نے چھان ڈالے۔ لیلیٰ کا دف پھر جادو کرنے لگا۔ اس کی آواز سنتے ہی شہروں میں ہلچل مچ جاتی۔ چاروں طرف سے تواضع و تکریم ہونے لگتی لیکن یہ دونوں رہ نورد کہیں ایک دن سے زیادہ نہ ٹھہرتے۔ نہ کسی کے دروازے پر جاتے۔ روکھا سوکھا کھاتے اور کبھی کسی درخت کے نیچے، کبھی کسی پہاڑ کے غار میں اور کبھی سڑک کے کنارے رات بسر کرتے تھے۔ دنیا کے ظالمانہ برتاؤ نے انہیں دنیا سے بیزار کر دیا تھا۔ اس کی ترغیبوں سے کوسوں بھاگتے تھے۔ انہیں تجربہ ہو گیا تھا کہ یہاں جس کے لیے جان دو، وہی اپنا دشمن ہو جاتا ہے۔ جس کے ساتھ نیکی کرو، وہی بدی پر کمر باندھتا ہے۔ بڑے بڑے رؤساء کے دعوتی پیغام آتے مگر لیلیٰ کسی کی نہ سنتی تھی۔ نادر کو کبھی کبھی حکومت کا خبط سوار ہو جاتا۔ وہ چاہتا کہ پوشیدہ طور پر کافی فوج مہیا کر کے طہران پر حملہ کر دوں اور باغیوں کو مغلوب کر کے بلا خرخشہ حکومت کروں مگر لیلیٰ کی بے دلی دیکھ کر اسے کسی تحریک کی جرأت نہ ہوتی تھی۔
ادھر ایران میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ جمہور سے تنگ آ کر رؤساء نے بھی استبداد پر کمر باندھی

تھی اور فریقین میں متواتر معرکہ آرائیاں ہوتی رہتی تھیں۔ پورا سال گزر گیا مگر کھیت جوتے بوئے نہ گئے۔ ملک میں قحط پڑا ہوا تھا۔ تجارت کی کساد بازاری تھی۔ خزانہ خالی، روز بروز جمہور کی طاقت روبہ زوال تھی۔ آخر یہاں تک نوبت پہنچی کہ حریت کے رضاکاروں نے ہتھیار ڈال دیئے اور سلطنت کی عنان امراء کے ہاتھوں میں آگئی۔ مخالفین کو عبرتناک سزائیں دی گئیں۔ کچھ قید کیے گئے، کچھ جلاوطن ہوئے اور کتنوں ہی کو پھانسی دے دی گئی، جمہور کا خاتمہ ہو گیا۔ اب اقتدار پسندوں کو نادر کی یاد آئی۔ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ ملک میں جمہوریت کی صلاحیت نہیں ہے۔ ظاہر کے لیے دلیل کی ضرورت نہ تھی۔ اس موقع پر ملوکیت ہی ملک کو بچا سکتی تھی۔ یہ بھی مسلم تھا کہ نادر اور لیلیٰ کو اب جمہوریت سے کوئی خاص رغبت نہ تھی۔ وہ رؤساء کے ہاتھوں میں کٹ پتلے بنے رہیں گے اور اس طرح ان لوگوں کو رعایا پر من مانی سختیاں کرنے کا موقع ملے گا۔ آپس میں مشورے ہوئے اور نادر کو منا لانے کے لیے رؤساء کا ایک وفد روانہ ہوا۔

(7)

شام کا وقت تھا۔ لیلیٰ اور نادر دمشق میں ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان پر سرخی چھائی ہوئی تھی۔ لیلیٰ قدرت کی بہار دیکھنے میں محو تھی اور نادر گزشتہ دور کی یاد میں۔ ایک کے لیے زندگی پُر بہار تھی، دوسرے لیے خارزار۔

دفعتاً بہت دور گرد اڑتی ہوئی نظر آئی۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر سوار چلے آرہے تھے۔ نادر اٹھ بیٹھا اور غور سے دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا۔ جسمِ لاغر میں جان سی پڑ گئی۔ جوش سے بولا۔ ''لیلیٰ! یہ ایران کے لوگ ہیں۔ کلامِ پاک کی قسم، یہ ایران کے لوگ ہیں۔''

لیلیٰ نے آنے والوں کی طرف متفکر نظروں سے دیکھا اور بولی۔ ''اپنی تلوار سنبھال لو۔ شاید اس کی ضرورت پڑے!''

نادر۔ ''نہیں لیلیٰ! ایران کے لوگ اتنے فرومایہ نہیں ہو سکتے کہ ایک معذور آدمی پر تلوار اٹھائیں۔''

لیلیٰ۔ ''پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی۔''

یہ رؤساء کا وفد تھا جو نادر کو تخت کی دعوت دینے آرہا تھا۔ نادر دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ وہ اب ایران کا بادشاہ نہ تھا، ایک ایرانی سیاح تھا۔ بادشاہت مٹ گئی تھی مگر ایرانیت روئیں روئیں میں بھری ہوئی تھی۔

نادر نے ان کا پیغام سن کر بے نیازی کی شان سے کہا۔ ''میں اس غربت میں بھی بہت آرام سے ہوں۔ آپ لوگ مجھے دِق نہ کریں۔''

وفد کے سردار نے کہا۔ ''ہم حضور کا دامن نہ چھوڑیں گے۔ یہیں آپ کے قدموں پر نثار ہو جائیں گے۔''

''اب مجھے اس کشمکش میں نہ ڈالیے۔ حکومت سے طبیعت سیر ہو گئی۔''

''حضور! شورش پسندوں کا اب نشان بھی باقی نہیں ہے۔ ہم لوگ انہیں پھر سر نہ اٹھانے دیں گے۔ صرف حضور کا سہارا چاہیے۔''

''اگر آپ مجھے اس ارادہ سے لے جانا چاہتے ہیں تو معاف رکھیے۔ میں نے اس سیر و سیاحت میں ہر ایک

ملک کی رعایا کا غور سے مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان کی حالت قابل رحم ہے۔ ایران میں مجھے کبھی ایسے مواقع نہ ملے تھے۔ میں رعایا کو اہلکاروں کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اب آپ لوگ مجھ سے یہ امید نہ رکھیں کہ میں آئینی غارت گری شروع کروں گا اور امراء کی آسائش اور وقار کے لیے رعایا کا خون کروں گا۔ یہ عذاب اپنی گردن پر نہیں لے سکتا۔ میں میزان عدل برابر رکھوں گا اور اسی شرط پر ایران جا سکتا ہوں۔"

لیلیٰ نے مسکرا کر کہا۔ "تم رعایا کا قصور معاف کر سکتے ہو کیونکہ اسے تم سے کوئی عناد نہ تھا۔ اس کے دانت تو مجھ پر تھے، میں اسے کیونکر معاف کر سکتی ہوں۔"

نادر نے متانت سے کہا۔ "تم اتنی کینہ پرور نہیں ہو لیلیٰ! مجھے یقین نہیں آتا کہ تمہارے منہ سے یہ باتیں نکل رہی ہیں۔"

اسی روز سے جب احرار نے بابِ عالی پر ہنگامہ کیا تھا اور لیلیٰ کی جلاوطنی پر مُصر ہوئے تھے، لیلیٰ کے خیالات میں انقلاب ہو گیا تھا۔ ابتدا ہی سے اس نے عوام سے ہمدردی کرنا سیکھا تھا۔ فاقہ کشی اور برہنگی کی تکلیفیں جھیل چکی تھی۔ وہ شاہی عمال کو رعایا پر ظلم کرتے دیکھتی اور اس کا نازک دل تڑپ اٹھتا۔ وہ اپنے میں کوئی ایسی طاقت پیدا کرنا چاہتی تھی جو ظالموں کے دل میں رحم اور رعایا کے دل میں جرأت پیدا کرے۔ اس کا طفلانہ تصور اسے تخت شاہی پر بٹھا دیتا جہاں وہ اپنے عدل وانصاف سے دنیا میں ایک نیا دور قائم کر دیتی۔ کتنی ہی راتیں اس نے ایسے ہی خوابوں کے دیکھنے میں کاٹی تھیں۔ کتنی ہی بار وہ مظلوموں کے سرہانے بیٹھ کر روئی تھی۔ تب اس میں نغمہ کا کمال رونما ہوا۔ اسے اپنی قوت کا احساس ہونے لگا۔ وہ طفلانہ تصور زیادہ روشن، زیادہ متجسس ہو گیا۔ وہ اب اتنا بعید از امکان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ دفعتاً نادر اس کے طفلانہ تصور کی بہار لیے ہوئے اس کی زندگی میں داخل ہوا۔ خواب نے حقیقت کی شکل اختیار کی لیکن حقیقت اتنی دلفریب، اتنی خوش آئند نہ تھی جتنا وہ خواب۔ اسے زندگی کا نیا اور تلخ تجربہ ہوا۔ اس نے دیکھا کہ رعایا اتنی متحمل، اتنی عاجز اور بے زبان نہیں ہے۔ وہ اچھے سلوک کی قدر کرنا نہیں جانتی۔ مقدرت پا کر اس کا اچھا استعمال نہیں کر سکتی۔ اسی دن سے رعایا کی جانب سے اس کا دل پھر گیا تھا۔ آج پھر انہی مکروہات کے دائرہ میں قدم رکھتے ہوئے اندیشہ اور خوف سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ پر نادر کی خاطر وہ کیا کچھ نہ کرتی۔

(8)

جس روز نادر اور لیلیٰ نے پھر طہران میں قدم رکھا، سارا شہر ان کے خیر مقدم کے لیے امڈ پڑا۔ شہر پر ہیبت ایک اندھیرے بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ امرا کے محلے آباد اور گلزار تھے۔ غربا کے محلے اجڑے ہوئے جنہیں دیکھ کر جگر پاش پاش ہو جاتا تھا۔ نادر رو پڑا مگر لیلیٰ کے ہونٹوں پر بے رحمانہ تبسم تنا بیٹھا تھا۔

نادر نے باگ ڈور سنبھالی مگر اب اور تب میں کتنا فرق تھا! تب کوئی طاقت اس کے سست قدموں کو آگے بڑھاتی رہتی تھی۔ اب وہی طاقت اس کے تیز قدموں کو روکتی تھی۔ وہ ہر روز دیکھتا کہ میں جو کرنا چاہتا ہوں، وہ نہیں ہوتا اور جو نہیں کرنا چاہتا، وہی ہوتا ہے مگر اس کا علاج اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ لیلیٰ مشیتِ غیب کی طرح اس کے دل پر مسلط تھی۔ اس گردش کے ایام میں لیلیٰ کی زندگی جو چھپے ہوئے پہلو، جو پوشیدہ حقیقتیں آشکارا ہوئی تھیں،

وہ اتنی دلکش، اتنی لطف انگیز، اتنی ساحر تھیں کہ نادر اس کی منشا کو نوشتۂ تقدیر سمجھتا تھا۔ لیلیٰ کی صحبت میں اس کی تمناؤں کا معراج تھا۔ اس کے لیے وہ کیا کچھ نہ کر سکتا تھا۔ رعایا اور اس کی سلطنت کی اس کے سامنے کیا ہستی تھی!
اس طرح تین سال گزر گئے۔ رعایا کی حالت روز بروز ابتر ہوتی گئی۔

(9)

ایک روز نادر شکار کھیلنے گیا اور ہمراہیوں سے الگ ہو کر جنگل میں بھٹکنے لگا۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور رفیقوں کا کہیں پتہ نہیں۔ گھر لوٹنے کا راستہ بھی معلوم نہ تھا۔ آخر خدا کا نام لے کر وہ ایک طرف چل پڑا کہ کسی گاؤں یا آبادی کا نشان تو ملے گا۔ وہیں رات بھر پڑا رہوں گا۔ چلتے چلتے جنگل کے دوسرے سرے پر اس کو ایک گاؤں نظر آیا جس میں مشکل سے تین چار مکانات ہوں گے۔ ہاں ایک مسجد البتہ تھی۔ مسجد میں ایک چراغ ٹمٹمار ہا تھا مگر کسی آدمی کا نشان نہ تھا۔ آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس لیے کسی کو جگانا مناسب نہ تھا۔ نادر نے گھوڑے کو ایک درخت سے باندھ دیا اور اسی مسجد میں رات بسر کرنے کی ٹھانی۔ وہاں ایک بوسیدہ چٹائی پڑی ہوئی تھی۔ اس پر لیٹ گیا۔ دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔ لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ معلوم نہیں وہ کتنی دیر تک سوتا رہا۔ یکایک کسی کی آہٹ پا کر چونکا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا نماز پڑھ رہا ہے۔ نادر کو تعجب ہوا کہ اس وقت کون نماز پڑھتا ہے۔ اسے خبر ہی نہ تھی کہ رات ختم ہو چکی اور یہ فجر کی نماز ہے۔ وہ پڑا پڑا دیکھتا رہا۔ بوڑھے نے نماز ادا کی۔ پھر سینہ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے لگا۔

"اے خدائے پاک! تو ہی غریبوں کا مددگار اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ تو اس ظالم بادشاہ کے مظالم دیکھتا ہے، تاہم تیرا قہر اس پر نازل نہیں ہوتا۔ یہ کافر بے دین ایک حسینہ کے عشق میں اپنے کو اتنا بھول گیا ہے کہ نہ آنکھوں سے دیکھتا ہے اور نہ کانوں سے سنتا ہے۔ اگر دیکھتا ہے تو اسی حسینہ کی آنکھوں سے، سنتا ہے تو اسی حسینہ کے کانوں سے۔ تیری مخلوق ان مظالم سے تنگ آ گئی ہے یا تو اس ظالم کو جہنم واصل کر دے یا ہم بے کسوں کو دنیا سے اٹھا لے۔"

نادر کا خون سرد ہو گیا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ رعایا اس سے مطمئن نہیں ہے مگر اسے کبھی یہ خیال نہ ہوا تھا کہ اس کی مصیبت اتنی ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ بوڑھا تو خدا کی درگاہ میں فریاد کر کے رخصت ہو گیا، پر نادر وہیں بے حس پڑا رہا۔ گویا اس پر بجلی گر پڑی ہو۔

ایک ہفتہ تک نادر دربار میں نہ آیا اور نہ کسی مشیر کو ہی طلب کیا۔ سارا دن اندر پڑا سوچا کرتا۔ لیلیٰ اس کے پاس بار بار جاتی، کبھی اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر، کبھی اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر پوچھتی۔ "تم کیوں اتنے اداس ہو؟" نادر اسے دیکھ کر رونے لگتا مگر منہ سے کچھ نہ کہتا۔ نیک نامی یا لیلیٰ؟ اس کے سامنے مشکل مسئلہ تھا۔ اس کے دل میں برابر کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ پر وہ کچھ تصفیہ نہ کر سکتا تھا۔ نیک نامی عزیز تھی، وہ بدنام ہو کر زندہ رہ سکتا تھا مگر لیلیٰ کے بغیر زندگی محال تھی۔

آٹھویں دن وہ مسکراتا ہوا اٹھا۔ اس نے تصفیہ کر لیا تھا۔ لیلیٰ میری ہے۔ میں لیلیٰ کا ہوں! نہ میں اس سے الگ، نہ وہ مجھ سے جدا۔ جو کچھ وہ کرتی ہے وہ میرا، جو کچھ میں کرتا ہوں، وہ اس کا ہے۔ یہاں من و تو کا فرق ہی کہاں ہے۔ بادشاہت چند روزہ ہے، فانی ہے۔ محبت قائم ہے، لافانی۔ ہم روز ابد تک ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے ہوئے بہشت کا لطف اٹھائیں گے۔ ہمارا عشق ابد تک ستارہ کی طرح چمکتا رہے گا۔

نادر خوش ہو کر اٹھا۔ اس کا چہرہ فتح کی سرخی سے لال ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے شجاعت ٹپکی پڑتی تھی۔ وہ لیلیٰ کی محبت کا جام پینے جا رہا تھا۔ جسے ایک ہفتہ سے اس نے منہ نہیں لگایا تھا۔ اس کا دل، اس امنگ سے اچھلا پڑتا تھا جو آج سے پانچ سال پہلے پیدا ہوا کرتی تھی۔ محبت کا پھول کبھی نہیں مرجھاتا۔ محبت کی ندی کبھی نہیں اترتی۔

لیکن لیلیٰ کی آرامگاہ کا دروازہ بند تھا اور اس کا دف جو روزانہ دروازہ پر ایک کھونٹی سے لٹکا رہتا تھا۔ غائب تھا۔ نادر کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ دروازہ بند ہونے کا مطلب تو یہ ہو سکتا تھا کہ لیلیٰ باغ میں ہو گی مگر دف کہاں گیا۔ ممکن ہے وہ دف لے کر باغ میں گئی ہو لیکن یہ اداسی کیوں چھائی ہے۔ یہ حسرت کیوں برس رہی ہے؟

نادر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے دروازہ کھول دیا۔ لیلیٰ اندر نہ تھی۔ پلنگ بچھا ہوا تھا۔ شمع جل رہی تھی۔ وضو کا پانی رکھا ہوا تھا۔ نادر کے پیر کانپنے لگے۔ کیا لیلیٰ رات کو بھی نہیں سوئی۔ کمرہ کے ایک ایک چیز میں لیلیٰ کی یاد تھی۔ اس کی تصویر تھی۔ اس کی مہک تھی مگر لیلیٰ نہ تھی۔ مکان سونا معلوم ہوتا تھا جیسے بے نور آنکھ۔

نادر کا دل بھر آیا، اس کی ہمت نہ پڑی کہ کسی سے کچھ دریافت کرے۔ دل اتنا رنجیدہ ہو گیا کہ وہیں دیوار سا فرش پر بیٹھ کر زار و قطار رونے لگا۔ جب ذرا آنسو تھمے تو آنسو پوچھنے لگا اور بستر کو سونگھا کہ شاید لیلیٰ کی کچھ خوشبو ہی معلوم ہو لیکن خس اور گلاب کی مہک کے سوا اور کوئی خوشبو نہ تھی۔

دفعتاً اس کے تکیہ کے نیچے سے باہر نکلا ہوا ایک کاغذ کا پرزہ نظر آیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے کلیجہ کو سنبھال کر وہ پرزہ نکال لیا اور سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ایک نظر میں سب کچھ معلوم ہو گیا۔ یہ نادر کی قسمت کا فیصلہ تھا۔ نادر کے منہ سے نکلا، ہائے لیلیٰ! اور وہ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔ لیلیٰ نے پرزہ میں لکھا تھا۔ ”میرے پیارے نادر! تمہاری لیلیٰ تم سے جدا ہوتی ہے، ہمیشہ کے لیے۔ تلاش نہ کرنا۔ تم میرا سراغ نہ پاؤ گے۔ میں تمہاری محبت کی کنیز تھی۔ تمہاری بادشاہت کی بھوکی نہیں۔ آج ایک ہفتہ سے دیکھ رہی ہوں کہ تمہاری نگاہ پھری ہوئی ہے۔ تم مجھ سے نہیں بولتے۔ میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجھ سے بیزار رہتے ہو۔ میں کن کن ارمانوں سے تمہارے پاس جاتی ہوں اور کتنی مایوس ہو کر لوٹتی ہوں، اس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں نے اس سزا کے لائق کوئی کام نہیں کیا ہے۔ میں نے جو کچھ کیا ہے، وہ تمہاری بھلائی کی ہی نیت سے۔ ایک ہفتہ مجھے روتے ہوئے گزر گیا۔ مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ اب میں تمہاری نگاہوں سے گر گئی، تمہارے دل سے خارج ہو گئی۔ آہ! یہ پانچ سال ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہی دف لے کر آئی تھی، یہی دف لے کر جاتی ہوں۔ پانچ سال تک محبت کے مزے اٹھا کر عمر بھر کے لیے داغ حسرت لیے جاتی ہوں۔ لیلیٰ محبت کی لونڈی ہے۔ جب محبت نہ رہی تو لیلیٰ کیونکر رہتی۔ رخصت!!“

نادر نے اس پُرزے کو آنکھوں سے لگایا اور وہیں بیٹھ گیا۔ اس کا دل ایک ہولناک بیابان کی طرح کھڑا سِسک رہا تھا۔

ایک لمحہ میں اسی ہولناک بیابان سے ایک صدائے درد اٹھی۔ ”لیلیٰ! لیلیٰ!“ جس نے اس بیابان کے ایک ایک ذرے کو اسی صدا سے مترنّم کر دیا۔

مزارِ الفت

(1)

اب نہ وہ جوانی ہے، نہ وہ نشہ ہے، نہ وہ جنون ہے۔ وہ محفل برہم ہو گئی، وہ شمع بجھ گی جس سے اس محفل کی رونق تھی۔ وہ نازنین کنج لحد میں سو رہی ہے جس نے وفا پر اپنے تئیں قربان کیا۔ ہاں اس کی محبت کا نقش اب بھی دل پر ہے اور اس کی دلفریب یادگار آنکھوں کے سامنے۔ اربابِ نشاط میں ایسی وفا، ایسا خلوص، ایسی عفت نایاب ہے اور روٗسا میں ایسا نباہ، ایسی فدائیت، ایسی عقیدت نادر۔ کنور نبیر سنگھ روز بلاناغہ شام کو زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتے۔ اسے پھولوں سے سجاتے اور آنسوؤں سے سینچتے۔ پندرہ سال گزر گئے۔ ایک دن بھی ناغہ نہ ہوا۔ پریم کی اپاسنا ہی ان کی زندگی کا مقصود تھا۔ اس پریم کا جس میں انہوں نے وہ کچھ پایا، وہ کچھ دیکھا، وہ کچھ محسوس کیا جس کی یاد اب بھی مست کر دیتی ہے۔ اس زیارت میں سلوچنا بھی ان کے ساتھ ہوتی جو زہرہ کی یادگار اور کنور صاحب کی ساری آرزوؤں کا مرکز تھی۔ کنور صاحب نے دو شادیاں کی تھیں مگر دونوں عورتیں بے اولاد دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ پھر انہوں نے شادی نہ کی۔ ایک دن ایک محفل میں زہرہ کے درشن ہوئے، دونوں مائل ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوا گویا ازل کے دو رفیق بچھڑ کر پھر مل گئے ہوں۔ زندگی کی بہار شروع ہوئی۔ کتنی فرحت سے بھری ہوئی، کتنی نغمہ ریز۔ مگر افسوس! وہ بہار پانچ مختصر سالوں میں ہی رخصت ہو گئی۔ وہ خوابِ شیریں پریشان ہو گیا۔ وہ صدق اور وفا کی دیوی تین سال کی سلوچنا کو ان کی گود میں سونپ کر سدھار گئی۔ کنور صاحب نے اس پریم کی امانت کو حرزِ جاں بنا لیا۔ ان کی مادرانہ الفت دیکھ کر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ کتنے ہی تو انہیں مجنوں سمجھتے۔ سلوچنا ہی کی نیند سوتے، اسی کی نیند جاگتے۔ ساتھ پڑھتے، ساتھ کھیلتے، ساتھ سیر کرتے۔ اتنی یکسوئی کے ساتھ جیسے کوئی بیوہ اپنے لڑکے کو پالے۔ جب سے سلوچنا یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی خود اسے موٹر پر پہنچا آتے اور شام کو خود جا کر لے آتے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ اس کی شادی کسی ممتاز اور شریف خاندان میں ہو۔ وہ اس کی پیشانی سے وہ داغ دھو دینا چاہتے تھے جو گویا تقدیر نے اپنے بے رحم ہاتھوں سے لگا دیا تھا۔ دولت تو اس داغ کو نہ دھو سکی، شاید تعلیم دھو ڈالے!

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کے مزار پر شفق کے پھول بکھرے ہوئے تھے اور کنور صاحب زہرہ کے مزار کو پھولوں سے سجا رہے تھے۔ سلوچنا کچھ فاصلے پر کھڑی اپنے کتے سے گیند کھیل رہی تھی کہ یکایک اس نے اپنے پروفیسر ڈاکٹر "رامیندر" کو آتے دیکھا۔ شرما کر منہ پھیر لیا، گویا انہیں دیکھا ہی نہیں۔ خوف ہوا کہیں ڈاکٹر رامیندر اس سے مزار کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھیں۔

یونیورسٹی میں داخل ہوئے اسے ایک سال سے کچھ کم ہی ہوا تھا مگر اتنے ہی دنوں میں اس نے محبت کی مختلف صورتیں دیکھ لی تھیں۔ کہیں وہ سامانِ تفریح تھا، کہیں ذریعۂ نشاط، کہیں مایۂ ہوس، کہیں تحریکِ نفس، کہیں وہ ذوقِ صالح نہ نظر آیا جو محبت کی بنیاد ہے۔ صرف رامیندر ہی ایک ایسے شخص تھے جنہیں اپنی طرف تاکتے دیکھ کر اس کے دل کے تار گونجنے لگتے تھے۔ پر ان آنکھوں میں کتنی بے بسی تھی، کتنی معذرت، کتنی التجا!

رامیندر نے کنور صاحب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’تمہارے بابا اس قبر پر کیا کر رہے ہیں؟‘‘
سلوچنا کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ بولی۔ ’’یہ ان کی پرانی عادت ہے۔‘‘
رامیندر۔ ’’کسی مہاتما کی سمادھی ہے؟‘‘
سلوچنا نے اس سوال کو اڑا دینا چاہا۔ رامیندر کو یہ تو معلوم ہی تھا کہ سلوچنا کنور صاحب کی ایک داشتہ عورت کی لڑکی ہے۔ پر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ یہ اسی عورت کی قبر ہے اور کنور صاحب اس یادگار محبت کے پجاری ہیں۔ یہ سوال انہوں نے ذرا بلند آواز میں کیا تھا۔ کنور صاحب اس وقت جوتے پہن رہے تھے۔ آواز ان کے کانوں میں پڑ گئی۔ جلدی سے جوتے پہن لیے اور قریب آ کر بولے۔ ’’دنیا کی آنکھوں میں تو وہ مہاتما نہ تھیں پر میری آنکھوں میں تھیں اور ہیں۔ یہ میری الفت کا مزار ہے۔‘‘
سلوچنا کا جی چاہتا تھا وہاں سے بھاگ جائے لیکن کنور صاحب کو زہرہ کی نوحہ خوانی میں مزہ آتا تھا۔ رامیندر کا استعجاب دیکھ کر بولے۔ ’’اس میں وہ دیوی سو رہی ہے جس نے دنیا کو میرے لیے جنت بنا دیا تھا۔ سلوچنا اسی کی یادگار ہے۔‘‘
رامیندر نے مزار کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’اچھا!‘‘
کنور صاحب نے دل میں اس یاد سے محظوظ ہو کر کہا۔ ’’وہ زندگی ہی اور تھی پروفیسر صاحب۔ ایسی نفس کشی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔ آپ کو فرصت ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ آپ کو اپنی داستانِ محبت......‘‘
سلوچنا نے قطع کلام کر کے کہا۔ ’’وہ سنانے کی چیز نہیں ہے دادا جی۔‘‘
کنور صاحب نے کہا۔ ’’میں رامیندر بابو کو غیر نہیں سمجھتا۔‘‘
رامیندر کو اس داستان محبت میں نفسیات کا ایک عمیق مسئلہ چھپا ہوا نظر آیا۔ وہ کنور صاحب کے ساتھ ان کے گھر تک آئے اور بہت دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے۔ آج انہیں اس خواہش کے اظہار کا موقع ملا جو مہینوں سے الفاظ کی تلاش میں پریشان تھی۔ کنور صاحب نے انہیں گلے لگا کر ان کی التجا قبول کی۔ رامیندر نے اپنی رفیق حیات کے لیے جو ذہنی معیار قائم کیا تھا، سلوچنا اس پر پوری اتری تھی۔
کنور صاحب نے انہیں ٹٹولا۔ ’’آپ نے اس معاملہ کے ہر ایک پہلو پر غور کر لیا ہے؟‘‘
رامیندر نے مضبوطی سے کہا۔ ’’میں ان باتوں کی پروا نہیں کرتا۔ اگر سماج ہمیں اتنی آزادی بھی نہیں دے سکتا تو ہم ایسے سماج میں رہنا ہی اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔‘‘
کنور صاحب نے پھر کہا۔ ’’لوگ خوب مضحکہ اڑائیں گے!‘‘
رامیندر: ’’مجھے یقین ہے کہ کوئی ذی فہم انسان نہ ہنسے گا اور بے اصول آدمیوں کے ہنسنے کی مجھے پروا نہیں۔‘‘
کنور صاحب۔ ’’تمہارے خاندان میں تو لوگ مخالفت نہ کریں گے؟‘‘
رامیندر۔ ’’میں تو آپ سے عرض کر چکا ہوں کہ مجھے کسی کی مخالفت کی پروا نہیں ہے۔ اگر میں برائی کروں، کوئی ایسا کام کروں جو اخلاقاً قابل مذمت ہو تو میں سماج کے فتوے کے سامنے شوق سے سر جھکا دوں گا لیکن سماج کے بے جا ظلم کو برداشت کرنا اخلاقی کمزوری ہے۔‘‘
رامیندر کی اس دلیرانہ اصول پسندی نے کنور صاحب کو مطمئن کر دیا۔

(2)

لیکن ڈاکٹر رامیندر کو اس وقت تک سماج کے ظلم کا تجربہ نہ تھا۔ جہاں جاتے ان کی عزت ہوتی تھی۔ تقریبوں اور پارٹیوں میں ان کے نام دعوتی خطوط آتے تھے۔ اپنی شادی کی تقریب میں انہوں نے جو شاندار دعوت دی تھی، اس میں وہ سبھی حضرات شریک ہوئے جن سے انہیں ہمدردی کی امید تھی لیکن جب سے سلوچنا گھر میں آئی ان کے یہاں مستورات کا آنا جانا تقریباً بند ہو گیا۔ مرد دوست اب بھی آتے تھے بلکہ پیشتر کے مقابلہ میں ان کی آمد و رفت اور بڑھ گئی تھی۔ صبح شام احباب کا تانتا لگا رہتا۔ سلوچنا ان کی خاطر و تعظیم میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتی لیکن ان کے احباب کے ساتھ ان کی مستورات نہ آتیں۔ پہلے چند ماہ تو رامیندر نے ادھر توجہ نہ کی لیکن جب کئی ماہ گزر گئے اور مستورات کا احتراز بدستور قائم رہا تو انہوں نے ایک دن سلوچنا سے کہا۔ "یہ لوگ اپنی گھر والیوں کو نہیں لاتے۔"

سلوچنا نے آہستہ سے کہا۔ "ہاں دیکھتی تو ہوں۔"

رامیندر۔ "کیا عورتیں تم سے پرہیز تو نہیں کرتیں؟"

سلوچنا۔ "شاید کرتی ہوں۔"

رامیندر۔ "مگر یہ لوگ تو بڑے آزاد ہیں۔ ان کی عورتیں بھی کافی تعلیم یافتہ ہیں، پھر یہ کیا بات ہے؟"

سلوچنا نے آہستہ سے کہا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔"

رامیندر نے کچھ دیر تامل کر کے کہا۔ "ہم لوگ کسی دوسری جگہ چلے جائیں تو کیا حرج ہے؟ وہاں تو کوئی ہمیں نہ جانتا ہو گا۔"

سلوچنا نے اب کی تیز لہجہ میں کہا۔ "دوسری جگہ کیوں جائیں۔ ہم نے کسی کا کچھ بگاڑا نہیں ہے۔ کسی سے کچھ مانگتے نہیں۔ جسے آنا ہو آوے، نہ آنا ہو نہ آوے۔ کسی دوسری جگہ جا کر منہ چھپانا مجھے تو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

رفتہ رفتہ رامیندر پر اب ایک اور حقیقت کھلنے لگی۔ جو خواتین کے احتراز سے کہیں زیادہ دل شکن، کہیں زیادہ مذمت آمیز اور نفرت انگیز تھی۔ رامیندر کو اب معلوم ہونے لگا کہ یہ حضرات جو آتے ہیں اور گھنٹوں بیٹھے قومی اور مجلسی امور پر مباحثے کیا کرتے ہیں، فی الواقع تبادلۂ خیال کے لیے نہیں بلکہ نظارہ حسن کے لیے آتے ہیں۔ ان کی نگاہیں سلوچنا ہی کی متلاشی رہتی ہیں۔ ان کے کان اسی کی شکر ریزیوں کے مشتاق رہتے ہیں۔ اس کے حسن و انداز کا لطف اٹھانا ہی ان کا مقصود ہے۔ یہاں انہیں وہ شرافت اور لحاظ نہیں مانع ہوتی جو کسی معزز آدمی کی بیٹی بہو کی طرف آنکھیں نہیں اٹھنے دیتی۔ وہ سوچتے ہیں یہاں انہیں ہر قسم کی آزادی ہے۔ کبھی کبھی جب رامیندر کی عدم موجودگی میں کوئی حضرت آ جاتے اس وقت سلوچنا کے لیے سخت آزمائش کا سامنا ہوتا۔ وہ اپنی نگاہوں سے، اپنی رازدارانہ باتوں سے، اپنی ٹھنڈی آہوں سے اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ ہم بھی تمہارے شیدائیوں میں ہیں۔ اگر رامیندر کا تم پر سولہوں آنہ حق ہے تو زکوٰۃ کے طور پر ہم بھی ایک نگاہ، ایک تبسم کے مستحق ہیں۔ سلوچنا اس وقت زہر کے گھونٹ پی کر رہ جاتی۔

اب تک رامیندر اور سلوچنا دونوں کلب جایا کرتے تھے۔ وہاں آزاد خیالوں کا اچھا جمگھٹ رہتا تھا۔ جب

تک رامیندر کو کسی کی جانب سے شبہ نہ تھا، وہ اسے اصرار کے ساتھ لے جاتا۔ سلوچنا کے پہنچتے ہی وہاں ایک زندہ دلی سی پیدا ہو جاتی۔ مجلس میں جان سی پڑ جاتی۔ جس میز پر سلوچنا بیٹھتی اس پر مجمع ہو جاتا۔ کبھی کبھی سلوچنا گاتی بھی تھی۔ اس وقت تو سارے مجمع پر نشہ طاری ہو جاتا۔ کلب میں مستورات کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ مشکل سے پانچ چھ لیڈیاں آتی تھیں مگر وہ سلوچنا سے زیادہ مخاطب نہ ہوتیں۔ بلکہ اپنے حرکات و کنایات سے اسے جتا دینا چاہتی تھیں کہ تم مردوں کا دل خوش کرنے کے لیے ہو۔ مردوں کا دل خوش کرو۔ ہم شریف زادیوں کے پاس تمہاری کوئی ضرورت نہیں لیکن جب سے رامیندر پر یہ تلخ حقیقت روشن ہوئی انہوں نے کلب جانا چھوڑ دیا۔ دوستوں کے یہاں آمد و رفت بھی کم کر دی اور اپنے یہاں آنے والوں سے بے اعتنائی کرنے لگے۔ وہ چاہتے تھے میرے گوشۂ تنہائی میں کوئی مخل نہ ہو۔ رفتہ رفتہ انہوں نے باہر آنا جانا چھوڑ دیا۔ گھر پر بیٹھے پڑھا لکھا کرتے۔ اپنے چاروں طرف انہیں احتراز اور دغا کی دیوار کھنچی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ کسی پر اعتماد نہ کر سکتے تھے۔ کہیں سے ہمدردی اور خلوص کی امید نہیں۔ دل سب سے بیزار تھا۔ بد طینت اور تنگ دل آدمیوں سے ملنے سے فائدہ ہی کیا۔ شروع سے محبت پسند آدمی تھے۔ اول درجہ کے یار باش۔ یہ گوشہ نشینی انہیں حد درجہ جانگزا معلوم ہوتی تھی۔ نہ کوئی سیر نہ تفریح، یہ تو قید تھی۔ جبری قید۔ اگرچہ وہ قول و فعل سے سلوچنا کی دلجوئی کرتے رہتے تھے لیکن سلوچنا کی باریک نگاہوں سے اب یہ چھپا نہ تھا کہ یہ حالت ان کے لیے روز بروز ناقابل برداشت ہوتی جاتی ہے۔ وہ دل میں سوچتی ان کی یہ حالت میرے ہی باعث تو ہے؟ میں ہی تو ان کی زندگی کا کانٹا ہو گئی۔ اگر میں نہ ہوتی تو کیوں انہیں ان دل آزاریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔

آخر ایک دن اس نے رامیندر سے کہا۔ ”آج کل کلب کیوں نہیں چلتے؟ کئی ہفتے ہوئے گھر سے نکلتے تک نہیں۔“

رامیندر نے بے دلی سے کہا۔ ”میرا تو جی نہیں چاہتا۔ اپنا گھر سب سے اچھا ہے۔“

”طبیعت تو گھبراتی ہی ہو گی۔ تم تنہائی کے عادی کبھی نہیں رہے۔ یہ تپسیا کیوں کرتے ہو؟ میں تو نہ جاؤں گی۔ ان عورتوں سے مجھے نفرت ہوتی ہے۔ ان میں ایک بھی ایسی نہیں جس کے دامن پر سیاہ داغ نہ ہو لیکن سیتا بنی پھرتی ہیں۔ مجھے تو ان کی صورت سے چڑ ہو گئی ہے لیکن تم کیوں نہیں جاتے؟ کچھ تفریح ہی ہو جائے گی۔“

رامیندر۔ ”تفریح کیا خاک ہو گی جب دل اندر سے جل رہا ہو تو تفریح کہاں؟“

سلوچنا چونک پڑی۔ آج پہلی بار اس نے رامیندر کے منہ سے ایسی بات سنی۔ وہ اپنی نگاہ میں خود مظلوم تھی۔ ذلت یا تحقیر جو کچھ تھی، اس کی تھی۔ رامیندر کے لیے تو اب بھی سب دروازے کھلے ہوئے تھے۔ وہ جہاں چاہیں جا سکتے تھے۔ جن سے چاہیں مل سکتے تھے۔ ان کے لیے کونسا امر مانع ہے۔ مشکل تو میری ہے! مرد شہدے، عورتیں مغرور اور کینہ پرور!

لیکن نہیں۔ اگر انہوں نے کسی دوسری شریف زادی سے شادی کی ہوتی تو ان کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی۔ معزز گھرانوں کی عورتیں آتیں۔ آپس میں اتحاد اور خلوص پیدا ہوتا۔ ریشم میں ریشم کا پیوند لگ جاتا۔ اب تو ریشم میں ٹاٹ کا پیوند لگا یا ٹاٹ میں ریشم کا، بات ایک ہی ہے۔

رامیندر کو بھی فوراً معلوم ہو گیا کہ زبان سے ایک ایسی بات نکل گئی جس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ اسی بات کو زیادہ واضح اور ملائم انداز سے کہا جا سکتا تھا۔ انہوں نے فوراً اس کی تاویل کی۔ ”کیا تم سمجھتی ہو کہ ہم اور تم الگ الگ ہیں؟ ہماری اور تمہاری زندگی ایک ہے۔ جہاں تمہاری قدر نہیں وہاں میں کیسے جا سکتا ہوں۔ مجھے بھی سماج کے

ان رنگے سیاروں سے کراہیت ہو رہی ہے۔ میں قریب قریب ان سبھوں کے اندرونی حالات سے واقف ہوں۔ اونچے عہدوں یا بڑی بڑی ڈگریوں یا دولت سے کسی کی آتما نہیں پاک ہو جاتی۔ جو یہ لوگ کرتے ہیں، وہ اگر کوئی کمتر درجہ کا آدمی کرتا تو اسے کہیں منہ دکھانے کی ہمت نہ ہوتی مگر یہ لوگ اپنی ساری برائیاں آزاد خیالی کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ ان لوگوں سے دور ہی رہنا اچھا۔"

سلوچنا کو تسکین ہو گئی۔

(3)

دوسرے سال سلوچنا کی گود میں ایک چاند سی لڑکی کا ظہور ہوا۔ اس کا نام رکھا گیا شوبھا۔ کنور صاحب کی صحت کچھ خراب ہو رہی تھی۔ وہ ان دنوں منصوری میں تھے۔ یہ خبر پاتے ہی رامیندر کو تار دیا کہ زچہ اور بچہ کو لے کر یہاں آجاؤ۔ موسم اچھا ہے لیکن رامیندر اس موقع پر نہ جانا چاہتے تھے۔ اپنے احباب کی شرافت اور آزاد خیالی کا ایک بار وہ آخری امتحان لینا چاہتے تھے۔ اس کے لیے اس سے بہتر موقع کیا ہو سکتا تھا۔ اس تقریب میں انہوں نے اعلیٰ پیمانے پر ایک دعوت کرنے کا فیصلہ کیا۔ گانے بجانے کی بھی تجویز ہوئی۔ کئی باکمال گویتے بلائے گئے۔ احباب کے نام دعوتی کارڈ بھیج دیئے گئے۔ مسلم دوستوں کو بھی مدعو کیا گیا۔ انگریزی، ہندوستانی، مسلمانی ہر ایک قسم کے کھانے کا انتظام کیا گیا۔ پھلاہاری مٹھائیاں بھی منگوائی گئی تھیں تاکہ راسخ الاعتقاد اصحاب کو شکایت کا موقع نہ ہو۔ اس تقریب میں شریک ہونے کے لیے کنور صاحب گرتے پڑتے منصوری سے آئے۔ برہی کے دن دعوت کی تاریخ تھی۔ دوپہر ہی سے نشستیں سجائی جانے لگیں۔ کوئی طشتریاں لگانے لگا۔ کوئی دونے سجانے لگا۔ شام ہوتے ہوتے سارا انتظام مکمل ہو گیا۔ مدعو حضرات ایک ایک کر کے تشریف لانے لگے۔ کنور صاحب خود ان کا استقبال کر رہے تھے۔ نواب صاحب تشریف لائے۔ خان صاحب آئے۔ مرزا صاحب آئے۔ میر صاحب آئے۔ غرض شہر کے مسلم رئیسوں میں بہت کم ایسے ہوں گے جو اس موقع پر جلوہ افروز نہ ہوئے ہوں مگر پنڈت جی اور بابو جی اور لالہ صاحب اور چودھری صاحب اور ککڑ اور مہرا اور چوپڑہ اور کول اور ہکو اور سری واستویہ اور ماتھر اور دوبے اور چوبے سب عنقا تھے۔ گویا شہر میں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ یہ سبھی احباب ہوٹلوں میں کھاتے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ دعوتیں اڑاتے تھے۔ شرابیں لنڈھاتے تھے۔ پھر آج کیوں تشریف نہیں لائے؟ اس لیے نہیں کہ چھوت کا خیال مانع تھا بلکہ اس لیے کہ وہ اپنی شرکت کو اس شادی کے جواز کی سند سمجھتے تھے اور یہ سند دینی انہیں منظور نہ تھی۔ حیرت تو یہ تھی کہ انگریز احباب نے بھی قدر افزائی نہ کی۔ ہاں دو چار عیسائی جن کے حسب نسب کا کوئی پتہ نہ تھا، آگئے۔ دس بجے رات تک کنور صاحب پھاٹک پر کھڑے رہے۔ اسلامی دعوت ختم ہو گئی۔ گانا شروع ہوا مگر ہندو حضرات ابھی تک لاپتہ تھے۔ ہندوؤں کے شامیانے میں ایک متنفس بھی نہ تھا۔ رامیندر پرشاد ایک کرسی پر مغموم اور دل شکستہ سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے کہ کنور صاحب نے آکر کہا۔ "اب لوگوں کا انتظار فضول ہے۔ سب سامان غریبوں کو دے دو۔" رامیندر نے افسردہ خاطر ہو کر کہا۔ "جی ہاں۔ یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔"

کنور۔ "مجھے تو پہلے ہی اندیشہ تھا۔"

رامیندر۔ "مجھ سے حماقت ہوئی کہ یہ دعوت کی۔ یہ تو میری علانیہ توہین ہوئی۔"

کنور۔ ”ہماری توہین نہیں ہوئی، خود ان لوگوں کی تنگ دلی کا پردہ فاش ہو گیا۔“

رامیندر۔ ”خیر امتحان ہو گیا۔ کہیے تو ابھی جا کر ان لوگوں کی خبر لوں؟“

کنور صاحب نے حیرت سے کہا۔ ”کیا ان کے گھر جا کر؟“

رامیندر۔ ”جی ہاں۔ پوچھوں کہ آپ لوگ جو قومی اصلاح کے راگ الاپتے پھرتے ہیں، وہ کس بل پر؟ یہی آپ کی اخلاقی ہمت ہے؟“

کنور۔ ”فضول ہے۔ جا کر آرام سے لیٹو۔ نیک و بد کی سب سے بڑی پہچان اپنا ضمیر ہے۔ اگر ہمارا دل گواہی دے کہ یہ کام برا نہیں تو پھر ساری دنیا منہ پھیر لے۔ ہمیں کسی کی پروا نہ کرنی چاہیے۔ میرے بھائی بند، عزیز رشتہ دار سب نے مجھے ترک کر دیا مگر میں نے کسی کی تنکے برابر بھی پروا نہ کی اور میرا خیال ہے کہ مجھے زندگی میں کبھی پچھتاوا نہیں ہوا۔“

رامیندر۔ ”لیکن میں ان لوگوں کو یوں نہ چھوڑوں گا۔ ایک ایک کا بخیا ادھیڑ کر نہ رکھ دوں تو نام نہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ محفل میں جا بیٹھے۔ کنور صاحب نے طشتریاں اٹھوا اٹھوا کر غرباء کو تقسیم کروانی شروع کیں۔

(4)

رامیندر ابھی شام کی ہوا خوری کر کے سوئے ہی تھے کہ اربابِ نشاط کا ایک مجمع سلوچنا کو مبارکباد دینے کے لیے آ پہنچا۔ ان کے ساتھ باجہ تھا۔ کئی عورتیں سروں پر تھال رکھے ہوئے تھیں۔ ایک لڑکی ناچ رہی تھی اور سب کی سب گاتی بجاتی چلی آتی تھیں۔ یہ بدھاوا تھا۔ زہرہ کی ایک سگی بھتیجی تھی گلنار۔ بلا کی حسین اور خوش گلو۔ سلوچنا کے یہاں پہلے برابر آتی جاتی تھی۔ ادھر دو سال سے نہ آئی تھی۔ لڑکی کی ولادت کی خبر پا کر پھولی نہ سمائی۔ بدھاوا لے کر آ پہنچی۔ حسب دستور اپنی سکھیوں سہیلیوں کو بھی ساتھ لائی۔ اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ اس پر شہر کے تماشائیوں کا اژدہام۔ پھاٹک پر ایک میلہ سا لگ گیا۔ رامیندر پرشاد نے یہ شور و غل سنا تو باہر آئے۔ گلنار نے آگے بڑھ کر انہیں سلام کیا اور بولی۔ ”بابو جی بیٹی مبارک! بدھاوا لائی ہوں!“

رامیندر پرشاد کا سارا جسم مفلوج سا ہو گیا۔ سر جھک گیا۔ نہ منہ سے بولے‘ نہ بیٹھنے کا اشارہ کیا‘ نہ وہاں سے ہلے۔ بس نقش دیوار بنے کھڑے رہ گئے۔ ایک بازاری عورت سے رسم پیدا کرنے کا خیال اس درجہ شرمناک اور پُر استکراہ تھا کہ اس کے سامنے ضمیر کی بلند آواز غائب ہو گئی۔ اتنا اخلاق بھی نہ برت سکے کہ کمرہ میں لے جا کر بٹھا تو دیتے۔ آج پہلی بار انہیں اپنی ذلت کا خود احساس ہوا۔ احباب کی بے وفائی اور لیڈیوں کے احتراز کو وہ ان کی بے انصافی سمجھتے تھے، اپنی ذلت نہیں۔ کل کے واقعہ کو بھی انہوں نے سماج کے ظلم ہی سے منسوب کیا لیکن یہ بدھاوا ان کی آزادروی کے لیے بھی بہت سنگین تھا۔ سلوچنا نے جس آب و ہوا میں پرورش پائی تھی، وہ ایک شریف اور ممتاز ہندو خاندان کی آب و ہوا تھی۔ وہاں ان تعلقات کی چرچا تک نہ تھی۔ یہ سچ ہے کہ اب بھی سلوچنا ایک بار روزانہ زہرہ کے مزار کی زیارت کرنے جاتی تھی مگر زہرہ اب ایک آسمانی وجود تھی۔ دنیاوی کثافتوں اور آلائشوں سے پاک۔ گلنار سے قرابت داری اور مراسم کا نباہ دوسری بات تھی۔ جو لوگ تصاویر کے سامنے سر جھکاتے اور نمسکار کرتے ہیں‘ یہاں تک کہ تصاویر پر پھول چڑھاتے اور تلک لگاتے ہیں‘ وہ بھی تو مورتی پوجا کی مذمت کرتے ہیں۔ ایک صریح

ہے، دوسرا کنایہ۔ ایک نظروں کے سامنے ہے دوسرا آنکھوں سے پوشیدہ۔

سلوچنا کل زچہ خانہ سے نکل چکی تھی۔ اپنے کمرہ میں پردہ کے سامنے کھڑی وہ رامیندر پرشاد کی پریشانی اور شش و پنج دیکھ رہی تھی۔ جس سماج کو اس نے اپنا معبود بنانا چاہا تھا، جس کے دروازہ پر سجدہ کرتے اسے برسوں ہو گئے تھے، اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس کا دل اس وقت بے اختیار بغاوت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا، گلنار کو بلا کر گلے لگا لوں۔ جو لوگ میری بات بھی نہیں پوچھتے، ان کی خوشامد کیوں کروں۔ یہ بیچاریاں اتنی دور سے آئی ہیں۔ آخر مجھے اپنا ہی سمجھ کر تو'ان کے دلوں میں محبت تو ہے۔ یہ میرے رنج اور خوشی میں شریک ہونے کو تیار تو ہیں۔ انہیں لالچ یہاں نہیں لائی۔ اپنی جیب سے خاصی رقم خرچ کرنی پڑی ہو گی؟ کس لیے؟ اسی لیے تو وہ کہ مجھے اپنا سمجھتی ہیں۔ ان کا خون اب بھی جوش کھاتا ہے۔

آخر رامیندر نے سر اٹھایا اور مصنوعی تبسم کے ساتھ گلنار سے بولے۔ "آیئے آپ لوگ اندر چلی آیئے۔ یہاں دھوپ ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے آگے راستہ دکھاتے ہوئے دیوان خانہ کی جانب چلے کہ یکایک ایک خادمہ نکلی اور گلنار کے ہاتھ میں ایک پرزہ دے کر چلی گئی۔ گلنار نے وہ پرزہ لے کر دیکھا اور اسے رامیندر پرشاد کے ہاتھ میں دے کر وہیں کھڑی ہو گئی۔ رامیندر نے پرزہ دیکھا۔ لکھا تھا۔ "بہن گلنار! تم یہاں ناحق آئیں۔ ہم لوگ یونہی ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ اب اور رسوا مت کرو۔ بدھاوا واپس لے جاؤ۔ بچی کے لیے دعا کرنا۔ کبھی ملنے کا جی چاہے تو رات کو آنا اور اکیلے۔ میرا جی تمہارے گلے لپٹ کر رونے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے مگر مجبور ہوں۔"

رامیندر نے پرزہ پھاڑ کر پھینک دیا اور دلیرانہ انداز سے بولے۔ "انہیں بکنے دو، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اندر آؤ۔"

گلنار نے ایک قدم پیچھے پھر کر کہا۔ "نہیں بابو جی! اب مجھے اجازت دیجئے، جاؤں گی۔"

رامیندر۔ "ایک منٹ تو بیٹھو۔"

گلنار۔ "جی نہیں۔ ایک سیکنڈ بھی نہیں۔ میں نے بڑی حماقت کی کہ بے سوچے سمجھے یہ سب تیاریاں کر بیٹھی۔"

یہ کہتی ہوئی وہ الٹے قدم واپس ہو گئی۔ خوان اور طشت سب جوں کے توں لوٹ گئے۔

رامیندر کا چہرہ زرد تھا۔ سر جھکا ہوا۔ آنکھوں میں اعتراف گناہ کی جھلک تھی۔ وہ خودداری، وہ غصہ جائز جو بے انصافی کے احساس سے پیدا ہوتا ہے، رخصت ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ ندامت اور پشیمانی تھی۔ اپنی شکست کا ذلت آمیز احساس! اس گلنار کو بدھاوے کی کیوں سوجھ گئی۔ یوں تو کبھی آتی جاتی نہ تھی۔ آج بلائے بے درماں کی طرح کھوپڑی پر سوار ہو گئی۔ اپنے دل میں سمجھتی ہو گی کہ میری بڑی قدر ہو گی۔ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ کنور صاحب اتنے آزاد خیال ہوں گے۔ انہوں نے زہرہ کے خاندان والوں سے بھائی چارے کا نباہ کیا ہو گا۔ میں اتنا آزاد نہیں ہوں۔ کہیں سلوچنا اس کے پاس آتی جاتی تو نہیں۔ مجھ سے تو اس نے کبھی اس گلنار کا ذکر بھی نہیں کیا مگر پوشیدہ خط و کتابت کرتی ہو گی ورنہ گلنار کو یہاں آنے کی ہمت نہ ہوتی۔ کنور صاحب عیاش تھے ہی۔ ان کے گھر بدھاوے آتے ہوں گے۔ ان کے گھر سے بانٹے جاتے ہوں گے۔ ہولی، دیوالی، عید، بقرعید کی دعوتیں اڑتی ہوں گے۔ سلوچنا نے لکھا بھی تو ہے کہ ملنے کا جی چاہے تو رات کو آنا اور اکیلی۔ جی تمہارے گلے لپٹ کر رونے کے لیے بے قرار ہو رہا ہے۔ کیوں نہ لکھے۔ خو بو وہی ہے۔ سرشت وہی' ضمیر وہی، نگاہ وہی، معیار وہی۔ مانا کنور صاحب کے گھر میں تعلیم و

تربیت ہوئی مگر خون کا اثر اتنی جلد زائل نہیں ہو سکتا۔ اچھا دونوں بہنیں ملتی ہوں گی تو ان میں کیا باتیں ہوتی ہوں گی۔ علمی یا تاریخی چرچا تو ہو ہی نہیں سکتا۔ بازاری گفتگو ہوتی ہو گی۔ گلنار اپنے تجربات بیان کرتی ہو گی۔ بازارِ حسن کے خریداروں اور دکانداروں کے عیب و ہنر پر بحث ہوتی ہو گی۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ گلنار اس کے پاس آتے ہی اپنے کو بھول جائے اور کوئی بھدی، معیوب اور شرمناک بات نہ کرے۔ ان میں اتنی تہذیب، اتنی متانت کہاں! اپنی فتوحات کی داستان کہتے کسے برا معلوم ہوتا ہے۔

مگر انسان بغیر کسی سے ملے جلے رہ بھی تو نہیں سکتا۔ یہ بھی تو ایک طرح کی بھوک ہے۔ بھوک میں اگر صاف کھانا نہ ملے تو انسان جھوٹا کھانے سے بھی تو گریز نہیں کرتا۔ ہمارے دوست احباب نے ہی تو یہ حالت پیدا کی ہے۔ اگر یہ لوگ سلوچنا کو اپنا بناتے، اس سے یوں احتراز نہ کرتے، اسے ذلیل نہ سمجھتے تو اسے کیوں ایسے آدمیوں سے ملنے کی خواہش ہوتی۔ اس کا کوئی قصور نہیں۔ یہ ساری خطا ہمارے سماج کی ہے جو ہمیں سنبھلنے نہیں دیتا۔ ہمیں اپنے ماضی کو تازہ رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمیں گڑھے سے نکلنے نہیں دیتا۔ اگر یہ لوگ سلوچنا سے ہمدردی کرتے۔ اس کی عزت کرتے تو اس کے دل میں اپنی روایات ماضی سے خود بخود نفرت پیدا ہوتی۔ اس کے دل میں خود بخود روشنی جلوہ نما ہوتی۔ اس کی تحقیر کر کے ان لوگوں نے اسے اس طرف مائل ہونے پر مجبور کیا ہے!

کنور۔ ''تو یہ کہو تمہارے ایما سے واپس کیا گیا ہے۔ تم نے اس طبقہ کو اپنی طرف کھینچنے کا کتنا نادر موقع کھو دیا ہے! سلوچنا کی مثال کا جو کچھ تھوڑا بہت اثر پیدا ہوا تھا، وہ تم نے مٹا دیا۔ بہت ممکن تھا کہ تمہاری ہمدردی اور اخلاق اور ایک معزز آدمی سے رشتہ رکھنے کا خیال اس کی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز کرتا۔ آپ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہر ایک برائی مجبوری سے پیدا ہوتی ہے۔ چور اس لیے چوری نہیں کرتا کہ چوری کرنے میں اسے لطف حاصل ہوتا ہے بلکہ اس لیے کہ ضرورت اسے مجبور کرتی ہے۔ ہاں وہ ضرورت واقعی ہے یا خیالی، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ بیوی کے لیے مَیکا جاتے وقت کوئی زیور بنوانا ایک آدمی کے لیے ضروری ہو سکتا ہے۔ دوسرے کے لیے بالکل غیر ضروری۔ فاقہ کشی کی حالت میں ایک آدمی اپنا ایمان کھو سکتا ہے۔ دوسرا مر جائے گا مگر کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے گا۔ مگر قدرت کا یہ قانون آپ جیسے عالموں کو نہ بھول جانا چاہیے کہ زندہ رہنا فطرت کا پہلا اصول ہے۔ زندہ رہنے کے لیے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لیے جتنا ہی مشکل ہو گا، اتنی ہی برائیوں کی تعداد بھی بڑھے گی۔ جتنا ہی آسان ہو گا، اتنی ہی برائیاں کم ہوں گی۔ سماج کا اصول یہ ہونا چاہیے کہ زندہ رہنا ہر ایک آدمی کے لیے آسان ہو۔ رامیندر بابو آپ نے اس وقت ان غریبوں کے ساتھ وہی کیا جو دوسرے آپ کے ساتھ کر رہے ہیں اور جس کا آپ کو بے حد صدمہ ہے۔''

رامیندر پرشاد نے اس لمبی تقریر کو اس طرح سنا گویا کوئی دیوانہ بک رہا ہو۔ اس قسم کی دلیلیں وہ بارہا سن چکے تھے اور خود ان کا استعمال کر چکے تھے۔ ان کا جواب دینے کی انہیں ضرورت نہ تھی۔ جب دل پر کوئی چوٹ لگتی ہے تو دلیلوں سے آدمی کی تشفی نہیں ہوتی۔ جس کے روپے لٹ گئے ہوں' اس کے لیے تقدیر یا ایشور کی مرضی کی دلیل کوئی معنی نہیں رکھتے۔ بازاری عورتوں کا دروازہ پر رشتہ دار کی حیثیت سے آنا اتنا شرمناک اور ذلت آمیز تھا کہ رامیندر کسی دلیل سے قائل ہو کر اسے قبول نہ کر سکتے تھے۔ نفرت دلیلوں کی محکوم نہیں۔ لاپروائی سے بولے۔

''میں ایسے آدمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ زہر اپنے گھر میں نہیں پھیلانا چاہتا۔''

اسی اثناء میں سلوچنا بھی کمرہ میں آ گئی۔ زچگی کا اثر ابھی چہرہ اور جسم پر باقی تھا۔ جسم لاغر تھا اور چہرہ زرد۔

رامیندر اسے دیکھ کر ذرا تیز ہو گئے۔ وہ اس پر ظاہر کر دینا چاہتے تھے کہ میں ایک حد تک جا سکتا ہوں۔ اس کے آگے میں کسی طرح قدم نہ اٹھاؤں گا۔ مجھے اس حد سے آگے لے جانے کی کوشش کامیاب نہ ہو گی بلکہ اس کا نتیجہ برا ہو گا۔ اسی سلسلہ میں بولے۔ ''میں یہ کبھی نہ گوارا کروں گا کہ کوئی بازاری عورت کسی وقت اور کسی حالت میں میرے گھر میں آئے۔ رات اس قید سے مستثنیٰ نہیں اور نہ تنہا یا صورت تبدیل کر کے آنے سے ہی اس برائی کا اثر دور ہو سکتا ہے۔ میں سوسائٹی کی حرف گیریوں سے نہیں ڈرتا۔ اس اخلاقی زہر سے ڈرتا ہوں۔ میرے ساتھ رہ کر تمام پرانے ناطے توڑ دینے پڑیں گے۔ کوئی حیلہ، کوئی عذر سننے کی مجھے تاب نہیں ہے۔''

سلوچنا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ بولی۔ ''کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس قید میں اکیلی جان دوں۔ کوئی تو ہو جس سے آدمی ہنسے بولے۔''

رامیندر نے گرم ہو کر کہا۔ ''ہنسنے بولنے کا شوق تھا تو میرے ساتھ شادی نہ کرنی چاہیے تھی۔ بواہ کا بندھن بڑی حد تک تیاگ کا بندھن ہے۔ جب تک دنیا کا یہ نظام قائم ہے اور عورت خاندان کی عزت و حرمت کی ذمہ دار اور امین سمجھی جاتی ہے، اس وقت تک کوئی مرد یہ نہ قبول کرے گا کہ اس کی بیوی ایسے آدمیوں سے کسی قسم کا تعلق رکھے جن کے اطوار اور کردار برے ہیں۔''

کنور صاحب کو معلوم ہو گیا کہ اس طرح رد و کد کرنے سے رامیندر اور سخت ہوتے جائیں گے اور اصلی منشا فوت ہو جائے گا۔ اس لیے انہوں نے زیادہ سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن بیٹا! یہ کیوں خیال کرتے ہو کہ ایک اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ عورت دوسروں کا اثر قبول کرے گی۔ اپنا اثر بالکل نہ ڈالے گی!''

رامیندر۔ ''ان معاملات میں میں تعلیم کا قائل نہیں۔ تعلیم ایسی کتنی ہی باتوں کو جائز قرار دیتی ہے جو رسم و رواج اور قدیم روایات کے اعتبار سے مذموم ہیں۔ فلسفہ ایک انسان اور دوسرے انسان میں کوئی تمیز نہیں کرتا۔ وہ شادی کو حیوانی ضرورت سمجھتا ہے اور اس معاملہ میں جذبات اور نازک احساسات کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ اگر پاؤں پھسل جائیں تو ہم انہیں کاٹ کر پھینک نہیں دیتے۔ پھر اگر جسم کا کوئی دوسرا حصہ لغزش کرے تو وہ کیوں بریدنی سمجھا جائے۔ یہ منطق کی دلیل ہے اور آپ مجھے معاف رکھیں۔ فی الحال میں اس دلیل کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں ہوں۔ میں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر پرانے تعلقات مٹا دینے پڑیں گے۔ اتنا ہی نہیں، دل کو ایسا بنا لینا پڑے گا کہ ایسی صحبتوں سے اسے خود کراہیت ہو۔ ہمیں اس طرح زندگی بسر کرنی پڑے گی کہ سماج اپنی غلطی پر نادم ہو اور خندہ پیشانی سے ہمارا خیر مقدم کرے۔ نہ یہ کہ ہم ایسا طرز معاشرت اختیار کریں جس سے دوسروں کو اپنے احتراز کو جائز سمجھنے کا موقع ملے۔''

سلوچنا نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ ''کوئی عورت اتنی بدگمانی کی متحمل نہیں ہو سکتی اور نہ وہ اس قید کو برداشت کر سکتی ہے۔ آپ کو کیا حق ہے کہ آپ اس کے رہنما بنیں؟ وہ آپ کی آنکھوں سے کیوں دیکھے؟ اسے یہ فیصلہ کرنے کا حق ہے کہ کیا چیز اس کے لیے مضر ہے اور کیا چیز مفید ہے؟''

کنور صاحب خائف ہو کر بولے۔ ''سلوچنا تم بھولی جاتی ہو کہ مباحثہ میں ہمیشہ ملائم الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ ہم جھگڑا نہیں کر رہے ہیں بلکہ ایک مسئلہ پر دوستانہ بحث کر رہے ہیں۔''

سلوچنا نے بے باکانہ انداز سے کہا۔ ''یہ دوستانہ مباحثہ نہیں ہے۔ میرے لیے بیڑیاں تیار کی جا رہی ہیں۔ میں ان بیڑیوں کو نہیں پہن سکتی۔ میں اپنے ضمیر کی آزادی کو اتنا ہی عزیز سمجھتی ہوں جتنا کوئی مرد سمجھتا ہے اور کسی

حالت میں اسے قربان نہیں کر سکتی۔"

رامیندر نے اپنی زیادتی کو محسوس کر کے کہا۔ "میں نے تمہارے ضمیر کی آزادی کو چھیننے کی کبھی کوشش نہیں کی اور نہ میں اتنا تنگدل ہوں لیکن تمہارے کسی فعل کو میں معیوب سمجھوں تو کیا تمہیں سمجھانے کا مجھے حق نہیں ہے؟"

سلوچنا۔ "اتنا ہی ہے جتنا تمہیں سمجھانے کا مجھے ہے۔ تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔"

رامیندر۔ "میں اسے تسلیم نہیں کر سکتا۔"

سلوچنا۔ "اگر میں اپنے کسی عزیز سے ربط و ضبط رکھوں تو آپ کی عزت میں خلل پڑتا ہے۔ کیا اسی طرح آپ یہ تسلیم کریں گے کہ آپ کسی بازاری عورت سے آمد و رفت رکھیں تو میری عزت میں خلل پڑتا ہے؟"

رامیندر۔ "ہاں، میں یہ مانتا ہوں۔"

سلوچنا۔ "آپ کا کوئی بھائی آجائے تو محض اس بنا پر کہ اس کا تعلق کسی بازاری عورت سے ہے، آپ اسے دروازہ سے دھتکار دیں گے؟"

رامیندر۔ "تم مجھے اس کے لیے مجبور نہیں کر سکتیں۔"

سلوچنا۔ "اور آپ مجھے مجبور کر سکتے ہیں؟"

رامیندر۔ "بے شک۔"

سلوچنا: "کیوں؟"

رامیندر۔ "اس لیے کہ میں اس چھوٹے سے خاندان کا جزوِ اعظم ہوں۔ اس لیے کہ تمہارے باعث ہی مجھے ......" رامیندر کہتے کہتے رک گئے مگر سلوچنا ان کے منہ سے نکلنے والے الفاظ تاڑ گئی۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا۔ گویا سینہ میں برچھی لگ گئی۔ جی میں بے اختیار ایک طوفان اٹھا کہ اسی وقت یہ گھر چھوڑ کر ساری دنیا سے ناطہ توڑ کر چلی جاؤں اور پھر انہیں منہ نہ دکھاؤں۔ اگر اسی کا نام شادی ہے کہ کسی ایک آدمی کی مرضی کی غلام ہو کر رہوں، وہ رات کو دن کہے تو اس کی ہاں میں ہاں ملاؤں تو اس شادی کو دور ہی سے سلام ہے۔

وہ طیش میں آکر کمرہ سے نکلی اور باہر کی طرف قدم اٹھایا مگر کنور صاحب نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور بولے۔ "کیا کرتی ہو بیٹا۔ گھر میں جاؤ۔ کیوں روتی ہو؟ ابھی تو میں زندہ ہی ہوں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ یہ تو نہیں جانتا لیکن جب تک زندہ ہوں، تمہیں کس بات کا غم ہے۔ رامیندر بابو نے کوئی ایسی بات نہیں کہی اور نہ کہنی چاہتے تھے۔ پھر آپس کی باتوں کا کیا برا ماننا۔ کسی موقع پر تم بھی جو جی میں آوے کہہ لینا۔"

یوں سمجھاتے ہوئے کنور صاحب اسے گھر میں لے گئے۔ حقیقتاً سلوچنا کے دل میں کبھی گلنار سے ملنے کی خواہش نہ ہوئی تھی۔ وہ اس سے خود احتراز کرتی تھی۔ ایک عارضی غصہ کی حالت میں اس نے گلنار کو وہ پرزہ لکھ دیا تھا مگر وہ خود سمجھتی تھی کہ ان لوگوں سے ربط و ضبط رکھنا مناسب نہیں لیکن رامیندر کی طرف سے یہ ممانعت ہوئی۔ یہی اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ یہ کیوں مجھے منع کریں، کیا میں اتنا بھی نہیں سمجھتی؟ کیا انہیں میری طرف سے اتنی بدگمانی تھی۔ یہ بدگمانی اسی لیے تو ہے کہ میں...... انہیں میرے ساتھ مطلق ہمدردی نہیں! صریح دیکھتے ہیں کہ دن بھر گھر میں پڑی رہتی ہوں۔ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد! تمہیں تو میری دل دہی کے لیے خود گلنار کو کبھی کبھی بلا لینا چاہیے تھا۔ مجھے خود اس سے مل آنے کے لیے تقاضا کرنا تھا۔ میں ایسی نادان نہ تھی کہ گلنار سے ملنے جاتی۔ یہ

سب تو کچھ نہ ہوا۔ الٹے اور گلا دبانے کو تیار! جسے محبت ہو، وہ کبھی اتنا بے درد نہیں ہو سکتا۔ محبت نہیں۔ بس بات یہی ہے۔ میں ابھی ابھی جاؤں گی۔ گلنار سے ملنے جاؤں گی۔ دیکھوں کوئی میرا کیا کرتا ہے!

پیار میں پلی ہوئی سلوچنا کو کبھی کسی نے تیکھی آنکھوں سے دیکھا تک نہ تھا۔ کنور صاحب اس کی مرضی کے غلام تھے۔ رامیندر بھی اتنے دنوں اس پر نثار ہوتے رہے۔ آج یکایک یہ جھڑکی اور پھٹکار پا کر اس کا خود سر دل الفت و محبت کے سارے رشتوں کو پیروں سے کچل ڈالنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا۔ وہ سب کچھ سہہ لے گی مگر یہ ذلت، یہ جبری قید، یہ دھونس اس سے نہ سہی جائے گی۔ اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر سائیس سے کہا۔ ''گاڑی تیار کرو، مجھے چوک جانا ہے۔ ابھی لاؤ۔''

کنور صاحب نے چمکار کر کہا۔ ''بیٹی سلو! کیا کرتی ہو؟ میرے اوپر ترس کھاؤ۔ اس وقت کہیں مت جاؤ ورنہ ہمیشہ کے لیے پچھتانا پڑے گا۔ رامیندر بابو بھی بڑے غصہ ور آدمی ہیں۔ انہیں کا کہنا مان لو۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں، تمہاری ماں جب زندہ تھی، بارہا ایسی نوبت آئی کہ میں نے اس سے کہا گھر سے نکل جاؤ مگر اس محبت کی دیوی نے کبھی ڈیوڑھی کے باہر پاؤں نہیں نکالا۔ اس وقت تحمل سے کام لو۔ مجھے یقین ہے کہ ذرا دیر میں رامیندر خود نادم ہو کر تمہارے پاس اپنی خطا معاف کرانے آئیں گے۔''

یکایک رامیندر نے آ کر پوچھا۔ ''گاڑی کیوں منگوائی؟ کہاں جا رہی ہو؟''

رامیندر کا چہرہ اتنا غضبناک ہو رہا تھا کہ سلوچنا سہم اٹھی۔ دونوں آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ نتھنے پھڑک رہے تھے۔ اسے یہ کہنے کی ہمت نہ پڑی کہ کہہ دے گلنار کے گھر جاتی ہوں۔ شاید اسے خوف ہوا گلنار کا نام لیتے ہی یہ میری گردن پر سوار ہو جائیں گے۔ حفظِ جان کا خیال غالب آیا، گردن جھکا کر بولی۔ ''ذرا اماں کے مزار تک جاؤں گی۔''

رامیندر نے تحکمانہ انداز سے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں وہاں جانے کی۔''

سلوچنا نے ناگن کی طرح پھنکار کر کہا۔ ''کیا اماں کے مزار کی زیارت کی بھی مخالفت ہے؟''

رامیندر نے اسی انداز سے کہا۔ ''ہاں۔''

سلوچنا۔ ''تو پھر اپنا گھر سنبھالو، میں جاتی ہوں۔''

رامیندر۔ ''جاؤ۔ تمہارے لیے کیا، یہ گھر نہ سہی دوسرا گھر سہی۔''

ابھی تک تسمہ باقی تھا، وہ بھی کٹ گیا۔ یوں شائد سلوچنا یہاں سے کنور صاحب کے بنگلہ پر جاتی۔ دو چار دن روٹھی رہتی۔ پھر رامیندر پرشادا سے منا لاتے اور معاملہ طے ہو جاتا لیکن اس چوٹ نے مصالحت اور تفہیم کی جڑ کاٹ دی۔ سلوچنا دروازہ تک پہنچی تھی، وہیں کھڑی رہ گئی۔ گویا سارے اعضاء مفلوج ہو گئے ہوں۔ گویا کسی رشی کے شراپ نے اس کے پران کھینچ لیے ہوں۔ وہیں بیٹھ گئی۔ کچھ جواب نہ دے سکی، کچھ سوچ نہ سکی۔ جس کے سر پر بجلی گر پڑی ہو، اس میں راکھ کے سوا اور کیا باقی رہ جاتا ہے۔ سوچنے والا دماغ کہاں، رونے والا دل کہاں، بولنے والی زبان کہاں؟ یہ سب تو جل کر راکھ ہو گئے۔ وہاں اب کیا ہے، رامیندر کے یہ الفاظ بجلی سے کہیں زیادہ قاتل تھے۔

سلوچنا کب تک وہاں بیٹھی رہی اسے کچھ خبر نہ تھی۔ جب اسے کچھ ہوش آیا تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گھڑی کی طرف نگاہ گئی۔ ایک بج رہا تھا۔ سامنے آرام کرسی پر کنور صاحب نوزائیدہ بچی کو گود میں لیے سو گئے تھے۔ برآمدہ میں دائی بیٹھی جمائیاں لے رہی تھی۔ سلوچنا نے اٹھ کر برآمدہ میں جھانکا۔ رامیندر اپنے پلنگ پر لیٹے ہوئے

تھے۔ اس کے جی میں آیا اسی وقت انہیں کے سامنے کلیجہ میں چھرا مار لوں اور انہیں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مر جاؤں۔ وہ مہلک الفاظ یاد آ گئے۔ ہائے! ان کے منہ سے وہ الفاظ نکلے کیونکر! اتنے مہذب اور بیدار مغز اور روشن خیال ہو کر بھی وہ زبان پر ایسے الفاظ کیونکر لا سکے! اس کی ساری نسائیت، ہندوستانی عصمت کی ازلی روایات میں پلی ہوئی' زمین پر مجروح پڑی اپنی بے کسی پر رو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اگر میرے نام پر یہ داغ نہ ہوتا، میں بھی شریف زادی ہوتی تو کیا یہ الفاظ ان کے منہ سے نکل سکتے۔ ہرگز نہیں لیکن میں بدنام ہوں، کمزور ہوں، بے کس ہوں، ذلیل ہوں۔ مجھے سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔

برآمدہ میں بجلی کی روشنی تھی۔ رامیندر کے چہرہ پر ندامت یا خجالت کا نام بھی نہ تھا۔ غصہ کی کرختگی اب بھی ان کے چہرہ پر مسلط تھی۔ شاید ان آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اب بھی سلوچنا کے مجروح دل کو تشفی ہوتی لیکن وہاں تو ابھی تک تلوار کھنچی ہوئی تھی۔

سلوچنا پھر الٹے قدم آئی۔ کنور صاحب کی آنکھیں اب بھی بند تھیں۔ چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید روتے روتے سو گئے تھے۔ سلوچنا نے ان کے پیروں کے پاس بیٹھ کر سچی عقیدت کے آنسو بہائے۔ ہاں مجھ بد نصیب کے لیے انہوں نے کتنی ذلتیں اٹھائیں، کتنی تکلیفیں سہیں۔ اپنی ساری زندگی مجھ پر نثار کر دی اور اس کا یہ حسرتناک انجام!

سلوچنا نے پھر بچی کو دیکھا مگر اس کا گلاب کا سا شگفتہ چہرہ دیکھ کر بھی اس کے دل میں مامتا نے جوش نہ مارا۔ اس نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ یہ اس ذلت کی یادگار ہے جو اتنے دنوں مجھے بھوگنی پڑی۔ میں اس کے لیے کیوں اپنی جان آفت میں ڈالوں۔ اگر اس کے باپ کو اس کی محبت ہے تو پالے اور ایک دن وہ بھی اس طرح ذلیل ہو جس طرح آج میرے دادا کو ذلیل ہونا پڑ رہا ہے۔

اس کے دل میں خیال آیا، صبح رامیندر سو کر اٹھیں گے تو مجھے روتے دیکھ کر ان کا دل کتنا خوش ہوگا! نہیں میں انہیں یہ خوشی نہ ہونے دوں گی۔ جان دینا ایسا کیا مشکل ہے اور پھر زندہ رہوں تو کس امید پر؟ اس طرح رو رو کر دن کاٹنے کے لیے نہیں۔ یوں جینا نہیں چاہتی۔ بہت جی چکی۔ اب دن دن اور زیادہ درگت ہو گی!

ایشور! اب کی جنم دینا تو کسی بھلے آدمی کے گھر جنم دینا۔ اس دنیا سے اور اس زندگی سے جی بھر گیا......

جہاں زہرہ کا مزار تھا، اس کے بغل میں ایک دوسرا مزار ہے۔ زہرہ کے مزار پر گھاس جم گئی ہے۔ جا بجا سے چونا گر گیا ہے لیکن دوسرا مزار بہت صاف ستھرا اور آراستہ ہے۔ اس کے چاروں طرف گملے رکھے ہوئے ہیں۔ چاروں طرف سرو کے درخت ہیں اور مزار تک جانے کے لیے ان درختوں کے بیچ سے روشیں بنی ہوئی ہیں۔ شام ہو گئی ہے۔ ایک آدمی ایک تین سال کی بچی کو گود میں لیے ہوئے آیا اور اس مزار کی خاکروبی کرنے لگا۔ لڑکی دوڑ کر تتلیاں پکڑنے لگی۔ اس آدمی نے جھاڑو لگائی، تب کنویں سے پانی کھینچ کر سینچنے لگا۔ روشوں میں جو پتیاں پڑی تھیں، وہ چن کر صاف کیں۔ یہ سلوچنا کا مزار ہے۔ اس کی آخری وصیت تھی کہ میری لاش جلائی نہ جاوے۔ مجھے میری ماں کے پہلو میں سلا دیا جائے۔ کنور صاحب تو سلوچنا کے بعد چھ مہینے سے زیادہ نہ چل سکے۔ رامیندر رسم قدیم نبھاتے جاتے ہیں۔ شوبھا اب تین سال کی ہو گئی ہے اور اسے یقین ہے کہ اس کی ماں ایک دن اسی مزار سے نکلے گی۔

ابھاگن

(1)

پرشرام۔ ”وہیں، وہیں، وہیں دالان میں ٹھہرو۔“

مریادا۔ ”کیوں کیوں، مجھ میں کچھ چھوت لگ گیا؟“

پرشرام۔ ”پہلے یہ بتاؤ کہ تم اتنے دنوں کہاں رہیں؟ کس کے ساتھ رہیں؟ کس طرح رہیں اور پھر یہاں کس کے ساتھ آئیں؟ تب...... تب سوچوں گا۔“

مریادا۔ ”کیاان باتوں کے پوچھنے کا یہی وقت ہے؟ پھر موقع نہ ملے گا؟“

”ہاں یہی بات ہے۔ تم سنان کر کے ندی سے تو میرے ساتھ ہی نکلی تھیں۔ میرے پیچھے پیچھے کچھ دور تک آئیں بھی۔ میں پھر پھر کر تمہیں دیکھتا جاتا تھا۔ پھر یکایک تم کہاں غائب ہو گئیں؟“

”تم نے دیکھا نہیں، ناگے سادھوؤں کی ایک ٹولی سامنے آگئی۔ سب لوگ ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ میں بھی ریلے میں پڑ کر جانے کدھر چلی گئی۔ جب ذرا بھیڑ کم ہوئی تو تمہیں ڈھونڈنے لگی۔ پر تم کہیں نظر نہ آئے۔“

”اچھا تب؟“

”تب میں ایک کنارے بیٹھ کر رونے لگی۔ کچھ سوجھ ہی نہ پڑتا تھا کہاں جاؤں، کس سے کہوں۔ شام تک وہیں بیٹھی روتی رہی۔“

”اتنا طول کیوں دیتی ہو؟ وہاں سے پھر کہاں گئیں؟“

”شام کو ایک آدمی نے آکر پوچھا۔ تمہارے گھر کے لوگ کھو تو نہیں گئے ہیں؟ میں نے کہا، ہاں۔ تب اس نے تمہارا نام، پتہ، ٹھکانہ پوچھا۔ اس نے سب ایک کتاب پر لکھ لیا اور مجھ سے بولا، میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچادوں گا۔“

”وہ کون آدمی تھا؟“

”وہاں کی سیوا سمتی کا کوئی والنٹیر تھا۔“

”تو تم اس کے ساتھ ہولیں؟“

”اور کیا کرتی۔ وہ مجھے سیوا سمتی کے دفتر میں لے گیا۔ وہاں ایک شامیانے میں لمبی ڈاڑھی والا آدمی بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہی ان والنٹیروں کا سردار تھا اور بھی کتنے ہی خدام وہاں کھڑے تھے۔ اس نے میرا پتہ ٹھکانہ ایک رجسٹر میں لکھ کر مجھے ایک علیحدہ شامیانہ میں بھیج دیا جہاں اور بھی کئی کھوئی ہوئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔“

”تم نے سردار سے اسی وقت کیوں نہ کہا کہ مجھے گھر پہنچا دو؟“

”میں نے ایک بار نہیں، سینکڑوں بار کہا مگر وہ یہی کہتے رہے کہ جب تک میلہ ختم نہ ہو جائے اور سب کھوئی ہوئی عورتیں جمع نہ ہو جائیں، میں تمہیں بھیجنے کا انتظام نہیں کر سکتا۔ میرے پاس نہ اتنے آدمی ہیں، نہ اتنے روپے۔“

”روپے کی تمہیں کیا کمی تھی۔ کوئی ایک سونے کی چیز بیچ دیتیں تو کافی روپے مل جاتے۔“

"آدمی تو نہیں تھے۔"

"تم نے یہ کہا تھا کہ خرچ کا تردد نہ کیجئے۔ میں اپنے زیور بیچ دوں گی؟"

"نہیں، یہ تو میں نے نہیں کہا۔"

"تمہیں اس وقت بھی زیور اتنے عزیز تھے؟"

"اور سب عورتیں کہنے لگیں، گھبرائی کیوں جاتی ہو؟ یہاں کسی بات کا ڈر نہیں ہے۔ ہم سبھی جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتے ہیں مگر کیا کریں، مجبوری ہے۔ میں بھی خاموش ہو رہی۔"

"اور سب عورتیں کنوئیں میں گر پڑتیں تو تم بھی گر پڑتیں؟"

"جانتی تو تھی کہ یہ لوگ دھرم کے ناتے میری حفاظت کر رہے ہیں۔ کچھ میرے غلام نہیں ہیں۔ پھر ضد کس منہ سے کرتی؟ یہ بات بھی ہے کہ بہت سی عورتوں کو وہاں دیکھ کر میری دلجمعی ہو گئی۔"

"ہاں اس سے بڑھ کر دلجمعی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟ اچھا وہاں کتنے دن اس دلجمعی اور اطمینان کا لطف اٹھاتی رہیں؟ میلہ تو دوسرے ہی دن اٹھ گیا ہو گا؟"

"رات بھر میں عورتوں کے ساتھ اسی شامیانے میں رہی۔"

"اچھا تم نے مجھے تار کیوں نہ دلوا دیا؟"

"میں نے سمجھا کہ جب یہ لوگ پہنچانے کا کہتے ہیں تو تار کیوں دوں؟"

"خیر رات بھر تم وہیں رہیں۔ نوجوان والنٹیر بار بار اندر آتے جاتے ہوں گے؟"

"صرف ایک بار ایک آدمی کھانے کے لیے پوچھنے آیا تھا۔ جب ہم سبھوں نے کھانے سے انکار کر دیا تو وہ چلا گیا اور پھر رات بھر کوئی نہ آیا۔ میں تو برابر جاگتی رہی۔"

"یہ میں کبھی نہ مانوں گا کہ وہاں اتنے نوجوان تھے اور کوئی اندر نہ گیا۔ سمتی کے لوگ آسمان کے فرشتے نہیں ہوتے۔ خیر وہ ڈڑھیل تو ضرور ہی دیکھ بھال کرنے آیا ہو گا؟"

"ہاں وہ آتے تھے مگر دروازہ پر سے پوچھ کر لوٹ جاتے تھے۔ ہاں جب ایک عورت کے پیٹ میں درد ہونے لگا تو دو تین بار دوا پلانے آئے تھے۔"

"نکلی نہ وہی بات۔ میں ان بدمعاشوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔ خاص کر تیلک اور مالا والے ڈڑھیلوں کی حرکتوں سے تو میں خوب واقف ہوں۔ تو یہ حضرت کئی بار دوائیں دینے گئے۔ کیوں تمہارے پیٹ میں تو درد نہیں ہونے لگا تھا؟"

"تم ایک بزرگ اور نیک آدمی سے خوامخواہ بدظن ہو رہے ہو۔ وہ بیچارے ایک تو میرے باپ کے برابر تھے، دوسرے برابر آنکھیں نیچی کیے رہتے تھے!"

"ہاں، وہاں سب دیوتا ہی دیوتا جمع تھے۔ خیر تم رات بھر وہاں رہیں۔ دوسرے دن کیا ہوا؟"

"دوسرے دن بھی وہیں رہی۔ ایک والنٹیر سب عورتوں کو ساتھ لے کر خاص خاص متبرک مقامات کی سیر کرانے لے گیا۔ دوپہر کو لوٹ کر ہم سب نے کھانا کھایا۔"

"تو وہاں تم نے سیر سپاٹا بھی خوب کیا۔ کوئی تکلیف نہ ہونے پائی۔ دعوت کے بعد گانا بجانا بھی ہوا ہو گا؟"

"گانا بجانا تو نہیں ہوا۔ ہاں سب اپنا اپنا دکھڑا روتی رہیں۔ شام تک میلہ اٹھ گیا تو دو سیوک ہم لوگوں کو

لے کر سٹیشن آئے۔"

"مگر تم تو آج ساتویں دن آ رہی ہو اور وہ بھی اکیلی؟"

"سٹیشن پر ایک حادثہ ہو گیا!"

"ہاں وہ تو میں سمجھ ہی رہا تھا، کیا حادثہ ہوا؟"

"جب ہمارے ساتھ کا سیوک ٹکٹ لینے جا رہا تھا تو ایک آدمی نے آ کر اس سے کہا۔ "یہاں گوپی ناتھ کی دھرم شالا میں ایک بابو جی ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی عورت کھو گئی ہے۔ ان کا بھلا سا نام ہے۔ یاد نہیں آتا۔ گورے گورے لمبے سے خوبصورت آدمی ہیں۔ لکھنؤ جھوائی ٹولے مکان ہے۔ تمہارا حلیہ اس نے ایسا ٹھیک بیان کیا کہ مجھے اس پر یقین ہو گیا۔ میں سامنے آ کر بولی۔ "تم بابو کو جانتے ہو؟" وہ ہنس کر بولا۔ "جانتا نہیں ہوں تو تمہیں تلاش کیوں کرتا پھرتا ہوں۔ تمہارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو رہا ہے۔" سب عورتیں کہنے لگیں، چلی جاؤ تمہارے شوہر گھبرا رہے ہوں گے۔ والنٹیر نے اس سے دو چار باتیں پوچھ کر مجھے اس کے ساتھ کر دیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں کسی شیطان کے پنجہ میں پھنسی جا رہی ہوں۔ دل میں خوش تھی کہ اب باسو کو دیکھوں گی۔ تمہارے درشن پاؤں گی۔ شاید اسی اشتیاق نے مجھے گمراہ کر دیا۔"

"تو تم اس آدمی کے ساتھ چل دیں۔ وہ کون تھا؟"

"کیا بتلاؤں کون تھا۔ کوئی دلال تھا۔"

"تمہیں یہ بھی نہ سوجھی کہ کہتیں جا کر بابو جی کو بھیج دو؟"

"مصیبت آتی ہے تو عقل پر پردہ پڑ جاتا ہے۔"

"دیکھو کوئی آ رہا ہے؟"

"میں غسل خانہ میں چھپی جاتی ہوں۔"

"آؤ بھابھی۔ کیا ابھی سوئی نہیں۔ دس تو بجے ہوں گے؟"

"باسدیو کو دیکھنے کو جی چاہتا تھا بھیا۔ کیا سو گیا؟"

"ہاں ابھی روتے روتے سو گیا ہے۔"

"کچھ مرجادا کی خبر بھی ملی؟ اب ملے بھی تو تمہارے کس کام کی؟ گھر سے نکلی ہوئی عورت تھان سے بھاگی ہوئی گھوڑی ہے جس کا کچھ بھروسا نہیں۔"

"کہاں سے کہاں میں اسے لے کر نہانے گیا۔"

"ہونہار ہے بھیا ہونہار! اچھا تو میں جاتی ہوں۔"

مرجادا باہر آ کر بولی "ہونہار نہیں، تمہاری چال ہے۔ باسدیو کو پیار کرنے کے بہانے تم اس گھر پر سکہ جمانا چاہتی ہو۔ تمہیں خوب سمجھتی ہوں۔"

پرشرام۔ "بکو مت، وہ دلال تمہیں کہاں لے گیا؟"

مرجادا۔ "میرے مالک! مجھ سے یہ نہ پوچھئے۔ مجھے کہتے شرم آتی ہے۔"

"یہاں آتے تو اور بھی شرم آنی چاہیے تھی۔"

"میں ایشور کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ میں نے کسی کو اپنا جسم چھونے نہیں دیا۔"

"دلال کا حلیہ بیان کر سکتی ہو؟"

"سانولا سا ٹھنگھنا آدمی تھا۔ نیچا کرتہ پہنے ہوئے تھا۔"

"گلے میں تعویذ بھی تھی؟"

"ہاں ہاں تھی۔"

"وہ دھرم سالہ کا مہتر تھا۔ میں نے اس سے تمہارے گم ہو جانے کا ذکر کیا تھا۔ اس بدمعاش نے یہ سوانگ رچا۔"

"مجھے تو وہ کوئی برہمن معلوم ہوتا تھا۔"

"نہیں، وہ مہتر تھا۔ تو وہ تمہیں اپنے گھر لے گیا؟"

"ہاں۔ اس نے مجھے تانگے پر بٹھایا اور ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹے سے مکان کے اندر لے جا کر بولا۔ "تم یہیں بیٹھو۔ تمہارے بابو جی یہیں آئیں گے۔" اب مجھے پتہ چلا کہ مجھے دھوکا دیا گیا۔ رونے لگی۔ وہ آدمی تھوڑی دیر کے بعد چلا گیا۔ ذرا دیر بعد ایک بڑھیا آئی اور مجھے پھسلانے لگی۔ میں نے اسے بہت پھٹکارا اور رات بھر روتی رہی۔ دوسرے دن پھر دونوں مجھے بہکانے لگے۔ کہنے لگے رو رو کر مر بھی جاؤ گی مگر یہاں کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔ تمہارا ایک گھر چھوٹ گیا۔ ہم تمہیں اس سے کہیں اچھا گھر دیں گے۔ جہاں تم سونے کے کور کھاؤ گی اور ہیروں سے لد جاؤ گی۔ جب میں نے دیکھا یہاں سے کسی طرح نہیں نکل سکتی تو میں نے ایک چال چلی۔"

"خیر سن چکا۔ میں تمہارا ہی کہنا مانے لیتا ہوں کہ تم نے اپنی عصمت کی حفاظت کی۔ پر مجھے اب تم سے نفرت ہو رہی ہے۔ تم میرے لیے اب وہ ہرگز نہیں ہو سکتیں جو پہلے تھیں۔ اس گھر میں تمہارے لیے جگہ نہیں ہے۔"

مرجادا نے رو کر کہا۔ "سوامی جی! یہ ستم نہ ڈھائیے۔ یوں کند چھری سے میرا گلا نہ ریتیئے۔ میں آپ کی وہی لونڈی ہوں جو پہلے تھی۔ سوچئے میری کیا حالت ہو گی۔"

"میں یہ سب سوچ چکا اور فیصلہ کر چکا۔ آج ایک ہفتہ سے یہی سوچ رہا ہوں۔ تم جانتی ہو، میں برادری کی پروا نہیں کرتا۔ چھوت چھات کو میں پہلے ہی خیر باد کہہ چکا ہوں۔ دیوی دیوتاؤں پر، مذہب کے رسوم پر مجھے ذرا بھی اعتقاد نہیں۔ پر جس عورت پر دوسروں کی نگاہیں پڑ چکیں جو ایک ہفتہ تک نہ جانے کہاں اور کس حالت میں رہی، اسے قبول کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ اگر یہ ظلم ہے، ستم ہے تو ایشور کی جانب سے ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔"

"میری بے کسی پر آپ کو ذرا بھی رحم نہیں آتا؟"

"جہاں نفرت ہے، وہاں رحم کہاں؟ میں تمہاری پرورش کا بار اٹھانے کو تیار ہوں۔ جب تک زندہ رہوں گا، تمہیں نان نفقہ کی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ پر اب تم میری بیوی نہیں ہو سکتیں۔"

"میں اپنے بیٹے کا منہ نہ دیکھوں اگر کسی نے میرے جسم کو ہاتھ بھی لگایا ہو۔"

"تمہارا کسی غیر مرد کے ساتھ ایک لمحہ بھی تخلیہ میں رہنا تمہاری عصمت میں داغ لگانے کو کافی ہے۔ یہ عجیب و غریب رشتہ ہے۔ رہے تو ابد تک رہے، ٹوٹے تو ایک پل میں ٹوٹ جائے۔ تمہی بتاؤ کسی مسلمان نے مجھے زبردستی اپنا جھوٹا کھلا دیا ہوتا تو تم مجھے قبول کرتیں؟"

"وہ...... وہ...... تو دوسری بات ہے...... یعنی......"

"نہیں۔ وہ بھی یہی بات ہے۔ جہاں جذبات کا تعلق ہے، وہاں بحث اور دلیل سے کام نہیں چلتا۔ یہاں

تک کہ اگر کوئی کہہ دے کہ تمہارے گھڑے کو مہتر نے چھولیا ہے تو تم وہ پانی ہرگز نہ پیو گی۔ اپنے دل سے سوچو، میں تمہارے ساتھ انصاف کر رہا ہوں یا ظلم؟"

"میں تمہاری چھوئی ہوئی چیزیں نہ کھاتی، تم سے الگ رہتی۔ پر تمہیں گھر سے تو نہ نکال سکتی تھی۔ مجھے اسی لیے دھتکار رہے ہو نا کہ تم گھر کے مالک ہو اور سمجھتے ہو کہ میں اس کی پرورش کرتا ہوں۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ میں اتنا کمینہ نہیں ہوں۔"

"تو یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں۔ آخری۔"

"جانتے ہو اس کا انجام کیا ہوگا؟"

"جانتا بھی ہوں اور نہیں بھی جانتا۔"

"مجھے باسدیو کو لے جانے دو گے؟"

"باسدیو میرا بیٹا ہے۔"

"اسے ایک بار پیار کر لینے دو؟"

"خوشی سے نہیں۔ ہاں تمہارا جی چاہے تو دور سے دیکھ سکتی ہو۔"

مرجادا دو تین منٹ تک سکتہ کے عالم میں کھڑی رہی جیسے اپنی عمر بھر کی کمائی، اپنی ساری بساط، ساری کائنات سینہ کے اندر سے ٹٹول کر نکال رہی ہو۔ جیسے اسے شبہ ہو رہا ہو کہ یہ وہی میرا گھر، یہ وہی میرا شوہر ہے، یہ وہی میرا لڑکا ہے یا کوئی خواب ہے، کوئی طلسم، کوئی سراب!

دفعتاً اس نے آپ ہی آپ کہا۔ "تو جانے دو۔ بچے کو بھی نہ دیکھوں گی۔ سمجھ لوں گی کہ بیوہ بھی ہوں اور بانجھ بھی۔ تقدیر! لے چل جہاں تیرا جی چاہے!"

دیوی

(1)

پن بابو کے لیے عورت دنیا کی سب سے حسین شے تھی۔ وہ شاعر تھے اور ان کے شاعرانہ تخیل کے لیے نسوانی حسن اور شباب کا ذکر ہی سب سے دلآویز مشغلہ تھا۔ جب سے ہوش سنبھالا تب ہی سے انہوں نے اس حسینہ کا تصور کرنا شروع کیا جو ان کے دل کی رانی ہوگی۔ اس میں طلوعِ سحر کی شگفتگی ہوگی، پھول کی نزاکت، کندن کی چمک، بسنت کی فرحت، کوئل کی آواز، وہ سارے شاعرانہ اوصاف سے مزیّن ہوگی۔ وہ اسی تصور کے دلدادہ تھے۔ اپنی غزلوں میں اسی کو مخاطب کرتے۔ دوستوں سے اسی کا چرچا کرتے اور ہمیشہ اسی خیال میں مست رہتے تھے۔ وہ دن بھی قریب آ گیا تھا جب ان کی آرزوئیں ہرے ہرے پتّوں سے لہرائیں گی۔ اس باغ میں بہار کے دن آئیں گے۔ کالج کا آخری امتحان ختم ہو گیا تھا اور شادی کے پیغام آنے لگے تھے۔

(2)

شادی طے ہو گئی۔ پن بابو نے عروس کو ایک نظر دیکھنے کی بہت ضد کی لیکن جب ان کے ماموں نے یقین دلایا کہ لڑکی نہایت حسین ہے تو خاموش ہو گئے۔ دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔ دلہن زیوروں سے لدی ہوئی منڈپ میں لائی گئی تو اس کے ہاتھ پاؤں نظر آئے۔ کتنی نازک اور خوبصورت انگلیاں تھیں! اعضا کا تناسب کتنا دلکش تھا! پن باغ باغ ہو گئے۔ دوسرے دن رخصتی ہو گئی۔

پن بابو دیدار کے لیے بے قرار تھے۔ بار بار اپنے گھوڑے کو دلہن کی پالکی کے پاس لاتے تھے لیکن درشن نہ ہوتے تھے۔ پالکی پر موٹا پردہ پڑا ہوا تھا۔ چلتے چلتے دو پہر ہو گئی۔ کہاروں نے ایک درخت کے سایہ میں پالکی اتار دی اور چنا چبینہ کرنے کے لیے کنویں پر چلے گئے۔ پن کو منہ مانگی مراد ملی۔ چپکے سے دلہن کے پاس جا پہنچے۔ وہ پالکی سے سر نکالے، گھونگھٹ ہٹائے باہر جھانک رہی تھی۔ پن نے اسے دیکھا اور سر پیٹ لیا۔ نفرت، غصہ اور مایوسی نے جیسے ان کے دل کو کچل دیا۔ یہ وہ حسن و نزاکت کی دیوی نہ تھی جس کی وہ برسوں سے پرستش کر رہے تھے۔ یہ ایک چوڑے منہ، چپٹی ناک اور پھولے رخساروں والی مکروہ عورت تھی جس پر صنفِ نازک کا کسی طرح بھی اطلاق نہ ہو سکتا تھا۔ پن کی ساری مستی رخصت ہو گئی۔ آہ! اس بھاگوان کو میرے ہی گلے پڑنا تھا کیا! کیا اس کے لیے دنیا میں اور کوئی شوہر نہ ملتا تھا! انہیں اپنے ماموں پر غصہ آیا جس نے عروس کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے تھے مگر خیریت ہوئی کہ وہ اس وقت وہاں نہ تھے۔ پن سوچنے لگا، میں اس عورت سے کیسے بولوں گا۔ کیسے اس کے ساتھ یہ زندگی بسر کروں گا۔ اس کی طرف تو تاکنے ہی سے نفرت ہوتی ہے۔ ایسی مکروہ صورتیں بھی دنیا میں ہیں اس کی اسے خبر نہ تھی۔ کیا منہ ایشور نے بنایا ہے! کیا آنکھیں ہیں۔ لاحول ولا قوۃ!

(3)

پن زندگی سے بیزار تھا۔ وہ اپنے ماموں سے لڑا۔ سسر کو ایک طولانی عتاب نامہ لکھا۔ ماں باپ سے ردو کد کی اور آخر گھر سے بھاگ جانے کے منصوبے باندھنے لگا۔ آشا پر اسے رحم آتا تھا۔ وہ اپنے تئیں سمجھاتا کہ اس میں اس غریب کی کیا خطا ہے۔ اس نے زبردستی تو مجھ سے شادی نہیں کی لیکن یہ رحم اور تحمل اس نفرت پر غالب نہ آسکتا تھا جو آشا کو دیکھتے ہی اس کے رگ رگ میں سرایت کر جاتی تھی۔ آشا اپنے اچھے سے اچھے کپڑے پہنتی، طرح طرح کے بال سنوارتی، گھنٹوں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرتی لیکن پن کو یہ شتر غمزے معلوم ہوتے تھے۔ کئی کئی دن گھر میں نہ آتا۔ وہ یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ اس کا بیاہ ہو گیا ہے۔

ایک دن کھانا کھانے کے وقت آشا نے اس سے کہا۔ ”اب تو آپ کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ کیا میرے کارن گھر چھوڑ دیجئے گا؟“

پن نے منہ پھیر کر کہا۔ ”گھر ہی پر تو رہتا ہوں۔ آج کل نوکری کی تلاش ہے۔ اسی لیے دوڑ دھوپ زیادہ کرنی پڑتی ہے۔“

آشا۔ ”کسی ڈاکٹر سے میری صورت کیوں نہیں بنوا دیتے۔ سنتی ہوں آج کل منہ سدھارنے والے ڈاکٹر

پیدا ہو گئے ہیں۔"

پتن۔ "کیوں ناحق چڑاتی ہو۔ کھانے دو گی یا نہیں!"

آشا۔ "آخر اس مرض کی دوا کون کرے گا؟"

پتن نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس مرض کی دوا نہیں ہے۔ جو کام ایشور سے نہ ہو سکا وہ آدمی کیا کرے گا؟"

آشا۔ "یہ تو تمہی سوچو کہ ایشور کی غلطی کی مجھے سزا دے رہے ہو۔ دنیا میں کون ایسا آدمی ہے جسے اچھی صورت بری لگتی ہو لیکن تم نے سنا ہے کہ کسی عورت نے اپنے شوہر کو محض بد صورت ہونے کے باعث چھوڑ دیا؟ شاید دوسرے ملکوں میں عورتیں اتنی صورت پرست ہوں، یہاں تو نہیں ہیں۔"

پتن نے بگڑ کر کہا۔ "کیوں ناحق سر کھا رہی ہو۔ میں تم سے بحث تو نہیں کر رہا ہوں۔ دل پر جبر نہیں کیا جا سکتا اور نہ دلیلوں کا ہی اس پر کچھ اثر ہوتا ہے۔ میں تمہیں کچھ کہتا تو نہیں ہوں، پھر کیوں مجھ سے حجت کرتی ہو!"

آشا یہ جھڑکی سن کر چلی گئی۔ اسے معلوم ہو گیا کہ انہوں نے ہمیشہ کے لیے میری طرف سے اپنا دل سخت بنا لیا ہے۔

(4)

پتن تو روز سیر سپاٹے کرتے۔ کبھی کبھی رات رات بھر غائب رہتے۔ ادھر آشا فکر اور غم سے گھلتے گھلتے بیمار پڑ گئی لیکن پتن بھول کر بھی اسے دیکھنے نہ جاتے، تیمار داری تو دور رہی۔ اتنا ہی نہیں۔ وہ دل میں مناتے تھے کہ یہ مر جاتی تو گلا چھوٹتا۔ اب کی خوب دیکھ بھال کر اپنی پسند کی شادی کرتا۔

اب وہ اور بھی کھل کھیلے۔ پہلے آشا سے کچھ دبتے تھے۔ کم سے کم یہ خیال رہتا تھا کہ کوئی میری حرکات پر نگاہ رکھنے والا بھی ہے۔ اب وہ خیال بھی غائب ہو گیا۔ یہاں تک پینگ بڑھے کہ مردانے کمرے ہی میں احباب کے جمگھٹ ہونے لگے لیکن نفس پرستی صرف دولت کا ستیاناس نہیں کرتی۔ اس سے کہیں زیادہ قوائے ذہنی و جسمانی کا ستیاناس کر دیتی ہے۔ پتن کے چہرے پر زردی چھا گئی۔ جسم لاغر ہو گیا۔ پسلیوں کی ہڈیاں نکل آئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے۔ اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ بناؤ سنوار کرتے۔ روز تیل ملتے، خط صاف کرتے، کپڑے بدلتے۔ پر چہرہ پر وہ چمک اور سرخی نہ تھی جو صحت کی برکت ہے۔ رنگ و روغن سے کیا ہو سکتا تھا۔

ایک دن آشا برآمدے میں چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ ادھر ہفتوں سے اس نے پتن کو نہ دیکھا تھا۔ آج انہیں دیکھنے کا جی چاہا۔ اسے خوف تھا کہ وہ نہ آئیں گے، پھر بھی وہ اس خواہش کو دور نہ کر سکی۔ پتن کو بلا بھیجا۔ پتن کو بھی اس پر کچھ رحم آ گیا۔ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ آشا نے ان کے چہرہ کی طرف دیکھا تو چونک پڑی۔ وہ اتنے لاغر ہو گئے تھے کہ پہچاننا مشکل تھا۔ بولی۔ "کیا تم بھی بیمار ہو گیا؟ مجھ سے بھی زیادہ گھل گئے ہو۔"

پتن نے بے دلی سے کہا۔ "اونہہ، زندگی میں رکھا ہی کیا ہے کہ زندہ رہنے کی فکر کروں؟"

آشا۔ "زندہ رہنے کی فکر نہ کرنے سے بھی کوئی اتنا دبلا نہیں ہو جاتا۔ تم اپنی کوئی دوا کیوں نہیں کرتے؟"

یہ کہہ کر اس نے پتن کا ہاتھ پکڑ کر اپنی چارپائی پر بٹھا لیا۔ پتن نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ ان کا مزاج آج بہت نرم ہو گیا تھا۔ غصہ یا وحشت یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہیں تھا۔ آشا کو ایسا معلوم ہوا کہ ان کی

آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے ہیں۔

پن چارپائی پر بیٹھے ہوئے بولے۔ ”میری دوا اب موت کرے گی۔ میں تمہیں جلانے کے لیے نہیں کہتا۔ ایشور جانتا ہے میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا مگر اب میں زیادہ نہ جیوں گا۔ مجھے کسی خوفناک بیماری کے آثار نظر آرہے ہیں۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے ہے۔ مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں تمہاری کچھ خدمت نہ کر سکا۔ کبھی کبھی بیٹھے بیٹھے میرا دل ڈوب جاتا ہے۔ غشی سی آجاتی ہے۔“

یہ کہتے کہتے وہ یکایک کانپ اٹھے۔ سارے جسم میں رعشہ آگیا۔ غش کھا کر چارپائی پر گر پڑے اور ہاتھ پاؤں پٹکنے لگے۔ اعضاء میں تشنج ہونے لگا۔ منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ جسم پسینہ سے تر ہو گیا۔

آشا کی بیماری غائب ہو گئی۔ وہ مہینوں سے بستر نہ چھوڑ سکتی تھی۔ پر اس وقت اس کے نحیف اعضاء میں ایک برقی قوت دوڑ گئی۔ اس نے تیزی سے اٹھ کر پن کو سنبھالا اور ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے دینے لگی۔ گھر بھر میں ہلچل پڑ گئی۔ باہر خبر ہوئی۔ دوستوں نے دوڑ کر ڈاکٹر کو بلایا۔ کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ پن نے آنکھیں نہ کھولیں۔ شام ہوتے ہوتے ان کا منہ ٹیڑھا ہو گیا اور جسم کا بایاں حصہ بے جان ہو گیا۔ ہلنا تو دور رہا، منہ سے بات تک نکلنی مشکل ہو گئی۔ یہ غشی نہ تھی، فالج کا دورہ تھا۔

(5)

فالج کے مریض کی تیمارداری آسان نہیں ہے۔ اس پر آشا خود مہینوں سے بیمار تھی لیکن اس مرض کے سامنے وہ اپنی بیماری بھول گئی۔ اس کی بیماری جسمانی نہیں، روحانی تھی۔ روح کا جسم سے تعلق ہے۔ اس لیے جسم پر اس کا اثر پڑنا لازمی تھا۔ دو ہفتہ تک پن کی حالت بہت نازک رہی۔ زندگی اور موت میں برابر کشمکش ہوتی رہی۔ آشا دن کے دن اور رات کے رات ان کی خدمت میں لگی رہتی۔ وقت پر دوا پلانا، ان کے ذرا ذرا اشاروں کو سمجھنا اور کھانے پینے کے متعلق ڈاکٹر کی حرف بحرف تعمیل کرنا اسی کا کام تھا۔ اپنا سر درد سے پھٹا کرتا، بخار سے جسم پھنکا جاتا، پر اس کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔

آخر پن کی حالت کچھ سنبھلی۔ ان کا بایاں پیر تو مفلوج ہو گیا، چہرہ کی کجی بھی بدستور قائم تھی۔ پر توتلی زبان میں کچھ بولنے لگے تھے۔ ان کا مردانہ حسن خاک میں مل گیا تھا۔ چہرہ اتنا ٹیڑھا ہو گیا تھا جیسے کوئی ربڑ کے کھلونے کو کھینچ کر بڑھا دے۔ بیڑی کی مدد سے ذرا دیر کے لیے بیٹھ یا کھڑے تو ہو جاتے تھے لیکن چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی۔

ایک دن لیٹے لیٹے انہیں نجانے کیا خیال آیا۔ آئینہ لے کر اپنا منہ دیکھنے لگے۔ ایسی مکروہ صورت انہوں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ خود ڈر گئے۔ غمناک لہجہ میں بولے۔ ”آشا! بھگوان نے مجھے غرور کی سزا دے دی۔ یہ اسی بدسلوکی کا بدلہ ہے جو میں نے تمہارے ساتھ کی ہے۔ اب اگر میری طرف دیکھ کر تم نفرت سے منہ پھیر لو تو مجھے ذرا بھی شکایت نہ ہوگی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے اس کمینہ پن......“

آشا نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”میں تو آپ کو اب بھی اسی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ مجھے تو آپ میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔“

پن۔ "واہ! بندر کا سامنہ نکل آیا ہے۔ تم کہتی ہو کوئی فرق ہی نہیں۔ میں تو اب کبھی باہر نہ نکلوں گا۔ ایشور نے مجھے وہی سزا دی جس کا میں مستحق تھا۔"

(6)

بہت علاج معالجہ کیا گیا مگر پن کا منہ نہ سیدھا ہوا۔ ہاں پیروں میں اتنی طاقت آ گئی کہ اب وہ چلنے پھرنے لگے۔

آشا نے ان کی بیماری میں کچھ منتیں مانی تھیں۔ آج وہی تقریب تھی۔ محلّہ کی عورتیں جمع تھیں۔ گانا بجانا ہو رہا تھا۔ ایک سہیلی نے پوچھا۔ "کیوں آشا ایک بات پوچھوں، برا تو نہ مانو گی؟ اب تو تمہیں ان کا منہ ذرا بھی اچھا نہ لگتا ہوگا؟" آشا نے متین انداز سے کہا۔ "مجھے تو پہلے سے کہیں اچھا لگتا ہے۔"

"چلو باتیں بناتی ہو!"

"نہیں بہن! سچ کہتی ہوں۔ صورت کے بدلے مجھے ان کا دل مل گیا جو صورت سے کہیں قیمتی ہے۔"

پن اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کئی دوست جمع تھے۔ تاش ہو رہا تھا۔

کمرے میں ایک کھڑکی تھی جو آنگن میں کھلتی تھی۔ ایک دوست نے اسے چپکے سے کھول دیا اور جھانک کر بولے۔ "آج تو تمہارے یہاں پریوں کا اچھا جمگھٹا ہے۔"

پن۔ "بند کر دو۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"ذرا ٹھہرو بھی۔ دیکھنے دو۔ کیسی اچھی اچھی صورتیں ہیں۔ تمہیں ان سبھوں میں کون سب سے اچھی معلوم ہوتی ہے؟"

پن نے اڑتی ہوئی نظروں سے آنگن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "وہی جو تھال میں پھول رکھ رہی ہے۔"

"واہ ری آپ کی نگاہ! سبحان اللہ! کیا صورت کے ساتھ تمہاری نگاہ بھی بدل گئی۔ مجھے تو وہ سب سے بدصورت معلوم ہوتی ہے۔"

"اس لیے کہ تم اس کا ظاہر دیکھ رہے ہو اور میں اس کا باطن دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھا۔ تو یہی حضور کی اہلیہ ہیں؟"

"جی ہاں۔ یہ وہی دیوی ہے جس پر میں ہزاروں پریوں کو قربان کر سکتا ہوں۔"

حسرت

(1)

رات بھگت مال پڑھتے پڑھتے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ کیسے کیسے عارف کامل تھے جن کے لیے خدا کی

بندگی ہی سب کچھ تھی جو اسی میں محو رہتے تھے۔ ایسی معرفت بڑے ریاض سے نصیب آتی ہے۔ کیا میں وہ ریاض نہیں کر سکتی؟ اس زندگی میں میرے لیے اور کیا ہے؟ جسے زیوروں سے الفت ہو وہ جانے' یہاں تو انہیں دیکھ کر آنکھیں پھوٹتی ہیں۔ جو زر و مال پر جان دیتا ہو وہ جانے' یہاں تو اس کے ذکر ہی سے بخار سا چڑھ جاتا ہے۔ کل پگلی سوشیلا نے کتنے امنگوں سے میرا سنگار کیا تھا۔ کتنی محبت سے میرے بالوں میں پھول گوندھے تھے۔ کتنا منع کرتی رہی، نہ مانی۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ جتنی دیر اس کے ساتھ ہنسی تھی، اس سے کہیں زیادہ دیر تک روئی۔ دنیا میں ایسا بھی کوئی آدمی ہے جو اپنی بیوی کی آرائش اور سنگار دیکھ کر سر سے پاؤں تک جل اٹھے! کون ایسی عورت ہے جو اپنے شوہر کے منہ سے یہ الفاظ سنے۔ تم میری عاقبت بگاڑو گی اور کچھ نہیں۔ تمہارے رنگ ڈھنگ کہے دیتے ہیں اور اس کا دل زہر کھا لینے کو نہ چاہے مگر دنیا میں ایسے آدمی بھی ہیں۔ میں نیچے چلی گئی اور بھگت مال پڑھنے لگی۔ اب کرشن ہی کی سیوا کروں گی، انہیں کو اپنا سنگار دکھاؤں گی۔ وہ تو دیکھ کر نہ جلیں گے۔ وہ تو میرے دل کا حال جانتے ہیں!

(2)

ایشور! میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں! تم علیم ہو، میرے دل کا حال جانتے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ ان کے اشارہ پر چلوں۔ انہیں میرے کسی فعل سے، میرے کسی برتاؤ سے شکایت نہ ہو۔ وہ بے قصور ہیں۔ میرے ماں باپ کی بھی کوئی خطا نہیں۔ میری تقدیر میں جو کچھ لکھا تھا، وہ ہوا لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں انہیں گھر میں آتے دیکھتی ہوں تو میرا دل بیٹھ جاتا ہے۔ چہرہ پر مردنی سی چھا جاتی ہے۔ دل میں ایک گرمی سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ شاید دشمن کو دیکھ کر بھی کسی کے دل میں اتنی تپش نہ ہوتی ہوگی۔ وہ دو ایک دن کے لیے کہیں چلے جاتے ہیں تو دل پر سے ایک بوجھ سا اٹھ جاتا ہے۔ ہنستی بھی ہوں، بولتی بھی ہوں۔ زندگی میں کچھ مزہ آنے لگتا ہے لیکن ان کے آنے کی خبر پاتے ہی پھر وہی مردنی، وہی حسرت، وہی تپش! دل کی حالت ایسی کیوں ہے، کہہ نہیں سکتی! مجھے تو ایسا گمان ہوتا ہے کہ شاید زندگی سابق میں میرے اور ان کے درمیان قلبی منافرت تھی۔ اسی منافرت کا انتقام لینے کے لیے انہوں نے مجھ سے شادی کی ہے۔ ہمارے دلوں پر وہی دیرینہ جذبات غالب ہیں۔ نہیں تو وہ مجھے دیکھ کر کیوں جلتے اور میں ان کی صورت سے کیوں بیزار رہتی۔ شادی کا تو یہ منشا نہیں ہوا کرتا۔ میں اپنے گھر اس سے کہیں خوش تھی۔ شاید میں اپنے گھر زندگی بھر آرام سے رہتی مگر اس رواج کا برا ہو جو لڑکیوں کو کسی نہ کسی مرد کے گلے باندھ دینا لازمی سمجھتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ کتنی بدنصیب عورتیں اس کے نام کو رو رہی ہیں۔ ارمانوں اور تمناؤں سے بھرے ہوئے کتنے دل اس کے بے رحم پیروں تلے روندے جا رہے ہیں۔ عورت کے لیے اس کا شوہر کتنے شیریں تخیلات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ مرد میں جو کچھ حامد ہے، مستحسن ہے، قابلِ ستائش ہے۔ اس کی زندہ تصویر اس لفظ کی یاد آتے ہی اس کی نظروں کے سامنے آکر کھڑی ہو جاتی ہے لیکن میرے لیے یہ لفظ کیا ہے؟ جگر کی ایک خلش' پہلو میں چبھنے والی ایک پھانس، آنکھوں میں کھٹکنے والی کرکری، دل کو تڑپانے والا کلمۂ سخت۔ سوشیلا کو ہمیشہ بشاش دیکھتی ہوں۔ ہمیشہ شگفتہ، وہ کبھی اپنی عسرت کا گلہ نہیں کرتی۔ گہنے نہیں ہیں، کپڑے نہیں ہے۔ بھاڑے کے ایک چھوٹے سے مکان میں رہتی ہے۔ اپنے ہاتھوں گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ پھر بھی اس کے ماتھے پر کبھی میل نہیں دیکھتی۔ اگر اپنے بس کی

بات ہوتی تو آج اپنی دولت کو اس کے افلاس سے بدل لیتی۔ اپنے پیارے شوہر کو مسکراتے ہوئے گھر میں آتے دیکھ کر اس کی ساری فکر، ساری بے دلی کافور ہو جاتی ہے۔ سینہ میں پھر یریاں سی اڑنے لگتی ہیں۔ ان کی ایک ہم آغوشی میں وہ کیفیت ہے جس پر تینوں لوک کی دولت کو قربان کر دوں۔

(3)

آج مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے پوچھا۔ ''آخر تم نے مجھ سے کس لیے شادی کی تھی۔؟'' یہ سوال مہینوں سے میرے دل میں تڑپ رہا تھا۔ پر ضبط کرتی چلی آتی تھی۔ آج پیالہ لبریز ہو گیا۔ وہ کچھ بوکھلا سے گئے۔ جیسے کسی نے ان کی پگڑی اتار لی ہو۔ کھیسیں نکال کر بولے۔ ''گھر سنبھالنے کے لیے، گرہستی کا بوجھ اٹھانے کے لیے اور نہیں کیا عیش اڑانے کے لیے۔'' گھرنی کے بغیر یہ گھر آپ کو بھوت کا ڈیرا سا معلوم ہوتا تھا۔ نوکر چاکر گھر کی چیزیں غائب کر دیتے ہیں جو چیز جہاں رہتی تھی وہیں پڑی رہ جاتی تھی۔ کوئی دیکھنے والا نہ تھا۔ تو اب معلوم ہوا کہ میں اس گھر کی حفاظت کرنے کے لیے لائی گئی ہوں۔ مجھے اس گھر کی چوکیداری کرنی چاہیے اور اپنی قسمت کو سراہنا چاہیے کہ یہ ساری جائیداد میری ہے۔ خاص چیز دولت ہے۔ میں تو محض خزانہ کا سانپ ہوں۔ ایسے گھر میں آج ہی آگ لگ جائے۔ سب کچھ جل کر خاک سیاہ ہو جائے۔ اب تک تو میں تقاضائے بشری سے یہاں تک نگرانی کرتی تھی۔ اتنی تو نہیں جتنی وہ چاہتے ہیں، پر کچھ نہ کچھ ضرور کرتی تھی لیکن اب کسی چیز کو نہ چھونے کی قسم کھاتی ہوں۔ یہ میں جانتی ہوں، کوئی آدمی گھر کی حفاظت کے لیے شادی نہیں کرتا اور ان حضرت نے مجھے چڑانے کے لیے یہ بات کہی لیکن سوشیلا ٹھیک کہتی ہے۔ عورت کے بغیر انہیں گھر سونا سونا لگتا ہوگا۔ جیسے پنجرے سے چڑیا اڑ گئی ہو۔ یہ ہے ہم لوگوں کی خوش نصیبی!

(4)

معلوم نہیں مجھ پر اتنا شبہ کیوں ہوتا ہے۔ جب سے تقدیر اس گھر میں لائی ہے، انہیں برابر اپنی طرف شبہ آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پاتی ہوں۔ اس کی وجہ؟ ذرا بال سنوارے اور ان کے تیوروں پر بل پڑے۔ ذرا کھڑکی کے سامنے کھڑی ہوئی اور انہیں بخار چڑھا۔ کہیں آتی نہیں، کہیں جاتی نہیں۔ کسی سے بولتی نہیں، پھر بھی اتنا شبہ۔ یہ ذلت اب نہیں سہی جاتی۔ مجھے یہ اتنی چھچھوری سمجھتے ہیں! سوشیلا ہاٹ بازار بھی جاتی ہے۔ میلے ٹھیلے بھی دیکھتی ہے۔ باغ باغیچوں میں بھی گھومتی ہے۔ اس کا شوہر خوش ہوتا ہے۔ یہاں بد گمانی کی جاتی ہے۔ شاید یہ حضرت سمجھتے ہیں کہ میں پنجرے سے نکل کر بھاگنا چاہتی ہوں۔ اپنے اختیار کے باہر کوئی کام کر بیٹھنے سے ہمارے دل کی یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ فقیر مسندِ شاہی پر بیٹھ کر کبھی چین کی نیند نہیں سو سکتا۔ اسے در و دیوار سے بھی بے وفائی کی بو آئے گی۔ میں سمجھتی ہوں جوان بیویوں کے بوڑھے شوہروں کا یہی حال ہوتا ہے۔

آج سوشیلا کے اصرار سے میں ٹھاکر جی کی جھانکی دیکھنے جا رہی تھی۔ اب یہ معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ پھوہڑ پن بہو بن کر باہر نکلنا اپنی ہنسی اڑانا ہے لیکن آپ اسی وقت نہ جانے کدھر سے ٹپک پڑے اور میری

طرف سخت نگاہوں سے دیکھ کر بولے۔ ''کہاں کی تیاری ہے؟''
میں نے کہہ دیا۔ ''ٹھاکر کی جھانکی دیکھنے جا رہی ہوں۔'' یہ سنتے ہی تیوریاں چڑھا کر بولے۔ ''تمہارے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جو عورت اپنے شوہر کی خدمت نہیں کر سکتی، اسے دیوتاؤں کے درشن سے ثواب کے بدلے عذاب ہوتا ہے۔ مجھ سے اڑنے چلی ہے! کل کی چھوکری! میں عورتوں کی رگ رگ پہچانتا ہوں۔''
ایسا غصہ آیا کہ بس اب کیا کہوں۔ اسی وقت کپڑے اتار ڈالے اور ٹھان لی کہ اب کبھی درشن کرنے نہ جاؤں گی۔ اس بدگمانی کی بھی کوئی انتہا ہے۔ ان کی بدگمانی کا جواب تو یہی تھا کہ اسی وقت گھر سے چل کھڑی ہوتی۔ پھر دیکھتی میرا کیا کر لیتے ہیں مگر صبر عورت کا خمیر ہے۔
انہیں میری دل گرفتگی اور انقباض پر تعجب ہوتا ہے۔ شاید مجھے دل میں احسان فراموش سمجھتے ہیں۔ اتنی کثیر جائیداد اور اتنی دولت دیکھ کر مجھے پھولا نہ سمانا چاہیے تھا۔ آٹھوں پہر ان کا جس گاتے رہنا چاہیے تھا۔ میں یہ تو کرتی نہیں۔ الٹے منہ لٹکائے رہتی ہوں۔ ہے یہ تعجب کی بات یا نہیں۔ کبھی کبھی مجھے ان پر رحم آتا ہے۔ یہ کیا جانیں کہ عورت کی زندگی میں کوئی ایسی بھی چیز ہے جسے کھو کر اس کی نظروں میں جنت بھی دوزخ ہو جاتی ہے۔

(5)

تین دن سے بیمار ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں بچنے کی کوئی امید نہیں۔ نمونیا ہو گیا ہے۔ پر مجھے نہ جانے کیوں مطلق غم نہیں ہے۔ میں اتنی سنگدل کبھی نہ تھی۔ میرے دل کا درد نہ جانے کہاں چلا گیا۔ کسی بیمار کو دیکھ کر میرا دل رقت سے پگھل جاتا تھا۔ میں کسی کا رونا نہیں سن سکتی تھی۔ وہی میں ہوں کہ آج تین دن سے انہیں بغل کے کمرے میں پڑے کراہتے سنتی ہوں اور ایک بار بھی دیکھنے نہ گئی۔ آنکھ میں آنسو کا ذکر ہی کیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے ان سے میرا کوئی ناتا نہیں۔ مجھے کوئی بے وفا سمجھے، دغا شعار سمجھے، بے عصمت سمجھے، پر مجھے تو یہ کہنے میں ذرا بھی شرم نہیں آتی کہ ان کی بیماری سے مجھے حاسدانہ مسرت ہوتی ہے۔ انہوں نے مجھے یہاں قید کر رکھا ہے۔ میں اسے شادی کے پاکیزہ نام سے موسوم نہ کروں گی۔ یہ قید ہی ہے۔ میں اتنی فراخدل نہیں ہوں کہ جس نے مجھے قید میں ڈال رکھا ہو، اس کی پوجا کروں۔ جو مجھے لات مارے اس کے پیروں کو چوموں۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے ایشور انہیں میرے ساتھ یہ بے رحمی کرنے کی سزا دے رہے ہیں۔ میں بے حجاب ہو کر کہتی ہوں کہ میری ان کے ساتھ شادی نہیں ہوئی۔ عورت کسی کے گلے باندھ دیئے جانے سے ہی بیاہتا نہیں ہو جاتی۔ وہی تعلق شادی کہلانے کا مستحق ہے جس میں کم سے کم ایک بار تو دل نشۂ محبت سے مخمور ہو جائے۔ سنتی ہوں حضرت اپنے کمرے میں پڑے پڑے مجھے کوسا کرتے ہیں۔ اپنی بیماری کا سارا ابخار مجھ پر نکالتے ہیں لیکن یہاں اس کی پروا نہیں۔ جس کا جی چاہے یہ جائیداد لے جائے۔ دولت لے جائے، مجھے ضرورت نہیں۔

(6)

آج تین مہینے ہوئے میں بیوہ ہو گئی۔ کم سے کم لوگ یہی کہتے ہیں۔ جس کا جو جی چاہے سمجھے۔ پر میں تو

اپنے کو جو کچھ سمجھتی ہوں، وہ سمجھتی ہوں۔ میں نے چوڑیاں نہیں توڑیں۔ کیوں توڑ دوں؟ مانگ میں سیندور پہلے بھی نہ ڈالتی تھی۔ اب بھی نہیں ڈالتی۔ بوڑھے بابا کی تکفین ان کے سپوت بیٹے نے کی۔ میں پاس تک نہ پھٹکی۔ گھر میں لوگ سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ کوئی میری مانگ چوٹی دیکھ کر ناک سکوڑتا ہے۔ کوئی میرے زیوروں کو دیکھ کر آنکھیں مٹکاتا ہے۔ میرے ہونٹوں کی سرخی پر کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے۔ انہیں چڑانے کے لیے میں اور بھی خوش رنگ ساڑھیاں پہنتی ہوں اور بھی بنتی سنورتی ہوں۔ مجھے غم کیوں ہو۔ میں تو قید سے چھوٹ گئی۔ ادھر کئی دن بعد سوشیلا کے گھر گئی۔ چھوٹا سا مکان ہے۔ نہ کوئی آرائش، نہ سجاوٹ، نہ کوئی فرنیچر۔ چارپائیاں تک نہیں۔ پر سوشیلا کتنے چین سے رہتی ہے۔ اس کی زندگی پر کیوں نہ رشک آئے۔ جب دیکھو آنکھیں مسکراتی رہتی ہیں۔ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا ہے۔ باتوں سے پریم کے پھول جھڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ خوشی چاہے کتنی ہی عارضی کیوں نہ ہو، دل پر ہمیشہ کے لیے ایک نقش چھوڑ جاتی ہے۔ اسے کوئی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس کی یاد آخر تک روح کو معطر کرتی رہتی ہے۔ دل کے تاروں کو آخر تک مرتعش رکھتی ہے۔

ایک دن میں نے سوشیلا سے کہا۔ "اگر تیرا شوہر تجھے چھوڑ کر پردیس چلا جائے تو تو شاید روتے روتے مر جائے۔"

سوشیلا نے متین انداز سے جواب دیا۔ "نہیں بہن! مروں گی نہیں۔ ان کی یاد میری روح کو تازہ رکھے گی۔ چاہے انہیں برسوں لگ جائیں۔"

میں بھی ویسی ہی محبت کی پیاسی ہوں۔ اسی خلش، اسی تڑپ کے لیے میں بھی بے چین ہوں۔ میں بھی ایسی ہی کوئی چوٹ چاہتی ہوں جس سے دل کے تار ہمیشہ بجتے رہیں۔

(7)

رات روتے روتے ہچکیاں بندھ گئیں۔ نہ جانے کیوں دل بھر بھر آتا تھا۔ اپنی زندگی ایک کفِ دست ریگستان سی، بے برگ و بار معلوم ہو رہی تھی۔ جہاں بگولوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ کہیں ہریالی نہیں، کہیں تازگی نہیں۔ گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ جی ایسا بے چین ہو رہا تھا کہ کہیں اڑ جاؤں۔ آج کل سیر تماشے کی جانب بھی دل راغب نہیں ہوتا۔ کیا چاہتی ہوں میں خود نہیں جانتی لیکن میں جو نہیں جانتی' وہ میرے ایک ایک عضو کو معلوم ہے۔ میں اپنے تخیلات کی زندہ تصویر ہوں۔ میرا ایک ایک عضو میرے دردِ نہاں کا آئینہ بنا ہوا ہے۔

(8)

میرے دل کا اضطراب اس حد تک پہنچ گیا ہے جب آدمی کو بدنامی کی نہ شرم رہتی ہے اور نہ خوف۔ جن حریص ماں باپ نے مجھے کنوئیں میں دھکیلا، جس بے رحم نے میری مانگ میں سیندور ڈالنے کا سوانگ کیا، ان کے لیے میرے دل سے بار بار بددعا نکلتی ہے۔ میں انہیں شرمندہ کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے منہ میں کالکھ لگا کر ان کا منہ کالا کرنا چاہتی ہوں۔ میں اپنی جان دے کر انہیں قتل کرانا چاہتی ہوں۔ میری بے کسی غائب ہو گئی ہے۔ میرے دل میں

انتقام کا شعلہ دہک رہا ہے۔
گھر کے سب آدمی سو رہے ہیں۔ میں چپکے سے نیچے اتری، دروازہ کھولا اور گھر سے نکلی۔ جیسے کوئی آدمی گرمی سے بیتاب ہو کر گھر سے نکلے اور کسی کھلی ہوئی جگہ کی طرف دوڑے۔ اس مکان میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔
سڑک پر سناٹا تھا۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ دفعتاً ایک بڑھیا نظر آئی۔ میں ڈری کہیں چڑیل نہ ہو۔ اس نے میرے قریب آ کر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور بولی۔ ''بیٹی کس کی راہ دیکھ رہی ہو؟''
میں نے چڑ کر کہا۔ ''موت کی۔''
بڑھیا۔ ''تمہارے نصیب میں تو ابھی زندگی کے بڑے سکھ لکھے ہیں۔ اندھیری رات گزر گئی، صبح کا اجالا نظر آ رہا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''اندھیرے میں بھی تمہاری آنکھیں اتنی تیز ہیں کہ نوشتہ تقدیر پڑھ لیتی ہو؟''
بڑھیا۔ ''آنکھوں سے نہیں بیٹا، عقل سے پڑھتی ہوں۔ دھوپ میں چونڈے نہیں سفید کیے ہیں۔ تمہارے برے دن گئے اور اچھے دن آ رہے ہیں۔ ہنسو مت بیٹا۔ یہی کام کرتے اتنی عمر گزر گئی۔ اسی بڑھیا کی بدولت جو عورتیں ندی میں ڈوبنے جا رہی تھیں، وہ آج سکھ کے سیج پر سو رہی ہیں۔ جو زہر کا پیالہ پینے کو تیار تھیں، وہ آج دودھ کی کلیاں کر رہی ہیں۔ اسی لیے اتنی رات گئے نکلتی ہوں کہ اپنے ہاتھوں کسی بدنصیب کا بھلا ہو جائے تو کر دوں۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتی، بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے۔ صرف یہی آرزو ہے کہ اپنے ہاتھوں کسی کی بھلائی ہو جائے۔ جنہیں دولت کی آرزو ہے انہیں دولت، جنہیں اولاد کی آرزو ہے انہیں اولاد۔ بس اور کیا کہوں۔ وہ منتر بتا دیتی ہوں کہ ساری تمنائیں پوری ہو جائیں۔''
میں نے کہا۔ ''مجھے نہ دولت کی آرزو ہے، نہ اولاد کی۔ میری تمنا تمہارے بس کی بات نہیں۔''
بڑھیا ہنسی۔ ''بیٹی جو تم چاہتی ہو، وہ میں جانتی ہوں۔ تم وہ چیز چاہتی ہو جو دنیا میں سب سے نایاب ہے۔ جو دولت و ثروت کو حقیر سمجھتی ہے اور روکھی روٹیوں میں مگن رہتی ہے۔ جو کبھی اتنی مضبوط ہے کہ ساری دنیا کی طاقت اسے جیت نہیں سکتی اور کبھی اتنی کمزور کہ ایک لفظ اسے جڑ سے کھود سکتا ہے۔ تم محبت کی پیاسی ہو۔ میں تمہیں اس کشتی پر بٹھا سکتی ہوں جو تمہیں منزل مقصود پر پہنچا دے۔''
میں نے اشتیاق سے کہا۔ ''تمہارا گھر کہاں ہے اماں؟''
بڑھیا۔ ''بہت نزدیک ہے بیٹی۔ تم چلو تو میں اپنی آنکھوں پر بٹھا کر لے چلوں۔''
مجھے ایسا معلوم ہوا کہ یہ امید کی دیوی ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔
اس کے بعد کیا ہوا، اس کا ذکر نہ کروں گی۔ اس بڑھیا نے مجھے دغا دیا۔ میں سوشیلا بننا چاہتی تھی، وہ تقدیر میں نہ تھا لیکن اس گری ہوئی حالت میں بھی میں اس سے کہیں زیادہ خوش ہوں جتنی اس وقت تھی، جب میں سہاگن تھی۔ ہنستی تو نہیں لیکن روتی بھی نہیں۔ ہاں ایک حسرت ہمیشہ دل پر چھائی ہوئی رہتی ہے۔
سوشیلا کی یاد برابر آتی رہتی ہے۔ کتنی پاکیزہ تھی اس کی زندگی! اس مسرت کی ایک چٹکی میرے لیے اکسیر ہو سکتی ہے لیکن وہ چٹکی کون دے گا۔ مجھے تو اب ایسا کوئی دیوتا یا ولی نہیں دکھائی دیتا۔ سوشیلا کو دیکھ کر اب شاید میرا سر خود بخود جھک جائے گا۔

چکمہ

(1)

پنڈت بالک رام شاستری کی بیوی مایا کو بہت دنوں سے ایک ہار کی تمنا تھی اور وہ سینکڑوں ہی بار پنڈت جی سے اس کا تقاضا کر چکی تھی مگر پنڈت جی ہمیشہ حیلے حوالے کرتے رہتے تھے۔ یہ تو صاف صاف نہ کہتے میرے پاس روپے نہیں ہیں...... اس سے وقارِ شوہری پر حرف آتا تھا...... دلیلوں کی پناہ لیا کرتے تھے۔ زیور ایک روگ ہے۔ ایک تو دھات خالص نہیں ملتی۔ اس پر سنار روپے کے آٹھ آنے کر دیتا ہے اور سب سے بڑی علت یہ ہے کہ گھر میں زیور رکھنا چوروں کو بیعانہ دینا ہے۔ لمحہ بھر کی آرائش کے لیے اتنا دردِ سر خریدنا جاہلوں کا کام ہے۔ بیچاری مایا منطق نہ پڑھی تھی۔ ان اعتراضوں کے سامنے لاجواب ہو جاتی۔ پڑوسوں کے زیور دیکھ دیکھ کر اس کا جی للچایا کرتا تھا مگر اپنا قصۂ غم کس سے کہے؟ اگر پنڈت جی ذرا جفاکش ہوتے تو یہ مشکل آسان ہو جاتی۔ پر وہ آلسی آدمی تھے۔ وقت کا بیشتر حصہ کھانے اور سونے میں صرف کرتے تھے۔ بیوی کے طعنے منظور تھے۔ اقربا سے آنکھیں چرانی منظور تھیں مگر نیند کی مقدار میں کمی غیر ممکن تھی۔

(2)

ایک دن پنڈت جی پاٹھ شالے سے آئے تو دیکھا کہ مایا کے گلے میں ایک ہار براج رہا ہے۔ ہار کی چمک سے اس کے چہرہ پر ایک عجیب رونق آگئی تھی۔ پوچھا "یہ ہار کس کا ہے؟"

مایا بولی۔ "پڑوسن میں جو بابو جی رہتے ہیں، انہیں کی عورت کا ہے۔ آج ان سے ملنے گئی تھی۔ یہ ہار دیکھا تو بہت پسند آیا۔ تمہیں دکھانے کے لیے پہن کر چلی آئی۔ بس ایسا ہی ایک ہار مجھے بنوا دو۔"

پنڈت۔ "غیر کی چیز ناحق مانگ لائیں۔ کہیں گم ہو جائے تو تاوان تو دینا ہی پڑے۔ بدنامی اوپر سے ہو۔"

مایا۔ "میں تو ایسا ہی ہار لوں گی۔ بیس تولے کا ہے۔"

پنڈت۔ "پھر وہی ضد!"

مایا۔ "جب سبھی پہنتی ہیں تو میں کیوں نہ پہنوں؟"

پنڈت۔ "سب کنوئیں میں گر پڑیں تو تم بھی گر پڑو گی؟ اس ہار کے بنوانے میں 600 روپے لگیں گے۔ اگر ایک روپیہ سینکڑہ بھی سود رکھ لیا جائے تو پانچ سال میں 600 کے ایک ہزار ہو جائیں گے لیکن پانچ برس میں ہار مشکل سے 300 کا رہ جائے گا۔ اتنا بڑا نقصان اٹھا کر ہار پہننے میں کیا مزہ ہے۔ یہ ہار واپس کر دو۔ کھانا کھاؤ اور آرام سے لیٹو۔"

یہ کہتے ہوئے پنڈت جی باہر چلے گئے۔

(3)

رات کو یکایک مایا نے شور مچا کر کہا۔ ''چور! چور! گھر میں چور۔ مجھے گھسیٹے لیے جاتا ہے۔''

پنڈت جی ہک بکا کر اٹھے اور بولے۔ ''کہاں؟ کہاں؟ دوڑو! دوڑو! چور چور!''

مایا۔ ''میری کوٹھری میں گیا ہے۔ میں نے اس کی پرچھائیں دیکھی ہیں۔''

پنڈت۔ ''لالٹین جلاؤ۔ ذرا میری لکڑی بھی اٹھاتی لانا۔''

مایا۔ ''مجھے تو ڈر لگتا ہے۔''

کئی آدمی باہر سے بولے۔ ''کہاں ہے پنڈت جی؟ کوئی سیند پڑی ہے کیا ہے؟''

مایا۔ ''نہیں سیند نہیں پڑی۔ کھپریل پر سے اترے ہیں۔ میری نیند کھلی تو کوئی میرے اوپر جھکا ہوا تھا۔ ہائے رام! یہ تو ہار ہی لے گیا۔ پہنے پہنے سو گئی تھی۔ موئے نے گردن سے نکال لیا! ہائے رام!''

پنڈت۔ ''تم نے ہار اتار کیوں نہ دیا تھا؟''

مایا۔ ''میں کیا جانتی تھی کہ آج ہی یہ غضب پڑے گا! ہائے رام! اب کیسے منہ دکھاؤں گی!''

پنڈت۔ ''اب ہائے ہائے کرنے سے کیا ہوگا؟ اپنی تقدیر کو روؤ۔ اسی لیے کہا کرتا تھا کہ سب دن برابر نہیں جاتے۔ نہ جانے کب کیا ہو جائے۔ اب آئی سمجھ میں میری بات؟ یا اب بھی شبہ ہے۔ دیکھ لو اور کچھ تو نہیں لے گیا؟''

پڑوسی لالٹین لے کر آ پہنچے۔ گھر کا کونا کونا دیکھا، کڑیاں دیکھیں۔ اگواڑا پچھواڑا دیکھا۔ جائے ضرور میں جھانکا۔ کہیں چور کا پتہ نہ تھا۔

ایک پڑوسی۔ ''کسی گھر کے بھیدیے کا کام ہے!''

دوسرا۔ ''بنا گھر کے بھیدیے کے کبھی چوری ہوتی ہی نہیں۔ اور کچھ تو نہیں لے گیا؟''

مایا۔ ''اور کچھ تو نہیں لے گیا۔ برتن سب پڑے ہیں۔ صندوق بھی بند ہے۔ نگوڑے کو لے ہی جانا تھا تو میری چیز لے جاتا، پرائی چیز ٹھہری۔ اب کیسے کیا ہوگا بھگوان!''

پنڈت۔ ''گہنے کا مزہ مل گیا نا؟''

مایا۔ ''ہائے رام۔ یہ اپجس بدا تھا اور تم جلے پر نمک چھڑکتے ہو۔ ابھاگے میرے گھر کا ایک ایک تنکا چن لیتے تو مجھے رنج نہ ہوتا۔ ابھی بیچاری نے نیا ہار بنوایا تھا۔''

پنڈت۔ ''خوب معلوم ہے بیس تولے کا تھا؟''

مایا۔ ''بیس ہی تولے تو کہتی تھیں۔''

پنڈت۔ ''بدھیا بیٹھ گئی اور کیا۔''

مایا۔ ''کہہ دوں گی گھر میں چوری ہو گئی۔ کیا جان لیں گے؟ اب ان کے لیے کوئی چوری تھوڑے ہی کرنے جائے گا۔''

پنڈت۔ ''تمہارے گھر سے چیز گئی، تمہیں دینی پڑے گی۔ انہیں اس سے کیا مطلب کہ چور اٹھا لے گئے یا تم نے رکھ لیا۔ پتیا ئینگی ہی نہیں۔''

مایا۔ ''تو اتنے روپے کہاں سے آئیں گے؟ ہانڈی بھر ہوتے ہوں گے۔''

پنڈت۔ ”کہیں نہ کہیں سے تو آئیں گے ہی۔ نہیں تو لاج کیسے رہے گی مگر تم نے کی بہت بڑی غلطی۔“
مایا۔ ”بھگوان سے مانگے کی چیز بھی نہ دیکھی گئی۔ میرے سر شیطان سوار تھا۔ نہیں تو گھڑی بھر گلے میں ڈال لینے سے ایسا کون سا سکھ مل گیا۔ میں ہوں ہی ابھاگنی۔“
پنڈت۔ ”اب پچھتانے اور اپنے کو کوسنے سے کیا فائدہ۔ چپ ہو کے بیٹھو۔ پڑوسن سے کہہ دینا گھبراؤ نہیں۔ تمہاری چیز جب تک لوٹا نہ دیں گے، ہمیں چین نہ آئے گا۔“

(4)

پنڈت بالک رام کو اب شب و روز ہار کی فکر ستانے لگی۔ یوں اگر ٹاٹ الٹ دیتے تو کوئی بات نہ تھی۔ پڑوسن کو صبر کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہوتا۔ برہمن سے تاوان کون لیتا لیکن پنڈت جی برہمنی کی شان کو اتنے سستے داموں نہ بیچنا چاہتے تھے۔ ان کی آرام طلبی غائب ہوگئی۔ فکر زر میں منہمک ہوگئے۔
چھ مہینے تک انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کر لیا۔ پہلے پاٹھ شالے سے آکر آرام کرتے تھے۔ براہمنوں کے لیے آمدنی کے جو ایک سو ایک دروازے کھلے ہوئے ہیں، ان میں سے وہ کسی کی طرف رخ نہ کرتے تھے۔ پر اب پاٹ شالے سے آکر ایک جگہ بھاگوت کی کتھا کہنے جاتے۔ وہاں سے لوٹ کر گیارہ بجے رات تک بیٹھے زائچے، برس پھل وغیرہ بنایا کرتے۔ علی الصبح مندر میں درگا پاٹھ کرنے جاتے۔ مایا ان کی یہ مصروفیت دیکھ کر دل میں پچھتاتی کہ میں نے کہاں سے کہاں یہ چال چلی۔ کہیں بیمار پڑ جائیں تو لینے کے دینے پڑیں۔ ان کے جسم کو لاغر ہوتے دیکھ کر اسے اب ان کی صحت کی فکر ہونے لگی۔ اسی طرح پانچ مہینے گزر گئے۔
ایک دن شام کو وہ چراغ بتی کرنے جا رہی تھی کہ پنڈت جی آئے۔ جیب سے ایک کیس نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا اور بولے۔ ”لو آج تمہارے قرض سے سبکدوش ہو گیا۔“
مایا نے کیس کھولا تو اس میں سونے کا ہار تھا۔ اس کی چمک دمک، وضع قطع دیکھ کر اس کے دل میں گدگدی ہونے لگی۔ چہرہ پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی۔ خائف نظروں سے دیکھ کر بولی۔ ”خوش ہو کر دے رہے ہو یا ناراض ہو کر؟“
پنڈت۔ ”اس سے کیا مطلب۔ قرض تو چکانا ہی پڑے گا۔ خوشی سے ہو یا ناخوشی سے۔“
مایا۔ ”یہ قرض نہیں ہے۔“
”اور کیا ہے؟ بدلہ سہی۔“
”بدلہ بھی نہیں ہے۔“
”پھر کیا ہے؟“
”تمہاری...... نشانی۔“
”تو کیا قرض ادا کرنے کے لیے دوسرا ہار بنوانا پڑے گا؟“
”نہیں جی۔ وہ ہار چوری نہیں ہو گیا تھا۔ میں نے جھوٹ موٹ شور مچایا تھا۔“
”سچ!“
”ہاں۔ سچ کہتی ہوں۔“

"میری قسم؟"
"تمہارے چرن چھو کر کہتی ہوں۔"
"تو تم نے مجھے چکمہ دیا؟"
"ہاں۔"
"خیر۔ کسی طرح تمہاری مراد تو بر آئی مگر ایشور کے لیے پھر ایسا چکمہ نہ دینا۔"

جنت کی دیوی

(1)

لیلا نے جس دن سسرال میں قدم رکھا اسی دن سے اس کا امتحان شروع ہوا۔ وہ سبھی کام جس کی اس کے گھر تعریف ہوتی تھی یہاں ممنوع تھے۔ اسے بچپن سے تازہ ہوا پر جان دینا سکھلایا گیا تھا۔ یہاں منہ کھولنا بھی گناہ تھا۔ بچپن سے سکھایا گیا تھا کہ روشنی ہی زندگی ہے۔ یہاں روشنی ہوّا تھی۔ کمروں میں کھڑکیاں تک نہ تھیں۔ روشنی اندر نہ آجائے گی! مجال کیا کہ بہو اپنی اندھیری کوٹھری کے دروازہ پر کھڑی ہو جائے یا کبھی چھت پر ٹہل سکے۔ ساس جی دنیا سر پر اٹھا لیتیں۔ انہیں بکنے کا مرض تھا۔ دال میں ذرا سا نمک کا زیادہ ہونا ان کی زبان کو دن بھر مصروف رکھنے کے لیے کافی تھا۔ موٹی تازی خاتون تھیں۔ چھینٹ کا گھیر دار لہنگا پہنے 'پاندان بغل میں رکھے' گہنے سے لدی ہوئی سارے دن برو ٹھے میں بیٹھی رہتی تھیں۔ کیا مجال کہ گھر کے اندر ان کی مرضی کے خلاف ایک پتّی بھی ہلے! بہو کی نئی نئی عادتیں دیکھ کر جلتی رہتی تھیں۔ اب کاہے کو آبرو رہے گی۔ نہ جانے اس کے دیس میں کون لوگ بستے ہیں! گہنے نہیں پہنتی، رنگین کپڑے نہیں بھاتے۔ یہ بھی کوئی اچھے لچھن ہیں۔ لیلا کے پیچھے سیتا سرن پر بھی پھٹکار پڑتی۔ تجھے چاندنی میں سونا اچھا لگتا ہے، کیوں؟ تو بھی اپنے کو مرد کہے گا؟ وہ مرد کیا کہ عورت اس کے کہنے میں نہ رہے! دن بھر گھر میں گھسا رہتا ہے۔ منہ میں زبان نہیں ہے! سمجھاتا کیوں نہیں؟

سیتا سرن کہتا۔ "اماں جب کوئی میرے سمجھانے سے مانے تب تو!"

ماں۔ "مانے گی کیوں نہیں۔ مرد وہ چاہیے کہ کڑی نگاہ سے دیکھ لے تو عورت کانپ اٹھے۔"

سیتا سرن۔ "تم تو سمجھاتی ہی رہتی ہو۔"

ماں۔ "میری اسے کیا پروا۔ سمجھتی ہو گی بڑھیا چار دن میں مر جائے گی، تب تو میں مالکن ہو ہی جاؤں گی۔"

سیتا سرن مسکرایا۔ شاید اماں کا بس ہوتا تو وہ مرنے کے بعد بھی بہو کو مالکن نہ ہونے دیتیں۔ مرتیں ہی کیوں؟

گرمی کے دن تھے اور شام کا وقت۔ باہر ہوا چلتی تھی۔ اندر جسم پھنکا جاتا تھا۔ لیلا اندر بیٹھی ایک کتاب دیکھ رہی تھی کہ سیتا سرن نے آکر کہا۔ "یہاں تو بڑی گرمی ہے، باہر بیٹھو۔"

لیلا۔ "یہ گرمی ان طعنوں سے ٹھنڈی ہے جو ابھی سننے پڑیں گے۔"

سیتاسرن۔ ”آج اگر وہ بولیں تو میں بھی بگڑ جاؤں گا۔“
لیلا۔ ”تب تو میرا گھر میں رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔“
سیتاسرن۔ ”بلا سے، الگ رہیں گے۔“
لیلا۔ ”میں تو مر بھی جاؤں تو الگ ہونے کا نام نہ لوں۔“
سیتاسرن نے اس کی طرف ہمدردانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”تمہیں اس گھر میں آکر بہت دکھ سہنا پڑا لیلا۔ میں تمہارے لائق نہ تھا۔ تم نے پہلے جنم میں ضرور کوئی پاپ کیا تھا۔“
لیلا نے شوہر کے ہاتھوں سے کھیلتے ہوئے شرما کر کہا۔ ”یہاں نہ آتی تو تم کہاں ملتے؟“

(2)

پانچ سال گزر گئے۔ لیلا دو بچوں کی ماں ہو گئی۔ لڑکے کا نام جانکی سرن، لڑکی کا کامنی۔ دونوں بچے گھر کو گلزار کیے رہتے تھے۔ لڑکی دادا سے ملتی تھی۔ لڑکا دادی سے۔ دونوں شوخ اور شریر تھے۔ گالی دے بیٹھنا، منہ چڑا دینا تو ان کی معمولی حرکت تھی۔ دن بھر کھاتے اور آئے دن بیمار پڑے رہتے۔ لیلا نے خود تو سبھی آفتیں جھیل لی تھیں لیکن لڑکوں کی عادت کا بگڑنا اسے بہت برا معلوم ہوتا تھا مگر اس کی سنتا کون تھا۔ بچوں کی ماں ہو کر اب گھر میں اس کی کوئی ہستی ہی نہ تھی۔ جو کچھ تھے بچے تھے۔ اسے کسی بچے کو ڈانٹنے کا مجاز نہ تھا۔ ساس پھاڑ کھاتی تھی۔

سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اس کی صحت اب اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ زچہ خانہ میں اسے وہ سبھی مظالم سہنے پڑے جو جہالت، رسم اور ضعیف الاعتقادی نے زچہ کی حفاظت کے لیے گھڑ رکھے ہیں۔ اس کال کوٹھڑی میں جہاں نہ ہوا کا گزر تھا، نہ روشنی کا، نہ صفائی کا۔ چاروں طرف عفونت، سیل اور گندگی بھری ہوئی تھی۔ اس کا نازک جسم گھل گیا۔ ایک بار جو کسر رہ گئی تھی، وہ دوسری بار پوری ہو گئی۔ چہرہ زرد پڑ گیا۔ آنکھیں دھنس گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا، بدن میں خون ہی نہیں رہا۔ صورت ہی بدل گئی۔

گرمیوں کے دن تھے۔ ایک طرف آم پکے، دوسری طرف خربوزے۔ ان دونوں پھلوں کی ایسی اچھی فصل پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اب کی ان میں اتنی مٹھاس نہ جانے کہاں سے آگئی تھی کہ کتنا ہی کھاؤ جی نہ بھرے۔ سنت سرن کے علاقہ سے خربوزے اور آم کے ٹوکرے بھرے چلے آتے تھے۔ سارا گھر خوب اچھل اچھل کھاتا تھا۔ بابو صاحب پرانی ہڈی کے آدمی تھے۔ سویرے ایک سیکڑے آموں کا ناشتہ کرتے۔ پھر پنسیری بھر خربوزے چٹ کر جاتے۔ مالکن بھی ان سے پیچھے رہنے والی نہ تھیں۔ ایک وقت کا کھانا بند کر دیا۔ اناج سڑنے والی چیز نہیں۔ آج نہیں کل خرچ ہو جائے گا۔ آم اور خربوزے تو ایک دن بھی نہیں ٹھہر سکتے۔ شدنی تھیں اور کیا۔ یونہی ہر سال دونوں چیزوں کی ریل پیل ہوتی تھی۔ پر کسی کو کبھی کوئی شکایت نہ ہوتی تھی۔ کبھی معدہ میں گرانی معلوم ہوئی تو ہڑ کی پھنکی مار لی۔ ایک دن سنت سرن کے پیٹ میں میٹھا میٹھا درد ہونے لگا۔ آپ نے اس کی پروانہ کی۔ آم کھانے بیٹھ گئے۔ سیکڑا پورا کر کے اٹھے ہی تھے کہ قے ہو گئی۔ گر پڑے۔ پھر تو تِل تِل پر قے اور دست ہونے لگے۔ ہیضہ ہو گیا۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ پر اس کے آنے سے پہلے بابو صاحب چل بسے۔ لوگ لاش کو سپرد خاک کر کے لوٹے تو مالکن کو بھی قے اور دست ہو رہے تھے۔ پھر دوڑ دھوپ شروع ہوئی لیکن سورج نکلتے نکلتے وہ بھی سدھار گئیں۔ میاں بیوی میں کبھی

مفارقت نہ ہوئی تھی۔ سنسار سے بھی ساتھ ساتھ رخصت ہوئے۔ صبح کو شوہر، شام کو بیوی۔

لیکن مصیبت کا ابھی خاتمہ نہ ہوا تھا۔ تیسرے دن دونوں بچے دادا دادی کے لیے روتے روتے بیٹھک میں جا پہنچے۔ وہاں ایک آلے پر ایک خربوزہ کٹا ہوا پڑا تھا۔ دو تین قلمی آم بھی کٹے رکھے تھے۔ ان پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ جانکی نے ایک تپائی پر چڑھ کر دونوں چیزیں اتار لیں اور دونوں نے مل کر کھائیں۔ شام ہوتے ہوتے دونوں کو ہیضہ ہو گیا اور دونوں ماں باپ کو روتا چھوڑ کر چل دیئے۔ تین دن پہلے جہاں چاروں طرف چہل پہل تھی، وہاں اب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی کے رونے کی آواز بھی نہ سنائی دیتی تھی۔ روتا ہی کون؟ لے دے کے کل دو آدمی رہ گئے تھے اور انہیں رونے کی بھی سدھ نہ تھی۔

(3)

لیلا کی صحت پہلے بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ اب تو وہ اور بھی بے جان ہو گئی۔ بچوں ہی میں اس کی جان بستی تھی۔ جب وہ ہی نہ رہے تو مرنا اور جینا برابر تھا۔ رات دن یہی منایا کرتی کہ بھگوان یہاں سے لے چلو لیکن بلانے سے موت کب آتی ہے؟

سیتا سرن پہلے تو بہت رویا دھویا یہاں تک کہ گھر چھوڑ کر بھاگا جاتا تھا لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے، طبیعت سنبھلتی جاتی تھی۔ اولاد کا غم تو کچھ ماں ہی کو ہوتا ہے۔ پہلے ہی کی طرح دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق ہونے لگا۔ یاروں نے اور بھی چنگ پر چڑھایا۔ سیر سپاٹے ہونے لگے۔ کہاں تو لیلا کو روتے دیکھ کر بے قرار ہو جاتا تھا۔ کہاں اب اسے غمگین اور اداس دیکھ کر جھنجھلا اٹھتا۔ زندگی رونے ہی کے لیے تو نہیں ہے۔ ایشور نے لڑکے دیئے تھے۔ ایشور ہی نے چھین لیے۔ کیا لڑکوں کے پیچھے اپنی جان بھی دیدیں۔ لیلا اس کے منہ سے یہ باتیں سن کر حیرت میں آجاتی۔ باپ کے منہ سے ایسے الفاظ نکل سکتے ہیں۔ دنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں!

ہولی کے دن تھے۔ مردانے میں گانا بجانا ہو رہا تھا۔ احباب کی دعوت کے سامان کیے گئے تھے۔ اندر لیلا زمین پر پڑی ہوئی رو رہی تھی۔ تیوہاروں کے دن اُسے روتے ہی کٹتے تھے۔ آج بچے ہوتے تو اچھے اچھے کپڑے پہنتے، کیسے اچھلتے پھرتے! بچے ہی نہ رہے تو کہاں کی تیج اور کہاں کا تیوہار۔ یکایک سیتا سرن نے آکر کہا۔ "کیا دن بھر روتی ہی رہو گی؟ ذرا کپڑے تو بدل ڈالو۔ آدمی بن جاؤ۔ یہ کیا گت بنا رکھی ہے!"

لیلا نے کہا۔ "تم جاؤ اپنی محفل میں بیٹھو۔ تمہیں میری کیا فکر پڑی ہے؟"

سیتا سرن۔ "کیا دنیا میں اور کسی کے لڑکے نہیں مرتے؟ تمہارے ہی سر یہ مصیبت پڑی ہے!"

لیلا۔ "یہ بات کون نہیں جانتا۔ اپنا اپنا دل ہی تو ہے۔"

سیتا سرن۔ "میرے ساتھ بھی تو تمہارا کچھ فرض ہے۔"

لیلا نے تعجب سے شوہر کی طرف دیکھا۔ گویا اس کا مطلب نہیں سمجھی۔ پھر منہ پھیر کر رونے لگی۔

سیتا سرن۔ "میں اب اس نحوست کا خاتمہ کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا اپنے دل پر قابو نہیں ہے تو میرا بھی اپنے دل پر قابو نہیں ہے۔ میں زندگی بھر ماتم نہیں منا سکتا۔"

لیلا۔ "تم راگ رنگ میں مگن رہتے ہو۔ میں منع تو نہیں کرتی۔ میں روتی ہوں تو کیوں نہیں رونے دیتے؟"

سیتاسرن۔ ”میرا گھر رونے کے لیے نہیں ہے۔“
لیلا۔ ”اچھی بات ہے۔ تمہارے گھر میں نہ روؤں گی۔“

(4)

لیلا نے میکے کی تیاری شروع کی۔ ماں باپ کیا ایک ٹکڑا روٹی نہ دے دیں گے! لیکن ذرا ہی دیر میں اس کا خیال پلٹ گیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اس وقت یہ اپنے ہوش میں نہیں ہیں۔ ان کے سر راگ رنگ کا بھوت سوار ہے۔ ادھر میں گئی، ادھر یہ گھر مٹی میں ملا۔ مفت خورے پیچھے پڑے ہی ہوئے ہیں۔ دو چار مہینہ میں وارا نیارا ہو جائے گا۔ اگر انہیں کوئی بیماری ہو جاتی تو کیا اس حالت میں میں انہیں چھوڑ کر چلی جاتی؟ کبھی نہیں۔ میں دل و جان سے ان کی خدمت کرتی۔ مانا انہیں ظاہری بیماری نہیں ہے مگر دل کی بیماری تو اس سے بھی زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ جو آدمی رونے کی جگہ ہنسے اور ہنسنے کی جگہ روئے، اس کے دیوانہ ہونے میں کیا شبہ ہے۔

ہاں! مجھے اپنا غم بھول جانا ہوگا۔ روؤں گی...... رونا تو میری تقدیر میں لکھا ہوا ہے مگر ہنس ہنس کر۔ اپنی تقدیر سے لڑوں گی۔ جو جاتے رہے ان کے نام کو رونے کے سوا اور کیا کر سکتی ہوں لیکن جو ہے اسے نہ جانے دوں گی۔ آ اے ٹوٹے ہوئے دل! آج تیرے ٹکڑوں کو جمع کر کے ایک مزار بناؤں اور اپنے غم کو اسی میں دفن کر دوں!

لیلا ساری رات بیٹھی دل سے یہی باتیں کر رہی تھی۔ ادھر مردانے میں دھما چوکڑی مچی ہوئی تھی۔ سیتا سرن نشہ میں چور کبھی گاتا تھا۔ کبھی تالیاں بجاتا تھا۔ ان کے قہقہوں سے دیواریں ہلی جاتی تھیں۔

پچھلے پہر محفل میں سناٹا چھا گیا۔ لیلا نے سوچا شاید یہ لوگ سو گئے۔ معلوم نہیں دروازہ بند کیا یا کھلا ہی چھوڑ دیا۔ شاید لوگ کہیں چلے گئے۔ کوئی سنک سوار ہوئی ہوگی۔ جا کر دہلیز سے مردانے کمرہ میں جھانکا۔ احباب رخصت ہو گئے تھے۔ صرف ایک حسینہ مسند پر جلوہ افروز تھیں اور سیتاسرن اس کے سامنے جھکا ہوا اس سے بہت دھیرے دھیرے باتیں کر رہا تھا۔ حسینہ کے چہرہ پر اور آنکھوں میں شرارت آمیز تغافل تھا۔ سیتاسرن شیفتگی اور از خود رفتگی کی تصویر، ایک بھولا بھالا دل ایک فریب شعار نازنین کے ہاتھوں لٹا جاتا تھا۔ لیلا کی دولت اس کی آنکھوں کے سامنے ایک سارقہ اٹھائے لیے جاتی تھی۔ لیلا کے جسم میں رعشہ آ گیا۔ ایسی وحشت سوار ہوئی کہ اسی وقت جا کر اس فاحشہ کو دھتکاروں اور کھڑے کھڑے نکال دوں۔ نسائیت کا وہ تار جو عرصہ سے مفلوج ہو رہا تھا یکبارگی مرتعش ہو اٹھا۔ پر لیلا نے ضبط کیا اور الٹے پاؤں اندر لوٹ آئی۔

آفتاب کی زرنگار شعاعیں کمرہ میں آئیں تو لیلا کو آئینے کے سامنے کھڑے دیکھا! آج کئی مہینوں کے بعد لیلا نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس کے منہ سے ایک ٹھنڈی آہ نکل گئی۔ غم نے اس کی صورت ہی تبدیل کر دی تھی۔ اس حسینہ کے سامنے وہ ایسی لگتی تھی جیسے تر و تازہ گلاب کے سامنے جوہی کا پھول۔

(5)

سیتاسرن کا خمار دوپہر کو ٹوٹا تو سامنے لیلا کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی انوکھی چھب آنکھوں میں سما گئی۔

ایسے خوش ہوئے گویا ایک مدت کے فراق کے بعد اس سے وصال ہوا ہو۔ انہیں کیا معلوم تھا کہ یہ روپ بھرنے سے پہلے لیلا نے کتنے آنسو بہائے ہیں۔ بالوں میں یہ پھول گونتھنے کے پہلے آنکھوں سے کتنی موتی پروئے ہیں۔ ان کا پشیمان دل اس کی دلجوئی کرنے کے لیے بے قرار ہو اٹھا۔ جوش محبت سے مخمور ہو کر لیلا کو گلے لگا لیا اور مسکرا کر بولے۔ ''آج تو تم مسلح ہو کر آئی ہو لیلا۔ کہاں بھاگوں؟''

لیلا نے اپنے دل کی طرف انگلی دکھا کر کہا۔ ''یہاں آ بیٹھو۔ بہت بھاگے بھاگے پھرتے ہو۔ اب تمہیں باندھ کر رکھوں گی۔''

باہر سے کسی دوست کے آنے کی خبر آئی۔ سیتاسرن چلنے لگے تو لیلا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ''میں نہ جانے دوں گی۔''

سیتاسرن۔ ''ابھی آتا ہوں۔''

لیلا۔ ''مجھے ڈر لگتا ہے، تم کہیں چل نہ دو۔''

سیتاسرن۔ ''نہیں لیلا۔ تم نے مجھے باندھ لیا۔ اب ہل نہیں سکتا۔''

سیتاسرن باہر آئے تو دوست صاحب بولے۔ ''اب تک سوتے ہی رہے کیا؟ اس وقت تو وہاں چلنے کی ٹھہری تھی نا؟''

سیتاسرن نے بے نیازی کی شان سے کہا۔ ''چلنے کو تو تیار ہوں لیکن لیلا جانے نہیں دیتی۔''

دوست۔ ''نرے گاودی ہی رہے۔ آ گئے بیوی کے پنجے میں۔''

سیتاسرن۔ ''ہاں بھئی آ گیا۔ اس نے گھر سے نکال دیا۔ تب چھاؤں ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ اب اس نے دروازہ کھول دیا ہے اور کھڑی بلا رہی ہے۔''

دوست۔ ''اجی یہاں وہ لطف کہاں! گھر کو لاکھ سجاؤ تو کیا باغ ہو جائے گا!''

سیتاسرن۔ ''بھئی گھر باغ تو نہیں ہو سکتا مگر سورگ ہو سکتا ہے۔ مجھے اس وقت اپنی فرمائیگی پر جتنی ندامت ہو رہی ہے، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ جس غم میں اس نے اپنی دلربائیوں کو لٹا دیا، اپنی خوشیوں کو فنا کر دیا، اسی غم کو میرا ایک اشارہ پا کر فراموش کر دیا۔ جانتے ہو کیوں؟ اسی لیے کہ میں بہک نہ جاؤں۔ وہ جنت کی دیوی ہے اور مجھ جیسے شوریدہ سروں کی حفاظت کرنے ہی کے لیے بھیجی گئی ہے۔''

بند دروازہ

آفتاب افق کی گود سے نکلا۔ بچہ پالنے سے۔ وہی ملاحت، وہی سرخی، وہی خمار، وہی ضیا۔

میں برآمدہ میں بیٹھا تھا۔ بچے نے دروازہ سے جھانکا۔ میں نے مسکرا کر پکارا۔ وہ میری گود میں آ کر بیٹھ گیا۔

اس کی شرارتیں شروع ہو گئیں۔ کبھی قلم پر ہاتھ بڑھایا۔ کبھی کاغذ پر دست درازی کی۔ میں نے گود سے اتار دیا۔ وہ میز کا پایہ پکڑے کھڑا رہا۔ گھر میں نہ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ایک چڑیا پھدکتی ہوئی آئی اور سامنے کے صحن میں بیٹھ گئی۔ بچہ کے لیے تفریح کا نیا سامان تھا۔ وہ اس کی طرف لپکا۔ چڑیا ذرا بھی نہ ڈری۔ بچہ نے سمجھا اب یہ پَردار کھلونا ہاتھ آگیا۔ بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے چڑیا کو بلانے لگا۔ چڑیا اُڑ گئی۔ مایوس بچہ رونے لگا مگر اندر کے دروازہ کی طرف تاکا بھی نہیں۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

گرم حلوے کی خوش آئند صدا آئی۔ بچہ کا چہرہ اشتیاق سے کھل اٹھا۔ خوانچے والا سامنے سے گزرا۔ بچے نے میری طرف التجا کی نظروں سے دیکھا۔ جوں جوں خوانچے والا دور ہوتا گیا۔ نگاہ التجا احتجاج میں تبدیل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ جب موڑ آگیا اور خوانچے والا نظروں سے غائب ہو گیا تو احتجاج نے فریاد پُر شور کی صورت اختیار کی مگر میں بازار کی چیزیں بچوں کو کھانے نہیں دیتا۔ بچہ کی فریاد نے مجھ پر کوئی اثر نہ کیا۔ میں نے آئندہ را احتیاط کے خیال سے اور بھی اکڑ کی لی۔ کہہ نہیں سکتا بچے نے اپنی ماں کی عدالت میں اپیل کرنے کی ضرورت سمجھی یا نہیں۔ عام بچے ایسی افتادوں کے موقع پر ماں سے اپیل کرتے ہیں۔ شاید اس نے کچھ دیر کے لیے اپیل ملتوی کر دی ہو۔ اس نے دروازہ کی طرف رخ نہ کیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔

میں نے اشک شوئی کے خیال سے اپنا فاؤنٹین پن اس کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ بچہ کو کائنات کی دولت مل گئی۔ اس کے سارے قوائے ذہنی اس نئے عقدے کو حل کرنے میں منہمک ہو گئے۔ دفعتاً دروازہ ہوا سے خود بخود بند ہو گیا۔ پٹ کی آواز بچہ کے کانوں میں آئی۔ اس نے دروازہ کی طرف دیکھا۔ اس کا وہ انہماک فی الفور غائب ہو گیا۔ اس نے فاؤنٹین پن کو پھینک دیا اور روتا ہوا دروازہ کی طرف چلا کیونکہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔

جلوس

(1)

کانگریس کا جلوس نکل رہا تھا۔ کچھ نوجوان، کچھ بوڑھے، کچھ بچے جھنڈیاں اور جھنڈے لیے ”بندے ماترم“ گاتے ہوئے مال کے سامنے سے نکلے۔ دونوں طرف تماشائیوں کی دیواریں کھڑی تھیں۔ گویا ان کو اس جتھے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ یہ کوئی تماشا ہے اور ان کا کام صرف کھڑے کھڑے تماشا دیکھنا ہے۔

شمبھوناتھ نے دکان پر پٹڑی پر کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ دینیال سے کہا۔ ”سب کے سب موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔ آگے سواروں کا دستہ مار مار کر بھگا دے گا۔“

دینیال نے کہا۔ ”مہاتما جی بھی سٹھیا گئے ہیں۔ جلوس سے سوراجیہ مل جاتا تو اب تک کب کا مل گیا ہوتا اور جلوس میں ہیں کون لوگ دیکھا! لفنگے!! دیوانے!!! شہر کا کوئی بڑا آدمی نہیں۔“

میکو جوچٹیوں اور سلیپروں کی مالا گردن میں لٹکائے کھڑا تھا۔ ان دونوں سیٹھوں کی باتیں سن کر ہنس پڑا۔

شمبھو نے پوچھا۔ ''کیوں ہنسے میکو؟ آج رنگ گہرا معلوم ہوتا ہے۔''

میکو۔ ''ہنسا اس بات پر جو تم نے کہی کہ کوئی بڑا آدمی جلوس میں نہیں ہے۔ بڑے آدمی جلوس میں کیوں آنے لگے۔ انہیں اس راج میں کون آرام نہیں ہے۔ بنگلوں اور محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹروں پر گھومتے ہیں۔ صاحبوں کے ساتھ دعوتیں کھاتے ہیں۔ انہیں کون تکلیف ہے۔ مر تو ہم لوگ رہے ہیں جنہیں روٹیوں کا ٹھکانہ نہیں۔ اس وقت کوئی ٹینس کھیلتا ہوگا، کوئی چاء پیتا ہوگا۔ کوئی گراموفون لیے گانا سنتا ہوگا۔ کوئی پارک کی سیر کرتا ہوگا۔ یہاں آویں پولیس کے کوڑے کھانے کے لیے۔ تم نے بھی اچھی کہی!''

شمبھو۔ ''تم یہ باتیں کیا سمجھو گے میکو! جس کام میں چار بڑے آدمی شامل ہوتے ہیں، اس کی سرکار پر بھی دھاک بیٹھ جاتی ہے۔ لونڈے لفنگوں کو حاکم لوگ بھلا کیا سمجھتے ہیں۔''

میکو نے ایسی نگاہ سے دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ ''ان باتوں کو ہم بھی سمجھتے ہیں۔'' اور بولا۔ ''بڑے آدمیوں کو ہمیں لوگ بناتے بگاڑتے ہیں یا کوئی اور؟ کتنے ہی لوگ جنہیں کوئی پوچھتا بھی نہ تھا۔ ہمارے بنائے بڑے آدمی بن گئے اور اب موٹروں پر نکلتے ہیں اور ہمیں نیچا سمجھتے ہیں۔ یہ ہم لوگوں کی تکدیر کی کھوبی ہے کہ جس کی جرا بھی ترکی ہوئی بس اس نے ہم لوگوں کی طرف سے نگاہ بدلی۔ ہمارا بڑا آدمی تو وہی ہے جو لنگوٹی باندھے ننگے پاؤں گھومتا ہے۔ جو ہمارے لیے اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہے۔ ہمیں اور کسی بڑے آدمی کی پروا نہیں ہے۔ سچ پوچھیے تو ان بڑے آدمیوں نے ہی ہماری مٹی خراب کر رکھی ہے۔ انہیں سرکار نے کوئی اچھی سی جگہ دے دی۔ بس اس کا دم بھرنے لگے۔''

دینديال۔ ''نیا داروغہ بڑا جلاد ہے۔ چوراہے پر پہنچتے ہی ہنٹر لے کر پل پڑے گا۔ پھر دیکھنا سب کیسا دم دبا کر بھاگتے ہیں۔ مزا آوے گا۔''

جلوس آزادی کے نشے میں چور چوراہے پر پہنچا تو دیکھا کہ سواروں اور سپاہیوں کا ایک دستہ راستہ روکے کھڑا ہے۔ یکایک داروغہ بیر بل سنگھ گھوڑا بڑھا کر جلوس کے سامنے آگیا اور بولا۔ ''تم لوگوں کو آگے جانے کا حکم نہیں ہے۔''

جلوس کے بڈھے لیڈر ابراہیم علی نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ کسی قسم کا دنگا فساد نہ ہوگا۔ ہم دکانیں لوٹنے یا موٹریں توڑنے نہیں نکلے ہیں۔ ہمارا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔''

بیر بل سنگھ۔ ''مجھے یہ حکم ہے کہ جلوس یہاں سے آگے نہ جانے پاوے۔''

ابراہیم۔ ''آپ اپنے افسروں سے ذرا پوچھ نہ لیں؟''

بیر بل سنگھ۔ ''میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔''

ابراہیم۔ ''تو ہم لوگ یہاں بیٹھے ہیں۔ جب آپ لوگ چلے جائیں گے تو ہم نکل جائیں گے۔''

بیر بل سنگھ۔ ''یہاں کھڑے ہونے کا بھی حکم نہیں ہے۔ تم کو واپس جانا پڑے گا۔''

ابراہیم نے متانت کے ساتھ جواب دیا۔ ''واپس تو ہم نہ جائیں گے۔ آپ کو یا کسی کو بھی ہمیں روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ اپنے سواروں، سنگینوں اور بندوقوں کے زور سے ہمیں روکنا چاہتے ہیں۔ روک لیجیے مگر آپ ہمیں واپس نہیں کر سکتے۔''

بیر بل میٹرک تھا۔ اس کا باپ سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ اس کی رگ رگ میں رعب بھرا ہوا تھا۔ افسروں کی

نگاہ میں اس کی بڑی عزت تھی۔ خاصا گورا چٹا، نیلی آنکھوں اور بھورے بالوں والا صاحبِ اقبال شخص تھا۔ شاید جس وقت وہ کوٹ پہن کر اوپر سے ہیٹ لگا لیتا تو وہ بھول جاتا کہ میں بھی یہیں کا رہنے والا ہوں۔ غالباً وہ اپنے کو سلطنت کرنے والی قوم کا جزو سمجھنے لگتا تھا مگر ابراہیم علی کے مردانہ استقلال نے ذرا دیر کے لیے اسے شش و پنج میں ڈال دیا۔ جلوس کو راستہ دے دیتا ہے تو جواب طلب ہو جائے گا۔ وہیں کھڑا رہنے دیتا ہے تو یہ سب نہ جانے کب تک کھڑے رہیں۔ اسی حیص بیص میں پڑا ہوا تھا کہ اس نے ڈی ایس پی کو موٹر پر آتے دیکھا۔ اب پس و پیش کا وقت نہ تھا۔ یہی موقع تھا کار گزاری دکھانے کا۔ اس نے کمر سے بیٹن نکال لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگا کر جلوس پر چڑھانے لگا۔ اسے دیکھتے ہی اور سواروں نے بھی گھوڑوں کو جلوس پر چڑھانا شروع کر دیا۔ ابراہیم داروغہ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے سر پر ایک بیٹن ایسے زور سے پڑا کہ اس کی آنکھیں تلملا گئیں۔ کھڑا نہ رہ سکا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ اسی وقت داروغہ نے گھوڑے کے دونوں پاؤں اٹھائے اور زمین پر بیٹھا ہوا ابراہیم اس کی ٹاپوں کے نیچے آ گیا۔ جلوس ابھی تک تک خاموش کھڑا تھا۔ ابراہیم کو گرتے دیکھ کر کئی آدمی اسے اٹھانے کے لیے لپکے مگر کوئی آگے نہ بڑھ سکا۔ ادھر سواروں کے ڈنڈے بڑی بے رحمی سے پڑ رہے تھے۔ لوگوں ہاتھوں پر ڈنڈوں کو روکتے تھے اور ثابت قدمی کے ساتھ کھڑے تھے۔ دل سے اشتعال کو دور رکھنا ان کے لیے دم بدم مشکل ہوتا جاتا تھا مگر مسلک اور اصول نے ان کے جذبات اور حرکات کو بندشوں سے جکڑ رکھا تھا۔

دس بارہ منٹ تک یونہی ڈنڈوں کی بوچھاڑ ہوتی رہی اور لوگ خاموش کھڑے رہے۔

(2)

اس مار پیٹ کی خبر ایک ہی آن میں بازار میں جا پہنچی۔ ابراہیم گھوڑے سے کچلے گئے، کئی آدمی زخمی ہو گئے۔ کتنوں ہی کے ہاتھ ٹوٹ گئے مگر نہ وہ لوگ واپس ہوتے ہیں نہ پولیس انہیں آگے جانے دیتی ہے۔

میکو نے جوش میں آ کر کہا۔ "اب تو بھائی یہاں نہیں رہا جاتا۔ میں بھی چلتا ہوں۔"

دینددیال نے کہا۔ "ہم بھی چلتے ہیں بھائی! دیکھی جائے گی۔"

شمبھو ایک منٹ تک خاموش کھڑا رہا۔ یکایک اس نے بھی دکان بڑھائی اور بولا۔ "ایک دن تو مرنا ہی ہے جی۔ جو کچھ ہونا ہے ہو۔ آخر یہ لوگ سبھی کے لیے تو جان دے رہے ہیں۔" دیکھتے دیکھتے زیادہ تر دکانیں بند ہو گئیں۔ وہ لوگ جو دس منٹ پیشتر تماشا دیکھ رہے تھے، ادھر ادھر سے دوڑ پڑے اور ہزاروں آدمیوں کا ایک جم غفیر جائے وقوعہ کی طرف چلا۔ یہ متوالا گروہ خونریزی کے نشہ میں بھرے ہوئے آدمیوں کا گروہ تھا جسے اصول اور مسلک کی پروانہ تھی۔ جو مرنے کے لیے ہی نہیں مارنے کے لیے بھی تیار تھے۔ کتنوں ہی کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں۔ کتنے ہی جیبوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نہ کوئی کسی سے کچھ بولتا تھا نہ پوچھتا تھا۔ بس سب کے سب دل میں ایک مستقل ارادہ کیے لپکے چلے جا رہے تھے۔ گویا کوئی گھٹا اُمڈی چلی آتی ہو۔

اس گروہ کو دور سے دیکھتے ہی سواروں میں کچھ ہلچل پڑی۔ بیربل سنگھ کے چہرہ پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ڈی ایس پی نے اپنی موٹر آگے بڑھائی۔ امن اور عدم تشدد کے حامیوں پر ڈنڈے برسانا اور بات تھی لیکن ایک پُرجوش گروہ سے مقابلہ دوسری بات۔ سوار اور سپاہی پیچھے ہٹ گئے۔

ابراہیم کی پیٹھ پر گھوڑے نے ٹاپ رکھ دیا تھا۔ وہ بے ہوش زمین پر پڑے تھے۔ ان آدمیوں کا شور و غل سن کر آپ ہی آپ ان کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایک نوجوان کو اشارہ سے بلا کر کہا۔ ''کیوں کیلاش! کیا کچھ لوگ شہر سے آ رہے ہیں؟''

کیلاش نے اس بڑھتی ہوئی گھٹا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی ہاں، ہزاروں آدمی ہیں۔''

ابراہیم۔ ''تو اب خیریت نہیں ہے۔ جھنڈا لوٹا دو۔ ہمیں فوراً واپس چلنا چاہیے، نہیں تو طوفان برپا ہو جائے گا۔ ہمیں اپنے بھائیوں سے لڑائی نہیں کرنا ہے۔ فوراً واپس چلو۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اٹھ نہ سکے۔

اشارہ کی دیر تھی۔ منظم فوج کی طرح لوگ حکم پاتے ہی پیچھے پھر گئے! جھنڈیوں کے بانسوں، صافوں اور رومالوں سے فوراً ایک اسٹریچر تیار ہو گیا۔ ابراہیم کو لوگوں نے اس پر لٹا دیا اور واپس ہوئے مگر کیا وہ مغلوب ہو گئے تھے؟ اگر کچھ لوگوں کو انہیں مغلوب سمجھنے میں ہی تسلی ہوتی ہو تو ہو لیکن حقیقت میں انہوں نے ایک معرکتہ الآرا فتح حاصل کی تھی۔ وہ جانتے تھے ہماری کشمکش اپنے ہی بھائیوں سے ہے جن کے مفاد حالت موجودہ میں ہمارے مفاد سے علیحدہ ہیں۔ ہمیں ان سے دشمنی نہیں کرنی ہے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ شہر میں لوٹ مار اور فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے اور ہماری قومی جدوجہد کا نتیجہ لٹی ہوئی دکانیں اور ٹوٹے ہوئے سر ہوں۔ ان کی فتح کا سب سے روشن پہلو یہ تھا کہ انہوں نے پبلک کی ہمدردی حاصل کر لی تھی۔ وہی لوگ جو پہلے ان پر تمسخر کرتے تھے، ان کا استقلال اور ان کی جرات دیکھ کر ان کی امداد کے لیے نکلے پڑے تھے۔ ذہنیت کی یہ تبدیلی یہ بیداری ہی ان کی اصلی فتح تھی۔

(3)

تین دن گزر گئے۔ بیر بل سنگھ اپنے کمرہ میں بیٹھے چائے پی رہے تھے اور ان کی بیوی مٹھن بائی بچے کو گود میں لیے سامنے کھڑی تھیں۔

بیر بل سنگھ نے کہا۔ ''میں اس وقت کیا کرتا؟ پیچھے ڈی ایس پی کھڑا تھا۔ اگر جلوس کو راستہ دے دیتا تو اپنی جان مصیبت میں نہ پھنستی۔''

مٹھن بائی نے سر ہلا کر کہا۔ ''تم کم سے کم اتنا تو کر ہی سکتے تھے کہ ان پر ڈنڈے نہ چلاتے۔ کیا تمہارا کام آدمیوں پر ڈنڈے چلانا ہے؟ تم زیادہ سے زیادہ جلوس کو روک سکتے تھے۔ کل کو تمہیں مجرموں کی بیت لگانے کا کام دیا جائے تو شاید تمہیں بڑی خوشی ہوگی۔ کیوں؟''

بیر بل سنگھ نے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''تم تو بات نہیں سمجھتی ہو!''

مٹھن بائی۔ ''میں خوب سمجھتی ہوں۔ ڈی ایس پی پیچھے کھڑا تھا۔ تم نے خیال کیا ہو گا کہ کارگزاری دکھانے کا ایسا موقع پھر کبھی ملے یا نہ ملے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اس گروہ میں کوئی بھلا آدمی نہ تھا؟ اس میں کتنے ہی آدمی ایسے تھے جو تمہارے جیسوں کو نوکر رکھ سکتے ہیں۔ علم میں تو شائد زیادہ تر تم سے بڑھے ہوئے ہوں گے مگر تم ان پر ڈنڈے چلا رہے تھے اور انہیں گھوڑے سے کچل رہے تھے۔ واہ ری جواں مردی!''

بیر بل سنگھ نے بے حیائی کی ہنسی کے ساتھ کہا۔ ''صاحب نے میرا نام نوٹ کر لیا ہے سچ!''
داروغہ نے سمجھا تھا۔ یہ مژدہ جانفزا سنا کر وہ مٹھن بائی کو خوش کر لیں گے۔ شرافت اور اخلاق کی چشم نمائیاں اس نفع صریح کی تاب نہ لا سکیں مگر مٹھن بائی کے چہرہ پر خوشی کی کوئی علامت نظر نہ آئی۔ بولی۔ ''ضرور کر لیا ہو گیا اور شاید تمہیں جلد ترقی بھی مل جائے مگر بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگ کر ترقی پائی تو کیا پائی! یہ تمہاری کارگزاری کا انعام نہیں، تمہاری غداری کی قیمت ہے۔ تمہاری کارگزاری کا انعام تو اس وقت ملے گا جب تم کسی خونی کو کھوج نکالو گے۔ کسی ڈوبتے ہوئے آدمی کو بچالو گے۔''
یکایک ایک سپاہی نے برآمدہ میں کھڑے ہو کر کہا۔ ''حضور! یہ لفافہ لایا ہوں۔'' بیر بل سنگھ نے باہر نکل کر لفافہ لے لیا اور اندر کی سرکاری چٹھی نکال کر پڑھنے لگے۔ پڑھ کر اسے میز پر رکھ دیا۔
مٹھن نے پوچھا۔ ''کیا ترقی کا پروانہ آگیا؟''
بیر بل سنگھ نے جھینپ کر کہا۔ ''تم تو بناتی ہو۔ آج پھر کوئی جلوس نکلنے والا ہے۔ مجھے اس کے ساتھ رہنے کا حکم ہوا ہے۔''
مٹھن۔ ''پھر تو تمہاری چاندی ہے۔ تیار ہو جاؤ۔ آج پھر ویسے ہی شکار ملیں گے۔ خوب بڑھ بڑھ کر ہاتھ دکھانا! ڈی ایس پی بھی ضرور آئیں گے۔ اس مرتبہ تم انسپکٹر ہو جاؤ گے۔ سچ!''
بیر بل سنگھ نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ''کبھی کبھی تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگتی ہو۔ فرض کرو، میں جا کر خاموش کھڑا رہوں تو کیا نتیجہ ہو گا؟ میں نالائق سمجھا جاؤں گا اور میری جگہ کوئی دوسرا آدمی بھیج دیا جائے گا۔ کہیں شبہ ہو گیا کہ مجھے سوراجیوں سے ہمدردی ہے تو کہیں کا نہ رہوں گا۔ اگر برخواست نہ بھی ہوا تو لین کی حاضری تو ہو ہی جائے گی۔ آدمی جس دنیا میں رہتا ہے، اسی کا چلن دیکھ کر کام کرتا ہے۔ میں عقلمند نہ سہی پر اتنا جانتا ہوں کہ یہ لوگ ملک اور قوم کو آزاد کرنے کے لیے ہی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ سرکار اس خیال کو پامال کر دینا چاہتی ہے۔ ایسا گدھا نہیں ہوں کہ غلامی کی زندگی پر فخر کروں لیکن حالت موجودہ سے مجبور ہوں۔''
باجے کی آواز کانوں میں آئی۔ بیر بل سنگھ نے باہر جا کر دریافت کیا۔ معلوم ہوا سوراجیوں کا جلوس آرہا ہے۔ فوراً وردی پہنی۔ صافہ باندھا اور جیب میں پستول رکھ کر باہر آئے۔ دم بھر میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ کانسٹیبل پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ سب لوگ ڈبل مارچ کرتے ہوئے جلوس کی طرف روانہ ہوئے۔

(4)

یہ لوگ کوئی پندرہ منٹ میں جلوس کے سامنے پہنچ گئے۔ ان لوگوں کو دیکھتے ہی بے شمار گلوں سے ''بندے ماترم'' کی ایک آواز نکلی گویا بادلوں میں گرج ہوئی ہو۔ پھر سناٹا چھا گیا۔ اُس جلوس میں اور اِس جلوس میں کس قدر فرق تھا۔ وہ سوراجیہ کے جشن کا جلوس تھا۔ یہ ایک شہید کے ماتم کا۔ تین دن کے مسلسل بخار اور تکلیف کے بعد آج اس زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ جس نے کبھی عہدے کی خواہش نہیں کی، کبھی منصب کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ انہوں نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میری لاش کو گنگا میں غسل دے کر دفن کیا جائے اور میرے مزار پر سوراجیہ کا

جھنڈا نصب کیا جائے۔ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی سارے شہر پر ماتم کا پردہ سا پڑ گیا۔ جو سنتا تھا ایک مرتبہ اس طرح چونک پڑتا تھا گویا کہ اسے گولی سی لگ گئی ہو اور فوراً ان کی زیارت کے لیے بھاگتا تھا۔ سارے بازار بند ہو گئے۔ یکہ اور تانگوں کا بھی کہیں پتہ نہ تھا جیسے شہر لٹ گیا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر امنڈ پڑا۔ جس وقت جنازہ اٹھا لاکھ سوا لاکھ آدمی ساتھ تھے۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو آنسوؤں سے سرخ نہ ہو۔

بیر بل سنگھ اپنے کانسٹیبلوں اور سواروں کو پانچ پانچ گز کے فاصلہ پر جلوس کے ساتھ چلنے کا حکم دے کر خود پیچھے چلے گئے۔ پچھلی صفوں میں کوئی پچاس گز تک مستورات تھیں۔ داروغہ نے ان کی طرف دیکھا۔ پہلی ہی قطار میں مٹھن بائی نظر آئی۔ بیر بل کو اعتبار نہ آیا۔ پھر غور کر کے دیکھا۔ وہی تھی۔ مٹھن نے ان کی طرف ایک بار دیکھ کر آنکھیں پھیر لیں لیکن اس کی ایک چتون میں کچھ ایسی لعنت، کچھ ایسی شرم، کچھ ایسا درد اور کچھ ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ بیر بل سنگھ کے جسم میں سر سے پاؤں تک سنسنی سی دوڑ گئی۔ وہ اپنی نگاہ میں کبھی ایسے ہلکے، اتنے کمزور اور اتنے ذلیل نہ ہوئے تھے۔

یکا یک ایک عورت نے داروغہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”کوتوال صاحب! کہیں ہم لوگوں پر ڈنڈے نہ چلا دیجئے گا۔ آپ کو دیکھ کر ڈر ہو رہا ہے۔“

دوسری بولی۔ ”آپ ہی کے تو کوئی بھائی تھے جنھوں نے اس دن نال کے چوراہے پر ڈنڈوں کی بارش کی تھی۔“

مٹھّن نے کہا۔ ”آپ کے کوئی بھائی نہ تھے، آپ خود تھے۔“

بیسوں منہ سے آوازیں نکلیں۔ ”اچھا! یہ وہی صاحب ہیں!! صاحب۔ آپ کو آداب ہے! یہ آپ ہی کی نوازش کا نتیجہ ہے کہ آج ہم بھی آپ کے ڈنڈے کی زیارت کے لیے آ کھڑی ہوئی ہیں!“

بیر بل نے مٹھن بائی کی طرف آنکھوں کا بھالا چلایا۔ پر منہ سے کچھ نہ بولے۔ ایک تیسری خاتون نے پھر کہا۔ ”ہم ایک جلسہ کر کے آپ کو ہار پہنائیں گے۔“

چوتھی نے کہا۔ ”آپ بالکل انگریز ہیں۔ جبھی اتنے گورے ہیں!“

ایک بڑھیا نے آنکھیں چڑھا کر کہا۔ ”میری کوکھ سے ایسا بچہ پیدا ہوتا تو اس کی گردن مروڑ دیتی۔“

ایک نوجوان خاتون نے اسے سرزنش کر کے کہا۔ ”آپ بھی خوب کہتی ہیں ماتا جی! کتے تک تو نمک کا حق ادا کرتے ہیں۔ یہ تو آدمی ہیں۔“

بڑھیا نے جھلا کر کہا۔ ”آدمی نہیں! پیٹ کے غلام۔ ہائے پیٹ! ہائے پیٹ!!“

اس پر کئی عورتوں نے بڑھیا کو آڑے ہاتھوں لیا اور وہ بچاری شرمندہ ہو کر بولی۔ ”ارے تو میں کچھ کہتی تھوڑے ہی ہوں مگر ایسا آدمی بھی کیا جو خود غرضی کے پیچھے اندھا ہو جائے۔“

بیر بل سنگھ اب اور نہ سن سکے۔ گھوڑا بڑھا کر جلوس سے کئی گز پیچھے چلے گئے۔ مرد طعنے دے تو ہمیں غصہ آتا ہے۔ عورت طعنے دیتی ہے تو ہم خفیف ہو جاتے ہیں۔ بیر بل سنگھ کی اس وقت اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر ان خاتونوں کے سامنے جاتے۔ اپنے افسروں پر غصہ آیا۔ مجھ کو ہی بار بار کیوں ان کاموں پر تعینات کیا جاتا ہے اور لوگ بھی تو ہیں۔ انہیں کیوں نہیں لایا جاتا؟ کیا میں ہی سب سے گیا گزرا ہوں؟ کیا میں ہی سب سے بے حس ہوں؟ مٹھی اس وقت مجھے دل میں کس قدر بزدل اور ذلیل سمجھ رہی ہو گی۔ شاید اس وقت مجھے کوئی مار بھی ڈالے تو وہ زبان نہ کھولے

گی۔ غالباً دل ہی دل میں خوش بھی ہو گی کہ اچھا ہوا۔ ابھی کوئی جا کر صاحب سے کہہ دے کہ بیر بل سنگھ کی بیوی جلوس میں نکلی تھی تو کہیں کا نہ رہوں۔ مٹھی جانتی ہے، سمجھتی ہے پھر بھی نکل کھڑی ہوئی۔ مجھ سے پوچھا تک نہیں۔ کوئی فکر نہیں ہے نا جبھی یہ باتیں سوجھتی ہیں۔ یہاں سبھی بے فکرے ہیں۔ کالجوں اور سکولوں کے لڑکے۔ مزدور، پیشہ ور۔ انہیں کیا فکر۔ موت تو ہم لوگوں کی ہے جن کے بال بچے ہیں اور کچھ عزت کا خیال ہے۔ سب کی سب میری طرف کیسا گھور رہی تھیں گویا کھا جائیں گی۔

جلوس شہر کی خاص سڑکوں سے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دونوں طرف چھتوں، چھجوں، جنگلوں اور درختوں پر تماشائیوں کی دیواریں سی کھڑی تھیں۔ بیر بل سنگھ کو آج ان کے چہروں پر ایک نئی امنگ ایک نیا عزم اور ایک نئی شان جھلکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ امنگ بڈھوں کے چہروں پر، عزم نوجوانوں کے اور شان خاتونوں کے۔ اب ان کے سفر کی منزل مقصود و مفقود نہ تھی۔ گم گشتوں کی طرح ادھر ادھر بھٹکنا نہ تھا۔ پامالوں کی طرح سر جھکا کر رونا نہ تھا۔ آزادی کی سنہری چوٹی دور دراز آسمان پر چمک رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں کو درمیان کے نالوں اور جنگلوں کی پروا نہیں ہے۔ سب اس سنہری منزل پر پہنچنے کے شوق میں بے چین ہو رہے تھے۔

گیارہ بجتے بجتے جلوس دریا کے کنارے جا پہنچا۔ جنازہ اتارا گیا اور لوگ لاش کو گنگا اشنان کرانے کے لیے چلے۔ اس کی سرد، خاموش اور زرد پیشانی پر لاٹھی کی چوٹ صاف نظر آ رہی تھی۔ خون جم کر سیاہ ہو گیا تھا۔ سر کے بڑے بڑے بال خون جم جانے سے کسی مصور کے برش کی طرح چمٹ گئے تھے۔ کئی ہزار آدمی اس شہید کی آخری زیارت کے لیے حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ بیر بل سنگھ پیچھے گھوڑے پر سوار کھڑے تھے۔ لاٹھی کی چوٹ انہیں بھی نظر آئی۔ ان کی روح نے انہیں پرزور ملامت کی۔ وہ لاش کی طرف نہ دیکھ سکے۔ منہ پھیر لیا۔ جس شخص کی زیارت کے لیے، جس کی خاکِ پا کو پیشانی پر لگانے کے لیے لاکھوں آدمی بے تاب ہو رہے تھے، اس کی میں نے اتنی بے عزتی کی۔ ان کی روح اس وقت اعتراف کر رہی تھی کہ اس بے رحمانہ تشدد میں فرض کی ادائیگی کا شمہ بھی نہ تھا، صرف خود غرضی تھی۔ کارگزاری دکھانے کا جوش اور افسروں کو خوش کرنے کی تمنا۔ ہزاروں آنکھیں غصہ سے بھری ہوئی ان کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن وہ آنکھیں اٹھانے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔

ایک کانسٹیبل نے آکر تعریف کی۔ ''حضور کا ہاتھ گہرا پڑا تھا۔ ابھی تک کھوپڑی کھلی ہوئی ہے۔''

بیر بل نے آزردہ خاطر ہو کر کہا۔ ''میں اسے اپنی جوانمردی نہیں، اپنا کمینہ پن سمجھتا ہوں۔''

مٹھن بائی کے گورے چہرے پر آج فخر، مسرت اور محبت کی پاکیزہ شگفتگی نظر آئی۔ ایسا معلوم ہوا اس کی ساری مرادیں پوری ہو گئی ہیں اور اس سے زیادہ خوش نصیب عورت دنیا میں نہیں۔

مگر اس نے اپنی خوشی کو سرد مہری کے پردہ میں چھپا کر سخت لہجہ میں کہا۔ ''دنیا میں محض ایسی خطائیں ہیں جن کی معافی ممکن نہیں۔ زبان خلق کی عدالت تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔''

بیر بل نے ایک بار اس کی طرف پرسوال نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو مٹھی۔''

بیر بل نے فوراً جیب سے پستول نکالا اور اپنے سینہ میں گولی مار لی۔ بوڑھی بیوہ چیخ کر اسے سنبھالنے کو دوڑی مگر مٹھن بائی اسی شگفتہ انداز سے کھڑی تھی۔

امتحان

(1)

نادر شاہ کی فوج نے دلی میں قتلِ عام کر رکھا ہے۔ راستوں میں خون کے دریا جاری ہیں۔ چاروں طرف قہر برپا ہے۔ بازار بند ہیں۔ اہلِ دلی مکانات کے دروازے بند کیے ہوئے زندگی کی خیریت منا رہے ہیں۔ کسی کی جان سلامت نہیں ہے۔ کہیں مکانوں میں...... ہو رہی ہے تو کہیں بازار لٹ رہا ہے۔ کوئی کسی کی فریاد نہیں سنتا۔ رئیسوں کی بیگمات محلوں سے نکالی جا رہی ہیں اور ان کی بے حرمتی کی جاتی ہے۔ ایرانی سپاہیوں کی تشنگیِ خون کسی طرح نہیں بجھتی۔ انسانی نفس کی سنگدلی، شقاوت اور بہیمیت اپنی غضبناک ترین صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اسی وقت نادر شاہ بادشاہی محل میں داخل ہوا۔

دلی ان دنوں عیش و عشرت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سجاوٹ اور تکلّفات کے سامانوں سے رئیسوں کے محل پُر رہتے تھے۔ مستورات کو بناؤ سنگار کے سوا دوسرا کام نہ تھا۔ مردوں کو عیش پروری کے سوا دوسری کوئی فکر نہ تھی۔ سیاست کی جگہ شعر و شاعری نے لے لی تھی۔ صوبہ جات سے دولت کھنچ کھنچ کر دلی آتی اور پانی کی طرح بہائی جاتی۔ حسن فروشوں کی چاندی تھی۔ کہیں تیتروں کے جوڑے ہوتے تھے۔ کہیں بٹیروں اور بلبلوں کی پالیاں ٹھنتی تھیں۔ تمام شہر خواب عشرت میں غرق تھا۔ نادر شاہ شاہی محل میں پہنچا تو وہاں کا سامان دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اس کی پیدائش ایک غریب گھر میں ہوئی تھی۔ اس کی تمام عمر میدانِ جنگ میں گزری تھی۔ نفس پروری کا اسے چسکا نہ لگا تھا۔ کہاں میدان جنگ کی سختیاں اور کہاں مجلس نشاط! جدھر آنکھیں اٹھتی تھیں ادھر سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں تھیں۔

شام ہو گئی تھی۔ نادر شاہ اپنے سرداروں کے ہمراہ محل کی سیر کرتا اور اپنی پسند کی چیزوں پر دست درازیاں کرتا۔ دیوان خاص میں آکر کارچوبی مسند پر بیٹھ گیا، سرداروں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم دے دیا۔ اپنے سب ہتھیار کھول کر رکھ دیئے اور محل کے داروغہ کو بلا کر حکم دیا۔ ”میں شاہی بیگمات کا ناچ دیکھنا چاہتا ہوں۔ تم فوراً ان کو نفیس پوشاک اور مرصع زیورات سے آراستہ و پیراستہ کر کے میرے سامنے لاؤ۔ خبردار ذرا بھی توقف نہ ہو۔ میں کوئی عذر یا انکار نہیں سن سکتا!“

(2)

داروغہ نے یہ نادر شاہی حکم سنا تو ہوش اڑ گئے۔ وہ خواتین جن پر کبھی سورج تک کی نگاہ بھی نہ پڑی تھی، رقص تو در کنار کیونکر اس محفل میں آئیں گی؟ شاہی بیگمات کی اس قدر بے حرمتی کبھی نہ ہوئی تھی۔ اُف رے انسان بہ صورت شیطان! دلی کو خون سے رنگ کر بھی تجھے سیری نہ ہوئی! مگر نادر شاہ کے روبرو ایک لفظ بھی منہ سے نکالنا گویا کہ موت کو بلانا تھا۔ سر جھکا کر آداب بجا لایا اور آکر محل سرا میں سب بیگمات کو نادر شاہی حکم سنایا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ اطلاع بھی دے دی کہ ذرا بھی تامل نہ ہو۔ نادر شاہ ذرا بھی عذر یا حیلہ نہ سنے گا۔ شاہی خاندان پر ایسی مصیبت کبھی نہ

پڑی تھی مگر اس وقت فاتح بادشاہ کا حکم بسر و چشم بجالانے کے سوا جانبری کی کوئی دوسری تدبیر نہ تھی۔

بیگمات نے جونہی یہ حکم سنا ان کی عقل زائل سی ہو گئی۔ محل سرا میں ماتم چھا گیا۔ ساری چہل پہل غائب ہو گئی۔ صد ہا دلوں سے اس ظالم کے لیے دعائے بد نکلنے لگی۔ کسی نے آسمان کی طرف نگاہ التجا سے دیکھا۔ کسی نے خدا اور رسول کو یاد کیا مگر ایک بھی بیگم ایسی نہ تھی جس کی نگاہ کٹار یا تلوار کی طرف گئی ہو۔ اگرچہ ان میں سے متعدد بیگمات کی رگوں میں راجپوتنیوں کا خون حرکت کر رہا تھا مگر نفس پرستی نے "جوہار" کے پرانے جوش کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ تن پروری، خودداری کو تباہ کر دیتی ہے۔ آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ننگ و ناموس کی حفاظت کے لیے کوئی طریقہ تجویز کرنے کی فرصت نہ تھی۔ ایک ایک لمحہ قسمت کا فیصلہ کر رہا تھا۔ ناامید ہو کر سبھی بیگمات نے اس ظالم کے سامنے جانے کا تہیہ کیا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آنکھوں میں سرمہ لگایا جا رہا تھا اور مصیبت زدہ دلوں پر خوشبو کی مالش کی جا رہی تھی۔ کوئی بال گوندھواتی تھی تو کوئی مانگوں میں موتی پروتی تھی۔ ایک بھی ایسے مصمم ارادہ کی بیوی نہ تھی جو خود پر یا اپنی ضد پر عدولی حکم کرنے کی ہمت کرتی۔

ایک گھنٹہ بھی نہ گزرنے پایا تھا کہ بیگمات پرے کے پرے زیورات سے جگمگاتی اپنے منہ کی رونق سے بیلے اور گلاب کی کلیوں کو لجاتی، خوشبو کی لپٹیں اڑاتی، چھم چھم کرتی دیوان خاص میں آ کر نادر شاہ کے سامنے کھڑی ہو گئیں۔

(3)

نادر شاہ نے ایک بار کنکھیوں سے پریوں کے اس ہجوم کو دیکھا اور تب مسند کے سہارے لیٹ گیا۔ اپنی تلوار اور کٹار سامنے رکھ دی۔ ایک آن میں اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس نے ایک انگڑائی لی اور کروٹ بدلی۔ ذرا دیر میں اس کے خراٹوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا معلوم پڑنے لگا کہ گہری نیند سو گیا ہے۔ آدھ گھنٹہ تک وہ پڑا سوتا رہا اور بیگمات جیوں کی تیوں سر جھکائے دیوار کی تصویروں کی طرح کھڑی رہیں۔ ان میں دو ایک بیویاں جو ذرا بے خوف تھیں، اندرون نقاب سے نادر شاہ کو دیکھ بھی رہی تھیں اور آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کیسی غضبناک صورت ہے! کتنی خونخوار آنکھیں ہیں! کتنا قوی ہیکل ہے! آدمی کیا ہے دیو ہے!

یکایک نادر شاہ کی آنکھیں کھلیں۔ پریوں کا ہجوم پیشتر کی طرح کھڑا تھا۔ اسے جاگتے دیکھ کر بیگمات نے سر نیچے کر لیے اور بدن کو سمیٹ کر بھیڑوں کی طرح ایک دوسرے سے مل گئیں۔ سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ اب یہ ظالم ناچنے کو کہے گا۔ تب کیسے کیا ہو گا! خدا اس ظالم سے سمجھے! مگر ناچا تو نہ جائے گا۔ چاہے جان ہی کیوں نہ جائے۔ اب اس سے زیادہ ذلت برداشت نہ ہو سکے گی۔

دفعتاً نادر شاہ کرخت لہجہ میں بولا۔ "اے خدا کی بندیو! میں نے تمہارا امتحان لینے کے لیے بلایا تھا اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تمہاری نسبت میرا جو گمان تھا وہ حرف بحرف سچ نکلا۔ جب کسی قوم کی عورتوں میں غیرت نہیں رہتی تو وہ قوم مردہ ہو جاتی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم لوگوں میں ابھی کچھ غیرت باقی ہے یا نہیں۔ اسی لیے میں نے تمہیں یہاں بلایا تھا۔ میں تمہاری بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اتنا عیش کا بندہ نہیں ہوں ورنہ آج بھیڑوں کے گلے چراتا ہوتا۔ نہ اس قدر ہوس پرست ہوں ورنہ آج فارس میں سرود و ستار کی تانیں سنتا ہوتا جس کا مزہ میں ہندوستانی گانے سے کہیں زیادہ اٹھا سکتا ہوں۔ مجھے صرف تمہارا امتحان لینا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر سچا ملال ہو رہا

ہے کہ تم میں غیرت کا جوہر باقی نہیں رہا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میرے حکم کو پیروں تلے کچل دیتیں؟ جب تم یہاں آ گئیں تب بھی میں نے تمہیں ایک موقع اور دیا کہ میں نے نیند کا بہانہ کیا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم میں سے کوئی خدا کی بندی اس کٹار کو اٹھا کر میرے جگر میں چبھا دیتی؟ میں کلام پاک کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تم میں سے کسی کو کٹار پر ہاتھ رکھتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی۔ میں ان نازک ہاتھوں کے سامنے گردن جھکا دیتا۔ پر افسوس ہے کہ آج تیموری خاندان کی ایک بیٹی بھی یہاں ایسی نہ نکلی جو اپنی حرمت بگاڑنے والے پر ہاتھ اٹھاتی! اب یہ سلطنت زندہ نہیں رہ سکتی! اس کی ہستی کے دن گنے ہوئے ہیں۔ اس کا نشان بہت جلد دنیا سے نیست و نابود ہو جائے گا۔ تم لوگ جاؤ اور اگر ہو سکے تو اب بھی سلطنت کو بچاؤ ورنہ اسی طرح ہوس کی غلامی کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاؤ۔"

سزا

(1)

شام کا وقت تھا۔ کچہری برخاست ہو گئی تھی۔ اہلکار اور چپڑاسی جیبیں کھنکھناتے گھر جا رہے تھے۔ خاکروب جگہ جگہ کوڑے ٹٹول رہا تھا کہ شاید کہیں پیسے ویسے مل جائیں۔ کچہری کے برآمدوں میں سانڈوں نے وکیلوں کی جگہ لے لی تھی۔ درختوں کے نیچے محرروں کی جگہ کتے بیٹھے نظر آتے تھے۔ اسی وقت ایک بڈھا آدمی پھٹے پرانے کپڑے پہنے لاٹھی ٹیکتا ہوا جنٹ صاحب کے بنگلہ پر پہنچا اور سائبان میں کھڑا ہو گیا۔ جنٹ صاحب کا نام مسٹر جی سنہا تھا۔ اردلی نے دور ہی سے للکارا۔ "کوئی سائبان میں کھڑا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟"

بڈھا۔ "غریب بامہن ہوں بھیا۔ صاحب سے بھینٹ ہو گی؟"

اردلی۔ "صاحب تم جیسوں سے نہیں ملا کرتے!"

بڈھا لاٹھی پر کمر سیدھی کر کے بولا۔ "کیوں بھائی! ہم سڑے ہیں یا ڈاکو چور ہیں یا ہمارے منہ میں کچھ لگا ہوا ہے؟"

اردلی۔ "بھیک مانگ کر مقدمہ لڑنے آئے ہو گئے؟"

بڈھا۔ "تو کوئی برائی کی ہے؟ اگر گھر بیچ کر مقدمہ نہیں لڑتے تو کوئی گناہ کرتے ہیں؟ یہاں تو مقدمہ لڑتے لڑتے عمر گزر گئی لیکن گھر کا پیسہ نہیں خرچا۔ میاں کی جوتی میاں کا سر کرتے ہیں۔ دس بھلے مانسوں سے مانگ کر ایک کو دے دیا۔ چلو چھٹی ہوئی۔ گاؤں بھر نام سے کانپتا ہے۔ کسی نے ذرا بھی ٹرپر کی اور میں نے عدالت میں دعویٰ دائر کیا۔ سمجھتے کیا ہو۔"

اردلی۔ "کسی بڑے آدمی سے سابقہ نہیں پڑا ابھی!"

بڈھا۔ "اجی! کتنے ہی بڑوں کو بڑے گھر بھجوا دیا۔ تم ہو کس پھیر میں۔ سیدھا ہائیکورٹ تک جاتا ہوں۔ کوئی میرے منہ کیا آئے گا بیچارا؟ گانٹھ سے تو کوڑی جاتی نہیں۔ پھر ڈریں کیوں؟ جس کی جس چیز پر دانت لگائے اپنا کر کے چھوڑا۔ سیدھے سے نہ دیا تو عدالت میں گھسیٹ لائے اور رگید رگید کر مارا۔ اپنا کیا بگڑتا ہے۔ تو صاحب سے اطلاع کرتے ہو کہ میں ہی پکاروں؟"

اردلی نے دیکھا کہ یہ آدمی ٹلنے والا نہیں تو جا کر صاحب سے اس کی اطلاع کی۔ صاحب نے حلیہ دریافت کیا اور خوش ہو کر کہا۔ ''فوراً بلا لاؤ۔''

اردلی۔ ''حضور! بالکل خستہ حال ہے۔''

صاحب۔ ''گدڑی ہی میں لعل ہوتے ہیں۔ جا کر بھیج دو۔''

مسٹر سنہا ادھیڑ عمر آدمی تھے۔ بہت ہی حلیم، بہت ہی دور اندیش۔ باتیں بہت کم کرتے تھے۔ رعونت اور بدمزاجی جو حکومت کا جزو سمجھی جاتی ہے، ان کو چھو بھی نہیں گئی تھی۔ انصاف اور رحم کے فرشتے معلوم ہوتے تھے۔ قیافہ شناس ایسے تھے کہ آدمی کی صورت دیکھتے ہی پہچان جاتے تھے۔ ڈیل، ڈول دیوؤں جیسا اور رنگ آبنوس کا سا۔ آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے پیچوان پی رہے تھے۔ بڈھے نے جا کر سلام کیا۔

سنہا۔ ''تم ہو جگت پانڈے! آؤ بیٹھو تمہارا مقدمہ تو بہت ہی کمزور ہے۔ بھلے آدمی! جعل بھی نہ کرتے بنا؟''

جگت۔ ''ایسا نہ کہیں حضور! غریب آدمی ہوں، مر جاؤں گا۔''

سنہا۔ ''کسی وکیل مختار سے صلاح بھی نہ لے لی؟''

جگت۔ ''اب تو سرکار کی پناہ میں آیا ہوں۔''

سنہا۔ ''سرکار کیا مِسل بدل دیں گے یا نیا قانون بنائیں گے۔ تم دھوکا کھا گئے۔ میں کبھی قانون کے باہر نہیں جاتا۔ جانتے ہو نہ! کبھی اپیل سے میری تجویز رد نہیں ہوتی!''

جگت۔ ''بڑا دھرم ہوگا سرکار (سنہا کے پیروں پر گنیوں کی ایک پوٹلی رکھ کر) بڑا دکھی ہوں سرکار!''

سنہا۔ (مسکرا کر) ''یہاں بھی اپنی چالبازی سے نہیں چوکتے؟ نکالو ابھی اور۔ اوس سے پیاس نہیں بجھتی۔۔ بھلا دہائی تو پوری کرو۔''

جگت۔ ''بہت تنگ ہوں دین بندھو!''

سنہا۔ ''ڈالو ڈالو کمر میں ہاتھ۔ بھلا میرے نام کی تو عزت رکھو۔''

جگت۔ ''لٹ جاؤں گا سرکار!''

سنہا۔ ''لٹیں تمہارے دشمن جو علاقہ بیچ کر لڑتے ہیں، تمہارے ججمانوں کا بھگوان بھلا کریں، تمہیں کس بات کی کمی ہے۔''

مسٹر سنہا اس معاملہ میں ذرا بھی رعایت نہیں کرتے تھے۔ جگت نے دیکھا کہ یہاں کائیاں پن سے کام نہ چلے گا تو چپکے سے پانچ گنیاں اور نکالیں لیکن انہیں مسٹر سنہا کے پیروں پر رکھتے وقت اس کی آنکھوں سے خون نکل آیا۔ یہ اس کی سالہا سال کی کمائی تھی۔ برسوں پیٹ کاٹ کر، تن جلا کر، خواہشات کو روک کر، جھوٹی گواہیاں دے کر یہ اندوختہ مہیا کیا تھا۔ اس کا ہاتھوں سے نکلنا جان نکلنے سے کم صدمہ کی بات نہ تھی۔

جگت پانڈے کے چلے جانے کے بعد تقریباً 9 بجے شب کے جنٹ صاحب کے بنگلہ پر ایک تانگہ آکر رکا اور اس پر سے پنڈت ستیہ دیو اترے جو راجہ صاحب شیو پور کے مختار تھے۔

مسٹر سنہا نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ شاید اپنے علاقہ میں غریبوں کو نہ رہنے دیں گے۔ اتنا ظلم!''

ستیہ دیو۔ ''غریب پرور! یہ کہیے کہ غریبوں کے مارے اب علاقہ میں ہمارا رہنا دوبھر ہو رہا ہے۔ آپ جانتے ہیں سیدھی انگلیوں گھی نہیں نکلتا۔ زمیندار کو کچھ نہ کچھ سختی کرنی ہی پڑتی ہے مگر اب یہ حال ہے کہ ہم نے ذرا

چوں بھی کی تو انہیں غریبوں کی تیوریاں بدل جاتی ہیں۔ سب مفت میں زمین جوتنا چاہتے ہیں۔ لگان مانگیے تو فوجداری کا دعویٰ کرنے کو تیار! اب اسی جگت پانڈے کو لیجئے گا۔ گنگا قسم حضور! سراسر جھوٹا دعویٰ ہے۔ حضور سے کوئی بات چھپی تو رہ نہیں سکتی۔ اگر جگت پانڈے یہ مقدمہ جیت گیا تو ہمیں بوریا باندھنا چھوڑ کر بھاگنا پڑے گا۔ اب حضور ہی بسائیں تو بس سکتے ہیں۔ راجہ صاحب نے حضور کو سلام کہا ہے اور عرض کی ہے کہ اس معاملہ میں جگت پانڈے کی ایسی خبر لیں کہ وہ بھی یاد کرے۔"

مسٹر سنہا نے ابرو سکوڑ کر کہا۔ "قانون میرے گھر تو نہیں بنتا۔"

ستیہ دیو۔ "حضور کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔"

یہ کہہ کر گنیوں کی ایک گڈی نکال کر میز پر رکھ دی۔ مسٹر سنہا نے گڈی کو آنکھوں سے شمار کر کے فرمایا۔ "انہیں میری طرف سے راجہ صاحب کی نظر کر دیجئے گا۔ آخر آپ کوئی وکیل تو کریں گے ہی۔ اسے کیا دیجئے گا؟"

ستیہ دیو۔ "یہ تو حضور کے اختیار میں ہے۔ جتنی ہی پیشیاں ہوں گی، اتنا ہی صرفہ بڑھے گا۔"

سنہا۔ "میں چاہوں تو مہینوں لٹکا سکتا ہوں۔"

ستیہ دیو۔ "بے شک! اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔"

سنہا۔ "پانچ پیشیاں بھی ہوئیں تو آپ کے کم سے کم ایک ہزار تو اڑ ہی جائیں گے۔ آپ یہاں اس کا آدھا ہی پورا کر دیجئے تو ایک ہی پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا۔ آدھی رقم بچ جائے گی۔"

ستیہ دیو نے دس گنیاں اور نکال کر میز پر رکھ دیں اور فخر کے ساتھ بولے۔ "حکم ہو تو راجہ صاحب سے کہہ دوں۔ آپ اطمینان رکھیں۔ صاحب کی نظر عنایت ہو گئی ہے۔" مسٹر سنہا نے تیز آواز میں فرمایا۔ "جی نہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میں کسی شرط پر یہ رقم نہیں لے رہا ہوں۔ میں کروں گا وہی جو قانون کی منشا ہو گی۔ خلاف قانون جَو بھر بھی نہیں جا سکتا۔ یہی میرا اصول ہے۔ آپ لوگ میری خاطر کرتے ہیں، یہ آپ کی شرافت ہے۔ میں اسے اپنا دشمن سمجھوں گا جو میرا ایمان خریدنا چاہے۔ میں جو کچھ لیتا ہوں، سچائی کا انعام سمجھ کر لیتا ہوں۔"

(2)

جگت پانڈے کو یقین کامل تھا کہ میری جیت ہو گی لیکن تجویز سنی تو ہوش اُڑ گئے۔ دعویٰ خارج ہو گیا۔ اس پر خرچ کی چپت علیحدہ۔ میرے ساتھ یہ چال! اگر لالہ صاحب کو اس کا مزا نہ چکھایا تو برہمن نہیں۔ ہیں کس پھیر میں؟ سارا رعب بھلا دوں گا۔ یہاں گاڑھی کمائی کے روپیہ ہیں، کون ہضم کر سکتا ہے؟ ہڈیاں پھوڑ کر نکلیں گے۔ اسی دروازہ پر سر پٹک پٹک کر مر جاؤں گا۔

اسی دن شام سے جگت پانڈے مسٹر سنہا کے بنگلہ کے سامنے مقیم ہو گئے۔ وہاں برگد کا ایک گھنا درخت تھا۔ مقدمہ والے وہیں ستو، چبینا کھاتے اور دوپہری اسی کے سایہ میں گزارتے تھے۔ جگت پانڈے ان سے مسٹر سنہا کی دل کھول کر ہجو کرتا۔ نہ کچھ کھاتا نہ پیتا۔ بس لوگوں کو اپنی رام کہانی سنایا کرتا۔ جو سنتا وہ جنٹ صاحب کو چار بری بھلی سناتا اور کہتا آدمی نہیں شیطان ہے۔ اس کو تو ایسی جگہ مارے کہ جہاں پانی نہ ملے۔ روپیہ کے روپیہ لیے اوپر سے ڈگری مع خرچ کر دی؟ یہی کرنا تھا تو روپیہ کاہے کو نگلے تھے! یہ ہے ہمارے بھائی بندوں کا حال۔ یہ اپنے کہلاتے ہیں! ان سے تو

انگریزاچھے۔اسی طرح کی شکایتیں دن بھر ہوا کرتیں۔ جگت پانڈے کے پاس دن بھر جمگھٹ سالگا رہتا۔

اسی طرح چار دن گزر گئے۔ مسٹر سنہا کو بھی خبر ہوئی۔ دیگر راشی اہلکاروں کی طرح آپ بھی شاندار آدمی تھے۔ایسے بے فکر رہتے گویا کہ ان میں یہ برائی چھو بھی نہیں گئی ہے جبکہ وہ قانون سے شمہ بھر بھی نہ ٹلتے تھے تو ان پر رشوت ستانی کا شک ہو ہی کیونکر سکتا تھااور اگر کوئی کرتا بھی تواس کی مانتا کون؟ایسے ہوشیار کھلاڑی کے خلاف کوئی ضابطہ کی کارروائی کیسے ہوتی؟مسٹر سنہا اپنے افسروں سے بھی خوشامد کا برتاؤ نہ کرتے۔اس سے حکام بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے مگر جگت پانڈے نے وہ منتر پھونکا تھا جس کا ان کے پاس کوئی اتار نہ تھا۔ایسے بے ڈھب آدمی سے آج تک انہیں سابقہ نہ پڑا تھا۔اپنے نوکروں سے پوچھتے۔"بڈھا کیا کہہ رہا ہے؟"نوکر لوگ یگانگت ظاہر کرنے کے لیے جھوٹ کے پُل باندھ دیتے۔"حضور!کہتا تھا بھوت بن کر لگوں گا۔ میری بیدی بنے تو سہی۔ جس دن مروں گا ایک کے سو جگت پانڈے ہوں گے۔"مسٹر سنہا پکے منکر تھے مگر ان باتوں کو سن سن کر کچھ خوفزدہ سے ہو جاتے اور ان کی اہلیہ تھر تھر کانپنے لگتیں۔وہ نوکروں سے بار بار کہتیں۔اس سے جا کر پوچھو، کیا چاہتا ہے؟ جتنے روپیہ چاہے لے لے۔ہم سے جو مانگے دیں گے، بس یہاں سے چلا جائے لیکن مسٹر سنہا آدمیوں کو اشارہ سے روک دیتے تھے۔انہیں ابھی تک امید تھی کہ بڈھا بھوک پیاس سے عاجز آکر چلا جائے گا۔اس سے زیادہ یہ ڈر تھا کہ میں ذرا بھی نرم پڑا اور نوکروں نے مجھے الو بنایا۔

چھٹے دن معلوم ہوا کہ جگت پانڈے کا بول بند ہو گیا ہے۔اس سے ہلا تک نہیں جاتا۔ چپ چاپ پڑا آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔شاید آج رات کو دم نکل جائے۔ مسٹر سنہا نے لمبی سانس لی اور انتہائی فکر میں ڈوب گئے۔اہلیہ نے چشم پر آب ہو کر کہا۔"تمہیں میرے سر کی قسم جا کر کسی طرح اس بلا کو ٹالو۔ بڈھا مر گیا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔اب روپیہ کا منہ نہ دیکھو،دو چار ہزار بھی دینے پڑیں تو دے کر اسے راضی کرو۔ تمہیں جاتے شرم آتی ہے تو میں چلی جاتی ہوں۔"

سنہا۔"جانے کا ارادہ تو میں کئی دن سے کر رہا ہوں لیکن جب دیکھتا ہوں وہاں جماؤ لگا رہتا ہے،اس سے ہمت نہیں پڑتی۔ سب آدمیوں کے سامنے تو نہ جایا جائے گا۔ چاہے کتنی ہی بڑی آفت کیوں نہ آپڑے۔ تم دو چار ہزار کو کہتی ہو،میں دس پانچ ہزار دینے کو تیار ہوں لیکن وہاں جا نہیں سکتا۔ نہیں معلوم کیسی منحوس گھڑی میں میں نے اس سے روپے لے لیے تھے۔ جانتا کہ یہ اتنا فساد کھڑا کرے گا تو پھاٹک میں گھسنے ہی نہ دیتا۔ دیکھنے میں تو ایسا سیدھا معلوم ہوتا ہے کہ گئو ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ آدمی پہچاننے میں دھوکا کھایا۔"

اہلیہ۔"تو میں ہی چلی جاؤں؟شہر کی طرف سے آؤں گی اور سب آدمیوں کو ہٹا کر علیحدہ باتیں کروں گی۔ کسی کو خبر نہ ہو گی کہ کون ہے۔اس میں تو کوئی حرج نہیں ہے؟"

مسٹر سنہا نے مشتبہ انداز سے کہا۔"تاڑنے والے تاڑ ہی جائیں گے چاہے تم کتنا ہی چھپاؤ۔"

اہلیہ۔"تاڑ جائیں گے تو تاڑ جائیں،اب اس سے کہاں تک ڈریں۔ بدنامی ابھی کیا کم ہو رہی ہے جو اور ہو جائے گی۔ساری دنیا جانتی ہے کہ تم نے روپے لیے۔یونہی کوئی کسی پر جان نہیں دیتا۔ پھر اب بیکار شان کیوں کرو؟"

مسٹر سنہا اب اندرونی خلش کو نہ دبا سکے۔ بولے۔"پیاری!یہ بیکار کی شان نہیں ہے۔چور کو عدالت میں بید کھانے سے یا عورت کو رسوائی سے اتنی شرم نہیں آتی جتنی کسی حاکم کو اپنی رشوت ستانی کا پردہ فاش ہونے سے آتی ہے۔وہ زہر کھا کر مر جائے گا لیکن دنیا کے سامنے اپنا پردہ فاش نہ کرے گا۔زندہ کھال کھینچے یا کولہو میں پیلے جانے

کے علاوہ اور کوئی ایسی سزا نہیں ہے جو اس سے اپنے جرم کا اقبال کرا سکے۔ اس کا تو مجھے ذرا بھی ڈر نہیں ہے کہ برہمن بھوت بن کر ہمیں ستائے گا یا ہمیں اس کی بیدی بنا کر پوجنی پڑے گی۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ گناہ کی سزا بھی اکثر نہیں ملتی لیکن برہم ہتیا سر پر لیتے ہوئے روح تھراتی ہے، بس اتنی سی بات ہے۔ میں آج رات کو موقع دیکھ کو جاؤں گا اور اس مصیبت کو ٹالنے کے لیے جو کچھ ہو سکے گا، کروں گا۔ اطمینان رکھو۔"

(3)

آدھی رات گزر چکی تھی۔ مسٹر سنہا گھر سے نکلے اور تنہا جگت پانڈے کو منانے چلے۔ برگد کے نیچے بالکل سناٹا تھا۔ تاریکی اس قدر تھی گویا کہ رات کی دیوی یہیں سو رہی ہو۔ جگت پانڈے کی سانس زور زور سے چل رہی تھی۔ گویا موت زبردستی گھسیٹے لیے جاتی ہو۔ مسٹر سنہا کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بڈھا کہیں مر تو نہیں رہا ہے؟ پاکٹ لیمپ نکالی اور جگت کے نزدیک جا کر بولے۔ "پانڈے جی! کہو کیا حال ہے؟"

جگت پانڈے نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور اٹھنے کی ناکامیاب کوشش کر کے بولا۔ "میرا حال پوچھتے ہو؟ دیکھتے نہیں مر رہا ہوں۔"

سنہا۔ "تو اس طرح کیوں جان دیتے ہو؟"

جگت۔ "تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کیا کروں؟"

سنہا۔ "میری تو یہ خواہش نہیں۔ ہاں تم البتہ میرا سب کچھ تباہ کرنے پر تُلے ہوئے ہو۔ آخر میں نے تمہارے ڈیڑھ سو روپے ہی تو لیے ہیں۔ اتنے روپیوں کے لیے تم اتنا ستیاگرہ کر رہے ہو۔"

جگت۔ "ڈیڑھ سو روپے کی بات نہیں ہے جی۔ تم نے مجھے مٹی میں ملا دیا۔ میری ڈگری ہو گئی ہوتی تو مجھے دس بیگھ زمین مل جاتی اور سارے علاقہ میں نام ہو جاتا۔ تم نے میرے ڈیڑھ سو نہیں لیے۔ میرے پانچ ہزار بگاڑ دیئے، پورے پانچ ہزار لیکن یاد رکھنا یہ گھمنڈ نہ رہے گا۔ کہے دیتا ہوں ستیاناس ہو جائے گا۔ اس عدالت میں تمہارا راج ہے لیکن ایشور کے دربار میں برہمنوں کا ہی راج ہے۔ برہمن کی دولت لے کر کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔"

مسٹر سنہا نے بہت افسوس اور شرم ظاہر کی۔ بہت خوشامد درآمد سے کام لیا اور آخر میں پوچھا۔ "سچ بتلاؤ پانڈو کتنے روپے پا جاؤ تو میرا قصور معاف کرو؟"

جگت پانڈے اس مرتبہ زور لگا کر اٹھ بیٹھے اور بڑی بے صبری سے بولے۔ "5 ہزار سے کوڑی کم نہ لونگا۔"

سنہا۔ "پانچ ہزار تو بہت ہوتے ہیں، اس قدر ظلم نہ کرو۔"

جگت۔ "نہیں، اس سے کم نہ لوں گا۔"

مسٹر سنہا کو اور کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔ روپے لانے گھر چلے لیکن گھر پہنچتے پہنچتے نیت بدل گئی۔ ڈیڑھ سو کے عوض پانچ ہزار دیتے قلق ہوا۔ دل میں کہنے لگے۔ مرتا ہے مر جانے دو۔ کہاں کی برہم ہتیا اور کیسا پاپ! یہ سب ڈھکوسلا ہے۔ بدنامی ہی نہ ہو گی؟ سرکاری ملازم تو یونہی بدنام ہوتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات تھوڑے ہی ہے۔ بچا کیسے اٹھ بیٹھے تھے۔ سمجھا ہو گا اچھا الو پھنسا۔ اگر چھ دن کی فاقہ کشی سے پانچ ہزار ملیں تو میں مہینہ میں کم سے کم پانچ مرتبہ یہ عمل کروں۔ پانچ ہزار نہیں کوئی مجھے ایک ہی ہزار دے دے یہاں تو مہینہ بھر ناک رگڑتا ہوں تب جا کے چھ سو کی

زیارت نصیب ہوتی ہے!

وہ چارپائی پر لیٹنا ہی چاہتے تھے کہ ان کی بیوی صاحبہ آکر کھڑی ہوگئیں۔ ان کے سر کے بال کھلے ہوئے تھے۔ آنکھیں سہمی ہوئیں۔ رہ رہ کر کانپ اٹھتی تھیں۔ منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ بڑی مشکل سے بولیں۔ ''آدھی رات تو ہو گئی ہوگی؟ تم جگت پانڈے کے پاس چلے جاؤ۔ میں نے ابھی ایسا برا خواب دیکھا ہے کہ ابھی تک کلیجہ دھڑک رہا ہے۔ جان مصیبت میں پڑی ہوئی تھی۔ جا کے کسی طرح اسے ٹالو۔''

سنہا۔ ''وہیں سے تو چلا آرہا ہوں۔ مجھے تم سے زیادہ فکر ہے۔ ابھی آکر کھڑا ہی ہوا تھا کہ تم آگئیں۔''

بیوی۔ ''اچھا! تو تم گئے تھے! کیا باتیں ہوئیں؟ راضی ہوا؟''

سنہا۔ ''پانچ ہزار روپیہ مانگتا ہے۔''

بیوی۔ ''پانچ ہزار!''

سنہا۔ ''کوڑی کم نہیں کرتا اور میرے پاس اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہ ہوں گے۔''

بیوی صاحبہ نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔ ''جتنا مانگتا ہے، اتنا ہی دے دو۔ کسی طرح گلو خلاصی تو ہو۔ تمہارے پاس روپے نہ ہوں تو میں دے دوں گی۔ ابھی سے خواب دکھائی دینے لگے ہیں۔ مرا تو جان کیسے بچے گی۔ بولتا چالتا ہے نہ؟''

مسٹر سنہا آبنوس تھے۔ تو ان کی بیوی چندن۔ سنہا ان کے غلام تھے۔ ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ بیوی صاحبہ بھی سیاسیات زوجی میں ماہر تھیں۔ حسن بے خبری میں نفاق ہے۔ حسینہ کبھی بھولی نہیں ہوتی۔ وہ انسان کے نفس پر آسن جمانا خوب جانتی ہے۔

سنہا۔ ''تو لاؤ دیتا آؤں لیکن آدمی بڑا کاٹھان ہے۔ کہیں روپے لے کر سب کو دکھاتا پھرے تو؟''

بیوی۔ ''اس کو اسی وقت یہاں سے بھگانا ہوگا۔''

سنہا۔ ''تو نکالو دے ہی دوں۔ زندگی میں یہ بات بھی یاد رہے گی۔''

بیوی صاحبہ نے بے اعتباری کے انداز سے کہا۔ ''چلو میں بھی چلتی ہوں، اس وقت کون دیکھتا ہے۔''

بیوی سے زیادہ شوہر کے محسوسات کا علم اور کسی کو نہیں ہوتا۔ مسٹر سنہا کے جذبات کو ان کی بیوی صاحبہ خوب جانتی تھیں۔ کون جانے روپیہ لے کر راستہ میں کہیں چھپا دیں اور کہہ دیں کہ دے آئے یا کہنے لگیں، روپے لے کر بھی نہیں ٹلتا تو میں کیا کروں گی؟ جا کر صندوق سے نوٹوں کے پلندے نکالے اور انہیں چادر میں چھپا کر مسٹر سنہا کے ساتھ چلیں۔ سنہا کے منہ پر جھاڑو سی پھری ہوئی تھی۔ لالٹین لیے پچھتاتے چلے جاتے تھے۔ پانچ ہزار نکلے جاتے ہیں! پھر اتنے روپے کب ملیں گے۔ کون جانتا ہے! اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ کمبخت مر ہی جاتا۔ بلا سے بدنامی ہوتی۔ کوئی میری جیب سے روپے تو نہ چھین لیتا۔ ایشور کرے مر گیا ہو!

ابھی دونوں آدمی پھاٹک ہی تک آئے تھے کہ دیکھا جگت پانڈے لاٹھی ٹیکتا چلا آتا ہے۔ اس کی صورت اتنی ہیبت ناک تھی گویا کہ قبرستان سے کوئی مردہ بھاگا چلا آتا ہو۔

ان کو دیکھتے ہی جگت پانڈے بیٹھ گیا اور ہانپتا ہوا بولا۔ ''بڑی دیر ہوئی، لائے؟''

بیوی صاحبہ بولیں۔ ''مہاراج! ہم تو آ ہی رہے تھے۔ تم نے کیوں تکلیف کی؟ روپیہ لے کر سیدھے گھر چلے جاؤ گے نہ؟''

جگت۔ ''ہاں ہاں۔ سیدھا گھر جاؤں گا۔ کہاں ہیں روپے، دیکھوں؟''
بیوی صاحبہ نے نوٹوں کا پلندہ باہر نکالا اور لالٹین دکھا کر بولیں۔ ''گن لو پورے پانچ ہزار روپے ہیں!''
پانڈے نے پلندہ لیا اور الٹ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں ایک نئی روشنی سے چمکنے لگیں۔ ہاتھوں میں نوٹوں کو تولتا ہوا بولا۔ ''پورے پانچ ہزار ہیں!''
بیوی۔ ''پورے گن لو!''
جگت۔ ''پانچ ہزار میں تو ٹوکری بھر جائے گی (ہاتھوں سے بتلا کر) اتنے سارے ہوئے پانچ ہزار!''
سنہا۔ ''کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آتا؟''
جگت۔ ''ہیں ہیں، پورے ہیں پورے پانچ ہزار۔ تو اب جاؤں، بھاگ جاؤں؟''
یہ کہہ کر وہ پلندہ لیے کئی قدم لڑکھڑاتا ہوا چلا جیسے کوئی شرابی اور تب دھم سے زمین پر گر پڑا۔ مسٹر سنہا لپک کر اٹھانے دوڑے تو دیکھا اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور منہ زرد پڑ گیا ہے۔ بولے۔ ''پانڈے۔ پانڈے! کیا کہیں چوٹ آ گئی؟''
پانڈے نے ایک بار منہ کھولا جیسے مرتی ہوئی چڑیا سر لٹکا کر چونچ کھول دیتی ہے۔ زندگی کا آخری تاگا بھی ٹوٹ گیا۔ ہونٹ کھلے ہوئے تھے اور نوٹوں کا پلندہ چھاتی پر رکھا ہوا تھا۔ اتنے میں بیوی صاحبہ بھی آ پہنچیں اور لاش دیکھ کر چونک پڑیں۔
بیوی۔ ''اسے کیا ہو گیا ہے؟''
سنہا۔ ''مر گیا ہے اور کیا ہو گیا؟''
بیوی۔ (سر پیٹ کر) ''مر گیا! ہائے بھگوان! اب کہاں جاؤں!''
یہ کہہ کر وہ بنگلہ کی طرف بڑی تیزی سے چلیں۔ مسٹر سنہا نے بھی نوٹوں کا پلندہ مردہ کی چھاتی پر سے اٹھا لیا اور چلے۔
بیوی۔ ''یہ روپے اب کیا ہوں گے؟''
سنہا۔ ''خیرات کر دوں گا۔''
بیوی۔ ''گھر میں مت رکھنا۔ خبردار! ہائے بھگوان!''

(4)

دوسرے دن سارے شہر میں خبر مشہور ہو گئی۔ جگت پانڈے نے جنٹ صاحب پر جان دے دی۔ اس کی لاش اٹھی تو ہزاروں آدمی ساتھ تھے۔ مسٹر سنہا کو کھلم کھلا گالیاں دی جا رہی تھیں۔
شام کے وقت مسٹر سنہا کچہری سے آ کر بیٹھے تھے کہ نوکروں نے آ کر کہا۔ ''سرکار ہم کو چھٹی دی جائے! ہمارا حساب کر دیجئے۔ ہماری برادری کے لوگ دھمکاتے ہیں کہ تم اگر جنٹ صاحب کی نوکری کرو گے تو حقہ پانی بند ہو جائے گا۔''
سنہا نے جھلا کر کہا۔ ''کون دھمکاتا ہے؟''

کہار۔ ''کس کا نام بتائیں سرکار؟ سبھی تو کہتے ہیں۔''
رسوئیاں۔ ''حضور! مجھے تو لوگ دھمکاتے ہیں کہ مندر میں نہ گھسنے پاؤ گے۔''
سنہا۔ ''ایک مہینہ کی نوٹس دیئے بغیر تم نہیں جاسکتے۔''
سائیس۔ ''حضور برادری سے بگاڑ کر ہم لوگ کہاں جائیں گے؟ ہمارا آج سے استعفیٰ ہے۔ حساب جب چاہے کر دیجئے گا۔''
مسٹر سنہا نے بہت دھمکایا۔ پھر دلاسا دینے لگے لیکن نوکروں نے ایک نہ سنی۔ آدھ گھنٹہ کے اندر سبھوں نے اپنا اپنا راستہ لیا۔ مسٹر سنہا دانت پیس کر رہ گئے لیکن حاکموں کا کام کب رکتا ہے۔ انہوں نے اسی وقت کوتوال کو خبر دی اور کئی آدمی بیگار میں پکڑ آئے۔ کام چل نکلا۔
اسی دن سے مسٹر سنہا اور ہندو سماج میں کشمکش شروع ہو گئی۔ دھوبی نے کپڑے دھونا بند کر دیا۔ گوالے نے دودھ لانے میں پہلو تہی کی۔ حجام نے حجامت بنانا چھوڑا۔ ان مصیبتوں پر بیوی صاحبہ کا رونا دھونا اور بھی غضب تھا۔ انہیں روزانہ ڈراؤنے خواب دکھائی پڑتے۔ رات کو ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے جان نکلتی تھی۔ کسی کا ذرا سر بھی درد کرتا تو ناخنوں میں جان سما جاتی۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ اپنے رشتہ داروں نے بھی آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک دن سالے آئے لیکن بغیر پانی پیئے واپس چلے گئے۔ اسی طرح ایک دن بہنوئی صاحب تشریف لائے۔ انہوں نے پان تک نہ کھایا۔ مسٹر سنہا بڑے استقلال سے یہ ساری بے عزتی برداشت کرتے تھے۔ اب تک ان کا مالی نقصان نہ ہوا تھا۔ غرض کے باولے جھک مار کر آتے ہی تھے اور نذر و نذرانہ ملتا ہی تھا۔ پھر متفکر ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔
لیکن اہلِ برادری سے نفاق کرنا پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کرنا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا موقع ضرور ہی آ جاتا ہے جب ہم کو اہلِ برادری کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے۔ مسٹر سنہا کو بھی سال بھر کے اندر ہی ایسا موقع آ پڑا۔ یہ ان کی لڑکی کی شادی تھی۔ یہی وہ معاملہ ہے کہ بڑے بڑے شان و شوکت والوں کا گھمنڈ چور چور کر دیتا ہے۔ آپ کسی کے آنے جانے کی پروانہ کریں۔ حقہ، پانی، بھوج، بھات، میل جول، کسی بات کی پروانہ کریں مگر لڑکی کی شادی تو نہ ٹلنے والی بلا ہے۔ اس سے بچ کر آپ کہاں جائیں گے۔ مسٹر سنہا کو اس بات کا دغدغہ تو پہلے ہی سے تھا کہ تربینی کی شادی میں رکاوٹیں پڑیں گی لیکن انہیں اطمینان تھا کہ دولت کی لامتناہی طاقت اس مشکل کو حل کر دے گی۔ کچھ دنوں تک انہوں نے جان بوجھ کر ٹالا کہ شاید اس آندھی کا زور کچھ کم ہو جائے لیکن جب تربینی کا سولہواں سال ختم ہوا تو ٹال مٹول کی گنجائش نہ رہی۔ پیغام بھیجنے لگے لیکن جہاں پیغام جاتا وہیں سے جواب ملتا، ہمیں منظور نہیں۔ جن گھروں میں سال بھر پیشتر ان کا پیغام پاکر لوگ اپنی قسمت پر ناز کرتے وہیں سے اب سوکھا جواب ملتا تھا۔ ہمیں منظور نہیں۔ مسٹر سنہا دولت کا لالچ دیتے۔ زمین نذر کرنے کو کہتے۔ لڑکے کو ولایت بھیج کر اونچے درجہ کی تعلیم دلانے کی تجویز پیش کرتے لیکن ان کی ساری تجاویز کا ایک ہی جواب ملتا۔ ''ہم کو منظور نہیں۔'' اعلیٰ خاندانوں کا یہ رویہ دیکھ کر مسٹر سنہا ان خاندانوں میں پیغام بھیجنے لگے جن کے ساتھ بیٹھ کر پیشتر انہیں کھانا کھانے میں بھی گریز تھا لیکن وہاں بھی انہیں وہی جواب ملا۔ ''ہمیں منظور نہیں۔'' یہاں تک کہ کئی جگہ وہ خود دوڑ دوڑ کر گئے۔ لوگوں کی منتیں کیں، پر یہی جواب ملا۔ ''صاحب! ہمیں منظور نہیں۔'' شاید برادری سے نکالے ہوئے خاندانوں میں ان کا پیغام منظور کر لیا جاتا۔ پر مسٹر سنہا جان بوجھ کر مکھی نہیں نگلنی چاہتے تھے۔ ایسے لوگوں سے رشتہ نہیں کرنا چاہتے تھے جن

کا برادری میں کوئی شمار نہ تھا۔ اس طرح ایک سال گزر گیا۔

مسز سنہا چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھیں۔ تربنی کھانا بنا رہی تھی اور مسٹر سنہا بیوی کے پاس فکر میں ڈوبے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک خط تھا۔ بار بار اسے دیکھتے اور سوچنے لگتے تھے۔ بڑی دیر کے بعد روہنی نے آنکھیں کھولیں اور بولیں۔ ''اب نہ بچوں گی۔ پانڈے میری جان لے کر چھوڑے گا۔''

''ہاتھ میں کیسا کاغذ ہے؟''

سنہا۔ ''لیشوانندن کے پاس سے خط آیا ہے۔ پاجی کو یہ خط لکھتے ہوئے شرم نہیں آئی۔ میں نے اس کی نوکری لگائی۔ شادی کرائی اور آج اس کا مزاج اتنا بڑھ گیا ہے کہ اپنے چھوٹے بھائی کی شادی میری لڑکی سے کرنا پسند نہیں کرتا۔ کمبخت کی قسمت کھل جاتی!''

بیوی۔ ''بھگوان۔ اب لے چلو یہ درگت نہیں دیکھی جاتی۔ انگور کھانے کا جی چاہتا ہے، منگوائے ہیں کہ نہیں؟''

سنہا۔ ''میں خود جا کر لیتا آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر انہوں نے انگور کی طشتری بیوی کے پاس رکھ دی۔ وہ اٹھا اٹھا کر کھانے لگیں۔ جب طشتری خالی ہو گئی تو بولیں۔ ''اب کس کے یہاں پیغام بھیجو گے؟''

سنہا۔ ''کس کے یہاں بتلاؤں۔ میری سمجھ میں تو کوئی ایسا آدمی نہیں رہ گیا۔ ایسی برادری میں رہنے سے تو ہزار درجہ بہتر ہے کہ برادری کے باہر رہوں۔ میں نے ایک برہمن سے رشوت لی، اس سے مجھے انکار نہیں لیکن کون رشوت نہیں لیتا؟ اپنے موقع پر کوئی نہیں چوکتا۔ برہمن نہیں خود ایشور ہی کیوں نہ ہو۔ رشوت خور انہیں بھی چوس ہی لیں گے۔ رشوت دہندہ اگر ناامید ہو کر جان دے دے تو میری کیا خطا؟ اگر کوئی میرے فیصلہ سے ناراض ہو کر زہر کھالے تو میں کیا کر سکتا ہوں؟ اس پر بھی میں اس کا کفارہ کرنے کو تیار ہوں۔ برادری جو سزا دے، اسے منظور کرنے کو تیار ہوں۔ سب سے کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے جو کفارہ چاہو کرالو...... پر کوئی سنتا نہیں۔ سزا خطا کے مطابق ہونی چاہیے۔ نہیں تو یہ ناانصافی ہے۔ اگر کسی مسلمان کا چھوا ہوا کھانا کھانے کے لیے برادری مجھے عبور دریائے شور کی سزا دینا چاہے تو میں اسے کبھی نہ مانوں گا۔ پھر خطا اگر ہے تو میری ہے، میری لڑکی نے کیا خطا کی ہے۔ میری خطا کے لیے میری لڑکی کو سزا دینا سراسر بعید از انصاف ہے۔''

بیوی۔ ''مگر کرو گے کیا؟ کوئی پنچایت کیوں نہیں کرتے؟''

سنہا۔ ''پنچایت میں بھی تو وہی برادری کے مکھیا لوگ ہی ہوں گے۔ ان سے مجھے انصاف کی امید نہیں۔ درحقیقت اس عتاب کا سبب حسد ہے۔ مجھے دیکھ کر سب جلتے ہیں اور اسی بہانے سے مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں۔''

بیوی۔ ''دل کی خواہش دل ہی میں رہ گئی۔ یہ ارمان لیے دنیا سے جانا پڑے گا۔ ایشور کی جیسی مرضی۔ تمہاری باتوں سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری بچی کی نہ جانے کیا حالت ہو گی مگر تم سے میری آخری درخواست یہی ہے کہ برادری سے باہر نہ جانا۔ نہیں تو پرلوک میں بھی میری روح کو تسکین نہ ہو گی۔ یہی رنج میری جان لے رہا ہے۔ ہائے میری بچّی! ہائے میری بچّی!!''

گھاس والی

(1)

ملیا ہری ہری گھاس کا گٹھا لے کر لوٹی تو اس کا گیہواں رنگ کچھ سرخ ہو گیا تھا اور بڑی بڑی مخمور آنکھیں کچھ سہمی ہوئی تھیں۔ مہابیر نے پوچھا۔ "کیا ہے مُلیا؟ آج کیسا جی ہے؟" ملیا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ منہ پھیر لیا۔

مہابیر نے قریب آکر پوچھا۔ "کیا ہوا ہے، بتاتی کیوں نہیں؟ کسی نے کچھ کہا ہے؟ اماں نے ڈانٹا ہے؟ کیوں اتنی اداس ہے؟"

ملیا نے سسک کر کہا۔ "کچھ نہیں۔ ہوا کیا ہے، اچھی تو ہوں۔"

مہابیر نے ملیا کو سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔ "چپ چاپ روتی رہے گی، بتائے گی نہیں۔"

ملیا نے سرزنش کے انداز سے کہا۔ "کوئی بات بھی ہو۔ کیا بتادوں!"

ملیا اس خارزار میں گل صد برگ تھی۔ گیہواں رنگ تھا۔ غنچہ کا سا منہ' بیضاوی چہرہ، ٹھوڑی کھچی ہوئی' رخساروں پر دلآویز سرخی، بڑی بڑی نکیلی پلکیں، آنکھوں میں ایک عجیب التجا۔ ایک دلفریب معصومیت، ساتھ ہی ایک عجیب کشش۔ معلوم نہیں چماروں کے اس گھر میں یہ اپسرا کہاں سے آ گئی تھی۔ کیا اس کا نازک پھول سا جسم اس قابل تھا کہ وہ سر پر گھاس کی ٹوکری رکھ کر بیچنے جاتی۔ اس گاؤں میں بھی ایسے لوگ موجود تھے جو اس کے تلووں کے نیچے آنکھیں بچھاتے تھے۔ اس کی چتونوں کے لیے ترستے تھے۔ جن سے اگر وہ بات بھی کرتی تو نہال ہو جاتے لیکن ملیا کو آئے سال بھر سے زائد ہو گیا۔ کسی نے اسے مردوں کی طرف تاکتے نہیں دیکھا۔ وہ گھاس لیے نکلتی تو اس کا گندمی رنگ طلوع کی سنہری کرنوں سے کندن کی طرح دمک اٹھتا۔ گویا بسنت اپنی ساری فرحت اور شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی جاتی ہو۔ کوئی غزلیں گاتا، کوئی چھاتی پر ہاتھ رکھتا۔ پر ملیا آنکھیں نیچی کیے اپنی راہ چلی جاتی تھی۔ لوگ حیران ہو کر کہتے۔ "اتنا غرور! اتنی بے نیازی! مہابیر میں ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ایسا جوان بھی تو نہیں۔ نہ جانے کیسے اس کے ساتھ رہتی ہے۔ چاند میں گہن لگ جاتا ہوگا۔"

مگر آج ایک ایسی بات ہو گئی جو چاہے اس ذات کی دوسری نازنینوں کے لیے دعوت کا پیغام ہوتی۔ ملیا کے لیے زخم جگر سے کم نہ تھی۔ صبح کا وقت تھا۔ ہوا آم کے بُور کی خوشبو سے متوالی ہو رہی تھی۔ آسمان زمین پر سونے کی بارش کر رہا تھا۔ ملیا سر پر ٹوکری رکھے گھاس چھیلنے جا رہی تھی کہ دفعتاً نوجوان چین سنگھ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ ملیا نے چاہا کہ کترا کر نکل جائے مگر چین سنگھ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ "ملیا! کیا تجھے مجھ پر ذرا بھی رحم نہیں آتا؟"

ملیا کا وہ پھول سا چہرہ شعلہ کی طرح دہک اٹھا۔ وہ ذرا بھی نہیں ڈری، ذرا بھی نہیں جھجکی۔ جھوّا زمین پر گرا دیا اور بولی۔ "مجھے چھوڑ دو، نہیں تو میں چلّاتی ہوں۔"

چین سنگھ کو آج زندگی میں یہ نیا تجربہ ہوا۔ نیچی ذاتوں میں حسن کا اس کے سوا اور کام ہی کیا ہے کہ وہ اونچی ذات والوں کے لیے کھلونا بنے۔ ایسے کتنے ہی معرکے اس نے جیتے تھے۔ پر آج مُلیا کے چہرے کا وہ رنگ، وہ

غصہ' وہ غرور، وہ تمکنت دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے خفیف ہو کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ مُلیا تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ چوٹ کی گرمی میں درد کا احساس نہیں ہوتا۔ زخم ٹھنڈا ہو جاتا ہے تو ٹیس ہونے لگتی ہے۔ مُلیا جب کچھ دور نکل گئی تو غصہ اور خوف اور اپنی بے کسی کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے کچھ دیر تک تو ضبط کیا۔ پھر سسک سسک کر رونے لگی۔ اگر وہ اتنی غریب نہ ہوتی تو کسی کی مجال تھی کہ اس طرح اس کی آبرو لوٹ لیتا۔ وہ روتی جاتی تھی اور گھاس چھیلتی جاتی تھی۔ مہابیر کا غصہ وہ جانتی تھی۔ اگر اس سے کہہ دے تو وہ اس ٹھاکر کے خون کا پیاسا ہو جائے گا۔ پھر نہ جانے کیا ہو! اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اسی لیے اس نے مہابیر کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا تھا۔

(2)

دوسرے دن مُلیا گھاس کے لیے نہ گئی۔ ساس نے پوچھا۔ ''تو کیوں نہیں جاتی اور سب تو چلی گئیں؟''

مُلیا نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں اکیلی نہ جاؤں گی۔''

ساس نے کہا۔ ''اکیلے کیا تجھے باگھ اٹھا لے جائے گا۔ کیوں اوروں کے ساتھ نہیں چلی گئی؟''

مُلیا نے اور بھی سر جھکا لیا اور نہایت دبی ہوئی آواز میں بولی۔ ''میں اوروں کے ساتھ نہ جاؤں گی۔''

ساس نے ڈانٹ کر کہا۔ ''نہ تو اوروں کے ساتھ جائے گی، نہ اکیلی جائے گی تو پھر کیسے جائے گی؟ صاف صاف کیوں نہیں کہتی کہ میں نہ جاؤں گی۔ تو یہاں میرے گھر میں رانی بن کر نباہ نہ ہوگا۔ کسی کو چام نہیں پیارا ہوتا کام پیارا ہوتا ہے۔ تو بڑی سندر ہے تو تیری سندرتا لے کر چاٹوں۔ اٹھا جھوا اور جا گھاس لا۔''

دروازہ پر نیم کے درخت کے سایہ میں کھڑا مہابیر گھوڑے کو مل رہا تھا۔ اس نے مُلیا کو رونی صورت بنائے جاتے دیکھا پر کچھ بول نہ سکا۔ اس کا بس چلتا تو مُلیا کو کلیجہ میں بٹھا لیتا۔ آنکھوں میں چُرا لیتا لیکن گھوڑے کا پیٹ بھرنا تو ضروری تھا۔ گھاس مول لے کر کھلائے تو بارہ آنے سے کم خرچ نہ ہوں۔ ایسی مزدوری ہی کیا ملتی ہے۔ مشکل سے ڈیڑھ دو روپے۔ وہ بھی کبھی ملے کبھی نہ ملے۔ برا ہو ان موٹر لاریوں کا۔ اب یکے کو کون پوچھتا ہے۔ مہاجن سے ڈیڑھ سو روپے قرض لے کر یکہ اور گھوڑا خریدا تھا۔ اس کے سود بھی نہیں پہنچتے۔ اصل کا ذکر ہی کیا۔ ظاہر داری کی۔ ''نہ جی چاہتا ہو نہ جا۔ دیکھی جائے گی۔''

مُلیا نہال ہو گئی۔ آبگوں آنکھوں میں محبت کا سرور جھلک اٹھا۔ بولی۔ ''گھوڑا کھائے گا کیا!''

آج اس نے کل کا راستہ چھوڑ دیا اور کھیتوں کی مینڈوں سے ہوتی ہوئی چلی۔ بار بار خائف نظروں سے ادھر ادھر تاکتی جاتی تھی۔ دونوں طرف اوکھ کے کھیت کھڑے تھے۔ ذرا بھی کھڑکھڑاہٹ ہوتی تو اس کا جی سن سے ہو جاتا۔ کوئی اوکھ میں چھپا بیٹھا نہ ہو مگر کوئی نئی بات نہ ہوئی۔ اوکھ کے کھیت نکل گئے۔ آموں کا باغ نکل گیا۔ سینچے ہوئے کھیت نظر آنے لگے۔ دور ایک کنویں پر پُر چل رہا تھا۔ کھیتوں کی مینڈوں پر ہری ہری گھاس جمی ہوئی تھی۔ مُلیا کا جی للچایا۔ یہاں آدھ گھنٹہ میں جتنی گھاس چھیل سکتی ہے اتنی خشک میدان میں دوپہر تک بھی نہ چھیل سکے گی۔ یہاں دیکھتا ہی کون ہے۔ کوئی پکارے گا تو چپکے سے سرک جاؤں گی۔ وہ بیٹھ کر گھاس چھیلنے لگی اور ایک گھنٹہ میں اس کا جھابا آدھے سے زیادہ بھر گیا۔ اپنے کام میں اتنی محو ہو گئی کہ اسے چین سنگھ کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ یکایک

آہٹ پا کر سر اٹھایا تو چین سنگھ کھڑا تھا۔

مُلیا کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ جی میں آیا بھاگ جائے۔ جھابا وہیں الٹ دے اور خالی جھابا لے کر چلی جائے۔ پر چین سنگھ نے کئی گز کے فاصلہ پر ہی رک کر کہا۔ "ڈرو مت 'ڈرمت' بھگوان جانے میں تجھ سے کچھ نہ بولوں گا۔ خوب چھیل لے، میرا ہی کھیت ہے۔"

مُلیا کے ہاتھ مفلوج سے ہو گئے۔ کھرپی ہاتھ میں جم سی گئی۔ گھاس نظر ہی نہ آتی تھی۔ جی چاہتا تھا دھرتی پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔ زمین آنکھوں کے سامنے تیرنے لگی۔

چین سنگھ نے دلا سا دیا۔ "چھیلتی کیوں نہیں۔ میں تجھ سے کچھ کہتا تھوڑا ہی ہوں۔ یہیں روز چلی آیا کر۔ میں چھیل دیا کروں گا۔"

مُلیا بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کے سینہ میں اب اتنی دھڑکن نہ تھی۔

چین سنگھ نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بولا۔ "تو مجھ سے اتنا ڈرتی کیوں ہے؟ کیا تو سمجھتی ہے، میں تجھے ستانے آیا ہوں۔ ایشور جانتا ہے کل بھی تجھے ستانے کے لیے تیرا ہاتھ نہیں پکڑا تھا۔ تجھے دیکھ کر آپ ہی آپ ہاتھ بڑھ گئے۔ مجھے کچھ سدھ ہی نہ رہی۔ تو چلی گئی تو میں وہیں بیٹھ کر گھنٹوں روتا رہا۔ جی میں آتا تھا، اس ہاتھ کو کاٹ ڈالوں۔ کبھی جی چاہتا تھا زہر کھالوں۔ تبھی سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں۔ آج تو ادھر سے چلی آئی۔ میں سارے ہار میں مارا مارا پھرا کیا۔ اب جو سزا تیرے جی میں آوے دے۔ اگر تو میرا سر بھی کاٹ لے تو گردن نہ ہلاؤں گا۔ میں شہدا ہوں، لچا ہوں لیکن جب سے تجھے دیکھا ہے، نہ جانے کیوں میرے من کی ساری کھوٹ مٹ گئی۔ اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ تیرا کتا ہوتا اور تیرے پیچھے پیچھے چلتا۔ تیرا گھوڑا ہوتا تب تو تو کبھی کبھی میرے منہ پر ہاتھ پھیرتی۔ تو مجھ سے کچھ بولتی کیوں نہیں۔ کسی طرح یہ چولا تیرے کام آوے۔ میرے من کی یہی سب سے بڑی لالسا ہے۔ روپیہ پیسہ، اناج پانی، بھگوان کا دیا سب کچھ گھر میں ہے۔ بس تیری دیا چاہتا ہوں۔ میری جوانی کام نہ آوے اگر میں کسی کھوٹ سے یہ باتیں کر رہا ہوں۔ بڑا بھاگوان تھا مہابیر کہ ایسی دیوی اسے ملی۔"

مُلیا چپ چاپ سنتی رہی۔ پھر سر نیچا کر کے بھولے پن سے بولی۔ "تو تم مجھے کیا کرنے کو کہتے ہو؟"

چین سنگھ نے اور قریب آکر کہا۔ "بس تیری دیا چاہتا ہوں۔"

مُلیا نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا شرمیلا پن نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ چبھتے ہوئے لفظوں میں بولی۔ "تم سے ایک بات پوچھوں، برا تو نہ مانو گے؟ تمہارا بیاہ ہو گیا ہے یا نہیں؟"

چین سنگھ نے دبی زبان سے کہا۔ "بیاہ تو ہو گیا ہے مُلیا! لیکن بیاہ کیا ہے، کھلواڑ ہے۔"

مُلیا کے لبوں پر ایک حقارت آمیز تبسم نمودار ہو گیا۔ بولی۔ "اگر اسی طرح مہابیر تمہاری عورت کو چھیڑتا تو تمہیں کیسا لگتا؟ تم اس کی گردن کاٹنے پر تیار ہو جاتے کہ نہیں؟ بولو کیا سمجھے ہو؟ مہابیر چمار ہے تو اس کے بدن میں لہو نہیں ہے، شرم نہیں ہے۔ اپنی اِجت آبرو کا کھیال نہیں ہے! میرا روپ رنگ تمہیں بھاتا ہے۔ کیا مجھ سے بہت سندر عورتیں شہر میں، ندی کے گھاٹ پر نہیں گھوما کرتیں۔ میرا منہ ان کے تلوؤں کی برابری بھی نہیں کر سکتا۔ تم ان میں سے کسی سے کیوں دیا نہیں مانگتے؟ کیا ان کے پاس دیا نہیں ہے؟ مگر تم وہاں نہ جاؤ گے کیونکہ وہاں جاتے تمہاری چھاتی دہلتی ہے۔ مجھ سے دیا مانگتے ہو۔ اس لیے کہ میں چمارن ہوں، نیچ جات ہوں اور نیچ جات کی عورت جرا سی آرجو بِنتی، یا جرا سے لالچ، یا جرا سی گھرکی دھمکی سے کابو میں آجاتی ہے۔ کتنا سستا سودا ہے! ٹھاکر ہو نا' ایسا سستا

سودا کیوں چھوڑنے لگے۔"

چین سنگھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا بلکہ سینکڑوں جوتے پڑ گئے۔ خفت آمیز لہجہ میں بولا۔ "یہ بات نہیں ہے مُلیا! میں سچ کہتا ہوں، اس میں اونچ نیچ کی بات نہیں ہے۔ سب آدمی برابر ہیں۔ میں تو تیرے چرنوں پر سر رکھنے کو تیار ہوں۔"

مُلیا طنز سے بولی۔ "اسی لیے تو کہ جانتے ہو، میں کچھ کر نہیں سکتی۔ جا کر کسی کھترانی یا ٹھکرائن کے چرنوں پر سر رکھو تو معلوم ہو کہ چرنوں پر سر رکھنے کا کیا پھل ملتا ہے۔ پھر یہ سر تمہاری گردن پر نہ رہے گا۔"

چین سنگھ مارے شرم کے زمین میں گڑا جاتا تھا۔ اس کا منہ اتنا خشک ہو گیا تھا جیسے مہینوں کی بیماری کے بعد اٹھا ہو۔ منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ مُلیا اتنی ذی فہم ہے، اس کا اسے گمان بھی نہ تھا۔

مُلیا نے پھر کہا۔ "میں بھی روز بجار جاتی ہوں۔ بڑے بڑے گھروں کا حال جانتی ہوں۔ مجھے کسی بڑے گھر کا نام بتادو جس میں کوئی سائیس، کوئی کوچوان، کوئی کہار، کوئی پنڈا، کوئی مہراج، نہ گھسا بیٹھا ہو۔ یہ سبھی بڑے گھروں کی لیلا ہے اور وہ عورتیں جو کچھ کرتی ہیں ٹھیک کرتی ہیں۔ ان کے مرد بھی تو چمارنوں اور کہارنوں پر جان دیتے پھرتے ہیں۔ لینا دینا برابر ہو جاتا ہے۔ بیچارے گریب آدمیوں کے لیے یہ راگ رنگ کہاں؟ مہابیر کے لیے سنسار میں جو کچھ ہوں، میں ہوں۔ وہ کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ سنجوگ کی بات ہے کہ میں جرا سندر ہوں لیکن میں کالی کلوٹی ہوتی تب بھی مہابیر مجھے اسی طرح رکھتا۔ اس کا مجھے بھروسا ہے۔ میں چمارن ہو کر بھی اتنی کمینہ نہیں ہوں کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے، اس کے ساتھ دگا کروں۔ ہاں مہابیر اپنے من کی کرنے لگے۔ میری چھاتی پر مونگ دلے تو میں بھی اس کی چھاتی پر مونگ دلوں گی۔ تم میرے روپ ہی کے دیوانے ہو نا؟ آج مجھے ماتا نکل آئے، کانی ہو جاؤں تو میری طرف تاکو گے بھی نہیں۔ بولو جھوٹھ کہتی ہوں؟"

چین سنگھ انکار نہ کر سکا۔

مُلیا نے اسی ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ "لیکن میری ایک نہیں، دونوں آنکھیں پھوٹ جائیں تب بھی مہابیر کی آنکھ نہ پھرے گی۔ مجھے اٹھاوے گا، بٹھاوے گا، کھلاوے گا، سلاوے گا۔ کوئی ایسی سیوا نہیں ہے جو وہ اٹھا رکھے۔ تم چاہتے ہو، میں ایسے آدمی سے دگا کروں، جاؤ۔ اب مجھے کبھی نہ چھیڑنا۔ نہیں تو اچھا نہ ہو گا۔"

(3)

جوانی جوش ہے۔ حوصلہ ہے، عزم ہے، رحم ہے، قوت ہے اور وہ سب کچھ جو زندگی کو روشن، پاکیزہ اور مکمل بنا دیتا ہے۔ جوانی کا نشہ غرور ہے، نفس پروری ہے، رعونت ہے، ہوس پرستی ہے، خود مطلبی ہے اور وہ سب کچھ جو زندگی کو بہیمیت، زوال اور بدی کی جانب لے جاتا ہے۔ چین سنگھ پر جوانی کا نشہ تھا۔ مُلیا نے ٹھنڈے چھینٹوں سے نشہ اتار دیا۔ عورت جتنی آسانی سے دین اور ایمان کو غارت کر سکتی ہے، اتنی ہی آسانی سے ان کو قوت بھی عطا کر سکتی ہے۔ وہی چین سنگھ جو بات بات پر مزدوروں کو گالیاں دیتا تھا، اسامیوں کو پیٹتا تھا۔ اب اتنا خلیق، اتنا متحمل، اتنا منکسر ہو گیا تھا کہ لوگوں کو تعجب ہوتا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن شام کو چین سنگھ کھیت دیکھنے گیا۔ پُر چل رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک جگہ نالی

ٹوٹ گئی ہے اور سارا پانی بہا چلا جا رہا ہے۔ کیاری میں بالکل پانی نہ پہنچتا تھا مگر کیاری برانے والی عورت چپ چاپ بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے اس کی ذرا بھی فکر نہ تھی کہ پانی کیوں نہیں آتا۔ پہلے یہ لاپروائی دیکھ کر چین سنگھ آپے سے باہر ہو جاتا۔ اس عورت کی پورے دن کی مزدوری کاٹ لیتا اور پُر چلانے والوں کو گھرکیاں جماتا۔ پر آج اسے غصہ نہیں آیا۔ اس نے مٹی لے کر نالی باندھ دی اور بڑھیا کے پاس جا کر بولا۔ ''تو یہاں بیٹھی ہے اور پانی سب بہا جا رہا ہے!''

بڑھیا کی روح فنا ہو گئی۔ گھبرا کر بولی۔ ''ابھی کھل گئی ہو گی راجہ۔ میں جا کر بند کیے دیتی ہوں۔''

بڑھیا کو تھرتھر کانپتے دیکھ کر چین سنگھ نے اس کی دلجمعی کرتے ہوئے کہا۔ ''بھاگ مت! میں نے نالی بند کر دی ہے۔ بڑھؤ کئی دن سے نہیں دکھائی دیئے۔ کہیں کام دھندا کرنے جاتے ہیں کہ نہیں؟''

بڑھیا کا سکڑا ہوا چہرہ چکنا ہو گیا۔ بولی ''آج کل تو ٹھالے ہی بیٹھے ہیں بھیا۔ کہیں کام نہیں لگتا۔''

چین سنگھ نے نرمی سے کہا۔ ''تو ہمارے یہاں لگا دے۔ تھوڑا سا سن رکھا ہے، کات دیں۔''

یہ کہتا ہوا وہ کنوئیں کی جانب چلا گیا۔ وہاں چار پُر چل رہے تھے۔ پر اس وقت دو ہکوے بیر کھانے گئے تھے۔ چین سنگھ کو دیکھتے ہی باقی مزدوروں کے ہوش اڑ گئے۔ اگر ٹھاکر نے پوچھا، دو آدمی کہاں گئے تو کیا جواب دیں گے۔ سب کے سب ڈانٹے جائیں گے۔ بچارے دل میں سہمے جا رہے تھے کہ دیکھیں سر پر کون آفت آتی ہے۔

چین سنگھ نے پوچھا۔ ''وہ دونوں کہاں گئے؟''

ایک مزدور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''دونوں کسی کام سے ابھی چلے گئے ہیں بھیا۔''

دفعتاً دونوں مزدور دھوتی کے ایک کونے میں بیر بھرے آتے دکھائی دیئے۔ دونوں خوش خوش چلے آ رہے تھے۔ چین سنگھ پر نگاہ پڑی تو پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اب نہ آتے بنتا ہے نہ جاتے۔ دونوں سمجھ گئے کہ آج بے طرح مار پڑی۔ شاید مزدوری بھی کٹ جائے۔ شش و پنج کی حالت میں کھڑے تھے کہ چین سنگھ نے پکارا۔ ''آؤ بڑھ آؤ۔ کیسے بیر ہیں؟ ذرا مجھے بھی دکھاؤ۔ میرے ہی باغ کے ہیں نا؟''

دونوں اور بھی تھرا اٹھے۔ آج ٹھاکر جیتا نہ چھوڑے گا۔ شائد سر کے بال بھی نہ بچیں۔ بھگو بھگو کر لگائے گا۔

چین سنگھ نے پھر کہا۔ ''جلدی سے آؤ جی۔ کھڑے کیا ہو مگر پکی پکی سب میں لے لوں گا۔ کہے دیتا ہوں۔ ذرا ایک آدمی لپک کر گھر سے تھوڑا سا نمک تو لے لو۔ (مزدوروں سے) چھوڑ دو پُر۔ آؤ بیر کھاؤ۔ اس باغ کے بیر بہت میٹھے ہوتے ہیں۔ کام تو کرنا ہی ہے۔''

دونوں خطاواروں کو اب کچھ تشفی ہوئی۔ آ کر سارے بیر چین سنگھ کے سامنے رکھ دیئے۔ ایک مزدور نمک لانے دوڑا۔ ایک نے کنوئیں سے لٹیا ڈور سے پانی نکالا۔ چین سنگھ چرسے کا پانی نہ پیتا تھا۔ آدھ گھنٹہ تک چاروں پُر بند رہے۔ سبھوں نے خوب بیر کھائے۔ جب سب بیر اڑ گئے تو ایک مجرم نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ''بھیا جی! آج جان بکسی ہو جائے۔ بڑی بھوک لگی تھی۔ نہیں تو کام چھوڑ کر نہ جاتے۔''

چین سنگھ نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ ''تو اس میں برائی کیا ہے۔ میں نے بھی تو بیر کھائے ہیں۔ آدھ گھنٹہ کا ہرج ہوا۔ اتنا ہی تو تم چاہو گے تو گھنٹہ بھر کا کام آدھ گھنٹہ میں کر لو گے۔ نہ چاہو گے تو دن بھر میں بھی گھنٹہ بھر کا کام نہ ہو گا۔''

چین سنگھ چلا گیا تو چاروں باتیں کرنے لگے۔

ایک نے کہا۔ ''مالک اس طرح رہے تو کام کرنے میں جی لگتا ہے۔ یہ نہیں کہ ہر دم چھاتی پر سوار!''

دوسرا۔ ”میں نے تو سمجھا آج کچا ہی کھائے جائے گا۔“
تیسرا۔ ”کئی دن سے دیکھتا ہوں مجاج کچھ نرم ہو گیا ہے۔“
چوتھا۔ ”سانجھ کو پوری مجوری ملے تو کہنا۔“
پہلا۔ ”تم تو ہو گوبر گنیس۔ آدمی کا رُکھ نہیں پہچانتے۔“
دوسرا۔ ”اب خوب دل لگا کر کام کریں گے۔“
تیسرا۔ ”جب انہوں نے ہمارے اوپر چھوڑ دیا تو ہمارا بھی دھرم ہے کہ اپنا کام سمجھ کر کام کریں۔“
چوتھا۔ ”مجھے تو بھیا ٹھاکر پر اب بھی بسواس نہیں آتا۔“

(4)

ایک دن چین سنگھ کو کسی کام سے کچہری جانا تھا۔ پانچ میل کا سفر تھا۔ یوں تو وہ برابر اپنے گھوڑے پر جایا کرتا تھا۔ پر آج دھوپ تیز تھی۔ سوچا یکے پر چلا چلوں۔ مہابیر کو کہلا بھیجا، مجھے بھی لیتے جانا۔ کوئی نو بجے مہابیر نے پکارا۔ چین سنگھ تیار بیٹھا تھا۔ چٹ پٹ یکے پر بیٹھ گیا مگر گھوڑا اتنا دبلا ہو رہا تھا، یکے کی گدی اتنی میلی اور پھٹی ہوئی، سارا سامان اتنا بوسیدہ کہ چین سنگھ کو یکے پر بیٹھتے شرم آتی تھی۔ پوچھا۔ ”یہ سامان کیوں بگڑا ہوا ہے مہابیر؟ تمہارا گھوڑا تو کبھی اتنا دبلا نہ تھا۔ کیا آج کل سواریاں کم ہیں؟“

مہابیر نے کہا۔ ”مالک سواریاں کم نہیں ہیں مگر لاریوں کے سامنے یکے کو کون پوچھتا ہے۔ کہاں دو ’ڈھائی‘ تین کی مجوری کر کے گھر لوٹتا تھا۔ کہاں اب بیس آنے کے پیسے بھی نہیں ملتے۔ کیا جانور کو کھلاؤں، کیا آپ کھاؤں۔ بڑی بپت میں پڑا ہوا ہوں۔ سوچتا ہوں یکہ گھوڑا بیچ باچ کر آپ لوگوں کی مجوری کروں۔ پر کوئی گاہک نہیں ملتا۔ جیادہ نہیں تو بارہ آنے تو گھوڑے ہی کو چاہیے۔ گھاس اوپر سے۔ جب اپنا ہی پیٹ نہیں بھرتا تو جانور کو کون پوچھے۔“

چین سنگھ نے اس کے پھٹے ہوئے کرتے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”دو چار بیگھے کی کھیتی کیوں نہیں کر لیتے؟ کھیت مجھ سے لے لو۔“

مہابیر نے معذوری کے انداز سے سر جھکا کر کہا۔ ”کھیتی کے لیے بڑی ہمت چاہیے مالک۔ میں نے بھی سوچا ہے، کوئی گاہک لگ جائے تو یکے کو اونے پونے نکال دوں۔ پھر گھاس چھیل کر بجار لے جایا کروں۔ آج کل ساس بہو دونوں گھاس چھیلتی ہیں تب جا کر دس بارہ آنے پیسے نصیب ہوتے ہیں۔“

چین سنگھ نے پوچھا۔ ”تو بڑھیا بجار جاتی ہو گی؟“

مہابیر شرماتا ہوا بولا۔ ”نہیں راجہ! وہ اتنی دور کہاں چل سکتی ہے۔ گھر والی چلی جاتی ہے۔ دوپہر تک گھاس چھیلتی ہے، تیسرے پہر بجار جاتی ہے۔ وہاں سے گھڑی رات گئے لوٹتی ہے۔ ہلکان ہو جاتی ہے بھیا‘ مگر کیا کروں، تکدیر سے کیا جور!“

چین سنگھ کچہری پہنچ گیا۔ مہابیر سواریوں کی ٹوہ میں شہر کی طرف چلا گیا۔ چین سنگھ نے اسے پانچ بجے آنے کو کہہ دیا۔

کوئی چار بجے چین سنگھ کچہری سے فرصت پا کر باہر نکلا۔ احاطے میں پان کی دکان تھی۔ احاطہ کے باہر

پھاٹک سے ملا ہوا ایک برگد کا درخت تھا۔ اس کے سایہ میں بیسیوں ہی یکے، تانگے، بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑے کھول دیئے گئے تھے۔ وکیلوں، مختاروں اور افسروں کی سواریاں یہیں کھڑی رہتی تھیں۔ چین سنگھ نے پانی پیا، پان کھایا اور سوچنے لگا، کوئی لاری مل جائے تو ذرا شہر کی سیر کر آؤں کہ یکایک اس کی نگاہ ایک گھاس والی پر پڑ گئی۔ سر پر گھاس کا جھابا رکھے سائیسوں سے مول بھاؤ کر رہی تھی۔ چین سنگھ کا دل اچھل پڑا۔ یہ تو مُلیا ہے۔ کتنی بنی ٹھنی۔ کئی کوچبان جمع ہو گئے تھے۔ کوئی اس سے مذاق کرتا تھا، کوئی گھورتا تھا، کوئی ہنستا تھا۔

ایک کالے کلوٹے کوچبان نے کہا۔ "مُلیا گھاس تو اڑ کے چھ آنے کی ہے۔"

مُلیا نے نشہ خیز آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "چھ آنے پر لینا ہے تو وہ سامنے گھسیارنیں بیٹھی ہیں، چلے جاؤ۔ دو چار پیسے کم میں پا جاؤ گے۔ میری گھاس تو بارہ آنے ہی میں جائے گی۔"

ایک ادھیڑ کوچبان نے فٹن کے اوپر سے کہا۔ "تیرا جمانا ہے، بارہ آنے نہیں، ایک روپیہ مانگ بھائی۔ لینے والے جھک ماریں گے اور لیں گے۔ نکلنے دے وکیلوں کو۔ اب دیر نہیں ہے۔"

ایک تانگے والے نے جو گلابی پگڑی باندھے ہوئے تھا، کہا۔ "بڑھؤ کے منہ میں بھی پانی بھر آیا۔ اب مُلیا کا مجاج کاہے کو ملے گا۔"

چین سنگھ کو ایسا غصہ آ رہا تھا کہ ان بدمعاشوں کی جوتوں سے خبر لے۔ سب کے سب اس کی طرف کیسا ٹکٹکی لگائے تاک رہے ہیں۔ گویا آنکھوں سے پی جائیں گے اور مُلیا بھی یہاں کتنی خوش ہے! نہ لجاتی ہے، نہ جھجھکتی ہے، نہ بگڑتی ہے۔ کیسا مسکرا مسکرا کر رسیلی چتونوں سے دیکھ دیکھ کر سر کا آنچل کھسکا کھسکا کر منہ موڑ موڑ کر باتیں کر رہی ہے۔ وہی مُلیا جو شیرنی کی طرح تڑپ اٹھی تھی!

ذرا دیر میں وکیل مختاروں کا ایک میلہ سا نکل پڑا۔ کوچبانوں نے بھی چٹ پٹ گھوڑے جوتے۔ مُلیا پر چاروں کی طرف عینک بازوں کی مشتاق، مستانہ، قدر درانہ، ہوس ناک نظریں پڑنے لگیں۔ ایک انگریزی فیشن کے بھلے آدمی آکر اس فٹن پر بیٹھ گئے اور مُلیا کو اشارے سے بلایا۔ کچھ باتیں ہوئیں۔ مُلیا نے گھاس پائدان کے پاس رکھی۔ ہاتھ پھیلا کر اور منہ موڑ کر کچھ لیا، پھر مسکرا کر چل دی۔ فٹن بھی روانہ ہو گئی۔

چین سنگھ پان والے کی دکان پر خود فراموشی کی حالت میں کھڑا تھا۔ پان والے نے دکان بڑھائی۔ کپڑے پہنے اور کیبن کا دروازہ بند کر کے نیچے اترا تو چین سنگھ کو ہوش آیا۔ پوچھا "کیا دکان بند کر دی؟"

پان والے نے ہمدردانہ انداز سے کہا۔ "اس کی دوا کرو ٹھاکر صاحب۔ یہ بیماری اچھی نہیں ہے۔"

چین سنگھ نے استعجاب سے پوچھا۔ "کیسی بیماری؟"

پان والا بولا۔ "کیسی بیماری؟ آدھ گھنٹہ سے یہاں کھڑے ہو جیسے بدن میں جان ہی نہیں ہے۔ ساری کچہری خالی ہو گئی۔ مہتر تک جھاڑو لگا کر چل دیئے۔ تمہیں کچھ خبر ہوئی؟ جلدی دوا کرا ڈالو۔"

چین سنگھ نے چھڑی سنبھالی اور پھاٹک کی طرف چلا کہ مہابیر کا یکہ سامنے سے آتا دکھائی دیا۔

(5)

یکہ کچھ دور نکل گیا تو چین سنگھ نے پوچھا۔ "آج کتنے پیسے کمائے مہابیر؟"

مہابیر نے ہنس کر کہا۔ "آج تو مالک دن بھر کھڑا ہی رہ گیا۔ کسی نے بیگار میں بھی نہ پکڑا۔ اوپر سے چار پیسے کی بیڑیاں پی گیا۔"

چین سنگھ نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا۔ "میری ایک صلاح مانو۔ عزت ہماری تمہاری ایک ہے۔ تم مجھ سے ایک روپیہ روز لے لیا کرو۔ بس جب بلاؤں تو یکہ لے کر آجاؤ۔ تب تو تمہاری گھر والی کو گھاس لے کر بازار نہ آنا پڑے گا۔ بولو منظور ہے؟"

مہابیر نے مشکور نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "مالک آپ ہی کا تو کھاتا ہوں۔ پرجا بھی آپ ہی کا ہوں۔ جب مرجی ہو بلوا لیجئے۔ آپ سے روپے......"

چین سنگھ نے بات کاٹ کر کہا۔ "نہیں، میں تم سے بیگار نہیں لینی چاہتا۔ تم مجھ سے ایک روپیہ روز لے جایا کرو۔ گھر والی کو گھاس لے کر بازار مت بھیجا کرو۔ ہاں دیکھو' مُلیا سے بھول کر بھی اس کی چرچا نہ کرنا۔ نہ اور کسی سے کہنا۔"

کئی دنوں کے بعد شام کو مُلیا کی ملاقات چین سنگھ سے ہو گئی۔ وہ آسامیوں سے لگان وصول کر کے گھر کی طرف لپکا جا رہا تھا کہ اسی جگہ جہاں اس نے مُلیا کی بانہہ پکڑی تھی، مُلیا کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ اس نے ٹھٹک کر دیکھا تو مُلیا دوڑی چلی آ رہی تھی۔ بولی۔ "کیا ہے مُلیا۔ دوڑ مت، دوڑ مت۔ میں تو کھڑا ہوں۔"

مُلیا نے ہانپتے ہوئے کہا۔ "اب میں گھاس بیچنے نہیں جاتی۔ کئی دن سے تم سے ملنا چاہتی تھی۔ پر تم کہیں ملتے نہ تھے اور تمہارے گھر جا نہ سکتی تھی۔ آج تمہیں دیکھ کر دوڑی۔ اس پیپل کے پاس سے دوڑی آ رہی ہوں۔"

چین سنگھ نے پیپل کی طرف دیکھ کر معذرت کے انداز سے کہا۔ "ناحق اتنی دور دوڑی۔ پسینے پسینے ہو رہی ہے۔ تو نے بڑا اچھا کیا کہ بازار جانا چھوڑ دیا۔"

مُلیا نے پوچھا۔ "تم نے مجھے کبھی گھاس بیچتے دیکھا ہے کیا؟"

چین سنگھ۔ "ہاں ایک دن دیکھا تھا۔ کیا مہابیر نے تجھ سے سب کچھ کہہ ڈالا؟ میں نے تو منع کر دیا تھا۔"

مُلیا۔ "وہ مجھ سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔"

دونوں ایک لمحہ تک خاموش کھڑے رہے۔ یکایک مُلیا نے مسکرا کر کہا۔ "یہیں تم نے میری بانہہ پکڑی تھی!"

چین سنگھ شرمندہ ہو کر بولا۔ "اس کو بھول جاؤ مولا دیوی۔ مجھ پر نہ جانے کون بھوت سوار تھا۔"

مُلیا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اسے کیوں بھول جاؤں۔ اسی ہاتھ پکڑنے کی لاج تو نبھا رہے ہو۔ گریبی آدمی سے جو چاہے کروادے، تم نے مجھے ڈوبنے سے بچا لیا۔"

پھر دونوں چپ ہو گئے۔

ذرا دیر بعد مُلیا نے شرارت آمیز انداز سے پوچھا۔ "تم نے سمجھا ہوگا۔ میں ہنسنے بولنے میں مگن ہو رہی تھی؟ کیوں؟"

چین سنگھ نے زور دے کر کہا۔ "نہیں مُلیا مجھے ایسا خیال ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں آیا۔ اتنا کمینہ نہ سمجھ۔"

مُلیا مسکرا کر بولی۔ "مجھے تم سے یہی آسا تھی۔"

ہوا سینچے ہوئے کھیتوں میں آرام کرنے جارہی تھی۔ آفتاب افق کی گود میں آرام کرنے جارہا تھااور اس دھندلی روشنی میں کھڑا چین سنگھ مُلیا کی مٹتی ہوئی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

بیوی سے شوہر

(1)

مسٹر سیٹھ کو ہر ایک ہندوستانی چیز سے نفرت تھی اور ان کی قبول صورت بیوی گوداوری کو ہر ایک ولایتی چیز سے گریز۔ مگر ضبط اور حلم ہندوستانی دیویوں کا خاصا ہے۔ گوداوری دل پر ہزار جبر کر کے ہر ایک بدیسی چیز کا استعمال کرتی۔ حالانکہ اندر ہی اندر اس کا دل اپنی بے کسی پر روتا رہتا تھا۔ وہ جس وقت اپنے چھجے پر کھڑی ہو کر سڑک پر نگاہ دوڑاتی اور کتنی ہی مستورات کو کھدر کی ساڑھیاں پہنتے دیکھتی تو اس کے دل سے ایک ٹھنڈی آہ نکل آتی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوتا، مجھ سے زیادہ بدنصیب عورت دنیا میں نہیں ہے۔ میں اپنے اہلِ وطن کی اتنی خدمت بھی نہیں کرسکتی! شام کو مسٹر سیٹھ کے پُر بضد ہونے پر بھی وہ کہیں سیر و تفریح کے لیے نہ جاتی۔ اسے ولایتی کپڑے پہنتے نکلتے ہوئے شرم دامنگیر ہوتی تھی۔

ہولی کا دن تھا۔ آٹھ بجے رات کا وقت۔ فدائیان حریت کا جلوس آکر مسٹر سیٹھ کے مکان کے سامنے رکا اور اسی چوڑے میدان میں ولایتی کپڑوں کی ہولی لگانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ گوداوری اپنے کمرہ میں کھڑکی پر کھڑی یہ نظارہ دیکھتی تھی اور دل میں مسوس کر رہ جاتی تھی۔ ایک وہ ہیں جو یوں خوش خوش نشۂ آزادی سے مخمور، غرور سے سر اٹھائے ہولی لگا رہے ہیں۔ اور ایک میں ہوں۔ قفس میں بند طائر کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی۔ ان تیلیوں کو کیسے توڑ دوں! اس نے کمرہ میں نگاہ ڈالی۔ ہر ایک چیز ولایتی تھی۔ یہی چیزیں وہاں جلائی جارہی تھیں اور وہی چیزیں یہاں ذلت کے احساس کی طرح صندوق میں مقفل رکھی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتی تھی ان چیزوں کو اٹھا کر اسی ہولی میں ڈال دے۔ اس کی ذلت اور بے کسی ایک شعلہ میں فنا ہو جائے۔ مسٹر سیٹھ ابھی تک کلب سے نہ لوٹے تھے۔ گوداوری کے جی میں آیا، اپنی ساڑھیاں اٹھا کر ہولی میں ڈال آؤں مگر پھر شوہر کی ناراضگی کا خیال آگیا۔ رک گئی۔

یکا یک مسٹر سیٹھ نے اندر آکر کہا۔ "ذرا ان احمقوں کو دیکھو۔ کپڑے جلا رہے ہیں۔ یہ دیوانگی اور جنون اور حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، ہندوستانیوں کو کبھی نہ عقل آئی ہے، نہ آوے گی۔ کوئی کل بھی تو سیدھی نہیں۔"

گوداوری نے کہا۔ "تم بھی تو ہندوستانی ہو!"

سیٹھ نے گرم ہو کر کہا۔ "ہاں لیکن مجھے اس کا ہمیشہ افسوس رہتا ہے۔ ایسے ذلیل ملک میں میں کیوں پیدا ہوا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے ہندوستانی کہے یا سمجھے۔ کم سے کم میں نے اپنی بود و باش، طور و طریق، قول و فعل میں کوئی ایسی بات نہیں رکھی جس سے کوئی مجھے ہندوستانی سمجھے۔ سوچیے جب ہمیں آٹھ آنہ گز میں نہایت خوبصورت

کپڑا ملتا ہے تو ہم کیوں موٹا ٹاٹ خریدیں۔ اس معاملہ میں کامل آزادی ہونی چاہیے۔ معلوم نہیں گورنمنٹ نے کیوں ان احمقوں کو یہاں جمع ہونے دیا۔ اگر میں بر سرِ اختیار ہوتا تو سبھوں کو واصل جہنم کر دیتا۔ تب معلوم ہوتا۔"

گوداوری۔ "تمہیں ذرا بھی اپنے غریب بھائیوں کا خیال نہیں آتا؟"

سیٹھ۔ "میں انہیں اپنا بھائی نہیں سمجھتا۔"

گوداوری۔ "آخر تمہیں سرکار جو تنخواہ دیتی ہے، وہ انہیں آدمیوں کے جیب سے تو آتی ہے۔"

سیٹھ۔ "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ میری تنخواہ کس کے جیب سے آتی ہے۔ مجھے جس کے ہاتھ سے ملتی ہے، وہ میرا آقا اور مالک ہے۔ نہ جانے ان احمقوں کو یہ کیا سنک سوار ہو گئی ہے۔ کہتے ہیں روحانیت ہندوستانیوں کی خاص صفت ہے۔ یہ روحانیت ہے کہ پرماتما کی مرضی کی مخالفت کی جائے؟ جب یہ معلوم ہے کہ پرماتما کی مرضی کے بغیر ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ اتنا بڑا ملک بغیر پرماتما کی مرضی کے انگریزوں کے زیرِ اقتدار ہو۔ کیوں ان دیوانوں کو اتنی عقل نہیں آتی کہ پرماتما کی جب تک مرضی نہ ہوگی، کوئی انگریزوں کا بال بھی بیکا نہ کر سکے گا۔"

گوداوری۔ "لیکن پرماتماں ان کی مدد بھی تو کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں۔"

سیٹھ۔ "بے شک کرتا ہے لیکن اس طرح نہیں جیسے یہ لوگ کر رہے ہیں۔ اپنے گھر میں آگ لگا دینا، گھر کی چیزوں کو جلا دینا ایسے کام ہیں جس میں پرماتما بھی مدد نہیں کر سکتا۔"

یکایک ہولی جلی۔ شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ گویا قومی آزادی آتشیں لباس میں ملبوس آکاش کے دیوتاؤں سے گلے ملنے جا رہی ہو۔ دینا ناتھ نے کھڑکی بند کر دی۔ وہ یہ نظارہ دیکھنا ہی نہ چاہتے تھے۔

گوداوری صورتِ تصویر خاموش کھڑی رہی۔

(2)

دوسرے دن علی الصبح کانگریس کی طرف سے ایک عام جلسہ ہوا۔ مسٹر سیٹھ نے ولایتی ٹوتھ پاؤڈر ولایتی برش سے دانتوں میں ملا۔ ولایتی صابن سے نہایا۔ ولایتی چائے، ولایتی چائے کے سیٹ میں پی۔ ولایتی بسکٹ ولایتی مکھن کے ساتھ کھایا۔ ولایتی دودھ پیا۔ پھر ولایتی سوٹ زیب تن کر کے ولایتی سگار ہونٹوں میں دبا کر گھر سے نکلے۔ سڑک پر ولایتی موٹر کھڑی تھی۔ اس میں بیٹھ کر فلاور شو دیکھنے چلے گئے۔

گوداوری کو رات بھر نیند نہ آئی تھی۔ مسٹر سیٹھ کی تالیفِ قلب کرنے کے لیے اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک حسینہ کر سکتی ہے۔ پر اس مردِ خدا پر اس کی ساری سحر طرازیوں اور عشوہ پردازیوں کا مطلق اثر نہ ہوا۔ خود تو سدیشی کپڑوں کے استعمال پر کیا راضی ہوتے، گوداوری کے لیے ایک کھدر کی ساڑھی کی تجویز بھی منظور نہ کی۔ یہاں تک کہ گوداوری نے قسم کھالی کہ اب تم سے کبھی کوئی چیز نہ مانگوں گی۔

اس نے سوچا جب یہ میری اتنی سی تمنا نہیں پوری کر سکتے تو پھر میں کیوں ان کے اشاروں پر چلوں۔ کیوں ان کی ہاں میں ہاں ملاؤں۔ میں نے ان کے ہاتھ کچھ اپنی آتما نہیں بیچی ہے۔ اگر آج یہ چوری یا غبن کریں تو کیا میں اس میں ان کی شریک ہوں گی۔ اس کی سزا یہ خود جھیلیں گے۔ اس کی ذمہ داری کلیتاً ان کے اوپر ہوگی۔ میری ہستی ان کی ہستی میں کیوں مدغم ہو۔ انہیں اپنے قول و فعل کا اختیار ہے۔ مجھے اپنے قول و فعل کا اختیار۔ یہ اپنے سرکار

کی غلامی کریں۔ انگریزوں کے چوکھٹ پر ناک رگڑیں۔ مجھے کیا غرض ہے کہ ان کی شریک بنوں۔ جو خود غلام ہے اس کی غلامی کیوں کروں۔ ملازمت اور غلامی میں فرق ہے۔ ملازم چند قواعد کا پابند ہو کر ملازمت کرتا ہے۔ وہ شرطیں حاکم و محکوم دونوں پر عائد ہوتی ہیں۔ غلام کے لیے کوئی شرط نہیں۔ اس کی جسمانی غلامی پیچھے ہوگی، روحانی غلامی پہلے ہے۔ سرکار نے کبھی شائد یہ نہ کہا ہوگا دیسی چیزیں نہ خریدو۔ سرکاری ٹکٹوں تک پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے۔ "سدیشی چیزیں خریدو۔" اس سے ظاہر ہے کہ سرکار سدیشی چیزوں کی ممانعت نہیں کرتی۔ پھر بھی یہ حضرت سرخرو بننے کی فکر میں سرکار سے بھی دو انگل آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں سے بھی زیادہ انگریز بنے ہوئے ہیں۔ وفا کی قبر پر لات مار رہے ہیں۔ میں کیوں ان کے پیچھے اپنی عاقبت بگاڑوں؟

ذرا دیر بعد سیٹھ نے کہا۔ "کل فلاور شو دیکھنے چلو گی؟"

گوداوری نے کہا۔ "نہیں۔ میں کانگریس کے جلسہ میں جاؤں گی۔"

سیٹھ کے سر پر اگر چھت گر پڑی ہوتی یا انہوں نے بجلی کا تار ہاتھ سے پکڑ لیا ہوتا تو وہ بھی اس قدر بدحواس اور مضطرب نہ ہوتے۔ آنکھیں پھاڑ کر بولے۔ "تم کانگریس کے جلسہ میں جاؤ گی؟"

"ہاں، ضرور جاؤں گی۔"

"میں نہیں چاہتا کہ تم وہاں جاؤ۔"

"اگر تم میری پروا نہیں کرتے تو میرا فرض نہیں کہ تمہارے ہر ایک حکم کی تعمیل کروں۔"

"نتیجہ برا ہوگا۔"

"جو کچھ ہو، اس کا غم نہیں ہے۔ تم میرے خدا نہیں ہو۔"

سیٹھ جی خوب گرم ہوئے، دھمکیاں دیں، آنکھیں دکھائیں۔ آخر منہ پھیر کر لیٹ رہے۔ جاتے وقت بھی انہوں نے گوداوری سے کچھ نہ کہا۔

(3)

گوداوری جس وقت کانگریس کے جلسہ میں پہنچی کئی ہزار مردوں اور عورتوں کا مجمع تھا۔ سیکرٹری نے چندہ کی پُرزور اپیل کی تھی اور کچھ لوگ چندہ دے رہے تھے۔ گوداوری اس مقام پر کھڑی ہو گئی جہاں عورتیں جمع تھیں۔ اس نے جیب ٹٹولی تو ایک روپیہ موجود تھا۔ سمجھا کافی ہے اور لوگ دو دو چار آنے ہی دے رہے ہیں۔

یکایک ایک اندھا لڑکا ہاتھ میں خنجری لیے کھڑا ہو گیا۔ اسے گوداوری روز اپنے گھر کے سامنے زمین پر بیٹھ کر خنجری بجا بجا کر گاتے سنا کرتی تھی۔ کبھی کبھی ایک آدھ پیسہ، کبھی روٹیاں دے دیتی تھی۔ لوگ اس کی طرف تاکنے لگے۔ کیا وہ بھی کچھ چندہ دینا چاہتا ہے۔ خوب! دن بھر گلا پھاڑتا ہے تب تو پیٹ کی روٹی ملتی ہے۔ وہ چندہ دینے آئے گا اور پھر ایسے سڑک پر گانے والوں کو دیتا بھی کون ہے۔ اگر وہی گانا پشواز اور ساز کے ساتھ کسی محفل میں ہوتو روپوں کی بارش ہو لیکن سڑک والے اندھے کی خنجری کی کون پروا کرتا ہے۔

لڑکے نے کمر سے کچھ نکالا اور جونہی چندہ کی جھولی اس کے قریب پہنچی، اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جھولی والی نے جھولی بڑھا دی۔ اندھے نے اس میں کچھ ڈال دیا۔ لوگوں نے دیکھا ایک پیسہ تھا۔ جھولی میں پیسہ ڈالتے ہی

اندھا لڑکا وہاں سے چل دیا اور دور جا کر پھر گانے لگا۔

وطن کی دیکھئے تقدیر کب بدلتی ہے

جلسہ کے پریذیڈنٹ نے کہا۔ "دوستو! دیکھئے یہ وہ پیسہ ہے جو ایک غریب اندھا لڑکا اس جھولی میں ڈال گیا ہے۔ میری نگاہوں میں اس ایک پیسہ کی قیمت کسی امیر کے ایک ہزار روپیہ سے کم نہیں ہے۔ شاید یہی اس غریب کی ساری بساط ہو گی۔ جب ایسے غریبوں کی ہمدردی اور قربانی ہمارے ساتھ ہے تو مجھے حق کی فتح یقینی نظر آتی ہے۔ ہمارے یہاں کیوں اتنے فقیر نظر آتے ہیں، اس لیے کہ یا تو سوسائٹی میں انہیں کوئی کام نہیں ملتا یا افلاس سے پیدا ہوئی بیماریوں کے باعث یہ اب اس قابل ہی نہیں رہے کہ کوئی کام کر سکیں یا اس گداگری نے ان میں کوئی محنت کرنے کی صلاحیت ہی نہیں باقی رکھی۔ سوراجیہ کے سوا ان حالات کی اور کوئی دوا نہیں ہے۔ یہ غریب اندھا جس کی تان اب بھی آپ کے کان میں آ رہی ہے، اس حقیقت کو خوب سمجھتا ہے۔ دیکھئے وہ گاتا ہے۔

وطن کی دیکھئے تقدیر کب بدلتی ہے

آہا! اس غریب، دکھ سے بھرے دل میں کتنا ایثار ہے! اب بھی کیا کوئی شک کر سکتا ہے کہ ہم کس کی آواز ہیں؟ یہ تامب پتر اس کی تصدیق کر رہا ہے۔ آپ میں کون اس تبرک کو اس رتن کو خریدنا چاہتا ہے۔ کون اس دُرِ بے بہا کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟"

گوداوری کے دل میں ایک اضطراب خیز خواہش ہوئی۔ کیا وہ یہی پیسہ تو نہیں ہے جو رات میں نے اسے دیا تھا؟ کیا اس نے سچ مچ رات کو کچھ نہیں کھایا؟

اس نے جا کر قریب سے پیسے کو دیکھا جو میز پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ یہ وہی گھسا ہوا پیسہ تھا۔

گوداوری نے کانپتے ہوئے گلے سے کہا۔ "مجھے آپ یہ پیسہ دیجئے۔ میں پانچ روپیہ دوں گی۔"

پریذیڈنٹ نے کہا۔ "ایک بہن اس پیسہ کی قیمت پانچ روپیہ دے رہی ہیں۔"

دوسری آواز آئی۔ "دس روپے!"

تیسری آواز آئی۔ "بیس روپے۔"

گوداوری نے آخری شخص کی طرف دیکھا۔ کوئی خوشحال مغرور آدمی تھا۔ سب کی نگاہیں اس کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ گوداری کے دل میں ایک ہیجان سا اٹھا۔ کچھ بھی ہو، اس شخص کے ہاتھ میں یہ پیسہ نہ جانے دوں گی۔ سمجھتا ہے اس نے بیس روپیہ کیا کہہ دیا، کوئی قلعہ جیت لیا۔

گوداوری نے کہا۔ "چالیس روپے۔"

امیر آدمی نے فوراً کہا۔ "پچاس روپے۔"

گوداوری کی طرف ہزاروں نگاہیں اٹھ گئیں۔ گویا کہہ رہی ہوں۔ "بس! یہ امیر اس پیسہ کو لیے جاتا ہے۔"

گوداری نے اس آدمی کی طرف مغرور نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "سو روپے۔"

امیر آدمی نے بھی فوراً کہا۔ "ایک سو بیس روپے۔"

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ لوگ سمجھ گئے امیر آدمی پیسہ لے گیا۔ گوداوری اس سے آگے نہیں جا سکتی۔ لوگوں نے مایوس نظروں سے گوداوری کو دیکھا مگر جونہی گوداوری کے منہ سے نکلا "ڈیڑھ سو" تو لوگوں نے

امیر آدمی کو پھر فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ گویا کہہ رہے تھے۔ ''تم اس پیسہ کو نہیں لے جا سکتے!'' امیر آدمی نے پھر کہا۔ ''پونے دو سو!''

گوداوری بولی ''دو سو!''

چاروں طرف سے تالیاں پڑیں۔ امیر آدمی شرمندہ ہو کر چلا گیا۔

گوداوری فتح کی مسرت کو انکسار سے دباتی ہوئی کھڑی تھی اور ہزاروں دعائیں پھولوں کی طرح اس پر برس رہی تھیں۔

(4)

جب لوگوں کو معلوم ہوا کہ گوداوری مسٹر سیٹھ کی بیوی ہے تو انہیں ایک حاسدانہ مسرت کے ساتھ اس پر رحم بھی آیا۔ سیٹھ ایک ہی خوشامدی ہے۔ گوداوری کو زندہ نہ چھوڑے گا۔

مسٹر سیٹھ ابھی فلاور شو ہی میں تھے کہ ایک پولیس کے افسر نے اسے یہ وحشت ناک خبر سنائی۔ مسٹر سیٹھ سکتے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ گویا مفلوج ہو گئے ہوں۔ پھر دونوں مٹھیاں باندھ لیں، دانت پیسا، ہونٹ چبایا اور اسی وقت گھر چلے۔ موٹر سائیکل اتنی تیز کبھی نہ چلی تھی۔

گھر میں گھستے ہی کڑک کر بولے۔ ''میرے منہ میں کالک لگوانا چاہتی ہو تم؟ میری قبر کھودنا چاہتی ہو تم؟''

گوداوری تحمل کے ساتھ بولی۔ ''کچھ منہ سے بھی تو کہو یا گالیاں ہی دیئے جاؤ گے؟ تمہارے منہ میں کالک لگے گی تو کیا میرے منہ میں نہ لگے گی؟ تمہاری قبر کھدے گی تو میرے لیے دوسرا کونسا سہارا ہے؟''

سیٹھ۔ ''سارے شہر میں طوفان مچا ہوا ہے، تم نے میرے روپے کیوں دیئے؟''

گوداوری نے اسی صابرانہ انداز سے کہا۔ ''اس لیے کہ میں اسے اپنا ہی روپیہ سمجھتی ہوں۔''

سیٹھ جی دانت کٹ کٹا کر بولے۔ ''ہرگز نہیں۔ کسی طرح نہیں۔ تمہیں میرے روپیہ کو خرچ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ کوئی اختیار نہیں ہے۔''

گوداوری۔ ''بالکل غلط۔ تمہارے روپیہ کو خرچ کرنے کا مجھے اتنا ہی اختیار ہے جتنا تم کو ہے۔ ہاں جب طلاق کا قانون پاس کرا لو گے اور طلاق دے دو گے تب نہ رہے گا۔''

سیٹھ جی نے اپنا ہیٹ اتنے زور سے میز پر پھینکا کہ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر گر پڑا اور بولے۔ ''مجھے تمہاری عقل پر افسوس آتا ہے۔ جانتی ہو تمہاری اس حماقت کا کیا نتیجہ ہو گا۔ مجھ سے جواب طلب ہو گا۔ بتلاؤ کیا جواب دوں گا۔ ہے کوئی جواب؟ جب ظاہر ہے کہ کانگریس سرکار سے دشمنی کر رہی ہے تو کانگریس کی مدد کرنا سرکار کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔''

''تم نے تو نہیں کی کانگریس کی مدد؟''

''تم نے تو کی۔''

''اگر میں کوئی جرم کروں تو اس کی سزا مجھے ملے گی یا تمہیں؟''

''جرم کی بات اور ہے۔ یہ بات اور ہے!''

"تو کیا کانگریس کی کچھ مدد کرنا چوری یا ڈاکے سے بھی برا ہے؟"
"ہاں گورنمنٹ ملازم کے لیے یہ چوری یا ڈاکے سے بھی کہیں برا ہے۔"
"میں نے یہ نہیں سمجھا تھا۔"
"اگر تم نے نہیں سمجھا تھا تو تمہاری غلطی تھی، حماقت تھی۔ جہالت تھی۔ روز اخباروں میں دیکھتی ہو، پھر بھی پوچھتی ہو۔ ایک کانگریس کا آدمی پلیٹ فارم پر بولنے کھڑا ہوتا ہے تو غیر وردی والے بیسیوں خفیہ پولیس کے افسر اس کی رپورٹ کی نقل کرنے بیٹھتے ہیں۔ کانگریس کے سرغناؤں کے پیچھے کئی کئی مخبر لگائے جاتے ہیں جن کا کام یہی ہے کہ ان کے اوپر کڑی نگاہ رکھیں۔ چوروں کے ساتھ تو اتنی سختی کبھی نہیں کی جاتی۔ ہزاروں چوریاں اور ڈاکے اور خون روز ہوتے ہیں۔ کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ نہ پولیس اس کی پروا کرتی ہے مگر پولیس کو جس معاملہ میں پالیٹکس کی بو آتی ہے، اس میں دیکھو اس کی مستعدی انسپکٹر جنرل سے لے کر کانسٹیبل تک ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ چوروں سے سرکار کو خوف نہیں۔ چور سرکار پر حملہ نہیں کرتا۔ کانگریس سرکار کے اختیار پر حملہ کرتی ہے۔ اس لیے سرکار بھی اپنی حفاظت کے لیے انتہائی تدابیر اختیار کرتی ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔"

مسٹر سیٹھ آج دفتر چلے تو ان کے قدم پیچھے رہے جاتے تھے۔ وہاں آج نہ جانے کیا حشر ہو۔ روز کی طرح وہ دفتر میں پہنچتے ہی چپراسیوں پر بگڑے نہیں، کلرکوں پر رعب نہیں جمایا۔ چپکے سے کرسی پر بیٹھ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ان کے سر پر تلوار لٹک رہی ہے۔ جونہی صاحب کی موٹر آکر رکی، روح فنا ہو گئی۔ روز وہ اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے تھے۔ جب صاحب آکر بیٹھ جاتے تھے تب آدھ گھنٹہ کے بعد وہ مسلیں لے کر پہنچتے تھے۔ آج وہ برآمدہ میں سلام کرنے کو کھڑے تھے۔ صاحب اترے تو انہوں نے جھک کر سلام کیا مگر صاحب نے منہ پھیر لیا۔ مسٹر سیٹھ کی جان نکل گئی۔

لیکن پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ آگے بڑھ کر پردہ ہٹا دیا۔ جونہی صاحب نے کمرہ میں قدم رکھا آپ نے پنکھا کھول دیا مگر جان سوکھی جاتی تھی کہ دیکھیں کب سر پر تلوار گرتی ہے۔ صاحب کو خبر تو مل ہی گئی ہو گی۔ یہ تو غیر ممکن ہے کہ اب تک انہیں خبر ہی نہ ہو۔ صاحب جونہی کرسی پر بیٹھے سیٹھ جی نے لپک کر سگار بکس اور دیا سلائی اور خاکدان لا کر میز پر رکھ دیا۔

یکایک انہیں ایسا معلوم ہوا گویا آسمان پھٹ گیا ہے۔ صاحب گرج رہے تھے۔ "تم دغا باز آدمی ہے۔"
مسٹر سیٹھ نے اس طرح صاحب کی طرف دیکھا گویا ان کا مطلب نہیں سمجھے۔
صاحب نے گھور کر کہا۔ "تم دغا باز آدمی ہے۔"
مسٹر سیٹھ کے خون میں حرارت آئی۔ "میرا تو خیال ہے کہ مجھ سے زیادہ وفادار آدمی ہندوستان میں نہ ہو گا۔"

صاحب۔ "تم نمک حرام آدمی ہے۔"
مسٹر سیٹھ کے چہرہ پر سرخی آئی۔ "آپ زبان مبارک کو ناحق خراب کر رہے ہیں۔"
صاحب۔ "تم شیطان آدمی ہے۔"
مسٹر سیٹھ کی آنکھوں میں سرخی آئی۔ "آپ میری بے عزتی کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی پندرہ سال کی ملازمت میں کبھی ایسی باتیں نہیں سنیں۔"

صاحب۔ ''چپ رہو۔ ٹو بلاڈی۔ تم کو سرکار پانچ سو روپیہ تنخواہ اسی لیے دیتا ہے کہ تم اپنی بلاڈی وائف کے ہاتھ سے کانگریس کا چندہ دلوائے۔ تم کو اس لیے سرکار روپیہ نہیں دیتا۔ تم کو اس لیے نوکر نہیں رکھا ہے کہ تم سرکار کے دشمنوں سے مل کر سرکار کا گلا کاٹے۔''

مسٹر سیٹھ کو اپنی صفائی دینے کا موقع ملا جس کے وہ تلاش میں تھے۔ بولے۔ ''میں حلف سے کہتا ہوں کہ میری وائف نے میرے حکم کے خلاف، سراسر میری مرضی کے خلاف روپے دیئے ہیں۔ میں تو اس وقت فلاور شو دیکھنے گیا تھا جہاں میں نے مس کاک کا گلدستہ پانچ روپیہ میں لیا۔ وہاں سے لوٹا تو مجھے یہ خبر ملی۔''

صاحب۔ ''تم ہم کو بے وقوف بناتا ہے۔ ہم کو بے وقوف بناتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے صاحب جامہ سے باہر ہو گئے۔ کسی ہندوستانی کی اتنی مجال کہ انہیں بے وقوف بنائے۔ وہ جو ہندوستان کا بادشاہ ہے، جس کے سامنے بڑے بڑے تعلقہ دار آکر سلام کرتے ہیں، بڑے بڑے رئیس ڈالیاں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ جس کے نوکروں کو بڑے بڑے ہندوستانی افسر نذرانے دیتے ہیں، اس کو کوئی بے وقوف بنائے۔ یہ وہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا غصہ جوابال کے درجہ تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ اس مکارانہ گستاخی پر مشتعل ہو پڑا۔ رُول اٹھا کر دوڑا۔

لیکن سیٹھ جی مضبوط آدمی تھے۔ ٹینس برابر کھیلتے تھے۔ یوں وہ ہر طرح کی خوشامد کرنے پر تیار تھے لیکن یہ ذلت ان کی قوتِ برداشت سے باہر تھی۔ انہوں نے رول کو تو ہاتھ پر لیا اور آگے بڑھ کر ایک گھونسا صاحب کے منہ پر رسید کیا۔ صاحب اس گھونسے کے لیے تیار نہ تھے۔ ہندوستانی تو متحمل مزاج ہوتا ہے۔ خاص کر صاحب بہادروں کے سامنے تو اس کی زبان بھی نہیں کھلتی۔ گھونسا کھاتے ہی وہ گر پڑا۔ ناک سے خون گرنے لگا۔ پھر مسٹر سیٹھ سے الجھنے کی اس کی ہمت نہ پڑی۔ شائد دل میں افسوس کر رہا تھا کہ کیوں رول چلایا یا سوچ رہا ہو کہ اسے کیونکر نیچا دکھاؤں۔ مسٹر سیٹھ وہاں سے اپنے کمرہ میں آئے اور سوچنے لگے۔ انہیں مطلق ندامت نہ تھی بلکہ وہ اپنی جسارت پر خوش تھے۔ اس کی بدمعاشی تو دیکھو کہ مجھ پر رول چلا دیا۔ جتنا دبتا تھا اتنا ہی دبائے جاتا تھا۔ اس کی بیوی یاروں کے لیے گھوما کرتی ہے تو اس کا کیا بنالیتا ہے۔ اس کی بات بھی نہیں پوچھتی۔ منہ چھپاتا پھرتا ہے اور مجھ سے شیر بن گئے۔ اب دوڑے گا کمشنر صاحب کے پاس۔ مجھے برخاست کرائے بغیر نہ چھوڑے گا۔ ساری شرارت گوداوری کی ہے۔ اس کی بدولت یہ ساری بربادی ہو رہی ہے۔ بے عزتی تو ہو ہی گئی' اب روٹیوں کو بھی محتاج ہونا پڑا۔ ان صاحبوں سے انصاف کی امید رکھنی فضول ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہی کون ہے۔ ایک پروانہ آگیا، تم برخاست کر دیئے گئے۔ اپیل کہاں ہو گی۔ سیکرٹری ہندوستانی ہیں مگر انگریزوں سے زیادہ انگریز۔ ہوم ممبر صاحب بھی ہندوستانی ہیں مگر انگریزوں کے غلام، زر خرید۔ گوداوری کے چندہ کا نام سنتے ہی انہیں لرزہ آجائے گا۔ انصاف کی کسی سے توقع نہیں۔ اب یہاں سے نکل جانے ہی میں خیریت ہے۔

یہ سوچ کر انہوں نے ایک استعفیٰ لکھا اور اردلی کو دیا کہ صاحب کو دے آئے۔ صاحب نے استعفیٰ دیکھا تو جل گئے۔ اسی پر لکھ دیا۔ ''برخاست!''

مسٹر سیٹھ خونبار آنکھوں سے دیکھ کر بولے۔ ''اب رو ؤ سر پر ہاتھ دھر کے۔

گوداوری نے بے باکی سے کہا۔ ''میں کیوں روؤں، تم روؤ۔ یہاں تو سوت کاتوں گی۔ اسی سے کپڑے بھی ملیں گے۔ کھانا بھی۔ تم روؤ کہ تمہارا کام نہ چلے گا۔ یہی اس غلامی کی سزا ہے جو تم نے پال رکھی تھی۔''

سیٹھ نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ”شرمندہ تو نہ ہوگی اور اوپر سے دھاندلی کرتی ہو۔“

گوداوری اسی شان استغنا سے بولی۔ ”شرمندہ کیوں ہوں؟ یہاں اپنا ضمیر اپنی ضرورتوں کے ہاتھ نہیں بیچا ہے۔ تمہاری آمدنی ولایتی تکلفات کے پیچھے ہی تو غارت ہوتی تھی۔ گویا ہم انہیں چیزوں کے غلام تھے۔ پرماتما کا شکر کیوں نہیں کرتے کہ تم اس غلامی سے آزاد ہو گئے۔“

سیٹھ۔ ”آخر کچھ سوچا ہے، کام کیسے چلے گا۔ ولایتی چیزیں چھوڑ بھی دوں تب بھی تو بلا روپے کے کام نہ چلے گا۔“

گوداوری۔ ”چلے گا۔ میں چلا کر دکھاؤں گی۔ میں جو کچھ کہوں، وہ تم کیے جانا۔ اب تک میں تمہاری ہدایتوں پر چلتی تھی، اب تم میری ہدایتوں پر چلنا۔ میں تمہاری ساری باتیں بے عذر قبول کرتی تھی۔ تم ولایتی پہناتے تھے، پہنتی تھی۔ ننگی رکھتے، ننگی رہتی۔ موٹا کھلاتے، موٹا کھاتی۔ مہین کھلاتے، مہین کھاتی۔ محل میں رکھتے، محل میں رہتی۔ جھونپڑے میں رکھتے، جھونپڑے میں رہتی مگر حرف شکایت زبان پر نہ لاتی۔ اسی طرح آپ بے چوں وچرا میری ہدایتوں پر عمل کرنا۔ جس حالت میں رکھوں، اس حالت میں رہنا۔ جو کام کرنے کو کہوں، وہ کام کرنا۔ پھر دیکھوں کیسے کام نہیں چلتا۔ ہاں میں تمہاری روحانی آزادی نہ چھینوں گی۔ کوئی ایسا کام کرنے کو نہ کہوں گی جس میں تمہارے ضمیر کا خون ہو۔ آج تک تم میرے شوہر تھے۔ آج سے میں تمہاری شوہر ہوں۔“

گوداوری ہاں ہاں کرتی ہی رہی کہ سیٹھ نے ولایتی سیٹ کو اٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور ذرا دیر میں اس گھر میں ولایتی کپڑوں کی ہولی جلی جس کی پیدائش سے جلنے تک کے سارے مرحلے خود سیٹھ جی کے ہاتھوں طے ہوئے تھے۔

پوس کی رات

(1)

ہلکو نے آکر اپنی بیوی سے کہا۔ ”شہنا آیا ہے۔ لاؤ جو روپے رکھے ہیں، اسے دے دو۔ کسی طرح گردن تو چھوٹے۔“

مُنی بہو جھاڑو لگا رہی تھی۔ پیچھے پھر کر بولی۔ ”تین ہی تو روپے ہیں، دیدوں تو کمبل کہاں سے آئے گا؟ ماگھ پوس کی رات کھیت میں کیسے کٹے گی۔ اس سے کہہ دو فصل پر روپے دے دیں گے، ابھی نہیں ہیں۔“

ہلکو تھوڑی دیر تک چپ کھڑا رہا اور اپنے دل میں سوچتا رہا۔ پوس سر پر آگیا۔ بغیر کمبل کے کھیت میں رات کو وہ کسی طرح سو نہیں سکتا مگر شہنا مانے گا نہیں۔ گھرکیاں دے گا، گالیاں سنائے گا۔ بلا سے جاڑوں مریں گے یہ بلا تو سر سے ٹل جائے گی۔ یہ سوچتا ہوا وہ اپنا بھاری جسم لیے ہوئے (جو اس کے نام کو غلط ثابت کر رہا تھا) اپنی بیوی کے پاس گیا اور خوشامد کر کے بولا۔ ”لا دے گردن تو کسی طرح سے بچے۔ کمبل کے لیے کوئی دوسری تدبیر سوچوں گا۔“

مُنی اس کے پاس سے دور ہٹ گئی اور آنکھیں ٹیڑھی کرتی ہوتی بولی۔ ”کر چکے دوسری تدبیر۔ ذرا سنوں کون سی تدبیر کروگے؟ کون کمبل خیرات میں دے دے گا۔ نہ جانے کتنا روپیہ باقی ہے جو کسی طرح ادا ہی نہیں ہوتا۔ میں کہتی ہوں، تم کھیتی کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔ مر مر کر کام کرو، پیداوار ہو تو اس سے قرضہ ادا کرو۔ چلو چھٹی ہوئی۔ قرضہ ادا کرنے کے لیے تو ہم پیدا ہی ہوئے ہیں۔ ایسی کھیتی سے باز آئے۔ میں روپے نہ دوں گی، نہ دوں گی۔“

ہلکو رنجیدہ ہو کر بولا۔ ”تو کیا گالیاں کھاؤں؟“

مُنی نے کہا۔ ”گالی کیوں دے گا۔ کیا اس کا راج ہے؟“ مگر یہ کہنے کے ساتھ ہی اس کی تنی ہوئی بھنویں ڈھیلی پڑ گئیں۔ ہلکو کی بات میں جو دل ہلا دینے والی صداقت تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی جانب ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس نے طاق پر سے روپے اٹھائے اور لا کر ہلکو کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ پھر بولی۔ ”تم اب کی کھیتی چھوڑ دو۔ مزدوری میں سکھ سے ایک روٹی تو کھانے کو ملے گی۔ کسی کی دھونس تو نہ رہے گی۔ اچھی کھیتی ہے۔ مزدوری کر کے لاؤ، وہ بھی اس میں جھونک دو۔ اس پر سے دھونس۔“

ہلکو نے روپے لیے اور اس طرح باہر چلا کہ معلوم ہوتا تھا' وہ اپنا کلیجہ نکال کر دینے جا رہا ہے۔ اس نے ایک ایک پیسہ کاٹ کر تین روپے کمبل کے لیے جمع کیے تھے۔ وہ آج نکلے جا رہے ہیں! ایک ایک قدم کے ساتھ اس کا دماغ اپنی ناداری کے بوجھ سے دبا جا رہا تھا!

(2)

پوس کی اندھیری رات۔ آسمان پر تارے بھی ٹھٹھرتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ہلکو اپنے کھیت کے کنارے اوکھ کے پتوں کی ایک چھتری کے نیچے بانس کے کھٹولے پر اپنی پرانی گاڑھے کی چادر اوڑھے ہوئے کانپ رہا تھا۔ کھٹولے کے نیچے اس کا ساتھی کتا ”جبرا“ پیٹ میں منہ ڈالے سردی سے کوں کوں کر رہا تھا۔ دو میں سے ایک کو بھی نیند نہ آتی تھی۔

ہلکو نے گھٹنوں کو گردن میں چمٹاتے ہوئے کہا۔ ”کیوں جبرا جاڑا لگتا ہے۔ کہا تو تھا گھر میں پیال پر لیٹ رہ۔ تو یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اب کھا سردی۔ میں کیا کروں۔ جانتا تھا، میں حلوہ پوری کھانے آ رہا ہوں۔ دوڑتے ہوئے آگے چلے آئے۔ اب روؤ اپنی نانی کے نام کو۔“ جبرا نے لیٹے ہوئے دم ہلائی اور ایک انگڑائی لے کر چپ ہو گیا۔ شائد وہ یہ سمجھ گیا کہ اس کی کوں کوں کی آواز سے اس کے مالک کو نیند نہیں آ رہی ہے۔

ہلکو نے ہاتھ نکال کر جبرا کی ٹھنڈی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔ ”کل سے میرے ساتھ نہ آنا نہیں تو ٹھنڈے ہو جاؤ گے۔ یہ رانڈ پچھوا ہوا نہ جانے کہاں سے برف لیے آ رہی ہے۔ اٹھوں پھر ایک چلم بھروں۔ کسی طرح رات تو کٹے۔ آٹھ چلم تو پی چکا۔ یہ کھیتی کا مزہ ہے اور ایک ایک بھاگوان ایسے پڑے ہیں جن کے پاس اگر جاڑا جائے تو گرمی سے گھبرا کر بھاگے۔ موٹے گدے، لحاف، کمبل، مجال ہے کہ جاڑے کا گزر ہو جائے۔ تقدیر کی خوبی ہے۔ مزدوری ہم کریں، مزا دوسرے لوٹیں۔“

ہلکو اٹھا اور گڈھے میں سے ذرا سی آگ نکال کر چلم بھری۔ جبرا بھی اٹھ بیٹھا۔ ہلکو نے چلم پیتے ہوئے کہا۔ ”پیئے گا چلم؟ جاڑا تو کیا جاتا ہے ہاں ذرا من بہل جاتا ہے۔“

جبرا نے اس کی جانب محبت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ ہلکو نے کہا۔ "آج اور جاڑا کھالے۔ کل سے میں یہاں پیال بچھادوں گا۔ اس میں گھس کر بیٹھنا' جاڑا نہ لگے گا۔"

جبرا نے اگلے پنجے اس کی گھٹنیوں پر رکھ دیئے اور اس کے منہ کے پاس اپنا منہ لے گیا۔ ہلکو کو اس کی گرم سانس لگی۔ چلم پی کر ہلکو پھر لیٹا اور یہ طے کر لیا کہ چاہے جو کچھ ہو، اب کی سو جاؤں گا لیکن ایک لمحہ میں اس کا کلیجہ کانپنے لگا۔ کبھی اس کروٹ لیٹا کبھی اس کروٹ۔ جاڑا کسی بھوت کی مانند اس کی چھاتی کو دبائے ہوئے تھا۔

جب کسی طرح نہ رہا گیا تو اس نے جبرا کو دھیرے سے اٹھایا اور اس کے سر کو تھپتھپا کر اسے اپنی گود میں سلا لیا۔ کتے کے جسم سے معلوم نہیں کیسی بدبو آرہی تھی۔ پر اسے اپنی گود سے چمٹاتے ہوئے ایسا سکھ معلوم ہوتا تھا جو ادھر مہینوں سے اسے نہ ملا تھا۔ جبرا شائد یہ خیال کر رہا تھا کہ بہشت یہی ہے اور ہلکو کی روح اتنی پاک تھی کہ اس کو کتے سے بالکل نفرت نہ تھی۔ وہ اپنی غریبی سے پریشان تھا جس کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچ گیا تھا۔ ایسی انوکھی دوستی نے اس کی روح کے سب دروازے کھول دیئے تھے اور اس کا ایک ایک ذرہ حقیقی روشنی سے منور ہو گیا تھا۔ اسی اثناء میں جبرا نے کسی جانور کی آہٹ پائی۔ اس کے مالک کی اس خاص روحانیت نے اس کے دل میں ایک جدید طاقت پیدا کر دی تھی جو ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں کو بھی ناچیز سمجھ رہی تھی۔ وہ جھپٹ کر اٹھا اور چھپری سے باہر آکر بھونکنے لگا۔ ہلکو نے اسے کئی مرتبہ پچکار کر بلایا، پر وہ اس کے پاس نہ آیا۔ کھیتوں میں چاروں طرف دوڑ دوڑ کر بھونکتا رہا۔ ایک لمحہ کے لیے آ بھی جاتا تو فوراً ہی پھر دوڑتا۔ فرض کی ادائیگی نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

(3)

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ سردی بڑھنے لگی۔ ہلکو اٹھ بیٹھا اور دونوں گھٹنوں کو چھاتی سے ملا کر سر کو چھپا لیا۔ پھر بھی سردی کم نہ ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا خون منجمد ہو گیا ہے۔ اس نے اٹھ کر آسمان کی جانب دیکھا۔ ابھی کتنی رات باقی ہے۔ وہ سات ستارے جو قطب کے گرد گھومتے ہیں، ابھی اپنا نصف دورہ بھی ختم نہیں کر چکے۔ جب وہ اوپر آجائیں گے تو کہیں سویرا ہوگا۔ ابھی ایک گھڑی سے زیادہ رات باقی ہے۔

ہلکو کے کھیت سے تھوڑی دور کے فاصلہ پر ایک باغ تھا۔ پت جھڑ شروع ہو گئی تھی۔ باغ میں پتوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ہلکو نے سوچا چل کر پتیاں بٹوروں اور ان کو جلا کر خوب تاپوں۔ رات کو کوئی مجھے پتیاں بٹورتے دیکھے تو سمجھے کہ کوئی بھوت ہے۔ کون جانے کوئی جانور ہی چھپا بیٹھا ہو مگر اب تو بیٹھے نہیں رہا جاتا۔

اس نے پاس کے ارہر کے کھیت میں جا کر کئی پودے اکھاڑے اور اس کا ایک جھاڑو بنا کر ہاتھ میں سلگتا ہوا اُپلہ لیے باغ کی طرف چلا۔ جبرا نے اسے جاتے دیکھا تو پاس آیا اور دم ہلانے لگا۔

ہلکو نے کہا، اب تو نہیں رہا جاتا۔ جبرو چلو باغ میں پتیاں بٹور کر تاپیں۔ ٹاٹھے ہو جائیں گے تو پھر آکر سوئیں گے۔ ابھی تو رات بہت ہے۔

جبرا نے کوں کوں کرتے ہوئے اپنے مالک کی رائے سے موافقت ظاہر کی اور آگے آگے باغ کی جانب چلا۔ باغ میں گھٹاٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ درختوں سے شبنم کی بوندیں ٹپ ٹپ ٹپک رہی تھیں۔ یکایک ایک جھونکا مہندی کے پھولوں کی خوشبو لیے ہوئے آیا۔

ہلکو نے کہا۔ "کیسی اچھی مہک آئی جبرا! تمہاری ناک میں بھی کچھ خوشبو آ رہی ہے؟"

جبرا کو کہیں زمین پر ایک ہڈی پڑی مل گئی تھی۔ وہ اسے چوس رہا تھا۔

ہلکو نے آگ زمین پر رکھ دی اور پتیاں بٹورنے لگا۔ تھوڑی دیر میں پتوں کا ایک ڈھیر لگ گیا۔ ہاتھ ٹھٹھرتے جاتے تھے۔ ننگے پاؤں گلے جاتے تھے اور وہ پتیوں کا پہاڑ کھڑا کر رہا تھا۔ اسی الاؤ میں وہ سردی کو جلا کر خاک کر دے گا۔

تھوڑی دیر میں الاؤ جل اٹھا۔ اس کی لو اوپر والے درخت کی پتیوں کو چھو چھو کر بھاگنے لگی۔ اس متزلزل روشنی میں باغ کے عالیشان درخت ایسے معلوم ہوتے تھے کہ وہ اس لاانتہا اندھیرے کو اپنی گردن پر سنبھالے ہوں۔ تاریکی کے اس اتھاہ سمندر میں یہ روشنی ایک ناؤ کے مانند معلوم ہوتی تھی۔

ہلکو الاؤ کے سامنے بیٹھا ہوا آگ تاپ رہا تھا۔ ایک منٹ میں اس نے اپنی چادر بغل میں دبا لی اور دونوں پاؤں پھیلا دیئے۔ گویا وہ سردی کو للکار کر کہہ رہا تھا۔ "تیرے جی میں جو آئے وہ کر۔" سردی کی اس بے پایاں طاقت پر فتح پا کر وہ خوشی کو چھپا نہ سکتا تھا۔

اس نے جبرا سے کہا۔ "کیوں جبرا! اب تو ٹھنڈ نہیں لگ رہی ہے؟"

جبرا نے کوں کوں کر کے گویا کہا۔ "اب کیا ٹھنڈ لگتی ہی رہے گی!"

"پہلے یہ تدبیر نہیں سوجھی۔ نہیں اتنی ٹھنڈ کیوں کھاتے۔"

جبرا نے دم ہلائی۔

"اچھا آؤ اس الاؤ کو کود کر پار کریں۔ دیکھیں کون نکل جاتا ہے۔ اگر جل گئے بچہ تو میں دوا نہ کروں گا۔"

جبرا نے خوفزدہ نگاہوں سے الاؤ کی جانب دیکھا۔

"منی سے کل یہ نہ جڑ دینا کہ رات خوب ٹھنڈ لگی اور تاپ تاپ کر رات کاٹی ورنہ لڑائی کرے گی۔"

یہ کہتا ہوا وہ اچھلا اور اس الاؤ کے اوپر سے صاف نکل گیا۔ پیروں میں ذرا سی لپٹ گئی۔ پر وہ کوئی بات نہ تھی۔ جبرا الاؤ کے گرد گھوم کر اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

ہلکو نے کہا۔ "چلو چلو، اس کی سہی نہیں۔ اوپر سے کود کر آؤ۔"

وہ پھر کودا اور الاؤ کے اس کے پار آ گیا۔

(4)

پتیاں جل چکی تھیں۔ باغیچے میں پھر اندھیرا چھا گیا تھا۔ راکھ کے نیچے کچھ کچھ آگ باقی تھی جو ہوا کا جھونکا آنے پر ذرا جاگ اٹھتی تھی، پر ایک لمحہ میں پھر آنکھیں بند کر لیتی تھی۔

ہلکو نے پھر چادر اوڑھ لی اور گرم راکھ کے پاس بیٹھا ہوا ایک گیت گنگنانے لگا۔ اس کے جسم میں گرمی آ گئی تھی۔ پر جوں جوں سردی بڑھتی جاتی تھی۔ اسے سستی دبائے لیتی تھی۔

دفعتاً جبرا زور سے بھونک کر کھیت کی طرف بھاگا۔ ہلکو کو ایسا معلوم ہوا کہ جانوروں کا ایک غول اس کے کھیت میں آیا۔ شائد نیل گاؤں کا جھنڈ تھا۔ ان کے کودنے اور دوڑنے کی آوازیں صاف کان میں آ رہی تھیں۔ پھر ایسا

معلوم ہوا کہ وہ کھیت میں چر رہی ہیں۔ اس نے دل میں کہا۔ نہیں' جبرا کے ہوتے کوئی جانور کھیت میں نہیں آسکتا۔ نوچ ہی ڈالے۔ مجھے وہم ہو رہا ہے۔ کہاں! اب تو کچھ سنائی نہیں دیتا۔ مجھے بھی کیسا دھوکا ہوا!

اس نے زور سے آواز لگائی۔ "جبرا! جبرا!"

جبرا بھونکتا رہا۔ اس کے پاس نہ آیا۔

جانوروں کے چرنے کی آواز چر۔ چر سنائی دینے لگی۔ ہلکو اب اپنے کو فریب نہ دے سکا مگر اسے اس وقت اپنی جگہ سے ہلنا زہر معلوم ہوتا تھا۔ کیسا گرمایا ہوا مزے سے بیٹھا تھا۔ اس جاڑے پالے میں کھیت میں جانا، جانوروں کو بھگانا، ان کا تعاقب کرنا اسے پہاڑ معلوم ہوتا تھا۔ اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ بیٹھے بیٹھے جانوروں کو بھگانے کے لیے چلانے لگا۔ لہو لہو۔ ہو۔ ہو۔ ہاہا!

مگر جبرا پھر بھونک اٹھا۔ اگر جانور بھاگ جاتے تو وہ اب تک لوٹ آیا ہوتا۔ نہیں بھاگے، ابھی تک چر رہے ہیں شائد۔ وہ سب بھی سمجھ رہے ہیں کہ اس سردی میں کون بیدھا ہے جو ان کے پیچھے دوڑے گا۔ فصل تیار ہے۔ کیسی اچھی کھیتی تھی۔ سارا گاؤں دیکھ دیکھ کر جلتا تھا۔ اسے یہ ابھاگے تباہ کیے ڈالتے ہیں!

اب ہلکو سے نہ رہا گیا۔ وہ پکا ارادہ کر کے اٹھا اور دو تین قدم چلا۔ پھر یکا یک ہوا کا ایسا ٹھنڈا' چبھنے والا' بچھو کے ڈنک کا سا جھونکا لگا کہ وہ پھر بجھتے ہوئے الاؤ کے پاس آ بیٹھا اور راکھ کو کرید کرید کر اپنے ٹھنڈے جسم کو گرمانے لگا۔

جبرا اپنا گلا پھاڑے ڈالتا تھا۔ نیل گائیں کھیت کا صفایا کیے ڈالتی تھیں اور ہلکو گرم راکھ کے پاس بے حس بیٹھا ہوا تھا۔ افسردگی نے اسے چاروں طرف سے رسی کی طرح جکڑ رکھا تھا۔

آخر وہیں چادر اوڑھ کر سو گیا۔

سویرے جب اس کی نیند کھلی تو دیکھا چاروں طرف دھوپ پھیل گئی ہے اور مُنی کھڑی کہہ رہی ہے۔

"کیا آج سوتے ہی رہو گے۔ تم یہاں میٹھی نیند سو رہے ہو اور ادھر سارا کھیت چوپٹ ہو گیا۔ سارا کھیت ستیاناس ہو گیا۔ بھلا کوئی ایسا بھی سوتا ہے۔ تمہارے یہاں منڈیا ڈالنے سے کیا ہوا۔"

ہلکو نے بات بنائی۔ "میں مرتے مرتے بچا، تجھے اپنے کھیت کی پڑی ہے۔ پیٹ میں ایسا درد اٹھا کہ میں ہی جانتا ہوں۔"

دونوں پھر کھیت کے ڈانڈ پر آئے۔ دیکھا کھیت میں ایک پودے کا نام نہیں اور جبرا منڈیا کے نیچے چت پڑا ہے۔ گویا بدن میں جان ہی نہیں ہے۔

دونوں کھیت کی طرف دیکھ رہے تھے۔ مُنی کے چہرہ پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔ پر ہلکو خوش تھا۔

منی نے فکر مند ہو کر کہا۔ "اب مجوری کر کے مال گجاری دینی پڑے گی۔"

ہلکو نے مستانہ انداز سے کہا۔ "رات کو ٹھنڈ میں یہاں سونا تو نہ پڑے گا۔"

"میں اس کھیت کا لگان نہ دوں گی۔ کہے دیتی ہوں۔ جینے کے لیے کھیتی کرتے ہیں، مرنے کے لیے نہیں کرتے۔"

"جبرا ابھی تک سویا ہوا ہے۔ اتنا تو کبھی نہ سوتا تھا۔"

"آج جا کر سہنا سے کہہ دے کھیت جانور چر گئے۔ ہم ایک پیسہ نہ دیں گے۔"

"رات بڑے غضب کی سردی تھی۔"

"میں کیا کہتی ہوں، تم کیا سنتے ہو؟"

"تو گالی کھلانے کی بات کہہ رہی ہے۔ سحنا کو ان باتوں سے کیا سروکار تمہارا کھیت چاہے جانور کھائیں، چاہے آگ لگ جائے۔ چاہے اولے پڑ جائیں، اسے تو اپنی مال گجاری چاہیے۔"

"تو چھوڑ دو کھیتی۔ میں ایسی کھیتی سے باز آئی۔"

ہلکو نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "جی میں تو میرے بھی یہی آتا ہے کہ کھیتی باڑی چھوڑ دوں مُنی۔ تجھ سے سچ کہتا ہوں مگر مجوری کا کھیال کرتا ہوں تو جی گھبرا اٹھتا ہے۔ کسان کا بیٹا ہو کر اب مجوری نہ کروں گا۔ چاہے کتنی ہی درگت ہو جائے۔ کھیتی کا مرجاد نہ بگاڑوں گا۔ جبرا! جبرا! کیا سوتا ہی رہے گا۔ چل گھر چلیں۔"

وفا کی دیوی

(1)

بڑھوں میں جو ایک طرح کی بے شرمی قریب قریب خلوص سے ملتی ہوئی پیدا ہو جاتی ہے' وہ "تلیا" میں اس وقت تک نہ آئی تھی۔ حالانکہ اس کے سر کے بال چاندی ہو گئے تھے اور گال لٹک کر ڈاڑھیوں کے نیچے آ گئے تھے' لوگ اس کی عمر کا اندازہ سو سے اوپر کرتے تھے' وہ خود تحقیق سے کچھ نہ کہہ سکتی تھی' لیکن اب بھی وہ کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتی تھی۔ چلتی تو ساڑھی سے سر ڈھانک کر آنکھیں نیچی کیے ہوئے گویا نویلی بہو ہے۔ ذات کی چمارن تھی' لیکن کیا مجال کہ کسی غیر کے گھر کا پکوان دیکھ کر اس کا جی للچائے۔ گاؤں میں اونچی نیچی ذاتوں کے بہت سے گھر تھے' "تلیا" کی سب جگہ آمدورفت تھی۔ سارا گاؤں اس کی عزت کرتا تھا اور عورتیں تو دل سے اس کے ساتھ عقیدت رکھتی تھیں۔ اسے اصرار کر کے اپنے گھر بلاتیں' اس کے سر میں تیل ڈالتیں' مانگ میں سیندور بھرتیں' کوئی اچھی چیز پکائی ہوتی' جیسے پھلوڑیاں' کھیر یا حلوا تو اسے کھلانا چاہتیں' لیکن بڑھیا کبھی نہ کھاتی تھی۔ اس کے آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ چماروں کے ٹولے میں ایک آدمی بھی نہ تھا۔ کچھ تو گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے' کچھ پلیگ اور ملیریا کی نذر ہو گئے۔ اُن کے ماتم میں تھوڑے سے کھنڈر کھڑے تھے' برہنہ سر' چھاتی سی پیٹتے ہوئے صرف "تلیا" کی جھونپڑی زندہ تھی اور "تلیا" حالانکہ "تلیا" مسافت کا وہ حصہ طے کر چکی تھی' جہاں انسان تمام ظاہری اور مذہبی قیود سے نجات پا جاتا ہے' اور اب اُونچی ذات والوں کو بھی اس کی ذات کی بنا پر اس سے کوئی پرہیز نہ تھا۔ سب ہی اُسے اپنے گھر میں گوشہ دینے کو تیار تھے۔ مگر وضعدار بڑھیا کیوں کسی کا احسان لے' کیوں اپنے شوہر مرحوم کی عزت میں بٹہ لگائے۔ جس کی اُس نے کبھی صورت نہ دیکھی تھی۔ صرف نام سنا تھا' ہاں صرف نام سنا تھا۔ جب اس کی شادی ہوئی تو اس کی عمر کل پانچ سال کی تھی۔ اس کا شوہر اٹھارہ سال کا خوش رُو گٹھیلا نوجوان تھا۔ شادی کے بعد وہ پورب کی طرف کمانے چلا گیا۔ سوچا تھا' ابھی بیوی کے بالغ ہونے میں دس بارہ سال کی دیر ہے اتنے دنوں میں کچھ نہ کچھ روپے جمع کر لیں اور پھر ساری زندگی مزے سے گھر پر رہ کر کھیتی باڑی کریں۔ لیکن بیوی بالغ بھی ہو گئی' جوان بھی ہو گئی'

بوڑھی بھی ہوگئی وہ لوٹ کر نہ آیا۔ ان کے خطوط ہر تیسرے مہینے آتے تھے اور خط کے ساتھ تیس روپے کا منی آرڈر بھی ہوتا۔ خط کے لفافہ کے اندر جواب کے لیے ایک خالی لفافہ بھی رکھا ہوتا تھا۔ یہی وہ رشتہ تھا جو ان میاں بیوی کا تعلق قائم رکھے ہوئے تھا۔ خط میں وہ اپنی مجبوری اور بدنصیبی کا اظہار کرتا اور لکھتا "کیا کروں تولا! دل میں یہی ارمان ہے کہ ایک بار تم سے مل لیتا اپنی جھونپڑی آباد کر لیتا مگر سب کچھ نصیب کے ہاتھ ہے' اپنا کوئی بس نہیں ہے' جب بھگوان لائیں گے تب آوں گا' تم صبر کرنا' میرے جیتے جی تمھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی' تمہاری بانہہ پکڑی ہے تو مرتے دم تک اس کا نباہ کروں گا۔ جب آنکھیں بند ہو جائیں گی تب کیا ہوگا۔ کون جانے۔" قریب قریب یہی مضمون یہی الفاظ کے خفیف تغیر کے ساتھ ہر ایک خط میں ہوتا اور یہ خط "تلیا" کے حرزِ جاں تھے۔ ایک خط بھی اس نے نہ پھاڑا تھا۔ ایسے شگون کے خط کہیں پھاڑے جاتے ہیں' ان کا ایک چھوٹا سا دفتر جمع ہو گیا۔ بوسیدہ' بے رنگ' سیاہی تک اڑ گئی تھی' کاغذ کا رنگ بھی اڑ گیا تھا مگر سب کے سب جوں کے توں اس کی پٹاری میں ایک لال ڈورے سے تہ بہ تہ بندھے ہوئے رکھے تھے۔ ان خطوط کو پا کر "تلیا" کو بے اندازہ مسرت ہوتی' اس کے پاؤں زمین پر نہ پڑتے۔ بار بار پڑھواتی اور بار بار روتی' اور اس دن ضرور سر میں تیل ڈالتی۔ سیندور سے مانگ بھرواتی رنگین ساڑھی پہنتی۔ اس کا سہاگ جاگ اٹھتا تھا۔ بہوئیں مذاق سے پوچھتیں' کیوں تولا بوا! تم نے پھوپا کو دیکھا ہوگا؟ ان کی کچھ یاد آتی ہے؟ اور تلیا کے پُر شکن چہرے پر جوانی عود کر آتی' آنکھوں میں ایک سرور پیدا ہو جاتا۔ کہتی۔ "یاد کیوں نہیں آتی' بیٹا! ان کی صورت تو اب بھی میرے سامنے ہے۔ بڑی بڑی آنکھیں لال لال' اونچا ماتھا' چوڑی چھاتی۔ ایسا تو اب یہاں کوئی بیٹھا ہی نہیں ہے۔ موتیوں کے سے دانت تھے بیٹا! لال لال کرتا پہنے ہوتے تھے۔ جب بیاہ ہو گیا تو میں نے ان سے کہا میرے لیے بہت سے گہنے بنواؤ گے نا؟ نہیں تو میں تمہارے گھر نہ آوں گی۔ لڑکپن تھا بیٹا' سرم لحاج کچھ تھوڑے ہی تھا۔ وہ میری بات سن کر بڑے جور سے ہنسے اور مجھے اپنے کندھے پر بٹھا کر بولے' میں' تجھے گہنوں سے لاد دوں گا۔ تلیا کتنے گہنے پہنے گی تو' میں پردیس کمانے جاتا ہوں' وہاں سے روپے بھیجوں گا تو بہت سے گہنے بنانا' اور جب میں آوں گا تو اپنے ساتھ بہت سے گہنے لاؤں گا۔ میرا ڈولا گیا تھا' بیٹا! ماں باپ کی ایسی حیثیت کہاں تھی کہ انہیں بارات کے ساتھ بلاتے۔ انہی کے گھر میرا ان سے بیاہ ہوا' اور ایک دن میں وہاں رہی' اسی ایک دن میں وہ مجھے کچھ ایسے بھائے کہ جب وہ چلنے لگے تو ان کے گلے لپٹ کر روتی تھی اور کہتی تھی' مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو' میں تمہارا کھانا پکاؤں گی' تمہاری کھاٹ بچھاؤں گی۔ وہاں انہی کی عمر کے دو تین آدمی اور بیٹھے تھے' انہی کے سامنے وہ مسکرا کر میرے کان میں بولے' اور میرے ساتھ سوئے گی نہیں۔ بس میں ان کا گلا چھوڑ کر الگ کھڑی ہو گئی۔ اور بولی' گالی دوگے تو کہے دیتی ہوں' ہاں!"

لاکھوں ہی بار اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل چکے تھے مگر اس کے لئے وہ ہمیشہ تازہ تھے' اس کے جگر کے عزیز ترین گوشے میں محفوظ' جہاں ہوا کا گزر نہ تھا۔ ان میں وہی لطافت تھی' وہی لذت' وہی شیرینی' آہ! اس وقت کوئی اس کا چہرہ دیکھتا! کھلا پڑتا تھا' گھونگھٹ نکال کر' بھاؤ بنا کر' منہ پھیر کر' اور ایسی دلآویز تبسم کے ساتھ دل میں اس کا مزہ لیتی ہوئی وہ اس واقعہ کو بیان کرتی' جو اس کی عمر طویل کی بہترین یادگار تھا۔ شبنم میں کھلے ہوئے پھول کی طرح دل آویز' وہ پھول اب بھی تازہ تھا۔ اس میں وہی خوش نمائی تھی' وہی خوشبو' واقعاتی زندگی کی جھلسانے والی آلائشوں سے پاک' تمنا ابھی تک تمنا کی سرخوشیوں اور کیفیتوں سے مرصّع تھی جسے کشاکش حیات بے جان نہ کر پایا تھا۔

(2)

تلیا کسی زمانہ میں حسین تھی بلا کی فرادا تھی' قاتل تھی اور اپنے کشتگانِ ناز کی درد بھری داستانیں جب وہ بچشم نم کہتی تو شاید کشتوں کی روحیں عالم زیریں یا عالم بالا میں وجد کرتی ہوں گی۔ زندگی میں جن کی اس نے بات نہ پوچھی' انہی پر ہمدردی اور وفا کے پھول نثار کرتی تھی۔ اس کی اٹھتی ہوئی جوانی تھی کہ ماں باپ رخصت ہو گئے' بھائی بھی پردیس چلا گیا' وہ گھر میں اکیلی رہ گئی۔ وہ جدھر سے نکل جاتی تھی' نوجوان کلیجہ تھام کر رہ جاتے تھے۔ تب بنسی سنگھ نام کا ایک ٹھاکر تھا۔ بڑا چھیلا' بڑا رسیا' دن میں سینکڑوں بار اس کے گھر کے چکر لگاتا۔ تالاب کے کنارے' کھیت میں' کھلیان میں' کنوئیں پر جہاں وہ جاتی سایہ کی طرح اس کے پیچھے لگا رہتا۔ کبھی دودھ لے کر اس کے گھر جاتا' کبھی گھی لے کر' کبھی ساڑھیاں لے کر' کہتا تلیا! میں تجھ سے کچھ نہیں چاہتا۔ تو میری بھینٹ لے لے' تو مجھ سے بولنا نہیں چاہتی مت بول' میری صورت دیکھنا نہیں چاہتی مت دیکھ' لیکن جو میں لاؤں اسے لے لے۔ بس اسی سے میرا دل بھر جائے گا۔ بھولی بھالی تلیا ایسی انیلی نہ تھی' جانتی تھی یہ انگلی پکڑنے کی باتیں ہیں۔ انگلی پکڑتے ہی پہنچا پکڑنے کی باتیں ہونے لگیں گی۔ لیکن نہ جانے کیسے وہ اس کے دھوکے میں آ گئی۔ نہیں دھوکے میں نہیں آئی اسے اس کی جوانی پر ترس آیا۔ ایک دن وہ پکے ہوئے قلمی آم لایا' تلیا نے اپنی زندگی میں قلمی آم نہ کھائے تھے۔ آم اس سے لے لئے۔ پھر تو روزانہ آم کے ٹوکرے آنے لگے اور آم لے کر بنسی سنگھ خود آتا اور چھپ کر رات کو آتا کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ گاؤں میں شور مچ جائے گا۔ ایک دن جب تلیا آم کی ٹوکری لے کر گھر میں جانے لگی تو بنسی سنگھ نے اس کا ہاتھ آہستہ سے پکڑ کر اپنے سینہ پر رکھ لیا اور چٹ اس کے پیروں پر گر پڑا اور بولا تلیا اگر اب بھی تجھے مجھ پر دیا نہیں آتی تو آج مجھے مار ڈال' اپنے ہاتھوں سے مار ڈال۔ بس اب یہی ابھلا کھا ہے۔

تلیا نے آم کی ٹوکری پٹک دی' اور اپنے پاؤں چھڑا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ اور اس کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر بولی "اچھا ٹھاکر اب یہاں سے چلے جاؤ۔ نہیں تو یا تم نہ رہو گے یا میں نہیں رہوں گی۔ تمہارے آموں میں آگ لگے اور تم کو کیا کہوں' میرا آدمی کالے کوسوں میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے' اسی لئے کہ میں یہاں اس کے نام کو کلنک لگاؤں؟ وہ مرد ہے چار پیسے کما تا ہے' کیا وہ دوسری نہ رکھ سکتا تھا' عورتوں کی سنسار میں کمی ہے۔ لیکن وہ میرے نام پر بیٹھا ہوا ہے' مرد ہو کر بیٹھا ہوا ہے' تم سے کم پٹھا نہیں ہے' تمہارے جیسا سندر چاہے نہ ہو۔ پڑھو گے اس کی چٹھیاں وہ جو میرے نام بھیجتا ہے۔ آپ چاہے جس حال میں ہو' میں کون یہاں بیٹھی دیکھتی ہوں لیکن ہر تیسرے مہینے میرے لئے روپے بھیج دیتا ہے۔ اسی لئے کہ میں دوسروں سے بہار کروں؟ وہ ایک پیسہ بھی نہ بھیجے لیکن جب تک وہ ایسی پریم سے بھری چٹھیاں بھیجتا رہے گا، جب تک وہ مجھ کو اپنی اور اپنے کو میرا سمجھتا رہے گا، تلیا ایسی رہے گی۔ دل میں بھی' دکھاوے میں بھی۔ جب اس سے میرا بیاہ ہوا ہے' تب میں پانچ برس کی الھڑ چھوکری تھی۔ تمہارے دروازے پر جاتی تھی تو تم دھتکار دیتے تھے' اس نے میرے ساتھ کیا سکھ اٹھایا جو میرے لئے اتنا کر رہا ہے۔ بس ایک بانہہ پکڑنے کی لاج کو نبھا رہا ہے' تو میں عورت ہو کے اس کے ساتھ دغا کروں۔"

یہ کہہ کر وہ اندر گئی اور چٹھیوں کی پٹاری لا کر ٹھاکر کے سامنے پٹک دی مگر ٹھاکر کو چٹھیوں کے پڑھنے کا شوق کہاں تھا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بندھا ہوا تھا۔ ہونٹ پچکے جا رہے تھے۔ چپ چاپ سر جھکائے کھڑا تھا۔

ایک لمحہ بعد اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "مجھ سے بہت بڑا قصور ہو گیا تولا! میں نے تم کو پہچانا نہ تھا' اب اس

کی سزا یہی ہے کہ تم مجھے اپنے ہاتھ سے مار ڈالو۔ اسی وقت مار ڈالو۔ ایسے روسیاہ آدمی کا زندہ رہنا کس کام کا۔ میں کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہا۔ بس اب یہی آرزو ہے کہ تمہارے ہاتھوں قتل ہو جاؤں۔"

تلیا کو اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ یہ ابھی تک شرارت کئے جاتا ہے۔ جھلا کر بولی مرنے کو جی چاہتا ہے تو جاؤ۔ کیا دنیا میں کنوئیں تالاب نہیں ہیں' یا تمہارے پاس کٹار نہیں ہے۔ میں کسی کو کیوں ماروں۔"

ٹھاکر نے مایوس نظروں سے دیکھا۔ "تو تمہارا یہ ہی حکم ہے؟"

"میرا حکم کیوں ہونے لگا۔ مرنے والے کسی کا حکم نہیں لیتے۔"

وہ چلا گیا اور دوسرے دن ندی میں اس کی لاش تیرتی ہوئی ملی۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیسے ڈوب گیا۔ یہی خیال ہوا کہ نہانے آیا ہوگا۔ پاؤں پھسل گیا ہوگا۔ کئی دن کیا' کئی مہینوں تک گاؤں میں اس کا چرچا رہا۔ تلیا نے زبان تک نہ کھولی۔ ٹھاکر کے مرتے ہی بھائی نے جائیداد پر قبضہ کر لیا' اور اس کی بیوی اور بچے کو ستانے لگا۔ دیورانی طعنے دیتی' دیور عیب لگاتا' آخر غریب بیوہ ایک دن زندگی سے تنگ آ کر بچے کو لے کر گھر سے نکل پڑی۔ رات کا وقت تھا' تلیا اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ لالٹین جل رہی تھی' ارزانی کے دن تھے۔ سہ ماہی تیس روپے میں اس کی بڑی فراغت سے گزران ہوتی تھی۔ جو وہ کھاتی اور پہنتی تھی وہ ٹھکرانیوں کو بھی نصیب نہ تھا۔ گائے پالی تھی اس کو روٹی کھلانے نکلی تھی کہ اس نے ٹھکرائن کو بچے کے ساتھ جاتے دیکھا۔ ٹھکرائن سسکتی اور آنچل سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔ تین سال کا بچہ گود میں تھا۔

تلیا نے پوچھا۔ "اس وقت کہاں جاتی ہو' ٹھکرائن! سنو' سنو کیا بات ہے' تم رو رہی ہو۔"

ٹھکرائن جا تو رہی تھی مگر کہاں' یہ اسے خود معلوم نہ تھا۔ وہ یہاں رہنا نہ چاہتی تھی اور اپنے بچے کی جان کا خوف تھا۔ ان دنوں یہ پولیس کی تحقیقاتیں کہاں تھیں۔ دیور اسے اور اس کے بچے کو مار ڈالتا۔ کسی کو خبر بھی نہ ہوتی مگر اس چمارن سے اپنا دکھڑا کیسے کہے۔ آخر تھی ٹھکرائن' ایک بار تلیا کی طرف دیکھا اور بلا کچھ جواب دیئے آگے بڑھی۔ جواب کیسے دیتی' گلے میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ اس وقت نہ جانے کیوں اور امڈ آئے تھے۔

تلیا نے گائے کے سامنے روٹی پھینکی' لوٹے سے ہاتھ دھویا اور قریب آ کر بولی۔ "جب تک تم مجھے نہ بتلا دو گی کہ کہاں جا رہی ہو میں تمہیں آگے ایک قدم نہ جانے دوں گی۔"

ٹھکرائن رک گئی اور آنسو بھری آنکھوں میں غصہ بھر کر بولی۔ "تو کیا کرے گی پوچھ کر' تجھ سے مطلب!"

"مجھ سے کوئی مطلب ہی نہیں' میں تمہارے گاؤں میں نہیں رہتی؟ گاؤں والے ایک دوسرے کے دکھ درد میں نہ ساتھ دیں گے تو کون دے گا؟"

"اس زمانے میں کون کسی کا ساتھ دیتا ہے۔ تلیا جب اپنے گھر والوں نے ساتھ نہ دیا اور تیرے بھیا کے مرتے ہی میرے خون کے پیاسے ہو گئے تو پھر میں کس سے امید رکھوں۔ کیا تو میرے گھر کا حال نہیں جانتی؟ تجھ سے کیا چھپا ہے۔ وہاں نائن' کہارن کے لیے روٹیاں ہیں' میرے لئے نہیں۔ اور لاتوں کی ماری روٹیاں کون کھائے۔ میں کسی سے خیرات نہیں مانگتی ہوں۔ میں رکھیلی نہیں ہوں' اڑھری نہیں ہوں' بیاہتا ہوں' دس گاؤں کے آدمیوں کے بیچ میں بیاہ کے آئی ہوں' اپنا رتی بھر حق نہ چھوڑوں گی۔ آج کوئی نہ دے۔ میں اناتھ ہوں' لیکن چاہے میری آبرو جائے' ان کو مٹا کے چھوڑوں گی اور اپنا حصہ لے کے رہوں گی۔"

"تیرے بھیا" یہ دو لفظ تلیا کو اتنے پیارے لگے کہ اس نے ٹھکرائن کو گلے سے لگا لیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ "تو بہن میرے گھر چل کر رہو اور کوئی تمہارا ساتھ دے یا نہ دے، تلیا مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے گی۔ میرا گھر تمہارے رہنے کے لائق نہیں ہے، میں بھی غریب ہوں لیکن گھر میں چاہے اور کچھ نہ ہو شانتی تو ہے اور میں کتنی ہی غریب ہوں لیکن تمہاری بہن تو ہوں۔"

ٹھکرائن نے اس کے چہرے کو حیرت کی نگاہ سے دیکھا۔ "ایسا نہ ہو میرے پیچھے میرا دیور تمہارا دشمن ہو جائے۔"

تلیا نے دلیرانہ انداز سے کہا۔ "میں دشمنوں سے نہیں ڈرتی اور پھر ان سے کہنے ہی کون جاتا ہے اور تم پردہ میں رہتی ہی ہو۔"

ٹھکرائن تلیا کے ساتھ اس کے گھر میں آکر بیٹھ گئی۔ وہاں ایک ہی کھاٹ تھی۔ تلیا نے اس پر بچے کو لٹا دیا۔ چمارن کے برتن میں ٹھکرائن کیسے کھانا پکائے کیسے پانی پیئے۔ تلیا دوسرے ہی دن بازار سے برتن بھانڈے لائی اور ٹھکرائن کے لیے ایک کوٹھڑی الگ کر دی۔ ٹھکرائن مغرور تھی' آرام پسند تھی مگر دھن کی پوری تلیا اس کے برتن دھوتی' اس کے کپڑے صاف کرتی' اس کا بچہ کھلاتی۔ ٹھکرائن اس طرح کام لیتی تھی گویا وہ اس کی لونڈی ہے لیکن تلیا کشتۂ ناز عاشق کے ساتھ وفا کا نباہ کر رہی تھی۔ اس کا من کبھی نہ میلا ہوتا' ماتھے پر کبھی نہ بل پڑتا۔

ایک دن ٹھکرائن نے کہا۔ "تو لا تم دیکھتی رہنا۔ میں دو چار دن کے لیے ذرا باہر جاؤں گی۔ اس طرح تو یہاں زندگی بھر پڑی رہوں گی' مگر دل کی آگ نہ ٹھنڈی ہو گی۔ اس بے حیا کو اس کی شرم کہاں کہ اس کی بھاوج کسی غیر کے ٹکڑے پر پڑی ہوئی ہے۔ وہ تو اسی کوشش میں ہے کہ کسی طرح مجھے یہاں سے نکلوا دے' اور ممکن ہو تو بدنام کر کے۔ اتنے دن تو آرام کر چکی' اب کچھ کام بھی کرنا چاہیے۔"

تلیا نے پوچھا۔ "کہاں جانا چاہتی ہو بہن! کوئی حرج نہ ہو تو میں بھی ساتھ چلوں' اکیلی کہاں جاؤ گی؟"

"اس سانپ کو کچلنے کے لئے کسی کی مدد کے بغیر کام نہ چلے گا۔"

"وہ مدد کہاں ملے گی؟"

"میں جانتی ہوں اور پھر تجھ سے کیا چھپاؤں میں اپنے روپ کے جادو سے ان کا گھمنڈ توڑ دوں گی۔ میرے پاس دوسرا کون سا ہتھیار ہے۔ میں جوان ہوں اور ایسی بری نہیں ہوں۔ میں آج اپنا روپ بیچنے پر آ جاؤں تو جانتی ہوں اس کے دام کیا ہوں گے؟ اس بھیڑیئے کا سر' اور میں نے یہی طے کیا ہے۔ اس پرگنہ کا حاکم جو کوئی بھی ہو اسی پر میرا جادو چلے گا۔ اور ایسا کوئی مرد نہیں جو کسی خوبصورت عورت کے جادو سے بچ سکے۔ چاہے وہ اسّی سال کا بڈھا ہی کیوں نہ ہو۔ چاہے وہ رشی ہی کیوں نہ ہو۔ دھرم جاتا ہے جائے' مجھے پرواہ نہیں ہے۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتی کہ میں بن بن کی پتیاں توڑوں اور شہدا مونچھوں پر تاؤ دے کر راج کرے۔ اور یہ کل تین چار دن کا کام ہے۔ تلیا کل تین چار دن کا کام' تو بچے کی دیکھ بھال کرنا۔ بچہ تجھ سے ہلا ہوا بھی ہے میرے لیے بہت نہ ہڑکے گا۔ کوئی پوچھے کہاں گئی تو کہہ دینا میکے چلی گئی۔"

تلیا کو معلوم ہوا' اس خوددار عورت کے دل پر کتنی گہری چوٹ ہے۔ اس جلن کو مٹانے کے لئے وہ جان ہی پر نہیں کھیل رہی' دھرم پر کھیل رہی ہے جسے وہ جان سے زیادہ عزیز سمجھتی ہے۔ بنسی سنگھ کی وہ صورتِ التجا اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ وہ طاقت ور تھا' اپنے فولادی قویٰ سے وہ بڑی آسانی سے اس پر جبر کر سکتا تھا اور

اس رات کے سناٹے میں اس کی حمایت کرنے والا کون تھا۔ مگر اس کی عفت آمیز تنبیہ نے بنسی سنگھ کو کس طرح رام کر لیا' گویا کوئی خونخوار اژدھا سریلا راگ سن کر مست ہو گیا ہو اور اپنا خونی ارادہ ترک کر کے اس کی تانوں پر ناچنے لگے۔ اسی سچے سورما کی آبرو آج خطرے میں ہے۔ کیا تلیا اس کے آبرو لٹنے دے گی اور خاموش بیٹھی رہے گی' نہیں' نہیں' نہیں!

بنسی سنگھ کا وہ سرفروشانہ ضبط' وہ مردانہ تحمل' وہ ذوقِ شہادت' وہ سچا عشق' وہ اپنی شمع حیات کو بجھا کر سوزِ نہاں کو ٹھنڈا کرنے کا شجاعانہ عمل' وہ اس کے فیصلے پر جان نثار کر دینے کا جذبۂ نیاز۔ نہیں' بنسی سنگھ نے اس کی آبرو کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھا تو وہ بھی اس کی آبرو کو اپنی آبرو سے زیادہ عزیز ثابت کر دے گی۔ اپنی سحر طرازیوں سے' اپنی محبت نوازیوں سے' اپنی شیریں اداؤں سے' اپنی عظمت کو گوشۂ جگر میں محفوظ رکھے ہوئے' وہ اپنی وفا کا حق ادا کرے گی۔

تلیا نے ٹھکرائن کو تشفی دیتے ہوئے کہا۔ "ابھی تم مت جاؤ' بہن کہیں مت جاؤ' پہلے مجھے اپنی طاقت آزما لینے دو۔ میری آبرو چلی بھی گئی تو کون ہنسے گا۔ تمہاری آبرو کے پیچھے ایک خاندان کی آبرو ہے۔"

ٹھکرائن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔ اس نے کہا۔

"تو یہ فن کیا جانے تلیا!"

"کون سا فن!"

"یہی مردوں کو الو بنانے کا فن"

"یہ فن سب ہی عورتوں کو آتا ہے بہن' کہیں سیکھنے جانے کا کام نہیں۔"

"اچھا بتاؤ تو کیا کرو گی؟"

"وہی جو تم کرنے جا رہی ہو۔ تم حاکمِ پرگنہ پر اپنا جادو ڈالنا چاہتی ہو میں تمہارے دیور پر جادو ڈالوں گی۔"

"بڑا گھاگھ ہے۔"

"گھاگھوں کو پھانسنا اور بھی آسان ہے۔"

(3)

تلیا نے آزمودہ کار جنرل کی طرح جارحانہ عمل اور مدافعت و مراجعت کے نقشے تیار کیے اور تسخیر کی تیاریاں کرنے لگی۔ عمل کے مدارج اور کامیابی کی منزل جتنی صفائی سے اسے نظر آتی تھی' شاید سکندر یا نپولین کو بھی نظر نہ آئی ہو گی۔ پیش بندی کے لیے اس نے مدافعت اور مراجعت کے پہلو بھی سوچ لیے مگر اسے اس میں شک نہ تھا کہ یہ "بڑھے چلو" والی جنگ ہو گی۔ غنیم بالکل بے خبر تھے' بالکل غیر مسلح' اور اس فن حرب سے بالکل غیر معروف۔

بنسی سنگھ کا چھوٹا بھائی گردھر کندھے پر چھ فٹ کا موٹا ڈنڈا رکھے اکڑتا چلا آتا تھا کہ تلیا نے پکارا۔ "ٹھاکر جرا یہ گھاس کا گٹھا اٹھا کر میرے سر پر رکھ دو' مجھ سے نہیں اٹھتا۔"

اندھیرا ہو گیا تھا۔ کسان اپنے اپنے کھیتوں سے لوٹ کر گھر آچکے تھے' راستے میں سناٹا تھا۔

اس وقت تلیا کا آنچل کھسک گیا اور سرخ چولی کے اندر کا ابھار جھلک پڑا۔ تلیا نے جھٹ آنچل سنبھال لیا۔ مگر اس کوشش میں اس کا سر کھل گیا اور اس کے جوڑے میں گتھی ہوئی پھولوں کی بنی بجلی کی طرح آنکھوں میں کوند گئی۔ گردھر پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ اعلیٰ اور ادنیٰ کا امتیاز مٹ گیا' آنکھوں میں ہلکا سا نشہ نمودار ہوا اور چہرے پر ہلکی سی سرخی اور خفیف سا تبسم' رگ رگ میں نغمہ سا گونج گیا۔

اس نے تلیا کو ہزاروں بار دیکھا تھا' آرزو اور التجا کی آنکھوں سے مگر تلیا اپنے حسن اور عصمت کے غرور میں اس کی طرف کبھی مخاطب نہ ہوئی تھی۔ اس کے انداز و بُشرے میں کچھ ایسی بے نیازی' کچھ ایسی سرد مہری تھی کہ ٹھاکر کے سارے حوصلے پست ہو جاتے تھے' سارا شوق ٹھنڈا پڑ جاتا تھا۔ آسمان پر اڑنے والے طائر پر اس کے لاسے اور دانے اور جال کا کیا اثر ہو سکتا تھا۔ مگر آج وہ طائر اس کے مکان کے سامنے والی شاخ پر آبیٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوکا ہے' پھر کیوں نہ وہ دانہ اور جال لے کر دوڑے۔

اس نے مخمور ہو کر کہا۔ "میں پہنچائے دیتا ہوں۔ تلیا تو کیوں سر پر اٹھائے۔"

تلیا نے شکار پر وار کیا۔ "اور کوئی دیکھ لے تو یہی کہے گا کہ ٹھاکر کو کیا ہو گیا ہے۔"

"مجھے کتوں کے بھونکنے کی پرواہ نہیں۔"

"لیکن مجھے تو ہے۔"

ٹھاکر نہ مانا' گٹھا سر پر رکھ لیا اور اس طرح چلا گویا قارون کا خزانہ لیے جاتا ہو۔

(4)

ایک مہینہ گزر گیا۔ تلیا ٹھاکر پر موہنی ڈال رہی تھی اور اب اسے مچھلی کی طرح کھلا رہی تھی۔ کبھی ڈھیلی کر دیتی۔ کبھی کھینچ لیتی۔ لگاوٹ بازی بھی تھی اور پرہیز بھی اور ٹھاکر کی آتش شوق تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھی۔ اپنا ایمان اور دھرم سب کچھ نثار کر کے بھی وہ حصولِ مدعا کے قریب نہ آیا تھا۔ تلیا آج بھی اس سے اتنی ہی دور تھی جتنی پہلے۔

ایک دن وہ تلیا سے بولا۔ "اس طرح کب تک جلائے گی۔ تلیا چل کہیں بھاگ چلیں۔"

تلیا نے پھندے کو کسا۔ "ہاں اور کیا جب تم منہ پھیر لو تو کسی کام کی نہ رہوں' دین سے بھی جاؤں دنیا سے بھی۔"

ٹھاکر نے شکوہ آمیز لہجہ سے کہا۔ "اب تجھے مجھ پر وشواش نہیں آتا۔"

"بھونرے پھول کا رس لے کر اڑ جاتے ہیں۔"

"اور پتنگے جل کر راکھ ہو جاتے ہیں۔"

"پتیاؤں کیسے؟"

"میں نے تیرا کوئی حکم ٹالا ہے۔"

"تم سمجھتے ہو گے تلیا کو ایک رنگین ساڑھی اور دو ایک چھوٹے موٹے گہنے دے کر پھنسا لوں گا' میں ایسی انیلی نہیں ہوں۔"

تلیا نے ٹھاکر کے دل کی بات بھانپ لی تھی۔ ٹھاکر حیرت میں آکر اس کے منہ کی طرف تکنے لگا۔
تلیا نے پھر کہا۔ ”آدمی اپنا گھر چھوڑتا ہے تو پہلے کہیں بیٹھنے کا ٹھکانا کر لیتا ہے۔“
ٹھاکر نے خوش ہو کر کہا۔ ”تو چل میرے گھر میں مالکن بن کے رہ۔“
تلیا آنکھیں مٹکا کر بولی۔ ”آج مالکن بن کر رہوں اور کل لونڈی بن کر بھی نہ رہنے پاؤں‘ کیوں؟“
”تو جس طرح تیرا دامن بھرے وہ کر‘ میں تیرا غلام ہوں۔“
”بچن دیتے ہو۔“
”ہاں دیتا ہوں۔“
”پھر تو نہ جاؤ گے۔“
بچن دے کر پھر جانا مردوں کا کام ہے؟“
”تو آدھی جمین جائیداد میرے نام لکھ دو۔“
ٹھاکر اپنے گھر میں ایک کوٹھڑی‘ دس پانچ بیگھے کھیت‘ گہنے‘ کپڑے اور اپنی عزت تو اس کے قدموں پر نثار کرنے کو تیار تھا لیکن آدھی جائیداد اس کے نام منتقل کرنے کی ہمت اس میں نہ تھی۔ کل کو تلیا اس سے کسی بات پر ناراض ہو جائے تو اسے آدھی جائیداد سے ہاتھ دھونا پڑے۔ عورت کا کیا اعتبار‘ اسے گمان تک نہ تھا کہ تلیا اس سے اتنا سنگین مطالبہ کرے گی۔ اسے تلیا پر غصہ آیا‘ یہ چمارن ذرا سندر کیا ہو گئی ہے کہ سمجھتی ہے کہ میں اپسرا ہوں۔ اس کی محبت ایک بے تاب خواہش تھی اور بس۔ وہ محبت جو اپنے کو فنا کر دیتی ہے اور فنا ہو جانا ہی زندگی کا حاصل سمجھتی ہے‘ اس میں نہ تھی۔
اس نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ ”میں جانتا تھا کہ تجھے میری زمین جائیداد ہی سے محبت ہے۔ تلیا مجھ سے نہیں۔“
تلیا نے برجستہ جواب دیا۔ ”تو کیا میں نہ جانتی تھی کہ تمہیں میرے روپ اور جوانی سے محبت ہے‘ مجھ سے نہیں۔“
”تو محبت کو بازار کا سودا سمجھتی ہے۔“
”ہاں سمجھتی ہوں۔ تمہارے لیے محبت چار دن کا تماشا ہو گی۔ میں تو کہیں کی نہ رہوں گی۔ میں اپنا سب کچھ تمہیں دے رہی ہوں تو اس کے بدلے میں سب کچھ لینا بھی چاہتی ہوں۔ تمہیں اگر مجھ سے محبت ہوتی تو آدھی کیا ساری جائیداد میرے نام لکھ دیتے۔ لیکن تمہاری نیت معلوم ہو گئی۔ ہاں بھگوان نہ کرے کہ ایسا کوئی سمے آئے لیکن دن کسی کے برابر نہیں جاتے۔ اگر کوئی ایسا سمے آیا کہ تمہارے پاس کچھ نہ رہا تو تلیا دکھا دے گی کہ عورت کیا کچھ کر سکتی ہے۔“
تلیا جھلّائی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مگر مایوس نہ تھی‘ نہ بے دل‘ آگے کیا ہونے والا ہے اس کے متعلق اسے مطلق شبہ نہ تھا۔
ٹھاکر نے جائیداد تو اپنی دانست میں بچالی تھی مگر بڑے مہنگے داموں۔ اس کا اطمینانِ قلب رخصت ہو چکا تھا۔ زندگی میں جیسے کوئی لطف ہی نہ رہ گیا تھا۔ جائیداد آنکھوں کے سامنے تھی‘ تلیا دل کے اندر۔ روز سامنے آکر بیٹھنے والی تلیا‘ اب آرزو تھی‘ جو حقیقت سے کہیں زیادہ دل آویز ہے‘ نشہ خیز ہے۔

تلیا اسے کبھی کبھی خواب کی ایک جھلک کی طرح نظر آ جاتی اور خواب ہی کی طرح غائب ہو جاتی۔ گردھر اس سے اپنا دردِ دل کہنے کا موقع ڈھونڈ تا رہتا لیکن تلیا اس کے سایہ سے بھی پرہیز کرتی۔ گردھر کو اب محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کے لیے اس کی زمین کے مقابلہ میں تلیا کہیں زیادہ لازمی ہے۔ اسے اپنی تنگ ظرفی پر غصہ آتا' زمین اور جائیداد کیا تلیا کے نام رہی کیا اس کے نام۔ اس ذرا سی بات میں کیا رکھا ہے۔ تلیا تو اس وقت کے لئے پیش بندی کر رہی تھی' جب میں اس کے ساتھ بے وفائی کرتا۔ جب میں اس کا بن کوڑی غلام ہوں تو بے وفائی کیسی۔ میں اس کے ساتھ بے وفائی کروں گا جس کی ایک نگاہِ کرم کے لیے ترستا رہتا ہوں۔ کاش وہ ایک بار مل جاتی تو اس سے کہہ دیتا کہ تو لا میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب تمہارا ہے۔ کہو ہبہ نامہ لکھ دوں' کہو بیع نامہ لکھ دوں' مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کے لئے نادم ہوں۔ جائیداد سے انسان کو جو رواجی الفت ہے اسی کے زیر اثر میں نے وہ حماقت کی تھی۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ دنیا میں وہی چیز سب سے بیش قیمت ہے۔ جس سے زندگی میں کیف اور سرور پیدا ہو۔ اگر فقر اور بے نوائی میں سرور حاصل ہو تو وہی سب سے قیمتی ہے۔ جس پر زمین اور ملکیت سب کچھ قربان کر دی جاتی ہے۔ آج بھی لاکھوں خدا کے بندے ہیں جو دنیا کی نعمتوں پر لات مار کر جنگل بیاباں کی سیر کرنے میں مست ہیں۔ اور اس وقت میں اتنی ذرا سی بات نہ سمجھا' ہائے رے کم بختی!

(5)

ایک دن ٹھاکر کے پاس تلیا نے پیغام بھیجا۔ میں بیمار ہوں آ کر مجھے دیکھ جاؤ' کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔

رات کے دس بجے ہوں گے۔ ٹھاکر نے سنا اور دوڑا۔ اس کی چھاتی دھڑک رہی تھی اور سر اڑا جاتا تھا۔ تلیا بیمار ہے۔ تلیا اس کی آنکھوں سے دور تھی لیکن دل میں بسی ہوئی اور دل و جان سے بھی زیادہ عزیز۔ دل تو محض اس کا مکان تھا اور تلیا بیمار ہے۔ کیا ہوگا بھگوان؟ تم مجھے کیوں نہیں بیمار کر لیتے۔ میں تو اس کی جگہ مرنے کو بھی تیار ہوں۔

تلیا کی بیماری اس کے ذہن میں ہر لمحہ خوفناک ہوتی جاتی تھی اور بیماری میں تلیا نے مجھے بلایا ہے۔ کہا ہے کہ اگر آ کر دیکھ جاؤ' کون جانے بچوں کہ نہ بچوں۔ تو اگر نہ بچے گی تلیا تو میں بھی نہ بچوں گا۔ دیوار سے سر پھوڑ کر جان دے دوں گا۔ پھر میری اور تیری چتا ایک ساتھ بنے گی۔ ایک ساتھ دونوں کے جنازے نکلیں گے۔

اس نے قدم اور تیز کیا اور تھرتھراتے ہوئے پاؤں سے تلیا کے گھر میں قدم رکھا۔ تلیا اپنی کھاٹ پر ایک چادر اوڑھے سمٹی پڑی تھی اور اس نیم تاریکی میں جاں بلب معلوم ہو رہی تھی۔ گردھر نے اس کے قدموں پر سر رکھ دیا اور کانپتی ہوئی اشک میں ڈوبی ہو آواز میں بولا۔ "تلیا یہ بدنصیب تمہارے قدموں پر پڑا ہوا ہے۔"

تلیا نے آنکھیں کھولیں اور نقیہ آواز میں بولی۔ "تم ہو' گردھر سنگھ تم آ گئے۔ اب میں آرام سے مروں گی۔ تمہیں ایک بار دیکھنے کے لئے جی بہت بے چین تھا۔ میرا کہا ماپھ کر دینا اور میرے لیے رونا مت' اس مٹی کی دیہہ میں کیا رکھا ہے گردھر۔ یہ تو مٹی میں مل جائے گا لیکن میں کبھی تمہارا ساتھ نہ چھوڑوں گی۔ پرچھائیں کی طرح سدا تمہارے ساتھ رہوں گی۔ تم مجھے نہ دیکھ سکو گے' میری باتیں سن نہ سکو گے لیکن تلیا آٹھوں پہر' سوتے جاگتے تمہارے ساتھ رہے گی۔ میرے لیے اپنے کو بدنام مت کرنا۔ گردھر کبھی کسی کے سامنے میرا نام جبان پر مت لانا۔"

گردھر زار و قطار رو رہا تھا۔ ہاتھ میں کٹار ہوتی تو اسی وقت جگر میں مار لیتا اور اس کے سامنے تڑپ کر مر جاتا۔
تلیا نے ذرا دم لے کر پھر کہا۔ "میں بچوں گی نہیں گردھر، تم سے ایک منتی کرتی ہوں مانو گے؟"
گردھر نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔ "اب جیوں گا تو اس لیے کہ تیرا حکم پورا کروں، نہیں تو اس جندگی میں کیا رکھا ہے۔"
اسے ایسے معلوم ہوا کہ تلیا مسکرائی۔
"نہیں، نہیں ایسا مت کہو تمہارے بال بچے ہیں، ان کی پرورش کرنا اور مجھے بھول جانا۔ میری یہی منتی ہے کہ اپنی بھابی کو اور اس کے بچے کو اسی طرح رکھنا جیسے بنسی سنگھ کے سامنے رہتی تھیں۔ ان کا آدھا نہیں دے دینا۔"
گردھر بولا۔ "لیکن بھاوج تو دو مہینے سے اپنے میکے میں ہیں اور کہہ گئی ہیں کہ اب کبھی نہ آؤں گی۔"
یہ تم نے برا کیا ہے، گردھر بہت برا۔ اب میں سمجھی کہ کیوں مجھے برے برے سپنے آ رہے تھے۔ اگر چاہتے ہو کہ میں جی اٹھوں تو جتنی جلدی ہو لکھا پڑھی کر کے کاغذ میرے پاس رکھ دو، تمہاری بے انصافی ہی میری جان کی گاہک ہو رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ تمہاری بھاوج کیوں بار بار مجھے سپنے میں دکھائی دیتی تھیں اور بنسی سنگھ کیوں مجھ سے سپنے میں کہتے تھے، گردھر نے میری مکت بگاڑ دی۔ بس ابھی جاؤ گردھر اور لکھا پڑھی کر کے کاگد لاؤ، دیر کی تو مجھے جیتا نہ پاؤ گے۔"
گردھر نے دبی زبان سے کہا۔ "لیکن رات کو کیسے لکھا پڑھی ہو گی تلیا، اسٹامپ کہاں ملے گا، لکھے گا کون، گواہ کہاں ہیں؟ بتلاؤ؟"
"کل سانجھ تک یہ کام کر لو گے، تو میں بچ جاؤں گی۔ گردھر، بنسی سنگھ مجھے لگے ہوئے ہیں، وہی مجھے ستا رہے ہیں۔ میری جان لے رہے ہیں۔ اگر تم نے دیر کی تو تلیا مر جائے گی۔"
"میں کل سانجھ تک آ جاؤں گا۔ تلیا تیرا حکم سر اور آنکھوں پر۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ تو......"
"نہیں نہیں میں کل سانجھ تک نہیں مروں گی، اس کا وشواش رکھو۔"
گِردھر اُسی وقت وہاں سے نکلا، راتوں رات پچیس کوس کی منزل طے کر کے صدر پہنچا، وکیلوں سے مشورہ کیا، اسٹامپ لیا، بھاوج کے نام آدھی جائیداد منتقل کروائی اور چراغ جلتے جلتے حیران و پریشان، تھکن سے چور، امید و بیم سے معمور آ کر تلیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔
تلیا نے روحانی شگفتگی کے عالم میں کہا۔ "تم آ گئے گِردھر، کام کر آئے؟"
مگر گِردھر نے کاغذ اُس کے سامنے رکھ کر کہا۔ "ہاں تلیا کر آیا، اور اگر اب بھی تم اچھی نہ ہوئیں تو تمہارے ساتھ گِردھر کی جان بھی جائے گی۔"
تلیا اُٹھ بیٹھی اور کاغذ کو اپنے سرہانے رکھ کر بولی۔ "میں بہت اچھی ہوں گِردھر! تم جب رات یہاں سے چلے گئے، تب ہی سے میری طبیعت سنبھلنے لگی۔ اور اب میں اچھی ہوں اور سویرے تک بالکل اچھی ہو جاؤں گی لیکن ابھی ابھی میں سو گئی تھی اور بنسی سنگھ مجھے سپنے میں کہہ رہے تھے "تلیا تو بیاہتا ہے، تیرا آدمی ہجار کوس پر بیٹھا تیرے نام کی مالا جپ رہا ہے، چاہتا تو دوسری کر لیتا لیکن تیرے نام پر بیٹھا ہوا ہے۔ اور جنم بھر بیٹھا رہے گا۔ اگر تو نے اُس سے دگا کی تو میں تیرا دشمن ہو جاؤں گا، تو نے اپنے آدمی کے ساتھ کپٹ کیا تو اُسی دن میں تیری جان لے لوں گا۔ بس یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔"

گردھر نے ایک لمحہ تلیا کے چہرہ کی طرف دیکھا جس پر اس وقت ایک روحانی جلال سا چمک رہا تھا اور دفعتاً جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا اور ساری سازش سمجھ میں آگئی۔ اُس نے سچی عقیدت سے تلیا کے قدموں کو بوسہ دیا اور بولا۔ ''سمجھ گیا تلیا تو دیوی ہے۔''

زیور کا ڈبّہ

(1)

بی اے پاس کرنے کے بعد چندر پرکاش کو ایک ٹیوشن کرنے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔ ان کی ماں پہلے ہی مر چکی تھی۔ اسی سال والد بھی چل بسے اور پرکاش زندگی کے جو شیریں خواب دیکھا کرتا تھا وہ مٹی میں مل گئے۔ والد اعلیٰ عہدہ پر تھے۔ ان کی وساطت سے چندر پرکاش کو کوئی اچھی جگہ ملنے کی پوری امید تھی مگر وہ سب منصوبے دھرے ہی رہ گئے اور اب گزر اوقات کے لیے صرف تیس روپے ماہوار کی ٹیوشن ہی رہ گئی۔ والد نے کوئی بھی جائیداد نہ چھوڑی الٹا بہو کا بوجھ اور سر پر لاد دیا۔ اور عورت بھی ملی تو تعلیم یافتہ' شوقین' زبان کی طرارہ جسے موٹا کھانے اور موٹا پہننے کی نسبت مر جانا قبول تھا۔ چندر پرکاش کو تیس کی نوکری کرتے شرم تو آتی تھی لیکن ٹھاکر صاحب نے رہنے کے لئے مکان دے کر ان کے آنسو پونچھ دیئے۔ یہ مکان ٹھاکر صاحب کے مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ پختہ' ہوادار' صاف ستھرا اور ضروری سامان سے آراستہ' ایسا مکان بیس روپے ماہوار سے کم میں نہ مل سکتا تھا۔ کام صرف دو گھنٹے کا تھا' لڑکا تو لگ بھگ انہی کی عمر کا تھا مگر بڑا کند ذہن کام چور' ابھی نویں درجہ میں پڑھتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھاکر اور ٹھکرائن دونوں پرکاش کی بڑی عزت کرتے تھے بلکہ اپنا ہی لڑکا سمجھتے تھے۔ گویا وہ ملازم نہیں گھر کا آدمی تھا اور گھر کے ہر ایک معاملہ میں اس سے مشورہ لیا جاتا تھا۔

(2)

شام کا وقت تھا' پرکاش نے اپنے شاگرد ویراندر کو پڑھا کر چلنے کے لیے چھڑی اٹھائی تو ٹھکرائن نے کہا۔ ''ابھی نہ جاؤ بیٹا' ذرا میرے ساتھ آؤ' تم سے کچھ کہنا ہے۔''

پرکاش نے دل میں سوچا' وہ کیا بات ہے جو ویراندر کے سامنے نہیں کہی جا سکتی۔ پرکاش کو علیحدہ لے جا کر اُمادیوی نے کہا۔ ''تمہاری کیا صلاح ہے' ویرو کا بیاہ کر دوں۔ ایک بہت اچھے گھر کا پیغام آیا ہے۔''

پرکاش نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ تو ویرو بابو ہی سے پوچھیے۔''

''نہیں میں تم سے پوچھتی ہوں۔''

پرکاش نے ذرا تذبذب سے کہا۔ ''میں اس معاملہ میں کیا صلاح دے سکتا ہوں' ان کا بیسواں سال تو ہے

لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ بیاہ کے بعد پڑھنا ہو چکا۔"

"تو ابھی نہ کروں تمہاری یہی صلاح ہے۔"

"جیسا آپ مناسب خیال فرمائیں' میں نے تو دونوں باتیں عرض کر دیں۔"

"تو کر ڈالوں؟ مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ لڑکا کہیں بہک نہ جائے۔ پھر پچھتانا پڑے گا۔"

"کیوں؟ میرے رہتے ہوئے تو اس کی آپ فکر نہ کریں۔ ہاں مرضی ہو تو کر ڈالیئے' کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"سب تیاریاں تمہیں کرنی پڑیں گی یہ سمجھ لو۔"

"تو میں کب انکار کرتا ہوں۔"

روٹی کی خیر منانے والے تعلیم یافتہ نوجوانوں میں ایک کمزوری ہوتی ہے جو انہیں تلخ سچائی کے اظہار سے روکتی ہے۔ پرکاش میں بھی یہی کمزوری تھی۔

بات پکی ہو گئی اور شادی کا سامان ہونے لگا۔ ٹھاکر صاحب ان اصحاب میں سے تھے جنہیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں پرکاش کی ڈگری اپنے ساٹھ سالہ تجربے سے زیادہ قیمتی تھی۔ شادی کا سارا انتظام پرکاش کے ہاتھوں میں تھا۔ دس بارہ ہزار روپے خرچ کرنے کا اختیار کچھ تھوڑی عزت کی بات نہیں تھی۔ دیکھتے دیکھتے ایک خستہ حال نوجوان ذمہ دار منیجر بن بیٹھا۔ کہیں بزاز اسے سلام کرنے آیا ہے۔ کہیں محلّہ کا بنیا گھیرے ہوئے ہے۔ کہیں گیس اور شامیانہ والا خوشامند کر رہا ہے۔ وہ چاہتا تو دو چار سو روپیہ آسانی سے اڑا سکتا تھا لیکن اتنا کمینہ نہ تھا۔ پھر اس کے ساتھ کیا دغا کرے جس نے سب کچھ اسی پر چھوڑ دیا ہو۔ مگر جس دن اس نے پانچ ہزار کے زیور خریدے اس کے کلیجے پر سانپ لوٹنے لگا۔

گھر آکر چمپا سے بولا۔ "ہم تو یہاں روٹیوں کے محتاج ہیں اور دنیا میں ایسے ایسے آدمی پڑے ہیں جو ہزاروں لاکھوں روپیہ کے زیورات بنوا ڈالتے ہیں۔ ٹھاکر صاحب نے آج بہو کے چڑھاوے کے لئے پانچ ہزار کے زیور خریدے۔ ایسی ایسی چیزیں کہ دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں۔ سچ کہتا ہوں بعض چیزوں پر تو آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔"

چمپا حاسدانہ لہجہ میں بولی۔ "اونہ ہمیں کیا کرنا ہے' جنہیں ایشور نے دیا ہے وہ پہنیں۔ یہاں تو رو رو کر مرنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔"

چندر پرکاش۔ "یہی لوگ مزے اڑاتے ہیں' نہ کمانا نہ دھمانا۔ باپ دادا چھوڑ گئے' مزے سے کھاتے اور چین کرتے ہیں۔ اسی لیے کہتا ہوں ایشور بڑا غیر منصف ہے۔"

چمپا۔ "اپنا اپنا مقدر ہے ایشور کا کیا قصور۔ تمہارے باپ دادا چھوڑ گئے ہوتے تو تم بھی مزے اڑاتے۔ یہاں تو روزمرہ کا خرچ چلانا مشکل ہے۔ گہنے کپڑے کو کون روئے۔ کوئی ڈھنگ کی ساڑھی بھی نہیں کہ کسی بھلے آدمی کے گھر جانا ہو تو پہن لوں۔ میں تو اسی سوچ میں ہوں کہ ٹھکرائن کے یہاں شادی میں کیسے جاؤں گی۔ سوچتی ہوں بیمار پڑ جاتی تو جان بچتی۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پرکاش نے تسلی دی۔ "ساڑھی تمہارے لیے ضرور لاؤں گا۔ یہ مصیبت کے دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ زندہ رہا تو ایک دن تم سر سے پاؤں تک زیور سے لدی ہو گی۔"

چمپا مسکرا کو بولی۔ "چلو ایسی من کی مٹھائی میں نہیں کھاتی۔ گزر ہوتی جائے یہی بہت ہے۔"

پرکاش نے چمپا کی بات سن کر شرم اور غم سے سر جھکا لیا۔ چمپا اسے اتنا کاہل الوجود سمجھتی ہے۔

(3)

رات کو دونوں کھانا کھا کر سوئے تو پرکاش نے پھر زیوروں کا ذکر چھیڑا۔ ''زیور اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے تھے۔ اس شہر میں ایسے بڑھیا زیور بنتے ہیں مجھے اس کی امید نہ تھی۔''

چمپا نے کہا۔ ''کوئی اور بات کرو' زیوروں کی بات سن کر دل جلتا ہے۔''

''ایسی چیزیں تم پہنو تو رانی معلوم ہونے لگو۔''

''زیوروں سے کیا خوبصورتی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے تو ایسی بہت سی عورتیں دیکھی ہیں جو زیور پہن کر بھی بھدی معلوم ہوتی ہیں۔''

ٹھاکر صاحب بھی مطلب کے یار ہیں۔ یہ نہ ہوا کہ کہتے ''اس میں سے کوئی چیز چمپا کے لیے لیتے جاؤ۔''

''تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔''

''اس میں بچپن کی کیا بات ہے۔ کوئی فراخ دل آدمی کبھی اتنی کنجوسی نہ کرتا۔''

''میں نے ایسا سخی کوئی نہیں دیکھا جو اپنی بہو کے زیور کسی غیر کو بخش دے۔''

''میں غیر نہیں ہوں۔ ہم دونوں ایک ہی مکان میں رہتے ہیں۔ میں ان کے لڑکے کو پڑھاتا ہوں اور شادی کا سارا انتظام کر رہا ہوں۔ اگر سو دو سو کی کوئی چیز دے دیتے تو کونسی بڑی بات تھی۔ مگر اہلِ ثروت کا دل دولت کے بوجھ سے دب کر سکڑ جاتا ہے۔ اس میں سخاوت اور فراخ حوصلگی کے لئے جگہ نہیں رہتی۔''

رات کے بارہ بج گئے۔ پھر بھی پرکاش کو نیند نہیں آئی۔ بار بار وہی چمکیلے زیور آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ کچھ بادل گھر آئے ہیں اور بار بار بجلی چمک اٹھتی ہے۔

یکایک پرکاش چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آہ چمپا کے نازک جسم پر ایک گہنا بھی نہیں' پھر بھی وہ کتنی شاکر ہے۔ اسے چمپا پر رحم آ گیا۔ یہی تو کھانے پینے کی عمر ہے اور اس عمر میں اس بچاری کو ہر ایک چیز کے لئے ترسنا پڑتا ہے۔ وہ دبے پاؤں کمرے سے باہر چھت پر آیا۔ ٹھاکر صاحب کی چھت اس چھت سے ملی ہوئی تھی۔ بیچ میں ایک پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ کر ٹھاکر صاحب کی چھت پر آہستہ سے اتر گیا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

اس نے سوچا پہلے زینہ سے اتر کر کمرہ میں چلوں۔ اگر وہ جاگ گئے تو زور سے ہنس دوں گا اور کہوں گا کیسا چرکا دیا۔ کہہ دوں گا میرے گھر کی چھت سے کوئی آدمی ادھر آتا دکھائی دیا۔ اس لیے میں بھی اس کے پیچھے پیچھے آیا کہ دیکھوں یہ کیا کرتا ہے۔ کسی کو مجھ پر شک نہیں ہوگا۔ اگر صندوق کی کنجی مل گئی تو پو بارہ ہیں۔ سب نوکروں پر شبہ کریں گے۔ میں بھی کہوں گا صاحب نوکروں کی حرکت ہے' ان کے سوا اور کون لے جا سکتا ہے۔ میں نلوہ نکل جاؤں گا۔ شادی کے بعد کوئی دوسرا گھر لے لوں گا پھر آہستہ آہستہ ایک ایک زیور چمپا کو دوں گا جس سے کوئی شک نہ گذرے۔

پھر بھی جب وہ زینہ سے اترنے لگا تو اس کا دل دھڑک رہا تھا۔

(4)

دھوپ نکل آئی تھی۔ پرکاش ابھی سو رہا تھا کہ چمپا نے اسے جگا کر کہا۔ ''بڑا غضب ہو گیا' رات کو ٹھاکر

کے گھر میں چوری ہو گئی۔ چور زیوروں کا ڈبہ اٹھا کر لے گئے۔"

پرکاش نے پڑے پڑے پوچھا۔ "کسی نے پکڑا نہیں چور کو؟"

"کسی کو خبر بھی نہیں۔ وہی ڈبہ لے گئے جس میں شادی کے زیور رکھے تھے۔ نہ جانے کیسے چابی اڑالی۔ اور کیسے انہیں معلوم ہوا کہ اس صندوق میں ڈبہ رکھا ہے۔"

"نوکروں کی کارستانی ہو گی' باہر کے آدمی کا یہ کام نہیں ہے۔"

"نوکر تو ان کے تینوں پرانے ہیں۔"

"نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ آج موقع دیکھا اڑالے گئے۔"

"تم جا کر ان کو تسلی دو۔ ٹھکرائن بیچاری رو رہی تھی۔ تمہارا نام لے کر کہتی تھی کہ بیچارا مہینوں ان زیوروں کے لیے دوڑا۔ ایک ایک چیز اپنے سامنے بنوائی اور چور مونڈی کاٹے نے اس کی محنت پر پانی پھیر دیا۔"

پرکاش جھٹ پٹ اٹھ بیٹھا اور گھبرایا ہوا سا جا کر ٹھکرائن سے بولا۔ "یہ تو بڑا غضب ہوا ماتا جی۔ مجھے تو ابھی ابھی چمپا نے بتلایا۔"

ٹھاکر صاحب سر پر ہاتھ رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ بولے۔ "کہیں سیندھ نہیں' کوئی تالا نہیں ٹوٹا' کسی دروازے کی چول نہیں اتری' سمجھ میں نہیں آتا چور آیا کدھر سے؟"

ٹھکرائن نے رو کر کہا۔ "میں تو لٹ گئی بھیا' بیاہ سر پر ہے کیا ہو گا بھگوان' تم نے کتنی دوڑ دھوپ کی تھی۔ تب جا کر کہیں چیزیں تیار ہو کر آئی تھیں۔ نہ جانے کس منحوس ساعت میں بنوائی تھیں۔"

پرکاش نے ٹھاکر صاحب کے کان میں کہا۔ "مجھے تو کسی نوکر کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔"

ٹھکرائن نے مخالفت کی۔ "ارے نہیں بھیا! نوکروں میں کوئی ایسا نہیں۔ دس دس ہزار روپے یونہی اوپر رکھے رہتے ہیں کبھی ایک پائی کا نقصان نہیں ہوا؟"

ٹھاکر صاحب نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "تم کیا جانو آدمی کا دل کتنی جلدی بدل جایا کرتا ہے۔ جس نے اب تک چوری نہیں کی وہ چوری نہیں کرے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ میں پولیس میں رپورٹ کراؤں گا اور ایک ایک نوکر کی تلاشی کراؤں گا۔ کہیں مال اڑا دیا ہو گا۔ جب پولیس کے جوتے پڑیں گے تو آپ اقبال کریں گے۔"

پرکاش نے پولیس کا گھر میں آنا خطرناک سمجھا' کہیں ان کے گھر کی تلاشی لیں تو ستم ہو جائے گا۔ بولے۔ "پولیس میں رپورٹ کرنا اور تحقیقات کرانا بالکل بے فائدہ ہے۔"

ٹھاکر صاحب نے منہ بنا کر کہا۔ "تم بھی کیا بچوں کی سی بات کر رہے ہو۔ پرکاش بابو۔ بھلا چوری کرنے والا خود بخود اقبال کرے گا۔ تم زدوکوب بھی تو نہیں کر سکتے۔ ہاں پولیس میں رپورٹ کرنا مجھے بھی فضول معلوم ہوتا ہے۔ مال چلا گیا اب نہ ملے گا۔"

پرکاش۔ "لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

ٹھاکر۔ "کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کوئی خفیہ پولیس کا آدمی ہو جو چپکے چپکے پتہ لگا دے تو البتہ مال نکل آئے لیکن یہاں ایسے آدمی کہاں' نصیبوں کو رو کر بیٹھ رہو اور کیا۔"

پرکاش۔ "آپ بیٹھ رہئے لیکن میں تو بیٹھنے والا نہیں۔ میں انہیں نوکروں کے سامنے چور کا نام نکلواؤں گا۔"

ٹھکرائن۔ ”نوکروں پر مجھے پورا یقین ہے' کسی کا نام بھی نکل آئے تو مجھے یہی خیال رہے گا کہ یہ کسی باہر کے آدمی کا کام ہے۔ چاہے جدھر سے آیا ہو پر چور آیا باہر سے۔ تمہارے کوٹھے سے بھی تو آسکتا ہے۔“

ٹھاکر۔ ”ہاں ذرا اپنے کوٹھے پر دیکھو شاید کچھ نشان ملے۔ کل دروازہ تو کھلا ہوا نہیں رہ گیا؟“

پرکاش کا دل دھڑکنے لگا بولا۔ ”میں تو دس بجے دروازہ بند کر لیتا ہوں۔ ہاں کوئی پہلے ہی سے موقع پا کر کوٹھے پر چلا گیا ہو اور وہاں چھپا بیٹھا رہا ہو تو دوسری بات ہے۔“

تینوں آدمی چھت پر گئے تو بیچ کی منڈیر پر کسی کے پاؤں کے نشان دکھائی دیئے۔ جہاں پرکاش کا پاؤں پڑا تھا وہاں چونا لگ جانے سے چھت پر پاؤں کا نشان پڑ گیا تھا۔ پرکاش کی چھت پر جا کر منڈیر کی دوسری طرف دیکھا تو ویسے ہی نشان وہاں بھی دکھائی دیئے۔ ٹھاکر صاحب سر جھکائے کھڑے تھے۔ لحاظ کے مارے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ پرکاش نے ان کے دل کی بات کھول دی۔ اب تو کوئی شک ہی نہیں رہا۔

ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ”ہاں میں بھی یہی سمجھتا ہوں لیکن اتنا پتہ لگ جانے سے کیا' مال تو جانا تھا وہ گیا۔ اب چلو آرام سے بیٹھو۔ آج روپیہ کی کوئی تجویز کرنی ہو گی۔“

پرکاش۔ ”میں آج ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔“

ٹھاکر۔ ”کیوں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔“

پرکاش۔ ”آپ نہ کہیں' لیکن میں تو سمجھتا ہوں۔ میرے سر پر بہت بڑی جواب دہی آ گئی۔ میرا دروازہ نو دس بجے تک تو کھلا ہی رہتا ہے۔ چور نے راستہ دیکھ لیا ہے۔ ممکن ہے دو چار دن میں پھر آ گھسے۔ گھر میں اکیلی ایک عورت سارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکتی۔ ادھر وہ تو باورچی خانہ میں بیٹھی ہے۔ ادھر کوئی آدمی چپکے سے اوپر چڑھ گیا تو ذرا بھی آہٹ نہیں مل سکتی۔ میں گھوم گھام کر کبھی نو بجے آیا' کبھی دس بجے اور شادی کے دنوں میں دیر ہوتی رہے گی۔ ادھر کا راستہ ہی بند ہو جانا چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں چور کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔“

ٹھکرائن ڈریں۔ ”تم چلے جاؤ گے بھیا تب تو گھر اور پھاڑے کھائے گا۔“

پرکاش۔ ”کچھ بھی ہو ماتا جی' مجھے جلد گھر چھوڑ دینا پڑے گا۔ میری غفلت سے چوری ہو گئی۔ اس کا خمیازہ مجھے اٹھانا پڑے گا۔“

پرکاش چلا گیا تو ٹھاکر کی عورت نے کہا۔ ”بڑا لائق آدمی ہے۔ چور ادھر سے آیا' یہی بات اسے کھا گئی۔ کہیں چور پکڑ پائے تو کچا ہی کھا جائے' مار ہی ڈالے۔“

”دیکھ لینا کبھی نہ کبھی مال برآمد کرے گا۔“

”اب اس گھر میں ہرگز نہ رہے گا۔ کتنا ہی سمجھاؤ۔“

”کرایہ کے بیس روپے دینے پڑیں گے۔“

”ہم کرایہ کیوں دیں۔ وہ آپ ہی گھر چھوڑ رہے ہیں ہم تو کچھ کہتے نہیں۔“

”کرایہ تو دینا ہی پڑے گا۔ ایسے آدمی کے لیے غم بھی کھانا پڑے تو برا نہیں لگتا۔“

”میں تو سمجھتی ہوں وہ کرایہ لیں گے ہی نہیں۔“

”تیس روپے میں گزر بھی تو نہیں ہو گی۔“

(5)

پر کاش نے اسی دن وہ گھر چھوڑ دیا۔ اس گھر میں رہنے میں خدشہ تھا لیکن جب تک شادی کی دھوم دھام رہی۔ اکثر تمام دن یہیں رہتے تھے۔ پیش بندی کے لیے چمپا سے کہا۔ ''ایک سیٹھ جی کے ہاں پچاس روپیہ ماہوار کا اور کام مل گیا ہے' مگر وہ روپیہ میں ان ہی کے پاس جمع کرتا جاؤں گا۔ وہ آمدنی صرف زیوروں میں خرچ ہوگی۔ اس میں ایک پیسہ گھر کے خرچ میں نہ آنے دوں گا۔'' خاوند کی محبت کا یہ ثبوت پاکر اسے اپنی قسمت پر ناز ہوا۔ دیوتاؤں میں اس کا اعتقاد اور بھی پختہ ہو گیا۔

اب تک پر کاش اور چمپا میں کوئی راز نہ تھا۔ پر کاش کے پاس جو کچھ تھا وہ چمپا کا تھا۔ چمپا ہی کے پاس اس کے ٹرنک اور الماری کی چابیاں رہتی تھیں۔ مگر اب پر کاش کا ایک صندوق ہمیشہ بند رہتا۔ اس کی چابی کہاں ہے' اس کا چمپا کو پتہ نہیں۔ وہ پوچھتی ہے اس صندوق میں کیا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کچھ پرانی کتابیں ہیں۔ ماری ماری پھرتی تھی' اٹھا کے صندوق میں بند کر دی ہیں۔ چمپا کو شک کی گنجائش نہ تھی۔

ایک دن چمپا انہیں پان دینے گئی تو دیکھا وہ اس صندوق کو کھولے کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اسے دیکھتے ہی ان کا چہرہ فق ہو گیا۔ شبہ کا اکھوا سا نکلا۔ مگر پانی نہ پاکر سوکھ گیا۔ چمپا کسی ایسے راز کا خیال ہی نہ کر سکی جس سے شبہ کو غذا ملتی۔

لیکن پانچ ہزار کی پونجی کو اس طرح چھوڑ دینا کہ اس کا دھیان ہی نہ آئے' پر کاش کے لئے ناممکن تھا۔ وہ کہیں باہر سے آتا تو ایک بار صندوق کو ضرور کھولتا۔

ایک دن پڑوس میں چوری ہو گئی۔ اس دن سے پر کاش کمرہ ہی میں سونے لگا۔ جون کا مہینہ تھا۔ گرمی کے مارے دم گھٹتا تھا۔ چمپا نے کئی بار باہر سونے کے لئے کہا۔ مگر پر کاش نہ مانا۔ اکیلا گھر کیسے چھوڑ دے۔

چمپا نے کہا۔ ''چوری ایسوں کے گھر نہیں ہوتی' چور کچھ دیکھ کر ہی جان خطرے میں ڈالتے ہیں' یہاں کیا رکھا ہے۔''

پر کاش نے غصہ سے کہا۔ ''کچھ نہیں ہے برتن تو ہیں۔ غریب کے لیے تو اپنی ہنڈیا ہی بہت ہے۔''

ایک دن چمپا نے کمرہ میں جھاڑو لگائی تو صندوق کو کھسکا کر ایک طرف رکھ دیا۔ پر کاش نے صندوق کی جگہ بدلی ہوئی پائی تو بولا۔ ''صندوق تم نے ہٹایا تھا؟''

یہ پوچھنے کی بات نہ تھی۔ جھاڑو لگاتے وقت اکثر چیزیں ادھر ادھر کھسکا دی جاتی ہیں۔ بولی۔ ''میں کیوں ہٹانے لگی۔''

''پھر کس نے ہٹایا؟''

''میں نہیں جانتی۔''

''گھر میں تم رہتی ہو جانے گا کون؟''

''اچھا۔ اگر میں نے ہی ہٹا دیا تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔''

''کچھ نہیں یوں ہی پوچھا تھا۔''

مگر جب تک صندوق کھول کر تمام چیزیں دیکھ نہ لے پر کاش کو چین کہاں۔ چمپا جیسے ہی کھانا پکانے لگی' وہ صندوق کھول کر دیکھنے لگا۔ آج چمپا نے پکوڑیاں بنائی تھیں۔ پکوڑیاں گرم گرم ہی مزہ دیتی ہیں۔ پر کاش کو پکوڑیاں

پسند بھی بہت تھیں۔ اس نے تھوڑی سی پکوڑیاں طشتری میں رکھیں اور پرکاش کو دینے گئی۔ پرکاش نے اسے دیکھتے ہی صندوق دھماکے سے بند کر دیا اور تالا لگا کر بہلانے کے لیے بولا۔ ”طشتری میں کیا لائیں۔ آج نہ جانے کیوں مطلق بھوک نہیں لگی۔ پیٹ میں گرانی معلوم ہوتی ہے۔ اچھا پکوڑیاں ہیں۔“

آج چمپا کے دل میں شبہ کا وہ اکھوا جیسے ہرا ہو کر لہلہا اٹھا۔ صندوق میں کیا ہے۔ یہ دیکھنے کے لئے اس کا دل بے قرار ہو گیا۔ پرکاش اس کی چابی چھپا کر رکھتا ہے۔ چمپا کو وہ تالی کسی طرح نہ ملی۔ ایک دن ایک پھیری والا بساطی پرانی چابیاں بیچنے آنکلا۔ چمپا نے اس تالے کی چابی خرید لی اور صندوق کھول ڈالا۔ ارے یہ تو زیور ہیں۔ اس نے ایک ایک زیور نکال کر دیکھا۔ کہاں سے آئے۔ مجھ سے تو کبھی ان کے متعلق بات چیت نہیں کی۔ معاً اس کے دل میں خیال گذرا۔ یہ زیورات ٹھاکر صاحب کے تو نہیں۔ چیزیں وہی تھیں جن کا ذکر وہ کرتے رہتے تھے۔ اسے اب کوئی شک نہ رہا۔ لیکن اتنی بڑی شرم و ندامت سے اس کا سر جھک گیا۔ اس نے ایک دم صندوق بند کر دیا اور پلنگ پر لیٹ کر سوچنے لگی۔ ان کی اتنی ہمت پڑی کیسے؟ یہ کمینہ خواہش ان کے من میں آئی کیسے؟ میں نے تو کبھی زیوروں کے لیے انہیں تنگ نہیں کیا۔ اگر تنگ بھی کرتی تو کیا اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ چوری کر کے لائیں۔ چوری زیوروں کے لئے ان کا ضمیر اتنا کمزور کیوں ہو گیا؟“

(6)

اُس دن سے چمپا کچھ اداس رہنے لگی۔ پرکاش سے اُسے وہ محبت نہ رہی' نہ وہ عزت کا جذبہ۔ بات بات پر تکرار ہو جاتی۔ تب دونوں ایک دوسرے سے دل کی باتیں کہتے تھے۔ مستقبل کے منصوبے باندھتے تھے۔ آپس میں ہمدردی تھی مگر اب دونوں میں کئی کئی دن تک آپس میں بات بھی نہ ہوتی۔

کئی مہینے گزر گئے۔ شہر کے ایک بینک میں اسسٹنٹ منیجر کی جگہ خالی ہوئی۔ پرکاش نے اکاؤنٹینٹ کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن شرط یہ تھی کہ نقد دس ہزار روپیہ کی ضمانت داخل کی جائے۔ اتنی بڑی رقم کہاں سے آئے۔ پرکاش تڑپ کر رہ جاتا۔

ایک دن ٹھاکر صاحب سے اس معاملہ پر بات چل پڑی۔ ٹھاکر صاحب نے کہا۔ ”تم کیوں نہیں درخواست بھیجتے؟“

پرکاش نے سر جھکا کر کہا۔ ”دس ہزار کی نقد ضمانت مانگتے ہیں۔ میرے پاس روپے کہاں رکھے ہیں۔“

”اجی تم درخواست تو دو' اگر اور سب امور طے ہو جائیں تو ضمانت بھی دے دی جائے گی۔ اس کا فکر نہ کرو۔“

پرکاش نے حیران ہو کر کہا۔ ”آپ زرِ ضمانت داخل کر دیں گے؟“

”ہاں ہاں یہ کونسی بڑی بات ہے۔“

پرکاش گھر کی طرف چلا تو بڑا اُداس تھا۔ اُس کو یہ نوکری ضرور ملے گی' مگر پھر بھی وہ خوش نہیں ہے۔ ٹھاکر صاحب کی صاف دلی اور اُن کے اس پر اتنے زبردست اعتماد سے اُسے دلی صدمہ ہو رہا ہے۔ ان کی شرافت اس کے کمینہ پن کو روندے ڈالتی ہے۔

اس نے گھر آکر چمپا کو خوش خبری سنائی۔ چمپا نے سن کر منہ پھیر لیا۔ پھر ایک منٹ بعد بولی۔ ”ٹھاکر

دل میں پھیلی ہوئی حرارتیں ایک نقطہ پر جمع ہو کر شعلہ گیر ہو گئیں۔

(7)

کئی روز گزر گئے۔ پرکاش کو بینک میں ملازمت مل گئی۔ اس تقریب میں اس کے ہاں مہمانوں کی دعوت ہے۔ ٹھاکر صاحب' ان کی اہلیہ' ویراندر اور اس کی نئی دلہن بھی آئے ہوئے ہیں۔ باہر یار دوست گا بجا رہے ہیں۔ کھانا کھانے کے بعد ٹھاکر صاحب چلنے کو تیار ہو گئے۔

پرکاش نے کہا۔ ''آج آپ کو یہاں رہنا ہو گا' دادا! میں اس وقت نہ جانے دوں گا۔''

چمپا کو اُس کی یہ ضد بُری معلوم ہوئی۔ چارپائیاں نہیں ہیں' بچھونے نہیں ہیں اور نہ ہی کافی جگہ ہے۔ رات بھر ان کو تکلیف دینے اور خود تکلیف اٹھانے کی کوئی ضرورت اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ لیکن پرکاش برابر ضد کرتا رہا' یہاں تک کہ ٹھاکر صاحب راضی ہو گئے۔

بارہ بجے تھے' ٹھاکر صاحب اوپر سو رہے تھے اور پرکاش باہر برآمدہ میں۔ تینوں عورتیں اندر کمرہ میں تھیں۔ پرکاش جاگ رہا تھا۔ ویرو کے سرہانے چابیوں کا گچھا پڑا ہوا تھا۔ پرکاش نے گچھا اٹھالیا۔ پھر کمرہ کھول کر اس میں سے زیورات کا ڈبہّ نکالا اور ٹھاکر صاحب کے گھر کی طرف چلا۔ کئی ماہ پیشتر وہ اسی طرح لرزتے ہوئے دل کے ساتھ ٹھاکر صاحب کے مکان میں گھسا تھا۔ اس کے پاؤں تب بھی اسی طرح تھرتھرا رہے تھے۔ لیکن تب کانٹا چبھنے کا درد تھا' آج کانٹا نکلنے کا۔ تب بخار کا چڑھاؤ تھا' حرارت' اضطراب اور خلش سے پُر' اب بخار کا اتار تھا' سکون' فرحت اور اُمنگ سے بھرا ہوا۔ تب قدم پیچھے ہٹتا تھا آج آگے آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹھاکر صاحب کے گھر پہنچ کر اس نے آہستہ سے ویراندر کا کمرہ کھولا اور اندر جا کر صاحب کے پلنگ کے نیچے ڈبہّ رکھ دیا۔ پھر فوراً دبا کر آہستہ سے دروازہ بند کیا اور گھر لوٹ پڑا۔ ہنومان جی سنجیونی بوٹی والا پہاڑ کا ٹکڑا اٹھائے جس روحانی سرور کا لطف اٹھا رہے تھے' ویسی ہی خوشی پرکاش کو بھی ہو رہی تھی۔ زیوروں کو اپنے گھر لے جاتے ہوئے اُس کی جان سوکھی ہوئی تھی۔ گویا کہ کسی گہری اتھاہ گہرائی میں گرا جا رہا ہو۔ آج ڈبہّ کو لوٹا کر اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا' جیسے وہ ایروپلین پر بیٹھا ہوا فضا میں اڑا جا رہا ہے۔ اُوپر' اُوپر' اُوپر' اور اُوپر۔

وہ گھر پہنچا تو ویرو سویا ہوا تھا۔ چابیوں کا گچھا اس کے سرہانے رکھ دیا۔

(8)

ٹھاکر صاحب صبح تشریف لے گئے۔

پرکاش شام کو پڑھانے جایا کرتا تھا۔ آج وہ بے صبر ہو کر تیسرے پہر ہی جا پہنچا۔ دیکھنا چاہتا تھا وہاں آج کیا گل کھلتا ہے۔

ویراندر نے اسے دیکھتے ہی خوش ہو کر کہا۔ ''بابو جی! کل آپ کے ہاں کی دعوت بڑی مبارک تھی' جو زیورات چوری ہو گئے تھے سب مل گئے۔''

صاحب سے تم نے کیوں ضمانت دلوائی۔ جگہ نہ ملتی نہ سہی، روٹیاں تو مل ہی جاتی ہیں۔ روپے پیسے کا معاملہ ہے، کہیں بھول چوک ہو جائے تو تمہارے ساتھ اُن کے پیسے بھی جائیں۔"

"یہ تم کیسے سمجھتی ہو کہ بھول چوک ہو گی کیا میں ایسا اناڑی ہوں؟"

چمپا نے کہا "آدمی کی نیّت بھی تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی۔"

پرکاش سناٹے میں آ گیا۔ اُس نے چمپا کو چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا مگر چمپا نے منہ پھیر لیا تھا۔ وہ اُس کے اندرونی خیالات کا اندازہ نہ لگا سکا۔ مگر ایسی خوشخبری سن کر بھی چمپا کا اُداس رہنا اسے کھٹکنے لگا۔ اس کے دل میں سوال پیدا ہوا۔ اس کے الفاظ میں کہیں طنز تو نہیں چھپا ہے۔ چمپا نے صندوق کھول کر دیکھ تو نہیں لیا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے وہ اس وقت اپنی ایک آنکھ بھی نذر کر سکتا تھا۔

کھانے کے وقت پرکاش نے چمپا سے پوچھا۔ "تم نے کیا سوچ کر کہا کہ آدمی کی نیّت تو ہمیشہ ایک سی نہیں رہتی؟" جیسے اس کی زندگی اور موت کا سوال ہو۔

چمپا نے آزردہ ہو کر کہا۔ "کچھ نہیں، میں نے تو دنیا کی بات کہی تھی۔" پرکاش کو تسلی نہ ہوئی۔ اُس نے پوچھا۔

"کیا جتنے آدمی بینک میں ملازم ہیں اُن کی نیّت بدلتی رہتی ہے؟"

چمپا نے گلا چھڑانا چاہا۔ "تم تو زبان پکڑتے ہو۔ ٹھاکر صاحب کے ہاں شادی میں ہی تم اپنی نیّت ٹھیک نہ رکھ سکے۔ سو دو سو روپیہ کی چیز گھر میں رکھ ہی لی۔"

پرکاش کے دل سے بوجھ سا اُتر گیا۔ مسکرا کر بولا۔ "اچھا تمہارا اشارہ اس طرف تھا۔ لیکن میں نے کمیشن کے سوا اُن کی ایک پائی بھی نہیں چھوئی اور کمیشن لینا تو کوئی پاپ نہیں، بڑے بڑے حکام کھلے خزانے کمیشن لیا کرتے ہیں۔"

چمپا نے نفرت کے لہجہ میں کہا۔ "جو آدمی اپنے اوپر اتنا یقین رکھے، اس کی آنکھ بچا کر ایک پائی لینا بھی گناہ سمجھتی ہوں۔ تمہاری شرافت تو تب جانتی کہ تم کمیشن کے روپے لے جا کر ان کے حوالے کر دیتے۔ ان چھ مہینوں میں انہوں نے تمہارے ساتھ کیا کیا سلوک کیے، کچھ یاد ہے؟ مکان تم نے خود چھوڑا لیکن وہ بیس روپیہ ماہوار دیئے جاتے ہیں۔ علاقہ سے کوئی سوغات آتی ہے، تمہارے یہاں ضرور بھیجتے ہیں۔ تمہارے پاس گھڑی نہ تھی، اپنی گھڑی تمہیں دے دی، تمہاری کہارن جب ناغہ کرتی ہے، خبر پاتے ہی اپنا نوکر بھیج دیتے ہیں۔ میری بیماری میں ڈاکٹر کو فیس انہوں نے ادا کی اور دن میں دو دفعہ پوچھنے آیا کرتے تھے۔ یہ ضمانت کی کیا چھوٹی بات ہے؟ اپنے رشتہ داروں تک کی ضمانت تو جلدی سے کوئی دیتا ہی نہیں، تمہاری ضمانت کے لیے نقد دس ہزار روپے نکال کر دے دیئے۔ اسے تم چھوٹی بات سمجھتے ہو۔ آج تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اُن کے روپے تو ضبط ہو جائیں۔ جو آدمی اپنے اوپر اتنی مہربانی کرے اس کے لیے ہمیں جان قربان کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

پرکاش کھانا کھا کر لیٹا تو اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا۔ دکھتے ہوئے پھوڑے میں کتنا مواد بھرا ہے، یہ اس وقت معلوم ہوتا ہے جب نشتر لگایا جاتا ہے۔ دل کی سیاہی اس وقت معلوم ہوتی ہے جب کوئی اسے ہمارے سامنے کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی سوشل یا پولیٹیکل کارٹون دیکھ کر ہمارے دل پر چوٹ لگتی ہے۔ اس لیے کہ وہ تصویر ہماری حیوانیت کو کھول کر ہمارے سامنے رکھ دیتی ہے۔ جو دل کی اتھاہ سمندر میں بکھرا ہوا پڑا تھا اکٹھا ہو کر گھر سے نکلنے والے کوڑے کی طرح اپنی جسامت سے ہمیں متوحش کر دیتا ہے، تب ہمارے منہ سے نکل پڑتا ہے۔ افسوس چمپا کے ان ملامت آمیز الفاظ نے پرکاش کی انسانیت کو بیدار کر دیا۔ وہ صندوق کئی گنا بھاری ہو کر پتھر کی طرح اسے دبانے لگا۔

ٹھاکر صاحب بھی آگئے' اور بولے۔ "بڑی مبارک دعوت تھی تمہاری' پورا کا پورا ڈبّہ مل گیا' ایک چیز بھی نہیں گئی' جیسے امانت رکھنے کے لیے ہی لے گیا ہو۔"

پرکاش کو ان باتوں پر یقین کیسے آئے' جب تک وہ اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لے' کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ چوری گیا ہوا مال چھ ماہ بعد مل جائے اور جوں کا توں۔

ڈبّہ کھول کر اُس نے بڑی سنجیدگی سے دیکھا۔ "تعجب کی بات ہے' میری عقل تو کام نہیں کرتی۔"

ٹھاکر۔ کسی کی عقل کچھ کام نہیں کرتی بھائی' تمہاری ہی کیوں۔ ویرو کی ماں تو کہتی ہے' کوئی غیبی معجزہ ہے۔ آج سے مجھے بھی معجزات پر یقین ہو گیا۔"

پرکاش۔ "اگر آنکھوں دیکھی بات نہ ہوتی تو مجھے یقین نہ آتا۔"

ٹھاکر۔ "آج اس خوشی میں ہمارے ہاں دعوت ہو گی۔"

پرکاش۔ "آپ نے کوئی منتر و نتر تو نہیں پڑھوا لیا کسی سے؟"

ٹھاکر۔ "کئی پنڈتوں سے۔"

پرکاش۔ "تو بس اسی کی برکت ہے۔"

گھر لوٹ کر پرکاش نے چمپا کو یہ خبر سنائی تو وہ دوڑ کر اُن کے گلے سے چمٹ گئی' اور نہ جانے کیوں رونے لگی۔ جیسے اس کا بچھڑا ہوا خاوند بہت مدت کے بعد گھر آ گیا ہو۔

پرکاش نے کہا۔ "آج ان کے ہاں ہماری دعوت ہے!"

"میں ایک ہزار بھوکوں کو کھانا کھلاؤں گی۔"

"تم تو سینکڑوں کا خرچ بتلا رہی ہو!"

"مجھے اتنی خوشی ہوئی ہے کہ لاکھوں روپیہ خرچ کرنے پر بھی ارمان پورا نہ ہو گا۔"

پرکاش کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔

آشیاں برباد

(1)

مردلا مجسٹریٹ کے اجلاس سے زنانہ جیل میں واپس آئی تو اس کا چہرہ شگفتہ تھا۔ بَری ہو جانے کی گلابی امید اُس کے رُخساروں پر چمک رہی تھی' اُسے دیکھتے ہی سیاسی قیدیوں کے گروہ نے اُسے گھیر لیا۔ اور پوچھنے لگیں۔ "کتنے دن کی ہوئی بہن؟"

مردلا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "میں نے تو صاف صاف کہہ دیا' میں نے دھرنا نہیں دیا' یوں آپ زبردست ہیں' جو فیصلہ چاہیں کریں' نہ میں نے کسی کو روکا' نہ دھکا دیا' نہ کسی سے آرزو منت ہی کی' کوئی خریدار

میرے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہاں میں دکان پر کھڑی ضرور تھی۔ وہاں کئی والنٹیر گرفتار کر لیے گئے تھے' خلقت جمع ہو گئی تھی' میں بھی کھڑی ہو گئی' بس تھانے دار نے مجھے آکر گرفتار کر لیا۔"

چھما دیوی کچھ قانون جانتی تھی' بولی۔ "یہ تو ایک طرح سے اپنی صفائی دینے کے برابر ہے۔"

مردلا نے فوراً تردید کی۔ "میں مقدمہ کی کسی کارروائی میں شریک نہ ہونا چاہتی تھی' لیکن جب میں نے ان لوگوں کو صریح جھوٹ بولتے دیکھا تو مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ میں نے ان سے جرح کرنی شروع کی۔ میں نے بھی اتنے دنوں گھاس نہیں کھودی ہے' تھوڑا سا قانون جانتی ہوں۔ پولیس والوں نے سمجھا ہو گا کہ یہ کچھ بولے گی تو ہے نہیں' ہم جو بیان چاہیں گے' دے دیں گے۔ جب میں نے جرح شروع کی تو سب کے سب بغلیں جھانکنے لگے۔ میں نے تینوں گواہوں کے بیان کو فرضی ثابت کر دیا۔ اس وقت جانے کیوں کر مجھے نکتے سوجھتے گئے۔ مجسٹریٹ نے تھانہ دار صاحب کو دو تین بار پھٹکار بھی بتائی۔ وہ میرے سوالوں کا اول جلول جواب دیتا تھا تو مجسٹریٹ بول اٹھتا تھا۔ "وہ جو کچھ پوچھتی ہیں اس کا جواب دیجئے' فضول باتیں کیوں کرتے ہو۔" تب حضرت کا چہرہ ذرا سا نکل آتا تھا۔ میں نے سبھوں کو لاجواب کر دیا۔ ابھی مجسٹریٹ نے فیصلہ نہیں سنایا' لیکن مجھے یقین ہے کہ بری ہو جاؤں گی۔ میں جیل سے نہیں ڈرتی لیکن بیوقوف بھی نہیں بننا چاہتی۔ وہاں سیکرٹری صاحب بھی تھے اور بہت سی بہنیں تھیں۔ سب یہی کہتے تھے کہ تم چھوٹ جاؤ گی۔"

عورتیں اسے نفرت کی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ ان میں کسی کی میعاد سال بھر کی تھی' کسی کی چھ مہینے کی' کسی نے بھی عدالت کی کارروائیوں میں حصہ نہیں لیا تھا۔ اُن کے مشرب میں یہ کفر سے کم نہ تھا۔ مردلا پولیس سے جرح کر کے ان کی نظروں میں گر گئی تھی۔

دور جا کر ایک دیوی نے کہا۔ "اس طرح تو ہم لوگ بھی چھوٹ جاتے' ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ سرکاری عدالتوں سے ہمیں انصاف کی اُمید نہیں۔"

دوسری خاتون بولی۔ "یہ تو معافی مانگ لینے کے برابر ہے' گئی تھیں دھرنا دینے' ورنہ دکان پر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ والنٹیر گرفتار ہوئے تھے' آپ کی بلا سے' آپ وہاں کیوں گئیں؟ مگر اب کہتی ہیں دھرنا دینے گئی ہی نہیں' یہ تو معافی مانگنا ہوا۔"

تیسری دیوی نے فرمایا۔ "جیل میں رہنے کے لیے بڑا کلیجہ چاہیے' اس وقت تو واہ واہ کہلانے کے لیے آ گئیں' اب رونے لگیں۔ ایسی عورتوں کو تو قومی کام کے نزدیک ہی نہ آنا چاہیے۔ تحریک کو بدنام کرنے سے کیا فائدہ۔"

(2)

صرف چھما دیوی اب تک مردلا کے پاس متفکر کھڑی تھی۔ اُس نے ایک تقریر کرنے کے الزام میں سال بھر کی سزا پائی تھی۔ دوسرے ضلع سے تبدیل ہو کر ایک مہینہ ہوا یہاں آئی تھی۔ ابھی میعاد پوری ہونے میں آٹھ ماہ باقی تھے۔ یہاں کے پندرہ قیدیوں میں سے کسی سے اس کا دل نہ ملتا تھا۔ ذرا ذرا سی باتوں کے لئے ان کا آپس میں جھگڑنا' آرائش اور شوق کی چیزوں کے لیے لیڈی وارڈوں کی خوشامدیں کرنا' گھر والوں سے ملنے کے لئے ان کا

اضطراب اسے پسند نہ تھا۔ وہی بدگوئیاں اور سرگوشیاں جیل کے اندر بھی تھیں۔ وہ خودداری جو اس کے خیال میں ایک سیاسی قیدی میں ہونی چاہیے کسی میں بھی نہ تھی۔ ان کا زیادہ تر وقت اپنے خانگی معاملات کی چرچا میں صرف ہوتا تھا۔ چھما ان سے احتراز کرتی تھی۔ اس میں قوم کا فدائیانہ جوش تھا اور سچا درد' مگر دوسری دیویاں اسے مغرور سمجھتی تھیں اور احتراز کا جواب احتراز سے دیتی تھیں۔ مردلا کو حراست میں آئے آٹھ دن ہوئے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں چھما کو اس سے خاص انس ہو گیا تھا۔ مردلا میں تنگ دلی اور رقابت نہ تھی' نہ بدگوئی کی عادت' نہ آرائش کا خبط' نہ بیہودہ مذاق' اس نے مہرپذیر دل پایا تھا۔ جوشِ خدمت سے پُر' ہمدردی سے لبریز۔ چھما نے سوچا تھا اس کے ساتھ چھ مہینے لطف سے گذر جائیں گے۔ لیکن تقدیر اسے یہاں بھی پامال کرنے پر آمادہ تھی۔ کل مردلا یہاں سے چلی جائے گی پھر وہ اکیلی رہ جائے گی۔ یہاں کون ایسا ہے جس کے ساتھ وہ گھڑی بھر بیٹھ کر دل کی باتیں کہے گی۔ ملک اور قوم کی چرچا کرے گی۔ جس کی صحبت میں مغائرت یا ناہمدردی کی بو نہ آئے۔ مردلا نے پوچھا۔ "تمہیں تو ابھی آٹھ مہینے باقی ہیں۔ بہن بڑی مشکل سے گزریں گے۔"

چھمّا نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ "کسی نہ کسی طرح کٹ ہی جائیں گے بہن۔ مگر تمہاری یاد ہمیشہ ستایا کرے گی۔ اس ایک ہفتہ کے اندر تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کر دیا ہے۔ جب سے تم آئی ہو مجھے یہ جیل خانہ نہ معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ملتی رہنا۔"

مردلا نے دیکھا کہ چھما کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ تشفی کے انداز سے بولی:

"ضرور ملوں گی بہن! مجھے خود بغیر تم سے ملے چین نہیں آئے گا۔ بھان کو بھی لاؤں گی۔ کہوں گی تیری ماسی آئی ہے تجھے بلا رہی ہے۔ دوڑا ہوا آئے گا۔ اب تم سے آج کہتی ہوں بہن' یہاں سے مجھے کسی کی یاد آتی تھی تو بھان کی۔ بیچارہ اماں اماں کہہ کر مجھے تلاش کرتا ہو گا اور روتا ہو گا۔ مجھے دیکھ کر روٹھ جائے گا۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ جاؤ میں تم سے نہیں بولتا۔ تم میرے گھر سے نکل جاؤ۔ بڑا شیطان ہے بہن' دم بھر بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ صبح اٹھتے ہی گاتا ہے۔ "جھنڈا اونتا لہے امالا" "چھوراج کا مندل دیل میں ہے۔" (جھنڈا اونچا رہے ہمارا) (سوراج کا مندر جیل میں ہے) جب ایک جھنڈی کندھے پر رکھ کر کہتا ہے۔ "نالی چھلاب پینا حلام ہے" تو دیکھتے ہی بنتا ہے۔ باپ کو تو کہتا ہے تم گلام ہو۔ ایک انگریز کمپنی میں نوکر ہیں۔ بار بار سوچتے ہیں کہ استعفیٰ دے دوں لیکن گزر بسر کی بھی تو کوئی صورت ہو' کیسے چھوڑیں۔ وہ اب تک چھوڑ بیٹھے ہوتے۔ بہن تم سے سچ کہتی ہوں نوکری سے انہیں نفرت ہے لیکن میں ہی منع کرتی رہتی ہوں۔ بیچارے کیسے دفتر جاتے ہوں گے۔ کیسے بھان کو سنبھالتے ہوں گے۔ ساس جی کے پاس تو رہتا ہی نہیں۔ وہ بیچاری بوڑھی اس کے ساتھ کہاں کہاں دوڑیں۔ چاہتی ہیں کہ میرے پاس بیٹھا رہے۔ وہ پل بھر نچلا نہیں بیٹھتا۔ اماں بہت بگڑیں گی۔ بس یہی ڈر لگ رہا ہے۔ مجھے دیکھنے ایک دن بھی نہیں آئیں۔ کل بابو جی کہتے تھے تم سے بہت ناراض ہیں۔ تین دن تو دانہ پانی چھوڑ دیا تھا۔ اس چھوکری نے کُل کی مرجاد ڈبو دی۔ خاندان میں داغ لگا دیا۔ کل مونہی کل چھنی' نہ جانے کیا کیا بکتی رہیں۔ میں تو ان کی باتوں کا برا نہیں مانتی۔ بہن پرانے زمانے کے ہیں۔ ان سے کوئی چاہے کہ ہم لوگوں میں آکر مل جائیں تو یہ اس کی زیادتی ہے۔ کل چل کر منانا پڑے گا۔ بڑی منتوں سے مانیں گی۔ کل ہی کتھا ہو گی دیکھ لینا۔ براہمن کھائیں گے۔ جیل خانہ کا پرائشچیت تو کرنا ہی پڑے گا۔ تم ہمارے گھر ایک دو دن رہ کر تب جانا بہن' میں تمہیں آکر لے جاؤں گی۔"

چھمّا کو ان خوشیوں میں سے ایک بھی نصیب نہ تھی۔ وہ اکیلی بیوہ تھی۔ جلیانوالے باغ میں اس کا آشیانہ

برباد ہو گیا تھا۔ شوہر مارا گیا۔ لڑکے مارے گئے۔ اب کوئی ایسا نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکتی اور ان دس برسوں سے اس کا حرماں نصیب دل قوم کی خدمت میں تشفی اور سکون کی تلاش کر رہا تھا۔ جن اسباب نے اس کے بسے ہوئے گھر کو ویران کر دیا' اس کے سہاگ کو لوٹا' اس کی گود سونی کر دی' ان اسباب کو مٹانے میں وہ مجنونانہ جوش کے ساتھ مصروف تھی۔ بڑی سے بڑی قربانیاں تو وہ پہلے ہی کر چکی تھی' اب اس کے پاس اپنے دل و دماغ کو قربان کرنے کے سوا اور رہ ہی کیا گیا تھا۔ اوروں کے لیے خدمتِ قوم' تہذیب کا ایک تقاضا ہو یا نمود کا ایک ذریعہ' اس کے لئے تو یہ عبادت تھی اور وہ اپنی ساری نسوانی عقیدت اور انہاک کے ساتھ اسے بجالاتی تھی۔ لیکن طائر کو آسمان پر پرواز کرنے کے بعد اپنے آشیانہ کی یاد تو آتی ہی ہے۔ چھما کا یہ آشیانہ کہاں تھا۔ یہی تو وہ موقعے تھے جب اس کا دل ہمدردی کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا۔ یہاں درد شناس مردلا کو پا کر وہ اپنی قسمت کی تعریف کر رہی تھی۔ مگر یہ صحبت بھی اتنی جلدی برہم ہو گئی۔

چھما حسرت ناک انداز سے بولی۔ "یہاں سے جا کر بھول جاؤ گی۔ مردلا تمہارے لئے یہ ریل گاڑی کی ملاقات ہے اور میرے لیے تمہارے وعدے اس ملاقات کے وعدے ہیں۔ کبھی کہیں ملاقات ہو جائے گی تو یا تو پہچانو گی ہی نہیں یا ذرا مسکرا کر نمستے کہتی ہوئی اپنی راہ چلی جاؤ گی۔ یہی دنیا کا دستور ہے۔ اپنے رونے سے فرصت ہی نہیں ملتی۔ دوسرے کے لیے کیونکر روئے۔ تمہارے لیے تو میں کچھ نہیں تھی۔ میرے لیے تم سب کچھ تھیں۔ اپنے پیاروں میں کبھی کبھی مجھے ضرور یاد کر لیا کرنا۔ بھکاری کے لیے چٹکی بھر آٹا ہی بہت ہے۔"

دوسرے دن مجسٹریٹ نے فیصلہ سنا دیا۔ مردلا رہا ہو گئی۔ شام کو وہ سب بہنوں سے گلے مل کر رو رلا کر رخصت ہو گئی گویا میکے سے بدا ہوئی ہو۔

(3)

تین مہینے گذر گئے مگر مردلا ایک بار بھی نہ آئی۔ اور قیدیوں سے ملنے والے آتے رہتے تھے۔ بعضوں کے گھر سے کھانے پینے کی چیزیں بھی آ جاتی تھیں۔ لیکن چھما کو کون پوچھنے والا تھا۔ ہر مہینے کے آخری اتوار کو وہ صبح سے مردلا کا انتظار کرنے لگتی۔ جب ملاقات کا وقت گذر جاتا تو ذرا دیر رو کر دل کو سمجھا لیتی۔ زمانہ کا یہی دستور ہے۔

ایک دن شام کو چھما سندھیا کر کے اٹھی تھی کہ دیکھا مردلا سامنے چلی آ رہی ہے۔ نہ وہ چہرہ ہے نہ وہ رونق۔ دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی اور روتی ہوئی بولی۔ "یہ تیری کیا حالت ہے مردلا' صورت ہی بدل گئی' تم بیمار ہو کیا۔"

مردلا کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ بولی۔ "بیمار تو نہیں ہوں بہن' مصیبت زدہ ہوں۔ تم مجھے بے وفا اور وعدہ فراموش سمجھتی ہو گی۔ ان ساری شکایتوں کی تلافی کرنے آئی ہوں اور سارے فکروں سے آزاد ہو کر آئی ہوں۔"

چھما کا دل کانپ اٹھا۔ سینہ کی گہرائیوں سے ایک لہر سی اٹھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بولی "خیریت تو ہے؟ اتنی جلدی تم پھر یہاں کیوں آ گئیں۔ ابھی تو تین مہینے بھی نہیں ہوئے۔"

مردلا زرد تبسم کے ساتھ بولی۔ "اب سب خیریت ہے۔ بہن ہمیشہ کے لئے خیریت ہو گئی۔ کوئی فکر

نہیں رہی۔ اب یہاں ہمیشہ رہنے کے لئے تیار ہوں۔ تمہاری محبت کی کشش اب معلوم ہوئی۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔ "تمہیں باہر کی خبریں کیا ملی ہوں گی۔ پرسوں شہر میں گولیاں چلیں، دیہاتوں میں آج کل لگان وصول کیا جارہا ہے۔ کسانوں کے پاس روپیہ ہے نہیں، غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور دن بدن بھاؤ گرتا جارہا ہے۔ پونے دو روپے میں من بھر گیہوں آتا ہے۔ میری عمر ہی کیا ہے۔ اماں بھی کہتیں ہیں، اتنا سستا غلہ کبھی نہیں تھا۔ کھیت کی پیداوار سے بیجوں تک کے دام نہیں آتے۔ سینچائی اور محنت سب اوپر، غریب کہاں سے دیں۔ سرکار کا حکم ہے جیسے بھی ہو لگان وصول کیا جائے۔ کسان اس پر بھی راضی ہیں کہ ہمارے مال اسباب نیلام کرلو، قرق کرلو، اپنی زمین لے لو مگر یہاں تو حاکموں کو اپنی کارگزاری دکھانے کی فکر لگی ہوئی ہے۔ زمینداروں نے کہہ دیا ہم سے وصول نہیں ہوگا۔ اب پولیس بھیجی گئی ہے۔ بھیروی گنج کا علاقہ پیسا جارہا ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا ایک کسان کے گھر میں گھس کر کئی کانسٹیبلوں نے اسے پیٹنا شروع کیا۔ بیچارہ بیٹھا مار کھاتا رہا۔ اس کی بیوی سے نہ رہا گیا۔ شامت کی ماری کانسٹیبلوں کو گالیاں دینے لگی۔ بس ایک کانسٹیبل نے اسے برہنہ کر دیا اور اب بہن کیا کہوں۔ ہمارے بھائی اتنی بے رحمی کریں اس سے زیادہ شرمناک اور کیا ہوگا۔ اب کسان سے ضبط نہ ہوا کبھی پیٹ بھر کر غریبوں کو کھانے کو تو ملتا نہیں اس پر اتنی کڑی مشقت۔ جسم میں طاقت باقی رہتی ہے نہ ہمت مگر انسان کا دل ہی تو ٹھہرا۔ بیچارہ بے دم پڑا ہوا تھا۔ بیوی کا چلانا سن کر اٹھ بیٹھا اور اس بدمعاش کانسٹیبل کو زور سے دھکا دے کر اس سے لپٹ گیا۔ ایک کسان کسی پولیس کے آدمی کے ساتھ اتنی بے ادبی کرے اسے بھلا وہ کہیں برداشت کر سکتا ہے۔ سب کانسٹیبلوں نے غریب کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔"

چھما۔ "گاؤں کے اور لوگ تماشا دیکھتے رہے ہوں گے۔"

مردلا۔ "اس میں بھی آفت ہے، اگر دس بیس آدمی جمع ہو جاتے ہیں تو پولیس سمجھتی ہے مزاحمت کرنے آئے ہیں۔ شاید ڈنڈے چلانے شروع کر دیتی اور اگر کوئی آدمی غصہ میں ایک آدھ پتھر پھینک دیتا تو گولیاں چلا دیتی۔ دو چار آدمی بھن جاتے۔ اسی لیے لوگ جمع نہیں ہوتے۔ لیکن جب وہ کسان مر گیا تو گاؤں والے طیش میں آئے، لاٹھیاں لے لے کر دوڑ پڑے اور کانسٹیبلوں کو گھیر لیا۔ ممکن ہے دو چار آدمیوں نے لاٹھیاں چلائی ہوں۔ کانسٹیبلوں نے گولیاں چلانی شروع کیں۔ دو کانسٹیبلوں کے چوٹیں آئیں۔ اس کے بدلے میں دس بارہ آدمیوں کی جانیں لے لی گئیں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں کو اختیارات مل جاتے ہیں تو یہ لوگ اس کے بیجا استعمال کرنے لگتے ہیں۔ گاؤں کے غریب لوگوں پر اپنا رعب جما کر کانسٹیبل فتح کے نقارے بجاتے ہوئے لوٹ گئے۔ گاؤں والوں کی فریاد کون سنتا، غریب ہیں، بیکس ہیں، بے زبان ہیں، جتنے آدمیوں کو چاہو مار ڈالو۔ حکام اور عدالت سے انہوں نے انصاف کی امید چھوڑ دی۔ سوچتے ہیں آخر اسی سرکار نے تو کانسٹیبلوں کو تعینات کیا تھا۔ وہ سرکار کسانوں کی فریاد کیوں سننے لگی؟ مگر آدمی کا دل بغیر فریاد کئے نہیں مانتا۔ گاؤں والوں نے اپنے شہر کے بھائیوں سے فریاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ پبلک اور کچھ نہیں کر سکتی ہمدردی تو کرتی ہے۔ غم کی داستان سن کر آنسو تو بہاتی ہے۔ مظلوم کے لیے ہمدردی کے آنسو بھی کم پیارے نہیں ہوتے۔ اگر آس پاس کے گاؤں کے لوگ جمع ہو کر ہمدردی کرتے تو ان غریبوں کی کچھ تشفی ہو جاتی مگر پولیس نے اس گاؤں میں لوگوں کا آنا جانا بند کر دیا تھا۔ چاروں سرحدوں پر کانسٹیبل کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ یہ زخم پر نمک تھا، مارتے بھی ہو رونے بھی نہیں دیتے۔ آخر لوگوں نے لاشیں اٹھائیں اور شہر والوں کو اپنی مصیبت کی کہانی سنانے آئے۔ ہنگامہ کی خبر پہلے ہی شہر میں پہنچ چکی تھی۔ ان مظلوموں کو دیکھ کر پبلک میں اشتعال پیدا ہو گیا اور جب

سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ان لاشوں کا جلوس نکالنے کی اجازت نہیں دی تو لوگ اور بھی جھلّائے۔ بہت بڑا مجمع ہو گیا۔ میرے بابو جی بھی اس مجمع میں تھے۔ سمجھاتی رہی مت جاؤ آج کا رنگ اچھا نہیں۔ کہنے لگے میں کسی سے لڑنے تھوڑے ہی جاتا ہوں۔ پچاس ہزار آدمی جنازے کے ساتھ تھے اور پانچ سو مسلح پولیس راستہ روکے ہوئے تھی۔ سوار اور پیادے پوری فوج تھی۔ جب بار بار پولیس کی دھمکیوں پر بھی مجمع منتشر نہ ہوا تو گولیاں چلانے کا حکم ہو گیا۔ فائر ہونے لگے، کتنے گھائل ہوئے، کون جانتا ہے۔ میرا مکان لب سڑک ہے۔ میں اپنے چھجے پر کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی۔ ہزاروں آدمی بھاگے چلے آ رہے تھے۔ بہن! وہ نظارہ یاد کر کے روئیں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایسی وحشت، ایسی سراسیمگی کہ تم سے کیا کہوں، مگر ان بھاگنے والوں کے پیچھے سرفروش جانبازوں کی ایک جماعت تھی جو دیوار کی طرح مستقل کھڑے گولیاں کھا رہے تھے اور پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے تھے۔ بندوقوں کی آوازیں صاف سنائی دیتی تھیں اور ہر ایک دھائیں دھائیں کے بعد ہزاروں گلوں سے جے کی صدا نکلتی تھی۔ اس صدا میں کتنی کشش تھی، کتنا جوش! بس یہی جی چاہتا تھا کہ جا کر گولیوں کے سامنے کھڑی ہو جاؤں اور ہنستے ہنستے مر جاؤں۔ اس وقت ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مر جانا کوئی کھیل ہے۔ اماں جی کمرے میں بھان کو لئے مجھے بار بار اندر بلا رہی تھیں۔ جب میں نہ گئی تو بھان کو لئے ہوئے چھجے پر آ گئیں۔ اس دس بارہ آدمی ایک اسٹریچر پر میرے سوامی کی لاش لیے ہوئے دروازے پر آئے۔ اماں کی ان پر نظر پڑی۔ سمجھ گئیں۔ مجھے تو سکتہ سا ہو گیا۔ اماں نے جا کر ایک بار لاش کو دیکھا۔ اسے چھاتی سے لگایا۔ اس کا بوسہ لیا اور سیدھی چوراہے کی طرف چلیں۔ جہاں سے اب بھی دھائیں اور جَے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں نقش بہ دیوار بنی لاش کو دیکھتی تھی کبھی اماں کو۔ نہ کچھ بولی، نہ جگہ سے ہلی، نہ روئی، نہ بیقرار ہوئی۔ احساس کی مجھ میں قوت ہی نہ رہی تھی۔ اماں جی جانبازوں کی صف میں جا کر سامنے کھڑی ہو گئیں اور ایک منٹ میں ان کی لاش بھی زمین پر گر پڑی۔ ان کے گرتے ہی جانبازوں کا ضبط بھی رخصت ہو گیا۔ ان کے سر پر خون سا سوار ہو گیا۔ نہتے تھے مگر ہر ایک فرد اپنے دل میں شیر کی قوت محسوس کر رہا تھا۔ سپاہیوں نے اس سیلاب کو آتے دیکھا تو ہوش اڑ گئے، جانیں لے کر بھاگے، کوئی ادھر کوئی اُدھر۔ مگر بھاگتے ہوئے بھی گولیاں چلاتے تھے۔ بھان چھجے پر جھکا کھڑا تھا، نہ جانے کدھر سے آ کر ایک گولی اس کے سینہ میں لگی، میرا لال وہیں گر پڑا۔ سانس تک نہ لی۔ مگر میری آنکھوں میں اب بھی آنسو نہ تھے۔ میں نے بھان کو گود میں اٹھا لیا، اس کے سینے سے خون جاری تھا۔ میں نے اسے دودھ پلایا تھا، اسے وہ خون سے ادا کر رہا تھا۔ اُس کے خون سے تر کپڑے پہنے ہوئے مجھے ایسا فاتح مندانہ غرور ہو رہا تھا جو شاید اس کے بیاہ میں ریشمی کپڑے پہن کر بھی نہ ہوتا۔ لڑکپن، جوانی اور موت ساری منزلیں ایک ہی ہچکی میں تمام ہو گئیں۔ میں نے بیٹے کی لاش کو باپ کی گود میں دے دیا۔ اتنے میں اماں جی کا جنازہ بھی آ پہنچا۔ معلوم ہوتا تھا لیٹی ہوئی مسکرا رہی ہیں۔ مجھے تو روکتی رہتی تھیں اور خود اس طرح بھاگ کر آگ میں کود پڑیں گویا وہی سورگ کا راستہ ہو۔ جب ندی کے کنارے ایک ہی چتا میں تینوں لاشیں رکھی گئیں، تب میرا سکتہ ٹوٹا، ہوش آیا، ماں اپنے جنم بھر کی کمائی لیے جاتی ہے، جنہیں نازوں سے پالا انہیں چھوڑ کیسے جاتی۔ وہ تو وہاں بیٹے اور پوتے کے ساتھ گئیں، میرے لیے کیا چھوڑا۔ ایک بار جی میں آیا میں بھی انہیں کے ساتھ چتا میں جا بیٹھوں۔ سارا کنبہ ایک ساتھ ایشور کے دربار میں جا پہنچے، لیکن پھر میں نے سوچا، تو نے ابھی ایسا کام ہی کونسا کیا ہے جس کا معاوضہ یہ ملے۔ بہن اس چتا کی لپٹوں میں مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اماں جی سچ مچ بھان کو گود میں لیے بیٹھی مسکرا رہی ہیں، اور سوامی جی مجھ سے کہہ رہے ہیں، تم جاؤ اور بے فکر ہو کر کام کرو۔ ان کے چہروں پر کتنا جلال تھا، خون اور آگ میں ہی تو دیوتا بنتے ہیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا' ندی کے کنارے نہ جانے کتنی چتائیں جل رہی تھیں۔ دُور سے یہ جلتی ہوئی چتائیں مشعلوں کی طرح معلوم ہوتی تھیں۔ جیسے دسیا کے پل پر برقی لالٹینوں کی ایک قطار ہو۔ اسی پل پر سے ہو کر شہادت کی منزل ہے اور یہی مشعلیں بقائے دوام کی طرف لے جاتی ہیں۔ یا یہ بھٹیاں تھیں جن میں بھارت کی تقدیر گھڑی جا رہی تھی۔

جب چتائیں راکھ ہو گئیں تو ہم لوگ لوٹے' لیکن اس گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میرے لیے اب وہ گھر نہ تھا۔ میرا گھر اب یہ ہے جہاں میں بیٹھی ہوں یا پھر وہی چتا۔ میں نے گھر کا دروازہ بھی نہیں کھولا۔ مہلا آشرم چلی گئی۔ کل کی گولیوں میں کانگریس کمیٹی کا صفایا ہو گیا تھا۔ کانگریس باغی انجمن قرار دے دی گئی تھی' اُس کے دفتر پر پولیس نے چھاپا مارا اور اس پر اپنا قفل ڈال دیا۔ مہلا آشرم پر بھی حملہ ہوا' اس پر بھی قفل ڈال دیا گیا۔ ہم نے ایک درخت کے سائے میں اپنا دفتر قائم کیا اور کام کرتے رہے۔ شام کو ہم نے ایک جلوس نکالنے کا فیصلہ کیا۔ کل کے خونیں واقعہ کی یاد اور خوشی اور مبارک باد میں جلوس نکالنا ضروری تھا۔ لوگ کہتے ہیں جلوس نکالنے سے کیا ہوتا ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم زندہ ہیں' مستعد ہیں' میدان سے ہٹے نہیں۔ ہمیں اپنی ہار نہ ماننے والی خودداری کا ثبوت دینا تھا۔ یہ دکھانا تھا کہ ہم تشدد سے اپنے مطالبہ آزادی سے دستبردار ہونے والے نہیں۔ ہم اس نظام کو بدل دینا چاہتے ہیں' جس کی بنیاد خودغرضی اور خون چوسنے پر رکھی گئی ہے۔ اور پولیس نے جلوس کو روک کر اپنی زندگی اور قوت کا ثبوت دینا بھی ضروری سمجھا۔ شاید پبلک کو دھوکہ ہو گیا ہو کہ کل کے واقعہ سے سرکار میں اخلاق کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور وہ اپنی حرکت پر نادم ہے۔ پبلک کے اس وہم کو دور کرنا اُس نے اپنا فرض سمجھا۔ وہ یہ دکھانا چاہتی تھی کہ ہم تمہارے اوپر حکومت کرنے آئے ہیں اور حکومت کریں گے۔ تمہاری خوشی یا ناخوشی کی ہم کو پرواہ بھی نہیں' جلوس نکالنے کی ممانعت کر دی گئی۔ پبلک کو ہدایت اور تنبیہ کر دی گئی کہ خبردار جلوس میں نہ آنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ مگر شام کے وقت پچاس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ آج کانگریس کی صدارت کا فخر مجھے عطا کیا گیا تھا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طاقت کا احساس کر رہی تھی۔ ایک کمزور عورت جسے بولنے کا بھی شعور نہیں' جس نے کبھی گھر سے قدم نہیں نکالا' آج اپنے پیاروں کی قربانیوں کی بدولت اس رُتبہ پر پہنچ گئی تھی جو بڑے سے بڑے سرکاری افسروں کو بھی' بڑے سے بڑے مہاراجہ کو بھی حاصل نہیں۔ یہ دلوں کی حکومت تھی۔ یہ مجمع کیا میرا تنخواہ دار تھا یا اُسے مجھ سے کسی نفع کی امید تھی یا نقصان کا خوف تھا۔ ہرگز نہیں۔ پھر بھی وہ میرے کڑے سے کڑے حکم کو بسر و چشم ماننے کو تیار تھے۔ اسی لیے کہ ان کے دلوں میں آزادی کی تڑپ' غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینے کی جو بے چینی ہے' میں اس تڑپ اور بے چینی کی زندہ مثال تھی۔ جلوس روانہ ہوا۔ اسی وقت پولیس نے میری گرفتاری کا وارنٹ دکھایا۔ مجھے وارنٹ دیکھتے ہی تمہاری یاد آئی۔ پہلے تمہیں میری ضرورت تھی' اب مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ پہلے تم مجھ سے ہمدردی کی خواستگار تھیں' اب میں تمہاری ہمدردی کے لیے ہاتھ پھیلائے ہوئے ہوں اور مجسٹریٹ جو بڑی سے بڑی سزا دے اس کے لیے تیار ہوں۔ اب میں پولیس کی غلط بیانیوں یا بیجا الزام کے خلاف زبان تک نہ کھولوں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں آزارہ کر جو کچھ کر سکتی ہوں جیل میں اس سے کہیں زیادہ کر سکتی ہوں۔ آزادی میں غلطی کا امکان ہے' بہکنے کا خوف ہے' مصالحت کا اندیشہ ہے' رقابت کی فکر ہے۔ جیل احترام اور عقیدت کا ایک دائرہ ہے جس کے اندر شیطان قدم نہیں رکھ سکتا۔ میدان میں جلتا ہوا الاؤ ہوا میں اپنی حرارت کھو دیتا ہے لیکن انجن میں بند ہو کر وہی آگ تحریک کا لازوال خزانہ بن جاتی ہے۔

اُور دیویوں کو بھی خبر ملی' سب کی سب مرد لا سے ملنے آ پہنچیں' پھر بھارت ماتا کی جے کی صدا جیل کی دیواروں کو توڑتی ہوئی آسمان میں جا پہنچی۔"

خانہ داماد

(1)

جیٹھ کی دوپہر تھی۔ ہری دھن ایکھ کے کھیت میں پانی دے کر آیا تھا اور باہر ہی بیٹھا رہا۔ گھر میں سے دھواں اٹھتا ہوا نظر آرہا تھا اور ساتھ ہی کھن کھن کی آواز بھی آرہی تھی۔ اس کے دونوں سالے اس کے بعد آئے اور گھر میں چلے گئے۔ ان دونوں کے لڑکے بھی آئے اور اسی طرح گھر میں داخل ہو گئے۔ مگر ہری دھن اندر نہ جا سکا۔ ادھر ایک مہینہ سے اس کے ساتھ یہاں جو برتاؤ ہو رہا تھا' اور خصوصاً کل اسے جیسی ڈانٹ سہنی پڑی تھی وہ اس کے پیروں میں بیڑیاں سی ڈالے ہوئے تھی۔ کل اس کی ساس ہی نے تو کہا تھا کہ میرا جی تم سے بھر گیا' میں کوئی تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ لیے بیٹھی ہوں کیا؟ سب سے بڑھ کر اس کی بیوی کے بے دردانہ سلوک نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا۔ وہ بیٹھی ہوئی اس ساری ڈانٹ پھٹکار کو سنتی رہی' مگر اس کے منہ سے ایک مرتبہ بھی تو نہ نکلا کہ اماں! تم کیوں ان کی بے عزتی کر رہی ہو؟ چُپ بیٹھی سنتی رہی۔ شاید میری درگت پر وہ خوش ہو رہی تھی۔ اس گھر میں وہ کیسے جائے' کیا پھر وہی گالیاں کھانے' وہی دل آزار باتیں سننے کے لیے؟ اور آج اس گھر میں زندگی کے دس سال گزر جانے پر یہ حال ہو رہا ہے۔ کیا میں کسی سے کم کام کرتا ہوں' دونوں سالے میٹھی نیند سوتے رہتے ہیں اور میں بیلوں کو چارہ پانی دیتا ہوں۔ چھانٹی کاٹتا ہوں۔ وہاں سب لوگ پَل پَل پر چلم پیتے ہیں' میں آنکھیں بند کیے اپنے کام میں لگا رہتا ہوں۔ شام کو گھر والے گانے بجانے چلے جاتے ہیں' میں بڑی رات تک گائیں بھینسیں دوہتا رہتا ہوں۔ ان سب کاموں کے لیے یہ انعام مل رہا ہے کہ کوئی مجھے کھانے کو بھی نہیں پوچھتا' اُلٹی اور گالیاں ملتی ہیں۔

اس کی عورت گھر سے ڈول لے کر نکلی اور بولی۔ "ذرا اسے کنویں سے کھینچ تو لو' گھر میں ایک بوند پانی نہیں ہے۔"

ہری دھن ڈول لے کر کنوئیں پر گیا اور پانی بھر لایا۔

اسے زور سے بھوک لگ رہی تھی۔ سمجھا اب کھانے کو بلانے آوے گی مگر عورت ڈول لے کر اندر گئی تو وہیں کی ہو رہی۔ ہری دھن تھکا ماندہ بھوک سے بے قرار پڑا پڑا سو گیا۔

دفعتہً اس کی بیوی نے آکر جگایا۔

ہری دھن نے پڑے پڑے کہا۔ "کیا ہے' کیا پڑا بھی رہنے دے گی' کیا اور پانی چاہیے؟"

گمانی سخت لہجے میں بولی۔ "غرّاتے کیوں ہو' کھانے کو بلانے آئی ہوں۔"

ہری دھن نے دیکھا اس کے دونوں سالے اور بڑے سالے کے دونوں لڑکے کھانا کھائے ہوئے چلے آرہے ہیں۔ اس کے بدن میں آگ لگ گئی۔ میری اب یہ نوبت پہنچ گئی کہ ان لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھا بھی نہیں

سکتا۔ یہ لوگ مالک ہیں، میں ان کی جھوٹی پتیلی چاٹنے والا ہوں۔ میں ان کا کتا ہوں، جسے کھانے کے بعد روٹی کا ٹکڑا پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی گھر ہے جہاں آج سے دس برس پہلے اس کی کتنی آؤ بھگت ہوتی تھی۔ سالے غلام بنے رہتے تھے۔ ساس منہ چومتی رہتی تھیں۔ بیوی پوجا کرتی تھی۔ تب اس کے پاس روپیہ تھا، جائیداد تھی۔ اب وہ مفلس ہے اس کی ساری جائیداد کو ان ہی لوگوں نے تو برباد کر دیا۔ اب اُسے روٹیوں کے بھی لالے پڑ رہے ہیں۔ اس کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا کہ اسی وقت اندر جا کر ساس اور سالوں کو خوب لعنت ملامت کرے، مگر ضبط کر کے رہ گیا۔ پڑے پڑے بولا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے، آج نہیں کھاؤں گا۔''

گمانی نے کہا۔ ''نہ کھاؤ گے میری بلا سے! ہاں نہیں تو، کھاؤ گے تو تمہارے ہی پیٹ میں جائے گا۔ کچھ میرے پیٹ میں تھوڑا چلا جائے گا۔''

ہری دھن کا غصہ آنسو بن گیا، یہ میری بیوی ہے جس کے لیے میں نے اپنا سب کچھ سُواہا کر دیا، مجھے الّو بنا کر اب یہ سب لوگ نکال دینا چاہتے ہیں۔ وہ اب کہاں جائے کیا کرے۔

اس کی ساس آکر بولی۔ ''چل کر کھا کیوں نہیں لیتے جی، روٹھتے کس سے ہو، یہاں تمہارے نخرے اٹھانے کا کسی میں بل بوتہ نہیں ہے۔ جو دیتے ہو وہ نہ دینا، اور کیا کرو گے۔ تم کو بیٹی بیاہی ہے، کچھ تمہاری زندگی بھر کا ٹھیکہ تو نہیں لیا ہے۔''

ہری دھن نے پیچ و تاب کھا کر کہا۔ ''ہاں اماں میری غلطی تھی، میں ویسا ہی سمجھ رہا تھا، اب میرے پاس دھرا ہی کیا ہے کہ تم میری زندگی کا ٹھیکہ لو گی۔ جب میرے پاس روپیہ تھا میں سب کچھ تھا۔ اب غریب ہوں تو تم کیوں بات پوچھو گی۔''

بوڑھی ساس بھی منہ پھلائے ہوئے اندر چلی گئی۔

(2)

بچوں کے لیے باپ ایک فالتو ہی چیز ہے، ایک تکلف ہے، جیسے گائے کے لیے کھلی یا بابوؤں کے لیے چٹنی۔ ماں دال روٹی ہے، چٹنی عمر بھر نہ ملے تو ہرج ہی کیا ہے۔ مگر دال روٹی ایک دن بھی نہ ملے تو پھر دیکھیے کیا حال ہوتا ہے۔ باپ کا درشن کبھی کبھی صبح و شام مل جاتا ہے۔ وہ بچہ کو اچھالتا ہے، پیار کرتا ہے اور کبھی اسے گود میں لے کر انگلی پکڑ کر سیر کروانے لے جاتا ہے۔ اس میں بھی اس کے فرائض کی حد ہے۔ وہ پردیس چلا جائے، بچہ کو پروا نہیں ہوتی۔ مگر ماں تو بچہ کے لیے سبھی کچھ ہے۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اس کی جدائی برداشت نہیں کر سکتا۔ باپ کہیں ہو اسے پروا نہیں، اسے تو صرف ایک اچھالنے کدانے والا آدمی چاہیے، مگر ماں تو اس کو اپنی ہی ہونی چاہیے۔ سولہ آنے اپنی، وہی روپ، وہی رنگ، وہی پیار، وہی سب کچھ۔ اگر وہ نہیں ہے تو گویا بچہ کی زندگی کا چشمہ خشک ہو جاتا ہے۔ پھر تو وہ شیوجی کا نادیا ہے جس پر پھول چڑھانا لازمی نہیں محض اختیاری ہے۔

ہری دھن کی ماں کا آج دس سال ہوئے انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ بیاہا جا چکا تھا۔ وہ سولہ سال کا تھا، مگر ماں کے مرتے ہی اسے معلوم ہوا کہ میں کتنا بے کس ہوں، جیسے اس گھر پر اس کا کوئی حق ہی نہ رہا ہو۔ بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں، بھائی کوئی نہ تھا، بے چارہ تنہا گھر میں جاتے ہوئے بھی ڈرتا تھا۔ اماں کے لیے روتا تھا مگر ماں

کے سایہ سے خوف کھاتا تھا۔ جس کوٹھڑی میں اس کی جان نکلی تھی اُدھر وہ نظر تک نہ اٹھاتا تھا۔ گھر میں ایک بوا تھی جو ہری دھن کو بہت چاہتی تھی۔ اسے اب دودھ زیادہ ملتا'کام بھی کم کرنا پڑتا۔ بوا بار بار پوچھتی' بیٹا کچھ کھاؤ گے؟ باپ بھی اب اسے زیادہ پیار کرتا' اس کے لیے ایک گائے الگ منگوادی تھی۔ کبھی کبھی اسے کچھ پیسے دیتا کہ جس طرح چاہے خرچ کرے۔ مگر یہ سارے مرہم اس زخم کو مندمل نہ کرسکتے تھے جس نے دل کو مجروح کردیا تھا۔ یہ لاڈ پیار بار بار اس کو ماں کی یاد دلاتا۔ ماں کی جھڑکیوں میں جو مزہ تھا وہ کیا اس پیار میں تھا؟ پہلے وہ تندرست تھا' مانگ مانگ کر کھاتا تھا' لڑ لڑ کر کھاتا' اب وہ بیمار تھا' اچھی سے اچھی چیزیں دی جاتی تھیں مگر اسے بھوک نہ تھی۔

سال بھر تک وہ اسی حالت میں رہا' پھر تغیر واقع ہوا۔ ایک نئی عورت جسے لوگ اس کی ماں کہتے تھے' اس کے گھر میں آئی اور دیکھتے دیکھتے ایک کالی گھٹا کی طرح اس کی چھوٹی سی دنیا پر چھاگئی۔ ساری ہریالی' سارے اجالے پر تاریکی کا پردہ پڑ گیا۔ ہری دھن نے اس نقلی ماں سے بات تک نہ کی۔ اس کے پاس کبھی گیا تک نہیں۔ ایک روز گھر سے نکلا اور سسرال چلا گیا۔

باپ نے بار بار بلایا مگر اس کے جیتے جی وہ پھر گھر نہ گیا۔ جس دن باپ کے انتقال کی خبر ملی' اُسے ایک قسم کی حسد آمیز مسرت ہوئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو کا ایک قطرہ بھی نہ نکلا۔

اس نئی دُنیا میں آکر ہری دھن کو پھر ایک مرتبہ ماں کی محبت کا سا سکھ ملا۔ اس کی ساس نے کسی رشی کے بردان کی طرح اس کی بے لطف زندگی کو دلچسپیوں سے معمور کردیا۔ اس میں ہریالی پیدا ہوگئی۔ سالیوں کی چھیڑ چھاڑ میں' ساس کی شفقت میں' سالوں کے مذاق میں اور بیوی کی محبت میں اس کے دل کی ساری مرادیں پوری ہوگئیں۔ ساس کہتی بیٹا تم اس گھر کو اپنا ہی سمجھو۔ تمھی میری آنکھوں کے تارے ہو۔ وہ اس سے اپنے لڑکوں کی' بہوؤں کی شکایت کرتی۔ وہ دل میں سمجھتا کہ ساس جی مجھے اپنے بیٹوں سے زیادہ چاہتی ہے۔ باپ کے مرتے ہی وہ گھر گیا اور اپنے حصہ کی جائیداد فروخت کرکے روپیہ کی تھیلی لیے ہوئے پھر واپس آگیا۔ اب اس کی دُگنی قدر و منزلت ہونے لگی۔ اس نے اپنی ساری پونجی ساس کے چرنوں پر رکھ کر اپنے کو خوش نصیب سمجھا۔ اب تک اُسے کبھی کبھی گھر کی یاد آجاتی تھی۔ اب بھول کر بھی اس کی یاد نہ آتی تھی۔ گویا وہ گھر اس کی زندگی کا خوفناک واقعہ تھا جسے بھول جانا ہی بہتر تھا۔ وہ سب سے پہلے اٹھتا' سب سے زیادہ کام کرتا' اس کی محنت و تندہی دیکھ کر گاؤں کے لوگ دانتوں تلے انگلی دباتے تھے۔ اس کے خسر کی قسمت کو سراہتے جسے ایسا داماد ملا تھا۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے گئے' اس کی خاطر داری میں کمی ہوتی گئی۔ وہ پہلے دیوتا تھا' پھر گھر کا آدمی اور بالآخر وہ گھر کا غلام ہو کر رہا۔ روٹیوں میں بھی خلل واقع ہوا۔ توہین ہونے لگی۔ اگر گھر کے لوگ بھوکوں مرتے اور اُن کے ساتھ ہی اُسے بھی مرنا پڑتا تو اسے ذرا بھی شکایت نہ ہوتی۔ لیکن جب وہ دیکھتا کہ اور لوگ تو مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں' صرف میں ہی ایک دودھ کی مکھی بنادیا گیا ہوں تو اس کے دل سے آہِ سرد نکل جاتی۔ ابھی وہ صرف پچیس ہی سال کا تو تھا۔ اتنی عمر اس گھر میں کیسے کٹے گی۔
اور تو اور اس کی بیوی نے بھی آنکھیں پھیرلیں۔ یہ اس کی مصیبت کا سب سے زیادہ دردناک پہلو تھا۔

(3)

ہری دھن ادھر تو بھوکا پیاسا فکر و تشویش کی آگ میں جل رہا تھا۔ اور اُدھر مکان کے اندر ساس اور

دونوں سالوں میں باتیں ہو رہی تھیں۔ گمانی بھی ہاں میں ہاں ملاتی جاتی تھی۔

بڑے سالے نے کہا۔ "ہم لوگوں کی برابری کرتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ کسی نے ان کی عمر بھر کا ٹھیکہ تھوڑی ہی لے لیا ہے۔ دس سال ہو گئے' اتنے دنوں میں کیا دو تین ہزار نہ کھا گئے ہوں گے۔"

چھوٹا سالا بولا۔ "مجور (مزدور) ہو تو آدمی جھڑکے بھی' ڈانٹے بھی' اب انہیں کوئی کیا کہے۔ نہ جانے ان سے کبھی پنڈ چھوٹے گا بھی یا نہیں۔ اپنے دل میں کہتے ہوں گے میں نے دو ہزار روپے انہیں دے رکھے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ ان کے دو ہزار کب کے صاف ہو گئے۔ سوا سیر تو ایک جون کو چاہیے۔"

ساس نے متانت سے کہا۔ "بڑی بھاری خوراک ہے۔"

گمانی ماں کے سر سے جوں نکال رہی تھی۔ بولی۔ "نکمّے آدمی کو کھانے کے سوا اور کام ہی کیا رہتا ہے۔"

بڑا سالا۔ "کھانے کی کوئی بات نہیں ہے' جسے جتنی بھوک ہو اتنی کھائے۔ مگر کچھ پیدا بھی تو کرنا چاہیے۔ یہ نہیں سمجھتے کہ مہمانی میں کس کے دن کٹے ہیں۔"

چھوٹا سالا۔ "میں تو ایک دن کہہ دوں گا کہ آپ اپنی راہ لیجئے' آپ کا قرضہ نہیں کھایا ہے۔"

گمانی اپنے گھر والوں کی ایسی ایسی باتیں سن کر اپنے شوہر سے نفرت کرنے لگی تھی۔ اگر وہ باہر سے چار پیسے لاتا تو اس گھر میں کتنی آؤ بھگت ہوتی۔ وہ بھی رانی بن کر رہتی' نہ جانے کیوں کہیں باہر جا کر کماتے اُن کی نانی مرتی ہے۔

گمانی کے خیالات و جذبات ابھی بالکل طفلانہ تھے۔ اس کا اپنا کوئی گھر نہ تھا' اسی گھر کے نفع و نقصان کا خیال اسے بھی تھا۔ وہ بھی اس مسئلہ کو انہیں الفاظ میں سمجھتی اور انہیں نگاہوں سے دیکھتی' جیسا اُس کے گھر والے۔ سچ تو ہے دو ہزار میں کیا کسی کو مول لے لیں گے۔ دس سال میں دو ہزار ہوتے ہی کیا ہیں۔ دو سو ہی تو سال بھر کے ہوئے۔ کیا دو آدمی سال بھر میں دو سو بھی نہ کھائیں گے۔ پھر کپڑے لتے' دودھ گھی سبھی کچھ تو ہے۔ دس سال ہو گئے۔ ایک پیتل کا چھلا بھی بنا کر نہیں دیا۔ گھر سے نکلتے تو جیسے ان کے پران جاتے ہیں۔ جانتے ہیں جیسے پہلے پوجا ہوتی تھی ویسی ہی ہوتی رہے گی۔ یہ نہیں سوچتے کہ پہلے اور بات تھی' اب اور بات ہے۔ بہو پہلے سسرال جاتی ہے تو اس کا کتنا مہاتم ہوتا ہے۔ ڈولی سے اترتے ہی باجے بجتے ہیں۔ گاؤں اور محلّہ کی عورتیں اس کا منہ دیکھنے آتی ہیں اور روپیہ بھی دیتی ہیں۔ مہینوں اُسے گھر بھر سے اچھا کھانے کو ملتا ہے' اچھا پہننے کو' کوئی کام نہیں لیا جاتا۔ لیکن چھ مہینے کے بعد کوئی اس کی بات بھی نہیں پوچھتا۔ وہ گھر بھر کی لونڈی ہو جاتی ہے۔ ان کے گھر میں میری بھی تو وہی گت ہوئی۔ پھر رونا کاہے کا' جو یہ کہو کہ میں تو کام کرتا ہوں تو یہ تمہاری بھول ہے۔ مجوری کی اور بات ہے' آدمی ڈانٹتا بھی ہے' مارتا بھی ہے' جب چاہتا ہے رکھتا ہے' جب چاہتا ہے نکال دیتا ہے' کس کر کام لیتا ہے' یہ نہیں کہ جب جی میں آیا پڑ کر سو رہے۔"

(4)

ہری ابھی پڑا ہوا اندر ہی اندر سلگ رہا تھا کہ اس کے دونوں سالے باہر آئے۔ بڑے صاحب بولے۔ "بھیا اٹھو تیسرا پہر ڈھل گیا' کب تک سوئے رہو گے؟"

ہری دھن فوراً اٹھا اور تیز لہجہ میں بولا۔ "کیا تم دونوں نے مجھے الّو سمجھ لیا ہے۔"

دونوں ششدر رہ گئے۔ جس آدمی نے کبھی زبان نہیں کھولی' ہمیشہ نوکر کی طرح ہاتھ باندھے حاضر رہا' وہ آج یکایک اتنا خوددار ہو جائے' یوں آستین چڑھا کر کھڑا ہو جائے۔ یہ انہیں ہوش میں لانے کے لیے کافی تھا' کچھ جواب نہ سوجھا۔

ہری دھن نے دیکھا ان دونوں کے قدم اکھڑ گئے ہیں' بس وہ ایک دھکا دینے کی زبردست خواہش کو روک نہ سکا۔ اسی طرح بولا۔ ''میری بھی آنکھیں ہیں' اندھا نہیں ہوں نہ بہرا ہوں' چھاتی پھاڑ کر کام کروں اور اس پر بھی کتا سمجھا جاؤں' ایسے گدھے کہیں اور ہوں گے۔''

اب بڑے سالے صاحب بھی گرم ہو پڑے۔ ''تمہیں کسی نے یہاں باندھ تو نہیں رکھا ہے۔''

ہری دھن لاجواب ہو گیا' کوئی بات نہ سوجھی۔

بڑے نے پھر اسی لہجہ میں کہا۔ ''اگر تم یہ چاہو کہ جنم بھر مہمان بنے رہو اور تمہارا ویسا ہی آدر ہوتا رہے' تو یہ بات ہمارے بس کی نہیں ہے۔''

ہری دھن نے آنکھیں نکال کر کہا۔ ''کیا میں تم لوگوں سے کم کام کرتا ہوں؟''

بڑے۔ ''یہ کون کہتا ہے۔''

ہری۔ ''تو تمہارے گھر کی یہی ریت ہے کہ جو سب سے زیادہ کام کرے وہی بھوکوں مارا جائے۔''

بڑے۔ ''تم خود کھانے نہیں گئے' کیا کوئی تمہارے منہ میں ڈال دیتا۔''

ہری نے ہونٹ چبا کر کہا۔ ''میں خود کھانے نہیں گیا'' کہتے تمہیں لاج نہیں آتی؟''

بڑے۔ ''نہیں آئی تھی بہن تمہیں بلانے؟''

ہری دھن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دانت پیس کر رہ گیا۔

چھوٹے سالے نے کہا۔ ''اماں بھی تو آئی تھیں' تم نے کہہ دیا بھوک نہیں ہے تو کیا کرتیں؟''

ساس بھی اندر سے لپکی آ رہی تھی۔ سن کر بولی۔ ''کتنا کہہ کر ہار گئی' کوئی اٹھے نہ تو میں کیا کروں؟''

ہری دھن نے زہر' خون اور آگ سے بھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ ''تو میں تمہارے لڑکوں کا جھوٹا کھانے کے لیے ہوں۔ میں کہتا ہوں کہ تم لوگ کھا کر میرے سامنے رکھی روٹی کا ایک ٹکڑا ڈال دو؟''

بڑھیا نے اینٹھ کر کہا۔ ''تو کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے۔''

ہری دھن شکست کھا گیا' بڑھیا نے ایک جملہ کے وار سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اس کی تنی ہوئی بھویں ڈھیلی پڑ گئیں' آنکھوں کی آگ مدھم پڑ گئی' بھڑکتے ہوئے نتھنے ساکت ہو گئے۔ کسی چوٹ کھائے ہوئے آدمی کی طرح وہ زمین پر گر پڑا۔ ''کیا تم میرے لڑکوں کی برابری کرو گے؟'' یہ جملہ ایک لمبے بھالے کی طرح اُس کے دل میں چبھتا چلا جا رہا تھا۔ نہ دل کی حد تھی نہ بھالے کی انتہا۔

(5)

کُل گھر نے کھانا کھایا مگر ہری دھن نہ اُٹھا۔ ساس نے منایا' سالیوں نے منایا' خسر نے منایا' دونوں سالے منا کر رہ گئے مگر ہری دھن نہ اٹھا۔ وہیں دروازے پر ایک ٹاٹ پڑا تھا ا سے اٹھا کر الگ کنویں پر لے گیا اور جگت پر بچھا کر پڑ رہا۔

رات زیادہ ہو چکی تھی، آسمان کی فضائے بسیط میں لا محدود ستارے لڑکوں کی طرح کھیل رہے تھے۔ کوئی ناچتا تھا، کوئی کودتا تھا، کوئی ہنستا تھا، کوئی آنکھیں بند کر کے پھر کھول دیتا تھا۔ تھوڑی دیر میں کوئی بہادر لڑکا ایک لمحہ میں اس وسیع فضا کو پار کر جاتا اور نہ جانے کہاں جا کر چھپ جاتا۔ ہری کو اپنا بچپن یاد آیا۔ جب وہ اسی طرح کھیلا کرتا تھا۔ اس کی بچپن کی یاد روشن ستاروں کی طرح چمک اٹھی۔ وہ اس کا چھوٹا سا گھر، وہ آم کا باغ جہاں کیریاں چنا کرتا تھا۔ وہ میدان جہاں کبڈی کھیلا کرتا تھا۔ سب اسے یاد آنے لگے۔ پھر ماتا بھری ماں کی موہنی صورت اُس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔ ان آنکھوں میں کتنا درد تھا، کتنا رحم تھا۔ اُسے معلوم ہوا گویا ماں آنکھوں میں آنسو بھرے اُسے سینے سے لگانے کے لیے ہاتھ پھیلائے اس کی طرف چلی آرہی ہے۔ وہ اسی دلکش تصور میں محو ہو کر رہ گیا گویا ماں نے اس کو سینہ سے لگالیا ہے۔ اور وہ محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی ہے۔ وہ رونے لگا، زار و قطار رونے لگا۔ اسی خود فراموشی کی حالت میں اس کے منہ سے یہ یہ الفاظ نکلے۔ ''اماں تم نے مجھے اتنا بھلا دیا دیکھو! تمہارے پیارے لالہ کی کیا گت ہو رہی ہے۔ کوئی اسے پانی کو بھی نہیں پوچھتا، کیا جہاں تم ہو وہاں میرے لیے جگہ نہیں ہے۔''

دفعتہً گمانی نے آکر پکارا۔ ''کہاں سو گئے تم۔ چل کر کھانا کیوں نہیں کھا لیتے، کب تک کوئی تمہارے لیے بیٹھا رہے۔''

ہری اٹھ بیٹھا اور ایک تلوار سی نیام سے نکال کر بولا۔ ''بھلا تمہیں میری سدھ تو آئی، میں نے تو کہہ دیا تھا، مجھے بھوک نہیں ہے۔''

گمانی: ''تو کے (کتنے) دن نہ کھاؤ گے؟''

ہری: ''اس گھر کا پانی نہ پیوں گا، تجھے میرے ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟''

ان مصمّم ارادے سے بھرے ہوئے الفاظ کو سن کر گمانی سہم اٹھی، بولی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟''

ہری نے گویا نشے میں کہا۔ ''تجھے اس سے کیا مطلب؟ میرے ساتھ چلے گی یا نہیں، پھر پیچھے سے نہ کہنا کہ مجھ سے نہیں کہا۔''

گمانی معترضانہ لہجہ میں بولی۔ ''تم بتاتے کیوں نہیں، کہاں جا رہے ہو؟''

''تو میرے ساتھ چلے گی یا نہیں؟''

''جب تک تم نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گی۔''

''تو معلوم ہو گیا تو نہیں جانا چاہتی۔ مجھے اتنا ہی پوچھنا تھا، نہیں تو میں اب تک آدھی دور نکل گیا ہوتا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ گمانی۔ ''سنو تو، سنو تو'' پکارتی رہی، مگر اس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

(6)

تیس میل کی مسافت ہری دھن نے پانچ گھنٹہ میں طے کی۔ جب وہ اپنے گاؤں کے آم والے باغ کے قریب پہنچا تو اس کی ماں کی یاد سے بھرا ہوا تخیل افق کی سنہری گود میں کھیل رہا تھا۔ ان درختوں کو دیکھ کر اس کا بے قرار دل ناچنے لگا۔ مندر کا سنہرا کلس دیکھ کر وہ اس طرح دوڑا گویا ایک جست میں وہ اس کے اوپر جا پہنچے گا۔ وہ

تیزی سے دوڑا جارہا تھا گویا اس کی ماں غوش کھولے اُسے بلا رہی ہو۔ جب وہ آموں کے باغ میں پہنچا' جہاں ڈالیوں پر بیٹھنے سے اسے ہاتھی کی سواری کا مزا ملتا تھا' جہاں کے کچے بیر اور لسوڑوں میں ایک روحانی لذت تھی وہ بے اختیار بیٹھ گیا اور زمین پر سر جھکا کر رونے لگا۔ گویا ماں کو اپنی مصیبت کی داستان سنا رہا تھا۔ وہاں کی ہوامیں' وہاں کی روشنی میں گویا اس کی ماں کی ایک بہت بڑی سی مورت بس رہی تھی۔ وہاں کی چپہ چپہ زمین ماں کے قدموں کے نشانات سے مقدس بنی ہوئی تھی۔ ماں کی محبت بھرے الفاظ گویا اب تک اس فضا میں گونج رہے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا میں نہ جانے کونسا امرت تھا جس نے اس کے افسردہ دل کو ایک مرتبہ پھر امنگوں سے بھر دیا۔ وہ ایک درخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور آم توڑ کر کھانے لگا۔ ساس کی وہ سخت کلامی' بیوی کی وہ بے اعتنائی اور ساری ذلت' یہ سب باتیں وہ بھول گیا۔ اس کے پاؤں پھول رہے تھے۔ تلوے جل رہے۔ مگر اس مسرت کی محویت میں اسے کسی بات کا خیال نہ تھا۔

یکایک باغ کے رکھوالے نے پکارا۔ "یہ کون اوپر چڑھا ہوا ہے رے؟ اُتر ابھی نہیں تو ایسا پتھر کھینچ کر ماروں گا کہ وہیں ٹھنڈا ہو جائے گا۔"

اس نے گالیاں بھی دیں' مگر ان گالیوں میں اس وقت ہری دھن کو بڑا لطف آتا تھا۔ وہ ڈالیوں میں چھپ گیا۔ اس نے کئی آم کاٹ کاٹ کر نیچے گرائے اور زور زور سے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ایسی خوشی سے بھری ہوئی ہنسی اس نے بہت دنوں سے نہ ہنسی تھی۔

رکھوالے کو وہ ہنسی پہچانی ہوئی سی معلوم ہوئی۔ مگر ہری دھن یہاں کہاں۔ وہ تو سسرال کی روٹیاں توڑ رہا ہے۔ کیسا ہنسوڑ تھا' کتنا چلبلا' نہ جانے بے چارے کا کیا حال ہوا۔ پیڑ کی ڈال سے تالاب میں کود پڑتا تھا۔ اب گاؤں میں ایسا کون ہے؟

ڈانٹ کر بولا۔ "وہاں سے بیٹھے بیٹھے ہنسو گے تو آکر ساری ہنسی نکال دوں گا۔ نہیں تو سیدھے اُتر آؤ۔"

وہ گالیاں دینے ہی والا تھا کہ ایک گٹھلی آکر اس کے سر پر لگی۔ وہ سر سہلاتا ہوا بولا۔ "یہ کون شیطان ہے' نہیں مانتا' ٹھہر و میں آکر خبر لیتا ہوں۔" اس نے اپنی لاٹھی نیچے رکھ دی اور بندروں کی طرح جھٹ اوپر چڑھ گیا۔ دیکھا تو ہری دھن بیٹھا مسکرا رہا ہے۔ متحیر ہو کر بولا۔ "ارے ہری دھن تم یہاں کب آئے؟ اس پیڑ پر کب سے بیٹھے ہو؟"

دونوں بچپن کے ساتھی وہیں گلے ملے۔

"یہاں کب آئے' چلو گھر چلو' بھلے آدمی؟ کیا وہاں آم بھی میسر نہ ہوتے تھے۔"

ہری دھن نے مسکرا کر کہا۔ "منگرو ان آموں میں جو سواد (لذت) ہے اور کہیں کے آموں میں نہیں ہے گاؤں کا کیا رنگ ڈھنگ ہے؟"

منگرو۔ "سب چین چان ہے بھیا! تم نے تو جیسے ناتا ہی توڑ دیا۔ اس طرح کوئی اپنا گاؤں گھر چھوڑ دیتا ہے۔ جب سے تمہارے دادا مرے' ساری گرہستی چوپٹ ہوگئی اور چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں۔ ان کے کئے کیا ہوتا ہے۔"

ہری دھن۔ مجھے اب اس گرہستی سے کیا واسطہ ہے بھائی' میں تو اپنا لے دے چکا۔ مجوری تو ملے گی نا' تمہاری گیا (گائے) میں چرا دیا کروں گا۔ مجھے کھانے کو دے دینا۔"

منگرو نے شک کے لہجہ میں کہا۔ "ارے بھیا کیسی باتیں کرتے ہو؟ تمہارے لیے جان تک حاضر ہے' کیا سسرال میں اب نہ رہو گے؟ کوئی چنتا نہیں' پہلے تو تمہارا گھر ہی ہے' اُسے سنبھالو' چھوٹے چھوٹے بچے ہیں' ان کو

پالو۔ تم نئی ماں سے ناحق (ناحق) ڈرتے تھے' بڑی سیدھی ہیں بے چاری۔ بس اپنی اماں ہی سمجھو' تمہیں پاکر تو نہال ہو جائیں گی۔ اچھا گھر والی کو بھی تو لاؤ گے؟"

ہری دھن۔ "اس کا منہ اب نہ دیکھوں گا' میرے لیے وہ مر گئی۔"

منگرو۔ "تو دوسری سگائی ہو جائے گی۔ اب کے ایسی عورت لادوں گا کہ اس کے پیر دھو دھو کر پیو گے۔ پر کہیں پہلی آگئی تو؟"

ہری دھن۔ "وہ نہ آئے گی۔"

(7)

ہری دھن اپنے گھر پہنچا تو دونوں "بھیا آئے" کہتے ہوئے اندر دوڑے گئے اور ماں کو خبر دی۔

اس گھر میں قدم رکھتے ہی ہری دھن کو ایسے دلی سکون کا احساس ہوا گویا وہ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا ہے۔ اتنے دنوں تک ٹھوکریں کھانے سے اس کا دل نرم ہو گیا تھا۔ جہاں پہلے سے گھمنڈ تھا' ضد تھی' شیخی تھی وہاں اب مایوسی تھی' شکست تھی اور طلب تھی۔ مرض کا زور گھٹ چکا تھا۔ اب اس پر معمولی دوا بھی اثر کر سکتی تھی۔ قلعہ کی دیواروں میں سوراخ ہو گئے تھے' اب اس میں داخل ہو جانا مشکل نہ تھا۔ وہی گھر جس سے وہ ایک دن برداشتہ خاطر ہو چکا تھا' اب آغوش کھولے ہوئے اسے پناہ دینے کو تیار تھا۔ بے یار و مددگار ہری دھن اس سہارے کو پاکر بالکل مطمئن ہو گیا۔

شام کو اس کی سوتیلی ماں نے کہا۔ "بیٹا تم گھر آگئے' ہمارے دھنیہ بھاگ' اب ان بچوں کو پالو' ماں کا ناتا نہ سہی' باپ کا ناتا تو ہے۔ مجھے ایک روٹی دے دینا' کھا کر ایک کونے میں پڑ رہوں گی۔ تمہاری اماں سے میری بہن کا ناتا ہے' اس ناتے سے بھی تم میرے لڑکے ہی ہوتے ہو۔"

ماں کے لیے ترسنے والے ہری دھن کو سوتیلی ماں کے روپ میں اپنی ہی ماں کا درشن ہوا۔ گھر کے ایک ایک گوشے میں ماں کی یاد کا جلوہ چاندنی کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ وہی سوتیلی ماں کے چہرے پر نظر آ رہا تھا۔

دوسرے روز ہری دھن پھر کندھے پر ہل رکھے ہوئے کھیت کو چلا۔ اس کے چہرے پر خوشی تھی اور اس کی آنکھوں میں غرور تھا۔ اب وہ کسی کا سہارا لینے والا نہیں بلکہ سہارا دینے والا تھا۔ کسی کے در کا بھکاری نہیں بلکہ اپنے گھر کا نگہبان تھا۔

ایک روز اُس نے سنا کہ گمانی نے دوسرا شوہر کر لیا۔ وہ ماں سے بولا۔ "تم نے سنا کاکی گمانی نے دوسرا گھر کر لیا۔"

کاکی نے کہا۔ "گھر کیا کرے گی ٹھٹھا ہے۔ برادری میں ایسا اندھیر' پنچایت نہیں عدالت تو ہے۔"

ہری نے کہا۔ "نہیں کاکی بہت اچھا ہوا' لاؤ مہابیر سوامی کو لڈو چڑھاؤں۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ کہیں میرے گلے نہ آپڑے۔ بھگوان نے میری سن لی۔ میں وہاں سے اپنے من میں ٹھان کر چلا تھا کہ اب کبھی اس کا منہ نہ دیکھوں گا۔"

قہر خدا کا

(1)

شام کو جب دینا ناتھ نے گھر آکر گوری سے کہا' مجھے ایک دفتر میں پچاس روپے کی جگہ مل گئی ہے تو گوری کا ایک ایک عضو شگفتہ ہو گیا' آنکھیں چمکیں' ہونٹ کھلے' چہرہ دمک اٹھا۔ دیوتاؤں پر اس کا اعتقاد اور مضبوط ہو گیا۔ اِدھر ایک سال سے ان غریبوں کا برا حال تھا۔ نہ کوئی روزی نہ روزگار۔ گھر میں جو تھوڑے گہنے پاتے تھے وہ کب کے بِک چکے تھے۔ جن دوستوں سے قرض مل سکتا تھا سب سے لے چکے تھے۔ جن بنیوں سے اُدھار چیزیں مل سکتی تھیں ان سے آنکھیں چراتے پھرتے تھے۔ اب یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ کئی مہینہ کا کرایہ سر پر لدا ہوا تھا۔ گوالے نے تقاضے سے تنگ آکر دودھ بند کر دیا' اور بچہ دن بھر دودھ سے بلکتا رہتا۔ ایک وقت کسی طرح کھانا میسر ہو جاتا تو اسے کھینچ تان کر دو تین وقت چلاتے۔ تقاضوں کے مارے دینا ناتھ کا گھر سے نکلنا مشکل تھا۔ گھر سے نکلے نہیں کہ چاروں طرف سے چھتاڑ مچ جاتی۔ ''واہ بابو جی واہ دو دن کا وعدہ کر کے سودا لے گئے اور آج دو مہینہ سے صورت نہیں دکھائی۔ ایسے دس پانچ گاہک اور ن جائیں تو دیوالیہ ہی نکل جائے۔ واہ بھائی صاحب یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ اپنی ضرورتوں کا تو آپ کو خیال رہے لیکن دوسروں کی ضرورتوں کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لیے بزرگوں نے کہا ہے دشمن کو چاہے قرض دے دو' مگر دوستوں کو کبھی مت دو' قرض دیا اور دوست دشمن ہوا۔''

دینا ناتھ کو یہ فقرے تیروں سے زیادہ لگتے تھے' اور اس کا جی چاہتا تھا کہ اس زندگی کا خاتمہ کر دے مگر بے زبان عورت اور بے سمجھ بچہ کا منہ دیکھ کر کلیجہ تھام کر رہ جاتا تھا۔ بارے آج ایشور نے اس پر رحم کیا اور مصیبت کے ایام کٹ گئے۔

گوری نے خوش ہو کر کہا۔ ''میں کہتی نہ تھی کہ ایشور سب کی سدھ لیتا ہے وہ کبھی نہ کبھی ہماری سدھ بھی لے گا مگر تمہیں یقین نہ آتا تھا اب تو ایشور کی رحیمی کے قائل ہوئے۔''

دینا ناتھ نے ہٹ دھرمی کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری دوادوش کا نتیجہ ہے۔ ایشور نے کیا کیا' ایشور کو تو جب مانتا کہ کہیں سے چھپر پھاڑ کر بھیج دیتے۔''

''ایشور جب دیتا ہے کسی نہ کسی حیلہ سے دیتا ہے' سنا نہیں ہے حیلے روزی بہانے موت۔''

لیکن منہ سے چاہے جو کہے' اس میں شک نہیں کہ اس کے اُوسرِ کفر میں بھی اعتقاد کے بیج پڑ چکے تھے اور اس میں اکھوے بھی نکل آئے۔

(2)

دینا ناتھ کا آقا نہایت کج خلق آدمی تھا اور کام میں بڑا چست۔ اس کی عمر پچاس سے زیادہ تھی اور صحت بھی رخصت ہو چکی تھی۔ ساگو دانہ کے سوا اور کوئی چیز ہضم نہ ہوتی تھی۔ پھر بھی دفتر میں سب سے زیادہ جفاکش تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی ملازم ایک منٹ کی بھی دیر کرے یا ایک منٹ بھی وقتِ معین سے پہلے چلا جائے۔ خود نہ جانے

کب آتا تھااور نہ جانے کب جاتا تھا۔ عملے والے جب دفتر آتے تو وہ اپنی کرسی پر بیٹھا نظر آتا اور جب جاتے تب بھی وہ اپنی جگہ پر موجود رہتا۔ لوگ اس کے سامنے جاتے ایسا ڈرتے تھے گویا کاٹ کھائے گا۔ دس منٹ تک کلیجہ مضبوط کرتے اور فراغت پاتے ہی ایسا بگٹٹ بھاگتے گویا قید سے چھوٹے ہوں۔ ملنے کو تو کسی کو مہلت نہ تھی بس اپنی جگہ پر بیٹھے لوگ اس کی نقلیں کیا کرتے۔ نہ جانے اس کے کتنے نام رکھ لئے گئے تھے۔ اس کی حرکات و سکنات کی تضحیک کرنا ہی لوگوں کی دلچسپی کا مشغلہ تھا۔ صرف ایک بجے عملہ کو 15 منٹ کا وقفہ ملتا تھا۔ اس میں جس کا جی چاہے پان کھائے' سگریٹ پیئے یا چائے۔ اس کے بعد ایک منٹ کا بھی موقع نہ ملتا تھا۔ قاعدہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور حالانکہ تنخواہ پہلی تاریخ کو ملتی تھی۔ تعطیلوں میں دفتر بند رہتا اور معینہ اوقات سے زیادہ ایک منٹ بھی کام نہ لیا جاتا۔ سب کو بونس ملتا تھا اور پراویڈنٹ فنڈ کی بھی سہولت تھی۔ پھر بھی کوئی آدمی خوش نہ تھا۔ کام کی کثرت یا پابندیِ اوقات کی کسی کو شکایت نہیں تھی۔ مگر مشکل یہ تھی کہ یہاں کتنا ہی دل لگا کر کام کرو' جان ہی کیوں نہ دے دو' شکریہ کا لفظ یا حوصلہ افزائی کا ایک کلمہ بھی اس شخص کے منہ سے نہ نکلتا۔

مگر اور لوگ چاہے کتنے ہی شاکی ہوں' دیناناتھ کو مالک سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اس فاقہ کشی کے مقابلہ میں اس روکھے پن یا ترش روئی کی کیا حقیقت تھی۔ وہ گھرکیاں اور پھٹکار پا کر شاید حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتا۔ تضحیک و تفضیح میں بھی وہ شریک نہ ہوتا۔ احسان سے اس کا ایک ایک رواں گراں بار ہو رہا تھا۔ سال بھر میں ہی اپنی کفایت شعاری کی بدولت اس نے سب قرضے چکا دیئے اور کچھ پس انداز بھی کر لیا۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو تھوڑے میں بھی خوش رہ سکتے تھے اگر معین وقت پر ملتا جائے۔ چار روپے روز میں شاید وہ برکت نہ ہوتی جو پچاس روپے ماہوار میں تھی۔ ضروری مصارف کی مدیں قائم ہو گئی تھیں۔ زندگی ایک لکیر بن گئی تھی اور اس پر وہ آنکھیں بند کر کے بے کھٹکے چلا جاتا تھا۔ غیر معین آمدن میں وہ بجٹ کیسے بناتا' کیسے اس کی پابندی کرتا' کبھی ایک چیز آتی تو دوسری کم پڑ جاتی' دوسری آتی تو تیسری کا رونا ہوتا۔ کمرے میں مستقل روشنی چاہے دھندلی ہو اس بجلی کے لیمپ سے بہتر ہے جو کبھی جلے اور کبھی بجھ جائے۔ کبھی ہنی ہنا' کبھی مٹھی بھر چنا والی زندگی اُسے مطلق پسند نہ تھی۔ مقررہ خرچ کے علاوہ ایک روپیہ بھی کسی خاص کام کے لیے خرچ کرنا پڑتا تو میاں بیوی میں گھنٹوں بحث و تمحیص ہوتی اور بڑی جھاؤں جھاؤں کے بعد کہیں منظوری ملتی۔ بل گوری کی طرف سے پیش ہوتا تو دیناناتھ مخالفت کرتا' دیناناتھ کی طرف سے پیش ہوتا تو گوری اس کا بخیہ اُدھیڑتی۔ بل کو پاس کرا لینا مجوز کی وکالت اور لیاقت پر منحصر تھا۔ سرٹیفائی کرنے والی کوئی تیسری طاقت نہ تھی۔

دیناناتھ اب پکا خدا پرست بن گیا تھا۔ ایشور کے رحم و انصاف میں اب اُسے کوئی شک نہ تھا۔ روز سندھیا کرتا اور بلاناغہ گیتا پڑھتا۔ ایک دن اس کے منکر دوست نے جب ایشور کی مذمت کی تو اس نے کہا۔ "بھائی صاحب اس کا تو آج تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ ایشور ہے یا نہیں' منکر اور موحد دونوں کے پاس فولاد کی سی دلیلیں موجود ہیں لیکن میرے خیال میں موحد رہنا منکر رہنے سے کہیں زیادہ مصلحت آمیز ہے۔ اگر ایشور کا وجود ہے تب تو منکروں کو دوزخ کے سوا اور کہیں ٹھکانہ نہیں۔ موحد کے دونوں ہاتھ میں لڈو ہیں' ایشور ہے تب تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ اس کے لیے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ایشور نہیں ہے تب بھی اس کا کیا بگڑتا ہے۔ دو چار منٹ کا وقت ہی تو جاتا ہے۔"
منکر دوست اس کی دو رُخی دلیل پر منہ بنا کر چلا گیا۔ ایسوں کے لیے اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

دیوالی کا دن تھا۔ گوری نے اب کے ایک ہزار چراغ جلانے کا بندوبست کیا۔ دس سیر تیل لیا اور سارے

دن بیٹھی بتیاں بناتی رہی۔ شام کو جب دیناناتھ دفتر سے آئے اور یہ تیاریاں دیکھیں تو چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ ''تمہیں بھی سنک سوار ہو گئی' بل پیش کرنے سے پہلے ہی اس پر عملدرآمد شروع کر دیا۔ اتنا تیل جلانے سے فائدہ؟ آٹھ آنے کے تیل میں کیا کام نہ چل سکتا تھا؟''

گوری مسکراتی ہوئی بولی' اسے کبھی غصہ نہ آتا تھا۔ ''کام کیوں نہ چل سکتا تھا۔ پچھلے سال تو دھیلے کا تیل بھی نہ آیا' کیا تب کام نہ چلا؟''

''میں یہ تو نہیں کہتا کہ تیل لیا ہی کیوں' یہی کہتا ہوں کہ اتنا زیادہ تیل کیوں لیا' یہ فضول خرچی ہے۔''

''میرا جی آج فضول خرچی ہی پر مائل ہے۔ سوچو ایک دن وہ تھا کہ دیوالی کے دن گھر میں اندھیرا پڑا رہا' ایک دن آج ہے کہ ہم ایک ہزار چراغ جلانے کے لائق ہیں۔ کیا بھگوان نے جب ہنسنے کا موقع دیا ہے' تب بھی روئے جائیں۔ یہ کتنی بڑی ناشکری ہے۔''

''اچھا یہ خیال ہے' تب ضرور جلاؤ۔ تمہارا بل پاس ہو گیا۔''

ایک دن دیناناتھ شام کو دفتر سے چلنے لگے تو سیٹھ جی نے انہیں اپنے کمرے میں بلا بھیجا اور بڑی خاطر سے کرسی پر بٹھا کر بولے۔ ''تمہیں یہاں کام کرتے کتنے دن ہو گئے۔ سال تو ہو گیا ہو گا۔''

دیناناتھ نے ادب سے جواب دیا۔ ''جی ہاں تیرھواں مہینہ چل رہا ہے۔''

''آرام سے بیٹھو۔ اس وقت گھر جا کر کچھ چائے وائے پیتے ہو؟''

''جی نہیں میں چائے کا عادی نہیں ہوں۔''

''پانی وان تو کھاتے ہی ہو گے؟ جوان آدمی ہو کر ابھی سے اتنا پرہیز!''

یہ کہہ کر سیٹھ جی نے گھنٹی بجائی اور اردلی سے پان اور کچھ مٹھائیاں لانے کو کہا۔ حالانکہ دیناناتھ برابر انکار کرتا ہی رہا۔ اسے تعجب ہو رہا تھا کہ آج یہ غیر معمولی خاطر داری کیوں ہو رہی ہے۔ کہاں تو حضرت سلام ہی نہ لیتے تھے کہاں آج مٹھائیاں اور پان سبھی کچھ منگایا جا رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے میری خدمات سے خوش ہو گئے ہیں۔ اس خیال سے انہیں اپنے اوپر کچھ اعتماد پیدا ہوا اور ایشور کی یاد آ گئی۔ پرماتما ضرور حاضر و ناظر ہے' ورنہ مجھے کون پوچھتا۔ دفتر میں میرا عہدہ بھی تو اونچا نہیں۔

اردلی پان اور مٹھائیاں لایا۔ دیناناتھ اصرار سے مجبور ہو کر مٹھائیاں کھانے لگا۔

سیٹھ جی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مجھے بہت خشک اور بے مروت پایا ہو گا۔ میرے ملازموں کو مجھ سے یہ شکایت عام ہے مگر میں مجبور ہوں۔ ہمارے یہاں ابھی لوگوں میں اپنی ذمہ داری کا اتنا کم احساس ہے کہ افسر ذرا بھی نرم پڑ جائے تو لوگ اس کی شرافت اور انسانیت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگتے ہیں اور اپنے کام سے بے توجہی کرنے لگتے ہیں۔ انہیں اپنے کام کی اتنی پرواہ نہیں رہتی جتنی اپنے افسر کی خوشامد اور مصاحبت کی۔ کچھ ایسے خوش نصیب بھی موجود ہیں جو نوکروں سے میل جول بھی رکھتے ہیں' ان سے ہنستے بولتے بھی ہیں' اُن کی مجلسوں میں شریک بھی ہوتے ہیں پھر بھی نوکروں کو ان سے زیادہ بے تکلف ہونے کا حوصلہ نہیں ہوتا بلکہ وہ اور بھی تندہی سے اپنا کام کرتے ہیں۔ مالک سے انہیں ہمدردی ہو جاتی ہے۔ میں ایسا خوش نصیب نہیں ہوں' مجھ میں وہ فن نہیں ہے' اس لیے میں اپنے آدمیوں سے کھچے رہنے ہی میں خیریت سمجھتا ہوں اور اب تک اس طرز عمل سے مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ لیکن آدمیوں سے علیحدہ رہ کر بھی میں ان کے رنگ ڈھنگ دیکھتا رہتا ہوں اور ان کی فطرت کا امتحان لیا

کرتا ہوں۔ میں نے اب تک تمہارے متعلق جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے کہ تم وفادار اور بااصول آدمی ہو' اور میں تمہارے اوپر اعتبار کر سکتا ہوں۔ اس لیے میں تمہیں زیادہ ذمہ داری کا کام دینا چاہتا ہوں۔ جہاں تمہیں خود بہت کم کام کرنا پڑے گا۔ صرف نگرانی کرنی پڑے گی۔ تمہاری تنخواہ میں پچاس روپے کا اضافہ ہو جائے گا اور اختیارات بڑھ جائیں گے۔ مجھے یقین ہے اب تک جس تندہی سے تم نے کام کیا ہے' آئندہ اس سے بھی زیادہ توجہ اور خلوص سے اپنا کام کرو گے۔"

دینا ناتھ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور حلق کی مٹھائی کچھ نمکین ہو گئی۔ جی میں آیا آقا کے قدموں میں سر رکھ دے اور عرض کرے آپ کی خدمت کے لیے میری جان حاضر ہے' آپ نے میری جو عزت افزائی کی ہے اور مجھ پر جو اعتبار کیا ہے میں اس کے قابل بننے کی کوشش کروں گا۔ آواز قابو میں نہ تھی' جذبات اس پر حاوی ہو گئے تھے' صرف احسان مند نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔ مگر ان خاموش نظروں نے جتنا اظہار کیا شاید وفاداری اور تشکر کے مرصع الفاظ نے نہ کیا ہوتا۔ تب سیٹھ جی نے ضخیم لیجر نکال کر اس کے اوراق الٹتے ہوئے کہا۔ "میں ایک ایسے کام میں تمہاری مدد چاہتا ہوں جس پر اس کاروبار کا سارا مستقبل اٹکا ہوا ہے۔ اتنے آدمیوں میں' میں نے تمہیں کو قابل اعتماد سمجھا ہے اور مجھے یقین ہے تم مجھے مایوس نہ کرو گے۔ یہ سال گزشتہ کا لیجر ہے' اور اس میں کچھ ایسے اندراجات ہیں جن کے مطابق کمپنی کو کئی لاکھ کا نفع ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت حال سے تم واقف ہو۔ ہم کئی مہینے سے خسارہ اٹھاتے جا رہے ہیں۔ جس کلرک نے یہ لیجر لکھا تھا اس کی تحریر تمہاری تحریر سے بالکل ملتی ہے۔ اگر دونوں تحریریں آمنے سامنے رکھ دی جائیں تو کسی ماہر فن کو بھی ان میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے۔ میں چاہتا ہوں تم ان اعداد کے مطابق ایک نیا صفحہ لکھو اور اس صفحہ کو لیجر سے نکال کر نیا ورق چسپاں کر دو۔ میں نے صفحہ کا نمبر چھپوا لیا ہے' ایک باہر کا دفتری بھی ٹھیک کر لیا ہے جو راتوں رات شیرازہ بندی کر دے گا' کسی کو پتہ نہ چلے گا۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ تم وہ نیا صفحہ ان اعداد کے مطابق نقل کر دو۔"

دینا ناتھ نے اس تجویز کے خطرہ سے متاثر ہو کر کہا۔ "اگر انہیں اعداد کو نقل کرنا ہے تو نیا صفحہ جوڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

سیٹھ جی اس کی سادگی پر ہنس کر بولے۔ "تو کیا تم سمجھتے ہو اس صفحہ کی بجنسہ نقل کرنی ہو گی' میں کچھ نئے اعداد دوں گا جنہیں تم نشان کردہ رقموں کی جگہ درج کر دو گے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں محض اس دفتر کی بہتری کے خیال سے یہ کارروائی کر رہا ہوں۔ اگر یہ ردوبدل نہ کیا گیا تو اس دفتر کے ایک سو آدمیوں کی روزی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ یہاں کچھ پس و پیش کی ضرورت ہی نہیں' کیونکہ یہ ایک سو ملازموں اور کم سے کم پانچ سو مزدوروں کی روٹیوں کا معاملہ ہے۔ تم بہت زود نویس ہو اور تمہارے لیے یہ محض آدھ گھنٹہ کا کام ہے۔"

بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ اسے صریح جعل سازی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس کے پاس اس حقیقت کو دریافت کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ سیٹھ نے جو تجویز پیش کی ہے' اس میں ان کی ذاتی غرض شامل ہے یا صرف دفتر کے آدمیوں کی بہتری کا خیال ہے۔ لیکن بہر حال ہے یہ تحریف اور تلبیس۔ تو کیا وہ ذاتی نفع کے لیے اپنے ضمیر کا خون کرے گا۔ نہیں ہرگز نہیں۔

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آپ مجھے معاف کریں' میں یہ خدمت نہ بجا لا سکوں گا۔ میں اسے اپنے اصول کے خلاف سمجھتا ہوں۔"

سیٹھ جی کو مطلق غصہ نہ آیا۔ اسی سکون آمیز تبسم کے ساتھ بولے۔ ”کیوں؟“

”اس لیے کہ یہ سراسر جعل ہے۔“

”جعل کسے کہتے ہیں۔“

”نقل کو اصل بنا کر دکھانا جعل نہیں تو اور کیا ہے۔“

”لیکن اگر تغیر سے سو آدمیوں کی روزی بنی رہے تو اس حالت میں بھی یہ جعل ہے۔ کمپنی کی اصل حالت کچھ ہے 'کاغذی حالت کچھ اور ہے۔ اگر تغیر نہ کیا گیا تو فوراً کئی لاکھ روپے کے نفع دینے پڑ جائیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ کمپنی کا دیوالہ ہو جائے گا اور یہ سارے آدمی بیکار ہو جائیں گے۔ میں نہیں چاہتا کہ تھوڑے سے مالدار حصہ داروں کے لیے اتنے غریبوں کا خون کیا جائے۔ غریبوں کی بہتری کے لیے اگر کچھ جعل کرنا بھی پڑے تو میں اسے ضمیر کا خون نہیں سمجھتا' اگر میرے جھوٹ بولنے سے کسی آدمی کی جان بچتی ہو تو مجھے جھوٹ بولنے میں مطلق تامل نہ ہوگا۔ میں ہر ایک فعل کو اس کے اسباب تحریک کے اعتبار سے دیکھتا ہوں۔ جس سے دوسروں کا بھلا ہو وہی سچ ہے۔ جس سے دوسروں کو نقصان ہو وہی جھوٹ ہے۔“

دینا ناتھ کو کوئی جواب نہ سوجھا' اگر سیٹھ جی کا قول صحیح ہے اور اس تحریف سے ایک سو آدمیوں کی روزی قائم رہ سکتی ہے تو اسے جعل کرنا پڑے گا۔ یہ جعل نہیں ناگوار فرض ہے۔ اگر ضمیر کا خون بھی ہوتا ہے تو اتنے آدمیوں کی بہتری کے لئے اس کا خون بھی کرنا پڑے گا لیکن ضمیر کو سمجھا لینے کے بعد اسے اپنے مواخذہ کا خیال آیا۔ قانون کی نظر میں تو جعل جعل ہے خواہ کسی نیت سے کیا جائے۔

بولا۔ ”لیکن کہیں یہ راز کھل گیا تو مجھے تو سزا ہو جائے گی۔ چودہ سال کا کالا پانی رکھا ہوا ہے۔“

سیٹھ جی نے زور سے قہقہہ مارا۔ ”اگر راز کھل گیا تو تم نہ پھنسو گے میں پھنسوں گا۔ تم صاف انکار کر سکتے ہو۔“

”تحریر میں کچھ نہ کچھ امتیاز تو رہے گا۔“

”پتہ ہی کیسے چلے گا کہ کونسا صفحہ بدلا گیا ہے' اگر تحریروں میں کچھ امتیاز ہے بھی تو نا قابلِ احساس۔“

دینا ناتھ لاجواب ہو گیا' اسی وقت اس صفحہ کو نئے اعداد کے مطابق لکھنے لگا۔

پھر بھی دینا ناتھ کے دل میں چور بیٹھا ہوا تھا۔ گوری کو اس نے شریک راز نہ کیا۔

ایک مہینہ بعد اس کی ترقی ہو گی۔ سو روپے ملنے لگے۔ دو سو بونس کے بھی ملے۔

یہ سب کچھ ہوا' گھر میں فارغ البالی کے آثار نظر آنے لگے لیکن دینا ناتھ کا مجرم ضمیر ایک بوجھ سے دبا رہتا تھا۔ جن دلیلوں سے سیٹھ جی نے اس کی زبان بند کر دی تھی' ان دلیلوں سے گوری کی زبان بند کر دینے کا یقین اسے نہ تھا۔ اب خود اسے ان دلیلوں کا اصلی پہلو نظر آنے لگا تھا۔ اس کی خدا پرستی' روحانی تقویت کے بدلے اسے پاگل کرتی رہتی تھی۔ قہر الٰہی کا خوف اس کے دل میں سمایا رہتا تھا۔ اس گناہ کی سزا اسے ضرور ملے گی۔ کسی توبہ' کسی کفارہ سے وہ اس سزا سے بچ نہیں سکتا۔ ابھی نہ ملے' سال دو سال نہ ملے' دس پانچ سال نہ ملے لیکن جتنی ہی دیر میں ملے گی اتنی ہی خوفناک ہو گی۔ زر اصل سود کے ساتھ بڑھتا جائے گا۔ وہ اکثر پچھتاتا تھا۔ میں سیٹھ جی کی ترغیب میں کیوں آ گیا۔ کارخانہ ٹوٹتا یا رہتا' میری بلا سے' مجھے تو یہ روحانی خلش نہ ہوتی لیکن اب تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور سزا ضرور ملے گی۔ اس خوف سے اس کا سکون قلب' اس کی طبعی بشاشت' اس کی زندہ دلی رخصت ہو گئی۔ اب وہ گنہگار تھا جس کا فرد جرم جلی حرفوں میں اس کی نظروں کے سامنے لٹکتا رہتا تھا۔ وہ ایک پل بھی اس کی طرف سے آنکھیں بند نہ کر سکتا تھا۔

ملیریا پھیلا ہوا تھا۔ بچے کو بخار آنے لگا۔ دیناناتھ کی جان ناخن میں سما گئی۔ کہاں جائے' کیا کرے جیسے عقل سلب ہو گئی ہو۔

گوری نے کہا۔ "جاکر کوئی دوا لاؤ یا کسی ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ تین دن تو ہو گئے۔"

دیناناتھ نے تشویشناک انداز سے جواب دیا۔ "ہاں جاتا ہوں لیکن مجھے بڑا اندیشہ ہو رہا ہے۔"

"اندیشہ کی کون سی بات ہے۔ بے بات کی بات منہ سے نکالتے ہو۔ آج کل کسے بخار نہیں آتا؟"

"ایشور اتنا بے رحم کیوں ہے۔"

ایشور بے رحم ہے گنہگاروں کے لئے ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے؟"

"کیا ایشور گنہگاروں کو بھی معاف نہیں کرتا؟"

"گنہگاروں کو سزا نہ ملے تو دنیا میں کوئی زندہ نہ رہنے پائے۔"

"لیکن آدمی ایسے کام بھی تو کرتا ہے جو ایک خیال سے گناہ ہو سکتے ہیں' دوسرے خیال سے عین ثواب۔"

"میں نہیں سمجھی!"

"مان لو میرے جھوٹ بولنے سے کسی کی جان بچتی ہو' تو وہ گناہ ہے؟"

"میں سمجھتی ہوں ایسا جھوٹ ثواب ہے۔"

دیناناتھ کو تھوڑی دیر کے لئے سکون ہو گیا۔ ڈاکٹر کو بلا لایا' علاج شروع کیا' ایک ہفتہ میں بچہ بھلا چنگا ہو گیا۔

مگر تھوڑے ہی دن بعد وہ خود بیمار پڑا۔ اب کے ضرور اس پر خدا کا قہر نازل ہوا ہے اور وہ جانبر نہیں ہو سکتا۔ معمولی فصلی بخار تھا لیکن دیناناتھ کے خوفِ سزا نے اسے سرسام کی صورت دے دی۔ بخار میں حالت نشہ کی طرح یوں ہی واہمہ بہت بلند پرواز ہو جایا کرتا ہے۔ پہلے جو محض ایک وہم تھا وہ شکل حقیقت بن بیٹھا۔ تخیل نے موت کے فرشتے بنا کر کھڑے کر دیئے۔ ان کے بھالے اور کوہ نما گرز بنا ڈالے۔ دوزخ کے اگنی کنڈ دہکا دیئے۔ ڈاکٹر کی ایک گھونٹ ایک ایک ہزار من کے گرز کی چوٹ اور آگ کے ابلتے ہوئے سمندر کی جلن پر کیا اثر کرتی۔ دیناناتھ وہم پرست نہ تھا۔ پرانوں کے دوراز قیاس قصوں پر اسے مطلق ایمان نہ تھا' نہ ہی معقولات کا دلدادہ تھا اور خدا پر بھی اسے ایسی وقت یقین آیا جب اس کی عقل نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا لیکن ایشور آیا تو اس کے ساتھ رحم بھی آیا قہر بھی آیا۔ رحم کی بدولت اسے روزی ملی۔ خدا کا رحم نہ ہوتا تو شاید وہ بھوکوں مر جاتا۔ لیکن رحم کی صورت کتنی کمزور اور حقیر ہے۔ قہر کی صورت کتنی ہیبت ناک۔ بھوکوں مر جانا' اگن کنڈ میں دھکیل دیئے جانے کی نسبت کتنا آسان ہے۔ بالکل کھیل ہے۔ سزا کا تخیل بزرگوں سے متوارث ہوتے ہوتے اتنا راسخ ہو گیا تھا گویا اس کی روح اور عقل کا ایک جزو ہو گیا ہو۔ اس کا استدلال اس کے جمے ہوئے تاثرات پر سمندر کی اونچی لہروں کی طرح آتا تھا اور انہیں ایک لمحہ کے لئے غرقاب کر کے پھر لوٹ جاتا تھا اور وہ پہاڑ جوں کا توں کھڑا رہ جاتا۔

زندگی باقی تھی بچ گیا۔ طاقت آتے ہی دفتر جانے لگا۔

ایک دن گوری بولی۔ "جب تم بیمار تھے تو ایک دن تمہاری حالت بہت نازک ہو گئی تھی اور میں نے گھبرا کر بھگوان سے منوتی کی تھی کہ اگر یہ اچھے ہو جائیں گے تو پچاس براہموں کا بھوجن کراؤں گی۔ دوسرے ہی دن تمہاری حالت سنبھلنے لگی۔ ایشور نے میری عرض سن لی۔ آج بازار سے سامان لا دو تو وہ مانتا پوری کر دوں۔ پچاس براہموں کو نیوتہ دو گے تو سو ضرور ہی آئیں گے۔ پچاس کنگلے بھی سمجھ لو اور دوستوں میں بھی پچیس نکل ہی آئیں

گے۔ دو سو آدمیوں کا تخمینہ ہے۔ میں جنس کی مقدار لکھے دیتی ہوں۔"

دیناناتھ نے پیشانی پر بل ڈال کر کہا۔ "تو تمہارا خیال ہے' میں ایشور کے رحم سے اچھا ہو گیا۔"

"اور کیسے اچھے ہوئے؟"

"اچھا ہوا اس لیے کہ زندگی باقی تھی۔"

"ایسی باتیں نہ کرو' مانتا پوری کرنی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں۔ میں بھگوان کو رحیم نہیں سمجھتا۔"

"اور کیا بھگوان بے رحم اور ظالم ہے۔"

"اس سے زیادہ بے رحم اور سنگدل ہستی دنیا میں نہ ہوگی جو اپنے بنائے ہوئے کھلونوں کو ان کی غلطیوں اور حماقتوں کی سزا یہ دے کہ انہیں دوزخ کے اگن کنڈ میں دھکیل دے' وہ بھگوان رحیم نہیں ہو سکتا۔ ایسے بھگوان کے تخیل ہی سے میری روح کو لرزہ آتا ہے۔ محبت کی دنیا سب سے بڑی طاقت کہی گئی ہے' عقلمندوں نے محبت ہی کو زندگی کی اور دنیا کی علت قرار دیا ہے۔ برتاؤ میں نہ سہی' تخیل میں سہی۔ محبت ہی ہماری زندگی کی حقیقت ہے۔ مگر تمہارا ایشور اپنے قہر اور عذاب کے خوف سے دنیا پر حکومت کرتا ہے' پھر اس میں اور معمولی انسان میں کیا فرق ہوا۔ ایسے ایشور کی عبادت میں نہیں کرنا چاہتا' نہیں کر سکتا۔ جو لوگ موٹے ہیں ان کے لیے رحیم ہوگا' کیونکہ وہ دنیا کو اس کی رحیمی کی بدولت لوٹتے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو ایشور کی دیا کہیں نظر نہیں آتی۔ ہاں اس کی سزا کا خوف قدم قدم پر کھڑا گھورا کرتا ہے۔ یہ مت کرو' نہیں تو ایشور سزا دے گا۔ وہ مت کرو' نہیں دوزخ میں جاؤ گے۔ ایسے ایشور سے کم از کم مجھے عقیدت نہیں ہو سکتی۔ محبت سے حکومت کرنا انسانیت ہے۔ خوف سے حکومت کرنا بربریت ہے۔ ایسے قہار جبار خدا سے تو خدا کا نہ رہنا کہیں اچھا ہے۔ اسے دل سے نکال کر میں اس کے رحم اور اس کے قہر دونوں ہی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ ایک کلمۂ سخت برسوں کے پریم کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ میں تمہارے اوپر برابر جان دیتا رہتا ہوں' لیکن کسی ایک دن طعنہ دے دوں تو تم میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہ کرو گی۔ ایسی پر عذاب زندگی کے لیے میں کسی ایشور کا احسان نہیں لینا چاہتا۔ اگر تم نے براہمنوں کے بھوج پر زور دیا تو میں زہر کھا لوں گا۔"

گوری اس کے چہرہ کی طرف خوف زدہ نظروں سے تکتی رہ گئی۔

فریب

(1)

دنیا میں اگر کوئی شخص ایسا ہوتا جس کی نگاہ لوگوں کے اندر گھس سکتی تو ایسے بہت کم لوگ ہوتے جو اس کے سامنے سیدھی آنکھیں کر کے دیکھ سکتے۔ مہلا آشرم کی جگنو بائی کے متعلق لوگوں کو ایسی ہی نگاہ رکھنے کا گمان تھا۔ وہ ناخواندہ غریب بوڑھی عورت تھی مسکین صورت' لیکن جیسے کسی ہوشیار پروف ریڈر کی نگاہ غلطیوں ہی پر جا پڑتی

ہے'اس کی آنکھیں بھی باطن کے داغوں پر جا پڑتی تھیں۔ شہر میں ایسی کوئی سر بر آوردہ خاتون نہ تھی جس کے متعلق دو چار راز کی باتیں اسے نہ معلوم ہوں۔ اس کا پست قد' نحیف جسم' سفید بال اور پُر شکن چہرہ اس کی جانب سے حسنِ ظن پیدا کرتے تھے۔ مہلائیں اسے اپنا محرمِ راز بنا لیتی تھیں اور ہمیشہ کے لیے اس کے دام میں پھنس جاتی تھیں۔ جس پر وہ ایک بار قابو پا لیتی اُس پر ہمیشہ سختی سے حکومت کرتی۔ اس کا کام مہلا آشرم میں عورتوں کی خدمت تواضع کرنا تھا جس میں انہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ لیکن دیویاں اس کی صورت سے کانپتی تھیں۔ اس کا ایسا رعب تھا کہ جوں ہی وہ کمرے میں قدم رکھتی لبوں پر آئی ہنسی جیسے رو پڑتی تھی۔ چہکنے والی آوازیں خاموش ہو جاتی تھیں۔ گویا اس کے چہرے پر دیویوں کو اپنے پچھلے کارنامے لکھے نظر آتے ہوں۔ پچھلے کارنامے' کون ہے جو اپنے پچھلے کارناموں کو کسی خونخوار درندے کی طرح پنجرے میں بند کر کے نہ رکھنا چاہتا ہو۔ وہ راز جو پہلے ایک کیڑے کی طرح حقیر اور کم بضاعت تھا' دنوں کے ساتھ جسیم اور خوفناک ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم اس کی یاد ہی سے کانپ اٹھتے ہیں اور اگر اپنے ہی کارناموں کی بات ہوتی تو زیادہ تر عورتیں جگنو سے اجتناب کرتیں مگر یہاں تو سسرال اور ننھیال چاروں طرف کی حفاظت کرنی پڑتی تھی اور جس قلعہ میں اس قدر دروازے ہوں اس کی حفاظت کون کر سکتا ہے۔ وہاں تو حملہ آور کے سامنے سر جھکا دینے میں ہی خیریت ہے۔ جگنو کے دل میں ہزاروں مردے دفن تھے۔ جب ضرورت پڑتی اکھاڑ لیتی۔ جہاں کسی عورت نے دُون کی لی یا شان دکھلائی وہیں جگنو کی تیوریاں بدلیں۔ اس کی ایک کڑی نگاہ اچھے اچھوں کو سیدھا کر دیا کرتی تھی۔ مگر مستورات اس سے نفرت کرتی ہوں' یہ بات نہ تھی۔ سبھی بڑے چاؤ سے اس سے ملتیں اور اس کی آؤ بھگت کرتیں۔ اپنے ہمسایوں کی بدنامی سے ہمیشہ لوگوں کو دلچسپی کا سامان ہی رہا ہے اور جگنو کے پاس اس کی کمی نہ تھی۔

(2)

شہر میں اندومتی مہلا پاٹھ شالا نام کا ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول تھا۔ حال ہی میں مس خورشید اس کی ہیڈ مسٹرس ہو کر آئی تھیں۔ شہر میں مستورات کا دوسرا کلب نہ تھا۔ مس خورشید ایک دن آشرم میں تشریف لائیں۔ ایسی اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ کوئی دوسری عورت آشرم میں نہ تھی۔ ان کی بڑی مدارات ہوئی۔ پہلے ہی دن معلوم ہو گیا کہ مس خورشید کی آمد سے آشرم میں جان سی پڑ جائے گی۔ کچھ اس طرح دل کھول کر ہر ایک سے ملیں' کچھ ایسی دلچسپ باتیں کیں کہ تمام عورتیں فریفتہ ہو گئیں۔ گانے میں ہوشیار تھیں۔ تقریر بھی خوب کرتی تھیں اور ناٹک کے پارٹ ادا کرنے میں تو انہوں نے لندن میں خاص نام پیدا کیا تھا۔ ایسی ہمہ صفت موصوف خاتون کی آمد آشرم کی خوش قسمتی تھی۔ گلابی گورا رنگ' نازک اندام' نرگسی آنکھیں' نئے فیشن کے کٹے ہوئے بال' ایک ایک عضو سانچے میں ڈھلا ہوا' خوبصورتی کی اس سے اچھی تصویر کسی نے کم دیکھی ہو گی۔

چلتے وقت مس خورشید نے مسز ٹنڈن سے جو آشرم کی انچارج تھیں بلا کر پوچھا۔

"وہ بڑھیا کون ہے؟"

جگنو کئی مرتبہ کمرے میں آ کر مس خورشید کو متجسس نگاہوں سے دیکھ چکی تھی۔ جیسے کوئی شہسوار نئی گھوڑی کو دیکھ رہا ہو۔

مسز ٹنڈن نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یہ اوپر کا کام کرنے پر نوکر ہے' کوئی کام ہو تو بلاؤں۔"
مس خورشید نے شکریہ ادا کر کے کہا' "جی نہیں کوئی کام نہیں' مجھے چالباز معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی دیکھ رہی ہوں یہاں پر وہ نوکر نہیں بلکہ مالکہ ہے۔"
مسز ٹنڈن تو جگنو سے جلی بیٹھی ہی تھی۔ ان کی بیوگی پر داغ لگانے کے لیے وہ سدا سہاگن کہا کرتی تھی۔ مس خورشید سے اس کی جتنی برائی ہو سکی وہ کی اور اسے خبر دار رہنے کا مشورہ دیا۔
مس خورشید نے سنجیدگی سے کہا۔ "تب تو خوفناک عورت ہے' جبھی سبھی عورتیں اس سے کانپتی ہیں۔ آپ اسے نکال کیوں نہیں دیتیں۔ ایسی چڑیل کو ایک دن بھی نہ رکھنا چاہیے۔"
مسز ٹنڈن نے اپنی مجبوری ظاہر کر دی۔ "نکال کیسے دوں' زندگی مشکل ہو جائے۔ ہماری قسمت اس کی مٹھی میں ہے۔ آپ پر دو چار دنوں میں اس کے جوہر کھلیں گے۔ میں تو ڈرتی ہوں کہیں آپ بھی اس کے پنجے میں نہ پھنس جائیں۔ اس کے سامنے بھول کر بھی کسی مرد سے بات نہ کیجئے گا۔ اس کے مخبر نہ جانے کہاں کہاں لگے ہوئے ہیں۔ نوکروں سے مل کر بھید یہ لے۔ ڈاکیوں سے مل کر خط یہ دیکھے۔ لڑکیوں کو پھسلا کر گھر کا حال یہ پوچھے۔ اس رانڈ کو تو خفیہ پولیس میں بھرتی ہونا چاہیے تھا۔ یہاں نہ جانے کیوں آمری۔"
مس خورشید فکر میں ڈوب گئیں' گویا اس عقدہ کو حل کرنے کی ترکیب سوچ رہی ہو۔ ایک لمحہ بعد بولیں۔ "اچھا میں اسے ٹھیک کروں گی۔"
مسز ٹنڈن۔ "نکال دینے سے کیا ہو گا' اُس کی زبان تو بند نہ ہو گی' تب اور بھی نڈر ہو کر کیچڑ اچھالے گی۔"
مس خورشید نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ "میں اس کی زبان بھی بند کر دوں گی' بہن آپ دیکھ لیجئے گا' ٹکے کی عورت یہاں راج کر رہی ہے' میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔"
وہ چلی گئیں تو مسز ٹنڈن نے جگنوں کو بلا کر کہا۔ "ان نئی مس صاحبہ کو دیکھا یہاں پرنسپل ہیں۔"
جگنو نے بغض بھرے ہوئے لہجہ میں کہا۔ "آپ دیکھیں' میں ایسی سینکڑوں چھوکریاں دیکھ چکی ہوں' آنکھ کا پانی جیسے مر گیا ہو۔"
مسز ٹنڈن۔ "آہستہ بولو' تمہیں کچا ہی کھا جائیں گی۔ ان سے ڈرتی رہنا۔ کہہ گئی ہیں میں اسے ٹھیک کر کے چھوڑوں گی۔ میں نے سوچا تمہیں خبر دار کر دوں۔ ایسا نہ ہو اس کے سامنے کچھ ایسی ویسی بات کہہ بیٹھو۔"
جگنو نے گویا تلوار کھینچ کر کہا۔ "مجھے خبر دار کرنے کی ضرورت نہیں' انہیں خبر دار کر دیجئے گا۔ یہاں کا آنا بند نہ کر دوں تو اپنے باپ کی نہیں۔ وہ گھوم کر دنیا دیکھ آئی ہے' تو یہاں گھر بیٹھے دنیا دیکھ چکی ہوں۔"
مسز ٹنڈن نے پیٹھ ٹھونکی۔ "میں نے سمجھا دیا بھئی۔ آگے تم جانو تمہارا کام۔"
جگنو: "آپ چپ چاپ دیکھتے جائیے' کیسا تگنی کا ناچ نچاتی ہوں۔ اس نے اب تک بیاہ کیوں نہیں کیا' عمر تو تیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔"
مسز ٹنڈن نے رڈا جمایا۔ "کہتی ہیں' میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ کسی مرد کے ہاتھوں اپنی آزادی کیوں بیچوں۔"
جگنو نے آنکھ نچا کر کہا۔ "کوئی پوچھتا ہی نہ ہو گا۔ ایسی بہت سی کنواریاں دیکھ چکی ہوں۔ ستر چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔"

اتنے میں اور کوئی مستورات آ گئیں اور بات کا سلسلہ بند ہو گیا۔

دوسرے روز جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی۔ اتفاق سے مس خورشید ہوا کھانے گئی ہوئی تھیں۔ خانساماں نے پوچھا۔ "کہاں سے آئی ہو؟"

جگنو۔ "یہیں رہتی ہوں بیٹا' میم صاحبہ کہاں سے آئی ہیں۔ تم تو ان کے پرانے نوکر ہو گے۔"

خانساماں۔ "ناگپور سے آئی ہیں۔ میرا گھر بھی وہیں ہے۔ دس سال سے ان کے ساتھ ہوں۔"

جگنو۔ "کسی اونچے خاندان کی ہوں گی۔ وہ تو رنگ ڈھنگ سے ہی معلوم ہوتا ہے۔"

خانساماں۔ "خاندان تو کچھ ایسا اونچا نہیں ہے۔ ہاں تقدیر کی اچھی ہیں۔ ان کی ماں ابھی تک مشن میں تیس روپیہ پاتی ہیں۔ یہ پڑھنے میں تیز تھیں۔ وظیفہ مل گیا' ولایت چلی گئیں۔ بس تقدیر کھل گئی۔ اب تو اپنی ماں کو بلانے والی ہیں۔ لیکن وہ بڑھیا شاید ہی آوے یہ گرجے ورجے نہیں جاتیں۔ اس سے دونوں میں پٹتی نہیں۔"

جگنو۔ "مزاج کی تیز معلوم ہوتی ہیں۔"

خانساماں۔ "نہیں مائی بہت نیک ہیں۔ ہاں گرجے نہیں جاتیں۔ تم کیا نوکری کی تلاش میں ہو۔ کرنا چاہتی ہو تو کر لو۔ ایک آیا رکھنا چاہتی ہیں۔"

جگنو۔ "نہیں بیٹا اب میں نوکری کیا کروں گی۔ اس بنگلہ میں پہلے جو میم صاحبہ رہتی تھیں وہ مجھ پر بہت مہربان تھیں۔ میں نے سمجھا چلو نئی میم صاحبہ کو دعا دے آؤں۔"

خانساماں۔ "یہ دعا لینے والی میم صاحبہ نہیں ہیں۔ ایسوں سے بہت چڑتی ہیں۔ کوئی مانگنے والا آیا اور اسے ڈانٹ بتائی۔ کہتی ہیں بنا کام کئے کسی کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ بھلا چاہتی ہو تو چپکے سے راہ لو۔"

جگنو۔ "تو یہ کہو ان کا کوئی دھرم کرم نہیں ہے۔ پھر بھلا غریبوں پر کیوں رحم کرنے لگیں۔"

جگنو کو اپنی دیوار کھڑی کرنے کے لئے کافی مصالحہ مل گیا۔ نیچ خاندان کی ہیں۔ ماں سے نہیں بنتی۔ دھرم کرم سے خالی ہیں۔ پہلے دھاوے میں اتنی کامیابی کچھ کم نہ تھی۔ چلتے چلتے خانساماں سے اتنا اور پوچھا۔ "ان کے صاحب کیا کرتے ہیں؟"

خانساماں نے مسکرا کر کہا۔ "ان کی تو ابھی شادی ہی نہیں ہوئی۔ صاحب کہاں ہوں گے؟"

جگنو نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "ارے اب تک بیاہ نہیں کیا۔ ہمارے یہاں تو دنیا ہنسنے لگے۔"

خانساماں۔ "اپنا اپنا رواج ہے۔ ان کے ہاں کتنی ہی عورتیں عمر بھر بیاہ نہیں کرتیں۔"

جگنو نے افسردہ دلی سے کہا۔ "ایسی کنواریاں تو میں بہت دیکھ چکی ہوں۔ ہماری برادری میں کوئی اس طرح رہے تو تھڑی تھڑی ہو جائے۔ لیکن ان کے ہاں جو جی میں آئے کرو' کوئی نہیں پوچھتا۔"

اتنے میں مس خورشید آ پہنچیں۔ گلابی جاڑا پڑنے لگا تھا۔ مس صاحبہ ساڑھی کے اوپر اوور کوٹ پہنے ہوئے تھیں۔ ایک ہاتھ میں چھاتا تھا' دوسرے میں کتے کی زنجیر۔ نسیم سحری میں ورزش نے گالوں کو تازہ اور سرخ بنا دیا تھا۔ جگنو نے جھک کر سلام کیا۔ پر انہوں نے اسے دیکھ کر بھی نہ دیکھا۔ اندر جا کر خانساماں کو بلا کر پوچھا۔ "یہ عورت کیا کرنے آئی ہے۔"

خانساماں نے جوتے کا فیتہ کھولتے ہوئے کہا۔ "بھکارن ہے حضور' پر عورت سمجھدار ہے۔ میں نے کہا یہاں نوکری کرو گی تو راضی نہیں ہوئی۔ پوچھنے لگی۔ ان کے صاحب کیا کرتے ہیں۔ جب میں نے بتایا تو اسے بڑا

تعجب ہوا اور ہونا ہی چاہیے۔ ہندوؤں میں تو دودھ پیتی بچیوں تک کا بیاہ ہو جاتا ہے۔"
خورشید نے سوال کیا۔ "اور کیا کہتی تھی؟"
"اور تو کوئی بات نہیں حضور!"
"اچھا اسے میرے پاس بھیج دو۔"

(4)

جگنو نے جوں ہی کمرے میں قدم رکھا' مس خورشید نے کرسی سے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ "آیئے ماں جی' میں ذرا سیر کرنے چلی گئی تھی۔ آپ کے آشرم میں تو سب خیریت ہے؟"
جگنو ایک کرسی کا تکیہ پکڑ کر کھڑے کھڑے بولی۔ "سب خیریت ہے' مس صاحبہ! میں نے کہا آپ کو دعائیں دے آؤں۔ میں آپ کی لونڈی ہوں' جب کوئی کام پڑے مجھے یاد کیجئے گا۔ یہاں اکیلے تو حضور کو اچھا نہ لگتا ہو گا۔"
مس۔ "مجھے اپنی اسکول کی لڑکیوں کے ساتھ بڑا لطف حاصل ہوتا ہے۔ وہ سب میری ہی لڑکیاں ہیں۔"
جگنو نے مادرانہ انداز سے سر ہلا کر کہا۔ "یہ ٹھیک ہے مس صاحبہ پر اپنا اپنا ہی ہے' دوسرا اپنا ہو جائے تو اپنوں کے لئے کوئی کیوں روئے؟
اچانک ایک خوبصورت نوجوان ریشمی سوٹ ڈانٹے اندر داخل ہوا۔ مس خورشید نے اس طرح دوڑ کر اس کا استقبال کیا' گویا جامہ میں پھولی نہ سماتی تھی۔ جگنو اسے دیکھ کر کونے میں دبک گئی۔
خورشید نے نوجوان سے گلے مل کر کہا۔ "پیارے! میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔" (جگنو سے) "ماں جی! آپ جائیں' پھر کبھی آنا' یہ میرے پیارے دوست ولیم کنگ ہیں۔ ہم دونوں بہت دنوں تک ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔"
جگنو چپکے سے نکل کر باہر چلی آئی۔ خانساماں کھڑا تھا۔ پوچھا۔ "یہ لونڈا کون ہے؟"
خانساماں نے سر ہلایا۔ "میں نے اسے آج ہی دیکھا ہے' شاید کنوار پن سے دل بھر گیا۔ اچھا طرح دار جوان ہے!"
جگنو۔ "دونوں اس طرح ٹوٹ کر گلے ملے ہیں کہ میں تو شرم کے مارے گڑ گئی۔ دونوں لپٹ گئے۔ لونڈا تو مجھے دیکھ کر کچھ جھجکا بھی' پر تمہاری مس صاحبہ تو جیسی متوالی ہو گئی تھیں۔"
خانساماں نے کہا۔ "مجھے تو کچھ بے ڈھب معاملہ نظر آتا ہے۔"
جگنو تو یہاں سے سیدھی مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی۔ ادھر مس خورشید اور نوجوان میں باتیں ہونے لگیں۔
مس خورشید نے قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم نے اپنا پارٹ خوب کھیلا' لیلا! بڑھیا سچ مچ چندھیا گئی۔"
لیلا۔ "میں تو ڈر رہی تھی کہیں بھانپ نہ جائے۔"
مس خورشید۔ "مجھے یقین تھا وہ آج ضرور آئے گی۔ میں نے دور ہی سے اسے برآمدے میں دیکھا اور تمہیں اطلاع دی۔ آج آشرم میں بڑے مزے رہیں گے۔ جی چاہتا ہے عورتوں کی کانا پھوسیاں سنوں۔ دیکھ لینا سب ہی اس کی باتوں پر یقین کر لیں گی۔"

لیلا۔ ''تم بھی جان بوجھ کر دلدل میں پاؤں رکھ رہی ہو!''
مس خورشید۔ ''مجھے ناٹک کھیلنے میں بڑا مزا آتا ہے بہن! ذرا دل لگی رہے گی! بڑھیا نے بڑا ظلم ڈھا رکھا ہے۔ ذرا اسے سبق دینا چاہتی ہوں۔ کل تم اسی وقت اسی ٹھاٹھ سے پھر آ جانا۔ بڑھیا کل پھر آئے گی۔ اس کے پیٹ میں پانی نہ ہضم ہو گا۔ جس وقت آئے گی تمہیں خبر کر دوں گی۔ بس تم چھیلا بنی پہنچ جانا۔''

(5)

آشرم میں اس دن جگنو کو دم مارنے کی فرصت نہ تھی۔ اس نے سارا حال مسز ٹنڈن سے کہا۔ مسز ٹنڈن دوڑی ہوئی آشرم میں پہنچی اور دوسری عورتوں کو خبر سنائی۔ جگنو اس کی تصدیق کرنے کے لئے بلائی گئی۔ جو عورت آتی وہ جگنو کے منہ سے یہ کہانی سنتی۔ ہر ایک ریہرسل میں کچھ نہ کچھ رنگ چڑھ جاتا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہوتے ہوتے سارے شہر کے مہذب حلقوں میں یہ خبر پھیل گئی۔
ایک عورت نے پوچھا۔ ''یہ آدمی کون ہے؟''
مسز ٹنڈن۔ ''سنا ہے ان کے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ دونوں میں پہلے سے کچھ بات چیت رہی ہو گی۔ وہی تو میں کہتی تھی کہ اتنی عمر ہو گئی' یہ کنواری کیسے بیٹھی ہے۔ اب قلعی کھلی۔''
جگنو۔ ''اور کچھ ہو یا نہ ہو جوان تو بانکا ہے۔''
مسز ٹنڈن۔ ''یہ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا حال ہے۔''
جگنو۔ ''میں تو ان کی صورت دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی۔ دھوپ میں بال سفید نہیں کئے۔''
ٹنڈن۔ ''کل پھر جانا۔''
جگنو۔ ''کل نہیں میں آج ہی رات کو جاؤں گی۔'' لیکن رات کو جانے کے لئے کوئی بہانہ ضروری تھا۔ مسز ٹنڈن نے آشرم کے لئے ایک کتاب منگوا بھیجی۔ رات کے 9 بجے جگنو مس خورشید کے بنگلہ پر پہنچی۔ اتفاق سے اس وقت لیلاوتی وہاں موجود تھی۔ بولی۔ ''یہ بڑھیا تو بے طرح پیچھے پڑی!''
خورشید۔ ''میں نے تم سے کہا تھا' اس کے پیٹ میں پانی نہ پچے گا۔ تم جا کر روپ بھر آؤ تب تک میں اسے باتوں میں لگاتی ہوں۔ شرابیوں کی طرح اول جلول بکنا شروع کر دینا۔ بس یوں بن جانا جیسے اپنے ہوش میں نہیں ہو۔''
لیلا مشن میں ڈاکٹر تھی۔ اس کا بنگلہ بھی پاس ہی تھا۔ وہ چلی گئی تو مس خورشید نے جگنو کو بلایا۔
جگنو نے ایک پرزہ دے کر کہا۔ ''مسز ٹنڈن نے یہ کتاب مانگی ہے۔ مجھے آنے میں دیر ہو گئی۔ میں اس وقت آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ پر سویرے ہی وہ مجھ سے مانگے گی۔ ہزاروں روپیہ مہینے کی آمدنی ہے مس صاحبہ مگر ایک ایک کوڑی دانت سے پکڑتی ہے۔ ان کے دروازہ پر بھکاری کو بھیک نہیں ملتی۔''
مس خورشید نے پرزہ دیکھ کر کہا۔ ''اس وقت تو یہ کتاب نہیں مل سکتی صبح لے جانا۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ بیٹھو میں ابھی آتی ہوں۔''
وہ پردہ اٹھا کر پیچھے کے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں سے کوئی پندرہ منٹ میں ایک خوبصورت ریشمی ساڑھی پہنے عطر میں بسی ہوئی منہ پر پاؤڈر لگائے نکلی۔ جگنو نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ او' یہ سنگار شاید اس وقت وہ لونڈا

آنے والا ہوگا' تب ہی یہ تیاریاں ہیں ورنہ سونے کے وقت کنواریوں کو بناؤ سنگار کی کیا ضرورت۔ جگنو کی رائے میں عورتوں کے بناؤ سنگار کا صرف ایک ہی مدعا تھا۔ خاوند کو لبھانا' اس لئے سہاگنوں کے سوا سنگار سب کے لئے منع تھا۔
ابھی خورشید کرسی پر بیٹھنے بھی نہ پائی تھی کہ جوتے کا چرمر سنائی دیا۔ اور ایک منٹ میں ولیم کنگ نے کمرہ میں قدم رکھا۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور کپڑوں سے شراب کی بو آرہی تھی۔ وہ مس خورشید سے لپٹ گیا۔

مس خورشید نے اپنے کو اس کے چنگل سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "چلو ہٹو شراب پی کر آئے ہو!"

کنگ نے شرابیوں کی طرح کہا۔ "آج تمہیں بھی پلاؤں گا۔"

مس خورشید نے اس طرح جگنو کی موجودگی کا اشارہ کیا کہ جگنو کی نظر پڑ جائے۔ پر کنگ نشہ میں مست تھا' جگنو کی طرف دیکھا ہی نہیں۔

مس خورشید نے غصہ سے اپنے کو الگ کر کے کہا۔ "یہ کیا بیہودگی ہے' چلو' ہٹو۔"

کنگ۔ "اتنے دنوں سے چوروں کی طرح آتا ہوں' آج سے میں کھلے خزانے آؤں گا۔"

خورشید۔ "تم تو پاگل ہو رہے ہو' دیکھتے نہیں کمرہ میں کون بیٹھا ہوا ہے۔"

کنگ نے حیران ہو کر جگنو کی طرف دیکھا اور جھک کر بولا۔ "یہ بڑھیا یہاں کب آئی۔ تو یہاں کیوں آئی' بڑھی شیطان کی بچی۔ یہاں بھید لینے آئی ہے۔ ہم کو بدنام کرنا چاہتی ہے۔ میں تیرا گلا گھونٹ دوں گا۔"

جگنو بلی کی طرح کمرہ سے نکلی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگی۔ ادھر کمرے سے قہقہے اٹھ اٹھ کر کمرے کی چھت کو ہلانے لگے۔

جگنو اسی وقت مسز ٹنڈن کے گھر پہنچی۔ اس کے پیٹ میں بلبلے اٹھ رہے تھے مگر مسز ٹنڈن سو گئی تھیں۔ وہاں سے ناامید ہو کر اس نے کئی گھروں کی کنڈیاں کھٹکھٹائیں پر کوئی دروازہ نہ کھلا اور غریب کو ساری رات اسی طرح کاٹنی پڑی جیسے کوئی روتا ہوا بچہ گود میں ہو۔ صبح وہ آشرم میں جا کودی۔ کوئی آدھ گھنٹہ میں مسز ٹنڈن بھی آئیں۔ انہیں دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا۔

مسز ٹنڈن نے پوچھا۔ "رات کیا تم میرے گھر گئی تھیں۔ اس وقت مجھے مہاراج نے کہا۔"

جگنو نے بے پروائی سے کہا۔ "پیاسا ہی تو کنویں کے پاس جاتا ہے۔ مجھے آگ میں جھونک کر آپ دور ہٹ گئیں۔ بھگوان نے حفاظت کی نہیں تو کل جان ہی گئی تھی۔"

مسز ٹنڈن نے بے قراری سے کہا۔ "کیا ہوا' کچھ تو کہو' مجھے تم نے جگا کیوں نہ لیا۔ تم جانتی ہو میری عادت سویرے سو جانے کی ہے۔"

جگنو۔ "مہاراج نے گھر میں گھسنے ہی نہ دیا' جگا کیسے لیتی۔ آپ کو اتنا سوچنا چاہیے تھا کہ وہ وہاں گئی ہے تو آتی ہوگی۔ گھڑی بھر بعد ہی سوتیں تو کیا بگڑتا' پر آپ کو کسی کی کیا پروا؟"

مسز ٹنڈن۔ "تو کیا ہوا' مس خورشید مارنے دوڑیں؟"

جگنو۔ "وہ نہیں مارنے دوڑیں۔ ان کا وہ خصم مارنے دوڑا۔ لال لال آنکھیں نکالے آیا اور مجھ سے کہا نکل جا۔ جب تک میں نکلوں تب تک ہنٹر کھینچ کر دوڑ ہی تو پڑا۔ میں سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگتی تو کھال ادھیڑ ڈالتا اور وہ رانڈ بیٹھی تماشا دیکھتی رہی۔ دونوں میں پہلے سے ساز باز ہوگی۔ ایسی فاحشہ عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔ بازاری

عورت بھی اتنی بے شرم نہیں ہوتی۔"

ذرا دیر میں اور مستورات بھی آ پہنچیں۔ یہ حال سننے کے لئے سب ہی بے قرار تھیں۔ جگنو کی قینچی لگاتار چلتی رہی۔ مستورات کو اس پریم کتھا سے اتنا لطف حاصل ہو رہا تھا کہ کچھ نہ پوچھو۔ ایک ایک بات کو کرید کرید کر پوچھتی تھیں۔ گھر کے کام دھندے بھول گئیں۔ کھانے پینے کی سدھ بدھ نہ رہی اور ایک بار سن کر ان کا جی نہ بھرتا تھا۔ بار بار وہی کہانی سنتی تھیں اور نیا چٹخارہ لیتی تھیں۔

مسز ٹنڈن نے آخر کہا۔ "اس آشرم میں ایسی عورتوں کو لانا غیر واجب ہے۔ آپ لوگ اس سوال پر غور کریں۔"

مسز پانڈیا نے تائید کی۔ "ہم آشرم کو اپنے معیار سے گرانا نہیں چاہتے۔ میں تو کہتی ہوں ایسی عورت کسی بھی اسکول کی پرنسپل بننے کے لائق نہیں۔"

مسز بانگڑا نے فرمایا۔ "جگنو بائی نے ٹھیک کہا تھا۔ ایسی عورت کا منہ دیکھنا بھی پاپ ہے۔ اس سے صاف کہہ دینا چاہیے کہ آپ یہاں تشریف نہ لائیں۔"

ابھی یہی کھچڑی پک رہی تھی کہ آشرم کے سامنے ایک موٹر آ کر رکی۔ عورتوں نے سر اٹھا اٹھا کر دیکھا تو موٹر میں مس خورشید اور ولیم کنگ بیٹھے ہوئے تھے۔

جگنو نے منہ پھلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "وہی لونڈا ہے۔" عورتوں کا سارا جھنڈ چق کے سامنے آنے کے لئے بے چین ہو گیا۔

مس خورشید نے موٹر سے اتر کر ہڈ بند کر دیا اور آشرم کے دروازہ کی طرف چلیں۔ مستورات بھاگ بھاگ کر اپنی اپنی جگہ آ بیٹھیں۔

مس خورشید نے کمرہ میں قدم رکھا۔ کسی نے استقبال نہ کیا۔ مس خورشید نے جگنو کی طرف بے جھجک آنکھوں سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہئے بائی جی! رات آپ کو چوٹ تو نہیں آئی؟"

جگنو نے بہتیری دیدہ دلیر عورتیں دیکھی تھیں پر اس دیدہ دلیری نے اسے حیران کر دیا۔ چور ہاتھ میں چوری کا مال لئے شاہ کو للکار رہا ہے۔

جگنو نے اینٹھ کر کہا۔ "جی نہ بھرا ہو تو اب پٹوا دو، سامنے ہی تو ہیں۔"

خورشید۔ "وہ اس وقت اپنا قصور معاف کرانے آئے ہیں۔ رات وہ نشہ میں تھے۔"

جگنو نے مسز ٹنڈن کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اور آپ بھی کچھ کم نشہ میں نہیں تھیں۔"

خورشید نے مذاق سمجھ کر کہا۔ "میں نے آج تک کبھی نہیں پی، مجھ پر جھوٹا الزام مت لگاؤ۔"

جگنو نے لاٹھی ماری۔ "شراب سے بھی بڑی نشہ کی چیز ہے کوئی، وہ اسی کا نشہ ہو گا۔ ان صاحب کو پردہ میں کیوں ڈھانک دیا۔ یہ بھی تو ان کی صورت دیکھتیں۔"

مس خورشید نے شرارت کی۔ "صورت تو ان کی لاکھوں میں ایک ہے۔"

مسز ٹنڈن نے صاف صاف کہا۔ "نہیں ان کو یہاں لانے کی ضرورت نہیں۔ آشرم کو ہم بدنام نہیں کرنا چاہتے۔"

مسز خورشید نے ضد کی۔ "معاملے کو صاف کرنے کے لئے ان کا آپ لوگوں کے سامنے آنا ضروری ہے۔ یکطرفہ آپ فیصلہ کیوں کرتی ہیں۔"

مسز ٹنڈن نے ٹالنے کے لیے کہا۔ "یہاں کوئی مقدمہ تھوڑا ہی پیش ہے۔"

مس خورشید۔ "واہ میری عزت میں بٹا لگا جا رہا ہے۔ اور آپ کہتی ہیں کوئی مقدمہ نہیں ہے۔ مسٹر کنگ آئیں گے اور آپ کو ان کا بیان سننا ہوگا۔"

سوائے مسز ٹنڈن کے سب ہی عورتیں کنگ کو دیکھنے کے لیے بے قرار تھیں۔ کسی نے اختلاف نہ کیا۔

خورشید نے دروازہ پر آکر اونچی آواز میں کہا۔ "تم ذرا یہاں چلے آؤ۔"

پٹ کھلا اور مس لیلاوتی ریشمی ساڑھی پہنے مسکراتی ہوئی نکل آئیں۔

آشرم میں سناٹا چھا گیا۔ عورتیں حیران ہو کر دیوی لیلاوتی کو دیکھنے لگیں۔ جگنو نے آنکھیں چمکا کر کہا۔ "انہیں کہاں چھپا دیا آپ نے؟"

خورشید۔ "وہ چھو منتر سے اڑ گئے۔ جا کر گاڑی دیکھو۔"

جگنو لپک کر گاڑی کے پاس آگئی اور خوب دیکھ بھال کر منہ لٹکائے ہوئے لوٹی۔

مس خورشید نے پوچھا۔ "کیا ہوا، ملا کوئی؟"

جگنو۔ "میں یہ تریا چرتر کیا جانوں (لیلاوتی کو غور سے دیکھ کر) مردوں کو ساڑھی پہنا کر آنکھوں میں دھول جھونک رہی ہو۔ یہی تو ہیں وہ رات والے صاحب؟"

خورشید۔ "خوب پہچانتی ہو؟"

جگنو۔ "ہاں ہاں کیا اندھی ہوں؟"

مسز ٹنڈن۔ "کیا پاگلوں کی سی باتیں کرتی ہو جگنو، یہ تو ڈاکٹر لیلاوتی ہیں۔"

جگنو۔ (انگلی چمکا کر) "ارے جاؤ لیلاوتی ہیں۔ ساڑھی پہن کر عورت بنتے لاج بھی نہیں آتی۔ تم رات کو ان کے گھر تھے؟"

لیلاوتی نے مذاق کے لہجہ میں کہا۔ "میں کب انکار کر رہی ہوں۔ رات کو ولیم کنگ بن جاتی ہوں۔ اس میں بات ہی کیا ہے۔"

مستورات کو سچائی کی روشنی دکھائی دی۔ چاروں طرف قہقہے بلند ہوئے۔ کوئی تالیاں بجاتی تھی۔ کوئی ڈاکٹر لیلاوتی کی گردن میں لپٹی جاتی تھی۔ کوئی مس خورشید کی پیٹھ پر تھپکیاں دیتی تھی۔ کئی منٹ تک ہُو حق مچا رہا۔ جگنو کا منہ اس روشنی میں بالکل ذرا سا نکل آیا اور زبان بند ہو گئی۔ ایسا چرکا اس نے کبھی نہ کھایا تھا۔ اتنی ذلیل کبھی نہ ہوئی تھی۔

مسز مہرا نے ڈانٹ بتائی۔ "اب بولو دائی، لگی منہ پر سیاہی کہ نہیں۔"

مسز بانگڑا۔ "اسی طرح یہ سب کو بدنام کرتی ہے۔"

لیلاوتی۔ "آپ لوگ بھی تو جو یہ کہتی ہے اس پر یقین کر لیتی ہیں۔"

مس خورشید نے کہا۔ "ذرا اس سے پوچھو، میرے پیچھے کیوں پڑ گئی تھی۔"

مسز ٹنڈن نے پکارا۔ "جگنو کہاں ہے۔"

تلاش ہونے لگی۔ جگنو غائب۔
اس دن سے پھر کسی نے جگنو کی صورت نہیں دیکھی۔ آشرم کی تاریخ میں یہ معاملہ آج بھی مایۂ تفریح بنا ہوا ہے۔

لاٹری

(1)

جلدی سے مالدار بن جانے کی ہوس کسے نہیں ہوتی۔ ان دنوں جب فرنچ لاٹری کے ٹکٹ آئے تو میرے عزیز دوست بکرم سنگھ کے والد، چچا، بھائی، ماں سبھی نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا۔ کون جانے کس کی تقدیر زور کرے۔ روپے رہیں گے تو گھر ہی میں، کسی کے نام آجائیں۔

مجھے اپنی تقدیر آزمانے کی سوجھی۔ اس وقت تک زندگی کا مجھے جو تھوڑا بہت تجربہ ہوا تھا وہ بہت ہمت افزا نہ تھا۔ لیکن بھئی تقدیر کا حال کون جانے۔ گاہ باشد کہ کودکِ ناداں۔ ایک بار اپنی تقدیر آزمانے کو دل بیتاب ہو گیا اور بکرم بھی دوسروں کا دست نگر نہ بننا چاہتا تھا۔ سب کے نام روپے آئیں گے۔ وہ خود موج اڑائے گا۔ اسے کون پوچھتا ہے۔ بہت ہوگا دس پانچ ہزار اس کے حصہ میں آجائیں گے۔ مگر اس سے کیا ہوگا۔ اس کی زندگی میں بڑے بڑے منصوبے تھے۔ پہلے تو اسے ساری دنیا کی سیاحت کرنی تھی۔ ایک ایک کونے کی، عام سیاحوں کی طرح نہیں کہ تین ہفتہ میں ساری دنیا میں آندھی کی طرح اڑ کر گھر آپہنچے۔ وہ ایک خطہ میں کافی عرصہ تک رہ کر وہاں کے باشندوں کی معاشرت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا۔ پیرو، برازیل، مدغاسکر اور ابی سینیا۔ یہ سبھی دشوار گزار خطے اس کے پروگرام میں تھے۔ پھر اسے ایک بہت بڑا کتب خانہ تیار کرانا تھا جس میں ساری دنیا کی کتابیں رکھی جائیں۔ اس کے لئے وہ دو لاکھ تک صرف کرنے کو تیار تھا۔ والد یا چچا کے ہاتھ روپے آئے تو شاید دو چار ہزار مل جائیں۔ بڑے بھائی کے نام آئے تو دھیلا بھی نہ ملے گا۔ ہاں اماں کے ہاتھ آئے تو بیس ہزار یقینی ہیں۔ مگر اس سے کہیں پیاس بجھتی ہے۔ منصوبے تو اتنے اونچے تھے لیکن روپے نہ ان کے پاس تھے نہ میرے۔ گھر میں روپے ملنے کی اسے امید نہ تھی۔ ممکن تھا بہت ضد کرتا تو مل بھی جاتے مگر وہ اس امر کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔

میرے پاس بھی روپے نہ تھے۔ میں اسکول میں ماسٹر تھا بیس روپے ملتے تھے۔ دس گھر بھیج دیتا تھا۔ دس میں لشتم پشتم اپنا گذارا کرتا تھا۔ ایسی حالت میں پانچ روپے کے ٹکٹ خریدنا میرے لئے مشکل ہی نہیں محال تھا۔

بکرم نے کہا۔ ''کہو تو میں اپنی انگوٹھی بیچ دوں، کہہ دوں گا انگلی سے پھسل پڑی۔ میں نے منع کیا نہیں چوری فوراً کھل جائے گی اور مفت شرمندگی ہوگی۔ ایسا کام کیوں کرو کہ بعد کو خفت ہو۔''

یہ تجویز ہوئی کہ ہم دونوں اپنی اپنی پرانی کتابیں کسی سیکنڈ ہینڈ کتابوں کے دکاندار کے ہاتھ بیچ ڈالیں اور اس روپے سے ٹکٹ خریدیں۔ ہم دونوں کے پاس اسکول کی کتابیں ارتھمیٹک، الجبرا، جیامیٹری، جاگرفی موجود تھیں۔ میں تو ماسٹر تھا کسی بک سیلر کی دکان پر جاتے جھینپتا تھا۔ قریب قریب سبھی مجھے پہچانتے تھے اس لئے یہ خدمت بکرم

کے سپرد ہوئی اور وہ آدھ گھنٹے میں پانچ روپے کا ایک نوٹ لئے آ پہنچا۔ کتابیں پچیس سے کم نہ تھیں۔ مگر یہ پانچ اس وقت ہمارے لئے پانچ ہزار کے برابر تھے۔ فیصلہ ہو گیا ہم دونوں ساجھے میں ایک ٹکٹ لیں گے۔ آدھا میرا ہو گا آدھا بکرم کا۔ دس لاکھ میں پانچ لاکھ میرے حصہ میں آئیں گے۔ پانچ لاکھ بکرم کے۔ ہم اپنے اسی میں خوش تھے۔ ہاں بکرم کو اپنی سیاحت والی اسکیم میں کچھ ترمیم کرنی پڑی۔ کتب خانہ کی تجویز میں کسی قسم کی قطع و برید ناممکن تھی۔ یہ بکرم کی زندگی کا مقصدِ اولیٰ تھا۔

میں نے اعتراض کیا۔ "یہ لازمی نہیں کہ تمہارا کتب خانہ شہر میں سب سے زیادہ شاندار ہو۔ ایک لاکھ بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔"

بکرم مُصر تھا۔ "ہرگز نہیں 'کتاب خانہ تو شہر میں لاثانی ہو گا۔ کیوں تم کچھ مدد نہ کرو گے؟

میں نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا۔ بھئی میری ضرورتیں مقابلتاً کہیں زیادہ ہیں۔ تمہارے گھر میں کافی جائیداد موجود ہے۔ والدین بھی زندہ ہیں۔ کسی قسم کا بار تمہارے اوپر نہیں۔ میرے سر پر تو ساری گرہستی کا بوجھ ہے۔ دو بہنوں کی شادیاں اور دو بھائیوں کی تعلیم ہے' نیا مکان بنوانا ہی پڑے گا۔ میں تو ایسا انتظام کروں گا کہ سارے مصارف سود سے نکل آئیں اور اصل میں داغ نہ لگنے پائے۔ کچھ ایسی قیدیں لگا دوں گا کہ میرے بعد کوئی اصل کو نہ نکال سکے۔"

"تم نے سوچی تو بہت دور کی ہے لیکن بینکوں کا شرح سود بہت گرا ہوا ہے۔"

"پانچ لاکھ کی رقم بھی تو کم نہیں۔ اگر پانچ فیصدی بھی ملے تو پچیس ہزار سالانہ ہوئے' تھوڑے ہیں۔"

ہم نے کئی بینکوں کا شرح سود دیکھا۔ واقعی بہت کم تھا۔ خیال آیا کیوں نہ لین دین کا کاروبار شروع کر دیا جائے۔ بکرم اور میں دونوں کی مشترکہ کمپنی ہو۔ لین دین میں سود بھی اچھا ملے گا اور اپنا رعب داب بھی رہے گا۔ اچھے اچھے گھٹنے ٹیکیں گے۔ ہاں جب تک اچھی جائیداد نہ ہو کسی کو روپیہ نہ دیا جائے۔ چاہے کتنا ہی معتبر آسامی ہو' مجبوری معتبروں کو بھی غیر معتبر بنا دیتی ہے۔ جائیداد کی کفالت پر رہن نامہ لکھا کے روپیہ دینے میں اندیشہ نہیں رہتا۔ روپے نہ وصول ہوں تو جائیداد تو مل ہی جاتی ہے۔

مگر لاٹری کے ٹکٹ پر دو نام نہیں رہ سکتے' کس کا نام دیا جائے۔

بکرم نے کہا۔ "میرا نام رہے گا۔"

"کیوں میرا کیوں نہ رہے گا۔"

"تمہارا ہی نام سہی لیکن میری بہت دل شکنی ہو گی۔ اگر روپے مل گئے تو میں گھر والوں پر بم گولا چھوڑوں گا اور لوگوں کو خوب چڑاؤں گا۔ بالکل طفلانہ خواہش ہے۔"

میں مجبور ہو گیا۔ بکرم کے نام سے ٹکٹ لیا گیا۔

(2)

ایک ایک کر کے انتظار کے دن کٹنے لگے۔ صبح ہوتے ہی ہماری نگاہ کیلنڈر پر جاتی۔ میرا مکان بکرم کے مکان سے ملا ہوا تھا۔ اسکول جانے سے قبل اور اسکول سے آنے کے بعد ہم دونوں ساتھ بیٹھے اپنے اپنے منصوبے باندھا کرتے اور سرگوشیوں میں کہ کوئی سن نہ لے۔ ایک دن شادی کا تذکرہ چھڑ گیا۔

بکرم نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔ "بھئی شادی وادی کا خلجان نہیں پالنا چاہتا۔ خواہ مخواہ کوفت اور پریشانی۔ بیوی کی ناز برداری ہی میں بہت سے روپے اڑ جائیں گے۔ ہم بقائے نسل کے کوئی ٹھیکہ دار ہیں؟"

میں نے شادی کے دوسرے پہلوؤں پر غور کیا۔ "ہاں یہ تو درست ہے مگر جب تک شادی و غم میں کوئی رفیق نہ ہو۔ دولت کا لطف ہی کیا۔ تنہا خوری سے انسان کی طبیعت خود نفرت کرتی ہے۔ میں تو بھئی عیالداری سے اتنا بیزار نہیں۔ ہاں رفیق ایسا چاہتا ہوں جو سچے معنوں میں رفیق ہو اور وہ بیوی کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔"

بکرم کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ بولا۔ "خیر اپنا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ آپ کو عیالداری مبارک' بندہ تو آزاد رہے گا۔ اپنے مزے سے جہاں چاہا اڑ گئے اور جب جی چاہا سو گئے۔ یہ نہیں کہ ہر وقت ایک پاسبان آپ کی ہر ایک حرکت پر آنکھیں لگائے بیٹھا رہے۔ ذرا سی دیر ہوئی اور فوراً جواب طلب۔ آپ کہیں چلے اور فوراً سوال ہوا کہاں جاتے ہو؟ کیوں کسی کو مجھ سے یہ سوال کرنے کا حق ہو۔"

میں نہ یہ سوال کسی سے کرنا چاہتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی یہ سوال کرے۔ نا بابا' آپ کو شادی مبارک۔ بچے کو ذرا سا زکام ہوا اور آپ اڑے چلے جا رہے ہیں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے پاس۔ ذرا عمر کھسکی اور لونڈے منتیں ماننے لگے کہ کب آپ راہی عدم ہوں اور وہ گل چھرّے اڑائیں۔ نہ نہ میں اس وبال—— "

بکرم کی بہن کنتی نے اتنے دھماکے سے دروازہ کھولا کہ ہم دونوں چونک پڑے۔ کوئی تیرہ چودہ سال کی تھی۔ مگر بڑی خوش مزاج اور انتہادرجہ کی شوخ۔

بکرم نے ڈانٹا۔ "تو بڑی شیطان ہے کنتی میں تو ڈر گیا۔ کس نے تجھے یہاں بلایا؟" کنتی نے مشتبہ نظروں سے بکرم کو دیکھا جیسے کوئی تحقیقات کر رہی ہو اور بولی۔ "تم لوگ ہر دم یہاں بیٹھے کیا باتیں کرتے ہو۔ جب دیکھو یہیں جمے ہو' نہ کوئی کام نہ دھندا' کہیں گھومنے بھی نہیں جاتے' ایسے اچھے اچھے تماشے آئے اور چلے گئے۔ تم چلے ہی نہیں۔ آخر میں کس کے ساتھ جاؤں کیا کوئی جادو منتر جگا رہے ہو؟"

بکرم ہنسا۔ "ہاں جادو جگا رہے ہیں۔ جس میں تجھے ایسا دولہا ملے گا جو گن کر روز پانچ ہنٹر جمائے۔"

کنتی نے پیٹھ کی طرف سے اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور بولی۔ "مجھے اپنا بیاہ نہیں کرنا ہے۔ اماں سے پچاس ہزار روپے لے لوں گی اور مزے سے عیش کروں گی۔ کیوں کسی مرد کی غلامی کروں۔ کھلائے گا تو دو روٹیاں اور حکومت ایسے جتائے گا گویا اس کی زر خرید لونڈی ہوں۔ بندی باز آئی ایسی شادی سے۔ میں روز اماں کے ٹکٹ کے لیے ایشور سے پرارتھنا کرتی ہوں۔ اماں کہتی ہیں کنواری لڑکیوں کی دعا میں بڑی تاثیر ہوتی ہے۔ میرا دل تو کہتا ہے اماں کو ضرور روپے ملیں گے۔"

مجھے اپنے ننہیال کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ایک بار دیہات میں بارش بالکل نہ ہوئی تھی۔ بھادوں کا مہینہ آ گیا اور پانی کی ایک بوند نہیں۔ تب گاؤں والوں نے چندہ کر کے گاؤں کی سب کنواری لڑکیوں کی دعوت کی تھی اور دوسرے دن موسلادھار بارش ہوئی تھی۔ ضرور کنواریوں کی دعا میں تاثیر ہوتی ہے۔

میں نے بکرم کو پُر معنی نظروں سے دیکھا۔ بکرم نے مجھے۔ نظروں ہی نظروں میں ہم نے فیصلہ کر لیا۔ ایسا شفیع پا کر کیوں چوکئے۔

بکرم بولا۔ "اچھا بیٹی تجھ سے ایک بات کہیں' کسی سے کہے گی تو نہیں' اگر کہا تو حلال ہی کر دوں گا۔ میں اب کے تجھے خوب دل لگا کر پڑھاؤں گا اور پاس کرا دوں گا۔ ہم دونوں نے بھی لاٹری کا ٹکٹ لیا ہے۔ ہم لوگوں کے

لئے بھی ایشور سے دعا کر۔ اگر روپے ملے تو تجھے ہیرے جواہرات سے مڑھ دیں گے۔ سچ مگر خبردار کسی سے کہنا مت۔ ''مگر کنتی کا ہاضمہ اتنا مضبوط نہ تھا۔ یہاں سے تو وعدہ کر گئی مگر اندر جاتے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ ایک ہی لمحہ میں سارے گھر میں خبر پھیل گئی۔ اب جسے دیکھئے ہم دونوں کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔ پانچ روپے لے کر پانی میں ڈال دیئے۔ گھر میں چار ٹکٹ تو تھے ہی پانچویں کی کیا ضرورت تھی۔ یہ ماسٹر اسے خراب کر رہا ہے۔ نہ کسی سے پوچھا نہ گچھا۔ لے کے روپے پھینک دیئے۔ خود درا فضیحت والی کہانی سامنے آئی ـــ گھر کے بزرگ چاہے گھر میں آگ لگا دیں کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بے چارے چھوٹے ان کی مرضی کے خلاف آواز بھی نکالیں تو کہرام مچ جاتا ہے۔

(3)

بکرم کے والد بڑے ٹھاکر کہلاتے تھے۔ چچا چھوٹے ٹھاکر۔ دونوں ہی ملحد تھے' پکے ناستک' دیوتاؤں کے دشمن' پوجا پاٹ کا مذاق اڑانے والے' گنگا کو پانی کی دھارا اور تیرتھوں کو سیر کے مقامات سمجھنے والے۔ مگر آج کل دونوں ہی معتقد ہو گئے تھے۔ بڑے ٹھاکر صاحب علی الصبح ننگے پاؤں گنگا اشنان کرنے جاتے اور ادھر سے سارے شہر کے دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہوئے کوئی گیارہ بجے گھر لوٹتے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر گھر ہی میں بیٹھے ہوئے روز ایک لاکھ رام نام لکھ کر تب جل پان کرتے۔ دونوں صاحب شام ہوتے ہی ٹھاکر دوارے میں جا بیٹھتے اور بارہ بجے رات تک بھاگوت کی کتھا سنتے رہتے۔ بکرم کے بڑے بھائی صاحب کا نام پرکاش تھا' انہیں سادھو سنتوں سے عقیدت ہو گئی تھی۔ انہیں کی خدمت میں دوڑتے رہتے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ جہاں کسی مہاتما نے آشیرباد دیا اور ان کا نام آیا۔ رہیں بکرم کی اماں جی' ان میں ایسا کوئی خاص تغیر تو نہ تھا' ہاں آج کل خیرات زیادہ کرتی تھیں اور برت بھی زیادہ رکھتی تھیں۔ درگا پاٹ کا بھی انتظام کیا تھا۔ لوگ ناحق کہتے ہیں کہ مادہ پرستوں میں اعتقاد نہیں ہوتا۔ میں تو سمجھتا ہوں' ہم میں جو اعتقاد اور پرستش اور دینداری ہے وہ ہماری مادہ پرستی کے طفیل' ہمارا دین اور مذہب ہماری دنیا کے بل پر لٹکا ہوا ہے۔ ہوس انسان کی رائے' دماغ میں اتنی روحانیت پیدا کر سکتی ہے۔ یہ میرے لئے نیا تجربہ تھا اور یہ محض روحانیت کا ملمع نہ تھا' توہمات تھی۔ وہی خلوص' وہی نشہ' وہی انہماک' گویا طبیعت ہی بدل گئی ہو۔ رہے ہم دونوں ساجھے دار ہمارے پاس روپے نہ تھے' نہ اتنا وقت تھا' مجھے نوکری بچانی تھی۔ بکرم کو کالج جانا تھا۔ ہم دونوں ہاتھ مل کر رہ جاتے۔ ہاں جوتشیوں کی تلاش میں رہتے تھے مگر ان کے لئے بھی ہمارے پاس نیاز مندی اور خدمت گزاری کے سوا اور کیا تھا۔

جوں جوں قتل کی رات قریب آتی جاتی تھی ہمارا سکونِ خاطر غائب ہوتا جاتا تھا۔ ہمیشہ اسی طرف دھیان لگا رہتا۔ میرے دل میں خواہ مخواہ یہ شبہ ہونے لگا کہ کہیں بکرم مجھے حصہ دینے سے انکار کر دے تو کیا کر لوں گا۔ صاف انکار کر جائے کہ تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا' نہ کوئی تحریر ہے' نہ کوئی دوسرا ثبوت۔ سارا دارومدار بکرم کی نیت پر ہے۔ اسی کی نیت میں ذرا سا خلل آیا اور میرا کام تمام' کہیں فریاد نہیں کر سکتا۔ زبان تک نہیں کھول سکتا۔ اب اگر تحریر کے لئے کہوں تو بدمزگی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں۔ اگر اس کی نیت بگڑ گئی ہے تب تو وہ ابھی سے انکار کر دے گا۔ اگر نیت درست ہے تو اس شبہ سے اسے روحانی صدمہ ہو گا۔ آدمی تو ایسا نہیں ہے لیکن بھئی دولت پا کر ایمان سلامت رکھنا مشکل ہے۔ ابھی تو روپے نہیں ملے ہیں' اس وقت ایماندار بننے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔

آزمائش کا وقت تو جب آئے گا جب روپے مل جائیں گے۔

میں نے اپنے باطن کا جائزہ لیا۔ اگر ٹکٹ میرے نام ہوتا اور حسنِ اتفاق سے میرا نام آجاتا تو کیا میں نصف رقم بے چوں وچرا بکرم کے حوالے کر دیتا؟ کہتا تم نے مجھے ڈھائی روپے قرض دیئے تھے ان کے بدلے پانچ لے لو' دس لے لو' سو لے لو اور کیا کرو گے؟ مگر نہیں شاید اتنی بددیانتی کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ اگر دیتا بھی تو خوش معاملگی سے نہیں بلکہ بدنامی اور تشہیر کے خوف سے۔

ایک دن ہم دونوں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے کہ یکایک بکرم نے کہا' ہمارا ٹکٹ نکل آئے تو مجھے دل میں یہ افسوس ضرور ہو گا کہ ناحق تم سے ساجھا کیا۔

میں نے چونک کر کہا۔ "اچھا' مگر اسی طرح کیا مجھے افسوس نہیں ہو سکتا؟"

"لیکن ٹکٹ تو میرے نام کا ہے!"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔"

"اچھا مان لو' میں کہہ دوں' تم نے ٹکٹ میں ساجھا ہی نہیں کیا۔"

میرے خون کی حرکت بند ہو گئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"میں تمہیں اتنا بد نیت نہیں سمجھتا۔"

"مگر ہے بہت ممکن' پانچ لاکھ' سوچو۔"

"تو آؤ لکھا پڑھی کر لیں' جھگڑا ہی کیوں رہے۔"

بکرم نے ہنس کر کہا۔ "تم بڑے شکی ہو یار' میں تمہارا امتحان لے رہا تھا۔ بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے۔ پانچ لاکھ کا نہیں پانچ کروڑ کا معاملہ ہو تب بھی ایشور چاہے گا تو نیت میں فتور نہ آنے دوں گا۔"

مگر مجھے ان اعتماد انگیز باتوں سے تشفی نہ ہوئی۔ دل میں ایک تشویش آگ کی چنگاری کی طرح سلگنے لگی۔ نہیں یہ شخص سچ مچ انکار کر جائے تو کہیں کا نہ رہوں۔

میں نے کہا۔ "یہ تو میں جانتا ہوں کہ تمہاری نیت میں فتور نہیں آ سکتا لیکن تحریر سے پابند ہو جانے میں کیا ہرج ہے۔"

"فضول ہے!"

"فضول ہی سہی"

"تو پکے کاغذ پر لکھنا پڑے گا' دس لاکھ کی کورٹ فیس دس ہزار ہو جائے گی۔ کس خیال میں ہو آپ۔"

میں نے تامل کر کے کہا۔ "مجھے سادے کاغذ ہی سے اطمینان ہو جائے گا۔"

"جس معاہدے کی کوئی قانونی اہمیت نہ ہو' اسے لکھ کر کیوں وقت ضائع کریں۔"

"قانونی اہمیت نہ ہو' اخلاقی اہمیت تو ہے۔"

"اچھا لکھ دوں گا' جلدی کیا ہے۔"

مجھے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ بگڑ کر بولا۔ "تمہاری نیت تو ابھی سے بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"تو کیا تم ثابت کرنا چاہتے ہو کہ ایسی حالت میں تمہاری نیت فاسد ہو جاتی۔"

"میری نیت اتنی کمزور نہیں ہے۔"

"اجی رہنے بھی دو بڑے نیت والے دیکھے ہیں۔"

"مجھے اب تمہارے اوپر اعتبار نہیں رہا۔ میں تم سے معاہدہ لکھوا کر چھوڑوں گا' چاہے دوستی کا خاتمہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

بڑے نشست خانہ میں جہاں دونوں ٹھاکر بیٹھا کرتے تھے' اسی طرح کا مناظرہ چھڑا ہوا تھا۔ جھڑپ کی آواز سن کر ہمارا دھیان ادھر لگا۔ دیکھا تو دونوں بھائیوں میں ہاتھاپائی ہو رہی ہے۔ سچ مچ دونوں اپنی کرسیوں سے اٹھ کر پینترے بدل رہے تھے۔

چھوٹے ٹھاکر نے بگڑ کر جواب دیا۔ "ہرگز نہیں' جا کر قانون دیکھو' اگر میں کوئی جرم کروں تو مجھے سزا ہو گی۔ مشترکہ خاندان کو نہیں۔ یہ انفرادی معاملہ ہے۔"

"اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔"

"شوق سے عدالت جائیے۔ اگر میرے لڑکے کی بیوی یا خود میرے نام لاٹری نکلی تو آپ کو اس سے اسی طرح کوئی تعلق نہ ہو گا۔ جیسے آپ کے نام کی لاٹری نکلے تو مجھ سے یا میرے لڑکے سے یا میری بیوی سے۔"

"اگر میں جانتا آپ یہ پہلو اختیار کریں گے تو اپنے بیوی بچوں کے نام سے ٹکٹ لے لیتا۔"

"تو یہ آپ کا قصور ہے۔"

"اسی لیے مجھے خیال تھا کہ آپ میرے حقیقی بھائی ہیں اور یکجا معاملہ ہے۔"

"یہ جوا ہے یہ آپ کو سمجھ لینا چاہیے۔"

بکرم کی ماں نے دونوں بھائیوں کو شمشیر بکف دیکھا تو دوڑی ہوئی باہر آئیں اور دونوں کو سمجھانے لگیں۔

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔ "آپ مجھے کیا سمجھاتی ہیں۔ انہیں سمجھائیے جو بھائی کی گردن پر چھری پھیر رہے ہیں۔ آپ کے پاس چار ٹکٹ ہیں میرے پاس صرف ایک۔ میرے مقابلے میں آپ لوگوں کو روپے ملنے کا چوگنا چانس ہے۔"

بڑے ٹھاکر سے نہ رہا گیا۔ بولے۔ "ہم نے بیس روپے نہیں دیئے ٹھنا ٹھن۔"

اماں نے انہیں ملامت کے انداز میں دیکھا اور چھوٹے ٹھاکر صاحب کو ٹھنڈا کیا۔ بولیں۔ "تم میرے روپے سے آدھے لے لینا۔ میں اپنے بیٹے——"

بڑے ٹھاکر نے زبان پکڑ لی۔ "کیوں واہیات قسم کھا رہی ہو۔ وہ کیوں آدھا لیں گے۔ میں ایک دھیلا بھی نہ چھونے دوں گا۔ اگر ہم انسانیت سے کام لیں تو انہیں پانچویں حصے سے زائد کسی طرح نہ ملے گا۔ آدھے کا دعویٰ کس بناء پر ہو سکتا ہے۔"

چھوٹے ٹھاکر نے خونی نظروں سے دیکھا۔ "ساری دنیا کا قانون آپ ہی جانتے ہیں؟"

"جانتے ہیں' بیس سال تک وکالت نہیں کی ہے؟"

"یہ وکالت نکل جائے گی۔ جب سامنے کلکتہ کا بیرسٹر کھڑا کر دوں گا۔"

"بیرسٹر کی ایسی تیسی۔"

"اچھا زبان سنبھالیئے۔ میں نصف لوں گا۔ اسی طرح جیسے گھر کی جائیداد میں میرا نصف ہے۔"

بڑے ٹھاکر صاحب کوئی توپ چھوڑنے ہی والے تھے کہ مسٹر پرکاش سر اور ہاتھ میں پٹی باندھے خوش

خوش لنگڑاتے ہوئے آکر کھڑے ہو گئے۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے گھبرا کر پوچھا۔ "یہ تمہیں کیا ہو گیا۔ ارے یہ چوٹ کیسی؟ کسی سے جھگڑا ہو گیا یا گر گر اپڑا؟ ارے مہنگو! جا ذرا ڈاکٹر صاحب کو بلا لا!"

اماں جی نے پرکاش کو ایک آرام کرسی پر لٹا دیا تھا اور وفور اشک سے کچھ پوچھ نہ سکتی تھیں۔

پرکاش نے کراہ کر حسرت ناک لہجے میں کہا۔ "کچھ نہیں' ایسی کچھ چوٹ نہیں لگی۔"

بڑے ٹھاکر صاحب نے جو غم و غصے سے کانپ رہے تھے۔ کہا۔ "کیسے کہتے ہو چوٹ نہیں لگی' سارا ہاتھ اور سر سوج گیا ہے۔ کہتے ہو چوٹ نہیں لگی۔ کس سے جھگڑا ہوا۔ کیا معاملہ ہے۔ بتلاتے کیوں نہیں میں تھانے جا کر رپٹ کرتا ہوں۔"

"آپ ناحق گھبراتے ہیں۔ بہت معمولی چوٹ ہے۔ دو چار روز میں اچھی ہو جائے گی۔"

اس کے چہرے پر اب بھی ایک مسرت آمیز امید جھلک رہی تھی۔ ندامت' غصہ یا انتقام کی خواہش کا نام تک نہ تھا۔

اماں نے آواز کو سنبھال کر پوچھا۔ "بھگوان کریں' جلد اچھے ہو جاؤ لیکن چوٹ لگی کیسے' کیا کسی تانگے سے گر پڑے؟"

پرکاش نے زور سے ناک سکوڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ نہیں' نہ کسی تانگہ سے گرا' نہ کسی سے جھگڑا ہوا۔ ذرا جھکڑ بابا کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ انہی کی دعا کا نتیجہ ہے۔ آپ تو جانتے وہ آدمیوں کی صورت سے بھاگتے ہیں اور پتھر لے کر مارنے دوڑ پڑتے ہیں۔ جو ڈر کر بھاگا وہ نامراد رہ جاتا ہے۔ جو پتھر کی چوٹیں کھا کر بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا' اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ چوٹ کھائی اور پاس ہوئے۔ آج میں وہاں پہنچا تو ایک میلہ لگا ہوا تھا۔ کوئی مٹھائیاں لئے' کوئی پھولوں کی مالا' کوئی شال دوشالے۔ جھکڑ بابا استغراق کی حالت میں بیٹھے تھے۔ یکایک انہوں نے آنکھیں کھولیں اور یہ مجمع دیکھا تو گالیاں بکتے ہوئے کئی پتھر اٹھا کر دوڑے۔ مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ لوگ گرتے پڑتے بھاگے' لیکن بندہ وہاں قطب مینار کی طرح ڈٹا رہا۔ بس انہوں نے پتھر چلا ہی تو دیا۔ پہلا پتھر سر میں لگا کھوپڑی بھنا گئی۔ معلوم ہوا جیسے گولا لگ گیا ہو۔ آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ دوسرا پتھر ہاتھ میں لگا۔ بس وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بابا گالیاں بکتے ہوئے لوٹ گئے۔ ادھر گھنٹہ بھر تک تو مجھ سے اٹھا ہی نہ گیا۔ آخر ہمت باندھ کر اٹھا اور ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا "فریکچر ہو گیا ہے' پٹی باندھ دی۔ بڑی شدت کا درد ہے مگر مراد پوری ہو گئی۔ اب لاٹری میرے نام آئی رکھی ہے۔ مطلق شبہ نہیں۔ سب سے پہلے جھکڑ بابا کی کٹی بنواؤں گا۔ ان کی مار کھا کر آج تک کوئی نامراد نہیں لوٹا۔"

بڑے ٹھاکر صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ اماں جی کا اندیشہ بھی دور ہو گیا۔ سر پھٹا تو کیا ہوا' ہاتھ بھی ٹوٹا' کیا غم ہے۔ لاٹری تو اپنی ہو گئی۔

شام ہو گئی تھی۔ بڑے ٹھاکر صاحب مندر کی طرف چلے گئے۔ بھگوت سننے کا وقت آ گیا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ پوچھا۔ "جھکڑ بابا تو وہیں رہتے ہیں ندی کے کنارے باغیچے میں۔"

پرکاش نے بے اعتنائی سے کہا۔ "جی ہاں!"

"کیا بہت زور سے مارتے ہیں؟"

پرکاش نے ان کا عندیہ سمجھ لیا۔
"آپ زور سے کہتے ہیں۔ ارے صاحب ایسا پتھر مارتے ہیں کہ بم گولے سا لگتا ہے۔ دیو سا تو قد ہے اور شہ زور اتنے ہیں کہ لوگ کہتے ہیں کہ شیروں کو گھونسے سے مار ڈالتے ہیں۔ اف سر پھٹا جاتا ہے۔ ان کا نشانہ ایسا بے خطا ہوتا ہے کہ آدمی بچ ہی نہیں سکتا۔ ایک دو پتھر سے زیادہ کھانے کی کسی میں تاب ہی نہیں اور یہ نہیں کہ ایک دو پتھر مار کر رہ جائیں۔ جب تک آپ دوڑتے چلے جائیں گے' مارتے جائیں گے جب تک آپ گر نہ پڑیں۔ مگر راز یہی ہے کہ آپ جتنے زیادہ پتھر کھائیں گے اتنا ہی اپنے مقصد سے قریب پہنچیں گے۔ ایک چوٹ کھا کر جان بچانے کے لئے کوئی بہانہ کر کے گر پڑے تو اس کا پھل بھی اتنا ہی ملتا ہے۔ آدھا یا اس سے بھی کم۔ میں نے تو ٹھان لیا تھا کہ چاہے مر ہی جاؤں لیکن جب تک گر نہ پڑوں پیچھا نہ چھوڑوں گا۔"
پرکاش نے ایسا ہیبت ناک مرقع کھینچا کہ چھوٹے ٹھاکر صاحب کانپ گئے۔ جھکڑ بابا کی خدمت میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔

(4)

آخر جولائی کی بیسویں تاریخ آئی۔ سویرے ہی سے ڈاک خانے کے سامنے کئی ہزار آدمیوں کا مجمع ہو گیا۔ تار کا انتظار ہونے لگا۔ دونوں ٹھاکروں نے گھڑی رات رہے گنگا اشنان کیا اور مندر میں بیٹھ کر پوجا کرنے لگے۔ ہم دونوں ساجھے داروں نے اپنا اپنا کام تقسیم کر لیا۔ بکرم تو ڈاک خانے گیا' میں مندر میں دیوتاؤں کے قدموں میں جا بیٹھا۔ دونوں ٹھاکر بیٹھے پوجا کر رہے تھے۔ ان کے چہروں پر ایک رنگ آتا تھا ایک جاتا تھا۔ بالکل بچوں کی سی کیفیت تھی جو ذراسی بات پر ہنس دیتے تھے اور ذراسی بات میں رو دیتے تھے۔
بڑے ٹھاکر نے پوچھا۔ "بھگوان تو اپنے بھگتوں پر بڑی دیا رکھتے ہیں' کیوں پجاری جی! پجاری نے فرمایا۔
"ہاں سرکار! گج کو گراہ کے منہ سے بچانے کے لیے بھگوان چھیر ساگر سے دوڑے تھے۔"
چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا۔ "بھگوان تو انتر جامی (عالم الغیب) ہیں۔ کس میں کتنی بھگتی ہے' یہ ان سے کیا چھپا رہتا ہوگا۔"
پجاری نے فرمایا۔ "نہیں سرکار ان سے کیا چھپا ہے۔"
ادھر پوجا ہو رہی تھی' ادھر مندر کے باہر مساکین کو غلہ تقسیم کیا جا رہا تھا۔ بڑے ٹھاکر نے پھر پوچھا۔
"تمہارا دل کیا کہتا ہے پجاری جی؟"
پجاری نے بے تکلف کہا۔ "آپ کی پھتے (فتح) ہو گی سرکار۔"
چھوٹے ٹھاکر نے پوچھا۔ "اور میری!"
پجاری نے بے تکلف کہا۔ "آپ کی بھی پھتے ہو گی۔"
دونوں آدمیوں کی فتح کیسے ہو گی اس پر غور کرنے کی وہاں کسے فرصت تھی۔ کتھا ختم ہو گئی تو بڑے ٹھاکر صاحب نشۂ عقیدت سے سرشار مندر سے نکلے بھجن گاتے ہوئے۔
پربھو میں تو تیرے چرنوں میں آیا

چھوٹے ٹھاکر صاحب بھبھوت لپیٹے حمد و ثنا میں مصروف تھے۔

پیرو تلے بچھایا کیا خوب فرشِ خاکی
اور سر پہ لاجوردی کیا آسماں بنایا

زندگی میں جب ترا ہم کو ہمیشہ تھا خیال
بعد مردن بھی ہوس دل میں وہی لے جائیں گے

پرکاش بابو پٹیاں باندھے غریبوں کو غلہ بانٹ رہے تھے اور بار بار فون پر جاکر پوچھتے تھے کیا خبر ہے؟
ہر شخص کے چہرے پر امید و بیم کا رنگ تھا۔ امید رگوں میں' آنکھوں میں' ہونٹوں میں امڈی پڑتی تھی اور بیم دل میں' دماغ میں' جگر میں رعشہ پیدا کر رہا تھا۔

ٹیلیفون کی گھنٹی زور سے بجی۔ سب کے سب دوڑے۔ رسیور بکرم کے ہاتھ لگا۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں بکرم۔"

"کیا خوش خبری ہے؟"

"اس شہر کا صفایا ہے' شہر ہی کا نہیں' سارے ہندوستان کا۔ امریکہ کے ایک آدمی کا نام آیا ہے۔"

پرکاش بابو زمین پر گر پڑے۔ بڑے ٹھاکر صاحب پر جیسے فالج گر گیا ہو' بے حس و حرکت نقشِ دیوار کی طرح کھڑے رہ گئے۔ چھوٹے ٹھاکر صاحب سر پیٹ کر رونے لگے۔

رہا میں' مجھے مایوسی کے ساتھ ایک حاسدانہ مسرت ہو رہی تھی کہ مجھے بکرم کی خوشامد کی ذلت نہیں اٹھانی پڑی۔ اماں جان باہر نکل آئیں اور کہہ رہی تھیں' سبھوں نے بے ایمانی کی' کون وہاں دیکھنے گیا تھا۔

اس روز رات کو کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ بڑے ٹھاکر صاحب نے پجاری جی پر غصہ اتارا اور انہیں برخاست کر دیا۔ "اسی لیے تمہیں اتنے دنوں سے پال رکھا ہے' حرام کا مال کھاتے ہو اور چین کرتے ہو۔"

اتنے میں بکرم رونی صورت لئے آکر بیٹھ گیا۔

میں نے پوچھا۔ "اب تو معاملہ ختم ہو گیا مگر سچ کہنا تمہاری نیت فاسد تھی یا نہیں۔"

بکرم بے غیرتی کے ساتھ مسکرا پڑا۔

"اب کیا کرو گے پوچھ کر' پردہ ڈھکا رہنے دو۔"

نیور

آسمان پر چاندی کے پہاڑ اڑ رہے تھے' ٹکرا رہے تھے' گلے مل رہے تھے' آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ کبھی سایہ ہو جاتا تھا' کبھی تیز دھوپ چمک اٹھتی تھی۔ برسات کے سوکھے دن تھے' اُمس ہو رہی تھی' ہوا بند ہو گئی تھی۔

گاؤں کے باہر کئی مزدور ایک کھیت کی مینڈھ باندھ رہے تھے۔ ننگے بدن پسینے میں تر، کچھنی کسے ہوئے، سیاہ فام، سب کے سب پھاوڑے سے مٹی کھود کھود کر مینڈھ پر رکھتے جاتے تھے۔ کئی دن قبل بارش ہوئی تھی اس سے مٹی نرم ہو گئی تھی۔

گوبر نے اپنی کانی آنکھ مٹکا کر کہا۔ ''اب تو ہاتھ نہیں چلتا بھائی، گولا بھی چھوٹ گیا ہوگا، چلو چبینہ کر لیں۔''

نیور نے ہنس کر کہا۔ ''یہ مینڈھ تو پوری کر لو پھر چبینہ کر لینا۔ میں تو تم سے پہلے آیا تھا۔''

دینو نے جھوّا سر پر اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اپنی جوانی میں گھی کھایا ہوگا۔ نیور دادا، اتنا تو اب ہمیں پانی بھی میسر نہیں۔''

نیور پستہ قد، گٹھیلا، بے حد سیاہ، پھرتیلا آدمی تھا۔ عمر پچاس سے زائد تھی مگر اچھے اچھے نوجوان محنت میں اس کا لوہا مانتے تھے۔ ابھی دو تین سال پہلے تک کشتی لڑتا تھا۔ جب سے گھر کی گائے مری کشتی لڑنا چھوڑ دیا۔ مول کے دودھ میں گزارا کہاں۔

گوبر نے پھر نیور کو چھیڑا۔ ''تم سے بے تمباکو پیئے کیسے رہا جاتا ہے نیور دادا، یہاں تو چاہے روٹی نہ ملے لیکن پاؤ بھر تمباکو ضرور چاہیے۔''

نیور اپنے کام میں مصروف تھا، نوجوان کی گلخپ میں اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ دینا نے اُسے باتوں میں لگانے کی دوبارہ کوشش کی۔ ''تو یہاں سے جا کر روٹی پکاؤ گے دادا، تمہاری بڑھیا کیوں کام نہیں کرتی۔ ہم سے تو دادا ایسی مہریا سے ایک دن نہ پٹے۔''

یہ کوشش کارگر ہوئی۔ نیور کے پچکے ہوئے کھچڑی مونچھوں سے ڈھکے چہرے پر تبسم کی نورانی لکیر کھنچ گئی۔ جس نے اس کے کریہہ منظر میں بھی ایک حسن پیدا کر دیا۔ بولا۔ ''جوانی تو اسی کے ساتھ کٹی ہے بیٹا، اب اس سے کوئی کام نہیں ہوتا تو کیا کروں۔''

گوبر نے زمین پر بیٹھ کر ہاتھ سے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ نہیں تو کام کیوں نہ کرتی، مجے سے کھاٹ پر بیٹھی چلم پیا کرتی ہے، اور سارے گاؤں سے لڑا کرتی ہے۔ تم بوڑھے ہو گئے۔ لیکن وہ تو اب بھی جوان بنی ہوئی ہے۔''

دینا نے اور ردّا جمایا۔ ''جوان عورت کیا اس کی برابری کرے، سیندور، کاجل، مسّی، مہندی، ان سنگاروں میں سے تو جیسے اس کا من بستا ہے۔ جب دیکھا کنارے دار رنگین ساڑھی پہنے دیکھا، اس پر گہنے الگ، گہنوں سے تو اس کا جی ہی نہیں بھرتا۔ تم گئو ہو، اس سے نباہ ہو جاتا ہے، نہیں تو اب تک گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی۔''

گوبر نے تھوڑے دن پہلے اپنی عورت کو اسی لیے چھوڑ دیا تھا کہ وہ کام چور تھی اور کھانے میں حاتم۔

دینا بولا۔ ''مجھے تو اس کے بناؤ سنگار پر گسّہ آتا ہے، کچھ کام نہ کرے گی، کھانے پہننے کو اچھا ہی چاہیے۔''

نیور نے جیسے اپنی صفائی دی۔ تم کیا جانو گے بیٹا۔ تب تم لوگوں کا جنم ہی نہیں تھا۔ جب وہ آئی تھی تو میرے گھر میں سات ہل چلتے تھے۔ وہ رانی بنی بیٹھی رہتی تھی۔ تھی بھی بڑے گھر کی بیٹی۔ مجور لگے ہوئے تھے، اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہ کرنا پڑتا تھا۔ جمانا بدل گیا۔ اس کا دل تو وہی ہے۔ گھڑی بھر چولہے کے پاس بیٹھ جاتی ہے تو آنکھیں لال ہو جاتی ہیں۔ اور سر تھام کر پڑ رہتی ہے۔ مجھ سے تو یہ نہیں دیکھا جاتا۔ اسی دن رات کے لیے تو آدمی

سادی بیاہ کرتا ہے۔ نئی گرہستی میں جنجال کے سوا اور کیا رکھا ہے۔ یہاں سے جا کر روٹی پکاؤں گا' پانی لاؤں گا تب بڑی مشکل سے دو کور کھائے گی۔ نہیں تو مجھے اپنی کیا چنتا تھی۔ تمہاری طرح چار پھنکی مار کر ایک لوٹا پانی چڑھا لیتا۔ جب سے بٹیا مر گئی تب سے تو وہ اور بھی ٹوٹ گئی۔ یہ بڑا بھاری دھکا لگا۔ اس ماں کی ماتا کو ہم تم کیا سمجھیں گے بیٹا۔ پہلے تو میں کبھی کبھی ڈانٹ بھی دیتا تھا' اب تو اس کو دیکھ کر درد آ جاتا ہے۔"

دینا نے پوچھا۔ "تم کل روکھ پر کاہے کو چڑھ رہے تھے' ابھی تو گولر نہیں پکی۔"

نیور کے چہرے پر رقت جھلک اٹھی۔ بولا۔ "اس بکری کیلئے پتیاں توڑ رہا تھا بیٹا۔ بٹیا اسی کا دودھ تو پیتی تھی۔ اب بے چاری بڑھیا ہو گئی ہے' دودھ کیا دے گی' لیکن یہ کیسے بھول جاؤں کہ بٹیا اسی کا دودھ پیتی تھی۔"

گھر پہنچ کر نیور نے لوٹا اور ڈول اُٹھایا اور نہانے چلا کہ بیوی نے کھاٹ پر لیٹے لیٹے کہا۔ "اتنی دیر کیوں کر دیتے ہو۔ آدمی کام کے پیچھے جان تھوڑے ہی دے دیتا ہے۔ جب مجوری سب کو برابر ملتی ہے تو کام بھی برابر کرو۔ کوئی ایک دھیلا بیشی تو نہیں دے دیتا۔"

نیور کے فضائے دل پر سنہرے بادلوں کی طرح ایک مستانہ کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لفظوں کی مٹھاس نے جیسے اس کے وجود کے ایک ایک ذرّے کو مٹھاس میں شرابور کر دیا۔ اس بے غرضانہ محبت میں کتنا درد' کتنی دلجوئی' کتنی خیر اندیشی بھری ہوئی تھی' اور دوسرا کون ہے جسے اس کے آرام کی' اس کے جینے مرنے کی فکر ہو۔ پھر وہ کیوں نہ اپنی بڑھیا کے لیے مرے۔ سرور میں آ کر بولا۔ "تم اس جنم میں کوئی دیوی رہی ہو گی بڑھیا۔" "سچ!" بڑھیا نے میٹھی جھڑکی دی۔ "اچھا رہنے دو یہ چاپلوسی۔ ہمارے آگے اب کون بیٹھا ہوا ہے جس کے لیے اتنی ہائے ہائے کرتے ہو۔"

نیور گز بھر کی چھاتی لئے نہانے چلا گیا۔ لوٹ کر اس نے موٹی موٹی روٹیاں پکائیں' آلو چولہے میں ڈال دیئے تھے۔ ان کا بھرتہ بنایا۔ تب دونوں ساتھ کھانے بیٹھے۔

بڑھیا نے حسرت سے کہا۔ "میری جات سے تمہیں کوئی آرام نہ ملا۔ پڑے پڑے کھاتی ہوں اور تمہاری چھاتی پر مونگ دَلتی ہوں۔ اس سے تو کہیں اچھا تھا کہ بھگوان مجھے اٹھا لیتے۔"

"بھگوان آئیں گے تو میں کہوں گا' پہلے مجھے لے چلو' تب اس سونی جھونپڑی میں کون رہے گا۔"

"تم نہ رہو گے تو میری کون دَسا ہو گی۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔ میں نے کوئی بڑا پن کیا تھا کہ تمہیں پایا۔ کسی اور کے ساتھ میرا کیا نباہ ہوتا۔"

اس انکسار میں کتنا نشہ تھا۔ نیور کی ایک ایک رگ مخمور ہو اٹھی۔ اس سے پہلے بھی کتنی ہی بار یہ مسئلہ چھڑا تھا اور یوں ہی چھوڑ دیا گیا تھا لیکن نہ جانے کیوں نیور نے اپنے حق میں فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے میں جاؤں گا۔

اس کے بعد بھی جب تک جیئے آرام سے رہے۔ کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ اس لیے وہ مرتا رہتا تھا کہ ہاتھ میں چار پیسے ہو جائیں' سخت سے سخت کام جس کے لیے کوئی نہ کھڑا ہو وہ نیور کے ہاتھوں انجام پاتے۔ دن بھر پھاوڑے' کدال کا کام کرنے کے بعد رات کو وہ اکھ کے دنوں میں کسی ایک کی اکھ پیلتا یا فصل کی رکھوالی کرتا۔ لیکن دن نکلتے جاتے تھے' اور جو کچھ کماتا تھا وہ بھی نکلتا جاتا تھا۔ بڑھیا کے لیے کوئی آسرا نہ تھا۔

لیکن آج کی باتوں نے نیور کے دل میں ہیبت ڈال دی۔ سچ مچ' کہیں بڑھیا ہی نہ چلی جاوے۔ پانی میں ایک بوند رنگ کی طرح' یہ خیال اس کے دل میں سما کر گھلنے لگا۔

گاؤں میں نیور کے لیے کام کی کمی نہ تھی' پر مزدوری تو وہی ملتی تھی جو اب تک ملتی آئی تھی۔ اس

کساد بازاری کے زمانے میں وہ مزدوری بھی نہ رہ گئی تھی۔ کہیں بڑھیا پہلے چل بسی تو اس کے کریا کرم کے لیے تو ہاتھ میں کچھ ہونا چاہیے۔ اس دھوم سے کام کرے گا کہ لوگ دنگ رہ جائیں۔

اسی دن اتفاق سے ایک مہاتما کہیں سے گھومتے گھامتے آ نکلے اور وہیں نیور کی جھونپڑی کے سامنے پیپل کے نیچے ان کی دھونی جل گئی۔ گاؤں والوں نے سمجھا' زہے نصیب! باباجی کی خدمت اور تکریم کے سامان جمع ہونے لگے۔ کہیں سے لکڑی آ گئی' کہیں سے پوال' کہیں سے بچھانے کو کمبل۔ نیور غریب کے پاس کیا تھا' باباجی کا بھوجن پکانے کی خدمت اس نے اپنے ذمے لی۔ چرس آ گئی' باباجی نے دم لگانا شروع کیا۔ بھگتوں کی ایک جماعت نے بھجن گانے کی تیاریاں کیں' ڈھول' مجیرا' کرتال آ گئے۔

دو تین دن میں ہی باباجی کے کشف و کرامات کے چرچے ہونے لگے۔ وہ روشن ضمیر ہیں۔ ان کی نگاہ پر زمانے کی قید نہیں۔ لوبھ تو چھو کر ہی نہیں گیا۔ پیسہ ہاتھ سے نہیں چھوتے اور بھوجن بھی کیا کرتے ہیں آٹھ پہر میں ایک کٹورا دودھ پی لیا۔ یا ایک دو چمچہ کھچڑی کھا لی۔ لیکن چہرے پر کتنا جلال ہے۔ جیسے شمع جل رہی ہو۔ زبان کتنی میٹھی ہے۔ سیدھا سادا نیور، باباجی کا خاص طور پر معتقد ہو گیا تھا۔ اس پر کہیں باباجی کی دیا ہو گئی تو پارس ہی ہو جائے گا۔ سارا دُکھ دلدر دُور ہو جائے گا۔

آدھی رات ہو گئی تھی۔ عقیدت مندوں کی جماعت رخصت ہو گئی تھی۔ صرف نیور بیٹھا باباجی کے پاؤں دبا رہا تھا۔

باباجی نے فرمایا۔ "بچہ سنسار مایہ جال ہے' اس میں کیوں پھنسے ہو۔"

نیور نے فرق تعظیم جھکا کر کہا۔ "نادان ہوں مہاراج' کیا کروں' عورت ہے اُسے کس پر چھوڑوں۔"

"تو سمجھتا ہے تو ہی اس کا پالن کرتا ہے؟"

"اور دوسرا کون سہارا ہے اسے باباجی۔"

"ایشور کچھ نہیں ہے' تو ہی سب کچھ ہے۔"

نیور کا ضمیر جیسے نورِ عرفان سے منوّر ہو گیا۔ میں اتنا مغرور ہوں' اتنا خردماغ' اتنا کور باطن' مزدوری کرتے کرتے جان نکلتی ہے' اور میں سمجھتا ہوں' میں ہی بڑھیا کا سب کچھ ہوں۔ ایشور جو سارے سنسار کا پالن کرتے ہیں تو ان کی مرضی میں دخل دینے والا کون؟ اس کے زودِ اعتقاد دہقانی باطن سے ایک صدا سی نکل کر اس کی رگ رگ میں گونجنے لگی۔ تو اگیانی ہے۔ صرف اتنا بولا۔ آپ مجھے گیان دیجئے۔ اور اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

باباجی نے تحکمانہ انداز سے کہا' دیکھنا چاہتا ہے ایشور کی لیلا۔ وہ چاہے تو تجھے چھن بھر میں لکھ پتی کر دے۔ چھن بھر میں تیری ساری چنتائیں ہٹا دے۔ میں اس کا ادنیٰ غلام ہوں۔ کوّے کی بیٹ لیکن مجھ میں ابھی اتنی کرامات ہے کہ تجھے پارس بنا دوں' تو صاف دل' سچا ایماندار آدمی ہے' مجھے تجھ پر دیا آتی ہے۔ میں نے اس گاؤں میں ایک ایک کو غور سے دیکھا' کسی میں بھی اعتقاد نہیں' ایمان نہیں۔ تجھ میں میں نے بھگت کا دل پایا۔ بتا تیرے پاس کچھ چاندی ہے؟

نیور کو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سامنے جنت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔

"دس پانچ روپے پڑے ہوں گے مہاراج۔"

"چاندی کے ٹوٹے پھوٹے گہنے نہیں ہیں۔"

"گھر والی کے کچھ گہنے بھی ہیں۔"

"کل رات کو جتنی چاندی مل سکے یہاں لا اور ایشور کی کرامات دیکھ۔ تیرے سامنے میں چاندی کو ایک ہانڈی میں کس کے بند کر کے اسی دھونی میں رکھ دوں گا۔ سویرے آ کر ہانڈی نکال لینا۔ مگر اتنا یاد رکھنا کہ ان اشرفیوں کو شراب جوا یا کسی دوسرے برے کام میں خرچ کیا تو کوڑھی ہو جائے گا۔ اب جا سو رہ۔ ہاں اتنا اور سن لے' اس کا چرچا کسی سے مت کرنا' گھر والی سے بھی نہیں۔"

"نہیں۔"

نیور گھر چلا تو ایسا خوش تھا گویا ایشور کا ہاتھ اس کے سر پر ہے۔ رات بھر اُسے نیند نہیں آئی۔ سویرے اس نے کئی آدمیوں سے دو دو چار روپے اُدھار لے کر پچاس روپے جمع کر لیے۔ لوگ اس کا اعتبار کرتے تھے۔ کبھی کسی کا ایک پیسہ نہ دبا تھا' وعدے کا پکا' نیّت کا صاف' روپے ملنے میں دقت نہ ہوئی۔ پچیس روپے اس نے اپنی کمائی سے جوڑ رکھے تھے۔ مگر بڑھیا سے گہنے کیسے مانگے؟ لگے گی طرح طرح کے سوال پوچھنے' کیا کرو گے؟ کسی کو دے تو نہ دو گے۔ چکمہ دیا تیرے گہنے بہت میلے ہو گئے ہیں بڑھیا۔ کھٹائی سے صاف کر لے' رات بھر کھٹائی میں رکھنے سے نئے ہو جائیں گے۔ تب میں پٹولے کے پاس لے جا کر نئے ڈورے میں گھتوا لاؤں گا۔ بڑھیا چکمے میں آ گئی۔ نیور کی جانب سے کسی طرح کا شبہ ہونا امکان سے بعید تھا۔ ہانڈی میں کھٹائی ڈال کر گہنے بھگو دیئے۔ جب رات کو وہ سو گئی تو نیور نے روپے بھی اس ہانڈی میں ڈال دیئے اور ہانڈی لئے بابا جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ بھگت لوگ رخصت ہو چکے تھے۔ مطلع صاف تھا۔ بابا نے بے اعتنائی کے انداز سے ہانڈی لی۔ کچھ منتر پڑھ کر اس پر پھونکا اور ہانڈی کو دھونی کی راکھ میں رکھ کر نیور کو سورج نکلنے سے پہلے آنے کی تاکید کر کے رخصت کیا۔

رات بھر اشتیاق اور گدگدی کا مزہ لینے اور خوب خیالی پلاؤ پکانے کے بعد نیور منہ اندھیرے بابا جی کے درشن کرنے گیا۔ سینہ بانسوں اچھل رہا تھا۔ کل یہ جھونپڑی جھونپڑی نہ رہے گی۔ اور نہ یہ بڑھیا اس حالت میں رہے گی۔ یہیں بڑھیا کے نام پر ایک کنواں کھدے گا اور ایک مندر بنے گا۔ مگر نیور اسی طرح چار آنے روز کی مزدوری کرتا رہے گا۔ دولت پا کر آدمی اپنے کو نہ بھولے۔ جب بٹے اترانے لگے تو کیا رہ گیا۔ ایں آج بابا جی دھونی کے پاس نہیں ہیں۔ گئے ہوں گے ندی کی طرف' اُن کے انتظار کی ضرورت نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا تھا سورج نکلنے کے پہلے آ کر ہانڈی نکال لینا۔ جٹ دھونی میں ہاتھ ڈالا' ہانڈی ملی' مگر بالکل خالی' سینہ دھک دھک کرنے لگا۔ پھر راکھ ٹٹولی' کچھ نہ ملا' کوئی ہانڈی سے اشرفیاں نکال تو نہیں لے گیا۔ بابا جی نے ہی تو کہیں احتیاطاً چھپا کر نہیں رکھ دیں۔ بدحواس ہو کر بابا جی کی تلاش میں ندی کی طرف دوڑا' باغوں میں ڈھونڈا' بابا کی گرد بھی نہ ملی' مایوس ہو کر لوٹا اور وہیں دھونی کے پاس سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ بھگت لوگ آنے لگے۔ ارے بابا کہاں گئے' کمبل بھی غائب یہ ماجرا کیا ہے؟

ایک صاحب بولے۔ "سادھوؤں کا کیا ٹھکانہ' آج یہاں' کل وہاں' ایک جگہ رہیں تو مایا جال میں نہ پھنس جائیں' لوگوں سے میل محبت ہو جائے۔"

دوسرے بھگت نے کہا۔ "پہنچے ہوئے تھے!"

"پورے سدھ۔"

"لوبھ تو چھو نہیں گیا تھا۔"

"نیور کہاں ہے؟ اُس پر بڑی دیا کرتے تھے' اس سے کہہ گئے ہوں گے۔"

نیور دانستہ لاپتہ ہو گیا۔ اس کی تلاش ہونے لگی۔ اتنے میں بڑھیا نیور کو پکارتی ہوئی گھر میں سے نکلی۔ پھر

ہنگامہ برپا ہو گیا۔ بڑھیا روتی تھی اور نیور کو گالیاں دیتی تھی۔

نیور کھیتوں کی مینڈوں سے بے تحاشا بھاگتا چلا جاتا تھا۔ گویا اس دارِ عصیاں سے نکل جائے گا۔ ادھر نیور کی بدنیتی کے قصے کھُلنے لگے۔

"کل ہم سے پانچ روپے لیے تھے' آج شام کو دینے کا وعدہ کیا تھا۔"

"ہم سے بھی دو روپے آج ہی کے وعدے پر لیے تھے؟"

بڑھیا روئی۔ "ڈاڑھی جار' میرے سارے گہنے لے گیا۔ پچیس روپے جوڑ کر رکھے تھے وہ بھی اٹھا لے گیا۔"

ایک آدمی نے اس کی ملامت کی۔ "کیوں اسے گالی دیتی ہے بڑھیا! تیرے لیے جان دیتا تھا اور آج تو اسے گالیاں دے رہی ہے۔ اس کی نیت کبھی بدل ہی نہیں سکتی۔ اس بابا نے اسے چکمہ دیا ہوگا' بچارہ سیدھا آدمی تھا جھانسے میں آ گیا۔ بڑا مکار نکلا یہ بابا۔"

قرائن اس شبہ کی تصدیق کر رہے تھے۔

"نیور لاج کے مارے کہیں چھپا بیٹھا ہوگا؟"

"جو گنگا میں نہ کود پڑا ہو۔"

"بابا ملے تو کچا ہی کھا جائیں۔"

تین مہینے گزر گئے۔

جھانسی ضلع میں دھسان ندی کے کنارے ایک بڑا گاؤں ہے کاشی پور۔ ندی کے دوسرے کنارے ایک پہاڑی ہے۔ اس پر کئی دن سے ایک سادھو نے آسن جمایا ہے۔ ناٹے قد کا آدمی ہے۔ کالے توے کا سا رنگ' جسم گٹھا ہوا۔ یہ نیور ہے جو سادھوؤں کے بھیس میں دنیا کو دھوکہ دے رہا ہے۔ وہی بھولا بھالا صاف دل' بے لوث نیور۔ جس نے کبھی پرائے مال کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی۔ جو پسینے کی روٹی کھا کر مگن تھا۔ جو کبھی اپنے لیے نہیں ہمیشہ دوسروں کے لیے مرا۔ گھر کی اور گاؤں کی یاد اس کے دل سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اترتی۔ اس زندگی میں کیا پھر کوئی دن آئے گا کہ وہ اپنے گھر پہنچے گا اور پھر اس دنیا میں ہنستا کھیلتا اپنی چھوٹی چھوٹی فکروں اور چھوٹی چھوٹی امیدوں کے ساتھ زندگی بسر کرے گا۔ کتنی پر عافیت تھی وہ زندگی۔ جتنے تھے سب اپنے تھے۔ سبھی عزت کرتے تھے۔ ہمدردی کرتے تھے۔ دن بھر کی کڑی محنت کے بعد جب وہ تھوڑا سا اناج اور تھوڑے سے پیسے لے کر گھر آتا تھا تو بڑھیا اس سے کیسی میٹھی میٹھی باتیں کرتی تھی۔ وہ ساری محنت' ساری تھکاوٹ جیسے اس مٹھاس میں پک کر اور بھی میٹھی ہو جاتی تھی۔ آہ' وہ دن کب آئیں گے۔ نہ جانے بڑھیا کیسے رہتی ہوگی؟ کون اسے پان کی طرح پھیرتا ہوگا' کون اسے پکا کر کھلاتا ہوگا۔ گھر میں ایک پیسہ بھی تو نہیں چھوڑا' گہنے تک ڈبا دیئے۔ تب اُسے اس بابا پر ایسا غصہ آیا کہ پا جائے تو خون ہی پی لے۔ ہائے رے لالچ۔

اس کے خاص عقیدت مندوں میں ایک حسینہ بھی تھی' جسے اس کے شوہر نے کئی سال سے چھوڑ رکھا تھا۔ حسینہ کا باپ فوجی پنشنر تھا۔ ایک تعلیم یافتہ نوجوان سے لڑکی کی شادی کی۔ لیکن لڑکا اپنی ماں کا سعادت مند فرزند تھا اور حسینہ اپنی ساس کو خوش نہ رکھ سکی۔ وہ چاہتی تھی' ساس سے علیحدہ ہو کر شوہر کے ساتھ رہے۔ شوہر اپنی ماں سے الگ ہونے پر راضی نہ ہوا۔ ماں کی قربانیوں کو کیسے بھول جائے۔ بہو روٹھ کر میکے چلی آئی۔ تب سے تین سال ہو گئے تھے اور سسرال سے ایک بار بھی بلاوا نہ آیا۔ نہ شوہر نے آنے کی تکلیف کی۔ نازنین کسی طرح اپنے شوہر کو اپنے بس میں کر لینا چاہتی تھی۔ مہاتماؤں کے لیے کسی کا دل کسی کی طرف پھیر دینا کیا مشکل ہے۔ ہاں ان کی نظر کرم چاہیے۔

ایک دن اس نے تخلیہ میں باباجی سے اپنی داستان غم سنائی۔ نیور کو جس شکار کی تلاش تھی وہ آج بہت دنوں کے بعد پھنسا ہوا معلوم ہوا۔ تقدس کی شان سے بولا۔ ''میں نہ مہاتما ہوں نہ کامل' نہ دنیا کے مایا جال میں پڑتا ہوں۔ لیکن تیری سردھا اور پریم دیکھ کر تجھ پر رحم آتا ہے۔ بھگوان نے چاہا تو تیری مراد پوری ہو جائے گی۔''

اس انکسار نے اس کا رنگ اور بھی جمادیا۔ لڑکی نے اس کے قدموں پر سر رکھ کر عرض کی۔

''آپ سب کچھ کر سکتے ہیں مہاراج! مجھے آپ کے اوپر وشواش ہے۔''

''بھگوان جی کی جو مرضی ہو گی وہ ہو گا۔ میں کچھ نہیں ہوں۔''

''اس بدنصیب کاڈونگا آپ ہی پار لگا سکتے ہیں۔''

''ایشور پر بھروسہ رکھو۔''

''میرے ایشور تو آپ ہی ہیں۔''

نیور نے گویا اس کے منتوں سے بہت مجبور ہو کر کہا۔ ''لیکن بیٹی اس کام میں بہت سے انوشٹھان (عملیات) کرنے پڑیں گے' اور انوشٹھان میں سینکڑوں ہزاروں روپے کا خرچ ہے۔ اس پر بھی تیری مراد پوری ہو گی یا نہیں' کہہ نہیں سکتا۔ ہاں میرے کیے جو کچھ ہو سکتا ہے وہ میں کروں گا' مگر سب کچھ بھگوان کے ہاتھ ہے۔ میں مایا کو ہاتھ سے نہیں چھوتا۔ لیکن تیرا دکھ نہیں دیکھا جاتا۔''

اسی رات کو اس غرض کی باؤلی نے اپنے گہنوں کی پٹاری باباجی کے قدموں پر رکھ دی۔ باباجی نے متنفر ہاتھوں سے پٹاری کھولی اور چاند کی روشنی میں زیوروں کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ اب اگر ان میں کچھ عقل ہو تو یہ ساری مایا ان کی ہے۔ وہ گویا ان کے سامنے دست بستہ کہہ رہی ہے مجھے قبول کیجئے' کرنا ہی کیا ہے' کچھ بھی نہیں' محض پٹاری لے کر اپنے سرہانے رکھ لینا ہے اور لڑکی کو دعائیں اور تقویت دے کر رخصت کر دینا ہے۔ وہ سویرے آئے گی۔ اس وقت تک وہ اتنی دور ہوں گے جتنی دور ٹانگیں لے جائیں۔ ایسی غیر مترقبہ نعمت! جب وہ روپیوں سے بھری تھیلی لیے گھر پہنچیں گے اور بڑھیا کے سامنے رکھ دیں گے' اس وقت بڑھیا..........

لیکن نہ جانے کیوں اتنا ذرا سا کام بھی اس سے نہیں ہو سکتا۔ وہ پٹاری کو اٹھا کر اپنے سرہانے کمبل کے نیچے دبا کر نہیں رکھ سکتا' ہے کچھ نہیں۔ اس سے زیادہ آسان کام دنیا میں نہ ہو گا مگر اس کے لیے منع ہے۔ ہمت شکن ہے۔ ہفتخوان ہے۔ وہ پٹاری کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھا سکتا' ہاتھوں پر اس کا کوئی قابو نہیں ہے۔ جانے دو' ہاتھ سمجھ لو کٹ گئے۔ زبان پر تو اس کا قابو ہے' اتنا کہنے میں کونسی دنیا الٹ جاتی ہے کہ بیٹی پٹاری اُٹھا کر کمبل کے نیچے رکھ دو۔ زبان کٹ تو نہ جائے گی۔ مگر اس پر حقیقت کھلتی ہے کہ زبان پر بھی اس کا قابو نہیں ہے۔ آنکھوں کے اشارے سے بھی وہ کام ہو سکتا ہے لیکن اس موقع پر آنکھیں بھی دغا دے رہی ہیں۔ دل کا بادشاہ اتنے وزیروں اور مشیروں کے ہوتے ہوئے بھی لاچار ہے۔ ضعیف ہے۔ لاکھ روپے کی تھیلی سامنے رکھی ہو' ننگی تلوار ہاتھ میں ہو' گائے مضبوط رسی سے سامنے بندھی ہو۔ کیا اس گائے کی گردن پر اس کے ہاتھ اٹھیں گے؟ غیر ممکن' کوئی خود اس کی گردن کاٹ لے مگر وہ گئو کی ہتیا نہیں کر سکتا۔ وہ غم نصیب مظلوم عورت اس کی نظروں میں اس گئو کی طرح بے زبان قابل رحم تھی۔ جس موقع کو وہ اتنے دنوں سے تلاش کر رہا ہے اسے پا کر آج اس کا ضمیر لرز رہا ہے اور روح کانپ رہی ہے۔ اس کی ہوس فطرتاً بھی وحشی جانوروں کی طرح خونخوار ہے لیکن عرصۂ دراز تک زنجیر میں بندھے بندھے اس کے ناخن گر گئے ہیں اور دانت کمزور ہو گئے ہیں۔

اس نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ ''بیٹی پٹاری اٹھالے جاؤ' تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔ میں تمہاراامتحان لے رہا تھا۔''

چاند ندی کے اس پار درختوں کی گود میں محو خواب تھا۔ نیور آہستہ سے اٹھااور ایک طرف چل دیا۔ بھبھوت اور تلک سے اسے نفرت ہو رہی تھی۔ اُسے تعجب ہو رہا تھا کہ وہ گھر سے نکلا ہی کیوں۔ تھوڑی سی رسوائی اور تضحیک کے خوف سے؟ نہیں سمیّت کے زیر اثر دغا اور ریا نے اس میں جن شیطانی جذبات کو برانگیختہ کیا تھا' ان سے مغلوب ہو کر' اور آج ایک معصوم مظلوم آتما کے اعتقاد اور اعتماد میں اس نے اپنی کھوئی ہوئی حقیقت کو پھر پالیا تھا۔ ایسا خوش تھا گویا وہ زنجیروں سے آزاد ہو گیا ہو۔ ایک نئی سحر کا طلوع' اس کی روح کو ایک نورانی ضیاء سے منور کر رہا تھا اور اس کی رگ رگ سے اس کی شعاعیں نکل رہی تھیں۔

نیور آٹھویں دن اپنے گاؤں پہنچ گیا۔ لڑکوں نے دوڑ کر' اُچھل کود کر' ناچ کر اس کے ہاتھ سے اس کی لکڑی چھین کر اس کا خیر مقدم کیا۔

ایک لڑکے نے کہا۔ ''کاکی تو مر گئی نیور دادا۔''

نیور کے پاؤں جیسے بندھ گئے۔ منہ کے دونوں کونے نیچے جھک گئے اور آنکھیں بجھ گئیں۔ کچھ بولا نہیں۔ کسی سے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ پل بھر جیسے غشی کی حالت میں کھڑا رہا۔ پھر دیوانہ وار ایک بے خودی کے عالم میں اپنی جھونپڑی کی طرف چلا۔ لڑکے بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے مگر وہ ان کی طفلانہ شرارت غائب ہو گئی تھی۔ نادانستہ طور پر وہ سب بھی اس حادثۂ غم سے متاثر ہوئے۔

جھونپڑی کھلی پڑی تھی۔ بڑھیا کی چارپائی جوں کی توں بچھی ہوئی تھی۔ ایک گوشہ میں دوچار پیتل کے برتن پڑے ہوئے تھے۔ لڑکے باہر ہی کھڑے رہ گئے۔ اندر کیسے جائیں وہاں بڑھیا بیٹھی ہے۔

گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ نیور دادا آگئے۔ جھونپڑی کے دروازہ پر بھیڑ لگ گئی۔ سوالات کی یورش ہونے لگی۔ تم اتنے دن کہاں تھے دادا؟ تمہارے جانے کے تیسرے دن کاکی چل بسی۔ رات دن تمہیں گالیاں دیتی تھی۔ مرتے دم تک تمہیں کوستی رہی۔ تیسرے دن ہم لوگوں نے دیکھا تو اکڑی پڑی تھی۔ تم اتنے دن کہاں رہے۔ وہ مکار بابا پھر نہیں دکھائی دیا۔ نہیں تو کھود کر گاڑ دیتے۔

نیور نے جواب نہ دیا۔ صرف مایوس' دردناک' مجروح' خالی آنکھوں سے لوگوں کو دیکھتا رہا گویا حس ہی نہ ہو۔ اس دن سے کسی نے اُسے روتے یا ہنستے نہیں دیکھا۔ ہاں محنت وہ اسی طرح کرتا ہے اور اس کی مزدوری ہے صرف دو روٹیاں۔

لعنت

کاؤس جی نے اخبار نکالا اور شہرت کمانے لگے۔ شاپور جی نے روئی کی دلالی شروع کی اور دولت کمانے

لگے۔ کمائی دونوں ہی کر رہے تھے۔ لیکن شاہ پور جی خوش تھے۔ کاؤس جی دل گرفتہ۔ شاپور جی کو دولت کے ساتھ عزت اور شہرت خود بخود مل رہی تھی۔ کاؤس جی کو شہرت کے ساتھ دولت دور بین سے دیکھنے پر بھی کہیں نظر نہ آتی تھی۔ اس لیے شاپور کی زندگی میں سکون تھا' عافیت تھی' اُمید تھی' درد تھا اور چہل پہل تھی۔ کاؤس کی زندگی میں تلخی تھی' ناکامی تھی' مایوسی تھی' بیزاری تھی' بیدردی تھی۔ دولت کو حقیر سمجھنے کی وہ بہت کوشش کرتے تھے۔ لیکن جو عیاں تھا اس کی جانب سے آنکھیں بند کر لینا غیر ممکن تھا۔ شاہ پور جی کے دولت کدہ میں جو فراخدلی اور مہمان نوازی اور شرافت تھی اس کے مقابلہ میں انہیں اپنے گھر کی بے سروسامانی' تنگ دلی' نزاع اور بدنظمی سے نفرت ہوتی تھی۔ شیریں بیان اور خوش خلق مسز شاپور کے سامنے انہیں اپنی گلشن بانو کم ظرف اور حسد کی پتلی معلوم ہوتی تھی۔ جسے مہمانوں سے گویا کوئی پُرخاش ہو' جو سیدھی سی بات بھی کہتی تو طنز اور جگر خراش کنایوں کے ساتھ۔ شاپور جی گھر میں آتے تو شیریں بائی تبسم اور گرمجوشی سے ان کا خیر مقدم کرتی۔ کاؤس جی خود تھکے ماندے پریشان حال گھر آتے تو گلشن اپنا دُکھڑا سنانے بیٹھ جاتی اور ان کو خوب ملامت کرتی۔ تم بھی اپنے کو انسان کہتے ہو۔ میں تمہیں بیل سمجھتی ہوں' نرا چار پیروں والا بیل۔ بیل بڑا غریب ہے' سیدھا ہے' محنتی ہے' صابر ہے' مانا۔ لیکن پھر اسے شادی کرنے کا کیا حق تھا۔ کاؤس جی سے ایک لاکھ بار یہ سوال کیا جا چکا تھا کہ جب تمہیں اخبار نکال کر اپنی زندگی برباد کرنی تھی تو تم نے شادی کیوں کی' اپنے ساتھ مجھے کیوں لے ڈوبے۔ جب تمہارے گھر میں دو روٹیاں نہ تھیں تو مجھے کیوں لائے۔ اس سوال کا جواب دینے کی غریب کاؤس میں ہمت تھی' نہ طاقت اور نہ صلاحیت۔ انہیں کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ وہ خود اپنی غلطی پر پچھتاتے تھے۔ ایک بار بہت تنگ آکر انہوں نے کہا تھا۔ اچھا بھئی اب تو جو ہونا تھا ہو چکا لیکن میں تمہیں باندھے ہوئے تو نہیں ہوں۔ تمہیں جو مرد زیادہ آرام سے رکھ سکے' اس کے ساتھ جا کر رہو۔ اب اور میں کیا کروں؟ دولت نہیں ملتی تو کیا جان دے دوں۔ اس پر گلشن نے ان کے دونوں کان پکڑ کے زور سے اینٹھے اور گالوں پر دو طمانچے لگائے اور شعلہ بار نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "اچھا اب زبان سنبھالو ورنہ برا ہوگا۔ ایسی شرمناک بات کہتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ مگر غیرت ہوتی تو۔ تم نے شرم تو جیسے بھون کھائی۔" تب سے بے چارے کاؤس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ رہا۔ کہاں تو یہ بدمزاجی اور سرکشی اور دست درازی' کہاں وہ تپاک اور خلوص اور تہذیب کی دیوی شیریں جو کاؤس جی کو دیکھتے ہی پھول کی طرح کِھل جاتی' میٹھی میٹھی باتیں کرتی۔ چائے' مربّے اور پھلوں سے خاطر کرتی اور اکثر انہیں اپنی کار پر سیر کرانے لے جاتی۔ کاؤس جی نے کبھی اس خیال کو اپنے دل میں جگہ دینے کی ہمت نہیں کی۔ مگر وہ خیال ایک آرزو کی صورت میں وہاں چھپا ہوا تھا۔ کاش گلشن کی طرح شیریں ان کی رفیقِ حیات ہوتی تو ان کی زندگی کتنی قابلِ رشک ہوتی۔ کبھی کبھی گلشن کی بدزبانیوں سے وہ اتنے رنجیدہ ہوتے کہ موت کا دروازہ کھٹکھٹاتے۔ گھر ان کے لیے قید خانے سے کم دل فگار نہ تھا اور انہیں جب موقع ملتا سیدھے شیریں کے گھر جا کر اپنے دل کی جلن ٹھنڈی کر آتے۔

ایک دن کاؤس جی علی الصبح گلشن سے برگشتہ خاطر ہو کر شاپور منزل پہنچے تو دیکھا شیریں بانو کی آنکھیں سرخ ہیں اور چہرہ تمتمایا ہوا ہے۔ گویا حرارت ہو۔ گھبرا کر پوچھا۔ "آپ کی طبیعت کیسی ہے' بخار تو نہیں آگیا۔"

شیریں نے مایوس نظروں سے دیکھ کر دردناک لہجہ میں کہا۔ "نہیں نہیں بخار نہیں۔ کم سے کم جسمانی بخار تو نہیں ہے۔"

کاؤس جی اس معمّے کو سمجھ نہ سکے۔

شیریں نے ایک لمحہ خاموش رہ کر پھر کہا۔ ''آپ کو میں اپنا مہربان سمجھتی ہوں۔ کاؤس جی آپ سے کیا چھپاؤں؟ میں اب زندگی سے عاجز آ گئی ہوں۔ میں نے اب تک دل کی آگ دل کے اندر رکھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے باہر نہ نکالوں گی تو شاید میری ہڈیاں تک جل جائیں گی۔ اس وقت آٹھ بجے ہیں لیکن میرے رنگیلے پیا کا کہیں پتہ نہیں۔ رات کا کھانا کھا کر وہ ایک دوست سے ملنے کا بہانہ کر کے گھر سے نکلے تھے اور ابھی تک لوٹ کر نہیں آئے۔ اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ادھر کئی مہینوں سے یہ ان کی روز کی عادت ہے۔ میں نے آج تک کبھی آپ سے اپنا دردِ دل نہیں کہا' مگر اس وقت بھی جب میں آپ سے ہنس کر باتیں کرتی تھی' میرا دل روتا تھا۔ اور میں آپ سے ایک دوست کی حیثیت سے پوچھتی ہوں' میرے لیے اب کونسا راستہ ہے۔'' اُس نے منتظر نگاہوں سے کاؤس کی طرف دیکھا۔

شیریں کی آنکھیں لبریز ہو گئی تھیں مگر چہرے پر ایک جلال سا نمایاں تھا۔ اپنی بے کسی کا یہ اظہار اسے کتنا ناگوار گزر رہا تھا۔ یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا۔

کاؤس جی نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔ ''آپ نے ان سے پوچھا نہیں۔''

''پوچھنے سے کیا لوگ اپنے دل کی باتیں بتا دیا کرتے ہیں۔''

''تم سے تو نہیں کوئی بات چھپانی نہ چاہیے۔''

''گھر سے انسان بیزار ہو تو کیا کرے۔''

''مجھے یہ سن کر حیرت ہو رہی ہے۔ تم جیسی پاکیزہ صفت خاتون جس گھر میں ہو وہ جنت ہے۔ شاپور جی کو تو تمہاری پرستش کرنی چاہیے تھی۔''

شیریں مسکرائی' ستم ظریفانہ انداز سے۔ اس تبسم میں رازِ دل تھا۔

''آپ کے یہ جذبات اس وقت تک ہیں جب تک آپ کے پاس دولت نہیں ہے۔ آج آپ کو کہیں سے دو چار لاکھ مل جائیں تو تم یوں نہ رہو گے' نہ تمہارے دل کی یہ حالت رہے گی۔ دولت کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے۔ سطح کے سکون اور ہریالی فضا کے نیچے کتنی حرارت ہے' یہ تو اس وقت کھلتا ہے جب زمین میں شگاف ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں گھر میں دولت کا انبار لگا کر انہوں نے وہ سب کچھ کر دیا ہے جو ان کا فرض تھا' میرے ساتھ' اور اب مجھے شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ میرا زبان کھولنا بھی حق بجانب نہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ یہ سارے امارت کے لوازمات مصری تہ خانوں میں مدفون تکلّفات کی طرح ہیں' جو ان سونے والی روحوں کے عیش و آرام کے لیے رکھے جاتے ہیں۔''

کاؤس جی یہ ایک نئی بات سن رہے تھے۔ انہیں اب تک زندگی کا جو کچھ تجربہ تھا' وہ تھا کہ عورت طبعاً عشرت پسند اور نفس پرور ہوتی ہے۔ اس پر لاکھ جان نثار کرو' اس کے لیے مر ہی کیوں نہ مٹو لیکن جب تک تمہاری جان نثاری کا کوئی عملی اظہار نہ ہو' مرصع زیورات کی صورت میں' ریشمی ملبوسات کی صورت میں' بیش قیمت تحائف کی صورت میں' فرمائشوں کی تکمیل کی صورت میں' اُبلتے ہوئے کیش بکس کی صورت میں' اُسے تسکین نہیں ہوتی۔ وہ محض کھریرا نہیں چاہتی' دانہ اور گھاس بھی چاہتی ہے۔ لیکن ایک یہ دیوی ہے جو دنیا کی نعمتوں کو حقیر سمجھتی ہے اور مرتی ہے مہرووفا کے لیے' خلوص و محبت کے لیے' دل سوزی اور دلجوئی کے لیے۔ اُن کے دل میں گدگدی سی ہوئی۔

مسز شاپور کی آواز تلخ ہو گئی تھی اور پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔ ذرا دم لیکر بولیں۔ ''اُن کی یہ ہوس پروری

میری برداشت کے باہر ہو گئی ہے۔ مسٹر کاؤس جی میرے دل میں سوزش ہے' ہیجان ہے اور میں دین اور شرع' ننگ وناموس کسی کی آڑ لے کر بھی اپنے کو پابند نہیں رکھ سکتی۔ عصمت کی حفاظت کس لیے' جب کوئی اس کی قدر نہیں کرتا۔ جنگل میں کوئی کیوں گائے جب کوئی سننے والا نہیں۔ دل کو سمجھاتی ہوں' کیا دنیا میں لاکھوں بیوائیں نہیں پڑی ہوئی ہیں۔ جوان حسین' ناز و نعمت میں پلی ہوئی' کیا میں انہیں کی طرح یاس اور محرومی قسمت کا دامن پکڑ کر زندگی کی منزل طے نہیں کر سکتی لیکن دل کی آگ نہیں بجھتی۔ اب مجھے یقین آتا جاتا ہے کہ شاپور مجھے پردۂ عصمت کو چاک کر ڈالنے کی تحریک کر رہے ہیں۔ دیدہ و دانستہ شاید کسی خاص منشا سے۔ میں نے اب تک ان کی چنوتی منظور نہیں کی ہے لیکن پانی سر کے اوپر چڑھ گیا ہے اور میں کسی تنکے کے سہارے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوگا۔ نہیں کچھ اس سے زیادہ ہوگا۔ ناموس کی زنجیر سے آزاد ہو کر آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ آپ اُن کے دوست ہیں' آپ سے بن پڑے تو انہیں سمجھائیے۔ میں اس عصمت کی بیڑی کو اب اور نہیں پہن سکتی۔"

مسٹر کاؤس جی آنے والی مسرتوں کی ایک جنت بنا رہے تھے۔ روشن' پُر فضا' روحانی خوشیوں سے پُر' بولے۔ "ہاں ہاں! میں ضرور سمجھاؤں گا' یہ تو میرا فرض ہے' لیکن مجھے اُمید نہیں کہ میرے سمجھانے کا اُن پر کوئی اثر ہو۔ جس کے پاس دولت نہیں اُسے ایک صاحب دولت کو سمجھانے کا حق ہی کیا ہے۔ آپ کا خیال درست ہے' ضرور انہوں نے کسی منشا سے یہ روش اختیار کی۔"

"یوں تو وہ مجھ پر بڑی عنایت رکھتے ہیں۔ میری خاطر داری میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھتے' اُن کی یہی عادت مجھے پسند نہیں۔"

"تم نے اتنے دنوں تحمل سے کام لیا۔ یہی تعجب ہے۔ کوئی دوسری خاتون ایک دن بھی برداشت نہ کرتی۔"

"اُن کے ساتھ زیادہ سختی کیجیے' مسٹر کاؤس جی! یہ عادت تو کم و بیش ہر مرد میں ہوتی ہے۔ لیکن ایسے مردوں کی بیویاں بھی اسی مزاج کی ہوتی ہیں اور عوض معاوضہ گلہ ندارد کے اصول پر دونوں اپنے اپنے رنگ میں خوش رہتے ہیں۔ عملاً نہ ہوں دلاً ضرور ہوتے ہیں۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ میری حالت بالکل مختلف ہے' میں نے ہمیشہ انہیں اپنا معبود سمجھا ہے۔"

"لیکن جب مرد اس وفا اور تسلیم کی قدر ہی نہ کرے تو مجبوری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ انہوں نے دل میں کوئی اور تہیہ نہ کر لیا ہو۔"

"اور کیا تہیہ کر سکتے ہیں۔"

"کیا آپ ان کا قیاس نہیں کر سکتیں؟"

"اچھا' وہ بات' لیکن کوئی میری خطا؟"

"شیر اور میمنے والی کہانی کیا آپ نے نہیں سنی۔"

"مسز شاپور یکایک خاموش ہو گئیں' سامنے سے شاہ پور جی کی کار نظر آئی۔ انہوں نے کاؤس جی کو ممنون اور ملتجی نظروں سے دیکھا' اور دوسرے دروازے سے نکل کر اندر چلی گئیں۔ مسٹر شاپور جی آنکھوں میں خمار کی سرخی اور مستی بھرے ہوئے کار سے اُترے اور مسکرا کر کاؤس جی سے ہاتھ ملایا اور اپنا ہیٹ کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا۔

"معاف کیجیے گا' میں رات کو ایک دوست کے گھر رہ گیا' دعوت تھی' کھانے میں دیر ہوئی' کچھ گانے بجانے کا بھی

انتظام تھا۔ میں نے سوچا اب گھر کون جائے۔"

کاؤس جی نے طنز آمیز تبسم کے ساتھ پوچھا۔ "کس کے ہاں دعوت تھی۔ میرے رپورٹر نے تو اس کی کوئی خبر نہیں دی' ذرا مجھے نوٹ کرا دیجئے گا۔"

اُنہوں نے جیب سے نوٹ بک نکالی۔

شاہ پور جی نے سنبھل کر کہا۔ "ایسی کوئی بڑی دعوت نہیں تھی' دو چار بے تکلف احباب جمع ہو گئے تھے۔"

"پھر بھی اس کی خبر تو اخباروں میں آنی چاہیے' جس بے تکلف جلسہ میں آپ جیسے باوقار اصحاب شریک ہوں' اُسے اخبار والے کسی طرح نظرانداز نہیں کر سکتے اور عوام کو بھی ایسی خبروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے' میزبان کون صاحب تھے؟"

شاہ پور جی نے ایک پر معنی تبسم کے ساتھ پوچھا۔ "آپ چونکیں گے تو نہیں؟"

"فرمایئے تو!"

"مس گوہر۔"

"مس گوہر؟"

"جی ہاں' وہی۔ آپ چونکے کیوں؟ کیا آپ اسے تسلیم نہیں کرتے کہ دن بھر کے دردِ سر کے بعد مجھے تازہ ہونے کے لیے کچھ تفریح کی بھی ضرورت ہے ورنہ یہ زندگی عذاب ہو جائے۔"

کاؤس جی نے زاہدانہ استحکام کے ساتھ کہا۔ "میں اسے نہیں مانتا۔"

"کیوں۔"

"اس لیے کہ میں کسی قسم کی نفسیاتی تفریح کو اپنی منکوحہ کے ساتھ بے انصافی سمجھتا ہوں۔"

شاہ پور جی ہنسے۔ ایک پُر معذرت انداز کے ساتھ بولے۔ "وہی دقیانوسی خیال۔"

کاؤس جی نے جوش کے ساتھ کہا۔ "آپ کو واضح ہونا چاہیے کہ آج کی تہذیب ایک نسل پہلے کی تہذیب سے کہیں زیادہ قرینِ انصاف ہے۔ اب عورتوں کے حقوق اس حد تک پامال نہیں کیے جاتے۔ اب عورت کو مرد سے بازپرس کرنے کا حق ہے۔"

"بالفاظِ دیگر' اب عورتیں مردوں پر حکومت کر سکتی ہیں۔"

"اس طرح جیسے کہ مرد عورتوں پر حکومت کر سکتے ہیں۔"

"میں اسے نہیں مانتا' مرد عورت کا محتاج نہیں ہے' عورت مرد کی محتاج ہے۔"

"آپ کا مطلب یہی تو ہے کہ عورت اپنی گزر اوقات کے لیے مرد کی دست نگر ہے۔"

"اگر آپ اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ مگر اختیار کی عنان سیاست کی طرح مدنیات میں بھی ہمیشہ ثروت کے ہاتھ رہی ہے اور رہے گی۔"

کاؤس جی اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھ پڑھ چکے تھے اور اس کے ہر پہلو پر غور کیا تھا۔ بولے۔ "اس اعتبار سے تو اگر خدانخواستہ کسبِ معاش کا بار عورت اٹھا رہی ہو تو اسے بھی اختیار ہے کہ جس طرح چاہے تفریح کر سکے۔ آپ کو اس میں کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے۔"

شاپور جی کی زندہ دلی نے متانت کی صورت اختیار کی۔
"میں عورت کا یہ حق تسلیم نہیں کرتا۔"
"تو یہ آپ کی سراسر بے انصافی ہے!"
"مطلق نہیں، عورت پر فطرت نے ایسی بندشیں عائد کر رکھی ہیں کہ وہ بحدِ امکان کوشش کرنے پر بھی مرد کی طرح مطلق العنان نہیں رہ سکتی اور نہ حیوانی طاقت میں ہی مرد کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ ہاں نسائیت کو ترک کر کے اور غیر فطری زندگی کی حمایت میں جا کر وہ سب کچھ کر سکتی ہے، اور آج بھی لاکھوں کروڑوں عورتیں اس آزادانہ روش پر چل رہی ہیں۔"

آپ لوگ اُسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ نسائیت کو ترک کر کے یہ آزادانہ روش اختیار کرے۔"

"میں اس آنے والے زمانے کا قیاس بھی نہیں کر سکتا جب مردوں کی حکومت اور فضیلت کو تسلیم کرنے والی عورتوں کا قحط پڑ جائے۔ قانون اور تہذیب سے مجھے بحث نہیں۔ میں تو اتنا ہی جانتا ہوں کہ مردوں نے عورتوں پر ہمیشہ راج کیا ہے اور کریں گے۔"

دفعتاً کاؤس جی نے پہلو بدلا۔ اتنی تھوڑی سی دیر میں ترغیبِ نفس، نے ان پر تسخیر کا عمل شروع کر دیا تھا۔ شاپور جی کو تحسین کی نظروں سے دیکھ کر بولے "تو اس معاملہ میں میں اور آپ دونوں ہم خیال ہیں۔ میں صرف آپ کی تھاہ لے رہا تھا۔ میں بھی عورت کو بیوی، ماں، بہن کی صورت ہی میں دیکھ سکتا ہوں۔ اسے مطلق العنان نہیں دیکھ سکتا۔ اگر کوئی عورت آزاد رہنا چاہتی ہے تو اس کے لیے میرے نظام تمدن میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ ابھی مسز شاپور کی باتیں سن کر میں حیرت میں آ گیا۔ مجھے اس کا خواب میں بھی گمان نہ تھا کہ عورت اتنے فاسد خیالات کو دل میں جگہ دے سکتی ہے۔"

شاہ پور جی کی گردن کی رگیں تن گئیں۔ نتھنے پھول گئے۔ آنکھیں مشتعل ہو گئیں۔ تنفس تیز ہو گیا۔ کرسی سے اٹھ کر بولے۔ "اچھا! تو شیریں نے اب یہ پر نکالے ہیں، میں ابھی اس سے پوچھتا ہوں، آپ کے روبرو پوچھتا ہوں، ابھی فیصلہ کر ڈالوں گا، مجھے اس کی پروا نہیں ہے، کسی کی پروا نہیں ہے۔ بے وفا عورت، تنگ نظر، کور باطن، جس کے دل میں ہمدردی کا شائبہ تک نہیں، جو میری تاریک زندگی میں روشنی کی ایک جھلک بھی نہیں دیکھ سکتی، جو مجھے زندگی کی جگر کاویوں سے ایک لمحہ بھی مہلت نہیں دینا چاہتی۔ کیا وہ چاہتی ہے کہ میں ہمیشہ اس کے آنچل سے بندھا بندھا گھوموں۔ شاپور سے وہ یہ اُمید رکھتی ہے۔ بیوقوف بھول جاتی ہے کہ اگر میں ذرا سا آنکھوں کا اشارہ کر دوں تو ایک سو شیر بیناں آ کر میری ناز برداری کریں۔ جی ہاں میرے تلوے سہلائیں۔ میں نے اس کے لیے جو کچھ کیا شاید ہی کسی مرد نے کسی عورت کے لیے کیا ہو گا۔ میں۔ نے...... میں نے......"

انہیں معاً خیال آ گیا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بہکے جا رہے ہیں۔ شیریں کی وہ محبت آمیز قربانیاں، وہ بے نفس خدمتیں یاد آ گئیں۔ ضبط کر کے بولے "لیکن میرا خیال ہے وہ اب بھی سمجھ سے کام لے سکتی ہے۔ میں اس کا دل دُکھانا نہیں چاہتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتی ہے وہ احباب سے میری شکایت ہے۔ اتنا مجبوری کا اظہار ہے اس سے آگے قدم اٹھانے کی حماقت اس سے سرزد نہیں ہو سکتی۔ اس کی غیرت قبول نہ کرے گی۔ میں اسے منا لوں گا۔ عورتوں کو منا لینا بہت مشکل نہیں ہے۔ کم سے کم مجھے تو یہی تجربہ ہے۔"

کاؤس جی نے تردید کی۔ "میرا تجربہ تو کچھ اور ہے۔"

''ممکن ہے۔ لیکن آپ کے پاس خالی خولی باتیں ہیں' میرے پاس دولت کا تریاق ہے۔''

''انحراف کا اثر تریاق سے رد نہیں ہو سکتا۔''

شاپور جی نے خطرہ کا صحیح اندازہ کرنے کی کوشش کر کے کہا۔ ''شاید آپ کا خیال درست ہو۔''

کئی دنوں کے بعد کاؤس جی کی ملاقات شیریں سے ہوئی پارک میں۔ وہ اسی موقع کے منتظر تھے۔ ادھر وہ شیریں کے گھر نہ گئے تھے۔ اندیشہ تھا' شاپور جی بدگمان نہ ہو جائیں۔ اُن کی جنت تعمیر ہو چکی تھی' اس میں صرف شیریں کو مسند پر بٹھانے کی کسر تھی۔ اس روزِ سعید کے تصور میں وہ پاگل ہو رہے تھے۔ بالکل خبر نہ تھی کہ اس جنت کی بنیادیں بالو پر ہیں یا پانی پر ہیں۔ اُمید کا سراب دیکھ کر بڑے بڑے دانا بھی شیخ چلی ہو جاتے ہیں۔ گلشن کو انہوں نے میکے بھیج دیا تھا' وہ روٹھ کر چلی گئی تھی۔ جب شیریں ان کی غربت اور بے سروسامانی کی دعوت قبول کر رہی ہے تو گلشن کی ناز برداری کیوں کی جائے۔ لپک کر شیریں سے ہاتھ ملایا اور بولے۔ ''آپ خوب ملیں' میں تو آج آنے والا تھا۔''

شیریں نے شکایت کی۔ ''آپ کی راہ دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئیں۔ شاید آپ بھی زبانی ہمدردی ہی کرنا جانتے ہیں۔ آپ کو کیا خبر ان دنوں میں میری آنکھوں سے کتنے آنسو بہے ہیں۔''

کاؤس جی نے شیریں کا وہ حسین چہرہ اشتیاق سے چمکتا ہوا اور التجا سے زہد شکن دیکھا تو ان کا دل اندر سے بیٹھتا ہوا معلوم ہوا۔ اس طالب علم کی سی حالت ہوئی جو آج تعلیم کی آخری منزل طے کر چکا ہو' زندگی کا مسئلہ اپنی خوفناک صورت میں اس کے سامنے کھڑا ہو۔ کاش وہ کچھ دن اور امتحانوں کی بھول بھلیوں میں زندگی کے میٹھے سنہرے خوابوں کا لطف اٹھا سکتا۔ اس خواب کے سامنے یہ حقیقت کتنی دلدوز تھی' کتنی ہمت شکن' ابھی تک کاؤس جی نے مہا مکھی کا شہد ہی چکھا تھا۔ اس وقت وہ ان کے چہرہ پر منڈلا رہی تھی اور وہ ڈر رہے تھے' کہیں ڈنک نہ مارے۔

دبی ہوئی آواز سے بولے۔ ''مجھے یہ سن کر دلی صدمہ ہوا۔ میں نے تو شاپور کو بہت سمجھایا تھا۔'' شیریں نے ان کا ہاتھ بے تکلفی سے پکڑ کر ایک بنچ پر بٹھا دیا اور آنکھوں میں اصرار اور التجا بھر کر بولی۔ ''ان پر اب سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہو گا اور مجھے بھی کیا غرض پڑی ہے کہ میں اُن کی خوشامد کرتی رہوں۔ آج میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب لوٹ کر اس گھر میں نہ جاؤں گی۔ اگر انہیں عدالت میں ذلیل ہونے کا شوق ہے تو مجھ پر حق شوہریت کا دعویٰ کریں' میں تیار ہوں۔ میں جس کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اس کے ساتھ رہنے کے لیے خدا بھی مجھے مجبور نہیں کر سکتا' عدالت کیا چیز ہے۔ اگر تم میں' تمہارے دل میں وہ خلوص اور محبت ہے جس کا تم اشاروں میں بارہا اظہار کر چکے ہو اور جسے میں نے ہمیشہ قدر کی نگاہوں سے دیکھا ہے' جسے میں نے پیغام سمجھا ہے تو آج سے میں تمہاری بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ جب تک تم میرے رہو گے' میں دولت کی بھوکی نہیں' یہ تم جانتے ہو۔ میں صرف وفا اور محبت چاہتی ہوں لیکن اگر تم میں اتنی اخلاقی ہمت نہیں ہے تو میرے لیے وسیع دنیا ہے۔ میں جیسی کچھ ہوں اتنا جانتی ہوں کہ میرے قدردانوں کی کمی نہیں ہے۔ صاف صاف بتاؤ کہ کیا وہ ساری ہمدردیاں محض زبانی تھیں۔''

کاؤس جی نے کلیجہ مضبوط کر کے کہا۔ ''نہیں نہیں' شیریں! خدا جانتا ہے' میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم میری جنت کی دیوی ہو۔ میری زندگی کا روشن ستارہ.........''

''زیادہ لفاظی نہیں کرو' گلشن کو کیا کرو گے؟''

''اسے طلاق دے دوں گا۔''

''ہاں' میں بھی یہی چاہتی ہوں اور مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔ میں اس کا بنا بنایا آشیانہ برباد نہیں کر رہی

ہوں۔ میں صرف اس آشیانہ کو آباد کر رہی ہوں جس کی اس نے کبھی قدر نہیں کی۔ تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی' اسی وقت۔ خوب سوچ لیا! شاپور سے اب میرا کوئی تعلق نہیں' نہ دین کا نہ دنیا کا۔"

کاؤس جی کو اپنے دل میں ایک رعشہ کا احساس ہوا۔ گدگدی نہیں تھی' رعشہ تھا' لرزہ' کپکپی۔ بولے۔ "لیکن ابھی تو میرے گھر میں کوئی تیاری نہیں ہے۔"

شیریں نے بنچ سے اٹھ کر گویا دریا میں کودتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں ہے۔ تم سب کچھ ہو۔ ایک ٹیکسی لے لو' میں اسی وقت چلوں گی۔ تمہارے گھر سے شاپور کو ایک رقعہ لکھ دوں گی۔ تم مجھ سے سیر ہو گئے اس لیے جاتی ہوں' پھر نہ آؤں گی۔"

کاؤس جی ٹیکسی کی تلاش میں پارک سے نکلے۔ وہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے تھوڑی سی مہلت چاہتے تھے۔ اس بہانہ سے وہ مہلت مل گئی۔ اب اُن پر جوانی کا وہ نشہ نہ تھا جو کبھی ہمیں گڈھوں میں گرا دیا کرتا ہے۔ ذلت کے' رسوائی کے۔ اگر کچھ نشہ ہوا بھی تو وہ اب تک ہرن ہو چکا تھا۔ بیشک انہیں پریشانی ہو گی۔ تباہی کے سامان بھی تو ہو سکتے ہیں اور رسوائی کے بھی۔ شاپور جی اُن کے قاتل دشمن ہو جائیں گے اور انہیں خاک میں ملا دینے کے لیے اپنی ثروت اور اختیار کے سارے وسائل کام میں لائیں گے۔ گلشن بھی خاموش بیٹھنے والی نہیں۔ وہ گلی گلی کوچے کوچے میں اُسے رسوا کرے گی۔ اخباروں میں کہرام مچ جائے گا۔ حریفوں کی قسمت جاگ اُٹھے گی۔ اس واقعہ کو جلی سرخیوں میں شائع کریں گے ...... بوالہوسی کے کرشمے۔ "ایک شکاری اڈیٹر کی رنگین مزاجی۔ نئی تہذیب کا دیوالیہ" وغیرہ۔ مگر یہ سب مصیبتیں جھیلنے کو وہ تیار تھے۔ شاپور جی کی زبان بند کرنے کے لیے اُن کے پاس کافی دلیلیں تھیں۔ گلشن کو بھی طبقۂ اناث میں ذلیل کرنے کا ان کے پاس کافی سامان تھا۔ شیریں جیسی پاک نفس عورت کے لیے وہ اس سے کہیں سخت آزمائش کا مقابلہ کرنے کو تیار تھے۔ خوف تھا تو یہ کہ شیریں کی اس محبت میں قیام بھی ہے۔ ابھی تک شیریں نے انہیں صرف انصاف اور حق کے وکیل کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ صرف ان کے بیدار مغز مضامین پڑھے ہیں۔ صرف ان کی شرافت اور ہمدردی سے بھری ہوئی باتیں سنی ہیں۔ اس میدان میں تو انہیں شاپور سے کسی قسم کا اندیشہ نہ تھا۔ اخلاقی' ذہنی' جذباتی اوصاف میں شاپور اُن کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتے۔ لیکن ان کی شرافت اور ذکاوت کا وہ رنگ ان کی بے سروسامانی اور بدحالی میں کچھ عرصہ تک قائم رہے گا۔ اس میں انہیں شک تھا۔ حلوے کی جگہ چپڑی روٹیاں بھی ملیں تو آدمی صبر کر سکتا ہے۔ روکھی بھی مل جائے تو شاید وہ قناعت کرے لیکن سوکھی گھاس سامنے دیکھ کر تو فرشتے بھی جامے سے باہر ہو جائیں گے۔ شیریں کو اُن سے محبت ہے' اس میں شک نہیں۔ لیکن محبت کی قربانی کی بھی تو کوئی حد ہے۔ دو چار دن یا دو چار مہینے تو شعریت کے نشہ میں وہ خاموشی سے کاٹ لے گی لیکن شعریت اور کیف قائم رہنے والی چیزیں تو نہیں۔ حقیقتوں کی یورش کے مقابلہ میں شعریت کتنے دن ٹکے گی۔ اس چھچھالیدر کا تصور کر کے وہ کانپ اٹھے۔ اب تک وہ محل میں رہی ہے' اب اسے ایک پھونس کی جھونپڑی ملے گی جس کے فرش پر ایرانی قالینوں کی جگہ ٹاٹ بھی نہیں۔ کہاں وردی پوش ملازموں کی پلٹن' کہاں ایک بڑھیا ماما کی کج بحثیاں۔ جو بات بات پر بھنبھناتی ہے' کوستی ہے اور چھوڑ کر بیٹھ جانے کی دھمکیاں دیتی ہے۔ ان کی آدھی آمدنی تو موسیقی کے ماسٹر کی نذر ہو جائے گی' جو اُسے گانا سنانے آتا ہے۔ اور کہیں شاپور جی نے سفلہ پن سے کام لیا تو انہیں بدمعاشوں سے پٹوا سکتے ہیں' قتل کرا سکتے ہیں۔ خیر ان باتوں سے وہ نہیں ڈرتے۔ یہ تو ان کی فتح ہو گی۔ لیکن شیریں کی نفاست پسندی اور شوق نمود پر کیسے فتح پائیں۔ بڑھیا ماما جب منہ پھلائے آکر اس کے سامنے روٹیاں اور سالن رکھ

دے گی، چاندی کے ظروف میں نہیں، چینی کی طشتریوں میں، تب شیریں کے شگفتہ چہرے پر کیسی مظلوم مایوسی طاری ہو جائے گی۔ کہیں وہ اس برانگیختگی کے عالم میں اُن کو اور اپنی قسمت کو لعنت نہ بھیجنے لگے۔ نہیں تمول کی کمی ناز برداریوں سے نہیں پوری کی جاسکتی۔

دفعتاً سامنے سے ایک کار نظر آئی۔ کاؤس جی نے دیکھا شاپور جی رونق افروز تھے۔ انہوں نے ہاتھ اُٹھا کر کار کو روک لیا اور پیچھے دوڑتے ہوئے آکر شاپور جی سے بولے۔ ''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''یوں ہی ذرا گھومنے نکلا ہوں۔''

''شیریں بانو پارک میں ہیں، انہیں لیتے جائیے!''

''وہ مجھ سے لڑ کر آئی ہیں کہ اب اس گھر میں کبھی قدم نہ رکھوں گی۔''

''اور آپ سیر کرنے جا رہے ہیں؟''

''تو کیا آپ چاہتے ہیں بیٹھ کر روؤں۔''

''بہت رو رہی ہیں۔''

''ہمدردی کرنے کو تو آپ ہیں ہی۔''

''آپ انہیں منائیں، ذرا اُن کے آنسو پونچھیں وہ ضرور آپ کے ساتھ چلی جائیں گی۔''

''میں امتحان لینا چاہتا ہوں کہ وہ بغیر منائے مانتی ہیں یا نہیں۔''

''میری جان بڑے عذاب میں ہے، آپ مجھ پر رحم کیجئے، آپ کے پیروں پر پڑتا ہوں۔''

''شیریں جیسی حسینہ کو اپنی حمایت میں لینا عذاب نہیں ہے جناب! نہایت خوشگوار فرض ہے، اور بہت سعی کے بعد آپ کو یہ موقع ہاتھ آیا ہے۔ میں تو روٹھنے منانے کے تماشوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا بھی ایک زمانہ تھا۔ مگر مدت ہوئی ہے بزم چراغاں کیے ہوئے۔''

کار چل دی اور اور کاؤس جی مخمصے کی حالت میں وہیں کھڑے رہ گئے۔ دیر ہو رہی تھی، سوچنے لگے کہیں شیریں یہ نہ سمجھنے لگے کہ انہوں نے بھی اس کے ساتھ دغا کی۔ لیکن جائیں کیسے۔ اس امیر زادی کو اپنی اس سنسان کٹیا میں لے جانے کا خیال ہی انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ حیرت یہ تھی کہ پہلے یہ خیال ان کے دل میں کیونکر نہ آیا۔ وہ کٹیا تو اسی لیے ہے کہ ایک ایڈیٹر عابدانہ محویت کے ساتھ حق اور انصاف اور آزادی کی پرستش کرے۔ امارت اور نفاست کے لیے وہاں جگہ کہاں؟ بلبل کے لیے گلشن چاہیے، ویرانے میں اس کی دلچسپی کے سامان کہاں۔ اس کٹیا کے لیے تو گلشن ہی موزوں ہے۔ کڑھتی ہے، کوستی ہے، چلاتی ہے، روتی ہے، لیکن وقت پر کھانا تو دے دیتی ہے۔ پھٹے ہوئے کپڑوں کو رفو تو کر دیتی ہے۔ کوئی مہمان آ جاتا ہے تو خندہ پیشانی سے اس کی خاطر و تعظیم کرتی ہے۔ کوئی چھوٹی سی سوغات بھی دے دو تو کتنی خوش ہو جاتی ہے۔ تھوڑی سی تعریف کر کے چاہے اس سے غلامی کروالو۔ اب انہیں اپنا ذرا ذرا سی باتوں پر جھنجھلا پڑنا، اس کی سیدھی باتوں کا ٹیڑھا جواب دینا، شیریں کی شرافت کی نظیریں دے کر اُسے ذلیل کرنا یاد آنے لگا۔ ان کی حق پژدہی اور عالی نفسی کیا محض تحریر کے لیے وقف ہے۔ محض ان کے لیے جو ان سے دور ہیں، بے تعلق ہیں۔ اس دن گلشن نے بھی تو کہا تھا کہ اس کی چھوٹی بہن کی سالگرہ کے موقع پر کوئی تحفہ بھیجنا چاہیے۔ اس میں برس پڑنے کی کونسی بات تھی۔ مانا وہ اپنا ادارتی مقالہ لکھنے میں محو تھے لیکن ان کے لیے ادارتی مقالہ جتنا اہم اور ضروری ہے کیا اتنا ہی یا اس سے زیادہ ضروری اور اہم گلشن کے لیے تحفہ بھیجنا نہیں ہے۔ بیشک ان کے

پاس اس وقت روپے نہ تھے۔ معمولی سوغات سے گلشن کو تسکین نہ ہوتی تھی۔ لیکن وہ میٹھے الفاظ میں یہ نہ کہہ سکتے تھے کہ ڈارلنگ مجھے افسوس ہے۔ اس وقت میں تنگدست ہوں لیکن دوچار روز میں کوئی انتظام کردوں گا۔ یہ جواب سن کر وہ خاموش ہو جاتی اور اگر کچھ جھنجھنا لیتی تو ان کا کیا بگڑ جاتا...... ترک موالات تو نہ کر بیٹھتی۔ اپنے مقالات اور مضامین میں وہ کتنی ملاحت اور فصاحت اور خوش بیانی سے کام لیتے تھے۔ ایک بھی دل آزار کلمہ ان کے قلم سے نہ نکلتا تھا۔ دنیائے فصاحت میں ان کا قلم اپنی لطافت کے لیے مشہور تھا۔ کیا محض اس خوف سے کہ وہ گورنمنٹ اور پبلک دونوں ہی سے ڈرتے تھے۔ جانتے تھے کہ ذرا بھی سخت کلامی کی اور گردن ناپی گئی۔ ان کے آئین صحافت میں غصہ اور ہٹ دھرمی بہت بڑے گناہ تھے۔ پھر وہ گلشن پر کیوں برہنہ شمشیر کی طرح ٹوٹ پڑتے تھے۔ کیا اس لیے کہ وہ ان کی دست نگر ہے اور روٹھ جانے کے سوا انہیں اور کوئی سزا نہیں دے سکتی۔ کتنی کمینہ خود غرضی ہے کہ وہ اقتدار اور اختیار والوں کے سامنے دُم ہلائیں اور جو اِن کے لیے اپنی زندگی قربان کر سکتی ہے اور کرتی ہے اُسے کاٹنے دوڑیں۔

ان کا دھیان اس تانگہ کی طرف گیا جو یکایک سامنے رک گیا تھا۔ کتنے بدمعاش ہوتے ہیں یہ تانگے والے۔ اندھا دھند دوڑا چلا آتا ہے۔ اچھا اس پر تو کوئی لیڈی صاحبہ سوار ہیں' غالباً آپ کو تانگے پر کار کا لطف اٹھانے کا خبط ہوا ہوگا۔ ارے یہ تو گلشن ہے' ہاں وہی اور میری ہی طرف آرہی ہے۔ اُنہوں نے تپاک سے آگے بڑھ کر اسے گلے لگالیا اور بولے۔ "تم اس وقت یہاں کیسے آئیں' میں ابھی ابھی تمہارا ہی خیال کر رہا تھا۔"

گلشن نے رقت آمیز لہجہ میں کہا۔ "تمہارے ہی پاس آرہی تھی۔ شام کو برآمدے میں بیٹھی تمہارا مقالہ پڑھ رہی تھی کہ نہ جانے کب جھپکی آگئی' اور میں نے ایک وحشت ناک خواب دیکھا۔ مارے خوف کے آنکھ کھل گئی۔ اور تم سے ملنے چل پڑی۔ دل بے چین ہو رہا تھا۔ تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو۔ کوئی حادثہ تو نہیں ہو گیا۔ میرا سینہ دھک دھک کر رہا ہے۔! ہاتھ رکھ کر دیکھو۔"

کاؤس جی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "میں تو خدا کے فضل سے بہت اچھی طرح ہوں' کیا خواب دیکھا تم نے؟"

"میں نے دیکھا جیسے تم ایک عورت کے پیروں پر سر رکھے ہوئے ہو اور وہ تمہیں پائے حقارت سے ٹھکرا رہی ہے' پھر کیا دیکھا کہ پولیس آگئی ہے اور تمہیں گھسیٹے لیے جا رہی ہے۔"

"کتنا بے ہودہ اور مہمل خواب ہے اور تمہیں اس پر یقین بھی آگیا۔ میں تم سے کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ خواب محض فکر مند دل کے اوہام ہیں۔"

گلشن نے ان کی طرف شبہ کی نظروں سے دیکھا۔ "تم مجھ سے چھپا رہے ہو' کوئی نہ کوئی بات ہوئی ہے ضرور۔ اچھا تم اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو؟ یہ تو تمہارے لکھنے کا وقت ہے۔"

"یونہی ذرا گھومنے چلا آیا تھا' اکیلے گھر میں جی نہ لگا۔"

"جھوٹ بولتے ہو' کھاؤ میرے سر کی قسم۔"

"اب تمہیں اعتبار نہ آئے تو اس کا کیا علاج۔"

"قسم کیوں نہیں کھاتے۔"

"قسم کو میں کذب کی تائید سمجھتا ہوں۔"

گلشن نے پھر ان کے چہرے پر متجسس نگاہ ڈالی۔ پھر ایک لمحہ کے بعد بولی۔ ''اچھی بات ہے' چلو گھر چلیں۔''
کاؤس جی نے مسکرا کر کہا۔ ''تم پھر مجھ سے لڑائی کرو گی۔''
گلشن نے برجستہ کہا۔ ''سرکار سے لڑ کر بھی تم سرکار کی عملداری میں رہتے ہو کہ نہیں۔''
''ہم اسے کب مانتے ہیں کہ یہ سرکار کی عملداری ہے۔''
''یہ تم محض زبان سے کہتے ہو' تمہارا رُواں رُواں اسے تسلیم کر رہا ہے' نہیں تم اس وقت جیل میں ہوتے۔''
''اچھا تم چلو' میں ذرا دیر میں آتا ہوں۔''
''میں اکیلی نہیں جانے کی' آخر سنوں تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''
کاؤس جی نے بہت کوشش کی کہ گلشن یہاں سے کسی طرح چلی جائے۔ لیکن وہ جتنا ہی اس پر زور دیتا تھا اتنا ہی گلشن اور ضد پکڑتی تھی۔ آخر مجبور ہو کر کاؤس جی کو شاپور اور شیریں کی خانہ جنگیوں کی داستان کہنی پڑی۔ ہاں اس ناٹک میں اس کا اپنا جو حصہ تھا' اسے اس نے بڑی ہشیاری سے چھپا دینے کی کوشش کی۔
گلشن نے الہامی انداز سے کہا۔ ''تو تمہیں یہ جنون بھی سوار ہوا۔''
کاؤس جی نے فوراً اپنی صفائی دی۔ ''کیسا جنون' میری اس میں کیا خطا۔''
''تم بیچ میں کیوں پڑے' آخر شیریں نے تم سے کیوں داد خواہی کی۔''
''اب یہ انسانیت نہیں ہے کہ ایک دوست کی بیوی مجھ سے فریاد کرے اور میں بغلیں جھانکتا پھروں۔''
گلشن نے ملامت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''جھوٹ بولنے کیلئے بڑی عقل کی ضرورت ہوتی ہے پیارے! اور وہ عقل تم میں نہیں ہے۔ سمجھے تم۔ اپنا اخبار لکھے جاؤ اور حق و انصاف کے نعرے لگائے جاؤ۔ ان خانہ جنگیوں میں پڑ کر تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی اور تمہارے ساتھ میری بھی۔ چپکے سے جا کر شیریں بانو کو سلام کرو اور کہو کہ جا کر اپنے گھر میں آرام سے بیٹھیں۔ مسرتِ کامل کا دنیا میں وجود ہی نہیں۔ مشیّت اتنی بے انصافی نہیں کر سکتی۔ جس طرح غم میں کچھ خوشی ہوتی ہے' اُسی طرح خوشی میں کچھ غم بھی شامل ہوتا ہے۔ اگر مسرت کا لطف اٹھانا ہے تو اس کے کانٹوں اور داغوں اور خامیوں کے ساتھ اٹھانا پڑے گا۔ ابھی سائنس نے کوئی ایسی ایجاد نہیں کی جس سے ہم مسرت کو اس کے کانٹوں سے علیحدہ کر سکیں۔ مفت کا مال اڑانے والوں کو عیاشی کے سوا اور کیا سوجھے گا؟ دولت اگر ساری دنیا کی لذتوں کو خریدنا چاہے تو وہ دولت ہی کیسی؟ اس کی اشتہائیں سیر نہیں ہوتیں' کبھی نہیں۔ کیا شیریں کے لیے بھی وہی دروازے نہیں کھلے ہیں جو شاپور جی کے لیے کھلے ہیں۔ اس سے کہو شاپور جی کی چھاتی پر مونگ دلے۔ ان کی دولت سے حظ اٹھائے اور بھول جائے کہ وہ شاپور کی بیوی ہے۔ اسی طرح جیسے شاپور بھول گیا ہے کہ وہ شیریں کا شوہر ہے۔ جلنا اور کڑھنا چھوڑ کر دولت کے مزے لوٹے۔ اس کی دولت ایک سے ایک حسین اور رنگین مزاج نوجوانوں کو کھینچ لائے گی۔ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ ایک زمانہ میں فرانس میں باثروت اور عیاش عورتوں کا سارے سماج پر راج تھا۔ ان کے شوہر سب کچھ دیکھتے تھے اور منہ نہ کھول سکتے تھے اور خود اسی دھن میں مست تھے' یہی دولت کا فیض ہے۔ آج سے نہیں ازل سے۔ تم سے نہ بنے تو چلو میں شیریں کو سمجھا دوں۔ عیاش مرد کی بیوی اگر عیاش نہ ہو تو یہ اس کی بے حسی اور بے شرمی ہے۔''
کاؤس جی کے لیے یہ فلسفہ بالکل اچھوتا تھا۔ گلشن کی ذکاوت نے کبھی اتنی اونچی پرواز نہ کی تھی۔ حیرت میں آ کر بولے۔ ''لیکن تم بھی دولت کے پرستاروں میں ہو۔''

گلشن نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "یہی تو زندگی کی لعنت ہے۔ ہم اسی چیز پر لپکتے ہیں جو ہمیں جہنم اور بربادی کی طرف لے جاتی ہے۔ میں پاپا کے ساتھ عرصہ تک دیہات میں رہی ہوں۔ وہاں چاروں طرف مزدور اور کسان رہتے تھے۔ بے چارے دن بھر پسینہ بہاتے تھے۔ شام کو جیسے مر جاتے تھے۔ عیاشی اور بدمعاشی کا کہیں نام نہ تھا اور یہاں شہر میں دیکھتی ہوں کہ سبھی بڑے گھروں میں یہی رونا ہے۔ سبھی لوگ ہتھکنڈوں سے پیسے کماتے ہیں۔ بے محنت' بے مشقت اور غیر فطری زندگی بسر کرتے ہیں۔ انہیں عیاشی نہ سوجھے تو کسے سوجھے۔ اگر آج تمہیں کہیں سے دولت مل جائے تو تم بھی شاپور بن جاؤ گے۔ یقیناً۔"

کاؤس نے شرارت سے پوچھا۔ "تب شاید تم بھی یہ نیا طرزِ عمل اختیار کرو گی۔" گلشن نے متبسم آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ "شاید نہیں! یقیناً!"

بڑے بھائی صاحب

(1)

میرے بھائی صاحب مجھ سے پانچ سال بڑے تھے' لیکن صرف تین درجے آگے۔ انہوں نے بھی اسی عمر میں پڑھنا شروع کیا تھا' جب میں نے شروع کیا، لیکن تعلیم جیسے اہم معاملہ میں وہ جلد بازی سے کام لینا پسند نہ کرتے تھے۔ اس عمارت کی بنیاد خوب مضبوط ڈالنا چاہتے تھے۔ سال کا کام دو سال میں کرتے تھے تاکہ عمارت پختہ ہو جائے۔

میں چھوٹا تھا' وہ بڑے تھے۔ میری عمر نو سال تھی' وہ چودہ سال کے تھے۔ انہیں میری تنبیہ اور نگرانی کا پورا اور پیدائشی حق تھا اور میری سعادت مندی اسی میں تھی کہ ان کے حکم کو قانون سمجھوں۔

وہ بڑے محنتی واقع ہوئے تھے۔ ہر وقت کتاب کھولے بیٹھے رہتے اور شاید دماغ کو آرام دینے کے لئے کبھی کاپی پر کبھی کتاب کے حاشیوں پر چڑیوں' کتوں' بلیوں کی تصویریں بنایا کرتے۔ کبھی کبھی ایک ہی نام کو دس بیس بار لکھ جاتے' کبھی ایک شعر کو دس بیس بار خوشخط حروف میں نقل کرتے' کبھی ایسی عبارتیں لکھتے جن میں کوئی ربط نہ ہوتا نہ کوئی معنی مثلاً ایک بار ان کی کاپی میں میں نے یہ عبارت دیکھی اسپیشل' آئینہ بھائیو' بھائیوں دراصل، بھائی، بھائی رادھے شیام' شری جت رادھے شیام، ایک گھنٹے تک۔ اس کے بعد ایک انسان کا چہرہ تھا۔ میں نے ہر چند کوشش کی اس عبارت میں کوئی معنی نکالوں' لیکن ناکام رہا اور ان سے پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔ وہ نویں جماعت میں تھے۔ میں پانچویں جماعت میں' ان کی تحریر سمجھنا میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات تھی۔

میرا جی پڑھنے میں بالکل نہ لگتا۔ ایک گھنٹہ بھی کتاب لے کر بیٹھنا بارِ خاطر تھا۔ موقع پاتے ہی ہوسٹل سے نکل کر میدان میں آ جاتا اور کبھی کنکریاں اچھالتا' کبھی کاغذ کی تتلیاں اڑاتا، اور کہیں کوئی ساتھی مل گیا تو پوچھنا ہی کیا۔ کبھی چہار دیواری پر چڑھ کر پیچھے کود رہے ہیں' کبھی پھاٹک پر سوار ہو کر موٹر کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ لیکن کمرہ میں آتے ہی بھائی صاحب کی صورت دیکھ کر روح فنا ہو جاتی اور سارا مزا کرکرا ہو جاتا۔ پہلا سوال ہوتا کہاں تھے؟ اس کا

جواب خاموشی کے سوا میرے پاس کچھ نہ ہوتا۔ نہ جانے میری زبان سے یہ بات کیوں نہ نکلتی کہ ذرا باہر کھیل رہا تھا۔ میری خاموشی اعترافِ گناہ سمجھی جاتی۔ اور بھائی صاحب بزرگانہ محبت اور تندی سے ملے ہوئے لہجہ میں کہتے اس طرح انگریزی پڑھوگے تو زندگی بھر پڑھتے رہوگے اور ایک حرف نہ آئے گا۔ انگریزی پڑھنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے کہ جو چاہے پڑھ لے۔ اس طرح انگریزی آتی تو سبھی پڑھ لیتے۔ یہاں رات دن آنکھیں پھوڑنی پڑتی ہیں' خون جلانا پڑتا ہے' تب کہیں جا کر انگریزی آتی ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ تم کتنے کوڑھ مغز ہو کہ مجھے دیکھ کر بھی سبق نہیں لیتے۔ میں کتنی محنت کرتا ہوں یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو۔ اگر نہیں دیکھتے تو یہ تمہارا قصور ہے' تمہاری عقل کا قصور ہے' اتنے میلے تماشے ہوتے ہیں میں کبھی نہیں جاتا۔ روز کرکٹ اور ہاکی کے میچ ہوتے میں قریب نہیں پھٹکتا۔ ہمیشہ پڑھتا رہتا ہوں۔ اس پر دو دو تین تین سال ایک ایک درجہ میں پڑا رہتا ہوں۔ پھر تم کیسے امید کرتے ہو کہ تم یوں کھیل کود میں وقت گنوا کر پاس ہو جاؤ گے۔ مجھے دو ہی تین سال لگتے ہیں۔ تم ساری زندگی اسی درجے میں پڑے سڑتے رہوگے۔ اگر تمہیں اسی طرح عمر گنوانی ہے تو بہتر ہے گھر چلے جاؤ اور مزے سے گلی ڈنڈا کھیلو۔ دادا کی گاڑھی کمائی کے روپے کیوں برباد کرتے ہو۔

میں یہ پھٹکار سن کر آنسو بہانے لگتا۔ جواب ہی کیا تھا۔ بھائی صاحب کو نصیحت کے فن میں کمال تھا۔ ایسی ایسی لگتی باتیں کہتے تھے کہ میرے جگر کے ٹکڑے ہو جاتے اور ہمت ٹوٹ جاتی۔ اسی طرح جان توڑ محنت کرنے کی طاقت میں اپنے میں نہ پاتا تھا اور ذرا دیر کے لئے مجھ پر مایوسی آ جاتی' اور میں سوچتا کیوں نہ گھر چلا جاؤں۔ جو کام میرے بوتے کے باہر ہے اس میں ہاتھ ڈال کر کیوں اپنی زندگی خراب کروں۔ اس کے ساتھ ہی آئندہ سے خوب جی لگا کر پڑھنے کا ارادہ کرتا۔ ٹائم ٹیبل بناتا' صبح اٹھتا' منہ دھو کر ناشتہ کرتا' پھر انگریزی مطالعہ سات سے آٹھ تک' حساب آٹھ سے نو تک' تاریخ نو سے سے ساڑھے نو تک' کھانا کھا کر اسکول جاتا۔ ساڑھے تین بجے اسکول سے واپس۔ آدھ گھنٹے تک آرام۔ پانچ تک جغرافیہ اور نقشہ۔ پانچ سے چھ تک گرائمر' آدھ گھنٹہ آرام' چھ سے ساڑھے سات تک انگریزی کمپوزیشن۔ پھر کھانا کھا کر آٹھ سے نو تک انگریزی' نو سے دس تک اردو' دس سے گیارہ تک متفرق مضامین۔ مگر ٹائم ٹیبل بنا لینا ایک بات تھی' اس پر عمل کرنا دوسری بات۔ پہلے ہی دن سے اس کی خلاف ورزی شروع ہو جاتی۔ میدان کی وہ فرحت انگیز ہوا' وہ دلآویز ہریالی' وہ پر لطف آزادی مجھے اضطراری طور پر کھینچ لے جاتی اور بھائی صاحب کو نصیحت اور فصیحت کرنے کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے سایہ سے بھاگتا' ان کی نگاہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا۔ کمرہ میں اس طرح دبے پاؤں آتا کہ انہیں خبر نہ ہو۔ ان کی نظر میری جانب اٹھی اور میری روح فنا ہوئی۔ ہمیشہ سر پر ایک برہنہ شمشیر سی لٹکتی معلوم ہوتی۔ کتابوں سے نفرت سی ہوتی جاتی تھی۔

(2)

سالانہ امتحان ہوا' بھائی صاحب فیل ہو گئے۔ میں پاس ہو گیا اور درجہ اول میں آیا۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دو درجوں کا تفاوت رہ گیا۔ جی میں آیا' بھائی کو آڑے ہاتھوں لوں۔ آپ کی وہ شبانہ روز کی دیدہ ریزی کہاں گئی۔ مجھے دیکھئے مزے سے کھیلتا رہا اور درجہ اول میں ہوں لیکن وہ اس قدر پژمردہ اور شکستہ خاطر تھے کہ مجھے ان سے دلی ہمدردی ہوئی اور ان کے زخم پر نمک چھڑکنے کا خیال ہی شرمناک معلوم ہوا۔ ہاں اب مجھے اپنے اوپر کچھ اعتماد

پیدا ہوا اور بھائی صاحب کا وہ رعب مجھ پر نہ رہا۔ آزادی سے کھیل کود میں شریک ہونے لگا۔ دل مضبوط تھا۔ اگر انہوں نے پھر فصیحت کی تو صاف کہہ دوں گا آپ نے اپنا خون جلا کر کونسا تیر مار لیا۔ میں تو کھیلتے کودتے درجہ اول میں آ گیا۔ زبان سے یہ ہیکڑی جتانے کی ہمت نہ ہونے پر بھی بشرے اور انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میں بھائی صاحب سے اتنا مرعوب نہیں ہوں۔

بھائی صاحب نے اسے بھانپ لیا اور روز جب میں صبح کا سارا وقت گلی ڈنڈے کی نذر کر کے ٹھیک کھانے کے وقت آیا تو بھائی صاحب نے گویا میان سے تلوار کھینچ لی اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ "دیکھتا ہوں امسال پاس ہو گئے اور درجہ اول میں آ گئے تو اب تمہیں دماغ ہو گیا ہے۔ مگر بھائی جان گھمنڈ تو بڑے بڑوں کا نہیں رہا۔ تمہاری کیا ہستی ہے۔ تاریخ میں راون کا حال تو پڑھا ہی ہو گا۔ اس کی زندگی سے تم نے آخر کیا نتیجہ نکالا یا یوں ہی پڑھ گئے۔ محض امتحان پاس کر لینا تو کوئی بڑی چیز نہیں، اصل چیز ہے تاریخ سے سبق حاصل کرنا۔ راون ساری دنیا کا مہاراجہ تھا۔ ایسے راجوں کو چکرورتی کہتے ہیں۔ آجکل انگریزوں کا راج بہت وسیع ہے مگر انہیں چکرورتی راجہ نہیں کہہ سکتے۔ راون چکرورتی راجہ تھا۔ بڑے بڑے دیوتا اس کی غلامی کرتے تھے۔ آگ اور پانی کے دیوتا بھی اس کے غلام تھے مگر اس کا انجام کیا ہوا۔ غرور نے اس کا نام و نشان مٹا دیا۔ کوئی اسے چلو پانی دینے والا تک نہ بچا۔ انسان اور چاہے جو برائی کرے، غرور کیا اور دین و دنیا سے گیا۔ ابلیس کا حال بھی پڑھا ہو گا۔ اسے بھی غرور ہوا تھا۔ نتیجہ ہوا کہ جنت سے دوزخ میں دھکیل دیا گیا۔ شاہ روم نے بھی ایک بار غرور کیا تھا، بھیک مانگ مانگ کر مر گیا۔ تم نے ابھی صرف ایک درجہ پاس کیا ہے اور ابھی سے تمہارا سر پھر گیا۔ تب تم آگے پڑھ چکے۔ یہ سمجھ لو کہ تم اپنی محنت سے نہیں پاس ہوئے، اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ گئی۔ مگر بٹیر صرف ایک بار ہاتھ لگ سکتی ہے، بار بار نہیں لگ سکتی۔ کبھی کبھی گلی ڈنڈے میں بھی اندھے چوٹ نشانہ پڑ جاتا ہے، اس سے کوئی کامیاب کھلاڑی نہیں ہو جاتا۔ کامیاب کھلاڑی وہ ہے جس کا کوئی نشانہ خالی نہ جائے۔ میرے فیل ہونے پر مت جاؤ، میرے درجہ میں آؤ گے تو دانتوں پسینہ آ جائے گا۔ جب الجبرا اور جامیٹری کے لوہے کے چنے چبانے پڑیں گے، اور انگلستان کی تاریخ پڑھنی پڑے گی۔ بادشاہوں کے نام یاد رکھنا آسان نہیں۔ آٹھ آٹھ ہنری ہو گذرے ہیں، کون سا واقعہ کس ہنری کے زمانے میں ہوا؟ کیا اسے یاد رکھنا آسان سمجھتے ہو۔ ہنری ساتویں کی جگہ ہنری آٹھویں لکھا اور سب نمبر غائب، صفر بھی نہ ملے گا صفر بھی، ہو کس خیال میں۔ درجنوں تو جیمس ہوئے ہیں اور درجنوں ولیم، کوڑیوں چارلس، دماغ چکر کھانے لگتا ہے۔ ان کم بختوں کو نام بھی نہ جڑتے تھے۔ ایک ہی نام کے پیچھے دوم، سوم، چہارم، پنجم لگاتے چلے گئے۔ اور جامیٹری تو بس خدا کی پناہ۔ اب ج کی جگہ اج ب لکھ دیا اور سارے نمبر کٹ گئے۔ کوئی ان بے رحم ممتحنوں سے نہیں پوچھتا کہ آخر اب ج اور اج ب میں کیا فرق ہے، اور کیوں اس مہمل بات کے لئے طالب علموں کا خون کرتے ہو؟ دال بھات روٹی اور دال روٹی بھات میں کونسا فرق ہے۔ مگر ممتحنوں کو کیا پرواہ وہ تو وہی دیکھتے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے۔ چاہتے ہیں کہ سب لڑکے رٹو ہو جائیں۔ اسی رٹنت کا نام تعلیم رکھ چھوڑا ہے اور آخر ایسی بے سر پیر کی باتیں پڑھانے سے فائدہ ہی کیا۔ اس خط پر وہ عمود گرا دو تو قاعدہ عمود سے دوگنا ہو گا۔ پوچھئے اس سے کیا مطلب؟ دوگنا نہیں چوگنا ہو جائے، آٹھ گنا ہو جائے میری بلا سے۔ لیکن پڑھنا ہے تو یہ ساری باتیں یاد رکھنی پڑیں گی۔ انگریزی مضامین لکھنے پڑتے ہیں۔ کہہ دینا "وقت کی پابندی" پر ایک مضمون لکھو جو چار صفحے سے کم نہ ہو۔ اب کاپی کھولے ہوئے اس کے نام کو روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ وقت کی پابندی اچھی بات ہے لیکن اس پر چار صفحے کیسے لکھیئے؟ جو بات ایک جملہ میں کہی جا سکتی ہے، اس کے لیے چار صفحے لکھنے پڑیں گے، چاہے جیسے لکھیئے اور صفحے بھی پورے فل سکیپ

سائز کے۔ یہ لڑکوں پر ستم ناروا نہیں تو کیا ہے؟ ظالم اس پر بھی کہے جاتے ہیں کہ اختصار سے کام لو۔ ایک ذرا سی بات پر تو آپ چار صفحے رنگواتے ہیں اور اس پر فرماتے ہیں کہ اختصار سے بھی کام لو۔ تیز بھی دوڑیئے اور آہستہ آہستہ بھی۔ ہے متضاد یا نہیں، بچہ بھی سمجھ سکتا ہے لیکن ان ماسٹروں کو اتنی بھی تمیز نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے کہ ہم ماسٹر ہیں میرے درجہ میں آؤ گے تو یہ پاپڑ بیلنے پڑیں گے اور تب آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگا۔ اس درجہ میں اول آگئے ہو تو اتنا اتراتے ہو، میرا کہنا مانیے۔ لاکھ فیل ہو گیا، لیکن تم سے بڑا ہوں، دنیا کا تم سے زیادہ تجربہ حاصل کیا ہے، میرا کہنا مانو، جو کچھ کہتا ہوں اسے گرہ سے باندھو ورنہ پچھتاؤ گے۔

اسکول کا وقت قریب تھا ورنہ خدا جانے یہ نصیحت کب ختم ہوتی۔ مجھے آج کا کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوا۔ جب پاس ہونے پر یہ لتاڑ پڑتی ہے تو کہیں فیل ہو جاؤں تو یہ حضرت زندہ ہی نہ چھوڑیں گے۔ انہوں نے اپنے درجہ کی پڑھائی کی جو ہیبت ناک تصویر کھینچی تھی' اس نے مجھے سچ مچ لرزا دیا۔ کیسے اسکول چھوڑ کر گھر نہیں بھاگا' یہی تعجب ہے۔ لیکن یہ سب درگت ہونے پر بھی کتابوں سے میری بیزاری بدستور برقرار رہی۔ کھیل کود کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔ پڑھتا بھی تھا مگر بہت کم' بس اتنا کہ روز کا کام ختم ہو جائے اور درجہ میں ذلیل نہ ہونا پڑے۔ اپنے اوپر جو اعتماد پیدا ہوا تھا وہ پھر فنا ہو گیا اور پھر چوروں کی سی زندگی بسر ہونے لگی۔

(3)

پھر سالانہ امتحان ہوا اور کچھ اتفاق ایسا ہوا کہ میں پھر پاس ہو گیا اور بیچارے بھائی صاحب پھر فیل ہو گئے۔ میں نے زیادہ محنت نہیں کی، مگر خدا جانے کیسے درجہ اول آ گیا' مجھے خود تعجب ہوا۔ بھائی صاحب نے حیرت انگیز محنت کی تھی۔ دس بجے رات تک' ادھر چار بجے صبح سے' پھر ادھر چھ سے ساڑھے نو تک' اسکول جانے سے قبل۔ چہرہ زرد ہو گیا تھا مگر فیل۔ مجھے ان پر رحم آتا تھا۔ نتیجہ سنایا گیا تو رو پڑے اور میں بھی رونے لگا۔

میرے اور بھائی صاحب کے درمیان صرف ایک درجہ کا تفاوت باقی رہ گیا تھا۔ میرے دل میں ایک بیہودہ خیال یہ پیدا ہوا کہ کہیں بھائی صاحب ایک سال اور فیل ہو جائیں تو ان کے برابر ہو جاؤں۔ پھر کس بناء پر میری فضیحت کر سکیں گے۔ لیکن میں نے اس خیال کو دل سے فوراً نکال دیا۔ آخر وہ مجھے ڈانٹتے ہیں تو میری ہی بھلائی کے لیے' مجھے اس وقت ناگوار لگتا ہے ضرور مگر شاید ان کی تنبیہ کا ہی اثر ہو کہ میں یوں دنادن پاس ہوتا جاؤں اور اتنے اچھے نمبروں سے۔

اب کے بھائی صاحب کچھ نرم پڑ گئے تھے۔ کئی بار مجھے ڈانٹنے کا موقع پا کر بھی انہوں نے تحمل سے کام لیا۔ شاید اب انہیں خود محسوس ہونے لگا تھا کہ یہ مجاز اب انہیں نہیں رہا۔ یا رہا تو بہت کم۔ میری بد معاشی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ میں ان کے تحمل کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگا۔ مجھے ایسا گمان ہوا کہ میں پاس ہو ہی جاؤں گا پڑھوں یا نہ پڑھوں۔ میری تقدیر اچھی ہے۔ اس لیے بھائی صاحب کے خوف سے جو تھوڑا بہت کتابیں دیکھ لیا کرتا تھا وہ بھی جاتا رہا۔ مجھے کنکوے اڑانے کا نیا شوق پیدا ہو گیا تھا اور اب زیادہ تر بلکہ سارا وقت اسی مشغلہ کی نذر ہوتا تھا۔ پھر بھی بھائی صاحب کا ادب کرتا تھا اور ان کی نظریں بچا کر کنکوے اڑاتا تھا۔ ساری جزئیات در پردہ عمل میں آتی تھیں۔ میں انہیں یہ گمان کرنے کا موقع نہ دینا چاہتا تھا کہ بھائی صاحب کی وقعت اور عزت میری نظروں میں کچھ کم ہو گئی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ہاسٹل سے دور میں میں ایک کنکوا لوٹنے دوڑا جا رہا تھا کہ بھائی صاحب سے میری مڈ بھیڑ ہو گئی۔ شاید وہ بازار سے لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے وہیں میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے حقارت کی نظروں سے دیکھ کر بولے۔ ''ان بازاری لونڈوں کے ساتھ دھیلے کے کنکوے کے لیے دوڑتے تمہیں شرم نہیں آتی۔ تمہیں اس کا بھی کچھ لحاظ نہیں کہ اب نیچی جماعتوں میں نہیں ہو' بلکہ آٹھویں جماعت میں آ گئے ہو' اور مجھ سے صرف ایک درجہ پیچھے ہو۔ آخر کچھ تو اپنی پوزیشن کا خیال کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ آٹھواں درجہ پاس کر کے نائب تحصیلدار ہو جاتے تھے۔ میں کتنے ہی مڈلچیوں کو جانتا ہوں جو آج اول درجہ کے ڈپٹی کلکٹر یا سپرنٹنڈنٹ ہیں۔ کتنے ہی ہمارے لیڈر ہیں بی اے اور ایم اے والے ان کے ماتحت اور ان کے پیرو ہیں اور تم اسی آٹھویں درجہ میں آ کر بازاری لونڈوں کے ساتھ کنکوے کے لئے دوڑ رہے ہو۔ افسوس ہے تمہاری اس ناعقلی پر' تم ذہین ہو اس میں شک نہیں' لیکن وہ دھن کس کام کا جس سے آدمی اپنا وقار کھو بیٹھے۔ تم اپنے دل میں سمجھتے ہو گے میں ان سے محض ایک درجہ پیچھے ہوں اور اب انہیں مجھ کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، میں تمہارے اس خیال کو کبھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں۔ اور چاہے آج تم میری جماعت میں آ جاؤ' اور ممتحنوں کا یہی حال ہے تو یقیناً اگلے سال میرے ہم جماعت ہو جاؤ گے اور شاید ایک سال بعد مجھ سے آگے نکل جاؤ۔ لیکن مجھ میں اور تم میں جو پانچ سال کا تفاوت ہے اسے تم کیا خدا بھی نہیں مٹا سکتا۔ میں تم سے پانچ سال بڑا ہوں اور ہمیشہ بڑا رہوں گا۔ مجھے دنیا اور زندگی کا جو تجربہ ہے تم اس کے برابر کبھی نہیں آ سکو گے۔ چاہے تم ایم اے اور ایل ایل ڈی ہی کیوں نہ ہو جاؤ۔ عقل کتابیں پڑھ لینے سے ہی نہیں آتی۔ ہماری اماں نے کوئی درجہ پاس نہیں کیا اور دادا بھی شاید پانچویں چھٹی جماعت سے آگے نہیں گئے لیکن ہم دونوں آج ساری دنیا کا علم کیوں نہ پڑھ لیں' اماں اور دادا کو ہمیں تنبیہ کرنے کا ہمیشہ اختیار رہے گا۔ محض اس لیے نہیں کہ بزرگ ہیں بلکہ اس لیے کہ ہم سے زیادہ تجربہ کار ہیں اور رہیں گے۔ امریکہ میں کس طرح کی حکومت ہے؟ اور ہنری ہشتم نے کتنی شادیاں کیں اور آسمان میں کتنے ستارے ہیں' یہ باتیں انہیں نہ معلوم ہوں لیکن ہزاروں ایسی باتیں ہیں جن کا علم انہیں ہم سے زیادہ ہے۔ آج میں خدانخواستہ بیمار ہو جاؤں تو تمہارے ہاتھ پاؤں پھول جائیں گے۔ سوائے دادا کو تار دینے کے تمہیں اور کچھ نہ سوجھے گا' لیکن تمہاری جگہ دادا ہوں گے تو کسی کو تار نہ دیں گے بلکہ خود مرض پہچانیں گے اور خود علاج کریں گے' بدحواس نہ ہوں گے۔ ہمارے خرچ کے لیے وہ جو کچھ بھیجتے ہیں اسے ہم بیس بائیس تاریخ تک خرچ کر کے پیسے پیسے کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ ناشتہ بند کر دیتے ہیں۔ دھوبی اور نائی سے منہ چراتے ہیں۔ لیکن جتنا آج ہم اور تم خرچ کر رہے ہیں' اس کے نصف میں دادا نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ عزت اور نیک نامی کے ساتھ بسر کیا اور ایک کنبہ کی پرورش کی ہے' جس میں سب ملا کر نو آدمی تھے۔ یہ غرور دل سے نکال ڈالو کہ تم میرے قریب آ گئے' اور اب خود مختار ہو۔ میرے دیکھتے تم کبھی اپنی زندگی برباد نہ کر پاؤ گے۔ میں جانتا ہوں تمہیں میری باتیں زہر لگ رہی ہیں۔''

میں نے ان کی بزرگی کا احساس کرتے ہوئے اپنی ناسعادت مندی پر نادم ہو کر باچشم تم کہا۔ ''ہرگز نہیں' آپ جو کچھ فرما رہے ہیں' وہ معقول ہے اور آپ کو اس کے کہنے کا حق ہے۔''

بھائی صاحب نے مجھے شفقت کی نظروں سے دیکھا اور مجھے گلے لگا لیا اور بولے۔ ''میں کنکوے اڑانے سے منع نہیں کرتا۔ میرا جی بھی کبھی کبھی کنکوے اڑانے کو للچاتا ہے' کروں کیا خود بے راہ چلوں تو تمہیں ہدایت کیسے کروں' یہ فرض تو میرے سر پر ہے۔''

اتفاق سے اسی وقت ایک کنکوا ہمارے اوپر سے گذرا' اس کی ڈور لٹک رہی تھی۔ بھائی صاحب لمبے تھے۔ اچھل کر اس کی ڈور پکڑلی اور اسے لئے ہوئے ہوسٹل کی طرف دوڑے۔ میں پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

مِس پدما

پدما کار سے اتر کر اپنی بہن سے گلے ملی' تو اسے خوشی کے بجائے روحانی صدمہ ہوا۔ یہ وہ رتنا نہ تھی جسے اس نے سال بھر پہلے چچاجی کے ساتھ خوش خوش گھر سے آتے دیکھا تھا۔ شگفتہ اور مخمور اور متبسم' وہ پھول مرجھا گیا تھا۔ بہن کے خطوط سے پدما کو اتنا ضرور معلوم ہوا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ خوش نہیں ہے' اور اس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے لیکن اس کی حالت اتنی خراب ہو گئی ہے' اس کا اسے گمان نہ تھا۔ جیسے تصویر مٹ گئی ہو صرف اس کا خاکہ باقی ہو۔

اس نے پوچھا۔ "یہ تمہاری کیا حالت ہے بہن! تم بیمار ہو' اپنی بیماری کی اطلاع تو تم نے کبھی نہ دی۔" رتنا حسرت ناک تبسم کے ساتھ بولی۔ "کیا کرتی لکھ کر' تقدیر میں جو تھا وہ ہوا' اور آئندہ ہوگا۔ تمہیں اور اماں کو اپنی داستانِ غم سنا کر خواہ مخواہ کیوں رنجیدہ کرتی۔ تجھ سے ملنے کو دل بہت بے قرار تھا اور تو اتنی شیطان ہے کہ بار بار آنے کا وعدہ کر کے ٹال جاتی تھی۔ ایسا غصہ آتا تھا کہ تجھے پاجاؤں تو خوب پیٹوں' مہینوں کا غبار جمع ہے' چل کر ہاتھ دھولے' کچھ کھاپی کر مضبوط ہو جا۔"

مگر پدما کو مطلق بھوک نہیں ہے' دوپہر کو اس نے صرف ایک پیالہ چائے اور ٹوسٹ کھایا تھا۔ سہ پہر کو ایک سنترا' اور اب شام ہو گئی ہے۔ گاڑی سے اتری تو اس کا جی کچھ کھانے کو چاہتا تھا لیکن اب جیسے بھوک غائب ہو گئی ہے۔ اس نے کرسی پر لیٹ کر کہا۔ "جیجاجی تو تم سے بڑی محبت کرتے تھے' یکایک کیوں برہم ہو گئے۔"

رتنا نے بے نور آنکھوں سے تاکتے ہوئے کہا۔ "اب میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں' شاید میں اتنی حسین نہیں ہوں' یا اتنی سلیقہ دار نہیں ہوں یا اتنی غلام نہیں ہوں۔ کیونکہ اب مجھے تجربہ ہوا ہے کہ عورتوں کی آزادی کا دم بھرنے والے مرد بھی عام مردوں سے کچھ بہتر نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ اپنی اس فراخدالی کے معاوضہ میں اور بھی کامل' بے زبان اطاعت چاہتے ہیں۔"

پدما نے حقیقت کو اور واضح کرنے کے ارادہ سے پوچھا۔ "لیکن تم دونوں تو ایک دوسرے سے خوب واقف تھے۔"

رتنا تھکی ہوئی سی بولی۔ "یہی تو رونا ہے۔ ہماری شادی بزرگوں کی طے کردہ نہ تھی۔ ہم ایک دوسرے کے مزاج اور عادات اور خیالات سے خوب واقف تھے۔ برسوں ہمسائے رہے تھے۔ ایک دوسرے کے عیب و ہنر پہچاننے کے جتنے موقعے ہمیں ملے بہت کم کسی کو ملتے ہوں گے۔ ہم نے گھڑے کو خوب ٹھونک بجا کر اپنا اطمینان کر لیا تھا۔ ظرف میں کہیں شگاف یا درز تو نہیں۔ آواز اس کی سچی تھی' ٹھوس' دھات کی آواز کی طرح مترنم' لیکن ظرف میں پانی پڑتے ہی نہ جانے کدھر سے بال نکل آئے' اور سارا پانی بہہ گیا۔ اور اب گھڑا پھوٹی تقدیر کی طرح

خشک پڑا ہوا ہے۔ مجھے اب معلوم ہوا عورت کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ شادی کو لعنت کا طوق سمجھے اور مطلق العنان رہ کر زندگی بسر کرے۔ عورت کے لئے ہی کیوں مرد کے لیے بھی میں شادی کو اتنا ہی مہلک سمجھتی ہوں۔ اگر شیامو کی طبیعت مجھ سے سیر ہو گئی تو میری طبیعت بھی ان سے کچھ کم سیر نہیں ہوئی۔ ان کی جن اداؤں اور خوش فعلیوں پر فدا تھی' اب ان سے مجھے نفرت ہے' کیوں دل کی یہ حالت ہے' کہہ نہیں سکتی۔ لیکن اب میں ان کے ساتھ ایک دن بھی نہیں رہنا چاہتی۔ وہ ہنستے ہیں تو مجھے ان کی ہنسی میں چھچھورے پن کی بو آتی ہے۔ باتیں کرتے ہیں تو ان میں بناوٹ کا رنگ جھلکتا ہے۔ اچکن اور پائجامہ پہنتے ہیں تو میراثیوں جیسے لگتے ہیں۔ کوٹ اور پتلون پہنتے ہیں تو جیسے کوئی کرستان ہو۔ ان کے ساتھ جتنی دیر رہتی ہوں دل پر بہت جبر کر کے رہتی ہوں۔ لیکن ہم دونوں میں یہ فرق ہے کہ وہ اپنی مرضی کے بادشاہ ہیں' میں ان کی مرضی کی غلام ہوں۔ ان کے لئے میرے جیسی اور مجھ سے بدرجہا حسین دل بستگی کے لئے موجود ہیں' کوشاں ہیں' طالب ہیں' میرے پاؤں میں زنجیر ہے' قانون کی بھی' احساسات کی بھی اور وقار کی بھی۔ وہ آزاد ہیں' اس لئے خوش ہیں' متحمل ہیں' ظاہر دار ہیں۔ میں مقیّد ہوں' میرا ایک ایک ذرہ' ایک ایک نقطہ نفی ہے۔ ستم یہ ہے کہ میں ظاہر داری بھی نہیں کر سکتی۔ میں خلوص چاہتی ہوں' خلوص کو غصہ میں برداشت کر سکتی ہوں' تصنع کی دلجوئی بھی نہیں برداشت کر سکتی' اور جب خلوص پاتی نہیں تو خلوص دوں کہاں سے۔ تجھے میں یہی صلاح دوں گی کہ کبھی یہ بیڑی اپنے پاؤں میں نہ ڈالنا۔ عورتوں نے شادی کو ذریعہ معاش سمجھ لیا ہے' میں نے بھی وہ غلطی کی' اپنے کو کسی پیشے کے لیے تیار نہ کیا' لیکن تیرے لیے ابھی بہت موقع ہے' تو ذہین ہے' زود فہم ہے' ذی حوصلہ ہے' تو اگر وکالت کرے تو مجھے یقین ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں تیرا رنگ جم جائے۔ مرد حسن پرست ہوتے ہیں' حسن ان کے دل کی ازلی بھوک ہے۔ کیوں نہ ہم ان کی اس حماقت سے فائدہ اٹھائیں۔ جس مقدمہ میں مرد وکیل ایک پائے تو اس میں تو ستم کے ساتھ ہو دو پا سکتی ہے۔ یہ پیارا چاند سا مکھڑا کس مرد کی نظر میں نہ بس جائے گا لیکن وہی شخص جو ابھی تیرے قدموں پر سر رکھے گا اور تیری اداؤں پر قربان ہو گا تجھ سے شادی ہو جانے پر شتر غمزے کرے گا' تجھ پر رعب جتائے گا۔"

بیوقوف رتنا لینا سب کچھ چاہتی تھی دینا کچھ نہیں۔ محض نسائیت کے بوتے پر' اپنے حسن اور انداز کے بل پر۔ وہ حسین ہے' خوش ادا ہے' تسلیم کا حق ہے' کوڑیاں دے کر جواہر پارے لینا چاہتی ہے۔

مسٹر شیام ناتھ جھلّا آتے نظر آئے۔ پدما نے کمرہ سے نکل کر ان سے ہاتھ ملایا۔

(2)

پدما خود انہی خیالات کی لڑکی تھی اور بہن کی تاکید نے اس کے خیالات اور بھی مستحکم کر دیئے۔ بی اے میں تو تھی ہی۔ امتحان میں اس نے اول درجہ حاصل کیا۔ قانون کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ دو سال میں اس نے قانون بھی اول درجہ میں پاس کر لیا اور وکالت شروع کر دی۔ اس کی ذہانت اور ذکاوت نے اس کے حسن کے ساتھ مل کر سال بھر میں اسے جونیر وکیلوں کی اول صف میں بٹھا دیا۔ وہ جس اجلاس میں پہنچ جاتی ایک ہنگامہ مچ جاتا۔ نوجوان وکلا چاروں طرف سے آ آ کر بیٹھ جاتے اور سائلانہ نظروں سے اسے دیکھتے۔ عدالت بھی اس کی رعنائیوں اور شیریں بیانیوں سے بے نیاز نہ رہ سکتی۔ زاہد طبیعت ججوں کی نظریں بھی مسرور ہو جاتیں' چہروں پر رونق آ جاتی' سبھی اس کی

ایک نظر کے متمنی تھے اور اس کی وکالت کیوں نہ کامیاب ہوتی—— وہ شکستوں سے ناآشنا تھی‘ان میں بھی فتح کا پہلو چھپا ہوا تھا۔اس کے موکل ملزم کو الزام ثابت ہو جانے پر بھی سزا بہت نرم ملتی۔یا اس کا مقدمہ کمزور ہونے پر بھی فریق مخالف کا شدید ترین مواخذہ ہوتا۔اس کے خلاف ڈگریاں بھی ہوتیں‘ تو اس سے عدالت کا خرچہ نہ لیا جاتا۔ شرح سود میں معقول تخفیف ہو جاتی اور موافق ڈگریوں میں فریق ثانی کی شامت ہی آجاتی۔اس کے حسن کا جادو نامعلوم طور پر اپنا اثر ڈالتا رہتا تھا۔

لیکن اس کی دھاک جمی اس استغاثہ کی پیروی میں جو اس کی بہن رتنا نے مسٹر جھلّا پر علیحدگی کے لئے دائر کیا۔میاں بیوی کے تعلقات اس درجہ کشیدہ ہو گئے تھے کہ رتنا کو اب قانون کے سوا چارہ نہ رہا۔اس کا مقدمہ ہر ایک پہلو سے کمزور تھا۔علیحدگی کے لئے جن قانونی اسباب کی ضرورت ہوتی ہے ان کا یہاں نشان نہ تھا۔

لیکن پدما نے کچھ ایسی دقت نظری سے کام لیا کہ مقدمہ کچھ سے کچھ ہو گیا۔جس وقت پدما اجلاس میں آکر کھڑی ہوتی اور اپنے مؤثر لہجہ میں خطیب کامل کی روانی اور انہماک اور استدلال کی وضاحت اور جامعیت کے ساتھ اپنی تقریر شروع کرتی تو سامعین چشم حیرت سے دیکھتے رہ جاتے اور آپس میں کہتے یہ قدرت کی دین ہے۔بلا شبہ اس کی بحث میں استدلال کے مقابلہ میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا لیکن اس میں نفسیات کی جگہ صداقت اور خلوص کا اتنا پختہ رنگ ہوتا کہ عدالت بھی اس سے بغیر متاثر ہوئے نہ رہ سکی۔رتنا کی ڈگری ہوئی اور پدما کے لیے عروج کے دروازے کھل گئے۔

(3)

دونوں بہنیں اب ایک ساتھ رہنے لگیں۔اس شہر میں یہ خاندان ممتاز تھا۔پدما کے والد پنڈت امانا تھ کول کامیاب بیرسٹر تھے۔اور اگرچہ ان کی زندگی نے وفا نہ کی اور عین عالم شباب میں دو یتیم لڑکیاں چھوڑ کر رحلت کر گئے لیکن اتنا اثاثہ چھوڑ گئے کہ بیوہ ماں کو لڑکیوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی دقت نہ ہوئی۔امانا تھ خود شوقین‘ آزاد مشرب‘ رنگین مزاج آدمی تھے‘ لیکن ان کی متاہل زندگی پر سکون تھی۔باہر وہ کچھ کریں‘ گھر کے اندر ان کی بیوی کا راج تھا اور وہ خوش تھی۔بدمزگیاں ہوتیں‘لیکن سوال و جواب تک رہ جاتیں‘ سخت زبانیوں کی نوبت نہ آتی۔کول صاحب جاہا سپر انداختن کے اصول سے واقف تھے۔انہیں یقین تھا وہ کتنی ہی بے عنوانیاں کریں بیوی کی وفا‘ خلوص اور اعتماد پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔اور آج ان کو مرے بیس سال ہو گئے مگر وہ دیوی ابھی تک ان کی پرستش کرتی جاتی تھی۔وہ صرف ایک بار کھانا کھاتی اور وہ بھی بے نمک‘ زمین پر سوتی اور مہینے کے آدھے دن برت رکھتی جیسے کوئی سنیاسی ہو۔دونوں لڑکیوں کی اس روش پر اسے روحانی کوفت ہوتی تھی۔مگر انہیں سمجھانے کی اس کے پاس عقل نہ تھی‘ نہ ہمت—— وہ دونوں اپنی ماں کا مضحکہ اڑاتیں اور اسے سادہ لوح‘ بے زبان‘ فرسودہ خیال سمجھ کر اس پر رحم کرتی تھیں۔ان میں کسی کو ایسا نفس پرور‘ بے وفا‘ سرد مہر شوہر ملا ہوتا تو اسے ٹھوکر مارتیں اور اس کی صورت نہ دیکھتیں اور اسے دکھا دیتیں کہ اگر تم کج روی کر سکتے ہو تو ہم بھی تم سے کم نہیں ہیں۔نہ جانے اماں کیونکر ایسے وحشی‘ بیدرد‘ ناشناش آدمی کے ساتھ رہ سکتی تھیں اور اب بھی اس کا احترام کرتی ہیں۔تعلیم نہ پانے کی یہی برکت ہے‘ وہی طوفان نوح کے زمانے کے خیالات ہیں۔دنیا کتنی دور نکل گئی ہے‘اس غریب کو کیا خبر؟

پدمانے وکالت شروع کرتے ہی علیحدہ مکان لے لیا تھا۔ ماں کے ساتھ اسے بہت سی قیدوں کی پابندی‘ شرما حضوری‘ اس کے پاس خاطر سے کرنا پڑتی‘ اور وہ آزاد رہنا چاہتی تھی۔ وہ کسی کے روبرو جواب دہ کیوں ہو؟ وہ اپنے نیک و بد کی مختار ہے۔ کسی کو اس کے معاملہ میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ بیوہ ماں اسی پرانے مکان میں رہتی تھی۔ تنہا مرحوم کی یاد کی پرستش کرتی ہوئی۔ رتنا شوہر سے علیحدہ ہو کر پدما کے ساتھ رہنے لگی لیکن چند ہی مہینوں میں اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا یہاں نباہ نہیں ہو سکتا۔ پدمانے خود ہی کوشش کر کے مفصل کے ایک شہر میں اسے ایک مدرسہ میں جگہ دلوادی۔ پدمانے تعلیم سے جو فیض اٹھایا تھا اس میں نفسانی خواہشات کی تکمیل ہی حیات کا مقصد تھا۔ بندش روح کی بالیدگی کے لئے زہر تھی۔ فرائڈ اس کا معبود تھا اور فرائڈ کے نظریے اس کی زندگی کے لئے مشعل ہدایت۔ کسی عضو کو باندھ دو۔ تھوڑے ہی دنوں میں دوران خون بند ہو جانے کے باعث بیکار ہو جائے گا۔ فاسد مادہ پیدا کر کے زندگی کو معرض خطر میں ڈال دے گا۔ یہ جو جنون اور مراق اور اختلال دماغ کی اتنی کثرت ہے‘ محض اس لئے کہ خواہشات میں رکاوٹ ڈالا گیا۔ نفسیات کی یہ نئی تنقیح پدما کی زندگی کا مسلمہ اصول تھی۔

اور وہ بڑی آزادی سے اپنی پرسونالٹی کی تکمیل کر رہی تھی۔ پیشہ کی ابتدائی کشمکش ختم ہو جانے کے بعد اس کی وکالت اس طرح تھی‘ جیسے مچھلی کے لئے پانی۔ بیشتر مقدمات اپنی نوعیت کے اعتبار سے یکساں ہوتے تھے۔ صرف جزئیات میں کچھ امتیاز ہوتا تھا۔ ان کی پیروی کے لئے کسی قسم کی تحقیق یا تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ محرر ضابطے کی تکمیل کر دیتا۔ وہ اجلاس میں جا کھڑی ہوتی اور وہی ہزار بار کی دہرائی ہوئی دلیلیں اور منجھے ہوئے الفاظ۔ اس لئے اب اسے فرصت بھی کافی تھی۔ اس کے ہواخواہوں میں کئی نوجوان رئیس تھے جو محض اس کے دیدار سے محظوظ ہونے کے لئے نئے نئے مقدمات لاتے رہتے تھے۔ اور وکالت کے مندر کی تو وہ دیوی تھی۔ اور کتنے ہی نوجوان وکیل اس کی چوکھٹ پر جبہ سائی کرتے رہتے تھے۔ نوجوان ہی کیوں‘ جہاندیدہ بھی‘ پکے ہوئے بال اور پکی ہوئی عقل والے جس پر اس کی نظر کرم ہو جاتی وہ پارس ہو جاتا۔

مگر انسان کوشش کرنے پر بھی بالکل حیوان نہیں ہو سکتا۔ پدما شباب کی پہلی امنگ میں تو دلوں سے کھیلتی رہی۔ نازوادا‘ رعنائی و دل ربائی کے کرشمے تھے اور صید افگنی گھاتیں۔ مگر رفتہ رفتہ اسے خرمستیوں سے نفرت ہونے لگی اور دل ایک ایسے وجود کی تلاش کرنے لگا جس میں درد ہو گہرائی ہو‘ جس پر وہ تکیہ کر سکے۔ ان شہدوں میں سبھی بھنورے تھے۔ پھول کا رس لے کر اڑ جانے والے جو اس کے رسوخ اور اثر اور کرم کے لیے اس کے عاشق بنے ہوئے تھے۔ وہ اب ایسا چاہنے والا چاہتی تھی جو اس کے لئے زندگی قربان کر سکے۔ جو اس کی محبت کو اپنی زندگی کی آرزو بنالے اور جس پر جو خود اپنے کو مٹا سکے۔

اتفاق سے اسے ایک دن مسٹر جھلّا نظر آ گئے۔ اس نے اپنی کار روک لی اور بولی۔ ”آپ کب تشریف لائے؟“ رشتہ ٹوٹ جانے پر بھی کج اخلاقی تو نہ کی جا سکتی تھی۔“

جھلّانے اشتیاق سے کہا۔ ”آج ہی آیا تھا اور تم سے ملنا چاہتا تھا۔ جب سے تمہاری وہ بحث سنی ہے اور تمہارا وہ انداز دیکھا ہے‘ تمہارا مداح ہو گیا ہوں۔ کسی وقت تمہیں فرصت ہو تو آؤں۔“

پدما کو ان سے ہمدردی ہوئی۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی‘ گو میں نے اپنی بہن کی حمایت میں تمہارے خلاف بہت سی غلط بیانیاں کیں۔ غلط الزامات لگائے۔ لیکن وہ پیشہ کی بات تھی۔ اس میں مجھے تم سے مطلق ملال نہیں ہے۔ بولی۔ ”شوق سے آئیے۔ میرے ساتھ ہی چلیے‘ میں گھر ہی چل رہی ہوں۔“

جھلّا آکر بیٹھ گئے اور مختصر سی ملاقات میں پدما کو معلوم ہوا کہ جھلّا شریف' روشن خیال اور صاف گو آدمی ہیں۔

دونوں چائے پر بیٹھے تو جھلا نے شکایت آمیز تبسم کے ساتھ کہا۔ "آپ نے تو بحث کے دوران میں مجھے پورا شیطان بنا کر کھڑا کر دیا۔"

پدما ہنس کر بولی۔ "اس کا ذکر نہ کیجئے وہ پروفیشنل معاملہ تھا۔"

"تو کیا میں یہ باور کرلوں کہ آپ فی الواقع مجھے اتنا مکروہ انسان نہیں سمجھتیں۔"

"آپ کے برعکس میں آپ کے اخلاق سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔ مجھے تعجب ہے کہ آپ کی رتنا سے کیوں نہ پٹی؟"

"اگر آپ انسان کو انسان نہ سمجھ کر فرشتہ دیکھنا چاہیں تو یقیناً مایوسی ہو گی۔"

"شادی کر کے خوش رہنے کے لیے جس بے حسی کی ضرورت ہے' اتنی شاید رتنا میں نہ تھی۔"

"اب مجھے یہی تجربہ کرنا ہے کہ آزاد رہ کر خوشی مل سکتی ہے یا نہیں۔ شادی کر کے دیکھ لیا۔"

"میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔"

"نسائی ہمدردی کی میری نگاہوں میں کوئی وقعت نہیں۔"

پدما نے عشوہ طراز نظروں سے دیکھا۔

"ایسے بے وفاؤں کو زبانی ہمدردی کے سوا اور کیا مل سکتا ہے۔"

"یہ بھول نہ جایئے کہ یہ عدالت نہیں ہے۔"

"صفائی کا بار آپ کے اوپر ہے۔"

"مجھے موقع عطا کیجئے۔"

دوسرے دن جھلا پھر آئے اور زیادہ دیر تک رہے اور اس کے بعد روزانہ کسی نہ کسی وقت ضرور آجاتے۔ پدما روز بروز ان کی جانب ملتفت ہوتی جاتی تھی۔ ان میں وہ سارے اوصاف نظر آتے تھے جن کی اسے بھوک تھی۔ ان میں خیالات کی مناسبت تھی۔ نیک نیتی تھی' ایثار تھا' جذبات تھے اور کوئی ذاتی غرض نہیں۔

ایک دن جھلا نے کہا۔ "میرا جی چاہتا ہے' یہیں آکر پریکٹس کروں' مجھے اب محسوس ہو رہا ہے کہ تم سے دور نہیں رہ سکتا۔"

پدما خوش ہو کر بولی۔ "ضرور آجایئے میری بھی یہی تمنا ہے اور اسی مکان میں ٹھہریئے۔"

"یعنی آپ کے سایہ میں! غیر ممکن؟"

"مجھ سے محبت اور میرے سایہ سے نفرت!"

"آپ کی آزادی میں مخل ہونا نہیں چاہتا۔"

"یوں کہیے کہ آپ کو میری جانب سے اپنی آزادی میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے۔"

"میں تو تائب ہو چکا۔"

"دل سے۔"

"تو مجھ سے معاہدہ کر لیجئے نا۔"

”دل سے۔“
”ہاں دل سے۔“

(4)

رتنا نے پدما کو غصہ اور تنبیہ سے بھرا ہوا خط لکھا۔ ”تو نے یہ کہاوت نہیں سنی آز مودہ را آز مودن جہل است“ مجھے حیرت ہوتی ہے تو اس شخص کے ساتھ کیونکر ملتفت ہوئی۔ یہ شخص دغا دے گا۔ مکار ہے' نفسانیت سے بھرا ہوا۔“

لیکن پدما پر کوئی اثر نہ ہوا۔ جھلا کو وہ خط دکھا دیا۔ جھلا بولے۔ ”تم لکھ دو میں ان سے شادی نہیں کر رہی ہوں' اور طلاق کی نوبت نہ آئے گی۔“

پدما نے شوخی کے ساتھ کہا۔ ”میں تو لکھ دوں گی' میں ان سے شادی کر رہی ہوں' اور کبھی طلاق نہ دوں گی۔“

جھلا کی ڈاکٹری پریکٹس برائے نام تھی۔ ایک کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا' دروازہ پر اپنا سائن بورڈ لگا دیا تھا اور صبح کو دو تین گھنٹے اپنے کمرہ میں بیٹھے ناول پڑھا کرتے تھے جس کا انہیں بے حد شوق تھا۔ مریض عنقا تھے۔ پدما ان پر کچھ ایسی فریفتہ ہو گئی تھی کہ وہ جتنا چاہیں خرچ کریں اور جس طرح چاہیں خرچ کریں وہ مطلق معترض نہ ہوتی تھی۔ ان کے لئے ایک نہ ایک تحفہ روز ہی لاتی رہتی تھی۔ ایسی بیش قیمت گھڑی شہر کے بڑے سے بڑے رئیس کے پاس بھی نہ ہو گی۔ ان کے لئے ایک علیحدہ کار تھی — دوسرے الگ نوکروں کو سخت تاکید تھی کہ ان کے کسی حکم کی تعمیل میں دیر نہ ہو۔ ذرا سی شکایت ہوئی اور تم گئے۔ روز ان کے لئے اچھی اچھی شرابیں آتیں' اور پدما کو شراب کا چسکا پڑ گیا تھا۔ جنت کے مزے لوٹے جا رہے تھے۔ اور اتنا ہی نہیں۔ پدما جھلا کی رضا کی چیری تھی۔ جھلا کا نام ہی جھلا نہیں تھا' مزاج کے بھی جھلے تھے۔ ذرا ذرا سی بات پر برانگیختہ ہو جاتے اور پدما ان کا مناون کرتی۔ ان کا عتاب اس کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ جھلا کو اپنی طاقت کا علم تھا اور اس کا اظہار کرتے تھے' پدما صبر کرتی تھی۔ جھلا کا ایک تبسم' شکریہ کا ایک لفظ یا محض مسرت خاموش اسے باغ باغ کرنے کے لئے کافی تھا۔ سیاسیات کی طرح آئین محبت میں ایک حاکم ہوتا ہے' دوسرا محکوم۔ محکوم پسینہ نکالتا ہے' مرتا ہے' سہتا ہے اور زبان نہیں کھول سکتا۔ حاکم سزائیں دیتا ہے' رعب جماتا ہے' رلاتا ہے اور ابروؤں کا شکن بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

دیکھنے والے دیکھتے تھے اور حیرت میں آ جاتے تھے۔ یہ وہی پدما ہے' وہی غرور کی پتلی' وہ نازک مزاج' فسوں طراز' مگر کتنی متحمل ہو گئی ہے۔ اس طرح تو کوئی بوالہوس مرد بھی کسی حسینہ کی ناز برداری نہیں کرتا۔ کیا بوٹی سنگھا دی ہے اس ڈاکٹر نے۔ دل جلے حاسد پدما پر آوازے کستے' پدما ہنس کر رہ جاتی تھی۔ اس کے راندے ہوئے جو عشاق تھے' انہیں اس کی بے زبان حلقہ بگوشی دیکھ کر مسرت ہوتی تھی۔ کہتے تھے جیسے کو تیسا۔

ایک دن جھلا کا ایک خط پدما نے غلطی سے کھول ڈالا۔ جھلا نے غضبناک ہو کر پوچھا۔

”میرا خط کس نے کھولا؟“

پدما شاید اپنی غلطی کا اعتراف نہ کر سکی۔

”شاید محرر کی غلطی ہو گی۔“

”میں تمہیں اس کا ذمہ دار سمجھتا ہوں اور تمہیں اس کا جرمانہ دینا ہو گا۔“

"حاضر ہوں سر جھکائے ہوئے۔"

جھلا نے اسے آغوش میں لے لیا۔۔۔۔اور پدما پر گھڑوں نشہ چڑھ گیا۔ دنیا اس کی نظروں میں حقیر تھی۔

(5)

دو سال گذر گئے اور پھول مرجھانے لگا۔ اس میں پھل آرہا تھا۔ نازک پدما لاغر ہو گئی۔ چہرہ زرد' رخسار بے رنگ' آنکھوں میں تکان' جسم میں ڈھیلا پن' فکر' مغموم' اس پر ایک ہیبت سی طاری رہتی۔ متوحش خواب دیکھتی۔ آئینہ میں اپنی صورت دیکھتی اور آہ کھینچ کر رہ جاتی۔ ساری دنیا کے رنگ و روغن اور بہترین مقویات فطرت کے اس تغیر کے سامنے ہیچ تھے۔ آنکھوں کے گرد حلقے' غذا کی اشتہا غائب' مگر اسی تناسب سے پیار کی بھوک تیز' اب وہ ناز برداری چاہتی تھی' کوئی اُسے پان کی طرح پھیرے' اُسے سینے سے لگائے رکھے' کبھی علیحدہ نہ کرے۔ اپنے اوپر جو اعتماد تھا وہ رخصت ہو گیا۔

مگر جھلا اس تغیر سے بے خبر اور بے اثر اپنی روش پر چلے جا رہے تھے۔ وہی طنطنہ تھا وہی دماغ۔ پدما کیوں انہیں ڈنر کے لیے بلانے نہیں آئی۔ انہیں بھوک نہیں ہے۔ وہ کیوں خود پان لے کر ان کے پاس نہیں آتی۔ یہ مزاج! حسن تو غائب ہو گیا' وہ ادائیں ہیں نہ وہ شوخی' نہ وہ ملاحت اور دماغ آسمان پر ہے۔ وہ چاہتے تھے پدما ظاہر کی ان پامالیوں کو مزید التفات سے پورا کرے۔ ان پر قربان ہو۔ بلائیں لے۔ اسی طرح دونوں میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ پدما سوچتی کتنا بے درد آدمی ہے' اور جھلا سوچتا کتنی بے اعتنائی ہے۔ انہیں اب اس سے گریز ہوتا تھا۔ ان کے لیے اب یہاں دل بستگی کا کوئی سامان نہ تھا۔ جانتے تھے ہی کہ پدما ان کی لونڈی ہے۔ پھر وہ کیوں نہ لطفِ زندگی اٹھائیں۔ کیوں نہ رنگ رلیاں منائیں۔

پدما اپنے کمرے میں اداس بیٹھی رہتی' وہ سیر کرنے نکل جاتے اور آدھی رات کو آتے' وہ ان کا انتظار کیا کرتی۔

ایک دن اُس نے شکایت کی۔ "تم اتنی رات تک کہاں غائب رہتے ہو۔ تمہیں خیال بھی نہیں آتا' مجھے کتنی تکلیف ہوتی ہے؟"

جھلا نے منہ بنایا۔ "اچھا اب آپ کو ذرا سا میرا انتظار کرنے میں تکلیف ہوتی ہے۔" بے اعتنائی سے بولے۔ "تو کیا چاہتی ہو کہ میں تمہارے آنچل سے بندھا رات دن بیٹھا رہوں۔"

"کچھ ہمدردی تو چاہتی ہی ہوں۔"

"میں اپنی عادتوں کو تبدیل نہیں کر سکتا۔"

پدما خاموش ہو گئی۔ بدمزگی ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے تئیں اب اور بھی ان کی محتاج پاتی تھی' کہیں ناراض نہ ہو جائیں' کہیں چلے نہ جائیں' اس خیال سے ہی اُسے وحشت ہوتی تھی۔ رتنا کا بھی خوف تھا۔ وہ آج بھی رقیبانہ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جھلا کہیں چلے گئے تو وہ کتنے طعنے دے گی۔ اسے کتنا ذلیل کرے گی۔ وہ رتنا کو دکھانا چاہتی تھی' تو جہاں ناکام ہوئی' میں نے انہیں محبت سے باندھا' اور باوجود کسی رسمی یا قانونی یا روحانی معاہدہ نہ ہونے کے اب تک باندھے ہوئے ہوں۔ وہ سب کچھ جھیل کر محبت کی فتح دکھانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے سے زیادہ فکر اس نظریے کی فتح کی تھی۔

وہ درد سے بے چین تھی۔ لیڈی ڈاکٹر آئی‘ نرس آئی‘ دائیہ آئی‘ جھلا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بار بار جی ڈوب جاتا‘ کرب سے بے ہوش ہو جاتی‘ روتی تھی‘ تڑپتی تھی‘ بدن پسینے سے تر معلوم ہوتا تھا‘ جان نکل جائے گی‘ جھلا کو بار بار پوچھتی‘ جیسے انہیں کے پاس اس درد کا علاج ہے۔ ہاں اگر وہ آکر کھڑے ہو جاتے‘ اس کا سر سہلاتے‘ اسے پیار کرتے تو وہ اس سے بھی جانگزا درد جھیل لیتی‘ لیکن وہ کہاں ہیں؟ اب تک نہیں آئے‘ اب تو بارہ بجے ہوں گے۔

لیڈی ڈاکٹر نے کہا ساڑھے بارہ ہیں!

”اور وہ ابھی تک نہیں آئے ہیں‘ کوئی ذرا جا کر اُنہیں بلا لائے۔“

”کہاں گئے‘ کچھ آپ کو معلوم ہے؟“

”نہیں مجھے معلوم نہیں‘ مگر کسی کو بھیج دو۔ تلاش کر لائے!“

لیڈی ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ اپنے کو اس طرح پریشان نہ کریں‘ اس سے درد اور بڑھتا ہے۔“

پدما چپ ہو گئی۔ پھر تڑپنے لگی اور بے ہوش ہو گئی۔ جب ہوش آیا تو بولی۔ ”میں اب بچوں گی نہیں مس جم! یہ درد میری جان لیکر رہے گا۔ شیام بابو آئیں تو کہہ دینا میں نے انہیں معاف کیا۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں۔ بچہ آپ انہیں دے دیجئے گا۔ اور میری طرف سے کہنا‘ اسے پالو‘ یہ تمہاری بدنصیب پدما کی نشانی ہے۔“

اور اُسے معلوم ہوا جیسے تاریک نزع کا پہاڑ اس کے سر پر ٹوٹ پڑا۔ اس کی آنکھیں کھلیں تو ”کہاں۔ کہاں“ کی خوش آیند‘ پیاری‘ میٹھی‘ جاں بخش‘ ضیا بار صدا کانوں میں آئی۔ لیڈی ڈاکٹر نے بچہ کو اس کے سامنے کر دیا‘ جیسے اس کی آنکھوں میں ٹھنڈک آ گئی‘ اور وہ ٹھنڈک حلق سے ہوتی ہوئی دل اور جگر تک پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بچے کو گود میں لے لیا اور بولی۔ ”شیام بابو آگئے‘ ایں ابھی تک نہیں آئے!“

اس کا چہرہ افسردہ ہو گیا‘ جیسے چراغ بجھ جائے۔ زندگی کی سب سے بڑی مسرت جس کے سامنے ہو اور سب کچھ ناچیز تھا۔ نازوادا‘ بناؤ سنگار‘ بوس و کنار‘ کہیں یہ لطف نہیں‘ وہ اس سے محروم ہو گئی۔ — وہ نوزائیدہ فرشتے کو گود میں اٹھا کر آنکھوں میں غرور اور تشکر بھرے ہوئے جذبات کے ساتھ اُسے جھلا کی گود میں نہ دے سکی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

(6)

صبح ہوئی جھلا نہیں آئے۔ شام ہوئی‘ رات ہوئی پھر صبح ہوئی‘ پھر شام ہوئی۔ یہاں تک کہ چھ صبحیں آئیں اور گئیں‘ جھلا نہ آئے‘ نہ کچھ کہہ گئے نہ کوئی خط دے گئے۔ پدما مارے فکر اور خوف کے سوکھی جاتی تھی۔

ساتویں دن اس نے منشی جی کو بینک بھیجا۔ کچھ روپے نکالنے تھے۔ منشی جی بینک سے ناکام لوٹے۔ بینک کے سب روپے ڈاکٹر جھلا نکال لے گئے۔ پدما نے انہیں بینک سے لین دین کا اختیار دے رکھا تھا۔

اس نے تعجب سے پوچھا۔ ”مگر میرے بیس ہزار جمع تھے۔“

”جی ہاں سب کا سب نکال لے گئے۔“

”اور کچھ معلوم ہوا کہاں گئے۔“

”جی وہاں تو کسی کو کچھ خبر نہیں!“

پدما اسی طیش میں جھلا کے کمرے میں گئی' اور اس کی قدِ آدم تصویر جو ایک ہزار میں بنوائی تھی اُٹھا کر اتنے زور سے پٹخی کہ شیشہ چور چور ہو گیا' پھر اس تصویر کو دونوں ہاتھوں سے پھاڑا اور اُسے پیروں سے خوب کچلا اور دیا سلائی لگا دی۔ پھر جھلا کے کپڑے 'کتابیں' صندوق' جوتے' سگرٹ کیس اور صدہا سامان جو وہاں رکھے تھے' سب کو ایک جگہ جمع کر کے اس پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگا دی۔ اور بلند آواز میں بولی۔ "شہدا! بدمعاش' حرام' خور' خردماغ' خرنفس......ایں جھلا! تم تم............"

"ہاں!" ڈاکٹر جھلا جانے کہاں سے ٹپک پڑے تھے' اور دروازے پر کھڑے یہ تباہ کاریاں دیکھ رہے تھے۔ دلچسپ اور غیر متاثر نظروں سے۔

پدما حیرت' خفت اور غصہ میں ڈوبی ہوئی کھڑی ہو گئی اور پوچھا۔

"تم اب تک کہاں تھے' اور تم نے میرے روپے کیوں اڑا لیے' شہدا' بے ایمان۔"

جھلا نے ظرافت آمیز انداز سے کہا۔ "دل کا بخار نکل گیا یا ابھی باقی ہے۔" پدما جھلا کر بولی۔ "تم نے میرے روپے اُڑا لیے۔ احسان فراموش میں تمہیں جیل کی سیر کرا کے چھوڑوں گی' دغاباز!"

جھلا نے نوٹوں کا ایک پلندا اس کی طرف حقارت سے پھینک دیا اور بولے۔ "یہ لو اپنے روپے اور میرا سلام قبول کرو۔ یہ تھی تمہاری محبت جس کا اس شدومد سے اظہار کیا جا رہا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اپنے بُل ڈاگ کے ساتھ کرتی ہو۔ اسے گود میں کھلاتی ہو' چومتی ہو' ساتھ لے کر سیر کو جاتی ہو۔ اپنی بغل میں بٹھا کر خوش ہوتی ہو۔ اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتی ہو' ڈارلنگ اور خدا جانے کیا کیا کہتی ہو۔ لیکن کتا ذرا دانت دکھا دے تو اس پر ہنٹروں کی بارش کر دو گی اور شاید گولی مار دو۔ میں بھی تمہارا بُل ڈاگ تھا۔ اتنا ہی عزیز اور اتنا ہی حقیر۔ میں دیکھتا تھا اور امتحان لینا چاہتا تھا اور اب مجھے اطمینان ہو گیا کہ میرا خیال صحیح تھا' کہ یہ ایک ہفتہ تک غائب رہنا اتنا بڑا جرم نہ تھا' نہ بیس ہزار روپوں کی کوئی حقیقت ہے مگر تمہاری محبت دیکھ لی۔ رتنا مجھ سے علیحدہ ہے مگر محض قانوناً' اس کا مجھ سے روحانی رشتہ ہے اور وہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ کیونکہ وہ آج بھی مسز جھلا ہے۔ اور میں جانتا ہوں جس وقت میں نادم ہو کر اس کے سامنے جاؤں گا' وہ پھر میری بیوی ہو گی اور میں اس کا غلام شوہر۔ تمہاری آزادی تمہیں مبارک۔ دیکھنا چاہتی ہو رتنا کے خطوط۔ یہ لو دیکھو اور شرماؤ۔ وہ آج بھی میرے نام پر بیٹھی ہوئی ہے اور تم کل' ہاں کل کوئی دوسرا طائر پھانسوں گی اور پھر اس پر اپنی محبتوں کی بارش کرو گی۔ اور بدمزاج اور غصہ ور اور سخت گیر رتنا یوں ہی مجھ سے جلتی رہے گی اور میری رہے گی۔"

پدما بت کی طرح کھڑی تھی۔ جھلا چلے جا رہے تھے' جیسے قید سے چھوٹ گئے ہوں۔

ہولی کی چھٹی

(1)

ورنیکلز فائنل پاس کرنے کے بعد مجھے ایک پرائمری مدرسہ میں جگہ مل گئی جو میرے گھر سے گیارہ میل

پر تھا۔ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحب کو تعطیلوں میں بھی لڑکوں کو پڑھانے کا خبط تھا۔ رات کو لڑکے کھانا کھا کر مدرسہ میں آجاتے اور ہیڈ ماسٹر صاحب چارپائی پر لیٹ کر اپنے خراٹوں سے انہیں پڑھایا کرتے۔ جب لڑکوں میں دھول دھپا شروع ہو جاتا اور شور و غل مچنے لگتا تب یکایک وہ خواب خرگوش سے چونک پڑتے اور لڑکوں کو دو چار طمانچے لگا کر پھر خواب نوشین کے مزے لینے لگتے۔ گیارہ بارہ بجے تک یہی ڈراما ہوتا رہتا یہاں تک کہ لڑکے نیند سے بیقرار ہو کر وہیں ٹاٹ پر سو جاتے۔ اپریل میں سالانہ امتحان ہونے والا تھا اس لیے جنوری ہی سے ہائے توبہ مچی ہوئی تھی۔ نائب مدرسوں پر اتنی عنایت تھی کہ رات کی کلاسوں میں انہیں نہ طلب کیا جاتا تھا مگر تعطیلیں بالکل نہ ملتی تھیں۔ سوم وتی اماوس آیا اور نکل گیا۔ بسنت آیا اور چلا گیا۔ شیوراتری آئی اور گزر گئی' اور اتواروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ایک دن کے لیے کون اتنا بڑا سفر کرتا' اس لیے کئی مہینوں سے مجھے گھر جانے کا موقع نہ ملا تھا۔ مگر اب میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ہولی پر ضرور گھر جاؤں گا' چاہے نوکری سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونے پڑیں۔ میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی سے ہیڈ ماسٹر صاحب کو الٹی میٹم دے دیا کہ 20 مارچ کو ہولی کی تعطیل ہو گی' اور بندہ 19 کی شام کو رخصت ہو جائے گا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے مجھے سمجھایا کہ ابھی لڑکے ہو تمہیں کیا معلوم نوکری کتنی مشکلوں سے ملتی ہے' نوکری پانا اتنا مشکل نہیں جتنا اس کا نبھانا۔ اپریل میں امتحان ہونے والا ہے۔ تین چار دن مدرسہ بند رہا تو بتاؤ کتنے لڑکے پاس ہوں گے۔ سال بھر کی ساری محنت پر پانی پھر جائے گا کہ نہیں' میرا کہنا مانو' اس تعطیل میں نہ جاؤ۔ امتحان کے بعد جو تعطیل پڑے اس میں چلے جانا۔ ایسٹر کی چار دن کی تعطیل ہو گی۔ میں ایک دن کے لیے بھی نہ روکوں گا۔ میں اپنے مورچہ پر قائم رہا۔ فہمائش اور تخویف اور جواب طلبی کسی اسلحہ کا مجھ پر اثر نہ ہوا۔ 19 کو جوں ہی مدرسہ بند ہوا میں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کو سلام بھی نہ کیا اور چپکے سے اپنی جائے قیام پر چلا آیا۔ انہیں سلام کرنے جاتا تو وہ ایک نہ ایک کام نکال کر مجھے روک لیتے۔ رجسٹر میں فیس کی میزان لگاتے جاؤ' اوسط حاضری نکالتے جاؤ' لڑکوں کی مشقی کاپیاں جمع کر کے ان پر اصلاح اور تاریخ سب مکمل کر دو۔ گویا یہ میرا آخری سفر ہے اور مجھے زندگی کے سارے کام بھی ختم کر دینے چاہئیں۔

مکان پر آکر ہم نے جھٹ پٹ اپنی کتابوں کا بقچہ اُٹھایا' اپنا ہلکا سا لحاف کندھے پر رکھا اور اسٹیشن پر چل پڑے۔ گاڑی پانچ بجکر پانچ منٹ پر جاتی تھی۔ مدرسہ کی گھڑی حاضری کے وقت ہمیشہ آدھ گھنٹہ تیز اور روانگی کے وقت آدھ گھنٹہ سُست رہتی تھی۔ چار بجے مدرسہ بند ہوا تھا۔ میرے خیال میں اسٹیشن پر پہنچنے کے لیے کافی وقت تھا۔ پھر بھی مسافروں کو گاڑی کی طرف سے عام طور پر جو اندیشہ لگا رہتا ہے اور جو گھڑی ہاتھ میں ہونے پر بھی اور گاڑی کا وقت صحیح معلوم ہونے پر بھی دور سے کسی گاڑی کی گڑگڑاہٹ یا سیٹی سن کر قدموں کو تیز اور دل منتشر کر دیا کرتا ہے' وہ مجھے بھی لگا ہوا تھا۔ کتابوں کا بقچہ وزنی تھا۔ اس پر کندھے پر لحاف بار بار ہاتھ بدلتا تھا اور لپکا چلا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ اسٹیشن کوئی دو فرلانگ سے نظر آیا۔ سگنل ڈاؤن تھا۔ میری ہمت بھی اس سگنل کی طرح پست ہو گئی۔ تقاضائے عمر سے ایک سو قدم دوڑا ضرور' مگر یہ یاس کی ہمت تھی۔ میرے دیکھتے دیکھتے گاڑی آئی۔ ایک منٹ ٹھہری' اور روانہ ہو گئی۔ مدرسہ کی گھڑی یقیناً آج معمول سے بھی زیادہ سُست تھی۔

اب اسٹیشن پر جانا بے سود تھا۔ دوسری گاڑی گیارہ بجے رات کو آئے گی۔ میرے گھر والے اسٹیشن پر کوئی بارہ بجے پہنچے گی اور وہاں سے مکان پر جاتے جاتے ایک بج جائے گا۔ اس سناٹے میں راستہ چلنا بھی ایک مہم تھی جسے سر کرنے کی مجھ میں جرأت نہ تھی۔ جی میں تو آیا کہ چل کر ہیڈ ماسٹر کو آڑے ہاتھوں لوں۔ مگر ضبط کیا اور پیدل چلنے

کے لیے تیار ہو گیا۔ کل بارہ میل ہی تو ہیں۔ اگر دو میل فی گھنٹہ بھی چلوں تو چھ گھنٹہ میں گھر پہنچ سکتا ہوں۔ ابھی پانچ بجے ہیں۔ ذرا قدم بڑھاتا جاؤں تو دس بجے یقیناً پہنچ جاؤں گا۔ اماں اور منو میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ پہنچتے ہی گرم گرم کھانا ملے گا۔ کولھواڑے میں گڑپک رہا ہو گا۔ وہاں سے گرم گرم رس پینے کو آجائے گا اور جب لوگ سنیں گے میں اتنی دور سے پیدل چلا آیا ہوں تو نہیں کتنا تعجب ہو گا۔ میں نے فوراً گنگا کی طرف قدم بڑھایا۔ یہ قصبہ ندی کے کنارے واقع تھا اور میرے گاؤں کی سڑک ندی کے اس پار سے تھی۔ مجھے اس راستے سے جانے کا کبھی اتفاق نہ ہوا تھا۔ مگر اتنا سنا تھا کہ کچی سڑک سیدھی چلی جاتی ہے۔ تردد کی کوئی بات نہ تھی۔ دس منٹ میں ناؤ اس پار پہنچ جائے گی اور بس فراٹے بھرتا ہوا چل دوں گا۔ بارہ میل کہنے کو تو ہوتے ہیں' ہیں تو کل چھ کوس۔

مگر گھاٹ پر پہنچا تو ناؤ میں آدھے مسافر بھی نہ بیٹھے تھے۔ میں کود کر جا بیٹھا' کھیوے کے پیسے بھی نکال کر دے دیئے۔ لیکن ناؤ ہے کہ قطب بنی ہوئی ہے۔ مسافروں کی تعداد کافی نہیں ہے۔ کیسے کھلے' لوگ تحصیل اور کچہری سے آتے جاتے ہیں اور بیٹھتے جاتے ہیں اور میں ہوں کہ اندر ہی اندر بھنا جاتا ہوں۔ سورج نیچے دوڑا چلا جا رہا ہے گویا مجھ سے بازی لگائے ہوئے ہے' ابھی سفید تھا' پھر زرد ہونا شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہو گیا۔ دریا کے اس پار اُفق پر لٹکا ہوا تھا گویا کوئی ڈول کنوئیں میں لٹک رہا ہو۔ ہوا میں کچھ خنکی بھی آگئی تھی اور بھوک میں معلوم ہونے لگی۔ میں نے آج گھر جانے کی خوشی اور ولولے میں روٹیاں نہ پکائی تھیں۔ سوچا تھا شام کو تو گھر پہنچ جاؤں گا' لاؤ ایک پیسہ کے چنے لے کر کھالوں۔ ان دانوں نے اتنی دیر تک تو رفاقت کی' اب پیٹ کی پیچیدگیوں میں جا کر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ مگر کیا غم ہے' رستے یں کیا دکانیں نہ ہوں گی۔ دو چار پیسے کی مٹھائیاں لے کر کھالوں گا۔

جب ناؤ اس کنارے پہنچی تو سورج کی صرف آخری سانس باقی تھی' حالانکہ ندی کا پاٹ بالکل پیندے میں چمٹ کر رہ گیا تھا۔

میں نے بقچہ اٹھایا اور تیزی سے چلا۔ دونوں طرف چنے کے کھیت تھے جن کے اُودے پھولوں پر شبنم کا ہلکا پردہ پڑ چلا تھا' بے اختیار ایک کھیت میں گھس کر بوٹ اکھاڑ لیے اور ٹھونگتا ہوا بھاگا۔

(2)

سامنے بارہ میل کی منزل ہے' کچا سنسان راستہ' شام ہو گئی ہے' مجھے پہلی بار اپنی غلطی کا احساس ہوا' لیکن جوشِ طفلی نے کہا' کیا مضائقہ' ایک دو میل تو دوڑ ہی سکتے ہیں' بارہ کو دل میں 1760 سے ضرب دیا' بیس ہزار گز ہی تو ہوتے ہیں۔ بارہ میل کے مقابلہ میں بیس ہزار گز کچھ ہلکے اور آسان معلوم ہوئے' اور جب دو تین میل رہ جائے گا تب تو ایک طرح سے اپنے گاؤں ہی میں ہوں گا' اس کا کیا شمار ہمت بندھ گئی۔ اِکے دُکے مسافر بھی پیچھے چلے آرہے تھے۔ اور بھی اطمینان ہوا۔

اندھیرا ہو گیا تھا' میں لپکا جا رہا ہوں۔ سڑک کے کنارے دور سے ایک جھونپڑی نظر آتی ہے۔ ایک کپی جل رہی ہے۔ ضرور کسی بنئے کی دکان ہو گی اور کچھ نہ ہو گا تو گڑ اور چنے تو مل ہی جائیں گے' قدم اور تیز کرتا ہوں۔ جھونپڑی آتی ہے' اس کے سامنے ایک لمحہ کے لیے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ چار پانچ آدمی اکڑوں بیٹھے ہوئے ہیں' بیچ میں ایک بوتل ہے۔ ہر ایک کے سامنے ایک ایک کلھڑا۔ دیوار سے ملی ہوئی اونچی گدی ہے اس پر ساہو جی بیٹھے ہوئے

ہیں۔ان کے سامنے کئی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں' ذرااور پیچھے ہٹ کرایک آدمی کڑھائی میں سوکھے مٹر بھون رہاہے۔اس کی رغبت افزاسوندھی خوشبو میرے جسم میں برقی رفتار سے دوڑ جاتی ہے۔اضطراری طور پر جیب میں ہاتھ ڈالتا ہوں اورایک پیسہ نکال کراس کی طرف چلتا ہوں' لیکن آپ ہی قدم رک جاتے ہیں یہ کلوریا ہے۔

خوانچہ والا پوچھتا ہے۔"کیالو گے ؟"

میں کہتا ہوں۔"کچھ نہیں۔"

اور آگے بڑھ جاتا ہوں۔ دکان بھی ملی تو شراب کی۔ گویا دنیا میں انسان کے لیے شراب ہی سب سے ضروری چیز ہے۔ یہ سب آدمی دھوبی اور چمار ہوں گے۔ دوسرا کون شراب پیتا ہے دیہات میں۔ مگر وہ مٹر کا دلآویز سوندھا پن میرا پیچھا کر رہا ہے' اور میں بھاگا جارہا ہوں۔

کتابوں کا بقچہ جی کا جنجال ہو رہا تھا۔ ایسی خواہش ہوتی ہے کہ اسے یہیں سڑک پر پٹک دوں۔اس کا وزن مشکل سے پانچ سیر ہو گا مگراس وقت وہ مجھے من بھر سے زیادہ معلوم ہو رہا ہے' جسم میں کمزوری محسوس ہو رہی ہے۔ پورن ماشی کا چاند درختوں کے اوپر جا بیٹھا ہے اور پتیوں سے زمین کی طرف جھانک رہاہے۔ میں بالکل اکیلا چلا جارہا ہوں' مگر خوف بالکل نہیں ہے' بھوک نے ساری حسیات کو دبا رکھا ہے اور خود ان پر حاوی ہو گئی ہے۔

آہا یہ گڑ کی خوشبو کہاں سے آئی۔ کہیں تازہ گڑ پک رہاہے۔ کوئی گاؤں قریب ہی ہو گا۔ہاں وہ آموں کے جھرمٹ میں روشنی نظر آرہی ہے لیکن وہاں پیسے دو پیسے کا گڑ کون بیچے گا اور یوں مجھ سے مانگا نہ جائے گا۔ معلوم نہیں لوگ کیا سمجھیں۔ آگے بڑھتا ہوں مگر زبان سے رال ٹپک رہی ہے۔ گڑ سے مجھے بڑی رغبت ہے۔ جب کسی چیز کی دکان کھولنے کی سوچتا تھا تو وہ حلوائی کی دکان ہوتی تھی۔ بکری ہو یا نہ ہو' مٹھائیاں تو کھانے کو ملیں گی۔ حلوائیوں کو دیکھو مارے مٹاپے کے ہل نہیں سکتے' لیکن یہ بیوقوف ہوتے ہیں۔ آرام طلبی کے باعث توند نکال لیتے ہیں۔ میں ورزش کرتا رہوں گا۔ مگر گڑ کی وہ صبر آزما اور اشتہا انگیز خوشبو برابر آرہی ہے۔ مجھے وہ واقعہ یاد آتا ہے جب اماں تین ماہ کے لئے اپنے میکے یا میری ننھیال گئی تھیں۔اور میں نے تین مہینے میں ایک من گڑ کا صفایا کر دیا تھا۔ یہی گڑ کے دن تھے۔ نانا بیمار تھے۔ اماں کو بلا بھیجا تھا۔ میرا امتحان قریب تھا' اس لئے میں ان کے ساتھ نہ جاسکا۔ منو کو وہ لیتی گئیں۔ جاتے وقت انہوں نے ایک من گڑ لے کر ایک مٹکے میں رکھا اور اس کے منہ پر ایک سکورا رکھ کی مٹی سے بند کر دیا۔ مجھے سخت تاکید کر دی کہ مٹکا نہ کھولنا۔ میرے لئے تھوڑا سا گڑ ایک ہانڈی میں رکھ دیا تھا۔ وہ ہانڈی میں نے ایک ہفتہ میں صفاچٹ کر دی۔ صبح کو دودھ کے ساتھ گڑ' دوپہر کو روٹیوں کے ساتھ گڑ' تیسرے پہر دانوں کے ساتھ گڑ' رات کو پھر دودھ کے ساتھ گڑ۔ یہاں تک تو جائز خرچ ہے جس پر اماں کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا۔ مگر مدرسہ سے بار بار پانی پینے یا پیشاب کرنے کے بہانہ گھر میں آتا اور ایک دو پنڈیاں نکال کر کھالیتا۔اس کی بجٹ میں کہاں گنجائش تھی۔ اور مجھے گڑ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ ہر وقت وہی نشہ سوار رہتا۔ میرا گھر میں آنا گڑ کے سر شامت آنا تھا۔ایک ہفتہ میں ہانڈی نے جواب دے دیا۔ مگر مٹکا کھولنے کی سخت ممانعت تھی اور اماں کے گھر آنے میں ابھی پونے تین مہینے باقی تھے۔ ایک دن تو میں نے طوعاً و کرہاً صبر کیا لیکن دوسرے دن ایک آہ کے ساتھ صبر جاتا رہا اور مٹکے کی ایک نگاہِ شیریں کے ساتھ ہوش رخصت ہو گیا۔ میں نے کسی گناہِ کبیرہ کے احساس کے ساتھ مٹکے کو کھول کر اور ہانڈی بھر گڑ نکال کر اسی طرح مٹکے کو بند کر دیا اور عہد کر لیا کہ اس ہانڈی کو تین مہینے چلاؤں گا۔ چلے یا نہ چلے مگر میں چلائے جاؤں گا۔ مٹکے کو منزل ہفت خواں سمجھوں گا جسے رستم بھی نہ کھول سکا تھا۔ میں نے مٹکے کی پنڈیوں کو کچھ

اس طرح قینچی لگا کر رکھا جیسے بعض دکاندار دیا سلائی کی ڈبیاں بھر دیتے ہیں۔ ایک ہانڈی گڑ خالی ہو جانے پر بھی مٹکا لبریز تھا۔ اماں کو پتہ ہی نہ چلے گا۔ مواخذہ کی نوبت کس طرح آئے گی مگر دل اور زبان میں وہ کشمکش شروع ہوئی کہ کیا کہوں اور ہر بار فتح زبان ہی کے ہاتھ رہتی۔ یہ دو انگل کی زبان دل جیسے شہ زور پہلوان کو نچا رہی تھی' جیسے مداری بندر کو نچائے' اس کو جو آسمان میں اڑتا ہے اور فلک الافلاک کے منصوبے باندھتا ہے اور اپنے زعم میں فرعون کو بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ بار بار ارادہ کرتا دن بھر میں پانچ پنڈیوں سے زیادہ نہ کھاؤں گا لیکن یہ ارادہ شرابیوں کی توبہ سے زیادہ دیرپا نہ ہوتا تھا۔ گھنٹہ دو گھنٹہ سے زیادہ نہ ٹکتا' اپنے کو کوستا' نفرین کرتا' گڑ تو کھا رہے ہو مگر برسات میں سارا جسم سڑ جائے گا۔ گندھک مرہم لگائے گھومو گے۔ کوئی تمہارے ساتھ بیٹھنا بھی پسند نہ کرے گا۔ قسمیں کھاتا' علم کی' ماں کی' مرحوم باپ کی' گئو کی' ایشور کی' مگر ان کا وہی حشر ہوتا۔ دوسرا ہفتہ ختم ہوتے ہی ہانڈی ختم ہو گئی۔ اس دن میں نے بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ ایشور سے پرارتھنا کی، "بھگوان یہ میرا چنچل لوبھی من مجھے پریشان کر رہا ہے۔ مجھے شکتی دو کہ اس کو قابو میں رکھ سکوں۔ مجھے ہشت دھات کا لگام دو جو اس کے منہ میں ڈال دوں۔ یہ کمبخت مجھے اماں سے پٹوانے اور گھرکیاں سنوانے پر تلا ہوا ہے' تم ہی میری رکشا کرو تو بچ سکتا ہوں۔" میری آنکھوں سے اس ذوقِ عبودیت میں دو چار بوندیں آنسوؤں کی بھی گریں لیکن ایشور نے بھی کچھ سماعت نہ کی اور گڑ کی خواہش مجھ پر غالب رہی' یہاں تک کہ دوسری ہانڈی کی مرثیہ خوانی کی نوبت آ پہنچی۔ حسن اتفاق سے انہیں دنوں تین دن کی تعطیل ہوئی اور میں اماں سے ملنے ننھیال گیا۔ اماں نے پوچھا "گڑ کا مٹکا دیکھا ہے' چیونٹے تو نہیں لگے' سیل تو نہیں پہنچی" میں نے مٹکے کو دیکھنے کی بھی قسم کھا کر اپنی سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اماں نے مجھے غرور کی نظروں سے دیکھا اور میری حکم پروری کے صلے میں مجھے ایک ہانڈی نکال لینے کی اجازت دے دی' ہاں تاکید کر دی کہ مٹکے کا منہ اچھے طرح بند کر دینا۔ اب تو مجھے وہاں ایک ایک دن ایک ایک جگ معلوم ہونے لگا۔ چوتھے دن گھر آتے میں نے پہلا کام جو کیا وہ مٹکے کو کھول کر ہانڈی بھر گڑ نکالنا تھا۔ یکبارگی پانچ پنڈیاں اڑا گیا۔ پھر وہی گڑ بازی شروع ہوئی۔ اب کیا غم ہے۔ اماں کی اجازت مل گئی ہے۔ سیاں بھئے کوتوال' اور آٹھ دن میں ہانڈی غائب۔ آخر میں اپنے دل کی کمزوری سے مجبور ہو کر مٹکے کی کوٹھڑی کے دروازہ پر قفل ڈال دیا اور اس کی کنجی دیوار کے ایک موٹے شگاف میں ڈال دی۔ اب دیکھیں تم کیسے گڑ کھاتے ہو۔ اس شگاف میں سے کنجی نکالنے کے یہ معنی تھے کہ تین ہاتھ دیوار کھود ڈالی جائے اور یہ ہمت مجھ میں نہ تھی۔ مگر تین دن میں ہی صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا۔ اور ان تین دنوں میں دل کی جو حالت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ حجرہ شیریں کی طرف بار بار گرسنہ اور بے صبر نگاہوں سے دیکھتا اور ہاتھ مل کر رہ جاتا۔ کئی بار قفل کو کھٹکھٹایا' کھینچا' جھٹکے دیئے مگر ظالم ذرا بھی نہ ہُسا۔ کئی بار اس شگاف کا جائزہ لیا' اس میں جھانک کر دیکھا' ایک لکڑی سے اس کی گہرائی کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر اس کی تہہ نہ ملی۔ طبیعت کھوئی ہوئی سی رہتی' نہ کھانے پینے میں کچھ مزہ تھا' نہ کھیلنے کودنے میں۔ نفس بار بار منطق کے زور سے دل کو قائل کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر گڑ اور کس مرض کی دوا ہے' میں اسے پھینک تو دیتا نہیں' کھاتا ہی تو ہوں' کیا آج کھایا اور ایک ماہ بعد کھایا۔ اس میں کیا فرق ہے' اماں جان نے ممانعت کی ہے' بیشک' لیکن انہیں مجھے ایک جائز کام سے باز رکھنے کا کیا حق ہے' اگر وہ آج کہیں کھیلنے مت جاؤ یا درختوں پر مت چڑھو یا تالاب میں تیرنے مت جاؤ یا چڑیوں کے لئے کمپا مت لگاؤ' تتلیاں مت پکڑو' تو کیا میں مانے لیتا ہوں۔ آخر میرے بھی کچھ حقوق ہیں یا نہیں' تو پھر اس ایک معاملہ میں میں کیوں اماں کی ممانعت پر اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو قربان کر دوں۔ آخر چوتھے دن نفس نے فتح پائی۔ میں نے علی الصبح ایک کدال لے کر دیوار کو کھودنا شروع کیا۔

شگاف تھا ہی کھودنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔ آدھ گھنٹہ کی محنت شاقہ کے بعد دیوار سے کوئی گز بھر لمبا اور تین انچ موٹا چپر چھوٹ کر نیچے گر پڑا اور شگاف کی تہہ میں وہ کلید کامیابی پڑی ہوئی تھی' جیسے سمندر کی تہہ میں موتی کی سیپ پڑی ہو۔ میں نے جھٹ پٹ اسے نکال لیا اور فوراً دروازہ کھولا۔ مٹکے سے گڑ نکال کر ہانڈی میں بھرا' اور دروازہ بند کر دیا۔ مٹکے میں اس دست برد سے قابل احساس کمی واقع ہو گئی تھی۔ ہزاروں ترکیبیں آزمانے پر بھی اس کا خلا پر نہ ہوا۔ مگر اب کی بار میں نے اس چٹورے پن کا اماں جان کی واپسی تک خاتمہ کر دینے کے لئے کنجی کو کنویں میں ڈال دیا۔ قصہ طویل ہے۔ میں نے کیسے قفل توڑا' کیسے گڑ نکالا اور مٹکا خالی ہو جانے پر کیسے اسے پھوڑا اور اس کے ٹکڑے رات کو کنویں میں پھینکے' اور اماں آئیں تو میں نے کیسے رو رو کر ان سے مٹکے کی چوری ہو جانے کی داستان کہی۔ یہ بیان کرنے لگا تو یہ واقعہ جو میں آج لکھنے بیٹھا ہوں ناتمام رہ جائے گا۔

چنانچہ اس وقت گڑ کی اس میٹھی اور مرغوب خوشبو نے مجھے از خود رفتہ بنا دیا مگر صبر کر کے آگے بڑھا۔

جوں جوں رات گزرتی تھی جسم تکان سے چور ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پاؤں میں لغزش ہونے لگی۔ کچی سڑک پر گاڑیوں کے پہیوں کی لیک پڑ گئی تھی۔ جب کبھی لیک میں پاؤں چلا جاتا تو معلوم ہوتا کسی گہرے گڈھے میں گر پڑا ہوں۔ بار بار جی میں آتا یہیں سڑک کے کنارے لیٹ جاؤں۔ کتابوں کا مختصر سا بقچہ من بھر کا لگتا تھا۔ اپنے کو کوستا تھا کہ کتابیں لے کر کیوں چلا۔ دوسری زبان کا امتحان دینے کی تیاری کر رہا تھا مگر چھٹیوں میں ایک دن بھی تو کتاب کھولنے کی نوبت نہ آئے گی۔ خواہ مخواہ یہ پشتارہ اٹھائے چلا آتا ہوں۔ ایسا جی جھنجھلاتا ہے کہ ان بارِ حماقت کو وہیں پٹک دوں۔

آخر ٹانگوں نے چلنے سے انکار کر دیا۔ ایک بار میں گر پڑا۔ اور سنبھل کر اٹھا تو پاؤں تھرتھرا رہے تھے۔ اب بغیر کچھ کھائے ایک قدم اٹھانا دشوار تھا۔ مگر یہاں کیا کھاؤں' بار بار رونے کو جی چاہتا تھا' اتفاق سے ایک اکھ کا کھیت نظر آیا۔ اب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ چاہتا تھا کہ کھیت میں گھس کر چار پانچ اکھ توڑ لوں اور مزے سے رس چوستا ہوا چلوں' راستہ بھی کٹ جائے گا اور پیٹ میں کچھ پڑ بھی جائے گا۔ مگر مینڈھ پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ کانٹوں میں اُلجھ گیا۔ کسان نے شاید مینڈھ پر کانٹے بکھیر دیئے تھے۔ شاید بیر کی جھاڑی تھی' دھوتی کرتا سب کانٹوں میں پھنسا ہوا۔ پیچھے ہٹا تو کانٹوں کی جھاڑی ساتھ ساتھ چلی۔ کپڑے چھڑانے لگا تو ہاتھ میں کانٹے چبھنے لگے۔ زور سے کھینچا تو دھوتی پھٹ گئی۔ بھوک تو غائب ہو گئی' فکر ہوئی اس نئی مصیبت سے کیونکر نجات ہو۔ کانٹوں کو ایک جگہ سے الگ کرتا تو دوسرے چمٹ جاتے۔ جھکتا تو جسم میں چبھتے۔ کسی کو پکاروں تو چوری کھلی جاتی ہے۔ عجیب مخمصے میں پڑا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے اپنی حالت پر رونا آ گیا۔ کوئی صحرانورد عاشق بھی اس طرح کانٹوں میں نہ پھنسا ہو گا۔ بڑی مشکل سے آدھ گھنٹہ میں پنڈ چھوٹا۔ مگر دھوتی اور کرتے کے ماتھے گئی۔ ہاتھ اور پاؤں چھلنی ہو گئے' وہ گھاٹے میں۔ اب ایک قدم آگے رکھنا محال تھا۔ معلوم نہیں کتنا راستہ طے ہوا کتنا باقی ہے' نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ کس سے پوچھوں' اپنی حالت پر روتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک بڑا گاؤں نظر آیا بڑی خوشی ہوئی' کوئی نہ کوئی دکان مل ہی جائے گی۔ کچھ کھا لوں گا اور کسی کے سائبان میں پڑ رہوں گا۔ صبح دیکھی جائے گی۔

مگر دیہاتوں میں لوگ سرِ شام سونے کے عادی ہوتے ہیں۔ ایک آدمی کنویں پر پانی بھر رہا ہے۔ اس سے پوچھا تو اس نے نہایت ہی یاس انگیز جواب دیا۔ "اب یہاں کچھ نہ ملے گا' بنیئے نمک تیل رکھتے ہیں۔ حلوائی کی دکان ایک بھی نہیں' کوئی شہر تھوڑا ہی ہے۔ اتنی رات تک دکان کھولے کون بیٹھا رہے۔"

میں نے اس سے نہایت منت آمیز لہجہ میں کہا۔ ''کہیں سونے کی جگہ مل جائے گی؟''
اس نے پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''
''مدرس ہوں' گھر جا رہا ہوں۔''
''تمہاری جان پہچان کا یہاں کوئی ہے؟''
''جان پہچان کا کوئی ہوتا تو تم سے کیوں سوال کرتا۔''
''تو بھئی انجان آدمی کو ہم یہاں نہیں ٹھہرنے دیں گے۔ اسی طرح کل ایک مسافر آکر ٹھہرا تھا' رات کو ایک گھر میں سیندھ پڑ گئی' صبح کو مسافر کا پتہ نہ تھا۔''
''تو کیا تم سمجھتے ہو میں چور ہوں۔''
''کسی کے ماتھے پر تو لکھا نہیں ہوتا' اندر کا حال کون جانے۔''
''نہیں ٹھہرانا چاہتے تو نہ سہی مگر چور نہ بناؤ۔ میں یہ جانتا یہ اتنا منحوس گاؤں ہے تو ادھر آتا ہی کیوں؟''
میں نے زیادہ خوشامد نہ کی۔ جی جل گیا۔ سڑک پر آکر پھر آگے چلا۔ اس وقت میرے ہوش بجا نہ تھے' کچھ خبر نہیں کس راستہ سے گاؤں میں آیا تھا اور کدھر چلا جا رہا تھا۔ اب مجھے اپنے گھر پہنچنے کی امید نہ تھی' رات یوں ہی بھٹکتے ہوئے گزرے گی۔ پھر اس کا کیا غم کہ کہاں جا رہا ہوں۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک مجھ پر یہ کیفیت طاری رہی۔ دفعتاً ایک کھیت میں آگ جلتی ہوئی نظر آئی گویا شمع اُمید ہو۔ ضرور وہاں کوئی آدمی ہوگا۔ شاید رات کاٹنے کو جگہ مل جائے۔ قدم تیز کیے اور قریب پہنچا کہ یکایک ایک بڑا سا کتا بھونکتا ہوا میری طرف دوڑا۔ اتنی خوفناک آواز تھی کہ میں کانپ اٹھا۔ ایک لمحہ میں وہ میرے سامنے آگیا اور میری طرف لپک لپک کر بھونکنے لگا۔ میرے ہاتھوں میں کتابوں کے بقچہ کے سوا اور کیا تھا' نہ کوئی لکڑی نہ پتھر' کیسے بھگاؤں کہیں بدمعاش میری ٹانگ پکڑ لے تو کیا کروں' تازی نسل کا شکاری کتا معلوم ہوتا تھا۔ میں جتنا دھت دھت کرتا اتنا ہی وہ اور گرجتا تھا۔ میں خاموش کھڑا ہو گیا اور بقچہ زمین پر رکھ کر پاؤں سے جوتے نکال لیے۔ اپنی حفاظت کے لیے کوئی حربہ تو ہاتھ میں ہو۔ اس کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا کہ خوفناک حد تک قریب آئے تو اس کے سر اتنے زور سے نعل دار جوتا ماروں کہ یاد ہی تو کرے لیکن شاید اس نے میری نیت تاڑ لی اور اس طرح میری طرف جھپٹا کہ مجھے رعشہ آگیا اور جوتے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑے۔ اُسی وقت میں نے ہیبت زدہ آواز مین پکارا، ''ارے کھیت میں کوئی ہے۔ دیکھو یہ کتا مجھے کاٹ رہا ہے' رکھوالو دیکھو' تمہارا کتا مجھے کاٹ رہا ہے۔''
جواب ملا ''کون ہے؟''
''میں ہوں راہ گیر' تمہارا کتا مجھے کاٹ ہا ہے۔''
''نہیں کاٹے گا نہیں' ڈرو مت کہاں جانا ہے؟''
''محمود نگر۔''
''محمود نگر کا راستہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے۔ آگے تو ندی ہے۔''
میرا کلیجہ بیٹھ گیا' روہنا سا ہو کر بولا۔ ''محمود نگر کا راستہ کتنی دور چھوٹ گیا ہوگا؟''
''یہی کوئی تین میل!''
اور ایک قد آور انسان ہاتھ میں لالٹین لیے ہوئے آکر میرے سامنے کھڑا ہو گیا۔ سر پر ہیٹ تھا' اور موٹا

فوجی اوور کوٹ پہنے' نیچے نیکر' پاؤں میں فل بوٹ' بڑا قوی ہیکل' بڑی بڑی مونچھیں' گورا رنگ' مردانہ وجاہت کا مجسمہ۔
بولا۔ "تم کوئی اسکولی لڑکے معلوم ہوتے ہو۔"

"لڑکا تو نہیں ہوں' لڑکوں کا مدرس ہوں۔ گھر جا رہا ہوں' آج سے ہولی کی تعطیل ہے۔"

"تو ریل سے کیوں نہیں گئے؟"

"ریل چھوٹ گئی' اور دوسری ایک بجے چھوٹتی ہے۔"

"وہ ابھی تمہیں مل جائے گی' بارہ کا عمل ہے' چلو میں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں۔"

"کون سے اسٹیشن کا۔"

"بھگونت پور کا۔"

"بھگونت پور ہی سے میں چلا ہوں' وہ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہو گا۔"

"بالکل نہیں' تم بھگونت پور اسٹیشن سے ایک میل کے اندر کھڑے ہو۔ چلو میں تمہیں اسٹیشن کا راستہ دکھا دوں۔ ابھی گاڑی مل جائے گی لیکن رہنا چاہو تو میرے جھونپڑے میں لیٹ رہو' کل چلے جانا۔"

اپنے اوپر غصہ آیا کہ سر پیٹ لوں۔ پانچ بجے سے تیلی کے بیل کی طرح گھوم رہا ہوں اور ابھی بھگونت پور سے کُل ایک میل آیا ہوں' راستہ بھول گیا۔ یہ واقعہ یاد رہے گا کہ چلا چھ گھنٹے اور طے کیا ایک میل' گھر پہنچنے کی دھن اور بھی دہک اٹھی۔

بولا۔ "نہیں' کل تو ہولی ہے' مجھے رات کو پہنچ جانا چاہیے۔"

"مگر راستہ پہاڑی ہے' ایسا نہ ہو کوئی جانور مل جائے۔ اچھا چلو' میں تمہیں پہنچائے دیتا ہوں۔ مگر تم نے بڑی غلطی کی۔ انجان راستے میں رات کو پیدل چلنا کتنا خطرناک ہے۔ اچھا چلو میں پہنچائے دیتا ہوں۔ خیر یہیں کھڑے رہو میں ابھی آتا ہوں۔"

کتا دم ہلانے لگا اور مجھ سے دوستی کرنے کا خواہشمند معلوم ہوا۔ دم ہلاتا ہوا سر جھکائے' عذر تقصیر کے طور پر میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ میں نے بھی فیاضی سے اس کا قصور معاف کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ایک لمحہ میں وہ شخص بندوق کندھے پر رکھے آ گیا اور بولا۔ "چلو اب ایسی نادانی نہ کرنا۔ خیریت ہوئی کہ میں تمہیں مل گیا۔ ندی پر پہنچ جاتے تو ضرور کسی جانور سے مڈبھیڑ ہو جاتی۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ تو کوئی انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ مگر آپ کا لہجہ بالکل ہمارے جیسا ہے۔" اُس نے ہنس کر کہا۔ "ہاں میرا باپ انگریز تھا' فوجی افسر' میری ماں اس کا کھانا پکاتی تھی۔ میں بھی فوج میں رہ چکا ہوں۔ یورپ کی لڑائی میں گیا تھا۔ اب پنشن پاتا ہوں۔ لڑائی میں میں نے جو نظارے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور جن حالات میں مجھے زندگی بسر کرنا پڑی اور مجھے اپنے انسانی جذبات کا جس حد تک خون کرنا پڑا ان سے اس پیشہ سے مجھے نفرت ہو گئی اور میں پنشن لے کر یہاں چلا آیا۔ میرے پاپا نے یہیں ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا۔ میں یہیں رہتا ہوں۔ اور آس پاس کے کھیتوں کی رکھوالی کرتا ہوں۔ یہ گنگا کی گھاٹی ہے' سور' نیل گائے' ہرن ساری کھیتی برباد کر دیتے ہیں۔ میرا کام ہے جانوروں سے کھیتی کی حفاظت کرنا۔ کسانوں سے مجھے ہل پیچھے ایک من غلہ مل جاتا ہے جو میرے گزر بسر کے لیے کافی ہوتا ہے۔ میری بڑھیا ماں ابھی زندہ ہے جس طرح پاپا کا کھانا پکاتی تھی' اسی طرح اب میرا کھانا پکاتی ہے۔ کبھی کبھی میرے پاس آیا کرو' میں تمہیں کسرت کرنا سکھا دوں گا۔ سال بھر میں پہلوان ہو جاؤ گے۔"

میں نے پوچھا۔ ''آپ ابھی تک کسرت کرتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہاں دو گھنٹے روزانہ کسرت کرتا ہوں۔ مگدر اور لیزم کا مجھے بہت شوق ہے۔ میرا پچاسواں سال ہے۔ مگر ایک سانس میں پانچ میل دوڑ سکتا ہوں۔ کسرت نہ کروں تو اس جنگل میں رہوں کیسے۔ میں نے خوب کشتیاں لڑی ہیں' اپنی رجمنٹ میں خوب مضبوط آدمی تھا' مگر اب اس فوجی زندگی کے حالات پر غور کرتا ہوں تو شرم اور افسوس سے میرا سر جھک جاتا ہے۔ کتنے ہی بے گناہ میری رائفل کے شکار ہوئے۔ میرا انہوں نے کیا نقصان کیا تھا۔ میری ان سے کون سی عداوت تھی' مجھے تو جرمن اور آسٹرین سپاہی بھی ویسے ہی خلیق' ویسے ہی بہادر اور ویسے ہی خوش مزاج' ویسے ہی ہمدرد معلوم ہوئے' جیسے فرانس یا انگلینڈ کے۔ ہماری ان سے خوب بے تکلفی ہو گئی تھی۔ ساتھ کھیلتے تھے' ساتھ بیٹھتے تھے۔ خیال ہی نہ آتا تھا کہ یہ لوگ ہمارے اپنے نہیں ہیں۔ مگر پھر بھی ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ کس لیے؟ اسی لیے کہ بڑے بڑے انگریز سوداگروں کو خطرہ تھا کہ کہیں جرمنی ان کا روزگار نہ چھین لے' یہ سوداگروں کا راج ہے۔ ہماری فوجیں انہی کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں ہیں۔ جان ہم غریبوں کی گئی' جیبیں گرم ہوئیں موٹے موٹے سوداگروں کی۔ اس وقت ہماری ایسی خاطر ہوتی تھی' ایسی پیٹھ ٹھونکی جاتی تھی' گویا ہم سلطنت کے داماد ہیں۔ ہمارے اوپر پھولوں کی بارش ہوتی تھی۔ ہمیں گارڈن پارٹیاں دی جاتی تھیں۔ ہماری جانبازیوں کی داستانیں روزانہ اخباروں میں تصویروں کے ساتھ چھپتی تھیں۔ نازک بدن لیڈیاں اور شہزادیاں ہمارے لیے کپڑے سیتی تھیں۔ طرح طرح کے مربّے اور اچار بنا بنا کر بھیجتی تھیں۔ لیکن جب صلح ہو گئی تو انہی جانبازوں کو کوئی ٹکے کو بھی نہ پوچھتا تھا۔ کتنوں ہی کے انگ بھنگ ہو گئے تھے۔ کوئی لُولا ہو گیا تھا' کوئی لنگڑا' کوئی اندھا۔ انہیں ایک ٹکڑا روٹی دینے والا بھی کوئی نہ تھا۔ میں نے کتنوں ہی کو سڑکوں پر بھیک مانگتے دیکھا۔ تب سے مجھے اس پیشہ سے نفرت ہو گئی۔ میں نے یہاں آ کر یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور خوش ہوں۔ سپہ گری کا یہی منشا ہے کہ اس سے غریبوں کی جان و مال کی حفاظت ہو۔ یہ نہیں کہ کروڑ پتیوں کی بیشمار دولت میں اضافہ ہو۔ یہاں میری جان ہمیشہ خطرہ میں رہتی ہے۔ کئی بار مرتے مرتے بچا ہوں لیکن اس کام میں مر بھی جاؤں تو مجھے افسوس نہ ہو گا۔ کیونکہ مجھے یہ تسکین ہو گی کہ میری زندگی غریبوں کے کام آئی اور یہ بے چارے کسان میری کتنی خاطر کرتے ہیں کہ تم سے کیا کہوں۔ اگر میں بیمار پڑ جاؤں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ میں ان کے جسم کے تازہ خون سے اچھا ہو جاؤں گا تو بے دریغ اپنا خون دے دیں گے۔ پہلے میں بہت شراب پیتا تھا۔ میری برادری کو تو تم جانتے ہو گے۔ ہم میں بہت زیادہ لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا میسر ہو یا نہ ہو مگر شراب ضرور چاہیے۔ میں بھی ایک بوتل شراب روز پی جاتا تھا۔ باپ نے کافی پیسے چھوڑے تھے۔ اگر کفایت سے رہنا جانتا تو زندگی بھر آرام سے پڑا رہتا مگر شراب نے ستیاناس کر دیا۔ ان دنوں میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ کالر ٹائی لگائے' چھیلا بنا ہوا' نوجوان چھوکریوں سے آنکھیں لڑایا کرتا تھا۔ گھوڑ دوڑ میں جوا کھیلنا' شراب پینا' کلب میں تاش کھیلنا اور عورتوں سے دل بہلانا یہی زندگی کا مشغلہ تھا۔ تین چار سال میں مَیں نے پچیس تیس ہزار روپے اڑا دیئے' کوڑی کفن کو نہ رکھی۔ جب پیسے ختم ہو گئے تو روزی کی فکر ہوئی۔ فوج میں بھرتی ہو گیا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر لوٹا۔ یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ بہادر کا کام جان لینا نہیں بلکہ جان کی حفاظت کرنا ہے۔

یورپ سے آ کر ایک دن میں شکار کھیلنے گیا اور ادھر آ گیا۔ دیکھا کئی کسان اپنے کھیتوں کے کنارے اداس کھڑے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟؟ تم لوگ کیوں اس طرح اداس کھڑے ہو؟''

ایک آدمی نے کہا۔ "کیا کریں صاحب زندگی سے تنگ ہیں، نہ موت آتی ہے نہ پیداوار ہوتی ہے، سارے جانور آکر کھیت چر جاتے ہیں۔ کس کے گھر سے لگان چُکائیں، کیا مہاجن کو دیں، کیا عمّالوں کو دیں اور کیا خود کھائیں۔ کل انہی کھیتوں کو دیکھ کر دل کا غنچہ کھل جاتا تھا۔ آج انہیں دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جانوروں نے صفایا کر دیا۔"

معلوم نہیں اس وقت میرے دل پر کس دیوتا یا نبی کا سایہ تھا کہ مجھے ان پر رحم آگیا۔ میں نے کہا آج سے میں تمہارے کھیتوں کی رکھوالی کروں گا، کیا مجال کہ کوئی جانور پھٹک سکے۔ ایک دانہ جو جائے تو جرمانہ دوں۔ بس اسی دن سے آج تک میرا یہی کام ہے۔ آج دس سال ہوگئے ہیں کبھی ناغہ نہیں کیا، اپنا گزر بھی ہوتا ہے اور احسان مفت ملتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کام سے دل کی خوشی ہوتی ہے۔

ندی آگئی۔ میں نے دیکھا وہی گھاٹ ہے جہاں شام کو کشتی میں بیٹھا تھا۔ اس چاندنی میں ندی مرصّع زیورات پہنے جیسے کوئی سنہرا خواب دیکھ رہی ہو۔

میں نے پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے کبھی کبھی آپ کی زیارت کو آیا کروں گا۔" اس نے لالٹین اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا اور بولا۔ "میرا نام جیکسن ہے، ول جیکسن، ضرور آنا، اسٹیشن کے پاس جس سے میرا پوچھو گے، میرا پتہ بتلا دے گا۔"

یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑا مگر یکایک لوٹ پڑا اور بولا۔ "مگر تمہیں ساری رات بیٹھنا پڑے گا اور تمہاری اماں گھبرا رہی ہوں گی۔ تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ تو میں تمہیں اس پار پہنچادوں۔ آجکل پانی بہت کم ہے۔ میں تو اکثر تیر نے آتا ہوں۔"

میں نے احسان سے دب کر کہا۔ "آپ نے یہی کیا کم عنایت کی ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچادیا ورنہ شاید گھر پہنچنا نصیب نہ ہوتا، میں یہاں بیٹھا رہوں گا اور صبح کو کشتی سے پار اتر جاؤں گا۔"

"واہ! اور تمہاری اماں روتی ہوں گی کہ میرے لاڈلے پر جانے کیا گزری!"

یہ کہہ کر مسٹر جیکسن نے مجھے چٹ اٹھا کر کندھے پر بٹھالیا اور اس طرح بے خوف پانی میں گھسے گویا سوکھی زمین ہے۔ میں دونوں ہاتھوں سے ان کی گردن پکڑے ہوں اور کچھ ہنس بھی رہا ہوں۔ پھر بھی سینہ دھڑک رہا ہے اور رگوں میں سنسنی سی ہو رہی ہے۔ مگر جیکسن صاحب اطمینان سے چلے جا رہے ہیں۔ پانی گھٹنے تک آیا، پھر کمر تک پہنچا، افوہ سینہ تک پہنچ گیا۔ اب صاحب کو ایک ایک قدم مشکل ہو رہا ہے۔ میری جان نکلی جا رہی ہے، لہریں ان کے گلے لپٹ رہی ہیں، میرے پاؤں بھی چومنے لگیں، میرا جی چاہتا ہے ان سے کہوں، خدارا واپس چلیے مگر زبان نہیں کھلتی۔ حواس نے جیسے اس خطرہ کا مقابلہ کرنے کے لیے سب دروازے بند کر لیے ہیں۔ ڈرتا ہوں کہیں جیکسن صاحب پھسلے تو اپنا کام تمام ہے۔ یہ تو تیراک ہیں نکل جائیں گے، میں لہروں کی خوراک بن جاؤں گا۔ افسوس آتا ہے اپنی حماقت پر کہ تیرنا کیوں نہ سیکھ لیا۔ یکایک جیکسن نے مجھے دونوں ہاتھوں سے کندھے کے اوپر اٹھالیا۔ ہم بیچ دھار میں پہنچ گئے تھے۔ بہاؤ میں اتنی تیزی تھی کہ ایک قدم آگے رکھنے میں ایک ایک منٹ لگ جاتا تھا۔ دن کو اس ندی میں بارہا نہا چکا تھا لیکن رات کو اور اس منجدھار میں وہ مرگ رواں جیسی معلوم ہوتی تھی۔ دس بارہ قدم تک میں جیکسن کے دونوں ہاتھوں پر ٹنگا رہا۔ پھر پانی اترنے لگا۔ میں دیکھ نہ سکا مگر شاید پانی جیکسن کے سر کے اوپر تک آگیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے مجھے ہاتھوں پر اٹھالیا تھا۔ جب ان کی گردن باہر نکل آئی تو زور سے ہنس کر بولے۔ "لو اب پہنچ گئے۔"

میں نے کہا۔ ’’آپ کو آج میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی۔‘‘
جیکسن نے مجھے ہاتھوں سے اتار کر پھر کندھے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ’’اور مجھے آج جتنی مسرت ہوئی، اتنی آج تک کبھی نہ ہوئی تھی۔ جرمن کپتان کو قتل کر کے بھی۔ اپنی ماں سے کہنا مجھے دُعا دیں۔‘‘
گھاٹ پر پہنچ کر میں صاحب سے رخصت ہوا۔ شرافت، بے غرض خدمت اور جانبازانہ سرفروشی کا نہ مٹنے والا نقش دل پر لیے ہوئے۔ میرے جی میں آیا کاش میں بھی اسی طرح لوگوں کے کام آسکتا۔
تین بجے رات کو جب میں گھر پہنچا تو ہولی میں آگ لگ رہی تھی۔ میں اسٹیشن سے دو میل سرپٹ دوڑتا ہوا گیا۔ معلوم نہیں بھوکے جسم میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔
اماں میری آواز سنتے ہی آنگن میں نکل آئیں اور مجھے سینہ سے لگالیا اور بولیں۔ ’’اتنی رات کہاں کر دی۔ میں تو سانجھ سے تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔ چلو کھانا کھالو۔ کچھ کھایا پیا ہے کہ نہیں۔‘‘
وہ اب جنت میں ہیں، لیکن ان کا محبت بھرا چہرہ میری نظروں میں ہے۔ اور وہ پیار بھری آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔
مسٹر جیکسن سے کئی بار مل چکا ہوں۔ اس کی شرافت نے مجھے اس کا عقیدت مند بنا دیا ہے۔ میں اسے انسان نہیں فرشتہ سمجھتا ہوں۔

زادِ راہ

(1)

سیٹھ رام ناتھ نے بسترِ علالت پر پڑے پڑے مایوس نظروں سے اپنی بیوی سوشیلا کی طرف دیکھ کر کہا۔ ’’میں بڑا بدقسمت ہوں، سوشیلا! میرے ساتھ تمہیں ہمیشہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ جب گھر میں کچھ نہ تھا تو شب و روز دنیاداری کے بکھیڑوں اور بچوں کے لئے مرتی رہتی تھیں۔ جب معاملہ ذرا سنبھلا اور تمہارے آرام کے دن آئے تو تمہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہوں۔ آج تک مجھے زندگی کی امید تھی مگر آج وہ امید جاتی رہی۔ دیکھو سوشیلا روؤ مت! دنیا میں سبھی مرتے ہیں، کوئی دو سال آگے، کوئی دو سال پیچھے۔ اب عیالداری کا بوجھ تمہارے سر پر ہے۔ میں نے نقد روپیہ نہیں چھوڑا، لیکن جو کچھ اثاثہ ہے تمہاری زندگی اس سے کسی طرح کٹ جائے گی۔ یہ موہن کیوں رو رہا ہے؟‘‘
سوشیلا نے آنسو پونچھ کر کہا۔ ’’ضدی ہو گیا ہے اور کیا، آج سویرے سے رٹ لگائے ہوئے ہے کہ موٹر لوں گا۔ پانچ روپے سے کم میں آئے گی موٹر؟‘‘
سیٹھ جی کو کچھ دنوں سے دونوں بچوں سے محبت ہو گئی تھی، بولے۔ ’’تو منگوا دو نا ایک، بیچارہ کب سے رو رہا ہے! کیا ارمان دل میں تھے سب خاک میں مل گئے۔ رانی کے لئے ولایتی گڑیا بھی منگوا دو، دوسروں کے کھلونے دیکھ کر ترستی رہتی ہے۔ جس دولت کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھا، وہ آخر ڈاکٹروں نے کھائی۔ بچے مجھے کیا یاد کریں گے

کوئی باپ تھا— آہ بد قسمت باپ نے تو مال و زر کو لڑکی لڑکے سے پیارا سمجھا۔ ایک پیسہ کی چیز لا کر بھی نہ دی' افسوس۔"

آخری وقت جب دنیا کی ناپائداری حقیقت بن کر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہے تو جو کچھ نہ کیا اس کا افسوس اور جو کچھ کیا اس پر پچھتاوا دل کو فراخ اور درد مند بنا دیتا ہے۔ سوشیلا نے راجہ کو بلایا اور اسے چھاتی سے لگا کر رونے لگی۔ وہ مامتا جو شوہر کی کنجوس طبیعت کے سبب اندر ہی اندر تڑپ کر رہ جاتی تھی' اس وقت جیسے ابل پڑی۔ لیکن موٹر کے لئے روپے کہاں تھے؟

سیٹھ نے پوچھا۔ "موٹر لو گے بیٹا' اپنی ماں سے روپے لے کر بہن کے ساتھ چلے جاؤ' خوب عمدہ لانا۔"

موہن نے ماں کے آنسو اور باپ کا پیار دیکھا' تو اس کی ضد پگھل گئی' بولا۔ "ابھی نہیں لوں گا۔" سیٹھ جی نے پوچھا، "کیوں؟"

"جب آپ اچھے ہو جائیں گے تب لوں گا۔"

سیٹھ جی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

(2)

تیسرے روز سیٹھ رام ناتھ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

دولت مند کے زندہ رہنے سے دکھ بہتوں کو ہوتا ہے اور سکھ تھوڑوں کو۔ ان کے مرنے سے دکھ چند کو ہوتا ہے اور سکھ زیادہ کو۔ اب مہابرہمنوں کا گروہ الگ خوش ہے' پنڈت جی الگ بشاش ہیں' اور شاید برادری کے لوگ بھی خوش ہیں۔ اس لئے کہ ایک برابر کا آدمی کم ہو گیا۔ دل سے ایک کانٹا نکل گیا اور پٹی داروں کا تو پوچھنا ہی کیا' اب وہ پرانی کسر نکالیں گے۔ دل کو ٹھنڈا کرنے کا ایسا موقع بہت دنوں کے بعد ملا ہے۔

آج پانچواں دن ہے۔ وہ عالی شان مکان سُونا پڑا ہے۔ بچے نہ روتے نہ ہنستے ہیں۔ من مارے ماں کے پاس بیٹھے ہیں اور بیوہ ماں مستقبل کے لاانتہا تفکرات کے بوجھ سے دبی ہوئی مردہ سی پڑی ہے۔ گھر میں جو روپے بچ رہے تھے وہ تجہیز و تکفین کی نذر ہو گئے اور ابھی سارے رسوم باقی ہیں۔ خدایا! کیسے بیڑا پار لگے گا۔

کسی نے دروازے پر آواز دی۔ مہرا نے آکر سیٹھ دھنی رام کے آنے کی خبر دی۔ دونوں بچے باہر دوڑے۔ سوشیلا کا دل بھی ایک لمحہ کے لئے تازہ ہو گیا۔ سیٹھ دھنی رام برادری کے چوہدری تھے۔ بیکس بیوہ کا دل سیٹھ جی کی اس دلجوئی سے خوش ہو گیا۔ آخر برادری کے سرپنچ ہیں' یہ لوگ بے کس بیوہ اور یتیم بچوں کی خبر نہ لیں تو اور کون لے۔ آفرین ہے ایسے نیک بندوں پر جو مصیبت کے وقت بیکسوں کی دست گیری کرتے ہیں۔ سوشیلا گھونگھٹ نکال کر برآمدہ میں آکر کھڑی ہو گئی۔ دیکھا تو علاوہ دھنی رام کے اور بھی کئی بھلے آدمی کھڑے ہیں۔

دھنی رام جی بولے۔ "بہو جی' بھائی رام ناتھ کی بے وقت موت سے ہم لوگوں کو جو رنج ہوا ہے وہ ہمارا دل ہی جانتا ہے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی لیکن پرماتما کی مرضی' اب تو ہمارا ہی فرض ہے کہ پرمیشور پر بھروسہ رکھیں اور آگے کے لئے کوئی راستہ نکالیں۔ کام ایسا کرنا چاہیے کہ گھر کی عزت بنی رہے اور ہمارے مرحوم بھائی کی روح کو تسکین ہو۔"

کبیر داس نے سوشیلا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''عزت کے سوا دنیا میں اور ہے کیا' اس کو نبھانا' اس کی حفاظت کرنا ہمارا دھرم ہے لیکن چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہیے' کتنے روپے تمہارے پاس ہیں بہو؟''

سوشیلا۔ ''گھر میں روپے کہاں ہیں سیٹھ جی' جو تھوڑے بہت تھے بیماری میں اٹھ گئے۔''

دھنی رام۔ ''تو یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی' ایسی حالت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔''

کبیر چند۔ ''جو کچھ سہی دعوت تو دینی ہو گی۔ ہاں اپنی بساط دیکھ کر کام کرنا چاہیے۔ میں قرض لینے کی صلاح نہ دوں گا۔ گھر میں جتنے روپے کا انتظام ہو سکے اس میں کوئی کسر نہیں رکھنی چاہیے۔ مرنے والے کے ساتھ ہمارا بھی تو کوئی فرض ہے۔ اب تو وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔ اس سے ہمیشہ کے لئے رشتہ ٹوٹ رہا ہے۔ اس لئے سب کچھ حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ برہمنوں کو تو دہی اور مٹھائیاں دی جائیں گی' لیکن برادری کی دعوت اسی اعتبار سے کرنی چاہیے کہ عزت میں فرق نہ آئے۔''

دھنی رام۔ ''تو کیا تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ تم نے ایک عجیب بات کہہ دی۔ بہو جی دو چار ہزار بھی نہیں؟''

سوشیلا۔ ''میں آپ سے سچ کہتی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بھلا ایسے وقت جھوٹ بولوں گی۔''

دھنی رام نے کبیر داس کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تب تو یہ مکان بیچنا پڑے گا۔''

''اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے' ناک کٹانا تو اچھا نہیں ہے۔ رام ناتھ کا کتنا نام تھا' برادری کے ستون تھے۔ یہی اس وقت ایک علاج ہے۔ بیس ہزار میرے نکلتے ہیں' سود بٹہ لگا کر پچیس ہزار ہوں گے۔ باقی روٹی میں خرچ ہو جائیں گے۔ اگر کچھ بچ رہا تو بال بچوں کے کام آ جائے گا۔''

دھنی رام۔ ''آپ کے پاس یہ گھر کتنے پر رہن تھا؟''

کبیر۔ ''بیس ہزار روپیہ پر سینکڑہ سود۔''

دھنی رام۔ ''میں نے تو کم سنا ہے۔''

کبیر۔ ''اس کا تو رہن نامہ لکھا ہے' زبانی بات چیت تھوڑی ہے۔ میں دو چار ہزار کے لئے جھوٹ نہ بولوں گا۔''

دھنی رام۔ ''نہیں' نہیں۔ یہ میں کب کہتا ہوں۔ تو تُو نے سن لیا' بائی پنچوں کی صلاح ہے مکان بیچ دیا جائے۔''

سوشیلا کا چھوٹا بھائی سنت لال بھی اس وقت آ پہنچا۔ یہ آخری الفاظ اس کے کان میں پہنچ گئے۔ وہ بول اٹھا۔ ''کس لئے مکان بیچ دیا جائے' برادری کی روٹی کے لئے! برادری تو کھا پی کر راستہ لے گی۔ ان یتیموں کی کون پرورش کرے گا؟ یہ تو سوچنا چاہیے۔''

دھنی رام نے غصہ بھری آنکھوں سے دیکھ کر کہا۔ ''آپ کو ان معاملوں میں ٹانگ اڑانے کا کوئی حق نہیں۔ صرف آئندہ کی فکر کرنے سے کام نہ چلے گا۔ مرحوم کا پیچھا بھی کسی طرح سدھارنا ہی پڑے گا۔ ہنسی تو ہماری ہو گی۔ دنیا میں عزت سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ وقار کے لئے لوگ جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ جب وقار ہی نہ رہا تو کیا رہ گیا۔ اگر ہماری صلاح پوچھو گے تو ہم تو یہی کہیں گے۔ آگے بائی کو اختیار ہے' جیسا چاہے کرے' پر ہم سے سروکار نہ ہو گا۔ چلیے کبیر چند جی چلیے۔''

سوشیلا نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "بھیا کی باتوں کا خیال نہ کیجئے سیٹھ جی! ان کی تو یہ عادت ہے' میں نے تو آپ کی بات نہیں ٹالی' آپ میرے بزرگ ہیں۔ گھر کا حال آپ کو معلوم ہی ہے۔ میں اپنے مالک کی روح کو رنجیدہ کرنا نہیں چاہتی لیکن جب ان کے بال بچے ٹھوکر کھائیں گے تو ان کی روح رنجیدہ نہ ہو گی؟ بیٹی کا بیاہ کرنا ہی ہو گا۔ لڑکے کو لکھانا پڑھانا پڑے گا ہی۔ برہمنوں کو کھلا دیجئے لیکن روٹی کرنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے۔"

دونوں اصحاب کو گویا تھپڑ لگ گیا۔ بھلا ایسی بات بھی زبان سے نکالی جاتی ہے۔ پنچ لوگ اپنے منہ پر سیاہی نہ لگنے دیں گے۔ دنیا بیوہ عورت پر نہیں ہنسے گی' ہنسی ہو گئی پنچوں کی۔ یہ جگ ہنسائی وہ کیسے سہہ سکتے ہیں۔ ایسے گھر کے دروازہ پر جھانکنا بھی گناہ ہے۔

سوشیلا رو کر بولی۔ "میں غریب ہوں' نادان ہوں' مجھ پر غصہ نہ کیجئے۔ آپ لوگ ہی مجھے چھوڑ دیں گے تو میرا گذارہ کیسے ہو گا۔"

اتنے میں دو اصحاب اور آ گئے۔ ایک بہت موٹے' دوسرے بہت دبلے۔ نام بھی اسم با مسمّٰی بھیم چند اور دربل داس۔ دھنی رام نے چند لفظوں میں ساری کیفیت انہیں سمجھا دی اور دربل داس نے بہت ہمدردی سے کہا۔ "تو ایسے کیوں نہیں کرتے کہ ہم لوگ مل کر کچھ روپے دے دیں' اس کا لڑکا سیانا ہو جائے گا تو روپے مل ہی جائیں گے۔ اگر نہ بھی ملیں تو ایک دوست سے کچھ بل کھا جانا کوئی بڑی بات نہیں۔"

سنت لال نے خوش ہو کر کہا۔ "اتنی مہربانی آپ لوگ کریں تو کیا کہنا۔"

کبیر چند تیوری چڑھا کر بولے۔ "تم بے سر پیر کی باتیں کرنے لگے دربل داس جی۔ اس وقت بازار میں کس کے پاس فالتو روپے رکھے ہوئے ہیں جو دے دے گا۔ زمانہ کا رنگ نہیں دیکھتے۔"

بھیم چند۔ "یہ تو ٹھیک ہے' ایسا مندا بازار تو کبھی دیکھا ہی نہیں' مگر نبھاؤ تو کرنا چاہیے۔"

کبیر چند اکڑ گئے۔ وہ سوشیلا کے مکان پر دانت لگائے ہوئے تھے۔ ایسی باتوں سے شکار ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ تھا۔ وہ اپنے روپے وصول کر کے چھوڑیں گے۔ عورتوں کے جھمیلے میں پڑ کر اپنا نقصان کیوں کریں۔ بھیم چند نے بہت اچھا کیا' انہیں ہوشیار کر دیا لیکن ضیافت تو دینی ہی پڑے گی۔ پنچ لوگ برادری کی ناک نہیں کٹوا سکتے۔

سوشیلا نے دربل داس میں ہمدردی کا شائبہ دیکھا' ان کی طرف بیکسانہ نظروں سے دیکھ کر بولی۔ "میں آپ لوگوں سے باہر تھوڑا ہی ہوں۔ آپ لوگ مالک ہیں جیسا مناسب سمجھیں کریں۔"

دربل داس نے پوچھا۔ "تیرے پاس کچھ تھوڑے بہت زیور تو ہوں گے۔"

سوشیلا نے قبول کیا۔ "ہاں تھوڑے سے گہنے پڑے ہوں گے۔ بیماری میں آدھے سے زیادہ بک گئے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے سارے زیور لا کر پنچوں کے سامنے رکھ دیئے۔

دھنی رام بولے۔ "مگر یہ مشکل سے تین ہزار میں اٹھیں گے۔"

دربل داس نے پوٹلی کو ہاتھ میں تول کر کہا۔ "تین ہزار کیسے میں ساڑھے تین ہزار لا دوں گا۔"

بھیم چند نے پھر پوٹلی کو جانچ کر کہا۔ "میری بولی چار ہزار کی ہے۔"

کبیر داس کو مکان کے فروخت کرنے کا سوال چھیڑنے کا پھر موقع ملا' بولے۔ "چار ہزار میں کیا ہوا جاتا ہے۔ برادری کا کھانا ہے یا کوئی بلا ٹالنا ہے۔ کم از کم دس ہزار کا خرچ ہے۔ مکان تو نکالنا ہی پڑے گا۔"

سنت لال نے ہونٹ چبا کر کہا۔ "میں کہتا ہوں آپ لوگ کیا اتنے بے رحم ہیں۔ آپ لوگوں کو یتیم بچوں

پر رحم نہیں آتا۔ کیا انہیں بھکاری بنا کر چھوڑو گے۔"

لیکن سنت لال کی فریاد پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ بِلا مکان فروخت کئے کسی طرح کام نہیں چل سکتا۔ بازار آج کل مندا ہے۔ تیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے۔ پچیس ہزار تو کبیر داس کے ہیں' پانچ ہزار بچیں گے۔ اس طرح نو ہزار میں بڑی کفایت سے برہم بھوج بھی ہو جائے گا اور برادری کی دعوت بھی ہو جائے گی۔ پنچوں کو آخر مرحوم کے بال بچوں کا خیال بھی کرنا ہے۔"

سوشیلا نے دونوں بچوں کو سامنے کر کے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "پنچو! میرے بچوں کا منہ دیکھو۔ میرے گھر میں جو کچھ ہے سب لے لیجئے لیکن مکان چھوڑ دیجئے۔ مجھے ٹھکانہ نہ ملے گا۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ مکان اس وقت نہ بیچیں۔"

اس بیوقوفی کا کیا جواب دیا جائے۔ پنچ لوگ تو چاہتے تھے کہ مکان نہ بیچنا پڑے۔ انہیں یتیم بچوں کے ساتھ کچھ دشمنی نہیں' لیکن برادری کا کھانا اور کس طریقے سے کیا جائے۔ اگر بیوہ پانچ ہزار کا انتظام اور کر دے تو مکان فی الحال بچ سکتا ہے۔ جب وہ ایسا نہیں کر سکتی تو مکان فروخت کرنے کے سوا اور کوئی علاج نہیں ہے۔

کبیر داس نے کہا۔ "دیکھ بائی' بازار کی حالت آج کل خراب ہے' روپیہ کسی سے ادھار نہیں مل سکتا! بال بچوں کے بھاگ میں لکھا ہو گا تو بھگوان اور کسی حیلے سے دے دیں گے۔ حیلہ روزی بہانہ موت' بھگوان جس کو پیدا کرتے ہیں اس کے رزق کا بھی انتظام کر دیتے ہیں۔ ہم تجھے سمجھا کر ہار گئے۔ اگر تو اپنی ہٹ نہیں چھوڑے گی تو ہم بات بھی نہ کریں گے۔ پھر یہاں تیرا رہنا مشکل ہو جائے گا۔ شہر والے تیرے پیچھے پڑ جائیں گے۔"

بیوہ سوشیلا اور کیا کرتی' پنچوں سے لڑ کر وہ کیسے رہ سکتی تھی۔ پانی میں رہ کر مگرمچھ سے کون دشمنی کر سکتا ہے۔ اندر جانے کے لئے اٹھی' مگر وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ ابھی تک کچھ امید قائم تھی۔ بچوں کی پرورش میں وہ اپنی بیوگی کو بھول سکتی تھی۔ مگر اب تو چاروں طرف اندھیرا تھا۔

سیٹھ رام ناتھ کے دوستوں کا ان کے گھر پر پورا حق تھا' دوستوں کا حق نہ ہو تو کس کا ہو۔ عورت کون ہوتی ہے۔ جب وہ اتنی سی موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتی کہ برادری کو روٹی دینا اور دھوم دھام سے دینا لازمی ہے تو اس کو زیادہ سمجھانا فضول ہے۔ اب زیورات کون خریدے۔ بھیم چند چار ہزار لگا چکے تھے۔ لیکن اب ان کو معلوم ہوا کہ ان سے بھول ہوئی تھی۔ دربل داس نے ساڑھے تین ہزار لگائے تھے' اس لئے سودا انہیں کے ہاتھ ہوا' اس بات پر بھیم چند اور دربل داس میں تکرار ہو گئی لیکن بھیم چند کو منہ کی کھانا پڑی' انصاف دربل کی طرف تھا۔

دھنی رام نے ذرا چٹکی لی۔ "دیکھو دربل داس مال تو لے جاتے ہو مگر ساڑے تین ہزار سے زائد کا ہے۔ میں انصاف کا خون نہ ہونے دوں گا۔"

کبیر داس بولے۔ "اجی تو گھر میں ہی تو ہے کہیں باہر تو نہیں گیا۔ ایک دن دوستوں کی دعوت ہو جائے گی۔" اس پر چاروں اصحاب ہنس پڑے۔ اس کام سے فرصت پا کر اب مکان کا سوال اٹھا۔ کبیر چند تیس ہزار دینے کو تیار تھے لیکن قانونی کارروائی کے بغیر معاملہ پختہ نہ تھا۔ یہ خامی کیوں رکھی جائے۔ فوراً ایک دلال بلایا گیا۔ پستہ قد آدمی' پوپلا منہ' کوئی ستر سال کی عمر' نام تھا چوکھے لال۔

کبیر داس نے کہا۔ "چوکھے لال سے ہماری تیس برس کی دوستی ہے' آدمی کیا ہیرا ہے۔"

بھیم چند۔ "دیکھو چوکھے لال! یہ مکان بیچنا ہے' اس کے لئے کوئی اچھا خریدار لاؤ' تمہاری دلالی پکی۔"

کبیر داس۔ ''بازار کا حال اچھا نہیں ہے لیکن پھر بھی ہمیں تو یہ دیکھنا پڑے گا کہ رام ناتھ کے بچوں کو خسارہ نہ رہے۔ (چوکھے لال کے کان میں) تیس سے آگے نہ جانا۔''

بھیم چند۔ ''دیکھئے کبیر داس' یہ اچھی بات نہیں ہے۔''

کبیر داس۔ ''تو میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں تو یہی کہہ رہا تھا اچھے دام لگانا۔''

چوکھے لال۔ ''آپ لوگوں کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں' میں اپنا دھرم سمجھتا ہوں۔ رام ناتھ میرے بھی دوست تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس مکان کے بنوانے میں لاکھ سے ایک پائی بھی کم خرچ نہیں ہوئے لیکن بازار کا حال کیا آپ لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔ اس وقت اس کے پچیس ہزار سے زائد نہیں مل سکتے۔ سنبھلتے سے کوئی گاہک مل جائے تو دس پانچ ہزار اور مل جائیں گے لیکن اس وقت پچیس ہزار بھی بہت ہیں۔''

دھنی رام۔ ''پچیس ہزار تو بہت کم ہیں بھائی۔ اور نہ سہی تو تیس ہزار کرا دو۔''

چوکھے لال۔ ''تیس کیا ہیں میں چالیس کرا دوں' کوئی گاہک تو ملے' آپ لوگ کہتے ہیں تو میں تیس ہزار کی بات چیت کرا دوں گا۔''

دھنی رام۔ ''جب تیس ہزار میں دینا ہے تو کبیر داس ہی کیوں نہ لے لیں' اتنا سستا مال دوسروں کو کیوں دیا جائے۔''

کبیر داس۔ ''آپ سب لوگوں کی جیسی رائے ہو۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ بائی کے ساتھ جہاں تک ہو سکے رعایت کی جائے۔''

دھنی رام نے ہاں ہاں کہہ کر منظوری دے دی۔ بھیم چند من میں اینٹھ کر رہ گیا۔ سودا بھی پکا ہو گیا۔ اسی دن وکیل نے بیعنامہ لکھا۔ جھٹ رجسٹری ہو گئی۔ سوشیلا کے سامنے بیعنامہ لایا گیا' تو اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں سے اس پر دستخط کر دیئے' اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ بے وفا دوست کی طرح یہ گھر بھی سکھ کے دنوں میں اس کا ساتھ دے کر دکھ میں ساتھ چھوڑ رہا ہے۔

پنچ لوگ سوشیلا کے صحن میں بیٹھے برادری کو رقعے لکھ رہے ہیں اور لاوارث بیوہ جھروکے میں اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ ادھر رقعہ تیار ہوا ادھر بیکس بیوہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر گر پڑے۔

دھنی رام نے اوپر دیکھ کر کہا۔ ''پانی کی چھینٹ کہاں سے آئی۔''

سنت لال۔ ''بائی بیٹھی رو رہی ہے' اس نے رقعے پر اپنے خون کے آنسوؤں کی مہر لگا دی ہے۔''

دھنی رام۔ ''(اونچی آواز میں) ارے تو کیوں رو رہی ہے بائی۔ یہ رونے کا وقت نہیں' تجھے خوش ہونا چاہیے تھا کہ پنچ لوگ تیرے گھر میں آج ایک نیک کام کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ جس خاوند کے ساتھ تو اتنے دنوں عیش و آرام سے رہی اس کی آتما کے لئے کچھ ''زادِ راہ'' نہ دے گی۔ اس کی مکتی کی طرف تیرا ذرا بھی دھیان نہیں۔''

برادری میں رقعہ پھرا اور پھر تین چار دن پنچوں نے دعوت کی تیاری میں صرف کئے۔ گھی دھنی رام کی آڑھت سے آیا' میدے اور چینی کی آڑھت بھی انہی کی تھی۔ پانچویں دن صبح کے وقت برہمنوں کا کھانا ہوا' شام کو برادری کی روٹی ہوئی۔ سوشیلا کے دروازہ پر گاڑیوں اور موٹروں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ صحن' بیٹھک' دلان' برآمدہ' اوپر کی چھت سب مہمانوں سے بھرے ہوئے تھے۔ لوگ کھانا کھاتے تھے اور پنچوں کی تعریف کرتے تھے۔ خرچ تو سب ہی کرتے تھے مگر انتظام کا سلیقہ چاہیے۔ ایسی مزیدار چیزیں کم کھانے میں آئی ہیں۔ لوگ تعریفیں کر رہے تھے۔

"سیٹھ چمپارام کی روٹی کے بعد ایسی روٹی ہوئی ہے۔"

"امرتیاں کیسی خستہ ہیں۔"

"رس گلے میوے سے بھرے ہیں۔"

"سارا انتظام پنچوں کا ہے۔"

دھنی رام نے انکساری سے کہا۔ "رام ناتھ سے میرا بھائی چارہ تھا' ہم نہ کرتے تو کون کرتا۔ سمجھ لو کہ چار دن سے سونا نصیب نہیں ہوا۔"

"آفرین۔ دوست ہوں تو ایسے ہوں۔"

"کیا بات ہے 'آپ نے رام ناتھ جی کا نام رکھ لیا۔ برادری یہی کھانا کھلانا دیکھتی ہے' رقم کو دیکھنے نہیں آتی۔"

مہمان لوگ تعریفیں کر کر کے تر مال اڑا رہے ہیں اور ادھر کوٹھڑی میں بیٹھی ہوئی سوشیلا سوچ رہی تھی۔ دنیا میں ایسے خود غرض لوگ بھی ہیں۔ ساری دنیا مطلب پرست بن گئی ہے۔ سب پیٹوں پر ہاتھ پھیر پھیر کر کھانا کھا رہے ہیں' کوئی اتنا بھی پوچھتا کہ غریب یتیموں کے لئے کچھ بچا یا نہیں۔

(3)

ایک مہینہ گزر گیا' سوشیلا پیسے پیسے کو محتاج ہو رہی تھی۔ نقد تھا ہی نہیں' زیور نکل گئے۔ اب صرف تھوڑے سے برتن بچ رہے تھے ادھر بہت سے چھوٹے چھوٹے بل چکانے تھے۔ کچھ روپے ڈاکٹر کو دینے تھے' کچھ بنیئے کو' کچھ درزی کو۔ سوشیلا کو یہ رقمیں گھر کا بچا کھچا سامان بیچ کر چکانا پڑیں' اور مہینہ پورا ہوتے ہوتے اس کے پاس کچھ نہ بچا۔ بیچارہ سنت لال ایک دوکان میں منیم تھا۔ کبھی کبھی دو چار روپے دے دیتا اور خرچ کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ بچے تو صورتِ حال کو سمجھتے تھے' ماں کو دق نہ کرتے تھے لیکن مکان کے سامنے سے کوئی خوانچے والا نکل جاتا اور دونوں دوسرے بچوں کو پھل یا مٹھائیاں کھاتے دیکھتے تو ان کے منہ میں چاہے پانی نہ آئے' آنکھوں میں ضرور آ جاتا تھا۔ ایسی للچائی مجبور نظروں سے دیکھتے کہ رحم آ جاتا۔ وہی بچے جو چند روز پہلے میوے اور مٹھائیوں کی طرف تاکتے بھی نہ تھے' اب ایک ایک پیسے کی چیز کو ترستے تھے۔ وہی حضرات جنھوں نے برادری کو دعوت کروائی تھی' مکان کے سامنے سے نکل جاتے تھے' پر کوئی جھانکتا تک نہ تھا۔

شام ہو گئی تھی سوشیلا چولہا جلائے روٹیاں سینک رہی تھی اور دونوں بچے چولہے کے پاس بیٹھے روٹیوں کو گرسنہ نظروں سے دیکھ رہے تھے' دال پکنے کا انتظار تھا۔ لڑکی گیارہ سال کی تھی لڑکا آٹھ سال کا۔

موہن بے صبر اہو کر بولا۔ "اماں مجھے روکھی روٹیاں ہی دے دو' بڑی بھوک لگی ہے۔"

سوشیلا نے محبت آمیز انداز میں کہا۔ "ذرا اور صبر کرو بیٹا۔ ابھی دال پکی جاتی ہے۔"

ریوتی کو بھائی پر رحم آ گیا۔ بولی۔ "میرے پاس ایک پیسہ ہے' میں دہی لیے آتی ہوں۔"

سوشیلا نے پوچھا۔ "تو نے پیسہ کہاں سے پایا؟"

ریوتی نے معصومانہ انداز سے کہا۔ "مجھے کل اپنی گڑیوں کی پٹاری سے ملا تھا۔"

سوشیلا مطمئن ہو کر بولی۔ "اچھا' جا مگر جلد آئیو۔"

ریوتی دوڑی ہوئی باہر گئی اور ایک پتّے پر ذرا سا دہی لے آئی۔ ماں نے روٹی دے دی۔ موہن دہی سے روٹی کھانے لگا۔ عام لڑکوں کی طرح وہ بھی خود غرض تھا۔ بہن سے پوچھا بھی نہیں۔

سوشیلا نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ ''اکیلا ہی کھا جائے گا۔ بہن کو بھی دے دے۔'' موہن شرمندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

ریوتی بولی۔ ''نہیں اماں کتنا ملا ہے' تم کھالو۔ موہن تمہیں جلد نیند آجاتی ہے' میں تو دال کے ساتھ کھاؤں گی۔''

اسی وقت دو آدمیوں نے باہر سے آواز دی۔ ریوتی نے باہر جا کر پوچھا۔ معلوم ہوا سیٹھ کبیر داس کے آدمی ہیں' مکان خالی کرانے آئے ہیں۔ سوشیلا کی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں۔

بروٹھے میں آکر بولی۔ ''ابھی میرے شوہر کی وفات کو ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور ابھی سے مکان خالی کرانے کی دھن سوار ہو گئی۔ میرا پچاس ہزار کا مکان تیس ہزار میں لے لیا' اس پر پانچ ہزار سود کے ہضم کئے' پھر بھی پیٹ نہیں بھرا۔ کہہ دو میں ابھی مکان خالی نہ کروں گی۔''

منیم نے ملائمت سے کہا۔ ''بائی جی! میں تو نوکر ہوں' میرا کیا اختیار ہے۔ جب ملکیّت دوسرے کی ہو گئی تب مجبوراً آپ کو چھوڑنی ہی پڑے گی۔ قانون کسی کی حالت کو نہیں دیکھتا۔''

سوشیلا سمجھ گئی منیم جو کہتا ہے۔ رحم اور انسانیت کے بل پر کب تک گزارہ ہو گا۔ نرم ہو کر بولی۔ ''اتنا میں بھی جانتی ہوں منیم جی۔ تم سیٹھ جی سے میری طرف سے عرض کرنا' دس دن کی مہلت اور دے دیں۔ لیکن نہیں' کچھ عرض معروض کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیوں دس پانچ دن کے لئے کسی کا احسان لوں۔ میری تقدیر میں اس گھر میں رہنا لکھا ہوتا تو کیوں ہاتھ سے نکل جاتا۔''

منیم نے پوچھا۔ ''تو کل سویرے تک خالی ہو جائے گا؟''

سوشیلا بولی۔ ''ہاں ہاں کہتی تو ہوں' اور سویرے تک کیوں؟ میں ابھی خالی کئے دیتی ہوں۔ میرے پاس ایسا اثاثہ ہی کیا ہے۔ تمہارے سیٹھ جی کے رات بھر کے کرائے کا کیوں نقصان ہو جا کر قفل لاؤ یا لائے ہو——؟''

''ایسی کیا جلدی ہے بائی جی۔ کل اطمینان سے خالی کر دیجئے گا۔''

''جب خالی ہی کرنا ہے تو کل کا جھگڑا کیوں رکھوں۔ منیم جی آپ جایئے اور تالا لا کر ڈال دیجئے۔''

یہ کہتی ہوئی سوشیلا اندر گئی' بچوں کو کھانا کھلایا۔ ایک روٹی خود آنسوؤں کے ساتھ نگلی۔ برتن مانجھے۔ پھر ایک یکّہ منگوا کر اس پر مختصر سا سامان لادا اور بادلِ پُر درد اس گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ جسے اس نے اتنے ارمانوں سے کئی پشتوں کے لئے بنوایا تھا۔ اس وقت دل میں کتنی امنگیں تھیں' اینٹ اول درجہ کی ہو' چونا خالص کنکر کا' لکڑی پختہ۔ سیٹھ جی مرحوم تو دن بھر اپنی آڑھت میں رہتے تھے' مزدوروں کی نگرانی اور دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی۔ جس دن مکان تیار ہو گیا اور آبادی کی رسم ادا ہوئی' اس دن کئی ہزار برہمنوں کا بھوج ہوا تھا۔ سوشیلا کو اتنی دوڑ دھوپ کرنی پڑی کہ وہ ایک مہینہ تک بیمار رہی۔ اس گھر سے اتنے ہی دنوں میں کتنی یادیں وابستہ ہو گئی تھیں۔ اسی گھر میں اس کے دو لڑکے مرے تھے' یہیں اس کے شوہر نے دنیا کو خیر باد کہا۔ مرنے والوں کی روحیں گویا اسی در و دیوار پر منڈلا رہی ہوں۔ اس کا ایک ایک کونا گویا اس کے دکھ سے دکھی اور اس کے سکھ سے سکھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ پرانا رفیق آج اس سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہا ہے۔

اس نے رات ایک ہمسایہ کے گھر کاٹی اور دوسرے دن دس روپے ماہوار پر ایک گلی میں دوسرا مکان لے لیا۔

(4)

اس نئے مکان میں ان مصیبت زدوں نے تین مہینے جس عذاب میں کاٹے وہ سمجھنے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ جو ایک ہوادار اور پُر فضا وسیع اور ہر موسم میں آرام دہ مکان میں رہنے کا عادی ہو' اس کے لئے یہ نیا مکان تنگ و تاریک زندان خانہ سے کم تکلیف دہ نہ تھا۔ مگر بھلا ہو بیچارے سنت لال کا' وہ اپنی قلیل آمدنی میں بھی ان غریبوں کی کچھ نہ کچھ مدد کرتا رہتا تھا۔ اگر سوشیلا شروع ہی سے افلاس کی عادی ہوتی تو چکی پیستی' کپڑے سیتی یا کسی کا کھانا پکا کر گذر کرتی۔ مگر خوشحال ماں باپ کی لاڈلی بیٹی اور خوشحال شوہر کی بیوی' یہ کام اسے ذلیل معلوم ہوتے تھے۔ پھر اپنے مرحوم شوہر کے وقار کا بھی تو خیال تھا۔ حیثیت سے گر کر رہنے میں کتنی سُبکی تھی۔ لوگ یہی کہتے یہ سیٹھ رام ناتھ کی بیوی ہے۔ کل کیا تھے آج کیا ہو گئے۔ اس نام کی لاج تو رکھنی ہی تھی۔ سماج کی سخت گیریوں سے کسی طرح بھی تو نجات نہیں۔ لڑکی کے دو ایک زیور بچ گئے تھے' وہ بک گئے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے تھے تو گھر کا کرایہ کہاں سے آتا۔ تین مہینے تک تو مالک مکان نے کسی طرح صبر کیا وہ بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا جس نے ضیافت میں بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے تھے اور سوشیلا کی زبوں حالی سے واقف تھا مگر بیچارہ کہاں تک صبر کرتا۔ تیس روپے کا معاملہ تھا۔ روپیہ آٹھ آنے کی بات نہ تھی' اتنی بڑی رقم تو نہیں چھوڑی جا سکتی۔

آخر جب چوتھا مہینہ لگ لیا تو ایک دن سیٹھ جی بہ نفسِ نفیس وارد ہوئے اور سانڈ کی طرح ڈکارتے ہوئے بولے۔ "اگر تُو کرایہ دے نہیں سکتی تو گھر خالی کر دے۔ میں نے برادری کے ناتے اتنی مروت کی لیکن تو پرواہی نہیں کرتی۔ کھاتی ہے' پیتی ہے' کپڑے پہنتی ہے۔ پھر گھر کا کرایہ دیتے ہوئے کیوں نانی مرتی ہے۔ بے چارے رام ناتھ کی آتما کو بدنام کر رہی ہے۔"

سوشیلا دردناک لہجہ میں بولی۔ "سیٹھ جی میرے پاس روپے ہوتے تو آپ کا کرایہ ادا کر کے تب پانی پیتی' آپ نے اتنی مروّت کی' اس لئے میرا سر آپ کے قدموں پر ہے۔ لیکن ابھی میں بالکل تنگدست ہوں' یہ سمجھ لیجئے کہ بس ایک بھائی میرے بال بچوں کی پرورش کر رہے ہیں اور کیا کہوں۔"

سیٹھ جی کچی گولیاں نہ کھیلے تھے' پورن ماشی کو ہمیشہ ست نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ اب کہاں تک دھرم کے نام کو روتے۔ غضبناک ہو کر بولے۔ "چل چل اس طرح کے بہانے بہت سن چکا ہوں' میں برادری کا آدمی ہوں نا' اس لئے چاہتی ہے کہ مجھے چُوس لے۔ اگر کوئی دوسرا ہوتا تو اسے چپکے سے مہینے مہینے کرایہ دیتی۔ نہیں اس نے باہر کیا ہوتا۔ میں برادری کا ہوں مجھے کرایہ دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے مانگنا ہی نہ چاہیے' کیونکہ برادری کے ساتھ یہی سلوک' اسی کے سایہ میں رہتی ہے' اسی کی جڑ کھودتی ہے۔"

ریوتی بھی کہیں سے کھیلتی ہوئی آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیٹھ جی نے اسے سر سے پاؤں تک مبصرانہ انداز سے دیکھا' اور تب ذرا رقیق ہو کر بولے۔ "اچھا تو یہ لڑکی سیانی ہو گئی' کہیں اس کی سگائی کی بات چیت نہیں کی؟"

ریوتی شرما کر بھاگ گئی۔ سوشیلا نے ان الفاظ میں ہمدردی کی جھلک پا کر پُر اعتماد لہجہ میں کہا۔ "ابھی تو کہیں بات چیت نہیں ہوئی سیٹھ جی! گھر کا کرایہ تو ادا نہیں کر سکتی' سگائی کہاں سے کروں' پھر ابھی چھوٹی بھی تو ہے۔"

سیٹھ جی نے فوراً شاستروں کا حوالہ دیا۔ ''لڑکیوں کی شادی بارہ سال کے اندر کر دینی چاہیے۔ شاستروں کی یہی منشاء ہے۔ دھرم سب کے لئے ایک ہے۔ کیا غریب کیا امیر' اس کا نیرادر نہ کرنا چاہیے۔ کرایہ کی کوئی بات نہیں ہے' پھر دے دینا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سیٹھ رام ناتھ کی کنیا ابھی کنواری بیٹھی ہے۔''

سوشیلا کو جیسے آنکھیں مل گئیں۔ بولی۔ ''تو آپ کی نگاہ میں کوئی اچھا لڑکا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں' میرے پاس لینے دینے کو کچھ نہیں۔''

سیٹھ جھابر مل جی (آپ کا یہی مبارک نام تھا) کی مردانہ حمیّت جوش میں آگئی۔ آواز میں قند و شکر گھول کر بولے۔ ''لینے دینے کی کوئی بات نہیں بائی جی! سیٹھ رام ناتھ بھائی تھے۔ ان کی کنیا کنواری بیٹھی رہے' یہ میں نہیں دیکھ سکتا۔ ایسا گھر ہے کہ لڑکی زندگی بھر آرام سے رہے گی۔ تمہارا لڑکا بھی وہیں رہ سکتا ہے۔ اس کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ بس یہی سمجھ لو کہ تمہارے نصیب کھل جائیں گے۔ گھرانہ بہت ہی شریف اور اونچا ہے' ہاں لڑکا دوہاجو ہے۔''

''عمر اچھی ہونی چاہیے' دوہاجو ہونے سے کیا ہوتا ہے۔''

''عمر بھی کچھ زیادہ نہیں ہے' ابھی چالیسواں ہی سال ہے' دیکھنے میں تیس ہی کا لگتا ہے' ہٹا کٹا اور مضبوط آدمی ہے' اور مرد کی عمر تو اس کی غذا ہے' اچھی غذا ملتی جائے تو عمر کی پروا نہیں' بس یہ سمجھ لو کہ تمہارا بیڑا پار لگ جائے گا۔''

سوشیلا تشویشناک لہجہ میں بولی۔ ''اچھا میں سوچ کر جواب دوں گی۔ ایک بار مجھے بھی دکھا دینا۔''

سیٹھ جھابر مل جی مسکرا کر بولے۔ ''دیکھنے کو کہیں جانا ہے بائی جی! وہ تو تیرے سامنے ہی کھڑا ہے۔''

سوشیلا کے منہ پر طمانچہ سا پڑ گیا۔ نفرت آمیز نظروں سے سیٹھ کو دیکھا۔ یہ پچاس سال کا بوڑھا کھوسٹ اور اس کی یہ ہوس۔ سینہ کا گوشت لٹک کر ناف تک آ پہنچا ہے' ٹھڈی سینہ کا بوسہ لے رہی ہے' دانت کے ستون جیسے کوئٹہ کے زلزے میں منہدم ہو گئے ہیں اور اس پر یہ بڑھیں۔ یہ احمق سمجھتا ہے کہ میں لالچ میں آ کر اپنی پھول سی لڑکی اس کے گلے باندھ دوں گی۔ میں اسے عمر بھر کنواری رکھوں گی پر اس مرد کے ساتھ اس کی شادی کر کے اس کی زندگی برباد نہ کروں گی۔ مگر اس نے ضبط کیا۔ یہ زمانہ کی خوبی ہے کہ ایسے کھوسٹوں کو اس کی بے کسی کو ذلیل کرنے کا حوصلہ ہوتا ہے' بولی۔ ''آپ کی اس عنایت کے لیے آپ کی مشکور ہوں سیٹھ! مگر میں اپنی لڑکی کی شادی آپ سے نہیں کر سکتی۔''

جھابر مل تُند ہو کر بولے۔ ''تو اور تُو کیا سمجھتی ہے کہ تیری لڑکی کے لئے برادری میں کوئی کنوارا لڑکا مل جائے گا۔''

''تو میری لڑکی کنواری ہی رہے گی۔''

''اور سیٹھ رام ناتھ کے نام کو داغ لگائے گی۔''

''نام کے لئے اپنی ساری جائیداد کھوئی' زیور کھو دیئے' مکان کھویا لیکن لڑکی کنویں میں نہیں ڈال سکتی' نام رہے یا جائے۔''

''تو پھر میرا کرایہ اسی وقت دے دے۔''

''ابھی میرے پاس روپے نہیں ہیں۔''

جھابر مل اسی غیظ کے عالم میں مکان کے اندر گھس گئے اور خانہ داری کی ایک ایک چیز نکال کر گلی میں

پھینک دی۔ گھڑا پھوٹ گیا' مٹکے چُور چُور ہو گئے' برتن ٹوٹ گئے' صندوق کے کپڑے بکھر گئے۔ چیتھڑوں کو جوڑ کر ریوتی نے کھیلنے کے لئے جو خوبصورت سی گڑیا بنا رکھی تھی' اس کے اعضاء منتشر ہو گئے اور اس کے ریزے ہوا میں اڑ گئے۔ سوشیلا ایک بے حسی کے عالم میں دور کھڑی اپنی تباہی کا یہ جگر دوز منظر دیکھتی رہی۔

گھر کو خاک میں ملا کر جھابر مل نے مکان میں قفل ڈال دیا اور عدالت سے پیسے وصول کرنے کی دھمکی دے کر چلے گئے۔

(5)

بڑوں کے پاس دولت ہوتی ہے' چھوٹوں کے پاس دل ہوتا ہے۔ دولت سے عالی شان محل بنتے ہیں' عیاشیاں ہوتی ہیں' مقدمہ بازیاں کی جاتی ہیں' رعب جتایا جاتا ہے اور انسانوں کو کچلا جاتا ہے۔ دل سے ہمدردی ہوتی ہے' زخم پر مرہم رکھا جاتا ہے اور آنسو نکلتے ہیں۔

اسی مکان سے ملی ہوئی ایک سبزی بیچنے والی کنجڑن کی دوکان تھی۔ بوڑھی' بیوہ' ضعیف' بے اولاد عورت تھی۔ ظاہر میں آگ' باطن میں پانی' جھابر مل کو خوب صلواتیں سنائیں اور سوشیلا کی ٹوٹی پھوٹی بکھری ہوئی کام کی چیزوں کو سمیٹ کر اپنے گھر میں لے گئی اور پیار سے بولی۔ "تم چل کر میرے گھر میں رہو بہو' ملاحظہ میں آگئی' نہیں نگوڑے کی مونچھیں اکھاڑ لیتی' موت سر پر ناچ رہی ہے۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگھا' اور مُوا پیسے کے لئے مرا جاتا ہے۔ جانے چھاتی پر لاد کر لے جائے گا۔ چار دن میں گنگا میں جائیں گے' انہیں بیاہ کی دُھن سوار ہے۔ پیسہ پا کر آدمی کی آنکھیں بھی اندھی ہو جاتی ہیں کیا۔ تم آرام سے میرے گھر میں رہو۔ میرے ہاں کسی بات کا کھٹکا نہیں۔ بس میں اکیلی ہوں' ایک ٹکڑا مجھے بھی دے دینا۔"

سوشیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ماتا جی! میرے پاس ان ٹوٹے پھوٹے سامانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہے' کرایہ کہاں سے دوں گی؟"

بڑھیا مادرانہ شفقت سے بولی۔ "میں جھابر مل نہیں ہوں بیٹی' نہ کبیر داس ہوں' میں دل رکھتی ہوں۔ اچھے برے دن سب کے آتے ہیں۔ سکھ میں اتراؤ مت' دکھ میں گھبراؤ نہیں۔ تمہیں اس دن بھی دیکھا تھا جب تم محل میں رہتی تھیں اور آج میں دیکھ رہی ہوں جب تم اناتھ ہو۔ جو مزاج تب تھا وہی اب ہے۔ میرے دَھن بھاگ کہ تم میرے گھر آؤ۔ میری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا کہ میں تم سے کرایہ مانگوں گی۔"

ان تشفی سے بھرے ہوئے الفاظ نے سوشیلا کے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ اس نے آج دیکھا کہ سچی انسانیت اور محبت غریبوں اور رذیلوں ہی میں رہتی ہے۔ بڑوں کا دل بھی بڑا ہوتا ہے تکبّر اور خود نمائی سے پُر۔

اس کنجڑن کے ساتھ رہتے ہوئے سوشیلا کو چھ مہینے ہو گئے تھے۔ اس کی مادرانہ الفت میں سوشیلا کو اپنا رنج و غم بہت کچھ بھول گیا تھا۔ وہ جو کچھ پاتی لا کر سوشیلا کے ہاتھ پر رکھ دیتی۔ دونوں بچے اس کی دو آنکھیں تھے۔ مجال نہ تھی کہ پڑوس کا کوئی آدمی انہیں ترچھی آنکھوں سے دیکھ بھی سکے' بڑھیا آسمان سر پر اٹھا لیتی۔

سنت لال ہر مہینے کچھ نہ کچھ لا کر دیا کرتا تھا' اس سے فراغت کے ساتھ گذر ہو جاتی تھی۔ سوشیلا گھر کی مالکن تھی۔

کاتک کا مہینہ تھا' فصلی بخار پھیلا ہوا تھا۔ موہن ایک دن ہنستا کھیلتا بیمار پڑ گیا اور تین دن تک بے ہوش پڑا رہا۔ بخار اتنی شدت کا تھا کہ پاس کھڑے ہونے سے لپٹ لگتی تھی۔ سوشیلا کو ٹائیفائیڈ کا اندیشہ تھا۔ اس کی جان سوکھی جاتی تھی۔ کیا کرے کس سے کہے۔

پانچویں دن اس نے ریوتی سے کہا۔ ''بیٹی تو نے پنچ جی کا گھر دیکھا ہے نا' جاکر ان سے میرا پرنام کہنا۔ بھیا کو پانچ دن سے زور کا بخار ہے' چھن بھر کو بھی نہیں اترتا' کوئی ڈاکٹر بھیج دیجئے۔''

ریوتی کو کہنے کی دیر تھی' دوڑی ہوئی سیٹھ کبیر داس کے پاس گئی۔ کبیر داس نے حال سنا۔ اپنے منیم سے بولے۔ ''ایسا حکم بھیجتی ہے جیسے میں اس کے باپ کا نوکر ہوں۔ کھانے کو تو ٹھکانہ نہیں' انہیں ڈاکٹر چاہیے چڑیل!''

ریوتی سے بولے۔ ''جاکر کہہ دے ڈاکٹر کی فیس سولہ روپے ہوگی' راضی ہو تو بھیج دوں۔''

ریوتی نے دل شکستہ ہو کر کہا۔ ''اماں کے پاس روپے کہاں ہیں سیٹھ جی!''

کبیر داس جھڑک کر بولے۔ ''تو پھر کس منہ سے ڈاکٹر بھیجنے کو کہتی ہے۔ تیرا ماموں کہاں ہے اس سے جا کر کہہ' سیوا سمتی سے کوئی ڈاکٹر بلانے جائے یا خیراتی ہسپتال میں کیوں نہیں لڑکے کو لے جاتی' یا ابھی وہی پرانی بُو سمائی ہوئی ہے۔ کتنی بے سمجھ عورت ہے گھر میں ٹکا نہیں ڈاکٹر کی فرمائش کر دی۔ سمجھتی ہوگی فیس پنچ جی دیں گے۔ پنچ جی کیوں فیس دیں گے' پنچایت کا مال دھرم کاج کے لئے ہے' یوں اڑانے کے لئے نہیں۔ شہر کے لاکھوں آدمی اسپتال میں اچھے ہو جاتے ہیں پھر یہ کہاں کی بڑی رانی ہیں۔ ابھی بھاگوت کی کتھا بیٹھنے والی ہے۔ کئی ہزار کا خرچ ہے' اس طرح ہر ایک کے لئے ڈاکٹر بھیجنے لگوں تو ثواب کا کوئی کام ہی نہ ہو۔''

ریوتی آنکھوں میں آنسو بھرے لوٹی۔ مگر جو کچھ سنا تھا وہ کہہ کر ماں کے زخم پر نمک نہ چھڑکنا چاہتی تھی۔ سیٹھ جی ملے نہیں کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

سوشیلا نے ڈانٹ کر کہا۔ ''منیم جی سے کیوں نہیں کہا' یہاں کوئی مٹھائی رکھی تھی جو دوڑی ہوئی آ گئی۔''

اسی وقت سنت لال ایک وید کو لے کر آ گئے۔

(6)

مگر وید جی ایک دن آ کر دوسرے دن نہ لوٹے۔ جب پوری فیس کی جگہ آدھی بھی نہ ملے اور نہ اس تعلق سے کسی موٹے مریض کے پھنسنے کی امید ہی ہو تو پھر وہ کس تحریک سے روز آئیں۔ سیوا سمتی کے ڈاکٹر صاحب بھی دو دن بڑی منتوں سے آئے' پھر انہیں بھی فرصت نہ رہی۔ جھابر مل کو بخار آنے لگا تھا اور جھابر مل برادری کے ذی اثر آدمی تھے' ان کے معالجے میں ہر طرح کا فائدہ تھا۔

ادھر موہن کی حالت روز بروز خراب ہوتی جاتی تھی۔ ایک مہینہ یوں ہی گذر گیا مگر بخار نے اترنے کا نام نہ لیا۔ پیرِ تسمہ پا کی طرح گردن پر سوار ہو گیا تھا کہ ہلتا تک نہ تھا۔ موہن کا چہرہ اتنا زرد اور افسردہ ہو گیا تھا گویا خون کا ایک قطرہ بھی جسم میں نہ ہو۔ اسے دیکھ کر رحم آتا تھا۔ لمبا سا چہرہ نکل آیا تھا جس پر طفلانہ بے کسی روتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ نہ کچھ بولتا نہ کہتا' یہاں تک کہ کچھ سنتا بھی نہ تھا۔ پڑا پڑا بے نور آنکھوں سے چھت کی طرف تاکتا رہتا۔ بڑے بڑے جلد میں خراش ہو گئی تھی۔ سر کے بال گر گئے تھے۔ ہاتھ پاؤں لکڑی جیسے' چارپائی پر ایسا سمٹا ہوا تھا گویا ہے

ہی نہیں۔ تصویر مٹ گئی تھی۔ صرف اس کا عکس باقی تھا۔ ماں دن رات اس کی تیمارداری میں لگی رہتی' بڑھیا بھی دعائیں دیا کرتی۔ مگر تیمارداری اور دعا سے دوا کا کام تو نہیں ہو سکتا۔

ایک دن شام کے وقت موہن کے ہاتھ پاؤں سرد ہو گئے۔ سوشیلا تو پہلے ہی سے تقدیر ٹھونک رہی تھی۔ یہ حالت دیکھی تو چھاتی پیٹنے لگی۔ اسے بے بسی میں کچھ اور نہ سوجھا' کھڑی ہو گی اور موہن کی کھاٹ کے گرد سات بار گھوم کر دست بدعا ہو کر بولی۔ "بھگوان! یہی میری اس جنم بھر کی کمائی ہے۔ اپنا سب کچھ کھو کر بھی اپنے لال کو چھاتی سے لگائے ہوئے اپنی قسمت پر شاکر تھی۔ یہ چوٹ سہی نہ جائے گی۔ تم اسے اچھا کر دو' اس کے بدلے مجھے اٹھا لو۔ بس میں تمہاری اتنی ہی دیا چاہتی ہوں۔"

غیب کے کرشمے کون سمجھ سکتا ہے' کیا ہم میں سے بہتیروں کو اس کا تلخ تجربہ نہیں کہ جس دن ہم نے بے ایمانی سے رقم اڑائی۔ اسی دن سے ہمیں اس رقم کا دوگنا نقصان اٹھانا پڑا۔ اسے اتفاق کہو یا دعا کا اثر اسی رات موہن کا بخار اتر گیا اور سوشیلا کو بخار آ گیا۔ بچے کی تیمارداری میں آدھی تو یوں ہی ہو رہی تھی' بخار نے ایک ہی جھٹکے میں بسترِ مرگ پر سلا دیا۔ معلوم نہیں دیوتا بیٹھے سن رہے تھے یا کیا۔ اس کی دعا حرف بحرف پوری ہوئی۔ تیسرے دن موہن چارپائی سے اٹھا اور ماں کے پاس آ کر اس کی چھاتی پر سر رکھ کر رونے لگا۔ طویل بیماری کے بعد ہم میں جو ایک روشن ضمیری آ جاتی ہے۔ اس سے اسے آنے والے سانحہ کا الہام سا ہو گیا تھا۔ ماں نے اسے چھاتی سے لگا لیا۔ اور بولی۔ "کیوں روتے ہو بیٹا' میں اچھی ہو جاؤں گی۔ جب تم کو بھگوان نے اچھا کر دیا تو میری کیا فکر' وہی بھگوان تمہارے ماتا پتا ہیں' وہی تمہاری پرورش کریں گے۔ اب مجھے کوئی فکر نہیں' بہت جلد اچھی ہو جاؤں گی۔"

موہن سسکیاں بھر کر بولا۔ "جیا تو کہتی ہے اماں اچھی نہ ہوں گی۔"

سوشیلا نے بچہ کا بوسہ لے کر کہا۔ "جیا پگلی ہے' اسے بکنے دو' میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گی' تمہارے ساتھ رہوں گی' یا جس دن تم کسی کو ستاؤ گے' کسی کا دل دکھاؤ گے' اپنی نیت خراب کرو گے' کسی کی کوئی چیز چرا لو گے' اسی دن میں مر جاؤں گی۔"

موہن خوش ہو کر بولا۔ "میں کبھی کسی کی چیز نہ چراؤں گا۔ اماں کبھی کسی کو گالی نہ دوں گا۔ تم میرے ساتھ ہمیشہ رہو گی نا؟" "ہاں بیٹا ہمیشہ۔"

اسی رات کو مصیبت کی ستائی ہوئی وہ غم نصیب بیوہ دونوں یتیم بچوں کو خدا کے سائے میں چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

(7)

اس سانحہ کو تین سال ہو گئے۔ موہن اور ریوتی ابھی تک اس پاک نفس کنجڑن کے پاس رہتے ہیں۔ بڑھیا ماں تو نہیں ہے مگر ماں سے بڑھ کر ہے۔ روز علی الصبح موہن کو باسی روٹیاں مکھن کے ساتھ کھلا کر گروجی کی پاٹھ شالا میں پہنچا آتی ہے۔ چھٹی کے وقت خود جا کر لے آتی ہے۔ ریوتی کا چودھواں سال ہے۔ وہ گھر کا سارا کام پیسنا' کوٹنا' چوکا' برتن' جھاڑو بہارو کرتی ہے اور اس کا من ذرا بھی میلا نہیں ہوتا۔ جب بڑھیا سودا لے کر بازار چلی جاتی ہے تو وہ دکان پر آ کر بیٹھتی ہے۔

ایک دن بڑے پنچ سیٹھ کبیر داس نے اسے بلوا بھیجا اور بولے۔ "کیوں ری تو اتنی سیانی ہو گئی، تجھے کنجڑن کی دکان پر بیٹھتے شرم نہیں آتی۔ ساری برادری کی ناک کٹوا رہی ہے۔ خبردار جو کل سے دکان پر بیٹھی۔ میں نے تیری شادی کے لیے سیٹھ جھابر مل جی کو پکا کر لیا ہے، رانی بن جائے گی رانی!"

سیٹھانی نے تائید کی۔ "تو اب سیانی ہوئی بیٹی، تیرا اب اس طرح دکان پر بیٹھنا اچھا نہیں۔ لوگ طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ تہمت لگنے میں کتنی دیر لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے جھابر مل جی کو راضی کیا ہے۔ کہتے تھے، ایسی بلّی چھوکری سے شادی کر کے کون بدنامی مول لے۔ مگر ہم نے بہت سمجھا بجھا کر انہیں سیدھا کیا ہے۔ بس یہ سمجھ لے کہ بھاگ جاگ جائیں گے تیرے۔ لاکھوں کی جائیداد ہے، لاکھوں کی۔ تیرے دھن بھاگ کہ ایسا بر ملا، تیرا چھوٹا بھائی ہے، اسے بھی پڑھا لکھا کر کوئی دکان کرا دی جائے گی۔"

سیٹھ جی نے پیشانی کو اوپر چڑھا کر کہا۔ "برادری کی کتنی ہنسی ہو رہی ہے۔" سیٹھانی نے تصدیق کی "ہے ہی۔"

ریوتی نے لجا کر کہا۔ "میں کیا جانوں، یہ سب آپ ماما سے کہیں۔"

کبیر داس بگڑ کر بولے۔ "ماما کون ہوتا ہے، ٹکے کا آدمی، اس سے کیا پوچھوں۔ میں برادری کا پنچ ہوں، مجھے اختیار ہے کہ جس کام میں برادری کی بہتری دیکھوں وہ کروں۔ میں نے اور پنچوں سے رائے لے لی ہے۔ سب راضی ہیں۔ اگر یوں نہ مانے گی تو ہم عدالتی کاروائی کریں گے۔ پاگل نہ بن، ہمارا کہنا مان، تیرے ہی بھلے کو کہتے ہیں۔ خرچ برچ کے لئے کچھ درکار ہو تو یہ لیتی جا۔"

یہ کہہ کر انہوں نے پچاس روپے کا ایک نوٹ صندوق سے نکال کر ریوتی کی طرف پھینک دیا۔ ریوتی نے نوٹ اٹھا کر وہیں پرزے کر ڈالا اور تمتماتے ہوئے منہ سے بولی۔ "برادری نے اس وقت ہماری بات پوچھی جب ہم روٹیوں کو محتاج تھے۔ میری بدنصیب ماں مر گئی، برادری کا کوئی آدمی جھانکنے تک نہ گیا۔ میرا بھائی بیمار ہوا کسی نے خبر تک نہ لی۔ ایسی برادری کی مجھے پروا نہیں۔"

ریوتی چلی گئی تو جھابر مل پاس کی کوٹھڑی سے نکل آئے، جہاں وہ پہلے ہی سے چھپے بیٹھے تھے۔ چہرے پر جھاڑو پھری ہوئی تھی۔

مسز کبیر داس بولیں۔ "لڑکی کتنی گھمنڈن ہے آنکھ کا پانی مر گیا۔"

جھابر مل نے نوٹ کے پرزوں کو چنتے ہوئے رونا منہ بنا کر کہا۔ "پچاس روپوں پر پانی پھر گیا۔ سسری نے ایسا پھاڑا ہے کہ جوڑ بھی نہیں سکتے۔"

کبیر داس نے ان کے آنسو پونچھے۔ "تم گھبراؤ نہیں جھابر مل جی! اسے عدالت سے ٹھیک کروں گا۔ جاتی کہاں ہے۔"

جھابر مل نے دانت نکال کر کہا۔ "اب تو آپ ہی کا بھروسہ ہے۔"

برادری کے بڑے پنچ نے یہ الفاظ محض عتاب میں نہ کہے تھے، انہوں نے جلدی ہی عملی کاروائی شروع کر دی، اور قانون نے ان کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ ریوتی نابالغ تھی اور یتیم، ایسی حالت میں پنچوں کو اس کی نگرانی اور حفاظت کا استحقاق تھا۔ وہ برادری کی لونڈی بن کر نہیں رہنا چاہتی، نہ چاہے، اس کی سنتا کون ہے۔ قانون برادری کے حقوق کو کیونکر پامال کر سکتا ہے۔

سنت لال نے یہ ماجرا سنا تو غصہ و غضب کے عالم میں دانت پیس کر بولے۔ "یہ برادری نہ جانے کب

جہنم میں جائے گی۔"

ریوتی نے تیوریاں چڑھا کر کہا۔ "تو کیا برادری مجھے جبراً اپنی حمایت میں لے سکتی ہے۔"

"ہاں بیٹی، جس کے ہاتھ میں روپے ہیں، اسی کے ہاتھ میں قانون بھی ہے۔"

"میں صاف کہہ دوں گی، میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

"تیرے کہنے سے کچھ نہ ہوگا، تیری تقدیر میں یہی لکھا ہے تو اس کا کیا علاج۔ ایسی برادری میں پیدا ہونے کی یہی سزا ہے۔" ایک لمحہ کے بعد وہ کھڑا ہو کر بولا۔ "میں جاتا ہوں سیٹھ کبیر داس کے پاس۔"

"نہیں ماما جی! تم کہیں نہ جاؤ۔ جب بھاگ کا ہی بھروسہ ہے تو جو کچھ بھاگ میں ہے ہوگا۔"

رات تو ریوتی نے کروٹیں بدل کر اور رو کر کاٹی۔ بار بار نیند کی آغوش میں سوئے ہوئے پیارے بھائی کو گلے لگاتی اور روتی۔ یہ اناتھ اکیلے کیسے رہے گا۔ یہ سوچ کر اس کا دل کمزور ہو جاتا مگر جھابر مل کی وہ منحوس صورت یاد کر کے اس کا عزم پھر قوی ہو جاتا۔

علی الصبح ریوتی گوکل اشنان کرنے گئی۔ ادھر کئی مہینوں سے اس کا روز کا یہ معمول تھا۔ آج ذرا اندھیرا تھا، پر یہ کوئی کھٹکے والی بات نہ تھی۔ شبہ تو جب ہوا، جب آٹھ بج گئے اور وہ لوٹ کر نہ آئی۔ تیسرے پہر ساری برادری میں خبر پھیل گئی، سیٹھ رام ناتھ کی کنیا گنگا میں ڈوب گئی۔ اس کی لاش معائنہ کے لئے پولیس اٹھا لے گئی۔

کبیر داس بولے۔ "چلو جھگڑا پاک ہوا، برادری کی بدنامی تو نہ ہو گی۔"

جھابر مل نے مایوسانہ انداز میں کہا۔ "میں تو لُٹ گیا سیٹھ جی۔ میرے لئے اب اور کوئی راستہ نکالئے۔"

ادھر موہن سر پیٹ پیٹ کر رو رہا تھا، اور بڑھیا اسے سمجھا رہی تھی۔ "بیٹا اس دیوی کے لیے کیوں روتے ہو۔ زندگی میں اس کے لئے کونسا سکھ تھا، اب وہ اپنی ماں کی گود میں آرام کر رہی ہے۔ ان پنچوں کا ستیاناس ہو جائے میری لاڈلی کی جان ہی لے کر چھوڑی۔"

موہن معصومانہ سادگی سے بولا۔ "یہ لوگ جیا کو کیوں اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے ماں! میری خبر کیوں نہیں لیتے، میری پڑھائی کا کیوں انتظام نہیں کرتے۔"

بڑھیا نے اسے گلے لگا لیا اور پیار سے بولی۔ "تم میری آنکھوں کے تارے ہو بیٹا!"

حقیقت

(1)

وہ راز امرت کے دل میں سربستہ ہی رہا۔ پورنما کو اس کی نظروں سے، باتوں سے یا قیافے سے کبھی یہ وہم بھی نہ ہوا کہ امرت کو اس سے معمولی آداب ہمسائیگی اور بچپن کی دوستی کے سوا اور کوئی تعلق بھی ہے یا ہو سکتا ہے۔ بیشک جب وہ گھڑا لے کر کنویں پر پانی کھینچنے جاتی تو امرت خدا جانے کہاں سے آ جاتا اور گھڑا اس کے ہاتھ سے بزور

لے کر پانی کھینچ دیتا۔ جب وہ اپنی گائے کو سانی دینے لگتی تو وہ اس کے ہاتھ سے بھوسے کی ٹوکری لے لیتا اور گائے کی ناند میں سانی ڈال دیتا۔ بنیئے کی دوکان پر کوئی چیز لینے جاتی تو امرت اکثر مل جاتا اور اس کا کام کر دیتا۔

پورنما کے گھر میں کوئی دوسرا لڑکا یا آدمی نہ تھا۔ اس کے باپ کا کئی سال پہلے انتقال ہو چکا تھا اور ماں پردے میں رہتی تھی۔ امرت پڑھنے جانے لگتا تو پورنما کے گھر جا کر پوچھ لیا کرتا' بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں ہے' اس کے گھر میں کھیتی باڑی ہوتی تھی گائیں بھینسیں تھیں' باغ باغیچے' تھے۔ گھر والوں کی نظر بچا کر وہ فصل کی چیزیں سوغات کے طور پر پورنما گھر دے آتا۔ مگر پورنما ان خاطر داریوں کو اس کی شرافت اور سیر چشمی کے سوا اور کیا سمجھے اور کیوں سمجھے۔ ایک گاؤں میں رہنے والے خونی تعلق نہ رکھتے ہوں مگر گاؤں کے رشتے سے بہن بھائی تو ہوتے ہی ہیں۔ ان خاطر داریوں میں کوئی خاص بات نہ تھی۔

ایک دن پورنما نے اس سے کہا۔ ''تم دن بھر مدرسہ رہتے ہو' میرا جی گھبراتا ہے۔''

امرت نے سادگی سے کہا۔ ''کیا کروں' امتحان قریب ہے۔''

''میں سوچا کرتی ہوں جب میں چلی جاؤں گی تو تمہیں کیسے دیکھوں گی' اور تم میرے گھر کیوں آؤ گے!''

امرت نے گھبرا کر پوچھا۔ ''کہاں چلی جاؤ گی تم؟''

پورنما لجا گئی۔ پھر بولی۔ ''جہاں تمہاری بہنیں چلی گئیں' جہاں سب لڑکیاں چلی جاتی ہیں۔''

امرت نے حسرت کے ساتھ کہا۔ ''اچھا وہ بات'' اور خاموش ہو گیا۔ اس وقت تک یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ پورنما کہیں چلی جائے گی۔ اتنی دور تک سوچنے کی اسے مہلت ہی نہ تھی۔ مسرت تو حال میں مست رہتی ہے۔ آئندہ کی سوچنے لگے تو مسرت ہی کیوں رہے۔''

اور یہ سانحہ اس سے جلد رونما ہو گیا جس کا امرت کو گمان ہو سکتا تھا۔ پورنما کے لئے ایک پیغام آ گیا۔ متمول خاندان تھا اور ذی عزت۔ پورنما کی ماں نے اسے بڑی خوشی سے منظور کر لیا۔ عسرت کی حالت میں اس کی نظروں میں دنیا کی جو چیز سب سے زیادہ عزیز تھی وہ دولت تھی اور یہاں پورنما کے لیے فارغ البال زندگی کے سارے سامان موجود تھے۔ اسے جیسے منہ مانگی مراد مل گئی۔ فکروں سے گھلی جاتی تھی۔ لڑکی کی شادی کا خیال آتے ہی اختلاجِ قلب ہونے لگتا تھا۔ گویا غیب نے ابرو کی ایک جنبش سے اس کی ساری فکروں اور پریشانیوں کا خاتمہ کر دیا۔

امرت نے سنا تو دیوانہ ہو گیا۔ بے تحاشا پورنما کے گھر کی طرف دوڑا۔ مگر پھر لوٹ آیا۔ ہوش نے پاؤں روک دیئے۔ کیا فائدہ' اس کی کیا خطا؟ کسی کی بھی کیا خطا؟ اپنے گھر آیا اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہا۔ پورنما چلی جائے گی پھر وہ کیسے رہے گا۔ ہیجان سا ہونے لگا تھا۔ وہ زندہ ہی کیوں رہے۔ زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔ مگر یہ ہیجان بھی فرو ہو گیا۔ اور اس کی جگہ اس سکون نے لے لی جو طوفان کے بعد آتا ہے۔ وہ بے نیاز ہو گیا۔ جب پورنما جاتی ہے تو وہ اب اس سے کیوں تعلق رکھے؟ کیوں ملے جلے' اور اب پورنما کو اس کی پرواہی کیوں ہونے لگی اور پروا تھی ہی کب۔ وہ خود ہی کتوں کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا رہتا تھا۔ پورنما نے تو کبھی بات بھی نہیں پوچھی' اور اب اسے کیوں نہ غرور ہو۔ ایک لکھ پتی کی بیوی بننے جا رہی ہے۔ شوق سے بنے' امرت بھی زندہ رہے گا مرے گا نہیں۔ یہی اس زمانے کی رسم وفا ہے۔

مگر یہ ساری شورش دل کے اندر تھی۔ بے عمل' اس میں اتنی ہمت کہاں کہ جا کر پورنما کی ماں سے کہہ دے۔ ''پورنما میری ہے اور میرے رہے گی۔ غضب ہو جائے گا گاؤں میں کہرام مچ جائے گا۔ ایسا واقعہ گاؤں کی

روایتوں نے کبھی سنا ہے اور نہ نواحات نے کبھی دیکھا ہے۔"

اور پورنما کا یہ حال تھا کہ دن بھر اس کی راہ دیکھا کرتی۔ وہ کیوں اس کے دروازے سے ہو کر نکل جاتا ہے اور اندر نہیں آتا۔ کبھی راستہ میں ملاقات ہو جاتی تو جیسے اس کے سائے سے بھاگتا ہے۔ وہ کلسا لے کر کنویں پر کھڑی رہتی کہ وہ آتا ہوگا' مگر وہ نظر نہیں آتا۔

ایک دن وہ اس کے گھر گئی اور اس کے پاس جاکر جواب طلب کیا۔ "تم آج کل آتے کیوں نہیں۔" اور اس کا گلا بھر آیا' اسے یاد ہو آیا کہ اب وہ اس گاؤں میں چند دنوں کی مہمان ہے۔

مگر امرت بے حس بیٹھا رہا' بے اعتنائی سے صرف اتنا بولا۔ "امتحان قریب ہے' فرصت نہیں ملتی۔ سوچتا ہوں جب تم جا رہی ہو ــــ "

وہ کہنا چاہتا تھا "تو اب محبت کیوں بڑھاؤں۔" مگر خیال آگیا' کتنی احمقانہ گفتگو ہے۔ کوئی مریض مرنے جا رہا ہو تو کیا اس خیال سے اس کا معالجہ چھوڑ دیا جاتا ہے؟ اس کے برعکس جوں جوں اس کی حالت دگرگوں ہوتی ہے لوگ اور بھی زیادہ انہماک کے ساتھ دوا دوش کرتے ہیں اور نزع کی حالت میں تو جدوجہد کی انتہا ہی نہیں رہتی۔ گفتگو کا پہلو بدل کر بولا۔ "سنا ہے وہ لوگ بھی بڑے مالدار ہیں!"

پورنما نے یہ آخری الفاظ شاید سنے ہی نہیں' یا ان کا جواب دینے کی ضرورت نہ سمجھی۔ اس کے کانوں میں تو جواب کا پہلا حصہ ہی گونج رہا تھا۔

دردناک لہجہ میں بولی۔ "اس میں میری کیا خطا۔ میں اپنی خوشی سے تو نہیں جا رہی ہوں' جانا پڑتا ہے اس لئے جا رہی ہوں۔"

یہ کہتے کہتے شرم سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ جتنا اسے کہنا چاہیے تھا شاید اس سے زیادہ کہہ گئی۔ محبت میں بھی شطرنج کی سی چالیں ہوتی ہیں۔

امرت نے اس کی طرف دیکھا' گویا تحقیق کرنا چاہتا ہے۔ ان لفظوں میں کچھ معنی بھی ہیں یا نہیں۔ کاش ان آنکھوں میں آرپار دیکھنے کی طاقت ہوتی۔ اس طرح تو سبھی لڑکیاں مایوسانہ گفتگو کرتی ہیں۔ گویا شادی ہوتے ہی ان کی جان پر بن جائے گی۔ مگر سبھی ایک دن اچھے اچھے گہنے پہن کر اور پالکی میں بیٹھ کر چلی جاتی ہیں۔ ان الفاظ سے اس کو کچھ تشفی نہ ہوئی۔

پھر ڈرتے ڈرتے بولا۔ "تب تمہیں میری یاد کیوں آئے گی!"

اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا۔ ایسی وحشت خیز ندامت ہوئی کہ کمرہ سے باہر بھاگ جائے۔ پورنما کی طرف تاکنے کی بھی جرأت نہ ہوئی' کہیں وہ یہ سمجھ نہ گئی ہو۔

پورنما نے سر جھکا کر' جیسے اپنے دل سے کہا۔ "تم مجھے اتنی نرموہنی سمجھتے ہو۔ تم جو مجھ سے بے قصور روٹھتے ہو' تمہیں اس وقت مجھ سے ہمدردی کرنی چاہیے۔ مجھے تشفی دینی چاہیے اور تم مجھ سے تنے بیٹھے ہو۔ تمہی بتاؤ میرے لئے دوسرا کون سا راستہ ہے۔ آپ مجھے غیروں کے گھر بھیجے دے رہے ہیں۔ وہاں مجھ پر کیا گذرے گی' میری کیا حالت ہوگی۔ یہ غم میری جان لینے کے لیے کافی نہیں ہے کہ تم اس میں اپنا غصہ بھی حل کر دو۔"

اس کا گلا پھر بھر آیا' آج امرت کو اس ملامت میں پورنما کے سوزِ نہاں کا یقین ہوا اور اپنی کم ظرفی اور نفس پروری گویا کالکھ بن کر اس کے چہرہ پر چمکنے لگی۔

پورنما کے ان الفاظ میں پوری صداقت تھی اور کتنی سرزنش اور کتنا اپناپن' غیروں سے کوئی کیوں شکوہ کرے۔ بیشک اس حالت میں اسے پورنما کی دلجوئی کرنی چاہیے تھی۔ یہ اس کا فرض تھااور اسے یہ فرض خندہ پیشانی سے پورا کرنا چاہیے تھا۔ پورنما نے محبت کا ایک نیا معیار اس کے سامنے رکھ دیااور اس کا ضمیر اس معیار سے انحراف نہ کر سکتا تھا۔ بیشک محبت ایک بے نفس قربانی ہے' طویل اور جگر دوز۔

اس نے پشیمان ہو کر کہا۔ "مجھے معاف کر دو پورنما! میری غلطی تھی' بلکہ حماقت۔"

(2)

پورنما کی شادی ہو گئی۔ امرت جان و دل سے اس کے اہتمام میں مصروف رہا۔ دولہا ادھیڑ تھا۔ توندل' کم رو اور اس کے ساتھ ہی بڑا مغرور اور بد مزاج' لیکن امرت اس انہماک سے اس کی خاطر داری کر رہا تھا گویا وہ کوئی دیوتا ہے اور اس کا ایک تبسم اسے جنت میں پہنچا دے گا۔ پورنما سے بات چیت کرنے کا اسے کوئی موقع نہ ملا اور نہ ہی اس نے موقع پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ پورنما کو جب دیکھتا روتے ہی دیکھتا اور آنکھوں کی زبانِ خاموش سے جتنی دلجوئی اور ہمدردی اور تشفی ممکن تھی وہ کرتا رہتا تھا۔

تیسرے دن پورنما رو دھو کر رخصت ہو گئی۔ امرت نے اس دن شیو مندر میں جا کر سچی عبودیت سے بھرے ہوئے دل سے دعا کی کہ پورنما ہمیشہ سکھی رہے۔ غم کی تازگی میں فاسد خیالات کا کہاں گذر' غم تو روحانی امراض کا ازالہ ہے' مگر دل کے اندر سے ایک ہمہ گیر سونے پن اور خلا کا احساس ہو رہا تھا۔ گویا اب زندگی ویران ہے اس کا کوئی مقصد اور مدعا نہیں۔

تین سال کے بعد پورنما پھر میکے آئی۔ اس دوران میں امرت کی بھی شادی ہو چکی تھی اور وہ زندگی کا جُوا گردن پر رکھے لکیر پیٹتا چلا جا رہا تھا۔ مگر ایک موہوم سی تمنا جس کی کوئی واضح صورت وہ نہ بنا سکتا تھا' تھرمامیٹر کے پارے کی طرح اس کے اندر محفوظ تھی۔ پورنما نے آکر اس میں حرارت ڈال دی اور پارہ چڑھ کر سرسام کی حد تک جا پہنچا۔ اس کی گود میں ایک دو سال کا پیارا سا بچہ تھا۔ امرت اس بچے کو سارا دن گلے باندھے رہتا۔ صبح و شام اسے گود میں لے کر ٹہلانے لے جاتا اور اس کے لیے بازار سے طرح طرح کے کھلونے اور مٹھائیاں لاتا' صبح ہوتے ہی اس کے ناشتے کے لئے حلوہ اور دودھ لے کر پہنچ جاتا' اسے نہلاتا' دھلاتا' اس کے بال صاف کرتا۔ اس کے پھوڑے پھنسیوں کو دھوتا' مرہم رکھتا۔ یہ ساری خدمت اس نے اپنے ذمہ لے لی۔ بچہ بھی اس سے اتنا ہل گیا کہ ایک لمحہ کے لیے اس کا گلا نہ چھوڑتا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی اس کے ساتھ ہو جاتا' اور پورنما کے آ کے بلانے پر بھی اس کے ساتھ نہ جاتا۔

امرت پوچھتا۔ "تم کس کے بیٹے ہو۔"

بچہ کہتا۔ "ٹماں لے"

اور امرت متوالا ہو کر اُسے جگر سے چمٹا لیتا۔

پورنما کا حسن اور بھی نکھر آیا تھا۔ کلی کھل کر پھول ہو گئی تھی۔ اب اس کے مزاج میں خودداری اور تمکنت تھی اور سنگار سے عشق' طلائی زیوروں سے سج کر اور ریشمی ساڑھی پہن کر اب وہ پہلے سے کہیں زیادہ جاذبِ

نظر ہو گئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا' امرت سے احتراز کرنا چاہتی ہے۔ بلا کسی خاص ضرورت کے اس سے بہت کم بولتی اور وہ اس انداز سے گویا اس پر کوئی احسان کر رہی ہو۔ امرت اس کے بچہ پر کس قدر جان دیتا ہے اور اس کی فرمائشوں کی کتنی تندہی سے تعمیل کرتا ہے بظاہر اس کی نگاہوں میں ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی۔ گویا یہ امرت کا فرض ہے اور اسے ادا کرنا چاہیے۔ اس کے لئے وہ کسی شکریے اور احسان کا حقدار نہیں۔

بچہ روتا ہے تو وہ دھمکاتی ہے' خبردار رونا نہیں' ورنہ ماموں تم سے کبھی نہ بولیں گے اور بچہ خاموش ہو جاتا۔

اسے جب کسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ امرت کو بلا کر تحکمانہ انداز میں کہہ دیتی ہے اور امرت فوراً تعمیل کرتا ہے' گویا اس کا غلام ہو۔ وہ بھی شاید سمجھتی ہے کہ اس نے امرت سے غلامی لکھالی ہے۔

چھ مہینے میکے رہ کر پورنما سسرال چلی گئی۔ امرت اسے پہنچانے اسٹیشن تک آیا۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھ گئی تب امرت نے بچہ کو اس کی گود میں دے دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو کی بوند ٹپک پڑی۔ اس نے منہ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ پھیر کر آنسو پونچھ ڈالا۔ پورنما کو اپنے آنسو کیسے دکھائے کیونکہ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر دل نہ مانتا تھا' نہ جانے پھر کب ملاقات ہو۔

پورنما نے تمکنت کے ساتھ کہا۔ "بچہ کئی دن تک تمہارے لیے بہت ہڑکے گا۔"

امرت نے بھرے گلے سے کہا۔ "مجھے تو عمر بھر بھی اس کی صورت نہ بھولے گی۔"

"کبھی کبھی ایک آدھ خط تو بھیج دیا کرو۔"

"بھیجوں گا۔"

"مگر میں جواب نہ دوں گی' یہ سمجھ لو۔"

"مت دینا میں مانگتا تو نہیں۔ مگر یاد رکھنا۔"

گاڑی روانہ ہو گئی اور امرت اس کی کھڑکی کی طرف تاکتا رہا۔ ایک فرلانگ کے بعد اس نے دیکھا کہ پورنما نے کھڑکی سے سر نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ پھر بچہ کو گود میں لے کر کھڑکی سے ذرا دکھایا۔

امرت کا دل اس وقت اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ اتنا خوش ہے جیسے اپنی منزلِ مقصود پہ پہنچ گیا ہو۔

اسی سال پورنما کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ پورنما اس وقت زچہ خانے میں تھی' ماں کا آخری دیدار نہ کر سکی۔ امرت نے علاج معالجہ دوا دوش جتنی ہو سکی کی' کریا کرم کیا۔ براہمنوں کو کھلایا۔ برادری کی دعوت کی جیسے اس کی اپنی ماں مر گئی ہو۔ اس کے ماں باپ انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنے گھر کا مالک تھا۔ کوئی اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔

پورنما اب کس ناتے سے میکے آتی اور اسے اب فرصت بھی کہاں تھی۔ اپنے گھر کی مالکن تھی' کس پر گھر چھوڑ آتی۔ اس کے دو بچے اور بھی ہوئے۔ بڑا لڑکا بڑا ہوا اور اسکول میں پڑھنے لگا۔ چھوٹا دیہات کے مدرسہ میں پڑھتا تھا۔ امرت سال میں ایک بار نائی کو بھیج کر خیر سلا منگا لیا کرتا تھا۔ پورنما فارغ البال ہے' خوش ہے۔ اس کی تشفی کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ امرت کے لڑکے بھی اب سیانے ہو گئے تھے۔ خانہ داری کی فکروں میں پریشان رہتا تھا اور عمر بھی چالیس سال سے آگے نکل گئی تھی۔ مگر پورنما کی یاد ابھی تک اس کے جگر کے عمیق ترین حصہ میں محفوظ تھی۔

دفعتاً ایک دن امرت نے سنا کہ پورنما کے شوہر نے دنیائے عدم کی راہ لی۔ مگر تعجب یہ تھا اسے رنج نہ ہوا' وہ خواہ مخواہ اپنے دل میں یہ طے کر بیٹھا تھا کہ اس خبیث شوہر کے ساتھ پورنما کی زندگی قابلِ رشک نہیں ہو سکتی۔ فرض کی مجبوری اور عصمت پروری کے لحاظ سے پورنما نے کبھی اپنے سوزِ جگر کا اظہار نہ کیا۔ مگر یہ غیر ممکن ہے کہ

آرام اور فارغ البالی کے باوجود اسے اس مکروہ صورت انسان سے کوئی خاص محبت رہی ہو۔ یہ تو ہندوستان ہی ہے جہاں ایسی اپسرائیں ایسے نااہلوں کے گلے باندھ دی جاتی ہیں ورنہ کوئی دوسرے ملک میں تو پورنما جیسی عورت پر ملک کے نوجوان نثار ہو جاتے۔ اس کی مری ہوئی تمنائیں پھر زندہ ہو گئیں۔ اب اس میں وہ پہلی سی جھجک نہیں ہے۔ اس کی زبان پر نہ وہ مہرِ خموشی ہے اور پورنما بھی اب آزاد ہے۔ تقاضائے سن نے یقیناً اسے زیادہ مہر پرور بنا دیا ہو گا۔ وہ شوخی اور الھڑپن اور بے نیازی تو کب کی رخصت ہو چکی ہو گی۔ اس دوشیزگی کی جگہ اب آزمودہ کار نسائیت ہو گی جو محبت کی قدر کرتی ہے اور اس کی طلب گار ہوتی ہے۔ وہ پورنما کے گھر ماتم پرسی کرنے جائے گا اور اسے اپنے ساتھ لائے گا اور اس کے امکان میں اس کی جو کچھ خدمت ہو سکے گی وہ کرے گا۔ اب اسے پورنما کے محض قرب سے تشفی ہو جائے گی۔ وہ محض اس کے منہ سے یہ سن کر روحانی تشفی پائے گا کہ وہ اب بھی اسے یاد کرتی ہے۔ اب بھی اس سے وہی بچپن کی سی محبت کرتی ہے۔

بیس سال پہلے اس نے پورنما کی جو صورت دیکھی تھی وہ بھرا ہوا جسم' وہ رخساروں کی سرخی' وہ ملاحت' وہ اس کی نشہ خیز مسکراہٹ۔ وہی صورت بہت خفیف تغیر کے ساتھ ابھی تک اس کی آنکھوں میں تھی اور تغیر تخیل کی آنکھوں میں اب اسے اور بھی خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔ ضرور زمانہ کی بیدادیوں کا اس کے اوپر کچھ نہ کچھ اثر ہوا ہو گا۔ لیکن پورنما کے جسم میں کسی ایسی تبدیلی کا گمان بھی نہ کر سکتا تھا جس سے اس کی دلفریبی میں فرق آ جائے۔ اب وہ ظاہر کا اتنا گرویدہ بھی نہ تھا' جتنا اس کے سخن ہائے شیریں کا' اس کی نگاہ محبت کا' اس کے اعتماد کا' وہ مردانہ خود پروری کے زعم میں شاید یہ بھی سمجھتا تھا کہ وہ پورنما کے ناآسودہ ذوقِ محبت کو اپنی ناز برداریوں اور گرم جوشیوں سے محظوظ کر دے گا' اور پچھلی فروگذاشتوں کی تلافی کر دے گا۔

حسن اتفاق سے ایک دن پورنما خود اپنے چھوٹے لڑکے کے ساتھ اپنے گھر آ گئی۔ اس کی ایک بیوہ موسی جو اس کی ماں کے ساتھ ہی اپنی بیوگی کے دن کاٹ رہی تھی' ابھی موجود تھی۔ وہ سونا گھر آباد ہو گیا۔

امرت نے اس کی خبر سنی تو اشتیاق سے مخمور ہو کر دوڑا۔ بچپن اور شباب کی شیریں اور پُر مسرت اور پُر شوق یادگاروں کو دل کے دامن میں سنبھالتا ہوا جیسے کوئی بچہ اپنے ہمجولی کو دیکھ کر اپنے ٹوٹے پھوٹے کھلونے لے کر دوڑے۔

مگر اس کی صورت دیکھتے ہی اس کا اشتیاق اور ولولہ جیسے بجھ گیا۔ سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پورنما اس کے سامنے آ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ سفید ساڑھی کے گھونگھٹ سے آدھا منہ چھپا ہوا تھا' مگر کمر جھک گئی تھی' بانہیں سُوت سی پتلی' پشتِ پا کی رگیں ابھری ہوئی' آنکھوں سے آنسو جاری' اور رخسارے زرد' جیسے کفن میں لپٹی ہوئی لاش کھڑی ہو۔

پورنما کی موسی نے آ کر کہا۔ "بیٹھو بیٹا' دیکھتے ہو اس کی حالت' سوکھ کر کانٹا ہو گئی ہے۔ ایک چھن کو بھی آنسو نہیں تھمتے۔ صرف ایک وقت سوکھی روٹیاں کھاتی ہے اور کسی چیز سے مطلب نہیں۔ نمک چھوڑ دیا ہے' گھی دودھ سب تیاگ دیا ہے' بس روکھی روٹیوں سے کام۔ اس پر آئے دن برت رکھتی ہے' کبھی ایکادشی' کبھی اتوار' کبھی منگل۔ زمین پر سوتی ہے ایک چٹائی بچھا کر' گھڑی رات سے پوجا پاٹ کرنے لگتی ہے۔ لڑکے سمجھاتے ہیں مگر کسی کی نہیں سنتی۔ کہتی ہے جب بھگوان نے سہاگ اٹھا لیا تو سب کچھ متھیا (باطل) ہے۔ جی بہلانے کے لئے یہاں آئی تھی مگر یہاں رونے کے سوا دوسرا کوئی کام نہیں۔ کتنا سمجھاتی ہوں' بیٹی بھاگ میں جو لکھا تھا وہ ہوا۔ اب صبر سے کام لو۔

بھگوان نے تمہیں بال بچے دیئے ہیں ان کو پالو۔ گھر میں بھگوان کا دیا ہوا سب کچھ ہے' چار کو کھلا کر کھا سکتی ہو' من پوتر چاہیے' بدن کو دکھ دینے سے کیا فائدہ مگر سنتی ہی نہیں۔ تم سمجھاؤ تو شاید مانے۔"

اور امرت بظاہر بے حس اور باطن میں روح فرسا درد چھپائے کھڑا تھا' گویا جس بنیاد پر زندگی کی عمارت کھڑی تھی وہ ہل گئی ہو۔ آج اسے معلوم ہوا کہ زندگی بھر اس نے جس چیز کو حقیقت سمجھا تھا وہ محض سراب تھا' محض خواب' نفس کی اس کامل تسخیر اور عمل کے اس زاہدانہ اجتہاد میں اس کی وہ پُرارمان اور پُراشتیاق محبت فنا ہو گئی اور اس کے سامنے یہ نئی حقیقت جلوہ افروز ہوئی کہ دل میں اگر مٹی کا دیوتا بنانے کی قدرت ہے تو انسان کو دیوتا بنانے کی بھی قدرت ہے۔ پورنما اسی مکروہ انسان کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کر رہی تھی۔

اس نے احترام کے لہجہ میں کہا۔ "تپسونی کو ہم جیسے غرض کے بندے کیا سمجھا سکتے ہیں موسی۔ ہمارا فرض اس کے قدموں پر سر جھکانا ہے' سمجھانا نہیں۔"

اور پورنما نے منہ پر کا گھونگھٹ ہٹاتے ہوئے کہا۔ "تمہارا بچہ ابھی تک تمہیں پوچھا کرتا ہے۔"

ڈامُل کا قیدی

(1)

دس بجے رات کا وقت' ایک عالی شان محل میں ایک سجا ہوا کمرہ' صاف وستھرا شفاف فرش' مسند' تکیے' بجلی کی روشنی' کرسمس کے ایام ہیں' شدت کی سردی پڑ رہی ہے۔

سیٹھ خوب چند افسروں کی خدمت میں ڈالیاں بھیجنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ پھلوں' میووں' کیلوں' مٹھائیوں اور کھلونوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے سامنے کھڑی ہیں۔ بغل میں ایک بوڑھے منحنی منیم جی افسروں کے نام بولتے جاتے ہیں اور سیٹھ جی اپنے ہاتھوں سے حسبِ حیثیت ڈالیاں لگاتے جاتے ہیں۔ چکنی چاند' دوہرا بدن' بند کالر کا کوٹ پہنے ہوئے۔

خوب چند ایک مل کے مالک ہیں اور بمبئی کے بڑے کنٹریکٹر' ایک بار شہر کے میئر بھی رہ چکے ہیں۔ اس وقت بھی کئی تجارتی انجمنوں کے سیکرٹری اور صدر ہیں۔ یہ شہرت' اعزاز و ثروت کس حد تک ڈالیوں کی طفیل ہے' کون جانے۔ مگر اس تقریب میں ان کے دس پانچ ہزار ضرور بگڑ جاتے ہیں' اور سیٹھ نیکی کر اور دریا میں ڈال والے انسان نہیں ہیں۔ ان کے چہرہ سے ان کی کارپردازی صاف چھلک رہی ہے۔ اگر دنیا انہیں خوشامدی' ٹوڈی' جی حضوری کہتی ہے تو کہے اور اپنا دل خوش کرے' سیٹھ جی تاجر ہیں اور تاجر کا کام نفع حاصل کرنا ہے' جیسے بھی ملے۔

پجاری نے آکر عرض کی۔ "سرکار! بڑی دیر ہو گئی' ٹھاکر جی کا بھوگ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

عام اہلِ ثروت اصحاب کی طرح سیٹھ جی نے بھی ایک مندر بنوایا تھا ٹھاکر جی کی پوجا کرنے کے لیے ایک پجاری نوکر رکھ لیا تھا۔ اور روزانہ درشن کیا کرتے تھے۔ رات کو دنیا کے دھندوں سے فارغ ہو کر۔

پجاری کو قہر کی نظروں سے دیکھ کر بولے۔ "دیکھتے نہیں ہو کیا کر رہا ہوں' یہ بھی ایک کام ہے' کھیل نہیں' تمہارے ٹھاکر جی ہی سب کچھ نہ دے دیں گے۔ پیٹ بھرنے پر ہی پوجاپاٹ بھی سوجھتی ہے' گھنٹے دو گھنٹے کی دیر ہو جانے سے ٹھاکر جی بھوکوں نہ مر جائیں گے اور نہ ٹھنڈا بھوگ انہیں بد ہضمی کرے گا۔"

پجاری اپنا سا منہ لے کر چلا گیا اور سیٹھ جی پھر ڈالیاں سجانے میں مصروف ہو گئے۔

ایک ہی منٹ بعد ان کے ایک خاص دوست لالہ کیشورام تشریف لائے۔ خوب چند اٹھ کر ان کے گلے لپٹ گئے' اور پوچھا۔ "کدھر سے؟ میں تو ابھی تمہیں بلوانے والا تھا۔"

کیشورام نے مسکرا کر کہا۔ "اتنی رات تک ڈالیاں ہی لگ رہی ہیں' بھلے آدمی اب تو سمیٹو' کل کا سارا دن پڑا ہے' لگا لینا۔ اور ان ڈالیوں سے ہوتا کیا ہے۔ مفت کی زحمت' آج کیا پروگرام تھا' یاد ہے؟"

خوب چند نے گردن اٹھا کر یاد کرنے کی کوشش کی' کیا کوئی خاص پروگرام تھا۔ (یکایک حافظہ بیدار ہو جاتا ہے)

"اچھا' وہ بات' ہاں یاد آ گیا' ابھی تو دیر نہیں ہوئی!"

"تو چلو پھر' میں نے تو سمجھا تھا' تم وہاں پہنچ گئے ہو گئے۔"

"لیلا ناراض تو نہیں ہو گی؟"

"یہ تو وہاں پہنچنے پر معلوم ہو گا۔"

"تم میری طرف سے معذرت کر دینا۔"

(2)

سیٹھ جی کا سُدیشی مِل ممتاز ملوں میں ہے۔ جب سے سُدیشی تحریک شروع ہوئی ہے' مال کی کھپت دونی ہو گئی ہے' اور سیٹھ جی نے موقع دیکھ کر قیمتوں میں اضافہ کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی آدمیوں کی مزدوری میں تخفیف کا اعلان بھی کر دیا ہے' کیونکہ غلہ ارزاں ہو گیا ہے اور نصف مزدوری پر کثرت سے آدمی مل رہے ہیں۔ کاشتکار دیہاتوں سے بھاگے ہوئے بمبئی چلے آ رہے ہیں۔ تخفیف کا اعلان محض پرانے آدمیوں کو برطرف کرنے کا حیلہ تھا۔

صبح کا وقت ہے' مِل کے احاطہ کے باہر مزدوروں کا ہجوم ہے' پھاٹک پر کانسٹیبلوں کا پہرا۔ مِل میں پوری ہڑتال ہے۔ مزدوروں کے سرغنہ نے سیٹھ جی سے بہت کچھ آرزو منت کی' مگر سیٹھ جی نہ دبے۔

اس وقت بھی سرغنہ سیٹھ جی کے پاس آخری شرطیں لے گیا ہے۔ لوگ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک نوجوان سا مزدور سائیکل پر دوڑا ہوا احاطہ کے سامنے آیا۔ مزدوروں نے چاروں طرف سے اُسے گھیر لیا اور سوالوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ یہی لمبا' دُبلا' سانولا نوجوان' مزدوروں کا سرغنہ ہے۔

اس نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "سیٹھ جی بالکل سماعت نہیں کرتے تو پھر ہم کیوں ان کی خوشامد کریں۔ ہڑتال سے ان کا کوئی نقصان نہ ہو گا اور ہم مر مٹیں گے۔ لیکن ہم خود جان دے کر دوسروں کے لیے راستہ صاف کر دیں گے۔ ہم خود مریں گے تاکہ دوسرے جیئیں۔ دوستو زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے ہیں جب مر جانا ہی زندگی کی دلیل ہوتی ہے۔ نئے آدمیوں کی بھرتی شروع ہو گئی ہے۔ آج ہمیں عہد کرنا پڑے گا کہ ہم کسی باہر کے

آدمی کو مل میں نہ گھسنے دیں گے' چاہے ہمارے اوپر لاٹھیاں برسیں' گولیاں برسیں بھائیو......!"

ایک طرف سے آواز آئی۔ "سیٹھ جی آگئے' سیٹھ جی آگئے۔"

سبھی پیچھے پھر پھر کے دیکھنے لگے' چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں' کتنے ہی تو بدحواس ہو کر کانسٹیبلوں سے مل کر کے اندر جانے کے لیے منت کرنے لگے۔ کچھ لوگ روئی کی گانٹھوں کی آڑ میں جا چھپے جو ذرا دیر پہلے ریل سے آئی تھیں۔ اور مزدوروں کے ہجوم کے باعث اندر نہ جا سکی تھیں۔ صرف مٹھی بھر آدمی سہمے ہوئے سے نوجوان سرغنہ کے ساتھ کھڑے رہے۔ گویا اپنی جان ہتھیلیوں پر لئے ہوں۔

سیٹھ جی نے کار سے اترتے ہی کانسٹیبلوں کو حکم دیا۔ "ان بدمعاشوں کو مار کر بھگا دو۔"

فوراً ہڑتالیوں پر ڈنڈے پڑنے لگے۔ دس پانچ تو گر پڑے' باقی اپنی جانیں لے کر بھاگے۔ نوجوان سرغنہ دو آدمیوں کے ساتھ ڈٹا کھڑا رہا۔

ثروت میں اتنا تحمل کہاں' سیٹھ جی خود ڈنڈا لے کر دوڑے۔ کانسٹیبلوں نے اِن تینوں کی گردن ناپی' حراست میں لے لیا اور لاری کی طرف لے چلے جو اسی لیے لائی گئی تھی۔

ان کا گرفتار ہونا تھا کہ ایک ہزار آدمیوں کا مجمع چاروں طرف سے آ پہنچا اور انہیں رہا کرانے کے لیے مُصر ہوا۔ کانسٹیبلوں نے آدمیوں کے تیور دیکھے تو فراست سے کام لیا۔ انہیں چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔ سیٹھ جی نے دانت پیس لیے۔ ایک ہی لمحہ میں صورت حال میں تغیر ہو جائے گا' اس کا انہیں گمان نہ تھا۔ اب وہ تنہا ہیں' اور ایک ہزار آدمیوں کا مقابلہ' صرف ریوالور ان کا رفیق ہے۔

مجمع نوجوان سرغنہ کی سرکردگی میں سیٹھ جی کی طرف چلا۔ سیٹھ جی کے اوسان خطا ہو گئے۔ موقع و محل کا امتیاز نہ رہا۔ سمجھا یہ سب کے سب مجھے قتل کرنے آ رہے ہیں۔ نوجوان کی طرف نشانہ کیا اور ریوالور داغ دیا' وہ لڑکھڑایا اور زمین پر گر پڑا۔

اس کے گرتے ہی مزدوروں کے سر پر جیسے خون سوار ہو گیا۔ اس کے قبل تک ان میں اہنسا (تشدد) کا شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ منظّم ہو کر سیٹھ جی کو دکھا دینا چاہتے تھے کہ آپ ہماری مزدوری کاٹ کر چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ لیکن اہنسا نے اہنسا کو مشتعل کر دیا۔ سب کے سب قاتلانہ ارادہ سے سیٹھ جی کی طرف لپکے۔ گویا ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ پہلا وار کرنے کا اعزاز اُسے ملے۔ سیٹھ جی نے دیکھا ہموار زمین پر ریوالور سے وہ اپنی جان نہیں بچا سکتے۔ مگر بھاگنے کا کہیں راستہ نہ تھا۔ جب کچھ نہ سوجھا تو روئی کی گانٹھوں پر چڑھ گئے اور ریوالور دکھا دکھا کر نیچے والوں کو اوپر چڑھنے سے روکنے لگے۔ نیچے پانچ چھ سو آدمی کا محاصرہ ہے۔ اوپر سیٹھ جی تنہا ریوالور لیے کھڑے ہیں' کہیں سے کوئی مدد نہیں آ رہی ہے۔ ہر لمحہ زندگی کی اُمید نفی میں ڈوبتی جاتی ہے' پچھتا رہے ہیں کہ بندوق کیوں نہ لیتا آیا' ایک ایک کو بھون کر رکھ دیتا۔ مگر کیا معلوم تھا اس مصیبت کا سامنا ہو گا۔

دفعتاً وہی نوجوان پیچھے سے آ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں پٹی بندھی ہوئی تھی اور خون جاری تھا۔ اس کا چہرہ زرد سے خاکستر ہو گیا تھا۔ اور آثار سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ درد سے بے چین ہے۔ اسے دیکھتے ہی لوگوں نے اسے گھیر لیا۔ اسے بچانا سیٹھ جی کو قتل کرنے سے زیادہ اہم تھا۔ اس اہنسا کے جنون میں بھی اپنے سردار کو جیتا جاگتا دیکھ کر ان کے دل تشکر سے پُر ہو گئے۔ ایک فلک دوز نعرہ بلند ہوا "گوپی ناتھ کی جے۔"

زخمی گوپی ناتھ نے مجمع کو مخاطب کر کے ضعیف آواز میں کہا۔ "میں اب چند لمحوں کا مہمان ہوں۔

بھائیوں! شاید پھر مجھے نہ دیکھو' اس لیے میری تم سے آخری درخواست ہے کہ تم لوگ اپنے گھر جاؤ اور سیٹھ جی سے مزاحم نہ ہو۔ میرا کہنا مانو اگر سیٹھ جی کا بال بیکا ہوا تو میری آتما کو وہاں بھی چین نہ آئے گا۔"

لوگوں نے اعتراض کیے' سرگوشیاں کیں' مخالفانہ آوازے بھی کسے' لیکن گوپی ناتھ کا حکم کیسے ٹالیں جس نے انہی کے لیے اپنی زندگی قربان کر دی۔ میدان صاف ہونے لگا۔ صرف تھوڑے سے جاں نثار باقی رہ گئے تو گوپی ناتھ نے سیٹھ جی سے عاجزی کے ساتھ کہا۔

"سرکار' آپ چلے جائیں' میں جانتا ہوں آپ نے گھبراہٹ میں مجھے مارا۔ میں اس وقت آپ سے یہی کہنے جا رہا تھا جواب کہہ رہا ہوں' مگر بھگوان کی مرضی۔"

سیٹھ جی کو گوپی ناتھ سے کچھ عقیدت ہو گئی۔ نیچے اترنے میں کچھ اندیشہ ضرور تھا۔ لیکن اوپر بھی تو جان بچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ اِدھر اُدھر چوکنّی نظروں سے تاکتے ہوئے وہ اُترے۔ اب بھی پچاس ساٹھ آدمی کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی آنکھ میں اشتعال ہے۔ کچھ لوگ فحش کلامی بھی کر رہے ہیں۔ مگر کوئی ان سے بول نہیں سکتا۔ شہید کی تحریک میں یہ اثر ہے۔

سیٹھ جی کار پر بیٹھے' اور گوپی ناتھ زمین پر گر پڑا' اور پھر نہ اُٹھا۔

(3)

سیٹھ جی کی کار جتنی تیزی سے اُڑی جا رہی تھی' اتنی ہی تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے گوپی ناتھ کی تصویر بھی ان کی آنکھوں کے سامنے دوڑتی چلی آتی تھی۔ اگر گوپی ناتھ ان کا دشمن تھا تو اس نے ان کی جان کیوں بچائی اور ایسی حالت میں جب وہ خود مر رہا تھا' اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ بے گناہ جیسے ہاتھ باندھے ہوئے ان کے روبرو کھڑا کہہ رہا تھا۔ "آپ نے مجھے بے گناہ کیوں مارا؟"

نفس کے بندے بالعموم لطیف احساسات سے محروم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سیٹھ جی کا ضمیر اتنا بے حِس نہ ہوا تھا کہ ایک بے گناہ کا خون کر کے انہیں افسوس نہ ہوتا۔ وہ گھر پہنچے تو ان کے چہرہ پر وحشت چھائی ہوئی تھی۔ مسند پر لیٹ گئے اور ایک لمبی سانس کھینچ کر پرمیلا سے بولے۔ "بڑا غضب ہو گیا۔ پرمیلا میں نے ایک بے گناہ کا خون کر دیا۔ وہی گوپی جو مزدوروں کا سردار تھا۔ معلوم نہیں کیوں مزدوروں کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا اور گوپی پر ریوالور چھوڑ دیا۔ حالانکہ اس غریب نے آخر دم تک مجھے بچانے کی کوشش کی اور اسی کے سمجھانے کا یہ اثر ہے کہ مزدوروں نے مجھے یہاں تک آنے دیا۔ مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی دیوتا تھا' ضرور مر گیا ہوگا' حالانکہ زخم پاؤں میں تھا مگر وہ بچے گا نہیں۔ میں کار میں بیٹھا ہوں تو میں نے اُسے گرتے دیکھا۔ میں نے اُسے قتل کر دیا' مجھے سمجھانے آرہا تھا۔"

سیٹھ جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں مشتعل ہو گئیں' زور زور سے سانس کھینچنے لگے' پیشانی پر عرق کے قطرے جھلک پڑے' بولے۔ "ذرا پنکھا دو۔ پرمیلا گرمی لگ رہی ہے' جسم پُھنکا جاتا ہے' اب مجھ سے نہیں رہا جاتا۔ میں جا کر پولیس میں اپنے جرم کا اقرار کروں گا۔ میں نے گوپی کو بے گناہ مارا' بالکل بے گناہ۔"

باہر شور ہو رہا تھا۔ گوپی کے مرتے ہی مزدوروں نے اس کا جلوس نکالا تھا اور سیٹھ جی نے شور سنا اور اٹھ

کر کھڑکی سے جھانکا۔

پر میلا نے ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ''تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں بھیتر آجاؤ' مزدور تمہیں دیکھ لیں گے تو اور بھی طوفان مچائیں گے۔''

سیٹھ جی نے ہاتھ چھڑا لیا اور بولے۔ ''میں چھپنا نہیں چاہتا۔ میں نے ایک بے گناہ کو قتل کیا ہے اور مجھے اس کی سزا ملنی چاہیے۔ اس لیے جان بچاؤں کہ میں نے دولت جمع کی ہے اور عزت حاصل کی ہے۔ گوپی مجھ سے زیادہ دولت مند تھا۔ مجھ سے زیادہ معزّز تھا۔ میں نے اس کا خون کیا ہے۔ دیکھو پولیس مزدوروں کے پیچھے ہے۔ مسلح پولیس' مزدور میرے دروازہ پر آکر ماتم کریں گے۔ شاید میرے دفتر میں آگ لگا دیں' لُوٹ مچا دیں' پولیس ان پر گولی چلائے گی۔ نہیں میں اپنی جان بچانے کے لیے بے شمار جانیں نہ لوں گا۔ مزدور میرے خون کے پیاسے ہیں۔ مجھے پولیس کے ہاتھوں میں دیکھ کر اُن کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔ شاید تم سے پھر ملاقات نہ ہو' مجھے معاف کرنا' تمہیں ایشور کو سونپا............''

وہ زینہ کی طرف چلے' پر میلا ان کے پیچھے دوڑی' مگر سیٹھ جی نکل گئے اور پر میلا وہیں کھڑی روتی رہ گئی۔

(4)

مجرم خود اپنے جرم کا اقبال کر رہا ہو تو وکیل اور بیرسٹر کیا کرے۔ سارا شہر عدالت میں آتا تھا اور سیٹھ کا بیان سن کر دانتوں میں انگلی دیتا تھا۔ کچھ لوگ ان کی اخلاقی جرأت کی تعریف کرتے تھے۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں خللِ دماغ ہو گیا ہے۔ صفائی کے بیرسٹر نے ہر چند کوشش کی سیٹھ جی سے یہ کہلائیں کہ انہوں نے اپنی محافظت کیلئے ریوالور چلایا۔ لیکن سیٹھ جی نے یہ کسی طرح تسلیم نہ کیا۔ ایک ماہر نفسیات نے لکھا ہے زاہد اور گنہگار دونوں ہی دماغی توازن کے اختلال ہیں۔ جب کوئی مشین بگڑ جاتی ہے تو وہ یا تو بالکل بند ہو جاتی ہے یا سو گنی رفتار سے چلنے لگتی ہے۔ سرسام کا مریض اس اختلال کی ایک مثال ہے یا تو وہ دیوار پھاند جائے گا یا حرکت بھی نہ کر سکے گا وغیرہ۔ عدالت کو اب سزا دینے کے سوا چارہ نہ رہا اور سیٹھ جی کو حبسِ دوام کی سزا ملی۔

سیٹھ جی کے جاتے ہی تموّل اور ثروت کی دیوی بھی روٹھ گئی۔ مِل تو پہلے ہی بند ہو چکی تھی۔ لینا دینا چکانے کے بعد معلوم ہوا' یہ شان و شکوہ محض طلسم تھا۔ ان طلسموں میں سے ایک' جو بڑے بڑے مہاجن آئے دن باندھتے رہتے ہیں جس کی بدولت وہ ہوا میں محل کھڑے کر دیتے ہیں۔ پانی پر نقش بنا دیتے ہیں۔ ساری دنیا کی آنکھوں میں سلائی پھیر کر تاریک کو روشن دکھا سکتے ہیں۔ مگر خوب چند کا یہ طلسم ٹوٹا تو گھر بھی سلامت نہ بچا۔ پر میلا کے پاس اب بھی ہزاروں کے زیور تھے۔ اس کے گزارہ کے لیے یہ اثاثہ بھی کافی تھا مگر شوہر کے نام کی لاج تو رکھنی تھی۔ کسی کو انگشت نمائی کا موقع کیوں ملے۔ اس نے زیور بھی بیچ ڈالے اور سب دینے چکا دیئے۔ وہ حاملہ تھی' جب پرماتما نے اس پر اتنا رحم کیا اور اس کی زندگی کی سب سے بڑی تمنا پوری کر دی تو وہ کیوں نہ خوش معاملہ بنے' کیوں نہ سب کچھ پرماتما کے قدموں پر ہی نثار کر دے۔ ساتویں مہینے جب روزِ سعید آیا تو پر میلا ایک چھوٹے سے مکان میں تھی مگر یہ نعمت پا کر وہ ساری مصیبتیں بھول گئی۔ اب وہ سب کچھ خوشی سے جھیل لے گی۔ اس تنکے کے سہارے وہ اپنی کشتی کنارے پر پہنچا دے گی جس نیک نیتی سے اس نے شوہر کے قرضے ادا کیے تھے۔ اس سے لوگوں کو اس کے ساتھ

حسنِ اعتقاد ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ اسے ماہوار وظیفہ دینے پر بھی آمادہ تھے۔ لیکن پر میلا نے کسی کا احسان نہ لیا۔ شریف گھرانوں میں اس کی رسائی تھی ہی۔ وہ ان گھروں میں سُدیشی چیزیں مہیا کر کے اپنے گزر بھر کا کما لیتی۔ جب تک بچہ دودھ پیتا تھا' اسے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن دودھ چھڑا دینے کے بعد وہ آزاد ہو گئی۔ بچے کو دائی کے سپرد کر کے وہ معاش کی فکر میں نکل جاتی۔ اور دن بھر کی دوا دوش کے بعد جب وہ شام کو گھر آتی اور بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگتی تو اس کا دل مسرت سے پھول اٹھتا اور عالم خیال میں وہ اپنے شوہر کے پاس پہنچ جاتی۔ اسے دولت کے لٹ جانے کا ذرہ بھر غم نہیں ہے۔ ایشور نے اس کی تلافی کر دی۔ اب اس کی اتنی آرزو ہے کہ سیٹھ جی زندہ و سلامت لوٹ آئیں اور بچے کو دیکھ کر اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں' پھر تو اس بے نوائی میں بھی شاکر رہے گی۔ وہ روز ٹھاکر جی کے قدموں میں سر جھکا کر اپنے شوہر کے لیے دُعا مانگتی ہے۔ اسے یقین ہے کہ ایشور اس پر مہربان ہیں۔ عبودیت میں اسے صبر اور ہمت اور سکون کا القا سا ہوتا رہتا ہے۔ دعا ہی اب اس کی امیدوں کا مرکز ہے۔

(5)

ایّامِ معصیت امید کے سائے میں کٹ گئے۔ پورے چودہ سال۔ شام کا وقت ہے۔ ہونہار کرشن چندر اپنی ماں کے پاس اُداس بیٹھا ہوا ہے۔ وہ نہ ماں کو پڑا ہے' نہ باپ کو۔

پر میلا نے اس کی پیشانی پر پھیلے ہوئے بالوں کو سلجھا کر پوچھا۔ "کیوں بیٹا تمہارا امتحان تو ختم ہو گیا؟"

کرشن چندر نے مایوسانہ انداز سے کہا۔ "ہاں اماں امتحان تو ہو گیا۔ لیکن میرے پرچے اچھے نہیں ہوئے۔ میری طبیعت پڑھنے میں نہیں لگتی۔"

اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ پر میلا نے شفقت آمیز لہجہ میں کہا۔ "یہ تو اچھی بات نہیں ہے بیٹا۔ مجھے یہ سن کر رنج ہوا ہے۔"

کرشن چندر نے قصوروار نظروں سے دیکھا۔ "مجھے بار بار بابو جی کی یاد آتی ہے۔ اماں وہ تو اب بہت بوڑھے ہو گئے ہوں گے۔ میں سوچا کرتا ہوں وہ آئیں گے تو دل و جان سے ان کی خدمت کروں گا۔ اتنی عظیم الشان قربانی کس نے کی ہو گی۔ اماں اس پر بھی کچھ لوگ انہیں بے رحم کہتے ہیں۔ میں کئی بار گوپی ناتھ کے گھر گیا ہوں۔ اماں' ان کی بیوی ہے' ماں ہے اور لڑکی ہے جو مجھ سے دو سال بڑی ہے۔ ماں بیٹی دونوں اسی مل میں کام کرتی ہیں' دادی بہت بوڑھی ہو گئی ہیں۔"

پر میلا نے تعجب سے پوچھا۔ "تجھے ان کے گھر کا پتہ کیسے لگا؟"

کرشن چند خوش ہو کر بولا۔ "میں ایک دن مل میں گیا تھا۔ میں وہ جگہ دیکھنا چاہتا تھا جہاں مزدوروں نے بابو جی کو گھیرا تھا اور وہ جگہ بھی جہاں گوپی ناتھ گولی کھا کر گرا تھا مگر ان جگہوں کا اب وہاں پر نشان تک نہیں ہے' عمارتیں بن گئی ہیں۔ مل کا کام زوروں سے چل رہا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بہت سے آدمیوں نے گھیر لیا۔ سب کہتے تھے تم بھیا جی گوپی ناتھ کا روپ بھر کر آئے ہو۔ لوگوں نے وہاں شہید گوپی ناتھ کی ایک تصویر لٹکا رکھی ہے۔ میں اسے دیکھ کر حیرت میں آ گیا جیسے میری تصویر ہو۔ ہو بہو میری۔ بس مونچھوں کا فرق ہے۔ جب میں نے گوپی ناتھ کے گھر والوں کا حال پوچھا' تو ایک آدمی دوڑ کر اس کی بیوی کو بلا لایا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی رونے لگی اور جانے کیوں مجھے بھی

رونا آگیا۔ عورتیں بڑی تکلیف اٹھا رہی ہیں اماں۔ مجھے تو ان پر ترس آتا ہے۔ ہم ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے اماں!"

پرمیلا ڈری۔ ان جھگڑوں میں پڑ کر لڑکا کہیں پڑھنا نہ چھوڑ بیٹھے۔ بولی۔ "ابھی ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ بیٹا دولت ہوتی تو کہتی دس پانچ روپے دے دیا کرو۔ لیکن گھر کا حال تو تم جانتے ہی ہو۔ ابھی جی لگا کر پڑھو۔ جب تمہارے بابوجی آجائیں تب شاید ہمارے اچھے دن آجائیں۔"

اس وقت کرشن چندر خاموش ہو گیا۔ لیکن آج سے اس کا یہ معمول ہو گیا کہ اسکول سے لوٹ کر ایک بار گوپی ناتھ کے گھر ضرور جاتا۔ پرمیلا اسے جیب خرچ کے لئے جو پیسے دیتی ان سے ان بیکسوں کی مدد کرتا۔ کبھی پھل لے لئے، کبھی سبزی لے لی، کبھی کچھ۔

ایک دن کرشن کو گھر آنے میں دیر ہوئی تو پرمیلا بہت گھبرائی۔ پوچھتی پاچھتی گوپی کے گھر پہنچی تو دیکھا، ایک تنگ گلی میں ایک بوسیدہ میلے متعفّن گھر کے اندر گوپی ناتھ کی بیوہ ایک ٹوٹی کھاٹ پر پڑی ہوئی ہے اور کرشن چندر کھڑا اسے پنکھا جھل رہا ہے۔ بولی۔ "آج تم یہاں کب تک رہو گے بیٹا۔ دیا بتی کا وقت آگیا، چلو دیر نہ کرو۔"

کرشن چندر کو اس کا آنا ناگوار ہوا۔ بولا۔ "میں تو ابھی نہ جاؤں گا اماں۔ دیکھو کا کی کتنی بیمار ہے۔ دادی کو کچھ سوجھتا نہیں۔ بنّی کھانا پکا رہی ہے، ان کے پاس کون بیٹھے؟"

"لیکن یہاں پھر بھی تین آدمی ہیں، میں تو اکیلی ہوں، اس وقت چلو، سویرے چلے آنا۔"

مریضہ نے پرمیلا کی آواز سن کر آنکھیں کھول دیں اور نقیہ آواز میں بولی۔ "آؤ ماتاجی۔ بیٹھو، میں تو بھیا سے کہہ رہی تھی۔ دیر ہو رہی ہے، اب گھر جاؤ مگر یہ گئے ہی نہیں، مجھ ابھاگن پر نہ جانے کیوں اتنی دیا آتی ہے۔"

مکان میں دم گھٹ رہا تھا، ہوا کا کہیں گذر نہیں لیکن کرشن چندر ایسا خوش تھا گویا پردیسی چاروں طرف سے ٹھوکریں کھا کر اپنے گھر میں آگیا ہو۔

پرمیلا نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں تو ایک دیوار پر اسے ایک تصویر نظر آئی۔ اس نے قریب جا کر تصویر دیکھی تو اس کا سینہ دھک سے ہو گیا۔ بیٹے کی طرف دیکھ کر بولی۔ "تو نے یہ تصویر کب کھچوائی تھی کرشنا، مجھ سے کہا بھی نہیں۔"

کرشن مسکرا کر بولا۔ "یہ میری تصویر نہیں ہے اماں۔ گوپی ناتھ کی تصویر ہے۔"

پرمیلا کو یقین نہ آیا۔ "چل جھوٹا کہیں کا۔"

مریضہ نے حسرت ناک لہجہ میں کہا۔ "بھیا ٹھیک کہتے ہیں، ماتاجی، میرے آدمی ہی کی تصویر ہے، بھگوان کی لیلا کوئی نہیں جانتا۔ مگر بھیا کی صورت ان سے اتنی ملتی ہے کہ مجھے اچرج ہوتا ہے اور سبھاؤ بھی بالکل وہی ہے۔"

پرمیلا پر ایک نامعلوم دہشت کا غلبہ ہوا، جیسے اس نے کوئی برا خواب دیکھا ہو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کرشن چندر کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی دروازہ کی طرف چلی، گویا کوئی اسے اس کے ہاتھوں سے چھینے لئے جاتا ہو۔

مریضہ نے صرف اتنا کہا۔ "ماتاجی کبھی کبھی انہیں میرے پاس آنے دیا کرو نہیں تو میں مر جاؤں گی۔"

(6)

پندرہ سال کے بعد سیٹھ خوب چند اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچے۔ ہرا بھرا درخت ٹھونٹھ ہو کر رہ گیا

تھا۔ چہرہ پر جھرّیاں پڑی ہوئی' سر کے بال سن اور داڑھی جنگل کی طرح بڑھی ہوئی' دانت گویا کہیں کھو گئے' کمر کمان' ٹھونٹھ دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے' یہ وہی تناور درخت ہے جس کی ٹہنیوں پر چڑیاں بسیرا لیتی تھیں۔

اسٹیشن کے باہر نکل کر وہ سوچنے لگے' کہاں جائیں' اپنا نام لیتے شرم آتی ہے' بے حیا ابھی زندہ ہے' عاقبت کے بوریئے بٹورنے کے لئے' کس سے پوچھیں' پرمیلا جیتی ہے یا مر گئی ہے' اگر ہے تو کہاں؟ انہیں دیکھ کر خوش ہو گی یا منہ پھیر لے گی۔

خوب چند کی کوٹھی ابھی تک خوب چند کی کوٹھی کہلاتی تھی۔ زبانِ خلق قانون کے الٹ پھیر کیا جانے۔ اپنی کوٹھی کے سامنے پہنچ کر انہوں نے ایک پان والے سے پوچھا۔ "بھیا یہی تو خوب چند سیٹھ کی کوٹھی ہے؟"

پان والے نے ناہمدردانہ انداز سے پان لگاتے ہوئے کہا۔ "سیٹھ خوب چند کی جب تھی تب تھی' اب تو لالہ دیسراج کی ہے۔"

"اچھا' مجھے یہاں آئے بہت دن ہو گئے' سیٹھ جی کے یہاں نوکر تھا۔ سنا سیٹھ جی کو کالا پانی ہو گیا تھا۔"

"ہاں بے چارہ بھلمنسی میں مارا گیا' چاہتے تو بے داغ بچ جاتے۔ مگر نصیب! سارا گھر مٹی میں مل گیا۔"

"سیٹھانی تو ابھی ہوں گی؟"

"ہاں سیٹھانی کیوں نہیں ہیں' سیٹھ جی کا ایک لڑکا بھی ہے۔"

سیٹھ جی کے چہرہ پر جوانی ناچ اُٹھی' زندگی کا وہ جوش اور ولولہ جو آج پندرہ سال سے کنبھ کرن کی طرح پڑا سو رہا تھا' گویا نئی زندگی پا کر اُٹھ بیٹھا ہے اور اس وقت تو وہ استخوان میں سما نہیں رہا ہے۔

انہوں نے اس بے تکلفی سے پان والے کا ہاتھ پکڑ لیا گویا پرانی دوستی ہے اور کہا۔ "اچھا ان کا لڑکا بھی ہے۔ کہاں رہتی ہیں سیٹھانی۔ ذرا بتاؤ تو جا کر سلام کر آؤں۔ بہت دنوں ان کا نمک کھایا ہے۔"

تنبولی نے پرمیلا کے مکان کا پتہ بتا دیا۔ وہ اسی محلّہ میں رہتی تھی۔ سیٹھ جی گویا آسمان میں اڑتے ہوئے یہاں سے چلے' پرمیلا کے گھر کی طرف۔

راستے میں ٹھاکر جی کا مندر نظر آیا' سیٹھ جی نے مندر میں جا کر مورتی کے سامنے سر جھکا دیا۔ اُن کے لیے ایک ایک روئیں سے عقیدت اور استحسان کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ اس طولانی کوفت اور یاس کے عالم میں ان کی مجروح اور مجبور آتما کو کہیں عافیت ملتی تھی تو وہ یہی عبادت اور جبّہ سائی تھی۔ دن بھر ایکھ کے کولہو میں جتے رہنے یا پھاوڑے چلانے کے بعد جب وہ رات کو زمین کی آغوش میں سوتے تو ان کی روح کی گہرائیوں سے درد اور سوز میں ڈوبی ہوئی صدا نکلتی۔ "ایشور مجھ پر رحم کرو۔" جب ان کے پاس ثروت تھی' عیش کے سامان تھے' جوانی تھی' صحت تھی' اختیار تھا' انہیں عبادت کے لیے موقع نہ ملتا تھا۔ دل ماسواہی کی طرف لپکتا تھا۔ اب محروم اور پامال ہو کر انہیں خدا کے سوا اور کہیں سایہ نہ ملتا تھا۔ پانی پر جب تک کائی کا پردہ ہے اس میں روشنی کا گزر کہاں۔

سیٹھ جی مندر سے نکلے ہی تھے کہ ایک عورت نے مندر میں قدم رکھا۔ خوب چند کا دل اچھل پڑا۔ خون کا ایک ایک قطرہ ناچ اٹھا۔ وہ ایک از خود رفتگی کی حالت میں ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے۔ معلوم ہوا دل کی مسّرت آنکھوں سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ یہ پرمیلا تھی۔

ان پندرہ سالوں میں ایک دن بھی ایسا نہیں گزرا جب انہیں پرمیلا کی یاد نہ آئی ہو۔ وہ حسن اور شباب کی تصویر' ہمیشہ ان کی نظروں کے سامنے رہتی تھی۔ آج اس تصویر اور حقیقت میں کتنا فرق نظر آیا۔ تصویر زمانہ کے

اثرات سے مامون تھی۔ اس پر دُکھ سکھ کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہی شرمیلی نگاہیں تھیں۔ وہی دلفریب متبسم۔ اس حقیقت میں انہیں عامل کا جلال نظر آیا اور ان کا دل وجد میں ڈوبے ہوئے ترنم کی طرح تھرتھرا اٹھا۔ ایک ولولہ سا اُٹھا کہ اس کے قدموں میں گر پڑوں اور کہوں اس بدنصیب کو اپنے آنچل میں پناہ دو۔ مگر اس ہیئت کذائی میں اس کے روبرو جاتے انہیں شرم دامن گیر ہوئی۔

پرمیلا نے ٹھاکر جی کی پوجا کر کے تلسی دل لیا اور مندر کے باہر نکلی۔ خوب چند بھی اس کے پیچھے چلے۔ دور آگے چل کر ایک کئی منزل کا چال ملا۔ پرمیلا "چال" میں داخل ہوئی۔ سیٹھ جی بھی اندر گھسے مگر وہ تو پوری ایک بستی تھی۔ پرمیلا کدھر گئی کیا خبر۔ دفعتاً ایک نوعمر لڑکے کو اندر سے نکلتے دیکھ کر وہ پکار اُٹھے۔ "ذرا سنو تو بیٹا تم سے کچھ پوچھنا ہے۔"

لڑکا آہستہ آہستہ ان کی طرف آیا اور ایک لمحہ غائر نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ پھر چشم پُر آب ہو کر ان کے قدموں سے لپٹ گیا۔ سیٹھ جی کا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ یہ تو گوپی ہے۔ صرف عمر میں اس سے کچھ کم، وہی صورت، وہی قد و قامت، وہی خدوخال جیسے وہ عالم بالا سے اُتر آیا ہو اور تازہ جوان ہو کر۔ انہیں رعشہ سا آ گیا۔ ہیبت ان کے سر کے سامنے مجسم کھڑی تھی۔

کرشن چندر نے ایک لمحہ میں اٹھ کر کہا۔ "ہم تو کئی دن سے آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ آیئے اندر آیئے۔ میں آپ کو دیکھتے ہی پہچان گیا۔ کہیں بھی دیکھ کر پہچان جاتا۔"

خوب چند اس کے ساتھ اندر چلے تو، مگر ان کا دل جیسے خیالات کے بھنور میں پڑا ہوا تھا۔ گوپی کی صورت کیا کبھی ان کے ذہن سے اتر سکتی تھی۔ اس چہرہ کو انہوں نے کتنی ہی بار خواب میں دیکھا تھا۔ وہ سانحہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا یادگار واقعہ تھا۔ گوپی کی وہ صورت اس وقت بھی ان کی نگاہوں کے سامنے کھڑی تھی۔

کرشن چندر زینے کے پاس رُک کر بولا۔ "جا کر ماں سے کہہ آؤں۔ آپ کے لیے نئے کپڑے بنے رکھے ہیں۔"

خوب چند نے لڑکے کو گود میں لے کر اس کا بوسہ لیا جیسے وہ بچہ ہو، اور اسے گود میں لیے ہوئے زینے پر چڑھے اور بے تکان چڑھتے گئے۔

(7)

آج سیٹھ جی کو آئے ساتواں دن ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ سیٹھ جی سندھیا کرنے جا رہے ہیں۔ گوپی ناتھ کی بیٹی نے آ کر پرمیلا سے کہا۔ "ماتا جی! اماں کا جی اچھا نہیں ہے۔ بھیا کو بلا رہی ہیں۔"

پرمیلا نے کہا۔ "آج تو وہ نہ آ سکے گا، اس کے پتا جی آ گئے ہیں۔ ان سے باتیں کر رہا ہے۔"

کرشن چندر نے کمرہ سے اس کی باتیں سن لیں۔ فوراً برآمدہ میں آ کر بولا۔ "نہیں اماں میں دادا سے پوچھ کر ذرا دیر کے لیے چلا جاؤں گا۔"

پرمیلا نے خفا ہو کر کہا۔ "تو وہاں جاتا ہے تو تجھے گھر کی سدھ نہیں رہتی۔ نہ جانے ان سبھوں نے تجھے کیا بُوٹی سنگھا دی ہے۔"

"میں بہت جلد چلا آؤں گا اماں! تمہارے پیروں پڑتا ہوں۔"

"تو بھی عجیب لڑکا ہے' وہ بے چارے اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں' اور تجھے وہاں جانے کی پڑی ہے۔"

سیٹھ جی نے یہ باتیں سنیں' آکر بولے۔ "کیا حرج ہے' جلدی آنے کو کہہ رہے ہیں جانے دو۔"

کرشن چندر خوش ہو کر بنّی کے ساتھ چلا گیا۔ پر میلا بولی۔ "جب سے میں نے گوپی کی تصویر دیکھی ہے مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ بھگوان نہ جانے کیا کرنے والے ہیں۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی تصویر ہے۔"

سیٹھ جی نے بھی تشویش ظاہر کی۔

"میں تو پہلی بار اسے دیکھ کر چونک گیا تھا۔ معلوم ہوا گوپی ناتھ ہی کھڑا ہے۔"

"گوپی ناتھ کی گھر والی کہتی ہے' اس کی چال ڈھال بھی گوپی ہی جیسی ہے۔"

"بھگوان کی لیلا ہے کہ جس کی میں نے جان لی' وہ میرے بیٹے کے روپ میں جنم لے۔"

دو گھنٹے گزر گئے اور کرشن چندر گھر نہیں آیا' ماں بیتاب ہونے لگی۔ سیٹھ جی کو بھی تشویش ہوئی۔ کیا کرنے لگا۔ اس کی عادت ہے گوپی کے گھر جاتا ہے تو اسے کھانے پینے تک کی سدھ نہیں رہتی۔

دوپہر ہوئی' شہر میں خبریں اڑنے لگیں کہ مل میں ہڑتال ہو گئی' پولیس لاریوں میں دوڑی جا رہی ہے۔ پر میلا دہشت سے لرزنے لگی۔ بار بار کھڑکی سے دیکھنے لگی۔ ابھی تک نہیں آیا۔ کہیں ہڑتالیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔

اچھا یہ مجمع کیسا چلا آ رہا ہے' اسی طرف کو آتا ہے۔ کوئی ایک ہزار آدمی ہوں گے۔ کوئی ارتھی معلوم ہوتی ہے۔ ارتھی ہے۔ سیٹھ جی جھانکنے لگے۔ ضرور کوئی بڑا رئیس مر گیا ہے۔

وہ جلوس پر میلا کے مکان کے نیچے رک گیا اور آواز آئی۔ "شہید کرشن زندہ باد!"

پر میلا کا خون خشک ہو گیا۔ وہ مدہوشی کے عالم میں زینے کی طرف دوڑی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

سیٹھ جی نے بھی یہ نعرہ سنا مگر ان کی پیشانی پر بل تک نہ آیا۔ زاہدانہ توکّل' صبر اور سکون کے ساتھ نیچے آئے' لاش کو گلے لگا کر اس کا بوسہ لیا۔ دریافت حال کیا۔ معلوم ہوا مل میں آج ہڑتال تھی' منیجر نے حاضری کے متعلق کچھ نئے قاعدے نافذ کیے تھے۔ مزدوروں نے اسے منظور نہ کیا۔ مل میں ہڑتال ہوئی۔ کرشن چندر کو مزدوروں نے اپنا سرغنہ بنایا' اس کی کم عمری کے باوجود مزدوروں کو اس پر کامل اعتماد تھا۔ ان کو یقین تھا کہ یہ گوپی کا اوتار ہے۔ گوپی کی بیوی نے اس معاملہ میں مشورہ کرنے کے لیے آج کرشنا کو بلایا تھا۔ کرشنا مزدوروں کا نمائندہ بن کر کئی آدمیوں کے ساتھ پولیس کی مزاحمت کے باوجود منیجر سے ملنے جا رہا تھا۔ ہنگامہ ہو گیا۔ پولیس نے گولیاں چلائیں اور کرشن چندر اُن گولیوں کا نشانہ بن گیا۔

سیٹھ جی اسی اطمینان کے ساتھ اُوپر گئے' اوپر سے پر میلا کو سنبھال کر نیچے لائے۔ پر میلا بیٹے کی لاش سے لپٹ گئی اور بین کر کے رونے لگی۔ کوئی ایسی آنکھ نہ تھی' جس سے آنسو نہ نکل رہے ہوں۔

کئی منٹ گزر گئے' پر میلا لاش کو سینے سے لگائے روتی رہی۔ جس نعمت کو پا کر اس نے مصیبت کو راحت سمجھا تھا اُس سے آج وہ محروم ہو گئی یا اس کی تاریکی میں جس شمع سے امید اور صبر کی روشنی پا رہی تھی وہ شمع بجھ گئی۔

سیٹھ جی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیا کرتی ہو پر میلا جس کی موت پر ایشور کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اس کی موت پہ روتی ہو۔ ظلم کے سامنے سینہ سپر ہو جانے سے موت کس کو نصیب ہوتی ہے۔"

پرمیلا نے وحشت زدہ نظروں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔ "تم سمجھتے ہو گے کہ ایشور جو کچھ کرتا ہے ہماری بھلائی کے لیے کرتا ہے' میں ایسا نہیں سمجھتی۔ کیوں سمجھوں ہائے میرا لال' میرا راجہ' میرا سورج' میرا چاند' میری زندگی کے سہارے' تجھے کھو کر کیسے صبر کروں۔ جسے گود میں دیکھ کر نہال ہو گئی تھی' اسے زمین پر پڑا دیکھ کر دل کو کیسے سنبھالوں۔"

اسی رات کو وہ غم نصیب ماں دنیا سے رخصت ہو گئی' چڑیا اپنے بچے کی تلاش میں پنجرے سے نکل گئی اور سیٹھ خوب چند جی آج بھی مزدوروں کی چال میں ان کی خدمت میں مصروف نظر آتے ہیں۔

کفن

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِزہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی۔ فضا سناٹے میں غرق۔ سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا' جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں۔"

"تو بڑا بے درد ہے بے' سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا سکھ بھوگا' اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی۔"

"تو مجھ سے اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لیے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج ہو تو ان کے لیے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا۔ جب تک وہ پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آ جاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لیے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کا کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکّل کے لیے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجیب زندگی تھی۔ ان لوگوں کے گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی ڈھانکے ہوئے' دنیا کے فکروں سے آزاد' قرض سے لدے ہوئے' گالیاں بھی کھاتے تھے۔ مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصولی کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے دیتے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اونکھ توڑ لاتے اور

راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود کر لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا۔ مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی' اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پیسائی کر کے' گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا بھی انتظام کر لیتی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازئ شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دردِزہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی چڑیل کا پھنساؤ ہو گا اور کیا۔ یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے۔ کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھڑی میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دیگا۔ بولا۔ "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے؟ میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا' آج اس کا اگھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ' گڑ' تیل کچھ تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آئے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو جو لوگ ابھی پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے' گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے' کہیں زیادہ فارغ البال تھے' وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے کہ گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بین تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین وادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لیے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا' اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں کچھ ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چِھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا تھا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی اندر کا حصہ زبان اور تالو اور حلق کو جلا دیتا تھا۔ اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کافی سامان تھا۔ اسی لیے دونوں

جلدی جلدی نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی بارات یاد آئی۔ جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔ ''وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی' رائتہ' تین طرح کے سوکھے ساگ' ایک رسے دار ترکاری' دہی' چٹنی' مٹھائی اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا' ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوریاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے' پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے تھے مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھولیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سُدھ تھی۔ کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔''

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ کہ ''اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔''

''اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ شادی بیاہ میں مت کھرچ کرو' کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے۔ ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔''

''تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔''

''بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔''

''میں پچاس کھا جاتا۔''

''پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا۔ تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔''

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے تھے۔ جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

صبح کو مادھو نے کوٹھری میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس گیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسمِ قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے گھونسلے میں ماس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمینداروں کے پاس گئے۔ وہ ان دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں سے پیٹ چکے تھے...... چوری کی علّت میں' وعدہ پر کام پر نہ آنے کی علّت میں۔ پوچھا۔ ''کیا ہے بے گھیسوا۔ روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔''

گھیسوا نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ ''سرکار بڑی بپت میں ہوں۔ مادھو کی

گھر والی رات گجر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی۔ آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوادارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دگا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا۔ مالک تباہ ہو گئے۔ گھر اجڑ گیا۔ آپ کا گلام ہوں۔ اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا سب دوادارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہہ دیں۔ "چل دور ہو یہاں سے' لاش گھر میں رکھ سڑا۔ یوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آکر خوشامد کر رہا ہے' حرام خور کہیں کا۔ بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا۔ طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے۔ مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنیئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیوں کر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام سے ڈھنڈورا پیٹتا جاتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے کسی نے چار آنے۔ ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دیا اور کسی نے لکڑی' اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے۔ ادھر لوگ بانس واس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش آآ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے کیوں مادھو؟"

مادھو بولا۔ "ہاں لکڑی تو بہت ہے' اب کپھن چاہیے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کپھن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا لاش اُٹھتے اُٹھتے رات ہو جائے گی۔ رات کو کپھن کون دیکھتا ہے۔"

"کیسا برا رواج ہے کہ جسے جیتے جی تن ڈھانکنے کو چیتھڑا بھی نہ ملے اسے مرنے پر نیا کپھن چاہیے۔"

"کپھن لاس کے ساتھ جل تو جاتا ہے۔"

"اور کیا رکھا ہے' یہی پانچ روپیہ ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں اِدھر اُدھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آپہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے اور ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے۔ پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب کی لی۔ کچھ گزک اور دونوں برآمدے میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کُجیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ "کپھن لگانے سے کیا ملتا' جل ہی تو جاتا' کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔

"دنیا کا دستور ہے۔ یہی لوگ بامنوں کو ہجاروں کیوں دیتے ہیں۔ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے کہ نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں' ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے۔"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دیں گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے کہ روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا۔ اس غیر متوقع خوش نصیبی پر قدرت کو اس طرح شکست دینے پر بولا۔

"بڑی اچھی تھی بیچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹ کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے تھے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا' نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پُن نہ ہو گا۔"

مادھو نے فرطِ عقیدت سے سر جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہِردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔

"کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پُر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے۔؟"

"کہیں گے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے کہ اسے کفن نہ ملے گا' تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال کیا دنیا میں گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کفن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا بولا۔ "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں۔"

"کون دے گا۔ بتاتے کیوں نہیں۔"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کپھن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی' مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا' کوئی لہکتا تھا' کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا۔ کوئی اپنے دوست کے منہ سے ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا' ہوا میں نشہ' کتنے تو چلّو میں الّو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آئے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لیے' شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لیے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مُردہ ہیں یا زندہ درگور۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزا لے لے کر چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں' پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتّل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی

طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "پینے" کے غرور' ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ "لے جا کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی تھی وہ تو مر گئی مگر تیرا اسیر بادا سے جرور پہنچ جائے گا۔ رُوئیں رُوئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں' کسی کو دبایا نہیں۔ مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لاسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ میں جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لیے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بدلا۔ تلوّن نشے کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا۔

مادھو بولا۔ "مگر دادا بچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی تو کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹا! کھُس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی۔ جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محوِ تماشا تھا اور یہ دونوں مے کش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی' کودے بھی' گرے بھی' مٹکے بھی' بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

شطرنج کے کھلاڑی

(1)

نواب واجد علی شاہ کا زمانہ تھا۔ لکھنؤ عیش و عشرت کے رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ چھوٹے بڑے سب رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ کہیں نشاط کی محفلیں آراستہ تھیں۔ کوئی افیون کی پینک کے مزے لیتا تھا۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں رندی و مستی کا زور تھا۔ امورِ سیاست میں' شعر و سخن میں' طرزِ معاشرت میں' صنعت و حرفت میں' تجارت و تبادلہ میں سبھی جگہ نفس پرستی کی دہائی تھی۔ اراکینِ سلطنت مے خواری کے غلام ہو رہے تھے۔ شعراء بوسہ و کنار میں مست' اہلِ حرفہ کلابتو اور چکن بنانے میں' اہلِ سیف تیتر بازی میں' اہلِ روزگار سرمہ و مسّی' عطر و تیل کی خرید و فروخت کا دلدادہ' غرض سارا ملک نفس پروری کی بیڑیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ سب کی آنکھوں میں ساغر و جام کا نشہ چھایا ہوا تھا دنیا میں کیا ہو رہا ہے' علم و حکمت کن کن ایجادوں میں مصروف ہے' بحر و بر پر مغربی اقوام کس

طرح حاوی ہوتی جاتی ہیں اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ بٹیر لڑ رہے ہیں‘ تیتروں میں پالیاں ہو رہی ہیں‘ کہیں چوسر ہو رہی ہے‘ پوبارہ کا شور مچا ہوا ہے‘ کہیں شطرنج کے معرکے چھڑے ہوئے ہیں۔ فوجیں زیروزبر ہو رہی ہیں۔ نواب کا حال اس سے بھی بدتر تھا۔ ہاں گتوں اور تالوں کی ایجاد ہوتی تھی۔ حظِ نفس کے لیے نئے لٹکے نئے نئے نسخے سوچے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ فقرا خیرات کے پیسے پاتے تو روٹیاں خریدنے کی بجائے مدک اور چنڈو کے مزے لیتے تھے۔ رئیس زادے حاضر جوابی اور بذلہ سنجی کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے اربابِ نشاط سے قلم بند کرتے تھے۔ فکر کو جولاں‘ عقل کو رسا اور ذہن کو تیز کرنے کے لیے شطرنج کیمیا سمجھا جاتا تھا۔ اب بھی اس قوم کے لوگ کہیں کہیں موجود ہیں۔ جو اس دلیل کو بڑے شدومد سے پیش کرتے ہیں۔ اس لیے اگر مرزا سجاد علی اور میر روشن علی اپنی زندگی کا بیشتر حصہ عقل کو تیز کرنے میں صرف کیا کرتے تھے تو کسی ذی فہم کو اعتراض کرنے کا موقع نہ تھا۔ ہاں جہلا انہیں جو چاہیں سمجھیں۔ دونوں صاحبوں کے پاس موروثی جاگیریں تھیں۔ فکرِ معاش سے آزاد تھے۔ آخر اور کرتے ہی کیا۔ طلوعِ سحر ہوتے ہی دونوں صاحب ناشتہ کر کے بساط پر بیٹھ جاتے۔ مہرے بچھا لیتے اور عقل کو تیز کرنا شروع کر دیتے۔ پھر انہیں خبر نہ ہوتی تھی کہ کب دوپہر ہوئی‘ کب سہ پہر اور کب شام۔ گھر سے بار بار آدمی آ کر کہتا تھا کہ کھانا تیار ہے۔ یہاں سے جواب ملتا تھا چلو آتے ہیں‘ دستر خوان بچھاؤ۔ مگر شطرنج کے سامنے قورمے اور پلاؤ کے مزے بھی پھیکے تھے۔ یہاں تک کہ باورچی مجبور ہو کر کھانا کمرے میں ہی رکھ جاتا تھا اور دونوں دوست دونوں کام ساتھ ساتھ کر کے اپنی باریک نظری کا ثبوت دیتے تھے۔ کبھی کبھی کھانا رکھا ہی رہ جاتا۔ اس کی یاد ہی نہ آتی تھی۔ مرزا سجاد علی کے مکان میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا اس لیے انہی کے دیوان خانے میں معرکہ آرائیاں ہوتی تھیں۔ مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ مرزا کے گھر کے اور لوگ اس مشغلہ سے خوش تھے۔ ہرگز نہیں۔ محلّہ کے گھر کے نوکر چاکروں میں‘ مہریوں ماماؤں میں بڑی حاسدانہ حرف گیریاں ہوتی رہتی تھیں۔ بڑا منحوس کھیل ہے۔ گھر کو تباہ کر کے چھوڑتا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کسی کو اس کی چاٹ پڑے۔ آدمی نہ دین کے کام کا رہتا ہے نہ دنیا کے کام کا۔ بس اسے دھوبی کا کتا سمجھو گھر کا نہ گھاٹ کا۔ بُرا مرض ہے۔ ستم یہ تھا کہ بیگم صاحبہ بھی آئے دن اس مشغلہ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتی رہتی تھیں۔ حالانکہ انہیں اس کے موقعے مشکل سے ملتے۔ وہ سوتی ہی رہتی تھیں کہ ادھر بازی جم جاتی تھی۔ رات کو سو جاتی تھیں۔ تب کہیں مرزا جی گھر میں آتے تھے۔ ہاں جولاہے کا غصہ داڑھی پر اتارا کرتی تھیں۔ نوکروں کو جھڑکیاں دیا کرتیں۔ کیا میاں نے پان مانگے ہیں۔ کہہ دو آ کر لے جائیں۔ کیا پاؤں میں مہندی لگی ہوئی ہے۔ کیا کہا ابھی کھانے کی فرصت نہیں ہے؟ کھانا لے جا کر سر پر پٹک دو۔ کھائیں یا کتوں کو کھلائیں۔ یہاں ان کے انتظار میں کون بیٹھا رہے گا۔ مگر لطف یہ تھا کہ انہیں اپنے میاں سے اتنی شکایت نہ تھی‘ جتنی میر صاحب سے۔ وہ میر صاحب کو نکھٹو‘ بگاڑو‘ ٹکڑے خور وغیرہ ناموں سے یاد کیا کرتی تھیں۔ شاید مرزا جی بھی اپنی بریت کے اظہار میں سارا الزام میر صاحب ہی کے سر ڈال دیتے تھے۔

ایک دن بیگم صاحبہ کے سر میں درد ہونے لگا تو ماما سے کہا جا کر مرزا جی کو بلا لا۔ کسی حکیم کے یہاں سے دوا لا دیں۔ دوڑ جلدی کر سر پھٹا جاتا ہے۔ ماما گئی تو مرزا جی نے کہا چل ابھی آتے ہیں۔ بیگم صاحبہ کو اتنی تاب کہاں کہ ان کے سر میں درد ہو اور میاں شطرنج کھیلنے میں مصروف ہوں۔ چہرہ سرخ ہو گیا اور ماما سے کہا جا کر کہہ کہ ابھی چلیئے ورنہ وہ خود حکیم صاحب کے پاس چلی جائیں گی۔ کچھ ان کے آنکھوں دیکھا راستہ نہیں ہے۔ مرزا جی بڑی دلچسپ بازی کھیل رہے تھے۔ دو ہی کشتیوں میں میر صاحب کی مات ہوئی جاتی تھی۔ بولے۔ ”کیا ایسا دم لبوں پر ہے۔ ذرا صبر

نہیں آتا۔ حکیم صاحب چُھومنتر کردیں گے کہ ان کے آتے ہی آتے دردِ سر رفع ہو جائے گا۔"

میر صاحب نے فرمایا۔ "ارے جاکر سن ہی آیئے نا۔ عورتیں نازک مزاج ہوتی ہی ہیں۔"

مرزا جی۔ "ہاں کیوں نہ چلا جاؤں دو کشتیوں میں آپ کی مات ہوئی جاتی ہے۔"

میر صاحب جی۔ "اس بھروسے نہ رہیے گا۔ وہ چال سوچی ہے کہ آپ کے مہرے دھرے کے دھرے رہ جائیں۔ اور مات ہو جائے۔ پر جایئے سن آیئے۔ کیوں خواہ مخواہ ذرا سی بات کے لیے ان کا دل دکھایئے گا۔"

مرزا جی۔ "جی چاہتا ہے اسی بات پر مات کردوں۔"

میر صاحب۔ "میں کھیلوں گا ہی نہیں۔ آپ پہلے جاکر سن آئیں۔"

مرزا جی۔ "ارے یار جانا پڑے گا حکیم کے یہاں۔ دردورد خاک نہیں ہے مجھے دق کرنے کا حیلہ ہے۔"

میر صاحب۔ "کچھ بھی ہو ان کی خاطر کرنی ہی پڑے گی۔"

مرزا جی۔ "اچھا۔ ایک چال اور چل لوں۔"

میر صاحب۔ "ہرگز نہیں جب تک آپ سن نہ آئیں گے مہروں کو ہاتھ نہ لگاؤں گا۔"

مرزا صاحب مجبور ہو کر اندر گئے تو بیگم صاحبہ نے کراہتے ہوئے کہا۔ "تمہیں نگوڑا شطرنج اتنا پیارا ہے کہ چاہے کوئی مر بھی جائے پر اٹھنے کا نام نہیں' شطرنج ہے کہ میری سوکن ہے۔ نوج کوئی تم جیسا نرموہیا ہو۔"

مرزا۔ "کیا کروں۔ میر صاحب مانتے ہی نہ تھے۔ بڑی مشکلوں سے گلا چھڑا کر آیا ہوں۔"

بیگم۔ "کیا جیسے خود نکھٹو ہیں ویسے ہی دوسروں کو سمجھتے ہیں۔ ان کے بھی تو بال بچے ہیں کہ سب کا صفایا کردیا۔"

مرزا۔ "بڑا لتی آدمی ہے جب آکر سر پر سوار ہو جاتا ہے تو مجبور ہو کر مجھے بھی کھیلنا ہی پڑتا ہے۔"

بیگم۔ "دھتکار کیوں نہیں دیتے کتے کی طرح۔"

مرزا۔ "سبحان اللہ برابر کے آدمی ہیں۔ عمر میں' رتبہ میں مجھ سے دو انگل اونچے۔ ملاحظہ کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تو میں ہی دھتکارے دیتی ہوں۔ ناراض ہو جائیں گے۔ کون میری روٹیاں چلاتے ہیں۔ رانی روٹھیں گی اپنا سہاگ لیں گی۔ (ماما سے) عباسی' شطرنج اٹھالا۔ میر صاحب سے کہہ دینا' میاں اب نہ کھیلیں گے۔ آپ تشریف لے جائیں۔ اب پھر منہ نہ دکھایئے گا۔"

مرزا۔ "ہائیں ہائیں کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ کیا ذلیل کراؤ گی۔ ٹھہر عباسی' کمبخت کہاں دوڑی جاتی ہے۔"

بیگم۔ "جانے کیوں نہیں دیتے میرا ہی خون پیئے جو روکے' اچھا اسے روک لیا۔ مجھے روک لو تو جانوں۔"

یہ کہہ کر بیگم صاحبہ خود جھلّائی ہوئی دیوان خانہ کی طرف چلیں۔ مرزا جی کا چہرہ فق ہو گیا۔ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ بیوی کی منتیں کرنے لگے۔ خدا کے لیے تمہیں شہیدِ کربلا کی قسم۔ میری ہی میّت دیکھے جو ادھر قدم رکھے لیکن بیگم صاحبہ نے ایک نہ مانی' دیوان خانہ کے دروازہ تک گئیں۔ یکایک نامحرم کے روبرو بے نقاب جاتے ہوئے پیر رک گئے۔ وہیں سے اندر کی طرف جھانکا' حسنِ اتفاق سے کمرہ خالی تھا۔ میر صاحب نے حسبِ ضرورت دو چار مہرے تبدیل کردیئے تھے۔ اس وقت اپنی صفائی جتانے کے لیے باہر چبوترہ پر چہل قدمی کر رہے تھے پھر کیا تھا بیگم صاحبہ کو منہ مانگی مراد ملی۔ اندر پہنچ کر بازی الٹ دی۔ مہرے کچھ تخت کے نیچے پھینکے کچھ باہر۔ تب دروازہ اندر سے بند کر کے کنڈی لگادی۔ میر صاحب دروازے پر تو تھے ہی مہرے باہر پھینکے جاتے دیکھے۔ پھر چوڑیوں کی جھنکار سنی تو

سمجھ گئے بیگم صاحبہ بگڑ گئیں۔ چپکے سے گھر کی راہ لی۔

مرزا نے بیگم صاحبہ سے کہا۔ "تم نے غضب کر دیا۔"

بیگم۔ "اب مُوا ادھر آئے تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔ گھر نہیں چکلا سمجھ لیا ہے۔ اتنی لو اگر خدا سے ہو تو ولی ہو جاتے۔ آپ لوگ تو شطرنج کھیلیں' میں یہاں چولہے چکی میں سر کھپاؤں۔ لونڈی سمجھ رکھا ہے۔ جاتے ہو حکیم صاحب کے یہاں کہ اب بھی تامل ہے؟"

مرزا جی گھر سے نکلے تو حکیم صاحب کے یہاں کے بدلے میر صاحب کے گھر پہنچے تو معذرت آمیز لہجہ میں یہ دل پُر درد ماجرا کہہ سنایا۔

میر صاحب ہنس کر بولے۔ "اتنا تو میں اسی وقت سمجھ گیا تھا جب دردِ سر کا پیغام ماما لائی تھی کہ آج آثار اچھے نہیں ہیں۔ مگر بڑی غصہ ور معلوم ہوتی ہیں۔ اُف اتنی تمکنت' آپ نے انہیں بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ یہ مناسب نہیں۔ انہیں اس سے کیا مطلب کہ آپ باہر کیا کرتے ہیں۔ خانہ داری کا انتظام کرنا ان کا کام ہے۔ مردوں کی باتوں میں دخل دینے کا انہیں کیا مجال۔ میرے یہاں دیکھئے کبھی کوئی چُوں بھی نہیں کرتا۔"

مرزا۔ "خیر اب یہ بتائیے 'اب جماؤ کہاں ہوگا۔"

میر۔ "اس کا کیا غم ہے اتنا بڑا گھر پڑا ہوا ہے بس یہیں جمے گی۔"

مرزا۔ "لیکن بیگم صاحبہ کو کیسے مناؤں گا۔ جب گھر پر بیٹھا رہتا تھا تب تو اتنی خفگی تھی۔ گھر سے چلا آؤں تو شاید زندہ نہ چھوڑیں۔"

میر۔ "اجی بکنے دیجیے۔ دو چار دن میں خود بخود سیدھی ہو جائیں گی۔ ہاں آپ بھی ذرا تن جائیے۔"

(2)

میر صاحب کی بیگم صاحبہ کسی وجہ سے میر صاحب کا گھر سے غائب رہنا ہی پسند کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ان کے مشغلۂ تفریح کا مطلق گلہ نہ کرتی تھیں۔ بلکہ کبھی کبھی انہیں جانے میں دیر ہو جاتی یا کچھ الکساتے تو سرود یہ مستان یاد دہانیدن کے مصداق انہیں آگاہ کر دیا کرتی تھیں۔ ان وجوہ سے میر صاحب کو گماں ہو گیا تھا کہ میری بیگم صاحبہ نہایت خلیق' متحمل مزاج اور عفت کیش ہیں۔ لیکن جب ان کے دیوان خانہ میں بساط بچھنے لگی اور میر صاحب کی دائمی موجودگی سے بیگم صاحبہ کی آزادی میں ہرج پیدا ہونے لگا تو انہیں بڑی تشویش دامن گیر ہوئی۔ دن کے دن دروازہ جھانکنے کو ترس جاتی تھیں۔ سوچنے لگیں کیونکر یہ بلا سر سے ٹلے۔

ادھر نوکروں میں بھی یہ کانا پھوسی ہونے لگی۔ اب تک دن بھر پڑے پڑے خراٹے لیتے تھے۔ گھر میں کوئی آئے کوئی جائے ان سے مطلب تھا نہ سروکار۔ مشکل سے دو چار دفعہ بازار جانا پڑتا۔ اب آٹھوں پہر کی دھونس ہو گئی۔ کبھی پان لگانے کا حکم ہوتا۔ کبھی پانی لانے' کبھی برف لانے کا' کبھی تمباکو بھرنے کا۔ حقّہ تو کسی دل جلے عاشق کی طرح ہر دم گرم رہتا تھا۔ سب جا کر بیگم صاحبہ سے کہتے۔ "حضور میاں کا شطرنج تو ہمارے جی کا جنجال ہو گیا۔ دن بھر دوڑتے دوڑتے پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ یہ بھی کوئی کھیل ہے کہ صبح کو بیٹھے تو شام کر دی۔ گھڑی دو گھڑی کھیل لیا چلو چھٹی ہوئی اور پھر حضور تو جانتی ہیں کہ کتنا منحوس کھیل ہے۔ جسے اس کی چاٹ پڑ جاتی ہے کبھی

نہیں پنپتا۔ گھر پر کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک کے پیچھے محلے کے محلے تباہ ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ محلے والے ہر دم ہمیں لوگوں کو ٹوکا کرتے ہیں۔ شرم سے گڑ جانا پڑتا ہے۔" بیگم صاحبہ کہتیں۔ "مجھے تو یہ کھیل خود ایک آنکھ نہیں بھاتا' پر کیا کروں میرا کیا بس ہے۔"

محلّہ میں دو چار بڑے بوڑھے تھے' وہ طرح طرح کی بدگمانیاں کرنے لگے۔ اب خیریت نہیں' ہمارے رئیسوں کا یہ حال ہے تو ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔ یہ سلطنت شطرنج کے ہاتھوں تباہ ہوگی۔ لچھّن برے ہیں۔

ملک میں واویلا مچا ہوا تھا۔ رعایا دن دہاڑے لٹتی تھی پر کوئی اس کی فریاد سننے والا نہ تھا۔ دیہاتوں کی ساری دولت لکھنؤ میں کھچی چلی آتی تھی اور یہاں سامانِ عیش کے بہم پہنچانے میں صَرف ہو جاتی تھی۔ بھانڈ' نقال' کتھک' اربابِ نشاط کی گرم بازاری تھی۔ ساقنوں کی دکانوں پر اشرفیاں برستی تھیں۔ رئیس زادے ایک ایک دم کی ایک ایک اشرفی پھینک دیتے تھے۔ مصارف کا یہ حال اور انگریزی کمپنی کا قرضہ روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ادائیگی کی کسی کو فکر نہ تھی۔ یہاں تک کہ سالانہ خراج بھی ادا نہ ہوسکتا تھا۔ ریزیڈنٹ بار بار تاکیدی خطوط لکھتا۔ دھمکیاں دیتا مگر یہاں لوگوں پر نفس پروری کا نشہ سوار تھا کسی کے کان پر جوں نہ رینگتی تھی۔

خیر میر صاحب کے دیوان خانے میں شطرنج ہوتے کئی مہینے گزر گئے۔ نت نئے نقشے حل کیے جاتے۔ نئے نئے قلعے تعمیر ہوتے اور مسمار کیے جاتے' کبھی کبھی کھیلتے کھیلتے آپس میں جھڑپ ہو جاتی' تُو تُو مَیں مَیں کی نوبت پہنچ جاتی۔ پر یہ شکر رنجیاں بہت جلد رفع ہو جاتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ مرزا جی روٹھ کر اپنے گھر چلے جاتے۔ میر صاحب بساط اٹھا کر اپنے گھر میں آ بیٹھتے اور قسمیں کھاتے کہ اب کبھی شطرنج کے نزدیک نہ جائیں گے مگر صبح ہوتے ہی دونوں دوست پھر مل بیٹھتے۔ نیند ساری بدمزگیوں کو دور کر دیتی تھی۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے شطرنج کے دلدل میں غوطے کھا رہے تھے کہ شاہی رسالہ کا ایک سوار وردی پہنے اسلحہ سے لیس میر صاحب کا نام پوچھتا آ پہنچا۔ میر صاحب کے حواس اڑے۔ اوسان خطا ہو گئے۔ خدا جانے کیا بلا سر پر آئی۔ گھر کے دروازے بند کر لیے اور نوکروں سے کہا۔ "گھر میں نہیں ہیں۔"

سوار نے کہا۔ "گھر میں نہیں ہیں تو کہاں ہیں' کہیں چھپے بیٹھے ہوں گے۔"

خدمت گار۔ "میں یہ نہیں جانتا گھر میں سے یہی جواب ملا ہے کیا کام ہے۔"

سوار۔ "کام تجھے کیا بتاؤں' حضور میں طلبی ہے۔ شاید فوج کے لیے کچھ سپاہی مانگے گئے ہیں۔ جاگیر دار ہیں کہ مذاق ہے۔"

خدمت گار۔ "اچھا تشریف لے جایئے۔ کہہ دیا جائے گا۔"

سوار۔ "کہنے سننے کی بات نہیں۔ میں کل پھر آؤں گا اور تلاش کر کے لے جاؤں گا۔ اپنے ہمراہ حاضر کرنے کا حکم ہوا ہے۔"

سوار تو چلا گیا۔ میر صاحب کی روح فنا ہو گئی۔ کانپتے ہوئے مرزا جی سے بولے۔ "اب کیا ہوگا۔"

مرزا۔ "بڑی مصیبت ہے کہیں میری طلبی بھی نہ ہو۔"

میر۔ "کمبخت کل پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔"

مرزا۔ "قہر آسمانی ہے اور کیا کہیں۔ سپاہیوں کی مانگ ہو تو بِن موت مرے۔ یہاں تو جنگ کا نام سنتے ہی تپ چڑھ آتی ہے۔"

میر۔ ''یہاں تو آج سے دانہ پانی حرام سمجھئے۔''

مرزا۔ ''بس یہی تدبیر ہے کہ اس سے ملیے ہی نہیں۔ دونوں آدمی غائب ہو جائیں۔ سارا شہر چھانتا پھرے۔ کل سے گومتی پار کسی ویرانے میں نقشہ جمے۔ وہاں کسے خبر ہو گی۔ حضرت اپنا سامنہ لے کر لوٹ جائیں گے۔''

میر۔ ''بس بس آپ کو خوب سوجھی۔ واللہ کل سے گومتی پار کی ٹھہرے۔''

ادھر بیگم صاحبہ سوار سے کہہ رہی تھیں۔ ''تم نے خوب بہروپ بھرا۔''

اس نے جواب دیا۔ ''ایسے گاؤدیوں کو تو چٹکیوں پر نچاتا ہوں۔ اس کی ساری عقل اور ہمت تو شطرنج نے چرلی۔ اب دیکھ لینا جو کبھی بھول کر بھی گھر رہے۔ صبح کا گیا پھر رات کو آئے گا۔''

(3)

اس دن سے دونوں دوست منہ اندھیرے گھر سے نکل کھڑے ہوتے اور بغل میں ایک چھوٹی سی دری دبائے' ڈبّے میں گلوریاں بھرے' گومتی پار ایک پرانی ویران مسجد میں جابیٹھتے جو شاید عہدِ مغلیہ کی یادگار تھی۔ راستہ میں' تمباکو' مدریا لے لیتے اور مسجد میں پہنچ' دری بچھا' حقّہ بھر کر بساط پر جابیٹھتے۔ پھر انہیں دین دنیا کی فکر نہ رہتی تھی۔ کشت شہ پٹ لیا۔ ان الفاظ کے سوا ان کے منہ سے اور کوئی کلمہ نہ نکلتا تھا۔ کوئی چِلّہ کش بھی اتنے استغراق کی حالت میں نہ بیٹھتا تھا۔ دوپہر کو جب بھوک معلوم ہوتی تو دونوں حضرت گلیوں میں ہوتے ہوئے کسی نانبائی کی دکان پر کھانا کھالیتے اور چلم حقّہ پی کر پھر محوِ شطرنج بازی۔ کبھی کبھی تو انہیں کھانے کی سُدھ نہ رہتی تھی۔

ادھر ملک میں سیاسی پیچیدگیاں روز بروز پیچیدہ ہوتی جاتی تھیں۔ کمپنی کی فوجیں لکھنؤ کی طرف بڑھی چلی آتی تھیں۔ شہر میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ لوگ اپنے اپنے بال بچوں کو لے کر دیہاتوں میں بھاگے جا رہے تھے۔ پر ہمارے دونوں شطرنج باز دوستوں کو غمِ دزدا اور غمِ کالا سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ گھر سے چلتے تو گلیوں میں ہو جاتے' کہیں کسی کی نگاہ نہ پڑ جائے۔ محلے والوں کو بھی ان کی صورت نہ دکھائی دیتی تھی۔ یہاں تک کہ انگریزی فوجیں لکھنؤ کے قریب پہنچ گئیں۔

ایک دن دونوں احباب بیٹھے بازی کھیل رہے تھے۔ میر صاحب کی بازی کچھ کمزور تھی۔ مرزا صاحب انہیں کشت پر کشت دے رہے تھے کہ دفعتاً کمپنی کی فوج سڑک پر سے آتی ہوئی دکھائی دی۔ کمپنی نے لکھنؤ پر تصرف کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قرض کی علّت میں سلطنت ہضم کر لینا چاہتی تھی۔ وہی مہاجنی چال چلی جس سے آج ساری کمزور قومیں پابہ زنجیر ہو رہی ہیں۔

میر صاحب۔ ''انگریزی فوجیں آ رہی ہیں۔''

مرزا۔ ''آنے دیجیے۔ کشت بچائیے۔ یہ کشت۔''

میر۔ ''ذرا دیکھنا چاہیے۔ آڑ سے دیکھیں کیسے قوی ہیکل جوان ہیں' دیکھ کر سینہ تھراتا ہے۔''

مرزا۔ ''دیکھ لیجئے گا کیا جلدی ہے۔ پھر کشت۔''

میر۔ ''توپ خانہ بھی ہے۔ کوئی پانچ ہزار آدمی ہوں گے۔ سرخ چہرہ جیسے لال بندر۔''

مرزا۔ ''جناب حیلے نہ کیجئے۔ یہ کشت۔''

میر۔ ”آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خیال تو کیجئے۔ شہر کا محاصرہ ہو گیا تو گھر کیسے چلیں گے۔“
مرزا۔ ”جب گھر چلنے کا وقت آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ یہ کشت اور مات۔“
فوج نکل گئی۔ یاروں نے دوسری بازی بچھادی۔ مرزا جی بولے۔ ”آج کھانے کی کیسی رہے گی۔“
میر۔ ”آج روزہ ہے کیا آپ کو زیادہ بھوک لگی ہے۔“
مرزا۔ ”جی نہیں۔ شہر میں نامعلوم کیا ہو رہا ہو گا۔“
میر۔ ”شہر میں کچھ نہیں ہو رہا ہو گا۔ لوگ کھانے سے فارغ ہو کر آرام کر رہے ہوں گے۔ حضور جانِ عالم بھی استراحت فرماتے ہوں گے یا شاید ساغر کا دور چل رہا ہو گا۔“

اب کے دونوں دوست کھیلنے بیٹھے تو تین بج گئے۔ اب کے مرزا جی کی بازی کمزور تھی۔ اسی اثنا میں فوج کی واپسی کی آہٹ ملی۔ نواب واجد علی شاہ معزول کر دیئے گئے تھے۔ اور فوج انہیں گرفتار کیے لیے جاتی تھی۔ شہر میں کوئی ہنگامہ نہ ہوا نہ کشت خون۔ یہاں تک کہ کسی جانباز نے ایک قطرہ خون بھی نہ بہایا۔ نواب گھر سے اس طرح رخصت ہوئے جیسے لڑکی روتی پیٹتی سسرال جاتی ہے۔ بیگمیں روئیں' نواب زادے' مامائیں' مغلانیاں روئیں اور بس سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ ازل سے کسی بادشاہ کی معزولی اتنی صلح آمیز' اتنی بے ضرر نہ ہوئی ہو گی۔ کم از کم تاریخ میں اس کی نظیر نہیں۔ یہ وہ اہنسانہ تھی جس پر ملائک خوش ہوتے ہیں۔ یہ وہ پست ہمتی' وہ نامردی تھی جس پر دیویاں روتی ہیں۔ لکھنؤ کا فرمانروا قیدی بنا چلا جاتا تھا اور لکھنؤ عیش کی نیند میں مست تھا۔ یہ سیاسی زوال کی انتہائی حد تھی۔

مرزا نے کہا۔ ”حضورِ عالی کو ظالموں نے قید کر لیا ہے۔“
میر۔ ”ہو گا۔ آپ کوئی قاضی ہیں یہ لیجئے شہ۔“
مرزا۔ ”حضرت ذرا ٹھہریئے۔ اس وقت بازی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوتی۔ حضورِ عالی خون کے آنسو روتے جاتے ہوں گے۔ لکھنؤ کا چراغ آج گل ہو گیا۔“
میر۔ ”رویا ہی چاہئیں۔ یہ عیش قیدِ فرنگ میں کہاں میسّر۔ یہ شہ۔“
مرزا۔ ”کسی کے دن ہمیشہ برابر نہیں جاتے۔ کتنی سخت مصیبت میں ہے بلائے آسمانی۔“
میر۔ ”ہاں ہے ہی۔ پھر کشت بس دوسری کشت میں مات ہے۔ بچ نہیں سکتے۔“
مرزا۔ ”آپ بڑے بے درد ہیں۔ واللہ ایسا حادثہ جانکاہ دیکھ کر آپ کو صدمہ نہیں ہوتا۔ ہائے حضور جانِ عالم کے بعد اب کمال کا کوئی قدردان نہ رہا۔ لکھنؤ ویران ہو گیا۔“
میر۔ ”پہلے اپنے بادشاہ کی جان بچایئے پھر حضور پُرنور کا ماتم کیجئے۔ یہ کشت اور مات' لانا ہاتھ۔“

نواب کو لیے ہوئے فوج سامنے سے نکل گئی۔ ان کے جاتے ہی مرزا جی نے نئی بازی بچھادی۔ ہار کی چوٹ بُری ہوتی ہے۔ میر صاحب نے کہا آیئے نواب صاحب کی حالتِ زار پر ایک مرثیہ کہہ ڈالیں۔ لیکن مرزا جی کی وفاداری اور اطاعت شعاری اپنی ہار کے ساتھ غائب ہو گئی تھی۔ وہ شکست کا انتقام لینے کے لیے بے صبر ہو رہے تھے۔

(4)

شام ہو گئی۔ مسجد کے کھنڈر میں چمگادڑوں نے اذان دینا شروع کر دی۔ ابابیلیں اپنے اپنے گھونسلوں سے

چمٹ کر نماز مغرب ادا کرنے لگیں۔ پر دونوں کھلاڑی بازی پر ڈٹے ہوئے تھے۔ گویا دو خون کے پیاسے سورما موت کی بازی کھیل رہے ہوں۔ مرزا متواتر تین بازیاں ہار چکے تھے۔ اب چوتھی بازی کا بھی رنگ اچھا نہ تھا۔ وہ بار بار جیتنے کا مستقل ارادہ کر کے خوب سنبھل کر طبیعت پر زور دے دے کر کھیلتے تھے لیکن ایک نہ ایک چال ایسی خراب پڑ جاتی تھی کہ ساری بازی بگڑ جاتی۔ ادھر میر صاحب غزلیں پڑھتے تھے۔ ٹھمریاں گاتے تھے۔ چٹکیاں لیتے تھے۔ آوازیں کستے تھے۔ ضلع اور جگت میں کمال دکھاتے تھے۔ ایسے خوش تھے گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا ہے۔ مرزا صاحب ان کی یہ خوش فہمیاں سن سن کر جھنجھلاتے تھے اور بار بار تیوری چڑھا کر کہتے 'آپ چال نہ تبدیل کیا کیجئے۔ یہ کیا کہ چال چلے اور فوراً بدل دی۔ جو کچھ کرنا ہو ایک بار خوب غور کر کے کیجئے۔ جناب آپ مہرے پر انگلی کیوں رکھے رہتے ہیں۔ مہرے کو بے لاگ چھوڑ دیا کیجئے۔ جب تک چال کا فیصلہ نہ ہو جائے مہرے کو ہاتھ نہ لگایا کیجئے۔ حضرت آپ ایک چال آدھ آدھ گھنٹے میں کیوں چلتے ہیں۔ اس کی سند نہیں جس کی ایک چال میں پانچ منٹ سے زیادہ لگے 'اس کی مات سمجھی جائے۔ پھر آپ نے چال بدلی مہرہ وہیں رکھ دیجیے۔

میر صاحب کا فرزین پٹا جاتا تھا۔ "بولے میں نے چال چلی کب تھی۔"

مرزا۔ "آپ کی چال ہو چکی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ مہرہ اسی گھر میں رکھ دیجیے۔"

میر۔ "اس گھر میں کیوں رکھوں؟ میں نے مہرے کو ہاتھ سے چھوا کب تھا۔"

مرزا۔ "آپ قیامت تک مہرے کو نہ چھوئیں تو کیا چال ہی نہ ہو گی۔ فرزین پٹتے دیکھا تو دھاندلی کرنے لگے۔"

میر۔ "دھاندلی آپ کرتے ہیں۔ ہار جیت تقدیر سے ہوتی ہے۔ دھاندلی کرنے سے کوئی نہیں جیتا۔"

مرزا۔ "یہ بازی آپ کی مات ہو گی۔"

میر۔ "میری مات کیوں ہونے لگی۔"

مرزا۔ "تو آپ مہرہ اس گھر میں رکھ دیجیے جہاں پہلے رکھا تھا۔"

میر۔ "وہاں کیوں رکھوں۔ نہیں رکھتا۔"

مرزا۔ "آپ کو رکھنا پڑے گا۔"

میر۔ "ہرگز نہیں۔"

میرزا۔ "رکھیں گے تو آپ کے فرشتے۔ آپ کی حقیقت ہی کیا ہے۔"

بات بڑھ گئی۔ دونوں اپنے ٹیک کے دھنی تھے۔ نہ یہ دبتا تھا نہ وہ۔ تکرار میں لامحالہ غیر متعلق باتیں ہونے لگتی ہیں جن کا منشا ذلیل اور خفیف کرنا ہوتا ہے۔ مرزا جی نے فرمایا۔ "اگر خاندان میں کسی نے شطرنج کھیلا ہوتا تو آپ آئین اور قاعدے سے واقف ہوتے۔ وہ ہمیشہ گھانس چھیلا کیے آپ کیا کھا کر شطرنج کھیلئے گا۔ ریاست شے دیگر ہے۔ جاگیر مل جانے سے کوئی رئیس نہیں ہو جاتا۔"

میر۔ "گھانس آپ کے ابا جان چھیلتے ہوں گے۔ یہاں تو شطرنج کھیلتے پیڑھیاں اور پشتیں گزر گئیں۔"

مرزا۔ "اجی جائیے۔ نواب غازی الدین کے یہاں باورچی گیری کرتے کرتے عمر گزر گئی۔ اس طفیل جاگیر پا گئے۔ آج رئیس بننے کا شوق چڑھ آیا ہے۔ رئیس بننا دل لگی نہیں ہے۔"

میر۔ "کیوں اپنے بزرگوں کے منہ میں کالکھ لگا رہے ہو۔ وہی باورچی رہے ہوں گے۔ ہمارے بزرگ تو نواب کے دستر خوان پر بیٹھتے تھے۔ ہم نوالہ و ہم پیالہ تھے۔"

مرزا۔ "بے حیاؤں کو شرم بھی نہیں آتی۔"

میر۔ "زبان سنبھالیے ورنہ برا ہوگا۔ یہاں ایسی باتیں سننے کے عادی نہیں ہیں۔ کسی نے آنکھ دکھائی اور ہم نے دیا ٹلا ہوا ہاتھ۔ بھنڈار کھل گئے۔"

مرزا۔ "آپ ہمارے حوصلے دیکھیں گے۔ تو سنبھل جائیے۔ تقدیر آزمائی ہو جائے۔"

میر۔ "ہاں آجاؤ۔ تم سے دبتا کون ہے۔"

دونوں دوستوں نے کمر سے تلواریں نکالیں۔ ان دنوں ادنیٰ و اعلیٰ سبھی کٹار خنجر، قبض، شیر پنجہ باندھتے تھے۔ دونوں عیش کے بندے تھے مگر بے غیرت نہ تھے۔ قومی دلیری ان میں عنقا تھی۔ مگر ذاتی دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ان کے سیاسی جذبات فنا ہو گئے تھے۔ بادشاہ کے لیے 'سلطنت کے لیے' قوم کے لیے کیوں مریں۔ کیوں اپنی میٹھی نیند میں خلل ڈالیں۔ مگر انفرادی جذبات میں مطلق خوف نہ تھا۔ بلکہ وہ قوی ہو گئے تھے۔ دونوں پینترے بدلے لکڑی اور گتکہ کھیلے ہوئے تھے۔ تلواریں چمکیں۔ چھپا چھپ کی آواز آئی اور دونوں زخم کھا کر گر پڑے۔ دونوں نے وہیں تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ اپنے بادشاہ کے لیے جن کی آنکھوں سے ایک بوند آنسو کی نہ گری۔ انہی دونوں آدمیوں نے شطرنج کے وزیر کے لیے اپنی گردنیں کٹا دیں۔

اندھیرا ہو گیا تھا۔ بازی بچھی ہوئی تھی۔ دونوں بادشاہ اپنے اپنے تخت پر رونق افروز تھے۔ ان پر حسرت چھائی ہوئی تھی۔ گویا مقتولین کی موت کا ماتم کر رہے تھے۔

چاروں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ کھنڈر کی پوشیدہ دیواریں اور خستہ حال کنگرے اور سربسجود مینار ان لاشوں کو دیکھتے تھے اور انسانی زندگی کی بے ثباتی پر افسوس کرتے تھے۔ جس میں سنگ و خشت کا ثبات بھی نہیں۔

عیدگاہ

رمضان کے پورے تیس روزوں کے بعد آج عید آئی۔ کتنی سہانی اور رنگین صبح ہے۔ بچّے کی طرح پُر تبسم درختوں پر کچھ عجیب ہریاول ہے۔ کھیتوں میں کچھ عجیب رونق ہے۔ آسمان پر کچھ عجیب فضا ہے۔ آج کا آفتاب دیکھو' کتنا پیارا ہے گویا دنیا کو عید کی خوشی پر مبارکباد دے رہا ہے۔ گاؤں میں کتنی چہل پہل ہے۔ عیدگاہ جانے کی دھوم ہے۔ کسی کے کُرتے میں بٹن نہیں ہیں تو سوئی تاگا لینے دوڑا جا رہا ہے۔ کسی کے جوتے سخت ہو گئے ہیں' اسے تیل اور پانی سے نرم کر رہا ہے۔ جلدی جلدی بیلوں کو سانی پانی دے دیں۔ عیدگاہ سے لوٹتے لوٹتے دوپہر ہو جائے گی۔ تین کوس کا پیدل راستہ پھر سینکڑوں رشتے قرابت والوں سے ملنا ملانا۔ دوپہر سے پہلے لوٹنا غیر ممکن ہے۔ لڑکے سب سے زیادہ خوش ہیں۔ کسی نے ایک روزہ رکھا' وہ بھی دوپہر تک۔ کسی نے وہ بھی نہیں۔ لیکن عیدگاہ جانے کی خوشی ان کا حصہ ہے۔ روزے بڑے بوڑھوں کے لیے ہوں گے۔ بچوں کے لیے تو عید ہے۔ روز عید کا نام رٹتے تھے آج وہ آگئی۔ اب جلدی پڑی ہوئی ہے کہ عیدگاہ کیوں نہیں چلتے۔ انہیں گھر کی فکروں سے کیا واسطہ؟ سیویوں کے لیے گھر

میں دودھ اور شکر میوے ہیں یا نہیں۔ اس کی انہیں کیا فکر؟ وہ کیا جانیں۔ ابا کیوں بد حواس گاؤں کے مہاجن چودھری قاسم علی کے گھر دوڑے جا رہے ہیں۔ ان کی اپنی جیبوں میں تو قارون کا خزانہ رکھا ہوا ہے۔ بار بار جیب سے اپنا خزانہ نکال کر گنتے ہیں۔ دوستوں کو دکھاتے ہیں اور خوش ہو کر رکھ لیتے ہیں۔ ان ہی دو چار پیسوں میں دنیا کی سات نعمتیں لائیں گے۔ کھلونے اور مٹھائیاں اور بگل۔

اور سب سے زیادہ خوش ہے حامد۔ وہ چار سال کا غریب صورت بچہ ہے جس کا باپ پچھلے سال ہیضہ کی نذر ہو گیا تھا اور ماں نہ جانے کیوں زرد ہوتی ہوتی ایک دن مر گئی۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ بیماری کیا ہے۔ کہتی کس سے' کون سننے والا تھا؟ دل پر جو گزرتی تھی سہتی تھی۔ اور جب نہ سہا گیا تو دنیا سے رخصت ہو گئی۔ اب حامد اپنی بوڑھی دادی امینہ کی گود میں سوتا ہے اور اتنا ہی خوش ہے۔ اس کے ابا جان بڑی دور روپے کمانے گئے تھے۔ بہت سی تھیلیاں لے کر آئیں گے۔ امی جان اللہ میاں کے گھر مٹھائی لینے گئی ہیں۔ اس لیے خاموش ہے۔ حامد کے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔ سر پر ایک پرانی دھرانی ٹوپی ہے جس کا گوٹہ سیاہ ہو گیا ہے۔ پھر بھی وہ خوش ہے۔ جب اس کے ابا جان تھیلیاں اور اماں جان نعمتیں لے کر آئیں گے تب وہ دل کے ارمان نکالے گا۔ تب دیکھے گا کہ محمود اور محسن' آذر اور سمیع کہاں سے اتنے پیسے لاتے ہیں۔ دنیا میں مصیبتوں کی ساری فوج لے کر آئے' اس کی ایک نگاہِ معصوم اسے پامال کرنے کے لیے کافی ہے۔

حامد اندر جا کر امینہ سے کہتا ہے۔ "تم ڈرنا نہیں اماں' میں گاؤں والوں کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔ بالکل نہ ڈرنا۔" لیکن امینہ کا دل نہیں مانتا۔ گاؤں کے بچے اپنے اپنے باپ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ حامد کیا اکیلا ہی جائے گا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کہیں کھو جائے تو کیا ہو۔ نہیں امینہ اسے تنہا نہ جانے دے گی۔ ننھی سی جان۔ تین کوس چلے گا۔ پاؤں میں چھالے نہ پڑ جائیں گے۔

مگر وہ چلی جائے تو یہاں سیویاں کون پکائے گا۔ بھوکا پیاسا دوپہر کو لوٹے گا' کیا اس وقت سیویاں پکانے بیٹھے گی۔ رونا تو یہ ہے کہ امینہ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے فہمین کے کپڑے سیئے تھے۔ آٹھ آنے پیسے ملے تھے۔ اس اٹھنی کو ایمان کی طرح بچاتی چلی آئی تھی اس عید کے لیے' لیکن گھر میں پیسے اور نہ تھے اور گوالن کے پیسے اور چڑھ گئے تھے۔ دینے پڑے۔ حامد کے لیے روز دو پیسے کا دودھ تو لینا پڑتا ہے۔ اب کل دو آنے پیسے بچ رہے ہیں۔ تین پیسے حامد کی جیب میں اور پانچ امینہ کے بٹوے میں۔ یہی بساط ہے۔ اللہ ہی بیڑا پار کرے گا۔ دھوبن مہترانی اور نائن بھی تو آئیں گی۔ سب کو سیویاں چاہئیں۔ کس کس سے منہ چھپائے؟ سال بھر کا تہوار ہے۔ زندگی خیریت سے رہے۔ ان کی تقدیر بھی تو اس کے ساتھ ہے۔ بچے کو خدا سلامت رکھے یہ دن بھی یوں ہی کٹ جائیں گے۔

گاؤں سے لوگ چلے اور حامد بھی بچوں کے ساتھ تھا۔ سب کے سب دوڑ کر نکل جاتے۔ پھر کسی درخت کے نیچے کھڑے ہو کر ساتھ والوں کا انتظار کرتے۔ یہ لوگ کیوں اتنے آہستہ آہستہ چل رہے ہیں۔

شہر کا سرا شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں طرف امیروں کے باغ ہیں۔ پختہ چہار دیواری بنی ہوئی ہے۔ درختوں میں آم لگے ہوئے ہیں۔ حامد نے ایک کنکری اٹھا کر ایک آم پر نشانہ لگایا۔ مالی اندر سے گالی دیتا ہوا باہر آیا۔ بچے وہاں سے ایک فرلانگ پر ہیں۔ خوب ہنس رہے ہیں۔ مالی کو خواب الو بنایا۔

بڑی بڑی عمارتیں آنے لگیں۔ یہ عدالت ہے۔ یہ مدرسہ ہے۔ یہ کلب گھر ہے۔ اتنے بڑے مدرسہ میں کتنے سارے لڑکے پڑھتے ہوں گے۔ لڑکے نہیں ہیں جی بڑے بڑے آدمی ہیں۔ سچ ان کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں۔

اتنے بڑے ہو گئے اب تک پڑھنے جاتے ہیں۔ آج تو چھٹی ہے لیکن ایک بار جب پہلے آئے تھے تو بہت سے داڑھی مونچھوں والے لڑکے یہاں کھیل رہے تھے۔ نہ جانے کب تک پڑھیں گے' اور کیا کریں گے اتنا پڑھ کر۔ گاؤں کے دیہاتی مدرسے میں دو تین بڑے بڑے لڑکے ہیں۔ بالکل کوڑ جیسے کام سے جی چرانے والے' یہ لڑکے بھی اسی طرح کے ہوں گے جی۔ اور کیا نہیں کیا اب تک پڑھتے ہوتے۔ وہ کلب گھر ہے۔ وہاں جادو کا کھیل ہوتا ہے۔ سنا ہے مردوں کی کھوپڑیاں اڑتی ہیں۔ آدمی کو بے ہوش کر دیتے ہیں۔ پھر اس سے جو کچھ پوچھتے ہیں وہ سب بتلا دیتے ہیں۔ اور بڑے بڑے تماشے ہوتے ہیں اور میمیں بھی کھیلتی ہیں۔ سچ ہماری اماں کو وہ دے دو۔ کیا کہلاتا ہے۔ "بیٹ" تو اسے گھماتے ہی لڑھک جائیں۔

محسن نے کہا۔ "ہماری امی جان تو اسے پکڑ ہی نہ سکیں۔ ہاتھ کانپنے لگیں۔ اللہ قسم۔"

حامد نے اس سے اختلاف کیا "چلو" منوں آٹا پیس ڈالتی ہیں۔ ذرا سی بیٹ پکڑ لیں گے تو ہاتھ کانپنے لگے گا۔ سینکڑوں گھڑے پانی روز نکالتی ہیں۔ کسی میم کو ایک گھڑا پانی نکالنا پڑے تو آنکھوں تلے اندھیرا آ جائے۔"

محسن۔ "لیکن دوڑتی تو نہیں' اچھل کود نہیں سکتیں۔"

حامد۔ "کام آ پڑتا ہے تو دوڑ بھی لیتی ہیں۔ ابھی اس دن تمہاری گائے کھل گئی تھی اور چودھری کے کھیت میں جا پڑی تھی تو تمہاری اماں ہی تو دوڑ کر اسے بھگا لائی تھیں۔ کتنی تیزی سے دوڑی تھیں۔ ہم تو دونوں ان سے پیچھے رہ گئے۔"

پھر آگے چلے۔ حلوائیوں کی دکانیں شروع ہو گئیں۔ آج خوب سجی ہوئی تھیں۔

اتنی مٹھائیاں کون کھاتا ہے؟ دیکھو نا۔ ایک ایک دکان پر منوں ہوں گی۔ سنا ہے رات کو ایک جن ہر ایک دکان پر جاتا ہے۔ جتنا مال بچا ہوتا ہے وہ سب خرید لیتا ہے اور سچ مچ کے روپے دیتا ہے بالکل ایسے ہی چاندی کے روپے۔

محمود کو یقین نہ آیا۔ ایسے روپے جنّات کو کہاں سے مل جائیں گے۔

محسن۔ "جنات کو روپوں کی کیا کمی؟ جس خزانہ میں چاہیں چلے جائیں کوئی انہیں دیکھ نہیں سکتا۔ لوہے کے دروازے تک نہیں روک سکتے جناب' آپ ہیں کس خیال میں' ہیرے جواہرات ان کے پاس رہتے ہیں۔ جس سے خوش ہو گئے اسے ٹوکروں جواہرات دے دیے۔ پانچ منٹ میں کھو کا بل پہنچ جائیں۔"

حامد۔ "جنّات بہت بڑے ہوتے ہوں گے۔"

محسن۔ "اور کیا ایک ایک آسمان کے برابر ہوتا ہے۔ زمین پر کھڑا ہو جائے تو اس کا سر آسمان سے جا لگے۔ مگر چاہے تو ایک لوٹے میں گھس جائے۔"

سمیع۔ "سنا ہے چودھری صاحب کے قبضہ میں بہت سے جنات ہیں۔ کوئی چیز چوری چلی جائے' چودھری صاحب اس کا پتہ بتا دیں گے اور چور کا نام تک بتا دیں گے۔ جمراتی کا بچھڑا اس دن کھو گیا تھا۔ تین دن حیران ہوئے کہیں نہ ملا۔ تب جھک مار کر چودھری کے پاس گئے۔ چودھری نے کہا۔ مویشی خانہ میں ہے اور وہیں ملا۔ جنات آ کر انہیں سب خبریں دے جایا کرتے ہیں۔"

اب ہر ایک کی سمجھ میں آ گیا کہ چودھری قاسم علی کے پاس کیوں اس قدر دولت ہے اور کیوں وہ قرب و جوار کے مواضعات کے مہاجن ہیں۔ جنات آ کر انہیں روپے دے جاتے ہیں۔

آگے چلیے یہ پولیس لائن ہے۔ یہاں پولیس والے قواعد کرتے ہیں۔ رائٹ لپ' پھام پھو۔

نوری نے تصحیح کی۔ یہاں پولیس والے پہرہ دیتے ہیں۔ جب ہی تو انہیں بہت خبر ہے۔ اجی حضرت یہ لوگ چوریاں کراتے ہیں۔ شہر کے جتنے چور ڈاکو ہیں سب ان سے ملے رہتے ہیں۔ رات کو سب ایک محلّہ میں چوروں سے کہتے ہیں اور دوسرے محلّہ میں پکارتے ہیں جاگتے رہو۔ میرے ماموں صاحب ایک تھانہ میں سپاہی ہیں۔ بیس روپے مہینہ پاتے ہیں لیکن تھیلیاں بھر بھر گھر بھیجتے ہیں۔ میں نے ایک بار پوچھا تھا۔ ماموں اتنے روپے آپ چاہیں تو ایک دن میں لاکھوں مار لائیں۔ ہم تو اتنا ہی لیتے ہیں جس میں اپنی بدنامی نہ ہو اور نوکری بنی رہے۔

حامد نے تعجب سے پوچھا۔ "یہ لوگ چوری کراتے ہیں تو انہیں کوئی پکڑتا نہیں۔"

نوری نے اس کی کوتاہ فہمی پر رحم کھا کر کہا۔ "ارے احمق انہیں کون پکڑے گا۔ پکڑنے والے تو یہ خود ہیں۔ لیکن اللہ انہیں سزا بھی خوب دیتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے ماموں کے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا مال متاع جل گیا' ایک برتن تک نہ بچا۔ کئی دن تک درخت کے سائے کے نیچے' اللہ قسم پھر نہ جانے کہاں سے قرض لائے تو برتن بھانڈے آئے۔"

بستی گھنی ہونے لگی۔ عید گاہ جانے والوں کے مجمع نظر آنے لگے۔ ایک سے ایک زرق برق پوشاک پہنے ہوئے۔ کوئی تانگے پر سوار کوئی موٹر پر' چلتے تھے تو کپڑوں سے عطر کی خوشبو اڑتی تھی۔

دہقانوں کی یہ مختصر سی ٹولی اپنی بے سروسامانی سے بے حس اپنی خستہ حالی میں مگر صابر و شاکر چلی جاتی تھی۔ جس چیز کی طرف تاکتے' تاکتے رہ جاتے اور پیچھے سے بار بار ہارن کی آواز ہونے پر بھی خبر نہ ہوتی تھی' محسن تو موٹر کے نیچے جاتے جاتے بچا۔

وہ عید گاہ نظر آئی' جماعت شروع ہو گئی ہے اور املی کے گھنے درختوں کا سایہ ہے نیچے کھلا ہوا پختہ فرش ہے۔ جس پر جاجم بچھا ہوا ہے اور نمازیوں کی قطاریں ایک کے پیچھے دوسری خدا جانے کہاں تک چلی گئی ہیں۔ پختہ فرش کے نیچے جاجم بھی نہیں۔ کئی قطاریں کھڑی ہیں جو آتے جاتے ہیں پیچھے کھڑے ہوتے جاتے ہیں۔ آگے اب جگہ نہیں رہی۔ یہاں کوئی رُتبہ اور عہدہ نہیں دیکھتا۔ اسلام کی نگاہ میں سب برابر ہیں۔ دہقانوں نے بھی وضو کیا اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ کتنی باقاعدہ منظّم جماعت ہے۔ لاکھوں آدمی ایک ساتھ جھکتے ہیں' ایک ساتھ دوزانو بیٹھ جاتے ہیں اور یہ عمل بار بار ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا بجلی کی لاکھوں بتیاں ایک ساتھ روشن ہو جائیں اور ایک ساتھ بجھ جائیں۔ کتنا پُر احترام رعب انگیز نظارہ ہے۔ جس کی ہم آہنگی اور وسعت اور تعداد دلوں پر ایک وجدانی کیفیت پیدا کر دیتی ہے۔ گویا اخوت کا رشتہ ان تمام روحوں کو منسلک کیے ہوئے ہے۔

نماز ختم ہو گئی ہے۔ لوگ باہم گلے مل رہے ہیں۔ کچھ لوگ محتاجوں اور سائلوں کو خیرات کر رہے ہیں۔ جو آج یہاں ہزاروں جمع ہو گئے ہیں۔ ہمارے دہقانوں نے مٹھائی اور کھلونوں کی دکانوں پر یورش کی۔ بوڑھے بھی ان دلچسپیوں میں بچوں سے کم نہیں ہیں۔ یہ دیکھو ہنڈولا ہے' ایک پیسہ دے کر آسمان پر جاتے معلوم ہوں گے۔ کبھی زمین پر گرتے ہیں۔ یہ چرخی ہے' لکڑی کے گھوڑے' اونٹ' ہاتھی میخوں سے لٹکے ہوئے ہیں۔ ایک پیسہ دے کر بیٹھ جاؤ اور پچیس چکروں کا مزہ لو۔ محمود اور محسن دونوں ہنڈولے پر بیٹھے ہیں۔ آذر اور سمیع گھوڑوں پر۔ ان کے بزرگ اتنے ہی طفلانہ اشتیاق سے چرخی پر بیٹھے ہیں۔ حامد دور کھڑا ہے۔ تین ہی پیسے تو اس کے پاس ہیں۔ ذرا سا چکر کھانے کے لیے وہ اپنے خزانہ کا ثلث نہیں صرف کر سکتا۔ محسن کا باپ بار بار اسے چرخی پر بلاتا ہے لیکن وہ راضی نہیں ہوتا۔ بوڑھے کہتے ہیں اس لڑکے میں ابھی سے اپنا پرایا آ گیا ہے۔ حامد سوچتا ہے کیوں کسی کا احسان لوں' عُسرت نے اسے

ضرورت سے زیادہ ذکی الحس بنادیا ہے۔ سب لوگ چرخی سے اترتے ہیں۔ کھلونوں کی خرید شروع ہوتی ہے۔ سپاہی اور گجریا اور راجہ رانی اور وکیل اور دھوبی اور بہشتی بے امتیاز ان سے ران ملائے بیٹھے ہوئے ہیں۔ دھوبی راجہ رانی کی بغل میں ہے اور بہشتی وکیل صاحب کی بغل میں۔ واہ کتنے خوبصورت بولا ہی چاہتے ہیں۔ محمود سپاہی پر لٹو ہو جاتا ہے' خاکی وردی اور پگڑی لال 'کندھے پر بندوق 'معلوم ہوتا ہے 'ابھی قواعد کے لیے چلا آرہا ہے۔ محسن کو بہشتی پسند آیا۔ کمر جھکی ہوئی ہے۔ اس پر مشک کا دہانہ ایک ہاتھ سے پکڑے ہوئے ہے۔ دوسرے ہاتھ میں رسّی ہے۔ کتنا بشاش چہرہ ہے شاید کوئی گیت گا رہا ہے۔ مشک سے پانی ٹپکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ نوری کو وکیل سے مناسبت ہے۔ کتنی عالمانہ صورت ہے۔ سیاہ چغہ نیچے سفید اچکن 'اچکن کے سینہ کی جیب میں سنہری زنجیر 'ایک ہاتھ میں قانون کی کتاب لیے ہوئے ہے۔ معلوم ہوتا ہے ابھی کسی عدالت سے جرح یا بحث کر کے چلے آرہے ہیں۔ یہ سب دو دو پیسے کے کھلونے ہیں۔ حامد کے پاس کل تین پیسے ہیں۔ اگر دو کا ایک کھلونا لے لے تو پھر اور کیا لے گا۔ نہیں کھلونے فضول ہیں۔ کہیں ہاتھ سے گر پڑے تو چُور چُور ہو جائے۔ ذرا سا پانی پڑ جائے تو سارا رنگ دھل جائے۔ ان کھلونوں کو لے کر وہ کیا کرے گا کس مصرف کے ہیں۔

محسن کہتا ہے۔ "میرا بہشتی روز پانی دے جائے گا صبح شام۔"

محمود۔ "اور میرا سپاہی گھر کا پہرہ دے گا۔ کوئی چور آئے گا تو فوراً بندوق سے فائر کر دے گا۔"

نوری۔ "اور میرا وکیل روز مقدمے لڑے گا اور روز روپے لائے گا۔"

سمیع۔ "اور میری دھوبن روز کپڑے دھوئے گی۔"

حامد کھلونوں کی مذمت کرتا ہے۔ مٹی کے ہی تو ہیں گریں تو چکنا چور ہو جائیں۔ لیکن ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ ذرا دیر کے لیے انہیں ہاتھ میں لے سکتا۔ یہ بساطی کی دکان ہے' طرح طرح کی ضروری چیزیں' ایک چادر بچھی ہوئی ہے۔ گیند' سیٹیاں' بگل' بھنورے' ربڑ کے کھلونے اور ہزاروں چیزیں۔ محسن ایک سیٹی لیتا ہے' محمود گیند' نوری ربڑ کا بُت جو چوں چوں کرتا ہے اور سمیع ایک خنجری اسے وہ بجا بجا کر گائے گا۔ حامد کھڑا ہر ایک کو حسرت سے دیکھ رہا ہے۔ جب اس کا رفیق کوئی چیز خرید لیتا ہے تو وہ بڑے اشتیاق سے ایک بار اسے ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن لڑکے اتنے دوست نواز نہیں ہوتے۔ خاص کر جب کہ ابھی دلچسپی تازہ ہے۔ بے چارہ یوں ہی مایوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

کھلونوں کے بعد مٹھائیوں کا نمبر آیا۔ کسی نے ریوڑیاں لی ہیں' کسی نے گلاب جامن' کسی نے سوہن حلوہ' مزے سے کھا رہے ہیں۔ حامد ان کی برادری سے خارج ہے۔ کمبخت کی جیب میں تین پیسے تو ہیں کیوں نہیں کچھ لے کر کھاتا۔ حریص نگاہوں سے سب کی طرف دیکھتا ہے۔

محسن نے کہا۔ "حامد یہ ریوڑی لے جا کتنی خوشبودار ہیں؟"

حامد سمجھ گیا یہ محض شرارت ہے۔ محسن اتنا فیاض طبع نہ تھا پھر بھی وہ اس کے پاس گیا۔ محسن نے دو نے سے دو تین ریوڑیاں نکالیں۔ حامد کی طرف بڑھائیں۔ حامد نے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے ہاتھ کھینچ لیا اور ریوڑیاں اپنے منہ میں رکھ لیں۔ محمود اور نوری اور سمیع خوب تالیاں بجا بجا کر ہنسنے لگے۔ حامد کھسیانہ ہو گیا۔ محسن نے کہا۔

"اچھا اب ضرور دیں گے یہ لے جاؤ اللہ قسم۔"

حامد نے کہا۔ "رکھیے رکھیے کیا میرے پاس پیسے نہیں ہیں؟"

سمیع بولا۔ ''تین ہی پیسے تو ہیں کیا کیا لو گے ؟''
محمود۔ ''تم اس سے مت بولو حامد' میرے پاس آؤ یہ گلاب جامن لے لو۔''
حامد۔ ''مٹھائی کون سی بڑی نعمت ہے۔ کتاب میں اس کی برائیاں لکھی ہیں۔''
محسن۔ ''لیکن جی میں کہہ رہے ہو گے کہ کچھ مل جائے تو کھالیں۔ اپنے پیسے کیوں نہیں نکالتے۔''
محمود۔ ''اس کی ہوشیاری میں سمجھتا ہوں۔ جب ہمارے سارے پیسے خرچ ہو جائیں گے تب یہ مٹھائی لے گا اور ہمیں چڑا چڑا کر کھائے گا۔''

حلوائیوں کی دکانوں کے آگے کچھ دکانیں لوہے کی چیزوں کی تھیں۔ کچھ گلٹ اور ملمّع کے زیورات کی۔ لڑکوں کے لیے یہاں دلچسپی کا کوئی سامان نہ تھا۔ حامد لوہے کی دکان پر ایک لمحہ کے لیے رک گیا۔ دست پناہ رکھے ہوئے تھے۔ وہ دست پناہ خرید لے گا۔ ماں کے پاس دست پناہ نہیں ہے۔ توے سے روٹیاں اتارتی ہیں تو ہاتھ جل جاتا ہے۔ اگر وہ دست پناہ لے جا کر اماں کو دے دے تو وہ کتنی خوش ہوں گی پھر ان کی انگلیاں کبھی نہیں جلیں گی' گھر میں ایک کام کی چیز ہو جائے گی۔ کھلونوں سے کیا فائدہ' مفت میں پیسے خراب ہوتے ہیں۔ ذرا دیر ہی تو خوشی ہوتی ہے۔ پھر تو انہیں کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا یا تو گھر پہنچتے پہنچتے ٹوٹ پھوٹ کر برباد ہو جائیں گے یا چھوٹے بچے جو عید گاہ نہیں جا سکتے ہیں ضد کر کے لے لیں گے اور توڑ ڈالیں گے۔ دست پناہ کتنے فائدہ کی چیز ہے۔ روٹیاں توے سے اتار لو' چولہے سے آگ نکال کر دے دو۔ اماں کو فرصت کہاں ہے' بازار آئیں اور اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں۔ روز ہاتھ جلا لیتی ہیں۔ اس کے ساتھی آگے بڑھ گئے ہیں۔ سبیل پر سب کے سب پانی پی رہے ہیں۔ کتنے لالچی ہیں سب نے اتنی مٹھائیاں لیں کسی نے مجھے ایک بھی نہ دی۔ اس پر کہتے ہیں میرے ساتھ کھیلو۔ میری تختی دھو لاؤ۔ اب اگر یہاں محسن نے کوئی کام کرنے کو کہا تو خبر لوں گا' کھائیں مٹھائیاں آپ منہ سڑے گا۔ پھوڑے پھنسیاں نکلیں گی۔ آپ ہی زبان چٹوری ہو جائے گی۔ تب پیسے چرائیں گے اور مار کھائیں گے۔ میری زبان کیوں خراب ہو گی۔ اس نے پھر سوچا اماں دست پناہ دیکھتے ہی دوڑ کر میرے ہاتھ سے لے لیں گی اور کہیں گی میرا بیٹا اپنی ماں کے لیے دست پناہ لایا ہے۔ ہزاروں دعائیں دیں گی۔ پھر اسے پڑوسیوں کو دکھائیں گی۔ سارے گاؤں میں واہ واہ مچ جائے گی۔ ان لوگوں کے کھلونوں پر کون انہیں دعائیں دے گا۔ بزرگوں کی دعائیں سیدھی خدا کی درگاہ میں پہنچتی ہیں اور فوراً قبول ہوتی ہیں۔ میرے پاس بہت سے پیسے نہیں ہیں جب ہی تو محسن اور محمود یوں مزاج دکھاتے ہیں' میں بھی ان کو مزاج دکھاؤں گا۔ وہ کھلونے کھیلیں' مٹھائیاں کھائیں میں غریب سہی۔ کسی سے کچھ مانگنے تو نہیں جاتا۔ آخر ابا کبھی نہ کبھی آئیں گے ہی پھر ان لوگوں سے پوچھوں گا کتنے کھلونے لو گے۔ ایک ایک کو ایک ٹوکری دوں اور دکھا دوں کہ دوستوں کے ساتھ اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔ جتنے غریب لڑکے ہیں سب کو اچھے اچھے کُرتے دلوا دوں گا' اور کتابیں دے دوں گا۔ یہ نہیں کہ ایک پیسہ کی ریوڑیاں لیں تو چڑا چڑا کر کھانے لگیں۔

دست پناہ دیکھ کر سب کے سب ہنسیں گے۔ احمق تو ہیں ہی سب۔ اس نے ڈرتے ڈرتے دکاندار سے پوچھا ''یہ دست پناہ بیچو گے ؟''

دکاندار نے اس کی طرف دیکھا اور ساتھ کوئی آدمی نہ دیکھ کر کہا۔ ''وہ تمہارے کام کا نہیں ہے۔''
''بکاؤ ہے یا نہیں؟''
''بکاؤ ہے جی اور یہاں کیوں لاد کر لائے ہیں۔''

"تو بتلاتے کیوں نہیں کتنے پیسے کا دو گے؟"

"چھ پیسے لگے گا۔"

حامد کا دل بیٹھ گیا۔ کلیجہ مضبوط کر کے بولا۔ "تین پیسے لو گے؟" اور آگے بڑھا کہ دکاندار کی گھُرکیاں نہ سنے۔ مگر دکاندار نے گھُرکیاں نہ دیں۔ دست پناہ اس کی طرف بڑھادیا اور پیسے لے لیے۔

حامد نے دست پناہ کندھے پر رکھ لیا گویا بندوق ہے اور شان سے اکڑتا ہوا اپنے رفیقوں کے پاس آیا۔

محسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "یہ دست پناہ لایا ہے احمق اسے کیا کرو گے؟"

حامد نے دست پناہ کو زمین پر پٹک کر کہا۔ "ذرا اپنا بہشتی زمین پر گرا دو ساری پسلیاں چور چور ہو جائیں گی بچّہ کی۔"

محمود۔ "تو یہ دست پناہ کوئی کھلونا ہے؟"

حامد۔ "کھلونا کیوں نہیں ہے۔ ابھی کندھے پر رکھا بندوق ہو گیا' ہاتھ میں لے لیا فقیر کا چمٹا ہو گیا' چاہوں تو اس سے تمہاری ناک پکڑ لوں' ایک چمٹا دوں تو تم لوگوں کے سارے کھلونوں کی جان نکل جائے۔ تمہارے کھلونے کتنا ہی زور لگائیں اس کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ میرا بہادر شیر ہے یہ دست پناہ۔"

سمیع متاثر ہو کر بولا۔ "میری خنجری سے بدلو گے دو آنے کی ہے۔"

حامد نے خنجری کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہا۔ "میرا دست پناہ چاہے تو تمہاری خنجری کا پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بس ایک چمڑے کی جھلّی لگا دی ڈھب ڈھب بولنے لگی ذرا سا پانی لگے تو ختم ہو جائے۔ میرا بہادر دست پناہ تو آگ میں' پانی میں' آندھی میں' طوفان میں' برابر ڈٹا رہے گا۔ میلہ بہت دور پیچھے چھوٹ چکا تھا۔ دس بج رہے تھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی۔ اب دست پناہ نہیں مل سکتا۔ اب کسی کے پاس پیسے بھی تو نہیں رہے' حامد ہے بڑا ہوشیار۔ اب دو فریق ہو گئے محمود' محسن اور نوری ایک طرف' حامد یکہ و تنہا۔ دوسری طرف سمیع غیر جانبدار ہے جس کی فتح دیکھے گا اس کی طرف ہو جائے گا۔ مناظرہ شروع ہو گیا۔ آج حامد کی زبان بڑی صفائی سے چل رہی ہے۔ اتحادِ ثلاثہ اس کے جارحانہ عمل سے پریشان ہو رہا ہے۔ ثلاثہ کے پاس تعداد کی طاقت ہے۔ حامد کے پاس حق اور اخلاق۔ ایک طرف مٹی' ربڑ اور لکڑی کی چیزیں۔ دوسری جانب اکیلا لوہا جو اس وقت اپنے آپ کو فولاد کہہ رہا ہے۔ وہ رُوئیں تن ہے یہ صف شکن ہے۔ اگر کہیں شیر کی آواز کان میں آ جائے تو میاں بہشتی کے اوسان خطا ہو جائیں۔ میاں سپاہی مٹی کی بندوق چھوڑ کر بھاگیں۔ وکیل صاحب کا سارا قانون پیٹ میں سما جائے۔ چغے میں منہ چھپا کر لیٹ جائیں۔ مگر بہادر' یہ رستم ہند لپک کر شیر کی گردن پر سوار ہو جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال لے گا۔

محسن نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کہا۔ "اچھا تمہارا دست پناہ پانی تو نہیں بھر سکتا۔" حامد نے دست پناہ کو سیدھا کر کے کہا کہ "یہ بہشتی کو ایک ڈانٹ بتائے گا تو دوڑا ہوا پانی لا کر اس کے دروازے پر چھڑکنے لگے گا۔ جناب اس سے چاہے گھڑے' مٹکے اور کونڈے بھر لو۔"

محسن کا ناطقہ بند ہو گیا۔ نوری نے کمک پہنچائی۔ "بچہ گرفتار ہو جائیں تو عدالت میں بندھے بندھے پھریں گے تب تو ہمارے وکیل صاحب ہی پیروی کریں گے بولیے جناب۔"

حامد کے پاس اس وار کا دفعیہ اتنا آسان نہ تھا۔ دفعتاً اس نے ذرا مہلت پا جانے کے ارادے سے پوچھا۔ "اسے پکڑنے کون آئے گا؟"

محمود نے کہا۔ "یہ سپاہی بندوق والا۔"
حامد نے منہ چڑھا کر کہا۔ "یہ بے چارے اس رستم ہند کو پکڑ لیں گے؟ اچھا لاؤ ابھی ذرا مقابلہ ہو جائے۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بچہ کی ماں مر جائے گی' پکڑیں گے کیا بے چارے۔"
محسن نے تازہ دم ہو کر وار کیا۔ "تمہارے دست پناہ کا منہ روز آگ میں جلا کرے گا۔"
حامد کے پاس جواب تیار تھا۔ "آگ میں بہادر کودتے ہیں جناب۔ تمہارے یہ وکیل اور سپاہی اور بہشتی ڈرپوک ہیں۔ سب گھر میں گھس جائیں گے۔ آگ میں کودنا وہ کام ہے جو رستم ہی کر سکتا ہے۔"
نوری نے انتہائی جدت سے کام لیا۔ "تمہارا دست پناہ باورچی خانہ میں زمین پر پڑا رہے گا۔ میرا وکیل شان سے میز کرسی لگا کر بیٹھے گا۔" اس جملہ نے مُردوں میں بھی جان ڈال دی۔ سمیع بھی جیت گیا۔ بے شک بڑے معرکے کی بات کہی۔ "دست پناہ باورچی خانہ میں پڑا رہے گا۔"
حامد نے دھاندلی کی۔ "میرا دست پناہ باورچی خانہ میں رہے گا۔ وکیل صاحب کرسی پر بیٹھیں گے تو جا کر انہیں زمین پر پٹک دے گا اور سارا قانون ان کے پیٹ میں ڈال دے گا۔"
اس جواب میں بالکل جان نہ تھی۔ بالکل بے تکی سی بات تھی لیکن قانون پیٹ میں ڈالنے والی بات چھا گئی۔ تینوں سورما منہ تکتے رہ گئے۔ حامد نے میدان جیت لیا' گو ثلاثہ کے پاس ابھی گیند' سیٹی اور بت ریزرو تھے مگر ان مشین گنوں کے سامنے ان بزدلوں کو کون پوچھتا ہے۔ دست پناہ رستمِ ہند ہے۔ اس میں کسی کو چوں وچرا کی گنجائش نہیں۔
فاتح کو مفتوحوں سے تھار اور خوشامد کا مزاج ملتا ہے۔ وہ حامد کو ملنے لگا اور سب نے تین تین آنے خرچ کیے اور کوئی کام کی چیز نہ لے سکے۔ حامد نے تین ہی پیسوں میں رنگ جما لیا۔ کھلونوں کا کیا اعتبار دو ایک دن میں ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔ حامد کا دست پناہ تو فاتح رہے گا ہمیشہ۔ صلح کی شرطیں طے ہونے لگیں۔
محسن نے کہا۔ "ذرا اپنا چمٹا دو' ہم بھی دیکھیں' تم چاہو تو ہمارا وکیل دیکھ لو۔" حامد: "ہمیں اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے۔" وہ فیاض طبع فاتح ہے۔ دست پناہ باری باری سے محمود' محسن' نوری اور سمیع سب کے ہاتھوں میں گیا اور ان کے کھلونے باری باری حامد کے ہاتھ میں آئے۔ کتنے خوبصورت کھلونے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بولا ہی چاہتے ہیں' مگر ان کھلونوں کے لیے انہیں دعا کون دے گا؟ کون ان کھلونوں کو دیکھ کر اتنا خوش ہوگا جتنا اماں جان دست پناہ کو دیکھ کر ہوں گی۔ اسے اپنے طرزِ عمل پر مطلق پچھتاوا نہیں ہے پھر اب تو دست پناہ تو ہے سب کا بادشاہ۔
راستے میں محمود نے ایک پیسے کی ککڑیاں لیں۔ اس میں حامد کو بھی خراج ملا حالانکہ وہ انکار کرتا رہا۔ محسن اور سمیع نے ایک ایک پیسے کے فالسے لیے حامد کو خراج ملا۔ یہ سب رستمِ ہند کی برکت تھی۔
گیارہ بجے سارے گاؤں میں چہل پہل ہو گئی۔ میلے والے آ گئے۔ محسن کی چھوٹی بہن نے دوڑ کر بہشتی اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور مارے خوشی جو اچھلی تو میاں بہشتی نیچے آ رہے اور عالم جاودانی کی سدھارے۔ اس پر بھائی بہن میں مار پیٹ ہوئی۔ دونوں خوب روئے۔ ان کی اماں جان یہ کہرام سن کر اور بگڑیں۔ دونوں کو اوپر سے دو دو چانٹے رسید کیے۔ میاں نوری کے وکیل صاحب کا حشر اس سے بھی بدتر ہوا۔ وکیل زمین پر یا طاق پر تو نہیں بیٹھ سکتا۔ اس کی پوزیشن کا لحاظ کرنا ہی ہوگا۔ دیوار میں دو کھونٹیاں گاڑی گئیں۔ ان پر چیڑ کا ایک پرانا پڑا رکھا گیا۔ پڑے پر سرخ رنگ کا ایک چیتھڑا بچھا دیا گیا جو منزلہ قالین کے تھا۔ وکیل صاحب عالمِ بالا پہ جلوہ افروز ہوئے۔ یہیں سے قانونی بحث کریں گے۔ نوری ایک پنکھا لے کر جھلنے لگا۔ معلوم نہیں پنکھے کی ہوا سے یا پنکھے کی چوٹ سے وکیل صاحب

عالم بالا سے دنیائے فانی میں آرہے اور ان کے مجسمۂ خاکی کے پرزے ہوئے۔ پھر بڑے زور کا ماتم ہوا۔ اور وکیل صاحب کی میت پارسی دستور کے مطابق کوڑے پر پھینک دی گئی تاکہ بے کار نہ جاکر زاغ و زغن کے کام آجائے۔

اب رہے میاں محمود کے سپاہی۔ محترم اور ذی رعب ہستی ہے۔ اپنے پیروں چلنے کی ذلت اسے گوارا نہیں۔ محمود نے اپنی بکری کا بچہ پکڑا اور اس پر سپاہی کو سوار کیا۔ محمود کی بہن ایک ہاتھ سے سپاہی کو پکڑے ہوئے تھی اور محمود بکری کے بچہ کا کان پکڑ کر اسے دروازے پر چلا رہا تھا۔ اور اس کے دونوں بھائی سپاہی کی طرف سے "تھونے والے داگتے لہو" پکارتے چلتے تھے۔ معلوم نہیں کیا ہوا میاں سپاہی اپنے گھوڑے کی پیٹھ سے گر پڑے اور اپنی بندوق لیے زمین پر آرہے۔ ایک ٹانگ مضروب ہوگئی۔ مگر کوئی مضائقہ نہیں۔ محمود ہوشیار ڈاکٹر ہے۔ ڈاکٹر نگم اور بھاٹیہ اس کی شاگردی کر سکتے ہیں اور یہ ٹوٹی ٹانگ آناً فاناً میں جوڑ دے گا' صرف گولر کا دودھ چاہیے۔ گولر کا دودھ آتا ہے' ٹانگ جوڑی جاتی ہے لیکن جوں ہی کھڑا ہوتا ہے' ٹانگ پھر الگ ہو جاتی ہے۔ عملی جراحی ناکام ہو جاتی ہے۔ تب محمود اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دیتا ہے۔ اب وہ آرام سے ایک جگہ بیٹھ سکتا ہے۔ ایک ٹانگ سے تو نہ چل سکتا تھا' نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اب وہ گوشہ میں بیٹھ کر ٹٹّی کی آڑ میں شکار کھیلے گا۔

اب میاں حامد کا قصہ سنیے۔ امینہ اس کی آواز سنتے ہی دوڑی اور اسے گود میں اٹھا کر پیار کرنے لگی۔ دفعتاً اس کے ہاتھ میں چمٹا دیکھ کر چونک پڑی۔

"یہ دست پناہ کہاں ملا بیٹا؟"

"میں نے مول لیا ہے تین پیسے میں۔"

امینہ نے چھاتی پیٹ لی۔ "یہ کیسا بے سمجھ لڑکا ہے کہ دوپہر ہوگئی نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ لایا کیا یہ دست پناہ۔ سارے میلے میں تجھے اور کوئی چیز نہ ملی۔"

حامد نے خطاوارانہ انداز سے کہا۔ "تمہاری انگلیاں توے سے جل جاتی تھیں کہ نہیں۔"

امینہ کا غصہ فوراً شفقت میں تبدیل ہو گیا۔ اور شفقت بھی وہ نہیں جو منہ سے بیان ہوتی ہے اور اپنی ساری تاثیر لفظوں میں منتشر کر دیتی ہے۔ یہ بے زباں شفقت تھی۔ دردِ التجا میں ڈوبی ہوئی۔ اف کتنی نفس کشی ہے۔ کتنی جانسوزی ہے۔ غریب نے اپنے طفلانہ اشتیاق کو روکنے کے لیے کتنا ضبط کیا۔ جب دوسرے لڑکے کھلونے لے رہے ہوں گے' مٹھائیاں کھا رہے ہوں گے اس کا دل کتنا لہراتا ہوگا۔ اتنا ضبط اس سے ہوا۔ کیونکہ اپنی بوڑھی ماں کی یاد اسے وہاں بھی رہی۔ میرا لال میری کتنی فکر رکھتا ہے۔ اس کے دل میں ایک ایسا جذبہ پیدا ہوا کہ اس کے ہاتھ میں دنیا کی بادشاہت آجائے اور وہ اسے حامد کے اوپر نثار کر دے۔

اور تب بڑی دلچسپ بات ہوئی۔ بڑھیا امینہ ننھی سی امینہ بن گئی۔ وہ رونے لگی۔ دامن پھیلا کر حامد کو دعائیں دیتی جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو کی بڑی بڑی بوندیں گراتی جاتی تھی۔ حامد اس کا راز کیا سمجھتا اور نہ شاید ہمارے بعض ناظرین ہی سمجھ سکیں گے۔

دو بیل

جانوروں میں گدھا سب سے بیوقوف سمجھا جاتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو پرلے درجے کا احمق کہنا چاہتے ہیں تو اسے گدھا کہتے ہیں۔ گدھا واقعی بیوقوف ہے۔ یا اس کی سادہ لوحی اور انتہادرجہ کی قوتِ برداشت نے اسے یہ خطاب دلوایا ہے۔ اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا۔ گائے شریف جانور ہے۔ مگر سینگ مارتی ہے۔ کتّا بھی غریب جانور ہے لیکن کبھی کبھی اسے غصہ بھی آجاتا ہے۔ مگر گدھے کو کبھی غصہ نہیں آتا جتنا جی چاہے مار لو۔ چاہے جیسی خراب سڑی ہوئی گھاس سامنے ڈال دو۔ اس کے چہرے پر ناراضگی کے آثار کبھی نظر نہ آئیں گے۔ اپریل میں شاید کبھی کلیل کر لیتا ہو۔ پر ہم نے اسے کبھی خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک مستقل مایوسی چھائی رہتی ہے۔ سکھ دکھ، نفع نقصان سے کبھی اسے شاد ہوتے نہیں دیکھا۔ رشی مُنیوں کی جس قدر خوبیاں ہیں، سب اس میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں لیکن آدمی اسے بیوقوف کہتا ہے۔ اعلیٰ خصلتوں کی ایسی توہین ہم نے اور کہیں نہیں دیکھی۔ ممکن ہے دنیا میں سیدھے پن کے لیے جگہ نہ ہو۔

لیکن گدھے کا ایک بھائی اور بھی ہے جو اس سے کچھ کم ہی گدھا ہے اور وہ ہے بیل۔ جن معنوں میں ہم گدھے کا لفظ استعمال کرتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں، جو بیل کو بیوقوفوں کا سردار کہنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارا خیال ایسا نہیں۔ بیل کبھی کبھی مارتا ہے۔ کبھی کبھی اڑیل بیل بھی دیکھنے میں آتے ہیں اور کبھی کئی طریقوں سے وہ اپنی ناپسندیدگی اور ناراضگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لہٰذا اس کا درجہ گدھے سے نیچے ہے۔

جھوری کاچھی کے پاس دو بیل تھے۔ ایک کا نام ہیرا تھا دوسرے کا موتی۔ دونوں پچھائیں نسل کے تھے۔ دیکھنے میں خوبصورت، کام میں چوکس، ڈیل ڈول میں اونچے، بہت دنوں سے ایک ساتھ رہتے رہتے دونوں میں محبت سی ہو گئی۔ دونوں آمنے سامنے یا ایک دوسرے کے پاس بیٹھے زبانِ خاموش میں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے دل کی بات کیوں کر سمجھ جاتے تھے، یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔ ضرور ان میں کوئی نہ کوئی ناقابلِ فہم قوت تھی جس کے سمجھنے سے اشرف المخلوقات ہونے کا مدعی انسان محروم ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ کر اور سونگھ کر اپنی محبت کا اظہار کرتے تھے۔ کبھی دونوں سینگ ملا لیا کرتے تھے۔ عناد سے نہیں محض زندہ دلی سے، محض ہنسی مذاق سے جیسے یار دوستوں میں کبھی کبھی دھول دھپّا ہو جاتا ہے۔ اس کے بغیر دوستی کچھ پھیکی اور ہلکی سی رہتی ہے۔ جس پر زیادہ اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

جس وقت یہ دونوں بیل ہل یا گاڑی میں جوتے جاتے اور گردنیں ہلا ہلا کر چلتے تو ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ زیادہ بوجھ میری ہی گردن پر رہے۔ کام کے بعد دوپہر یا شام کو کھلتے تو ایک دوسرے کو چوم چاٹ کر اپنی تکان اُتار لیتے۔ ناند میں کھلی بھوسا پڑ جانے کے بعد دونوں ایک ساتھ اٹھتے۔ ایک ساتھ ناند میں منہ ڈالتے اور ایک ہی ساتھ بیٹھتے۔ ایک منہ ہٹا لیتا تو دوسرا بھی ہٹا لیتا تھا۔

ایک مرتبہ جھوری نے دونوں بیل چند دنوں کے لیے اپنے سسرال بھیجے۔ بیلوں کو کیا معلوم وہ کیوں بھیجے جاتے ہیں۔ سمجھے مالک نے ہمیں بیچ دیا۔ کون جانے بیلوں کو اپنا بیچا جانا پسند آیا یا نہیں۔ لیکن جھوری کے سالے کو انہیں اپنے گاؤں تک لے جانے میں دانتوں پسینہ آگیا۔ پیچھے سے ہانکتا تو دونوں دائیں بائیں بھاگتے۔ آگے سے پکڑ کر کھینچتا تو

دونوں پیچھے کو زور لگاتے۔ مارتا تو دونوں سینگ نیچے کر کے پھنکارتے۔ اگر ان بے زبانوں کے زبان ہوتی تو جھوری سے پوچھتے تُو نے ہم غریبوں کو کیوں نکال دیا۔ ہم نے تمہاری خدمت کرنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اتنی محنت سے کام نہ چلتا تھا تو اور کام لے لیتے۔ ہم کو انکار نہ تھا۔ ہمیں تمہاری خدمت میں مر جانا قبول تھا۔ ہم نے کبھی دانے چارے کی شکایت نہیں کی۔ تم نے جو کچھ کھلایا سر جھکا کر کھالیا۔ پھر تم نے ہمیں اس ظالم کے ہاتھوں کیوں بیچ دیا؟

شام کے وقت دونوں بیل گیا کے گاؤں میں جا پہنچے۔ دن بھر کے بھوکے تھے لیکن جب ناند میں لگائے گئے تو کسی نے بھی اس میں منہ نہ ڈالا۔ دونوں کا دل بھاری ہو رہا تھا۔ جسے انہوں نے اپنا گھر سمجھا تھا وہ آج ان سے چھوٹ گیا۔ یہ نیا گھر' نیا گاؤں' نئے آدمی سب انہیں بے گانے لگتے تھے۔ دونوں نے چپ کی زبان میں کچھ باتیں کیں۔ ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھا اور لیٹ گئے۔

جب گاؤں میں سوتا پڑ گیا تو دونوں نے زور مار کر پگہے تڑا لیے اور گھر کی طرف چلے۔ پگہے مضبوط تھے کسی کو شبہ بھی نہ ہو سکتا تھا کہ بیل انہیں توڑ سکیں گے۔ پر ان دونوں میں اس وقت دگنی طاقت آگئی تھی۔ ایک جھٹکے میں رسیاں ٹوٹ گئیں۔

جھوری نے صبح اٹھ کر دیکھا کہ دونوں بیل چرنی پر کھڑے تھے۔ دونوں کی گردنوں میں آدھا آدھا رسہ لٹک رہا تھا۔ گھٹنوں تک پاؤں کیچڑ میں بھرے ہوئے تھے اور دونوں کی آنکھوں میں محبت اور ناراضگی جھلک رہی تھی۔ جھوری ان کو دیکھ کر محبت سے باؤلا ہو گیا اور دوڑ کر ان کے گلے سے لپٹ گیا۔ انسان اور حیوان کی محبت کا یہ منظر نہایت دلکش تھا۔

گھر اور گاؤں کے لڑکے جمع ہو گئے اور تالیاں بجا بجا کر ان کا خیر مقدم کرنے لگے۔ گاؤں کی تاریخ میں یہ واقعہ اپنی قسم کا پہلا نہ تھا۔ مگر اہم ضرور تھا۔ بال سبھا نے فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہادروں کو ایڈریس دیا جائے۔ کوئی اپنے گھر سے روٹیاں لایا' کوئی گڑ' کوئی چوکر اور کوئی بھوسی۔

ایک لڑکے نے کہا۔ "ایسے بیل اور کسی کے پاس نہ ہوں گے۔"

دوسرے نے تائید کی۔ "اتنی دور سے دونوں اکیلے چلے آئے۔"

تیسرا بولا۔ "پچھلے جنم میں ضرور آدمی ہوں گے۔"

اس کی تردید کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ سب نے کہا۔

"ہاں بھائی ضرور ہوں گے۔"

جھوری کی بیوی نے بیلوں کو دروازہ پر دیکھا تو جل اٹھی اور بولی۔ "کیسے نمک حرام بیل ہیں۔ ایک دن بھی وہاں کام نہ کیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔"

جھوری اپنے بیلوں پر یہ الزام برداشت نہ کر سکا۔ بولا۔ "نمک حرام کیوں ہیں؟ چارہ دانہ نہ دیا ہوگا' کیا کرتے؟"

عورت نے تنگ آ کر کہا۔ "بس تم ہی بیلوں کو کھلانا جانتے ہو اور تو سبھی پانی پلا پلا کر رکھتے ہیں۔"

جھوری چڑھا۔ "چارہ ملتا تو کیوں بھاگتے؟"

عورت چڑھی۔ "بھاگے اس لیے وہ لوگ تم جیسے بدھوؤں کی طرح بیلوں کو سہلاتے نہیں۔ کھلاتے ہیں تو' توڑ کر جوتتے بھی ہیں۔ یہ دونوں ٹھہرے کام چور۔ بھاگ نکلے۔ اب دیکھتی ہوں کہاں سے کھلی اور چوکر آتا ہے۔

خشک بُھوسے کے سوا کچھ نہ دوں گی۔ کھائیں چاہے مریں۔"
وہی ہوا مزدور کو تاکید کر دی گئی کہ بیلوں کو صرف خشک بُھوسا دیا جائے۔ بیلوں نے ناند میں منہ ڈالا تو پھیکا پھیکا۔ نہ چکناہٹ نہ رس کیا کھائیں؟ پُر امید نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔
جھوری نے مزدور سے کہا۔ "تھوڑی سی کھلی کیوں نہیں ڈال دیتا ہے؟"
مزدور۔ "مالکن مجھے مار ہی ڈالے گی۔"
جھوری۔ "ڈال دے تھوڑی سی۔"
مزدور۔ "نہ دادا۔ بعد میں تم بھی انہی کی سی کہو گے۔"

دوسرے دن جھوری کا سالا پھر آیا اور بیلوں کو لے چلا۔ اب کے اس نے دونوں کو گاڑی میں جوتا۔ دو چار مرتبہ موتی نے گاڑی کو کھائی میں گرانا چاہا مگر ہیرا نے سنبھال لیا۔ اس وقت دونوں میں قوتِ برداشت زیادہ تھی۔
شام کے وقت گھر پہنچ کر گیا نے دونوں کو موٹی رسیوں سے باندھا اور کل کی شرارت کا مزہ چکھایا پھر وہی خشک بھوسہ ڈال دیا۔ اپنے بیلوں کو کھلی چونی سب کچھ کھلایا۔
ہیرا اور موتی اس برتاؤ کے عادی نہ تھے۔ جھوری انہیں پھول کی چھڑی سے بھی نہ مارتا تھا۔ اس کی آواز پر دونوں اڑنے لگتے تھے۔ یہاں مار پڑی۔ اس پر خشک بُھوسا۔ ناند کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھائی۔
دوسرے دن گیا نے بیلوں کو ہل میں جُوتا۔ پر ان دونوں نے جیسے پاؤں اٹھانے کی قسم کھالی تھی۔ وہ مارتے مارتے تھک گیا۔ مگر انہوں نے قدم نہ اٹھایا۔ ایک مرتبہ جب اس ظالم نے ہیرا کی ناک پر ڈنڈا جمایا تو موتی غصہ کے مارے آپے سے باہر ہو گیا۔ ہل لے بھاگا۔ ہل، رسّی اور جُوا جوت سب ٹوٹ کر برابر ہو گئے۔ گلے میں بڑی بڑی رسیاں نہ ہوتیں تو دونوں نکل گئے تھے۔
ہیرا نے زبان خاموش سے کہا۔ "بھاگنا مشکل ہے۔"
موتی نے بھی نگاہوں سے جواب دیا۔ "تمہاری تو اس نے جان لے لی تھی۔ اب کے بڑی مار پڑے گی۔"
ہیرا۔ "پڑنے دو۔ بیل کا جنم لیا ہے تو مار سے کہاں بچیں گے۔"
گیا دو آدمیوں کے ساتھ دوڑا آ رہا ہے۔ دونوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں ہیں۔
موتی۔ "کہو تو میں بھی دکھا دوں کچھ مزا؟"
ہیرا۔ "نہیں بھائی کھڑے ہو جاؤ۔"
موتی۔ "مجھے مارے گا تو میں ایک آدھ کو گرا دوں گا۔"
ہیرا۔ "یہ ہمارا دھرم نہیں ہے۔"
موتی دل میں اینٹھ کر رہ گیا۔ اتنے میں گیا آ پہنچا اور دونوں کو پکڑ کر لے چلا۔
خیریت ہوئی کہ اس نے اس وقت مار پیٹ نہ کی۔ نہیں تو موتی بھی تیار تھا۔ اس کے تیور دیکھ کر سہم گیا اور اس کے ساتھی سمجھ گئے کہ اس وقت ٹال جانا ہی مصلحت ہے۔
آج دونوں کے سامنے پھر وہی خشک بُھوسا لایا گیا۔ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔ گھر کے لوگ کھانا کھانے لگے۔ اسی وقت ایک چھوٹی سی لڑکی دو روٹیاں لیے نکلی اور دونوں کے منہ میں دے کر چلی گئی۔ اس ایک ایک

روٹی سے ان کی بھوک تو کیا مٹتی مگر دونوں کے دل کو کھانا مل گیا۔ معلوم ہوا یہاں بھی کوئی صاحبِ دل رہتا ہے۔ یہ لڑکی گیا کی تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی۔ سوتیلی ماں اسے مارتی تھی اس لیے ان بیلوں سے اسے ہمدردی تھی۔

دونوں دن بھر جُوتے جاتے' ڈنڈے کھاتے' شام کو تھان پر باندھ دیے جاتے اور رات کو وہی لڑکی انہیں ایک ایک روٹی دے جاتی۔ محبت کے اس کھانے کی یہ برکت تھی کہ دو چار خشک بُھوسے کے لقمے کھا کر بھی دونوں کمزور نہ ہوتے تھے مگر دونوں کی آنکھوں کی نس نس میں سرکشی بھری تھی۔

ایک دن چپ کی زبان میں موتی نے کہا۔ "اب تو نہیں سہا جاتا ہیرا۔"

ہیرا۔ "کیا کرنا چاہیے؟"

موتی۔ "گیا کو سینگ پر اٹھا کر پھینک دوں؟"

ہیرا۔ "مگر وہ لڑکی اس کی بیٹی ہے اسے مار کر گراؤ گے تو وہ یتیم ہو جائے گی۔"

موتی۔ "تو مالکن کو پھینک دوں' وہ لڑکی کو ہر روز مارتی ہے۔"

ہیرا۔ "عورت کو مارو گے' بڑے بہادر ہو۔"

موتی۔ "تم کسی طرح نکلنے ہی نہیں دیتے تو آؤ آج رسہ تڑا کر بھاگ چلیں۔"

ہیرا۔ "ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن ایسی موٹی رسّی ٹوٹے گی کیونکر؟"

موتی۔ "پہلے رسّی کو چبا لو پھر جھٹکا دے کر تڑا لو۔"

رات کو جب لڑکی روٹیاں دے کر چلی گئی۔ دونوں رسّیاں چبانے لگے۔ پر موٹی رسّی منہ میں نہ آتی تھی۔ بے چارے بار بار زور لگا کر رہ جاتے۔

معاً گھر کا دروازہ کھلا اور وہی لڑکی نکلی۔ دونوں سر جھکا کر اس کے ہاتھ چاٹنے لگے۔ دونوں کی دُمیں کھڑی ہو گئیں۔ اس نے ان کی پیشانی سہلائی اور بولی۔

"کھول دیتی ہوں۔ بھاگ جاؤ نہیں تو یہ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے۔ آج گھر میں مشہور ہو رہا ہے کہ تمہاری ناک میں ناتھ ڈال دی جائیں۔"

اس نے دونوں کے رسّے کھول دیے پر دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

موتی نے اپنی زبان میں پوچھا۔ "اب چلتے کیوں نہیں؟"

ہیرا نے جواب دیا "اس غریب پر آفت آجائے گی۔ سب اسی پر شبہ کریں گے۔"

یکایک لڑکی چلّائی "او دادا' او دادا۔ دونوں پھوپھا والے بیل بھاگے جا رہے ہیں۔ دوڑو۔ دونوں بیل بھاگے جا رہے ہیں۔"

گیا گھبرا کر باہر نکلا اور بیلوں کو پکڑنے چلا۔ بیل بھاگے۔ گیا نے پیچھا کیا۔ وہ اور بھی تیز ہو گئے۔ گیا نے شور مچایا پھر گاؤں کے کچھ اور آدمیوں کو ساتھ لانے کے لیے لوٹا۔ دونوں بیلوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ سیدھے دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ راستہ کا خیال نہ رہا۔ جس راہ سے یہاں آئے تھے اس کا پتہ نہ تھا۔ نئے نئے گاؤں ملنے لگے۔ تب دونوں ایک کھیت کے کنارے کھڑے ہو کر سوچنے لگے کہ اب کیا کرنا چاہیے؟

ہیرا نے اپنی زبان میں کہا۔ "معلوم ہوتا ہے راستہ بھول گئے۔"

موتی۔ "تم بھی بے تحاشا بھاگے' وہیں اسے مار گراتے۔"

ہیرا۔ "اسے مار گراتے تو دنیا کیا کہتی۔ وہ اپنا دھرم چھوڑ دے لیکن ہم اپنا دھرم کیونکر چھوڑ دیں۔"

دونوں بھوک سے بے حال ہو رہے تھے۔ کھیت میں مٹر کھڑے تھے چرنے لگے۔ رہ رہ کر آہٹ لے رہے تھے کہ کوئی آ تو نہیں رہا۔ جب پیٹ بھر گیا اور دونوں کو آزادی کا احساس ہوا تو اچھلنے کودنے لگے۔ پہلے ڈکار لی پھر سینگ ملائے اور ایک دوسرے کو دھکیلنے لگے۔ موتی نے ہیرا کو کئی قدم پیچھے ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ وہ کھائی میں گر گیا۔ تب اسے بھی غصہ آیا۔ سنبھل کر اٹھا اور پھر موتی سے لڑنے لگا۔ موتی نے دیکھا کہ کھیل میں جھگڑا ہوا چاہتا ہے تو ایک طرف ہٹ گیا۔

ارے یہ کیا کوئی سانڈ ڈونکتا چلا آتا ہے۔ ہاں سانڈ ہی تو ہے۔ وہ سامنے آ پہنچا دونوں دوست تذبذب میں پڑ گئے۔ سانڈ بھی پورا ہاتھی۔ اس سے لڑنا جان سے ہاتھ دھونا تھا لیکن نہ لڑنے سے بھی جان بچتی نظر نہ آتی تھی۔ انہی کی طرف آرہا تھا کتنا جسیم تھا۔

موتی نے کہا۔ "برے پھسے جان کیسے بچے گی؟ کوئی طریقہ سوچو۔"

ہیرا نے کہا۔ "غرور سے اندھا ہو رہا ہے' منت سماجت کبھی نہ سنے گا۔"

موتی۔ "بھاگ کیوں نہ چلیں؟"

ہیرا۔ "بھاگنا پست ہمتی ہے۔"

موتی۔ "تو تم یہیں مرو' بندہ نو دو گیارہ ہوتا ہے۔"

ہیرا۔ "اور جو دوڑ آئے تو پھر؟"

موتی۔ "کوئی طریقہ بتاؤ۔ لیکن ذرا جلدی۔ وہ تو آ پہنچا۔"

ہیرا۔ "طریقہ یہی ہے کہ ہم دونوں ایک ساتھ حملہ کر دیں۔ میں آگے سے دھکیلوں تم پیچھے سے دھکیلو۔ دیکھتے دیکھتے بھاگ کھڑا ہوگا۔ جونہی مجھ پر حملہ کرے تم پیٹ میں سینگ چبھو دینا۔ جان جوکھوں کا کام ہے' لیکن دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔"

دونوں دوست جان ہتھیلیوں پر لے کر آگے بڑھے۔ سانڈ کو کبھی منظم دشمن سے لڑنے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ وہ انفرادی جنگ کا عادی تھا۔ جونہی ہیرا پر جھپٹا موتی نے پیچھے سے ہلّہ بول دیا۔ سانڈ اس کی طرف مڑا تو ہیرا نے دھکیلنا شروع کیا۔ سانڈ چاہتا تھا ایک ایک کر کے دونوں کو گرا لے۔ پر یہ بھی استاد تھے۔ اسے یہ موقع ہی نہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سانڈ جھلّا کر ہیرا کو ہلاک کرنے چلا تو موتی نے بغل سے آکر اس کے پیٹ میں سینگ رکھ دیے۔ بے چارہ زخمی ہو کر بھاگا اور دونوں فتح یاب دوستوں نے دور تک اس کا تعاقب کیا۔ یہاں تک کہ سانڈ بے دم ہو کر گر پڑا۔ تب دونوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا۔

دونوں بیل فتح کے نشہ میں جھومتے چلے جاتے تھے۔ موتی نے اپنے اشاروں کی زبان میں کہا۔ "میرا جی چاہتا تو تھا کہ بچّہ جی کو مار ہی ڈالوں۔"

ہیرا۔ "گرے ہوئے دشمن پر سینگ چلانا نامناسب ہے۔"

موتی۔ "یہ سب فضول ہے اگر اس کا داؤ چلتا تو کبھی نہ چھوڑتا۔"

ہیرا۔ "اب کیسے گھر پہنچو گے؟ یہ سوچو؟"

موتی۔ "پہلے کچھ کھا لیں تو سوچیں' ابھی تو عقل کام نہیں کرتی۔"

یہ کہہ کر موتی مٹر کے کھیت میں گھس گیا۔ ہیرا منع کرتا ہی رہ گیا لیکن اس نے ایک نہ سنی۔ ابھی دو ہی چار منہ مارے تھے کہ دو آدمی لاٹھیاں لیے آگئے اور دونوں بیلوں کو گھیر لیا۔ ہیرا تو مینڈ پر تھا نکل گیا۔ موتی کھیت میں تھا۔ اس کے کھر کیچڑ میں دھنسنے لگے' نہ بھاگ سکا۔ پکڑا گیا۔ ہیرا نے دیکھا دوست تکلیف میں ہے تو لوٹ پڑا۔ پھنسیں گے' تو اکٹھے۔ رکھوالوں نے اسے بھی پکڑ لیا۔ دوسرے دن دونوں دوست کانجی ہاؤس میں تھے۔

ان کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سارا دن گزر گیا اور کھانے کو ایک تنکا بھی نہ ملا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا یہ کیسا مالک ہے۔ اس سے تو گیا ہی اچھا تھا۔ وہاں کئی بھینسیں تھیں' کئی بکریاں' کئی گھوڑے' کئی گدھے مگر چارہ کسی کے سامنے بھی نہ تھا۔ سب زمین پر مُردے کی طرح پڑے تھے۔ کئی تو اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ سارا دن دروازہ کی طرف دیکھتے رہے۔ مگر کوئی چارہ لے کر نہ آیا۔ تب غریبوں نے دیوار کی نمکین مٹی چاٹنی شروع کی مگر اس سے کیا تسکین ہو سکتی تھی؟

جب رات کو بھی کھانا نہ ملا تو ہیرا کے دل میں سرکشی کے خیالات پیدا ہوئے۔ موتی سے بولا۔ ''مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جان نکل رہی ہے۔''

موتی۔ ''اتنی جلدی ہمت نہ ہارو بھائی۔ یہاں سے بھاگنے کا طریقہ سوچو۔''

ہیرا۔ ''آؤ دیوار توڑ ڈالیں۔''

موتی۔ ''مجھ سے تو اب کچھ نہ ہو گا۔''

ہیرا۔ ''بس اسی بوتے پر اکڑتے تھے۔''

موتی۔ ''ساری اکڑ نکل گئی بھائی۔''

باڑے کی دیوار کچی تھی۔ ہیرا نے اپنے نوکیلے سینگ دیوار میں گاڑ دیے اور زور مارا تو مٹی کا ایک چپڑ نکل آیا۔ اس سے اس کا حوصلہ بڑھ گیا۔ اس نے دوڑ دوڑ کر دیوار سے ٹکریں ماریں۔ ہر ٹکر میں تھوڑی تھوڑی مٹی گرنے لگی۔

اتنے میں کانجی ہاؤس کا چوکیدار لالٹین لے کر جانوروں کی حاضری لینے آ نکلا۔ ہیرا کی وحشت دیکھ کر اس نے کئی ڈنڈے رسید کیے اور موٹی سی رسّی سے باندھ دیا۔

موتی نے پڑے پڑے اس کی طرف دیکھا' گویا زبانِ حال سے کہا آخر مار کھا لی کیا ملا۔

ہیرا۔ ''زور تو آزما لیا۔''

موتی۔ ''ایسا زور کس کام کا اور بندھن میں پڑ گئے۔''

ہیرا۔ ''اس سے باز نہ آؤں گا۔ خواہ بندھن بڑھتے جائیں۔''

موتی۔ ''جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے۔''

ہیرا۔ ''اس کی مجھے پروا نہیں۔ یوں بھی تو مرنا ہے۔ ذرا سوچو اگر دیوار گر جاتی' تو کتنی جانیں بچ جاتیں۔ اتنے بھائی یہاں بند ہیں کسی کے جسم میں جان بھی نہیں۔ دو چار دن یہی حال رہا تو سب مر جائیں گے۔''

موتی نے بھی دیوار میں اسی جگہ سینگ مارا۔ تھوڑی سی مٹی گری اور ہمت بڑھی تو وہ دیوار میں سینگ لگا کر اسی طرح زور کرنے لگا جیسے کسی سے لڑ رہا ہو۔ آخر کوئی دو گھنٹہ کی زور آزمائی کے بعد دیوار کا کچھ حصہ گر گیا۔ اس نے دوگنی طاقت سے دوسرا دھکا لگایا تو آدھی دیوار گر پڑی۔

دیوار کا گرنا تھا کہ نیم جان جانور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ تینوں گھوڑیاں بھاگ نکلیں۔ بھیڑ بکریاں نکلیں۔ اس کے بعد بھینسیں بھی کھسک گئیں۔ پر گدھے ابھی کھڑے تھے۔

ہیرا نے پوچھا۔ "تم کیوں نہیں جاتے؟"

ایک گدھے نے کہا۔ "کہیں پھر پکڑ لیے جائیں تو؟"

ہیرا۔ "پکڑ لیے جاؤ پھر دیکھا جائے گا اس وقت تو موقع ہے۔"

گدھا۔ "ہمیں ڈر لگتا ہے ہم نہ بھاگیں گے۔"

آدھی رات گزر چکی تھی۔ دونوں گدھے کھڑے سوچ رہے تھے بھاگیں یا نہ بھاگیں۔ موتی اپنے دوست کی رسّی کاٹنے پر مصروف تھا۔ جب وہ ہار گیا تو ہیرا نے کہا۔ تم جاؤ مجھے یہیں رہنے دو۔ شاید کبھی ملاقات ہو جائے۔

موتی نے آنکھوں میں آنسو لا کر کہا۔ "تم مجھے خود غرض سمجھتے ہو ہیرا' ہم اور تم اتنے دنوں ساتھ رہے۔ آج تم مصیبت میں پھنسے۔ تو میں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔"

ہیرا۔ "بہت مار پڑے گی۔ سمجھ جائیں گے یہ تمہاری شرارت ہے۔"

موتی۔ "جس قصور کے لیے تمہارے گلے میں رسّہ پڑا ہے۔ اس کے لیے اگر مجھے مار پڑے گی تو کیا بات ہے۔ اتنا تو ہو گیا کہ نو دس جانوروں کی جان بچ گئی۔"

یہ کہہ کر موتی نے دونوں گدھوں کو سینگ مار مار کر باہر نکال دیا اور اپنے دوست کے پاس آ کر سو گیا۔

صبح ہوتے ہوتے منشیوں' چوکیداروں اور دوسرے ملازموں میں کھلبلی مچ گئی۔ اس کے بعد موتی کی مرمت ہوئی اور اسے بھی موٹی رسّی سے باندھ دیا گیا۔

ایک ہفتہ تک دونوں بیل بندھے پڑے رہے۔ خدا جانے اس کانجی ہاؤس کے آدمی کیسے بے درد تھے کہ کسی نے چارے کا ایک تنکا تک نہ ڈالا۔ ہاں ایک مرتبہ پانی دکھا دیا جاتا تھا۔ یہی ان کی خوراک تھی۔ دونوں اتنے کمزور ہو گئے کہ اٹھا تک نہ جاتا تھا۔ ہڈیاں نکل آئیں۔

ایک دن باڑے کے سامنے ڈگڈگی بجنے لگی۔ اور دوپہر ہوتے ہوتے پچاس ساٹھ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دونوں بیل نکالے گئے اور ان کی دیکھ بھال ہونے لگی۔ لوگ آ آ کر ان کی صورت دیکھتے اور چلے جاتے تھے۔ ایسے نیم جان بیلوں کو کون خرید تا؟

معاً ایک آدمی جس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جس کے چہرہ پر سخت دلی کے آثار نمایاں تھے' آیا اور منشی جی سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی شکل دیکھ کر کسی نامعلوم احساس سے دونوں بیل کانپ اٹھے۔ وہ کون ہے اور انہیں کیوں خرید تا ہے؟ اس کے متعلق انہیں کوئی شبہ نہ رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

ہیرا نے کہا۔ "گیا کے گھر سے ناحق بھاگے۔ اب جان نہ بچے گی۔"

موتی نے جواب دیا۔ "کہتے ہیں بھگوان سب پر مہربانی کرتے ہیں۔ انہیں ہماری حالت پر رحم کیوں نہیں آتا؟"

ہیرا۔ "بھگوان کے لیے ہمارا مرنا جینا دونوں برابر ہیں۔"

موتی۔ "چلو اچھا ہے' کچھ دن ان کے پاس رہیں گے۔"

ہیرا۔ "ایک مرتبہ بھگوان نے اس لڑکی کے روپ میں بچایا تھا۔ کیا اب نہ بچائیں گے۔"

موتی۔ ”یہ آدمی چھری چلائے گا دیکھ لینا۔“

ہیرا۔ ”معمولی بات ہے مر کر ان دکھوں سے چھوٹ جائیں گے۔“

نیلام ہو جانے کے بعد دونوں بیل اس آدمی کے ساتھ چلے۔ دونوں کی بوٹی بوٹی کانپ رہی تھی۔ بے چارے پاؤں تک نہ اٹھا سکتے تھے۔ مگر ڈر کے مارے چلے جاتے تھے۔ ذرا بھی آہستہ چلتے تو ڈنڈا جما دیتا تھا۔

راہ میں گائے بیلوں کا ایک ریوڑ مرغزار میں چرتا نظر آیا۔ سبھی جانور خوش تھے۔ کوئی اُچھلتا تھا' کوئی بیٹھا جگالی کرتا تھا۔ کیسی پُرمسرت زندگی تھی' لیکن وہ کیسے خود غرض تھے۔ کسی کو ان کی پروا نہ تھی۔ کسی کو خیال نہ تھا کہ ان کے دو بھائی موت کے پنجہ میں گرفتار ہیں۔

معاً انہیں ایسا معلوم ہوا کہ یہ راستہ دیکھا ہوا ہے۔ ہاں ادھر ہی سے تو گیا ان کو اپنے گاؤں لے گیا تھا۔ وہی کھیت ہیں' وہی باغ' وہی گاؤں۔ اب ان کی رفتار تیز ہونے لگی۔ ساری تکان' ساری کمزوری' ساری مایوسی رفع ہو گئی۔ ارے' یہ تو اپنا کھیت آ گیا۔ یہ اپنا کنواں ہے۔ جہاں ہر روز پانی پیا کرتے تھے۔

موتی نے کہا۔ ”ہمارا گھر نزدیک آ گیا۔“

ہیرا بولا۔ ”بھگوان کی مہربانی ہے۔“

موتی۔ ”میں تو اب گھر کو بھاگتا ہوں۔“

ہیرا۔ ”یہ جانے بھی دے گا اتنا سوچ لو۔“

موتی۔ ”اسے مار گراتا ہوں۔ جب تک سنبھلے تب تک گھر جا پہنچیں گے۔“

ہیرا۔ ”نہیں دوڑ کر تھان تک چلو۔ وہاں سے آگے نہ چلیں گے۔“

دونوں مست ہو کر بچھڑوں کی طرح کُلیلیں کرتے ہوئے گھر کی طرف دوڑے اور اپنے تھان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے دوڑا آتا تھا۔

جھوری دروازہ پر بیٹھا دھوپ کھا رہا تھا۔ بیلوں کو دیکھتے ہی دوڑا' اور انہیں پیار کرنے لگا۔ بیلوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک جھوری کا ہاتھ چاٹ رہا تھا۔ دوسرا پیر۔

اس آدمی نے آ کر بیلوں کی رسیاں پکڑ لیں۔ جھوری نے کہا۔ ”یہ بیل میرے ہیں۔“

”تمہارے کیسے ہیں۔ میں نے نیلام میں لیے ہیں۔“

جھوری۔ ”میرا خیال ہے چُرا کر لائے ہو۔ چپکے سے چلے جاؤ۔ بیل میرے ہیں۔ میں بیچوں گا تو بکیں گے' کسی کو میرے بیل بیچنے کا کیا حق ہے؟“

”میں نے تو خریدے ہیں۔“

”خریدے ہوں گے۔“

اس پر وہ آدمی زبردستی بیلوں کو لے جانے کے لیے آگے بڑھا۔ اسی وقت موتی نے سینگ چلایا۔ وہ آدمی پیچھے ہٹا۔ موتی نے تعاقب کیا' اور اسے ریلتا ہوا گاؤں کے باہر تک لے گیا اور تب اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آدمی دور کھڑا دھمکیاں دیتا تھا۔ گالیاں دیتا تھا۔ پتھر پھینکتا تھا اور موتی اس کا راستہ روکے ہوئے تھا۔ گاؤں کے لوگ یہ تماشا دیکھتے تھے اور ہنستے تھے۔

جب وہ آدمی ہار کر چلا گیا تو موتی اکڑتا ہوا لوٹ آیا۔

ہیرا نے کہا۔ ”میں ڈر رہا تھا کہ کہیں تم اسے مار نہ بیٹھو۔“
موتی۔ ”اگر نزدیک آتا تو ضرور مارتا۔“
ہیرا۔ ”اب نہ آئے گا۔“
موتی۔ ”آئے گا تو دور ہی سے خبر لوں گا۔ دیکھوں کیسے لے جاتا ہے۔“
ذرا دیر میں ناند میں کھلی بھوسا چوکر دانہ سب کچھ بھر دیا گیا۔ دونوں بیل کھانے لگے۔
جھوری کھڑا ان کی طرف دیکھتا اور خوش ہوتا تھا۔ بیسیوں لڑکے تماشا دیکھ رہے تھے۔ سارا گاؤں مسکراتا معلوم ہوتا تھا۔
اسی وقت مالکن نے آکر اپنے دونوں بیلوں کے ماتھے چوم لیے۔

حجِ اکبر

(1)

منشی صابر حسین کی آمدنی کم تھی اور خرچ زیادہ۔ اپنے بچّے کے لیے دایہ رکھنا گوارا نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ایک تو بچّے کی صحت کی فکر اور دوسرے اپنے برابر والوں سے ہیٹے بن کر رہنے کی ذلت اس خرچ کو برداشت کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ بچّہ دایہ کو بہت چاہتا تھا۔ ہر دم اس کے گلے کا ہار بنا رہتا۔ اس وجہ سے دایہ اور بھی ضروری معلوم ہوتی تھی۔ مگر شاید سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ وہ مروّت کے باعث دایہ کو جواب دینے کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔ بڑھیا ان کے یہاں تین سال سے نوکر تھی۔ اس نے ان کے اکلوتے بچّے کی پرورش کی تھی۔ اپنا کام دل و جان سے کرتی تھی۔ اسے نکالنے کا کوئی حیلہ نہ تھا اور خواہ مخواہ کیچڑ اچھالنا صابر جیسے حلیم شخص کے لیے غیر ممکن تھا۔ مگر شاکرہ اس معاملہ میں اپنے شوہر سے متفق نہ تھی۔ اسے شک تھا کہ دایہ ہم کو لوٹے لیتی ہے۔ جب دایہ بازار سے لوٹتی ہے تو وہ دہلیز میں چھپی رہتی کہ دیکھوں آٹا چھپا کر تو نہیں رکھ دیتی۔ لکڑی تو نہیں چھپا دیتی۔ اس کی لائی ہوئی چیز کو گھنٹوں دیکھتی پچتاتی۔ بار بار پوچھتی اتنا ہی کیوں؟ کیا بھاؤ ہے؟ کیا اتنا مہنگا ہو گیا؟ دایہ کبھی تو ان بدگمانیوں کا جواب ملائمیت سے دیتی۔ لیکن جب بیگم زیادہ تیز ہو جاتیں تو وہ بھی کڑی پڑ جاتی تھی۔ قسمیں کھاتی۔ صفائی کی شہادتیں پیش کرتی۔ تردید اور حجت میں گھنٹوں لگ جاتے۔ قریب قریب روزانہ یہی کیفیت رہتی تھی اور روز یہ ڈرامہ دایہ کی خفیف سی اشک ریزی کے بعد ختم ہو جاتا تھا۔ دایہ کا اتنی سختیاں جھیل کر پڑے رہنا شاکرہ کے شکوک کی آب ریزی کرتا تھا۔ اسے کبھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ بڑھیا محض بچّے کی محبت سے پڑی ہوئی ہے۔ وہ دایہ کو ایسے لطیف جذبہ کا اہل نہیں سمجھتی تھی۔

(2)

اتفاق سے ایک روز دایہ کو بازار لوٹنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہاں دو کنجڑنوں میں بڑے جوش و خروش سے

مناظرہ ہو رہا تھا۔ ان کا مصور طرزِ ادا، ان کا اشتعال انگیز استدلال، ان کی متشکل تضحیک، ان کی روشن شہادتیں اور منوّر روایتیں، ان کی تعریض اور تردید سب بے مثال تھیں۔ زہر کے دو دریا تھے یا دو شعلے جو دونوں طرف سے امڈ کر باہم گتھ گئے تھے۔ کیا روانیِ زبان تھی۔ گویا کوزے میں دریا بھرا ہوا۔ ان کا جوشِ اظہار ایک دوسرے کے بیانات کو سننے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ ان کے الفاظ کی ایسی رنگینی، تخیل کی ایسی نوعیت، اسلوب کی ایسی جدّت، مضامین کی ایسی آمد، تشبیہات کی ایسی موزونیت اور فکر کی ایسی پرواز پر ایسا کون شاعر ہے جو رشک نہ کرتا۔ صفت یہ تھی کہ اس مباحثہ میں تلخی یا دل آزاری کا شائبہ بھی نہ تھا۔ دونوں بلبلیں اپنے اپنے ترانوں میں محو تھیں۔ ان کی متانت، ان کا ضبط، ان کا اطمینان سب حیرت انگیز تھا۔ ان کے ظرفِ دل میں اس سے کہیں زیادہ کہنے کی اور بدرجہا زیادہ سننے کی گنجائش معلوم ہوتی تھی۔ الغرض یہ خالص دماغی، ذہنی مظاہرہ تھا۔ اپنے اپنے کمالات کے اظہار کے لیے ایک خالص زور آزمائی تھی، اپنے اپنے کرتب اور فن کے جوہر دکھانے کے لیے۔

تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ وہ مُبتذل کنایات و اشارے جن پر بے شرمی کو شرم آتی۔ وہ کلماتِ رکیک جن سے عفونت بھی دور بھاگتی، ہزاروں رنگین مزاجوں کے لیے محض باعثِ تفریح تھے۔

دایہ بھی کھڑی ہو گئی کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے۔ پر تماشا اتنا دلآویز تھا کہ اسے وقت کا مطلق احساس نہ ہوا۔ یکایک نو بجنے کی آواز کان میں آئی تو سحر ٹوٹا۔ وہ لپکی ہوئی گھر کی طرف چلی۔

شاکرہ بھری بیٹھی تھی۔ دایہ کو دیکھتے ہی تیور بدل کر بولی۔ کیا بازار میں کھو گئی تھیں؟ دایہ نے خطاوارانہ انداز سے سر جھکا لیا، اور بولی۔ بی بی ایک جان پہچان کی ماما سے ملاقات ہو گئی اور باتیں کرنے لگی۔

شاکرہ جواب سے اور بھی برہم ہوئی۔ یہاں دفتر جانے کو دیر ہو رہی ہے۔ تمھیں سیر سپاٹے کی سوجھی ہے۔ مگر دایہ نے اس وقت دبنے میں خیریت سمجھی۔ بچّے کو گود میں لینے چلی پر شاکرہ نے جھڑک کر کہا۔ "رہنے دو، تمہارے بغیر بے حال نہیں ہوا جاتا۔"

دایہ نے اس حکم کی تعمیل ضروری نہ سمجھی۔ بیگم صاحبہ کا غصہ فرو کرنے کی اس سے زیادہ کارگر کوئی تدبیر ذہن میں نہ آئی۔ اس نے نصیر کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلائے لڑکھڑاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ دایہ نے اسے گود میں اُٹھا لیا اور دروازے کی طرف چلی لیکن شاکرہ باز کی طرح جھپٹی اور نصیر کو اس کی گود سے چھین کر بولی۔ "تمہارا یہ مکر بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں۔ یہ تماشے کسی اور کو دکھایئے۔ یہاں طبیعت سیر ہو گئی۔"

دایہ نصیر پر جان دیتی تھی اور سمجھتی تھی کہ شاکرہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں شاکرہ اور اس کے درمیان یہ ایسا مضبوط تعلق تھا جسے معمولی تُرشیاں کمزور نہ کر سکتی تھیں۔ اسی وجہ سے باوجود شاکرہ کی سخت زبانیوں کے اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ واقعی مجھے نکالنے پر آمادہ ہے۔ پر شاکرہ نے یہ باتیں کچھ اس بے رخی سے کہیں اور بالخصوص نصیر کو اس بے دردی سے چھین لیا کہ دایہ سے ضبط نہ ہو سکا۔ بولی۔ "بیوی مجھ سے کوئی ایسی بڑی خطا تو نہیں ہوئی۔ بہت ہو گا تو پاؤ گھنٹہ کی دیر ہوئی ہو گی۔ اس پر آپ اتنا جھلّا رہی ہیں۔ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتیں کہ دوسرا دروازہ دیکھو۔ اللہ نے پیدا کیا ہے تو رزق بھی دے گا۔ مزدوری کا کال تھوڑا ہی ہے۔"

شاکرہ۔ "تو یہاں تمہاری پروا کون کرتا ہے۔ تمہاری جیسی مامائیں گلی گلی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہیں۔"

دایہ۔ "ہاں خدا آپ کو سلامت رکھے۔ مامائیں دائیاں بہت ملیں گی۔ جو کچھ خطا ہوئی ہو، معاف کیجئے گا۔ میں جاتی ہوں۔"

شاکرہ۔ ”جاکر مردانے میں اپنی تنخواہ کا حساب کرلو۔“
دایہ۔ ”میری طرف سے نصیر میاں کو اس کی مٹھائیاں منگوا دیجیے گا۔“
اتنے میں صابر حسین بھی باہر سے آگئے۔ پوچھا ”کیا ہے؟“
دایہ۔ ”کچھ نہیں بیوی نے جواب دے دیا ہے گھر جاتی ہوں۔“
صابر حسین خانگی تردّدات سے یوں بچتے تھے جیسے کوئی برہنہ پا کانٹوں سے بچے۔ انہیں سارے دن ایک ہی جگہ کھڑے رہنا منظور تھا پر کانٹوں میں پیر رکھنے کی جرأت نہ تھی۔ چیں بہ جبیں ہو کر بولے۔ ”کیا بات ہوئی؟“
شاکرہ۔ ”کچھ نہیں، اپنی طبیعت، نہیں جی چاہتا نہیں رکھتے۔ کسی کے ہاتھوں بِک تو نہیں گئے۔“
صابر۔ ”تمہیں بیٹھے بٹھائے ایک نہ ایک کھچڑ سوجھتی رہتی ہے۔“
شاکرہ۔ ”ہاں مجھے تو اس بات کا جنون ہے۔ کیا کروں؟ خصلت ہی ایسی ہے۔ تمہیں یہ بہت پیاری ہے تو لے جاکر گلے باندھو۔ میرے یہاں ضرورت نہیں ہے۔“
دایہ گھر سے نکلی تو اس کی آنکھیں لبریز تھیں۔ دل نصیر کے لیے تڑپ رہا تھا کہ ایک بار بچّے کو گود میں لے کر پیار کرلوں۔ پر یہ حسرت لیے اسے گھر سے نکلنا پڑا۔

(3)

نصیر دایہ کے پیچھے پیچھے دروازہ تک آیا لیکن جب دایہ نے دروازہ باہر سے بند کر دیا تو مچل کر زمین پر لیٹ گیا اور انّا انّا کہہ کر رونے لگا۔ شاکرہ نے چمکارا، پیار کیا، گود میں لینے کی کوشش کی۔ مٹھائی کا لالچ دیا، میلہ دکھانے کا وعدہ کیا۔ اس سے کام نہ چلا تو بندر اور سپاہی اور لولو اور ہوا کی دھمکی دی مگر نصیر پر مطلق اثر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ شاکرہ کو غصہ آ گیا۔ اس نے بچے کو وہیں چھوڑ دیا اور آکر گھر کے دھندوں میں مصروف ہوگئی۔ نصیر کا منہ اور گال لال ہوگئے آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ آخر وہ وہیں زمین پر سسکتے سسکتے سو گیا۔
شاکرہ نے سمجھا تھا تھوڑی دیر میں بچہ رو دھو کر چپ ہو جائے گا۔ پر نصیر نے جاگتے ہی پھر انّا کی رٹ لگائی۔ تین بجے صابر حسین دفتر سے آئے اور بچے کی یہ حالت دیکھی تو بیوی کی طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا اور بہلانے لگے۔ آخر نصیر کو جب یقین ہوا کہ دایہ مٹھائی لینے گئی تو اسے تسکین ہوئی مگر شام ہوتے ہی اس نے پھر چیخنا شروع کیا۔ ”انّا مٹھائی، لائی؟“
اس طرح دو تین دن گزر گئے۔ نصیر کو انّا کی رٹ لگانے اور رونے کے سوا اور کوئی کام نہ تھا۔ وہ بے ضرر کتا جو ایک لمحہ کے لیے اس کی گود سے جدا نہ ہوتا تھا۔ وہ بے زبان بلّی جسے طاق پر بیٹھے دیکھ کر وہ خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ وہ طائر بے پرواز جس پر وہ جان دیتا تھا۔ سب اس کی نظروں سے گر گئے۔ وہ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ انّا جیسی جیتی جاگتی پیار کرنے والی، گود میں لے کر گھمانے والی، تھپک تھپ کر سلانے والی، گا گا کر خوش کرنے والی چیز کی جگہ ان بے جان، بے زبان چیزوں سے پُر نہ ہوسکتی تھی۔ وہ اکثر سوتے سوتے چونک پڑتا، اور انّا انّا پکار کے رونے لگتا۔ کبھی دروازہ پر جاتا اور انّا انّا پکار کر ہاتھوں سے اشارہ کرتا گویا اسے بلا رہا ہے۔ انّا کی خالی کوٹھڑی میں جاکر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ اسے اُمید ہوتی تھی کہ انّا یہاں آتی ہوگی۔ اس کوٹھڑی کا دروازہ بند پاتا تو جاکر کھٹکھٹاتا کہ شاید انّا اندر

چھپی بیٹھی ہو۔ صدر دروازہ کھلتے سنتا تو انا انا کہہ کر دوڑتا۔ سمجھتا کہ انا آگئی۔ اس کا گدرایا ہوا بدن گھل گیا۔ گلاب کے رخسار سوکھ گئے۔ ماں اور باپ دونوں اس کی موہنی ہنسی کے لیے ترس ترس کر رہ جاتے۔ اگر بہت گدگدانے اور چھیڑنے سے ہنستا بھی تو ایسا معلوم ہوتا دل سے نہیں محض دل رکھنے کے لیے ہنس رہا ہے۔ اسے اب دودھ سے رغبت تھی نہ مِصری سے' میوہ سے نہ میٹھے بسکٹ سے' نہ تازی امرتیوں سے۔ ان میں مزہ تھا جب انّا اپنے ہاتھوں سے کھلاتی تھی۔ اب ان میں مزہ نہ تھا۔ دو سال کا ہونہار لہلہاتا ہوا شاداب پودا مرجھا کر رہ گیا۔ وہ لڑکا جسے گود میں اٹھاتے ہی نرمی گرمی اور وزن کا احساس ہوتا تھا' اب استخوان کا ایک پتلا رہ گیا تھا۔ شاکرہ بچے کی یہ حالت دیکھ دیکھ کر اندر ہی اندر کڑھتی اور اپنی حماقت پر پچھتاتی۔ صابر حسین جو فطرتاً خلوص پسند آدمی تھے۔ اب نصیر کو گود سے جدا نہ کرتے تھے۔ اسے روز ہوا کھلانے لے جاتے۔ نت نئے کھلونے لاتے۔ پر مرجھایا ہوا پودا کسی طرح نہ پنپتا تھا۔ دایہ اس کی دنیا کا آفتاب تھی ـــ اس قدرتی حرارت اور روشنی سے محروم ہو کر سبزی کی بہار کیوں کر دکھاتا؟ دوسری انا تیسرے ہی دن رکھ لی تھی۔ پر نصیر اس کی صورت دیکھتے ہی منہ چھپا لیتا تھا۔ گویا وہ کوئی دیونی یا بھتنی ہے۔

عالمِ وجود میں دایہ کو نہ دیکھ کر نصیر اب زیادہ تر عالمِ خیال میں رہتا۔ وہاں اس کی اپنی انا چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ اس کی وہی گود تھی' وہی محبت' وہی پیاری پاری باتیں' وہی پیارے پیارے گیت' وہی مزے دار مٹھائیاں' وہی سہانا سنسار' وہی دلکش لیل و نہار۔ اکیلے بیٹھا انا سے باتیں کرتا۔ انا کتا بھونکے۔ انا گائے دودھ دیتی۔ انا اجلا اجلا گھوڑا دوڑتا۔ صبح ہوتے ہی دایہ کی کوٹھڑی میں جاتا اور کہتا "انا پانی پی۔" دودھ کا گلاس لے کر اس کی کوٹھڑی میں رکھ آتا اور کہتا "انا سوتی" شاکرہ کھانے بیٹھتی تو رکابیاں اُٹھا اُٹھا کر انا کی کوٹھڑی میں لے جاتا اور کہتا۔ "انا کھانا کھائے گی۔" انا اس کے لیے اب ایک آسمانی وجود تھی جس کی واپسی کی اب اسے مطلق اُمید نہ تھی۔ وہ محض گزشتہ خوشیوں کی دلکش یادگار تھی جس کی یاد ہی اس کا سب کچھ تھا۔ نصیر کے انداز میں رفتہ رفتہ طفلانہ شوخی اور بے تابی کی جگہ ایک حسرت ناک توکّل' ایک مایوسانہ خوشی نظر آنے لگی۔ اسی طرح تین ہفتے گزر گئے۔ برسات کا موسم تھا کبھی شدت کی گرمی کبھی ہوا کے ٹھنڈے جھونکے۔ بخار اور زکام کا زور تھا۔ نصیر کی نقاہت اس موسمی تغیرات کو برداشت نہ کر سکی۔ شاکرہ احتیاطاً اسے فلالین کا کرتا پہنائے رکھتی۔ اسے پانی کے قریب نہ جانے دیتی۔ ننگے پاؤں ایک قدم نہ چلنے دیتی۔ مگر رطوبت کا اثر ہو ہی گیا۔ نصیر کھانسی اور بخار میں مبتلا ہو گیا۔

(4)

صبح کا وقت تھا۔ نصیر چارپائی پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ ڈاکٹروں کا علاج بے سود ہو رہا تھا۔ شاکرہ چارپائی پر بیٹھی اس کے سینے پر تیل کی مالش کر رہی تھی اور صابر حسین صورتِ غم بنے ہوئے بچہ کو پُر درد نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے وہ شاکرہ سے کم بولتے تھے۔ انہیں اس سے ایک نفرت سی ہوتی تھی۔ وہ نصیر کی اس بیماری کا سارا الزام اسی کے سر رکھتے تھے۔ وہ ان کی نگاہوں میں نہایت کم ظرف' سفلہ مزاج' بے حس عورت تھی۔

شاکرہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "آج بڑے حکیم صاحب کو بلا لیتے۔ شاید انہی کی دوا سے فائدہ ہو۔" صابر حسین نے کالی گھٹاؤں کی طرف دیکھ کر ترشی سے جواب دیا۔ "بڑے حکیم نہیں' لقمان بھی آئیں تو اسے کوئی فائدہ نہ ہو گا۔"

شاکرہ۔ ''تو کیا اب کسی کی دوا ہی نہ ہو گی؟''

صابر۔ ''بس اس کی ایک ہی دوا ہے اور وہ نایاب ہے۔''

شاکرہ۔ ''تمہیں وہی دھن سوار ہے۔ کیا عبّاسی امرت پلا دے گی؟''

صابر۔ ''ہاں وہ تمہارے لیے چاہے زہر ہو لیکن بچّے کے لیے امرت ہی ہو ئی۔''

شاکرہ۔ ''میں نہیں سمجھتی کہ اللہ کی مرضی میں اسے اتنا دخل ہے۔''

صابر۔ ''اگر نہیں سمجھتی ہو اور اب تک نہیں سمجھا تو روؤ گی' بچّے سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔''

شاکرہ۔ ''چپ بھی رہو۔ کیسا شگون زبان سے نکالتے ہو۔ اگر ایسی جلی کٹی سنانی ہیں تو یہاں سے چلے جاؤ۔''

صابر۔ ''ہاں تو میں جاتا ہوں۔ مگر یاد رکھو یہ خون تمہاری گردن پر ہو گا۔ اگر لڑکے کو پھر تندرست دیکھنا چاہتی ہو تو اس عبّاسی کے پاس جاؤ۔ اس کی منت کرو' التجا کرو۔ تمہارے بچے کی جان اسی کے رحم و کرم پر منحصر ہے۔''

شاکرہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

صابر حسین نے پوچھا۔ ''کیا مرضی ہے۔ جاؤں اسے تلاش کروں؟''

شاکرہ۔ ''تم کیوں جاؤ گے۔ میں خود چلی جاؤں گی۔''

صابر۔ ''نہیں' معاف کرو۔ مجھے تمہارے اوپر اعتبار نہیں ہے۔ نہ جانے تمہارے منہ سے کیا نکل جائے کہ وہ آتی بھی ہو تو نہ آئے۔''

شاکرہ نے شوہر کی طرف نگاہ ملامت سے دیکھ کر کہا۔ ''ہاں اور کیا! مجھے اپنے بچّے کی بیماری کا قلق تھوڑے ہی ہے۔ میں نے شرم کے مارے تم سے کہا نہیں لیکن میرے دل میں بار بار یہ خیال پیدا ہوا ہے۔ اگر مجھے دایہ کے مکان کا پتہ معلوم ہوتا تو میں اسے کب کی منا لائی ہوتی۔ وہ مجھ سے کتنی ہی ناراض ہو لیکن نصیر سے اسے محبت تھی۔ میں آج ہی اس کے پاس جاؤں گی' اس کے قدموں کو آنسوؤں سے تر کر دوں گی اور وہ جس طرح راضی ہو گی' اسے راضی کروں گی۔''

شاکرہ نے بہت ضبط کر کے یہ باتیں کہیں مگر اُمڈے ہوئے آنسو اب نہ رُک سکے۔ صابر حسین نے بیوی کی طرف ہمدردانہ نگاہ سے دیکھا اور نادم ہو کر بولے۔ ''میں تمہارا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ میں خود ہی جاتا ہوں۔''

(5)

عبّاسی دنیا میں اکیلی تھی۔ کسی زمانے میں اس کا خاندان گلاب کا سرسبز شاداب درخت تھا۔ مگر رفتہ رفتہ خزاں نے سب پتّیاں گرا دیں۔ بادِ حوادث نے درخت کو پامال کر دیا اور اب یہی سوکھی ٹہنی ہرے بھرے درخت کی یادگار باقی تھی۔

مگر نصیر کو پا کر اس کی سوکھی ٹہنی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ اس میں ہری ہری پتیاں نکل آئی تھیں۔ وہ زندگی جو اب تک خشک اور پامال تھی' اس میں پھر رنگ و بو کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔ اندھیرے بیاباں میں بھٹکے ہوئے مسافر کو شمع کی جھلک نظر آنے لگی تھی۔ اب اس کا جوئے حیات سنگ ریزوں سے نہ ٹکراتا تھا۔ وہ اب ایک گلزار کی آبیاری کرتا تھا۔ اب اس کی زندگی مہمل نہیں تھی۔ اس میں معنی پیدا ہو گئے تھے۔

عبّاسی نصیر کی بھولی بھالی باتوں پر نثار ہوگئی مگر وہ اپنی محبت کو شاکرہ سے چھپاتی تھی۔ اس لیے کہ ماں کے دل میں رشک نہ ہو۔ وہ نصیر کے لیے ماں سے چھپ کر مٹھائیاں لاتی اور اسے کھلا کر خوش ہوتی۔ وہ دن میں دو تین بار اسے اُبٹن ملتی کہ بچّہ خوب پروان چڑھے۔ وہ اسے دوسروں کے سامنے کوئی چیز نہ کھلاتی کہ بچے کو نظر نہ لگ جائے۔ ہمیشہ دوسروں سے بچے کی کم خوری کا رونا رویا کرتی۔ اسے نظر بد سے بچانے کے لیے تعویذ اور گنڈے لاتی رہتی۔ یہ اس کی خالص مادرانہ محبت تھی۔ جس میں اپنے روحانی احتظاظ کے سوا کوئی غرض نہ تھی۔

اس گھر سے نکل کر عبّاسی کی وہ حالت ہوگئی جو تھیٹر میں یکایک بجلیوں کے گُل ہو جانے سے ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہی صورت ناچ رہی تھی۔ کانوں میں وہی پیاری پیاری باتیں گونج رہی تھیں۔ اسے اپنا گھر پھاڑے کھاتا تھا۔ اس کال کوٹھڑی میں دم گھٹا جاتا تھا۔

رات جوں توں کر کے کٹی۔ صبح کو وہ مکان میں جھاڑو دے رہی تھی۔ یکایک تازے حلوے کی صدا سن کر بے اختیار باہر نکل آئی۔ معاً یاد آ گیا آج حلوہ کون کھائے گا؟ آج گود میں بیٹھ کر کون چہکے گا۔ وہ نغمۂ مسرت سننے کے لیے جو حلوہ کھاتے وقت نصیر کی آنکھوں سے، ہونٹوں سے اور جسم کے ایک ایک عضو سے برستا تھا۔ عبّاسی کی روح تڑپ اُٹھی۔ وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلی کہ چلوں نصیر کو دیکھ آؤں پر آدھے راستہ سے لوٹ گئی۔

نصیر عبّاسی کے دھیان سے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں اُترتا تھا۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی۔ معلوم ہوتا نصیر ڈنڈے کا گھوڑا دبائے چلا آتا ہے۔ پڑوسیوں کے پاس جاتی تو نصیر ہی کا چرچا کرتی۔ اس کے گھر کوئی آتا تو نصیر ہی کا ذکر کرتی۔ نصیر اس کے دل و جان میں بسا ہوا تھا۔ شاکرہ کی بے رخی اور بد سلوکی کے ملال کے لیے اس میں جگہ نہ تھی۔

وہ روز ارادہ کرتی کہ آج نصیر کو دیکھنے جاؤں گی اس کے لیے بازار سے کھلونے اور مٹھائیاں لاتی۔ گھر سے چلتی لیکن کبھی آدھے راستہ سے لوٹ آتی۔ کبھی دو چار قدم سے آگے نہ بڑھا جاتا۔ کون سامنہ لے کر جاؤں؟ جو محبت کو فریب سمجھتا ہو اسے کون منہ دکھاؤں۔ کبھی سوچتی کہیں نصیر مجھے نہ پہچانے تو! بچوں کی محبت کا اعتبار کیا؟ نئی دایہ سے رچ گیا ہو۔ یہ خیال اس کے پیروں پر زنجیر کا کام کر جاتا تھا۔

اس طرح دو ہفتے گزر گئے۔ عبّاسی کا دل ہر دم اُچاٹ رہتا۔ جیسے اسے کوئی لمبا سفر درپیش ہو۔ گھر کی چیزیں جہاں کی تہاں پڑی رہتیں۔ نہ کھانے کی فکر نہ کپڑے کی۔ بدنی ضروریات بھی خلاءِ دل کو پُر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں حج کے دن آ گئے۔ محلّہ میں کچھ لوگ حج کی تیاریاں کرنے لگے۔ عباسی کی حالت اس وقت پالتو چڑیا کی سی تھی جو قفس سے نکل کر پھر کسی گوشہ کی تلاش میں ہو۔ اسے اپنے تئیں بھلا دینے کا یہ ایک بہانہ مل گیا۔ وہ آمادۂ سفر ہوگئی۔

(6)

آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور ہلکی ہلکی پھواریں پڑ رہی تھیں۔ دہلی اسٹیشن پر زائرین کا ہجوم تھا۔ کچھ گاڑیوں میں بیٹھے تھے۔ کچھ اپنے گھر والوں سے رخصت ہو رہے تھے۔ چاروں طرف اک کہرام سا مچا ہوا تھا۔ دنیا اس وقت بھی جانے والوں کے دامن پکڑے ہوئے تھی۔ کوئی بیوی سے تاکید کر رہا تھا۔ "دھان کٹ جائے تو تالاب والے کھیت میں مٹر بو دینا اور باغ کے پاس گیہوں۔" کوئی اپنے جوان لڑکے کو سمجھا رہا تھا۔ "آسامیوں پر بقایا

لگان کی نالش کرنے میں دیر نہ کرنا اور دو روپیہ سینکڑہ سود ضرور مجرا کر لینا۔" ایک بوڑھے تاجر صاحب اپنے منیم سے کہہ رہے تھے۔ "مال آنے میں دیر ہو تو خود چلے جائیے گا اور چلتو مال لیجئے گا ورنہ روپیہ پھنس جائے گا۔" مگر خال خال ایسی صورتیں بھی نظر آئیں تھیں جن پر مذہبی ارادت کا جلوہ تھا۔ وہ یا تو آسمان کی طرف تاکتی تھیں یا محوِ تسبیح خوانی تھیں۔ عبّاسی بھی ایک گاڑی میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ ان بھلے آدمیوں کو اب بھی دنیا کی فکر نہیں چھوڑتی۔ وہی خرید و فروخت، لین دین کے چرچے! نصیر اس وقت یہاں ہوتا تو بہت روتا۔ میری گود سے کسی طرح نہ اترتا۔ لوٹ کر ضرور اسے دیکھنے جاؤں گی۔۔۔ یا اللہ! کسی طرح گاڑی چلے۔ گرمی کے مارے کلیجہ بُھنا جاتا ہے۔ اتنی گھٹا اُمڈی ہوئی ہے، برسنے کا نام ہی نہیں لیتی۔۔۔ معلوم نہیں یہ ریل والے کیوں دیر کر رہے ہیں۔ جھوٹ موٹ اِدھر اُدھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ چٹ پٹ گاڑی کھول دیں۔ مسافروں کی جان میں جان آئے۔۔۔ یکایک اس نے صابر حسین کو بائیسکل لیے پلیٹ فارم پر آتے دیکھا۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور کپڑے تر تھے۔ وہ گاڑیوں میں جھانکنے لگے۔ عبّاسی محض یہ دکھانے کے لیے کہ میں بھی حج کرنے جارہی ہوں، گاڑی سے باہر نکل آئی۔ صابر حسین اسے دیکھتے ہی لپک کر قریب آئے اور بولے "کیوں عبّاسی! تم بھی حج کو چلیں؟"

عبّاسی نے فخریہ انکسار سے کہا۔ "ہاں! یہاں کیا کروں؟ زندگی کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ خدا کے یہاں منہ دکھانے کے لیے بھی تو کوئی سامان چاہیے۔ نصیر میاں تو اچھی طرح ہیں؟"

صابر۔ "اب تم جارہی ہو۔ نصیر کا حال پوچھ کر کیا کروگی۔ اس کے لیے دعا کرتی رہنا۔"

عبّاسی کا سینہ دھڑکنے لگا۔ گھبرا کر بولی۔ "کیا دشمنوں کی طبیعت اچھی نہیں ہے؟"

صابر۔ "اس کی طبیعت تو اسی دن سے خراب ہے جس دن تم وہاں سے نکلیں۔ کوئی دو ہفتے تک تو انّا انّا کی رٹ لگا تا رہا اور اب ایک ہفتے سے کھانسی اور بخار میں مبتلا ہے۔ ساری دوائیں کر کے ہار گیا۔ کوئی نفع ہی نہیں ہوتا۔ میں نے ارادہ کیا تھا چل کر تمہاری منت سماجت کر کے لے چلوں۔ کیا جانے تمہیں دیکھ کر اس کی طبیعت کچھ سنبھل جائے، لیکن تمہارے گھر پر آیا تو معلوم ہوا کہ تم حج کرنے جارہی ہو۔ اب کس منہ سے چلنے کو کہوں۔ تمہارے ساتھ سلوک ہی کون سا اچھا کیا تھا کہ اتنی جرأت کر سکوں اور پھر کارِ ثواب میں رخنہ ڈالنے کا بھی خیال ہے۔ جاؤ! اس کا خدا حافظ ہے۔ حیات باقی ہے تو صحت ہو ہی جائے گی ورنہ مشیّتِ ایزدی سے کیا چارہ؟"

عبّاسی کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ سامنے کی چیزیں تیرتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ دل پر ایک عجیب وحشت کا غلبہ ہوا۔ دل سے دعا نکلی۔۔۔ "اللہ میری جان کے صدقے میرے نصیر کا بال بیکا نہ ہو۔" رقت سے گلا بھر آیا۔۔۔ "میں کیسی سنگ دل ہوں۔ پیارا بچہ رو رو کر ہلکان ہو گیا اور میں اسے دیکھنے تک نہ گئی۔ شاکرہ بدمزاج سہی۔ نصیر نے میرا کیا بگاڑا تھا؟ میں نے ماں کا بدلہ نصیر سے لیا۔ یا خدا میرا گناہ بخشیو! پیارا نصیر میرے لیے ہڑک رہا ہے (اس خیال سے عباسی کا کلیجہ مسوس اٹھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے) مجھے کیا معلوم تھا کہ اسے مجھ سے اتنی محبت ہے ورنہ شاکرہ کی جوتیاں کھاتی اور گھر سے قدم نہ نکالتی۔ آہ! نہ معلوم بے چارے کی کیا حالت ہے۔" انداز وحشت سے بولی۔ "دودھ تو پیتے ہیں نا!"

صابر۔ "تم دودھ پینے کو کہتی ہو۔ اس نے دو دن سے آنکھیں تو کھولی نہیں۔"

عبّاسی۔ "یا میرے اللہ! ارے او قلی! قلی! بیٹا آ کے میرا اسباب گاڑی سے اتار دے۔ اب مجھے حج وج کی نہیں سوجھتی۔ ہاں بیٹا جلدی کر۔ میاں دیکھیے کوئی یکّہ ہو تو ٹھیک کر لیجیے۔"

یکّہ روانہ ہوا۔ سامنے سڑک پر کئی بگھیاں کھڑی تھیں۔ گھوڑا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ عبّاسی بار بار جھنجھلاتی تھی اور یکہ بان سے کہتی تھی۔ "بیٹا! جلدی کر‘میں تجھے کچھ زیادہ دے دوں گی۔" راستہ میں مسافروں کی بھیڑ دیکھ کر اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا گھوڑے کے پَر لگ جاتے لیکن جب صابر حسین کا مکان قریب آگیا تو عبّاسی کا سینہ زور سے اچھلنے لگا۔ سر تیورا گیا۔ بار بار دل سے دعا نکلنے لگی۔ سب خیر وعافیت ہو۔

یکّہ صابر حسین کی گلی میں داخل ہوا۔ دفعتاً عبّاسی کے کان میں کسی کے رونے کی آواز آئی۔ اس کا کلیجہ منہ کو آگیا۔ سر تیورا گیا۔ معلوم ہوا دریا میں ڈوبی جاتی ہوں۔ یکّہ سے کود پڑوں۔ مگر ذرا دیر میں معلوم ہوا کہ عورت میکہ سے بدا ہو رہی ہے۔ تسکین ہوئی۔

آخر صابر حسین کا مکان آ پہنچا۔ عبّاسی نے ڈرتے ڈرتے دروازے کی طرف تاکا۔ جیسے کوئی گھر سے بھاگا ہوا یتیم لڑکا شام کو بھوکا پیاسا گھر آئے اور دروازے کی طرف سہمی ہوئی نگاہ سے دیکھے کہ کوئی بیٹھا تو نہیں۔ دروازہ پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ باورچی بیٹھا حقہ پی رہا تھا۔ عباسی کو ذرا ڈھارس ہوئی۔ گھر میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ نئی دایہ بیٹھی پولٹس پکا رہی ہے۔ کلیجہ مضبوط ہوا۔ شاکرہ کے کمرے میں گئی تو اس کا دل گرما کی دوپہری دھوپ کی طرح کانپ رہا تھا۔ شاکرہ نصیر کو گود میں لیے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے تاک رہی تھی۔ غم اور یاس کی زندہ تصویر۔

عبّاسی نے شاکرہ سے کچھ نہیں پوچھا۔ نصیر کو اس کی گود سے لے لیا اور اس کے منہ کی طرف چشمِ پُرنم سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹا نصیر! آنکھیں کھولو!"

نصیر نے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحہ تک دایہ کو خاموش دیکھتا رہا۔ تب یکایک دایہ کے گلے سے لپٹ گیا اور بولا۔ "انّا آئی۔ انّا آئی۔"

نصیر کا زرد مرجھایا ہوا چہرہ روشن ہو گیا جیسے بجھتے ہوئے چراغ میں تیل پڑ جائے۔ ایسا معلوم ہوا گویا وہ کچھ بڑھ گیا ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ صبح کا وقت تھا۔ نصیر آنگن میں کھیل رہا تھا۔ صابر حسین نے آکر اسے گود میں اُٹھا لیا اور پیار کر کے بولے۔ "تمہاری انّا کو مار بھگا دیں؟" نصیر نے منہ بنا کر کہا۔ "نہیں روئے گی۔"

عبّاسی بولی۔ "کیوں بیٹا! مجھے تو تو نے کعبہ شریف نہ جانے دیا۔ میرے حج کا ثواب کون دے گا؟"

صابر حسین نے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں اس سے کہیں زیادہ ثواب ہو گیا۔ اس حج کا نام حجِ اکبر ہے۔"

پنچایت

جُمّن شیخ اور الگو چودھری میں بڑا یارانہ تھا۔ ساجھے میں کھیتی ہوتی۔ لین دین میں بھی کچھ ساجھا تھا۔ ایک کو دوسرے پر کامل اعتماد تھا۔ جمّن جب حج کرنے گئے تھے تو اپنا گھر الگو کو سونپ گئے تھے اور الگو جب کبھی باہر جاتے تو جُمّن پر اپنا گھر چھوڑ دیتے۔ وہ نہ ہم نوالہ تھے نہ ہم مشرب۔ صرف ہم خیال تھے اور یہی دوستی کی اصلی بنیاد ہے۔

اس دوستی کا آغاز اسی زمانہ میں ہوا جب دونوں لڑکے جمّن کے پدر بزرگوار شیخ جمعراتی کے روبروزانوئے ادب تہ کرتے تھے۔ الگو نے استاد کی بہت خدمت کی۔ خوب رکابیاں مانجھیں۔ خوب پیالے دھوئے۔ ان کا حقّہ دم نہ لینے پاتا تھا۔ ان خدمتوں میں شاگردانہ عقیدت کے سوا اور کوئی بھی خیال مضمر نہ تھا۔ جسے الگو خوب جانتا تھا۔ ان کے باپ پرانی وضع کے آدمی تھے۔ تعلیم کے مقابلے میں انہیں استاد کی خدمت پر زیادہ بھروسہ تھا۔ وہ کہا کرتے تھے استاد کی دعا چاہیے جو کچھ ہوتا ہے فیض سے ہوتا ہے' اور اگر الگو پر استاد کے فیض یا دعاؤں کا اثر نہ ہوا تو اسے تسکین تھی کہ تحصیلِ علم کا کوئی دقیقہ اس نے فروگزاشت نہیں کیا۔ علم اس کی تقدیر ہی میں نہ تھا۔ شیخ جمعراتی خود دعا اور فیض کے مقابلے میں تازیانے کے زیادہ قائل تھے اور جمّن پر اس کا بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ اسی کا یہ فیض تھا کہ آج جمّن کی قرب وجوار کے مواضعات میں پرشش ہوتی تھی۔ بیع نامہ یا رہن نامہ کے مسودات پر تحصیل کا عرائض نویس بھی قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ حلقہ کا پوسٹ مین کانسٹیبل اور تحصیل کا مذکوری یہ سب ان کے دستِ کرم کے محتاج تھے۔ اس لیے اگر الگو کو ان کی ثروت نے ممتاز بنا دیا تھا تو شیخ جمّن بھی علم کی لازوال دولت کے باعث عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

شیخ جمّن کی ایک بوڑھی بیوہ خالہ تھیں۔ ان کے پاس کچھ تھوڑی سی ملکیت تھی۔ مگر غریب کا وارث کوئی نہ تھا۔ جمّن نے وعدے وعہد کے سبز باغ دکھا کر خالہ اماں سے وہ ملکیت اپنے نام کرا لی تھی۔ جب تک ہبہ نامہ پر رجسٹری نہ ہوئی تھی خالہ جان کی خوب خاطر داریاں ہوتی تھیں۔ خوب میٹھے لقمے چٹ پٹے سالن کھلائے جاتے تھے۔ مگر پگڑی کی مہر ہوتے ہی ان کی خاطر داریوں پر بھی مہر ہو گئی۔ وہ وعدے وصال کے دمورے ثابت ہوئے۔ جمّن کی اہلیہ بی فہیمن نے روٹیوں کے ساتھ چیزیں بھی بدل دیں اور رفتہ رفتہ سالن کی مقدار روٹیوں سے کم کر دی۔ بُڑھیا وقت کے بورے بٹورے گی کیا' دو تین بیگھے اوسر کیا دے دیا ہے۔ اک دن دال بغیر روٹی نہیں اترتی۔ جتنا روپیہ اس کے پیٹ میں گیا' اگر ہوتا تو اب تک کئی گاؤں مول لے لیتے۔ کچھ دنوں تک خالہ جان نے اور دیکھا مگر جب برداشت نہ ہوئی تو جمّن سے شکایت کی۔ جمّن صلح پسند آدمی تھا۔ اب اس معاملے میں مداخلت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ کچھ دن تو رو دھو کر کام چلا۔ آخر ایک روز خالہ جان نے جمّن سے کہا۔

"بیٹا۔ تمہارے ساتھ میرا نباہ نہ ہوگا۔ تم مجھے روپے دے دیا کرو' میں اپنا الگ پکالوں گی۔"

جمّن نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "روپیہ کیا یہاں پھلتا ہے؟"

خالہ جان نے بگڑ کر کہا۔ "تو مجھے کچھ نان نمک چاہیے یا نہیں؟"

جمّن نے مظلومانہ انداز سے جواب دیا۔ "چاہیے کیوں نہیں میرا خون چوس لو! کوئی یہ تھوڑے ہی سمجھتا تھا کہ تم خواجہ خضر کی حیات لے کر آئی ہو۔"

خالہ جان اپنے مرنے کی بات نہیں سُن سکتی تھیں۔ جامہ سے باہر ہو کر پنچایت کی دھمکی دی۔ جمّن ہنسے۔ وہ فاتحانہ ہنسی جو شکاری کے لبوں پر ہرن کو جال کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نظر آتی ہے۔ کہا۔ "ہاں۔ ضرور پنچایت کر و فیصلہ ہو جائے۔ مجھے بھی رات دن کا وبال پسند نہیں۔"

پنچایت کی صدا کس کے حق میں اٹھے گی اس کے متعلق شیخ جمّن کو اندیشہ نہیں تھا۔ قرب وجوار میں ایسا کون تھا جو ان کا شرمندۂ منت نہ ہو؟ کون تھا جو ان کی دشمنی کو حقیر سمجھے؟ کس میں اتنی جرأت تھی جو ان کے سامنے کھڑا ہو سکے۔ آسمان کے فرشتے تو پنچایت کرنے آئیں گے نہیں۔ مریض نے آپ ہی دوا طلب کی۔

اس کے بعد کئی دن تک بوڑھی خالہ لکڑی لیے آس پاس کے گاؤں کے چکر لگاتی رہیں۔ کمر جھک کر کمان ہو گئی تھی۔ ایک قدم چلنا مشکل تھا۔ مگر بات آ پڑی تھی اس کا تصفیہ ضرور تھا۔ شیخ جمّن کو اپنی طاقت' رسوخ اور منطق پر کامل اعتماد تھا۔ وہ کسی کے سامنے فریاد کرنے نہیں گئے۔

بوڑھی خالہ نے اپنی دانست میں تو گریہ وزاری کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ مگر خوبیٔ تقدیر کوئی اس طرف مائل نہ ہوا۔ کسی نے تو یوں ہی ہاں ہوں کر کے ٹال دیا۔ کسی نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ ذرا اس ہوس کو دیکھو قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں۔ آج مریں کل دوسرا دن ہوا' مگر صبر نہیں ہوتا۔ پوچھو اب تمہیں گھر بار جگہ زمین سے کیا سروکار۔ ایک لقمہ کھاؤ' ٹھنڈا پانی پیو اور مالک کی یاد کرو۔ سب سے بڑی تعداد ستم ظریفوں کی تھی۔ خمیدہ کمر' پوپلا منہ 'سَن کے سے بال اور ثقلِ ساعت جب اتنے تفریح کے سامان موجود ہوں تو ہنسی کا آنا قدرتی امر ہے۔ غرض ایسے درد رس' انصاف پرور آدمیوں کی تعداد بہت کم تھی جنہوں نے خالہ جان کی فریاد کو غور سے سنا ہو اور اس کی تشفی کی ہو۔ چاروں طرف سے گھوم گھام کر بڑھیا الگو چودھری کے پاس آئی۔ لاٹھی پٹک دی اور دم لے کر کہا۔

"بیٹا! تم بھی چھن بھر کو پنچایت میں چلے آنا۔"

الگو بے رخی سے بولے۔

"مجھے بلا کر کیا کرو گی۔ کئی گاؤں کے آدمی تو آئیں گے ہی۔"

خالہ نے ہانپ کر کہا۔ "اپنی پھریاد تو سب کے کان میں ڈال آئی ہوں۔ آنے نہ آنے کا حال اللہ جانے؟ ہمارے سیّد سالار گُہار سن کر پیڑے اُٹھ آئے تھے۔ کیا میرا رونا کوئی نہ سنے گا۔"

الگو نے جواب دیا۔ "یوں آنے کو میں آجاؤں گا' مگر پنچایت میں منہ نہ کھولوں گا۔"

خالہ نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں بیٹا۔"

الگو نے پیچھا چھڑانے کے لیے کہا۔ "اب اس کا کیا جواب؟ اپنی اپنی طبیعت جمّن میرے پرانے دوست ہیں۔ اس سے بگاڑ نہیں کر سکتا۔"

خالہ نے تاک کر نشانہ مارا۔ "بیٹا کیا بگاڑ کے ڈر سے ایمان کی بات نہ کہو گے؟"

ہمارے سوئے ایمان کی ساری جتھا چوری سے لٹ جائے' اُسے خبر نہیں ہوتی۔ مگر کھلی ہوئی للکار سن کر وہ چونک پڑتا ہے اور ہشیار ہو جاتا ہے۔ الگو چودھری اس سوال کا جواب نہ دے سکے۔ کیا وہ "نہیں" کہنے کی جرأت کر سکتے تھے۔

شام کو ایک پیڑ کے نیچے پنچایت بیٹھی۔ ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ حقہ پان کا بھی انتظام تھا۔ یہ سب شیخ جمّن کی مہمان نوازی تھی۔ وہ خود الگو چودھری کے ساتھ ذرا دور بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ جب کوئی آتا تھا ایک دبی ہوئی سلام علیک سے اس کا خیر مقدم کرتے تھے مگر تعجب تھا کہ بااثر آدمیوں میں صرف وہی لوگ نظر آتے جنہیں ان کی رضا جوئی کی کوئی پروا نہیں ہو سکتی تھی۔ کتنے مجلس کو دعوتِ احباب سمجھ کر جھنڈ کے جھنڈ جمع ہو گئے تھے۔

جب پنچایت پوری بیٹھ گئی تو بوڑھی بی نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا:

"پنچو! آج تین سال ہوئے میں نے اپنی سب جائیداد اپنے بھانجے جمّن کے نام لکھ دی تھی۔ اسے آپ لوگ جانتے ہوں گے۔ جمّن نے مجھے تاحیات روٹی کپڑا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ سال چھ مہینے تو میں نے ان کے ساتھ کسی طرح رو دھو کر کاٹے مگر اب مجھ سے رات دن کا رونا نہیں سہا جاتا۔ مجھے پیٹ کی روٹیاں تک نہیں ملتیں۔ بیکس بیوہ ہوں۔

تھانہ کچہری کر نہیں سکتی۔ سوائے تم لوگوں کے اور کس سے اپنا دکھ درد روؤں۔ تم لوگ جو راہ نکال دو اس راہ پر چلوں۔ اگر میری برائی دیکھو میرے منہ پر تھپڑ مارو۔ جمّن کی برائی دیکھو تو اسے سمجھاؤ۔ کیوں ایک بیکس کی آہ لیتا ہے۔"

رام دھن مصر بولے۔ (ان کی کئی آسامیوں کو جمّن نے توڑ لیا تھا) "جمّن میاں پنچ کسے بدتے ہو' ابھی سے طے کر لو۔"

جمّن نے حاضرین پر ایک اڑتی ہو نگاہ ڈالی۔ اپنے تئیں مخالفوں کے نرغے میں پایا۔ دلیرانہ انداز سے کہا۔

"خالہ جان جسے چاہیں پنچ بنائیں مجھے عذر نہیں ہے۔"

خالہ نے چلا کر کہا۔ "ارے اللہ کے بندے تو پنچوں کے نام کیوں نہیں بتا دیتا؟"

جمّن نے بڑھیا کو غضبناک نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔

"اب اس وقت میری زبان نہ کھلواؤ جسے چاہو پنچ بنا دو۔"

خالہ نے جمّن کے اعتراض کو تاڑ لیا۔ بولیں۔ "بیٹا۔ خدا سے ڈور۔ میرے لیے کوئی اپنا ایمان نہ بیچے گا۔ اتنے بھلے آدمیوں میں کیا سب تیرے دشمن ہیں اَور سب کو جانے دو' الگو چودھری کو تو مانے گا؟"

جمّن فرطِ مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے۔

"الگو چودھری ہی سہی۔ میرے لیے جیسے رام دھن مصر' ویسے الگو کوئی میرا دشمن نہیں ہے۔"

الگو بغلیں جھانکنے لگے۔ اس جھمیلے میں نہیں پھنسنا چاہتے تھے۔ معترضانہ انداز سے کہا۔

"بوڑھی ماں تم جانتی ہو کہ میری اور جمّن کی گاڑھی دوستی ہے۔"

خالہ نے جواب دیا۔

"بیٹا دوستی کے لیے کوئی اپنا ایمان نہیں بیچتا۔ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔ پنچ کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ اللہ کی طرف سے نکلتی ہے۔"

الگو کو کوئی چارہ نہ رہا۔ سر پنچ بنے۔ رام دھن مصر دل میں بڑھیا کو کوسنے لگے۔

الگو چودھری نے فرمایا۔

"شیخ جمّن۔ ہم اور تم پرانے دوست ہیں۔ جب ضرورت پڑی ہے تم نے میری مدد کی ہے اور ہم سے بھی جو کچھ بن پڑا ہے' تمہاری خدمت کرتے آئے ہیں۔ مگر اس وقت نہ تم ہمارے دوست ہو' نہ ہم تمہارے دوست۔ یہ انصاف اور ایمان کا معاملہ ہے۔ خالہ جان نے پنچوں سے اپنا حال سنایا۔ تم کو بھی جو کہنا ہو کہو۔"

جمّن ایک شانِ فضیلت سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے۔

"پنچو۔ میں خالہ جان کو اپنی ماں کی بجائے سمجھتا ہوں اور ان کی خدمت میں کوئی کسر نہیں رکھتا۔ ہاں عورتوں میں ذرا ان بن رہتی ہے۔ اس میں میں مجبور ہوں۔ عورتوں کی تو یہ عادت ہی ہے۔ مگر ماہوار روپیہ دینا میرے قابو سے باہر ہے۔ کھیتوں کی جو حالت ہے وہ کسی سے چھپی نہیں۔ آگے پنچوں کا حکم سر اور ماتھے پر ہے۔"

الگو کو آئے دن عدالت سے واسطہ رہتا تھا۔ قانونی آدمی تھے۔ جمّن سے جرح کرنے لگے۔ ایک ایک سوال جمن کے دل پر ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگتا تھا۔ رام دھن مصر اور ان کے رفیق سر ہلا ہلا کر ان سوالوں کی داد دیتے تھے۔ جمّن حیرت میں تھے کہ الگو کو کیا ہو گیا ہے۔ ابھی تو یہ میرے ساتھ بیٹھا کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں ایسی کایا پلٹ ہو گئی کہ میری جڑ کھودنے پر آمادہ ہے۔ اچھی دوستی نباہی۔ اس سے اچھے تو رام دھن ہی

تھے۔ وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ کون کون سے کھیت کتنے پر اٹھتے ہیں اور کیا نکاسی ہوتی ہے۔ ظالم نے بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

جرح ختم ہونے کے بعد الگو نے فیصلہ سنایا۔ لہجہ نہایت سنگین اور تحکمانہ تھا۔

"شیخ جمّن۔ پنچوں نے اس معاملہ پر اچھی طرح غور کیا۔ زیادتی سراسر تمہاری ہے۔ کھیتوں سے معقول نفع ہوتا ہے۔ تمہیں چاہیے کہ خالہ جان کو ماہوار' گذارے کا بندوبست کر دو۔ اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں اگر تمہیں یہ منظور نہیں تو ہبہ نامہ منسوخ ہو جائے گا۔"

جمّن نے فیصلہ سنا اور سناٹے میں آ گیا۔ احباب سے کہنے لگا۔

"بھئی اس زمانہ میں یہی دوستی ہے کہ جو اپنے اوپر بھروسہ کرے' اس کی گردن پر چھری پھیری جائے۔ اسی کو نیرنگیِ روزگار کہتے ہیں۔ اگر لوگ ایسے دغاباز جو فروش گندم نمانہ ہوتے تو ملک پر یہ آفتیں کیوں آتیں۔ یہ ہیضہ اور پلیگ انہیں مکاریوں کی سزا ہے۔"

مگر رام دھن مصر اور فتح خان اور جگّو سنگھ اس بے لاگ فیصلہ کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ اس کا نام پنچایت ہے۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی' دوستی دوستی کی جگہ ہے۔ مقدم ایمان سلامت رکھنا ہے۔ ایسے ہی ستیہ بادیوں سے دنیا قائم ہے ورنہ کب کی جہنم میں مل جاتی۔

اس فیصلہ نے الگو اور جمّن کی دوستی کی جڑیں ہلا دیں۔ تناور درخت حق کا ایک جھونکا بھی نہ سہہ سکا۔ وہ اب بھی ملتے تھے مگر وہ تیر و سپر کی طرح۔ جمّن کے دل سے دوست کی غداری کا خیال دور نہ ہوتا تھا اور انتقام کی خواہش چین نہ لینے دیتی تھی۔

خوش قسمتی سے موقع بھی جلد مل گیا۔ پچھلے سال مصر و بٹسیر کے میلے سے بیلوں کی ایک اچھی گوئیاں مول لائے تھے۔ پچھائیں نسل کے خوبصورت بیل تھے۔ مہینوں تک قرب و جوار کے لوگ انہیں دیکھنے آتے رہے۔

اس پنچایت کے ایک مہینہ بعد ایک بیل مر گیا۔ جمّن نے اپنے دوستوں سے کہا۔

"یہ دغابازی کی سزا ہے۔ انسان صبر کر جائے مگر خدا نیک و بد دیکھتا ہے۔"

الگو کو اندیشہ ہوا کہ جمّن نے اسے زہر دلوایا ہے۔ اس کے برعکس چودھرائن کا خیال تھا کہ اس پر کچھ کرایا گیا ہے۔ چودھرائن اور فہیمن میں ایک دن زور شور سے ٹھنی۔ دونوں خواتین نے روانیِ بیان کی ندی بہا دی۔ تشبیہات اور استعاروں میں باتیں ہوئیں۔ بارے جمّن نے آگ بجھا دی۔ بیوی کو ڈانٹا اور رزم گاہ سے ہٹا لے گیا۔ ادھر چودھری نے اپنے ڈنڈے سے چودھرائن کی شیریں بیانی کی داد دی۔

ایک بیل کس کام کا۔ اس کا جوڑ بہت ڈھونڈا مگر نہ ملا۔ ناچار اسے بیچ ڈالنے کی صلاح ہوئی۔ گاؤں میں ایک سمجھو سیٹھ تھے۔ وہ یکہ گاڑی ہانکتے تھے۔ گاؤں سے گڑ گھی بھرتے اور منڈی لے جاتے۔ منڈی سے تیل اور نمک لاد کر لاتے اور گاؤں میں بیچتے تھے۔ اس بیل پر ان کی طبیعت لہرائی۔ سوچا اسے لے لوں تو دن میں بلا کسی منت کے تین کھیوے ہوں۔ نہیں تو ایک ہی کے لالے رہتے ہیں۔ بیل دیکھا گاڑی میں دوڑایا۔ دام کے لیے ایک مہینہ کا وعدہ ہوا۔ چودھری بھی غرض مند تھے۔ گھاٹے کی کچھ پرواہ نہ کی۔

سمجھو نے نیا بیل پایا تو پاؤں پھیلائے۔ دن میں' تین تین چار چار کھیوے کرتے 'نہ چارے کی فکر تھی نہ پانی کی۔ بس کھیوؤں سے کام تھا۔ منڈی لے گئے وہاں کچھ سوکھا بُھس ڈال دیا اور غریب جانور ابھی دم بھی نہ لینے پایا تھا کہ پھر جوت دیا۔ الگو چودھری کے یہاں تھے تو چین کی بنسی بجتی تھی۔ راتب پاتے' صاف پانی' دلی ہوئی ارہر' بُھو سے

کے ساتھ کھلی، کبھی کبھی گھی کا مزہ بھی مل جاتا تھا۔ شام سویرے ایک آدمی کھریرے کرتا۔ بدن کھجلاتا، جھاڑتا، پونچھتا، سہلاتا۔ کہاں وہ ناز و نعمت کہاں یہ آٹھوں پہر کی رپٹ۔ مہینہ بھر میں بیچارے کا کچومر نکل گیا۔ یکہ کا جُوا دیکھتے ہی بے چارے کا ہاؤ چھوٹ جاتا۔ ایک ایک قدم چلنا دو بھر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں، لیکن اصیل جانور، مار کی تاب نہ تھی۔ ایک دن چوتھے کھیوے میں سیٹھ نے دونا بوجھ لادا۔ دن بھر کا تھکا جانور، پیر مشکل سے اٹھتے تھے۔ اس پر سیٹھ جی کوڑے رسید کرنے لگے۔ بیل جگر توڑ کر چلا۔ کچھ دور دوڑا۔ چاہا کہ ذرا دم لے۔ ادھر سیٹھ جی کو جلد گھر پہنچنے کی فکر، کئی کوڑے بے دردی سے لگائے۔ بیل نے ایک بار پھر زور لگایا مگر طاقت نے جواب دے دیا۔ زمین پر گر پڑا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ سیٹھ نے بہت مارا پیٹا، ٹانگ پکڑ کر کھینچی، نتھنوں میں لکڑی کھونس دی، مگر لاش نہ اٹھی۔ تب کچھ اندیشہ ہوا غور سے دیکھا۔ بیل کو کھول کر الگ کیا اور سوچنے لگے کہ گاڑی کیوں کر گھر پہنچے۔ بہت چیخے اور چلائے مگر دیہات کا راستہ بچّوں کی آنکھ ہے سرِ شام سے بند، کوئی نظر نہ آیا۔ قریب کوئی گاؤں بھی نہ تھا۔ مارے غصہ کے موئے بیل پر اور درّے لگائے۔ سسرے تجھے مرنا تھا تو گھر پر مرتا۔ تو نے آدھے راستے میں دانت نکال دیے۔ اب گاڑی کون کھینچے؟ اس طرح خوب جلے بھنے۔ کئی بورے گڑ اور کئی کنستر گھی کے بیچے تھے۔ دو چار سو روپے کمر میں بندھے ہوئے تھے۔ گاڑی پر کئی بورے نمک کے تھے۔ چھوڑ کر جا بھی نہیں سکتے۔ گاڑی پر لیٹ گئے، وہیں رت جگا کرنے کی ٹھان لی اور آدھی رات تک دل کو بہلاتے رہے۔ حقہ پیا، گایا، پھر حقہ پیا، آگ جلائی، تاپا اپنی دانست میں وہ تو جاگتے ہی رہے۔ مگر جب پو پھوٹی چونکے اور کمر پر ہاتھ رکھا، تو تھیلی ندارد۔ کلیجہ سن سے ہو گیا۔ کمر ٹٹولی تھیلی کا پتہ نہ تھا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا، کئی کنستر تیل کے بھی غائب تھے۔ سر پیٹ لیا، پچھاڑیں کھانے لگے۔ صبح کو بہزار خرابی گھر پہنچے۔

سیٹھانی جی نے یہ حادثہ المناک سنا تو چھاتی پیٹ لی۔ پہلے تو خوب روئیں تب الگو چودھری کو گالیاں دینے لگیں۔ حفظِ ماتقدم کی سوجھی، نگوڑے نے ایسا منحوس بیل دیا کہ سارے جنم کی کمائی لٹ گئی۔

اس واقعہ کو کئی ماہ گذر گئے۔ الگو جب اپنے بیل کی قیمت مانگتے تو سیٹھ اور سیٹھانی دونوں جھلّائے ہوئے کتوں کی طرح چڑھ بیٹھتے۔ یہاں تو سارے جنم کی کمائی مٹی میں مل گئی فقیر ہو گئے، انہیں دام کی پڑی ہے۔ مردہ منحوس بیل دیا تھا، اس پر دام مانگتے ہیں۔ آنکھ میں دُھول جھونک دی۔ مرا ہوا بیل گلے باندھ دیا۔ نرا پونگا ہی سمجھ لیا ہے۔ کسی گڈھے میں منہ دھو آؤ تب دام لینا۔ صبر نہ ہوتا ہو تو ہمارا بیل کھول لے جاؤ۔ مہینے کے بدلے دو مہینے جوت لو اور کیا لو گے؟ اس فیاضانہ فیصلے کے قدر دان حضرات کی بھی کمی نہ تھی۔ اس طرح جھڑپ سن کر چودھری لوٹ آتے مگر ڈیڑھ سو روپے سے اس طرح ہاتھ دھو لینا آسان کام نہ تھا۔

ایک بار وہ بھی بگڑے۔ سیٹھ جی گرم ہو پڑے۔ سیٹھانی جی جذبہ کے مارے گھر سے نکل پڑیں۔ سوال و جواب ہونے لگے۔ خوب مباحثہ ہوا۔ مجادلہ کی نوبت آ پہنچی۔ سیٹھ جی نے گھر میں گھس کر کواڑ بند کر لئے۔ گاؤں کے کئی معزز آدمی جمع ہوئے۔ دونوں فریق کو سمجھایا۔ سیٹھ جی کو دلاسا دے کر گھر سے نکالا، اور صلاح دی کہ آپس میں سر پھٹول سے کام نہ چلے گا۔ اس سے کیا فائدہ۔ پنچایت کر لو جو کچھ طے ہو جائے اسے مان جاؤ۔ سیٹھ جی راضی ہو گئے۔ الگو نے بھی حامی بھری۔ فیصلہ ہو گیا۔ پنچایت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں فریق نے غول بندیاں شروع کیں۔ تیسرے دن اسی سایہ دار درخت کے نیچے پھر پنچایت بیٹھی۔

وہی شام کا وقت تھا۔ کھیتوں میں کووں کی پنچایت لگی ہوئی تھی۔ امرِ متنازعہ یہ تھا کہ مٹر کی پھلیوں پر ان کا

جائز استحقاق ہے' یا نہیں' اور جب تک یہ مسئلہ طے نہ ہو جائے وہ رکھوالے لڑکے کی فریادِ بے داد پر اپنی بلاغت آمیز ناراضگی کا اظہار ضروری سمجھتے تھے۔

درخت کی ڈالیوں پر طوطوں میں زبردست مباحثہ ہو رہا تھا۔ بحث طلب یہ امر تھا کہ انسان کو انہیں من حیث القوم بے وفا کہنے کا کیا حق ہے۔

پنچایت پوری آ بیٹھی تو رام دھن مصر نے کہا۔

"اب کیوں دیر کی جائے بولو چودھری کن کن آدمیوں کو پنچ بدتے ہو؟"

الگو نے منکسرانہ انداز سے جواب دیا۔

"سمجھو سیٹھ ہی چن لیں۔"

سمجھو سیٹھ کھڑے ہو گئے اور کڑک کر بولے۔

"میری طرف سے شیخ جمّن کا نام رکھ لو۔"

الگو نے پہلا نام جمّن کا سنا تو کلیجہ دھک سے ہو گیا' گویا کسی نے اچانک تھپڑ مار دیا۔ رام دھن مصر الگو کے دوست تھے۔ تہہ پر پہنچ گئے۔ بولے۔ "چودھری تم کو کوئی عذر تو نہیں ہے؟"

چودھری نے مایوسانہ انداز سے جواب دیا۔ "نہیں مجھے کوئی عذر نہیں۔"

اس کے بعد چار نام اور تجویز کیے گئے۔ الگو پہلا چرکا کھا کر ہوشیار ہو گئے تھے۔ خوب جانچ کر انتخاب کیا۔ صرف سرپنچ کا انتخاب باقی تھا۔ الگو اس فکر میں تھے کہ اس مرحلہ کو کیوں کر طے کروں کہ یکایک سمجھو سیٹھ کے ایک عزیز گودڑ شاہ بولے۔

"سمجھو بھائی سرپنچ کسے بناتے ہو؟"

سمجھو کھڑے ہو گئے' اور اکڑ کر بولے۔ "شیخ جمّن کو۔"

رام دھن مصر نے چودھری کی طرف ہمدردانہ انداز سے دیکھ کر پوچھا۔ "الگو تمہیں کوئی عذر ہو تو بولو۔"

الگو نے قسمت ٹھونک لی' حسرت ناک لہجے میں بولے۔ "نہیں مجھے عذر کوئی نہیں ہے۔"

اپنی ذمہ داریوں کا احساس اکثر ہماری تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح ہوتا ہے اور گمراہی کے عالم میں معتبر رہنما۔

ایک اخبار نویس اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا مجلسِ وزرا کو کتنی بے باکی اور آزادی سے اپنے تازیانۂ قلم کا نشانہ بناتا ہے مگر ایسے مواقع بھی آتے ہیں جب وہ خود مجلسِ وزرا میں شریک ہوتا ہے۔ اس دائرہ میں قدم رکھتے ہی اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالمِ شباب میں کتنا بے فکر ہوتا ہے۔ والدین اسے مایوسانہ نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ اسے ننگِ خاندان سمجھتے ہیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں والدین کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد وہی وارفتہ مزاج' ننگِ خاندان کتنا سلامت رو' کتنا محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو اور وسیع کر دیتا ہے۔ مگر زبان کو محدود۔

شیخ جمّن کو بھی اپنی عظیم الشان ذمہ داری کا احساس ہوا۔ اس نے سوچا میں اس وقت انصاف کی اونچی مسند پر بیٹھا ہوں۔ میری آواز اس وقت حکمِ خدا ہے اور خدا کے حکم میں میری نیت کو مطلق دخل نہیں ہونا چاہیے۔ حق

اور راستی سے جَو بھر ٹلنا بھی مجھے دنیا اور دین دونوں ہی میں سیاہ بنادے گا۔

پنچایت شروع ہوئی۔ فریقین نے اپنے حالات بیان کیے۔ جرح ہوئی۔ شہادتیں گذریں۔ فریقین کے مددگاروں نے بہت کھینچ تان کی جمّن نے بہت غور سے سنا' اور تب فیصلہ سنایا۔

"الگو چودھری اور سمجھو سیٹھ۔ پنچوں نے تمہارے معاملہ پر غور کیا۔ سمجھو کو بیل کی پوری قیمت دینا واجب ہے۔ جس وقت بیل ان کے گھر آیا اس کو کوئی بیماری نہ تھی۔ اگر قیمت اسی وقت دے دی گئی ہوتی تو اسے سمجھو واپس لینے کا ہرگز تقاضہ نہ کرتے۔"

رام دھن مصر نے کہا "قیمت کے علاوہ ان سے کچھ تاوان بھی لیا جائے۔ سمجھو نے بیل کو دوڑا دوڑا کر مار ڈالا۔"

جمّن نے کہا۔ "اس کا اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔"

گودڑ شاہ نے کہا "سمجھو کے ساتھ کچھ رعایت ہونی چاہیے۔ ان کا بہت نقصان ہوا ہے اور اپنے کیے کی سزا مل چکی ہے۔"

جمّن بولا "اس کا بھی اصل معاملہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ الگو چودھری کی بھَل مَنسی پر منحصر ہے۔" یہ فیصلہ سنتے ہی الگو چودھری پھولے نہ سمائے۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور زور زور سے ہانک لگائی۔

"پنچ پرمیشری کی جے۔۔۔"

آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ اس نعرہ کے ساتھ ان کی صدائے تحسین بھی سنائی دی۔ بہت مدھم گویا سمندر پار سے آئی ہو۔

ہر شخص جمّن کے انصاف کی داد دے رہا تھا۔ "انصاف اس کو کہتے ہیں۔ آدمی کا یہ کام نہیں۔ پنچ میں پرماتما بستے ہیں۔ یہ ان کی مایا ہے۔ پنچ کے سامنے کھوٹے کو کھرا بنانا مشکل ہے۔"

ایک گھنٹہ بعد جمّن شیخ الگو کے پاس آئے اور ان کے گلے سے لپٹ کر بولے۔ "بھیا جب سے تم نے میری پنچایت کی ہے میں دل سے تمہارا دشمن تھا۔ مگر آج مجھے معلوم ہوا کہ پنچایت کی مسند پر بیٹھ کر نہ کوئی کسی کا دوست ہوتا ہے نہ دشمن۔ انصاف کے سوا اور اسے کچھ نہیں سوجھتا۔ یہ بھی خدا کی شان ہے۔ آج مجھے یقین آگیا کہ پنچ کا حکم اللہ کا حکم ہے۔"

الگو رونے لگے۔ دل صاف ہوگئے۔ دوستی کا مرجھایا ہوا درخت پھر سے ہرا ہو گیا۔ اب وہ بالُو کی زمین پر نہیں' حق اور انصاف کی زمین پر کھڑا تھا۔

بٹوارہ

(1)

بھولا مہتو نے پہلی عورت کے مرجانے کے بعد دوسری سگائی کی تو اس کے لڑکے رگھو کے لئے مصیبت کے دن آگئے۔ رگھو کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی۔ مزے سے گاؤں میں گلی ڈنڈا کھیلتا پھرتا تھا۔ نئی ماں کے

آتے ہی چکی میں جُتنا پڑا۔ پنّا حسین عورت تھی اور حسن کے ساتھ غرور بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی موٹا کام نہ کرتی۔ گوبر رگھو نکالتا' بیلوں کو سانی رگھو دیتا۔ رگھو ہی گھر کے جھوٹے برتن مانجھتا۔ بھولا کی آنکھیں کچھ ایسی پھریں کہ اسے اب رگھو میں برائیاں نظر آتیں۔ پنّا کی باتوں کو وہ پرانے رواج کے مطابق آنکھیں بند کر کے مان لیتا تھا۔ رگھو کی شکایتوں کی مطلق پروانہ کرتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رگھو نے شکایت کرنا چھوڑ دی۔ کس کے سامنے روئے؟ باپ ہی نہیں۔ سارا گاؤں اس کا دشمن تھا۔ "بڑا ضدی لڑکا ہے۔ پنّا کو تو کچھ سمجھتا ہی نہیں ـــــ بے چاری اس کو دُلار کرتی ہے' کھلاتی پلاتی ہے۔ یہ اسی کا تو نتیجہ ہے ـــــ دوسری عورت ہوتی تو نباہ نہ ہوتا۔ وہ تو کہو پنّا اتنی سیدھی ہے کہ نباہ ہو جاتا ہے۔" زبردست کی شکایت سب سنتے ہیں' کمزور کی فریاد کوئی نہیں سنتا۔ رگھو کا دل ماں کی طرف سے دن بہ دن پھٹتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ آٹھ سال گزر گئے۔ ایک دن بھولا کے نام موت کا پیغام آ پہنچا۔

پنّا کے چار بچے تھے۔ تین لڑکے اور ایک لڑکی۔ اتنا بڑا خرچ اور کمانے والا کوئی نہیں ـــــ رگھو اب کیوں بات پوچھنے لگا۔ یہ بات مانی ہوئی تھی اپنی بیوی لائے گا اور الگ رہے گا۔ بیوی آکر اور بھی آگ لگائے گی۔ پنّا کو چاروں طرف اندھیرا نظر آتا تھا۔ مگر کچھ بھی ہو وہ رگھو کی دست نگر بن کر گھر میں نہ رہے گی۔ جس گھر میں اس نے راج کیا ہے اس میں وہ لونڈی نہ بنے گی۔ جس لڑکے کو اپنا غلام سمجھا اس کا منہ نہ تاکے گی۔ وہ حسین تھی۔ ابھی اس کی عمر بھی کچھ ایسی زیادہ نہ تھی ـــــ اس کا حسن ابھی پوری بہار پر تھا ـــــ وہ کوئی دوسرا گھر کرے گی۔ یہی ہوگا نا لوگ ہنسیں گے۔ بلا سے ـــــ اس کی برادری میں کیا ایسا ہوتا نہیں۔ باہمن ٹھاکر تھوڑا ہی ہے کہ ناک کٹ جائے گی۔ یہ تو ان ہی اونچی ذاتوں میں ہوتا ہے کہ گھر میں چاہے جو کچھ کرو باہر پردہ ڈھکا رہے۔ یہاں تو سنسار کو دکھا کر دوسرا گھر کر سکتی ہے۔ رگھو کی دبیل بن کر کیوں رہے۔

بھولا کو مرے ایک مہینہ گزر گیا تھا ـــــ شام ہوگئی' پنّا اسی فکر میں پڑی ہوئی تھی کہ یکایک اسے خیال آیا کہ بچّے گھر میں نہیں ہیں۔ بیلوں کے آنے کا وقت ہے کہیں رستے میں نہ پڑ جائیں۔ اب دروازے پر کون ہے جو ان کی نگرانی کرے گا۔ رگھو تو یہ چاہے گا کہ نہ کچلنے کو ہوں تو کچل جائیں۔ میرے لڑکے تو اسے پھوٹی آنکھ نہیں بھاتے' کبھی ہنس کر نہیں بولتا ـــــ گھر سے باہر نکلی تو دیکھا۔ رگھو سامنے جھونپڑی میں بیٹھا اوکھ کی گنڈیریاں بنا رہا ہے ـــــ تینوں لڑکے اسے گھیرے کھڑے ہیں اور چھوٹی لڑکی اس کی گردن میں ہاتھ ڈالے اس کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی ہے۔ پنّا کو آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ آج تو یہ نئی بات ہے۔ شاید دنیا کو دکھاتا ہے کہ میں اپنے بھائیوں کو کتنا چاہتا ہوں اور من میں چھری رکھے ہوئے ہے۔ گھات ملے تو جان ہی لے لے۔ کالا سانپ ہے کالا سانپ! تند لہجے میں بولی۔ "تم سب کے سب یہاں کیا کرتے ہو گھر میں آؤ۔ سانجھ کی بیرا ہے گورو آتے ہوں گے۔"

رگھو نے عاجزانہ نظروں سے دیکھ کر کہا۔ "میں تو ہوں ہی کاکی۔ ڈر کس بات کا ہے۔"

بڑا لڑکا کیدار بولا۔ "کاکی۔ رگھو دادا نے ہمارے لیے دو گاڑیاں بنا دی ہیں یہ دیکھ۔ ایک پر ہم اور کنور بیٹھیں گے۔ دوسری پر لچھمن اور جھنیا۔ دادا دونوں گاڑیاں کھینچیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ ایک کونے سے دو گاڑیاں نکال لایا۔ چار چار پہیے لگے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کے لئے تختے اور روک کے لئے دونوں طرف بازو تھے۔

پنّا نے تعجب سے پوچھا۔ "گاڑیاں کس نے بنائیں؟"

کیدار نے کچھ چڑ کر کہا۔ "رگھو دادا نے بنائی ہیں اور کس نے؟ بھگت کے گھر سے بسولا اور کھانی مانگ کر

لائے اور چٹ پٹ بنادیں۔ کھوب دوڑتی ہیں کاکی ـــــ بیٹھ کنّو ـــــ میں کھینچوں ـــــ"

کنّو گاڑی پر بیٹھ گیا۔ کیدار کھینچنے لگا۔ چرچر کا شور ہوا جیسے گاڑی بھی اس کھیل میں لڑکوں کے ساتھ شریک ہو۔ بچھمن نے دوسری گاڑی میں بیٹھ کر کہا۔ "دادا کھینچو۔"

رگھو نے جھنیا کو بھی گاڑی میں بٹھادیا اور گاڑی کھینچتا ہوا دوڑا۔ تینوں لڑکے تالیاں بجانے لگے۔ پنّا حیرت زدہ نگاہوں سے یہ نظارہ دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ یہ وہی رگھو ہے یا کوئی اور؟

تھوڑی دیر کے بعد دونوں گاڑیاں لوٹیں ـــــ لڑکے گھر میں جاکر اس گاڑی کے سفر کے تجربات بیان کرنے لگے۔ کتنے خوش تھے سب! گویا ہوائی جہاز پر بیٹھ آئے ہوں۔

کنّو نے کہا۔ "کاکی سب پیڑ دوڑ رہے تھے ـــــ"

بچھمن۔ "اور بچھیاں کیسی بھاگیں ـــــ سب کی سب دوڑیں۔"

کیدار۔ "کاکی رگھو دادا دونوں گاڑیاں ایک ساتھ کھینچ لے جاتے ہیں۔"

جھنیا سب سے چھوٹی تھی۔ اس کی قوتِ اظہار اچھل کود اور نگاہوں تک محدود تھی۔ تالیاں بجا بجا کر ناچ رہی تھی۔

کنّو۔ "اب ہمارے گھر گائے بھی آجائے گی کاکی ـــــ رگھو دادا نے گردھاری سے کہا ہے کہ ہمیں ایک گائے لادو ـــــ گردھاری بولا کل لاؤں گا ـــــ"

کیدار۔ "تین سیر دودھ دیتی ہے کاکی۔ کھوب دودھ پئیں گے ـــــ"

اتنے میں رگھو بھی اندر آگیا۔ پنّا نے بیزار نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا ـــــ "کیوں رگھو، تم نے گردھاری سے کوئی گائے مانگی ہے؟"

رگھو نے عذر خواہانہ انداز میں کہا۔ "ہاں مانگی تو ہے کل لائے گا ـــــ"

پنّا۔ "روپے کس کے گھر سے آویں گے یہ بھی سوچا ہے؟"

رگھو۔ "سب سوچ لیا ہے کاکی۔ میری یہ مہر نہیں ہے، اس کے پچیس روپے مل رہے ہیں۔ پانچ روپے بچھیا کے مجرا دے دوں گا، بس گائے اپنی ہو جائے گی۔"

پنّا سناٹے میں آگئی۔ اب اس کا شکی دل بھی رگھو کی شرافت اور محبت کو نہ جھٹلا سکا ـــــ بولی ـــــ "مہر کیوں بیچتے ہو۔ گائے کی ابھی کون جلدی ہے۔ ہاتھ میں پیسے ہو جائیں گے تو لے لینا۔ سُونا سُونا گلا اچھا نہ لگے گا۔ اتنے دنوں گائے نہیں رہی تو کیا لڑکے نہیں جیئے ـــــ"

رگھو فلسفیانہ انداز میں بولا۔ "بچوں کے کھانے پینے کے یہی دن ہیں کاکی ـــــ اس عمر میں نہ کھایا تو کب کھائیں گے۔ مہر پہننا اب مجھے اچھا نہیں لگتا۔ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ باپ مر گیا ہے تو اسے مہر پہننے کی سوجھی ہے"

بھولا مہتو گاما کی فکر میں چل بسے۔ نہ روپے آئے اور نہ گائے ملی۔ مجبور تھے۔ رگھو نے وہ مشکل کتنی آسانی سے حل کر دی۔ آج زندگی میں پہلی بار پنّا کو رگھو پر اعتبار آیا۔ بولی۔ "جب گہنا ہی بیچنا ہے تو اپنی مہر کیوں بیچو گے میری ہنسلی لے لینا ـــــ"

رگھو۔ "نہیں کاکی وہ تمہارے گلے میں بہت اچھی لگتی ہے۔ مردوں کو کیا، مہر پہنیں یا نہ پہنیں۔"

پنّا۔ "چل میں بوڑھی ہوئی ـــــ مجھے اب ہنسلی پہن کر کیا کرنا ہے تو ابھی لڑکا ہے۔ تیرا سُونا گلا اچھا نہ لگے گا۔"

رگھو مسکرا کر بولا۔ ''تم ابھی سے کیسے بوڑھی ہو گئیں۔ گاؤں میں کون تمہارے برابر ہے؟''
رگھو کی اس سادہ تنقید سے پنّا شرما گئی۔ اس کے روکھے مرجھائے چہرے پر تازگی آ گئی۔۔۔

(2)

پانچ سال گزر گئے۔ رگھو کا سا محنتی، ایمان دار، بات کا دھنی دوسرا کسان گاؤں میں نہ تھا۔ پنّا کی مرضی کے بغیر وہ کوئی کام نہ کرتا۔ اس کی عمر اب 23 سال کی ہو گئی تھی۔ پنّا بار بار کہتی۔ ''بھیا بہو کو بدا کرا لاؤ۔ کب تک وہ نے ہر میں پڑی رہے گی۔ سب لوگ مجھی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہی بہو کو نہیں آنے دیتی۔'' مگر وہ ٹال دیتا۔ کہتا تھا۔ ''ابھی جلدی کیا ہے۔'' اسے اپنی بہو کے رنگ ڈھنگ کا علم دوسروں سے ہو چکا تھا۔۔۔ ایسی عورت کو گھر میں لا کر دردِ سر مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

آخر ایک روز پنّا نے بضد ہو کر کہا۔۔۔ ''تو تم نہ جاؤ گے؟''
''کہہ دیا ابھی کوئی جلدی نہیں ہے۔۔۔''
''تمہارے لئے جلدی نہ ہو گی۔ میرے لئے تو جلدی ہے۔ میں آج ہی آدمی بھیجتی ہوں۔''
''پچھتاؤ گی کاکی۔ اس کا مجاج اچھا نہیں ہے۔''
''تمہاری بلا سے، جب میں اس سے بولوں گی ہی نہیں تو کیا ہوا سے لڑے گی۔۔۔ روٹیاں تو بنا ہی دے گی۔۔۔ مجھ سے اب باہر بھیتر کا کام نہیں ہو گا۔۔۔ میں آج بلائے لیتی ہوں۔''
''بلانا چاہتی ہو بلا لو۔ مگر پھر یہ مت کہنا کہ یہ مہریا کو ٹھیک نہیں کرتا۔۔۔ اس کا گلام ہو گیا ہے۔۔۔''
''نہ کہوں گی۔ جا کر دو ساڑھیاں اور مٹھائی لیتا آ۔۔۔''

تیسرے دن ملیا میکے سے آ گئی۔ دروازے پر نقارے بجے۔ شہنائیوں کی مدھر آواز بلند ہوئی۔ منہ دکھاوے کی رسم ادا ہوئی۔۔۔ وہ اس خشک زمین میں ایک سبک رودھارے کی مانند تھی۔ گندمی رنگ تھا' بڑی بڑی نوکیلی پلکیں' رخساروں پر ہلکی سرخی' بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجیب کشش۔۔۔ رگھو اسے دیکھتے ہی مسحور ہو گیا۔۔۔

صبح سویرے پانی کا گھڑا لے کر چلتی تو اس کا گندمی رنگ طلوعِ آفتاب کی سنہری کرنوں سے کندن ہو جاتا۔۔۔ گویا صبح کی دیوی اپنی ساری خوشبو اور شگفتگی اور مستانہ پن لیے مسکراتی چلی ہو۔۔۔

(3)

ملیا میکے ہی سے جلی بُھنی آئی تھی۔۔۔ میرا شوہر چھاتی پھاڑ کر کام کرے اور پنّا رانی بنی بیٹھی رہے۔۔۔ اس کے لڑکے رئیس زادے بنے گھومیں۔ ملیا سے یہ برداشت نہ ہو گا' وہ کسی کی گلامی نہ کرے گی۔ اپنے لڑکے تو اپنے ہوتے نہیں' بھائی کس کے ہوتے ہیں۔ جب تک پَر نہیں نکلتے ہیں رگھو کو گھیرے ہوئے ہیں' جوں ہی ذرا سیانے ہوئے پَر جھاڑ کر نکل جائیں گے۔ بات بھی نہ پوچھیں گے۔

ایک دن اس نے رگھو سے کہا۔ ''تمہیں اس طرح گلامی کرنی ہو تو کرو' مجھ سے تو نہ ہو گی۔''

رگھو۔ ”تو پھر کیا کروں تو ہی بتا۔ لڑکے ابھی گھر کا کام کرنے لائق بھی تو نہیں ہیں۔“

ملیا۔ ”لڑکے کچھ تمہارے نہیں ہیں، پنّا کے ہیں جو تمہیں دانے دانے کو ترساتی تھی۔۔۔ سب سن چکی ہوں۔ میں لونڈی بن کر نہ رہوں گی۔ روپے پیسے کا مجھے کچھ حساب نہیں ملتا۔ نہ جانے تم کیا لاتے ہو اور وہ کیا کرتی ہے۔ تم سمجھتے ہو روپے گھر ہی میں تو ہیں مگر دیکھ لینا جو تمہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی ملے۔۔۔“

رگھو۔ ”روپے پیسے تیرے ہاتھ میں دینے لگوں تو دنیا کیا کہے گی یہ تو سوچ۔“

ملیا۔ ”دنیا جو چاہے کہے۔ دنیا کے ہاتھوں بکی تو نہیں ہوں۔ دیکھ لینا بھاڑ لیپ کر ہاتھ کالا ہی رہے گا۔ پھر تم اپنے ماں بھائیوں کے لئے مرو میں کیوں مروں؟

رگھو نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے جس بات کا خوف تھا وہی بات سر آپڑی تھی۔ اب اگر اس نے بہت تھتھو تھمبو کیا تو سال چھ مہینے اور کام چلے گا۔ بس آگے یہ ڈونگا چلتا نظر نہیں آتا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔

ایک دن پنّا نے مہوے کا سکھاون ڈالا۔ برسات شروع ہو گئی تھی۔۔۔ کچھار میں اناج گیلا ہو رہا تھا۔ ملیا سے بولی۔۔۔ ”بہو جرا دیکھتی رہنا۔ میں تب تک تالاب سے نہا آؤں۔۔۔“

ملیا نے کہا۔۔۔ ”مجھے نیند آرہی ہے تم بیٹھ کر دیکھو۔ ایک دن نہ نہاؤ گی تو کیا ہو گا۔۔۔“

پنّا نے ساڑھی اٹھا کر رکھ دی۔ نہانے نہ گئی۔۔۔ ملیا کا وار خالی گیا۔۔۔

کئی دن کے بعد ایک شام کو پنّا دھان روپ کر لوٹی تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ دن بھر کی بھوکی تھی۔ امید تھی کہ بہو نے روٹی بنا رکھی ہو گی مگر یہاں دیکھا تو چولہا ٹھنڈا پڑا تھا اور بچے مارے بھوک کے تڑپ رہے تھے۔ ملیا سے آہستہ سے پوچھا۔۔۔ ”آج ابھی چولہا نہیں جلا؟“

کیدار نے کہا۔ ”آج تو دوپہر کو بھی چولہا نہیں جلا کاکی۔ بھابی نے کچھ بنایا ہی نہیں۔۔۔“

پنّا۔ ”تو تم لوگوں نے کیا کھایا۔۔۔؟“

کیدار۔ ”کچھ نہیں۔ رات کی روٹیاں تھیں۔ کنّو اور لچھمن نے کھائیں۔ میں نے ستّو کھا لیا۔۔۔“

پنّا۔ ”اور بہو؟“

کیدار۔ ”وہ تو پڑی سوتی رہی تھیں۔ کچھ نہیں کھایا۔“

پنّا نے اسی وقت چولہا جلایا اور کھانا پکانے بیٹھ گئی۔۔۔ آٹا گوندھتی اور روتی تھی۔ کیا نصیب تھے! دن بھر کھیت میں جلی گھر آئی تو چولہے کے سامنے جلنا پڑا!!

کیدار کا چودھواں سال تھا۔ بھابی کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر ساری کیفیت سمجھ رہا تھا۔ بولا۔ ”بھابی اب تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں۔“

پنّا نے چونک کر کہا۔ ”کیا کچھ کہتی تھی؟“

”کہتی کچھ نہیں تھیں مگر ان کے من میں ہے یہی بات، پھر تم کیوں اسے نہیں چھوڑ دیتیں۔۔۔ جیسے چاہیں رہیں۔ ہمارا بھگوان ہے۔“

پنّا نے دانتوں سے زبان دبا کر کہا۔ ”چپ میرے سامنے ایسی بات بھول کر بھی نہ کہنا۔ رگھو تمہارا بھائی نہیں تمہارا باپ ہے۔ ملیا سے کبھی بولے تو سمجھ لینا کہ جہر کھا لوں گی۔“

(4)

دسہرے کا تہوار آیا۔ اس گاؤں میں کوس بھر پر ایک میلہ لگتا تھا۔ گاؤں کے سب لڑکے میلہ دیکھنے چلے۔ پنّا بھی لڑکوں کے ساتھ چلنے کو تیار ہوئی مگر پیسے کہاں سے آئیں ـــــ کنجی تو ملیا کے پاس تھی۔

رگھو نے آکر ملیا سے کہا ـــــ ”لڑکے میلے جارہے ہیں۔ سب ہی کو دو دو آنے پیسے دے دے۔“

ملیا نے تیور چڑھا کر کہا۔ ”پیسے گھر میں نہیں ہیں۔“

رگھو۔ ”روپے تو ابھی تلہن بیچ کر لایا تھا اتنی جلدی اٹھ گئے۔“

ملیا۔ ”ہاں اٹھ گئے۔“

رگھو۔ ”کہاں اٹھ گئے؟ جرا سنوں۔ آج تیوہار کے دن لڑکے میلہ دیکھنے نہ جائیں گے؟“

ملیا۔ ”اپنی کاکی سے کہو پیسے نکالیں۔ گاڑ کر کیا کریں گی۔“

کھونٹی پر کنجی لٹک رہی تھی۔ رگھو نے کنجی اتاری اور چاہا کہ صندوق کھولے کہ ملیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”کنجی مجھے دے دو، نہیں تو ٹھیک نہیں ہو گا۔ کھانے پہننے کو بھی چاہیے۔ کاگج کتاب کو بھی چاہیے۔ اس پر میلہ دیکھنے کو بھی چاہیے۔ ہماری کمائی اسی لئے نہیں ہے کہ دوسرے کھائیں اور مونچھوں پر تاؤ دیں۔“

پنّا نے رگھو سے کہا۔ ”بھیا پیسے کیا ہوں گے، لڑکے میلہ دیکھنے نہ جائیں گے۔“

رگھو نے جھڑک کر کہا۔ ”میلہ دیکھنے کیوں نہ جائیں گے، سارا گاؤں جارہا ہے۔ ہمارے ہی لڑکے نہ جائیں گے ـــــ“

رگھو نے یہ کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور لڑکوں کو پیسے نکال کر دے دیے مگر جب کنجی ملیا کو دینے لگا تو اس نے اسے آنگن میں پھینک دیا اور منہ لپیٹ کر لیٹ رہی۔ لڑکے میلہ دیکھنے نہ گئے۔

اس کے بعد دو دن گزر گئے۔ ملیا نے کچھ نہیں کھایا۔ پنا بھی بھوکی رہی ـــــ رگھو کبھی اسے مناتا کبھی اسے ـــــ پر نہ یہ اٹھتی نہ وہ! آخر رگھو نے حیران ہو کر ملیا سے پوچھا۔ ”کچھ منہ سے تو کہہ تو چاہتی کیا ہے ـــــ“

ملیا نے زمین کو مخاطب کر کے کہا ـــــ ”میں کچھ نہیں چاہتی مجھے میرے گھر پہنچا دو۔“

رگھو۔ ”اچھا اٹھ، کھانا بنا، پہنچا دوں گا۔“

ملیا نے رگھو کی طرف دیکھا۔ رگھو اس کی صورت دیکھ کر ڈر گیا۔ وہ خوبصورتی، وہ کشش، وہ دلآویزی غائب ہو گئی تھی۔ دانت نکل آئے تھے۔ آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔ انگارے کی سی لال آنکھوں سے دیکھ کر بولی ـــــ ”اچھا تو کاکی نے یہ صلاح دی ہے۔ یہ منتر پڑھایا ہے تو یہاں ایسی کچی نہیں ہوں۔ تم دونوں کی چھاتی پر مونگ دلوں گی۔ ہو کس پھیر میں ـــــ“

رگھو۔ ”اچھا مونگ ہی دل لینا کچھ کھا پی لے گی تبھی تو مونگ دل سکے گی۔“

ملیا۔ ”اب تو جبھی منہ میں پانی ڈالوں گی، جب گھر الگ ہو جائے گا ـــــ بہت جھیل چکی اب نہیں جھیلا جاتا ـــــ“

رگھو سکتے میں آگیا۔ ایک منٹ تک تو اس کے منہ سے آواز ہی نہ نکلی۔ الگ ہونے کا تو اسے خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا ـــــ اس نے گاؤں میں دو چار خاندانوں کو الگ ہوتے دیکھا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا روٹی کے ساتھ لوگوں کے دل بھی الگ ہو جاتے ہیں ـــــ اپنے ہمیشہ کے لئے غیر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان میں وہی ناتا رہ جاتا ہے جو

گاؤں کے اور آدمیوں میں ـــــ رگھو نے ٹھان لیا تھا کہ اس بلا کو اپنے گھر میں قدم نہ رکھنے دوں گا۔ لیکن ہونی کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ آہ! میرے منہ میں کالکھ لگے گی۔ دنیا یہی کہے گی کہ باپ کے مر جانے کے بعد دس سال بھی ایک گھر میں نباہ نہ ہو سکا' اور پھر کس سے الگ ہو جاؤں ـــــ جن کو گود میں کھلایا' جن کو بچوں کی طرح پالا' جن کے لئے طرح طرح کی تکلیفیں اٹھائیں' انہی سے الگ ہو جاؤں ـــــ اپنے پیاروں کو گھر سے نکال کر باہر کر دوں ـــــ اس کا گلا پھنس گیا۔ کانپتے لہجے میں بولا ـــــ ''تو کیا چاہتی ہے کہ میں اپنے بھائیوں سے الگ ہو جاؤں! بھلا سوچ تو! کہیں منہ دکھانے کے لائق رہوں گا؟''

ملیا۔ ''تو میرا ان لوگوں کے ساتھ نباہ نہ ہو گا۔''

رگھو۔ ''تو تُو الگ ہو جا' مجھے کیوں اپنے ساتھ گھسیٹتی ہے۔''

ملیا۔ ''تو مجھے کیا تمہارے گھر میں مٹھائی ملتی ہے ـــــ میرے لئے کیا سنسار میں جگہ نہیں ہے؟''

رگھو۔ ''تیری جیسی مرضی' جہاں چاہے رہ ـــــ میں اپنے گھر والوں سے الگ نہیں ہو سکتا۔ جس دن اس گھر میں دو چولہے جلیں گے' اس دن میرے کلیجے کے دو ٹکڑے ہو جائیں گے ـــــ میں یہ چوٹ نہیں سہہ سکتا۔ تجھے جو تکلیف ہو میں دور کر سکتا ہوں۔ مال اسباب کی مالکن تو ہے ہی ـــــ اناج پانی بھی تیرے ہاتھ میں ہے' اب رہ کیا گیا ہے۔ اگر تو کچھ کام دھندا نہیں کرنا چاہتی تو مت کر۔ بھگوان نے مجھے سمائی دی ہوتی تو میں تجھے تنکا بھی نہ اٹھانے دیتا۔ تیرے یہ خوبصورت ہاتھ پیر محنت مجوری کرنے کے لئے نہیں بنائے گئے ہیں' مگر کیا کروں اپنا کچھ بس ہی نہیں۔ پھر بھی تیرا جی نہ چاہے تو کوئی کام مت کر مگر مجھ سے الگ ہونے کو نہ کہہ تیرے پیروں پڑتا ہوں ـــــ ''

ملیا نے آنچل سر سے کھسکایا اور ذرا قریب آ کر بولی۔ ''میں کام کرنے سے نہیں ڈرتی۔ نہ بیٹھے بیٹھے کھانا چاہتی ہوں مگر مجھ سے کسی کی دھونس نہیں سہی جاتی۔ تمہاری کاکی گھر کا کام دھندا کرتی ہیں تو اپنے لیے کرتی ہیں۔ اپنے بال بچوں کے لیے کرتی ہیں۔ مجھ پر کوئی احسان نہیں کرتیں۔ پھر مجھ پر دھونس کیوں جماتی ہیں۔ انہیں اپنے بچے پیارے ہوں گے' مجھے تو تمہارا آسرا ہے۔ میں اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھ سکتی کہ سارا گھر تو چین کرے' جرا جرا سے بچے تو دودھ پئیں اور جس کے بل بوتے پر گرہستی بنی ہوئی ہے وہ مٹھے کو ترسے۔ کوئی اس کا پوچھنے والا نہ ہو۔ جرا اپنا منہ تو دیکھو کیسی صورت نکل آئی ہے ـــــ اوروں کے تو چار برس میں اپنے پٹھے تیار ہو جائیں گے ـــــ تم تو دس سال میں کھاٹ پر پڑ جاؤ گے۔ یہ سب مجھ سے نہیں دیکھا جاتا۔ بیٹھ جاؤ کھڑے کیوں ہو۔ کیا مار کر بھاگو گے یا میں تمہیں جبر دستی باندھ لوں گی یا مالکن کا حکم نہیں ہے۔ سچ کہوں تم بڑے کٹھ کلیجے کے ہو ـــــ مجھے معلوم ہوتا کہ ایسے آدمی سے پالا پڑے گا تو بھول کر بھی اس گھر میں نہیں آتی ـــــ آتی تو من نہ لگاتی۔ مگر اب تو تم سے من لگ گیا ہے۔ گھر بھی جاؤں تو من یہیں رہے گا اور تم ہو کہ میری بات نہیں پوچھتے ـــــ ''

ملیا کی یہ رسیلی باتیں رگھو پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں۔ وہ اسی رکھائی سے بولا۔ ''ملیا یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ الگ ہونے کا دھیان کرتے ہی میرا من نہ جانے کیسا ہو جاتا ہے۔ یہ چوٹ مجھ سے نہ سہی جائے گی ـــــ ''

ملیا نے مضحکہ اڑا کر کہا۔ ''تو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھو نا ـــــ لاؤ میں مونچھیں لگا لوں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم میں بھی کچھ کس بل ہے۔ اب دیکھتی ہوں تو تم نرے مٹی کے لوندے ہو ـــــ ''

پنا دالان میں کھڑی دونوں کی گفتگو سن رہی تھی ـــــ اب اس سے نہ رہا گیا۔ سامنے آ کر رگھو سے بولی۔ ''جب وہ الگ ہونے پر تلی ہوئی ہے تو تم کیوں اسے زبردستی ملائے رکھنا چاہتے ہو ـــــ تم اسے لے کر رہو ـــــ

ہمارے بھگوان مالک ہیں۔ جب مہتو مر گئے تھے اور کہیں اوکھ کی چھاؤں نہ تھی تب اس بھگت بھگوان نے پناہ دی تو اب کیا ڈر ـــــ اب تو بھگوان کی دیا سے تینوں لڑکے سیانے ہو گئے ہیں ـــــ کوئی چنتا نہیں ـــــ "

رگھو نے آنسو بھری آنکھوں سے پنّا کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کاکی تو بھی پاگل ہو گئی ہے۔ کیا جانتی نہیں دو روٹیاں ہوتے ہی دو من ہو جاتے ہیں ـــــ "

پنّا۔ جب وہ مانتی ہی نہیں تو تم کیا کرو گے۔ بھگوان کی یہی مرجی ہو گی تو کوئی کیا کرے گا۔ قسمت میں جتنے دن ایک ساتھ رہنا لکھا تھا اتنے دن رہے' اب اس کی یہی مرجی ہے تو یہی سہی۔ تم نے میرے بال بچوں کے لئے جو کچھ کیا وہ میں بھول نہیں سکتی ـــــ تم نے ان کے سر پر ہاتھ نہ رکھا ہوتا تو آج ان کی نہ جانے کیا گت ہوتی ـــــ نہ جانے کس کس کے دروازے پر ٹھوکریں کھاتے' نہ جانے کہاں کہاں بھیک مانگتے پھرتے۔ تمہارا امرتے دم تک جس نہ بھولوں گی۔ اگر میری کھال تمہارے جوتے بنانے کے کام آ جائے تو کھوسی سے دے دوں۔ چاہے تم سے الگ ہو جاؤں لیکن جس گھڑی تم پکارو گے کتے کی طرح دوڑی آؤں گی۔ یہ بھول کر بھی مت سوچنا کہ تم سے الگ ہو کر تمہارا برا چیتوں گی۔ جس دن تمہاری برائی میرے دل میں آئے گی اس دن بِس کھا کر مر جاؤں گی۔ بھگوان کرے تم دودھوں نہاؤ' پوتوں پھلو۔ مرتے دم تک یہی دعا میرے روئیں روئیں سے نکلتی رہے گی اور لڑکے بھی اگر اپنے باپ کے ہیں تو مرتے دم تک تمہارا احسان مانیں گے۔"

یہ کہہ کر پنّا وہاں سے روتی ہوئی چلی گئی ـــــ رگھو وہیں بت کی طرح کھڑا رہا ـــــ آسمان کی طرف ٹکٹکی لگی ہوئی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

(5)

پنّا کی باتیں سن کر ملیا سمجھ گئی کہ اب اپنے پو بارہ ہیں۔ چٹ پٹ اٹھی' گھر میں جھاڑو لگائی' چولہا جلایا اور کنوئیں سے پانی لینے چلی۔ اس کی ٹیک پوری ہو گئی تھی ـــــ

گاؤں میں عورتوں کے دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک بہوؤں کا' دوسرا ساسوں کا۔ بہوئیں مشورے اور ہمدردی کے لئے اپنے فریق سے مخاطب ہوتی ہیں۔ ساسیں اپنے فریق سے۔ دونوں کی پنچایتیں الگ ہوتی ہیں ـــــ ملیا کو کنوئیں پر دو تین بہوئیں مل گئیں۔ ایک نے پوچھا۔ "آج تو تمہاری بُڑھیا رو رہی تھی؟"

ملیا نے فاتحانہ غرور کے ساتھ کہا۔ "اتنے دنوں سے گھر کی مالک بنی ہوئی ہیں۔ راج پاٹ چھوڑتے کسے اچھا لگتا ہے۔ بہن میں ان کا برا نہیں چاہتی ـــــ لیکن ایک آدمی کی کمائی میں کہاں برکت ہو گی۔ میرے بھی تو کھانے پینے اوڑھنے پہننے کے دن ہیں۔ ابھی ان کے پیچھے مرو' پھر بال بچے ہو جائیں' ان کے پیچھے مرو ـــــ ساری زندگی روتے ہی روتے کٹ جائے ـــــ "

ایک بہو۔ "بوڑھیاں یہی چاہتی ہیں کہ یہ سب جنم بھر لونڈی بنی رہیں۔ موٹا جھوٹا کھائیں اور پڑی رہیں۔"

دوسری بہو۔ "کس بھروسے پر کوئی مرے۔ اپنے لڑکے تو بات نہیں پوچھتے۔ پرائے لڑکوں کا کیا بھروسہ؟ کل ان کے ہاتھ پیر ہو جائیں گے پھر کون پوچھتا ہے۔ اپنی اپنی مہریوں کا منہ دیکھیں گے۔ پہلے ہی سے پھٹکار دینا اچھا ہے پھر تو کوئی کلک نہ ہو گا۔"

ملیاپانی لے کر آئی۔ کھانا بنایااور رگھو سے بولی۔ "جاؤ نہا آؤ روٹی تیار ہے۔"
رگھو نے گویاسنا ہی نہیں۔ سر پر ہاتھ رکھے دروازے کی طرف تاکتا رہا۔۔۔
ملیا۔ "کیا کہتی ہوں کچھ سنائی دیتا ہے۔ روٹی تیار ہے۔ جاؤ نہا آؤ۔۔۔"
رگھو۔ "سن تو رہا ہوں! کیا بہرا ہوں۔ روٹی تیار ہے تو جا کر کھالے۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔۔۔" ملیا نے پھر نہیں کہا۔ جا کر چولہا بجھادیا۔ روٹیاں اٹھا کر چھینکے پر رکھ دیں اور منہ ڈھانپ کر لیٹ رہی۔۔۔
ذرا دیر میں آکر پنّا نے رگھو سے کہا۔۔۔ "کھانا تو تیار ہے۔ بھیا نہادھو کر کھالو۔ بہو بھوکی ہوگی۔"
رگھو نے جھنجھلا کر کہا۔۔۔ "کاکی تو گھر میں رہنے دے گی کہ منہ میں کالکھ لگا کر کہیں نکل جاؤں۔ کھانا تو کھانا ہی ہے۔ آج نہ کھاؤں گا کل کھاؤں گا۔ پیٹ پر بھی کوئی بس ہے لیکن ابھی مجھ سے نہ کھایا جائے گا۔ کیدار کیا ابھی مدرسے سے نہیں آیا؟"
پنّا۔ "ابھی نہیں آیا تو آتا ہی ہوگا۔۔۔"
پنّا سمجھ گئی کہ جب تک وہ کھانا بنا کر لڑکوں کو نہ کھلائے گی اور خود نہ کھائے گی رگھو کھانا نہ کھائے گا۔۔۔ اتنا ہی نہیں اسے رگھو سے لڑائی کرنی پڑے گی، جلی کٹی سنانی پڑیں گی۔ اسے یہ یقین دلانا پڑے گا کہ میں ہی اس سے الگ ہونا چاہتی ہوں ورنہ رگھو اس پریشانی میں گھل گھل کر جان دے دے گا۔ یہ سوچ کر اس نے الگ چولہا جلایا اور کھانا بنانے لگی۔ اتنے میں کیدار اور کنّو مدرسے سے آگئے۔ پنّا نے کہا۔ "آؤ بیٹا کھالو' روٹی تیار ہے۔"
کیدار نے پوچھا۔۔۔ "بھیا کو بھی بلالوں نا؟"
پنّا۔ "تم آکر کھالو۔ ان کی روٹی بہو نے الگ بنائی ہے۔"
کنّو۔ "جا کر بھیا سے پوچھ نہ آؤں۔۔۔"
پنّا۔ "جب ان کا جی چاہے گا کھائیں گے تو بیٹھ کر کھا' تجھے ان باتوں سے کیا مطلب؟ جس کا جی چاہے گا کھائے گا جس کا جی نہ چاہے گا نہ کھائے گا۔۔۔ جب وہ اور اس کی بیوی الگ ہونے پر تُلے ہیں تو کون منائے۔۔۔"
کیدار۔ "تو کیا اماں جی ہم الگ گھر میں رہیں گے۔۔۔"
پنّا۔ "ان کا جی چاہے ایک گھر میں رہیں' جی چاہے آنگن میں دیوار ڈال لیں۔"
کنّو نے دروازے پر جا کر جھانکا۔ سامنے پھوس کی جھونپڑی پڑی تھی۔ وہاں کھاٹ پر پڑا رگھو ناریل پی رہا تھا۔۔۔
کنّو۔ "بھیا تو ابھی ناریل لیے بیٹھے ہیں۔"
پنّا۔ "جب جی چاہے گا کھائیں گے۔"
کیدار۔ "بھیا نے بھابی کو ڈانٹا نہیں؟"
ملیا اپنی کوٹھڑی میں پڑی یہ باتیں سن رہی تھی۔۔۔ باہر آکر بولی۔ "بھیا نے تو نہیں ڈانٹا اب تم آکر ڈانٹو۔۔۔"
کیدار کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ پھر زبان نہ کھولی۔ تینوں لڑکوں نے کھانا کھایا اور باہر نکلے۔ لُو چلنے لگی تھی۔ آم کے باغ میں گاؤں کے لڑکے لڑکیاں ہوا سے گرے ہوئے آم چن رہے تھے۔
کیدار نے کہا۔ "آج ہم بھی تو آم چننے چلیں۔ آم گر رہے ہیں۔۔۔"
کنّو۔ "دادا جو بیٹھے ہیں۔۔۔؟"

کچھمن۔ ”میں نہ جاؤں گا۔ دادا گھر کیں گے۔“

کیدار۔ ”وہ تو اب الگ ہو گئے۔“

کچھمن۔ ؟؟ تو جب کوئی ہم کو مارے گا تب بھی دادا نہ بولیں گے؟“

کیدار۔ ”واہ تب کیوں نہ بولیں گے؟“

رگھو نے تینوں لڑکوں کو دروازے پر کھڑے دیکھا پر کچھ بولا نہیں۔ پہلے تو وہ گھر کے باہر نکلتے ہی ڈانٹ دیتا تھا لیکن آج وہ مورتی کی مانند خاموش بیٹھا رہا۔۔۔

اب لڑکوں کو کچھ ہمت بندھی اور آگے بڑھے۔ رگھو اب بھی نہ بولا۔ کیسے بولے؟ وہ سوچ رہا تھا کاکی نے لڑکوں کھلا پلا دیا' مجھ سے پوچھا تک نہیں۔۔۔ کیا اس کی آنکھوں پر بھی پردہ پڑ گیا ہے۔ اگر میں نے لڑکوں کو پکارا' اور وہ نہ آئے تو؟ تو میں ان کو مار پیٹ نہ سکوں گا۔ لُو میں سب مارے مارے پھریں گے۔ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں۔۔۔ اس کا دل مسوس کر رہ جاتا تھا۔ لیکن منہ سے کچھ نہ کہہ سکتا تھا۔۔۔ لڑکوں نے دیکھا کہ وہ بالکل نہیں بولتے تو نڈر ہو کر چل پڑے۔

اچانک ملیا نے آکر کہا۔ ”اب تو اٹھو گے کہ اب بھی نہیں؟۔۔۔ جن کے نام پر فاقہ کر رہے ہو' انہوں نے مزے سے لڑکوں کو کھلایا اور آپ کھایا۔ اب آرام سے سو رہی ہیں۔ مور پیا بات نہ پوچھے مور سہاگنی ناچ۔۔۔ ایک بار بھی تو منہ سے نہ پھوٹا کہ چلو بھیا کھا لو۔“

رگھو کو اس وقت دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ ملیا کے ان سخت الفاظ نے زخم پر نمک چھڑک دیا۔ دکھ بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ ”تیری جو مرضی تھی وہی تو ہوا۔ اب جا ڈھول بجا۔“

ملیا۔ ”نہیں تمہارے لئے تھالی پروسے بیٹھی رہوں۔“

رگھو۔ ”مجھے چڑا مت' تیرے پیچھے میں بدنام ہو رہا ہوں۔۔۔ اب تُو کسی کی ہو کر نہیں رہنا چاہتی تو دوسرے کو کیا غرض ہے جو میری خوشامد کرے۔ جاکر کاکی سے پوچھ لڑکے آم چننے گئے ہیں انہیں پکڑ لاؤں۔“

ملیا انگوٹھا دیکھا کر بولی۔ ”یہ جاتا ہے۔ تمہیں سو بار غرض ہو جا کر پوچھو۔“

اتنے میں پنّا بھی اندر سے نکل آئی تھی۔ رگھو نے پوچھا۔ ”لڑکے باغ میں چلے گئے کاکی 'لو چل رہی ہے۔“

پنّا۔ ”اب ان کا کون پوچھنے والا ہے؟ باغ میں جائیں' پیڑ پر چڑھیں' پانی میں ڈوبیں۔ میں اکیلی کیا کیا کروں۔“

رگھو۔ ”جا کر پکڑ لاؤں۔“

پنّا۔ ”جب تمہیں اپنے من سے نہیں جانا ہے تو میں جانے کو کیوں کہوں۔ تمہیں روکنا ہوتا تو روک نہ دیتے۔ تمہارے سامنے ہی تو گئے ہوں گے۔“

پنّا کی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ رگھو نے ناریل کونے میں رکھ دیا اور باغ کی طرف چلا۔

رگھو لڑکوں کو لے کر باغ سے لوٹا' تو دیکھا ملیا ابھی تک دروازے میں کھڑی ہے' بولا۔ ”تو جا کر کھا کیوں نہیں لیتی؟ مجھے تو اس وقت بھوک نہیں ہے۔“

ملیا اینٹھ کر بولی۔ ”ہاں بھوک کیوں لگے گی۔ بھائیوں نے کھایا وہی تمہارے پیٹ میں پہنچ گیا ہو گا۔“

رگھو نے دانت پیس کر کہا۔ ”مجھے جلامت ملیا۔ نہیں تو اچھا نہیں ہو گا۔ کھانا کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ ایک

وقت نہ کھاؤں گا تو مر نہ جاؤں گا۔ کیا تُو سمجھتی ہے کہ آج گھر میں کوئی چھوٹی بات ہو گئی ہے۔ تُو نے گھر میں چولہا نہیں جلایا میرے کلیجے میں آگ لگائی ہے۔ مجھے گھمنڈ تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے' میرے گھر میں یہ پھوٹ کا روگ نہیں گھس سکتا۔ مگر تُو نے میرا یہ گھمنڈ چُور کر دیا۔ نصیب کی بات ہے۔"

ملیا تنک کر بولی۔ "سارا دکھ تم کو ہی ہے یا کسی اور کو بھی ہے۔ میں تو کسی کو بسورتے نہیں دیکھتی۔"

رگھو نے ٹھنڈی سانس کھینچ کر کہا۔ "ملیا گھاؤ پر نمک نہ چھڑک۔ تیری وجہ سے میری پیٹھ پر ڈھول لگ رہی ہے۔ مجھے اس گرہستی کا موہ نہ ہوگا تو کسے ہو گا۔ میں نے ہی تو اسے تنکا تنکا جوڑا ہے۔ جن کو گود میں کھلایا' اب وہی میرے پٹی وار ہوں گے ـــــ جن بچوں کو میں ڈانٹتا تھا' انہیں کڑی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ان کے بھلے کے لئے بھی کوئی بات کہوں تو دنیا یہی کہے گی کہ یہ اپنے بھائیوں کو لوٹے لیتا ہے۔ جا مجھے چھوڑ دے' ابھی مجھ سے کچھ نہ کھایا جائے گا۔"

ملیا۔ "میں قسم کھلا دیتی ہوں نہیں تو چپکے چلے چلو۔"

رگھو۔ "دیکھو اب بھی کچھ نہ بگڑا ہے۔ اپنی ہٹ چھوڑ دے۔"

ملیا۔ "ہمارا ہی لہو پیئے جو کھانے کو نہ اٹھے۔"

رگھو نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "یہ تو نے کیا کیا ملیا۔ میں تو اٹھ ہی رہا تھا۔ چل کھا لو۔ نہانے دھونے کون جائے لیکن یہ کہے دیتا ہوں کہ چاہے چار کی جگہ چھ روٹیاں کھا جاؤں' چاہے تُو مجھے گھی کے مٹکے میں ڈبو دے مگر یہ داگ میرے دل سے نہ مٹے گا۔"

ملیا۔ "داگ واگ سب مٹ جائے گا۔ پہلے سب کو ایسا ہی لگتا ہے۔ دیکھتے نہیں ہو ادھر کیسی چین کی بنسی بج رہی ہے۔ وہ تو چاہ رہی تھیں کہ کسی طرح سب لوگ الگ ہو جائیں۔ اب وہ پہلے کی سی چاندی تو نہیں ہے کہ جو کچھ گھر آیا سب غائب۔ اب کیوں ساتھ رہنے لگیں۔ آرام سے پکایا۔ ایک بار بھی نہ پوچھا کہ آؤ بھیا تم کھا لو۔"

رگھو نے حسرت ناک لہجے میں کہا۔ "اسی کا مجھے گم (غم) ہے۔ کاکی سے مجھے ایسی امید نہ تھی۔"

رگھو کھانے کو بیٹھا تو لقمے زہر کے گھونٹ سے لگتے تھے' دال پانی سی لگتی تھی۔ پانی بھی حلق سے نیچے نہ اترتا تھا۔ دودھ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ دو چار لقمے کھا کر چلا آیا جیسے کسی عزیز کے شرادھ کا کھانا ہو۔

رات کا کھانا بھی اسی طرح کھایا۔ قسم پوری کی۔ مگر رات بھر اس کا دل بے چین رہا۔ ایک نامعلوم دہشت اس کے دل پر چھا رہی تھی۔ جیسے بھولا دروازے پر بیٹھا رو رہا ہے۔ وہ بار بار چونک کر اٹھا۔ بھولا اس کی طرف تیز اور حقارت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

وہ دونوں وقت کھانا کھاتا تھا مگر جیسے دشمن کے گھر۔ بھولا کی ماتمی تصویر اس کی آنکھوں سے نہ اترتی تھی۔ راتوں کو اسے نیند نہ آتی تھی۔ وہ گاؤں میں نکلتا تو اس طرح منہ چرائے' سر جھکائے گویا گئو ہتیا کی ہو۔

پانچ سال گزر گئے تھے۔ رگھو دو لڑکوں کا باپ تھا۔ آنگن میں دیوار کھنچ گئی تھی۔ کھیتوں میں مینڈیں ڈال دی گئی تھیں۔ مویشی تقسیم کر دیے گئے۔ کیدار کی عمر سولہ سال کی ہو گئی تھی۔ اس نے اب پڑھنا چھوڑ دیا تھا اور کھیتی کا کام کرتا تھا۔ کنّو گائے چراتا تھا۔ صرف چھمن ابھی تک مدرسے جاتا تھا۔ پنّا اور ملیا ایک دوسرے کی صورت سے جلتی تھیں مگر ملیا کے دونوں لڑکے اکثر پنّا کے ہی کے پاس رہتے تھے۔ وہی انہیں ابٹن ملتی' وہی کاجل لگاتی' گود میں لئے

پھرتی ــــ ملیا کی زبان پر شکریے کا ایک لفظ بھی نہ آتا تھا' نہ پنّا کو اس کی طلب تھی۔ وہ جو کچھ کرتی تھی بے غرض کرتی تھی۔ اس کے اب دو لڑکے کماؤ ہو گئے تھے۔ لڑکی کھانا پکا لیتی تھی۔ وہ خود اوپر کا کام کاج کرتی تھی۔ اس کے برعکس رگھو اپنے گھر کا اکیلا تھا' وہ بھی نیم جاں شکستہ حال۔ قبل از وقت بوڑھا۔ ابھی تیس سال بھی عمر نہ تھی لیکن بال کھچڑی ہو گئے تھے' کمر بھی جھک گئی تھی' کھانسی نے حیران کر رکھا تھا۔ دیکھ کر رحم آتا تھا اور کھیتی خون پسینے کا کام ہے' وہ ٹھہرا اکیلا' کھیتوں کی خدمت جیسی چاہیے تھی ویسی نہ ہوتی تھی۔ اچھی فصل کہاں سے آتی۔ کچھ مقروض بھی ہو گیا۔ یہ فکر بھی مارے ڈالتی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اسے اب کچھ آرام ملے۔ اتنے دنوں کی شبانہ روز مشقت کے بعد اب بار کچھ ہلکا ہوتا لیکن ملیا کی خود غرضی اور ناعاقبت اندیشی نے لہراتی ہوئی کھیتی اجاڑ دی۔ اگر سب ساتھ ہوتے تو وہ اس وقت پنشن پاتا۔ مزے سے دروازے پر بیٹھا ناریل پیتا۔ بھائی کام کرتے' وہ صلاح مشورہ دیتا اور بے فکر پھرتا۔ کسی کے جھگڑے چکاتا۔ کہیں سادھو سنتوں کی سیوا کرتا مگر موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو فکروں کا ہجوم روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر اسے دھیما دھیما بخار رہنے لگا۔ پہلے کچھ پروا نہ کی' سمجھا آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔ مگر جب کمزوری بڑھنے لگی تو دوا کی فکر ہوئی' جس نے جو بتا دیا وہ کھا لیا۔ ڈاکٹر یاوید کے پاس جانے کی توفیق کسے؟ اور ہوتی بھی تو روپے خرچ کر دینے کے سوا اور نتیجہ بھی کیا تھا۔ تپ کہنہ کا علاج ہی کیا تھا۔ نہ وہ بسنت مالتی کا سیون کر سکتا تھا اور نہ آرام سے بیٹھ کر اچھی غذائیں کھا سکتا تھا۔ پنّا اب بھی موقع پاتی تو اس کو تشفی دیتی تھی' لیکن اس کے لڑکے اب رگھو سے بات بھی نہ کرتے تھے۔ دوا دارو تو کیا کرتے اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ بھیا سمجھتے تھے کہ ہم لوگوں سے الگ ہو کر سونے کی اینٹ رکھ لیں گے۔ بھابی سمجھتی تھیں کہ سونے سے لد جائیں گی۔ اب دیکھیں کون پوچھتا ہے۔ بہت ہائے ہائے بھی اچھی نہیں ہوتی۔ آدمی اتنا کام کرے جتنا ہو سکے۔ یہ نہیں کہ روپیہ کے لیے جان ہی دے دے۔ پنّا کہتی رگھو بیچارے کا کیا قصور ہے؟

اور کیدار جواب دیتا۔ "چل میں خوب سمجھتا ہوں۔ ان کی جگہ میں ہوتا تو ڈنڈے سے بات کرتا۔ مجال تھی کہ عورت یوں جدا کرتی۔ یہ سب بھیا کی چال تھی۔"

آخر ایک دن رگھو کی زندگی کا ٹمٹماتا ہو چراغ بجھ گیا۔ موت نے ساری فکروں کا خاتمہ کر دیا۔ آخر وقت میں اس نے کیدار کو بلایا تھا لیکن کیدار کو اوکھ میں پانی دینا تھا۔ کہیں دوا کے لئے نہ بھیج دیں اس لئے بہانہ بنا دیا۔

ملیا کے لیے اب زندگی تاریک ہو گئی۔ جس زمین پر اس نے اپنے منصوبوں کی دیوار کھڑی کی تھی وہ نیچے سے کھسک گئی تھی۔ جس کھونٹے کے بل پر اچھل رہی تھی وہ اکھڑ گیا تھا ــــ گاؤں والوں نے کہنا شروع کر دیا کہ ایشورے نے کتنی جلدی سزا دی۔ بچاری مارے لاج کے اپنے دونوں بچوں کے لیے رویا کرتی تھی۔ گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ ہر شخص اسے یہ کہتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ گھمنڈ کے مارے پاؤں زمین پر نہ رکھتی تھی ــــ آخر مل گئی سزا کہ نہیں ــــ اب کسی گھر میں کیسے نباہ ہو گا؟ وہ کس کے سہارے رہے گی۔ کس کے بل پر کھیتی ہو گی۔ بیچارا رگھو بیمار تھا مگر جب تک زندہ رہا اپنا کام کرتا رہا۔ کمزوری کے مارے کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا اور ذرا دیر دم لے کر پھر ہاتھ چلانے لگتا۔ اب کھیتی کون سنبھالے گا۔

سارے کام پھیلے پڑے تھے۔ اناج کی داتھیں کھلیان میں ہی پڑیں تھیں۔ اوکھ الگ سوکھ رہی تھی۔ وہ اکیلی کیا کیا کرے گی۔ پھر سنچائی اکیلے آدمی کا کام تو نہیں' تین تین مزدوروں کو کہاں سے لائے۔ گاؤں میں مزدور تھے ہی کتنے؟ آدمیوں کے لئے کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ کیا کرے کیا نہ کرے۔

اس طرح تیرہ دن گزر گئے۔ کریا کرم سے فراغت ہوئی۔ دوسرے دن علی الصبح بچوں کو گود میں اٹھایا اور اناج ماڈنے چلی۔ کھلیان میں پہنچ کر ایک بچے کو درخت کے نیچے گھاس کے نرم بستر پر سلادیا اور دوسرے کو وہیں بٹھا کر اناج ماڈنے لگی۔ بیلوں کو ہانکتی اور روتی تھی۔ کیا بھگوان نے اسے اس لیے جنم دیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہی کیا ہو گیا۔ ان ہی دنوں پچھلے سال بھی اناج ماڈا گیا تھا۔ وہ رگھو کے لئے لوٹے میں شربت اور مٹر کا چبینا لے کر آئی تھی۔ آج کوئی اس کے آگے ہے نہ پیچھے۔ یکا یک چھوٹے بچے کا رونا سن کر اس نے ادھر تاکا تو دیکھا بڑا لڑکا اسے پچکار کر کہہ رہا تھا۔ ”بیا ٹپ رہو۔ ٹپ رہو —“ دھیرے دھیرے اس کے منہ پر ہاتھ پھیرتا تھا اور چُپ کرانے کے لئے بے کل تھا۔ جب بچّہ کسی طرح چپ نہ ہوا تو وہ خود اس کے پاس لیٹ گیا اور چھاتی سے لگا کر پیار کرنے لگا اور جب یہ کوشش بھی کامیاب نہ ہوئی تو خود بھی رونے لگا۔

اسی وقت پنّا دوڑی ہوئی آئی اور چھوٹے بچے کو گود میں اٹھا کر پیار کرتی ہوئی بولی۔ ”لڑکوں کو مجھے کیوں نہ دے آئیں بہو؟ ہائے ہائے بیچارا دھرتی پر پڑا لوٹ رہا ہے۔ جب میں مر جاؤں تو جو چاہے کرنا‘ ابھی تو میں جیتی ہوں۔ الگ ہو جانے سے بچے تو پرائے نہیں ہو گئے۔“

ملیا۔ ”تمہیں بھی چھٹی نہیں تھی‘ اماں کیا کرتی۔“

پنّا۔ ”تو تجھے یہاں آنے کی ایسی کیا جلدی تھی۔ ڈانٹھ ماڈ نہ جاتی۔ تین لڑکے تو ہیں اور کس کام آئیں گے؟ کیدار تو کل ہی ماڈنے کو کہہ رہا تھا۔ میں نے کہا کہ پہلے اوکھ میں پانی دے لو تب اناج ماڈنا‘ منڈائی تو دس دن بعد بھی ہو سکتی ہے۔ اوکھ کی سنچائی نہ ہوئی تو اوکھ سوکھ جائے گی۔“

”کل سے اوکھ میں پانی چڑھا ہوا ہے۔ پرسوں تک کھیت پورے بھر جائیں گے تب پھر منڈائی بھی ہو جائے گی۔ تجھے بسواس نہ آئے گا جب سے بھیا مرے ہیں کیدار کو بڑی چنتا ہو گئی ہے۔ دن میں سو سو بار پوچھتا ہے کہ بھابی بہت روتی تو نہیں ہے۔ دیکھ لڑکے بھوکے تو نہیں ہیں۔ کوئی لڑکا روتا ہے تو دوڑا ہوا آتا ہے‘ دیکھا اماں کیا ہوا۔ بچّہ کیوں روتا ہے۔ کل رو کر بولا۔ ”اماں میں جانتا کہ بھیا اتنی جلدی چلے جائیں گے تو ان کی کچھ سیوا کر لیتا۔“ کہاں جگائے جگائے اٹھتا تھا۔ اب دیکھتی ہوں رات سے اٹھ کر کام میں لگ جاتا ہے۔ کنّو کل جرا سا بولا کہ پہلے ہم اپنی اوکھ میں پانی دے لیں گے پھر بھیا کی اوکھ میں دیں گے‘ اس پر کیدار نے ایسا ڈانٹا کہ کنّو کے منہ سے پھر بات نہ نکلی۔ بولا کیسی تمہاری کیسی ہماری اوکھ بھیا نے جلانہ لیا ہوتا تو آج یا مر گئے ہوتے یا کہیں بھیک مانگتے ہوتے۔ آج بڑے اوکھ والے بنے ہو۔ یہ انہی کا پن پرتاپ ہے کہ آج بھلے آدمی بنے بیٹھے ہو — پرسوں روٹی کھانے بلانے گئی تو منڈیا میں بیٹھا چپ چاپ رو رہا تھا۔ پوچھا۔ کیوں روتا ہے؟ تو بولا کہ اماں بھیا اسی الگو جھے کے دکھ سے مر گئے نہیں تو ابھی ان کی عمر ہی کیا تھی —

”یہ اس وقت نہیں سوجھا تو ان سے بگاڑ کیوں کرتے؟“ یہ کہہ کر پنّا نے ملیا کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ”تمہیں وہ الگ نہ رہنے دے گا۔ کہتا ہے کہ بھیا ہمارے لیے مر گئے تو ہم کیا ان کے بال بچوں کے لئے مر جائیں گے۔“ ملیا کی آنکھوں میں آنسو جاری تھے۔ پنّا کی باتوں میں کس قدر خلوص تھا‘ کتنی سچائی تھی۔ ملیا کا دل اس کی طرف اتنا مائل نہ ہوا تھا۔ جن سے اسے طعنہ اور انتقام کا خوف تھا اور اتنے مہربان اور غمگسار ہو گئے تھے۔ آج پہلی بار اسے خود غرضی پر شرم آئی۔ پہلی بار آتما نے بٹوارے پر شرمندہ کیا۔

اس واقعے کو پانچ سال گزر گئے۔ پنّا اب بوڑھی ہو گئی ہے۔ کیدار اب گھر کا مالک ہے۔ ملیا اب گھر کی مالکن ہے۔ کنّو اور چھمن کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ مگر کیدار اب بھی کنوارا ہے۔ کہتا ہے میں شادی نہ کروں گا۔ کئی جگہوں سے بات چیت ہوئی۔ کئی سگائیاں آئی مگر کیدار نے ہامی نہ بھری۔ پنّا نے بہت کوشش کی مگر وہ جال میں نہ آیا۔ کہتا کہ عورتوں سے کیا سکھ؟ کہتا ہے مہریا گھر میں آئی اور آدمی کا مجاج بدلا' پھر جو کچھ ہے وہ مہریا ہے۔ ماں باپ بہن بھائی سب پرائے ہو گئے۔ جب بھیا جیسے آدمی کا مجاج بدل گیا تو پھر دوسروں کی کیا گنتی۔ دو لڑکے بھگوان نے دیے ہیں اور کیا چاہیے۔ بنا بیاہ کے بیٹے مل گئے' اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا ــــ؟ جسے اپنا سمجھو وہی اپنا ہے جسے غیر سمجھو وہ غیر ہے۔

ایک دن پنّا نے کہا۔ "تو بیاہ نہ کرے گا تو تیرا بنس (خاندان) کیسے چلے گا؟"

کیدار۔ "میرا بنس تو چل رہا ہے دونوں لڑکوں کو اپنا ہی سمجھتا ہوں۔"

پنّا۔ "سمجھنے پر ہی ہے تو تو نے ملیا کو اپنی مہریا سمجھا ہوگا۔"

کیدار نے جھینپتے ہوئے کہا۔ "تم تو گالی دیتی ہو اماں۔"

پنّا۔ "گالی کیسی تیری بھابی ہی تو ہوتی ہے۔"

کیدار۔ "میرے جیسے گنوار کو وہ کیوں پوچھنے لگی؟"

پنّا۔ "تو کہنے کو کہہ تو میں اس سے پوچھوں۔"

کیدار۔ "نہیں اماں کہیں رونے گانے نہ لگے؟"

پنّا۔ "تیرا من ہو تو میں باتوں ہی باتوں میں اس کے من کی تھاہ لوں۔"

کیدار۔ "میں نہیں جانتا جو چاہے کر۔"

پنّا کیدار کے دل کی بات سمجھ گئی۔ لڑکے کا دل ملیا پر آیا ہے۔ یہ شرم اور خوف کے مارے کچھ کہہ نہیں پاتا۔ اسی دن اس نے ملیا سے کہا۔ "کیا کروں بہو! من کی لالسا من میں ہی رہی جاتی ہے۔ کیدار کا گھر بھی بس جاتا تو میں نچنت (بے فکر) ہو جاتی۔"

ملیا۔ "وہ تو کرنے کو ہی نہیں کہتے۔"

پنّا۔ "کہتا ہے ایسی عورت ملے جو گھر میں میل سے رہے تو کر لوں۔"

ملیا۔ "ایسی عورت اس گاؤں میں کہاں ملے گی' کہیں ڈھونڈو؟"

پنّا۔ "میں نے تو ڈھونڈ لیا ہے۔"

ملیا۔ "سچ! کس گاؤں کی ہے؟"

پنّا۔ "ابھی نہ بتاؤں گی۔ مگر یہ جانتی ہوں کہ اس سے کیدار کی سگائی ہو جائے تو گھر بن جائے اور کیدار کی جندگی بھی سپھل ہو جائے۔ نہ جانے لڑکی مانے گی کہ نہیں؟"

ملیا۔ "مانے گی کیوں نہیں اماں' ایسا سندر کماؤ' سوشیل بَر اور کہاں مل جاتا ہے۔ اس جنم کا کوئی سادھو مہاتما ہے۔ نہیں تو لڑائی جھگڑے کے ڈر سے کون بن بیاہا رہتا ہے۔ کہاں رہتی ہے میں جا کر اسے منا لاؤں۔"

پنّا۔ "تو چاہے تو اسے منا لے؟ تیری ہی عمر کی ہے۔"

ملیا۔ "میں آج ہی چلی جاؤں گی۔ اس کے پیروں میں پڑ کر منا لاؤں گی۔"

پنّا۔ "بتا دوں' وہ تُو ہی ہے!"

ملیا۔ ”شرما کر بولی۔ ”تم تو اماں جی گالی دیتی ہو۔“

پنّا۔ ”گالی کیسی دیور ہی تو ہے۔“

ملیا۔ ”بھلا مجھ جیسی بڑھیا کو وہ کیوں پوچھیں گے۔“

پنّا۔ ”وہ تجھی پر دانت لگائے بیٹھا ہے۔ تیرے سوا کوئی عورت اسے بھاتی ہی نہیں۔ ڈر کے مارے کہتا نہیں پر اس کے من کی بات میں جانتی ہوں‘ تجھے پا کر وہ پُھولا نہ سمائے گا۔“

بیوگی کے غم سے مرجھائی ہوئی ملیا کا زرد چہرہ کنول کی طرح کِھل گیا۔ دس سال میں جو کچھ کھویا تھا وہ ایک لمحہ میں سود کے ساتھ مل گیا۔ وہی تازگی‘ وہی شگفتگی‘ وہی ملاحت‘ وہی دل کشی۔

سوا سیر گیہوں

(1)

کسی گاؤں میں شنکر نامی ایک کُرمی کسان رہتا تھا۔ سیدھا سادہ غریب آدمی تھا۔ اپنے کام سے کام۔ نہ کسی کے لینے میں نہ دینے میں‘ چھکّا پنچانہ جانتا تھا۔ چھل کپٹ کی اسے ہوا بھی نہ لگی تھی۔ ٹھگے جانے کی فکر نہ تھی۔ ٹھگ وِدّیا نہ جانتا تھا۔ کھانا ملا تو کھا لیا نہ ملا تو چبینے سے پیٹ بھر لیا۔ چبینہ بھی نہ ملا تو پانی پی لیا اور رام کا نام لے کر سو رہا مگر جب کوئی مہمان دروازے پر آ جاتا تو اسے قناعت کا راستہ ترک کر دینا پڑتا۔ بالخصوص جب کوئی سادھو مہاتما آ جاتے تھے‘ اسے لازمی دنیاوی باتوں کا سہارا لینا پڑتا۔ خود بھوکا سو سکتا تھا مگر سادھو کو کیسے بھوکا سلاتا۔ بھگوان کے بھگت جو ٹھہرے!

ایک روز شام کے وقت ایک مہاتما نے آ کر اس کے دروازے پر ڈیرا جمایا۔ چہرہ پر جلال تھا‘ پیتامبر گلے میں‘ جٹا سر پر‘ پیتل کی کنڈل ہاتھ میں۔ کھڑاؤں پیر میں‘ عینک آنکھوں پر‘ غرض کہ پورا بھیس ان مہاتماؤں کا سا تھا جو رئیسوں کے محلوں میں ریاضت‘ ہوا گاڑیوں پر مندروں کا طواف اور یوگ میں کمال حاصل کرنے کے لئے لذیذ غذائیں کھاتے ہیں! گھر میں جَو کا آٹا تھا وہ انہیں کیسے کھلاتا۔ پرانے زمانے میں جَو کی خواہ کچھ اہمیت رہی ہو مگر زمانہ حال میں جَو کی غذا مہاتما لوگوں کے لئے ثقیل اور دیر ہضم ہوتی ہے۔ بڑی فکر ہوئی کہ مہاتما جی کو کیا کھلاؤں۔ آخر طے ہوا کہ کہیں سے گیہوں کا آٹا ادھار لاؤں۔ گاؤں بھر میں گیہوں کا آٹا نہ ملا۔ گاؤں میں سب آدمی ہی آدمی تھے دیوتا ایک بھی نہ تھا۔ پھر وہاں دیوتاؤں کی خوراک کیسے ملتی۔ خوش قسمتی سے گاؤں کے پنڈت جی کے یہاں تھوڑے سے گیہوں مل گئے۔ ان سے سوا سیر گیہوں ادھار لیے اور بیوی سے کہا انہیں پیس دے۔ مہاتما نے کھانا کھایا۔ لمبی تان کے سو رہے اور صبح کو آشیرواد دے کر اپنا راستہ لیا۔

پنڈت سال بھر میں دو بار کھلیان لیا کرتے تھے۔ شنکر نے دل میں کہا کہ سوا سیر گیہوں کیا لوٹاؤں۔ پنیری کے بدلے کچھ زیادہ کھلیانی دے دوں گا۔ یہ بھی سمجھ جائیں گے‘ میں بھی سمجھ جاؤں گا۔

چیت میں جب پنڈت جی پہنچے تو انہیں ڈیڑھ پنیری کے قریب گیہوں دے دیا اور اپنے کو سبکدوش سمجھ کر

اس کا کوئی ذکر نہ کیا۔ پنڈت جی نے پھر کبھی نہ مانگا۔ سیدھے سادے شنکر کو کیا معلوم تھا کہ یہ سوا سیر گیہوں چکانے کے لیے مجھے دوبارہ جنم لینا پڑے گا۔

(2)

سات سال گزر گئے۔ پنڈت جی برہمن سے مہاجن ہوئے۔ شنکر کسان سے مزدور ہو گیا۔ اس کا چھوٹا بھائی منگل اس سے الگ ہو گیا تھا۔ ایک ساتھ رہ کر دونوں کسان تھے الگ ہو کر دونوں مزدور ہو گئے تھے۔ شنکر نے بہت چاہا کہ علیحدگی کی آگ نہ بھڑکنے پائے مگر حالات نے اس کو مجبور کر دیا۔

جس وقت الگ الگ چولہے جلے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ آج سے بھائی بھائی دشمن ہو جائیں گے۔ ایک روئے گا دوسرا ہنسے گا' ایک کے گھر غمی ہو گی تو دوسرے کے گھر گلگلے پکیں گے۔ محبت کا رشتہ 'خون کا رشتہ' دودھ کا رشتہ' آج ٹوٹا جاتا ہے۔ اس نے محنت کر کے خاندانی عزت کا یہ درخت لگایا تھا' اسے اپنے خون سے سینچا تھا' اس کو جڑ سے اکھڑتا دیکھ کر اس کے دل کے ٹکڑے ہوئے جاتے تھے۔ سات روز تک اس نے دانے کی صورت بھی نہ دیکھی۔ دن بھر جیٹھ کی دھوپ میں کام کرتا تھا اور رات کو منہ لپیٹ کر سو رہتا تھا۔ اس سخت رنج اور ناقابلِ برداشت تکلیف نے خون جلا دیا۔ گوشت اور چربی کو گھلا دیا۔ بیمار پڑا تو مہینوں چارپائی سے نہ اٹھا۔ اب گزر بسر کیسے ہو؟ پانچ بیگھے کے آدھے کھیت رہ گئے۔ ایک بیل رہ گیا کھیتی کیا خاک ہوتی؟ آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ کھیتی صرف نام بھر کو رہ گئی۔ گزر بسر کا سارا بار مزدوری پر آپڑا۔

سات سال گزر گئے۔ ایک دن شنکر مزدوری کر کے لوٹا تو راستے میں پنڈت جی نے ٹوک کر کہا۔ "شنکر کل آ کر اپنا حساب کر لے۔ تیرے یہاں ساڑھے پانچ من گیہوں کب سے باقی پڑے ہیں اور تُو دینے کا نام نہیں لیتا۔ ہضم کرنے کی نیت ہے کیا؟"

شنکر نے تعجب سے کہا۔ "میں نے تم سے کب گیہوں لیے تھے جو ساڑھے پانچ من ہو گئے؟ تم بھولتے ہو۔ میرے یہاں نہ کسی کا چھٹانک بھر اناج ہے نہ ایک پیسہ اُدھار۔"

پنڈت۔ "اسی نیت کا تو یہ پھل بھوگ رہے ہو کہ کھانے کو نہیں جُڑتا۔"

یہ کہہ کر پنڈت جی نے اس سوا سیر گیہوں کا ذکر کیا جو آج سے سات سال پہلے شنکر کو دیے تھے۔ شنکر سن کر ساکت رہ گیا۔ ایشور میں نے انہیں کتنی بار کھلیانی دی' انہوں نے میرا کون سا کام کیا تھا۔ جب پوتھی پترا دیکھنے ساعت شگون بچارنے دوار پر آتے تھے تو کچھ نہ کچھ دچھنا لے ہی جاتے تھے' اتنا سوارتھ۔ سوا سیر اناج کو انڈے کی طرح سے کر آج یہ بُھوت کھڑا کر دیا جو مجھے نگل ہی جائے گا۔ اتنے دنوں میں ایک بار بھی کہہ دیتے تو میں گیہوں دے دیتا۔ کیا اسی نیت سے چپ بیٹھے رہے؟ بولا۔ "مہاراج نام لے کر تو میں نے اتنا اناج نہیں دیا مگر کئی بار کھلیانی میں سیر سیر دو دو سیر دے دیا ہے۔ اب آپ آج ساڑھے پانچ من مانگتے ہیں میں کہاں سے دوں گا۔"

پنڈت۔ "لیکھا جو جو بکسیں (بخشش) سو سو۔ تم نے جو کچھ دیا ہو گا کھلیانی میں دیا ہو گا۔ اس کا کوئی حساب نہیں' چاہے ایک جگہ چار پنیری دے دو۔ تمہارے نام ہی میں ساڑھے پانچ من لکھا ہوا ہے جس سے چاہے حساب لگوا لو' دے دو تو تمہارا نام کاٹ دوں نہیں تو اور بڑھتا رہے گا۔"

شنکر۔ ”پانڈے جی کیوں غریب کو ستاتے ہو؟ میرے کھانے کا ٹھکانہ نہیں‘ اتنا گیہوں کس کے گھر سے دوں گا۔“

پنڈت۔ ”جس کے گھر سے چاہو لاؤ! میں چھٹانک بھر بھی نہ چھوڑوں گا۔ یہاں نہ دو گے بھگوان کے گھر تو دو گے؟“

شنکر کانپ اٹھا۔ ہم پڑھے لکھے لوگ ہوتے تو کہہ دیتے۔ اچھی بات ہے ایشور کے گھر ہی دے دیں گے۔ وہاں کی تول یہاں سے کچھ بڑی تو نہ ہو گی۔ کم سے کم اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس نہیں پھر اس کی کیا فکر؟ مگر شنکر اتنا عقلمند‘ اتنا چالاک نہ تھا۔ ایک تو قرض وہ بھی برہمن کا۔ بہی میں نام رہے گا تو سیدھا نرک میں جاؤں گا۔ اس خیال سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے‘ بولا۔ ”مہاراج تمہارا جتنا ہو گا یہیں دوں گا۔ ایشور کے یہاں کیوں دوں۔ اس جنم میں تو ٹھوکریں کھا ہی رہا ہوں‘ اس جنم کے لیے کیوں کانٹے بوؤں؟ مگر یہ کوئی نیائے نہیں ہے۔ تم نے رائی کا پربت بنا دیا۔ برہمن ہو کے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اسی وقت تگادا کر کے لے لیا ہوتا تو آج میرے اوپر اتنا بڑا بوجھ کیوں پڑتا؟ میں تو دے دوں گا مگر تمہیں بھگوان کے یہاں جواب دینا پڑے گا۔“

پنڈت۔ ”وہاں کا ڈر تمہیں ہو گا‘ مجھے کیوں ہونے لگا۔ وہاں تو سب اپنے ہی بھائی بند ہیں۔ رشی مُنی سب تو برہمن ہی ہیں‘ دیوتا برہمن ہیں جو کچھ بنے بگڑے گی سنبھال لیں گے۔ تو کب دیتے ہو؟“

شنکر۔ ”میرے پاس رکھا تو ہے نہیں۔ کسی سے مانگ تانگ کر لاؤں گا‘ تبھی دوں گا۔“

پنڈت۔ ”میں یہ نہ مانوں گا۔ سات سال ہو گئے۔ اب ایک دن کا بھی ملاحظہ نہ کروں گا۔ گیہوں نہیں دے سکتے تو دستاویز لکھ دو۔“

شنکر۔ ”مجھے تو دینا ہے‘ چاہے گیہوں لو چاہے دستاویز لکھاؤ۔ کس حساب سے دام رکھو گے۔“

پنڈت۔ ”بازار بھاؤ پانچ سیر کا ہے تمہیں سوا پانچ سیر کا۔ کاٹ دوں گا۔“

شنکر۔ ”جب دے ہی رہا ہوں تو بازار بھاؤ کاٹوں گا۔ پاؤ بھر چھڑا کر کیوں برا بنوں۔“

حساب لگایا گیا۔ تو گیہوں کی قیمت ساٹھ روپیہ ہوئی۔ ساٹھ روپیہ کا دستاویز لکھا گیا۔ تین روپیہ سیکڑہ سود سال بھر میں نہ دینے پر سود کی شرح ساڑھے تین سیکڑہ بارہ آنے کا اسٹامپ۔ ایک روپیہ دستاویز کی تحریر شنکر کو الگ سے دینی پڑی۔

سارے گاؤں نے پنڈت جی کی مذمت کی مگر سامنے نہیں۔ مہاجن سے سبھی کا کام پڑتا ہے اس کے منہ کون لگے؟

(3)

شنکر نے سال بھر تک سخت محنت کی۔ میعاد سے پہلے اس نے روپیہ ادا کرنے کا برت سا کر لیا۔ دوپہر کو پہلے بھی چولہا نہ جلتا تھا‘ صرف چبینے پر بسر ہوتی تھی اب وہ بھی بند ہوا۔ صرف لڑکے کے لیے رات کو روٹیاں رکھ دی جاتیں۔ ایک پیسہ روز کی تمباکو وہ پی جاتا تھا۔ یہی ایک لت تھی جسے وہ کبھی نہ چھوڑ سکا تھا‘ اب وہ بھی اس کٹھن برت کے بھینٹ ہو گئی۔ اس نے چلم پٹک دی‘ حقہ توڑ دیا اور تمباکو کی ہانڈی چُور چُور کر ڈالی۔ کپڑے پہلے بھی تیاگ

کی انتہائی حد تک پہنچ چکے تھے۔ اب وہ باریک ترین قدرتی کپڑوں میں منسلک ہو گئے۔ کڑکڑاتی سردی کو اس نے آگ کے سہارے کاٹ دیا۔ اس اٹل ارادے کا نتیجہ امید سے بڑھ کر نکلا۔ سال کے آخر تک اس کے پاس ساٹھ روپیہ جمع ہو گئے۔ اس نے سمجھا کہ پنڈت جی کو اتنے روپے دے دوں گا اور کہہ دوں گا مہاراج باقی روپیہ بھی جلد ہی آپ کے سامنے حاضر کر دوں گا۔ پندرہ دن کی تو اَور بات ہے۔ کیا پنڈت جی اتنا بھی نہ مانیں گے؟ اس نے روپے لیے اور لے جا کر پنڈت جی کے قدموں پر رکھ دیے۔

پنڈت جی نے متعجب ہو کر پوچھا۔ ''کسی سے ادھار لیے کیا؟''

شنکر۔ ''نہیں مہاراج آپ کی اسیس سے اب کی مجوری اچھی ملی۔''

پنڈت۔ ''لیکن یہ تو ساٹھ ہی ہیں؟''

شنکر۔ ''ہاں مہاراج اتنے ابھی لے لیجیے۔ باقی میں دو تین مہینے میں دے دوں گا۔ مجھے اُرن کر دیجئے۔''

پنڈت۔ ''اُرن تو تبھی ہو گے جب میری کوڑی کوڑی چکا دو گے ـــــ جا کر میرے پندرہ اور لاؤ۔''

شنکر۔ ''مہاراج اتنی دیا کرو' اب سانجھ کی روٹیوں کا بھی ٹھکانہ نہیں ہے گاؤں میں ہوں تو کبھی نہ کبھی دے ہی دوں گا۔''

پنڈت۔ ''میں یہ روگ نہیں پالتا۔ نہ بہت باتیں کرنا جانتا ہوں۔ اگر میرے روپئے پورے نہ ملیں گے تو آج سے ساڑھے تین روپیہ سیکڑہ کا بیاج چلے گا۔ اتنے روپے چاہے اپنے گھر میں رکھو' چاہے میرے یہاں چھوڑ جاؤ۔''

شنکر۔ ''اچھا جتنا لایا ہوں اتنا رکھ لیجیے۔ میں جاتا ہوں کہیں سے پندرہ اور لانے کی پھکر کرتا ہوں۔''

شنکر نے سارا گاؤں چھان مارا مگر کسی نے پندرہ روپیہ نہ دیا۔ اس لیے نہیں کہ اس کا اعتبار نہ تھا یا کسی کے پاس روپے نہ تھے بلکہ پنڈت جی کے شکار کو چھڑانے کی کسی میں ہمّت نہ تھی۔

(4)

عمل کے بعد ردِ عمل کا قاعدہ قدرتی ہے۔ شنکر سال بھر تک تپسیا کرنے پر بھی جب قرض بے باق کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس کی احتیاط مایوسی میں بدل گئی۔ اس نے سمجھ لیا کہ جب اتنی تکلیف اٹھانے پر بھی سال بھر میں ساٹھ روپے سے زیادہ نہ جمع کر سکا تو اب کونسا اُپائے ہے جس سے اس کے دُونے روپے جمع ہوں۔ جب سر پر قرض کا بوجھ ہی لدنا ہے تو کیا من بھر اور کیا سوا من کا۔ اس کی ہمّت پست ہو گئی۔ محنت سے نفرت ہو گئی۔ امید ہی حوصلہ کو پیدا کرنے والی ہے' امید میں رونق ہے' طاقت ہے' زندگی ہے۔ امید ہی دنیا کو چلانے والی قوت ہے۔ شنکر مایوس ہو کر بے پروا ہو گیا۔ وہ ضرورتیں جن کو اس نے سال بھر تک ٹال رکھا تھا اب دروازے پر کھڑی ہونے والی بھکارنیں نہ تھیں بلکہ سر پر سوار ہونے والی چڑیلیں تھیں جو اپنا چڑھاوا لیے بغیر جان ہی نہیں چھوڑتیں۔ کپڑوں میں پیوند لگنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ اب شنکر کو حساب ملتا تو وہ روپیہ جمع نہ کرتا۔ کبھی کپڑے لاتا اور کبھی کوئی کھانے کی چیز۔ جہاں پہلے ہی تمباکو پیا کرتا تھا وہاں اب گانجہ اور چرس کا بھی چسکا لگا۔ اسے اب روپے ادا کرنے کی کوئی فکر نہ تھی۔ گویا اس پر کسی کا ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ پہلے لرزہ آجانے پر بھی وہ کام کرنے ضرور جاتا تھا۔ اب کام پر نہ جانے کا بہانہ تلاش کیا کرتا تھا۔

اس طرح تین سال گزر گئے۔ پنڈت جی مہاراج نے ایک بار بھی تقاضہ نہ کیا۔ وہ ہوشیار شکاری کی طرح سیدھا نشانہ لگانا چاہتے تھے۔ پہلے سے شکار کو چونکا دینا اُن کی پالیسی کے خلاف تھا۔ ایک روز پنڈت جی نے شنکر کو بلایا۔ حساب دکھایا۔ ساٹھ روپے جو جمع تھے وہ منہا کرنے پر اب بھی شنکر کے ذمے ایک سو بیس روپے نکلے۔

شنکر۔ ''اتنے روپے تو اُس جنم میں دوں گا اس جنم میں تو ہو نہیں سکتا۔''

پنڈت۔ ''میں اس جنم میں لوں گا۔ اصل نہ سہی سود تو دینا ہی پڑے گا۔''

شنکر۔ ''ایک بیل ہے وہ لے لیجیے۔ ایک جھونپڑی ہے وہ لے لیجیے اور میرے پاس رکھا کیا ہے۔''

پنڈت۔ ''مجھے بیل بدھیا لے کر کیا کرنا ہے۔ مجھے دینے کو تمہارے پاس بہت کچھ ہے۔''

شنکر۔ ''اور کیا ہے مہاراج!''

پنڈت۔ ''کچھ نہیں ہے تو تم تو ہو' آخر تم بھی تو کہیں مزدوری کرنے جاتے ہی ہو' مجھے بھی کھیتی کے لیے ایک مزدور رکھنا ہی پڑتا ہے' سود میں تم ہمارے یہاں کام کیا کرو۔ جب سبھیتا ہو' اصل بھی دے دینا۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تم کسی دوسری جگہ کام کرنے نہیں جا سکتے جب تک میرے روپے نہ چکا دو۔ تمہارے پاس کوئی جائداد نہیں ہے' اتنی بڑی گٹھڑی میں کس اعتبار پر چھوڑ دوں؟ کون اس کا ذمہ لے گا؟ کم از کم مجھے مہینے مہینے سود دیتے رہو گے اور کہیں کما کر جب تم مجھے سود بھی نہیں دے سکتے تو اصل کون کہے؟''

شنکر۔ ''مہاراج سود میں تو میں کام کروں گا اور کھاؤں گا کیا؟''

پنڈت۔ ''تمہاری گھر والی ہے' لڑکے ہیں' کیا وہ ہاتھ پیر کٹا کر بیٹھیں گے؟ رہا میں تمہیں آدھ سیر جَو' روز چبینے کے لیے دے دیا کروں گا۔ اوڑھنے کو سال میں ایک کمل پا جاؤ گے' ایک سلوکا بھی بنوا دیا کروں گا اور چاہیے کیا؟ یہ سچ ہے کہ اور لوگ تمہیں چھ آنے روز دیتے ہیں لیکن مجھے ایسی غرض نہیں ہے۔ میں تو تمہیں اپنے روپے بھرانے کے لیے رکھتا ہوں۔''

شنکر نے کچھ دیر تک گہری سوچ میں پڑے رہنے کے بعد کہا۔ ''مہاراج یہ تو جنم بھر کی گُلامی ہوئی۔''

پنڈت۔ ''گُلامی سمجھو چاہے مجوری سمجھو' میں اپنے روپے بھرائے بنا تمہیں کبھی نہ چھوڑوں گا۔ تم بھاگو گے تو تمہارا لڑکا بھرے گا۔ ہاں جب کوئی نہ رہے گا تب کی بات تو دوسری ہے۔''

اس فیصلے کی کہیں اپیل نہ تھی۔ مزدوروں کی ضمانت کون کرتا؟ کہیں پناہ نہ تھی' بھاگ کر کہاں جاتا؟ دوسرے روز سے اس نے پنڈت جی کے یہاں کام کرنا شروع کر دیا۔ سوا سیر گیہوں کی بدولت عمر بھر کے لیے غلامی کی بیڑیاں پاؤں میں ڈالنی پڑیں۔ اس بدنصیب کو اب اگر کسی خیال سے تسکین ہوتی تھی تو اس سے کہ یہ سب میرے پچھلے جنم کا بھوگ ہے۔ عورت کو وہ کام کرنے پڑتے تھے جو اس نے کبھی نہ کیے تھے۔ بچے دانے دانے کو ترستے تھے لیکن شنکر چپ چاپ دیکھنے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ وہ گیہوں کے دانے کسی دیوتا کی بددعا کی طرح تمام عمر اس کے سر سے نہ اترے۔

(5)

شنکر نے پنڈت جی کے یہاں بیس برس تک غلامی کرنے کے بعد اس دُکھی سنسار سے کوچ کیا۔ ایک سو

ہیں اب تک اس کے سر پر سوار تھے۔ پنڈت جی نے اس غریب کو ایشور کے دربار میں تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اتنے بے درد اور بے انصاف نہ تھے۔ پس انہوں نے اس کے جوان بیٹے کی گردن پکڑی۔ آج تک وہ پنڈت جی کے یہاں کام کرتا ہے۔ اس کی نجات کب ہوگی' ہوگی بھی یا نہیں ایشور ہی جانے!

(قارئین اس قصے کو فرضی نہ سمجھیے۔ یہ سچا واقعہ ہے ایسے شنکروں اور پنڈتوں سے دنیا خالی نہیں ہے۔)

بوڑھی کاکی

(1)

بڑھاپا اکثر بچپن کا دوسرا دور ہوا کرتا ہے۔ بوڑھی کاکی میں زبان کے چٹخارے کے سوا اور کوئی حِس باقی نہ تھی اور نہ اپنی تکلیفوں کی طرف دوسروں کو متوجہ کرنے کا' رونے کے علاوہ کوئی اور دوسرا سہارا ہی تھا۔ سارے اعضاء' آنکھیں' ہاتھ اور پیر جواب دے چکے تھے۔ زمین پر پڑی رہتیں اور جب گھر والے کوئی بات ان کی مرضی کے خلاف کرتے' کھانے کا وقت ٹل جاتا' یا اس کی مقدار پوری نہ ہوتی یا بازار سے کوئی چیز آتی اور انہیں نہ ملتی تو وہ رونے لگتی تھیں۔ ان کا رونا' سسکنا معمولی رونا نہیں تھا۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر روتی تھیں۔

ان کے پتی دیو کو سورگ سدھارے ایک زمانہ گزر چکا تھا۔ بیٹے جوان ہو ہو کر چل بسے تھے۔ اب ایک بھتیجے کے سوائے اور کوئی نہ تھا۔ اسی بھتیجے کے نام انہوں نے اپنی ساری جائداد لکھ دی تھی۔ ان حضرت نے لکھاتے وقت خوب لمبے چوڑے وعدے کیے لیکن وہ وعدے صرف قلی ڈپو کے دلالوں کے سبز باغ تھے۔ اگرچہ اس جائداد کی سالانہ آمدنی ڈیڑھ سو روپے سے کم نہ تھی لیکن بوڑھی کاکی کو پیٹ بھر کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا۔ اس میں ان کے بھتیجے پنڈت بدھ رام کا قصور تھا یا ان کی بیوی شریمتی روپا کا' اس کا فیصلہ کرنا آسان نہیں۔ بدھ رام نیک مزاج آدمی تھے لیکن اسی وقت تک جب تک کہ ان کی جیب پر کوئی آنچ نہ آئے۔ روپا مزاج کی تیز سہی' مگر ایشور سے ڈرتی تھی اس لیے بوڑھی کاکی کو اس کی تیزی اتنی نہ کھلتی تھی جتنی کہ بدھ رام کی بھلمنساہٹ۔

بدھ رام کو کبھی کبھی اپنے اوپر افسوس بھی ہوتا تھا۔ وہ سوچتے کہ اس کی جائداد کی بدولت میں اس وقت بھلا مانس بنا بیٹھا ہوں۔ اگر زبانی تسلّی' تشفی سے صورتِ حال میں سدھار ہو سکتا تو یہ کام ان کے لیے کچھ مشکل نہ ہوتا لیکن زائد خرچ کا ڈر ان کے اس نیک احساس کو دبائے رکھتا۔ یہاں تک کہ اگر دروازے پر کوئی بھلا آدمی بیٹھا ہوتا اور بوڑھی کاکی اس وقت اپنا راگ الاپنا شروع کر دیتیں تو وہ آگ ہو جاتے اور گھر میں آ کر انہیں زور سے ڈانٹتے۔ بچّوں کو تو ویسے ہی بڈھوں سے فطرتاً بغض ہوتا ہے۔ وہ ماتا پتا کا یہ رنگ دیکھ کر بوڑھی کاکی کو اور ستانے لگتے۔ کوئی چٹکی کاٹ کر بھاگتا' کوئی ان پر پانی کی کلّی کر دیتا۔ کاکی چیخ مار کر روتیں لیکن یہ بات مشہور ہی تھی کہ وہ صرف کھانے کے لیے روتی ہیں اس لیے ان کی چیخ و پکار اور فریاد پر کوئی دھیان نہیں دیتا تھا۔ ہاں اگر کاکی غصے میں آ کر گالیاں دینے لگتیں تو روپا موقعۂ واردات پر آ پہنچتی۔ اس خوف سے کاکی اپنے زبان کے خنجر کا بہت کم استعمال

کرتی تھیں۔ حالانکہ ان ہنگاموں کو ختم کرنے کے لیے یہ تدبیر رونے سے زیادہ مفید تھی۔
سارے گھر میں اگر کاکی سے کسی کو محبت تھی تو وہ بدھ رام کی چھوٹی لڑکی لاڈلی تھی۔ لاڈلی اپنے دونوں بھائیوں کے خوف سے اپنے حصے کی مٹھائی یا چبینا بوڑھی کاکی کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتی تھی۔ یہی اس کی پناہ گاہ تھی۔ اگرچہ کاکی کی پناہ ان کے لالچ کے سبب اسے بہت مہنگی پڑتی لیکن بھائیوں کے ظلم کے مقابلے میں کہیں بہتر تھی۔ اس بات نے ان دونوں میں محبت اور باہمی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

(2)

رات کا وقت تھا۔ بدھ رام کے دروازے پر شہنائی بج رہی تھی اور گاؤں کے بچّوں کا جھنڈ حیرت زدہ نگاہوں سے گانے کی داد دے رہا تھا۔ مہمان چارپائیوں پر لیٹے آرام کر رہے تھے اور نائیوں سے ٹکیاں لگوا رہے تھے۔ پاس ہی کھڑا ہوا بھاٹ ورداولی سنا رہا تھا اور متاثر ہونے والے مہمانوں کی ''واہ واہ'' پر ایسا خوش ہو رہا تھا جیسے اس ''واہ واہ'' کا درحقیقت وہی حق دار ہے۔ دو ایک انگریزی پڑھے نوجوان ایسی باتوں سے بیزار تھے۔ وہ ایسی گنوار منڈلی میں بولنا یا شامل ہونا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔
آج بدھ رام کے بڑے لڑکے مکھ رام کا تلک آیا ہے' یہ اسی کا جشن ہے۔ گھر کے اندر عورتیں گا رہی تھیں اور روپا مہمانوں کے لیے کھانے کے انتظامات میں مصروف تھی۔ بھٹیوں پر کڑھاؤ چڑھائے ہوئے تھے۔ ایک میں سے پوریاں کچوریاں نکل رہی تھیں۔ دوسروں میں دیگر پکوان بن رہے تھے۔ ایک بڑے ہنڈے میں مسالے دار ترکاری پک رہی تھی۔ گھی اور مسالے کی اشتہا انگیز خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔
بوڑھی کاکی اپنی کوٹھڑی میں کسی غم انگیز خیال کی مانند بیٹھی ہوئی تھیں۔ یہ ذائقہ دار خوشبو انہیں بے چین کر رہی تھی۔ وہ من ہی من میں سوچ رہی تھیں' شاید مجھے پوریاں نہیں ملیں گی۔ اتنی دیر ہو گئی کوئی کھانا لے کر نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے سب لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ میرے لیے کچھ نہیں بچا۔ یہ سوچ کر انہیں رونا آیا لیکن بدشگونی کے ڈر سے وہ رونہ سکیں۔
''آہا۔ کیسی خوشبو ہے۔ اب مجھے کون پوچھتا ہے۔ جب روٹیوں ہی کے لالے پڑے ہیں تو ایسے بھاگ کہاں کہ پیٹ بھر پوریاں ملیں؟'' یہ سوچ کر انہیں رونا آیا۔ کلیجے میں ہوک سی اُٹھنے لگی لیکن روپا کے ڈر سے انہوں نے ضبط کیا۔
بوڑھی کاکی دیر تک ان ہی دردانگیز خیالات میں ڈوبی رہیں۔ گھی اور مسالوں کی خوشبو رہ رہ کر من کو آپے سے باہر کیے دیتی تھی۔ منہ میں پانی بھر بھر آتا تھا۔ پوریوں کے ذائقے کا تصور کر کے دل میں گدگدی ہونے لگتی تھی۔ کسے پکاروں' آج لاڈلی بیٹی بھی نہیں آئی۔ دونوں چھوکرے سدا دِق کرتے ہیں۔ آج ان کا بھی کہیں پتہ نہیں' کچھ معلوم تو ہوتا کہ کیا بن رہا ہے۔
بوڑھی کاکی کے ذہن میں پوریوں کی تصویر ناچنے لگی۔ خوب لال لال' پھولی پھولی' نرم نرم ہوں گی۔ روپا نے اچھی طرح بھوجن دیا ہوگا۔ کچوریوں میں اجوائن اور الائچی کی مہک آ رہی ہوگی۔ ایک پوری ملتی تو ذرا ہاتھ میں لے کر دیکھتی۔ کیوں نہ چل کر کڑھاؤ کے سامنے ہی بیٹھوں۔ پوریاں چھن چھن کر تیار ہوں گی۔ کڑھاؤ سے گرم گرم

نکال کر تھال میں رکھی جاتی ہوں گی۔ پھول تو ہم گھر میں بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن باغیچے میں کچھ اور بات ہوتی ہے۔

روپا اس وقت کام کاج کی وجہ سے پریشان سی ہو رہی تھی۔ کبھی اِس کمرے میں جاتی کبھی اُس کمرے میں۔ کبھی کڑھاؤ کے پاس جاتی اور کبھی بھنڈار میں جاتی۔ کسی نے باہر سے آکر کہا۔ "مہاراج ٹھنڈائی مانگ رہے ہیں۔" ٹھنڈائی دینے لگی۔ اتنے میں پھر کسی نے آکر کہا۔ "بھاٹ آیا ہے اسے کچھ دے دو۔" بھاٹ کے لیے کھانا نکال رہی تھی کہ ایک تیسرے آدمی نے آکر پوچھا۔ "ابھی کھانا تیار ہونے میں کتنی دیر ہے؟ ذرا ڈھول مجیرا اتار دو۔" بے چاری اکیلی عورت دوڑتے دوڑتے پریشان ہو رہی تھی۔ جھنجھلاتی تھی، کُڑھتی تھی مگر غصہ ظاہر کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اسے ڈر تھا، کہیں پڑوسنیں یہ نہ کہنے لگیں کہ اتنے میں ہی اُبل پڑیں۔ پیاس سے خود اس کا گلا سوکھ رہا تھا، گرمی کے مارے پھنکی جاتی تھی لیکن اتنی فرصت بھی نہیں تھی کہ پانی پی لے یا پنکھا لے کر جھلے۔ یہ بھی کھٹکا تھا کہ ذرا آنکھ ہٹی اور چیزوں کی لوٹ مچی۔ اس حالت میں اس نے بوڑھی کاکی کو کڑھاؤ کے پاس بیٹھے دیکھا تو جل گئی۔ غصہ نہ رک سکا۔ اس کا بھی دھیان نہ رہا کہ پڑوسنیں بیٹھی ہوئی ہیں، دل میں کیا کہیں گی۔ مردانے میں لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے۔ جس طرح مینڈک کیچوے پر جھپٹتا ہے اسی طرح وہ بوڑھی کاکی پر جھپٹی اور انہیں دونوں ہاتھوں سے جھٹک کر بولی۔ "ایسے پیٹ میں آگ لگے۔ پیٹ ہے یا بھاڑ؟ کوٹھڑی میں بیٹھتے ہوئے کیا دم گھٹتا تھا؟ ابھی مہمانوں نے نہیں کھایا، بھگوان کو بھوگ نہیں لگا تب تک صبر نہ ہو سکا، آکر چھاتی پر سوار ہو گئیں۔ جل جائے ایسی جیبھ دن بھر کھائی نہ ہوتیں نہ جانے کس کی ہانڈی میں منہ ڈالتیں؟ گاؤں دیکھے گا تو کہے گا کہ بڑھیا کھانے کو نہیں پاتی تب ہی تو اس طرح منہ باندھے پھرتی ہے۔ ڈائن نہ مرے نہ مانچا چھوڑے۔ نام بیچنے پر لگی ہے۔ ناک کٹوا کر دم لے گی۔ اتنا ٹھونستی ہے، نہ جانے کہاں بھسم ہو جاتا ہے۔ لو بھلا چاہتی ہو تو جا کر کوٹھڑی میں بیٹھو۔ جب گھر کے لوگ کھانے لگیں گے تب تمہیں بھی ملے گا۔ تم کوئی دیوی نہیں ہو کہ چاہے کسی کے منہ میں پانی نہ جائے لیکن تمہاری پوجا پہلے ہو جائے۔"

بوڑھی کاکی نے سر نہ اٹھایا۔ نہ روئیں، نہ بولیں۔ چپ چاپ رینگتی ہوئی اپنی کوٹھڑی میں چلی گئیں۔ یہ صدمہ اتنا سخت تھا کہ دل اور دماغ کی ساری قوتیں، سارے خیالات اور جذبات اسی طرف مرکوز ہو گئے تھے۔ ندی میں جب کنارے کا کوئی بڑا ٹکڑا کٹ کر گرتا ہے تو آس پاس کا پانی چاروں طرف سے سمٹ کر اسی خالی جگہ کو بھرنے کے لیے دوڑتا ہے۔

(3)

کھانا تیار ہو گیا۔ آنگن میں پتل پڑ گئے۔ مہمان کھانے لگے۔ عورتوں نے جیونار گیت گانا شروع کیا۔ مہمانوں کے نائی اور خدمت گار بھی اسی منڈلی کے ساتھ، لیکن ذرا الگ ہٹ کر کھانا کھانے بیٹھے تھے لیکن تہذیب کے مطابق۔ جب تک سب کے سب کھانہ چکیں، کوئی اٹھ نہیں سکتا تھا۔ دو ایک مہمان جو کچھ پڑھے لکھے تھے، خدمت گاروں کے زیادہ کھانے پر جھنجھلا رہے تھے۔ وہ اس پابندی کو بیکار اور بے سر پیر کی بات سمجھتے تھے۔

بوڑھی کاکی اپنی کوٹھڑی میں جا کر پچھتا رہی تھیں کہ میں کہاں سے کہاں گئی۔ انہیں روپا پر غصہ نہیں تھا، اپنی جلد بازی پر دکھ تھا۔ سچ ہی تو ہے جب تک مہمان لوگ نہیں کھا چکیں گے۔ گھر والے کیسے کھائیں گے۔ مجھ سے اتنی دیر بھی نہیں رہا گیا۔ سب کے سامنے پانی اتر گیا۔ اب جب تک کوئی بلانے نہ آئے گا، نہ جاؤں گی۔

دل ہی میں یہ فیصلہ کر کے وہ بلاوے کا انتظار کرنے لگیں لیکن گھی کی پُرکشش خوشبو بڑی ہی صبر آزما ثابت ہو رہی تھی۔ انہیں ایک ایک پل ایک ایک یُگ کے برابر معلوم ہو تا تھا۔ اب پتّل بچھ گئے ہوں گے۔ اب مہمان آگئے ہوں گے۔ لوگ ہاتھ پیر دھو رہے ہیں۔ نائی پانی دے رہا ہے۔ معلوم ہو تا ہے لوگ کھانے بیٹھ گئے ہیں۔ جیونار گایا جا رہا ہے۔ یہ سوچ کر وہ دل کو بہلانے کے لیے لیٹ گئیں۔ دھیرے دھیرے ایک گیت گنگنانے لگیں۔ پھر انہیں احساس ہوا' مجھے گاتے دیر ہو گئی۔ کیا اتنی دیر تک لوگ کھا ہی رہے ہوں گے۔ کسی کی آواز نہیں سنائی دیتی۔ ضرور لوگ کھا پی کر چلے گئے۔ مجھے کوئی بلانے نہیں آیا۔ روپا چڑ گئی۔ کیا جانے نہ بلائے۔ سوچتی ہو گی آپ ہی آئیں گی۔ وہ کوئی مہمان تو نہیں ہیں جو انہیں بلاؤں۔ بوڑھی کاکی چلنے کے لیے تیار ہوئی۔ یہ یقین کہ اب منٹ میں پوریاں اور مسالے دار ترکاریاں سامنے آئیں گی' ان کی حسِ ذائقہ کو گدگدانے لگی۔ انہوں نے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھے۔ پہلے ترکاری سے پوریاں کھاؤں گی' پھر دہی اور شکر سے۔ کچوریاں رائیتے کے ساتھ مزے دار معلوم ہونے لگیں۔ چاہے کوئی برا مانے' چاہے بھلا' میں تو مانگ مانگ کر کھاؤں گی۔ یہی نہ کہ لوگ کہیں گے کہ انہیں ذرا لحاظ نہیں؟ کہا کریں۔ اتنے دن بعد پوریاں مل رہی ہیں تو منہ جوٹھا کر کے تھوڑا ہی اٹھ جاؤں گی۔

وہ اکڑوں بیٹھ کر ہاتھوں کے بل سرکتی ہوئی آنگن میں آئیں لیکن ہائے بدنصیبی' ان کی خواہش نے پرانی عادت کے مطابق غلط اندازہ لگایا۔ مہمانوں کی منڈلی ابھی بیٹھی ہوئی تھی۔ کوئی کھا کر انگلیاں چاٹتا تھا۔ کوئی ترچھی نظروں سے دیکھتا تھا کہ اور لوگ ابھی کھا رہے ہیں یا نہیں۔ کوئی اس فکر میں تھا پتّل پر پوریاں چھوٹی جا رہی ہیں' کسی طرح انہیں اندر رکھ لیتا۔ کوئی دہی کھا کر زبان چٹخارتا تھا لیکن دوسرا دونا مانگتے ہچکچاتا تھا کہ اتنے میں بوڑھی کاکی رینگتی ہوئی ان کے درمیان جا پہنچی۔ کئی آدمی چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے' پکارنے لگے۔ "ارے یہ بڑھیا کون ہے' یہ کہاں سے آگئی۔ دیکھو کسی کو چھونہ دے۔"

پنڈت بدھ رام کاکی کو دیکھتے ہی غصے سے تلملا گئے۔ پوریوں کا تھال لیے کھڑے تھے۔ تھال کو زمین پر پٹک دیا اور جس طرح بے رحم مہاجن اپنے کسی بے ایمان اور بھگوڑے قرض دار کو دیکھتے ہی جھپٹ کر اس کا ٹینٹوا پکڑ لیتا ہے' اسی طرح لپک کر انہوں نے بوڑھی کاکی کے دونوں ہاتھ پکڑے اور گھسیٹتے ہوئے لا کر انہیں اندھیری کوٹھڑی میں دھم سے پٹک دیا۔ امیدوں کا باغ لُو کے ایک جھونکے سے برباد ہو گیا۔

مہمانوں نے کھانا کھایا۔ گھر والوں نے کھانا کھایا' باجے والے' دھوبی چمار بھی کھا چکے' لیکن بوڑھی کاکی کو کسی نے بھی نہ پوچھا۔ بدھ رام اور روپا دونوں بوڑھی کاکی کو ان کی بے غیرتی کے لیے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کے بڑھاپے پر' بے کسی پر' بدحواسی پر کسی کو رحم نہیں آتا تھا۔ اکیلی لاڈلی ان کے لیے کُڑھ رہی تھی۔

لاڈلی کو کاکی سے بڑی محبت تھی۔ بے چاری بھولی لڑکی تھی۔ طفلانہ شوخی اور شرارت کی اس میں بو تک نہیں تھی۔ دونوں بار جب اس کی ماتا اور پتا نے کاکی کو بے رحمی سے گھسیٹا تو لاڈلی دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ جھنجھلا رہی تھی کہ یہ لوگ کاکی کو بہت سی پوریاں کیوں نہیں دیتے تھے۔ کیا مہمان سب کی سب کھا جائیں گے اور اگر کاکی نے مہمانوں سے پہلے کھا لیا تو کیا بگڑ جائے گا؟ وہ کاکی کے پاس جا کر انہیں تسلی دینا چاہتی تھی لیکن ماں کے خوف سے نہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے حصے کی پوریاں بالکل نہ کھائی تھیں۔ اپنی گڑیوں کی پٹاری میں بند کر رکھی تھیں۔ وہ یہ پوریاں کاکی کے پاس لے جانا چاہتی تھی۔ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ بوڑھی کاکی میری آواز سنتے ہی اٹھ بیٹھیں گی۔ پوریاں دیکھ کر کیسی خوش ہوں گی۔ مجھے خوب پیار کریں گی۔

(4)

رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ روپا آنگن میں پڑی سو رہی تھی۔ لاڈلی کی آنکھوں میں نیند نہ آتی تھی۔ کاکی کو پوریاں کھلانے کی خوشی اسے سونے نہ دیتی تھی۔ اس نے گڑیوں کی پٹاری سامنے ہی رکھی۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ اماں سو رہی ہیں تو وہ چپکے سے اٹھی اور سوچنے لگی، کیسے چلوں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف چولہوں میں آگ چمک رہی تھی اور چولہوں کے پاس ایک کتا لیٹا تھا۔ لاڈلی کی نگاہ دروازے والے نیم کے درخت کی طرف گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس پر ہنومان جی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی دُم، ان کی پیٹھ سب صاف دکھائی دے رہی ہے۔ مارے خوف کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنے میں کتا اٹھ بیٹھا۔ لاڈلی کو ڈھارس ہو گئی۔ کئی سوئے ہوئے آدمیوں کے بدلے ایک جاگتا ہوا کتا اس کے لیے زیادہ تشفی کا باعث ہوا۔ اس نے پٹاری اٹھائی اور بوڑھی کاکی کی کوٹھڑی کی طرف چلی۔

(5)

بوڑھی کاکی کو صرف اتنا یاد تھا کہ کسی نے میرے ہاتھ پکڑ کر گھسیٹے۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پہاڑ پر اڑائے لیے جاتا ہے۔ ان کے پیر بار بار پتھروں سے ٹکرائے تب کسی نے انہیں پہاڑ پر سے پٹکا۔ وہ بے سُدھ ہو گئیں۔

جب انہیں ہوش آیا تو کسی کی ذرا سی آہٹ نہ ملتی تھی۔ سمجھ گئیں کہ سب لوگ کھا پی کر سو گئے اور ان کے ساتھ میری تقدیر بھی سو گئی۔ رات کیسے کٹے گی؟ رام۔ کیا کھاؤں، پیٹ میں آگ بھڑک رہی ہے۔ ہائے کسی نے سُدھ نہ لی۔ کیا میرا پیٹ کاٹنے سے دھن جمع ہو جائے گا؟ ان لوگوں کو اتنی بھی دیا نہیں آتی کہ بڑھیا نہ جانے کب مر جائے؟ اس کا دل کیوں دکھائیں؟ میں پیٹ کی روٹیاں ہی کھاتی ہوں کہ اور کچھ؟ اس پر بھی یہ حال! اندھی اپاہج ٹھہری، نہ کچھ سنوں، نہ پوچھوں، اگر آنگن میں چلی گئی تو کیا بدھ رام سے اتنا کہتے نہ بنتا تھا کہ کاکی ابھی لوگ کھا رہے ہیں، پھر آنا۔ مجھے گھسیٹا، پٹکا، ان ہی پوریوں کے لیے روپا نے سب کے سامنے گالیاں دیں، ان ہی پوریوں کے لیے اتنی درگت کرنے پر ان کا پتھر کا کلیجہ نہ پسیجا۔ سب کو کھلایا، میری بات تک نہ پوچھی۔ جب تب ہی نہ دیا تو اب کیا دیں گے۔

یہ سوچ کر کاکی مایوسی بھرے اطمینان کے ساتھ لیٹ گئیں۔ رقّت سے گلا بھر بھر آتا تھا لیکن مہمانوں کے ڈر سے روتی نہ تھیں۔

اچانک ان کے کانوں میں آواز آئی۔ ''کاکی اٹھو، میں پوریاں لائی ہوں۔'' کاکی نے لاڈلی کی آواز پہچان لی۔ چٹ پٹ اٹھ بیٹھیں۔ دونوں ہاتھوں سے لاڈلی کو ٹٹولا اور اسے گود میں بٹھا لیا۔ لاڈلی نے پوریاں نکال کر دیں، کاکی نے پوچھا۔ ''کیا تمہاری اماں نے دی ہیں؟''

لاڈلی نے کہا۔ ''نہیں، وہ میرے حصے کی ہیں۔''

کاکی پوریوں پر ٹوٹ پڑیں۔ پانچ منٹ میں پٹاری خالی ہو گئی۔ لاڈلی نے پوچھا۔ ''کاکی پیٹ بھر گیا؟''

جیسے تھوڑی سی بارش ٹھنڈک کی جگہ اور بھی حبس پیدا کر دیتی ہے، اسی طرح ان چند پوریوں نے کاکی کی بھوک اور خواہش کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔ بولیں۔ ''نہیں بیٹی۔ جا کر اماں سے اور مانگ لاؤ۔''

لاڈلی نے کہا۔ "اماں سوتی ہیں۔ جگاؤں گی تو ماریں گی۔"

کاکی نے پٹاری کو پھر ٹٹولا۔ اس میں کچھ ریزے گرے تھے۔ انہیں نکال کر وہ کھا گئیں۔ بار بار ہونٹ چاٹتی تھیں، چٹخارے بھرتی تھیں۔

دل مسوس رہا تھا کہ پوریاں کیسے پاؤں۔ صبر کا بندھن جب ٹوٹ جاتا ہے تو خواہش کا بہاؤ حد سے بڑھ جاتا ہے۔ متوالوں کے سامنے شراب کا ذکر کرنا انہیں اور دیوانہ بناتا ہے۔ کاکی کا بے تاب دل خواہش کے اس تیز بہاؤ میں بہہ گیا۔ مناسب اور غیر مناسب کی تمیز نہ رہی۔ وہ کچھ دیر اس خواہش کو روکتی رہیں یکایک لاڈلی سے بولیں۔

"میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے چلو۔ جہاں مہمانوں نے بیٹھ کر کھانا کھایا ہے۔"

لاڈلی ان کا اصل مقصد سمجھ نہ سکی۔ اس نے کاکی کا ہاتھ پکڑا، اور لے جا کر جوٹھے پتلوں کے پاس بٹھا دیا۔ غریب، بھوکی اور بد حواس بڑھیا پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے چن چن کر کھانے لگی اوہو، دہی کتنا مزے دار تھا، کچوریاں کتنی سلونی۔

کاکی فاتر العقل ہوتے ہوئے بھی اتنا جانتی تھیں کہ میں وہ کام کر رہی ہوں جو مجھے ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ میں دوسروں کی جوٹھی پتل چاٹ رہی ہوں۔ لیکن بڑھاپا حرص کی بیماری کا آخری درجہ ہوتا ہے۔ جہاں تمام خواہشات ایک ہی مرکز پر آکر جمع ہو جاتی ہیں۔ بوڑھی کاکی میں یہ مرکز ان کی حسِ ذائقہ تھی۔

ٹھیک اسی وقت روپا کی آنکھ کھلی۔ اسے معلوم ہوا کہ لاڈلی میرے پاس نہیں ہے۔ وہ چونکی، چارپائی کے ادھر ادھر تاکنے لگی کہ کہیں نیچے تو نہیں گر گئی۔ اسے وہاں نہ پا کر وہ اٹھ بیٹھی تو کیا دیکھتی ہے کہ لاڈلی جوٹھے پتلوں کے پاس چپ چاپ کھڑی ہے اور بوڑھی کاکی پتلوں سے پوریوں کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر کھا رہی ہے۔ روپا کا دل سن ہو گیا۔ کسی گائے کی گردن پر چھری چلتے دیکھ کر جو حالت اس کی ہوتی، وہی اس وقت ہوئی۔ ایک براہمنی دوسروں کی جوٹھی پتل ٹٹولے اس سے زیادہ دل ہلا دینے والا منظر ناممکن تھا۔ پوریوں کے چند نوالوں کے لیے اس کی چچیری ساس ایسی ذلیل اور پست حرکت کر رہی ہے۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھ کر دیکھنے والوں کے دل کانپ اٹھتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا زمین رک گئی۔ آسمان چکر کھا رہا ہے۔ دنیا پر کوئی مصیبت آنے والی ہے۔ روپا کو غصہ نہ آیا۔ صدمے کے موقع پر غصہ کہاں؟ درد اور خوف سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس ادھرم اور پاپ کا ذمہ دار کون ہے؟ اس نے سچے دل سے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "پرماتما میرے بچوں پر دیا کرو۔ اس ادھرم کی سزا مجھے مت دو، نہیں تو میرا ستیاناس ہو جائے گا۔"

روپا کو اپنی خود غرضی اور بے انصافی اس طرح صاف پہلے کبھی نظر نہ آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ "ہائے میں کتنی بے رحم ہوں۔ جس کی جائداد سے مجھے دو سو سالانہ کی آمدنی ہو رہی ہے، اس کی یہ درگت اور میری وجہ سے۔ اے سب پر دیا کرنے والے بھگوان، مجھ سے بڑی بھاری چوک ہوئی ہے۔ مجھے معاف کر دو۔ آج میرے بیٹے کا تلک تھا۔ سیکڑوں آدمیوں نے کھانا کھایا۔ میں ان کے اشاروں کی باندی بنی رہی۔ اپنے نام کے لیے سیکڑوں روپے خرچ کر دیے لیکن جس کی بدولت ہزاروں روپے اٹھائے، اسے اس تقریب میں بھی پیٹ بھر کھانا نہ دے سکی۔ صرف اس لیے کہ وہ بوڑھی اور بے سہارا ہے۔

روپا نے دیا جلایا۔ اپنے بھنڈار کا دروازہ کھولا اور ایک تھالی میں کھانے کی سب چیزیں سجا کر لیے ہوئے بوڑھی کاکی کی طرف چلی۔

آدھی رات جا چکی تھی۔ آسمان پر ستاروں کے تھال سجے ہوئے تھے اور ان پر بیٹھے دیوتا سورگ کی نعمتیں سجا رہے تھے لیکن ان میں کسی کو وہ عظیم ترین مسرت حاصل نہ ہو سکتی تھی جو بوڑھی کاکی کو اپنے سامنے تھال دیکھ کر حاصل ہوئی۔ روپا نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"کاکی، اٹھو کھانا کھالو۔ مجھ سے آج بڑی بھول ہوئی۔ اس کا برا نہ ماننا۔ پرماتما سے پرارتھنا کرو کہ وہ میری خطا معاف کر دیں۔"

بھولے بھالے بچّوں کی مانند، جو مٹھائیاں پاکر مار اور دھتکار سب بھول جاتے ہیں، بوڑھی کاکی ویسے ہی سب کچھ بھلا کر بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ ان کے ایک ایک رُوئیں سے سچی دعائیں نکل رہی تھیں اور روپا بیٹھی اس جنتی منظر کو دیکھ رہی تھی۔

شکوہ و شکایت

زندگی کا بڑا حصہ تو اسی گھر میں گزر گیا، مگر کبھی آرام نہ نصیب ہوا۔ میرے شوہر دنیا کی نگاہ میں بڑے نیک اور خوش اخلاق اور بیدار مغز ہوں گے، لیکن جس پر گزرتی ہے، وہی جانتا ہے۔ دنیا کو تو ان لوگوں کی تعریف میں مزہ آتا ہے، جو اپنے گھر کو جہنم میں ڈال رہے ہوں اور غیروں کے پیچھے اپنے آپ کو تباہ کیے جاتے ہوں، جو گھر والوں کے لیے مرتا ہے، اس کی تعریف دنیا والے نہیں کرتے۔ وہ تو ان کی نگاہ میں خود غرض ہے، بخیل ہے، تنگ دل ہے، مغرور، کور باطن ہے۔ اس طرح جو لوگ باہر والوں کے لیے مرتے ہیں، ان کی تعریف گھر والے کیوں کرنے لگے۔ اب انہی کو دیکھو، صبح سے شام تک مجھے پریشان کیا کرتے ہیں۔ باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے، جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو۔ ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے، نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب۔ یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دکان ہی کیوں ہوتی۔ انہیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کہ کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو۔ وہاں مال زیادہ کھپتا ہے۔ اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے۔ مگر نہیں، ٹٹ پُونجیوں سے ان کی ہمدردی ہے اور وہ انہیں الٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے، تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے۔ دال میں کنکر بھرے ہوئے، منوں لکڑی جلا ڈالو، کیا مجال کہ گلے۔ گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم، تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں۔ مگر دام دنے آئیں گے اعلیٰ درجے کے چمبیلی کے تیل کے۔ چلتی ہوئی دکان پر تو جاتے جیسے انہیں ڈر لگتا ہے۔ شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں۔ میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔

ایک دن کی بات ہو تو برداشت کر لی جائے، روز روز کی یہ مصیبت نہیں برداشت ہوتی۔ میں کہتی ہوں

آخر ٹٹ پونجیوں کی دکان پر جاتے ہی کیوں ہیں۔ کیا ان کی پرورش کا ٹھیکہ تمھی نے لے لیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں مجھے دیکھ کر بلانے لگتے ہیں۔ خوب! ذرا انھیں بلا لیا اور خوشامد کے دو چار الفاظ سنا دیئے۔ بس آپ کا مزاج آسمان پر جا پہنچا۔ پھر انھیں سدھ نہیں رہتی کہ وہ کوڑا کرکٹ باندھ رہا ہے یا کیا۔ پوچھتی ہوں' تم اس راستے سے جاتے ہی کیوں ہو۔ کیوں کسی دوسرے راستے سے نہیں جاتے؟ ایسے اٹھائی گیروں کو منہ ہی کیوں لگاتے ہو؟ اس کا کوئی جواب نہیں۔ ایک خموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

ایک بار ایک زیور بنوانا تھا' میں تو حضرت کو جانتی تھی۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک پہچان کے سنار کو بلا رہی تھی۔ اتفاق سے آپ بھی موجود تھے۔ بولے یہ فرقہ بالکل اعتبار کے قابل نہیں۔ دھوکا کھاؤ گی۔ میں ایک سنار کو جانتا ہوں میرے ساتھ کا پڑھا ہوا ہے۔ برسوں ساتھ ساتھ کھیلے ہیں' میرے ساتھ چال بازی نہیں کر سکتا۔ میں نے سمجھا جب ان کا دوست ہے اور وہ بھی بچپن کا' تو کہاں تک دوستی کا حق نہ نبھائے گا۔ سونے کا ایک زیور اور پچاس روپے ان کے حوالے کیے اور اس بھلے آدمی نے وہ چیز اور روپے نہ جانے کس بے ایمان کو دے دیئے کہ برسوں کے پیہم تقاضوں کے بعد جب چیز بن کر آئی تو روپے میں آٹھ آنے تانبا اور اتنی بدنما کہ دیکھ کر گھن آتی تھی۔ برسوں کا ارمان خاک میں مل گیا۔ رو پیٹ کر بیٹھ رہی۔ ایسے ایسے وفادار تو ان کے دوست ہیں' جنھیں دوست کی گردن پر چھری پھیرنے میں بھی عار نہیں۔ ان کی دوستی بھی انھی لوگوں سے ہے جو زمانہ بھر کے فاقہ مست 'قلانچ' بے سروسامان ہیں۔ جن کا پیشہ ہی ان جیسے آنکھ کے اندھوں سے دوستی کرنا ہے' روز ایک نہ ایک صاحب مانگنے کے لیے سر پر سوار رہتے ہیں اور بِلا لیے گلا نہیں چھوڑتے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے روپے ادا کیے ہوں۔ آدمی ایک بار کھو کر سیکھتا ہے' دوبارہ کھو کر سیکھتا ہے' یہ بھلے مانس ہزار بار کھو کر بھی نہیں سیکھتے۔ جب کہتی ہوں روپے تو دے آئے' اب مانگ کیوں نہیں لاتے' کیا مر گئے تمہارے وہ دوست تو بغلیں جھانک کر رہ جاتے ہیں۔ آپ سے دوستوں کو سوکھا جواب نہیں دیا جاتا۔ خیر سوکھا جواب نہ دو' میں بھی نہیں کہتی کہ دوستوں سے بے مروّتی کرو' مگر ٹال تو سکتے ہو۔ کیا بہانے نہیں بنا سکتے ہو۔ مگر آپ انکار نہیں کر سکتے۔ کسی دوست نے کچھ طلب کیا اور آپ کے سر پر بوجھ پڑا۔ بے چارے کیسے انکار کریں آخر لوگ جان جائیں گے کہ حضرت بھی فاقہ مست ہیں۔ دنیا انھیں امیر سمجھتی رہے۔ چاہے میرے زیور ہی کیوں نہ گروی رکھنے پڑیں۔ سچ کہتی ہوں بعض اوقات ایک ایک پیسے کی تنگی ہو جاتی ہے اور اس بھلے آدمی کو روپے جیسے گھر میں کاٹتے ہیں۔ جب تک روپیوں کے وارے نیارے نہ کرے' اسے کسی پہلو قرار نہیں۔ ان کے کرتوت کہاں تک کہوں۔ میری تو ناک میں دم آ گیا۔ ایک نہ ایک مہمان روز بلائے بے درماں کی طرح سر پر سوار' نہ جانے کہاں کے بے فکرے ان کے دوست ہیں' کوئی کہیں سے آ کر مرتا ہے' کوئی کہیں سے۔ گھر کیا ہے اپاہجوں کا اڈّا ہے۔ ذرا سا تو گھر' مشکل سے دو چار پائیاں' اوڑھنا بچھونا بھی بافراط نہیں۔ مگر آپ ہیں کہ دوستوں کو دعوت دینے کے لیے تیار۔ آپ تو مہمان کے ساتھ لیٹیں گے۔ اس لیے انھیں چارپائی بھی چاہیے۔ اوڑھنا بچھونا بھی چاہیے' ورنہ گھر کا پردہ کھل جائے۔ جاتی ہے تو میرے اور بچوں کے سر۔ زمین پر پڑے سکڑ کر رات کاٹتے ہیں' گرمیوں میں تو خیر مضائقہ نہیں' لیکن جاڑوں میں تو بس قیامت ہی آ جاتی ہے۔ گرمیوں میں بھی کھلی چھت پر تو مہمان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اب میں بچوں کو لیے قفس میں پڑی تڑپا کروں۔ اتنی سمجھ بھی نہیں کہ جب گھر کی یہ حالت ہے تو کیوں ایسوں کو مہمان بنائیں' جن کے پاس کپڑے تک نہیں۔ خدا کے فضل

سے ان کے سبھی دوست ایسے ہی ہیں۔ ایک بھی خدا کا بندہ ایسا نہیں' جو ضرورت کے وقت ان کی دھیلے سے بھی مدد کر سکے۔ دو ایک بار حضرت کو اس کا تجربہ اور بے حد تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ مگر اس مردِ خدا نے تو آنکھیں نہ کھولنے کی قسم کھالی ہے۔ ایسے ہی ناداروں سے ان کی پٹتی ہے۔ ایسے ایسے لوگوں کی آپ سے دوستی ہے کہ کہتے شرم آتی ہے۔ جسے کوئی اپنے دروازے پر کھڑا بھی نہ ہونے دے وہ آپ کا دوست ہے۔ شہر میں اتنے امیر کبیر ہیں' آپ کا کسی سے بھی ربط ضبط نہیں۔ کسی کے پاس نہیں جاتے۔ امراء مغرور ہیں' بد مغز ہیں' خوشامد پسند ہیں۔ ان کے پاس کیسے جائیں' دوستی گانٹھیں گے' ایسوں سے جن کے گھر میں کھانے کو بھی نہیں۔

ایک ہمارا خدمت گار چلا گیا اور کئی دن دوسرا خدمت گار نہ ملا۔ میں کسی ہوشیار اور سلیقہ مند نوکر کی تلاش میں تھی' مگر بابو صاحب کو جلد سے جلد کوئی آدمی رکھ لینے کی فکر سوار ہوئی۔ گھر کے سارے کام بدستور چل رہے تھے۔ مگر آپ کو معلوم ہو رہا تھا کہ گاڑی رکی ہوئی ہے۔ ایک دن نہ جانے کہاں سے ایک بانگڑو کو پکڑ لائے۔ اس کی صورت کہے دیتی تھی کہ کوئی جانگلو ہے۔ مگر آپ نے اس کی ایسی ایسی تعریفیں کیں کہ کیا کہوں' بڑا فرمانبردار ہے' پرلے سرے کا ایمان دار' بلا کا محنتی' غضب کا سلیقہ شعار اور انتہا درجے کا باتمیز ہے۔ خیر میں نے رکھ لیا۔ میں بار بار کیونکر ان کی باتوں میں آجاتی ہوں۔ مجھے خود تعجب ہے۔ یہ آدمی صرف شکل سے آدمی تھا' مگر آدمیت کی کوئی علامت اس میں نہ تھی۔ کسی کام کی تمیز نہ تھی۔ بے ایمان نہ تھا' مگر احمق اول نمبر کا۔ بے ایمان ہوتا تو کم سے کم اتنی تسکین ہوتی کہ خود کھاتا ہے' کم بخت دکانداروں کی فطرتوں کا شکار ہو جاتا تھا۔ اسے دس تک گنتی بھی نہ آتی تھی۔ ایک روپیہ دے کر بازار بھیجو تو شام تک حساب نہ سمجھا سکے۔ غصہ پی پی کر رہ جاتی تھی۔ خون جوش کھانے لگتا تھا کہ سوٗر کے کان اکھاڑ لوں۔ مگر ان حضرت کو کبھی اسے کچھ کہتے نہیں دیکھا۔ آپ نہا کر دھوتی چھانٹ رہے ہیں اور وہ بیٹھا تماشا دیکھ رہا ہے۔ میرا خون کھولنے لگتا۔ لیکن انہیں ذرا بھی احساس نہیں ہوتا۔ جب میرے ڈانٹنے پر دھوتی چھانٹنے جاتا بھی' تو آپ اسے قریب نہ آنے دیتے۔ اس کے عیبوں کو ہنر بنا کر دکھایا کرتے تھے۔ اور اس کوشش میں کامیاب نہ ہوتے تو ان عیوب پر پردہ ڈال دیتے تھے۔ کم بخت کو جھاڑو دینے کی بھی تمیز نہ تھی۔ مردانہ کمرہ ہی تو سارے گھر میں ڈھنگ کا ایک کمرہ ہے۔ اس میں جھاڑو دیتا تو اِدھر کی چیز اُدھر' اوپر کی نیچے۔ گویا سارے کمرے میں زلزلہ آگیا ہو اور گرد کا یہ عالم کہ سانس لینی مشکل مگر آپ کمرے میں اطمینان سے بیٹھے رہتے۔ گویا کوئی بات ہی نہیں۔ ایک دن میں نے اسے خوب ڈانٹا اور کہہ دیا اگر کل سے تو نے سلیقے سے جھاڑو نہ دی تو کھڑے کھڑے نکال دوں گی۔ سویرے سو کر اٹھی تو دیکھتی ہوں کمرے میں جھاڑو دی ہوئی ہے۔ ہر ایک چیز قرینے سے رکھی ہے' گرد و غبار کا کہیں نام نہیں۔ آپ نے فوراً ہنس کر کہا "دیکھتی کیا ہو آج گھورے نے بڑے سویرے جھاڑو دی ہے۔ میں نے سمجھا دیا تم طریقہ تو بتاتی نہیں ہو' الٹی ڈانٹنے لگتی ہو۔" لیجئے صاحب یہ بھی میری ہی خطا تھی۔ خیر میں نے سمجھا اس نالائق نے کم سے کم ایک کام تو سلیقے کے ساتھ کیا۔ اب روز کمرہ صاف ستھرا ملتا اور میری نگاہوں میں گھورے کی کچھ وقعت ہونے لگی۔ اتفاق کی بات ایک دن میں ذرا معمول سے سویرے سویرے اٹھ بیٹھی اور کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہوں کہ گھورے دروازے پر کھڑا ہے اور خود مابدولت تندہی سے جھاڑو دے رہیں۔ مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے ہاتھ سے جھاڑو چھین لی اور گھورے کے سر پر پٹک دی۔ حرام خور کو اسی وقت دھتکار بتاتی۔ آپ فرمانے لگے اس کی تنخواہ تو بے باق کر دو۔ خوب ایک تو کام نہ کرے' دوسرے آنکھیں دکھائے۔ اس پر تنخواہ بھی دے دوں۔ میں نے ایک کوڑی بھی نہ دی۔ ایک کرتہ دیا تھا وہ بھی چھین لیا تھا۔ اس پر حضرت کئی دن مجھ سے روٹھے رہے۔ گھر

چھوڑ کر بھاگے جارہے تھے بڑی مشکلوں سے رکے۔

ایک دن مہتر نے اتارے کپڑے کا سوال کیا۔ اس بیکاری کے زمانے میں فالتو کپڑے کس کے گھر میں ہیں۔ شاید رئیسوں کے گھر میں ہوں۔ میرے یہاں تو ضروری کپڑے بھی کافی نہیں۔ حضرت ہی کا توشہ خانہ ایک بقچی میں آجائے گا۔ جو ڈاک کے پارسل سے کہیں بھیجا جاسکتا ہے۔ پھر اس سال کی سردی کے موسم میں نئے کپڑے بنوانے کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ میں نے مہتر کو صاف جواب دے دیا۔ سردی شدت کی تھی۔ اس کا مجھے خود احساس تھا۔ غریبوں پر کیا گزرتی ہے' اس کا بھی علم تھا۔ لیکن میرے یا آپ کے پاس اس کا افسوس کے سوا اور کیا علاج ہے۔ جب رؤسا اور امراء کے پاس ایک ایک مال گاڑی کپڑوں سے بھری پڑی ہے تو پھر غرباء کیوں برہنگی کا عذاب جھیلیں۔ خیر میں نے تو اسے جواب دے دیا۔ آپ نے کیا کیا اپنا کوٹ اتار کر اس کے حوالے کر دیا۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ حضرت کے پاس یہی ایک کوٹ تھا۔ یہ خیال نہ ہوا کہ پہنیں گے کیا۔ مہتر نے سلام کیا' دعائیں دیں اور اپنی راہ لی۔ آخر کئی دن سردی کھاتے رہے۔ صبح کو گھومنے جایا کرتے تھے' وہ سلسلہ بند ہو گیا۔ مگر دل بھی قدرت نے انہیں ایک عجیب قسم کا دیا ہے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہنتے آپ کو شرم نہیں آتی۔ میں تو کٹ جاتی ہوں آپ کو مطلق احساس نہیں۔ کوئی ہنستا ہے تو ہنسے آپ کی بلا سے۔ آخر مجھ سے نہ دیکھا گیا تو ایک کوٹ بنوا دیا۔ جی تو جلتا ہے خوب سردی کھانے دوں مگر ڈری کہ کہیں بیمار نہ پڑ جائیں تو اور بھی آفت آجائے۔ آخر کام تو انہیں کو کرنا ہے۔

یہ اپنے دل میں سمجھتے ہوں گے میں کتنا نیک نفس اور منکسر مزاج ہوں۔ شاید انہیں ان اوصاف پر ناز ہو۔ میں انہیں نیک نفس نہیں سمجھتی ہوں۔ یہ سادہ لوحی ہے۔ سیدھی سادی حماقت' جس مہتر کو آپ نے کوٹ دیا اسی کو میں نے کئی بار رات کو شراب کے نشے میں بدمست جھومتے دیکھا ہے اور آپ کو دکھا بھی دیا ہے۔ تو پھر دوسرے کی کجروی کا تاوان ہم کیوں دیں۔ اگر آپ نیک نفس اور فیاض ہوتے تو گھر والوں سے بھی تو فیاضانہ برتاؤ کرتے یا ساری فیاضی باہر والوں کے لیے ہی مخصوص ہے۔ گھر والوں کو اس کا عشر عشیر بھی نہ ملنا چاہیے۔ اتنی عمر گزر گئی مگر اس شخص نے کبھی بھی میرے لیے ایک سوغات نہیں خریدی۔ بیشک جو چیز طلب کروں اسے بازار سے لانے میں انہیں کلام نہیں۔ مطلق عذر نہیں۔ مگر روپیہ بھی دے دوں یہ شرط ہے انہیں خود کبھی توفیق نہیں ہوتی۔ یہ میں مانتی ہوں کہ بے چارے اپنے لیے بھی کچھ نہیں لاتے۔ میں جو کچھ منگوا دوں اس پر قناعت کر لیتے ہیں۔ مگر آخر انسان کبھی کبھی شوق کی چیزیں چاہتا ہے۔ اور مردوں کو دیکھتی ہوں گھر میں عورت کے لیے طرح طرح کے زیور' کپڑے' شوق سنگار کے لوازمات لاتے رہتے ہیں۔ یہاں یہ رسم ممنوع ہے۔ بچوں کے لیے بھی مٹھائی' کھلونے' باجے' بگل شاید اپنی زندگی میں ایک بار بھی نہ لائے ہوں۔ قسم سی کھالی ہے۔ اس لیے میں تو انہیں بخیل کہوں گی' بدذوق کہوں گی' مردہ دل کہوں گی۔ فیاض نہیں کہہ سکتی۔ دوسرے کے ساتھ جوان کا فیاضانہ سلوک ہے' اسے بھی حرص و نمود اور سادہ لوحی پر محمول کرتی ہوں۔ آپ کی منکسر مزاجی کا یہ حال ہے کہ جس دفتر میں آپ ملازم ہیں اس کے کسی عہدیدار سے آپ کا میل جول نہیں۔ افسروں کو سلام کرنا تو آپ کے آئین کے خلاف ہے۔ نذریا ڈالی تو دور کی بات ہے۔ اول تو کبھی کسی افسر کے گھر جاتے ہی نہیں۔ اس کا خمیازہ آپ نہ اٹھائیں گے تو کون اٹھائے۔ اوروں کو رعایتی چھٹیاں ملتی ہیں۔ آپ کی تنخواہ کٹتی ہے۔ اوروں کی ترقیاں ہوتی ہیں آپ کو کوئی پوچھتا بھی نہیں۔ حاضری میں پانچ منٹ بھی دیر ہو جائے تو جواب طلبی ہو جاتی ہے۔ بے چارے جی توڑ کر کام کرتے ہیں۔ کوئی پیچیدہ مشکل کام آجائے تو انہیں کے سر منڈھا جاتا ہے۔ انہیں مطلق عذر نہیں۔ دفتر میں انہیں گھسو اور پسو وغیرہ

خطابات ملے ہوئے ہیں۔ مگر منزل کتنی ہی دشوار طے کریں ان کی تقدیر میں وہی سوکھی گھاس لکھی ہے۔ یہ انکسار نہیں ہے۔ میں تو اسے زمانہ شناسی کا فقدان کہتی ہوں۔ آخر کیوں کوئی شخص آپ سے خوش ہو۔ دنیا میں مروت اور رواداری سے کام چلتا ہے۔ اگر ہم کسی سے کھنچے رہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہم سے نہ کھنچا رہے۔ پھر جب دل میں کبیدگی ہوتی ہے' وہ دفتری تعلقات میں بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ جو ماتحت افسر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے جس کی ذات سے افسر کو کوئی ذاتی فائدہ پہنچتا ہے' جس پر اعتبار ہوتا ہے' اس کا لحاظ وہ لازمی طور پر کرتا ہے۔ ایسے بے غرضوں سے کیوں کسی کو ہمدردی ہونے لگی۔ افسر بھی انسان ہیں۔ ان کے دل میں جو اغراض و امتیاز کی ہوس ہے' وہ کہاں پوری ہو۔ جب ان کے ماتحت ہی فرنٹ رہیں۔ آپ نے جہاں ملازمت کی وہیں سے نکالے گئے۔ کبھی کسی دفتر میں سال دو سال سے زیادہ نہ چلے یا تو افسروں سے لڑ گئے یا کام کی کثرت کی شکایت کر بیٹھے۔

آپ کو کنبہ پروری کا دعویٰ ہے۔ آپ کے کئی بھتیجے ہیں۔ وہ کبھی آپ کی بات بھی نہیں مانتے۔ مگر آپ برابر ان کا منہ تاکتے رہتے ہیں۔ ان کے ایک بھائی صاحب آج کل تحصیلدار ہیں۔ گھر کی جائداد انہی کی نگرانی میں ہے۔ وہ شان سے رہتے ہیں۔ موٹر خرید لی ہے۔ کئی نوکر ہیں۔ مگر یہاں بھولے سے بھی خط نہیں لکھتے۔ ایک بار ہمیں روپے کی سخت ضرورت ہوئی۔ میں نے کہا اپنے برادر مکرم سے کیوں نہیں مانگتے' کہنے لگے کیوں انہیں پریشان کروں۔ آخر انہیں بھی تو اپنا خرچ کرنا ہے۔ کون سی ایسی بچت ہو جاتی ہوگی۔ میں نے بہت مجبور کیا تو آپ نے خط لیا۔ معلوم نہیں خط میں کیا لکھا۔ لیکن روپے نہ آنے تھے' نہ آئے۔ کئی دنوں کے بعد میں نے پوچھا کچھ جواب آیا؟ حضور کے بھائی صاحب کے دربار سے؟ آپ نے ترش ہو کر کہا۔ ابھی ایک ہفتہ تو پہنچے ہوا ہے۔ ابھی کیا جواب آسکتا ہے؟ ایک ہفتہ گزرا۔ اب آپ کا حال ہے کہ مجھے کوئی بات کرنے کا موقع ہی نہیں عطا فرماتے۔ اتنے بشاش نظر آتے ہیں کہ کیا کہوں۔ باہر سے آتے ہیں تو خوش خوش' کوئی نہ کوئی شگوفہ لیے ہوئے۔ میری خوشامد بھی خوب ہو رہی ہے۔ میرے میکے والوں کی تعریف بھی ہو رہی ہے۔ میں حضرت کی چال سمجھ رہی تھی۔ یہ ساری دلجوئیاں محض اس لیے تھیں کہ آپ کے برادرِ مکرم کے متعلق کچھ پوچھ نہ بیٹھوں۔ سارے ملکی' مالی' اخلاقی' تمدنی مسائل میرے سامنے بیان کیے جاتے ہیں۔ اتنی تفصیل اور شرح کے ساتھ کہ پروفیسر بھی دنگ رہ جائے۔ محض اس لیے کہ مجھے اس امر کی بابت کچھ پوچھنے کا موقع نہ ملے۔ لیکن میں کب چُوکنے والی تھی۔ جب پورے دو ہفتے گزر گئے اور بیمہ کمپنی کے روپے روانہ کرنے کی تاریخ موت کی طرح سر پر آ پہنچی تو میں نے پوچھا کیا ہوا تمہارے بھائی صاحب نے دہن مبارک سے کچھ فرمایا۔ ابھی تک خط ہی نہیں پہنچا۔ آخر ہمارا حصہ بھی گھر کی جائداد میں کچھ ہے یا نہیں؟ یا ہم کسی لونڈی باندی کی اولاد ہیں؟ پانچ سو روپے سال کا نفع نو دس سال قبل تھا۔ اب ایک ہزار سے کم نہ ہوگا۔ کبھی ایک کھنجی کوڑی بھی ہمیں نہیں ملی۔ موٹے حساب سے ہمیں دو ہزار ملنا چاہیے۔ دو ہزار نہ ہو' ایک ہزار ہو' پانچ سو روپے ہو' ڈھائی سو ہو۔ کچھ نہ ہو تو بیمہ کمپنی کے پریمیم بھر کو تو ہو۔ تحصیلدار کی آمدنی ہماری آمدنی کی چوگنی ہے۔ رشوتیں بھی لیتے ہیں تو پھر ہمارے روپے کیوں نہیں دیتے۔ آپ میں میں ہاں ہاں کرنے لگے۔ بے چارے گھر کی مرمت کراتے ہیں۔ عزیز و اقارب کی مہمانداری کا بار بھی تو انہی پر ہے۔ خوب! گویا جائداد کا منشا یہ ہے کہ اس کی کمائی اسی میں صرف ہو جائے۔ اس بھلے آدمی کو' بہانے گھڑنے نہیں آتے۔ مجھ سے پوچھتے میں ایک نہیں ہزار بتا دیتی۔ کہہ دیتے گھر میں آگ لگ گئی۔ سارا اثاثہ جل کر خاک ہو گیا یا چوری ہو گئی۔ چور نے گھر میں تنکا تک نہ چھوڑا۔ دس ہزار کا غلہ خریدا تھا' اس میں خسارہ ہو گیا تھا۔ گھاٹے میں بیچنا پڑا یا کسی سے مقدمہ بازی ہو گئی۔ اس میں دیوالیہ پٹ

گیا۔ آپ کو سوجھی بھی تو لچر سی بات۔ اس جولانیِ طبع پر مصنف اور شاعر بھی بنتے ہیں۔ تقدیر ٹھونک کر بیٹھ رہی۔ پڑوس کی بی بی سے قرض لیے۔ تب جا کر کہیں کام چلا۔ پھر بھی آپ بھائی بھتیجوں کی تعریف کے پل باندھتے ہیں تو میرے جسم میں آگ لگ جاتی ہے۔ ایسے برادرانِ یوسف سے خدا بچائے۔

خدا کے فضل سے آپ کے دو بچّے ہیں اور دو بچّیاں ہیں۔ خدا کا فضل کہوں یا خدا کا قہر کہوں۔ سب کے سب اتنے شریر ہو گئے ہیں کہ معاذاللہ۔ مگر کیا مجال کہ یہ بھلے مانس کسی بچّے کو تیز نگاہ سے بھی دیکھیں۔ رات کے آٹھ بج گئے ہیں۔ بڑے صاحبزادے ابھی گھوم کر نہیں آئے ہیں۔ گھبرا رہی ہوں۔ آپ اطمینان سے بیٹھے اخبار پڑھ رہے ہیں۔ جھلّائی ہوئی آتی ہوں اور اخبار چھین کر کہتی ہوں: "جا کر ذرا دیکھتے کیوں نہیں لونڈا کہاں رہ گیا ہے' نہ جانے تمہارے دل میں کچھ قلق ہے بھی یا نہیں۔ تمھیں تو خدا نے اولاد ہی ناحق دی۔ آج آئے تو خوب ڈانٹنا۔" تب آپ بھی گرم ہو جاتے ہیں۔ ابھی تک نہیں آیا۔ بڑا شیطان ہے آج بچّا آتے ہیں تو کان اکھاڑ لیتا ہوں۔ مارے تھپڑوں کے کھال ادھیڑ کر رکھ دوں گا۔ یوں بگڑ کر طیش کے عالم میں آپ اس کی تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ اتفاق سے آپ ادھر جاتے ہیں' ادھر لڑکا آ جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں تو کدھر سے آ گیا۔ وہ بے چارے تجھے ڈھونڈنے گئے ہوئے ہیں۔ دیکھنا آج کیسی مرمت ہوتی ہے۔ یہ عادت ہی چھوٹ جائے گی۔ دانت پیس رہے تھے۔ آتے ہی ہوں گے۔ چھڑی بھی ہاتھ میں ہے تم اتنے شریر ہو گئے ہو کہ بات نہیں سنتے۔ آج قدرِ عافیت معلوم ہو گی۔ لڑکا سہم جاتا ہے اور لیمپ جلا کر پڑھنے لگتا ہے۔ آپ ڈیڑھ دو گھنٹے میں لوٹتے ہیں۔

میں ان کا غصہ بھڑکانے کے ارادے سے کہتی ہوں: "آ کر بیٹھا تو ہے جا کر پوچھتے کیوں نہیں۔ میں پوچھ کر ہار گئی۔ کہاں گیا تھا کچھ بولتا ہی نہیں۔"

آپ گرج پڑتے ہیں: "منو یہاں آؤ!"

لڑکا تھر تھر کانپتا ہوا آ کر آنگن میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دونوں بچّیاں گھر میں چھپ جاتی ہیں کہ خدا جانے کیا آفت نازل ہونے والی ہے۔ چھوٹا بچّہ 'کھڑکی سے چوہے کی طرح جھانک رہا ہے۔ آپ جامے سے باہر ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے۔ میں بھی وہ غضبناک چہرہ دیکھ کر پچھتانے لگی ہوں کہ کیوں ان سے شکایت کی۔ آپ لڑکے کے پاس جاتے ہیں' مگر بجائے اس کے کہ چھڑی سے اس کی مرمت کریں' آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ بناوٹی غصے سے کہتے ہیں "تم کہاں گئے تھے جی۔ منع کیا جاتا ہے مانتے نہیں ہو۔ خبردار جواب اتنی دیر کی۔ آدمی شام کو گھر چلا آتا ہے یا اِدھر اُدھر گھومتا ہے؟"

میں سمجھ رہی ہوں یہ تمہید ہے قصیدہ اب شروع ہو گا۔ گریز تو بری نہیں' لیکن یہاں تمہید ہی پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بس آپ کا غصہ فرو ہو گیا۔ لڑکا اپنے کمرے میں چلا جاتا ہے اور غالباً خوشی سے اچھلنے لگتا ہے۔

میں احتجاج کی صدا بلند کرتی ہوں "تم تو جیسے ڈر گئے۔ بھلا دو چار طمانچے تو لگائے ہوتے' اس طرح تو لڑکے شریر ہو جاتے ہیں۔ آٹھ بجے آیا ہے کل نو کی خبر لائے گا۔ اس نے دل میں کیا سمجھا ہو گا۔"

آپ فرماتے ہیں "تم نے سنا نہیں میں نے کتنی زور سے ڈانٹا' بچے کی روح ہی فنا ہو گئی ہو گی۔ دیکھ لینا جو پھر کبھی دیر میں آئے گا۔"

"تم نے ڈانٹا تو نہیں۔ ہاں آنسو پونچھ دیئے۔"

آپ نے ایک نئی اُپج نکالی ہے کہ لڑکے تادیب سے خراب ہو جاتے ہیں۔ آپ کے خیال میں لڑکوں کو

آزاد رہنا چاہیے۔ ان پر کسی قسم کی بندش یا دباؤ نہ ہونا چاہیے۔ بندش سے آپ کے خیال میں لڑکے کی دماغی نشو و نما میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا یہ نتیجہ ہے کہ لڑکے شتر بے مہار بنے ہوئے ہیں۔ کوئی ایک منٹ بھی کتاب کھول کر نہیں بیٹھتا۔ کبھی گلی ڈنڈا ہے، کبھی گولیاں، کبھی کنکوے۔ حضرت انہیں کے ساتھ کھیلتے ہیں۔ چالیس سال سے تو تجاوز آپ کی عمر ہے۔ مگر لڑکپن دل سے نہیں گیا۔ میرے باپ کے سامنے کیا مجال تھی کہ کوئی لڑکا کنکوا اڑا لے یا گلی ڈنڈا کھیل سکے۔ خون پی جاتے۔ صبح سے لڑکے پڑھانے بیٹھ جاتے۔ سکول سے جوں ہی لڑکے واپس آتے پھر لے بیٹھتے۔ بس شام کو آدھ گھنٹے کی چھٹی دیتے۔ رات کو پھر کام میں جوت دیتے۔ یہ نہیں کہ آپ تو اخبار پڑھیں اور لڑکے گلی گلی کی خاک چھانتے پھریں۔ کبھی آپ بھی سینگ کٹا کر بچھڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکوں کے ساتھ تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ایسے باپ کا لڑکوں پر کیا رعب ہو سکتا ہے۔ ابا جان کے سامنے میرے بھائی سیدھے آنکھ اٹھا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی آواز سنتے ہی قیامت آجاتی تھی۔ انہوں نے گھر میں قدم رکھا اور خموشی طاری ہوئی۔ ان کے روبرو جاتے ہوئے لڑکوں کی جان نکلتی تھی اور اسی تعلیم کی یہ برکت ہے کہ سبھی اچھے عہدوں پر پہنچ گئے۔ صحت البتہ کسی کی بہت اچھی نہیں ہے تو ابا جان کی صحت ہی کون سی اچھی تھی۔ بے چارے ہمیشہ کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا رہتے۔ پھر لڑکوں کی صحت کہاں سے اچھی ہو جاتی۔ لیکن کچھ بھی ہو، تعلیم و تادیب میں انہوں نے کسی کے ساتھ رعایت نہیں کی۔

ایک روز میں نے حضرت کو بڑے صاحبزادے کو کنکوے کی تعلیم دیتے دیکھا۔ یوں گھماؤ، یوں غوطہ دو، یوں کھینچو، یوں ڈھیل دو، ایسا دل و جان سے سکھا رہے تھے گویا گرو منتر دے رہے ہوں۔ اس دن میں نے بھی ان کی ایسی خبر لی کہ یاد کرتے ہوں گے۔

میں نے صاف کہہ دیا کہ تم کون ہوتے ہو، میرے بچوں کو بگاڑنے والے! تمہیں گھر سے کوئی مطلب نہیں ہے نہ ہو۔ لیکن آپ میرے بچوں کو خراب مت کیجیے۔ برے برے شوق نہ پیدا کیجیے۔ اگر آپ انہیں سدھار نہیں سکتے تو کم از کم بگاڑیے مت۔ لگے باتیں بنانے۔ ابا جان کسی کو میلے تماشے نہ لے جاتے تھے۔ لڑکا سر پٹک کر مر جائے مگر ذرا بھی نہ پسیجتے تھے اور ان بھلے آدمی کا یہ حال ہے کہ ایک ایک سے پوچھ کر میلے لے جاتے ہیں۔ چلو چلو وہاں بڑی بہار ہے۔ خوب آتش بازیاں چھوٹیں گی۔ غبارے اڑیں گے۔ ولایتی چرخیاں بھی ہیں۔ ان پر مزے سے بیٹھنا اور تو اور آپ لڑکوں کو ہاکی کھیلنے سے بھی نہیں روکتے۔ یہ انگریزی کھیل بھی کتنے خوفناک ہوتے ہیں۔ کرکٹ، فٹ بال، ہاکی ایک سے ایک مہلک، گیند لگ جائے تو جان ہی لے کر چھوڑے۔ مگر آپ کو تو ان کھیلوں سے بڑی رغبت ہے۔ کوئی لڑکا میچ میں جیت کر آتا ہے تو کتنے خوش ہوتے ہیں۔ جیسے کوئی قلعہ فتح کر آیا ہو۔ حضرت کو ذرا بھی اندیشہ نہیں ہے کہ کسی لڑکے کے چوٹ لگ گئی تو کیا ہو گا۔ ہاتھ پاؤں ٹوٹ گیا تو بے چاروں کی زندگی کیسے پار لگے گی۔

پچھلے سال لڑکی کی شادی تھی۔ آپ کی ضد تھی کہ جہیز کے نام کانی کوڑی بھی نہ دیں گے، چاہے لڑکی ساری عمر کنواری بیٹھی رہے۔ آپ اہلِ دنیا کی خبیث النفسی آئے دن دیکھتے رہتے ہیں، پھر بھی چشم بصیرت نہیں کھلتی۔ جب تک سماج کا یہ نظام قائم ہے اور لڑکی کا بلوغ کے بعد کنواری رہنا انگشت نمائی کا باعث ہے، اس وقت تک یہ رسم فنا نہیں ہو سکتی۔ دو چار افراد بھلے ہی ایسے بیدار مغز نکل آئیں، جو جہیز لینے سے احتراز کریں۔ لیکن اس کا اثر عام حالات پر بہت کم ہوتا ہے اور برائی بدستور قائم رہتی ہے۔ جب لڑکوں کی طرح لڑکیوں کے لیے بھی بیس پچیس کی عمر تک کنواری رہنا بدنامی کا باعث نہ سمجھا جائے گا، اس وقت آپ ہی آپ یہ رسم رخصت ہو جائے گی۔ میں نے جہاں

جہاں پیغام دیئے' جہیز کا مسئلہ پیدا ہوا اور آپ نے ہر موقع پر ٹانگ اڑا دی۔ جب اس طرح ایک سال پورا ہو گیا اور لڑکی کا سترھواں سال گزر گیا تو میں نے ایک جگہ بات پکی کرلی۔ حضرت بھی راضی ہو گئے' کیونکہ ان لوگوں نے قرارداد نہیں کی۔ حالانکہ دل میں انہیں پورا یقین تھا کہ اچھی رقم ملے گی اور میں نے بھی طے کرلیا کہ اپنے مقدور بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھوں گی۔ شادی کے بخیر وعافیت انجام پانے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ لیکن ان مہاشے کے آگے میری ایک نہ چلتی تھی۔ یہ رسم بے ہودہ ہے۔ یہ رسم بے معنی ہے۔ یہاں روپے کی کیا ضرورت۔ یہاں گیتوں کی کیا ضرورت۔ ناک میں دم تھا۔ یہ کیوں' وہ کیوں؟ یہ تو صاف جہیز ہے۔ تم نے میرے منہ میں کالک لگادی' میری آبرو مٹادی۔ ذرا خیال کیجئے بارات دروازے پر پڑی ہوئی ہے اور یہاں بات بات پر ردوقدح ہو رہی ہے۔ شادی کی ساعت رات کے بارہ بجے تھے۔ اس دن لڑکی کے ماں باپ برت رکھتے ہیں۔ میں نے بھی برت رکھا۔ لیکن آپ کی ضد تھی کہ برت کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب لڑکے کے والدین برت نہیں رکھتے تو لڑکی کے والدین کیوں رکھیں۔ میں اور سارا خاندان ہر چند منع کرتا رہا۔ لیکن آپ نے حسبِ معمول ناشتہ کیا۔ کھانا کھایا۔ خیر رات کو شادی کے وقت کنیادان کی رسم آئی۔ آپ کو کنیادان کی رسم پر ہمیشہ سے اعتراض ہے۔ اسے آپ مہمل سمجھتے ہیں۔ لڑکی دان کی چیز نہیں۔ دان روپے پیسے کا ہوتا ہے۔ جانور بھی دان دیئے جاسکتے ہیں' لیکن لڑکی کے دان کی ایک لچر سی بات ہے۔ کتنا سمجھاتی ہوں۔ صاحب پرانا رواج ہے۔ شاستروں میں صاف اس کا حکم ہے۔ عزیز و اقارب سمجھا رہے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ کان پر جُوں تک نہیں رینگتی۔ کہتی ہوں دنیا کیا کہے گی؟ یہ لوگ کیا بالکل لامذہب ہو گئے۔ مگر آپ کان ہی نہیں دیتے۔ پیروں پڑی' یہاں تک کہا کہ بابا تم کچھ نہ کرنا' جو کچھ کرنا ہے میں کرلوں گی۔ تم صرف چل کر منڈپ میں لڑکی کے پاس بیٹھ جاؤ اور اسے دعا دو۔ مگر اس مردِ خدا نے مطلق سماعت نہ کی۔ آخر مجھے رونا آگیا۔ باپ کے ہوتے میری لڑکی کا کنیادان چچا یا ماموں کرے' یہ مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے تنہا کنیادان کی رسم ادا کی۔ آپ گھر جھانکے تک نہیں اور لطف یہ کہ آپ ہی مجھ سے روٹھ بھی گئے۔ بارات کی رخصتی کے بعد مجھ سے مہینوں بولے نہیں۔ جھک مار کر مجھی کو منانا پڑا۔

مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں ان سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ ان سارے عیوب کے باوجود میں انہیں پیار کرتی ہوں۔ ان میں وہ کون سی خوبی ہے' جس پر میں فریفتہ ہوں۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ مگر کوئی چیز ہے ضرور' جو مجھے ان کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں' تو میں بے صبر ہو جاتی ہوں۔ ان کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے۔ آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پتلا حسن اور دولت کا دیوتا بھی دے تو میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھوں۔ یہ فرض کی بیڑی نہیں ہے' ہرگز نہیں۔ یہ رواجی وفاداری بھی نہیں ہے۔ بلکہ ہم دونوں کی فطرتوں میں کچھ ایسی رواداریاں' کچھ صلاحیتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ گویا کسی مشین کے کل پرزے گھس گھسا کر فٹ ہو گئے ہوں اور ایک پرزے کی جگہ دوسرا پرزہ کام نہ دے سکے۔ چاہے وہ پہلے سے کتنا ہی سڈول' نیا اور خوش نما کیوں نہ ہو۔ جانے ہوئے رستے سے ہم بے خوف' آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں۔ اس کے نشیب و فراز' موڑ اور گھماؤ اب ہماری آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ اس کے برعکس کسی انجان رستے پر چلنا کتنی زحمت کا باعث ہو سکتا ہے۔ قدم قدم پر گمراہ ہو جانے کے اندیشے' ہر لمحہ چور اور رہزن کا خوف' بلکہ شاید آج میں ان کی برائیوں کو خوبیوں سے تبدیل کرنے پر بھی تیار نہیں۔

معصوم بچہ

(1)

گنگو کو لوگ برہمن کہتے ہیں اور وہ اپنے کو برہمن سمجھتا بھی ہے۔ میرے سائیس اور خدمت گار مجھے زور سے سلام کرتے ہیں۔ گنگو مجھے کبھی سلام نہیں کرتا۔ وہ شاید مجھ سے پا لاگن کی توقع رکھتا ہے۔ میرا جھوٹا گلاس کبھی ہاتھ سے نہیں چھوتا اور نہ کبھی میری اتنی ہمت ہوئی کہ اس سے پنکھا جھلنے کو کہوں۔ جب میں پسینے میں تر ہوتا ہوں اور وہاں کوئی دوسرا آدمی نہیں ہوتا، تو گنگو آپ ہی آپ پنکھا اٹھا لیتا ہے۔ لیکن اس کے چہرے سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ وہ مجھ پر کوئی احسان کر رہا ہے اور میں بھی نہ جانے کیوں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے پنکھا چھین لیتا ہوں۔ تیز مزاج آدمی ہے۔ بات کی مطلق برداشت نہیں۔ ایسے بہت کم آدمی ہیں، جن سے اس کی دوستی ہو۔ سائیس اور خدمت گار کے ساتھ بیٹھنا شاید وہ کسرِ شان سمجھتا ہے۔ میں نے اسے کسی سے بے تکلف ہوتے نہیں دیکھا۔ نہ میلے تماشے میں جاتے دیکھا۔ حیرت یہ ہے کہ اسے بھنگ بُوٹی سے بھی شوق نہیں، جو اس طبقے کے آدمیوں میں ایک غیر معمولی وصف ہے۔ وہ کبھی پوجا پاٹ نہیں کرتا اور نہ اسے ندی میں اشنان کرنے کا خبط ہے۔ بالکل ناحرف شناس آدمی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ برہمن ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا اس کی تعظیم اور خدمت کرے اور کیوں نہ چاہے؟ جب اجداد کی پیدا کی ہوئی ملکیتوں پر آج بھی لوگ قابض ہیں اور اسی شان سے قابض ہیں گویا انہوں نے خود پیدا کی ہو تو وہ کیوں اس تقدس اور امتیاز کو ترک کر دے، جو اس کے بزرگوں نے پیدا کیا تھا۔ یہی اس کا ترکہ ہے۔

میری طبیعت کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اپنے ملازموں سے بہت کم بولتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں جب تک میں نہ بلاؤں، کوئی میرے پاس نہ آئے۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ ذرا ذرا سی باتوں کے لیے آدمیوں کو آواز دیتا پھروں۔ مجھے اپنے ہاتھ سے صراحی سے پانی انڈیل لینا یا اپنا لیمپ جلا لینا یا اپنے جوتے پہن لینا یا الماری سے کوئی کتاب نکال لینا، اس سے کہیں زیادہ آرام دہ معلوم ہوتا ہے کہ ہینگن اور میکو کو پکاروں۔ اس سے مجھے اپنی آزادی اور خود اعتباری کا احساس ہوتا ہے۔ نوکر بھی میرے پاس بہت کم آتے ہیں۔ اس لیے ایک دن گنگو علی الصبح جب میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تو مجھے کچھ ناگوار گزرا۔ یہ لوگ جب آتے ہیں تو یا تو پیشگی حساب میں کچھ مانگنے کے لیے یا کسی دوسرے ملازم کی شکایت کرنے کے لیے اور مجھے یہ دونوں حرکتیں حد درجہ ناپسند ہیں۔ میں پہلی کو ہر ایک کی تنخواہ بے باق کر دیتا ہوں اور بیچ میں جب کوئی کچھ مانگتا ہے تو مجھے غصہ آتا ہے، کون دو دو چار چار روپے کا حساب رکھتا پھرے۔ پھر جب کسی کو منہ بھری مزدوری مل گئی تو اسے کیا حق ہے کہ اسے پندرہ دن میں خرچ کر دے اور قرض یا پیشگی کی ذلت اختیار کرے۔ اور شکایتوں سے تو مجھے نفرت ہے۔ میں شکایت کو کمزوری کی دلیل سمجھتا ہوں یا خوشامد پرستی اور امداد طلبی کی کمینی کوشش۔

میں نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔ "کیا معاملہ ہے میں نے تمہیں بلایا نہیں۔"

گنگو کے تیکھے، بے نیاز چہرے پر آج کچھ ایسی التجا، کچھ ایسا حجاب تھا کہ مجھے تعجب ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ کچھ جواب دینا چاہتا ہے، مگر الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔

میں نے ذرا اور تیز ہو کر کہا۔ ”آخر بات کیا ہے؟ کہتے کیوں نہیں۔ تم جانتے ہو یہ میری ہواخوری کا وقت ہے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

گنگو نے مایوسانہ لہجے میں کہا۔ ”تو آپ ہوا کھانے جائیں‘ میں پھر آجاؤں گا۔“

یہ صورت اور پریشان کرنے والی تھی۔ اس رواداری میں ایک منٹ میں وہ اپنی سرگزشت کہہ سنائے گا۔ وہ اتنا جانتا ہے کہ مجھے زیادہ فرصت نہیں ہے۔ دوسرے موقع پر تو کم بخت گھنٹوں روئے گا۔ میرے کچھ لکھنے پڑھنے کو تو شاید کام سمجھتا ہو‘ لیکن غور و خوض کو جو میرے لیے انتہائی مصروفیت ہے‘ وہ میرے آرام کا وقت سمجھتا ہے۔ یقیناً یہ اسی وقت آکر میرے سر پر سوار ہو جائے گا۔ میں نے تلخی سے کہا۔ ”کچھ پیشگی مانگنے آئے ہو‘ میں پیشگی نہیں دیتا۔“

”جی نہیں سرکار‘ میں نے تو کبھی پیشگی نہیں مانگی۔“

”تو کیا کسی کی شکایت کرنا چاہتے ہو؟ مجھے شکایتوں سے نفرت ہے۔“

”جی نہیں سرکار‘ میں نے کبھی کسی کی شکایت نہیں کی۔“

”تو پھر خواہ مخواہ کیوں سر پر سوار ہو گئے؟“

گنگو نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس کے بُشرے سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کوئی جست لگانے کے لیے اپنی ساری قوتوں کو مجتمع کر رہا ہے۔ آخر اس نے کہا: ”مجھے اب آپ چھٹی دے دیں۔ میں اب آپ کی نوکری نہ کر سکوں گا۔“ یہ اس قسم کی پہلی استدعا تھی‘ جو میرے کانوں میں پڑی۔ میری خودداری کو چوٹ لگی۔ میں جو اپنے آپ کو انسانیت کا پتلا سمجھتا ہوں‘ اپنے ملازموں سے سخت کلامی نہیں کرتا‘ اپنی آقائیت کو حتی الامکان نیام میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس درخواست پر کیوں نہ حیرت میں آجاتا۔ تحکم کے لہجے میں پوچھا۔ ”کیوں کیا شکایت ہے؟“

”آپ نے تو ہجور جیسی نیک طبیعت پائی ہے‘ ویسی کیا کوئی پائے گا۔ لیکن بات ایسی آپڑی ہے کہ اب میں آپ کے یہاں نہیں رہ سکتا۔ ایسا نہ ہو پیچھے سے کوئی بات ہو جائے تو آپ کی بدنامی ہو۔ میں نہیں چاہتا میرے ڈیل سے آپ کی آبرو میں بٹہ لگے۔“

میرے دل میں الجھن پیدا ہوئی۔ دریافت حال کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ہواخوری کا نشہ اتر گیا۔ توکّل کے انداز سے برآمدے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ کر بولا۔ ”تم پہیلیاں بُجھوا رہے ہو۔ صاف صاف کیوں نہیں کہتے کیا معاملہ ہے؟“

گنگو نے مجسم معذرت بن کر کہا۔ ”بات یہ ہے کہ وہ عورت جو ابھی بدھوا آشرم سے نکال دی گئی ہے۔ وہی گومتی دیو——“

وہ خاموش ہو گیا۔ میں نے بے صبر ہو کر کہا۔ ”ہاں نکال دی گئی تو پھر؟ تمہاری نوکری کا اس سے کیا تعلق؟“

”میں اس سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں حضور۔“

میں حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا۔ یہ پرانے خیال کا بونگا برہمن۔ جسے نئی تہذیب کی ہوا تک نہیں لگی اس عورت سے شادی کرے گا‘ جسے کوئی بھلا آدمی اپنے گھر میں قدم بھی نہیں رکھنے دے گا۔ گومتی نے محلے کی پُرسکون فضا میں تھوڑی سی حرکت پیدا کر دی تھی۔ کئی سال قبل وہ بدھوا آشرم میں داخل ہوئی تھی۔ تین بار آشرم کے منتظموں نے اس کی شادی کر دی‘ مگر ہر بار دو ہفتہ عشرہ کے بعد بھاگ آئی۔ یہاں تک کہ آشرم کے سیکرٹری نے اب کی بار اسے آشرم سے نکال دیا تھا۔ وہ اسی محلے میں ایک کوٹھڑی لے کر رہتی تھی اور سارے محلے کے شہدوں کے لیے

دل چسپی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

مجھے گنگو کی سادہ لوحی پر غصہ بھی آیا اور رحم بھی۔ اس بے وقوف کو ساری دنیا میں کوئی عورت ہی نہ ملتی تھی جو اس سے شادی کرنے جارہا تھا۔ جب وہ تین بار شوہروں کے پاس سے بھاگ آئی ہے تو اس کے پاس کتنے دنوں تک رہے گی۔ کوئی گانٹھ کا پورا آدمی ہوتا تو ایک بات بھی تھی شاید چھ مہینے ٹک جاتی۔ یہ تو محض آنکھ کا اندھا ہے۔ ایک ہفتہ بھی نباہ نہ ہو گا۔

میں نے تنبیہ آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''تم اس عورت کے حالات سے واقف ہو؟''

گنگو نے عین الیقین کے انداز سے کہا۔ ''سب جھوٹ ہے سرکار' لوگوں نے اس کو ناحق بدنام کیا ہے۔''

''کیا معنی؟ کیا وہ تین بار اپنے شوہروں کے پاس سے نہیں بھاگ آئی؟''

''ان لوگوں نے اسے نکال دیا تو کیا کرتی؟''

''کیسے احمق آدمی ہو۔ کوئی اتنی دور سے آکر شادی کر کے لے جاتا ہے' ہزاروں روپے خرچ کرتا ہے۔ اس لیے کہ عورت کو نکال دے؟''

گنگو نے شاعرانہ جوش کے ساتھ کہا۔ ''جہاں محبت نہیں ہے ہجور' وہاں عورت نہیں رہ سکتی۔ عورت کھالی روٹی کپڑا تو نہیں چاہتی ہے۔ کچھ محبت بھی تو چاہتی ہے۔ وہ لوگ سمجھتے ہوں گے کہ ہم نے بدھوا سے بیاہ کر کے اس کے اوپر کوئی بہت بڑا احسان کیا ہے' چاہتے تھے کہ وہ دل و جان سے اس کی ہو جائے۔ لیکن دوسرے کو اپنا بنانے کے لیے پہلے آپ اس کا بن جانا پڑتا ہے ہجور' یہ بات ہے پھر اسے ایک بیماری بھی ہے اسے کوئی بھوت لگا ہوا ہے۔ وہ کبھی بک جھک کرنے لگتی ہے اور بے ہوش ہو جاتی ہے۔''

''اور تم ایسی عورت سے شادی کرو گے؟'' میں نے شبہ کے انداز سے سر ہلا کر کہا۔ ''سمجھ لو زندگی تلخ ہو جائے گی۔''

گنگو نے شہیدانہ سرگرمی سے کہا۔ ''میں تو سمجھتا ہوں میری جندگی بن جائے گی۔ آگے بھگوان کی مرجی۔''

میں نے زور دے کر کہا۔ ''تو تم نے طے کر لیا ہے؟''

''ہاں ہجور۔''

''تو میں استعفیٰ منظور کرتا ہوں۔''

میں بے معنی رسوم اور مہمل بندشوں کا غلام نہیں ہوں۔ لیکن جو ایک فاحشہ سے شادی کر لے' اسے اپنے یہاں رکھنا اندیشے سے خالی نہ تھا۔ آئے دن قضیے ہوں گے۔ نئی نئی الجھنیں پیدا ہوں گی۔ کبھی پولیس تحقیقات کرنے آئے گی۔ کبھی مقدمے کھڑے ہوں گے۔ کیا عجب ہے چوری کی وارداتیں بھی ہوں۔ گنگو بھوکے آدمی کی طرح روٹی کا ٹکڑا دیکھ کر اس کی طرف لپک رہا ہے۔ روٹی خشک ہے' بدمزہ ہے۔ اس کی اسے پروا نہیں۔ اس کا عقلِ سلیم سے کام لینا محال تھا۔ میں نے اس کو علیحدہ کر دینے میں ہی اپنی عافیت سمجھی۔

(2)

پانچ مہینے گزر گئے۔ گنگو نے گومتی سے شادی کر لی تھی اور اسی محلے میں ایک کھپریل کا مکان لے کر رہتا تھا۔

وہ اب چاٹ کا خوانچہ لگا کر گزر بسر کرتا تھا۔ مجھے جب کبھی بازار میں مل جاتا میں اس سے استفسارِ حال کرتا۔ مجھے اس کے حالات سے ایک خاص دلچسپی ہو گئی تھی۔ یہ ایک معاشرتی مسئلے کی آزمائش تھی۔ معاشرتی ہی نہیں بلکہ نفسیاتی بھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ میں گنگو کو ہمیشہ خوش و خرم دیکھتا ــــــ فراغت اور بے فکری سے چہرے پر جو ایک نفاست اور مزاج میں ایک خود مختاری پیدا ہو جاتی ہے وہ مجھے یہاں صریحاً نظر آتی تھی۔ روپے بیس آنے کی روزانہ بکری ہو جاتی تھی۔ اس میں لاگت نکال کر آٹھ دس آنے بچ جاتے تھے۔ یہی اس کی معاش تھی' مگر اس میں کوئی خاص برکت تھی کیونکہ اس طبقے کے آدمیوں میں جو بے سرو سامانی' جو بے غیرتی نظر آتی ہے' ان سے وہ پاک تھا۔ اس کے چہرے پر خود اعتمادی اور مسرت کی جھلک تھی' جو سکونِ قلب ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دن میں نے سنا کہ گومتی گنگو کے گھر سے بھاگ گئی ہے۔

کہہ نہیں سکتا کیوں مجھے اس خبر سے ایک خاص خوشی ہوئی۔ مجھے گنگو کے اطمینان اور پُر عافیت زندگی پر ایک طرح کا رشک آتا تھا۔ میں اس کے بارے میں کسی رسوا کن سانحے' کسی دلفگار اور تباہ کن تغیر کا منتظر تھا۔ آخر اسے اپنی سہل اعتقادی کا تاوان دینا پڑا۔ اب دیکھیں وہ کس طرح منہ دکھاتا ہے۔ اب آنکھیں کھلیں گی اور معلوم ہو گا کہ لوگ جو اسے اس شادی سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے' نیک نیت تھے۔ اس وقت تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا حضرت کو ایک نایاب چیز ملی جا رہی ہے۔ گویا نجات کا دروازہ کھل گیا ہے۔ لوگوں نے کتنا سمجھایا' کتنا کہا کہ یہ عورت اعتبار کے قابل نہیں۔ کتنوں کو دغا دے چکی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی دغا کرے گی۔ مگر اس پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اب اس ابلہانہ ضد کا خمیازہ اٹھاؤ۔ اب میں تو ذرا مزاج پُرسی کروں۔ کہوں کیوں مہراج' دیوی جی کا یہ بردان پا کر خوش ہوئے یا نہیں۔ تم تو کہتے تھے وہ ایسی ہے اور ویسی ہے۔ لوگ اسے محض بدخواہی کے باعث تہمت لگاتے ہیں۔ اب بتلاؤ کون غلطی پر تھا۔ اب آگیا خیال شریف میں کہ حسن فروش عورتوں سے لوگ کیوں احتراز کرتے ہیں۔

اسی دن اتفاق سے بازار میں گنگو سے میری ملاقات ہو گئی۔ بدحواس تھا' بالکل کھویا ہوا۔ گم گشتہ' شکستہ۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ندامت سے نہیں درد سے۔ میرے پاس آکر بولا۔ "بابو جی گومتی نے میرے ساتھ بھی دغا کیا۔"

میں نے حاسدانہ مسرت سے لیکن بظاہر ہمدردی کا اظہار کر کے کہا۔ "تم سے تو میں نے پہلے ہی کہا تھا لیکن تم مانے ہی نہیں۔ اب صبر کرو۔ اس کے سوا کیا چارہ ہے۔ روپے پیسے صاف کر لے گئی یا کچھ چھوڑ گئی؟"

گنگو نے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ ایسا معلوم ہوا گویا میرے اس سوال نے اس کے جگر کے ٹکڑے کر دیئے۔

ارے بابو جی ایسا نہ کہیے۔ اس نے دھیلے کی چیز بھی نہیں چھوئی۔ اپنا جو کچھ تھا وہ بھی چھوڑ گئی۔ نہ جانے مجھ میں کیا برائی دیکھی۔ میں اس کے لائق نہ تھا۔ بس اور کیا کہوں' وہ پڑھی لکھی میں کریا اچھر بھینس برابر۔ میرے ساتھ اتنے دن رہی۔ یہی بہت تھا۔ کچھ دن اور اس کے ساتھ رہ جاتا تو آدمی بن جاتا۔ اس کا آپ سے کہاں تک بکھان کروں۔ بابو جی اوروں کے لیے وہ چاہے کچھ رہی ہو وہ میرے لیے کسی دیوتا کا اشیر باد تھی۔ کیا جانے مجھ سے کوئی ایسی خطا ہو گئی ہو۔ مگر قسم لے لیجئے جو اس نے بھول کر بھی شکایت کی ہو۔ میری اوکات ہی کیا ہے بابو جی۔ دس بارہ آنے روز کا مجور ہوں۔ مگر اسی میں اس کے ہاتھوں اتنی برکت تھی کہ کبھی کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ کبھی میں نے اس کے چہرے پر میل نہیں دیکھا۔

مجھے ان الفاظ سے سخت مایوسی ہوئی۔ میں نے سمجھا تھا وہ اس کی بے وفائی کی داستان کہے گا اور میں اس کی

حماقت پر حاسدانہ ہمدردی کروں گا، مگر اس احمق کی آنکھیں اب تک نہیں کھلیں۔ اب بھی اسی کا کلمہ پڑھ رہا ہے۔ ضرور اس کے دماغ میں کچھ خلل ہے۔

میں نے شماتت آمیز ظرافت شروع کی۔ "تو وہ تمہارے گھر سے کچھ نہیں لے گئی؟"

"کچھ نہیں بابو جی! دھیلے کی چیز بھی نہیں۔"

"اور تم سے محبت بھی کرتی تھی؟"

"اب آپ سے کیا کہوں بابو جی۔ وہ محبت تو مرتے دم تک یاد رہے گی۔"

"پھر بھی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی؟"

"یہی تو تعجب ہے بابو جی۔"

"تِریا چرِتّر کا نام کبھی سنا ہے؟"

"ارے بابو جی! ایسا نہ کہیے میری گردن پر کوئی چھری بھی رکھ دے تو بھی میں اس کا جس ہی گائے جاؤں گا؟"

"تو پھر ڈھونڈ نکالو!"

"ہاں مالک! جب تک اسے ڈھونڈ نہ لاؤں مجھے چین نہ آئے گا۔ مجھے اتنا معلوم ہو جائے کہ وہ کہاں ہے پھر تو میں اسے لے ہی آؤں گا اور بابو جی میرا دل کہتا ہے کہ وہ آئے گی جرور، دیکھ لیجئے گا۔ وہ مجھ سے خفا نہیں تھی۔ لیکن دل نہیں مانتا۔ جاتا ہوں مہینے دو مہینے جنگل پہاڑ کی خاک چھانوں گا۔ جیتا رہا تو پھر آپ کے درشن کروں گا۔ یہ کہہ کر وہ مجنونانہ رفتار سے ایک طرف چل دیا۔

(3)

اس کے بعد مجھے ایک ضرورت سے نینی تال جانا پڑا۔ تفریح کیلئے ایک مہینے کے بعد لوٹا اور ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ دیکھتا ہوں کہ گنگو ایک نوزائیدہ بچّے کو گود میں لیے کھڑا ہے۔ شاید کرشن کو پاکر نند بھی اتنے باغ باغ نہ ہوئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا مسرت اس کے جسم سے باہر نکلی پڑتی ہے۔ چہرے اور آنکھوں سے تشکّر اور نیاز کے نغمے سے نکل رہے تھے۔ کچھ وہی کیفیت تھی، جو کسی فاقہ کش سائل کے چہرے پر شکم سیر ہو جانے کے بعد نظر آتی ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیوں مہراج! گومتی دیوی کا کچھ سراغ ملا؟ تم تو باہر گئے تھے۔"

گنگو نے جامے میں پھولے نہ سماتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں بابو جی آپ کی دعا سے ڈھونڈ لایا۔ لکھنؤ کے زنانہ ہسپتال میں ملی۔ یہاں ایک سہیلی سے کہہ گئی تھی کہ اگر وہ بے قرار ہوں تو بتلا دینا۔ میں سنتے ہی لکھنؤ بھاگا اور انہیں لے آیا۔ گھاتے میں یہ بچہ بھی مل گیا۔"

اس نے بچّے کو گود میں اٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ گویا کوئی کھلاڑی تمغہ پاکر اسے دکھار ہا ہو۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ ابھی اس کی شادی کو ہوئے کل چھ مہینے ہوئے ہیں، پھر بھی یہ بچّے کو کس بے حیائی سے دکھار ہا ہے۔ میں نے تمسخر کے انداز میں پوچھا ـــــــ

"یہ لڑکا بھی مل گیا۔ شاید اسی لیے وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ ہے تو تمہارا لڑکا ہی نہ؟"

"میرا کاہے کو ہے بابو جی، آپ کا ہے، بھگوان کا ہے۔"

"تو لکھنؤ میں پیدا ہوا؟"

"ہاں بابو جی۔ ابھی تو کل ایک مہینے کا ہے۔"

"تمہاری شادی ہوئے کتنے دن ہوئے؟"

"یہ ساتواں مہینہ جا رہا ہے۔"

"شادی کے چھٹے مہینے میں پیدا ہوا؟"

"اور کیا بابو جی۔"

"پھر بھی تمہارا لڑکا ہے؟"

"ہاں جی۔"

"کیسی بے سر پیر کی باتیں کر رہے ہو؟"

معلوم نہیں وہ میرا منشا سمجھ رہا تھا' اسی سادہ لوحانہ انداز سے بولا۔ "گھر میں مرتے مرتے بچی' بابو جی۔ یہ نیا جنم ہوا۔ تین دن تین رات چھٹ پٹاتی رہی' کچھ نہ پوچھیے۔"

میں نے اب ذرا طنز کے ساتھ کہا۔ "لیکن چھ مہینے میں لڑکا ہوتے میں نے آج ہی سنا۔"

یہ کنایہ نشانہ پر جا بیٹھا' معذرت آمیز تبسم کے ساتھ بولا۔ "مجھے تو بابو جی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ اسی لاج سے تو گومتی بھاگی تھی۔ میں نے کہا۔ "گومتی اگر تمہارا دل مجھ سے نہیں ملتا تو مجھے چھوڑ دو۔ میں اسی دم چلا جاؤں گا اور پھر کبھی تمہارے پاس نہ آؤں گا۔ تمہیں جب کسی چیز کی جرورت ہو مجھے لکھنا۔ میں بے شک تمہاری مدد کروں گا۔ مجھے تم سے کوئی ملال نہیں ہے۔ تم میری نجر میں اتنی ہی بھلی ہو۔ اب بھی تجھے اتنا ہی چاہتا ہوں۔ نہیں اب تمہیں میں اور زیادہ چاہتا ہوں۔ اگر تمہارا دل مجھ سے بھر نہیں گیا ہے تو میرے ساتھ چلو۔ گنگو جیتے جی تم سے بے وپھائی نہیں کرے گا۔ میں نے تم سے اس لیے بیاہ نہیں کیا کہ تم دیوی ہو' بلکہ اس لیے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں اور سمجھتا تھا کہ تم مجھے بھی چاہتی ہو۔ یہ بچہ میرا ہے۔ میرا اپنا بچہ ہے۔ میں نے ایک بویا ہوا کھیت لیا تو کیا اس کے پھل کو اس لیے چھوڑ دوں گا کہ اسے دوسرے نے بویا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ مارا۔

میں کپڑے اتارنے بھول گیا۔ کہہ نہیں سکتا کہ کیوں میری آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ نہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس نے میری دلی کراہت کے باوجود میرے ہاتھوں کو بڑھا دیا۔ میں نے اس معصوم بچے کو گود میں لے لیا اور اس پیار سے اس کا بوسہ لیا کہ شاید اپنے بچوں کا کبھی نہ لیا ہو گا۔

گنگو بولا۔ "بابو جی آپ بڑے شریف آدمی ہیں۔ گومتی سے برابر آپ کا بکھان کیا کرتا ہوں۔ کہتا ہوں چل ایک بار ان کے درشن کر آ لیکن مارے شرم کے آتی ہی نہیں۔"

میں اور شریف! اپنی شرافت کا پردہ آج میری نظروں سے ہٹا۔ میں نے عقیدت کے ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ "نہیں جی' وہ میرے جیسے سیاہ دلوں کے پاس کیا آئیں گے۔ چلو میں ان کے درشن کرنے چلتا ہوں۔ تم مجھے شریف سمجھتے ہو' میں ظاہر میں شریف مگر دل کا کمینہ ہوں۔ اصلی شرافت تم میں ہے۔ اور یہ معصوم بچہ وہ پھول ہے جس سے تمہاری شرافت کی مہک نکل رہی ہے۔"

میں بچے کو سینے سے چمٹائے ہوئے گنگو کے ساتھ چلا۔

بدنصیب ماں

(1)

پنڈت اجودھیاناتھ کا انتقال ہوا تو سب نے کہا ایشور آدمی کو ایسی ہی موت دے۔ چار جوان لڑکے یادگار چھوڑے اور ایک لڑکی۔ اثاثہ بھی کافی۔ پختہ مکان' دو باغ' کئی ہزار کے زیور اور بیس ہزار نقد۔ بیوہ پھول متی کو صدمہ ہونا لازمی تھا اور وہ کئی دن تک بے حال رہی۔ لیکن جوان بیٹوں کو سامنے دیکھ کر اسے تشفّی ہوئی۔ چاروں لڑکے ایک سے ایک سعادت مند' چاروں بہویں ایک سے ایک فرمانبردار۔ جس وقت پھول متی چارپائی پر لیٹتی تو باری باری سے اس کے پاؤں دباتیں۔ وہ اشنان کر کے اٹھتی تو اس کی ساڑھی دھوتیں۔ سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا تھا۔ بڑے لڑکے کامتاناتھ ایک دفتر میں پچاس کا نوکر تھا۔ دوسرا اماناتھ ڈاکٹری پاس کر چکا تھا اور کہیں مطب کھولنے کی فکر میں تھا۔ تیسرا دیاناتھ بی اے میں فیل ہو گیا تھا اور اخباروں میں مضامین لکھ کر اپنا جیب خرچ نکال لیتا تھا۔ سب سے چھوٹا سیتاناتھ چاروں میں ذہین اور ہونہار تھا اور امسال بی اے اول درجے میں پاس کر کے ایم اے کی تیاری میں مصروف تھا۔ کسی میں وہ لاأبالیاں نہ تھیں' نہ فضول خرچیاں' نہ کم اندیشیاں جو والدین کو جلاتی ہیں اور خاندان کو تباہ کرتی ہیں۔ بڑھیا گھر کی مالکن تھی۔ اگرچہ کنجیاں بڑی بہو کے پاس رہتی تھیں۔ پھول متی میں وہ حکومت پسندی نہ تھی' جو بڑھاپے کو سخت گیر بنا دیا کرتی ہے۔ مگر اس کی مرضی کے بغیر کوئی لڑکا ناشتہ بھی نہیں منگا سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ پنڈت جی کو مرے آج بارھواں دن تھا۔ کل تیرھویں ہے برہم بھوج ہوگا۔ برادری کی دعوت ہوگی۔ اس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پھول متی اپنے حجرے میں بیٹھی دیکھ رہی تھی کہ پلّے دار بوریوں میں آٹا لا کر رکھ رہے ہیں۔ گھی کے ٹین آ رہے ہیں' سبزی کے ٹوکرے' شکر کی بوریاں' دہی کی مٹکیاں سب چلی آ رہی ہیں۔ مہابرہمن کے لیے دان کی چیزیں لائی گئیں۔ برتن' پلنگ' بستر' کپڑے وغیرہ مگر پھول متی کو کوئی چیز نہیں دکھائی گئی۔ حسب ضابطہ سب چیزیں اس کے پاس آنی چاہئیں تھیں۔ وہ ہر ایک چیز کو دیکھتی' اسے پسند کرتی' ان کی مقدار میں کمی بیشی کرتی' تب ان چیزوں کو بھنڈارے میں رکھا جاتا۔ مگر اسے دکھانے کی کسی نے ضرورت نہ سمجھی۔ اچھا آٹا تین ہی بوری کیوں آیا۔ اس نے تو پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا۔ گھی کے بھی پانچ ہی کنستر آئے۔ اس نے دس کنستر منگوائے تھے۔ شاید سبزی' دہی' شکر وغیرہ میں بھی کمی کی گئی ہو۔ کس نے اس حکم میں مداخلت کی۔ جب اس نے ایک بات طے کر دی تو کسی کو کیا حق ہے کہ اس میں کمی بیشی کرے۔ آج چالیس سال سے گھر کے ہر ایک معاملے میں پھول متی کا فیصلہ ناطق تھا۔ اس نے سو کہا تو سو خرچ کیے گئے۔ ایک کہا تو ایک۔ کسی نے مین میکھ نہ کی۔ یہاں تک کہ پنڈت اجودھیاناتھ سب کچھ اس کی مرضی پر چھوڑ دیتے تھے' پر آج اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے' وہ اسے کیونکر برداشت کر سکتی تھی؟

وہ کچھ دیر تک تو ضبط کیے بیٹھی رہی۔ پر اس سے آخر رہا نہ گیا۔ خود پروری اس کی فطرتِ ثانی بن گئی تھی۔ غصے میں بھری ہوئی آئی اور کامتاناتھ سے بولی۔ "کیا آٹا تین بوری لائے' میں نے پانچ بوریوں کے لیے کہا تھا اور گھی بھی پانچ کنستر' تمہیں یاد ہے میں نے دس کنستر کہے تھے۔ کفایت کو میں برا نہیں کہتی' لیکن جس نے یہ کنواں کھودا'

اس کی آتماپانی کوترسے‘ تو کتنی شرم کی بات ہے۔“

کامتاناتھ نے معذرت نہیں کی۔ عذر گناہ نہیں کیا۔ نادم بھی نہیں ہوا۔ فوراً تقصیر کی تلافی کرنے نہیں دوڑا۔ ایک منٹ تو باغیانہ انداز سے کھڑا رہا۔ پھر بولا۔ ”ہم لوگوں کی صلاح تین ہی بوریوں کی ہوئی اور تین بوریوں کے لیے پانچ کنستر گھی کافی تھا۔ اسی حساب سے اور چیزیں بھی کم کر دی گئیں۔“

پھول متی تیز ہو کر بولی۔ ”کس کی رائے سے آٹا کم کیا گیا؟“

”ہم لوگوں کی رائے سے۔“

”تو میری رائے کوئی چیز نہیں؟“

”ہے کیوں نہیں؟ لیکن اپنا نفع نقصان تو ہم ہی سمجھتے ہیں؟“

پھول متی ہکّا بکّا ہو کر اس کا منہ تکنے لگی۔ اس جملے کا مطلب اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ اپنا نفع نقصان یہ ”اپنا“ کیا بلا ہے؟ اس کا وجود کب سے ہوا؟ اس کے نفع نقصان کی ذمہ داری اس کے سر ہے۔ دوسروں کو خواہ وہ اس کے پیٹ کے لڑکے ہی کیوں نہ ہوں‘ اس فیصلے میں دخل دینے کا کیا حق ہے۔ لونڈا اس طرح جواب دے رہا ہے گویا گھر اس کا ہے۔ اس نے مر مر کر یہ گرہستی جمع کی ہے میں تو غیر ہوں۔ ذرا اس کی خودسری تو دیکھو۔

اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ”میرے نفع نقصان کے ذمہ دار تم نہیں ہو‘ مجھے اختیار ہے۔ میں جو مناسب سمجھوں‘ وہ کروں۔ ابھی جا کر دو بوری آٹا اور پانچ کنستر گھی لاؤ اور آئندہ سے خبردار جو کسی نے میری بات کاٹی۔

اس نے اپنے خیال میں ضرورت سے زیادہ تنبیہ کر دی تھی اور وہاں کھڑے ہونے کی ضرورت نہ سمجھ کر وہ اپنے حجرے میں چلی آئی۔ حالانکہ کامتاناتھ ابھی وہیں کھڑا تھا اور اس کے چہرے سے ایسا مترشح ہو رہا تھا کہ اسے اس حکم کی تعمیل میں کچھ عذر ہے۔ مگر پھول متی مطمئن بیٹھی تھی۔ اتنی تنبیہ پر بھی کسی کو اس پر نافرمانی کی جرأت ہو سکتی ہے‘ یہ اس کے ذہن میں نہ آیا۔ مگر رفتہ رفتہ اس پر اب حقیقت کھلنے لگی کہ اس گھر میں اس کی وہ حیثیت نہیں رہی‘ جو دس بارہ روز پہلے تھی۔ رشتہ داروں کے یہاں نوید میں گھی شکر مٹھائی وغیرہ آ رہی تھی۔ بڑی بہو ان چیزوں کو خود سنبھال سنبھال کر رکھ رہی تھی۔ تینوں چھوٹی بہوئیں بھی بھنڈارے میں گھسی تھیں۔ کوئی بھی پھول متی سے کچھ پوچھنے نہیں آتا۔ برادری کے لوگ بھی جو کچھ پوچھتے ہیں وہ کامتاناتھ سے یا بڑی بہو سے۔ کامتاناتھ کہاں کا بڑا منتظم ہے۔ دن بھر بھنگ پیے پڑا رہتا ہے اور بڑی بہو جیسی پھوہڑ عورت بھلا ان باتوں کو کیا سمجھ سکتی ہے۔ بھد ہو گی اور کیا۔ سب کے سب خاندان کی ناک کٹوائیں گے۔ وقت پر کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جائے گی تب ادھر ادھر بھاگے پھریں گے۔ ان کاموں کے لیے بڑا تجربہ اور سلیقہ چاہیے۔ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ بن جائے گی اور ماری ماری پھرے گی۔ کوئی چیز اتنی کم بنے گی کہ کسی پتل پر پہنچے گی‘ کسی پر نہیں۔ آخر ان سبھوں کو ہو کیا گیا ہے۔ اچھا بڑی بہو سیف کیوں کھول رہی ہے۔ وہ سیف کو میری مرضی کے بغیر کھولنے والی کون ہوتی ہے۔ کنجی اس کے پاس ہے ضرور‘ لیکن جب تک میں روپے نہ نکلواؤں وہ صندوق نہیں کھول سکتی۔ آج اس طرح کھول رہی ہے گویا سب کچھ وہی ہے‘ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ اس نے بڑی بہو کے پاس جا کر تند لہجے میں کہا۔ ”سیف کیوں کھولتی ہو بہو؟ میں نے تو کھولنے کو نہیں کہا۔“

بڑی بہو نے بے باکانہ انداز سے کہا۔ ”بازار سے سامان آیا ہے‘ تو دام نہ دیئے جائیں؟“

”کون چیز کس بھاؤ سے آئی ہے اور کتنی آئی ہے۔ مجھے کچھ معلوم نہیں‘ جب تک حساب نہ ہو جائے

روپے کیسے دیئے جائیں گے؟"

"حساب کتاب سب ہو گیا۔"

"کس نے کیا؟"

"اب میں کیا جانوں جا کر اپنے لڑکوں سے پوچھو۔"

پھول متی پھر آ کر اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گئی۔ اس وقت بگڑنے کا موقع نہ تھا۔ گھر میں مہمان بھرے ہوئے تھے۔ اگر اس وقت اس نے لڑکوں کو ڈانٹا تو لوگ یہی کہیں گے' پنڈت کے مرتے ہی ان کے گھر میں پھوٹ پڑ گئی۔ خون کا گھونٹ پی پی کر رہ جاتی ہے۔ جب مہمان رخصت ہو جائیں گے تب وہ ایک ایک کی خبر لے گی۔ دیکھیے اس وقت لڑکے کیا باتیں بناتے ہیں۔ اس عرصہ میں وہ کارپردازوں کی بے قاعدگیوں اور فضول کاریوں اور غلطیوں کا مبصّرانہ نگاہوں سے مشاہدہ کر رہی تھی۔ بارہ بجے دعوت شروع ہوئی۔ ساری برادری کے لوگ یکبارگی کھانے کے لیے بلا لیے گئے۔ پھول متی کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ صحن میں مشکل سے ڈھائی سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ یہ ساری برادری کیسے بیٹھے گی۔ دو پنگتوں میں لوگ بیٹھتے تو کیا برا تھا۔ یہی تو ہوتا کہ دو کی جگہ چار بجے ختم ہوتی۔ مگر یہاں تو سب کو سونے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔

دفعتاً شور مچا۔ "ترکاریوں میں نمک نہیں۔"

بڑی بہو جلدی جلدی نمک پیسنے لگی۔ پھول متی غصے سے ہونٹ چبا رہی تھی' مگر اس موقع پر زبان نہ کھول سکتی تھی۔ بارے نمک پسا اور پتیلیوں میں ڈالا گیا۔

یکا یک پھر شور مچا۔ "پانی گرم ہے۔"

گھر میں برف نہ تھی۔ آدمی بازار دوڑا گیا۔ بازار میں اتنی رات گئے برف کہاں' آدمی ناکام لوٹ آیا۔ مہمانوں کو وہی نل کا گرم پانی پینا پڑا۔ پھول متی کا بس چلتا تو لڑکوں کا منہ نوچ لیتی۔ ایسی بدانتظامی اس گھر میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس پر سب کو مالک اور منتظم بننے کی دھن ہے۔ برف جیسی ضروری چیز منگوانے کی فرصت نہ ملی۔ مہمان اپنے دل میں کیا کہتے ہوں گے۔ دعوت کرنے چلے تھے اور گھر میں برف تک نہیں۔ اچھا پھر کیوں ہلچل مچی۔ ارے غضب! کسی کے شوربے میں ایک مری ہوئی چوہیا نکل آئی۔ یا بھگوان اب تمہی آبرو قائم رکھیو۔ چھی' اس پھوہڑپن کی بھی کوئی حد ہے! سارے مہمان اٹھے جا رہے ہیں' نہ اٹھیں تو کیا کریں۔ آنکھوں سے دیکھ کر مکھی کون نگلے گا۔ پھول متی کے دل میں ایسا ابال اٹھ رہا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرائے۔ دیوانہ حالت میں بار بار سر کے بال نوچتی تھی۔ ابھاگے دعوت کا انتظام کرنے چلے تھے۔ سارا کرا دھرا مٹی میں مل گیا۔ سینکڑوں روپے پر پانی پھر گیا۔ بدنامی ہوئی وہ الگ۔ اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ مہمان اٹھ چکے تھے۔ پتلوں پر کھانا جوں کا توں پڑا تھا۔ چاروں لڑکے آنگن میں نادم کھڑے تھے۔ ایک دوسرے کو الزام دے رہا تھا۔ بڑی بہو دیورانیوں پر بگڑ رہی تھی۔ پھول متی شعلے کی طرح ٹوٹ کر آئی اور بولی۔ "منہ میں کالک لگ گئی کہ نہیں! یا ابھی کچھ کسر ہے۔ ڈوب مرو سب کے سب جا کر چلو بھر پانی میں۔ شہر میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہفتوں اس دعوت کا چرچا رہے گا۔ مذاق اڑایا جائے گا۔ تم لوگوں کو کچھ شرم و حیا تو ہے نہیں۔ تمہیں کیا' آتما تو اس کی رو رہی ہے جس نے زندگی کو گھر کی آبرو بنانے میں تباہ کر دیا۔"

کامتا ناتھ کچھ دیر تو کھڑا سنتا رہا۔ آخر جھنجھلا کر بولا: "اچھا اب رہنے دو' اماں غلطی ہوئی۔ لیکن اب کیا اس

کے لیے آدمیوں کو حلال کر ڈالو گی؟ سبھی سے غلطیاں ہوتی ہیں۔ پچھتانے کے سوا آدمی اور کیا کر سکتا ہے۔ کسی کی جان تو نہیں ماری جاتی۔ آدمی غلطیوں ہی سے سیکھتا بھی تو ہے۔"

بڑی بہو نے فرمایا "ہم کیا جانتے تھے کہ بی بی (نند کملا) سے اتنا ذرا سا کام نہ ہو گا۔ چوہیا ترکاری میں بیٹھی ہو گی۔ انہوں نے ٹوکری کو بغیر دیکھے بھالے کڑھاؤ میں ڈال دیا۔"

کامتاناتھ نے بیوی کو ڈانٹا: "اس میں نہ کملا کا قصور ہے' نہ تمہارا نہ میرا۔ اتفاق ہے۔ اتنے بڑے بھوج میں ایک مٹھی ترکاری کڑھاؤ میں نہیں ڈالی جاتی۔ ٹوکرے کے ٹوکرے انڈیل دیئے جاتے ہیں۔ اس میں کیسی جگ ہنسائی اور کیسی نک کٹائی۔ تم خواہ مخواہ جلے پر نمک چھڑکتی ہو۔"

پھول متی: "شرماتے تو نہیں' الٹے اور بے حیائی کی باتیں کرنے لگے۔"

کامتاناتھ: "شرماؤں کیوں کسی کی چوری کی ہے۔ چینی میں چیونٹے اور آٹے میں گھن یہ سب تو نہیں دیکھے جاتے۔ ہماری نگاہ نہ پڑی۔ بس یہی بات بگڑ گئی ورنہ چپکے سے چوہیا پکڑ کر نکال دیتے کسی کو خبر تک نہ ہوتی۔"

پھول متی اس کفر پر استعجاب سے بولی۔ "کیا سب کو چوہیا کھلا کر ان کا دھرم لے لیتا۔"

کامتاناتھ ماں کی طرف نگاہِ ملامت سے دیکھ کر بولا۔ "کیا پرانے زمانے کی باتیں کر رہی ہو اماں' ان باتوں سے دھرم نہیں جاتا۔ یہ دھرماتما لوگ جو پتل سے اٹھ اٹھ کر گئے ہیں' ان میں ایسا کون سا ہے' جو بھیڑ بکری کا گوشت نہ کھاتا ہو۔ تالاب کے کچھوے اور گونگھے تک تو کسی سے بچتے نہیں۔ کیا وہ ذرا سی چوہیا ان سب سے ناپاک ہے؟"

پھول متی کے پاس ایسی کٹ حجتیوں کا جواب نہ تھا' اپنا سا منہ لے کر چلی گئی۔

(2)

دو مہینے گزر گئے ہیں۔ رات کا وقت ہے۔ چاروں بھائی بھنگ پی کر کمرے میں بیٹھے مشورہ کر رہے ہیں۔ بڑی بہو بھی اس مجلس میں شریک ہیں۔

کامتاناتھ نے مسند پر ٹک کر کہا۔ "میں تو کملا کی شادی میں اپنے حصے کی ایک پائی بھی نہیں دے سکتا۔ آخر میرے بھی تو بال بچے ہیں"۔

اماناتھ: "تو یہاں کس کے پاس فالتو روپے ہیں۔ پانچ پانچ ہزار ہی تو ایک ایک کے حصے میں آئے ہیں۔ مجھے اپنا میڈیکل ہال کھولنے کے لیے کم از کم پانچ ہزار روپے کی ضرورت ہے۔"

دیاناتھ: "مجھے بھی پریس اور اخبار کی فکر ہے۔ پانچ ہزار اپنے ہوں گے تو پانچ ہزار کا کوئی ساجھی اور مل جائے گا۔ میں تو اپنے میں سے ایک کوڑی بھی نہیں دے سکتا۔"

کامتا: "دادا نے پانچ ہزار جہیز ٹھہرایا تھا۔ اس کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پنڈت مراری لال کے لڑکے سے شادی ہو۔ لڑکی قسمت والی ہو تو غریب گھر میں بھی آرام سے رہ سکتی ہے' بدنصیب ہو تو راجہ کے گھر میں بھی روتی رہے گی۔ یہ تو نصیب کا کھیل ہے۔"

سیتا نے شرماتے ہوئے کہا۔ "یہ تو مناسب معلوم نہیں ہوتا کہ طے کی ہوئی سگائی توڑ دی جائے۔ ان سے کہا جائے کہ پانچ ہزار کی جگہ تین ہزار لے لیں۔ اس طرح پانچ ہزار میں شادی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے حصے کے سب

روپے دے دوں گا۔"

کامتاناتھ نے کھسیا کر بھائیوں سے کہا۔ "سنتے ہو اس کی باتیں۔"

اُما: "جب ٹھوکریں کھائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی۔"

کامتا: "اتنا یاد رکھو کہ ہم لوگ تمہاری تعلیم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔"

سیتا: "جی ہاں یاد ہے۔"

اما: "اور جو کہیں تمہیں ولایت جا کر پڑھنے کے لیے وظیفہ مل جائے تو سوٹ بوٹ اور سفر خرچ کے لیے روپیہ کہاں سے لاؤ گے۔ اس وقت کس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھرو گے؟"

کامتا: "اور وظیفہ تمہیں ملے گا' کہو میں آج لکھ دوں۔"

اس دلیل نے سیتاناتھ کو بھی توڑ لیا۔ فی الواقع اگر اسے سرکاری وظیفہ مل گیا تو چار پانچ ہزار تیاریوں کے لیے درکار ہوں گے۔ کملا کیلئے وہ اتنی بڑی قربانی ہرگز نہیں کر سکتا کہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پامال کر دے۔

بولا: "ہاں ایسی حالت میں تو مجھے بھی روپے کی ضرورت پڑے گی۔"

کامتا: "تو اس کی ایک صورت یہی ہے کہ کملا کی شادی کم سے کم خرچ میں کر دی جائے۔ ایک ہزار سے زیادہ ہم کسی طرح خرچ نہیں کر سکتے۔ پنڈت دین دیال کیسے رہیں گے؟ ایم اے' بی اے نہ سہی' جمنانی سے اس کی آمدنی پچاس روپے ماہوار سے کم نہیں۔ عمر بھی ابھی چالیس سال سے زیادہ نہ ہو گی۔ پچھلے سال ہی تو بیوی مری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بغیر جہیز کے راضی ہو جائیں گے۔"

اما: "وہاں جہیز کا کوئی سوال ہی نہیں۔ تیسری شادی ہے۔"

کامتا: "یہ نہ کہو۔ وہ آج چاہیں تو ہزار دو ہزار پا سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ساتھ کچھ دب جائیں گے۔ تو یہی صلاح کہ مراری لال کو جواب دیا جائے اور یہ دین دیال کے ساتھ سگائی طے کی جائے۔"

دیا: "اماں سے بھی پوچھ لینا چاہیے۔"

کامتا: "اماں سے پوچھنا بیکار ہے۔ ان کی تو جیسے عقل گھاس کھا گئی ہے۔ وہی پرانے وقتوں کی باتیں۔ مراری لال کے نام پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں۔ یہ نہیں سمجھتیں کہ وہ زمانہ نہیں رہا۔"

اما: "وہ مانیں گی نہیں۔ اپنے زیور بیچ کر شادی کریں گی۔ دیکھ لیجئے گا۔"

کامتا: "یہ ممکن ہے۔ زیوروں پر ان کا پورا اختیار ہے۔ یہ ان کا اِستری دَھن ہے' وہ جو چاہیں کر سکتی ہیں۔"

دیاناتھ: "استری دھن ہے تو کیا اسے لٹا دیں گی؟ آخر وہ بھی تو دادا ہی کی کمائی ہے۔"

کامتا: "کسی کی کمائی ہو اِستری دَھن عورت کی چیز ہے۔"

اما: "یہ سب قانونی گورکھ دھندے ہیں۔ استری دھن کوئی چیز نہیں۔ گہنے دس ہزار سے کم کے نہیں ہیں۔ اتنی بڑی رقم ہم کھو دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ کسی بہانے سے یہ گہنے اپنے ہاتھ میں کرنے ہوں گے۔ ابھی دین دیال کا ذکر نہ کرو' ورنہ تاڑ جائیں گی۔ گہنے اپنے پاس آ جائیں تو صاف صاف کہہ دو۔ تب کیا کر لیں گی۔"

دیا: "ہاں یہ ترکیب اچھی ہے۔"

کامتا: "مجھے تو دھوکا کی چال اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ جس چیز پر ہمارا حق ہے اس کے لیے ہم لڑ سکتے ہیں۔ جس پر ہمارا حق نہیں اس کے لیے ہم دھوکا دھڑی نہیں کر سکتے۔"

دیاناتھ: ''آپ الگ بیٹھے رہیں میں جاکر کہتا ہوں کہ میں نے ایک اخبار میں مضمون لکھا تھا۔ اس پر سرکار مقدمہ چل رہا ہے۔ پانچ ہزار کی ضمانت دینی پڑے گی۔ آپ اپنے زیور دے دیں تو میری جان بچ جائے گی۔ آپ لوگ بھی کچھ نمک مرچ ملا دیجئے گا۔''

کامتا: ''نا بھیّا میں اس کام کے قریب نہ جاؤں گا۔''

سیتا: ''میرا بھی استعفیٰ ہے۔''

اُما: ''ان لوگوں کو جانے دو جی' ہم اور تم مل کر رنگ جمالیں گے۔ یہ دھرماتما لوگ ہیں' بھیّا نوکر ہیں۔ سیتا کو وظیفہ ملنے والا ہے۔ ضرورت تو ہمیں اور تمہیں ہے۔''

بڑی بہو نے فرمایا۔ ''پچاس روپے کے ہی تو نوکر ہیں یا اور کچھ۔ اتنے دن مجھے آئے ہوگئے۔ پیتل کا ایک چھلا بھی نہ بنوایا۔ توفیق ہی نہ ہوئی۔ آج دھرماتما بنے ہیں۔''

اُما: ''اماں کے زیور مل جائیں گے تو ان کا ہار تمہیں دے دوں گا۔ بھائی خاطر جمع رکھو۔''

بڑی بہو: ''مل چکے۔ وہ گڑ نہیں جو چیونٹے کھائیں۔''

دیا: ''اچھا تو اسی بات پر ابھی جاتا ہوں۔ زیور لے کر نہ آؤں تو منہ نہ دکھاؤں۔''

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دیاناتھ کی کوڑی چت پڑی۔ ماں کا ممتا بھرا دل بیٹے کی مصیبت دیکھ کر کیوں نہ پسیجتا۔ پھول متی یہ داستان سنتے ہی باؤلی ہوگئی۔ اس پر اماناتھ نے اور بھی رڈا جمایا۔ ''اگر صبح دس بجے تک روپے داخل نہ ہوئے تو ہتھکڑیاں پڑ جائیں گی۔ بینک سے روپے تو ابھی نہیں مل سکتے۔ مہینوں خط و کتابت ہوگی۔ وراثت کا فیصلہ ہو جائے گا تب کہیں جاکر روپے ملیں گے۔ پھول متی کو یہ کب برداشت ہو سکتا تھا کہ اس کے زیوروں کے ہوتے اس کے بیٹوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑ جائیں۔ سارے زیور نکال کر دیاناتھ کو دے دیئے۔ اس طرح اپنی ماں کی گردن پر خنجر چلا کر دونوں ناخلف خوش خوش بھائیوں کے پاس لوٹ آئے۔

(3)

دو تین مہینے اور گزر گئے۔ زیوروں پر تصرف کر کے چاروں بھائی اب ماں کی دلجوئی کرنے لگے۔ اپنی بیویوں کو سمجھاتے رہتے کہ اماں کا دل نہ دکھائیں۔ اگر اس کی تشفی تھوڑی سی ظاہر داری میں ہو جاتی ہے تو اس میں کیوں کمی کی جائے اور چاروں کرتے اپنے دل کی۔ مگر ماں سے صلاح لے لیتے یا ایسا جال پھیلاتے کہ وہ ان کی باتوں میں آجاتی اور ہر ایک بات میں رضامند ہو جاتی۔ باغ کا فروخت کرنا' اسے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ لیکن چاروں نے ایسی بندشیں باندھیں کہ وہ اسے بیع کرنے پر راضی ہو گئی۔ ہاں کملا کی شادی کے معاملے میں بیٹوں سے اس کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ کہتی تھی کہ شادی مراری کے لڑکے سے ہی ہو گی۔ چاروں بھائی پنڈت دین دیال سے کرنا چاہتے تھے۔ ایک دن اس بات پر تکرار کی نوبت آگئی۔

پھول متی نے کہا۔ ''ماں باپ کی کمائی میں کیا بیٹی کا حصہ نہیں ہے۔ تمہیں دس ہزار کا ایک باغ ملا۔ پچیس ہزار کا مکان' بیس ہزار نقد میں سے کیا پانچ ہزار بھی کملا کا حصہ نہیں ہے؟''

کامتاناتھ نے نرمی سے کہا۔ ''اماں کملا ہماری بہن ہے اور ہم اپنے مقدور بھر کوئی ایسی بات نہ کریں گے'

جس سے اسے نقصان ہو۔ لیکن حصے کی جو بات کہتی ہو تو کملا کا حصہ کچھ نہیں ہے۔ دادا جب زندہ تھے تب اور بات تھی۔ اب تو ہمیں ایک ایک پیسے کی کفایت کرنا پڑے گی۔ جو کام ایک ہزار میں ہو جائے' اس کے لیے پانچ ہزار خرچ کرنا کہاں کی عقلمندی ہے؟"

اما ناتھ نے تصحیح کی۔ "پانچ ہزار کیوں صاحب دس ہزار کہیے۔ دعوت' ضیافت' رسم و رسوم میں کیا پانچ ہزار بھی خرچ نہ ہوں گے؟"

کامتا: "ہاں ٹھیک ہے' دس ہی سمجھو۔ دس ہزار روپے ایک شادی میں خرچ کرنے کی اب ہماری حیثیت نہیں۔"

پھول متی نے ضد پکڑ کر کہا۔ "شادی تو مراری لال کے لڑکے سے ہی ہو گی۔ چاہے پانچ ہزار خرچ ہوں' چاہے دس ہزار۔ میرے شوہر کی کمائی ہے۔ میں نے مر مر کر جوڑا ہے۔ اپنی مرضی سے خرچ کروں گی تم سے مانگنے جاؤں تو مت دینا۔"

کامتا ناتھ کو اب تلخ حقیقت کے اظہار کے سوا چارہ نہ ہوا۔ بولے۔ "اماں تم خواہ مخواہ بات بڑھاتی ہو۔ جس روپے کو اب تم اپنا سمجھتی ہو' وہ تمہارا نہیں ہے۔ وہ ہمارا ہے۔ ایک ایک پائی ہماری ہے۔ تم ہماری مرضی کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ نہیں کر سکتیں۔"

پھول متی کو جیسے سانپ نے ڈس لیا۔ "کیا کہا پھر تو گویا میں اپنے ہی روپے اپنی مرضی سے خرچ نہیں کر سکتی۔"

کامتا: "وہ روپے تمہارے نہیں ہمارے ہیں۔"

پھول متی: "تمہارے ہوں گے لیکن میرے مرنے کے بعد۔"

کامتا: "نہیں دادا کے مرتے ہی سب کچھ ہمارا ہو گیا۔"

اما: "اماں قانون تو جانتی نہیں ہیں خواہ مخواہ الجھتی ہیں۔"

پھول متی کی بے نور آنکھیں شعلے کی طرح دہک اٹھیں۔ چہرہ لال ہو گیا۔ بولی۔ "تمہارا قانون بھاڑ میں جائے۔ ایسے قانون میں آگ لگے۔ میں ایسے لچر قانون کو نہیں مانتی۔ یہ قانون ہے کہ گلے پر چھری پھیرنا ہے۔ تمہارے دادا ایسے کوئی دھنّا سیٹھ نہ تھے۔ میں نے پیٹ اور تن کاٹ کر یہ روپے جمع کیے ہیں۔ نہیں تو آج اس گھر میں دُھول اڑتی ہوتی۔ گھر ہی کہاں ہوتا۔ میرے جیتے جی تم میرے روپے چھو نہیں سکتے۔ میں نے تم چاروں بھائیوں کی شادیوں میں دس دس ہزار روپے خرچ کیے ہیں۔ تمہاری پڑھائی میں بھی پانچ پانچ ہزار سے کم خرچ نہ ہوئے ہوں گے۔ کملا بھی تو میرے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے' اس کی شادی میں بھی دس ہزار خرچ کروں گی۔ جو کچھ بچے گا' تم لے لینا۔"

اما ناتھ نے جھلّا کر کہا۔ "بھائی صاحب آپ ناحق اماں کے منہ لگتے ہیں چل کر مراری لال کو خط لکھ دیجیے۔ یہ قاعدہ قانون تو جانتی نہیں' بے کار بحث کرتی ہیں۔"

پھول متی نے ضبط کر کے کہا۔ "اچھا کیا قانون ہے۔ ذرا میں بھی سنوں۔"

اُما: "قانون یہی ہے کہ باپ کے مرنے کے بعد ساری جائداد بیٹوں کی ہو جاتی ہے۔ ماں کا حق صرف گزارہ لینے کا ہے۔"

پھول متی نے پوچھا۔ "کس نے بنایا ہے ایسا قانون؟"

اُما: ”ہمارے رشیوں نے‘ مہاراج منو نے اور کس نے؟“

پھول متی: ”گھر میں نے بنوایا ہے۔ روپے میں نے جوڑے ہیں۔ باغ میں نے خریدا اور آج اس گھر میں غیر ہوں؟ منو نے یہ قانون بنایا ہے؟ اچھی بات ہے۔ اپنا گھر بار لو۔ میری جان چھوڑو۔ اس طرح محتاج بن کر رہنا مجھے منظور نہیں۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ میں مر جاؤں‘ واہ رے اندھیر میں نے ہی درخت لگایا اور میں ہی اس کا پتّہ نہیں توڑ سکتی۔ میں نے گھر بنوایا میں ہی اس میں نہیں رہ سکتی۔ اگر یہی قانون ہے تو اس میں آگ لگ جائے۔ اگر میں جانتی کہ میری یہ درگت ہونے والی ہے تو ساری جائداد اپنے نام کرا لیتی۔“

چاروں نوجوانوں پر ماں کی تندہی کا کوئی اثر نہ ہوا۔ قانون کا فولادی زرہ ان کی حفاظت کر رہا تھا۔ اس کچے لوہے کا ان پر کیا اثر ہوتا۔

شام ہو گئی تھی‘ دروازے پر نیم کا درخت سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے پتّوں میں بھی حس نہ تھی۔ رخصت ہونے والے آفتاب کی ٹھنڈی کرنیں جیسے جائے پناہ ڈھونڈتی پھرتی تھیں۔ پھول متی آہستہ سے اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں چلی گئی۔

(4)

پھول متی اپنے کمرے میں جا کر لیٹی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی کمر ٹوٹ گئی ہے۔ شوہر کے مرتے ہی اپنے پیٹ کے جنے لڑکے اس کے دشمن ہو جائیں گے‘ اس کا اسے کبھی خواب میں بھی گمان نہ ہوا تھا۔ جن لڑکوں کو اس نے خونِ جگر دے کر پالا تھا‘ جن پر اسے غرور تھا‘ وہی آج اسے یوں آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ واہ رے زمانے کی خوبی‘ اب اس گھر میں رہنا اسے عذاب معلوم ہوتا تھا۔ جہاں اس کی کچھ قدر نہیں۔ کچھ گنتی نہیں۔ وہاں لاوارثوں کی طرح پڑی روٹیاں کھائے‘ یہ اس کی خوددار طبیعت کے لیے حد درجہ گراں تھا۔ مگر چارہ ہی کیا تھا۔ وہ لڑکوں سے الگ ہو کر رہے بھی تو کس کی ناک کٹے گی۔ زمانہ اسے تھوکے تو کیا اور لڑکوں کو تھوکے تو کیا بدنامی تو اسی کی ہے۔ دنیا تو یہی کہے گی کہ چار جوان بیٹوں کے ہوتے بڑھیا الگ پڑی ہوئی ہے۔ مزدوری کر کے پیٹ پال رہی ہے۔ جنہیں اس نے ہمیشہ حقارت کی نظر سے دیکھا‘ وہی اب اس پر ہنسیں گے۔ نہیں یہ ذلت اس بے کسی کی ذلت سے کہیں زیادہ دل شکن تھی۔ اب اسے اپنے آپ کو ایک نئے طرزِ عمل کا عادی بنانا پڑے گا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب اسے نئے ماحول کے اندر زندگی بسر کرنی ہوگی۔ اب تک مالکن بن کر رہی۔ اب لونڈی بن کر رہنا پڑے گا۔ ایشور کی یہی مرضی ہے۔ اپنے بیٹوں کی لاتیں اور باتیں غیروں کی لاتوں اور باتوں کے مقابلے میں پھر بھی غنیمت ہیں۔ وہ بڑی دیر تک منہ ڈھانپے اپنی اس بے کسی پر روتی رہی۔ ساری رات اسی روحانی کوفت میں گزر گئی۔

جاڑوں کی صبح‘ آہستہ آہستہ ڈرتی ڈرتی تاریکی کے پردے سے نکلی۔ جیسے کوئی قیدی چھپ کر جیل سے نکل آیا ہو۔ پھول متی معمول کے خلاف آج تڑکے ہی اٹھی۔ رات بھر اس کا روحانی تناسخ ہو چکا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا اور وہ آنگن میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ رات بھر شبنم میں بھیگی ہوئی پختہ زمین اس کے ننگے پیروں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی۔ پنڈت زندہ تھے تب اسے بہت سویرے نہ اٹھنے دیتے تھے۔ ٹھنڈا اسے بہت مضر تھی۔ مگر اب وہ دن نہیں رہے۔ جھاڑو سے فرصت پا کر اس نے آگ جلائی اور کنکریاں چننے لگی۔ رفتہ رفتہ لڑکے جاگے‘ بہوئیں اٹھیں۔

سبھوں نے بڑھیا کو سردی میں کام کرتے دیکھا' پر کسی نے یہ نہ کہا کہ اماں کیوں ہلکان ہوتی ہو شاید وہ بڑھیا کی اس بے کسی پر دل میں خوش ہو رہے تھے۔

آج سے پھول متی کا یہی وطیرہ ہو گیا کہ جو کچھ بن پڑے' گھر کا کام کرنا۔ سارے گھر کی خدمت کرنا اور انتظامی امور سے الگ رہنا۔ اس کے چہرے پر جو ایک خودداری کی جھلک نمایاں تھی' اس کی جگہ ایک حسرت ناک بے بسی چھائی ہوئی نظر آتی تھی۔ جہاں بجلی جلتی تھی' وہاں اب تیل کا چراغ ٹمٹمار ہا تھا' جس کے بجھانے کے لیے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا کافی تھا۔

بھائیوں نے طے شدہ تجویز کے مطابق مراری لال کو ایک انکاری خط لکھ بھیجا۔ دین دیال سے کملا کی شادی ہو گئی۔ دین دیال کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی اور خاندانی وجاہت میں ہیٹے تھے۔ لیکن روٹی دال سے خوش تھے۔ بغیر کسی قرارداد کے شادی کر لی۔ تاریخ مقرر ہوئی۔ بارات آئی۔ شادی ہوئی۔ کملا رخصت ہو گئی۔ کملا کے دل پر کیا گزر رہی تھی' اسے بھی کون جان سکتا تھا۔ لیکن چاروں بھائی بے حد خوش تھے۔ گویا ان کے پہلو سے کانٹا نکل گیا ہو۔ شریف خاندان کی لڑکی گھر والوں کی رضا میں راضی تھی۔ تقدیر میں آرام لکھا ہو گا' آرام کرے گی۔ تکلیف لکھی ہو گی' تکلیف اٹھائے گی۔ گھر والوں نے جس سے شادی کر دی۔ اس میں ہزار عیب ہوں۔ تو یہی اس کا معبود' اس کا مالک۔ انحراف اس کے وہم و گمان سے باہر تھا۔

پھول متی نے کسی کام میں دخل نہ دیا۔ کملا کو کیا دیا گیا۔ مہمانوں کی کیا خاطر مدارات کی گئی۔ کس کے ہاں سے نوید میں کیا آیا۔ اسے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ اس سے کچھ صلاح بھی لی گئی تو یہی کہا کہ بیٹا تم لوگ جو کچھ کرتے ہو' اچھا ہی کرتے ہو' مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔"

جب کملا کے لیے دروازے پر ڈولی آ گئی اور کملا ماں کے گلے لپٹ کر رونے لگی تو وہ اسے اپنی کوٹھڑی میں لے گئی۔ اور جو کچھ سو پچاس روپے' اور دو چار زیور اس کے پاس بچ رہے تھے' بیٹی کے آنچل میں ڈال کر بولی۔ "بیٹی میری تو دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ نہیں تو آج کیا تمہاری شادی اس طرح ہوتی اور تم اس طرح بدا کی جاتیں۔"

کملا نے زیور اور روپے آنچل سے نکال کر ماں کے قدموں پر رکھ دیے۔ اور بولی۔ "اماں میرے لئے تمہاری آشیر باد لاکھوں روپوں کے برابر ہے۔ تم ان چیزوں کو اپنے پاس رکھو۔ نہیں معلوم ابھی تمہیں کن کن مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے۔" پھول متی کچھ کہنا چاہتی تھی کہ امانا تھ نے آ کر کہا۔ "کیا کر رہی ہو۔ کملا چل جلدی کر ساعت ٹلی جاتی ہے۔ وہ لوگ جلدی مچا رہے ہیں۔ پھر دو چار مہینے میں آئے گی ہی جو کچھ لینا دینا ہو لے لینا۔ پھول متی نے دل کو سنبھال کر کہا۔ " میرے پاس اب کیا ہے' بیٹا جو میں اسے دوں گی۔ جاؤ بیٹی بھگوان سہاگ امر کریں۔"

کملا رخصت ہو گئی۔ پھول متی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔

(5)

ایک سال گزر گیا۔ پھول متی کا کمرہ گھر میں سب کمروں سے وسیع اور ہوادار تھا۔ اس نے اسے بڑی بہو کے لیے خالی کر دیا اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں رہنے لگی۔ جیسے کوئی بھکارن ہو۔ لڑکوں اور بہوؤں سے اب اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ اب گھر کی لونڈی تھی۔ گھر کے کسی فرد کے معاملے سے اسے دلچسپی نہ تھی۔ وہ زندہ صرف اس

لیے تھی کہ اسے موت نہ آتی تھی۔ خوشی یا رنج کا اس کے اوپر کوئی اثر نہ تھا۔ امانا تھ کا مطب کھلا' احباب کی دعوت ہوئی۔ دیانا تھ نے اخبار جاری کیا۔ پھر جلسہ ہوا۔ سیتانا تھ کو وظیفہ ملا۔ وہ ولایت پڑھنے گیا۔ پھر جشن ہوا۔ کامتانا تھ کے بڑے لڑکے کا یگیوپویت ہوا۔ خوب دھوم دھام ہوئی۔ پھول متی کے چہرے پر مسرت کی خفیف سی جھلک بھی نظر نہ آئی۔ امانا تھ ''ٹائیفائیڈ'' میں مہینہ بھر بیمار رہے۔ دیانا تھ نے ایک مضمون لکھا اور دفعہ 144 میں چھ مہینے کے لیے جیل چلے گئے۔ امانا تھ نے ایک معاملے میں رشوت لے کر غلط رپورٹ لکھی اور سال بھر کے لیے معطل کر دیئے گئے۔ پھول متی کے چہرے پر رنج کی پرچھائیں تک نہ پڑیں۔ اس کی زندگی میں کسی قسم کی دلچسپی' کوئی آرزو' کوئی فکر نہ تھی۔ بس چوپایوں کی طرح کام کرنا اور کھانا' یہی اس کی زندگی کے دو کام تھے۔ جانور مارنے سے کام کرتا ہے مگر کھاتا ہے دل سے۔ وہ بے کہے کام کرتی تھی' مگر کھاتی کم تھی۔ زہر کے نوالوں کی طرح۔ مہینوں سر میں تیل نہ پڑتا۔ مہینوں کپڑے نہ دھلتے۔ کچھ پروا نہیں۔ اس میں احساس ہی گویا فنا ہو گیا تھا۔

ساون کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ ملیریا پھیل رہا تھا۔ آسمان پر مٹیالے بادل' زمین پر مٹیالا پانی' نم ہوا سینوں میں بلغم اور کف بھرتی پھرتی تھی۔ مہری اور کہارن دونوں بیمار پڑ گئے۔ پھول متی نے گھر کے سارے برتن مانجھے۔ پانی میں بھیگ کر سارا کام کیا۔ آگ جلائی۔ پتیلیاں چڑھا دیں اور گنگا سے پانی لانے چلی۔ کامتانا تھ روزانہ گنگا جل پیتے تھے۔ نل کا پانی انہیں موافق نہ تھا۔

کامتانا تھ نے چارپائی پر بیٹھے بیٹھے کہا۔ ''رہنے دو اماں' میں پانی بھر لاؤں گا۔ کہار اور مہری آج دونوں غائب ہیں۔''

پھول متی نے مٹیالے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تم بھیگ جاؤ گے بیٹا! سردی ہو جائے گی۔''

''تم بھی بھیگ رہی ہو' کہیں بیمار نہ پڑ جاؤ۔''

''میں بیمار نہیں پڑوں گی۔ مجھے بھگوان نے امر کر دیا ہے۔''

امانا تھ بھی وہیں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے مطب میں کچھ نفع نہ ہوتا تھا۔ اس لیے بہت پریشان رہتا تھا۔

''جانے بھی دو بھیّا بہت دنوں بہوؤں پر حکومت کر چکی ہے۔ اس کا خمیازہ اٹھانے دو۔''

گنگا بڑھی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا سمندر ہے۔ افق پانی کے ساحل سے ملا ہوا تھا۔ کنارے کے درختوں کی صرف پھنگیاں پانی کے اوپر نظر آتی تھیں۔ پھول متی کلسا لیے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری۔ پاؤں پھسلا۔ سنبھل نہ سکی۔ پانی میں گر پڑی۔ پل بھر ہاتھ پاؤں چلائے' پھر لہریں اسے نیچے کھینچ لے گئیں۔ کنارے پر دو چار پنڈت چلائے 'ارے بڑھیا ڈوبی جاتی ہے۔ دو چار آدمی دوڑے بھی لیکن پھول متی لہروں میں سما گئی تھی۔ ان بل کھاتی ہوئی لہروں میں' جنہیں دیکھ کر ہی انسان سہم اٹھتا ہے۔ ایک نے پوچھا۔

''یہ کون بڑھیا تھی؟''

''ارے وہی پنڈت اجودھیانا تھ کی بیوہ ہے۔''

''اجودھیانا تھ تو بہت بڑے آدمی تھے۔''

''ہاں اس کی تقدیر میں ٹھوکر کھانا لکھا تھا۔''

''اس کے تو کئی لڑکے بڑے بڑے ہیں اور سب کماتے ہیں۔''

''ہاں سب ہیں بھائی' مگر تقدیر بھی تو کوئی چیز ہے۔''

شانتی

مرحوم دیوناتھ میرے دوستوں میں سے تھے۔ آج بھی جب ان کی یاد آجاتی ہے تو وہ رنگ رلیاں آنکھوں میں پھر جاتی ہیں اور کہیں تنہائی میں جاکر ذرا دیر رو لیتا ہوں۔ میرے اور ان کے درمیان دو ڈھائی سو میل کا فاصلہ تھا۔ میں لکھنؤ میں تھا' وہ دہلی میں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا مہینہ جاتا کہ ہم آپس میں نہ مل لیتے ہوں۔ وہ نہایت شریف' محبت نواز اور دوستوں پر جان دینے والے آدمی تھے۔ جنہوں نے اپنے اور پرائے میں کبھی امتیاز نہیں کیا۔ دنیا کیا ہے اور یہاں شرافت و محبت کا صلہ کیا ملتا ہے' انہوں نے کبھی نہ جانا اور نہ جاننے کی کوشش کی۔ ان کی زندگی میں کئی ایسے مواقع آئے جب انہیں آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جانا چاہیے تھا۔ دوستوں نے ان کی صاف دلی سے نامناسب فائدہ اٹھایا اور کئی مرتبہ انہیں شرمندہ بھی ہونا پڑا۔ لیکن اس بھلے آدمی نے زندگی سے سبق لینے کی قسم کھائی تھی' ان کے طرزِ عمل میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ جیسے بھولا ناتھ جئے' ویسے ہی بھولا ناتھ مرے۔

جس دنیا میں وہ رہتے تھے' وہ نرالی دنیا تھی' جس میں بدگمانی و چالاکی اور بغض و حسد کے لیے گنجائش نہ تھی۔ سب اپنے تھے۔ کوئی غیر نہ تھا۔ میں نے بار بار انہیں متنبہ کرنا چاہا لیکن اس کا نتیجہ امید کے خلاف برآمد ہوا۔ زندگی کے خوابوں کو پریشان کرتے ہوئے ان کا دل دکھتا تھا۔ مجھے کبھی فکر ہوتی تھی کہ انہوں نے ہاتھ بند نہ کیا تو نتیجہ کیا ہو گا۔ مصیبت یہ تھی کہ ان کی بیوی گوپا بھی کچھ اسی سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ ہماری دیویوں میں جو ایک مآل اندیشی ہوتی ہے اور اڑاؤ مردوں کی غیر مآل اندیشیوں کے لیے بینک کا کام کرتی ہیں' اس سے گوپا محروم تھی۔ یہاں تک کہ اسے کپڑوں اور زیوروں کا شوق بھی نہ تھا۔

جب مجھے دیوناتھ کے انتقال کی خبر ملی اور میں بھاگا ہوا دہلی گیا تو گھر میں برتن بھانڈے کے سوا اور کوئی سامان نہ تھا۔ ابھی مرحوم کی عمر ہی کیا تھی جو زیادہ فکر کرتے۔ پورے چالیس کے بھی تو نہ ہوئے تھے۔ یوں تو لڑکپن ان کی سرشت میں داخل تھا۔ لیکن اس عمر میں سب ہی لوگ بے فکر ہوتے ہیں۔ پہلے ایک لڑکی ہوئی تھی۔ اس کے بعد دو لڑکے ہوئے' دونوں لڑکے تو بچپن ہی میں داغ دے گئے' لڑکی بچ رہی تھی۔

جس طرزِ معاشرت کے وہ عادی تھے' اسے دیکھتے ہوئے اس مختصر کنبے کے لیے دو سو روپے ماہوار کی ضرورت تھی۔ دو تین سال میں لڑکی کا بیاہ بھی کرنا ہو گا۔ کیسے کیا ہو گا۔ میری عقل کام نہ کرتی تھی۔

اس موقع پر مجھے یہ بیش قیمت تجربہ ہوا کہ جو لوگ خدمتِ خلق کرتے ہیں اور ذاتی مفاد کو اپنی زندگی کا مقصد نہیں سمجھتے' ان کے پسماندوں کو آڑ دینے والوں کی کبھی کمی نہیں رہتی۔ یہ کوئی قاعدہ نہیں ہے' کیونکہ میں نے ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے' جنہوں نے زندگی میں بہتوں کے ساتھ سلوک کیے۔ لیکن ان کے بعد ان کے بال بچوں کی کسی نے بات تک نہ پوچھی۔ لیکن چاہے کچھ ہو دیوناتھ کے دوستوں نے شرافت سے کام لیا اور گوپا کی بسر اوقات کے لیے روپیہ جمع کرنے کی تجویز کی۔ ایک صاحب جو رنڈوے تھے' اس سے بیاہ کرنے کو بھی تیار تھے۔ لیکن گوپا نے بھی اسی جذبے کا اظہار کیا جو ہماری دیویوں کا جوہر ہے اور تجویز کو رد کر دیا۔ مکان بہت بڑا تھا۔ اس کا ایک حصہ کرائے پر اٹھا دیا۔ اس طرح اس کو پچاس روپے ملنے لگے۔ وہ اتنے ہی میں اپنا نباہ کر لے گی۔ جو کچھ خرچ تھا وہ سُنی کی ذات سے تھا۔

اس کے ایک مہینے بعد مجھے کاروبار کے سلسلے میں غیر ممالک جانا پڑااور وہاں میرے اندازے سے کہیں زیادہ دو سال لگ گئے۔ گوپا کے خط برابر جاتے رہتے تھے۔ جن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ آرام سے ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا گوپا نے مجھے غیر سمجھا اور صحیح حالت چھپاتی رہی۔

پردیس سے لوٹ کر میں سیدھا دہلی پہنچا۔ دروازے پر پہنچتے ہی مجھے رونا آگیا۔ موت کی افسردگی سی طاری تھی۔ جس کمرے میں دوستوں کے جمگھٹ رہتے تھے اس کے دروازے بند تھے۔ مکڑیوں نے چاروں طرف جالے تان رکھے تھے۔ پہلی نظر میں تو شبہ ہوا کہ دیوناتھ دروازے پر کھڑے میری طرف دیکھ کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ میں توہم پرست نہیں ہوں اور اجسام روحانی کا بھی قائل نہیں ہوں۔ لیکن اس وقت میں ایک بار چونک ضرور پڑا۔ دل میں ایک لرزش سی محسوس ہوئی۔ لیکن دوسری نظر میں یہ خیالی تصویر مٹ چکی تھی۔ دروازہ کھلا گوپا کے سوا کھولنے والا ہی کون تھا؟

میں نے اسے دیکھ کر دل تھام لیا۔ اسے میرے آنے کی اطلاع تھی اور اس نے میرے استقبال کے لیے نئی ساڑھی پہن لی۔ اور شاید بال بھی گوندھ لیے تھے۔ پر ان دو برسوں میں وقت نے اس پر جو مظالم ڈھائے تھے' انہیں وہ کیا کرتی؟ عورتوں کی زندگی میں یہ وہ عمر ہے جب حسن و شباب اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ جب اس میں الھڑپن' شرم اور بے اعتنائی کی جگہ لگاوٹ' خوش ادائی اور دل آویزی آجاتی ہے۔ لیکن گوپا کی جوانی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر جھریاں تھیں۔ بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ "کیا تم بیمار تھیں گوپا؟"

اس نے آنسو پی کر کہا۔ "نہیں تو' میرے تو کبھی سر میں درد بھی نہیں ہوا۔"

"تو تمہاری یہ کیا حالت ہے؟ بالکل بوڑھی ہو گئیں۔"

"تو اب جوانی لے کر کرنا ہی کیا ہے؟ میری عمر بھی تو بتیس سے اوپر ہو گئی۔"

"یہ عمر تو زیادہ نہیں ہوتی۔"

"ہاں ان کے لیے جو بہت جینا چاہتے ہوں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ جتنی جلدی ہو سکے زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ بس سنّی کے بیاہ کی فکر ہے۔ اس سے چھٹی پا جاؤں پھر مجھے زندگی کی پروا نہ رہے گی۔"

اب معلوم ہوا کہ جو صاحب اس مکان میں کرایہ دار تھے' وہ تھوڑے دنوں بعد تبدیل ہو کر چلے گئے اور تب سے کوئی دوسرا کرایہ دار نہ آیا۔ میرے دل میں برچھی سی چبھ گئی۔ اتنے دنوں ان بے چاروں نے کس طرح بسر کی ــــــ' خیال ہی دردناک تھا۔

میں نے متاسف ہو کر کہا۔ "لیکن تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی؟ کیا میں بالکل غیر ہوں؟"

گوپا نے شرمندہ ہو کر کہا۔ "نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔ تمہیں غیر سمجھوں گی تو اپنا کسے سمجھوں گی؟ میں نے سوچا پردیس میں' تم خود اپنے جھمیلے میں پڑے ہوں گے تمہیں کیا ستاؤں۔ کسی نہ کسی طرح دن کٹ ہی گئے۔ گھر میں اور کچھ نہ تھا تو تھوڑے سے گہنے تھے ہی' اب سنّی کے بیاہ کا فکر ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ اس مکان کو الگ کر دوں گی۔ بیس بائیس ہزار روپے مل جائیں گے۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ مکان پہلے ہی رہن ہو چکا ہے۔ اور سود ملا کر اس پر بیس بائیس ہزار روپے ہو گئے ہیں۔ مہاجن کی اتنی ہی دیا کیا کم ہے کہ مجھے گھر سے نکال نہیں دیا۔ ادھر سے تو اب کوئی امید نہیں۔ بہت ہاتھ پاؤں جوڑنے پر شاید مہاجن سے دو ڈھائی ہزار روپے اور مل جائیں۔ اتنے میں

کیا ہو گا؟اسی فکر میں گھلی جا رہی ہوں۔ لیکن میں بھی کتنی مطلبی ہوں نہ تمہیں ہاتھ منہ دھونے کو پانی دیا' نہ کچھ ناشتے کو لائی اور اپنا دکھڑا لے بیٹھی۔ اب آپ کپڑے اتاریئے اور آرام سے بیٹھیئے۔ کچھ کھانے کو لاؤں' کھا لیجئے۔ تب باتیں ہوں۔ گھر میں تو سب خیریت ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں تو بمبئی سے سیدھا یہاں آ رہا ہوں' گھر کہاں گیا؟"

گوپا نے مجھے مخمور نگاہوں سے دیکھا۔ اس وقت اس کی نگاہوں میں شباب کی جھلک تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے چہرے کی جھریاں مٹ گئی ہیں۔ چہرے پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ اس نے کہا۔ "اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمہاری دیوی جی تمہیں کبھی یہاں نہ آنے دیں گی۔"

"میں کسی کا غلام ہوں؟"

"کسی کو غلام بنانے کے لیے پہلے خود بھی اس کا غلام بننا پڑتا ہے۔"

شام ہو رہی تھی۔ سُنّی لالٹین لے کر کمرے میں آئی۔ دو سال پیشتر کی معصوم لڑکی اب شباب میں قدم رکھ چکی تھی۔ جسے میں گود میں اٹھا کر پیار کیا کرتا تھا۔ اس کی طرف آج آنکھیں نہ اٹھا سکا۔ اور وہ جو میرے گلے سے لپٹ کر خوش ہوتی تھی آج میرے سامنے کھڑی بھی نہ رہ سکی۔ جیسے مجھ سے کوئی چیز چھپانا چاہتی ہے اور جیسے میں اسے اس چیز کے چھپانے کا موقع دے رہا ہوں۔

میں نے پوچھا۔ "سُنّی اب تم کس درجے میں پڑھتی ہو؟"

اس نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔ "دسویں میں ہوں۔"

"گھر کا بھی کچھ کام کاج کرتی ہو؟"

"اماں جب کرنے بھی دیں۔"

گوپا نے کہا۔ "میں نہیں کرنے دیتی یا خود کسی کام کے قریب نہیں جاتی۔"

سُنّی منہ پھیر کر ہنستی ہوئی چلی گئی۔ ماں کی دلاری لڑکی تھی' جس دن وہ گرہستی کا کام کرتی اس دن شاید گوپا رو رو کر آنکھیں پھوڑ لیتی۔ وہ خود لڑکی کو کوئی کام نہ کرنے دیتی تھی۔ مگر سب سے شکایت کرتی تھی کہ وہ کام نہیں کرتی۔ یہ شکایت بھی اس کے پیار ہی کا ایک کرشمہ تھا۔

میں کھانا کھا کر لیٹا تو گوپا نے پھر سُنّی کی شادی کا ذکر چھیڑ دیا۔ اس کے سوا اس کے پاس اور بات ہی کیا تھی۔ لڑکے تو بہت ملتے ہیں' لیکن کچھ حیثیت بھی تو ہو۔ لڑکی کو یہ سوچنے کا موقع کیوں ملے کہ دادا ہوتے تو میرے لیے شاید اس سے اچھا بَر ڈھونڈتے۔ پھر گوپا نے ڈرتے ڈرتے لالہ مداری لال کے لڑکے کا ذکر کیا۔

میں نے متحیّر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ لالہ مداری لال پہلے انجینئر تھے اب پنشن پاتے تھے۔ لاکھوں روپے جمع کر لیے۔ پر اب تک ان کی حرص کی پیاس نہ بجھی تھی۔ گوپا نے گھر بھی وہ چھانٹا جہاں اس کی رسائی دشوار تھی۔

میں نے کہا۔ "مداری لال تو بہت ہی بڑا آدمی ہے۔"

گوپا نے دانت تلے زبان دبا کر کہا۔ "ارے نہیں بھیّا تم نے انہیں پہچانا نہ ہو گا۔ میرے اوپر بڑے دیالو ہیں۔ کبھی کبھی آ کر خیریت بھی پوچھ جاتے ہیں۔ لڑکا ایسا ہونہار ہے کہ میں تم سے کیا کہوں۔ پھر ان کے یہاں کمی کس بات کی ہے؟ یہ ٹھیک بات ہے کہ پہلے وہ خوب رشوت لیتے تھے' لیکن یہاں دھرماتما کون ہے۔ کون موقع پا کر چھوڑ دیتا ہے۔ مداری لال نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ وہ مجھ سے جہیز نہیں چاہتے۔ صرف لڑکی چاہتے ہیں۔ سُنّی ان

کے من میں بیٹھ گئی ہے؟"

مجھے گوپا کی سادگی پر رحم آیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ میں اس کے دل میں کسی کے خلاف شبہات پیدا کیوں کروں، شاید مداری اب وہ نہ رہے ہوں۔ انسان کی طبیعت بدلتی رہتی ہے۔

میں نے نیم متفق ہو کر کہا۔ "مگر یہ تو سوچو تم میں اور ان میں کس قدر فرق ہے۔ تم شاید اپنا سب کچھ قربان کر کے بھی ان کا منہ سیدھا نہ کر سکو۔"

لیکن گوپا کے من میں بات جم گئی تھی۔ سنتی کو وہ ایسے گھر میں بیاہنا چاہتی تھی جہاں وہ رانی بن کر رہے۔

دوسرے دن میں مداری لال کے پاس گیا اور ان سے جو میری بات چیت ہوئی اس نے مجھے مطمئن کر دیا۔ کسی زمانے میں وہ لالچی رہے ہوں گے لیکن اس وقت تو انہیں بہت بلند خیال اور پاک دل پایا۔

بولے۔ "بھائی صاحب میں دیوناتھ جی سے خوب واقف ہوں۔ وہ آدمیوں میں رتن تھے۔ ان کی لڑکی میرے گھر میں آئے یہ میری خوش قسمتی ہے۔ آپ اس کی ماں سے کہہ دیجئے مداری لال ان سے کسی چیز کی خواہش نہیں رکھتا۔ خدا کا دیا ہوا میرے گھر میں سب کچھ ہے۔ میں انہیں زیر بار کرنا نہیں چاہتا۔"

میرے دل کا بوجھ اتر گیا۔ ہم سنی سنائی باتوں سے دوسروں کے متعلق کیسی غلط رائے قائم کر لیتے ہیں۔ میں نے آکر گوپا کو مبارکباد دی۔ یہ طے ہوا کہ گرمیوں میں بیاہ کر دیا جائے گا۔

چار مہینے گوپا نے بیاہ کی تیاریوں میں کاٹے۔ میں مہینے میں ایک مرتبہ ضرور اس سے مل جاتا تھا۔ لیکن ہر مرتبہ مایوس ہو کر لوٹتا۔ گوپا نے اپنے خاندان کی عزت کا نہ جانے کتنا بڑا نصب العین اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ دیوانی اس بھرم میں پڑی ہوئی تھی کہ اس کی اولوالعزمی شہر میں اپنی یادگار چھوڑ جائے گی۔ یہ جانتی تھی کہ یہاں ایسے تماشے روز ہوتے ہیں اور آئے دن بھلا دیئے جاتے ہیں۔ شاید وہ دنیا سے یہ کہلانا چاہتی تھی کہ اس گئی گزری حالت میں بھی مرا ہوا ہاتھی نولاکھ کا ہے۔ قدم قدم پر اسے دیوناتھ کی یاد آتی۔ وہ ہوتے تو یہ کام کیوں نہ ہوتا۔ یوں ہوتا۔ اور تب وہ روتی۔ مداری لال نیک آدمی ہے سچ ہے۔ لیکن گوپا کا اپنی بیٹی کے متعلق بھی تو کچھ فرض ہے۔ اس کی دس پانچ لڑکیاں تھوڑی ہی ہیں۔ وہ تو دل کھول کر ارمان نکالے گی۔ سنتی کے لیے اس نے جتنے گہنے اور جوڑے بنوائے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تعجب ہوتا تھا۔ جب دیکھو کچھ نہ کچھ سی رہی ہے۔ محلے میں شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا، جس سے اس نے قرض نہ لیا ہو۔ وہ اسے قرض سمجھتی تھی، پر دینے والے دان سمجھ کر دیتے تھے۔ سارا محلہ اس کا مددگار تھا۔ سنتی اب محلے کی لڑکی تھی۔ گوپا کی عزت اب سب کی عزت ہے۔ اور گوپا کے لیے تو نیند اور آرام حرام تھا۔ درد سے سر پھٹا جا رہا تھا، آدھی رات ہو گئی ہے مگر وہ بیٹھی کچھ سی رہی ہے۔

اکیلی عورت اور وہ بھی نیم جان اور کیا کیا کرے؟ جو کام دوسروں پر چھوڑ دیتی ہے اس میں کچھ نہ کچھ خرابی ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی ہمت ہے کہ کسی طرح نہیں مانتی۔

پچھلی مرتبہ اس کی حالت دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔" بولا۔ "گوپا دیوی اگر مرنا ہی چاہتی ہو تو شادی ہو جانے کے بعد مرنا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم اس سے پہلے ہی کہیں چل نہ دو۔"

گوپا نے جواب دیا۔ "بھیا اس کی فکر نہ کرو۔ بیوہ کی عمر بہت لمبی ہوتی ہے۔ تم نے سنا نہیں۔ رانڈ مرے نہ کھنڈر ڈھئے۔ لیکن میری تمنا یہی ہے کہ سنتی کا ٹھکانا لگا کر میں بھی چل دوں۔ اب اور زندہ رہ کر کیا کروں گی، سوچو کیا کروں۔ اگر کسی طرح کا رخنہ پڑ گیا تو کس کی بدنامی ہوگی؟ ان چار مہینوں میں مشکل سے گھنٹہ بھر سوتی ہوں گی۔ نیند

ہی نہیں آتی۔ لیکن میرا دل خوش ہے۔ میں مروں یا جیوؤں مجھے تسکین تو ہوگی کہ سَنتی کے لیے اس کا باپ جو کر سکتا تھا وہ میں نے کر دیا۔ مداری لال نے اپنی شرافت دکھائی تو مجھے تو اپنی ناک رکھنی ہے۔"

ایک دیوی نے آکر کہا۔ "بہن! ذرا چل کر دیکھ لو۔ چاشنی ٹھیک ہو گئی ہے یا نہیں۔" گوپا اس کے ساتھ چاشنی کا امتحان کرنے گئی۔ اور لمحے کے بعد آکر بولی۔ "جی چاہتا ہے کہ سر پیٹ لوں۔ تم سے ذرا باتیں کرنے لگی۔ ادھر چاشنی اتنی کڑی ہو گئی کہ لڈو دانتوں سے لڑیں گے۔ کسی سے کیا کہوں؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "تم بے کار جھنجھٹ کر رہی ہو۔ کیوں نہیں کسی حلوائی کو بلا کر مٹھائیوں کا ٹھیکہ دے دیتیں؟ پھر تمہارے یہاں مہمان ہی کتنے آئیں گے۔ جن کے لیے یہ طومار باندھ رہی ہو۔ دس پانچ کی مٹھائی ان کے لیے بہت ہوگی۔" میری یہ بات شاید گوپا کو ناگوار گزری۔ ان دنوں اسے بات بات پر غصہ آ جاتا تھا۔

بولی۔ "بھیا! تم یہ باتیں نہ سمجھو گے۔ تمہیں یقینی نہ ماں بننے کا موقع ملا' نہ بیوی بننے کا۔ سنیتا کے باپ کا کتنا نام تھا۔ کتنے آدمی ان کے دم سے پلتے تھے۔ کیا تم نہیں جانتے۔ یہ پگڑی میرے ہی سر تو بندھی ہے۔ تمہیں یقین نہ آئے گا' ناستک ہی جو ٹھہرے۔ پر میں تو انہیں سدا اپنے اندر بیٹھا ہوا پاتی ہوں۔ جو کچھ کر رہے ہیں وہی کر رہے ہیں۔ میں ناقص العقل بھلا اکیلی کر لیتی؟ وہی میرے مددگار ہیں۔ وہی میرے رہبر ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ جسم میرا ہے لیکن اس کے اندر جو آتما ہے وہ ان کی ہے۔ تم ان کے دوست ہو' تم نے اپنے سینکڑوں روپے خرچ کیے اور حیران ہو رہے ہو۔ میں تو ان کی شریک زندگی ہوں۔ لوک میں بھی اور پرلوک میں بھی۔"

میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

جون میں شادی ہو گئی۔ گوپا نے بہت کچھ دیا اور اپنی حیثیت سے بہت زیادہ دیا۔ لیکن پھر بھی اس کا دل مطمئن نہ ہوا۔ آج سَنتی کے باپ ہوتے تو نہ جانے کیا کرتے۔ بار بار یہ کہتی اور روتی رہی۔

جاڑوں میں میں پھر دہلی آگیا۔ میرا خیال تھا کہ گوپا اب خوش ہو گی۔ لڑکی کا گھر اور بَر دونوں اچھے ہیں۔ گوپا کو اس کے سوا اور کیا چاہیے' لیکن سکھ اس کے مقدر ہی میں نہ تھا۔

میں ابھی کپڑے بھی نہ اتارنے پایا تھا کہ اس نے دکھڑا شروع کر دیا۔ بھیّا گھر دوار سب کچھ اچھا ہے۔ ساس سسر بھی اچھے ہیں۔ لیکن داماد نکما نکلا۔ سَنتی بے چاری رو رو کے دن کاٹ رہی ہے۔ تم اسے دیکھو تو پہچان نہ سکو بس اس کا سایہ ہی رہ گیا ہے۔ ابھی چند دن ہوئے آئی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر چھاتی پھٹتی ہے۔ نہ تن بدن کی سُدھ ہے نہ کپڑے لتّے کی۔ میری سَنتی کی یہ درگت ہو گی۔ یہ تو میں نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔ بالکل گم سم ہو گئی۔ کتنا پوچھا بیٹا! تجھ سے وہ کیوں نہیں بولتا۔ بس آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے ہیں۔ میری سَنتی تو کنوئیں میں گر گئی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے اس کے گھر والوں سے پتا نہیں لگایا؟"

"لگایا کیوں نہیں بھیّا! سب حال معلوم ہو گیا۔ لڑکا چاہتا ہے کہ میں جس راہ جاؤں سَنتی میری پوجا کرتی رہے۔ سَنتی بھلا اسے کیوں سہنے لگی۔ اسے تم جانتے ہو کہ کتنی خوددار ہے۔ وہ ان عورتوں میں نہیں ہے جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں اور اس کی بدسلوکیاں برداشت کرتی رہتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ پیار دلار پایا ہے۔ باپ بھی اس پر جان دیتا تھا۔ میں بھی آنکھ کی پُتلی سمجھتی تھی۔ شوہر ملا چھیلا' جو آدھی آدھی رات تک مارا مارا پھرتا ہے۔ دونوں میں کیا بات ہوئی۔ یہ کون جان سکتا ہے۔ لیکن دونوں میں کوئی گانٹھ پڑ گئی ہے۔ نہ وہ سَنتی کی پروا کرتا ہے۔ اور نہ سَنتی اس کی پروا کرتی ہے۔ مگر وہ تو اپنے رنگ میں مست ہے۔ سَنتی جان دے دی گی۔"

میں نے کہا۔ "لیکن تم نے سَنتی کو سمجھایا نہیں۔ اس لونڈے کا کیا بگڑے گا۔ اس کی تو زندگی خراب ہو جائے گی۔"

گوپا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بولی۔ "بھیّا! کس دل سے سمجھاؤں۔ سَنتی کو دیکھ کر میری چھاتی پھٹتی ہے۔ بس یہی جی چاہتا ہے کہ اسے اپنے کلیجے میں رکھ لوں کہ اسے کوئی کڑی آنکھ سے دیکھ بھی نہ سکے۔ سَنتی پھوہڑ ہوتی' آرام طلب ہوتی تو سمجھاتی بھی۔ کیا یہ سمجھاؤں کہ تیرا شوہر گلی گلی منہ کالا کرتا پھرے اور تو اس کی پوجا کر۔ میں تو خود یہ ذلت برداشت نہ کر سکتی۔ مرد اور عورت میں بیاہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ دونوں سولہ آنے ایک دوسرے کے ہو جائیں۔ ایسے مرد کم ہیں جو عورت کی جَو برابر کج نگاہی بھی برداشت کر سکیں۔ لیکن ایسی عورتیں بہت ہیں' جو شوہر کو دیوتا سمجھتی ہیں۔ سَنتی ان عورتوں میں نہیں ہے۔ وہ اگر محبت کرتی ہے تو محبت چاہتی ہے اور اگر شوہر میں یہ بات نہ ہوئی تو وہ اس سے واسطہ نہیں رکھے گی۔ چاہے اس کی ساری زندگی روتے کٹے۔"

یہ کہہ کر گوپا اندر گئی اور ایک سنگاردان لا کر بولی۔ "سَنتی اب کے اسے یہیں چھوڑ گئی۔ اسی لیے آئی تھی۔ یہ وہ گہنے ہیں جنہیں میں نے نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کر کے بنوائے تھے۔ ان کے پیچھے ماری ماری پھرتی تھی۔ یوں کہو کہ بھیک مانگ کر جمع کیے تھے۔ سنتی اب ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتی۔ پہنے تو کس لیے؟ سنگھار کرے تو کس پر۔ پانچ صندوق کپڑوں کے دیئے تھے۔ کپڑے سیتے سیتے میری آنکھیں پھوٹ گئیں۔ وہ سب کپڑے اٹھا لائی۔ ان چیزوں سے اسے اب نفرت سی ہو گئی ہے۔ بس کلائی میں کانچ کی دو چوڑیاں اور اجلی ساڑھی' یہی اس کا سنگار ہے۔"

میں نے گوپا کو دلاسا دیا کہ "میں جا کر ذرا کیدار ناتھ سے ملوں گا۔ دیکھوں تو وہ کس رنگ ڈھنگ کا آدمی ہے۔"

گوپا نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "بھیّا! بھول کر بھی نہ جانا۔ سَنتی سنتے ہی جان دے دے گی۔ غیرت کی پتلی ہی سمجھو اسے۔ رسی سمجھ لو' جس کے جل جانے پر بھی بل نہیں جاتے' جن پیروں نے اسے ٹھکرا دیا' انہیں وہ کبھی نہ سہلائے گی۔ اسے اپنا بنا کر کوئی چاہے تو لونڈی بنا لے' لیکن حکومت تو اس نے میری نہ سہی' دوسروں کی کیا سہے گی۔"

میں نے گوپا سے تو اس وقت کچھ نہ کہا لیکن موقع پاتے ہی لالہ مداری لال سے ملا۔ میں راز معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اتفاق سے باپ بیٹا دونوں ایک ہی جگہ مل گئے۔ مجھے دیکھتے ہی کیدار ناتھ نے اس طرح جھک کر چرن چھوئے کہ میں اس کی سعادت مندی سے متاثر ہو گیا۔ جلدی سے اندر گیا اور چائے' مربہ اور مٹھائیاں لایا۔ اتنا شائستہ' اتنا شریف اور اتنا خلیق نوجوان میں نے نہ دیکھا تھا۔ یہ گمان ہی نہ ہو سکتا تھا کہ اس کے اندر اور باہر میں کوئی فرق ہے۔ جب تک رہا سر جھکائے بیٹھا رہا۔ جب وہ ٹینس کھیلنے چلا گیا تو میں نے مداری لال سے کہا۔

"کیدار ناتھ بابو تو بہت ہی نیک معلوم ہوتے ہیں۔ پھر میاں بیوی میں اتنی کشیدگی کیوں ہو گئی ہے؟"

مداری لال نے ایک لمحہ غور کر کے جواب دیا۔ "اس کا سبب سوا اس کے اور کیا بتاؤں کہ دونوں اپنے ماں باپ کے لاڈلے ہیں اور پیار لڑکوں کو اپنے من کا بنا دیتا ہے۔ میری ساری عمر محنت میں کٹی۔ اب جا کر ذرا راحت ملی ہے۔ رنگ رلیوں کا کبھی موقع ہی نہ ملا۔ دن بھر محنت کرتا تھا اور شام کو پڑ کر سو رہتا تھا۔ صحت بھی اچھی تھی اس لیے برابر یہی فکر سوار رہتی تھی کہ کچھ جمع بھی کر لوں۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پیچھے میرے بال بچے بھیک مانگتے پھریں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان مہاشے کو مفت کی دولت ملی۔ سنک سوار ہو گئی۔ شراب اڑنے لگی۔ پھر ڈرامہ کھیلنے کا شوق ہوا۔ روپے کی کمی تھی نہیں۔ اس پر ماں باپ کے اکیلے بیٹے۔ ان کی خوشی ہی ہماری زندگی کی بہشت تھی۔ پڑھنا لکھنا تو دور رہا' آوارگی کی طرف رجحان بڑھتا گیا۔ رنگ اور گہرا ہوا اور اپنی زندگی کا ڈرامہ کھیلنے لگے۔ میں نے یہ رنگ دیکھا تو مجھے فکر

ہوئی۔ سوچا بیاہ کر دوں ٹھیک ہو جائے۔ گوپادیوی کا پیغام آیا تو میں نے منظور کر لیا۔ میں سَنتی کو دیکھ چکا تھا۔ سوچا ایسی خوبصورت بیوی پا کر اس کی اصلاح ہو جائے گی۔ لیکن اتفاق سے وہ بھی لاڈلی لڑکی تھی۔ ضدی اور ہٹیلی' مفاہمت کا زندگی میں کیا درجہ ہے اس کی اس کو خبر ہی نہیں۔ لوہا لوہے سے لڑ گیا۔ یہ ہے سارا بھید اور صاحب میں تو بہو کو ہی زیادہ خطاوار سمجھتا ہوں۔ لڑکے تو سب ہی من چلے ہوتے ہیں۔ لڑکیاں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہیں۔ ان کی سیوا' قربانی اور محبت یہی ان کے وہ ہتھیار ہیں جن سے وہ اپنے شوہر پر فتح حاصل کر لیتی ہیں۔ بہو میں یہ گن نہیں ہے۔ ناؤ کیسے پار ہو گی۔ خدا ہی جانے۔"

اتنے میں سَنتی اندر سے آ گئی۔ اپنی تصویر کا مٹا ہوا خاکہ تھا۔ کندن تپ کر مجسم ہو گیا تھا۔ مٹی ہوئی تمناؤں کی اس سے اچھی تصویر نہیں ہو سکتی۔ مجھ پر طعن کرتی ہوئی بولی۔ "آپ جانے کب سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے خبر تک نہیں اور آپ شاید باہر ہی باہر چلے بھی جاتے۔"

میں نے اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ "نہیں سَنتی! یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ تمہارے پاس آ ہی رہا تھا کہ تم خود آ گئیں۔"

لالہ مداری لال کمرے سے باہر اپنی موٹر کی صفائی کرانے لگے۔ شاید مجھے سَنتی سے بات چیت کا موقع دینا چاہتے تھے۔

سَنتی نے پوچھا۔ "اماں تو اچھی طرح ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ہاں وہ تو اچھی ہیں لیکن تم نے اپنی کیا گت بنا رکھی ہے؟"

"میں تو بہت اچھی طرح ہوں۔"

"یہ بات کیا ہے؟ تم لوگوں میں کیا ان بن ہے؟ گوپادیوی جان دیئے ڈالتی ہیں۔ تم خود مرنے کی تیاری کر رہی ہو۔ کچھ تو عقل سے کام لو۔"

سَنتی کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ وہ بولی۔ "آپ نے ناحق یہ گفتگو چھیڑی۔ میں نے تو یہ سوچ کر اپنے دل کو سمجھا لیا کہ میں بدنصیب ہوں۔ بس ان باتوں کا علاج میرے قابو سے باہر ہے۔ میں اس زندگی سے موت کو کہیں بہتر سمجھتی ہوں۔ جہاں اپنی قدر نہ ہو۔ زندگی کی کوئی دوسری شکل میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس معاملے میں کسی طرح کا سمجھوتہ کرنا میرے لیے غیر ممکن ہے۔ نتیجے کی میں پروا نہیں کرتی۔"

"لیکن ـــــ"

"نہیں چاچا جی۔ اس معاملے میں آپ کچھ نہ کہیے' نہیں تو چلی جاؤں گی۔"

"آخر سوچو تو۔"

"میں سب سوچ چکی اور طے کر چکی۔ حیوان کو انسان بنانا میری طاقت سے باہر ہے۔"

مئی کا مہینہ تھا۔ میں منصوری گیا ہوا تھا کہ گوپا کا تار پہنچا۔ "فوراً آؤ بہت ضروری کام ہے۔" میں گھبرا کر دوسرے ہی دن دہلی پہنچا۔ گوپا دق کی مریضہ معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے پوچھا:

"سَنتی تو اچھی ہے؟"

اس نے جواب دیا "ہاں۔"

"کیدارناتھ؟"

”وہ بھی اچھی طرح ہے۔“

”تو کیا ماجرا ہے؟“

”کچھ نہیں۔“

”تم نے مجھے تار دے کر بلایا اور پھر کہتی ہو کہ کوئی بات نہیں۔“

”دل گھبرا رہا تھا۔ اس لیے تم کو بلا لیا۔ سَنتی کو کس طرح سمجھا کر یہاں لانا ہے۔ میں تو سب کچھ کر کے تھک گئی۔“

”کیا ادھر کوئی نئی بات ہوئی ہے؟“

”نئی تو نہیں لیکن ایک طرح سے نئی ہی سمجھو۔ کیدار ایک ایکٹریس کے ساتھ کہیں بھاگ گیا۔ ایک ہفتہ سے کچھ پتا نہیں۔ سَنتی سے کہہ گیا ہے کہ جب تک تم رہو گی، میں گھر میں قدم نہ رکھوں گا۔ سنا ہے کہ کیدار اپنے باپ کے جعلی دستخط بنا کر کئی ہزار روپے بھی بینک سے لے گیا ہے۔“

”تم سَنتی سے ملی تھیں؟“

”ہاں تین دن سے برابر جا رہی ہوں۔“

”اگر سَنتی نہیں آنا چاہتی تو تم رہنے کیوں نہیں دیتیں؟“

”وہاں وہ گھٹ گھٹ کر مر جائے گی۔“

”میں اسی وقت مداری لال کے پاس گیا۔ وہ میری صورت دیکھتے ہی بولے۔ ”بھائی صاحب میں لٹ گیا، لڑکا بھی اور بہو بھی گئی۔“

معلوم ہوا کہ جب سے کیدار غائب ہو گیا ہے، سَنتی اور بھی اداس رہنے لگی تھی۔ اس نے اسی دن اپنی چوڑیاں توڑ ڈالی تھیں اور مانگ کا سیندور پونچھ ڈالا تھا۔ کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ آج صبح وہ جمنا اشنان کرنے گئی۔ اندھیرا تھا۔ سارا گھر سو رہا تھا۔ کسی کو نہیں جگایا۔ جب دن چڑھ گیا اور بہو نہ ملی تو اس کی تلاش ہونے لگی۔ دوپہر کو پتہ ملا کہ جمنا گئی ہے۔ لوگ ادھر بھاگے۔ وہاں اس کی لاش ملی۔ پولیس آئی۔ لاش کا معائنہ ہوا۔ اب لاش ملی ہے۔ میں کلیجہ تھام کر بیٹھ گیا۔ ارتھی کے ساتھ گیا۔ اور وہاں سے لوٹا تو رات کے دس بج چکے تھے۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ خبر پا کر گوپا کی کیا حالت ہو گی؟ اس ابھاگن کے باغِ تمنا میں یہی ایک پودا تھا، اسے اپنے خونِ جگر سے سینچ کر پال رہی تھی۔ اس کی نسبت سنہرے خواب ہی اس کی زندگی کا ماحصل تھا۔ اس میں کونپلیں نکلیں گی۔ پھول کھلیں گے۔ پھل آئیں گے۔ چڑیاں اس کی ڈالیوں پر بیٹھ کر اپنے سہانے راگ گائیں گی۔ لیکن آج موت کے بے رحم ہاتھوں نے اس پودے کو اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کی زندگی اب بیکار تھی۔ وہ نقطہ ہی مٹ گیا تھا جس پر زندگی کے تمام خطوط آ کر ملتے تھے۔ دل کو دونوں ہاتھوں سے تھامے، میں نے زنجیر کھٹکھٹائی۔ گوپا ایک لالٹین لیے نکلی۔ میں نے گوپا کے چہرے پر سکون کی نئی جھلک دیکھی۔ اس نے مجھے غمگین دیکھ کر محبت سے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”آج تو تمہیں سارا دن روتے ہی کٹا۔ لاش کے ساتھ تو بہت آدمی تھے؟ میرے جی میں بھی آیا تھا کہ چل کر سَنتی کا آخری درشن کر لوں۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب سَنتی ہی نہ رہی تو اس لاش میں کیا رکھا ہے، نہ گئی۔“

میں حیرت سے گوپا کا منہ دیکھنے لگا۔ اسے اس افسوسناک حادثے کی اطلاع مل گئی تھی۔ لیکن وہ کس قدر صابر و پُرسکون ہے۔ میں نے کہا۔ ”اچھا کیا تم نہ گئیں رونا ہی تو تھا۔“

گوپانے کہا۔ "ہاں اور کیا روئی تو یہاں بھی۔ لیکن تم سے سچ کہتی ہوں کہ دل سے نہیں روئی۔ نہ جانے آنسو کس طرح نکل آئے۔ مجھے دراصل سَنتی کی موت سے خوشی ہوئی۔ بدنصیب اپنی غیرت و خودداری کے لیے دنیا سے رخصت ہو گئی۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا دیکھنا پڑتا۔ اس لیے اور بھی خوش ہوں کہ اس نے اپنی آن نبھادی۔ عورت کو زندگی میں محبت نہ ملے تو اس کا مرنا ہی اچھا ہے۔ تم نے سَنتی کی لاش دیکھی تھی۔ لوگ کہتے ہیں ایسا جان پڑتا کہ مسکرا رہی ہے۔ میری سَنتی سچ مچ دیوی تھی۔ بھیا انسان اس لیے تھوڑا ہی جینا چاہتا ہے کہ روتا رہے۔ جب معلوم ہو گیا کہ زندگی میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں تو آدمی جی کر کیا کرے؟ کس لیے جئے۔ کھانے' سونے اور مر جانے کے لیے؟ یہ میں نہیں کہتی کہ مجھے سَنتی کی یاد نہ آئے گی یا میں اسے یاد کر کے روؤں گی نہیں۔ لیکن غم کے آنسو نہ ہوں گے۔ خوشی کے آنسو ہوں گے۔ بہادر بیٹے کی ماں اس کی بہادری سے خوش ہوتی ہے۔ سَنتی کی موت کیا کم باعثِ فخر ہے؟ میں آنسو بہا کر اس فخر کو کیوں برباد کروں؟ وہ جانتی ہے کہ چاہے ساری دنیا اس کی مذمت کرے۔ اس کی ماں اس کی تعریف ہی کرے گی۔ اس کی روح سے یہ مسرت بھی چھین لوں؟ لیکن اب رات زیادہ ہو گئی ہے اوپر جا کر سو رہو' میں نے تمہاری چارپائی بچھا دی ہے۔ مگر دیکھو اکیلے پڑے پڑے رونا نہیں۔ سَنتی نے وہی کیا جو اسے کرنا چاہیے تھا۔ اس کے پتا ہوتے تو آج سَنتی کی مورت بنا کر پوجتے۔"

روشنی

(1)

آئی سی ایس پاس کر کے ہندوستان آیا تو مجھے صوبہ جات متحدہ کے ایک کوہستانی علاقے میں ایک سب ڈویژن کا چارج ملا۔ مجھے شکار کا بہت شوق تھا اور کوہستانی علاقے میں شکار کی کیا کمی' میری دلی مراد بر آئی۔ ایک پہاڑ کے دامن میں میرا بنگلہ تھا۔ بنگلے پر کچہری کر لیا کرتا تھا۔ اگر کوئی شکایت تھی تو یہ کہ سوسائٹی نہ تھی۔ اس لیے سیر و شکار اور اخبارات و رسائل سے اس کمی کو پورا کیا کرتا تھا۔ امریکہ اور یورپ کے کئی اخبار اور رسالے آتے تھے۔ ان کے مضامین کی شگفتگی اور جدت اور خیال آرائی کے مقابلے میں ہندوستانی اخبار اور رسالے بھلا کیا جچتے' سوچتا تھا وہ دن کب آئے گا کہ ہمارے یہاں بھی ایسے شاندار رسالے نکلیں گے۔

بہار کا موسم تھا۔ پھاگن کا مہینہ۔ میں دورے پر نکلا اور کندھوار کے تھانے کا معائنہ کر کے گجن پور کے تھانے کو چلا۔ کوئی اٹھارہ میل کی مسافت تھی' مگر منظر نہایت سہانا۔ دھوپ میں کسی قدر تیزی تھی' مگر ناخوشگوار نہیں۔ ہوا میں بھینی بھینی خوشبو تھی۔ آم کے درختوں میں بُور آ گئے تھے اور کوئل کوکنے لگی تھی۔ کندھے پر بندوق رکھ لی تھی کہ کوئی شکار مل جائے تو لیتا چلوں۔ کچھ اپنی حفاظت کا بھی خیال تھا' کیونکہ ان دنوں جا بجا ڈاکے پڑ رہے تھے۔ میں نے گھوڑے کی گردن سہلائی اور کہا: "چلو بیٹا چلو! ڈھائی تین گھنٹے کی دوڑ ہے۔ شام ہوتے گجن پور پہنچ جائیں گے۔" ساتھ کے ملازم پہلے ہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔

جا بجا کاشتکار کھیتوں میں کام کرتے نظر آتے تھے۔ ربیع کی فصل تیار ہو چکی تھی۔ اوکھ اور خربوزے کے لیے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ ذرا ذرا سے مزرعے تھے۔ وہی باوا آدم کے زمانے کے بوسیدہ ہل' وہی افسوسناک جہالت' وہی شرمناک نیم برہنگی' اس قوم کا خدا ہی حافظ ہے۔ گورنمنٹ لاکھوں روپے زراعتی اصلاحوں پر صرف کرتی ہے۔ نئی نئی تحقیقاتیں اور ایجادیں ہوتی ہیں۔ ڈائریکٹر' انسپکٹر سب موجود اور حالت میں کوئی اصلاح اور کوئی تغیّر نہیں۔ مغرب میں تعلیم کا طوفانِ بے تمیزی برپا ہے۔ یہاں مدرسوں میں کتے لوٹتے ہیں۔ جب مدرسے میں پہنچ جاتا ہوں تو مدرس کو کھاٹ پر نیم غنودگی کی حالت میں لیٹے پاتا ہوں۔ بڑی دوا دوش سے دس بیس لڑکے جوڑے جاتے ہیں۔ جس قوم پر جمود نے اس حد تک قبضہ کر لیا ہو اس کا مستقبل انتہا درجہ مایوس کن ہے۔ اچھے اچھے تعلیم یافتہ آدمیوں کو سلف کی یاد میں آنسو بہاتے دیکھتا ہوں۔ مانا کہ ایشیا کے جزائر میں آرین مبلغوں نے مذہب کی روح پھونکی تھی۔ یہ بھی مان لیا کہ کسی زمانے میں آسٹریلیا بھی آرین تہذیب کا ممنون تھا۔ لیکن اس سلف پروری سے کیا حاصل۔ آج تو مغرب دنیا کا مشعل ہدایت ہے۔ ننھا انگلینڈ نصف کرۂ زمین پر حاوی۔ اپنی صنعت و حرفت کی بدولت بیشک مغرب نے دنیا کو ایک نیا پیغام عمل عطا کیا ہے اور جس قوم میں اس پیغام پر عمل کرنے کی قوت نہیں ہے' اس کا مستقبل تاریک ہے۔ جہاں آج بھی نیم برہنہ گوشہ نشین فقیروں کی عظمت کے راگ الاپے جاتے ہیں۔ جہاں آج بھی شجر و حجر کی عبادت ہوتی ہے۔ جہاں آج بھی زندگی کے ہر شعبے میں مذہب گھسا ہوا ہے۔ اگر اس کی یہ حالت ہے تو تعجب کا مقام نہیں۔

میں انہی تصورات میں ڈوبا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دفعتہً ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا جسم میں لگا تو میں نے سر اوپر اٹھایا۔ مشرق کی جانب منظر گرد آلود ہو رہا تھا۔ افق گرد و غبار کے پردے میں چھپ گیا تھا۔ آندھی کی علامت تھی۔ میں نے گھوڑے کو تیز کیا۔ مگر لحہ بہ لحہ غبار کا پردہ وسیع اور بسیط ہوتا جاتا تھا۔ اور میرا راستہ بھی مشرق ہی کی جانب تھا۔ گویا میں یکتا و تنہا طوفان سے طوفان کا مقابلہ کرنے دوڑا جا رہا تھا۔ ہوا تیز ہو گئی۔ وہ پردۂ غبار سر پر آ پہنچا' اور دفعتہً میں گرد کے سمندر میں ڈوب گیا۔ ہوا' اتنی تند کہ کئی بار میں گھوڑے سے گرتے گرتے بچا۔ وہ سرسراہٹ اور گڑگڑاہٹ تھی کہ الاماں! گویا فطرت نے آندھی میں طوفان کی روح ڈال دی ہے۔ دس بیس ہزار توپیں ایک ساتھ چھوٹتیں۔ تب بھی اتنی ہولناک صدا نہ پیدا ہوتی۔ مارے گرد کے کچھ نہ سُوجھتا تھا۔ یہاں تک کہ راستہ بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُف ایک قیامت تھی' جس کی یاد سے آج بھی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ میں گھوڑے کی گردن سے چمٹ گیا اور اس کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ سنگریزے گرد کے ساتھ اڑ کر منہ پر اس طرح لگتے تھے' جیسے کوئی کنکریوں کو پچکاری میں بھر کر مار رہا ہو۔ ایک عجیب دہشت مجھ پر مسلّط ہو گئی۔ کسی درخت کے اکھڑنے کی آواز کانوں میں آ جاتی تو پیٹ میں میری آنتیں تک سمٹ جاتیں۔ کہیں کوئی درخت پہاڑ سے میرے اوپر گرے تو یہیں رہ جاؤں۔ طوفان میں تودے بھی ٹوٹ جاتے ہیں۔ کوئی ایسا تودہ لڑھکتا ہوا آ جائے تو بس خاتمہ ہے۔ ہلنے کی بھی گنجائش نہیں۔ پہاڑی راستہ کچھ سُجھائی دیتا نہیں۔ ایک قدم دائیں بائیں جاؤں تو ایک ہزار فٹ گہرے کھڈ میں پہنچ جاؤں۔ عجیب ہیجان میں مبتلا تھا۔ کہیں شام تک طوفان جاری رہا تو موت ہی ہے۔ رات کو کوئی درندہ آ کر صفایا کر دے گا۔ دل پر بے اختیار رقت کا غلبہ ہوا۔ موت بھی آئی تو اس حالت میں کہ لاش کا بھی پتا نہ چلے گا۔ افوہ! کتنی زور سے بجلی چمکی ہے کہ معلوم ہوا ایک نیزہ سینے کے اندر گھس گیا۔

دفعتہً چھن چھن کی آواز سن کر چونک پڑا۔ اس گڑگڑاہٹ میں بھی چھن چھن کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جیسے کوئی سانڈنی دوڑ رہی ہو۔ سانڈنی پر کوئی سوار تو ہو گا ہی' مگر اسے راستہ کیونکر سوجھ رہا ہے۔ کہیں سانڈنی ایک قدم بھی ادھر اُدھر ہو جائے تو بچہ تحت الثریٰ میں پہنچ جائے۔ کوئی زمیندار ہو گا۔ مجھے دیکھ کر شاید

پہچانے بھی نہیں، چہرے پر منوں گرد پڑی ہوئی ہے۔ مگر ہے بلا کا ہمت والا۔
ایک لمحہ میں چھن چھن کی آواز قریب آ گئی۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک جوان عورت سر پر ایک کھانچی رکھے قدم بڑھاتی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ ایک گز کے فاصلے سے بھی اس کا صرف دھندلا سا عکس نظر آیا۔ وہ عورت ہو کر اکیلی مردانہ وار چلی جا رہی ہے، نہ آندھی کا خوف ہے، نہ ٹوٹنے والے درختوں کا اندیشہ، نہ چٹانوں کے گرنے کا غم۔ گویا یہ بھی کوئی روزمرہ کا معمولی واقعہ ہے۔ مجھے اپنے دل میں غیرت کا احساس کبھی اتنا شدید نہ ہوا تھا۔
میں نے جیب سے رومال نکال کر منہ پونچھا اور اس سے بولا۔ ''او عورت گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''
میں نے پوچھا تو بلند لہجے میں مگر آواز دس گز بھی نہ پہنچی۔ عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں۔
میں نے چیخ کر پکارا۔ ''او عورت ذرا ٹھہر جا گجن پور یہاں سے کتنی دور ہے؟''
عورت رک گئی۔ اس نے میرے قریب آ کر مجھے دیکھ کر سر جھکا کر کہا۔ ''کہاں جاؤ گے؟''
''گجن پور کتنی دور ہے؟''
''چلے آؤ۔ آگے ہمارا گاؤں ہے، اس کے بعد گجن پور ہے۔''
''تمہارا گاؤں کتنی دور ہے؟''
''وہ کیا آگے دکھائی دیتا ہے؟''
''تم اس آندھی میں رک کیوں نہیں گئیں؟''
''چھوٹے چھوٹے بچے گھر پر ہیں، کیسے رک جاتی۔ مرد تو بھگوان کے گھر چلا گیا۔''
آندھی کا ایسا زبردست ریلا آیا کہ میں شاید دو تین قدم آگے کھسک گیا۔ گرد و غبار کی ایک دھونکنی سی منہ پر لگی۔ اس کا کیا حشر ہوا، مجھے خبر نہیں۔ میں پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔ فلسفے نے کہا۔ اس عورت کے لیے زندگی میں کیا راحت ہے۔ کوئی ٹوٹا پھوٹا جھونپڑا ہوگا۔ دو تین فاقہ کش بچے۔ بیکسی میں موت کا کیا غم، موت تو اس کے لیے باعثِ نجات ہوگی۔ میری حالت اَور ہے۔ زندگی اپنی تمام دل فریبیوں اور رنگینیوں کے ساتھ میری ناز برداری کر رہی ہے۔ حوصلے ہیں، ارادے ہیں اسے کیونکر خطرے میں ڈال سکتا ہوں۔
ہیں میں نے پھر گھوڑے کے ایالوں میں منہ چھپا لیا۔ شتر مرغ کی طرح جو خطرے سے بچنے کی کوئی راہ نہ پا کر بالوں میں سر چھپا لیتا ہے۔

(2)

وہ آندھی کی آخری سانس تھی۔ اس کے بعد بتدریج زور کم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ کوئی پندرہ منٹ میں مطلع صاف ہو گیا، نہ گرد و غبار کا نشان تھا نہ ہوا کے جھونکوں کا۔ ہوا میں ایک فرحت بخش خنکی آ گئی تھی۔ ابھی مشکل سے پانچ بجے ہوں گے۔ سامنے ایک پہاڑی تھی۔ اس کے دامن میں ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میں جوں ہی اس گاؤں میں پہنچا، وہی عورت ایک بچّے کو گود میں لیے میری طرف آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے پوچھا۔ ''تم کہاں رہ گئے تھے؟ میں ڈری کہ تم راستہ نہ بھول گئے ہو، تمہیں ڈھونڈنے جا رہی تھی۔''

میں نے اس کی انسانیت سے متاثر ہو کر کہا۔ ”میں اس کے لیے تمہارا بہت ممنون ہوں۔ آندھی کا ایسا ریلا آیا کہ مجھے راستہ نہ سُوجھا‘ میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ یہی تمہارا گاؤں ہے۔ یہاں سے گجن پور کتنی دور ہو گا؟“

”بس کوئی دھاپ بھر سمجھ لو۔ راستہ بالکل سیدھا ہے۔ کہیں دہنے بائیں مڑیو نہیں۔ سورج ڈوبتے ڈوبتے پہنچ جاؤ گے۔“

”یہی تمہارا بچہ ہے؟“

”نہیں ایک اور اس سے بڑا ہے۔ جب آندھی آئی تو دونوں نمبردار کی چوپال میں جا کر بیٹھے تھے کہ جھونپڑی کہیں اڑ نہ جائے۔ جب سے آئی ہوں یہ میری گود سے نہیں اترتا۔ کہتا ہے تو پھر بھاگ جائے گی۔ بڑا تو شیطان ہے لڑکوں میں کھیل رہا ہے۔ محنت مزدوری کرتی ہوں بابو جی! ان کو پالنا تو ہے۔ اب میرے کون بیٹھا ہوا ہے جس پر ٹیک کروں۔ گھاس لے کر بیچنے گئی تھی۔ کہیں جاتی ہوں تو من ان بچوں میں لگا رہتا ہے۔“

میرا دل اتنا اثر پذیر تو نہیں‘ لیکن اس دہقان عورت کے بے لوث اندازِ گفتگو‘ اس کی سادگی اور جذبۂ مادری نے مجھ پر تسخیر کا سا عمل کیا۔ اس کے حالات سے مجھے گونہ دلچسپی ہو گئی۔ پوچھا ”تمہیں بیوہ ہوئے کتنے دن ہو گئے؟“

عورت کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کیلئے بچے کے رخسار کو اپنی آنکھوں سے لگا کر بولی:

”ابھی تو کل چھ مہینے ہوئے ہیں بابو جی۔ بھگوان کی مرضی میں آدمی کا کیا بس۔ بھلے چنگے ہل لے کر لوٹے۔ ایک لوٹا پانی پیا‘ قے ہوئی‘ بس آنکھیں بند ہو گئیں۔ نہ کچھ کہا نہ سنا۔ میں سمجھی تھکے ہیں سو رہے ہیں۔ جب کھانا کھانے کے لیے اٹھانے لگی تو بدن ٹھنڈا۔ تب سے بابو جی گھاس چھیل کر پیٹ پالتی ہوں اور بچوں کو کھلاتی ہوں۔ کھیتی میرے مان کی نہ تھی۔ بیل بدھئے بیچ کر ان کے کریا کرم میں لگا دیئے۔ بھگوان تمہارے ان دونوں گلاموں کو زندگی دے میرے لیے یہی بہت ہیں۔“

میں موقع اور محل سمجھتا ہوں اور نفسیات میں بھی دخل رکھتا ہوں۔ لیکن اس وقت مجھ پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ میں آبدیدہ ہو گیا اور جیب سے پانچ چھ روپے نکال کر اس عورت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”میری طرف سے یہ بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے لے لو۔ مجھے موقع ملا تو پھر کبھی آؤں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے بچے کے رخساروں کو انگلی سے چھو دیا۔ ماں ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”نہیں بابو جی یہ رہنے دیجئے‘ میں غریب ہوں لیکن بھکارن نہیں ہوں۔“

”یہ بھیک نہیں ہے بچوں کی مٹھائی کھانے کے لیے ہیں۔“

”نہیں بابو جی۔“

”مجھے اپنا بھائی سمجھ کر لے لو۔“

”نہیں بابو جی جس سے بیاہ ہوا اس کی عزت تو میرے ہی ہاتھ ہے۔ بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ اب چلے جاؤ تمہیں دیر ہو جائے گی۔“

میں دل میں اتنا خفیف کبھی نہ ہوا تھا۔ جنہیں میں جاہل‘ کور باطن‘ بے خبر سمجھتا تھا اسی طبقے کی ایک معمولی عورت میں یہ خودداری‘ یہ فرض شناسی‘ یہ توکل‘ اپنے ضعف کے احساس سے میرا دل جیسے پامال ہو گیا۔ اگر تعلیم فی الاصل تہذیبِ نفس ہے اور محض اعلیٰ ڈگریاں نہیں تو یہ عورت تعلیم کے معراج پر پہنچی ہوئی ہے۔ میں نے نادم ہو کر نوٹ جیب میں رکھ لیا اور گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہیں اس آندھی میں ذرا بھی ڈر نہ معلوم ہوتا تھا۔“

عورت مسکرائی۔ "ڈر کس بات کا؟ بھگوان تو سبھی جگہ ہیں۔ اگر وہ مارنا چاہیں تو کیا یہاں نہیں مار سکتے۔ میرا آدمی گھر آکر بیٹھے بیٹھے چل دیا۔ آج وہ ہوتا تو تم اس طرح گجن پورا کیلے نہ جانے پاتے۔ جاکر تمہیں پہنچا آتا۔ تمہاری خدمت کرتا۔"

گھوڑا اُڑا' میرا دل اس سے زیادہ تیزی سے اُڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی مفلس سونے کا ڈلا پاکر دل میں ایک طرح کی پرواز کا احساس کرتا ہے۔ وہی حالت میری تھی۔ اس دہقان عورت نے مجھے وہ تعلیم دی جو فلسفہ اور مابعد الطبیعات کے دفتروں سے بھی حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں اس مفلس کی طرح اس سونے کے ڈلے کو گرہ میں باندھتا ہوا' ایک غیر مترقبہ نعمت کے غرور سے مسرور' اس اندیشے سے خائف کہ کہیں یہ اثر دل سے مٹ نہ جائے' اڑا چلا جاتا تھا۔ بس یہی فکر تھی کہ اس کو پارۂ دل کے کسی گوشے میں چھپالوں۔ جہاں کسی حریص کی اس پر نگاہ نہ پڑے۔

(3)

گجن پورا بھی پانچ میل کے فاصلے سے کم نہ تھا۔ راستہ نہایت پیچیدہ' بیہڑ بے برگ و بار' گھوڑے کو روکنا پڑتا۔ تیزی میں جان کا خطرہ تھا۔ آہستہ سنبھلتا ہوا چلا جاتا تھا کہ آسمان سے ابر گھر آیا۔ کچھ تو پہلے کا چھایا ہوا تھا' پر اب اس نے ایک عجیب صورت اختیار کرلی۔ برق کی چمک اور رعد کی گرج شروع ہوئی۔ پھر افقِ مشرق کی طرف سے زرد رنگ کے ایک ابر کی ایک تہہ اس مٹیالے رنگ پر زرد لیپ کرتی ہوئی تیزی سے اوپر کی جانب دوڑتی نظر آئی۔ میں سمجھ گیا اولے ہیں۔ پھاگن کے مہینے میں اس رنگ کے بادل اور گرج کی یہ مہیب گڑگڑاہٹ ژالہ باری کی علامت ہے۔ گھٹا سر پر چڑھتی چلی جاتی تھی۔ یکایک سامنے ایک کفِ دست میدان آگیا۔ جس کے پرلے سرے پر گجن پور کے ٹھاکر دوارے کا کلس صاف نظر آرہا تھا۔ کہیں کسی درخت کی بھی آڑ نہ تھی۔ لیکن میرے دل میں مطلق کمزوری نہ تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر کسی کا سایہ ہے' جو مجھے ہر آفت' ہر گزند سے محفوظ رکھے گا۔

ابر کی زردی ہر لحہ بڑھتی جاتی تھی۔ شاید گھوڑا اس خطرے کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بار بار ہنہناتا تھا اور اُڑ کر خطرے سے باہر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی دیکھا راستہ صاف ہے، لگام ڈھیلی کردی۔ گھوڑا اُڑا۔ میں اس کی تیزی کا لطف اٹھا رہا تھا۔ دل میں خوف کا مطلق احساس نہ تھا۔

ایک میل نکل گیا ہوں گا کہ ایک رپٹ آپڑی۔ پہاڑی ندی تھی جس کے پیٹے میں کوئی پچاس گز لمبی رپٹ بنی ہوئی تھی۔ پانی کی ہلکی دھار رپٹ پر سے بہہ رہی تھی۔ رپٹ کے دونوں طرف پانی جمع تھا۔ میں نے دیکھا ایک اندھا لاٹھی ٹیکتا ہوا رپٹ سے گزر رہا تھا۔ وہ رپٹ کے ایک کنارے سے اتنا قریب تھا کہ میں ڈر رہا تھا کہ کہیں گر نہ پڑے۔ اگر پانی میں گرا تو مشکل ہوگی۔ کیونکہ وہاں پانی گہرا تھا۔ میں نے چلّا کر کہا۔ "بڈھے اور داہنے کو ہو جا۔" بڈھا چونکا اور گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سن کر شاید ڈر گیا۔ داہنے تو نہیں ہوا اور بائیں کی طرف ہولیا اور پھسل کر پانی میں گر پڑا۔ اس وقت ایک ننھا سا اولا میرے سامنے گرا۔ دونوں مصیبتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔

ندی کے اس پار ایک مندر تھا۔ اس میں بیٹھنے کی جگہ کافی تھی۔ ایک منٹ میں وہاں پہنچ سکتا تھا۔ لیکن یہ نیا عقدہ سامنے آگیا۔ کیا اس اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑ کر اپنی جان بچانے کے لیے بھاگوں؟ حمیت نے اسے گوارا نہ کیا۔ زیادہ پس و پیش کا موقع نہ تھا۔ میں فوراً گھوڑے سے کودا اور کئی اولے میرے چاروں طرف گرے۔ میں پانی میں

کود پڑا۔ ہاتھی ڈباؤ پانی تھا۔ رپٹ کے لیے جو بنیاد رکھ دی گئی تھی وہ ضرورت سے زیادہ چوڑی تھی۔ ٹھیکیدار نے دس فٹ چوڑی رپٹ تو بنادی، مگر کھدی ہوئی مٹی برابر نہ کی۔ بڈھا اسی گڑھے میں گرا تھا۔ میں بھی ایک غوطہ کھا گیا، لیکن تیرنا جانتا تھا، کوئی اندیشہ نہ تھا۔ میں نے دوسری ڈبکی لگائی اور اندھے کو باہر نکالا۔ اتنی دیر میں وہ سیروں پانی پی چکا تھا۔ جسم بے جان ہو رہا تھا۔ اس لیے بڑی مشکل سے باہر نکلا تو دیکھا گھوڑا بھاگ کر مندر میں جا پہنچا ہے۔ اس نیم جان لاش کو لیے ہوئے ایک فرلانگ چلنا آسان نہ تھا۔ اوپر اولے تیزی سے گرنے لگے تھے۔ کبھی سر پر، کبھی شانے پر، کبھی پیٹھ میں گولی سی لگ جاتی تھی۔ میں تلملا اٹھتا تھا۔ لیکن اس لاش کو سینے سے لگائے مندر کی طرف لپکا چلا جاتا تھا۔ میں اگر اس وقت اپنے دل کے جذبات بیان کروں، تو شاید خیال ہو کہ میں خواہ مخواہ تعلی کر رہا ہوں۔ اچھے کام کرنے میں ایک خاص مسرت ہوتی ہے۔ مگر میری خوشی ایک دوسری ہی قسم کی تھی۔ وہ فاتحانہ مسرت تھی۔ میں نے اپنے اوپر فتح پائی تھی۔ آج سے پہلے غالباً میں اندھے کو پانی میں ڈوبتے دیکھ کر یا تو اپنی راہ چلا جاتا یا پولیس کو رپورٹ کرتا۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ سر پر اولے پڑ رہے ہوں۔ میں کبھی پانی میں نہ گھستا۔ ہر لمحہ خطرہ تھا کہ کوئی بڑا سا اولا سر پر گر کر عزیز جان کا خاتمہ نہ کر دے۔ مگر میں خوش تھا کیونکہ آج میری زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

میں مندر میں پہنچا تو سارا جسم زخمی ہو رہا تھا۔ مجھے اپنی فکر نہ تھی۔ ایک زمانہ ہوا میں نے فوری امداد (فرسٹ ایڈ) کی مشق کی تھی۔ وہ اس وقت کام آئی۔ میں نے آدھ گھنٹے میں اس اندھے کو اٹھا کر بٹھا دیا۔ اتنے میں دو آدمی اندھے کو ڈھونڈتے ہوئے مندر میں آ پہنچے۔ مجھے اس کی تیمارداری سے نجات ملی۔ اولے نکل گئے تھے۔ میں نے گھوڑے کی پیٹھ ٹھونکی، رومال سے ساز کو صاف کیا اور جگن پور چلا۔ بے خوف و خطر دل میں ایک غیبی طاقت محسوس کرتا ہوا۔ اسی وقت اندھے نے پوچھا۔ ''تم کون ہو بھائی؟ مجھے تو کوئی مہاتما معلوم ہوتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا خادم ہوں۔''

''تمہارے سر پر کسی دیوتا کا سایہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں ایک دیوی کا سایہ ہے۔''

''وہ دیوی کون ہے؟''

''وہ دیوی پیچھے گاؤں میں رہتی ہے۔''

''تو کیا وہ عورت ہے؟''

''نہیں میرے لیے وہ دیوی ہے۔''

مالکن

(1)

شیوداس نے بھنڈار کی کنجی اپنی بہو رام پیاری کے سامنے پھینک دی اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔

"بہو آج سے گرہستی کی دیکھ بھال تمہارے ذمہ ہے۔ میرا سکھ بھگوان سے نہیں دیکھا گیا۔ نہیں تو کیا جوان بیٹے کو یوں چھین لیتے؟ مگر اس کا کام کرنے والا تو کوئی چاہیے۔ اب ہل توڑدوں تو گزر نہ ہوگی۔ اس لیے برجو کا ہل اب میں ہی سنبھالوں گا۔ پھر گھر کی دیکھ بھال کرنے والا' رکھنے رکھانے والا تمہارے سوا دوسرا کون ہے؟ رومت بیٹا' بھگوان کی جو مرضی تھی' وہ ہوا اور جو مرضی ہوگی وہ ہوگا۔ ہمارا تمہارا کیا اختیار ہے۔ میرے جیتے جی تمہیں کوئی ٹیڑھی نگاہوں سے بھی نہ دیکھ سکے گا۔ تم کسی بات کی فکر نہ کرو۔ برجو گیا تو میں تو ابھی بیٹھا ہوں۔"

رام پیاری اور دلاری دو حقیقی بہنیں تھیں۔ دونوں کی شادی متھرا اور برجو حقیقی بھائیوں سے ہوئی۔ دونوں بہنیں میکے کی طرح سسرال میں بھی محبت اور پیار سے رہنے لگیں۔ شیوداس کو فرصت ملی۔ دن بھر دروازے پر بیٹھا گپ شپ کرتا۔ آباد گھر دیکھ کر خوش ہوتا۔ دھرم کے کاموں کی طرف طبیعت مائل ہونے لگی۔ لیکن خدا کی مرضی بڑا لڑکا جو بیمار ہوا اور آج اسے مرے ہوئے پندرہ روز ہوگئے۔ آج اس کے آخری مراسم سے فرصت ملی اور شیوداس نے سچے بہادر کی طرح کارزارِ حیات کے لیے کمر باندھ لی۔ دل میں چاہے اسے کتنا ہی صدمہ ہوا ہو' اسے کسی نے روتے ہوئے نہیں دیکھا۔ آج اپنی بہو کو دیکھ کر ایک آن کے لیے اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ لیکن اس نے اپنی طبیعت کو سنبھالا اور بھرّائی ہوئی آواز میں اسے دلاسا دینے لگا۔ شاید اس نے سوچا تھا کہ گھر کی مالکن بن کر بیوہ کے آنسو پُنچھ جائیں گے۔ کم سے کم اسے اتنی محنت تو نہ کرنی پڑے گی۔

رام پیاری نے رقّت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے دادا! تم محنت مزدوری کرو اور میں مالکن بن کر بیٹھوں۔ کام دھندے میں لگی رہوں گی تو دل بہلتا رہے گا۔ بیٹھے بیٹھے تو رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔"

شیوداس نے سمجھایا۔ "بیٹا! بھگوان کی مرضی سے تو کسی کا بس نہیں۔ رونے دھونے سے ہلکان ہونے کے سوا اور کیا ہاتھ آئے گا؟ گھر میں بھی تو بیسیوں کام ہیں۔ کوئی سادھو سنت آجائے' کوئی مہمان آپہنچے' اس کی خاطر مدارات کے لیے کسی کو تو گھر پر رہنا ہی پڑے گا۔" بہو نے بہت حیلے کیے' پر شیوداس نے ایک نہ سنی۔

(2)

شیوداس کے باہر چلے جانے کے بعد مالکن نے کنجی اٹھالی تو اس کے دل میں اختیار اور ذمہ داری کا زبردست احساس پیدا ہوا۔ تھوڑی دیر کے لیے شوہر کی جدائی کا صدمہ اس کے دل سے محو ہوگیا۔ اس کی چھوٹی بہن اور دیور دونوں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔ شیوداس باہر تھا۔ گھر بالکل خالی تھا۔ اس وقت وہ بے فکر ہو کر بھنڈار کو کھول سکتی ہے۔ اس میں کیا کیا سامان ہے' کیا کیا چیز ہے' یہ دیکھنے کے لیے اس کا دل بے تاب ہوگیا۔ اس مکان میں وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ جب کسی کو کچھ دینا یا کسی سے کچھ لینا ہوتا تو شیوداس آکر اس کوٹھڑی کو کھولتا۔ پھر اسے بند کرکے کنجی اپنی کمر میں رکھ لیتا تھا۔ رام پیاری کبھی کبھی کواڑ کی درازوں سے اندر جھانکتی تھی۔ مگر اندھیرے میں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ سارے گھر کے لیے وہ کوٹھڑی ایک طلسم یا راز تھی جس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہوتے رہتے تھے۔ آج رام پیاری کو وہ راز کھول کر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس نے باہر کا دروازہ بند کردیا کہ اسے کوئی بھنڈار کھولے نہ دیکھ لے۔ نہیں تو سوچے گا کہ بے ضرورت اس نے کیوں کھولا۔ اس کا سینہ دھڑک رہا تھا کہ کوئی دروازہ نہ کھٹکھٹانے لگے۔ اندر پاؤں رکھا تو اسے اسی طرح کی لیکن اس سے کہیں زیادہ خوشی ہوئی' جو اسے اپنے کپڑے اور زیور کی

پٹاری کے کھولنے میں ہوتی تھی۔ مٹکوں میں گڑ، شکر، گیہوں، جو وغیرہ سب چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک کنارے بڑے بڑے برتن رکھے ہوئے تھے۔ جو شادی بیاہ کے موقع پر نکالے جاتے تھے یا مانگے دیئے جاتے تھے۔ ایک جگہ مالگزاری کی رسیدیں اور لین دین کے کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ کوٹھڑی پر شان و شوکت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے سایہ میں رام پیاری کوئی آدھ گھنٹے تک اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچاتی رہی۔ لحہ بہ لحہ اس کے دل پر نشہ ساطاری ہوتا جارہا تھا۔ جب وہ اس کوٹھڑی سے نکلی تو اس کے دل کی حالت بدلی ہوئی تھی۔ جیسے کسی نے اس پر سحر کر دیا ہو۔

اسی وقت دروازے پر کسی آدمی نے آواز دی۔ اس نے فوراً بھنڈارے کا دروازہ بند کیا اور جا کر صدر دروازہ کھول دیا۔ دیکھا تو پڑوسن چھنیا کھڑی ایک روپیہ قرض مانگ رہی ہے۔

رام پیاری نے بے رخی سے کہا۔ ''ابھی تو ایک پیسہ بھی گھر میں نہیں ہے۔ بہن کام کاج میں سب خرچ ہو گیا۔''

چھنیا حیران رہ گئی۔ چوہدری کے گھر میں اس وقت ایک روپیہ بھی نہیں ہے۔ یہ یقین کرنے کی بات نہ تھی۔ جس کے یہاں سینکڑوں کا لین دین ہے۔ اس کا سارا اثاثہ کام کاج میں صرف نہیں ہو سکتا۔ اگر شیوداس نے یہ حیلہ کیا ہوتا تو اسے تعجب نہ ہوتا۔ رام پیاری تو اپنے سادہ اخلاق کے لیے گاؤں میں مشہور تھی۔ اکثر شیوداس کی نگاہیں بچا کر ہمسائیوں کو ضرورت کی چیزیں دے دیا کرتی تھی۔ ابھی کل ہی اس نے جانکی کو سیر بھر دودھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے گہنے تک دے دیا کرتی تھی۔ بخیل شیوداس کے گھر میں ایسی سخی بہو کا آنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے۔

چھنیا نے متعجب ہو کر کہا۔ ''ایسا نہ کہو بہن بڑی مصیبت میں پڑ گئی ہوں۔ نہیں تو تم جانتی ہو کہ عادت قرض مانگنے کی نہیں ہے۔ لگان کا ایک روپیہ دینا ہے۔ پیادہ دروازے پر کھڑا ایک جھک کر رہا ہے۔ روپیہ دے دو۔ کسی طرح مصیبت ٹلے۔ میں آج کے آٹھویں روز بعد دے جاؤں گی۔ گاؤں میں اور کون گھر ہے جہاں مانگنے جاؤں؟''

رام پیاری ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اس کے جاتے ہی رام پیاری شام کے کھانے کا انتظام کرنے لگی۔ پہلے چاول دال چننا وبال معلوم ہوتا تھا اور رسوئی میں جانا سولی پر چڑھنے سے کم نہ تھا۔ کچھ دیر دونوں بہنوں میں جھوڑ ہوتی، آخر میں شیوداس اس کو آکر کہتا کہ کیا آج کھانا نہ پکے گا، اس وقت دونوں میں ایک اٹھتی اور موٹے موٹے ٹکڑ پکا کر رکھ دیتی۔ جیسے بیلوں کا راتب ہو۔ آج رام پیاری تن من سے کھانا پکانے کے کام میں لگی ہوئی ہے۔ اب وہ گھر کی مالکن ہے۔

اس نے باہر نکل کر دیکھا کہ کتنا کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے۔ ''بڈھے دادا دن بھر مکھی مارا کرتے ہیں۔ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ ذرا جھاڑو ہی دے ڈالیں۔ اب کیا ان سے اتنا بھی نہیں ہوتا۔ دروازہ ایسا صاف ہونا چاہیے کہ دیکھ کر دل خوش ہو جائے۔ یہ نہیں کہ اُبکائی آنے لگے۔ ابھی کہہ دوں تو تنک اٹھیں۔ ''اچھا! یہ منی ناند سے الگ کیوں کھڑی ہے؟''

اس نے منی گائے کے پاس جا کر ناند میں جھانکا' بدبو آرہی تھی۔ ٹھیک ہے معلوم ہوتا ہے مہینوں سے پانی نہیں بدلا گیا ہے۔ اس طرح تو گائے رہ چکی۔ اپنا پیٹ بھر لیا چھٹی ہوئی اور کسی سے کیا مطلب؟ ہاں دودھ سب کو اچھا لگتا ہے۔ دادا دروازے پر بیٹھے چلم پی رہے ہیں۔ مگر اتنا نہیں ہوتا کہ چار گھڑے پانی ناند میں ڈال دیں۔ مزدور رکھا ہے۔ وہ بھی تین کوڑی کا۔ کھانے کو ڈیڑھ سیر۔ کام کرتے نانی مرتی ہے۔ آئے تو پوچھتی ہوں۔ ناند میں پانی کیوں نہیں بدلتا۔ رہنا ہو رہے یا جائے۔ آدمی بہت ملیں گے۔ چاروں طرف تو لوگ مارے مارے پھر رہے ہیں۔ آخر اس

سے نہ رہا گیا۔ گھڑا اٹھا کر پانی لینے چلی۔

شیوداس نے پکارا۔ "پانی کیا ہو گا، بہو؟ ناند میں پانی بھرا ہوا ہے۔"

پیاری نے کہا۔ "ناند کا پانی سڑ گیا، منی بھوسے میں منہ نہیں ڈالتی۔ دیکھتے ہو کوس بھر کھڑی ہے۔"

شیوداس مسکرایا۔ دوڑ کر بہو کے ہاتھ سے گھڑا لے لیا۔

(3)

کئی مہینے گزر گئے۔ پیاری کے اختیار میں آ کر جیسے اس گھر میں بہار آ گئی۔ اندر باہر جہاں دیکھئے ایک لائق منتظم کی سلیقہ شعاری، صفائی پسندی اور خوش مذاقی کے آثار نظر آنے لگے۔ پیاری نے گرہستی کی مشین کی ایسی کنجی کس دی کہ سب ہی پرزے ٹھیک چلنے لگے۔ کھانا پہلے سے اچھا ملتا ہے اور وقت پر ملتا ہے۔ دودھ زیادہ ہوتا ہے۔ گھی زیادہ ہوتا ہے۔ پیاری نہ خود آرام کرتی ہے، نہ دوسروں کو آرام کرنے دیتی ہے۔ گھر میں کچھ ایسی برکت آ گئی ہے کہ جو چیز مانگو گھر ہی میں نکل آتی ہے۔ آدمی سے لے کر جانور تک سب ہی تندرست نظر آتے ہیں۔ اب وہ پہلی سی حالت نہیں ہے کہ کوئی چیتھڑے لپیٹے پھر رہا ہے۔ کسی کو گہنے کی دُھن سوار ہے۔ ہاں اگر کوئی متردّد فکر مند اور پریشان ہے تو وہ پیاری ہے۔ پھر بھی سارا گھر اس سے جلتا ہے۔ یہاں تک کہ بوڑھے شیوداس بھی کبھی کبھی اس کی بدگوئی کرتے ہیں۔ کسی کو پہر رات رہے اٹھنا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔ محنت سے جی چراتے ہیں۔ پھر اتنا سب ہی مانتے ہیں کہ پیاری نہ ہو تو گھر کا کام نہ چلے اور تو اور اب دونوں بہنوں میں بھی اتنی مَیل نہیں ہے۔ صبح کا وقت تھا۔ دلاری نے ہاتھوں کے کڑے لا کر پیاری کے سامنے پٹک دیئے اور بگڑ کر بولی۔ "لے کڑے بھی بھنڈار میں بند کر دے۔"

پیاری نے کڑے اٹھا لیے اور نرم لہجے میں کہا۔ "کہہ تو دیا ہاتھ میں روپے آنے دے بنوا دوں گی۔ ابھی تو ایسے گھس نہیں گئے ہیں۔" بولی۔ "تیرے ہاتھ میں کاہے کو کبھی روپے آئیں گے، اور کاہے کو کڑے بنیں گے۔ جوڑ جوڑ رکھنے میں مزا آتا ہے نا۔"

پیاری نے ہنس کر کہا۔ "جوڑ جوڑ رکھتی ہوں تو تیرے ہی لیے یا میرے کوئی اور بیٹھا ہوا ہے یا میں سب سے زیادہ کھا پہن لیتی ہوں۔"

دلاری۔ "تم نہ کھاؤ، نیک نامی تو ہوتی ہے تمہاری۔ یہاں کھانے پینے کے سوا اور کیا ہے؟ میں تمہارا حساب کتاب نہیں جانتی۔ میرے کڑے آج بننے کو بھیج دو۔"

پیاری نے بالکل مذاق کے انداز سے پوچھا۔ "روپے نہ ہوں تو کہاں سے لاؤں؟"

دلاری نے چیخ کر کہا۔ "مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں، میں تو کڑے چاہتی ہوں۔"

اسی طرح گھر کے سبھی آدمی اپنے اپنے موقع پر پیاری کو دو چار سخت وسُست سنا جاتے تھے اور وہ غریب سب کی دھونس ہنس کر برداشت کر لیتی تھی۔ مالکن کا یہ تو فرض ہی ہے کہ سب کی دھونس برداشت کرے اور کرے وہی، جس میں گھر کی بھلائی ہو۔ مالکانہ ذمہ داری کے احساس پر طعن و طنز اور دھمکی کسی چیز کا اثر نہ ہوتا۔ اس کا مالکانہ احساس ان جملوں سے اور بھی قوی ہو جاتا تھا۔ وہ گھر کی منتظمہ ہے۔ سبھی اپنی اپنی تکلیف اسی کے سامنے کرتے ہیں۔ جو کچھ وہ کرتی ہے، وہی ہوتا ہے۔ اس کے اطمینان کے لیے اتنا کافی تھا۔

گاؤں میں پیاری کی تعریف ہوتی تھی۔ ابھی عمر ہی کیا ہے۔ لیکن تمام گھر سنبھالے ہوئے ہے۔ چاہتی تو دوسرا گھر کر کے چین کرتی۔ اس گھر کے واسطے اپنے کو مٹا رہی ہے۔ کبھی کسی سے ہنستی بولتی بھی نہیں۔ جیسے کایا پلٹ ہوگئی۔

چند روز کے بعد دلاری کے کڑے بن کر آگئے۔ پیاری خود سنار کے گھر دوڑ دوڑ کر گئی۔

شام ہوگئی تھی۔ دلاری اور متھرا کھیت سے لوٹے۔ پیاری نے نئے کڑے دلاری کو دیئے۔ دلاری نہال ہوگئی۔ جھٹ پٹ کڑے پہنے اور دوڑتی ہوئی جا کر کوٹھڑی میں متھرا کو کڑے دکھانے لگی۔ پیاری کوٹھڑی کے دروازے کے پیچھے کھڑی ہو کر یہ منظر دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں۔ دلاری اس سے بالکل تین سال ہی تو چھوٹی ہے۔ لیکن دونوں میں کتنا فرق ہے۔ اس کی نظریں گویا اس پر جم گئیں۔ متاہلانہ زندگی کی وہ حقیقی مسرت' ان کی محبت آگیں محویت' ان کی وہ سرخوشی!

پیاری کی ٹکٹکی سی بندھ گئی۔ یہاں تک کہ چراغ کی دھندلی روشنی میں وہ دونوں اس کی نظر سے غائب ہوگئے۔ اسے اپنی گزشتہ زندگی کا ایک واقعہ نگاہوں کے سامنے بار بار نئی صورت میں سامنے آنے لگا۔ ناگہاں شیوداس نے پکارا۔ ''بڑی بہو ایک پیسہ دو تمبا کو منگاؤں۔''

پیاری کا سلسلۂ تصور شکست ہوگیا۔ آنسو پونچھتی ہوئی بھنڈار میں پیسہ لینے چلی گئی۔

(4)

ایک ایک کر کے پیاری کے گہنے اس کے ہاتھ سے نکلتے گئے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا گھر گاؤں میں سب سے خوشحال سمجھا جائے اور اسی کو اس ہوس کی قیمت دینا پڑتی تھی۔ کبھی مکان کی مرمت کے لیے' کبھی بیلوں کی نئی جوڑی خریدنے کے لیے' کبھی رشتہ داروں کی خاطر مدارت کے لیے اور کبھی مریضوں کے علاج کے لیے روپے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور جب بہت جوڑ توڑ کرنے پر بھی کام نہ چلتا تو وہ اپنی کوئی نہ کوئی چیز نکال دیتی اور وہ چیز ایک بار ہاتھ سے نکل کر پھر واپس نہ آتی۔ وہ چاہتی تو ان میں سے بہت سے خرچوں کو ٹال جاتی۔ لیکن جہاں عزت کی بات آپڑتی تھی وہ دل کھول کر خرچ کرتی تھی۔ اگر گاؤں میں ہیٹی ہوگئی تو کیا بات رہی' اس کی بدنامی ہوگی۔ دلاری کے پاس بھی گہنے تھے' ایک دو چیزیں متھرا کے پاس بھی تھیں۔ لیکن پیاری ان کی چیزیں نہ چُھوتی۔ ان کے کھانے پینے کے دن ہیں۔ وہ اس جھگڑے میں کیوں پھنسے۔ دلاری کے لڑکا پیدا ہوا تو پیاری نے دھوم دھام کے ساتھ خوشی منانے کا ارادہ کیا۔

شیوداس نے مخالفت کی۔ ''کیا فائدہ؟ جب بھگوان کی کرپا سے بیاہ بارات کا موقع آئے گا تو دھوم دھام کر لینا۔''

پیاری کا حوصلہ مند دل بھلا کیوں مانتا؟ بولی۔ ''کیسی بات کرتے ہو دادا۔ پہلوٹی کے لڑکے کے لیے بھی دھوم دھام نہ ہوئی تو کب ہوگی؟ دل تو نہیں مانتا۔ پھر دنیا کیا کہے گی' نام بڑے درشن تھوڑے۔ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ اپنا تمام سامان کر لوں گی۔''

''گہنے کے بغیر جائے گی اور کیا؟'' شیوداس نے فکر مند ہو کر کہا۔ ''اس طرح ایک روز تار بھی نہ بچے گا۔ کتنا سمجھایا بیٹا! بھائی بھاوج کسی کے نہیں ہوتے' اپنے پاس دو چیز رہیں گی تو سب منہ تکیں گے۔ نہیں تو کوئی سیدھے منہ بات بھی نہ کرے گا۔''

پیاری نے ایسا منہ بنایا گویا ایسی بوڑھی باتیں بہت سن چکی ہے۔ بولی۔ ''جو اپنے ہیں وہ بات بھی نہ پوچھیں

جب بھی اپنے ہی رہتے ہیں۔ میرا دھرم میرے ساتھ ہے۔ ان کا دھرم ان کے ساتھ ہے۔ مر جاؤں گی تو کیا سینے پر لاد کے لے جاؤں گی؟''

دھوم دھام سے لڑکا پیدا ہونے کی خوشی منائی گئی۔ برھی کے روز ساری برادری کا کھانا ہوا۔ لوگ کھا پی کر چلے گئے۔ تو پیاری دن بھر کی تھکی ماندی آنگن میں ٹاٹ کا ایک ٹکڑا ڈال کر کمر سیدھی کرنے لگی۔ آنکھ لگ گئی۔ متھرا اسی وقت گھر میں آیا۔ نو مولود بچے کو دیکھنے کے لیے اس کا دل بے قرار ہو رہا تھا۔ دلاری زچہ خانہ سے نکل چکی تھی۔ حمل کی حالت میں اس کا جسم لاغر ہو گیا تھا۔ چہرہ بھی اتر گیا تھا۔ لیکن آج چہرے پر صحت کی سرخی چھائی ہوئی تھی۔ مادرانہ غرور و ناز نے اعضاء میں ایک نئی روح پیدا کر دی تھی۔ زچہ خانے کی احتیاط اور مقوّی چیزوں کے استعمال نے بدن کو چکنا دیا تھا۔ متھرا اسے آنگن میں دیکھتے ہی قریب آ گیا اور ایک بار پیاری کی طرف دیکھ کر اور یہ سمجھ کر کہ وہ سو گئی ہے' بچے کو گود میں لے لیا اور لگا اس کا منہ چومنے۔ آہٹ پا کر پیاری کی آنکھ کھل گئی۔ لیکن نیند کے بہانے وہ نیم باز آنکھوں سے یہ پُر لطف تماشا دیکھنے لگی۔ ماں باپ دونوں باری باری بچے کو چومتے اور گلے لگاتے اور اس کے منہ کو تکتے تھے۔ کیسی پُر کیف مسرت تھی۔ پیاری کی تشنہ تمنا ایک آن کے لیے مالکانہ حیثیت کو بھول گئی۔ جس طرح لگام سے منہ بند' بوجھ سے لدا ہوا ہانکنے والے کے کوڑے سے تکلیف زدہ دوڑتے دوڑتے بیدم گھوڑا ہنہناہٹ کی آواز سن کر کان کھڑے کر لیتا ہے' کچھ اسی طرح کی پیاری کی حالت ہو گئی۔ اس کی مادریت جو پنجرے میں بند خاموش بے جان پڑی ہوئی تھی' قریب سے گزرنے والی مادریت کی چہکار سے بیدار ہو گئی اور تفکرات کے اس پنجرے سے نکلنے کے لیے بازو پھڑ پھڑانے لگی۔

متھرا نے کہا۔ ''یہ میرا لڑکا ہے۔''

دلاری نے بچے کو سینے سے چمٹا کر کہا۔ ''ہاں ہے کیوں نہیں' تم ہی نے تو نو مہینے پیٹ میں رکھا ہے۔ مصیبت میں نے بھگتی' باپ کہلانے کے لیے تم آ گئے۔''

متھرا۔ ''میرا لڑکا نہ ہوتا تو میری صورت کا کیوں ہوتا؟ صورت و شکل سب میری سی ہی ہے کہ نہیں؟''

دلاری۔ ''اس سے کیا ہوتا ہے۔ بیج بنیئے کے گھر سے آتا ہے۔ کھیت کسان کا ہوتا ہے۔ پیداوار بنئے کی نہیں ہوتی' کسان کی ہوتی ہے۔''

متھرا۔ ''باتوں میں تم سے کوئی نہ جیتے گا۔ میرا لڑکا بڑا ہو جائے گا تو میں دروازے پر بیٹھ کر مزے سے حقہ پیا کروں گا۔''

دلاری۔ ''میرا لڑکا پڑھے لکھے گا' کوئی نہ کوئی بڑا عہدہ حاصل کرے گا۔ تمہاری طرح دن بھر بیل کے پیچھے نہ چلے گا۔ مالکن سے کہنا ہے کل ایک جھولا بنوا دیں۔''

متھرا۔ ''اب بہت سویرے نہ اٹھا کرنا اور کلیجہ پھاڑ کر کام بھی نہ کرنا۔''

دلاری۔ ''یہ مہارانی جینے دے گی؟''

متھرا۔ ''مجھے اس بے چاری پر ترس آتا ہے۔ اس کے کون بیٹھا ہے۔ ہمیں لوگوں کے لیے تو مرتی ہے۔ بھیا ہوتے تو اب تک دو تین لڑکوں کی ماں ہو گئی ہوتی۔''

پیاری کے گلے میں آنسوؤں کا ایک ایسا سیلاب امڈا کہ اس کے روکنے میں اس کا تمام جسم کانپ اٹھا۔ اس کی بیوگی کا سونا پن کسی خوفناک جانور کی طرح اسے نگلنے لگا۔ تصور اس بنجر زمین میں ہرا بھرا باغ لگانے لگا۔ یکا یک شیو داس نے اندر آ کر کہا۔ ''بہو کیا سو گئی؟ باجے والوں کو ابھی کھانے کو نہیں ملا۔ کیا کہہ دوں؟''

(5)

کچھ دنوں کے بعد شیوداس بھی مر گیا۔ ادھر دلاری کے دو بچّے ہوئے۔ وہ بھی زیادہ تر بچّوں کی پرورش و پرداخت میں رہنے لگی۔ کھیتی کا کام مزدوروں پر آپڑا۔ متھرا مزدور تو اچھا تھا مگر منتظم اچھا نہ تھا۔ اسے آزادانہ طور پر کام لینے کا موقع نہ ملا تھا۔ خودؔ پہلے بھائی کی نگرانی میں کام کرتا رہا' بعد کو باپ کی نگرانی میں کرنے لگا۔ کھیتی کا انداز بھی نہیں جانتا تھا۔ وہی مزدور اس کے یہاں ٹکتے تھے جو محنتی نہیں' خوشامد کرنے میں ہوشیار ہوتے تھے۔ اس لیے اب پیاری کو دو چار چکر کھیت کے بھی لگانے پڑتے۔ کہنے کو تو وہ بھی مالکن تھی مگر حقیقت میں گھر بھر کی خدمت گزار تھی۔ مزدور بھی اس سے تیوریاں بدلتے۔ زمیندار کا پیادہ بھی اس پر دھونس جماتا۔ کھانے میں کفایت کرنی پڑتی۔ لڑکوں کو تو جتنی بار مانگیں کچھ نہ کچھ چاہیے۔ دلاری تو بچوں والی تھی اسے بھی پوری خوراک چاہیے۔ متھرا گھر کا سردار تھا اس حق کو اس سے کون چھین سکتا تھا۔ مزدور بھلا کیوں رعایت کرنے لگے تھے۔ ساری کسر پیاری پر نکلتی تھی۔ اسی کی ایک ذات فاضل تھی۔ آدھا ہی پیٹ کھائے جب بھی کسی کا کوئی نقصان نہیں ہو سکتا تھا۔ تیس برس کی عمر میں اس کے بال سفید ہو گئے۔ کمر جھک گئی۔ آنکھوں کی روشنی کم ہو گئی۔ مگر وہ خوش تھی۔ مالک ہونے کا احساس ان تمام زخموں پر مرہم کا کام کرتا تھا۔

ایک روز متھرا نے کہا۔ ''بھابی! اب تو کہیں پردیس جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہاں تو کمائی میں کوئی برکت نہیں۔ کسی طرح پیٹ کی روٹیاں چلی جاتی ہیں۔ وہ بھی رو دھو کر۔ کئی آدمی پورب سے ائے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہاں دو تین روپے روز کی مزدوری ہوتی ہے۔ چار پانچ سال بھی رہ گیا تو مالا مال ہو جاؤں گا۔ اب لڑکے بالے ہوئے ان کے لیے کچھ تو کرنا ہی چاہیے۔''

دلاری نے تائید کی۔ ''ہاتھ میں چار پیسے ہوں گے' لڑکوں کو پڑھائیں گے۔ ہماری تو کسی طرح کٹ گئی' لڑکوں کو تو آدمی بنانا ہے۔''

پیاری یہ رائے سن کر حیران رہ گئی۔ ان کا منہ تکنے لگی۔ اس سے پہلے اس طرح کی بات چیت کبھی نہ ہوئی تھی۔ انہیں یہ دھن کیسے سوار ہو گئی۔ اسے شک ہوا کہ شاید میری وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا ہے۔

بولی۔ ''میں تو جانے کو نہ کہوں گی۔ آگے تمہاری جیسی خواہش ہو۔ لڑکوں کو پڑھانے لکھانے کے لیے یہاں بھی سکول ہیں۔ پھر کیا ہمیشہ ایسا ہی وقت رہے گا۔ دو تین سال میں کھیتی بن گئی تو سب کچھ ہو جائے گا۔''

متھرا۔ ''اتنے روز کھیتی کرتے ہو گئے۔ جب اب تک نہ بنی تو اب کیا بن جائے گی۔ اسی طرح ایک روز چل دیں گے۔ دل کی دل ہی میں رہ جائے گی۔ پھر اب ہاتھ پاؤں بھی تو تھک رہے ہیں۔ یہ کھیتی کون سنبھالے گا۔ لڑکوں کو اس چکّی میں جوت کر ان کی زندگی خراب کرنی نہیں چاہتا۔''

پیاری نے آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔ ''بھیّا! گھر پر جب تک آدھی ملے ساری کے لیے نہ دوڑنا چاہیے۔ اگر میری طرف سے کوئی بات ہو تو اپنا گھر بار اپنے ہاتھ میں لے لو۔ مجھے ٹکڑا دے دینا پڑی رہوں گی۔''

متھرا گلوگیر آواز سے بولا۔ ''بھابی! یہ تم کیا کہتی ہو؟ تمہارے ہی سنبھالے یہ گھر اب تک سنبھلا ہے۔ نہیں تو ختم ہو چکا ہوتا۔ اس گرہستی کے پیچھے تم نے اپنے کو مٹی میں ملا دیا۔ اپنا جسم تک گھلا ڈالا۔ میں اندھا نہیں ہوں۔ سب کچھ سمجھتا ہوں۔ ہم لوگوں کو جانے دو بھگوان نے چاہا تو گھر پھر سنبھل جائے گا۔ تمہارے لئے ہم برابر خرچ بھیجتے رہیں گے۔''

پیاری نے کہا۔ ”اگر ایسا ہی ہے تو تم چلے جاؤ۔ بال بچوں کو کہاں کہاں باندھے پھرو گے۔“
دلاری بولی۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے' بہن۔ یہاں دیہات میں لڑکے کیا پڑھیں لکھیں گے۔ بچوں کے بغیر وہاں ان کا جی بھی نہ لگے گا۔ دوڑ دوڑ کے گھر آئیں گے اور ساری کمائی ریل کھا جائے گی۔ پر دیس میں اکیلے جتنا خرچ ہوگا اتنے میں سارا گھر آرام سے رہے گا۔“
پیاری بولی۔ ”تو میں ہی یہاں رہ کر کیا کروں گی؟ مجھے بھی لیتے چلو۔“
دلاری اسے ساتھ لے چلنے کو تیار نہ تھی۔ کچھ روز زندگی کا لطف اٹھانا چاہتی تھی۔ اگر پر دیس میں بھی یہی ضابطہ رہا تو جانے سے فائدہ ہی کیا؟ بولی۔ ”بہن! تو چلتی تو کیا بات تھی۔ لیکن پھر یہاں تو سارا کاروبار چوپٹ ہو جائے گا۔ تم کچھ نہ کچھ دیکھ بھال کرتی ہی رہو گی۔“
روانگی کی تاریخ سے ایک روز پہلے ہی رام پیاری نے رات بھر جاگ کر حلوہ پوری پکائی۔ جب سے اس گھر میں آئی کبھی ایک روز کے لیے بھی تنہا رہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ دونوں بہنیں ہمیشہ ساتھ رہیں۔ آج اس ہولناک موقع کو سامنے آتے دیکھ کر پیاری کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ وہ دیکھتی تھی کہ متھرا خوش ہے' لڑکے باہر جانے کی خوشی میں کھانا پینا بھولے ہوئے ہیں تو اس کے جی میں آتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح بے غم رہے۔ محبت و ہمدردی کو پیروں تلے کچل ڈالے' لیکن وہ محبت جس غذا کو کھا کر پلی تھی' اسے اپنے سامنے سے ہٹتے جاتے دیکھ کر بے قرار ہونے سے نہ رُک سکی۔ دلاری تو اس طرح بے فکر بیٹھی تھی جیسے کوئی میلہ دیکھنے جا رہی ہے۔ نئی چیزوں کے دیکھنے' نئی دنیا کی سیر کرنے کے شوق نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ پیاری کے سر انتظام کا بار تھا۔ دھوبی کے گھر سے سب کپڑے آئے ہیں یا نہیں۔ کون کون سے برتن ساتھ جائیں گے۔ سفر خرچ کے لیے کتنے روپے کی ضرورت ہوگی۔ ایک بچے کو کھانسی آ رہی تھی۔ دوسرے کو کئی روز سے دست آ رہے تھے۔ ان دونوں کی دواؤں کو کوٹنا پیسنا وغیرہ سینکڑوں کام اسے مصروف کیے ہوئے تھے۔ لاولد ہو کر بھی وہ بچوں کی داشت و پرداخت میں دلاری سے ہوشیار تھی۔ دیکھو بچوں کو زیادہ مارنا پیٹنا مت' مارنے سے بچے ضدی اور بے حیا ہو جاتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ آدمی کو بچہ بن جانا پڑتا ہے۔ کبھی ان کے ساتھ کھیلنا پڑتا ہے۔ کبھی ہنسنا پڑتا ہے۔ اگر تم چاہو کہ ہم آرام سے پڑے رہیں اور بچے چپ چاپ بیٹھے رہیں' ہاتھ پاؤں نہ ہلائیں تو یہ نہیں ہو سکتا۔ بچے تو طبیعت کے تیز ہوتے ہیں۔ انہیں کسی نہ کسی کام میں پھنسائے رکھو۔ دھیلے کا ایک کھلونا ہزار گھرکیوں سے بڑھ کر ہوتا ہے۔“
دلاری ان ہدایتوں کو اس بے توجہی سے سن رہی تھی گویا کوئی پاگل بک رہا ہو۔
رخصت کا روز پیاری کے لیے امتحان کا دن تھا۔ اس کے جی میں آتا تھا کہ کہیں چلی جائے تاکہ وہ منظر نہ دیکھنا پڑے۔ ہائے گھڑی بھر میں یہ گھر سُونا ہو جائے گا۔ وہ دن بھر گھر میں تنہا پڑی رہے گی۔ کس سے ہنسے گی' کس سے بولے گی؟ یہ سوچ کر اس کا دل لرزا جاتا تھا۔ جوں جوں وقت قریب آتا تھا اس کے حواس معطّل ہوتے جاتے تھے۔ وہ کوئی کام کرتے کرتے جیسے کھو جاتی تھی اور ٹکٹکی باندھ کر کسی چیز کی طرف دیکھنے لگتی تھی۔ کبھی موقع پا کر تنہائی میں جا کر تھوڑا سا رو لیتی تھی۔ دل کو سمجھا رہی تھی کہ یہ لوگ اپنے ہوتے تو کیا اس طرح جاتے۔ یہ مانا کہ ناتہ ہے' مگر کسی پر زور تو نہیں۔ دوسروں کے لیے کتنا ہی مرو پھر بھی اپنے نہیں ہوتے۔ پانی تیل میں کتنا ملے پھر بھی الگ ہی رہے گا۔
بچے نئے نئے کپڑے پہنے نواب بنے گھوم رہے تھے۔ پیاری انہیں پیار کرنے کے لیے گود میں لینا چاہتی تھی تو رونے کا منہ بنا کر چھڑا کر بھاگ جاتے تھے۔ دس بجتے بجتے دروازے پر بیل گاڑی آ گئی۔ لڑکے پہلے ہی سے اس پر جا بیٹھے۔

گاؤں کے کتنے ہی مرد عورتیں ملنے آئیں۔ پیاری کو اس وقت ان کا آنا برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ دلاری سے تھوڑی دیر تنہائی میں گلے مل کر رونا چاہتی تھی۔ متھرا سے ہاتھ جوڑ کر کہنا چاہتی تھی کہ میری کھوج خبر لیتے رہنا۔ تمہارے سوا اب دنیا میں میرا کون ہے؟ لیکن گڑبڑ میں اسے ان باتوں کا موقع نہ ملا۔ متھرا اور دلاری دونوں گاڑی میں جا بیٹھے اور پیاری دروازے پر کھڑی روتی رہ گئی۔ وہ اتنی حواس باختہ تھی کہ اسے گاؤں کے باہر تک پہنچانے کا بھی ہوش نہ رہا۔

(6)

کئی روز تک پیاری بے ہوش سی پڑی رہی، نہ گھر سے نکلی، نہ چولہا جلایا، نہ ہاتھ منہ دھویا۔ اس کا ہلوایا جوکھو بار بار آ کر کہتا۔ "مالکن اٹھو منہ ہاتھ دھوؤ کچھ کھاؤ پیو کب تک اس طرح پڑی رہو گی؟"

اس طرح کی تسلی گاؤں کی اور عورتیں بھی دیتی تھیں۔ لیکن ان کی تسلی میں ایک قسم کے بغض کا اندازہ پایا جاتا تھا اور جوکھو کی آواز میں سچی محبت جھلکتی تھی۔ جوکھو کام چور، باتونی اور نشے باز تھا۔ پیاری اسے برابر ڈانٹتی رہتی تھی۔ وہ ایک بار اسے نکال بھی چکی تھی، مگر متھرا کی سفارش سے پھر رکھ لیا تھا۔ آج بھی جوکھو کی ہمدردی بھری باتیں سن کر جھنجھلاتی۔ یہ کام کرنے کیوں نہیں جاتا۔ یہاں میرے پیچھے کیوں پڑا ہے۔ مگر اسے جھڑکنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت اسے ہمدردی کی ضرورت تھی۔ پھل کانٹے دار درخت پر بھی ملیں تو کیا نہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ طبیعت بہلنے لگی۔ زندگی کا کاروبار جاری ہوا۔ اب کھیتی کا سارا بار پیاری پر تھا۔ لوگوں نے رائے دی کہ ایک ہل توڑ دو اور کھیتوں کو اٹھا دو۔ لیکن پیاری کی وضع داری یوں ڈھول پیٹ کر اپنی شکست قبول نہ کر سکتی تھی۔ تمام کام سابق کی طرح چلنے لگے۔ ادھر متھرا کے خط و کتابت نہ کرنے سے اس کے جذبات کو اور اشتعال ہوا۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں اس کے بھروسے بیٹھی ہوں۔ یہاں اس کے کھلانے کا بھی دعویٰ رکھتی ہوں۔ اس کے بھیجنے سے مجھے کوئی خزانہ مل جاتا۔ اسے اگر میری فکر نہیں ہے تو میں اس کی کب پروا کرتی ہوں۔ گھر میں تو اب کوئی زیادہ کام رہا نہیں۔ پیاری تمام دن کھیتی باڑی کے کاموں میں لگی رہتی۔ خربوزے بوئے تھے، وہ خوب پھلے اور بکے۔ پہلے سب دودھ گھر میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اب بکنے لگا۔ پیاری کے خیالات میں بھی ایک عجیب انقلاب پیدا ہو گیا۔ وہ اب صاف ستھرے کپڑے پہنتی۔ مانگ چوٹی کی طرف سے بھی اتنی بے توجہ نہ تھی۔ زیوروں کا بھی شوق ہوا۔ روپے ہاتھ میں آتے ہی اس نے اپنے گروی کے گہنے چھڑائے اور کھانے میں بھی احتیاط کرنے لگی۔ تالاب پہلے کھیتوں کو سیراب کر کے خود خالی ہو جاتا تھا۔ اب نکاس کی نالیاں بند ہو گئی تھیں۔ تالاب میں پانی جمع ہونے لگا۔ اب اس میں ہلکی ہلکی لہریں بھی تھیں۔ کھلے ہوئے کنول بھی تھے۔ ایک روز جوکھو کنوئیں سے لوٹا تو اندھیرا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پوچھا۔ "اب تک وہاں کیا کرتا رہا؟"

جوکھو نے کہا۔ "چار کیاریاں بچ رہی تھیں میں نے سوچا دس موٹ اور کھینچ دوں، کل کا جھنجھٹ کون رکھے۔"

جوکھو اب کچھ دنوں سے کام میں جی لگانے لگا تھا۔ جب تک مالک اس کے سر پر سوار رہتے تھے وہ حیلے بہانے کرتا تھا۔ اب سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ پیاری سارا دن کنوئیں پر تھوڑے ہی رہ سکتی تھی۔ اس لیے اب اس میں ذمہ داری کا احساس پیدا ہو گیا تھا۔ پیاری نے پانی کا لوٹا رکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا ہاتھ منہ دھو ڈالو۔"

"آدمی جان رکھ کر کام کرتا ہے۔ ہائے ہائے کرنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ کھیت آج نہ ہوتے کل ہوتے، کیا جلدی تھی؟"

جوکھو نے سمجھا پیاری بگڑ رہی ہے۔ اس نے تو اپنی سمجھ میں کارگزاری کی تھی اور سمجھا تھا تعریف ہو گی۔ یہاں اعتراض ہوا۔ چڑ کر بولا۔ "مالکن تم داہنے بائیں دونوں طرف چلتی ہو، جو بات نہیں سمجھتی ہو۔ اس میں کیوں کودتی ہو۔ کل کے لیے تو اونچے کے کھیت پڑے سوکھ رہے ہیں۔ آج بڑی مشکل سے کنواں خالی ہوا ہے۔ سویرے میں نہ پہنچتا تو کوئی اور آکر ڈٹ جاتا۔ پھر ہفتے بھر تک راہ دیکھنی پڑتی۔ تب تو اوکھ بدا ہو جاتی۔"

پیاری اس کی سادگی پر ہنس کر بولی۔ "ارے تو میں تجھے کچھ کہہ تھوڑی ہی رہی ہوں۔ میں تو کہتی ہوں کہ جان رکھ کر کام کر، کہیں بیمار ہو گیا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

جوکھو۔ "کون بیمار پڑ جائے گا۔ بیس برس سے کبھی سر تک تو نہیں دکھا۔ آئندہ کی نہیں جانتا۔ کہو رات بھر کام کرتا رہوں۔"

پیاری۔ "میں کیا جانوں۔ تمھی آئے دن بیٹھے رہتے تھے اور پوچھا جاتا تھا تو کہتے تھے کہ بخار آ گیا تھا۔ پیٹ میں درد تھا۔"

جوکھو جھینپتا ہوا بولا۔ "وہ باتیں جب تھیں جب مالک لوگ چاہتے تھے اسے پیس ڈالیں۔ اب تو جانتا ہوں میرے ہی سر ہے، میں نہ کروں گا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔"

پیاری۔ "میں کیا دیکھ بھال نہیں کرتی؟"

جوکھو۔ "تم بہت کرو گی تو دو وقت چلی جاؤ گی۔ تمام دن تم وہاں بیٹھی تو نہیں رہ سکتیں۔"

پیاری کو اس کی اخلاص بھری باتوں نے فریفتہ کر لیا۔ بولی۔ "اتنی رات گئے چولہا جلاؤ گے بیاہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

جوکھو نے منہ دھوتے ہوئے کہا۔ "تم بھی خوب کہتی ہو مالکن۔ اپنے پیٹ بھر کر تو ہوتا نہیں بیاہ کر لوں۔ سوا سیر کھاتا ہوں ایک وقت، پورا سوا سیر۔ دونوں وقت کے لیے ڈھائی سیر چاہیے۔"

پیاری۔ "اچھا آج میری رسوئی میں کھاؤ، دیکھوں کتنا کھاتے ہو؟"

جوکھو نے گلوگیر آواز میں کہا۔ "نہیں مالکن تم پکاتے پکاتے تھک جاؤ گی۔ ہاں آدھ آدھ سیر کی روٹیاں پکا دو تو کھا لوں۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ بس آٹا گوندھ کر دو روٹ بنا لیتا ہوں۔ اوپر سے سینک لیتا ہوں۔ کبھی میٹھے سے کبھی پیاز سے اور آکر پڑ رہتا ہوں۔"

پیاری۔ "میں تجھے آج پھلکے کھلاؤں گی۔"

جوکھو۔ "تب تو ساری رات کھاتے ہی گزر جائے گی۔"

پیاری۔ "بکومت جلدی آکر بیٹھ جاؤ۔"

جوکھو۔ "ذرا بیلوں کو چارہ پانی دیتا آؤں تو بیٹھوں۔"

(7)

جوکھو اور پیاری میں ٹھنی ہوئی تھی۔

پیاری نے کہا۔ "میں کہتی ہوں کہ دھان روپنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جھڑی لگ جائے تو کھیت

ڈوب جائے۔ بارش رک جائے تو کھیت سوکھ جائے۔ جوار' باجرہ' سن' ارہر سب تو ہیں دھان نہ سہی۔"

جوکھو نے اپنے کندھے پر پھاوڑا رکھتے ہوئے کہا۔ "جب سب کا ہوگا تو میرا بھی ہوگا۔ سب کا ڈوب جائے گا تو میرا بھی ڈوب جائے گا؟ میں کیوں کسی سے پیچھے رہوں۔ بابا کے زمانے میں پانچ بیگھے سے کم نہیں روپا جاتا تھا۔ برجو بھیّا نے اس میں ایک دو بیگھے اور بڑھا دیئے۔ متھرا نے بھی ہر سال تھوڑے بہت رُوپے تو کیا میں سب سے گیا گزرا ہوں۔ میں پانچ بیگھے سے کم نہ لگاؤں گا۔"

"تب گھر کے دو جوان کام کرنے والے تھے۔"

"میں تنہا ان دونوں کے برابر کھاتا ہوں' دونوں کے برابر کام کیوں نہ کروں گا؟"

"چل جھوٹا کہیں کا۔ کہتا تھا دو سیر کھاتا ہوں چار سیر کھاتا ہوں۔ آدھ سیر میں ہی رہ گیا۔"

"کسی روز تولو تو معلوم ہو۔"

"تولا ہے' بڑے کھانے والے! میں کہے دیتی ہوں دھان نہ روپو مزدور ملیں گے نہیں' تمہیں ہلکان ہونا پڑے گا۔"

"تمہاری بلا سے ہلکان ہوں گا! یہ بدن کس روز کام آئے گا۔"

پیاری نے اس کے کندھے سے پھاوڑا لے لیا اور بولی۔ "پہر رات سے پہر رات تک تال میں رہو گے نا' میرا دل گھبرائے گا۔"

جوکھو کو دل کے گھبرانے کا تجربہ نہ تھا۔ کوئی کام نہ ہو تو آدمی پڑا سو رہے۔ دل کیوں گھبرائے گا بھلا۔ جی گھبرائے تو سو رہنا چاہیے۔ میں گھر رہوں گا تب تو اور جی گھبرائے گا۔ میں بیکار بیٹھتا ہوں تب مجھے بار بار کھانے کی سوجھتی ہے۔ باتوں میں دیر ہو رہی ہے اور بادل گھرے آتے ہیں۔

پیاری نے کہا۔ "اچھا کل جانا' آج بیٹھو۔"

جوکھو نے گویا مجبور ہو کر کہا۔ "اچھا بیٹھ گیا' کہو کیا کہتی ہو؟"

پیاری نے تمسخر کے انداز سے پوچھا۔ "کہنا کیا ہے میں تم سے پوچھتی ہوں اپنا بیاہ کیوں نہیں کر ڈالتے۔ میں اکیلی مرا کرتی ہوں۔ تب ایک سے دو تین ہو جائیں گے۔"

جوکھو شرماتا ہوا بولا۔ "تم نے پھر وہی بات چھیڑ دی مالکن۔ کس سے بیاہ کروں؟ میں ایسی جورو لے کر کیا کروں جو گہنے کے لیے جان کھاتی رہے۔"

پیاری۔ "یہ تم نے بڑی کڑی شرط لگائی۔ ایسی عورت کہاں ملے گی جو گہنا نہ چاہتی ہو۔"

جوکھو۔ "یہ میں تھوڑا ہی کہتا ہوں کہ وہ گہنا نہ مانگے' ہاں میری جان نہ کھائے۔ تم نے تو کبھی گہنے کے لیے ضد نہیں کی بلکہ اپنے گہنے دوسروں کو دے دیئے۔"

پیاری کے رخساروں پر ہلکا سا رنگ آ گیا۔ بولی۔ "اچھا اور کیا چاہتے ہو؟"

جوکھو۔ "میں کہنے لگوں گا تو بگڑ جاؤ گی۔"

پیاری کی آنکھوں میں شرم کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بولی۔ "بگڑنے کی بات ہو گی تو ضرور بگڑوں گی۔"

جوکھو۔ "تو میں نہ کہوں گا۔"

پیاری نے اسے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "کہو گے کیسے نہیں۔ میں کہلا کر چھوڑوں گی۔"

جو کھو۔ ”اچھا تو سنو! میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہاری طرح ہو‘ ایسی ہی لجانے والی ہو۔ ایسی ہی بات چیت میں ہوشیار ہو۔ ایسا ہی اچھا کھانا پکاتی ہو۔ ایسی ہی کفایت شعار ہو۔ ایسی ہی ہنس مکھ ہو۔ بس ایسی عورت ملے گی تو بیاہ کروں گا‘ نہیں تو اسی طرح پڑار ہوں گا۔“

پیاری کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ پیچھے ہٹ کر بولی۔ ”تم بڑے دل لگی باج ہو۔ ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ گئے۔“

نئی بیوی

(1)

ہمارا جسم پرانا ہے لیکن اس میں ہمیشہ نیا خون دوڑ تا رہتا ہے۔ اسی نئے خون پر زندگی قائم ہے۔ دنیا کے قدیم نظام میں یہ نیاپن اس کے ایک ایک ذرے میں‘ ایک ایک ٹہنی میں‘ ایک ایک قطرے میں‘ تار میں چھپے ہوئے نغمے کی طرح گونجتا رہتا ہے۔ اور یہ سو سال کی بڑھیا آج بھی نئی دلہن بنی ہوئی ہے۔

جب سے لالہ ڈنگامل نے نئی شادی کی ہے‘ ان کی جوانی از سرِ نو عود کر آئی ہے۔ جب پہلی بیوی بقید حیات تھی وہ بہت کم گھر رہتے تھے۔ صبح سے دس گیارہ بجے تک تو پوجا پاٹ ہی کرتے رہتے‘ پھر کھانا کھا کر دکان پر چلے جاتے۔ وہاں سے ایک بجے رات کو لوٹتے اور تھکے ماندے سو جاتے۔ اگر لیلا کبھی کہتی کہ ذرا اور سویرے آ جایا کرو تو بگڑ جاتے۔ ”تمہارے لیے دکان بند کر دوں یا روزگار چھوڑ دوں۔ یہ وہ زمانہ نہیں ہے کہ ایک لوٹا جل چڑھا کر لکشمی کو خوشحال کر لیا جائے۔ آج کل لکشمی کی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنا پڑتا ہے۔ تب بھی ان کا منہ سیدھا نہیں ہوتا۔“ لیلا بےچاری خاموش ہو جاتی۔

ابھی چھ مہینے کی بات ہے۔ لیلا کو زور کا بخار تھا۔ لالہ جی دکان پر چلنے لگے تو لیلا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

”دیکھو میری طبیعت اچھی نہیں ہے‘ ذرا سویرے آ جانا۔“

لالہ جی نے پگڑی اتار کر کھونٹی پر لٹکا دی اور بولے۔ ”اگر میرے بیٹھے رہنے سے تمہارا جی اچھا ہو جائے تو میں دکان پر نہ جاؤں گا۔“

لیلا رنجیدہ ہو کر بولی۔ ”میں یہ کب کہتی ہوں کہ تم دکان پر نہ جاؤ۔ میں تو ذرا سویرے آ جانے کو کہتی ہوں۔“

”تو کیا میں دکان پر بیٹھا موج کرتا ہوں؟“

لیلا کچھ نہ بولی۔ شوہر کی یہ بےاعتنائی اس کے لیے کوئی نئی بات نہ تھی۔ ادھر کئی سال سے اسے اس کا دلدوز تجربہ ہو رہا تھا کہ اس گھر میں اس کی قدر نہیں ہے۔ اگر اس کی جوانی ڈھل چکی تھی تو اس کا قصور تھا؟ کس کی جوانی قائم رہتی ہے۔ لازم تو یہ تھا کہ پچیس سال کی رفاقت اب گہرے روحانی تعلق میں تبدیل ہو جاتی جو ظاہر سے بےنیاز رہتی ہے۔ جو عیب کو بھی حسن دیکھنے لگتی ہے‘ جو پکے پھل کی طرح زیادہ شیریں‘ زیادہ خوشنما ہو جاتی ہے۔

لیکن لالہ جی کا تاجر دل ہر ایک چیز کو تجارت کے ترازو پر تولتا تھا۔ بوڑھی گائے جب نہ دودھ دے سکتی ہو' نہ بچے' تو اس کے لیے گئوشالہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔ ان کے خیال میں لیلا کے لیے بس اتنا ہی کافی تھا کہ وہ گھر کی مالکن بن کر رہے۔ آرام سے کھائے پہنے اور پڑی رہے۔ اسے اختیار ہے' چاہے جتنے زیور بنوائے' چاہے جتنی خیرات اور پوجا کرے۔ روزے رکھے۔ صرف ان سے دور رہے۔ فطرتِ انسانی کی نیرنگیوں کا ایک کرشمہ یہ تھا کہ لالہ جی جس دلجوئی اور حظ سے لیلا کو محروم رکھنا چاہتے تھے' خود اسی کے لیے ابلہانہ سرمستی سے متلاشی رہتے تھے۔ لیلا چالیس کی ہو کر بوڑھی سمجھ لی گئی تھی مگر وہ پینتالیس کے ہو کر ابھی جوان تھے۔ جوانی کے ولولوں اور مسرتوں سے بیقرار۔ لیلا سے اب انہیں ایک طرح کی کراہت ہوتی تھی اور وہ غریب جب اپنی خامیوں کے حسرتناک احساس کی وجہ سے فطری بے رحمیوں کے ازالے کے لیے رنگ و روغن کی آڑ لیتی تو وہ اس کی بوالہوسی سے اور بھی متنفر ہو جاتے۔ چہ خوش! سات لڑکوں کی توماں ہو گئیں۔ بال کھچڑی ہو گئے۔ چہرہ دھلے ہوئے فلالین کی طرح پُرشکن ہو گیا۔ مگر آپ کو ابھی مہاور اور سیندور' مہندی اور اُبٹن کی ہوس باقی ہے۔ عورتوں کی بھی کیا فطرت ہے! نہ جانے آرائش پر کیوں اس قدر جان دیتی ہیں۔ پوچھو اب تمہیں اور کیا چاہیے؟ کیوں نہیں دل کو سمجھا لیتیں کہ جوانی رخصت ہو گئی اور ان تدبیروں سے اسے واپس نہیں بلایا جا سکتا۔ لیکن وہ خود جوانی کا خواب دیکھتے رہتے تھے۔ طبیعت جوانی سے سیر نہ ہوتی۔ جاڑوں میں کشتوں اور معجونوں کا استعمال کرتے رہتے تھے۔ ہفتے میں دو بار خضاب لگاتے اور کسی ڈاکٹر سے بندر کے غدودوں کے متعلق خط و کتابت کر رہے تھے۔

لیلا نے انہیں ششں و پنج کی حالت میں کھڑا دیکھ کر مایوسانہ انداز سے کہا۔ "کچھ بتلا سکتے ہو کے بجے آؤ گے؟"

لالہ جی نے ملائم لہجے میں کہا۔ "تمہاری طبیعت آج کیسی ہے؟"

لیلا کیا جواب دے؟ اگر کہتی ہے بہت خراب ہے تو شاید یہ حضرت یہیں بیٹھ جائیں اور اسے جلی کٹی سنا کر اپنے دل کا بخار نکالیں۔ اگر کہتی ہے اچھی ہوں تو شاید بے فکر ہو کر دو بجے رات کی خبر لائیں۔ ڈرتے ڈرتے بولی۔ "اب تک تو اچھی تھی لیکن اب کچھ کچھ بھاری ہو رہی ہے۔ لیکن تم جاؤ' دکان پر لوگ تمہارے منتظر ہوں گے۔ مگر ایشور کے لیے دو نہ بجا دینا۔ لڑکے سو جاتے ہیں۔ مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگتا۔ طبیعت گھبراتی ہے۔"

سیٹھ جی نے لہجے میں محبت کی چاشنی دے کر کہا۔ "بارہ بجے تک آؤں گا ضرور۔"

لیلا کا چہرہ اتر گیا۔ "دس بجے تک نہیں آسکتے؟"

"ساڑھے گیارہ بجے سے پہلے کسی طرح نہیں۔"

"ساڑھے دس بھی نہیں؟"

"اچھا گیارہ بجے۔"

گیارہ پر مصالحت ہو گئی۔ لالہ جی وعدہ کر کے چلے گئے۔ لیکن شام کو ایک دوست نے مجرا سننے کی دعوت دی۔ اب بے چارے اس دعوت کو کیسے رد کر دیتے۔ جب ایک آدمی آپ کو خاطر سے بلاتا ہے تو یہ کہاں کی انسانیت ہے کہ آپ اس کی دعوت نامنظور کر دیں۔ وہ آپ سے کچھ مانگتا نہیں' آپ سے کسی طرح کی رعایت کا خواستگار نہیں۔ محض دوستانہ بے تکلفی سے آپ کو اپنی بزم میں شرکت کی دعوت دیتا ہے۔ آپ پر اس کی دعوت قبول کرنا فرض ہوتا ہے۔ گھر کے جنجال سے کسے فرصت ہوتی ہے۔ ایک نہ ایک کام تو روز لگا ہی رہتا ہے۔ کبھی کوئی بیمار ہے۔ کبھی پوجا ہے۔ کبھی کچھ۔ اگر آدمی یہ سوچے کہ گھر سے بے فکر ہو کر جائیں گے تو اسے سارے دوستانہ مراسم منقطع

کر لینے پڑیں گے۔ اسے شاید ہی گھر سے کبھی فراغت نصیب ہو۔ لالہ جی مُجرا سننے چلے گئے تو دو بجے لوٹے۔ آتے ہی اپنے کمرے کی گھڑی کی سوئیاں پیچھے کر دیں۔ لیکن ایک گھنٹے سے زیادہ کی گنجائش کسی طرح نہ نکال سکے۔ دو کو ایک کہہ سکتے ہیں۔ گھڑی کی تیزی کے سر الزام رکھا جاتا ہے۔ لیکن دو کو بارہ نہیں کہہ سکتے۔ چپکے سے آ کر نوکر کو جگایا۔ کھانا کھا کر آئے تھے۔ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہے۔ لیلا ان کی راہ دیکھتی' ہر لمحہ درد اور بے چینی کی بڑھتی ہوئی شدت کا احساس کرتی نہ جانے کب کی سو گئی تھی۔ اسے جگانا سوئے ہوئے فتنے کو جگانا تھا۔

غریب لیلا اس بیماری سے جانبر نہ ہو سکی۔ لالہ جی کو اس کی وفات کا بے حد روحانی صدمہ ہوا۔ دوستوں نے تعزیت کے تار بھیجے۔ کئی دن تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ایک روزانہ اخبار نے مرنے والی کی قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اس کی دماغی اور اخلاقی خوبیوں کی مبالغہ آمیز تصویر کھینچی۔ لالہ جی نے ان سب ہمدردوں کا دلی شکریہ ادا کیا اور ان کے خلوص و وفاداری کا اظہار جنت نصیب لیلا کے نام سے لڑکیوں کے لیے پانچ وظیفے قائم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔ وہ نہیں مریں صاحب! میں مر گیا۔ زندگی کی شمعِ ہدایت گل ہو گئی۔ اب تو جینا اور رونا ہے۔ میں تو ایک حقیر انسان تھا' نہ جانے کس کار خیر کے صلے میں مجھے یہ نعمت بارگاہ ایزدی سے عطا ہوئی تھی۔ میں تو اس کی پرستش کرنے کے قابل بھی نہ تھا وغیرہ۔

چھ مہینے کی عزلت اور نفس کشی کے بعد لالہ ڈنگامل نے دوستوں کے اصرار سے دوسری شادی کر لی۔ آخر غریب کیا کرتے زندگی میں ایک رفیق کی ضرورت تو تھی ہی اور اس عمر میں تو رفیق کی ضرورت اور زیادہ ہو گئی تھی۔ لکڑی کی ضرورت جبھی ہوتی ہے جب پاؤں میں کھڑے رہنے کی طاقت نہیں رہتی۔

(2)

جب سے نئی بیوی آئی ہے لالہ جی کی زندگی میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ دکان سے اب انہیں اس قدر انہماک نہیں ہے۔ متواتر ہفتوں نہ جانے سے بھی ان کے کاروبار میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ زندگی سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت جوان میں روز بروز مضمحل ہوتی جاتی تھی' اب یہ ترشح پا کر پھر سرسبز ہو گئی ہے۔ اس میں نئی نئی کونپلیں پھوٹنے لگی ہیں۔ موٹر نیا آ گیا ہے۔ کمرے نئے فرنیچر سے آراستہ کر دیئے گئے ہیں۔ نوکروں کی تعداد میں معقول اضافہ ہو گیا ہے۔ ریڈیو بھی لگا دیا گیا ہے۔ لالہ جی کی بوڑھی جوانی جوانوں کی جوانی سے بھی زیادہ پُرجوش اور ولولہ انگیز ہو رہی ہے۔ اسی طرح جیسے بجلی کی روشنی چاند کی روشنی سے زیادہ شفاف اور نظر فریب ہوتی ہے۔ لالہ جی کو ان کے احباب ان کی اس جواں طبعی پر مبارکباد دیتے ہیں تو وہ تفاخر کے انداز میں کہتے ہیں۔ "بھئی ہم تو ہمیشہ جوان رہے اور جوان رہیں گے۔ بڑھاپا میرے پاس آئے تو اس کے منہ پر سیاہی لگا کر گدھے پر الٹا سوار کر کے شہر بدر کر دوں۔ جوانی اور بڑھاپے کو لوگ نہ جانے عمر سے کیوں منسوب کرتے ہیں۔ جوانی کا عمر سے اتنا ہی تعلق ہے جتنا مذہب کا اخلاق سے' روپے کا ایمانداری سے' حسن کا آرائش سے۔ آج کل کے جوانوں کو آپ جوان کہتے ہیں۔ ارے صاحب! میں ان کی ایک ہزار جوانیوں کو اپنی جوانی کے ایک گھنٹے سے نہ تبدیل کروں۔ معلوم ہوتا ہے زندگی میں کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ کوئی شوق ہی نہیں۔ زندگی کیا ہے' گلے میں پڑا ہوا ڈھول ہے۔ یہی الفاظ وہ کچھ ضروری ترمیم کے بعد آشا دیوی کے لوحِ دل پر نقش کرتے رہتے ہیں۔ اس سے ہمیشہ سینما' تھیٹر' سیرِ دریا کے لیے اصرار

کرتے ہیں۔ لیکن آشانہ جانے کیوں ان دلچسپیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں۔ وہ ہو جاتی تو ہے، مگر بہت اصرار کے بعد۔

ایک دن لالہ جی نے آ کر کہا۔ "چلو آج بجرے پر دریا کی سیر کر آئیں۔"

بارش کے دن تھے۔ دریا چڑھا ہوا تھا۔ ابر کی قطاریں بین الاقوامی فوجوں کی سی رنگ برنگ وردیاں پہنے آسمان پر قواعد کر رہی تھیں۔ سڑک پر لوگ ملہار اور بارہ ماسے گاتے چلے جا رہے تھے۔ باغوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔

آشا نے بے دلی سے کہا۔ "میرا تو جی نہیں چاہتا۔"

لالہ جی نے تادیب آمیز اصرار سے کہا۔ "تمہاری کیسی طبیعت ہے جو سیر و تفریح کی جانب مائل نہیں ہوتی؟"

"آپ جائیں، مجھے اور کئی کام کرنے ہیں۔"

"کام کرنے کو ایشور نے آدمی دے دیئے ہیں تمہیں کام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مہراج اچھا سالن نہیں پکاتا۔ آپ کھانے بیٹھیں گے تو یوں ہی اٹھ جائیں گے؟"

لیلا اپنی فرصت کا بیشتر حصہ لالہ جی کے لیے انواع و اقسام کے کھانے پکانے میں صرف کرتی تھی۔ کسی سے سن رکھا تھا کہ ایک خاص عمر کے بعد مردوں کی زندگی کی خاص دلچسپی لذتِ زبان رہ جاتی ہے۔ لالہ جی کے دل کی کلی کھِل گئی۔ آشا کو ان سے اس قدر محبت ہے کہ وہ سیر کو ان کی خدمت پر قربان کر رہی ہے۔ ایک لیلا تھی کہ کہیں جاؤں پیچھے چلنے کو تیار، پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہانے کرنے پڑتے تھے۔ خود سر پر سوار ہو جاتی تھی اور سارا مزا کرکرا کر دیتی تھی۔

بولے۔ "تمہاری بھی عجیب طبیعت ہے۔ اگر ایک دن سالن بے مزہ ہی رہا تو ایسا کیا طوفان آ جائے گا۔ تم اس طرح میرے رئیسانہ چونچلوں کا لحاظ کرتی رہو گی تو مجھے بالکل آرام طلب بنا دو گی۔ اگر تم نہ چلو گی تو میں بھی نہ جاؤں گا۔"

آشا نے جیسے گلے سے پھندا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "آپ بھی تو مجھے ادھر ادھر گھما کر میرا مزاج بگاڑ دیتے ہیں۔ یہ عادت پڑ جائے گی تو گھر کے دھندے کون کرے گا؟"

لالہ جی نے فیاضانہ لہجہ میں کہا۔ "مجھے گھر کے دھندوں کی ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ بال کی نوک برابر بھی نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہارا مزاج بگڑے اور تم اس گھر کی چکی سے دور رہو اور تم مجھے بار بار آپ کیوں کہتی ہو؟ میں چاہتا ہوں تم مجھے تم کہو، تُو کہو، محبت کی گالیاں دو۔ غصے کی صلواتیں سناؤ۔ لیکن تم مجھے آپ کہہ کر جیسے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا دیتی ہو، میں اپنے گھر میں دیوتا نہیں شریر چھوکرا بن کر رہنا چاہتا ہوں۔"

آشا نے مسکرانے کی کوشش کر کے کہا۔ "آئے نوج! بھلا میں آپ کو تم کہوں گی، تم برابر والوں کو کہا جاتا ہے یا بڑوں کو؟"

منیم جی نے ایک لاکھ کے گھاٹے کی پُر ملال خبر سنائی ہوتی تب بھی لالہ جی کو شاید اتنا صدمہ نہ ہوتا جتنا آشا کے ان بھولے بھالے الفاظ سے ہوا۔ ان کا سارا جوش، سارا ولولہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ جیسے برف کی طرح منجمد ہو گیا۔ سر پر بانکی رکھی ہوئی رنگین پھولدار ٹوپی، گلے میں پڑی ہوئی جوگیئے رنگ کی ریشمی چادر، وہ تن زیب کا بیل دار کرتہ جس میں سونے کے بٹن لگے ہوئے تھے، یہ سارا اٹھاٹ جیسے انہیں مضحکہ خیز معلوم ہونے لگا۔ جیسے سارا نشہ کسی منتر سے اتر گیا ہو۔

دل شکستہ ہو کر بولے۔ "تو تمہیں چلنا ہے یا نہیں؟"

"میرا جی نہیں چاہتا۔"

"لو میں بھی نہ جاؤں؟"

"میں آپ کو کب منع کرتی ہوں۔"

"پھر آپ کہا۔"

آشا نے جیسے اندر سے زور لگا کر "تم" کہا اور اس کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

"ہاں اس طرح "تم" کہا کرو۔ تو تم نہیں چل رہی ہو؟ اگر میں کہوں کہ تمہیں چلنا پڑے گا تب؟"

"تب چلوں گی' آپ کے حکم کی پابندی میرا فرض ہے۔"

لالہ جی حکم نہ دے سکے۔ فرض اور حکم جیسے الفاظ سے ان کے کانوں میں خراش سی ہونے لگی۔ کھسیانے ہو کر باہر چلے۔ اس وقت آشا کو ان پر رحم آ گیا۔ بولی۔ "تو کب تک لوٹو گے؟"

"میں نہیں جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو میں بھی چلتی ہوں۔"

جس طرح ضدی لڑکا رونے کے بعد اپنی مطلوبہ چیز پا کر اسے پیروں سے ٹھکرا دیتا ہے' اسی طرح لالہ جی نے رونا منہ بنا کر کہا۔ "تمہارا جی نہیں چاہتا تو نہ چلو' میں مجبور نہیں کرتا۔"

"آپ ـــــ نہیں تم برا مان جاؤ گے۔"

آشا سیر کرنے گئی لیکن امنگ سے نہیں جو معمولی ساڑھی پہنے ہوئے تھی وہی پہنے چل کھڑی ہوئی۔ نہ کوئی نفیس ساڑھی' نہ کوئی مرصّع زیور' نہ کوئی سنگار جیسے بیوہ ہو۔

ایسی ہی باتوں سے لالہ جی دل میں جھنجھلاتے۔ شادی کی تھی زندگی کا لطف اٹھانے کے لیے۔ جھلملاتے ہوئے چراغ میں تیل ڈال کر اسے روشن کرنے کے لیے۔ اگر چراغ کی روشنی تیز نہ ہوئی تو تیل ڈالنے سے کیا فائدہ؟ نہ جانے اس کی طبیعت کیوں اس قدر خشک اور افسردہ ہے' جیسے کوئی اوسر کا درخت ہو' کتنا ہی پانی ڈالو اس میں ہری پتیوں کے درشن ہی نہیں ہوتے۔ جڑاؤ زیوروں کے بھرے صندوق رکھے ہیں۔ کہاں کہاں سے منگوائے' دہلی سے' کلکتے سے' فرانس سے۔ کیسی کیسی قیمتی ساڑھیاں رکھی ہوئی ہیں۔ ایک نہیں سینکڑوں مگر صندوق میں کیڑوں کی خوراک بننے کے لیے۔ غریب خاندانوں کی لڑکیوں میں بھی یہی عیب ہوتا ہے ان کی نگاہ ہمیشہ تنگ رہتی ہے۔ نہ کھا سکیں' نہ پہن سکیں' نہ دے سکیں۔ انہیں تو خزانہ بھی مل جائے تو یہی سوچتی رہیں گی کہ بھلا اسے خرچ کیسے کریں؟"

دریا کی سیر تو ہوئی مگر کچھ لطف نہ آیا۔

(3)

کئی ماہ تک آشا کی طبیعت کو ابھارنے کی ناکام کوشش کر کے لالہ جی نے سمجھا کہ یہ محرم کی پیدائش ہے۔ لیکن پھر بھی برابر مشق جاری رکھی۔ اس بیوپار میں ایک خطیر رقم صَرف کرنے کے بعد وہ اس سے زیادہ سے زیادہ نفع اٹھانے کے تاجرانہ تقاضے کو کیسے نظر انداز کرتے۔ دلچسپی کی نئی نئی صورتیں پیدا کی جاتیں۔ گراموفون اگر بگڑ گیا ہے' گانا نہیں یا آواز صاف نہیں نکالتا تو اس کی مرمت کرانی پڑے گی' اسے اٹھا کر رکھ دینا یہ تو حماقت ہے۔

ادھر بوڑھا مہراج بیمار ہو کر چلا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا آ گیا تھا۔ کچھ عجیب

مسخرا سا بالکل اجڈ اور دہقانی، کوئی بات ہی نہ سمجھتا۔ اس کے پھلکے اقلیدس کی شکلوں سے بھی زیادہ مختلف الاشکال ہو جاتے۔ بیچ میں موٹے کنارے پتلے۔ دال کبھی تو اتنی پتلی جیسے چائے اور کبھی اتنی گاڑھی جیسے دہی۔ کبھی نمک اتنا کم کہ بالکل پھیکا، کبھی اتنا تیز کہ نیبو کا نمکین اچار۔ آشا سویرے ہی سے رسوئی میں پہنچ جاتی اور اس بد سلیقے مہراج کو کھانا پکانا سکھاتی۔ "تم کتنے نالائق آدمی ہو جگل؟ آخر اتنی عمر تک تم کیا گھاس کھودتے رہے یا بھاڑ جھونکتے رہے کہ پھلکے تک نہیں بنا سکتے؟"

جگل آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتا۔ "بہو جی! ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ سترھواں ہی سال تو ہے۔"

آشا ہنس پڑی۔ "تو روٹیاں پکانا کیا دس بیس سال میں آتا ہے؟"

"آپ ایک مہینہ میں سکھا دیں بہو جی۔ پھر دیکھنا میں آپ کو کیسے پھلکے کھلاتا ہوں کہ جی خوش ہو جائے۔ جس دن مجھے پھلکے پکانے آجائیں گے میں آپ سے کوئی انعام لوں گا۔ سالن تو اب میں کچھ کچھ پکانے لگا ہوں نا؟"

آشا حوصلہ افزا تبسم سے بولی۔ "سالن نہیں وہ پکانا آتا ہے۔ ابھی کل ہی نمک اتنا تیز تھا کہ کھایا نہ گیا۔"

"میں جب سالن بنا رہا تھا تو آپ یہاں کب تھیں؟"

"اچھا! تو جب میں یہاں بیٹھی رہوں تب تمہارا سالن لذیذ پکے گا؟"

"آپ بیٹھی رہتی ہیں تو میری عقل ٹھکانے رہتی ہے۔"

"اور میں نہیں رہتی تب؟"

"تب تو آپ کے کمرے کے دروازے پر جا بیٹھتی ہے!"

"تمہارے دادا آجائیں گے، تم چلے جاؤ گے؟"

"نہیں بہو جی! کسی اور کام میں لگا دیجئے گا۔ مجھے موٹر چلانا سکھوا دیجئے گا ـــــ نہیں نہیں آپ ہٹ جائیے میں پتیلی اتار لوں گا۔ ایسی اچھی ساڑھی ہے آپ کی، کہیں داغ لگ جائے تو کیا ہو؟"

"دور رہو، پھوہڑ تو تم ہو ہی، کہیں پتیلی پیر پر گر پڑے تو مہینوں جھیلو گے۔"

جگل افسردہ ہو گیا۔ نحیف چہرہ اور بھی خشک ہو گیا۔

آشا نے مسکرا کر پوچھا۔ "کیوں! منہ کیوں لٹک گیا سرکار کا؟"

"آپ ڈانٹ دیتی ہیں، بہو جی، تو میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ سیٹھ جی کتنا ہی گھرکیں مجھے ذرا بھی صدمہ نہیں ہوتا۔ آپ کی نظر کڑی دیکھ کر جیسے میرا خون سرد ہو جاتا ہے۔"

آشا نے تشفی دی۔ "میں نے تمہیں ڈانٹا نہیں، صرف اتنا ہی کہا کہ کہیں پتیلی پاؤں پر گر پڑے تو کیا ہو؟"

"ہاتھ تو آپ کا بھی ہے۔ کہیں آپ کے ہاتھ سے ہی چھوٹ پڑے تب؟"

سیٹھ جی نے رسوئی کے دروازے پر آکر کہا۔ "آشا ذرا یہاں آنا۔ دیکھو تمہارے لیے کتنے خوشنما گملے لایا ہوں۔ تمہارے کمرے کے سامنے رکھے جائیں گے۔ تم وہاں دھوئیں دھکڑ میں کیا پریشان ہوتی ہو۔ لونڈے سے کہہ دو کہ مہراج کو بلائے۔ ورنہ میں کوئی دوسرا انتظام کر لوں گا۔ مہراجوں کی کمی نہیں۔ آخر کب تک کوئی رعایت کرے۔ اس گدھے کو تو ذرا بھی تمیز نہ آئی۔"

"سنتا ہے جگل۔ آج لکھ دے اپنے باپ کو۔"

چولہے پر توا رکھا ہوا تھا۔ آشا روٹیاں بیل رہی تھی۔ جگل توے کیلئے روٹیوں کا انتظار کر رہا تھا۔ ایسی حالت

میں بھلاوہ کیسے گملے دیکھنے جاتی؟ کہنے لگی۔ "ابھی آتی ہوں ذرا روٹی بیل رہی ہوں' چھوڑوں گی تو جگل ٹیڑھی بیلے گا۔"

لالہ جی نے چڑ کر کہا۔ "اگر روٹیاں ٹیڑھی میڑھی بیلے گا تو نکال دیا جائے گا۔"

آشا ان سنی کر کے بولی۔ "دس پانچ دن میں سیکھ جائے گا نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"تم چل کر بتادو گملے کہاں رکھے جائیں؟"

"کہتی ہوں روٹیاں بیل کر آجاتی ہوں۔"

"نہیں میں کہتا ہوں تم روٹیاں مت بیلو۔"

"تم خواہ مخواہ ضد کرتے ہو۔"

لالہ جی سناٹے میں آگئے۔ آشا نے کبھی اتنی بے اتفاقی سے انہیں جواب نہ دیا تھا اور یہ محض بے التفاقی نہ تھی اس میں ترشی بھی تھی۔ خفیف ہو کر چلے گئے۔ انہیں ایسا غصہ آرہا تھا کہ ان گملوں کو توڑ کر پھینک دیں اور سارے پودوں کو چولہے میں ڈال دیں۔

جگل نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ چلی جائیں' بہو جی۔ سرکار ناراض ہو گئے۔"

"بکو مت! جلد جلد روٹیاں سینکو' نہیں تو نکال دیئے جاؤ گے اور آج مجھ سے روپے لے کر اپنے لیے کپڑے بنوالو۔ بھیک منگوں کی سی صورت بنائے گھومتے ہو اور بال کیوں اتنے بڑھا رکھے ہیں۔ تمہیں نائی بھی نہیں جُڑتا؟"

"کپڑے بنوالوں تو دادا کو کیا حساب دوں گا؟"

"ارے بے وقوف! میں حساب میں نہیں دینے کو کہتی' مجھ سے لے جانا۔"

"آپ بنوائیں گی تو اچھے کپڑے لوں گا۔ مہین کھدر کا کرتہ' کھدر کی دھوتی' ریشمی چادر' اچھا سا چپل۔"

آشا نے مٹھاس بھرے تبسم سے کہا۔ "اور اگر اپنے دام سے بنوانے پڑے تو؟"

"تب کپڑے بنواؤں گا نہیں۔"

"بڑے چالاک ہو تم۔"

"آدمی اپنے گھر سے روکھی روٹی کھا کر سو رہتا ہے۔ لیکن دعوت میں اچھے اچھے پکوان ہی کھاتا ہے۔"

"یہ سب میں نہیں جانتی۔ ایک گاڑھے کا کرتہ بنوالو اور ایک ٹوپی۔ حجامت کے لیے دو آنے کے پیسے لے لو۔"

"رہنے دیجئے میں نہیں لیتا۔ اچھے کپڑے پہن کر نکلوں گا تو آپ کی یاد آئے گی۔ سڑیل کپڑے ہوئے تو جی جلے گا۔"

"تم بڑے خود غرض ہو' مفت کے کپڑے لو گے اور اعلیٰ درجے کے۔"

"جب یہاں سے جانے لگوں تو آپ مجھے اپنی ایک تصویر دے دیجئے گا۔"

"میری تصویر لے کر کیا کرو گے؟"

"اپنی کوٹھڑی میں لگادوں گا اور دیکھا کروں گا۔ بس وہی ساڑھی پہن کر کھنچوانا جو کل پہنی تھی اور وہی موتیوں والی مالا بھی ہو۔ مجھے ننگی ننگی صورت اچھی نہیں لگتی۔ آپ کے پاس تو بہت گہنے ہوں گے۔ آپ پہنتی کیوں نہیں؟"

"تو تمہیں گہنے اچھے لگتے ہیں؟"

"بہت۔"

لالہ جی نے پھر آکر خفت آمیز لہجے میں کہا۔ "ابھی تک تمہاری روٹیاں نہیں پکیں جنگل! اگر کل سے تم نے اپنے آپ اچھی روٹیاں نہ بنائیں تو میں تمہیں نکال دوں گا۔"

آشا نے فوراً ہاتھ دھوئے اور بڑی مسرت آمیز تیزی سے لالہ جی کے ساتھ جاکر گملوں کو دیکھنے لگی۔ آج اس کے چہرے پر غیر معمولی شگفتگی نظر آرہی تھی۔ اس کے اندازِ گفتگو میں بھی دل آویز شیرینی تھی۔ لالہ جی کی ساری خفت غائب ہوگئی۔ آج اس کی باتیں زبان سے نہیں دل سے نکلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ بولی۔ "میں ان میں سے کوئی گملا نہ جانے دوں گی۔ سب میرے کمرے کے سامنے رکھوانا' سب کتنے سندر پودے ہیں۔ واہ ان کے ہندی نام بھی بتا دینا۔"

لالہ جی نے چھیڑا۔ "یہ سب لے کر کیا کرو گی؟ دس پانچ پسند کرلو' باقی میں باہر باغیچے میں رکھوا دوں گا۔"

"جی نہیں! میں ایک بھی نہیں چھوڑوں گی۔ سب یہیں رکھے جائیں گے۔"

"بڑی حریص ہو تم۔"

"حریص سہی' میں آپ کو ایک بھی نہ دوں گی۔"

"دس پانچ تو دے دو' اتنی محنت سے لایا ہوں۔"

"جی نہیں ان میں سے ایک بھی نہ ملے گا۔"

(4)

دوسرے دن آشا نے اپنے کو زیوروں سے خوب آراستہ کیا اور فیروزی ساڑھی پہن کر نکلی تو لالہ جی کی آنکھوں میں نور آگیا۔ اب ان کی عاشقانہ دلجوئیوں کا اثر ہو رہا ہے ضرور' ورنہ ان کے بار بار تقاضا کرنے پر منت کرنے پر بھی اس نے کوئی زیور نہ پہنا تھا۔ کبھی کبھی موتیوں کا ہار گلے میں ڈال لیتی تھی۔ وہ بھی بے دلی سے۔ آج ان زیوروں سے مرصّع ہو کر وہ پھولی نہیں سماتی' اترائی جاتی ہے۔ گویا کہتی ہے دیکھو میں کتنی حسین ہوں۔ پہلے جو کلی تھی وہ آج کھِل گئی ہے۔

لالہ صاحب پر گھڑوں نشہ چڑھا ہوا ہے۔ وہ چاہتے ہیں ان کے احباب و اعزا آکر اس سونے کی رانی کے دیدار سے اپنی آنکھیں روشن کریں۔ دیکھیں کہ ان کی زندگی کتنی پُر لطف ہے۔ جو انواع و اقسام کے شکوک دشمنوں کے دلوں میں پیدا ہوئے تھے وہ آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ اعتماد' رواداری اور فراست نے کتنا خلوص پیدا کر دیا ہے۔

انہوں نے تجویز کی۔ "چلو کہیں سیر کر آئیں' بڑی مزے دار ہوا چل رہی ہے۔"

آشا اس وقت کیسے آسکتی ہے۔ ابھی اسے رسوئی جانا ہے۔ وہاں سے کہیں بارہ ایک بجے تک فرصت ملے گی۔ پھر گھر کے کام دھندے سر پر سوار ہو جائیں گے۔ اسے کہاں فرصت ہے۔ پھر کل سے اسے کلیجہ میں کچھ درد بھی ہو رہا ہے۔ رہ رہ کر درد اٹھتا ہے۔ ایسا درد کبھی نہ ہوتا تھا۔ رات نہ جانے کیوں درد ہونے لگا۔

سیٹھ جی ایک بات سوچ کر دل ہی دل میں پُھول اٹھے۔ وہ گولیاں رنگ لا رہی ہیں۔ راج وید نے آخر کہا بھی تھا کہ ''ذرا سوچ سمجھ کر ان کا استعمال کیجئے گا۔'' کیوں نہ ہو خاندانی وید ہے۔ اس کا باپ راجہ بنارس کا معالج تھا۔ پرانے مجرّب نسخے ہیں اس کے پاس۔

چہرے پر سراسیمگی کا رنگ بھر کر پوچھا۔ ''تو رات ہی سے یہ درد ہو رہا ہے۔ تم نے مجھ سے کہا نہیں' ورنہ وید جی سے کوئی دوا منگوا دیتا۔''

''میں نے سمجھا تھا کہ آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا مگر بڑھ رہا ہے۔''

''کہاں درد ہو رہا ہے؟ ذرا دیکھوں تو کچھ آماس تو نہیں ہے؟''

سیٹھ جی نے آشا کے آنچل کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آشا نے شرما کر سر جھکا لیا اور بولی۔ ''یہی تمہاری شرارت مجھے اچھی نہیں لگتی' جا کر کوئی دوا لا دو۔''

سیٹھ جی اپنی جوانمردی کا یہ ڈپلومہ پا کر اس سے کہیں زیادہ محظوظ ہوئے۔ جتنا شاید رائے بہادری کا خطاب پا کر ہوتے۔ اپنے اس کارِ نمایاں کی داد لیے بغیر انہیں کیسے چین ہوتا' جو لوگ ان کی شادی کے متعلق شبہ آمیز سرگوشیاں کرتے تھے انہیں زک دینے کا کتنا نادر موقع ہاتھ آیا ہے۔ پہلے پنڈت بھولا ناتھ کے گھر پہنچے اور بادلِ دردمند بولے۔ ''میں تو بھئی سخت مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ کل سے ان کے سینے میں درد ہو رہا ہے۔ کچھ عقل کام نہیں کرتی۔''

بھولا ناتھ نے کچھ زیادہ ہمدردی کا اظہار نہیں کیا۔ بولے۔ ''ہوا لگ گئی ہو گی اور کیا؟''

سیٹھ جی نے ان سے اختلاف کیا۔ ''نہیں پنڈت جی ہوا کا فساد نہیں ہے۔ کوئی اندرونی شکایت ہے۔ ابھی کمسن ہیں نا؟ راج وید سے کوئی دوا لے لیتا ہوں۔''

''میں تو سمجھتا ہوں آپ ہی آپ اچھا ہو جائے گا۔''

''آپ بات نہیں سمجھتے' یہی آپ میں نقص ہے۔''

''آپ کا جو خیال ہے وہ بالکل غلط ہے۔ مگر خیر دوا لا کر دیجئے اور اپنے لیے بھی کوئی دوا لیتے آیئے گا۔''

سیٹھ یہاں سے اٹھ کر اپنے دوسرے دوست لالہ بھاگ مل کے پاس پہنچے اور ان سے بھی قریب قریب انہی الفاظ میں یہ پُر ملال خبر کہی۔ بھاگ مل بڑا شہدا تھا' مسکرا کر بولا۔ ''مجھے تو آپ کی شرارت معلوم ہوتی ہے۔''

سیٹھ جی کی باچھیں کھل گئیں۔ ''میں اپنا دکھ سنا رہا ہوں اور تمہیں مذاق سوجھتا ہے۔ ذرا بھی انسانیت تم میں نہیں ہے۔''

''میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ بھلا اس میں مذاق کی کیا بات۔ وہ ہیں کمسن' نازک اندام۔ آپ ٹھہرے آزمودہ کار' مردِ میدان۔ بس اگر یہ بات نہ نکلے تو مونچھیں منڈوا ڈالوں۔''

سیٹھ جی نے متین صورت بنائی۔ ''میں تو بھئی بڑی احتیاط کرتا ہوں تمہارے سر کی قسم۔''

''جی رہنے دیجئے' میرے سر کی قسم نہ کھایئے۔ میرے بھی بال بچے ہیں۔ گھر کا اکیلا آدمی ہوں۔ کسی قاطع دوا کا استعمال کیجئے۔''

''انہیں راج وید سے کوئی دوا لیے دیتا ہوں۔''

''اس کی دوا وید جی کے پاس نہیں' آپ کے پاس ہے۔''

سیٹھ جی کی آنکھوں میں نور آ گیا۔ شباب کا احساس پیدا ہوا اور اس کے ساتھ چہرے پر بھی شباب کی جھلک آ گئی۔ سینہ جیسے کچھ فراخ ہو گیا۔ چلتے وقت ان کا پیر کچھ زیادہ مضبوطی سے زمین پر پڑنے لگا اور سر کی ٹوپی بھی خدا جانے کیوں کج ہو گئی۔ بشرے سے ایک بانکپن کی شان برس رہی تھی۔ راج وید نے مژدہ جان فزا سنا تو بولے میں نے کہا تھا ذرا سوچ سمجھ کر ان گولیوں کا استعمال کیجئے گا۔ آپ نے میری ہدایت پر توجہ نہ کی۔ ذرا مہینے دو مہینے ان کا استعمال کیجئے اور پرہیز کے ساتھ رہیے' پھر دیکھئے ان کا اعجاز۔ اب گولیاں بہت کم رہی ہیں۔ لوٹ مچی رہتی ہے۔ لیکن ان کا بنانا اتنا مشکل اور وقت طلب ہے کہ ایک بار ختم ہو جانے پر مہینوں تیاری میں لگ جاتے ہیں۔ ہزاروں بوٹیاں ہیں۔ کیلاش' نیپال اور تبت سے منگائی جاتی ہیں اور اس کا بنانا تو آپ جانتے ہیں کتنا لوہے کے چنے چبانا ہے۔ آپ احتیاطاً ایک شیشی لیتے جائیے۔

(5)

جُگل نے آشا کو سر سے پاؤں تک جگمگاتے دیکھ کر کہا۔ ''بس بہو جی! اسی طرح پہنے اوڑھے رہا کریں۔ آج میں آپ کو چولہے کے پاس نہ آنے دوں گا۔''

آشا نے شرارت آمیز نظروں سے دیکھ کر کہا۔ ''کیوں آج یہ سختی کیوں؟ کئی دن تو تم نے منع نہیں کیا؟''

''آج کی بات دوسری ہے۔''

''ذرا سنوں کیا بات ہے؟''

''میں ڈرتا ہوں کہیں آپ ناراض نہ ہو جائیں۔''

''نہیں نہیں کہو۔ میں ناراض نہ ہوں گی۔''

''آج آپ بہت ہی سندر لگ رہی ہیں۔''

لالہ ڈنگامل نے سینکڑوں ہی بار آشا کے حسن و انداز کی تعریف کی تھی' مگر ان کی تعریف میں ایک تصنّع کی بو آتی تھی۔ وہ الفاظ ان کے منہ سے کچھ اس طرح لگتے تھے جیسے کوئی ہیجڑا تلوار لے کر چلے۔ جگل کے ان الفاظ میں ایک کیفیت تھی' ایک سرور تھا' ایک ہیجان تھا' ایک اضطراب تھا۔ آشا کے سارے جسم میں رعشہ آ گیا۔ آنکھوں میں جیسے نشہ چھا جائے۔

''تم مجھے نظر لگا دو گے' اس طرح کیوں گھورتے ہو؟''

''جب یہاں سے چلا جاؤں گا' تب آپ کی بہت یاد آئے گی۔''

''روٹی بنا کر تم کیا کرتے ہو؟ دکھائی نہیں دیتے۔''

''سرکار رہتے ہیں اسی لیے نہیں آتا۔ پھر اب تو مجھے جواب مل رہا ہے۔ دیکھئے بھگوان کہاں لے جاتے ہیں؟''

آشا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''کون تمہیں جواب دیتا ہے؟''

''سرکار ہی تو کہتے ہیں تجھے نکال دوں گا۔''

''اپنا کام کیے جاؤ۔ کوئی نہیں نکالے گا' اب تو تم روٹیاں بھی اچھی بنانے لگے۔''

''سرکار ہیں بڑے گُسّہ ور۔''

"دو چار دن میں ان کا مزاج ٹھیک کیے دیتی ہوں۔"

"آپ کے ساتھ چلتے ہیں تو جیسے آپ کے باپ سے لگتے ہیں۔"

"تم بڑے بدمعاش ہو۔ خبردار، زبان سنبھال کر باتیں کرو۔"

مگر خفگی کا یہ پردہ اس کے دل کا راز نہ چھپا سکا۔ وہ روشنی کی طرح اس کے اندر سے باہر نکلا پڑتا تھا۔ جنگل نے اسی بے باکی سے کہا۔ "میری زبان کوئی بند کرے، یہاں تو سب ہی کہتے ہیں۔ میرا بیاہ کوئی پچاس سال کی بڑھیا سے کر دے تو میں گھر چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ یا تو خود زہر کھالوں یا اسے زہر دے کر مار ڈالوں۔ پھانسی ہی تو ہوگی۔"

آشا مصنوعی غصہ قائم نہ رکھ سکی۔ جنگل نے اس کے دل کے تاروں پر مضراب کی ایسی چوٹ ماری تھی کہ اس کے بہت ضبط کرنے سے بھی دردِ دل باہر نکل ہی آیا۔

"قسمت بھی تو کوئی چیز ہے؟"

"ایسی قسمت جائے جہنم میں۔"

"تمہاری شادی کسی بڑھیا سے کروں گی، دیکھ لینا۔"

"تو میں بھی زہر کھالوں گا دیکھ لیجئے گا۔"

"کیوں؟ بڑھیا تمہیں جوان سے زیادہ پیار کرے گی، زیادہ خدمت کرے گی۔ تمہیں سیدھے راستے پر رکھے گی۔"

"یہ سب ماں کا کام ہے، بیوی جس کام کے لیے ہے اسی کے لیے ہے۔"

"آخر بیوی کس کام کے لیے ہے؟"

"آپ مالک ہیں نہیں تو بتلا ہی دیتا، بیوی کس کام کے لیے ہے۔"

موٹر کی آواز آئی، نہ جانے کیسے آشا کے سر کا آنچل سر سے کھسک کر کندھے پر آگیا تھا۔ اس نے جلدی سے آنچل سر پر کھینچ لیا اور یہ کہتی ہوئی اپنے کمرے کی طرف چلی۔ "لالہ کھانا کھا کر چلے جائیں گے، تم ذرا آ جانا۔"

گلّی ڈنڈا

ہمارے انگریزی خواں دوست مانیں یا نہ مانیں، میں تو یہی کہوں گا کہ گلّی ڈنڈا سب کھیلوں کا راجہ ہے۔ اب بھی جب کبھی لڑکوں کو گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھتا ہوں تو جی لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر کھیلنے لگوں۔ نہ لان (میدان) کی ضرورت ہے، نہ مشن گارڈ کی، نہ نیٹ کی، نہ بلّے کی۔ مزے سے کسی درخت کی ایک شاخ کاٹ لی۔ گلّی بنائی اور دو آدمی بھی آگئے تو کھیل شروع ہو گیا۔ ولایتی کھیلوں میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ ان کے سامان بہت مہنگے ہوتے ہیں۔ جب تک کم از کم ایک سو خرچ نہ کیجئے، کھلاڑیوں میں شمار ہی نہیں ہو سکتا۔ یہاں گلّی ڈنڈا ہے کہ بغیر ہینگ پھٹکڑی لگے چوکھا رنگ دیتا ہے۔ لیکن ہم انگریزی کھیلوں پر ایسے دیوانے ہو رہے ہیں کہ اپنی سب چیزوں سے

ہمیں نفرت سی ہو گئی ہے۔ ہمارے اسکولوں میں ہر ایک لڑکے سے تین چار روپے سالانہ صرف کھیلنے کی فیس لی جاتی ہے۔ کسی کو یہ سوجھتا نہیں کہ ہندوستانی کھیلیں کھلائیں، جو بغیر پیسے کوڑی کے کھیلے جاتے ہیں۔ انگریزی کھیل ان کے لیے ہیں، جن کے پاس روپیہ ہے۔ بے چارے غریب لڑکوں کے سر پر یہ فضول خرچیاں کیوں منڈھتے ہو۔ ٹھیک ہے گلّی سے آنکھ پھوٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے، تو کیا کرکٹ سے سر پھوٹ جانے کا اندیشہ نہیں رہتا ہے؟ اگر ہمارے ماتھے میں گلّی کا داغ آج تک لگا ہوا ہے، تو ہمارے کئی دوست ایسے بھی ہیں، جو بلّے سے گھائل ہونے کا سرٹیفکیٹ رکھتے ہیں۔ خیر یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔ مجھے گلّی ڈنڈا سب کھیلوں سے زیادہ پسند ہے اور بچپن کی یادوں میں گلّی ڈنڈا ہی سب سے زیادہ شیریں یاد ہے۔ وہ علی الصبح گھر سے نکل جانا۔ وہ درخت پر چڑھ کر ٹہنیاں کاٹنا اور گلّی ڈنڈے بنانا۔ وہ جوش و خروش، وہ لگن، کھلاڑیوں کے جمگھٹے، وہ پدنا اور پدانا، وہ لڑائی جھگڑے، وہ بے تکلف سادگی جس میں چھوت اچھوت اور غریب امیر کی کوئی تمیز نہ تھی۔ جس میں امیرانہ چونچلوں کی، غرور اور خود نمائی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اسی وقت بھولے گا جب گھر والے بگڑ رہے ہیں۔ والد صاحب چوکے پر بیٹھے ہوئے روٹیوں پر اپنا غصہ اتار رہے ہیں۔ اماں کی دوڑ صرف دروازے تک ہے۔ لیکن ان کے خیال میں میرا تاریک مستقبل ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈگمگا رہا ہے اور میں ہوں کہ پدانے میں مست ہوں۔ نہ نہانے کا خیال ہے، نہ کھانے کا۔ گلّی ہے تو ذرا سی مگر اس میں دنیا بھر کی مٹھائیوں کی مٹھاس اور تماشوں کا لطف بھرا ہوا ہے۔

میرے ہمجولیوں میں ایک لڑکا گیا نام کا تھا۔ مجھ سے دو تین سال بڑا ہوگا۔ دبلا لمبا، بندروں کی سی پھرتی، بندروں کی سی لمبی لمبی انگلیاں، بندروں کی سی جھپٹ، گلّی کیسی ہو، اس پر لپکتا تھا، جس طرح چھپکلی کیڑوں پر لپکتی ہے۔ معلوم نہیں اس کے ماں باپ کون تھے، کہاں رہتا تھا، کیا کھاتا تھا۔ پر تھا ہمارے گلّی کلب کا چمپئن، جس کی طرف وہ آجائے، اس کی جیت یقینی تھی۔ ہم سب اسے دور سے دیکھ کر اس کا استقبال کرتے تھے اور اسے اپنا گوئیاں بنا لیتے تھے۔

ایک دن ہم اور گیا دو ہی کھیل رہے تھے۔ وہ پدا رہا تھا، میں پد رہا تھا۔ لیکن کچھ عجیب بات ہے کہ پدانے میں ہم دن بھر مست رہ سکتے ہیں، پدنا ایک منٹ کا بھی سہا نہیں جاتا۔ میں نے گلا چھڑانے کے لیے وہ سب چالیں چلیں، جو ایسے موقع پر خلاف قانون ہوتے ہوئے بھی قابل معافی ہیں۔ لیکن گیا اپنا داؤں لیے بغیر میرا پیچھا نہ چھوڑتا تھا۔ میں گھر کی طرف بھاگا، منت سماجت اور خوشامد کا کوئی اثر نہ ہوا۔ گیا نے مجھے دوڑ کر پکڑ لیا اور ڈنڈا تان کر بولا۔

"میرا داؤں دے کر جاؤ۔ پدایا تو بہادر بن کر، پدنے کے وقت کیوں بھاگے جاتے ہو؟"

"تم دن بھر پداؤ تو میں دن بھر پدتا رہوں؟"

"ہاں تمہیں دن بھر پدنا پڑے گا؟"

"نہ کھانے جاؤں، نہ پینے جاؤں؟"

"ہاں میرا داؤں دیئے بغیر کہیں نہیں جا سکتے۔"

"میں تمہارا غلام ہوں؟"

"ہاں! تم میرے غلام ہو۔"

"میں گھر جاتا ہوں، دیکھوں تم میرا کیا کر لیتے ہو؟"

"گھر کیسے جاؤ گے کوئی دل لگی ہے۔ داؤں دیا ہے داؤں لیں گے۔"

"اچھا کل میں نے تمہیں امرود کھلایا تھا' وہ رکھ دو۔"

"وہ پیٹ میں چلا گیا۔"

"نکالو پیٹ سے 'تم نے کیوں کھایا میرا امرود؟"

"امرود تم نے دیا تب میں نے کھایا' میں تم سے مانگنے نہ گیا تھا۔"

"جب تک میرا امرود نہ دو گے' میں داؤں نہ دوں گا۔"

میں سمجھتا تھا انصاف میری طرف ہے۔ آخر میں نے کسی غرض کے لیے ہی اسے امرود کھلایا ہو گا۔ کون کسی کے ساتھ بے غرضانہ سلوک کرتا ہے۔ بھیک تک تو غرض کے لیے ہی دیتے ہیں۔ جب گیا نے میرا امرود کھایا تو پھر اسے مجھ سے داؤں لینے کا کیا حق حاصل ہے؟ رشوت لے کر تو لوگ خون تک چھپا جاتے ہیں' وہ میرا امرود یوں ہی ہضم کر جائے گا۔ امرود پیسے کے پانچ والے تھے۔ جو گیا کو باپ کو بھی نصیب نہ ہوں گے۔ یہ سراسر بے انصافی تھی۔

گیا نے مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ "میرا داؤں دے کر جاؤ۔ امرود سمرود میں نہیں جانتا۔"

مجھے انصاف کا زور تھا۔ میں ہاتھ چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے جانے نہ دیتا تھا۔ میں نے گالی دی' اس نے اس سے بھی سخت گالی دی اور گالی ہی نہیں دی ایک چانٹا جما دیا۔ میں نے اسے دانت سے کاٹ لیا۔ اس نے میری پیٹھ پر ڈنڈا جما دیا۔ میں رونے لگا۔ گیا میرے اس ہتھیار کا مقابلہ نہ کر سکا' بھاگا۔ میں نے فوراً آنسو پونچھ ڈالے۔ ڈنڈے کی چوٹ بھول گیا اور ہنستا ہوا گھر جا پہنچا۔ میں تھانیدار کا لڑکا ایک نیچ ذات کے لونڈے کے ہاتھوں پٹ گیا' یہ مجھے اس وقت بھی بے عزتی کا باعث معلوم ہوا' لیکن گھر میں کسی سے شکایت نہ کی۔

ان ہی دنوں والد صاحب کا وہاں سے تبادلہ ہو گیا۔ نئی دنیا دیکھنے کی خوشی میں ایسا پھولا کہ اپنے ہمجولیوں سے جدا ہو جانے کا بالکل افسوس نہ ہوا۔ والد صاحب افسوس کرتے تھے۔ یہ بڑی آمدنی کی جگہ تھی۔ اماں جی بہت افسوس کرتی تھیں۔ یہاں سب چیزیں سستی تھیں اور محلے کی عورتوں سے لگاؤ سا ہو گیا تھا۔ لیکن میں مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ لڑکوں سے شیخی بگھارتا تھا۔ وہاں ایسے گھر تھوڑے ہی ہیں' ایسے اونچے مکان ہیں کہ آسمان سے باتیں کرتے ہیں۔ وہاں کے انگریزی اسکول میں کوئی ماسٹر لڑکوں کو پیٹے تو قید ہو جائے۔ میرے دوستوں کی حیرت سے پھیلی ہوئی آنکھیں اور متعجب چہرے صاف بتلا رہے تھے کہ میں ان کی نگاہ میں کتنا اونچا اٹھ گیا ہوں۔ بچوں میں جھوٹ کو سچ بنا لینے کی وہ طاقت ہوتی ہے جسے ہم جو سچ کو جھوٹ بنا دیتے ہیں' نہیں سمجھ سکتے۔ دوست کہہ رہے تھے "تم خوش قسمت ہو بھائی جاؤ۔ ہمیں تو اسی گاؤں میں جینا بھی ہے اور مرنا بھی۔"

بیس سال گزر گئے ہیں' انجینئری پاس کی اور کسی ضلع کا دورہ کرتا ہوا اسی قصبے میں پہنچا اور ڈاک بنگلے میں ٹھہرا۔ اس جگہ کو دیکھتے ہی اس قدر دلکش اور شیریں یاد تازہ ہو کر اٹھی کہ میں نے چھڑی اٹھائی اور قصبے کی سیر کو نکلا۔ آنکھیں کسی پیاسے مسافر کی طرح بچپن کے ان مقامات کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھیں' جن کے ساتھ کتنی ہی یادگاریں وابستہ تھیں۔ لیکن اس مانوس نام کے علاوہ وہاں کوئی شناسا نہ ملا۔ جہاں کھنڈر تھا' وہاں پکے مکانات کھڑے تھے۔ جہاں برگد کا پرانا درخت تھا وہاں اب ایک خوبصورت باغیچہ تھا۔ اس جگہ کی کایا پلٹ ہو گئی تھی۔ اس کے نام اور نشان کا علم نہ ہوتا تو میں اسے پہچان بھی نہ سکتا تھا۔ وہ پرانی یادگاریں بانہیں پھیلا پھیلا کر اپنے پرانے دوستوں کے گلے لپٹنے کے لیے بے قرار ہو رہی تھیں۔ مگر دنیا بدل گئی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ اس زمین سے لپٹ کر روؤں اور

کہوں۔ "تم مجھے بھول گئیں، لیکن میرے دل میں تمہاری یاد تازہ ہے۔"

اچانک ایک کھلی جگہ میں میں نے دو تین لڑکوں کو گلّی ڈنڈا کھیلتے دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے آپ کو بالکل بھول گیا کہ میں ایک اونچا افسر ہوں۔ صاحبی ٹھاٹ میں، رعب اور اختیار کے لباس میں جاکر ایک لڑکے سے پوچھا۔ "کیوں بیٹے یہاں کوئی گیا نام کا آدمی رہتا ہے؟"

ایک لڑکے نے گلّی ڈنڈا اسمیٹ کر سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "کون گیا؟ گیا چمار؟"

میں نے یونہی کہا۔ "ہاں ہاں وہی، گیا نام کا کوئی آدمی ہے تو شاید وہی ہو۔"

"ہاں ہے تو؟"

"ذرا اسے بلا سکتے ہو؟"

لڑکا دوڑا ہوا گیا اور جلد ایک پانچ ہاتھ کے کالے دیو کو ساتھ لیے آتا دکھائی دیا۔ میں نے دور سے ہی پہچان لیا۔ اس کی طرف لپکنا چاہتا ہی تھا کہ اس کے گلے لپٹ جاؤں مگر کچھ سوچ سمجھ کر رہ گیا۔

بولا۔ "کہو مجھے پہچانتے ہو؟"

گیا نے جھک کر سلام کیا۔ "ہاں مالک بھلا پہچانوں گا نہیں۔ آپ مزے میں رہے؟"

"بہت مزے میں تم اپنی کہو؟"

"ڈپٹی صاحب کا سائیس ہوں۔"

"ماتا، موہن، درگا یہ سب کہاں ہیں؟ کچھ خبر ہے؟"

"ماتا تو مر گیا، موہن اور درگا دونوں ڈاکیے ہو گئے ہیں۔ آپ؟"

"میں ضلع کا انجینئر ہوں۔"

"سرکار تو پہلے ہی بڑے جہین تھے۔"

"اب گلّی ڈنڈا کھیلتے ہو؟"

گیا نے میری طرف سوال کی آنکھوں سے دیکھا۔ "گلّی ڈنڈا کیا کھیلوں گا سرکار۔ اب تو پیٹ کے دھندے سے ہی چھٹی نہیں ملتی۔"

"آؤ آج ہم تم کھیلیں گے۔ تم پدانا ہم پدیں گے۔ تمہارا ایک داؤں ہمارے اوپر ہے۔ وہ آج لے لو۔"

گیا بڑی مشکل سے راضی ہوا۔ وہ ٹھہرا ٹکے کا مزدور، میں ایک بڑا افسر۔ میرا اور اس کا کیا جوڑ۔ بے چارہ جھینپ رہا تھا۔ لیکن مجھے بھی کم جھینپ نہ تھی۔ اس لیے نہیں کہ میں گیا کے ساتھ کھیلنے جا رہا تھا بلکہ لوگ اس کھیل کو عجوبہ سمجھ کر اس کا تماشا بنائیں گے اور اچھی خاصی بھیڑ لگ جائے گی۔ اس بھیڑ میں وہ لطف کہاں رہے گا۔ لیکن کھیلے بغیر تو رہا نہیں جاتا۔ آخر فیصلہ ہوا کہ دونوں بستی سے دور تنہائی میں جا کر کھیلیں، وہاں کون دیکھنے والا بیٹھا ہو گا۔ مزے سے کھیلیں گے اور بچپن کی اس مٹھائی کو خوب مزے لے کر کھائیں گے۔ میں گیا کو لے کر ڈاک بنگلے پر آیا اور موٹر میں بیٹھ کر دونوں میدان کی طرف چلے۔ ساتھ ایک کلہاڑی لے لی۔ میں متانت کے ساتھ یہ سب کچھ کر رہا تھا مگر گیا ابھی تک مذاق سمجھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوشی اور ولولے کا کوئی نشان نہ تھا۔ شاید ہم دونوں میں جو فرق ہو گیا تھا، وہ اسے سوچنے میں محو تھا۔

میں نے پوچھا۔ "تمہیں کبھی ہماری یاد آئی تھی گیا؟ سچ کہنا۔"

گیا جھینپتا ہوا بولا۔ "میں آپ کو کیا یاد کرتا حضور، کس لائق ہوں۔ قسمت میں کچھ دن آپ کے ساتھ کھیلنا لکھا تھا، نہیں تو میری کیا گنتی۔"

میں نے کچھ اداس ہو کر کہا۔ "لیکن مجھے تو تمہاری یاد برابر آتی تھی۔ تمہارا وہ ڈنڈا جو تم نے تان کر جمایا تھا، یاد ہے نا۔"

گیا نے شرماتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑکپن تھا سرکار، اس کی یاد نہ دلاؤ۔"

"واہ، وہ میری ان دنوں کی سب سے رسیلی یاد ہے۔ تمہارے اس ڈنڈے میں جو رس تھا، وہ اب نہ عزت اور بڑائی میں پاتا ہوں، نہ دولت میں، کچھ ایسی مٹھاس تھی اس میں کہ آج تک من میٹھا ہوتا رہتا ہے۔"

اتنی دیر میں ہم بستی سے کوئی تین میل نکل آئے تھے۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ مغرب کی طرف سے کوسوں تک بھیم تال پھیلا ہوا تھا۔ جہاں آکر ہم کسی وقت کنول کے پھول توڑنے جاتے تھے۔ اور اس کے جھمکے بنا کر کانوں میں ڈال لیتے تھے۔ جون کی شام کیسر میں ڈوبی چلی آرہی ہے۔ میں لپک کر ایک درخت پر چڑھ گیا۔ اور ایک شاخ کاٹ لایا۔ جھٹ پٹ گلّی ڈنڈا بن گیا۔ کھیل شروع ہو گیا۔ میں نے راب میں گلّی رکھ کر اچھالی۔ گلّی گیا کے سامنے سے نکل گئی۔ اس نے ہاتھ لپکایا، جیسے مچھلی پکڑ رہا ہو۔ گلّی اس کے پیچھے جا گری۔ یہ وہی گیا تھا جس کے ہاتھوں میں گلّی جیسے آپ ہی آپ جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ وہ اپنے داہنے بائیں کہیں ہو، گلّی اس کی ہتھیلی میں پہنچتی تھی۔ جیسے گلّیوں پر اس نے جادو کر کے انہیں بس میں کر لیا ہو۔ نئی گلّی، پرانی گلّی، چھوٹی گلّی، بڑی گلّی، نوکدار گلّی سبھی اس سے ہل جاتی تھیں۔ گویا اس کے ہاتھوں میں کوئی مقناطیسی طاقت ہے، جو گلّیوں کو کھینچ لیتی ہو، لیکن آج گلّی کو اس سے وہ محبت نہیں رہی۔ پھر تو میں نے پدانا شروع کیا۔ میں طرح طرح کے فریب کر رہا تھا۔ مشق کی کمی بے ایمانی سے پوری کر رہا تھا۔ داؤں پورا ہونے پر بھی ڈنڈا کھیلے جاتا تھا۔ حالانکہ قاعدے کے مطابق گیا کی باری آنی چاہیے تھی۔ گلّی پر ہلکی چوٹ پڑتی اور وہ ذرا ہی دور گر پڑتی۔ میں لپک کر اسے خود ہی اٹھا لاتا اور دوبارہ ٹل لگاتا۔ گیا یہ ساری بے قاعدگیاں دیکھ رہا تھا۔ مگر کچھ نہ بولتا تھا۔ گویا اسے وہ تمام قاعدے قانون بھول گئے ہوں۔ اس کا نشانہ کتنا بے خطا تھا۔ گلّی اس کے ہاتھ سے نکل کر ٹن سے ڈنڈے میں آکر لگتی تھی، اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اس کا کام تھا ڈنڈے سے ٹکرا جانا۔ لیکن آج وہ گلّی ڈنڈے میں لگتی ہی نہیں۔ کبھی داہنے جاتی تھی کبھی بائیں۔ کبھی آگے کبھی پیچھے۔

آدھ گھنٹہ پدانے کے بعد ایک بار گلّی ڈنڈے میں آ لگی۔ میں نے دھاندلی کی "گلّی ڈنڈے میں نہیں لگی۔ پاس سے گئی۔ لیکن لگی نہیں"۔

گیا نے کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ "نہ لگی ہو گی"۔

"ڈنڈے میں لگتی تو کیا میں بے ایمانی کرتا۔"

"نہیں بھیّا تم بھلا بے ایمانی کرو گے۔"

بچپن میں مجال تھی کہ میں ایسا گھپلا کر کے بچتا۔ یہی گیا میری گردن پر چڑھ بیٹھتا لیکن آج میں اسے کتنی آسانی سے دھوکا دیئے چلا جاتا تھا۔ گدھا ہے۔ ساری باتیں بھول گیا۔

اچانک گلّی ڈنڈے میں لگی اور اتنے زور سے لگی جیسے بندوق چھوٹی ہو۔ اس ثبوت کے مقابل اب کسی طرح کے فریب چلنے کا مجھے اس وقت بھی حوصلہ نہ ہو سکا۔ لیکن کیوں نہ ایک بار سچ کو جھوٹ بنانے کی کوشش کروں، میرا حرج ہی کیا ہے؟

مان گیا تو واہ واہ' ورنہ دو چار ہاتھ پدنا ہی توپڑے گا۔ اندھیرے کا بہانہ کر کے گلا چھڑالوں گا۔ پھر کون داؤں دینے آتا ہے۔

گیا نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "لگ گئی' لگ گئی۔ ٹن سے بولی۔"

میں نے انجان بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے لگتے دیکھا۔ میں نے تو نہیں دیکھا"۔

"ٹن سے بولی ہے سرکار"۔

"اور جو کسی اینٹ میں لگ گئی ہو"۔

میرے منہ سے یہ فقرہ اس وقت کیسے نکل گیا۔ اس پر مجھے خود حیرت ہے۔ اس سچائی کا جھٹلانا ایسا ہی تھا جیسے دن کو رات بنانا۔ ہم دونوں نے گلّی کو ڈنڈے میں زور سے لگتا دیکھا تھا۔ گیا نے میرا کہنا مان لیا۔

"ہاں سرکار کسی اینٹ میں لگی ہو گی۔ ڈنڈے میں لگتی تو اتنی آواز نہ آتی"۔

میں نے پھر پدانا شروع کیا۔ لیکن اس قدر صاف اور صریح دھوکا دینے کے بعد گیا کی سادگی پر مجھے رحم آنے لگا۔ اس لئے جب تیسری بار گلّی ڈنڈے میں لگی تو میں نے بڑی فراخدلی سے داؤں دینا طے کر لیا۔

گیا نے کہا۔ "اب تو اندھیرا ہو گیا ہے بھیّا کل پر رکھو۔"

میں نے سوچا کل بہت سا وقت ہو گا۔ یہ نہ جانے کتنی دیر پدائے اس لیے اسی وقت معاملہ صاف کر لینا اچھا ہو گا۔

"نہیں نہیں بہت اجالا ہے تم اپنا داؤں لے لو"۔

"گلّی سوجھے گی نہیں"۔

"کچھ پروا نہیں"۔

گیا نے پدانا شروع کیا' لیکن اسے بالکل مشق نہ تھی۔ اس نے دو بار ٹُل لگانے کا ارادہ کیا۔ لیکن دونوں ہی بار چُوک گیا۔ ایک منٹ سے کم میں وہ اپنا داؤں پورا کر چکا۔ بے چارہ گھنٹہ بھر پدا۔ لیکن ایک منٹ ہی میں داؤں کھو بیٹھا۔ میں نے اپنے دل کی وسعت کا ثبوت دیا۔

"ایک داؤں اور لے لو۔ تم تو پہلے ہی ہاتھ میں ہچ گئے۔"

"نہیں بھیا اب اندھیرا ہو گیا ہے"۔

"تمہاری مشق چھوٹ گئی۔ کبھی کھیلتے نہیں ہو؟"

"کھیلنے کا وقت ہی کہاں ملتا ہے بھیّا"۔

ہم دونوں موٹر پر جا بیٹھے اور چراغ جلتے جلتے پڑاؤ پر پہنچ گئے۔

گیا چلتے چلتے بولا۔ "کل گلّی ڈنڈا ہو گا۔ سبھی پرانے کھلاڑی کھیلیں گے۔ تم بھی آؤ گے۔ جب تمہیں فرصت ہو سبھی کھلاڑیوں کو بلالوں"۔

میں نے شام کا وقت دیا اور دوسرے دن میچ دیکھنے گیا۔ کوئی دس آدمیوں کی منڈلی تھی۔ کئی میرے لڑکپن کے ساتھی نکلے۔ مگر بیشتر نوجوان تھے۔ جنہیں میں پہچان نہ سکا۔

کھیل شروع ہوا۔ میں موٹر پر بیٹھا تماشا دیکھنے لگا۔ آج گیا کا کھیل اور اس کی کرامات دیکھ کر میں دنگ رہ گیا۔ وہ ٹُل لگاتا تو گلّی آسمان سے باتیں کرتی۔ کل کی وہ جھجک' وہ ہچکچاہٹ' وہ بے دلی آج نہ تھی' لڑکپن کی جو بات تھی۔ آج اس نے اسے کمال معراج تک پہنچا دیا۔ کہیں کل اس نے مجھے اس طرح پدایا ہوتا تو میں ضرور رونے لگتا۔

اس کے ڈنڈے کی چوٹ کھا کر گلّی دو سو گز کی خبر لاتی تھی۔

پدانے والوں میں ایک نوجوان نے کچھ بے عنوانی کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے گلّی دبوچ لی ہے۔ گیا کا کہنا تھا کہ گلّی زمین سے لگ کر اچھلی ہے۔ اس پر دونوں میں تال ٹھونکنے کی نوبت آئی۔ نوجوان دب گیا۔ گیا کا تمتمایا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ڈر گیا۔ میں کھیل میں نہ تھا مگر دوسروں کے اس کھیل میں مجھے وہی لڑکپن کا لطف آ رہا تھا' جب ہم سب کچھ بھول کر کھیل میں مست ہو جاتے تھے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ گیا نے کل میرے ساتھ کھیلا نہیں' صرف کھیلنے کا بہانہ کیا۔ اس نے مجھے قابلِ رحم سمجھا۔ میں نے دھاندلی' بے ایمانیاں کیں۔ اُسے ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ اس لیے کہ وہ کھیل نہ رہا تھا' مجھے کِھلا رہا تھا۔ میرا جی رکھ رہا تھا۔ وہ پدا کر میرا کچومر نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ میں اب افسر ہوں۔ یہ افسری میرے اور اُس کے درمیان اب دیوار بن گئی ہے۔ میں اب اس کا لحاظ پا سکتا ہوں' ادب پا سکتا ہوں لیکن اس کا ہمجولی نہیں بن سکتا۔ لڑکپن تھا تب میں اس کا ساتھی تھا۔ ہم میں کوئی بھید نہ تھا۔ یہ عہدہ پا کر اب میں اس کے رحم کے قابل ہوں۔ وہ اب مجھے اپنا جوڑ نہیں سمجھتا—— وہ بڑا ہو گیا ہے' میں چھوٹا ہو گیا ہوں۔

سوانگ

(1)

راجپوت خاندان میں پیدا ہو جانے ہی سے کوئی سورما نہیں بن جاتا اور نہ نام کے پیچھے "سنگھ" کی دُم لگا لینے ہی سے بہادری آتی ہے۔ گجندر سنگھ کے بزرگ کسی زمانے میں راجپوت تھے۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں۔ لیکن ادھر تین پشتوں سے تو نام کے سوا ان میں راجپوتی کی کوئی علامت نہ تھی۔ گجندر سنگھ کے جد بزرگوار وکیل تھے اور جرح یا بحث میں کبھی کبھی راجپوتی کا مظاہرہ کر جاتے تھے۔ پدرِ بزرگوار نے کپڑے کی دکان کھول کر اس مظاہرے کی بھی گنجائش نہ رکھی۔ اور گجندر نے تو لٹیا ہی ڈبو دی۔ قد و قامت میں بھی فرق آتا گیا۔ بھوپندر سنگھ کا سینہ فراخ تھا۔ نریندر سنگھ کا شکم فراخ تھا۔ لیکن گجندر سنگھ کا کچھ بھی فراخ نہ تھا۔ وہ ہلکے پھلکے' گورے چٹے' عینک باز' نازک بدن' فیشن ایبل بابو تھے۔ انہیں علمی مشاغل سے دلچسپی تھی۔

مگر راجپوت کیسا ہی ہو' اس کی شادی تو راجپوت خاندان میں ہی ہو گی۔ گجندر سنگھ کی شادی جس خاندان میں ہوئی تھی' اس خاندان میں راجپوت جوہر بالکل فنا نہیں ہوا تھا۔ ان کے خسر پنشنر صوبیدار تھے۔ سالے شکاری اور کشتی باز۔ شادی ہوئے دو سال ہو گئے تھے' لیکن ابھی تک ایک بار بھی سسرال نہ آ سکا تھا۔ امتحانات سے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ لیکن اب تعلیم ختم ہو چکی تھی۔ ملازمت کی تلاش تھی۔ اس لیے اب کی ہولی کے موقع پر سسرال سے بلاوا آیا تو اس نے کوئی حیل و حجت نہ کی۔ صوبیدار کی بڑے بڑے افسروں سے شناسائی تھی۔ فوجی افسروں کی حکام کتنی قدر و منزلت کرتے ہیں' یہ اسے خوب معلوم تھا۔ سمجھا ممکن ہے صوبیدار صاحب کی سفارش سے نائب تحصیلداری میں نامزد ہو جاؤں۔ ادھر شیام دلاری سے بھی سال بھر سے ملاقات نہ ہوئی تھی۔ ایک نشانے سے دو شکار ہو رہے تھے۔ نیا ریشمی کوٹ بنوایا اور ہولی کے ایک دن پہلے سسرال جا پہنچا۔ اپنے گرانڈیل سالوں کے سامنے بچّہ سا معلوم ہوتا تھا۔

تیسرے پہر کا وقت تھا۔ گجندر سنگھ اپنے سالوں سے زمانۂ طالب علمی کے کارنامے بیان کر رہا تھا۔ فٹ بال میں کس طرح ایک طویل قامت گورے کو پٹخنی دی۔ ہاکی میچ میں کس طرح تنہا گول کر لیا۔ کہ صوبیدار صاحب دیو کی طرح آکر کھڑے ہو گئے اور بڑے لڑکے سے بولے۔ "ارے سنو! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ بابو جی شہر سے آئے ہیں۔ انہیں لے جا کر ذرا سیر کرا لاؤ۔ کچھ شکار وکار کھلاؤ۔ یہاں ٹھیٹر و یٹھر تو ہے نہیں' ان کا جی گھبراتا ہو گا۔ وقت بھی اچھا ہے' شام تک لوٹ آؤ گے۔"

شکار کا نام سنتے ہی گجندر سنگھ کی نانی مر گئی۔ بے چارے نے عمر بھر کبھی شکار نہ کھیلا تھا۔ یہ دیہاتی اجڈ لونڈے اسے نہ جانے کہاں کہاں دوڑائیں گے۔ کہیں کسی جانور کا سامنا ہو گیا تو کہیں کے نہ رہے۔ کون جانے ہرن ہی چوٹ کر بیٹھے۔ ہرن بھی راہِ فرار نہ پا کر کبھی کبھی پلٹ پڑتا ہے۔ کہیں بھیڑیا نکل آئے تو کام ہی تمام کر دے۔ بولے۔ "میرا تو اس وقت شکار کھیلنے کو جی نہیں چاہتا' بہت تھک گیا ہوں۔"

صوبیدار صاحب نے فرمایا۔ "تم گھوڑے پر سوار ہو لینا۔ یہی تو دیہات کی بہار ہے۔ چنّو جا کر بندوق لا۔ میں بھی چلوں گا۔ کئی دن سے باہر نہیں نکلا۔ میری رائفل بھی لیتے آنا۔"

چنّو اور منّو خوش خوش بندوق لینے دوڑے۔ ادھر گجندر کی جان سوکھنے لگی۔ پچھتا رہا تھا کہ ناحق ان لونڈوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔ جانتا کہ یہ بلا سر پر آنے والی ہے' تو آتے ہی فوراً بیمار بن کر چارپائی پر پڑ رہتا۔ اب تو کوئی حیلہ بھی نہیں کر سکتا۔ سب سے بڑی مصیبت گھوڑے کی سواری تھی۔ یہاں گھوڑے یوں ہی تھان پر بندھے بندھے ٹرّے ہو جاتے ہیں اور آسن کا کچا سوار دیکھ کر تو وہ اَور بھی شوخیاں کرنے لگتے ہیں۔ کہیں الف ہو گیا یا مجھے لے کر کسی نالے کی طرف بے تحاشا بھاگا' تو خیریت نہیں۔

دونوں سالے بندوقیں لے کر آ پہنچے۔ گھوڑا بھی کھنچ کر آ گیا۔ صوبیدار صاحب شکاری کپڑے پہن کر تیار ہو گئے۔ اب گجندر کے لیے کوئی حیلہ نہ رہا۔ اس نے گھوڑے کی طرف کنکھیوں سے دیکھا جو بار بار زمین پر پیر پٹکتا تھا۔ ہنہناتا تھا۔ اٹھی ہوئی گردن' لال آنکھیں' کنوتیاں کھڑی' بوٹی بوٹی پھڑک رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ گجندر دل میں سہم اٹھا۔ مگر بہادری دکھانے کے لیے گھوڑے کے پاس جا کر اس کی گردن پر اس طرح تھپکیاں دیں گویا پکّا شہسوار ہے اور بولا۔ "جانور تو جاندار ہے' مگر مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ آپ لوگ تو پیدل چلیں اور میں گھوڑے پر بیٹھوں۔ ایسا کچھ بہت تھکا ہوا نہیں ہوں' میں بھی پیدل ہی چلوں گا' اس کی مجھے مشق ہے۔"

صوبیدار نے کہا۔ "بیٹا جنگل دور ہے تھک جاؤ گے' بڑا سیدھا جانور ہے۔ بچہ بھی سوار ہو سکتا ہے۔"

گجندر نے کہا۔ "جی نہیں مجھے بھی یوں ہی چلنے دیجئے۔ گپ شپ کرتے ہوئے چلے چلیں گے۔ سواری میں وہ لطف کہاں۔ آپ بزرگ ہیں سوار ہو جائیں۔"

چاروں آدمی پیادہ چلے۔ لوگوں پر گجندر کے اس انکسار کا بہت اچھا اثر ہوا۔ تہذیب اور اخلاق تو شہر والے ہی جانتے ہیں۔ اس پر علم کی برکت!

تھوڑی دیر کے بعد پتھریلا راستہ ملا۔ ایک طرف ہرا بھرا میدان' دوسری طرف پہاڑوں کا سلسلہ۔ دونوں ہی طرف ببول' کریل' کروندے اور ڈھاک کے جنگل تھے۔ صوبیدار صاحب اپنی فوجی زندگی کے پامال قصے کہتے چلے آتے تھے۔ گجندر تیز چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بار بار بچھڑ جاتا تھا اور اسے دو چار قدم دوڑ کر ان کے برابر ہونا پڑتا تھا۔ پسینے میں تر' ہانپتا ہوا' اپنی حماقت پر پچھتاتا چلا جاتا تھا۔ یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ابھی سے یہ حال

ہے' شکار نظر آگیا تو نہ معلوم کیا آفت آئے گی۔ میل دو میل دوڑ تو ان کے لیے معمولی بات ہے۔ مگر یہاں تو کچو مر ہی نکل جائے گا۔ شاید بے ہوش ہو کر گر پڑوں۔ پیر ابھی سے من من بھر کے ہو رہے ہیں۔

یکایک راستے میں سیمل کا ایک درخت نظر آیا۔ نیچے لال لال پھول بچھے ہوئے تھے۔ اوپر سارا درخت گلنار ہو رہا تھا۔ گجندر وہیں کھڑا ہو گیا اور اس لالہ زار کو مستانہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

چنوّ نے پوچھا۔ "کیا ہے جیجا جی رک کیسے گئے؟"

گجندر نے عاشقانہ وارفتگی سے کہا۔ "کچھ نہیں اس درخت کا حُسنِ دل آویز دیکھ کر دل باغ باغ ہوا جا رہا ہے۔ آہا۔ کیا بہار ہے' کیا مذاق ہے' کیا شان ہے۔ گویا جنگل کی دیوی نے شفق کو شرمندہ کرنے کے لیے زعفرانی جوڑا زیبِ تن کیا ہو۔ یا رشیوں کی پاک روحیں سفرِ جاوداں میں یہاں آرام کر رہی ہوں۔ یا قدرت کا نغمۂ شیریں شکل پذیر ہو کر دنیا پر موہنی منتر ڈال رہا ہو۔ آپ لوگ شکار کھیلنے چلیے' مجھے اس آبِ حیات سے شاد کام ہونے دیجئے۔"

دونوں نوجوان فرطِ حیرت سے گجندر کا منہ تاکنے لگے۔ ان کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ یہ حضرت کہہ کیا رہے ہیں۔ دیہات کے رہنے والے' جنگلوں میں گھومنے والے' سیمل ان کے لیے کوئی انوکھی چیز نہ تھی۔ اسے روز دیکھتے تھے۔ کتنی بار اس پر چڑھے تھے۔ اس کے نیچے دوڑے تھے۔ اس کے پھولوں کے گیند بنا کر کھیلتے تھے۔ ان پر یہ مستی کبھی نہ طاری ہوئی تھی۔ حسن پرستی وہ کیا جانیں۔

صوبیدار صاحب آگے بڑھ گئے تھے۔ ان لوگوں کو ٹھہرا ہوا دیکھ کر لوٹ آئے اور بولے۔ "کیوں بیٹا ٹھہر کیوں گئے؟"

گجندر نے دست بستہ گزارش کی۔ "آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں شکار کھیلنے نہ جا سکوں گا۔ اس گلزار کو دیکھ کر مجھ پر وجدانی کیفیت طاری ہو گئی ہے۔ میری روح نغمۂ جنت کا مزہ لے رہی ہے۔ آہا یہ میرا ہی دل ہے جو پھول بن کر چمک رہا ہے۔ مجھ میں بھی وہی سرخی ہے' وہی حسن ہے' وہی لطافت ہے۔ میرے دل پر صرف گیان کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ کس کا شکار کریں؟ جنگل کے معصوم جانوروں کا! ہمیں تو جانور ہیں' ہمیں تو پرند ہیں۔ یہ ہمارے ہی تصورات کا آئینہ ہے جس میں عالمِ اجسام کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ کیا اپنا ہی خون کریں۔ نہیں آپ لوگ شکار کھیلنے جائیں۔ مجھے اس مستی و بہار میں محو ہونے دیں۔ بلکہ میں تو عرض کروں گا کہ آپ بھی شکار سے باز آئیں۔ زندگی مسرت کا خزانہ ہے۔ اس کا خون نہ کیجئے۔ نظارہ ہائے قدرت سے چشمِ باطن کو مسرور کیجئے۔ قدرت کے ایک ایک ذرے' میں ایک ایک پھول میں' ایک ایک ہستی میں مسرت کی شعاعیں چمک رہی ہیں۔ خونریزی سے مسرت کے اس لازوال چشمے کو ناپاک نہ کیجئے۔"

اس تصوف آمیز تقریر نے سبھی کو متاثر کر دیا۔ صوبیدار صاحب نے چنوّ سے آہستہ سے کہا۔ "عمر تو کچھ نہیں ہے لیکن کتنا گیان بھرا ہوا ہے۔" چنوّ نے بھی اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ "علم سے روح بیدار ہو جاتی ہے۔ شکار کھیلنا برا ہے۔"

صوبیدار نے عارفانہ انداز سے کہا۔ "ہاں برا تو ہے چلو لوٹ چلیں۔ جب ہر ایک چیز میں اسی کا جلوہ ہے تو شکاری کون اور شکار کون' اب کبھی شکار نہ کھیلوں گا۔"

پھر وہ گجندر سے بولے۔ "بھیّا! تمہارے اُپدیش نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ قسم کھاتے ہیں اب کبھی شکار نہ کھیلیں گے۔"

گجندر پر مستانہ کیفیت طاری تھی۔ اس سُرور کے عالم میں بولے۔ ''ایشور کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے آپ لوگوں کو یہ توفیق عطا کی۔ مجھے خود شکار کا کتنا شوق تھا عرض نہیں کر سکتا۔ ان گنت جنگلی سؤر' ہرن' تیندوے' نیل' گائیں' ہلاک کیے ہوں گے۔ ایک بار چیتے کو مار ڈالا تھا۔ مگر آج مئے عرفان کا وہ نشہ ہوا کہ ماسوا کا کہیں وجود ہی نہیں رہا۔''

(2)

ہولی جلنے کی مہورت نو بجے رات کو تھی۔ آٹھ ہی بجے سے گاؤں کے عورت' مرد' بوڑھے اور بچے گاتے بجاتے کبیریں اڑاتے ہولی کی طرف چلے۔ صوبیدار صاحب بھی بال بچوں کو لیے ہوئے مہمان کے ساتھ ہولی جلانے چلے۔

گجندر نے ابھی تک کسی بڑے گاؤں کی ہولی نہ دیکھی تھی۔ اس کے شہر میں تو ہر محلے میں لکڑی کے موٹے موٹے دو چار کُندے جلا دیئے جاتے تھے' جو کئی کئی دن جلتے رہتے تھے۔ یہاں کی ہولی ایک وسیع میدان میں کسی کوہسار کی بلند چوٹی کی طرح آسمان سے باتیں کر رہی تھی۔ جوں ہی پنڈت جی نے منتر پڑھ کر نئے سال کا خیر مقدم کیا آتش بازی چھوٹنے لگی۔ چھوٹے بڑے سبھی پٹاخے' چھچھوندریں' ہوائیاں چھوڑنے لگے۔ گجندر کے سر پر سے کئی چھچھوندریں سنسناتی ہوئی نکل گئیں۔ ہر ایک کے پٹاخے پر بے چارہ دو دو چار چار قدم پیچھے ہٹ جاتا تھا اور دل میں ان اجڈ دیہاتیوں کو بد دعائیں دیتا تھا۔ یہ کیا بیہودگی ہے۔ بارود کہیں کپڑے میں لگ جائے کوئی اور واردات ہو جائے تو ساری شرارت نکل جائے۔ روز ہی تو ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں' مگر ان دہقانوں کو کیا خبر۔ یہاں تو دادا نے جو کچھ کیا وہی کریں گے۔ چاہے اس میں کچھ تُک ہو یا نہ ہو۔

دفعتاً نزدیک سے ایک بم کے گولے کے چھوٹنے کی فلک شگاف آواز آئی گویا بجلی کڑکی ہو۔ گجندر سنگھ چونک کر کوئی دو فٹ اونچے اچھل گئے۔ اپنی زندگی میں وہ شاید کبھی اتنا نہ کودے تھے' دل دھک دھک کرنے لگا۔ گویا توپ کے نشانے کے سامنے کھڑے ہوں۔

چنّو نے کہا۔ ''جیجا جی آپ کیا چھوڑیں گے؟ کیا لاؤں؟''

منّو بولا۔ ''ہوائیاں چھوڑیئے جیجا جی۔ بہت اچھی ہیں۔ آسمان میں نکل جاتی ہیں۔''

چنّو: ''ہوائیاں بچے چھوڑتے ہیں کہ یہ چھوڑیں گے' آپ بم کا گولہ چھوڑیں بھائی صاحب۔''

گجندر نے کہا۔ ''مجھے ان چیزوں کا شوق نہیں' مجھے تو تعجب ہو رہا ہے کہ بوڑھے بھی کتنی دلچسپی لے رہے ہیں۔''

منّو: ''دو چار ماہتابیاں تو ضرور چھوڑیئے۔''

گجندر کو ماہتابیاں بے ضرر معلوم ہوئیں۔ ان کی سرخ' سبز اور سنہری چمک کے سامنے ان کے گورے چہرے اور خوبصورت بالوں اور ریشمی کرتے کی دلفریبی کتنی بڑھ جائے گی۔ کوئی خطرے کی بات بھی نہیں' مزے سے ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ گُل ٹپ ٹپ نیچے گر رہا ہے اور سب کی نگاہیں ان کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ ان کا فلسفی دماغ بھی خود نمائی کے شوق سے خالی نہ تھا۔ فوراً ماہتابی لے لی۔ گو ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ' مگر پہلی ہی ماہتابی چھوڑنا شروع کی تھی کہ دوسرا بم گولا چھوٹا۔ آسمان کانپ اٹھا۔ گجندر کو ایسا معلوم ہوا گویا کان کے پردے پھٹ گئے یا سر پر کوئی ہتھوڑا سا گر پڑا۔ ماہتابی ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی اور سینے میں اختلاج ہونے لگا۔ ابھی دھماکے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ

دوسرا دھماکہ ہوا۔ جیسے آسمان پھٹ پڑا ہو' ساری فضا متلاطم ہو گئی۔ چڑیاں گھونسلوں سے نکل نکل کر شور مچاتی ہوئی بھاگیں' جانور رسیاں تڑاتڑا کر بھاگے اور گجندر بھی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ سرپٹ اور سیدھے گھر پر آ کر دم لیا۔ چنو اور منو دونوں گھبرا گئے۔ صوبیدار صاحب کے ہوش اڑ گئے۔ تینوں آدمی بگٹٹ دوڑے ہوئے گجندر کے پیچھے چلے۔ دوسروں نے جو انہیں بھاگتے دیکھا تو سمجھے کہ کوئی شدید واردات ہو گئی' تو سب کے سب مہمان کے پیچھے ہو لیے۔ گاؤں میں ایک معزز مہمان کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ مہمان کو ہو کیا گیا ہے' ماجرا کیا ہے؟ کیوں یہ لوگ دوڑے جا رہے ہیں؟ ایک لمحے میں سینکڑوں آدمی صوبیدار صاحب کے دروازے پر پرسش کے لیے جمع ہو گئے۔ گاؤں کا داماد کم رُو ہونے پر بھی قابلِ زیارت اور بد حال ہوتے ہوئے بھی منظورِ نظر ہوتا ہے۔

صوبیدار نے سہمی ہوئی آواز سے پوچھا۔ "تم وہاں سے کیوں بھاگ آئے بھیا؟"

گجندر کو کیا معلوم کہ اس کے چلے آنے سے یہ تہلکہ مچ جائے گا۔ مگر اس کے حاضر دماغ نے جواب سوچ لیا تھا اور جواب بھی ایسا کہ گاؤں والوں پر اس کی ضمارسی کا سکّہ بٹھا دے۔

بولا۔ "کوئی خاص بات نہ تھی' دل میں کچھ ایسا ہی آیا کہ یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔"

"نہیں کوئی بات ضرور تھی۔"

"آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟ میں اسے ظاہر کر کے آپ کے جشن میں خلل نہیں ڈالنا چاہتا۔"

"جب تک بتلا نہ دو گے بیٹا ہمیں تسلی نہ ہو گی۔ سارا گاؤں گھبرایا ہوا ہے۔"

گجندر نے پھر صوفیوں کا سا چہرہ بنایا' آنکھیں بند کر لیں' جمائیاں لیں اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولے:

"بات یہ ہے کہ جوں ہی میں نے ماہتابی ہاتھ میں لی' مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے اسے میرے ہاتھ سے چھین کر پھینک دیا۔ میں نے کبھی آتش بازیاں نہیں چھوڑیں۔ ہمیشہ اس کی مذمت کرتا رہا۔ آج میں نے وہ فعل کیا' جو میرے ضمیر کے خلاف تھا۔ بس غضب ہی تو ہو گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میری روح مجھ پر نفرین کر رہی ہے۔ شرم سے میری گردن خم ہو گئی اور میں اسی عالم میں وہاں سے بھاگا۔ اب آپ لوگ مجھے معاف فرمائیں۔ میں آپ کے جشن میں شریک نہ ہو سکوں گا۔"

صوبیدار صاحب نے اس انداز سے گردن ہلائی گویا ان کے سوا وہاں کوئی اس تصوف کا راز نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ "آتی ہیں تم لوگوں کی سمجھ میں باتیں۔ تم بھلا کیا سمجھو گے۔ ہم بھی کچھ کچھ ہی سمجھتے ہیں۔"

ہولی تو وقت معیّنہ پر جلائی گئی۔ مگر آتش بازیاں دریا میں ڈال دی گئیں۔ شریر لڑکوں نے کچھ اس لیے چھپا کر رکھ لیں کہ گجندر چلے جائیں گے تو مزے سے چھوڑیں گے۔

شیام دلاری نے تخلیے میں کہا۔ "تم تو وہاں سے خوب بھاگے۔"

گجندر کڑک کر بولے۔ "بھاگتا کیوں' بھاگنے کی تو کوئی بات نہ تھی۔"

"میری تو جان نکل گئی کہ معلوم نہیں کیا ہو گیا۔ تمہارے ہی ساتھ میں بھی دوڑی آئی۔ ٹوکری بھر آتش بازی دریا میں پھینک دی گئی۔"

"یہ تو روپے کو آگ میں پھونکنا ہے۔"

"ہولی میں بھی نہ چھوڑیں تو کب چھوڑیں۔ تیوہار اسی لیے تو آتے ہیں۔"

"تیوہار میں گاؤ بجاؤ' اچھی اچھی چیزیں پکاؤ کھاؤ' خیرات کرو۔ عزیزوں سے ملو۔ سب سے محبت سے پیش آؤ۔ بارود اڑانے کا نام تیوہار نہیں ہے۔"

رات کے بارہ بج گئے تھے۔ کسی نے دروازے پر دھکا مارا۔

گجندر نے چونک کر پوچھا۔ "یہ دھکا کس نے مارا؟"

"شیاما نے لاپروائی سے کہا۔" بلّی وِلّی ہو گی۔"

کئی آدمیوں کے کھٹ پٹ کرنے کی آوازیں آئیں۔ پھر کواڑ پر دھکا پڑا۔ گجندر کو لرزہ آگیا۔ لالٹین لے کر دروازے سے جھانکا تو چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ چار پانچ آدمی کُرتے پہنے' پگڑیاں باندھے' داڑھیاں لگائے' شانے پر بندوقیں رکھے کواڑ کو توڑ ڈالنے کی سرگرم کوشش میں مصروف تھے۔ گجندر کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگا۔

"دونوں سو گئے ہیں کواڑ توڑ ڈالو۔ مال الماری میں ہے۔"

"اگر دونوں جاگ گئے؟"

"عورت کیا کر سکتی ہے' مرد کو چارپائی سے باندھ دیں گے۔"

"سنتے ہیں گجندر سنگھ کوئی بڑا پہلوان ہے؟"

"کیسا ہی پہلوان ہو۔ چار ہتھیار بند آدمیوں کے سامنے کیا کر سکتا ہے؟"

گجندر کے کاٹو تو بدن میں خون نہیں۔ شیام دلاری سے بولے۔ "یہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں۔ اب کیا ہو گا۔ میرے تو ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہیں۔"

"چور چور پکارو۔ جاگ ہو جائے گی۔ آپ بھاگ جائیں گے۔ نہیں میں چلّاتی ہوں۔ چور کا دل آدھا۔"

"نا! نا! دیکھنا کہیں ایسا غضب نہ کرنا۔ ان سبھوں کے پاس بندوقیں ہیں۔ گاؤں میں اتنا سناٹا کیوں ہے؟ گھر کے آدمی کیا ہوئے؟"

"بھیا اور منو دادا کھلیان میں سونے گئے ہیں۔ کاکا دروازے پر پڑے ہوں گے۔ ان کے کانوں پر توپ چھوٹے تب بھی نہ جاگیں گے۔"

"اس کمرے میں کوئی دوسری کھڑکی بھی تو نہیں ہے کہ باہر آواز پہنچے۔ مکان ہیں یا قید خانے؟"

"میں تو چلّاتی ہوں۔"

"ارے نہیں بھائی! کیوں جان دینے پر آمادہ ہو۔ میں تو سوچتا ہوں ہم دونوں چپ سادھ کر لیٹ جائیں اور آنکھیں بند کر لیں۔ بدمعاشوں کو جو کچھ لے جانا ہو لے جائیں۔ جان تو بچے۔ دیکھو کواڑ ہل رہے ہیں۔ کہیں ٹوٹ نہ جائیں۔ یا ایشور کہاں جاؤں۔ اس مصیبت میں تمہارا ہی بھروسہ ہے۔ کیا جانتا تھا کہ یہ آفت آنے والی ہے۔ نہیں تو آتا ہی کیوں۔ بس چپ ہی سادھ لو۔ اگر ہلائیں ولائیں تو بھی سانس مت لینا۔"

"مجھ سے چپّی سادھ کر پڑا رہا نہ جائے گا۔"

"زیور اتار کر رکھ کیوں نہیں دیتیں۔ شیطان زیور ہی تو لیں گے۔"

"زیور نہ اتاروں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔"

"کیوں جان دینے پر تلی ہوئی ہو؟"

"خوشی سے تو زیور نہ اتاروں گی' زبردستی کی تو اور بات ہے۔"

"خاموش، سنو سب کیا باتیں کر رہے ہیں؟"

باہر سے آواز آئی۔ "کواڑ کھول دو، نہیں تو ہم کواڑ توڑ کر اندر آ جائیں گے۔"

گجندر نے شیام دلاری کی منت کی۔ "میری بات مانو شیاما، زیور اتار کر رکھ دو، میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد نئے بنوا دوں گا۔"

باہر سے آواز آئی۔ "کیوں شامتیں آئی ہیں، بس ایک منٹ کی مہلت اور دیتے ہیں۔ اگر کواڑ نہ کھولے تو خیریت نہیں۔"

گجندر نے شیام دلاری سے پوچھا۔ "کھول دوں؟"

"ہاں بلا لو، تمہارے بھائی بند ہیں نا۔ وہ دروازے کو باہر سے دھکیلتے ہیں تم اندر سے باہر کو ٹھیلو۔"

"اور جو دروازہ میرے اوپر گر پڑے، پانچ ـــــ پانچ جوان ہیں؟"

"وہ کونے میں لاٹھی رکھی ہے، لے کر کھڑے ہو جاؤ۔"

"تم پاگل ہو گئی ہو؟"

"چنّوں دادا ہوتے تو پانچوں کو گرا دیتے۔"

"میں لٹھ باز نہیں ہوں۔"

"تو آؤ منہ ڈھانپ کر لیٹ جاؤ۔ میں ان سب کو سمجھ لوں گی۔"

"تمہیں تو عورت سمجھ کر چھوڑ دیں گے، ماتھے میرے جائے گی۔"

"میں چلّاتی ہوں۔"

"تم میری جان لے کر چھوڑو گی۔"

"مجھ سے تو اب صبر نہیں ہوتا۔ میں کواڑ کھولے دیتی ہوں۔"

اس نے دروازہ کھول دیا۔ پانچوں چور کمرے میں بھڑ بھڑا کر گھس آئے۔

ایک نے اپنے ساتھی سے کہا۔ "میں اس لونڈے کو پکڑے ہوئے ہوں تم عورت کے سارے گہنے اتار لو۔"

دوسرا بولا: "اس نے تو آنکھیں بند کر لیں۔ ارے تم آنکھیں کیوں نہیں کھولتے جی؟"

تیسرا: "یار عورت تو حسین ہے۔"

چوتھا: "سنتی ہے او مہریا، زیور دے دے نہیں تو گلا گھونٹ دوں گا۔"

گجندر دل میں بگڑ رہے تھے کہ یہ چڑیل زیور کیوں نہیں اتار دیتی؟

شیام دلاری نے کہا۔ "گلا گھونٹ دو، چاہے گولی مار دو، زیور نہ اتاروں گی۔"

پہلا: "اسے اٹھا لے چلو۔ یوں نہ مانے گی۔ مندر خالی ہے۔"

دوسرا: "بس یہی مناسب ہے۔ کیوں ری چھوکری ہمارے ساتھ چلے گی؟"

شیام دلاری: "تمہارے منہ میں کالکھ لگا دوں گی۔"

تیسرا: "نہ چلے گی تو اس لونڈے کو لے جا کر بیچ ڈالیں گے۔"

شیام: "ایک ایک کے ہتھکڑی لگوا دوں گی۔"

چوتھا: "کیوں اتنا بگڑتی ہے مہارانی، ہمارے ساتھ چلی کیوں نہیں چلتی۔ کیا ہم اس لونڈے سے بھی گئے

گزرے ہیں۔ کیارہ جائے گا۔ اگر ہم زبردستی تجھے اٹھا کر لے جائیں گے۔ یوں سیدھی طرح نہیں مانتی ہو۔ تم جیسی ماہرو پر ظلم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔"

پانچواں: "یا تو سارے زیور اتار کر دے یا ہمارے ساتھ چل۔"

شیام دلاری: "کاکا آجائیں گے تو ایک ایک کی کھال ادھیڑ ڈالیں گے۔"

پہلا: "یہ یوں نہ مانے گی۔ اس لونڈے کو اٹھائے لے چلو۔ تب آپ ہی پیروں پڑے گی۔"

دو آدمیوں نے ایک چادر سے گجندر کے ہاتھ پاؤں باندھے، گجندر بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔ سانس تک نہ آتی تھی۔ دل میں جھنجھلا رہے تھے۔ "ہائے کتنی بے وفا عورت ہے۔ زیور نہ دے گی چاہے یہ سب مجھے جان سے مار ڈالیں۔ اچھا زندہ بچوں گا تو دیکھوں گا۔ بات تک تو پوچھوں نہیں۔"

جب ڈاکوؤں نے گجندر کو اٹھا لیا اور لے کر آنگن میں جا پہنچے تو شیام دلاری دروازے پر کھڑی ہو کر بولی۔

"انہیں چھوڑ دو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

پہلا: "پہلے ہی کیوں نہ راضی ہو گئی۔ چلے گی نا؟"

شیام دلاری: "چلوں گی کہتی تو ہوں۔"

تیسرا: "اچھا تو چل۔ ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں۔"

دونوں چوروں نے گجندر کو لا کر چارپائی پر لٹا دیا اور شیام دلاری کو لے کر چل دیئے۔ کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ گجندر نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ کوئی نظر نہ آیا۔ اٹھ کر دروازے سے جھانکا۔ صحن میں کوئی نہ تھا۔ تیر کی طرح نکل کر صدر دروازے پر آئے لیکن باہر نکلنے کا حوصلہ نہ ہوا۔ چاہا کہ صوبیدار صاحب کو جگائیں، مگر منہ سے آواز نہ نکلی۔ اسی وقت قہقہے کی آواز آئی۔ پانچ عورتیں چہل کرتی ہوئی شیام دلاری کے کمرے میں آئیں۔ گجندر کا وہاں پتا نہ تھا۔

ایک: "کہاں چلے گئے؟"

شیام دلاری: "باہر چلے گئے ہوں گے۔"

دوسری: "بہت شرمندہ ہوں گے۔"

تیسری: "مارے خوف کے ان کی سانس بند ہو گئی تھی۔"

گجندر نے بول چال سنی تو جان میں جان آئی۔ سمجھے گھر میں جاگ ہو گئی۔ لپک کر کمرے کے دروازے پر آئے اور بولے:

"ذرا دیکھئے شیاما کہاں ہے۔ میری تو نیند نہیں کھلی۔ جلد کسی کو دوڑائیے۔"

یکایک انہی عورتوں کے بیچ میں شیاما کو کھڑے ہنستے دیکھ کر حیرت میں آ گئے —— پانچوں سہیلیوں نے ہنسنا اور تالیاں پیٹنا شروع کر دیں۔

ایک نے کہا: "واہ جیجا جی! دیکھ لی آپ کی بہادری۔"

شیام دلاری: "تم سب کی سب شیطان ہو۔"

تیسری: "بیوی تو چوروں کے ساتھ چلی گئی اور آپ نے سانس تک نہ لی۔"

گجندر سمجھ گئے بڑا دھوکا کھایا۔ مگر زبان کے شیر تھے۔ فوراً بگڑی بات بنالی۔

بولے: ”تو کیا تمہارا سوانگ بگاڑ دیتا۔ میں بھی اس تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ اگر سبھوں کو پکڑ کر مونچھیں اکھاڑ دیتا تو تم کتنی شرمندہ ہوتیں۔ میں اتنا بے رحم نہیں ہوں۔“

سب کی سب گجندر کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔

انصاف کی پولیس

(1)

سیٹھ نانک چند نے آج پھر وہی لفافہ پایا' اور وہی تحریر دیکھی' تو ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ خط کھولتے ہی ہاتھ اور دل دونوں کانپنے لگے۔ خط میں کیا ہے۔ یہ انہوں نے قیافے سے معلوم کر لیا تھا۔ اسی لفافے اور اسی تحریر کے کئی خطوط یکے بعد دیگرے انہیں مل چکے تھے۔ اس خط کا بھی وہی مضمون ہوگا۔ اس میں مطلق شبہ نہ تھا۔ وہ خط کانپتے ہوئے ہاتھوں میں لیے ہوئے آسمان کی طرف تاکنے لگے۔ گویا اس میں اپنا نوشتۂ تقدیر پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ وہ دل کے مضبوط آدمی تھے۔ مُردوں سے بھی اپنی رقم وصول کر لیتے تھے۔ رحم یا رعایت یا دوسری کمزوریاں انہیں چھو بھی نہیں گئی تھیں ورنہ مہاجن ہی کیسے بنتے۔ وہ ہر پورن ماشی کو ستیہ نارائن کی کتھا سنتے تھے۔ پچھلے پندرہ سال میں اس معمول میں ایک ناغہ بھی نہ ہوا تھا۔ منگل یا کسی خاص دن مہابیر جی کو لڈو چڑھاتے تھے۔ روزانہ جمنا میں اشنان کرتے اور شیو جی کو جل چڑھاتے تھے۔ مہینے میں دو بار برہمنوں کو بھوجن بھی کراتے تھے اور جب سے گھی کے کاروبار میں نفع کثیر ہونے لگا تھا' ایک دھرم شالہ بنوانے کی فکر میں تھے۔ زمین طے کر لی تھی اور کسی اچھے مہورت کے منتظر تھے۔ انہوں نے خوب حساب کر کے دیکھ لیا تھا کہ اس کارِ خیر میں ان کی جیب سے ایک کوڑی بھی نہ خرچ ہوگی۔ زمین ایک بیوہ کی تھی۔ جس پر انہوں نے پہلے اپنی گائے بھینسوں کے لیے ایک مختصر سا چھپر ڈال لیا تھا اور جب بیوہ ایک نابالغ لڑکا چھوڑ کر مر گئی تو وقف زمین اس کے قبضے میں آگئی۔ لڑکا اپنے ننھیال میں تھا۔ اور ننھیال والوں کو اتنی توفیق نہ تھی اور نہ اتنی فرصت کہ سیٹھ جی سے مقدمہ بازی کرتے۔ معمار سب ان کے اسامی تھے اور مزدوری کر کے سود ادا کرنا چاہتے تھے۔ اینٹ والا بھی ان سے کئی سال پہلے قرض لے گیا تھا اور اصل کی دو چند رقم ادا کر چکنے کے بعد بھی اس پر ان کے ہزاروں روپے نکلتے تھے۔ اس لیے یہ مرحلہ بھی طے تھا۔ صرف سیمنٹ اور چونے والے بیوپاری کے پھنسنے کا انتظار تھا۔ وہ دس بیس ہزار کی دستاویز لکھا لے' بس دھرم شالہ تیار ہے۔ ہر ایک کامیاب آدمی کی طرح دیوتاؤں پر ان کا پکا اعتقاد تھا۔ جن کی دعا اور برکت سے انہیں کسی کاروبار میں گھاٹا نہیں ہوا۔ مگر جب سے یہ خطوط ملنے لگے تھے' انہیں ایک وہم آمیز تشویش پیدا ہو گئی تھی۔ رات کو ان کے دروازے پر محض ایک چوکیدار رہتا تھا۔ اگر دس پانچ مسلح آدمی آجائیں تو وہ اکیلا کیا کر سکتا تھا۔ شاید انہیں دیکھ کر بھاگ کھڑا ہو۔ ہمسایوں میں ایسا کوئی نظر نہ آتا تھا جو خطرے کے وقت کام آئے۔ حالانکہ سبھی ان کے اسامی تھے یا رہ چکے تھے۔ لیکن یہ فرقہ احسان فراموش کا ہے' جس کے دروازے پر ضرورت کے وقت ناک اور پیشانی رگڑتا ہے اسی کے درپئے آزار

ہو جاتا ہے۔ احسان ماننا تو دور رہا' الٹا اور بدخواہ ہو جاتا ہے۔ انہوں نے سوچا اگر رات کو دس پانچ آدمی آ جائیں تو واقعی بڑی مشکل کا سامنا ہو۔ بیشک دروازہ مضبوط ہے اور اسے توڑنا آسان نہیں۔ جوڑیاں بھی جرمن ساخت کی ہیں جن پر کوئی حربہ اثر ہی نہیں کر سکتا اور دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ ان پر کوئی کیا کھا کے چڑھے گا۔ نقب تو امرِ محال ہے۔ بیرونی دیوار خالص پتھر کی ہے۔ ایک ایک پتھر دس دس من کا ہے۔

اس خیال سے انہیں قدرے تشفی ہوئی۔ اپنی رائفل نکال کر انہوں نے اس کا خوب معائنہ کیا۔ موقع پڑنے پر اس سے بھی دس پانچ آدمیوں کو منٹوں میں بھون سکتے ہیں۔ پھر بھی ان پر ایک دہشت سی طاری ہو گئی۔ کون جانے یہ چوکیدار بھی انہی میں مل گیا ہو' خدمت گار بھی تھوڑے سے لالچ سے آستین کا سانپ ہو سکتے ہیں۔

آخر کئی منٹ کے روحانی انتشار کے بعد انہوں نے خط کھولا اور ان کا چہرہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پھیل گئیں۔ سانس تیز چلنے لگی۔ فوراً دروازہ بند کر دیا اور خط لیے اندر آ کر کیسر سے بولے:

''دیکھتی ہو آج پھر وہی خط آیا۔ آج تو تاریخ بھی مقرر کر دی۔ پرسوں ان کا دھاوا ہو گا۔ لکھا ہے اگر اپنی جان عزیز ہے تو پچیس ہزار روپے نقد رامیشور کے مندر کے سامنے درخت کے نیچے آٹھ بجے رات کو رکھ دو' یہ سب سمجھتے ہوں گے کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے میں ڈر جاؤں گا۔''

کیسر پڑھنا نہ جانتی تھی پھر بھی اس نے ان کے ہاتھ سے خط لے لیا اور اس پر ایک نظر ڈال کر بولی۔

''میں سوچتی ہوں مہینے دو مہینے کے لیے یہاں سے کہیں چلے چلیں۔ کاشی' پراگ' ہردوار کہیں بھی۔ تیرتھ کا تیرتھ ہو جائے گا اور ذرا چین بھی نصیب ہو گا۔ مجھے تو مارے خوف کے رات کو نیند نہیں آتی۔''

سیٹھ جی دلیرانہ انداز سے بولے:

''اس طرح ایک دھمکی میں بھاگنے لگوں تو مہاجنی کر چکا۔ یہ سب میرے ہی اسامی ہیں۔ جن کی جائدادیں میں نے نیلام کرائی ہیں۔ رائفل کی ایک آواز جہاں کی سُدھ جائیں گے۔ پولیس کو بھی اطلاع کیے دیتا ہوں۔ میں نے ابھی تک پولیس کو خبر نہیں دی۔ وہ خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا دیں گے اور دو چار ہزار روپے میری حفاظت کے بہانے سے وصول کر لیں گے اور حفاظت جیسی وہ کریں گے وہ میں جانتا ہوں۔ لیکن اب اطلاع دے دوں گا۔ دو چار سو روپیوں کا منہ نہ دیکھوں گا' اپنی طرف سے ہوشیار رہنا اچھا ہے۔''

کیسر دوہرے بدن کی عورت تھی۔ نخلِ بے ثمر جو پت جھڑ میں بھی ہری ہری پتیوں سے لدا رہتا ہے۔ اولاد کی ناکام آرزو میں زندگی کا بڑا حصہ گزار چکنے کے بعد اب اس پر ہمیشہ ایک پُرخوف مایوسی طاری رہتی تھی۔ معلوم نہیں کب آنکھیں بند ہو جائیں۔ پھر یہ زر و مال کس کے ہاتھ لگے۔ سب سے زیادہ خوف اسے بیماری کا تھا۔ اسے وہ موت کا پیش خیمہ سمجھتی تھی۔ اور اس جامۂ ہستی کو اس وقت تک اتارنا نہ چاہتی تھی جب تک ایک تار بھی باقی رہے۔ بال بچے ہوتے تو وہ خوشی سے مرتی' موت کو بلاتی' لیکن اب تو اس کی زندگی ہی اس کا خاتمہ تھا۔ پھر کیوں نہ وہ زیادہ سے زیادہ زندہ رہے۔ اب تک تو صرف بیماری کا خوف تھا اسے۔ وہ دواؤں اور دعاؤں سے دور کرتی رہتی تھی اور گویا ایشور پر اپنی بے نیازی کا اظہار کرنے کے لیے ہمیشہ بنی ٹھنی رہتی تھی۔ لیکن جب سے یہ خطوط آنے لگے تھے' اس کا خوف بھوت کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا۔ منت آمیز لہجے میں بولی:

''پولیس کو اطلاع کرنے سے کچھ نہ ہو گا۔ میری بات مانو' یہاں سے بھاگ چلو۔ میری بات کیوں نہیں مانتے؟ کیا کرنے ٹِلے ہوئے ہو؟ چور کوئی گھر کو تو اٹھا نہ لے جائے گا؟''

سیٹھ جی نے کیسر کی بد حواسی پر ترس کھا کر کہا:

"تم ناحق اتنا ڈرتی ہو کیسر۔ پولیس کو جب ضابطے کے ساتھ اطلاع دی جائے گی تو اس کا فرض ہو جائے گا کہ ہماری حفاظت کرے۔ ہم پانچ ہزار سالانہ ٹیکس دیتے ہیں۔ اگر پولیس نے سماعت نہ کی تو میں لاٹ صاحب سے کہوں گا۔ جب سرکار ہم سے ٹیکس لیتی ہے تو ہماری جان و مال کی حفاظت کرنا اس کا قانونی فرض ہے۔"

سیاسیات کا یہ مسئلہ کیسر کی سمجھ میں کیا آتا۔ وہ تو کسی طرح اس خوف سے نجات پانا چاہتی تھی، جو اس کے دل میں سانپ کی طرح بیٹھا پھنکار رہا تھا۔ پولیس کا اسے اب تک جو تجربہ تھا اس سے اس کے دل کو تقویت نہ ہوتی تھی، بولی:

"پولیس والے واردات کے وقت تو نظر نہیں آتے۔ جب واردات ہو جاتی ہے تب البتہ شان جتانے کے لیے آ پہنچتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ پولیس اور دھنش طوفان ختم ہو جانے کے بعد دکھائی دیتی ہے۔"

سیٹھ جی نے پولیس کی حمایت کی۔ "پولیس والے تو سرکار کا راج چلا رہے ہیں۔ تم کیا جانو۔" کیسر نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ "اور میں کہتی ہوں کہ اگر واردات کل ہونے والی ہے تو پولیس کو خبر دینے سے آج ہو جائے گی۔ لوٹ کے مال میں ان کا سا جھا ہوتا ہے۔"

"جانتا ہوں، دیکھ چکا ہوں اور روز دیکھتا ہوں۔ لیکن کیا سرکار کو پانچ ہزار ٹیکس نہیں دیتے۔ اس پر داروغہ جی کو برابر پاپڑا چار وغیرہ پہنچاتا رہتا ہوں۔ ابھی جاڑوں میں سپرنٹنڈنٹ صاحب شکار کھیلنے آئے تھے۔ تو میں نے کتنی رسد پہنچائی تھی۔ ایک کنستر گھی اور ایک بوری شکر تو ایک ہی دن بھیجی تھی۔ یہ سب کھلانا پلانا کس دن کام آئے گا۔ ہاں یہ مانتا ہوں کہ آدمی کو بالکل دوسروں کے بھروسے نہ بیٹھا رہنا چاہیے۔ اپنی قوتِ بازو سے بھی کام لینا چاہیے۔ میرا نشانہ تو بے خطا ہوتا ہے۔ آؤ میں تمہیں بھی بندوق چلانا سکھا دوں۔"

یہ ایک مضحکہ خیز تجویز تھی۔ کیسر ہنس کر بولی:

"ہاں اور کیا۔ اب آج میں بندوق چلانا سیکھوں گی، تم کو جب دیکھو ہنسی ہی سوجھتی ہے۔"

سیٹھ جی نے کہا۔ "اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔ آج کل تو عورتیں فوج میں بھرتی ہو رہی ہیں۔ سپاہیوں کی طرح عورتیں بھی قواعد کرتی ہیں۔ بندوق چلاتی ہیں۔"

کیسر نے اعتراض کیا۔ "ولایت کی عورتیں ہی چلاتی ہوں گی۔ یہاں کی عورتیں کیا چلائیں گی۔ ہاں انگل بھر کی زبان چاہے چلا لیں۔"

سیٹھ جی نے اس فاسد خیال کی تصحیح کی۔ "اب یہاں کی عورتیں بھی چلاتی ہیں۔ زمانہ بدل رہا ہے۔ ہم تم دونوں بندوق لیے کھڑے ہو جائیں گے تو پچاس آدمی بھی اندر گھسنے کی ہمت نہ کر سکیں گے۔ عورت کے ہاتھ میں بندوق توپ سے بھی زیادہ قاتل ہو جاتی ہے۔"

کیسر نے آخری فیصلہ کیا۔ "نہ بابا میں تو چور کی آواز سنتے ہی چکر کھا کر گر پڑوں گی۔"

اس وقت چوکیدار نے آکر کہا "داروغہ جی نے کئی کانسٹیبل بھیجے ہیں۔ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔"

(2)

سیٹھ جی باہر آئے تو کانسٹیبلوں نے انہیں ادب سے سلام کیا اور ان میں سے ایک نے کہا۔ "ہمیں داروغہ

جی نے آپ کے پاس یہ دریافت کرنے کو بھیجا ہے کہ آپ کے پاس دھمکی کی چٹھیاں تو نہیں آ رہی ہیں۔ آج کل باہر سے بہت سے ڈاکو اس علاقے میں آ گئے ہیں اور لوٹ مار کی کئی وارداتیں ہو چکی ہیں۔"

سیٹھ جی نے کانسٹیبلوں کو کرسیوں پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "داروغہ جی کو کیسے معلوم ہو گیا؟ میرے پاس تو ایسے کئی خط آ چکے ہیں۔ ایک آج بھی آیا ہے۔ میں خود داروغہ جی کو اطلاع دینے آ رہا تھا۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا۔ "حضور یہ نہ پوچھیں کہ داروغہ جی کو کیسے معلوم ہو گیا۔ علاقے کے سب سے بڑے سیٹھ کے پاس ایسے خط آئیں اور پولیس کو خبر نہ ہو۔ بھلا کوئی بات ہے۔ حکام کی برابر تاکید ہوتی رہتی ہے کہ سیٹھ جی کو شکایت کا کوئی موقع نہ دیا جائے۔ حضور پانچ ہزار روپے سالانہ انکم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے مجال ہے کہ آپ کا بال بیکا ہو جائے۔ آج داروغہ جی بڑی دیر تک اس فکر میں غلطاں و پیچاں رہے۔ یہ ڈاکو اتنے دلیر اور تعداد میں اتنے زیادہ ہیں کہ تھانے کے باہر ان کا مقابلہ کرنا دشوار ہے۔ داروغہ جی نے سوچا تھا کہ گارد منگوا لیں گے۔ مگر ڈاکو کہیں ایک جگہ تو رہتے نہیں۔ آج یہاں ہیں تو کل یہاں سے دو سو کوس پر پہنچ گئے۔ گارد منگوا کر بھی کیا کر سکتے تھے۔ رعایا کی تو ہمیں فکر نہیں۔ کس کے پاس اتنا مال و اسباب رکھا ہے کہ ڈاکوؤں کا اندیشہ ہو۔ اور اگر کسی کے پاس دو چار سو روپے نکل ہی آئیں تو اس کے لیے پولیس ڈاکوؤں کے پیچھے اپنی جان ہتھیلی پر لیے نہ پھرے گی۔ ڈاکوؤں پر کوئی ذمہ داری نہیں، وہ تو بے دریغ گولی چلاتے ہیں اور اکثر چھپ کر۔ ہمارے لیے تو ہزار بندشیں اور قیدیں ہیں۔ کوئی بات بگڑ جائے تو الٹی اپنی جان آفت میں پھنس جائے۔ اس لیے داروغہ جی نے ہمیں یہ پیغام دے کر آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ کو جس مال و اسباب کے بارے میں خطرہ ہے اسے لا کر تھانے کے خزانے میں جمع کر دیجیے۔ آپ کو رسید دے دی جائے گی۔ آپ کا قفل لگا دیا جائے گا۔ صندوقوں پر اپنی مہر لگا دیجیے گا۔ جب یہ ہنگامہ ٹھنڈا ہو جائے گا تو آپ اپنی چیزیں واپس لے لیجیے گا۔ اس کے لیے سرکار آپ سے کسی قسم کی فیس نہیں لینا چاہتی۔ محض آپ کی حفاظت کے خیال سے یہ تجویز کی گئی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ گورنمنٹ کے دفتر سے اس قسم کا کوئی حکم آیا ہے کہ جو لوگ ایک ہزار یا اس سے زیادہ ٹیکس دیتے ہوں، ان کی حفاظت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے۔ ورنہ سخت جواب طلب کیا جائے گا۔ ورنہ آپ جانتے ہیں پولیس اتنا بڑا جوکھم کیوں اپنے سر لیتی۔ اس سے آپ کو بھی بے فکری ہو جائے گی اور ہم بھی ذمہ داری سے بچ جائیں گے۔ ورنہ خدانخواستہ کوئی واردات ہو جائے تو حضور کا جو نقصان ہو وہ تو ہو ہی، ہمارے اوپر بھی جواب دہی آ جائے گی۔ یہ ڈاکو اتنے ظالم ہیں کہ محض مال و اسباب لے کر ہی جان نہیں چھوڑتے، بلکہ خون بھی کر ڈالتے ہیں۔ اس لیے داروغہ جی نے بہت زور دے کر کہا کہ آپ سامان داخل کر کے رسید لے لیں۔ مزید اطمینان کے لیے آپ چاہیں تو اپنا ایک آدمی بھی وہاں تعینات کر سکتے ہیں۔ حضور کے پاس موٹر تو ہے ہی ہم چار آدمی آپ کے ساتھ ہوں گے۔ راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ تحقیقی خبر ملی ہے کہ ڈاکوؤں کا غول اس علاقے میں کل آ گیا ہے۔ بیس آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح۔ دو سادھو بنے ہوئے ہیں۔ اور دو پنجابیوں کے بھیس میں ہیں اور الوان اور دُھسّے بیچتے پھرتے ہیں۔ ان دونوں کے ساتھ دو بھنگی بردار بھی ہیں۔ دو ڈاکو بلوچیوں کے بھیس میں چھریاں اور تالے بیچتے پھرتے ہیں اور کہاں تک گناؤں ہمارے یہاں تو ان کا پورا حلیہ آ گیا ہے۔

خطرے میں انسان کا دل کمزور ہو جاتا ہے اور وہ ایسی باتوں کا یقین کر لیتا ہے جو شاید ہوش و حواس کی حالت میں وہ نہ کرتا۔ یہاں تو شبہے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ ممکن ہے اس میں داروغہ جی کی کوئی غرض شامل ہو اور وہ اس خدمت کا کچھ صلہ بھی چاہتے ہوں۔ اس کے لیے سیٹھ جی تیار تھے کہ اگر دو چار سو روپے دینے پڑیں تو کوئی مضائقہ

نہیں۔ایسے واقعے تو زندگی میں آتے رہتے ہیں۔ موجودہ حالت میں اس سے بہتر انتظام کوئی خیال میں نہیں آتا تھا۔ بلکہ اسے امدادِ غیب سمجھنا چاہیے۔انہی کانسٹیبلوں کو کچھ دے دلا کر ساری چیزیں نکلوا لیں گے۔دوسروں کا کیا بھروسہ کہیں ڈاکوؤں سے مل جائیں' تو غضب ہی ہو جائے۔راستے ہی میں گھیر لیے جائیں۔ بیس کے مقابلے میں چار آدمی کر ہی کیا سکتے ہیں اور کون جانے کہ ڈاکوؤں کے پاس کار نہ ہو گی۔

پھر بھی اس انداز سے بولے گویا داروغہ جی نے ان پر کوئی عنایت نہیں کی ہے۔ یہ ان کا فرض تھا۔ میں اس عنایت کے لیے داروغہ جی کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔ مگر میں نے یہاں ایسا انتظام کر لیا تھا کہ اگر ڈاکو یہاں آتے تو ان کے دانت کھٹے کر دیئے جاتے۔ سارا محلّہ مقابلے کے لیے تیار تھا۔ سبھی سے تو اپنا یارانہ ہے۔ مگر داروغہ جی کی تجویز مجھے پسند ہے۔اس سے وہ بھی اپنی ذمہ داری سے بری ہو جاتے ہیں اور میرے سر سے بھی فکر کا بوجھ اتر جاتا ہے' جیسا آپ نے خود کہا۔ لیکن اندر سے چیزیں نکال نکال کر باہر لانا اور کار میں رکھنا میرے بوتے کی بات نہیں۔ آپ کی دعا سے آدمی تو کافی ہیں' مگر کس کی نیت کیسی ہے' یہ کون جانتا ہے۔ آپ لوگ کچھ مدد کریں تو کام آسان ہو جائے گا۔(مسکرا کر) آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔"

کیسر نے اس تجویز کو لبیک کہا۔ کانسٹیبلوں نے بھی اپنی خدمات خوشی سے پیش کیں۔ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا:

"ہم حضور کے تابعدار ہیں۔اس میں مدد کی کون سی بات ہے۔ تنخواہ سرکار سے ضرور پاتے ہیں مگر دیتے تو حضور ہی ہیں۔ آپ صرف بتاتے جائیے' ہم لوگ آن کی آن میں سارا سامان نکال کر رکھ دیں گے۔"

کیسر نے خوش ہو کر کہا:

"بھگوان نے مدد کر دی' نہیں میں تو گھبرا رہی تھی۔ جان نکلی جاتی تھی۔"

سیٹھ جی نے ہمہ دانی کے انداز سے کہا:

"اسی کو کہتے ہیں سرکار کا انتظام۔اسی مستعدی کی بدولت سرکاری راج تھما ہوا ہے۔ میں تو سوچتا ہوں کوئی قیمتی چیز یہاں نہ چھوڑی جائے تاکہ وہ آئیں تو اپنا سا منہ لے کر چلے جائیں۔"

کیسر نے چہک کر کہا۔"کنجی ان سبھوں کے سامنے پھینک دینا کہ جو چیز چاہو نکال کر لے جاؤ۔"

دو کانسٹیبلوں نے اندر جا کر صندوقچے اور پٹارے نکالنے شروع کیے۔ایک باہر سامان کار پر لاد رہا تھا اور ہیڈ کانسٹیبل نوٹ بک پر ہر چیز کا اندراج کر رہا تھا۔ زیورات' اشرفیاں' نوٹ' بیش قیمت کپڑے' شال دوشالے' نقرئی ظروف' سب کار میں رکھ دیئے گئے۔ معمولی فرنیچر' برتن' فرش فروش اور غلہ وغیرہ کے سوا گھر میں اور کچھ نہ بچا اور یہ چیزیں ڈاکوؤں کے لیے بے مصرف ہیں۔ کیسر کا سنگاردان سیٹھ جی خود لائے اور ہیڈ کانسٹیبل کو دے کر بولے:

"بھئی اسے بڑی حفاظت سے رکھنا۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے سنگاردان لے کر کہا:

"میرے لیے ہر ایک تنکا اتنا ہی بیش قیمت ہے۔"

سیٹھ جی کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا۔ کہا:

"اس فہرست کی نقل مجھے بھی دے دیجئے گا۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔"آپ کو تھانے میں باضابطہ دی جائے گی۔"

"کیوں نہ یہیں دے دیجئے؟"

"یہاں لکھنے میں دیر ہو گی۔ اور پھر جب تک داروغہ جی کے دستخط نہ ہوں اس رسید کی وقعت ہی کیا۔ مگر آپ کے دل میں یہ شبہ کیوں پیدا ہوا؟"

سیٹھ جی نے نادم ہو کر کہا:

"شبہ نہیں تھا۔ میں نے سمجھا ایک رسید میرے پاس بھی ہوتی تو اچھا تھا۔"

ہیڈ کانسٹیبل نے بے رخی سے کہا۔ "اگر آپ کے دل میں کسی قسم کا شبہ ہو تو آپ چیزیں اپنے گھر ہی میں رکھیں۔ ہم یہاں بھی آپ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ مگر ہاں اس حالت میں ذمہ داری آپ کی رہے گی۔"

سیٹھ جی اور نادم ہوئے۔ "نہیں، نہیں صاحب! شبے کی بات نہیں تھی۔ یوں ہی خیال آ گیا۔ آپ کہتے ہیں رسید تھانے میں مل جائے گی۔ میں بھی مانتا ہوں۔"

کار پر سارا سامان رکھ دیا گیا۔ محلے کے سینکڑوں آدمی تماشا دیکھ رہے تھے۔ کار بہت بڑی تھی مگر بالکل بھر گئی۔ پانچ آدمیوں کے لیے بڑی مشکل سے جگہ نکلی۔ سیٹھ جی تو پیچھے والی جگہ پر بیٹھے، باقی چاروں آدمی اگلی سیٹ پر سمٹ کر بیٹھ گئے۔ کیسر دروازے پر اس انداز سے کھڑی تھی گویا اس کی لڑکی رخصت ہو رہی ہو۔

(3)

پانچ میل کا سفر تھا۔ قصبے سے باہر نکلتے ہی پہاڑوں کی خاموش اور اُودی بلندیاں نظر آئیں۔ جن کے دامن میں ہرا بھرا سبزہ زار تھا اور اس میدان کے بیچ سے سرخ بجری کی سڑک سیندور بھری مانگ کی طرح نکل گئی تھی۔ ایک میل جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل نے سیٹھ جی سے پوچھا:

"یہ کہاں تک صحیح ہے سیٹھ جی کہ پچیس سال پہلے آپ یہاں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے۔"

نانک چند تفاخر کے انداز سے بولے۔

"بالکل صحیح ہے خاں صاحب! میرے پاس کل تین روپے تھے۔ لٹیا ڈور کندھے پر تھی اور چھڑی ہاتھ میں۔ بس بھگوان کا بھروسہ تھا۔ بالکل تقدیر کا کھیل ہے۔ اور بھگوان کی مرضی چاہیے۔ آدمی کے بنتے بگڑتے دیر نہیں لگتی۔"

"میں نے سنا ہے آپ دوسرے سیٹھ ساہوکاروں کی طرح بخیل نہیں ہیں؟"

"میرا اصول یہ ہے کہ اصلی بچت وہی ہے جو آرام سے زندگی بسر کرنے کے بعد بچ رہے۔ جب بہت تھوڑی آمدنی تھی تب بھی میرا یہی اصول تھا۔"

"آخر یہ دولت آپ کو کہاں سے ملی؟"

"آڑھت، لین دین، رہن اور بیع سبھی کچھ تو ہے خاں صاحب! یہ سمجھ لیجئے کہ صبح سے آدھی رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ صرف کھانا کھانے اندر جاتا ہوں۔"

"آپ بجا فرماتے ہیں محنت کے بغیر کسی کام میں کامیابی نہیں ہوتی۔ آپ کو اپنے ہاتھ سے بھی بہت سا کام کرنا پڑتا ہوگا۔"

"کچھ نہیں صاحب! نوکر چاکر سب کچھ کر لیتے ہیں۔ میں تو بیٹھا نگرانی کرتا ہوں۔"

"آپ نے کئی لاکھ پیدا کیے ہوں گے؟"

"دو سوا دو لاکھ کی جائداد ہے خاں صاحب! بیس ہزار کا تو مکان ہی کھڑا ہے۔ آج بیچوں تو پچاس ہزار سے کم نہ ملیں۔"

"لیکن اصل سرمایہ وہی آپ کے تین روپے تھے؟"

"سرمایہ تو آدمی کی ساکھ ہے خاں صاحب! آج چاہوں تو کہیں سے لاکھوں کا مال منگوا سکتا ہوں۔"

"آپ کی زندگی واقعی ہمارے لیے نمونہ ہے۔"

"آپ لوگوں کی دعا سے اب تک تو آرام سے کٹ گئی ہے۔ آگے کی بھگوان جانے۔"

"اب تو اور بھی آرام سے کٹے گی کیوں کہ آپ کی ساکھ بہت بڑھ گئی ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے خاں صاحب! اپنی ساکھ تو بنانے سے بنتی ہے۔"

"یہ مال و اسباب اور جائداد آپ کے لیے فضول ہے۔ آپ اپنی ساکھ سے اپنا روزگار کر سکتے ہیں۔"

"بہت اچھی طرح خاں صاحب! یہ سب تو مایا جال ہے۔ جس میں پھنس جانے کے بعد پھر نجات نہیں ملتی۔ مر کر ہی گلا چھوٹتا ہے۔ اب دھرم شالہ بنوانے کا ارادہ ہے۔ سامان کر لیا ہے۔ کوئی اچھا مہورت دیکھ کر ہاتھ لگا دینا ہے۔ ایک لڑکا بھی گود لینا چاہتا ہوں۔ بس پھر بھگوان کا بھجن کروں گا۔"

"آپ کے کوئی اولاد ہوئی ہی نہیں؟"

"تقدیر میں نہ تھی خاں صاحب اور کیا کہوں۔ جن کے گھر میں بھونی بھانگ نہیں ان کے ہاں تو گھاس پھوس کی طرح بچے نکلتے آتے ہیں۔ جنہیں بھگوان نے کھانے کو دیا ہے وہ اولاد کے لیے ترس ترس کے رہ جاتے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں سیٹھ جی۔ آپ کی باتیں بڑی پُر مغز ہوتی ہیں۔ اگر ہم آپ کو اس مایا جال سے چھڑا دیں تو یقیناً آپ ہمارے احسان مند ہوں گے۔"

سیٹھ جی ہنسے اور بولے۔ "بھگوان کے سوا اس مایا جال سے کون چھڑا سکتا ہے' خاں صاحب؟"

ہیڈ کانسٹیبل نے سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا۔ "بھگوان کیوں چھڑانے لگے۔ آپ خود کیوں نہیں چھوٹ جاتے دولت سے۔ آپ کو کوئی فائدہ نہیں۔ اسے کیوں نہ غریبوں میں تقسیم کر دیجئے۔ بے فائدہ سینے پر بوجھ لادنے سے کیا مطلب؟"

"بھلا ایسا کہیں ہو سکتا ہے خاں صاحب! مایا جال کہیں ٹوٹ سکتا ہے؟"

"میں تو توڑنے کو تیار ہوں' اسی وقت۔"

"اسی دولت کے لیے آدمی اپنا خون پسینہ ایک کر دیتا ہے' خاں صاحب! دغا' فریب' بے ایمانی اور ظلم سب کچھ اسی کے لیے کرتا ہے۔ بغیر اپنا ضمیر بیچے دولت نہیں ملتی۔ ایسی بیش قیمت چیز کون چھوڑ سکتا ہے؟"

"لیکن آپ نے فرمایا ہے کہ صرف آپ کے اقبال کا ظہور ہے۔ آپ نے کوئی خاص محنت نہیں کی۔"

"نگرانی میں کچھ کم محنت ہے خان صاحب۔"

"آپ دن بھر دھوپ میں ٹھیلہ کھینچنا پسند کریں گے یا گدّی پر بیٹھے نگرانی کرنا؟"

"مگر سب آدمی سبھی کام تو نہیں کر سکتے؟"

"آخر یہ روپیہ آپ کے پاس آیا کہاں سے۔ آپ نے کسی آسامی کو سو روپیہ قرض دیئے ہوں گے' یقیناً

اس سے کچھ نہ کچھ سود لیا ہوگا۔ کبھی کبھی تو سود کے دو سو تین سو چار سو تک وصول کیے ہوں گے۔ آپ کے روپے نے بچے دیئے نہیں۔ آسامی کی محنت سے روپے آپ کے ہاتھ لگے۔ بسا اوقات دو چار سو روپے قرض دے کر آپ نے پورے خاندان کو اپنا غلام بنالیا ہوگا اور ان کی شبانہ روز کی محنت کی کمائی آپ کے ہاتھ لگی ہوگی۔"

سیٹھ جی نے حیرت کی نگاہ سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ تو کوئی بڑا عجیب آدمی ہے۔ خواہ مخواہ بحث کر رہا ہے۔ مانا میں نے دوسروں کی محنت سے ہی دولت کمائی۔ تو پھر جو سب کرتے ہیں وہی میں نے کیا۔ کوئی نئی بات نہیں کی۔ بولے:

"اس طرح تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ دنیا کے سبھی دولت مند مفت خور ہیں۔"

خاں صاحب نے اس کی تائید کی۔ "بیشک میں بڑے زور سے یہ دعویٰ کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سبھی سلطنتیں اسی ذیل میں آجاتی ہیں۔ فرق یہی ہے کہ آپ آسامیوں سے روپے وصول کر کے رکھ چھوڑتے ہیں۔ سرکار اس سے ملک کا انتظام کرتی ہے۔ عدالتیں اور پولیس قائم کرتی ہے کہ آپ اور آپ کے بھائی بہ اطمینان غربا کا خون چوس سکیں۔ اگر کوئی غریب سرکشی کرے اور آپ کا منہ اپنی رگ سے ہٹا دینا چاہے تو سرکار کی پولیس اور عدالت اور فوج آپ کی مدد کرے۔ دراصل آپ نے سود یا نفع یا مال گزاری کی شکل میں جو کچھ بھی پایا ہے' وہ غریبوں کی کمائی ہے۔ جو آپ نے جبراً چھین لی ہے اور جو آپ ہی کے لفظوں میں آپ کے پاس بیکار پڑی ہے۔ آپ کو مسروقہ مال گھر میں رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ آپ ان چیزوں کو پولیس کے حوالے کر کے گھر کی راہ لیجئے۔ ہم سرکاری پولیس کے سپاہی نہیں' انصاف پولیس کے سپاہی ہیں۔ ہم نے متواتر خطوط سے آپ کو آگاہ کیا۔ یہاں تک کہا کہ آپ ہمیں صرف پچیس ہزار روپے دیجئے۔ لیکن آپ سرکاری امداد کے زعم میں بیٹھے رہے۔ مجبوراً ہمیں یہ چال چلنا پڑی۔"

سیٹھ جی کا خون خشک ہو گیا۔ لیکن نہیں یہ پولیس والے ڈرا رہے ہیں اور میری بزدلانہ بدحواسی کا تماشا دیکھنا چاہتے ہیں۔ بولے:

"خاں صاحب! آپ بڑے دل لگی باز آدمی ہیں۔ لیکن سچ مچ ڈاکوؤں نے یہ چال چلی ہوتی تو اس وقت دھوکے میں آچکا ہوتا۔"

"تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ڈاکوؤں نے سچ مچ آپ کے ساتھ چال چلی ہے اور آپ دھوکے میں آگئے ہیں۔ اس میں شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہیں۔"

گاڑی رک گئی اور سیٹھ جی دھکیل کر نیچے گرا دیئے گئے اور دروازہ بند کر لیا گیا۔ موٹر آہستہ آہستہ چلی۔ سیٹھ چلاتے ہوئے موٹر کے پیچھے دوڑے۔

"حضور' سرکار' بھائیو! بالکل تباہ ہو جاؤں گا۔ رحم کیجئے۔ گھر میں ایک کوڑی بھی نہیں ہے۔ ہمارے بڑھاپے پر رحم کیجئے۔ میں خوشی سے آپ کو پچیس ہزار روپے دے دوں گا۔ آپ نے کہا ہے' آپ انصاف کی پولیس ہیں۔ یہ بے انصافی نہ کیجئے۔"

خاں صاحب نے دروازے سے سر نکال کر کہا:

"کاش! یہ پچیس ہزار آپ نے پہلے دیئے ہوتے۔ اب تو میعاد گزر چکی ہے۔ اپنے کو کتنے خطرے میں ڈال کر ہم نے یہ دولت پائی ہے۔ اس کا خیال کیجئے۔ آپ کو ذرا بھی شبہ ہو جاتا تو اس وقت ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ہوتیں اور بے بھاؤ کی پڑ رہی ہوتیں۔ اب آپ آرام سے تشریف لے جائیے۔ یہ وہ تین روپے ہیں جو آپ ساتھ

لے کر یہاں آئے تھے۔ اب جا کر پھر دولت جمع کیجئے۔ دس پانچ برس میں ہم پھر آپ کو مایا جال سے نکالیں گے۔"

موٹر تیز ہو گئی اور سیٹھ جی چیختے رہ گئے۔

"دوڑو' دوڑو' ڈاکو مجھے لوٹے لیے جا رہے ہیں۔"

لیکن وہ ساری فریاد' فریاد بہ صحرا تھی۔

غم نداری بُز بخر

اُن دنوں دودھ کی تکلیف تھی۔ کئی ڈیری فارموں کی آزمائش کی' اہیروں کا امتحان لیا' کوئی نتیجہ نہیں۔ دو چار دن تو دودھ اچھا ملتا' پھر آمیزش شروع ہو جاتی۔ کبھی شکایت ہوتی دودھ پھٹ گیا' کبھی اس میں سے ناگوار بو آنے لگتی۔ کبھی مکھن کے ریزے نکلتے۔ آخر ایک دن دوست سے کہا۔ "آؤ ساجھے میں ایک گائے لے لیں۔ تمہیں بھی دودھ کا آرام ہو گا' مجھے بھی۔ لاگت آدھی آدھی' خرچ آدھا' دودھ بھی آدھا آدھا۔ دوست صاحب راضی ہو گئے۔ میرے گھر میں جگہ نہ تھی اور گوبر وغیرہ سے مجھے نفرت ہے۔ ان کے مکان میں کافی جگہ تھی۔ اس لیے تجویز ہوئی کہ گائے انہی کے گھر رہے۔ اس کے عوض میں انہیں گوبر پر بلا شرکت غیرے اختیار ہے۔ وہ اسے کامل آزادی سے پاتھیں' اُپلے بنائیں' گھر لیپیں' پڑوسیوں کو دیں یا اسے کسی طبّی مصرف میں لائیں۔ من مقر کو اس میں کسی قسم کا اعتراض' احتجاج یا قیل و قال نہ ہو گا۔ اور من مقر بہ صحت ہوش و حواس و بہ اصابت عقل اقرار کرتا ہے کہ وہ گوبر پر کبھی دستِ تصرّف دراز نہ کرے گا اور نہ کسی کو تصرّف کے لیے آمادہ کرے گا۔

دودھ آنے لگا۔ روز بروز کی ضیق سے نجات ملی۔ ایک ہفتے تک کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی۔ گرم گرم دودھ پیتا تھا اور خوش ہو کر گاتا تھا۔

رب کا شکر ادا کر بھائی — جس نے ہماری گائے بنائی

تازہ دودھ پلایا اس نے — لطفِ حیات چکھایا اس نے

دودھ میں بھیگی روٹی میری — اس کے کرم نے بخشی سیری

خدا کی رحمت کی ہے مورت — کیسی بھولی بھالی صورت

مگر رفتہ رفتہ یہاں بھی پرانی شکایتیں پیدا ہونے لگیں۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ دودھ صرف نام کا رہ گیا۔ کتنا ہی ابالو' نہ کہیں ملائی کا پتہ نہ مٹھاس کا۔ پہلے تو شکایت کیا کرتا تھا اس سے دل کا بخار نکل جاتا تھا۔ شکایت سے اصلاح نہ ہوتی تو دودھ بند کر دیتا تھا۔ اب تو شکایت کا بھی موقع نہ تھا۔ بند کر دینے کا تو ذکر کیا۔ قہر درویش بر جان درویش۔ پیو یا نالی میں ڈال دو۔ آٹھ روز کا نوشتۂ قسمت تھا۔ بچہ دودھ کو منہ نہ لگاتا' پینا تو دور رہا۔ آدھوں آدھ شکر ڈال کر کچھ دنوں دودھ پلایا تو پھوڑے نکلنے شروع ہوئے۔ اور میرے گھر میں روز بم چیخ مچی رہتی تھی۔ بیوی نوکر سے فرماتیں دودھ لے جا کر انہیں کے سر پٹک آ۔ میں نوکر کو منع کرتا۔ وہ کہتیں "اچھے دوست ہیں تمہارے' اسے شرم

نہیں آتی۔ کیا اتنا احمق ہے کہ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ دودھ دیکھ کر کیا کہیں گے۔ گائے کو اپنے گھر منگوالو۔ بلا سے بدبو آئے گی، مچھر ہوں گے۔ دودھ تو اچھا ملے گا۔ روپے خرچے ہیں تو اس کی لذت تو ملے گی۔"

چڈھا صاحب میرے پرانے مہربان ہیں۔ خاصی بے تکلفی ہے ان سے۔ یہ حرکت ان کے علم میں ہوتی ہو، اسے قیاس باور نہیں کرتا۔ یا تو ان کی بیوی کی شرارت ہے یا نوکر کی۔ لیکن ذکر کیسے کروں اور پھر ان کی بیوی سے راہ و رسم ہے۔ کئی بار میرے گھر آچکی ہیں۔ میری دیوی جی بھی ان کے ہاں کئی بار مہمان جا چکی ہیں۔ کیا وہ یکایک اتنی بے وقوف ہو جائیں گی۔ صریح آنکھوں میں دھول جھونکیں گی اور پھر چاہے کسی کی شرارت ہو، میرے لیے یہ غیر ممکن تھا کہ ان سے دودھ کی خرابی کی شکایت کرتا۔ خیریت یہ ہوئی کہ تیسرے مہینے چڈھا کا تبادلہ ہو گیا۔ میں تنہا گائے نہ رکھ سکتا تھا۔ ساجھا ٹوٹ گیا۔ گائے آدھے داموں میں بیچ دی گئی۔ میں نے اس دن اطمینان کا سانس لیا۔

آخر یہ صلاح ہوئی کہ ایک بکری رکھ لی جائے۔ وہ بیچ آنگن کے ایک گوشے میں پڑی رہ سکتی ہے۔ اسے رکھنے کے لیے نہ گوالے کی ضرورت، نہ اس کا گوبر اٹھانے، ناند دھونے، چارہ بھوسا ڈالنے کے لیے کسی اہیرن کی ضرورت۔ بکری تو میرا ملازم بھی آسانی سے دوہ لے گا۔ تھوڑی سی چوکر ڈال دی، چلئے قصہ تمام ہوا۔ پھر بکری کا دودھ مفید بھی زیادہ ہے۔ بچوں کے لیے خاص طور پر زود ہضم، معتدل، صحت بخش۔ حسنِ اتفاق سے میرے یہاں جو پنڈت جی میرے مسودے نقل کرنے آیا کرتے تھے ان معاملات میں کافی تجربہ کار تھے۔ ان سے ذکر آیا تو انہوں نے ایک بکری کی ایسی قصیدہ خوانی کی کہ میں اس کا نادیدہ عاشق ہو گیا۔ پچھائیں نسل کی بکری ہے۔ اونچے قد کی، بڑے بڑے تھن جو زمین سے لگتے چلتے ہیں۔ بے حد کم خور، لیکن بے حد دودھار، ایک وقت میں دو ڈھائی سیر دودھ لے لیجیے۔ ابھی پہلی مرتبہ ہی بیاہی ہے۔ پچیس روپے میں آ جائے گی۔ مجھے دام کچھ زیادہ معلوم ہوئے لیکن پنڈت جی پر مجھے اعتبار تھا۔ فرمائش کر دی گئی اور تیسرے دن بکری آ پہنچی۔ میں دیکھ کر اچھل پڑا۔ جو اوصاف بیان کیے گئے ان سے کچھ زیادہ ہی نکلے۔ ایک چھوٹی سی مٹی کی ناند منگوائی گئی۔ چوکر کا بھی انتظام ہو گیا۔ شام کو میرے خدمت گار نے دودھ نکالا تو سچ مچ ڈھائی سیر۔ میری چھوٹی پتیلی لبریز ہو گئی تھی۔ اب موسلوں ڈھول بجائیں گے۔ یہ مسئلہ اتنے دنوں کے بعد جا کے کہیں حل ہوا ہے۔ پہلے ہی یہ بات سوجھتی تو کیوں اتنی پریشانی ہوتی۔ پنڈت جی کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ مجھے علی الصبح اور شام کو سینگ پکڑنے پڑتے تھے۔ تب آدمی دودھ پاتا تھا۔ لیکن یہ تکلیف اس دودھ کے مقابلے میں کچھ نہ تھی۔ بکری کیا ہے کام دھین ہے۔ بیوی نے سوچا اسے کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اس لیے اس کے تھن کے لیے ایک غلاف تیار ہوا۔ اس کی گردن میں چینی کے نیلے دانوں کی ایک مالا پہنائی گئی۔ گھر میں جو کچھ جھوٹا بچتا دیوی جی خود جا کر اسے کھلا آتی تھیں۔

لیکن ایک ہی ہفتے میں دودھ کی مقدار کم ہونے لگی، ضرور نظر لگ گئی۔ بات کیا ہے۔ پنڈت جی سے حال کہا تو انہوں نے کہا۔ "صاحب دیہات کی بکری ہے زمیندار کی۔ بے دریغ اناج کھاتی تھی اور سارا دن باغ میں گھوما چرا کرتی تھی۔ یہاں بندھے بندھے دودھ کم ہو جائے تو تعجب نہیں۔ اسے ذرا ٹہلا دیا کیجئے۔"

لیکن شہر میں بکری کو ٹہلائے کون اور کہاں؟ اس لیے یہ طے ہوا کہ مضافات میں مکان لیا جائے، وہاں بستی سے ذرا نکل کر کھیت اور باغ ہوں گے۔ کہار گھنٹے دو گھنٹے ٹہلا دیا کرے گا۔ جھٹ پٹ مکان تبدیل کیا اور ہر چند مجھے دفتر آنے جانے میں تین میل کا فاصلہ طے کرنا پڑتا لیکن اچھا دودھ ملے تو میں اس سے دوگنا فاصلہ طے کرنے کو تیار تھا۔ یہاں مکان کشادہ تھا۔ مکان کے سامنے صحن تھا۔ ذرا اور بڑھ کر آم اور مہوے وغیرہ کا باغ۔ باغ سے نکلئے تو

کاچھیوں کے کھیت تھے۔ کسی میں آلو، کسی میں گوبھی۔ ایک کاچھی سے طے کر لیا کہ روزانہ بکری کے لیے کچھ ہریالی دے جایا کرے۔ مگر اتنی کوشش کرنے پر بھی دودھ کی مقدار میں کوئی خاص بیشی نہ ہوئی۔ ڈھائی سیر کی جگہ مشکل سے سیر بھر دودھ نکلتا تھا۔ لیکن یہ تسکین تھی دودھ خالص ہے، یہی کیا کم ہے۔

میں یہ کبھی نہیں مان سکتا کہ خدمت گاری کے مقابلے میں بکری چرانا زیادہ ذلیل کام ہے۔ ہمارے دیوتاؤں اور نبیوں کا معزز طبقہ گلہ بانی کیا کرتا تھا۔ کرشن جی گائیں چراتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اس گلّے میں بکریاں نہ رہی ہوں گی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں ہی بھیڑیں چراتے تھے۔ لیکن انسان روایات کا غلام ہے، جو بزرگوں نے نہیں کیا اسے وہ کیسے کرے۔ نئے راستے پر چلنے کے لیے جس عزم اور پختہ یقین کی ضرورت ہے، وہ ہر ایک میں تو ہوتا نہیں۔ دھوبی آپ کے غلیظ کپڑے دھودے گا، لیکن آپ کے دروازے پر جھاڑو لگانے میں اپنی ہتک سمجھتا ہے۔ جرائم پیشہ اقوام کے فرد بازار سے کوئی چیز قیمتاً خریدنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ میرے خدمت گار کو بکری لے کر باغ میں جانا برا معلوم ہوتا ہے۔ گھر سے تو لے جاتا لیکن باغ میں اسے چھوڑ کر خود کسی درخت کے نیچے سو جاتا۔ بکری پتیاں چر لیتی تھی مگر ایک دن اس کے جی میں آیا کہ ذرا باغ سے نکل کر کھیتوں کی سیر کریں۔ یوں تو بہت ہی شستہ مزاج اور وضع دار بکری تھی۔ اس کی صورت سے متانت اور تحمل جھلکتا تھا۔ لیکن باغ اور کھیت میں اسے یکساں آزادی نہیں ہے۔ اسے وہ شاید نہ سمجھ سکی اور اس روز کسی کھیت میں گھس گئی اور گوبھی کی کیاریاں صاف کر گئی۔ کاچھی نے دیکھا تو اس کے کان پکڑ لیے اور میرے پاس آکر بولا۔ "بابو جی اس طرح آپ کی بکری ہمارے کھیت چرے گی تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ آپ کو بکری رکھنے کا شوق ہے تو اسے باندھ کر رکھئے۔ آج تو ہم نے تمہارا لحاظ کر لیا لیکن پھر ہمارے کھیت میں گئی تو ہم تو اس کی ٹانگ توڑ دیں گے یا کانجی ہوس بھیج دیں گے۔" ابھی وہ اپنی تقریر ختم نہ کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی آ پہنچی اور اس نے اسی خیال کو زیادہ پُر درد الفاظ میں ادا کیا۔ "ہاں ہاں کرتی ہی رہی مگر رانڈ کھیت میں گھس گئی اور سارا کھیت چوپٹ کر دیا۔ اس کے پیٹ میں بھوائی بیٹھیں۔ یہاں کوئی تمہارا دبیل نہیں ہے۔ حاکم ہو گے تو اپنے گھر کے ہو گے۔ بکری رکھنا ہے تو باندھ کر رکھو نہیں تو گلا اینٹھ دوں گی۔"

میں بھیگی بلی بنا ہوا کھڑا تھا۔ جتنی پھٹکار آج سہنی پڑی اتنی زندگی میں کبھی نہ سہی تھی اور جس تحمل سے آج کام لیا تھا اگر اس سے دوسرے موقعوں پر کام لیا ہوتا تو آج آدمی ہوتا۔ کوئی جواب ہی نہ سوجھتا تھا۔ بس یہی چاہتا تھا کہ بکری کا گلا گھونٹ دوں اور خدمت گار کو ڈیڑھ سو ہنٹر جماؤں۔ میری خاموشی سے وہ خاتون اور بھی شیر ہوئی جاتی تھی۔ آج مجھے معلوم ہوا کہ بعض موقعوں پر خموشی مضر ثابت ہوتی ہے۔ بارے میری اہلیہ نے گھر میں یہ غل غپاڑہ سنا تو دروازے پر آ گئیں اور ہیکڑی سے بولیں۔ "تو کانجی ہوس پہنچا دے اور کیا کرے گی۔ ناحق بڑبڑ کر رہی ہے گھنٹے بھر سے۔ جانور ہی ہے ایک دن کھل گئی تو کیا اس کی جان لے لے گی۔ خبردار! جو اب ایک بات بھی منہ سے نکالی ہو گی۔ کیوں نہیں کھیت کے چاروں طرف جھاڑ لگا دیتی۔ کانٹوں سے روندھ دے۔ اپنی غلطی تو مانتی نہیں اوپر سے لڑنے آئی ہے۔ ابھی پولیس کو اطلاع کر دیں تو بندھے بندھے پھرو۔"

اس تحکمانہ اندازِ بیان نے ان دونوں کو ٹھنڈا کر دیا۔ لیکن ان دونوں کے چلے جانے کے بعد میں نے دیوی جی کی خوب خبر لی۔ "غریبوں کا نقصان بھی کرتی ہو اوپر سے رعب جماتی ہو۔ اسی کا نام انصاف ہے؟" دیوی جی نے اندازِ تفاخر سے جواب دیا۔ "میرا احسان تو نہ مانو گے کہ شیطان کو کتنی آسانی سے دفع کر دیا لگے الٹے ڈانٹنے۔ گنواروں

کو راہ پر لانے کا سختی کے سوا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔ شرافت یا فیاضی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اسے یہ لوگ کمزوری سمجھتے ہیں اور کمزور کو کون نہیں دبانا چاہتا؟''

خدمت گار سے جواب طلب کیا تو اس نے صاف کہہ دیا۔ ''صاحب بکری چرانا میرا کام نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''تم سے بکری چرانے کو کون کہتا ہے۔ ذرا اسے دیکھتے رہا کرو کہ کسی کے کھیت میں نہ جائے۔ اتنا بھی تم سے نہیں ہو سکتا؟''

''میں بکری نہیں چرا سکتا صاحب۔ کوئی دوسرا آدمی رکھ لیجئے۔''

''آخر میں نے خود شام کو باغ میں چرالانے کا فیصلہ کیا۔ اتنے ذرا سے کام کے لیے ایک نیا آدمی رکھنا میری حیثیت سے باہر تھا اور اپنے خدمت گار کو جواب دینا نہیں چاہتا۔ جس نے کئی سال تک وفاداری سے میری خدمت کی تھی اور ایماندار تھا۔ دوسرے دن میں دفتر سے ذرا جلد چلا آیا اور جھٹ پٹ بکری کو لے کر باغ میں جا پہنچا۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ درختوں کے نیچے سوکھی پتیاں گری ہوئی تھیں۔ بکری پتیوں پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ گویا مہینوں کی بھوکی ہو رہی تھی۔ ابھی اس درخت کے نیچے تھی کہ پل میں وہ جا پہنچی۔ میری دلیل ہو رہی تھی کہ اس کے پیچھے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔ دفتر سے لوٹ کر ذرا آرام کیا کرتا تھا۔ آج یہ قواعد کرنا پڑی تھک گیا۔ محنت سپھل ہو گئی۔ آج بکری نے کچھ زیادہ دودھ دیا۔

یہ خیال آیا اگر سوکھی پتیاں کھانے سے دودھ کی مقدار بڑھ گئی تو یقیناً ہری ہری پتیاں کھلائی جائیں تو اس سے کہیں بہتر نتیجہ نکلے۔ لیکن ہری پتیاں آئیں کہاں سے۔ درختوں سے توڑوں تو باغ کا مالک ضرور اعتراض کرے گا۔ قیمتاً ہری پتیاں مل نہ سکتیں تھیں۔ سوچا کیوں نہ ایک بار بانس کے لگے سے پتیاں توڑیں۔ مالک نے شور مچایا تو اس سے منتیں کر لیں گے۔ راضی ہو گیا تو خیر، نہیں دیکھی جائے گی۔ تھوڑی پتیاں توڑ لینے سے درخت کا کیا بگڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پڑوسی سے ایک پتلا لمبا بانس مانگ لایا۔ اس میں آنکس باندھا اور شام کو بکری کو ساتھ لے کر پتیاں توڑنے لگا۔ چور آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتا جاتا کہیں مالک تو نہیں آ رہا ہے۔ دفعتاً وہی کاچھی ایک طرف سے نکلا اور مجھے پتیاں توڑتے دیکھ کر بولا۔ ''یہ کیا کرتے ہو بابو جی؟ آپ کے ہاتھ میں یہ لگا اچھا نہیں لگتا۔ بکری پالنا ہم غریبوں کا کام ہے کہ آپ جیسے شریفوں کا۔'' میں کٹ گیا کچھ جواب نہ سوجھا۔ اس میں کیا برائی ہے۔ اپنے ہاتھ سے اپنا کام کرنے میں کیا شرم ہے وغیرہ جوابات ہلکے، بے حقیقت، مصنوعی معلوم ہوئے۔ سفید پوشانہ خودداری نے زبان بند کر دی۔ کاچھی نے قریب آ کر میرے ہاتھ سے لگا لے لیا اور آن واحد میں ہری پتیوں کا ڈھیر لگا دیا اور پوچھا۔ ''پتیاں کہاں رکھ آؤں؟''

میں نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ''تم رہنے دو میں اٹھا لے جاؤں گا۔''

اس نے تھوڑی سی پتیاں بغل میں اٹھا لیں اور بولا۔ ''آپ کیا پتیاں رکھنے جائیں گے۔ چلئے میں رکھ آؤں۔''

میں نے برآمدے میں پتیاں رکھوا دیں۔ اسی درخت کے نیچے اس سے چوگنی پتیاں پڑی ہوئی تھیں۔ کاچھی نے ایک گٹھا بنایا اور سر پر لاد کر چلا گیا۔ اب معلوم ہوا یہ دہقان کتنے چالاک ہوتے ہیں۔ کوئی بات مطلب سے خالی نہیں۔

مگر دوسرے دن بکری کو باغ میں لے جانا میرے لیے دشوار ہو گیا۔ کاچھی پھر دیکھے گا۔ نہ جانے کیا کیا فقرے چست کرے گا۔ اس کی نظروں میں گر جانا رُوسیاہ ہو جانے سے کم شرمناک نہ تھا۔ ہماری عزت اور توقیر کا جو معیار عوام نے قائم کر رکھا ہے۔ ہم کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ نکوّبن کر رہے تو کیا رہے۔

لیکن بکری اتنی آسانی سے آزادانہ چہل قدمی سے دستبردار ہونا نہ چاہتی تھی جسے اس نے اپنا معمول سمجھنا

شروع کر دیا تھا۔ شام ہوتے ہی اس نے اتنے زور شور سے صدائے احتجاج بلند کی کہ گھر میں بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ گنگری دار میَں میَں کی آوازیں آ آ کر کان کے پردوں کو مجروح کرنے لگیں۔ کہاں بھاگ جاؤں؟ بیوی نے اُسے گالیاں دینا شروع کیں۔ میں نے غصے میں آ کر کئی ڈنڈے رسید کیے، مگر اس نے ستیاگرہ ملتوی کرنا تھا نہ کیا۔ عجیب عذاب میں جان تھی۔

آخر مجبور ہو گیا۔ خود کردہ را علاجے نیست۔ آٹھ بجے رات' جاڑوں کے دن گھر سے باہر منہ نکالنا مشکل اور میں بکری کو باغ میں ٹہلا رہا تھا اور اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ اندھیرے میں پاؤں رکھتے میری روح کانپتی ہے۔ ایک بار میرے سامنے سے ایک سانپ نکل گیا تھا۔ اگر اس کے اوپر پیر پڑ جاتا تو ضرور کاٹ لیتا۔ تب سے میں اندھیرے میں کبھی نہ نکلتا تھا۔ مگر آج اس بکری کے کارن مجھے اس خطرے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ذرا بھی ہوا چلتی اور پتے کھڑکتے تو میری آنتیں سکڑ جاتیں اور پنڈلیاں کانپنے لگتی۔ شاید اُس جنم میں بکری رہا ہوں گا اور یہ بکری میری آقا رہی ہو گی، وہی کفارہ اِس زندگی میں ادا کر رہا تھا۔ برا ہو اس پنڈت کا، جس نے یہ بلا میرے سر منڈھی۔ گرہستی ہی جنجال ہے۔ بچہ نہ ہوتا تو کیوں اس موذی جانور کی اتنی خوشامد کرنی پڑتی اور یہ بچہ بڑا ہو جائے گا تو بات نہ سنے گا۔ کہے گا آپ نے میرے لیے کیا کیا ہے۔ کون سی جائداد چھوڑی ہے۔ یہ سزا بھگت کر نو بجے رات کو لوٹا۔ اگر رات کو بکری مر جاتی تو مجھے مطلق غم نہ ہوتا۔

دوسرے دن صبح ہی سے مجھے یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ کس طرح رات کو بیگار سے چھٹی ملے۔ آج دفتر میں تعطیل تھی۔ میں نے ایک لمبی رسی منگوائی اور شام کو بکری کے گلے میں ڈال کر ایک درخت کی جڑ سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ اب چرے جتنا چاہے۔ اب چراغ جلتے جلتے کھول لاؤں گا۔ تعطیل تھی ہی، شام کو سینما دیکھنے کی ٹھہری۔ ایک اچھا سا کھیل آیا ہوا تھا۔ نوکر کو بھی ساتھ لیا ورنہ بچے کو کون سنبھالتا۔ جب نو بجے رات کو گھر لوٹے اور میں لالٹین لے کر بکری لینے گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ اس نے رسی کو دو تین درختوں میں لپیٹ کر ایسا الجھا ڈالا کہ سلجھنا مشکل ہے۔ اتنی رسی بھی نہ بچی تھی کہ وہ ایک قدم بھی چل سکتی۔ لاحول ولا قوۃ، جی میں آیا کمبخت کو یہیں چھوڑ دوں۔ مرتی ہے تو مر جائے۔ اب اتنی رات کو لالٹین کی روشنی میں کون رسی سلجھانے بیٹھے۔ لیکن دل نہ مانا۔ پہلے اس کی گردن سے رسی کھولی پھر اس کے پیچ در پیچ اینٹھن چھڑائی۔ ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ مارے سردی کے ہاتھ ٹھٹھرے جاتے تھے اور جی جل رہا تھا وہ الگ۔ یہ ترکیب اور بھی تکلیف دہ ثابت ہوئی۔

اب کیا کروں! کچھ عقل کام نہیں کرتی تھی۔ دودھ کا خیال نہ ہوتا تو کسی کو مفت دے دیتا۔ شام ہوتے ہی چڑیل صدائے بے ہنگام شروع کر دے گی اور گھر میں رہنا مشکل ہو جائے گا اور آواز بھی کتنی کریہہ اور منحوس ہوتی ہے۔ شاستروں میں لکھا بھی ہے، جتنی دور اس کی آواز جاتی ہے اتنی دور دیوتا نہیں آتے۔ سورگ کی بسنے والی ہستیاں جو اپسراؤں کے نغمے سننے کی عادی ہیں، اس کی مکروہ آواز سے نفرت کریں تو کیا تعجب۔ مجھ پر اس کی سمع خراش صداؤں کی ایسی ہیبت سوار تھی کہ دوسرے دن دفتر سے آتے ہی میں گھر سے نکل بھاگا۔ لیکن ایک میل نکل جانے پر بھی ایسا گمان ہو رہا تھا کہ اس کی آواز میرا پیچھا کیے چلی آتی ہے۔ اپنی تنگ ظرفی پر شرم بھی آ رہی تھی جسے ایک بکری رکھنے کی بھی توفیق نہ ہو وہ اتنا نازک دماغ کیوں بنے اور پھر تم ساری رات کو گھر سے باہر رہو گے نہیں، آٹھ بجے پہنچو گے تو کیا وہ گوسفندانہ نغمہ تمہارا خیر مقدم نہ کرے گا۔

دفعتہً ایک نیچی شاخوں والا درخت دیکھ کر مجھے بے اختیار اس پر چڑھنے کی تحریک ہوئی۔ سپاٹ تنوں پر چڑھنا مشکل ہوتا ہے۔ یہاں تو چھ سات فٹ کی اونچائی پر شاخیں پھوٹ گئی تھیں۔ ہری ہری پتیوں سے درخت لدا کھڑا تھا اور

درخت بھی تھا گولر کا، جس کی پتیوں سے بکریوں کو خاص رغبت ہے۔ میں ادھر تیس سال سے کسی رُوکھ پر نہیں چڑھا۔ وہ عادت جاتی رہی۔ اس لیے آسان چڑھائی کے باوجود میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ پر میں نے ہمت نہ ہاری اور پتیاں توڑ توڑ کر نیچے گرانے لگا۔ یہاں اکیلے میں کون مجھے دیکھتا ہے کہ پتیاں توڑ رہا ہوں۔ ابھی اندھیرا ہو جاتا ہے۔ پتیوں کا ایک گٹھر بغل میں دباؤں گا اور گھر جا پہنچوں گا۔ اگر اتنے پر بھی بکری نے کچھ چیں چپڑ کی تو اس کی شامت ہی آ جائے گی۔

میں ابھی اوپر ہی تھا کہ بکریوں اور بھیڑوں کا ایک غول نہ جانے کدھر سے آنکلا اور پتیوں پر پل پڑا۔ میں اوپر سے چیخ رہا ہوں مگر کون سنتا ہے۔ چرواہے کا کہیں پتہ نہیں۔ کہیں دبک رہا ہوگا کہ دیکھ لیا جاؤں گا تو گالیاں پڑیں گی۔ جھلا کر نیچے اترنے لگا۔ ایک پل میں پتیاں غائب ہوتی جاتی تھیں۔ اتر کر ایک ایک کی ٹانگ توڑ دوں۔

یکا یک پاؤں پھسلا اور دس فٹ کی اونچائی سے نیچے آ رہا۔ کمر میں ایک ایسی چوٹ آئی کہ پانچ منٹ تک آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ خیریت ہوئی کہ اور اوپر سے نہیں گرا نہیں تو شہید ہو جاتا۔ بارے میرے گرنے کے دھماکے سے بکریاں بھاگیں اور تھوڑی سی پتیاں بچ رہیں۔ جب ذرا ہوش بجا ہوئے تو میں نے ان پتیوں کو جمع کر کے ایک گٹھا بنایا اور مزدوروں کی طرح اسے کندھے پر رکھ کر شرم کے مارے چھپائے گھر چلا کہ راستے میں کوئی حادثہ نہ ہو۔ جب مکان چار فرلانگ رہ گیا اور میں نے قدم تیز کیے کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے تو وہ کاچھی سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ کچھ نہ پوچھو اس وقت میری کیا حالت ہوئی۔ راستے کے دونوں طرف کھیتوں کی اونچی مینڈھیں تھیں، جن کے اوپر ناگ پھنی کے کانٹے لگے ہوئے تھے۔ اگر رستے رستے جاتا ہوں تو وہ ظالم میری بغل سے ہو کر گزرے گا اور خدا کو معلوم کیا ستم ڈھائے۔ کہیں مُڑنے کا راستہ نہیں اور وہ مردود بلائے بے درماں کی طرح چلا آتا تھا۔ میں نے دھوتی اوپر سرکائی اور چال بدلی اور سر جھکا کر اس طرح نکل جانا چاہتا تھا کہ کوئی مزدور ہے۔ تلے کی سانس تلے اور اوپر کی اوپر جیسے وہ کاچھی کوئی خونخوار شیر ہو۔ بار بار خدا کو یاد کر رہا تھا، یا الٰہی تو ہی آفت زدوں کا والی و مددگار ہے۔ اس مردود کی زبان بند کر دے۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کا نور غائب کر دے — آہ! وہ جان گسل لمحہ جب میں اس کے برابر ایک گز کے فاصلے سے نکلا۔ ایک ایک قدم تلوار کی دھار پر پڑ رہا تھا کہ شیطانی آواز کان میں آئی۔ "کون ہے رے؟ کہاں سے پتیاں توڑے لاتا ہے؟" مجھے معلوم ہوا کہ نیچے کی زمین نکل گئی ہے اور میں اس کے گہرے شکم میں جا پہنچا ہوں۔ روئیں برچھائیں بنے ہوئے تھے۔ دماغ میں ابال سا آ رہا تھا۔ اعضاء مفلوج ہو رہے تھے۔ جواب دینے کا ہوش نہ رہا۔ تیزی سے دو تین قدم آگے بڑھ گیا۔ مگر وہ ارادی فعل نہ تھا۔ حفظِ جان کا اضطراری عمل تھا۔ ایک ظالم ہاتھ گٹھے پر پڑا اور گٹھا نیچے گر پڑا۔ پھر مجھے یاد نہیں کیا ہوا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے دروازے پر پسینے میں کھڑا تھا۔ گویا مرگی کے دورے کے بعد اٹھا ہوں۔ اس وقفے میں روح پر شعورِ ثانی کی حکومت تھی اور بکری کی وہ مکروہ آواز، وہ دل خراش آواز وہ ہمت شکن آواز، وہ دنیا کی ساری نحوستوں کا خلاصہ، وہ دنیا کی ساری لعنتوں کی روح کان میں چبھی جا رہی تھی۔

بیوی نے پوچھا۔ "آج کہاں چلے گئے تھے۔ اس چڑیل کو ذرا باغ میں بھی نہ لے گئے۔ جینا محال کیے دیتی ہے، گھر سے نکل کر کہاں چلی جاؤں۔"

میں نے تشفی دی۔ "آج چلا لینے دو کل سب سے پہلا یہ کام کروں گا کہ اسے گھر سے نکال باہر کروں۔ چاہے قصاب ہی کو دینا پڑے۔"

"اور لوگ نہ جانے کیسے بکریاں پالتے ہیں؟"

"بکری پالنے کے لیے کتّے کا دماغ چاہیے۔"

صبح کو بستر سے اٹھ کر اسی فکر میں بیٹھا تھا کہ اسی کالی بلا سے کیونکر نجات حاصل کروں کہ دفعتہً ایک گڈریا بکریوں کا ایک گلّہ چراتا ہوا آ نکلا۔ میں نے اسے پکارا اور اس سے اپنی بکری چرانے کی تجویز پیش کی۔ گڈریا راضی ہو گیا۔ یہی اس کا کام تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا لو گے؟''

''آٹھ آنے بکری ملتے ہیں ہجور۔''

''میں ایک روپیہ دوں گا لیکن بکری میرے سامنے نہ آئے۔''

گڈریا حیرت میں رہ گیا۔ ''مرکھنی ہے کیا بابو جی؟''

''نہیں نہیں بہت سیدھی ہے۔ بکری کیا مارے گی لیکن میں اس کی صورت نہیں دیکھنی چاہتا۔''

''ابھی تو دودھ دیتی ہے۔''

''ہاں سیر سوا سیر دودھ دیتی ہے۔''

''دودھ آپ کے گھر پہنچ جایا کرے گا۔''

''تمہاری مہربانی۔''

''جس وقت سے بکری گھر سے نکلی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میری نحوست نکلی جا رہی ہے۔ بکری بھی خوش تھی گویا قید سے چھوٹی ہو۔''

گڈریے نے اسی وقت دودھ نکالا اور گھر میں رکھ کر بکری کو لے کر چلا گیا۔ ایسا بے غرض گاہک اسے زندگی میں شاید پہلی بار ملا ہو گا۔

ایک ہفتے تک تو دودھ تھوڑا بہت آتا رہا۔ پھر اس کی مقدار کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ ایک مہینہ ختم ہوتے ہوتے دودھ بالکل بند ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ بکری گابھن ہو گئی ہے۔ میں نے ذرا بھی اعتراض نہ کیا۔ کاچھی کے پاس گائے تھی' اس سے دودھ لینے لگا۔ میرا نوکر خود جا کر دودھ دوہ لاتا تھا۔

کئی مہینے گزر گئے۔ گڈریا مہینے میں ایک بار آ کر اپنا روپیہ لے جاتا۔ میں نے کبھی اس سے بکری کا ذکر نہ کیا۔ اسکے خیال ہی سے میری روح کو وحشت ہوتی۔ وہ اگر قیافہ شناس ہوتا تو بڑی آسانی سے اپنا حق الخدمت دوگنا کر سکتا تھا۔

ایک دن میں دروازے پر بیٹھا ہوا تھا کہ گڈریا اپنی بکریوں کا گلّہ لیے آ نکلا۔ میں اس کا روپیہ لانے اندر گیا کہ کیا دیکھتا ہوں میری بکری دو بچوں کے ساتھ مکان میں آ پہنچی۔ وہ پہلے سیدھی اس جگہ گئی جہاں بندھا کرتی تھی۔ پھر وہاں سے آنگن میں آئی اور شاید تعارف کے اظہار کے لیے میری بیوی کی طرف تاکنے لگی۔ انہوں نے دوڑ کر ایک بچے کو گود میں لے لیا اور کوٹھڑی میں جا کر مہینوں کا جمع چوکر نکال لائیں۔ اور ایسی محبت سے بکری کو کھلانے لگیں گویا بہت دنوں کی بچھڑی ہوئی سہیلی آ گئی ہو۔ نہ وہ پرانی تلخی تھی' نہ وہ کدورت۔ کبھی بچے کو چمکارتی تھیں' کبھی بکری کو سہلاتی تھیں اور بکری ڈاک کی رفتار سے چوکر اڑا رہی تھی۔

تب مجھ سے بولیں۔ ''کتنے خوب صورت بچے ہیں؟''

''ہاں بہت خوب صورت ہیں۔''

''جی چاہتا ہے کہ ایک پال لوں۔''

''ابھی طبیعت سیر نہیں ہوئی۔''

''تم بڑے نرموہئے ہو۔''

چو کر ختم ہو گیا۔ بکری اطمینان سے رخصت ہو گئی۔ دونوں بچے بھی اس کے پیچھے پھدکتے ہوئے چلے گئے۔ دیوی آنکھ میں آنسو بھرے یہ تماشا دیکھتی رہیں۔

گڈریے نے چلم بھری اور گھر میں آگ مانگنے آیا۔ چلتے وقت بولا:

"کل سے دودھ پہنچادیا کروں گا' مالک۔"

دیوی جی نے کہا۔ "اور دونوں بچے کیا پئیں گے؟"

"بچے کہاں تک پئیں گے بہو جی۔ دو سیر دودھ دیتی ہے۔ ابھی دودھ اچھا نہ ہوتا تھا اس مارے نہیں لایا۔"

مجھے رات کا وہ روح شکن واقعہ یاد آ گیا۔

میں نے کہا۔ "دودھ لاؤ نہ لاؤ تمہاری خوشی۔ لیکن بکری کو ادھر نہ لانا۔"

اس دن سے پھر نہ وہ گڈریا نظر آیا اور نہ وہ بکری۔ اور نہ میں نے سراغ لگانے کی کوشش کی۔ لیکن دیوی جی اس کے بچوں کو یاد کر کے کبھی کبھی آنسو بہا لیتی ہیں۔

مفت کرم داشتن

ان دنوں حسنِ اتفاق سے حاکمِ ضلع ایک صاحبِ ذوق بزرگ تھے' جنھوں نے تاریخ اور قدیم سکّہ جات میں اچھی تفتیش کی ہے۔ خدا جانے کیسے دفتری کاموں سے انہیں ان مشاغل کے لیے فرصت مل جاتی ہے۔ میں نے ان کے کارنامے پڑھے تھے اور ان کا غائبانہ مداح تھا۔ لیکن ان کی افسری مزید تعلقات میں مانع تھی۔ مجھے یہ تکلف تھا کہ اگر میری جانب سے پیش قدمی ہوئی تو عام تجربے کے مطابق وہ میری حکام جوئی پر محمول کی جائے گی اور میں کسی حالت میں بھی یہ الزام اپنے سر پر نہیں لینا چاہتا تھا۔ میں حکام کو دعوتوں اور عام تقریبوں میں مدعو کرنے کا بھی مخالف ہوں۔ اور جب کبھی سنتا ہوں کہ کسی افسر کو رفاہِ عام کے جلسے کا صدر بنایا گیا یا کوئی اسکول یا شفاخانہ یا بدھوا آشرم کسی گورنر کے نام سے منسوب ہوا تو برادرانِ وطن کی غلامانہ ذہنیت پر گھنٹوں افسوس کرتا ہوں۔ مگر جب ایک دن حاکمِ ضلع نے خود میرے نام ایک رقعہ بھیجا کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرے بنگلے پر تشریف لانے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ کیا جواب دوں۔ اپنے دو ایک دوستوں سے مشورہ لیا۔ انہوں نے کہا صاف کہہ دیجئے مجھے فرصت نہیں۔ وہ حاکمِ ضلع ہوں گے تو اپنے گھر کے ہوں گے۔ کوئی سرکاری یا ضابطے کا کام ہوتا تو آپ کا جانا مناسب تھا۔ لیکن ذاتی ملاقات کے لیے آپ کا جانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ آخر وہ خود آپ کے مکان پر کیوں نہیں آئے۔ اس سے کیا ان کی شان میں بٹّہ لگ جاتا تھا۔ اسی لیے تو خود نہیں آئے اور آپ کو بلایا کہ وہ حاکمِ ضلع ہیں۔ ان احمق ہندوستانیوں کو بھی یہ سمجھ نہ آئے گی کہ دفتر کے باہر وہ بھی ویسے ہی انسان ہیں جیسے ہم آپ۔ شاید یہ لوگ اپنی بیوی سے بھی افسری جتاتے ہوں گے۔ انہیں اپنا عہدہ کبھی نہیں بھولتا۔

ایک صاحب نے جو لطیفوں کے خزانچی ہیں' ہندوستانی افسروں کے کئی پُر مذاق تذکرے سنائے۔ ایک افسر

صاحب سسرال گئے۔ شاید بیوی کو رخصت کرانا تھا۔ جیسا عام رواج ہے۔ خسر صاحب نے اس موقع پر رخصت کرنے سے انکار کیا' کہا۔ "بیٹا! ابھی اتنے دنوں کے بعد آئی ہے تین مہینے بھی نہیں ہوئے بھلا اور نہیں تو چھ مہینے تو رہنے دو۔" ادھر بیوی نے بھی نائن کے ذریعے پیغام کہلا بھیجا "ابھی میں جانا نہیں چاہتی' آخر ماں باپ سے مجھے بھی تو محبت ہے۔ کچھ تمہارے ہاتھ بک تھوڑے ہی گئی ہوں۔" میاں داماد ڈپٹی کلکٹر تھے۔ جامے سے باہر ہوگئے۔ خسر پر سمن جاری کر دیا۔ بے چارہ بڈھا آدمی دوسرے دن صاحبزادی کو لے کر داماد کی خدمت میں حاضر ہوا۔ تب جا کے اس کی جان بچی۔ یہ لوگ خر دماغ ہوتے ہیں اور پھر تمہیں حاکم ضلع سے لینا کیا ہے۔ اگر تم کوئی باغیانہ یا اشتعال انگیز مضمون لکھو گے فوراً گرفتار ہو جاؤ گے۔ مطلق رعایت نہ کی جائے گی۔ اپنے لڑکے کے لیے قانون گوئی یا نائب تحصیلداری کی فکر تمہیں ہے نہیں پھر خواہ مخواہ دوڑے جاؤ۔

لیکن میں نے دوستوں کی صلاح پر کار بند ہونا تہذیب کے خلاف سمجھا۔ ایک شریف آدمی قدر افزائی کرتا ہے تو اس سے محض اس بنا پر بے اعتنائی کرنا کہ وہ حاکمِ ضلع ہے' تنگ ظرفی ہے۔ بیشک حاکم ضلع صاحب میرے غریب خانے پر آتے تو ان کی شان کم نہ ہوتی۔ وضع دار آدمی بے تکلف چلا آتا۔ لیکن بھئی ضلع کی افسری بڑی چیز ہے اور قصہ نگار کی ہستی ہی کیا ہے۔ انگلینڈ یا امریکہ میں افسانہ نگاروں کی میز پر مدعو ہونے میں وزیر اعظم بھی اپنا اعزاز سمجھتے ہوں گے۔ لیکن یہ ہندوستان ہے۔ جہاں ہر ایک رئیس کے دربار میں شاعروں کا ایک انبوہ قصیدہ خوانی کے لیے جمع رہتا تھا۔ اور اب بھی تاج پوشی کے موقع پر ہمارے اہلِ قلم بن بلائے رئیسوں کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔ قصیدے پیش کرتے ہیں۔ انعام پاتے ہیں۔ تم تو ایسے کہاں کے وہ ہو کہ حاکم ضلع تمہارے گھر چلا آئے۔ وہ افسر ہے' تم معمولی مضمون نگار ہو۔ جب تم میں اس قدر اکڑپن اور تنک مزاجی ہے تو پھر وہ ضلع کا بادشاہ ہے۔ اگر اسے کچھ غرور بھی ہو تو جائز ہے۔ کمزوری کہو' حماقت کہو' خر دماغی کہو۔ لیکن پھر بھی جائز ہے۔ اور خدا کا شکر کرو کہ افسر صاحب تمہارے گھر نہیں آئے ورنہ ان کی خاطر مدارات کا سامان تمہارے یہاں کہاں تھا۔ گت کی کرسی بھی تو نہیں ہے۔ تین پیسے کی بیڑیاں پی کر دل خوش کر لیتے ہو' ہے توفیق روپے کے دو سگار پینے کی؟ کہاں وہ سگار ملتا ہے۔ اس کا کیا نام ہے۔ اس کی خبر ہے تمہیں۔ اپنی تقدیر کو سراہو کہ وہ خود نہیں آئے۔ چار پانچ روپے بگڑ ہی جاتے اور شرمندگی بھی ہوتی۔ خدانخواستہ اور تمہاری شامتِ اعمال سے کہیں ان کی اہلیہ بھی ہمراہ ہوتیں تو قیامت ہی آ جاتی۔ ان کی مہمان نوازی تم یا تمہاری دھرم پتنی جی کر سکتی تھیں؟ وہ تمہارے گھر میں یقیناً جاتیں اور تمہارے لیے موت کا سامان ہوتا۔ تم اپنے گھر میں پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنی بے نوائی میں مگن رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہو۔ لیکن کوئی بھی خوددار شخص گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی خستہ حالی دوسروں کے لیے مایۂ تفریح ہو۔ ان لیڈی صاحب کے سامنے تمہاری تو زبان بند ہو جاتی اور یہی جی چاہتا کہ زمین پھٹ جاتی اور تم اس میں سما جاتے۔

چنانچہ میں نے حاکمِ ضلع کی دعوت قبول کی اور باوجودیکہ اس میں کسی قدر ناگوار رعونت تھی، لیکن شفقت اور خلوص نے اسے ظاہر نہ ہونے دیا۔ کم سے کم انہوں نے مجھے شکایت کا موقع نہ دیا۔ افسرانہ فطرت کو تبدیل کرنا ان کے امکان سے باہر تھا۔

میں نے سوچا یہ ذاتی معاملہ ہے انہوں نے مجھے بلایا۔ میں چلا گیا۔ کچھ ادبی گپ شپ کی اور واپس آیا۔ کسی سے اس کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں نے اس واقعہ کو ذرا اہمیت نہ دی گویا بازار سبزی خریدنے گیا تھا۔ لیکن مخبروں نے جانے کیسے اس کی خبر لگائی۔ خاص خاص حلقوں میں یہ چرچے ہونے لگے کہ افسرِ ضلع

سے میرے بڑے دوستانہ تعلقات ہیں اور وہ میری بڑی عزت کرتے ہیں۔ مبالغے نے میری وقعت میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ یہاں تک مشہور ہوا کہ مجھ سے صلاح لیے بغیر کوئی تجویز یا رپورٹ نہیں لکھتے۔

کوئی ذی ہوش آدمی اس قسم کی شہرت سے فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ اہلِ غرض باؤلے ہوتے ہیں۔ تنکے کا سہارا ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ انہیں اس کا یقین دلانا کچھ مشکل بھی نہیں تھا کہ میرے ذریعے ان کی مطلب براری ہو سکتی ہے۔ لیکن میں ایسی حرکتوں کو ذلیل سمجھتا ہوں۔

صدہا اصحاب اپنی اپنی داستانیں لے کر میرے پاس آئے۔ کسی کے ساتھ پولیس نے بے جا زیادتی کی تھی۔ کوئی انکم ٹیکس والوں کی سختیوں سے نالاں تھا۔ کسی کو یہ شکایت تھی کہ دفتر میں اس کی حق تلفی ہو رہی ہے اور اس کے بعد کے آدمیوں کو ترقیاں مل رہی ہیں۔ اس کا نمبر جب آتا ہے' کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ علیٰ ہذا القیاس اس قسم کی کوئی نہ کوئی داستاں روز ہی مجھ تک پہنچنے لگی۔ لیکن میرے پاس ان سب کے لیے ایک ہی جواب تھا:

"مجھ سے کوئی مطلب نہیں۔"

ایک دن میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ میرے بچپن کے ایک ہم جماعت دوست وارد ہوئے۔ ہم دونوں ایک ہی مکتب میں پڑھنے جایا کرتے تھے کوئی 45 سال کی پرانی بات ہے۔ میری عمر آٹھ یا نو سال سے زیادہ نہ تھی۔ قریب قریب اسی عمر کے' مگر مجھ سے کہیں توانا اور فربہ تھے۔ میں ذہین تھا' وہ حد درجہ کے غبی۔ مولوی صاحب ان سے عاجز تھے اور انہیں سبق پڑھانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی۔ میں اسے اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتا تھا اور مولوی صاحب کی قمچی جہاں لاچار تھی وہاں میری ہمدردی کامیاب ہو گئی۔ بلدیو چل نکلا اور خالقِ باری تک آ پہنچا مگر اسی درمیان میں مولوی صاحب کی وفات نے اس مکتب کا خاتمہ کر دیا اور طلبہ بھی منتشر ہو گئے۔ تب بلدیو کو میں نے صرف دو تین بار راستے میں دیکھا۔ میں اب بھی وہی منحنی ہوں وہ اب بھی دیو قامت۔ رام رام ہوئی۔ ایک دوسرے کی خیر و عافیت پوچھی اور اپنی اپنی راہ چلے گئے۔ میں نے ان سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

"آؤ بھئی بلدیو مزے میں تو ہو' کیسے یاد کیا۔ کیا کرتے ہو آج کل؟"

بلدیو نے دردناک انداز سے کہا:

"زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں اور کیا' تم سے ملنے کا بڑے دنوں سے اشتیاق تھا۔ یاد کرو وہ مکتب والی بات جب تم مجھے پڑھایا کرتے تھے۔ تمہاری بدولت چار حرف پڑھ گیا اور اپنی زمینداری کا کام سنبھال لیتا ہوں۔ نہیں تو مورکھ بنا رہتا۔ تم میرے گرو ہو بھائی۔ سچ کہتا ہوں مجھ جیسے گدھے کو پڑھانا تمہارا ہی کام تھا۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ مولوی صاحب سے سبق پڑھ کر اپنی جگہ پر آیا نہیں کہ بالکل صاف' کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا تم تو تب بھی بڑے ذہین تھے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے مجھے پُر عزت نظروں سے دیکھا۔ میں نے باچشمِ تر کہا:

"میں تو جب تمہیں دیکھتا تو یہی جی میں آتا ہے کہ دوڑ کر تمہارے گلے سے لپٹ جاؤں۔ 45 سال کی مدت گویا بالکل غائب ہو جاتی ہے۔ وہ مکتب آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے اور بچپن ساری دلفریبیوں کے ساتھ تازہ ہو جاتا ہے۔"

بلدیو نے بھی رقت آمیز لہجے میں جواب دیا:

"میں نے تو بھئی تمہیں ہمیشہ اپنا مربّی اور رہنما سمجھا ہے۔ جب تمہیں دیکھتا ہوں تو چھاتی گز بھر کی ہو جاتی

ہے کہ وہ میرا بچپن کا دوست جاتا ہے' جو وقت پڑنے پر کبھی دغا نہیں دے گا۔ تم کچھ کھاتے پیتے کیوں نہیں' سوکھتے کیوں جاتے ہو۔ گھی نہیں ملتا ہو تو ایک دو کنستر بھجوادوں۔ اب تم بوڑھے ہوئے خوب ڈٹ کر کھایا کرو۔ اب تو بدن میں جو کچھ طاقت ہے وہ کھانے پینے کی بدولت ہے۔ میں تو اب بھی سیر بھر دودھ اور پاؤ بھر گھی اڑائے جاتا ہوں۔ ادھر تھوڑا مکھن بھی کھانے لگا ہوں۔ عمر بھر بال بچوں کے لیے مرمٹے کوئی پوچھتا ہے تمہاری کیا حالت ہے؟ اگر آج کندھا ڈال دوں تو کوئی ایک لوٹے پانی کو نہ پوچھے۔ اس لیے خوب کھاتا ہوں اور سب سے زیادہ کام کرتا ہوں۔ وہی جو بڑا لڑکا ہے اس پر پولیس نے ایک جھوٹا مقدمہ چلادیا ہے۔ اچھا خاصا پہلوان ہے۔ کسی سے دبتا نہیں۔ داروغہ جی سے ایک بار کچھ کہا سنی ہوگئی۔ تب سے اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے۔ ادھر گاؤں میں ڈاکہ پڑگیا۔ داروغہ جی نے تحقیقات میں اسے بھی پھانس لیا۔ ایک ہفتے سے حراست میں ہے۔ مقدمہ محمد خلیل صاحب ڈپٹی کلکٹر کے اجلاس میں ہے اور محمد خلیل اور داروغہ جی کی گہری دوستی ہے۔ ضرور سزا ہوجائے گی۔ اب تم ہی بچاؤ تو اس کی جان بچ سکتی ہے۔ ہمیں اور کوئی امید نہیں ہے۔ سزا تو ہوگی ہی' عزت خاک میں مل جائے گی۔ تم جاکر حاکم ضلع سے اتنا کہہ دو کہ مقدمہ جھوٹا ہے۔ آپ خود تحقیقات کریں۔ بس دیکھو! بچپن کے ساتھی ہو انکار مت کرنا۔ جانتا ہوں کہ تم ان معاملات میں نہیں پڑتے اور نہ پڑنا چاہیے۔ افسرِ ضلع سے تمہاری دوسری طرح کی ملاقات ہے۔ تم کیوں ان قضیوں میں پڑو گے۔ لیکن یہ گھر کا معاملہ ہے۔ اتنا سمجھ لو اور بالکل جھوٹا ہے۔ نہیں تو میں تمہارے پاس نہیں آتا۔ لڑکے کی ماں رو رو کر جان دیئے ڈالتی ہے۔ بیوی نے اپنا دانہ پانی چھوڑ رکھا ہے۔ سات دن سے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ میں دودھ پی لیتا ہوں۔ لیکن دونوں ساس بہو تو بے آب و دانہ پڑی ہوئی ہیں۔ اگر سزا ہوئی تو دونوں مرجائیں گی۔ میں نے یہی کہہ کر سب کو ڈھارس دی ہے کہ جب تک ہمارا بچپن کا دوست زندہ ہے کوئی ہمارا بال بیکا نہیں کرسکتا۔"

میں بڑی مشکل میں پڑا۔ میری جانب سے جتنے اعتراض ہو سکتے تھے' ان کا جواب بلدیو سنگھ نے پہلے ہی دے دیا تھا اگر اعادہ کرتا ہوں تو یہ سر ہو جائے گا۔ گلا نہ چھوڑے گا۔ کوئی جواب نہ سوجھا۔ آخر مجھے مجبور ہو کر کہنا پڑا کہ "میں جاکر صاحب سے اس کا ذکر کروں گا۔ مگر مجھے امید نہیں کہ اس کا کچھ نتیجہ ہو۔ حکام ماتحتوں کے معاملے میں بہت کم دخل دیتے ہیں۔"

"تم جاکر کہہ دو۔ تقدیر میں جو ہے وہ تو ہوگا ہی۔"

"اچھی بات۔"

"تو کل جاؤ گے؟"

"کل ہی جاؤں گا۔"

بلدیو سنگھ کو رخصت کر کے میں نے اپنا مضمون ختم کیا اور آرام سے کھانا کھا کر لیٹا۔ میں نے بلدیو سنگھ کو جھانسہ دیا تھا۔ میں پہلے سے بتا چکا تھا کہ افسر عام طور پر پولیس کا اعتبار کرتے ہیں۔ یہ کہنے کی کافی گنجائش تھی کہ صاحب نے اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا۔ صاحب کے پاس جانے کا میں نے خواب میں بھی خیال نہ کیا تھا۔

میں اس واقعہ کو بالکل بھول گیا تھا کہ آٹھویں دن بلدیو سنگھ اپنے پہلوان بیٹے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ بیٹے نے میرے قدموں پر سر رکھ دیا اور ایک کنارے کھڑا ہو گیا۔ بلدیو سنگھ بولے:

"بالکل بَری ہو گیا بھائی۔ صاحب نے داروغہ جی کو بلا کر خوب ڈانٹا کہ تم بھلے آدمیوں کو ستاتے اور بدنام کرتے ہو۔ اگر پھر ایسی شرارت کی تو برخاست کر دیئے جاؤ گے۔ داروغہ جی بہت پریشان ہوئے۔ جب صاحب نے

اسے بری کر دیا تو میں نے داروغہ صاحب کو جھک کر سلام کیا۔ بے چارے پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ یہ تمہاری سفارش کی برکت ہے اور اگر تم نے مدد نہ کی ہوتی تو ہم تباہ ہو گئے تھے۔ یہ سمجھ لو چار آدمیوں کی جان بچ گئی ہے۔ تمہارے پاس بہت ڈرتے ڈرتے آیا تھا۔ لوگوں نے کہا تھا کہ ان کے پاس ناحق جاتے ہو وہ بڑا بے مروّت آدمی ہے۔ اس کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ آدمی وہ کہلاتا ہے، جس سے ضرورت مندوں کا کام نکلے۔ وہ کیا آدمی ہے جو کسی کی کچھ سنے ہی نہیں۔ یہی کہے مجھ سے کچھ مطلب نہیں۔ لیکن بھائی میں نے کسی کی نہ سنی۔ میرے دل میں میرا رام بیٹھا کہہ رہا تھا کہ تم چاہے کتنے ہی روکھے اور بے مروّت ہو لیکن مجھ پر ضرور رحم کرو گے۔"

یہ کہہ کر بلدیو سنگھ نے اپنے لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ باہر گیا اور ایک بڑا سا گٹھڑ اٹھا لایا۔ جس میں انواع واقسام کی دیہاتی سوغاتیں بندھی ہوئی تھیں۔ حالانکہ میں برابر کہے جاتا تھا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی ضرورت نہیں۔"

مگر اس وقت بھی مجھے یہ تسلیم کرنے کا حوصلہ نہ ہوا کہ میں صاحب کے پاس گیا ہی نہیں۔ جو کچھ ہوا خود بخود ہوا۔ مفت کا احسان چھوڑنا طبیعت نے گوارا نہ کیا۔

قاتل کی ماں

(1)

رات کو رامیشوری سوئی، تو کیا خواب دیکھتی ہے کہ ونود نے کسی آفیسر کو مار ڈالا ہے اور کہیں روپوش ہو گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں بے گناہوں کو زدوکوب کر رہی ہے اور تمام شہر میں شوروشر برپا ہے۔ اسی گھبراہٹ میں اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو ونود سوتا تھا۔ اٹھ کر ونود کے پاس گئی۔ پیار سے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی اور سوچنے لگی میں نے کیا بے سر پیر کا خواب دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی کچھ متفکر بھی ہو گئی۔ پھر لیٹی مگر نیند نہ آئی۔ دل میں ایک خوف سما گیا تھا۔

صبح ونود نے ماں کو متفکر دیکھ کر پوچھا۔ "ماں! آج اداس کیوں ہو؟"

ماں ونود کو محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھ کر بولی۔ "بیٹا! تم سے کیا کہوں۔ رات کو میں نے ایک بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ جیسے تم کسی افسر کو مار کر بھاگ گئے ہو اور بے گناہوں پر مار پڑ رہی ہے۔"

ونود نے ہنس کر کہا۔ "کیا تم چاہتی تھیں کہ میں پکڑ لیا جاتا؟"

ماں نے کہا۔ "میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایسے کاموں کے نزدیک ہی نہ جاؤ۔ پکڑے جانے کا سوال ہی کیوں اٹھے۔ ہمارا دھرم ہے کہ خود جئیں اور دوسروں کو بھی جینے دیں۔ دوسروں کو مار کر خود جینا میرے دھرم کے خلاف ہے۔"

ونود: "یہ دھرم اور نیتی کا زمانہ نہیں ہے۔"

ماں: "دھرم اور نیتی کو ہمیشہ فتح حاصل ہوئی ہے اور آئندہ بھی ہو گی۔ سوراجیہ قتل وخون سے نہیں ملتا۔

تیاگ' تپ آتم شدھی سے ملتا ہے۔ لالچ چھوڑتے نہیں۔ بُری خواہشات چھوڑتے نہیں۔ اپنی برائیاں دیکھتے نہیں۔ اس پر دعویٰ ہے سوراجیہ لینے کا۔ یہ سمجھ لو جو سوراجیہ قتل وخون سے ملے گا' وہ قتل وخون پر ہی قائم رہے گا۔ عوام کی کوشش سے سوراجیہ ملے گا وہ ملک کی چیز ہوگی۔ افراد کی کوشش سے جو سوراجیہ ملے گا' وہ افراد کی چیز ہوگی اور تھوڑے سے آدمیوں کا ایک گروہ تلوار کے زور سے انتظام کرے گا۔ ہم عوام کا سوراجیہ چاہتے ہیں۔ قتل وخون کی طاقت رکھنے والے گروہ کا نہیں۔"

ونود نے کہا۔ "تم تو سٹیج پر کھڑی ہو کر بولتی ہو' یہاں کون سننے والا ہے۔"

ماں نے کہا۔ "بیٹا! تم ہنستے ہو اور میرا جی دکھی ہے۔ کئی دن سے دائیں آنکھ برابر پھڑک رہی ہے۔ یقیناً کوئی مصیبت آنے والی ہے۔"

ونود نے کہا۔ "میں مصیبت سے نہیں ڈرتا۔ ابھی کون سا سکھ بھوگ رہے ہیں جو مصیبتوں سے ڈریں۔"

یہ کہتا ہوا ونود باہر چلا گیا۔

(2)

آج صبح ہی سے ونود کا پتہ نہ تھا۔ معلوم نہیں کہاں گیا۔ رامیشوری نے پہلے تو سمجھا کہ کانگریس کے دفتر میں ہوگا۔ لیکن جب ایک بج گیا اور وہ لوٹ کر نہ آیا تو اسے فکر ہوئی۔ دس بجے کے بعد وہ کہیں نہیں رکتا تھا۔ پھر سوچا شاید کسی کام سے چلا گیا ہو۔ رات کا خواب اسے بے چین و پریشان کرنے لگا اور وقت کے ساتھ ساتھ بے چینی بھی بڑھنے لگی۔ جب شام ہوگئی تو اس سے رہا نہ گیا۔ کانگریس کے دفتر گئی۔

وہاں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آج ونود صبح سے ایک بار بھی نہیں آیا۔

رامیشوری کا دل کسی نامعلوم خوف سے پریشان ہوگیا۔ وہ خواب مجسم بن کر اسے ڈرانے لگا۔ کچھ دیر تک وہ حواس باختہ چپ چاپ کھڑی رہی۔ پھر خیال آیا شاید گھر گیا ہوگا۔ فوراً گھر لوٹی۔ لیکن یہاں ونود کا اب تک پتہ نہ تھا۔

جوں جوں اندھیرا ہوتا گیا تھا۔ اس کی جان خشک ہوتی جاتی تھی۔ اس پر دائیں آنکھ بھی پھڑکنے لگی۔ خیالات اور بھی خوفناک صورت اختیار کرنے لگے۔ کوئی دیوی یا دیوتا نہ بچا جس کی اس نے منت نہ مانی۔ کبھی صحن میں آکر بیٹھ جاتی۔ کبھی دروازے پر جا کر کھڑی ہوتی۔ اس کا دل کسی خوف زدہ طائر کی مانند' کبھی نشیمن میں آبیٹھتا اور کبھی شاخ پر۔ کھانا پکانے کا خیال کسے تھا۔ بار بار یہی سوچتی بھگوان میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے' جس کی سزا دے رہے ہو۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو' تو معاف کرو۔ میں تو خود ہی مصیبت زدہ ہوں' اب اور برداشت کرنے کی طاقت مجھ میں نہیں ہے۔

رامیشوری سر پر ہاتھ رکھ کر رونے لگی۔ آسمان پر سیاہ بادل گھرے ہوئے تھے۔ ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بھی بے کس کے ساتھ کوئی رونے والا نہ دیکھ کر اس کا ساتھ دیتی ہوں۔

(3)

نصف شب گزر چکی تھی۔ رامیشوری ابھی تک دروازے پر کھڑی ونود کا راستہ دیکھ رہی تھی۔ اتنے میں

کوئی شخص نہایت تیزی سے دوڑا ہوا آیا اور دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ایک سیاہ کمبل تھا' جسے اس نے اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ منہ کا بڑا حصہ چھپ گیا تھا۔ رامیشوری نے ڈر کر پوچھا۔ "کون ہے؟"

وہ ونود تھا۔ جلدی سے اندر داخل ہو کر ماں سے دروازہ بند کرنے کو کہا۔ پھر آنگن میں آ کر کمبل کو رکھ دیا اور کھانے کو مانگا۔

رامیشوری نے خائف ہو کر پوچھا۔ "تم آج دن بھر کہاں تھے؟ میں تمام دن تمہیں ڈھونڈتی رہی۔" ونود نے قریب آ کر کہا۔ "میں ایک نہایت ضروری کام سے گیا تھا اور ابھی پھر لوٹ جانا ہے۔ صرف تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اب دو چار مہینے میں یہاں نہ رہ سکوں گا۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے وہی کیا ہے جو میں اپنا دھرم سمجھتا تھا۔ حفاظتِ جان کی خاطر مجھے یہاں سے جانا ضروری ہے۔"

رامیشوری کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ بولی۔ "کیوں بیٹا! تم نے وہی کیا جس کا مجھے خوف تھا؟ ایشور نے تمہاری بدھی کیوں ہر لی۔"

ونود نے کہا: "نہ ایشور نے میری بُدھی ہر لی ہے نہ مجھ پر کوئی آفت آئی ہے۔ میں نے آج چھاؤنی میں ایک آفیسر کو مار ڈالا ہے۔ ایسا نشانہ مارا کہ ایک ہی گولی میں ٹھنڈا ہو گیا۔ ہلا تک نہیں۔"

"کیا وہاں کوئی اور تھا؟"

"کوئی نہیں بالکل سناٹا تھا۔"

"پولیس کو خبر ہو گئی ہے؟"

"ہاں کئی شخص پکڑے گئے ہیں۔ میں تو صاف بچ نکلا۔"

رامیشوری کی حالت بدل گئی۔ بیٹے کی محبت میں اشکبار آنکھیں غصے سے سرخ ہو گئیں۔ بولی۔ "میں اسے بچنا نہیں کہتی کہ مجرم تو منہ چھپا کر بھاگ جائے اور بے گناہوں کو سزا ملے۔ تم خونی ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری کوکھ سے ایسا سپوت پیدا ہو گا ورنہ پیدا ہوتے ہی گلا گھونٹ دیتی۔ اگر مرد ہے تو جا کر عدالت میں اپنا قصور تسلیم کر لے' ورنہ ان بے گناہوں کا خون بھی تیرے سر پر ہو گا۔"

یہ پھٹکار سن کر ونود کو غصہ آ گیا۔ بولا۔ "تمہارے کہنے سے میں خونی نہیں ہوا جاتا اور لوگ یہی کام کرتے ہیں تو لیڈر ہو جاتے ہیں۔ ان کی جے جے کار ہوتی ہے۔ لوگ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ میں نے کیا تو ہتیارا ہو گیا۔"

رامیشوری۔ "ہتیارا تو تو ہے ہی اور جو دوسروں کی ہتیا کرتے ہیں وہ تمام کے تمام ہتیارے ہیں۔ تیری ماں ہوں' میں بھی پاپ کی حصہ دار ہو گئی۔ میرے منہ پر بھی سیاہی لگ گئی۔ لیڈر وہ ہوتے ہیں جو دوسروں کے لیے مرتے ہیں' جو دوسروں کی حفاظت کرے' وہی بہادر اور سورما ہے۔ انہی کا جنم مبارک ہے۔ انہی کی مائیں خوش نصیب ہیں۔ تجھے شرم نہیں آتی کہ تو خون کر کے اپنی بڑائی کر رہا ہے۔"

ونود نے پھر کمبل اٹھا لیا اور بولا۔ "تم میری ماں نہ ہوتیں تو اسی وقت لگے ہاتھ تمہارا کام بھی تمام کر دیتا۔ جیتے جی پھر تمہارا منہ نہ دیکھوں گا۔"

یہ کہتا ہوا وہ جوش سے گھر سے نکل گیا۔

(4)

دم بھر بعد رامیشوری بھی اسی جوش میں گھر سے نکلی۔ "بیٹا ہے تو کیا' وہ یہ ناانصافی گوارا نہیں کر سکتی۔ وہ اسی وقت کوتوالی میں جا کر اس خون کی خبر کر دیگی۔ ونود کا پھانسی پر چڑھنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ بے گناہوں کو پھانسی ہو۔"

لیکن کچھ دور چلنے کے بعد ماں کا دل بے چین ہو گیا۔ وہ لوٹ پڑی اور گھر آ کر خوب روئی۔ جس بیٹے کو اس نے ایسی مصیبتیں جھیل کر پالا کیا اسے پھانسی دلاوے گی۔

لیکن پھر خیال آیا ان بے چاروں کی مائیں بھی تو ہوں گی' جو بے گناہ پھانسی پا جائیں گے۔ انہیں بھی تو اپنے بیٹے اتنے ہی پیارے ہوں گے۔ نہیں نہیں وہ یہ ظلم نہیں کر سکتی۔ اسے بغیر بیٹے کے ہونا منظور ہے' مگر اس کے دیکھتے بے گناہوں کا خون نہ ہو گا۔

رامیشوری اس الجھن میں پڑی ہوئی تھی۔ جب کوئی راستہ نظر نہ آتا تو رونے لگ جاتی تھی۔ پھر سوچتی کیوں نہ خودکشی کر لوں کہ تمام دکھوں سے نجات مل جائے۔ لیکن اس کی موت سے ان بے گناہوں کی جان تو نہ بچے گی۔ ان ماتاؤں کا کلیجہ تو نہ ٹھنڈا ہو گا۔ وہ اس پاپ سے تو آزاد نہ ہو گی۔ وہ اپنے آپ ہی بول اٹھی۔

"خواہ کچھ ہو میں بے گناہوں کا خون نہ ہونے دوں گی۔ اجلاس میں جا کر صاف صاف کہہ دوں گی کہ گناہگار میں ہوں کیونکہ میرے بیٹے نے یہ خون کیا ہے۔ ہم دونوں ہی قصوروار ہیں۔ دونوں کو پھانسی دیجئے۔ میں اپنے دھرم سے منحرف نہ ہوں گی۔ خواہ میری آنکھوں کے سامنے ہی ونود کی بوٹی بوٹی کیوں نہ کر ڈالی جائے۔ ہاں! میں اپنی آنکھوں سے اس کو پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی۔ کیونکہ میں نے اس کو جنم دیا ہے۔ بھگوان! مجھے طاقت دو کہ اپنے فرض پر ڈٹی رہوں۔ میں کمزور ہوں۔ پاپن ہوں' ہتیاری ہوں۔"

رامیشوری بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

(5)

جب رامیشوری کو ہوش آیا تو اس کا ارادہ مستحکم ہو چکا تھا۔ مگر دلی تکلیف ہو رہی تھی۔ کیا اسی لیے بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اسی لیے پالا پوسا تھا کہ ایک دن اسے پھانسی پر چڑھتا دیکھوں گی۔ ونود اس کی زندگی کا سہارا تھا۔ آج اسی ونود سے اس کا ناتا ٹوٹ رہا تھا۔ ونود کی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔ ایک دن وہ تھا کہ وہ اسے چھاتی سے لگائے پھرتی تھی۔ بڑے بڑے دکھ جھیل کر بھی خوش تھی۔ ایک دن یہ ہے کہ وہ اسے پھانسی دلانے جا رہی ہے۔ ونود کی کتابیں اور کپڑے کمرے میں رکھے تھے۔ اس نے ایک ایک چیز کو چھاتی سے لگایا۔ آہ! فرض کا راستہ کس قدر دشوار ہے۔ ونود کو آخری بار گلے لگانے اور اس کا آخری بوسہ لینے کے لیے اس کا دل بے چین ہو گیا۔ کیا لڑکے کو سزا دیتے ہوئے ماں محبت چھوڑ دیتی ہے؟"

رامیشوری ونود کو سزا دینے جا رہی تھی۔ جوشِ محبت سے بھری ہوئی۔

(6)

ایک ہفتہ گزر گیا۔ پولیس نے سازش کا پتہ لگا لیا۔ شہر کے دس نوجوان گرفتار کر لیے۔ انہی میں سے ایک

سرکاری گواہ بھی بن گیا اور مجسٹریٹ کے اجلاس میں مقدمہ دائر ہو گیا۔
ونود کا اسی دن سے پتہ نہ تھا۔ رامیشوری محبت اور فرض کے درمیان اس کشتی کی مانند ڈانواڈول ہو رہی تھی جس کے اوپر طوفانی آسمان ہو اور نیچے طوفانی سمندر۔ کبھی فرض کلیجے کو مضبوط کر دیتا۔ کبھی محبت دل کو کمزور کر دیتی۔ لیکن جوں جوں دن گزرتے تھے فرض پسپا ہوتا جاتا تھا۔ نئی نئی دلیلیں اس کے احساسِ فرض کو کمزور کرتی جاتی تھیں۔ جب تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتا ہے تو اس میں بھی اس کی مرضی ہوگی۔ یہی سب سے زبردست دلیل تھی۔ ان سات دنوں میں اس نے صرف پانی پی کر دن کاٹے اور وہ پانی بھی آنکھوں کے راستے سے نکل جاتا تھا۔ ایسی ہو گئی تھی جیسے برسوں کی مریضہ۔
دس بجے کا وقت تھا۔ وہ کانگریس کے دفتر کی طرف چلی۔ اسی وقت وہ روزانہ ایک بار ونود کا پتہ لینے کے لیے یہاں آیا کرتی تھی۔
ناگہاں اس نے نو دس نوجوانوں کو ہتھکڑیاں پہنے ایک درجن پولیس کے مسلح سپاہیوں کے پنجے میں گرفتار دیکھا۔ پیچھے تھوڑی دور پر کچھ مرد عورت سر جھکائے رنج و یاس کی تصویر بنے آہستہ آہستہ چلے جا رہے تھے۔
رامیشوری نے دوڑ کر ایک سپاہی سے پوچھا۔ ”کیا یہ کانگریس کے آدمی ہیں؟“
سپاہی نے کہا۔ ”کانگریس والوں کے سوا انگریزوں کو کون مارے گا؟“
”کون مارا گیا؟“
”ایک پولیس کے سارجنٹ کو ان سب نے قتل کر دیا۔ آج آٹھواں دن ہے۔“
”کانگریس کے آدمی ایسا نہیں کرتے۔“
”قصور نہ ہوگا تو آپ چھوٹ جائیں گے۔“
رامیشوری دم بھر وہیں کھڑی رہی۔ پھر انہی لوگوں کے پیچھے پیچھے کچہری کی طرف چلی۔ فرض یہ نئی طاقت پا کر سنبھل گیا۔ نہیں! وہ اتنے بے قصور نوجوانوں کو موت کے منہ میں نہ جانے دے گی۔ اپنے خونی بیٹے کی حفاظت کے لیے اتنے بے گناہوں کا خون نہ ہونے دے گی۔

(7)

کچہری میں بہت بڑا مجمع تھا۔ رامیشوری نے ایک اردلی سے پوچھا۔ ”کیا صاحب آگئے؟“
اس نے جواب دیا۔ ”ابھی نہیں آئے، آتے ہی ہوں گے۔“
”بہت دیر سے آتے ہیں۔ بارہ تو بجے ہوں گے؟“
اردلی نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تو کیا وہ تمہارے نوکر ہیں کہ جب تمہاری مرضی ہو آکر بیٹھ جائیں۔ بادشاہ ہیں جب مرضی ہوگی آئیں گے۔“
رامیشوری چپ ہو گئی۔
اس کے پاس ہی کئی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایک نے پوچھا:
”کیوں بہن تمہارے گھر کا بھی کوئی لڑکا پکڑا گیا ہے؟“

رامیشوری اپنی فکروں میں ڈوبی ہوئی تھی، کچھ نہ بولی۔

اس عورت نے پھر کہا۔ "کیا کہوں نہ جانے کس پاپی نے خون کیا۔ آپ تو منہ میں سیاہی لگا کر چھپ رہا اور ہم لوگوں کے متھے لگی۔"

کچھ عورتیں رو رہی تھیں۔ رامیشوری بھی رونے لگی۔

ایک ضعیف عورت اسے سمجھانے لگی:

"بہن چپ ہو جاؤ جو ہماری قسمت میں لکھا ہے وہی ہو گا۔ میرا بیٹا بالکل بے قصور پکڑا گیا ہے۔ کانگریس میں کام کرتا تھا۔ تمہارا کون گرفتار ہے؟"

رامیشوری نے اسے بھی کچھ جواب نہ دیا۔ بار بار لوگوں سے پوچھتی تھی۔ "صاحب کب تک آئیں گے؟"

دو بجے صاحب کی موٹر آئی۔ اجلاس میں ہلچل مچ گئی۔ جوں ہی صاحب کرسی پر بیٹھے، سرکاری وکیل نے یہ خون کا مقدمہ پیش کر دیا۔ پولیس کے افسر آ گئے۔ ملزم بھی سامنے کھڑے کر دیئے گئے۔

عین اس وقت رامیشوری نے اجلاس کے روبرو آ کر سلام کیا اور صاف لفظوں میں بولی:

"حضور اس مقدمے کے پیش ہونے سے پہلے میں کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔"

سب کے سب اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگے۔ کمرے میں سنّاٹا چھا گیا۔ صاحب نے اس کو تیز نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "کیا بات ہے؟"

رامیشوری: "میں اس لیے آپ کے سامنے آئی ہوں کہ اس مقدّمے کا سچا حال بیان کروں۔ سارجنٹ کا قتل کرنے والا میرا بیٹا ہے۔ یہ تمام ملزم بے گناہ ہیں۔"

صاحب نے متحیّر ہو کر پوچھا۔ "تم اپنے ہوش میں ہو یا نہیں؟"

رامیشوری نے کہا۔ "میں اپنے ہوش میں ہوں اور بالکل سچ کہتی ہوں۔ سارجنٹ کو میرے بیٹے نے مارا ہے۔ اس کا نام ونود بہاری ہے۔ میرے گھر میں اس کا فوٹو رکھا ہوا ہے۔ وہ اسی دن سے لاپتہ ہو گیا ہے۔ میں اپنے ہوش میں ہوں۔ اپنے بیٹے سے میری کوئی دشمنی نہیں ہے۔ میں اسے اسی طرح پیار کرتی ہوں جیسے ہر ایک بیوہ اپنے اکلوتے بیٹے سے۔ ایک ہفتہ پیشتر وہی میرا سب کچھ تھا۔ لیکن جب میرے ہر چند منع کرنے پر بھی اس نے یہ خون کیا تو میں نے سمجھ لیا میرے کوئی بیٹا نہ تھا۔ اس کی جان بچانے کے لیے میں اتنے گھر برباد نہ ہونے دوں گی۔ میری ان بہنوں کو بھی تو اپنی اولاد اتنی ہی پیاری ہے۔ انہیں بے اولاد بنا کر میں اولاد والی رہنا نہیں چاہتی۔ میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا۔ انصاف آپ کے ہاتھ ہے۔"

کمرے میں ہلچل مچ گئی۔ مرد عورت سب نے رامیشوری کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کئی عورتیں اس کے قدموں پر سر رکھ کر رونے لگیں۔ اپنی خوشی میں کسی کو اس بات کا خیال نہ رہا کہ اس بدنصیب کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ وہ بے حس و حرکت درمیان میں کھڑی تھی۔ نہ کچھ سوجھتا تھا، نہ سنائی دیتا تھا۔ بس ونود کی صورت آنکھوں کے سامنے تھی۔

یکایک مجمع سے ایک آدمی نکل کر رامیشوری کے سامنے آیا اور اس کے سینے میں خنجر اتار دیا۔ رامیشوری چیخ مار کر گر پڑی اور حملہ آور کے چہرے کی طرف دیکھ کر چونک پڑی۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا:

"ارے تُو ہے ونود!"

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے نکلے اور آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو گئیں۔